مفردات القرآن (اردو)

مصنف
امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری

شیخ شمس الحق
۲۱۔ کشمیر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

مفردات القرآن (اردو)

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری

جلد اول

شیخ شمس الحق

۲۳۸۔ کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

نام کتاب : مفردات القرآن
نام مولف : امام راغب اصفہانی
نام مترجم : حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدہ صاحب
طابع و ناشر : شیخ شمس الحق
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز
تاریخ اشاعت : جون ۸۷ء
قیمت :

واحد تقسیم کار

اسلامی اکادمی
اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا قرآن پاک نوعِ انسانی کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور یہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے انسانی عقل و فکر کے لئے ہر دور میں رہنما بن سکتا ہے اس کے مضامین کی وسعت اور ہمہ گیر تعلیمات کا تقاضا یہ تھا کہ اسے اس زبان میں نازل کیا جاتا جو اس وسعت کی متحمل ہو سکے اور اس کے اعجازِ بیان کو اپنے اندر سمو سکے۔

یہ ادعا نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ یہ وسعت صرف عربی زبان میں پائی جاتی ہے فصاحت و بلاغت کے جو نادر اس زبان میں پنہاں ہیں دوسری سامی اور آریائی زبانوں کا دامن ان سے یکسر تہی ہے اشتقاقات اور مترادفات کی جو فراوانی عربی زبان میں پائی جاتی ہے کسی دوسری زبان کو میسر نہیں محسنات بدیعیہ کے خدوخال اور آثار جو اس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔ دوسری زبانیں ان سے عاری نظر آتی ہیں الغرض عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو ہر قسم کی لفظی اور معنوی خوبیوں سے آراستہ پیراستہ ہے اور دوسری زبانوں پر فائق نظر آتی ہے۔

اسکی دلیل یہ بھی ہے کہ عربی زبان میں جس قدر ضخیم قوامیس و معاجم لکھے گئے ہیں دوسری زبانوں میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا ان معاجم کے ملاحظہ سے عربی زبان کی فراخ دامانی اور جامعیت بخوبی سمجھ آسکتی ہے صحاح جوہری[1] کو لیجئے کہ وہ چالیس ہزار مواد (ROOTS) پر مشتمل ہے قاموس فیروز آبادی[2] میں ساٹھ ہزار مواد مذکور ہیں لسان العرب میں ابن منظور افریقی[3] نے اسی ہزار مواد سے بحث کی ہے ان کے بعد تاج العروس شرح قاموس ملاحظہ فرمائیے جس میں سید مرتضیٰ زبیدی[4] نے

---

[1] اسماعیل بن حماد الجوہری المتوفی ۳۳۲ھ یا ۳۹۳ھ [2] القاموس المحیط والقابوس الوسیط فیما ذہب من کلام العرب شماطیط لمجد الدین ابی طاہر محمد بن یعقوب بن محمد الشیرازی الفیروز آبادی (۷۲۹ھ – ۸۱۶ھ) [3] ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری . . . (۶۳۰ھ – ۷۱۱ھ)

اپنے متبع سے ایک لاکھ بیس ہزار الفاظ جمع کر ڈالے ہیں[1]۔

ان تصریحات کے پیش نظر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قرآن پاک ایسی جامع کتاب کو، جو ابدی حقائق پر مشتمل ہے عربی زبان میں ہی نازل ہونا چاہیئے تھا اور یہی زبان ایسی تھی جو لسانِ وحی کی ترجمان بن سکتی تھی[2]۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عرب محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے اجمال وتفصیل سے کما حقہٗ آگاہ ہو جاتے تھے اور اس کے مفہوم ومعنی کی تہ تک پہنچ جاتے تھے جیسا کہ ابن خلدون اور ان کے بالتبع بعض دوسرے مؤلفین نے اس قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے[3] کیونکہ ایسی بات کہنا کسی قوم یا معاشرے کے احوال طبعی سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے موجودہ دور ہی کو لیجیے کہ کسی زبان میں جو علمی کتابیں تالیف کی جا رہی ہیں کیا اس زبان کے جاننے اور بولنے والے محض اہل زبان ہونے کی بنا پر ان کتابوں کو سمجھ رہے ہیں جب یہ واقعہ ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے معرفت لسانی کے علاوہ خاص درجہ کی ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کی ضرورت ہے تو ہم یہ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ نزول قرآن کے زمانہ میں جو عام اہل عرب یا صحابہ کرام موجود تھے محض عربی ہونے کی بنا پر خود ہی قرآن سمجھ لیتے تھے اور انہیں کسی معلم یا رہنما کی طرف مراجعت کی ضرورت نہ تھی۔

مزید برآں ہم صحابہؓ میں سے اہل علم حضرات کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کے بعض الفاظ کے معنی کے ادراک سے عجز کا اظہار فرمایا ہے علامہ سیوطیؒ الاتقان میں لکھتے ہیں:۔

حضرت عمرؓ نے آیت کریمہ: وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا میں "أَبًّا" کے معنی سمجھنے سے عجز کا اعتراف کیا ہے[4]

نیز منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر آیت کریمہ: أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ تلاوت فرمائی اور حاضرین سے "تخوف" کے معنی دریافت فرمائے اس پر بنی ہذیل سے ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا "اس آیت میں "تخوف" بمعنی "تنقص" ہے اور اس پر یہ شاہد پیش کیا[5]۔

تخوف الرحل منها تامكا قردا كما تخوف عود النبعة السفن

حضرت ابن عباسؓ ترجمان القرآن کے لقب سے معروف ہیں مگر مجاہد راوی ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا "فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ" کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا حتیٰ کہ دو اعرابی ایک کنویں کے متعلق نزاع میرے پاس لائے ان میں سے ایک نے اپنے حق ملکیت کے ثبوت میں کہا: "انا فطرتها" کہ اس کنویں کو پہلی مرتبہ میں نے کھودا ہے یہ کلمہ سن کر میری مشکل حل ہو گئی اور فاطر السموٰت کا صحیح مفہوم میں نے سمجھ لیا۔

صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں عدی بن حاتم کا قصہ مشہور ہے جو دلچسپ بھی ہے یعنی کہ جب آیت کریمہ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ: ۱۸۷) نازل ہوئی تو عدیؓ کا بیان ہے کہ میں نے سیاہ اور سفید دو عقال اپنے تکیے کے نیچے رکھ لئے کہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگیں گے تو کھانا پینا بند کر دوں گا آنحضرت کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا:۔

---

[1] محمد بن محمد بن عبد الرزاق الحسینی الزبیدی الملقب بمرتضیٰ (۱۱۴۵ھ – ۱۲۰۵ھ)[2] راجع شرح دیباجۃ القاموس للعلامۃ نصر الہورینی ص ۲۶
[2] راجع الفیض الخبیر علی نہج التیسیر ص ۳۲ – ۳۴ بحث ترجمہ قرآن [3] ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۰
[4] ج ۲ ص ۱۱۴ والموافقات بحوالہ اسماعیل [5] الموافقات ج ۲ ص ۸۸ – ۸۸ [6] صحیح بخاری مع الفتح ج ۸: ۱۳۹

إنَّكَ لَعَرِيضُ القفا إنَّمَا هِيَ سَوَادُ اللَّيْلِ وبياض النهار

کہ .... اس سے مراد تو صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی ہے[1]

مندرجہ بالا سطور سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابہ کرام کو بعض مفرد اور مرکب کلمات کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی اور وہ آنحضرت یا اپنے رفقاء میں سے کسی دوسرے سے دریافت کرتے تھے اور قرآن فہمی میں سب یکساں صلاحیتوں کے مالک نہ تھے ابن قتیبہؒ لکھتے ہیں :۔

عرب قرآن فہمی میں مساوی درجہ پر نہ تھے کہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے غریب اور متشابہات کا ادراک کر لیتا ہو بلکہ وہ مختلف مدارج کے حامل تھے

اسی طرح مسروقؒ کا بیان ہے :۔

میں صحابہ کرام کی مجالس میں بیٹھتا رہا اور ان سے مستفید بھی ہوتا رہا میں نے دیکھا کہ صحابہؓ کی مثال پانی کے جوہڑ کی ہے بعض جوہڑ وہ ہیں جو پورے علاقہ کی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں جن سے بمشکل ایک آدمی سیر ہو سکتے ہیں۔

اس مختصر تمہید سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابہؓ محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے ہر مقام کو نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو آنحضرت کی طرف رجوع کی ضرورت تھی اور یہ کہ علم و فضل میں سب صحابہ مساوی صلاحیتوں کے مالک نہ تھے بلکہ طبعی اور فطری طور پر ان میں بھی تفاوت درجات موجود تھا اس کے بعد اب ہم ان وسائل و مصادر سے بحث کرتے ہیں جو دور صحابہ میں موجود تھے جن سے بے نیازی دراصل تفسیر بالرائے کا دروازہ کھولتی ہے۔

تتبع اور جستجو سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن فہمی کے چار ذرائع تھے جن سے صحابہ و تابعین مستفید ہوتے رہے اور آج بھی ان ذرائع کی وہی حیثیت حاصل ہے جو اس دور میں سمجھی جاتی تھی۔

(۱) قرآن کریم (۲) احادیث نبویہ (۳) اسرائیلیات (۴) آثار صحابہؓ

(۱) قرآن کریم نے اپنے اسلوب بیان میں اگر ایک مقام پر اجمال سے کام لیا ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل بھی فرما دی ہے اور بعض آیات میں اگر اطلاق یا عموم پایا جاتا ہے تو دوسرے مقامات پر ان کی تقیید و تخصیص بھی موجود ہے اس بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ بقول "القرآن یفسر بعضه بعضاً" لازم ہے کہ قرآن سمجھنے کے لئے پہلے قرآن ہی کا مطالعہ کیا جائے جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک موضوع سے متعلقہ آیات کو یکجا کر کے مجموعی حیثیت سے ان پر غور کیا جائے علمائے تفسیر نے اس طریق تفسیر کو سب سے مقدم اور بہتر قرار دیا ہے حافظ ابن کثیرؒ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کے لئے سب سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔[2]

اس سلسلہ میں اختلاف قراءت کو بھی ایک اہم مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے صحابہ کرام اور تابعینؒ بعض آیات کو سمجھنے کے لئے اختلاف قراءت سے بھی استفادہ کرتے تھے خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کی قراءت بہت زیادہ

---

[1] المسائل والاجوبہ ص ۸ طبع سعادت مصر ۱۳۴۹ھ [2] تفسیر ابن کثیر ص ۳

اہمیت کی حامل ہیں حضرت مجاہدؒ بیان فرماتے ہیں :-

اگر میں حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت کو اختیار کرتا تو میرے بہت سے سوال ابن عباسؓ سے استفسار کے بغیر ہی حل ہو جاتے۔[۱]

بلکہ بعض علماء نے تفسیر کے ارتقاء اور اس کے مدارج کے سلسلہ میں اختلاف قراءت کو پہلا زینہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی جسے صحابہؓ اور تابعینؒ نے اختیار کیا ' مگر اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قراءت متواترہ تو نصوص کی حیثیت رکھتی ہیں ہاں قراءت غیر متواترہ کو تفسیر کی حیثیت دے سکتے ہیں ۔

مستشرقین نے اختلاف قراءت کو غلط رنگ دے کر اس سے غلط نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں نے قراءات کے قبول کرنے میں تساہل سے کام لیا حالانکہ نصوص قرآن کا ایک ہی شکل پر ہونا ضروری تھا اور یہ کہ ان قراءات کے موجد صحابہؓ کرام ہیں مگر یہ تعصب کی ہرزہ سرائی ہے۔ اگر یہ لوگ قراءت کی صحت اور اس کی قبولیت کے شرائط پر غور کر لیتے تو کبھی بھی صحابہؓ کی طرف تساہل کی نسبت نہ کرتے ۔

"تفسیر القرآن بالقرآن" کے طرز پر علماء نے تفاسیر بھی لکھی ہیں ان میں سے ایک تفسیر امام راغب کی طرف بھی منسوب ہے جس کے متعلق حاجی خلیفہ لکھتے ہیں :-

" وطرزہ انہ اورد جملاً من الآیات ثم فسرھا تفسیراً مشبعاً "

متأخرین میں سے حافظ ابن کثیرؒ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرز تفسیر کا اعتناء کیا ہے اور نہایت سہولت سے اسے اپنایا ہے حتیٰ کہ علماء نے ان کی تفسیر کو "تفسیر القرآن بالقرآن" کا منبع قرار دیا ہے ان کی یہ تفسیر نہایت صحیح اور قابل اعتماد تفاسیر میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ سلفؒ کے مسلک کے مطابق لکھی گئی ہے اس لئے راقم کو اس تفسیر سے خصوصی شغف ہے اور تفسیری حواشی "اشرف الفوائد" میں خاص طور پر اس کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔

شیخ الاسلام مولانا امرتسری مرحوم نے بھی "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" کے نام سے عربی زبان میں نہایت اہم تفسیر تالیف کی ہے جو گو مختصر ہے لیکن قابل قدر ہے تبویب القرآن وغیرہ بھی اسی قسم میں داخل ہو سکتی ہیں ۔

(۲) تفسیر قرآن کے سلسلہ میں سنت نبوی کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے اور ائمہ نے سنت کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے قبول کیا ہے آیت کریمہ (نحل آیت ۴۴) " وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس " سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت پر وحی کی تبلیغ کے علاوہ اس کی تبیین بھی لازم تھی علماء نے احادیث کو مدون کر کے اس تبیین و تفسیر نبوی کو محفوظ کر دیا ہے علمائے بدعت نے اس تفسیر کو رد کر کے گویا ایک طرف تو تفسیر بالرای کا دروازہ کھول دیا ہے اور دوسری طرف سنت کی حجیت کے انکار کی بھی طرح ڈالدی ہے محققین علماء نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کے لئے اس کو لازم قرار دیا ہے چنانچہ امام شافعیؒ "الرسالہ" لکھتے ہیں :-

آنحضرت نے جو فیصلہ بھی صادر فرمایا ہے وہ قرآن ہی سے سمجھ کر صادر فرمایا ہے[۲]

امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہؒ نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات درج کی ہیں یہاں پر ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سنت قرآن کی شارح ہے اور قرآن فہمی کے لئے قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع ضروری ہے ۔ چنانچہ

---

[۱] المذاہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن ص ۱ [۲] الرسالہ رقم ۳۰۲

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :-

اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے[۱]۔

خصوصاً قرآن میں جسقدر آیات احکام ہیں ان کی تفسیر و تشریح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے مثلاً نمازوں کی تعداد ان کا طریق ادا، احکام نکاح و طلاق اور بیوع وغیرہا معاملات وہ ہیں کہ ان کا بیان سنت ہی سے مل سکتا ہے

ابن جریر طبری اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

جہاں تک قرآن میں احکام کا ذکر ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جا سکتے ہیں لہذا تفسیر قرآن کے لئے سنت کی طرف رجوع ناگزیر ہے[۲]

ایک اشکال اور اس کا حل

یہاں پر ایک بہت بڑا اشکال لازم آتا ہے کہ تفسیری روایات اگر مستند اور قابل اعتنا ہوتیں تو امام احمد بن حنبل جیسے محدث یہ نہ فرماتے[۳] :-

ثلاثة ليس لها اصل التفسير و الملاحم و المغازي

کہ تین قسم کی کتابیں یا روایات بالکل بے بنیاد ہیں یعنی تفسیر ملاحم اور مغازی۔ مگر خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ اس قول سے امام احمد بن حنبل کے پیش نظر خاص قسم کی روایات یا کتابیں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :-

اما كتب التفسير فمن اشهرها كتابا الكلبي و مقاتل بن سليمان وقد قال احمدؒ في تفسير الكلبي من اوله الى اخره كذب۔

ورنہ تو امام احمدؒ بن حنبل نے تفسیری روایات پر مشتمل ایک صحیفہ کی خود تحسین فرمائی ہے اور اسکے حصول کی ترغیب دی ہے[۴]۔

ایک اہم بحث

بعض علمائے تفسیر مرفوع تفسیر کو تو حجت مانتے ہیں بشرطیکہ صحت کے ساتھ ثابت ہو مگر ان کا کہنا ہے کہ اس نوع کی تفسیر نہایت قلیل ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے احتجاج کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں[۵] :-

لم يكن النبي صلى الله عليه وسلم يفسر شيئا من القرآن الا آيات تعد علمهن اياه جبرئيل

اسی طرح امام سیوطیؒ اس موضوع پر بحث کے دوران میں لکھتے ہیں :-

الذي صح من ذلك قليل جدا بل اصل المرفوع منه في غاية القلة[۶]

یعنی حقیقتاً مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مستقل رکن کی حیثیت دینا اور ہر آیت کی تفسیر میں احادیث مناسبہ کو پیش کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا مگر آیات قرآنیہ اور دلائل سے جو آگے آرہے ہیں ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جسطرح صحابہؓ کے سامنے پورے قرآن کی تلاوت فرمائی ہے اسی طرح ان کے سامنے قرآن کے مطالب و معانی بھی بیان کئے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ سورہ نحل آیت ۴۴ میں قرآن کی تبیین کو آنحضرتؐ کے فرائض سے قرار دیا ہے امام ابن تیمیہؒ اور ان کے بااتبع دوسرے علماء کا بھی یہی رجحان ہے[۷]۔

ابوعبدالرحمٰن السلمی (عبداللہ بن حبیب تابعی ۷۴ھ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ، عبداللہؓ بن مسعود اور دیگر صحابہ۔ جو

---

[۱] مقدمہ تفسیر ص ۳ [۲] ص ۳۳ [۳] موضوعات ملا علی قاری ص ۹۵ [۴] التنوخ لبلوی [۵] القرطبی ج ۱ ص ۳۱ طبری ص ۱۲ [۶] الاتقان ج ۲ ص ۱۹۱
[۷] دیکھئے رسالہ اصول تفسیر لابن تیمیہ

ہمیں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے ــــــ کا بیان ہے کہ جب ہم آنحضرت سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو جب تک ان کے معنی و مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیتے اور پھر عملی طور پر اپنا نہ لیتے ان سے تجاوز نہ کرتے چنانچہ صحابہ کرام کا بیان ہے۔

ہم نے قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی سیکھا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ صحابۂ کرام ایک ہی سورہ کے حفظ میں سالہا سال لگے رہتے تھے مؤطا میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے[1]

انہ اقام علی حفظ البقرہ ثمان سنوات

کہ انہوں نے سورہ بقرہ کے حفظ میں پورے آٹھ برس صرف کر دیئے۔

اور حضرت عمرؓ نے دس برس کی مدت میں یہ سورہ ختم کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض قرآن کی قرأت یا تجوید نہ تھی بلکہ اس کے مطالب پر عبور اور عمل بھی اس میں شامل تھا۔

اور اس بات کو ہم عادۃً باور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص مثلاً حساب کی کوئی کتاب تو پڑھے مگر اس کی تشریح حاصل نہ کرے اور پھر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا بغیر معنی سمجھنے کے پڑھنا آج کل کے عجمی مسلمانوں سے تو ہو سکتا ہے مگر صحابہ کرام کے متعلق اس قسم کا تصور بھی بعید ہے خصوصاً جب کہ وہ تعلیم کے ساتھ اس کی عملی تطبیق بھی حاصل کرنے پر حریص بھی تھے۔

جو لوگ مرفوع تفسیر کے نہایت قلیل ہونے کے قائل ہیں ان کا حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت سے استدلال نہایت ہی مضحکہ خیز ہے اولاً تو حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہی غریب اور منکر ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن جعفر زبیدی ہے جس پر امام بخاری اور دیگر ائمہ رجال نے جرح کی ہے خود امام طبری ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

انہ ممن لا یعرف فی اھل الآثار

اور پھر یہ روایت واقعات کے بھی خلاف ہے اور بشرط صحت اس میں تاویل کی گنجائش ہے یعنی حضرت عائشہ کی مراد قرآن کی تفسیر کا وہ حصہ ہو جس کا تعلق مغیبات سے ہے مثلاً قیامت کے وقت کا علم وغیرہ جس کی تعیین کا اظہار مشیت الٰہی کے خلاف تھا جب کہ آنحضرت نے جبریلؑ کے جواب میں "ما المسئول عنھا باعلم من السائل" کے جملہ سے اس کی وضاحت فرما دی ہے نیز امام طبریؒ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں[2]

تفسیر چار قسم پر ہے ایک قسم تو وہ ہے جسے عرب اپنے محاورات کی روشنی میں سمجھ لیتے اس نوع کی تفسیر کے بیان کی ضرورت نہ تھی...... تیسری قسم تفسیر کی وہ ہے جسے علماء ہی جان سکتے ہیں (جیسے متشابہات) اور چوتھی قسم وہ ہے جو علم الٰہی کے ساتھ خاص ہے اور انسان اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔

الغرض قرآن کی تفسیر و تشریح بھی آنحضرت نے فرمائی ہے جو کہ کتب احادیث و سنن میں محفوظ ہے اسی بنا پر علماء نے قرآن و سنت کو لازم ملزوم قرار دیا ہے اور سنت کو بھی وحی کا حصہ قرار دیا ہے امام اوزاعی، حسان بن عطیہ سے بیان کرتے ہیں:[3]

آنحضرت پر قرآن کی وحی نازل ہوتی پھر حضرت جبریلؑ قرآن کی تفسیر کے لئے آنحضرت کی خدمت میں سنت لے کر حاضر ہوتے۔

---

[1] ابن کثیر ص ۳ [2] الموی ج ۴ ص ۲۸۲ [3] ص ۵ ۰ مراسیل ابی داؤد، قرطبی ج ۱ ص ۳۹-۳۸

یہی امام اوزاعی مکحول سے روایت کرتے ہیں :-

القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی القرآن۔

کہ قرآن اپنی تشریحات کیلئے جس قدر سنت کا محتاج ہے سنت کے مطالب کی وضاحت کے لئے قرآن کی ضرورت نہیں ہے خود آنحضرتؐ نے "اَلَا اِنِّی اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَ مِثْلَہٗ" فرما کر سنت کے اصل مقام کی وضاحت فرمادی ہے کہ سنت میں مزید احکام بھی ہیں جو قرآن میں بطور نص مذکور نہیں ہیں[1]

۳- اقوال صحابہ

صحابہ کرامؓ جاہلی عرب اہل کتاب کے عادات و اطوار اور لغت عرب کے اوضاع و اسرار سے بخوبی واقف تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن احوال و ظروف میں قرآن نازل ہو رہا تھا وہ انکی نظروں کے سامنے تھے پھر ان کے اذہان بھی صاف ستھرے اور گردو پیش کی آلائشوں سے منزہ تھے ان جملہ وجوہات کی بنا پر حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :-

صحابہ کرامؓ قرائن و احوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن ہم سے زیادہ سمجھتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل و فہم علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔[2]

اس بنا پر علمائے تفسیر نے قرآن و سنت کے بعد اقوال و آثار صحابہؓ کو تیسرے درجہ پر رکھا ہے ان کے اقوال کی بنیاد تین چیزوں پر تھی :-

۱- اسباب نزول کی معرفت

۲- توراۃ و انجیل (اسرائیلیات)

۳- اوضاع لغت کی معرفت۔

اب ہم ان تینوں کی تفسیری حیثیت سے بحث کرتے ہیں تاکہ ان سے استفادہ میں غلو سے کام نہ لیا جائے اور نہ ہی ان پر کلی طور پر اعتماد کر کے قطعیت کا حکم لگایا جائے۔

۱- اسباب نزول

قرآن پاک تدریجاً بحسب الحوائج نازل ہوا ہے اس کا اکثر حصہ تو وہ ہے جو ابتداءً موعظت و عبرت یا تشریعی احکام کے لئے نازل ہوا ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جو کسی حادثہ یا سوال کے جواب میں اترا ہے علماء نے ان حوادث یا سوالات کو "اسباب نزول" سے تعبیر کیا ہے[3]۔

اسباب نزول کی معرفت سے چونکہ آیت کا پس منظر سمجھ آتا ہے اس لئے علم تفسیر میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اور علماء نے علوم تفسیر پر جو کتابیں تالیف کی ہیں ان میں اسباب نزول کے عنوان کو مستقل جگہ دی ہے بلکہ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں علامہ سیوطی لکھتے ہیں :-

افردہ بالتصنیف جماعۃ اقدمھم علی بن المدینی شیخ البخاریؒ

کہ علماء کی ایک جماعت نے اس پر مستقل تالیفات لکھی ہیں اور اس باب میں سب سے پہلی تالیف علی بن المدینیؒ کی ہے جو امام بخاریؒ کے شیخ ہیں[4]

---

[1] دیکھئے رسالہ امام شافعیؒ [2] مقدمہ التفسیر ص ۳ [3] قرطبی ص ۲۹ [4] الاتقان ج ۱ ص ۲۵ [5] ص ۱۰۸ و ایضاً کشف الظنون حاجی خلیفہ

(فائدہ) امام سیوطیؒ نے بعض دوسری تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ واحدی (ابوالحسین علی بن احمد ۴۶۸ھ) کی تالیف کو مشہور ترین تالیف قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی "معیبۃ اعواز" لکھ کر طنز بھی کر دی ہے اور حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ) کی اسباب نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مات عنہ مسودۃ فلم نقف علیہ کاملاً" صاحب کشف نے اس باب میں ابن الجوزی، محمد بن اسعد العراقی، اور شیخ ابوجعفر ماندرانی کی کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے امام سیوطیؒ خود اپنی کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"وَاَلَّفْتُ فِیْہِ کِتَابًا حَافِلًا مُوْجِزًا مُحَرَّرًا لَمْ یُؤَلَّفْ مِثْلُہٗ فِیْ ھٰذَا النَّوْعِ سَمَّیْتُہٗ "لباب النقول فی اسباب النزول"

بہرحال "سبب النزول" کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر کتابیں تالیف کی ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے رسالہ "الفوز الکبیر" میں اس کی معرفت کو "مواضع صعبۃ" سے شمار کیا ہے اور اس فن کے مباحث کو منقح کرنے کی کوشش کی ہے[۱] لہٰذا جن علماء نے اس فن کو تاریخی حیثیت دے کر اس کے "لاطائل" ہونے کا گمان کیا ہے ان کا یہ موقف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے کذا قال السیوطی فی اتقانہ[۲]

دو گروہ | بعض علماء نے اس فن کی معرفت کو تفسیر قرآن کا موقوف علیہ قرار دیا ہے چنانچہ علامہ واحدی اپنے "اسباب" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

لا یمکن معرفۃ تفسیر الآیۃ دون الوقوف علی قصتھا و بیان نزولھا[۳]

اسی طرح امام سیوطیؒ بھی اپنے "لباب" میں اس فن کی معرفت کے بغیر تفسیر پر اقدام کو حرام قرار دیتے ہیں مگر امام ابن دقیق العید القشیریؒ نے اس فن کی معرفت کو فی الجملہ معاون تسلیم ہے نہ یہ کہ اس کے بغیر تفسیر ہی ممکن نہیں حافظ ابن تیمیہؒ بھی اسی طرف مائل نظر آتے ہیں چنانچہ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

معرفۃ سبب النزول تعین علی فھم الآیۃ فان العلم بالسبب یورث العلم بالمسبب[۴]

اصل میں صحابہؓ یا تابعینؒ کرام نے جو اسباب نزول بیان فرمائے ہیں وہ دو قسم پر ہیں، اسباب نزول کی ایک قسم تو وہ ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے مثلاً مغازی یا دوسرے واقعات کہ جب تک تفصیلی واقعات سامنے نہ ہوں متعلقہ آیات میں جو جزئیات مختصراً مذکور ہیں صحیح طور پر ذہن نشین نہیں ہوتیں اس قسم کے اسباب نزول کے متعلق واقعی کہا جا سکتا ہے کہ ایک مفسر قرآن کو ان کا جاننا لازم ہے جیسا کہ علامہ واحدی نے تصریح کی ہے لیکن دوسری قسم اسباب نزول کی وہ ہے جسے صحابہؓ یا تابعین کسی آیت کے تحت نزلت فی کذا یا انزل اللہ قولہ کذا کے الفاظ سے ذکر کر دیتے ہیں اس قسم کے واقعات کسی مناسبت سے محولہ آیات کے تحت ذکر کر دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ آیت کے مفہوم کی وضاحت کے سلسلہ میں اس واقعہ کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

وقد ذکر القدماء المفسرون تلک الحادثۃ بقصد الاحاطۃ بالآثار المناسبۃ للآیۃ او بقصد بیان ما صدق علیہ العموم ولیس ھذا القسم من الضروریات ...... وکان غرضھم تصویر ما صدقت علیہ الآیۃ الخ[۵]

پہلی قسم کے اسباب نزول میں چونکہ ان کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی بنیاد روایت و سماع پر ہوتی تھی اس بنا پر

---

[۱] حاجی خلیفہ ۲۶ ج ۱ (؟) ص ۱۰۰ [۲] ۲۵ سلفیہ لاہور [۳] الاتقان ص ۲۸ ج ۱ [۴] ص ۳ [۵] الاتقان سیوطی ۱ر۴۸ و البرہان للزرکشی ۱ر۲۲ [۶] الفوز ۴۸

علماء نے بلا اختلاف اس کو حدیث مسند کا درجہ دیا ہے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں :-

واذا ذكر سببا نزلت عقبه فانهم كلهم يدخلون مثل هذا في المسند لان مثل ذالك لا يقال بالرأي[1]

اور دوسری قسم یعنی جب کوئی صحابی نزلت فی کذا کے الفاظ استعمال کرے، اس میں اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی قسم اول کی طرح مسند حدیث کے حکم میں ہے یا اس کی بنیاد صحابی کے اجتہاد و رای پر ہے امام حاکم اپنے علوم الحدیث میں لکھتے ہیں :-

اذا اخبر الصحابي الذي شهد الوحي والتنزيل عن آية من القرآن" انها نزلت في كذا" فانه حديث مسند ومشى على هذا ابن الصلاح وغيره[2]

یعنی جب کسی آیت کے متعلق صحابی جس نے وحی و تنزیل کا مشاہدہ کیا ہو یہ بیان کرے کہ یہ آیت فلاں حادثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو ابن الصلاح وغیرہ محدثین کے نزدیک مسند حدیث شمار ہوگی حافظ ابن تیمیہ اس میں تفصیل و توزیع کے قائل ہیں یعنی اگر ان الفاظ سے سبب النزول مراد ہے تو تمام کے نزدیک حدیث مسند میں داخل ہے کما مر اور اگر اس سے صحابی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے گو اس کا سبب نزول نہیں ہے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی مسند حدیث کے حکم میں ہوگا یا نہیں امام بخاری تو اسے اس صحابی کی مسند میں داخل مانتے ہیں مگر امام احمد بن حنبل وغیرہ نے اس کو مسانید میں شامل نہیں کیا اکثر علماء حدیث و تفسیر کا میلان امام احمد بن حنبل کے قول کی طرف ہے۔ چنانچہ علامہ زرکشی لکھتے ہیں[3] :-

قد عرف من عادة الصحابة والتابعين ان احدهم اذا قال نزلت هذه الآية في كذا فانه يريد بذالك انها تتضمن هذا الحكم لا ان هذا كان السبب في نزولها فهو من جنس الاستدلال على الحكم بالآية لا من جنس النقل لما وقع۔

الغرض اسباب نزول کے بیان میں صحابہؓ کے اقوال مبنی بر اجتہاد بھی ہوتے اور بعض[4] اوقات تو خود صحابیؓ کو بھی اپنے بیان پر یقین نہ ہوتا اور وہ "احسب هذه الآية نزلت في كذا" کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ لہذا اسباب نزول کے بیان کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ علم صحابہؓ سے سماع و روایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا چنانچہ علامہ واحدی لکھتے ہیں :-

لا يحل القول في اسباب نزول الكتاب الا بالرواية والسماع ممن شاهدوا التنزيل ووقفوا على الاسباب وبحثوا عن علمها

سلف تو اسباب نزول کے سلسلہ میں روایت قبول کرنے میں تشدد سے کام لیتے اور جب تک صحت سند کے ساتھ اس کا صحابی سے مروی ہونا ثابت نہ ہو جاتا وہ اسے قابل التفات نہ سمجھتے ابن سیرین بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے ایک آیت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا

اتق الله وقل سدادا ذهب الذين يعلمون فيما انزل القرآن

لیکن ان کے بعد علماء نے تشدد کو ترک کرکے تساہل سے کام لینا شروع کر دیا حتی کہ اس سلسلہ میں کذب بیانی کی بھی کچھ پروا نہ کی گئی علامہ واحدی اسی قسم کے علماء پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

---

[1] منہج الفرقان ص ۴۹ [2] ج ۱ ص ۳۱-۳۲ الاتقان ۱/۳۱ [3] الاتقان ۱/۳۱ [4] الاتقان ۱/۳۱

واما الیوم فکل احد یخترع شیئاً ویختلق افکاً وکذباً ملقیاً زمامہ الی الجھالۃ غیر مفکر فی الوعید للجاھل بسبب الآیۃ۔

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متاخرین نے ہر آیت کے تحت شان نزول بیان کرنے کی کوشش کی اور رطب ویابس سے تفاسیر کو بھر دیا مبالغہ آمیزی اور کذب بیانی کے علاوہ بہت سی تاریخی لغزشوں کا بھی ارتکاب کیا اور امام طبری جیسے مؤرخ بھی ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

لہٰذا اسباب نزول کی روایات پر نقد ونظر کی ضرورت ہے اور جب تک کسی حادثہ کا صحت اسناد سے سبب ہونا ثابت نہ ہو جائے اسے قبول نہ کیا جائے اور پھر آیت کے مفہوم کو سبب نزول کے ساتھ مختص نہ کیا جائے بلکہ آیت کے معنی ومفہوم کو عموم پر رکھا جائے علامہ سیوطی لکھتے ہیں[1]:۔

اصح یہ ہے کہ نظم قرآن کو عموم پر محمول کیا جائے اور اسباب خاصہ کا اعتبار نہ کیا جائے۔۔۔ کیونکہ صحابہ کرام پیش آمدہ وقائع کی توضیح میں آیات کے عموم سے استدلال کرتے رہے ہوں گے ان کے اسباب نزول خاص تھے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسباب نزول دو قسم پر ہیں بعض اسباب تو وہ ہیں جن سے آیت کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور جب تک اس واقعہ کو بیان نہ کیا جائے پورے طور آیت کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہوتا لیکن اکثر واقعات وہ ہیں جو اسباب نزول کے طور پر علمائے تفسیر نے ذکر کر دیئے ہیں مگر نہ وہ درحقیقت اسباب نزول ہیں اور نہ ہی ان سے صرف نظر کرنے پر آیت کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی صعوبت پیش آتی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے الفوز میں تصریح کی ہے۔

روایات اہل کتاب یا اسرائیلیات

قرآن نے بعض مسائل اور واقعات کے بیان میں توراۃ سے موافقت کی ہے اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور ان کے معجزات کے بیان میں انجیل کی تصدیق کی ہے تاہم ان واقعات کے بیان میں کتب سابقہ کے نہج اور اسلوب بیان سے گریز کیا ہے اور قصص کی غیر ضروری جزئیات ترک کر کے صرف ان حصوں کو موضوع بحث بنایا ہے جن کا تعلق عبرت وموعظت سے تھا۔

اس بنا پر بعض مفسرین صحابہ نے ان قصص کی جزئیات معلوم کرنے کے سلسلہ میں مسلمان اہل کتاب علماء کی طرف رجوع کیا اور ان سے روایت بھی لی تاہم نقل وروایت میں حد اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور حدیث "حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج" کے تحت جواز کی حد تک ان سے استفادہ کیا اور وہ بھی صرف ان روایات میں جو قرآن وحدیث اور اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہوتی تھیں[2]۔

جن صحابہؓ نے اہل کتاب سے روایت نقل کی ہے ان میں سے حضرت ابوہریرہؓ، ابن عباسؓ اور عبداللہؓ بن عمرو بن العاص خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کی مرویات سے ہمارے دعویٰ کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں[3]۔

اسرائیلی روایات اور تابعین

البتہ صحابہؓ کے بعد تابعینؒ نے اہل کتاب سے اخذ روایت میں توسع سے کام لیا چنانچہ تفسیری روایات میں اسرائیلیات کی کثرت اسی دور کی پیداوار ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس دور

---

[1] الاتقان ۱؍۳۱ ص [2] مقدمہ اصول تفسیر ابن تیمیہ ص ۳۰ [3] تفصیل کے لئے دیکھئے ہمارا مقالہ "عدالت صحابہ"

میں یہود و نصاریٰ میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے تھے اور لوگ قصے کہانیاں سننے کے لئے ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے اس دور میں مفسرین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جنہوں نے روایت میں احتیاط سے کام نہ لیا اور رطب و یابس کے بیان کو اپنا مشغلہ بنالیا ان میں سے مقاتل بن سلیمان (المتوفی ۱۵۰ھ) اور وہب بن منبہ (خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تابعین کے بعد تو اس شغف علمی نے خاصی ترقی کر لی اور ہر قسم کے خرافات کو تفسیر کے سلسلہ میں روایت کیا جانے لگا۔ حتی کہ دور تدوین میں بعض مفسرین نے ان خرافات سے اپنی تفاسیر کو مزین کرنے کی کوشش کی۔

ایک مفسر کا فریضہ

اہل کتاب سے اس کثرت کے ساتھ نقل و روایت دراصل دین میں ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی الفوز میں لکھتے ہیں:۔

ان النقل عن بنی اسرائیل دسیسۃ دخلت فی دیننا

لہٰذا ایک مفسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس قسم کی روایات کے نقل میں نہایت مستعدی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے اور غور و فکر سے ایسے نتائج اخذ کرے جو قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہوں اور نقل و روایت میں صرف انہی حصوں پر اکتفاء کرے جو قرآن کے مجمل مقامات کو سمجھنے میں ممد ہوں اور پھر سنت سے بھی ثابت ہوں[۱]۔

البتہ جب اس قسم کے خیالات کے بیان میں متقدمین کا اختلاف ہو تو گو ایک شخص مؤلف کی حیثیت سے ان سب کو نقل کر کے ان میں سے صحیح بات کی نشان دہی کر سکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے ایسے موقع پر اسرائیلیات کو کلیۃً ترک کر کے قرآن پر تدبر میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرے جیسا کہ قرآن نے بعض مقامات پر اس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے[۲]۔ شاہ ولی اللہ الدہلوی فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ایک نہایت باریک نکتہ ہے جو طالب علم کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے

انہا قد تذکر فی القرآن قصۃ فی موضع الاجمال وفی موضع بالتفصیل ...... فیمکن ان یعلم من التفصیل تفسیر الاجمال وینتقل من التفصیل الی الاجمال واللہ اعلم۔

خلاصہ بحث

صحابہؓ نے اسرائیلی روایات سے بے شک استفادہ کیا ہے اور ضرورت کی حد تک ان کی روایت کو بھی جائز سمجھا ہے تاہم ان میں حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کا بیان محض ایک زنقش ہمنی کی حیثیت رکھتا ہے جسے وضاحت کے سلسلے میں قبول تو کیا جا سکتا ہے مگر میزان صحت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لغت و محاورات

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب و سنت اور اقوال صحابہؓ سے روشنی نہ پڑتی ہو تو پھر لغت و محاورات عرب کی طرف رجوع ہوگا کیونکہ قرآن فہمی کے سلسلہ صحابہؓ اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:۔

الشعر دیوان العرب فاذا تعاجم علینا شیئ من القرآن رجعنا الیہ[۳]

مگر لغت و محاورات عرب سے قرآن فہمی ہر ایک کا کام نہیں بلکہ اس کے لئے عربی زبان کا خصوصی ذوق اور اہلیت شرط ہے کیونکہ

---

[۱] دیکھئے روح المعانی ج ۱۵ ص ۹۳ [۲] الفوز الکبیر ص ۴۵-۴۶ [۳] دیکھئے مقدمہ اصول التفسیر لابن تیمیہ ص ۲۰

[۴] تفسیر طبری ج ۱۷ ص ۲۹ مذاہب التفسیر الاسلامی ۸۹-۹۰ [۵] الفوز الکبیر ص ۴۶

معاجم وقوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ بلا اسناد جمع کر دیا ہے۔ خصوصاً اشعار وامثال جن کو حضرت ابن عباسؓ دیوان العرب قرار دے رہے ہیں علمائے ادبیات جانتے ہیں کہ ان کی نسبت میں اختلاف واختلاط کا بے حد دخل ہے اور شاذونادر ہی کوئی ایسی روایت ہوگی جس پر اعتماد ہو سکے اور پھر محاورات کے بیان میں بھی ان میں باہم اختلاف ہے اور ان علماء نے تشریحات میں عمومی محاورات کو ملحوظ رکھا ہے خاص طور پر الفاظ قرآن کی تشریحات ان کے پیش نظر نہیں ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عام محاورہ قرآن کے مفہوم سے بھی ہم آہنگ ہو اور اگر انہوں نے قرآنی الفاظ کو پیش نظر رکھا بھی ہو تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ وہ لوگ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق محاورات عرب کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجہ اتم پائی جاتی ہے لہذا لغت ومحاورہ عرب سے استفادہ کے لئے چند امور کی رعایت ضروری ہے:۔

(۱) لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظ مفردہ کے ان معانی کو سامنے پیش نظر رکھا جائے جو زمانہ نزول کے وقت مفہوم ہوتے تھے اور پھر قوانین اعراب وبلاغت سے اس کے ترکیبی معنی پر غور کیا جائے اور سیاق وسباق پر بھی نظر ڈالی جائے اور پھر سیاق کلام سے معنی مقصود کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں:۔

انصاف پسند مفسر کا فرض ہے کہ شرح الغریب کی دو مرتبہ جانچ پڑتال کرے اولاً موارد استعمال پر نظر ڈالے اور پھر ترکیب کلام اور سیاق وسباق کے اعتبار سے جو معنی انسب نظر آئے اسے اختیار کرے بایں ہمہ یہ معنی اجتہادی ہوگا جس میں اختلاف کی گنجائش ہے شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

لان الكلمة الواحدة تجئ فى لغة العرب لمعان شتى[1]

(۲) لغت ومحاورہ عرب سے جو تفسیر بھی کی جائے اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت کی ہدی وسیرت کے بھی مطابق ہے اور آپ کے اقوال وافعال اور تفسیر صحابہ کے منافی تو نہیں ہے کونی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔

یہ تمام تر غور وفکر اور مساعی اس بنا پر بھی ضروری ہیں کہ کتب لغت بہر حال کتب لغت ہیں ان سے الفاظ کا معنوی حل ہی مل سکتا ہے وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہر صورت قاصر ہیں اور جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے پر تفسیر کی ہے انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں اس کا پہلا نمونہ ابو عبیدہ کی مجاز القرآن ہے اور پاک وہند میں جن لوگوں نے تفسیر باللغۃ کی ہے انہوں نے دراصل لغت کا سہارا لے کر مغربی افکار ونظریات کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس طرح پہلے ایک دور میں قرآن کو اسرائیلیات کے لئے تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی گئی تھی تفسیر القرآن سر سید بصیرۃ القرآن وغیرہ کی اساس بھی اس قسم کے نظریات پر رکھی گئی ہے اور قرآن جو کتاب ہدایت تھی ان مضحکہ خیز تفاسیر نے اس کی آب وتاب کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں مقاصد قرآن کی وضاحت کے لئے سنت نبوی کی طرف رجوع ضروری ہے چنانچہ علامہ طبری لکھتے ہیں:۔

مفردات قرآن کے معانی معلوم کرنے کے لئے تو لغت کی طرف رجوع ہو سکتا ہے مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے بہر حال وحی الٰہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارۂ کار نہیں۔

---

[1] مقدمہ طبری

ان تصریحات کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موارد استعمال کے تتبع سے کسی حد تک صرف مفردات کے حل میں مدد ملتی ہے ورنہ یہ ایسا ذریعہ نہیں کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے تفاسیر میں لغت و محاورات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کے لئے شواہد تک کو چھان مارا ہے وہ بھی اپنی تفاسیر میں سنت اور اقوال صحابہؓ سے بے نیاز نہیں ہو سکے اور باوجود معتزلہ اور عقل پسند ہونے کے حدیث نبوی اور اقوال صحابہؓ کا سہارا ضرور لیتے رہے ہیں الکشاف زمخشری کے مطالعہ سے ہر صاحب علم یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اُس وقت کے اعتزال اور اِس زمانہ کے اعتزال میں نظریاتی اختلاف پایا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کے اسلاف تو اعتزال کے ساتھ صفات علم سے بھی متصف تھے اور معتزلہ کا موجودہ گروہ تدلیس تلبیس میں تو شاطر نظر آتا ہے مگر صفات علم سے عاری ہے۔

بعض علماء نے شرح غریب القرآن کا خصوصی اعتناء بھی کیا ہے مفردات راغب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس لئے اب ہم ان کتابوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

غریب القرآن پر جن علماء نے خصوصی توجہ دی ہے ان میں سرفہرست حبر امت حضرت ابن عباسؓ کا نام ذکر کیا جاتا ہے چنانچہ علامہ عطار مقدمہ الصحاح للجوہری میں لکھتے ہیں :۔

وکانوا یستعینون بالشعر وکلام العرب لبیان معانی القرآن ...... وکان اوّل اتجاہ للعنایۃ اللغویۃ ھو رغبۃ دینیۃ محضۃ ولھذا نسب الی ابن عباس کتاب غریب القرآن[1]

بروکلمن نے "تاریخ ادب العرب" میں اس کے بعض خطی نسخوں کی نشان دہی بھی کی ہے[2]۔ اور التفسیر الکبیر جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے اس میں علی بن ابی طلحہ اور ابن الکلبی کی روایت سے غریب القرآن کی تشریحات منقول ہیں اور علی بن لیث کی روایت سے یہ نسخہ ابو صالح کاتب اللیث مصری کے پاس محفوظ تھا جسے وہ معاویہ بن ابی صالح کے واسطہ سے روایت کرتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اسی نسخہ پر اعتماد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل نے اس کی تحسین کی ہے[3]۔

ان تفاسیر کی نسبت حضرت ابن عباس کی طرف صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ غریب القرآن کی تشریح کے سلسلہ میں شعر اور کلام عرب سے استشہاد میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے گو بعض دیگر صحابہؓ سے بھی حضرت ابن عباسؓ کی طرز پر غریب القرآن کی تشریحات منقول ہیں[4]۔

(۲) غریب القرآن کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ کے بعد ابان بن تغلب الجریری (۱۴۱ھ) کا نام لیا جاتا ہے جو کہ قاری فقیہ ہونے کے علاوہ لغت میں بھی عظیم پایہ رکھتے تھے اور علی بن علی بن حسین، ابو جعفر اور ابو عبداللہ رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں استاذ عطار لکھتے ہیں :۔

...... سمع من العرب والف "غریب القرآن" وذکر شواھدہ من الشعر[5]

---

[1] مقدمہ الصحاح ص ۳۴ [2] ج ۱ ص ۱۲ [3] فتح الباری ج ۸ ص ۳۲۲ الاتقان للسیوطی ج ۲ ص ۱۸۸-۱۸۹ منقول بمکتبۃ شیخ الاسلام عارف حکمت بالمدینۃ المنورہ ۱۲ [4] مقدمہ الصحاح ۴۲ [5] یاقوت ج ۱ ص ۱۰۸ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۷ طوسی ج ۶ ص ۴

اور یہ ابان بن تغلب وہ ہیں جن سے امام مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے یہ گو تشیع میں غالی تھے یعنی حضرت علیؓ کی تفضیل کے قائل تھے تاہم رافضی نہ تھے اور پھر روایت میں ثقہ تھے اس بنا پر محدثین نے ان سے روایت لی ہے[۱]
ان کے بعد بہت سے علماء نے معانی القرآن، مجاز القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر جمع کیں جن کے نام فہرست ابن الندیم کشف الظنون حاجی خلیفہ اور مفتاح السعادۃ میں مذکور ہیں ان میں حسب ذیل اشخاص خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:۔

(۱) ابو زکریا یحییٰ بن زیاد الفراء ۲۰۷ھ

(۲) ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ التمیمی ۲۱۰ھ

(۳) ابو علی محمد بن المستنیر المعروف بہ قطرب ۲۰۶ھ

(۴) ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن یحییٰ الیزیدی ۲۳۶ھ

(۵) ابو محمد عبد اللہ بن مسلم الدینوری المعروف بہ ابن قتیبہ ۲۷۶ھ

(۶) ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن السری الزجاج ۳۱۱ھ

(۷) امام راغب اصفہانی ۵۰۲ھ

علاوہ ازیں ابو عبید قاسم بن سلام اور ابن ترکمانی نے غریب القرآن کے نام سے کتابیں لکھی ہیں اور ابو المعالی احمد بن علی البغدادی المعروف بابن سمین (۵۹۶ھ) کی مفردات القرآن کے متعلق امام سیوطی لکھتے ہیں:۔

وهو من احسن الكتب المؤلفة في هذا الشأن

سجستانی کی غریب القرآن حروف معجم کی ترتیب پر ہے اس لئے اس سے اخذ و تناول میں سہولت پائی جاتی ہے حجم کے اعتبار سے تقریباً راغب کی مفردات کے برابر ہے[۲]

ابو عبیدہ کے حالات میں مذکور ہے کہ انہوں نے مجاز القرآن، معانی القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر تالیف کیں[۳] ان الفاظ سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مستقل تین کتابیں تصنیف کی ہیں مگر بعض علماء کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک ہی تالیف کے تین نام ہیں مثلاً زبیدی طبقات النحویین میں لکھتے ہیں[۴]:۔

سألت اباحاتم عن غريب القرآن لابى عبيدة الذى يقال له المجاز

اسی طرح ابن خیر الاشبیلی الفہرست میں لکھتے ہیں[۵]:۔

واول كتاب جمع فى غريب القرآن ومعانيه كتاب ابى عبيدة معمر بن المثنى وهو كتاب المجاز۔

علاوہ ازیں مجاز القرآن کے مختلف نسخوں پر نام میں اختلاف ہے جس سے ہماری تائید ہوتی ہے چنانچہ اسماعیل صاحب کے نسخہ میں پہلی جزء پر "کتاب مجاز القرآن" کا عنوان ہے اور اس کے آخر میں کتاب غریب القرآن ہے اور مراد منلا کے نسخہ میں یہ عنوان ہے "کتاب المجاز التفسیر غریب القرآن"

---

[۱] ملخص من المیزان للذہبی ص ۵ - ۶ [۲] کشف الظنون مع حاشیہ کالم ۱۲۰۷ - ۱۲۰۸ [۳] الفہرست لابن الندیم ص
[۴] ص ۱۲۵ [۵] ص ۱۳۴

ابو عبیدہ کے معاصرین نے ان پر تنقید بھی کی ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ابو عبیدہ میں شعوبیت کے علاوہ خارجیت بھی تھی اور وہ خالص عربی کلام سے قرآن کی تفسیر کے قائل تھے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ تفسیر بالرائی کی طرف مائل تھے اور محدثین وفقہاء اس کے خلاف تھے چنانچہ فراء (م ۲۰۷) اور اصمعی نے ابو عبیدہ کی مخالفت کی[1] اور ابو حاتم نے ان کی مجاز القرآن کو تنقید کا نشانہ بنایا اور زجاج، زہری اور نحاس نے بھی یہی موقف اختیار کیا[2]۔

مگر اس مخالفت کے باوجود ان کے بعد جن علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ ابو عبیدہ سے بے نیاز نہ ہو سکے ابن قتیبہ نے اپنی "المشکل اور الغریب" دونوں کتابوں میں مجاز القرآن پر اعتماد کیا ہے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں مجاز القرآن سے استفادہ کیا ہے[3]۔

امام طبری (م ۳۱۰) نے اپنی تفسیر میں ان پر اعتماد تو کیا ہے مگر دوسرے علماء کے اقوال وآراء نقل کر کے مناقشہ اور مقارنہ بھی کیا ہے طبری کے علاوہ ابو عبد اللہ الیزیدی الزجاج ابن درید نے "الجمہرہ" اور سجستانی نے غریب القرآن میں ان سے نقل کیا ہے اور متاخرین میں سے حافظ ابن حجر ہیں جنہوں نے فتح الباری میں کتاب المجاز سے استفادہ کیا ہے۔

ابن قتیبہ کی غریب القرآن جو دراصل ان کی کتاب مشکل القرآن کا تتمہ ہے جیسا کہ اس کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے اس موضوع پر اہم کتاب ہے مؤلف نے اپنی ان دونوں کتابوں میں اہل بدعت پر تنقید کی ہے اور اہل سنت کے مسلک کو ثابت کیا ہے۔

ابن قتیبہؒ نے اپنے وقت کے تمام ائمہ سے استفادہ کیا ہے حتیٰ کہ آداب میں جاحظؒ سے ان کی بعض کتابوں کی اجازت بھی حاصل کی بعض مخالفین نے ان پر تشبیہ اور خارجیت کی تہمت لگائی ہے مگر یہ شدۃ تعصب کی بنا پر ہے ورنہ تو ابن قتیبہؒ کو اہل سنت میں وہی اہمیت حاصل ہے جو جاحظ کو معتزلہ میں حاصل ہے یعنی جاحظ اگر خطیب معتزلہ ہیں تو ان کے مقابلے میں ابن قتیبہؒ اہل سنت کے خطیب مانے گئے ہیں۔

ان کی مشکل اور غریب کو کنانی نے "القرطین" کے نام سے یکجا کر دیا ہے جو مصر میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے امیر قنوجی نے الاکسیر میں ابن قتیبہ کو مفسرین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

امام راغب کی مفردات اس موضوع پر اہم کتاب ہے قبل اس کے کہ ہم اس کے متعلق کچھ عرض کریں یہ واضح کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ امام راغب کے بعد بھی متاخرین نے اس موضوع پر کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے ... تحفۃ الاریب بما فی القرآن من الغریب" لابی حیان نحوی (المتوفی ۷۴۵ھ) تراجم الاعاجم تالیف زین المشائخ محمد بن ابو القاسم الخوارزمی (م ۵۶۲ھ) اور مفردات القرآن سمین حلبی (م ۷۵۶ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں مگر ان سب کتابوں میں مفردات راغب کو جو شہرت اور امتیاز حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔

مفردات میں راغب نے تقریباً پندرہ سو نواسی مواد سے بحث کی ہے قرآن کے بعض مواد متروک بھی ہیں تاہم وہ غیر اہم ہیں مؤلف نے اپنی کتاب کو حروف تہجی پر ترتیب دیا ہے اور ہر کلمہ کے حروف اصلیہ میں سے اول حرف کی رعایت

---

[1] تاریخ بغداد ۱۳/ ۲۵۵ [2] مقدمہ مجاز القرآن بحوالہ الزبیدی ص ۱۲۵-۱۲۶

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے ہمارا مقالہ "امام بخاری اور مجاز القرآن"

کی ہے طریق بیان فلسفیانہ ہے یعنی پہلے ہر مادہ کے جوہری معنی متعین کرتے ہیں پھر قرآن میں مختلف آیات پر اس معنی کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تشریح لغت میں یہ طریق اصولی حیثیت رکھتا ہے اصول لغت پر جن علماء نے تالیفات لکھی ہیں انہوں نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے تمام متعلقہ آیات کو سامنے رکھ لینے سے اس کلمہ کے صحیح معنی سمجھ میں آجاتے ہیں اور سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے ہر قسم کا اشتباہ دور ہو جاتا ہے۔

پھر مؤلفؒ الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں اشعار و محاورات اور احادیث کو بھی بطور شواہد پیش کرتے ہیں اور بعض علمائے تفسیر و لغت کے اقوال بھی بطور تائید پیش کرتے ہیں اور بعض مقامات پر وضاحت کے لئے اختلاف قراءات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔

کتاب کی افادیت اور اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ اصحاب تفسیر کے علاوہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی جیسے شارحین حدیث بھی امام راغب سے استفادہ کرتے ہیں حضرت الامیر القنوجی ان کی مفردات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ١-

و من احسنہا المفردات للراغب ...... و وی باب اعتماد جمہور مفسرین بر تحقیقات اوست

اس کتاب کا پورا نام "المفردات فی تحقیق مواد لغات العرب المتعلقۃ بالقرآن" ہے مطبوعہ نسخوں پر "المفردات فی غریب القرآن" کا عنوان مرقوم ہے ہم اس کے اردو ترجمہ کو "مفردات القرآن" کے نام سے پیش کر رہے ہیں عربی ایڈیشن کے چار نسخے مطبوعہ ایران و مصر راقم کی نظر سے گذر چکے ہیں طبع کراچی میں بھی مصری نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے مگر افسوس ہے کہ اتنی بڑی اہم کتاب کا اب تک محقق ایڈیشن شائع نہیں ہوا ہم یہ اردو ایڈیشن پوری تحقیق سے شائع کر رہے ہیں اور اس کے ترجمہ و تحقیق میں مندرجہ ذیل کو ملحوظ رکھا ہے۔

(۱) بعض اہل علم احباب کے مشورہ کے مطابق عموماً لفظی یا حرفی ترجمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاہم اس میں حتی الوسع سلاست پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) ہر آیت کے تحت آیت اور سورۃ کا نمبر دے دیا ہے تاکہ سہولت سے مراجعت ہو سکے مثلاً (۲-۲۸) سے ہماری مراد سورہ نمبر ۲ اور آیت نمبر ۲۸ ہے۔

(۳) آیات کا ترجمہ عموماً مولانا فتح محمد صاحب جالندھری کا ہے لیکن بعض مقامات پر مؤلف کا مقصود ترجمہ ہی لکھ دیا گیا ہے۔

(۴) پوری کوشش کی ہے کہ حاشیہ میں احادیث و اشعار کی مکمل تخریج آجائے۔

(۵) کتاب کے متن کی تصحیح میں عموماً تاج العروس اور لسان العرب پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ دیگر مراجع سے بھی بلاواسطہ استفادہ کی کوشش کی ہے۔

(۶) ابتداء میں یہ خیال تھا کہ متروکہ مواد کو آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا جائے مگر عدیم الفرصتی اس میں حائل رہی اور ہم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا امور کی رعایت سے اس اردو ایڈیشن میں وہ خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں جو عربی ایڈیشن میں نہیں ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس محنت کو قبول فرمائے اور اس کے بعد "مفردات الحدیث" کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔

اِمَام رَاغِبْ اَصْفَہَانِیؒ

امام راغب پانچویں اور چھٹی صدی کے علماء سے شمار ہوتے ہیں ان کا پورا نام حسین بن محمد بن مفضل بن محمد ہے اور راغب اصفہانی کے نام سے مشہور ہیں صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں۔

توفی سنۃ خمس مائۃ ونیف

یعنی سنہ ۵۰۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں مگر امام سیوطیؒ "بغیۃ الوعاۃ" میں لکھتے ہیں:

کان فی اوائل المائۃ الخامسۃ

اور امام سیوطی اور ان کے بالتبع طاش کبری زادہ نے ان کا نام مفضل بن محمدؒ لکھا ہے مگر یہ ان کی فروگذاشت ہے صحیح نام حسین بن محمد ہی ہے اور وفات ۵۰۲ھ ہے۔

تاریخ اخبار البشر کی غلطی

سید محسن بن الحسینی صاحب "روضات الجنات" کے حوالہ سے اپنی کتاب اعیان الشیعہ میں لکھتے ہیں:

صاحب "تاریخ اخبار البشر" نے امام راغب کی وفات ۵۶۵ھ نقل کی ہے مگر یہ ان کی فاش غلطی ہے کیونکہ اس کے بعد انہوں نے خود ہی یہ تصریح کی ہے کہ امام موصوف علامہ جار اللہ زمخشری سے پہلے فوت ہوئے ہیں حالانکہ علامہ کی وفات بالاتفاق ۵۳۸ھ ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امام موصوف کا سنہ وفات ۵۶۵ھ ہو"

علاوہ ازیں حاجی خلیفہ امام راغب کی کتاب "الذریعہ الی مکارم الشریعہ" کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان الغزالی کان یستصحب کتاب الذریعہ

کہ امام غزالی مؤلف کی کتاب "الذریعہ" ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور امام غزالی کی وفات ۵۰۵ھ ہے لہذا قرین قیاس یہ ہے کہ راغبؒ ان سے پہلے فوت ہوئے ہیں۔

راغبؒ کی شخصیت

مؤلفؒ کی تالیفات خصوصاً مفردات القرآن اور محاضرات الادباء کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف جامع علوم و فنون ہونے کے ساتھ بلند پایہ صوفی بھی تھے چنانچہ صاحب "روضات الجنات" ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

الراغب الاصفہانی صاحب لغۃ العرب والحدیث والشعر والحکمۃ والکلام وعلوم الاوائل وغیر ذالک وفضلہ اشہر من ان یوصف وکفاہ منقبۃ قبول العامہ والخاصۃ وفیما تحقق لہ من اللغۃ خاصۃ۔[1]

اسی طرح یاقوت معجم الادباء میں لکھتے ہیں :۔

احد اعلام العلم بغیر فن من العلوم ادبیھا وحکمیھا لہ کتاب فی تفسیر القرآن قیل وھو الکبیر۔

یعنی موصوف "کو علم" تھے اور ادب وفلسفہ بلکہ جملہ علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور انہوں نے قرآن پاک کی ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے۔

الغرض موصوف علم وفضل میں یگانۂ روزگار تھے اور ان کے فضل ومرتبہ کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ علامہ ذہبی نے ان کا تذکرہ "طبقات المفسرین" میں کیا ہے اور امام سیوطیؒ ان کو لغت ونحو کے ائمہ سے شمار کرتے ہیں علی بن محمد البیہقی نے اپنے "تتمہ صوان الحکمۃ" میں انہیں حکماء کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور یاقوت نے ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا تعارف کروایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوفؒ ہمہ فنی امام تھے اور بیک وقت تفسیر ولغت کے امام ہونے کے ساتھ بہت بڑے حکیم اور صوفی بھی تھے۔

امام راغب اور شیعیت دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے زمانہ میں جب راقم الحروف کو ایک سلسلے میں مفردات القرآن کا استیعاب سے مطالعہ کا اتفاق ہوا تو محسوس ہوا کہ بعض مقامات پر امام راغب حضرت علیؓ کو بجائے نام امیر المومنین کے لقب سے ذکر کرتے ہیں جس سے ذہن میں تردد پیدا ہوا کہ غالباً مؤلف شیعہ ہوں گے کیونکہ علمائے شیعہ کی یہ عادت ہے کہ وہ علیؓ نام کی بجائے انہیں امیر المومنین لکھتے ہیں مگر یہ خیال کرکے کہ بہت سے علمائے اہل سنت بھی ایسے ہیں جو حضرت علیؓ حسنؓ حسینؓ کے ساتھ علیہ السلام لکھ دیتے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ حضرت علیؓ کے نام کی بجائے امیر المومنین لکھنے والا ضرور شیعہ ہی ہو۔

اب جب کہ مفردات کی اشاعت کے سلسلہ میں مؤلف کے تعارف کے لئے کتب تراجم اور تذکروں کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس ہوئی تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے مسلکاً شیعہ ہونے کی علامت یہی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کرے جیسا کہ صاحب "روضات الجنات" نے تصریح کی ہے اور پھر آخر میں لکھا ہے۔

"وَھٰذہ آیۃ الفطن"

کہ یہ اس کے ذہن وفطین ہونے کی علامت ہے اسے ہمیشہ یاد رکھئے صاحب "اعیان الشیعہ" لکھتے ہیں :۔

اکثر علماء نے تصریح کی ہے کہ امام راغب معتزلی تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ بھی تھے کیونکہ معتزلہ اور شیعہ عموماً اصول میں متحد ہیں اور اصحاب تراجم معتزلہ اور شیعہ کا تذکرہ ایک ساتھ کرتے ہیں۔[2]

پھر صاحب روضات لکھتے ہیں :۔

---

[1] ص ۲۴۸ - ۲۵۵ ج [2] ص ۴۴۸

ان کی کتاب "محاضرات الادبا" کے مطالعہ سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کٹر سنی تھے پھر اس پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں مگر امام کی علمی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلکاً سنی شافعیؒ تھے علامہ سیوطیؒ "بغیۃ الوعاۃ" میں لکھتے ہیں :۔

پہلے پہل میرا گمان یہ تھا کہ امام موصوف معتزلی تھے
مگر جب میں نے "القواعد الصغریٰ" لابن عبد السلام
کی پشت پر زرکشی کے ہاتھ سے یہ لکھا ہوا پایا کہ امام
فخر الدین رازی نے "تاسیس التقدیس" میں تصریح کی
ہے کہ امام راغب ائمہ سنت میں سے تھے اور غزالی
کے ہم پایہ، تو میری یہ بدظنی دور ہوگئی خصوصاً جبکہ
امام رازی جیسی شخصیت ان کی تقدیس کر رہی ہے[1]

ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ گو امام موصوف کے متعلق لوگوں نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے مگر سیوطیؒ کی رائے اور ان کا آخری میلان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف علمائے سنت سے تھے۔ صاحب "روضات الجنات" کے الفاظ سے بھی اس کی تائید ملتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

وکان من الشافعیۃ کما استفید لنا من محاضراتہ

تالیفات سید محسن نے "اعیان الشیعۃ" میں اور بروکلمن نے تاریخ ادب العرب میں ان کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے کل دس کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) محاضرات الادباء :۔

یہ کتاب دس جلدوں میں ہے اور ۱۹۰۲ء میں ابراہیم بن زیدان کی تصحیح سے قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آگیا ہے۔ یہ کتاب عجائب وغرائب سے پر ہے اور نہایت دلچسپ خوانشاری نے اسی کتاب کی بنا پر ان کے سنی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

(۲) جامع التفسیر :۔

یہ قرآن پاک کی بہت بڑی تفسیر ہے جس کی طرف مؤلف نے اپنی کتاب مفردات میں بھی متعدد بار اشارے فرمائے ہیں۔ بروکلمن لکھتے ہیں کہ "آیا صوفیا" استنبول میں اس کا مخطوطہ محفوظ ہے اور ایک جزء طبع ہو کر شائع بھی ہو چکا ہے مگر راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

(۳) حل متشابہات القرآن :۔

نام سے ظاہر ہے کہ مؤلف نے متشابہات پر سیر حاصل بحث کی ہوگی اس موضوع پر شیعہ علماء نے بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن علمائے سنت نے عموماً اہل بدعت کی تردید کی غرض سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

---

[1] جزء ۲، ص ۲۲۱ [2] اعیان الشیعہ

(۴) الذریعہ الی مکارم الشریعہ۔

اخلاق ناصری کی طرز پر فارسی میں ہے اس میں مؤلف نے کلیلہ و دمنہ سے بہت سی حکایات نقل کی ہیں اور عجیب وغریب اشعار نقل کئے ہیں چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

زصد ہزار محمد کہ در جہاں آید
یکے بمنزلہ جاہ مصطفیٰ نشود؛
وگرچہ عرصۂ عالم ہزار علی گردد
یکے بعلم وسخاوت بمرتضیٰ نشود
جہاں گرچہ زموسیٰ و چوب خالی نیست
یکے کلیم نگردد یکے عصا نشود

(۵) درۃ التاویل فی غرۃ التنزیل:۔

اس کتاب میں مؤلف نے آیات کے تکرار کی حکمت اور تشابہات کے رموز بیان فرمائے ہیں مفردات میں بعض مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے حاجی خلیفہ اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ذکر انہ صنفہ بعد ما عمل کتاب المعانی الاکبر و املی کتاب کتاب احتجاج القراء

(۶) تحقیق البیان فی تاویل القرآن:۔

مصنف نے اپنی کتاب الذریعہ کے دیباچہ میں اس تالیف کا نام لیا ہے حاجی خلیفہ کے اس کتاب کے تحت امام سیوطیؒ کے طبقات النحاۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مفردات القرآن ہی کا دوسرا نام ہے لیکن علماء نے الگ تالیف کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۷) افانین البلاغۃ:۔

صاحب کشف الظنون نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۸) کتاب الایمان والکفر:۔

عجیب وغریب طرز پر لکھی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اصول میں اشعری تھے۔

(۹) تفصیل النشاتین:۔

یہ کتاب پہلے ۱۳۱۹ھ میں بیروت سے شائع ہوئی پھر امرتسر سے اردو ترجمہ کے ساتھ دو کالموں میں اس کا خوبصورت ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

(۱۰) المفردات فی غریب القرآن۔ جس کا اردو ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

(۱۱) کتاب المعانی الاکبر۔

(۲۱) کتاب احتجاج القراء۔

هٰذا آخر ما اردنا والحمد للّٰہ ربّ العلمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

محمد عبدہ الفلاحی
قاسم منزل حاجی آباد لائل پور

۱۰ رمضان المبارک سنہ ۱۳۰۹ھ

مفردات القرآن (اردو)

مترجم

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ وحواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہٗ فیروزپوری

جلد اوّل

شیخ شمس الحق

۳۸ کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلٰوتُهٗ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ اَجْمَعِيْنَ ○

امابعد۔ بندۂ ناچیز شیخ ابوالقاسم حسین بن محمد بن المفضل الراغب (خدا اس پر رحم فرمائے) درگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے انوار قدسیہ سے نور ایمان عطا فرمائے جس کے ذریعہ ہم خیر و شر کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ سکیں اور حق و باطل میں کما حقہ تمیز کر سکیں حتی کہ اس پسندیدہ گروہ میں شامل ہو جائیں جن کا نور ایمان قیامت کے دن ان کے سامنے اور دائیں طرف سے ضوء افشانی کرتا جاتا ہے اور جن کی تعریف میں قرآن فرماتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ — وہ ذات ہے جس نے مومنین کے دلوں میں طمانیت اور تسلی

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَ — نازل فرمائی۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو

اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۵۸۔۲۲) — راسخ کر دیا اور ان کی روحانی تائید فرمائی ہے۔

قبل ازیں ہم اپنی کتاب "الرسالۃ المنبھۃ علی فوائد القرآن" میں اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا ہے اور دین اسلام کو تمام ادیان کا ناسخ اور اسے ہر پہلو سے جامع و مکمل بنایا ہے چنانچہ فرمایا۔

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ — آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی

وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵:۳) — نعمت پوری کر دی اور بحیثیت دین تمہارے لئے اسلام پسند کیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت پر نازل کردہ کتاب یعنی قرآن پاک میں تمام سابقہ کتب سماویہ کے مطالب و مضامین کا نچوڑ اور خلاصہ جمع کر دیا ہے چنانچہ قرآن کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا:۔

یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ○ فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ۔ — وہ (نبی کریم) پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے جن میں سیدھے (اور دین کو قائم رکھنے والے) نوشتے ہیں۔

اور اس نے قرآن پاک کو یہ اعجاز بخشا ہے کہ ضخامت و حجم میں مختصر ہوتے ہوئے بھی معنوی عظمت

اور مضامین کی وسعت کے لحاظ وہ اتاہ سمندر ہے کہ انسانی عقل و فراست اِن کے ادراک عاجز ہے اور اس کائنات کے اسباب و وسائل اس کے مضامین کی گہرائیوں تک پہنچنے سے قاصر ہیں چنانچہ اسی حقیقت کی طرح اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (۳۱/۲۷)

اور زمین کے جتنے بھی درخت ہیں اگر وہ قلم بن جائیں اور موجودہ سمندر سات گنا بڑھ جائیں ان سے سیاہی کا کام لیا جائے تو بھی اللہ کے کلمات ختم ہونے کے نہیں بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

ہم نے اپنی کتاب "الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ" میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قرآن پاک کے انوار و برکات سے ہر شخص اپنی علمی و روحانی استعداد کے مطابق روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس کی تلاوت سے بقدر ظرف مستفید ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ بقول[1] ع

(۱) کَالْبَدْرِ مِنْ حَیْثُ الْتَفَتَّ رَاَیْتَهٗ یُهْدِیْ اِلٰی عَیْنَیْكَ نُوْرًا ثَاقِبًا

(۲) كَالشَّمْسِ فِیْ كَبِدِ السَّمَاءِ وَضَوْءُهَا یَغْشَی الْبِلَادَ مَشَارِقًا وَمَغَارِبًا

اس کی مثال ماہ کامل کی ہے جس پہلو سے بھی اس کی جانب دیکھو گے وہ تمہاری آنکھوں کو نور اور بینائی بخشنے گا دیا، سورج کی مانند ہے جو وسط آسمان میں نمودار ہوتا ہے۔ مگر اسکی روشنی مشرق اور مغرب تک پھیلی ہوئی ہو۔ لیکن اس کے محاسن انوار سے صرف اصحاب بصیرت ہی مستنیر ہو سکتے ہیں اور اس کے پاکیزہ معانی اور مطالب سے پاکباز اور برگزیدہ نفوس ہی فیضیاب ہوتے ہیں اور اس کے اکسیری نسخوں سے صرف پاکیزہ طبائع ہی شفایاب ہو سکتی ہیں چنانچہ قرآن نے خود اس کی تشریح کی ہے کہ۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۝ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۷، ۷۸، ۷۹)

یقیناً یہ ایک باعزت کتاب کتون میں محفوظ ہے صرف پاکباز اور صالح لوگ ہی اس کے حقائق و معارف تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

نیز اس کے سامعین کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَیْهِمْ عَمًى (۴۱/۴۴)

آپ کہہ دیجئے کہ یہ قرآن پاک ایمان والوں کے لئے ہدایت و شفا ہے اور جو اس پر ایمان نہیں لاتے اِن کے کانوں پر گرانبار گزرتا ہے اور اِن پر اس کے معانی مخفی رکھے جاتے ہیں۔

اور اپنے رسالہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جس طرح خیر و برکت کے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر اور کتا موجود ہو اسی طرح بصیرت افروز اور اطمینان بخش کیفیت اس دل میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو حرص و آز اور کبر و نخوت سے بھر چکا ہو۔ چنانچہ قرآن نے اس حقیقت

---

[1] قالہ المتنبی فی مدح سیف الدولۃ والبیت فی دیوانہ (۱: ۳۰) بشرح العکبری و مجموعۃ المعانی و الاتقان للسیوطی ۲/۲۰۶ و بینہما ثالث کالبحر یقذف للقریب جواہراً۔ جوداً و یبعث للبعید سحائباً۔

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (۲۴/۲۶) ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے اور (اسی طرح) پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لئے ہیں اور پاک باز مرد پاکباز عورتوں کے لئے۔

نیز اپنی کتاب میں ہم نے اس زاد راہ کو حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں جن کے ذریعہ انسان امکانی حد تک علوم و معارف میں بلند مقام حاصل کر سکتا ہے اور کتاب الٰہی کی مدد سے آسمان و زمین کے رازہائے سربستہ پر آگاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اپنے کلام کی توصیف میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (۶/۳۸) کہ ہم نے الکتاب میں کسی چیز کے ذکر کرنے میں کوتاہی نہیں برتی۔ بالکل صحیح ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جن کی ہدایت کا اس نے ذمہ لیا ہے اور ان کی رفاقت میں بلند مرتبہ اور عالی مقام پر فائز فرمائے اس لئے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نصیب نہ ہو اسے کوئی بھی راہ راست پر نہیں لا سکتا چنانچہ فرمایا :۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۲۸/۵۶) آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

ہم نے اس امر کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ علوم قرآن میں سب سے پہلے ان علوم کی ضرورت پیش آتی ہے جن کا تعلق نظم قرآن (الفاظ) سے ہے اور ان میں بھی سب سے پہلے مفردالفاظ کی تحقیق ضروری ہے لہذا قرآن کے مطالب و معانی کی تحقیق کے لئے مفردات قرآن کے معانی حاصل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ عمارت بنانے کے لئے سب سے پہلے اینٹ (اور مسالہ) کا حصول ضروری ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مفردات قرآن کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے محض علوم قرآنی کے سمجھنے ہی میں مدد نہیں ملتی بلکہ اس طرح تمام علوم شرعیہ تک رسائی میں مدد ملتی ہے اس لئے کہ قرآن مجید کے مستعمل الفاظ عربی زبان میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا لب لباب اور مغز ہیں احکام و مسائل اور حکم و مصالح کے استنباط میں فقہاءُ اور حکماء نے انہی الفاظ کو مبنیٰ قرار دیا ہے اور شعر و سخن کے شہسوار بھی انہی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ قرآن کے استعمال کردہ مواد اور ان کے مشتقات کے علاوہ جو الفاظ بھی عربی زبان میں مستعمل ہیں ان کی حیثیت قرآن کے مستعمل الفاظ کے مقابلہ میں وہی ہے جو مغز اور رس کے مقابلہ میں گٹھلی اور چھلکے کو حاصل ہے۔

چنانچہ مفردات قرآن کو حروف ہجا کی ترتیب پر ایک جامع کتاب کی شکل میں تالیف کیلئے میں نے خدا کے حضور استخارہ کیا اس کتاب کی ترتیب میں ہم سب سے پہلے وہ کلمات لکھیں گے جن کے شروع میں الف آتا ہے اور پھر وہ جو حروف باء سے شروع ہوتے ہیں اس طرح پوری کتاب

میں حروف تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی اس ترتیب میں ہم زوائد کو نظر انداز کر کے حروف اصلی (مادہ) کو پیش نظر رکھیں گے اسی طرح اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ان تعلقات کو بھی زیر بحث لایا جائے جو مستعار الفاظ اور ان کے مشتقات میں پائے جاتے ہیں اور الفاظ کے تعلقات کے متعلق اصول وقواعد اور ان کی تحقیق کو کسی دوسری کتاب میں زیر بحث لائیں گے جو مستقل اسی موضوع پر لکھی جائے گی اور جس کا ہم جا بجا حوالہ بھی دیتے جائیں گے۔

اور اس سلسلہ میں جو کچھ ہم نے سپرد قلم کیا ہے اس پر کلی اعتماد کر لینے سے تمام وہ دشواریاں دور ہو جاتی ہیں جو مسابقت الی الخیر کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵۷/۲۱) (اپنے رب کی بخشش حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرو) کے فرمان سے ترغیب دی ہے۔ خدائے عزوجل ہمارے لئے اس راہ پر گامزن ہونا آسان فرمائے۔

انشاء اللہ بشرط زندگی اس کے بعد ایک ایسی جامع کتاب کی پیشکش کا ارادہ رکھتے جس میں الفاظ مترادف کی تحقیق اور ان کے معانی میں جو فرق پایا جاتا ہے اسے بالوضاحت بیان کیا جائے گا۔ جس سے کہ قرآن مجید کے ایک ہی مضمون میں استعمال کردہ مختلف الفاظ۔ مثلاً ایک جگہ قَلْبٌ دوسرے موقع پر فُؤَادٌ اور تیسرے مقام پر صَدْرٌ کا لفظ استعمال کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ کی توجیہ معلوم ہو سکے گی اسی طرح وہاں ہم یہ بھی بتائیں گے کہ ایک ہی قصہ کے خاتمہ پر قرآن مجید میں ایک جگہ پر اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۷۹) ارشاد ہے اور دوسرے مقام پر لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰/۲۱) اسی طرح تیسرے مقام پر لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳۰/۲۲) اور کہیں پر لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ مذکور ہے۔ تو اس میں کونسی لطافت پائی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن میں لِاُولِى الْاَبْصَارِ، لِذِىْ حِجْرٍ اور لِاُولِى النُّهٰى وغیرہ کلمات جو مختلف مقامات پر استعمال ہوتے ہیں اور انہیں دیکھ کر سطحی اور ظاہر بین حضرات غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ انہیں مترادف الفاظ قرار دیکر بزعم خود سمجھتے ہیں کہ انہوں نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کی تفسیر "الشکر للہ" یا "لا ریب" کی تفسیر لا شك سے بیان کر کے بس قرآن مجید کی تفسیر کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق سے ہماری رہنمائی فرمائے اور خلوص ہمارے شامل حال رہے اور جو علم ہمیں بخشتا ہے اس کے ذریعہ ہمیں فائدہ پہنچائے اور اسے ہمارا زاد آخرت بنائے جس کے لئے ہمیں بدیں الفاظ تاکید فرمائی ہے۔ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (۲/۱۹۷) اور زادراہ تیار کرو اور بہترین زادراہ تقویٰ ہے۔ وَاللّٰهُ الموافق وَهُوَ نِعْمَ الْوَكِيْل ؀

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا

كِتَابُ الْهَمْزَة

أ

أ: الف با معنی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شروع کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔ تیسرا وہ جو آخر کلام میں آئے۔

(أ) وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے اس کی چند قسمیں ہیں:۔

(۱) الف الاِستِخبار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے بجائے الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہوگا کیونکہ اس میں عمومیت ہے جو استفہام و انکار نفی تبکیت زجر و توبیخ، تسویہ سب پر حاوی ہے۔ چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا۔ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲-۳۰) انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے

اور تبکیت[1] یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور کبھی غیر کو چنانچہ (قسم اول کے متعلق) فرمایا:۔

(۱) اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ (۴۶-۲۰) تم اپنی لذتیں حاصل کر چکے۔

(۲) اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (۲-۸۰) کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے؟

(۳) آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ (۱۰-۹۱) کیا اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟

اور غیر مخاطب کے متعلق فرمایا:۔

(۴) اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا (۱۰-۲) کیا لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے؟

(۵) اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ[2] (۳-۱۴۴) تو کیا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں؟

(۶) اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ۔ (۲۱-۳۴)

---

[1] وهو خاص بالانكار التوبيخى والابطالى وهما قسمان متقابلان معنى الاول ان ما بعد الهمزة واقع وان فاعله ملوم كما يظهر من الامثلة ۱، ۲، ۳، ۴ ومعنى الثانى ان ما بعد الهمزة لم يقع وان مدعيه كاذب كما يظهر من ۲، ۵، ۶، ۷۔ [2] انقلبتم على اعقابكم وبه يتم المثال ؁

بھلا اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟
(۲) آٰلذَّکَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ (۶-۱۴۴)
بتاؤ تو (خدا نے) دونوں نروں کو حرام کیا ہے۔
یا دونوں مادینوں کو۔
اور معنی تسویہ[1] میں فرمایا: سَوَآءٌ عَلَیْنَآ
اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا (۱۴-۲۱) اب ہم گھبرائیں
یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔
سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ
لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲-۶) تم خواہ انہیں نصیحت کرو یا
نہ کرو ان کے لئے برابر ہے وہ ایمان نہیں لانے کے۔
اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل
ہو تو اسے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اَخَرَجَ
(وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں نفی خروج کے معنی
پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر نفی کے معنی نہ
ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا۔
اور جب کلام منفی پر داخل ہو تو اسے مثبت بنا دیتا
ہے۔ کیونکہ کلام منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی
ہوئی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا ہے[2]۔
چنانچہ فرمایا:۔
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (۷-۱۷۲) کیا میں تمہارا پروردگار
نہیں ہوں (یعنی ضرور ہوں)
اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ (۹۵-۸) کیا خدا
سب سے بڑا حاکم نہیں ہے یعنی ضرور ہے۔
اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ (۱۳-۴۱) کیا انہوں
نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں۔

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ (۲۰-۱۳۳) کیا ان کے
پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔
اَوَلَا یَرَوْنَ (۹-۱۲۶) اور کیا یہ نہیں دیکھتے
اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ (۳۵-۳۷) اور کیا ہم نے
تم کو اتنی عمر نہیں دی۔
(۲) الف جو مضارع کے صیغہ واحد متکلم
کے شروع میں آتا ہے اور "میں" کے معنی رکھتا ہے
جیسے اَسْمَعُ وَاَبْصِرُ یعنی میں سنتا ہوں اور
میں دیکھتا ہوں
(۳) ہمزۂ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی
جیسے فرمایا:۔ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ
(۵-۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔
رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ (۶۶-۱۱)
اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں
اپنے پاس ایک گھر بنا۔
(۴) الف جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے
لئے آیا ہے جیسے فرمایا اَلْعٰلَمِیْنَ (۱-۱) تمام جہانوں
(۵) الف ندا، جیسے اَزَیْدُ (اے زید)[3]
(ب) وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس
کی پہلی قسم الف تثنیہ ہے (مثلاً رَجُلَانِ) اور
دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں پائی جاتی ہے
مثلاً مُسْلِمَاتٌ وَمَسَاكِیْنُ۔
(ج) اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا
ہے۔ وہ یا تو تانیث کے لئے ہوتا ہے جیسے
حُبْلٰی اور بَیْضَآءُ میں آخری الف یا پھر تثنیہ میں

---

[1] ویکن علی ذکر منک ان الہمزۃ التی تدخل علی جملۃ یصح حلول المصدر محلھا انما ہی لہ ہمزۃ التسویۃ ولا یلزم ان یکون بعد کلمۃ "سواء" کما توہم نحو ما ابالی اقمت ام قعدت انھم لم یرد فی القرآن الا بعد کلمۃ "سواء" رضی علی الکافیۃ ج ۲ ص ۳۷ وبعد سواء او جملۃ لا ابالی [2] ولہذا عطف المثبت علی المنفی فی سورۃ الانشراح (۹۴-۲) والضحیٰ (۹۳-۷) والفیل (۱۰۵-۳) والمعانی الہمزۃ فیہ الاستفہام راجع الی التقریر (دلہ ۴ھ ۲۶۸) [3] لیس فی التنزیل نداء بغیر یا الا ما قال الفراء فی الاٰیۃ امّن ہو قانت اناء اللیل (۳۹-۱۰) ان الہمزۃ فیہ للندا الا انا للجمہور والجوازہ وجوہ النظر المغنی لابن ہشام ج ۱ ص ۵ ❖ ❖ ❖

ضمیر کے لئے جیسا کہ اِذْ هَبَا میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے جیسے وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا (۳۳-۱۰) فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا (۳۳-۶۷) تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لئے آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے (جیسا کہ ابیات کے اواخر میں الف اشباع بڑھا دیتے ہیں)

اب ب

اَلْاَبُّ: اس گھاس کو کہتے ہیں جو جانوروں کے چرنے اور کٹنے کے لئے بالکل تیار ہو یہ اَبَّ لِکَذَا اَبًّا وَ اَبَابَۃً وَ اَبَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کوئی کام کرنے کے لئے تیار ہو جانا کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے۔

اَبَّ اِلٰی وَطَنِہٖ۔ وطن کا مشتاق ہو کر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اَبَّ لِسَیْفِہٖ تلوار سونتنے کو مستعد ہو جانا اور اسی سے اِبَّانَ ذٰلِکَ کی ترکیب ہے جس میں اِبَّانَ بروزن فِعْلَانَ ہے[1] یعنی وہ زمانہ جو کسی کام کرنے کے لئے بالکل مناسب ہو۔

قرآن میں ہے:-

وَفَاکِھَۃً وَّاَبًّا (۸۰-۳۱) اور میوے اور چارہ۔

اب د

اَلْاَبَدُ:۔ ایسے زمانہ دراز کے پھیلاؤ کو کہتے ہیں جس کے لفظ زمان کی طرح ٹکڑے نہ کئے جا سکیں۔ یعنی جس طرح زَمَانَ کَذَا (فلاں زمانہ) کہا جا سکتا ہے اَبَدُ کَذَا نہیں بولتے، اس لحاظ سے اس کا تثنیہ اور جمع نہیں بننا چاہیئے۔ اس لئے کہ اَبَدٌ تو ایک ہی مسلسل جاری رہنے والی مدت کا نام ہے جس کے متوازی اس کی جیسی کسی مدت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اسے ملا کر اس کا تثنیہ بنایا جائے قرآن میں ہے[2]

خَالِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا (۹۸-۱۱) وہ ابدالاباد ان میں رہیں گے۔

لیکن بعض اوقات اسے ایک خاص مدت کے معنی میں لے کر آبَادٌ اس کی جمع بنا لیتے ہیں جیسا کہ اسم جنس کو بعض افراد کے لئے مختص کر کے اس کا تثنیہ اور جمع بنا لیا جاتا ہے بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ آبَادٌ جمع مُوَلَّدٌ ہے۔ خالص عرب کے کلام میں اس کا نشان نہیں ملتا اور اَبَدٌ اَبِیْدٌ وَ اَبَدٌ اَبِدٌ (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے) میں دوسرا لفظ محض تاکید کے لئے لایا جاتا ہے تَاَبَّدَ الشَّیْئُ کے اصل معنی تو کسی چیز کے ہمیشہ رہنے کے ہیں مگر کبھی عرصہ دراز تک باقی رہنا مراد ہوتا ہے۔ آلْاَبِدَۃُ وحشی گائے والجمع اَوَابِدُ (وحشی جانور) تَاَبَّدَ الْبَعِیْرُ (وابد) اونٹ بدک کر وحشی جانور کی طرح بھاگ گیا۔ تَاَبَّدَ وَجْہُ فُلَانٍ وَاَبِدَ (اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے) بعض کے نزدیک اس کے معنی غضبناک ہونا بھی آتے ہیں[3]۔

(اب ق)

اَبَقَ (ض س ن) اَبْقًا آبَاقًا۔ غلام بھاگ

---

[1] وعند البعض وزن فَعَّال و النون للعمیۃ — اللسان والنہایۃ (ابن) [2] وفی حدیث الحج أمتعتنا ہذا لعامنا أم لأبد فقال بل لأبد اللسان (ا بد)۔ [3] قال فی المسائل وأبد علیہ أبدا غضب وفی آیات فی الغیب (ص ۱۱) عبید عبیدا أبد و بہا و ابدا أی غضب علیہ فہما ای الیمین والتحقیق من الابدال المزدوج، جمع ایضا الابدال لابی الطیب ج ص ۰۰ ۱۱۱ ۲ و النوادر ابی مسحل ۶۸، ۷۸۱۵ ؛

گیا۔ قرآن میں ہے: اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (۳۷-۱۴۰) جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی میں پہنچے آبِقٌ (صفت فاعلی) بھاگا ہوا غلام والجمع اُبَّاق۔ تَاَبَّقَ الرجل۔ وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح چھپ گیا اور شاعر کے قول[1]

۳- قد اُحْکِمَتْ حَکَمَاتِ الْقَدِّ وَالْاَبَقا

(ان گھوڑوں کے چمڑے کے تسمے اور جوٹ کی کی کنپٹیاں کسی ہوئی ہیں)

میں بعض نے کہا ہے کہ آبَقٌ کے معنی جوٹ یا اس کی رسی کے ہیں۔

(اب ل)

اَلْاِبِلُ۔ اونٹ کا گلہ۔ اس کا واحد اس مادہ سے نہیں آتا قرآن میں ہے۔ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ (۶-۱۴۴) اور دو اونٹوں میں سے۔

اور آیت کریمہ: اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۸۸-۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کئے گئے ہیں، میں بعض نے کہا ہے کہ اِبِلٌ بمعنی سحاب ہے یہ قول صرف معنی تشبیہ کے اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ کثرت اسفار میں بادل اور اونٹ میں یک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے[2]۔

اَبَلَ الوحشی ابولا واَبِلَ اَبْلًا۔ وحشی جانور کا اونٹ کی طرح پانی سے بے نیاز ہونا۔ تَاَبَّلَ الرجل عن امرءته۔ عورت سے مقاربت ترک کرنا اَبَّلَ الرجل۔ بہت اونٹوں والا فلان لا یأبل فلاں اونٹ پر جم کر سوار نہیں ہوسکتا۔ رجلٌ اَبِلٌ وَاٰبِلٌ اونٹوں کا اچھی طرح انتظام کرنے والا ابل مؤبّلة اکٹھے کئے ہوئے اونٹ الاِبّالة۔ لکڑیوں کا گٹھا[3]۔ اور آیت کریمہ:۔ وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (۱۰۵-۳) میں اَبَابِیل کے معنی یہ ہیں کہ ان پر پرندے اونٹوں کی مختلف ٹکڑیوں کی طرح قطار در قطار بھیجے گئے اور ابابیل کا واحد اِبِّيْلٌ ہے[4]

(اب و)

اَلْاَبُ۔ اس کے اصل معنی تو والد کے ہیں (مجازًا) ہر اس شخص کو جو کسی شے کی ایجاد ظہور یا اصلاح کا سبب ہوا سے اَبُوْہُ کہہ دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ (۳۳-۶) میں آنحضرت کو مومنین کا باپ قرار دیا گیا ہے۔ ایک قرأت میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ بھی آیا ہے[5] نیز مروی ہے کہ آنحضرت نے حضرت علی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا[6] (۱) انا وانت ابوا هذه الامة

---

[1] قال زهير بن ابی سلمى بن رباح المزنی وصدرہ القائدا الخیل منکوبا دوا برہا ۔۔۔۔ انظر للبیت دیوانہ ۱۲۰ بشرحہ للاعلم الشنتمری (لیدن) (۱۳۰۶) والمختارات ۹۴ ومختار الشعر مجانی ج ۱ ص ۱۷۲ والعقد الثمین ۸۵ والحکم (حکم) والاشتقاق ۷۲ [2] قال ابو عمرو بن العلاء: من جعله السحاب قرء الی الابل (بتشدید اللام) اعراب ثلاثین - ۷ الکشاف ۴: ۲۷ والبحر المحیط ۸: ۴۶۴ واللسان (ابل) [3] روح المعانی ۳۰: ۱۱۷ وفی غریب القرآن للقتیبی ۵۴ اشارۃ الیہ [4] وفی المثل ضغث علی ابالة ومعناه البلیة علی اخری المیدانی رقم ۲۲۰۲ [5] وعند الفراء والاخفش لا واحد له وعند الکسائی واحده ابول مثل عجاجیل وعجول ویمکن ان یکون واحده ابالة مثل دینار ودنانیر رابع [5] ذکر المؤلف ہذا القراءۃ ایضا فی المحاضرات (۲): ۴۳۴ وہذہ قراءۃ ابی فی مصحفہ ومنقول عن ابی عباس ومجاہد وعکرمۃ ثم نسخ کما یعلم من روایۃ کنز العمال ۴۶۴ ۱ والدر ۵: ۱۸۳ [6] لم اجدہ فلینظر من اخرجہ ۱۲ ؛

کہ میں اور تم اس امت کے باپ ہیں نیز اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا[1] (۴)

کل سبب ونسب منقطع یوم القیامۃ الا سببی ونسبی کہ قیامت کے دن میرے تعلق ورشتہ کے سوا تعلقات اور رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ اور میزبان کو ابو الاضیاف کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مہمانوں کی دیکھ بھال کرتا ہے

ابو الحرب۔ لڑائی کا بھڑکانے والا۔ بڑا جنگ جو۔ ابوعُذْرَتِہا۔ مرد دوشیزگی دبانے زن (مجازا) موجد اَلْاَبُوَانِ۔ یہ لفظ ماں باپ، باپ دادا۔ نیز باپ چچا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰھَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (۲-۱۳۳) میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے (تو) انہوں نے کہا آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے۔

میں حضرت اسماعیل کو یعقوب علیہما السلام کے آباء کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے حالانکہ وہ حضرت یعقوب کے چچا تھے۔ اور کبھی استاد اور معلم پر بھی ابٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کا روحانی مربی ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ (۴۳-۲۲) میں بعض نے کہا ہے[2] کہ آباء سے مراد وہ علماء ہیں جو ان کی علمی اور روحانی تربیت کرتے تھے۔ کیونکہ دوسری جگہ آیت:۔ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳-۶۷) میں ان آباء کو سادۃ اور کبراء کہا ہے بعض نے کہا ہے کہ آیت: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (۳۱-۱۴) میں وَالِدَيْن سے باپ اور معلم مراد ہیں اور آیت کریمہ:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ (۳۳-۴۰) کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں — میں نفی ابوۃ بلحاظ ولادت کے ہے۔ نیز تنبیہ کی ہے کہ متبنیٰ حقیقی اولاد کا حکم نہیں رکھتا۔

اَبٌ کی جمع آبَاءٌ ہے کبھی بُعُوْلَةٌ اور خُؤُوْلَةٌ (جمع بعل وخال) کی طرح اس کی جمع اُبُوَّةٌ بھی آجاتی ہے اصل میں ابٌ (اَبَوٌ) بروزن فَعَلٌ ہے اور اور شاعر کے قول[3] (۱-)

---

[1] رواہ الدارقطنی عن ابن عباس مرفوعًا فی حدیث طویل وقال فی آخرہ۔ تفرد بہ خارجۃ ولیس بثقۃ قال السیوطی روی الترمذی وابن ماجہ وقال ابن عدی ہو ممن یکتب حدیثہ اللالی للسیوطی: ۲۶۵ والحدیث فی المجاز لابی عبیدۃ ۲: ۱۷۸ ورواہ الحاکم فی المستدرک (۳: ۲۴) من حدیث عمرؓ فی قصۃ نکاح ام کلثوم وقال فی آخرہ فانا احببت ان یکون بینی وبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبب ونسب قال الذہبی فی تلخیص المستدرک منقطع وایضا راجع تذکرۃ للذہبی: ۶۵ وتتمۃ وبلغا من المجد غایتاہا۔ وفی العینی (شرح شواہد الکبری علی ہوامش الخزانۃ ۱: ۱۳۳) انہ لابی النجم ویقال انہ لرؤبۃ ولیس فی دیوانہ وفی النوادر لابی زید الانصاری بروایۃ المفضل الضبی عن ابی الغول لبعض اہل الیمن قال السیوطی فی شرح شواہدہ ۸۴: قیل ان الرجز لرؤبۃ وعزاہ الجوہری لابی النجم وراجع للشطر الاول اللسان (ابا) والخزانۃ البغدادیۃ (۳: ۲۳۷) وابن عقیل (۱۱۱) ومعانی القرآن المنسوب الی الزجاج، ۲۴ والمغنی (۱: ۳۷) والشطر الثانی (۱: ۱۳۱) واسرار الانصاری ۴۶ وعزاہ صاحب التحقیق الی ابی النجم العجلی من بنی بکر بن وائل المتوفی سنۃ ۱۳۰ھ) وفی البلدان (ابو قبیس) وذکر الیاقوت بحثا فی اعراب ابی قبیس (جبل فی مکۃ) وقال ینسب فیہ لحن الی ابی حنیفۃ والقصۃ الیہ فی العقد الفرید (۲: ۴۸۲) والعہد علیہ انظر ایضا دفاع الکھنوی فی التعلیق الممجد (مقدمہ) وقد فاز رضاء حق العینی ولطال البحث فی شرح شواہد (۱: ۱۳۴-۱۳۹)

(۴) "اِنَّ اَبَاهَا وَاَبَا اَبَاهَا"

(اس کا باپ اور دادا)

میں اسے قفًا کا حکم دیا گیا ہے یعنی قفًا کی طرح اسم مقصور سمجھ کر نصبی جری حالت میں الف کو ثابت رکھا گیا ہے) محاورہ ہے۔ اَبَوْتُ الْقَوْمَ (میں قوم کا باپ بن گیا) فلان یأبُوْ بَهْمَتَهٗ۔ (وہ اپنے جانوروں کی باپ کی طرح حفاظت کرتا) اور ندا کی حالت میں اَبَتِ پرتا زیادہ کرکے یا اَبَتِ (اے میرے باپ) کہا جاتا ہے[۱]۔ بَاْبَأَ الصَّبِیُّ (حکایت) بچے نے بابا کہا۔

(اب ی)

اَلْاِبَاءُ۔ کے معنی شدت امتناع یعنی سختی کے ساتھ انکار کرنا ہیں۔ یہ لفظ الامتناع سے خاص ہے لہٰذا ہر اِبَاء کو امتناع کہہ سکتے ہیں مگر ہر امتناع کو اِبَاءٌ نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے۔ وَيَأْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ (۹-۳۲) اور خدا اپنے نور کو پورا کئے بغیر رہنے کا نہیں۔ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ (۹-۸) لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ (۲-۳۴) اس نے سخت سے انکار کیا اور تکبر کیا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى (۱۵-۳۱) مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔

ایک روایت میں ہے[۲] كُلُّكُمْ فِي الْجَنَّةِ اِلَّا مَنْ اَبٰى (ک) تم سب جنتی ہو مگر وہ شخص جس نے (اطاعت الٰہی سے) انکار کیا۔

رَجُلٌ اَبِيٌّ۔ خود دار آدمی جو کسی کا ظلم برداشت نہ کرے اَبَيْتَ الضَّيْمَ (مضارع تَاْبٰى) تجھے اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رکھے۔ تَيْسٌ آبٰی۔ وہ بکرا جو پہاڑی بکروں کا بول ملا ہوا پانی پی کر بیمار ہو جائے اور پانی نہ پی سکے اس کا مؤنث اَبْوَاءُ ہے[۳]

(ا ت ی)

اَلْاِتْيَان۔ (مص ض) کے معنی کسی چیز کے بسہولت آنا کے ہیں۔ اسی سے سیلاب کو اَتِیٌّ کہا جاتا ہے[۴] اور اسی سے بطور تشبیہ مسافر کو قوم کا اَتَاوِیٌّ کہہ دیتے ہیں۔

الغرض اِتْيَان کے معنی "آنا" ہیں خواہ کوئی بذاتہ آئے یا اس کا حکم پہنچے یا اس کا نظم و نسق وہاں جاری ہو یہ لفظ خیر و شر اور اعیان و اعراض سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ (۶-۴۰) اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ (۱۶-۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آ ہی پہنچا۔

اور آیت کریمہ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ (۱۶-۲۶) میں اللہ کے آنے سے اس کے حکم کا عملاً نفوذ مراد ہے جس طرح کہ آیت وَجَآءَ رَبُّكَ (۸۹-۴۲) میں ہے اور شاعر نے کہا ہے[۵]

(۵) "اتیت المروءة من بابها"

تو جوانمردی میں اس کے دروازہ سے داخل ہوا

---

[۱] انظر الایات (۳۷-۱۰۲) (۱۹-۴۲-۴۵) [۲] رواہ البخاری من حدیث ابی ہریرۃ ۱۲ [۳] قارن النوادر لابی مسحل وفی النہایۃ (۱: ۱۷) [۴] عکسہ الاتی والاتاوی فی الاصل الغریب ویقال للسیل الذی یاتی من بعیداتی واتاوی ومنہ قیل الطریق سلوک ومیتاز کما فی حدیث اللقطۃ الفائق (۱-۷) [۵] انظر تکملۃ النوادر لابی مسحل (۶-۷) وہو منسوب الی اتی والقیاس اتوی کما فی عدی وعدوی زیدت فیہ الالف للنسبۃ اولاشباع الفتحۃ (۱-۵۰) [۵] لم اجدہ ولعلہ للاعشی وصدرہ: یکی یعلم الناس انی امرؤ۔۔۔ وفی دیوانہ المعنۃ بدل المروءۃ فلعل احد اللفظین مصحف مکان الآخر ۱۲

اور آیت کریمہ: وَلَا یَأْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى (۹-۵۴) میں یَاْتُوْنَ بمعنی یَتَعَاطُوْنَ ہے یعنی مشغول ہونا اور آیت کریمہ: یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ (۴:۱۵) میں الفاحشۃ (بدکاری) کے متعلق اتیان کا لفظ ایسے ہی استعمال ہوا ہے جس طرح کہ آیت کریمہ:۔ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا (۱۹-۲۷) فری کے متعلق مجیئ کا لفظ استعمال ہوا ہے (یعنی دونوں جگہ ارتکاب کے معنی ہیں)

اور آیت (مذکورہ) میں ایک قرارت تَاْتِی الْفَاحِشَۃَ بھی ہے اور یہ اَتَیْتُہٗ وَاَتَوْتُہٗ (واوی اور یائی) دونوں طرح آتا ہے[1]۔ چنانچہ (دودھ کے) مشکیزہ کو بلونے سے جو اس پر مکھن آجاتا ہے اسے "اتوۃ" کہا جاتا ہے لیکن اصل میں اَتْوَۃٌ اس آنے والی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے حاصل ہو کر آئے لہذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔

اَرْضٌ کَثِیْرَۃُ الْاِتَاءِ۔ زرخیز زمین جس میں بکثرت پیداوار ہو اور آیت کریمہ: اِنَّہٗ کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا (۱۹-۶۱) بے شک اس کا وعدہ آیا ہوا ہے) میں مَاْتِیًّا (فعل) اتیتہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں ماتیا بمعنی آتیا ہے (یعنی مفعول بمعنی فاعل) ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ محاورہ میں اتیتُ الْاَمْرَ وَاَتَانِی الْاَمْرُ دونوں طرح بولا جاتا ہے[2] اَتَیْتُہٗ بکذا واتیتہٗ کذا۔ کے معنی کوئی چیز لانا یا دینا کے ہیں قرآن میں ہے:۔ وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِهًا (۲-۲۵) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔

فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا (۲۷-۳۷) ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس سے مقابلہ کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔ وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا (۴-۵۴) اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

جن مواضع میں کتاب الہی کے متعلق آتَیْنَا (صیغہ معروف متکلم) استعمال ہوا ہے وہ اُوْتُوْا (صیغہ مجہول غائب) سے ابلغ ہے (کیونکہ) اُوْتُوْا کا لفظ کبھی ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت نہ ہو مگر آتَیْنَا کا صیغہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت بھی پائی جائے اور آیت کریمہ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ (۱۸-۹۶) تو تم لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ۔ میں ہمزہ نے الف موصولہ (ائْتُوْنِیْ) کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی جِیْئُوْنِیْ کے ہیں۔

اَلْاِیْتَاءُ (افعال) اس کے معنی اِعْطَاءٌ یعنی دینا اور بخشنا کے ہیں۔ قرآن بالخصوص صدقات کے دینے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوۃَ (۲-۲۷۷) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّكٰوۃِ (۲۱-۷۳) اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَیْتُمُوْهُنَّ (۲-۲۲۹) اور یہ جائز نہیں ہے کہ جو مہر تم ان کو دے چکو اس میں سے کچھ واپس لے لو وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ (۲-۲۴۷) اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔

---

[1] الواو لغۃ ہذیل یقال: ما احسن اَتْوَیَدَی الناقۃ واتی یدیہا قال خالد بن زہیر: یا قوم ما بال ابی۔ کنت اذا اتوتہ من غیب لا نظر الامالی ۲-۵۰ ہو اللسان (اتی) [2] یعنی یعدی بحرف الجر و بہمزۃ الافعال ۱۲

(ا ث ث)

اَلْاَثَاثُ۔ وافر رخت خانہ اصل میں یہ اَثَّ (ن) سے مشتق ہے جس کے معنی زیادہ اور گنجان ہونا کے ہیں۔ پھر یہ لفظ (اَثَاث) ہر قسم کے فراواں مال پر بولا جانے لگا ہے اور مَتَاعٌ کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آتا اس کی جمع اِثَاث (بکسر الہمزہ) ہے۔ نِسَاءٌ اَثَائِثُ۔ پرگوشت عورتیں گویا گوشت ان پر وافر سامان کی طرح چڑھا ہوا ہے تَاَثَّثَ فُلَانٌ۔ فلاں بہت زیادہ مالدار ہوگیا قرآن میں ہے:۔ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا (۱۹-۷۴) وہ سازوسامان میں زیادہ تھے اور خوش منظر بھی وَاَثَاثًا وَّمَتَاعًا (۱۶-۸۰) یعنی سازوسامان۔

(ا ث ر)

اَثَرُ الشَّیْءِ۔ (بقیہ علامت) کسی شی کا حاصل ہونا جو اصل شی کے وجود پر دال ہو اس سے فعل اَثَرَ (ض) وَاَثَّرَ (تفعیل) ہے اَثَرٌ کی جمع آثَارٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا (۵۷-۲۷) پھر ہم نے ان کے پیچھے اور پیغمبر بھیجے وَاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ (۴۰-۲۱) اور زمین میں نشانات بنانے کے لحاظ سے فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثَارِ رَحْمَتِ اللّٰهِ (۳۰-۵۰) تم رحمت الہی کے نشانات پر غور کرو اسی سے ان طریق کو آثار کہا جاتا ہے جس سے گذشتہ لوگوں کے اطوار (وخصائل) پر استدلال ہوسکے جیسے فرمایا فَهُمْ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ يُهْرَعُوْنَ (۳۷-۷۰) سو وہ انہیں کے نقش قدم پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِیْ (۲۰-۸۵) وہ میرے طریقہ پر کاربند ہیں۔

اسی سے مشہور محاورہ ہے سَمِنَتِ الْاِبِلُ عَلٰی اَثَارَۃٍ اَثَرٌ من تحجم فربہ شدند شتران بر بقیہ پیہ کہ پیش ازیں بود اَثَرْتُ الْبَعِیْرَ۔ میں نے اونٹ کے تلوے پر نشان لگایا تاکہ (گم ہو جانے کی صورت میں) اس کا کھوج لگایا جا سکے۔ اور جس لوہے سے اس قسم کا نشان بنایا جاتا ہے اسے اَلْمِئْثَرَۃُ کہتے ہیں۔

اَثَرُ السَّیْفِ۔ تلوار کا جوہر جو اسکی عمدگی کا نشان ہوتا ہے۔ سَیْفٌ مَاْثُوْرٌ۔ جوہر دار تلوار اَثَرْتُ (ن) الْعِلْمَ آثُرُهٗ اَثْرًا وَاِثَارَۃً وَّاُثْرَۃً۔ کے معنی ہیں علم کو روایت کرنا۔ در اصل اس کے معنی نشانات علم تلاش کرنا ہوتے ہیں۔ اور آیت :۔ اَوْ اَثَارَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ (۴۶-۴) میں اَثَارَۃٍ سے مراد وہ علم ہے جس کے آثار (تاحال) روایت یا تحریر کی وجہ سے باقی ہوں ایک قراءۃ میں اَثَرَۃٍ ہے یعنی اپنے مخصوص علم سے اَلْمَآثِرُ انسانی مکارم جو نسلاً بعد نسل روایت ہوتے چلے آتے ہیں۔ اسی سے بطور استعارہ اَثَرٌ بمعنی فضیلت بھی آجاتا ہے۔ اور اَلْاِیْثَارُ (افعال) کے معنی ہیں (ایک چیز کو اس کے افضل ہونے کی وجہ سے دوسری پر) ترجیح دینا اور پسند کرنا اس سے آثَرْتُهٗ ہے

۱؎ انظر ایضًا (۱۸-۶۴) (۲۰-۹۶)

یعنی میں نے اسے پسند کیا۔ قرآن میں ہے:۔ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِہِمْ (۵۹-۹) دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا (۱۲-۹۱) بخدا اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت بخشی ہے۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیَاۃَ الدُّنْیَا (۸۷-۱۶) مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

(۵) حدیث میں ہے: سَیَکُوْنُ بَعْدِیْ اَثَرَۃٌ[1] (میرے بعد تم میں خود پسندی آجائے گی) یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے کو دوسروں سے بہتر خیال کرے گا۔

اَلْاِسْتِئْثَارُ۔ یعنی کسی چیز کو اپنے لئے مخصوص کر لینا اور (محاورہ میں) اِسْتَأْثَرَ اللّٰہُ بِفُلَانٍ فلاں کی موت سے کنایہ ہوتا ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرف بخشی کے لئے اسے چن لیا ہے اور اپنے لئے خاص کر لیا ہے۔

رَجُلٌ اَثِرٌ جو اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دے۔ لحیانی[2] نے حکایت کی ہے خُذْ اٰثِرًا مَّا، وَاِثْرًا مَّا، وَاٰثِرَ ذِیْ اَثِیْرٍ یعنی سب سے پہلے یہ کام کرو۔[3]

(ا ث ل)

اَثْلٌ (جھاؤ کا درخت) قرآن میں ہے:۔ ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ (۳۴-۱۶) یعنی دو ایسے باغ دیئے) جن کے میوے بدمزہ اور جھاؤ اور کچھ سبزیاں تھیں اَثْل یعنی وہ درخت جس کی جڑ خوب مضبوط ہو اسی سے شَجَرٌ مُتَاَثِّلٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ درخت جس جڑ اَثل کی طرح مضبوط ہو۔ تَاَثَّلَ کَذَا وہ چیز اَثل کی طرح مضبوطی سے جم گئی اس نے جڑ پکڑ لی اور آنحضرت کا وَصِیّ کے متعلق "غَیْرُ مُتَاَثِّلٍ مَالًا" (۵) فرمایا[4] ہے (یعنی یتیم کے مال سے بقدر ضرورت لے اور ذخیرہ اندوزی نہ کرے) یہ مال کے اذخار اور اقتنا سے کنایہ ہے اور اسی سے بطور استعارہ نَحَتَ اَثْلَتَہٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی غیبت اور بدگوئی کرنا کے ہیں۔

(ا ث م)

اَلْاِثْمُ وَالْاَثَامُ۔ وہ (اعمال و افعال) جو ثواب سے روکنے اور پیچھے رکھنے والے ہو اس کی جمع آثَامٌ آتی ہے چونکہ اس لفظ میں تاخیر اور بُطْءٌ (دیر لگانا) کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے

[1] قالہ صلی اللہ علیہ وسلم للانصار والحدیث باختلاف الفاظہ وطرقہ فی البخاری ومسلم (۱-۳۲۸) طبع انصاری ولیس فی شیء من الطرق سیکون فتنبہ لذالک والحدیث فی الکشاف ۲/۲۰۶ وفی الحدیث قصۃ ابی قتادۃ مع معاویۃ راجع الحاکم والبیہقی (تخریج احادیث الکشاف ۴۰ رقم ۸۷) والحدیث ایضا فی النہایۃ واللسان (اثر)۔ [2] ابوالحسن علی بن مبارک او ابن حازم اللحیانی من بنی لحیان بن ہذیل بن مدرکہ اخذ عن الکسائی وابن زید وابی عمرو الشیبانی وطبقتہم وعمدتہم الکسائی راجع لترجمتہ بغیۃ الوعاۃ ۳۴۲ والفہرست ۷۲ و ۱۲۰ طبقات زبیدی ۲۱۳ والانباہ ۱: ۹-۱۰۲/۲۵۵ ومعجم الادباء ۱۴/۱۶-۱۰۸: [3] راجع للکلمۃ المعاجم [4] راجع للحدیث الکشاف (۱: ۲۴۸) والمصنف لعبدالرزاق والطبری عن الحسن العرنی ومسند احمد وابن ماجہ والنسائی وابو داؤد من روایۃ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ وابن حبان من روایۃ صالح بن رستم عن جابر والکامل لابن عدی (ترجمۃ صالح بن رستم) وابونعیم فی الحلیۃ فی ترجمۃ عمرو بن دینار (وقال تفرد بہ الخزان (صالح بن رستم ابو عامر الخزان) وہو من ثقات البصریین وضعفہ ابن معین (راجع تخریج الکشاف ص ۳۸-۳۹ رقم ۲۲۳) والنہایۃ ۱/۱۹ والفائق ۱/۸ وقالہ صلی اللہ وسلم فی وصی الیتیم وعمر حین وقف ارضہ لمن ولیہا ایضا مجمع البحار (اثل) :

شاعر نے اونٹنی کے متعلق کہا ہے[1] ۔ (المتقارب)

(۶) جمالیۃ تغتلی بالرادف
اذا کذب الآثمات الھجیرا

وہ اونٹ کی طرح مضبوط ہے جب سست رفتار اونٹنیاں دوپہر کے وقت چلنے سے عاجز ہوجاتی ہیں تو یہ ردیف کو لے کر تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہے اور آیت کریمہ: فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۲: ۲۱۹) میں خمر اور میسر میں اثم کبیر کے یہ معنی ہیں کہ ان کا تناول (اور ارتکاب) انسان کو ہر قسم کے افعال خیر سے روک لیتا ہے۔

آثِمٌ (ص) اَثِمَ اَثَامًا فَهُوَ آثِمٌ و اَثِمٌ وَاَثِيْمٌ (گناہ کا ارتکاب کرنا) اور تَاَثَّمَ (تفعل) کے معنی گناہ سے نکلنا (یعنی رک جانا اور توبہ کرنا) کے ہیں جیسے تَحَوَّبَ کے معنی حوب (گناہ) اور تحرج کے معنی خرج یعنی تنگی سے نکلنا کے آجاتے ہیں[2]۔

اور "الکذب" (جھوٹ) کو اثم کہنا اس وجہ سے ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا گناہ ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ انسان کو حیوان کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے حیوان کہہ دیا جاتا ہے اور آیت کریمہ: اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (۲-۲۰۶) کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عزت نفس (اور ہٹ دھرمی) اسے گناہ پر اکساتی ہے اور آیت: وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا (۲۵-۶۸) میں آثام سے (مجازا) عذاب مراد ہے اور عذاب کو اثام اس لئے کہا گیا ہے کہ ایسے گناہ (یعنی قتل و زنا) عذاب کا سبب بنتے ہیں جیسا کہ نبات اور شحم (چربی) کو ندیٰ (نمی) کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ نمی سے نباتات اور (اس سے) چربی پیدا ہوتی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے[3] (طویل)

(۷) "تعلی الندی فی متنہ وتحدرا"

اس کی پیٹھ پر تہ بر تہ چربی چڑھی ہوئی ہے اور نیچے تک پھیلی ہوئی ہے۔ بعض نے آیت کریمہ: میں يَلْقَ اَثَامًا کے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ مذکورہ افعال اسے دوسرے گناہوں پر برانگیختہ کریں گے کیونکہ (عموماً) صغائر گناہ کبائر کے ارتکاب کا موجب بن جاتے ہیں اور آیت کریمہ: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹-۵۹) کی تفسیر بھی ان ہر دو وجہ سے بیان کی گئی ہے۔

اَلْاٰثِمُ ۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والا ۔ قرآن میں ہے: آثِمٌ قَلْبُهُ (۲-۲۸۳) وہ دل کا گنہگار ہے۔

اور اثم کا لفظ بِرّ (نیکی) کے بالمقابل استعمال

---

[1] قال الاعشیٰ فی مدح ناقتہ وقبلہ: بناجیۃ کاتان الثمیل. تقضی السری بعد این عیرا. وفی روایۃ تعتلی بالعین المھملۃ ومعناہ تنھض وتطیق راجع دیوانہ ۷ والاقتضاب ۱۹۹ واللالی مع السمط (۱۱۳۸) والجمھرۃ (۲: ۵۷) واللسان (اثم، غلا) والاعشی ھو میمون بن قیس ادرک الاسلام [2] ھھنا سقط وخرم فی النسخ المطبوعۃ ولعل الصواب و تحرج خرج من حرجہ ای ضیقتہ ۔ [3] البیت لعمرو بن احمر الباھلی واولہ: کثور العداب الفرد یضربہ الندی ..... وفی روایۃ المعذاب بدل العداب والبیت فی اللسان (ندی) والاقتضاب ۴۰۴ والصاحبی ۹۵ وابن احمر ھو ابوالخطاب عمرو بن احمر الباھلی شاعر فحل مخضرم مشھور بالفصاحۃ والغریب توفی فی خلافۃ عثمان (قبیل سنۃ ۳۵ ھ) راجع الشعراء ۳۱۵ والخزانۃ ۳: ۳۸ والبیت ایضاً فی الصحاح والتاج والمحکم (عدب) ۱۲

ہوتا ہے چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا: (۱)

(۶) اَلْبِرُّ مَا اطمأنت الیہ النفس وَالْاِثْمُ مَا حاک فی صدرک[۱] کہ نیکی وہ ہے جس پر طبیعت مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جس کے متعلق دل میں تردد ہو۔ یاد رہے کہ اس حدیث میں آنحضرتؐ نے البر والاثم کی تفسیر نہیں بیان کی ہے بلکہ ان کے احکام بیان فرمائے ہیں۔

اور آیت کریمہ: مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ (۶۸-۱۲) میں اثیم بمعنی آثم ہے اور آیت: یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵-۶۲) (کہ وہ گناہ اور ظلم میں جلدی کر رہے ہیں) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ آثم سے آیت: وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵-۴۴) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے (یعنی عدم الحکم بما انزل اللہ کفر) اور عُدْوَان سے آیت کریمہ:۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵-۴۵) کے مفہوم کی طرف اشارہ (یعنی عدم الحکم بما انزل اللہ ظلم) اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ اِثم عدوان سے عام ہے۔

(ا ج ج)

اَلْاُجَاجُ۔ کے معنی سخت کھاری اور گرم پانی کے ہیں قرآن میں ہے:۔ ھٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّھٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۲۵-۵۳) ایک کا پانی نہایت شیریں اور دوسرے کا سخت گرم ہے۔ یہ (اُجَاج) اجیج النار (شعلہ نار یا اس کی شدید تپش اور حرارت) و اَجَّجْتُھَا وَقَدْ اَجَّتْ۔ میں نے آگ بھڑکائی چنانچہ وہ بھڑک اٹھی (وغیرہ محاورات) سے مشتق ہے۔

اِئْتَجَّ النَّھَارُ۔ دن گرم ہوگیا۔ اسی (ا ج ج) سے یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ (۱۸-۹۴)(۲۱-۹۶) ہے ان کے کثرت اضطراب کی وجہ سے مشتعل آگ یا موجزن اور متلاطم پانی کے ساتھ تشبیہ دے کر یاجوج ماجوج کہا گیا ہے۔

اَجَّ الظَّلِیْمُ اَجِیْجًا۔ شتر مرغ نہایت سرعت رفتار سے چلا۔ یہ محاورہ اشتعال نار کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

(ا ج ر)

اَلْاَجْرُ وَالْاُجْرَۃُ کے معنی جزائے عمل کے ہیں خواہ وہ بدلہ دنیوی ہو یا اخروی چنانچہ فرمایا:۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (۱۱-۲۹) میرا اجر تو خدا کے ذمے ہے۔ وَاٰتَیْنٰہُ اَجْرَہٗ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۹-۲۷) اور ان کو دنیا میں بھی ان کا صلہ عنایت کیا اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۱۲-۵۷) اور جو لوگ ایمان لائے ۔۔۔ ان کے لئے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔

اَلْاُجْرَۃُ (مزدوری) یہ لفظ خاص کر دنیوی بدلہ پر بولا جاتا ہے اَجْرٌ کی جمع اُجُوْرٌ ہے اور آیت کریمہ: وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ (۴-۲۵) اور ان کے مہر بھی انہیں ادا کردو میں کنایہ عورتوں

---

[۱] کلمۃ من حدیث وابصۃ الاسدی انظر (حم، طب، فی الدلائل عنہ حب) ذکرہ فی کنز العمال ۳: ۲۱۸۴، ۲۱۵۸ و بمعناہ روایۃ واصلۃ ۲۱۷۷-۲۱۸۲ و ذکرہ الغزالی فی الاحیاء فی مواضع ۳/۳۴ بتخریج العراقی

کے مہر کو اُجُوْرٌ کہا گیا ہے پھر اَجْرٌ اور اُجْرَۃٌ
کا لفظ ہر اس بدلہ پر بولا جاتا ہے جو کسی عہد وپیمان
یا تقریبًا اسی قسم کے عقد کی وجہ سے دیا جائے۔
اور یہ ہمیشہ نفع مند بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ ضرر
رساں اور نقصان دہ بدلہ کو اجر نہیں کہتے جیسے فرمایا۔
لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲-۲۷۷) ان کو ان
کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا۔ فَاَجْرُهٗ عَلَى
اللّٰهِ (۴۲-۴۰) تو اس کا بدلہ خدا کے ذمے ہے
اَلْجَزَاءُ ہر بدلہ کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی عہد
کی وجہ سے ہو یا بغیر عہد کے اچھا ہو یا برا دونوں
پر بولا جاتا ہے۔
چنانچہ فرمایا:۔ وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً
وَّحَرِيْرًا (۷۶-۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے
ان کو بہشت کے باغات اور ریشم (کے ملبوسات)
عطا کریں گے۔ فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ (۴-۹۳)
اس کی سزا دوزخ ہے۔
محاورہ میں ہے اَجَرَ (ن) زَيْدٌ عَمْرًا يَاْجُرُهٗ اَجْرًا
کے معنی ہیں زید نے عمر کو اجرت پر کوئی چیز دی
اور اٰجَرَ عَمْرٌو زَيْدًا کے معنی ہوں گے عمرو
نے زید کو اجرت دی قرآن میں ہے:۔
عَلٰى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ (۲۸-۲۷)
کہ تم اس کے عوض آٹھ برس میری خدمت کرو۔
اور یہی معنی اٰجَرَ (مفاعلہ) کے ہیں لیکن اس
میں معنی مشارکت کا اعتبار ہوتا ہے اور مجرد
(اَجَرْتُهٗ) میں مشارکت کے معنی ملحوظ نہیں ہوتے
ہاں مال کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ محاورہ ہے
اَجَرَهُ اللّٰهُ وَاٰجَرَهٗ دونوں طرح بولا جاتا ہے
یعنی خدا اسے بدلہ دے۔
اَلْاَجِيْرُ بروزن فَعِيْلٌ بمعنی فاعل یا مفاعل
ہے یعنی معاوضہ یا اجرت کا پر کام کرنے والا۔
اَلْاِسْتِئْجَارُ کے اصل معنی کسی چیز کو اجرت پر طلب
کرنا پھر یہ اجرت پر رکھ لینے کے معنی میں بولا جاتا
ہے جس طرح کہ استجاب (استفعال) بمعنی اَجَابَ
آجاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ: اِسْتَاْجِرْهُ اِنَّ
خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (۲۸-۲۶)
اسے اجرت پر ملازم رکھ لیجئے کیونکہ بہتر ملازم جو
آپ رکھیں وہ ہے جو توانا اور امانت دار ہو
میں (استیجار کا لفظ) ملازم رکھنے کے معنی میں استعمال
ہوا ہے۔

(ا ج ل)

اَلْاَجَلُ کے معنی کسی چیز کی مدت مقررہ
کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَلِتَبْلُغُوْا اَجَلًا
مُّسَمًّى (۴۰-۶۷) اور تاکہ تم (موت کے) وقت
مقررہ تک پہنچ جاؤ۔
اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ (۲۸-۲۸) ان دو معینہ
مدتوں میں سے جونسی مدت میں پوری کردوں۔
محاورہ ہے دَيْنُهٗ مُؤَجَّلٌ اس کے قرضہ وصول
کرنے کے لئے ایک مدت معین ہے قَدْ اَجَّلْتُهٗ
میں نے اس کے لئے مدت مقرر کردی اور انسان
کی زندگی کے لئے جو مدت مقرر ہوتی ہے اسے بھی
اَجَلٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے دَنَا اَجَلُهٗ
یعنی اس کی موت کا وقت قریب آ پہنچا۔ اصل
میں اس کے معنی مدت حیاۃ (زندگی) پورا کر
لینا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَبَلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (۶-۱۲۹)
اور (آخر) ہم اس وقت معین کو پہنچ گئے جو تو
نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا۔

یہاں اَجَلٌ سے مراد حدِ موت ہے اور بعض نے بڑھاپے کی انتہا مراد لی ہے۔ درحقیقت ان دونوں کا ایک مفہوم ہے (کیونکہ جب انسان بڑھاپے کی انتہاء کو پہنچ جائے تو موت کے قریب ہو جاتا ہے) اور آیت کریمہ :۔ ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (۶-۲) میں اجل اول سے حیات دنیوی اور اجل ثانی سے بقاء اخروی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اول سے دنیا میں بقا اور ثانی سے (برزخی زندگی مراد ہے جو) موت سے لے کر حشر تک کا زمانہ مراد ہے یہ حسنؒ سے مروی ہے ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت کریمہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۳۹-۴۲) میں جو دو موتیں مذکور ہیں ان کی طرف اشارہ ہے یعنی اول اجل سے نیند اور ثانی سے موت مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں جگہ اَجَلٌ سے مراد موت ہی ہے لیکن بعض کی موت کسی حادثہ مثلاً قتل، آتش زدگی، غرق وغیرہ ناموافق اسباب کی وجہ سے جو اس کی زندگی کے خاتمہ کا باعث بنتے ہیں اور بعض ان حوادث سے محفوظ اور عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں حتی کہ ان کو طبعی موت آجاتی ہے۔ انہی دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے فرمایا (۷) مَنْ اَخْطَأَتْهُ سَهْمُ الرَّزِيَّةِ لَمْ تُخْطِئْهُ سَهْمُ الْمَنِيَّةِ اگر کوئی مصیبت کے تیر سے بچ بھی جائے تو موت کا تیر اس سے خطا نہیں کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ انسان کی اجل (یعنی موت) دو قسم پر ہے۔ بعض جوانی کی حالت میں (کسی حادثہ کی وجہ) مر جاتے ہیں اور بعض عمر کی اس انتہا کو پہنچ کر مرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبعی زندگی کی آخری حد مقرر کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۲۲-۵) اور بعض (قبل از پیری) مرجاتے ہیں اور بعض (شیخ فانی ہوجاتے اور بڑھاپے کی) نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اور شاعر نے کہا ہے (طویل)

(۸) رأیتُ المنایا خَبْطَ عشواءَ من تُصِبْ
تُمِتْهُ . . . .

موت اندھی اونٹنی کی طرح مخبوط پھر رہی ہیں جس کو پہنچ جائیں اسے ختم کر ڈالتی ہیں

اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے :۔ (المنسرح)

(۹) :۔ مَنْ لَمْ يَمُتْ عَبْطَةً يَمُتْ هَرَمًا :

ـــه وفی فتح القدیر للشوکانی (ج ۱ ص ۹۸ - ۹۹) سبعة اقوال ـــه راجع ابن کثیر (ج ۱ ص ۱۲۳) قول الحسن فی روایة عنه ـــه اخرجه ـــه زهیر فی معلقته وتکملته . . . . . ومن تخطیٔ یُعَمَّر فیهرم راجع للبیت اللسان والمحکم (عشو، خبط) ودیوانه ۲۹ وامالی المرتضیٰ ۱ : ۲۶ ومختار الشعر الجاهلی ۱ : ۱۵۷ ومحاضرات المؤلف ۳ : ۳۲۹ والجمهرة ۱۱۱ والحیوان للجاحظ ۲ : ۱۰۲ و ۶ : ۵۰۹ والعقد الثمین ۹۶ وایام العرب ۲۷۶ وشرح المعلقات لابن الانباری ۲۸۸ ـــه وتمامه : للموت کأس والمرء ذائقها۔ البیت لامیة بن ابی الصلت الجاهلی کما فی المحکم واللسان (عبط) وراجع للبیت الکامل للمبرد ۶۶ وقال فی ۲۹۷ : قال ابو الحسن الاخفش الاصغر وصاعد اللغوی انه رجل من الخوارج واحری ان یکون هو الصواب راجع السمط للمیمنی والبیت ایضاً فی امالی المرتضیٰ ۱-۳۵۳ وعیون الاخبار ۲ : ۴۷ والاغانی ۳ : ۱۷۹ والقرطبی ۴ : ۲۹۷ والعینی ۲ : ۱۸۸ ودیوانه رقم ۴ وذیل الامالی ۱۳۵-۱۳۶ فی ثلاثة وفیه لاید ذائقها والنقائض ۲۷ والادیار للمؤلف ۴/۸۸ وفی اسد الغابة انشدته الفارعة اخت امیة بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصیدةً لاخیه وفیها البیت

جو شخص جوانی میں فوت نہ ہو آخر کار پیر فرتوت ہو کر مر جائے گا۔

اَلْاٰجِلُ (دیر سے ہونے والا) یہ عَاجِلٌ کی ضد ہے اور ہر اس جنایۃ کو اجل کہہ دیا جاتا ہے جس کے انجام بد کا جلد ہی اندیشہ نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہر اجل جنایۃ ہوتا ہے لیکن ہر جنایۃ اجل نہیں ہر محاورہ ہے:۔

فَعَلْتُ كَذَا مِنْ اَجْلِهٖ میں نے فلاں کی وجہ سے یہ کام کیا قرآن میں ہے:۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۵-۳۲) اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا۔ یعنی اس قتل کے ارتکاب کی وجہ سے ایک قراءت میں اِجْل (بکسر الہمزہ) [۱] ہے یعنی اس جرم کی وجہ سے۔

(اَجَلْ) (ہاں بے شک) یہ حرف ایجاب ہے اور کسی خبر کی تصدیق کے لئے آتا [۲] ہے اور آیت کریمہ:۔

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں .... نکاح میں رہنے دو (۲-۲۳۱) میں بلوغ الاجل سے وہ مدت مراد ہے جو طلاق اور انقضاء عدت کے درمیان ہوتی ہے (نیز بلوغ اجل سے عدت کا ختم ہونا یا عدت کے ختم ہونے تک کی مدت کے قریب پہنچ جانا مراد ہے) اور آیت کریمہ ہے فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (۲-۲۳۲) میں بھی انقضاء عدت کی طرف اشارہ ہے یعنی اس وقت فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ (۲-۲۳۴) ان پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ اپنے حق جو پسند کریں کر گزریں۔

(ا ح د)

اَحَدٌ کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ کبھی صرف نفی میں اور کبھی صرف اثبات میں۔ نفی کی صورت میں ذوی العقول کے لئے آتا ہے اور استغراق جنس کے معنی دیتا ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر مجتمع ہو یا متفرق جیسے مَا فِي الدَّارِ اَحَدٌ (گھر میں کوئی بھی نہیں ہے) یعنی نہ ایک ہے اور نہ دو یا دو سے زیادہ نہ مجتمع اور نہ ہی متفرق طور پر اس معنی کی بنا پر کلام مثبت میں اس کا استعمال درست نہیں ہے کیونکہ دو متضاد چیزوں کی نفی تو صحیح ہو سکتی ہے لیکن دونوں کا اثبات نہیں ہوتا جب فِي الدَّارِ وَاحِدٌ کہا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک اکیلے کا گھر میں ہونا تو ثابت ہو گا ہی مگر ساتھ ہی دو یا دو سے زیادہ کا بھی اجتماعاً و افتراقاً اثبات ہو جائے گا پھر احد کا لفظ چونکہ مَا فَوْقَ الْوَاحِدِ کی بھی نفی کرتا ہے اس لئے مَا مِنْ اَحَدٍ فَاضِلِيْنَ۔ کہنا صحیح ہو گا۔ چنانچہ قرآن میں ہے [۳] فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ (۶۹-۴۷) پھر تم میں سے کوئی بھی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہو گا۔

---

[۱] ہذہ قراءۃ ابی جعفر وحدہ راجع فتح القدیر ۱: ۲۴ و شرح الدرۃ للخفاجی۔ [۲] وکذا جیر وان راجع الرضی علی الکافیہ (۲: ۳۹۳) و ابن یعیش (۷-۱۲۴) و فیہ الشواہد [۳] و ایضاً قال:۔ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ (۲-۱۰۲)

کلام مثبت میں احد کا استعمال تین طرح پر ہوتا ہے (۱) عشرات کے ساتھ ضم ہو کر جیسے اَحَدَ عَشَرَ (گیارہ) اَحَدٌ وَّ عِشْرُوْنَ (اکیس) وغیرہ (۲) مضاف یا مضاف الیہ ہو کر اس صورت میں یہ اول (یعنی پہلا) کے معنی میں ہوگا جیسے فرمایا:۔ اَمَّا اَحَدُکُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا (۱۲-۴۱) یعنی تم میں سے جو پہلا ہے وہ تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا۔

یَوْمُ الْاَحَدِ ہفتے کا پہلا دن یعنی اتوار (۳) مطلقًا بطور وصف استعمال ہو تو اس صورت میں یہ باری تعالٰی وصف ہی ہوگا اور اس کے معنی ہوں گے یکتا، یگانہ بے نظیر، بے مثل) جیسے فرمایا:۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲-۱) کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ ہے۔ ایک ہے۔

اَحَدٌ اصل میں وَحَدٌ ہے لیکن وَحَدٌ کا لفظ غیر باری تعالٰی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نابغہ نے کہا ہے[1] ع (بسیط)

(۱۰) كَاَنَّ رَحْلِیْ وَقَدْ زَالَ النَّهَارُ بِنَا
بِذِی الْجَلِیْلِ عَلٰی مُسْتَاْنِسٍ وَحَدٍ

(دن ڈھلے وادی ذوالجلیل میں میری اونٹنی کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جیسے میرا پالان بجائے اونٹنی کے اس گورخر پر کسا ہوا ہو جو تنہا ہو اور انسان کی آہٹ پا کر ڈر کے مارے تیز بھاگ رہا ہو۔

(ا خ ذ)

اَلْاَخْذُ کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کر لینا، جمع کر لینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ (۱۲-۷۹) خدا پناہ میں رکھے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا ہم کسی اور کو پکڑ لیں اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں جیسے فرمایا:۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲-۲۵۵) نہ اس پر اونگھ غالب آسکتی اور نہ ہی نیند۔

محاورہ ہے۔ اَخَذَتْهُ الْحُمّٰى اسے بخار چڑھ گیا۔ قرآن میں ہے:۔ وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ (۱۱-۶۷) اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو چنگھاڑ (کی صورت میں عذاب) نے آپکڑا۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۷۹-۲۵) تو خدا نے اس کو دنیا اور آخرت (دونوں) کے عذاب میں پکڑ لیا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى (۱۱-۱۰۲) اور تمہارا پروردگار (جب نافرمان) بستیوں کو پکڑا کرتا ہے تو اس کی پکڑا سی طرح ہوتی ہے۔ اور قیدی کو مَاْخُوْذٌ اور اَخِیْذٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَلْاِتِّخَاذُ (افتعال) ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو کر جَعَلَ کے جاری مجری ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ (۵-۵۱) یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ (۳۹-۳) جن لوگوں

---

[1] قالہ النابغة یصف سرعة سیرہ والبیت فی دیوانہ وشرح العشر للتبریزی واللسان (انس-زول-وحد) وشواہد الکشاف (۴۲) وامالی الشجریہ ۲: ۲۷۱ والمعانی الکبیر للقتبی ۳۲ والخزانة البغدادیہ (۱: ۵۲۱) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۵۷) والحاضرات للمؤلف (۴: ۶۶۳) والشطر الثانی فی البلدان (اسم جلیل) وفی روایة اللسان والثمین یوم الجلیل بدل بذی الجلیل ومستوحش بدل مستانس ؛

نے اس کے سوا اور دوست بنائے۔ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا (۲۳-۱۱۰) تو تم نے انہیں تمسخر بنا لیا۔ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ (۵-۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنالو۔

اور آیت کریمہ: وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ (۱۶-۶۱) میں صیغہ مفاعلہ لاکر معنی مجازات اور مقابلہ پر تنبیہ کی ہے کہ جو انعامات خدا کی طرف سے انہیں ملے ان کے مقابلہ میں انہوں نے شکر گذاری سے کام نہیں لیا۔ فُلَانٌ مَأْخُوذٌ وَبِهِ أَخْذَةٌ مِنَ الْجِنِّ فلاں جن کے اثرات میں گرفتار ہے۔ فُلَانٌ يَأْخُذُ مَأْخَذَ فُلَانٍ یعنی فلاں اس جیسا کام کرتا ہے یا اس کے مسلک پر چلتا ہے اور اسی سے محاورہ ہے: ذَهَبُوا وَمَنْ أَخَذَ أَخْذَهُمْ وَإِخْذَهُمْ وہ اور ان کے ہم مشرب سب چلے گئے۔

رَجُلٌ أُخِذَ اَوْ بِهِ أُخُذٌ کنایۃ شخص جو آشوب چشم میں مبتلا ہو۔ اَلْإِخَاذَةُ وَالْإِخَاذُ وہ زمین جسے کوئی شخص اپنے لئے خاص کرلے۔

(ا خ ر)

اٰخِرُ۔ اوّلٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور اٰخَرُ (دوسرا) وَاحِدٌ کے مقابلہ میں آتا ہے اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے نشأۃ ثانیہ مراد لی جاتی ہے جس طرح کہ اَلدَّارُ الدُّنْيَا سے نشأۃ اولی چنانچہ فرمایا وَإِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹-۶۴) ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے لیکن کبھی اَلدَّارُ کا لفظ حذف کر کے صرف اَلْاٰخِرَةُ کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے فرمایا:

أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا النَّارُ (۱۱-۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور دَارٌ کا لفظ کبھی اٰخِرَةٌ کا موصوف ہوتا ہے اور کبھی اس کی طرف مضاف ہو کر آتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ اور یقیناً آخرت کا گھر بہتر ہے۔ ان کے لئے جو خدا سے ڈرتے ہیں (۶-۳۲)

وَلَأَجْرُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۱۶-۴۱) اور آخرت کا اجر بہت بڑا ہے۔ اگر وہ اسے جانتے ہوتے۔ یہ اصل میں وَلَأَجْرُ دَارِ الْحَيَاةِ الْاٰخِرَةِ ہے (اور دار کا لفظ الْحَيَاةِ الْاٰخِرَةِ کی طرف مضاف ہے)

اور أُخَرُ (جمع الاخریٰ) کا لفظ الْاٰخَرُ (معرف باللام) سے معدول ہے اور کلام عرب میں اس کی دوسری نظیر نہیں ہے کیونکہ أَفْعَلُ مِنْ كَذَا (یعنی صیغہ تفضیل) کے ساتھ اگر لفظ مِنْ لفظاً یا تقدیراً مذکور ہو تو نہ اس کا تثنیہ ہوتا اور نہ جمع اور نہ ہی تانیث آتی ہے اور اگر مِنْ مذکور نہ ہو تو معرف باللام ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع دونوں آسکتے ہیں[1]۔ لیکن لفظ آخَرُ میں اس کے نظائر کے برعکس الف لام کے بغیر اس کے استعمال کو جائز سمجھا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ الْاٰخَرُ سے معدول ہے۔

اَلتَّاخِيرُ یہ تقدیم کی ضد ہے (یعنی پیچھے کرنا چھوڑنا۔ چنانچہ فرمایا:۔ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ (۷۵-۱۳) جو عمل اس نے آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے۔

مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (۴۸-۲)

---

[1] وفی القرآن: وآخرون اعترفوا بذنوبهم (۹-۱۰۲) وآخر شکله (۳۸-۵۸) بین فی الاخرین (۲۶-۸۴) الاستحسان سواستفعال) راجع الایات ۲:۱۸۵-۱۸۵ اذ-۱

تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ

إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ (۱۴-۴۲) وہ ان کو اس دن تک مہلت دے رہا ہے جب کہ دہشت کے سبب، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ (۱۴-۴۴) اے ہمارے پروردگار ہمیں تھوڑی سی مہلت عطا کر۔

محاورہ ہے:۔ بِعْتُهُ بِأَخِرَةٍ میں نے اسے تاخیر اجل کے بیچ ڈالا یہ لفظ ومعنی نَظِرَةٍ کی طرح ہے اور أَبْعَدَ اللهُ الْأَخِرَ میں الْأَخِرَ کے معنی مُتَأَخِّرٌ عَنِ الْفَضِيلَةِ اور عن تحری الحق کے ہیں یعنی اللہ فضیلت اور حق کی تحری میں کوتاہی کرنے والے کو ہلاک کرے یا اپنی رحمت کو دور رکھے۔

(ا خ و)

أَخٌ (بھائی) اصل میں أَخَوٌ ہے اور ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کا ولادت میں ماں باپ دونوں یا ان میں سے ایک کی طرف سے یا رضاعت میں شریک ہو وہ اس کا أَخٌ کہلاتا ہے لیکن بطور استعارہ اس کا استعمال عام ہے اور ہر اس شخص کو جو قبیلہ دین ومذہب صنعت وحرفت دوستی یا کسی دیگر معاملہ میں دوسرے کا شریک ہو اسے أَخٌ کہا جاتا ہے[1] چنانچہ آیت کریمہ:۔

لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ (۳-۱۵۶) ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کفر کرتے ہیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں۔ میں إِخْوَانٌ سے ان کے ہم مشرب لوگ مراد ہیں اور فرمایا۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹-۱۰) مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا (۴۹-۱۲) کیا تم میں سے کوئی ایسی بات کو پسند کریگا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔

اور آیت کریمہ:۔

فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ (۴-۱۱) اگر میت کے بھائی بھی ہوں۔ میں إِخْوَةٌ کا لفظ بہن بھائی دونوں کو شامل ہے اور آیت کریمہ:۔ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ (۱۵-۴۷) (گویا) بھائی بھائی مسہریوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں متنبہ کیا ہے کہ اہل جنت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا۔

الْأُخْتُ (بہن) یہ أَخٌ کا مؤنث ہے اور اس میں تاء بمنزلہ عوض عن المحذوف کے ہے اور آیت کریمہ: يَا أُخْتَ هَارُونَ (۱۹-۲۸) اے ہارون کی بہن۔ میں بہن بلحاظ نسب مراد نہیں ہے بلکہ صلاح وتقویٰ کے اعتبار سے مریم علیہا السلام کو اخت ہارون کہا گیا ہے جس طرح کہ يَا أَخَا تَمِيمٍ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:۔

أَخَا عَادٍ (۴۶-۲۱) میں ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ان پر بھائیوں کی طرح شفقت فرماتے تھے اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا (۱۱-۶۱) اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ (۱۱-۵۰) اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی (ہود) کو بھیجا۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا (۱۱-۸۴) اور

---

[1] اس کی جمع اخوۃ اور اخوان آتی ہے ۱۲

مدین کی طرف ان کے بھائی (شعیب) کو بھیجا۔
اور آیت کریمہ :۔
وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا (۴۳-۴۸) اور جو نشانی ہم ان کو دکھاتے تھے وہ اس کی بہن سے بڑی ہوتی تھی۔ میں أُخْتِهَا پہلی نشانی سے ہے اور اس کو اخت اس لئے کہا ہے کہ صحت و صداقت اور اظہار حق میں دونوں ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ: كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا (۷-۳۸) جب ایک جماعت وہاں داخل ہو گی تو اپنی بہن پر لعنت کرے گی۔ میں أُخْتَهَا سے ان کے دیگر ہم مشرب لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ (۲-۲۵۷) ان کے دوست طاغوت ہیں۔ اور اسی قسم کی دیگر آیات میں پایا جاتا ہے۔

تَأَخَّيْتُ کسی کے ساتھ برادرانہ سلوک کرنا اور چونکہ دو بھائی مل کر رہتے ہیں اس جہت سے اس مادہ میں لزوم اور وابستگی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے اس کھونٹے کو آخِيَّةُ الدَّابَّةِ کہہ دیتے ہیں جس سے جانور بندھا رہتا ہے

(ا د د)

قرآن میں ہے :۔
لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا (۱۹-۸۹) یہ تو تم نا زیبا اور ناپسندیدہ بات زبان پر لائے ہو۔
إِدًّا کے معنی ہیں نہیت ہی ناپسندیدہ بات جس سے ہنگامہ بپا ہو جائے گا یہ أَدَّتِ النَّاقَةُ تَئِدُّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں اونٹنی (اپنے بچے کی جدائی میں) سخت رونی

اور گر یہ کیا۔
اَلْإِدِيدُ شور ہنگامہ اور أُدٌّ (نام پدر قبیلہ) یا تو وُدٌّ سے مشتق ہے یا پھر أَدَّتِ النَّاقَةُ سے۔

(ا د م)

آدَمُ۔ ابو البشر آدم علیہ السلام بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ أَدِيمُ الْأَرْضِ سے مشتق ہے اور ان کا نام آدم اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان کے جسم کو بھی ادیم ارض یعنی روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ أُدْمَةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگ کے ہیں۔ چونکہ آدم علیہ السلام بھی گندمی رنگ کے تھے اس لئے انہیں اس نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ رَجُلٌ آدَمُ کے معنی گندمی رنگ مرد کے ہیں۔ اور بعض آدم کی وجہ تسمیہ بیان ہے کہ وہ مختلف عناصر اور متفرق قوی کے امتزاج سے پیدا کئے گئے تھے۔ جیسا کہ آیت أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ (۷۶-۲) مخلوط عناصر سے ..... کہ اسے آزماتے ہیں۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے جَعَلْتُ فُلَانًا أُدْمَةَ أَهْلِي میں نے فلاں کو اپنے اہل و عیال میں ملا لیا مخلوط کر لیا۔

بعض نے کہا ہے کہ آدم إِدَامٌ سے مشتق ہے اور إِدَامٌ (سالن وغیرہ) ہر چیز کو کہتے ہیں جس سے طعام کو لذیذ اور خوشگوار محسوس ہو اور آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی روح ڈال کر اسے پاکیزہ بنا دیا تھا جیسے کہ آیت وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (۳۸-۷۲) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں۔ میں مذکور ہے اور پھر اسے عقل و فہم اور

ذکر عطا کرکے دوسری مخلوق پر فضیلت بھی دی ہے جیسے فرمایا:۔ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱۷-۷۰) اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

اس بنا پر ان کا نام آدم رکھا گیا ہے اور حدیث میں ہے[۸] لَوْ نَظَرْتَ اِلَيْهَا فَاِنَّهٗ اَحْرٰى اَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا اگر تو اسے (اپنی منگیتر کو) ایک نظر دیکھ لے تو اس سے تمہارے درمیان الفت اور خوشگواری پیدا ہو جانے کا زیادہ امکان ہے۔

(ا د ی (و))

اَلْاَدَاءُ کے معنی ہیں یکبارگی اور پورا پورا حق دے دینا۔ چنانچہ خراج اور جزیہ کے دے دینے اور امانت کے واپس کر دینے کو اداء کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ (۲-۲۸۳) تو امانت دار کو چاہیئے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کرے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (۴-۵۸) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے حوالہ کر دیا کرو۔

وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ (۲-۱۷۸) اور پسندیدہ طریق سے خون بہا اسے پورا پورا ادا کرنا۔ اصل میں یہ اَدَاةٌ سے ہے محاورہ ہے اَدَوْتَ تَفْعَلُ كَذَا کسی کام کے لئے حیلہ اور تدبیر کرنا اصل میں اس کے معنی اَدَاةٌ (کسی چیز) کو پکڑنے کے ہیں جس کے ذریعہ دوسری چیز تک پہنچا جا سکے۔

(ا ذ ا)

اِذَا۔ (ظرف زمان) زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے[۹] کبھی جب اس میں شرطیت کا مفہوم پایا جاتا ہے تو فعل مضارع کو جزم دیتا ہے[۱۰] اور یہ عام طور پر نظم میں آتا ہے اور اِذْ (ظرف) ماضی کیلئے آتا ہے اور جب ما کے ساتھ مرکب ہو (اذما) تو معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[۱۱]

(۱۱) اِذْ مَا اَتَيْتَ عَلَى الرَّسُوْلِ فَقُلْ لَهٗ

جب تو رسول اللہ کے پاس جائے تو ان سے کہنا۔

(ا ذ ن)

اَلْاُذُنُ کے معنی کان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر ہنڈیا کی کوروں کو اُذُنُ الْقِدْرِ کہا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر اس شخص پر اُذُنٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لیتا ہو۔ چنانچہ فرمایا:۔

---

[۸] لفظ حدیث من روایۃ ابی عبید فی غریبہ والذی فی الترمذی والنسائی وابن ماجۃ وابن خزیمۃ وابن حبان والحاکم واحمد والبزار وغیرہم فی حدیث المغیرۃ انہ خطب امرأۃ فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم انظر الیہا الخ وراجع تخریج الکشاف للحافظ ص ۱۳۱ رقم ۸۹) والفائق ۱/۱۱ والمنتقی بشرحہ النیل (۶: ۱۰۶-۱۰۷) والاحیاء بتخریج العراقی ۲/ ۳۹ واللسان (ادم) قال الزمخشری فی الحدیث اولمعنی لیت فان الغرض منہ الحث علی النظر ومنہ قولہم لو تاتینی فتحدثنی ۱۲ [۹] وایضا الاطلاق کما فی التنزیل اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ (۴۴-۱۸) ۱۲ [۱۰] وان دخل علی الماضی نحو اذا جاء نصر اللہ (۱۱۰-۱) [۱۱] وتارۃ تدل علی معنی المفاجاۃ نحو فاذا ہی حیۃ تسعٰی (۲۰-۲۱) [۱۲] قالہ العباس بن مرداس یمدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتمامہ . . . حقا علیک اذا اطمان المجلس والبیت فی السیرۃ ۴ : ۹۶) والکامل ۹۴ / ۲ والکتاب لسیبویہ (۱: ۴۳۲) قال الشنتمری والبیت مضمن وتمامہ فیما بعدہ والبیت ایضا فی الصحاح (اذ) وفی روایۃ الامیر بدل الرسول وہو محرف وفی اللسان "الامین"

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ۔ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ (۹-۶۱) اور کہتے ہیں یہ شخص نرا کان ہے ان سے کہدو کہ وہ کان ہے تو تمہاری بھلائی کے لئے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (۶-۲۵) اور انکے کانوں میں گرانی پیدا کردی ہے۔ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بہرے ہوگئے ہیں بلکہ اس سے اِن کی جہالت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اور اَذِنَ (الیہ) کے معنی توجہ سے سننا کے ہیں جیسے فرمایا:۔ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (۸۴-۲-۵) اور وہ اپنے پروردگار کا فرمان سنے گی اور اُسے واجب بھی ہے اور اِذْنٌ کا لفظ اِس علم پر بھی بولا جاتا ہے جو سماع سے حاصل ہو۔ جیسے فرمایا:۔ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۲-۲۷۹) تو خبردار ہو جاؤ کہ خدا اور رسول سے تمہاری جنگ ہے۔ اور اِذْنٌ وَاَذَانٌ ہر سُنی ہوئی بات کو کہتے ہیں اور اِن سے علم مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا اکثر علم مسموعات پر مبنی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ (۹-۴۹) مجھے اجازت دے دیجئے اور آفت میں نہ ڈالئے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ (۷-۱۶۷) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا۔ اٰذَنْتُهٗ بِكَذَا وَاَذَّنْتُهٗ کے ایک معنی ہیں یعنی اطلاع دینا اور اعلان کرنا اور اعلان کرنے والے کو مُؤَذِّنٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ (۱۲-۷۰) تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ اے قافلے والو۔

فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ (۷-۴۴) تو اس وقت) ان میں ایک پکارنے والا پکار دیگا۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (۲۲-۲۷) اور لوگوں میں حج کے لئے اعلان کر دو۔

اَلْاَذِيْنُ۔ وہ خاص جگہ جہاں اذان کی آواز پہنچتی ہو۔ اَلْاِذْنُ فِي الشَّيْءِ کے معنی ہیں یہ بتا دینا کہ کسی چیز میں اجازت اور رخصت ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴-۶۴) اور ہم نے پیغمبر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ میں اِذْن بمعنی ارادہ اور حکم ہے (اسی طرح فرمایا:۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (۳-۱۶۶) اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلے کے دن واقع ہوئی سو خدا کے حکم سے واقع ہوئی۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲-۱۰۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۵۸-۱۰) مگر خدا کے حکم کے سوا انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی علم الٰہی کے ہیں مگر اِذْن اور علم میں فرق ہے کیونکہ اِذْنٌ کا لفظ خاص ہے اور اس کا استعمال اِس موقع پر ہوتا ہے جہاں علم کے ساتھ مشیت بھی شامل ہو عام اس کہ وہ فعل پسندیدہ ہو یا پسندیدہ نہ ہو۔ لیکن علم میں مشیت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۰ - ۱۰۰) (حالانکہ کسی شخص کو قدرت نہیں ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایمان لائے)
پس ظاہر ہے کہ اللہ کی مشیت اور اس کا امر دونوں پائے جاتے ہیں[1]۔ اور آیت کریمہ :۔
وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲ - ۱۰۲) (اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں مشیت من وجہ پائی جاتی ہے کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طبعی طور پر ایسا بنایا ہے کہ دوسرے کی ضرب سے متأثر ہو اور اسے اس سے گزند پہنچے۔ وہ پتھر کی طرح نہیں ہے کہ کسی قسم کی ضرب سے اسے تکلیف نہ ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان میں اس قسم کی قوت کا پایا جانا اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہے اس اعتبار سے جب کسی شخص کو ظالم کے ظلم سے تکلیف پہنچتی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اللہ کے اذن اور مشیت سے ہی پہنچی ہے۔ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے دوسری کتاب درکار ہے۔
اَلْاِسْتِئْذَانُ کے معنی اجازت طلب کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۹ - ۴۵) اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں جو خدا پر اور پچھلے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔
فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ (۲۴ - ۶۲) سو جب یہ لوگ تم سے کسی کام کے لئے اجازت مانگا کریں۔
اِذَنْ۔ یہ جواب اور جزا کے لئے آتا ہے یعنی لفظاً یا تقدیراً جواب کو چاہتا ہے اور اس کے بعد کا کلام جزا کے معنی کو متضمن ہوتا ہے۔ جب یہ شروع کلام میں آئے اور اس کے بعد فعل مضارع ہو تو حتماً اس کو نصب دیگا۔ جیسے اِذَنْ اَخْرُجَ لیکن جب اثنائے کلام میں آئے اور پھر اس کے بعد فعل مضارع ہو تو فعل مضارع پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں جیسے اَنَا اِذَنْ اَخْرُجُ وَاَخْرُجَ مگر جب فعل کے بعد آئے یا اس کے بعد فعل مضارع ہی نہ ہو تو عمل نہیں کرتا[2] جیسے اَنَا اَخْرُجُ اِذَنْ) قرآن میں ہے : اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (۴ - ۱۴۰) ورنہ تم بھی انہیں جیسے ہو جاؤ گے۔

(ا ذ ی)

اَلْاَذٰى۔ ہر اس ضرر کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو پہنچتا ہے[3] وہ ضرر جسمانی ہو یا نفسانی یا اس کے متعلقات سے ہو اور پھر وہ ضرر دنیوی ہو یا اخروی چنانچہ قرآن میں ہے :۔ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (۲ - ۲۶۴) اپنے صدقات (وخیرات) کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر برباد نہ کرو۔
اور آیت کریمہ۔ فَاٰذُوْهُمَا (۴ - ۱۶) میں مار پٹائی (سزا) کی طرف اشارہ ہے اسی طرح سورۃ توبہ میں فرمایا :۔ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ (۹ - ۶۱) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو خدا کے پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے۔
وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ

---

[1] ایضاً راجع الآیۃ ویمسک السماء اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲۲ - ۶۵) و (۲ - ۲۱۳) [2] راجع للتفصیل الرضی علی الکافیۃ ۲/ ۲۳۵ - ۲۳۶ [3] وفی حدیث شعب الایمان ادناہا اماطۃ الاذی من الطریق وفی العقیقۃ: امیطوا عنہ الاذی ۱۲ ❖ ❖ ❖

اَلِیْمٌ (۹-۶۱) اور جو لوگ رسول خدا کو رنج پہنچاتے ہیں ان کے لئے عذاب الیم (تیار) ہے۔
لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى۔ (۳۳-۶۹) تم اِن لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے موسیٰؑ کو تکلیف دی (عیب لگا کر) رنج پہنچایا۔
وَ اُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰاهُمْ نَصْرُنَا (۶-۳۴) اور ایذا (پر) صبر کرتے رہے) یہاں تک کہ اِن کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی۔
لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ (۶۱-۵) تم مجھے کیوں ایذا دیتے ہو۔ اور آیت کریمہ:۔ وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى (۲-۲۲۲) میں حیض (کے دنوں میں عورت سے جماع کرنے) کو اَذًى کہنا یا تو از روئے شریعت ہے یا پھر بلحاظ علم طب کے جیسا کہ اس فن کے ماہرین بیان کرتے ہیں۔
اٰذَيْتُهٗ (افعال) اِيْذَاءً وَ اَذِيَّةً وَ اَذًى کسی کو تکلیف دینا۔
اَلْاَذِیُّ۔ موج بحر جو بحری مسافروں کیلئے تکلیف دہ ہو۔

(ا ر ب)

اَلْاَرَبُ کے معنی سخت احتیاج کے ہیں جسے دور کرنے کے لئے حیلہ اور تدبیر کرنی پڑے پس اَرَبٌ خاص اور حَاجَةٌ عام ہے پھر کبھی اَرَبٌ کا لفظ صرف حاجت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی محض حیلہ اور تدبیر کرنے کے لئے آتا ہے گو حاجت نہ ہو مثلاً محاورہ ہے۔ فُلَانٌ ذُوْ اَرَبٍ وَ اَرِيْبٌ فلاں صاحب حیلہ اور چالاک ہے۔
اَرِبَ اِلٰى كَذَا، اَرَبًا وَ اُرْبَةً وَ اِرْبَةً وَ مَاْرَبَةً کے معنی ہیں وہ کسی چیز کا سخت محتاج ہوا۔ (مَاْرَبَةٌ) سخت حاجت ج مآرِب (قرآن میں) ہے۔ وَ لِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۲۰-۱۸) اور اس میں میرے لئے اور بھی کئی فائدے ہیں۔
وَ لَا اَرَبَ لِیْ فِیْ كَذَا۔ مجھے اس کی کوئی شدید ضرورت نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ: غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ (۲۴-۳۱) نیز وہ خدمت گزار مرد جو عورتوں کی خواہش نہ رکھیں۔ میں اِرْبَة سے بطور کنایہ حاجت نکاح مراد ہے۔
اَلْاُرْبٰى بڑی مصیبت جس کے دور کرنے کیلئے تدبیر اور حیلہ کرنا پڑے۔
اَلْآرَابُ (واحد اِرْبٌ) وہ اعضاء جن کی انسان کو سخت ضرورت رہتی ہے کیونکہ اعضاء دو قسم کے ہیں ایک وہ جنکے ذریعہ ہر جاندار چیز اپنی ضروریات پورا کرتی ہے جیسے ہاتھ، پاؤں اور آنکھ اور دوسرے وہ جو محض زینت کے لئے بنائے گئے ہیں جیسے بھویں، داڑھی وغیرہ پھر وہ اعضاء جو حوائج کو پورا کرنے کیلئے بنائے گئے ہیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جن کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی اور دوسرے وہ ہیں جن کی سخت احتیاج رہتی ہے اور ان کے بغیر جسم انسانی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اس دوسری قسم کے اعضاء کو آراب کہا جاتا ہے حدیث میں ہے[1] (۹) اِذَا سَجَدَ الْعَبْدُ سَجَدَ مَعَهٗ سَبْعَةُ اٰرَابٍ کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ سات اعضاء سجدہ کرتے ہیں چہرہ، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے اور دو پاؤں

[1] رواہ الاربعۃ من حدیث ابن عباس وفی الصحیحین عنہ امرت ان اسجد علی سبعۃ اعظم وفی لفظ اعضاء ونی ابی داؤد وایضاً امر نبیکم راجع تخریج الکشاف للحافظ ابن حجر ۸۰،۱ رقم ۲۳۲ والفیل ۲:۲۶۷ والعون باب اعضاء السجود ۱۲

اور جب کوئی شخص اپنی ضرورت کے مطابق وافر حصہ لے تو کہا جاتا ہے أَرَّبَ نَصِيْبَهٗ اس نے بڑا حصہ لیا اور وافر۔ اسی سے محاورہ ہے:۔ أَرَّبَ مَالَهٗ اس نے اپنا مال بڑھالیا أَرَّبْتُ الْعُقْدَةَ میں نے مضبوط گرہ لگائی۔

(ا ر ض)

اَلْاَرْضُ (زمین) سَمَاءٌ (آسمان) کے بالمقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع اَرْضُوْنَ ہے جس کا صیغہ قرآن میں نہیں ہے کبھی اَرْض کا لفظ بول کر کسی چیز کا نیچے کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح سماء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔ شاعر نے گھوڑی کے وصف میں کہا ہے[1] (طویل)

۱۲ - وَاَحْمَرَ كَالدِّيْبَاجِ أَمَّا سَمَاؤُهَا
فَرَيَّا وَأَمَّا أَرْضُهَا فَمَحُوْلُ

وہ دیبا کی طرح سرخ ہے اس کا اوپر کا حصہ موٹا گداز ہے لیکن اس کا زیریں حصہ (یعنی ٹانگیں وغیرہ) خشک اور سخت ہے اور آیت کریمہ:۔

اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے (۵۷-۱۷)

میں فساد کے بعد تکوین اور بدء کے بعد عود کی طرف اشارہ ہے وہ نظام جو عالم میں جاری وساری ہے اسی بنا پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے دلوں کو ان کے سخت ہونے کے بعد نرم کرنا مراد ہے۔ محاورہ ہے:۔ اَرْضٌ اَرِيْضَةٌ زرخیز زمین تَاَرَّضَ النَّبْتُ نباتات زمین پر جم گئی اور زیادہ ہوگئی تَاَرَّضَ الْجَدْيُ بکری کے بچہ نے گھاس کھائی اور اَرَضَةٌ کے معنی دیمک کے ہیں اور اُرِضَتِ الْخَشَبَةُ کے معنی ہیں لکڑی دیمک خوردہ ہوگئی اور دیمک خوردہ لکڑی کو مَارُوْضَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ا ر ك)

اَلْاَرِيْكَةُ (مسہری، حجلہ (چھپر کھٹ) جو مسہری یعنی تخت کے اوپر رکھا ہو اس کی جمع اَرَائِكُ ہے اور اسے اَرِيْكَة کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ارض یعنی دنیا میں اراك (پیلو کی لکڑی) سے بنایا جاتا ہے جو ایک قسم کا درخت ہے اور یا محل اقامت ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ اَرَكَ بِالْمَكَانِ اُرُوْكًا سے مشتق ہے جس کے اصل معنی کسی جگہ پر اراک (یعنی پیلو) کے پتے چرنے کے لئے ٹھہرنا کے ہیں پھر مطلق ٹھہرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ (اس لئے جنت کے چھپر کھٹوں کو جو اہل جنت کی اقامت گاہ ہوں گے۔ اَرَائِكُ (۱۸-۲۱) کہا گیا ہے)

(ا ر م)

اَلْاِرَمُ۔ دراصل اس نشان کو کہتے ہیں

---

[1] البیت لطفیل الغنوی وفی اللسان (ارض) ارضہ وسماءہ بالتذکیر ایضا راجع الاقتضاب ۴۳۵ وتہذیب الاصلاح (۱: ۴۰) والعقد (۱: ۱۸۵) ومعانی العسکری ۲: ۱۰۶) والسمط (۲: ۸۸۱) والقالی ۲: ۴۸۰ والمعانی للقتبی (۱: ۱۵۵) قال وسمار الفرس ماکان من عجب الذنب الی العذر وارضہ قوائمہ وارض الفرس فی غیر ہذا المواضع حوافرہ والبیت فی دیوانہ ۶۲ (ملحقات) وقانون البلاغہ حمس وسائل البلاغة (صنعتہ گردعلی) وامالی المرتضی (۲: ۱۶۹) وفیہ کالدنیار بدل کالدیباج وھو احسن

جو پتھروں سے بنا دیا جاتا ہے اس کی جمع اُرُمٌ ہے اور پتھروں کو اُرَّمٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے غضب ناک آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ یَحْرِقُ الْاُرَّمَ یعنی فلاں مارے غصّے کے دانت پیستا ہے اور آیت کریمہ :۔

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۸۹-۶) ارم ستونوں والے۔ میں ارم سے بلند اور مزیّن ستون مراد ہیں (جو قوم عاد نے بنائے تھے) مَا بِهَا اَرِمٌ وَ اَرِيْمٌ یعنی اس میں کوئی نہیں اصل میں اس کے معنی اَللَّازِمُ لِلْاُرَّمِ کے ہیں اور اس کا استعمال ہمیشہ (حرف) نفی کے ساتھ ہوتا ہے جس طرح کہ مَا بِهَا دِيَارٌ کا محاورہ ہے اور اس کے اصل معنی مقیم فی الدار کے ہیں۔

(ا ز ز)

آیت کریمہ :۔ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا (۱۹-۸۳) کے معنی ہیں کہ وہ ان کو برانگیختہ کرتے رہتے ہیں یہ اَزَّتِ الْقِدْرُ سے ہے جس کے معنی ہیں :۔ ہانڈی میں جوش اور ابال آگیا (اسی مناسبت سے ورغلانا یا ابھارنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) ایک روایت میں ہے :۔

(۷) اَنَّهٗ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ كَانَ يُصَلِّيْ وَلِجَوْفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ کہ آنحضرتؐ نماز پڑھتے تو آپ کے اندروں سے ہانڈی کے کھد کھدانے کی (طرح رونے کی) آواز آتی۔ اَزَّهٗ اس کو بھڑکایا اور جھنجھوڑا یہ هَزَّهٗ سے ابلغ ہے۔

(ا ز ر)

اصل میں ازر اور اِزَار کے معنی لباس (یعنی تہبند) کے ہیں اِزَارٌ اِزَارَةٌ وَمِئْزَرَةٌ تینوں ہم معنی ہیں کنایہ کے طور پر اِزَارٌ سے عورت مراد لی جاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[۱] ؏

(۱۳) اَلَا اَبْلِغْ اَبَا حَفْصٍ رَسُوْلًا
فِدًى لَكَ مِنْ اَخِيْ ثِقَةٍ اِزَارِيْ

ابوحفص (حضرت عمرؓ) کو میرا پیغام پہنچا دو تجھ جیسے قابل اعتماد بھائی پر میری بیوی قربان ہو۔

اور عورت کو اِزَار اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مرد کے لئے بمنزلہ لباس کے ہے جیسے فرمایا :۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲-۱۸۷) وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اَلْاَزْرُ کے معنی قوت شدیدہ کے ہیں قرآن میں ہے۔ اُشْدُدْ بِهٖ اَزْرِيْ (۲۰-۳۱) اس سے میری قوت کو مضبوط فرما یعنی مجھے اس سے تقویت حاصل ہوگی۔ اٰزَرَهٗ۔ اعانت کرنا اور تقویت بخشنا۔ اصل میں یہ شَدَّ الْاِزَارَ سے ہے جس کے معنی ہیں چادر باندھنا قرآن میں ہے :۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ (۴۸-۲۹) وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے) زمین سے اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا۔ محاورہ ہے :۔ اٰزَرْتُهٗ فَتَاَزَّرَ میں نے اسے تہبند پہنائی تو اس نے پہن لی۔ هُوَ حَسَنُ الْاِزْرَةِ وہ خوش وضع ہے۔ اٰزَرْتُ الْبِنَاءَ وَاَزَّرْتُهٗ میں نے عمارت کی بنیاد کو مضبوط

---

[۱] قاله ابو المنہال بقیلة الاکبر الاشجعی فی قصیدة له الی عمرؓ عرض فیها بجعدة بن عبدالله السلمی والی الکوفة والبیت والقصة فی اللسان (ازر) فی ستة ابیات والمؤتلف للامدی ۸۲ فی خمسة ابیات والابواب مختارة ۱۰ والعقد الفرید (۲: ۴۶۳) والفائق (۱: ۱۷) والعمدة (۱: ۲۶۲) فی اربعة والشکل للقتبی ۱۰۸، ۲۰۵ فی خمسة ابیات ومجازات القرآن للشریف الرضی ۳۵۳ والاصابة ۲۱، ۷۲۸۸ رقم وکنز العمال بروایة ابن سیرین ج ۵ رقم ۴۶۱۸ وفی الصناعتین غیر منسوب ۱۲

کیا تَاَزَّرَ النَّبَاتُ نبات بڑھ گئی اور مضبوط ہو گئی اٰزَرْتُہٗ وَاٰزَرْتُہٗ میں اس کا وزیر بن گیا اصل میں یہ مثال واوی (وزر) سے ہے (جس کے معنی دوسرے کا بوجھ اٹھانا کے ہیں)

فَرَسٌ اٰزَرُ گھوڑا جس کی ٹانگیں محل ازار تک سفید ہوں۔ اور آیت کریمہ :۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ (۶-۷۴) اور (وہ وقت بھی یاد کرنیکے لائق ہے جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ تھا اور آزر اسی کا معرب ہے اور بعض نے کہا ہے کہ (یہ لقب ہے اور ان کی زبان میں آزَرُ کے معنی گمراہ کے ہیں۔

(ا ز ف)

قرآن میں ہے :۔

اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (۵۳-۵۷) یعنی قیامت قریب آپہنچی اَزِفَ وَاَفِدَ دونوں قریب المعنی ہیں قیامت کو اَزِفَ کہنا بلحاظ ضیق وقت کے ہے جیسے کہا جاتا ہے اَزِفَ الشُّخُوْصُ (کوچ کا وقت قریب آپہنچا) اور اَزَفٌ کے معنی ضیق وقت کے ہیں اور قیامت کو اٰزِفَةٌ کہنا اس کے قرب وقت کے اعتبار سے ہے اور اسی بنا پر اس کو سَاعَةٌ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اور نیز آیت کریمہ :۔

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ (۱۶-۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آہی پہنچا۔

میں قیامت کو لفظ ماضی کے ساتھ تعبیر کیا ہے نیز فرمایا۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ (۴۰-۸) اور ان کو قریب آنے والے دن سے ڈراؤ۔

(ا س ر)

اَلْاَسْرُ کے معنی قید میں جکڑ لینے کے ہیں۔ یہ اَسَرْتُ الْقَتَبَ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں میں نے پالان کو مضبوطی سے باندھ دیا اور قیدی کو اَسِیْرٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ رسی وغیرہ سے باندھا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔

يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (۷۶-۸) اور یتیموں اور قیدیوں کو۔ پھر ہر اس شخص کو جو گرفتار اور مقید ہو کر آئے الاسیر کہہ دیا جاتا ہے گو وہ باندھا ہوا نہ ہو اسِیْرٌ کی جمع اِسَارٰی وَاُسَارٰی وَاَسْرٰی ہے[1] اور مجازًا۔ اَنَا اَسِيْرُ نِعْمَتِكَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی تیرے احسان کی رسی میں بندھا ہوا ہوں۔ اور اُسْرَةُ الرَّجُلِ کے معنی افراد خاندان کے ہیں جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ : وَشَدَدْنَا اَسْرَهُمْ (۷۶-۲۸) اور ان کی بندش کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ میں اس حکمت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی ہیئت ترکیبی میں پائی جاتی ہے جس پر کہ آیت وَفِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱-۲۱) میں غور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اَلْاُسْرُ۔ کے معنی ہیں پیشاب بند ہو جانا۔ اور جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو اسے مَاْسُوْرٌ کہا جاتا ہے گویا اس کی پیشاب کی نالی بند کر دی گئی ہے اس کے مقابلہ میں پاخانہ کی بندش پر حُصْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

(ا س س)

اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ۔ (۹-۱۰۹) کے معنی ہیں اس

---

[1] قرآن میں ہے وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى (۲-۸۵)۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى (۸-۶۷)

نے عمارت کی بنیاد رکھی اور بنیاد کو اُسٌّ وَاَسَاسٌ کہا جاتا ہے۔ اُسٌّ کی جمع اِسَاسٌ اور اَسَاسٌ کی جمع اُسُسٌ آتی ہے محاورہ: ہے کَانَ ذَالِکَ عَلٰی اُسِّ الدَّھْرِ (وہ ابد الدھر) (بود آں بر ہمیشگی زمانہ واول آن) یعنی وہ قدیم زمانہ سے ہے جیسا کہ عَلٰی وَجْہِ الدَّھْرِ کا محاورہ مشہور ہے۔

(ا س ف)

اَلْاَسَفُ۔ حزن اور غضب کے مجموعہ کو کہتے ہیں کبھی آسَفَ کا لفظ حزن اور غضب میں سے ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے اصل میں اس کے معنی جذبہ انتقام سے دم قلب کے جوش مارنا کے ہیں۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمزور آدمی پر پیش آئے تو پھیل کر غضب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اگر اپنے سے قوی آدمی پر ہو تو منقبض ہو کر حزن بن جاتی ہے اس لئے جب حضرت ابن عباسؓ سے حزن اور غضب کی حقیقت دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا: لفظ دو ہیں مگر ان کی اصل ایک ہی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سے کمزور کے ساتھ جھگڑتا ہے تو غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے اور جب اپنے سے قوی کے ساتھ جھگڑتا ہے تو واویلا اور غم کا اظہار کرتا ہے اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[1] ؎ البسیط

(۴۳) فَحُزْنُ کُلِّ اَخِیْ حُزْنٍ اَخُو الْغَضَبِ کہ ہر غمزدہ کا حزن غضب کا ساتھی ہے۔ اور آیت کریمہ: فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۴۳-۵۵) کے معنی یہ ہیں کہ جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ یہاں ابو عبداللہ الرضا کا قول ہے کہ اللہ میاں ہماری طرح خفا نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے خفا ہونے سے اس کے اولیاء کا خفا ہونا مراد ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کے معنی اسکے اولیاء کے راضی ہونے کے ہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے[2] (۱۰) مَنْ اَھَانَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَةِ یعنی جس نے میرے دوست کی اہانت کی اس نے میرے ساتھ جنگ کی۔ اور قرآن میں ہے۔ وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴-۸۰) جو شخص رسول کی فرمانبرداری کریگا تو بیشک اسنے خدا کی فرمانبرداری کی۔ اور آیت کریمہ: غَضْبَانَ اَسِفًا (۷-۱۵۰) میں اَسِفٌ کے معنی بھی غضب ناک ہی کے ہیں اور استعارہ کے طور پر ماتحت غلام کو نیز جس کا دلوجہ کراہت کے) نام لینا پسند نہ ہو اسے اَسِیْفٌ (بیچارہ) کہہ دیا جاتا ہے[3]۔

(ا س ن)

اَسَنَ (ن) اَلْمَآءُ پانی کا سخت بدبودار ہو

---

[1] وصدرہ جزاک ربک بالاحزان مغفرۃ ...... قالہ المتنبی فی رثا راخت سیف الدولۃ فی (۴۴) بیتاً مطلعہا یا اخت خیر اخ یا بنت خیر آب کنایۃ بہما عن اشرف النسب راجع دیوانہ ۲۹۳ طبعۃ ہندیۃ مصر ۱۳۲۲ھ وبشرح العکبری (۱: ۹۴) والشطر الیضاً فی محاضرات المؤلف (۴: ۵۰۶ و ۱: ۲۲۳) [2] اصلہ فی الصحیحین ورواہ ابن ابی الدنیا فی کتاب الاولیاء والحکیم الترمذی فی جامعہ وابن مرویۃ حل فی الاسماء وابن عساکر عنہا انس انظر للحدیث باختلاف الفاظہ کنز العمال (ج ۱ رقم ۱۱۵۶ و ۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۲) ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ [3] ایضاً اسعی وفی القرآن یا اسفیٰ علیٰ یوسف (۱۲-۸۴) ایضاً رجل اسیف ای سریع الحزن والبکاء کما فی حدیث عائشۃ: ان ابابکر رجل اسیف راجع الفائق ۱/۱۹ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ہوجانا مَآءٌ اٰسِنٌ متغیر اور بدبودار پانی چنانچہ فرمایا: مِنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ (۴۷-۱۵) اس پانی کی نہریں ہیں) جو کبھی بدبودار نہیں ہوگا۔

اَسِنَ الرَّجُلُ پانی کی بدبو سے بیمار اور بیہوش ہونا شاعر نے کہا ہے [۱]

(۱۵) يَمِيْدُ فِى الرُّمْحِ مَيْدَ الْمَائِحِ الْاَسِنِ

نیزے پر اس طرح تڑپتا ہے جیسے کنویں میں اترنے والا بیہوش آدمی تڑپ رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تشبیہ کے طور تَاَسَّنَ الرَّجُلُ محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بیمار پڑنے کے ہیں

(ا س و)

اَلْاُسْوَةُ وَالْاِسْوَةُ (قُدْوَةٌ اور قِدْوَةٌ کی طرح) انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع ہوتا ہے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری، سرور بخش ہو یا تکلیف دہ اسی لیے آیت کریمہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳-۲۱) تمہارے لیے پیغمبر خدا میں اچھا اسوہ ہے۔ میں اُسْوَةٌ کی صفت حَسَنَةٌ لائی گئی ہے [۲]۔

تَاَسَّيْتُ بِهٖ میں نے اس کی اقتدار کی۔

اَلْاَسٰى بمعنی حزن آتا ہے اصل میں اس کے معنی کسی فوت شدہ چیز پر غم کھانا ہوتے ہیں۔ اَسِيْتُ عَلَيْهِ اَسًى وَاَسِيْتُ لَهٗ کسی چیز پر غم کھانا قرآن میں ہے: فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۵-۶۸) تو تم قوم کفار پر افسوس نہ کرو۔

شاعر نے کہا ہے [۳] ع

(۱۶) "اَسِيْتُ لِاَخْوَالِىْ رَبِيْعَة"

میں نے اپنے اخوال بنی ربیعہ پر افسوس کیا۔

یہ اصل میں (ناقص) واوی سے ہے کیونکہ محاورہ ہیں غمگین آدمی کو اَسْوَانُ (بالفتح) کہا جاتا ہے۔

اَلْاَسْوُ کے معنی زخم کا علاج کرنے کے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی ازالہ غم کے ہیں اور یہ كَرَبْتُ النَّخْلَ کی طرح ہے جس کے معنی کھجور کے درخت کی شاخوں کی جڑوں کو دور کرنے کے ہیں کہا جاتا ہے اَسَوْتُهٗ اَسُوْهُ اَسْوًا از باب نصر یعنی میں نے اس کا غم دور کیا اس کو تسلی دی۔

اَلْاٰسِىْ عالج۔ مرہم پٹی کرنے والا اس کی جمع اِسَاءٌ وَاُسَاةٌ ہے اور زخمی آدمی کو مَاْسِىٌّ وَاَسِىٌّ کہا جاتا ہے۔ اَسَيْتُ بَيْنَ الْقَوْمِ باہم صلح کرانا۔

اٰسَيْتُهٗ (مفاعلہ) کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا۔ (مال وغیرہ کے ذریعہ) شاعر نے کہا ہے [۴] ع

(۱۷) "آسٰى اَخَاهُ بِنَفْسِهٖ (طویل)"

جس نے خود کو اپنے بھائی پر نثار کر دیا ہو۔

---

[۱] قال زہیر السلمی وصدرہ: وقد اترک القرن مصفرا انامله ... وفی روایۃ اللسان (اسن) یغادر بدل اترک وہو الصواب لانہ من صفۃ الممدوح ای ابن سنان راجع للبیت ملحقات دیوانہ ۱۹۴ والعقد الثمین والمختارات ۵۲ والسمط (۱: ۱۹۹) والبحر (۷: ۲۰) والطبرسی (۲۶: ۴۳) وفی روایۃ التارک القرن مصفرا انامله ویمیل بدل یمید [۲] نیز فرمایا: قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراہیم والذین معہ (۶۰-۴) [۳] قطعۃ من البیت قالہ البحتری فی قصیدۃ لہ فی ۴۵ بیتا یمدح المتوکل ویذکر صلح بنی تغلب وتمامہ ... ان عفت مصایفہا واقوت ربوعہا والبیت فی البحتری (۱: ۱۱۱) وفی روایۃ دیوانہ ۴۰۶ بشرح حسن کامل صیرفی - اذا عفت بدل ان عفت ومصانعہا بدل مصایفہا [۴] قطعۃ من البیت من قصیدۃ جمہریۃ فی ۲۵ بیتا قالہا درید بن الصمۃ احد بنی بکر بن جشم فی رثاء اخیہ عبداللہ وتکملتہ: قتال امرء آسی اخاہ بنفسہ یعلم ان المرء غیر مخلد - والبیت فی الجمہرۃ ۲/۲ والشطر الثانی فی اشعار حلیۃ العمدۃ لابن رشیق (۲: ۱۴۷) ودرید ہذا شاعر شجاع فارس قتل یوم حنین مع المشرکین (بنی ہوازن) راجع العمریین ۲۱-۲۲ والاشتقاق ۱۷۷-۸ والاغانی ۹: ۲-۹ واللالی ۳۹-۴۰ والمؤتلف والخزانۃ ۴: ۴۴۶-۷۴۲/ ۳: ۱۱۶-۱۶۲ والمیسر ۸۱-۸۴ والشعراء ۷۲۵-۷۲۹

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۸) "فآمني وآداه فكان كمن جنيٰ"

اس نے ہمدردی کی اور سامان حرب دیا تو گویا اس نے جنایت کی۔

یہاں آمنی بروزن فاعل ہو اسی سے ہے اسی طرح شاعر کے قول [2]

(۱۹) "یکفون اثقال ثائی المستأسی"

المستأسی بروزن مستفعل بھی اسی مادہ سے ہے مگر الاساءۃ (افعال) جس کے معنی تکلیف پہنچانے کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ ساء (س و ء) سے منقول ہے۔

(ا ش ر)

اَلْاَشَرُ بہت زیادہ اترانا اَشِرَ یَاْشَرُ اَشَرًا (س) اَلْاَشِرُ بہت زیادہ اترانے والا۔ قرآن میں ہے: سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ (۵۴-۲۶) ان کو کل ہی معلوم ہو جائیگا کہ کون جھوٹا خود پسند ہے۔ پس اَشَرٌ۔ بَطَرٌ سے ابلغ ہے اور بَطَرٌ میں فَرَحٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اور فَرَحٌ اگرچہ عام حالات میں مذموم ہوتا ہے جس طرح کہ قرآن میں ہے: إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (۲۸-۷۶) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لیکن ایسے موقع پر جب خوشی کا اظہار ضروری ہو اور وہ اظہار بھی جب ضرورت ہو تو فرحت ممدوح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا (۱۰-۵۸) تو چاہیئے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ کیونکہ کبھی سرور کی وجہ سے فرحت کا حصول تقاضائے عقل کے مطابق ہوتا ہے مگر اَشَرٌ اس فرحت کو کہتے ہیں جو مبنی بر ہوائے نفس ہو اور اسی سے بطور تشبیہ نَاقَةٌ مِئْشِيرٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی چست اونٹنی کے ہیں۔ اور اس کے معنی دبلی اونٹنی بھی آتے ہیں اس صورت میں یہ اَشَرْتُ الْخَشَبَةَ سے ماخوذ ہوگا جسکے معنی لکڑی چیرنا کے ہیں۔

(ا ص ب ع)

اَلْاِصْبَعُ (انگلی) کا لفظ انگلی کی ہڈی ناخن بالائی سرا خم اور جوڑ کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے [3]۔ اور بطور استعارہ ظاہری احسان کے معنی میں آتا ہے چنانچہ لَكَ عَلَيْهِ يَدٌ کی طرح لَكَ عَلَىٰ فُلَانٍ إِصْبَعٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے [4]

(ا ص ر)

اَلْاَصْرُ (ض) کے اصل معنی کسی چیز میں گرہ لگانے اور اس کو زبردستی روک لینا کے ہیں اَصَرَ يَأْصِرُ اَصْرًا فَهُوَ مَأْصُورٌ اور مَأْصَرٌ وَمَأْصِرٌ بندرگاہ پر جہاز کھڑا کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ (۷-۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ... اتارتے ہیں -

---

[1] قالہ سوید المراثد الحارثی وصدرہ: ولم یجنہا ولکن جناہا ولیہا - وفی البیت آداہ (بالمہملہ) من الاداۃ ای عدۃ الحرب آداہ اصلہ عداہ بالعین فابدلت ہمزۃ (راجع المرزوقی ص ۸۱۷ رقم ۲۷۱، والکامل ۲-۱۰۲ فی ۱۵ ابیات والعیون ۱:-۱۹ واللسان فرجنی) وفی النسخ المطبوعۃ آذاہ (بالمعجمہ) مصحف۔ [2] لم اجدہ

[3] وجمعہ اصابع راجع الآیۃ (۲-۱۹)

یہاں اِصْرٌ سے وہ دشواریاں مراد ہیں جو خیرات اور ثواب تک پہنچنے سے اِن کے لئے رکاوٹ بنی ہوئی تھیں اور آیت :-
وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا (۲-۲۸۶) میں بھی اِصْرٌ اسی معنی پر محمول ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اِصْرٌ کے معنی بوجھ کے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔
نیز اِصْر اس عہد مؤکد کو بھی کہتے ہیں جو خلاف ورزی کرنے والے کو ثواب اور خیرات سے روک دے چنانچہ قرآن میں ہے :-
ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي (۳-۸۱) بھلا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا پختہ عہد لیا۔
اَلْاِصَارُ رسی یا میخ جن کے سہارے پر خیمہ کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ مَا يَأْصِرُنِي عَنْكَ شَيْءٌ مجھے تیرے پاس پہنچنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔
اَلْاَيْصَرُ۔ وہ کمبل جس میں خشک گھاس بھر کر اونٹ کی کوہان کے گرد لپیٹا جاتا ہے تاکہ اس پر آسانی کے ساتھ سواری ہو سکے۔

(ا ص ل)

اَصْلُ الشَّيْءِ (جڑ) کسی چیز کی اس بنیاد کو کہتے ہیں کہ اگر اس کا ارتفاع فرض کیا جائے تو اس شئے کا باقی حصہ بھی معلوم ہو جائے قرآن میں ہے :- أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۴-۲۵) اِس کی جڑ زمین میں پکی سے جمی ہے اور شاخیں آسمان میں۔ اور تَاَصَّلَ کَذَا کے معنی کسی چیز کے جڑ پکڑنا ہیں اس سے اصل اور خاندانی بزرگی مجد اَصِيلٌ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا أَصْلَ لَهُ وَلَا فَصْلَ یعنی نیست اور احسب ونہ زبان۔
اَلْاَصِيْلُ وَالْاَصِيْلَةُ کے معنی (عَشِيَّةٌ) عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ سَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۳۳-۴۲) اور صبح و شام کی تسبیح بیان کرتے رہو۔
اَصِيْلٌ کی جمع اُصُلٌ و آصَالٌ اور اَصِيلَةٌ کی جمع اَصَائِلُ ہے قرآن میں ہے۔ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ (۷-۲۰۵) صبح اور شام

(ا ف ف)

اَلْاُفُّ۔ اصل میں ہر گندی اور قابل نفرت چیز کو کہتے ہیں میل کچیل اور ناخن کا تراشہ وغیرہ اور محاورہ میں کسی بری چیز سے اظہار نفرت کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے: أُفٍّ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (۲۱-۶۷) تف ہے تم پر اور جنہیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو ان پر بھی۔
اَفَّفْتُ بِكَذَا کسی چیز سے کراہت ظاہر کرنا اُفٍّ کہنا۔ اسی سے اَفَّفَ فُلَانٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل برداشتگی کا اظہار کرنے کے ہیں۔

(ا ف ق)

اَلْاُفُقُ۔ کنارہ جمع آفَاقٌ۔ قرآن میں ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ (۴۱-۵۳) ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی ... نشانیاں دکھائیں گے آفاق کے معنی اطراف کے ہیں اس کا واحد اُفُقٌ وَاُفْقٌ ہے[1] اور نسبت کے وقت اُفُقِيٌّ کہا جاتا ہے اور

[1] و فی القرآن ولقد رآہ بالافق المبین (۸۱-۲۳) وھو بالافق الاعلیٰ (۵۳-)

اَفِقَ فُلَانٌ کے معنی آفاق (اطراف عالم) میں جانے کے ہیں اور افق کے اطراف میں انتہائی بُعد اور وسعت سے تشبیہ کے طور پر اٰفِقٌ کا لفظ انتہائی سخی پر بولا جاتا ہے۔

(ا ف ك)

اَلْاِفْكُ۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بناء پر ان ہواؤں کو جو اپنا اصلی رخ چھوڑ دیں مُؤْتَفِكَةٌ کہا جاتا ہے اور آیات کریمہ:۔ وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ (۶۹-۹) اور وہ الٹنے والی بستیوں نے گناہ کے کام کئے تھے۔
وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى (۵۳-۵۳) اور الٹی ہوئی بستیوں کو دے پٹکا۔ (میں مُؤتفکات سے مراد وہ بستیاں جن کو اللہ تعالیٰ نے مع ان کے بسنے والوں کے الٹ دیا تھا)
قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۹-۳۰) خدا ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔ یعنی اعتقاد و حق سے باطل کی طرف اور سچائی سے جھوٹ کی طرف اور اچھے کاموں سے برے افعال کی طرف پھر رہے ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا:۔ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (۵۱-۹) اس سے وہی پھرتا ہے جو (خدا کی طرف سے) پھیرا جائے۔
فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۶-۹۵) پھر تم کہاں بہکے پھرتے ہو۔ اور آیت کریمہ:۔ اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا (۴۶-۲۲) کیا تم ہمارے پاس اسلئے آئے ہو کہ ہمارے معبودوں سے پھیر دو۔
میں اِفْك کا استعمال ان کے اعتقاد کے مطابق ہوا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اعتقاد میں آلہتہ کی عبادت ترک کرنے کو حق سے برگشتگی سمجھتے تھے۔
جھوٹ بھی چونکہ اصلیت اور حقیقت سے پھرا ہوتا ہے اس لئے اس پر بھی اِفْكٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (۲۴-۱۱) جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تمہیں لوگوں میں سے ایک جماعت ہے۔
لِكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (۴۵-۷) ہر جھوٹے گنہگار کے لئے تباہی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ (۳۷-۸۶) کیوں جھوٹ (بنا کر) خدا کے سوا اور معبودوں کے طالب ہو۔ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِفْكًا مفعول لہٗ ہو اَیْ اٰلِهَةً مِنَ الْاِفْكِ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِفْكًا تُرِيْدُوْنَ کا مفعول ہو اور اٰلِهَةً اس سے بدل ... (اور باطل معبودوں کو (مبالغہ کے طور پر) اِفْكًا کہدیا ہو[1]۔
اور جو شخص حق سے برگشتہ ہو اسے مَاْفُوْكٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[2] (منسرح)

(۲۰) فَاِنْ تَكُ عَنْ اَحْسَنِ الْمُرُوْءَةِ مَاْفُوْ
كًا فَفِيْ اٰخَرِيْنَ قَدْ اُفِكُوْا

اگر تو حسن مروت کے راستہ سے پھر گیا ہے تو تم ان لوگوں میں ہو جو برگشتہ ہو چکے ہیں۔
اُفِكَ الرَّجُلُ يُؤْفَكُ کے معنی دیوانہ اور باؤلا ہونے کے ہیں اور باؤلے آدمی کو مَاْفُوكُ الْعَقْلِ کہا جاتا ہے

---

[1] ذکر الزمخشری ہہنا ثلاثۃ اوجہ من الاعراب اضاف ذکرہما المؤلف والثالث ان یکون افکا حالا من ضمیر الفاعل ۳: ۹۴؛ طبع مصر۔
[2] قالہ عمر بن اذینہ والبیت فی اللسان والصحاح (انک) والطبرسی (۲۶-۱۹) وشواہد الکشاف ۸۷ و تہذیب الاصلاح (۱: ۴۴) والاصلاح ۲۳ و تہذیب الالفاظ ۵۵۲ والبحر ۳: ۵۰۶/۷: ۴۹۴ والغریب القتبی ۳۰

(ا ف ل)

اَلْاُفُوْلُ کے معنی ماہتاب اور نجوم (وغیرہ نیّرات) کے غروب ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (۶-۷۶) جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔
فَلَمَّا اَفَلَتْ (۶-۷۸) مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا۔
بعض بکری کے چھوٹے بچوں کو اِفال اور اونٹ کے کمزور اور چھوٹے بچے کو اَفِیْلٌ کہا جاتا ہے۔

(ا ک ل)

اَلْاَکْلُ کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً اَکَلَتِ النَّارُ الْحَطَبَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا ڈالا۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے اسے اُکُلٌ (بضم کاف وسکونا) کہا جاتا ہے ارشاد ہے اُکُلُهَا دَائِمٌ (۱۳-۳۵) اسکے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔
اَلْاَکْلَۃُ مرۃ کا صیغہ ہے یعنی ایک مرتبہ کھانا اور اَلْاُکْلَۃُ بمعنی لُقْمَۃٌ ہے۔
اَکِیْلَۃُ الْاَسَدِ شیر کا شکار کیا ہوا جانور جسے وہ کھا جاتا ہے۔
اَلْاَکُوْلَۃُ بکری جو کھانے کیلئے موٹی کی گئی ہو۔
اَلْاَکِیْلُ ہم پیالہ کو کہتے ہیں اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔
فُلَانٌ مُؤَکَّلٌ وَمُطْعَمٌ (کنایہ مالدار تونگر۔
ثَوْبٌ ذُوْ اُکْلٍ سخت بنا ہوا کپڑا۔ گھنی بناوٹ کا کپڑا۔
اَلتَّمْرُ مَأْکَلَۃٌ لِلْفَمِ کھجور خوردنی چیز ہے۔ قرآن میں ہے:۔
ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ (۳۴-۱۶) اور کبھی اُکُلٌ کا لفظ نصیب پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فُلَانٌ ذُوْ اُکُلٍ مِنَ الدُّنْیَا یعنی وہ دنیا سے بہرہ یاب ہے
اِسْتَوْفٰی فُلَانٌ اُکُلَهٗ کنایہ از موت یعنی رزق پورا لے لیا۔
اَکَلَ فُلَانٌ فُلَانًا اس نے فلاں کی غیبت کی اور یہی معنی اَکَلَ لَحْمَهٗ کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا (۴۹-۱۲) کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے۔
شاعر نے کہا ہے [1] (طویل)
(۲۱) فَاِنْ کُنْتُ مَاْکُوْلًا فَکُنْ اَنْتَ اٰکِلِیْ۔
اگر مجھے کھایا جانا ہے تو تم خود ہی کھالو۔
مَا ذُقْتُ اُکْلًا میں نے کوئی چیز نہیں کھائی اور چونکہ کھانے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت مال کی ہوتی ہے اس لئے اَلْاَکْلُ کے معنی مال خرچ کرنا بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَلَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ (۴-۲۹) ایک دوسرے کا مال ناحق صرف نہ کرو۔ اور آیت:۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ

---

[1] قالہ الممزق العبدی حینما غضب علیہ النعمان بن المنذر او عمرو بن ہند وتمامہ .... والا فادرکنی ولما امزق وفی اللسان امزق) خیر آکل بدل انت آکلی والبیت ایضاً فی اللسان (اکل) وذیل امالی المرتضیٰ (۱-۳۲۵) والکامل للمبرد (۱: ۱۸) والسیوطی ۵۸ والاشباہ والنحویہ (۲: ۲۲۲) فی بحث الفرق بین لم ولما والبحر (۷-۵۵) والمؤتلف للآمدی ۲۸۳ وکتب عثمان ایام الفتنۃ الی علیؓ مکتوباً یستنجدہ وختم بہذا البیت انظر العمدۃ (۱: ۷۴، ۲۵۶) وابن ہشام (۱: ۳۰۹) والمحاسن والاضداد ۲۰۲ والحصری (۱: ۷۵) وامالی ابن الشجری (۱: ۱۳۵) والعقد (۳-۱۹۳ - ۴-۱۹) والعیون (۱: ۳۴) وایضاً السیوطی ۲۳۳ والشاعر اسمہ شاس بن نہار العبدی ولقب بالممزق لقولہ فی ہذا البیت (و لما امزق)، راجع الآمدی ۱۸۵ - ۱۸۶

اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا (۴-۱۰) میں یتامٰی کا مال کھانے سے اس کو ناجائز طور پر صرف کرنا مراد ہے اور پھر بعد میں اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ نَارًا (۴-۱۰) کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ یہ انہیں جہنم میں لے جائیگا۔
اَلْاَکُوْلُ وَالْاَکَّالُ (مبالغہ) زیادہ کھانے والا۔ قرآن میں ہے:۔
اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (۵-۴۲) اور رشوت کا حرام مال بہت زیادہ کھانے والے ہیں۔
۲ کِلٌّ کی جمع اَکَلَۃٌ ہے محاورہ ہے ھُمْ اَکَلَۃُ رَأْسٍ۔ یعنی وہ تعداد میں اتنے کم ہیں کہ بکری کا ایک سر ہی انہیں کافی ہے[1]۔ کبھی اَکَلٌ کے معنی خراب کرنا بھی آجاتے ہیں (یعنی کھانے کے بعد جو خراب سا رہ جاتا ہے) جیسے فرمایا۔ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ یعنی کھایا ہوا بھس۔
تَاَکَّلَ کَذَا۔ کسی چیز کا خراب ہوجانا اَصَابَہٗ اُکَالٌ فِیْ رَأْسِہٖ وَفِیْ اَسْنَانِہٖ سر کا کھجلی اور دانتوں کا خوردہ سے خراب ہوجانا واکلنی رأسی یعنی میرے سر کے بال جھڑ گئے مِیْکَائِیْلُ ایک فرشتے کا نام ہے اور یہ عربی لفظ نہیں ہے۔

(ا ل ل)

اَلْاِلُّ ہر وہ صاف اور ظاہری حالت جس کا انکار ناممکن ہو، عہد قرابت داری۔ قرآن میں ہے:۔
لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً (۹-۱۰) یہ لوگ کسی مؤمن کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا۔
اَلَّ الْفَرَسُ گھوڑے کا تیز چلنا اس کے اصل معنی چمکنے کے ہیں اور پھر تیزروی کے لئے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے جیسے کہ بَرَقَ وطَارَ کے الفاظ ہیں۔ اَلْاَلَّۃُ چمکدار برچھا اَلَّ بِھَا اس نے نیزہ یا برچھا سے مارا اور اسی سے تیز کان کو اُذُنٌ مُؤَلَّلَۃٌ کہا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اِلٌّ وَاِیْلٌ اسماءِ حسنٰی سے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اَلْاِلَالُ چھری کے دونوں پہلو

(ا ل ف)

اَلْاَلِفُ۔ حروف تہجی کا پہلا حرف ہے[1] اور اَلْاِلْفُ (ض) کے معنی ہیں ہم آہنگی کے ساتھ جمع ہونا۔ محاورہ ہے:۔ اَلَّفْتُ بَیْنَھُمْ میں نے ان میں ہم آہنگی پیدا کردی اور اسی سے اُلْفَۃٌ (بمعنی محبت) ہے اور کبھی ہر مالوف چیز کو اِلْفٌ واَلِفٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (۳-۱۰۳) جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ (۸-۶۳) اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کرسکتے
اور مُؤَلَّفٌ اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس کے مختلف اجزاء کو یکجا جمع کردیا گیا ہو اور ہر جزء کو تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے اس کی صحیح جگہ پر رکھا گیا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔
لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (۱۰۶-۱) قریش کے مالوف کرنے کے سبب میں اِیْلَافٌ (افعال) کا مصدر ہے اور آیت:۔ وَالْمُؤَلَّفَۃِ قُلُوْبُھُمْ (۹-۶۰)

---

[1] راجع للبحث عن حروف الہجاء المقدمہ ۲ وایضاً (اوک)

ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے۔ ہیں مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوبُ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی بہتری کا خیال رکھا جائے حتیٰ کہ وہ ان لوگوں کی صف میں داخل ہوجائیں جن کی وصف میں قرآن نے لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ فرمایا ہے یعنی مخلص مسلمان ہوجائیں۔

اَوَالِفُ الطَّیْرِ مانوس پرندے جو گھروں میں رہتے ہیں۔

اَلْاَلْفُ۔ ایک خاص عدد (ہزار) کا نام ہے اور اسے اَلْفٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعداد کے تمام اقسام جمع ہوجاتے ہیں کیونکہ اعداد کی چار قسمیں ہیں۔ اکائی، دہائی، سینکڑہ، ہزار تو اَلْف میں یہ سب اعداد جمع ہوجاتے ہیں اس کے بعد جو عدد بھی ہو وہ مکرر آتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ الف حروف تہجی بھی اسی سے ہے کیونکہ وہ مبدا انتظام بنتا ہے۔ اَلَفْتُ الدَّرَاھِمَ میں نے درہموں کو ہزار کردیا جس طرح مَاءَیْتُ کے معنی ہیں میں نے انہیں سو کردیا۔ اٰلَفْتُ وہ ہزار کو پہنچ گئے جیسے اَمَاءُوْا سو تک پہنچ گئے

(ا ل ك)

اَلْمَلٰٓئِکَۃُ (فرشتے) اور مَلَکٌ اصل میں مَاْلَکٌ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مَلْاَکٌ سے مقلوب ہے اور مَاْلَکٌ وَمَاْلَکَۃٌ وَاَلُوْکٌ کے معنی رسالت یعنی پیغام کے ہیں اسی سے اَلِکْنِیْ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں "اسے میرا پیغام پہنچادو"۔

اَلْمَلٰٓئِکَۃُ کا لفظ (اسم جنس ہے اور) واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا (۲۲-۷۵) خدا فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کرلیتا ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ مَاْلُکَۃٌ کے معنی ہیں پیغام اور اسے (مَاْلُکَۃ) اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی منہ میں چبایا جاتا ہے اور یہ فَرَسٌ یَاْلُکُ اللِّجَامَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گھوڑے کا منہ میں لگام کو چبانا۔

(ا ل م)

اَلْاَلَمُ کے معنی سخت درد کے ہیں کہا جاتا ہے اَلِمَ یَاْلَمُ (س) اَلَمًا فَھُوَ اٰلِمٌ قرآن میں ہے:۔ فَاِنَّھُمْ یَاْلَمُوْنَ کَمَا تَاْلَمُوْنَ (۴-۱۰۴) تو جس طرح تم شدید درد پاتے ہو اسی طرح وہ بھی شدید درد پاتے ہیں۔

اٰلَمْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو سخت تکلیف پہنچائی۔ اور آیت کریمہ:۔ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲-۱۰) میں اَلِیْمٌ بمعنی مُؤْلِمٌ ہے یعنی دردناک۔ دکھ دینے والا۔ اور آیت:۔ اَلَمْ یَاْتِکُمْ (۶-۱۳۰) کیا تم کو ... نہیں پہنچی۔ میں الف استفہام کا ہے جو لَمْ پر داخل ہوا ہے (یعنی اس مادہ سے نہیں ہے)

(ا ل ہ)

اَللّٰهُ (۱) بعض کا قول ہے کہ اَللّٰهُ کا لفظ اصل میں اِلٰهٌ ہے ہمزہ (تخفیفًا) حذف کردیا گیا ہے اور اس پر الف لام (تعریف) لاکر باری تعالیٰ کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے اسی تخصیص

کی بنا پر فرمایا۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (۱۹-۶۵) کیا تمہیں اس کے کسی ہمنام کا علم ہے۔

اِلٰہٌ کا لفظ عام ہے اور ہر معبود پر بولا جاتا ہے (خواہ وہ معبود برحق ہو یا معبود باطل) اور وہ سورج کو اَلْاِلٰهَة کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ انہوں نے اس کو معبود بنا رکھا تھا۔

اِلٰہٌ کے اشتقاق میں مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلَهَ (ف)، يَأْلَهُ فُلَانٌ وَتَاَلَّهَ سے مشتق ہے جس کے معنی پرستش کرنا کے ہیں اس بنا پر اِلٰهٌ کے معنی ہوں گے معبود اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلِهَ (س) بمعنی تحیر سے مشتق ہے اور باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے ادراک سے چونکہ عقول متحیر اور درماندہ ہیں اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے فرمایا ہے۔[1]

كَلَّ دُوْنَ صِفَاتِهٖ تَحْبِيْرُ الصِّفَاتِ وَضَلَّ هُنَاكَ تَصَارِيْفُ لِلّغَاتِ۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من
خاک بر فرق من وتمثیل من

اس لئے کہ انسان جس قدر صفات الٰہیہ میں غور وفکر کرتا ہے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہے اس بنا پر آنحضرتؐ نے فرمایا ہے[2] (۱۱) تَفَكَّرُوْا فِيْ آلَاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کیا کرو اور اس کی ذات کے متعلق مت سوچا کرو۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ اِلٰہ اصل میں وِلَاهٌ ہے واؤ کو ہمزہ سے بدل کر اِلَاہ بنا لیا ہے اور وَلِهَ (س) کے معنی عشق ومحبت میں وارفتہ اور بیخود ہونے کے ہیں[3] اور ذات باری تعالیٰ سے بھی چونکہ تمام مخلوق کو والہانہ محبت ہے اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے اگرچہ بعض چیزوں کی محبت تسخیری ہے جیسے جمادات اور حیوانات اور بعض کی تسخیری اور ارادی دونوں طرح ہے جیسے بعض انسان۔ اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے کہ ذات باری تعالیٰ تمام اشیاء کو محبوب ہے اور آیت کریمہ۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷-۴۴) مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں لَاهَ يَلُوْهُ لِيَاهًا سے ہے جس کے معنی پردہ میں چھپ جانا کے ہیں اور ذات باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور اور محجوب ہے اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶-۱۰۳) وہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔

نیز آیت کریمہ:۔ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۵۷-۳) میں "الباطن" کہہ کر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

---

[1] نثر مقفی قاله رضی اللہ عنہ فی خطبته الغراء والخطبة بطولها فی العقد وفیه "صفته" بدل صفاته وایضًا ابن الحدید [2] انظر الحدیث للسان (۱۱) و (ابو الشیخ عن علی، عدہب عن ابن عمرؓ) وفی روایة فی خلق اللہ (حل عن ابن عباس وابو الشیخ عن ابی ذر) وردی فی کل قسیء (ابو الشیخ فی العظمة عن ابن عباس) راجع کنز العمال ۳/۵۷۷ - ۵۸۱ ومعناہ ۵۸۶ - ۵۸۷ (ابو الشیخ فی العظمة حل عن عبد اللہ بن سلام [3] نسبه الطبرسی الی ابی عمرو

اللہ یعنی معبود درحقیقت ایک ہی ہے اس لئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس کی جمع نہ لائی جائے، لیکن اہل عرب نے اپنے اعتقاد کے مطابق بہت سی چیزوں کو معبود بنا رکھا تھا اس لئے اٰلِهَةٌ صیغہ جمع استعمال کرتے تھے۔ قرآن میں ہے: اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِنْ دُوْنِنَا (۲۱-۴۳) کیا ہمارے سوا ان کے اور معبود ہیں کہ ان کو مصائب سے بچالیں۔

وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ (۷-۱۲۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہوجائیں۔ ایک قرأت میں وَاِلَاهَتَكَ ہے جس کے معنی عبادت کے ہیں لَاهِ اَنْتَ۔ یہ اصل میں لِلّٰهِ اَنْتَ ہے ایک لام کو تخفیف کے لئے حذف کردیا گیا ہے۔

اَللّٰهُمَّ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یَا اَللّٰهُ کے ہیں اور اس میں میم مشدد یا (حرف ندا) کے عوض میں آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ اصل میں یَا اَللّٰهُ اُمَّنَا بِخَيْرٍ (اے اللہ تو خیر کے ساری ہماری طرف توجہ فرما) ہے (کثرت استعمال کی بنا پر) ... حَيْهَلَا کی طرح مرکب کرکے اَللّٰهُمَّ بنالیا گیا ہے۔[1] (جیسے هَلُمَّ)

اِلٰی۔ حرف (جر) ہے اور جہات ستہ میں سے کسی جہت کی نہایۃ حد بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔

(ا ل و)

اَلَوْتُ فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں کسی کام میں کوتاہی کرنا گویا کوتاہی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس امر کی انتہا ہی ہے۔ اور اَلَوْتُ فُلَانًا کے معنی اَوْلَيْتُهٗ تَقْصِيْرًا (میں نے اسے کوتاہی کا والی بنادیا) کے ہیں جیسے كَسَّبْتُهٗ اَیْ اَوْلَيْتُهٗ كَسْبًا (میں نے اسے کسب کا والی بنادیا) مَا اَلَوْتُهٗ جُهْدًا میں نے مقدور بھر اس سے کوتاہی نہیں کی اس میں جُهْدًا تمیز ہے جس طرح مَا اَلَوْتُهٗ نُصْحًا میں نُصْحًا ہے۔ قرآن میں ہے:

لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (۳-۱۱۸) یعنی یہ لوگ تمہاری خرابی چاہنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ اور آیت کریمہ: وَلَا يَأْتَلِ اُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ (۲۴-۲۲) اور جو لوگ تم میں سے صاحب فضل (اور صاحب وسعت) ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلَوْتُ سے باب افتعال ہے اور بعض نے اَلَيْتُ بمعنی حَلَفْتُ سے مانا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے متعلق نازل ہوئی تھی جب کہ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ مسطح کی مالی امداد نہیں کریں گے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ صیغہ افتعال اَفْعَلَ (مزید فیہ) سے نہیں آتا بلکہ فَعَلَ (مجرد) سے بنایا جاتا ہے جیسے: كَسَبْتُ سے اِكْتَسَبْتُ اور صَنَعْتُ سے اِصْطَنَعْتُ اور رَاَيْتُ سے اِرْتَاَيْتُ اور روایت[2]:

(۱۲) لَا دَرَيْتَ وَلَا ائْتَلَيْتَ میں بھی مَا اَلَوْتُهٗ شَيْئًا سے افتعال کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے معنی وَلَا اسْتَطَعْتَ کے ہیں (یعنی تم نے نہ جانا اور نہ تجھے اس کی استطاعت ہوئی) اصل میں اِيْلَاءٌ

---

[1] راجع للبحث فی (اللھم) المسائل والاجوبۃ لابن سیدہ ۱: ۱۰۹ معالم ص ۲-۲۲ المطرزی علی المقامات ص ۵۴۳ الکناش الکواکبی ص ۸۱ والکلام فی میم (اللھم) ومناقشۃ فیہا: ذخائر القصر لابن طولون آخر ص ۱۵ [2] رواہ البخاری ومسلم من حدیث انسؓ لکن فی روایتہما ولاتلیت والحدیث ایضا فی مسند البزار واحمد من عبداللہ بن عمرو والطبرانی فی الاوسط

وَ اَلِیَّۃٌ اس قسم کو کہتے ہیں جس پر قسم کھانے والے کو تکلیف اور کوتاہی کا سامنا کرنا پڑے اور اصطلاح شریعت میں اِیْلَاءٌ اس قسم کو کہتے ہیں جو عورت کے ساتھ جماع پر اٹھائی جائے اس قسم کی کیفیت اور احکام کا بیان کرنا کتب فقہ کے ساتھ مختص ہے اور آیت کریمہ :۔

وَاذْکُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰہِ (۷-۷۴) پس خدا کی نعمتوں کو یاد کرو۔ میں اٰلَاءٌ کا واحد اَلًی وَاِلًی ہے جس طرح کہ اٰنَاءٌ کا واحد اَنًا وَاِنًی آتا ہے بعض نے آیت کریمہ :۔ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ (۷۵-۲۳-۲۲) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے) میں اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ کے معنی اِلٰی نِعْمَۃِ رَبِّھَا مُنْتَظِرَۃٌ کئے ہیں یعنی اپنے پروردگار کی نعمت کے منتظر ہونگے لیکن بلاغت قرآن کی رو سے یہ سراسر تعسف ہے

(اَلَا)

اَلَا یہ حرف استفتاح ہے[1] (یعنی کلام کے ابتدا میں تنبیہ کے لئے آتا ہے)

(اِلَّا)

اِلَّا یہ حرف استثناء ہے[2]

اُولَاءِ (اُولَا)

یہ اسم مبہم ہے جو جمع مذکر و مؤنث کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے اس کا مفرد من لفظہٖ نہیں آتا کبھی اس کے شروع میں ھا تنبیہ بھی آجاتا ہے، قرآن میں ہے :۔ ھَآ اَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَھُمْ (۳-۱۱۹) دیکھو ! تم ایسے لوگ ہو کہ ان سے دوستی رکھتے ہو اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی (۲-۵) یہی لوگ ..... ہدایت پر ہیں اور کبھی اس میں قصر (یعنی بحذف ہمزہ آخر) بھی کر لیا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3] ع

(۲۲) ھٰؤُلَا ثُمَّ ھٰؤُلَا کُلًّا اَعْطَیْتُ نَوَالًا مَحْذُوَّۃً بِمِثَالٍ

ان سب لوگوں کو میں نے بڑے بڑے گرانقدر عطیے دیئے ہیں

(اُ م م)

اَلْاُمُّ یہ اَبٌ کا بالمقابل ہے اور ماں قریبی حقیقی ماں اور بعیدہ یعنی نانی پرنانی وغیرہ سب کو اُمٌّ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حواء کو اُمُّنَا کہا گیا ہے اگرچہ ہمارا ان سے بہت دور کا تعلق ہے۔ پھر ہر اس چیز کو اُمٌّ کہا جاتا ہے۔ جو کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے یا اس کی اصلاح و تربیت کا سبب ہو یا اس کے آغاز کا مبداء بنے۔ خلیل کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس کے اندر اس کے جملہ متعلقات منضم ہو جائیں یا سما جائیں ..... وہ ان کی اُمٌّ کہلاتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ :۔ وَاِنَّہٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ (۴۳-۴) اور یہ اصل نوشتہ (یعنی لوح محفوظ) میں ہے۔ میں اُمُّ الْکِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے کیونکہ وہ

---

[1] یکون مع التوبیخ والتمنی والاستفہام عن النفی مع العرض والتحضیض نحو اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ (۲۴-۲۲) وفی معنی التنبیہ اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْہِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْہُمْ (۱۱-۷) [2] وقد یکون صفۃ بمنزلۃ غیر نحو لَوْ کَانَ فِیْہِمَآ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا (انبیاء ۲۱: ۲۲) وفیہ بحث وعاطفۃ بمنزلۃ الواو لیجع الاٰیۃ (۲: ۱۵۰) (۲۷: ۱۰-۱۱) وزائدۃ فہذہ اربعۃ اوجہ واما اَلَّا فحرف تخصیص او مرکب من ان وان الناصبۃ المخففۃ ولا النافیۃ وراجع للبحث المغنی ج ۱ ص ۸۰۔ [3] قال الاعشٰی وفی جمہرۃ اشعار العرب لعالابدل نوالا ومعناہ سقیتھم کاس الردی والبیت فی اللسان ۱: ۱۲۸ ودیوانہ ۱۹۷

وہ تمام علوم کا منبع ہے اور اسی کی طرف تمام علوم منسوب ہوتے ہیں اور مکہ مکرمہ کو اُمّ القریٰ کہا گیا ہے کیونکہ وہ خطۂ عرب کا مرکز تھا) اور بموجب روایت تمام روئے زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی ہے (اور یہ ساری دنیا کا دینی مرکز ہے) قرآن میں ہے:۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (۲۔۹۲) تاکہ تو مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں۔ بدعملی کے انجام سے ڈرائے۔

اُمُّ النُّجوم۔ کہکشاں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۳۲) "بحیث اھتدت امّ النجوم الشوابك"

یعنی جہاں کہ کہکشاں راہ پاتی ہے

اُمّ الاضیاف۔ مہمان نواز۔ ام المساکین۔ مسکین نواز۔ مسکینوں کا سہارا۔ ایسے ہی جیسے بہت زیادہ مہمان نواز کو "ابو الاضیاف" کہا جاتا ہے اور رئیس جیش کو ام الجیش۔ شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)

(۳۳) "وام عیال قد شھدت تقوتھم"

اور وہ اپنی قوم کے لئے بمنزلہ ام عیال ہے جو ان کو رزق دیتا ہے۔

اُمّ الکتاب۔ سورۃ فاتحہ کا نام ہے۔ کیونکہ وہ قرآن کے لئے بمنزلہ دیباچہ اور مقدمہ ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۱۰۱۔۹) مثویٰ یعنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ دوزخ کے متعلق مَاْوٰىكُمُ النَّارُ (۲۹۔۲۵) فرمایا ہے (اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ایک محاورہ ہو) جس طرح کہ وَيْلٌ اُمِّهٖ وَهَوَتْ اُمُّهٗ ہے یعنی اس کیلئے ہلاکت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:۔ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ (۳۳۔۶) میں ازواج مطہرات کو امہات المؤمنین قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ بحث اَبٌ میں گزر چکی ہے۔ نیز فرمایا۔ يَبْنَؤُمَّ (۲۰۔۹۴) کہ بھائی۔

اُمٌّ (کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے) بعض نے کہا ہے کہ اُمٌّ اصل میں اُمَّهَةٌ ہے کیونکہ اس کی جمع اُمَّهَاتٌ اور تصغیر اُمَيْهَةٌ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اصل میں مضاعف ہی ہے کیونکہ اس کی جمع اُمَّاتٌ اور تصغیر اُمَيْمَةٌ آتی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ عام طور پر حیوانات وغیرہ کے لئے اُمَّاتٌ اور انسان کے لئے اُمَّهَاتٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اَلْاُمَّةُ ہر وہ جماعت جن کے مابین رشتۂ دینی ہو یا وہ جغرافیائی اور عصری وحدت میں منسلک

---

[1] قالہ تابط شرا وصدرہ یسری بوحشۃ الانس انیس ویھتدی …. والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی رقم ۱۳ فی تسعۃ ابیات والبیت فی الفاعتیق ۳۴۲ واللآلی (۲۔۱۲۵) ونقد الشعر ۱۴ والحیوان (۶: ۲۵۶) فی ستۃ ابیات وثمار القلوب ۲۴۳ وزھر الآداب (۲: ۲۱) فی عشرۃ ابیات وام النجوم الشوابک ہی الشعری والبیت فی التیجان ۲۴۲ منسوب لسلیک بن سلکۃ وراجع للبیت ایضا السمط ۲۷۲ وادبا المؤلف (۲: ۱۱۰)۔ [2] قالہ الشنفری عمرو بن مالک الازدی (م۔ ق ھ ۵۲۵ تقم) شاعر جاہلی من الصعالیک صاحب لامیۃ العرب التی شرحھا الزمخشری فی اعجب العجاب واراد بام عیال تابط شرا وانہم حین غزوا جعلوا ازوادہم الیہ فکان یقتر علیہم مخافۃ ان تطول الغزاۃ فیموتوا جوعا والازدیسمی رئیس القوم ودلی امرہم امّا وتمام البیت: اذا اطعمتہم اوتحت واقلت والبیت من کلمۃ مفضلیۃ رقم ۲۰ فی ۶۴ بیتا والبیت فی اللسان (ام) والاغانی (۲۱: ۹۰) وفی المطبوع تقوتہم بدل تقوتہم مصحف وفی روایۃ احفت بدل اوتحت واحترتہم بدل اطعمتہم وراجع للبیت تہذیب الالفاظ ۲۷۵ و۵۶ واللسان (حتر، ام) والتاج (ام) والجمہرۃ (۱: ۷۱) والمخصص (۳/۱۳۳) وکتاب الابدال لابی الطیب والسمط ۱۳ ام والاغانی (۱۴/۱۲۳) والخزانۃ (۲: ۱۶) والحماسۃ مع المرزوقی ۵۰۰ والتبریزی (۲: ۳۴) وادب الاستقبال (۱۲۱: ۳۲) والعینی (۱: ۲۷)

ہوں پھر وہ رشتہ اور تعلق اختیاری ہو یا غیر اختیاری اس کی جمع اُمَمٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ (۶-۳۸)

اور زمین پر جو چلنے پھرنے والے (حیوان) دو پروں سے اڑنے والے پرند ہیں وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں میں اُمَمٌ سے ہر وہ نوع حیوان مراد ہے جو فطری اور تسخیری طور پر خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ مثلاً مکڑی جالا بنتی ہے اور سرفۃ (موریسپید تنکوں سے) اپنا گھر بناتی ہے اور چیونٹی ذخیرہ اندوزی میں لگی رہتی ہے اور چڑیا کبوتر وغیرہ وقتی غذا پر بھروسہ کرتے ہیں الغرض ہر نوع حیوان اپنی طبیعت اور فطرت کے مطابق ایک خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے اور آیت کریمہ:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (۲-۲۱۳) (پہلے تو سب) لوگ ایک امت تھے۔ کے معنی یہ ہیں کہ تمام لوگ صنف واحد اور ضلالت و کفر کے ہی مسلک پر گامزن تھے اور آیت کریمہ:-

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً (۵-۴۸)

اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ہی شریعت پر کر دیتا۔ میں أُمَّةً وَاحِدَةً سے وحدۃ بلحاظ ایمان مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:- وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ (۳-۱۰۴) کے معنی یہ ہیں کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو علم اور عمل صالح کا راستہ اختیار کرے اور دوسروں کے لئے اسوۂ بنے اور آیت کریمہ:

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَى أُمَّةٍ (۴۳-۲۲) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک متفقہ دین پر پایا ہے میں اُمَّةٍ کے معنی دین کے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] ع

(۲۵) وَهَلْ يَأْثَمَنْ ذُو أُمَّةٍ وَهُوَ طَائِعٌ (طویل)

بھلا کوئی متدین آدمی رضا اور رغبت سے گناہ کر سکتا ہے اور آیت کریمہ:۔ وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ (۱۲-۴۵) میں اُمَّةٍ کے معنی حین یعنی عرصہ دراز کے ہیں اور ایک قرأت میں بعد أَمَهٍ (بالهاء)[2] یعنی نسیان کے بعد جب اسے یاد آیا۔ اصل میں بَعْدَ أُمَّةٍ کے معنی ہیں ایک دور یا کسی ایک مذہب کے متبعین کا دور گذر جانے کے بعد اور آیت کریمہ:۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ (۱۶-۱۲۰)

کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم عبادت الٰہی میں ایک جماعت اور قوم کے بمنزلہ تھے[3] جس طرح کہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ فِي نَفْسِهِ قَبِيلَةٌ کہ فلاں بذات خود ایک قبیلہ ہے یعنی ایک قبیلہ کے قائم مقام ہے[4] وَرُوِيَ انه يحشر زيد بن عمرو ابن نفيل أمة وحده اور ایک روایت میں ہے کہ حشر کے دن زید بن عمرو بن نفیل اکیلا ہی امت ہوگا[5] اور آیت کریمہ:

---

[1] قاله النابغة وأوله: حلفت فلم اترك لنفسك ريبة .... والبيت من القصيدة التي يعتذر بها الى النعمان بن المنذر عما وشت به بنو قريع وهو في ديوانه من الستة ۱۹ واللسان والصحاح (امم) وذيل مجالس ثعلب ۱/۵۰ ومجاز القرآن لابي عبيدة ۔۔ مارقم ۲۰۲ ومختار الشعر الجاهلي (۱/۲۰۹) والبلدان (رسم: ثبتو) والعقد الثمين ۱۹ والمعاني والمشكل للقتبي ۴۳۶ وفي رواية المرتضى حلفت ..... وليس وراء الله للمرء مذهب - وهو الطبق لرواية الديوان (۲:۱۷)

[2] قرء بذالك ابن عباس وكان ابو الهيثم يقرء به ايضا انظر اللسان (امه) والنوادر لابي مسحل الاعرابي ۴۴۴ والفائق (۱/۲۷)

[3] رواه الطبراني وفي الحديث قصة والبزار باختصار عنه وفيه المسعودي وقد اختلط وبقية رجاله ثقات وابويعلى وكذا قال ابن مسعود في معاذ وقد ورد ذالك في حديث مرفوع راجع مجمع الزوائد ۹ ص ۴۱۷ ۔ ۴۱۸ و تخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم ۲۶۵ - ۲۶۶

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ۔ (۳-۱۱۳) وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں ان اہل کتاب میں کچھ لوگ (حکم خدا پر) قائم بھی ہیں۔

یں اُمَّةٌ بمعنی جماعت ہے زجاج[1] کے نزدیک یہاں قَائِمَةٌ بمعنی استقامت ہے یعنی ذو طَرِيْقَةٍ وَّاحِدَةٍ تو یہاں مضمر متروک ہے

اَلْاُمِّيُّ۔ وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ ہی کتاب میں سے پڑھ سکتا ہو چنانچہ آیت کریمہ:۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ (۶۲-۲) وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا۔

میں اُمِّيّٖنَ سے یہی مراد ہے قطرب[2] نے کہا ہے کہ اُمِّيَّةٌ بمعنی غفلت وجہالت کے ہے اور امی سے امی ہے کیونکہ اسے بھی معرفت نہیں ہوتی چنانچہ فرمایا:۔ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ (۲-۷۸) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی کتاب سے) واقف ہی نہیں ہیں۔

یہاں اِلَّآ اَمَانِيَّ کے معنی اِلَّا اَنْ يُّتْلٰى عَلَيْهِمْ کے ہیں یعنی مگر یہ کہ انہیں پڑھ کر سنا یا جائے۔ فَرَّاءُ[3] نے کہا ہے کہ اُمِّيُّوْنَ سے مراد وہ ہیں جو اہل کتاب نہ تھے اور آیت کریمہ:۔

اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (۷-۱۵۷) اور وہ جو (محمد) رسول (اللہ) نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

یں بعض نے کہا ہے کہ اُمِّيٌّ اس امت یعنی قوم کی طرف منسوب ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو جس طرح کہ عَامِّيٌّ اسے کہتے ہیں جو عوام جیسی صفات رکھتا ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ آنحضرت کو اُمِّيٌّ کہنا اس بنا پر ہے کہ آپ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھتے تھے۔ بلکہ وحی الٰہی کے بارے میں اپنے حافظہ اور (خدا کی اس ضمانت) پر کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (۸۷-۶) ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کروگے۔ اعتماد کرتے تھے یہ صفت آپ کے لئے باعث فضیلت تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ام القریٰ یعنی مکہ کی طرف نسبت ہے[4]

اَلْاِمَامُ وہ ہے جس کی اقتدا کی جائے خواہ وہ انسان ہو یا اس کے قول وفعل کی اقتدا کی جائے یا کتاب وغیرہ ہو اور خواہ وہ شخص جس کی پیروی کی جائے حق پر ہو یا باطل پر ہو اس کی جمع اَئِمَّةٌ

---

[1] ابو اسحاق ابراہیم بن السری بن سہل الزجاج توفی بین ۳۱۰ھ ۳۱۶ھ وکان من اشہر تلامیذ المبرد واستاذ الزجاجی ومن مؤلفاتہ معانی القرآن راجع نزہۃ الالباء ۳۰۸-۳۱۲ طبقات زبیدی ۲۴ تاریخ بغدادی ۶/۸۹-۹۳ ابن خلکان رقم ۱۲ والاعلام زرکلی [2] محمد بن المستنیر بن احمد ابو علی النحوی المعروف بقطرب (...-۲۰۶) اللغوی البصری مولیٰ سالم بن زیاد لازم سیبویہ وکان یدلج الیہ فسماہ قطرباً ای دویبۃ اللیل ۷ ومن تصانیفہ معانی القرآن وھو اول من وضع المثلث فی اللغۃ دوفیات الاعیان ۱/۴۹۴ وطبقات النحویین ۱۰۷ بغیۃ الوعاۃ ۱۰۴ الفہرست ۵۲ معجم المطبوعات ۱۵۱۷ نزہۃ الالباء ۱۱۹ [3] ابو زکریا یحییٰ بن زیاد الفراء (...-۲۰۷) روی عن الکسائی وطبقتہ صاحب التصانیف بغیۃ الوعاۃ ۴۱۱-۴۱۲ الفہرست ۱۰۰ ۱۳۰۷ والانباہ ۲/۱ ۱۰۹-۲۵۷ وتہذیب الادباء ۲/۷۰ ۴ اکشف الظنون ۲/۱۹۲۰ [4] نسب ہذا القول الی الامام الباقر (انظر روح المعانی صلح ۹)

(اَفْعِلَۃ) ہے اور آیت:۔
یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِہِمْ (۱۷-۷۱)
جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔ میں امام سے وہ شخص مراد ہے جس کی وہ اقتداء کرتے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ امام بمعنی کتاب ہے۔[1] اور آیت کریمہ:۔
وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا (۲۵-۷۴) اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے کہ یہ امام (مفرد) کی جمع ہے[2] اور دوسرے علماء کے نزدیک یہ دِرْعٌ دِلَاصٌ وَدُرُوْعٌ دِلَاصٌ کے باب سے ہے[3] (یعنی فِعَال مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے)۔ اور آیات:۔
وَنَجْعَلَہُمْ اَئِمَّۃً (۲۸-۵) اور ان کو پیشوا بنائیں
وَجَعَلْنَاہُمْ اَئِمَّۃً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ (۲۸-۴۱)
اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا تھا وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔
میں اَئِمَّۃٌ کا واحد امام ہے اور آیت:۔
کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنَاہُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (۳۶-۱۲)
اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن یعنی لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔
اَلْاَمُّ (ن) کے معنی ہیں سیدھا مقصد کی جانب متوجہ ہونا (اور کسی طرف مائل نہ ہونا) اور آیت کریمہ:۔
وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ (۵-۲) اور نہ ان لوگوں کی جو عزت والے گھر (یعنی بیت اللہ) کو جا رہے ہوں۔ میں آٰمِّیْنَ اسی پر محمول ہے:۔
اَمَّہٗ بمعنی شَجَّہٗ کسی کا سر پھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اصل معنی ام دماغ پر مارنا کے ہیں۔ جیسا کہ اہل عرب کسی عضو پر مارنے کے لئے اس سے فَعَلْتُہٗ کا صیغہ بنا لیتے ہیں جیسے رَأَسْتُہٗ، رَجَلْتُہٗ، کَبَدْتُہٗ، بَطَنْتُہٗ

(اَمْ حرف)

اَمْ۔ جب یہ ہمزہ استفہام کے بالمقابل استعمال ہو تو بمعنی او ہوتا ہے جیسے اَزَیْدٌ فِی الدَّارِ اَمْ عَمْرٌو۔ یعنی ان دونوں میں سے کون ہے؟ اور اگر ہمزہ استفہام کے بعد نہ آئے تو بمعنی بَلْ ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
اَمْ زَاغَتْ عَنْہُمُ الْاَبْصَارُ (۳۸-۶۳) (یا) ہماری آنکھیں ان (کی طرف) سے پھر گئی ہیں۔

(اَمَّا حرف)

اَمَّا۔ یہ کبھی حرف تفصیل ہوتا ہے) اور احد الشیئین کے معنی دیتا ہے اور کلام میں مکرر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اَمَّا اَحَدُکُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّہٗ خَمْرًا وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ (۱۲-۴۱) تم میں سے ایک (جو پہلا خواب بیان کرنے والا ہے وہ) تو اپنے آقا کو شراب پلایا کریگا اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا۔
اور کبھی ابتداء کلام کے لئے آتا ہے جیسے اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّہٗ کَذَا۔

(ا م د)

اَلْاَمَدُ۔ (موت۔ غایت) قرآن میں ہے:۔
تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَہَا وَبَیْنَہٗ اَمَدًا بَعِیْدًا (۳-۳۰) تو آرزو کریگا کہ کاش اس میں اور اس برائی

---

[1] قرارۃ الحسن بکتابہم (الکشاف ص۶۸۲) ج ۲ ؎ [2] کذا فی الصحاح وعند البعض جمع آم کصائم وصیام کذا فی لسان العرب والکشاف للزمخشری ص۲۹۶ ج ۳ ؎ [3] وقال الزمخشری اراد ائمۃ فاکتفی بالواحد لدلالۃ علی الجنس ولعدم اللبس ص۲۹۹ ج ۳۰ ؎

میں انتہائی بعد ہوتا۔

اَلْاَمَدُ وَالْاَبَدُ دونوں قریب المعنی ہیں لیکن اَبَدًا غیر متعین اور غیر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہذا اَبَدًا كَذَا (اتنی مدت) کا محاورہ صحیح نہیں ہے اور اَمَدٌ غیر معین مگر محدود زمانہ کے معنی دیتاہے لہذا اَمَدُ كَذَا (اتنی مدت) کہنا صحیح ہے جس طرح کہ زمان کذا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ زَمَانٌ اور اَمَدٌ کے لفظ میں صرف اتنا فرق ہے کہ اَمَدٌ کا لفظ کسی مدت کی نہایت اور غایت کے لئے بولا جاتا ہے اور زمان کا لفظ کسی مدت کے مبدأ اور غایت کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی بنا پر بعض نے کہا ہے اَلْمَدَى وَالْاَمَدُ دونوں قریب المعنی ہیں (یعنی کسی چیز کی موت کی غایت بیان کرنے کے لئے آتے ہیں)

(ا م ر)

اَلْاَمْرُ (اسم) کے معنی شان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع اُمُوْرٌ ہے اور اَمَرْتُهٗ (ن) کا مصدر بھی اَمْرٌ آتا ہے جس کے معنی حکم دینا کے ہیں اَمْرٌ کا لفظ جملہ اقوال وافعال کے لئے عام ہے۔ چنانچہ آیات:۔

وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (۱۱-۱۲۳) اور تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (۳-۱۵۴) تم کہدو کہ بیشک سب باتیں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ یہ لوگ (بہت سی باتیں) دلوں میں مخفی رکھتے تھے جو تم پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی۔ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (۲-۲۷۵) اور (قیامت میں) اس کا معاملہ خدا کے سپرد۔ میں امر سے یہی معنی مراد ہیں۔

اور کبھی امر بمعنی ابداع بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷-۵۴)، دیکھو خلق اسی کے اختیار میں ہے اور ابداع بھی۔ اور امر بایں معنی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی مخلوق اس معنی میں اس کے ساتھ شریک نہیں اور آیت:۔

وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا۔ (۴۱-۱۲) اور ہر آسمان میں اس (کے امر) کا حکم بھیجا۔ میں بھی امر اسی معنی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور حکمائے امت نے آیت کریمہ:۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ۔ (۱۷-۸۵) کہدو کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔ میں بھی اَمْرِ رَبِّيْ۔ کے معنی اِبْدَاعِهٖ کئے ہیں[1] اور آیت کریمہ:۔ وَاِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۱۶-۴۰) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو (ہماری) بات یہی ہے کہ اس

---

[1] وفیہ لغۃ أیما وہو حرف شرط وتفصیل وتوکید ولزمت الفاء بعدہا وقد تحذف الفاء للضرورۃ والدیات التی بغیر فاء کما فی (۴۳: ۱۰۹) و (۵۴-۳۱) فہنا کہ یقدر لفظۃ فیقال راجع للبحث المغنی ج ۱ ص ۵۷۔ وقد یأتی للتوکید والشرط والفصل بین اما والفاء بواحد من امور ستۃ (۱) المبتدأ (۲) الخبر (۳) جملۃ الشرط (۴) اسم منصوب لفظا او محلا بالجواب کما فی سورۃ الضحٰی ۹-۱۰-۱۱ (۵) اسم منصوب معمول لمحذوف یفسرہ بعد الفاء (۶) ظرف معمول لاما راجع المغنی ج ۱ ص ۵۹-۶۰ والرضی علی الکافیۃ ج ۲ ص ۳۹۵-۴۰۰) وفیہ وقد یحذف کما فی نحو وثیابک فطہر والرجز فاہجر الآیۃ

کو کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ یہیں بھی امر اِبْدَاعِیْ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور کسی کام کو سرانجام دینے کے لئے باری تعالیٰ کی طرف سے جو اہتمام ہوتا ہے اسے نہایت اختصار اور بلاغت سے اس آیت میں بیان فرمادیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:۔ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ (۵۴-۵۰) اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے۔ میں بھی سرعت ایجاد سے کنایہ ہے اور عالم میں ایجاد و تکوین کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی تیز رفتاری کو بتانے کے لئے ایسا بلیغ طریقہ اختیار کیا ہے جو ہماری قوت واہمہ سے بھی بلند ہے اور امر بمعنی المتقدم بالشیٔ (یعنی حکم دینا) عام ہے کہ بصیغہ امر ہو یا بلفظ خبر ہو جیسے فرمایا:۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ (۲-۲۲۸) اور طلاق والی عورتیں اپنے تئیں روکے رکھیں۔ اور یا بطریق اشارہ وغیرہ ہو چنانچہ آیت کریمہ:۔ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (۳۷-۱۰۲) میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے انہوں نے کہا ابا جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجئے۔

پس حضرت ابراہیم کا خواب میں اپنے بچے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھنے کو امر (مَا تُؤْمَرُ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (۱۱-۹۷) اور فرعون کا معاملہ درست نہیں تھا۔ میں امر کا لفظ فرعون کے جملہ اقوال اور افعال کو شامل ہے اور آیت کریمہ:۔ اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ (۱۶-۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آہی پہنچا۔ میں امر سے مراد قیامت ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ عام لفظ استعمال کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا (۱۲-۱۸) بلکہ تمہارے لئے تمہارے دلوں نے بات کو خوشنما بنا لیا ہے۔ میں اَمْرًا سے مراد یہ ہے کہ یہ ان برے کاموں سے ہے جن پر نفس امارہ انسان کو اکساتا رہتا ہے۔

اَمِرَ (س) القَوْمُ کے معنی ہیں قوم زیادہ ہو گئی کیونکہ آبادی بڑھ جائے تو امیر (حاکم) کا تقرر ضروری ہو جاتا ہے جس کے بغیر انتظام صحیح نہیں رہ سکتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ع (البسیط)

(۲۶) لَا يَصْلُحُ النَّاسُ فَوْضٰى لَا سَرَاةَ لَهُمْ

جس قوم کا رئیس نہ ہو اس کا معاملہ درست نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا امر بمعنی کثرت استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ:۔ اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا (۱۷-۱۶) (تو) وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو حکم دیا۔ میں امر بمعنی حکم ہے یعنی ہم انہیں اطاعت الٰہی کا حکم دیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَمَرْنَا بمعنی کثرنا ہے یعنی وہاں کے خوشحال لوگوں کو بڑھا

لہ قالہ الافوہ الاودی واسمہ صلاءۃ بن عمرو ویکنی ابا ربیعہ والبیت فی العقد ۱: ۱۰/۳۴۳ والسمط (: ۲۷۰) واللالی (۲: ۷۲۲) قال الاستاذ المیمنی والبیت من کلمتہ، ایضا فی نسخۃ دیوان الافوہ (الطرائف ۹-۱۰) ولا توجد کاملۃ فی الکتب المعروفۃ وبعضہا فی آخر دیوان ابی الاسود صنعۃ السکری قال وقد زعم لی بعض الرواۃ انہا للافوہ اصر والبیت فی جمہرۃ المعانی (۱۲) ۱۹-۱۳۰) والشعراء ۱۷۵ وابن الحدید ۴: ۵۲۱ والصحاح واللسان (فوض) والمزہر (۱: ۱۴۴) والنوادر (۱: ۲۹۸) وروضۃ العقلاء ۲۷۴ والبیت ثالث ثلاثۃ للافوہ التی ذکرہا المؤلف (ص و ص ۳۵۵)

دیتے ہیں۔
ابو عمرو کا قول ہے کہ معنی کثرت کے لئے اَمَرْتُ (مجرد) نہیں آتا بلکہ اٰمَرْتُ (تفعیل) وَ اٰمَرْتُ استعمال ہوتا ہے لیکن ابو عبیدہ کا قول ہے[1] کہ کبھی اس معنی کے لئے اَمَرْتُ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے جیساکہ حدیث میں ہے[2]۔ (۱۴) خَیْرُ الْمَالِ مُهْرَةٌ مَأْمُوْرَةٌ وَسِكَّةٌ مَأْبُوْرَةٌ کہ بہتر مال پرورش کیا ہوا بچھیرا اور پیوند کئے کھجور کے درخت ہیں تو مَأْمُوْرَةٌ اَمَرْتُ سے ہے ایک قرأت میں اٰمَرْنَا ہے جس کے معنی ہیں:۔ ہم ان کو امراء بنا دیتے ہیں جیساکہ دوسری آیت میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا۔ کہ ہم نے اس کے اکابر کو مجرم بنا دیا تاکہ اس میں مکر و فریب کریں (۶-۱۲۳) اور ایک قرأت میں اَمَّرْنَا بمعنی اَكْثَرْنَا بھی ثابت ہے[3]
اَلْاِئْتِمَارُ کے اصل معنی حکم بجا لانا کے ہیں اور تَشَاوُرٌ یعنی باہم مشورہ کرنے کو بھی اِئْتِمَار کہا جاتا ہے۔ کیونکہ مشورہ میں بھی ایک دوسرے کے حکم کو قبول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ شہر کے رئیس تمہارے بارے میں صلاح مشورے کرتے ہیں (۲۸-۲۰) اور شاعر نے کہا ہے ع[4]

(۲۷) اٰمَرْتُ نَفْسِيْ اَيَّ اَمْرٍ اَفْعَلُ
میں نے اپنے جی میں سوچا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔
اور آیت کریمہ:۔
لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا یہ تو آپ نے بڑی ناپسندیدہ بات کی (۱۸-۷۱) میں اِمر بمعنی منکر ہے اور یہ اَمِرَ الْاَمْرُ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی کسی معاملہ کے حد سے بڑھ جانے کے ہیں جس طرح کہ اِسْتَفْحَلَ الْاَمْرُ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:۔ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۴-۵۹)، اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں۔ میں بعض کے نزدیک عہد نبوی کے امراء مراد ہیں۔ اور بعض آئمہ اہل بیت مراد لیتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اولی الامر کے معنی اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کے ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس سے وہ فقہاء اور اہل علم مراد ہیں۔ جو احکام الٰہی کے فرمانبردار ہوں اور یہ سبھی اقوال صحیح ہیں کیونکہ اولی الامر جو لوگوں کو برائی سے روکتے ہیں چار قسم پر ہیں (۱) انبیاء جن کا حکم عوام و خواص کے ظاہر و باطن پر نافذ ہوتا ہے (۲) حکام جن کا صرف لوگوں کی ظاہری حالت پر جاری ہو سکتا ہے۔ دلوں پر ان کی حکومت نہیں ہوتی (۳) حکماء خواص کے دلوں پر حکومت کرتے

---

[1] انظر لقول ابی عبیدۃ فی مجازہ ج ۱ ص ۲-۳۷۲-۳۷۳ واللسان (امر) ثم القراءۃ بالتخفیف مرویۃ عن الصحابۃ والتابعین الا الحسن فانہ [illegible] وتبعہ ابو عبیدۃ فی مجازہ عن ابی العالیۃ الریاحی آمَّرْنا بالتشدید ورویت عن علیؓ ۱۲) [2] راجع للحدیث الفائق ۱: ۳۰۰ والنہایۃ ۱/۱۱ واللآلی ۸ ۳۱ والحدیث اخرجہ ابن کثیر من مسند احمد (حم طب) عن سوید بن ہبیرۃ والماوردی فی ادب الدنیا والدین ۳۶۷ مع شرح المنہاج وبمعنی انظر البیان ۲/۱۰ والعیون والمستقصی والثعالبی ۲/۴ ۲۰ و ۲۱۰ والالفاظ ۲ و ۳۸۳ و اللسان (امر) وراجع ایضا ذیل تفسیر الکشاف ۲/۵۵۶ وفیہ التخریج قال البکری وحمل الحدیث علی ہذہ اللغۃ الفصیحۃ اولی من حملہ علی الاتباع
[3] ہی قراءۃ شاذۃ عن ابی عثمان النہدی والليث عن ابی عمرو وابان عن عاصم انظر القراءات الشاذۃ لابن خالویہ ۷۵ [4] قالہ کعب بن زہیر وصدرہ:۔ انحنت قلوصی وکتلات بعینہا، راجع السمط (۱: ۲۰۰) واللسان (کلا) ودیوانہ والبحر (۶: ۱۹) وفی روایتہم جمیعا اتی امری بدل ای امر۔

ہیں (۴) وعاظ جن کا حکم صرف عوام کے قلب وضمیر پر ہی جاری ہو سکتا ہے[1]۔

(ا م ن)

اَلْاَمْنُ۔ اصل میں امن کا معنی نفس کے مطمئن ہونا کے ہیں۔ اَمْنٌ، اَمَانَۃٌ اور اَمَانٌ یہ سب اصل میں مصدر ہیں اور امان کے معنی کبھی حالت امن کے آتے ہیں اور کبھی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی کے پاس بطور امانت رکھی جائے۔ قرآن میں ہے:۔ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِکُمْ (۸-۲۷) یعنی وہ چیزیں جن پر تم امین مقرر کئے گئے ہو ان میں خیانت نہ کرو۔ اور آیت کریمہ:۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہم نے (بار) امانت آسمان اور زمین پر پیش کیا (۳۳-۷۲) کی تفسیر میں بعض نے "عدل وانصاف" مراد لیا ہے۔ بعض نے حروف تہجی اور بعض نے عقل مراد لی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ معرفت توحید عدل وانصاف کا قیام اور حروف تہجی کی معرفت عقل کے بغیر ممکن نہیں۔ بلکہ انسان کے لئے علوم ممکنہ کی تحصیل اور افعال حسنہ کی سرانجام دہی عقل کے بغیر مشکل ہے۔ اور عقل کے باعث ہی انسان کو اکثر مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا اور جو شخص اس (مبارک گھر) میں داخل ہوا اس نے امن پا لیا (۳-۹۷) میں امن پانے سے مراد دوزخ کی آگ سے بےخوف ہونا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے۔ کہ ان دنیوی مصائب سے بے خوف ہونا مراد ہے جو اُن لوگوں کو پہنچتے ہیں جن کے بارے میں اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ خدا چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے (۹-۵۵) ارشاد فرمایا ہے اور نہ زیر بحث آیت میں خبر بمعنی انشاء ہے یعنی جو شخص حرم میں داخل ہو اسے امن دیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ ہلاکت سے بے خوف ہونا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اسے پر امن رہنے دیا جائے جیسے محاورہ ہے ھٰذَا حَلَالٌ وَھٰذَا حَرَامٌ یعنی اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور دوسری حرام ہے لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ مجرم جب تک حرم کے اندر ہے نہ اس سے قصاص لیا جائے اور نہ ہی کسی جرم میں اسے قتل کیا جائے[2] اسی طرح آیت:۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے (۲۹-۶۷) اور آیت وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا (۲-۱۲۵) میں بھی امن کے یہی معنی مراد ہو سکتے ہیں اور آیت کریمہ:۔ اَمَنَۃً نُّعَاسًا (یعنی) نیند (نازل فرمائی) (۳-۱۵۴) میں اَمَنَۃً بمعنی امن ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کَتَبَۃٌ کی طرح اٰمِنٌ کی جمع ہے نزول مسیح والی حدیث میں ہے[3]۔ (۱۵) وَتَقَعُ

---

[1] لم یذکر لعبدہ (رام س) ولام (ل) (راجع الاستدراک [2] کما روی عن عمر رضی اللہ عنہ لو ظفرت فیہ بقاتل الخطاب ما مسستہ حتی یخرج منہ (راجع الکشاف ج ۱ ص ۳۸۹ - [3] والحدیث باختلاف الفاظہ رواہ ابن حبان واصحاب السنن الاربعۃ والشیخان والبیہقی فی الاسماء والصفات وانظر تخریجہ ابن کثیر ۱/ ۵۷۸ و ۵۸۳ وللشوکانی رسالۃ سماہا التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر والدجال والمسیح ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

الْاَمَنَةُ فِی الْاَرْضِ اور زمین میں امن قائم ہو جائیگا اور آیت کریمہ:۔

ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ۔ پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچادو (۹ - ۶) میں مَاْمَنَ ظرف ہے جس کے معنی "جائے امن" کے ہیں۔

'اٰمَنَ' (افعال) دو طرح سے استعمال ہوتا ہے (۱) متعدی بنفسہٖ۔ جیسے 'اٰمَنْتُهٗ' (میں نے اسے امن دیا) اور اسی معنی کے اعتبار سے اسماء حسنیٰ میں مُؤْمِنٌ آیا ہے۔

(۲) لازم جس کے معنی ہیں پرامن ہونے والا۔

اَلْاِیْمَانُ کے ایک معنی شریعت محمدیؐ کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ :۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئُوْنَ۔ اور جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (۲ - ۶۲) میں اٰمَنُوْا کے یہی معنی ہیں اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہوسکتا ہے جو توحید و نبوۃ کا اقرار کر کے شریعت محمدی میں داخل ہو جائے اور بعض نے آیت وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔ اور ان میں سے اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں (۱۲ - ۱۰۶) کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

۲۔ اور کبھی ایمان کا لفظ بطور مدح استعمال ہوتا ہے اور اس سے "حق کی تصدیق کر کے اس کا فرمانبردار ہو جانا" مراد ہوتا ہے اور یہ چیز تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالجوارح سے حاصل ہوتی ہے اس لئے فرمایا:۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ (۵۷ - ۱۹) اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے ہیں۔ وہی صدیق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اعتقاد، قول صدق اور عمل صالح میں سے ہر ایک کو ایمان کہا گیا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ۔ اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یوں ہی کھو دے (۲ - ۱۴۳) میں ایمان سے مراد نماز ہے اور (۱۶) آنحضرتؐ نے حیا اور راستہ سے تکلیف کے دور کرنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور حدیث جبریل میں آنحضرت نے چھ باتوں کو کو اصل ایمان کہا ہے[۱] اور آیت کریمہ:۔

وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ اور آپ ہماری بات گو گو ہم سچ ہی کہتے ہوں باور نہیں کریں گے (۱۲ - ۱۷)

میں مُؤْمِن بمعنی مصدق ہے۔ لیکن ایمان اس تصدیق کو کہتے ہیں جس سے اطمینان قلب حاصل ہو جائے اور تردد جاتا رہے اور آیت کریمہ:۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔ (۴ - ۵۱) میں ان کی مذمت کی ہے کہ وہ ان چیزوں سے امن و اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں جو باعث امن نہیں ہوسکتیں کیونکہ انسان فطری طور پر کبھی بھی باطل

---

[۱] حدیث شعب الایمان فی الصحیحین مرفوعًا عن ابی ہریرۃ : الایمان بضع وسبعون شعبۃ اعلاھا قول لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان والحدیث ایضًا فی ابی داؤد وابن ماجۃ والنسائی وحدیث جبریل مروی فی الصحیحین عن عمر بن الخطاب وفیہ : ان تؤمن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ

پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ تو یہاں يُؤْمِنُوْنَ کا لفظ ایسے ہی (بطور طنز کے ہے جس طرح آیت: - مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللهِ (بلکہ) وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے (۱۶-۱۰۶) میں کفر کے ساتھ شرح صدر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو یہ اِنَّمَا تُهُ الْكُفْرَ وَتَحِيَّتُهُ الضَّرْبُ کے قبیل سے ہے۔ رَجُلٌ اُمَنَةٌ وَاُمْنَةٌ ہر ایک پر اعتماد کرنے والا۔ رَجُلٌ اَمِيْنٌ وَاَمَانٌ امانتدار آدمی۔ اَلْاَمُوْنُ۔ وہ اونٹنی جس کے تھک جانے اور لغزش کھانے سے سوار بے خوف ہو۔

آمِيْن۔ یہ ممدود اور مقصور دونوں طرح بولا جاتا ہے اور صَهْ وَمَهْ کی طرح اسم فعل ہے[1] جن کے نزدیک آمین بمعنی استجب ہے یعنی میری دعا قبول فرما اور اَمَّنَ (تفعیل) کے معنی آمین کہنے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آمین اسماء حسنیٰ سے ہے[2]۔ ابو علی الفسوی فرماتے ہیں[3] کہ اسم الہٰی کہنے سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ بمعنی اِسْتَجِبْ کے ہے اور ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔

اور آیت کریمہ: - اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ اللَّيْلِ (بھلا مشرک اچھا ہے) یا وہ شخص جو رات کے وقتوں میں ... عبادت کرتا ہے (۳۹-۹) میں اَمَّنْ اصل میں اَمْ مَنْ ہے اور ایک قرأت میں اَمَنْ ہے۔ بہرحال اس کا تعلق اس مادہ سے نہیں ہے۔

(اِنَّ حرف)

اِنَّ وَاَنَّ (حرف) یہ دونوں اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں[4] اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اِنَّ جملہ مستقل پر آتا ہے اور اَنَّ کا ما بعد ایسے مفرد کے حکم میں ہوتا ہے جو اسم مرفوع، منصوب اور مجرور کی جگہ پر واقع ہوتا ہے جیسے اَعْجَبَنِيْ اَنَّكَ تَخْرُجُ وَعَجِبْتُ اَنَّكَ تَخْرُجُ اور تَعَجَّبْتُ مِنْ اَنَّكَ تَخْرُجُ جب اِنَّ کے بعد ما (کافہ) آجائے تو یہ عمل نہیں کرتا اور (کلمہ حصر کے معنی دیتا ہے۔ فرمایا: - اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ۔ مشرک تو پلید ہیں (۹-۲۸) یعنی نجاست تامہ تو مشرکین کے ساتھ مختص ہے۔ نیز فرمایا: - اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو ... حرام کر دیا ہے (۲-۱۷۳) یعنی مذکورہ اشیاء کے سوا اور کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا اس میں تنبیہ ہے کہ مطعومات میں سے جو چیزیں اصول شریعت میں حرام ہیں ان میں سے

---

[1] راجع للبحث من کلمۃ آمین الرضی علی الکافیہ ۶۷ ج ۲ القرطبین ۹۹-۱۰۰ (وزن آمین: المسائل الحلبیہ ص ۸ [2] وفی ابن کثیر ۱: ۳۱ وحکی القرطبی عن مجاہد وجعفر الصادق وبلال بن یساف ان آمین اسم من اسماء اللہ تعالیٰ قال وروی عن ابن عباس مرفوعا ولا یصح قالہ ابوبکر ابن العربی المالکی بل روی ابن مردویہ عن ابی ہریرۃ مرفوعاً آمین خاتم رب العلمین وفی الدعاء لابن ابی شیبۃ ان جبریل لقن رسول اللہ وقال قل آمین فقال آمین واختلف الفقہاء فی انہ یستحب برفع الصوت ام باخفائہ راجع کتب الخلاف [3] ابو علی الحسن بن احمد (ابو محمد) بن عبد الغفار الفسوی الفارسی الشیرازی (۲۸۸-۳۷۷) من تلامذۃ السراج والزجاج صاحب التصانیف الشہیرۃ انظر الفہرست ۶۴ ونزہۃ الالباء ۳۸۷ تاریخ بغداد ۷/۲۷۵ ابن خلکان ۱۳۵ الارشاد ولیا قوت ۳: ۹-۲۲ والکامل لابن اثیر ۹=۳۶ شذرات ۳/۸۸-۸۹ بغیہ ۲۱۶ [4] تحقیق نفیس فی الفرق بینہما الروض الانف ج ۲ ص ۳۱۴ بحث انما۔ بدائع الفوائد لابن القیم ص ۱۰۲ علۃ تخفیف النون فی اشہد ان لاالٰہ وتشدیدہا فی وان محمداً (ازاہیر الریاض المریعۃ للبیہقی فی اللغۃ ۱۹

یہ چیزیں سب سے بڑھ کر ہیں۔

(اَنْ)

یہ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) اَنْ مصدریہ۔ یہ ماضی اور مضارع دونوں پر داخل ہوتا ہے اور اس کا مابعد تاویل مصدر میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مضارع کو نصب دیتا ہے جیسے:۔
اَعْجَبَنِیْ اَنْ تَخْرُجَ وَ اَنْ خَرَجْتَ۔

۲۔ اَنْ المخففہ مِنَ المثقلۃ یعنی وہ اَنّ جو ثقیلہ سے خفیفہ کر لیا گیا ہو یہ کسی شے کی تحقیق اور ثبوت کے معنی دیتا ہے جیسے:۔ اَعْجَبَنِیْ اَنْ زَیْدٌ مُنْطَلِقٌ

۳۔ اَنْ (زائدہ) جو لَمَّا کی توکید کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا فَلَمَّا اَنْ جَاءَ الْبَشِیْرُ جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا (۱۲-۹۲)

۴۔ اَنْ مفسرہ۔ یہ ہمیشہ اس فعل کے بعد آتا ہے جو قول کے معنی پر مشتمل ہو (خواہ وہ لفظاً ہو یا معنیً) جیسے فرمایا:۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا اور ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو (۳۸-۶) یہاں اَنِ امْشُوْا، قَالُوْا کے معنی کو متضمن ہے[1]

اِنْ

اَنْ کی طرح یہ بھی چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ اِنْ شرطیہ جیسے فرمایا:۔
اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں (۵-۱۱۸)

۲۔ اِنْ مخففہ جو اِنَّ ثقیلہ سے مخفف ہوتا ہے (یہ تاکید کے معنی دیتا ہے اور) اس کے بعد لام (مفتوح) کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا:۔
اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا (تو) یہ ضرور ہم کو بہکا دیتا (۲۵-۴۲)

۳۔ اِنْ نافیہ اس کے بعد اکثر اِلَّا آتا ہے[2] جیسے فرمایا:۔ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا ... ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں (۴۵-۳۲)
اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (پھر بولا) یہ (خدا کا کلام نہیں بلکہ) بشر کا کلام ہے (۷۴-۲۵)
اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا (کر دیوانہ کر) دیا ہے (۱۱-۵۴)

۴۔ اِنْ (زائدہ) جو (ما) نافیہ کی تاکید کے لئے آتا ہے جیسے: مَا اِنْ يَّخْرُجُ زَيْدٌ۔ زید باہر نہیں نکلے گا۔

(ا ن ث)

اَلْاُنْثٰى (مادہ) یہ ذَكَرٌ یعنی نر کی ضد ہے اصل میں انثیٰ و ذکر عورت اور مرد کی شرمگاہوں کے نام ہیں پھر اس معنی کے لحاظ سے (مجازاً) یہ دونوں نر اور مادہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ جو نیک کام کریگا مرد ہو یا عورت (۴-۱۲۴)
اور چونکہ تمام حیوانات میں مادہ بنسبت نر کے کمزور ہوتی ہے لہذا اس میں معنی ضعف کا اعتبار کرکے ہر ضعیف الاثر چیز کو اُنثیٰ کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ کمزور لوہے کو حَدِيْدٌ اَنِيْثٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[3] ع

(۲۸) ...... عِنْدِیْ ؛ جراز لا افل ولا انیث

---

[1] راجع المغنی ج ۱ ص ۲۴-۳۵ وبحث اَنْ ۱۷-۲۴ [2] ایضاً [3] تصحیح الفیۃ وادل: فیعلمہ بان العقل ... ۔ والبیت فی اللسان (انث) والبحر (۳: ۵۲۳) والاقتضاب ۵۴ وقبلہ: ولیت مبلغا یاتی بقولی ۔ نقار ابی المثلم لا بریث

میرے پاس شمشیر براں ہے جو کند اور کمزور نہیں ہے۔ اور انثیٰ (مادہ) کے ساتھ تشبیہ دیکر نرم اور زرخیز زمین کو بھی ارض انیث کہہ دیا جاتا ہے یہ تشبیہ یا تو محض نرمی کے اعتبار سے ہے۔ اور یا عمدہ اور پیداوار دینے کے اعتبار سے اسے انیث کہا گیا ہے جیساکہ زمین کو عمدہ اور پیداوار کے اعتبار سے حُرْۃ اور ذلُول کہا جاتا ہے۔

پھر بعض اشیاء کو لفظوں میں مذکر کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کے لئے صیغہ مذکر استعمال کیا جاتا ہے اور بعض کو مؤنث کے ساتھ تشبیہ دے کر صیغہ تانیث استعمال کرتے ہیں جیسے۔ یَدٌ۔ اُذُنٌ اور خُصْیَۃٌ چنانچہ خصیتین پر تانیث لفظی کی وجہ سے انثیین کا لفظ بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (ع وافر)

(۲۹) وَمَا ذَکَرٌ وَاِنْ یَسْمَنْ فَاُنْثٰی

اور کونسا مذکر ہے کہ اگر وہ موٹا ہو جائے تو مؤنث ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد قُراد یعنی چیچڑ ہے کہ جب وہ بڑھ کر خوب موٹا ہو جاتا ہے تو اسے حَلَمَۃٌ بلفظ مؤنث کہا جاتا ہے اسی طرح آیت کریمہ۔ وَاِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا (۴-۱۱۷) وہ خدا کے سوا جن کی بھی پرستش کرتے ہیں وہ مادہ ہیں۔ میں اِنَاثٌ، اُنْثٰی کی جمع ہے) بعض مفسرین نے احکام لفظیہ کا اعتبار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کو جن اسماء سے پکارتے تھے جیسے لات، عزیٰ، منات الثالثہ یہ سب مؤنث ہیں اس لئے قرآن نے اناث کہہ کر پکارا[2] ہے۔ اور بعض نے معنی کا اعتبار کیا ہے اور کہا ہے کہ ہر منفعل اور ضعیف چیز کو انیث کہا جاتا ہے جیسے کمزور لوہے پر انیث کا لفظ بولتے ہیں اسکی تفصیل یہ ہے کہ موجودات کی باہمی نسبت کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں ۱۔ فاعل غیر منفعل، یہ صفت صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔

۲۔ منفعل غیر فاعل یہ خاصہ جمادات کا ہے۔

۳۔ ایک اعتبار سے فاعل اور دوسرے اعتبار سے منفعل جیسے جن و انس اور ملائکہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے منفعل اور اپنی مصنوعات کے لحاظ سے فاعل ہے اور چونکہ ان کے معبود جمادات کی قسم سے تھے جو منفعل محض ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں اناث کہہ کر پکارا ہے اور اس سے ان کی اعتقادی جہالت پر تنبیہ کی ہے کہ جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں نہ عقل ہے نہ سمجھ، نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں بلکہ کسی حیثیت سے بھی کوئی کام سرانجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (توحید کی طرف دعوت کے سلسلہ میں) اپنے باپ سے کہا۔

---

[1] وفی التنبیہ للبکری قالہ بیاض والبیت فی المخصص (۱۶ : ۱۰۲) والمفضلیات لشرح ابن الانباری ۔ ۲۷۰ واللسان والصحاح (فرس) غیر منسوب والاقتضاب ۸ ام وفی روایتہم جمیعا وان یکبر بدل وان یسمن وہو الصواب راجع السمط (۱ : ۱۷۵) وتمامہ : شدید الازم لیس بذی ضروس نقال البکری وکذا انشدہ ابو علی الفارسی وفی روایۃ لیس لہ ضروس والصواب الاول قالہ ابن البری وراجع حواشی الصحاح والتنبیہ للبکری ۳۰ والمزہر (۱ : ۲۷۵) وشرح ابیات الایضاح للشنتری ۷۴ آ (مخطوط) والمعانی للقتبی ۴۴۲ وبعدہ : اناوجدنا بن سلمۃ بمنزلۃ مثل القراد علی حالیہ فی الناس وبعدہ ابیات لغزفی الشطرنج [2] چنانچہ حسن سے مروی ہے : لم یکن حیٌّ من احیاء العرب الا ولہم صنم یعبدونہ یسمونہ انثی بنی فلان الکشاف

يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا (۱۹-۴۲) کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں لیکن آیت کریمہ:۔ وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا (۴۳-۱۹) اور انہوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں (مادہ خدا کی بیٹیاں) بنا دیا میں ملائکہ کو اناث قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

(ا ن س)

اَلْاِنْسُ یہ جن کی ضد ہے اور (اُنْسٌ (بضمہ الہمزہ) نُفُوْرٌ کی ضد ہے اور اِنْسِیٌّ۔ اِنْسٌ کی طرف منسوب ہے اور اِنْسِیٌّ اسے کہا جاتا ہے۔ جو بہت زیادہ مانوس ہو اور ہر وہ چیز جس سے اُنس کیا جائے اسے بھی اِنْسِیٌّ کہدیتے ہیں اور جانور یا کمان کی وہ جانب جو سوار یا کمانچی کی طرف ہو اسے اِنْسِیٌّ کہا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل دوسری جانب کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں اِنْسٌ کی جمع اَنَاسِیُّ ہے قرآن میں ہے:۔ وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا (۲۵-۴۹) بہت سے (چوپایوں) اور آدمیوں کو۔ اور نفس انسانی کو اِبْنُ اِنْسِكَ کہا جاتا ہے۔

آنَسَ (افعال) کے معنی کسی چیز سے انس پانا یا دیکھنا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا (۴-۶) اگر ان میں عقل کی پختگی دیکھو۔ آنَسْتُ نَارًا (۲۷-۷) میں نے آگ دیکھی۔

اور آیت کریمہ:۔ حَتّٰی تَسْتَأْنِسُوا (۲۴-۲۷) کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم ان سے اجازت لے کر انس پیدا نہ کر لو۔

اَلْاِنْسَانُ۔ انسان چونکہ فطرۃ ہی کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ اس کی زندگی کا مزاج باہم انس اور میل جول کے بغیر نہیں بن سکتا اس لئے اسے انسان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان طبعی طور پر متمدن واقع ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آپس میں میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اکیلا ضروریات زندگی کا انتظام کر سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اسے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اسی سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے انسان کہا جاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ انسان اصل میں اِنْسِیَانٌ بروزن اِفْعِلَانٌ ہے اور (انسان) چونکہ اپنے عہد کو بھول گیا تھا اس لئے اسے انسان کہا گیا ہے۔

(ا ن ف)

اَلْاَنْفُ اصل میں اَنْفٌ بمعنی ناک[1] ہے۔ مجازاً کسی چیز کے سرے اور اس کے بلند تر حصہ کو بھی اَنْفٌ کہا جاتا ہے چنانچہ پہاڑ کی چوٹی کو اَنْفُ الْجَبَلِ اور کنارہ ریش کو اَنْفُ اللِّحْيَةِ کہدیتے ہیں۔ اور حمیت وغضب اور عزت وذلت کو انف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[2] ع

(۳۰) إِذَا غَضِبَتْ تِلْكَ الْأُنُوفُ لَمْ أُرْضِهَا
وَلَمْ أَطْلُبِ الْعُتْبٰى وَلٰكِنْ أَزِيدُهَا

اور جب وہ ناراض ہوں گے تو میں انہیں راضی نہیں کروں گا۔ بلکہ ان کی ناراضگی کو اور بڑھاؤں گا۔

---

[1] وفی القرآن:۔ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ (۵-۴۵) ؂

اور متکبر کے متعلق کہا جاتا ہے۔ شَمَخَ فُلَانٌ بِاَنْفِہٖ فلاں نے ناک چڑھائی یعنی تکبر کیا۔
تَرِبَ اَنْفُہٗ وہ ذلیل ہو۔
اَنِفَ فُلَانٌ مِنْ کَذَا کسی بات کو باعث عار سمجھنا
اَنَفْتُہٗ اس کی ناک پر مارا۔ اور اَنَفَۃٌ بمعنی حمیت بھی آتا ہے۔
اِسْتَاْنَفْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی شے کے سرے اور مبدأ کو پکڑنے (اور اس کا آغاز کرنے کے ہیں) اور اسی سے ارشاد ہے۔ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا (۴۷-۱۶) انہوں نے ابھی (شروع میں) کیا کہا تھا؟

(ا ن م ل)

آیت کریمہ :۔
عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ (۳-۱۱۹)
(تو) تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں میں اَنَامِلُ اَنْمُلَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی انگلی کے اوپر کے پورے کے ہیں جس میں ناخن ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ مُؤَنْمَلُ الْاَصَابِعِ فلاں کی انگلیوں کے پور غلیظ اور چھوٹے ہیں۔ اس میں ہمزہ زائدہ ہے کیونکہ نَمِلُ الْاَصَابِعِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے صرف لفظی مناسبت کی وجہ سے ہم نے یہاں کر دیا ہے۔

(اَنّٰی)

اَنّٰی۔ یہ حالت اور جگہ دونوں کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اس لئے بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی اَیْنَ اور کَیْفَ۔ کے آتا ہے پس آیت کریمہ :۔ اَنّٰی لَکِ ھٰذَا (۳-۳۷) کے معنی یہ ہیں کہ کھانا تجھے کہاں سے ملتا ہے۔

(اَنَا)

ضمیر واحد متکلم ہے ایک لغت میں وصل کے وقت اس کا الف حذف کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ :۔
لٰکِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ (۱۸-۳۸) مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ خدا ہی میرا پروردگار ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ لٰکِنَّا اصل میں لٰکِنْ اَنَا ہے اَنَا کے ہمزہ کو حذف کر کے لٰکِنْ کے نون کو نَا کے نون میں ادغام کر دیا گیا ہے ایک قرأت میں لٰکِنْ هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ۔ ہے جس میں اَنَا کے آخری الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔
اِنِّیَّۃُ الشَّیْءِ وَ اُنِّیَّتُہٗ۔ کے معنی ذات شئی کے ہیں اس سے کسی شئے کے وجود کی طرف اشارہ ہوتا ہے یہ ترکیب عربی نہیں ہے بلکہ محدث ہے۔

(ا ن ی)

اَنٰی (ض) الشَّیْءُ اس کا وقت قریب آگیا۔ وہ اپنی انتہا اور پختگی کے وقت کو پہنچ گئی۔ قرآن میں ہے :۔ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کیا ابھی تک مومنوں کے لئے وقت نہیں آیا (۵۷-۱۶)
غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىہُ (۳۳-۵۳) تم کھانے کے وقت کا انتظار کر رہے ہو اَنٰی الْحَمِیْمُ۔ پانی حرارت میں انتہا کو پہنچ گیا) قرآن میں ہے حَمِیْمٍ اٰنٍ (۵۵-۴۴) مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَۃٍ (۸۸-۵) گرم کھولتے ہوئے چشمے سے۔
اَنِیٌّ (بتثلیث الهمزه) وقت کا کچھ حصہ اس کی جمع اٰنَاءٌ ہے۔ قرآن میں ہے :۔
یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ الَّیْلِ (۳-۱۱۳)

جورات کے وقت خدا کی آئتیں پڑھتے ہیں وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ (۲۰-۱۳۰) اور رات کے اوقات میں (بھی) اس کی تسبیح کیا کرو۔

اِنًی"۔ ہمزہ مکسور ہونے کی صورت میں اسم مقصور ہوگا اور ہمزہ مفتوح ہونے کی صورت میں اسم ممدود حطیئہ نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۳۱) آنَيْتُ الْعَشَاءَ اِلَى سُهَيْلٍ
اَوِ الشِّعْرَى فَطَالَ بِىَ الْاَنَاءُ

میں نے سہیل یا شعریٰ ستارہ کے طلوع ہونے تک کھانے کو مؤخر کر دیا اور میرا انتظار طویل ہوگیا۔

آنَيْتُ الشَّيْئَ اِيْنَاءً۔ کسی کام کو اس کے مقررہ وقت سے مؤخر کرنا[2]۔ تَاَنَّيْتُ۔ میں نے دیر کی

اَلْاَنَاةُ۔ حلم۔ وقار۔ طمانیت تَاَنّٰى فُلَانٌ تَاَنِّيًا۔ وَاَنِىَ يَاْنِىْ اَنْيًا (س) تحمل اور حلم سے کام لینا۔

اِسْتَاْنَيْتُ الشَّيْئَ میں نے اس کے وقت کا انتظار کیا نیز اس کے معنی دیر کرنا بھی آتے ہیں جیسے اِسْتَاْنَيْتُ الطَّعَامَ۔ میں نے کھانے کو اس کے وقت سے مؤخر کر دیا۔

اَلْاِنَاءُ۔ برتن۔ جمع آنِيَةٌ۔ جیسے كِسَاءٌ وَاَكْسِيَةٌ اس کی جمع الجمع اَلْاَوَانِىْ ہے۔

(ا ھ ل)

اَهْلُ الرَّجُلِ۔ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اس کے ہم نسب یا ہم دین ہوں اور یا کسی صنعت یا مکان میں شریک ہوں یا ایک شہر میں رہتے ہوں اصل میں اھل الرجل تو وہ ہیں جو کسی کے ساتھ ایک مسکن میں رہتے ہوں پھر مجازاً آدمی کے قریبی رشتہ داروں پر اہل بیت الرجل کا لفظ بولا جانے لگا ہے اور عرف میں اہل البیت کا لفظ خاص کر آنحضرتؐ کے خاندان پر بولا جانے لگا ہے کیونکہ قرآن میں ہے:۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (۳۳-۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کر دے۔

اور کبھی اہل الرَّجُل سے بیوی مراد ہوتی ہے[3]۔ اور اَهْلُ الْاِسْلَامِ کے معنی مسلمان قوم کے ہیں۔ شریعت (اسلامیہ) نے اکثر احکام میں کافر اور مسلمان کے مابین چونکہ نسبی تعلق کو کالعدم قرار دیا ہے اس لئے (نوح علیہ السلام) کے لڑکے متعلق فرمایا:۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱-۴۶) یعنی یہ تیرے خاندان سے نہیں ہے اس کے اعمال غیر صالح ہیں۔ اور فرمایا وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ (۱۱-۴۰) اپنے اہل کو کشتی میں سوار کر لو۔ ہاں جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے اس کو سوار نہ کرنا۔

---

[1] قاله حطيئة فى قصيدة ۳۴ بيتاً يهجو فيها الزبرقان بن بدر مطلعها: ۔الا ابلغ بنى عوف بن كعب۔ فهل قوم على خلق سوا والقصيدة فى ديوانه (۱۰۹-۹۸) (نشر نعمان قاهرة ۱۳۷۸ھ) والبيت فى اضداد الاصمعى ۲۷ وابن السكيت ۱۸۲ واضداد ابن الانبارى ۸۲ واضداد ابى الطيب ۱۱ واللسان (انى) والطبرى ۲۲: ۴۳ والاشباه النحويه ۴: ۹۴ وابن ولاد ۷، ۸۱ والعمدة ۱۲: ۱۷۰ وذيل مجالس ثعلب (۱: ۲۷۶) وفى رواية ابى عبيدة واكريت بدل وآنيت (اللسان كرا) واصلاح ابى يعقوب ۲۴۳ وفى رواية الاصمعى اَنَيْتُ ورواه فى المختارات ۱۳۰ فى قصيدة ۳۴ مطلعها: الا قالت امامة هل تعزى۔ فقلت اميم قد غلب العزاء [2] وفى الحديث قال صلى الله عليه وسلم لقد آنيت وآذيت فى رجل جاء يوم الجمعة يتخطى رقاب الناس [3] وفى القرآن: وسار باهله (۲۸-۲۹)

أَهَلَ الرَّجُلُ (ن ض)، يَأْهُلُ أُهُولًا اس نے شادی کر لی۔
مَكَانٌ مَاهُوْلٌ آباد جگہ جہاں لوگ بستے ہوں۔
أُهِلَ بِهٖ۔ وہ جگہ آباد ہو گئی۔ دَابَّةٌ أَهِلٌ وَ أَهْلِيٌّ وہ چوپایہ جو کسی جگہ سے مانوس ہو (پالتو)
تَاَهَّلَ الرَّجُلُ۔ اس نے شادی کر لی اس سے (بطور دعا) کہا جاتا ہے أَهَّلَكَ اللّٰهُ فِي الْجَنَّةِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں بیوی اور اہل بخشے کہ تم ان کے ساتھ رہو۔
فُلَانٌ أَهْلٌ لِكَذَا۔ فلاں اس کا مستحق اور سزاوار ہے اور مہمان کی آمد پر اسے خوش آمدید کے طور پر مَرْحَبًا وَ أَهْلًا کہا جاتا ہے" یعنی ہمارے پاس تمہارے لئے فراخی ہے اور ہم تمہارے اہل بیت کی طرح تمہارے ساتھ شفقت سے پیش آئیں گے۔ أَهْلٌ کی جمع أَهْلُوْنَ وَ أَهَالٍ وَ أَهْلَاتٌ آتی ہے[1]

(ا و ب)

اَلْاَوْبُ۔ گو اس کے معنی رجوع ہونا کے ہیں لیکن رجوع کا لفظ عام ہے جو حیوان اور غیر حیوان دونوں کے لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ مگر أَوْبٌ کا لفظ خاص کر حیوان کے ارادۃً لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ آبَ أَوْبًا وَ إِيَابًا وَ مَآبًا وہ لوٹ آیا قرآن میں ہے:۔
إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ (۸۸-۲۵) بیشک ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهٖ مَآبًا (۷۸-۳۹) پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنائے۔
اَلْمَآبُ۔ یہ مصدر (میمی) ہے اور اسم ظرف زمان اور مکان بھی۔ قرآن میں ہے:۔
وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَآبِ (۳-۱۴) اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔
اَلْاَوَّابُ۔ یہ تَوَّابٌ کی (صیغہ مبالغہ) ہے یعنی وہ شخص جو معاصی کے ترک اور فعل طاعت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ قرآن میں ہے:۔ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيْظٍ۔ یعنی ہر رجوع لانے اور حفاظت کرنے والے کے لئے (۵۰-۳۲) إِنَّهٗ أَوَّابٌ (۳۸-۱۷) بیشک وہ رجوع کرنے والے تھے۔
اسی سے أَوْبَةٌ بمعنی توبہ بولا جاتا ہے۔۔۔
اَلتَّأْوِيْبُ۔ دن کو سفر کرنا اور شاعر کے قول ع
(۴۴) آبَتْ يَدُ الرَّامِيْ إِلَى السَّهْمِ"
تیر انداز کا ہاتھ تیر کی طرف لوٹ آیا۔
میں آبَ (لوٹنا) کی نسبت ید کی طرف کی گئی ہے جو در حقیقت تیر انداز کا فعل ہے۔ اس سے ہمارے سابق بیان پر اعتراض نہیں ہو سکتا ہے کہ أَوْبٌ کا ارادہ اور اختیار کے ساتھ لوٹنے پر بولا جاتا ہے[2]۔
اسی طرح نَاقَةٌ أَوُوْبٌ سبک رفتار اونٹنی کو کہتے کیونکہ اس کے ہاتھ پھرتی سے لوٹتے ہیں۔

(ا و د)

اَلْاَوْدُ (ن) آدَ يَؤُدُ أَوْدًا وَ إِيَادًا کے بوجھل اور گرانبار کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] والیه ا اہل الکتاب الذین عندہم کتاب سماوی وفی جمیع القرآن الاولو بہم الیہود والنصاری [2] فی القرآن: یٰجبال اَوّبی معہ (۳۴-۱۰) وفی الحدیث شغلونا عن صلوٰۃ الوسطیٰ حتی آبت الشمس راجع للتاج (راغب)

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا (۲-۲۵۵) اور آسمان و زمین کی حفاظت باری تعالیٰ کو بوجھل نہیں کرتی اور یہ بروزن قَالَ يَقُوْلُ قَوْلاً ہے اس سے واحد متکلم کا صیغہ اُدْتُ بروزن قُلْتُ ہوگا اصل میں آدَهٗ کے معنی ہیں اس نے اپنے بوجھ اور گرانباری کی وجہ اس کی گذرگاہ سے ٹیڑھا کر دیا۔

(ا و ل)

اٰلُ۔ بعض نے کہا ہے کہ آل اصل میں اہل ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُهَيْلٌ آتی ہے مگر اس کی اضافت ناطقین انسان میں سے ہمیشہ عَلَم کی طرف ہوتی ہے کسی اسم نکرہ یا زمانہ یا مکان کی طرف اس کی اضافت جائز نہیں ہے اس لئے آل فلان (علم) تو کہہ سکتے ہیں مگر آل رجل، آل زمان کذا و آل مکان کذا بولنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ہمیشہ صاحب شرف اور افضل ہستی کی طرف مضاف ہوگا اس لئے آل الحیاط بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ آل اللہ یا آل السلطان کہا جائیگا۔ مگر اھل کا لفظ مذکورہ بالا میں سے ہر ایک کی طرف مضاف ہو کر آجاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح اہل زمن کذا وبلد کذا بولا جاتا ہے اسی طرح اہل اللہ واہل الحیاط بھی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ "آل" دراصل بمعنی شخص ہے اس کی تصغیر اُوَيْل آتی ہے اور یہ اس شخص کے متعلق استعمال ہوگا جس کو دوسرے کے ساتھ ذاتی تعلق ہو مگر قریبی رشتہ داری یا تعلق والا ہو۔ قرآن میں ہے وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ (۳-۳۳) خاندان ابراہیم اور خاندان عمران۔

اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰-۴۶) فرعون والوں کو نہایت سخت عذاب میں داخل کر دو۔

آلُ النبیؐ۔ بعض نے کہا ہے کہ آل النبی سے آنحضرت کے رشتہ دار مراد ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہیں علم و معرفت کے اعتبار سے آنحضرت کے ساتھ خصوصی تعلق حاصل ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل دین دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو علم و عمل کے اعتبار سے راسخ اور محکم ہوتے ہیں ان کو آلُ النبیؐ اور اُمَّتُهٗ بھی کہہ سکتے ہیں دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا سراسر تقلیدی ہوتا ہے ان کو اُمَّتُ محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہہ سکتے ہیں مگر آلِ محمدؐ نہیں کہہ سکتے اس سے معلوم ہوا کہ امت اور آل میں عموم و خصوص کی نسبت ہے یعنی ہر آل نبی اس کی امت میں داخل ہے مگر ہر امتی آل نبی نہیں ہو سکتا۔

امام جعفر صادقؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگ تمام مسلمانوں کو آل نبی میں داخل سمجھتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا یہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ سائل نے عرض کی یہ کیسے؟ فرمانے لگے غلط تو اس لئے کہ تمام امت آل نبی میں داخل نہیں ہے اور صحیح اس لئے کہ وہ شریعت کے کما حقہ پابند ہو جائیں تو انہیں آل النبی کہا جا سکتا ہے[1]۔

اور آیت کریمہ:۔ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ (۴۰-۲۸) اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن شخص ... کہنے لگا۔ میں اس مرد مومن کے آل فرعون سے ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ (بظاہر) تو اس کے خصوصی اہل کاروں اور فرعونی شریعت کے ماننے والوں سے تھا اور مسکن

---

[1] فی الحدیث آل محمد کل تقی (طس) والرسالۃ القشیریہ ص ۵۷ عن انس) انظر المجالس للشیخ الجیلانی والشفاء للقاضی عیاض مع شرح نسیم الریاض ــ وایضاً الرخصۃ وشرح المہذب للنووی ـ

ونسب کے اعتبار سے انہیں میں سے شمار ہوتا تھا نہ اس لئے کہ وہ لوگ بھی اسے اپنی شریعت کا پابند خیال کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جبریئل اور میکائیل میں ایل اسماء حسنیٰ سے ہے مگر قواعد عربیہ کی رو سے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ اسماء مرکب اضافی ہوتے تو لفظ ایل کو مضاف الیہ ہونے کی بنا پر مجرور ہونا چاہیئے تھا۔

آلُ الشیئِ کے معنی کسی چیز کا شخص کے ہیں اور جو دور سے مضطرب نظر آرہا ہو۔

شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۳۳) وَلَمْ یَبْقَ اِلَّا آلُ خَیْمٍ مُنَضَّدٍ

کہ مرتب خیموں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

اور آل اس حالت کو بھی کہتے ہیں جس کی طرف انسان کا معاملہ آخر کار لوٹ کر آئے شاعر نے کہا ہے[2]

سَاَحْمِلُ نَفْسِیْ عَلٰی آلَۃٍ (متقارب)

فَاِمَّا عَلَیْہَا وَ اِمَّا لَہَا

آخر الامر میں اپنی جان کو ایسے امر پر مجبور کروں گا وہ یا تو اس کے لئے نقصان دہ ہوگی یا فائدہ مند۔

اور آل بمعنی سراب بھی آتا ہے یعنی وہ جو ہوا کے تموج سے یا ویسے بے حقیقت چیز (دوپہر کے وقت) دکھائی دیتی ہے لہذا یہ اصل میں آئی یوئل سے ہے جس کے معنی لوٹنا کے ہیں۔ آل اللَّبَنُ دودھ گاڑھا ہو گیا گویا اس میں نقصان کی طرف رجوع ہونے کے معنی ملحوظ ہیں جیسا کہ ناقص چیز کو رَاجِعٌ کہا جاتا ہے۔

اَلتَّاوِیْلُ۔ یہ بھی اول سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کے اصل کی طرف رجوع ہونے کے ہیں اور جس مقام کی طرف کوئی چیز لوٹ کر آئے اُسے مَوْئِلٌ (جائے بازگشت) کہا جاتا ہے۔

پس تَاوِیْلٌ کسی چیز کو اس غایت کی طرف لوٹانا کے ہیں جو اس سے بلحاظ علم یا عمل کے مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ غایت علمی کے متعلق فرمایا:

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳-۶) حالانکہ اس کی مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ لوگ جو علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں اور غایت عملی کے متعلق شاعر نے کہا ہے[3]

(۳۵) "وَلِلنَّوٰی قَبْلَ یَوْمِ الْبَیْنِ تَاْوِیْلٌ"

اور جدائی کے دن سے پہلے ہی جدائی کا انجام کار اور اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اور قرآن میں ہے ہَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَہٗ یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُہٗ (۷-۵۳) اب صرف وہ اس کی تاویل یعنی وعدہ عذاب کے انجام کار کا انتظار کر رہے ہیں جس دن اس وعدہ عذاب کے نتائج

---

[1] قالہ زہیر یمدح ہرم بن سنان وصدرہ: اربت بہا الارواح کل عشیۃ ـ ... وفی روایۃ فلم یدل ولم والبیت فی دیوانہ ۱۸۰ دلشرحہ للشنتمری طبع لیدن سنہ ۱۳۰۶ھ والعقد الثمین ۹۷ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۰۸) تالبحر (۱: ۵۵۴) وفیہ آل نوی بدل آل خیم وفی اللسان انظر صدر البیت وعجزہ: یسفع علی آس ونوی متعلب ونسبہ الی النابغۃ ویروی عجزہ وثم علی عرش الخیام غسیل۔ قال وروا ابو عبیدۃ للنابغۃ وثعلب للزبیر [2] قالتہ خنساء فی رثاء ابی عمرو والبیت فی اللسان والمحکم (علا، فوق) وایام العرب و ۲۹ یوم حوذۃ الثانی (۸: والکامل للمبرد و ۲۱۲ا) فی ستۃ ابیات [3] قالہ عبدۃ بن الطبیب وصدرہ، وللاحبۃ ایام تذکرھا والبیت فی المفضلیات (۱: ۱۳۴) وتفسیر الطبری (۳: ۱۳۴) وتاریخ الطبری (۴: ۱۳۴) والقصیدۃ فی منتہی الطلب (۱: ۱۸۹-۱۹۴)

سامنے آجائیں گے۔
یعنی اس دن سے جو غایت مقصود ہے وہ عملی طور پر ان کے سامنے ظاہر ہوجائے گی۔

اور آیت کریمہ: ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۴-۵۹) میں بعض نے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے احسن تاویلا ہونا مراد لیا ہے اور بعض نے آخرت میں بلحاظ ثواب کے احسن ہونا مراد لیا ہے۔

اَلْاَوْلُ (ن) کے معنی ہیں مآل اور نتیجہ پر نظر رکھتے ہوئے سیاست اور انتظام کرنا۔ اسی سے کہا جاتا ہے قَدْ اُلْنَا وَاِيْلَ عَلَيْنَا۔ ہم نے حکومت کی اور ہم پر حکومت کی گئی۔

اَلْاَوَّلُ۔ خلیل کے نزدیک اس کی اصل (اول) ہے اس لئے فَعَّلٌ کے وزن پر ہوگا بعض کا خیال ہے کہ اس کا مادہ (ود ل) ہے اس لئے اَوَّلُ بروزن اَفْعَلُ ہوگا لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ فا اور عین کلمہ میں دو حرف یک جنس نہایت قلیل الاستعمال ہیں۔ بہت صورت میں یہ اَوْلٌ سے مشتق ہوگا جس کے معنی اصل کی طرف رجوع ہونا کے ہیں اور اَوَّلُ اصل میں اَءْوَلُ ہوگا کثرت استعمال کے باعث الف ثانی کو واؤ میں ادغام کردیا گیا ہو۔

اَوَّلُ۔ اصل میں صیغہ صفت ہے کیونکہ اس کی تانیث اُوْلٰی بروزن اُخْرٰی آتی ہے[۱]۔ بس اَوَّلُ وہ ہے جس پر اس کا غیر مرتب ہو اور بچند وجوہ استعمال ہوتا ہے۔

(۱) جو دوسرے پر باعتبار زمانہ متقدم ہو جیسے عبد الملک اولا ثم منصور۔ کہ پہلے عبد الملک اور پھر منصور۔

(۲) اور مرتبہ اور ریاست کے اعتبار سے دوسرے پر متقدم ہو اور دوسرا اس کی اقتدا کرے جیسے الامیر اولا ثم الوزیر۔ کہ پہلے امیر اور اس کے بعد وزیر۔

(۳) وضع اور نسبت کے اعتبار سے پہلے ہو جیسے ایک شخص عراق سے روانہ ہو تو اسے کہا جائیگا۔ القادسیۃ اولا ثم فید۔ کہ پہلے قادسیہ آئے گا اور پھر فید۔ اور مکہ سے روانہ ہونے والے کو کہا جائے گا کہ پہلے فید اور پھر قادسیہ آئے گا۔

(۴) جو نظام صناعی کے اعتبار سے متقدم ہو جیسے الاس اولا ثم البناء کہ پہلے بنیاد رکھی جاتی ہے اس پر عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

اور جب صفت باری تعالیٰ میں ھوالاول کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ ہو اور جن علماء نے اول کے معنی غیر محتاج یا مستغنی بنفسہ کئے ان کا اشارہ بھی اسی معنی کی طرف ہے۔

اور آیت وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶-۱۶۴) اور آیت وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۷-۱۴۳) میں اَوَّلُ کے معنی یہ ہیں کہ اسلام و ایمان میں ہی سب سے پہلے دوسروں کے لئے اسوہ اور مقتدا بنتا ہوں اسی طرح آیت: وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (۲-۴۱) کے معنی یہ ہیں کہ کفر میں پہل کرکے دوسروں کے لئے اسوہ اور پیشوا نہ بنو کہ لوگ تمہاری اقتدار کریں۔

---

[۱] دنی القرآن۔ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۹۲-۱۳) راجع ایضا (الدخان = ۳۵-۵۶) (النجم = ۲۵-۵۰-۵۶) (الواقعۃ = ۶۲) (النازعات = ۲۵) (اللیل = ۱۸) (الضحیٰ = ۴)

کبھی اول کا لفظ بطور ظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ مبنی علی الضم ہوتا ہے جیسے جِئْتُہٗ اَوَّلُ۔ اور کبھی اوّل بمعنی قدیم بھی آ جاتا ہے جیسے جِئْتُكَ اَوَّلاً وَ آخِراً ای قدیماً وحدیثاً یعنی پہلے بھی آیا تھا اور اب بھی۔

اور آیت کریمہ:۔ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی (۷۵-۳۴) میں اولیٰ کلمۂ تہدید اور تخویف ہے اور جو شخص ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو اسے تنبیہ کرنے کے لئے آتا ہے پھر جو شخص بڑی ذلت کے بعد ہلاکت سے بچ جائے اسے دوبارہ روکنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے عموماً یہ کلمہ مکرر آتا ہے گویا اسے تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ انجام پر غور کرکے اس سے بچنے کی کوشش کرے[۱]۔

(ا و ن)

اَلْآنَ۔ ہر وہ لمحہ جو ماضی اور مستقبل کے مابین فرض کیا جائے اسے اَلْآنَ کہا جاتا ہے۔ جیسے اَلْآنَ اَفْعَلُ کَذَا (میں اب کرتا ہوں) اور اَلْآنَ کا لفظ ہمیشہ الف لام تعریف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے[۱] اور اَفْعَلُ کَذَا آوِنَۃً کا محاورہ بھی اَلْآنَ سے ماخوذ ہے ھٰذَا اَوَانُ ذٰلِكَ (یہ اس کا صحیح زمانہ یا وقت ہے) سیبویہ نے کہا ہے کہ اَلْآنَ آنُكَ کے معنی ہیں ھٰذَا الْوَقْتُ وَقْتُكَ[۲] اسی سے فعل آنَ یَؤُوْنُ اَوْناً استعمال ہوتا ہے۔ ابوالعباس[۳] لکھتے ہیں کہ یہ "اَلْآنَ" سے نہیں ہے بلکہ ایک مستقل اور علٰحدہ فعل ہے۔

(ا و ہ)

اَلْاَوَّاہُ۔ وہ شخص جو بہت زیادہ متلقۃ کرتا ہو اور تَاَوَّہَ کے معنی ہیں حزن وغم ظاہر کرنے کے لئے اَوَّہْ زبان پر لانا اور ہر وہ کلمہ جس سے تاسف اور حزن کا اظہار ہوتا ہو اسے تَاَوَّہَ سے تعبیر کر لیتے ہیں لہٰذا اَوَّاہٌ کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو خشیت الٰہی کا بہت زیادہ اظہار کرنیوالا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔ اَوَّاہٌ مُّنِیْبٌ (۱۱-۷۵) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) مومن اور بہت زیادہ دعا کرنے والے تھے مآل کے اعتبار سے یہ معنی بھی ماتقدم کی طرف راجع ہے۔

ابوالعباس فرماتے ہیں کہ کام کے روکنے کے لئے کلمہ "اِیْھًا" اور ترغیب دینے کے لئے وَیْھًا کہا جاتا ہے اور اظہار تعجب کے لئے وَاھًا کہتے ہیں۔

(ا و ی)

اَلْمَاْوٰی (یہ اَوٰی (ض)، اُوِیًّا وَمَاْوًی کا مصدر ہے (جس کے معنی کسی جگہ پر نزول کرنے

---

[۱] قال فی اللسان الاصل فی الآن ان یکون لزمان الحال ثم توسعوا فیہ للوصف واللام فیہ للتعریف واصل "الآن" اوان "حذف الہمزۃ ثم غیرت واوہا الی الالف کما فی الراح والرباح [۲] بنصب الآن ورفع آنک قال ابن جنی وکذا قراناہ فی الکتاب لسیبویہ راجع اللسان (ابن) والکتاب [۳] ابوالعباس محمد بن یزید (۲۱۰ھ-۲۸۶) الثمالی المعروف بالمبرد امام العربیۃ واحد ائمۃ الادب والاخبار من کتبہ المطبوعۃ "الکامل" وشرح لامیۃ العرب المطبوع مع شرح الزمخشری ولہ کتب اخری معروفۃ۔ قال الزبیدی فی شرح خطبۃ القاموس المبرد بفتح الراء المشددۃ وبعضہم یکسر راجع لاحوالہ النزہۃ ۲۸۵ والبغیۃ ۱۱۶ والفہرست ۵۹ وطبقات للزبیدی رقم ۴۱ والانساب ۱۱۲ الثمالی والحصری ۲/۲۱۶ و۲۳۷ والادباء ۷/۱۳۷ والوفیات ۱/۴۹۵ ولسان المیزان ۵/۴۳۰ ومعانی العسکری ۱/۱۷۸ ۞ ۞

یا پناہ حاصل کرنا کے ہیں) اور آوَیٰ اِلیٰ کذا۔ کے معنی ہیں کسی کے ساتھ مل جانا اور منضم ہو جانا اور آواہ (افعال) اِیْوَاءً کے معنی ہیں کسی کو جگہ دینا قرآن میں ہے اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ (۱۸-۱۰) جب وہ اس غار میں جا رہے قَالَ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ (۱۱-۴۳) اس نے کہا کہ میں (ابھی) پہاڑ سے جا لگوں گا۔ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ (۳۳-۵۱) جسے چاہو اپنے پاس ٹھکانا دو وَفَصِیْلَتِہِ الَّتِیْ تُؤْوِیْہِ (۷۰-۱۳) اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔ عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی (۵۳-۱۵) میں لفظ جَنَّۃ کی اضافت مَاْوٰی (مصدر) کی طرف ہے جیسا کہ دَارُ الْخُلْدِ (۴۱-۲۸) میں لفظ دار کی اضافت اَلْخُلْد مصدر کی طرف ہے[1] اور آیت مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ (۱۷-۹۷) میں مَاْوٰی کے معنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔

اَوَیْتُ لَہٗ اَوْیًا وَاِیَّۃً وَمَاْوِیَۃً وَمَاْوَاۃً کے معنی ہیں میں نے اس پر رحم کھایا۔ اصل میں اس کے معنی رَجَعْتُ اِلَیْہِ بِقَلْبِیْ کے ہیں یعنی میں دل سے اس کی طرف مائل ہوا۔

اور آیت کریمہ:۔ آوٰی اِلَیْہِ اَخَاہُ (۱۲-۶۹) کے معنی یہ ہیں کہ یوسف نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا اور حاتم طائی کے شعر[2] (الطویل)

(۳۷) اَمَاوِیَّ اِنَّ الْمَالَ غَادٍ وَرَائِحٌ

ای ماویہ! بے شک مال صبح شام آنے جانے والی چیز ہے۔

میں اَلْمَاوِیَۃ۔ عورت (بیوی) کا نام ہے چنانچہ بعض نے اسے بھی اسی باب (اوی) سے مانا ہے اور کہا ہے کہ گویا قبولِ صورت (ماوی الصورۃ) ہونے کی وجہ سے اسے الماویہ کہا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے یہ مَاءٌ کی طرف نسبت ہے اور اصل میں مَائِیَۃ ہے ہمزہ کو واو کے ساتھ بدل لیا گیا ہے[3]

(ا ی ی)

اَیٌّ۔ جب استفہام کیلئے ہو تو جنس یا نوع کی تعیین اور تحقیق کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اور یہ خبر اور جزا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے[4] چنانچہ فرمایا: اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (۱۷-۱۱۰) جس نام سے اسے پکارا اس کے سب نام اچھے ہیں اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ (۲۸-۲۸) کہ میں جونسی مدت رچا ہوں (پوری کردوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

---

[1] فی النسخ المطبوعۃ کلہا دار الخلود تصحیف وجاء فی التنزیل یوم الخلود (۵۰-۳۴) فی آیۃ فقط واما کلمۃ خلد فقد جاء فی آیات (۱۰-۵۲)(۲۰-۱۲۰) (۲۱-۳۴) (۱۵-۲۵) (۳۲-۱۴) [2] قال فی شواہد الکشاف ۶۰ ان ماویۃ اسم ام حاتم وہی بنت عفیر وکانت تلومہ فی جودہ بالمال واصلہ نسبۃ الی الماء لانہا تشبیہہ فی اللین والرقۃ وعجز البیت ... ویبقی من المال الاحادیث والذکر انظر دیوانہ ۵۰ فی ۲۰ بیتا وراجع للبیت ایضا الخزانۃ ۴: ۱۵۸/۳ ۱۹۳ وذیل الامالی ۳۰ فی اربعۃ ابیات والعقد ۲۴۶:۱ فی ۵ ابیات وقیل انہ افضل ماقیل فی الجود ورایت فی تقدمۃ دیوان (بیروت ۱۳۸۳ھ) ان ماویۃ زوجتہ وذکر فیہ قصۃ زواجہ معہ [3] راجع شرح شواہد الکشاف ۶۰ [4] ای یکون شرطا وقد یاتی موصولا نحو لننزعن من کل شیعۃ ایہم اشد (۱۹-۶۹) وفی اعراب الآیۃ اعتراک بین العلماء وقد یاتی دالا علی معنی الکمال فیقع صفۃ للنکرۃ نحو زید رجل ای رجل وان یکون وصلۃ الی نداء ما فیہ ال نحو یاایہا الناس فہذہ خمسۃ وجوہ

اَلْاٰیَةُ۔ اسی کے معنی علامت ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں دراصل "آیۃ" ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو دوسری ایسی شے کو لازم ہو جو اس کی طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس ظاہر شے کا ادراک کرے گو اس دوسری (اصل) شے کا بذاتہ اس نے ادراک نہ کیا ہو مگر یقین کر لیا جائے کہ اس نے اصل شے کا بھی ادراک کر لیا کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے اور لزوم کا یہ سلسلہ محسوسات اور معقولات دونوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ جب کسی شخص کو معلوم ہو کہ فلاں راستے پر فلاں قسم کے نشانات ہیں اور پھر وہ نشان بھی مل جائے تو اسے یقین ہو جائیگا کہ اس نے راستہ پالیا ہے۔ اسی طرح کسی مصنوع کے علم سے لامحالہ اس کے صانع کا علم ہو جاتا ہے۔

آیۃ کا لفظ یا تو اَیٌّ سے مشتق ہے کیونکہ یہ بھی ایک چیز کو دوسری سے تمیز دیتی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ تَاَیِّیْ (مصدر تفعل) سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز پر ٹھہرنے اور تثبت حاصل کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے: تَاَیَّ (امر) یعنی ٹھہرو اور رفق سے کام لو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُوِیٰ اِلَیْهِ سے مشتق ہو۔

(۱) آیۃٌ کا لفظ بلند عمارت پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا: اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ آيَةً تَعْبَثُوْنَ (۲۶-۱۲۸) کہ تم ہر فضا مقام پر بے کار نشان تعمیر کرتے ہو۔

(۲) اور قرآن کے ہر اس حصہ کو جو کسی حکم پر دال ہو آیۃ کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ایک سورۃ ہو یا اس کی ایک فصل یا کئی فصلیں ہو۔

(۳) اور کبھی ہر اس کلام کو جو لفظی اعتبار سے دوسرے سے الگ ہو آیۃ کہدیا جاتا ہے اسی اعتبار سے سُوَر کی آیات کو آیات کہا جاتا ہے جن کے ذریعہ سورۃ شمار کی جاتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۹-۴۴) میں آیات سے فکری دلائل مراد ہیں کہ لوگ اپنے مراتب علمیہ کے اعتبار سے ان کی معرفت میں مختلف درجات رکھتے ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا: بَلْ هُوَ آیَاتٌ بَیِّنَاتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیَاتِنَا اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (۲۹-۴۹) بلکہ یہ اہل علم کے نزدیک واضح دلائل ہیں اور ہمارے ان دلائل سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔ وَكَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۲-۱۰۵) اور آسمان و زمین میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔

پھر قرآن مجید میں کسی خاص معنی کا لحاظ کرتے بعض مواضع میں آیۃً مفرد اور دوسرے مقامات پر آیات بصیغۂ جمع لایا گیا ہے جس کی تفصیل اور توضیح اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

اور آیت کریمہ: وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗ آیَةً (۲۳-۵۰) میں حضرت عیسٰی علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم کو آیَتَیْنِ (دو ایتیں) کہنے کی بجائے آیَۃً (ایک آیت) قرار دیا ہے کیونکہ یہ دونوں مل کر (بحیثیت مجموعی) ایک آیت بنتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیَاتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا (۱۷-۵۹) میں بعض نے کہا ہے کہ آیات سے جراد، قمل، ضفادع وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جو امم سابقہ پر (بطور عذاب) بھیجی گئی تھیں۔ اور "تخویفا" کے لفظ سے متنبہ کیا ہے کہ جو لوگ اس قسم کے افعال کا ارتکاب کریں گے ان پر اسی طرح کے عذاب نازل ہوں گے اور یہ کہ اس قسم کی آیات

کو طلب کرنا مکلّفین کے خسیس ترین ہونے کی دلیل ہے کیونکہ انسان فعل خیر یا تو کسی رغبت اور خوف کی وجہ سے کرتا ہے یہ سب سے ادنیٰ مرتبہ ہے اور یا اچھی شہرت حاصل کرنے کے لئے۔ مگر اشرف اور اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ فضیلت کو فضیلت سمجھ کر حاصل کیا جائے اور امت محمدیہ چونکہ اشرف امت ہے جیسا کہ آیت۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (　　) میں مذکور ہے اس لئے انہیں اللہ تعالیٰ نے اس (خسیس) مرتبہ سے بلند قرار دیا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ گو ان میں سے جہلاء یہ کہہ کر۔ أَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ عَلِيمٍ۔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ان پر عمومی عذاب نہیں آئے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ آیات سے مراد دلائل ہیں اور تنبیہ کی ہے کہ ان کے سامنے صرف دلائل بیان ہوں گے اور انہیں اس عذاب سے محفوظ رکھا جائیگا وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ (۲۲-۴۷) جس کے متعلق یہ جلدی کر رہے ہیں۔

لفظ آیَۃ کے وزن میں تین اقوال ہیں:۔

(۱) یہ فَعْلَۃٌ کے وزن پر ہے ایسے کلمات (جن کے عین اور لام کلمہ میں حرف علت ہو میں حق تو یہ ہے کہ ان کے لام کلمہ میں تعلیل کی جائے نہ کہ عین کلمہ میں جیسے حَیَاۃٌ اور نَوَاۃٌ وغیرہ نظائر موجود ہیں) لیکن عین کلمہ میں حرف یا آنے کی وجہ سے لام کلمہ میں تعلیل نہیں ہوئی جیسے رَایَۃٌ وغیرہ۔

(۲) بعض نے کہا ہے یہ فَعَلَۃٌ کے وزن پر ہے دو حرف علت جمع ہونے کی وجہ سے پہلی یا کو الف سے تبدیل کر دیا گیا ہے جیسے طَائِیٌ اور طَیِّئٌ۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ آیَۃٌ دراصل آیِیَۃٌ بروزن فَاعِلَۃٌ ہے بغرض تخفیف یار اول کو حذف کر کے آیَۃٌ بنا لیا گیا ہے مگر یہ آخری قول ضعیف ہے کیونکہ آیَۃٌ کی تصغیر اُیَیَّۃٌ ہے اگر یہ اصل میں فَاعِلَۃٌ کے وزن پر ہوتا تو اس کی تصغیر اُوَیِّیَۃٌ آنا چاہیئے تھی۔

(اَیَّانَ)

اَیَّانَ (کب) کسی شے کا وقت دریافت کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ قریب قریب "متیٰ" کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ہے۔ اَیَّانَ مُرْسٰهَا (۷۹-۴۲) کہ اس (قیامت) کا وقوع کب ہوگا۔ وَمَا يَشْعُرُونَ اَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۱۶-۲۱) ان کو بھی یہ معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ (۵۱-۱۲) کہ جزا کا دن کب ہوگا۔

لفظ اَیَّانَ دراصل اَیٌّ سے مشتق ہے اور بعض کے نزدیک اس کی اصل اَیُّ اَوَانٍ ہے جس کے معنی ہیں "کونسا وقت" الف کو حذف کر کے واؤ کو یا اور پھر اسے یا میں ادغام کر کے اَیَّانَ بنا لیا گیا ہے۔

(اِیَّا)

یہ کلمہ ضمیر منصوب منفصل کے تلفظ کے لئے وضع کیا گیا ہے جب ضمیر (منصوب) اپنے عامل پر (مقدم ہو یا اس پر کسی کلمہ کا عطف ڈالا جائے اور یا اِلَّا کے بعد آئے تو اس (اِیَّا) کے ساتھ استعمال ہوتی ہے جیسے (تقدیم کی صورت میں فرمایا) اِیَّاكَ نَعْبُدُ (۱-۴) اور عطف کی

صورت میں فرمایا نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷-۳۱) ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۷-۲۳) اور تیرے پروردگار نے قطعی طور ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

(اِ ی)

اِیْ - حرف ایجاب ہے کلام متقدم کی تحقیق اور توثیق کے لئے وضع کیا گیا ہے[1] جیسے فرمایا:- قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (۱۰-۵۲) کہدو ہاں خدا کی قسم یہ سچ ہے۔

(اَ ی)

اَیْ - یہ حرف ندا ہے جیسے اَیْ زَیْدُ اور کبھی (حرف تفسیر ہوتی ہے اور) اس بات پر تنبیہ کے لئے بھی آجاتا ہے کہ اس کا مابعد اس کے ماقبل کی شرح اور تفسیر ہے[2]

(ایا)

حرف ندا ہوتا ہے جیسے اَیَا زَیْدُ۔

(أ)

یہ بھی منجملہ حروف ندا ہے جیسے اَ زَیْدُ۔

(ا ی د)

اَلْاَیْدُ (اسم) سخت قوت اس سے اَیَّدَ (تفعیل) ہے جس کے معنی تقویت دینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۵-۱۱۰) ہم نے تمہیں روح قدس سے تقویت دی وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۳-۱۳) یعنی جسے چاہتا ہے اپنی نصرت سے بہت زیادہ تقویت بخشتا ہے اِدْتُهٗ (ض) اَئِیْدُهٗ اَیْدًا جیسے بِعْتُهٗ اَبِیْعُهٗ بَیْعًا (تقویت دینا) اور اس سے اَیَّدْتُهٗ (تفعیل) تکثیر کے لئے آتا ہے قرآن میں ہے۔ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ (۵۱-۴۷) اور ہم نے آسمان کو بڑی قوت سے بنایا اور اَیْدٌ میں ایک لغت آدٌ بھی ہے اور اسی سے امر عظیم کو مُؤَیَّدٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز دوسری کو سہارا دے اور بچائے اسے اِیَادُ الشیئ کہا جاتا ہے ایک قرأت میں اٰیَدْتُكَ ہے جو اَفعلتُ (افعال) سے ہے اور اِیَادُ الشیٔ کے محاورہ سے ماخوذ ہے زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ فاعلت (مفاعلہ) مثل عاونتُ سے بھی ہو سکتا ہے۔

(ا ی ك)

اَلْاَیْكُ - درختوں کا جھنڈ (ذو ایکۃ) اور آیت۔ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ (۱۵-۷۸) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے[3] کہ اَلْاَیْكَةُ ان کے شہر اور آبادی کا نام ہے۔

(ا ی م)

اَلْاَیَامٰی (۲۴-۳۲) یہ اَلْاَیِّمُ کی جمع ہے اور آمَ الرَّجُلُ وَتَاَیَّمَ کے معنی ہیں مرد رنڈوا ہو گیا اور عورت کے بیوہ ہونے کے لئے آمَتِ الْمَرْاَةُ وَتَاَیَّمَتْ کہا جاتا ہے

---

[1] ای سواء کان قبلها خبرا او استفهام وعلی کل حال یکون بعدها القسم [2] وحینئذ یکون مابعدها عطف بیان علی ما قبلها او بدل لاعطف نسق ابن المغنی ۱/۸۰ [3] راجع آیت (۲۶-۱۷۶) (۳۸-۱۳) (۵۰-۱۴)

اِمْرَءَۃٌ اَیِّمَۃٌ۔ بیوہ عورت رَجُلٌ اَیِّمٌ رنڈوا مرد اَلْحَرْبُ مَأْیَمَۃٌ جنگ مرد کو عورت سے الگ کردیتی ہے اَلْاَیْمُ۔ سانپ۔

این ظرف،

یہ کلمہ کسی جگہ کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے جیسا کہ لفظ "متیٰ" زمانہ کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے۔

(ا ی ن)

اَلْاَیْنُ (ض) کے معنی تھک کر چلنے سے عاجز ہو جانا کے ہیں نیز آنَ یَئِیْنُ اَیْنًا اور آنیٰ یَأْنِیْ اُنِیًا کے معنی کسی چیز کا موسم یا وقت آ جانا کے ہیں اور محاورہ میں بَلَغَ اَنَاہُ کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ آنیٰ (ناقص) سے مقلوب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابو العباسؒ نے کہا ہے کہ آنَ یَئِیْنُ اَیْنًا کا ہمزہ دراصل حاء سے مقلوب (بدلا ہوا) ہے اور اصل میں حَانَ یَحِیْنُ حَیْنًا ہے اور اصل کلمہ اَلْحِیْنُ ہے۔

لہ قرآن القرآن ۔ فاین تذھبون (۸۱۔۲۶)

کِتَابُ البَاء

(ب)

الباء (حرف جار) یہ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضمر کے متعلق ہوکر استعمال ہوتی ہے پھر متعلق بفعل ظاہر دو قسم پر ہے۔

(۱) ہمزہ افعال کی طرح تعدیہ فعل کے لئے آتی ہے جیسے ذھبت بہ و اذھبتہٗ۔ قرآن میں ہے[۱]: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵-۷۲) جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔

(۲) آلہ کے لئے ہوتی ہے[۲] جیسے قطعتہٗ بالسکین (میں نے اسے چھری سے کاٹا)

اور متعلق بمضمر کبھی موضع حال میں ہوتی ہے جیسے خرج بسلاحہ (یعنی وہ نکلا درآنحالیکہ اس پر یا اس کے ساتھ اسلحہ بھی تھا۔ اور کبھی زائدہ ہوتی ہے جیسے فرمایا: وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (۱۲-۱۷) اور آپ ہماری بات کو باور نہیں کریں گے۔ اس جگہ میں اور مَا اَنْتَ مُؤْمِنًا میں فرق ہے کیونکہ منصوب ہونے کی صورت میں متکلم کے ذہن میں ایک ہی ذات کا تصور ہے جیسا کہ زَيْدٌ خَارِجٌ میں ہے مگر مجرور ہونے کی صورت میں جیسے مَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ہے دو ذات کا تصور ہے جیسا کہ لَقِيْتُ بِزَيْدٍ رَجُلًا فَاضِلًا میں ہے[۳]۔ کہ یہاں فَاضِلًا سے گو زید ہی مراد ہے مگر اسے ایسی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ اس سے ایک شخص (فاضلاً) متصور ہوتا ہے گویا تقدیر کلام یہ ہے کہ رَأَيْتُ بِرُؤْيَتِكَ آخر وھو رجل فاضل اسی طرح رَأَيْتُ بِكَ حَاتِمًا فی السخاء کا محاورہ ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶-۱۱۴) اور میں مومنوں کو راندنے والا بھی نہیں ہوں۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (۳۹-۳۶) کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں ہے۔ مگر شیخ[۴] فرماتے ہیں کہ یہ کلام محل نظر ہے[۵]۔ اور آیت کریمہ: تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ (۲۳-۲۰) میں بعض نے کہا ہے یہ تُنْبِتُ الدُّهْنَ کے معنی میں ہے[۶] مگر اس آیت سے یہ معنی مقصود نہیں ہے بلکہ تُنْبِتُ النبات ومعہ الدھن کے ہم معنی ہے[۷] یعنی اس میں بالقوہ روغن موجود ہوتا ہے اور بِالدُّهْنِ کا لفظ لاکر اللہ تعالیٰ کے انعام ایزدی کی ہے نیز اس کے نکالنے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے بعض نے کہا ہے اس میں باء حال کے معنی میں ہے یعنی درآنحالیکہ اس میں روغن موجود ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہمزہ اور باء دونوں برائے تعدیہ آتے ہیں اور یہ دونوں ایک ہی کلمہ میں جمع نہیں ہو سکتے۔

---

[۱] الباء فی الآیۃ للالصاق المجازی لا للتعدیۃ وہما نوعان راجع ابن ہشام ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۷ وباء التعدیۃ تسمی باء النقل والاولیٰ کاف (ذہب اللہ بنورہم (۲-۱۷) [۲] وتسمی باء الاستعانۃ [۳] الاولیٰ ان تکون الباء فیہا سببیۃ ای لسبب لقائی ایاہ واصحاب المعانی یسمون مثل ہذا الباء [۴] ای الشیخ عبد القادر الجرجانی [۵] ای الباء زائدۃ [۶] فعلی ہذا یکون الظرف حالا من المفعول ای تنبت الشجر مصاحبا للدھن

اور آیت کریمہ: وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۔ (۴-۷۹، ۴-۲۸) میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے[1] اور یہ اصل میں وَكَفَى اللّٰهُ شَهِيْدًا ہے جیسا کہ آیت: وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ (۳۳-۲۵) میں ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے تو لازم آتا ہے آیت مقیس علیہ میں بھی وَكَفٰى بِاللّٰهِ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ کہنا صحیح ہو حالانکہ درست نہیں ہے کیونکہ باء زائدہ اسی مقام پر آتی ہے جہاں اس کے بعد منصوب موضع حال میں مذکور ہو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے لہذا صحیح یہ ہے کہ یہاں کَفٰی کا لفظ اِكْتَفِ (امر) کی جگہ لایا گیا ہے[2] جیسا کہ اَحْسِنْ بِزَيْدٍ میں لفظ احسن، ما احسن کی جگہ لایا گیا ہے[3] اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ اِكْتَفِ بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۔ اور اسی معنی میں فرمایا۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵-۳۱) وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا (۴-۴۵) اور خدا ہی کارساز کافی ہے اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۴۱-۵۳) کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے اور حُبُّكَ اِلَيَّ بِفَقْدِكَ کا محاورہ بھی اسی توجیہ پر محمول ہوگا ای اَحْبِبْ اِلَيَّ بِہٖ

اور آیت کریمہ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲-۱۹۵) میں بعض نے دعوی کیا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے[4] اور اصل میں لَا تُلْقُوْا اَيْدِيَكُمْ ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی باء آلہ کی ہے اور اصل میں لَا تُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ہے مگر مفعول کو عدم ضرورت اور معنوی عموم کے پیش نظر حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جس طرح اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ممنوع ہے اسی طرح دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اور آیات: عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳-۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس سے خدا کے مقرب پئیں گے عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (۷۶-۶) یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے خدا کے بندے پئیں گے ـــــ میں بعض نے کہا ہے کہ باء بمعنی مِنْ ہے[5] ای يَشْرَبُ مِنْهَا اور بعض نے زائدہ کہا ہے ای يَشْرَبُهَا لیکن صحیح یہ ہے کہ باء کو اس کے معنی پر رہنے دیا جائے اور کہا جائے کہ عَيْنًا سے پانی مراد نہیں ہے بلکہ چشمہ کا گڑھا ہے لہذا یہ مَكَانًا يَّشْرَبُ بِهٖ کی طرح ہوگا[6]

اور آیت: فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ (۳-۸۸) میں بھی بِمَفَازَةٍ کے معنی بِمَوْضِعِ الْفَوْزِ کے ہیں یعنی ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ کسی نجات کی جگہ کے ذریعہ عذاب سے ہمکنار ہو جائیں گے۔

(ب ی ر)

اَلْبِئْرُ (کنویں) اصل میں یہ مہموز (العین)

---

[1] قال الخراز زيدت الباء للمبالغة في المدح كما قالوا: اظرف بعبد الله وانبل بزيد وحسبك بصديقنا (اللسان)

[2] قاله الزجاج وصرح ابن هشام بان هذا التوجيه بعيد راجع الاتقان ج ۱ ص ۱۵۹ والمغني [3] اي غير الخبرالي معنى الطلب [4] ذكره ابن هشام في المغني وقال الثاني مما تزاد فيه الباء على المفعول كما في الآية [5] قاله الفارسي والاصمعي والقتيبي وابن مالك (ابن هشام ص ۱۱) [6] اي الباء للاستعانة كما قاله الزمخشري فالمعنى يشرب بها الخمر۔

ہے۔ بَأَرْتُ بِئْرًا وَبَأَرْتُ بُؤْرَةً کے معنی گڑھا کھودنے کے ہیں[۱]۔ قرآن میں ہے۔ وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ (۲۲-۴۵) اور بہت سے کنویں بیکار اور محل ویران پڑے ہیں۔ اسی سے اَلْمِئْبَرَةُ کا لفظ مشتق ہے جو اصل میں اس گڑھے کو کہتے ہیں جس کا منہ اس طرح ڈھانپ دیا جائے کہ جو شخص اس کے اوپر سے گزرے اس میں گر پڑے ایسے گڑھے کو مِغْوَاةٌ بھی کہا جاتا ہے اور کنایۃً مِئْبَرٌ ایسی سخن چینی کو کہتے ہیں جو انسان کو بلا میں ڈالنے والی ہو اس کی جمع اَلْمَآبِرُ آتی ہے

(ب ء س)

اَلْبُؤْسُ وَالْبَأْسُ وَالْبَأْسَاءُ۔ تینوں میں سختی اور ناگواری کے معنی پائے جاتے ہیں مگر بُؤْسٌ کا لفظ زیادہ تر فقر و فاقہ اور لڑائی کی سختی پر بولا جاتا ہے اور اَلْبَأْسُ وَالْبَأْسَاءُ بمعنی نکایہ (یعنی جسمانی زخم اور نقصان کیلئے آتا ہے قرآن میں ہے وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَأْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيلًا (۴-۸۴) اور خدا لڑائی کے اعتبار سے بہت سخت ہے اور سزا کے لحاظ سے بھی بہت سخت ہے فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ (۶-۴۲) پھر (ان کی نافرمانیوں کے سبب) ہم انہیں سختیوں اور تکلیفوں میں پکڑتے رہے وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ (۲-۱۷۷) اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔۔ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ (۵۹-۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔

بَؤُسَ يَبْؤُسُ (بَأْسًا) بہادر اور مضبوط ہونا۔ اور آیت کریمہ:۔ بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ (۷-۱۶۵) میں بَئِيْسٌ بروزن فعیل ہے اور یہ بَأْسٌ یا بُؤْسٌ سے مشتق ہے یعنی بڑے سخت عذاب میں اور آیت کریمہ:۔ فَلَا تَبْتَئِسْ (۱۱-۳۶) کے معنی یہ ہیں کہ غمگین اور رنجیدہ رہنے کے عادی نہ بن جاؤ۔ حدیث میں ہے[۲] اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَكْرَهُ الْبُؤْسَ وَالتَّبَاؤُسَ وَالتَّبَؤُّسَ۔ کہ آنحضرت کو یہ بات بری لگتی تھی کہ فقراء دوسروں کے سامنے عجز و انکسار کریں یا کوئی شخص اپنے آپ کو ذلیل کرے (اور عزت نفسی کا خیال نہ رکھے) بِئْسَ۔ فعل ذم ہے اور ہر قسم کی مذمت کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ نِعْمَ ہر قسم کی مدح کے لئے استعمال ہوتا ہے اِن کا اسم اگر معرف باللام ہو یا معرف باللام کی طرف مضاف ہو تو اسے رفع دیتے ہیں جیسے بِئْسَ الرَّجُلُ زَيْدٌ وَبِئْسَ غُلَامُ الرَّجُلِ زَيْدٌ اور اسم نکرہ کو نصب دیتے

---

[۱] ومنہ ابتر بمعنی ادخر (الحدیث:۔ فلم یبتئر خیرًا ای فلم یدخر (اللسان) [۲] و فی اللسان (باس) و یجوز التبؤس ای بالقصر والتشدید و کذا جاء فی حدیث الصلوۃ:۔ ان تقنع یدیک و تباءس تفاعل من بئس بمعنی افتقر والحدیث اخرجہ ابونعیم فی تاریخ اصبہان وحمزہ السہمی فی تاریخ جرجان عن ابی ہریرۃ / ان اللہ اذا انعم علی عبد نعمۃ ۔ ویکرہ البؤس والتبؤس ورواہ ابویعلی والبیہقی فی الشعب ویبغض البؤس والتباؤس النظر ص ۲۳ رقم ۱۸۹ ص ۲۴ رقم ۳۶۰ عن ابی ہریرۃ مرفوعا وفیہ عن ابی سعید و ہناد ــــ عن یحییٰ بن جعدۃ مرسلا ــــ ویبغض بدل یکرہ والحدیث مذکور مع حدیث ان اللہ جمیل یحب الجمال راجع تخریج الکشاف وکنز العمال ۶:۲۵۸۶ ۵۹۲ لا یحب بدل یکرہ (طب، ہق، والضیاء عن زہیر بن ابی علقمۃ ۱۲۶۰۲، ۲۶۱۱، ۲۶۱۲ (ابن صیعری فی امالیہ عن ابی ہریرۃ)

ہیں جیسے قرآن میں ہے:۔ بِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۵-۷۹) ای بِئْسَ شَيْئًا يَفْعَلُونَهُ یعنی بلاشبہ وہ برا کرتے تھے وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴-۲۹) اور وہ بُرا ٹھکانا ہے فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ۔ (۳۹-۷۲) تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے۔ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا (۱۸-۵۰) ظالموں کے لئے برا بدل ہے۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۵-۶۳) بلاشبہ وہ بھی برا کرتے ہیں بِئْسَ اصل میں بَئِسَ (س) اور بُؤْسٌ سے مشتق ہے۔

(ب ت ر)

اَلْبَتْرُ۔ یہ قریبًا بَتْكٌ کے ہم معنی ہے مگر خاص کر دُم کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ پھر مجازاً قطع نسل کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور اَبْتَر اس شخص پر بولا جاتا ہے جس کی موت کے بعد اس کا خلف نہ ہو اور اَبْتَر یا اَبَاتِر وہ جس کا ذکر خیر باقی نہ رہے نیز رَجُلٌ اَبَاتِرٌ۔ قاطع رحم۔ اور جس خطبہ کے شروع میں حمد وثنا نہ ہو اسے بھی مجازاً خُطْبَةٌ بَتْرَاء کہا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا ہے[1] كُلُّ اَمْرٍ لَا يُبْدَءُ فِيهِ بِذِكْرِ اللهِ فَهُوَ اَبْتَرُ (۱۷) ہر وہ کام جس کے شروع میں اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ اَبْتَر رہے۔

اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۱۰۸-۳) میں اَبْتَر کے معنی یہ ہیں کہ تیرے مخالف کا ذکر خیر باقی نہیں رہے گا۔ جب کفار نے طعنہ دیا کہ محمدؐ کی موت کے ساتھ ہی اس کا نام ونشان منقطع ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کی نسل (اولاد) نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا کہ تمہارا بداندیش ہی مقطوع النسل رہے گا آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴-۴) کا مقام بخشا ہے کیونکہ جملہ مؤمنین آپ کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کے اور آپ کے دین کے محافظ مقرر کر دیا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے[2] (۲۰) اَلْعُلَمَاءُ بَاقُونَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ، اَعْيَانُهُمْ مَفْقُودَةٌ وَاٰثَارُهُمْ فِي الْقُلُوبِ مَوْجُودَةٌ۔ علماء تا قیامت باقی رہیں گے ان کے اجسام مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ مگر ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر ثبت رہتے ہیں۔ جب علماء کو یہ فضیلت حاصل ہے جو آنحضرت کے متبعین سے ہیں تو آنحضرت کی شان تو اس سے کہیں بلند ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو "رفع ذکر" کا شرف بخشا ہے اور آپ کو خاتم الانبیاء قرار دیا ہے صلی اللہ علیہ وعلیہم افضل الصلاۃ والسلام

(ب ت ك)

اَلْبَتْكُ (ض) یہ قریب قریب بَتٌّ (کاٹنا) کے ہم معنی ہے مگر بَتْكٌ کا لفظ اعضاء یا بال کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے بَتَكَ شَعْرَهُ

---

[1] والحدیث اوردہ العلماء بالفاظ مختلفۃ رواہ ابوعوانۃ فی صحیحہ واصحاب السنن ــــ عن ابی ہریرۃ بلفظ لایبدأ فیہ بحمد اللہ فہو اقطع (احمد فی مسندہ من ہذا الوجہ" لایفتتح بذکر اللہ فہو ابتر واقطع" والخطیب فی الجامع عن الزہری لایبدأ فیہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم فہو اقطع ومارواہ المؤلف فلم ار فی المراجع بہذ اللفظ راجع تخریج الکشاف ص ۲ رقم ۲ ؛ [2] انظر القول علی ہذا ادب الدنیا والدین لشرادوفیس وفا ۶۱ ولفظہ : ـ وبقی خزان العلم اعیانہم مفقودۃ وامثالہم فی القلوب موجودۃ ۱۲

وَاُذُنَہٗ۔ اس نے فلاں کے بال یا کان کاٹ ڈالے قرآن میں ہے: فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ (۴-۱۱۹) کہ وہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں۔

اسی سے سَیْفٌ بَاتِکٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی قاطع تلوار کے ہیں۔ اور جب کسی جانور کے بال یا پر پکڑ کر اس طرح کھینچے جائیں کہ وہ جڑ سے اکھڑ جائیں تو اس معنی میں بَتَکْتُ الشَّعْرَ بولتے ہیں اور اس طرح اکھڑے ہوئے بالوں کے قطعہ کو بِتْکَۃٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع بِتَکٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1]

(۳۷) طَارَتْ وَفِیْ یَدِھَا مِنْ رِیْشِھَا بِتَکٌ (بسیط)

وہ (قطاۃ) اڑ گئی اور اس کے ہاتھ میں کچھ پر باقی رہ گئے اور بَتٌّ کا لفظ رسی یا تعلق کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے محاورہ ہے طَلَّقْتُ الْمَرْءَۃَ بَتَّۃً وَبَتْلَۃً۔ میں نے عورت کو قطعی طلاق دے دی بَتَّتُّ الْحُکْمَ بَیْنَھُمَا۔ میں نے ان کے درمیان قطعی فیصلہ کر دیا۔

ایک روایت میں ہے[2]

(۲۱) لَاصِیَامَ لِمَنْ لَمْ یُبَیِّتِ الصِّیَامَ مِنَ اللَّیْلِ جو شخص رات کو روزہ کی قطعی نیت نہ کرے اسکا روزہ نہیں ہے۔

اور بَتْلٌ بھی اس کے ہم معنی ہے مگر یہ لفظ کپڑے کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے نیز رو اونٹنی کو نَاقَۃٌ بَشْکٰی کہا جاتا ہے کیونکہ سرعت رفتار میں اونٹنی کے ہاتھ کو بافندہ عورت کے ہاتھ مشابہ ہوتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3]

(۳۸) فِعْلَ السَّرِیْعَۃِ بَادَرَتْ جُدَّادُھَا قَبْلَ الْمَسَاءِ تَھُمُّ بِالْاِسْرَاعِ

جیسا کہ بافندہ عورت کپڑا بنتی ہوئی اس کے دامن تک پہنچ جاتی ہے اور وہ غروب آفتاب سے قبل اسے ختم کرنے کے لئے جلدی کرتی ہے۔

(ب ت ل)

آیت کریمہ:۔ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا (۷۳-۸) کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص نیت اور عبادت میں سب سے کٹ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ (۶-۹۱) کہدو کہ (اس کتاب کو) خدا ہی نے (نازل کیا تھا) پھر ان کو چھوڑ دو۔ لہذا اس آیت یعنی وتبتل الیہ تبتیلا اور حدیث[4] (۲۲) لَارَھْبَانِیَّۃَ وَلَا تَبَتُّلَ فِی الْاِسْلَامِ کے درمیان منافات نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جس تبتل سے منع کیا گیا ہے وہ نکاح سے کنارہ کشی انقطاع ہے اور اسی معنی میں مریم علیہ السلام کو اَلْعَذْرَاءُ الْبَتُوْلُ کہا جاتا ہے کیونکہ مریم علیہ السلام عمر بھر ازدواجی زندگی سے کنارہ کش رہیں اور ترک نکاح شرعاً ممنوع ہے جیسے فرمایا:۔

---

[1] قالہ زہیر وصدرہ: حتی اذا ماکف الغلام لہا ۔۔۔ والمؤنث یرجع الی القطاۃ والبیت فی دیوانہ والبحر۵: ۴۳۳/۳: ۸۴۳ و مختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۷۱) وذیل ابدال ابی الطیب ۲: ۵۵ والعقد الثمین ۸۷ من قصیدۃ فی ۳۴ بیتًا قالہا حین اغار بنو اسد علی ابلہم واستاقتہا [2] الحدیث رواہ اصحاب السنن والطبرانی العصص [3] قالہ المسیب بن علس والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲: ۰۴) وایضًا وامالی المرتضی (۱: ۵۶۰) وفی المطبوع عدا دلم دبالحار) مصحف والجداد معناہ صدب الثوب یعنی ان ہذہ النساجۃ قد قاربت الفراغ من الثوب وبلغت الی صدبہ فہی تبادر الفراغ منہ قبیل المساء والقصیدۃ فی ذیل الامالی ۱۳۰-۱۳۲ فی ۲۶ بیتًا وذکر ان ابا جعفر المنصور استحسنہا [4] حدیث النہی عن التبتل رواہ الترمذی وابن ماجۃ عن سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وایضًا راجع الفائق ۱/۶۹ ۲ وابوعبید فی غریبہ:

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (۲۴-۳۲) کہ اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو اور حدیث میں ہے[1] (۲۳) تَنَاكَحُوْا تَكْثُرُوْا فَاِنِّىْ اُبَاهِىْ بِكُمُ الْاُمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ کہ نکاح کرو تاکہ تمہاری کثرت ہو قیامت کے دن دوسروں کے مقابلہ میں مجھے تمہاری کثرت تعداد سے فخر ہوگا۔

نَخْلَةٌ مُّبْتَلٌ۔ کھجور جس کے ساتھ کا چھوٹا پودا اس سے الگ ہو گیا ہو

(ب ث ث)

اَلْبَثُّ (ن ض) اصل میں بَثٌّ کے معنی کسی چیز کو متفرق اور پراگندہ کرنا کے ہیں جیسے بَثَّ الرِّيْحُ التُّرَابَ۔ ہوا نے خاک اڑائی۔ اور نفس کے سخت ترین غم یا بھید کو بَثُّ النَّفْسِ کہا جاتا ہے بَثَثْتُهٗ فَانْبَثَّ میں نے اسے منتشر کیا چنانچہ وہ منتشر ہوگیا اور اسی سے فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا (۵۶-۶) ہے یعنی پھر وہ منتشر ذرات کی طرح اڑنے لگیں اور آیت کریمہ: وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ (۲-۱۶۴) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں ہر قسم کے جانوروں کو پیدا کیا اور ان کو ظہور بخشا اور آیت: كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (۱۰۱-۴) میں المبثوث سے مراد وہ پروانے ہیں جو مخفی اور پرسکون جگہوں میں بیٹھے ہوں اور ان کو پریشان کر دیا گیا ہو۔ اور آیت اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (۱۲-۸۶) میں بَثٌّ کے معنی سخت ترین اور پوشیدہ غم کے ہیں جو وہ ظاہر کر رہے ہیں اس صورت میں مصدر بمعنی مفعول ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر بمعنی فاعل ہو یعنی وہ غم جس نے میرے فکر کو منتشر کر رکھا ہے جیسا کہ توزعنی الفکر کا محاورہ ہے یعنی مجھے فکر نے پریشان کر دیا۔

(ب ج س)

بَجَسَ الْمَآءُ وَانْبَجَسَ۔ پانی پھوٹ کر بہ نکلا یہ اِنْفَجَرَ کے ہم معنی ہے مگر اِنْبِجَاسٌ عام طور پر اس مقام پر بولا جاتا ہے جب کسی تنگ مقام سے پانی بہ نکلا ہو اور اِنْفِجَارٌ کا لفظ عام ہے یعنی وہ کسی تنگ مقام سے پانی بہ نکلنے پر بھی بولا جاتا ہے اور وسیع جگہ سے بھی۔

یہی وجہ ہے قرآن میں ایک مقام پر فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۷-۱۶۰) آیا ہے اور دوسرے مقام پر فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۲-۶۰) آیا ہے یعنی تنگ مقام (پتھر) سے پانی بہ نکلنے پر دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ (مگر جہاں یہ معنی ملحوظ نہیں) جیسے وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا (۱۸-۳۳) کہ دونوں کے درمیان ہم نے ایک نہر بھی جاری کر دی۔ وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا (۵۴-۱۲) کہ ہم نے زمین میں چشمے جاری کر دیئے ـــــ وہاں صرف فَجَّرَ کا لفظ استعمال ہوا بجسنا نہیں فرمایا:

(ب ح ث)

اَلْبَحْثُ (ف) کے معنی کریدنا اور تلاش کرنا کے ہیں بَحَثْتُ عَنِ الْاَمْرِ و بحثت كذا

[1] الحدیث بالفاظہ مرفوعًا فی الاحیاء (مسند الفردوس) وعزاہ للدیلمی وابن مردویہ فی تفسیرہ موقوفًا علی ابن عمر واسنادہ ضعیف والبیہقی فی المعرفۃ عن الشافعی از بلغۃ راجع الاحیاء بتخریج العراقی ۲/۲۲ والنیل ۶/۱۰۶

میں نے فلاں معاملہ کے متعلق کرید کی یا فلاں چیز کو تلاش کیا قرآن میں ہے: فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ (۵-۳۱) اب خدا نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کریدنے لگا۔ اور جب اونٹنی چلتے وقت زمین پر سخت پاؤں رکھے (کہ مٹی اڑاتی ہوئی چلی جائے) تو ایسے موقعہ پر بَحَثَتِ النَّاقَۃُ فِی السَّیْرِ کہا جاتا ہے۔

(ب ح ر)

اَلْبَحْرُ (سمندر) اصل میں اس وسیع مقام کو کہتے ہیں جہاں کثرت سے پانی جمع ہو پھر کبھی اس کی ظاہری وسعت کے اعتبار سے بطور تشبیہ بَحَرْتُ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سمندر کی طرح کسی چیز کو وسیع کر دینا کے ہیں اسی سے بَحَرْتُ الْبَعِیْرَ ہے یعنی میں نے بہت زیادہ اونٹ کے کان کو چیر ڈالا یا پھاڑ دیا اور اس طرح کان چرے ہوئے اونٹ کو اَلْبَحِیْرَۃ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے مَاجَعَلَ اللّٰہُ مِنْ بَحِیْرَۃٍ (۵-۱۰۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے بحیرہ جانور کا حکم نہیں دیا کفار کی عادت تھی کہ جو اونٹنی دس بچے جن چکتی تو اس کا کان پھاڑ کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے اور نہ بوجھ لادتے۔

اور جس کو کسی صنعت میں وسعت حاصل ہو جائے اسے بحر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کو بحر کہہ دیا جاتا ہے۔ آنحضرت نے ایک گھوڑے پر سواری کے بعد فرمایا:[1] (۲۲) وَجَدْتُہٗ بَحْرًا کہ میں نے اسے سمندر پایا۔

اسی طرح وسعت علمی کے اعتبار سے بھی بحر کہہ دیا جاتا ہے اور تَبَحَّرَ فِی کَذَا کے معنی ہیں اس نے فلاں چیز میں بہت وسعت حاصل کر لی اور اَلْبَتَحُّرُ فِی الْعِلْمِ علم میں وسعت حاصل کرنا۔

اور کبھی سمندر کی ملوحت اور نمکینی کے اعتبار سے کھاری اور کڑوے پانی کو بَحْرَانِیٌّ کہہ دیتے ہیں۔ اَبْحَرَ الْمَاءُ۔ پانی کڑوا ہو گیا شاعر نے کہا ہے[2]

(۳۹) قدعاد ماء الارض بحرا فزادنی
الی مرض ان اَبْحَرَ المشربُ العذبُ

زمین کا پانی کڑوا ہو گیا تو شیریں گھاٹ کے تلخ ہونے سے میرے مرض میں اضافہ کر دیا۔

اور آیت کریمہ: بَحْرَیْنِ ھٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّھٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۲۵-۵۳) دو دریا ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری ہے چھاتی جلانے والا میں عَذْبٌ کو بحر کہنا مِلْحٌ کے بالمقابل آنے کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورج اور چاند کو قَمَرَانِ کہا جاتا ہے اور بَنَاتُ بَحْرٍ کے معنی زیادہ بارش برسانے والے بادلوں کے ہیں۔ اور آیت: ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۳۰-۴۱) کی تفسیر میں بعض نے

---

[1] من حدیث انس بن مالک رواہ البخاری فی مواضع من صحیحہ باب الرکوب علی الدابۃ الصعبۃ راجع الفتح و مسلم باختلاف الالفاظ و اللسان (بحر) قالہ فی فرس لابی طلحۃ یقال لہ مندوب۔ [2] قالہ نصیب و البیت فی اللسان والمحکم (بحر) والصحاح وفی روایۃ فردنی بدل فزادنی والاشباہ النحویہ ۳ر ۲۴۴ والبحر (۱: ۵۹) والبلدان (اسم بحار) وفی روایۃ عذب الماء بدل ماء الارض وعلی ظمائی بدل الی مرض۔

کہا ہے کہ بحر سے سمندر مراد نہیں ہے بلکہ بَرّ سے جنگلات اور بحر سے زرخیز علاقے مراد ہیں۔
لَقِيْتُهٗ صَحْرَةً بَحْرَةً میں اسے ایسے میدان میں ملا جہاں کوئی اوٹ نہ تھی۔[1]

(ب خ س)

اَلْبَخْسُ (س) کے معنی کوئی چیز ظلم سے کم کرنا کے ہیں قرآن میں ہے وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (۱۱-۱۵) اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ (۷-۸۵) اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو۔
اَلْبَخْسُ وَالْبَاخِسُ۔ حقیر اور ناقص چیز۔ اور آیت کریمہ:۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ (۱۲-۲۰) میں بعض نے کہا ہے کہ بَخْسٍ کے معنی حقیر اور ناقص کے ہیں اور بعض نے منحوس یعنی منقوص کا ترجمہ کیا ہے۔
محاورہ ہے تَبَاخَسُوْا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی حق تلفی کی۔

(ب خ ع)

اَلْبَخْعُ (ف) کے معنی غم سے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالنا کے ہیں[2] اور آیت کریمہ:۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (۱۸-۶) شاید تم غم و غصہ سے خود کو ہلاک کر ڈالو۔ میں رنج و غم کے ترک کی ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ آیت: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵-۸) میں ہے کہ ان پر حسرتوں کے باعث تمہاری جان نہ نکل جائے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (طویل)

(۴۰) اَلَا اَيُّهَا الْبَاخِعُ الْوَجْدِ نَفْسَهٗ

. . . .

اے غم کی وجہ سے خود کو ہلاک کرنے والے
بخع فلانٌ بالطاعۃ فلاں نے طاعت میں مبالغہ کیا۔ بخع فلانٌ بِمَا علیہ من الحق فلاں نے سخت بیزاری کے ساتھ اپنے اوپر دوسرے کے حق کا اقرار کیا گویا یہاں سخت کراہت اور بیزاری کو خود کو ہلاک کرنے کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔

(ب خ ل)

اَلْبُخْلُ (س) اپنے جمع کردہ ذخائر کو ان جگہوں سے روک لینا جہاں پر خرچ کرنے سے اسے روکنا نہیں چاہئے۔ اس کے بالمقابل الجود ہے بَخِلَ اس نے بخل کیا بَاخِلٌ۔ بخل کرنے والا۔
اَلْبَخِيْلُ (صیغہ مبالغہ) جو بہت زیادہ بخل سے کام لیتا ہو جیسا کہ الراحم (مہربان) سے اَلرَّحِيْمُ مبالغہ کے لئے آتا جاتا ہے۔
اَلْبُخْلُ۔ دو قسم پر ہے ایک یہ ہے کہ انسان اپنی چیزوں کو خرچ کرنے سے روک لے اور دوم یہ کہ دوسروں کو بھی خرچ کرنے سے منع کرے یہ پہلی

---

[1] ای لیس بینی و بینہ حاجۃ انظر للکلمۃ المیدانی ۲ رقم ۱۹ والصحاح (بحر) وفی ہوامش الصحاح: کل من صحرۃ و بحرۃ غیر منصرف و فی القاموس و ینونان [2] اصلہ فی الذبیحۃ یقال بخع الذبیحۃ اذا بالغ فی الذبح حتی یقطع عظم رقبتہا و البخاع العرق فی الصلب ثم کثر استعمالہ للمبالغۃ فی شیء (الفائق ۱: ۴۷) [3] قالہ ذو الرمۃ و تمامہ . . . لشیء نحتہ عن یدیہ المقادر۔ راجع دیوانہ ۲۵۱ ط کیمبرج ۱۹۱۹ء) و مجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۳۹۳ ر ۲: ۳۸) و غریب القرآن للقتیبی ۲۶۳ والسیوطی ۲۲۷ والبحر (۶: ۹۲) و عزاہ الی الفرزدق والصحاح والتاج والاساس واللسان (بخع) والبیت من شواہد الطبری فی تفسیرہ (۱۵: ۱۹۴ ر ۹: ۵۸) و فی روایۃ عن یدیک و فی البیت ایضاً شاہد علی وصف ای فی النداء باسم الاشارۃ موصوف بال و البیت ایضاً فی الفتح ۸: ۳۰۸)

قسم سے بدتر ہے جیسے فرمایا:۔ اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۴-۳۷) یعنی جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیں۔

(ب د ء)

بَدَأْتُ بِکَذَا وَاَبْدَأْتُ وَابْتَدَأْتُ میں نے اسے مقدم کیا۔ اس کے ساتھ ابتدا کی۔

اَلْبَدْءُ وَالْاِبْتِدَاءُ۔ ایک چیز کو دوسری پر کسی طور مقدم کرنا قرآن میں ہے وَبَدَأَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (۳۲-۷) اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔ کَیْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (۲۹-۲۰) اس نے کیسے مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اَللّٰہُ یَبْدَءُ الْخَلْقَ (۳۰-۱۱) خدا ہی نے مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا کَمَا بَدَأَکُمْ تَعُوْدُوْنَ (۷-۲۹) اس نے جس طرح تم کو ابتداء میں پیدا کیا تھا اس طرح تم پھر پیدا ہو جاؤ گے۔

مَبْدَءُ الشَّیْءِ۔ جس سے کوئی چیز مرکب ہو یا اس سے بنے مثلاً حروف تہجی کو مبدء کلام کہا جاتا ہے اور لکڑی دروازے یا تخت کا مبدء ہے اسی طرح نَوَاۃٌ (گٹھلی) کھجور کا مبدء کہلاتی ہے۔

بَدْءٌ (پہلا سردار) یعنی سرداروں کا شمار کیا جائے تو اس سے ابتدا ہو اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِیْدُ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی ابتداء اور انتہا کا سبب اصلی ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ رَجَعَ عَوْدَہٗ عَلٰی بَدْئِہٖ۔ یعنی جس راستہ پر آیا اسی پر واپس لوٹا۔

فعل ذالک عَائِدًا وَ بَادِءًا وَمُبْدِءًا وَمُعِیْدًا۔ اسے سب سے پہلے کیا اَبْدَأْتُ مِنْ اَرْضٍ کَذَا میں نے فلاں سرزمین سے سفر شروع کیا اور آیت کریمہ۔ بَادِیَ الرَّأْیِ (۱۱-۲۷) رائے فطری یعنی وہ رائے جو ابتداء سے قائم کرلی جائے۔

ایک قراءت میں بَادِیَ الرَّاْیِ بدون ہمزہ کے ہے اس صورت میں اس کے معنی ظاہری رائے کے ہوں گے جس میں غور و فکر سے کام نہ لیا گیا ہو۔

شَیْءٌ بَدِیْءٌ۔ انوکھی چیز جو پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئے جیسا کہ اَلْبَدِیْعُ جو پہلے معمول نہ ہو۔

اَلْبَدْأَۃُ وہ حصہ جس سے تقسیم کی ابتداء کی جائے اسی سے گوشت کے بڑے ٹکڑے کو بَدْءٌ کہا جاتا ہے۔

(ب د ر)

بَدَرْتُ اِلَیْہِ وَبَادَرْتُ: کسی کام کے لئے جلدی کرنا قرآن میں ہے وَلَا تَاْکُلُوْھَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا (۴-۶) جلدی میں نہ اڑا دینا یعنی اسراف اور عجلت سے یتیم کا مال مت کھاؤ اور جو لغزش جلد بازی سے انسان سے سرزد ہو اسے بَادِرَۃ کہا جاتا ہے۔ بَوَادِرُ کَانَتْ مِنْ فُلَانٍ بَوَادِرُ فِیْ ھٰذَا الْاَمْرِ فلاں سے اس معاملہ میں جلد بازی سے لغزشیں ہوئی ہیں۔

اَلْبَدْرُ (ماہ کامل) بعض نے کہا ہے کہ پورے چاند کو بَدْرٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سورج سے پہلے طلوع ہوتا ہے اور بعض نے بَدْرَۃٌ (روپے سے بھری ہوئی تھیلی) سے اخذ کیا ہے اور کہا ہے کہ پورا چاند بھی بَدْرَۃٌ کی طرح بھرپور ہوتا ہے اس لئے اسے بَدْرٌ کہا جاتا ہے اس توجیہ کی بنا پر یہ مصدر بمعنی فاعل ہوگا۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ بَدْرٌ کو اس باب میں اصل

قرار دیا جائے۔ اور دوسرے معانی کو بَدْرٌ کے
مختلف اوصاف کے اعتبار سے اس پر متفرع کیا
جائے مثلاً بَدَرَ کذا کے معنی ہوں گے وہ بدر کی
طرح طلوع اور ظاہر ہوا اور معنی اِمْتلاء کے لحاظ
سے دراہم سے بھری تھیلی کو بِدْرَۃٌ کہہ دیتے ہیں
اس طرح کھلیان کو اَلْبَیْدَرُ کہا جاتا ہے کیونکہ
وہ بھی غلہ سے پُر ہو جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ
(۳-۱۲۳) اور خدا نے جنگ بدر میں تمہاری مدد
کی تھی اور اس وقت بھی تم بے سروسامان تھے۔
میں بَدْرٌ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مشہور
مقام کا نام ہے[1]

(ب د ع)

اَلْاِبْدَاعُ۔ کسی کی تقلید اور اقتداء کے بغیر
کسی چیز کو ایجاد کرنا۔ اسی سے نئے کھودے ہوئے
کنویں کو رَکِیَّۃٌ بَدِیْعٌ کہا جاتا ہے۔ جب اِبْدَاعٌ
کا لفظ اللہ عزوجل کے لئے استعمال ہو تو اس کے
معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ بغیر مادہ اور بغیر زمان و مکان
کے کسی شئے کو ایجاد کرنا اور یہ معنی صرف اللہ تعالیٰ
کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ اور اَلْبَدِیْعُ بمعنی
مُبْدِعٌ بھی آیا ہے جیسے فرمایا:۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ (وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا
ہے (۲-۱۱۷)
اور بمعنی مُبْدَعٌ (اسم مفعول) بھی آجاتا ہے جیسے
رَکِیَّۃٌ بَدِیْعٌ (نیا کھودا ہوا کنواں)
اسی طرح بِدْعًا کا لفظ بھی اسم فاعل اور اسم
مفعول دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ
آیت کریمہ:۔ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ
کہ میں کوئی نیا پیغمبر نہیں ہوں (۴۶-۹) میں بِدْعًا
بمعنی مُبْدِعٌ بھی ہو سکتا ہے یعنی پیغمبر ایسا کہ مجھ سے
پہلے کوئی پیغمبر نہ آیا ہو اور بمعنی مُبْدَعٌ
کے بھی یعنی میں کوئی نئی بات نہیں کہتا۔
اَلْبِدْعَۃُ مذہب میں نئی بات داخل کرنا جس کا
قائل یا فاعل صاحب شریعت کی اقتدا نہ کرے
اور نہ ہی سلف صالحین اور اصول شریعت سے
اس کا ثبوت ملتا ہو ایک روایت میں ہے[2] (۲۵)
کُلُّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ
وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ کہ ہر نئی رسم بدعت
ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ
میں ہے۔ اَلْاِبْدَاعُ بِالرَّجُلِ سواری کے
ماندہ اور دبلا ہونے کی وجہ سے رفقاء سے
منقطع ہو جانا[3]۔

(ب د ل)

اَلْاِبْدَالُ وَالتَّبْدِیْلُ وَالتَّبَدُّلُ وَ
الْاِسْتِبْدَالُ کے معنی ایک چیز کو دوسری کی
جگہ رکھنا کے ہیں یہ عوض سے عام ہے کیونکہ
عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لینا
شرط ہوتا ہے لیکن تبدیل مطلق تغیر کو کہتے ہیں۔
خواہ اس کی جگہ پر دوسری چیز نہ لائے قرآن میں
ہے فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ
قِیْلَ لَھُمْ (۲-۵۹) تو جو ظالم تھے انہوں نے
اس لفظ کو جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا بدل کر اس

---

[1] راجع لتحقیقہ البلدان و معجم البکری۔ [2] کلمۃ من خطبتہ صلی اللہ علیہ وسلم انظر رقم ۳، ن، ص ۲، عن جابر و ابن حبان
فی زوائدہ رقم ۱۰۲ [3] والفعل منہ فی ہذا المعنی لا یستعمل الا مجہولا ۱۲

کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (۲۴-۵۵) اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ اور آیت:۔ فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (۲۵-۷۰) کے معنی بعض نے یہ کئے ہیں کہ وہ ایسے نیک کام کریں جو ان کی سابقہ برائیوں کو مٹا دیں اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرما دیگا اور ان کے نیک عملوں کا انہیں ثواب عطا کریگا فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ (۲-۱۸۱) تو جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے۔ وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ (۱۶-۱۰۱) جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں۔ وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ (۳۴-۶)۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ (۷-۹۵) پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔

اور آیت کریمہ:۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ (۱۴-۴۸) کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی موجودہ حالت تبدیل کر دی جائے گی۔ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ (۴۰-۲۶) کہ وہ (کہیں) تمہارے دین کو (نہ) بدل دے۔ وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ (۲-۱۰۸) اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر اختیار کیا وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۴۷-۳۸) اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئیگا۔ اور آیت کریمہ:۔ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (۵۰-۲۹) ہمارے ہاں بات بدلا نہیں کرتی۔ کا مفہوم یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتا پس اس میں تنبیہ ہے کہ جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وقوع پذیر ہو گی وہ اس کے علم کے مطابق ہی وقوع پذیر ہو گی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس کے وعدہ میں خلف نہیں ہوتا۔ اور فرمان باریتعالیٰ: لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (۶-۳۴) تو اہین خداوندی کو تبدیل کرنے والا نہیں۔ نیز: لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ فطرت الہٰی میں تبدیلی نہیں ہو سکتی (۳۰-۳۰) بھی ہر دو معانی پر محمول ہو سکتے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اس آخری آیت میں خبر بمعنی امر ہے اس میں اختصاء کی ممانعت ہے۔

اَلْاَبْدَالُ وہ پاکیزہ لوگ کہ جب کوئی شخص ان میں سے مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا قائم مقام فرما دیتے ہیں[1] درحقیقت ابدال وہ لوگ ہیں جنہوں نے صفات ذمیمہ کی بجائے صفات حسنہ کو اختیار کر لیا ہو۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جنکی طرف آیت: فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (۲۵-۷۰) میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَلْبَادِلَۃُ گردن اور ہنسلی کے درمیان کا حصہ اس کی جمع بَآدِلُ ہے[2] ع (طویل)

---

[1] قال علی الابدال بالشام والنجباء بمصر والعصائب بالعراق (النهایة ۱ر۲۴) والحدیث الابدال راجع مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۲-۶۳ من علی موقوفا وعن عبادة بن الصامت وانس وابن مسعود مرفوعا ولا يخلو ای حدیث عن مقال ؕ

[2] وصدره: فتی قدّ قدّ السيف لا متضائل... وفی اللسان وابدال ابی الطیب متآزف بدل متضائل وفی الاصول ولارهل بدل رہل وقد وقع فی نسبة هذا البیت تخليط وارتباك ففی المرزوقی (۲۴-۱۰۴-۱۰۹) والحماسة مع التبریزی ۳:۲۴- لزینب بنت الطثریه فی رثاء اخیها ولکن اخوه شاعرا مغلقا كذا فی الحماسة البحتری ۲۷۵ والبیان (۱:۲۱۶) والاغانی ۷:۱۴۶) وامالی القالی (۲:۸۵-۸۶) لکن فی الحماسة نفسه ۲:۱۹۳) ذکر هذا البیت مع ابیات لجبیر السلولی (لجبیر بن عبدالله) وفی الصناعتین ۲۵۲ و غیر عزو فی روايته صدره طويل نجاد السيف لا متضائل وفی السمط ۱۰۰۸ انه لثور بن الطثريه فی رثاء اخيه يزيد وقيل لام يزيد ترثی ابنها راجع السمط وفی محاضرات المؤلف (۳:۲۶۲) وبعضهم نسبها الی الابيرد ارباكی والاغانی ۱۲:۱۲۴-۱۲۷)

(۱۹) وَلَا رَهِلٌ لَبَّاتُهُ وَبَآدِلُهُ
اس کے سینہ اور بغلوں کا گوشت ڈھیلا نہیں تھا۔

(ب د ن)

اَلْبَدَنُ یہ جَسَدٌ کے ہم معنی ہے لیکن بدن باعتبار عظمت جثہ کے بولا جاتا ہے اور جَسَدٌ باعتبار رنگ کے اسی سے رنگین کپڑے کو ثَوْبٌ مُجَسَّدٌ کہا جاتا ہے اور جسیم عورت کو اِمْرَءَةٌ بَادِنٌ وَبَدِیْنٌ کہتے ہیں اسی سے قربانی کے جانوروں کو اس کے فربہ ہونے کی وجہ سے بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے اور بَدَنَ وَبَدَّنَ کے معنی موٹا ہونے کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بَدَّنَ کے معنی عمر رسیدہ ہو جانا کے ہیں شاعر نے کہا ہے[۱] (رجز)

(۲۰) وَکُنْتُ خِلْتُ الشَّیْبَ وَالتَّبْدِیْنَا۔
میں بڑھاپے اور عمر رسیدہ ہونے کو خیال کرتا تھا اسی معنی میں آنحضرت نے فرمایا[۲]۔ (۲۶)
لَا تُبَادِرُوْنِیْ بِالرُّکُوْعِ وَالسُّجُوْدِ فَاِنِّیْ قَدْ بَدَّنْتُ۔ کہ میں بوڑھا اور سن رسیدہ ہوگیا ہوں اس لئے رکوع و سجود میں مجھ سے سبقت نہ کیا کرو۔

اور آیت کریمہ: فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ (۱۰-۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے۔ میں بَدَنٌ بمعنی جَسَدٌ ہے اور بعض نے اس سے زرہ مرادلی ہے کیونکہ زرہ کو بھی جسم پر ہونے کی وجہ بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ قمیص کے بازو کو یَدٌ اور اس کی اگلی اور پچھلی طرف کو ظہر اور بطن کہدیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَکُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لئے شعائر خدا مقرر کیا ہے (۲۲-۳۶) میں بُدْنٌ بَدَنَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہدی یعنی قربانی کے ہیں جو حرم میں لے جاکر ذبح کی جائے۔

(ب د و)

بَدَا (ن) الشَّیْءُ یَبْدُ وًّا وَبَدَاءٌ کے معنی نمایاں طور پر ظاہر ہو جانا کے ہیں قرآن میں ہے:۔
وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ۔ (۳۹-۴۷) اور ان پر خدا کی طرف سے وہ امر ظاہر ہو جائیگا جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔
وَبَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوْا (۳۹-۴۸) اور ان کے اعمال کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جائیں گی۔
فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (۲۰-۱۲۱) تو ان پر ان کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں۔
اَلْبَدْوُ یہ حَضَرٌ کی ضد ہے اور آیت کریمہ:۔ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ (۱۲-۱۰۰) آپ کو گاؤں سے یہاں لایا۔ میں بَدْوٌ بمعنی بَادِیَةٌ (صحراء) ہے اور ہر وہ مقام جہاں کوئی عمارت وغیرہ نہ ہوں اور تمام چیزیں ظاہر نظر آتی ہوں اسے بَدْوٌ (یا بَادِیَةٌ) کہا جاتا ہے اور اَلْبَادِیْ کے معنی صحرا نشین کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
سَوَآءَنِ الْعَاکِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ (۲۲-۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔
لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ (۳۳-۲۰) کہ کاش گنواروں میں جا رہیں[۳]۔

---

[۱] قالہ حمید الارقط وتمامہ: وانہم مما یذھل القرینا۔ وفی اللسان (بدن وکون) واضداد ابی الطیب ۲۲۸ بغیر عزو والبیت فی الاقتضاب ۳۴۲ واصلاح المنطق ۳۳۰ وغریب ابی عبید ا ر ۲ ھا وفیہ کمیت [۲] الحدیث باختلاف الالفاظ رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ عن معاویۃ (ک) عن ابی موسیٰ والبیہقی عن معاویۃ وابن سعد والبغوی عن ابی سعدۃ صاحب الجیوش انظر کنز العمال ج ۷ رقم ۲۷۸، ۲۷۸۳، ۲۸۱۴، ۳۰۱۹ وغریب ابی عبید ۲ر۲د

[۳] الابداء (افعال) ظاہر کرنا (۲-۳۱) (۲-۳۳) (۲-۷۱)

(ب ذ ر)

اَلتَّبْذِیْرُ (تفعیل) کے معنی پراگندہ کرنے اور بکھیر دینے کے ہیں اصل میں "تَبْذِیْرٌ" کے معنی زمین میں بیج ڈالنے کے ہیں اور چونکہ زمین میں بیج ڈالنا ناعاقبت اندیش لوگوں کی نظر میں بظاہر ضائع کرنا ہوتا ہے اس لئے تَبْذِیْر کا لفظ بطور استعارہ مال ضائع کردینے کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (۱۷-۲۷) فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا (۱۷-۲۶) اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ۔

(ب ر ر)

اَلْبَرُّ یہ بَحْرٌ کی ضد ہے (اور اس کے معنی خشکی کے ہیں) پھر معنی وسعت کے اعتبار سے اس سے اَلْبِرُّ کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جس کے معنی وسیع پیمانہ پر نیکی کرنا کے ہیں اس کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جیسے اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۵۲-۲۸) بے شک وہ احسان کرنے والا مہربان ہے۔ اور کبھی بندہ کی طرف جیسے بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّهٗ (یعنی بندے نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی) چنانچہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ثواب عطا کرنا ہوتے ہیں۔ اور جب بندہ کی طرف منسوب ہو تو اطاعت اور فرمانبرداری کے اَلْبِرُّ (نیکی) دو قسم پر ہے اعتقادی اور عملی اور آیت کریمہ:۔ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ (۲-۱۷۷) (الآیۃ) دونوں قسم کی نیکی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسی بنا پر جب آنحضرت سے بِرٌّ کی تفسیر دریافت کی گئی تو آں جناب نے جواباً یہی آیت تلاوت فرمائی کیونکہ اس آیت میں عقائد و اعمال فرائض و نوافل کی پوری تفصیل پائی جاتی ہے[1]۔

بِرُّ الْوَالِدَیْنِ کے معنی ہیں ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ اور احسان کرنا اس کی ضد عُقُوْقٌ ہے۔ قرآن میں ہے۔ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ (۶۰-۸) جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی ...... کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا۔

اور بِرٌّ کے معنی سچائی بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی خیر ہے جس میں وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔ بَرَّ فِیْ یَمِیْنِهٖ اس نے اپنی قسم پوری کر دکھائی اور شاعر کے قول[2] (۴۳) اَکُوْنُ مَکَانَ الْبِرِّ مِنْهُ۔

میں بعض نے کہا ہے کہ بِرٌّ بمعنی فُؤاد یعنی دل ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی بِرٌّ بمعنی نیکی ہے یعنی میرا مقام اس کے ہاں بمنزلہ بر کے ہوگا۔

بَرَّ اَبَاهُ فَهُوَ بَارٌّ وَ بَرٌّ صیغہ صفت جو کہ صَائِفٌ وَصَیِّفٌ وَطَائِفٌ وَطَیِّفٌ

---

[1] کذا فی الطبری ۲/۹۴ و فی ابن کثیر ۱/۲۰۷ عن ابی ذر انہ سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما الایمان؟ فتلا علیہ لکنہ منقطع لان مجاہدا لم یدرک اباذر و راجع ایضاً الیعا ۔ و التاج (بر) [2] لخداش بن زہیر کما فی التاج (بر) و فی اللسان غیر منسوب لکن البیت فی روایۃ التاج:۔ یکون مکان البر منی و دونہ ۔ و اجعل مالی دونہ واؤامرہ

کی شکل دونوں طرح آتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔ وَ بَرًّا بِوَالِدَیْهِ (۱۹-۱۴) اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے۔ وَ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ (۱۹-۳۲) اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا (بنا)

بَرَّ فِیْ یَمِیْنِهٖ فَهُوَ بَارٌّ وَ اَبْرَرْتُهٗ قسم پوری کرنا۔ بَرَّتْ یَمِیْنِیْ میری قسم پوری ہو گئی۔ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ حج جس میں رفث و فسق اور جدال نہ ہو۔

اَلْبَارُّ کی جمع اَبْرَارٌ وَ بَرَرَةٌ آتی ہے قرآن میں ہے۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ (۸۲-۱۳) بیشک نیکوکار نعمتوں (کی بہشت) میں ہوں گے۔ کَلَّا اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ (۸۳-۱۸) اور یہ بھی سن رکھو کہ نیکوکاروں کے اعمال علیین میں ہیں۔ اور آیت کریمہ۔ کِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (۸۰-۱۶) جو سردار اور نیکوکار ہیں۔ میں خاص کر فرشتوں کو بَرَرَةٌ کہا ہے کیونکہ اَبْرَارٌ (جمع) سے زیادہ بلیغ ہے۔ اس لئے کہ بَرَرَةٌ، بَرٌّ کی جمع ہے اور اَبْرَارٌ بَارٌّ کی تو جیسے عَادِلٌ کی نسبت عَدْلٌ میں مبالغہ پایا جاتا ہے اسی طرح بَرٌّ میں بَارٌّ سے زیادہ مبالغہ ہے

اَلْبَرِیْرُ خاص کر پیلو کے درخت کے پھل کو کہتے ہیں عام محاورہ ہے:۔ فُلَانٌ لَا یَعْرِفُ الْبِرَّ مِنَ الْهِرِّ (وہ چوہے اور بلی میں تمیز نہیں کر سکتا) بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ حکایت کی صورت کے طور پر بولے جاتے ہیں [1] مگر اس محاورہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خیر خواہ اور بدخواہ میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

اَلْبَرْبَرَةُ بڑبڑ کرنا یہ بھی حکایت صوت کے قبیل سے ہے۔

(ب ر ء)

اَلْبُرْءُ وَالْبَرَاءُ وَالتَّبَرِّیْ کے اصل

معنی کسی مکروہ امر سے نجات حاصل کرنا کے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے۔ بَرَءْتُ مِنَ الْمَرَضِ میں تندرست ہوا۔

بَرِئْتُ مِنْ فُلَانٍ وَ تَبَرَّءْتُ میں فلاں سے بیزار ہوں۔ اَبْرَءْتُهٗ مِنْ کَذَا وَ بَرَّءْتُهٗ میں نے اس کو تہمت یا مرض سے بری کر دیا۔

رَجُلٌ بَرِیْءٌ پاک اور بے گناہ آدمی ج بُرَآءُ بَرِیْئُوْنَ قرآن میں ہے:۔ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (۹-۱) اور اس کے رسول کی طرف سے بیزاری کا اعلان ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَ رَسُوْلُهٗ (۹-۳) کہ خدا مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دست بردار ہے)۔

اَنْتُمْ بَرِیْٓئُوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۰-۴۱) تم میرے عملوں کے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے عملوں کا جواب دہ نہیں ہوں۔

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۶۰-۴) کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖٓ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (۴۳-۲۶) اور جب

---

[1] کما ورد فی التاج وعن ابن الاعرابی البر سوق الغنم والہر دعاؤہا قالہ الثقفی راجع ایضاً کتاب الحیوان (۴: ۷-۷۸) والمثل فی اللسان (بر) وادب الکاتب ۳۸ وکتب الامثال

ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ فَبَرَّءَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (۳۳-۶۹) تو خدا نے ان کو بے عیب ثابت کیا۔

اِذْ تَبَرَّءَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا (۲-۱۶۶) اس دن (کفر کے) پیشوا اپنے پیروؤں سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

اَلْبَارِئُ (پیدا کرنے والا) یہ اسماء حسنیٰ سے ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اَلْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (۵۹-۲۴) ایجاد واختراع کرنے والا صورتیں بنانے والا۔

فَتُوْبُوْا اِلٰى بَارِئِكُمْ (۲-۵۴) تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو۔

اَلْبَرِيَّةُ کے معنی مخلوق کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہموز ہے لیکن ہمزہ کو ترک (یا ادغام) کر دیا گیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ بَرَيْتُ الْقَوْسَ سے مشتق ہے اور مخلوق کو بَرِيَّةٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ البری یعنی مٹی سے پیدا کی گئی ہے۔ جیسا کہ آیت:۔ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ (۳۵-۱۱) سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (۹۸-۶) یہ لوگ سب مخلوق سے بدتر ہیں۔

(ب ر ج)

اَلْبُرُوْجُ یہ بُرْجٌ کی جمع ہے جس کے معنی قصر کے ہیں اسی مناسبت سے ستاروں کے مخصوص منازل کو بروج کہا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۸۵-۱) آسمان کی قسم جس میں بُرج ہیں۔ اَلَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا (۲۵-۶۱) جس نے آسمان میں برج بنائے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (۴-۷۸) خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو۔ میں بروج سے مضبوط قلعے اور محلات بھی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ستاروں کی برجیں مراد ہوں اس صورت میں بروج کے ساتھ فقط مُشَيَّدَةٍ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا اور باعتبار معنی اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوگا۔ جیسا کہ زہیر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۴۴) وَمَنْ هَابَ اَسْبَابَ الْمَنَايَا يَنَلْنَهُ
وَلَوْ نَالَ اَسْبَابَ السَّمَآءِ بِسُلَّمِ

جو شخص اسباب موت سے ڈرتا ہے تو وہ لامحالہ اس کو پالیں گے۔ اگرچہ سیڑھی لگا کر آسمان کے اسباب پر کیوں نہ چلا جائے۔

اگر زمین کی برجیں مراد ہوں تو یہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہوگا جیسے دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے[2] ع (بسیط)

(۴۵) وَلَوْ كُنْتُ فِيْ غُمْدَانَ يَحْرُسُ بَابَهُ
اَرَاجِيْلُ اُحْبُوْشٍ وَاَسْوَدُ آلِفُ

---

[1] انظر دیوانہ ۳۰ وشرح العقائد النسفی ۱۲ وابن الانباری ۲۸۳ وفی روایتہ اختلاف واللسان (سبب) والمشکل القتیبی ۴۲ ۳۵۷ والبحر ۲۶/۱:۱۹۵ / ۴/۳ :۳۹۵) والطبری (۸-۵۷) والعمدۃ (۱: ۳۳۳) والجمہرۃ ۱۱۰ [2] من قول ثعلبۃ بن عمر والعبدی وہمامن کلمۃ مفضلیۃ رقم ۷۴ فی ۱۲ بیتا وراجع الحماسۃ للبحتری ۷۹ والمعانی الکبیر ۴۸۵ وفی الاغانی (۱۱-۱۲۷-۱۲۹) بہما الشیء من الاختلاف فی الروایۃ منسوبتان لابی الطفل القینی ولعلہ تمثل بہما وباختلاف طفیف فی دیوان اوس بن حجر (۱: ۴۲) راجع شرح شواہد المغنی ومعجم البلدان (ریمان)

إِذًا لَا تَأْتِنِي حَيْثُ كُنْتُ مَنِيَّتِي
يَخُبُّ بِهَا هَادٍ لِإِثْرِي قَائِفُ

اور اگر غمدان کے قلعہ میں چلا جاؤں جس کے دروازہ پر حبشی پہرہ دے رہے ہوں تو پھر بھی موت میرے پاس پہنچ جائے جیسے ایک قائف بدی خواں میرے نقش قدم پر چلا جا رہا ہوگا
ثَوْبٌ مُبَرَّجٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر برجوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں پھر اس میں معنی حسن کا اعتبار کرکے تَبَرَّجَتِ الْمَرْأَةُ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی عورت نے مزین کپڑے کی طرح آرائش کا اظہار کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ تَبَرَّجَتِ المرأۃ کے معنی ہیں عورت اپنے قصر سے ظاہر ہوئی جیسا کہ ان دونوں آیتوں۔
وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (۳۳-۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح (پہلے) جاہلیت کے زمانہ میں اظہار تجمل کرکے اپنے محلات سے نکلا کرتی تھیں اسی طرح اب مت نکلو زینت نہ دکھاؤ۔
غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ (۲۴-۶۰) بشرطیکہ اپنی زینت کی چیزیں ظاہر نہ کریں۔ سے معلوم ہوتا ہے اور پھر حسن وسعت میں تشبیہ دے کر وسعت چشم اور حسن نظر کے لئے اَلْبُرْجُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(ب ر ح)

اَلْبَرَاحُ اس وسیع جگہ کو کہتے ہیں جہاں عمارت درخت وغیرہ کچھ نہ ہو۔ لہذا کبھی اس میں معنی ظہور کا اعتبار لیتے ہیں جیسے فَعَلَ كَذَا بَرَاحًا یعنی اس نے کھلے بندوں یہ کام کیا بَرِحَ الْخَفَاءُ راز فاش ہو گیا گویا وہ کھلے میدان میں ہے اسی سے بَرَاحُ الدَّارِ ہے جس کے معنی گھر کے کھلے صحن کے ہیں۔
بَرَحَ کھلے میدان میں چلا جانا۔ اسی سے اَلْبَارِحُ ہے جس کے معنی سخت ہوا کے ہیں۔
اَلْبَارِحُ مِنَ الظِّبَاءِ وَالطَّيْرِ۔ خاص کر اس ہرن یا پرند کو کہتے ہیں جو شکاری کے سامنے سے ایسے رخ پر گزرے کہ اس کا نشانہ ممکن نہ ہو ایسے شکار کو منحوس سمجھا جاتا ہے اسکی جمع بَوَارِحُ آتی ہے اس کے بالمقابل سَانِحٌ اس شکار کو کہتے ہیں جو ایسے رخ سے آئے کہ اس کا قصد کار کرنا آسان ہو ایسے شکار کو میمون (مبارک) خیال کیا جاتا ہے۔
اَلْبَارِحَةُ شب گزشتہ بَرِحَ کھلی جگہ جم کر ٹھہرے رہنا اسی سے فرمان الہی لَا أَبْرَحُ ہے یہ لَا أَزَالُ کی طرح معنی مثبت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ بَرِحَ اور زَالَ میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں اور "لَا" بھی نفی کے لئے ہوتا ہے اور نفی پر نفی آنے سے اثبات حاصل ہو جاتا ہے اسی بنا پر فرمایا:۔ لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ کہ.... ہم تو اس (کی پوجا) پر قائم رہیں گے (۲۰-۹۱)
لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ (۱۸-۶۰) کہ جب تک میں دو دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں ہٹنے کا نہیں۔ اور اَلْبَارِحُ سے معنی نحوست کا اعتبار کرکے تَبْرِيحٌ اور تَبَارِيحُ کا لفظ تکلیف اور شدائد کے لئے استعمال ہونے لگا ہے جیسے بَرَّحَ بِيَ الْأَمْرُ مجھے فلاں معاملہ سے تکلیف پہنچی بَرَّحَ بِي فُلَانٌ فِي التَّقَاضِي۔ فلاں نے سخت تقاضا کیا۔

ضَرَبَهٗ ضَرْبًا مُبَرِّحًا[1] اسے سخت مارا۔
جَاءَ فُلَانٌ بِالْبَرْحِ۔ فلاں نے حیرت انگیز کام کیا۔
اَبْرَحْتُ رَبًّا میں اپنے رب کی تعظیم بجا لایا۔
اَبْرَحْتُ جَارًا میں نے ہمسائے کی عزت کی
بَرْحٰی رارے نشانہ خطا ہونے پر یہ کلمہ ملامت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل لفظ "مَرْحٰی" ہے جو نشانہ لگنے پر تحسین کے لئے بولا جاتا ہے۔ یعنی واہ، کیا خوب محاورہ[2] ہے۔ لَقِیْتُ مِنْهُ الْبَرْحِیْنَ وَالْبُرَحَاءَ مجھے اس سے تکالیف پہنچیں بُرَحَاءُ الْحُمّٰی بخار کی شدت۔

(ب ر د)

اَلْبَرْدُ (ٹھنڈا) اصل میں یہ حَرٌّ کی ضد ہے۔ محاورہ میں کبھی اس کی ذات کا اعتبار کر کے کہا جاتا ہے۔
بَرَدَ (ن ک) کَذَا اس نے ٹھنڈ حاصل کی۔
بَرَدَ (ن) اَلْمَاءُ کَذَا پانی نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔
جیسے[3] ع (الطویل)

(۴۷) سَتَبْرُدُ اَکْبَادًا وَتُبْکِیْ بَوَاکِیَا

تو بہت سے کلیجوں کو ٹھنڈا کیا اور بہت سی رونے والیوں کو رلا ڈالے گی۔

اور بَرَّدَ (تفعیل) بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے بعض کے نزدیک اَبْرَدَ (افعال) بھی اس معنی میں آجاتا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔
اسی سے اَلْبَرَّادَةُ ہے جس کے معنی پانی ٹھنڈا کرنے والی چیز کے ہیں اور محاورہ میں بَرَدَ کَذَا کے معنی کسی چیز کے البرد والے کی طرح جامد اور ثابت ہونا بھی آتے ہیں جس طرح حَرٌّ کو حرکت لازم ہے اسی طرح بَرْدٌ کے ساتھ کسی چیز کا ثبات مختص ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
بَرَدَ عَلَیْهِ دَیْنٌ۔ اس پر قرض ٹھہر گیا۔
شاعر نے کہا ہے[4] (رجز)

(۴۸) اَلْیَوْمَ بَارِدٌ سُمُوْمُهٗ۔

آج باد سموم جامد ہے۔
اور دوسرے شاعر نے کہا ہے[5] (خفیف)

(۴۹) ... قَدْ بَرَدَ الْمَوْتُ عَلٰی مُصْطَلَاهُ ...

کہ اس کے ہاتھ اور چہرہ پر موت طاری ہوگئی۔
لَمْ یَبْرُدْ بِیَدِیْ شَیْءٌ میرے ہاتھ میں کوئی چیز قرار نہیں پکڑتی۔ بَرَدَ الْاِنْسَانُ مر جانا فوت ہو جانا۔ بَرَدَهٗ اسے قتل کر ڈالا اسی سے سیوف کو بَوَارِدُ کہا جاتا ہے کیونکہ میت بھی فقدان روح سے سرد پڑ جاتی ہے اور اسے سکون لاحق ہوتا ہے۔

---

[1] وفی القرآن وَلَا تَحْضُرُ بُوهُن ضربًا مبرحا ( ) ای ضربًا موجعًا ۱۲ [2] قال المرتضی: البرحین شدائد الدہر مع فتح الراء وکسر الحاء استعملوہ کنایۃ عن الضیق وقد ما انموا واحدہ لما ارادوا وصف الدواہی بالکثرۃ ذیل الکامل ۹۹ وانظر للکلمۃ ایضًا تہذیب الالفاظ ۳۴ ومجالس ثعلب ۵۲۰ - ۵۲۱ وفی الفائق: ہو فی الاصل جمع برح جمع السلامۃ للمبالغۃ مثل بلغ وبلغین یجوز فی اعرابہ ان یجری علی النون وان یجری علی ما قبلہا (۱: ۱۰۰) [3] قالہ مالک بن ریب المازنی فی رثاء نفسہ وکان فی جند سعید بن عثمان بطریق فارس وصدرہ: فعطل قلوصی فی الرکاب فانہا ... والبیت فی البحر (۶: ۳۱۹) من قصیدۃ جہریۃ فی ۵۷ بیتًا ۲۴۹-۲۷۲ وذیل الامالی ۱۲۷-۱۳۸ وفیہ وغیرہ بدل عطل وتمامہا فی نوادر الیزیدی والاختیارین رقم ۱۰ وفی المعجم للمرزبانی ۲۹۱ [4] قالہ جعفر بن علبۃ الحارثی یرثی نفسہ لما ہموا بقتلہ باختلاف طفیف وقود قلوصی بینہن فانما ستغضب مسرا وتبکی بواکیا۔ وایام العرب ۸۵ وفیہ وقرب بدل عطل [5] قالہ الراجز وتمامہ: من عجز الیوم فلا الوم والشطر فی الجمہرۃ (۱: ۲۴۴) والتبریزی (۱: ۱۹۵) وفی اللسان (برد) من جزع بدل من عجز کما فی السمط ۴۲۵ والفائق (۱: ۷۴) [5] قالہ ابو زبید الطائی فی رثاء الجلاح یصف الموت وتکملۃ البیت بارز ناجزاہ قد برد الموت علی مصطلاہ ای برد والبیت من قصیدۃ جہریۃ ۲۶۶-۲۷۲ فی ۵۸ بیتا والبیت فی اللسان (برد) والمعانی ۱۰۵۹، ۲۰۵ والاختیارین ۱۲۶ وجمہرۃ الاشعار ۲۷۲ وامالی الیزیدی

یا ظاہری طور پر جلد میں خنکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔ اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا (۳۹-۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)

اور آیت کریمہ:۔ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْھَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (۷۸-۲۴) میں بھی بَرْد بمعنی نیند ہے یعنی وہاں کسی قسم کی راحت اور زندگی کی خوشگواری نصیب نہیں ہوگی اور اس اعتبار سے کہ گرمی میں سردی سے راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے خوشگوار زندگی کے لیے عَیْشٌ بَارِدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

اَلْاَبْرَادَانِ صبح وشام کیونکہ یہ دونوں وقت ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اَلْبَرَدُ کے معنی اولے کے ہیں اور بَرَدَ السَّحَابُ کے معنی ہیں بادل نے ژالہ باری کی سَحَابٌ اَبْرَدُ وَ بَرِدٌ۔ اولے برسانے والے بادل قرآن میں ہے:۔

وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْھَا مِنْ بَرَدٍ (۲۴-۴۳) اور آسمان کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

اَلْبَرْدِیُّ نرکل کی قسم کا ایک پودا۔ یہ بَرْد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ بھی پانی میں پیدا ہوتا ہے مثل مشہور ہے[1]۔ اَصْلُ کُلِّ دَاءٍ اَلْبَرَدَۃُ کہ بدہضمی سب الامراض ہے بدہضمی کو بَرَدَۃٌ[2] اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس برودت طبعی کی وجہ سے عارض ہوتی ہے جس سے قوت ہضم ناقابل ہو جاتی ہے۔

اَلْبَرُوْدُ ٹھنڈ پہنچانے والی چیز کو کہتے ہیں اور کبھی ٹھنڈی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں کیونکہ فَعُوْلٌ کبھی بمعنی فاعل ہوتا ہے اور کبھی بمعنی مفعول آتا ہے۔ جیسے:۔ مَاءٌ بَرُوْدٌ (ٹھنڈا پانی) ثَغْرٌ بَرُوْدٌ (خنک دانت) جیسا کہ آنکھ کو ٹھنڈک پہنچانے والے سرمہ کو بَرُوْدٌ کہا جاتا ہے[3] بَرَدْتُ الْحَدِیْدَ میں نے لوہے کو ریتی سے رگڑا یہ بَرَدْتُہٗ بمعنی قَتَلْتُہٗ سے مشتق ہے اور لوہ چون کو بُرَادَۃٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمِبْرَدُ (آلہ) ریتی جس سے لوہے کو ریتتے ہیں۔

اَلْبُرُدُ یہ اَلْبَرِیْدُ کی جمع ہے اور محکمہ مواصلات کی اصطلاح میں بُرُدٌ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی جگہ پر پیغام رسانی کے لئے متعین رہتے ہیں۔ وہ ہرکارے چونکہ سرعت سے پیغام رسانی کا کام کرتے تھے اس لئے ہر تیز رو کے لئے ھُوَ یُبْرِدُ کا محاورہ استعمال ہونے لگا ہے۔ اور پرندے کے پروں کو بَرِیْدَانِ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی اسے برید کا کام دیتے ہیں تو یہ بناء الفرع علی الفرع کے قبیل سے ہے جیسا کہ "علم الاشتقاق" میں بیان کیا جاتا ہے۔

(ب ر ز)

اَلْبَرَازُ کے معنی فضا یعنی کھلی جگہ کے ہیں۔ اور بَرَزَ (ن) کے معنی ہیں کھلی جگہ میں چلے جانا اور بُرُوْزٌ (ظہور) کئی طرح پر ہوتا ہے (۱) از خود کسی چیز کا ظاہر ہو جانا جیسے فرمایا:۔ وَتَرَی الْاَرْضَ بَارِزَۃً (۱۸-۴۷) اور تم زمین

---

[1] رواہ الدارقطنی فی العلل، عن انس وابن السنی وابونعیم فی الطب عن علیؓ وعن ابی سعیدؓ وعن الزہری مرسلاً قال فی النہایۃ ۱/۸۷ واللسان (برد) البردۃ ہی التخمۃ وثقل الطعام علی المعدۃ وایضاً قارن غریب لابی عبیدۃ

[2] [3] وفی اللسان (برد) کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمبرود

کو صاف میدان دیکھو گے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ زمین پر سے عمارات اور ان کے ساکنین سب ختم ہو جائیں گے اسی سے مُبَارَزَةٌ ہے جس کے معنی صفوف جنگ سے آگے نکل کر مقابلہ کرنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِھِمْ (۳-۱۵۴) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِہٖ (۲-۲۵۰) اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے بالمقابل میں آئے۔

(۲) دوم بُرُوْزٌ کے معنی فضیلت ظاہر ہونے کے ہیں جو کسی محمود کام میں سبقت لے جانے سے حاصل ہوتی ہے

(۳) کسی مستور چیز کا منکشف ہو کر سامنے آجانا جیسے فرمایا:۔ وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ (۱۴-۴۸) اور سب لوگ خدائے یگانہ زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ جَمِیْعًا (۱۴-۲۱) اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے سامنے کھڑے ہونگے۔

یَوْمَ ھُمْ بَارِزُوْنَ۔ (۴۰-۱۶) جس روز وہ نکل پڑیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغَاوِیْنَ (۲۶-۹۱) اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ انہیں دوزخ کے سامنے لایا جائیگا محاورہ ہے۔ تَبَرَّزَ فُلَانٌ کنایہ از قضائے حاجت اور پاکدامن عورت کو اِمْرَءَۃٌ بَرْزَۃٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی رفعت پاکدامنی اور عفت میں مضمر ہوتی ہے نہ یہ کہ بَرْزَۃٌ کا لفظ اس معنی کا مقتضی ہے۔

(ب ر ز خ)

اَلْبَرْزَخُ کے معنی دو چیزوں کے درمیان حد فاصل اور روک کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ دراصل یہ بَرْزَۃٌ (پردہ) سے معرب ہے۔ قرآن میں ہے۔ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِ (۵۵-۲۰) دونوں میں ایک آڑ ہے کہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتے[۱]۔

اور بَرْزَخٌ اس رکاوٹ کو بھی کہا گیا ہے جو آخرت میں انسان اور اس کے منازل رفیعہ تک پہنچنے کے درمیان حائل ہوگی جسے قرآن نے آیت:۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَۃَ۔ (۹۰-۱۱) مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔ میں عَقَبَۃٌ کہا ہے چنانچہ فرمایا:۔ وَمِنْ وَّرَآئِھِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ اور ان کے پیچھے برزخ ہے (جہاں وہ) اس دن تک کہ (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے (رہینگے) (۲۳-۱۰۰)

لہٰذا عَقَبَۃٌ سے مراد وہ موانع ہیں جو بلند درجات تک پہنچنے سے روک لیتے ہیں جن تک کہ نیک لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں برزخ سے موت اور حشر کے مابین کی مدت مراد ہے۔

(ب ر ص)

اَلْبَرَصُ پھلبہری مشہور مرض کا نام ہے[۲] اور

---

[۱] وایضًا: وَجَعَلَ بَیْنَھُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵-۵۳) [۲] دفی القرآن و ابرء الاکمہ والابرص (۳-۴۸) وتبرئ الاکمہ والابرص (۵-۱۱۰)

چاند کو اس سیاہ دھبہ کی وجہ سے جو اس میں نظر آتا ہے، اَبْرَصُ کہا گیا ہے۔ اور سَامٌّ اَبْرَصُ کے معنی چھپکلی کے ہیں کیونکہ اس کی جلد پر بھی برص جیسے دھبے ہوتے ہیں۔

اَلْبَرِیْصُ وہ ہے جو ابرص کی طرح چمکدار ہو۔ یہی معنی تقریبًا بصیص کے ہیں جو بَصَّ یَبِصُّ بمعنی برق سے مشتق ہے۔

(ب ر ق)

اَلْبَرْقُ کے معنی بادل کی چمک کے ہیں قرآن میں ہے:۔ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ (۲-۱۹) اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہو اور (بادل) گرج (رہا) ہو اور بجلی کوند رہی ہو۔

اس سے فعل بَرَقَ وَاَبْرَقَ دونوں آتے ہیں اور بَرَقَ ہر چمک دار چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے:۔ سَیْفٌ بَارِقٌ چمکدار تلوار۔

بَرِقَ وَبَرَقَ کے معنی خوف کی وجہ سے آنکھ خیرہ ہو جانا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (۷۵-۷) جب آنکھیں چندھیا جائیں ایک قراءت میں بَرَقَ ہے۔

پھر کبھی بَرَقَ سے اختلاف رنگ کے معنی لے کر مختلف الوان کی پتھریلی زمین کو بُرْقَةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْاَبْرَقُ کے معنی سیاہ سفید پہاڑ کے ہیں اسی لئے آنکھ کو بَرْقَاءُ کہا جاتا ہے۔

نَاقَةٌ بَرُوْقٌ۔ اونٹنی جو دم اٹھا کر حمل کو ظاہر کرے

اَلْبَرُوْقَةُ ایک قسم کی گھاس جو ابر کو دیکھ کر ہی سرسبز ہو جاتی ہے اسی سے مثل مشہور ہے۔

اَشْکَرُ مِنْ بَرُوْقَةٍ وہ بروقہ سے بھی زیادہ شکر گزار ہے

بَرَقَ طَعَامَهٗ بِزَیْتِهٖ روٹی کو زیتون سے چپڑنا۔

اَلْبَارِقَةُ وَالْاُبَیْرِقُ۔ چمکدار تلوار

اَلْبُرَاقُ بعض کہتے ہیں کہ یہ اس دابۃ کا نام ہے جس پر آنحضرت شب معراج کو سوار ہوئے تھے اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔

اَلْاِبْرِیْقُ لوٹا یا صراحی (ج اَبَارِیْقُ[1])

اور بَرَقَ سے کبھی خوف کے معنی لے کر بَرَقَ فُلَانٌ وَاَبْرَقَ وارعد کے معنی دھمکی دینا بھی آجاتے ہیں۔

(ب ر ک)

اَلْبَرْکُ اصل میں البَرْک کے معنی اونٹ کے سینہ کے ہیں (جس پر وہ جم کر بیٹھ جاتا ہے) گو یہ دوسروں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے سینہ کو بِرْکَةٌ کہا جاتا ہے۔

بَرَکَ الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ اپنے گھٹنے رکھ کر بیٹھ گیا پھر اس سے معنی لزوم کا اعتبار کر کے اِبْتَرَکُوْا فِی الْحَرْبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور جم کر لڑنے کے ہیں۔

بَرَاکَاءُ الْحَرْبِ وَبَرُوْکَاءُهَا سخت کارزار جہاں بہادر ہی ثابت قدم رہ سکتے ہوں۔

اِبْتَرَکَتِ الدَّابَّةُ چوپائے کا جم کر کھڑا ہو جانا

بِرْکَةٌ حوض، پانی جمع کرنے کی جگہ۔

اَلْبَرَکَةُ کے معنی کسی شے میں خیر الٰہی ثابت ہونا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷-۹۶) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات

---

[1] وفی الواقعة ۵۶-۱۸، باکواب واباریق وتتصل بذالک لفظ استبرق (والجرس) راجع الآیات (۱۸-۳۱) (۴۴-۵۳) (۵۵-۵۴) ÷

(کے دروازے) کھول دیتے۔

یہاں برکات سے مراد بارش کا پانی ہے اور چونکہ بارش کے پانی میں اس طرح خیر ثابت ہوتی ہے جس طرح کہ حوض میں پانی ٹھہر جاتا ہے اس لئے بارش کو برکاتؓ سے تعبیر کیا ہے۔

اَلْمُبَارَكُ ہر وہ چیز جس میں خیر و برکت پائی جائے اور آیت کریمہ:۔ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (۲۱-۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔ میں ذکر کو مبارک کہہ کر ان خیرات الٰہیہ پر تنبیہ کی ہے۔ جو اس میں پائی جاتی ہیں۔

نیز فرمایا: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ (۳۸-۲۹) (یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے مبارک ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا (۱۹-۳۱) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے مجھے خیر برکت کا محل بنایا ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (۴۴-۳) کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا۔

رَبِّ اَنْزِلْنِىْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا (۲۳-۲۹) یعنی اے پروردگار ہمیں اس جگہ پر اتاریو جہاں خیر و برکت پائی جاتی ہو۔ اور آیت:۔ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا (۵۰-۹) اور آسمان سے برکت والا پانی اتارا۔ میں بارش کے پانی کو بابرکت قرار دیا ہے چنانچہ اس کی برکت کو دوسرے مقام پر بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ (۳۹-۲۱) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا پھر اس سے کھیتی اگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ (۲۳-۱۸) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی نازل کیا پھر اس کو زمین میں ٹھہرا دیا۔

اور خیر الٰہی چونکہ غیر محسوس طریقہ پر صادر ہوتی ہے اور بے شمار طریقوں پر پائی جاتی ہے اس لئے ہر اس چیز کو جس میں غیر محسوس طور پر زیادتی محسوس ہو اسے مبارک (بابرکت) کہدیتے ہیں۔ اور حدیث میں جو مروی ہے[۱]۔

(۲۷) لَا يَنْقُصُ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا۔ تو اس سے بھی اسی قسم کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ورنہ نقصان حسی کی نفی نہیں ہے جیسا کہ بعض بدنصیب لوگوں نے اعتراض کیا ہے۔ کہ نقصان نہیں ہوتا تو ترازو سے تول کر دیکھ لو اور آیت کریمہ:۔

تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا (۲۵-۶۱) اور (خدا) برکت والا ہے۔ جس نے آسمانوں میں برج بنائے۔ میں ان نعمتوں پر تنبیہ کی ہے جو ان برجوں اور نیّرات کے ذریعہ ہم پر نازل ہوتی ہیں اور آیات کریمہ:۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳-۱۴) تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے بڑا بابرکت ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (۲۵-۱) وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِىْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ (۲۵-۱۰) وہ (خدا) بہت بابرکت ہے جو اگر چاہے تو تمہارے لئے اس سے بہتر (چیزیں) بنا دے۔

---

[۱] راجع کنز العمال ج ۳ رقم ۱۸۸) وفی روایۃ۔ انقصت الحدیث فی دحم ام ات و روضۃ العقلاء للبستی ۵۱۴ عن ابی ہریرۃ و راجع لمعناہ مشکل الحدیث لابن قتیبۃ ۱۲

تَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ (۴۰-۶۴) پس خدائے پروردگار عالم بہت ہی بابرکت ہے۔ تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ (۶۷-۱) وہ (خدا) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے۔
میں تنبیہ کی ہے کہ وہ تمام خیرات جن کو لفظ تبارک کے تحت ذکر کیا ہے، ذات باری تعالےٰ ہی کے ساتھ مختص ہیں۔

(ب ر م)

اَلْاِبْرَامُ کے معنی کسی معاملہ کو محکم اور مضبوط کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ اَمْ اَبْرَمُوْا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ (۴۳-۷۹) کیا انہوں نے کوئی بات ٹھہرا رکھی ہے تو ہم بھی کچھ ٹھہرانے والے ہیں۔ یہ اصل میں اِبْرَامُ الْحَبْلِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی رسی کو مضبوط بٹنے کے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۵۰) عَلٰی کُلِّ حَالٍ مِنْ سَحِیْلٍ وَّ مُبْرَمٍ

یعنی ہر حالت میں (تم قابل ستائش ہو)

اَلْبَرِیْمُ بمعنی مُبْرَمٌ یعنی مضبوط بٹی ہوئی رسی محاورہ ہے۔ اَبْرَمْتُہٗ فَبَرِمَ فَھُوَ بَرِیْمٌ اسی بنا پر کنجوس آدمی کو جو جوا نہ کھیلتا ہو بَرَمٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ بخیل کو مغلول الید کہتے ہیں۔ اور مُبْرِمُ الْحَبْلِ کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس آدمی کو جو کسی معاملہ میں مصر اور بضد ہو اسے اَلْمُبْرِمُ کہا جاتا ہے یہی معنی اَلْبَرَمُ کے ہیں اور جو آدمی دو دو کھجوریں ملا کر کھاتا ہو اسے بھی بَرَمٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں سختی کے ساتھ کھانا کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور رسی کبھی دو رنگ پر ہوتی ہے اس لئے ہر سیاہ سفید پر مشتمل لشکر اور بکریوں کے ملے جلے ریوڑ کو بَرِیْمٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْبُرْمَۃُ اصل میں پتھر کی ہنڈیا کو کہتے ہیں ج بِرَامٌ جیسے حُضْرَۃٌ کی جمع حِضَاءٌ اور یہ ضُحْکَۃٌ وَھُزْءَۃٌ کی طرح مفعول کے اوزان سے ہے۔

(ب ر ہ)

اَلْبُرْھَانُ کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں اور یہ رُجْحَانٌ وَثُنْیَانٌ کی طرح فُعْلَانٌ کے وزن پر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بَرِہَ یَبْرَہُ کا مصدر ہے جس کے معنی سفید اور چمکنے کے ہیں صفت اَبْرَہُ مونث بَرْھَاءُ ج بُرْہٌ اور نوجوان سپید رنگ حسینہ کو بَرَھْرَھَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْبَرْھَۃُ دقت کا کچھ حصہ لیکن بُرْھَانٌ دلیل قاطع کو کہتے ہیں جو تمام دلائل سے زوردار ہو اور ہر حال میں ہمیشہ سچی ہو اس لئے کہ دلیل کی پانچ قسمیں ہیں۔
(۱) وہ جو ہمیشہ صدق کی مقتضی ہو (۲) وہ جو ہمیشہ کذب کی مقتضی ہو (۳) وہ جو اقرب الی الصدق ہو (۴) جو کذب کے زیادہ قریب ہو (۵) وہ جو اقتضاء صدق و کذب میں مساوی ہو۔ قرآن میں ہے۔
قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲-۱۱۱) اے پیغمبر (ان سے) کہدو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔
قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ ھٰذَا ذِکْرُ مَنْ مَّعِیَ۔ (۲۱-۲۴) کہدو کہ (اس بات پر) اپنی دلیل پیش کرو یہ (میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے۔

---

[1] قالہ زہیر فی معلقتہ واولہ: یمینا لنعم السیدان وجدتما۔ راجع للبیت فی شرح المعلقات لابن الانباری ۲۷۰ والعشر للتبریزی ۸۰ و السمط ۱:۲ واللسان (سحل) و شواہد الکشاف والاشباہ والنحویہ (۴:۲۰۵) والمعانی للقتیبی ۸۰۰ ومختار الشعر الجاہلی فی شرح السقاد ۱:۱۵۳ والجمہرۃ ۱۰۷ والعقد الثمین ۹۵ و ایام العرب ۲۴۳

قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۴-۱۷۴) تمہارے پاس دلیل (روشن) آچکی ہے۔

(ب ز غ)

بَزَغَ الشَّمْسُ کے معنی ہیں سورج کا طلوع ہونا۔ جب کہ اس کی روشنی پھیل رہی ہو۔ قرآن میں ہے۔
فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً (۶-۷۸) پھر جب سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔
فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا (۶-۷۷) پھر جب چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا۔
تشبیہ کے طور پر بَزَغَ النَّابُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی اونٹ کی نیش نکل آنا کے ہیں۔ اصل میں یہ بَزَغَ الْبَيْطَارُ الدَّابَّةَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی جانور کے نشتر لگا کر خون بہانا کے ہیں۔

(ب س س)

آیت کریمہ:۔ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (۵۶-۵) میں بُسَّتْ کے معنی پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانا کے ہیں اور یہ بَسَسْتُ الْحِنْطَةَ وَالسَّوِيقَ بِالْمَاءِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی پانی میں گندم یا جو کے ستو ڈال کر نشاستہ نکالنے کے ہیں اور نشاستہ کو بَسِيسَة کہا جاتا ہے بعض نے اس کے معنی تیز ہنکانا کئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ انْبَسَّتِ الْحَيَّةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سانپ کے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے بل کی طرف دوڑنا کے ہیں اور اسی معنی کو دوسری جگہ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ (۱۸-۴۷) اور:۔ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (۲۷-۸۸) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے بَسَسْتُ الْإِبِلَ اونٹوں کو ہنکاتے وقت ڈانٹنا اَبْسَسْتُ بِهَا عِنْدَ الْحَلَبِ اونٹنی دوہنے کے وقت اس کو چمکارنا اور اس اونٹنی کو جو بغیر چمکارنے کے دودھ نہ دے بَسُوسٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے[1]۔
(۲۸) جَاءَ أَهْلُ الْيَمَنِ يَبُسُّونَ عِيَالَهُمْ۔ کہ اہل یمن اپنے اہل وعیال کو نرمی سے چلاتے ہوئے آپہنچے ہیں۔

(ب س ر)

اَلْبَسْرُ کے معنی کسی چیز کو قبل از وقت جلدی لے لینا کے ہیں جیسے بَسَرَ الرَّجُلُ الْحَاجَةَ (اس نے قبل از وقت اپنی ضرورت کو طلب کیا) بَسَرَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ (مادہ کی خواہش کے بغیر اونٹ نے اس سے جفتی کی) مَاءٌ بُسْرٌ بارش کا تازہ پانی جو زمین پر گرنے سے پہلے ہی لے لیا جائے بُسَرَ الْقَرْحُ پھوڑے کو پکنے سے پہلے پھوڑ دینا اسی سے گدری کھجور کو بُسْرٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۷۴-۲۲) پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔ میں بَسَرَ کے معنی قبل از وقت منہ بگاڑنے کے ہیں اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر بَسَرَ کے یہی معنی ہیں تو آیت:۔ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ (۷۵-۲۴) اور بہت سے منہ اس دن اداس ہوں گے۔ میں بَاسِرَةٌ کے کیا معنی ہوں گے کیونکہ وہاں تو قبل از وقت منہ بگاڑنا نہیں ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ

[1] الحدیث بتفصیلہ فی (رخ) مدینہ و (ط) راجع لشرح الحدیث غریب لابی عبید (بسس) ۲: ۱۵

ان کی یہ حالت آگ میں داخل ہونے سے قبل ہوگی اس لئے بَاسِرَۃ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ گویا آگ میں پہنچنے سے قبل ان کا منہ بگاڑنا محض تکلف اور قبل از وقت ہوگا جیسا کہ بعد کی آیت:۔ وَتَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَۃٌ (۷۵-۲۵) خیال کریں گے کہ ان پر مصیبت واقع ہونے والی ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ب س ط)

بَسَطَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو پھیلانے اور توسیع کرنے کے ہیں۔ پھر استعمال میں کبھی دونوں معنی ملحوظ ہوتے ہیں اور کبھی ایک معنی منصور ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے بَسَطَ الثَّوْبَ (اس نے کپڑا پھیلایا) اسی سے اَلْبِسَاطُ ہے جو ہر پھیلائی ہوئی چیز پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (۷۱-۱۹) اور خدا ہی نے زمین کو تمہارے لئے فراش بنایا۔ اور بساط کے معنی وسیع زمین کے ہیں اور بَسِیْطُ الْاَرْضِ کے معنی ہیں کھلی اور کشادہ زمین۔ ایک گروہ کے نزدیک بسیط کا لفظ بطور استعارہ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس میں ترکیب و تالیف اور نظم متصور نہ ہوسکے۔ اور بسط کبھی بمقابلہ قبض آتا ہے۔ جیسے وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ (۲-۲۴۵) خدا ہی روزی کو تنگ کرتا اور (وہی اسے) کشادہ کرتا ہے۔ اور کبھی بمقابلہ قدر (یعنی تنگ کردینا) کے جیسے وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ (۴۲-۲۷) اور اگر خدا اپنے بندوں کے لئے رزق میں فراخی کر دیتا۔ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲-۲۴۷) اسنے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی بڑا عطا کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کا بسیطۃ فی العلم یہ تھا کہ انہوں نے اس سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا اور یہ ان کا بَسْطَة یعنی جود وسخا تھا۔

بَسْطُ الْيَدِ کے معنی ہاتھ پھیلانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ (۱۸-۱۸) ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔

اور بَسْطُ الْكَفِّ (ہتھیلی پھیلانا) یہ لفظ کبھی طلب وسوال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے:۔ كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ (۱۳-۱۴) اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا دے۔ اور کبھی آخذ یعنی پکڑنے کے معنی میں آتا ہے جیسے:۔ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ (۶-۹۳) اور فرشتے (ان کی طرف عذاب کے لئے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔

اور کبھی حملہ کرنے اور مارنے کے معنی میں آتا ہے جیسے فرمایا:۔ وَيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْۗءِ (۶۰-۲) اور ایذا کے لئے تم پر ہاتھ (بھی) چلائیں اور زبانیں (بھی)

اور کبھی اس سے بخشش کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ (۵-۶۴) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

اَلْبَسْطُ وہ اونٹنی جس کے ساتھ اس کے بچے کو چھوڑ دیا گیا ہو اور یہ بمعنی مَبْسُوْطَةٌ ہے جیسے نِكْثٌ بمعنی منکوث ونقض بمعنی منقوض آجاتا ہے۔ اَلْبَسَطُ نَاقَةٌ اونٹنی کو اس

کے بچے کے ساتھ چھوڑ دیا۔

(ب س ق)

قرآن میں ہے:۔
وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ (۵۰-۱۰)
اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔
اَلْبَاسِقُ کے معنی ہیں بلندی میں لمبا چلا جانے والا چنانچہ اسی سے بَسَقَ فُلَانٌ عَلٰی اَصْحَابِهٖ ہے جس کے معنی ہیں اپنے ساتھیوں پر فضیلت میں بازی لے جانا۔
بَسَقَ وبَصَقَ جس کے معنی تھوکنا ہیں اصل میں بَزَقَ ہے بَسَقَتِ النَّاقَةُ اونٹنی کے تھنوں میں بغیر جفتی نر کے تھوک کیطرح معمولی سا دودھ اتر آیا۔

(ب س ل)

اَلْبَسْلُ کے معنی کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور روکنا کے ہیں۔ اکٹھا کرنا کے مفہوم کے پیش نظر استعارۃً ترشروئی کے معنی استعمال ہوتا ہے اور ترشرو کو باسل و مبتسل الوجہ کہا جاتا ہے۔ اور روکنے کے معنی کے پیش نظر حرام اور گروی چیز کو بَسْلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَذَكِّرْ بِهٖ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶-۷۰) یعنی اس (قرآن) کے ذریعے نصیحت کرتے رہو تاکہ (قیامت کے دن) کوئی نفس اپنے اعمال کے ثواب سے محروم نہ رہ جائے بلاکت میں نہ ڈالا جائے۔
بسل اور حرام میں فرق یہ ہے کہ حرام عام ہے جو ممنوع عنہ حکمی اور قہری دونوں کو شامل ہے اور بَسْلٌ کا لفظ صرف جبراً کسی چیز سے محروم کردینے پر بولا جاتا ہے قرآن میں ہے۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا (۶-۷۰) یعنی یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے سبب ثواب سے محروم کردیئے گئے۔ بعض نے آیت کریمہ:۔
• كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴-۳۸) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے کے پیش نظر اس کی تفسیر اُبْسِلُوْا سے بھی کی ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنے اعمال کے بدلے گروہوں گے شاعر نے کہا:[1]
(۵۱) وَاِبْسَالِيْ بَنِيَّ بِغَيْرِ جُرْمٍ (وافر)
اور میرا اپنے بیٹوں کو ناحق (بنی قشیر کے پاس) گرو کرنا اور دوسرے نے کہا:[2] (طویل)

---

[1] لعوف بن الاحوص البابلی یحسر علی تسلیم ابناءہ بنی قشیر رھنًا فی دم رجل منھم اسمہ ابو الصحیفہ وتمامہ: بعونا و ولا بدم مراق ونعونا من بعا بعیو بعوا بمعنی الجنایۃ والجرم والبیت فی نوادر ابی زید ۱۵۱ والطبری ۲۲۳ والقرطبی (۱۶:۷) وشواھد الکشاف ۸۳ ومعانی الکبیر ۱۱ ومجاز القرآن (۱:۹۴ رقم ۲۲۱) والبحر (۴:۴۴) تہذیب الالفاظ ۳۴۳ واللسان والتاج والمحکم (بسل بعو) وفیہ قال ابن الطبری انہ لعبد الرحمان بن الاحوص وانظر لترجمۃ الشاعر المعجم للمرزبانی ۲۷۵ والسمط ۲۷۷ والمعانی ۱۱۴[2] قال زھیر بن ابی سلمٰی وصدرہ: بلاد بہا نادمتھم والفتھم ھکذا الروایۃ فی دیوانہ ۹ بشرح الاعلم وبہا انشد ابو علی فی المعالیہ لیکون فی کلیہما فانہما بدل فانھم وھکذا الروایۃ فی نوادر ابی زید ۱۸۸ وروایۃ ابی سعید حسب روایۃ المؤلف ای فانھم بضمیر الجمع لکن فیہ فان تقویا وھی موافقۃ لروایۃ ابی الطیب عن قطرب (الاضداد) وللی الطیب ۱۳) وصاۃ البیت: تربص فان تقو المرارۃ منھم۔ ودارا تہا لا تقو منھم فتمحل فان تقویا منھم فان محرا۔ وجزع الحسا منھم اذا قلما یخلو۔ بلاد۔۔۔ فان اوحشت۔۔۔ وھی الروایۃ صحیحۃ ای فنا والدار والبیت فی الاصل ملفق فاختلطت روایتہ علی الروایۃ ومعنی البیت علی روایۃ المؤلف فانھم حرام ای حیث کانوا لایقربھم احد ولا یغیر علیھم وعلی الثانیۃ فضمیر التثنیۃ یرجع الی الموضعین ای بعد ذلھم حرام علی زیادتہما والبیت فی المختارات ۸۶ والنوادر ۳ والامالی ۲:۸۰ وفی اللآلی مع السمط ۹۲۲-۹۲۳

15107

(۵۲) فَإِنْ تَفَوَّلَوْا مِنْهُمْ فَإِنَّهُمْ بُسَّلٌ
اگر تم انہیں چھوڑ کر چلے جاؤ تو وہ بہادر ہیں۔
یہاں تَفَوَّلَوا، اقوی المکان سے ہے جس کے معنی جگہ خالی ہونے کے ہیں اور بسالۃ بمعنی شجاعت ہے اور بُسَّلٌ باسل کی جمع ہے اور بہادر کو باسل یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ترش رو رہتا ہے اور یا اس لئے کہ اس کے ہمسروں پر اس کی جان حرام ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ دشمنوں کو اپنے مال سے محروم کر دیتا ہے۔
اَبْسَلْتُ الْمَکَانَ کسی جگہ کی حفاظت کرنا اور اس شخص کو جو اسے چھیننا چاہتا ہے محروم کر دینا۔
اَلْبُسْلَۃُ دم جھاڑ کرنے والے کی اجرت یہ رقیہ پڑھنے والے کے قول اَبْسَلْتُ فُلَانًا سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی شیطان، سانپ اور زہریلے کیڑوں کی مدافعت پر دلیر کرنے کے ہیں یا کسی کو ان چیزوں پر حرام کر دینے کے ہیں بعض نے بَسَّلْتُ الْحَنْظَلَ کا محاورہ بھی نقل کیا ہے جس کے معنی حنظل کو طیب بنانے کے ہیں اگر یہ حکایت صحیح ہو تو اس کے اصل معنی حنظل کی بسالت یعنی شدت یا اس کی تحریم یعنی کڑوا پن دور کرنا ہوں گے جو بمنزلہ حرمت کے ہے:
بَسَلْ۔ ہاں۔ بس[1]

(ب ش ر)

اَلْبَشَرَۃُ کے معنی انسان کی جلد کی اوپر کی سطح اور اَدَمَۃٌ کے معنی باطنی سطح کے ہیں۔ عام ادباء کا یہی قول ہے مگر ابو زید[2] نے اس کے برعکس کہا ہے چنانچہ ابو العباس وغیرہ نے ان کی تردید کی ہے[3]۔
بَشَرَۃ کی جمع بَشَرٌ و اَبْشَارٌ آتی ہے اور اسی سے انسان کو بشر کہا جاتا ہے کہ اس کی جلد بالوں سے صاف ہوتی ہے اس کے برعکس دیگر حیوانات کی کھال پر اون، بال یا پشم ہوتی ہے۔
لفظ بَشَرٌ واحد اور جمع دونوں کے لئے برابر طور پر استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ بَشَرَیْنِ ہے۔
جیسے فرمایا:۔ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا (۲۳-۴۷)
کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔
اور قرآن میں جہاں کہیں انسان کی جسمانی بناوٹ اور ظاہری جسم کا لحاظ کیا ہے تو ایسے موقع پر خاص کر اسے بَشَر کہا گیا ہے جیسے فرمایا:۔
وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا (۲۵-۵۴)
اور وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا۔
اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ۔ (۳۸-۷۱) کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔
کفار انبیاء علیہم السلام کی کسر شان کے لئے ان کو بَشَرٌ کہہ کر پکارتے تھے جیسے:۔
اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۷۴-۲۵) یہ (خدا) کا کلام نہیں بلکہ بشر کا کلام ہے۔
اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (۵۴-۲۴) بھلا ایک آدمی جو ہم ہی میں سے ہے ہم اس کی پیروی کریں۔

---

[1] راجع للبحث عن مادہ (ب س م) فی الاستدراک [2] ابو زید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری الخزرجی من تلامیذ ابی عمرو بن العلاء والمفضل الضبی وکان جدہ من الصحابۃ وجمع نحوًا من القرآن علی عہد الرسول ﷺ) شدید العنایۃ بجمع اللغات واللہجات توفی ۲۱۴ھ وقد قارب المائۃ انظر المعارف لابن قتیبۃ ۲۷۰ نزہۃ الاولیاء ۱۷۳-۱۷۹ تاریخ بغداد للخطیب ۹/۷۷-۸۰ الارشاد ۴/۲۳۸-۲۴۰ ابن خلکان رقم ۲۴۹ مرآۃ الجنان الیافعی ۲/۵۷-۸ التہذیب لابن حجر ۴/۳ والبغیۃ للسیوطی ۲۵۴ وکتاب النوادر من اشہر تالیفہ [3] قالوا ان اضداد ابی الطیب ۱/۷۷-۷۶ وقال ابو مالک من قول ابی زید انظر اللسان (بشر)

مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۳۶-۱۵) کہ تم داور کچھ) نہیں مگر ہماری طرح کے آدمی (ہو)
اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا (۲۳-۴۷) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔
فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا (۶۴-۶) تو یہ کہتے کہ کیا آدمی ہمارے ہادی بنتے ہیں۔
چنانچہ قرآن نے :-
اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (۱۸-۱۱۰) کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔
کہہ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ بلاشبہ بشری تقاضوں میں سب انسان برابر ہیں مگر معارف جلیلہ اور اعمال جمیلہ کے لحاظ سے ان میں تفاوت رتبی پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ان معارف و اعمال کے ساتھ مخصوص فرما کر سرفراز کر دیتا ہے۔ چنانچہ جملہ یُوْحٰٓی اِلَیَّ میں اس حقیقت پر تنبیہ کی ہے کہ میں تم سے صرف وحی الٰہی کے ساتھ ممتاز ہوں۔
وَلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ۔ (۱۹-۲۰) مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ میں خاص کر مس بشر کی نفی کی ہے اور آیت کریمہ :- فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا (۱۹-۱۷) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا میں تَمَثَّلَ کا فاعل فرشتہ ہے اور اس میں تنبیہ کی ہے کہ فرشتہ خوبصورت انسان کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوا تھا اور آیت کریمہ :-
مَا ھٰذَا بَشَرًا (۱۲-۳۱) یہ آدمی نہیں۔ میں بشریت کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ یوسف علیہ السلام کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ تو اس سے بلند و اشرف معلوم ہوتے ہیں کہ انسانی جوہر سے مرکب ہو۔

بَشَرْتُ الْاَدِیْمَ میں نے کھال کی ظاہری سطح کو چھیل دیا جیساکہ اَنَفْتُ وَ رَجَلْتُ کا محاورہ ہے اور اسی سے بَشَرَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ ہے جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو چٹ کر جانے کے ہیں۔
اَلْمُبَاشَرَۃُ کے اصل معنی تو ایک کی جلد کو دوسرے کی جلد کے ساتھ ملانا کے ہیں مگر کنایۃً عورت سے مجامعت کرنا کے معنی میں آجاتا ہے جیسے فرمایا:-
وَلَا تُبَاشِرُوْھُنَّ وَاَنْتُمْ عٰکِفُوْنَ (۲-۱۸۷) اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْھُنَّ (۲-۱۸۷) اب تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو۔ فُلَانٌ مُؤْدَمٌ مُبْشَرٌ فلاں ظاہر و باطن کے لحاظ سے اچھا ہے۔ اصل میں یہ محاورہ اَبْشَرَہُ اللّٰہُ وَاَدَمَہُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی کھال کے ظاہر و باطن کو اچھا کرے پھر ہر اس کامل شخص کو جو ظاہری و باطنی خوبیوں کا مالک ہو۔ اسے مُؤْدَمٌ وَمُبْشَرٌ کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی کئے ہیں۔ اس کا آدَمَۃ (باطن) نرم اور بشرہ (ظاہر) سخت ہے۔
اَبْشَرْتُ الرَّجُلَ وَبَشَّرْتُہٗ وَبَشَرْتُہٗ خوشخبری پہنچانا۔ خوش کن خبر سنانا جس سے انسان کے چہرہ پر انبساط ظاہر ہو کیونکہ انسان کو جب کوئی اچھی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کے جسم میں (فرط مسرت سے) خون اس طرح دورہ کرنے لگتا ہے جیسے درختوں میں پانی۔ اس لئے التبشیر کے معنی ہیں اس قسم کی خبر سنانا جسے سن کر چہرہ شدت فرحت سے تمتما اٹھے۔ مگر ان کے معانی میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔ تبشیر میں کثرت کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور

بَشَرْتُهٗ (مجرد) عام ہے جو اچھی وبُری دونوں قسم کی خبر پر بولا جاتا ہے۔ اور اَلْبَشْرُ اَحْمَدْتُهٗ کی طرح لازم ومتعدی آتا ہے جیسے:۔ بَشَرْتُهٗ فَاَبْشَرَ (یعنی وہ خوش ہوا)

اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ (۳-۴۵) کہ خدا تم کو اپنی طرف سے بشارت دیتا ہے میں ایک قرأت يَبْشُرُكِ ويُبْشِرُكِ ہے نیز فرمایا:۔ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ۔ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰٓی اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ (۱۵-۵۳،۵۴،۵۵) مہمانوں نے کہا ڈریے نہیں ہم آپ کو ایک دانشمند بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں وہ بولے کہ جب بڑھاپے نے آپکڑا تو تم خوشخبری دینے لگے اب کاہے کی خوشخبری دیتے ہو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو سچی خوشخبری دیتے ہیں۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ (۳۹-۱۷) تو میرے بندوں کو بشارت سنادو۔ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ (۳۶-۱۱) سو اس کو مغفرت کی بشارت سنادو۔

اِسْتَبْشَرَ کے معنی خوش ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ۔ (۳۹-۵۴) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے (اور شہید ہو کر) ان میں شامل نہیں ہو سکے ان کی نسبت خوشیاں منا رہے ہیں۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ (۳-۱۷۱) اور خدا کے انعامات اور فضل سے خوش ہو رہے ہیں۔

وَجَاءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۱۵-۶۷) اور اہل شہر (لوط کے پاس) خوش خوش (دوڑے) آئے۔

۔۔ اور خوش کن خبر کو بشارۃ اور بُشْریٰ کہا جاتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ (۱۰-۶۴) ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ (۲۵-۲۲) اس دن گنہگاروں کے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔ وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى (۲۹-۳۱) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے۔

يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ (۱۲-۱۹) زہے قسمت یہ تو (حسین) لڑکا ہے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ (۳-۱۲۶) اور اس مدد کو تو خدا نے تمہارے لئے (ذریعہ) بشارت) بنایا۔

اَلْمُبَشِّرُ خوشخبری دینے والا۔ قرآن میں ہے:۔ فَلَمَّا اَنْ جَاءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا (۱۲-۹۶) جب خوشخبری دینے والا آپہنچا تو کرتہ یعقوبؑ کے منہ پر ڈال دیا اور وہ بینا ہو گئے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ مُبَشِّرٰتٍ (۳۰-۴۶) کہ ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ خوش خبری دیتی ہیں[1] میں مُبَشِّرَات سے مراد بارش کی خوش خبری دینے والی ہوائیں ہیں۔

اور حدیث[2]:۔

(۲۹) اِنْقَطَعَ الوحی ولم يبق اِلَّا المُبَشِّرَات الخ (وحی منقطع ہوگئی اور مبشرات باقی رہ گئیں)

---

[1] ہکذا الایۃ فی النسخ المطبوعۃ لکن الصحیح بُشْرًا۔ موضع مبشرات راجع سورۃ الاعراف (۷-۵۷) ولعل المصنف اراد ایۃ سورۃ الروم ان یرسل الریاح مبشرات (۳۰-۴۶) فوقع الذلۃ من المصحح ۱۲

[2] الحدیث باختلاف الفاظہ فی الترمذی وابن ماجۃ والحاکم والبیہقی واحمد والبزار والکامل لابن عدی وقد اخبع الکلام علی طرق الحدیث ابن کثیر (۲ / ۴۲۳ - ۴۲۴) وابن جریر ۱۱ / ۱۳۴ - بروایۃ ابن مسعود ۱۲

میں مُبَشِّرَات سے مومن کی سچی خوابیں مراد ہیں جیسا کہ بعد میں وَھِیَ الرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ الَّتِیْ یَرَاھَا الْمُؤْمِنُ اَوْ تُرٰی لَہٗ سے اس کی تشریح فرمائی ہے اور آیات کریمہ:۔

• فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹-۳۴) ان کو عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔ وَبَشِّرِ الْمُنَافِقِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ (۴-۱۳۸) (اے پیغمبر) منافقوں (یعنی دوزخی لوگوں) کو بشارت دو کہ ان کے لئے۔

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹-۳) اور (اے پیغمبر) کافروں کو دکھ دینے والے عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ میں تبشیر کے لفظ سے تنبیہ کی ہے کہ سب سے بہتر خوش کن خبر جو وہ سن سکتے ہیں وہ عذاب الیم ہے جس میں قیامت کے روز گرفتار ہوں گے۔ اور عذاب کے متعلق بَشِّرْ کا لفظ بطور تہکم استعمال ہوا ہے جیسا کہ[1] (وافر)

(۳۵) تَحِیَّۃُ بَیْنِھِمْ ضَرْبٌ وَجِیْعٌ

(ان کا باہمی سلام دردناک ضرب لگانا ہے)۔

میں ضرب وجیع کے متعلق تحیۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے[2]۔

اور آیت کریمہ:۔ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِیْرَکُمْ اِلَی النَّارِ (۱۴-۳۰) (کہدو کہ (چند روز) فائدے اٹھالو آخر کار تم کو دوزخ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ میں لفظ تَمَتَّعُوْا بھی ایسے ہی مفہوم کے پیش نظر آیا ہے نیز فرمایا:۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّ

ھُوَ کَظِیْمٌ (۴۳-۱۷) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جو انہوں نے خدا کے لئے بیان کی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہوجاتا اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔

اَبْشَرَ کے معنی ہیں اس نے بشارت کو پایا جیسے اَبْقَلَ وَاَمْحَلَ یعنی اس نے بقل اور محل یعنی خشک سالی کو پایا قرآن میں ہے:۔

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱-۳۰) اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے خوشی مناؤ اَبْشَرَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین سبزہ زار ہوگئی اور خوش منظر آنے لگی۔ اسی سے حضرت ابن مسعود کا قول ہے[3]

(۳۰) مَنْ اَحَبَّ الْقُرْاٰنَ فَلْیَبْشَرْ کہ جسے قرآن سے محبت ہے اسے خوش ہونا چاہیے۔

فَرَّاء کا قول ہے[4] کہ اگر شین مشدد (یعنی باب تفعیل سے) ہو تو بُشْرٰی سے ہوگا اور اگر خفیفہ یعنی مجرد سے ہو تو معنی مسرور ہوگا جیسے محاورہ ہے:۔ بَشَرْتُہٗ فَبَشَرَ مثل جَبَرْتُہٗ فَجَبَرَ سیبویہ نے کہا ہے[5] کہ بَشَرْتُہٗ کا مطاوع اَبْشَرَ بھی آجاتا ہے۔ مگر ابن قتیبہ کی رائے ہے کہ یہاں یعنی حدیث میں فَلْیَبْشَرْ کا لفظ بَشَرْتُ الْاَدِیْمَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھال کو چھیلنا کے ہیں۔ لہذا فَلْیَبْشَرْ کے معنی ہوئے تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو کمزور اور دبلا کرے[6]۔ جیسا کہ مروی ہے۔

(۳۱) اِنَّ وَرَاءَنَا عَقَبَۃً لَا یَقْطَعُھَا اِلَّا الضُّمَّرُ

---

[1] قاله عمرو بن معدی کرب صاحب ریحانة اخت دريد بن الصمة واوله: وخيل قد دلفت لها بخيل والبيت من شواهد الطبري (١: ٢٩١) راجع للبيت الخزانة والاصمعيات وشواهد الكشاف ٩٠٢ والبحر ٦: ١٢٦/٢: ١١٨ والكتاب (١: ٣ ٢٢٥/٣٦٥) والعمدة (٢: ٢٩٢) [2] الآية من باب التهكم لكن الاستشهاد بالبيت فيه خلط وقع كثير من الشراح الذين شرحوا كلام الزمخشري لان البيت في صنعة التنويع والتنويع قد ياتي للتهكم قد حققه ابن فارس في الصاحبي وانظر الطراز للخفاجي ٢٩-٣٤ [3] راجع الفائق (١: ٩٠) والنهاية واللسان (بشر) [4] فراء ابوزكريا يحيى بن زياد الفراء نسبة الى بيع الفروة [5] ابو بشر عمرو بن عثمان بن قنبر الملقب بسيبويه ومعناه بالفارسية رائحة التفاح من اكبر تلاميذ الخليل ومصنف اول كتاب في النحو الذي تلقاه من شيخه ومناظرته مع الكسائي في مسئلة الزنبور معلوم تلقاه التوضيح للسخاوي (٣٤) مشهورة حصل الكسائي انوار الفتح توفي سنة ١٨٠ او سنة ١٨٠ راجع النزهة لابن الانباري ٧١-٨١ وطبقات الزبيدي رقم ٢٢ وتاريخ بغداد للخطيب ١٢/١٩٥-١٩٩ والارشاد ٦/٨٠-٨٨ ووفيات لابن خلكان رقم ٤٧٤ ومرآة الجنان ١/٤٤٥-٤٤٥ والبلغة ١٨٥ وبغية الوعاة ٣٦٦-٣٦٧ وشذرات لابن العماد ١/٢٥٢-٢٥٥ ونفح الطيب للمقري ٢/٢٧٤-٤٩٤ ومعجم طبقات الكتاب طبع بولاق ١٣١٦ بتقريرات بالهامش ونبذة من شرح السيرافي عن مسندنا شرح الشواهد للاعلم الشنتمري [6] اهلنا من الاستعارة بالتواب وتاويل ابن قتيبة ذكره الزمخشري بلفظ قيل بغير عزو

مِنَ الرِّجَالِ کہ ہمارے سامنے ایک گھاٹی ہے جسے
مبلے آدمی ہی عبور کر سکیں گے اور شاعر کا قول[1]

(۵۴) فَأَعِنْهُمْ وَابْشُرْ بِمَا بَشِرُوا بِهٖ
وَإِذَا هُمُ نَزَلُوا بِضَنْكٍ فَانْزِلِ

(اِن کی مدد کرو اور جو چیز انہیں خوش لگتی ہو اسی پر خوش رہو اور جب وہ کسی تنگ مقام پر نازل ہوں تو تم بھی وہاں اتر پڑو۔ پہلے معنی یعنی فراء کے قول پر محمول ہے۔

تَبَاشِيْرُ الْوَجْهِ وَبِشْرُهٗ چہرے پر خوشی کے آثار۔ خوش روئی۔ تَبَاشِيْرُ الصُّبْحِ آغاز صبح تَبَاشِيْرُ النَّخْلِ کھجور کا پہلا پختہ پھل۔ بُشْرٰی وَبِشَارَۃٌ وہ عطیہ (یا انعام) جو بشارت دینے والے کو دیا جائے۔

(ب ص ر)

اَلْبَصَرُ کے معنی آنکھ کے ہیں جیسے فرمایا:۔
كَلَمْحِ الْبَصَرِ (۵۴-۵۰) آنکھ کے جھپکنے کی طرح۔ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ (۳۳-۱۰) اور جب آنکھیں پھر گئیں۔

نیز قوت بینائی کو بصر کہہ لیتے ہیں اور دل کی بینائی پر بَصَرٌ اور بصیرت دونوں لفظ بولے جاتے ہیں قرآن میں ہے۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰-۲۲) اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (۵۳-۱۷) ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ آگے بڑھی۔

بَصَرٌ کی جمع اَبْصَارٌ اور بَصِيْرَۃٌ کی جمع بَصَائِرُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

فَمَا اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا اَبْصَارُهُمْ (۴۶-۲۶) تو نہ ان کے کان ہی ان کے کچھ کام آسکے اور نہ آنکھیں۔

اور آنکھ سے دیکھنے کے لئے بَصِيْرَۃٌ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ بصر کے لئے اَبْصَرْتُ استعمال ہوتا ہے اور بَصِيْرَۃٌ کے لئے اَبْصَرْتُ وبَصُرْتُ بِہٖ دونوں فعل استعمال ہوتے ہیں جب حاسۂ بصر کے ساتھ رؤیت قلبی شامل نہ ہو تو بَصُرْتُ کا لفظ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابصار کے متعلق فرمایا:۔

لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ (۱۹-۴۲) آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں۔ رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا (۳۲-۱۲) اے ہمارے پروردگار ہم نے دیکھ لیا اور سُن لیا۔ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ (۱۰-۴۳) اگرچہ کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔ وَاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ (۳۷-۱۷۹) اور دیکھتے رہو یہ بھی عنقریب (نتیجہ) دیکھ لیں گے۔ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ (۲۰-۹۶) میں نے ایسی چیز دیکھی جو اوروں نے نہیں دیکھی۔

اور اسی معنی میں فرمایا:۔

اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲-۱۰۸) یعنی پوری تحقیق اور معرفت کے بعد تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں (اور یہی حال میرے پیروکار کا ہے) اور آیت کریمہ:۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ (۷۵-۱۴)

---

[1] قالہ عبد القیس بن خفاف البرجمی ونسبہ صاحب اللسان لابی عطیۃ بن زید الجاہلی والبیت من کلمۃ مفضلیۃ رقم ۱۷ فی ۱۸ بیتاً وفی روایتہ: والیسر ما یسیرا بہ امیٔ باسرع الی اجابتہم والبیت فی اللسان (بشر) وتفسیر الطبری ۱۵/۳۰، ۷ ومعانی القرآن للفراء والاصمعیات ۸۰، وشواہد المغنی (۵۹ و ۲/۲۰۳، ۲۰۳) وتہذیب اصلاح المنطق مع آخر قبلہ۔

میں عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان پر خود اس کے اعضاء میں سے گواہ اور شاہد موجود ہیں جو قیامت کے دن اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دینگے جیسے فرمایا :۔

یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ (۲۴-۲۴) جس دن ان کی زبانیں ہاتھ ...... ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

اور کبھی ضَرِیْر (اندھے) کو بھی بَصِیْر کہہ دیا جاتا ہے اور یہ اطلاق الاسم علی ضدہ کے قبیل سے ہے۔ لیکن اولیٰ یہ ہے کہ اسے تسمیۃ الشیٔ باسم ضدہ کے باب سے نہ بنایا جائے۔ بلکہ کہا جائے کہ ضَرِیْرٌ کو بصیر کہنا اس کی بصیرۃ قلبی کے لحاظ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مُبْصِرٌ وَبَاصِرٌ نہیں کہا جاتا پس اگر یہ باسم ضدہ کے قبیل سے ہوتا تو یہ اطلاق بھی جائز ہونا چاہیئے تھا اور آیت کریمہ :۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (۶-۱۰۴) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ میں اکثر علماء نے اَبْصَارٌ کے معنی آنکھ کئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ظاہری آنکھ کے علاوہ اوہام وافہام کی نفی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا قول ہے (۴۲) اَلتَّوْحِیْدُ اَنْ لَّا تَتَوَھَّمَہٗ کہ (حقیقتاً) توحید تو یہ ہے جو انسان کے واہمہ میں بھی نہ آسکے اور فرمایا کہ جو کچھ انسان ادراک کرتا ہے وہ توحید نہیں ہے۔ اَلْبَاصِرَۃُ کے معنی ظاہری آنکھ کے ہیں۔ محاورہ ہے رَأَیْتُہٗ لَمْحًا بَاصِرًا میں نے اسے عیاں طور پر دیکھا۔ اَلْمُبْصِرَۃُ روشن اور واضح دلیل۔ قرآن میں ہے۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً (۲۷-۱۳) جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں پہنچیں

وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً (۱۷-۱۲) یعنی ہم نے دن کی نشانی کو نظروں کی روشنی دینے والی بنایا۔ اور آیت کریمہ :۔

وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً (۱۷-۵۹) اور ہم نے ثمود کی اونٹنی (نبوت صالح) کی کھلی نشانی دی۔ میں مُبْصِرَۃً اسی معنی پر محمول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں مُبْصِرَۃً کے معنی ہیں کہ ایسی نشانی جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ جیسا کہ رَجُلٌ مُخْبِثٌ وَمُضْعِفٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اہل اور قریبی رشتہ دار خبیث اور ضعیف ہوں اور آیت کریمہ :۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ لِلنَّاسِ (۲۸-۴۳) میں بَصَائِرُ بصیرۃ کی جمع ہے جس کے معنی عبرت کے ہیں یعنی ہم نے پہلی قوموں کی ہلاکت کو ان کے لئے تازیانہ عبرت بنادیا اور آیت کریمہ :۔

وَأَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ (۳۷-۱۷۵) کے معنی یہ ہیں کہ انتظار کرو حتیٰ کہ تم سب اپنی آنکھوں سے نتائج ملاحظہ کرلو اور آیت کریمہ :۔

وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۹-۳۸) حالانکہ وہ دیکھنے والے تھے میں مُسْتَبْصِرِیْنَ کے معنی طالب بصیرت کے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بطور استعارہ اِسْتِبْصَار (استفعال) بمعنیٰ اِبْصَار (افعال) ہو جیسا کہ اِسْتِجَابَۃٌ بمعنیٰ اِجَابَۃٌ کے آجاتا ہے اور آیت کریمہ :۔

وَاَنْبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ بَھِیْجٍ تَبْصِرَۃً۔ اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں (۵۰-۷) اور

یں تَبْصِرَۃٌ کے معنی ہیں دکھانے اور سمجھانے کو اور یہ (تفعلۃ کے وزن پر باب تفعیل کا مصدر ہے۔ جیسے قَدَّمْتُہٗ تَقْدِیْمًا وَتَقْدِمَۃً وَذَکَّرْتُہٗ تَذْکِیْرًا وَتَذْکِرَۃً اور آیت کریمہ: وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا یُّبَصَّرُوْنَھُمْ۔ (۷۰-۱۰، ۱۱) اور کوئی دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا (حالانکہ) ایک دوسرے کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے میں یُبَصَّرُوْنَھُمْ کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے احوال و آثار سے خوب طرح واقف کر دیا جائے گا۔

بَصَّرَ الْجَرْوُ: پلے نے آنکھیں کھولیں۔

اَلْبَصْرَۃُ: ملائم چمکدار پتھر گویا وہ بینا ہے اور یا اسے بَصْرَۃٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دور سے چمکتا ہوا نظر آجاتا ہے اور اسے بَصْرٌ بھی کہا جاتا ہے۔

اَلْبَصِیْرَۃُ (ایضًا) خون کا دھبہ جو دور سے چمکتا ہوا دکھائی دے، چمکدار ڈھال، کپڑے یا شگیر ے کے دو تہوں کے درمیان کا شگاف جس سے آر پار نظر آتا ہو۔ اسی سے بَصَّرْتُ الثَّوْبَ وَالْاَدِیْمَ کا محاورہ ہے جس کے معنی کپڑے یا چمڑے کا درمیانی شگاف سلائی کرنا کے ہیں۔

(ب ص ل)

اَلْبَصَلُ: پیاز۔ قرآن میں ہے:-

وَعَدَسِھَا وَبَصَلِھَا (۲-۶۱) اور مسور اور پیاز اور تشبیہ کے طور پر لوہے کے خود کو بھی بَصَلٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ع (رمل)

(۵۵) "وَتَرِکَۃً کَالْبَصَلِ"

اور پیاز جیسی خود

(ب ض ع)

اَلْبِضَاعَۃُ: مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لئے الگ کر لیا گیا ہو۔ اَبْضَعَ وَاَبْتَضَعَ بِضَاعَۃً سرمایہ یا پونجی جمع کرنا۔ الگ کرنا قرآن میں ہے:-

ھٰذِہٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا (۱۲-۶۵) یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کر دی گئی ہے۔

وَجِئْنَا بِبِضَاعَۃٍ مُّزْجٰۃٍ (۱۲-۸۸) اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لائے ہیں۔

اصل میں بِضَاعَۃٌ بَضْعٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گوشت کا بڑا ٹکڑا۔ بَضَعْتُہٗ وَبَضَّعْتُہٗ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بنانا۔ اِبْتَضَعَ وَتَبَضَّعَ اس کا مطاوع آتا ہے جیسے قَطَعْتُہٗ وَقَطَّعْتُہٗ فَانْقَطَعَ وَتَقَطَّعَ۔ اَلْمِبْضَعُ (آلہ)

---

[1] وتکملتہ: فخمۃ ذفراء ترتی بالعرا۔ تردمانیا۔۔۔۔ والبیت من قصیدۃ للبید فی دیوانہ اخیہ مطلعھا: ان تقوی ربنا خیر نفل وباذن اللہ ریثی وعجل (منفیہ الفاقیہ) فی دیوانہ ۱۱-۱۷۶ والبیت فی وصف کتیبۃ سمکۃ من الحدید علیھا دروع فخلتہ فخمۃ ای کتیبۃ عظیمۃ ذفراء (ذفراء) ای منتنۃ الریح من الحدید القرونائی معرب (گرگوئانہ) ای عمل وتقی وراجع معجم انتھایاس ۱۰۲۲ وابن الاخباء فی (۱۶-۲۱۲) ای دروع غلیظۃ والترک بیض الحدید والتر معناہ انشد یقول الشاعر: ان ھذہ الکتیبۃ ملبوستہ فی دروع طویلۃ خددت اطرافھا بالعری بسطہ اللہ منتشر وتشتمل علی البیضا وعلی رؤسھم بیض الحدید مثل البصل وقبلہ: فتی ینفع مراح صادق یجلوبھا ذات جرس وزجل والبیت فی اللسان والصحاح (ذفر) رتو قریم: ذفر والسان وحارۃ (بصل) وتہذیب الالفاظ ۴۹۴ والتوشیح ۸۰ والاقتضاب ۲۱۵-۴۱۹ وابصنا عنتین (۹۲۲-۱۰۲۷) وخورہ من روی التشبیۃ والاصلاح ۳۴۷-۔ والمقاییس (۱: ۲۵۳-۳۵۸، ۲: ۲۹۵) والمعانی ۴۸۷۰، ۹۰۲۹، ۱۰۲۹ واضداد لابن السکیت ۱۹۶ واضداد لابن الانباری ۸۹ دابی الطیب ۲۷۹ ونوادر ابی مسحل ۲۸۸ والعلقات لابن الانباری (۵۱۵) وکان طمرینا یامر بروایۃ ہذا القصیدۃ ۱۲۔ ∴

نشتر جیسے مِقْطَعٌ۔ کنایہ کے طور بُضْعٌ[1] کے معنی عورت کی شرمگاہ بھی آ جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے۔ مَلَكْتُ بُضْعَهَا کیا تم نے اس عورت سے نکاح کرلیا ہے۔

بَاضَعَهَا بِضَاعًا۔ عورت سے مجامعت کرنا۔

فُلَانٌ حَسَنُ الْبَضْعِ وَالْبَضِيْعِ وَالْبَضْعَةِ وَالْبَضَاعَةِ۔ فلاں خوب موٹا تازہ ہے۔ اَلْبَضِيْعُ ٹاپو۔ وہ جزیرہ جو خشکی سے بہت دور ہو۔ فُلَانٌ بَضْعَةٌ مِنِّيْ۔ فلاں میرے جسم کا ٹکڑا ہے یعنی نہایت قریبی رشتے دار ہے اَلْبَاضِعَةُ زخم جو گوشت کو کاٹ ڈالے۔

اَلْبِضْعُ (بکسر الباء) عدد جو دس سے الگ کئے گئے ہیں یہ لفظ تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کہ پانچ سے اوپر اور دس سے کم پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے[1]:

بِضْعَ سِنِيْنَ (۱۲-۴۲) چند سال۔

(ب ط ر)

اَلْبَطَرُ۔ وہ دہشت جو خوشحالی کے غلط استعمال، حق نعمت میں کوتاہی اور نعمت کے غلط طور پر صرف کرنے سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ (۸-۴۷) جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے۔

بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (۲۸-۵۸) اپنی معیشت میں اترا رہے تھے۔ یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِيْشَتُهٗ ہے فعل کی نسبت اس سے قطع کرکے بطور تمیز اسے منصوب کر دیا گیا ہے۔ اور ذریبًا طَرَبٌ بمعنی بَطَرٌ آتا ہے مگر طَرَبٌ اس خفت کو کہتے ہیں جو فرط مسرت کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی طَرَبٌ بمعنی غم بھی آ جاتا ہے۔ اَلْبَيْطَرَةُ حیوانات کا علاج کرنا، انکی چیر پھاڑ کرنا۔

(ب ط ش)

اَلْبَطْشُ کے معنی کوئی چیز زبردستی لے لینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (۲۶-۱۳۰) اور جب کسی کو پکڑتے تو ظالمانہ پکڑتے ہو۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى[2] (۴۴-۱۶) جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا (۵۴-۳۶) اور لوط نے ان کو ہماری گرفت سے ڈرایا۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵-۱۲) بیشک تمہارے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے۔

يَدٌ بَاطِشَةٌ سخت گیر ہاتھ۔

(ب ط ل)

اَلْبَاطِلُ یہ حق کا بالمقابل ہے اور تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے اسے باطل کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ (۳۱-۳۰) یہ اس لئے کہ خدا کی ذات برحق ہے اور جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ لغو ہیں۔

اور باطل کا لفظ قول و فعل دونوں پہ بولا جاتا ہے۔

---

[1] قال علماء اللغة والتفسير البضع ما بين الثلاث الى التسع راجع اللسان (بضع) ورواه الطبراني وابن مردويه عن دينار بن مكرم والترمذى عن ابن عباس مرفوعًا۔ [2] اريد بالبطشة الكبرى يوم بدر او عذاب يوم القيمة (الطبرى ۲۵/۱۱۲-۱۱۸)

پسا نچہ فرمایا:۔ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۳-۷۱) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔

بَطَلَ (ن) بُطُوْلًا وَبُطْلًا وَبُطْلَانًا کسی چیز کا یونہی ضائع چلا جانا۔

اَبْطَلَهٗ ضائع کر دینا۔ قرآن میں ہے:۔

وَبَطَلَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۷-۱۱۸) اور جو کچھ فرعونی کرتے تھے باطل ہو گیا۔

اور ہر وہ آدمی جو دنیا اور آخرت کی بھلائی کیلئے کوئی مفید کام نہ کرے اسے بَطَّال وذوبِطَالَۃٍ کہا جاتا ہے۔

بَطُلَ (ک) دَمُهٗ خون کا رائیگاں جانا۔

بَطَلٌ بہادر جو موت سے نہ ڈرے ایسے آدمی کے خون کو رائیگاں سمجھ کر یہ لفظ اس پر بولا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۵۷) فَقُلْتُ لَهَا لَا تَنْکِحِیْهِ فَاِنَّهٗ
لِاَوَّلِ بَطَلٍ اَنْ یُّلَاقِیْ مَجْمَعًا

(میں نے اس سے کہا کہ اس سے نکاح مت کیجئے کیونکہ وہ لڑائی میں بہادر کے ہاتھ سے مارا جائیگا) (اس معنی کے لحاظ سے بَطَلٌ بروزن فَعَلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے یعنی وہ جس کا خون رائیگان جانے والا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فَعَلٌ بمعنی فاعل ہو کیوں کہ وہ اپنے دشمن کے خون کو رائیگاں کر دیتا ہے۔

بَطَلَ (ن) اَلرَّجُلُ بُطُوْلَۃً بہادر ہونا بَطَّال یعنی یہ بیکار یہ بَطَالَۃٌ (بیکاری) کی طرف منسوب ہے۔ محاورہ ہے:۔

ذَهَبَ دَمُهٗ بُطْلًا اس کا خون رائیگاں گیا۔

اَلْاِبْطَالُ کے معنی کسی چیز کو خراب اور نابود کرنے کے ہیں خواہ وہ چیز حق ہی کیوں نہ ہو قرآن میں ہے:۔

لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ (۸-۸) تاکہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کر دے۔

کبھی اِبْطَالٌ کا لفظ بے حقیقت بات کہنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ۔ (۳۰-۵۸) اور اگر تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کرو تو کافر کہہ دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔

اور آیت کریمہ:۔

وَخَسِرَ هُنَالِکَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۰-۷۸) اور اہل باطل نقصان میں پڑ گئے۔

میں مُبْطِلُوْن سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ب ط ن)

اَلْبَطْنُ اصل میں بَطْنٌ کے معنی پیٹ کے ہیں اس کی جمع بُطُوْنٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِکُمْ (۵۳-۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

بَطَنْتُهٗ میں نے اس کے پیٹ پر مارا۔

---

[1] قالہ تابط شرا مادحًا نفسہ عندما خطب امرءۃ فنہیٰہا الناس بانہ سیقتل فتبقین ایمًا والبیت فی الحماسۃ ۱۹۴ بشرحہ المرزوقی ۱۱ بیتًا وقد احسن الشارح فی اعراب البیت وفی روایۃ: قالوا بدل فقلت ونصل بدل بطل والبیت فی البحر ۵: ۳۲۵

اَلْبَطْنُ ہر چیز میں یہ ظَھْرٌ کی ضد ہے اور ہر چیز کی نیچے کی جہت کو بطن اور اوپر کی جہت کو ظہرٌ کہا جاتا ہے اسی سے بطور تشبیہ کہا جاتا ہے :۔

بَطْنُ الْاَمْرِ (کسی معاملہ کا اندرون) بَطْنُ الْوَادِیْ (وادی کا نشیبی حصہ) اور بطن بمعنی قبیلہ بھی آتا ہے اس اعتبار سے کہ تمام عرب کو بمنزلہ ایک شخص کے فرض کیا جائے ہیں اور ہر قبیلہ بمنزلہ بطن فخذ اور کاہل (کندھا) وغیرہ اعضاء کے تصور کیا جائے۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[1] ؎ (مدید)

(۵۷) اَلنَّاسُ جِسْمٌ وَاِمَامُ الْھُدٰی
رَاْسٌ وَاَنْتَ الْعَیْنُ فِی الرَّاْسِ

(کہ لوگ بمنزلہ جسم ہیں اور امام ہدیٰ بمنزلہ سر ہے مگر تم سر میں آنکھ ہو۔

اور ہر پیچیدہ معاملہ کو بطن اور جلی اور عیاں کو ظہر کہا جاتا ہے۔ اسی سے بُطْنَانُ الْقِدْرِ وَظُھْرَانُھَا[2] کا محاورہ ہے۔ یعنی دیگ کی اندرونی اور بیرونی جانب۔

ہر اس چیز کو جس کا حاسہ بصر سے ادراک ہو سکے اسے ظاہر اور جس کا حاسہ بصر سے ادراک نہ ہو سکے اسے باطن کہا جاتا ہے قرآن میں ہے :۔

وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ (۶ - ۱۲۰)

اور ظاہری اور پوشیدہ (ہر طرح کا) گناہ ترک کر دو۔

مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ (۷ - ۳۲) ظاہری ہوں یا پوشیدہ۔

اَلْبَطِیْنُ کلاں شکم۔ اَلْبَطِنُ بسیار خور۔

اَلْمِبْطَانُ جس کا بسیار خوری سے پیٹ بڑھ گیا ہو۔

اَلْبِطْنَۃُ بسیار خوری مثل مشہور ہے[3]

اَلْبِطْنَۃُ تُذْھِبُ الْفِطْنَۃَ[4] بسیار خوری ذہانت ختم کر دیتی ہے۔

بَطِنَ الرَّجُلُ بَطْنًا شکم پری اور بسیار خوری سے اترا جانا۔

بَطُنَ (ک) الرَّجُلُ بڑے پیٹ والا ہونا۔

مُبَطَّنٌ پچکے ہوئے پیٹ والا۔

بُطِنَ الرَّجُلُ مرض شکم میں مبتلا ہونا اس سے صیغہ صفت مفعولی مَبْطُوْنٌ (مریض شکم) آتا ہے۔

اَلْبِطَانَۃُ کے معنی کپڑے کا استر یا اس کے اندرونی حصہ کے ہیں اور اس کی ضد ظِھَارَۃٌ ہے[5] جس کے معنی کپڑے کا اوپر کا حصہ یا ابرہ کے ہیں اور بَطَنْتُ ثَوْبِیْ بِاٰخَرَ کے معنی ہیں میں نے ایک کپڑے کو دوسرے کے نیچے لگایا۔

بَطَنَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ کسی شخص کے اندرونی معاملات سے واقف ہونا اور بطور استعارہ اَلْبِطَانَۃُ کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو دوسرے کا رازدان ہو چنانچہ قرآن میں ہے :۔

لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ (۳ - ۱۱۸)

---

[1] قالہ علی بن جبلۃ العکوک یمدح حمید بن عبد الحمید الطوسی والبیت فی الکامل ۵۸۷ والعمدۃ (ا: ۲۶۴) وفیہ صنعۃ التولید وشرح الدرۃ للخفاجی ۷۵ والورقۃ لابن الجراح ۱۰۶ وذیل الامالی ۶۹ آخر والطبقات لابن المعتز ۴۳ ۴ وفی خاص الخاص للثعالبی قبلہ ع دجلۃ تسقی یطیح من تسقی من الناس ونسبہ المؤلف (فی محاضراتہ الی المنصور النمری خلافا لجمیع المراجع الاخری وراجع لترجمۃ العکوک الضریر الاغانی وطبقات لابن المعتز ۱۷۱-۱۸۵ والشعر والشعراء لابن قتیبہ ومسالک الابصار وابن خلکان والفہرست وان شعرہ مائۃ وخمسین ورقۃ ۱۲

[2] وفی الامثال للثعالبی تأفن بدل تذہب یضرب لمن غیر استغناء عقلہ وافسرہ راجع رقم ۴۵۲۴ [3] ... [4] بطانۃ والجمیع بطائن ومنہ قولہ تعالٰی : بطائنہا من استبرق (۵۵ - ۵۴) قال الحسن اراد ظواہرہا ولذا عدہ العلماء من الاضداد وراجع اضداد لابی الطیب ۶۷

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

کسی غیر مذہب کے آدمی) کو اپنا رازدان نہ بنانا اور بطانۃ الثوب سے استعارہ ہے کیونکہ اسی معنی میں لَبِسْتُ فُلَانًا وَ فُلَانٌ شِعَارِیْ وَ دِثَارِیْ بھی کہا جاتا ہے ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا:

(۳۳) مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَبِیٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِیْفَةٍ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَةٌ تَأْمُرُهٗ بِالْخَیْرِ وَ تَحُضُّهٗ علیه وبِطَانَةٌ تَأْمُرُهٗ بِالشَّرِّ وَ تَحُثُّهٗ عَلَیْهِ[1] کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کسی کو خلیفہ بنایا ہے مگر ہمیشہ اس کے دو رازدان رہے ہیں ایک رازدار اسے خیر کا مشورہ اور اس کی ترغیب دیتا رہا ہے اور دوسرا اسے شر کا مشورہ اور اسی پر اکساتا رہا ہے۔

اَلْبِطَانُ: تنگ جس سے جانور کا پالان کسا جاتا ہے والجمع اَبْطِنَةٌ وَبُطُنٌ۔ اَلْاَبْطِنَانِ پیٹ کی دو رگیں۔ اَلْبُطَیْنُ۔ ستارہ جو برج حمل کے لئے بمنزلہ شکم کے ہے وآں سہ ستارۂ خرد است کہ برصورت دیگ پایہا واقع شدہ)

اَلتَّبَطُّنُ (تفعل) کسی معاملہ کی تہ تک پہنچنا۔

اَلظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۳۰۵۷) صفات الٰہی سے ہیں۔ اور اَلْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کی طرح مزدوج یعنی ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اَلظَّاهِرُ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ یہ اس معرفت کی طرف اشارہ ہے جو ہمیں بالبداہت حاصل ہوتی ہے کیونکہ انسان جس چیز کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھے اس کی فطرت کا یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے جیسے فرمایا:۔ وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ اور وہی (ایک) آسمانوں میں معبود ہے اور وہی زمین میں معبود ہے (۴۳/۸۴) اسی لئے بعض حکماء کا قول ہے کہ معرفت الٰہی کے طالب کی مثال اس شخص کی ہے جو اطراف عالم میں ایسی چیز کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہو۔ جو خود اس کے پاس موجود ہو۔ اور اَلْبَاطِنُ سے اس حقیقی معرفت کی طرف اشارہ ہے۔ جس کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ہے۔

(۳۴) یَا مَنْ غَایَةُ مَعْرِفَتِهٖ اَلْقُصُوْرُ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ اے وہ ذات جس کی معرفت کی انتہا اس کی معرفت سے درماندگی ہے۔)

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات (دلائل قدرت) کے لحاظ سے ظاہر ہے اور باعتبار ذات کے باطن ہے۔ اور بعض نے کہا کہ اَلظَّاهِرُ سے اس کا تمام اشیاء پر محیط ہونا مراد ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ ہمارے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتا اَلْبَاطِنُ ہے۔ چنانچہ فرمان الٰہی ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶-۱۰۳) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔

حضرت علیؓ سے ایک مقولہ مروی ہے جس سے ان دونوں لفظوں کی تفسیر پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں[2] (۳۵) تَجَلّٰی لِعِبَادِهٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ رَاَوْهُ وَ اَرَاهُمْ نَفْسَهٗ مِنْ غَیْرِ اَنْ تَجَلّٰی لَهُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر تجلی فرمائی بدوں اس کے کہ بندے اس کو دیکھ سکیں اور اپنی ذات کو دکھایا بدوں اسکے کہ ان کے سامنے جلوہ افروز ہو۔ مگر اس قول کو سمجھنے

---

[1] الحدیث فی (حم، خ، ن۔ عن ابی سعید وبعناہ زھد، ت۔ عن ابی ہریرۃ، ف۔ عن ابی ایوب وابی ہریرۃ) راجع کنز العمال ج ۲ رقم ۱۴۳۵۱ - ۱۴۳۵۰ وبعناہ رواہ ابن حبان رقم ۲۱۰۲ وفی الکنز تحضہ بدل تحثہ، [2] ہذا وذکر العلامۃ الماوردی فی تفسیر الآیۃ تسعۃ اقوال فتذکر ۱۲

کے لئے فہم روشن اور عقل وافر کی ضرورت ہے۔
اور آیت کریمہ: وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (۳۱-۲۰) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردی ہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ ظَاهِرَةً سے نبوت اور بَاطِنَةً سے عقل مراد ہے اور بعض نے ظَاهِرَةً سے محسوس نعمتیں مراد لی ہیں اور بَاطِنَةً سے معقولات یعنی وہ نعمتیں مراد لی ہیں جن کا حس سے ادراک نہیں ہو سکتا۔
اور بعض نے کہا ہے کہ ظَاهِرَةً سے وہ غلبہ مراد ہے جو دشمنوں پر انسانوں کے ذریعہ حاصل ہوا۔ اور باطنہ سے وہ غلبہ مراد ہے جو فرشتوں کے ذریعہ حاصل ہوا۔ لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان تمام اقوال کو شامل ہے۔

(ب ط ء)

اَلْبُطْءُ (ک) کے معنی چلنے میں دیر لگانے اور سستی کرنے کے ہیں اور یہ باب کرم و تفاعل و استفعال وافعال سے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بَطُؤَ (ک) کے معنی اس وقت بولتے ہیں جب دیر لگانے کا عادی ہو جائے اور تَبَاطَاءَ کے معنی ہیں بتکلف دیر کرنا اور استفعال میں طلب کے معنی پائے جاتے ہیں۔
اِبْطَاءٌ (افعال) سست رفتاری کے ساتھ متصف ہونا۔ نیز بَطَّأَهٗ وَاَبْطَأَهٗ (متعدی) مؤخر کرنا اور آیت کریمہ: وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (۴-۷۲) اور تم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو (عمدًا) دیر لگاتے ہیں۔
میں لَيُبَطِّئَنَّ کے معنی دوسروں سے دیر لگوانا کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی بہت زیادہ سستی کرنا بھی لکھے ہیں حاصل یہ ہے کہ بعض تم میں سے خود بھی دیر لگاتے ہیں اور دوسروں سے بھی دیر لگواتے ہیں۔

(ب ظ ر)

ایک قرأت میں ہے:
وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُظُوْرِ اُمَّهٰتِكُمْ (۱۶-۷۸) اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کی شرمگاہوں سے باہر نکالا۔
بُظُوْرِ (بَظَارَةٌ) کی جمع ہے جس کے معنی بکری کے تھنوں کے لٹکے ہوئے گوشت کے ہیں اور عورت کی شرمگاہ کے اوپر ابھرے ہوئے گوشت کو بَظَارَةٌ کہا جاتا ہے۔ پھر مجازاً بَضْعٌ کی طرح شرمگاہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

(ب ع ث)

اَلْبَعْثُ (ف) اصل میں بعث کے معنی کسی چیز کو ابھارنے اور کسی طرف بھیجنا کے ہیں اور اِنْبَعَثَ دراصل مطاوع ہے بَعَثَ کا مگر متعلقات کے لحاظ سے اس کے معنی مختلف ہوتے رہتے ہیں مثلاً بَعَثْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی اونٹ کو اٹھانے اور آزاد چھوڑ دینا کے ہیں اور مردوں کے متعلق استعمال ہو تو قبروں سے زندہ کرکے محشر کی طرف چلانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (۶-۳۶) اور مردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اٹھائے گا۔
يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا (۵۸-۶) جس دن خدا ان سب کو جلا اٹھائے گا۔
زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى

وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ (۶۴-۷) جو لوگ کافر ہوئے ان کا اعتقاد ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہدو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱-۲۸) تمہارا پیدا کرنا اور جلا اٹھانا ایک شخص (کے پیدا کرنے اور جلا اٹھانے) کی طرح ہے۔

پس بَعْثٌ دو قسم پر ہے بعث بشری یعنی جس کا فاعل انسان ہوتا ہے جیسے بَعَثْتُ الْبَعِيْرَ (یعنی اونٹ کو اٹھا کر چلانا) اور بَعَثْتُ الْاِنْسَانَ فِیْ حَاجَةٍ (کسی کو کسی کام کے لئے بھیجنا)

دوم بعث الٰہی یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ اعیان، اجناس اور انواع کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ قسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس پر کبھی کسی دوسرے کو قدرت نہیں بخشی۔ دوم مردوں کو زندہ کرنا۔ اس صفت کے ساتھ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بھی سرفراز فرما دیتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہم مثل دوسرے انبیاء کے متعلق مذکور ہے اور آیت کریمہ:۔

فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ (۳۰-۵۶) اور یہ قیامت ہی کا دن ہے۔ بھی اسی قبیل سے ہے یعنی یہ حشر کا دن ہے اور آیت کریمہ:۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ (۵-۳۱) اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کریدنے لگا۔

میں بَعَثَ بمعنی قَيَّضَ ہے۔ یعنی مقرر کر دیا اور رسولوں کے متعلق کہا جائے۔ تو اس کے معنی مبعوث کرنے اور بھیجنے کے ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (۱۶-۳۶) اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا (۲۳-۴۴) فرمایا ہے اور آیت:۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا (۱۸-۱۲) پھر ان کو جگا اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ جتنی مدت وہ (غار میں) رہے دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔ میں بَعَثْنَا کے معنی صرف (نیند سے) اٹھانے کے ہیں اور اس میں بھیجنے کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا (۱۶-۸۹) اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے خود ان پر گواہ کھڑا کریں گے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ الآية (۶-۶۵) کہدو کہ (اس پر بھی) قدرت رکھتا ہے کہ تم پر (اوپر کی طرف سے ... عذاب بھیجے۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ (۲-۲۵۹) تو خدا نے اس کی روح قبض کر لی (اور) سو برس تک (اس کو مردہ رکھا) پھر اس کو جلا اٹھایا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَهُوَ الَّذِیْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ (۶-۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے۔ میں نیند کے متعلق توفی اور دن کو اٹھنے کے متعلق بعث کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ (۹-۴۶)

لیکن خدا نے ان کا اٹھنا (اور نکلنا) پسند نہ کیا۔ میں انبعاث کے معنی جانے کے ہیں۔

(ب ع ث ر)

آیت کریمہ:۔ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۸۲-۴) میں بُعْثِرَتْ کے معنی قبروں کی مٹی کو الٹ پلٹ کرنے اور مُردوں کو اٹھانے کے ہیں۔ جن علماء کے نزدیک رباعی اور خماسی دو ثلاثی مادوں سے مل کر بنتے ہیں ان کے خیال میں "بُعْثِرَ" بُعِثَ اور اُثِیْرَ سے مل کر بنا ہے جیسا کہ ہَلَّلَ وَبَسْمَلَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور بِسْمِ اللّٰہ سے بنے ہیں۔ اور اس میں کچھ بُعد نہیں ہے کیونکہ اَلْبَعْثَرَۃ میں ان دونوں فعلوں کے معنی موجود ہیں۔

(ب ع د)

اَلْبُعْدُ کے معنی دوری کے ہیں یہ قُرْب کی ضد ہے اور ان کی کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ ایک ہی جگہ کے اعتبار سے ایک کو قریب اور دوسری کو بعید کہا جاتا ہے۔

محسوسات میں تو ان کا استعمال بکثرت ہوتا ہے مگر کبھی کبھی معانی کے لئے بھی آجاتے ہیں جیسے فرمایا: ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۴-۱۳۶) وہ راہ ہدایت سے بھٹک کر دور جا پڑے۔

اُولٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ (۴۱-۴۴) (ان کو گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

بَعُدَ (ک) فَھُوَ بَعِیْدٌ۔ دور ہونا جیسے فرمایا: وَمَا ھِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ (۱۱-۸۳) اور وہ (بستی ان) ظالموں سے کچھ دور نہیں ہے۔

لیکن بَعِدَ (س) کے معنی مرنا کے ہیں۔ اور عموماً اَلْبُعْدُ ہلاک ہونا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔ کَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (۱۱-۹۵) جیسے ثمود تباہ ہوگئے۔ اور اَلْبُعْدُ وَالْبُعْدُ کبھی قرب کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۵۸) "فِی الْاَدْنیٰ وَفِی الْبُعُدِ"

یعنی ہر قریب و بعید پر اس کے احسانات موجود ہیں اور کبھی یہ دونوں (اَلْبُعْدُ وَالْبُعْدُ) ہلاکت کے معنی میں بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ انہی معنی میں فرمایا: فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۲۳-۴۱) پس ظالم لوگوں پر لعنت ہے۔

فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (۲۳-۴۴) پس جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان پر لعنت۔

اور آیت کریمہ:۔

بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ فِی الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ۔ (۳۴-۸) بات یہ ہے جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ آفت اور پرلے درجے کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔

میں الضلال البعید سے ایسی گمراہی مراد ہے جس کے بعد ہدایت کی طرف لوٹنا نہایت مشکل ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص شاہراہ سے بہت دور چلا جائے جس کے بعد دوبارہ اس کے شاہراہ کی طرف لوٹ کر آنے کی امید نہ ہو اور آیت کریمہ:۔

---

[1] قالہ النابغۃ یمدح النعمان وتکملتہ: فتلک تبلغنی النعمان ان لہ فضلاً علی الناس . . . . والبیت فی العقد الثمین ۲ وشرح العشر للتبریزی ۲۹۵ والخزانۃ (۱: ۲۲۲ طبعۃ بولاق) والسیوطی ۲۷۸ ودیوانہ ۲۵ واللسان والتاج (بعد) فی روایۃ الصحاح والمحکم (بعد) فی الاذنین والبُعد والبعیدُ شذ لعبید بن الابرص وتکملتہ: اولا توک بجمیع لا کفار لہ۔ قوم ھم القوم راجع دیوان ابن الابرص مع شرح جالس (طبعۃ لندن ۱۹۱۳ء)

وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ (۱۱-۸۹) اور لوط کی قوم (تو) تم سے کچھ دور نہیں ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ تم بھی گمراہی میں ان جیسے ہو، اس لئے کچھ بعید نہیں کہ ان کی طرح تم پر بھی عذاب آجائے۔ بَعْدُ یہ قَبْلُ کی ضد ہے لہذا قبل کی بحث میں اس کی جمیع انواع بیان کی جائیں گی ان شاء اللہ تعالٰی۔

(ب ع ر)

اَلْبَعِيْرُ۔ اونٹ (جنس) لفظ انسان کی طرح مذکر و مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے اس کی جمع اَبْعِرَةٌ وَاَبَاعِرُ وبُعْرَان آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَلِمَنْ جَاءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ (۱۲-۷۲) اور جو شخص اس کو لے آئے اس کے لئے بار شتر (انعام)
اَلْبَعْرُ۔ اونٹ کی مینگنی۔
اَلْمِبْعَرُ (جائے بعر) اَلْمِبْعَارُ:۔ بہت زیادہ مینگنی کرنے والا اونٹ۔

(ب ع ض)

بَعْضُ الشَّيْءِ ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اسلئے کل کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جیسے: بَعْضُهٗ وَكُلُّهٗ اس کی جمع اَبْعَاضٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲-۳۶) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔
وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا (۶-۱۲۹) اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔
وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (۲۹-۲۵) اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے
اور بَعَّضْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو حصوں میں تقسیم کردینا ہیں جیسے جَزَّأْتُهٗ اور آیت کریمہ:۔
وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ۔ (۴۳-۶۳) نیز اس لئے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو تم کو سمجھا دوں۔
میں ابو عبیدہ[1] نے کہا ہے کہ یہاں بعض بمعنی کل ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] ع (کامل)

---

[1] راجع مجاز ۲/۲۰۲ ص ۴۹ فانہ قال: والبعض یکون شیئاً من الشیٔ ویکون کل الشیٔ قال لبید... لکن تحت آیۃ ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم (۳-۵۰) ثم قال تحت الآیۃ (۴۳-۶۳) البجرتہ: البعض ہہنا الکل قال لبید... لان الموت لایعتلق بعض النفوس دون بعض اھ وابوعبیدۃ معمر بن المثنی-۱۱-۔وتاریخ وفاتہ (۴۲/۹۷) مختلف فیہ الاغلب ۲۱۰-۲۱۳ کان من معاصری تلامذۃ الخلیل ولم یتأثر بہ تأثراً مباشراً- کان ابواہ من یہود فارس وکان مولی لبنی تیم قریش واخذ فی شبیبتہ عن ابی عمرو بن العلاء ویونس بن حبیب، اتصل بالخوارج (مقالات الاسلامیین للاشعری ۱/۱۰۲ والبیان للجاحظ ۱/۳۴۲) کان ضعیفاً فی علم النحو (مقدمۃ تہذیب الازھری) صنف کتاباً فی مثالب العرب نقماً منہم لاعیبہ علیہ لنسبتہ العجم فکرہہ الناس حتی لم یحضر جنازتہ (اعلام البصریین (راجع ضحی الاسلام لاحمد امین ۲/۳۰۴ مع المراجع ویرکلمن او مجازہ فی تفسیر القرآن مشہور وعلیہ تعلیقات للاصمعی (والارشاد لیاقوت ۷/۱۶۷-۱۶۸) [2] قال لبید بن ربیعۃ وصدرہ "تراک امکنۃ اذالم ارضہا... وفی روایۃ" او یعتلق "بدل او یرتبط والبیت فی معلقتہ فی شرح العشرہ ۱۵۵ والقرطبی (۴: ۹۶) وشواہد الکشاف ۲۹۰ والمحکم واللسان (بعض) ومجالس ثعلب ۵۰، ۳۶۸ والبحر (۲: ۴۶۸/۱۷: ۱۶۱ وذیل الجامع الکبیر ۲۷ والزوزنی ۹ والشطر ایضاً فی الصاحبی ۲۵۱

(۵۹) اَوْ یَرْتَبِطُ بَعْضَ النُّفُوْسِ حِمَامُهَا
(یا نفوس کو ان کی موت پالے)

لیکن یہ ابو عبیدہ کی کوتاہ بینی ہے۔ کیونکہ مسائل شریعت کی چار قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کا بیان کرنا خلاف مصلحت ہوتا ہے ایسی چیز کا بیان کرنا صاحب شریعت کے لئے جائز نہیں ہوتا۔ جیسے قیامت یا موت کا وقت کہ اس کے بتا دینے میں مفسدہ لازم آتا ہے۔

(۲) اور بعض چیزیں محض عقلی ہوتی ہیں جن کا ادراک نبی کے علاوہ دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت جو کہ آسمان وزمین کی خلق میں پائی جاتی ہے تو ایسی چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر فرض نہیں ہوتا اسی لئے قرآن نے ان چیزوں کی معرفت عقول کے سپرد کی ہے جیسا کہ آیت: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۰-۱۰۱) (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ اور آیت اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا (۳۰-۸) کیا انہوں نے غور نہیں کیا۔

(۳) بعض چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر واجب ہوتا ہے۔

(۴) بعض احکام فروعی ہوتے ہیں جو اصول شریعت سے مستنبط ہو سکتے ہیں پس جب کسی ایسے حکم میں اختلاف ہو جائے جس کا بیان کرنا نبی پر واجب نہیں۔ تو صاحب شریعت کو اختیار ہے کہ حسب موقع اسے بیان فرمادے یا سکوت اختیار کرے زیر بحث آیت میں اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ بعض سے کل مختلف فیہا اشیا مراد نہیں ہیں۔

پھر جس شعر سے استدلال کیا گیا ہے اس میں بھی شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہے یعنی مگر یہ کہ مجھے موت پالے۔ لیکن شاعر نے تصریح کی بجائے تعریض سے کام لیا ہے۔ کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ موت سے دور بھاگتا ہے۔

خلیل نے کہا کہ رَأَیْتُ غِرْبَانًا تَتَبَعَّضُ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو پکڑ رہے ہیں اَلْبَعُوْضُ (مچھر) یہ بھی لفظ بعض سے بنا ہے۔ مچھر چونکہ دوسرے حیوانات کی بہ نسبت صغیر الجسم ہوتا ہے اس لئے اسے بَعُوْضٌ کہا جاتا ہے۔

(ب ع ل)

اَلْبَعْلُ۔ کے معنی شوہر کے ہیں قرآن میں ہے:۔ وَهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں (۱۱-۷۲)
اس کی جمع بُعُوْلَةٌ آتی ہے جیسے فَحْلٌ وَ فُحُوْلَةٌ فرمایا:۔
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (۲-۲۲۸)
اور ان کے خاوند... ان کو زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔
اور اس تصور کے پیش نظر کہ مرد کو عورت پہ برتری حاصل ہے۔ اسے عورت کا منتظم مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

ؔ۱ وعلیہ ایضاً الطبری (۲۵/۵۰) والمبرد والنحاس فی معانیہ (۲۴آ) وابن سیدہ فی المحکم (بعض) والطبری اکثر ما یرد علی ابی عبیدۃ تفسیرہ ولنا مقالۃ (ابو عبیدۃ والطبری فی تفسیر الغریب والامام البخاری) وقد اشبعنا الکلام فی الرد علی من یلزم البخاری انہ قلد ابا عبیدۃ فی تفسیر الغریب ؔ۲ راجع المبرد والقرطبی (۴-۹۲) شایع ابا عبیدۃ وجوزان یکون بعض بمعنی کل

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴-۳۴) میں مذکور ہے بنا بریں ہر وہ چیز جو دوسری اشیا پر فوقیت رکھتی ہو اسے بَعْلٌ کہنے لگے ہیں چنانچہ اہل عرب اپنے بت کو جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا چاہتے تھے بَعْلٌ کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے بلند اور برتر سمجھتے تھے جیسے فرمایا:۔ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ کیا تم بعل کو پکارتے (اور پوجتے) ہو اور سب سے بہتر کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو (۳۷-۱۲۵) محاورہ ہے:۔ اَتَانَا بَعْلُ ھٰذِہِ الدَّابَّةِ اس دابہ کا مالک ہمارے پاس آیا۔

اَلْبَعْلُ (ایضاً) (۱) بلند زمین (۲) فحل نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا سردار[1] (۳) ہر وہ بڑا درخت جو اپنی جڑوں کے ذریعہ از خود زمین سے پانی جذب کرلیتا ہو اور اسے آبیاری کی ضرورت نہ ہو۔ حدیث میں ہے[2] (۳۶) فِیْمَا سُقِیَ بَعْلًا الْعُشْرُ یعنی بعل میں عشر (واجب) ہے اور جب عالی کی اپنے مستولی علیہ ماتحت پر گرفت بھاری اور گراں ہو تو کہا جاتا ہے: اَصْبَحَ فُلَانٌ بَعْلًا عَلٰی اَھْلِہٖ یعنی فلاں اپنے علو کی وجہ اپنے اہل پر ثقیل ہے[3]۔

اور لفظ اَلْبَعْلُ سے مُبَاعَلَةٌ وَبِعَالٌ (مصدر مفاعلہ) بنایا گیا ہے جس کے معنی (کنایۃً) مجامعت کے ہوتے ہیں[4] محاورہ ہے بَعَلَ الرَّجُلُ (ن) بُعُوْلَةً وَاسْتَبْعَلَ فَھُوَ بَعْلٌ وَمُسْتَبْعِلٌ شوہر ہونا۔ اِسْتَبْعَلَ النَّخْلُ کھجور کا تناور ہو جانا۔ اور بَعْلٌ کھجور سے ایک جگہ پر قیام اور ثبات کے معنی کا تصور کرکے ہر اس آدمی کو جو اپنے معاملہ میں حیرت کی بنا پر ایک جگہ پر کھڑا رہے اس کے متعلق بَعِلَ فُلَانٌ بِاَمْرِہٖ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے معاملہ میں حیران ہے، جیسا کہ اس شخص کے متعلق جو اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہے مَاھُوَ اِلَّا شَجَرٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(ب غ ت)

اَلْبَغْتُ (ف) کے معنی کسی چیز کا یکبارگی ایسی جگہ سے ظاہر ہوجانا کے ہیں۔ جہاں سے اس کے ظہور کا گمان تک بھی نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔ لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْتَةً (۷-۱۸۷) اور ناگہاں تم پر آجائے گی۔ بَلْ تَاْتِیْھِمْ بَغْتَةً (۱۲-۱۰۷) یا ان پر ناگہاں قیامت آجائے۔ بَغَتَ کَذَا فَھُوَ بَاغِتٌ کسی چیز کا ناگہاں آپہنچنا شاعر نے کہا ہے[5] ع

(۷۰) اِذَا بَغَتَتْ اَشْیَاءُ قَدْ کَانَ مِثْلُھَا
قَدِیْمًا فَلَا تَعْتَدَّھَا بَغَتَاتٍ

(ب غ ض)

اَلْبُغْضُ کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل کا متنفر اور بیزار ہونا کے ہیں۔ یہ حُبٌّ کی ضد ہے۔

---

[1] وفی اللسان فحل النخل وکذا فی اضداد ابی الطیب ۶۸-۲۳ [2] نصب بعلًا علی الحال کذا فی الفائق ۱/۵۵ والحدیث رواہ ابن جریر۔ عن معاذ ولفظہ: اوسقی بعلًا العشر دکنز العمال ۷: ۸/۲۲۳۶) وفی روایۃ النسائی وابی داؤد وابن ماجۃ من حدیث ابن عمرؓ اوکان بعلًا العشر و فی بعض الروایات عثریا بدل بعلًا راجع غریب ابی عبید ا/۲۶ [3] کذا فی الفائق ۱/۵۵ [4] ومنہ الحدیث ایام التشریق ایام اکل وشرب وبعال ای ملاعبۃ الرجل اہلہ سیأتی تخریجہ (عود) [5] قالہ ابن الرومی یحث علی تصور المصائب والاستعداد لہا والبیت فی محاضرات المؤلف فی حسنۃ ہیات وقبلہ: ولاعونصنا نعمی البلوی وقدسأت غفلات من الایام بعد غفلات راجع دیوان ابن الرومی وفی المطبوع (فی جمیع الطبعات) لعبث بالعین المہملۃ والثاء المثلثۃ مصحف :

جس کے معنی کسی پسندیدہ چیز کی طرف دل کا منجذب ہونا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے
بَغِضَ (س)، اَلشَّیْئُ بُغْضًا وَ بَغَضْتُہٗ (ن)، بُغْضَاءً
قرآن میں ہے:۔
وَاَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَاءَ (۵-۶۴)
اور ہم نے اِن کے باہم عداوت اور بغض قیامت تک کے لئے ڈال دیا ہے۔
اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَاءَ (۵-۹۱) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے۔ اور حدیث میں ہے[۱] (۳۷) اِنَّ اللّٰہَ یَبْغَضُ الْفَاحِشَ وَالْمُتَفَحِّشَ بیشک اللہ تعالیٰ بدکلام گالی دینے والے سے نفرت کرتا ہے۔ یہاں بغض کا لفظ بول کر اس امر پر تنبیہ کی ہے۔ کہ باری تعالیٰ اس سے اپنا فیضان اور توفیق احسان روک لیتا ہے[۲]۔

(ب غ ل)

اَلْبَغْلُ (خچر) وہ جانور جو گدھے اور گھوڑی کے باہم ملاپ سے پیدا ہوتا ہے (والجمع بغالۃ)
قرآن میں ہے:۔
وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ (۱۶-۸) اور اسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے۔
تَبَغَّلَ الْبَعِیْرُ اونٹ کا خچر کی طرح تیز چلنا۔ کبھی خچر کی شرارت اور خباثت کے پیش نظر کمینے شخص کو بھی بَغْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

(ب غ ی)

اَلْبَغْیُ کے معنی کسی چیز کی طلب میں درمیانہ روی کی حد سے تجاوز کی خواہش کرنا کے ہیں۔ خواہ تجاوز کر سکے یا نہ۔ اور بَغْیٌ کا استعمال کمیت اور کیفیت یعنی قدر و وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
بَغَیْتُ الشَّیْئَ وَابْتَغَیْتُہٗ کسی چیز کے حاصل کرنے میں جائز حد سے تجاوز کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَۃَ مِنْ قَبْلُ (۹-۴۸) یہ پہلے بھی طالب فساد رہے ہیں۔
یَبْغُوْنَکُمُ الْفِتْنَۃَ (۹-۴۷) تم میں فساد ڈلوانے کی غرض سے۔
بَغْیٌ دو قسم پر ہے۔ محمود[۱] یعنی حد عدل و انصاف سے تجاوز کر کے مرتبہ احسان حاصل کرنا اور فرض سے تجاوز کر کے تطوع بجا لانا۔
[۲] مذموم۔ یعنی حق سے تجاوز کر کے باطل یا شبہات میں واقع ہونا جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا[۳] (۳۸) اَلْحَقُّ بَیِّنٌ وَالْبَاطِلُ بَیِّنٌ وَبَیْنَ ذٰلِکَ اُمُوْرٌ مُشْتَبِھَاتٌ وَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمٰی اَوْشَکَ اَنْ یَقَعَ فِیْہِ حق بھی واضح ہے اور باطل بھی واضح ہے لیکن اِن دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں اور جو جانور چراگاہ کے ارد گرد کھائیگا کچھ بعید نہیں کہ چراگاہ میں چرنے لگے اور چونکہ بغی محمود بھی ہوتی ہے اور مذموم بھی اس لئے آیت کریمہ:۔
اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۴۲-۴۲)

---

[۱] الحدیث فی (حم عن الساعۃ) بدون الواو وفی روایۃ لایحب (حل عن جابر و عن عائشۃ) وفی (مسلم عن عائشۃ) لایحب الفحش والتفحش وفی (حم عن اسامۃ ایضًا) کل فاحش متفحش (ای بدون اللام والواو) والاحادیث فی ذم الفحش کثیرۃ راجع الکنز للمتقی (۳ر۹۳۲۹-۳۲۰)، [۲] سقط لفظ المتع من المطبوع [۳] والمعروف فی الروایۃ الحلال بین والحرام بین راجع (ق ۴ طس بن عمر ت ہ ک عن سلمان) الفتح الکبیر ۲ر (۸۲-۸۳)

الزام توان لوگوں پر ہے۔ جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ یہاں عقوبۃ کو بغی بغیر الحق کے ساتھ مقید کیا ہے۔

اَبْغَيْتُكَ کسی شے کی طلب میں مدد کرنا۔ بَغَى الْجُرْحُ زخم کا بہت زیادہ بگڑ جانا۔ بَغَتِ الْمَرْاَةُ عورت نے زنا کا ارتکاب کیا۔ زنا کو بَغْیٌ اسلئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی حدود عفت سے تجاوز کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (۲۴-۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو...... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔

بَغَتِ السَّمَاۗءُ بادل کا ضرورت سے زیادہ برسنا اور بَغْیٌ کے معنی تکبر کرنا بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اپنی حد سے تجاوز کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور یہ ہر امر کے متعلق استعمال ہوتا ہے گو لغت میں بَغْیٌ کا لفظ محمود اور مذموم دونوں قسم کے تجاوز پر بولا جاتا ہے مگر قرآن میں اکثر جگہ معنی مذموم کے لئے استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا:۔

يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۱۰-۲۳) تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔

اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ (۱۰-۲۳) تمہاری شرارت کا وبال تمہاری ہی جانوں پر ہوگا۔

ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ (۲۲-۶۰) پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے تو خدا اسکی مدد کریگا۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰي فَبَغٰى عَلَيْهِمْ (۲۸-۷۶) قارون موسٰی کی قوم میں سے تھا اور ان پر تعدی کرتا تھا۔

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَي الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ (۴۹-۹) اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔

اور آیت کریمہ:۔ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (۲-۱۷۳) (بشرطیکہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا ہی لے جتنی اسے ضرورت ہے اور حد متعین سے آگے نہ بڑھے۔ امام حسن[1] رض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ نہ تو محض لذت کے لئے کھائے۔ اور نہ ہی سد رمق (یعنی ضرورت سے) تجاوز کرے۔

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے[2] کہ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کے یہ معنی ہیں بشرطیکہ وہ نہ تو امام وقت سے باغی ہو اور نہ ہی معصیت کا ارتکاب کرکے راہ حق سے تجاوز کرنے والا ہو۔

اَلْاِبْتِغَاءُ یہ خاص کر کوشش کے ساتھ کسی چیز کو طلب کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اگر اچھی چیز کی طلب ہو تو یہ کوشش بھی محمود ہوگی (ورنہ مذموم) چنانچہ فرمایا:۔

اِبْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ (۱۷-۲۸) اپنے

---

[1] راجع لقول الحسن (الطبری ۲: ۸۳) والحسن بن یسار البصری ابوسعید التابعی احد العلماء الفقہاء فی البصرۃ وعلیہ کتاب لاحسان عباس (الحسن البصری) ولقاء ونعی والیاسہ اخرقتہ غیر محقق (کمرۃ الشاہ ولی اللہ) الامیر القنوجی وانیتہ صاحب "فخر الحسن" وفی الجمان الیاس الخرقۃ بدعۃ حققتہا فی حواشی مآثر الکرام (فارسی بلجرامی) راجعہ (راجع التراجم الحسن تہذیب ومیزان الاعتدال ۱/۴ ۲۵ وامالی المرتضی ۱/۱۰۶

[2] وقول مجاہد ذکرہ الشوکانی فی الفتح ۱/۱۷۰ وفی اکل المضطر المیتۃ ومال الغیر اختلاف بین الفقہاء ولم ینصف من انکر اکل مال الغیر مطلقاً راجع القرطبی وایضاً ابن کثیر وامامجاہد فہو ابن جبر المکی (۲۱-۱۰۴) تلمیذ ابن عباس فی التفسیر قال الذہبی شیخ القراء والمفسرین وہو وان کان من الثقات لکن لا یعتمد علی تفسیرہ لانہ ینقل عن اہل الکتاب (راجع طبقات الفقہاء ۵ والارشاد ۶: ۲۴۲ ومیزان الاعتدال ۳/۹ والجمع بین رجال الصحیحین ۵۱۰ راجع الاعلام لزرکلی

پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں۔ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی (۹۲-۲۰) بلکہ اپنے خداوندِ اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنیکے لئے دیتا ہے۔

اور ینبغی (انفعال) بغی کا مطاوع آتا ہے اور یَنْبَغِیْ اَنْ یَّکُوْنَ کَذَا کا محاورہ دو طرح استعمال ہوتا ہے (۱) اس شے کے متعلق جو کسی فعل کے لئے مسخر ہو جیسے اَلنَّارُ یَنْبَغِیْ اَنْ تُحْرِقَ الثَّوْبَ یعنی کپڑے کو جلا ڈالنا آگ کا خاصہ ہے (۲) یہ کہ وہ اس کا اہل ہے یعنی اس کے لئے ایسا کرنا مناسب اور زیبا ہے جیسے۔ فُلَانٌ یَنْبَغِیْ اَنْ یُّعْطِیَ لِکَرَمِهٖ کہ فلاں کے لئے اپنے کرم کی وجہ سے بخشش کرنا زیبا ہے اور آیت کریمہ:۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ (۳۶-۶۹) اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھلائی اور نہ وہ ان کو شایاں ہے۔

پہلے معنی پر محمول ہے۔ یعنی نہ تو آنحضرت فطرتاً شاعر ہیں۔ اور نہ ہی سہولت کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں اور یہ معلوم کہ آپ کی زبان پر شعر جاری نہ ہوتا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔ وَهَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ (۳۸-۳۵) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔ دوسرے معنی پر محمول ہے۔ یعنی میرے بعد وہ سلطنت کسی کو میسر نہ ہو)

(ب ق ر)

اَلْبَقَرُ۔ (اسم جنس) کے معنی (بیل یا) گائے کے ہیں اس کا واحد بَقَرَةٌ ہے۔ قرآن میں ہے۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا (۲-۷۰) کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ (۲-۶۸) کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔ بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا (۲-۶۹) کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہے۔ بَقَرَةٌ کی جمع بَاقِرٌ وبَقِیْرٌ (بروزن حکیم) آتی ہے جیسے حَامِلٌ وَحَمِیْلٌ اور بعض کے نزدیک اس کی جمع بَیْقُوْرٌ بھی آتی ہے اور بیل کو ثَوْرٌ کہا جاتا ہے جیسے:۔ نَاقَةٌ وَجَمَلٌ وَرَجُلٌ وَامْرَءَةٌ اور بیل چونکہ کھیتی باڑی کے کام آتا ہے اس لئے زمین کو پھاڑنے اور جوتنے کے لئے بَقَرَ الْاَرْضَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور بیل چونکہ وسیع طور پر زمین کو پھاڑتا ہے اس لئے ہر وسیع شگاف کے متعلق یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔ بَقَرْتُ بَطْنَهٗ میں نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باقر کا لقب دیا گیا ہے[1] کیونکہ ان کو دقائق و رموز علیہ کے متعلق گہری تحقیق حاصل تھی بَیْقَرَ الرَّجُلُ فِی الْمَالِ وَفِیْ غَیْرِهٖ کسی کا بہت زیادہ مال دار ہونا بَیْقَرَ فِیْ سَفَرِهٖ ملک در ملک پھرنا۔ شاعر نے کہا ہے[2] ع (طویل)

(۶۱) الا هل اتاها والحوادث جمّة

بان امرئ القيس يهلك بيقرا

کیا اسے یہ خبر ملی ہے کہ زمانہ کی بوقلمونیوں کی وجہ

---

[1] محمد بن علی زین العابدین الحسین ابوجعفر الباقر (۵۷ھ م ۱۱۴) خامس الائمۃ الاثنی عشر عند الامامیۃ ولہ فی العلم وتفسیر القرآن آراء راجع کتاب اخبار ابی جعفر الباقر للجلودی (۳۳۲ھ) وتذکرۃ الحفاظ ۱/ ۱۱۷ الذریعۃ ۱: ۳۱۵ ونزھۃ الجلیس ۲: ۲۳ ومنہاج السنۃ ۲/ ۱۱۴و۱۲۳ والیعقوبی ۳: ۶۰۔ [2] قالہ امرء القیس راجع الطبری ۱/ ۳۹ و معانی القرآن للفراء والسنتہ ۱۳۰ و دیوانہ ۴۶ م ضعۃ سندوبی والسمط ۶۴ والاقتضاب ۷۷م وتہذیب الالفاظ ۸۷م والبحر ۳: ۳۵۷ والبلدان (اسم ومقر) و شرح السبع لابن الانباری ۵۹م واللسان (بقر) والاغانی ۸: ۶۱) والمعانی ۸۷۵ و فی بعض الروایات بن نملک بدل یہلک وہی بنت عمرو بن زبید ام امرئی القیس۔

سے امرؤ القیس بن تملک دربدر دھکے کھا رہا ہے۔
بَقَرَ الصِّبْيَانُ بچوں کا بُقَيْرى کھیل کھیلنا یہ بچوں کے ایک کھیل کا نام ہے جس میں ریت کا ڈھیر لگا کر اس کے آس پاس گڑھے کھود دیتے ہیں (فارسی میں اسے کولہ موئی کہا جاتا ہے)
اَلْبَيْقَرَانِ ایک قسم کے گھاس کا نام ہے کیونکہ وہ جب اگتا ہے تو زمین میں شگاف ڈال دیتا ہے اور اس کی جڑیں زمین میں دور تک چلی جاتی ہیں۔

(ب ق ل)

قرآن میں ہے:۔
مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا (۲-۶۱) ترکاری اور ککڑی
بَقْلٌ :۔ ان سبزیوں کو کہتے ہیں جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں۔
اس سے فعل مشتق کرکے بَقَلَ بمعنی نَبَتَ استعمال ہوتا ہے اور تشبیہ کے طور پر بَقَلَ وَجْهُ الصَّبِیّ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں لڑکے کے چہرہ پر سبزہ نمودار ہونے لگا۔ ابن السکیت[1] کے نزدیک بَقَلَ نَابُ الْبَعِيْرِ کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کیلے نکل آئے
اَبْقَلَ الْمَكَانُ فَهُوَ مُبْقِلٌ جگہ کا سرسبز ہونا
بَقَلْتُ الْبَقْلَ میں نے سبزی کاٹی اَلْمَبْقَلَةُ (ظرف) سبزیوں کی جگہ۔

(ب ق ی)

اَلْبَقَاءُ کے معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں یہ فناء کی ضد ہے۔ یہ باب بَقِيَ (س) يَبْقٰى بَقَاءً ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کا باب بَقٰى (ض) بَقْيًا بھی آتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے[2] (۳۹)
بَقَيْنَا رَسُوْلَ اللهِ۔ یعنی ہم آنحضرت کے منتظر رہے اور کافی عرصہ تک آپ کی نگہبانی میں بیٹھے رہے۔
اَلْبَاقِیْ (صفت) دو قسم پر ہے ایک الباقی بنفسہٖ جو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہے اور اس پر کبھی فنا طاری نہ ہو اس معنی میں یہ حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ دوم الباقی بغیرہٖ اس میں سب ماسوی اللہ داخل ہیں کہ ان پر فناء اور تغیر کا طاری ہونا صحیح ہے۔
اَلْبَاقِیْ بِاللهِ بھی دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو بذاتہٖ جب تک اللہ کی مشیت ہو باقی رہے جیسے اجرام سماویہ۔ دوم وہ جس کے افراد و اجزاء تو تغیر پذیر ہوں مگر اس کی نوع یا جنس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہو۔ جیسے انسان و حیوان۔ اسی طرح آخرت میں بھی بعض اشیاء بِشَخْصِہٖ باقی رہیں گی جیسے اہل جنت کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہیں گے۔ جیسے فرمایا:۔
خَالِدِيْنَ (۲-۱۶۲) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔
اور بعض چیزیں صرف جنس و نوع کے اعتبار سے باقی رہیں گی۔ جیسا کہ آنحضرت سے مروی ہے[3] (۴۰)
ان ثمار اهل الجنة يقطفها اهلها و يأكلونها ثم تخلف مكانها مثلها: کہ ثمار جنت کو اہل جنت چن کر کھاتے رہیں گے اور ان کی جگہ

---

[1] ہو ابو یوسف یعقوب بن اسحاق بن السکیت تادب علی الکسائی والفراء واخذ عن الاصمعی وابی عبیدة البصری واشتہر بمصنفاته وکان مؤدبا لابی المعتز توفی فی رجب سنة ۲۴۴ھ صنف کتاب اصلاح المنطق والالفاظ وکتاب المقصور والممدود والقلب والابدال والاضداد وقد انتشرت راجع لترجمته معجم الادباء ۲۰/۵۲ والبغیہ ۴۱۸-۴۱۹ وشذرات ۲/۱۰۶ وابن خلکان ۷۹۸ والارشاد ۷/۳۰۰-۳۰۱ والیافعی ۲/۱۴۷-۱۴۹، [2] و تمامه: ذات ليلة في صلاة العشاء والحديث في الكشاف ۲/۳۸ والفائق ۱/۵۷ وابی داؤد من حديث معاذ بن جبل (تخريج الكشاف ۸۸ رقم ۱۹۵) [3] فی الطبرانی والبزار بمعناه عن ثوبان راجع مجمع الزوائد (۱۰/۴۱۴)

نئے پھل پیدا ہوتے رہیں گے چونکہ آخرت کی تمام اشیاء دائمی ہیں اس لئے فرمایا:۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّأَبْقَىٰ (۲۸-۶۰) اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ (۱۸-۴۶) میں وہ تمام اذکار و اعمال صالحہ داخل ہیں جن کا ثواب انسان کے لئے باقی رہے گا۔ بعض نے ان سے پانچ نمازیں مراد لی ہیں۔ اور بعض نے اس سے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی تسبیح و تحمید مراد لی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ان میں ہر وہ عبادت داخل ہے جس سے رضائے الٰہی مقصود ہو یہی معنی آیت کریمہ:۔ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ (۱۱-۸۶) میں بَقِيَّتُ اللّٰهِ کے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

فَهَلْ تَرَىٰ لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ (۶۹-۸) بھلا تو ان میں سے کسی کو بھی باقی دیکھتا ہے۔ میں بَاقِيَةٌ کا موصوف جماعۃ یا فِعْلَةٌ محذوف ہے یعنی باقی رہنے والی جماعت یا ان کا کوئی فعل جو باقی رہا ہو اور بعض کے نزدیک بَاقِيَةٌ بمعنی بَقِيَّةٌ ہے ان کا قول ہے کہ بعض مصادر فاعل کے وزن پر آتے ہیں اور بعض مفعول کے وزن پر لیکن پہلا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔[1]

(ب ك ك)

بَكَّةُ۔ مجاہد نے منقول ہے کہ یہ اصل میں مَكَّةُ ہے اور اس میں باء میم سے مبدل ہے جیسا کہ: سَبَدَ رَأْسَهُ وَسَمَدَهَا وَضَرْبَةُ لَازِبٍ وَلَازِمٍ میں ہے۔[2] قرآن میں ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا (۳-۹۶) پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکے میں ہے با برکت۔

بعض کا قول ہے کہ بکہ سے اندرون مکہ مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مسجد کا نام ہے۔ اور بعض نے بیت اللہ کے اسماء سے شمار کیا ہے اور بعض نے مطاف (طواف گاہ) سے تفسیر کی ہے۔ اور یا تو تَبَاكٌّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ازدحام کے ہیں اور وہاں چونکہ طواف کے لئے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لئے اس کو بکہ کہا گیا ہے۔[3] بعض کہتے ہیں کہ بَكَّةُ بَكٌّ (ن) سے مشتق ہے جس کے معنی مزاحمت کرنے اور پھاڑ ڈالنے کے ہیں چونکہ سنت الٰہی جاری ہے کہ جو ظالم وہاں الحاد و ظلم پھیلانا چاہتا ہے۔ اس کی گردن توڑ دی جاتی ہے اسلئے اسے اس نام سے پکارا گیا ہے۔[4]

(ب ك م)

اس باب میں اصل کلمہ بُكْرَةٌ ہے جس کے

---

[1] راجع لاقوالہم ابن کثیر ۳ ر ۸۵ وانظر العموم ابن جریر الطبری والیضا الکشاف ۲ ر ۵۰۲ واختلف ایضا فی الآیۃ (۲-۲۴۸) راجع البغوی ۱ ر ۲۱۶ وفی آیۃ اولو بقیۃ (۱۱-۱۱۶) المراد بہا اہل الفضل والعقل دبیضاوی (۱ ر ۴۲۸)
[2] اولہ ابو عبیدۃ بالمصدر فرد علیہ المؤلف واکثر مایرد علیہ [3] لان ابدال المیم من حرف ال بدال راجع ابدال ابی الطیب [4] تاذن مجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱ : ۷۵) وغریب القرآن للسجستانی ۲۵ واللسان (بکر) وتالول الادلۃ والاشتقاق فی الفتح للشوکانی ۱ ر ۳۶۲

معنی دن کے ابتدائی حصہ کے ہیں پھر اس سے صیغہ فعل مشتق کر کے کہا جاتا ہے۔ بَکَرَ دن، فُلَانٌ بُکُوْرًا کسی کام کو صبح سویرے نکلنا۔ اَلْبَکُوْرُ (صیغہ مبالغہ) بہت سویرے جانے والا۔

بَکَّرَ۔ فِیْ حَاجَتِہٖ وَابْتَکَرَ وَبَاکَرَ مُبَاکَرَۃً۔ صبح سویرے کسی کام کے لئے جانا اور بُکْرَۃٌ (دن کا پہلا حصہ) چونکہ دن کے باقی حصہ پر متقدم ہوتا ہے اس لئے اس سے شتابی کے معنی لے کر ہر اس شخص کے متعلق بَکِرَ (س) فعل استعمال ہوتا ہے جو کسی معاملہ میں جلد بازی سے کام لے شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۶۲) بَکَرَتْ تَلُوْمُكَ بَعْدَ وَھْنٍ فِی النَّدٰی
بُسْلٌ عَلَیْكَ مَلَامَتِیْ وَعِتَابِیْ

وہ کچھ عرصہ کے بعد جلدی سے سخاوت پر ملامت کرنے لگی میں نے کہا کہ تم پر مجھے ملامت اور عتاب کرنا حرام ہے۔

بِکْرٌ پہلا بچہ اور جب ماں باپ کے پہلا بچہ پیدا ہو تو احتراماً انہیں بِکْرَان کہا جاتا ہے جیسا کہ بیت اللہ بولا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ثواب الٰہی اور ان غیر فانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے تیار کی ہیں۔[2] جس کی طرف آیت کریمہ:۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ (۲۹-۶۴) اور ہمیشہ کی زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے میں اشارہ فرمایا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (رجز)

(۶۳) یَا بِکْرَ بِکْرَیْنِ وَیَا خِلْبَ الْکَبِدِ
اے والدین کے اکلوتے بیٹے اور جگر گوشے۔

پس آیت کریمہ:۔

لَا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ۔ (۲-۶۸) نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔ میں بِکْرٌ سے نوجوان گائے مراد ہے جس نے ابھی تک کوئی بچہ نہ دیا ہو۔ اور ترتیب کے اعتبار سے دوشیزہ کو بھی بِکْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اسے مجامعت کے لئے ترتیب پر ترجیح دی جاتی ہے بِکْرٌ کی جمع اَبْکَارٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّا اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا۔ (۵۶-۳۵-۳۶) ہم نے ان (حوروں) کو پیدا کیا تو ان کو کنواریاں بنایا۔

اَلْبَکَرَۃُ چھوٹی سی چرخی۔ کیونکہ وہ تیزی کے ساتھ گھومتی ہے۔

(ب ك م)

اَلْاَبْکَمُ۔ پیدائشی گونگا اور اخرس عام گونگے کو کہتے ہیں لہذا اَبْکَمُ عام اور اخرس خاص ہے قرآن میں ہے۔

---

[1] البیت لضمرۃ بن ضمرۃ النھشلی انشدہ ابوزید النوزی وابوحاتم فی ان البسل من الاضداد والبیت فی النوادر لابی زید ۲ والسمط ۹۲۲ والامالی (۲: ۲۷۹) والدرۃ مع شرح الخفاجی ۹۳ اوالاقتضاب ۸ ۲۴ وفیہ ان لفظۃ بکرت دیأتی مثلا للتعجیل کما فی ہذا البیت وفی روایۃ الکامل ۸۴۸ ہبت بدل بکرت والبیت فی الفاضل ۹۱ ۷ والاضداد لابی حاتم رقم ۳۴۱ ص ۱۰۳ ولباب الآداب وطبقات السیرافی ۵۷ والوحشیات رقم ۴۲ فی خمسۃ ابیات والبیت اولہا والمجالس ۸ ۴۴ وابدال ابی الطیب (۲: ۲۳ ۵) وفی روایۃ ام عمرو بدل لبعد من ولعدہ: ااصرّ دیتی عمرو ساغبنکفاک من ابۃ علی وعاب۔ راجع اضداد للجستانی وابن الانباری ۲ ۴ واضداد ابی الطیب ۲ ۳ ۳ واعراب ثلاثین لابن خالویہ واللسان (بسل) والطبری [2] ولعلہ اشارۃ الی تفسیر الآیۃ ولھم رزقھم فیھا بکرۃ وعشیا (۱۹-۱۱) وہہنا سقط والد اعلم

[3] قال الراجز ولعدہ: اصبحت منی کذراع من عضدٖ۔ والشطر فی اللسان (بکر) وفی الصحاح بغیر عزو (بکر) والبحر (۱: ۲۴۸) واضداد لابن الانباری ۴۲ واضداد ابی الطیب ۹۱ وامالی القالی (۱: ۲۴) ۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (۱۶-۷۶) اور خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں ایک ان میں گونگا اور دوسرے کی ملک) ہے (بے اختیار و ناتوان) کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

اور اَبْکَم کی جمع بُکْمٌ آتی ہے چنانچہ فرمایا:۔

صُمٌّ بُكْمٌ (۲-۱۸) یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اور جو شخص ضعف عقل کے سبب گفتگو نہ کر سکے اور گونگے کی طرح چپ رہے تو اس کے متعلق بَکِمَ عن الکلام کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ کلام سے عاجز ہو گیا۔

(ب ک ی)

بَکٰی یَبْکِی کا مصدر بُکًی وبُکَاءٌ یعنی ممدود اور مقصور دونوں طرح آتا ہے اور اس کے معنی غم کے ساتھ آنسو بہانے اور رونے کے ہیں اگر آواز غالب ہو تو اسے بُکَاءٌ (ممدود) کہا جاتا ہے جیسے رُغَاءٌ وثُغَاءٌ اور اس نوع کے دیگر اوزان جو صوت کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور اگر غم غالب ہو تو اُسے بُکًی (بالقصر) کہا جاتا ہے۔

اَلْبَاکِی رونے والا غم اور اندوہ سے آنسو بہانے والا اس کی جمع بَاکُوْنَ وَبُکِیٌّ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا (۱۹-۵۸) تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے رہتے تھے۔

اصل میں بُکِیٌّ (بُکُوْیٌ) بروزن فُعُوْلٌ ہے جیسے سَاجِدٌ وَسُجُوْدٌ وَرَاکِعٌ وَرُکُوْعٌ وَقَاعِدٌ وَقُعُوْدٌ واؤ کو یاء سے تبدیل کر کے یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے جیسے جَاثٍ وَجُثِیٌّ وَعَاتٍ وَعُتِیٌّ نیز:

بُکًی کے اصل معنی تو غم کے ساتھ آنسو بہانے کے ہوتے ہیں۔ مگر کبھی صرف آنسو بہانے اور کبھی صرف غم کھانے کے لئے بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (۹-۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں)..... بہت سا رونا ہوگا۔

میں مطلق خوشی اور غم کے معنی مراد ہیں اور ضحک کے ساتھ قہقہہ اور بکاء کے ساتھ آنسو بہانا ضروری نہیں ہے۔ یہی معنی آیت کریمہ:۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (۴۴-۲۹) پھر ان پر نہ تو آسمان اور زمین کو رونا آیا۔

میں مراد ہیں ہاں جو لوگ آسمان اور زمین کے لئے زندگی اور علم ثابت کرتے ہیں وہ اسے حقیقی معنی پر حمل کرتے ہیں اور جو زندگی کے قائل نہیں ہیں وہ نسبت مجازی قرار دیتے ہیں یعنی ان سے آسمان اور زمین کے باشندے مراد ہیں[1]۔

بَلْ (حرف)

بَلْ حرف استدراک ہے اور تدارک کی دو صورتیں ہیں (۱) جبکہ بل کا مابعد اس کے ماقبل کی نقیض ہو تو اس صورت میں کبھی تو اس کے مابعد حکم کی تصحیح سے ماقبل کی تردید مقصود ہوتی ہے۔ اور کبھی اس کے برعکس ماقبل کی تصحیح اور مابعد کے ابطال کی غرض سے بل کو لایا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی صورت کے متعلق فرمایا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔

---

[1] قال الحسن ای اہل السماء والارض کما فی قولہ تعالیٰ حتی تضع الحرب اوزارہا) ویمکن ان یکون المراد المبالغۃ فی وصف القوم بالصغر فی القدر او کنایۃ عن عدم عملہم الصالح فی الارض یرفع الی السماء کما روی عن ابن عباس و قال السدی لما قتل الحسین بن علی بکت السماء علیہ وبکاؤہا حمرۃ اطرافہا فکلن الروایۃ غیر ثابت واللہ اعلم۔

(۸۳-۱۴) جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں دیکھو یہ جو اعمال بد کر رہے ہیں ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

تو بَلْ کا معنی یہ نہیں کہ آیات الٰہی کو اَسَاطِیر کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ان کی جہالت سے پھر رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کہہ کر ان کی جہالت پر تنبیہ کی ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا:۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ ھٰذَا بِاٰلِھَتِنَا یٰٓاِبْرٰھِیْمُ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْــَٔـلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (۲۱: ۶۱-۶۲) (جب ابراہیم آئے تو بت پرستوں نے کہا کہ ابراہیم بھلا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کیا ہے (ابراہیم نے) کہا (نہیں) بلکہ یہ ان کے اس بڑے بت نے کیا (ہوگا)، اگر یہ بولتے ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔

اور دوسری صورت میں ماقبل کی تصحیح اور مابعد کے الطال کے متعلق فرمایا:۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹: ۱۵-۱۷) مگر انسان (عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ (آہا) میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ (ہائے) میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا نہیں بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے۔

یعنی رزق کی فراخی یا تنگی اکرام یا اہانت کی دلیل نہیں ہے (بلکہ یہ پروردگار کی طرف سے آزمائش ہے، مگر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ یہ مال کو بیجا صرف کر رہے ہیں اور اسی طرح آیت:۔

صٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ (۳۸: ۱-۲) قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے (کہ تم حق پر ہو) مگر جو لوگ کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ کہہ کر یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن تذکر یعنی نصیحت حاصل کرنے کی کتاب ہے اور کفار کا اس کی طرف متوجہ نہ ہونا اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کا اعراض محض غرور اور مخالفت کی وجہ سے ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا (۵۰: ۱-۲) قرآن مجید کی قسم (کہ محمد پیغمبر ہیں) لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے یعنی ان کا قرآن پر ایمان نہ لانا قرآن کے بزرگ ہونے کے منافی نہیں ہے بلکہ محض ان کی جہالت سے بَلْ عَجِبُوْٓا کہہ کر ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہے کیونکہ کسی چیز پر اسی وقت تعجب ہوتا ہے جب اس کا سبب معلوم نہ ہو۔ نیز فرمایا:۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ ۭ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (۸۲: ۶-۹) تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکہ دیا (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا۔ اور (تیرے قامت کو) معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا جوڑ دیا۔ مگر ہیہات تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو۔

یعنی رب کریم کے بارے میں کوئی چیز سوائے اس کے دھوکے میں ڈالنے والی نہیں ہے کہ وہ دین کو جھٹلا رہے ہیں۔

(۲) تدارک کی دوسری صورت یہ ہے کہ دوسری کلام کے ذریعہ پہلی کلام کی وضاحت اور اس پر اضافہ مقصود ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ (۲۱-۵) بلکہ ظالم کہنے لگے کہ (یہ قرآن) پریشان (باتیں ہیں جو) خواب (میں دیکھ لی) ہیں (نہیں) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے (نہیں) بلکہ یہ (شعر ہے)، جو اس (شاعر) کا نتیجہ طبع ہے۔

یہاں متنبہ کیا ہے کہ اولاً انہوں نے قرآن کو خیالات پریشان کہا پھر اس پر اضافہ کرکے اسے افترا بتلانے لگے پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ کے متعلق (نعوذ باللہ) کذاب ہونے کا ادعا کرنے لگے کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں شاعر فطرۃً کاذب کو کہا جاتا ہے اور آیت :۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ (۲۱-۳۹-۴۰) اے کاش کافر اس وقت کو جانیں جب وہ اپنے مونہوں پر سے (دوزخ کی) آگ کو روک نہ سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں پر سے اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا بلکہ قیامت ان پر ناگہاں آواقع ہوگی اور ان کے ہوش کھو دے گی۔

بھی اس معنی پر محمول ہے کہ کاش وہ اس کے علاوہ دوسری بات کو جانتے ہوتے جو پہلی بات سے زیادہ اہم ہے یعنی یہ کہ قیامت ان پر ناگہاں آواقع ہوگی۔ قرآن میں جتنی جگہ بھی بَلْ آیا ہے ان دونوں معنی میں سے کسی ایک پر دلالت کرتا ہے اگرچہ بعض مقامات ذرا وضاحت طلب ہیں[1] اور ان کے پیچیدہ ہونے کی بنا پر بعض علمائے نحو نے غلطی سے کہدیا ہے کہ قرآن میں بل صرف معنی ثانی کیلئے استعمال ہوا ہے[2]

(ب ل د)

اَلْبَلَدُ (شہر) وہ مقام جس کی حدبندی کی گئی ہو اور وہاں لوگ آباد ہوں۔ اس کی جمع بِلَادٌ اور بُلْدَانٌ آتی ہے اور آیت :۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۹۰-۲۱) میں هٰذَا الْبَلَدِ سے مکہ مکرمہ مراد ہے دوسری جگہ فرمایا رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا (۱۴-۳۵) کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لئے) امن کی جگہ بنا دے۔ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ (۳۴-۱۵) پاکیزہ شہر ہے۔

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (۴۳-۱۱) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کر دیا۔

فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ (۳۵-۹) پھر ہم ان کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ :۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (۲-۱۲۶) اے پروردگار اس جگہ کو امن کا شہر بنا۔

---

[1] قال فی المغنی: بل حرف اضراب فان تلاہا جملۃ کان معنی الاضراب اما الابطال ای الاول و اما الانتقال من غرض الی آخر و ہی فی ذالک کلمۃ حرف ابتداء لا عاطفۃ علی الصحیح وان تلاہا مفرد فہی عاطفۃ ثم ان تقدمہا امر او ایجاب فہی تجعل ماقبلہا کالمسکوت عنہ واثبات الحکم لما بعدہا وان تقدمہا نفی او نہی فہی لتقریر ماقبلہا علی حالتہ وجعل ضدہ لما بعد (راجع ۱: ۱۱۹-۱۲۰) [2] کما قال ابن مالک فی شرح الکافیہ (راجع ابن ہشام ۱: ۱۲۰)

میں بھی مکہ مکرمہ مراد ہے لیکن ایک مقام پر اسے معرفہ اور دوسرے مقام پر نکرہ لانے میں جو لطافت اور نکتہ ملحوظ ہے اسے ہم دوسری کتاب میں بیان کرینگے اور بَلَدٌ کے معنی بیابان اور قبرستان بھی آتے ہیں کیونکہ پہلا وحشی جانوروں دوسرا مردوں کا مسکن ہوتا ہے۔

اَلْبَلْدَۃُ منازل قمر سے ایک منزل کا نام ہے اور تشبیہ کے طور پر ابرو کے درمیان کی جگہ اور اونٹ کے سینہ کو بھی بَلْدَۃٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی شہر کی طرح محدود ہوتے ہیں اور بطور استعارہ انسان کے سینہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اثر یعنی نشان کے معنی کے اعتبار سے بِجِلْدِہٖ بَلَدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اس کی کھال پر نشان ہے اس کی جمع اَبْلَادٌ آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (ع البسیط)

(۶۴) وَفِی النُّحُوْرِ کُلُوْمٌ ذَاتُ اَبْلَادِ

اور ان کے سینوں پر زخموں کے نشانات ہیں۔

اَبْلَدَ الرَّجُلُ شہر میں چلا جانا جیسا کہ اَنْجَدَ وَ اَتْھَمَ کے معنی نجد اور تہامہ میں چلے جانے کے ہیں۔ بَلَدَ الرَّجُلُ کے معنی شہر میں مقیم ہونے کے ہیں اور کسی مقام پر ہمیشہ رہنے والا اکثر اوقات دوسری جگہ میں جا کر متحیر ہو جاتا ہے اس لئے متحیر آدمی کے متعلق بَلَدَ فِیْ اَمْرِہٖ وَ اَبْلَدَ وَ تَبَلَّدَ وغیرہا کے محاورات استعمال ہوتے ہیں شاعر نے کہا ہے (ع)

(۶۵) لَا بُدَّ لِلْمَحْزُوْنِ اَنْ یَّتَبَلَّدَا

(کہ اندوہ گیں لازما متحیر رہے گا)۔

اجڈ لوگ عام طور پر بلید یعنی کند ذہن ہوتے ہیں اس لئے ہر جسیم آدمی کو اَبْلَدُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا (۷-۵۸) (جو زمین پاکیزہ ہے، اس میں سے سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے (نفیس ہی) نکلتا ہے اور جو خراب ہے۔ اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے) میں بلد کے طیب اور خبیث ہونے سے کنایۃً نفوس کا طیب اور خبیث ہونا مراد ہے۔

(ب ل س)

اَلْاِبْلَاسُ (افعال) کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں۔ اَبْلَسَ وہ مایوس ہونے کی وجہ سے مغموم ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی سے اِبْلِیْسُ مشتق ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ (۳۰-۱۲) اور جس دن قیامت برپا ہوگی گنہگار مایوس مغموم ہو جائیں گے۔

اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۶-۴۴) تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔

وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْھِمْ مِّنْ قَبْلِہٖ لَمُبْلِسِیْنَ۔ (۳۰-۴۹) اور بیشتر تو وہ مینہ کے اترنے سے پہلے ناامید ہو رہے تھے۔

اور عام طور پر غم اور مایوسی کی وجہ سے انسان خاموش رہتا ہے اور اسے کچھ سوجھائی نہیں دیتا اس لئے اَبْلَسَ فُلَانٌ کے معنی خاموش اور دلیل سے عاجز ہونے کے ہیں۔

---

[1] قالہ القطامی وا ولہ: لیست تجرح فرارًا ظہورہم ـــ ۔ ۔ ۔ ۔ والبیت فی اللسان والتاج والصحاح (بلد) وتہذیب الالفاظ ۸۰۱ والاصلاح ۴۱ م وفی النسخ المطبوعۃ النجوم بدل النحور مصحف والتصویب من المراجع [2] وفی مصارع العشاق (د ۷-۷۶) مثلہ لحبابۃ مع تغییر قالتہ حین رثیتہ بہا ورأتہ متغیرًا وروایۃ البیت: الا انما الیوم ان یتبلدا۔ فقد منع المحزون ان یتجلدا۔ والبیت فی اللسان (بلد) فی ارلعۃ منسوبۃ الی الاحوص

بَلَسَتِ النَّاقَةُ نَهى مِبْلَاسٌ آواز نہ کرو ناقہ
از غایت خواہش کش اور بَلَاسٌ بمعنی ٹاٹ فارسی
و پلاس سے معرب ہے۔

(ب ل ع)

بَلَعْتُ (ف) الشَّیْءَ وَابْتَلَعْتُهُ کے معنی کسی چیز
کو نگل لینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
یٰاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ (۱۱-۴۴) کہ اے زمین اپنا
پانی نگل جا۔
اسی سے بَلُوْعَةٌ ہے جس کے معنی بدرو اور گندی
نالی یا چو بچہ کے ہیں۔ سَعْدُ بَلَعَ ایک ستارے کا نام
بَلَعَ الشَّیْبُ فِیْ رَاْسِهٖ سر میں بڑھاپے کے
آثار ظاہر ہونا۔

(ب ل غ)

اَلْبُلُوْغُ وَالْبَلَاغُ (ن) کے معنی مقصد اور
منتہی کے آخری حد تک پہنچنے کے ہیں۔ عام اس
سے کہ وہ مقصد کوئی مقام ہو یا زمانہ یا اندازہ کئے
ہوئے امور میں سے کوئی امر ہو۔ مگر کبھی محض قریب
تک پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے گو انتہا تک نہ
بھی پہنچا ہو۔ چنانچہ انتہا تک پہنچنے کے معنی میں فرمایا:۔
حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً (۴۶-۱۵)
یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوتا ہے اور چالیس
برس کو پہنچ جاتا ہے۔
فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (۲-۲۳۲)
اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو ان کو... مت روکو۔
وَمَا هُمْ بِبَالِغِیْهِ (۴۰-۵۶) اور وہ اس کو پہنچنے والے نہیں۔
فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ (۳۷-۱۰۲) جب وہ ان کے ساتھ
دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا۔

لَعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ (۴۰-۳۶) تاکہ میں (اس پر
چڑھ کر) رستوں پر پہنچ جاؤں۔ اور آیت کریمہ:۔
اَمْ لَكُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ (۶۸-۳۹) یا تم
نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو... چلی جائیں گی۔
یہاں بَالِغَةٌ سے انتہائی مؤکد قسمیں مراد ہیں۔
اَلْبَلَاغُ کے معنی تبلیغ یعنی پہنچا دینے کے ہیں۔
جیسے فرمایا: هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (۱۴-۵۲) یہ
(قرآن) لوگوں کے نام (خدا کا) پیغام ہے۔
بَلٰغٌ فَهَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ
(۴۶-۳۵) (یہ قرآن) پیغام ہے سو (اب) وہی ہلاک
ہوں گے جو نافرمان تھے۔
وَمَا عَلَیْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۳۶-۱۷) اور
ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔
فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ (۱۳-۴۰)
تمہارا کام (ہمارے احکام کا) پہنچا دینا ہے اور ہمارا
کام حساب لینا ہے۔
اور بَلَاغٌ کے معنی کافی ہونا بھی آتے ہیں جیسے:۔
اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ (۲۱-۱۰۶)
عبادت کرنے والے لوگوں کے لئے اس میں (خدا
کے حکموں کی) پوری پوری تبلیغ ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (۵-۶۷)
اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں
قاصر رہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم نے یہ یا کوئی
دوسرا حکم جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے نہ پہنچایا تو گویا
تم نے وحی الٰہی سے ایک حکم کی بھی تبلیغ نہیں کی
یہ اس لئے کہ جس طرح انبیاء کرام کے درجے بلند
ہوتے ہیں اسی طرح ان پر احکام کی بھی سختیاں ہوتی
ہیں اور وہ عام مومنوں کی طرح نہیں ہوتے جو اچھے

اور برے بلے جلے عمل کرتے ہیں اور انہیں معاف کردیا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ (۲-۶۵)

پھر جب وہ اپنی میعاد (یعنی انقضائے عدت) کو پہنچ جائیں تو یا تو ان کو زوجیت میں رہنے دو۔

میں بلوغ اجل سے عدت طلاق کا ختم ہونے کے قریب پہنچ جانا مراد ہے۔ کیونکہ عدت ختم ہونے کے بعد تو خاوند کے لئے مراجعت اور روکنا جائز ہی نہیں ہے۔

بَلَّغْتُهُ الْخَبَرَ وَاَبْلَغْتُهُ کے ایک ہی معنی ہیں مگر بَلَّغْتُ (تفعیل) زیادہ استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسَالٰتِ رَبِّيْ (۷-۶۲) تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵-۶۷) اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ (۱۱-۵۷) اگر تم روگردانی کروگے تو جو پیغام میرے ہاتھ تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ میں نے تمہیں پہنچا دیا ہے۔

اور قرآن پاک میں ایک مقام پر:۔

بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ (۳-۴۰) کہ میں تو بوڑھا ہوگیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

آیا ہے یعنی بلوغ کی نسبت کِبَرٌ کی طرف کی گئی ہے۔

اور دوسرے مقام پر:۔

وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (۱۹-۸) اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں۔

ہے یعنی بلوغ کی نسبت متکلم کی طرف ہے اور یہ اَدْرَكَنِيَ الْجَهْدُ وَاَدْرَكْتُ الْجَهْدَ کے مثل دونوں طرح جائز ہے مگر بَلَغَنِيَ الْمَكَانُ یا اَدْرَكَنِيْ کہنا غلط ہے۔

اَلْبَلَاغَةُ کا لفظ دو طرح بولا جاتا ہے ایک یہ کہ وہ کلام بذاتہ بلیغ ہو اور اس کے لئے اوصاف ثلاثہ کا جامع ہونا شرط ہے یعنی وضع لغت کے اعتبار سے درست ہو، معنی مقصود کے مطابق ہو اور فی الواقع سچی بھی ہو اگر ان اوصاف میں کسی ایک وصف میں بھی کمی ہو تو بلاغت میں نقص رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہ (یعنی متکلم اور مخاطب) کے اعتبار سے بلیغ ہو یعنی کہنے والا اپنے مافی الضمیر کو خوبی سے ادا کرے کہ مخاطب کو اس کا قائل ہونا پڑے اور آیت کریمہ:۔ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (۴-۶۳) اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں پر اثر کر جائیں۔

میں "قول بلیغ" ان ہر دو معنی پر محمول ہوسکتا ہے اور بعض نے اس کے جو یہ معنی کئے ہیں کہ "ان سے کہہ دو کہ اگر تم نے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کیا تو قتل کردیے جاؤگے یا یہ کہ انہیں ان پر نازل ہونے والے مصائب سے ڈراؤ" تو یہ اس کے عام مفہوم میں سے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔

اَلْبُلْغَةُ اتنی مقدار جس سے گذر اوقات ہوسکے۔

(ب ل و ی)

بَلِيَ الثَّوْبُ۔ بِلًى وَبَلَاءً کے معنی کپڑے کا بوسیدہ اور پرانا ہونے کے ہیں اسی سے بَلَاهُ السَّفَرُ ای اَبْلَاهُ۔ کا محاورہ ہے۔ یعنی سفر نے اسے لاغر کردیا ہے اور بَلَوْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اسے آزمایا۔ گویا کثرت آزمائش سے میں نے اسے کہنہ کردیا اور آیت کریمہ:۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ (۱۰-۳۰)

وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کر لے گا۔

یہاں ایک قرأت نَبْلُوْا (بصیغہ جمع متکلم) بھی ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہاں ہم ہر نفس کے اعمال کی حقیقت کو پہچان لیں گے اور اسی سے اَبْلَیْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کا امتحان کرنا بھی آتے ہیں۔ اور غم کو بَلَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جسم کو گھلا کر لاغر کر دیتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَفِیْ ذَالِکُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (۲-۴۹)

اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ (۲-۱۵۵) الآیۃ۔ اور ہم کسی قدر خوف... سے تمہاری آزمائش کریں گے۔

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِیْنُ (۳۷-۱۰۶)

بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔

اور تکلیف کو کئی وجوہ کی بناء پر بَلَاءٌ کہا گیا ہے ایک اس لئے کہ تکالیف بدن پر شاق ہوتی ہیں اس لئے انہیں بَلَاءٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تکلیف بھی ایک طرح سے آزمائش ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاھِدِیْنَ مِنْکُمْ وَنَعْلَمَ الصَّابِرِیْنَ۔ (۴۷-۳۱) اور ہم تم لوگوں کو آزمائیں گے تاکہ جو تم میں لڑائی کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں ان کو معلوم کریں۔

سوم اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کبھی تو بندوں کو خوش حالی سے آزماتے ہیں کہ شکر گذار بنتے ہیں یا نہیں اور کبھی تنگی کے ذریعہ امتحان فرماتے ہیں کہ ان کے صبر کو جانچیں۔ لہٰذا مصیبت اور نعمت دونوں آزمائش ہیں محنت صبر کا تقاضا کرتی ہے اور منحۃ یعنی فضل وکرم شکر گزاری چاہتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ کما حقہٗ صبر کرنا کما حقہٗ شکر گذاری سے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لئے نعمت میں بہ نسبت مشقت کے بڑی آزمائش ہے اسی بنا پر حضرت عمرؓ فرماتے ہیں (۳۴) بُلِیْنَا بِالضَّرَّاءِ فَصَبَرْنَا وَبُلِیْنَا بِالسَّرَّاءِ فَلَمْ نَصْبِرْ کہ تکالیف پر تو صابر رہے لیکن فراخ حالی میں صبر نہ کر سکے اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں:۔

(۳۵) مَنْ وُسِّعَ عَلَیْہِ دُنْیَاہُ فَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّہٗ قَدْ مُکِرَ بِہٖ فَھُوَ مَخْدُوْعٌ عَنْ عَقْلِہٖ۔ کہ جس پر دنیا فراخ کی گئی اور اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ آزمائش کی گرفت میں ہے تو فریب خوردہ اور عقل وفکر سے محروم ہے قرآن میں ہے:۔

وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً (۲۱-۳۵)

اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْہُ بَلَاءً حَسَنًا (۸-۱۷)

اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں) سے اچھی طرح آزما لے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَفِیْ ذَالِکُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (۲-۴۹)

اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔ میں بَلَاءٌ کا لفظ نعمت و مشقت دونوں طرح کی آزمائش کو شامل ہے چنانچہ آیت:۔

یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَکُمْ (۲-۴۹)

(تمہارے بیٹوں کو) تو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ میں مشقت کا بیان ہے اور فرعون سے نجات میں نعمت کا تذکرہ ہے اسی طرح آیت:۔

وَاٰتَیْنٰھُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْہِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ (۴۴-۳۳)

اور ان کو ایسی نشانیاں دی تھیں جنمیں صریح آزمائش تھی ہیں دونوں قسم کی آزمائش مراد ہے جیسا کہ کتاب اللہ کے متعلق فرمایا۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ ۚ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى (۴۱-۴۴) اِبْتَلٰى فُلَانٌ وَاَبْلَاهُ (کسی کا امتحان کرنا) یہ دو امر کو متضمن ہوتا ہے (۱) تو اس شخص کی حالت کو جانچنا اور اس سے پوری طرح باخبر ہونا مقصود ہوتا ہے دوسرے (۲) اس کی اچھی یا بری حالت کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا۔ پھر کبھی تو یہ دونوں معنی مراد ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی معنی مقصود ہوتا ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی اس شخص کی خوبی یا نقص کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے اسے کسی کی حالت سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں لہذا آیت کریمہ:۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (۲-۱۲۴) اور پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ دوسرے معنی پر محمول ہوگی (یعنی حضرت ابراہیم کے کمالات کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود تھا)

اَبْلَيْتُ فُلَانًا يَمِيْنًا کسی سے آزمائشی قسم لینا۔

بَلٰى (حرف)

حرف ایجاب ہے پہلی بات میں[1] نفی کی تردید کے لئے آتا ہے، جیسا کہ:۔ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ کے بعد فرمایا:۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً (۲-۸۱) کیوں نہیں! جو برے کام کرے۔

اور یا اس استفہام کے جواب میں آتا ہے۔ جو نفی پر واقع ہو جیسے:۔

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (۷-۱۷۲) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں وہ کہنے لگے "کیوں نہیں"۔

نَعَمْ اور بَلٰى میں فرق یہ ہے کہ نَعَمْ صرف استفہام (یعنی بدون نفی) کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ (۷-۴۴) بھلا جو وعدہ تمہارے پروردگار نے تم سے کیا تھا تم نے بھی اسے سچا پایا؟ وہ کہیں گے ہاں۔

یہاں پر بَلٰى کا استعمال صحیح نہیں ہے[2]۔ نیز جب کوئی شخص مَا عِنْدِيْ شَيْءٌ (کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں) کہے تو اس کے جواب میں اگر "بلیٰ" کہا جائے تو اس کی تردید ہوگی یعنی غلط کہتے ہو اور اگر نعم سے جواب دیں تو آپ نے نفی کا اقرار کر لیا یعنی بیشک تمہارے پاس کچھ نہیں ہے[3]۔ قرآن میں ہے:۔

فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۲۸) تو مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم کوئی برا کام نہیں کرتے تھے کیوں نہیں! جو کچھ تم کرتے تھے خدا اسے خوب جانتا ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ

---

[1] حرف جواب تختص بالنفی وتفید ابطالہ سواء کان مجرداً او مقروناً بالاستفہام وسواء کان الاستفہام حقیقیا او توبیخیا او تقریریا (راجع المغنی بحث بلی) [2] ہذا وان کان متفقاً علیہ عند العلماء العربیۃ لکن وقع فی کتب الحدیث ما یقتضی انہا یجاب بہا الاستفہام المجرد ففی صحیح البخاری انہ علیہ السلام قال لاصحابہ: اترضون ان تکونوا ربع اہل الجنۃ؟ قالوا بلی او فی صحیح مسلم: ایسرک ان یکونوا لک فی البر سواء؟ قال: بلی: وایضاً قال علیہ السلام لرجل: انت الذی لقیتنی بمکۃ فقال بلی۔ لکنہ قلیل [3] وبذلک قال جماعۃ من الفقہاء لکن فی المسئلۃ خلاف راجع المغنی (۱: ۱۲۱)

بلیٰ وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّکُمْ (۳۴-۳) اور کافر کہتے ہیں کہ (قیامت کی) گھڑی ہم پر نہیں آئے گی۔ کہہ دو کیوں نہیں (آئے گی) میرے پروردگار کی قسم۔

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ رَبِّكُمْ وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا بَلٰی (۳۹-۷۱)

تو جہنم کے خازن ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو تمہارے پروردگار کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے وہ کہیں گے کیوں نہیں۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِیْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰی (۴۰-۵۰) وہ کہیں گے کہ تمہارے پاس تمہارے پیغمبر نشانیاں لے کر نہیں آئے تھے وہ کہیں گے کیوں نہیں

(ب ن ن)

اَلْبَنَانُ (واحد بَنَانَةٌ) کے معنی انگلیاں (یا ان کے اطراف) کے ہیں۔ یہ اَبَنَّ بِالْمَکَانِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ اقامت پذیر ہونے کے ہیں اور چونکہ کسی جگہ قامت کیلئے ضروریات زندگی کی اصلاح بھی انگلیوں سے ہوتی ہے اس لئے ان کو بَنَان کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:۔

بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ (۷۵-۴) ضرور کریں گے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں۔

میں انگلیوں کی درستگی پر اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے اسی طرح آیت:۔

وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸-۱۲) اور ان کا پور پور مار (کر توڑ) دو۔

میں خاص کر ان کے پور پور کاٹ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ مدافعت اور مقاتلہ کا واحد ذریعہ ہیں۔

اَلْبَنَّةُ بو، اچھی یا بری۔ کیونکہ اس میں کسی چیز کے ساتھ لازم ہونے کی وجہ سے ٹھہرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

(ب ن ی)

بَنَیْتُ اَبْنِیْ بِنَاءً وَبِنْیَةً وَبُنْیًا کے معنی تعمیر کرنے کے ہیں قرآن میں ہے :۔

وَبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (۷۸-۱۲) اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْىدٍ (۵۱-۴۷) اور آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (۹۱-۵) اور آسمان اور اس ذات کی (قسم) جس نے اسے بنایا۔

اَلْبُنْیَانُ یہ واحد ہے جمع نہیں ہے جیسا کہ آیات:۔

لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ (۹-۱۱۰) یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (موجب) خلجان رہے گی۔ كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱-۴) کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْیَانًا (۳۷-۹۷) وہ کہنے لگے کہ اس کے لئے ایک عمارت بناؤ۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بُنْیَانَةٌ کی جمع ہے اور یہ:۔ شَعِیْرٌ وَشَعِیْرَةٌ، تَمْرٌ وَتَمْرَةٌ، وَنَخْلٌ وَنَخْلَةٌ کی طرح ہے (یعنی جمع اور مفرد میں تا کے ساتھ فرق کرتے ہیں) اور جمع

کی اس قسم میں تذکیر و تانیث دونوں جائز ہوتے ہیں۔
لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ (۳۹-۲۰)
ان کے لئے اونچے اونچے محل ہیں جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوتے ہیں۔
بِنَاءٌ (مصدر بمعنی مفعول) عمارت ج اَبْنِيَةٌ
اَلْبُنْيَةُ سے بیت اللہ مراد لیا جاتا ہے[1]
اَلْاِبْنُ۔ یہ اصل میں بَنَوٌ ہے[2] کیونکہ اس کی جمع اَبْنَاءٌ اور تصغیر بُنَيٌّ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ (۱۲-۵)
کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔
يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ (۳۷-۱۰۲)
کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں۔
يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ (۳۱-۱۳) کہ بیٹا خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا۔
يَا بُنَيَّ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ بیٹا شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ اور بیٹا بھی چونکہ اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے اس لئے اسے ابن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا بانی بنایا ہے اور بیٹے کی تخلیق میں باپ بمنزلہ معمار کے ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو دوسری کے سبب اس کی تربیت، دیکھ بھال اور نگرانی سے حاصل ہو اسے اس کا ابن کہا جاتا ہے۔ نیز جسے کسی چیز سے لگاؤ ہو اسے بھی اس کا ابن کہا جاتا ہے جیسے:۔
فُلَانٌ ابْنُ حَرْبٍ۔ فلاں جنگ جو ہے۔ اِبْنُ السَّبِيْلِ مسافر۔ اِبْنُ اللَّيْلِ چور۔ اِبْنُ الْعِلْمِ پروردۂ علم۔
شاعر نے کہا ہے[3] ؎ (طویل)
(۴۶) أُولَاكَ بَنُوْ خَيْرٍ وَشَرٍّ كِلَيْهِمَا
یہ لوگ خیر و شر یعنی ہر حالت میں اچھے ہیں۔
فُلَانٌ ابْنُ بَطْنِهٖ پیٹ پرست فُلَانٌ ابْنُ فَرْجِهٖ شہوت پرست۔ اِبْنُ يَوْمِهٖ جو کل کی فکر نہ کرے۔ قرآن میں ہے:۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (۹-۳۰)
اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔
إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي (۱۱-۴۵) میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے۔
إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ (۱۲-۸۱) کہ ابا آپ کے صاحبزادے نے (وہاں جا کر) چوری کی۔
اِبْنٌ کی جمع اَبْنَاءٌ اور بَنُوْنَ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (۱۶-۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے
يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ (۱۲-۶۷)
کہ بیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔
يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

---

[1] یقال: لا ورب ہذہ البنیۃ (کعبۃ) وقد کثر قسمہم بہا (راجع التاج ب ن ی) [2] ہذا وان کان فی اصلہ خلاف لکن رجح فی التاج ان اصلہ بَنَیٌ (محرکۃ بالیا) وقال وانما قضینا انہ من الیا لان بنی یبنی اکثر فی کلامہم من یبنو [3] قال مسافع بن حذیفۃ العبسی (کما فی شرح التبریزی) وتمامہ: جمیعًا ومعروف الم ومنکر۔ کذا فی الصناعتین ۳۱۴ مع آخر وفی ۸۹ والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی ۷۴۶ فی اربعۃ ابیات والاشباہ ۲/۱۲۳ مع اختلاف فی بعض الروایۃ وفی بعض النسخ وابناء معروف بدل جمیعًا ومعروف وفی الحیوان (۲: ۸۹) قالہ العتبی وفی روایتہ لکن بدل اولاک والعتبی ہو محمد بن عبداللہ بن عتبۃ بن ابی سفیان ومسافع بن حذیفۃ شاعر عاسی من شعراء الجاہلیۃ (راجع الخزانۃ ۲: ۳۶۰)

۷-۳۱) اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے
ئیں مزین کیا کرو۔
یَابَنِیۡ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطَانُ (۷-۲۷)
ے بنی آدم (دیکھنا کہیں) شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔
ور اِبْنٌ کی مؤنث اِبْنَةٌ و بِنْتٌ اور ان کی جمع
بَنَاتٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
هٰؤُلَاءِ بَنَاتِیۡ هُنَّ اَطْهَرُ لَکُمْ (۱۱-۷۸)
یہ (جو) میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں تمہارے لئے
(جائز اور) پاک ہیں۔
لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیۡ بَنَاتِکَ مِنْ حَقٍّ (۱۱-۷۹)
تمہاری (قوم کی) بیٹیوں کی ہمیں کچھ حاجت نہیں۔
بعض کہتے ہیں[1] کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اکابر قوم
کو خطاب کیا تھا اور ان کے سامنے اپنی بیٹیاں
پیش کی تھیں۔ مگر یہ ناممکن سی بات ہے کیونکہ نبی
کی شان سے بعید ہے کہ وہ اپنی چند لڑکیاں مجمع کثیر
کے سامنے پیش کرے اور بعض نے کہا ہے[2] کہ بَنَات
سے ان کی قوم کی عورتیں مراد ہیں اور ان کو بَنَاتِیۡ اس
لئے کہا ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کے لئے بمنزلہ باپ کے
ہوتا ہے بلکہ والدین سے بھی اس کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے
جیسا کہ اَبٌ کی تشریح میں گزر چکا ہے اور آیت کریمہ:
وَیَجْعَلُوۡنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ (۱۶-۵۷) اور یہ لوگ خدا
کے لئے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

(ب ھ ت)

بَهِتَ (س) حیران و ششدر رہ جانا بَهَتَهٗ (ف)
اسے مبہوت کر دیا۔ قرآن میں ہے۔
فَبُهِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ (۲-۲۵۸) یہ سن کر کافر حیران
رہ گیا۔ اور آیت کریمہ:۔
هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیۡمٌ (۲۴-۱۶) یہ تو (بہت) بڑا
بہتان ہے۔ میں بہتان کے معنی ایسے الزام کے ہیں
جسے سن کر انسان ششدر و حیران رہ جائے۔ اور آیت کریمہ:
وَلَا یَاۡتِیۡنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیۡنَهٗ بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِنَّ وَ
اَرْجُلِهِنَّ (۶۰-۱۲) نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی
بہتان باندھ لائیں گی۔
میں بہتان زنا سے کنایہ ہے۔ بعض نے کہا ہے
نہیں بلکہ اس سے ہر وہ عمل شنیع مراد ہے جسے ہاتھ
اور پاؤں سے سرانجام دیا جائے۔ مثلاً ہاتھ سے کسی
ناروا چیز کو پکڑنا یا کسی عمل شنیع کا ارتکاب کرنے کے
لئے اس کی طرف چل کر جانا۔ جَاءَ بِالْبُهَیۡتَةِ اس
نے جھوٹ بولا۔

(ب ھ ج)

اَلْبَهْجَةُ۔ خوش نمائی۔ فرحت و سرور کا ظہور۔
قرآن میں ہے:۔
حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ (۲۷-۶۰) سرسبز باغ۔
بَهُجَ (ک) خوشنما اور تر و تازہ ہونا۔ اور خوشنما چیز
کو بَهِیۡجٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَاَنْۢبَتْنَا فِیۡهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیۡجٍ (۵۰-۷)
اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں۔
اور بَهِجٌ بھی صیغہ صفت ہے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (ع)
(۶۷) ذَاتُ خَلْقٍ بَهِجٍ
اور اس سے بَهُوۡجٌ بروزن فَعُوۡلٌ استعمال نہیں ہوتا۔
اِبْتَهَجَ بِکَذَا کسی چیز پر اس قدر خوش اور مسرور ہونا
کہ چہرہ پر خوشی کے آثار ظاہر ہو جائیں۔ اَبْهَجَهٗ خوش کرنا۔

---

[1] مروی عن قتادۃ (الطبری ۱۲: ۹۷) [2] قالہ مجاہد وسعید بن جبیر (الطبری ۱۲: ۹۷)

(ب ھ ل)

اَلْبَھْلُ (ف) اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کا اس حال میں ہونا ہے کہ اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے اسی سے اَلْبَاھِلُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پایہ بند یا پستان لگائے بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے یا وہ اونٹنی جسے تھن باندھے بغیر چھوڑ دیا ہو چنانچہ کسی عورت نے اپنے خاوند سے کہا:۔ اَتَیْتُکَ بَاھِلًا غَیْرَ ذَاتِ صِرَارٍ[1] کہ تمہیں پوری آزادی ہے جس طرح چاہو لطف اندوزی کرو اور اَلْبَاھِلُ اونٹ کے ساتھ تشبیہ دے کر اَبْھَلْتُ فُلَانًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی کسی کو اس کی رائے اور ارادہ میں آزاد چھوڑ دینا کے ہیں۔

اَلْبَھْلُ وَالْاِبْتِھَالُ فِی الدُّعَاءِ کھل کر عاجزی سے دعا کرنا قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ نَبْتَہِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ۔ (۳-۶۱) پھر دونوں فریق (خدا سے) دعا والتجا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔

جن لوگوں نے یہاں اِبْتِھَال کے معنی لعنت کئے ہیں وہ محض اس بنا پر کئے ہیں کہ یہاں دعا لعنت کے لئے ہے۔ شاعر نے کہا ہے[2] (رمل)

(۶۸) نَظَرَ الدَّھْرُ اِلَیْھِمْ فَابْتَھَلْ

یعنی زمانہ ان کی طرف تیزی سے چلا اور انہیں فنا کر دیا۔

(ب ھ م)

اَلْبُھْمَۃُ کے معنی ٹھوس چٹان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر بہادر آدمی کو بُھْمَۃٌ کہا جاتا ہے نیز ہر وہ حسی یا عقلی چیز جس کا عقل (وحواس) سے ادراک نہ ہو سکے اسے مُبْھَمٌ کہا جاتا ہے۔

اَبْھَمْتُ کَذَا مبہم کرنا اس کا مطاوع اِسْتَبْھَمَ ہے۔ اَبْھَمْتُ الْبَابَ دروازے کو اس طرح بند کرنا کہ کھل نہ سکے۔

اَلْبَھِیْمَۃُ چوپایہ جانور (کیونکہ اس کی صورت مبہم ہوتی ہے۔ مگر عرف میں درندہ اور پرندہ کے علاوہ باقی جانوروں کو بہیمۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ (۵-۱) تمہارے لئے چار پائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔

لَیْلٌ بَھِیْمٌ سیاہ رات فَعِیْلٌ بمعنی مُفْعَلٌ ہے اور تاریکی کے باعث اس کا معاملہ بھی چونکہ مبہم ہوتا ہے اس لئے اسے بَھِیْمٌ کہا جاتا ہے یا فَعِیْلٌ بمعنی مُفْعِلٌ ہے چونکہ وہ چیزوں کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے اس لئے اسے بَھِیْمٌ کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ بَھِیْمٌ یک رنگ گھوڑا جس کی اچھی طرح پہچان نہ ہو سکے اسی سے ایک روایت میں ہے:۔[3] (الم) یُحْشَرُ النَّاسُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بُھْمًا کہ قیامت کے دن لوگ ننگے بدن اٹھیں گے بعض نے کہا ہے کہ دنیاوی زیب و زینت اور آرائش سے عاری ہوں گے واللہ اعلم۔

اَلْبَھْمُ بھیڑ بکری کے بچے۔ واحد بَھْمَۃٌ

اَلْبُھْمٰی ایک قسم کی گھاس جس کے بیچ دار ہونے کی وجہ اس کی جڑیں معلوم نہیں ہو سکتیں کہاں ہیں اَبْھَمَتِ الْاَرْضُ زمین میں بہمی گھاس کا بکثرت ہونا۔ جیسا کہ اَعْشَبَتْ وَاَبْقَلَتْ کے معنی گھاس اور سبزی کے بکثرت ہونے کے ہیں۔

---

[1] قال ابو عبیدۃ فی مجازہ (۱: ۹۶) ثم نبتھل ای نلتعن یقال مالہ بھلۃ اللہ یقال علیہ بھلۃ اللہ راجع ایضًا الکشاف والقرطبی ۴/۱۰۵

[2] ہذا عجز بیت للبید وصدرہ فی قوم سادۃ من قومہ انظر دیوانہ ص ۸۰ الطبع لیدن (۱۸۹۱ء) والبیت مما استشھد بہ الطبری فی تفسیرہ (۳: ۲۹۸) والاملی المرتضی (۱: ۵۴) والبحر (۲: ۴۸۰)

[3] وتمام الحدیث حفاۃ عراۃ بُھمًا راجع الفائق (۱/۱۴۳) والنہایۃ واللسان (بہم) ومعنی البھم صحیحۃ الاعضاء کما فی النھایۃ ۞

(ب و ب)

اَلْبَابُ ہر چیز میں داخل ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ دراصل امکنہ جیسے شہر، مکان، گھر وغیرہ میں داخل ہونے کی جگہ کو باب کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَبْوَاب ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ (۱۲-۲۵) اور دونوں دروازوں کی طرف بھاگے اور عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے دیکھ کر جو کھینچا تو پھاڑ ڈالا۔ اور دونوں کو دروازوں کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ (۱۲-۶۷) ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔

اور اسی سے (مجازاً) علم میں بَابُ كَذَا کا محاورہ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے هٰذَا الْعِلْمُ بَابٌ اِلٰى عِلْمِ كَذَا کہ یعنی یہ علم فلاں علم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا[1]:۔ (۴۲)

اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے[2] (رجز)

(۶۹) اَتَيْتَ الْمُرُوْءَةَ مِنْ بَابِهَا

تم نے جوانمردی کو اسی کی جگہ سے حاصل کیا۔

قرآن میں ہے:۔

فَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (۶-۴۴) تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

لَهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ (۵۷-۱۳) جس میں ایک دروازہ ہوگا جو اس کی جانب اندرونی ہے اس میں نور رحمت ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اَبْوَابُ جَنَّة اور اَبْوَابِ جہنم سے مراد وہ باتیں ہیں جو ان تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں قرآن میں ہے:۔

اُدْخُلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ (۳۹-۷۲) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (۳۹-۷۳) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ تو اس کے داروغہ ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام۔

اور جو چیز کسی کام کے لئے صلاحیت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔

هٰذَا مِنْ بَابَتِهٖ كَذَا۔ کہ یہ اس کے مناسب ہے اس کی جمع بَابَات ہے۔ خلیل کا قول ہے کہ بَابَةٌ کا لفظ حدود (اور حساب میں) استعمال ہوتا ہے[3]

بَوَّبْتُ بَابًا۔ میں نے دروازہ بنایا۔

اَبْوَابٌ مُبَوَّبَةٌ بنے ہوئے دروازے قائم کئے ہوئے دروازے۔ اَلْبَوَّابُ دربان تَبَوَّبْتُ بَابًا میں نے دروازہ بنایا۔

بَابٌ اصل میں بَوَبٌ ہے اور اس میں الف واؤ سے مبدل ہے۔

---

[1] مروی عن علیؓ فی الترمذی وابن عباس مرفوعًا فی المستدرک وقال صحیح الاسناد وذکرہ ابن الجوزی فی الموضوعات واوردہ السیوطی فی اللالی والسنوعب طرقہ وذکر نقود العلماء علی ہذا الحدیث راجع (۱: ۳۲۹-۳۳۶) وفی تخریج الاحیاء للعراقی (۲: ۱۹۰) قال ابن حبان لا اصل لہ وقال ابن طاہر موضوع ہذا فی الفتح الکبیر (۱: ۲۷۶) عق وعد وطب وک۔ عن ابن عباس (عدک) عن جابر۔ وفی الترمذی عن علیؓ انا دار الحکمۃ وعلی بابہا وقال غریب [2] قدمر فی (اتی) [3] قال المتنبی: وبابۃ کل غلام عتی ؎

(ب و ر)

اَلْبَوَارُ (ن) اصل میں بَارَ الشَّیْءُ یَبُوْرُ بَوْرًا وَبَوَارًا کے معنی کسی چیز کے بہت زیادہ مندا پڑنے کے ہیں اور چونکہ کسی چیز کی کساد بازاری اس کے فساد کا باعث ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کَسَدَ حَتّٰی فَسَدَ اس لئے بَوَار بمعنی ہلاکت استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے۔ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (۳۵-۲۹) اس تجارت (کے فائدے) کے جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔ وَمَكْرُ أُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ (۳۵-۱۰) اور ان کا مکر نابود ہو جائیگا۔

ایک روایت میں ہے[1] (۴۳) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ بَوَارِ الْأَيِّمِ کہ ہم بیوہ کے مندا پن سے پناہ مانگتے ہیں یعنی یہ کہ اس کے لئے کہیں سے پیغام نکاح نہ آئے۔

أَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴-۲۸) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر اتارا۔

رَجُلٌ حَائِرٌ بَائِرٌ مرد سرگشتہ خود رائے۔ جمع کے لئے حُوْرٌ بُوْرٌ کہا جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔ حَتّٰی نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا (۲۵-۱۸) یہاں تک کہ وہ تیری یاد کو بھول گئے اور یہ ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

میں بُوْرٌ بَائِرٌ کی جمع ہے[2] بعض نے کہا ہے کہ بُوْر مصدر ہے اور واحد و جمع دونوں کی صفت واقع ہوتا ہے جیسے۔ رَجُلٌ بُوْرٌ وَقَوْمٌ بُوْرٌ شاعر نے کہا ہے[3] ع (خفیف)

(۷۰) يَا رَسُوْلَ الْمَلِيْكِ إِنَّ لِسَانِيْ
رَاتِقٌ مَا فَتَقْتُ إِذْ أَنَا بُوْرٌ

اے اللہ کے رسول جو گناہ میں نے کفر کی حالت میں کئے اب ان سے تائب ہوتا ہوں۔

بَارَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کے اصل معنی نر شتر کا مادہ کو یہ معلوم کرنے کے لئے سونگھنا کہ آیا حاملہ ہے یا نہیں اور استعارۃً کسی چیز کا امتحان کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔ بُرْتُ كَذَا میں نے فلاں چیز کو آزما دیکھا۔

(ب و ع)

اَلْبَوَاعُ ۔ کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزا کا مساوی (اور ساتھ کا موافق) ہونے کے ہیں۔ یہ نَبْوَةٌ کی ضد ہے جس کے معنی اجزاء کی ناہمواری

---

[1] انظر للحدیث، للسان (بوس) والنهاية ۱/۹۸ وغریب القرآن للقتبی ۱۳۱ والصغیر للطبرانی ۲۱۸ وفیه تفرد وفی کنز العمال ۲/ رقم ۲۲۳۸ عن ابن عباس (زن)، و ۳۸۲۱ عن مجاهد مرفوعا [2] وقال تعالیٰ: وكنتم قوما بورا (الفتح ۱۲) ای ہلکی عن ابن عباس ومجاهد وغیر واحد وقیل قوما فاسدین عن قتادة (الطبری ۲۶-۵۹) وابن کثیر (۴: ۱۸۹) [3] قاله عبد الله بن الزبعری السہمی القرشی وفی اللسان (بور) الالہ بدل الملیک والبیت من كلمة قالها حین قدم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلما وکان هاربا من فی النجران قال السہیلی رتقت) ای فی الدین فکل اثم فتق وکل توبۃ رتق۔ او انا بور یریدا ذ انا کافر الک اھ راجع الروض (۲: ۲۷۹) والمؤتلف ۱۳۲ والسمط ۲۸۸-۹۰۳، ۸۳۳ واصلاح المنطق ۱۲۵ والسیرۃ (جوتنجن ۸۲۷) والطبری (۳: ۱۳۰/۲: ۲۶۶) وتاریخ الطبری (۲: ۳۳۹) فی اربعۃ ابیات وفی (۳: ۱۲۲) والجمہرۃ (۱: ۲۵۸) والقرطبی (۱۳: ۱۱) والطبرسی (۲۲: ۵۸) واللسان والتاج والمقاییس (بور) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۴۳ رقم ۳۹۰) والاتباع لابی الطیب ۲۴ والمخصص (۳: ۸۴) والاغانی (۱: ۲۳/۱۷: ۳۰) والامالی (۱: ۱۴۰) والاقتضاب ۱۱ والشریشی (۲: ۳۱۸) وابن خالویہ ۲۳ وغریب القرآن للقتبی ۳۱۱ وشرح السبع لابن الانباری ۴۸۹، ۵۹ واسد الغابۃ (۳: ۱۶۰) فی ستۃ ابیات ٭

(ناسازگاری) کے ہیں۔ لہٰذا مَكَانٌ بَوَاءٌ اس مقام کو کہتے ہیں۔ جو اس جگہ پر اترنے والے کے سازگار اور موافق ہو۔

بَوَّأْتُ لَهٗ مَكَانًا میں نے اس کے لئے جگہ کو ہموار اور درست کیا اور تَبَوَّأْتُ اس کا مطاوع ہے جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں قرآن میں ہے:
وَأَوْحَيْنَا إِلٰى مُوسٰى وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا (۱۰-۸۷) اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لئے مصر میں گھر بناؤ۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ (۱۰-۹۳) اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کو عمدہ جگہ دی۔

تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (۳-۱۲۰) ایمان والوں کو لڑائی کے لئے مورچوں پر (موقع بموقع) متعین کرنے لگے۔

يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ (۱۲-۵۶) وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے۔

ایک روایت میں ہے[1] (۴۵) إِنَّهٗ كَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَتَبَوَّأُ لِبَوْلِهٖ كَمَا يَتَبَوَّأُ لِمَنْزِلِهٖ کہ آنحضرت پیشاب کرنے کے لئے ہموار اور مناسب جگہ تلاش کرتے جیسے کوئی شخص اقامت کے لئے جگہ تلاش کرتا ہے۔

بَوَّأْتُ الرُّمْحَ میں نے مناسب جگہ پر نیزہ مارا۔

ایک حدیث میں ہے:[2] (۴۶)
مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ جو عمداً مجھ پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے الراعی نے اونٹوں کی صفت میں کہا ہے[3] ع

(۴۷) لَهَا أَمْرُهَا حَتّٰى إِذَا مَا تَبَوَّأَتْ
بِأَخْفَافِهَا مَأْوًى تَبَوَّأَ مَضْجَعًا

یعنی چرواہا اونٹ چھوڑ دیتا ہے یہاں تک کہ جب وہ چرنے کے لئے جگہ ہموار پالیتے ہیں تو وہ اپنی آرام گاہ پر آکر سو جاتا ہے۔

اور تَبَوَّأَ فُلَانٌ (کنایہ) کے معنی نکاح کرنے کے ہیں جیسا کہ بَنٰى بِأَهْلِهٖ وغیرہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بَوَاءٌ کا لفظ مصاہرت یا قصاص میں برابر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے فُلَانٌ بَوَاءٌ لِفُلَانٍ۔ وہ فلاں کا ہمسر ہے یعنی رشتۂ مصاہرت میں اس کا کفو ہے یا قصاص میں اس کے مساوی ہے۔ اور آیت کریمہ: فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۸-۱۶) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی جگہ پر اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب یعنی عقوبت ہے۔ تو یہاں بِغَضَبٍ موضع حال میں ہے جیسے خَرَجَ بِسَيْفِهٖ میں ہے اور مَرَّ بِزَيْدٍ کی طرح مفعول نہیں ہے۔ اور بِغَضَبٍ پر باء لا کر تنبیہ کی ہے کہ موافق جگہ میں

---

[1] رواه في (طس۔ عن ابي هريرة) راجع كنز العمال (۱۷ رقم ۱۹۶) [2] من حديث ابي هريرة رواه احمد ۲/ ۵۰۱ رقم ۱۰۵۲۰ وابن ماجة ارواء الحديث باختلاف الفاظه في مسلم ار۵ والحاكم ار ۱۰۲-۱۰۳ ومسند احمد رقم ۸۲۴۹ و ۸۷۶۱ و ۹۳۰۵، ۹۳۴۹ و ۹۵۷ و ۱۰۰۵۰ و ۲۰۷۳۹-۲/۲۲۱، ۳۶۵، ۴۱۰، ۴۳۱، ۴۶۹، ۵۱۹، والشافعي في الرسالة ۱۰۹۱-راجع لتخريجه ايضاً كنز العمال ۴/ ۵۵ - ۳۵۷ رقم ۱۰۳۱۰ و ۱۰۳۱۱ ولا تجد في غيره
[3] قاله الراعي واسمه عبيد بن حصين بن معاوية من بني نمير يكنى ابا جندل شاعر اسلامي وقبله: فخذ ابل ان يتبع الرزح مرة يدعها ويخف الصوت حتى تربعا راجع للبيت اللآلي ۔۵ السمط ۵۷۵ والامالي (۲/ ۱۳۷) وفي رواية لاخفافها مرعى بدل باخفافها مأوى وامالي المرتضى (۱: ۲۲۲) والفائق (۱: ۴۲) فيه قصة الشعبي مع السائل حين سئل عن رجل لطم عين رجل فشرقت بالدم فقال البيت فقصر به مثلا للعين المضروبة اي لاديه فيها حتى يذهب ضوؤها

ہونے کے باوجود وہ غضب الٰہی میں گرفتار رہے تو ناموافق جگہ میں بَاءَ لَا أُولیٰ اس پر غضب ہوگا۔ لہذا یہ فَبَاءُوْا بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ کی مثل ہے اور آیت کریمہ:۔
إِنِّيْ أُرِيْدُ أَنْ تَبُوْءَ بِإِثْمِيْ وَإِثْمِكَ (۵-۲۹)
میں تَبُوْءَ بِإِثْمِيْ کے معنی یہ ہیں کہ تو اس حالت کے ساتھ ہمیشہ رہے شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)
(۴۰) "أَنْكَرْتُ بَاطِلَهَا وَبُؤْتُ بِحَقِّهَا"
میں نے اس کے باطل کا انکار کیا اور اس کے حق پر اقرار کیا۔
جن لوگوں نے اس کے معنی أَقْرَرْتُ بِحَقِّهَا (یعنی اس کے حق کا اقرار کیا) کئے ہیں تو یہ تفسیر مقتضی لفظ کے مطابق نہیں ہے۔ اَلْبَاءَةُ۔ کنایہ از جماع خلف الاحمر سے منقول ہے کہ حَيَّاكَ اللهُ وَبَيَّاكَ اللهُ میں بَيَّاكَ اصل میں بَوَّءَكَ مَنْزِلًا ہے جیسا کہ أَتَيْتُهُ الْغَدَايَا وَالْعَشَايَا میں ہے یعنی عشایا کی مناسبت سے غدایا کہا جاتا ہے۔

(ب ی ت)

اَلْبَيْتُ اصل میں بیت کے معنی انسان کے رات کے ٹھکانہ کے ہیں۔ کیونکہ بَاتَ کا لفظ رات کو کسی جگہ اقامت کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے ظَلَّ کے معنی دن گزارنے کے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ مطلق مسکن اور مکان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے عام اس سے کہ وہ مٹی یا پتھر سے بنایا گیا ہو یا اون اور بالوں کا بنا ہوا ہے اس کی جمع بُیُوْتٌ اور اَبْيَاتٌ آتی ہے مگر پہلی جمع مسکن کے مختص ہے اور دوسری بیت بمعنی شعر کے ساتھ۔ قرآن میں ہے:۔
فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا (۲۷-۵۲)
یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب خالی پڑے ہیں۔
وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً (۱۰-۸۷) اور اپنے گھروں کو قبلہ (یعنی مسجدیں) ٹھہراؤ۔
لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ (۲۴-۲۷)
دوسرے لوگوں کے گھروں میں ... داخل نہ ہوا کرو۔
اور تشبیہ کے طور پر ایک شعر کو بیت کہہ دیتے ہیں۔ اور ہر چیز کے مکان کو (مجازا) اس کا بیت کہا جاتا ہے
اور أَهْلُ الْبَيْتِ کا لفظ آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں متعارف ہو چکا ہے اور آنحضرت نے (۴۱) سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ (سلمان ہمارے اہل بیت سے ہے) فرما کر تنبیہ کر دیا ہے[2] کہ غلام کی نسبت اس کے آقا کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے[3]
(۴۲) مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَابْنُهُ مِنْ أَنْفُسِهِمْ
کہ کسی قوم کا غلام انہی میں سے ہے اور اس کا لڑکا بھی ان ہی سے ہے۔
بَيْتُ اللهِ وَالْبَيْتُ الْعَتِيْقُ کعبہ قرآن میں ہے:۔
وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۲۲-۲۹) اور خانہ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔

---

[1] قالہ لبیہ وعجزہ : بندی، ولم یقم علی کرامہا۔ والبیت فی اللسان والتاج والصحاح (بوء) [2] الحدیث رواہ الطبرانی فی الکبیر والحاکم فی المستدرک عن عمرو بن عوف، الفتح الکبیر ۲/۱۵۹ [3] وفی روایۃ "من انفسہم" راجع لہ (حم، د، ن، حب، ک، ت عن ابی رافع تخ - عن انس، واحمد من حدیث عتبۃ بن غزوان وابی موسیٰ والطبرانی من حدیث ابی سعید فتح الباری ۵/۱۳۱ وطب۔ عن مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وطب والبیہقی۔ عن ابن عباس والبغوی والباوردی وابن عساکر عن طہمان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنز العمال ۷: ۱۹۲۸۰، ۱۹۳۷۲، ۱۹۴۴۲، ۱۹۵۱ واما لفظہ "وابنہ من انفسہم" فلم اجدہ فی شیء من المراجع :

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ (۳-۹۶) پہلا بیت جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ (۲-۱۲۷) اور جب ابراہیم ... بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى (۲-۱۸۹) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ (احرام کی حالت میں) گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔

ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو احرام کے بعد اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہونے سے پرہیز کرتے اور اسے احرام کے منافی سمجھتے تھے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں متنبہ فرمایا کہ اس قسم کی رسوم بِرّ کے منافی ہیں اور آیت کریمہ:۔

وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ (۱۳-۲۳-۲۴) اور فرشتے (بہشت کے) ہر ایک دروازے سے ان کے پاس آئیں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو۔

میں مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ سے ہر قسم کی مسرتیں مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ (۲۴-۳۶) (ان گھروں میں ہے) جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلند کئے جائیں۔

میں بقول بعض اس سے بیوت نبوی مراد ہیں۔ جیسا کہ آیت:۔

لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ (۳۳-۵۳) پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو مگر اس صورت میں کہ تم کو اجازت دی جائے۔

میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فِي بُيُوتٍ سے آپ کے اہل بیت اور قوم مراد ہے۔ اور بعض کے نزدیک قلب یعنی دل کی طرف اشارہ ہے بعض حکماء نے حدیث[1] لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ کے تحت لکھا ہے کہ یہاں بیت سے مراد دل اور کلب سے مراد حرص ہے۔ کیوں کہ كَلِبَ فُلَانٌ کے معنی بہت زیادہ حرص کرنے کے ہیں اور کتا حرص میں ضرب المثل ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے فُلَانٌ أَحْرَصُ مِنَ الْكَلْبِ (فلاں کتے سے زیادہ حریص ہے) اور آیت:۔ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (۲۲-۲۶) جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانہ کعبہ کو مقام مقرر کیا۔

میں مَكَانَ الْبَيْتِ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (۶۶-۱۱) اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔ میں جنت میں گھر بنانے کے معنی یہ ہیں کہ جنت میں داخل ہونا میرے لئے آسان کر دے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً (۱۰-۸۷) اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لئے

[1] متفق علیہ من حدیث ابی طلحۃ زید بن سہل الانصاری وابن ماجۃ من حدیث علیؓ ایضاً فی سنن ابی داؤد والنسائی وزاد ابن حبان رقم ۴۸۴) لکن بزیادۃ لفظ "ولا جنب" وہذہ الزیادۃ وردت بطرق ضعاف عون المعبود ۱/۹۰

مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ ٹھہراؤ۔
یہاں گھروں کو قبلہ ٹھہرانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر مسجد اقصٰی کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہو۔ اور آیت کریمہ:۔
فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ۔ (۵۱-۳۶) اور اس میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔
یہاں ایک گھر سے ایک خاندان مراد ہے جو ایک گھر میں سکونت پذیر تھے۔ جیسا کہ قریہ بول کر اہل قریہ مراد لے جاتے ہیں۔
اَلْبَيَاتُ وَالتَّبْيِيتُ کے معنی رات میں دشمن پر حملہ کرنے یعنی شبخون مارنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ۔ (۷-۹۷) کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو واقع ہو اور وہ بے خبر سو رہے ہوں۔
بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ (۷-۴) (رات کو) آتا تھا جب کہ وہ سوتے تھے یا (دن کو) جب وہ قیلولہ (یعنی دن کو آرام) کرتے تھے۔
اَلْبَيُّوتُ وہ معاملہ جس پر رات بھر غور و خوض کیا گیا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ (۴-۸۱) ان میں بعض لوگ رات کو مشورے کرتے ہیں۔
اور بَيَّتَ الْأَمْرَ کے معنی ہیں رات کے وقت کسی کام کی تدبیر کرنا۔ چنانچہ فرمایا:۔
إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ (۴-۱۰۸) حالانکہ جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کیا کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔
اسی طرح ایک روایت میں ہے[۱] (۴۸)
لَا صِيَامَ لِمَنْ لَمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ مِنَ اللَّيْلِ کہ جو شخص رات سے روزہ کی پختہ نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ اور بَاتَ فُلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا کے معنی رات بھر کوئی کام کرنا کے ہیں جیسا کہ ظل کے معنی دن بھر کام کرنا آتے ہیں اور یہ دونوں افعال عادات سے ہیں[۲]۔

(ب ی د)

بَادَ (ض) الشَّيْءُ يَبِيدُ بَيَادًا کے اصل معنی بَيْدَاءُ یعنی بیابان میں کسی چیز کے متفرق اور پراگندہ ہونے کے ہیں اور اسی اعتبار سے کامل تباہی اور بربادی کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔
مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا (۱۸-۳۵) کہ میں نہیں خیال کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو۔
اَلْبَيْدَاءُ کے معنی لق و دق صحرا کے ہیں اس کی جمع بِيدٌ ہے اور مادہ خروشی کو أَتَانٌ بَيْدَانَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ب ی ض)

اَلْبَيَاضُ سفیدی۔ یہ سَوَادٌ کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے اِبْيَضَّ، اِبْيِضَاضًا وَبَيَاضًا فَهُوَ مُبْيَضٌّ۔ قرآن میں ہے:۔
يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ (۳-۱۰۶) جس دن بہت سے منہ سفید ہونگے اور بہت سے منہ سیاہ۔

---

[۱] والحدیث بلفظ فی النسائی عن حفصۃ راجع تخریج الکشاف ۱۲ والفائق ۱/۳۲۳ رفع روایۃ لمن لم یبیت واصحاب السنن من حدیث حفصۃ بلفظ لمن لم یجمع و باختلاف الفاظ فی (ن) عن حفصۃ، وقط و ہق۔ عن عائشۃ و بمعناہ فی (ص، حم ۱/۳ عن حفصۃ) [۲] فی المطبوع ہہنا ھو جاج والتسدید من المراجع :

وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ (۳-۱۰۷) اور جن کے منہ سفید ہوں گے۔

اور اَبْیَض ایک رگ کا نام بھی ہے جو سفید رنگ ہونے کی وجہ سے ابیض کہلاتی ہے۔

اہل عرب کے ہاں چونکہ سفید رنگ تمام رنگوں میں بہتر خیال کیا جاتا تھا جیسے کہا گیا ہے۔ اَلْبَیَاضُ اَفْضَلُ وَالسَّوَادُ اَهْوَلُ وَالْحُمْرَةُ اَجْمَلُ وَالصُّفْرَةُ اَشْكَلُ۔ اس لئے بیاض بول کر فضل و کرم مراد لیا جاتا ہے اور جو شخص ہر قسم کے عیب سے پاک ہو اسے اَبْیَضُ الْوَجْهِ کہا جاتا ہے اس بنا پر آیت مذکورہ میں اِبْیِضَاضُ الْوُجُوْهِ سے مسرت اور اِسْوِدَادُ الوجوہ سے غم مراد ہوگا جیسے دوسری جگہ فرمایا:۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا (۱۶-۵۸) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے۔

اور جیسے اِبْیَاضُ الْوُجُوْهِ خوشی سے کنایہ ہوتا ہے اسی طرح آیت:۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۷۵-۲۲) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔ اور آیت:۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (۸۰-۳۸) اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے خوش اور مسرور نظر آئیں گے۔ میں بھی نَضْرَة اور اِسْفَار سے مراد مسرت ہی ہوگی۔ شاعر نے کہا ہے[1] (منسرح)

(۲۲) اُمُّكَ بَیْضَاءُ مِنْ قُضَاعَةَ

یعنی تم عفیف اور سخی مرد رہو۔

اسی معنی میں فرمایا:۔ بَیْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ (۳۷-۴۶) جو رنگ کی سفید اور پینے والوں کے لئے (سراسر) لذت ہوگی۔

اَلْبَیْضُ یہ بَیْضَةٌ کی جمع ہے اور انڈے کے سفید ہونے کی وجہ سے بَیْضَۃ کہا جاتا ہے۔ انڈا سفید اور پروں کے نیچے محفوظ رہتا ہے اس لئے تشبیہ کے طور بَیْضَةٌ بول کر خوبصورت عورت مراد لی جاتی ہے۔ بَیْضَةُ الْبَلَدِ[2] یہ لفظ تعریف اور مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب کلمہ تعریفی ہو تو اس سے رئیس شہر مراد ہوتا ہے۔

اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[3]:۔ (کامل)

(۲۳) كَانَتْ قُرَيْشٌ بَيْضَةً فَتَفَلَّقَتْ
فَالْمُخُّ خَالِصُهٗ لِعَبْدِ مَنَافٍ

قریش ایک انڈے کی مثل تھے۔ جو ٹوٹا تو عبد مناف کے حصہ میں خالص مخ آئی۔

---

[1] قال ابن قیس الرقیات وتمامہ: ۔۔۔ فی البیت الذی یستظل فی طنبہ۔ راجع اللسان (بیض) وشرح دیوان زہیر ۲۸ و دیوانہ ۹۲ واضداد ابی الطیب ۱۳ بغیرعزو وذکر بعضہم تکملتہ: ۔۔۔ قاتمت لہا الوالدات والنفد۔ راجع معانی اللبیہ للقتیبی ۵۳۴ والمرزوقی ۱۵۰ وفیہ یستکن بدل یستظل وفی ص ۱۹۴ عزاہ فی حواشی المرزوقی لابن قیس الرقیات والشد بدایضا [2] مثل عند الجرجانی ۱۰۹ والعسکری ۲: ۱۶۴ والمیدانی ۱: ۴۲ ، ۱۲۷ ، ۸۷ والکلام علیہ مستوفی فی الاضداد لابن الانباری ۴۶ والسجتانی ۱۱۷ وذکر فی السمط کلا المعنیین ۵۴۹

[3] البیت فی اللسان والتاج والصحاح (مخ) والسیرۃ (۱: ۹۴) وابن ابی الحدید (۳: ۴۵۳) والعینی (۴: ۱۴۰) منسوب الی ابن الزبعری وفی اکثر الروایات فالمخ والہامۃ ادفی روایۃ اللسان وحدہ "خالصہا" راجع الامالی للمرتضی (۲: ۸) و ۲۶۸ ونسبہ الی مطرود بن کعب الخزاعی وفی ۵۴ وذکر قصتہ وتاریخ الطبری (۲: ۱۴) فی ترجمۃ ابن عبد مناف واضداد ابن الانباری ۷۸ وابی الطیب ۵۵ والتنبیہ للبکری ۶۵ ومثلہ لحسان بن ثابت ودیوانہ ۱۴ الطبعۃ (دار صادر) لکن فیہ عبد الدار بدل عبد مناف ۲۔

اور جب مذمت کے لئے استعمال ہو تو اس سے ذلیل آدمی مراد لیا جاتا ہے جیسے جنگل میں پڑے ہوئے انڈے کی طرح ہر ایک توڑ سکتا ہے اور شکل و رنگ میں مشابہت کی وجہ سے خصیتین کو بَیْضَتَا الرَّجُل کہا جاتا ہے۔ بَاضَتِ الدَّجَاجَۃ مرغی کا انڈے دینا۔ بَاضَ کَذَا کسی جگہ پر متمکن ہونا۔ شاعر نے کہا ہے[1] (

(۴۴) بَدَا مِنْ ذَوَاتِ الضِّغْنِ یَأْوِیْ
صُدُوْرُھُمْ فَعَشَّ ثُمَّ بَاضَا

بَاضَ الْحَرُّ گرمی سخت ہونا۔
بَاضَتْ یَدُ الْمَرْأَۃِ عورت کے ہاتھ پر انڈے کی طرح ورم ہونا۔ دَجَاجَۃٌ بَیُوْضٌ انڈے دینے والی مرغی ج بُیُضٌ۔

(ب ی ع)

اَلْبَیْعُ کے معنی بیچنے اور شِرَاءٌ کے معنی خریدنے کے ہیں۔ لیکن یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور یہ قیمت اور مبیع کے لحاظ سے ہوتا ہے اسی معنی میں فرمایا:۔
وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ (۱۲-۲۰) اور اس کو تھوڑی سی قیمت یعنی معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا۔
اور علیہ السلام نے فرمایا[2] (۴۶)
لَا یَبِیْعَنَّ اَحَدُکُمْ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْہِ کہ کوئی اپنے بھائی کی خرید پر خرید نہ کرے۔
اَبَعْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو بیع کے لئے پیش کرنا۔ شاعر نے کہا ہے[3] (کامل)

(۴۵) فَرَسًا فَلَیْسَ جَوَادُنَا بِمُبَاعٍ

یعنی ہم عمدہ گھوڑی فروخت کے لئے پیش نہیں کیا کریں گے۔
اَلْمُبَایَعَۃُ وَالْمُشَارَاۃُ خرید و فروخت کرنا۔
وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲-۲۷۵) حالانکہ سودے کو خدا نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام
وَذَرُوا الْبَیْعَ (۶۲-۹) اور (خرید و فروخت ترک کردو)
لَا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلٰلٌ (۱۴-۳۱) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا نہ دوستی (کام آئے گی)
بَایَعَ السُّلْطَانَ (بادشاہ کی بیعت کرنا) اس قلیل مال کے عوض جو بادشاہ عطا کرتا ہے اس کی اطاعت کا اقرار کرنا۔ اس اقرار کو بَیْعَۃٌ یا مُبَایَعَۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ (۹-۱۱۱) تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو۔
میں بیعت رضوان کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر کہ آیت:۔
لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (۴۸-۱۸) (اے پیغمبر) جب مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ اَلْاٰیَۃ (۹-۱۱۱) میں پایا جاتا ہے۔
اَلْبَاعُ (دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار

---

[1] لم اجده فی المراجع

[2] رواه مسلم عن ابی ہریرۃ ط، خ، ف، د- عن ابن عمر وعنہ الصّارحم، ق، د، ت،

[3] واوله: فرضیت آلا ر الکمیت فمن یُبع۔ والبیت فی اللسان (بیع) والاقتضاب ۲۰۲ واصلاح یعقوب ۲۴۳ وحواشی المقاییس (۱: ۲۷) قالہ اجدع بن مالک الہمدانی وفی روایۃ اذ لالا الکمیت بدل آلا ر الکمیت وراجع ترجمۃ الشاعر الاشتقاق ۲۴۵، ۱۲۱ والمؤتلف ۴۱

جو تقریباً ۱۰ فٹ ہوتی ہے) یہ مادہ واوی سے ہے کیونکہ بَاعَ فِی السَّیْرِ یَبُوْعُ کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی گھوڑے کے لمبے لمبے قدم رکھنا کے ہیں۔[1]

(ب ی ل)

اَلْبَالُ اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس کی فکر یا پرواہ کی جائے اور یہ مَا بَالَیْتُ بِکَذَا بَالَۃً کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی پرواہ نہ کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

کَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷-۲) ان سے ان کے گناہ دور کر دیئے اور ان کی حالت سنوار دی۔

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (۲۰-۵۱) تو پہلی جماعتوں کا کیا حال۔[2]

اور انسان کے دل اور دل میں گزرنے والے خیال کو بھی بَالٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

خَطَرَ کَذَا بِبَالِیْ میرے دل میں یہ بات کھٹکی۔

(ب ی ن)

اَلْبَیْنُ کے معنی دو چیزوں کا درمیان اور وسط کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَجَعَلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًا (۱۸-۳۲) اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔

محاورہ ہے بَانَ کَذَا کسی چیز کا الگ ہو جانا اور جو کچھ اس کے تحت پوشیدہ ہو، اس کا ظاہر ہو جانا۔ چونکہ اس میں ظہور اور انفصال کے معنی ملحوظ ہیں اس لئے یہ کبھی ظہور اور کبھی انفصال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور گہرے کنویں کو بَیُوْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ پانی نیچے اتر جانے کے سبب اس سے پانی نکالتے وقت رسی کو ہاتھ سے جدا کرنا پڑتا ہے تو اس میں انفصال کا معنی ملحوظ ہے۔

بَانَ الصُّبْحُ صبح نمودار ہو گئی اور آیت کریمہ:۔

لَقَدْ تَقَطَّعَ بَیْنَکُمْ (۶-۹۵) آج تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے۔

میں بَیْنٌ کے معنی رشتہ اور تعلق کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ تمہارے اموال قبیلہ اور اعمال جن پر تم اعتماد کرتے تھے سب ضائع ہو گئے جس کی طرف کہ آیت:۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے۔ (۲۶-۸۸)

میں اشارہ پایا جاتا ہے اور یہی معنی آیت:۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (۶-۹۴) الآیۃ ایسے ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے۔ کے ہیں۔

واضح رہے کہ لفظ بَیْنَ کبھی اسم بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی ظرف چنانچہ آیت مذکورہ میں دو قراءتیں ہیں جو اسے اسم قرار دیتے ہیں وہ بَیْنُکُمْ (بضمہ نون) پڑھتے ہیں اور جن کے نزدیک ظرف ہے وہ بَیْنَکُمْ (بفتح نون) پڑھتے ہیں اور ظرف غیر متمکن ہونے کی بنا پر اسے مفتوح رہنے دیتے ہیں۔[3] چنانچہ آیات:۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۴۹-۱) (کسی بات کے جواب میں) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۵۸-۱۲) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔

فَاحْکُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ (۳۸-۲۲) تو آپ ہم میں

---

[1] وایضاً البیعۃ معبد النصاری۔ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ (۲۲-۴۰) [2] وایضاً فما بال النسوۃ التی قطعن ایدیهن (۱۲-۵۰) [3] قراءۃ الرفع منسوب الی حمزۃ الکوفی احد القراء السبعۃ والفتح قراءۃ نافع الکسائی وحفص (راجع اضداد ابی الطیب ۸۳ وبحر المحیط لابی حیان ۴/۱۸۲)

انصاف کا فیصلہ کر دیجئے۔ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (۴-۹۲) اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو۔ میں بَيْنَ ظرف واقع ہوا ہے اور آیت:۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا (۱۸-۶۱) جب ان کے ملنے کے مقام پر پہنچے۔

میں بَيْنَ کا لفظ اسم ظرف بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی مصدر بھی یعنی جب وہ ان کے الگ ہونے کے مقام پر پہنچے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ بَيْنَ کا لفظ یا تو وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں مسافت پائی جائے جیسے بَيْنَ الْبَلَدَيْنِ (دو شہروں کے درمیان) یا جہاں دو یا دو سے زیادہ چیزیں موجود ہوں جیسے بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ بَيْنَ الْقَوْمِ اور واحد کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں بَيْنَ کو مکرر لانا ضروری ہوتا ہے[1]۔ جیسے فرمایا:۔

وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ (۴۱-۵) اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے۔

فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا (۲۰-۵۸) تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کر لو۔

اور کہا جاتا ہے:۔ هٰذَا الشَّيْءُ بَيْنَ يَدَيْكَ یعنی یہ چیز تیرے قریب اور سامنے ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ (۷-۱۷) پھر ان کے آگے ... (غرض ہر طرف سے) آؤں گا۔

لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا (۱۹-۶۴) جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو پیچھے ... سب اسی کا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا (۳۶-۹) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی۔ اور ان کے پیچھے بھی۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (۵-۴۶) جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے۔

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا (۳۸-۸) کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے اور آیت کریمہ:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (۳۴-۳۱) اور جو کافر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن کو مانیں گے اور نہ ان کتابوں کو جو اس سے پہلے کی ہیں۔

میں بَيْنَ يَدَيْهِ سے انجیل اور دیگر کتب سماویہ مراد ہیں اور آیت کریمہ:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ (۸-۱) خدا سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔

کے معنی یہ ہیں کہ صلہ رحمی، قرابت، دوستی وغیرہ باہمی رشتوں کا لحاظ کرو جو باہم تم سب کے درمیان مشترک ہیں اور بَيْنَ کے بعد مَا یا الف کا اضافہ کر کے حِيْنَ کے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں[2] جیسے بَيْنَمَا زَيْدٌ يَفْعَلُ كَذَا وَبَيْنَا نَفْعَلُ یعنی درآنحالیکہ زید یہ کام کر رہا تھا۔ شاعر نے کہا ہے[3] ع (کامل)

(۷۶) بَيْنَا تَعَنُّقِهِ الْكُمَاةَ وَرَوْغِهِ
يَوْمًا اُتِيْحَ لَهٗ جَرِيْءٌ سَلْفَعُ

اس حال میں کہ وہ ایک روز بہادروں سے مقابلہ اور مراوغہ کر رہا تھا کہ اس کے لئے ایک دلیر بہادر مقصد ہو گیا۔

[1] واما آیۃ لا نفرق بین احد من رسلہ ففیہا لفظۃ احد بمعنی الجمیع فلا اعتراض (لنووی ۱/۷) [2] ولیس ہذہ الالف الکافۃ وقیل بعض الکافۃ وقیل الاشباع و بین مضافۃ الی الجملۃ (المغنی لابن ہشام ۱/۳۱۱) [3] قالہ (بقیہ صفحہ ۳۷ پر دیکھو)

بَانَ وَاسْتَبَانَ وَتَبَيَّنَ کے معنی ظاہر اور واضح ہو جانے کے ہیں اور بَيَّنْتُهُ کے معنی کسی چیز کو ظاہر اور واضح کر دینے کے۔ قرآن میں ہے۔

وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ (۱۴-۴۵)
اور تم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کس طرح (کا معاملہ) کیا تھا۔

وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسَاكِنِهِمْ (۲۹-۳۸)
چنانچہ ان کے (ویران) گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (۶-۵۵) اور اس لئے کہ گنہگاروں کا رستہ ظاہر ہو جائے۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲-۲۵۶) ہدایت صاف طور پر ظاہر (اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيَاتِ (۳-۱۱۸) ہم نے تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دیں۔

وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ
نیز اس لئے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم کو سمجھا دوں (۴۳-۶۳)

اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱۶-۴۴) ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ (۱۶-۳۹)
تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے۔

فِيْهِ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ (۳-۹۷) اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ (۲-۱۸۵) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے۔

اور بیان کرنے والے کے اعتبار سے آیت کو مُبَيِّنَة بھی کہا جاتا ہے جیسے اٰيَةٌ مُّبَيِّنَةٌ و مُبَيِّنَاتٌ و مُبَيَّنَاتٌ۔ اَلْبَيِّنَةُ کے معنی واضح دلیل کے ہیں۔ خواہ وہ دلالت عقلیہ ہو یا محسوسۃ اور شَاهِدَانِ (دو گواہ) کو بھی بَيِّنَة کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے:[۱۵] (۴۷)
اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ
کہ مدعی پر گواہ لانا ہے اور مدعا علیہ پر حلف۔

قرآن میں ہے:-
اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (۱۱-۱۷)
بھلا جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل (روشن) رکھتے ہیں۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸-۴۲) تاکہ جو مرے بصیرت پر (یعنی یقین جان کر) مرے اور جو جیتا رہے وہ بھی بصیرت پر (یعنی حق پہچان کر) جیتا رہے۔

بقیعہ[۱۳۶] ابو ذویب الحضرمی فی رثاء بنیہ والشطر الاول فی المطبوع مصحف والتسدید من المراجع والبیت فی اللسان والتاج (بین) والمغنی لابن ہشام رقم ۷۹۸ والسیوطی ۹۲، ۲۶۷ وفی روایتہم جمیعًا تعانقہ بدل تعنقہ والبیت فی الخزانۃ (۳: ۱۸۳) والتبریزی شرح الحماسۃ (۴: ۲۹) والمرزوقی ۴۸۱۷ واستشہد بہ الاصمعی وکثیر من النحاۃ بان لفظۃ بینا وبینما یأتیان للمفاجاۃ والجزم ان تقع بعدہما اذا واذ بخلاف ما ذہب الیہ سیبویہ راجع للبحث الکتاب لسیبویہ والبیت ایضًا فی الاشباہ والنحویہ ۱: ۱۲۲) والجمہرۃ ۲۴۷ فی ۲۲ بیتًا وقیوان الہذلیین (۱: ۸) وشرح الدرۃ للخفاجی ۹۷ [۱۵] رواہ الترمذی عن ابن عمرو ولکن لفظہ والیمین علی المدعیٰ علیہ وفی البیہقی وابن عساکر عن ابن عمر۔ علی من انکر (راجع الفتح الکبیر ۲/۲۰)

جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (۷-۱۰۱) ان کے پاس ان کے پیغمبر نشانیاں لے کر آئے۔

اَلْبَیَانُ کے معنی کسی چیز کو واضح کرنے کے ہیں اور یہ نطق سے عام ہے۔ کیونکہ نطق انسان کے ساتھ مختص ہے اور کبھی جس چیز کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اسے بھی بَیَانٌ کہہ دیتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ "بَیَانٌ" دو قسم پر ہے۔ ایک بیان بالتَّنْجِیْزِ یعنی وہ اشیاء جو اس کے آثار صنعت میں سے کسی حالت پر دال ہوں دوسرے بیان بالاختیار اور یہ یا تو زبان کے ذریعہ ہوگا اور یا بذریعہ کتابت اور اشارہ کے چنانچہ بیان حالت کے متعلق فرمایا۔

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ۔ (۴۳-۶۲) اور (کہیں) شیطان تم کو (اس سے) روک نہ دے وہ تو تمہارا علانیہ دشمن ہے۔ یعنی اس کا دشمن ہونا اس کی حالت اور آثار سے ظاہر ہے۔ اور بیان بالاختیار کے متعلق فرمایا:۔

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ (۱۶-۴۳، ۴۴) اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ اور ان پیغمبروں (کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱۶-۴۴) اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کردو۔

اور کلام کو بیان کہا جاتا ہے کیونکہ انسان اس کے ذریعہ اپنے ما فی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ (۳-۱۳۸) یہ (قرآن) لوگوں کیلئے بیان صریح ہے۔

اور مجمل مبہم کلام کی تشریح کو بھی بیان کہا جاتا ہے جیسے ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۷۵-۱۹) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

بَيَّنْتُهُ وَأَبَنْتُهُ کسی چیز کی تشریح کرنا۔ جیسے فرمایا:۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱۶-۴۴) تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کردو۔

نَذِيرٌ مُبِينٌ (۲۲-۲۶) کھول کر ڈرانے والا ہوں۔

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ (۳۷-۱۰۶) بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔

وَلَا يَكَادُ يُبِينُ۔ (۴۳-۵۲) اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔

وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ۔ (۴۳-۱۸) اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔

کتابُ التَّاءِ

(ت) (حرف جار)

شروع کلمہ میں قسم کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ وَتَاللّٰهِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ۔ (۲۱-۹۷) اور خدا کی قسم۔۔۔ میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔

(۲) فعل مستقبل کے شروع میں مخاطب پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ۔ (۱۰-۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو۔ نیز صیغہ تانیث ہونا ظاہر کرتا ہے جیسے فرمایا:۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ (۴۱-۳۰) ان پر فرشتے اتریں گے۔

(۳) اور آخر کلمہ میں یا تو زائدہ علامت تانیث کے طور پر آتا ہے۔ اور یہ کبھی تو حالت وقف میں ھا بن جاتا ہے۔ جیسے "قَائِمَةٌ" اور کبھی وقف اور وصل دونوں حالتوں میں ثابت رہتا ہے۔ جیسے اُخْتٌ وَبِنْتٌ اور (۲) یا جمع مؤنث سالم کے آخر میں الف کے بعد آتی ہے جیسے مُسْلِمَاتٌ وَمُؤْمِنَاتٌ۔

(۴) فعل ماضی کے آخر میں جب مضموم ہو تو ضمیر متکلم کہلاتی ہے جیسے فرمایا:۔ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (۷۴-۱۲) اور جس کو ہم نے مال کثیر دیا۔

اور مفتوح ہونے کی صورت میں ضمیر مذکر مخاطب ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ (۱-۶) جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا۔

اور مکسور ہو تو واحد مؤنث حاضر کی ضمیر پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا (۱۹-۲۷) یہ تو تم نے برا کام کیا۔

(ت ب ب)

اَلتَّبُّ وَالتَّبَابُ (ض) کے معنی مسلسل خسارہ میں رہنے کے ہیں کہا جاتا ہے تَبًّا لَهٗ (اللہ اسے خائب و خاسر کرے) تَبَّ لَهٗ وَتَبَّبْتُهٗ کسی سے "تَبًّا لَکَ" کہنا۔ قرآن میں ہے۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ (۱۱۱-۱) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں یعنی وہ ہمیشہ خسارے میں رہے یہی مفہوم ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ (۱۱-۲۲) میں پایا جاتا ہے۔ وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ (۱۱-۱۰۱) نقصان میں ڈالنے (یعنی تباہ کرنے) کے سوا ان کے حق میں اور کچھ نہ کرسکے۔

وَمَا کَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ۔ (۴۰-۳۷) اور فرعون کی تدبیر تو بیکا رتھی۔

(ت ب ت)[1]

اَلتَّابُوْتُ کے معنی صندوق کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ (۲-۲۴۸)

---

[1] والانسب ذکرہ فی (ت و ب) لان وزنہ فعلوت لان فاعولا قلیل وغیر معروف فہو اذا فعلوت من التوب وہو الرجوع ملخصا من الکشاف (۱:۲۹۳ ج۱) لکن صاحب اللسان رجح کونہ (ت ب ت) کما ذکرہ المؤلف وقال الصواب ان وزنہ فاعول لان تاءہ اصلیۃ ۱۲

کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ وہ صندوق لکڑی کا تھا جس میں حکمت کی کتابیں تھیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تابوت سے مراد دل ہے اور اس میں سکینت سے مراد علم ہے اسی لئے دل کو سَفَطُ الْعِلْمِ وَ بَيْتُ الْحِكْمَةِ وَ تَابُوتُ الْعِلْمِ وَ صندوقہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:۔

اِجْعَلْ سِرَّكَ فِي وِعَاءٍ غَيْرِ سَرِبٍ۔ کہ اپنے بھید کو ایسے برتن میں رکھو جو ٹپکتا نہ ہو اور دل کا نام تابوت ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے عبد اللہ بن مسعودؓ کے متعلق فرمایا (۷۴)

هُوَ كُنَيْفٌ مُلِئَ عِلْمًا وہ ایک ایسا برتن ہے جو علم سے پر ہے۔

ت ب ع

تَبِعَهُ وَاتَّبَعَهُ کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں یہ کبھی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲-۳۸) تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ غمناک ہونگے۔

قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا (۳۶-۲۰-۲۱) کہنے لگا کہ اے میری قوم پیغمبروں کے پیچھے چلو ایسے کے جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ (۲۰-۱۲۳) تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ (۷-۳) (لوگو) جو (کتاب) تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو۔

وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ (۲۶-۱۱۱) اور تمہارے پیرو تو ذلیل لوگ ہوتے ہیں۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي (۱۲-۳۸) اور اپنے باپ دادا ... کے مذہب پر چلتا ہوں

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۴۵-۱۸) پھر ہم نے تم کو دین کے کھلے رستے پر (قائم) کر دیا ہے تو اسی (رستے) پر چلے چلو اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ (۲-۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو ... شیاطین پڑھا کرتے تھے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (۲-۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۳۸-۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی۔

هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَى أَنْ تُعَلِّمَنِ (۱۸-۶۶) اگر آپ اس میں سے مجھے سکھائیں تو میں آپکے ساتھ رہوں۔

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ (۳۱-۱۵) اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اسکے رستے پر چلنا۔

اَتْبَعَهُ کسی کے پیچھے چلنا اور اسے پالینا۔ قرآن میں ہے: فَأَتْبَعُوهُمْ مُشْرِقِينَ (۲۶-۶۰) تو انہوں نے سورج نکلتے ہی جا لیا۔

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا (۱۸-۸۹) پھر اس نے دوسرا رستہ پایا

وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً (۲۸-۴۲) اور اس دنیا میں ہم نے ان کے ساتھ لعنت لگا دی۔

فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ (۷-۱۷۵) اس نے اسے پالیا۔

فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا (۲۳-۴۴) تو ہم بھی بعض

---

۱ فارن مجاز القرآن لابی عبیدۃ (۲: ۲۰۹) وزاد وموضع تبع الجاہلیۃ موضع الخلیفۃ فی الاسلام وہم ملوک العرب الاعاظم (دیکھئے فتح الباری ۸ / ۴۹۴)

کو بعض کے پیچھے لگا تے (یعنی ہلاک کرتے) رہے۔
اُتْبِعَتْ عَلَیْہِ (قرض) دوسرے کے حوالہ کرنا۔ دوسرے پر اتارنا۔ احاطہ کرنا۔ اُتْبِعَ فُلَانٌ بِمَالٍ مال اس پر حوالہ کیا گیا۔
اَلتَّبِیْعُ بچھڑا جو ابھی تک گائے کے پیچھے پیچھے چلتا ہو۔
اَلتَّبَعُ۔ چارپائے کی ٹانگ۔ گویا دوڑتے وقت اس کی ٹانگیں اُن لوگوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں جو طلب انتقام میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوتے ہیں۔
اَلْمُتْبِعُ۔ وہ چوپایہ جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو۔
تُبَّعٌ۔ رؤسائے یمن کا لقب تھا کیونکہ وہ سیاست وریاست میں ایک دوسرے کی اتباع کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ تُبَّعٌ ایک بادشاہ کا لقب ہے جس کی رعیت اس کی مطیع اور فرمانبردار تھی اس کی جمع تَبَابِعَۃٌ ہے[1] قرآن میں ہے:۔
اَھُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ (۴۴-۳۷) بھلا یہ اچھے ہیں یا تبع کی قوم۔ اَلتُّبَّعُ (ایضًا) سایہ کیونکہ وہ دھوپ کے پیچھے لگا رہتا ہے۔

(ت ب ر)

اَلتَّبْرُ (ض) کے معنی توڑ دینے اور ہلاک کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ تَبَرَہٗ وَ تَبَّرَہٗ اس نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّ ھٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْہِ (۷-۱۳۹) یہ لوگ جس (فعل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ برباد ہونیوالا ہے۔
وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا (۱۷-۷) اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔
وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا (۷۱-۲۸) اور ظالم لوگوں کے لئے اور زیادہ تباہی بڑھا۔

(ت ت ر)

تَتْرٰی۔ یہ مُوَاتَرَۃ سے فَعْلٰی کے وزن پر ہے جس کے معنی کسی چیز کے یکے بعد دیگرے آنے کے ہیں۔ اصل میں یہ وَتْرٰی واؤ کے ساتھ ہے[2] تُرَاث اور تجاہ کی طرح اس کی واؤ تا سے تبدیل ہوگئی ہے[3] جن کے نزدیک یہ منصرف ہے وہ الف زائدہ بنانے ہیں[4] اور جن کے نزدیک غیر منصرف ہے۔ اِن کے نزدیک الف تانیث ہے[5] قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (۲۳-۴۴) پھر ہم پے در پے اپنے پیغمبر بھیجتے رہے۔
قرار کہتے ہیں کہ رفعی اور جری حالت میں تَتْرٰی اور نصبی حالت میں تَتْرًا ہے اور الف تنوین کے عوض میں آیا ہے۔ ثعلب کے نزدیک یہ تَفْعَلُ کے وزن پر ہے۔ ابوعلی الفنبور کہتے ہیں[6] کہ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ صفت کا کوئی صیغہ تَفْعَلُ کے وزن پر نہیں آتا۔

(ت ج ر)

تَجَرَ (ن)، تَجْرًا وَ تِجَارَۃً کے معنی نفع کمانے کے لئے راس المال کو کاروبار میں لگانے کے ہیں۔ صیغہ صفت تَاجِرٌ و تَجْرٌ جیسے صَاحِبٌ وَصَحْبٌ یاد رہے۔ کہ عربی زبان میں اس کے سوا اور کوئی لفظ

---

[1] ولذا ذکرہ المؤلف ایضًا فی (وتر) [2] ای علی خلاف القیاس ومثلہا فی احد وأناۃ والسمار [3] ای کانت للالحاق کما فی ارطی ینون نکرۃ لا معرفۃ وان کانت اصلیۃ ینون وایضًا [4] وفی شرح الکتاب للسیرافی (۲: ۹) وجعل بعضہم الفہا للتانیث فیقر بغیر تنوین وہی قراءۃ الجمہور وقرا ابن کثیر وابوعمرو بالتنوین فوزنہ فعل واللفہ بدل من التنوین وخط المصحف یؤید الانصراف والتنوین [5] والفراء

ایسا نہیں ہے۔ جس میں تاء اصلی کے بعد جیم ہو۔ رہا تجاہ تو اصل میں وجاہ ہے اور تجوب وغیرہ میں تاء اصلی نہیں ہے بلکہ فعل مضارع کی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۶۱-۱۰) میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے۔
میں لفظ تجارۃ کی تفسیر خود قرآن نے بعد کی آیت: تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ الآیہ میں بیان فرما دی ہے۔
نیز فرمایا۔ اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ (۲-۱۶) ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا۔
اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۴-۲۹) ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ جائز ہے)
تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ (۲-۲۸۲) سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔
ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ فُلَانٌ تَاجِرٌ بِكَذَا کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز میں ماہر ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔

(ت ح ت)

تَحْتَ (اسم ظرف) یہ فوق کی ضد ہے قرآن میں ہے۔
لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۵-۶۶) تو ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲-۲۵) (نعمت کے) باغ میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔
فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ (۹-۲۴) اس وقت ان کے نیچے کی جانب سے آواز دی۔
تحت اور اسفل میں فرق یہ ہے کہ تحت اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے نیچے ہو مگر اسفل کسی چیز کے نچلا حصہ کو جیسے:۔ اَلْمَالُ تَحْتَهٗ (مال اس کے نیچے ہے) اَسْفَلُهٗ اَغْلَظُ مِنْ اَعْلَاهُ (اس کا نچلا حصہ اعلیٰ حصہ سے سخت ہے)
حدیث میں ہے[1] (۴۸) لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ التُّحُوْتُ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ کمینے لوگ غلبہ حاصل نہ کرلیں۔ بعض نے کہا ہے کہ حدیث میں آیت کریمہ:۔
وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (۸۴-۴) اور جب یہ زمین ہموار کردی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] کلمۃ من حدیث طویل ذکرہ ابن حبان فی زوائدہ فی امارات الساعۃ انثار حدیث ابی ہریرۃ رقم ۱۸۸۷ والحافظ فی الفتح ۱۷/۱۲۱ من الطبرانی فی الاوسط وایضاً من طریق الی علقمۃ عن ابی ہریرۃ وعبداللہ بن مسعود وراجع الزمخشری فی الفائق ۱/۹۹ (تحت) اقال وذکرہ مثلاً للارذلہ،

(ت خ ذ)

تَخِذَ (س) بمعنی اَخَذَ یعنی پکڑنے کے آتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] ع (طویل)

(۷۷) وَقَدْ تَخِذَتْ رِجْلِیْ اِلٰی جنبِ غَرْزِهَا
نَسِیْفًا کَاُفْحُوْصِ الْقَطَاةِ الْمُطَرِّقِ

اس کے رکاب کے پہلو میں انڈا دینے والی قطا کے گڑھے جیسے نشان کو میرے پاؤں چھو رہے تھے۔

اسی سے اِتَّخَذَ (افتعال) ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِیْ (۱۸-۵۰) کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو۔

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (۲-۸۰) ان سے پوچھو کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (۲-۱۲۵) جس مقام پر ابراہیم کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنالو۔

لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ (۶۰-۱) تم میرے اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔

لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا (۱۸-۷۷) اگر آپ چاہتے تو ان سے (اسکا) معاوضہ لیتے (تاکہ کھانے کا کام چلتا)

(ت ر ب)

اَلتُّرَابُ کے معنی مٹی کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔
اِنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (۳۰-۲۰) کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔

يٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا (۷۸-۴۰) کہ اے کاش کہ میں مٹی ہوتا۔

تَرِبَ کے معنی فقیر ہونے کے ہیں کیونکہ فقر بھی انسان کو خاک آلودہ کر دیتا ہے۔ فرمایا:۔
اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۹۰-۱۶) یا فقیر خاکسار کو یعنی جو بوجہ فقر و فاقہ کے خاک آلودہ رہتا ہے۔

اَتْرَبَ (افعال) کے معنی مال دار ہونے کے ہیں۔ گویا اس کے پاس مٹی کی طرح مال ہے نیز تُرَابٌ کے معنی زمین کے بھی آتے ہیں اور اس میں اَلتَّيْرَابُ، تَيَارِبُ اور اَلتَّوْرَابُ وَ اَلتَّوْرَبُ وَ اَلتَّوْرَابُ وغیرہ (دس) لغات ہیں[2]

رِيْحٌ تَرِبَةٌ خاک اڑانے والی ہوا۔ اسی سے آنحضرت کا فرمان ہے[3] (۵۰) عَلَيْكَ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ کہ شادی کے لئے دیندار عورت تلاش کر۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ (اس میں تنبیہ ہے کہ دیندار عورت تیرے ہاتھ سے نہ جانے پائے ورنہ تمہارا مقصد حاصل

---

[1] وغریب ابی عبید ۳/۱۲۵ قالہ المرق العبدی واسمہ شاس بن نہار والبیت فی اللسان (طرق) وفی روایتہ لقعید ل وقد راجع ایضا التاج واللسان (تخذ، فحص، طرق، نسف) والصحاح (طرق) والمحکم (فحص) والاصمعیات ۷۴ والجمہرۃ (۲: ۴۶، ۲۲۳، ۱، ۲، ۷، ۳/۳: ۹۳) والعینی (۴: ۵۹۰) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۴۱۱) والطبری (۱۵: ۲۹۱) وشواہد الکشاف والسیوطی ۲۴۳ والاشباہ والنحویہ (۱: ۱۰۹، ۳/۲: ۴۱) والشاعر جاہلی قدیم ترجم لہ فی الشعراء ۲۳۶ والمؤتلف ۱۸۵ والمرزبانی ۴۹۵ والاشتقاق ۱۹۹ والبیت ایضا فی الیلان (۵: ۸۱) والقطاۃ المطرق التی حان خروج بیضہا والنسیف اثر رکض الرجل بجنبی البعیر او فحص عنہ الوبر وفی المطبوع المطوق بالواو بدل الراء تصحیف والبیت یستشہد بہ علی ان تخذ یاتی بمعنی اخذ [2] راجع المعاجم [3] راجع للحدیث النہایہ (ترب) واللسان (ترب) وامثال ابی الطیب ۱۲۶ واختلف فی تاویلہ انظر اعراب ابن خالویہ ۹۳ واصل الحدیث متفق من حدیث ابی ہریرۃ راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ۲/۲۷ ونیل الاوطار للشوکانی ۶/۱۱۲-۱۱۳، وشرح الترمذی للشیخ المبارکفوری وادب الدنیا والدین للماوردی ۱۴۷ وفی روایۃ ابی سعید الخدری تربت یمینک کما فی زوائد ابن حبان رقم ۱۲۳۱۔

نہیں ہوگا اور تم غیر شعوری طور پر فقیر ہو جاؤ گے۔[1]
بَارِحٌ تَرِبٌ خاک اڑانے والی ہوا۔
تَرَائِبُ سینہ کی پسلیاں (مفرد تَرِیبَۃٌ) قرآن میں ہے:۔ یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اَبْکَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا۔ (۵۶-۳۷) کنواریاں، اور شوہروں کی پیاریاں اور ہم عمر۔ وَکَوَاعِبَ اَتْرَابًا (۷۸-۳۳) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔ وَعِنْدَھُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ (۳۸-۵۲) اور ان کے پاس نیچی نگاہ رکھنے والی (اور) ہم عمر (عورتیں) ہوں گی۔ میں اتراب کے معنی ہیں ہم عمر جنہوں اکٹھی تربیت پائی ہوگی گویا وہ عورتیں اپنے عادات کے اس طرح مساوی اور مماثل یعنی ہم مزاج ہوں گی جیسے سینوں کی ہڈیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور یا اس لئے کہ گویا زمین پر یک وقت واقع ہوئی ہیں اور بعض نے یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ وہ اکٹھی مٹی میں ایک ساتھ کھیلتی رہی ہیں۔

(ت ر ث)

تُرَاثٌ (ورثہ) یہ اصل میں وِرَاثٌ مثال واوی ہے۔ (جیسا کہ ورث میں بیان ہوگا۔ قرآن میں ہے:۔ وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا (۸۹-۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

(ت ر ف)

اَلتُّرْفَۃُ۔ عیش و عشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اُتْرِفَ فُلَانٌ فَھُوَ مُتْرَفٌ وہ آسودہ حال اور کثرت دولت کی وجہ سے بدمست ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَاَتْرَفْنٰھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۲۳-۳۳) اور دنیا کی زندگی میں ہم نے اس کو آسودگی دے رکھی تھی۔ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِیْہِ (۱۱-۱۱۶) اور جو ظالم تھے وہ ان ہی باتوں کے پیچھے لگے رہے۔ جن میں عیش و آرام تھا۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰی مَآ اُتْرِفْتُمْ فِیْہِ (۲۱-۱۳) اور جن (نعمتوں) میں تم عیش و آسائش کرتے تھے ان کی طرف لوٹ جاؤ۔ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْھِمْ بِالْعَذَابِ (۲۳-۶۴) ہم نے ان میں سے آسودہ حال لوگوں کو پکڑ لیا۔ اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا (۱۷-۱۶) تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو بڑھا دیتے ہیں۔ اور یہی وہ مترفین ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا:۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىہُ رَبُّہٗ فَاَکْرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ (۸۹-۱۵) مگر انسان عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے۔

(ت ر ق)

اَلتَّرْقُوَۃُ کے معنی ہنسلی کی ہڈی کے ہیں[2] (ج)

---

[1] قالی الثعالبی فی الذیل وحملہ اکثر العلماء علی التنبیہ والاغراء وان کان لفظ الدعاء (علیہ وراجع اضداد ابی الطیب ۱۱۶-۱۱۸ والذیل (۵) ومن حملہ علی الدعاء علیہ قال معناہ: ان احترت غیر ذات الدین وخالفت الوصیۃ۔ و ہہنا محل آخر للحدیث وھو ان اترب من الاضداد یاتی بمعنی الفقر وبمعنی الغنی فمعناہ والدعاء لہ بالغنا اذا قبل وصیتہ ۱۲

[2] ذکرہ بعض اصحاب اللغۃ فی (ر ق ی) والصحیح انہ من (ت ر ق) کما ھہنا قال فی اللسان (ت ر ق) علی وزن فعلوۃ

اَلتَّرَاقِیُ قرآن میں ہے :-
كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۔ (۷۵-۲۶) دیکھو جب جان گلے تک پہنچ جائے ۔

(ت ر ک)

تَرْكُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو چھوڑ دینا کے ہیں[1] خواہ وہ چھوڑنا ارادہ و اختیار سے ہو اور خواہ مجبوراً چنانچہ ارادۃً اور اختیار کے ساتھ چھوڑنے کے متعلق فرمایا :-
وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ (۱۸-۹۹) اس روز ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ (وہ روئے زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۴۴-۲۴) اور دریا سے (کہ) خشک (ہو رہا ہوگا) پار ہو جاؤ۔

اور بحالت مجبوری چھوڑنے کے متعلق فرمایا :-
كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ (۴۴-۲۵) وہ لوگ بہت سے باغ چھوڑ گئے ۔

اسی سے جب کوئی شخص اپنی موت کے بعد مال چھوڑ جاتا ہے تو اس کو تَرِكَة کہا جاتا ہے ۔ اور کبھی ہر عمل کے متعلق جو کسی حالت پر منتہی ہو، تَرَكْتُهٗ كَذَا یا اس کے ہم معنی جَعَلْتُهٗ کا محاورہ استعمال کر لیتے ہیں جیسے :- تَرَكْتُ فُلَانًا وَحِيْدًا کہ میں نے اسے اس حال میں چھوڑا کہ وہ اکیلا تھا ۔

اَلتَّرِيْكَةُ کے اصل معنی جنگل میں پڑے ہوئے انڈا کے ہیں اور (مجازاً) عورت کو بھی تَرِيْكَة کہا جاتا ہے ۔ جیسا کہ اس پر بَيْضَة کا لفظ بولا جاتا ہے ۔

(ت س ع)

تِسْعَةٌ (نو) اور تِسْعُوْنَ (نوے) اسماء عدد سے ہیں۔ قرآن میں ہے :-
تِسْعَةُ رَهْطٍ (۲۷-۴۸) نو شخص۔ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً (۳۸-۲۳) ننانوے دنبیاں ۔ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۷۴-۳۰) اس پر انیس داروغے ہیں۔ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا (۱۸-۲۵) نو اوپر تین سو سال ۔

اَلتِّسْعُ (ایضًا) نو دن کے پیاسے اونٹ۔ اَلتُّسْعُ ہر ماہ کی ساتویں، آٹھویں اور نویں تاریخ (ان تین دنوں کو تُسَع کہا جاتا ہے۔ تَسَعْتُ الْقَوْمَ قوم کے مال سے نواں حصہ وصول کرنا یا ان میں نواں تھا

(ت ع س)

اَلتَّعْسُ۔ اصل میں تعس کے معنی پھسل یا لغزش کھا کر گرنا اور پھر اٹھ نہ سکنا۔ پستی میں گر کر کسی چیز کا ٹوٹ جانا) اور یہ تَعِسَ (س) تَعْسًا وَتَعْسَةً کا مصدر ہے[2]۔ قرآن میں ہے :-
فَتَعْسًا لَّهُمْ (۴۷-۸)، ان کے لئے ہلاکت ہے[3]۔

(ت ف ث)

اَلتَّفَثُ کے اصل معنی ناخن وغیرہ کی میل کچیل کے ہیں جسے بدن سے دور کیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :-
ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ (۲۲-۲۹) پھر چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں ۔
یہاں لْيَقْضُوْا قَضَی الشَّیْءَ سے ہے جس کے معنی

---

[1] قد یاتی فی معنی البقی کما فی الآیۃ: وترکنا علیہ فی الآخرین (۳۷-۷۸) ای ابقینا الثنا علیہ ۱۲ [2] تعس ـ تعس: الفعل منہ تعس مثل وضع کما فی القاموس [3] تعسًا منصوب علی المصدر بفعل یجب اضمارہ (راجع الکشاف) وقال الخفاجی فی الدرۃ ۱۲۷ یقال فی الدعاء علی العاثر والفعل منہ بکسر العین ۱۲

کسی چیز کو قطع اور زائل کرنے کے ہیں ایک اعرابی کا قول ہے۔ مَا اَتْفَثَكَ وَمَا اَدْرَنَكَ۔ تو کس قدر میلا کچیلا ہے۔

(ت ق و)

اَلتَّقْوٰى۔ تقوٰی کی تاء واؤ سے مبدل ہے اس پر اس کے باب (وق ی) میں بحث آئیگی۔

(ت ك ء)

اَلْمُتَّكَاءُ (اسم مکان) سہارہ لگانے کی جگہ۔ تکیہ جس پر ٹیک لگائی جائے اور آیت کریمہ:۔ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً (۱۲-۳۱) اور ان کے لئے ایک محفل مرتب کی۔ میں مُتَّكَاً کے معنی ترنج کے ہیں[1] اور بعض نے کہا ہے کہ مراد کھانا اور یہ اِتَّكَاَ عَلٰی كَذَا فَاَكَلَهٗ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ قرآن میں ہے:۔ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا (۲۰-۱۸) یہ میری لاٹھی ہے جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں۔ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ (۵۲-۲۰) تختوں پر جو برابر برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِــُٔوْنَ (۳۶-۵۶) تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ (۵۶-۱۶) آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوئے۔

(ت ل ل)

اَلتَّلُّ۔ اصل میں تَلٌّ کے معنی بلند جگہ یعنی ٹیلے کے ہیں اور تَلِيْلٌ گردن کو کہتے ہیں اور تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (۳۷-۱۰۳) کے معنی ٹیلے پر لٹا دینے کے ہیں جیسے تَتْرِبَةٌ (کسی کو زمین پر گرانا)۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی تَلِيْل یعنی گردن اور رخسار کے بل لٹا دینا ہیں جیسا کہ جبین (پیشانی) کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے۔ مِتَلٌّ نیزہ وغیرہ جسے مار کر کسی کو پچھاڑا جاتا ہے (سیدھا اور سخت نیزہ)

(ت ل و)

تَلَاهُ (ن) کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنا کے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی اجنبی کو چیز حائل نہ ہو یہ کہیں تو جسمانی طور ہوتا ہے اور کہیں اس کے احکام کا اتباع کرنے سے اس معنی میں اس کا مصدر تُلُوٌّ اور تَلْوٌ آتا ہے اور کبھی یہ متابعت کسی کتاب کی قراءت (پڑھنے) اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے غور و فکر کرنے کی صورت میں ہوتی ہے اس معنی کے لئے اس کا مصدر تِلَاوَةٌ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۹۱-۲) اور چاند کی قسم جب وہ سورج کا اتباع کرتا ہے۔ میں سورج کا اتباع بلحاظ اقتداء اور مرتبہ مراد ہے اور یہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے اور وہ سورج کے لئے بمنزلہ خلیفہ کے ہے۔ چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ:۔ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (۱۰-۵) میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ضیاء بنسبت نور کے زیادہ روشن ہوتی ہے۔ اور

---

[1] قال القتبی المتکا الطعام قال ابوعبیدۃ فی مجازہ (۱: ۳۰۹) وزعم قوم انہ لاترج وہذا ابطل باطل فی الارض ثم ذکر وعلیہ ابوعبید فی غریبہ وقال القتباء اعلم بالتاویل منہ قال الشیری ثم ذکر الصحیح ما قال ابوعبیدۃ واخذہ البخاری راجع فتح الباری (۸: ۲۷۰) ۱۲

لفظ ضیاء کے اندر نور کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر نور کے اندر ضیاء کا مفہوم نہیں آتا۔

اور آیت کریمہ :۔ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (۱۱-۱۷) اور ان کے ساتھ ایک (آسمانی) گواہ بھی اس کی جانب سے ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ ایسا شاہد جو اس کی پیروی کرتا ہے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے۔ يَتْلُونَ آيَاتِ اللهِ (۳-۱۱۳) وہ آیات الہٰی کی تلاوت کرتے ہیں۔

اَلتِّلَاوَۃُ۔ بالخصوص خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے اتباع کو تلاوۃ کہا جاتا ہے کبھی یہ اتباع ان کی قرأت (پڑھنے) کی صورت میں ہوتی ہے اور کبھی ان کے اوامر ونواحی (احکام) ترغیب وترہیب اور جو کچھ ان سے سمجھا جا سکتا ہے ان کی اتباع کی صورت میں، مگر یہ لفظ قرأت (پڑھنے) سے خاص ہے یعنی تلاوۃ کے اندر قراءۃ کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر تلاوۃ کا مفہوم قراءۃ کے اندر نہیں آتا چنانچہ کسی کا خط پڑھنے کے لیے تَلَوْتُ رُقْعَتَكَ نہیں بولتے بلکہ یہ لفظ صرف قرآن پاک سے کچھ پڑھنے پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے اس پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے اور آیت کریمہ :۔

هُنَالِكَ تَتْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ (۱۰-۳۰) وہاں ہر شخص (اپنے) اعمال کی، جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کر لے گا۔ میں ایک قرأت تتلوا بھی ہے یعنی وہاں ہر شخص اپنے عمل نامے کو پڑھ کر اس کے پیچھے چلے گا۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا (۴۵-۲۵) اور ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ (۲۹-۵۱) کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

قُلْ لَّوْ شَاءَ اللهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ (۱۰-۱۶) (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا (تو) میں ہی یہ (کتاب) تم کو پڑھ کر نہ سناتا۔

وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا (۸-۲) اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔

یہاں تلاوۃ بمعنی قرأت کے ہے اور یہی معنی آیات ذیل میں ہیں۔

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ (۱۸-۲۷) اور اپنے پروردگار کی کتاب کو جو تمہارے پاس بھیجی جاتی ہے پڑھتے رہا کرو۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ (۵-۲۷) اور (اے محمدؐ) ان کو آدم کے دو بیٹوں (ہابیل وقابیل) کے حالات (جو بالکل سچے ہیں) پڑھ کر سنا دو۔

فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا (۳۷-۳) پھر ذکر (یعنی قرآن) پڑھنے والوں کی۔

اور آیت کریمہ :۔ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ (۲-۱۲۱) وہ اس کو (ایسا) پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے پڑھ کر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں اور آیت کریمہ :۔ ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ (۳-۵۸) یہ ہم تم کو (خدا کی) آیتیں اور حکمت بھری نصیحتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ میں نَتْلُوهُ کے معنی نازل کرنا کے ہیں کیونکہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی نازل کرنا ہی ہوتے ہیں۔ اور آیت کریمہ :۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّيٰطِيْنُ (۲-۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو... شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ یہں شیاطین کے پڑھنے کو تلاوت کہنا ان کے اس ادعا کی بنا پر ہے کہ جو کچھ وہ پڑھ کر سناتے وہ کتب الہیہ کا حصہ ہے۔

اَلتَّلَاوَۃُ وَالتَّلِیَّۃُ (قرض وغیرہ کا) باقی ماندہ حصہ جسے وصول کرنے کے لئے پیچھا کرنا پڑتا ہے۔

اَتْلَیْتُہٗ کے معنی کسی کے پیچھے لگانے کے ہیں جیسے اَتْلَیْتُ فُلَانًا عَلٰی فُلَانٍ بِحَقِّ یعنی میں نے اس کا قرضہ فلاں کے حوالہ کر دیا فلانٌ یتلوا علی فُلان وَ یَقُوْلُ عَلَیْہِ یعنی وہ فلاں پر جھوٹ بولتا اور اس پر غلط بیانی کرتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ (۳-۷۸) اور خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ لَا دَرَیْتَ وَلَا اَتْلَیْتَ اَوْ لَا تَلَیْتَ وَلَا دَرَیْتَ تو یہاں پر تَلَیْتَ اصل میں تَلَوْتَ ہے قانون مزاوجت کی وجہ سے تَلَیْتَ کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مَازُوْرَاتٍ غَیْرَ مَاجُوْرَاتٍ میں ہے کہ اصل میں مَوْزُوْرَاتٍ ... ہے یعنی وہ بغیر اجر کے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹیں[1]۔

(ت م م)

تَمَامُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کے اس حد تک پہنچ جانے کے ہیں جس کے بعد اسے کسی خارجی شے کی احتیاج باقی نہ رہے اس کی ضد ناقص ہے یعنی وہ جو اپنی ذات کی تکمیل کے لئے ہنوز خارجی شے کی محتاج ہو اور تمام کا لفظ معدودات کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور مقدار وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے مثلاً عَدَدٌ تَامٌّ وَکَیْلٌ تَامٌّ قرآن میں ہے:۔

وَتَمَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ (۷-۱۳۷) (۶-۱۱۵) (۱۱-۱۱۹) اور تمہارے پروردگار کا وعدہ پورا ہوا۔

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ (۶۱-۸) حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا۔

وَاَتْمَمْنٰہَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّہٖ (۷-۱۴۲) اور دس (راتیں) اور ملا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا تو اس کے پروردگار کی ... میعاد پوری ہو گئی[2]۔

(ت و ب)

اَلتَّوْبُ (ن) کے معنی گناہ کے باحسن وجوہ ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لَمْ اَفْعَلْہُ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لئے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشنے لگ جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلائے افرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ

---

[1] کما فی الاتباع لابی الطیب (۳۰) نفی الفائق (۱-۲۰۷) وفی حدیث المنکر فیقول لا دریت ولا تلیت ومعناہ لا قرأت ولا درست قال فی النہایۃ (تلا) والمحدثون یروون کذالک والصواب لا اتلیت والکلمۃ انفعال من الوت[؟] وذکروا من اغلاط الازدواج ایضاً حدیث غیر خزایا ولا ندامی راجع فتح الباری (۱: ۱۴۰) والغدایا والعشایا والاقتضاب (۲۷۸) والبحث فی ابن جنی علی تصریف المازنی ۲۱۶-۲۱۷ وشرح الدرۃ للخفاجی ۷۹ وفی الشریشی (۲: ۳۳۲) ان التشدید فی یا رب الشجی للمزاوجۃ مع الخلی والکلام علی الازدواج۔ ابن الطیب علی الاقتراح ۱۲۸۷

[2] ایضاً تمام (۷-۱۴۵) والنذر (۱۱-۱۴) (۲۳-۲۷)

کہا جاتا ہے مگر شرعاً اسے توبہ جب کہیں گے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پہ نادم ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔

تَابَ اِلَی اللّٰہِ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن میں ہے:۔

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا (۲۴-۳۱) سب خدا کے آگے توبہ کرو۔

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ (۵-۷۴) توبہ کیوں خدا کے آگے توبہ نہیں کرتے۔

تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ اللہ نے اس کی توبہ قبول کی اسی سے فرمایا:۔

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ (۹-۱۱۷) بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین پر۔

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا (۹-۱۱۸) پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ (۲-۱۸۷) سو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے درگزر فرمائی۔

اَلتَّائِبُ (اسم فاعل) توبہ کرنے والا۔ توبہ قبول کرنے والا بندہ خدا کے سامنے توبہ کرتا ہے اور اللہ توبہ قبول فرماتا ہے اس لئے تَائِبٌ کا لفظ اللہ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔

اَلتَّوَّابُ یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صفت ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے چھوڑتے بالکل گناہوں کو ترک کردے اور جب تواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۲-۳۷) بیشک وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا (۲۵-۷۱) کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ترک کرکے عمل صالح کا نام ہی مکمل توبہ ہے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ (۱۳-۳۰) میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

(ت و ر)

اَلتَّوْرَاةُ آسمانی کتاب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی یہ وَرْیٌ سے مشتق ہے اور تاء واؤ سے مبدل ہے علمائے کوفہ کے نزدیک یہ وَوْرَاةٌ بروزن تَفْعَلَةٌ ہے اور بعض کے نزدیک تَفْعَلُ کے وزن پر ہے جیسے تَتْفُلُ لیکن کلام عرب میں تَفْعَلُ کے وزن پر اسم کا صیغہ نہیں آتا۔

علماء بصرہ کے نزدیک یہ وَوْرَی بروزن فَوْعَلَ ہے جیسے حَوْقَلَ قرآن میں ہے:۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ (۵-۴۴) بے شک ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (۴۸-۲۹) ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔

(ت ا ر ۃ)

تَارَۃ کے معنی ایک مرتبہ کے ہیں قرآن میں ہے:
ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى (۲۰-۵۵) پھر تم دوسری مرتبہ نکالیں گے۔
بقول بعض یہ تَارَ الجُرحُ سے مشتق ہے جس کے معنی زخم کا بھر جانا اور مندمل ہو جانا کے ہیں۔

(ت ی ن)

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ (۹۵-۱) انجیر کی قسم اور زیتون۔ بعض کے نزدیک تین اور زیتون دو پہاڑوں کے نام ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کھانے کی دو چیزیں ہیں ان کے مقام ورود اور اختصاص کی تحقیق اس کتاب کے بعد بیان ہو گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(ت ی ہ)

تَاہَ (ض) کے معنی متحیر ہونے کے ہیں اور یہ باب تَاہَ يَتُوْهُ (واوی) بھی آتا ہے قصہ بنی اسرائیل میں فرمایا:۔
اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ (۵-۲۶) چالیس برس تک ...... اور (جنگل کی) زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں گے۔
تَوَّهَهُ وَتَيَّهَهُ حیران کرنا اور پھینک دینا۔
وَقَعَ فِي التِّيْهِ وَالتَّوْهِ (ورطہ) حیرت میں پھنس گیا۔
مَفَازَةٌ تَيْهَاءُ وہ جنگل جس میں مسافر بھٹک جائیں۔

كِتَابُ الثَّاء

(ث ب ت)

اَلثَّبَاتُ یہ زوال کی ضد ہے اور ثَبَتَ (ن) ثَبَاتًا کے معنی ایک حالت پر جمے رہنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا (۸۔۴۵) مومنو جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔

رَجُلٌ ثَبْتٌ وَثَبِيْتٌ فِی الْحَرْبِ لڑائی میں ثابت قدم رہنے والا مرد۔ اَثْبَتَ السَّهْمَ فِيْهِ اس میں تیر آر پار کر دیا۔ اور ثَابِتٌ کا لفظ اس پر بھی بولا جاتا ہے جو نظروں کے سامنے موجود ہو اور اس پر بھی جو کسی دلیل سمعی کی رو سے صحیح ہو مثلاً:۔

فُلَانٌ ثَابِتٌ عِنْدِیْ فلاں حکم میرے نزدیک دلیل کی رو سے صحیح ہے۔ نُبُوَّةُ النَّبِیِّ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم) ثَابِتَةٌ آنحضرت کی نبوت ثابت ہے یعنی از روئے دلائل صحیح ہے۔

اَلْاِثْبَاتُ وَالتَّثْبِيْتُ (افعال وتفعیل) کے معنی کبھی تو کسی چیز کو فی الواقع موجود کرنے کے ہوتے ہیں مثلاً اَثْبَتَ اللّٰهُ كَذَا (اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو موجود کر دیا) اور کبھی ثبوت حکمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَثْبَتَ الْحَاكِمُ عَلٰی كَذَا (قاضی نے فلاں پر یہ حکم لگایا) اور کبھی اثبات باعتبار قول مراد ہوتا ہے۔ خواہ وہ بات نفس الامر میں حق ہو یا باطل جیسے:۔

اَثْبَتَ التَّوْحِيْدَ وَصِدْقَ النُّبُوَّةِ اس نے توحید اور صدق نبوت کو دلائل سے ثابت کیا۔

فُلَانٌ اَثْبَتَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فلاں نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ثابت کیا اور آیت کریمہ:۔

لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ (۸۔۳۰) تاکہ تم کو قید کر دیں یا جان سے مار ڈالیں۔

میں لِيُثْبِتُوْا کے معنی قید کرنے یا ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۴۔۲۷) خدا مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور پکی) بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے۔

میں "قول ثابت" سے دلائل قویہ مراد ہیں اور آیت:۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا (۴۔۶۶) اور اگر یہ اس نصیحت پر کاربند ہوتے جو ان کو کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور (دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔

میں اَشَدَّ تَثْبِيْتًا کے معنی علم و ایمان کے لحاظ سے مضبوطی بھی مراد ہو سکتی ہے[1] اور اعمال کی پائیداری اور ان کا ثمرہ حاصل کرنے کے لحاظ سے بھی تثبیت مراد ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں گے جن کے اعمال کی ناپائیداری بیان کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے:۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵۔۲۳) اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے

---

[1] کما قال السدی راجع ابن کثیر (۱: ۵۲۲)

ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دینگے۔

محاورہ ہے:۔ ثَبَّتُّهٗ:۔ میں نے اسے استحکام بخشا، ثابت قدم رکھا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ .... (۱۷-۷۴) اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے۔

فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۸-۱۲) تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (۲-۲۶۵) اور خلوص نیت سے۔[1]

وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (۳-۱۴۷) اور ہم کو ثابت قدم رکھ۔

(ث ب ر)

اَلثُّبُوْرُ (مصدر ن) کے معنی ہلاک ہونے یا (زخم کے) خراب ہونے کے ہیں اور اَلْمُثَابِرُ کسی کام کو مسلسل کرنے والا) ثَابَرَ عَلَى الْاَمْرِ سے (اسم فاعل کا صیغہ) ہے۔ جس کے معنی کسی کام کو مسلسل کرنا کے ہیں قرآن میں ہے:۔

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا (۲۵-۱۳-۱۴) تو وہاں ہلاکت کو پکاریں گے آج ایک ہی ہلاکت کو نہ پکارو، بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔

اور آیت کریمہ:۔

وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (۱۷-۱۰۲) اے فرعون میں خیال کرتا ہوں کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

میں ابن عباسؓ نے مَثْبُوْرًا کے معنی ناقص العقل کئے ہیں کیونکہ نقصانِ عقل سب سے بڑی ہلاکت ہے۔

ثَبِيْرٌ۔ مکہ کی ایک پہاڑی کا نام

(ث ب ط)

ثَبَّطَهُ الْمَرَضُ وَاَثْبَطَهُ: اسے مرض نے روک دیا اور اسے لازم ہو گئی قرآن میں ہے:۔

فَثَبَّطَهُمْ (۹-۴۶) تو ان کو ہلنے چلنے نہ دیا۔

(ث ب ی (و))

ثُبَةٌ کے معنی ایک جماعت کے ہیں اس کی جمع ثُبَاتٌ وَثُبِيْنَ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۴-۷۱) پھر یا تو جماعت جماعت ہو کر نکلا کرو یا سب اکٹھے کوچ کیا کرو۔

شاعر نے کہا ہے[2] (الوافر)

(۷۸) وَقَدْ اَغْدُوْ عَلٰى ثُبَةٍ كِرَامٍ

اور میں شریف لوگوں کی جماعت کے پاس جاتا ہوں اور اسی لئے ثَبَّيْتُ عَلٰى فُلَانٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کے متفرق محاسن بیان کرنے کے ہیں۔

ثُبَةٌ کی تصغیر ثُبَيَّةٌ ہے لہٰذا اس میں یاء محذوف ہے[3] لیکن ثُبَةُ الْحَوْضِ جس کے معنی وسطِ حوض ہیں جہاں پانی جمع ہوتا ہے یہ اجوف سے ہے اور اس میں عین کلمہ محذوف ہے۔[4]

(ث ج ج)

ثَجَّ (ن) ثُجُوْجًا۔ اَلْمَاءُ پانی کا زور سے بہنا

---

[1] ای متقربین بانما ثیب الله علیہا (الزجاج) [2] زہیرہ تمامہ نشاوی واجدین لما اشلو۔ راجع دیوانہ مع شرح الاعلم الشنتمری ۸ ۱۵ طبعہ لیدن والعقد الثمین ۷۷ والطبری (۵ / ۱۴۲) واللسان نشو، مجاز القرآن رقم ۱۵۶ اختیار الشعراء لابی ۲۵ (علیہ) وابن الانباری ۱۰۰ ومجموعۃ المعانی ۱۹۸ ومعاہد التنصیص (۱/ ۱۹۵) وفی روایۃ علی شرب بدل ثبۃ فلا شاہد [3] والمختار عند المحققین انہ ثبۃ من الواو واصلہا ثبوۃ وبہ قال ابن جنی والمؤلف انہ من الیاء [4] ذہب الجوہری وبعض علماء اللغۃ انہا من ثبۃ الحوض والذاہبۃ الواو من وسطہ وبہ قال ابو اسحاق بدلیل ثویبۃ لکن الاکثر علی النقص ۱۲

یا برسنا محاورہ ہے:۔ اَتَی الْوَادِیْ بِثَجِیْجِہٖ زبردست سیلاب آنا۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا (۷۸-۱۴) اور نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔
حدیث میں ہے:۔(۵)
اَفْضَلُ الْحَجِّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ یعنی افضل حج وہ ہے جس میں زور زور سے لبیک پکارا جائے اور کثرت سے قربانی کا خون بہایا جائے۔

(ث خ ن)

ثَخُنَ (ک) الشَّیْئُ کے معنی ہیں کسی چیز کا گاڑھا ہو جانا اس طرح کہ بہنے سے رک جائے اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔
اَثْخَنْتُہٗ ضَرْبًا وَاسْتِخْفَافًا میں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ اپنے مقام سے حرکت نہ کر سکا قرآن میں ہے:۔
مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸-۶۷) پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہا دے۔
حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴۷-۴) جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو۔

(ث ر ب)

اَلتَّثْرِیْبُ (تفعیل) کے معنی ہیں کسی کو اس کی غلطی پر سرزنش اور زجر و توبیخ کرنا قرآن میں ہے:
لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ (۱۲-۹۲) (یوسف نے کہا کہ آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (و ملامت) نہیں ہے۔
ایک روایت میں ہے[2]:۔ (۵)
اِذَا زَنَتْ اَمَۃُ اَحَدِکُمْ فَلْیَجْلِدْھَا وَلَا یُثَرِّبْھَا۔ کہ جب کوئی لونڈی زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے اور صرف ملامت پر اکتفا نہ کرے۔
اور عربی زبان میں اس سے صرف ثَرْبٌ کا لفظ معروف ہے جس کے معنی باریک اور پتلی سی چربی کے ہیں[3] (جو انتڑیوں کے ساتھ ہوتی ہے) اور آیت کریمہ:
یَا اَھْلَ یَثْرِبَ (۳۳-۱۳) اے اہل مدینہ۔ میں ہو سکتا ہے کہ یَثْرِبَ اسی مادہ سے ہو اور اس میں یا زائدہ ہو[4]۔

(ث ع ب)

ثَعَبَ (ف) ثَعْبًا۔ الْمَاءَ کے معنی ہیں اس نے پانی بہایا فَانْثَعَبَ اس کا مطاوع ہے جس کے معنی ہیں چنانچہ وہ بہ نکلا۔ اسی سے ثُعَبُ الْمَطَرِ ہے (جس کے معنی بارش کا بہتا ہوا پانی یا برساتی نالہ کے ہیں) اور ہو سکتا ہے کہ آیت کریمہ:۔
فَاِذَا ھِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ (۲۶-۳۲) تو وہ اسی وقت صریح اژدہا بن گئی۔
میں ثُعْبَانٌ (اژدہا) بھی ثَعَبْتُ الْمَاءَ کے محاورہ سے ماخوذ ہو سانپ بھی چونکہ زمین پر اس طرح چلتا

---

[1] الترمذی والنسائی من حدیث عمرو ابن ماجہ من حدیث محمد بن المنکدر عن جابر کرحق عن ابی بکر ۔ع۔ عن ابن مسعود راجع کنز العمال رقم وراجع لشرحہ غریب ابی عبید ۳/۱۴۰ [2] اصل الحدیث متفق علیہ رواہ احمد وابوداؤد من حدیث ابی ہریرۃ ولفظ الحدیث کما فی المراجع اذا زنت امۃ احدکم فتبین زنا ہا فلیجلدھا الحد ولا یثرب علیہا وفی روایۃ النسائی "ولا یعنفہا" [3] وفی الحدیث ان المنافق یؤخر العصر حتی اذا صارت الشمس کثرب البقرۃ صلاہا [4] ہم قدیم للمدینۃ باسم اول من سکنہا من ولد سام بن نوح وقد نہی النبی ان یقال لہا یثرب وسماہا طیبۃ وطابۃ لان فی مادۃ ثرب معنی الفساد ۱۲

ہے۔ جیسے پانی بہ رہا ہوتا ہے اسلئے اسے ثُعْلُبْ کہا گیا ہو۔ ثُغْبَۃٌ خبیث قسم کا گرگٹ ج ثُعَبٌ یہ بھی چونکہ شکل وصورت میں سانپ کے مشابہ ہوتا ہے اس لئے اسے ثُعْبَۃٌ کہا جاتا ہے اور جسم میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کے لفظ میں اختصار کر لیا گیا ہے۔

(ث ق ب)

اَلثَّاقِبُ اتنا روشن کہ جس چیز پر اس کی کرنیں پڑیں اس میں چھید کرتی پار گزر جائیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَاَتْبَعَہٗ شِہَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷-۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ ان کے پیچھے لگتا ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ (۸۶-۱،۲،۳) آسمان اور رات کے وقت آنے والے کی قسم اور تم کو کیا معلوم کہ رات کے وقت آنے والا کیا ہے؟ وہ تارا ہے چمکنے والا۔

اَلثَّاقِبُ اصل میں ثُقْبَۃٌ سے ہے جس کے معنی سوراخ کے ہیں۔ اَلْمِثْقَبُ پہاڑ میں سخت اور دشوار گزار راستہ گویا وہ سوراخ کی مثل ہے۔ ابوعمرو کا قول ہے کہ صحیح لغت مَثْقَبٌ (بفتح المیم) ہے[1] محاورہ ہے ثَقَّبْتُ النَّارَ میں نے آگ بھڑکائی۔

(ث ق ف)

اَلثَّقْفُ (س ک) کے معنی ہیں کسی چیز کے پالینے یا کسی کام کے کرنے میں حذاقت اور مہارت سے کام لینا۔ اسی سے اَلْمُثَاقَفَۃُ کا لفظ مستعار ہے۔ (جس کے معنی ہتھیاروں کے ساتھ باہم کھیلنے کے ہیں اور سیدھے نیزے کو رُمْحٌ مُثَقَّفٌ کہا جاتا ہے۔

اور اَلثِّقَافُ اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے نیزہ ل کو سیدھا کیا جاتا ہے۔

ثُقِفْتُ کَذَا کے اصل معنی مہارت نظر سے کسی چیز کا نگاہ سے ادراک کر لینا کے ہیں۔ پھر مجازاً محض کسی چیز کے پالینے پر بولا جاتا ہے خواہ اسکے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہ۔ قرآن میں ہے:۔ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (۲-۱۹۱) اور ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ (۸-۵۷) اگر تم ان کو لڑائی میں پاؤ۔

مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (۳۳-۶۱) پھٹکارے ہوئے، جہاں پائے گئے پکڑے گئے۔ اور جان سے مار ڈالے گئے۔

(ث ق ل)

اَلثِّقَلُ یہ خِفَّۃٌ کی ضد ہے اور اس کے معنی بھاری اور انبار ہونا کے ہیں اور ہر وہ چیز جو وزن یا اندازہ میں دوسری پر بھاری ہو اسے ثَقِيْلٌ کہا جاتا ہے۔ اصل (وضع) کے اعتبار سے تو یہ اجسام کے بھاری ہونے پر بولا جاتا ہے لیکن (مجازاً) معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے:۔

اَثْقَلَہُ الْغُرْمُ وَالْوِزْرُ اسے تاوان یا گناہ کے بوجھ نے دبا لیا۔ قرآن میں ہے:۔ اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۵۲-۴۰) (اے پیغمبر) کیا تم ان سے صلہ مانگتے ہو کہ ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔

---

[1] راجع التاج (ثقب) لکن معناہ الطریق ۱۲

اور عرف میں انسان کے متعلق ثقیل[1] لفظ عام طور تو بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مدح بھی آجاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2]۔ (الوافر)

(۷۰-۸۰) تَخِفُّ الْاَرْضُ اِذَا مَازِلْتَ عَنْهَا
وَتَبْقٰى مَا بَقِيْتَ بِهَا ثَقِيْلًا
حَلَلْتَ بِمُسْتَقَرِّ الْعِزِّ مِنْهَا
فَتَمْنَعُ جَانِبَيْهَا اَنْ تَمِيْلًا

کہ جس سرزمین سے تم چلے جاؤ وہ ہلکی ہو جاتی ہے اور وہ اسی وقت تک بھاری رہتی ہے جب تک تم اس پر رہو۔ تم زمین میں عزت کے مقام پر فروکش ہو اور تمہاری وجہ سے اس میں توازن قائم ہے کہا جاتا ہے۔

فِیْ اُذُنِهٖ ثِقْلٌ یعنی اس کی قوت سماعت کمزور ہے رضد فِیْ اُذُنِهٖ خِفَّةٌ "گویا جو بات اس سے کی جاتی ہے اس کو سمجھنے میں گرانی محسوس کرتا ہے اور کسی بات کا سننا ناگوار محسوس ہو تو کہا جاتا ہے ثَقُلَ الْقَوْلُ... چنانچہ اسی معنی میں قیامت کے متعلق فرمایا:۔ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷-۱۸۷) وہ آسمان اور زمین میں ایک بھاری بات ہوگی۔

اور آیت کریمہ:۔ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۹۹-۲) اور زمین اپنے (اندر کے) بوجھ نکال ڈالے گی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ زمین کے دفینے مراد ہیں اور بعض نے حشر کے روز قبروں سے زندہ ہو کر نکلنا مراد لیا ہے اور آیت کریمہ:۔ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ (۱۶-۷) اور... وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ میں اثقال سے بھاری بوجھ مراد ہیں اور آیت:۔

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (۲۹-۱۳) اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور لوگوں کے بوجھ بھی۔ میں گناہوں کے بوجھ مراد ہیں جو انہیں ثواب سے روک دیں گے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔ لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ (۱۶-۲۵) (اے پیغمبر ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا (۹-۴۱) تم سبکسار ہو یا گرانبار گھروں سے نکل آؤ۔ میں بعض نے خفاف اور ثقال سے جوان اور بوڑھے مراد لئے ہیں اور بعض نے خفاف سے نادار اور ثقال سے غنی لوگ مراد لئے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان سے غریب الوطن اور مقیم لوگ مراد ہیں۔ اور بعض نے خفاف سے چست اور ثقال سے سست مراد لئے ہیں۔ لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان جملہ معانی کو شامل ہے کیونکہ قرآن کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دینا ہے کہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی ہر حال میں تمہیں جہاد کے لئے چل کھڑے ہونا چاہیئے[3]۔

اَلْمِثْقَالُ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے چنانچہ ہر باٹ کو مثقال

---

[1] ومنہ قولہ تعالیٰ: اَيُّهَ الثَّقَلَانِ (۵۵-۳۱) للجن والانس لما خصا بہ من العقل والتمییز من سائر الحیوان (راجع اللسان ثقل) [2] قالہ زہیر بن ابی سلمی والشطر الثانی فی الثانی من اجاز ذ ابنہ کعب فیہ قصتہ راجع امالی المرتضیٰ (۱: ۹۷) وفیہا الاول: تزال الارض اذا امامت خِفّا وتحیٰ ما حییتَ بہا ثقیلا وفیہ نزات بدل حللت دیوانہ والعقد الثمین ۱۷۳ محاضرات المؤلف وفی روایتہ اختلاف یسیر [3] قال العماد (۲: ۳۵۹) والاولیٰ حملہ علی العموم ۱۲

کہہ سکتے ہیں قرآن میں ہے:۔
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹-۷،۸) توجس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لیگا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور آیت کریمہ:۔
وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۱۰۱-۸) اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے۔
میں وزن کے ہلکا نکلنے سے اعمال حسنہ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔
ثقیل اور خفیف کے الفاظ دو طرح استعمال ہوتے ہیں ایک بطور مقابلہ کے یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے اعتبار سے ثقیل یا خفیف کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور دوسرے یہ کہ جو چیزیں (طبعًا) نیچے کی طرف مائل ہوتی ہیں انہیں ثقیل کہا جاتا ہے جیسے حجر مدر وغیرہ اور جو چیزیں (طبعًا) اوپر کو چڑھتی ہیں جیسے آگ اور دھواں انہیں خفیف کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (۹-۳۸) توتم زمین پر گرے جاتے ہو۔ میں زمین پر گرنا دوسرے معنی کے اعتبار سے ہے۔

(ث ل ل)

اَلثَّلَّةُ (بفتح الثاء) کے اصل معنی اون کے ڈھیر کے ہیں اس لئے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو بھی ثَلَّۃ کہا جاتا ہے[1] اور معنی اجتماع کے اعتبار سے آدمیوں کی جماعت کو ثُلَّۃٌ۔ قرآن میں ہے:۔
ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۔ (۵۶-۳۹-۴۰) (یہ) بہت سے تو اگلے لوگوں میں سے ہیں اور بہت سے پچھلوں میں سے۔
ثَلَلْتُ كَذَا میں نے اس سے کافی مقدار لی۔ ثَلَّ عَرْشَهٗ اس کی حکومت برباد کر دی۔ اس کی عزت ضائع کردی۔ اَلثَّلَلُ دانتوں کا گرنا۔ اسی سے اَثَلَّ فَمُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی دانت گرنے کے ہیں۔ تَثَلَّلَتِ الرَّكِيَّةُ کنواں منہدم ہو کر پٹ گیا۔

(ث ل ث)

اَلثَّلَاثَةُ تین (مونث) ثَلَاثُوْنَ تیس (مذکر و مونث) اَلثَّلٰثُمِائَةِ تین سو (مذکر و مونث) ثَلٰثَةُ الْاٰفٍ تین ہزار (مذکر و مونث) اَلثُّلُثُ تہائی (تثنیہ ثُلُثَانِ اور جمع اَثْلَاثٌ قرآن میں ہے:۔
فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (۴-۱۱) تو ایک تہائی مال کا حصہ
وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (۷-۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔
مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (۵۸-۷) (کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع) سرگوشی نہیں کرتا مگر وہ ان میں چوتھا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ (۲۴-۵۸) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے (کے) ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ تین اوقات ستر کے ہیں۔
وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ (۱۸-۲۵) اور اصحاب کہف اپنے غار میں (نو اوپر) تین سو سال رہے۔
بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ۔ (۳-۱۲۴) تین ہزار فرشتے نازل کر کے تمہیں مدد دے۔
اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ (۷۳-۲۰) تمہارا پروردگار

[1] فی المطبوع: للمقیم مصحف والصحیح للغنم کما فی التاج (ثلل)

خوب جانتا ہے کہ تم .... کبھی (دو تہائی کے قریب اور کبھی) آدھی رات اور کبھی) تہائی رات قیام کرتے ہو۔

مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (۴-۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔

ثَلَّثْتُ الشَّیْءَ تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔

ثَلَثْتُ الْقَوْمَ میں نے قوم کے مال سے ایک تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثْلَثْتُهُمْ دو میں شامل ہو کر تین بنا دیا۔ مال سے تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثْلَثْتُ الدَّرَاهِمَ تین درم کر دیئے (یعنی دو سے تین کر دیئے)

اَثْلَثَ الْقَوْمُ وہ تین ہو گئے۔ حَبْلٌ مَثْلُوْثٌ تین بٹوں سے بٹی ہوئی رسی۔ رَجُلٌ مَثْلُوْثٌ جس کے مال سے تہائی لے لی گئی ہو۔ ثَلَّثَ الْفَرَسُ وَ رَبَّعَ (دوڑ میں) گھوڑے کا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آنا محاورہ ہے:۔

أَثَلَاثَةٌ وَ ثَلَاثُوْنَ عِنْدَكَ اَوْ ثَلَاثٌ وَثَلَاثُوْنَ یعنی کیا تمہارے پاس ۳۳ مرد ہیں یا عورتیں؟ جَاؤُا ثُلٰثَ وَ مَثْلَثَ وہ تین تین آئے نَاقَةٌ ثَلُوْثٌ جس کے تین تھنوں سے دودھ دوہا جائے۔

اَلثُّلَاثَاءُ منگلوار (اسی طرح) اَلْاَرْبِعَاءُ بدھوار ان میں الف ھا کے عوض ہے (جیسے حَسَنَةٌ وَ حَسْنَاءُ) اور یہ ایام کے ساتھ مخصوص ہیں۔

ثَلَّثَ الْبُسْرُ گدر کھجوریں دو تہائی پک گئیں۔ اسی طرح ثَلَّثَ الْعِنَبُ کا محاورہ ہے یعنی انگور دو تہائی پختہ ہو گئے۔ ثَوْبٌ ثُلَاثِیٌّ تین گز کپڑا۔

(ث م م)

ثُمَّ[1] یہ حرف عطف ہے اور پہلی چیز سے دوسری کے متاخر ہونے پر دلالت کرتا ہے خواہ یہ تاخیر بالذات ہو یا باعتبار مرتبہ اور یا باعتبار وضع کے ہو جیسا کہ قَبْلُ اور اول کی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْئٰنَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۰-۵۱) کیا جب وہ آ واقع ہو گا تب اس پر ایمان لاؤ گے (اس وقت کہا جائے گا کہ) اور اب (ایمان لائے) اس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۱۰-۵۲) پھر ظالم لوگوں سے کہا جائیگا۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ (۲-۵۲) پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا۔

ثُمَامَةٌ ایک قسم کی گھاس جو نہایت چھوٹی ہوتی ہے اور ثَمَّتِ الشَّاةُ کے اصل معنی بکری کے ثُمَامَةٍ گھاس چرنا کے ہیں جیسے درخت چرنے کے لئے شَجَّرَتْ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے پھر ہر قسم کی گھاس چرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

ثَمَمْتُ الشَّیْءَ اس چیز کو اکٹھا اور درست کیا۔ اسی سے محاورہ ہے۔ كُنَّا اَهْلَ ثُمِّهٖ وَرُمِّهٖ ہم اس کی اصلاح و مرمت کے اہل تھے۔

اَلثُّمَّةُ خشک گھاس کا مٹھا۔

ثَمَّ وہاں، اسم اشارہ بعید کے لئے آتا ہے اور اس کے بالمقابل هُنَالِكَ اسم اشارہ قریب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ دونوں لفظ دراصل اسم ظرف ہیں[2] اور آیت کریمہ:۔

وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا (۷۶-۲۰)

---

[1] حرف عطف یقتضی ثلاثۃ امور، التشریک فی الحکم والترتیب والمهلة وفی کل منها خلاف راجع المغنی (ا: ۱۲۴) [2] قال الطبری معناه اُھنالک ولیست ثم التی تأتی للعطف قال ابن ہشام وہذا وہم منہ [3] ای ظرف لا یتصرف ۱۲ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

اور بہشت میں (جہاں) آنکھ اٹھاؤ گے کثرت سے نعمت ۔ ۔ ۔ دیکھو گے۔ میں ثَمَّ مفعول واقع ہوا ہے۔[1]

(ث م د)

ثَمُوْدُ (حضرت صالحؑ کی قوم کا نام) بعض اسے معرب بتلاتے ہیں اور قوم کا علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے اور بعض کے نزدیک عربی ہے اور ثَمْدٌ سے مشتق ہے (بروزن فَعُوْلٌ) اور ثَمَدٌ (بارش کے) تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو جاری نہ ہو۔

اسی سے رَجُلٌ مَثْمُوْدٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ آدمی جس میں عورتوں سے کثرت جماع کے سبب مادہ منویہ باقی نہ رہے۔ نیز مَثْمُوْد اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جسے سوال کرنے والوں نے مفلس کر دیا ہو۔

(ث م ر)

اَلثَّمَرُ اصل میں درخت کے ان اجزاء کو کہتے ہیں جن کو کھایا جا سکے اس کا واحد ثَمَرَۃٌ اور جمع ثِمَارٌ وَ ثَمَرَات آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ (۲-۲۲) اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لئے انواع و اقسام کے میوے پیدا کئے۔

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ (۱۶-۶۷) اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی۔

اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ (۶-۹۹) ان کے پھلنے اور پکنے پر غور کرو۔[2]

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ (۱۳-۳، ۱۶-۱۱) اور ہر طرح کے میوے۔

ثَمَرٌ اور ثِمَارٌ کے ایک ہی معنی ہیں بعض نے کہا ہے کہ ثِمَارٌ، ثَمَرٌ کی جمع ہے پھر بطور کنایہ ثمر کا لفظ ہر قسم کے کمائے ہوئے مال پر بولا جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ... (۱۸-۳۴) (اس طرح) اس (شخص) کو (ان کی) پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔ میں ابن عباسؓ نے ثمر کے یہی معنی کئے ہیں۔

محاورہ ہے ثَمَّرَ اللّٰهُ مَالَهٗ اللہ تعالیٰ اس کا مال بڑھائے اور مجازاً ہر چیز کے نفع پر ثمر کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے ثَمَرَةُ الْعِلْمِ الْعَمَلُ الصَّالِحُ کہ علم کا ثمرہ نیک عمل ہیں۔ وَثَمَرَةُ الْعَمَلِ الصَّالِحِ الْجَنَّةُ۔ اور نیک عمل کا ثمرہ جنت ہے۔

اور صوری مشابہت اور نیچے کی طرف لٹکنے کے اعتبار سے چابک کے سر کی گرہ کو بھی ثَمَرَةُ السَّوْطِ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی اسی طرح چابک سے نیچے لٹکتی ہوئی نظر آتی ہے جیسے درخت سے پھل کا گچھا لٹک پڑتا ہے۔

اَلثَّمِيْرَۃُ مکھن کے بلبلے جو دودھ کو بلونے سے اس پر نظر آتے ہیں۔ صوری تشابہ کی وجہ سے ان کو ثَمِيْرَةُ اللَّبَنِ کہا جاتا ہے اور پھر وہ دودھ سے حاصل بھی ہوتا ہے جیسے پھل درخت سے۔

(ث م ن)

اَلثَّمَنُ اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو فروخت کرنے والا اپنی چیز کے عوض خریدار سے وصول کرتا ہے خواہ وہ زر نقد ہو یا سامان۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] قال ابن ہشام وغلط من اعربہ مفعولا لرأیت فی ہذا الآیۃ ۱۲ [2] وفی النسخ المطبوعۃ القدیمۃ والکشی "کلوا من ثمرہ" مصحف ۱۲ ۱۲

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ (۱۲-۲۰) اور اسے تھوڑی سی قیمت یعنی چند درہموں پر بیچ ڈالا۔ اور وہ کچھ جو کسی چیز کے عوض میں حاصل ہو وہ اس کا ثمن کہلاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۳-۷۷) جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں (کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۱۶-۹۵) اور خدا سے جو تم نے عہد کیا تھا (اس کو مت بیچو اور) اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لو۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۵-۴۴) اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا۔

محاورہ میں اَثْمَنْتُ الرَّجُلَ بِمَتَاعِہٖ وَاَثْمَنْتُ لَہٗ کے معنی کسی چیز کی زیادہ قیمت دینے کے ہیں۔ اور قیمتی چیز کو شَیْءٌ ثَمِیْنٌ کہا جاتا ہے۔

ثَمَانِیَۃٌ آٹھ (مذکر) ثَمَانُوْنَ۔ اسی (مذکر و مؤنث) اَلثُّمُنُ آٹھواں حصہ۔

ثَمَنْتُہٗ آٹھواں ہونا۔ کسی شخص کے مال سے آٹھواں حصہ لینا۔ قرآن میں ہے:۔ ثَمَانِیَۃَ اَزْوَاجٍ (۶-۱۴۳) (یہ بڑے چھوٹے چارپائے) آٹھ قسم کے ہیں۔

سَبْعَۃٌ وَّ ثَامِنُھُمْ کَلْبُھُمْ (۱۸-۲۲) وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

عَلٰۤی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ (۲۸-۲۷) اس (عہد) پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو۔

اَلثَّمِیْنُ بمعنی ثُمُن یعنی آٹھواں حصہ۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۸۱) فَمَا صَارَ لِیْ فِی الْقَسْمِ اِلَّا ثَمِیْنُھَا

اس مقاسمہ میں میرا آٹھواں حصہ تھا۔

قرآن میں ہے

فَلَھُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَکْتُمْ (۴-۱۲) تو جو مال تم (مرد) چھوڑ مرو تو اس میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔

(ث ن ی)

اَلثِّنْیُ وَالْاِثْنَانُ یہ دونوں ان تمام کلمات کی اصل ہیں جو اس مادہ سے بنتے ہیں یہ کبھی معنی عدد کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں اور کبھی تکرار معنی کے لحاظ سے جو ان کے اصل مادہ میں پایا جاتا ہے اور کبھی ان میں عدد و تکرار دونوں ملحوظ ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ (۹-۴۰) دو میں دوسرا۔

اثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا (۲-۶۰) بارہ چشمے۔

مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (۴-۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔ کہا جاتا ہے ثَنَّیْتُہٗ تَثْنِیَۃً میں دوسرا تھا میں[2] نے اسکا نصف مال لے لیا[3] ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کو ملا کر دو کر دینا۔

اَلثِّنْیُ۔ جس کا دو مرتبہ اعادہ ہو حدیث میں ہے[4]۔ (۸۲)

---

[1] قالہ یزید بن الطثریۃ (والطثریۃ امہ وھو احد الشعراء الذین اشتہروا بامہاتہم واسم ابیہا الصمۃ) واولہ: والقیت سہمی وسطہم حین اوخشوا والبیت فی اللسان (ثمن) والاقتضاب ۷۵ فی خمسۃ ابیات وتہذیب الالفاظ ۵۸۹ والدرۃ مع الخفاجی ۸۹ وادب الکاتب ۵۷ وقبلہ:۔ اری صبیۃ یسعون للوصل کلھم ۔ لہ عند لیلیٰ دینۃ یستدینہا ۔ ومعنی اوخشوا (دوا) سہام المیسر فی خریطتہا [2] القسم بمعنی المقاسمۃ ۱۲ [3] والحدیث فی الصحاح (ثنی) والفائق ۱/۸۳ والدیلمی والنہایۃ واموال ابی عبید عن علیؓ (راجع کنز العمال ۷ رقم ۱۹۹۵ و ۱۳۲۲) وغریب ابی عبید ۱/۹۸

لَا ثِنیٰ فِی الصَّدَقَةِ ... یعنی صدقہ سال میں دو مرتبہ نہ لیا جائے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۸۲) "..... لَقَدْ کَانَ مَلَامَتَهَا ثِنیٰ"

بے شک اس نے بار بار ملامت کی۔

اِمْرَءَةٌ ثِنیٌ جس عورت نے دو بچے جنے ہوں اس دوسرے بچہ کو ثِنیٌ کہا جاتا ہے۔

حَلَفَ یَمِیْنًا فِیْهَا ثِنیٌ وَ ثَنْوٰی وَ ثَنِیَّةٌ وَ مَثْنَوِیَّةٌ اس نے استثنا کے ساتھ قسم اٹھائی۔

ثَنَا (ض) ثَنْیًا۔ الشَّیْءَ کسی چیز کو موڑنا۔ دوہرا کرنا لپیٹنا قرآن میں ہے:۔

اَلَا اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ (۱۱-۵) دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی قرأت یَثْنَوْنِیْ صُدُوْرُهُمْ ہے۔ جو اِثْنَوْنَیْتُ کا مضارع ہے[2]

اور آیت کریمہ:۔ ثَانِیَ عِطْفِهٖ (۲۲-۹) (اور تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے۔

میں گردن موڑنے سے مراد تکبر اور اعراض کرنا ہے جیسا کہ لَوٰی شِدْقَهٗ وَ نَاٰی بِجَانِبِهٖ کا محاورہ ہے۔

اَلثَّنِیُّ (ایضا بکری) جو دوسرے سال میں داخل ہو (اونٹ) جس کے ثنیہ دانت گر گئے ہوں اور اس معنی میں فعل اَثْنٰی ہے

ثَنَّیْتُ الشَّیْءَ اَثْنِیْهِ۔ کسی چیز کو ثنایین رسی کے ساتھ باندھنا۔ یہ غیر مہموز ہے بعض نے اس کے غیر مہموز ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہ کلمہ تثنیہ ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کا واحد ثِنَاءٌ نہیں بولا جاتا[3]

اَلْمَثْنَاۃُ دوسری رسی۔

اَلثُّنْیَانُ سادات کے شمار کے وقت دوسرے درجہ کا سردار۔

ثُنْیَةٌ فرمایہ محاورہ ہے فلَانٌ ثُنْیَةُ اَهْلِ بَیْتِهٖ فلاں اپنے اہل میں ثنیہ یعنی سب سے کم مرتبہ ہے۔

ثَنِیَّةٌ وہ پہاڑ جسے عبور کرنے وقت اوپر چڑھنا اور نیچے اترنا پڑے گویا دوہرا سفر کرنا پڑتا ہے شکل و صورت اور صلابت کے لحاظ سے پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دے کر سامنے کے چار دانت (دو از فوق دو از تحت) میں سے ہر ایک کو ثَنِیَّة کہا جاتا ہے (جمع ثنایا)

اَلثَّنَایَا۔ (من الجزور) ذبح کئے گئے اونٹ کا سر اور صلب جو قصاب اپنے لئے مستثنیٰ کرلیتا ہے[4] اور ان کو ثُنْوٰی بھی کہا جاتا ہے۔

اَلثَّنَاءُ۔ کے معنی بار بار کسی کی خوبیاں بیان کرنے

---

[1] قالہ کعب بن زہیر فی امرأتہ حین لامتہ فی بکر وتکملۃ البیت۔ أفی جنب بکر قطعتنی ملامۃ — لعمری... والبیت فی اللسان (ثنی) دیوانہ ۲۸ والبحر ۲۵:۵ ونسبہ الصاحبی ۱۳۲ الی اوس بن حجر وجمعہ الدکتور محمد یوسف نجم فی مختلط شعرہ راجع دیوانہ ۱۴۱ وفی روایۃ خزانۃ بدل ملامۃ وضبطہ الجامع بالرفع والصواب النصب علی التمیز وفاعل قطعتنی امرأتہ وقبلہ وہو مطلع القصیدۃ: - الا بکرت عرسی توائم من لحی۔ واقرب باحلام النساء من الروی [2] راجع ابن کثیر ۲/۴۳۶ من اثنونی (افعوعل) کما احلولی من الحلاوۃ۔ [3] ذکرہ الجوہری فی الصحاح وکذا فی النہایۃ فی شرح حدیث عمرو بن دینار رأیت ابن عمر ینحر بدنتہ وہی بارکۃ مثنیۃ بثنایین ... ولعدہ: قال الاصمعی وان مدہ مادّ لکان صوابا فجوز الاصمعی ثناآن کما تقول کساآن لکن النحاۃ اتفقوا علی ترک الہمزۃ فی الثنایین وتورد الازہری بالبسط فی تہذیبہ علی من ہمزہ فتدبر ۱۲ [4] وما فی المعاجم من الراس والقوائم وذکر بعضہم معہما لفظ الصلب ۱۲

کے ہیں اور اَثْنٰی عَلَیْہِ کے معنی کسی کی ثنا کرنے کے ہیں۔

تَثَنّٰی (تفعل) فِی مِشْیَتِہٖ تکبر سے لڑکھڑا کر چلنا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (۱۵-۸۷)

اور ہم نے تم کو سات مثانی (سورتیں) عطا کیں۔ میں قرآن کی سورتوں کو مثانی کہا ہے[1] کیونکہ مرور ایام کے ساتھ بار بار ان کا ذکر اور اعادہ ہوتا رہیگا۔ لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ نہ تو ان میں کسی قسم کا تغیر آئے گا اور نہ ہی دوسری اشیاء کی طرح یہ زوال پذیر ہیں۔ اسی بنا پر فرمایا:۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ۔ (۳۹-۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دوہرائی جاتی ہیں۔

اور قرآن کو مثانی کہنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ بار بار اعادہ سے اس کے عجائب وغرائب منقطع نہیں ہوتے اور ہر بار نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے وصف میں ایک روایت مروی ہے[2] لَا یَعْوَجُّ فَیُقَوَّمُ وَلَا یَزِیْغُ فَیُسْتَعْتَبُ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ۔ کہ اس میں کجی نہیں آئے گی کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئے اور اس میں زیغ پیدا ہوگا کہ اس کا ازالہ کرنا پڑے اور اس کے عجائب وغرائب کبھی منقطع نہیں ہوں گے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَثَانِی ثناء سے مشتق ہو تو اس سے اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ قرآن پاک سے ہمیشہ ایسے مضامین ظاہر ہوتے رہیں گے جو اس کی، اس کو پڑھنے والوں، اس کا علم حاصل کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں، کی تعریف کا موجب ہوں گے اور اسی معنی میں قرآن کو آیت:۔ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ (۵۶-۷۷) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔ میں کریم کے ساتھ متصف کیا ہے اور آیت:۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ (۸۵-۲۱) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔ اس کے وصف میں مجید کا لفظ ذکر کیا ہے۔

اَلْاِسْتِثْنَاء کے معنی کلام میں ایسا لفظ لانے کے ہیں جو پہلے عام حکم سے بعض افراد کی تخصیص یا اس عام حکم کے کلیۃً مرتفع ہونے کا فائدہ دے چنانچہ عموم حکم سے بعض افراد کی تخصیص کے متعلق فرمایا:۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً (الایۃ) (۶-۱۴۵) کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں میں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے۔ حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو۔

اور یہی کلام کی کلیۃً نفی جیسے:۔

وَاللّٰهِ لَاَفْعَلَنَّ كَذَا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ میں یہ کام ضرور کروں گا انشاء اللہ۔

اِمْرَأَتُهٗ طَالِقٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اس کی عورت کو طلاق ہے انشاء اللہ۔

عَبْدُهٗ عَتِیْقٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اس کا غلام آزاد ہے ان شاء اللہ اور آیت کریمہ:۔

اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِیْنَ وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ (۶۸-۱۷-۱۸) جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا

---

[1] راجع للبحث علی المثانی التاج (ثنی) وغریب ابی عبید ۳ ر ۱۴۵-۱۴۷ [2] کلمہ من حدیث طویل فی فضل القرآن راجع المصاحف لابن الانباری ر ک ۵ ر ب۔ عن ابن مسعود، ش و محمد بن نصر، کنز العمال ا ر رقم ۲۳۵۰

کہ شرح ہوتے ہوتے ہم اس کا میوہ توڑ لیں گے۔ اور انشاء اللہ کہا۔ میں وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ سے بھی یہی مراد ہیں۔

(ث و ب)

ثَوْبٌ کا اصل معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آنا کے ہیں یا غور و فکر سے جو حالت مقدر اور مقصود ہوتی ہے اس تک پہنچ جانا کے ہیں۔ چنانچہ حکماء کے اس قول اَوَّلُ الْفِکْرَۃِ اٰخِرُ الْعَمَلِ میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے یعنی آغاز فکر ہی انجام عمل بنتا ہے۔ چنانچہ اول معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ ثَابَ فُلَانٌ اِلٰی دَارِہٖ۔ فلاں اپنے گھر کو لوٹ آیا ثَابَتْ اِلَیَّ نَفْسِیْ میری سانس میری طرف لوٹی اور کنوئیں کے منہ پر جو پانی پلانے کی جگہ بنائی جاتی ہے اسے مَثَابَۃٌ کہا جاتا ہے اور غور و فکر سے حالت مقدرہ مقصود تک پہنچ جانے کے اعتبار سے کپڑے کو ثَوْبٌ کہا جاتا ہے کیونکہ سوت کاتنے سے غرض کپڑا بننا ہوتا ہے لہذا کپڑا بن جانے پر گویا سوت اپنی حالت مقصودہ کی طرف لوٹ آتا ہے یہی معنی ثواب العمل کا ہے۔ اور ثَوْبٌ کی جمع اَثْوَابٌ وَثِیَابٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:۔

وَثِیَابَکَ فَطَہِّرْ (۷۴-۴) اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ میں بعض نے ثِیَاب سے اس کے حقیقی معنی یعنی کپڑے پاک رکھنا مراد لیا ہے[1] اور بعض نے کہا ہے کہ ثِیَاب سے (کنایۃً) نفس مراد ہے[2] (یعنی نفس کو رذائل سے پاک رکھنا مراد ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3]۔ (طویل)

(۸۳) ثِیَابُ بَنِیْ عَوْفٍ طَہَارٰی نَقِیَّۃٌ

کہ بنی عوف کے نفوس پاک و صاف ہیں۔

اسی طہارت نفسانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَہْلَ الْبَیْتِ وَیُطَہِّرَکُمْ تَطْہِیْرًا (۳۳-۳۳) (اے پیغمبر کے اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کردے اور تمہیں بالکل پاک صاف کردے۔

اَلثَّوَابُ انسان کے عمل کی جو جزا انسان کی طرف لوٹتی ہے اسے ثواب کہا جاتا ہے اس تصور پر کہ وہ جزا گویا عین عمل ہی ہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آیت:۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ (۹۹-۷) تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لیگا۔ میں جزا کو نفس عمل ہی قرار دیا ہے اس لئے یہاں یَرَ جَزَاءَہٗ نہیں کہا حالانکہ مراد یہی ہے۔

گو لغوی اعتبار سے ثَوَابٌ کا لفظ خیر و شر دونوں قسم کی جزا پر بولا جاتا ہے لیکن اکثر اور متعارف استعمال نیک اعمال کی جزا پر ہے چنانچہ فرمایا:۔ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ

[1] تفسیر ابن کثیر (۴: ۴۴۳) الی محمد بن سیرین ورجحہ ابن جریر [2] نقل عن ابن عباس واکثر التابعین ویؤیدہ کلام العرب [3] قالہ امرؤ القیس فی مدح بنی عوف وتمامہ: واوجہہم بیض المسافر غران (مقید القافیہ من کلمۃ ۱۶ بیتا ولا توجدنا منۃ عند غیر ابن الانباری ۴۳۲ وفی روایۃ والسمط (۹) یوم الکریہۃ بدل بیض المسافر والبیت فی اللسان والصحاح (ثوب ہغر) ودیوانہ ۱۵ والعقد الثمین ۱۲۱ وایام العرب ۵۰ وشرح السبع لابن الانباری ۷۰ وہو فیہ عند الشاہد بدل بیض المسافر والمعانی للقبتی ۴۸۵-۸۱ والسیوطی ۱۳۹ والصناعتین ۲۵۳ ومختار الشعر ۳۱۳ والعمدۃ (۱: ۱۴۸) فی اربعۃ ابیات والشطر فی حواشی تہذیب الالفاظ ۴۸۳ والبحر (۲: ۱۶۴) والشطر الثانی فی البحر (۳-۲۲/۸-۳۷۱

الثَّوَابِ (۳-۱۹۵) (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔
فَآتَاهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ (۳-۱۴۸) تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں بھی بہت اچھا بدلہ دے گا۔
اسی طرح لفظ مَثُوبَةٌ بھی زیادہ تر جزائے خیر پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ (۵-۶۰) کہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ خدا کے ہاں اس سے بھی بدتر جزا پانے والے کون ہیں۔
میں جزائے بد کے لئے مَثُوبَةً کا بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق بشارت کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ جزائے خیر کے متعلق فرمایا۔
وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ (۲-۱۰۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔
اَلْإِثَابَةُ (افعال) کے معنی بھی اچھی جزا دینے کے ہیں جیسے فرمایا:۔
فَأَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (۵-۸۵) تو خدا نے ان کو ان کے کہنے کے عوض (بہشت کے) باغ عطا فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ (۳-۱۵۳) تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا۔ میں بری جزا کو ثواب قرار دینا بطور استعارہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔
اَلتَّثْوِيبُ (تفعیل) قرآن میں یہ لفظ صرف بری جزا کے لئے استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا:۔ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ (۸۳-۳۶) تو کافروں کو پورا پورا بدلہ مل گیا۔ اور آیت کریمہ:۔ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ (۲-۱۲۵) اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے کی جگہ مقرر کیا۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ مَثَابَة کے معنی جائے ثواب کے ہیں اور خانہ کعبہ کو مَثَابَةٌ اس لئے کہا ہے کہ وہاں ثواب اعمال لکھا جاتا ہے۔
اَلثَّيِّبُ۔ بیوہ یا مطلقہ عورت کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی خاوند سے جدا ہو کر (گویا پہلی حالت کی طرف) لوٹ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
ثَيِّبَاتٍ وَأَبْكَارًا (۶۶-۵) بن شوہر اور کنواریاں۔
اَلتَّثْوِيبُ کے معنی بار بار منادی کرنے کے ہیں اسی سے تَثْوِيبٌ فِي الْأَذَانِ ہے (یعنی فجر کی اذان میں حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے بعد اَلصَّلوٰةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ کہنا)
ثُؤْبَاء (غشی) کیونکہ وہ بھی دورہ کے ساتھ بار بار طاری ہوتی ہے۔
اَلثُّبَةُ۔ جماعت کیونکہ اس کے افراد بھی بظاہر ایک دوسرے کی طرف لوٹتے ہیں قرآن میں ہے۔
فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انْفِرُوا جَمِيعًا (۴-۷۱)
شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)
وَقَدْ اغْدُو عَلَى ثُبَةٍ كِرَامٍ
ثُبَةُ الْحَوْضِ حوض کا وسط جس کی طرف پانی لوٹ کر آتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

(ث و ر)

ثَارَ (ن) ثَوْرًا وَ ثَوَرَانًا۔ الغُبَارُ وَالسَّحَابُ کے معنی غبار یا بادل کے اوپر اٹھنے اور پھیلنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

---

[1] قدمر تخریجہ فی (ث ب و)

فَتُثِيرُ سَحَابًا (۳۰-۴۸) تو وہ بادل کو اوپر اٹھاتی ہیں۔
اَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَا (۳۰-۵) انہوں نے زمین کو جوتا اور اس کو . . . . آباد کیا۔
اور غبار کے منتشر ہونے کے ساتھ تشبیہ دیکر ثَارَتِ الْحَصْبَةُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کنکر کے پھیل جانے کے ہیں اور اسی طرح (یعنی مجازاً) ثَوَّرَ شَرًّا (شر کی آگ بھڑکانا) کہا جاتا ہے۔
ثَارَ ثَائِرُهٗ (کنایہ) یعنی وہ غضب ناک ہوگیا۔
ثَاوَرَهٗ اس پر حملہ کر دیا۔
اَلثَّوْرُ بیل کیونکہ اس سے زمین جوتی جاتی ہے۔ یہ اصل میں مصدر بمعنی فاعل ہے جیسا کہ ضَيْفٌ وَطَيْفٌ بمعنی ضائف وَطَائِفٌ استعمال ہوتا ہے محاورہ ہے۔
سَقَطَ ثَوْرُ الشَّفَقِ۔ یعنی شفق کی سرخی غروب ہوگئی۔
اَلثَّائِرُ کے معنی "خون کا بدلہ" کے ہیں یہ اصل میں مہموز العین ہے اور اس مادہ سے نہیں ہے۔

(ث و ی)

اَلثَّوَاءُ (ض) کے اصل معنی کسی جگہ پر مستقل طور پر اقامت کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے ثَوٰی يَثْوِيْ ثَوَاءً وہ اقامت پذیر ہوگیا۔ قرآن میں ہے۔
وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ (۲۸-۴۵)
اور نہ تم مدین والوں میں رہ رہے تھے۔
اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ (۳۹-۶۰)
کیا غرور والوں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے۔
وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷-۱۲) اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔
اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۴۰-۷۶) (اب) جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ ہمیشہ اسی میں رہو گے۔ متکبروں کا کیسا برا ٹھکانا ہے۔
قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ (۶-۱۲۸) خدا فرمائے گا (اب) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔
مَنْ اُمُّ مَثْوَاكَ (کنایہ) تمہارا میزبان کون ہے۔
اَلثَّوِيَّةُ بھیڑ بکریوں کے باڑہ کو کہتے ہیں۔
(وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

کِتَابُ الْجِیْمِ

(ج ء ر)

اَلْجُؤَارُ (ف) کے اصل معنی وحشیات جیسے ہرن وغیرہ کے گھبراہٹ کے وقت زور سے آواز نکالنے اور چیخنے کے ہیں پھر تشبیہ کے طور پر دعا اور تضرع میں افراط اور مبالغہ کرنے پر بولا جاتا ہے قرآن میں ہے۔

فَاِلَیْہِ تَجْئَرُوْنَ (۱۶-۵۳) تو اسی کے سامنے آہ وگریہ کرتے ہو۔ اِذَا ھُمْ یَجْئَرُوْنَ (۲۳-۶۴) تو اس وقت چلائیں گے۔ لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ (۲۳-۶۵) آج مت چلاؤ۔

(ج ب ب)

اَلْجُبُّ کنواں جو پختہ یا لپا ہوا نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَلْقُوْہُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ (۱۲-۱۰) کسی گہرے گڑھے میں ڈال دو۔

اور اس کنوئیں کو جُبٌّ یا تو اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ جُبُوْب یعنی سخت زمین میں کھدا ہوا تھا اور یا اس لئے کہ وہ گہرا گڑھا سا تھا۔[1]

اصل میں اَلْجَبُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو اس کے اصل سے کاٹ دینے کے ہیں جیسے جَبُّ النَّخْلِ کھجور کو گابھا دینا اور زَمَنُ الصِّرَامِ کی طرح زَمَنُ الْجَبَابِ کا محاورہ بھی مشہور ہے جس کے معنی کھجور کو گابھنے کا موسم کے ہیں۔

بَعِیْرٌ اَجَبُّ شتر کوہان برید اور ناقۃ جبّاء اور جیسا کہ مرد مقطوع الید کو رَجُلٌ اَقْطَعُ کہا جاتا ہے اور ایسی عورت کو قَطْعَاءُ کہتے ہیں۔

مَجْبُوْبٌ وہ مرد جس کا آلۂ تناسل جڑ سے قطع کر دیا گیا ہو۔ اسی سے جُبَّۃٌ (نوعے از پیراہن) ہے اور تشبیہ کے طور پر زرہ کے اس پورے کو بھی جُبَّۃ کہا جاتا ہے جس میں بھالا پیوست ہوتا ہے۔

اَلْجُبَابُ کلک شیر شتر کہ بسکہ ماند جَبَّتِ الْمَرْأَۃُ النِّسَاءَ حُسْنًا حسن میں برتر ہونا غالب رہنا یہ بھی جَبٌّ بمعنی قطع سے مستعار ہے جیسا کہ منازعت بحث ومباحثہ میں غالب ہونے کے لئے قَطَعْتُہٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جَبْجَبَۃٌ جس کے معنی طبل یا چرمیں زنبیل کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ محض اس صوت کی وجہ سے اسے جَبْجَبَۃ کہا جاتا ہے جو اس سے مسموع ہوتی ہے۔

(ج ب ت)

اَلْجِبْتُ جِبْتٌ اور جِبْسٌ اس دھوکہ کو کہتے ہیں جو کسی کام کا نہ ہو اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل جِبْسٌ کے سین کو تاء سے تبدیل کر لیا گیا ہے۔ تاکہ معنی مبالغہ

---

[1] علی اثنی عشر میلا من طبریہ ادبین سنجل ونابلس (التاج)

پر دلالت کرے شاعر نے کہا ہے[1]۔ (رجز)

(۸۴) عمرو بن یربوع شرار النّاتِ

یعنی عمرو بن یربوع تمام لوگوں سے ناکام ہے۔

نیز ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے وہ جِبْتٌ کہلاتی ہے اور ساحر کاہن کو بھی جِبْت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (۴۔ ۵۱) کہ یہ اہل باتوں اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

(ج ب ر)

اَلْجَبْرُ اصل میں جبر کے معنی زبردستی اور دباؤ سے کسی چیز کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے جَبَرْتُهٗ (ن)، فَانْجَبَرَ وَاجْتَبَرَ بعض نے جَبَرْتُهٗ فَجَبَرَ بھی نقل کیا ہے یعنی جَبَرَ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (رجز)

(۸۵) قَدْ جَبَرَ الدِّيْنَ الْإِلٰهُ فَجَبَرْ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کو درست کیا تو وہ درست ہوگیا۔ یہی قول اکثر ائمہ لغت کا ہے لیکن بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں فَجَبَرْ (انفعال) یعنی لازم نہیں ہے بلکہ متعدی ہے اور تکرار سے اصلاح اور اس کی تکمیل پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ نے دین کی اصلاح کی ابتدا کی اور پھر اسے تکمیل تک پہنچا دیا کیونکہ فَعَلَ کا صیغہ جس طرح کسی کام کو شروع کرنے کا معنی دیتا ہے اسی طرح اس کے معنی کسی کام کو سرانجام دے کر اس سے فارغ ہوجانا بھی آتے ہیں اور اس سے مبالغہ کے معنی یا تکلف کو ظاہر کرنے کے لئے تَجَبَّرَ (تفعل) کا صیغہ استعمال ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے[3] (طویل)

(۸۶) تَجَبَّرَ بَعْدَ الْأَكْلِ فَهُوَ غَمِيْضُ

گھاس چرانے کے بعد دوبارہ ہری ہوگئی ہے۔

پھر جبر کا لفظ کبھی صرف اصلاح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حضرت علیؓ کا قول ہے۔ (۵۲)

يَا جَابِرَ كُلِّ كَسِيْرٍ وَمُسَهِّلَ كُلِّ عَسِيْرٍ اے ہر شکستہ کی اصلاح کرنے والے اور ہر مشکل آسان کرنے والے اور اسی معنی میں روٹی کو جَابِرُ بْنُ حَبَّةَ کہا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ کبھی محض استبداد کے

---

[1] انشد فی الامالی (۲: ۶۷) ثلاثة اشطار عن القراد: یاقبح اللہ بنی السعلات۔ عمرو بن یربوع شرار الناتِ۔ لیسوا اعفاء ولا اکیات راجع للشطر النوادر لابی زید ۱۴۷ و فیہ الا قاتل اللہ بدل یاقبح اللہ والجمہرۃ لابن درید (۳: ۲۳۳) قال الاستاذ المیمنی فی طرتہ علی اللالی والاشعار فی الثعلب ایضاً وراجع ابدال ابی الطیب (۱: ۱۱۷) واللسان (نات س)، والخصائص لابن جنی (۲: ۵۳) وسر الصناعۃ ۱۱۹ والمخصص لابن سیدۃ (۳: ۳۶) ومبادی اللغۃ للاسکافی وتفسیر الطبری (۵: ۲۲۲) والصاحبی ۱۰۹ وفیہ عمر بن مسعود والمفصل ۳۶۸ والشطر منسوب لعلباء بن ارقم الیشکری کما فی اللالی واللسان (نا) وہو شاعر جاہلی قدیم [2] نصف مطلع من ارجوزۃ العجاج فی نحو مائتی اشطار وہی موقوفۃ مقیدۃ یمدح بہا عمر بن عبید اللہ بن معمر وکان عبد الملک وجہہ لقتال ابی فدیک الخارجی فاوقع بہ وباصحابہ فذالک ذکر الجبار الدین ولبعدہ: وعور الرحمان من ولی العور وقد جمع الشاعر بین اللازم والواقع راجع الخزانۃ (۱: ۱۰۳) والطبری (۲: ۱۷۴) والعمدۃ (۱: ۸۵) واصلاح لیعقوب ۲۸۸ واللسان (جبر) والاقتضاب ۴۰۷ [3] قالہ امرؤ القیس فی قصیدۃ ۵۲ بیتا مطلعہا: امن ذکر سلمی اذ نأتک تنوص فتقصر عنہا خطوۃ وتبوص وصدر البیت: ویاکلن من قوٍّ لعاعاً وریّۃ وفی روایۃ الدیوان نمیص بدل غمیض وکما فی بعض الطباعۃ، وہو مصحف والتصویب من المراجع وہی موافقۃ لما فی اللسان (جبر۔ نمص) قال السندوبی ونمیص ذاہب الشعر وفی اللسان: النمیص: النبات حین طلع ورقہ راجع للبیت اللسان (جبر) والعقد الثمین ۱۲۷ ودیوانہ ۸۰ (صنعۃ السندوبی) والجمہرۃ لابن درید (۳: ۸۹) وابدال ابی الطیب (۲: ۳۸۸) وغریب ابی عبید ۱۶۷۔

معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ علیہ السلام کا فرمان ہے[1] (۸۵) لَا جَبْرَ وَ لَا تَفْوِیْضَ. کہ انسان نہ تو مجبور محض ہے نہ کلی طور پر مختار۔

علم ریاضی کی اصطلاح میں الجبر کے معنی ہیں کسی چیز کی اصلاح کے لئے اس کے ساتھ کچھ الحاق کرنا اور اَلْجَبْرُ بمعنی بادشاہ بھی آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۸۶) وَ انْعِمْ صَبَاحًا اَیُّهَا الْجَبْرُ

(کہ اے بادشاہ سلامت! تم خوش رہو۔

بادشاہ کو جبر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کے مطابق لوگوں کو مجبور کر لیتا ہے یا اس لئے کہ وہ ان کے امور کی اصلاح کرتا ہے۔

اَلْاِجْبَارُ (افعال) اس کے اصل معنی کسی کو مجبور کرنا کہ وہ دوسرے کی اصلاح کرے۔ لیکن عرف میں محض اکراہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَجْبَرْتُهٗ عَلٰی کَذَا (کسی کام پر مجبور کرنا) اور جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو گناہ پر مجبور کرتا ہے انہیں متکلمین کی اصطلاح میں مُجْبِرَۃ کہا جاتا ہے اور متقدمین انہیں جَبْرِیَّہ یا جَبَرِیَّہ کہتے ہیں[3]

اَلْجَبَّارُ انسان کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ناجائز تعلی سے اپنے نقص کو چھپانے کی کوشش کرنا۔ بدیں معنی اس کا استعمال بطور مذمت ہی ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے:۔

وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ (۱۴-۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد رہ گیا۔

وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (۱۹-۳۲) اور مجھے سرکش اور بد بخت نہیں بنایا۔

اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ (۵-۲۲) وہاں تو بڑے زبردست لوگ (رہتے) ہیں۔

کَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰-۳۵) ۔۔۔ اسی طرح خدا ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

یعنی جو شخص قبول حق اور اس پر ایمان لانے سے بالاتر ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے۔

کبھی کبھی محض دوسرے پر استبداد کرنے والے کو جبّار کہا جاتا ہے اسی معنی میں فرمایا:۔

وَمَا اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰-۴۵) اور تم ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو۔

اور ہمسروں پر تعلّی کے معنی کے لحاظ سے بلند کھجور یا اونٹنی کو جَبَّارَۃ کہا جاتا ہے اور ربو حدیث میں آیا ہے[4] ( )

ضِرْسُ الْکَافِرِ مِثْلُ اُحُدٍ وَکَثَافَۃُ جِلْدِهٖ اَرْبَعُوْنَ ذِرَاعًا بِذِرَاعِ الْجَبَّارِ کہ دوزخ میں کافر کی ڈاڑھ کا حجم مثل احد کے ہوگا اور اس کی کھال کی کثافت جبار کے چالیس ذراع کے برابر ہوگی — تو اس حدیث

---

[1] ورد من علی موقوفًا فی خطبۃ طویلۃ (انظر حل) کنز العمال رقم ۱۵۶۸ رواہ الشافعی [2] قالہ ابن احمر واولہ: اسلم براووق حییت بہ قال ابن جنی ولم یسمع بالجبر الملک الا فی شعر ابن احمر والبیت فی اللسان (جبر) والمعانی للقبتی ۵۰۴ قال والجبر الرجل اصلہ سریانی [3] خلاف القدریہ قال الحافظ فی تبصیر ہو طریق منعلق الشافعیہ وفی البصائر وہذا قول المتقدمین واما فی عرف المتکلمین فیقال لہم المجبرۃ وکذا فی التاج) ابو عبید ہو کلام مولد وہم فرقۃ اہل ہوا منسوبون الی شیخہم الحسین بن محمد النجار البصری (فی التاج) قلت ہو ابو عبد اللہ الحسین بن محمد بن عبد اللہ النجار وکان جملۃ المجبرۃ ومتکلمیہم ولہ مع النظام مجالس ومناظرات ولہ کتب فی القضاء والقدر وراجع الفہرست لابن الندیم ۲۵۴ والجواہر المضیئۃ ۲۱۴ وایضا التبصیر ص ۱۴ [4] فی روایۃ الترمذی عن ابی ہریرۃ اثنان واربعون ذراعًا ولیس فیہ ذکر ذراع الجبار وفی مسند احمد من حدیث ابی عمر سبعون ذراعًا واما لفظ ضرس الکافر مثل احد فرواہ مسلم وفیہ غلظ جلدہ مسیرۃ ثلاث راجع تخریج الاحیاء للعراقی ۴/۲۳۵ وذکر ذراع الجبار و(فی الفائق ۱/۸۶ وفیہ کان ہذا الملک من ملوک العجم تام الذراع وکذا قال القتیبی (راجع التاج)

کی تفسیر میں ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ یہاں جَبّار سے مراد بادشاہ ہے اور اس ذراع کو ذِرَاعُ الشَّاہ کہا جاتا تھا[1]

اور جب الجبار باری تعالیٰ کی صفت ہو جیسے فرمایا:
اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (۵۹-۲۳) غالب زبردست بڑائی والا۔ تو اس کے اشتقاق میں اہل لغت سے دو قول منقول ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ جَبَرْتُ الْفَقِيْرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی فقیر کی حالت کو درست کرنے اور اسے بے نیاز کر دینا کے ہیں اور باری تعالیٰ بھی چونکہ اپنے فیضان نعمت سے لوگوں کی حالتیں درست کرتا اور ان کے نقصانات پورے فرماتا ہے اس لئے اسے الجَبّار کہا جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کے سامنے مقہور کر لیتا ہے اس لئے اسے الجبّار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لیکن بعض ارباب لغت نے بحیثیت لفظ اور صیغہ کے اس معنی پر اعتراض کیا ہے کہ اَفْعَلْتُ سے صیغہ فَعَّال (مبالغہ) قیاساً نہیں آتا۔ لہٰذا اَلْجَبَّار کا صیغہ اِجْبَار (افعال) سے نہیں بن سکتا[2]۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جَبْرٌ سے بنا ہے نہ کہ اِجْبَارٌ سے اور جَبْرٌ کے معنی بھی مجبور کرنا آجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے[3]: لَاجَبْرَ وَلَا تَفْوِيْضَ۔ (کہ نہ مجبور کرنا ہے اور نہ سونپ دینا)

اور معتزلہ کی ایک جماعت نے معنوی لحاظ سے اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کی شان اس سے بلند ہے کہ بندوں کو مجبور کرے حالانکہ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر بندوں کو بہت سی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے جن سے رہائی پانا ان کے اختیار سے باہر ہے اور جبر کے یہ معنی مقتضائے حکمت الہیہ کے عین مطابق ہیں نہ کہ اس کے خلاف جیسا کہ جاہل اور گمراہ لوگوں کا خیال ہے مثلاً مرض، موت بعث بعد از موت وغیرہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خاص صنعت اور اعمال و اخلاق میں کوئی طریقہ اختیار کرنے پر مسخر کر رکھا ہے اور اسے مجبور بصورت مختار بنایا ہے کہ ہر انسان جس دھن میں لگا ہے اس میں مگن ہے یا اس سے بیزار ہے لیکن با دل نخواستہ اسے کئے چلا جا رہا ہے کہ گویا اس کے بدلہ میں کوئی اور کام اسے نظر ہی نہیں آتا۔ اسی بنا پر ارشاد ہے:

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۲۳-۵۳) تو پھر آپس میں اپنے کام کو متفرق کر کے جدا جدا کر دیا جو چیز جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہو رہا ہے۔ نیز فرمایا:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۴۳-۳۲) ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا۔

اس معنی میں الجبّار اللہ تعالیٰ کی صفت ہونا ظاہر ہے کیونکہ اگر وہ کسی پر جبر کرتا ہے تو تفضلاً

---

[1] کذا فی التاج (جبر) [2] قالہ القلیبی کما فی التاج (ارجوزۃ الفرار) وقال: لم اسمع تعال الامن افعل الا فی حرفین و ہو جبار من اجبرت و دراک من ادرکت وایضاً وافقہ الازہری [3] قدمر الآن تخریجہ وایضاً الشاہد فی ارجوزۃ العجاج وسباق من قول علی رضی اللہ عنہ۔

حکمت کے مطابق کرتا ہے جیسا کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے[1] (۵۶)

یَا بَارِئَ النَّسَمَاتِ وَجَبَّارَ الْقُلُوْبِ عَلٰی فِطْرَتِهَا وَشَقِیِّهَا وَسَعِیْدِهَا کہ اے روحوں کو پیدا کرنے والے اور دلوں کو ان کی اچھی یا بری فطرت پر جوڑنے والے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دلوں کو علم و عرفان کے لحاظ سے ان کی اصلی فطرت پر جوڑ دیا ہے اور یہ ماتقدم کے عموم میں داخل ہے۔

اَلْجَبَرُوْتُ (قدرت) طاقت، عظمت، یہ تجبر وتفعل سے فَعَلُوْتٌ کے وزن پر ہے۔

اِسْتَجْبَرْتُ حَالَهٗ میں نے اس کی حالت درست کرنے کے لئے اس کی دیکھ بھال کی۔

اَصَابَتْهُ مُصِیْبَةٌ لَا یَجْتَبِرُ اسے اتنی بڑی مصیبت پہنچی کہ وہ اس کے جبر کا قصد نہیں کرسکتا۔

اور جَبْرُ الْعَظْمِ (ہڈی کو جوڑنا) سے اَلْجَبِیْرَةُ مشتق ہے جس کے معنی اس پٹی کے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے اور اَلْجِبَارَةُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے اَلْجَبِیْرَةُ کی جمع اَلْجَبَائِرُ آتی ہے نیز تشبیہ کے طور پر کنگن اور بازوبند کو بھی جِبَارَةٌ کہا جاتا ہے اور اَلْجُبَارُ جس کی دیت ساقط ہو[2]

(ج ب ل)

اَلْجَبَلُ پہاڑ ج اَجْبَالٌ وَجِبَالٌ

قرآن میں ہے:۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهَادًا۔ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا (۷۸-۶،۷) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو (اس کی میخیں) نہیں ٹھہرایا؟

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۷۹-۳۲) اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا۔

وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْ بَرَدٍ (۲۴-۴۳)۔۔۔ اور آسمان میں جو (اولوں کے) پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا۔ (۳۵-۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔

وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا۔ (۲۰-۱۰۵) اور تم سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ خدا ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ (۲۶-۱۴۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

اور پہاڑ کی مختلف صفات کے اعتبار سے استعارۃ ہر صفت کے مطابق اشتقاق کر لیتے ہیں مثلاً معنی ثبات کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ جَبَلٌ لَا یَتَزَحْزَحُ کہ فلاں نہ ہلنے والا پہاڑ ہے۔ جَبَلَهُ اللّٰهُ عَلٰی کَذَا۔ اس کی فطرت ہی ایسی ہے یعنی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ فُلَانٌ ذُوْجِبِلَّةٍ فلاں بھدے جسم کا ہے۔ ثَوْبٌ جَیِّدُ الْجِبْلَةِ عمدہ اور مضبوط بنا ہوا کپڑا۔

---

[1] وفی الفائق ار۳۹۱ عن سلامۃ الکندی کان علیؓ یعلمنا الصلوۃ علی النبی ونقلہ تماما قریبًا فی سبعۃ اسطر [2] ومنہ فی الحدیث المعدن جبار والبئر جبار والعجماء جبار - ای الجرح والدم فی ہذہ الثلاثۃ ہدر لا ارش فیہا بتدوفی الشطورع من الارض مکان من الارض مصحف والتسدید من المراجع ۱۲

اور بڑائی وعظمت کے معنیٰ کا اعتبار کرتے ہوئے بڑی جماعت کو جِبِلٌّ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا (۳۶-۶۲) اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

ایک قرأت میں جُبُلًّا تشدید کے ساتھ ہے۔ تَوَّزِی نے کہا ہے کہ جُبُلًا وَجَبْلًا وَجُبُلًّا وَجِبِلًّا کے ایک ہی معنیٰ ہیں[۱]

اور دوسرے علماء نے کہا ہے جِبِلًّا جِبِلَّةٌ کی جمع ہے اور اسی سے آیت:۔ وَاتَّقُوا الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ (۲۶-۱۸۴) میں جبلۃ سے مراد ان کے وہ احوال ہیں جن پر ان کو پیدا کیا تھا اور وہ راستے جن پر چلنے کے وہ فطرۃً پابند تھے۔ جس کی طرف آیت کریمہ:۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (۱۷-۸۴) کہدو کہ ہر شخص اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے جَبُلَ فُلَانٌ فلاں پہاڑ کی طرح غلیظ الجسم ہے۔

(ج ب ن)

اَلْجَبِيْنُ پیشانی کا کنارہ۔ اور پیشانی کے دونوں طرف کے کناروں کو جَبِيْنَانِ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (۳۷-۱۰۳) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹالیا۔

اَلْجُبْنُ (بزدلی) دل کا ایسے موقع پر کمزوری کا اظہار کرنا جہاں اسے قوت کا مظاہرہ کرنا چاہیئے تھا۔ جَبَانٌ بزدل (مذکر ومؤنث) اَجْبَنْتُهٗ بزدل پانا کسی پر بزدلی کا حکم لگانا۔ اَلْجُبْنُ (ایضًا) پنیر تَجَبَّنَ اللَّبَنُ دودھ پنیر بن گیا یا پنیر کی طرح جم گیا۔

(ج ب ہ)

اَلْجَبْهَةُ (ماتھا، پیشانی) سر کا وہ حصہ جو سجدہ کی حالت میں زمین پر لگتا ہے اس کی جمع جِبَاہٌ آتی ہے جیسے فرمایا:۔ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ (۹-۳۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائیگا۔

اور جَبْهَةٌ کے معنی ثریا ستارہ کے بھی آتے ہیں گویا وہ بھی برج اسد کے لئے بمنزلہ پیشانی کے ہے۔ جَبْهَةُ الْقَوْمِ سرداران قوم جیسا کہ انہیں وُجُوْهُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے اور جَبْهَة کے معنی گھوڑے بھی آتا ہے جیسا کہ مروی ہے[۲] (ف) اَنَّهٗ لَيْسَ فِى الْجَبْهَةِ صَدَقَةٌ یعنی گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

(ج ب ی)

جَبَى (ض) جِبَايَةً۔ اَلْمَاءَ فِى الْحَوْضِ حوض میں پانی جمع کیا اور بڑے حوض کو جَابِيَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع جَوَابٍ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[۱] ففیہ اربع قرأت جُبُلًّا نسبہ الطبری الی سدرح وزید وخال وہو قرأۃ الحسن والاعرج والزہری راجع الطبرسی ۲۲/۲۲۲ والتیسیر للدانی ۱۸۴ وتوزی ہو ابو محمد عبداللّٰہ بن محمد التوزی من علماء البصرۃ (۲۳۰) راجع البغیہ ۲۹۰ والانباہ ۲/۱۲۶

[۲] وفی الفائق ۱/۱۸۶ وسمیت بذالک لانہا خیار البہائم والحدیث باختلاف الفاظہ فی البیہقی عن ابی ہریرۃ والحاکم فی الکنی عن الحسن عن عبدالرحمان بن سمرۃ وفی مراسلہ والبیہقی ایضا عن الحسن مرسلا وابو عبید فی غریبہ راجع لتخریجہ (رخیل)

وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ (۳۴-۱۳) اور لگن جیسے بڑے
بڑے حوض۔ اور اسی سے بطور استعارہ جَبَيْتُ
الْخَرَاجَ جِبَايَةً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
جس کے معنی مال خراج جمع کرنے کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
يُجْبٰى اِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ (۲۸-۵۷)
جہاں ہر قسم کے میوے پہنچائے جاتے ہیں۔
اَلْاِجْتِبَاءُ (افتعال) کے معنی انتخاب کے طور
پر کسی چیز کو جمع کرنے کے ہیں لہٰذا آیت کریمہ:۔
وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا
(۷-۲۰۳) اور جب تم ان کے پاس (کچھ دنوں
تک) کوئی آیت نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ تم نے
(اپنی طرف سے) کیوں نہیں بنا لی۔ میں لَوْلَا
اجْتَبَيْتَهَا کے معنی یہ ہوں گے کہ تم خود ہی ان کو
تالیف کیوں نہیں کر لیتے دراصل کفار یہ جملہ طنزاً
کہتے تھے کہ یہ آیات اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔
بلکہ تم خود ہی اپنے طور بنا لیتے ہو۔
اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا کے معنی
یہ ہوتے ہیں کہ وہ اسے اپنے فیض کے لئے
برگزیدہ کر لیتا ہے جسے گونا گوں نعمتیں
جدوجہد کے بغیر حاصل ہو جاتی ہیں یہ انبیاء
کے ساتھ خاص ہے اور صدیقوں اور شہیدوں
کے لئے جو ان کے قریب درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔
جیساکہ یوسفؑ کے متعلق فرمایا:۔ وَكَذٰلِكَ
يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ (۱۲-۶) اور اسی طرح خدا
تمہیں برگزیدہ (وممتاز) کرے گا۔
فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِيْنَ
(۶۸-۵۰) پھر پروردگار نے ان کو برگزیدہ کر
کے نیکوکاروں میں کر لیا۔
وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ
(۶-۸۷) ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ
بھی دکھایا تھا۔
ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى (۲۰-۱۲۲)
پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی
سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔
يَجْتَبِيْ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ
يُّنِيْبُ (۴۲-۱۳) جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ
کا برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع
کرے اسے اپنی طرف رستہ دکھا دیتا ہے۔
اس اجتباء کو دوسرے مقام پر اخلاص سے تعبیر فرمایا ہے۔
اِنَّا اَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (۳۸-۴۶)
ہم نے ان کو ایک (صفت) خاص (آخرت
کے) گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا۔

(ج ث ث)

جَثَّهُ (ن) جَثًّا کے معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ
دینے کے ہیں اور اِنْجَثَّ اس کا مطاوع آتا ہے
جیساکہ جَثَّ کا مطاوع اِجْتَثَّ آتا ہے قرآن
میں ہے[1]۔
اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ (۱۴-۲۶) زمین کے
اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔
اَلْمِجَثَّةُ۔ ہر وہ آلہ جس سے درخت کو اکھاڑا یا
کھودا جائے۔
جُثَّةُ الشَّيْءِ کے معنی کسی کے ابھرے ہوئے
شخص کے ہیں اور اَلْجُثُّ ہر اس چیز پر بولا جاتا
ہے جو زمین سے بلند ہو جائے جیسے ٹیلہ وغیرہ۔

---
[1] وفی الحدیث قال رجل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ما ہذہ الکماۃ الا الشجرۃ التی اجتثت من فوق الارض فقال لا بل ہی من المن (التاج) ۱۲

اَلْجُثْنَۃُ کھجور کا پودا جو اکھاڑ کر لگایا گیا ہو۔[1]
اَلْجَثْجَاثُ ایک قسم کا گھاس۔ ایک کڑوا خوشبودار زرد درخت جس میں بابونہ کی طرح پھول ہوتے ہیں۔

(ج ث م)

جَثَمَ (ض ن) جَثْمًا وَجُثُوْمًا۔ الطائر پرند کا زمین پر سینہ کے بل بیٹھنا اور اس کے ساتھ چمٹ جانا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر فرمایا:۔
فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ (۷-۹۱) اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔
اَلْجُثْمَانُ بیٹھے ہوئے انسان کا شخص۔ رَجُلٌ جُثَمَۃٌ وَجَثَّامَۃٌ بہت سونے والا سست آدمی۔

(ج ث و)

جَثَا (ن) جُثُوًّا وَجِثِیًّا۔ اَلرَّجُلُ گھٹنوں کے بل بیٹھنا یہ عَتَا (ن) عُتُوًّا وَعِتِیًّا کی طرح (باب نصر سے آتا ہے) جَاثٍ (صیغہ صفت) ج جُثِیٌّ جیسے بَاكٍ وَبُكِیٌّ۔ اور آیت کریمہ:۔
وَنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْھَا جِثِیًّا (۱۹-۷۲) اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے۔ میں جِثِیًّا، جَاثٍ کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور مصدر بمعنی اسم فاعل بھی اور آیت کریمہ:۔
وَتَرٰی كُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً (۴۵-۲۸) اور تم ہر ایک فرقے کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوگا۔ میں "جَاثِیَۃً" جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے جَمَاعَۃٌ قَائِمَۃٌ اَوْ قَاعِدَۃٌ۔

(ج ح د)

جَحَدَ (ف) جَحْدًا وَجُحُوْدًا (جان بوجھ کر انکار کر دینا) کے معنی دل میں جس چیز کا اقرار ہو اس کا انکار اور جس کا انکار ہو اس کا اقرار کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَجَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَآ اَنْفُسُھُمْ (۲۷-۱۴) اور ان سے انکار کر دیا کہ ان کے دل انکو مان چکے تھے۔
بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ (۷-۵۱) اور ہماری آیتوں سے منکر ہو رہے تھے۔ کہا جاتا ہے:۔
رَجُلٌ جَحْدٌ یعنی کنجوس اور قلیل الخیر آدمی جو فقر کو ظاہر کرے۔
اَرْضٌ جَحْدَۃٌ خشک زمین جس میں روئیدگی نہ ہو۔ محاورہ ہے:۔ جَحْدًا لَّہٗ وَنَكَدًا (اسے خیر حاصل نہ ہو۔)
اَجْحَدَ (افعال) انکار کرنا۔ منکر ہونا۔

(ج ح م)

اَلْجَحْمَۃُ آگ بھڑکنے کی شدت اسی سے اَلْجَحِیْمُ (فعیل) ہے جس کے معنی دوزخ یا دہکتی ہوئی آگ کے ہیں۔
اور جَحُمَتِ النَّارُ سے بطور استعارہ جَحِمَ (س) وَجْھُہٗ مِنْ شِدَّۃِ الْغَضَبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی غصہ سے چہرہ جل بھن جانے کے ہیں کیونکہ غصہ کے وقت بھی حرارت قلب بھڑک اٹھتی ہے کہا جاتا ہے:۔
جَحَمَ (ف) اَلْاَسَدُ بِعَیْنَیْہِ شیر نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا کیونکہ شیر کی آنکھیں بھی آگ کی طرح روشن ہوتی ہیں۔

(ج د د)

اَلْجَدُّ (مصدر ض) کے اصل معنی ہموار زمین پر چلنے کے ہیں۔ اسی سے جَدَّ فِیْ سَیْرِہٖ

---

[1] فی المطبوع "بعد طحنہ" مصحف والصحیح بعد قلعہ کما فی المعاجم

ہے جس کے معنی تیز روی کے ہیں اور جب کوئی شخص اپنے معاملہ میں محنت اور جانفشانی سے کام کرے تو کہا جاتا ہے جَدَّ فِی اَمْرِہٖ۔

اور اَجَدَّ (افعال) کے معنی صاحب جِد ہونے کے ہیں اور جَدَدْتُ الْاَرْضَ سے کسی چیز کو کاٹنے کا معنی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے جَدَدْتُہٗ (میں نے درست کرنے کے لئے اسے کاٹا) اور ثَوْبٌ جَدِیْدٌ کے اصل معنی قطع کئے ہوئے کپڑا کے ہیں اور چونکہ جس کپڑے کو کاٹا جاتا ہے وہ عموماً نیا ہوتا ہے اس لئے ہر نئی چیز کو جَدِیْدٌ کہا جانے لگا ہے اس بنا پر آیت:۔

بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (۵۰-۱۵) میں خلق جدید سے نشاۃ ثانیہ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے پیدا ہونا مراد ہے کیونکہ کفار اس کا انکار کرتے ہوئے کہتے تھے۔

أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ۔ (۵۰-۳) بھلا جب ہم مرگئے اور مٹی ہوگئے (تو پھر زندہ ہوں گے؟) یہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید ہے۔ اور جدید (نیا) خلق یعنی پرانا کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اسی اعتبار سے رات دن کو اَلْجَدِیْدَانِ اور اَلْاَجَدَّانِ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ (۳۵-۲۷) اور پہاڑوں میں سفید رنگ کے قطعات ہیں۔ میں جُدَدٌ کا واحد جُدَّۃٌ ہے جس کے معنی کھلے راستہ کے ہیں اور یہ طَرِیْقٌ مَجْدُوْدٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی وہ راستہ جس پر چلا جائے اسی سے جَادَّۃُ الطَّرِیْقِ ہے (جس کے معنی شاہراہ یا ہموار اور راستہ کے درمیانی حصہ کے ہیں جس پر عام طور پر آمد و رفت ہوتی رہتی ہے)

اَلْجَدُّ ثَدْیٌ وَالْجَدَّاءُ خشک تھنوں والی بھیڑ بکری اور سب وشتم کے طور پر کہا جاتا ہے۔ جُدَّ ثَدْیُ اُمِّہٖ اس کی ماں کے پستان خشک ہوجائیں اور جَدٌّ کا لفظ فیض الٰہی پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَاَنَّهٗ تَعَالٰى جَدُّ رَبِّنَا (۷۲-۳) اور یہ کہ ہمارے پروردگار کا فیضان بہت بڑا ہے۔

میں جَدٌّ بمعنی فیض الٰہی ہی کے ہے بعض کے نزدیک اس کے معنی عظمت کے ہیں[1] لیکن اس کا مرجع بھی معنی اول کی طرف ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت اختصاص ملک کے طریق سے ہے اور حظوظ دنیوی جو اللہ تعالیٰ انسان کو بخشتا ہے پر بھی جَدٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے جس کے معنی بخت و نصیب کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے جُدِدْتُ وَحُظِظْتُ خوش قسمت اور صاحب نصیب ہوگیا اور حدیث (۵۸) وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ۔[2] کے معنی یہ ہیں کہ دنیاوی مال وجاہ سے آخرت میں ثواب حاصل نہیں ہوسکے گا بلکہ اُخروی ثواب کے حصول کا ذریعہ صرف طاعت الٰہی ہے۔ جیسا کہ آیت:۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيهَا مَا نَشَاءُ الآیۃ کے بعد فرمایا:۔

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا (۱۷-۱۹) اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور

---

[1] راجع غریب القرآن للقتیبی ۱۹ [2] اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۱/۱۹۰ من حدیث ابی سعید الخدری وابن عباس (باب الدعاء بعد الرکوع) والنسائی عن معاویہ: (ما یقول اذا انصرف من الصلوۃ کنز العمال ۲ رقم ۲۰۸۹) ۱۲

اور اس میں اپنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

نیز اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶-۸۸) جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔

اَلْجَدُّ (ایضًا) دادا۔ نانا۔

بعض نے کہا ہے کہ لَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ کے معنی یہ ہیں کہ اسے آبائی نسب فائدہ نہیں دے گا اور جس طرح کہ آیت لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ۔ میں اولاد کے فائدہ بخش ہونے کی نفی کی ہے اسی طرح حدیث میں آباؤ اجداد کے نفع بخش ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

(ج د ث)

جَدَثٌ۔ قبر ج اَجْدَاثٌ قرآن میں ہے:۔ یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا (۷۰-۴۳) اس دن یہ قبر سے نکل کر (اس طرح) دوڑیں گے۔

اور سورۂ یٰسٓ میں ہے:۔ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ (۳۶-۵۱) یہ قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف دوڑیں گے۔ اور قبر کو جَدَفٌ بھی کہا جاتا ہے[1]۔

(ج د ر)

اَلْجِدَارُ کے معنی حَائِط (دیوار) ہی کے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ وہ زمین سے اونچی اور بلند ہوتی ہے اسے جدار کہا جاتا ہے اور اس اعتبار سے کہ احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہے اسے حَائط کہا جاتا ہے۔ جِدَارٌ کی جمع جُدُرٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَیْنِ (۱۸-۸۲) اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں کی تھی۔

جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (۱۸-۷۷) ایک دیوار دیکھی جو (جھک کر) گرا چاہتی تھی خضرؑ نے اس کو سیدھا کر دیا۔

اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ (۵۹-۱۴) یا دیواروں کی اوٹ میں۔ اور حدیث میں ہے[2] (۵۹) حَتّٰی یَبْلُغَ الْمَآءُ الْجُدُرَ جب تک کہ پانی دیوار تک نہ پہنچ جائے۔

جَدَرْتُ الْجِدَارَ دیوار کو اونچا کر دیا۔

اور اس میں معنی ارتفاع کے اعتبار سے جَدَرَ الشَّجَرُ کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں چنے کے دانے کی طرح درخت کے کونپل نکل آئے اسی طرح اس طرح وہ روئیدگی جو زمین پر ظاہر ہو۔ اسے جَدْرٌ کہا جاتا ہے اس کا واحد جَدْرَةٌ ہے اور اَجْدَرَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین سبزہ زار ہو گئی۔

جُدِرَ (ن) الصَّبِیُّ وَجُدِّرَ بچے کو چیچک نکل آئی۔ یہ محاورہ درخت کے کونپل کیساتھ تشبیہ لیا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اَلْجُدَرِیُّ وَالْجُدَرَةُ کے معنی غدود یا آبلہ کے ہیں جو جسم پر ظاہر ہوتا ہے اس کی جمع اَجْدَارٌ ہے۔ شَاةٌ جَدْرَاءُ گوسپند آبلہ زدہ۔

---

[1] راجع کتاب الابدال لابی الطیب ۱/۱۹۲ [2] قال صلی اللہ علیہ وسلم فی شراج الحرۃ حین اختصم الیہ الزبیر بن العوام وحاطب بن ابی بلتعۃ فقال یا زبیر اسق ثم ارسل الماء الی جارک فغضب الانصاری وقال: ان کان ابن عمتک فقال صلی اللہ علیہ وسلم اسق یا زبیر ثم احبس الماء حتی یرجع الی الجدر الحدیث (الکشاف ۱/۲۷۸) وابن ابی حاتم عن سعید بن المسیب فی الصحیحین من طریق الزہری عن عروۃ وراجع تخریج الکشاف ۴۵ رقم ۲۷ وغریب ابی عبید ۱م : ۲۰۱) والفائق ۱/۱۹۵)

اَلْجَیْدَرُ کوتاہ قد یہ بھی جدار سے مشتق ہے لیکن بطور تحکم اس میں یاء زائدہ کر دی گئی ہے حقارت کو ظاہر کرنے کے لئے اس میں یا بڑھا دی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی کتاب "اصول الاشتقاق" میں بیان کر چکے ہیں۔

اَلْجَدِیْرُ (سزاوار) اس کے معنی منتہی کے ہیں۔ کیونکہ اس تک کسی امر کی انتہا ہوتی ہے جیسا کہ دیوار تک پہنچ کر کوئی چیز رک جاتی ہے اور جَدَرٌ کے معنی کسی چیز کے لائق ہونے کے ہیں اس سے صیغہ صفت جَدِیْرٌ آتا ہے۔

مَا اَجْدَرَہٗ وَ اَجْدِرْ بِہٖ (صیغہ تعجب) وہ اسکے لئے کس قدر زیبا ہے۔

(ج د ل)

اَلْجِدَالُ (مفاعلۃ) کے معنی ایسی گفتگو کرنا کے ہیں جسمیں طرفین ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اصل میں یہ جَدَلْتُ الْحَبْلَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں رسی کو مضبوط بٹنا اسی سے بٹی ہوئی رسی کو اَلْجَدِیْلُ کہا جاتا ہے جَدَلْتُ الْبِنَاءَ مضبوط عمارت بنانا۔ دِرْعٌ مَجْدُوْلَۃٌ مضبوط زرہ۔

اَلْاَجْدَلُ شکرا۔ کیونکہ اس کا بدن بھی گٹھا ہوا ہوتا ہے۔

اَلْمِجْدَلُ مضبوط محل

اسی سے اَلْجِدَالُ (جھگڑنا) ہے کیونکہ جھگڑنے والے بھی ایک دوسرے کو اس کی رائے سے اس طرح پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ رسی کو پیچ دیا جاتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اصل میں جدال کے معنی صِرَاع یعنی ایک دوسرے کو جَدَالَۃ یعنی سخت زمین پر پچھاڑ دینا کے ہیں قرآن میں ہے۔

وَجَادِلْہُمْ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ (۱۶-۱۲۵) اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔

اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیَاتِ اللّٰہِ (۴۰-۳۵) جو لوگ ... خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔

وَاِنْ جَادَلُوْکَ فَقُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ (۲۲-۶۸) اور اگر یہ تم سے جھگڑا کریں تو کہدو کہ .... خدا ان سے خوب واقف ہے۔

قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا (۱۱-۳۲) تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور جھگڑا بھی بہت کیا۔ ایک قرأت میں جَدَلَنَا بھی ہے۔

مَا ضَرَبُوْہُ لَکَ اِلَّا جَدَلًا (۴۳-۵۸) انہوں نے (عیسیٰ کی) جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (۱۸-۵۴) لیکن انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔

وَہُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰہِ (۱۳-۱۳) اور وہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔

یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ (۱۱-۷۴) وہ قوم لوط کے بارے میں لگے ہم سے بحث کرنے۔

وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ (۴۰-۵) اور بیہودہ (شبہات سے) جھگڑتے رہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ (۲۲-۳) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا کی شان میں .... جھگڑتے .... ہیں۔

وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (۲-۱۹۷) تو حج کے دنوں میں .... نہ کسی سے جھگڑے۔

(ج ذ ذ)

اَلْجَذُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور

ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں اور پتھر یا سونے کے ریزوں
کو جُذَاذ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:۔
فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا (۲۱-۵۸) پھر ان کو توڑ کر
ریزہ ریزہ کردیا۔
عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ (۱۱-۱۰۸) یہ خدا کی
بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔
محاورہ ہے۔
مَا عَلَيْهِ جُذَّةٌ یعنی اس کے بدن پر چیتھڑا
بھی نہیں ہے۔

(ج ذ ع)

اَلْجِذْعُ درخت کا تنہ۔ ج جُذُوْعٌ
قرآن میں ہے:۔ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ (۲۰-۷۱)
جَذَعْتُهُ (ف) شاخ یا تنے کی طرح کاٹ ڈالنا۔
اَلْجَذَعُ (من الابل) شتر بسال پنجم (من الشاۃ)
گوسپند بسال دوم اور چوپایوں کے ساتھ تشبیہ
دے کر زمانہ کو بھی جَذَعٌ کہا جاتا ہے کیونکہ
زمانہ بھی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

(ج ذ و)

اَلْجَذْوَةُ وَالْجُذْوَةُ (انگارہ) جلنے
اور شعلہ ختم ہوجانے کے بعد جو ایندھن باقی رہ جاتا
ہے اسے جَذْوَةٌ کہا جاتا ہے ج جِذًى وجُذًى
قرآن میں ہے:۔
اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ (۲۸-۲۹) یا آگ کا انگارہ۔
خلیل نے کہا ہے کہ جَذَا اور جَثَا ہم معنی ہیں
یعنی چمٹ جانا مگر جَذَا میں شدت لزوم کے معنی
پائے جاتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔
جَذَا الْقُرَادُ فِي جَنْبِ الْبَعِيرِ کہ چچڑی اونٹ
کے پہلو میں سختی کے ساتھ چمٹ گئی۔
اَجْذَتِ (افعال) الشَّجَرَةُ درخت کا جڑ پکڑ
لینا۔ حدیث میں ہے[1]۔ (۶۰)
كَمَثَلِ الْاَرْزَةِ الْمُجْذِيَةِ اس کی مثال مضبوط
جڑ والے صنوبر کے درخت کی ہے (یعنی جو ہوا
کے جھکولوں سے ادھر ادھر نہیں جھکتا)
رَجُلٌ جَاذٍ مرد کوتاہ دست وکوتاہ ارش مؤنث
جَاذِيَةٌ کوتاہ موئے ہیں اس کے دونوں ہاتھ
گویا پارہ آتش ہیں۔

(ج ر ح)

جَرَحَهُ (ف) جَرْحًا زخمی کرنا صفت مفعول
جَرِيحٌ وَمَجْرُوحٌ (زخمی) جُرْحٌ (اسم) ج جُرُوحٌ
قرآن میں ہے:۔
وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (۵-۴۵) اور سب زخموں
کا اسی طرح بدلہ ہے۔
اور زخم کے ساتھ تشبیہ دے کر گواہ پر بحث
کرنے کو بھی جَرْحٌ کہا جاتا ہے اور کتے چیتے
اور پرندے شکاری جانور کو جَارِحَةٌ کہا جاتا ہے۔
اس کی جمع جَوَارِحُ ہے اور شکاری جانوروں
کو جَوَارِحُ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شکار
کو زخمی کرتے ہیں اور یا اس لئے کہ وہ کما کر لاتے ہیں
ان ہر دو وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر اعضاء
کاسبہ یعنی ہاتھ پاؤں کو جَوَارِحُ کہا جاتا ہے۔
قرآن میں ہے۔

---

[1] راجع الفائق ۱/۱۸۶ ولفظہ الحدیث متفق علیہ من حدیث کعب بن مالک فی اثنا رحدیث: مثل المؤمن الحدیث راجع المسلم مع النووی ۲/۳۷۶ طبعۃ الهند وضبط النووی المجذیۃ بالیاء من اجذیت ، البخاری (مرضیٰ ، توحید و "دی" ، اناق رحم) ۲/۵۲۳-۳/۲۵۴-۵/۱۴۲ وغریب ابی عبید ج ۱ ص ۱۱۶-۱۱۷) ؛

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ (۵-۴) اور وہ شکار بھی حلال ہے) جو تمہارے شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔

اَلْاِجْتِرَاحُ جرائم کا ارتکاب کرنا۔ اصل میں جَرَاحَۃ سے ہے جیسا کہ اِقْتِرَافٌ کا لفظ قَرَفَ الْقُرْحَۃَ سے مشتق ہے جس کے معنی زخم کو چھیلنے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ (۴۵-۲۱) جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں۔

(ج ر د)

اَلْجَرَادُ۔ ٹڈی اس کا واحد جَرَادَۃٌ ہے۔

قرآن میں ہے:۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ (۷-۱۳۳) ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں ..... بھیجیں۔

كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ (۵۴-۷) الغرض جَرَادٌ کے معنی ٹڈی کے ہیں۔ اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اصل ہو اور اس سے جَرَدَ الْاَرْضَ مشتق ہو جس کے معنی ہیں ٹڈی زمین پر سے گھاس چٹ کر گئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جراد خود جَرْدٌ سے مشتق ہو جس کے معنی ننگا کرنے کے ہیں اور چونکہ ٹڈی زمین کی روئیدگی کو کھا کر اسے ننگا اور صاف کر دیتی ہے اس لئے ٹڈی کو جراد کہا گیا ہے اور اَرْضٌ مَجْرُوْدَۃٌ اس زمین کو کہا جاتا ہے جس کی نباتات کو ٹڈیوں نے کھا کر صاف کر دیا ہو۔

فَرَسٌ اَجْرَدُ بے بال یا چھوٹے بالوں والا گھوڑا۔ ثَوْبٌ جَرْدٌ پرانا کپڑا۔ کیونکہ اس کی روئیں جھڑ جاتی ہے اور کمزور ہو جاتا ہے۔ تَجَرَّدَ عَنِ الثَّوْبِ ننگا ہونا کپڑے اتار دینا۔ جَرَّدْتُہٗ (عَنِ الثِّيَابِ) ننگا کرنا۔

اِمْرَءَۃٌ حَسَنَۃُ الْمُتَجَرَّدِ یعنی خوب صورت بدن است وقت برہنگی ایک روایت میں ہے[۱]

(۶۱) جَرِّدُوْا الْقُرْاٰنَ قرآن کو علیحدہ رکھو یعنی اس کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط نہ کرو۔

اِنْجَرَدَ بِنَا السَّيْرُ۔ دراز گردید سفر۔

جَرِدَ الْاِنْسَانُ خراج برآرد پوست انسان از خوردن ملخ یعنی ملخ کے کاٹنے سے جسم پر پتی اچھلنا۔

(ج ر ز)

جُرُزٌ۔ وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو فرمایا:۔ صَعِيْدًا جُرُزًا (۱۸-۸) بنجر میدان ..... یعنی جس پر گھاس درخت وغیرہ کوئی چیز نہ ہو۔

اَرْضٌ مَجْرُوْزَۃٌ زمین جس سے گھاس چر کر ختم کر دیا گیا ہو۔

اَلْجَرُوْزُ جو دستر خوان کو صاف کر دے۔ مثل مشہور ہے:۔ لَا تَرْضٰى شَانِئَہٗ اِلَّا بِجَرْزَۃٍ یعنی اس کے دشمن اس کا استیصال کئے بغیر خوش نہیں ہوں گے۔

اَلْجَارِزُ سخت کھانسی (اس میں معنی جرز کا تصور پایا جاتا ہے)

اَلْجُرَازُ تلوار سے کاٹنا۔ سَيْفٌ جُرَازٌ شمشیر بران

---

[۱] موقوفا علی ابن مسعود وتمامہ لیربو فیہ صغیرکم ولا ینائی عنہ کبیرکم فان الشیطان یخرج من بیت تقرء فیہ سورۃ البقرۃ الفائق ا ر ۱۹۶ و فی تاویلہ قولان: ارادرضی اللہ عنہ تجریدہ عن النقط والعشور لئلا ینشا نشوء فیری انہا من القرآن وقیل ہو حث علی ان لا یتعلم غیرہا فی حصرہ بالتعلم غریب ابی عبیدہ ۴ر۴۲ ۔ ۴۹ ۔ ۴ ؎

(ج ر ع)

جَرَعَ (ف)، جَرْعًا۔ اَلْمَاءُ گھونٹ گھونٹ کرکے پانی پینا۔ اور بقول بعض جرِع (س) آتا ہے۔

تَجَرَّعَهُ (تفعل) تکلف سے گھونٹ گھونٹ کرکے پی گیا۔ گویا اس کا پینا طبیعت پر ناگوار گذر رہا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ (۱۴-۱۷) وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیئے گا اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔

جُرْعَةٌ ایک مرتبہ گھونٹ سے نگلنا۔ مثل مشہور ہے[1]۔

اَفْلَتَ بِجُرَيْعَةِ الذَّقَنِ وہ ہلاکت کے قریب پہنچ کر بچ نکلا۔

نُوْقٌ مَجَارِيعُ۔ وہ اونٹنیاں جن کا دودھ تھوڑا یا خشک ہو گیا ہو۔

اَلْجَرَعُ وَالْجَرْعَاءُ ریگستان جس میں کچھ نہ اُگے گویا وہ بیج کو نگل لیتا ہے۔

(ج ر ف)

قرآن میں ہے: عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (۹-۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارے پر۔ اَلْجُرُفُ۔ دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو کٹ کٹ کر نیچے گر رہا ہو۔ محاورہ ہے: جَرَفَ الدَّهْرُ مَالَهٗ حوادث زمانہ نے اس کے مال کو تباہ کر دیا۔

رَجُلٌ جُرَافٌ مرد بسیار جماع شادمان۔ گویا وہ اس شغل میں بہہ رہا ہے۔

(ج ر م)

اَلْجَرْمُ (ض) اس کے اصل معنی درخت سے پھل کاٹنے کے ہیں۔ یہ صیغہ صفت جَارِمٌ ج جُرَّامٌ۔ تَمْرٌ جَرِيْمٌ خشک کھجور۔ جُرَامَةٌ ردی کھجوریں جو کاٹتے وقت نیچے گر جائیں یہ نُفَايَةٌ کے وزن پر ہے (جو کہ ہر چیز کے ردی حصہ کے لئے استعمال ہوتا ہے)

اَجْرَمَ (افعال) جرم والا ہونا جیسے اَثْمَرَ وَاَتْمَرَ وَاَلْبَنَ اور استعارہ کے طور پر اس کا استعمال اکتساب مکروہ پر ہوتا ہے۔ اور پسندیدہ کسب پر بہت کم بولا جاتا ہے۔ اس کا مصدر جَرْمٌ ہے شاعر نے عقاب کے متعلق کہا ہے[2] (الوافر)

(۸۸) جَرِيْمَةُ نَاهِضٍ فِيْ رَأْسِ نِيْقٍ

جیسا کہ (عقاب) بلند پہاڑ کی چوٹی پر اپنے بچوں کے لئے روزی کما کر ان کو کھلاتا ہے۔

یہاں شاعر کا "شاہین کے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کو جرم کہنا" یا تو اس بنا پر ہے کہ وہ پرندوں کا شکار کرکے لاتا ہے اور یا اس کو ایسا شخص فرض کیا ہے جو اپنی اولاد کی خاطر گناہ کرتا ہے جیسا کہ کسی نے کہا کہ ہر صاحب اولاد خواہ بہائم ہی کیوں نہ ہوں اپنی اولاد کے لئے ضرور ہی جرائم کا ارتکاب کرتا ہے

قرآن مجید میں اِجْرَام (افعال) اور جَرْم (ض) دونوں فعل استعمال ہوئے ہیں چنانچہ اجرام کے

---

[1] افلت یکون لازما ومتعدیا والباء بمعنی مع وجریعۃ تصغیر جرعہ والمراد منہ النفس ای خلص مع جریعۃ الذقن ای فیہ بقیۃ لوجہ بقدر جرعۃ فی الفم راجع لتفصیلہ المیدانی ۶۹-۷۰ وابدال ابی الطیب ۳/۲۳-۲۷۴ واللسان (جرع) [2] قالہ ابوخراش الہذلی یصف عقابا تبعہ فرسہ بہا ترزق فرخہا وتمامہ: تری لعظام ما جمعت صلیبا وفی اللسان (جرم، صلب) والاساس (جرع) ناہض بدل ناہص والبیت فی الاقتضاب ۲۱۷ والمعانی للقتبی ۲۸۰ وغریب القرآن للقتبی ۱۲۹ واصلاح یعقوب وادب الکاتب ۲۶ والدرر (ط حرد ۳:۲۱۳) والحیوان (۷:۲۳۴) واشعار الہذلیین (۲:۵۷)

متعلق فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ (۸۳-۲۹) جو گنہگار (یعنی کفار) ہیں وہ دنیا میں (مومنوں) سے ہنسی کیا کرتے تھے۔

کُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّکُمْ مُّجْرِمُوْنَ (۷۷-۴۶) (اے جھٹلانے والو) تم کسی قدر کھالو اور فائدے اٹھالو تم بیشک گنہگار ہو۔

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (۵۴-۴۷) بیشک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں۔

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ (۴۳-۷۴) اور جَرَمَ (ض) کے متعلق فرمایا:

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْٓ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ (۱۱-۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کراوے کہ ..... تم پر واقع ہو۔

یہاں اگر یَجْرِمَنَّکُمْ فتحہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو بَغَیْتُهٗ مَالًا کی طرح ہوگا اور اگر ضمہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو اَبْغَیْتُهٗ مَالًا (یعنی میں نے مال سے اس کی مدد کی) کے مطابق ہوگا۔

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا (۵-۸) اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ اور آیت کریمہ:

فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ (۱۱-۳۵) تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر۔ میں ہوسکتا ہے کہ اِجْرَام (بکسر الہمزہ) باب افعال سے مصدر ہو اور اگر اَجْرَام (بفتح الہمزہ) پڑھا جائے تو جَرْمٌ کی جمع ہوگی[1]۔

اور جرم بمعنی قطع سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔ جَرَمْتُ صُوْفَ الشَّاۃِ میں نے بھیڑ کی اون کاٹی تَجَرَّمَ اللَّیْلُ رات ختم ہوگئی۔

اَلْجِرْمُ (جسم) اصل میں یہ بمعنی مَجْرُوْمٌ ہے یعنی قطع کیا ہوا جیسے نِفْضٌ وَنِقْضٌ بمعنی منفوض و منقوض کے آتا ہے۔

پھر یہ جسم پر بولا جاتا ہے اور فُلَانٌ حَسَنُ الْجِرْمِ کے معنی ہیں کہ خوبصورت ہے جیسا کہ حَسَنُ السَّخَا کا محاورہ ہے اور حَسَنُ الْجِرْمِ کے معنی حسن صوت بھی آتے ہیں اور اس میں درحقیقت جرم سے محل صوت کی طرف اشارہ ہوتا ہے نہ کہ نفس صوت کی طرف لیکن اس سے آواز کی خوبصورتی بیان کرنا مقصود ہوتی ہے اس لئے اس کے معنی حسن صوت کردیئے جاتے ہیں جیسا کہ اسی معنی میں طَیِّبُ الْحَلْقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ حلق سے صوت مراد لی جاتی ہے نہ کہ بذات خود حلق مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

لَا جَرَمَ (۱۶-۱۰۹) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے لَا اصل میں محذوف پر داخل ہوا ہے جیسا کہ لَا اُقْسِمُ میں لا آتا ہے اور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] ع (متقارب)

(۸۹) لَا وَاَبِیْکِ ابْنَةَ الْعَامِرِیِّ

اور جَرَمَ فعل ماضی ہے جس کے معنی کَسَبَ یا جَنٰی کے ہیں اس کے بعد اَنَّ لَهُمُ النَّارَ (جملہ) موضع مفعول میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے لئے (دوزخ کی) آگ حاصل کی۔

بعض نے کہا ہے کہ جَرَمَ اور جُرْمٌ کے ایک ہی

---

[1] قال الزمخشری ونصر الجمع ان فسرہ الاولون بآثامی (الکشاف ۲: ۲۹۲ ج ۲) [2] قال امرؤ القیس یخاطب ابنة عمه فاطمة والبیت من قطعة نعتیة وعدتها ۱۴ بیتا وتمامه: ..... لا یدعی القوم انی افر. والبیت فی الحماسة مع المرزوقی. راجع الخزانة ۱: ۳۲۷-۳۴۹ والعینی ۱: ۵۹ اوشرح المفضلیات والعقد لابن الانباری ۴۴ والعقد الثمین ۱۲۶ والسیوطی ۲۱۷ والطبری ۲۷: ۱۳۱ والغرر ۳: ۲۱۴ والبیت ایضا من شواہد الکشاف ۵۴ وقال المحب وقیل البیت لربیعة بن جشم الیمنی وایضا المغنی ۱: ۲۷۶ ودیوانه ۹۴ ۞

معنی ہیں۔ لیکن لا کے ساتھ جَرَمَ آتا ہے جیسا کہ قسم کے ساتھ عَمْرُ کا لفظ مختص ہے اگرچہ عَمْرٌ و عُمْرٌ کے معنی ایک ہی ہیں اور معنی یہ ہے کہ ان کے لئے آگ کا ہونا کسی کا جُرْم نہیں ہوگا بلکہ یہ ان کے عملوں کی سزا ہوگی اور انہوں نے خود ہی اسے اپنے لئے حاصل کیا ہوگا جیسا کہ آیت: وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا۔ (۴۱-۴۶) اور جو بُرے کام کرے گا۔ تو اس کا ضرر اسی کو ہوگا۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس کی تفسیر میں اور بھی بہت سے اقوال منقول ہیں[1]۔ لیکن ان میں سے اکثر تحقیق کی رو سے صحیح نہیں ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:۔

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۱۶-۲۲-۲۳) تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں خدا ضرور اس کو جانتا ہے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۶-۱۰۹) کچھ شک نہیں کہ یہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

(ج ر ی)

جَرَىٰ (ض) جِرْيَةً وَجَرْيًا وَجِرْيَانًا کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ پانی اور پانی کی طرح چلنے والی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (۴۳-۵۱) اور یہ نہریں جو میرے (محلوں کے) نیچے بہہ رہی ہیں۔ میری نہیں ہیں۔

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲-۲۵) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ (۳۰-۴۶) اور تاکہ ... کشتیاں چلیں

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۸۸-۱۲) اس میں چشمے بہ رہے ہوں گے اور آیت کریمہ:۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (۶۹-۱۱) جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کر لیا۔

میں جَارِيَةٌ سے مراد کشتی ہے اس کی جمع جَوَارٍ آتی ہے جیسے فرمایا:۔ اَلْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ (۵۵-۲۴) اور جہاز جو .... اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ (۴۲-۳۲) اور اسی کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز ہیں (جو) گویا پہاڑ ہیں۔

اور پرند کے سنگدانہ کو جِرِيَّةٌ کہنے کی وجہ ہے کہ کھانا چل کر وہاں پہنچتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ طعام کا مجریٰ بنتا ہے۔ اَلْاِجْرِيَّا عادت جس پر انسان چلتا ہے۔

اَلْجَرِيُّ وکیل۔ یہ لفظ رسول اور وکیل سے اخص ہے۔

[1] وقیل: اَنّ ذو موضع رفع وجَرَمَ بمعنی وجب ان لہم النار وانہم مفرطون بحث القالی فی نوادرہ فی لاجرم ومنہ اخذ ابن الانباری وغیرہم معظم ہذا الباب ولم یخرج المؤلف مما ہنالک وذکروا فیہ وجوہ ذہب الفراء تبعاً للکسائی ان جرم اسم لا وذہب سیبویہ فی الکتاب بانہ فعل ماضی راجع للبحث النوادر ۲۱۲-۲۱۳ الخزانۃ ۴ ر ۳۱۱ والصحاح والتاج (جرم) والامالی المرتضی ار ۱۱۰ والفاخر لابی طالب ۱۹۹ واعراب القرآن المنسوب الی الزجاج ۱۱۷-۱۱۸ وفی ابن کثیر (۳: ۸۰) قال السدی وابن جریج "لاجرم" معنا حقا وقال الضحاک لاکذب وقال علی بن طلحہ عن ابن عباس لاجرم معنا دبلی ....

[2] فی التاج ... وما یجری جرۃ وفی المطبوع ... وما یجری بجریہ ۱۲

اور جَرَّیْتُ جَرِیًّا کے معنی وکیل بنا کر بھیجنے کے ہیں اور حدیث میں ہے۔ (۶۲)

لَا یَسْتَجْرِیَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ یہاں یہ لفظ اپنے اصل معنی پر بھی محمول ہو سکتا ہے یعنی شیطان اپنے حکم کی بجا آوری اور اطاعت میں بہہ جانے پر تمہیں برانگیختہ نہ کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جَرِیٌّ بمعنی رسول یا وکیل سے مشتق ہو اور معنی یہ ہونگے کہ شیطان کی وکالت اور رسالت کے سرپرست نہ بنو گویا یہ آیت کریمہ۔

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ (۴-۷۶) شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا: اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ (۳-۱۷۵) یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔

(ج ز ء)

جُزْءُ الشَّیْءِ چیز کا وہ ٹکڑا جس سے وہ چیز مل کر بنے۔ جیسے اَجْزَاءُ السَّفِیْنَةِ اَجْزَاءُ الْبَیْتِ اور حساب میں اَجْزَاءُ الْجُمْلَةِ (یعنی کل مجموعہ کے اجزاء) وغیرہ محاورات بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا (۲-۲۶۰) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھوا دو۔

لِکُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۱۵-۴۴) ہر ایک دروازے کے لئے ان میں ایک حصہ تقسیم کر دیا گیا ہے۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (۴۳-۱۵) اور انہوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لئے اولاد مقرر کی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ جُزْءًا سے مراد اَنَاثٌ ہیں میں انہوں نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا اور یہ اَجْزَأَتِ الْمَرْأَةُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی مادینہ اولاد کو جنم دینا کے ہیں۔

جَزْءُ الْاِبِلِ مَجْزَءً وَجَزْأً اونٹ تر گھاس کھانے کی وجہ سے پانی سے بے نیاز ہو گئے محاورہ ہے:۔ اَللَّحْمُ السَّمِیْنُ اَجْزَءُ مِنَ الْمَهْزُوْلِ موٹا گوشت دبلے گوشت سے زیادہ کفایت کرنے والا ہوتا ہے۔

جُزْأَةُ السِّکِّیْنِ چھری کا دستہ کیونکہ وہ اس کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

(ج ز ع)

اَلْجَزَعُ بے صبری۔ قرآن میں ہے:۔ سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا (۱۴-۲۱) اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں۔ ہمارے حق میں برابر ہے۔ یہ حزن سے خاص ہے کیونکہ جزع خاص کر اس غم کو کہتے ہیں جو انسان کو جس چیز کے وہ درپے ہو اس سے پھیر دے اور اس سے تعلق قطع کر دے۔

اصل میں جَزْعٌ (ف) کے معنی رسی کو نصف سے کاٹ دینے کے ہیں اور اِنْجِزَاعٌ (انفعال) اس کا مطاوع آتا ہے جیسے جَزَعْتُهٗ فَانْجَزَعَ میں نے اسے کاٹا چنانچہ کٹ گیا۔ اور معنی انقطاع کے تصور کی بنا پر وادی کے موڑ کو جِزْعُ الْوَادِیْ کہا جاتا ہے اور تغیر سے بھی چونکہ اصل

؎۵ الحدیث فی النہایۃ وقبلہ قولوا بقولکم ... وذالک انہم مدحوہ فکرہ لہم المبالغۃ فی المدح ای لا تتکلفوا فی المدح فیتخذکم الشیطان جریا ای وکیلا ... (۲۶۶)

رنگ کٹ جاتا ہے اس لئے متلون خرمہرے کو جَزْعٌ کہتے ہیں اسی سے لَحْمٌ مُجَزَّعٌ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی دو رنگ کے گوشت کے ہیں اور نیم پختہ کھجور کو مُجَزَّعٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْجَاذِعُ شہتیر کو کہتے ہیں جو چھت کے وسط میں ڈالا جاتا ہے اور دونوں طرف سے چھوٹے شہتیر آ آ کر اس پر مل جاتے ہیں تو اسے جاذع یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ بوجھ اٹھانے کی وجہ سے گویا وہ بے صبر ہو رہا ہے اور یا اس لئے کہ کمرے کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے گویا وہ اسے دو حصوں میں قطع کر دیتا ہے۔

(ج ز ی)

اَلْجَزَاءُ (ض) کافی ہونا۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَیْئًا۔ (۲-۴۸) کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔
لَا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ ھُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا۔ کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکیگا۔
اَلْجَزَاءُ (اسم) کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو جیسے خیر کا بدلہ خیر سے اور شر کا بدلہ شر سے دیا جائے۔ کہا جاتا ہے۔ جَزَیْتُہٗ کَذَا بِکَذَا میں نے فلاں کو اس کے عمل کا ایسا بدلہ دیا قرآن میں ہے:۔
وَذٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَکّٰی (۲۰-۷۶) اور یہ اس شخص کا بدلہ ہے جو پاک ہوا۔
فَلَهٗ جَزَاءً نِ الْحُسْنٰی (۱۸-۸۸) اس کے لئے بہت اچھا بدلہ ہے۔
وَجَزَاءُ سَیِّئَةٍ مِّثْلُھَا (۴۲-۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔
وَجَزَاھُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِیْرًا۔ (۷۶-۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت (کے باغات) اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کریگا۔
جَزَاءُکُمْ جَزَاءً مَّوْفُوْرًا (۱۷-۶۳) اور وہ پوری پوری جزا ہے۔
اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا (۲۵-۷۵) ان (صفات) کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیے جائیں گے۔
وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۷-۳۹) اور تم کو بدلا ویسا ہی ملے گا جیسے تم کام کرتے تھے۔
اَلْجِزْیَةُ وہ ٹیکس جو ذمیوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ اور اسے جزیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے جان و مال کی حفاظت کے بدلہ میں ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے۔
حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صَاغِرُوْنَ (۹-۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔
محاورہ ہے:۔ جَازِیْكَ فُلَانٌ یعنی فلاں تجھے کافی ہے۔
جَزَیْتُهٗ بِکَذَا وَجَازَیْتُهٗ میں نے اسے بدلہ دیا۔
قرآن نے جَزٰی (ض) کا لفظ استعمال کیا ہے اور جَازٰی (مفاعلہ) استعمال نہیں کیا کیونکہ مجازاۃ کے معنی مکافات کے ہوتے ہیں یعنی کسی کے احسان (نعمت) کے بدلے میں اسی قسم کا احسان کرنا۔ یہ چیز دو آدمیوں کے درمیان تو باہم مشترک ہو سکتی ہے۔ لیکن نعمت الہٰی کی کوئی شخص مکافات نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے بارے میں مکافات کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے یہ بات بالکل واضح ہے (جس کی دلیل کی ضرورت نہیں)

(ج س س)

اَلْجَسُّ کے اصلی معنی ہیں رگ کو چھونا اور

نبض دیکھ کر معلوم کرنا کہ بیمار ہے یا تندرست۔
یہ حَسٌّ سے خاص ہے۔ کیونکہ حَسٌّ کے معنی
قوت احساس سے کسی چیز کا ادراک کرنا کے ہیں۔
لیکن جَسٌّ کسی اندرونی حالت کے معلوم کرنے
کو کہتے ہیں اور لفظ جَسٌّ سے جَاسُوْسٌ کا لفظ
مشتق ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تَجَسَّسُوا (۴۹-۱۲) اور ایک دوسرے
کے اندرونی حالات کا تجسس نہ کیا کرو۔

(ج س د)

اَلْجَسَدُ (اسم) جسم ہی کو کہتے ہیں مگر یہ
جسم سے اخص ہے خلیل فرماتے ہیں کہ جسد کا لفظ
انسان کے علاوہ دوسری مخلوق پر نہیں بولا جاتا
نیز جَسَد رنگ (جسم کو کہتے ہیں مگر جسم کا لفظ بے
جان اشیاء (مثلاً پانی ہوا وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے
اور آیت کریمہ:۔
وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ
(۲۱-۸) کہ ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے
تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں ـــ سے خلیل کے قول
کی تائید ہوتی ہے۔
نیز قرآن میں ہے: عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ
(۲۰-۸۸) ایک بچھڑا (یعنی قالب جس کی آواز
گائے کی سی تھی۔ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا
ثُمَّ اَنَابَ (۳۸-۳۴) اور ان کے تخت پر ہم
نے ایک دھڑ ڈال دیا چنانچہ انہوں نے خدا کی
طرف رجوع کیا اور لون کے اعتبار سے زعفران
کو جساد کہا جاتا ہے اور زعفران سے رنگے
ہوئے کپڑے کو ثَوْبٌ مُجَسَّدٌ کہتے ہیں۔
اَلْمُجَسَّد۔ کپڑا جو بدن سے متصل ہو اَلْجَسَد
وَالْجَاسِدُ وَالْجَسِدُ۔ خشک خون۔

(ج س م)

اَلْجِسْمُ وہ ہے جس میں طول، عرض اور
عمق پایا جائے اور اجزاء جسم خواہ کتنے ہی لطیف
کیوں نہ ہوں اجسام ہی کہلاتے ہیں قرآن میں ہے
زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲-۲۴۷)
اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن
و توش بھی (بڑا عطا کیا ہے)
اور آیت کریمہ:۔
وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ (۶۳-۴)
اور جب تم ان کے تناسب اعضا) کو دیکھتے
ہو تو ان کے جسم نہیں (کیا ہی) اچھے معلوم
ہوتے ہیں۔
میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بظاہر ان کی
شکل وصورت اگرچہ جاذب نظر آتی ہے لیکن
ان کے اندر کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہے۔
اَلْجُسْمَانُ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی
چیز کا شخص کے ہیں لیکن کسی شخص کے اجزاء
ضروری نہیں کہ تقطیع اور تجزیہ کے بعد بھی ان کو
شخص ہی کہا جائے مگر جسم کے اجزا کو خواہ
کتنا ہی باریک کیوں نہ کر دیا جائے وہ جسمیت
سے خارج نہیں ہوتے۔

(ج ع ل)

جَعَلَ (ف) یہ لفظ ہر کام کرنے کے لئے
بولا جا سکتا ہے اور فَعَلَ وَصَنَعَ وغیرہ افعال
کی بنسبت عام ہے۔ اور یہ پانچ طرح پر استعمال
ہوتا ہے۔

(۱) بمعنی صَارَ وَطَفِقَ اس صورت میں متعدی نہیں ہوتا جیسے جَعَلَ زَیْدٌ یَقُوْلُ کَذَا (یعنی زید یوں کہنے لگا) شاعر نے کہا ہے (وافر)

(۹۶) فَقَدْ جَعَلَتْ قَلُوْصُ بَنِیْ سُهَیْلٍ
مِنَ الْاَکْوَارِ مَرْتَعُهَا قَرِیْبُ

اب بنی سہیل کی اونٹنی اکوار (جمع کور) کے قریب چرنے لگی ہے۔

(۲) بمعنی اَوْجَدَ (یعنی ایجاد اور پیدا کرنا) اس صورت میں یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ (۶-۱) اور اندھیرے اور روشنی بنائی۔ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (۱۶-۷۸) اور اس نے تم کو کان اور آنکھیں اور دل (اور اس کے علاوہ اور اعضاء) بخشے۔

(۳) ایک شے کو دوسری شے سے پیدا کرنا اور بنانا جیسے فرمایا:۔ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا (۴۲-۱۱) اسی نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے۔ وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَکْنَانًا (۱۶-۸۱) اور پہاڑوں میں غاریں بنائیں۔ وَجَعَلَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا (۴۳-۱۰) اور اس میں تمہارے لئے رستے بنائے۔

(۴) بمعنی تصییر یعنی کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کرنا جیسے فرمایا:۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (۲-۲۲) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا ..... بنایا۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَکُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا (۱۶-۸۱) اور خدا ہی نے تمہارے (آرام کے) لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے۔ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا (۷۱-۱۶) اور چاندکو ان میں (زمین کا) نور بنایا۔ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا (۴۳-۳) کہ ہم نے اس کو قرآن عربی بنایا ہے۔

(۵) کسی چیز پر کسی چیز کے ساتھ حکم لگانا عام اس سے کہ وہ حکم حق ہو یا باطل حق کی مثال جیسے: اِنَّا رَادُّوْهُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ (۲۸-۷) ہم ان کو تمہارے پاس واپس پہنچا دیں گے اور (پھر) اسے پیغمبر بنا دیں گے۔

اور باطل کی مثال جیسے:۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا (۶-۱۳۶) اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں یعنی کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔ وَیَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ (۱۶-۵۷) اور یہ لوگ خدا کے لئے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ (۱۵-۹۱) یعنی قرآن کو (کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے سے) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

اَلْجِعَالَةُ چولہے سے دیگ اتارنے کا چیتھڑا جسے مِنْدِیْل بھی کہتے ہیں اور اسی سے جُعَالَةٌ، یا آتارنے کا رومال۔ اَلْجُعْلُ وَالْجُعَالَةُ وَالْجَعِیْلَةُ جو چیز کسی شخص کے لئے کسی کام کے عوض مقرر کیا جائے۔ یہ

۱؎ قاله رجل من بحتربن عتود والبیت فی الحماسة رقم ۹۹ مع المرزوقی فی ثلاثة بغیر عزو والبیت من شواهد الخزانة (۴: ۹۲) وفی روایة ابن زیاد" ولم ار احد من الشراح نسبها الی قائلها ووجدت نسبتها عند الصاغانی فی العباب (الخیال) والبیت فی اللسان (جعل) والعینی والخزانة (۲: ۳۳۶) ۱۲

اُجرت اور ثواب سے اعم ہے۔
کَلْبٌ یُجْعِلُ (کنایہ) کتے کا جفتی کی خواہش کرنا۔[1]
اَلْجُعَلُ گبریلا۔ سیاہ بھونرا ج جِعْلَانٌ۔

(ج ف ن)

اَلْجَفْنَۃُ پیالہ۔ خاص کر کھلانے کے برتن کو کہتے ہیں ج جِفَانٌ قرآن میں ہے:۔
وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ (۳۴-۱۳) اور لگن جیسے بڑے حوض۔ حدیث میں ہے[2] (۶۳)
وَاَنْتَ الْجَفْنَۃُ الْغَرَّاءُ تم سخی سردار ہو۔ اور لگن کے ساتھ تشبیہ دے کر چھوٹے کنوئیں کو بھی جَفْنَۃٌ کہا جاتا ہے:۔
اَلْجَفْنُ اس کے معنی خاص کر تلوار کی نیام یا آنکھ کے پپوٹے کے آتے ہیں ج اَجْفَانٌ اور انگور کی بیل کو بھی جَفْنٌ کہا جاتا ہے گویا وہ انگور کے لئے بمنزلہ برتن کے ہے۔

(ج ف و)

اَلْجُفَاءُ وہ کوڑا کرکٹ جو وادی کے دونوں کناروں پر رہ جاتا ہے یا ہانڈی کا میل کچیل جو ابال آنے سے ادھر ادھر گر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے
اَجْفَأَتِ الْقِدْرُ زَبَدَھَا ہنڈیا نے اپنا ابال کو پھینک دیا۔ قرآن میں ہے:۔
فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْھَبُ جُفَاءً (۱۳-۱۷)
سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور بے فائدہ اور بے کار چیز کو بھی جُفَاء کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا جاتا ہے:۔
اَجْفَأَتِ الْاَرْضُ زمین جفا یعنی جھاگ کی طرح ناکارہ اور بے خیر ہو گئی۔
بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں ناقص واوی ہے۔ لہٰذا جَفَتِ الْقِدْرُ وَاَجْفَتْ کہا جائے گا اور اسی سے اَلْجَفَاءُ بمعنی ظلم ہے۔ اور جَفَاہُ (ن) جَفْوَۃً وَجَفَاءً کے معنی ہیں کسی پر ظلم کرنا اور اسی سے محاورہ ہے جَفَا السَّرْجَ عَنْ ظَھْرِ الدَّابَّۃِ گھوڑے کی پشت سے زین کو اٹھا دیا۔

(ج ل ل)

اَلْجَلَالَۃُ کے معنی ہیں عظیم القدر یعنی قدر و منزلت میں بڑا یعنی بلند مرتبہ ہونا کے ہیں اور (ۃ) کے بغیر اَلْجَلَالِ کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں عظمت کی آخری حد جس کے بعد اور مرتبہ نہ ہو۔ اسی لئے یہ اللہ تعالیٰ کی وصف کے ساتھ مختص ہے۔ اور دوسروں کے حق میں استعمال نہیں ہوتا چنانچہ قرآن میں ہے:۔
ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵-۲۷) صاحب جلال و عظمت۔
اَلْجَلِیْلُ اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص نہیں ہے" اللہ تعالیٰ کو اَلْجَلِیْلُ یا تو اس لئے کہا جاتا

[1] راجع التاج والمعروف مجعل والفعل اجعل (انفعال) والبحث فی الحیوان للجاحظ ۵/۲۵۰ ÷ [2] النہایۃ انا انت الجفنۃ الغراء فی الکامل للمبرد: قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا الجفنۃ الغراء وفی النہایۃ واللسان انہ قیل لہ انت کذا وانت کذا و انت الجفنۃ الغراء وفی الفائق ۱/۲۰۲ من قول عبداللہ بن الشخیر حین قدم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا فی التاج وراجع النہایۃ و اللسان (جفن) قال فی حاشیۃ الکامل ولم ار ہذا الحدیث ۹۷۷ فی المطبوع وانت الجفنۃ الغراء ای الطعام مصحف والتسدید من المراجع والجملۃ من تحیۃ الجاہلیۃ لملوکہم [3] ورد فی القرآن: تتجافی جنوبہم عن المضاجع (۳۲-۱۶) ÷ ÷ ÷ ÷

ہے کہ اس نے بڑی بڑی عظیم الشان چیزوں کو پیدا کیا ہے جن سے اس کی ذات بابرکت پر استدلال ہو سکتا ہے اور[1] یا اللہ تعالیٰ کی ذات اَلْجَلِیْل اس لئے ہے کہ وہ احاطہ سے بلند ہے اور[2] یا اس لئے کہ حواس کے ذریعہ اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

اصل وضع کے اعتبار سے جَلِیل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو جسامت کے اعتبار سے بڑی بھی ہو اور غلیظ یعنی موٹی اور سخت بھی پھر معنی غلظت کے اعتبار سے یہ دقیق کے مقابلہ میں استعمال ہونے لگا ہے اور عظیم کا لفظ صغیر کے مقابلہ میں، چنانچہ کہا جاتا ہے جلیل ودقیق وعظیم وصغیر اور باہم مقابلہ کے اعتبار سے اونٹ کو جلیل اور بھیڑ بکری کو حقیر کہا جاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے[3] مَالَہٗ جَلِیْلَۃٌ وَلَا دَقِیْقَۃٌ کہ اس کے پاس نہ اونٹ ہے اور نہ بھیڑ بکری) مَا اَجَلَّنِیْ وَلَا اَدَقَّنِیْ (اس نے مجھے نہ اونٹ دیئے اور نہ بھیڑ بکری) — یہ اس کے اصل معنی ہیں — پھر یہ لفظ ہر بڑی اور چھوٹی چیز پر بولا جاتا ہے۔ اَلْجَلَالَۃُ خاص کر کلاں جسم اونٹنی کو کہتے ہیں اور اَلْجِلَّۃُ کلاں سال کو۔ اَلْجَلَل۔ ہر بڑی چیز کار بزرگ جَلَّلت کذا میں نے اس کا بڑا حصہ لے لیا۔ تجللت البعیر[4] میں نے کلاں جسم اونٹ یا ان کی بڑی مقدار لی۔ اَلْجَلَل[5] (ایضاً) جو بینگنی اٹھائی جائے۔ اسی سے کنایۃً ہر حقیر چیز کو جلل کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[6]۔

(۹۱) ؎ کل مصیبۃ بعدہٗ جَلَل

کہ ہر مصیبت اس کے بعد حقیر ہے۔

اَلْجُلُّ کے معنی مصحف کے غلاف کے ہیں پھر اس سے مصحف کو مُجَلَّۃ کہا جانے لگا ہے[7]۔ اَلْجُلْجُلَۃ جس کے معنی حکایت صوت کے ہیں وہ اس مادہ سے نہیں ہے اور اسی سے سَحَابٌ مُجَلْجِلٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی گرجنے والے بادل کے ہیں۔ ہاں سَحَابٌ مُجَلِّلٌ کا محاورہ اس مادہ سے ہے۔ جس کے معنی عام بارش برسانے والے بادل کے ہیں۔ گویا وہ پانی اور نباتات سے زمین کو چھپا دیتا ہے۔

(ج ل ب)

اَلْجَلْبُ (ن ض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[8]۔

(۹۲) وَقَدْ یَجْلِبُ الشَّیْئَ الْبَعِیْدَ الْجَوَابُ

---

[1] الزیادۃ" " من التاج قد سقط فی المطبوع [2] وفی التاج مالہ جلیلۃ ولا دقیقۃ ولا اجلنی ولا احشانی [3] فی المطبوع تجللت البقر خلاف جمیع الاصول وفی التاج قال الراغب تجللت البعیر اھ وعلیہ اعتمدنا [4] وفی المطبوع الجلل التناول من البقر وفی التاج قال الراغب: ... من البقر تصحف والاسف ان المفردات للراغب لم یطبع الی الآن طبعًا محققًا مقابلًا ... بالاصول وانا اکلت جواوی فی تسدیدہ وسخروہ والحمد للہ علی ذالک [5] لم اجدہ ومثلہ یوجد فی شعر امرء القیس: الا کل شیئ سواہ جلل وفی المزہرۃ (دیوان ۱۰۲۰:) قال زہیر بن حرث ... فکل الذی لاقیت من بعد جلل وایضًا انشد ابن درید: فعظیم کل مصیبۃ جلل [6] وفی التاج قال الراغب الجُلُّ مکان الصحف وعلیہ اعتمدنا لان الجلل بالفک لم یرد فی الاصول بہذا المعنی [7] لم اجدہ ویہ جلع ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

کبھی جواب دور کی چیز کو کھینچ کر لے آتا ہے۔
اَجْلَبَ (انعال) عَلَیْہِ کسی پر چلا کر زبردستی اسے آگے بڑھانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَجْلِبْ عَلَیْھِمْ بِخَیْلِکَ وَرَجِلِکَ (۱۷-۶۴) اور ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کو چڑھا کر لاتا رہ۔

اور حدیث[1] (۶۳) لَا جَلَبَ (یعنی جلب جائز نہیں ہے) کے دو معنی بیان کئے جاتے ہیں ایک یہ کہ مصدق یعنی زکوٰۃ جمع کرنے والا چراگاہ سے کہیں دور بیٹھ جائے اور وہاں جانوروں کو حاضر کرنے کا حکم دے اور گھڑدوڑ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوڑ میں اپنے گھوڑے پر چیخنے کے لئے ایک آدمی کو مقرر کرے تاکہ وہ آگے بڑھ جائے۔

اَلْجُلْبَۃُ پوست جراحی کہ خشک شدہ باشد۔
اَلْجُلْبُ۔ پتلا سا بادل جو زخم کے پردہ کیطرح ہوتا ہے۔
اَلْجَلَابِیْبُ اس کا واحد جِلْبَابٌ ہے جس کے معنی چادر یا قمیص کے ہیں۔

(ج ل ت)

جَالُوْت یہ اسم عجمی ہے عربی میں اس کی اصل نہیں ہے قرآن میں ہے:۔
وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِہٖ (۲-۲۵۰)
اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل میں آئے۔

(ج ل د)

اَلْجِلْدُ کے معنی بدن کی کھال کے ہیں اس کی جمع جُلُوْدٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنَاھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا (۴-۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔ اور آیت کریمہ:۔
اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَقُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (۳۹-۲۳) اور خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دہرائی جاتی (ہیں) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہو کر) خدا کی یاد کی طرف (متوجہ) ہو جاتے ہیں۔
میں جُلُوْدٌ سے مراد ابدان اور قلوب سے مراد نفوس ہیں اور آیت کریمہ:۔
حَتّٰی اِذَا مَا جَاءُوْھَا شَھِدَ عَلَیْھِمْ سَمْعُھُمْ وَاَبْصَارُھُمْ وَجُلُوْدُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِھِمْ لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا۔۔ (۴۱-۲۰، ۲۱) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور چمڑے (یعنی دوسرے اعضا) ان کے خلاف ان کے اعمال کی شہادت دیں گے اور وہ اپنے چمڑوں (یعنی اعضا) سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ جُلُوْدٌ سے فروج یعنی شرمگاہیں مراد ہیں[2]۔

[1] الحدیث فی الفائق ۱/۲۰۴ والنسائی والضیاء عن ابن عمرو (حم، ق، ن) وابن حبان (زوائدہ رقم ۱۲۰۷) عن عمران بن حصین والطبرانی عن انس (ش) عن عطاء مرسلا (ش) عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ راجع کنز العمال ۲ رقم ۱۳۲۹، ۱۳۱۸ و ۱۳۲۷ و ۱۳۲۹ [2] تفسیر غریب القرآن لابن قتیبہ ۳۸۹ و لیذا رای السدی والفراء وغیرہما ۱۲

جَلَدَہٗ (ض) کسی کے چمڑے پر مارنا۔ جیسے بَطَنَہٗ وَ ظَھَرَہٗ اور اس کے دوسرے معنیٰ دُرّے لگانا بھی آتے ہیں جیسے عَصَاہٗ (یعنی لاٹھی کے ساتھ مارنا) چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمَانِیْنَ جَلْدَۃً (۲۴-۴) تو ان کو اسی درّے مارو۔
اَلْجَلَدُ وَالْجِلْدُ اونٹنی کے بچہ کی بھس بھری ہوئی کھال۔
جَلُدَ (ک) جَلَدًا کے معنی قوی ہونے کے ہیں۔ صیغہ صفت جَلْدٌ وَجَلِیْدٌ ہے اور اس کے اصل معنی اکتسابِ الجلد قوۃً یعنی بدن میں قوت حاصل کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے:۔
مَالَہٗ مَعْقُوْلٌ وَلَا مَجْلُوْدٌ اس میں نہ عقل ہے نہ قوت۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو اَرْضٌ جَلَدَۃٌ کہا جاتا ہے اس طرح قوی اونٹنی کو نَاقَۃٌ جَلَدَۃٌ کہتے ہیں۔
جَلَدْتُ کَذَا میں نے اس کی جلد باندھی۔
فَرَسٌ مَجْلَدٌ مار سے نہ ڈرنے والا گھوڑا یہ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ مُجَلَّدٌ اس شخص کو کہتے ہیں جسے مارنے سے درد نہ ہو۔
اَلْجَلِیْدُ پالا، یخ گویا صلابت میں چمڑے کے متشابہ۔

(ج ل س)

اَلْجَلْسُ اس کے اصل معنی سخت زمین کے ہیں۔ اسی لحاظ سے نَجْدٌ یعنی بلند زمین کو جَلْسٌ کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے[1] (۴۳) اَعْطَاھُمُ الْمَعَادِنَ الْقَبَلِیَّۃَ غَوْرِیَّھَا وَجَلْسِیَّھَا.... کہ آنحضرت نے انہیں (بلال بن حارث) قبلیۃ کانیں نشیبی اور بلند سب کی سب (بطور جاگیر) عطا کردیں۔
اصل میں جَلَسَ کے معنی انسان کے اپنی مقعد کو سخت زمین پر رکھنے کے ہیں۔ پھر محض بیٹھنے کو جُلُوْس اور بیٹھنے کی جگہ کو مَجْلِسٌ کہا جاتا ہے اور مَجْلِسٌ کی جمع مَجَالِسُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ (۵۸-۱۱) جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھا کرو خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔

(ج ل و)

اَلْجُلُوُّ (ن) کے اصل معنی کسی چیز کے نمایاں طور پر ظاہر ہو جانا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
اَجْلَیْتُ الْقَوْمَ عَنْ مَنَازِلِھِمْ فَجَلَوْا عَنْھَا (یعنی میں نے انہیں جلاوطن کیا تو وہ چلے گئے اور جَلَاہٗ (متعدی) بھی استعمال ہوتا ہے[2]۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3] ع (طویل)

(۹۲) فَلَمَّا جَلَاھَا بِالْاِیَامِ تَحَیَّزَتْ
ثُبَاتٍ عَلَیْھَا ذُلُّھَا وَاکْتِئَابُھَا

(جب انگبین گیرندہ نے شہد کی مکھیوں کو دھواں

---

[1] وفی الفائق ا/ ۲۴۰ اعطی بلال بن الحارث معادن القبلیۃ جلسیہا وغوریہا والحدیث فی (د ق ک) عن ابن عباس (د ق) کثیر بن عبد اللہ المزنی عن ابیہ عن جدہ (طب ک) عن بلال بن الحارث (راجع کنز العمال ۲ رقم ۳۹۸۷)
[2] وفی التاج: واجلی یتعدی ولا یتعدی کلاہما ومن اشتقاق النعی حدیث الحوض فیجلون عنہ ای ینفون ویطرد (د ق)
[3] قالہ ابو ذؤیب الہذلی یصف مشتار او فی روایۃ تحیرت وبالراء المہملۃ والبیت فی اللسان (جلا، ایم) والاقتضاب ۲۰۔۴ والبحر (۳: ۲۹۰) والمعانی ۶۹۱ وفی روایۃ الدیوان ایضا تحیرت قال فی التاج ویروی: فلما اجتلاہا سکان جلاہا۔

کے ذریعے سے دور ہٹایا تو وہ ٹکڑیاں ہوکر غم واندوہ کے ساتھ ایک طرف سکڑ گئیں۔

قرآن میں ہے:۔ وَلَوْلَا اَنْ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَھُمْ فِی الدُّنْیَا (۵۹-۳)۔۔۔ اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلاوطن کرنا نہ لکھ دیا ہوتا۔ تو ان کو دنیا میں بھی عذاب دے دیتا۔

اسی سے جَلَا لِیْ خَبَرٌ (کسی خبر کا ظاہر ہونا) وَخَبَرٌ جَلِیٌّ (واضح خبر) وَقِیَاسٌ جَلِیٌّ (اور واضح قیاس) کے محاورات ہیں اور صیغہ صفت (فاعل) جَالٍ مسموع نہیں ہے۔

جَلَوْتُ الْعَرُوْسَ جِلْوَۃً وَجِلَاءً: دلہن کو بناؤ سنگار کرکے پیش کرنا۔

جَلَوْتُ السَّیْفَ جِلَاءً: تلوار کو صیقل کیا

اَلسَّمَاءُ جَلْوَاءُ آسمان بے ابر اور صاف ہے

رَجُلٌ اَجْلٰی وہ شخص جس کے سر کے بال اڑ گئے ہوں

اَلتَّجَلِّیْ کے معنی ہیں ظاہر ہونا اور ہویدا ہونا اور جلوہ بار ہونا اور یہ (تجلی) کبھی بالذات ہوتی ہے جیسے: وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی (۹۲-۲) اور دن کی جب نمایاں طور پر روشنی ہوجائے۔

اور کبھی بذریعہ امر اور فعل کے ہوتی ہے جیسے فرمایا: فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ (۷-۱۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر جلوہ افروز ہوا۔

کہا جاتا ہے:۔

فُلَانٌ اِبْنُ جَلَا ... یعنی فلاں مشہور و معروف ہے[1]

اَجْلَوْا عَنْ قَتِیْلٍ وہ مقتول سے الگ ہوگئے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

(ج م م)

اَلْجَمُّ کے معنی ہر چیز کی کثرت اور زیادتی کے ہیں یہ جُمَّۃُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے اور جُمَّۃُ الْمَاءِ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہت بڑی مقدار میں جمع ہوجاتا ہو قرآن میں ہے:۔

وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹-۲۰) اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔

اصل میں یہ اَلْجَمَامُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں راحت کے لئے کسی جگہ پر ٹھہر جانا اور محنت ومشقت چھوڑ دینا

جُمَامُ الْمَکُّوْكِ دَقِیْقًا آٹے سے لبالب بھرا ہوا مکوک جس میں مزید گنجائش نہ ہو۔ اور معنی کثرت کے لحاظ سے جُمَّۃٌ کا لفظ لوگوں کی اس بڑی جماعت پر بولا جاتا ہے جو کسی مصیبت کا بوجھ اٹھانے کے لئے جمع ہوں نیز جُمَّۃٌ کے معنی ہیں پیشانی کے مجتمع بال۔

جُمَّۃُ الْبِئْرِ پانی سے بھرا ہوا کنواں گویا کئی دنوں سے اس میں پانی جمع ہورہا ہے اور متواتر اور سخت دوڑنے والے گھوڑے کو جَمُوْمُ الشَّدِّ کہا جاتا ہے۔

اَلْجَمَّاءُ الْغَفِیْرُ وَالْجَمُّ الْغَفِیْرُ ہجوم۔ لوگوں کی بڑی جماعت شَاۃٌ جَمَّاءُ بے سینگ کے بکری یہ جُمَّۃُ النَّاصِیَۃِ سے ہے۔

(ج م ح)

جَمَحَ (ف) جَمْحًا وَجِمَاحًا وَجُمُوْحًا گھوڑے کا تیزی کے ساتھ دوڑتے جانا اور سوار کے قابو میں نہ رہنا یہ نشاط اور مرح سے زیادہ بلیغ ہے۔ پھر کسی آدمی کے سرکشی کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] وقال الزجاج ان ظھر وبان وتد امذہب اہل السنۃ والمؤلف مال الی الناویل فراغ تلۃ قال سحیم بن وثیل الریاحی انا ابن جلا وطلاع الثنایا متی اضع العمامۃ تعرفونی وقد تمثل الحجاج بقولہ ؎

وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (۹-۵۷) تو... رسیاں تڑاتے ہوئے...
اَلْجُمَّاحُ بے پھل کا تیر جس سے بچے کھیلتے ہیں اس کے سرے پر غلیلہ سا لگا ہوتا ہے۔

(ج م ع)

اَلْجَمْعُ (ف) کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ملا دینا۔ محاورہ ہے:۔ جَمَعْتُهٗ فَاجْتَمَعَ میں نے اسے اکٹھا کیا چنانچہ وہ اکٹھا ہوگیا۔ قرآن میں ہے:۔
وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۷۵-۹) اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى (۷۰-۱۸) اور (مال) جمع کیا اور بند رکھا۔
جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (۱۰۴-۲) مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ (۳۴-۲۶) ہمارا پروردگار ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کریگا۔ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۳-۱۵۷) تو جو (مال و متاع) لوگ جمع کرتے ہیں اس سے خدا کی بخشش اور رحمت کہیں بہتر ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ (۱۷-۸۸) کہدو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں۔ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (۱۸-۹۹) تو ہم سب کو جمع کرلیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ (۴-۱۴۰) کچھ شک نہیں کہ خدا منافقوں ..... کو جمع کرنے والا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔

وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ (۲۴-۶۲) ..... اور جب کبھی ایسے کام کے لئے جو جمع ہوکر کرنے کا ہو پیغمبر خدا کے پاس جمع ہوں۔ میں امر جامع کے معنی اہم معاملہ کے ہیں جس کے لئے لوگ جمع ہوں تو گویا اس معاملے نے ان کو جمع کر لیا ہے۔
ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ (۱۱-۱۰۳) یہ وہ دن ہوگا جس میں سب لوگ اکٹھے کئے جائیں گے۔ جیسے فرمایا:۔
يَوْمَ الْجَمْعِ (۴۲-۷) قیامت کے دن کا۔
يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ (۶۴-۹) جس دن وہ تم کو اکٹھا ہونے (یعنی قیامت) کے دن اکٹھا کرے گا۔
اور مجموع، جَمْعٌ، جَمِيْعٌ اور جَمَاعَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۳-۱۶۶) اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلہ کے دن واقع ہوئی۔
وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶-۳۲) اور سب کے سب ہمارے روبرو حاضر کئے جائینگے۔
اَلْجُمَّاعُ مختلف قبائل کے لوگ جو ایک جگہ جمع ہوں۔ شاعر نے کہا ہے[1]: (سریع)
(۹۳) بِجَمْعٍ غَيْرِ جُمَّاعٍ
ایسا مجمع جو مختلف قسم کے لوگوں پر مشتمل نہ تھا۔
اور اَجْمَعْتُ كَذَا عام طور پر اس عزم و ارادہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس تک غور و فکر سے پہنچا جائے۔ جیسے فرمایا:۔

[1] قالہ ابو قیس بن الاسلت السلمی یصف الحرب واولہ: حتی انتہینا ولنا غایۃ ..... وفی روایۃ اللسان (ع م) من بین جمع مدل الجمیع وتم بجلنسو بدل انتہینا والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲۷:۵۵) فی ۲۴ بیتا وراجع للبیت الفق المرزوقی ۱۰۸۶ واالاقتضاب ۳۵۸ وتہذیب الالفاظ ۳۴ والمحکم (جمع) والجمہرۃ ۲۳۸ وفیہ حتی التقینا وفی الفائق (۱:۱۱۰) من بین (غیر جماع)

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ (۱۰-۷۱) تم اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر ایک کام (جو میرے بارے میں کرنا چاہو) مقرر کرلو۔

اور شاعر نے کہا ہے؎ :۔ (رجز)

(۴۹) هَلْ أَغْدُوَنْ يَوْمًا وَأَمْرِي مُجْمَعٌ

کیا میں کسی روز جنگ کروں گا اور میرا سامان حرب فراہم ہوگا۔ قرآن میں ہے :۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ (۲۰-۶۴) تو تم (جادو کا) سامان اکٹھا کرو۔

اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى كَذَا کسی معاملہ پر امت مسلمہ کا متفق ہوجانا۔ نَهْبٌ مُجْمَعٌ لوٹ جو نہایت فکر وتدبر سے حاصل کی جائے۔ اور آیت کریمہ :۔

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ (۳-۱۷۳) کے بعض نے یہی معنی کئے ہیں کہ انہوں نے تمہارے خلاف تدبیر پر اتفاق کرلیا ہے۔ اور بعض نے لشکر کثیر جمع کرنا مراد لیا ہے۔

جَمِيْعٌ وَ اَجْمَعُ وَ اَجْمَعُوْنَ یہ تینوں الفاظ کسی امر پر اجتماع کی توکید کے لئے استعمال ہوتے ہیں لیکن اَجْمَعُوْنَ کا لفظ ہمیشہ اسم معرفہ کی صفت بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی بھی حال بن کر منصوب نہیں ہوتا جیسے فرمایا :۔ فَسَجَدَ الْمَلٰۗىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (۳۸-۷۳) تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۲-۹۳) اور اپنے تمام اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ۔

اور جَمِيْعٌ کا لفظ کبھی منصوب علی الحال ہوکر توکید کا فائدہ دیتا ہے جیسے فرمایا :۔ اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (۲-۳۸) تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا (۱۱-۵۵) تم سب مل کر میرے بارے میں (جو تدبیر کرنی چاہو) کرلو۔

اور جمعہ کے دن کو يَوْمُ الْجُمُعَةِ اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ اس میں لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (۶۲-۹)۔۔۔۔ جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (یعنی نماز) کے لئے جلدی کرو۔

اور مسجد الجامع کی اصل مَسْجِدُ الْاَمْرِ الْجَامِعِ او الوقت الجامع ہے لہذا یہاں جامع مسجد کی صفت نہیں ہے جَمَّعُوْا کے معنی نماز جمعہ ادا کرنے یا جامع یا جماعت میں حاضر ہونے کے ہیں۔ اَتَانٌ جَامِعٌ حاملہ گدھی قِدْرٌ جَامِعٌ بڑی دیگ اِسْتَجْمَعَ الْفَرَسُ جَرْيًا کے معنی ہیں گھوڑا سرپٹ دوڑا پوری قوت سے بھاگا۔ اس میں جمع کے معنی ظاہر ہیں مَاتَتِ الْمَرْءَةُ بِجُمْعٍ؎ حمل کی حالت میں مرگئی یہ محاورہ بھی عورت اور اس کے حمل میں اجتماع کے تصور پر استعمال ہوتا ہے۔ هِيَ مِنْهُ بِجُمْعٍ؎ (وہ اپنے خاوند سے ابھی حالت دوشیزگی میں ہے۔ یعنی یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب اس کے خاوند نے مجامعت کرکے اس کے پردہ بکارت کو زائل نہ کیا ہو۔

؎ قالہ الراجز واولہ یالیت شعری والمنی لاتنفع۔ فی اللسان (جمع) وفیہ اغدون بدل اغزون (جمع الطبری (۱۶): ۱۸۳/۱۱: ۱۴۱) والسیوطی ۲۷۴ وشرح السبع لابن الانباری ۵۲۷ بخسوابد الکشاف (۰۷) وفی اصلاح لیعقوب (۲۶۳) غیر منسوب والامالی المرتضیٰ (۱: ۵۵۹) والبحر (۵: ۱۷۹) ؎ وفی الحدیث : ای امرۃ ماتت بجمع ایلم تطمث دخلت الجنۃ (جمع النہایۃ ۱/۲۰۷ والفائق ۱/۲۱۱ واللسان (جمع) وغریب ابی عبید ۱/۱۲۵ والحدیث فی (د) جنائز (ن) جنائز (حم) ۵/۳۰۵ ؎ وفی اضداد ابی الطیب ۱۷۸ : ومنہ قول الدھناء بنت سہل : انی منہ بجمع ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞

ضَرَبْتُہٗ بِجُمْعِ كَفِّہٖ اس نے اسے مکا مارا۔ أَعْطَاهُ مِنَ الدَّرَاهِمِ جُمْعَ الْكَفِّ اسے مٹھی بھر درہم دیئے۔ اَلْجَوَامِعُ زنجیر۔ طوق کیونکہ اس سے ہاتھ پاؤں باندھے جاتے ہیں۔

(ج م ل)

اَلْجَمَالُ کے معنی حسن کثیر کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔

(۱) وہ خوبی جو خاص طور پر بدن یا نفس یا عمل میں پائی جاتی ہے۔

(۲) وہ خوبی جو دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے اسی معنی میں مروی ہے کہ آنحضرت نے فرمایا (۲۶) إِنَّ اللهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ۔ کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو محبوب رکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ سے خیرات کثیرہ کا فیضان ہوتا ہے لہذا جو اس صفت کے ساتھ متصف ہوگا۔ وہی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوگا۔ اور قرآن میں ہے:۔

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ (۱۶-۶) اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو۔۔۔ تو ان سے تمہاری عزت وشان ہے۔

اور جَمِيْلٌ وَجُمَالٌ وَجُمَّالٌ مبالغہ کے صیغے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ (۱۲-۱۸) اچھا صبر (کہ وہی) خوب ہے) فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (۷۰-۵) تو تم (کافروں کی باتوں کو) حسن صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہو۔

جَامَلْتُ فُلَانًا۔ کسی کے ساتھ اچھا معاملہ کرنا تواضع سمر قندی سے پیش آنا۔ أَجْمَلْتُ فِي كَذَا کسی کام کو عمدگی سے سرانجام دینا اعتدال اختیار کرنا جَمَالَكَ یعنی اعتدال سے کام لو۔ پھر اس سے کثرت کے معنی کا اعتبار کرکے ہر مجموعہ اشیاء کو جملہ کہتے ہیں اسی سے مجموعی حساب کو بھی جس کی تفصیل نہ کی گئی ہو جملۃ کہا جاتا ہے اور جس کلام کی تفصیل بیان نہ کی گئی ہو اسے مُجْمَلٌ کہا جاتا ہے اور أَجْمَلْتُ الْحِسَابَ وَأَجْمَلْتُ فِي الْكَلَامِ کے معنی حساب یا کلام کو اجمال سے بیان کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (۲۵-۳۲) اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا۔

اور فقہا نے مجمل کی تعریف میں جو یہ کہا ہے کہ اَلْمُجْمَلُ مَا يَحْتَاجُ إِلَى الْبَيَانِ کہ مجمل وہ ہوتا ہے جو بیان کا محتاج ہو تو یہ مُجْمَلٌ کی تحدید یا تفسیر نہیں ہے بلکہ صرف اس کی ایک حالت کا ذکر ہے جو بعض لوگوں کو پیش آتی ہے اور شئے کی تحدید میں اس کے کسی ایسے ذاتی وصف کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے جس سے وہ ممتاز ہو جائے اور مجمل درحقیقت وہ ہے جو بہت سی اشیاء کے ایسے مجموعہ پر مشتمل ہو جن کی تلخیص نہ کی گئی ہو۔

اَلْجَمَلُ جوان اونٹ جو کم از کم پانچ سال کا ہو۔ اس کی جمع جِمَالٌ وَأَجْمَالٌ وَجِمَالَةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (۷-۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور آیت کریمہ:۔

---

۲۶ الفائق ۱/۱۰۵ والحديث باختلاف الفاظه البيهقي وابو يعلى عن ابي سعيد ومسلم والترمذي من رواية عبد الله ابن مسعود والطبراني من ابي امامة وذكره عن ابن عمر راجع للتفصيل الفتح الكبير نبهاني ۱/۳۳۱ وتخريج الكشاف ص ۱۴۴ رقم ۳۷۰ وكنز العمال۔

كَأَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (۷۷-۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔
میں جِمٰلَتٌ، جِمَالَۃٌ کی جمع ہے اور جِمَالَۃٌ جَمَلٌ کی اور ایک قرأت میں جُمَالَاتٌ بضمہ جیم ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی جوان اونٹنیوں کے ہیں۔
اَلْجَامِلُ اونٹوں کا گلہ جن کے ساتھ ان کا چرواہا بھی ہو یہ بَاقِرٌ کی طرح ہے اور اِتَّخَذَ اللَّیْلَ جَمَلًا (کہ اس نے رات کو اونٹ بنالیا) محاورہ مجاز پر محمول ہے جس کے معنی ہیں اپنے ساری رات سفر کیا۔ جیسا کہ رَکِبَ اللَّیْلَ کا محاورہ ہے اور اونٹ کو جَمَلٌ کہنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عرب لوگ اونٹ کو اپنے لئے باعث زینت اور فخر سمجھتے تھے جیسا کہ آیت:۔
وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔
جَمَلْتُ الشَّحْمَ چربی پگھلانا اور پگھلائی ہوئی چربی کو اَلْجَمِیْلُ کہا جاتا ہے اور اِجْتِمَالٌ کے معنی چربی کو بطور تیل ملنے کے ہیں۔ ایک عورت نے اپنی لڑکی سے کہا:۔
تَجَمَّلِیْ وَتَعَفَّفِیْ یعنی چربی پگھلا کر کھایا کرو اور عُفَافَہ یعنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ پیا کرو۔

(ج ن ن)

اَلْجَنُّ (ن) کے اصل معنی کسی چیز کو حواس سے پوشیدہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔ جَنَّهُ اللَّیْلُ وَاَجَنَّهُ اسے رات نے چھپالیا جُنَّ عَلَیْہِ اسے جنون ہوگیا۔
پس جَنَّهُ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور اَجَنَّهُ کے معنی چھپانے کے لئے کوئی چیز دینے کے ہیں جیسے:۔ قَبَرْتُهُ وَاَقْبَرْتُهُ وَسَقَیْتُهُ وَاَسْقَیْتُهُ جَنَّ عَلَیْہِ کَذَا۔ کسی چیز نے اسے چھپالیا۔
قرآن میں ہے:۔
فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰى كَوْكَبًا (۶-۷۶) جب رات نے ان کو پردہ تاریکی سے چھپادیا تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا۔
اَلْجَنَانُ دل کیونکہ وہ حواس سے مستور ہوتا ہے۔
اَلْمِجَنُّ وَالْمِجَنَّةُ ڈھال۔ کیونکہ اس سے انسان اپنے آپ کو بچاتا اور چھپاتا ہے۔
قرآن میں ہے:۔ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (۶۳-۲) انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔
اور حدیث میں ہے[1]:۔ (۶۷)
اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ کہ روزہ ڈھال ہے۔
اَلْجَنَّةُ ہر وہ باغ جس کی زمین درختوں کیوجہ سے نظر نہ آئے جنت کہلاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ (۳۴-۱۵) (اہل) سبا کے لئے ان کے مقام بود و باش میں ایک نشانی تھی (یعنی دو باغ ایک دائیں طرف اور (ایک) بائیں طرف۔
وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ (۱۸-۳۹) اور (بھلا) جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو ..... کیوں نہ۔
بعض کہا ہے کہ ان گنجان درختوں کو بھی جنت

---

[1] ای یقی صاحبہ من الشہوات انظر للحدیث النہایۃ ۱ر۳۰۸ واللسان (جنن)، و زرواہ ابن حبان۔ عن کعب بن عجرۃ انظر رقم ۲۰۵۳ و ۲۶۱ و ۱۵۷۹ ÷ ÷ ÷

کہا جاتا ہے جو زمین کو چھپائے ہوئے ہوں اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[1] (بسیط)

(۹) مِنَ النَّوَاضِحِ تَسْقِيْ جَنَّةً سَحِقًا

اور نخلستان کو سیراب کرنے والی سدھائی ہوئی اونٹنی پر رکھے ہوتے ہیں۔

اور بہشت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے، اگرچہ دونوں میں بون بعید ہے اور یا اس لئے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں جیسا کہ فرمایا:۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (۳۲-۱۷) کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جَنَّاتٍ جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔[2]

(۱) جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ (۲) جَنَّةُ عَدْنٍ (۳) جَنَّةُ النَّعِيْمِ (۴) دَارُ الْخُلْدِ (۵) جَنَّةُ الْمَأْوٰى (۶) دَارُ السَّلَامِ (۷) عِلِّيِّيْنَ۔

اَلْجَنِیْنُ۔ بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہو اسے جنین کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَجِنَّةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ أُمَّهَاتِكُمْ (۵۳-۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

اور یہ یعنی جنین فعیل بمعنی مفعول سے ہے یعنی چھپا ہوا۔ اَلْجَنِیْنُ قبر کو بھی کہتے ہیں۔ فعیل بمعنی فاعل ہے یعنی چھپانے والی۔

اَلْجِنُّ۔ جن (اس کی جمع جِنَّةٌ آتی ہے اور) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

(۱) انسان کے مقابلہ میں ان تمام روحانیوں کو جن کہا جاتا ہے جو حواس سے مستور ہیں۔ اس صورت میں جن کا لفظ ملائکہ اور شیاطین دونوں کو شامل ہوتا ہے لہذا تمام فرشتے جن ہیں لیکن تمام جن فرشتے نہیں ہیں۔ اسی بنا پر ابو صالح نے کہا ہے کہ سب فرشتے جن ہیں۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ جن روحانیوں کی ایک قسم ہیں کیونکہ روحانیات تین قسم ہیں۔

(۱) اَخْيَارٌ (نیک) اور یہ فرشتے ہیں۔

(۲) اَشْرَارٌ (بد) اور یہ شیاطین ہیں۔

(۳) اَوْسَاطٌ جن میں بعض نیک اور بعض بد ہیں اور یہ جن ہیں چنانچہ سورت جن کی ابتدائی آیات:۔ قُلْ أُوْحِيَ إِلَيَّ ... وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقَاسِطُوْنَ (۷۲-۱-۱۴) اور یہ کہ ہم بعض فرمانبردار ہیں اور بعض (نافرمان) گنہگار ہیں۔

اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں بعض نیک اور بعض بد ہیں۔

اَلْجِنَّةُ جنوں کی جماعت۔ قرآن میں ہے:۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۱۱۴-۶) (خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں میں سے۔ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (۳۷-۱۵۸) اور انہوں نے خدا میں اور جنوں میں رشتہ مقرر کیا۔

اَلْجِنَّةُ (ایضًا) جنون۔ دیوانگی۔ قرآن میں ہے:۔ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۷-۱۸۴) کہ ان کے

---

[1] قالہ زہیر بن ابی سلمٰی وادلہ۔ کان عینی فی غربی مقتلۃ والبیت فی دیوانہ بشرح الاعلم الشنتمری ۷۱ (طبع لیدن ۱۳۰۶ھ) والعقد الثمین ۹۴ وطالسان دعمل، شواہد الکشاف ۸۰ ومختار الشعر الجاہلی ۱: ۷۱ والبحر ۵: ۳۱۳۰، ۳۴/۷ [2] وفی الفتح ۴/۲۷۸:۔ ملح المؤلف (البخاری) ہہنا باسماء الجنۃ وہا عشرۃ او تزید سبق المذکورۃ ۸) دار المقامۃ (۹) المقام الامین (۱۰) مقعد صدق (۱۱) الحسنی وکما فی القرآن وزاد بعضہم دار الحیوان وقعد ای الخلاۃ وفیہ نظر۔

رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو (کسی طرح کا بھی) جنون... نہیں ہے۔

اور دیوانگی کو جنون اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کے دل اور عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔

جُنَّ فُلَانٌ۔ اسے جن لگ گیا۔

امراض کے معانی میں دوسرے افعال کی طرح یہ بھی فعل مجہول ہی استعمال ہوتا ہے جیسے زُکِمَ (اسے زکام ہو گیا) لُقِیَ (اسے لقوہ ہو گیا) حُمَّ (اسے بخار ہو گیا) وغیرہ۔ بعض نے کہا ہے کہ جُنَّ فُلَانٌ کے معنی ہیں۔ اس کے قلب کو عارضہ ہو گیا اور بعض نے کہا کہ دیوانگی نے اس کی عقل کو چھپا لیا اور آیت کریمہ مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (۴۴-۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ جن چمٹا ہوا ہے جو اسے تعلیم دیتا ہے اور یہی معنی آیت :-

أَئِنَّا لَتَارِكُوْا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷-۳۶) کہ بھلا ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔ میں شاعر مجنون کے ہیں۔

جُنَّ التِّلَاعُ وَالْاٰفَاقُ یعنی ٹیلوں اور ان کے گردو نواح کو گھاس نے چھپا لیا۔ اور آیت کریمہ :-

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵-۲۷) اور جان کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

میں جَآنَّ سے بھی جنوں کی ایک قسم مراد ہے[1]۔ لیکن آیت کریمہ :- كَاَنَّهَا جَآنٌّ (۲۷-۱۰) میں جَآنَّ سے ایک قسم کا سانپ مراد ہے۔

(ج ن ب)

اَلْجَنْبُ اصل میں اس کے معنی پہلو کے ہیں اس کی جمع جُنُوْبٌ ہے۔ قرآن میں ہے :-

قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (۳-۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے۔

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ (۹-۳۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو ..... داغے جائیں گے۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (۳۲-۱۶) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔

پھر بطور استعارہ پہلو کی سمت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسا کہ یمین، شمال اور دیگر اعضا میں عرب لوگ استعارات سے کام لیتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] ع (الکامل)

(۹۷) مِنْ عَنْ يَّمِيْنِيْ مَرَّةً وَّاَمَامِيْ

کبھی دائیں جانب سے اور کبھی سامنے سے۔

اسی سے جَنْبُ الْحَائِطِ وَجَانِبُهٗ کا محاورہ ہے۔ یعنی دیوار کی جانب۔

اور اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (۴-۳۶) کے معنی قریبی دوست کے ہیں۔ اور آیت کریمہ :-

يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ (۳۹-۵۶) کہ ہائے ہائے اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

---

[1] الجان ابو الجن عن ابن عباس والحسن عن قتادہ وعند البعض ابو الشیاطین ابلیس راجع نزان (۲ : ۵۰۳)۔ [2] البیت لقطری بن فجاءۃ امامی اسد زعماء الخوارج فی زمان مصعب بن الزبیر ۶۷ھ وسنۃ ۷۷ھ واکہ جعد بن مازن وصدرہ: فلقد اراني للرماح دريئۃ ...... والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی رقم ۳۰ والشعر (۱۲ : ۴۰۲، ۲۲۹) والقالی (۲ : ۷۸) والخزانۃ (۴ : ۲۵۸) وابن عقیل (۱ : ۲۴۳) وابن ہشام رقم ۲۶۵ واستشہد بہ النحاۃ علی ان لفظۃ من عن قد تکون اسما بمعنی جانب قال ابن ہشام وذالک یتعین فی ثلاثۃ مواضع احدہا ان یدخل علیہا من وہو کثیر کقول الشاعر۔

میں جَنْبِ اللّٰہِ سے خدا تعالیٰ کے اوامر حدود مراد ہیں جو اس نے ہمارے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔
سَارَ جَنِیْبَهُ وَجَنِیْبَتَهُ وَجَنَابَيْهِ وَجَنَابَتَيْهِ اس کے پہلو پر چلا وَجَنَبْتُهُ میں نے اس کے پہلو پر مارا جیسے کَبَدْتُهُ میں نے اسکے کلیجے پر مارا فَأَدْتُهُ میں نے اس کے فُوَاد یعنی دل پر مارا۔ جُنِبَ الرَّجُلُ ..... پہلو کے درد میں مبتلا ہونا جیسے کُبِدَ وَفُئِدَ اور جَنْبٌ سے فعل دو معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک کسی کی سمت مخالف کو جانا یا اس سے دور ہونا۔ دوم سمت موافق کو آنا یا اس کے قریب ہونا۔ اول معنی کی مثال جیسے جَنَبْتُهُ وَاَجْنَبْتُهُ میں نے اسے جانب مخالف یعنی دور کر دیا۔ اسی سے اَلْجَارِ الْجُنُبِ (۴-۳۶) ہے جس کے معنی اجنبی یعنی دور کے ہمسایہ کے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۹۷) فَلَا تَحْرِ مَنِّیْ نَائِلًا عَنْ جَنَابَةٍ

تو مجھ جیسے غریب الوطن کو دور ہی سے عطا سے محروم نہ کر۔
رَجُلٌ جَنِبٌ وَجَانِبٌ اجنبی آدمی۔
اَلْاِجْتِنَابُ (افتعال) بچنا، یکسو رہنا، پہلو تہی کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ (۴-۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جس سے تم کو منع کیا جاتا ہے۔ اجتناب رکھو گے۔
اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبَائِرَ الْاِثْمِ (۵۳-۳۲) جو ... بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔
وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲-۳۰) اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ (۳۹-۱۷) میں بتوں سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے طاغوت کی عبادت یکسر ترک دی اس طرح وہ طاغوت سے دور رہے۔ نیز فرمایا:۔
فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵-۹۰) سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ اور یہ یعنی اِجْتَنِبُوْا بنسبت اُتْرُکُوْهُ کے زیادہ بلیغ ہے۔
جَنَبَ بَنُوْ فُلَانٍ بے شیر شدن قوم
جَنِبَ فُلَانٌ خَیْرًا۔ فلاں خیر سے محروم ہوگیا۔
جَنَبَ شَرًّا۔ وہ شر سے دور رہا۔ چنانچہ قرآن میں نار جہنم کے متعلق ہے:۔
وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهُ یَتَزَکّٰی (۹۲: ۱۷-۱۸) اور جو بڑا پرہیزگار ہے وہ اس (نار) سے بچا لیا جائے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ پاک ہو۔ لیکن اگر مطلق یعنی بغیر کسی متعلق کے جُنِبَ فُلَانٌ کہا جائے تو اس کے معنی خیر سے محروم ہونا ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعائے خیر کے لئے بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۱۴-۳۵) اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں بچائے رکھ۔
میں اُجْنُبْنِیْ جَنَبْتُهُ عَنْ کَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز سے دور رکھنے اور بچانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ جَنَبْتُ الْفَرَسَ کے محاورہ

---

[1] قاله علقمة بن عبدة التميمي المعروف بعلقمة الفحل صاحب امرئ القيس يخاطب بالحارث بن جبلة يمدحه وكان قد اسر اخاه شاسًا في تسعين رجلًا من بني تميم وتمامه:..... فاني امرؤ وسط القباب غريب والبيت في ديوان الستة ۱۰۷ والمفضليات (۲: ۴ ۱۹) والكامل ۲۲۷ والزجاج (۱: ۱۷ب مخطوطة) و الشنتمري (۲: ۳ ۴۴) والقرطبي (۵: ۱۸۳ ۱۳/ ۲۵۷) واللسان والتاج (جنب) ابوعبيدة (۲: ۹۸/۱: ۱۲۶) وشواهد الشافية ۴۹۴ ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۳۲۳) والبحر (۳: ۲۳۰) وامالي الشجرية (۱: ۱۴) والعمدة (۱: ۷ ۱۵) والعقد الثمين ۱۰۷ وايام العرب ۵۸ ÷ ÷ ÷

سے ماخوذ ہے جس کے معنی کوتل یا نکلنا کے ہیں۔ تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ اپنے لطف وکرم اور اسباب مخفیہ کے ذریعہ اسے شرک کی جانب سے کھینچ لائے اور اسی طرح اس سے دور رکھے۔

اَلْجَنَبُ، (ایضًا) پیدائشی طور پر پاؤں کا ایک دوسرے سے دور ہونا اور آیت کریمہ:۔

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (۵-۶) کے معنی یہ ہیں کہ جب تم حالت جنابت میں ہوا کرو تو غسل کرلو۔[1] اور شرعًا جَنَابَةٌ کا لفظ انزال یعنی خروج منی سے ثابت ہوتا ہے اور یا دو ختنوں کے التقاء یعنی مرد کے عضو تناسل کے عورت کی شرم گاہ میں داخل ہونے[2] سے اور جنبی ہونے کے معنی میں جَنَبَ (ک ن س) وَتَجَنَّبَ وَاجْتَنَبَ تینوں باب استعمال ہوتے ہیں اور جَنَابَةٌ کو جنابت اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ شرعًا نماز سے دور رہنے کا سبب بنتی ہیں۔

اَلْجُنُوْبُ (جنوبی ہوا) اس میں کعبہ کی جانب سے آنے اور اس کی جانب جانے دونوں معنی کا اعتبار ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جَنُوْبٌ سے جَنَبَتِ الرِّیْحُ کا محاورہ لیا گیا ہے جس کے معنی جنوبی ہوا چلنے کے ہیں۔ اَجْنَبْنَا ہم جنوب میں داخل ہوئے۔ جُنِبْنَا ہمیں جنوبی ہوا لگی۔ سَحَابَةٌ مَجْنُوْبَةٌ وہ بادل جسے جنوبی ہوا چلا کر لائی ہو۔

(ج ن ح)

اَلْجَنَاحُ پرندکا بازو۔ اسی سے جَنَحَ الطَّائِرُ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی اس کا بازو توڑ دینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا طَائِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (۶-۳۸) یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے۔

پھر کسی چیز کے دونوں جانب کو بھی جَنَاحَیْن کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً جَنَاحَا السَّفِیْنَةِ (سفینہ کے دونوں جانب)، جَنَاحَا الْعَسْكَرِ (لشکر کے دونوں جانب) اسی طرح جَنَاحَا الْوَادِیْ وادی کے دونوں جانب اور انسان کے دونوں پہلوؤں کو جَنَاحَا الْاِنْسَانِ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ (۲۰-۲۲) اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے لگا لو۔ اور آیت:۔

وَاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸-۳۲) اور خوف دور ہونے (کی وجہ) سے اپنے بازو کو اپنی طرف سکیڑ لو۔

میں جَنَاحٌ بمعنی یَدٌ کے ہے۔ کیونکہ پرندکا بازو اس کے لئے بمنزلہ ہاتھ کے ہوتا ہے اسی لئے جَنَاحَا الطَّیْرِ کو یَدَا الطَّیْرِ بھی کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷-۲۴) اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔

میں ذُلٌّ کے لئے جَنَاحٌ بطور استعارہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ذُلٌّ یعنی ذلت وانکساری دو قسم پر ہے ایک ذلت وہ ہے جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرا دیتی ہے اور دوسری وہ ہے جو انسان کے مرتبہ کو بلند کر دیتی ہے اور یہاں چونکہ ذلت کی دوسری قسم مراد ہے۔ جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرانے

---

[1] وایضًا مجنب بمعنی بعید کما فی قولہ تعالیٰ فبصرت بہ عن جنب (۲۸-۱۱) ای عن بعد ۱۲
[2] وفی الحدیث عن عائشۃ: اذا مس الختان الختان فقد وجب الغسل وفی روایۃ جاوز وانہ یوضح المراد (راجع العون ۱/۱۲)

کی بجائے بلند کر دیتی ہے اس لئے جناح کا لفظ بطور استعارہ (یعنی معنی رفعت کی طرف اشارہ کے لئے) استعمال کیا گیا ہے گویا اسے حکم دیا گیا ہے کہ رحمت الٰہی حاصل کرنے کے لئے ان کے سامنے ذلت کا اظہار کرتے رہو اور یا یہ معنی ہیں کہ ان پر رحمت کرنے کے لئے ذلت کا اظہار کرو۔

جَنَحَتِ الْعِيْرُ فِيْ سَيْرِهَا قافلہ تیزی سے چلا۔ گویا وہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑ رہا ہے۔ جَنَحَ اللَّيْلُ رات کی تاریکی چھا گئی۔ اَلْجُنْحُ رات کا سیاہ حصہ۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (۸-۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ۔

میں جَنَحُوْا کے معنی مائل ہونے کے ہیں یہ جَنَحَتِ السَّفِيْنَةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کشتی کے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ اسی لئے ہر وہ گناہ جو انسان کو حق سے مائل کر دے اسے جُنَاحٌ کہا جاتا ہے۔ پھر عام گناہ کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں متعدد مواضع پر لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ آیا ہے۔

جَوَانِحُ الصَّدْرِ وہ پسلیاں جن کے سرے سینے کے وسط میں باہم متصل ہوتے ہیں اس کا واحد جَانِحَةٌ ہے اور ان پسلیوں کو جوانح اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں میلان یعنی خم ہوتا ہے۔

(ج ن د)

اَلْجُنْدُ کے اصل معنی سنگستان کے ہیں معنی غلظت اور شدت کے اعتبار سے لشکر کو جُنْدٌ کہا جانے لگا ہے۔ اور مجازاً ہر گروہ اور جماعت پر جُنْدٌ پر لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے (حدیث میں ہے) اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ[1] کہ ارواح کے بھی گروہ اور جماعتیں ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ (۳۷-۱۷۳) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ (۴۴-۲۴) (تمہارے بعد) ان کا تمام لشکر ڈبو دیا جائے گا۔

اور جُنْدٌ کی جمع اَجْنَادٌ وَ جُنُوْدٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ (۲۶-۹۵) اور شیطان کے لشکر سب کے سب داخل جہنم ہوں گے۔

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (۷۴-۳۱) اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور آیت کریمہ:۔

اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۳۳-۹) خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت کی) جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کئے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں پہلے جُنُوْد سے مراد کفار کی فوجیں ہیں اور

---

[1] وتمامہ: فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف (محاضرات المؤلف ۳/۵۳) والحدیث اخرجہ مسلم من حدیث ابی ہریرۃ والبخاری تعلیقاً من حدیث عائشۃ والطبرانی من حدیث ابن مسعود وبمعناہ اخرجہ الطبرانی فی الاوسط من حدیث علی وفیہ قصۃ امرأتین المکیۃ والمدنیۃ اخرجہ الحسن بن سفیان فی مسندہ بسند حسن والدیلمی والخرائطی فی اعتلال القلوب عن علی وسند ومن عمرو بمعناہ السلفی فی انتخاب حدیث الفراء راجع تخریج الاحیاء للعراقی ۲/۱۶۱-۱۶۲ وادب الدنیا والدین للماوردی ۹۱ بشرح خان زادہ وکنز العمال ۹ رقم ۲۳،۱۰۳،۱۰۴،۱۰۱،۹۲۱-۹۲۳ ❊

دوسرے سے فرشتوں کے لشکر مراد ہیں جو انہیں نظر نہیں آتے تھے۔

(ج ن ف)

اَلْجَنَفُ اس کے اصل معنی فیصلہ میں ایک طرف مائل ہوجانے یعنی جانب داری یا ظلم کرنے کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔
فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا (۲-۱۸۲) اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی وارث کی طرفداری کا اندیشہ ہو۔ میں صریح طور پر جانبدار مراد ہے اسی طرح فرمایا:۔
غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ (۵-۳) بشرطیکہ گناہ کی طرف مائل نہ ہو۔

(ج ن ی)

جَنَيْتُ (ض) جَنْيًا۔ الثَّمَرَةَ وَاجْتَنَيْتُهَا میں نے درخت سے پھل توڑا۔
اَلْجَنِيُّ وَالْجَنَى چنے ہوئے پھل، چھتے سے نکالا ہوا شہد لیکن عام طور پر جَنِیٌّ تازہ پھل کو کہتے ہیں جو حال ہی میں توڑا گیا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (۱۹-۲۵) تم پر تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔
وَجَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ (۵۵-۵۴) اور دونوں باغوں کے میوے قریب (جھک رہے) ہیں۔
اَجْنَى الشَّجَرُ درخت کے پھل پک گئے توڑنے کے قابل ہوگئے اَجْنَتِ الْاَرْضُ زمین زیادہ پھلوں والی ہوگئی۔ اسی سے یعنی پھل توڑنے کے معنی سے بطور استعارہ جَنٰی فُلَانٌ جِنَايَةً گناہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ
اِجْتَرَمَ کا محاورہ بطور استعارہ اس معنی میں آتا ہے۔

(ج ھ د)

اَلْجَهْدُ وَالْجُهْدُ کے معنی وسعت و طاقت اور تکلیف و مشقت کے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اَلْجَهْدُ (فتح جیم) کے معنی مشقت کے ہیں اور اَلْجُهْدُ (بضم جیم) طاقت اور وسعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اَلْجُهْدُ کا لفظ صرف انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ (۹-۷۹) اور جنہیں اپنی محنت و مشقت (کی کمائی) کے سوا کچھ میسر نہیں ہے۔
اور آیت کریمہ:۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ (۱۶-۳۸) کے معنی یہ ہیں کہ وہ بڑی زور زور سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ اس میں اپنی انتہائی کوشش صرف کریں گے۔
اَلْاِجْتِهَادُ (افتعال) کے معنی کسی کام پر پوری طاقت صرف کرنے اور اس میں انتہائی مشقت اٹھانے پر طبیعت کو مجبور کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے جَهَدْتُ رَأْيِيْ وَاَجْهَدْتُهٗ میں نے غور و فکر سے اپنی رائے کو مشقت اور تعب میں ڈالا۔
اَلْجِهَادُ وَالْمُجَاهَدَةُ دشمن کے مقابلہ اور مدافعت میں اپنی انتہائی طاقت اور وسعت خرچ کرنا اور جہاد تین قسم پر ہے (۱) ظاہری دشمن یعنی کفار سے جہاد کرنا (۲) شیطان اور (۳) نفس سے مجاہدہ کرنا اور آیت کریمہ:۔
وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (۲۲-۷۸) کہ اللہ کی راہ میں پوری طرح جہاد کرو۔۔۔ تینوں

قسم کے جہاد پر مشتمل ہے۔ نیز فرمایا:۔
وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹-۴۱) کہ خدا کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو۔ اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹-۲۰) جو لوگ ایمان لائے اور وطن چھوڑ گئے اور خدا کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرتے رہے۔
اور حدیث میں ہے[1] (۶۶)
جَاهِدُوْا اَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَاءَكُمْ کہ جس طرح اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو اسی طرح اپنی خواہشات سے بھی جہاد کیا کرو۔
اور مجاہدہ ہاتھ اور زبان دونوں کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (۶۷)
جَاهِدُوا الْكُفَّارَ بِاَيْدِيْكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ کہ کفار سے ہاتھ اور زبان دونوں کے ذریعہ جہاد کرو۔

(ج ھ ر)

اَلْجَهْرُ (ف) اس کے اصل معنی کسی چیز کا حاسہ سمع یا بصر میں افراط کے سبب پوری طرح ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں چنانچہ حاسہ بصر یعنی نظروں کے سامنے کسی چیز کے ظاہر ہونے کے متعلق کہا جاتا ہے رَاَيْتُهٗ جِهَارًا کہ میں نے اسے کھلم کھلا دیکھا قرآن میں ہے:۔
لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (۲-۵۵) کہ جب تک ہم خدا کو سامنے نمایاں طور پر نہ دیکھ لیں تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔
اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (۴-۱۵۳) ہمیں نمایاں اور ظاہر طور پر خدا دکھا دو۔
اور اسی معنی سے جَهَرَ الْبِئْرَ وَاجْتَهَرَهَا ہے جس کے معنی ہیں اس نے کنواں دکو صاف کرکے اس کا پانی ظاہر کردیا۔ محاورہ ہے مَا فِي الْقَوْمِ اَحَدٌ يَجْهَرُ عَيْنِيْ۔ قوم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو میری نظر میں بڑا معلوم ہوتا ہو۔
اَلْجَوْهَرُ یہ بھی اسی مادہ سے فَوْعَلٌ کے وزن پر ہے اور جوہر اسے کہتے ہیں جس کے بطلان سے اس کے جملہ محمولات کا بطلان لازم آتا ہو اور اسے جوہر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حاسہ بصر یعنی نظر کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔
اور حاسہ کے سامنے ظاہر ہونے کے متعلق فرمایا:۔
سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ (۱۳-۱۰) کہ تم میں سے کوئی چپکے سے بات کہے یا آواز بلند پکار کر (اس کے نزدیک) دونوں برابر ہیں وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى (۲۰-۷) تم پکار کر بات کہو وہ تو چھپے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ (۶۷-۱۳) اور تم پوشیدہ بات کرو یا ظاہر۔
وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ (۴۹-۲) اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے کے سامنے زور سے بات کرتے ہو (اسی طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔
كَلَامٌ جَهْوَرِيٌّ۔ بلند گفتگو اور بلند آواز شخص کو جَهِيْرٌ کہا جاتا ہے نیز جَهِيْرٌ کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنے حسن وجمال سے نظر کو خیرہ کردے۔

---

[1] الحديث باختلاف لفظه في الدارمي عن انس وايضا ابن حبان والنسائي وصححه ورجال اسناده رجال الصحيح ۱۲

(ج ھ ز)

اَلْجِھَازُ۔ ساز و سامان جو تیار کرکے رکھا جائے۔ قرآن میں ہے:۔ فَلَمَّا جَھَّزَھُمْ بِجَھَازِھِمْ۔ (۱۲-۵۹) جب ان کے لئے ان کا سامان تیار کر دیا۔

اَلتَّجْھِیْزُ (تفعیل) تیار کردہ سامان کو لادنا یا بھیجنا ضَرَبَ الْبَعِیْرُ بِجَھَازِہٖ[1]۔ اونٹ نے اپنا سامان (پالان اور بوجھ) نیچے پھینک دیا اور بدک کر بھاگ گیا۔ جَھِیْزَۃٌ ایک احمق عورت[2] نیز مادہ گرگ جو دوسرے کے بچے کو دودھ پلاتی ہو اسے بھی جَھِیْزَۃٌ کہا جاتا ہے[3]۔

(ج ھ ل)

اَلْجَھْلُ۔ (جہالت، نادانی) جہالت تین قسم پر ہے (۱) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا اور یہی اس کے اصل معنی ہیں اور بعض متکلمین نے کہا ہے کہ انسان کے وہ افعال جو نظام طبعی کے خلاف جاری ہوتے ہیں ان کا مقتضی بھی یہی معنی جہالت ہے۔ (۲) کسی چیز کے خلاف واقع یقین و اعتقاد قائم کرلینا۔ (۳) کسی کام کو جس طرح سرانجام دینا چاہیئے اس کے خلاف سرانجام دینا عام ہے کہ اس کے متعلق اعتقاد صحیح ہو یا غلط مثلاً کوئی شخص دیدہ و دانستہ نماز ترک کردے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے آیت:۔ اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ (۲-۶۷) میں ھُزُوًا کو جہالت قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَھَالَۃٍ (۴۹-۶) تو خوب تحقیق کرلیا کرو (مبادا) کہ تم کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو۔

اور جاہل کا لفظ عموماً بطور مذمت بولا جاتا ہے۔ مگر کبھی بطور مذمت نہیں بھی آتا۔ چنانچہ آیت:۔ یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (۲-۲۷۳) کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔ میں الجاہل سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کی حالت سے ناواقف ہیں لہذا یہاں یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں ہے[4]۔

اَلْمَجْھَلُ (سبب جہالت) ہر وہ معاملہ یا عادت یا زمین جو کسی چیز کے متعلق واقع کے خلاف اعتقاد قائم کرلینے کا سبب بنے اسے مَجْھَلٌ کہا جاتا ہے۔

اِسْتَجْھَلَتِ الرِّیْحُ الْغُصْنَ۔ ہوانے شاخ کو اس طرح زور سے ہلایا گویا وہ اسے جہالت پر مجبور کررہی ہے۔ یہ کس قدر عمدہ استعارہ ہے۔

(ج ھ ن م)

جَھَنَّمُ۔ دوزخ کا نام ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصل میں فارسی لفظ جہنام سے معرب ہے واللہ اعلم۔

---

[1] مثل یضرب عند اظہار النفور من شیء راجع المیدانی رقم ۲۴۰ وفیہ جہازہ وفی من صلۃ المعنی ای صدعا ثراً فی جہازہ۔
[2] وفی المثل قطعت جھیزۃ قول کل خطیب انظر المثل والقصۃ المیدانی رقم ۳۰۸۲۔
[3] وفی الحیوان ۱/۲۷۴ والعیون ۲/۹۷ یقال احمق من جھیزۃ لانھا تترک ولدھا وترضع ولد الضبع راجع للمثل المعانی للقتبی ۲۱۲ واللسان (جہز) وجمہرۃ الامثال ۱/۲۶۔
[4] والجاہلیۃ الاولیٰ (۳۳-۳۳) فیقال علی العادات التی کانت فیہم قبل الاسلام وفی الآیۃ (۲۵-۶۳) جاء لفظۃ الجاھلون فی مقابلۃ عباد الرحمٰن ۱۲

(ج و و)

اَلْجَوُّ کے معنی فضا کے ہیں قرآن میں ہے:۔

فِیْ جَوِّ السَّمَاءِ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ (١٦-٧٩) کہ فضا میں ۔۔۔ ان کو خدا ہی تھامے رکھتا ہے۔

اور یمامۃ کو جوٌّ بھی کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

(ج و ب)

اَلْجَوْبُ (ض) اس کے اصل معنی جَوْبَۃٌ قطع کرنے کے ہیں اور یہ پست زمین کی طرح (زمین میں گڑھا سا) ہوتا ہے۔ پھر ہر طرح زمین کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (٨٩-٩) اور ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی (قریٰ) میں پتھر تراشتے (اور مکانات بنانے) تھے۔

وَالْجَائِبَۃُ۔ پھیلنے والی، محاورہ ہے ھَلْ عِنْدَكَ مِنْ جَائِبَۃِ خَبَرٍ۔ کیا تمہارے پاس کوئی نشر ہونے والی خبر ہے۔

جَوَابُ الْکَلَامِ اور کسی کلام کے جواب کو بھی جواب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قائل کے منہ سے نکل کر فضا کو قطع کرتا ہوا سامع کے کان تک پہنچتا ہے مگر عرف میں ابتدائے کلام کرنے کو جواب نہیں کہتے بلکہ کلام کے لوٹانے پر جواب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا (٢٧-٥٦) تو ان کی قوم کے لوگ (بولے تو) یہ بولے اور اس کے سوا ان کا جواب نہ تھا۔

پھر جواب کا لفظ سوال کے مقابلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور سوال دو قسم پر ہے (١) گفتگو کا طلب کرنا اس کا جواب گفتگو ہی ہوتی ہے (٢) طلب عطا یعنی خیرات طلب کرنا اس کا جواب یہ ہے کہ اسے خیرات دے دی جائے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:۔

اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ (٤٦-٣١) خدا کی طرف سے بلانے والے کی بات قبول کرو۔ وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ (٤٦-٣٢) اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات قبول نہ کرے۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے فرمایا:۔

قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا (١٠-٨٩) کہ تمہاری دعا قبول کرلی گئی تو ہم ثابت قدم رہنا

اَلْاِسْتِجَابَۃُ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی اِجَابَۃٌ (افعال) کے ہے اصل میں اس کے معنی جواب کے لئے تحری کرنے اور اس کے لئے تیار ہونے کے ہیں لیکن اسے اِجَابَۃٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ قرآن میں ہے:۔ اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (٨-٢٤) کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (٤٠-٦٠) کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری (دعا) قبول کرونگا۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ (٣-١٩٥) تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کرلی۔ وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (٤٢-٢٦) اور جو ایمان لائے اور عمل نیک کئے ان کی دعا قبول فرماتا۔ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (٤٢-٣٨) اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ (٢-١٨٦) اور اے پیغمبر جب تم سے میرے بندے میرے

بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیئے کہ میرے حکموں کو مانیں۔ اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (۳-۱۷۲) جنہوں نے باوجود زخم کھانے کے خدا اور رسول کے حکم کو قبول کیا۔

(ج و د)

اَلْجُوْدِیُّ۔ اس پہاڑی کا نام ہے جو موصل اور جزیرہ کے درمیان واقع ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِیِّ (۱۱-۴۴) اور کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری۔ یہ دراصل اَلْجُوْدُ کی طرف منسوب ہے اور اَلْجُوْدُ کے معنی مقتنیات (ذخائر) کو صرف اور خرچ کرنے کے ہیں عام اس سے کہ وہ ذخیرۂ علم ہو یا ذخیرہ مال کا ہو۔
رَجُلٌ جَوَادٌ۔ سخی آدمی فَرَسٌ جَوَادٌ (تیز رفتار عمدہ گھوڑا) جو دوڑنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دے اس کی جمع اَلْجِیَادُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ بِالْعَشِیِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ (۳۸-۳۱) (جب ان کے سامنے) شام کو خاصے کے گھوڑے (پیش کئے گئے)
جَوْدٌ۔ زیادہ بارش۔ اور گھوڑے میں جو تیز رفتاری کی صفت ہوتی ہے اسے جَوْدَةٌ کہتے ہیں اور سخاوت مال کو جُوْدٌ کہا جاتا ہے۔
جَادَ (ن) اَلشَّیْءُ جَوْدَةً کسی چیز کا عمدہ اور جید ہونا اس سے صیغہ صفت جَیِّدٌ آتا ہے الشیاء میں جو عمدگی (جودۃ) پائی جاتی ہے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰-۵۰) کہ اس نے ہر چیز کو اس کی (مناسب) شکل و صورت بخشی اور پھر راہ دکھائی۔

(ج و ر)

اَلْجَارُ (پڑوسی۔ ہمسایہ) ہر وہ شخص جس کی سکونت گاہ دوسرے کے قرب میں ہو وہ اس کا جَارٌ کہلاتا ہے یہ "اسماء متضایفہ" یعنی ان الفاظ سے ہے جو ایک دوسرے کے تقابل سے اپنے معنی دیتے ہیں جیسا کہ اَخٌ اور صَدِیْقٌ کے الفاظ ہیں (کہ اخوت اور صداقت دونوں جانب سے ہوتی ہے) کیونکہ کسی کا پڑوسی ہونا اسی وقت متصور ہو سکتا ہے جب دوسرا بھی اسکا پڑوسی ہو۔ چونکہ ہمسائے کا حق عقلاً اور شرعاً بہت بڑا حق سمجھا گیا ہے اس بنا پر ہر وہ شخص جس کا حق بڑا ہو یا وہ کسی دوسرے کے حق کو بڑا خیال کرتا ہو اسے اس کا "جارٌ" کہہ دیتے ہیں قرآن میں ہے۔ اَلْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ (۴-۳۶) اور رشتہ دار ہمسایہ اور اجنبی ہمسایوں۔
اِسْتَجَرْتُهٗ فَاَجَارَنِیْ (میں نے اس سے پناہ طلب کی چنانچہ اس نے مجھے پناہ دے دی)[1]۔
چنانچہ آیت کریمہ:۔ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ (۸-۴۸) اور میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں ——— میں جارٌ اسی معنی پر محمول ہے نیز فرمایا:۔ وَهُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْهِ (۲۳-۸۸) اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے بالمقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

---

[1] وفی التنزیل وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ (۹-۶) قل ولن یجیرنی من اللہ احد (۷۲-۲۲) فمن یجیر الکافرین (۶۷-۲۸)

اور جَاذٌ میں معنی قرب کے تصور کی بنا پر جَاوَرَہٗ وَجَاوَرَہٗ وَتَجَاوَرَ (انفعال) استعمال ہونے لگے ہیں یعنی کسی کے قرب وجوار میں رہنا قرآن میں ہے:۔ لَا یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْهَا اِلَّا قَلِیْلًا (۳۳-۶۰) وہ اس (شہر) میں عرصہ قلیل کے سوا تمہارے ہمسایہ بن کر نہیں رہ سکیں گے۔ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (۱۳-۴) اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعات ہیں۔

اور معنی قرب کے اعتبار سے جَارَ عَنِ الطَّرِیْقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی (صلہ عن کی وجہ سے) راستہ سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں پھر مطلقاً حق سے عدول کرنے کے لئے اس کو اصل قرار دے کر اس سے اَلْجَوْرُ بمعنی ظلم بنایا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (۱۶-۹) اور بعض راستے سیدھی راہ سے ایک جانب مائل ہو رہے ہیں (جو باری تعالیٰ تک نہیں پہنچتے)۔

بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَائِرُ (جَوْرٌ سے صیغہ فاعل) انسانوں میں سے ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو احکام شریعت کے التزام سے رک جائے (اور اسی کا نام ظلم ہے)

(ج و ز)

جَوْزُ الطَّرِیْقِ کے معنی راستہ کے وسط کے ہیں اسی سے جَازَ الشَّیْءُ ہے جو کسی چیز کے جائز یا خوشگوار ہونے کی ایک تعبیر ہے گویا۔ اس نے وسط طریق کو لازم پکڑا۔[1]

جَوْزُ السَّمَآءِ وسط آسمان۔ اَلْجَوْزَآءُ آسمان کے ایک برج کا نام ہے کیونکہ وہ بھی وسط آسمان میں ہے۔ شَاۃٌ جَوْزَآءُ۔ سیاہ بھیڑ جس کے وسط میں سفیدی ہو۔

(جَاوَزَہٗ کسی چیز کے وسط سے آگے گزر جانا) قرآن میں ہے۔ فَلَمَّا جَاوَزَہٗ هُوَ (۲-۲۴۹) پھر جب وہ (حضرت طالوت) اس دریا کے وسط سے آگے گزر گئے یعنی پار ہو گئے۔ وَجَاوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْبَحْرَ (۱۰-۹۰) اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا۔

جُزْتُ الْمَکَانَ کسی جگہ میں گزرنا۔ اَجَزْتُہٗ میں نے اسے نافذ کر دیا یا اس کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اِسْتَجَزْتُ فُلَانًا فَاَجَازَنِیْ (میں نے اس سے (جانوروں یا کھیتی کے لئے) پانی طلب کیا چنانچہ اس نے مجھے دے دیا۔ یہ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور کسی لفظ کا حقیقی معنی وہ ہوتا ہے جو اپنے وضعی معنی میں استعمال ہو اور اس سے تجاوز نہ کرے[2] اور اسے مجاز کہتے ہیں)

(ج و س)

آیت کریمہ:۔ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ (۱۷-۵) میں جَاسُوْا کے معنی ہیں کہ وہ تمہارے دیار کے اندر گھس گئے اور ان میں خوب پھرے (غارت گری اور قتل سے کنایہ ہے) اور وَاسُوْا کے معنی بھی اسی (جَاسُوْا) کے قریب قریب ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَوْسُ کے معنی کسی چیز کو استقصار کے ساتھ طلب کرنا کے ہوتے ہیں۔

اَلْمَجُوْسُ۔ ایک معروف فرقے کا نام ہے۔

---

[1] وفی حدیث الصراط فاکون انا وامتی اول من یجیز علیہ [2] ههنا التسامح فتفکر ۱۲

(ج و ع)

اَلْجُوْعُ ۔ وہ تکلیف جو کسی حیوان کو معدہ کے طعام سے خالی ہونے کی وجہ پہنچتی ہے۔ اَلْمَجَاعَۃُ خشک سالی کا زمانہ۔ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ جَائِعٌ بھوکا آدمی اور جب بہت زیادہ بھوکا ہو تو اسے جَوْعَانٌ کہا جاتا ہے۔

(ج و ل)

جَالُوْتُ ۔ ایک سرکش بادشاہ کا نام ہے جسے حضرت داؤد علیہ السلام نے قتل کیا تھا چنانچہ آیت:۔ وَقَتَلَ دَاؤدُ جَالُوْتَ (۲-۲۵۱) میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

(ج ی ء)

جَاءَ (ض) جِیْئَۃً وَ مَجِیْئًا یہ اِلْاِتْیَان کے ہم معنی ہے جس کے معنی آنا کے ہیں لیکن مَجِیْئٌ کا لفظ اِتْیَان سے زیادہ عام ہے کیونکہ اِتْیَان کا لفظ خاص کر کسی چیز کے بسہولت آنے پر بولا جاتا ہے نیز اِتْیَان کے معنی کسی کام کا قصد اور ارادہ کرنا بھی آجاتے ہیں گو اس کا حصول نہ ہو۔ لیکن مَجِیْئٌ کا لفظ اس وقت بولا جائیگا جب وہ کام واقعہ میں حاصل بھی ہو چکا ہو نیز جَاءَ کے معنی مطلق کسی چیز کی آمد کے ہوتے ہیں۔ خواہ وہ آمد بالذات ہو یا بالامر اور پھر یہ لفظ اعیان واعراض دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کسی جگہ یا کام یا وقت کا قصد کرے قرآن میں ہے:۔ وَجَاءَ مِنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَۃِ رَجُلٌ یَّسْعٰی (۳۶-۲۰) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آپہنچا۔ وَلَقَدْ جَاءَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ (۴۰-۳۴) اور پہلے یوسف بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔ وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِھِمْ (۱۱-۷۷) اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غمناک ہو گئے۔ فَاِذَا جَاءَ الْخَوْفُ (۳۳-۱۹) پھر جب خوف کا وقت آئے۔ فَاِذَا جَاءَ اَجَلُھُمْ (۳۵-۴۵) جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ بَلٰی قَدْ جَاءَتْکَ اٰیٰتِیْ (۳۹-۵۹) کیوں نہیں میری آیتیں تیرے پاس پہنچ گئی تھیں۔

اور آیت: فَقَدْ جَاءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا (۲۵-۴) کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے یہ بات کہہ کر ظلم اور جھوٹ کا قصد کیا ہے اور حد سے تجاوز کیا ہے۔ تو یہاں پر ظلم اور زور کے متعلق مجیئ کا لفظ استعمال کرنا ایسے ہی ہے جیسا ان کے متعلق اَلْقَصْدُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اِذْ جَاءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ (۳۳-۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَجَاءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا (۸۹-۲۲) میں پروردگار کے آنے سے اس کے حکم کا آجانا مراد ہے۔ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے اور یہی معنی آیت فَلَمَّا جَاءَھُمُ الْحَقُّ (۱۰-۷۶) میں الحق کے آنے کے ہیں۔

جَاءَہٗ بِکَذَا وَ اَجَاءَہٗ (متعدی بحرف جار و ہمزہ) وہ اسے لے آیا۔ قرآن میں ہے:۔ فَاَجَاءَھَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَۃِ (۱۹-۲۳)

تو درد زہ ان کو کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔ بعض نے یہاں اَجَاءَ کے معنی اِلْجَاءُ یعنی مجبور اور لاچار کرنا بھی کئے ہیں مگر یہ جَاءَ سے ہمزہ تعدیہ، متعدی بنا یا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سے مثل مشہور[1] ہے:۔ شَرٌّ مَا اَجَاءَكَ اِلٰى مُخَّةِ عُرْقُوبٍ یعنی انتہائی فقر ہی تمہیں عرقوب سے مخ جوسنے کے لئے لے آیا ہے شاعر نے کہا ہے[2] (الوافر)

(۹۸) "اَجَاءَتْكَ الْمَخَافَةُ وَالرَّجَاءُ"

اسے امید و بیم تمہارے پاس لے آئی ہے

جَاءَ بِکَذَا۔ اس نے اسے لا حاضر کیا۔ قرآن میں ہے:۔ لَوْلَا جَاءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ (۲۴-۱۳) یہ افتراء پرداز اپنی بات کی تصدیق کے لیے چار گواہ کیوں نہیں لائے۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَقِيْنٍ (۲۷-۲۲) اور میں تمہارے پاس شہر سبا سے ایک سچی خبر لیکر آیا ہوں۔ اور جو چیز لائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے جَاءَ بِکَذَا کے معنی بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

(ج ی ب)

اَلْجَيْبُ کے معنی گریبان کے ہیں (مجازاً سینہ) اس کی جمع اَلْجُيُوْبُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (۲۴-۳۱) ان کو چاہیئے کہ اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھا کریں۔

---

[1] راجع للمثل المیدانی رقم ۱۹۷۷ وفیہ یجیئک بدل اجاک وفی اللسان اعرقب ولیضرب للمضطر جداً وذالک لان العرقوب لا مخ له والعرقوب ایضاً اسم رجل وھو مواعید عرقوب مثل فی خلف الوعد[2] قالہ زہیر بن ابی سلمی واولہ وجار سار معتمداً الیکم قال الفراء واصلہ من جئت وقد جعلتہ بمعنی الجأ راجع اللسان والتاج رجیأ والبیت من شواہد الطبری (۱۶-۴۲) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۹۶) والبحر (۶: ۱۸۲) والعقد الثمین ۷۷ ومحاضرات المؤلف (۱ = ۲۶۸) ومجاز القرآن (۱۵-۲) ودیوانہ ۷۷ والقرطبی (۱۱ = ۹۲) ۱۲ ج

كِتَابُ الْحَاءِ

(ح ب ب)

اَلْحَبّ وَالْحَبَّةُ (بفتح حاء) گندم جو وغیرہ مطعومات کے دانہ کو کہتے ہیں۔ اور خوشبودار پودوں اور پھولوں کے بیج کو حِبٌّ وَحِبَّةٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (۲ - ۲۶۱) (اس کی مثال) اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں۔

وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ (۶ - ۵۹) اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى (۶ - ۹۵) بے شک خدا ہی دانے اور گھٹلی کو پھاڑ کر ان سے درخت اگاتا ہے)

اور آیت کریمہ:۔ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ (۵۰ - ۹) اور اس باغ سے دلبستان اگائے اور اناج۔ میں حَبَّ الْحَصِيْدِ سے گندم وغیرہ مراد ہے جو کاٹا جاتا ہے اور حدیث میں ہے[1] كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِيْ حَمِيْلِ السَّيْلِ۔ جیسے گھاس پات کے بیج جو سیلاب کے بہاؤ میں اگ آتے ہیں۔

اَلْحُبُّ (محبوب۔ عاشق) جس کی محبت حد سے بڑھ جائے وانوں کے ساتھ تشبیہ دیکر حَبَبُ الْاِنْسَانِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دانتوں کی ہمواری اور موزونیت کے ہیں۔ اسی طرح شکل وصورت میں حبوب کے ساتھ تشبیہ دے کر پانی کے بلبلہ کو حَبَابُ الْمَاءِ کہا جاتا ہے۔

حَبَّةُ الْقَلْبِ۔ سویدائے قلب۔ یہ بھی ہیئت میں تشبیہ کے اعتبار سے ہے۔

حَبَبْتُ فُلَانًا۔ اس کے اصل معنی ہیں میں نے اس کے حَبَّةُ الْقَلْبِ پر مارا۔ جیسا کہ كَبَدْتُهُ فَاَدْتُهُ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

اَحْبَبْتُ فُلَانًا اصل معنی تو یہ ہیں کہ میں نے اپنا دل اس کی محبت کے لئے پیش کیا مگر عرف میں مُحِبّ کی جگہ پر محبوب کا لفظ رکھ لیا جاتا ہے اور اُحِبَبْتُ کی بجائے حَبَبْتُ بھی استعمال ہوتا ہے۔

اَلْمَحَبَّةُ کے معنی کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس کا ارادہ کرنے اور چاہنے کے ہیں اور محبت تین قسم پر ہے:۔

(۱) محض لذت اندوزی کے لئے جیسے مرد کسی عورت سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ آیت:۔ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا (۷۶ - ۸) میں اسی نوع کی محبت کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) محبت نفع اندوزی کی خاطر جیسا کہ انسان کسی نفع بخش اور مفید شے سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ

---

[1] قطعة من حديث طويل ورد في اهل النار بعد ما يخرجون منها يلقون في نهر الحياة راجع البخاري مع الفتح ۱۱ / ۲۵۵ وفي رواية مسلم القتارة بدل الجنة وحمئة السيل بدل حميل السيل والحديث في الفائق ۱ / ۲۶۲ وغريب ابي عبيدة وهناك تخريجه ۱۲ ۞ ۞

اللهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ (۶۱-۱۳) اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو یعنی تمہیں خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح حاصل ہوگی۔

(۳) کبھی یہ محبت بہ محض فضل وشرف کی وجہ سے ہوتی ہے جیسا کہ اہل علم وفضل آپس میں ایک دوسرے سے محض علم کی خاطر محبت کرتے ہیں۔

اور بعض نے مثل آیت: فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا (۹-۱۰۸) میں محبت کی تفسیر ارادہ سے بھی کی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ لفظ محبت میں بنسبت ارادہ کے معنوی طور پر زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے کیونکہ ہر محبت میں ارادہ تو پایا جاتا ہے مگر ہر ارادے کو محبت نہیں کہہ سکتے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (۹-۲۳) کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیں اور پسند کریں۔ اصل میں اِسْتِحْبَابٌ کے معنی کسی چیز میں ایسا معنی تلاش کرنے کے ہیں جس کی بنا پر اس سے محبت کی جائے مگر یہاں عَلٰی (صلہ) کی وجہ سے اس میں ایثار اور ترجیح کے معنی پیدا ہوگئے ہیں اسی طرح آیت کریمہ:۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۴۱-۱۷) کے معنی بھی یہ ہیں کہ انہوں نے اندھاپن کو ہدایت پر ترجیح دی۔ اور آیت کریمہ:۔

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (۵-۵۴) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور جسے وہ دوست رکھیں گے۔

میں اللہ تعالیٰ کے ان سے محبت کرنے سے مراد ان پر انعام کرنا ہے اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کے معنی ہیں بندہ تقرب الٰہی حاصل کرنے کی طلب میں لگا رہے"۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ (۳۸-۳۲) کے معنی یہ ہیں کہ میں نے گھوڑوں سے اسطرح محبت کی جس طرح کہ مجھے خیر سے محبت ہے۔ (اس طرح میں اللہ کی یاد سے غافل ہوگیا) اور آیت کریمہ:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (۲-۲۲۲) میں اللہ تعالیٰ کے توابین اور متطہرین سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ثواب دیگا اور ان پر فضل وکرم فرمائیگا اور آیت کریمہ:۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (۲-۲۷۶)

اور آیت:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۱۸-۲۱) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔

میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ گناہوں کے ارتکاب سے انسان اس قدر سرکش ہو جاتا ہے کہ توبہ کرنے کا نام نہیں لیتا اور جب توبہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ان معنوں میں محبت نہیں کرتا جن معنوں میں کہ وہ توابین اور متطہرین سے محبت کرتا ہے یعنی انعام وافضال کرنا اور ثواب سے نوازنا۔

حَبَّبَ اللّٰهُ اِلَيَّ كَذَا فلاں چیز خدا نے مجھے عزیز کردی۔ قرآن میں ہے:۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ (۴۹-۷) لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا۔

اَحَبَّ الْبَعِيْرُ اونٹ کا ماندہ اور بیمار ہو کر ایک جگہ پڑے رہنا گویا اسے اس جگہ سے محبت ہے۔

حَبَابُكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا یعنی تیری انتہائی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تم ایسا کرو۔

(ح ب ر)

اَلْحِبْرُ۔ وہ نشان جو عمدہ اور خوبصورت معلوم ہو حدیث میں ہے (۶۵) یَخْرُجُ مِنَ النَّارِ رَجُلٌ قَدْ ذَهَبَ حِبْرُهٗ وَسِبْرُهٗ کہ آگ سے ایک آدمی نکلے گا جس کا حسن وجمال اور چہرے کی رونق ختم ہو چکی ہو گی اسی سے رونمائی کو حِبْرٌ کہا جاتا ہے[1]۔ شَاعِرٌ مُحَبِّرٌ عمدہ گو شاعر[2] شِعْرٌ مُحَبَّرٌ عمدہ شعر۔ ثَوْبٌ حَبِيْرٌ ملائم اور نیا کپڑا۔ اَرْضٌ مِحْبَارٌ جلد سرسبز ہونے والی زمین (والجمع محابیر) اَلْحِبِيْرُ (من السحاب) خوبصورت بادل۔

حُبِرَ فُلَانٌ اس کے جسم پر زخم کا نشان باقی ہے۔ اَلْحِبْرُ عالم کو کہتے ہیں اسلئے کہ لوگوں کے دلوں پر اس کے علم کا اثر باقی رہتا ہے۔ اور افعال حسنہ میں لوگ اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے فرمایا (۶۶) کہ علماء تاقیامت باقی رہیں گے اگرچہ ان کی شخصیتیں اس دنیا سے فنا ہو جاتی ہیں لیکن ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر باقی رہتے ہیں۔

حَبْرٌ کی جمع اَحْبَارٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹-۳۱) انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ ۔۔۔ کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ (۳۰-۱۵) کے معنی یہ ہیں کہ وہ جنت میں اس قدر خوش ہوں گے کہ وہاں کی نعمتوں کی تروتازگی کا اثر ان کے چہروں پر ہویدا ہو گا۔

(ح ب س)

اَلْحَبْسُ (ض) کے معنی کسی کو اٹھنے سے روک دینا کے ہیں قرآن میں ہے:۔ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ (۵-۱۰۶) تو ان کو (عصر کی) نماز کے بعد روک لو۔

نیز حَبْسٌ اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جو پانی روکنے کے لئے بنائی گئی ہو۔ اس کی جمع اَحْبَاسٌ ہے

اَلتَّحْبِيْسُ ہمیشہ کے لئے وقف کرنا کہا جاتا ہے۔ هٰذَا حَبِيْسٌ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ اللہ کی راہ میں وقف ہے۔

(ح ب ط)

اَلْحَبْطُ (ض) کے معنی کسی کام کا اکارت اور ضائع ہو جانا کے ہیں) قرآن میں ہے:۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۲-۲۲) جن کے اعمال ضائع ہو گئے۔ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶-۸۸) اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل وہ کرتے تھے سب ضائع ہو جاتے۔ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (۳۹-۶۵) تو تمہارے عمل برباد ہو جائینگے۔ اَلْاِحْبَاطُ (افعال) اکارت کر دینا) قرآن میں ہے:۔ وَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ (۴۷-۳۲) اور خدا ان کا سب کیا کرایا اکارت کر دے گا۔

---

[1] تلہ فی الفائق ا ر ۲۰۷ الحبر والسبر بالکسر وقد یروی فیہما الفتح ایضاً راجع غریب ابی عبید ۱: ۸۵-۸۶ و ایضاً اصلاح یعقوب ۱۰

[2] ومنہ سمی کعب الاحبار لانہ کان صاحب کتب وہو کعب بن ماتع الحمیری ابو اسحاق التابعی مخضرم توفی ۳۲ھ فی خلافۃ عثمان وقد جاوز المائۃ وفی القاموس کعب الحبر ولا تقل الاحبار لکن ورد فی العلماء راجع مشارق عیاض وتہذیب النووی [3] قال الاصمعی: وکان یقال لطفیل الغنوی فی الجاہلیۃ المحبر لانہ کان یحسن الشعر غریب ابی عبید ۱: ۸۶ [4] راجع نقول علیؓ اخذہ ۲-۲۲۲ وفیہ بامثالہ بدل واشخاصہم کذا فی ابن الحدید ۱۲

فَأَحْبَطَ اللّٰهُ أَعْمَالَهُمْ (۴۷-۲۸) تو اس نے بھی ان کے عملوں کو برباد کر دیا۔

حبطِ عمل کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) اول یہ کہ وہ اعمال دنیوی ہوں اس لئے قیامت کے دن کچھ کام نہیں آئیں گے اسی کیطرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَنْثُورًا (۲۵-۲۳) اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے۔

(۲) اعمال تو اخروی ہو لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے نہ کیا گیا ہو جیسا کہ مروی ہے[۶۹] انہ یؤتیٰ یوم القیامۃ برجل فیقال لہ بما کان اشتغالک قال بقراءۃ القرآن فیقال لہ قد کنت تقرء لیقال ھو قارئ وقد قیل ذالک فیؤمر بہ الی النار کہ قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قسم کے عمل کرتا رہا وہ جواب دے گا کہ میں قرآن پاک پڑھتا رہا تو اس سے کہا جائے گا کہ تونے قرآن اس لئے پڑھا تھا کہ تجھے قاری کہا جائے سو لوگ تجھے قاری کہتے رہے حکم ہوگا کہ اسے دوزخ میں لے جاؤ۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال صالحہ کئے ہوں گے لیکن ان کے بالمقابل گناہ کا بار اسقدر ہوگا کہ اعمال صالحہ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے اور گناہوں کا پلہ بھاری رہے گا اسی کی طرف خفۃ المیزان سے اشارہ فرمایا گیا ہے[۱]۔

اصل میں حَبَط کا لفظ حَبَطٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ جانور اتنا زیادہ کھا جائے کہ اس کا پیٹ اپھر جائے[۲]۔ حدیث میں ہے[۷۰] اِنَّ مِمَّا یُنْبِتُ الرَّبِیْعُ مَا یَقْتُلُ حَبَطًا اَوْ یُلِمُّ بعض اوقات موسم ربیع کی گھاس یا پیٹ میں اپھار کی وجہ سے قتل کر دیتی ہے اور یا بیمار کر دیتی ہے۔ ایک شخص حارث کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ نفخ بطن سے مرگیا تھا تو اس کا نام الحارث الحبط پڑ گیا اور اس کی اولاد کو حبطات کہا جاتا ہے[۳]۔

(ح ب ك)

اَلْحَبِیْکَۃُ وَالْحِبَاكُ کے معنی راستہ کے ہیں (ج) اَلْحُبُكُ۔ آیت کریمہ:۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۵۱-۷) اور آسمان کی قسم جس میں رستے ہیں۔

میں بعض نے الحبک سے ستاروں اور کہکشاں کے محسوس راستے مراد لئے ہیں اور بعض نے عقلی راستے مراد لئے ہیں جن کا تعلق بصیرت سے ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا الآیۃ (۳-۱۹۱) میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

اصل میں یہ بَعِیْرٌ مَحْبُوْكُ الْقُوَیٰ۔ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی وہ اونٹ جس کے جوڑ بند نہایت مضبوط ہوں۔

اَلْاِحْتِبَاكُ (افتعال) کس کر اور مضبوطی سے باندھنا۔

---

[۱] الحدیث باختلاف الفاظہ فی مسلم ۲ ر ۱۴۰ — من حدیث ابی ہریرۃ [۲] ای فی الآیۃ (۱۰۱: ۸ ۔ ۹) واما من خفت موازینہ فامہ ہاویۃ۔

[۳] راجع للحدیث کنز العمال ۳ رقم ۱۱۰۴، ۵ ۵ بجمیع مخارجہ وفیہ مثل للمفرط من جمع الدنیا ومنعہا من حقہا المیدانی ۲ ر فی روایۃ ما یقتل حبطا غریب ابی عبید بخاری جہاد، الزکاۃ مسلم زکاۃ، المنافق ا ر ۵۵۶ [۳] وہم خمسۃ عامر، سعد، ربیعہ، انمار، عمرو (التاج) ۱۲

(ح ب ل)

اَلْحَبْلُ۔ کے معنی رسی کے ہیں قرآن میں ہے۔ فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱-۵) اس کے گلے میں کھجور کی رسی ہوگی۔

پھر جو کہ رگ بھی شکل وصورت میں رسی سے ملتی جلتی ہے اس لئے شہ رگ کو حَبْلُ الْوَرِیْدِ (۵۰-۱۶) اور حَبْلُ الْعَاتِقِ کہتے ہیں اور ریت کے لمبے ٹیلے کو حَبْلُ الرَّمْلِ کہا جاتا ہے استعارتًا حَبْلٌ کے معنی ملا دینا بھی آتے ہیں اور ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز تک پہنچ جائے حَبْلٌ کہلاتی ہے اس لئے آیت کریمہ:۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (۳-۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا۔ میں حَبْلُ اللّٰہِ سے مراد قرآن پاک اور عقل سلیم وغیرہما اشیاء ہیں جن کے ساتھ تمسک کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور عہد وپیمان کو بھی حَبْلٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔ ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ اَیْنَمَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (۳-۱۱۲) یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت کو دیکھو گے کہ ان سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کے عہد (معاہدہ) میں آجائیں۔ میں تنبیہ کیا گیا ہے کہ کافر کو اپنی جان ومال کی حفاظت کے لئے دو قسم کے عہد وپیمان کی ضرورت ہے ایک عہد الٰہی اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص اہل کتاب سے ہو اور کسی سماوی کتاب پر ایمان رکھتا ہو۔

ورنہ تو اسے اس کے دین پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اسے ذمہ اور امان مل سکتا ہے دوسرا عہد وہ ہے جو لوگوں کی جانب سے اسے حاصل ہو۔

اَلْحِبَالَۃُ خاص کر صیاد کے پھندے کو کہا جاتا ہے اس کی جمع حَبَائِلُ ہے۔ ایک حدیث میں ہے[1] (۷۱) اَلنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّیْطَانِ کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں۔

اَلْمُحْتَبِلُ وَالْحَابِلُ پھندا لگانے والا۔ ضرب المثل ہے[2]۔ وَقَعَ حَابِلُھُمْ عَلٰی نَابِلِھِمْ یعنی انہوں نے آپس میں شروفساد پیدا کردیا یا ان کا اول آخر پر گھوم آیا۔

اَلْحَبْلَۃُ

(ح ت م)

اَلْحَتْمُ کے معنی قضاء مقدر کے ہیں[3]۔

اَلْحَاتِمُ۔ کالا کوا جو اہل عرب کے خیال کے مطابق کائیں کائیں کرکے جدائی ڈال دیتا ہے۔

حَتّٰی (حرف)

کبھی تو الٰی کی طرح یہ حرف جر کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے مابعد غایت ماقبل کے حکم میں داخل ہوتا ہے اور کبھی عاطفہ ہوتا ہے اور کبھی استیناف کا فائدہ دیتا ہے۔ جیسے اَکَلْتُ السَّمَکَۃَ حَتّٰی رَأْسَھَا (عاطفہ) رَأْسِھَا (جارہ) رَأْسُھَا (مستانفہ) قرآن میں ہے:۔ لَیَسْجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیْنٍ (۱۲-۳۵) کچھ عرصہ کے لئے

---

[1] قالہ ابن مسعود راجع المیدانی ۲ر۳۴۰ وفی الاحیاء ۳ر۹۶ مرفوعًا وتمامہ: ولولا ہذہ الشہوۃ لما کان للنساء سلطنۃ علی الرجال قال العراقی فی تخریجہ الاصفہانی فی الترغیب والترہیب من حدیث خالد بن زید الجہنی باسناد فیہ جہالۃ [2] راجع للمثل اللسان والصحاح (حبل) [3] وفی التنزیل: وکان علی ربک حتمًا مقضیا (۱۹-۷۱)

نہیں نیند ہی کر دیں۔

حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷-۵) طلوع صبح تک۔۔۔ جب یہ فعل مضارع پر داخل ہو تو اس پر رفع اور نصب دونوں جائز ہوتے ہیں اور ان میں ہر ایک کی دو وجہ ہو سکتی ہیں نصب کی صورت میں حَتّٰى بمعنی (۱) اِلٰی اَنْ یا (۲) کَیْ ہوتا ہے اور مضارع کے مرفوع ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ حَتّٰى سے پہلے فعل ماضی آجائے جیسے:۔

مَشَیْتُ حَتّٰى اَدْخُلَ الْبَصْرَةَ (یعنی میں چلا حتی کہ بصرہ میں داخل ہوا) دوسری صورت یہ ہے کہ حَتّٰى کا مابعد حال واقع ہو جیسے مَرِضَ حَتّٰى لَا يَرْجُوْنَهٗ (وہ بیمار ہوا اس حال میں کہ سب اس سے ناامید ہو گئے) اور آیت کریمہ:۔

حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ (۲-۲۱۴) یہاں تک کہ پیغمبر۔۔۔۔ پکار اٹھے۔ میں یَقُوْلَ پر رفع اور نصب دونوں منقول ہیں اور ان ہر دو قراءت میں دونوں معنی بیان کئے گئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ حتی کا مابعد اس کے ماقبل کے خلاف ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا (۴-۴۳) اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کر لو۔ ہاں اگر حالت سفر رستے چلے جا رہے ہو اور غسل نہ کر سکو تو تیمم سے نماز پڑھ لو۔

مگر کبھی اس طرح نہیں بھی ہوتا جیسے مروی ہے[1]:-

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا۔ پس اس حدیث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمہارے تھک جانے کے بعد ذات باری تعالیٰ بھی تھک جاتی ہے۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کو کبھی ملال لاحق نہیں ہوتا۔

(ح ج ج)

اَلْحَجُّ (ن) کے اصل معنی کسی کی زیارت کا قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)

(۹۹) يَحُجُّوْنَ سِبَّ الزِّبْرِقَانِ الْمُعَصْفَرَا

وہ زبرقان کے زرد رنگ کے عمامہ کی زیارت کرتے ہیں۔

اور اصطلاح شریعت میں اقامت نسک کے ارادہ سے بیت اللہ کا قصد کرنے کا نام حج ہے اَلْحَجُّ (بفتح الحا) مصدر ہے اور اَلْحِجُّ (بکسر الحا) اسم ہے اور آیت کریمہ:۔

يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ (۹-۳) میں حج اکبر سے مراد یوم نحر یا یوم عرفہ ہے۔ ایک روایت میں ہے[3]:

اَلْعُمْرَةُ الْحَجُّ الْاَصْغَرُ عمرہ حج اصغر ہے۔

اَلْحُجَّةُ اس دلیل کو کہتے ہیں جو صحیح مقصد کی وضاحت کرے اور نقیضین میں سے ایک کی صحت کی مقتضی ہو۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] قطعة من حديث طويل لعائشة متفق عليه وفي الموطا بلاغا راجع لشرحه الزرقاني ۱/۴۳۲ ۲۴۴۲ [2] قاله المخبل السعدي كما في الساني الكبير للقتبي (۱: ۴۸۷) واصلاح ليعقوب ۳۷۲ وصدره وانشهد من عوف حلولا كثيرة (في اللسان (سب) الطبري (۲: ۱۹۴) المزعفر بدل المعصفر قال في ذيله بكذا ورد والبيت في الاصول المطبوعة والمخطوطة لكن استدرك مصحح اللسان على قول "بيت" وقال الصواب "سب" لبيين جملة مسكورة وبار موعدة ومعناه العمامة وهو المناسب لقوله المزعفر او المعصفر وقال تطرب معناه الاسيث لانه كان مفرقا وليسائى الابنة راجع الجمهرة (۱: ۳۱) والخزانة (۳: ۲۸۴) وفيه خلاف انظر السهيلي (۲: ۳۳۵) وتهذيب الالفاظ ۳۰۴ والبيت في الغريب للقتبي ۲۴ والساجي ۱۸ لغير عزو والبيان (۳: ۵۱) والسمط (۹) والصحاح والاساس والمحكم (حج) والتاج واللسان (سب)

[3] رواه الشافعي في الام (راجع الشوكاني ۱/)

قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ (۶-۱۴۹) کہہ دو کہ خدا ہی کی حجت غالب ہے۔

لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّۃٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ (۲-۱۵۰) (یہ تاکید اس لئے کی گئی ہے) کہ لوگ تم کو کسی طرح کا الزام نہ لگا سکیں۔ مگر ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں تو دیں۔

اس آیت میں ظالموں کے احتجاج کو حجۃ سے مستثنٰی کیا ہے گو اصولاً وہ حجت میں داخل نہیں ہے پس یہ استثناء ایسا ہی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۱۰۰) وَلَا عَیْبَ فِیْھِمْ غَیْرَ اَنَّ سُیُوْفَھُمْ
بِھِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْکَتَائِبِ

ان میں صرف یہ عیب پایا جاتا ہے کہ لشکروں کے ساتھ لڑنے سے ان کی تلواروں پر دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے اس احتجاج کو حجت قرار دینا ایسا ہی ہو۔ جیسا کہ آیت:۔

وَالَّذِیْنَ یُحَاجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ حُجَّتُھُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ... (۴۲-۱۶) اور جو لوگ خدا کے بارے میں بعد اس کے کہ اسے (مومنوں نے) مان لیا ہو جھگڑتے ہیں ان کے پروردگار کے نزدیک ان کا جھگڑا لغو ہے۔ میں ان کے باطل جھگڑے کو حجت قرار دیا گیا ہے اور آیت کریمہ:۔

لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ (۴۲-۱۵) (ہم میں اور تم میں کچھ بحث و تکرار نہیں ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ ظہور بیان کی وجہ سے بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلْمُحَاجَّۃُ۔ اس جھگڑے کو کہتے ہیں جس میں ہر ایک دوسرے کو اس کی دلیل اور مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

وَحَاجَّہٗ قَوْمُہٗ قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ (۶-۸۰) اور ان کی قوم ان سے بحث کرنے لگی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں (کیا) بحث کرتے ہو۔

فَمَنْ حَاجَّکَ فِیْہِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَکَ مِنَ الْعِلْمِ (۳-۶۱) پھر اگر یہ عیسٰیؑ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت الحال تو معلوم ہو ہی چکی ہے۔

لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِیْ اِبْرٰھِیْمَ (۳-۶۵) تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔

ھٰاَنْتُمْ ھٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِیْمَا لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ (۳-۶۶) دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا جس کا تمہیں کچھ علم تھا بھی مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو کچھ بھی علم نہیں۔

وَاِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ (۴۰-۴۷) اور جب وہ

[1] قالہ النابغۃ فی مدح ملوک غسان وہذا البیت مشہور اوردہ العلماء فی تصانیفھم وقد اورد العلماء البدیع شاہداً فی تاکید المدح بما یشبہ الذم انظر لکلمۃ الفصل علی البیت الخزانۃ (۲: ۲۹۹) واللسان (فلل) وشواہد الکشاف ۱۰ والکامل للمبرد (۴۸، ۳۰۰) والعمدۃ (۲: ۱۱۴) وذیلہ (۱: ۳۱۶) ودیوانہ ۶ والصناعتین ۴۰۸ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۸۰) والبحر (۵: ۶/۷۲: ۳/۲۰۲: ۵۱۶) والکتاب (۱/۳۶۷) ومحاضرات المؤلف (۳: ۱۵۶) والحیوان (۳: ۲۷۴) والعقد الثمین ۳ والصاجی ۲۶۷ والمعانی الکبیر ۴۰۶ والسیوطی ۲۱ (فی شواہد ’’بید‘‘) ۱۲

دوزخ میں جھگڑیں گے۔
اور حَجَّ کے معنی زخم کی گہرائی ناپنا بھی آتے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] ع (البسیط)

یَحُجُّ مَأمُومَۃً فِی قَعْرِھَا لَجَفٌ

وہ سر کے زخم کو سلائی سے ناپتا ہے جس کا تعر نہایت وسیع ہے۔

(ح ج ب)

اَلْحَجْبُ وَالْحِجَابُ (ن) کسی چیز تک پہنچنے سے روکنا اور درمیان میں حائل ہوجانا اور وہ پردہ جو دل اور پیٹ کے درمیان حائل ہے اسے "حجاب الجوف" کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ :۔ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ۔ (۷-۴۶) اور ان دونوں (بہشت اور دوزخ) کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ میں حجاب سے وہ پردہ مراد نہیں ہے جو ظاہری نظر کو روک لیتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ آڑ ہے جو جنت کی لذتوں کو اہل دوزخ تک پہنچنے سے مانع ہوگی اسی طرح اہل جہنم کی اذیت کو اہل جنت تک پہنچنے سے روک دے گی جیسے فرمایا:۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۵۷-۱۳) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی اس کے باطن میں رحمت ہوگی اور بظاہر اس طرف عذاب ہوگا۔ اور آیت کریمہ :۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ (۴۲-۵۱) اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعے) سے یا پردے کے پیچھے سے۔ میں پردے کے پیچھے سے کلام کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جس سے اللہ تعالیٰ کلام کرتے ہیں وہ ذات الٰہی کو دیکھ نہیں سکتا اور آیت کریمہ :۔
حَتَّىٰ تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (۳۸-۳۲) کے معنی ہیں حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا۔
اَلْحَاجِبُ دربان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ تک پہنچنے سے روک دیتا ہے۔
اور حَاجِبَانِ (تثنیہ) بھویں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھوں کے لئے بمنزلہ سلطانی دربان کے ہوتی ہیں۔
حَاجِبُ الشَّمْسِ سورج کا کنارہ اسلئے کہ وہ بھی بادشاہ کے دربان کی طرح پہلے پہل نمودار ہوتا ہے اور آیت کریمہ :۔
كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ (۸۳-۱۵) کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز تجلی الٰہی کو ان سے روک لیا جائیگا (اس طرح وہ دیدار الٰہی سے محروم رہیں گے) جس کے متعلق آیت کریمہ :۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(ح ج ر)

اَلْحَجَرُ سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع

---

[1] قالہ عذارۃ بن ورد الطائی وتمامہ: فاست الطبیب قذاہا کالمغاریدہ۔ انظر التاج واللسان والمحکم (حج) والکامل للمبرد (۹۸، ۲۲۴) والمعجم للیاقوت (۱۵: ۳۷-۴۷) حیث الکلام طویل علی البیت والحیوان (۳: ۴۲) والمخصص ۱۳: ۱۸۲ والمعنی بالجز ان الطبیب یجزع من ہولہا فالقذی یتساقط من استۃ کالمغاریدوہو جمع مغرود ومعناہ کما صغار رو قال القتبی فی المعانی ۷۶۹ یجح ای یصلح ولجف ان یذہب فی احدالناحیتین فالطبیب مما یری من ہولہا لقذی استۃ کالمغاریدو ہذا آخر ما قیل فی شرح البیت ۱۲ ۔

اَحْجَارٌ وَحِجَارَةٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:۔ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲-۲۴) جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ وہ پتھر گندھک کے ہوں گے۔ اور بعض نے یہی پتھر مراد لئے ہیں اور اس سے اس آگ کی ہولناکی پر تنبیہ کی ہے کہ وہ پتھروں اور انسانوں سے بھڑکائی جائے گی بخلاف دنیا کی آگ کے کہ یہ جلنے کے بعد پتھروں پر تھوڑا بہت اثر کرتی ہے لیکن انہیں جلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہیں جیسے پتھر چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا ہے:۔ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (۲-۷۴) گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔

اَلْحَجْرُ وَالتَّحْجِيْرُ کے معنی کسی جگہ پر پتھروں سے احاطہ کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے۔ حَجَرْتُهُ حَجْرًا فَهُوَ مَحْجُوْرٌ وَحَجَّرْتُهُ تَحْجِيْرًا فَهُوَ مُحَجَّرٌ اور جس جگہ کے ارد گرد پتھروں سے احاطہ کیا گیا ہو۔ اسے حِجْرٌ کہا جاتا ہے اس لئے حطیم کعبہ اور دیار ثمود کو حِجْرٌ کہا گیا ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ (۱۵-۸۰) اور (وادی) حجر کے رہنے والوں نے بھی پیغمبروں کی تکذیب کی۔ اور حِجْرٌ (پتھروں سے احاطہ کرنا) سے حفاظت اور روکنے کے معنی لے کر عقل انسانی کو بھی حِجْر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی انسان کو نفسانی بے اعتدالیوں سے روکتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ (۸۹-۵) (اور) بے شک یہ چیزیں عقلمندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق ہیں۔

مبرد (لغوی) نے کہا ہے کہ گھوڑی کو بھی حِجْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پیٹ کے اندر حمل روکے رکھتی ہے۔ اور حِجْرٌ حرام چیز کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کا تناول ممنوع ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔ وَقَالُوْا هٰذِهٖ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ (۶-۳۸) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور کھیتی حرام ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵-۲۲) میں حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ایک محاورہ ہے جاہلیت کا دستور تھا جب کسی کے سامنے کوئی ایسا شخص آجاتا جس سے اذیت کا خوف ہوتا تو حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کہدیتا (یعنی ہم تمہاری پناہ چاہتے ہیں) یہ الفاظ سن کر دشمن اسے کچھ نہ کہتا، تو قرآن نے یہاں بیان کیا کہ کفار بھی (عذاب کے) فرشتوں کو دیکھ کر (حسب عادت) یہ الفاظ کہیں گے کہ شاید عذاب سے پناہ مل جائے[2]۔

اور آیت کریمہ:۔ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵-۵۳) اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنادی۔

میں حِجْرًا مَّحْجُوْرًا سے مراد ایسی مضبوط رکاوٹ ہے جو دور نہ ہوسکے۔

فُلَانٌ فِيْ حِجْرِ فُلَانٍ وہ فلاں کے زیر نگرانی

---

[1] ناحیۃ الشام عند وادی القری دہم قوم صالح النبی صلی اللہ علیہ وسلم واما حَجْر (بفتح جیم مصروف) فقصبۃ الیمامۃ۔ [2] وبہذا فسر اللیث وابن جریج وردہ الازہری وقال ان علماء التفسیر الذی یعتمدون، علی خلاف ذالک وقالوا ان ذالک کلہ من قول الملائکۃ راجع الطبری (۱۹: ۳) والتاج واللسان (حجر)۔

ہے یعنی اس کی طرف سے اس کے مال اور دیگر اختیارات پر پابندی ہے اس کی جمع حُجُوْرٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ (۴-۲۳)

اور وہ لڑکیاں جنہیں تم پرورش کرتے ہو۔

حَجْرُ الْقَمِيصِ یعنی قمیص کا اگلا حصہ جس میں کوئی چیز رکھ لی جاتی ہے۔ اور حجر سے احاطہ کے معنی لے کر کہا جاتا ہے۔

حُجِرَتْ عَيْنُ الْفَرَسِ یعنی گھوڑی کی آنکھ کے گرداگرد داغ دیا گیا۔ حُجِّرَ الْقَمَرُ۔ چاند کے گرد ہالہ ہونا۔

اَلْحَجُوْرَةُ ایک قسم کا بچوں کا کھیل جو وہ خط مستدیر کھینچ کر کھیلتے ہیں۔ اسی سے مَحْجِرُ الْعَيْنِ کا محاورہ ہے جس کے معنی خانۂ چشم کے ہیں۔

تَحَجَّرَ كَذَا کسی چیز کا پتھر کی طرح سخت ہو جانا

اَلْاَحْجَارُ بنی تمیم کے چند بطون (جو اس نام سے مشہور ہوئے) اَلْاَحْجَارُ کیونکہ ان کے بزرگوں کے نام جندل حجر اور صخر وغیرہ تھے[1]۔

اور حِجاز کو بھی حجاز اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شام اور بادیہ کے درمیان حائل ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (۶۹-۴۷)

پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہیں ہے۔ میں حَاجِزِيْنَ، اَحَدٍ کی صفت ہے کیونکہ احد کا لفظ معنی جمع ہے۔

نیز حجاز اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی کلائی میں ڈال کر اسے اس کی کمر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں (تاکہ بل نہ سکے) پھر حجز میں معنی منع کے پیش نظر اِحْتَجَزَ فُلَانٌ عَنْ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز کے رک جانے کے ہیں

اِحْتَجَزَ بِاِزَارِہٖ تہبند باندھنا۔ اسی سے حُجْزَةُ السَّرَاوِيْلِ ہے جس کے معنی ازار بند کے نیفہ کے ہیں[2] مشہور محاورہ ہے۔ اِنْ اَرَدْتُمُ الْمُحَاجَزَةَ فَقَبْلَ الْمُنَاجَزَةِ یعنی ایک دوسرے کو روکنے اور صلح کا موقعہ لڑائی سے قبل ہوتا ہے[3]۔

حَجَازَيْكَ یعنی ان کے درمیان حائل ہو جایئے

(ح ج ز)

اَلْحَجْزُ (ن ض) کے معنی دو چیزوں کے درمیان روک اور حد فاصل بنانے کے ہیں کہا جاتا ہے حَجَزَ بَيْنَهُمَا ان کے درمیان حد فاصل قائم کر دی جیسے فرمایا:۔

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا (۲۷-۶۱) اور (کس نے) دو دریاؤں کے بیچ اوٹ بنادی۔

(ح د د)

اَلْحَدُّ جو دو چیزوں کے درمیان ایسی روک جو ان کو باہم ملنے سے روک دے۔ حَدَدْتُ كَذَا میں نے فلاں چیز کے لئے حد ممیز مقرر کر دی۔ حَدُّ الدَّارِ مکان کی حد، جس کی وجہ سے وہ دوسرے مکان سے ممیز ہوتا ہے۔

حَدُّ الشَّيْءِ کسی چیز کا وہ وصف جو دوسروں

---

[1] کذا فی اللسان والتاج (حجر) قال وا باہم عنی الشاعر بقولہ "وکل انثی حملت احجارا" [2] ومنہ الحدیث: وانا آخذ بحجزکم [3] کذا فی التاج (حجز) وفی المیدانی المثل یروی عن اکثم بن صیفی قال ابو عبید معناہ: ربح نفسک قبل لقاء من لا تقاومہ (المیدانی رقم ۱۴۹) ۱۲

سے اسے ممتاز کر دے اور زنا و شراب کی سزا کو بھی حد اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا دوبارہ ارتکاب کرنے سے انسان کو روکتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ (۶۵-۱)..... اور یہ خدا کی حدیں ہیں۔ جو خدا کی حدود سے تجاوز کرے گا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (۲-۲۲۹) یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں ان سے تجاوز مت کرو۔ اور آیت کریمہ:۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَنْ لَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۹-۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو احکام (شریعت) خدا نے نازل فرمائے ہیں ان سے واقف (ہی) نہ ہوں۔

میں بعض نے حدود کے معنی احکام کئے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حقائق و معانی مراد ہیں۔

جملہ حدود الٰہی چار قسم پر ہیں (۱) ایسے حکم جن میں نقص و زیادہ دونوں ناجائز ہوتے ہیں جیسے فرض نمازوں میں تعداد رکعات کو جو شارع علیہ السلام نے مقرر کر دی ہیں ان میں کمی بیشی قطعاً جائز نہیں ہے (۲) وہ احکام جن میں اضافہ تو جائز ہو لیکن کمی جائز نہ ہو (۳) وہ احکام جو اس دوسری صورت کے برعکس ہیں یعنی ان میں کمی تو جائز ہے لیکن ان پر اضافہ جائز نہیں ہے۔ (۴)

اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵۸-۲۰) جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔

میں یُحَآدُّوْنَ کے معنی اللہ رسول کی مخالفت کے ہیں اور اس مخالفت کو یُحَآدُّوْنَ کہنا یا تو روکنے کے اعتبار سے ہے اور یا الحدید کے استعمال یعنی جنگ کی وجہ سے حَدِيْدٌ لوہا۔ قرآن میں ہے

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (۵۷-۲۵) اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطر بھی شدید ہے۔

حَدَّدْتُ السِّكِّيْنَ میں نے چھری کی دھار تیز کی۔ اور اَحْدَدْتُهٗ اس کے لئے حد مقرر کر دی نیز ہر وہ چیز جو بلحاظ خلقت یا بلحاظ معنی کے ایک ہو جیسے نگاہ اور بَصِيْرَة اس کی صفت میں الحدید کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے:۔

هُوَ حَدِيْدُ النَّظَرِ (وہ تیز نظر ہے) هُوَ حَدِيْدُ الْفَهْمِ (وہ تیز فہم ہے) قرآن میں ہے:۔

فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰-۲۲) تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ اور جب زبان بلحاظ تیزی کے لوہے کی سی تاثیر رکھتی ہو تو صَارِمٌ وَمَاضٍ کی طرح اس کی صفت حدید بھی آجاتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ (۳۳-۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارے میں تیز زبانی کریں۔

اور روکنے کے معنی کے پیش نظر دربان کو حَدَّادٌ کہا جاتا ہے اور بدنصیب اور محروم آدمی کو رَجُلٌ مَحْدُوْدٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح د ب)

حَدِبَ (س) حَدَبًا۔ اَلرَّجُلُ وَاَحْدَبَ واحْدَوْدَبَ کبڑا ہونا۔ ہو سکتا ہے کہ حَدَبُ الظهر کا لفظ اس مادہ میں بنیاد کی حیثیت رکھتا

حوجن کے معنی کبڑی بیٹھ کے ہیں۔ پھر تشبیہ کے طور پر لاغر اونٹنی کو جس کے سرینوں کی ہڈیاں نمایاں ہوں، ناقۃ حدباء کہہ دیتے ہیں اور اسی سے (مجازاً) بلند اور سخت زمین کو حدب کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ (۲۱-۹۶)
اور وہ (یاجوج ماجوج) بلندی سے دوڑ رہے ہونگے۔

(ح د ث)

اَلْحُدُوْثُ (ن) کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے نہ ہو عام اس سے کہ وہ جوہر ہو یا عرض اور اِحْدَاث کے معنی ایجاد یعنی وجود میں لانا ہیں جواہر کا اِحْدَاث صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مُحْدَثٌ (صیغہ صفت مفعول) ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئی ہو اور کسی چیز کا اِحْدَاث کبھی تو نفس شے کے اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی اس شخص کے اعتبار سے ہوتا ہے جسے وہ حاصل ہوئی ہو۔ جیسے: اَحْدَثْتُ مِلْكًا میں نے نیا ملک حاصل کیا، چنانچہ آیت کریمہ:۔
مَا يَأْتِيْهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ (۲۱-۲) ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی میں اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے ذکر کو محدث کہا گیا ہے، اور ہر وہ قول وفعل جو نیا نیا ظہور پذیر ہوا ہو اسے بھی حُدُث کہہ دیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
حَتّٰى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا۔ (۱۸-۷۰)
جب تک میں خود ہی پہل کر کے تجھ سے بات نہ کروں۔

لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۶۵-۱) شاید خدا اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کر دے۔
ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعہ پہنچے اسے حدیث کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہو یا بحالت بیداری (قرآن میں ہے:
وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا (۶۶-۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔
هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۸۸-۱) بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت کا) حال معلوم ہوا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (۱۲-۱۰۱) اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا۔ میں احادیث سے رؤیا مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھی حدیث کہہ کر پکارا ہے، چنانچہ فرمایا:۔
فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ (۵۲-۳۴) تو ایسا کلام بنا لائیں۔
اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ (۵۳-۵۹) (اے منکرین خدا) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو۔
فَمَالِ هٰۤؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۴-۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟۔
حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (۶-۶۸) یہاں تک کہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں۔
فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۴۵-۶) تو یہ خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا۔ اور خدا سے

بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔

اور حدیث میں ہے[1] (۷۴) اِنْ یَّکُنْ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ مُحَدَّثٌ فَھُوَ عُمَرُ۔ کہ اگر اس امت میں کوئی محدّث ہے تو وہ عمرؓ ہے اور محدَّث سے آپ کی مراد وہ شخص ہے جس کے دل پر ملأ اعلیٰ کی طرف سے القاء ہوتا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

فَجَعَلْنٰھُمْ اَحَادِیْثَ (۲۳-۱۹) تو ہم نے (انہیں نابود کر کے) ان کے افسانے بنا دیئے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی داستانیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ جو بطور مثال کے ذکر کی جاتی ہیں

اَلْحَدِیْثُ (ایضًا) تازہ پھل رَجُلٌ حَدُوْثٌ یعنی خوش گفتار آدمی۔ ھُوَ حِدْثُ النِّسَاءِ وہ عورتوں سے باتیں کرنے کا عادی ہے۔ حَادَثَہٗ وَتَحَدَّثَہٗ وَتَحَادَثُوْا باہم بات چیت کرنا صَارَ اُحْدُوْثَۃً وہ افسانہ بن چکا ہے۔ رَجُلٌ حَدَثٌ وَحَدِیْثُ السِّنِّ نوعمر آدمی۔ حَادِثَۃٌ مصیبت۔ اس کی جمع حَوَادِثُ آتی ہے

(ح د ق)

اَلْحَدِیْقَۃُ (مرغزار) وہ قطعہ زمین جس میں پانی جمع ہو اور ھیئت وصورت اور پانی کے ہونے کی وجہ سے اسے حَدَقَۃُ الْعَیْنِ (آنکھ کی پتلی) کے ساتھ تشبیہ دے کر اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع حَدَائِقُ آتی ہے قرآن میں ہے حَدَائِقَ ذَاتَ بَھْجَۃٍ (۲۷-۶۰) سرسبز باغ۔ اور حَدَقَۃٌ کی جمع حِدَاقٌ وَاَحْدَاقٌ آتی ہے۔ حَدَّقَ اَنْظُرَہٗ گھور دیکھنا نظر جما کر دیکھنا حَدَّقُوْا بِہٖ وَاَحْدَقُوْا۔ انہوں اس کے گرد احاطہ کر لیا یہ معنی بھی حدقۃ العین کے گھمانے سے لئے گئے ہیں۔

(ح ذ ر)

اَلْحَذْرُ (س) خوف زدہ کرنے والی چیز سے دور رہنا کہا جاتا ہے حَذِرَ حَذَرًا وَحَذِرْتُہٗ میں اس سے دور رہا۔ قرآن میں ہے :۔

یَحْذَرُ الْاٰخِرَۃَ (۳۹-۹) آخرت سے ڈرتا ہے۔ وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ (۲۶-۵۶) اور ہم سب باسازوسامان ہیں۔

ایک قراُت میں حَذِرُوْنَ ہے۔

ھُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْھُمْ (۶۳-۴) یہ تمہارے دشمن ہیں ان سے محتاط رہنا۔

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ (۶۴-۱۴) تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔

حَذَرْ۔ کسی امر سے محتاط رہنے کے لئے کہنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ (۳-۲۸) اور خدا تم کو اپنے (غضب) سے محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے

اَلْحِذْرُ بچاؤ۔ اور آیت کریمہ:۔

خُذُوْا حِذْرَکُمْ (۴-۷۱) (جہاد کے لئے) ہتھیار لے لیا کرو۔ میں حِذْرٌ سے مراد اسلحہ جنگ وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ دشمن سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے حِذَارِ اسم فعل بمعنی امر ہے جیسے مَنَاعِ بمعنی اِمْنَعْ

---

[1] اخرجہ البخاری من حدیث ابی ہریرۃ ولفظہ: لقد کان فیما قبلکم من الامم محدثون فان یک فی امتی احد فانہ عمر رواہ مسلم من حدیث عائشۃ انظر الفتح ۷ ص ۴۰ والبضانی مناقب عمر وھناک الکلام علیہ وتخریج الاحیاء ۳ ص ۲۴ وبمعناہ المستدرک للحاکم ۳/۸۶ عن عائشۃ والنقائق (۲۲/۱)

(ح ر ر)

اَلْحَرَارَۃُ یہ بُرُوْدَۃٌ کی ضد ہے اور حرارت دو قسم پر ہے (۱) وہ حرارت جو گرم اجسام سے نکل کر ہوا میں پھیل جاتی ہے جیسے سورج اور آگ کی گرمی (۲) وہ حرارت جو عوارض طبعیہ سے بدن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے محموم (بخار زدہ) کے بدن کا گرم ہونا کہا جاتا ہے۔

حَرَّ (س) حَرَارَۃً الیومُ اوالرِّیحُ دن یا ہوا گرم ہو گئی۔ ایسے دن کو مَحْرُوْرٌ کہا جاتا ہے اسی طرح حَرَّ الرَّجُلُ کا محاورہ ہے قرآن میں ہے۔ لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا (۹ - ۸۱) کہ گرمی میں مت نکلنا (ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔

اَلْحَرُوْرُ گرم ہوا۔ لو۔ ارشاد ہے: وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ (۳۵ - ۲۱) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ کی تپش۔ اِسْتَحَرَّ الْقَیْظُ گرمی سخت ہو گئی۔ اَلْحَرَرُ یبوست جو شدت پیاس کی وجہ سے جگر میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اَلْحَرَّۃُ (اسم مرۃ از حَرَّ) کہا جاتا ہے[1] (مثل)

حَرَّۃٌ تَحْتَ قِرَّۃٍ یعنی سخت پیاس سردی کے ساتھ (بددعا)۔ اَلْحَرَّۃُ (ایضًا) پتھر جو گرمی کی شدت سے سیاہ ہو جائے۔ اسی سے اِسْتَحَرَّ الْقَتْلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی کشت و خون کا معرکہ گرم ہونے کے ہیں۔

حَرُّ الْعَمَلِ کام کی شدت۔ صعوبت عمل۔ مشہور ہے (مثل)۔ اِنَّمَا یَتَوَلّٰی حَارَّهَا مَنْ تَوَلّٰی قَارَّهَا ..... جس نے اس کی ٹھنڈک سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہی اس کی گرمی برداشت کرے۔

اَلْحُرُّ عَبْدٌ کی ضد کہا جاتا ہے حُرٌّ بَیِّنُ الْحُرُوْرِیَّۃِ اَوِ الْحُرُوْرَۃِ وہ آدمی جس کی شرافت نمایاں ہو حُرِّیَّۃٌ (آزادی)۔ یعنی آزادی دو قسم پر ہے۔

(۱) جو کسی کا غلام نہ ہو۔ جیسے فرمایا:۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ (۲ - ۱۷۸) کہ آزاد کے بدلے آزاد

(۲) جسے صفات ذمیمہ یعنی حرص لالچ دنیوی مال و متاع کا غلام نہ بنادیں۔

ضد عبودیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا (۲۲) تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ درہم و دینار کا بندہ ہلاک ہو۔ شاعر نے کہا ہے[2] ع (

(۱۰۲) وَرِقُّ ذَوِی الْاَطْمَاعِ رِقٌّ مُخَلَّدٌ

حریص اور لالچی لوگ ہمیشہ غلام رہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے (مثل)

عَبْدُ الشَّهْوَۃِ اَذَلُّ مِنْ عَبْدِ الرِّقِّ۔ کہ شہوت کا بندہ غلام سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔

اَلتَّحْرِیْرُ کے معنی کسی انسان کو آزاد کرنے کے ہیں چنانچہ شریعت نے اول معنی کے پیش نظر فرمایا:۔ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ تو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہیئے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا: نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا (۳ - ۳۵) جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں۔ چنانچہ بعض نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ اپنے اس لڑکے سے کسی قسم کا دنیوی فائدہ حاصل نہیں کریں گی جس کی طرف آیت:۔ بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً (۱۶ - ۷۲) اس میں اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ یہ خالص عبادت الٰہی کے لئے وقف رہے گا۔ اسی بنا پر شعبیؒ نے مُحَرَّرًا کے معنی مخلصًا کئے ہیں اور مجاہد نے مُحَرَّرًا کے معنی خادم مَعْبَد کئے ہیں۔ امام جعفر نے کہا ہے۔

---

[1] انظرنی (ق ر ر)، [2] ہو تحریجہٖ رجید ۳ لم اجدہٗ فی المراجع ۱۲

کر امور دنیوی سے آزاد ہوگا لیکن مآل کے لحاظ سے سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔

حَرَّرْتُ الْقَوْمَ میں نے انہیں قید خانہ سے رہا کر دیا۔

حُرُّ الْوَجْهِ وہ شخص جو احتیاج کے پنجہ میں گرفتار نہ ہوا ہو۔

حُرُّ الدَّارِ گھر کا درمیان

اَحْرَارُ الْبَقْلِ وہ ترکاریاں جو کچی کھائی جاتی ہیں۔

اور شاعر کا قول ہے (الکامل)

(۱۰۳) جَادَتْ عَلَيْهِ كُلُّ بِكْرٍ حُرَّةٍ

موسم بہار کی پہلی موسلا دھار بارش نے اس پر سخاوت کی ہے۔

بَاتَتِ الْمَرْأَةُ بِلَيْلَةِ حُرَّةٍ شب زفاف کو شوہر دراں بکارت زائل نہ کر سکا، یہ سب استعارات ہیں۔

اَلْحَرِيْرُ (ریشمی کپڑا) ہر ایک باریک کپڑے کو حریر کہا جاتا ہے فرمایا:

وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۲۲ - ۲۳) وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔

(ح ر ب)

اَلْحَرْبُ جنگ کارزار۔ اور فتحہ راء کے ساتھ لڑائی میں کسی کا مال چھیننے کے ہیں پھر ہر قسم کے سلب کو حَرَبٌ کہا جاتا ہے اور حَرَبٌ معنوی لحاظ سے حَرْبٌ سے مشتق ہے کہا جاتا ہے۔

حُرِبَ الرَّجُلُ اس کا سامان چھین لیا گیا تو وہ حَرِيْبٌ یعنی لٹا ہوا۔ اَلتَّحْرِيْبُ لڑائی کا بھڑکانا۔ رَجُلٌ مِحْرَبٌ جنگجو گویا وہ لڑائی بھڑکانے کا آلہ ہے۔

اَلْحَرْبَةُ برچھا۔

اصل میں یہ حَرْبٌ یا حِرَابٌ سے فَعْلَةٌ کے وزن پر ہے اور مسجد کے محراب کو محراب یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان اور خواہشات نفسانی سے جنگ کرنے کی جگہ ہے اور یا اس لئے کہ اس جگہ میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے والے پر حق یہ ہے کہ دنیوی کاروبار اور پریشان خیالیوں سے یک سو ہو جائے۔

بعض کہتے ہیں کہ اصل میں محراب البیت صدر مجلس کو کہتے ہیں اسی بنا پر جب مسجد میں امام کی جگہ بنائی گئی تو اسے بھی محراب کہہ دیا گیا۔ اور بعض نے اس کے برعکس محراب المسجد کو اصل اور محراب البیت کو اس کی فرع مانا ہے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ (۳۴-۱۳) وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی محراب اور مجسمے۔

اَلْحِرْبَاءُ گرگٹ کیونکہ وہ سورج کے سامنے اس طرح بیٹھ جاتی ہے گویا اس سے جنگ کرنا چاہتی ہے نیز زرہ کے حلقہ یا میخ کو بھی صوری مشابہت کی بنا پر حِرْبَاءٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ ضَبٌّ اور کَلْبٌ کے ساتھ مشابہت کی

تمامہ عنترة وتمامۂ: فتترکن کل قرارة کالدرہم۔ وفی روایة الامالی (۲: ۷ ۲۹) عینٌ فترة بدل بکر حرة وحدیقة بدل قرارة وکذا فی معلقته والعشر للتبریزی ۸ ۲۶۷) وفی شرح التبریزی۔ ۸ اکما ہہنا والسمط ۵۴۹ والصحاح والسان (حسا) والمحکم (حدق) والکامل ۲۰ والصناعتین ۲۸۲ والمختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۸) ونقدہ ۶ والبحر (۵: ۴۲ ۵ (۱: ۱۶۰ (۷: ۲ ۱۷) والحیوان (۲: ۳۱۲) والعقد الثمین ۵۴ وطراز المجالس ۶۱ وفی البیت بحث یتعلق بلفظ کل والبیت فی دیوانہ ۵۴ وابن ہشام (۱: ۲۱۷) بحث کل و المعجزة ۳۰۱ وابن الانباری ۲۱ وانظر البشاری المعانی للقرین... والمعدا فی ۵

وجہ سے اس کے بعض حصوں کو ضَبَّۃٌ اور کَلْبٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح ر ث)

اَلْحَرْثُ (ن) کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اور اسے زراعت کے لئے تیار کرنے کے ہیں اور کھیتی کو بھی حَرْث کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِيْنَ۔ (۶۸-۲۲) کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔ اور کھیتی سے زمین کی آبادی ہوتی ہے اس لئے حرث بمعنی آبادی آجاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (۴۲-۲۰) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طلبگار ہے اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔
اور ہم اپنی کتاب مکارم الشریعہ میں دنیا کے کھیتی اور لوگوں کے کسان ہونے اور اس میں بیج بونے کی کیفیت تفصیل سے بیان کرچکے ہیں۔
ایک روایت میں ہے[1] (۲-۷)
اَصْدَقُ الْاَسْمَاءِ الْحَارِثُ کہ سب سے سچا نام حارث ہے کیونکہ اس میں کسب کے معنی پائے جاتے ہیں ایک دوسری روایت میں ہے[3] (۲-۷۵)
اُحْرُثْ لِدُنْيَاكَ لِآخِرَتِكَ کہ اس دنیا میں آخرت کے لئے کاشت کرلو۔
حَرَثَ الْاَرْضَ (زمین کاشت کرنا) سے تشبیہ بھڑکانا کے معنی کے پیش نظر حَرَثْتُ النَّارَ کہا جاتا ہے یعنی میں نے آگ بھڑکائی اور جس لکڑی سے آگ کریدی جاتی ہے اسے مِحْرَث کہا جاتا ہے۔ کسی کا قول ہے[1]۔
اُحْرُثِ الْقُرْاٰنَ یعنی قرآن کی خوب تحقیق سے کام لو۔ حَرَثَ نَاقَتَهٗ اونٹنی کو کام اور محنت سے دبلا کردیا۔
حضرت معاویہ نے انصار سے دریافت کیا کہ تمہارے پانی کھینچنے والے اونٹ کیا ہوئے تو انہوں نے جواب دیا[2]:۔
حَرَثْنَاهَا يَوْمَ بَدْرٍ کہ ہم نے بدر کے دن انہیں دبلا کردیا۔ اور آیت کریمہ:۔
نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ۔ (۲-۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔ میں استعارۃً عورتوں کو حرث کہا ہے کہ جس طرح زمین کی کاشت پر افراد انسانی کی بقا کا مدار ہے اس طرح نوع انسان اور اس کی نسل کا بقا عورت پر ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (۲-۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کردے۔ دونوں قسم کی کھیتی کو شامل ہے۔

(ح ر ج)

اَلْحَرَجُ وَالْحَرَاجُ (اسم) کے اصل معنی اشیاء کے مجتمع یعنی جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور موجود ہے اسلئے تنگی اور گناہ کو بھی حَرَج کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے

[1] النہایہ (حرث)، [2] الحدیث ورد بالفاظ مختلفہ راجع النہایہ ۱/ ۳۵۵ [3] عن حدیث عبداللہ بن مسعود والنہایہ ۱/ ۳۹ [4] راجع النہایہ

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (۴-۶۵)
اور ... اپنے دل میں تنگ نہ ہوں۔
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲-۷۸) اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔

حَرِجَ (س) حَرَجًا۔ صَدْرُهٗ: سینہ تنگ ہو جانا۔ قرآن میں ہے:۔
يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (۶-۱۲۵) اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔
ایک قراءت میں حَرِجًا ہے[1] یعنی کفر کی وجہ سے اس کا سینہ گھٹا رہتا ہے اس لئے کہ عقیدہ کفر کی بنیاد ظن پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو کبھی سکون نفس حاصل نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۲-۷) سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ (۷-۲)
اس سے تم کو تنگ دل نہیں ہونا چاہیئے۔
میں لَا يَكُنْ فعل نہی کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور ..... جملہ دعائیہ بھی۔ بعض نے اسے جملہ خبریہ کے معنی میں لیا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۹۴-۱) سے مفہوم ہوتا ہے۔
اَلْمُتَحَرِّجُ (صفت فاعلی) گناہ اور تنگی سے دور رہنے والا جیسے مُتَحَوِّبٌ۔ حُوْبٌ (یعنی گناہ) سے بچنے والا۔

(ح ر د)

اَلْحَرْدُ (ض) تیزی اور غصہ کے ساتھ کسی چیز کو روکنا۔ قرآن میں ہے۔ وَغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قَادِرِيْنَ (۶۸-۲۵) اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔
یعنی وہ اس بات پر قدرت رکھتے تھے کہ مسکینوں کو اپنے باغ میں آنے سے روک دیں۔
نَزَلَ فُلَانٌ حَرِيْدًا یعنی فلاں قوم سے الگ تھلگ اترا۔ هُوَ حَرِيْدُ الْمَحَلِّ یعنی الگ تھلگ رہنے والا ہے۔ حَارَدَتِ السَّنَةُ یعنی امسال بارش نہیں ہوئی۔
حَارَدَتِ النَّاقَةُ اونٹنی نے دودھ روک لیا۔ (یعنی اس کا دودھ کم یا خشک ہو گیا) حَرِدَ (س) غضبناک ہونا۔ حَرَّدَهٗ كَذَا فلاں چیز نے اسے غضبناک کر دیا۔ بَعِيْرٌ اَحْرَدُ اونٹ جس کی اگلی ٹانگ کا پٹھا ڈھیلا ہو۔ اَلْحُرْدِيَّةُ سرکنڈے کا باڑہ۔

(ح ر س)

اَلْحَرَسُ وَالْحُرَّاسُ (جمع) پاسبان۔ اس کا واحد حَارِسٌ ہے[2]۔ قرآن میں ہے:۔
فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا (۷۲-۸)
تو اس کو مضبوط چوکیداروں ..... سے بھرا ہوا پایا۔
اَلْحَرْسُ (ض) اور اَلْحَرْزُ کے جس طرح الفاظ ملتے جلتے ہیں ایسے ہی ان کے معنی بھی قریب قریب ایک ہی ہیں ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ حِرْزٌ

---

[1] قراءۃ ابن عباس وعمرؓ [2] قال فی التاج: والحرس ولا نقل حارس لانہ قد صار اسم جنس الا ان یذھب بہ الی معنی الحراسۃ ۱۲

کا استعمال زیادہ تر نقدی اور سامان کی حفاظت کے لئے آتا ہے شاعر نے کہا ہے[۱] (الکامل)

(۴۰۱) فَبَقِيتُ حَرَسًا قَبْلَ مُجْرَى دَاحِسٍ
لَوْكَانَ لِلنَّفْسِ اللَّجُوْجِ خُلُوْدُ

میں داحس کی دوڑ سے پہلے اس کی حفاظت کرتا رہا کاش سرکش نفس کے لئے ہمیشہ رہنا ہوتا

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں حَرَسًا کے معنی دَهْرًا کے ہیں ہم کہتے ہیں کہ اگر صرف اس شعر کی بنا پر حرس کے معنی زمانہ کے گئے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ شعر مذکور میں ہو سکتا ہے کہ حرس مصدر بمعنی فاعل موضع حال میں ہو ای بقیت حَارِسًا اب رہا اس کا زمانہ یا مدت کے معنی پر دلالت کرنا تو یہ لفظ حرس کے اصل معنی نہیں ہیں بلکہ مقتضائے کلام سے مفہوم ہوتے ہیں۔

اَحْرَسَ صاحب حراست ہونا اس میں صاحب ماخذ ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں جیسا کہ باب افعال کا خاصہ ہے۔

حَرِيسَةُ الْجَبَلِ وہ مال جو رات کے وقت پہاڑ میں حفاظت کے لئے رکھا جاتا ہے[۲]۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ الحریسۃ بمعنی مَحْرُوْسَۃ ہے نیز اَلْحَرِيسَةُ بمعنی مسروقۃ بھی آجاتا ہے یعنی چوری کیا ہوا مال اور اس معنی میں باب حَرَسَ (ض) يَحْرِسُ حَرْسًا آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اَلْحَرِيسَة سے بنا ہے کیونکہ اہل عرب سے الحریسۃ کے بمعنی سَرِقَۃ یعنی چوری بھی منقول ہے۔

(ح ر ص)

اَلْحِرْصُ شدت آز یا فرط ارادہ۔ قرآن میں ہے:۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ (۱۶-۳۷) یعنی ان کی ہدایت کے لئے تمہارے دل میں شدید آرزو اور خواہش ہو۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ (۲-۹۶) بلکہ ان کو تم اور لوگوں سے زندگی پر کہیں زیادہ حریص دیکھو گے۔

وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۲-۱۰۳) اور بہت سے آدمی گو تم کتنی ہی خواہش کرو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اصل میں یہ حَرَصَ الْقَصَّارُ الثَّوْبَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دھوبی نے کپڑے کو پتھر پر مار مار کر اسے پھاڑ دیا۔

اَلْحَارِصَةُ وہ زخم جو جلد کو پھاڑ ڈالے۔

اَلْحَارِصَةُ وَالْحَرِيصَةُ اس بادل کو کہتے ہیں جو اپنی بارش سے زمین کی بالائی سطح کو کھرچ ڈالے۔

(ح ر ض)

اَلْحَرَضُ اس چیز کو کہتے ہیں جو نکمی ہو جائے اور درخور اعتناء نہ رہے اس لئے جو چیز قریب بہ ہلاکت ہو جائے اس کے متعلق حَرِضَ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا (۱۲-۸۵) یا تو قریب بہ ہلاکت

---

[۱] قالہ لبید کما فی اللسان والتاج (حرس) والعمرین ۶۳ وفی روایۃ وغنیت سبتًا بدل لبقیت حرسًا وفی مجاز القرآن ۱/ ۳۶۹ رقم ۳۲۲ والحکم والمزروقی ۱۷۴: وعمرت حرسا والبیت فی دیوانہ (۱: ۲۵) واصلاح یعقوب۔ وتہذیب الاصلاح (۱: ۱۲) مع آخرقبلہ والبحر (۱: ۴۰۲)۔ [۲] ومنہ فی الحدیث فی حریسۃ الجبل (التاج) لانہ لیس فی حرز:

ہو جاؤ گے۔ اور اَحْرَضَہٗ کے معنی گھلا دینے اور قریب بہ ہلاکت کر دینے کے ہیں۔
شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۰۵) اِنِّیْ امْرُؤٌ نَابَنِیْ ھَمٌّ فَاَحْرَضَنِیْ

میں وہ آدمی ہوں جسے تمہارے غم نے گھلا دیا ہے

اَلْحُرْضَۃُ گھٹیا قسم کا آدمی جو خود ایک دام بھی خرچ نہ کرے بلکہ جیئے بازی کا گوشت مفت کھانے کا عادی ہو۔

اَلتَّحْرِیْضُ کے معنی ازالہ حرض کے ہیں یعنی کسی چیز سے بگاڑ اور خرابی کو دور کر دینا جیسے کہ مَرَّضْتُہٗ اور قَذَّیْتُہٗ کے معنی مرض اور تنکے کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔

تَحْرِیْضٌ کے معنی کسی کو مزین کرکے اور اسے آسان صورت میں پیش کرکے اس پر برانگیختہ کرنے کے ہیں [2]۔

اَحْرَضْتُہٗ (افعال) کسی چیز میں خرابی پیدا کر دینا جیسے :۔ اَقْذَیْتُہٗ (کسی چیز کو قذا آلود کرنا) ہوتے ہیں۔

(ح ر ف)

حَرْفُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کے کنارہ کے ہیں حَرْفٌ کی جمع اَحْرُفٌ وَحُرُوْفٌ آتی ہے اور پہاڑ، کشتی اور تلوار کے کنارہ کو حرف کہا جاتا ہے اور حُرُوْفُ الْھِجَا کے معنی اطراف کلمہ کے ہیں اور اصطلاح نحاۃ میں اَلْحُرُوْفُ الْعَوَامِلُ ان حروف کو کہا جاتا ہے جو کلموں کے اطراف میں واقع ہوتے ہیں اور ان کو باہم مرتبط کرتے ہیں اور حَرْفُ الْجَبَلِ یعنی پہاڑ کے کنارے اور بالائی میں حرف کے ساتھ تشبیہ دے کر لاغر اونٹنی کو حرف کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ :۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (۲۲-۱۱) اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں۔ جو کنارے پر (کھڑا) ہو کر خدا کی عبادت کرتے ہیں ـــ میں عَلٰى حَرْفٍ کے معنی خود قرآن نے ہی بعد میں فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرٌ الآیۃ سے بیان کر دیئے ہیں یعنی جب تک اطاعت و عبادت میں کچھ دنیاوی فائدہ نظر آتا ہے کرتا رہتا ہے اور جب کوئی تکلیف نظر آتی ہے تو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اور یہی معنی آیت :۔
مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ (۴-۱۴۳) کے ہیں۔

اِنْحَرَفَ عَنْ کَذَا اور تَحَرَّفَ کسی چیز سے کنارہ کرنا ایک جانب مائل ہونا۔ اَلْاِحْتِرَافُ کوئی پیشہ اختیار کرنا

اَلْحِرْفَۃُ (فعلۃ) پیشہ، پیشے کی حالت جیسے قِعْدَۃٌ وَجِلْسَۃٌ [3]۔

اَلْمُحَارَفُ۔ وہ شخص جو خیر سے محروم اور اس کے کنارہ پر ہو (کم نصیب)

اَلتَّحْرِیْفُ (الشَّیْءِ) کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک جانب مائل کر دینا جیسے تَحْرِیْفُ الْقَلَمِ قلم کو ٹیڑھا قط لگانا۔

اور تَحْرِیْفُ الْکَلَامِ کے معنی ہیں کلام کو اس

---

[1] قالہ العرجی عبد اللہ بن عمرو بن عبد اللہ تمامہ حتی بلیت وحتی شفنی السقم۔ والبیت فی اللسان والصحاح والتاج (حرض) ومجاز القرآن ۱: ۳۱۶ رقم ۳۶۶ والطبری (۱۳: ۴۲) وفی روایۃ لج بی حب بدل نابنی ہم والقرطبی (۹: ۲۵۰) والشطر فی فتح الباری (۸: ۲۷۳) ولہ ترجمۃ الشاعر الاغانی (۱: ۳۸۳) والاشتقاق ۸۴ والسمط ۴۲۲ والبحر (۵: ۳۲۷) [2] وفی التنزیل حرض المؤمنین علی القتال (۸-۶۵)

کے موقع و محل سے پھیر دینا کہ اس میں دو احتمال پیدا ہو جائیں۔ قرآن میں ہے[1]۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (۵-۱۳) یہ لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔ اور دوسرے مقام پر مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ (۵-۴۱) ہے یعنی ان کے محل اور صحیح مقام پر ہونے کے بعد۔

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ (۲-۷۵) (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے سمجھ لینے کے بعد اس کو (جان بوجھ کر) بدل دیتے رہے ہیں۔

اَلْحِرْفُ۔ وہ چیز جس میں تلخی اور حرارت ہو گویا وہ حلاوت اور حرارت سے پھیر دی گئی ہے۔ طَعَامٌ حِرِّيفٌ چرچراہٹ والا کھانا۔ ایک روایت میں ہے[2] (۷۶)

نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلَىٰ سَبْعَةِ أَحْرُفٍ کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔

اس کی تحقیق ہمارے رسالہ المنبہۃ علی فوائد القرآن میں ملے گی[3]۔

(ح ر ق)

أَحْرَقَ كَذَا۔ (کسی چیز کو جلانا) اِحْتَرَقَ (جلنا) اَلْحَرِيقُ (آگ) قرآن میں ہے:۔

ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (۳-۱۸۱) کہ عذاب (آتش) سوزاں کے مزے چکھتے رہو۔

فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ (۲-۲۶۶) تو (ناگہاں) اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولا چلے اور وہ جل (کر راکھ کا ڈھیر ہو) جائے۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ (۲۱-۶۸) (تب) وہ کہنے لگے ۔۔۔۔ تو اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

لَنُحَرِّقَنَّهُ (۲۰-۹۷) ہم اسے جلا دیں گے۔ ایک قرأت میں لَنَحْرُقَنَّهُ ہے۔ پس حَرَقَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز میں بغیر اشتعال کے جلن پیدا کرنے کے ہیں جیسے دھوبی کے پٹخنے سے کپڑے کا پھٹ جانا۔

حَرَقَ (ن) الشَّيْءَ ریتی سے رگڑنا اسی سے حَرَقَ النَّابَ کا محاورہ ہے جس کے معنی دانت پیسنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ يَحْرُقُ عَلَيَّ الْأُرَّمَ یعنی وہ مجھ پر دانت پیستا ہے۔ حَرِقَ الشَّعْرُ۔ بالوں کا منتشر ہونا۔ مَاءٌ حُرَاقٌ بہت کھاری پانی جو کھاری پن سے جلا ڈالے۔ اَلْإِحْرَاقُ کسی چیز کو جلانا اسی سے استعارۃً جب کہ بہت زیادہ ملامت کرکے اذیت پہنچائے تو کہا جاتا ہے۔ أَحْرَقَنِي بِلَوْمِهِ یعنی اس نے مجھے ملامت سے جلا ڈالا۔

---

[1] کذا فی غریب ابی عبید ۳/۱۵۹-۱۶۲ وتمامہ کلہا شاف کاف۔ وبعضہم یردیہ فاقرؤا کما علمتم راجع الفائق ۱/۲۴ والصحیح انزل بدل نزل والحدیث باختلاف الفاظہ فی (حم ق) عن عباس والسجزی فی الابانۃ عن زید بن ثابت و (حب) عن عمرو بن العاص و (د ن) عن ابی بن کعب (حم طب) عن عبادۃ بن الصامت (حم م ک) عن ابی بکرۃ و عمر (حم) عن ابی جہیم (حم ف) عن ابی (حم) عن حذیفۃ و (طب) عن معاذ و عن ابن مسعود وابی الضریس عن ابن عباس وابن جریر عن ابن مسعود وابن عمر (حم) وابن جریر (طب) و ابو نصر السجزی فی الابانۃ راجع کنز العمال ۲۷۰:۱۸۶-۲۲۵ وفی بعضہا ثلاثۃ احرف وفی بعضہا اربعۃ احرف لکن حدیث سبعۃ اکثر واصح فلہا الاعتبار ۔ [2] وہی تلاوۃ تکلّ ۔[3]

(ح ر ک)

اَلْحَرْکَۃُ: سکون کی ضد ہے اور جسم کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جسم کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو حرکت کہا جاتا ہے اور کبھی کسی چیز میں تغیر ہونے یا اس کے اجزاء میں کمی بیشی واقع ہونے پر بھی تحرک کذا کہہ لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ (۷۵-۱۶) اور (اے محمد) وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ چلایا کرو۔

(ح ر م)

اَلْحَرَامُ: وہ ہے جس سے روک دیا گیا ہو خواہ یہ ممانعت تسخیری یا جبری، یا عقل کی رو سے ہو اور یا پھر شرع کی جانب سے ہو اور یا اس شخص کی جانب سے ہو جو حکم شرع کو بجا لاتا ہے پس آیت کریمہ:۔
وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ (۲۸-۱۲) اور ہم نے پہلے ہی سے اس پر (دودھ پلانے والیوں کے) دودھ حرام کر دیئے تھے۔ میں حرمت تسخیری مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا (۲۱-۹۵) اور جس بستی (والوں) کو ہم نے ہلاک کر دیا محال ہے کہ (وہ دنیا کی طرف رجوع کریں۔
کو بھی اسی معنی پر حمل کیا گیا ہے اور بعض کے نزدیک آیت فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً (۵-۲۶) کہ وہ ملک ان پر چالیس برس تک کے لئے حرام کر دیا گیا۔
میں بھی تحریم تسخیری مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ منع جبری پر محمول ہے اور آیت کریمہ:۔
إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (۵-۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا۔ خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا۔
میں بھی حرمت جبری مراد ہے اسی طرح آیت:۔
إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ (۷-۵۰) کہ خدا نے بہشت کا پانی اور رزق کافروں پر حرام کر دیا ہے۔
میں تحریم بواسطہ منع جبری ہے اور حرمت شرعی جیسے (۷۷) آنحضرتؐ نے طعام کی طعام کے ساتھ بیع میں تفاضل کو حرام قرار دیا ہے[1]۔ اور آیت کریمہ:۔
وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ (۲-۸۵) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلا دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا۔
میں بھی تحریم شرعی مراد ہے کیونکہ ان کی شریعت میں یہ چیزیں ان پر حرام کر دی گئی تھیں۔ نیز تحریم شرعی کے متعلق فرمایا:۔
قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ (۶-۱۴۵) الآیۃ کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا حرام نہیں پاتا۔
وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ (۶-۱۴۶) اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے۔

---

[1] متفق علیہ من حدیث عمر بن الخطاب و رواہ النسائی وابن ماجۃ والطبرانی و من حدیث عبادۃ بن الصامت راجع النیل ۵/۲۰۴۔

سَوْطٌ مُحَرَّمٌ بے دباغت چمڑے کا کوڑا۔ گویا دباغت سے وہ حلال نہیں ہوا جو کہ حدیث[1] کُلُّ إِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ کا مقتضی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مُحَرَّمٌ اس کوڑے کو کہتے ہیں جو نرم نہ کیا گیا ہو۔

اَلْحَرَمُ کو حرام اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے اس کے اندر بہت سی ایسی چیزیں حرام کر دی ہیں جو دوسری جگہ حرام نہیں ہیں اور یہی معنی الشہر الحرام کے ہیں رَجُلٌ حَرَامٌ وَ مُحْرِمٌ یعنی وہ شخص جو حالت احرام میں ہو اس کے بالمقابل رَجُلٌ حَلَالٌ وَ مُحِلٌّ ہے اور آیت کریمہ: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶-۱) کے معنی یہ ہیں کہ تم اس چیز کی تحریم کا حکم کیوں لگاتے ہو جو اللہ نے حرام نہیں کی کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے حرام نہ کی ہو وہ کسی کے حرام کرنے سے حرام نہیں ہو جاتی جیسا کہ آیت: وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا الآيَة (۶-۱۳۸) اور (بعض) چارپائے ایسے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کر دیا گیا ہے۔ میں مذکور ہے۔

اور آیت کریمہ: بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (۶۹-۲۷) بلکہ ہم (برگشتہ نصیب) بے نصیب ہیں ان کے محروم ہونے سے بدنصیبی مراد ہے۔

اور آیت کریمہ: لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱-۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے (دونوں) میں محروم سے مراد وہ شخص ہے جو خوشحالی اور وسعت رزق سے محروم ہو اور بعض نے کہا ہے المحروم سے کتا مراد ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ محروم کتے کو کہتے ہیں جیسا ان کی تردید کرنے والوں نے سمجھا ہے بلکہ انہوں نے کتے کو بطور مثال ذکر کیا ہے کیونکہ عام طور پر کتے کو لوگ دور ہٹاتے ہیں اور اسے کچھ نہیں دیتے۔

اَلْمَحْرُمَةُ وَالْمَحْرَمَةُ کے معنی حرمت کے ہیں۔

اِسْتَحْرَمَتِ الْمَاعِزُ بکری نے نر کی خواہش کی (یہ حِرْمَةٌ سے ہے جس کے معنی بکری کی جنسی خواہش کے ہیں)

(ح ر ی)

حَرَى (ض) اَلشَّيْءَ وَتَحَرَّاهُ کے معنی کسی چیز کے حَرًى یعنی جانب کا قصد کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے: فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۷۲-۱۴) یہی لوگ ہیں جنہوں نے سیدھی راہ کا قصد کیا۔ اور حَرَى الشَّيْءُ حَرْيًا کے معنی کسی چیز کے کم ہونے کے ہیں گویا وہ ایک جانب پڑی رہی اور بیچ میں نہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۱۰۶) وَالْمَرْءُ بَعْدَ تَمَامِهِ يَحْرِي۔

---

[1] أخرجه بهذا اللفظ الطبراني عن ابن عباس والمعروف من لفظ الحديث ايما بدل كل (راجع رحم، ت، ن، ه) والمسلم عن ابن عباس وكذا في مسند احمد ورواه الشافعي وابن حبان والدارقطني ورواه الخطيب في تلخيص المتشابه من حديث جابر وفي رواية الدارقطني عن عائشة مرفوعا طهور كل اديم دباغها (راجع النيل (۱: ۷۵)، وكنز العمال ۹ رقم ۲۱۴۴، ۲۱۲۹ بالفاظ وطرق

[2] لسلمة بن عوية بن ربيعة الضبي من قصيدة طويلة وصدره حتى كانى خاتل قنصا ونسبه المرتضى (۱: ۲۴۴) عن الجاحظ لذي الاصبع ونسبه القالي (۲: ۱۶۶) ۲ ابياتا السلمي بن غزية قال الاستاذ الميمني وهو غوية بن سلمي انظر السمط ۳۲۲ ومجالس ثعلب (۱: ۲۴۵ واللآلي ۹۷ وقد ذكره المرزباني في معجمه في حرف العين المهملة وقال ويقال غوية بالمعجمة وفي البحتري ۲۹۲ لغزية بن سلمى ٭

انسان کامل ہونے کے بعد ڈھلنا شروع ہوجاتا ہے
رَمَاہُ اللّٰہُ بِاَفْعٰی حَارِیَۃٍ[۱] (مثل)
واللہ تعالیٰ اس پر بوڑھا اژدہا مسلط کرے۔

(ح ز ب)

اَلْحِزْبُ وہ جماعت جس میں سختی اور شدت پائی جائے۔ قرآن میں ہے:
اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا (۱۸-۱۲)
دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔
اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ (۵۸-۱۹) یہ جماعت شیطان کا لشکر ہے۔ اور آیت کریمہ:
وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ (۳۳-۲۲)
اور جب مومنوں نے کافروں کے لشکر کو دیکھا۔ میں احزاب سے وہ لوگ مراد ہیں جو مختلف قبائل سے آنحضرت کے خلاف جنگ کے لئے جمع ہو گئے تھے اور آیت کریمہ:
فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵-۵۶)
اور خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔ میں حزب اللہ سے انصار اللہ یعنی دین الٰہی کی مدد کرنے والے لوگ مراد ہیں۔
یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْھَبُوْا وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّھُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ (۳۳-۲۰) خوف کے سبب خیال کرتے ہیں کہ فوجیں نہیں گئیں اور اگر لشکر آجائیں تو تمنا کریں کہ کاش گنواروں میں جا رہیں۔

اس کے بعد تھوڑا سا آگے چل کر فرمایا:
وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ (۳۳-۲۲)

(ح ز ن)

اَلْحُزْنُ وَالْحَزَنُ کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔ نیز غم کی وجہ سے جو بیقراری سی طبیعت کے اندر پیدا ہوجاتی ہے اسے بھی حُزْنٌ یا حَزَنٌ کہا جاتا ہے اس کی ضد فَرَحٌ ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنی معتبر ہوتے ہیں اس لئے غم زدہ ہونے کے لئے خَشُنَتْ بِصَدْرِہٖ بھی کہا جاتا ہے۔
حَزِنَ (س) غمزدہ ہونا۔ حَزَنَہٗ (ن) وَاَحْزَنَہٗ غمگین کرنا۔ قرآن میں ہے:
لِکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ (۳-۱۵۳)
تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے..... اس سے تم اندوہناک نہ ہو۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵-۳۴) کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔
تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا (۹-۹۲) تو وہ لوٹ گئے اور ... ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (۱۲-۸۶) کہ میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔
اور آیت کریمہ:
وَلَا تَحْزَنُوْا (۳-۱۳۹) اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔
اور لَا تَحْزَنْ (۹-۴۰) کہ غم نہ کرو۔

---

[۱] انظر السمط ۹۴ والقالی ۲/۱۷۲، ۱۷۰ وذیل اللالی ۵ د فی مبحث "دعاء العرب" قال والجاریۃ التی رجع سمھا فیھا فالحرتھا فھو اشد لضربتھا والمیدانی ۱/۲۷۱، ۲۰۸، ۲۸۲ والحیوان ۴/۲۴۴ والمثل فی جل المعاجم

میں اندوہگین ہونے سے منع نہیں کیا ہے اسلئے کہ مغموم ہونا کسی انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے۔ جس سے منع کرنے کی ضرورت پیش آئے بلکہ یہاں دراصل ان کاموں کے کرنے سے منع کرنا مقصود ہے جو غم واندوہ کا باعث بنتے ہیں اسی معنی کیطرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے[1] ع (ر)

(۱۰۸) مَنْ سَرَّهُ أَنْ لَا يَرَى مَا يَسُوءُهُ
فَلَا يَتَّخِذْ شَيْئًا يُبَالِي لَهُ فَقْدًا

(جسے یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی چیز اسے غمگین نہ کرے تو وہ ایسی چیز حاصل نہ کرے جس کے گم ہونے کا اندیشہ ہو نیز انسان کو دنیا کے نظام پر غور کرنا چاہیئے (کہ یہاں کس طرح سلسلہ اضداد قائم ہے) تاکہ جب اس پر اچانک کوئی مصیبت آپڑے تو اس سے زیادہ پریشان نہ ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ انسان معمولی مصیبتیں برداشت کرنے کا عادی بن جائے تاکہ بڑے مصائب کو بھی برداشت کرسکے

(ح س س)

اَلْحَاسَّةُ اس قوۃ کو کہتے ہیں جس سے عوارض حِسِّیَّۃ کا ادراک ہوتا ہے اس کی جمع حَوَاسٌّ ہے جس کا اطلاق مشاعر خمسہ (یعنی سمع، بصر، شم، ذوق اور لمس) پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے:۔

حَسَسْتُ (ن) وَحَسِيْتُ وَاَحْسَسْتُ محسوس کرنا اور اَحْسَسْتُ (افعال) دو طرح استعمال ہوتا ہے۔

(۱) قوت حس سے کسی چیز تک پہنچنا (محسوس کرنا) جیسے عِنْتُهُ وَرُعْتُهُ۔

(۲) کسی کے حاسہ پر مارنا۔ جیسے کَبَدْتُهُ وَفَادْتُهُ۔

اور حاسہ پر مار لے سے کبھی انسان قتل ہوجاتا ہے۔ اس لئے حَسَسْتُهُ بمعنی قَتَلْتُهُ آجاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

(إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ) (۳-۱۵۲) جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔

اور حَسِيْسٌ بمعنی قتیل بھی آتا ہے اور اسی سے پکی ہوئی جراد کو جَرَادٌ مَحْسُوْسٌ کہا جاتا ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں حَسَّ الْبَرْدُ النَّبَاتَ پالے نے نبات کو جلا ڈالا۔ اِنْحَسَّتْ اَسْنَانُهُ اس کے دانت گر گئے۔ اور حَسِسْتُ (س) فَهِمْتُ وَعَلِمْتُ کے ہم معنی ہے مگر یہ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جو بذریعہ حواس کے معلوم ہو۔ اور حَسِيْتُ میں ایک سین کو یا سے تبدیل کردیا گیا ہے اور اَحْسَسْتُهُ کے اصل معنی بھی کسی چیز کو محسوس کرنے کے ہیں اور اَحَسْتُ بھی اَحْسَسْتُ ہی ہے مگر اس میں ایک سین کو تخفیفاً حذف کردیا گیا ہے جیسا کہ ظَلْتُ (میں ایک لام محذوف ہے) اور آیت کریمہ:۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ (۳-۵۲) جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کی طرف سے نافرمانی (اور نیت قتل) دیکھی۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اسقدر برملا طور پر کفر کیا کہ عقل وفہم کی بجائے وہ ہر ایک کو محسوس ہورہا تھا اور یہی معنی آیت:۔

فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ۔ (۲۱-۱۲) جب انہوں نے ہمارے (مقدمہ) عذاب کو دیکھا تو لگے اس سے بھاگنے۔

میں مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

---

[1] قالہ عبداللہ بن عبداللہ بن طاہر وعدہ الثعالبی فی خاص الخاص ص۱۰۷ ابن ظریف شعرہ وقبلہ الم تران الدہر یہدم ما بنی۔ ویاخذ ما اعطی ویفسد ما اسدی۔

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ (۱۹-۹۸) کے معنی یہ ہیں کہ کیا تم کسی کو بھی ان میں سے محسوس کر سکتے ہو۔
اَلْحَسِیْسُ وَالْحِسُّ۔ حرکت، آہٹ کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا (۲۱-۱۰۲) (یہاں تک کہ) اس کی آہٹ بھی تو نہیں سنیں گے۔
اَلْحُسَاسُ سوءِ خلق یہ زکام وسُعال کی طرح (فعال) کے وزن پر ہے (جو بیماری یا عیب کے معنی کے ساتھ خاص ہے)

(ح س ب)

اَلْحِسَابُ کے معنی گننے اور شمار کرنے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ حَسَبْتُ (ض) اَحْسِبُ حِسَابًا وَحُسْبَانًا۔ قرآن میں ہے :۔
لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ (۱۷-۱۲) اور برسوں کا شمار اور حساب جان لو۔
وَجَاعِلُ الَّیْلِ سَکَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا[1] (۶-۹۶) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام (ٹھہرایا) اور سورج اور چاند کو (ذرائع) شمار بنایا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ ان کے حُسْبَان ہونے کی حقیقت خدا ہی جانتا ہے اور آیت کریمہ :۔
وَیُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ (۱۸-۴۰) اور وہ (تمہارے باغ) پر آسمان سے آفت بھیج دے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ حُسْبَانًا کے معنی آگ اور عذاب کے ہیں اور حقیقت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس پر محاسبہ کیا جائے اور پھر اس کے مطابق بدلہ دیا جائے۔ حدیث میں ہے[2] (۷۷) آنحضرت نے آندھی کے متعلق فرمایا :۔
اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْهَا عَذَابًا وَّحُسْبَانًا کہ الٰہی! اسے عذاب یا حُسْبَان نہ بنا اور آیت کریمہ :۔
فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِیْدًا (۶۵-۸) تو ہم نے ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا۔ میں حدیث[3] (۷۸)
مَنْ نُوْقِشَ فِی الْحِسَابِ عُذِّبَ (کہ جس سے حساب میں سختی کی گئی اسے ضرور عذاب ہوگا) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ :۔
اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ (۲۱-۱) لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آپہنچا (اپنے مضمون میں)، وَکَفٰی بِنَا حَاسِبِیْنَ کی طرح ہے اور آیت کریمہ :۔ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ (۶۹-۲۶) اور مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ اور آیت :۔ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ (۶۹-۲۰) مجھے یقین تھا کہ مجھ کو میرا حساب (وکتاب) ضرور ملے گا۔
میں "ہ" وقف کی ہے جیسا کہ مَالِیَهْ وَسُلْطَانِیَهْ میں ہے۔۔
اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۱۵-۵۱) بیشک خدا جلد حساب لینے والا ہے۔
اور آیت کریمہ :۔

---

[1] ہی قراءۃ الاکثر وفی قراءۃ الکوفۃ جعل (فعل ماضی) وکلا ہما قراءتان مستفیضتان (الطبری ۷/۲۸۳ والدانی ۱۰۵) وحُسْبانا جمع حساب مثل شہاب وشہبان قالہ الاخفش (والفتح للشوکانی وایضًا ابوعبیدہ فی مجازہ ۱/۲۰۱) وقیل ہو مصدر (الطبرسی ۷/۱۳۸)
[2] راجع غریب ابی عبید ۱/۲۰۱ وابوداؤد (جنائز) والترمذی (فی التفسیر والمستدرک ۲/۸۴) [3] من حدیث عائشۃ وفی المطبوع مضطرب والتصحیح من الاصول راجع للحدیث ومحاورۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الفتح للحافظ ۱۱/۱۹۱-۱۹۳ و الحدیث فی الفائق ۲/۸۸ والنہایۃ واصلہ من الصحیحین ۱۲ ؛

جَزَاءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا۔ (۷۸-۳۶)
یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے صلہ ہے انعام کثیر۔ میں بعض نے کہا ہے کہ حِسَابًا کے معنی کافیا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت :۔ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳-۳۹) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔
اور آیت کریمہ :۔
وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۲-۲۱۲)
اور خدا جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔ میں بغیر حساب کی متعدد توجیہات ہو سکتی ہیں۔
(۱) استحقاق سے زیادہ عطا فرماتا ہے۔
(۲) جسے چاہے عطا فرماتا ہے اور پھر اس سے واپس نہیں لیتا۔
(۳) اس قدر عطا فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اس کا احصاء ممکن نہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے (۱۰۹) عَطَایَاہُ یُحْصٰی قَبْلَ اِحْصَائِہَا الْقَطْرُ
کہ بارش کے قطروں سے بھی اس کے عطایا زیادہ ہو جاتے ہیں۔
(۴) بغیر کسی تنگی کے دیتا ہے اور یہ حَاسَبْتُہٗ سے ہے جس معنی ضَایَقْتُہٗ یعنی تنگی کرنا آتے ہیں۔
(۵) لوگوں کے عام اندازہ سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔
(۶) اپنی مصلحت کے مطابق عطا فرماتا ہے نہ کہ لوگوں کے حساب کے مطابق جیسا کہ آیت :۔
وَلَوْلَا اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ (الآیۃ) (۴۳-۳۳)
اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی جماعت ہو جائیں گے تو جو لوگ خدا سے انکار کرتے ہیں۔ میں تنبیہ فرمائی ہے۔
(۷) مومن کو جو کچھ دیتا ہے اس پر محاسبہ نہیں کریگا اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن دنیا میں بقدر کفایت حاصل کرتا ہے اور وہ بھی جائز طریقہ سے اور حسب ضرورت اور اسی طریق سے خرچ کرتا ہے اور ساتھ ہی اپنے آپ پر محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس سے اس طرح حساب نہیں لے گا۔ جس سے کہ اسے نقصان پہنچے جیسا کہ حدیث میں ہے (۹۷) مَنْ حَاسَبَ نَفْسَہٗ فِی الدُّنْیَا لَمْ یُحَاسِبْہُ اللّٰہُ یوم القیامۃ۔ کہ جو شخص دنیا میں اپنے نفس پر محاسبہ کرتا رہے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے حساب نہیں لے گا (یعنی جس سے کہ اسے نقصان پہنچے)
(۸) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے استحقاق سے زیادہ بدلہ عطا فرمائیگا۔ جیسے فرمایا :۔
مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً (۲-۲۴۵)
کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔
اور آیت کریمہ :۔
فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ یُرْزَقُوْنَ فِیْہَا بِغَیْرِ حِسَابٍ (۴۰-۴۰) تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہاں ان کو بے شمار رزق ملے گا۔
بھی ان مذکورہ وجوہ (ثمانیہ) پر محمول ہو سکتی ہے۔
اور آیت کریمہ :۔
ہٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (۳۸-۳۹) یہ ہماری بخشش ہے (چاہو تو احسان کر دو یا (چاہو) تو رکھ چھوڑو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔
میں بغیر حساب کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اس

میں اس شخص کی طرح تصرف کرو جسے محاسبہ کا خوف نہ ہو۔ یعنی (مومن کی طرح) واجب طریق سے بوقت ضرورت اور بقدر کفایت لیا کرو اور پھر اسی طریق سے خرچ کرتے رہو۔ اَلْحَسِيْبُ وَالْمُحَاسِبُ کے اصل معنی حساب لینے والا یا حساب کرنے والا کے ہیں۔ پھر حساب کے مطابق بدلہ دینے والے کو بھی حَسِیْب کہا جاتا ہے۔ (اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کے حسیب ہونے کے ہیں) اور آیت کریمہ:۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۴-۶) تو خدا ہی (گواہ اور) حساب لینے والا کافی ہے۔ میں حسیب بمعنی رقیب ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی نگہبانی کے لئے کافی ہے جو ان سے محاسبہ کرے گا۔

حَسْبُ (اسم فعل) بمعنی کافی۔ جیسے فرمایا:۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ (۹-۵۹) ہمیں خدا کافی ہے۔

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ (۵۸-۸) ان کو دوزخ (ہی کی سزا) کافی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (۶-۵۲) ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:۔

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵-۱۰۵) اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اور آیت:۔

وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ (۲۶-۱۱۲-۱۱۳) مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے ہیں ان کا حساب (اعمال) میرے پروردگار کے ذمے ہے۔ کے مفہوم کے مطابق ہے بعض نے آیت مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ کے یہ معنی کئے ہیں کہ ان کو کافی ہونا تمہارا کام نہیں ہے۔ بلکہ تیرے اور ان کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ جیسا کہ آیت: عَطَاءً حِسَابًا (۷۸-۳۶) میں حساب بمعنی کافی ہے اور یہ حَسْبِيْ كَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنْ حِسَابِهِمْ سے ان کے اعمال مراد ہیں یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے تجھ پر گرفت نہیں ہوگی اور اعمال کو بلحاظ مآل کے حساب کہا گیا ہے۔

اِحْتَسَبَ ابْنًا لَهٗ یعنی اس نے اپنے بیٹے کی موت پر یہ سمجھ کر صبر کیا کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملیگا۔ اور اس کے عمل کو حِسْبَةٌ کہا جاتا ہے اور آیات:۔

اَلٰٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ (۲۹-۲) کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ (۲۹-۴) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۴-۴۲) اور (مومنو) مت خیال کرنا کہ یہ ظالم جو عمل کر رہے ہیں خدا ان سے بے خبر ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ (۱۴-۴۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے اس کے خلاف کرے گا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (۲-۲۱۴) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یوں ہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

میں سب کا مصدر الْحُسْبَان ہے اور الْحُسْبَان کے معنی یہ ہیں کہ نقیضین میں سے کسی ایک کے بارے میں اس طرح حکم لگایا جائے کہ دوسری

کا دل میں خیال تک بھی نہ آنے پائے اسی کو گنتی میں لائے اور اسی پر ہی انگلی کو گرہ لگائے مگر اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہو اور یہی معنی تقریبًا ظن کے ہیں مگر ظن کی صورت میں دونوں نقیضوں کا خیال لایا جاتا ہے اور پھر ایک کو دوسری پر غلبہ دیکر حکم لگایا جاتا ہے

(ح س د)

اَلْحَسَدُ (ن) کسی مستحق نعمت سے اس نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنے کا نام حسد ہے۔ بسا اوقات اس میں اسی مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے ایک روایت میں ہے (ن ۸) اَلْمُؤْمِنُ یَغْبِطُ وَالْمُنَافِقُ یَحْسِدُ کہ مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے

قرآن میں ہے:۔
حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ (۲-۱۰۹) اپنے دل کی جلن سے۔
وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ (۱۱۳-۵) اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب حسد کرنے لگے۔

(ح س ر)

اَلْحَسْرُ (ن ض) کے معنی کسی چیز کو ننگا کرنے اور اس سے پردہ اٹھانے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ حَسَرْتُ عَنِ الذِّرَاعِ میں نے آستین چڑھائی
اَلْحَاسِرُ بغیر زرہ یا بغیر خود کے۔
اَلْمَحْسَرَۃُ
فُلَانٌ کَرِیْمُ الْمَحْسِرِ کنایہ یعنی نَاقَۃٌ حَسِیْرٌ تھکی ہوئی اور کمزور اونٹنی۔ جس کا گوشت اور قوت زائل ہو گئی ہو اس کی جمع حَسْرٰی ہے۔

اَلْحَاسِرُ۔ تھکا ہوا۔ کیونکہ اس کے قویٰ ظاہر ہو جاتے ہیں عاجز اور درماندہ کو حَاسِرٌ بھی کہتے ہیں اور مَحْسُوْرٌ بھی حَاسِرٌ تو اس تصور کے پیش نظر کہ اس نے خود اپنے قویٰ کو ننگا کر دیا اور مَحْسُوْرٌ اس تصور پر کہ درماندگی نے اس کے قویٰ کو ننگا کر دیا۔ اور آیت کریمہ:۔
يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (۶۷-۴) تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔
میں حَسِیْرٌ بمعنی حَاسِرٌ بھی ہو سکتا ہے اور مَحْسُوْرٌ بھی فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (۱۷-۲۹) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

اَلْحَسْرَۃُ۔ غم۔ جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اس پر پشیمان اور نادم ہونا گویا وہ جہالت اور غفلت جو اس کے ارتکاب کی باعث تھی وہ اس سے دور ہو گئی یا فرط غم سے اس کے قویٰ ننگے ہو گئے یا اس کوتاہی کے تدارک سے اسے درماندگی نے پالیا قرآن میں ہے:۔
لِيَجْعَلَ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ (۳-۱۵۶) ان باتوں سے مقصود یہ ہے کہ خدا ان لوگوں کے دلوں میں افسوس پیدا کر دے۔
وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۶۹-۵۰) نیز یہ کافروں کے لئے (موجب) حسرت ہے۔
يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (۳۹-۵۶) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

لہ کذا ذکرہ الغزالی فی الاحیاء مرفوعًا قال العراقی فی تخریجہ (۳ر۱۸۹) لم اجد لہ اصلا مرفوعًا وانما ہو من قول الفضیل بن عیاض ذکرہ ابن ابی الدنیا فی ذم الحسد راجع لمعنی الحسد والغبطۃ النہایۃ تحت حدیث لا حسد فی اثنتین الخ (۱ر۳۸۳) ۱۲

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ
(۲-۱۶۷) اسی طرح خدا ان کے اعمال انہیں حسرت
بنا کر دکھائے گا۔
يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ج (۳۶-۳۰) بندوں پر افسوس ہے۔
اور فرشتوں کے متعلق فرمایا:۔
لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ
(۲۱-۱۹) وہ اس کی عبادت سے نہ کنیاتے ہیں اور
نہ درماندہ ہوتے ہیں۔ اس میں لَا يَحْسِرُوْنَ
سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ح س م)

اَلْحَسْمُ (ض) کے معنی کسی چیز کے نشان کو
زائل کرنے اور مٹا دینے کے ہیں کہا جاتا ہے:۔
قَطَعَهٗ فَحَسَمَهٗ یعنی اسے قطع کیا اور پھر
اس کا نشان تک مٹا دیا۔ پھر اس اعتبار سے
تلوار کو حُسَام کہا جاتا ہے۔
حَسْمُ الدَّاءِ زخم کو مسلسل داغ دے کر اس
کے نشان کو مٹا دینا اور رجب نحوست انسان
کے نشان کو مٹا ڈالے تو کہا جاتا ہے نَالَہٗ حُسُوْمٌ
اور آیت کریمہ:۔
ثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (۶۹-۷) آٹھ دن لگاتار۔
میں بعض نے کہا ہے کہ ان کے گھروں کے نشانات
مٹا دینے والی ریح مراد ہے اور بعض نے کہا ہے
کہ نام و نشان مٹا دینے والی مراد ہے اور بعض نے
ان کی عمروں کو قطع کر دینے والی مراد لی ہے اور
یہ سب معانی حُسُوْمٌ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

(ح س ن)

اَلْحُسْنُ ہر خوش کن اور پسندیدہ چیز کو
حُسْنٌ کہا جاتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔
(۱) وہ چیز جو عقل کے اعتبار سے مستحسن ہو۔
(۲) وہ جو خواہش نفسانی کی رو سے پسندیدہ ہو۔
(۳) صرف نگاہ میں بھلی معلوم ہو۔
اَلْحَسَنَةُ ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کے نفس
یا بدن یا اس کی کسی حالت میں حاصل ہو کر اس کے
لئے مسرت کا سبب بنے حَسَنَةٌ کہلاتی ہے
اس کی ضد سَيِّئَةٌ ہے اور یہ دونوں الفاظ
مشترکہ کے قبیل سے ہیں اور لفظ "حیوان"
کی طرح مختلف انواع کو شامل ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ (۴-۷۸)
اور ان لوگوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے
ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند
پہنچتا ہے۔
میں حَسَنَة سے مراد فراخ سالی، وسعت اور
کامیابی ہے اور سَيِّئَة سے قحط سالی، تنگی اور
ناکامی مراد ہے اور یہی معنی آیت:۔
فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ج
(۷-۱۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو
کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں میں مراد ہیں اور آیت:۔
مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ
اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط (۴-۷۹)
(اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف
سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت
اعمال کی) وجہ سے ہے۔
میں حَسَنَة سے ثواب اور سَيِّئَة سے عذاب
مراد ہے۔
اَلْحُسْنُ وَالْحَسَنَةُ اور اَلْحُسْنٰی یہ تین لفظ ہیں۔

(۲) ان میں فرق یہ ہے کہ حَسَنٌ اعیان و اغراض دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی طرح حَسَنَۃٌ جب بطور صفت استعمال ہو تو دونوں پر بولا جاتا ہے اور اسم ہو کر استعمال ہو تو زیادہ تر اَحْدَاث (احوال) میں استعمال ہوتا ہے اور حُسْنیٰ کا لفظ صرف احداث کے متعلق بولا جاتا ہے۔ اَعْیَان کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اور اَلْحَسَنُ کا لفظ عرف عام میں اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو بظاہر دیکھنے میں بھلی معلوم ہو جیسے کہا جاتا ہے رَجُلٌ حَسَنٌ حُسَّان وامْرأۃٌ حَسَنَۃٌ وَحُسَّانَۃٌ لیکن قرآن میں حَسَنٌ کا لفظ زیادہ تر اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو عقل و بصیرت کی رو سے اچھی ہو اور آیت کریمہ:۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ (۳۹-۱۸) جو بات کو سنتے اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ میں اَحْسَنُ سے وہ بات مراد ہے جو شک و شبہ سے دور (اور بالا) ہو جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا[1] (۸۱) اِذَا شَکَکْتَ فِیْ شَیْءٍ فَدَعْ کہ جس چیز میں تجھے شبہ ہو اسے ترک کر دے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲-۸۳) اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ میں حُسن سے اچھی بات مراد ہے۔ اسی طرح فرمایا:۔

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حُسْنًا (۲۹-۸) قُلْ ھَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّا اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ (۹-۵۲) کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۵-۵۰) اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟۔

میں اگر اعتراض کیا جائے کہ اللہ کا حکم تو ہر حال اچھا ہے۔ خواہ کوئی یقین کرے یا نہ کرے تو پھر "لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ" کی تخصیص کیوں کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں بلکہ ظہور حسن کا قصد اور اس پر مطلع ہونا مراد ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حکم الٰہی کا حسن اسی شخص کے سامنے ظاہر ہوگا جو پاکیزہ نفس ہو اور حکمت الٰہی پر اس کی نظر ہو۔ ورنہ جہال پر تو یہ راز منکشف نہیں ہو سکتا۔

اَلْاِحْسَان (افعال) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے اول یہ کہ دوسروں پر انعام کرنا۔ کہا جاتا ہے۔ اَحْسَنَ اِلٰی فُلَانٍ اس نے فلاں پر انعام کیا۔ دوم یہ کہ اپنے فعل میں حسن پیدا کرنا اور یہ چیز حسن علم اور حسنِ عمل سے پیدا ہوتی ہے اسی معنی میں امیر المؤمنین نے فرمایا[2] (۸۲) اَلنَّاسُ اَبْنَاءُ مَا یُحْسِنُوْنَ یعنی لوگ اپنے علم و فضل اور اعمال حسنہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ (۳۲-۷) جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا (یعنی) اس کو پیدا کیا۔

اِحْسَان انعام سے اعم ہے قرآن میں ہے:

---

[1] ولم اجدہ بہذا اللفظ وحدیث دع ما یریبک معروف وسیاتی فی (ریب) وذکرہ الغزالی فی احیاءہ ۹۵ وقد عقدہ الشافعی مع ثلاثۃ: اخسوا اتق الشبہات وازھد ودع ما لیس یعنیک واعملن بالنیۃ (العاہر ۲/۸) [2] انظر فی ادب الدنیا والدین للماوردی قال الشارح معناہ ای ابناء ما ینسبون الیہ من العلوم والصنائع فیقال مثلاً فلان العالم وفلان الجاہد فی معناہ قول عائشۃ راجع المحاضرات للمؤلف ۱/۳۱۔

إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ (۱۷-۷) اگر تم نیکو کاری کرو گے تو اپنی جان کے لئے کرو گے۔

اور آیت کریمہ:۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (۱۶-۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ میں اشارہ ہے کہ احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کر دینا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے لہذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اور انسان پر عدل وانصاف سے کام لینا تو واجب اور فرض ہے مگر احسان مندوب ہے۔ اسی بنا پر فرمایا:۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے۔ اور فرمایا:۔

وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ (۲-۱۷۸) اور پسندیدہ طریق سے (قرار داد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خونبہا کرنا)۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لئے بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

إِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۲۹-۶۹) اور خدا تو نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۲-۱۹۵) بیشک خدا نیکی کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِن سَبِيلٍ (۹-۹۱) نیکو کاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۳۹-۱۰) جنہوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے بھلائی ہے۔

(ح ش ر)

اَلْحَشْرُ (ن) کے معنی لوگوں کو ان کے ٹھکانہ سے مجبور کرکے نکال کر لڑائی وغیرہ کی طرف لے جانے کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے[1] (۸۳) اَلنِّسَاءُ لَا يُحْشَرْنَ کہ عورتوں کو جنگ کے لئے نہ نکالا جائے اور یہ انسان اور غیر انسان سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ حَشَرَتِ السَّنَةُ مَالَ بَنِي فُلَانٍ یعنی قحط سالی نے مال کو ان سے زائل کر دیا اور حشر کا لفظ صرف جماعت کے متعلق بولا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ (۲۶-۳۶) اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے۔

وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً (۳۸-۱۹) اور پرندوں کو بھی کہ جمع رہتے تھے۔

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (۸۱-۵) اور جب وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے۔

مَا ظَنَنتُمْ أَن يَخْرُجُوا لِأَوَّلِ الْحَشْرِ (۵۹-۲) حشر اول کے وقت تمہارے خیال میں بھی نہ تھا کہ نکل جائیں گے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ (۲۷-۱۷) اور سلیمان کے لئے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے اور قسم وار کئے جاتے تھے۔

اور قیامت کے متعلق فرمایا:۔

وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً (۴۶-۶)

---

[1] راجع للحدیث النہایۃ ۱/۳۸۹ وفیہ: لایحشرن ولایعشرن ۱۲

اور جب لوگ جمع کئے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے۔

فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا (۴-۱۷۲) تو خدا سب کو اپنے پاس جمع کرلے گا۔

وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا (۱۸-۴۷) اور ان (لوگوں) کو ہم جمع کرلیں گے تو ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

اور قیامت کے دن کو یَوْمُ الْحَشْرِ بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے یَوْمُ الْبَعْثِ اور یَوْمُ النُّشُوْرِ کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔

رَجُلٌ حَشْرُ الْأُذُنَيْنِ لطیف اور باریک کانوں والا۔

(ح ص ص)

حَصْحَصَ الْحَقُّ (۱۲-۵۱) کے معنی ہیں کہ حق بات جو کسی دباؤ کی وجہ سے چھپی ہوئی اب اس دباؤ کے دور ہونے کی وجہ واضح ہوکر سامنے آگئی اور حَصَّ وحَصْحَصَ (ثلاثی ورباعی) دونوں طرح آتا ہے۔ جیسے کَفَّ وَکَفْکَفَ وکَبَّ وَکَبْکَبَ۔

حَصَّہٗ (ن) کسی چیز سے ایک حصہ کاٹ لینا۔ یہ کاٹنا خواہ حقیقی طور پر ہو یا حکمی طور پر۔ حقیقی کی مثال جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ع (سریع)

(۱۱۹) "قَدْ حَصَّتِ الْبَيْضَةُ رَأْسِي"

(یعنی مسلسل خود پہنے رہنے کی وجہ سے میرے سر کے بال جھڑ گئے۔

اسی سے رَجُلٌ اَحَصُّ کا محاورہ ہے (یعنی مرد موئے رفتہ از سر) مؤنث حَصَّاءُ رَجُلٌ اَحَصُّ منحوس مرد، جو اپنی نحوست کی وجہ سے لوگوں سے خیرات کو قطع کردے۔

اَلْحِصَّةُ کے معنی کل میں سے ایک ٹکڑہ کے ہیں اور بمعنی بہرہ یعنی نصیب کے استعمال ہوتا ہے۔

(ح ص د)

اَلْحَصْدُ وَالْحِصَادُ کے معنی کھیتی کاٹنے کے ہیں اور زَمَنُ الْحَصَادِ وَالْحِصَادِ یہ زَمَنُ الْجَدَادِ وَالْجِدَادِ کی طرح (بکسرہ حاء وفتحہا) دونوں طرح آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (۶-۱۴۱) اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔

میں وہ کھیتی مراد ہے جو اس کے صحیح وقت میں کاٹی گئی ہو۔ مگر آیت:

حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ (۱۰-۲۴) یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات

۱؎ قالہ احیحۃ الاوس ابو القیس بن الاسلت وتمامہ ... فما — اطعم نوما غیر تہجاع وفی روایۃ الضبی غمضا بدل نوما والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲: ۸۴) فی ۲۴ بیتا جمہرۃ (۴۳-۲۳۶) یتقدم فی تاثیرہا لبیت فی اللسان والصحاح والتاج والمحکم (حصص) والموشح ۶۴ والکامل ۱۵۵ وابن اثیر (۱: ۲۸۴) والاغانی والخزانۃ (۲: ۸۴، ۵۳۴) والتنبیہ للبکری والکنز اللغوی ۱۷۰ والمرزوقی (۱: ۱۰۶) والجمحی ۸۸ والحماسۃ للبحتری ۴۴ وشواہد الکشاف ۷۰ ومحاضرات المؤلف ۳ (۲۴۶، ۳۳۵) والحیوان للجاحظ (۶: ۱۹۴) وایام العرب ۹۲

۲؎ وفی المطبوع المحمود مصحف والصواب المحصود ۱۲

گویا ان کو ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کر ایسا کر) ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ یہاں حصید سے مراد وہ کھیتی ہے جو بوقت افساد اور تباہی کی غرض سے کاٹی گئی ہو۔ اور اسی سے حَصَدَ هُمُ السَّيْفُ کا استعارہ ہے یعنی تلوار نے انہیں تباہ کر دیا اور آیت کریمہ:۔

مِنْهَا قَائِمٌ وَّحَصِيْدٌ (۱۱-۱۰۰) ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور بعض کا تہس نہس ہو گیا۔ میں حَصِيْد سے تباہ و برباد کی ہوئی بستیاں مراد ہیں۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۶-۴۵) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور حَبَّ الْحَصِيْدِ (۵۰-۹) سے مراد اناج ہے اور حدیث میں ہے۔[1] (۸۴)

وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ لوگوں کو دوزخ میں اوندھے منہ صرف وہی گرائے گا جو ان کی زبانوں سے کاٹا ہو گا۔ یہاں زبان کے ساتھ حصائد کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی سے حَبْلٌ مَحْصُوْدٌ (رسن محکم تافتہ)

وَدِرْعٌ حَصْدَاءُ (زرہ تنگ حلقہ و محکم تافتہ) وَشَجَرَةٌ حَصْدَاءُ (درخت بسیار برگ) کے محاورات ہیں۔

تَحَصَّدَ الْقَوْمُ لوگوں کا جمع ہو کر ایک دوسرے سے قوت حاصل کرنا۔

(ح ص ر)

اَلْحَصْرُ (ن) کے معنی تضییق یعنی تنگ کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔ وَاحْصُرُوْهُمْ (۹-۵) اور گھیر لو یعنی انہیں تنگ کرو۔

اور آیت کریمہ:۔

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِيْنَ حَصِيْرًا (۱۷-۸) اور ہم نے جہنم کو کافروں کیلئے قیدخانہ بنا رکھا ہے۔ میں حَصِيْرٌ کے معنی روکنے والا کے ہیں۔ حسنؒ نے کہا ہے کہ حصیر کے معنی مہاد یعنی بچھونے کے ہیں گویا ان کے نزدیک اس سے حصیر مرمول یعنی چٹائی مراد ہے اور چٹائی کو حصیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ریشے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں۔ اور لبید کے شعر[2] (الکامل) (۱۱۰)

وَمَقَامَةٍ غُلْبِ الرِّقَابِ كَاَنَّهُمْ
جِنٌّ لَدٰى بَابِ الْحَصِيْرِ قِيَامُ

اور بہت سے موٹی گردنوں والے بہادر ہیں جو بادشاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے جنات معلوم ہوتے ہیں میں حصیر کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ اور بادشاہ کو حصیر یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ محصور رہتا ہے جیسا کہ اسے مُحْتَجِبٌ کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ جسے چاہے اسے اپنے پاس آنے سے روک سکتا ہے اور آیت کریمہ:۔ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا (۳-۳۹) اور سردار ہوں گے

---

[1] اخرجہ الترمذی وصححہ وابن ماجۃ والحاکم من حدیث معاذ بن جبل وقال صحیح علی شرط الشیخین راجع تخریج الاحیا للعراقی ۲/۱۰۹۔ [2] وفی روایۃ تماقم بدل ومقامۃ وہی جمع تماقم (بضمۃ القاف) ومعناہ الرئیس الجواد والبیت فی الطری (۱۵-۴۵) والسمط ۹۵۵ فی ثلاثۃ ابیات والامالی (۲: ۳۰۸) والقرطبی (۱۰: ۲۲۴) والصحاح واللسان والتاج (حصر) ومجاز القرآن (۱: ۳۷۱) رقم ۳۳۴ والبحر (۶: ۱۱/۲: ۶۰) وفی روایۃ الدیوان (۲: ۳۹) طرف الحصیر بدل باب الحصیر قال فی الصحاح وہذہ روایۃ غیر ابی عبیدۃ وفی المطبوع (مصر وکراتشی) ومعالم وہذ تصحیف فی تماقم ۱۰ ؟

اور عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے۔
میں حصورًا کے معنی عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والا کے ہیں خواہ یہ نامردی کی وجہ سے ہو اور خواہ عفت اور ازالۂ شہوت میں مجاہدہ اور ریاضت کی بنا پر مگر یہاں دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں کیونکہ یہ لفظ ان (یحیٰی علیہ السلام) کے لئے بطور مدح کے استعمال ہوا ہے۔

اَلْحَصْرُ وَالْاِحْصَارُ دونوں کے معنی حج سے روک دینے کے ہیں۔ مگر احصار ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی رکاوٹ کے متعلق بولا جاتا ہے جیسے دشمن کا آڑے آکر روک دینا یا مرض وغیرہ کی وجہ سے رک جانا مگر جب وہ رکاوٹ باطنی اسباب جیسے مرض وغیرہ کی بنا پر ہو تو اس موقع پر حَصْرٌ ہی بولا جاتا ہے۔ پس آیت کریمہ:۔
فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ (۲-۱۹۶) اور اگر راستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو)
میں دونوں قسم کی رکاوٹیں مراد ہیں۔ اسی طرح آیت:۔
لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (۲-۲۷۳)
ان حاجت مندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔ میں بھی احصار کے عام معنی مراد ہیں
اور آیت کریمہ:۔
اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ (۴-۹۰)
یا اس حال میں کہ ان کے دل .... رک گئے ہوں تمہارے پاس آجائیں۔

میں بخل بزدلی وغیرہ کی وجہ سے سینوں کا تنگ ہونا مراد ہے اور ان کو حصر کے ساتھ تعبیر کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ ان معانی کو ضیق الصدر کے لفظ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور ان کے اضداد درجود و شجاعت وغیرہ پر اَلْبِرّ اور السعة کا لفظ بولا جاتا ہے۔

(ح ص ن)

اَلْحِصْنُ (قلعہ) اس کی جمع حُصُوْنٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
مَانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِنَ اللّٰهِ (۵۹-۲)
کہ ان کے قلعے ان کو خدا کے عذاب سے بچا لیں گے۔
اور آیت کریمہ:۔
لَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ (۵۹-۱۴) یہ سب جمع ہو کر بھی تم سے (بالمواجہ) نہیں لڑ سکیں گے مگر بستیوں کے قلعوں میں۔
میں مُحَصَّنَة سے مراد وہ بستیاں ہیں جو قلعوں کی طرح محفوظ اور محکم بنائی گئی ہوں۔
تَحَصَّنَ کے اصل معنی تو قلعہ کو مسکن بنا لینا کے ہیں مگر مجازًا ہر قسم کا بچاؤ حاصل کرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی سے دِرْعٌ حَصِیْنَةٌ (زرہ محکم) اور فَرَسٌ حِصَانٌ (اسپ نر و نجیب) کا محاورہ ہے۔ کیونکہ زرہ بدن کے لئے اور گھوڑا اپنے سوار کے لئے ایک طرح سے بمنزلہ قلعہ کے ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر نے کہا ہے[ل] ع (الکامل)

ل العجز للاشعر بن حمران الجعفی فاربعدما اخذتا نر ابیہ واتخذ الخیل یذکر فضلہا واولہ: ولقد علمت علی توقی الردی۔۔۔ دنی بدرایۃ الاصمعی علی تجنب الردی" راجع اللسان (حصن) والبیت من الشواہد الکشاف، ۲ وفی المطبوع مون القری والتسدید من المراجع والبیت من کلمۃ اصمعیۃ فی الوحشیات رقم ۸۵ فی ۳۵ بیتا ذالطبری (۱۲: ۴۲) والمحاضرات للمولف (۲: ۳۳۶) والحیوان للجاحظ (۱: ۳۴۱) وکتاب الخیل لمعمر بن المثنی الی ثمانیۃ ابیات وکتاب العرب للقتبی ۳۴۹ ضمن رسائل البلغاء صنعۃ کرد علی ؛

(۱۱۱) إِنَّ الْحُصُوْنَ الْخَيْلُ لَا مُدُنُ الْقُرٰى کہ حقیقی قلعے تو نجیب گھوڑے ہیں نہ کہ شہر اور قصبے۔ اور آیت کریمہ:۔

إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ (۱۲ - ۴۸) صرف وہی تھوڑا سا رہ جائیگا جو تم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے۔

میں تُحْصِنُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ قلعے جیسی محفوظ جگہوں میں حفاظت سے رکھ چھوڑو۔

کہا جاتا ہے:۔

اِمْرَأَةٌ حَصَانٌ وَحَاصِنٌ (عفیفہ عورت) حَصَانٌ کی جمع حُصُنٌ اور حَاصِنٌ کی جمع حَوَاصِنُ آتی ہے اور حَصَانٌ کے معنی پاکدامن یا معزز عورت کے ہوتے ہیں[1]۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۶ -) اور (دوسری) عمران کی بیٹی مریم کی جنہوں نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا۔

أَحْصَنَتْ وَحَصَنَتْ کے ایک ہی معنی ہیں۔

فَإِذَا أُحْصِنَّ (۴ - ۲۵) یعنی جب نکاح کر لیں اور أُحْصِنَّ (مجہول) ہو تو نکاح کر دی جائیں۔

اَلْحِصَانُ کے معنی مُحْصَنَة عورت کے ہیں خواہ وہ اَحْصَان پاکدامنی کی وجہ سے ہو یا کسی کے ساتھ نکاح کر لینے کی وجہ سے اور یا اپنے شرف و حریت کی وجہ سے محفوظ ہو اور عورت کو مُحْصِنٌ (بصیغہ فاعل) بھی کہا جاتا ہے اور مُحْصَنٌ (بصیغہ مفعول) بھی اول یعنی صیغہ فاعل اس تصور کی بنا پر ہے کہ وہ خود اپنی ذات کی حفاظت کرتی ہے اور اسم مفعول دوسرے کی جانب سے حفاظت کی وجہ سے ہے اور آیت کریمہ:۔

وَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ ... فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ (۴ - ۲۵) اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کر دو۔ بشرطیکہ عفیفہ ہوں نہ ایسی کھلم کھلا بدکاری کریں ... پھر اگر نکاح میں آکر بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں تو جو سزا آزاد عورتوں (یعنی بیبیوں) کے لئے ہے اس کی آدھی ان کو دی جائے۔

میں اول مُحْصَنَات سے شوہر والی عورتیں مراد ہیں گویا خاوند ان کی حفاظت کرتے ہیں اور قرآن میں جہاں کہیں بھی مُحْصَنَات کا لفظ آیا ہے وہاں فتحہ اور کسرہ صاد دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے لیکن جہاں حُرِّمَتْ کے بعد آیا ہے وہاں صرف فتحہ صاد کے ساتھ ہی پڑھا جائیگا کیونکہ شوہردار عورتوں کے ساتھ ہی نکاح حرام ہے نہ کہ عفائف کے ساتھ۔

(ح ص ل)

اَلتَّحْصِيْلُ (تفعیل) کے معنی چھلکے سے گودہ اور مغز نکالنے کے ہیں مثلاً معدن کے پتھروں سے سونا نکالنا یا بھوسے سے گندم کے دانوں کو الگ الگ کرنا۔ پس آیت کریمہ:۔

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰۰ - ۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جو بھید سینوں میں ہیں وہ اس طرح نکال کر جمع کر دیئے جائیں گے جس طرح کہ چھلکے سے مغز الگ کر لیا جاتا ہے۔ یا جیسے حساب کا حاصل ظاہر کیا جاتا ہے اور حُثَالَةٌ (یعنی حیوان

---

[1] وقال حسان فی عائشة رضی الله تعالی عنها حَصَانٌ رَزَانٌ ما تُزَنُّ بريبةٍ وتصبح غرثى من لحوم الغوافل ۱۲ ؎

وغیرہ) کو حصیل کہا جاتا ہے۔

حَصَلَ الْفَرَسُ گھوڑے کا حثالہ وغیرہ کھانے کی وجہ سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہونا۔ اور پرند کے پوٹے یا سنگدانے کو حَوْصَلَةُ الطَّيْرِ کہا جاتا ہے۔

(ح ص ی)

اَلْاِحْصَاءُ (افعال) کے معنی عدد کو حاصل کرنا کہا جاتا ہے اَحْصَيْتُ كَذَا میں نے اسے شمار کیا۔ اصل میں یہ لفظ حَصًى (کنکریاں) سے مشتق ہے اور اس سے گننے کا معنی اس لئے لیا گیا ہے کہ عرب لوگ گنتی میں کنکریوں پر اس طرح اعتماد کرتے تھے جس طرح ہم انگلیوں پر کرتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (۷۲-۲۸) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو گن رکھا ہے۔ اور اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک حدیث میں ہے[۱] (۸۵) مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ کہ جو شخص ان (اسمائے حسنیٰ) کا احصار کرلیگا (یعنی یاد کرلے گا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔ نیز آنحضرت نے فرمایا[۲] (۸۶) نَفْسٌ تُنْجِيهَا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اِمَارَةٍ لَا تُحْصِيهَا کہ ایک جان کو ہلاکت سے بچالینا اس امارت سے بہتر ہے جسے تم نباہ نہ سکو۔ قرآن میں ہے:۔

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ (۷۳-۲۰) اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔ ایک اور روایت میں ہے[۳] (۸۷) اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا کہ سیدھے رہو اور تم پوری طرح استقامت حاصل نہیں کر سکو گے۔

استقامت کے احصار اور تحصیل کے متعذر اور مشکل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حق صرف ایک ہے اور باطل کی بے شمار قسمیں ہیں بلکہ حق کی مثال بنسبت باطل کے دائرہ کے اجزا میں ایک نقطہ کی ہے یا کسی ہدف میں نشانہ لگانے کی جگہ کی ہو اس لئے اسے حاصل کرنا نہایت کٹھن کام ہے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت نے فرمایا[۴] (۸۸) مجھے سورہ ہود اور اس کی مثل دوسری سورتوں نے بوڑھا کردیا تو صحابہ نے عرض کی کہ ان میں کونسی آیت ہے جس نے آپ کو بوڑھا کردیا تو آنحضرت نے فرمایا وہ آیت:۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ (۱۱-۱۱۲) ہے۔ یعنی جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق پوری استقامت سے رہو۔

اہل لغت نے یہاں لَنْ تُحْصُوْا کے معنی لَا تُحْصُوْا ثَوَابَهٗ کئے ہیں یعنی تم اس ثواب کو شمار میں نہیں لاسکو گے۔

---

[۱] الحدیث متفق علیہ والترمذی عن ابی ہریرۃ وابن عساکر عن عمر وایضا ابن مردویہ وابو الشیخ معًا فی التفسیر وابو نعیم فی الاسماء الحسنیٰ راجع کنز العمال رقم ۱۹۴۰۱-۱۹۴۴۳ [۲] ذکرہ الغزالی فی الاحیاء فی محادثۃ علی بن ریحان بن عمر ومع ابی جعفر المنصور فقال قد سأل جدک العباس النبی صلی اللہ علیہ وسلم امارۃ مکہ والطائف فقال صلی اللہ علیہ وسلم یا عباس یا عم النبی۔۔۔ اخرجہ ابن ابی الدنیا ہکذا معضلا بغیر اسناد ورواہ البیہقی من حدیث جابر متصلا من روایۃ المنکدر مرسلا وقال ہذا ہو المحفوظ مرسلا راجع تخریج العراقی ۲/۲۳۵ وادب الدنیا للماوردی بشرح خان زادہ ۳۸۲ وفی العقد ۱/۲۴ تحبیبا وولایۃ بدل امارۃ وہم ۳/۱۳ فی خطبۃ لعبد اللہ بن مسعود [۳] الحدیث فی ابن ماجہ والحاکم والدارمی والطبرانی فی الصغیر ۲۱۰ والبزار عن ثوبان وفی بعض طرقہ انقطاع الکافی ۹۵ والنہایۃ ۱/۲۲۴-۲۳۵ واللسان (قوم) والفتح الکبیر ۱/۱۸۱ وابن قتیبۃ فی غریبہ ۳۸۹ وفی کنز العمال باستیعابہ ۳/۴۴۲ وایضا تخریج الکشاف للحافظ ۹۵ [۴] الحدیث باختلاف الفاظہ فی الترمذی عالدارقطنی والدلائل للبیہقی وابن سعد فی الطبقات وابن عدی فی الکامل راجع ایضا فی (۵۴۲) ۱۲

(ح ض ض)

اَلْحَضُّ (ن) کے معنی حَثٌّ کی طرح کسی کام پر ابھانے اور برانگیختہ کرنے کے ہیں۔ مگر حَثٌّ کا لفظ سواری وغیرہ کو تیز چلانے کے لئے آتا ہے۔ اور حَضٌّ کا لفظ سواری ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برانگیختہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اصل میں حَضٌّ کے معنی جانور کو الحضیض یعنی نشیب زمین کی طرف ہانکنے کے ہیں پھر ابھارنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، قرآن میں ہے:۔

وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۶۹-۳۴)(۱۰۷-۳)[1]
اور نہ فقیر کے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔

(ح ض ب)

اَلْحَضَبُ کے معنی ایندھن کے ہیں اور آگ کریدنے کی لکڑی کو مِحْضَبٌ کہا جاتا ہے اور حَصَبُ جَهَنَّمَ (۲۱-۹۸) میں ایک قراءت حَضَبُ جَهَنَّمَ (دوزخ کا ایندھن) بھی ہے۔

(ح ض ر)

اَلْحَضَرُ یہ البدو کی ضد ہے اور اَلْحَضَارَۃُ حاد کو فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے جیسا کہ بَدَاوَۃ و بِدَاوَۃ اس کے اصل شہر میں اقامت کے ہیں۔ پھر کسی جگہ پر یا انسان وغیرہ کے پاس موجود ہونے پر حَضَارَۃ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ (۲-۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آ جائے۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَۃَ (۴-۸) اور جب تم میراث کی تقسیم کے وقت ... آموجود ہوں۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (۴-۱۲۸) اور طبائع میں بخل ودیعت کر دیا گیا ہے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ (۸۱-۱۴) تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (۲۳-۹۸) میں کنایہ ہے کہ اے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں کہ جن وشیاطین میرے پاس آحاضر ہوں۔

اور بطور کنایہ مجنون اور قریب المرگ شخص کو مُحْتَضَرٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰-۱۶)

اور آیت کریمہ:۔ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ میں اس معنی پر متنبہ کیا گیا ہے اور آیت کریمہ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا (۳-۳۰) کے معنی یہ ہیں کہ انسان جو نیکی بھی کرے گا۔ قیامت کے دن اس کا اس طرح مشاہدہ اور معاینہ کر لے گا جیسا کہ کوئی شخص سامنے موجود ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ (۷-۱۶۳) اور ان سے اس گاؤں کا حال پوچھو جو لب دریا پر واقع تھا۔ میں حَاضِرَۃَ الْبَحْرِ کے معنی دریا کے قریب (یعنی ساحل کے ہیں) اور آیت کریمہ:۔

تِجَارَةً حَاضِرَةً (۲-۲۸۲) میں حَاضِرَۃٌ

---

[1] وفی التنزیل: ولا تحاضون علی طعام المسکین (۸۹-۱۸)

کے معنی نقد کے ہیں۔ نیز فرمایا: ۔
وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶-۳۲) اور سب کے سب ہمارے روبرو حاضر کئے جائیں گے۔
فِى الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۰-۱۶) وہ عذاب میں ڈالے جائیں گے۔ اور آیت کریمہ: ۔
كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (۵۴-۲۸) ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیئے۔ میں پانی کی باری کے محتضر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ باری والے اس گھاٹ پر موجود ہوں۔
اَلْحَضْرُ۔ خاص کر گھوڑے کی تیز دوڑ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ۔ اَحْضَرَ الْفَرَسُ گھوڑا تیز دوڑا۔ اِسْتَحْضَرْتُ الْفَرَسَ میں نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ حَاضَرْتُهٗ مُحَاضَرَةً وَحِضَارًا باہم جھگڑنا۔ مباحثہ کرنا۔ یہ یا تو حضور سے ہے گویا ہر فریق اپنی دلیل حاضر کرتا ہے اور یا حُضْر سے ہے جس کے معنی تیز دوڑ کے ہوتے ہیں جیسا کہ... جَارَيْتُهٗ کہا جاتا ہے۔
اَلْحَضِيْرَةُ لوگوں کی جماعت جو جنگ میں حاضر کی جائے اور کبھی اس سے پانی پر حاضر ہونے والے لوگ بھی مراد لئے جاتے ہیں۔ اَلْمَحْضَرُ اسم مکان حاضر ہونے کی جگہ اور حَضَرْتُ (فعل) کا مصدر بھی بن سکتا ہے۔

(ح ط ط)

اَلْحَطُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے حَطَطْتُ الرَّحْلَ (میں نے سواری سے پالان اتار کر نیچے رکھ دیا) جَارِيَةٌ مَّحْطُوْطَةُ الْمَتْنِ (دختر نیست شکم کہ پشت وی دراز و ہموار باشد) اور آیت کریمہ:
وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ اور حطة کہنا (۲-۵۸) میں بنی اسرائیل کو یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا جس کے معنی ہیں[1] اے اللہ ہمارے گناہ ہم سے اتار دے بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی قُوْلُوْا صَوَابًا کے ہیں یعنی صحیح بات کہنا۔

(ح ط ب)

اَلْحَطَبُ (ایندھن) ہر وہ چیز جو آگ جلانے کے لئے تیار کی جائے حَطَبٌ کہلاتی ہے اور حَطَبَ (ض) حَطْبًا وَاحْتَطَبَ کے معنی ایندھن جمع کرنا کے ہیں۔ قرآن میں فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۷۲-۱۵) تو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔
اپنی گفتگو میں رطب و یابس ملانے والے کو حَاطِبُ لَيْلٍ کہا جاتا ہے کیونکہ رات کو لکڑی جمع کرنے والا بھی یہ نہیں دیکھتا کہ رسی میں کیا باندھ رہا ہے۔
حَطَبْتُ لِفُلَانٍ حَطَبًا کسی کے لئے کام کرنا۔
مَكَانٌ حَطِيْبٌ وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں (صفت از حَطَبَ الْمَكَانُ)
نَاقَةٌ مُّحَاطِبَةٌ (ناقہ کہ خار خشک خورد)
اور آیت کریمہ: ۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۱۱۱-۴) جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے۔ میں سخن چینی سے استعارہ ہے۔ اور حَطَبَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ کے معنی کسی کی چغلی کھانا کے ہیں۔

---

[1] وہی مصدر من حط عنا ذنوبنا رفع حکایۃ (راجع الطبری (۱: ۲۳۰) و مجاز ابی عبیدۃ (۱: ۴۱) و فتح الباری

۱۲ :: ۲۲۹/۸

اسی طرح کہا جاتا ہے فُلَانٌ یُوْقِدُ بِالْحَطَبِ الْجَزْلِ (مثل) فلاں بہت بڑا چغل خور ہے۔

(ح ط م)

اَلْحَطْمُ کے اصل معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں جیسا کہ اَلْهَشْیِمُ وغیرہ الفاظ اسی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر کسی چیز کو ریزہ ریزہ کر دینے اور روندنے پر حَطْمٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمَانُ وَجُنُوْدُهٗ (۲۷-۱۸) ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں۔ کہا جاتا ہے حَطَمْتُهٗ فَانْحَطَمَ (میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ چیز ٹوٹ گئی)

سَائِقٌ حُطَمٌ بے رحم چرواہا۔ جو اونٹوں کو سخت ہنکا کر ان پر ظلم کرے[1] اور دوزخ کو حُطَمَۃ کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فِی الْحُطَمَۃِ وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَۃُ (۱۰۴-۴،۵) حطمہ میں۔۔۔ اور تم کیا سمجھے کہ حُطَمَہ کیا ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر بہت زیادہ کھانے والے کو بھی حُطَمَۃٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے پیٹ کو تنور کے ساتھ تشبیہ دی ہے[2] ع (   )

(   ) کَاَنَّمَا فِیْ جَوْفِهٖ تَنُّوْرٌ

گویا اس کے پیٹ میں تنور ہے۔

دِرْعٌ حُطَمِیَّۃٌ زرہ بننے والے یا استعمال کرنے والے کی طرف منسوب ہے اور حَطِیْمٌ وَزَمْزَمُ (حرم میں) دو جگہوں کے نام ہیں۔

اَلْحُطَامُ جو خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔

قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُهٗ حُطَامًا (۳۹-۲۱) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے پھر اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔

(ح ظ ظ)

اَلْحَظُّ کے معنی معین حصہ کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَظِظَ وَاَحَظَّ فَهُوَ مَحْظُوْظٌ حَظٌّ کی جمع اَحَاظٍ وَاُحُظٌّ آتی ہے قرآن میں ہے۔

فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِهٖ مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جوان کو کی گئی تھی ایک حصہ فراموش کر دیا (۵-۱۴)

لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (۴-۱۱) کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

(ح ظ ر)

اَلْحَظْرُ (ن) کے معنی کسی چیز کو حَظِیْرَہ یعنی احاطہ میں جمع کرنے کے ہیں اور ممنوع کو مَحْظُوْر کہا جاتا ہے۔ اَلْمُحْتَظِرُ باڑہ بنانے والا۔ قرآن میں ہے:۔

فَکَانُوْا کَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴-۳۱) تو وہ ایسے ہو گئے جیسے باڑ والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔

جَاءَ فُلَانٌ بِالْحَظِرِ الرَّطْبِ (مثل) یعنی اس نے بہت قبیح جھوٹ بولا۔

---

[1] ومنہ الحدیث شر الرعاء الحطمۃ وفی روایۃ بغیر ہاء (النہایہ) [2] لم اجدہ

(ح ف ف)

(اَلْحَفُّ) (ن) کے معنی کسی چیز کو سافتین یعنی دونوں جانب سے گھیرنے یا احاطہ کرنے کے ہیں، قرآن میں ہے:-

وَحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ (۱۸-۳۲) اور ان کے گرد اگرد کھجوروں کے درخت لگا دیئے تھے۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹-۷۵) اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔

یعنی اس کے دونوں جانب کو گھیرے ہوئے ہیں ایک حدیث میں ہے[1]:- (۸۹)

تَحُفُّهُ الْمَلَائِكَةُ بِاَجْنِحَتِهَا اسکو فرشتے اس پر اپنے پروں کے ساتھ گھیرا ڈال لیتے ہیں

شاعر نے کہا ہے[2] ع (طویل)

(۱۱۳) لَهُ لَحَظَاتٌ فِىْ حَفَافَىْ سَرِيْرِهٖ

اس کی نظریں اس کے تخت کے دونوں جانب لگی رہتی ہیں۔

حَفَافٌ کی جمع اَحِفَّةٌ ہے۔ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ فِىْ حَفَفٍ مِنَ الْعَيْشِ یعنی تنگ حال ہے[3]۔ گویا وہ خوشحالی سے ایک جانب میں ہے۔

اس کے برعکس خوشحالی کے لئے کہا جاتا ہے۔ هُوَ فِىْ قَرَاسِطَةٍ مِنَ الْعَيْشِ اسی سے محاورہ ہے[4] (مثل)

مَنْ حَفَّنَا اَوْرَفَّنَا فَلْيَقْتَصِدْ - یعنی جو شخص ہماری تعریف کرے اسے چاہیئے کہ درمیانہ روی سے کام لے (نہایہ)

حَفِيْفُ الشَّجَرِ وَالْجَنَاحِ درخت کے ہلنے یا پرندکے پروں کی سرسراہٹ۔ یہ حکایت صوت ہے۔

اَلْمِحَفَّةُ شانہ بافندہ تیغ آں کیونکہ اس سے حرکت کے وقت آواز آتی ہے۔

(ح ف د)

اَلْحَافِدُ۔ ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو تبرعًا تیزی کے ساتھ خدمت بجا لائے خواہ وہ اجنبی ہو یا رشتہ دار۔ اسی کی جمع حَفَدَةٌ آتی ہے قرآن میں ہے:-

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (۱۶-۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔

مفسرین کا قول ہے کہ یہاں حَفَدَةٌ سے

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظ فی فضیلۃ مجلس الذکر عن ابی ہریرۃ وغیرہ رواہ مسلم والغزالی فی الاحیاء راجع تخریج العراقی ۱/۳۰۲ ونہایۃ ابن الاثیر ۱/۴۰۸ [2] قالہ ابراہیم بن ہرمۃ فی مدیح المنصور واجازہ بہ عشرۃ آلاف کما فی ذیل الامالی (۴۰) وتمامہ: .... اذا کرا فیہا عقاب ونائل۔ راجع للبیت الحیوان (۳/۱۳۴) والاغانی ۴/۱۰۹) وعیون الاخبار (۱/۴ ۲۹) وفی روایتہم جمیعًا عن حفافی وفی العقد (۴ : ۳۲۹) عن حفافی سریرہ وفی العمدۃ (۲ : ۱۰۹) عن خفافی وفی الحصری (۲: ۲۶۲) من بدل عن وفی العقد (۱: ۳۷۰) عذاب بدل عقاب ولیعدہ: فام الذی امنت آمنۃ الردی ـــ وام الذی اوعدت بالشکل ثاکل وفی روایۃ حاولت والبیت فی البحر (۷: ۲۷۴) من غیر عزو [3] ومنہ الحدیث انہ علیہ السلام لم یشبع من طعام الاعلی حفف ای ضیق وقلۃ (نہایہ ۱/۴۰۸) [4] مثل وفی روایۃ فلیترک راجع للمثل المیدانی ۲/۱۷۶، ۲۲۱، ۲۲۷ والعسکری ۴/۱۸۴، ۲/۱۹۱ وشرح الدرۃ للخفاجی ۸۳

مراد اَسْبَاط یعنی پوتے نواسے وغیرہم ہیں۔ کیونکہ ان کی خدمت زیادہ سچی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۱۱۴) " حَفَدَ الْوَلَائِدُ بَيْنَهُنَّ "

فُلَانٌ مَحْفُوْدٌ فلاں مخدوم ہے۔

الغرض حَفَدَةٌ کا اطلاق سسرا اولاد دونوں طرف کے رشتہ داروں پر ہوتا ہے۔ اور دعا میں ہے[2]۔ اِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ ہم تیری طرف دوڑتے ہیں۔

سَيْفٌ مُحْتَفِدٌ قاطع تلوار۔

اصمعی کہتے ہیں کہ اصل میں حَفْدٌ کے معنی پھرتی اور جلدی کرنا کے ہیں۔

(ح ف ر)

اَلْحَفَرُ۔ وہ مٹی جو گڑھے سے نکالی جاتی ہے (بہ اسم مفعول کے معنی میں ہے) جیسا کہ نَقَضٌ بمعنی منقوض آجاتا ہے۔

اَلْحُفْرَةُ وَالْحَفِيْرَةُ گڑھا۔ قرآن میں ہے:۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (۳-۱۰۲) اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔

اَلْمِحْفَارُ وَالْمِحْفَرُ وَالْمِحْفَرَةُ بیلچہ وغیرہ جس سے گڑھا کھودا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کو حَافِرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دوڑتے وقت اپنے سم سے مٹی اڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَئِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ (۷۹-۱۰) کیا ہم الٹے پاؤں پھر لوٹیں گے؟۔ میں مَرْدُوْدٌ فِي الْحَافِرَةِ۔ ایک مثل ہے اور یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو جدھر سے آئے اسی طرف لوٹا دیا جائے ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ حَافِرَةٌ سے مراد وہ زمین ہے جس میں ان کی قبریں بنائی گئی تھیں اور حَافِرَةٌ یہاں موضع حال میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ کیا ہم لوٹائے جائیں گے اس حال میں کہ قبروں میں ہوں گے۔ محاورہ ہے۔ رَجَعَ عَلٰى حَافِرَتِهٖ اَوْ رَجَعَ الشَّيْخُ اِلٰى حَافِرَتِهٖ یعنی بوڑھا ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶-۷۰) آیا ہے۔

اور جو چیز نقد فروخت کی جائے اس کے متعلق عرب لوگ کہتے ہیں[3] (مثل) اَلنَّقْدُ عِنْدَ الْحَافِرَةِ۔ اور اصل میں یہ گھوڑے کی بیع کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جیسے:۔ لَا يَزُوْلُ حَافِرُهٗ اَوْ يُنْقَدَ ثَمَنُهٗ کہ اس

---

[1] تکملۃ البیت: ...... واُسلمت بأکفھن ازمۃ الاجمال۔ البیت من شواہد ابی عبیدۃ فی مجازہ (۱: ۳۶۳) ونسبہ لجمیل بن عبداللہ العذری والبیت فی الطبری (۱۴: ۱۴۳-۱۴۴) واللسان والتاج (حفد) والانصاف (۹،۷) والبحر المحیط (۵: ۵۰) بغیر عزو والجمہرۃ (۲: ۱۲۳) والقرطبی (۱: ۱۴۳) ونسبہ ابن درید الی الفرزدق ومسائل نافع بن الازرق (ترتیب فؤاد عبدالباقی) قال مرتبہ ولا ادری کیف اضبطہ وجمیل ہو جمیل بن عبداللہ الی سلی العذری من شعراء الدولۃ الامویۃ لہ ترجمۃ فی الشعراء والاغانی (۷: ۷۲) والخزانۃ (۱: ۱۹۰) وغریب ابی عبید (۳/۴: ۲۷) ونسبہ الی الاخطل ولیس فی دیوانہ ۱۲

[2] کلمۃ من دعاء القنوت فی الوتر راجع غریب القرآن للقتبی ۲۴۷ واللسان (حفد) والطبری ج ۱۴ وسنعید تخریجہ فی (قنت) وہناک المصادر ان شاء اللہ

[3] کذا فی اللآلی (۱: ۱۲۱) والقالی (۱: ۲۶-۲۷) وفی مجالس ثعلب فقال عند السبق ای عند اول یقع الفرس رجلہ اذا سبق راجع المیدانی ۲/۲۶۴ نقلا عن ثعلب وقد اسہب اللسان فی شرحہ (حفد) ۱۲

کا اسم یہاں سے جدا نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی قیمت نقد ادا نہ کی جائے۔

اَلْحَفَرُ: تاکل الاسنان دانتوں کی زردی ان کو کھا جاتی ہے۔

حُفِرَ فُوْهُ حَفَرًا اس کے دانت خراب ہوگئے

اَحْفَرَ الْمُهْرُ بچھڑے کے ثنائی یا رباعی دانت گر گئے

(ح ف ظ)

اَلْحِفْظُ کا لفظ کبھی تو نفس کی اس ہیئت (یعنی قوت حافظہ) پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ جو چیز سمجھ میں آئے وہ محفوظ رہتی ہے اور کبھی دل میں یاد رکھنے کو حفظ کہا جاتا ہے۔ اس کی ضد نسیان ہے، اور کبھی قوت حافظہ کے استعمال پر یہ لفظ بولا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔

حَفِظْتُ کَذَا حِفْظًا یعنی میں نے فلاں بات یاد کرلی۔ پھر ہر قسم کی جستجو نگہداشت اور نگرانی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵-۹) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ (۲-۲۳۸) سب نمازیں... پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳-۵) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (۳۳-۳۵) اور اپنے ستر کی حفاظت کرنیوالے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں... میں حفظ فرج عفت اور پاکدامنی... سے کنایہ ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ [1] اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہیں (۴-۳۴) کے معنی یہ ہیں کہ اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ان کے عہد کی حفاظت کرتی ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے۔ اور ایک قرأت میں حَفِظَ اللّٰهَ اللہ پر نصب کے ساتھ ہے اس وقت معنی یہ ہوں گے کہ وہ اللہ کے حق کی نگہبانی کے لئے حفاظت کرتی ہیں نہ کہ کسی قسم کی ریاکاری اور تصنع کے طور پر۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا (۴-۸۰) تو اے پیغمبر تمہیں ہم نے ان کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ میں حفیظ بمعنی حافظ یعنی نگہبان کے ہیں جیسا کہ:۔ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰-۴۵) اور وَمَآ اَنْتَ بِوَكِیْلٍ (۶-۱۰۸) میں فَعَّال اور فَعِیْل بمعنی فَاعِلٌ ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا (۱۲-۶۴) تو خدا ہی بہتر نگہبان ہے۔

میں ایک قراءت حِفْظًا ہے یعنی اس کی حفاظت دوسروں سے بہتر ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِیْظٌ (۵۰-۴) اور ہمارے پاس تحریری یادداشت بھی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ کتاب ان کے اعمال کی حفاظت کرنے والی ہے تو یہاں بھی حفیظ بمعنی حافظ ہے جیسا کہ اَللّٰهُ حَفِیْظٌ عَلَیْهِمْ (۶-۱۰۴) میں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حفیظ بمعنی محفوظ ہو یعنی وہ کتاب ضائع نہیں ہوگی۔

---

[1] ای فی صورہن والتزام ازواجہن النفقۃ علیہن قالہ الزجاج (الطبری ۵/۹۵)

جیسے فرمایا:۔
عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى .... (۲۰-۵۲)
اَلْمُحَافَظَةُ وَالْحِفَاظُ (مفاعلہ) ایک دوسرے کی حفاظت کرنا اور آیت کریمہ:۔
وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ (۷۰-۳۴) اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں۔
میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات اور اس کے ارکان کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی پابندی کرتے ہیں۔ اور نماز ان کی حفاظت کرتی ہے۔ یعنی وہ انہیں بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے جیسے فرمایا:۔
اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹-۴۵) کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔
اَلتَّحَفُّظُ (تفعل) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عقل کی کمی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی قوت حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تکلف سے کسی چیز کو یاد کرنے کے ہیں۔ اور قوت حافظہ چونکہ اسباب عقل سے ہے اس لئے اس کی تفسیر میں لوگوں نے وسعت سے کام لیا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

اَلْحَفِيظَةُ کے اصل معنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے غصہ اور حمیت سے کام لینے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ محض غصہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے کہا جاتا ہے۔
اَحْفَظَنِي فُلَانٌ ۔ یعنی فلاں نے مجھے غصہ دلایا۔

(ح ف و)

اَلْاِحْفَاءُ کے معنی کسی چیز کے مانگنے میں اصرار کرنے یا کسی کی حالت دریافت کرنے کے لئے بحث اور کاوش میں لگے رہنے کے ہیں پہلے معنی کے لحاظ سے اَحْفَيْتُ السُّؤَالَ وَاَحْفَيْتُ فُلَانًا فِي السُّؤَالِ دونوں طرح کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنْ يَسْئَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا (۴۷-۳۷) اگر وہ تم سے مال طلب کرے اور تمہیں تنگ کرے تو تم بخل کرنے لگو۔
اصل میں یہ اَحْفَيْتُ الدَّابَّةَ (اسے سادہ گردانیدم پائے ستور را) سے ہے۔ جس کے معنی گھوڑے یا اونٹ کو زیادہ چلا کر اس کے سم یا پاؤں کو گھسا ہوا کر دینے کے ہیں۔ اور حَفِيَ حَفًا وَحَفْوَةً کے معنی زیادہ چلنے سے پاؤں کے چھل جانے کے ہیں۔ اسی سے اَحْفَيْتُ الشَّارِبَ (نیک برید بروت را) ہے جس کے مونچھوں کو اچھی طرح کاٹ کر صاف کر دینے کے ہیں۔
اَلْحَفِيُّ ۔ نیکوکار اور نہایت مہربان۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا (۱۹-۴۷) بے شک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔
کہا جاتا ہے اَحْفَيْتُ بِفُلَانٍ وَتَحَفَّيْتُ بِهِ میں نے اس کے اعزاز و اکرام کے بجا لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔
اَلْحَفِيُّ (ایضًا) کسی چیز کا اچھی طرح جاننے والا۔[1]

---

[1] فی التنزیل يَسْئَلُونَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا (۷-۱۸۷) ای کانک عالم بہا۔

(ح ق ق)

اَلْحَقُّ (حق) کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے اور لفظ "حق" کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ (۶-۶۲) پھر (قیامت کے دن تمام) لوگ اپنے مالک برحق خدا تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔

نیز فرمایا:۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۱۰-۳۲) یہی خدا تو تمہارا پروردگار برحق ہے اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے سوا ہے ہی کیا؟ تو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

(۲) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ ..... مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۰-۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں ..... یہ (سب کچھ) خدا نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔

اور قیامت کے متعلق فرمایا:۔

وَيَسْتَنْۢبِـــُٔـوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (۱۰-۵۳) اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ سچ ہے کہہ دو ہاں خدا کی قسم سچ ہے

وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (۳-۷۱) اور حق کو کیوں چھپاتے ہو۔ نیز فرمایا:۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۳-۶۰) (یہ بات) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔

وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۲-۱۴۹) بےشبہ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔

(۳) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں۔ کہ بعث ثواب وعقاب اور جنت ودوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔ قرآن میں ہے:

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (۲-۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی۔

(۴) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جسطرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (۱۰-۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد ..... ثابت ہو کر رہا۔

حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـــَٔنَّ جَهَنَّمَ (۳۲-۱۳) میری طرف سے یہ بات قرار پاچکی ہے کہ میں دوزخ کو ..... بھردوں گا۔

اور آیت کریمہ:۔
وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ (۲۳-۷۱) اور اگر (خدائے) برحق ان کی خواہشوں پر چلے۔
میں الحق سے مراد ذات باری تعالیٰ بھی ہو سکتی ہے اور وہ حکم بھی ہو سکتا ہے جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ کہا جاتا ہے۔
اَحْقَقْتُ کَذَا میں نے اس کا حق ہونا ثابت کر دیا یا اس پر حق ہونے کا حکم لگایا۔ اور آیت کریمہ:۔
لِيُحِقَّ الْحَقَّ (۸-۸) تاکہ سچ کو سچ کر دے۔
پس احقاق حق دو طرح ہو سکتا ہے (۱) ادلہ اور آیات کے اظہار سے جیسے فرمایا:۔ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (۴-۹۱) یعنی ہم نے تمہیں ان پر حجت تو یہ عطا فرمائی (۲) شریعت حقہ کی تکمیل اور لوگوں میں اس کی نشر و اشاعت کے ذریعہ جیسے فرمایا:۔
وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۶۱-۸) حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۶۱-۹) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے اور سب دینوں پر غالب کرے۔ اور آیت کریمہ:۔
اَلْحَآقَّةُ مَا الْحَآقَّةُ (۶۹-۱،۲) سچ مچ ہونے والی، وہ سچ مچ ہونے والی کیا ہے۔
میں قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اور قیامت کو حَآقَّةٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جزائے اعمال واقع ہوگی۔
کہا جاتا ہے:۔ حَاقَقْتُهٗ فَحَقَقْتُهٗ میں نے حق کے متعلق اس سے جھگڑا کیا اور اس پر غالب رہا۔
حضرت عمرؓ کا فرمان ہے۔[1] (۹۰)
"اِذَا النِّسَاءُ بَلَغْنَ نَصَّ الْحِقَاقِ فَالْعَصَبَةُ اَوْلٰى فِيْ ذٰلِكَ" جب عورتیں بالغ ہو جائیں تو عصبہ زیادہ حقدار ہیں۔
فُلَانٌ نَزِقُ الْحِقَاقِ فلاں معمولی باتوں میں جھگڑا کرتا ہے اور کبھی لفظ حق واجب، لازم اور لائق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰-۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔
كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰-۱۰۳) اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔
اور آیت کریمہ:۔
حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ..... (۷-۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ کہوں سچ ہی کہوں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ حقیق بمعنی جدیر (یعنی سزاوار) ہے اور بعض نے بمعنی واجب لکھا ہے ایک قرأت میں حَقِيْقٌ عَلَيَّ بھی ہے نیز فرمایا:۔
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ (۲-۲۲۸) اور ان کے خاوند ..... (اس مدت) میں ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔

---

[1] كذا نسبه المؤلف الى عمرؓ والذی فی اللسان ومختار الصحاح للرازی ۸ ۲۹ وغریب ابی عبید ۳ ر ۵۷ ۴ و الفائق ۱/ ۲۷۶ والنهایة (حق) انه من قول علی رضہ فی روایة نص الحقائق والمراد بنص الحقائق الادرک یعنی ما وانہ الجاریة صغیرۃ فامها اولیٰ بها فاذا بلغت فالعصبۃ اولیٰ من امها انظر ایضاً کنز العمال ۱۱ رقم ۱۶۵ ۔

اور اَلْحَقِیْقَةُ کا لفظ کبھی اس چیز کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جیسے ثبات اور وجود حاصل ہو جیسے آنحضرتؐ نے حارثہؓ سے پوچھا تھا (۱) کہ لِكُلِّ حَقٍّ حَقِيْقَةٌ فَمَا حَقِيْقَةُ اِيْمَانِكَ کہ ہر حق چیز کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ تو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے یعنی یہ کیسے معلوم ہو کہ جس چیز کے تم مدعی ہو وہ حق ہے۔

فُلَانٌ يَحْمِيْ حَقِيْقَتَهٗ یعنی وہ اس چیز کی حفاظت کرتا ہے جس کی حفاظت اس پر واجب ہو۔

کبھی حَقِيْقَةٌ کا لفظ اعتقاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور کبھی عمل اور قول کے متعلق جیسے کہا جاتا ہے فُلَانٌ لِفِعْلِهٖ حَقِيْقَةٌ فلاں کا فعل صحیح ہے یعنی وہ ریاکار نہیں ہے۔ وَلِقَوْلِهٖ حَقِيْقَةٌ یعنی وہ نہ رخصت پر عمل کر رہا ہے اور نہ زیادتی سے کام لے رہا ہے۔ اس کے برعکس معنی میں متجوز، متوسع یا متفسح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ کہا گیا ہے۔

اَلدُّنْيَا بَاطِلٌ وَالْاٰخِرَةُ حَقِيْقَةٌ کہ دنیا فانی ہے اور بقا صرف آخرت کو ہے۔

فقہا اور متکلمین کے نزدیک حقیقت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی لفظ اصل لغت کے لحاظ سے اپنے معنی موضوع لہ میں استعمال ہو۔

اَلْحِقُّ وہ اونٹ جو بار برداری کے قابل ہو جائے مونث حِقَّةٌ ج حِقَاقٌ اور کہا جاتا ہے۔

اَتَتِ النَّاقَةُ عَلٰى حِقِّهَا یعنی وہ وقت آگیا ہے۔ جس میں گزشتہ سال اس پر اونٹ بٹھایا گیا تھا۔

(ح ق ب)

قرآن میں ہے :-

لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ج (۷۸-۲۳) اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ اَحْقَاب کا واحد حُقُبٌ ہے جس کے معنی زمانہ کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حِقْبَةٌ کا لفظ اسی سال کی مدت پر بولا جاتا ہے (۲) اس کی جمع حِقَبٌ آتی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ مدت غیر معینہ پر بولا جاتا ہے۔

اَلْاِحْتِقَابُ (افتعال) سوار کا اپنے پیچھے حقیبہ یعنی سامان سفر کا تھیلا باندھنا چنانچہ کہا جاتا ہے۔ اِحْتَقَبَهٗ وَاسْتَحْقَبَهٗ اس نے اسے پالان کے پیچھے باندھ لیا۔ حَقِبَ الْبَعِيْرُ شتر کے غلاف نرہ میں اس کے تنگ کے داخل ہونے کی وجہ سے پیشاب کا رک جانا یا تکلیف سے آنا۔

اَلْاَحْقَبُ سرخ رنگ کا گورخر بعض نے کہا ہے کہ اَحقب اس گورخر کو کہتے ہیں جس کے دونوں پہلو باریک ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ سفید پہلوؤں والے گورخر کو کہا جاتا ہے اس کا مونث حَقْبَاءُ ہے۔

(ح ق ف)

اَلْحِقْفُ منحنی تودہ ریت اس کی جمع اَحْقَافٌ ہے۔ قرآن میں ہے :-

اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ (۴۶-۲۱) کہ جب

---

(۱) وفی تاریخ الطبری قال شیخ من بنی عامر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل قول حقیقۃ فانبئنی بحقیقۃ قولک و بدء خبرک (۱ : ۵۷۵) ۔ (۲) روی ذالک عن ابن عمرو ابی ہریرۃ و عن الحسن انہ سبعون سنۃ وقال الفراء انہ سنۃ بلغۃ قریش (راجع التاج) ۔

انھوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ہدایت کی۔
ظَبْيٌ حَاقِفٌ وہ ہرن جو ریت کے تودوں میں رہتا ہو
اِحْقَوْقَفَ۔ مائل ہو کر ریت کے تودہ کی طرح ہو
جانا شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۱۱۵) سَمَاوَةَ الْهِلَالِ حَتّٰى احْقَوْقَفَا
چاند کو راتیں تاریک کر رہی ہیں حتی کہ وہ کمان کی طرح خمیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

(ح ك م)

حَكَمَ کے اصل معنی کسی چیز کی اصلاح کے لئے اسے روک دینے کے ہیں۔ اسی بنا پر لگام کو حَكَمَةُ الدَّابَّةِ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتا ہے) کہا جاتا ہے۔ حَكَمْتُ الدَّابَّةَ میں نے اسے لگام دی۔ اسی طرح حَكَمْتُ السَّفِيْنَةَ وَاَحْكَمْتُهَا بھی کہا جاتا ہے۔
شاعر نے کہا ہے[2] (الوافر)

(۱۱۶) اَبَنِیْ حَنِيْفَةَ اَحْكِمُوْا سُفَهَاءَكُمْ
اے بنی حنیفہ اپنے سفہاء کے منہ میں لگام دو۔

قرآن میں ہے
اَحْكَمَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا (یعنی) پیدا کیا۔
فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيَاتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲-۵۲) تو جو (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔
اَلْحُكْمُ کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کا نام حکم ہے یعنی وہ اس طرح ہے یا اس طرح نہیں ہے خواہ وہ فیصلہ دوسرے پر لازم کر دیا جائے یا لازم نہ کیا جائے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴-۵۸) اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔
يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ (۵-۹۵) جسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کر دیں۔
شاعر نے کہا ہے[3] (البسیط)

(۱۱۷) فَاحْكُمْ كَحُكْمِ فَتَاةِ الْحَيِّ اِذْ نَظَرَتْ
اِلٰى حَمَامٍ سِرَاعٍ وَارِدِ الثَّمَدِ
اس نوجوان عورت کی طرح عدل و انصاف سے فیصلہ کر جس نے پانی پر وارد ہونے والی کبوتروں کی ٹکڑی کو دیکھ کر ان کی صحیح تعداد بتادی تھی) اور بعض نے اس کے معنی کن حکیما کئے ہیں نیز فرمایا۔
اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵-۵۰) کیا یہ زمانہ جاہلیت کے حکم کے خواہاں ہیں۔ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟
اور جو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے اسے حَاكِمٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع حُكَّامٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے۔
وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ (۲-۱۸۸) اور نہ اس کو

---

[1] قاله العجاج راجع لتخریجه ذرلف ...... [2] قاله جریر وتمامه ...... انی اخاف علیکم ان اغضبا۔ راجع للبیت البحر المحیط (۵: ۲۰۰، ۴: ۳۳۷) و دیوانه ۷ والفائق (۱: ۴۱) والمحکم (حکم) [3] قاله النابغة وقال بعضهم انه لیس من الحکم فی شیء بل معناه کن حکیما وانظر للبیت دیوانه ۳۳ وشرح البطلیوسی وادب الکاتب ۲۲ والاقتضاب ۴۲۹ وشواهد الکشاف ۳۲ ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۸۷) والنحزة (۲: ۹۱) والجمحی ۸۵ والکتاب (۱: ۸۵) والعمدة الثمین والعشر للتبریزی ۷۹ والمعانی للقتبی ۲۹۹ والعینی (۲: ۲۵۴) والسیوطی ۱۸ وذیل اللآلی (۱: ۲۲۹) وابن الشجری (۲: ۲۸۹) والصناعتین ۱۴۷ فی خمسة ابیات وفی روایة ثمر اع کما فی الحیوان (۳: ۲۲۱) وهی روایة الاصمعی کما فی الخزانة (۱: ۳۰۰) لکن روایة النسب۔

رشوۃ، حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔

اور حَکَمٌ (منصف) ماہر حاکم کو کہا جاتا ہے اس لئے اس میں لفظ حاکم سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا (۶-۱۱۴) کہو کیا میں خدا کے سوا اور منصف تلاش کروں۔

اور آیت کریمہ:۔

فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا (۴-۳۵) تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔

میں حَاكِمًا کی بجائے حَكَمًا کہنے سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ دو منصف مقرر کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ دونوں تفصیلات کی طرف مراجعت کئے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں خواہ وہ فیصلہ فریقین کی مرضی کے موافق ہو یا مخالف اور حَكَمٌ کا لفظ واحد جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔

تَحَاكَمْنَا إِلَى الْحَاكِمِ ہم حاکم کے پاس فیصلہ لے گئے قرآن میں ہے:۔

يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ (۴-۶۰) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں۔

حَكَّمْتُ فُلَانًا۔ کسی کو منصف مان لینا۔ قرآن میں ہے:۔

حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (۴-۶۵) جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے حَكَمَ بِالْبَاطِلِ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے باطل کو بطور حکم کے جاری کیا اَلْحِكْمَةُ کے معنی علم وعقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں۔ لہذا حکمت الہی کے معنی اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت احکام کے ساتھ انکو موجود کرنا ہیں اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو سرانجام دینے کا نام ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ (۳۱-۱۲) اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی۔

میں حکمت کے یہی معنی مراد ہیں جو کہ حضرت لقمان کو عطا کی گئی تھی۔ لہذا جب اللہ تعالے کے متعلق حکیم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے کے ہوتے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالی نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا ہے۔

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ (۹۵-۸) کیا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

اور قرآن پاک کو حکیم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حکمت کی باتوں پر مشتمل ہے جیسے فرمایا،

الٓرٰ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ (۱۰-۱) یہ بڑی دانائی کی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نیز فرمایا:۔

وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّنَ الْأَنبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ (۵۴-۴، ۵) اور ان کو ایسے حالات (سابقین) پہنچ چکے ہیں جن میں عبرت ہے اور کامل دانائی (کی کتاب بھی)۔

اور بعض نے کہا ہے کہ قرآن پاک کے وصف میں حکیم بمعنی محکم ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ (۱۱-۱) جس کی آیتیں مستحکم ہیں۔

اور یہ دونوں قول صحیح ہیں کیونکہ قرآن پاک کی آیات مُحْكَم بھی ہیں اور ان میں پراز حکمت احکام بھی ہیں لہذا ان ہر دو معانی کے لحاظ سے

قرآن محکم ہے۔
حکم کا لفظ حکمۃ سے عام ہے ہر حکمت کو حکم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر حکم حکمت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حکم کے معنی کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں کہ وہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے۔
آنحضرت نے فرمایا[1] (۹۲) اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً۔ کہ بعض اشعار مبنی بر حکمت ہوتے ہیں جیسا کہ لبید نے کہا ہے[2] (وہ ل)

(۱۱۸) اِنَّ تَقْوٰی رَبِّنَا خَیْرُ نَفَلْ
کہ خدائے تعالیٰ کا تقویٰ ہی بہترین نوشہ ہے۔

قرآن میں ہے:۔
وَاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا (۱۹-۱۲) اور ہم نے ان کو لڑکپن میں ہی دانائی عطا فرمائی تھی۔
اور آنحضرت نے فرمایا[3] ۹۳ اَلصَّمْتُ حُکْمٌ وَ قَلِیْلٌ فَاعِلُہٗ کہ خاموشی بھی حکمت ہے۔ لیکن بہت تھوڑے لوگ اسے اختیار کرتے ہیں۔
یہاں (آیت اور حدیث میں) حکم کے معنی حکمت کے ہیں[4]۔ قرآن میں ہے:۔

وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (۲-۱۲۹) اور (ان لوگوں) کو کتاب اور دانائی سکھایا کرے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ (۳۳-۳۴) اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔
میں حکمت سے مراد تفسیر قرآن ہے یعنی جس بہ کہ قرآن نے آیت اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ...... میں تنبیہ کی ہے کہ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے حکمت بنا دیتا ہے تو اس میں ترغیب ہے کہ لوگوں کو اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیئے۔
ابن عباس فرماتے ہیں[5] کہ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ میں حکمت سے ناسخ منسوخ محکم اور متشابہات کا علم مراد ہے۔ اور ابن زید کہتے ہیں کہ آیات حکم کا علم مراد ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ حکمت سے سنت نبوی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حقائق قرآن کا فہم مراد ہے۔ کیونکہ بعض حقائق کا

---

[1] انظر الحدیث (حم ق د ہ) عن ابی (ت) عن ابن مسعود (طب) عن عمرو بن عوف (ع) عن ابی بکرۃ (حل) عن ابی ہریرۃ (خط عن عائشۃ عن حسان بن ثابت (ابن عساکر عن عمر) (ق) عن ابن عباس (عسکری عن عائشۃ) (کر عن عائشۃ) (وفی کلہا حکمۃ بدون اللام ولبا ط قال فیہا حکما و فی بعضہا لحکما انظر کنز العمال لعلی المتقی (۳ / ۳۲۲) ثم ذکرہ ۳۲ و ۲ (ام) عن احمر بن بکرۃ الاسدی وفیہ لحکمۃ کما رواہ الاکثر ۱۲ [2] قال لبید بن ربیعۃ العامری وتمامہ: وباذن اللہ ریثی وعجل۔ البیت فی دیوانہ ۳۹ وامالی المرتضی (۱ - ۲۱) والعقد (۲: ۳۷۸) والمشکل للقتیبی ۲ وغریبہ ۷۷ وجمہرۃ الاشعار ۷ انالکامل (۲: ۲۴۴) ونظام الغریب ۲۳۷ والبحر (۴: ۵۵) واللسان (نفل) وشواہد الکشاف ۹ ۲۲ والطبری (۹: ۱۷) والقرطبی (۷: ۳۶۱) ومجاز القرآن رقم ۲ ۲۷ وفی کنز العمال (۳: ۴۸۹) ان عمر بن الخطاب کان یامر بروایۃ ہذہ القصیدۃ (دیکھ) [3] اخرجہ ابو منصور الدیلمی فی مسند الفردوس من حدیث ابن عمر بسند ضعیف والبیہقی فی الشعب والقضاعی من حدیث انس ان لقمان قال الخ کما فی البیہقی وروضۃ العقلاء ۴۸ بسند صحیح عن انس راجع کنز العمال ۳ / ۲۰۰ - رقم ۵۲ ۷ وتخریج الاحیاء للعراقی ۳ / ۱۱۸ وفی الاحیاء الصمت حکمۃ غلط، غلط فیہ عثمان بن سعید الراوی [4] راجع الطبری (۱: ۴۷۶) وقول السدی ہو المنقول عن قتادۃ راجع فتح القدیر للشوکانی ۱۲

بیان اولوالعزم پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور اس معاملہ میں دوسرے انبیاء ان کے تابع ہوتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
یَحْکُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا (۵-۴۴) اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے۔ یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں۔ میں یَحْکُمُ کے معنی اس حکمت کے بیان کرنے کے ہیں جو انبیاء کے ساتھ مختص ہوتی ہے اور یا یہ حکم ہی سے ماخوذ ہے یعنی فیصلہ کرتے رہے ہیں اور آیت کریمہ:۔
مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (۳-۷) جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں۔ میں محکمات سے وہ آیات مراد ہیں جن میں لفظی اور معنوی اعتبار سے کسی قسم کا اشتباہ نہ پایا جاتا ہو اور متشابہ کی چند قسمیں ہیں جنہیں ان کے باب (ش ب ہ) میں بیان کیا جائیگا انشاء اللہ تعالےٰ۔
حدیث میں ہے (۴۹) کہ جنت مُحَکَّمِیْن کے لئے ہے بعض نے کہا ہے کہ مُحَکَّمِیْن سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کہا جائے کہ یا تو مرتد ہو جاؤ ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے تو وہ قتل ہونا پسند کریں اور بعض نے کہا ہے کہ محکمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکمت کے ساتھ متخصص ہیں۔

ح ل ل

اَلْحَلُّ اصل میں حَلٌّ کے معنی گرہ کشائی کے ہیں ۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ (۲۰-۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔
میں یہی معنی مراد ہیں اور حَلَلْتُ کے معنی کسی جگہ پر اترنا اور فروکش ہونا بھی آتے ہیں۔ اصل میں یہ حَلُّ الْاَحْمَالِ عند النزول سے ہے جس کے معنی کسی جگہ اترنے کے لئے سامان کی رسیوں کی گرہیں کھول دینا کے ہیں پھر محض اترنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ لہذا حَلَّ (ن) حُلُوْلًا کے معنی کسی جگہ پر اترنا ہیں اور اَحَلَّهٗ کے معنی اتارنے کے۔ قرآن میں ہے:۔
اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ (۱۳-۳۱) یا ان کے مکانات کے قریب نازل ہوتی رہے گی۔
وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴-۲۸) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر اتارا۔
حَلَّ الدَّیْنُ قرض کی ادائیگی کا وقت قریب آپہنچا۔
اَلْحِلَّةُ نازل ہونے والی قوم (اسی سے کہا جاتا ہے حَیٌّ حِلَالٌ جبکہ لوگ ایک دوسرے کے جوار میں مقیم ہوں اَلْمَحِلَّةُ (اترنے کی جگہ) اور حَلَّ الْعُقْدَةَ (گرہ کھولنا) سے بطور استعارہ۔ حَلَّ (ض) الشَّیْءُ حِلًّا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز کے حلال ہونا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا (۵-۸۸) اور جو حلال طیب روزی خدا نے تم کو دی ہے اسے کھاؤ۔
هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (۱۶-۱۱۶) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔
اور اَلْحُلُوْلُ سے اَحَلَّتِ الشَّاةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بکری کے تھنوں میں دودھ اتر آنا کے ہیں۔ مگر اَحَلَّ اللّٰهُ کَذَا کے معنی کسی چیز

لہ والمحکمین علی صیغۃ المفعول وبکسر الکاف معناہ المنصف من نفسہ راجع للحدیث الفائق (۱/۲۸۱) واللسان والنہایہ (حکم)

کو حلال کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ (۵-۱) تمہارے لئے چوپائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ (الآیۃ) (۳۳-۵۰) اے پیغمبر! ہم نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیئے ہیں۔ حلال کر دی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں۔
میں ازواج مطہرات کی حلت لوظا ہر ہے کہ وہ آپؐ کے عقد میں تھیں اور بنات العم وغیرہ کی حلت سے حلت نکاح مراد ہے۔
بَلَغَ الْأَجَلُ مَحِلَّهُ ادائیگی فرض کا وقت قریب آپہنچا۔ قرآن میں ہے:۔
حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ (۲-۱۹۶) جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے۔
رَجُلٌ حَلَالٌ وَمُحِلٌّ جو احرام کھول دے یا وہ آدمی جو حدود حرم سے باہر چلا جائے قرآن میں ہے:۔
وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا (۵-۲) اور جب احرام اتار دو تو پھر شکار کرو۔
وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ (۹۰-۲) اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔
اور آیت کریمہ:۔
قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ (۶۶-۲) خدا نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری قسموں کی گرہ کشائی کا کفارہ بیان کر دیا ہے۔ حدیث میں ہے[1] (۹۵) لَا يَمُوتُ لِلرَّجُلِ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوْلَادِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ إِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ کہ جس مسلمان کے تین بچے مر جائیں (اور وہ صبر کرے) تو اسے دوزخ کی آگ صرف تَحِلَّةَ الْقَسَمِ کی مقدار سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ یعنی جتنی دیر میں کہ انشاء اللہ کہے۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[2] ع (۱۱۹) وَقْعُهُنَّ الْأَرْضَ تَحْلِيلُ کہ ان کے قدم کا زمین پر پڑنا تحلۃ القسم کی مقدار

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظہ فی اللسان (حلل) والفائق ۱/۲۹۴ ولفظ لایموت لمؤمن وفی ابن کثیر لمسلم فی روایۃ من مات لہ راجع للحدیث المسند عبدالرزاق وابوداؤد والطیالسی واصلہ فی الصحیحین من حدیث ابی ہریرۃ انظر ابن کثیر ۳/۱۳۲ وکنزالعمال ۲/۱۴۳۔ ۱۴۴ والیضا الاستثناء الا تحلۃ القسم ورد للحارث فی سبیل اللہ فی مسند احمد والروایۃ فی الترمذی والنسائی وابن ماجۃ وتحلۃ القسم مثل فی القلیل المفرط فی القلۃ وقیل اشارۃ الی قولہ تعالیٰ وان منکم الا واردھا والذی ذھب الیہ المؤلف ھو اعتبار بالاصل یخالف المنقول فی تفسیرہ) ۱۲ [2] قطعۃ من البیت لکعب بن زہیر السلمی من قصیدۃ جمہریۃ (۲۸۲-۲۸۷) فی ۵۸ بیتا وصدرہ: تخدی علی لیسرات وہی لاحقۃ ذوابل ... وفی روایۃ اللسان لاحقۃ بدل لاحقۃ وارابع بدل ذوابل وفی روایۃ المحکم (حلل) نجائب بدل ذوابل والبیت فی النہایۃ (حلل) والعمدۃ (۲: ۸۸) وجمہرۃ اشعار العرب ۱۳۱ ودیوانہ ۱۲ ومثلہ لعبدۃ بن الطبیب من قصیدۃ مفضلیۃ رقم ۲۶ فی ۸۱ بیتا یذکر ثورا وصدرہ: یخفی التراب باظلاف ثمانیۃ فی اربع ... والبیت فی امالی المرتضی والنوادر ۹ ودیوان المعانی (۲: ۱۰۸) واللسان (حلل) لکن فیہ مسھن بدل وقعھن ۱۲

یعنی برائے نام ہے۔

اَلْحَلِیْلُ خاوند۔ مؤنث حَلِیْلَۃٌ میاں بیوی کو حَلِیْلٌ و حَلِیْلَۃٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے اپنی چادر کھولتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اسی لئے جو شخص کسی کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا ہو وہ اس کا حَلِیْلٌ کہلاتا ہے اور یا یہ حَلَال سے ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کیلئے حلال ہیں۔ اور حَلِیْلَۃٌ کی جمع اَلْحَلَائِلُ ہے۔ قرآن میں ہے:

وَحَلَائِلُ اَبْنَائِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ (۴-۲۳) اور تمہارے صلبی بیٹوں کی عورتیں بھی۔

اَلْحُلَّۃُ کپڑوں کا جوڑا (اِزار اور رداء (اوپر اور نیچے کی چادریں)

اَلْاِحْلِیْلُ پیشاب نکلنے کا سوراخ، کیونکہ پیشاب کے وقت اس کی گرہ کھل جاتی ہے۔

(ح ل ف)

اَلْحِلْفُ عہد و پیمان جو لوگوں کے درمیان ہو۔ اَلْمُحَالَفَۃُ (مفاعلہ) معاہدہ یعنی باہم عہد و پیمان کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر مخالفت سے لزوم کے معنیٰ لے کر کہا جاتا ہے فُلَانٌ حِلْفُ کَرَمٍ وحَلِیْفُ کَرَمٍ یعنی وہ کرم سے جدا نہیں ہوتا۔ حَلِیْفٌ جس کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا ہو اس کی جمع اَحْلَافٌ (وحُلَفَاءُ) آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۱۲۰) تَدَارَکْتُمَا الْاَحْلَافَ قَدْ ثُلَّ عَرْشُہَا

تم نے ان حلیفوں کا تدارک کر دیا جن کے پائے ثبات متزلزل ہو چکے تھے۔

اَلْحَلْفُ اصل میں اس قسم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے عہد و پیمان کیا جائے اس کے بعد عام قسم کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَلَا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّہِیْنٍ (۶۸-۱۰) اور کسی ایسے شخص کے کہے میں نہ آ جانا جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل اوقات ہے۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ مَا قَالُوْا (۹-۷۴) یہ خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے (تو کچھ) نہیں کہا۔

وَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ اِنَّہُمْ لَمِنْکُمْ وَمَا ہُمْ مِّنْکُمْ (۹-۵۶) اور خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لِیُرْضُوْکُمْ (۹-۶۲) یہ لوگ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش کر دیں۔

شَیْءٌ مُحْلِفٌ (مشکوک چیز) جس کے ثابت کرنے کے لئے قسم کی ضرورت ہو۔

کُمَیْتٌ مُحْلِفٌ گھوڑا جس کے کمیت اور اشقر ہونے میں شک ہو ایک قسم کھائے کہ یہ کمیت ہے اور دوسرا حلف اٹھائے کہ یہ اشقر یعنی سرخ ہے اَلْمُحَالَفَۃُ کے اصل معنیٰ تو ایک دوسرے کے سامنے قسم کھانا کے ہیں اس سے یہ لفظ محض لزوم کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا

---

[1] قالہ زہیر یمدح ہرم بن سنان والحارث بن عوف والاحلاف غطفان وقیس وتمامہ: وذبیان قد زلت باقدامہا النعل۔ دراجع دیوانہ ۱۰۹ وشواہد الکشاف ۰۰ والمعلقات العشر والمختارات ۴۲ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۶۲) والاتباع لابی الطیب ۴۳ واضداد ابن الانباری ۳۸۷ واضداد ابی الطیب (۱: ۱۳۷) واللسان (ثلل)

ہے اور جو کسی سے الگ نہ ہوتا ہو اسے اس کا حِلْفٌ یا حَلِیْفٌ کہا جاتا ہے حدیث میں ہے[1] (۹۶) لَاحِلْفَ فِی الْاِسْلَامِ اسلام میں زمانہ جاہلیت ایسے معاہدے نہیں ہیں۔

فُلَانٌ حَلِیْفُ اللِّسَانِ فلاں چرب زبان ہے گویا اس نے بولنے سے عہد کر رکھا ہے اور اس سے ایک لمحہ نہیں رکتا حَلِیْفُ الْفَصَاحَۃِ وہ فصیح ہے۔

(ح ل ق)

اَلْحَلْقُ حلق وہ جگہ جہاں سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے) حَلَقَہٗ (ض) اسکے حلق کو قطع کر ڈالا۔ پھر یہ لفظ بال مونڈنے پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ حَلَقَ شَعْرَہٗ اس نے اپنے بال منڈوا ڈالے۔

قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَکُمْ (۲-۱۹۶) اور ..... سر نہ منڈواؤ۔

مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ (۴۸-۲۷) اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر

رَأْسٌ حَلِیْقٌ مونڈا ہوا سر۔

لِحْیَۃٌ حَلِیْقَۃٌ مونڈی ہوئی داڑھی۔

اور کسی انسان کے حق میں بد دعا کے وقت عَقْرٰی حَلْقٰی کہا جاتا ہے یعنی اسے ایسی مصیبت پہنچے جس پر عورتیں اپنے سر کے بال منڈوا ڈالیں۔ بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالٰے اس کے حلق کو قطع کر ڈالے۔

اَلْمُحَالِقُ وہ کمبل جو کھردرا ہونے کی وجہ سے بدن کے بال کاٹ ڈالے۔

حَلْقَۃٌ یا حَلَقَۃٌ جماعت جو دائرہ کی شکل میں جمع ہو۔ کیونکہ وہ دائرہ ہیئت میں انسان کے حلق کے مشابہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَلَقَۃٌ کا لفظ صرف اس جماعت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے سر منڈوا ڈالتے ہیں[2]۔

اِبِلٌ مُحَلَّقَۃٌ شتران کہ بشکل حلقہ داغ بر آنہا کردہ باشند اور حلقہ میں معنی دوران کا اعتبار کرکے حَلَّقَ الطَّائِرُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی پرندکا چکر لگا کر اڑنا کے ہیں[3]۔

(ح ل م)

اَلْحِلْمُ کے معنی ہیں نفس وطبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ وغضب کے موقع پر بھڑک نہ اٹھے اس کی جمع اَحْلَامٌ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اَمْ تَاْمُرُھُمْ اَحْلَامُھُمْ (۵۲-۳۲) کیا ان کی عقلیں ان کو ..... سکھاتی ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ اَحْلَام سے عقلیں مراد ہیں اصل میں حلم کے معنی متانت کے ہیں مگر چونکہ متانت بھی عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے حلم کا لفظ بول کر عقل مراد لے لیتے ہیں جیسا کہ مسبب بول کر سبب مراد لے لیا جاتا ہے۔

حَلُمَ بردبار ہونا۔ حَلَّمَہُ الْعَقْلُ وَتَحَلَّمَ عقل نے اسے بردبار بنا دیا۔ اَحْلَمَتِ الْمَرْءَۃُ

---

[1] رواہ الحاکم فی المستدرک والمسلم وابو داؤد والنسائی۔ عن جبیر بن مطعم (راجع الفتح للنبہانی ۲/۲۴۳) والحدیث فی النہایۃ (حلف) وغریب ابی عبید (۲) [2] وعلی ہذا فہی جمع حالق ہذ علی الاول مفرد وجمعہ حَلَقٌ واما الحلقۃ بسکون اللام فجمعہ حِلَقٌ وعند البعض حَلَقٌ علی غیر قیاس (النہایہ) [3] (۶۷-۸۳) میں حلقوم بمعنی حلق آیا ہے دنی التنزیل الحلقوم (۵۶-۸۳) بمعنی الحلق قال بعضہم المیم فیہ اصلیۃ وعند البعض الواو والمیم زائدتان (النہایہ) ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

عورت کا حلیم بچے جننا۔ قرآن میں ہے :۔
اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ (۱۱-۷۵)
بیشک ابراہیم بڑے تحمل والے، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔ اور آیت کریمہ :۔
فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ (۳۷-۱۰۱) تو ہم نے ان کو ایک نرم دل لڑکے کی خوشخبری دی۔
کے معنی یہ ہیں کہ اس غلام میں قوت برداشت ..... تھی۔ اور آیت کریمہ :۔
وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ (۲۴-۵۹)
اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔
میں حُلُم کے معنی سن بلوغت کے ہیں اور سن بلوغت کو حُلُم اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس عمر میں عام طور پر عقل وتمیز آجاتی ہے کہا جاتا ہے۔
حَلَمَ (ن) فِی نَوْمِهٖ خواب دیکھنا مصدر حُلْمٌ اور حُلُمٌ اور حُلْمٌ مثل رُعْبٌ بھی کہا گیا ہے۔ اور یہی معنی تَحَلَّمَ وَاحْتَلَمَ کے ہیں۔
حَلَمْتُ بِهٖ فِی نَوْمِی۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ قرآن میں ہے :۔
قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ (۱۲-۴۴) انہوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔
اَلْحَلَمَةُ بڑی چیچڑی۔ کیونکہ وہ ایک جگہ پر جمے رہنے کی وجہ سے حلیم نظر آتی ہے اور سرپستان کو حَلَمَةُ الثَّدْیِ کہنا محض ہیئت میں چیچڑی

کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس مجاز کی دلیل یہ ہے کہ سرپستان کو قُرَاد بھی کہہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ع (طویل)
(۱۲۱) كَاَنَّ قُرَادَیْ زَوْرِهٖ طَبَعَتْهُمَا
بِطِیْنٍ مِنَ الْجَوْلَانِ كُتَّابُ اَعْجَمِیْ
(اس کے سینے پر پستانوں کے نشانات اس طرح خوشنما نظر آتے ہیں کہ گویا کسی کاتب نے مٹی کی مہریں لگا دی ہیں) حَلِمَ الْجِلْدُ چمڑے کو کیڑا لگ جانا۔ حَلَّمْتُ الْبَعِیْرَ میں نے اونٹ سے چیچڑ نکالے۔ حَلَّمْتُ فُلَانًا کسی پر قدرت حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ مدارات سے پیش آنا تاکہ وہ مطمئن رہے جیسا کہ اونٹ سے چیچڑ دور کرنے سے اسے سکون اور راحت محسوس ہوتی ہے اور انسان اس پر پوری طرح قدرت پالیتا ہے۔

(ح ل ی)

اَلْحُلِیُّ (زیورات) یہ حَلْیٌ کی جمع ہے جیسے ثَدْیٌ کی جمع ثُدِیٌّ آجاتی ہے۔ قرآن میں ہے :۔
مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ اپنے زیور کا ایک بچھڑا (بنالیا) (وہ) ایک جسم (تھا) جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی (۷-۱۴۸)
حَلِیَ یَحْلٰی آراستہ ہونا (اور حَلّٰی آراستہ کرنا)

[1] قاله عدی بن الرقاع فی قصیدة لیمدح فیها عمر بن هبیرة ویروی ایضًا للمفضل الجرمی کما فی اللسان (قرد، عجم) والمعرب للجوالیقی ۱۰۵ والحماسة (۲: ۲۵۱-۳۵۲) والمرزوقی رقم ۸۱ من خمسة ابیات والاقتضاب ۹۷ والبیت بغیر عزو فی المخصص (۲: ۱۴۸) والطبرسی (۱: ۹۴) والجولان بفتح الجیم جبل من نواحی دمشق وطینه مشهور للختم وروی صاحب الاقتضاب ان الجولان اسم للطین الذی یطبع به وفی المطبوع الجولان بالمهملة مصحف والشدا. الجوهری (قرد) بلا نسبة بمدح لبعض الخلفاء وفی روایة صدره بدل زوره وعدی بن الرقاع هو عدی بن زید بن مالک بن عدی بن الرقاع العاملی وکان شاعرًا مقدمًا عند بنی امیة خاصًا بالولید بن عبد الملک وعده ابن سلام فی الطبقة الثامنة من شعراء الاسلام راجع الاغانی (۸: ۱۷۲-۱۷۷) وابن سلام (۲۰۹-۲۱۳) والمؤتلف ۱۰۷ والمرزبانی ۲۵۲

قرآن میں ہے:۔
يُحَلَّوْنَ فِيهَا أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (۱۸-۳۱) ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔
حُلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ج (۷۶-۲۱) اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔
اور حِلْيَةٌ کے معنی زیور کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ (۴۳-۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

(ح م م)

اَلْحَمِيمُ کے معنی سخت گرم پانی کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا (۴۷-۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔
إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (۷۸-۲۵) مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔
وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ (۱۰-۴) اور جو کافر ہیں ان کے پینے کو نہایت گرم پانی۔
يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ (۲۲-۱۹) (اور) ان کے سروں پر جلتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔
ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ (۲۲-۱۹) پھر اس (کھانے) کے ساتھ ان کو گرم پانی ملا کر دیا جائے گا۔
هَذَا فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ (۳۸-۵۷) یہ گرم کھولتا ہوا پانی اور پیپ (ہے) اب اس کے مزے چکھیں۔

اور گرم پانی کے چشمہ کو حَمَّةٌ کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے[1] (۹۷)
اَلْعَالِمُ كَالْحَمَّةِ يَأْتِيهَا الْبُعَدَاءُ وَيَزْهَدُ فِيهَا الْقُرَبَاءُ۔ کہ عالم کی مثال گرم پانی کے چشمہ کی سی ہے جس میں نہانے کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں (اور شفایاب ہو کر لوٹتے ہیں) اور قرب وجوار کے لوگ اس سے بے رغبتی کرتے ہیں (اس لئے اس کے فیض سے محروم رہتے ہیں)
اور تشبیہ کے طور پر پسینہ کو بھی حَمِيمٌ کہا جاتا ہے اسی سے اِسْتَحَمَّ الْفَرَسُ کا محاورہ ہے جس کے معنی گھوڑے کے پسینہ پسینہ ہونے کے ہیں۔ اور حَمَّامٌ کو حَمَّامٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پسینہ آور ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ اس میں گرم پانی موجود رہتا ہے۔
اِسْتَحَمَّ فُلَانٌ۔ حمام میں داخل ہونا۔
پھر مجازاً قریبی رشتہ دار کو بھی حَمِيمٌ کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ انسان اپنے رشتہ داروں کی حمایت میں بھڑک اٹھتا ہے اور کسی شخص کے اپنے خاص لوگوں کو حَامَّةٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اَلْحَامَّةُ وَالْعَامَّةُ خاص وعام کا محاورہ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ (۲۶-۱۰۲-۱۰۱) تو (آج) نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا ہے اور نہ گرم جوش دوست۔
نیز فرمایا:۔
وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا (۷۰-۱۰) اور کوئی

---

[1] الحدیث فی النهایة (حمم) والفائق ۱/۱۰۵ وفیه ویترکها القرباء وغریب ابی عبید ۳/۲۰۱ والمعاجمة (حمم) قال الحافظ فی تخریج الکشاف لم اجده (۴/۲۰)

دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا۔
اور اس کی دلیل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسان کے قریبی مہربانوں کو حُزَانَتُہٗ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے غم میں شریک رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔

اِحْتَمَّ فُلَانٌ لِفُلَانٍ فلاں اس کے لئے غمگین ہوا یا اس کی حمایت کے لئے جوش میں آگیا۔ اس میں باعتبار معنی اِھْتَمَّ سے زیادہ زور پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں غمزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ جوش اور گرمی کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔

اَحَمَّ الشَّحْمَ چربی پگھلا۔ یہاں تک کہ وہ گرم پانی کی طرح ہوجائے اور آیت کریمہ:۔

وَظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ (۵۶-۴۳) اور سیاہ دھوئیں کے سایے میں۔

میں یَحْمُوْم حمیم سے یفعول کے وزن پر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی سخت سیاہ دھوآں کے ہیں۔ اور اسے یَحْمُوْم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں شدت حرارت پائی جاتی ہے جیسا کہ بعد میں لَا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ سے اس کی تفسیر کی ہے اور یا اس میں حُمَمَۃٌ یعنی کوئلے کی سی سیاہی کا تصور موجود ہے۔ چنانچہ سیاہ کو یَحْمُوْم کہا جاتا ہے اور یہ حُمَمَۃٌ (کوئلہ) کے لفظ سے مشتق ہے۔ چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

لَھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِھِمْ ظُلَلٌ۔۔۔ (۳۹-۱۶) ان کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے اور نیچے (اس کے) فرش ہونگے۔

اور حِمَام بمعنی موت بھی آجاتا ہے جیسا کہ کسی امر کے مقدر ہونے پر حُمَّ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور بخار کو اَلْحُمّٰی کہنا یا تو اس لئے ہے کہ اس میں حرارت تیز ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں آنحضرت نے فرمایا:[1] (۹۸)

اَلْحُمّٰی مِنْ فَیْحِ جَھَنَّمَ۔ کہ بخار جہنم کی شدت سے ہے اور یا بخار کو حُمّٰی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں پسینہ ترتا ہے اور یا اس لئے کہ یہ موت کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ جیسا کہ عرب لوگ کہتے ہیں اَلْحُمّٰی بَرِیْدُ الْمَوْتِ (کہ بخار موت کا پیغام بر ہے) اور بعض اسے باب الموت یعنی موت کا دروازہ بھی کہتے ہیں اور اونٹوں کے بخار کو حُمَام کہا جاتا ہے یہ بھی حِمَام (موت) سے مشتق ہے۔ کیونکہ اونٹ کو بخار ہوجائے تو وہ شاذونادر ہی شفایاب ہوتا ہے۔

حَمَّمَ الْفَرْخُ پرند کے بچہ نے بال و پر نکال لئے کیونکہ اس سے اس کی جلد سیاہ ہوجاتی ہے۔

حَمَّمَ وَجْھُہٗ اس کے چہرہ پر سبزہ نکل آیا۔ یہ دونوں محاورے حُمَمَۃٌ سے ماخوذ ہیں۔

اور حَمْحَمَتِ الْفَرَسُ جس کے معنی گھوڑے کے ہنہنانے کے ہیں یہ اس باب سے نہیں ہے۔

(ح م د)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (تَعَالٰی) کے معنی اللہ تعالےٰ کی فضیلت کے ساتھ اس کی ثنا بیان کرنے کے

---

[1] متفق علیہ من حدیث بن عمر و عند البخاری عن عائشۃ موصولا وفی المؤطا عن عروۃ مرسلا وعند الترمذی عن ثوبان وبمعناہ رواہ الحاکم والنسائی عن ابن عباس وفی روایۃ عن انس: زائد الموت لابن السنی وابو نعیم فی الطب اہنا وفی الزہد وابن ابی الدنیا فی المرض والکفارات عن الحسن مرسلاً واجع التخریج بکنز العمال ۳ رقم ۱۶۱۴ ح ۱۶۱۷، ۱۶۹۳ وج ۱۰ رقم ۱۷۰ والفتح للنبہانی ۲/۸۲ وایضاً الکنز ج ۱۰ رقم ۹/۱۵/۲۵، ۱۶۶ ٭

ہیں۔ یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے۔ کیونکہ مدح ان افعال پر بھی ہوتی ہے جو انسان سے اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ان اوصاف پر بھی جو پیدائشی طور پر اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح مال کے خرچ کرنے اور علم و سخا پر انسان کی مدح ہوتی ہے اس طرح اسکی درازئ قدو قامت اور چہرہ کی خوبصورتی پر بھی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن حمد صرف افعال اختیاریہ پر ہوتی ہے۔ نہ کہ اوصاف اضطراریہ پر اور شکر تو صرف کسی کے احسان کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ لہذا ہر شکر حمد ہے۔ مگر ہر حمد شکر نہیں ہے اور ہر حمد مدح ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے[1]۔ اور جس کی تعریف کی جائے اسے محمود کہا جاتا ہے۔ مگر مُحَمَّدٌ صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو نیز جب کوئی شخص محمود ثابت ہو تو اسے بھی محمود کہہ دیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (۱۱-۷۳) وہ سزاوار تعریف اور بزرگوار ہے۔

میں حمید بمعنی محمود بھی ہو سکتا ہے اور حامد بھی۔ حُمَادَاكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا یعنی ایسا کرنے میں تمہارا انجام بخیر ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت سناتا ہوں۔ (۶۱-۶)

میں لفظ احمد سے آنحضرت کی ذات کی طرف اشارہ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد ہوگا اسی طرح آپ اپنے اخلاق و اطوار کے اعتبار سے بھی محمود ہوں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی بشارت میں لفظ احمد (صیغہ تفضیل) بولنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے پیشرو جملہ انبیاء سے افضل ہیں اور آیت کریمہ:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (۴۸-۲۹) محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔

میں لفظ محمد گو من وجہ آنحضرت کا نام ہے لیکن اس میں آنجناب کے اوصاف حمیدہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى (۱۹-۷)

میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا یہ نام معنی حیات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اس کے مقام پر مذکور ہے۔

(ح م ر)

اَلْحِمَارُ (گدھا) اس کی حُمُرٌ وَحَمِيْرٌ وَاَحْمِرَةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ (۱۶-۸) اور گھوڑے خچر اور گدھے۔

کبھی حمار کے لفظ سے جاہل اور بے علم آدمی بھی مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲-۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔

كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (۷۴-۵۰) گویا گدھے ہیں جو بدک جاتے ہیں۔

---

[1] انظر الکشاف ج ۱ ص ۹-۱۰

حِمَارُ قُبَّان ایک قسم کا کیڑا (جسے فارسی میں خرک کہا جاتا ہے) اَلْحِمَارَانِ دو پتھر جن پر پنیر خشک کیا جاتا ہے ہیئت میں حمار سے تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے اور گدھے کے ساتھ جلادت میں تشبیہ دیکر دوغلی نسل کے گھوڑے کو بھی اَلْمُحَمَّر کہا جاتا ہے۔

اَلْحُمْرَۃُ سرخی۔ اَلْاَحْمَرُ وَالْاَسْوَدُ عرب وعجم (اس میں عمومی رنگت کا لحاظ کیا گیا ہے) اور کبھی حَمْرَاءُ الْعِجَان (کنایہ از عجم) بھی کہا جاتا ہے[1]۔

اَلْاَحْمَرَانِ۔ گوشت اور شراب[2] اَلْمَوْتُ الْاَحْمَرُ سخت موت، وہ موت جو قتل سے واقع ہو سَنَۃٌ حَمْرَاءُ قحط سالی کیونکہ اس میں فضا کا رنگ سرخ نظر آتا ہے اسی بنا پر سخت گرمی کو حَمَّارَۃُ الْقَیْظِ کہا جاتا ہے۔ وَطْاَۃٌ حَمْرَاءُ قدم کا تازہ نشان اس کے بالمقابل مٹے ہوئے نشان کو وَطْاَۃٌ دَھْمَاءُ بولتے ہیں۔

(ح م ل)

اَلْحَمْلُ (ض)، کے معنی بوجھ اٹھانے یا لادنے کے ہیں اس کا استعمال بہت سی چیزوں کے متعلق ہوتا ہے اس لئے گو صیغہ فعل یکساں رہتا ہے مگر بہت سے استعمالات میں بلحاظ مصادر کے فرق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بوجھ جو حسی طور پر اٹھائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی چیز پیٹھ پر لادی جائے اس پر حِمْل (بکسرالحا) کا لفظ بولا جاتا ہے اور جو بوجھ باطن یعنی کوئی چیز اپنے اندر اٹھائے ہوئے ہوتی ہے اس پر حَمْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ۔ بادل میں پانی اور عورت کے حمل کے ساتھ تشبیہ دے کر درخت کے پھل کو بھی حَمْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَۃٌ اِلٰی حِمْلِھَا لَا یُحْمَلْ مِنْہُ شَیْءٌ (۳۵-۱۸) اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ بٹانے کو کسی کو بلائے تو اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا۔

اور حَمَلْتُ کا صیغہ ہر قسم کا بوجھ اٹھانے پر بولا جاتا ہے خواہ وہ بوجھ ظاہری ہو یا باطنی مثلاً کہا جاتا ہے حَمَلْتُ الثِّقْلَ حَمْلًا میں نے بوجھ اٹھایا۔ الرسالۃ پیغام اٹھایا۔ اَلْوِزْرَ گناہ کا بوجھ اٹھایا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَھُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِھِمْ (۲۹-۱۳) یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور (لوگوں کے) بوجھ بھی۔ وَمَا ھُمْ بِحَامِلِیْنَ مِنْ خَطَایَاھُمْ مِّنْ شَیْءٍ (۲۹-۱۲) حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بوجھ اٹھانے والے نہیں۔

وَلَا عَلَی الَّذِیْنَ اِذَا مَا اَتَوْکَ لِتَحْمِلَھُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُکُمْ عَلَیْہِ (۹-۹۲) اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر تم کو سوار کروں۔ لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَھُمْ کَامِلَۃً یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ (۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ اور آیت کریمہ :۔

---

[1] وفی حدیث علیؓ عارضہ رجل من الموالی فقال: اسکت یا ابن حمراء العجان ای یا ابن الامۃ والعجان ما بین القبل والدبر وہی کلمۃ تقولھا العرب فی السب والذم (النہایہ ۱/۴۳۸) [2] والیضا الذہب والزعفران ویقال للماء واللبن الابیضان وللتمر والماء الاسودان (النہایۃ)

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ (٦٢-٥) جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی پھر انہوں نے اس (کے بار تعمیل) کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر احکام تورات کی بجا آوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی مگر انہوں نے اسمیں کوتاہی کی۔

کہا جاتا ہے :۔

حَمَّلْتُہٗ وَحَمَّلْتُ عَلَیْہِ کَذَا میں نے اس کے ذمہ فلاں کام لگایا۔ تَحَمَّلَ وَاحْتَمَلَ وَحَمَلَ اس کے مطاوع آتے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا۔ (١٣-١٧) پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آگیا۔

حَمَلْنَاکُمْ فِی الْجَارِیَۃِ (٦٩-١١) تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کر لیا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْہِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیْکُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ . . . . (٢٤-٥٤) اگر منہ موڑ دو گے تو رسول پر (اس چیز کا ادا کرنا) جو ان کے ذمے ہے اور تم پر (اس چیز کا ادا کرنا) جو تمہارے ذمے ہے۔

وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ وَاعْفُ عَنَّا (٢-٢٨٦) ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار (جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو۔

وَحَمَلْنٰہُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (٥٤-١٣) اور ہم نے نوح کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔

ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا (١٧-٣) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا بے شک نوح (ہمارے) شکر گذار بندے تھے۔

وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ (٦٩-١٤) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھا لئے جائیں گے۔

حَمَلَتِ الْمَرْأَۃُ عورت کا حاملہ ہونا۔ اسی طرح حَمَلَتِ الشَّجَرَۃُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے حَمْلٌ کی جمع اَحْمَالٌ آتی ہے قرآن میں ہے :۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُہُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَہُنَّ اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے (٦٥-٤)

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ . . . . . (٤١-٤٧) اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔

حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِہٖ اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے اور اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے (٧-١٨٩)

حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ کُرْہًا وَّوَضَعَتْہُ کُرْہًا وَحَمْلُہٗ وَفِصَالُہٗ ثَلٰثُوْنَ شَھْرًا (٤٦-١٥) اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے۔

اصل میں حَمْلٌ کے معنی پیٹھ پر بوجھ لادنا کے ہیں پھر بطور استعارہ عورت کے حمل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا اونٹنی کے حاملہ ہونے کے لئے وَسَقَتِ النَّاقَۃُ بولا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَمُوْلَۃُ (بالفتح) اسے کہتے ہیں جس پر بوجھ لادا گیا ہو۔ اور یہ قَتُوْبَۃٌ اور رَکُوْبَۃٌ کی طرح ہے اور جو بوجھ لدا ہوا ہو اسے حُمُوْلَۃٌ (بالضم) کہا جاتا ہو اور حَمَلٌ بمعنی محمول آتا ہے اور

یہ خاص کر بھیڑ کے چھوٹے بچے پر بولا جاتا ہے کیونکہ اسے چلنے سے عاجز یا نوزائیدہ ہونے کی وجہ سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور حَمَلٌ کی جمع اَحْمَال وَحِمْلَان آتی ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر بادل کو حامل کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا (۵۱-۲) اور پانی کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔
اَلْحَمِیْلُ بہت پانی والا بادل۔ نیز حَمِیل اس کوڑا کرکٹ کو بھی کہا جاتا ہے جو سیلاب بہا کر لے آتا ہے اور اجنبی مسافر اور ضامن پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ ضامن بھی مقروض کے ساتھ اس کی ضمانت کا بوجھ اٹھائے ہوتا ہے۔ نیز اَلْحَمِیل اس بچے کو کہتے ہیں جس کا نسب ثابت نہ ہو۔ چنانچہ میراثُ الْحَمِیل کا مسئلہ ہے یعنی اس شخص کی میراث جس کا نسب متحقق نہ ہو۔[1]
حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کنایۃً چغلخور۔
فُلَانٌ یَحْمِلُ الْحَطَبَ الرَّطْبَ یعنی فلاں چغلی کھاتا ہے۔

(ح م ی)

اَلْحُمّٰی وہ حرارت جو گرم جواہر جیسے آگ، سورج وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی جو بدن میں قوت حارہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔
قرآن میں ہے:۔
فِیْ عَیْنٍ حَامِیَةٍ (۱۸-۸۶) اگرم چشمے میں۔
ایک قرأت میں حَمِئَةٍ ہے[2]
یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ (۹-۳۵) جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا۔
حَمِیَ النَّهَارُ دن گرم ہو گیا۔ اَحْمَیْتُ الْحَدِیْدَةَ لوہا گرم کیا گیا۔
حُمَیَّا الْکَأْسِ شراب کی تیزی، اور انسان کی قوت غضبیہ جب جوش میں آجائے اور حد سے بڑھ جائے۔ تو اسے بھی حَمِیَّة کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے حَمِیْتُ عَلٰی فُلَانٍ میں فلاں پر غصّے ہوا قرآن میں ہے:۔
حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ (۴۸-۲۶) اور ضد بھی جاہلیت کی پھر استعارہ کے طور پر حَمَیْتُ الْمَکَانَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی کسی جگہ کی حفاظت کرنا۔ ایک روایت میں ہے[3] (۹۹)
لَا حِمٰی اِلَّا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ کہ چراگاہ کا محفوظ کرنا صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے۔
حَمَیْتُ اَنْفِیْ مَحْمِیَةً میں نے اپنی عزت کی حفاظت کی۔ حَمَیْتُ الْمَرِیْضَ حَمْیًا بیمار کو نقصان دہ چیزوں سے روک دیا۔ اور آیت کریمہ:
وَلَا حَامٍ (۵-۱۰۳) اور نہ حام۔
میں بعض کے نزدیک حام سے وہ نر اونٹ مراد ہے جس کی پشت سے دس بچے پیدا ہو چکے ہوں (اس کے متعلق) کہہ دیا جاتا تھا حُمِیَ ظَهْرُهٗ فَلَا یُرْکَبُ اس کی پشت محفوظ ہے اس پر کوئی سوار نہ ہو۔

---

[1] وفی حدیث انہ کتب الی شریح: اَلْحَمِیْلُ لا یورث الا ببینۃ (النہایہ)، وفی الترمذی ... کان ابی حمیلا فورثہ مسروق [2] الاولی قراءۃ ابن مسعود والحسن والثانی ابن عباس وعلیہ المصحف فی مجاز ابی عبیدۃ: فی عین حمئۃ (۸۶) التقدیر فعلۃ وہی مہموزۃ ومجازہا ذات حماۃ ومن لم یہمز جعل مجازہ مجاز فعلۃ من الحرالحامی وموضعہا حامیۃ۔ [3] الحدیث فی النہایہ (حمی) وباختلاف الفاظہ فی معجم الاصبہانی وابن النجار عن ابن عباس (حم خ د) عن الصعب بن جثامۃ راجع کنز العمال ۱۲

أَحْمَاءُ الْمَرْءَةِ خاوند کی طرف سے عورت کے رشتہ دار کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں اضافت کے وقت تینوں حالتوں میں حَمَاهَا وَ حَمُوهَا وَحَمِيهَا کہا جاتا ہے بعض حَمْءٌ (بہمزہ) بھی بولتے ہیں جیسا کہ کَمْءٌ ہے۔

اَلْحَمَأَةُ وَالْحَمَاءُ سیاہ بدبودار مٹی قرآن میں ہے: مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ (۱۵-۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔ کہا جاتا ہے حَمَأْتُ الْبِئْرَ میں نے کنوئیں کو صاف کیا۔ أَحْمَأْتُهَا اسے کیچڑ سے بھر دیا۔ ایک قرأت میں عَيْنٍ حَمِئَةٍ (۱۸-۸۶) ہے یعنی سیاہ بدبودار کیچڑ والا چشمہ۔

(ح ن ن)

اَلْحَنِينُ کسی چیز کی طرف شفقۃً کھنچنا کہا جاتا ہے۔

حَنَّتِ الْمَرْءَةُ وَالنَّاقَةُ لِوَلَدِهَا عورت اور اونٹنی کا اپنے بچے کا مشتاق ہونا اس اشتیاق کے ساتھ چونکہ کبھی آواز بھی ہوتی ہے اس لئے حنین اس آواز کو کہتے ہیں جس میں اشتیاق اور شفقت پائی جائے یا اشتیاق کی صورت کا تصور کے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ حدیث حَنِينُ الْجِذْعِ اس معنی پر محمول ہے[1]

رِيحٌ حَنُونٌ سرسراہٹ سے چلنے والی ہوا۔ قَوْسٌ حَنَّانَةٌ آواز نکالنے والی کمان۔ محاورہ ہے (مثل) مَالَهُ حَانَّةٌ وَلَا آنَّةٌ۔ یعنی اسکے پاس نہ اونٹنی ہے۔ اور نہ کوئی موٹی بھیڑ اس میں اونٹنی اور بھیڑ کی یہ صفت ان کے صوت کی بنا پر ہے۔ اور حنین چونکہ معنی شفقت پر مشتمل ہوتا ہے اور شفقت میں ہمیشہ جذبہ رحمت کارفرما ہوتا ہے اس لئے اس سے مراد رحمت لے لی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:

وَحَنَانًا مِنْ لَدُنَّا (۱۹-۱۳) اور اپنے پاس سے شفقت ..... دی تھی۔

اسی سے اسمائے حسنیٰ اَلْحَنَّانُ وَالْمَنَّانُ ہے جس کے معنی بہت زیادہ رحم کھانے والے کے ہیں۔ حَنَانَيْكَ تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہوں یہ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ کی طرح تثنیہ لایا جاتا ہے۔

حُنَيْنٌ (مکہ اور طائف کے درمیان) ایک مشہور مقام کا نام ہے (جہاں ۸ھ کو جنگ حنین ہوئی تھی) قرآن میں ہے:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (۹-۲۵) اور (جنگ) حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرہ تھا۔

(ح ن ث)

اَلْحِنْثُ گناہ، نافرمانی۔ قرآن میں ہے:

وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيمِ (۵۶-۴۶) اور گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔

اسی لئے يَمِينٌ غَمُوسٌ (جھوٹی قسم) کو بھی حنث کہا جاتا ہے۔ اور حَنِثَ فِي يَمِينِهِ کے معنی قسم توڑنے کے ہیں اور حنث کے معنی سن بلوغت کے بھی آتے ہیں کیونکہ اس عمر میں انسان

---

[1] وفی النہایہ: انہ کان یصلی الی جذع فی مسجدہ فلما عمل لہ المنبر صعد علیہ فحن الجذع الیہ کذافی النہایۃ وفی روایۃ، کان یخطب بدل یصلی ثم حدیث حنین الجذع معروف رواہ جماعۃ من الصحابۃ وفی بعض الروایات فخار کخوار الثور حتی ارتج المسجد فلا معنی لتاویل المؤلف وحملہ علی المجاز راجع للحدیث الداعی سقم (۱۳-۲۲م)

جو گناہ کرے گا اس پر اسے مواخذہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے بَلَغَ فُلَانٌ الْحِنْثَ فلاں بالغ ہوگیا اَلْمُتَحَنِّثُ وہ شخص جو اپنے سے گناہ کو دور کرنے کے لئے عبادت کرے جیسے متحرّج اور متأثّم کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

(ح ن ج ر)

اَلْحَنْجَرَةُ (زنرخرہ) نائے گلو یعنی بیرونی جانب سے حلقوم کا سرا اس کی جمع حَنَاجِرُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِيْنَ (۴۰-۱۸) غم سے بھر کر گلو تک آرہے ہوں گے۔

وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (۳۳-۱۰) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔

(ح ن ذ)

اَلْحَنِيْذُ (بھونا ہوا) قرآن میں ہے:۔

اَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ (۱۱-۶۹) کہ ایک بھونا ہوا بچھڑا لے آئے۔

یعنی وہ بچھڑا جو دو گرم پتھروں کے درمیان رکھ کر کباب کیا گیا تھا اور یہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اس سے لزوجت بہ کر نکل جائے۔ یہ حَنَذْتُ الْفَرَسَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پسینہ لانے کے لئے گھوڑے کو ایک دو چکر دوڑا کر اس پر جھول ڈال دینے کے ہیں۔ ایسے گھوڑے کو مَحْنُوْذٌ اور حَنِيْذٌ کہا جاتا ہے۔

حَنَذَتْنَا الشَّمْسُ ہمیں سورج نے جھلس دیا۔ اور پسینہ سے چونکہ معمولی سا پانی نکلتا ہے۔ اس لئے جب کوئی شراب پلائے تو اس سے کہا جاتا ہے اَحْنِذْ یعنی اس میں تھوڑا سا پانی ملا لو یعنی پسینہ کی مقدار میں یا اس رطوبت کی طرح جو حَنِيْذٌ یعنی کباب کئے ہوئے گوشت سے نکلتی ہے۔

(ح ن ف)

اَلْحَنَفُ کے معنی گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ اس کے بالمقابل حَنَفٌ ہے جس کے معنی ہیں استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا۔

اَلْحَنِيْفُ (بروزن فعیل) جو باطل کو چھوڑ کر استقامت پر آجائے قرآن میں ہے:۔

قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا (۱۶-۱۲۰) اور خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک کے ہو رہے تھے۔

حَنِيْفًا مُّسْلِمًا (۳-۶۷) سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو رہے تھے۔

حَنِيْفٌ کی جمع حُنَفَاءُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ (۲۲-۳۰-۳۱) اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو صرف ایک خدا کے ہو کر۔

تَحَنَّفَ فُلَانٌ راہ استقامت کی تلاش کرنا۔ ہر وہ شخص جو بیت اللہ کا حج کرتا اور ختنہ کرواتا عرب کے لوگ اسے حَنِيْفٌ کہہ کر پکارتے تھے یعنی یہ دین ابراہیمؑ کا پابند ہے۔

اَلْاَحْنَفُ جس کے پاؤں میں کجی ہو کبھی تفاؤل کے طور پر کسی کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صرف مائل ہونے کے معنی بطور استعارہ آتا ہے۔

(ح ن ك)

اَلْحَنَكُ کے معنی انسان یا چوپائے کے تالو کے ہیں اور کوّے کی چونچ کو حنک کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اس کے لئے بمنزلہ انسان کے تالو کے ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

اَسْوَدُ مِثْلَ حَنَكِ الْغُرَابِ اوحَلَكِ الْغُرَابِ وہ کوّے کی چونچ یا اس کے پروں کی طرح سیاہ ہے، یہاں حنک کے معنی منقار اور حلک کے معنی پروں کی سیاہی کے ہیں اور آیت کریمہ:۔

لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ اِلَّا قَلِيْلًا تو میں تھوڑے شخصوں کے سوا اس کی (تمام) اولاد کی جڑ کاٹتا رہوں گا (۱۷-۶۲)

میں یہ حَنَكْتُ الدَّابَّةَ سے بھی مشتق ہوسکتا ہے جس کے معنی اس کے منہ میں لگام دینے یا رسی باندھنے کے ہیں۔ پس یہ لَاُلْجِمَنَّ فُلَانًا وَ لَاُرْسِنَنَّهٗ کی طرح ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِحْتَنَكَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ سے مشتق ہو جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو صفاچٹ کردینے کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ میں انہیں اس طرح تباہ و برباد کروں گا جیسے ٹڈی زمین پر سے نبات صفاچٹ کردیتی ہے۔

حَنَّكَهُ الدَّهْرُ زمانہ نے اسے تجربہ کار بنادیا۔ جیسا کہ نَجَّذَهٗ وَ قَرَّعَ سِنَّهٗ وَ افْتَرَّهٗ وغیرہ استعارات تجربہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ح و ب)

اَلْحَوْبُ (ن) جرم کا ارتکاب کرنا۔ حُوْبٌ (اسم) گناہ۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا (۴-۲) کہ یہ بڑا سخت گناہ ہے۔

ایک روایت میں ہے[1] (۱۰۰)

طَلَاقُ اُمِّ اَيُّوْبَ حُوْبٌ کہ ام ایوب کو طلاق دینا گناہ عظیم ہے اور طلاق کو حوب کہنا اس بنا پر ہے کہ وہ ممنوع عنہ ہے اور یہ حَابَ حُوْبًا وَحَوْبًا وَحِيَابَةً سے ہے جس کے معنی ارتکاب جرم کے ہیں۔ اصل میں حَوْبٌ کا لفظ کلمہ زجر ہے جو اونٹوں کو ڈانٹنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

فُلَانٌ يَتَحَوَّبُ مِنْ كَذَا۔ فلاں گناہ سے بچتا ہے جیسے يَتَاَثَّمُ عرب لوگ کہتے ہیں: (مثل) اَلْحَقَ اللّٰهُ بِهِ الْحَوْبَةَ اللہ اسے مسکنت اور احتیاج میں مبتلا کرے اصل میں حَوْبَةٌ اس حاجت کو کہتے ہیں جو انسان کو ارتکاب جرم پر آمادہ کرلے کہا جاتا ہے۔ بَاتَ فُلَانٌ بِحِيْبَةِ سُوْءٍ فلاں نے بری حالت میں رات گزاری۔

اَلْحَوْبَاءُ بقول بعض نفس کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن اصل میں حَوْبَاء اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہ کا مرتکب ہو جیسے قرآن نے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ (۱۲-۵۳) میں نفس امارہ سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] اخرجه ابوداؤد فی المرسل وابراہیم الحربی فی الغریب من روایۃ ابن سیرین ورواہ یحیی الہمدانی فی مسندہ والطبرانی فی الاوسط عن ابن سیرین عن ابن عباس وزاد: قال ابن سیرین الحوب الاثم وروی الحاکم عن انس لکن فیہ ان طلاق ام سلیم لحوب وراجع للتفصیل ذیل الکشاف ۱/۲۶۴ وتخریج الکشاف ۳۸ رقم ۳۱۶ ÷

÷ ÷ ÷ ÷ ÷

(ح و ت)

اَلْحُوْتُ بڑی مچھلی کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
نَسِیَا حُوْتَهُمَا (۱۸-۶۱) تو اپنی مچھلی بھول گئے
فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ (۳۷-۱۴۲) پھر مچھلی نے ان کو نگل لیا۔
اس کی جمع حِیْتَانٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا (۷-۱۶۳) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں۔
اور مچھلی چونکہ رخ بدلتی رہتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے حَاوَتَنِیْ فُلَانٌ اس نے مجھے مچھلی کی طرح دھوکا دیا۔

(ح و ج)

اَلْحَاجَةُ اس چیز کی ضرورت کو کہتے ہیں جس کی دل میں محبت ہو اس کی جمع حَاجَاتٌ و حَوَائِجُ آتی ہے اور حَاجَ (ن) یَحُوْجُ وَ اِحْتَاجَ کے معنی ضرورت مند ہونے کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰهَا (۱۲-۶۸) ہاں وہ یعقوب کے دل کی خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی۔
حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا ۔۔۔۔ (۵۹-۹) اور جو کچھ ان کو ملا اس سے کچھ خواہش۔
اَلْحَوْجَاءُ کے معنی حاجت ہی کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ حَاجٌ ایک قسم کے کانٹے کو کہتے ہیں۔

(ح و ذ)

اَلْحَوْذُ (ن) کے معنی ہیں ہانکنے والا جو اونٹ کے پیچھے اس کے رانوں کے عین بیچ میں چل کر وہاں سے سختی کے ساتھ اسے ہانکے جائے۔
حَاذَ الْاِبِلَ سختی کے ساتھ ہانکنا اور آیت:۔
اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ (۵۸-۱۹) شیطان نے ان کو قابو میں کر لیا ہے۔
میں استحوذ کے معنی ان پر مسلط ہو کر ہانکنے کے ہیں۔ یہ اِسْتَحْوَذَ الْعِیْرُ عَلَی الْاَتَانِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی گدھے کا مادہ خر کی پشت پر چڑھ کر دونوں جانب سے قابو پا لینا (جیسا کہ جفتی کی صورت میں ہوتا ہے) اس میں ایک قرأت اِسْتَحَاذَ بھی ہے جو قیاس کے مطابق ہے آیت میں شیطان کے بنی آدم پر غلبہ پانے کے لئے اِسْتَحْوَذَ کا استعمال بطور استعارہ کے ہے جیسا کہ اِقْتَعَدَهُ الشَّیْطٰنُ وَارْتَکَبَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شیطان نے اسے اپنی سواری بنا لیا۔
اَلْاَحْوَذِیُّ مرد سبک فہم و نیک کارگزار کسی چیز کا ماہر یہ حَوْذٌ بمعنی سَوْقٌ (چلانا) سے مشتق ہے۔

(ح و ر)

اَلْحَوْرُ (ن) کے اصل معنی پلٹنے کے ہیں خواہ وہ پلٹنا بلحاظ ذات کے ہو یا بلحاظ فکر کے اور آیت کریمہ:۔
اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (۸۴-۱۴) اور خیال کرتا تھا کہ (خدا کی طرف) پھر کر نہیں آئے گا۔

لہ وفی ذیل الامالی الزرق والحوبۃ المسکنۃ ۱۲

میں لَنْ یَّحُوْرَ سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:۔

زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ (۶۴-۷) جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہدو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

حَارَ الْمَآءُ فِی الْغَدِیْرِ پانی کا حوض میں گھومنا۔

حَارَ فِیْ اَمْرِہٖ کسی معاملہ میں متحیر ہونا۔

اسی سے مِحْوَرٌ ہے۔ یعنی وہ لکڑی جس پر چرخی گھومتی ہے اور گھومنے کے معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔

سَیْرُ السَّوَانِیْ اَبَدًا لَا یَنْقَطِعُ کہ پانی کھینچنے والے اونٹ ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

مَحَارَۃُ الْاُذُنِ کان کا گڑھا۔ یہ مَحَارَۃُ الْمَآءِ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں آواز سے ہوا اس طرح چکر کاٹتی ہے۔ جیسے گڑھے میں پانی گھومتا ہے۔ اَلْقَوْمُ فِیْ حَوَارٍ یعنی زیادتی کے بعد نقصان کی طرف لوٹ رہے ہیں حدیث میں ہے[1]:۔ (۱۰۱)

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ ہم زیادتی کے بعد کمی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یا کسی کام کا عزم کر لینے کے بعد اس میں تردد سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اسی طرح کہا جاتا ہے (مثل)

حَارَ بَعْدَ مَا کَارَ زیادہ ہونے کے بعد کم ہو گیا۔

اَلْمُحَاوَرَۃُ وَالْحِوَارُ ایک دوسرے کی طرف کلام لوٹانا اسی سے تَحَاوُرٌ (تبادلہ گفتگو) ہے قرآن میں ہے۔

وَاللّٰہُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا (۵۸-۱) اور خدا تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

کَلَّمْتُہٗ فَمَا رَجَعَ اِلَیَّ حَوَارًا اَوْ حَوِیْرًا اَوْ مَحُوْرَۃً میں نے اس سے بات کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مَا یَعِیْشُ بِاَحْوَرَ وہ عقلمندی سے زندگی بسر نہیں کر رہا ہے۔ اور آیات کریمہ:۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ (۵۵-۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔

حُوْرٌ عِیْنٌ (۵۶-۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

میں حُوْرٌ، اَحْوَرُ اور حَوْرَآءُ کی جمع ہے۔ اور حُوْرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی "بقول بعض" آنکھ کی سیاہی میں تھوڑی سی سفیدی ظاہر ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

اِحْوَرَّتْ عَیْنُہٗ یعنی اس کی آنکھ بہت سیاہی اور سفیدی والی ہے۔ اور یہ آنکھ کا انتہائی حسن سمجھا جاتا ہے جو اس سے مقصود ہو سکتا ہے۔

حَوَّرْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو گھمانا۔ سفید کرنا (کپڑے کا) اسی سے اَلْخُبْزُ الْحُوَّارٰی ہے جس کے معنی میدے کی روٹی کے ہیں عیسٰی علیہ السلام کے انصار واصحاب کو حَوَارِیِّیْنَ کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قصّار یعنی دھوبی تھے اور بعض نے کہا ہے کہ صیاد یعنی شکاری تھے بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حواری اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو علمی اور دینی فائدہ پہنچا کر گناہوں کی میل سے اپنے آپ کو پاک کرتے تھے جس پاکیزگی کی طرف کہ آیت۔

---

[1] الحدیث فی اللسان (حور، کور، کون) ومجالس ثعلب ۳۵۱ ومجازات القرآن للشریف الرضی ۲۸۲ والمجازات النبویہ واساس البلاغۃ والفائق ۲/۳۱۱ وفیہ بعد الکون وغریب ابی عبید ا/۲۱۹ والترمذی فی الدعوات والنسائی فی الاستعاذۃ و (رحم) ۵: ۸۲-۸۳ [2] المثل فی جل المعاجم۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳-۳۳) میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر انہیں تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قصّارؑ کہہ دیا گیا ہے ورنہ اصل میں وہ دھوبی پن کا کام نہیں کرتے تھے اور اس سے وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جو معرفت حقائق کی بنا پر عوام میں متداول پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار نہ کرے اسی طرح ان کو صتیا و اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو حیرت سے نکال کر حق کیطرف لاکر گویا ان کا شکار کرتے تھے۔ آنحضرت نے حضرت زبیر کے متعلق فرمایا (۱۰۲)

الزبیر ابن عمتی وحواری۔ کہ زبیر میرا پھوپھی زاد بھائی اور حواری ہے نیز فرمایا (۱۰۳) لکل نبی حواری وحواری الزبیر۔ کہ ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری رہا ہے اور میرا حواری زبیرؓ ہے۔ اس روایت میں حضرت زبیرؓ کو حواری کہنا محض نصرت اور مدد کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا۔

مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ- قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ (۶۱-۱۴) بھلا کون ہیں جو خدا کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں۔ حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔

ح و ش

حَاشَا (کلمہ استثناء اور تنزیہ ہے) قرآن میں ہے:۔

وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ (۱۲-۳۱) یعنی وہ ہر نقص سے پاک اور دور ہے۔

ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ یہ تنزیہ اور استثناء کیلئے آتا ہے۔ ابو علی الفسویؒ کا قول ہے کہ حاش اسم نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر حرف جر داخل نہیں ہوتا۔ اور نہ حرف ہے کیونکہ حرف میں جب تک تضعیف نہ ہو اس میں سے حذف نہیں ہوتا۔ حالانکہ حاش و حاشی دونوں طرح بولتے ہیں۔ پس بعض حاش کو مستقل کلمہ مان کر اسے حُوش بمعنی وحشی سے مشتق مانتے ہیں اور اسی سے حُوشِيُّ الْكَلَامِ (وحشی کلام) ہے اور بعض نے کہا ہے کہ حَوش کے معنی مذکر جن کے ہیں اور اسی کی طرف وَحشَةُ الصيد منسوب ہے اور اَحْشَتَهُ کے معنی ہیں کہ شکار کو ہر طرف سے گھیر کر پھندے کی طرف لایا۔

وَاسْتَوْحَشُوهُ وَتَحَوَّشُوهُ انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اَلْحُوشُ (ن) ایک کنارے سے کھانا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حَتِيَ سے مقلوب ہے اور اسی سے حَاشِيَةٌ ہے جس کے معنی کنارے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (بسیط)

(۱۲۲) وَمَا اُحَاشِي مِنَ الْاَقْوَامِ مِنْ اَحَدٍ

اور لوگوں سے میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا گویا شاعر نے کہا ہے کہ میں کسی کو ایک حشا میں نہیں رکھتا۔ کہ تمہاری فضیلت بیان کرتے وقت

---

[1] اخرجہ النسائی والترمذی والبخاری من حدیث جابر وردت ک من علیؓ راجع الفتح مناقب زبیر بن العوام وتخریج الکشاف لابن حجر ۱۲ [2] قالہ النابغۃ واولہ: ولا اری فاعلا فی الناس یشبہہ۔ الشطر فی الاشباہ والنحویہ (۲: ۷) والبیت فی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۷۷) والعقد الثمین ۷ واللسان (حشی) ودیوانہ ۱۳ والخزانہ (۲: ۴۴) والمغنی لابن ہشام (۱: ۱۲۰) والعینی (۱: ۳۸) والسیوطی ۲۸، ۲۷ اواسرار ابن الانباری ۲۰۸ وشرح العشر للتبریزی ۶ ۲۷ ۹ و اسمہ ابو امامہ زیاد بن معاویہ المتوفی (نحو ۱۸ ق) واختلف العلماء فی حاشیٰ ہل ہو فعل او حرف جر واستدل المبرد بہذا البیت علی ان حاشی قد یکون فعلا انظر التفصیل فی البغدادیہ (۲: ۴۴-۵۴)

اسے مستثنیٰ کرنا پڑے۔
دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ (طویل)
(۱۲۳) وَلَا يَتَخَشَّى الْفَحْلُ اِنْ اَعْرَضَتْ بِهٖ
وَلَا يَمْنَعُ الْمِرْبَاعَ مِنْهُ نَصِيْلُهَا

(ح و ط)

اَلْحَائِطُ۔ دیوار جو کسی چیز کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور اِحَاطَة (افعال) کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اجسام کے متعلق جیسے۔ اَحَطْتُ بِمَكَانِ كَذَا یہ کبھی بمعنی حفاظت کے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (۴۱-۵۴) سن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔
یعنی وہ ہر جانب سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور کبھی روکنے کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اِلَّا اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (۱۲-۶۶) مگر یہ کہ تم گھیر لئے جاؤ۔ یعنی تمہیں روک لیا جائے۔ اور آیت کریمہ: اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ (۲-۸۱) اور اس کے گناہ (ہر طرف سے) اس کو گھیر لیں۔
میں بہت بلیغ استعارہ ہے۔ کیونکہ انسان جب کسی صغیرہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اسے بار بار کرتا ہے تو یہ اسے کسی بڑے گناہ کے ارتکاب کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اس طرح وہ برابر گناہوں کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور وہ گناہ کو چھوڑ نہیں سکتا تو گویا گناہ نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا۔

(۲) دوم احاطہ بالعلم ہے جیسے فرمایا:۔ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶۵-۱۲) اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۳-۱۲۰) یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔
اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۱۱-۹۲) میرا پروردگار تو تمہارے سب اعمال پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔
اور کسی چیز پر علم کے ذریعے احاطہ کر لینے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ انسان اس چیز کے وجود، جنس، کیفیت، اس کی غرض اور اس کو وجود میں لانے کے مقصد الغرض اس کے مالہ و ما علیہ کو پوری طرح جان لے۔ اور اس طرح کا احاطہ اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن نے مخلوق سے اس قسم کے احاطہ علمی کی نفی کی ہے۔ جیسے فرمایا:۔
بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ (۱۰-۳۹) حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر یہ قابو نہیں پا سکتے اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا۔ اور خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا:۔
وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (۱۸-۶۸) اور جس بات کی تمہیں خبر ہی نہیں اس پر صبر کر بھی کیونکر سکتے ہو۔
اس میں تنبیہ ہے کہ جب تک کسی چیز پر پوری طرح احاطہ نہ ہو اس وقت تک کامل صبر بہت مشکل ہوتا ہے اور کسی چیز پر پوری طرح احاطہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازش کے بغیر ناممکن ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ (۱۰-۲۲) اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (اب تو) لہروں میں گھر گئے۔
میں احاطہ بالقدرۃ مراد ہے۔ اسی طرح فرمایا:۔
وَاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا۔

لہ قالہ رجل من بنی عکل والبیت فی المعانی للقتیبی ۳۹۲، ۱۲۳۷ واللسان (حشی) وابن البابلی فی المعانی ۱۲۲ ؛ ؛ ؛

(۴۸-۲۱) اور غنیمتیں دیں جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (اور) وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں۔
اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ (۱۱-۸۴) مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تم کو گھیر کر رہیگا۔
اَلْاِحْتِیَاطُ (افتعال) یعنی ایسے وسائل بروئے کار لانا جن کے ذریعہ کسی (ضرر) سے بچاؤ ہو سکے۔

(ح و ل)

اَلْحَوْلُ (ن) دراصل اس کے معنی کسی چیز کے متغیر ہونے اور دوسری چیزوں سے الگ ہونا کے ہیں یعنی تغیر کے اعتبار سے حَالَ الشَّیْءُ یَحُوْلُ حُؤُوْلًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی شے کے متغیر ہونیکے ہیں۔ اور اِسْتَحَالَ کے معنی تغیر پذیر ہونے کے لئے مستعد ہونے کے اور معنی انفصال کے اعتبار سے حَالَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکَ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی میرے اور اس کے درمیان فلاں چیز حائل ہو گئی۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ (۸-۲۴) اور جان رکھو کہ خدا آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔
میں باری تعالےٰ کے مقلب القلوب ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالےٰ اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق انسان کے دل میں ایسی بات ڈال دیتا ہے جو اسے اس کے مقصد سے پھیر دیتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَحِیْلَ بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ مَا یَشْتَھُوْنَ (۳۴-۵۴) (ان میں اور ان کی خواہش کی چیزوں کے درمیان پردہ حائل کردیا گیا) بھی اسی معنی پر محمول ہے۔
بعض نے آیت یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مہلت دیے رکھتا ہے۔ تاکہ وہ ارذل عمر کی حد تک پہنچ جائے اور جاننے کے بعد کسی چیز کو بھی نہ جان سکے۔
حَوَّلْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو متغیر کرنا اور پھیر دینا۔ اور یہ تغیر کبھی باعتبار ذات کے ہوتا ہے اور کبھی باعتبار حکم اور قول کے اسی سے کہا جاتا ہے۔ اَحَلْتُ عَلٰی فُلَانٍ بِالدَّیْنِ میں نے فلاں پر قرض کا حوالہ کردیا۔ حَوَّلْتُ الْکِتَابَ کتاب کو نقل کرنا۔ مثل مشہور ہے[1] (مثل) لَوْ کَانَ ذَا حِیْلَۃٍ لَتَحَوَّلَ اگر صاحب تدبیر ہوتا تو پھر جاتا اور آیت کریمہ:۔
لَا یَبْغُوْنَ عَنْھَا حِوَلًا (۱۸-۱۰۸) اور وہاں سے مکان بدلنا نہ چاہیں گے۔ میں حِوَلًا کے معنی تحول یعنی پھرنے کے ہیں۔
اَلْحَوْلُ سال کو کہتے ہیں اس لئے کہ سال بھر میں سورج اپنی گردش پوری کرلیتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ (۲-۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔
مَتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ (۲-۲۴۰) کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔
اسی سے حَالَتِ السَّنَۃُ تَحُوْلُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں سال گزر گیا۔ حَالَتِ الدَّارُ

---

[1] راجع للمثل المیدانی رقم ۳۲۲۴، ۲۷۱، ۱۳۴

گھر کی حالت متغیر ہوگئی۔

اَحَالَتْ وَاَحْوَلَتْ اس پر ایک سال پورا ہوگیا جیسا کہ اَعَامَتْ وَاَشْهَرَتْ کا محاورہ ہے۔

اَحَالَ فُلَانٌ بِمَكَانِ كَذَا وہ فلاں جگہ پورا ایک سال رہا۔

حَالَتِ النَّاقَةُ تَحُوْلُ حِيَالًا اونٹنی کا حاملہ نہ ہونا۔ گویا اس کی پہلی حالت متغیر ہوگئی۔

اَلْحَالُ انسان وغیرہ کی وہ حالت جو نفس جسم اور مال کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے اور حَوْل کا لفظ مالی، بدنی اور جسمانی تینوں قسم کی قوت پر بولا جاتا ہے اسی سے کہا جاتا ہے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اللہ کے سوا کچھ حیلہ اور قوت نہیں ہے۔

حَوْلُ الشَّيْءِ کسی چیز کی وہ جانب جس کی طرف اسے پھیرنا ممکن ہو حَوْل کہلاتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ (۴۰-۷) اور جو لوگ عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے گرداگرد (حلقہ باندھے ہوئے) ہیں۔

اَلْحِيْلَةُ وَالْحُوَيْلَةُ اس تدبیر کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز تک پوشیدہ طور سے پہنچا جاسکے۔ عام طور پر اس کا استعمال بری تدبیر کے لئے ہوتا ہے لیکن کبھی ایسی تدبیر کے متعلق بھی ہوتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے وصف میں:۔ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳-۱۳) آیا ہے یعنی باری تعالیٰ خفیہ سے اس کام کو سرانجام دیتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کو مکر و کید کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے۔ نہ کہ بطور مذمت کے اللہ تعالیٰ تو ہر قبح سے پاک اور بالا ہے۔

اور حِيْلَةٌ بھی حَوْل سے مشتق ہے واؤ کا ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے اسے یاء سے تبدیل کردیا گیا ہے اور اسی سے رَجُلٌ حُوَّلٌ کا محاورہ ہے یعنی بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔

اَلْمُحَالُ کے معنی ہیں دو متناقض چیزوں کا ایک جگہ جمع ہونا یہ کبھی قول میں ہوتا ہے جیسے کہا جائے ایک جسم دو جگہوں میں ایک ہی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اِسْتَحَالَ الشَّيْءُ کسی چیز کا محال ہونا اور اس چیز کو مُسْتَحِيْل کہا جاتا ہے یعنی محال ہونے لگی۔

اَلْحُوَلَاءُ یعنی سبز سی جھلی جو اونٹنی کے پیٹ سے بچے کے ساتھ نکلتی ہے۔

مثل مشہور ہے[1] (مثل) وَلَا اَفْعَلُ كَذَا مَا اَرْزَمَتْ اُمُّ حَائِلٍ جب تک کہ اونٹنی آواز نکالتی رہے میں اس کام کو نہیں کروں گا اور ام حائل اس شتر بچہ مادینہ کو کہتے ہیں جو ابھی پیٹ سے باہر آیا ہو اور اس میں شبہ نہ رہا ہو کہ یہ مادہ ہے حالت اشتباہ کے دور ہونے کی وجہ سے اسے ام حائل کہا جاتا ہے۔

اَلْحَالُ لغت میں اس صفت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی چیز موصوف ہوتی ہے اور اہل منطق کی اصطلاح میں سریع الزوال کیفیت کو حالت کہا جاتا ہے۔ جیسے حرارت برودت یبوست اور رطوبت جو کسی چیز کو عارض ہوتی ہے۔

(ح و ی)

اَلْحَوَايَا (انتڑیاں) یہ حَوِيَّةٌ کی جمع ہے

---

[1] ای لا افعلہ ابدا راجع اللسان (حول) والامالی ا ر ۲

جس کے معنی آنت کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اَوِ الْحَوَايَا اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (۶-۱۴۶) یا
انتڑیوں میں ہو یا ہڈی میں ملی ہو۔
اور حَوِيَّةٌ اس کمبل کو بھی کہتے ہیں جو اونٹ
کی کوہان کے ارد گرد لپٹا جاتا ہے۔ یہ اصل میں
حَوَيْتُ (ض) حَيًّا وَحَوَايَةً سے مشتق ہے۔
جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔
اَلْاَحْوٰی کالا سیاہ مائل بسبزی۔ یہ حُوَّةٌ سے
مشتق ہے جس کے معنی سبزی مائل سیاہی ہیں
اور اس کا باب اِحْوَوٰی یَحْوَوِیْ اِحْوِوَاءً
آتا ہے جیسے اِدْعَوٰی بعض نے کہا ہے کہ اس وزن
پر یہ دو باب ہی آتے ہیں وَلَا ثالث لہما
حَوِیَ حُوَّۃً سیاہ سبزی مائل ہونا اسی سے
اَحْوٰی ہے جس کے معنی سخت سیاہ کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔
فَجَعَلَهٗ غُثَاۤءً اَحْوٰی (۸۷-۵) پھر اس کو
سیاہ رنگ کا کوڑا کر دیا۔
یہاں اَحْوٰی سے مراد وہ گھاس جو پرانی
بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے۔ جس کے متعلق
شاعر نے کہا ہے[1] ( )
(۱۴۲) كَالَ حَبَشِيٌّ بِاللَّدِيْنِ الْاَسْوَدِ
پرانی خشک اور سیاہ گھاس یں ہوں سے محسوس
ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کی ترتیب اصل
یہ ہے[2]۔ وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی۔ اَحْوٰی فَجَعَلَهٗ
غُثَاۤءً یعنی اللہ تعالےٰ سبز چارہ اگاتا ہے پھر
اس کو کوڑا بنا دیتا ہے۔

(ح ی ث)

حَيْثُ (یہ ظرف مکان مبنی بر ضم ہے) اور
مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ
سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ (۲-۱۴۴) اور تم جہاں ہوا کرو۔
وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ (۲-۱۴۹) اور تم جہاں سے نکلو۔

(ح ی د)

اَلْحَيْدُ (ض) کے معنی پہلو تہی کرنے اور
دور بھاگنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۵۰-۱۹) (اے
انسان) یہی (وہ حالت) ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

(ح ی ر)

حَارَ (ض) حَيْرَةً فَهُوَ حَائِرٌ وَحَيْرَانُ
وَتَحَيَّرَ وَاسْتَحَارَ کے معنی کسی کام سے بھٹکنے اور
متردد ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِيْنُ فِی الْاَرْضِ
حَيْرَانَ (۶-۷۱) جیسے کسی کو جنات نے جنگل
میں بھلا دیا ہو (اور وہ) حیران ہو رہا ہو۔
اَلْحَائِرُ جائے گرداب۔ شاعر نے کہا ہے[3] ( )
(۱۲۵) وَاسْتَحَارَ شَبَابُهَا
اور اس کی جوانی بھرپور ہو گئی۔ اور استحار کے

---

[1] لم اجرلہ ویرجح ۱۲ [2] وعلیٰ ہذا التقدیر یکون احوی حالاً کما فی الکشاف ۴: ۲۳۸ وذکرہ ثعلب فی مجالسہ ۳۰۷ فی امثلۃ التغلب ۱۲
[3] قالہ ابوذویب الہذلی وتکملتہ ثلاثۃ اعوام فلما تجرمت تقضی شبابی ... والبیت فی اللسان والصحاح والتاج (جرم)، والمحکم (جرا
وفی روایتہ احوال بدل اعوام الینا بہون بدل تقضی شبابی ودیوان الہذلیین الستۃ (۱: ۷) والسیوطی ۹ فی روایۃ علینا بہون وکذا
فی (س)، ودیوان الہذلیین ۱۲

معنی پانی سے پیٹ کے اس قدر پر ہو جانے کے ہیں کہ اسے حیرت لاحق ہو جائے۔
اَلْحُبَیْرُ: ایک مقام کا نام ہے بعض کہتے ہیں کہ پانی کے جمع ہونے کی وجہ سے اس مقام کا نام حَیْرَۃ پڑ گیا تھا۔

(ح ی ص)

حَاصَ (ض) عن الحق کے معنی حق سے بھاگ کر شدت و مکروہ کی طرف جانے کے ہیں قرآن میں ہے:۔
هَلْ مِنْ مَحِيصٍ (۵۰-۳۶) کہیں بھاگنے کی جگہ ہے۔
مَا لَنَا مِنْ مَحِيصٍ (۱۴-۲۱) کوئی جگہ گریز اور رہائی ہمارے لئے نہیں ہے۔
یہ اصل میں حَيْصٌ وَبَيْصٌ سے ہے جس کے شدت اور سختی کے ہیں۔ مگر اَلْحُوْصُ (واوی) ہو تو اس کے معنی چھڑا سلنا ہونے ہیں اور اسی سے حُصْتُ عَيْنَ الصَّقْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنی صقرہ کی آنکھیں سی دینے کے ہیں۔

(ح ی ض)

اَلْحَيْضُ۔ وہ خون جو مخصوص دنوں میں صفت خاص کے ساتھ عورت کے رحم سے جاری ہوتا ہے اسے حیض کہا جاتا ہے۔ اور مَحِيضٌ کے معنی حیض، وقت حیض اور مقام حیض کے ہیں۔ کیونکہ فعل سے اس قسم کے مصادر مَفْعَلٌ کے وزن پر آتے ہیں جیسے مَعَاشٌ وَ مَعَادٌ اور شاعر کے قول[1] (الکامل)

(۱۲۶) لَا يَسْتَطِيعُ بِهَا الْقُرَادُ مَقِيلًا
(کہ چچڑی اس میں قیلولہ کی جگہ بھی نہیں پاتی)۔
میں مقیلا ظرف ہے یعنی قیلولہ کرنے کی جگہ گو بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے اور کہا جاتا ہے مَا فِي بُرِّكَ مَكِيلٌ وَمَكَالٌ کہ تیرے غلہ میں ماپ نہیں ہے۔

(ح ی ف)

اَلْحَيْفُ (ض) فیصلہ کرنے میں ایک جانب کو جھک جانا انصاف نہ کرنا۔ قرآن میں ہے:۔ أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۲۴-۵۰) یا ان کو خوف ہے کہ خدا اور اسکا رسول ان کے حق میں ظلم کرینگے (نہیں) بلکہ یہ خود ظالم ہیں۔
کہا جاتا ہے:۔
تَحَيَّفْتُ الشَّيْءَ میں نے اسے کناروں سے پکڑا۔

(ح ی ق)

(اَلْحُيُوْقُ وَالْحَيَقَانُ (ض) کے معنی کسی چیز کو گھیرنے اور اس پر نازل ہونے کے ہیں۔ اور یہ باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (۳۵-۴۳) اور بری چال کا وبال اسکے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔
وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴۶-۲۶) اور جس چیز سے استہزاء کیا کرتے تھے اس نے ان کو آ گھیرا۔

---

[1] قاله الراعی النمیری عبید بن حصین بن جندل الراعی (ابو جندل ہو من فحول الشعراء) وصدرہ: بُنِيَت مرافقهن فوق مزلة ... والبيت من كلمة جمهرية طويلة (۱/۳۳۱-۳۳۷) وراجع للبيت اللسان (زل) وامالی المرتضیٰ ۱/۲۲۳ والبحر (۲: ۱۶۷) والكتاب (۲: ۲۷۴) مع شرحه للشنتمری المفصل ۹: ۵۵/۱۶: ۱۲) والمحکم (حیض) واللسان وفیہ مایستطیع والحیوان (۵: ۳۷۴) وفی روایته مُنِيَتْ بدل بنيت وفی بعض الروایات ثبتت ۱۲

(ح ی ن)

اَلْحِیْنُ۔ اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو۔ یہ ظرف مبہم ہے اور اس کی تعیین ہمیشہ مضاف الیہ سے ہوتی ہے جیسے فرمایا۔ وَلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸-۳) اور وہ رہائی کا وقت نہ تھا۔

اور بعض نے حینُ (رفع کے ساتھ) پڑھا ہے پس حین کا استعمال چند وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) مدت اور اجل کے معنی میں جیسے فرمایا:۔ وَمَتَّعْنَاهُمْ اِلٰی حِیْنٍ (۱۰-۹۸) اور ایک مدت تک (فوائد دنیوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔

(۲) سال اور برس کے معنی میں جیسے:۔ تُؤْتِیْ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴-۲۵) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو۔

(۳) ایک ساعت اور گھڑی کے معنی میں جیسے فرمایا:۔ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ (۳۰-۱۷) تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو۔ ...

(۴) مطلق زمانہ اور وقت کے معنی میں جیسے فرمایا۔ هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (۷۶-۱) بیشک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ (۳۸-۸۸) اور تم کو اس کا حال ایک وقت کے بعد معلوم ہو جائیگا۔ اور کسی ایک معنی کی تعیین موقع ومحل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔ عَامَلْتُهٗ مُحَایَنَةً "میں نے اس سے وقتاً فوقتاً معاملہ کیا۔

اَحْیَنْتُ بِالْمَکَانِ میں وہاں ایک عرصہ ٹھہرا رہا۔ حَانَ حِیْنُ کَذَا۔ فلاں چیز کا موسم قریب آپہنچا۔ حَیَّنْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کیلئے وقت مقرر کرنا۔ اور اَلْحَیْنُ (بفتح الحاء) کے معنی موت اور ہلاکت کے ہیں۔

(ح ی ی)

اَلْحَیَاةُ زندگی، جینا یہ اصل میں حَیِیَ (س) یَحْیٰی کا مصدر ہے) کا استعمال مختلف وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) قوت نامیہ جو حیوانات اور نباتات دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے نبات کو حَیٌّ یعنی زندہ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۵۷-۱۷) جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ فَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا (۵۰-۱۱) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱-۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

(۲) دوم حیاۃ کے معنی قوت احساس کے آتے ہیں اور اسی قوت کی بنا پر حیوان کو حیوان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (۳۵-۲۲) اور نہ زندے اور مردے برابر ہو سکتے ہیں۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ کِفَاتًا اَحْیَآءً وَّاَمْوَاتًا (۷۷-۲۵-۲۶) اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ الَّذِیْ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ

قَدِيْرٌ (۴۱-۳۹) تو جس نے زمین کو زندہ کیا وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہی زمین کو زندہ کرنے سے اسے قوت نامیہ عطا کرنا مراد ہے اور مُحْيِي الْمَوْتٰى سے قوت احساس کے عطا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) قوت عاقلہ عاملہ کا عطا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (۶-۱۲۲) بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور شاعر نے کہا ہے[1] (   )

(۱۲۷) اَسْمَعْتَ لَوْ نَادَيْتَ حَيًّا
وَلٰكِنْ لَا حَيَاةَ لِمَنْ تُنَادِيْ

اگر تو کسی زندہ کو پکارتا تو وہ سن لیتا۔ لیکن جس کو تم پکار رہے ہو اس میں زندگی نہیں ہے (یعنی عقل سے محروم ہے)

(۴) غم کا دور ہونا مراد ہوتا ہے۔ اس معنی میں شاعر نے کہا ہے[2] ع (خفیف)

(۱۲۸) لَيْسَ مَنْ مَاتَ فَاسْتَرَاحَ بِمَيْتٍ
اِنَّمَا الْمَيْتُ مَيِّتُ الْاَحْيَاءِ

جو شخص مر کر راحت کی نیند سو گیا وہ درحقیقت مردہ نہیں ہے۔ حقیقتاً مردے وہ ہیں جو زندہ ہونے کے باوجود مردے بنے ہوئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۳-۱۶۹)

جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔

میں شہداء کو اسی معنی میں اَحْيَاءٌ یعنی زندے کہا ہے۔ کیونکہ وہ لذت وراحت میں ہیں۔ جیسا کہ ارواح شہداء کے متعلق بہت سی احادیث مروی ہیں۔

(۵) حیات سے آخرت کی دائمی زندگی مراد ہوتی ہے۔ جو کہ علم وعقل کی زندگی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] البیت فی التاج غیر منسوب والطبرسی (۱: ۹۶) والطبری (۵/ ۷۸) والبحر (۱: ۳۷۲، ۸۰۴) وتنزیہ القرآن ۱۰ وفیہ تقدیم وتأخیر وفی لطائف المعارف للبوفی ۷۳۳ وفی المطبوع وقد نادیت لو اسمعت حیا مقلوب ثم رایت فی البلدان (رسم ابیہ) ان قائلہ کثیر یرثی صدیقا فانی ۱۹ بیتا ۱۲ [2] البیت مقطوعۃ لعدی بن الرعلاء الغسانی جاہلی وہو الذی یقال لہ کوثی ابن الرعلاء (التاج یکوت، کوث) والنحویون یستشہدون بہ (راجع معالم الاہتداء للزبیدی ص) والبیت فی الاصمعیات (د تہذیب الالفاظ ۴۴ والمعجم للمرزبانی ۸۶ والسمط ۸/ ۳، ۶ والخزانۃ (۴: ۱۸۷) وابن الشجری آ و والسیوطی ۳۸، ۱۴/ ۸۷ والاقتضاب ۸۹ ومجاز القرآن ۹۴ ارقم ۱۷۹ والصناعتین ۳۱۵ والبحر (۱: ۲۰۹) وایام العرب ۵۳ والرسالۃ القشیریہ ۴۳ والحکم (شعث) فی امثلۃ بیت التشعیث والاضداد لابی الطیب (۱: ۲۱۸) ونسبہ البحتری فی الحماسۃ ۴۱ الی صالح بن عبد القدوس قال الاستاذ المیمنی فی ذیل السمط وہو بہ الیط وبمذہبہ اونق والاسف ان الاستاذ حسن کامل الصیرفی نقل تخریج المیمنی بغیر عزو فی تعلیقاتہ علی دیوان البحتری وذکر الجاحظ فی البیان (۱: ۱۳۲) ان الحسن البصری کان یتمثل بہذا البیت فی مجلسہ ومواعظہ راجع الحیوان ۶، ۷، ۵۰ وکنز العمال رقم ۱۵۵۱ ۲ والدیلمی عن انس او ابن عباس والاضداد لابی الطیب ۸ ۱۳ ولطائف المعارف للبوفی ۳۲۷ وفی المیدانی ۱: ۲۸۹ مثل یضرب بمن یوعظ فلا یقبل ولا یفہم وفی المعجم للمرزبانی واللالئ ان الشاعر قالہا فی وقعۃ عین اباغ بین الغساسنۃ بالشام والمناذرۃ بالعراق واولہا: کم ترکنا بالعین عین اباغ من ملیک وسوقۃ القاء وبعد الشاہد انما المیت من یعیش ذلیلا کاسفا بالہ قلیل الرجاء وبہذا یتضح المراد ۱۲

اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸-۲۴) خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو جب کہ رسول خدا تمہیں ایسے کام کے لئے بلاتے ہیں جو تم کو زندگی (جاوداں) بخشتا ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ:۔

يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي (۸۹-۲۴) کاش میں نے اپنی زندگی (کی جاودانی کے لئے) کچھ آگے بھیجا ہوتا۔

میں بھی اخروی دائمی زندگی مراد ہے۔

(۶) وہ حیات جس سے صرف ذات باری تعالےٰ متصف ہوتی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالےٰ کی صفت میں حَیّ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات اقدس ہوتی ہے جس کے متعلق موت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

پھر دنیا اور آخرت کے لحاظ بھی زندگی دو قسم پر ہے یعنی حیات دنیا اور حیات آخرت چنانچہ فرمایا:۔

فَأَمَّا مَنْ طَغٰى وَآثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۷۹-۳۷-۳۸) تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھا۔

اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ (۲-۸۶) جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (۱۳-۲۶) اور دنیا کی زندگی آخرت (کے مقابلے) میں (بہت) تھوڑا فائدہ ہے۔ یہاں متاع سے دنیاوی ساز وسامان مراد ہے۔

وَرَضُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا (۱۰-۷) اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ (۲-۹۶) بلکہ تم ان کو اور لوگوں سے زندگی پر کہیں حریص دیکھو گے اور آیت کریمہ:۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيمُ رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى... (۲-۲۶۰) اور جب ابراہیمؑ نے (خدا سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔

میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اخروی زندگی کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کے متعلق سوال کیا تھا۔ جو دنیوی آفات کے شوائب سے پاک ہو گی۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (۲-۱۷۹) اور اے اہل عقل (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگی ہے۔

میں قصاص میں حیات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قصاص کے خوف سے لوگ قتل پر اقدام کرنے سے رکے رہیں گے۔ لہذا اس سے لوگوں کو زندگی حاصل ہو گی۔

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۵-۳۲) اور جو اس کی زندگی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگی کا موجب ہوا۔

یعنی انہیں ہلاکت سے نجات بخشی اور آیت کریمہ:۔

رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ اَنَا اُحْيِي وَاُمِيتُ (۲-۲۵۸) میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے وہ بولا کہ جلا اور مار تو میں بھی کر سکتا ہوں۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں اس کافر کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک شخص کو معاف کر کے اسے زندگی بخشتا ہوں۔

اَلْحَيَوَانُ یہ زندگی کا مقام اور مقر ہوتا ہے اور دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) وہ جس میں قوت احساس ہو (۲) وہ جسے دائمی بقا حاصل ہو اور آیت کریمہ:۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۲۹-۶۴) اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) آخرت کا گھر ہے۔ کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔

میں اسی دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے دار آخرت کو حیوان کہا گیا ہے۔ اور لَهِیَ الْحَیَوَانُ کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ حقیقی اور سرمدی زندگی تو وہ ہے جس کے بعد فنا نہ آئے نہ کہ وہ جو کچھ مدت کے بعد فنا ہو جائے۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ حیوان اور حیاۃ دونوں ہم معنی ہیں بعض کہتے ہیں کہ حیوان وہ ہے جس میں حیاۃ یعنی زندگی ہو اس کے بالمقابل مَوَتَانَ وہ ہے جس میں زندگی نہ ہو۔ اور بارش کو حیًا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور آیت :-

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱-۳۰)

میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:-

إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ (۱۹-۷)

میں انہیں یحییٰ کہنے سے صرف یہ مقصود نہیں تھا۔ کہ وہ اس نام سے مشہور ہوں گے۔ کیونکہ اس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا تھا کہ گناہوں سے اس کا دل مردہ نہیں ہوگا جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے

اور آیت کریمہ :-

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (۳۰-۱۹) وہی زندے کو مردے سے نکالتا ہے اور (وہی) مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ نطفہ سے انسان پیدا کرتا ہے اور انڈے سے مرغی۔ اسی طرح زمین سے نباتات نکالتا ہے اور انسان سے نطفہ۔ اور آیت کریمہ:-

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (۴-۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دیا کرو یا انہی لفظوں سے دعا دو۔ نیز:-

فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ (۲۴-۶۱) اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں کو) سلام کیا کرو (یہ خدا کی طرف سے .... تحفہ ہے۔

میں تَحِيَّة کے معنی کسی کو حَيَّاكَ اللهُ کہنے کے ہیں یعنی اللہ تجھے زندہ رکھے۔ یہ اصل میں جملہ خبریہ ہے لیکن دعا کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے حَيَّا فُلَانٌ فُلَانًا تَحِيَّةً فلاں نے اسے حَيَّاكَ اللهُ کہا۔ اصل میں تَحِيَّةَ حیات سے مشتق ہے۔ پھر دعائے حیات کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کیونکہ جملہ اقسام تحیۃ حصول حیاۃ یا سبب حیاۃ سے خارج نہیں ہیں خواہ یہ دنیا میں حاصل ہو یا عقبیٰ میں۔ اسی سے اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ[1] ہے اور آیت کریمہ :-

وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ (۲-۴۹) اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔

کے معنی عورتوں کو زندہ چھوڑ دینے کے ہیں۔ اَلْحَيَاءُ کے معنی قبائح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَيِيَ فَهُوَ حَيٌّ وَاسْتَحْيَا فَهُوَ مُسْتَحْيٍ۔ اور بعض نے اِسْتَحَىٰ فَهُوَ مُسْتَحٍ (تخفیف یاء) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ قرآن میں ہے:-

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا (۲-۲۶) خدا اس بات

---

[1] دیلمی التشہد فی الصلوٰۃ والفاظہ وردت فی غیر حدیث والمعروف تشہد عبداللہ بن مسعود واخرجہ الائمۃ الستۃ ومنہا تشہد ابن عباس واختارہ الشافعی وتشہد مالک واصحابہ الی تشہد عمرؓ راجع الزرقانی علی المؤطا ۱: ۱۷۶-۱۷۸)

سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے۔
وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَقِّ (۳۳-۳۵) لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔
ایک روایت میں ہے۔[1]
(۱۰۳) اِنَّ اللّٰہَ یَسْتَحْیِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ اَنْ یُّعَذِّبَہٗ کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے شرماتا ہے۔

پس اللہ کی طرف جب حیا کی نسبت ہو تو اس کے معنی انقباض نفس کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذات باری تعالیٰ منزہ ہے بلکہ اس سے مراد اسے عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے[2]
(۱۰۴) اِنَّ اللّٰہَ حَیِیٌّ کہ اللہ حَیِیٌّ ہے تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ قبائح کو چھوڑنے والا اور محاسن یعنی افعال حسنہ کو سرانجام دینے والا ہے۔

---

[1] ۔۔۔

[2] ورد الحدیث بالفاظ مختلفۃ وتمامہ کریم یستحیی من عبدہ اذ رفع یدیہ ان یردھما صفرا راجع ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ من حدیث سلمان والحدیث ایضا فی المستدرک للحاکم من انس وابی یعلی عن جابر ابن عمر من الطبرانی ورا جع عون المعبود ار ۳ ۵ ۵ والکافی لابن حجر رقم ۳۰ وکنز العمال رقم ۳۴۴۲ و ۳۲۴۴ و ۳۲۵۳ و ۳۲۸۴ (عبد الرزاق عن انس) والحکیم الترمذی ایضا عن انس ج ۲ وایضا ۳۸۴-۳۸۶

کتاب الخاء

(خ ب ء)

اَلْخَبْءُ (ف) کسی چیز کے پوشیدہ اور مخفی ذخیرہ کو خبأ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اَلَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ (۲۷-۲۵) جو چھپے ہوئے خزانے نکالتا ہے۔

اسی سے جَارِیَۃٌ خُبَأَۃٌ (طُلَعَۃٌ) کا محاورہ ہے[1] یعنی وہ لڑکی جو کبھی پردہ میں چلی جاتی ہو اور کبھی باہر نکل آتی ہو۔

اَلْخِبَاءُ۔ وہ نشان جو اونٹنی کے کسی خفیہ مقام پر لگایا گیا ہو۔

(خ ب ت)

اَلْخَبْتُ نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں اور اَخْبَتَ الرَّجُلُ کے معنی نشیبی اور نرم زمین کا قصد کرنے یا وہاں اترنے کے ہیں (جیسے اَسْہَلَ وَاَنْجَدَ) اس کے بعد لفظ اَلْاِخْبَاتُ (افعال) نرمی اور تواضع کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ قرآن میں ہے۔ وَاَخْبَتُوْا اِلٰی رَبِّہِمْ (۱۱-۲۳) اور اپنے پروردگار کے آگے عاجزی کی۔ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ۔ (۲۲-۳۴) اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنادو۔ یعنی تواضع کرنے والوں کو جیسا کہ دوسری جگہ انہی لوگوں کے متعلق لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ (۷-۲۰۶) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ فَتُخْبِتَ لَہٗ قُلُوْبُہُمْ (۲۲-۵۴) تو ان کے دل اللہ کے سامنے عاجزی کریں۔ میں اخبات کے معنی دلوں کے نرم ہونے اور عاجزی کرنے کے ہیں۔ اور یہاں اس کے معنی قریبًا وہی ہیں جو کہ آیت وَاِنَّ مِنْہَا لَمَا یَہْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ (۲-۷۴) اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ میں ہبوط کے ہیں۔

(خ ب ث)

اَلْمُخْبَثُ وَالْخَبِیْثُ۔ ہر وہ چیز جو ردی اور خسیس ہونے کی وجہ سے بری معلوم ہو خواہ وہ چیز محسوسات سے ہو یا معقولات (یعنی عقائد و خیالات) سے تعلق رکھتی ہو اصل میں خبیث ردی اور ناکارہ چیز کو کہتے ہیں جو بمنزلہ لوہے کی میل کے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] ع:

(۱۰۹) سَبَکْنَاہُ وَنَحْسِبُہٗ لُجَیْنًا !
فَاَبْدَی الْکِیْرُ عَنْ خَبَثِ الْحَدِیْدِ

ہم نے اسے اس خیال سے ڈھالا کہ یہ چاندی ہے لیکن بھٹی میں ڈالنے سے معلوم ہوا کہ یہ لوہے کا میل ہے۔ اس اعتبار سے یہ اعتقاد باطل، کذب اور فعل

---

[1] والمعروف فی المثل خُبَأَۃٌ طُلَعَۃٌ فیہما سقوط

تبیح سب کو شامل ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۷۔۱۵۷) اور
ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔
یعنی محظورات جو طبیعت کے ناموافق ہیں۔ اور
آیت کریمہ:۔
وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ
الْخَبٰٓئِثَ (۲۱۔۷۴) اور اس بستی سے جہاں کے
لوگ گندے کام کرتے تھے بچا نکالا۔
میں عمل خبائث میں لذت اندوزی کے لئے مردوں
کی طرف مائل ہونے سے کنایہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ
عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (۳۔۱۷۹)
جب تک خدا ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دیگا۔
میں اعمال خبیثہ کو اعمال صالحہ سے اور بدباطن لوگوں
کو نفوس زکیہ سے تمیز دینا مراد ہے۔ اور آیت:۔
وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ (۴۔۲) اور ان
کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو (اپنے ناقص اور برے
مال سے نہ بدلو۔
میں خبیث اور طیب سے حلال اور حرام مراد ہیں
اور فرمایا:۔
اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ
(۲۴۔۲۶) ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے
ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے۔
یعنی افعال قبیحہ اور آوارہ کام، بدباطن اور آوارہ
لوگ ہی کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ (۵۔۱۰۰)
کہدو کہ ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں۔
میں خبیث اور طیب سے کافر اور مومن اور اچھے
اور برے اعمال مراد ہیں۔ اور آیت:۔
مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ (۱۴۔۲۶)
اور ناپاک بات کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے۔
میں کفر، جھوٹ، چغلی ہر قسم کی قبیح باتیں داخل
ہیں حدیث میں ہے:۔
اَلْمُؤْمِنُ اَطْيَبُ مِنْ عَمَلِهٖ وَالْكَافِرُ اَخْبَثُ
مِنْ عَمَلِهٖ۔ کہ مومن اپنے عمل سے پاک اور
کافر اپنے عمل سے ناپاک ہے۔
اور خَبِيْث وَمُخْبِثٌ خبث کے مرتکب کو
بھی کہا جاتا ہے۔

(خ ب ر)

اَلْخَبَرُ۔ جو باتیں بذریعہ خبر کے معلوم ہو سکیں
ان کے جاننے کا نام "خبر" ہے کہا جاتا ہے۔
خَبَرْتُهٗ خُبْرَةً وَاَخْبَرْتُ۔ جو خبر مجھے
حاصل ہوئی تھی اس کی میں نے اطلاع دی۔
بعض نے کہا ہے کہ خُبْرَةٌ کا لفظ کسی معاملہ
کی باطنی حقیقت کو جاننے پر بولا جاتا ہے۔
اَلْخَبَارُ وَالْخَبْرَآءُ نرم زمین۔ اور کبھی درختوں
والی زمین پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔
اَلْمُخَابَرَةُ۔ بٹائی پر کاشت کرنا۔ اسی سے
کسان کو "خَبِيْرٌ" کہا جاتا ہے۔
اَلْخِبْرُ چھوٹا توشہ دان۔ تشبیہ کے طور پر زیادہ
دودھ دینے والی اونٹنی کو بھی خِبْرٌ کہا جاتا
ہے اور آیت کریمہ:۔
وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵۸۔۳) اور جو
کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال
کی حقیقت کو جانتا ہے:۔
اور بعض نے کہا ہے کہ وہ تمہارے باطن امور

سے واقف ہے۔ اور بعض نے خَبِیْرٌ بمعنی مُخْبِرٌ کہا ہے۔ جیسا کہ آیت۔
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۶۲-۸)
پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتائیگا سے مفہوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ (۴۷-۳۱) اور تمہارے حالات جانچ لیں۔
قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (۹-۹۴) خدا نے ہم کو تمہارے سب حالات بتا دئیے ہیں۔ یعنی تمہارے احوال سے ہمیں آگاہ کر دیا گیا ہے۔

(خ ب ز)

اَلْخُبْزُ۔ روٹی۔ قرآن میں ہے:۔
اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِىْ خُبْزًا (۱۲-۳۶) کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔
اَلْخُبْزَةُ۔ نان کوماج۔ اَلْخَبْزُ مصدر (ض) روٹی بنانا۔
اِخْتَبَزَ (افتعال) روٹی بنانے کا حکم دینا۔
اَلْخِبَازَةُ۔ نانبائی کا پیشہ۔
استعارہ کے طور پر خَبْزٌ کے معنی سخت ہنکانے کے بھی آجاتے ہیں۔ کیونکہ ہانکنے والا بھی اسی طرح ہاتھ مارتا ہے جیسے روٹی بنانے والا کرتا ہے۔

(خ ب ط)

اَلْخَبْطُ (ض) کے معنی کسی چیز کو اندھا دھند بلا استواری کے مارنے کے ہیں۔ جیسے اونٹ کا زمین پر اگلا پاؤں مارنا یا آدمی کا لاٹھی کے ساتھ درخت سے پتے جھاڑنا۔ اور درخت سے جھاڑے ہوئے پتوں کو بھی خَبَطٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ مضروب پر ضَرْبٌ کا لفظ بول لیتے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر بادشاہ کے ظلم پر بھی خَبْطٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ ظالم بادشاہ کو خَبُوْطٌ کہا جاتا ہے۔
اِخْتِبَاطُ الْمَعْرُوْفِ کے معنی ہیں کسی سے زبردستی احسان کا مطالبہ کرنا یہ محاورہ خَبْطُ الْوَرَقِ (درخت سے پتے جھاڑنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے اور آیت:۔
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (۲-۲۷۵)
جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔
میں يَتَخَبَّطُ کے معنی خَبْطُ الشَّجَرِ سے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اور اختباط سے بھی۔ جس کے معنی احسان کا مطالبہ کے ہیں ایک حدیث[1] میں ہے (۱۰۵)
اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ يَتَخَبَّطَنِىَ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان مجھے لپٹ کر دیوانہ بنا دے۔

(خ ب ل)

اَلْخَبَالُ وَالْخَبْلُ وَالْخَبَلُ۔ اس فساد یا خرابی کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو لاحق ہو کر اس میں اضطراب اور بے چینی پیدا کر دے۔ جیسے جنون یا وہ مرض جو عقل و فکر پر اثر انداز ہو۔ کہا جاتا ہے۔ خَبَلَهٗ وَخَبَّلَهٗ فَهُوَ خَابِلٌ وَ الجمع خُبَّلٌ رَجُلٌ مُخَبَّلٌ دیوانہ قرآن میں ہے:۔
يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (۳-۱۱۸) مومنو! (کسی غیر (مذہب کے آدمی) کو اپنا رازدان نہ

---

[1] رواہ النسائی (۲/۳۲۰) من حدیث ابی الیسر ۱۲

بنانا۔ یہ لوگ تمہاری خرابی اور فتنہ انگیزی کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔

مَا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا (۹-۴۷) تو تمہارے حق میں شرارت کرتے۔

اور حدیث میں ہے[1]:

(۱۰۶) مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ ثَلَاثًا كَانَ حَقًّا عَلَى اللهِ اَنْ يَّسْقِيَهٗ مِنْ طِيْنَةِ الْخَبَالِ جو شخص تین مرتبہ شراب پئے گا تو اللہ تعالیٰ اسے لازمًا دوزخیوں کی پیپ پلائے گا۔

زہیر نے کہا ہے[2] (طویل):

(۱۳۰) هُنَالِكَ اِنْ يُّسْتَخْبَلُوْا الْمَالَ يُخْبِلُوْا یعنی ایسے موقع پر اگر ان سے مال مانگا جائے تو وہ مال دے دیتے ہیں۔

(خ ب و)

خَبَتِ (ن) النَّارُ آگ کا شعلہ افسردہ ہو گیا اور اس پر راکھ کا خِبَاءٌ یعنی پردہ سا آگیا۔ اصل میں خِبَاءٌ اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔ اسی بنا پر جو یا گیہوں کی بالی کے چھلکا کو بھی خِبَاءٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (۱۷-۹۷) جب اس کی آگ بجھنے کو ہوگی تو ہم ان کو (عذاب دینے کے لئے) اور بھڑکا دیں گے۔

(خ ت ر)

اَلْخَتْرُ اصل میں اس غداری کو کہتے ہیں جسے اس قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان کمزور پڑ جائے اور اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں قرآن میں ہے:۔

كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱-۳۲) جو عہد شکن اور ناشکرے ہیں۔

(خ ت م)

اَلْخَتْمُ وَالطَّبْعُ۔ کے لفظ دو طرح سے استعمال ہوتے ہیں کبھی تو خَتَمْتُ اور طَبَعْتُ کے مصدر ہوتے ہیں اور اس کے معنی کسی چیز پر مہر کی طرح نشان لگانا کے ہیں اور کبھی اس نشان کو کہتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا ہے۔

مجازًا کبھی اس سے کسی چیز کے متعلق وثوق حاصل کر لینا اور اس کا محفوظ کرنا مراد ہوتا ہے

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظہ فی النسائی عن ابن عمرو واحمد فی ۵ ن عن ابن عمرو ر ۵ عن ابی ہریرۃ، والطیب عن ابن عمر والترمذی عن ابن عمرو وسددرۃ عن ابن عمرو، راجع الفتح الکبیر ج ۳/۲۰۱-۲۰۲ ؛ [2] قالہ زہیر بن ابی سلمی المزنی وتمامہ .... وان یسئلوا یعطوا وان ییسروا یغلوا والبیت فی اللسان (خبل خول) وفی روایۃ الطبری (۳:۲۲ ۱۹۹/۷: ۲۷۸) وان یستخولوا بدل یستخبلوا ویخولوا بدل یخبلوا وکذا فی روایۃ ابی عبید فی غریبہ والعسکری فی الصناعتین وعدہ من جید المدیح قال فی الامالی (۲: ۱۵۴) وما یبالی مدح بہذین البیتین الا یمدح بغیرہما والبیت فی مختار الجاہلی بشرح المصطفی السقا (۱: ۱۹۳) والمختارات ۴۲ والعمدۃ (۲: ۱۲۷) ونقد الشعر ۳۲ فی سبعۃ ابیات و البحر (۲: ۱۴۴) والعقد التمیین ۹۱ والمعانی الکبیر ۵۴۳ والسیوطی ۱۰۸ قال فی اللسان والاخبال اعطاء البعیر او الناقۃ للرکوب ما استخبل ای استعارنہ الاصمعی وابو عبیدہ فی روایتہما عن ابی عمرو انکر الاستخبال وغیرہا اثبتہ دو المعانی للقتبی ۵۴۰؛

جیسا کہ کتابوں یا دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔ قرآن میں ہے۔
خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (۲-۷) خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے۔
وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ (۴۵-۲۳) اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی۔
اور کبھی کسی چیز کا اثر حاصل کر لینے سے کنایہ ہوتا ہے جیسا کہ مہر سے نقش ہو جاتا ہے اور اسی سے خَتَمْتُ الْقُرْآنَ کا محاورہ ہے۔ یعنی قرآن ختم کر لیا۔ اور آیت کریمہ:۔
خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (۲-۷) خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ اور آیت:۔
قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ (۶-۴۶) (ان کافروں سے) کہو بھلا دیکھو تو اگر خدا تمہارے کان یا آنکھیں چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے۔
میں عادت الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اعتقادِ باطل یا محرمات کے ارتکاب میں حد کو پہنچ جاتا ہے اور کسی طرح حق کی طرف التفات نہیں کرتا تو اس کی ہیئتِ نفسانی کچھ ایسی بن جاتی ہے کہ گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی خو بن جاتی ہے۔ گویا اس طرح اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَسَمْعِہِمْ وَاَبْصَارِہِمْ (۱۶-۱۰۸)۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر خدا نے مہر لگا رکھی ہے۔
اسی طرح آیات کریمہ:۔
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے ..... اس کا کہا نہ ماننا۔
وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِہِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَہُوْہُ (۱۷-۴۶) اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔
وَجَعَلْنَا قُلُوْبَہُمْ قَاسِیَۃً (۵-۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔
میں اِغْفَالٌ کِنٌّ اور قَسَاوَۃٌ سے بھی علی الترتیب یہی معنی مراد ہیں۔
جبائی[1] کہتے ہیں کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انکے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے انکے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔ لیکن یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح (   ) کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامات سے بے نیاز ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنی ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں اور آیت کریمہ:۔
اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاہِہِمْ (۳۶-۶۵) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ کلام نہیں کر سکیں گے اور آیت (۳۳-۴۰) میں آنحضرت کو خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ فرمانے کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت نے اپنی آمد سے سلسلہ نبوت کو مکمل کر دیا

---

[1] ہو ابو علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی (المتوفی ۳۰۳ھ) و الجبائی مثل رمان کورۃ بخوزستان من نواحی الاہواز بین فارس و واسط و البصرۃ مقدار التاج (۔

ہے (اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔
اور آیت کریمہ :۔
وَخِتَامُهٗ مِسْكٌ (۸۳-۲۶) جس کی مہر مسک کی ہوگی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ خِتَامٌ کے معنی مَا يُخْتَمُ بِهٖ کے ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے مگر آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا آخری لطف اور برتن میں باقی ماندہ جھوٹ مسک کی طرح مہکے گا اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی مگر یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ شراب کو بذات خود لذیذ ہونا چاہیئے اگر وہ بذات خود لذیذ نہ ہو تو اس پر مسک کی مہر لگانا چنداں مفید نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کی لذت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔

(خ د د)

اَلْخَدُّ وَالْاُخْدُوْدُ کے معنی ہیں زمین میں مستطیل اور گہرا گڑھا اَلْاُخْدُوْدُ کی جمع اَخَادِيْدُ ہے قرآن میں ہے قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ (۸۵-۴) کہ خندقوں کے رکھودنے والے ہلاک کر دیئے گئے۔
اصل میں خَدُّ الْاِنْسَانِ کے معنی انسان کے رخسار کے ہیں اور استعارۃً زمین اور دوسری اشیاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ لفظ وجہ (چہرہ) ہے۔ تَخَدَّدَ اللَّحْمُ جسم کا لاغر ہو کر جھری دار ہو جانا خَدَّدْتُهٗ کسی کو دبلا کرنا۔ اس کا مطاوع تَخَدَّدَ آتا ہے۔

(خ د ع)

اَلْخِدَاعُ کے معنی ہیں جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کر کے کسی کو اس چیز سے پھیر دینا جس کے وہ درپے ہو اور آیت کریمہ :۔
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (۲-۹) یہ (اپنے پندار میں) خدا کو چکمہ دیتے ہیں۔
میں اللہ تعالےٰ کو دھوکا دینے سے اس کے رسول اور اولیاء کو فریب دینا مراد ہے اور اللہ تعالےٰ کا نام ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آنحضرت کے ساتھ کوئی سا معاملہ کرنا گو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا :۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ (۴۸-۱۰) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔
اور ان کے اس فعل کی شناخت اور آنحضرت اور صحابہ کرام کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے خِدَاع سے تعبیر کیا ہے۔
اور بعض اہل لغت کا یہ کہنا کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل میں يُخَادِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ہے۔ پھر مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ مضاف محذوف کو ذکر کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ایک تو یہاں ان کی فریب کاریوں کی شناخت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ بتانا ہے کہ آنحضرت کے ساتھ معاملہ کرنا اللہ تعالےٰ سے معاملہ کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَ الْاٰيَةَ میں بیان ہو چکا ہے۔
اور آیت کریمہ :۔

۱؎ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱-۱۸) ای لا تعرض عنہم استکبارًا ۔

وَهُوَ خَادِعُهُمْ (۴-۱۴۲) اور وہ انہیں کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی فریب کاریوں کا بدلہ دے گا اور بعض نے کہا ہے کہ مقابلہ اور مشاکلہ کے طور پر یہ کہا گیا ہے جیسا کہ آیت وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ میں ہے۔
خَدَعَ الضَّبُّ گوہ کا اپنے بل میں داخل ہو جانا اور گوہ کے بل میں چھپ جانے کے لئے خدع کا استعمال اس بنا پر ہے کہ اس کی بل کے دروازے پر ہمیشہ ایک بچھو تیار بیٹھا رہتا ہے۔ جو بل میں ہاتھ ڈالنے والے کو ڈس دیتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے اَلْعَقْرَبُ بَوَّابُ الضَّبِّ کہ بچھو گوہ کا دربان ہے۔
چونکہ اہل عرب کے ہاں ضَبٌّ کی مکاری ضرب المثل تھی اس لئے کہا گیا ہے[1] (مثل) هُوَ اَخْدَعُ مِنَ الضَّبِّ کہ وہ ضب سے زیادہ مکار ہے طَرِيقٌ خَادِعٌ وَخَيْدَعٌ گمراہ کرنے والا راستہ گویا وہ مسافر کو دھوکا دیتا ہے۔ اَلْمِخْدَعُ بڑے کمرے کے اندر چھوٹا کمرہ۔ گویا اس بڑے کمرے سے چیز اٹھانے والے کو دھوکا دینے کے لئے بنایا ہے۔
خَدَعَ الرِّيقُ منہ میں تھوک کا خشک ہونا اس میں بھی دھوکے کا تصور پایا جاتا ہے۔ اَلْاَخْدَعَانِ گردن کی دو رگیں کیونکہ وہ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ ہو ہیں۔ کہا جاتا ہے خَدَعْتُهٗ میں نے اس کی اخدع رگ کو کاٹ دیا۔ حدیث میں ہے[2] (۱۰۷)
بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ سِنُوْنَ خَدَّاعَةٌ کہ قیامت کے قریب دھوکا دینے والے سال ہوں گے کیونکہ وہ بھی خشک سالی اور خوشحالی سے رنگ بدلتے رہیں گے۔

(خ د ن)

اَلْخِدْنُ۔ کے معنی مصاحب اور رفیق کے ہیں۔ مگر عام طور پر اس مصاحب پر بولا جاتا ہے جو جنسی خواہش پوری کرنے کے لئے کسی کے ساتھ رہتا ہو اسی لئے خِدْنُ الْمَرْءَةِ وَخِدْنُهَا کا محاورہ ہے جس کے معنی عورت کے آشنا کے ہیں اَلْخِدْنُ کی جمع اَخْدَانٌ آتی ہے قرآن میں ہے۔ وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ اور نہ وہ در پردہ آشنا رکھنے والی ہوں (۴-۲۵) اور شاعر کے قول[3] (ع د) (۱۳۱) " خَدِيْنُ الْعُلٰى " وہ بلندیوں کا ساتھی ہے۔
میں بلندیوں کے لئے خَدِيْن کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ يَعْشَقُ الْعُلٰى (وہ بلندیوں پر عاشق ہے) يُشَبِّبُ بِالنَّدٰى (وہ سخاوت کے ساتھ تشبیب کرتا ہے) يَنْسِبُ بِالْمَكَارِمِ (اس کا نسب مکارم سے ملتا ہے) وغیرہا استعارات ہیں۔

(خ ذ ل)

قرآن میں ہے:۔
وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵-۲۹) اور شیطان انسان کو عین موقعہ پر دغا دینے والا ہے۔

---

[1] راجع للمثل المیدانی رقم ۱۳۰۲ و الحیوان ۶: ۳۳، ۵۲۸/۴---۱۰ واللسان (خدع) [2] الحدیث باختلاف الفاظہ فی النہایہ (خدع) وغریب ابی عبید ( ) وفی تاویلہ اختلاف فتی المحکم (خدع) ان قبل الساعۃ سنین خداعۃ واللآلی مع السمط ۱۲۷ و فیہ ان قبل الدجال سنین خداعۃ ای قاطعۃ الزکوٰۃ او قلیل المطر کذا فی الفائق ۲/۱۰۷ وفیہ ایضًا بین یدی الساعۃ سنین غدارۃ ای یکثر فیہا المطر ویقل النبات ❊
[3] لم اجدہ ویرجیٰ ۱۲

اَلْخَذُوْلُ (صیغہ مبالغہ) بہت زیادہ خُذْلَان یعنی دغا دینے والا۔ اَلْخُذْلَان ایسے شخص کا عین موقعہ پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہوجانا جس کے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کریگا۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے:۔ خَذَلَتِ الْوَحْشِیَّۃُ وَلَدَھَا وحشی گائے نے اپنے بچہ کو چھوڑ دیا۔ تَخَاذَلَتْ رِجْلَا فُلَانٍ اس کی ٹانگیں کمزور پڑ گئیں اسی سے اعشی نے کہا ہے[1] (الرمل)

(۱۳۲) بَیْنَ مَغْلُوْبٍ تَلِیْلٍ خَدُّہٗ
وَخَذُوْلِ الرِّجْلِ مِنْ غَیْرِ کَسَحٍ

(بعض مغلوب ہو کر رخسارے کے بل گر پڑے ہیں اور بعض کی ٹانگیں بدوں بے حسی کے جواب دے چکی ہیں۔

رَجُلٌ خُذَلَۃٌ بے بس آدمی۔

(خ ر ر)

خَرَّ (ن ض) خَرِیْرًا کے معنی کسی چیز کے آواز کے ساتھ نیچے گرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ (۳۴-۱۴) جب عصا گر پڑا تب جنوں کو معلوم ہوا۔ کَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (۲۲-۳۱) تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے۔ فَخَرَّ عَلَیْھِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِھِمْ (۱۶-۲۶) اور چھت ان پر ان کے اوپر سے گر پڑی۔ اَلْخَرِیْرُ پانی وغیرہ کی آواز کو کہتے ہیں جو اوپر سے گر رہا ہو، اور آیت کریمہ:۔ خَرُّوْا سُجَّدًا (۳۲-۱۵) تو سجدے میں گر پڑتے ہیں میں خَرُّوْا کا لفظ دو معنوں پر دلالت کرتا ہے یعنی (۱) گرنا اور (۲) ان سے تسبیح کی آواز کا آنا۔ اور اس کے بعد آیت وَسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ سے تنبیہ کی ہے کہ ان کا سجدہ ریز ہونا اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ تھا نہ کہ کسی اور امر کے ساتھ۔

(خ ر ب)

خَرِبَ الْمَکَانُ خَرَابًا کسی جگہ کا اجاڑ ہونا۔ یہ عِمَارَۃٌ (آباد ہونا) کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا (۲-۱۱۴) اور ان کی ویرانی میں ساعی۔ اَخْرَبَہٗ وَخَرَّبَہٗ ویران کر دینا۔ قرآن میں ہے:۔ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَھُمْ بِاَیْدِیْھِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ (۵۹-۲) کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اس لئے ویران کرتے تھے تاکہ آنحضرت اور مسلمانوں کے کام نہ آئیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بربادی ان کی جلاوطنی کی وجہ سے تھی۔

اَلْخُرْبَۃُ کان میں وسیع چھید گویا اس سے کان میں خرابی پیدا ہوگئی اور اَقْطَعُ وَقَطْعَاءُ کی طرح اَخْرَبُ وَخَرْبَاءُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور تشبیہ کے طور مشکیزہ کے سوراخ کو بھی خُرْبَۃُ الْمَزَادَۃِ کہا جاتا ہے جیسا کہ مجازًا اُذُنُ الْمَزَادَۃِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور خَارِبٌ کے معنی خاص کر اونٹوں کا چور کے ہیں[2] اَلْخَرَبُ (نر سرخاب) شتر مرغ

---

[1] قال الاعشیٰ فی قصیدۃ طویلۃ فی دیوانہ (۳۸-۴۲) یمدح فیھا ایاس بن قبیصہ الطائی وفی روایۃ اللسان والمحکم (کسح، خذل) وصدرہ: کل وضاح کریم جدہ۔ وفی روایۃ ص وس صدرہ بین مغلوب نبیل جدہ کذا رواہ ابن بری واما روایۃ المؤلف فلم ارلہ الا فی بعض حواشی دیوانہ ۲۴۲ او یروی: تلیل والبیت فی اللسان (خذل) ودیوانہ ام وغریب ابی عبید (م: ۲۸۳) ۱۲
[2] قال الاصمعی والجمع خراب والجوہری)۔

کی قسم کا ایک پرند اس کی جمع خِرْبَانٌ ہے کسی شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۱۳۳) اَبْصَرُ خِرْبَانَ فِضَاءٍ فَانْكَدَرَ

کہ وہ فضا میں سرخابوں کو دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

(خ ر ج)

خَرَجَ (ن) خُرُوْجًا کے معنی کسی کے اپنی قرارگاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قرارگاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا کپڑا ہو اور یا کوئی حالت نفسانی ہو جو اسباب خارجیہ کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو۔ قرآن میں ہے:۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ (۲۸-۲۱) موسیٰ وہاں سے ڈرتے ڈرتے نکل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ (۷-۱۳) فرمایا تو بہشت سے اتر جا۔ تجھے شایاں نہیں کہ یہاں غرور کرے۔ پس نکل جا۔

وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَةٍ مِنْ اَكْمَامِهَا (۴۱-۴۷) اور نہ تو پھل گابھوں سے نکلتے ہیں۔ فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِنْ سَبِيْلٍ (۴۰-۱۱) تو کیا نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا (۵-۳۷) (ہر چند) چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں مگر اس سے نہیں نکل سکیں گے۔ اور اِخْرَاجٌ کا لفظ زیادہ تر اعیان کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا اَنَّكُمْ مُخْرَجُوْنَ (۲۳-۳۵) تو تم (زمین سے) نکالے جاؤ گے۔

كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ (۸-۵) جس طرح تمہارے پروردگار نے تم کو تدبیر کے ساتھ گھر سے نکالا۔

وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا (۱۷-۱۳) اور قیامت کے روز وہ کتاب اسے نکال دکھائینگے۔

اَخْرِجُوْا اَنْفُسَكُمْ (۶-۹۳) کہ نکالو اپنی جانیں۔

اَخْرِجُوْا اٰلَ لُوْطٍ مِنْ قَرْيَتِكُمْ (۲۷-۵۶) کہ لوط کے گھر والوں کو اپنے شہر سے نکال دو۔ اور کبھی اِخْرَاجٌ بمعنی تکوین الہی بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (۱۶-۷۸) اور خدا ہی نے تم کو ماؤں کے شکم سے پیدا کیا۔

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِنْ نَبَاتٍ شَتّٰى (۲۰-۵۳) پھر اس نے انواع واقسام کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ (۳۹-۲۱) اس سے کھیتی اگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔

اَلتَّخْرِيْجُ (تفعیل) یہ عام طور پر علوم وصناعات کی ایجاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور زمین کی پیداوار اور جو کچھ حیوان کے اوجھ سے نکلتا ہے۔ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو خَرْجٌ وَخَرَاجٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ﷺ (۲۳-۷۲) کیا تم ان سے (تبلیغ کے سلسلے میں) کچھ مال مانگتے ہو تو تمہارے پروردگار کا مال بہت اچھا ہے۔

---

[1] قالہ العجاج فی مشطورتہ یمدح فیہا عمر بن عبید اللہ بن معمر التیمی وکان توجہہ عبد الملک الی ابی فدیک الحروری حین خرج علیہ فقبلہ: تقضی البازی اذا البازی کسر۔ وفی روایۃ آنس بدل ابصر والشطر فی الطبری (۹: ۷۹) (۳۰: ۶۵) واللسان (کذا) ودیوانہ (طبع لیبک ۱۹۰۳ء) رقم البیت ۶۷ والبیت من شواہد ابی عبیدۃ فی مجازہ تحت قولہ واذا النجوم انکدرت (تکویر ۲) والشطر الاول فی ابن الشجری (۱: ۳۸۹) والاقتضاب ۱۳۴ والامالی (۲: ۱۷۱) والشطر فی السمط ۹۰۷ والبحر (۸: ۴۳۰) وفیہ فلاۃ بدل فضاء ۱۲

ہاں خرج کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ نے اسے لازم و واجب کیا ہے اور خَرْجٌ خَرَاجٌ سے عام ہے کیونکہ خَرْجٌ کا لفظ دَخْلٌ (آمدنی) کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا (۱۸-۹۴) بھلا ہم آپ کے لئے خرچ کا انتظام کر دیں۔

مگر خَرَاجٌ کا لفظ عموماً زمین کے لگان پر بولا جاتا ہے محاورہ ہے۔ اَلْعَبْدُ يُؤَدِّي خَرْجَهٗ غلام اپنی آمدنی سے مقررہ حصہ ادا کرتا ہے۔ وَالرَّعِيَّةُ تُؤَدِّي اِلَى الْاَمِيْرِ الْخَرَاجَ رعیت حاکم کو لگان ادا کرتی ہے۔ اَلْخَرْجُ ایضاً بادل کی ایک قسم ہے۔ اس کی جمع خُرُوْجٌ آتی ہے۔ ایک روایت میں ہے[۱]۔ (۱۰۷) اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ یعنی مال بائع سے جو فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ مبیع کی اس ضمانت کے عوض سمجھا جائے گا جو اس سے ساقط ہو چکی ہے۔

اَلْخَارِجِيُّ وہ شخص جو بذات خود اپنے ہمسروں کی صفات سے باہر نکل جائے اگر یہ خروج کسی اعلیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو بطور مدح بولا جاتا ہے اور اگر ادنیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو یہ لفظ بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح کہ فُلَانٌ لَيْسَ بِاِنْسَانٍ یعنی کسی سے انسانیت کی نفی کبھی بطور مدح ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[۲] (طویل)

(۱۳۴) فَلَسْتَ لِاِنْسِيٍّ وَلٰكِنْ لِمَلْاَكٍ
تَنَزَّلَ مِنْ جَوِّ السَّمَاءِ يَصُوْبُ

تم انسان نہیں ہو بلکہ فرشتہ کی مثل ہو جو آسمان کی بلندی سے زمین پر اتر آئے۔

اور کبھی مذمت کے لئے۔ جیسے فرمایا:۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ (۲۵-۴۴) یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں۔

اَلْخَرْجُ دو رنگ سیاہ و سپید (دو رہم) اسی سے کہا جاتا ہے۔ ظَلِيْمٌ اَخْرَجُ وَنَعَامَةٌ خَرْجَاءُ ابلق شتر مرغ۔ اَرْضٌ مُخْتَرِجَةٌ زمین کہ جائے انبار گیاہ و جائے بے گیاہ باشد۔ اور اَلْخَوَارِجُ کو خوارج اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ امام کی طاعت سے باغی ہو گئے تھے۔

(خ ر ص)

اَلْخَرْصُ پھلوں کا اندازہ کرنا اور اندازہ کئے ہوئے پھلوں کو خِرْصٌ کہا جاتا ہے یہ بمعنی مَخْرُوْصٌ ہے۔ جیسے نَقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ بعض نے کہا ہے کہ خَرْصٌ بمعنی کذب آجاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۶-۱۱۶) یہ تو صرف انکلیں دوڑا رہے ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ يَخْرُصُوْنَ بمعنی يَكْذِبُوْنَ ہے یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

---

[۱] الحدیث مروی مختصراً ومفصلاً راجع ابو داؤد والترمذی ۲/ ۲۶۰-۲۶۱ مع التحفہ والنسائی وابن ماجۃ راجع تخریجہ الرسالۃ رقم ۱۲۳۲ مع التحقیق احمد شاکر وکنز العمال ۲ رقم ۵۰۰۵ وابن حبان فی زوائدہ رقم ۱۱۲۵، ۱۱۲۶ [۲] اختلفوا فی نسبۃ ہذا البیت قال العینی (۴: ۵۷۴) قائلہ رجل من عبد القیس یمدح النعمان وقیل ہو لابی وجزۃ یمدح عبد اللہ بن الزبیر ونسبۃ الاعلم فی ہامش الکتاب (۲: ۳۷۹) الی علقمۃ والبیت من شواہد الطبری (۱: ۱۴۸، ۱۹۸) وراجع البیت ایضاً الصحاح والتاج (الک، ملک، صوب) والقرطبی (۱: ۲۶۳) وامالی ابن الشجری (۲: ۲۰، ۲۹۶) والاشتقاق ۲۷ والجانۃ لابی عبیدۃ (۱: ۳۳) ومختار الشعر الجاہلی وتہذیب الاصلاح (۱: ۱۲۶) والبحر (۵: ۴۳۲، ۳: ۴۴، ۳۱: ۵۲۷) وابن خالویہ ۸۲ وابن الانباری فی السبع ۵۲۲ والبیت من کلمۃ مفضلیۃ من زیادات المرزوقی (۲: ۹۴) وصدرہ: ولست بجنی ولکن ملاک ۱۲

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۵۱-۱۰) اٹکل کرنے والے ہلاک ہوں۔
کے معنی بقول بعض یہ ہیں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو، اصل میں ہر وہ بات جو ظن و تخمین سے کہی جائے اسے خَرْصٌ کہا جاتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اندازہ غلط ہو یا صحیح۔ کیونکہ تخمینہ کرنے والا نہ تو علم یا غلبہ ظن سے بات کرتا ہے، اور نہ سماع کی بنا پر کہتا ہے۔ بلکہ اس کا اعتماد محض گمان پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تخمینہ کرنیوالا پھلوں کا تخمینہ کرتا ہے اور اس قسم کی بات کہنے والے کو بھی جھوٹا کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ واقع کے مطابق ہی کیوں نہ بات کرے جیسا کہ منافقین کے بارے میں فرمایا:۔
اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۶۳-۱)
(اے محمد) جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (ازراہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہیں۔ اور خدا جانتا ہے کہ درحقیقت تم اس کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق (دل سے نہ اعتقاد رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔

(خ ر ط)

اَلْخُرْطُوْمُ اس کے اصل معنی ہاتھی کی سونڈ کے ہیں۔ قرآن نے میں ہے:۔
سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (۶۸-۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔
میں انسان کی ناک پر خرطوم کا اطلاق کیا ہے تو یہ محض مذمت کے لئے ہے۔ یعنی اُسے نہ مٹنے والی عار لاحق ہو گی یہ جُدِعَتْ اَنْفُهٗ کی طرح کا محاورہ ہے۔

(خ ر ق)

اَلْخَرْقُ (ض) کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے بگاڑنے کے لئے پھاڑ ڈالنا۔ قرآن میں ہے:۔
اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا (۱۸-۷۱) کیا آپ نے اس کو اس لئے پھاڑا ہے کہ مسافروں کو غرق کر دیں۔
خَرْقٌ خَلْقٌ کی ضد ہے۔ جس کے معنی اندازہ کے مطابق خوش اسلوبی سے کسی چیز کو بنانا کے ہیں۔ اور خَرْق کے معنی کسی چیز کو بے قاعدگی سے پھاڑ ڈالنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۶-۱۰۰) اور بے سمجھے (جھوٹ بہتان) اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بنا کھڑی ہیں۔
یعنی بے سوچے سمجھے یہ بات کہتے ہیں۔ پھر معنی قطع کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: خَرَقَ الثَّوْبَ وَخَرَّقَهٗ کپڑے کو پھاڑ ڈالا خَرَقَ الْمَفَازَةَ ریگستان طے کئے اِخْتَرَقَ الرِّيْحُ ہوا کا تیز چلنا۔
اَلْخَرْقُ وَالْخَرِيْقُ خاص کر کشادہ بیابان کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں ہوائیں تیزی سے چلتی ہیں اور یا اس لئے کہ وہ وسیع ریگستان کی صورت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔
اَلْخَرْقُ (خاص کر) کپڑے میں سوراخ اور کان میں کشادہ سوراخ۔ صَبِيٌّ اَخْرَقُ وَامْرَاَةٌ خَرْقَاءُ جس کے کان میں کشادہ چھید ہو اور آیت کریمہ:۔
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ (۱۷-۳۷) کی تفسیر میں دو قول ہیں ایک یہ کہ تو زمین کو طے نہیں کر سکے گا۔

یا یہ کہ تو زمین کو اپنے پاؤں سے پھاڑ نہیں ڈالے گا۔
یہ دوسرا معنی خرق فی الاذن سے ماخوذ ہے اور بے سوچے سمجھے کام کرنے کے اعتبار سے احمق اور نادان شخص کو اَخْرَقُ وَ خَرِقٌ کہا جاتا ہے اس کی مؤنث خرقاء ہے۔ اور تند ہوا کو بھی خرقاء کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے[1] (۱۰۸)

مَا دَخَلَ الْخُرْقُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ جس چیز میں نادانی کا عمل دخل ہو وہ عیب ناک ہو جاتی ہے

اور خرق سے مَخْرَقَۃٌ کا لفظ لیا گیا ہے[2] جس کے معنی کسی کام میں حیلہ جوئی کے لئے بے وقوفی کا اظہار کرنے کے ہیں۔

اَلْمِخْرَاقُ کپڑے کا کوڑا جس سے بچے کھیلتے ہیں گویا اسے بھی کسی چیز کو واقع کے خلاف ظاہر کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔

خَرِقَ الْغَزَالُ ہرن کا نادانی کی وجہ سے دوڑ نہ سکنا۔

(خ ز ن)

اَلْخَزْنُ کے معنی کسی چیز کو خزانے میں محفوظ کر دینے کے ہیں۔ پھر ہر چیز کی حفاظت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے جیسے بھید وغیرہ کی حفاظت کرنا اور آیت :۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ (۱۵-۲۱)
اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں۔

وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶۳-۷)
حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا ہی کے ہیں۔

میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنی قدرت کاملہ سے جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یا اس معنی کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق آنحضرت ؐ نے فرمایا :۔ (۱۰۹)[3]

فَرَغَ رَبُّکُمْ مِنْ خَلْقِ الْخَلْقِ وَالرِّزْقِ وَالْاَجَلِ
کہ خدا تعالیٰ مخلوق کی پیدائش اس کے رزق اور اجل سے فارغ ہو چکا ہے اور آیت کریمہ :۔

فَاَسْقَیْنٰکُمُوْہُ وَمَا اَنْتُمْ لَہٗ بِخَازِنِیْنَ (۱۵-۲۲)
اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔

میں بعض نے خَازِنِیْنَ کے معنی حَافِظِیْنَ کئے ہیں۔ یعنی شکر گزاری سے تم اس کی حفاظت نہیں کر سکتے بعض نے کہا کہ یہ آیت کریمہ :۔

اَفَرَاَیْتُمُ الْمَاءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ الْاٰیَۃَ (۵۶-۶۸-۶۹)
بھلا دیکھو تو سہی کہ جو پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا ہے۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْخَزَنَۃُ یہ خازن کی جمع ہے چنانچہ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ وَقَالَ لَھُمْ خَزَنَتُھَا (۳۹-۷۱)
تو اس کے داروغے اس سے کہیں گے۔

اور آیت کریمہ :۔ وَلَا اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَائِنُ اللّٰہِ (۶-۵۰) کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔

میں خَزَائِنُ اللّٰہِ سے وہ مقدورات الٰہیہ مراد ہیں جو اللہ تعالےٰ نے لوگوں سے روک رکھی ہیں۔ کیونکہ لفظ خزن میں منع کے معنی پائے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وسیع جود اور قدرت مراد ہے۔ اور بعض نے اس سے کلمہ

---

[1] الحدیث فی التاج والنہایۃ (خرق) [2] قال الاصمعی مولد والجوہری ۱۲۱ [3] راجع لحدیث فرغ اللہ باختلاف الفاظہ والنہایہ ۲ وطس عن ابن مسعود والطبرانی عن ابی الدرداء وکنز العمال ۱/۹۴ والفتح للنبہانی ۲/۲۶۶ ؛

کن مراد لیا ہے خَزَنَ اللَّحْمُ کے اصل معنی تو گوشت کی ذخیرہ اندوزی کے ہیں۔ لیکن کنایۃً گوشت کے بدبودار ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہی معنی خَنِزَ (بہ تقدیم نون) کے ہیں۔

(خ ز ی)

خَزِیَ (س) الرَّجُلُ رسوا ہونا۔ خواہ وہ رسوائی انسان کو خود اس کی ذات سے لاحق ہو یا غیر کی طرف سے پھر جو رسوائی اپنی جانب سے لاحق ہوتی ہے اسے حیائے مفرط کہا جاتا ہے اور اس کا مصدر خَزَایَۃٌ ہے۔ اس سے صیغۂ صفت مذکر خَزْیَانُ اور مؤنث خَزْیٰ ج خَزَایَا حدیث میں ہے[۱] (۱۰۱) اَللّٰھُمَّ احْشُرْنَا غَیْرَ خَزَایَا وَلَا نَادِمِیْنَ اے خدا ہمیں اس حالت میں زندہ نہ کرنا کہ ہم شرم اور ندامت محسوس کرنیوالے ہوں۔ اور جو رسوائی دوسروں کی طرف سے لاحق ہوتی ہے وہ ذلت کی ایک قسم ہے۔ اور اس کا مصدر خِزْیٌ ہے۔ اور رَجُلٌ خِزْیٌ کے معنی ذلیل آدمی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا (۲-۱۱۴) دنیا میں انکی رسوائی ہے۔

اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (۱۶-۲۷) کہ آج کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔

فَاَذَاقَھُمُ اللّٰہُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۳۹-۲۶) پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا۔

لِنُذِیْقَھُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۴۱-۱۶) تاکہ ان کو دنیا کی زندگی میں ذلت کے عذاب کا مزہ چکھائے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی (۲۰-۱۳۴) کہ ہمارے ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے۔

اَخْزٰی (انفعال) یہ خِزْیٌ اور خَزَایَۃٌ دونوں سے آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۶۶-۸) اس دن خدا پیغمبر کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کریگا۔

کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن خِزْیٌ سے بنا انسب معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ (۳-۱۹۲) اے پروردگار جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا اسے رسوا کیا۔

میں اَخْزَیْتَہٗ خَزَایَۃٌ سے ہے مگر خِزْیٌ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہی معنی مندرجہ ذیل آیات میں مراد ہیں:۔

مَنْ یَّاْتِیْہِ عَذَابٌ یُّخْزِیْہِ (۳۹-۴۰) کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کریگا۔

وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (۳-۱۹۴) اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔

وَلِیُخْزِیَ الْفٰسِقِیْنَ (۵۹-۵) کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔

وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ (۱۱-۷۸) اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری آبرو نہ کھوؤ۔

جس طرح خِزْیٌ دو قسم پر ہے یعنی رسوائی کبھی اپنی ذات کی طرف سے لاحق ہوتی ہے اور کبھی دوسروں کی طرف سے اسی طرح ذَلَّ وَھَانَ بھی دو قسم پر ہے جو ذلت انسان کو خود اس کی ذات کی جانب سے لاحق ہوا سے ھَوْنٌ وَذُلٌّ

---

[۱] فلینظر من اخرجہ ۱۲

کہا جاتا ہے۔ اور یہ صفات محمودہ سے ہے مگر جو دوسروں کی طرف سے پہنچے اسے ھُوْنٌ، ھَوَان اور ذُلٌّ کہتے ہیں اور یہ مذموم سمجھی جاتی ہے۔

(خ س ء)

خَسَأْتُ الْكَلْبَ فَخَسَأَ میں نے کتے کو دھتکارا تو وہ دور ہوگیا۔ اور کسی کو دھتکارنے کے لئے عربی میں اِخْسَأْ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں کفار کے متعلق فرمایا:-
اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ (۲۳-۱۰۸) اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ (۲-۶۵) تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔
اسی سے خَسَأَ الْبَصَرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں نظر درماندہ ہوکر منقبض ہوگئی۔
قرآن میں ہے:-
خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (۶۷-۴) کہ وہ نظر درماندہ اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

(خ س ر)

اَلْخُسْرُ وَالْخُسْرَانُ راس المال میں کمی آجانا خسارہ کی نسبت کبھی انسان کی طرف ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے خَسِرَ (س) فُلَانٌ فلاں نے نقصان اٹھایا۔ اور کبھی فعل کی طرف ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے خَسِرَتْ تِجَارَتُهٗ اس کی تجارت خسارہ میں ہے۔ قرآن میں ہے:-
تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۷۹-۱۲) یہ لوٹنا تو موجب زیاں ہے۔

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔ جیسے مال وجاہ وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت وسلامتی عقل و ایمان اور ثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالےٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-
اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۳۹-۱۵) جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا۔ دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲-۱۲۱) اور جو اس کو نہیں مانتے وہ خسارہ پانے والے ہیں۔
اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲-۲۷) جو خدا کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں ... یہی لوگ نقصان اٹھانیوالے ہیں۔
فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۵-۳۰) مگر اس کے نفس نے اس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اس نے اسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگیا۔ اور آیت کریمہ:-
وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (۵۵-۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔
میں ہوسکتا ہے کہ ماپ تول میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے اور ظلم ترک کرنے کا حکم ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان افعال کے ارتکاب سے منع کیا ہو جو قیامت کے دن میزان عمل میں کمی

کا موجب ہوں جس کی وجہ سے آدمی ان لوگوں سے ہو جائے جن کے متعلق قرآن نے فَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۱۰۱-۸) کہا ہے، یہ دونوں معنی باہم لازم ملزوم ہیں۔ اور جہاں کہیں قرآن میں خسران کا لفظ آیا ہے وہ اسی دوسرے معنی پر محمول ہے۔ دنیوی کاروبار اور دیگر چیزوں میں نقصان اٹھانا مراد نہیں ہے۔

(خ س ف)

اَلْخُسُوْفُ کا لفظ چاند کے بے نور ہونے اور کُسُوْفٌ کا لفظ سورج کے بے نور ہونے پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ خسوف قدرے بے نور ہونے کو کہا جاتا ہے اور کسوف پوری طرح بے نور ہو جانے کو کہتے ہیں عام اس سے کہ وہ سورج ہو یا چاند کہا جاتا ہے خَسَفَهُ اللّٰهُ اللہ نے اسے زمین میں دھنسا دیا (متعدی) خَسَفَ هُوَ (لازمی) زمین میں دھنس جانا۔

قرآن میں ہے:۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (۲۸-۸۰) پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا (۲۸-۸۲) اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔

حدیث میں ہے[1] (۱۱۶) اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهٖ کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو کسی کی موت یا پیدائش کی وجہ سے بے نور نہیں ہوتے۔ اور عَيْنٌ خَاسِفَةٌ (اندر دھنسی ہوئی آنکھ) کا محاورہ خَسَفَ الْقَمَرُ سے منقول ہے بِئْرٌ مَّخْسُوْفَةٌ وہ کنواں جس کا پانی غائب ہو گیا ہو اور چاند گہن لگنے سے چونکہ ماند پڑ جاتا ہے اس لئے بطور استعارہ خَسْفٌ بمعنی ذلت و رسوائی بھی آ جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔
تَحَمَّلَ فُلَانٌ خَسْفًا۔ فلاں شخص ذلیل ہو گیا۔

(خ ش ب)

اَلْخَشَبُ (موٹی لکڑی ج خُشُبٌ) اور آیت کریمہ:۔

كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ (۶۳-۴) گویا لکڑیاں ہیں جو دیوار سے لگائی گئی ہیں۔

میں انہیں نکما ہونے میں لکڑیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور خَشَبٌ کے لفظ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے خَشَبْتُ السَّيْفَ۔ تلوار کو صیقل کرنا اور صیقل کرنے کے آلہ کو مِخْشَبٌ کہا جاتا ہے۔ سَيْفٌ خَشِيْبٌ تلوار جو تازہ صیقل کی گئی ہو۔ جَمَلٌ خَشِيْبٌ نیا اونٹ یعنی جو سدھایا نہ گیا ہو۔

تَخَشَّبَتِ الْاِبِلُ۔ لکڑی کھانا سوکھی گھاس چرنا۔ جَبْهَةٌ خَشْبَاءُ۔ لکڑی کی طرح سخت اور کھردری پیشانی (کنایۃً) بے حیا۔ جیسا کہ شاعر نے صخر یعنی چٹان کے ساتھ تشبیہ دیکر کہا ہے ع

(۱۳۵) وَالصَّخْرُ هَشٌّ عِنْدَ وَجْهِكَ فِي الصَّلَابَةِ
تیرے چہرے کے مقابلہ میں تو پتھر بھی ہشاش بشاش

---

[1] الحدیث فی الصحیحین و ابی داؤد والنسائی عن عائشہ (صلوۃ الکسوف) والطیالسی عن انس و ایضا البخاری والنسائی عن ابی بکرۃ راجع الفتح اللبهانی ج ا ص ۳۰۵-۳۰۶

معلوم ہوتا ہے۔
اَلْمُخَشَّوْبُ۔ وہ چیز جس میں لکڑی ملائی گئی ہو۔ اور یہ ردی چیز سے کنایہ ہوتا ہے۔

(خ ش ع)

اَلْخُشُوْعُ (ن) کے معنی ضَرَاعَةٌ یعنی عاجزی کرنے اور جھک جانے کے ہیں۔ مگر زیادہ تر خُشُوْعٌ کا لفظ جوارح اور ضَرَاعَتٌ کا لفظ قلب کی عاجزی پر بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک روایت میں ہے:[1] (۱۲۱)
اِذَا ضَرَعَتِ الْقَلْبُ خَشَعَتِ الْجَوَارِحُ
جب دل میں فروتنی ہو تو اسی کا اثر جوارح پر ظاہر ہو جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (۱۷-۱۰۹) اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔
اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (۲۳-۲) جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں۔
وَكَانُوْا لَنَا خَاشِعِيْنَ (۲۱-۹۰) اور ہمارے آگے عاجزی کیا کرتے تھے۔
وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (۲۰-۱۰۸) اور ۔۔۔ ۔۔۔ آوازیں پست ہو جائیں گی۔
خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ (۶۸-۴۳) ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔
اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (۷۹-۹) اور آنکھیں جھکی ہوئی۔ یہ ان کی نظروں کے مضطرب ہونے سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ زمین و آسمان کے متعلق بطور کنایہ کے فرمایا۔
اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (۵۶-۴) جب زمین بھونچال سے لرزنے لگے۔
اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹-۱) جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی۔
يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا۔ (۵۲-۹-۱۰) جس دن آسمان لرزنے لگے کپکپا کر۔ اور پہاڑ اڑنے لگیں (اون ہو کر)

(خ ش ی)

اَلْخَشْيَةُ۔ اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہو جائے، یہ بات عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:۔
اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵-۲۸) اور خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔ میں خشیت الٰہی کے ساتھ علماء کو خاص کیا ہے۔
وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى (۸۰-۹) اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور خدا سے ڈرتا ہے۔
مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (۵۰-۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔
فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (۱۸-۸۰) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (بڑا ہو کر جو بدکردار ہوتا کہیں) ان کو سرکشی اور کفر میں پھنسا دے۔
فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ (۲-۱۵۰) سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا۔
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً۔ (۴-۷۷) لوگوں سے یوں ڈرنے لگے

---

[1] لم اجدہ ۱۲

جیسے خدا سے ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔
اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ (۳۳-۳۹)
جو خدا کے پیغام (جوں کے توں) پہنچاتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔
وَلْیَخْشَ الَّذِیْنَ (۴-۹)۔۔۔ اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیئے۔
یعنی ان کو اپنے فقر کے خوف کا احساس ہونا چاہیئے۔
خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ (۱۷-۳۱) مفلسی کے خوف سے
یعنی اس اندیشے سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو کہ یہ مفلس ہو کر ذلیل ہو جائے گی۔ اور آیت کریمہ:۔
مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ (۵۰-۳۳)
جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔
یعنی اس کے دل میں ایسا خوف ہو جو کہ معرفت الٰہی کا تقاضا ہے۔

(خ ص ص)

اَلتَّخْصِیْصُ وَالْاِخْتِصَاصُ وَالْخُصُوْصِیَّۃُ وَالتَّخَصُّصُ کسی چیز کے بعض افراد کو دوسروں سے الگ کرکے ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا یہ اَلْعُمُوْمُ وَالتَّعَمُّمُ وَالتَّعْمِیْمُ کی ضد ہے۔
خُصَّانُ الرَّجُلِ۔ جن پر خصوصی نوازش کرتا ہو۔
اَلْخَاصَّۃُ۔ یہ عامۃ کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَاصَّۃً (۸-۲۵) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گنہگار ہیں یعنی، بلکہ سب پر واقع ہوگا۔
خَصَّہٗ بِکَذَا وَاخْتَصَّہٗ۔ کسی کو کسی چیز کے ساتھ مختص کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (۲-۱۰۵)
جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے۔
خَصَاصُ الْبَیْتِ مکان میں شگاف کو کہتے ہیں۔
اسی سے خَصَاصَۃٌ اس فقر و احتیاج کو کہتے ہیں جو ختم نہ ہوئی ہو۔ اس قسم کے فقر کو خَلَّۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ (۵۹-۹) اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔
لہٰذا آپ اسے خصاص سے ماخوذ قرار دے سکتے ہیں۔
اَلْخُصُّ۔ بانس یا لکڑی کا جھونپڑا اور اسے خُصٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جھروکے نظر آتے ہیں۔

(خ ص ف)

قرآن میں ہے:۔
وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْہِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ (۲۰-۱۲۲) یعنی آدمؑ اور حواؑ اپنے اوپر خَصَفَۃٌ یعنی درخت کے پتے چپکانے لگے اسی سے زنبیل کو جو کھجوریں ڈالنے کے لئے کھجور کے پتوں سے بنایا جاتا ہے اور گاڑھے کپڑے کو خَصَفَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع خَصَفٌ (وخِصَافٌ) آتی ہے۔ اور خَصْفَۃٌ (بسکون صاد) چمڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کے اوپر اس جیسا دوسرا ٹکڑا رکھ کر۔ جوتا بنایا جائے
خَصَفْتُ النَّعْلَ بِالْمِخْصَفِ ستالی کے

ساتھ جوتا سینا۔

ایک روایت میں ہے[1] (۱۱۳)

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْصِفُ نَعْلَهُ

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا خود ہی مرمت کر لیا کرتے تھے۔

خَصَفْتُ الْخَصَفَةَ۔ زنبیل بننا۔

اَلْاَخْصَفُ وَالْخَصِيْفُ دو رنگ کا کھانا اصل میں اس دودھ وغیرہ کو کہتے ہیں جو چمڑے کے شکیزے میں ڈالا جائے اور اس چمڑے کا رنگ اسی کے ساتھ مل جائے[2]۔

(خ ص م)

اَلْخَصْمُ۔ یہ خَصَمْتُهُ کا مصدر ہے جس کے معنی جھگڑنے کے ہیں کہا جاتا ہے خَصَمْتُهُ وَخَاصَمْتُهُ مُخَاصَمَةً وَخِصَامًا کسی سے جھگڑا کرنا قرآن میں ہے:۔

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲-۲۰۴) اور وہ حالانکہ سخت جھگڑالو ہے۔

وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۴۳-۱۸) اور جھگڑنے کے وقت بات نہ کر سکے۔

اور مُخَاصِمٌ کو خَصْمٌ کہا جاتا ہے اور خصم کا لفظ واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی تثنیہ بھی آجاتا ہے[3]۔

اصل میں خَصْمٌ کے معنی کنارہ کے ہیں۔ اور مخاصمت کے معنی ایک دوسرے کو کنارہ سے پکڑنے کے ہیں۔ اور بوری کو کونے سے پکڑ کر کھینچنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے[4]: (۱۱۴)

نَسِيْتُهَا فِي خُصْمِ فِرَاشِي کہ میں اسے اپنے بستر ہ کے کونے میں بھول آیا ہوں خُصْمٌ کی جمع خُصُوْمٌ وَاَخْصَامٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

خَصْمَانِ اخْتَصَمُوْا (۲۲-۹) دو فریق جھگڑتے ہیں۔ میں خَصْمَانِ سے دو فریق مراد ہیں اسی لئے اِخْتَصَمُوْا آیا ہے۔

اَلْاِخْتِصَامُ (افتعال) ایک دوسرے سے جھگڑنا۔ قرآن میں ہے:۔

لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ (۵۰-۲۸) ہمارے حضور رد و کد نہ کرو۔

وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ (۲۶-۹۶) ...... وہ آپس میں جھگڑیں گے۔

اَلْخَصِيْمُ۔ جھگڑالو بہت زیادہ جھگڑا کرنے والا جیسے فرمایا:۔

فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۱۶-۴) مگر وہ (اس بارے میں) علانیہ جھگڑنے لگا۔

اَلْخَصِمُ سخت جھگڑالو جس کا شیوہ ہی جھگڑنا ہو۔ قرآن میں ہے:۔

بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳-۵۸) حقیقت یہ ہے۔ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔

---

[1] کلمة من حديث عائشة رواه الترمذي وفي كنز العمال (المتفرقات) ۷: رقم ۴۳۸۴ (حم. عن عائشة) وفي تخريج العراقي على الاحياء ۲/ ۳۰۶ اخرجه احمد من حديث عائشة ورجاله رجال الصحيح ورواه ابو الشيخ ايضا وابن حبان في زوائده رقم ۲۱۳۳-۲۱۳۵-

[2] قال الجوهري الخصيف. اللبن الحليب يصب عليه الرائب فان جعل عليه التمر والسمن فهو العوثباني [3] قال الجوهري ومن العرب من ثنيه ويجمعه. [4] راجع اللسان (خصم) من حديث ام سلمة قالت يارسول الله اراك تمسا هم الوجه من علة قال لا لكنه من السبعة الدنانير التي اتينا بها امس في خصم الفراش فبت ولم اقسمها۔

(خ ض د)

خَضَدْتُہٗ فَانْخَضَدَ کے معنی ہیں میں نے درخت کے کانٹے توڑے چنانچہ وہ ٹوٹ گئے اور ایسے درخت کو جس کے کانٹے توڑ دیئے گئے ہوں اسے مَخْضُوْد اور خضید کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔
فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶-۲۸) (یعنی) بے خار کی بیریوں ہیں۔
اور خَضَدٌ بمعنی مَخْضُوْدٌ آتا ہے جیسے نَقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ اور اسی سے استعارۃً خَضَدَ عُنُقَ الْبَعِیْرِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس نے اونٹ کی گردن توڑ ڈالی۔

(خ ض ر)

قرآن میں ہے:۔
فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّۃً (۲۲-۶۳) تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔
ثِیَابًا خُضْرًا (۱۸-۳۱) سبز رنگ کے کپڑے۔
خُضْرًا کا واحد اَخْضَرُ ہے اور اَلْخُضْرَۃُ ایک قسم کا رنگ ہوتا ہے جو سفیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے مگر سیاہی غالب ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اَسْوَد (سیاہ) اور اَخْضَرُ (سبز) کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۱۳۶) قَدْ اَعْسِفُ النَّازِحَ الْمَجْهُوْدَ مَعْسَفَۃً
فِیْ ظِلِّ اَخْضَرَ یَدْعُوْھَا مَۃُ الْیُوْمِ

میں تاریک اور بھیانک راتوں میں دور دراز راستوں میں سفر کرتا ہوں جو بے نشان ہوتے ہیں۔ اور سبزی اور شادابی کی وجہ سے عراق کے ایک حصہ کو سَوَادُ الْعِرَاق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
مُدْھَامَّتَانِ (۵۵-۶۴) کے معنی سرسبز کے ہیں اور خُضْرَۃ کی جگہ دُھْمَۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی سیاہی کے ہیں۔ حدیث میں ہے[2]:۔ (۱۴۱)
اِیَّاکُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ تم کوڑی کی سرسبزی سے بچو۔ اور خَضْرَاءَ الدِّمَنِ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آنحضرت نے فرمایا اَلْمَرْأَۃُ الْحَسْنَۃُ فِیْ مَنْبَتِ السُّوْءِ یعنی خوبصورت عورت جو بد طینت ہو۔
اَلْمُخَاضَرَۃُ سبزیوں اور کچے پھلوں کی بیع کرنا۔
اَلْخَضِیْرَۃُ کھجور کا درخت جس کی سبز اور نیم پختہ کھجوریں جھڑ جائیں

(خ ض ع)

اَلْخُضُوْعُ کے معنی خشوع یعنی جھکنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
رَجُلٌ خُضَعَۃٌ وہ شخص جو ہر ایک کے سامنے عاجزی اور انکساری ظاہر کرتا پھرے۔
خَضَعْتُ اللَّحْمَ۔ میں نے گوشت کاٹا۔

---

[1] قالہ ذو الرمۃ ویروی المجهول بدل المجهود ومعسفۃ بدل معسفۃ کما فی اللسان (یوم) والاقتضاب وفی روایۃ اغضف بدل اخضر وھو المتنبی وادب الکاتب ۲۳ / ۱۹۱ والبیت فی دیوانہ ۴۷۵ واضداد ابن الانباری ۳۴۸ واللسان (خضر، عسف) واضداد ابی الطیب ۲۳۰ والحیوان (۶ : ۱۷۵) والسیوطی ۱۵۰ والمحکم (عسف) معنی العسف رکوب المفازۃ وقطعھا بغیر قصد ولا ھدایۃ ولا توخی صوب ولا طریق مسلوک ۱۲ [2] رواہ الدارقطنی فی الافراد والرامھرمزی فی الامثال من حدیث الخدری قال الدارقطنی تفرد بہ الواقدی وھو ضعیف (تخریج احیاء للعراقی ۲ / ۱۴) والحدیث مثل راجع المیدانی ۱ / ۳۲ والفائق ۱ / ۱۷۵ وغریب ابی عبید الحصری ۱ / ۵۹

ظَلِیْمٌ اَخْضَعُ شترمرغ جس کی گردن میں پستی اور جھکاؤ ہو۔

(خ ط ط)

اَلْخَطُّ (مثل مَدٌّ) جس میں طول ہو اہل ہندسہ کے نزدیک خطوط کئی قسم پر ہیں۔ یعنی مسطوح، مستدیر مقوس اور ممال وغیرہ اور ہر مستطیل علاقہ کو خَطٌّ کہہ دیتے ہیں جیسے خَطُّ الْیَمَنِ جو یمن کے ایک علاقہ کا نام ہے جس کی طرف خطی نیزے منسوب ہیں اور زمین کا وہ حصہ جو انسان اپنے لئے مخصوص کرے اور کھودے اسے خَطٌّ اور خِطَّۃٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَطِیْطَۃُ وہ زمین جس کے ارد گرد بارش ہوئی ہو اور وہ درمیان میں خط منحرف کی طرح بے بارش کے رہ گئی۔ اور اَلْخَطُّ کے معنی لکھنا کتابت کرنا بھی ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِہٖ مِنْ کِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ (۲۹-۴۸) اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے۔

(خ ط ء)

اَلْخَطَأُ وَالْخَطَأَۃُ کے معنی صحیح جہت سے عدول کرنے کے ہیں۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) کوئی ایسا کام بالارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔ یہ خطا تام ہے جس پر مواخذہ ہوگا اس معنی میں فعل خَطِئَ یَخْطَأُ خِطْأً وَخِطْأَۃً بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ خِطْأً کَبِیْرًا (۱۷-۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت جرم ہے۔

وَاِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ (۱۲-۹۱) اور بلاشبہ ہم خطا کار تھے۔

(۲) ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہو جائے۔ کہا جاتا ہے:۔

اَخْطَأَ یُخْطِئُ اِخْطَاءً فَھُوَ مُخْطِئٌ اس میں اس کا ارادہ تو درست ہوتا ہے مگر اس کا فعل غلط ہوتا ہے اسی قسم کی خطا کے متعلق آنحضرتؐ نے فرمایا ہے[1] (۱۵)

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ کہ میری امت سے خطا اور نسیان اٹھائے گئے ہیں۔

نیز فرمایا[2]: (۱۶)

مَنِ اجْتَھَدَ فَاَخْطَأَ فَلَہٗ اَجْرٌ جس نے اجتہاد کیا۔ لیکن اس سے غلطی ہوگئی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن میں ہے:۔

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ (۴-۹۲) اور جو غلطی سے مومن کو مار ڈالے تو ایک تو .... غلام کو آزاد کردے۔

(۳) غیر مستحسن فعل کا ارادہ کرے لیکن اتفاق سے مستحسن فعل سرزد ہو جائے۔ اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے مگر ارادہ غلط ہے لہٰذا اس کا قصد مذموم ہوگا مگر فعل بھی قابل ستائش نہیں ہوگا۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[3] ع ( )

(۱۳۷) اَرَدْتَّ مَسَاءَتِیْ فَاَجْرَتْ مَسَرَّتِیْ
وَقَدْ یُحْسِنُ الْاِنْسَانُ مِنْ حَیْثُ لَا یَدْرِیْ

(تو نے میری برائی کا ارادہ کیا لیکن مجھے خوشی حاصل ہوگئی کبھی انسان نادانستہ طور پر بھی اچھا کام کر لیتا ہے۔

---

[1] ... روایۃ وضع روی ابن عدی عن ابی بکرۃ مرفوعا رفع اللہ عن ہذہ الامۃ ثلاثا الخ قال الحافظ فی تخریجہ ص ۱۳۲ رقم ۲۰۲ انہ من منکرات جعفر وفی روایۃ ابن ماجۃ و البیہقی وابن حبان عن ابن عباس ان اللہ تجاوز عن امتی (راجع المشکوٰۃ واللآلی للسیوطی) [2] لم اجدہ [3] لم اجدہ وبرجع ((

حاصل کلام یہ کہ جس شخص سے اتفاقاً ارادہ کے
خلاف فعل صادر ہو جائے۔ تو اس کے متعلق
"اَخْطَأَ" کہا جاتا ہے اور اگر ارادہ کے مطابق نہ
فعل صادر ہو تو اصاب کہتے ہیں مگر کبھی اَخْطَأَ
کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے
جس نے کسی غیر مستحسن فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کسی
نا زیبا کام کا ارادہ کیا ہو۔ لہذا اَصَابَ الْخَطَأَ وَ
اَخْطَأَ الصَّوَابَ وَاَصَابَ الصَّوَابَ وَالْخَطَأَ
الْخَطَأَ ہر طرح کہنا درست ہوگا اور یہ لفظ مشترک
ہے جو بہت سے معانی کا محتمل ہوتا ہے اس لئے
جو شخص حقائق کا متلاشی ہو اسے اس کے متعلق
خوب غور سے کام لینا چاہیئے۔

اَلْخَطِیْئَةُ یہ قریب قریب سَیِّئَةٌ کے ہم معنی
ہے۔ قرآن میں ہے:
وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ (۲-۸۱) اور اسکے
گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں گے۔

لیکن زیادہ تر خَطِیْئَةٌ کا استعمال اس فعل کے
متعلق ہوتا ہے جو بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ
کسی دوسری چیز کا ارادہ اس کے صدور کا سبب
بن جائے مثلاً کسی نے شکار کے نشانہ لگایا مگر
نشانہ خطا ہو کر کسی انسان کو جا لگا یا کسی مسکر چیز
کا استعمال کیا اور نشہ کی حالت میں کسی جرم کا ارتکاب
کر بیٹھا یہ سبب دو قسم پر ہے ایک سبب محظور
جیسے مسکر چیز پینا اس حالت میں جو فعل سرزد ہوگا
وہ قابل گرفت ہوگا۔ دوسرا سبب مباح جیسے شکار
کو نشانہ بنایا اس حالت میں جو خطا سرزد ہوگی اس
پر گرفت نہیں ہوگی اسی قسم کی غلطی کے متعلق فرمایا:
وَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ
مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (۳۳-۵) اور جو بات تم
سے غلطی سے ہو گئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں
لیکن جو قصد دلی سے کرو اس پر مواخذہ ہے)

اور آیت کریمہ:
وَمَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا (۴-۱۱۲) اور
جو کوئی قصور یا گناہ خود کرے۔
میں خَطِیْئَةٌ سے وہ فعل مراد ہے جو بلا قصد
سرزد ہوا ہو اور اسی قسم کی خطا کے متعلق حضرت
ابراہیم نے کہا تھا۔
وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ
الدِّیْنِ (۲۶-۸۲) اور وہ جس سے میں امید
رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشیگا۔

خَطِیْئَةٌ کی جمع خَطِیْئَاتٌ وَخَطَایَا ہے۔ قرآن
میں ہے:
وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا مِمَّا
خَطِیْٓئٰتِهِمْ (۷۱-۲۴-۲۵) اور ظالم لوگوں
کے لئے اور زیادہ تباہی بڑھا (آخر) وہ اپنے گناہ
کے سبب ہی۔
اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَا (۲۶-۵۱)
ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ
بخش دے گا۔
وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰكُمْ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ
خَطٰیٰهُمْ مِّنْ شَیْءٍ (۲۹-۱۲) ہم تمہارے
گناہ اٹھا لیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ
بھی بوجھ اٹھانے والے نہیں۔ اور آیت کریمہ:
نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ (۲-۵۸) ہم تمہارے
گناہ معاف کر دیں گے۔
سے وہ گناہ مراد ہیں جو عمداً کئے ہوں۔

اَلْخَاطِئُ بالارادہ گناہ کرنے والے کو کہتے ہیں جیسے فرمایا:
وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ لَّا یَاْكُلُهٗٓ اِلَّا

الْخَاطِئُوْنَ (۶۹-۳۷) اور نہ پیپ کے سوا اس کے لئے) کھانا ہے جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

مگر کبھی نفس گناہ پر بھی خَاطِئَۃٌ کا اطلاق ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ (۶۹-۹) اور وہ جو الٹی بستیوں میں رہتے تھے سب گناہ کے کام کرتے تھے۔

یعنی وہ گناہ عظیم کا ارتکاب کرتے تھے جیسا کہ (بطور مبالغہ) شِعْرٌ شَاعِرٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

لیکن جو گناہ بلا قصد سرزد ہو جائے اس کے متعلق آنحضرت نے فرمایا ہے کہ وہ قابل گرفت نہیں ہے[1]۔ مگر آیت کریمہ:۔

نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ (۲-۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کردیں گے۔

میں وہی معنی مراد ہیں جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(خ ط ب)

اَلْخَطْبُ وَالْمُخَاطَبَةُ وَالتَّخَاطُبُ۔

باہم گفتگو کرنا۔ ایک دوسرے کی طرف بات لوٹانا اسی سے خُطْبَۃٌ اور خِطْبَۃٌ کا لفظ ہے لیکن خُطْبَۃٌ وعظ و نصیحت کے معنی میں آتا ہے اور خِطْبَۃٌ کے معنی ہیں نکاح کا پیغام۔

قرآن میں ہے:۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ (۲-۲۳۵) اگر تم کنایہ کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو .... تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔

اصل میں خِطْبَۃٌ اسی حالت کو کہتے ہیں جو بات کرتے وقت ہوتی ہے جیسا کہ جِلْسَۃٌ اور قِعْدَۃٌ پھر خُطْبَۃٌ سے تو خَاطِبٌ اور خَطِيْبٌ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں مگر خِطْبَۃٌ سے صرف خَاطِبٌ کا لفظ ہی بولا جاتا ہے۔ اور خَطَبَ فعل دونوں معنی کے لئے آتا ہے۔

اَلْخَطْبُ۔ اہم معاملہ جس کے بارے میں کثرت سے تخاطب ہو۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ (۲۰-۹۵) (پھر سامری سے کہنے لگے) کہ سامری تیرا کیا حال ہے۔

فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ (۵۱-۳۱) کہ فرشتو تمہارا مدعا کیا ہے۔

فَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸-۲۰) دو ٹوک بات، فیصلہ کن بات جس سے نزاع ختم ہو جائے۔

(خ ط ف)

خَطِفَ يَخْطَفُ خَطْفًا وَاخْتَطَفَ اِخْتِطَافًا کے معنی کسی چیز کو سرعت سے اچک لینا کے ہیں۔ یہ باب (س ض) دونوں سے آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ (۳۷-۱۰) ہاں جو کوئی (فرشتوں کی) بات کو) چوری سے جھپٹ لینا چاہتا ہے۔

طا پر فتحہ اور کسرہ دونوں منقول ہیں اور اس سے مراد وہ شیاطین ہیں جو چوری چھپے ملأ اعلیٰ کی گفتگو سنا کرتے تھے۔ نیز فرمایا:۔

تَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ (۲۲-۳۱) پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔

---

[1] وقد مر الآن ۱۲

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ (۲-۲۰) قریب ہے کہ بجلی (کی چمک) ان کی آنکھوں (کی بصارت) کو اچک لے جائے۔

وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۲۹-۶۷) اور لوگ ان کے گرد نواح سے اچک لئے جاتے ہیں۔ یعنی ان کے گرد و نواح میں قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہے۔

اَلْخُطَّافُ۔ (۱) ابابیل کی قسم کا ایک پرندہ جو پرواز کرنے میں کسی چیز کو جھپٹ لیتا ہے۔ (۲) آہن کج جس کے ذریعے کنوئیں سے ڈول نکالا جاتا ہے گویا وہ ڈول کو اچک کر باہر لے آتا ہے (۳) وہ لوہا جس پر کنوئیں کی چرخی گھومتی ہے۔ ج خَطَاطِيفُ بَازٌ مُخْطِفٌ۔ باز جو اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ اَلْخَيْطَفُ۔ تیز رفتاری۔ اَخْطَفُ الْحَشَا وَمُخْتَطَفُهُ۔ مرد باریک شکم جس کے دبلاپن کی وجہ سے ایسا معلوم ہو کہ اس کی انتڑیاں اچک لی گئی ہیں۔

(خ ط و)

خَطَوْتُ أَخْطُوْ کے معنی چلنے کے لئے قدم اٹھانے کے ہیں خَطْوَةٌ ایک بار قدم اٹھانا اَلْخُطْوَةُ وہ فاصلہ جو دو قدموں کے درمیان ہو۔ اَلْخُطْوَةُ کی جمع خُطُوَاتٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ۔ (۲-۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔

یعنی شیطان کی اتباع نہ کرو۔ اور یہ آیت کریمہ:۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (۳۸-۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا۔ کی طرح ہے۔

(خ ف ف)

اَلْخَفِيْفُ (ہلکا) یہ ثقیل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اس کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے (۱) کبھی وزن میں مقابلہ کے طور یعنی دو چیزوں کے باہم مقابلہ میں ایک کو خفیف اور دوسری کو ثقیل کہہ دیا جاتا ہے جیسے دِرْهَمٌ خَفِيْفٌ وَدِرْهَمٌ ثَقِيْلٌ یعنی وہ درہم ہلکا ہے۔ اور یہ بھاری ہے (۲) اور کبھی تقابل زمانی کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً (ایک گھوڑا جو فی گھنٹہ دس میل کی مسافت طے کرتا ہو اور دوسرا پانچ میل فی گھنٹہ دوڑتا ہو تو پہلے کو خفیف (سبک رفتار) اور دوسرے کو ثقیل (سست رفتار) کہا جاتا ہے (۳) جس چیز کو خوش آئندہ پایا جائے اسے خفیف اور جو طبیعت پر گراں ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے اس صورت میں خفیف کا لفظ بطور مدح اور ثقیل کا لفظ بطور مذمت استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات کریمہ:۔

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ (۸-۶۶) اب خدا نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (۲-۸۶) سو نہ تو ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔ اسی معنی پر محمول ہیں بلکہ ہمارے نزدیک آیت:۔

حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا (۷-۱۸۹) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

(۴) جو شخص جلد طیش میں آجائے اسے خفیف اور جو پروقار ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے خفیف صفت ذم ہوگی اور ثقیل صفت مدح۔

(۵) جو اجسام نیچے کی طرف جھکنے والے ہوں انہیں ثقیل اور جو اوپر کی جانب چڑھنے والے ہوں انہیں خفیف کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے زمین پانی وغیرہا کو اجسام ثقیلہ اور ہوا، آگ وغیرہا اجسام خفیفہ میں داخل ہوں گے۔

خَفَّ (ض) خَفًّا وَخِفَّۃً وَتَخَفَّفَ۔ ہلکا ہونا۔ خَفَّفَہٗ تَخْفِیْفًا۔ ہلکا کرنا۔ اِسْتَخَفَّہٗ۔ ہلکا سمجھنا خَفَّ الْمَتَاعُ سامان کا ہلکا ہونا اسی سے کَلَامٌ خَفِیْفٌ عَلَی اللِّسَانِ کا محاورہ مستعار ہے یعنی وہ کلام جو زبان پر ہلکا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَہٗ فَاَطَاعُوْہُ (۴۳-۵۴)

غرض اس نے اپنی قوم کی عقل مار دی اور انہوں نے اس کی بات مان لی۔

کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اس نے اپنی قوم کو اکسایا کہ اس کے ساتھ تیزی سے چلیں اور یا یہ کہ انہیں اجسام وعزائم کے اعتبار سے "ڈھیلا پایا" اور بعض نے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ "انہیں جاہل اور کم عقل سمجھا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ (۷-۹) اور جن کے وزن ہلکے ہوں گے۔

میں اعمال صالحہ کی کمی کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:۔

وَلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ (۳۰-۶۰) اور وہ تمہیں اوچھا نہ بنا دیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ شبہات پیدا کر کے تمہیں تمہارے عقائد سے متزلزل اور برگشتہ نہ کر دیں۔

خَفُّوْا عَنْ مَنَازِلِہِمْ۔ وہ تیزی سے کوچ کر گئے

اَلْخُفُّ۔ موزہ۔ انسان کے موزہ سے تشبیہ دے کر خُفُّ النَّعَامَۃِ وَالْبَعِیْرِ (پیل شتر و سم شتر مرغ) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(خ ف ت)

اَلْمُخَافَتَۃُ وَالْخَفْتُ پوشیدہ گفتگو کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

یَتَخَافَتُوْنَ بَیْنَہُمْ (۲۰-۱۰۳) وہ آپس میں آہستہ آہستہ کہیں گے۔

وَلَا تُخَافِتْ بِہَا (۱۷-۱۱۰) اور نہ آہستہ۔

کسی شاعر نے کہا ہے[1] ع (   )

(۱۳۷) وَشَتَّانَ بَیْنَ الْجَہْرِ وَالْمَنْطِقِ الْخَفْتِ

کہ بلند اور پوشیدہ گفتگو میں بین فرق ہوتا ہے۔

(خ ف ض)

اَلْخَفْضُ۔ یہ رَفْعٌ کی ضد ہے۔ اور خَفْضٌ کے معنی نرم رفتاری اور سکون وراحت بھی آتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاخْفِضْ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ (۱۷-۲۴) اور عجز ونیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔ میں ماں باپ کے ساتھ نرم برتاؤ اور ان کا مطیع اور فرمانبردار ہو کر رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ گویا یہ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ (کہ مجھ سے سرکشی نہ کرنا) کی ضد ہے اور قیامت کے متعلق فرمایا:۔

خَافِضَۃٌ رَّافِعَۃٌ (۵۶-۳) کسی کو پست کرے اور کسی کو بلند۔

کیونکہ وہ بعض کو پست اور بعض کو بلند کرے گی پس خَافِضَۃٌ میں آیت کریمہ:۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (۹۵-۵) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] البیت فی الصحاح واللسان (خفت) بغیر عزو وصدرہ: اخاطب جہرا اذ لہن تخافت ۱۲

(خ ف ی)

خَفِیَ (س) خُفْیَۃً۔ اَلشَّیْءُ پوشیدہ ہونا۔ قرآن میں ہے:۔

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (۷-۵۵) اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو۔

اَلْخِفَاءُ (مثل غِطَاءٌ) کے معنی پردہ کے ہیں۔ خَفَیْتُہٗ۔ میں نے اس سے پوشیدگی دور کردی یعنی ظاہر کر دیا۔ اَخْفَیْتُہٗ۔ پوشیدہ کرنا۔ چھپانا۔ یہ اِبْدَاءٌ اور اِعْلَانٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا ھِیَ وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَآءَ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (۲-۲۷۱) اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے۔ اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔

وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ (۱-۶) جو کچھ تم مخفی طور پر اور جو علی الاعلان کرتے ہو وہ مجھے معلوم ہے۔

بَلْ بَدَا لَھُمْ مَّا کَانُوْا یُخْفُوْنَ (۶-۲۸) ہاں یہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے (آج) ان پر ظاہر ہوگیا ہے۔

اَلْاِسْتِخْفَاءُ۔ چھپنا۔ قرآن میں ہے:۔

اَلَآ اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْہُ (۱۱-۵) دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں تاکہ خدا سے پردہ کریں۔

اَلْخَوَافِیْ۔ پرندکے بازوں کے نیچے چھپے ہوئے پر۔ اس کا مفرد خَافِیَۃٌ ہے اور یہ اَلْقَوَادِمُ کی ضد ہے۔

(خ ل ل)

اَلْخَلَلُ۔ دو چیزوں کے درمیان کشادگی اور فاصلہ کو کہتے ہیں مثلاً بادل اور گھروں کے درمیان کا فاصلہ یا راکھ وغیرہ کا اندرونی حصہ اس کی جمع خِلَالٌ ہے۔ چنانچہ بادل کے متعلق فرمایا:۔

فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلَالِہٖ (۳۰-۴۸) تم دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ میں سے بارش برسنے لگتی ہے۔ اور گھروں کے متعلق فرمایا:۔

فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ (۱۷-۵) اور وہ شہروں کے اندر پھیل گئے۔

شاعر نے کہا ہے[1] ع (   )

(۱۳۹) اَرٰی خَلَلَ الرَّمَادِ وَمِیْضَ جَمْرٍ
میں راکھ کے اندر آگ کے انگارے کی چمک دیکھتا ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَاَ اَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ (۹-۴۷) اور تم میں دوڑے دوڑے پھرتے۔ یعنی چغل خوری اور

---

(۱) قالہ بعض شعراء الاموییین وتمامہ: فلخاف ان یکون لہ ضرام۔ والبیت فی اللسان (ضرم) ونسبہ ابن بری لابی مریم وفی روایتہ خلل الرماد بدل خلال الرماد وفی تاریخ الطبری (۷: ۳۶) کتب نصر بن سیار الی مروان بن محمد وفی العقد (۴: ۴۷۷) الی ہشام بن عبد الملک یخبرہ بخروج ابی مسلم الخراسانی علیہ والبیت ایضاً فی الاخبار الطوال لابی حنیفۃ الدینوری المتوفی ۲۸۲ھ فی خمسۃ ابیات کذا فی مجموعۃ المعانی ۲۱۱ وعزاہ لابی مریم البجلی وفی محاضرات المؤلف (۲: ۷۷) معزولا لابی مہیم والبیت ایضاً فی الاغانی (۹: ۱۲) وفیہ واحربان بدل اما دران وفی ابن عساکر (۴: ۱۹۱) خلیق ان وفی الاغانی (۶: ۱۲۸) انہ ارسل الابیات الی الولید بن یزید وفی العقد (۱: ۱۱) نار بدل جمر کذا فی الاصول سوی العیون (۱: ۱۲۸)

اور فساد سے تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کی کوشش کرتے۔

اَلْخِلَالُ۔ دانت وغیرہ صاف کرنیکا تنکا کہا جاتا ہے۔ خَلَّ سِنَّہٗ (اس نے اپنا دانت صاف کیا) خَلَّ ثَوْبَہٗ (کپڑے میں سوراخ کرنا۔ خَلَّ (ن) لِسَانَ الْفَصِیْلِ (اونٹ کے بچے کی زبان کو چھید کر) کھو لتی تا النا ناکہ اونٹنی کا دودھ نہ پی سکے۔ خَلَّ الرَّمِیَّۃَ بِالسَّھْمِ (نشانہ پر تیر مار کر سوراخ کر دیا) حدیث میں ہے[1] (۱۷۱) خَلِّلُوْا اَصَابِعَکُمْ (وضو میں انگلیوں کا خلال کیا کرو)۔ اَلْخَلَلُ فِی الْاَمْرِ کسی کام میں خرابی کا پیدا ہو جانا۔ جیسا کہ دو چیزوں کے درمیان رخنہ پڑ جاتا ہے۔ خَلَّ (ض) خَلًّا وَّخِلَالًا۔ لَحْمُہٗ گوشت کا دبلا اور کم ہو جانا۔ شاعر نے کہا ہے[2] : (مدید)

(۱۴۰) اِنَّ جِسْمِیْ بَعْدَ خَالِیْ لَخَلٌّ

کہ ماموں کے مرنے کے بعد میرا جسم گھل گیا ہے۔

اَلْخَلَّۃُ۔ ریگ زار کے اندر راستہ کو کہتے ہیں اور اسے خَلَّۃٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دشوار گزار ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ راستہ ریگ زار کے اندر سے گزرتا ہے۔ نیز ترش سرکہ کو بھی خَلَّۃ کہتے ہیں کیونکہ ترشی اس میں سرایت کئے ہوتی ہے۔ اَلْخِلَّۃُ تلوار کی نیام کا چمڑا جو اس کے اوپر منڈھا ہوا ہوتا ہے۔ نیام چونکہ اس کے اندر ہی ہے اس لئے اس چمڑے کو خِلَّۃ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَلَّۃُ۔ (ایضًا) طبیعت کی خرابی یا عارضہ جو کسی چیز کی خواہش یا سخت احتیاج کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَلَّۃٌ کے معنی حاجت اور خصلت بیان کئے جاتے ہیں۔

اَلْخُلَّۃُ۔ مودت، دوستی۔ محبت اور دوستی کو خُلَّۃٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دل کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اور یا اس لئے کہ وہ دل کے اندر داخل ہو کر اس طرح اثر کرتی ہے جس طرح تیر نشانہ پر لگ کر اس میں نشان ڈال دیتا ہے۔ اور یا اس لئے کہ اس کی سخت احتیاج ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے:۔

خَالَلْتُہٗ مُخَالَّۃً وَّخِلَالًا فَھُوَ خَلِیْلٌ

اور آیت کریمہ:۔

وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا (۴-۲۵) اور خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنایا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے خلیل کہا ہے کہ وہ ہر حال میں باری تعالیٰ کے محتاج تھے اور یہ احتیاج ویسے ہی ہے۔ جس کی طرف آیت:۔

اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (۲۸-۲۴) میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔

---

[1] راجع (حم) عن ابن عباس و (قط) عن عائشۃ و (قط) عن ابی ھریرۃ (الفتح للنبھانی ج ۲ ص ۹۰) [2] و صدرہٗ فاسقینھا یا سواد بن عمرو والبیت فی قصیدۃ حماسیۃ لتابط شرا فی رثاء خالہ بعد ان اخذ بثارہ و مطلعھا ان بالشعب الذی دون سلع۔ لقتیلاً دمہ ما یطل۔ و فی نسبتہ اختلاف کبیر نسبہ ابو تمام فی الحماسۃ لتأبط شرا (۲: ۳۱۳ - ۳۱۹) المرزوقی۔ والتبریزی الی خلف الاحمر (۲: ۹۰) و طبقات الشعراء لابن سلام ۹۷ وبعضھم الی ابن اخت تابط شرا ھم اختلف فی ابن اختہ فقیل الشنفری کما فی الاغانی (۵: ۱۶۲) و امالی المرتضی (۲: ۱۸۵ و ذیلہ ۱: ۲۸۰) واللسان (خلل) اقال فی السمط ۹۲۰ قولہ بعد خالی یرید اختیالی و قیل اراد بعد قتل خالی و فی امالی القالی (۲: ۲۷۸) الخل الرجل النحیف الجسم وعدہ العلامۃ من الاضداد ۱۲

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اسی معنی میں کہا گیا ہے:[1] (۱۸)

اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْکَ۔ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْکَ۔ اے اللہ مجھے اپنی احتیاج کے ساتھ غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کرکے کسی دوسرے کا محتاج نہ بنا۔

بعض نے کہا ہے کہ خَلِیْلٌ خُلَّہ سے ہے اور اللہ کے حق میں خُلَّۃٌ کے لفظ کے وہی معنی ہیں جو لفظ محبت کے ہیں۔ ابو القاسم البلخی کا کہنا ہے[2] کہ یہ خَلَّۃٌ (احتیاج) سے ہے اور خُلَّۃٌ (دوستی) سے نہیں ہے۔ جو لوگ اسے حبیب پر قیاس کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی بندے سے محبت کرنا تو جائز ہے اس لئے کہ محبت اس کی ثنا میں داخل ہے۔ لیکن خُلَّۃٌ (دوستی) جائز نہیں ہے کیونکہ خُلَّۃ کے معنی دوستی کے دل میں سرایت کر جانے کے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3] ع ()

(۱۳۱) قَدْ تَخَلَّلْتَ مَسْلَکَ الرُّوْحِ مِنِّیْ
وَبِہٖ سُمِّیَ الْخَلِیْلُ خَلِیْلًا

تم میرے لئے بمنزلہ روح کے ہو اور اسی سبب سے خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے اسی بنا پر مشہور محاورہ ہے۔ تَمَازَجَ رُوْحَانَا۔ ہماری روحیں باہم مخلوط ہیں۔

اور محبت کے معنی حبۂ قلب میں دوستی رچ جانے کے ہیں۔ یہ حَبَبْتُہٗ سے مشتق ہے جس کے معنی حبۂ پر مارنے کے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے متعلق محبت کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد احسان اور مہربانی کے ہوتے ہیں لہٰذا یہی معنی خُلَّۃ سے مراد ہوں گے۔ کیونکہ اگر ایک میں یہ تاویل صحیح ہے تو دوسرے میں بھی ہو سکتی ہے۔ مگر حُبٌّ سے حَبَّۃُ الْقَلْبِ مراد لینا اور خُلَّۃ سے اللہ تعالیٰ کے حق میں تخلل کا معنی لینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ ان باتوں سے بلند ہے[4]۔ اور آیت کریمہ:۔

لَا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ (۲-۲۵۴) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئے گی۔ کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے دن نہ تو حسنات کی خرید و فروخت ہوگی اور نہ ہی یہ مودت کے ذریعہ حاصل ہو سکیں گی تو گویا یہ آیت:۔

وَاَنْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

لَا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلَالٌ (۱۴-۳۱) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئیگی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ خِلَال باب مفاعلہ سے مصدر ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ خلیل کی جمع ہے۔ کیونکہ اس کی جمع اَخِلَّۃٌ وَخِلَالٌ دونوں آتی ہیں اور یہ پہلی آیت کے ہم معنی ہے۔

(خ ل د)

اَلْخُلُوْدُ (ن) کے معنی کسی چیز کے فساد کے عارضہ سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم

---

[1] ...
[2] راجع لاحالہ فی (ذور) [3] قالہ بشار بن برد۔ الاعمیٰ والبیت فی ادب الدنیا والدین للماوردی۔ ۲۹۰ والبحر (۳: ۳۴۸) ومحاضرات المیلف (۲: ۱۳) [4] قال البغدادی فی لباب التاویل (۱: ۵۰۲) وخلۃ اللہ للعبد ہی تمکینہ من طاعتہ وعصمتہ وتوفیقہ وستر خللہ ونصرہ والثناء علیہ ۱۲

رہنے کے ہیں۔ اور جب کسی چیز میں عرصہ دراز تک تغیر وفساد پیدا نہ ہو اہل عرب اسے خلود کے ساتھ متصف کر دیتے ہیں۔ مثلاً چولھے کے ان تین پتھروں کو جن پر دیگ چڑھائی جاتی ہے۔ "خَوَالِدُ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دیر تک ایک جگہ پڑے رہتے ہیں نہ اس لئے کہ ان کو دوام بقا حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے:۔

خَلَدَ يَخْلُدُ خُلُوْدًا عرصہ دراز تک رہنا

قرآن میں ہے:۔

لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶-۱۲۹) شاید تم ہمیشہ رہو گے۔ اور خَلَدٌ انسان کے اس حصہ کو کہا جاتا ہے جو تا زندگی ایک حالت پر قائم رہتا ہے اور دوسرے اعضاء کی طرح اس میں تغیر نہیں ہوتا۔

اصل میں مُخَلَّدٌ اسے کہتے ہیں جو عرصہ دراز تک باقی رہے اس بنا پر جس شخص میں باوجود بڑی عمر کے بڑھاپا نہ آئے اسے "مُخَلَّدٌ" کہا جاتا ہے۔ اور جس جانور کے (رباعی) دانت نکلنے تک ثنایا دانت قائم رہیں اسے مُخَلَّدَةٌ کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ ہمیشہ رہنے والی چیز کے متعلق خلود کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

جنت میں خلود کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن میں ہے:۔

أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۱-۲۳) یہی صاحب جنت ہیں ہمیشہ اسمیں رہیں گے۔

أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲-۸۱) تو ایسے لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں۔ (اور) وہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا (۴-۹۳) اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔ تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا۔ اور آیت کریمہ:۔

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (۵۶-۱۷) نوجوان خدمت گار جو ہمیشہ (ایک ہی حالت میں) رہیں گے ان کے آس پاس پھریں گے۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ علیٰ حالہ قائم رہیں گے اور ان کی حالت تبدیل نہیں ہوگی اور بعض نے اس کے معنی مُقَرَّطُوْنَ بِالْخِلَدَةِ کئے ہیں یعنی بالیاں پہنے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ خَلَدَةٌ ایک قسم کی بالی کو کہتے ہیں۔

اَلْإِخْلَادُ کے معنی کسی چیز کو باقی رکھنے یا اس پر بقا کا حکم لگانے کے ہیں اسی معنی میں فرمایا:۔

وَلٰكِنَّهٗ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ (۷-۱۷۶) یعنی زمین کی طرف مائل ہوگیا یہ خیال کرکے کہ وہ اس پر ہمیشہ رہیگا۔

(خ ل ص)

اَلْخَالِصُ (خالص) اور اَلصَّافِيْ دونوں مترادف ہیں مگر الصافی کبھی ایسی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں جس میں پہلے ہی سے آمیزش نہ ہو اور خالص اسے کہتے ہیں جس میں پہلے آمیزش ہو مگر اس سے صاف کر لیا گیا ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

خَلَّصْتُهٗ فَخَلَصَ میں نے اسے صاف کیا تو وہ صاف ہوگیا اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[1] ( )

(۱۴۴) خُلَاصَ الْخَمْرِ مِنْ نَسْجِ الْفِدَامِ

جیسے شراب صافی سے صاف ہو کر نکل آتی ہے

[1] قال المتنبی یصف حمی نالتہ بمصر فی ذی الحجۃ سنۃ ثمان واربعین وثلاث مائۃ فی قصیدۃ ۱۴ بیتہ وصدرہ: وضاقت خطۃ فخلصت منہا
راجع دیوانہ ۲۷۷ ہندیہ بمصر ۱۹۲۳ء

قرآن میں ہے :۔

وَ قَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا (۶-۱۳۹) اور یہ بھی کہتے ہیں جو بچہ ان چارپایوں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے۔

محاورہ میں هٰذَا خَالِصٌ وَخَالِصَةٌ (مذکر ومونث) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جیسے دَاهِيَةٌ وَدَاهِيَةٌ اور آیت کریمہ :۔

فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا (۱۲-۸۰) جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔

میں خَلَصُوْا کے معنی دوسروں سے الگ ہونا کے ہیں اور آیت کریمہ :۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (۲-۱۳۹) اور ہم خالص اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲-۲۴) بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے۔

میں مخلص بندہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہ تو یہود کی طرح تشبیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح تثلیث کے قائل تھے چنانچہ تثلیث کے متعلق فرمایا :۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے اور مسلمانوں کے متعلق فرمایا۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۹۸-۵) کہ اخلاص کیساتھ۔

وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ (۴-۱۴۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہو گئے۔

نیز موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا :۔

اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔ (۱۹-۵۱) بے شک وہ (ہمارے) برگزیدہ اور پیغمبر مرسل تھے۔

اور حقیقتاً اخلاص ماسوی اللہ سے بیزار ہونیکا نام ہے۔

(خ ل ط)

اَلْخَلْطُ (ن) کے معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے اجزا کو جمع کرنے اور ملا دینے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ چیزیں سیال ہوں یا جامد یا ایک مائع ہو اور دوسری جامد اور یہ مَزْجٌ سے اعم ہے کہا جاتا ہے اِخْتَلَطَ الشَّيْءُ (کسی چیز کا دوسری کے ساتھ مل جانا) قرآن میں ہے :۔

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ (۱۰-۲۴) پھر اس کے ساتھ سبزہ ...... مل کر نکلا۔

خَلِيْطٌ کے معنی دوست پڑوسی یا کاروبار میں شریک کے ہیں۔ اسی سے کتب فقہ میں خلیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا مال اکٹھا ہو۔ قرآن میں ہے :۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۳۸-۲۴) اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔

اور خَلِيْطٌ کا لفظ واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

(۱۴۳) بَانَ الْخَلِيْطُ وَلَمْ يَأْوُوْا لِمَنْ تَرَكُوْا

ساتھی جدا ہو گئے اور انہوں نے جن کو چھوڑا ان پر رحم نہ کھایا۔

قرآن میں ہے :۔ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا (۹-۱۰۲) انہوں نے اچھے اور برے عملوں

---

(۱) قالہ زہیر فی مطلع قصیدۃ فی ۲۳ بیتًا وتمامہ : وزودوک اشتیاقا ایۃ سلکوا والبیت فی النقائض ۱۶۹ ودیوانہ والعقد الثمین ۸۶-۲۸۴

کو ملا جلا دیا تھا۔
یعنی نیک اور بد دونوں قسم کے عمل کرتے رہے
محاورہ ہے:۔
اَخْلَطَ فُلَانٌ فِیْ کَلَامِہٖ (فلاں نے بکواس کی)
اَخْلَطَ الْفَرَسُ فِیْ جَرْیِہٖ۔ گھوڑے کا دوڑنے میں کوتاہی کرنا۔

(خ ل ع)

اَلْخَلْعُ اس کے معنی اتار دینے کے ہیں اور یہ انسان کا اپنے کپڑے وغیرہ اور گھوڑے کا جھول اور پوزی وغیرہ اتارنے پر بولا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ (۲۰-۱۲) تو اپنی جوتیاں اتار دو۔
بعض نے کہا ہے کہ یہاں لفظی معنی مراد ہیں اور انہیں جوتا اتارنے کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ مردار گدھے کے چمڑے سے بنا ہوا تھا بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ یہ دراصل تمثیل ہے کہ یہاں اطمینان سے اقامت پذیر ہو جاؤ جیسا کہ جب کسی کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ یہاں جم کر بیٹھ جاؤ تو اس کے لئے اِنْزَعْ ثَوْبَكَ اَوْ خُفَّكَ وغیرہ محاورات استعمال کئے جاتے ہیں کبھی اس کا صلہ عَلٰی لاکر اس سے بخشش کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ جیسے
خَلَعَ فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ فلاں نے اسے خلعت دی یاد رہے کہ عَلٰی (صلہ) کی وجہ سے عطا کے معنی مفہوم ہوتے ہیں ورنہ اس کے بغیر یہ معنی صحیح نہیں ہوتے۔

(خ ل ف)

خَلْفٌ (پیچھے) یہ قدام کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے۔
یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۲-۲۵۵) جو کچھ ان کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔
لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ (۱۳-۱۱) اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں۔
فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً (۱۰-۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لئے عبرت ہو۔
اور خَلَفَ کے معنی پیچھے رہ جانے اور کسی کا جانشین ہونے کے ہیں یہ تَقَدَّمَ اور سَلَفَ کی ضد ہے اور جو مرتبہ میں گرا ہوا ہو اسے بھی خَلْفٌ کہا جاتا ہے اسی بنا پر ردی چیز کو خَلْفٌ کہتے ہیں اور خلف کے معنی متأخر اور جانشین کے بھی آتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (۷-۱۶۹) پھر ان کے بعد ناخلف ان کے قائم مقام ہوئے۔
امثال عرب میں ہے[1] (مثل)
سَكَتَ اَلْفًا وَنَطَقَ خَلْفًا کہ وہ ہزار باتوں سے خاموش رہا اور آخر بات کی تو بے ہودہ اور ردی۔
خُلْفَةٌ مسرین جب اس سے گوز نکل جائے کم عقل جو بے ہودہ بات کرے۔
تَخَلَّفَ فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ کسی سے پیچھے رہ جانا کسی کا جانشین ہونا۔ اس کا مصدر خِلَافَةٌ ہے جس کے معنی جانشینی کے ہیں مگر خَلَافَةٌ (بفتحہ الخاء) کے معنی کم عقل ہونے کے ہیں اور کم عقل آدمی کو خَالِفٌ کہا جاتا ہے۔
اور کبھی خَلْفٌ سے ناخلف بھی مراد ہوتا ہے۔

---

[1] المثل فی المیدانی رقم ۱۷۷۲ و فی الاشتقاق ۱۳۷ و فی جل المعاجم ۱۲

جیسے فرمایا :۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ

پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو چھوڑ دیا گو اسے (کھو دیا) (۱۹-۵۹)

اور جو کسی کا جانشین اور قائم مقام ہو اسے خَلَفٌ (بفتح اللام) کہا جاتا ہے۔ خِلْفَۃٌ ایک کا دوسرے کے بعد آنا قائم مقام ہونا قرآن میں ہے :۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً (۲۵-۶۲)

اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔

کہا جاتا ہے :۔

اَمْرُهُمْ خِلْفَةٌ یعنی ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۱۴۴) بِهَا الْعِیْنُ وَالْاٰرَامُ یَمْشِیْنَ خِلْفَةً

اس میں گاؤ دشتی اور ہرنیاں ایک دوسرے کے پیچھے چلتی ہیں۔

اَصَابَتْهُ خِلْفَةٌ : پیچش لگ جانا۔

خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا۔ وہ اس کا جانشین ہوا خواہ اس کی موجودگی میں ہو یا بعد میں۔ قرآن میں ہے :۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ (۴۳-۶۰) اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتے بنا دیتے جو تمہاری جگہ زمین میں رہتے۔

اَلْخِلَافَةُ کے معنی دوسرے کا نائب بننے کے ہیں۔ خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب ہو اور یا اس کے عجز کے سبب سے ہو اور یا محض نائب کو شرف بخشنے کی غرض سے ہو اس آخری معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے چنانچہ فرمایا :۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (۶-۱۶۵)

اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (۳۵-۳۹) وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا۔

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۱۱-۵۷)

اور میرا پروردگار تمہاری جگہ اور لوگوں کو لابسائیگا۔

اَلْخَلَائِفُ کا واحد خَلِيْفَةٌ ہے اور خُلَفَاءُ کا خَلِيْفٌ قرآن میں ہے :۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ (۳۸-۲۶)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ (۱۰-۷۳) اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷-۶۹)

جب اس نے تم کو قوم نوح کے بعد سردار بنایا۔

اَلْاِخْتِلَافُ وَالْمُخَالَفَةُ کے معنی کسی حالت یا قول میں ایک دوسرے کے خلاف طریق کار اختیار کرنے کے ہیں۔ اور خِلَافٌ کا لفظ ان دونوں سے اعم ہے کیونکہ ضدین کا مختلف ہونا تو

---

[1] قالہ زہیر فی معلقتہ وتمامہ - واطلاؤہا ینہضن من کل مجثم والبیت فی دیوانہ ۵ وشرح القصائد العشر للتبریزی ۱۰۱ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۵۱) وتفسیر الطبری (۲: ۱۹/۶۳ : ۳۲) واللسان (خلف طلی) والاقتضاب ۱۶۱ ومحاضرات المؤلف (۴: ۴۴۳) والجمہرۃ ۵۰ وغریب القرآن ۳۱۴ والمعانی الکبیر ۶۹۹ والقرطبی (۲: ۶۵) ومجاز القرآن (۲: ۸۰) والعقد الثمین ۹۴ وایام العرب ۲۷۱ وشرح المعلقات لابن الانباری ۲۳۹۰۷۱ والسیوطی ۲۵۵

ضروری ہوتا ہے مگر مختلفین کا ضدین ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر لوگوں کا باہم کسی بات میں اختلاف کرنا عموماً نزاع کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے استعارۃً اختلاف کا لفظ نزاع اور جدال کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ (۴۳-۶۵) پھر کتنے فرقے۔۔۔۔ پھٹ گئے۔

وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ (۱۱-۱۱۸) لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ (۳۰-۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ۵ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۷۸-۳) (یہ لوگ) کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں؟ (کیا) بڑی خبر کی نسبت؟ جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔

اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (۵۱-۸) (اے اہل مکہ) تم ایک متناقض بات میں (پڑے ہوئے) ہو۔

مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ (۱۶-۶۹) جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ (۳-۱۰۵) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور احکام بین کے آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف) اختلاف کرنے لگے۔

فَهَدَی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (۲-۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھا دی۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰-۱۹) اور (سب) لوگ (پہلے) ایک ہی امت (یعنی ایک ہی دین پر) تھے۔ پھر جدا جدا ہو گئے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ (۱۰-۹۳) اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کی بڑی عمدہ جگہ دی اور کھانے کو پاکیزہ چیزیں عطا کیں۔ لیکن وہ باوجود علم حاصل ہونے کے اختلاف کرتے رہے۔ بے شک جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان میں ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا۔

اور قیامت کے دن کے متعلق فرمایا:۔

وَلَیُبَیِّنَنَّ لَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۱۶-۹۲) اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا۔

لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ (۱۶-۳۹) تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ (۲-۱۷۶)۔ اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا۔ میں بعض نے اِخْتَلَفُوْا بمعنی خَلَفُوْا کیا ہے۔ جیسے کَسَبَ وَاکْتَسَبَ اور بعض نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے خلاف اس میں ردوبدل کر دیا۔ اور آیت کریمہ:۔

لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ (۸-۴۲) تو وقت معین (پر جمع ہونے) میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی۔

میں اِخْتَلَفْتُمْ کا لفظ خلاف سے بھی ہو سکتا
ہے اور خُلْفٌ سے بھی۔ نیز فرمایا:
وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى
اللّٰهِ (۴۲-۱۰) اور تم جس بات میں اختلاف کرتے
ہو اس کا فیصلہ خدا کی طرف (رجوع ہوگا)
فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ
(۳-۵۵) تو جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے
.... ان کا فیصلہ کر دوں گا۔ اور آیت کریمہ:
اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (۱۰-۶) رات
اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں۔
میں اختلاف سے انکا یکے بعد دیگرے آنا مراد ہے۔
اَلْخُلْفُ۔ کے معنی وعدہ شکنی کے ہیں محاورہ ہے:
وَعَدَنِيْ فَاَخْلَفَنِيْ۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا مگر
اسے پورا نہ کیا۔ قرآن میں ہے۔
بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ (۹-۷۷) کہ انہوں
نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اسکے خلاف کیا۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳-۹) بیشک
خدا خلاف وعدہ نہیں کرتا۔
فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا
مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا (۲۰-۸۶، ۸۷) تم نے
مجھ سے وعدہ کیا تھا (اس کے) خلاف کیا۔ وہ کہنے
لگے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلافی نہیں کی۔
اَخْلَفْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو وعدہ خلاف پایا۔
اَلْاِخْلَافُ۔ ایک دوسرے کے بعد پانی پلانا۔
اَخْلَفَ الشَّجَرُ پت جھڑ کے بعد درخت کا
دوبارہ سرسبز ہونا۔
اَخْلَفَ اللّٰهُ عَلَيْكَ اللہ تعالیٰ تجھے ضائع
شدہ چیز کا نعم البدل عطا فرمائے۔
خَلَفَ اللّٰهُ عَلَيْكَ۔ اللہ کی جانب سے تیرا
خلیفہ ہو۔ اور آیت کریمہ:۔
لَا يَلْبَثُوْنَ خَلْفَكَ (۱۷-۷۶) تمہارے
پیچھے یہ بھی نہ رہتے۔
میں خلف کے معنی بعد کے ہیں ایک قراءت
میں خِلَافَكَ ہے یعنی تیری مخالفت کرکے۔
اور آیت کریمہ:۔
اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ
(۵-۳۳) یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ
اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دئیے جائیں۔
یعنی ایک سیدھی جانب سے اور دوسرا الٹی
جانب سے۔ خَلَّفْتُهٗ۔ میں نے اسے پیچھے
چھوڑا۔ قرآن میں ہے:۔
فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ
رَسُوْلِ اللّٰهِ (۹-۸۱) جو لوگ (غزوہ تبوک
میں) پیچھے رہ گئے وہ پیغمبر خدا کی (مرضی) کے
خلاف بیٹھ رہنے سے خوش ہوئے... یعنی پیغمبر
خدا کے مخالف ہوکر۔
وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا (۹-۱۱۸)
اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔
قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ (۴۸-۱۶)...... جو......
پیچھے رہ گئے تھے ان سے کہدو۔
اَلْخَالِفُ۔ نقصان یا کوتاہی کی وجہ سے پیچھے
رہنے والا اور یہی معنی مُتَخَلِّفٌ کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ (۹-۸۳) پیچھے
رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔
اَلْخَالِفَةُ۔ خیمے کا پچھلا ستون بطور کنایہ اس
سے مراد عورت لی جاتی ہے کیونکہ یہ مجاہدین سے
پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اس کی جمع خَوَالِفُ ہے

قرآن میں ہے:۔
رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ (۹-۸۷) یہ اس بات سے خوش ہیں کہ عورتوں کے ساتھ جو پیچھے رہ جاتی ہیں (گھروں میں) بیٹھ رہیں۔
وَجَدْتُ الْحَیَّ خُلُوْفًا یعنی مرد گئے ہوئے ہیں صرف عورتیں موجود ہیں[1]۔
اَلْخَلْفُ وَ اَیْضًا۔ کلہاڑی کی دھار۔ پہلو کی سب سے چھوٹی پسلی جو پیٹ کے جانب سب سے آخری ہوتی ہے۔ اَلْخِلَافُ۔ بید کی قسم کا ایک درخت کیونکہ وہ امید کے خلاف اگتا ہے۔ یا اس کا باطن ظاہر کے خلاف ہوتا ہے:۔
مُخْلِفُ عَامٍ اَوْ عَامَیْنِ۔ شتر کہ از نہ سالگی یک یا دو سال درگذشتہ باشد۔ اَلْخِلِّیْفٰی۔ خلافت۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے[2] (۸ ۱۱)
لَوْلَا الْخِلِّیْفٰی لَاَذَّنْتُ۔ اگر بار خلافت نہ ہوتا تو میں خود ہی اذان دیا کرتا (اذان کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے)

(خ ل ق)

اَلْخَلْقُ۔ اصل میں خلق کے معنی (کسی چیز کو بنانے کے لئے) پوری طرح اندازہ لگانا کے ہیں۔ اور کبھی خلق بمعنی ابداع بھی آجاتا ہے یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے اور بغیر کسی کی تقلید کے پیدا کرنا چنانچہ آیت کریمہ:۔
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۱۶-۳) اسی نے آسمانوں اور زمین کو مبنی برحکمت پیدا کیا۔ میں خلق بمعنی ابداع ہی ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اسی کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲-۱۱۷) سے تعبیر کیا ہے۔ نیز ایک چیز کو دوسری شے سے بنانے اور ایجاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ۔ (۴-۱) تم کو ایک شخص سے پیدا کیا۔
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ (۱۶-۴) اسی نے انسان کو نطفے سے بنایا۔
خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ (۲۳-۱۲) ہم نے انسان کو خلاصے سے پیدا کیا۔
وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ (۷-۱۱) اور ہمیں نے تم کو (ابتداء میں مٹی سے) پیدا کیا۔
خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ۔ (۵۵-۱۵) اور جنات کو ... شعلے سے پیدا کیا۔
خیال رہے کہ خلق بمعنی ابداع ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ ذات باری تعالیٰ اور دوسروں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔
اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ۔ (۱۶-۱۷) تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کرسکے۔ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔
البتہ خلق جو بصورت استحالہ کے ہوتا ہے بعض اوقات ذات باری تعالیٰ دوسروں کو بھی اس کا

---

[1] ومنہ حدیث المرءۃ والمزادتین: والحی خلوف ای رجالنا غُیَّبٌ (النہایہ خلف)، [2] و فی الفائق (۱: ۱۸۲) ولفظہ لو اطیق الاذان مع الخلیفٰی لاذّنت وھو مصدر ومعناہ کثرۃ جھدہ فی ضبط امور الخلافۃ وتصریف اعنتھا کذا فی النہایہ (خلف) ولفظہ لو اطقت قال وھو مصدر مثل الرمّیّا والدلیلا وفی غریب ابی عبید (۳: ۳۱۹) اسم علی وزن ہِجِّیرا ومعناہ الخلافۃ و امثالہ سعد ودۃ ۱۲

اختیار دے دیتی ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرکے فرمائیں گے:۔
إِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ (۵-۱۱۰)
اور جب تم میرے حکم سے مٹی کا جانور بنا کر۔
اور عام لوگوں کے لئے خلق کا لفظ صرف دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) اندازہ کرنا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ع (الکامل)
(۵۴) وَلَأَنْتَ تَفْرِي مَا خَلَقْتَ ۔ وَبَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِي
تم جو سوچتے ہو کر گزرتے ہو۔ اور بعض لوگ تجاویز کرتے رہتے ہیں مگر انہیں عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ (۲) جھوٹ بولنے کے معنی میں فرمایا:۔
وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا (۲۹-۱۷) اور طوفان باندھتے ہو۔
اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت کریمہ:۔
فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (۲۳-۱۴)
تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ بڑا بابرکت ہے۔
سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق کے ساتھ خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے بھی متصف ہوسکتے ہیں، تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ بمعنی أَحْسَنُ الْمُقَدِّرِينَ ہے یعنی اللہ تعالیٰ سب سے بہتر اندازہ کرنے والا ہے (اور خلق بمعنی تقدیر دوسروں کی صفت بھی آجاتا ہے)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ پر أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ کا اطلاق کفار کے اعتقاد کے اعتبار سے ہے۔ ان کا زعم یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے بھی پیدا کرتے ہیں تو پھر بھی ذات باری تعالیٰ ان کے اعتقاد کے بموجب ان سب سے بہتر پیدا کرنے والی ٹھہری جیسے فرمایا:۔
خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ (۱۳-۱۶) کیا انہوں نے خدا کی سی مخلوقات پیدا کی ہے جس کے سبب ان پر مخلوقات مشتبہ ہوگئی ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ (۴-۱۱۹) اور (یہ بھی) کہتا رہوں گا کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلتے رہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ خَلْقُ اللَّهِ کی تغییر سے مراد خصا (یعنی خصی ہونا) اور نتف اللحیۃ (ڈاڑھی کے بال اکھاڑنا) وغیرہ کے ذریعہ (فطرتی صلاحیتوں اور) صورتوں کو تبدیل کرنا مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ احکام الٰہی میں تحریف و تبدیل کرنا مراد ہے[2] (اس صورت میں خلق اللہ سے مراد دین الٰہی ہوگا) اور آیت کریمہ:۔
لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ (۳۰-۳۰) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔

---

[1] البیت لزہیر بن ابی سلمیٰ من قصیدۃ یمدح ہرمانی ۲۱ بیتا راجع دیوانہ ۹۴ والحقد الثمین ۸۲ والمعانی للقتبی ۱/۳۲۱، ۵۳۹ والاضداد لابن السکیت ۲۰۵ والاصمعی ۵۵ وابن الانباری ۱۵۹ وابی الطیب ۲۶۱ وشرح شواہد الشافیہ ۲۳۹ والکتاب (۲: ۲۸۹) و... مقاییس اللغۃ (۲: ۲۱۴) والحیوان (۳: ۳۸۳) واللسان (خلق فری) والطبری (۱۸: ۹) والبحر المحیط (۱: ۹۳، ۲/۴۶۵، ۶: ۳۹۸) والمشکل للقتبی ۳۸۸ والصناعتین (۴۴، ۳۸۷) وفیہ فاورا کب بدل ولانت وفی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۹۰) فلا بدل ولا والبیت ایضا فی ثلاثین لابن خالویہ ۵۴ ۔
[2] ولکلا القولین محمل وکل منہی منقول عن السلف راجع ابن کثیر ۱: ۵۵۶ ومعالم التنزیل للبغوی ۱/ ۴۹۹ ۔

میں بعض نے "خَلْقُ اللہِ" سے قضاء و قدر الٰہی
مراد لی ہے اور بعض نے تغییر خلقت یعنی شکل
وصورت کا بدلنا مراد لیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ (۲۶-۱۶۶)
اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لیے
(بیبیاں) پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو۔
میں "مَا خَلَقَ" سے کنایۃً عورتوں کی شرمگاہیں
مراد ہیں۔

اور وہ ہر مقام جہاں خلق کا لفظ کلام کے
متعلق استعمال ہوا ہے۔ اس سے جھوٹ ہی
مراد ہے۔ اس بنا پر اکثر لوگ قرآن کے تعلق
خلق کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ
اسی معنی میں فرمایا:۔
اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (۲۶-۱۳۷)
یہ تو اگلوں کے ہی طریق ہیں اور ایک قراءت میں
اِنْ هٰذَآ اِلَّا خَلْقُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۶-۱۳۷)
بھی ہے یعنی یہ تو پہلے لوگوں کی ایجاد و اختراع ہے۔
مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ
هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ۔ (۳۸-۷) یہ پچھلے مذہب
میں ہم نے کبھی سنی ہی نہیں۔ یہ بالکل بنائی
ہوئی بات ہے۔

خَلْقٌ۔ کا لفظ مخلوق کے معنی میں بھی استعمال
ہوتا ہے۔ خَلْقٌ اور خُلُقٌ اصل میں دونوں
ایک ہی ہیں جیسے شَرْبٌ وَشُرْبٌ وصَرْمٌ
وَصُرْمٌ مگر ان میں اتنا فرق ہے کہ خَلْق بمعنی
خلقت یعنی اس شکل وصورت پر بولا جاتا ہے
جس کا تعلق ادراک بصر سے ہوتا ہے اور خُلُق
کا لفظ قوی باطنہ اور عادات وخصائل کے معنی
میں استعمال ہوتا ہے جن کا تعلق بصیرت سے ہے[1]
قرآن میں ہے:۔
وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (۶۸-۴) اور اخلاق
تمہارے بہت (عالی) ہیں۔

اَلْخَلَاقُ۔ وہ فضیلت جو انسان اپنے اخلاق
سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲-۲۰۰)
ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔

فُلَانٌ خَلِيْقٌ بِكَذَا۔ فلاں اس کا اہل ہے
گویا وہ خوبی اس میں پیدا کی گئی ہے جیسا کہ فُلَانٌ
مَجْبُوْلٌ عَلٰى كَذَا اَوْ مَدْعُوٌّ اِلَيْهِ مِنْ جِهَةِ
الْخُلُقِ کا محاورہ ہے۔

خَلَقَ الثَّوْبُ وَاَخْلَقَ کپڑے کا پرانا ہو جانا
اور پرانے کپڑے کو خَلَقٌ وَمُخْلَقٌ وَاَخْلَاقٌ
کہا جاتا ہے جیسا کہ حَبْلٌ اَرْمَامٌ وَاَرْمَاثٌ
کا محاورہ ہے اور کپڑے کے پرانا ہونے سے
ملائم اور چکنا ہونے کا معنی لیا جاتا ہے چنانچہ کہا
جاتا ہے:۔
جَبَلٌ اَخْلَقُ وَصَخْرَةٌ خَلْقَاءُ (چکنا پہاڑ
یا چکنا پتھر)

خَلَّقْتُ الثَّوْبَ۔ میں نے کپڑے کو پرانا کیا
اِخْلَوْلَقَ السَّحَابُ (اَنْ تُمْطِرَ) امید
ہے کہ بارش ہوگی۔
یہ یا تو خَلَّقْتُ الثَّوْبَ سے ماخوذ ہے اور
یا هُوَ خَلِيْقٌ بِكَذَا کے محاورہ
سے لیا گیا ہے۔

اَلْخَلُوْقُ۔ ایک قسم کا خوشبو۔

---

[1] و العلماء دونوا الاخلاق علی حدۃ وصنفوا فیہا الکتب ومنہا تہذیب الاخلاق لیحیی بن عدی وکتب الامام الغزالی انفع للشریعۃ فی ہذا الباب۔

(خ ل و)

اَلْخَلَاءُ۔ خالی جگہ جہاں عمارت و مکان وغیرہ نہ ہو اور اَلْخُلُوُّ کا لفظ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ میں مُضِیٌّ (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت خَلَا الزَّمَانُ کے معنی زمانہ گذر گیا کر لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (٣-١٤٤) اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں۔

وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ (١٣-٦) حالانکہ ان سے پہلے عذاب (واقع) ہو چکے ہیں۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (٢-١٣٤) یہ جماعت گذر چکی۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ (٣-١٣٧) تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گذر چکے ہیں۔

اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (٣٥-٢٤) مگر اس میں ہدایت کرنے والا گذر چکا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (٢-٢١٤) ..... تم کو پہلے لوگوں کی سی۔

وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (٣-١١٩) اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ (١٢-٩) پھر ابا کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔ کے معنی یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے رہ جائے گی۔

خَلَا الْاِنْسَانُ۔ تنہا ہونا۔ خَلَا فُلَانٌ بِفُلَانٍ کسی کے ساتھ تنہا ہونا۔

خَلَا اِلَيْهِ کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ (٢-١٤) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔

خَلَّيْتُ فُلَانًا کے اصل معنی کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ فرمایا:۔

فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (٩-٥) تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

نَاقَةٌ خَلِيَّةٌ۔ اونٹنی کو دودھ دوہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔ اِمْرَأَةٌ خَلِيَّةٌ مطلقہ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد چھوڑ دی گئی ہو اور جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی ہو اسے بھی خَلِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَلِيُّ جو غم سے خالی ہو۔ جیسا کہ مُطَلَّقَةٌ کا لفظ سکون و اطمینان کے معنی میں آجاتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے[1] (طویل)

(١٤٦) تُطَلِّقُهُ طَوْرًا وَطَوْرًا تُرَاجِعُ

میں (کبھی) اسے سکون ہو جاتا ہے اور کبھی وہ درد عود کر آتی ہے (اس میں تطلقہ کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

اَلْخَلَاءُ۔ خشک گھاس۔ کہا جاتا ہے:۔

خَلَيْتُ الْخَلَاءَ۔ میں نے خشک گھاس کاٹی۔

---

[1] قالہ النابغۃ الذبیانی وصدرہ: تناذرہا الراقون من سوء سمہا۔ وفی المطبوع مطلقۃ محرف والبیت فی اللسان (طلق، قدر) والکامل ۲ ۸۵ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۸۲) والبحر (۵: ۲۲۴) والعمدۃ (۱: ۲۳۸) والمخصص (۹: ۶۵) ودیوانہ ۵۲ والحیوان (۴: ۲۴۸) والعقد الثمین ۱۹

خَلَیْتُ الدَّابَّةَ۔ جانور کو خشک گھاس ڈالی۔
سَیْفٌ مُخْتَلٍ۔ تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

(خ م د)

خَمَدَتِ (ن) النَّارُ۔ آگ کے شعلوں کا ساکن ہو جانا (جب کہ اس کا انگارہ نہ بجھا ہو) اور اسی سے بطور استعارہ خَمَدَتِ الْحُمّٰی کا محاورہ ہے جس کے معنی بخار کا جوش کم ہو جانے کے ہیں۔ اور کبھی بطور کنایہ خُمُوْدٌ بمعنی موت بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خَامِدِیْنَ (۲۱-۱۵) ہم نے ان کو (کھیتی کی طرح) کاٹ کر (آگ کی طرح) بجھا کر ڈھیر کر دیا۔
فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ (۳۶-۲۹) سو وہ اسی سے ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔

(خ م ر)

اَلْخَمْرُ (ن) اصل میں خَمْرٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اسی طرح خِمَارٌ اصل میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی چیز چھپائی جائے مگر عرف میں خِمَارٌ کا لفظ صرف عورت کی اوڑھنی پر بولا جاتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنے سر کو چھپاتی ہے۔ اس کی جمع خُمُرٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ (۲۴-۳۱) اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔

کہا جاتا ہے:۔
اِخْتَمَرَتِ الْمَرْاَةُ وَتَخَمَّرَتْ عورت نے سر پر اوڑھنی ڈال لی۔
خَمَّرْتُ الْاِنَاءَ۔ میں نے برتن ڈھانپ دیا۔ ایک روایت میں ہے[1] (۱۲۱)
خَمِّرُوْا اٰنِیَتَکُمْ۔ کھانے کے برتن ڈھانپ کر رکھا کرو۔
اَخْمَرْتُ الْعَجِیْنَ۔ گوندھے ہوئے آٹے میں خمیر ملانا اور خَمِیْرَةٌ کو خمیر اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ پہلے مَخْمُوْرٌ ہوتا ہے
دَخَلَ فِیْ خِمَارِ النَّاسِ۔ لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو کر چھپ گیا۔
اَلْخَمْرُ۔ شراب۔ نشہ۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے بعض لوگوں کے نزدیک ہر نشہ آور چیز پر خمر کا لفظ بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک صرف اسی چیز کو خمر کہا جاتا ہے۔ جو انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے[2] (۱۲۲)
اَلْخَمْرُ مِنْ هَاتَیْنِ الشَّجَرَتَیْنِ النَّخْلَةِ وَالْعِنَبَةِ (کہ خمر (شراب حرام) صرف وہی ہے جو ان دو درختوں یعنی انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ "خمر" صرف غیر مطبوخ یعنی اسی کو کہتے ہیں جو پکائی نہ گئی ہو۔ پھر اس بارے میں فقہاء مختلف ہیں کہ کس حد تک پکانے کے بعد اس پر خمر کا اطلاق نہیں ہوتا۔
اَلْخُمَارُ۔ بیماری جو شراب نوشی سے لگ جاتی ہے یہ بھی زُکَامٌ اور سُعَالٌ کی طرح

---

[1] وتمامہ واوتوا اسقیتکم واجیفوا ابوابکم واطفئوا مصابیحکم واکفتوا ابناءکم الخ الحدیث فی الفائق (۱: ۱۸۴)
[2] رواہ الدارمی (۲-۳۸) من حدیث ابی ہریرۃ والحدیث فی مسلم والاربعہ واحمد فی مسندہ

فُعَالٌ کے وزن پر ہے جو کہ بیماری کے معنی کے لئے مخصوص ہے۔

خَمْرَةُ الطِّيبِ خوشبو خَامَرَهُ وَخَمَرَهُ کسی سے گھل مل جانا اس سے الگ نہ ہونا۔ اسی سے بطور استعارہ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (طویل)

(۱۴۷) "خَامِرِي أُمَّ عَامِرٍ"

کہ اے ام عامر چھپ جا۔

(خ م س)

اَلْخَمْسُ۔ (پانچ) اصل میں یہ لفظ اسم عدد ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲)

اَلْخَمْسِينَ (پچاس) قرآن میں ہے:۔

فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۲۹-۱۴) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔

اَلْخَمِيسُ۔ جامہ پانچ گزی۔ روز پنجشنبہ۔

رُمْحٌ مَخْمُوسٌ نیزہ پانچ گزی۔ اَلْخِمْسُ پیاسے اونٹ جو چوتھے روز پانی پر وارد ہوں۔

خَمَسْتُ الْقَوْمَ (ن) پانچواں حصہ لینا۔

خَمَسْتُهُمْ (ض) پانچواں ہونا۔

(خ م ص)

اَلْمَخْمَصَةُ۔ ایسی بھوک جس سے پیٹ پچک جائے۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ (۵-۳) ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے۔ کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ خَامِصٌ پچکے ہوئے پیٹ والا أَخْمَصُ الْقَدَمِ پاؤں کے تلوے کا گڑھا۔

(خ م ط)

اَلْخَمْطُ۔ درخت بے خار۔ بعض نے کہا کہ خَمْطٌ۔ پیلو کے درخت کو کہتے ہیں۔

اَلْخَمْطَةُ۔ ترش شراب تَخَمَّطَ غضبناک ہونا۔ کہا جاتا ہے۔ تَخَمَّطَ الْفَحْلُ۔ سانڈ کا مستی سے بربرانا۔

(خ ن ز ر)

اَلْخِنْزِيرُ کے معنی سور کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ (۵-۶۰)

اور (جن کو) ان میں سے بندر اور سور بنا دیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خاص کر سور ہی مراد ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں

---

[1] قطعة من البيت وتكملته: فلا تدفنوني ان دفني محرم۔ عليكم ولكن ۔۔۔ قال المرتضى (۲: ۲۳۰) البيت لتأبط شرا ويروى للشنفري (صاحب لامية العرب التي شرحها الزمخشري باعجب العجاب) وللاستاذ الميمني حقق بذا في الطرائف (۱ / ۳۶) راجع للبيت و قصته الاغاني (۲۱: ۱۳۶) وطبقات الشعراء لابن سلام (۱: ۴۷) والحيوان (۶: ۴۰۵) وللمعاني الكبير ۲۱۳ وامالي ابن الشجري (۱: ۳۶) والحماسة بالتبريزي (۲: ۴۲) وذيل الامالي ۳۶ والصناعتين ۳۸۸ والصاحبي ۲۳۴ والبحر (۳: ۴۷۷) ومجمع البيان (۱: ۴۷) والمحاضرات للمؤلف (۲: ۳۹۸) وابن ابي الحديد (۱: ۵۷) واللسان (عمر) وفي رواية البشرى بدل خامري۔ قال صاحب العقد (۱: ۱۱۸ - ۱۱۹ / ۴ : ۲۱۹) ان رواية خامري بعيد عن المعنى۔ راجع الازمنة والامكنة ومعنى البيت لا تدفنوني بل دعوني للتي يقال لها اذا صيدت خامري ام عامر اي للضبع قاله الخليل ونقل عنه سيبويه في الكتاب" والخفاجي في شرح الدرة (۱۴- ۱۵) وصدرها لا ماض فعلي بذا ليس في البيت التفات كما ذهب اليه البعض والقطعة ايضا في بيت الاخطل اللسان (وخط) والمرزوقي والقطعة مثل راجع الجرجاني ۹۰ والعسكري والميداني ۱۲

جن کے افعال و عادات بندر اور سور جیسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ بلحاظ صورت کے بندر اور سور بن گئے تھے[1]۔ مگر زیر بحث آیت میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ مروی ہے کہ ایک قوم کی صورتیں مسخ ہو گئی تھیں اور وہ بندر اور سور بن گئے تھے[1]۔ اسی طرح انسانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو شکل و صورت کے لحاظ سے گو انسان نظر آتے ہیں۔ لیکن اخلاق و عادات کے اعتبار سے بندر اور سور بنے ہوئے ہیں۔

(خ ن س)

اَلْخُنُسُ (ن) کے معنی پیچھے ہٹنے اور سکڑ جانے کے ہیں اسی سے شیطان کو خنّاس کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر الٰہی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور وسوسہ انداز نہیں ہو پاتا۔ قرآن میں ہے:۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴-۴) شیطان وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۸۱-۱۵) ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

میں خُنَّس سے وہ ستارے مراد ہیں جو دن کو الٹی رفتار چلتے ہیں یہ خَانِسٌ کی جمع ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے زحل، مشتری اور مریخ مراد ہیں کیونکہ یہ الٹی چال چلتے رہتے ہیں۔

اَخْنَسْتُ عَنْهُ حَقَّهٗ میں نے اس کے حق کو مؤخر کر دیا۔ روک لیا۔

(خ ن ق)

اَلْمُنْخَنِقَةُ (۵-۳) جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے۔

اَلْمِخْنَقَةُ۔ کے معنی قلاوہ کے ہیں۔

(خ و ر)

اَلْخُوَارُ۔ دراصل یہ لفظ گائے بیل کی آواز کے ساتھ مختص ہے۔ پھر استعارۃً اونٹ کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (۲۰-۸۸) ایک بچھڑا (یعنی اس کا) قالب جس کی آواز گائے کی سی تھی۔

اَرْضٌ خَوَّارَةٌ دو بلندیوں کے درمیان پست زمین۔

رُمْحٌ خَوَّارٌ۔ کمزور نیزہ۔

اَلْخَوْرَانُ۔ بہائم کی آواز۔ جانوروں کے گوبر کرنے کا راستہ۔

(خ و ض)

اَلْخَوْضُ (ن) کے معنی پانی میں اترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں بطور استعارہ کسی کام میں مشغول رہنے پر بولا جاتا ہے قرآن میں اس کا زیادہ تر استعمال فضول کاموں میں لگے رہنا پر ہوا ہے چنانچہ فرمایا:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ (۹-۶۵) اور اگر تم ان سے (اس بارے میں) دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی بات چیت اور دل لگی کرتے تھے۔

وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا (۹-۶۹) اور جس طرح وہ باطل میں ڈوبے رہے اسی طرح تم باطل میں ڈوبے رہے۔

ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ (۶-۹۱)

---

[1] ذہب الجمہور الی ان المسخ کان عقوبۃ حقیقیۃ وقال مجاہد بالقول الثانی واول المسخ علی تغییر الاخلاق واللہ اعلم (راجع التفاسیر)

پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں۔
وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ (۶-۶۸) اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بیہودہ بکواس کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہوجاؤ۔ یہاں تک کہ اور باتوں میں مشغول ہوجائیں۔
کہا جاتا ہے :۔
اَخَضْتُ دَابَّتِیْ فِی الْمَآءِ۔ میں نے اپنی سواری کو پانی میں ڈال دیا۔
تَخَاوَضُوْا فِی الْحَدِیْثِ۔ باہم باتوں میں مشغول ہوگئے۔

(خ و ف)

اَلْخَوْفُ (س) کے معنی ہیں قرائن وشواہد سے کسی آنے والے خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ رَجَاء اور طَمَعٌ کا لفظ قرائن وشواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (۱۷-۵۷) اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔
وَکَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَکْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰہِ (۶-۸۱) بھلا میں ان چیزوں سے جن کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو کیونکر ڈروں جب کہ تم اس سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ شریک بناتے ہو۔
تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ (۳۲-۱۶) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔ (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا (۴-۳) اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ ... انصاف نہ کرسکو گے۔
اور آیت کریمہ :۔
وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا (۴-۳۵) اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے۔ میں بعض نے خِفْتُمْ کے معنی عَرَفْتُمْ کئے ہیں یعنی اگر تمہیں معلوم ہو مگر اس کے اصل معنی یہی ہیں کہ اگر حالات سے واقفیت کی بنا پر تمہیں اندیشہ ہو کہ
اَلْخَوْفُ مِنَ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ سے ڈرنا) کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔ اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہوجائے بلکہ خوف الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے۔ اور طاعات کو اختیار کرے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہوسکتا۔
اَلتَّخْوِیْفُ (تفعیل) ڈرانا) اللہ تعالیٰ کے لوگوں کو ڈرانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو بری کاموں سے بچتے رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ :۔
ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰہُ بِهٖ عِبَادَهٗ (۳۹-۱۶) بھی اسی معنی پر محمول ہے اور باری تعالیٰ نے شیطان سے ڈرنے اور اس کی تخویف کی پرواہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔
اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْھُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔

(۳-۱۷۵) یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے لہذا اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرو اور مجھی سے ڈرتے رہنا۔

یعنی شیطان کا حکم مت بجالاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہوکر رہو۔ اور آیت کریمہ :-

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ (۱۹-۵)

اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔

میں خوف کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنے مال کی فکر تھی کہ موالی اس کے وارث بن جائیں گے جیسا کہ بعض جہلاء نے سمجھا ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا درجہ اس سے کہیں بلند ہوتا ہے کہ وہ دنیوی مال و اسباب کی فکر کریں بلکہ موالی سے انہیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ ان کے مرنے کے بعد شریعت کی رعایت اور نظام دین کی حفاظت نہیں کریں گے۔

اَلْخِیْفَۃُ کے معنی خوف کی حالت کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی قُلْنَا لَا تَخَفْ (۲۰-۶۷) (اس وقت) موسیٰؑ نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔

اور کبھی خِیْفَۃٌ بمعنی خوف بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا۔

وَالْمَلٰٓئِکَۃُ مِنْ خِیْفَتِہٖ (۱۳-۱۳) اور فرشتے سب اس کے خوف سے۔

تَخَافُوْنَھُمْ کَخِیْفَتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ (۳۰-۲۸)

(اور کیا) تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنوں سے ڈرتے ہو۔

یہاں خوف کی بجائے خِیْفَۃٌ کا لفظ لانے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خوف ان کی حالت لازم بن چکی تھی جو ان پر ہر آن طاری رہتی تھی۔

اَلتَّخَوُّفُ (تفعل) کسی انسان کا اظہار خوف کرنا تَخَوَّفْنَاھُمْ۔ ہم نے انہیں اتنا کم کیا جسقدر کہ خوف اس کا مقتضی تھا۔ قرآن میں ہے :-

اَوْ یَاْخُذَھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ (۱۶-۴۷) یا جب ان کو عذاب کا ڈر پیدا ہوگیا ہو اس وقت پکڑ لے[1]۔

(خ و ل)

اَلتَّخْوِیْلُ (تفعیل) کے اصل معنی خَوَلَ یعنی حشم و خدام عطا کرنے کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ایسی چیزیں عطا کرنے کے ہیں جو انسان کو خَوَلٌ کا کام دے اور بقول بعض ایسی چیزیں عطا کرنا جن کی نگہداشت کی ضرورت پڑے۔ اور یہ فُلَانٌ خَالُ مَالٍ اَوْخَائِلُ مَالٍ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی فلاں مال کی خوب نگہداشت کرنے والا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَتَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُھُوْرِکُمْ (۶-۹۴) اور (جاہ و مال و متاع) ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔

اور اَلْخَالُ " اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو وحشی جانوروں کو ڈرانے کے لئے کھیت میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ نیز خَالٌ کے معنی تل یعنی بدن پر سیاہ نشان کے بھی آتے ہیں[2]۔

(خ و ن)

اَلْخِیَانَۃُ۔ خیانت اور نفاق دونوں ہم معنی ہیں مگر خیانت کا لفظ عہد اور امانت کا پاس نہ

---

[1] ذہب الفراوالی ان معناہ التنقص والزجاج الی معنی الاخافۃ راجع التاج واللسان (خوف) [2] وایضا الخال والخالۃ اخو الام واختہا وفی التنزیل خالاتک (۳۳-۵۰) او بیوت اخوالکم او بیوت خالاتکم (۲۴-۶۱) خالاتک (۳۳-۵۰) خالاتکم (۴-۲۳) ؞ ؞

کہنے پر بولا جاتا ہے اور نفاق دین کے متعلق بولا جاتا ہے۔ پھر ان میں تداخل ہو جاتا ہے پس خیانت کے معنی خفیہ طور پر عہد شکنی کر کے حق کی مخالفت کے آتے ہیں اس کا ضد امانت ہے۔ اور محاورہ میں خُنْتُ فُلَانًا وَ اَمَانَةَ فُلَانٍ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمَانَاتِكُمْ (۸-۲۷) نہ تو خدا اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا (۶۶-۱۰) خدا نے کافروں کے لئے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے ان کی خیانت کی۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ (۵-۱۳) اور ..... ہمیشہ تم ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔

کے معنی بعض نے عَلٰى جَمَاعَةٍ خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ کئے ہیں یعنی خَآئِنَةٍ کو جَمَاعَةٍ کی صفت مانا ہے اور بعض نے اس کے معنی عَلٰى رَجُلٍ خَائِنٍ کئے ہیں یعنی اسے رَجُلٍ کی صفت مانا ہے اور کہا ہے رَجُلٌ خَائِنٌ وَخَائِنَةٌ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ رَاوِيَةٌ (روایت کرنے والا) و دَاهِيَةٌ کے الفاظ میں۔

بعض نے کہا ہے کہ خَائِنَةٌ یہاں مصدر کی جگہ پر استعمال ہؤا ہے جیسا کہ قُمْ قَائِمًا کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:۔ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ (۴۰-۱۹) وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور فرمایا:۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ (۸-۷۱) اور اگر یہ لوگ تم سے دغا کرنا چاہیں تو یہ پہلے ہی خدا سے دغا کر چکے ہیں تو اس نے ان کو (تمہارے) قبضے میں دے دیا۔

اور آیت کریمہ:۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (۲-۱۸۷) خدا جانتا ہے کہ تم اپنے حق میں خیانت کرنا چاہتے تھے۔

میں اِخْتِيَانٌ کے معنی خیانت کے لئے حیلہ کرنے کے ہیں۔ اس بنا پر تَخُوْنُوْنَ اَنْفُسَكُمْ نہیں کہا کیونکہ ان سے خیانت کا صدور نہیں ہوا تھا بلکہ انہوں نے اِخْتِيَانٌ کا ارتکاب کیا تھا جس کے معنی قصد خیانت کے لئے جذبات کے حرکت میں آنے کے ہیں اسی معنی کی طرف اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

(خ و ی)

اَلْخَوَاءُ کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔ خَوٰى (ض) خَوًى۔ بَطْنُهُ مِنَ الطَّعَامِ یعنی اس کا پیٹ طعام سے خالی ہوگیا۔ اور تشبیہ کے طور پر خَوَى الْجَوْزُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔ خَوَتْ خَوَاءً الدَّارُ گھر ویران ہو کر گر پڑا[۱] اور جب ستارے کے گرنے پر بارش نہ ہو تو تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے خَوَى النَّجْمُ وَاَخْوٰى

---

[۱] وفی التنزیل وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وایضاً (۲:۲۵۹) (۶۹-۷)

یہاں خوی کی نسبت اخوی کے لفظ میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے جیسا کہ سقی اور اسقی ہیں۔
اَلتَّخْوِیَۃُ دو چیزوں کے درمیان جگہ خالی چھوڑنا۔

(خ ی ب)

اَلْخَیْبَۃُ (ض) کے معنی ناکام ہونے اور مقصد فوت ہوجانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (۱۴-۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد ہوگیا۔
وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ (۲۰-۶۱) اور جس نے افترا کیا وہ نامراد رہا۔
وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (۹۱-۱۰) اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

(خ ی ر)

اَلْخَیْرُ وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو مثلاً عقل عدل وفضل اور تمام مفید چیزیں۔ یہ اَلشَّرُّ کی ضد ہے۔ اور خیر دو قسم پر ہے (۱) خیر مطلق جو ہر حال میں اور ہر ایک کے نزدیک پسندیدہ ہو جیسا کہ آنحضرتؐ نے جنت کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا (۱۱۹)
لَا خَیْرَ بِخَیْرٍ بَعْدَہُ النَّارُ وَلَا شَرَّ بِشَرٍّ بَعْدَہُ الْجَنَّۃُ کہ وہ خیر کچھ بھی خیر نہیں ہے جس کے بعد آگ ہو اور وہ شر کچھ بھی شر نہیں ہے جس کے بعد جنت حاصل ہوجائے۔ (۲) دوسری قسم خیر وشر مقید کی ہے یعنی وہ چیز جو ایک کے حق میں خیر اور دوسرے کے لئے شر ہو مثلاً دولت کہ بسا اوقات یہ زید کے حق میں خیر اور عمرو کے حق میں شر بن جاتی ہے۔ اس بنا پر قرآن نے اسے خیر وشر دونوں سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنْ تَرَكَ خَيْرًا (۲-۱۸۰) اگر وہ کچھ مال چھوڑ جاتے۔
اور دوسرے مقام پر فرمایا:۔
اَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ (۲۳-۵۵-۵۶) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں (تو اس سے) ان کی بھلائی میں جلدی کر رہے ہیں۔
بعض علماء نے کہا ہے کہ مال پر خیر کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ مال کثیر ہو اور حلال طریق سے جمع کیا گیا ہو جیسا کہ مروی ہے (۱۲۱) کہ حضرت علیؓ اپنے ایک غلام کے پاس گئے تو اس نے دریافت کیا کہ اے امیر المؤمنین! میں کچھ وصیت نہ کر جاؤں تو حضرت علیؓ نے فرمایا "نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کیلئے "اِنْ تَرَكَ خَيْرًا" فرمایا ہے۔ اور خیر مال کثیر کو کہا جاتا ہے" چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (۱۰۰-۸) وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔ میں بھی خیر کے معنی مال کثیر کے ہیں۔
بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کریمہ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا میں مال کو خیر کہنے میں ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وصیت صرف

سلہ وایضاً (۳-۱۲۶) ؛ سلہ الحدیث ذکرہ فی الکشاف
قال الحافظ فی تخریجہ رواہ عبدالرزاق عن معمر عن ہشام عن ابیہ وایضاً ابن ابی شیبۃ عن ابی خالد الاحمر عنہ ومثلہ عن عائشۃ ان رجلا اراد ان یوصی فسألتہ کم مالک (عبدالرزاق عن عبداللہ بن عبید بن عمیر وابن ابی شیبۃ عن ابن ابی ملیکۃ عن عائشۃ انظر تخریج الحافظ ۴ ارقم ۱۰۴-۱۰۶)

اس مال میں بہتر ہے جو محمود طریق سے جمع کیا گیا ہو اس معنی میں فرمایا :-

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ (۲-۱۱۵)

کہدو (جو) جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہل استحقاق ہیں) ماں باپ کو۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (۲-۱۹۷)

اور جو نیک کام کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائیگا۔

اور آیت کریمہ :-

فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا (۲۴-۳۳)

اگر تم ان میں (صلاحیت اور) نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کرلو۔

میں بعض نے خَيْرًا سے مال مراد لیا ہے یعنی اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے پاس مال ہے اور بعض نے خیر بمعنی ثواب لیا ہے کہ اگر تمہیں یقین ہو کہ انکی آزادی تمہارے اور ان کے حق میں فائدہ مند یعنی باعث ثواب ہو گی۔ خیر و شر کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے کبھی بطور اسم کے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور آیت کریمہ :-

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ (۳-۱۰۴)

اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔

میں بھی خیر بطور اسم کے استعمال ہوا ہے اور کبھی یہ دونوں بطور وصف کے آتے ہیں۔ اور اَفْعَلُ مِنْ کی تقدیر میں ہوتے ہیں جیسے هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ ذَاكَ وَاَفْضَلُ یعنی یہ اس سے بہتر اور افضل ہے قرآن میں ہے :-

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا (۲-۱۰۶) تو اس سے بہتر بھیج دیتے ہیں

اور آیت کریمہ :-

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ..... (۲-۱۸۴) اور روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

میں خیر اسم بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی اَفْعَلُ مِنْ بھی۔ اور آیت کریمہ :-

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (۲-۱۹۷)

اور زاد راہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر (فائدہ) زاد راہ (کا) پرہیزگاری ہے۔

میں خیر بمعنی اَفْعَلُ مِنْ کے ہے۔

پھر کبھی تو خیر کا لفظ شر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اور کبھی ضُرٌّ کے مقابلہ میں جیسے فرمایا :-

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶-۱۷) اور اگر خدا تم کو کوئی سختی پہنچائے تو اسی کے سوا اس کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر نعمت (و راحت) عطا کرے (تو کوئی اس کو روکنے والا) نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور آیت کریمہ :-

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ (۵۵-۷۰) ان میں نیک سیرت (اور) خوبصورت۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خَيْرَاتٌ اصل میں خَيِّرَاتٌ ہے تخفیف کے لئے ایک یاء کو حذف کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ خَيْرٌ وَّامْرَاَةٌ خَيْرَةٌ وَهٰذَا خَيْرُ الرِّجَالِ وَهٰذِهٖ خَيْرَةُ النِّسَاءِ اور خَيْرَات سے مراد یہ ہے کہ ان میں نیک سیرت عورتیں ہوں گی جن میں کسی قسم کی رذالت نہیں پائی جائے گی۔ اَلْخَيْرُ۔ بہتر جو خیر کے ساتھ مختص ہو نَاقَةٌ خِيَارٌ وَجَمَلٌ خِيَارٌ (مذکر و مؤنث) بہتر اونٹنی یا اونٹ۔

اَلْاِسْتِخَارَةُ کے معنی طلب خیر کے ہیں اس کا مطاوع خَارَ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے :-

اِسْتَخَارَ اللّٰہُ الْعَبْدَ فَخَارَ لَہٗ۔ بندے نے اللہ تعالیٰ سے طلبِ خیر کی تو اللہ تعالیٰ نے جو بہتر تھا وہ بتا دیا۔ خَایَرْتُ فُلَانًا کَذَا فَخِرْتُہٗ میں نے فلاں سے (علم میں) مسابقت کی تو میں غالب رہا۔

اَلْخِیَرَۃُ سے مراد وہ حالت ہے جو طالب خیر یا مختار کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ قِعْدَۃٌ وَجِلْسَۃٌ کا لفظ قَاعِدٌ اور جَالِسٌ کی ہیئت اور حالت پر بولا جاتا ہے۔

اَلْاِخْتِیَارُ (افتعال) بہتر چیز کو طلب کر کے اسے کر گزرنا۔

اور کبھی اختیار کا لفظ کسی چیز کو بہتر سمجھنے پر بھی بولا جاتا ہے گو نفس الامر میں وہ چیز بہتر نہ ہو اور آیت کریمہ:۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰھُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ (۴۴-۳۲) اور ہم نے بنی اسرائیل کو اہل عالم سے دانستہ منتخب کیا تھا۔

میں ان کے بلحاظ خلقت کے بہتر ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں دوسروں پر فوقیت بخشنا مراد ہو۔ متکلمین کی اصطلاح میں مختار کا لفظ ہر اس فعل کے متعلق بولا جاتا ہے جس کے کرنے میں انسان پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو لہٰذا ھُوَ مُخْتَارٌ فِیْ کَذَا کا محاورہ فُلَانٌ لَہٗ اِخْتِیَارٌ کے ہم معنی نہیں ہے کیونکہ اختیار کے معنی اس کام کے کرنے کے ہوتے ہیں جسے انسان بہتر خیال کرتا ہو۔ مگر مُخْتَارٌ کا لفظ فاعل اور مفعول دونوں پر بولا جاتا ہے۔

(خ ی ط)

اَلْخَیْطُ۔ تاگا۔ والجمع اَلْخُیُوْطُ۔

خَاطَ (ض) خِیَاطَۃً وَخَیَّطَ الثَّوْبَ کے معنی کپڑا سینے کے ہیں اور کپڑا سینے کی سوئی کو اَلْخِیَاطُ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ (۷-۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے نکل جائے۔

اور آیت کریمہ:۔

حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (۲-۱۸۷) یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔

میں خَیْطِ اَبْیَض اور اَسْوَد سے صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی مراد ہے۔ اور شاعر کے قول (طویل)

(۱۴۸) تَدَلّٰی عَلَیْھَا بَیْنَ سِبٍّ وَخَیْطَۃٍ

وہ رسی اور میخ کے مابین اس پر اٹک گیا۔

میں خَیْطَۃٌ کا لفظ بطور استعارہ رسی یا میخ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ایک روایت میں ہے (۱۲۲) کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدیؓ بن حاتم نے سیاہ اور سفید دو عقال (ڈورے) رکھ لئے ان کی طرف دیکھتے جاتے اور کھاتے جاتے یہاں تک کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگے پھر اس نے آنحضرتؐ کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا:۔

۱؎ قال ابو ذویب یصف مشتار العسل وتمامہ:..... بجرداء مثل الوکف یکبو غرابہا وفی التہذیب القالی (۲: ۲۵۸) شطرہ الثانی شدید الوصاۃ نابل ابن وابن نابل والبیت من شواہد الکشاف ۳۴۴ الکن فیہ تمامہ تدلی نلوا المایح المتشم واللہ اعلم والبیت فی تہذیب الاصلاح ۲۱ للسان (سبب، خیط)۔

۲؎ حدیث عدی بن حاتم متفق علیہ فی ابی داؤد من حدیث الشعبی عنہ والصحیح انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ہزاحا ولم یعیرہ بالحمق وان کانت اللفظۃ تاتی بمعنی الحمق، الصفا ۱۲ ش

إِنَّكَ لَعَرِيضُ الْقَفَا وَإِنَّمَا ذَالِكَ بَيَاضُ النَّهَارِ وَسَوَادُ اللَّيْلِ۔ کہ تم تو نرے ہی عریض القفاء (احمق) ہو۔ اس سے مراد تورات کی سیاہی اور فجر کی سفیدی ہے۔

خَيَّطَ الشَّوْبُ فِي رَأْسِهٖ۔ اس کے سر میں تاگے کی طرح بڑھاپا ظاہر ہوگیا۔ اَلْخَيْطُ (ایضًا) شترمرغ اس کی جمع اَلْخِيطَانُ ہے۔ نَعَامَةٌ خَيْطَاءُ۔ تاگے کی طرح لمبی گردن والا شترمرغ۔

(خ ی ل)

اَلْخَيَالُ۔ اس کے اصل معنی صورت مجردہ کے ہیں جیسے وہ صورت جو خواب یا آئینے میں نظر آتی ہے یا کسی کی عدم موجوگی میں دل کے اندر اس کا تصور آتا ہے۔ پھر (مجازاً) ہر اس امر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا تصور کیا جائے اور ہر اس پتلے دبلے شخص کو خیال کہا جاتا ہے جو بمنزلہ خیال اور تصور کے ہو۔

اَلتَّخْيِيلُ (تفعیل) کے معنی کسی کے نفس میں کسی چیز کا خیال یعنی تصور قائم کرنے کے ہیں اور اَلتَّخَيُّلُ کے معنی از خود اس قسم کا تصور قائم کر لینے کے ہیں۔ اور خِلْتُ بمعنی ظَنَنْتُ آتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ مظنون چیز بھی بمنزلہ خیال کے ہوتی ہے۔

خَيَّلَتِ السَّمَاءُ آسمان میں بارش کا سماں نظر آنے لگا۔ فُلَانٌ مُخِيلٌ بِكَذَا۔ فلاں اس کا سزاوار ہے اصل میں اس کے معنی یہ ہیں کہ فلاں اس خیال کو ظاہر کرنے والا ہے۔ اَلْخُيَلَاءُ۔ تکبر جو کسی ایسی فضیلت کے تخیل پر مبنی ہو جو انسان اپنے اندر خیال کرتا ہو۔ اسی سے لفظ خَيْل لیا گیا ہے کیونکہ جو شخص گھوڑے پر سوار ہو وہ اپنے اندر نخوت و غرور پاتا ہے۔ دراصل خَيْل کا لفظ گھوڑے اور سوار دونوں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ (۸-۶۰) اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے اور کبھی ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے[1] (۱۲۲) يَا خَيْلَ اللّٰهِ ارْكَبِي۔ (اے اللہ کے سوار گھوڑے پر سوار ہو جا) تو یہاں خیل بمعنی فارس کے ہے اور ایک حدیث میں ہے[2] (۱۲۳) عَفَوْتُ لَكُمْ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ کہ میں نے تمہیں گھوڑوں کا صدقہ معاف کیا اَلْأَخْيَلُ۔ شقرا (ایک پرندہ) کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور ہر لحظہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ دوسرے رنگ کا ہے۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[3] (مجزوالکامل)

(۱۴۹) كَأَبِي بَرَاقِشَ كُلَّ لَوْ نٍ لَوْنُهٗ يَتَخَيَّلُ

ابو براقش کی طرح جو ہر آن نیا رنگ بدلتا ہے۔

---

[1] رواہ الشیخ فی الناسخ والمنسوخ وعزاہ السہیلی فی الروض لمسلم والحدیث باختلاف الفاظہ فی ابی داؤد والمستدرک للحاکم وفی الردۃ للواقدی قالہ خالد بن الولید لاصحابہ یوم الیمامۃ راجع الکافی رقم ۴۹ والحیوان ۱/۳۳۵ من کلمات النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یتقدمہ فیہن احد وفی اضداد ابی الطیب یقولون یا خیل اللہ ارکبی علی القلب وھذہ من المجاز [2] رواہ ابوداؤد والترمذی من حدیث علی مرفوعا قال الدارقطنی الصواب وقفہ علی علیؓ وفی المسئلۃ اختلاف راجع لاختلاف الفاظہ النیل ۴/۱۴۴-۱۴۷ وکنز العمال ۳ رقم ۱۲۵۸ [3] قالہ الاسدی فی ذم قوم شہورین بالتقابح وفی المطبوع کاتب بدل کابی مصحف راجع اللسان (برقش) والاقتضاب ۳۵۲ والعیون (۲: ۲۹) والحیوان (۳: ۷۴) وانظر للبیت والروایات عما مثل فیہ دیوان المعانی (۱: ۲۸۲) وخزانۃ الادب (۳: ۶۶۰) والصناعتین ۱۰۳ وذیل الامالی ۸۳ والمحاضرات للمؤلف (۱: ۱۵)

کتابُ الدّال

(د ء ب)

اَلدَّأْبُ کے معنی مسلسل چلنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔
دَأَبَ فِي السَّيْرِ دَأْبًا۔ وہ مسلسل چلا۔ قرآن میں ہے:۔
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (۱۴-۳۳)
اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں (دن رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں۔
نیز دَأْبٌ کا لفظ عادۃ مستمرہ پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔
كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۳-۱۱) ان کا حال بھی فرعونیوں کا سا ہے۔
یعنی انکی سی عادت جس پر وہ ہمیشہ چلتے رہے ہیں۔

(د ب ب)

اَلدَّبُّ وَالدَّبِيْبُ (ض) کے معنی آہستہ آہستہ چلنے اور رینگنے کے ہیں۔ یہ لفظ حیوانات اور زیادہ تر حشرات الارض کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور شراب اور بھنگی وغیرہ کے جسم اور کپڑے وغیرہ میں) سرایت کر جانے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جن کی حرکات کا علم حاسہ بصر سے اور ملیک نہ ہو سکتا ہو۔ یہ لفظ گو عرف میں خاص کر گھوڑے پر بولا جاتا ہے مگر (لغۃ) ہر حیوان یعنی ذی حیات چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (۲۴-۴۵)
اور خدا ہی نے ہر چلتے پھرتے جانور کو پانی سے پیدا کیا۔
وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ (۲-۱۶۴) اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلائے ہیں۔
وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱-۶) اور زمین پر چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمے ہے۔
وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ۔۔۔۔ (۶-۳۸) اور زمین پر چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والا پرند نہیں ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (۳۵-۴۵)
اور اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر کسی ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔
کی تفسیر میں ابو عبیدۃؓ نے کہا ہے کہ یہاں دَآبَّةٌ

سے خاص کر انسان مراد ہیں۔[1] مگر اولیٰ یہ ہے کہ اسے عموم پر رکھا جائے اور اس سے ہر ذی حیات چیز مراد لی جائے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْھِمْ اَخْرَجْنَا لَھُمْ دَآبَّۃً مِّنَ الْاَرْضِ تُکَلِّمُھُمْ (۲۷-۸۲)

اور جب ان کے بارے میں (عذاب کا) وعدہ پورا ہوگا تو ہم ان کے لئے زمین میں سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک غیر معروف قسم کا جانور ہوگا جو قیامت کے قریب خروج کریگا۔ اور بعض نے اس سے وہ شریر لوگ مراد لئے ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح ہوں گے۔ اس صورت میں لفظ دَآبَّۃ جمع ہوگا (جیسا کہ خائن کی جمع خَائِنَۃ آجاتی ہے) اور ہر چلنے پھرنے والی چیز کو شامل ہوگا۔ اور آیت کریمہ

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ (۸-۲۲) کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانوروں میں سب سے بدتر۔

میں دَوَابّ کا لفظ جملہ حیوانات کو شامل ہے۔

محاورہ ہے:۔

نَاقَۃٌ دَبُوْبٌ ضعف اور سستی کی وجہ سے آہستہ چلنے والی اونٹنی۔

مَا بِالدَّارِ دُبِّیٌّ۔ گھر میں کوئی نہیں۔

اَرْضٌ مَدْبُوْبَۃٌ۔ وہ زمین جس میں چھوٹے چھوٹے رینگنے والے جانور کثرت سے ہوں۔

(د ب ر)

دُبُرٌ۔ پشت، مقعد یہ قُبُل کی ضد ہے اور

یہ دونوں لفظ بطور کنایہ جائے مخصوص کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور اس میں دُبْرٌ اور دُبُرٌ دو لغات ہیں اس کی جمع اَدْبَارٌ آتی [illegible] قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗ (۸-۱۶) اور جو شخص جنگ کے روز ان سے پیٹھ پھیرے گا۔

یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ (۸-۵۰) ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر (کوڑے وہتھوڑے وغیرہ) مارتے ہیں۔

فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ (۸-۱۵) تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا۔

یعنی ہزیمت خوردہ ہو کر مت بھاگو۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۵۰-۴۰) (اور نماز کے بعد بھی)

میں ادبار کے معنی نمازوں کے آخری حصے (یا نمازوں کے بعد) کے ہیں۔ اور اَدْبَارَ النُّجُوْمِ (۵۲-۴۹) میں ایک قراءت اِدْبَارَ النُّجُوْمِ بھی ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر بمعنی ظرف ہوگا یعنی ستاروں کے ڈوبنے کا وقت جیسا کہ مَقْدَمَ الْحَاجِ اور خُفُوْقَ النَّجْمِ میں ہے۔ اور اَدْبَار (بِفَتْحِ الْھَمْزَۃِ) ہونے کی صورت میں جمع ہوگی۔ اور الدبر سے مشتقات (جیسے دَبَرَ وَاَدْبَرَ وَدَابِرٌ) کبھی باعتبار فاعل (یعنی فعل لازم) کے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے:۔ دَبَرَ فُلَانٌ (فلاں نے پیٹھ پھیری) اَمْسِ الدَّابِرُ (کل گذشتہ) قرآن میں ہے۔

وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ (۷۴-۳۳) اور رات کی جب پیٹھ پھیرنے لگے

اور کبھی باعتبار مفعول (یعنی فعل متعدی) کے جیسے دَبَرَ السَّھْمُ الْھَدَفَ (تیر نشانہ سے ورے گرپڑا)

[1] ھو نصہ وجاز دابۃ ھا ھنا الانسان راجع مجازہ (۲: ۱۵۶) وقارن الطبری ۲۰: ۱۰ وفی قال الجبری ولا یتکلم بہا الا فی الجدال النفی :

دَبَرَ فُلَانٌ اَلْقَوْمَ (یعنی وہ قوم سے پیچھے رہ گیا
قرآن میں ہے:۔
فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (۶-۴۵)
غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔
اِنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِیْنَ (۱۵-۶۶)
کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہی کاٹ دی جائیگی۔
اور دَابِرٌ کے معنی متاخر یا تابع کے آتے ہیں خواہ وہ تاخر باعتبار مکان یا زمان کے ہو اور خواہ باعتبار مرتبہ کے۔
اَدْبَرَ۔ اعراض کرنا۔ پشت پھیرنا۔ قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ اور پھر پشت پھیر کر چلا اور (قبول حق سے) غرور کیا (۷۴-۲۳)
تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۷۰-۱۷) ان لوگوں کو بلائے گی جنہوں نے (دین حق سے) اعراض کیا۔
حدیث میں ہے[1]:۔ (۱۲۵)
لَا تَقَاطَعُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا۔ کہ نہ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو اور نہ آپس میں روٹھو اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔
بعض نے لَا تَدَابَرُوْا کے معنی یہ کئے ہیں کہ پس پشت ایک دوسرے کی برائی بیان نہ کرو۔
اَلْاِسْتِدْبَارُ (استفعال) پشت پھیرنا۔ کسی چیز کے پیچھے ہونے کو طلب کرنا۔

تَدَابَرَ الْقَوْمُ باہم اختلاف کرکے قطع تعلق کرنا۔
اَلدِّبَارُ یہ دَابَرَهٗ کا مصدر ہے جس کے معنی پس پشت دشمنی کرنے کے ہیں۔
اَلتَّدْبِیْرُ (تفعیل) کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا قرآن میں ہے:۔
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۷۹-۵) پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔
یعنی وہ فرشتے جو امور دنیوی کے انتظام کیلئے مقرر ہیں۔
اَلتَّدْبِیْرُ (ایضًا) آزاد کردن بندہ پس از مرگ۔
اَلدَّبَارُ (بفتح الدال) ہلاکت جو قوم کی جڑ کو کاٹ ڈالے۔
نیز ایام جاہلیت میں بدھ کے دن کو دبار کہا جاتا تھا۔ کیونکہ عرب لوگ اس سے بدشگونی لیتے تھے۔
اَلدَّبِیْرُ۔ ریسماں کہ برکشند بوقت رشتن سپس (دوپو روضد آں قبیل است)
رَجُلٌ مُّقَابَلٌ وَّمُدَابَرٌ۔ نجیب الطرفین۔
شَاةٌ مُّقَابَلَةٌ مُّدَابَرَةٌ۔ بکری جس کا اگلی اور پچھلی جانب سے کان کٹا ہوا ہو۔
دَابِرَةُ الطَّائِرِ پرندکے پاؤں کا رخار۔ پرند کی پانچویں انگلی جو دوسری انگلیوں کے اوپر نکلتی ہے۔
دَابِرَةُ الْحَافِرِ۔ ناخن کہ بر بازوئے ستور بر آید۔
اَلدَّبُوْرُ پچھوائی ہوا۔ اَلدَّبْرَةُ قابل کاشت زمین کا ٹکڑا اسکی جمع دِبَارٌ ہے شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)
(۱۵۰) جِرْبَةٍ تَعْلُوا الدِّبَارَ غُرُوْبُهَا

[1] متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ ورواہ البخاری عن انس بمعناہ والطبرانی عن ابی ایوب راجع کنز العمال ۹: ۲۲۹ و ۳۸: ۹ وتخریج الاحیاء ۲/ ۱۷۸، ۱۸۰ [2] قالہ بشر بن ابی خازم وتکملتہ: تحدر ماء البئر عن جرشیۃ علی ... وفی المطبوع جربۃ رباالیا (مصحف) والصواب بالموحدۃ والقصاد ومعناہ المزرعۃ والدبار جمع دبرۃ او دبارۃ وہی القطعۃ من المزرعۃ والجرشیۃ ناقۃ منسوبۃ الی جرش وہی ارض بالیمن واہلہا یستقون علی الابل فالشاعر شبہ تحدر دموعہ بتحدر ماء علی جربۃ من غروب یستقی علیہا کذا قال الجوہری (دبر۔ جرش۔ دبر) والبیت ایضًا فی اللسان (جرب دبر جرش) و المفضلیات (۲: ۳۰) وفیہ الغرب مکان البئر راجع ایضًا البلدان (رسم جرش) وفیہ ان جرش فتحت فی حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سنۃ عشر من الہجرۃ صلحًا علی الفئ وجُرَش بالضم والفتح ۱۲

جیسے کہ مینی اونٹنی کے پانی سے بھرے ہوئے ڈول زمین پر گرتے ہیں۔

اَلدَّبْرُ۔ شہد کی مکھیوں، بھڑوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا غول جن کا ڈنک ان کے مقعد پر ہوتا ہے۔ اس کا واحد دَبْرَۃٌ ہے۔

اَلدِّبْرُ۔ مال کثیر جو میت چھوڑ مرے۔ اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔[1]

دَبِرَ الْبَعِیْرُ۔ زخمی بیٹھ والا ہونا۔ ایسے اونٹ کو ادبر و دَبِرٌ کہتے ہیں۔ اَلدَّبَرَۃُ (بفتح الباء و سکونہا) شکست در کارزار۔[2]

(د ث ر)

اَلْمُدَّثِّرُ۔ (از تفعل) اصل میں مُتَدَثِّرٌ تھا۔ تا کو دال سے بدل کر دال کو دال میں ادغام کر دیا۔ اس کے معنی کپڑا اوڑھنے والے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے دَثَّرْتُہٗ فَتَدَثَّرَ (میں نے اسے کپڑے میں لپیٹا چنانچہ وہ لپٹ گیا) قرآن میں ہے:۔ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۷۴-۱) اے (محمدؐ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو۔

اَلدِّثَارُ۔ وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ جائے جیسے چادر کمبل وغیرہ

تَدَثَّرَ الْفَحْلُ النَّاقَۃَ۔ سانڈھ اونٹنی پر چڑھ گیا

تَدَثَّرَ الرَّجُلُ الْفَرَسَ۔ آدمی گھوڑے پر کود کر سوار ہو گیا۔ رَجُلٌ دَثُوْرٌ۔ گمنام آدمی۔

سَیْفٌ دَاثِرٌ۔ زنگ آلود تلوار جسے پالش کئے بہت عرصہ گزر گیا ہو۔ اسی سے جس منزل کے نشانات مٹ گئے ہوں اُسے دَاثِرٌ کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ دِثْرُ مَالٍ وہ مال کی اچھی طرح خبر گیری کرنے والا ہے۔

(د ح ر)

اَلدَّحْرُ وَالدُّحُوْرُ۔ (ن) کے معنی دھتکار دینے اور دور کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۷-۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل دھتکارا ہوا۔

فَتُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۱۷-۳۵) (ملامت زدہ اور درگاہ خدا سے راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔

وَ یُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا (۳۷-۹) اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں۔ (یعنی وہاں سے) نکال دینے کو۔

(د ح ض)

دَاحِضَۃٌ۔ (اسم فاعل) باطل اور زائل ہونے والی (دلیل) قرآن میں ہے:۔ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۴۲-۱۶) ان کے پروردگار کے نزدیک ان کی دلیل بالکل بودی ہے۔

کہا جاتا ہے اَدْحَضْتُ فُلَانًا فِیْ حُجَّتِهٖ فَدَحَضَ وَ اَدْحَضْتُ حُجَّتَهٗ فَدَحَضَتْ (میں نے اس کی دلیل کو باطل کیا تو وہ باطل ہو گئی)[3] قرآن میں ہے:۔ وَ یُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ (۱۸-۵۶) اور جو کافر ہیں وہ باطل (سے استدلال کر کے) جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو اس کے مقام سے پھسلا دیں۔

اصل میں یہ دَحْضُ الرِّجْلِ سے مشتق ہے

---

[1] کذا فی الصحاح [2] ومنہ المثل شر الرأی الدبری ای الذی یسنح اخیراً عند فوت الحاجۃ [3] وفی التنزیل: فساہم فکان من المدحضین (۳۷-۱۴۱)

جس کے معنی پاؤں کے پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کے ہیں۔ اس بنا پر مناظرہ کے بارے میں کسی نے کہا ہے[1] ع (الکامل)

(۱۵) نَظَرًا يُزِيلُ مَوَاقِعَ الْأَقْدَامِ

ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔ اور بطور استعارہ دَحَضَتِ الشَّمْسُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سورج ڈھلنے کے ہیں

(د ح و)

اَلدَّحْوُ کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۷۹-۳۰) اور اس کے بعد زمین کو اس کے مقر سے دور کیا۔ یعنی اسے اس کی قرار گاہ سے زائل کر دیا جیسا کہ آیت کریمہ :۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ (۷۳-۱۴) میں ہے۔ یہ دَحَا الْمَطَرُ الْحَصٰى عَنْ وَجْهِ الْأَرْضِ (کہ بارش زمین سے کنکر بہا کر لے گئی) کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے: مَرَّ الْفَرَسُ يَدْحُو دَحْوًا۔ گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا خاک اڑاتا چلا گیا۔ اور اسی سے اُدْحِيُّ النَّعَامِ ہے جس کے معنی ریت میں شترمرغ کے انڈے دینے کی جگہ کے ہیں۔ یہ دَحْوٌ سے اُفْعُوْلٌ کے وزن پر ہے۔ دِحْيَةُ ایک مرد کا نام تھا (جو دحیہ کلبی کے نام سے مشہور تھا)

(د خ ر)

اَلدَّخَرُ وَالدُّخُوْرُ (ف، س) کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ اَدْخَرْتُهُ فَدَخَرَ میں نے اسے ذلیل کیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔ قرآن میں ہے: وَهُمْ دَاخِرُوْنَ (۱۶-۴۸) اور وہ ذلیل ہو کر۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (۴۰-۶۰) جو لوگ میری عبادت سے از راہ تکبر کنیاتے ہیں عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔

اور يَدَّخِرُ اصل میں يَذْتَخِرُ تھا پہلے تاء کو دال سے تبدیل کیا پھر ذال کو دال بنا کر دال کو دال میں ادغام کر کے يَدَّخِرُ بنا لیا) اور یہ اس باب (د خ ر) سے نہیں ہے۔

(د خ ل)

اَلدُّخُوْلُ (ن) یہ خروج کی ضد ہے۔ اور مکان و زمان اور اعمال سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے دَخَلَ مَكَانَ كَذَا فلاں جگہ میں داخل ہوا۔ قرآن میں ہے:۔ اُدْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ (۲-۵۸) کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۳۲) جو تم عمل کیا کرتے تھے ان کے بدلے بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

---

[1] والبیت من شواہد الکشاف ۳: ۱۲۳ واولہ: یتقارضون اذا التقوا فی مجلس۔ والبیت فی محاضرات المؤلف ۱: ۲۳) والصناعتین ۲۸۱، ۳۵۷ وفیہ مواطیٔ بالمواقع واللسان (نظر، قرض، زال) وفی روایتہ فی موطن بدل فی مجلس والشطر فی المقاییس ۲: ۳۳۱) والبیت فی المشکل للقتیبی ۱۳۰ ومجازات القرآن للرضی ۳۴۳ والشوکانی ۲۶۹ والقرطبی ۲۵۶ والفخر (۳۰: ۱۰۰) والبحر ۷: ۳۱ والطبری (۲۹: ۳۰) والغریب للقتیبی ۴۸۲ والبیان للجاحظ (۱: ۱۱) وفی روایتہ فی موقف بدل فی مجلس ۱۲

اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (۱۶-۲۹) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ اس میں رہو گے۔

وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۵۸-۲۲) اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں داخل کرے گا۔

وَيُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ (۷۶-۳۱) جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔
وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ (۱۷-۸۰) اور کہو کہ اے پروردگار مجھے (مدینے میں) اچھی طرح داخل کیجیو۔

میں مَدْخَلٌ (بفتح المیم)، دَخَلَ يَدْخُلُ سے ہوگا اور مُدْخَلٌ (بضمہ میم) ہو تو اَدْخَلَ يُدْخِلُ سے جیسے فرمایا:۔
لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ (۲۲-۵۹) وہ ان کو ایسے مقام میں داخل کریگا جسے وہ پسند کریں گے۔ اور آیت کریمہ:۔
مُدْخَلًا كَرِيْمًا (۴-۳۱) میں ہر دو قراءت منقول ہیں یعنی (میم کا ضمہ اور فتحہ) ابوعلی الفسوی[1] لکھتے ہیں کہ مَدْخَلًا (بفتح المیم) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جنت میں قصد اور ارادہ سے داخل ہوں گے۔ اور ان کی حالت اہل دوزخ کی سی نہیں ہوگی جن کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:۔
اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ (۲۵-۳۴) جو لوگ اپنے چہروں کے بل دوزخ کی طرف جمع کئے جائیں گے۔
اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی (اور) گھسیٹے جائیں گے۔
اور مُدْخَلًا پڑھا جائے تو یہ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ کی طرح ہوگا۔

اِدَّخَلَ۔ کسی جگہ میں بہ صد مشقت داخل ہونا گھس جانا۔ قرآن میں ہے:۔
لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا (۹-۵۷) اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مغاک یا زمین کے اندر گھسنے کی جگہ مل جائے۔

اَلدَّخَلُ۔ یہ دَغَلٌ کی طرح اندرونی عداوت، فساد یا کسی نسب کا دعوی کرنے سے کنایہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے:۔
دُخِلَ فُلَانٌ فِيْ عَقْلِهٖ اَوْ جَسَدِهٖ (ہ) فَهُوَ مَدْخُوْلٌ وَدَخِلَ (س)، دَخَلًا (کنایہ) یعنی اس کے عقل و جسم یا اصل میں خرابی پائی جاتی ہے۔ اسی سے اندر سے کھوکھلے درخت کو شَجَرَةٌ مَّدْخُوْلَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ (۱۶-۹۲) تم اپنی قسموں کو باہمی فساد کا ذریعہ بنانے لگو۔

اَلدِّخَالُ (الابل) وہ اونٹ جو ایک مرتبہ پانی پی چکا ہو اور اسے دوبارہ پیاسے اونٹوں کے درمیان حوض پر داخل کیا جائے تاکہ مزید پانی پی لے۔

اَلدُّخَّلُ۔ ایک چھوٹا سا دھندے رنگ کا پرند اور اسے دُخَّلٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گنجان درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔

اَلدَّوْخَلَةُ کھجور کے پتوں کا زنبیل۔

---

[1] الفارسی صاحب الایضاح والتکملۃ والمتولد ۲۸۸ھ المتوفی ۳۷۷ھ راجع لاحوالہ (من بحث آمین)

دَخَلَ بِامْرَءَتِہٖ (کنایہ) اس نے اپنی عورت سے مباشرت کی۔ قرآن میں ہے:۔

مِنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِھِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِھِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ (۴-۲۳) جن عورتوں سے تم مباشرت کر چکے ہو.... لیں اگر ان کے ساتھ تم نے مباشرت نہ کی ہو تو ان کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح کر لینے میں، تم پر کچھ گناہ نہیں۔

(د خ ن)

اَلدُّخَانُ۔ یہ اَلْعُثَانُ کے ہم معنی ہے یعنی اس دھوئیں کو کہتے ہیں جو آگ کے شعلہ کے ساتھ نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ (۴۱-۱۱) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دھوئیں کی مثل تھا یعنی اس میں تماسک نہیں تھا۔

دَخَنَتِ النَّارُ تَدْخُنُ۔ آگ کا کثرت سے دھواں دینا اسی سے دُخْنَۃٌ ہے لیکن عرف میں اس خوشبو کو دُخْنَۃٌ کہا جاتا ہے جس سے دھونی دی جاتی ہے۔

دَخِنَ الطَّبِیْخُ۔ پکی ہوئی چیز کا دھوئیں سے خراب ہو جانا۔ اور دُخَان سے لون (رنگ) کے معنی لے کر کہا جاتا ہے۔ شَاۃٌ دَخْنَاءُ وَذَاتُ دُخْنَۃٍ دھوئیں جیسی سیاہ بکری۔

لَیْلَۃٌ دَخْنَانَۃٌ تاریک رات۔

اور اس سے ایذا رسانی کے معنی لیکر ھُوَ دَخِنُ الْخُلُقِ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں یعنی وہ بد خلق ہے۔ ایک روایت میں ہے[1]: (۱۲۵)

ھُدْنَۃٌ عَلٰی دَخَنٍ۔ یعنی صلح ہو جائے گی لیکن دلوں میں کینہ ہوگا۔

(د ر ر)

اَلْمِدْرَارُ (صیغۂ مبالغہ) بہت برسنے والا قرآن میں ہے:۔

وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْھِمْ مِّدْرَارًا (۶-۶) اور ان پر آسمان سے لگاتار مینہ برسایا۔

یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا (۷۱-۱۱) وہ تم پر آسمان سے لگاتار مینہ برسائے گا۔

اصل میں مِدْرَار، دَرٌّ اور دِرَّۃٌ سے ہے جس کے معنی دودھ کے ہیں۔ پھر بطور استعارہ بارش کے لئے استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ اونٹ کے دیگر اسماء و اوصاف بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔

لِلّٰہِ دَرُّہٗ (اس کی خوبی اللہ کے لئے ہے (تعجب) کَثُرَ دَرُّكَ تمہاری خیر زیادہ ہو۔

پھر بطور استعارہ بازار کے پُر رونق ہونے پر لِلسُّوْقِ دِرَّۃٌ (بازار پر رونق ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

مثل مشہور ہے (مثل) سَبَقَتْ دِرَّتُہٗ غِرَارَہٗ اس کی تلوار پر خون سبقت کر جاتا ہے) جیسا کہ ضرب المثل کے طور پر (مثل) سَبَقَ سَیْلُہٗ مَطَرَہٗ (اس کی بارش سے قبل ہی سیلاب آجاتا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ اِسْتَدَرَّتِ الْمِعْزٰی۔ یعنی بکری نے نر سے جفتی کی خواہش کی کیونکہ بکری حاملہ ہوگی تو بچہ جنے گی اور بچہ جنے گی تو دودھ دے گی لہٰذا

---

[1] من حدیث حذیفۃ بن الیمان وبعدہ دجماعۃ علی اقذاء مثل تکدہ رنیاتہم وفقد نصانیہم الفائق ۲/۲۲۲ والبو اؤد ۲۱۳:۳ ۵۸ ❊

اِسْتَدْبَارٌ کا لفظ بول کر نر کی خواہش سے کنایہ کیا جاتا ہے۔

(د ر ء)

اَلدَّرْءُ (ف)، کے معنی دنیزہ وغیرہ کے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ قَوَّمْتُ دَرْءَهٗ میں نے اس کی کجی کو درست کر دیا۔ دَرَءْتُ عَنْهُ۔ میں نے اس سے دفع کیا قرآن میں ہے: وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۱۳-۲۲) اور نیکی کے ذریعہ برائیوں کا مقابلہ کرتے ہیں وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ (۲۴-۸) اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے۔
حدیث میں ہے (۱۲۶) اِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ شرعی حدود کو شبہات سے دفع کرو اس میں تنبیہ کیا ہے کہ حدود کو دفع کرنے کے لئے حیلہ کرنا چاہیے
قرآن میں ہے:۔
فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ.... (۳-۱۶۸)
تو اپنے اوپر سے موت کو ٹال دینا۔
اور آیت کریمہ:۔
فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا (۲-۷۲) (تو اس میں تم باہم جھگڑنے لگے۔
میں اِدَّارَءْتُمْ اصل میں تَدَارَأْتُمْ ہے تخفیف کے لئے تاء کو دال سے بدل کر ادغام کر دیا گیا ہے اور شروع میں ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصلی لایا گیا ہے لہٰذا یہ اِفَّاعَلْتُمْ کے وزن پر ہے۔ بعض ادبا نے کہا ہے اِدَّارَءْتُمْ بروزن اِفْتَعَلْتُمْ ہے مگر یہ چند وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔ اوّل یہ کہ اِدَّارَءْتُمْ کے آٹھ حروف ہیں اور اِفْتَعَلْتُمْ کے صرف سات حرف ہیں۔ دوم یہ کہ اس میں ہمزہ وصلی کے بعد حرف تاء ہے جسے دال سے تبدیل کیا گیا ہے (اور اِفْتَعَلْتُمْ میں ایسے نہیں ہے) سوم یہ کہ اگر اِفْتَعَلْتُمْ کے وزن پر ہوتا تو دوسرے حرف کے بعد دال کو تاء سے تبدیل کرنا چاہیئے تھا۔ چہارم یہ کہ جس فعل کا عین کلمہ حرف صحیح ہو اس میں تاء افتعال کا مابعد ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ مگر یہاں اسے ساکن بنا لیا گیا ہے پنجم یہ کہ یہاں تاء اور دال کے درمیان حرف زائد لایا گیا ہے۔ حالانکہ باب افتعال میں یہ نہیں ہوتا۔ ششم یہ کہ اسے باب افتعال سے ماننے کی صورت میں الف کو عین کلمہ ماننا پڑے گا۔ حالانکہ وہ موضع عین میں نہیں ہے۔ ہفتم یہ کہ دو حروف اِفْتَعَلَ کی تاء سے قبل ہیں اور اس کے بعد بھی دو ہی ہیں۔ مگر اِدَّارَأْتُمْ میں تاء کے بعد تین حروف ہیں۔

(د ر ج)

اَلدَّرَجَةُ۔ کا لفظ منزلۃ کے ہم معنی ہے مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مَنْزِلَةٌ (اترنے کی جگہ) کو درجۃ اس وقت کہتے ہیں جب اس سے صعود یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار کیا جائے ورنہ بسیط جگہ پر امتداد کے اعتبار سے اسے درجۃ نہیں کہتے جیسا کہ چھت اور سیڑھی کے درجات ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا اطلاق منزلہ رفیعہ یعنی

۱؎ روی عن علی مرفوعاً لکنہ منکر وعن ابن مسعود موقوفاً وفی مسند ابی حنیفۃ الحارثی عن ابن عباس مرفوعاً وکذا عن عقبۃ بن عامر ومعاذ وعمرو وغیرہ احد من الصحابۃ لکن جملۃ الآثار لاتخلو عن ضعف او نکارۃ واصح ما فیہ قول ابن مسعود راجع النیل (۷: ۱۱۰-۱۱۱) وبمعناہ فی ابن ماجۃ وعن عائشۃ فی الترمذی موقوفاً ۲؎ تاریخ الطبری ۱/ ۲۵۶-۲۵۷

بلند مرتبہ پر بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲-۲۲۸) البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔
میں تنبیہ کی ہے کہ عقل و سیاست وغیرہ کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے جس کی طرف آیت:۔
اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (۴-۳۴) مرد عورتوں کے قوام اور منتظم ہیں۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔
اور اہل جنت کے متعلق فرمایا:۔
لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۸-۴) اور ان کے لئے پروردگار کے ہاں (بڑے بڑے) درجے ہیں۔۔۔۔۔
هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (۳-۲۳) یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصحاب درجات ہوں گے اور تشبیہ کے طور پر ستاروں کے منازل کو دَرَجَاتُ النُّجُوْمِ کہا جاتا ہے۔
مَدْرَجَةٌ۔ راستے کا وسط اور وسیع حصہ۔
فُلَانٌ يَتَدَرَّجُ فِي كَذَا فلاں اس پر درجہ بدرجہ چڑھ رہا ہے۔
دَرَجَ الشَّيْخُ وَالصَّبِيُّ دَرَجَانًا۔ بوڑھے اور بچے کا اس طرح آہستہ آہستہ چلنا جیسا کہ سیڑھی پر چڑھنے والا چلتا ہے۔
اَلدَّرْجُ۔ کتاب یا کپڑے کی تہ اور لپیٹے ہوئے مراسلہ یا کپڑے کو بھی دَرْج کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ دَرْج بمعنی موت بھی آجاتا ہے۔ جیسا کہ طَوَتْهُ الْمَنِيَّةُ میں طَيٌّ کا لفظ موت کے لئے مستعار ہے۔ اور محاورہ ہے:۔
مَنْ دَبَّ وَدَرَجَ یعنی جو زندہ اور چل پھر رہا ہے اور جو مر چکا ہے اور اس نے اپنے دفتر زندگی کو لپیٹ لیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۷-۱۸۲) ہم ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم نہ ہوگا۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ ہم انہیں کتاب کی طرح لپیٹ لیں گے۔ یہ ان کی بے خبری اور غفلت سے کنایہ ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔۔۔۔ اس کا کہا نہ ماننا۔
بعض نے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کے معنی یہ کئے ہیں کہ ہم انہیں بتدریج پکڑیں گے بایں طور کہ انہیں آہستہ آہستہ کسی چیز (جہنم) کے قریب لارہے ہیں جیسا کہ سیڑھیوں اور منزلوں پر چڑھا یا ان سے نیچے اترا جاتا ہے۔
دُرْجٌ۔ چھوٹا سا تھیلا جس میں عورتیں خوشبو اور سنگار کا دیگر سامان رکھتی ہیں۔ اَلدُّرْجَةُ۔ وہ لتہ جسے لپیٹ کر ناقہ کی کس میں رکھ دیا جاتا ہے اَلدُّرَّاجُ تیتر کیونکہ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہے۔

(د ر س)

دَرَسَ الدَّارُ۔ گھر کے نشان باقی رہ گئے اور نشان کا باقی رہنا چونکہ شے کے فی ذاتہ مٹنے کو چاہتا ہے اس لئے دُرُوْسٌ کے معنی اِنْمِحَاءٌ یعنی مٹ جانا کر لئے جاتے ہیں اسی طرح دَرَسْتُ الْكِتَابَ وَالْعِلْمَ کے اصل معنی کتاب یا علم کو حفظ کر کے اس کا اثر لے لینے کے ہیں اور اثر کا حاصل ہونا مسلسل قراءت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے دَرَسْتُ الْكِتَابَ کے معنی

سلسل پڑھنا کے آتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ (۷-۶۹) اور جو کچھ اس (کتاب)
میں ہے اس کو انہوں نے پڑھ بھی لیا ہے۔
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ
تَدْرُسُوْنَ (۳-۷۹) کیونکہ تم کتاب (خدا کی)
تعلیم دیتے اور اسے پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔
وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا (۳۴-۴۴)
اور ہم نے نہ تو ان کو کتابیں دیں جن کو یہ پڑھتے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ (۶-۱۰۵) میں ایک قراءت
دَارَسْتَ بھی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کافر یہ
نہ کہیں کہ تم نے کتاب کو دوسروں سے پڑھ لیا۔
بعض نے کہا ہے وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ (۷-۱۶۹)
کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اس پر عمل ترک کر دیا
اور یہ دَرَسَ الْقَوْمُ الْمَكَانَ کے محاورہ سے
ماخوذ ہے۔ یعنی انہوں نے مکان کے نشانات مٹا دیئے۔
دَرَسَتِ الْمَرْأَةُ (کنایہ) عورت کا حائضہ ہونا۔
دَرَسَ الْبَعِيْرُ۔ اونٹ کے جسم پر خارش
کے اثرات ظاہر ہونا۔

(د ر ك)

اَلدَّرْكُ اور دَرْج کے ایک ہی معنی ہیں۔
لیکن اَلدَّرْجُ کا لفظ اوپر چڑھنے کے اعتبار سے
بولا جاتا ہے اور اَلدَّرْكُ کا لفظ نیچے اترنے کے
لحاظ سے اس لئے دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ اور دَرَكَاتُ
النَّارِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ پستی کے
اعتبار سے دوزخ کو هَاوِيَةٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ
(۴-۱۴۵) کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ
کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہوں گے۔
اور سمندر کی گہرائی کی تہہ اور اس رسی کو جس کے
ساتھ پانی تک پہنچنے کے لئے دوسری رسی ملائی جاتی
ہے، بھی دَرَكٌ کہا جاتا ہے۔ اور دَرَكٌ بمعنی
تاوان بھی آتا ہے مثلاً خرید و فروخت میں بیعانہ
کو دَرَكٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى (۲۰-۷۷) پھر
تم کو نہ تو (فرعون کے) آپکڑنے کا خوف ہو گا اور
نہ (غرق ہونے کا) ڈر۔
اَدْرَكَ۔ کسی چیز کی غایت کو پہنچنا، یا لینا جیسے
اَدْرَكَ الصَّبِيُّ لڑکا بچپن کی آخری حد کو پہنچ گیا
یعنی بالغ ہو گیا۔ قرآن میں ہے:۔
حَتّٰى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (۱۰-۹۰) یہاں
تک کہ اس کو غرق (کے عذاب) نے آپکڑا۔
اور آیت کریمہ:۔
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ
(۶-۱۰۳) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک
نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔
کو بعض نے ادراک بصری کی نفی پر حمل کیا ہے
اور بعض نے ادراک کی نفی بلحاظ بصیرت مراد لی
ہے اور کہا ہے کہ اس آیت سے اس معنی پر تنبیہ
کی ہے جو کہ حضرت ابوبکرؓ کے قول "يَا مَنْ غَايَةُ
مَعْرِفَتِهِ الْقُصُوْرُ عَنْ مَعْرِفَتِهِ" (اے وہ
ذات جس کی غایت معرفت بھی اس کی معرفت سے
کوتاہی کا نام ہے) میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ
کی معرفت کی غایت یہ ہے کہ انسان کو تمام اشیاء
کا کما حقہ علم حاصل ہونے کے بعد یہ یقین ہو جائے
کہ ذات باری تعالیٰ نہ کسی کی جنس ہے اور نہ ہی
کسی چیز کی مثل ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کی موجد ہے

تَتَدَارُكُ۔ (پا لینا) یہ زیادہ تر نعمت اور فریاد رسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَوْلَآ اَنْ تَدَارَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (۶۸-۴۹)
اگر تمہارے پروردگار کی مہربانی ان کی یاوری نہ کرتی۔
اور آیت کریمہ:۔
حَتّٰٓی اِذَا ادّٰرَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا (۷-۳۸)
یہاں تک کہ جب سب اس میں داخل ہو جائیں گے۔
کے معنی یہ ہیں کہ جب سب کے سب اس میں ایک دوسرے کو آملیں گے۔ پس اِدّٰرَكُوْا اصل میں تَدَارَكُوْا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔
بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (۲۷-۶۶)
بلکہ آخرت کے بارے میں انکا علم منتہی ہو چکا ہے۔
میں اِدّٰرَكَ اصل میں تَدَارَكَ ہے تاء کو دال میں ادغام کرنے کے بعد ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصل لایا گیا ہے جس طرح کہ آیات:۔
اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (۹-۳۸) اور اِطَّيَّرْنَا بِكَ (۲۷-۴۷) میں ہے ایک قراءت میں بَلْ اَدْرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ہے حسنؒ نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ امور آخرت سے سراسر غافل ہیں، مگر اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ آخرت کو پالینے سے انکا علم منتہی ہو چکا ہے اس بنا پر وہ اس سے جاہل اور بے خبر ہیں۔ بعض نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ انہیں آخرت میں ان چیزوں کی حقیقت معلوم ہو جائیگی کیونکہ دنیا میں جو چیزیں محض ظنون نظر آتی ہیں آخرت میں ان کے متعلق یقین حاصل ہو جائے گا۔

(د ر ہ م)

اَلدِّرْهَمُ۔ چاندی کے ایک سکہ کا نام ہے اسکی جمع دَرَاهِمُ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ (۱۲-۲۰)
اور اسکو تھوڑی سی قیمت (یعنی) معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا۔

(د ر ی)

اَلدِّرَايَةُ اس معرفت کو کہتے ہیں جو کسی قسم کے حیلہ یا تدبیر سے حاصل کی جائے اور یہ دَرَيْتُهٗ وَدَرَيْتُ بِهٖ دِرْيَةً دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (یعنی اس کا تعدیہ باء کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اور باء کے بغیر بھی) جیسا کہ فَطِنْتُ وَشَعَرْتُ ہے اور اِدَّرَيْتُ بمعنی دَرَيْتُ آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] ع (الوافر)
(۱۵۲) وَمَاذَا يَدَّرِيْ الشُّعَرَآءُ مِنِّيْ
وَقَدْ جَاوَزْتُ رَاْسَ الْاَرْبَعِيْنَ
اور شعراء مجھے کیسے دھوکہ دے سکتے ہیں جب کہ میں چالیس سے تجاوز کر چکا ہوں۔ قرآن میں ہے۔
لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۶۵-۱) تجھے کیا معلوم شاید خدا اس کے بعد کوئی رجعت کی سبیل پیدا کر دے۔
وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ (۲۱-۱۱۱) اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لئے آزمائش ہو۔
مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ (۴۲-۵۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے۔
اور قرآن پاک میں جہاں کہیں وَمَآ اَدْرٰكَ آیا ہے

---

[1] قالہ سحیم بن وثیل الریاحی وفی اللسان والمحکم وطبع ، آخرہ بدل رأس والبیت فی البحتری ۲۵ والکامل ۵۰۴ وفی ترجمتہ فی الاصابۃ (۲: ۱۱۰) والسمط (۵۵۸) والسیوطی ۷۵ والعینی (۱: ۱۹۱) والخزانۃ (۱: ۱۲۶) والاصمعیات ۷۳ واصلاح یعقوب ۵۶ ونقد الشعر ، وفیہ یبتغی بدل یدری ومجالس ثعلب ۷۶ والاشباہ (۴: ۱۵۲) والبیت کانہ مقیدۃ القافیۃ فیہ اقواء ولعدہ :۔ اخو خمسین مجتمع اشدی ونجذنی مداورۃ الشئون ۱۲ ؎

وہاں بعد میں اس کا بیان بھی لایا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ۔ نَارٌ حَامِيَةٌ (۱۰۱-۱۰-۱۱)
اور تم کیا سمجھے کہ ہاویہ کیا ہے؟ (وہ) دھکتی ہوئی آگ ہے۔
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۹۷-۲-۳) اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر۔
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ (۶۹-۳) اور تم کو کیا معلوم ہے کہ سچ مچ ہونے والی کیا چیز ہے؟
ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ (۸۲-۱۷) اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ (۱۰-۱۶) (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا تو (نہ تو) میں ہی یہ کتاب تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ ہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔
میں اَدْرٰىكُمْ دَرَيْتُ سے ہے کیونکہ اگر دَرَأْتُ سے ہوتا تو وَلَآ اَدْرَأْتُكُمُوْهُ کہا جاتا۔ اور جہاں کہیں قرآن میں وَمَا يُدْرِيْكَ آیا ہے اس کے بعد اس کا بیان مذکور نہیں ہے[۱] جیسے فرمایا:
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى (۸۰-۳)۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ (۴۲-۱۷) اور تم کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہی آپہنچی ہو۔
یہی وجہ ہے کہ دِرَايَةٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا اور شاعر کا قول[۲] ع (

(۱۵۳) لَاهُمَّ لَآ اَدْرِيْ وَاَنْتَ الدَّارِيْ
اے اللہ میں نہیں جانتا اور تو خوب جانتا ہے۔
میں جو اَنْتَ الدَّارِيْ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوا ہے تو یہ بے سمجھ اور اجڈ بدو کا قول ہے (لہٰذا حجت نہیں ہو سکتا)
اَلدَّرِيَّةُ (۱) ایک قسم کا حلقہ جس پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہے۔
(۲) وہ اونٹنی جسے شکار کو مانوس کرنے کے لئے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اور شکاری اسکی اوٹ میں بیٹھ جاتا ہے تاکہ شکار کر سکے۔
اَلْمِدْرٰى (۱) بکری کا سینگ کیونکہ وہ اس کے ذریعہ مدافعت کرتی ہے۔ اسی سے استعارۃً کنگھی یا باریک سینگ کو مدرٰی کہا جاتا ہے[۳]۔ جس سے عورتیں اپنے بال درست کرتی ہیں۔

(د س ر)

اَلدُّسُرُ: میخیں اس کا واحد دِسَارٌ ہے قرآن میں ہے:۔
وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۵۴-۱۳)
اور ہم نے نوحؑ کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔
اصل میں دَسْرٌ کے معنی کسی چیز کو زور سے مار کر ہٹا دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔ دَسَرَهٗ بِالرُّمْحِ۔ اسے نیزہ مار کر پیچھے ہٹا دیا اور رَجُلٌ

---

[۱] و فی الصحاح: و قرئ ولا ادرأتکم بہ، والوجہ فیہ ترک الھمزۃ (راھد) و فی اعراب ثلاثین ھمزۃ الحسن البصری فی بعض الآیات وکذبہ النحویون وکذا الاختلاف فی الدریۃ۔ قال ابو زید ھو ہمو ر... لکن الجمہور علی ترک الہمزۃ [۲] منقول عن الفراء راجع اعراب ثلاثین لابن خالویہ۔ لم
[۲] البیت فی الصحاح واللسان (دری) (لہم) وتمامہ... کل امریٔ منک علی مقدار ۱۲ [۳] و فی الحدیث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان فی یدہ مدری یحک بہ راسہ (الفائق ۱/۱۹۶)

مِطْعَنٌ کی طرح مِدْسَرٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بہت بڑے نیزہ باز کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے[1] (۱۲۷)

لَیْسَ فِی الْعَنْبَرِ زَکٰوۃٌ اِنَّمَا ھُوَ شَیْئٌ دَسَرَہُ الْبَحْرُ کہ عنبر میں زکوٰۃ نہیں ہے وہ ایک چیز ہے جسے سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے۔

(د س س)

اَلدَّسُّ (ن) کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں زبردستی داخل کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ دَسَسْتُہٗ فَدَسَّ۔ میں نے اسے ٹھونسا تو وہ ٹھنس گیا[2]

دُسَّ الْبَعِیْرُ بِالْھِنَاءِ۔ اونٹ پر زبردستی قطران مل گئی۔

بعض کہتے ہیں کہ قطران کے متعلق دَسٌّ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے:۔

اَمْ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ (۱۶-۵۹) یا زمین میں گاڑ دے۔

(د س ی)

دَسّٰی (تفعیل) کے معنی کسی چیز کو مٹی میں چھپا دینے اور گم کر دینے کے ہیں۔ یہ اصل میں دَسَّسَ تھا تخفیف کے لئے ایک سین کو یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے جیسا کہ تَظَنَّنْتُ سے تَظَنَّیْتُ بنا لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (۹۱-۱۰) اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد اور ناکام رہا۔

(د ع ع)

اَلدَّعُّ کے معنی سختی کے ساتھ دھکا دینے کے ہیں۔ اصل میں یہ کلمہ زجر ہے جس طرح پھسلنے والے کو دبطور دعا لَعًا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دَعْ دَعْ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَھَنَّمَ دَعًّا (۵۲-۱۳) جس دن وہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائیں گے۔

فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (۱۰۷-۲) یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے[3] (   )

(۱۵۴) دَعَّ الْوَصِیِّ عَلٰی قَفَاءِ یَتِیْمِہٖ

جیسا کہ وصی یتیم کی گدی پر گھونسا مارتا اور اسے دھکے دیتا ہے۔

(د ع و)

اَلدُّعَاءُ (ن) کے معنی ندا کے ہیں مگر ندا کا لفظ کبھی صرف یا، اَیَا وغیرہما حروف ندا پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے بعد منادیٰ مذکور نہ ہو لیکن دُعاء کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب حرف ندا کے ساتھ اسم (منادیٰ) بھی مذکور ہو جیسے[4]:۔ یَا فُلَانُ۔ کبھی یہ دونوں یعنی دعاء اور نداء ایک دوسرے کی جگہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَاءً وَّنِدَآءً (۲-۱۷۱) (ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

اور کبھی دُعاء بمعنی تسمیہ (نام رکھنا) آجاتا ہے

---

[1] الحدیث موقوف علی ابن عباس راجع الفائق ار ۱۹۷ وبحث عنہ صاحب الامالی وعنہ ایضًا لیس العنبر بزکاۃ راجع البخاری مع الفتح ۸ر۱۰۵ [2] وفی الحدیث العرق دساس من روایۃ ابن عمر والفائق ار۲۲۱ [3] لم اجدہ [4] یحیی قال ان الفتح للحافظ ۱۲ر۳۳۸

جیسے دَعَوْتُ ابْنِی زَیْدًا[1] میں نے اپنے لڑکے کا نام زید رکھا۔ اور آنحضرتؐ کی تعظیم پر رغبت دلاتے ہوئے فرمایا[2]:۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَاءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا۔ (۲۴-۶۳) مومنو! پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔

کیونکہ بعض لوگ آنحضرتؐ سے مخاطبت کے وقت آپ کو "یا محمدؐ" کہہ کر پکارتے تھے۔

اور دَعَوْتُہٗ کے معنی سوال یا مدد طلب کرنا بھی آتے ہیں[3]۔ قرآن میں ہے:۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ۔ انہوں نے کہا (اب کے) اپنے پروردگار سے پھر درخواست کیجیے۔

اور آیت کریمہ:۔

قُلْ أَرَأَیْتَکُمْ إِنْ أَتَاکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ أَوْ أَتَتْکُمُ السَّاعَةُ أَغَیْرَ اللّٰہِ تَدْعُوْنَ إِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ۔ بَلْ إِیَّاہُ تَدْعُوْنَ۔

(۶-۴۰-۴۱) کہو (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو تو کیا تم (ایسی حالت میں) خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ اگر سچے ہو (تو بتاؤ) (نہیں) بلکہ (مصیبت کے وقت تم) اسی کو پکارتے ہو۔

میں تنبیہ کی ہے کہ جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے ہی گڑگڑا کر دعا اور عاجزی کرتے ہو۔

وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ (۷-۵۶) اور خدا سے خوف کرتے ہوئے اور امید رکھ کر دعائیں مانگتے رہنا۔

وَادْعُوْا شُھَدَاءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ إِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ (۲-۲۳) اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ مُنِیْبًا إِلَیْہِ۔ (۳۹-۸) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کو پکارتا (اور) اس کی طرف دل سے رجوع کرتا ہے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِہٖ (۱۰-۱۲) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا ہمیں پکارتا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ (۱۰-۱۰۶) اور خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کو نہ پکارنا جو نہ تمہارا بھلا کرسکے اور نہ کچھ بگاڑ سکے۔

اور آیت کریمہ:۔

لَا تَدْعُوا الْیَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا کَثِیْرًا۔ (۲۵-۱۴) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بہت سی موتوں کو پکارو۔

دعائے ثبور سے یَا لَھْفَاہُ یَا حَسْرَتَاہُ وغیرہ کلمات تاسف کہنا اور واویلا کرنا مراد ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ آج تم پر ایک مصیبت نہیں ہے بلکہ بہت سے غموم و مصائب کا سامنا ہوگا۔

اَلدُّعَاءُ (إِلَی الشَّیْءِ) کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے پر رغبت دلانے اور اکسانے کے ہیں۔

---

[1] کذا ذکرالحافظ فی الفتح ۱۳/۲۳۸ [2] وجملة القول ان لفظ الدعاء جاء فی القرآن لستة معان العبادة ولم یذکرہ المؤلف والایة ادعونی استجب لکم بمعنی العبادة بدلیل ما بعدھا والاستغاثة والسؤال والقول والنداء والثناء راجع شرح الاسماء الحسنٰی لابی القاسم القشیری [3] وایضاً دعا بمعنی جعل کما فی قولہ تعالیٰ: اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۱۹-۹۱)

قرآن میں ہے :۔

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ (۱۲-۳۳) کہ پروردگار جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔

وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ (۱۰-۲۵) اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

وَیٰقَوْمِ مَالِیْٓ اَدْعُوْکُمْ اِلَی النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَی النَّارِ o تَدْعُوْنَنِیْ لِاَکْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِکَ بِهٖ۔ (۴۰-۴۱، ۴۲) اور اے قوم میرا حال ہے کہ میں تو تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی (آگ کی طرف بلاتے ہو۔ تم مجھے اس لئے بلاتے ہو کہ خدا کے ساتھ کفر کروں اور....

.... اس کا شریک مقرر کروں۔

اور آیت کریمہ :۔

لَا جَرَمَ اَنَّ مَا تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ۔ (۴۰-۴۳) سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کو دنیا اور آخرت میں بلانے (یعنی دعا قبول کرنے) کا مقدور نہیں ہے۔

میں دَعْوَةٌ کے معنی رفعت اور عظمت کے ہیں[1]۔

اَلدِّعْوَةُ۔ کے معنی خاص کر نسب کا دعویٰ کرنے کے آتے ہیں۔ اصل میں یہ قِعْدَةٌ وَجِلْسَةٌ کی طرح فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے جو حالت کے لئے آتا ہے۔ مثل مشہور ہے :۔

دَعْ دَاعِیَ اللَّبَنِ (مثل) یعنی دودھ اتارنے کے لئے تھوڑا سا دودھ تھنوں میں چھوڑ دے[2]۔

اَلْاِدِّعَاءُ کے معنی کسی چیز کے متعلق دعویٰ کرنے کے ہیں (کہ یہ میری ہے) اور جنگ میں اِدِّعَاء کے معنی اپنے کو کسی طرف منسوب کرنا ہوتے ہیں[3] (کہ میں فلاں قوم سے ہوں یا فلاں کا بیٹا ہوں وغیرہ) اور آیت کریمہ :۔

وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ o نُزُلًا (۴۱-۳۲) اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لئے (موجود ہوگی یہ) مہمانی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم جنت میں جو چیز طلب کرو گے حاضر کردی جائے گی۔

اور دَعْوٰی کبھی بمعنی اِدِّعَاءٌ بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا :۔

فَمَا کَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ (۷-۵) توجس وقت ان پر عذاب آتا تھا ان کے منہ سے یہی نکلتا تھا۔

اور کبھی بمعنی دعا کے[4] جیسے فرمایا :۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۰-۱۰) اور ان کا آخری قول یہ (ہوگا) کہ خدائے رب العٰلمین کی حمد (اور اسکا شکر) ہے۔

(د ف ء)

اَلدِّفْءُ۔ گرمی، حرارت یہ بَرْدٌ (سردی) کی ضد ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

لَکُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ (۱۶-۵) ان میں تمہارے لئے جڑاول اور بہت سے فائدے ہیں۔

میں دِفْءٌ سے جاڑے کا سامان مراد ہے۔

رَجُلٌ دِفْاٰنٌ (مؤنث دِفْاٰئِی) گرمی حاصل کرنیوالا۔

---

[1] کذا نقل عن المؤلف الحافظ فی الفتح (۱۳-۳۲۸) [2] امر صلی اللہ علیہ وسلم ضرار بن ازور ان یحلب ناقۃ فقال لہ (الفائق ۱/۴۱۹ والنہایہ دعا) وغریب ابی عبید [3] کما قال صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاحد: انا ابن عبد المطلب ومن الدعوة الدعیٰ وجمعہ اَدْعِیَاءُ (۳۳-۴) [4] والدعوی ہہنا بمعنی القول راجع الفتح للحافظ ۱۳/۳۲۸

بَیْتٌ دَفِیْئٌ گرم مکان۔

(د ف ع)

اَلدَّفْعُ (دفع کرنا، ہٹا دینا) جب اس کا تعدیہ بذریعہ اِلٰی ہو تو اس کے معنی دے دینے اور حوالے کر دینا ہوتے ہیں جیسے فرمایا:۔
فَادْفَعُوْٓا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (۴-۶) تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔
اور جب بذریعہ عَنْ متعدی ہو تو اس کے معنی مدافعت اور حمایت کرنا ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
اِنَّ اللّٰهَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲۲-۳۸)
خدا تو مومنوں سے ان کے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔
وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ۔ (۲-۲۵۱) اور خدا لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے ہٹاتا نہ رہتا۔
اور آیت کریمہ:۔
لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ (۷۰:۲-۳) کوئی اس کو ٹال نہ سکے گا۔ (اور وہ) خدائے صاحب درجات کی طرف سے (نازل ہوگا)
میں دَافِعٌ کے معنی حامی اور محافظ کے ہیں۔
اَلْمُدَفَّعُ ہر جگہ سے دھتکارا ہوا۔ ذلیل اور رسوا۔
اَلدُّفْعَةُ بارش کی بوچھاڑ۔ اَلدُّفَّاعُ سیلاب کا زور۔

(د ف ق)

اَلدَّفْقُ (مصدر ن) کے معنی سرعت کے ساتھ بہنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۔ (اچھل کر تیزی سے گرنے والے والے پانی سے۔ (۸۶-۶)
اسی سے بطور استعارہ جَآءُوْا دُفْعَةً (وہ یکبارگی آ گئے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور تیز رفتار اونٹ کو بَعِیْرٌ اَدْفَقُ کہتے ہیں۔
مَشٰی الدِّفِقّٰی اس طرح تیز رفتاری سے چلا جیسے زور سے بہنے والا پانی اچھل کر گرتا ہے اور بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔
مَشَوْا دِفَقًّا۔ وہ تیز چلے۔

(د ک ک)

اَلدَّكُّ (اسم) کے معنی نرم اور ہموار زمین کے ہیں۔ اور دَكَّهٗ (ن) دَكًّا کے معنی کوٹ کر ہموار کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (۶۹-۱۴) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھا لئے جائیں گے پھر ایک بارگی توڑ کر برابر کر دیئے جائیں گے۔
وَدُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (۸۹-۲۱)[1]
یعنی زمین کوٹ کوٹ کر ہموار کر دی جائیگی۔
فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا (۷-۱۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر نمودار ہوا تو (تجلی انوار ربانی نے) اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔
اور اسی سے دُكَّان ہے جس کے معنی ہموار چبوترہ کے ہیں۔
اَلدَّكَّاءُ نرم ریت۔ اَرْضٌ دَكَّاءُ ہموار زمین۔ ج دُكٌّ۔ اور ہموار زمین کے ساتھ تشبیہ دے کر نَاقَةٌ دَكَّاءُ اس اونٹنی کو کہہ دیتے ہیں جس کی کوہان نہ ہو۔[2]

---

[1] وفی المطبوع الجبال مکان الارض خطأ مطبعی ۱۲ [2] قارن المجاز لابی عبیدہ (۱/۳۱۵)

(د ل ل)

اَلدَّلَالَۃُ۔ جس کے ذریعہ کسی چیز کی معرفت حاصل ہو جیسے الفاظ کا معانی پر دلالت کرنا اور اشارات در موز اور کتابت کا اپنے مفہوم پر دلالت کرنا اور حساب میں عقود کا عدد مخصوص پر دلالت کرنا وغیرہ اور پھر دلالت عام ہے کہ جاعل یعنی واضع کی وضع سے ہو یا بغیر وضع اور قصد کے ہو مثلاً ایک شخص کسی انسان میں حرکت دیکھ کر جھٹ جان لیتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ (۳۴-۱۴) تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا مگر گھن کے کیڑے سے۔

اصل میں دَلَالَۃٌ کا لفظ کِنَایَۃٌ وَاَمَارَۃٌ کی طرح مصدر ہے۔ اور اسی سے دَالٌّ صیغہ صفت فاعل ہے یعنی وہ جس سے دلالت حاصل ہو اور دَلِیْلٌ صیغہ مبالغہ ہے جیسے عَالِمٌ وَعَلِیْمٌ وَقَدِیْرٌ[1] ہے۔ کبھی دَالٌّ وَدَلِیْلٌ بمعنی دَلَالَۃٌ (مصدر) آجاتے ہیں اور یہ تسمیۃ الشیئ بمصدرہ کے قبیل سے ہے۔

(د ل ك)

دُلُوْكُ (الشَّمْسِ) کے معنی ہیں آفتاب کا (زوال) مائل بہ غروب ہونا۔ قرآن میں ہے:۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (۱۷-۷۸) (اے محمدؐ) سورج کے ڈھلنے سے .... نماز .... پڑھا کرو۔

یہ اصل میں دَلَکْتُ الشَّمْسَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کوئی چیز دیکھنے کے لئے آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھ کر دھوپ کو دفع کرنا۔ اور اسی سے دَلَکْتُ الشَّیْئَ فِی الرَّاحَۃِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی چیز کو ہتھیلی میں لے کر ملنے کے ہیں۔ دَلَکْتُ الرَّجُلَ لیت لعل کرنا۔

اَلدَّلُوْكُ۔ ایک قسم کی خوشبو جسے بدن پر ملا جاتا ہے۔

اَلدَّلِیْكُ۔ ایک قسم کا کھانا جو مسکہ اور کھجور سے تیار ہوتا ہے۔

(د ل و)

دَلَوْتُ الدَّلْوَ۔ کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں اور اَدْلَیْتُهَا کے معنی ڈول بھر کر نکالنے کے ابو منصور نے لکھا ہے کہ اَدْلٰی کے معنی ڈول کنویں میں ڈالنے کے آجاتے ہیں۔ قرآن میں ہے[2]:۔

فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ (۱۲-۱۹) اس نے کنویں میں ڈول لٹکایا۔

اسی سے بطور استعارہ اَدْلٰی کے معنی کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی آجاتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[3] (ع)

(۱۵۵) وَلَیْسَ الرِّزْقُ عَنْ طَلَبٍ حَثِیْثٍ
وَلٰکِنْ اَلْقِ دَلْوَكَ فِی الدِّلَاءِ

رزق جدوجہد سے حاصل نہیں ہوتا ہاں تمہیں اس کے لئے وسائل تلاش کرنا چاہیئے۔ اسی بنا پر وسیلہ کو مَا یُدْلٰی بِہٖ[4] کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے (ع) (الطویل)

---

[1] وفی التنزیل ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلا (۲۵-۴۵)، [2] راجع تاج المصادر للبیہقی [3] البیت فی محاضرات المؤلف (۲: ۲۹۴) وفی روایۃ: وما طلب المعیشۃ بالتمنی ...... ومجموعۃ المعانی ۲۳ وامثال المیدانی رقم ۳۳۲۰ مع آخر ولم ارفی المراجع من نسبہ [4] قالہ العجیر السلولی ومعنی بالمائح لسانہ وفی اللسان (میح) المائح مثل الناس ومعنی بازل معل والدلا رجل الطوی والبیت فی المحکم (میح) ومجالس ثعلب (۲: ۴۶۵) فی نسخۃ والازمنہ والامکنہ (۲: ۱۵۹) وہی قصیدۃ فی الایشا انشدھا الشاعر بین یدی عبدالملک بن مروان والعجیر ہو عمیر بن عبداللہ بن عبیدۃ شاعر مقل وکان حبشیا راجع الاغانی (۱۱: ۱۴۷-۱۵۳) والخزانۃ (۲: ۳۹۹) وابن السلام (۱۹۹-۲۰۰)

(۱۵۶) وَلِیْ مَاتِحٌ لَمْ یُوْرِدِ النَّاسُ قَبْلَهٗ
مُعَلًّی وَاَشْطَانُ التَّطَوِّیْ کَثِیْرَۃٌ
میرے پاس اظہار مطلب کے لئے ایسا بلند قدر ڈول ہے جو اچھوتے مضامین بیان کرتا ہے اور گفتگو کے اسباب بہت ہیں اور قرآن میں ہے۔ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَی الْحُکَّامِ (۲-۱۸۸)۔ اور نہ ان اموال کے ذریعہ رشوت دیکر حکام تک رسائی حاصل کرو۔
اَلتَّدَلِّیْ (تفعل) قریب ہونا اور اترآنا۔ قرآن میں ہے۔ ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی (۵۳-۸) پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔

(د م د م)

اَلدَّمْدَمَۃُ (فعللۃ) ہلاک کرنا۔ اور آیت۔ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ (۹۱-۱۴)۔ کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انہیں ہلاک کر ڈالا اور پریشان و بے چین کر دیا۔
بعض نے کہا ہے کہ دَمْدَمَۃٌ (اسم صوت ہے اور) بلی کی آواز کی حکایت کو کہتے ہیں۔ اسی سے دَمْدَمَ فُلَانٌ فِیْ کَلَامِهٖ کا محاورہ ہے یعنی اس نے پریشان کن سی گفتگو کی۔ دَمَمْتُ الثَّوْبَ کپڑے کو رنگ سے طلا کرنا۔
اَلدِّمَامُ۔ ہر وہ چیز جس سے طلا کی جائے۔
بَعِیْرٌ مَدْمُوْمٌ بِالشَّحْمِ۔ بہت موٹا اور چربی والا اونٹ گویا چربی اس پر طلا کی گئی ہے۔
اَلدُّمَّاءُ وَالدُّمَّمَۃُ۔ جنگلی چوہے کا بل۔
اَلدَّامَاءُ (تخفیف میم) وَالدَّہْمُوْمَۃُ صحراء۔ ریگستان۔

(د م ر)

اَلتَّدْمِیْرُ (تفعیل) کے معنی ہیں کسی چیز پر ہلاکت لا ڈالنا۔ قرآن میں ہے:۔
فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِیْرًا۔ (۱۷-۱۶) اور ہم نے انہیں ہلاک کر ڈالا۔
ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ۔ (۲۶-۱۷۲) پھر ہم نے اوروں کو ہلاک کر دیا۔
وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ۔ (۷-۱۳۷) اور فرعون اور قوم فرعون جو (محل) بناتے اور (انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔
اور آیت کریمہ:۔
دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (۴۷-۱۰) خدا نے ان پر تباہی ڈال دی۔
میں دَمَّرَ کا مفعول محذوف ہے۔
محاورہ ہے:۔ مَا بِالدَّارِ تَدْمُرِیٌّ۔ یعنی گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔

(د م ع)

دَمَعَتْ (ف) الْعَیْنُ دَمْعًا وَّدَمْعَانًا
آنسو جاری ہونا۔ قرآن میں ہے:۔
تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا۔ (۹-۹۲) تو وہ لوٹ گئے۔ اور اس غم سے ... ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔
معلوم ہوا کہ الدمع اسم بھی آتا ہے جس کے معنی ہیں آنسو اور (باب مذکور کا) مصدر بھی۔

(د م غ)

اَلدَّمْغُ (ف) کے اصل معنی دماغ پھوڑ دینے کے ہیں (اس سے نیست و نابود کرنے

کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، قرآن میں ہے:۔
بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ۔ (۲۱-۱۸) (نہیں) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا مغز توڑ دیتا ہے۔
حُجَّةٌ دَامِغَةٌ۔ حجت قاطع۔ سر پھوڑ دلیل۔ نیز دَامِغَةٌ۔ ایک قسم کے شگوفہ کو کہتے ہیں جو کھجور کے تنا سے پھوٹ نکلتا ہے۔ اگر اسے کاٹا نہ جائے تو کھجور کے درخت کو خشک اور خراب کر دیتا ہے نیز دامغۃ اس لوہے کو بھی کہتے ہیں جو بالان کی لکڑی کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے۔
یہ تمام الفاظ دَمَغَہٗ سے بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں۔ جس کے معنی دماغ کو توڑنا کے ہیں۔

(د م ی)

اَلدَّمُ۔ خون۔ یہ اصل میں دَمْیٌ تھا (یا) کو برائے تخفیف حذف کر دیا ہے، قرآن میں ہے:۔
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ (۵-۳)۔ تم پر مردار جانور اور (بہتا) لہو ..... یہ سب حرام ہیں۔
دَمٌ کی جمع دِمَاءٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاءَكُمْ (۲-۸۴) کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا۔
دَمِيَتْ (س) الْجِرَاحَةُ۔ زخم سے خون بہنا۔
فَرَسٌ مَدْمِيٌّ۔ خون کی طرح نہایت سرخ رنگ کا گھوڑا۔
اَلدُّمْيَةُ۔ گڑیا جو خون کی مانند سرخ اور منقوش ہو۔
شَجَّةٌ دَامِيَةٌ۔ سر کا زخم جس سے خون بہہ رہا ہو۔

(د ن ر)

اَلدِّيْنَارُ۔ (اشرفی) اصل میں دِنَّارٌ تھا ایک نون کو یا سے تبدیل کیا گیا ہے (والجمع دنانیر) بعض نے کہا ہے کہ یہ فارسی لفظ دین آر سے معرب ہے یعنی وہ جسے شریعت لے آئی ہو[1] قرآن میں ہے:۔
مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ (۳-۷۵) کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو۔

(د ن و)

اَلدُّنُوُّ (ن) کے معنی قریب ہونے کے ہیں اور یہ قرب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی اور قرب بلحاظ مرتبہ سب کو شامل ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ (۶-۹۹) اور کھجور کے گابھے میں سے قریب جھکے ہوئے خوشے کو۔
اور آیت کریمہ:۔
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى (۵۳-۸)۔ پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔
میں قرب حکمی مراد ہے۔ اور لفظ ادنیٰ کبھی بمعنی اَصْغَرُ آتا ہے۔ اس صورت میں اَكْبَرُ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ (۵۸-۷) اور نہ اس سے کم نہ زیادہ۔
اور کبھی[2] اَدْنٰى بمعنی اَرْذَلُ استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ خیر کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَيْرٌ (۲-۶۱) بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو۔
اور[3] کبھی بمعنی اول (نشأۃ اولیٰ) استعمال ہوتا ہے اور الآخر (نشأۃ ثانیہ) کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔

---
[1] المعرب للجوالیقی وراجع الاتقان (۱/۱۳۹) [2] والصواب فی التمثیل ولنذیقنهم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر (۳۲-۲۱)

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ (۲۲-۱۱) اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۶-۱۲۲) اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔
اور کبھی اَدْنٰی بمعنی اقرب آتا ہے اور اقصٰی کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى (۸-۴۲) جس وقت تم (مدینے کے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔
اَلدُّنْيَا کی جمع اَلدُّنٰی آتی ہے جیسے اَلْکُبْرٰی کی جمع اَلْکُبَرُ والصُّغْرٰی کی جمع اَلصُّغَرُ۔
اور آیت کریمہ:۔
ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ (۵-۱۰۸) اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح صحیح شہادت ادا کریں۔
میں اَدْنٰی بمعنی اقرب ہے یعنی یہ اقرب ہے۔ کہ شہادت ادا کرنے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں۔ اور آیت کریمہ:۔
ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ (۳۳-۵۱) یہ (اجازت) اس لئے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲-۲۱۹، ۲۲۰) تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں (غور کرو)
دنیا اور آخرت کے تمام احوال کو شامل ہے کہا جاتا ہے۔
اَدْنَيْتُ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ وَاَدْنَيْتُ اَحَدَهُمَا مِنَ الْاٰخَرِ۔ یعنی دو چیزوں کو باہم قریب کرنا۔ یا ایک چیز کو دوسری کے قریب کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (۳۳-۵۹) کہ باہر نکلا کریں تو اپنی چادریں اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔
اَدْنَتِ الْفَرَسُ۔ گھوڑی کے وضع حمل کا وقت قریب آپہنچا۔
اَلدَّنِيُّ۔ خاص کر حقیر اور رذیل آدمی کو کہا جاتا ہے اور یہ سَيِّئٌ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے:۔ هُوَ دَنِيٌّ۔ یعنی نہایت رذیل ہے۔ اور جو مروی ہے[1] (۱۲۸) اِذَا اَكَلْتُمْ فَدَنُّوْا تو یہ دُوْنَ سے ہے یعنی جب کھانا کھاؤ تو اپنے سامنے سے کھاؤ۔

(د ھ ر)

اَلدَّهْرُ (زمانہ) اصل میں مدت عالم کو کہتے ہیں یعنی ابتداء آفرینش سے لے کر اس کے اختتام تک کا عرصہ۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (۷۶-۱) بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے۔
میں اَلدَّهْرُ سے یہی معنی مراد ہیں پھر (مجازاً) اس سے ہر طویل مدت مراد لی جاتی ہے برخلاف لفظ "زمان" کے کہ یہ مدت قلیلہ اور کثیرہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور دَهْرُ فُلَانٍ کے معنی اس کی مدت حیاۃ کے ہیں اور جو عادت زندگی بھر باقی رہے اس پر بھی استعارۃً دَهْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: مَا دَهْرِيْ بِكَذَا۔

---

[1] وفی النہایۃ دنوا سموا اللہ ودنوا وسمتوا اتال وہو فتعلوا من دنا یدنو دنو ومعناہ کلوا مما یلیکم وما بین یدیکم ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

ہیں اس کا عادی نہیں ہوں۔ اور خلیلؒ نے حکایت کی ہے:۔ دَھَرَ فُلَانًا نَائِبَۃٌ دَھْرًا۔ (یعنی فلاں پر مصیبت نازل ہوگئی) تو یہاں دَھْر کا لفظ مصدر ہے اور بعض نے دَھْدَرَۃٌ دَھْدَرَۃٌ بھی کہا ہے دَھْرٌ دَاھِرٌ وَدَھِیْرٌ زمانہ بے انتہا وقت۔ ایک حدیث میں ہے[1] (۱۲۹)

لَا تَسُبُّوْا الدَّھْرَ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الدَّھْرُ۔ کہ زمانہ کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے) بعض نے اللہ تعالیٰ کے دَھْر ہونے کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جو خیر و شر اور خوشی و ناخوشی زمانہ کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کا فاعل حقیقی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے لہٰذا جب تم زمانہ کو برا بھلا کہو گے جو تمہارے اعتقاد کے مطابق فاعل ہے۔ تو گویا اللہ تبارک و تعالیٰ کو گالیاں دے رہے ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حدیث میں دَھْر ثانی دَھْر اول کا غیر ہے اور یہ مصدر بمعنی فاعل ہے یعنی فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الدَّاھِرُ۔ اور معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کا تصرف و تدبیر اور جو کچھ رونما ہوتا ہے اس کا فیضان اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے مگر معنیٰ اول اظہر و انسب ہے۔ اور قرآن پاک نے مشرکین عرب کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:۔

مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ۔ (۴۵-۲۴) کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور یہ صرف زمانہ ہی ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔

اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں دَھْرٌ سے مراد زمانہ ہی ہے۔

(د ھ ق)

اَلدَّھْقُ (ف) کے معنی لبالب بھرنے اور چھلکنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَکَاْسًا دِھَاقًا (۷۸-۳۴) اور لبالب اور چھلکتا ہوا پیالہ۔

محاورہ ہے:۔

اَدْھَقْتُ الْکَاْسَ فَدَھَقَ (میں نے پیالہ بھرا تو وہ بھر گیا) دَھَقَ لِیْ مِنَ الْمَالِ دَھْقَۃً (اس نے مجھے بہت مال دیا) جیسا کہ قَبَضَ لِیْ قَبْضَۃً کا محاورہ ہے۔

(د ھ م)

اَلدُّھْمَۃُ۔ کے اصل معنی تورات کی سیاہی کے ہیں اور یہ لفظ گھوڑے کی سیاہی پر بولا جاتا ہے۔ کبھی اس سے نہایت گہرا سبز رنگ مراد ہوتا ہے جیسا کہ ہلکے سیاہ رنگ کو خُضْرَۃٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں قسم کی رنگت قریبًا ملتی جلتی سی ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

مُدْھَامَّتَانِ (۵۵-۶۴) دونوں خوب گہرے سبز۔ یہ اِدْھَامَّ اِدْھِیْمَامًا سے مُفْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ کسی شاعر نے رات کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے[2]۔ (البسیط)

---

[1] اخرجہ البخاری والمسلم (دہر) والفائق ۱ر۳۱۵ وانظر تاویل الحدیث امالی المرتضی (۱ر۴۵-۴۶) وابن کثیر ۴ر۱۵۱) والطبری ۲۵ر۲۱۵ بسیاق غریب جدا والحدیث باختلاف الفاظہ فی (م احمد فی) وابن عساکر فی معجمہ وابن النجار کلہم عن ابی ہریرۃ (راجع کنز العمال ر ۳ : ۴۵۳)

[2] قالہ ذوالرمۃ والبیت فی اللسان (عسف، ہوم) (فقد مر تخریجہ فی خضر)

(۱۳۶) فِیْ ظِلِّ اَخْضَرَ یَدْعُوْھَا مَنْہُ الْبُوْمُ
یعنی تاریک رات جس میں کہ بوم اپنے ہام کو بلارہا ہوتا ہے۔

(د ھ ن)

اَلدُّھْنُ۔ تیل۔ چکناہٹ ج اَدْھَانٌ

قرآن میں ہے:۔
تَنْبُتُ بِالدُّھْنِ (۲۳-۲۰)۔ جو روغن۔۔۔۔ لئے ہوئے اگتا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ فَکَانَتْ وَرْدَۃً کَالدِّھَانِ۔ (۵۵-۳۷) پھر۔۔۔ تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائیگا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ دِھَان کے معنی تلچھٹ کے ہیں۔
اَلْمُدْھُنُ۔ ہر وہ برتن جس میں تیل ڈالا جائے۔ یہ اسم آلہ کے منجملہ ان اوزان کے ہے جو بطور شواذ مُفْعُلٌ کے وزن پر آتے ہیں اور بطور تشبیہ (پہاڑ میں) اس مقام (چھوٹے سے گڑھے) کو بھی مُدْھُنٌ کہا جاتا ہے جہاں تھوڑا سا پانی ٹھہر جاتا ہو اور دُھْنٌ سے بطور استعارہ کم دودھ والی اونٹنی کو دَھِیْنٌ کہا جاتا ہے اور یہ فعیل بمعنی فاعل کے وزن پر ہے یعنی وہ بقدر دہن کے دودھ دیتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔

گویا اسے دودھ کا دُھن لگایا گیا ہے۔ یہ بھی دودھ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ دوسرا قول اقرب الی الصحت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے آخر میں تا نیث نہیں آتی۔ (جو فعیل بمعنی مفعول ہونیکی دلیل ہے)
دَھَنَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ۔ بارش نے زمین کو ہلکا سا نم کر دیا جیسا کہ سر پر تیل ملا جاتا ہے۔
دَھَنَہٗ بِالْعَصَا (کنایۃً) لاٹھی سے اس کی تواضع کی۔ یہ بطور تہکم کے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ مَسَحْتُہٗ بِالسَّیْفِ وَحَیَّیْتُہٗ بِالرُّمْحِ کا محاورہ ہے۔
اَلْاِدْھَانُ۔ یہ اصل میں تَدَھُّنٌ کی طرح ہے۔ لیکن یہ تصنع، نرمی برتنے اور حقیقت کا دامن ترک کر دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ تَقْرِیْدٌ کا لفظ جس کے اصل معنی اونٹ سے چیچڑ دور کرنا کے ہیں پھر تصنع اور نرمی برتنا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَفَبِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْھِنُوْنَ (۵۶-۸۱)
کیا تم اسی کتاب سے انکار کرتے ہو؟
شاعر نے کہا ہے[1]:۔ (السریع)

(۱۵۷) اَلْحَزْمُ وَالْقُوَّۃُ خَیْر
نَ الدِّھَانِ وَالْفَلَّۃِ وَالْھَاعِ

کہ حزم واحتیاط اور قوت چاپلوسی اور جزع فزع

---

[1] قالہ ابو قیس بن الاسلت الانصاری وفی روایۃ الاکثر: الکیس والقوۃ خیر من الـ: اِشفاق والفہۃ وَالْہَاعِ۔ والبیت من کلمۃ مفضلیۃ ۲۳۵ فی ۲۴ بیتا وفی روایتہ الفکۃ بدل الفلۃ وفی روایۃ احمد بن عبید الفہۃ کما فی اللسان (فک) ومعناہ الضعف والہاع سوء الحرص مع الضعف والبیت فی الحیوان (۳: ۴۴) والبیان (۱: ۲۰۴) والامالی (۲: ۲۱۲) والسمط ۲۷ والبحر (۸: ۲۰۸) وابدال ابی الطیب (۲: ۳۷۵) وفی العمدۃ (۲: ۸۵) اثنا رالامثلۃ مما عیب فی المقابلۃ وابوقیس اختلف فی اسمہ ذکرہ الحافظ فی الاصابہ والراجح صیفی بن الاسلت وکان الذی اسند امرہ الیہ فی الحروب الاخیرۃ بین الاوس والخزرج فکفی وساد حتی شحب وتغیر ولبث اشہرا لایقرب من امرئتہ ثم انہ جاء لیلۃ فدق علی امرئتہ ففتحت لہ فاھوی الیہا بیدہ فدفعتہ وانکرتہ فقال انا ابوقیس فقالت والشاعر فتنک حتی تکلمت فقال فی ذالک القصیدۃ مطلعہا: قالت ولم تقصد لقیل الخنا۔ مہلا فقد ابلغت اسماعی۔ وفیہا الشاہد واختلف فی اسلامہ راجع الاصابۃ (۴: ۱۵۸/ ۵: ۲۵۷/ ۴: ۲۵۲) والاغانی (۱۵: ۱۴۵) واسد الغابۃ (۱: ۱۸۴) والخزانۃ (۳: ۳۷۵-۳۷۸) ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

سے بہتر ہیں۔
دَاهَنْتُ فُلَانًا مُدَاهَنَةً میں نے فلاں کے سامنے چاپلوسی کی۔ قرآن میں ہے:۔
وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸-۹) کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم مداہنت سے کام لو یہ بھی نرم ہو جائیں۔

(د و د)

دَاوُدُ (داؤد علیہ السلام) یہ عجمی نام ہے (اور عجمہ و علمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے)

(د و ر)

اَلدَّارُ۔ منزل۔ مکان کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ چار دیواری سے گھرا ہوتا ہے۔ بعض نے دَارَةٌ بھی کہا ہے۔ اس کی جمع دِيَارٌ ہے۔ پھر دار کا لفظ شہر، علاقہ بلکہ سارے جہان پر بولا جاتا ہے اور اَلدَّارُ الدُّنْيَا اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے نشاۃ اولیٰ و نشاۃ ثانیہ میں دو قرارگاہوں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے دَارُ الدُّنْيَا وَدَارُ الْاٰخِرَةِ (باضافت) بھی کہا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۶-۱۲۷) ان کے لئے ان کے اعمال کے صلے میں پروردگار کے ہاں سلامتی کا گھر ہے۔
یہاں دارالسلام سے جنت مراد ہے اور دَارُ الْبَوَارِ (۱۴-۲۸) ہلاکت کا گھر۔ اسے جہنم نیز فرمایا۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ (۲-۹۴) کہہ دو کہ اگر آخرت کا گھر ..... تمہارے لئے ہی مخصوص ہے۔
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ (۲-۲۴۳)۔ بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو .... اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے۔
وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا (۲-۲۴۶) جب کہ ہم وطن ...... سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔
سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ (۷-۱۴۵) میں عنقریب تم کو نافرمان لوگوں کا گھر دکھاؤں گا۔
کہا جاتا ہے مَا بِهَا دَيَّارٌ۔ یعنی یہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ دَارٌ سے فَيْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ کیونکہ اگر فَعَّالٌ کے وزن پر ہوتا تو دَيَّارٌ کی بجائے دَوَّارٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ (قول سے) قَوَّالٌ اور (جور سے) جَوَّارٌ ہے۔
اَلدَّائِرَةُ۔ خط محیط (سرکل) کو کہتے ہیں یہ دَارَ يَدُوْرُ دَوَرَانًا سے ہے جس کے معنی چکر لگانا کے ہیں پھر مصیبت گردش زمانہ کو بھی دائرہ (یا دائرۃ) کہہ دیا جاتا ہے اسی مناسبت سے زمانہ کو ... الدَّوَارِيُّ کہتے ہیں کیونکہ اس کی گردشیں بھی انسان پر گھومتی رہتی ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (الرجز) (۱۵۸) وَالدَّهْرُ بِالْاِنْسَانِ دَوَّارِيُّ کہ زمانہ انسان کو گھما رہا ہے۔
اور الدولۃ والدولۃ کا لفظ مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو محبوب چیز گھوم کر آئے اسے دَوْلَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] بیت من مشطورۃ الرجز للعجاج فی وصف الدهر وبعدہ: "افنی القرون وہو تعسری" وقبلہ: أطربًا وانت قنسری" والرجز فی اللسان (قعسر دور) والصحاح (دور) وتفسیر الطبری (۱۹: ۱۴) واراجیز العرب للسید توفیق البکری ۴۷، ومجموع اشعار العرب (۲: ۶۶) والخزانۃ (۳: ۱۱۵) وابن ہشام (۱: ۱۲) رقم ۱۲ وتلاثین ۱۹ والسیوطی ۱۸ والمرزوقی ۴: ۸۱۸ والمحکم (تعسر) ۱۲

نَخْشٰی اَنْ تُصِیْبَنَا دَائِرَۃٌ۔ (۵-۵۲) ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر زمانے کی گردش نہ آجائے (دائرۃ کی جمع دوائر آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَیَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَائِرَ عَلَیْھِمْ دَائِرَۃُ السَّوْءِ۔ (۹-۹۸) کہ وہ تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں انہی پر بری مصیبت واقع ہو یعنی تباہی اور بربادی انہیں ہر طرف سے اس طرح گھیر لے جیسا کہ کوئی شخص دائرہ کے اندر ہوتا ہے۔ اور ان کے لئے اس بربادی سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے
اَلدَّوَّارُ۔ ایک بت کا نام ہے جس کے گرد اگرد لوگ طواف کیا کرتے تھے۔
اَلدَّارِیُّ۔ یہ الدار کی طرف منسوب ہے[1] مگر عطار (عطر فروش) کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جیسا کہ اَلْھَالِکِیُّ کا لفظ قَیْنٌ یعنی لوہار پر خاص کر بولا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے[2] (۱۲۹)
مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ کَمَثَلِ الدَّارِیِّ کہ نیک صحبتی کی مثال عطار کی سی ہے۔
اور جو شخص گھر کے اندر ہی جم کر بیٹھا رہے اور باہر نہ نکلے اسے بھی دَارِیٌّ کہا جاتا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً حَاضِرَۃً تُدِیْرُوْنَھَا بَیْنَکُمْ۔ (۲-۲۸۲) ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔
یعنی نقد اور ہاتھوں ہاتھ لین دین ہو اور اس میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔

(د و ل)

اَلدَّوْلَۃُ وَالدُّوْلَۃُ۔ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی گردش کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَۃٌ کا لفظ مال وزر کے گھومنے پر بولا جاتا ہے اور دُوْلَۃٌ لڑائی اور عزت وجاہ کے ادلنے بدلنے پر۔ بعض نے ان دونوں میں یہ فرق کیا ہے کہ دَوْلَۃٌ اسم ہے اور اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ لین دین کیا جائے اور دُوْلَۃٌ (بضم الدال) مصدر ہے یعنی لین دین کرنا قرآن میں ہے:۔
کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔
تَدَاوَلَ الْقَوْمُ کَذَا کسی چیز کو دولت [illegible] باری باری لینا۔
دَاوَلَ اللّٰہُ کَذَا بَیْنَھُمْ۔ اللہ تعالےٰ نے لوگوں کے درمیان اسے گھمایا۔
قرآن میں ہے:۔
وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ (۳-۱۴۰)

---

[1] ذکر علماء اللغۃ والغریب قولین فی ہذہ النسبۃ الاول نسبۃ الی الدار وہی علم لموضع بین البصرۃ والبحرین کما فی الیاقوت (رسم: الدار) وذکرہ ابن دریلق الملاحم وقال:۔ الدار موضع بالبحرین معروف والیہ ینسب الداری العطار والثانی انہ نسبۃ الی فرضۃ البحرین یقال لہا دارین: قال الیاقوت: والنسبۃ الیہا دارِیٌّ والیہ ذہب ابن الاثیر فی النہایۃ (دار) والجوہری فی الصحاح (دار) وفی البلدان ہی بلدۃ فتحت فی ایام ابی بکر رضی اللہ عنہ سنۃ ۱۲ وکان علی الغزاۃ العلاء بن الحضرمی وفیہ یقول الفرزدق کَاَنَّ تریکۃ من ماء مزن ۔ ودارِیٌّ الذکی من المدام راجع البلدان (رسم: دارین) ۱۲ [2] وتتمۃ الحدیث ذکرہ المؤلف فی الاخوانیات من محاضراتہ (۳-۲) والزمخشری فی الفائق (۱: ۲۰۲) والنہایۃ (دار) راجع الحدیث (د، ک، عن انس) (دع وانراہمرزی، د، حب فی روضۃ العقلاء عن شبل من انس وابن حبان والرامہرمزی ایضاً عن ابی موسیٰ ولفظ الاکثر مثل العطار الا ان اصحاب الغریب ذکروا لفظ الداری بدل العطار راجع للمراجع کنز العمال (۹، ۵، ۵ والفتح للنبہانی ۳/۸۱۲ ومجمع البحار ۱/ ۵۲۴) ۱۲

اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔
اَلدَّوْلُوْلُ۔ بڑی مصیبت ج اَلدَّآلِیْلُ
وَالدُّوْلَاءُ۔

(د و م)

اَلدَّوَامُ۔ اصل میں دوام کے معنی سکون کے ہیں کہا جاتا ہے۔ دَامَ الْمَاءُ (پانی ٹھہر گیا) اور حدیث میں[1] (۱۳۰) اَلْمَاءُ الدَّائِمُ یعنی کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔
اَدَمْتُ الْقِدْرَ وَدَوَّمْتُهَا تھوڑا سا پانی ڈالکر ہانڈی کو ٹھنڈا کر دیا۔ اسی سے دَامَ الشَّیْئُ کا محاورہ ہے یعنی وہ چیز جو عرصہ دراز تک رہے قرآن میں ہے:۔
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ (۵-۱۱۷)۔ اور جب تک میں ان میں رہا ان (کے حالات) کی خبر رکھتا رہا۔
اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا۔ (۳-۷۵) جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو۔
لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيهَا (۵-۲۴) جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جا سکتے۔
اور یہ باب دِمْتَ تَدَامُ سے آتا ہے اور بعض نے دُمْتَ تَدُوْمُ کہا ہے جیسے مُتَّ تَمُوْتُ۔
دَوَّمَتِ الشَّمْسُ فِیْ كَبِدِ السَّمَآءِ۔ وسط آسمان میں سورج ٹھہر گیا۔ شاعر نے کہا ہے[2]۔ ع
(۱۵۹) وَالشَّمْسُ حَيْرٰى لَهَا فِى الْجَوِّ تَدْوِيْمُ
سورج حیران پریشان ہو کر فضا میں ٹھہرا ہوا ہے۔
دَوَّمَ الطَّيْرُ فِى الْهَوَاءِ۔ پرند فضا میں منڈلایا۔
اسْتَدَمْتُ الْاَمْرَ میں نے اس پر دیر تک غور و فکر کیا۔
اَلظِّلُّ الدَّوْمُ (دَائِمٌ) ہمیشہ رہنے والا سایہ۔
اَلدِّيْمَةُ۔ بارش جو لگاتار کئی روز تک برستی رہے۔

(د و ن)

اَلدُّوْنُ۔ جو کسی چیز سے قاصر اور کوتاہ ہو وہ "دُوْن" کہلاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دُنُوٌّ کا مقلوب ہے۔ اور اَلْاَدْوَنُ بمعنی دَنِیٌّ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (۳-۱۱۸) کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کو راز دار مت بناؤ جو دیانت میں تمہارے ہم مرتبہ (یعنی مسلمان) نہیں ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جو قرابت میں تم سے نیچے ہیں یعنی تمہارا ان سے تعلق نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ (۴-۴۸) اور اسکے سوا اور گناہ ...... معاف کر دے۔
میں مَا دُوْنَ سے وہ گناہ مراد ہیں جو شرک سے کم درجہ ہیں یا وہ جو شرک کے علاوہ ہیں۔ اور یہ دونوں معنی ایک دوسرے کو لازم ملزوم ہیں اور آیت کریمہ:۔
ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَيْنِ

---

[1] ولفظة الحديث ولا يبولن احدكم فى الماء الدائم راجع تخريجه فى كنز العمال ۹: ۲۷۷۲ - ۲۷۸۶ - ۱۷ و فى كتب الغريب النهاية (دوم) والفائق (۱/ ۲۰۵) [2] قاله ذو الرمة فى ميميته يصف جندبا الذى يصيح فى حر الشمس واوله: معروريا رمض الرضراض يركضه۔ والبيت فى اللسان (دوم) والاقتضاب ۴۵۹ والبحر (۲: ۸۹۴) والمحاضرات للمؤلف ۴۹۵ والمعانى الكبير ۱۱۶۴ وديوانه ۵۷۸ وابو الطيب فى اضداده ۲۷۷ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۵-۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو۔ میں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے معنی غَیْرُ اللّٰهِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہم دونوں کو معبود بنا لو۔ بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ دو معبود جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا جائے۔ اور آیت کریمہ:۔

لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ (۶-۵۱) اس کے سوا نہ تو ان کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا۔ اور نیز آیت:۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۲-۱۰۷) اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ حکم الٰہی کے بغیر کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی مدد کر سکے اور یہی معنی آیت کریمہ:۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا (۶-۷۱) کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکے نہ برا۔ میں مراد ہیں اور دُوْنَ میں ایک لغت دَوْنَ (بفتح الدال) بھی ہے کہا جاتا ہے۔ دَوْنَكَ كَذَا یعنی یہ پکڑ لو۔ قتیبی نے کہا ہے کہ دَانَ يَدُوْنُ دُوْنًا کے معنی کمزور ہونے کے ہیں[1]۔

(د ی ن)

دِنْتُ الرَّجُلَ کے معنی قرض لینے اور اَدَنْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے دائن بنا دیا یعنی قرض دیا۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ دِنْتُهٗ کے معنی اَقْرَضْتُهٗ یعنی قرض دینا کے ہیں اور مقروض کو مَدِيْنٌ وَمَدْيُوْنٌ کہا جاتا ہے دِنْتُهٗ کے معنی قرض لینا بھی آتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (

(۱۶۰) نَدِيْنُ وَيَقْضِي اللّٰهُ عَنَّا وَقَدْ نَرٰى
مَصَارِعَ قَوْمٍ لَا يَدِيْنُوْنَ ضُيَّعَا

ہم قرض لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہم سے اس قرض کو ادا کر دیتا ہے اور جو لوگ قرض نہیں لیتے ان کی قبریں ضائع ہونے والی دیکھتے ہیں اور اَدَنْتُ دِنْتُ کی طرح ہے یعنی اس کے معنی قرض لینا کے ہیں اور اَدَنْتُ کے معنی قرض دینا بھی ہیں۔

اَلتَّدَايُنُ وَالْمُدَايَنَةُ۔ قرض کا معاملہ کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۲-۲۸۲) جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لئے قرض کا معاملہ کرنے لگو۔

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ (۴-۱۲) (یہ حصے بھی) بعد ادائے وصیت و قرض۔

اَلدِّيْنُ کے معنی طاعت اور جزا کے آتے ہیں اور بطور استعارہ دین بمعنی شریعت بھی آتا ہے۔ اور دین ملت کی طرح ہے لیکن شریعت کی طاعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے اسے دین کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳-۱۹) دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین

---

[1] قال فی الصحاح ولا یشتق منہ فعل، وبعضہم یقول منہ، دَانَ يَدُوْنُ دَوْنًا راجع ایضا اللسان (دون)

[2] فی اللسان ضُيَّعٌ بالخفض علی الصفة للقوم والبیت للعجیر السلولی وقبلہ: فعد صاحب اللحام سیفا تبیعہ۔ وزد ورہما فوق المغالین فاخنع ـ والبیت فی الصحاح (دین) وفی روایة الفیا ضُيَّعًا فقال ابن بری: صوابہ ضُيَّعٍ بالخفض علی الصفة (للقوم) ❖ ❖ ❖

اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔

وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ (۴-۱۴۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہو گئے۔ اور آیت کریمہ:۔

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (۵-۷۷) اے اہل کتاب اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ کرو۔ میں آنحضرت کے دین یعنی اسلام کی اتباع پر ترغیب پائی جاتی ہے جو تمام ادیان سے معتدل دین ہے اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (۲-۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت معتدل بنایا۔

اور آیت کریمہ:۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲-۲۵۶)۔ دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔

میں بعض نے دین کے معنی طاعت کئے ہیں کیونکہ طاعت حقیقت میں وہی ہے جو مبنی بر اخلاص ہو اور اخلاص کی صورت میں اکراہ وجبر کیسے ہو سکتا ہے بعض نے کہا ہے کہ عدم جبر کا حکم ان اہل کتاب کے ساتھ مختص ہے جو جزیہ ادا کریں۔ اور آیت کریمہ:۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ (۳-۸۳) کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟۔

میں دِيْنُ اللّٰهِ سے دین اسلام مراد ہے۔ کیونکہ (قرآن نے)، دوسری آیت میں تصریح فرما دی ہے:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (۳-۸۵) اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی یہی معنی مراد ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ۔ (۹-۳۳) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔

وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ (۹-۲۹) اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ (۵۶-۸۶)۔

میں غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ کے معنی غَيْرَ مَجْزِيِّيْنَ کے ہیں۔ یعنی اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا نہیں دی جائے گی۔

اَلْمَدِيْنُ وَالْمَدِيْنَةُ (ایضًا) کے معنی غلام اور لونڈی کے بھی آتے ہیں۔ ابو زید[1] نے کہا ہے کہ یہ دِيْنَ فُلَانٌ يُدَانُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی ناپسند کام پر مجبور کئے جانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دِنْتُهٗ سے ماخوذ ہے جس کے معنی طاعت کی جزا دینے کے ہیں۔ بعض نے لفظ مَدِيْنَةٌ (شہر) بھی اسی معنی سے لیا ہے۔

---

[1] ابو زید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری وجدہ من الصحابۃ یاشدید العنایۃ بجمع اللغات واللہجات توفی سنہ ۲۱۴ھ وقد قارب المائۃ کان من تلامذۃ عمرو بن العلاء و زلیزیدی کان رفیقہ فی الدرس راجع لاحوالہ (بشد) ۱۲

کتاب الذال

(ذ ء ب)

اَلذِّئْبُ۔ کے معنی بھیڑیا کے ہیں اصل میں یہ ذِئْبٌ یعنی مہموز ہے۔ قرآن میں ہے:۔ فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ (۱۲-۱۷) تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔ اَرْضٌ مَذْءَبَةٌ۔ بہت بھیڑیوں والی سرزمین۔ ذُئِبَ فُلَانٌ۔ در گوسپنداں وے گرگ افتاد۔ تَذَاءَبَتِ الرِّيْحُ۔ ہوا ہر طرف سے چلی۔ یہ بھیڑیے کی آمد کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ تَذَاءَبْتُ لِلنَّاقَةِ۔ اونٹنی کو بچے پر مہربان کرنے کیلئے بھیڑیے کا روپ دھار لینا اور ہیئت کذائی میں مشابہت کے پیش نظر یالان کے پہلوؤں کے درمیان کی کشادگی کو ذِئْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ذ ء م)

ذَاَمَهٗ يَذْءَمُهٗ ذَاْمًا اور ذَمَهٗ (ن) ذَمًّا اور ذَامَهٗ۔ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی کو حقیر اور مذموم گردانتا۔ قرآن میں ہے:۔ اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۷-۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل راندے ہوئے۔

(ذ ب ب)

اَلذُّبَابُ۔ کے معنی مکھی کے ہیں اور یہ لفظ شہد کی مکھی اور بھڑ وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۱۶۱) فَهٰذَا اَوَانُ الْعِرْضِ حَتّٰى ذُبَابُهٗ
زَنَابِيْرُهٗ وَالْاَزْرَقُ الْمُتَلَمِّسُ

یہ وادی کے پر رونق ہونے کا موسم ہے اس کے زنابیر اور سبز مکھیاں خوب بھن بھنا رہی ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا (۲۲-۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے۔ میں ذباب کے معنی مکھی کے ہیں۔ ذُبَابُ الْعَيْنِ۔ آنکھ کی پتلی۔ اسے ذُباب یا تو ہیئت میں تشبیہ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ آنکھ کی پتلی سے بھی مکھی کی طرح شعاعیں نکلتی ہیں۔ اور ایذا رسانی میں مکھی کے ساتھ تشبیہ دے کر تلوار کی دھار کو ذُبَابُ السَّيْفِ کہا جاتا

---

[1] قال المتلمس ولقب بہ بہذا البیت والبیت فی الحماسۃ (۲: ۱۰۲) والخزانۃ (۳: ۲۷۰) والاغانی (۲۱: ۲۰۱) والسمط ۲۸۰ والاقتضاب وديوانہ رقم ۵ والسیوطی ۱۷، ۱۰۴ والمختارات ۳۳ والمحکم (عرض) والحیوان (۳: ۳۹۱) والمعانی الکبیر للقتبی وفی روایتہ وذاک یدل فہذا والمرزوقی ۶۶۲ وفی روایتہ حتی ذبابہ یدل حی ذبابہ والمتلمس شاعر جاہلی اسمہ جریر بن عبد المسیح الضبعی راجع لترجمۃ السیوطی ۱۰۲-۱۰۴ والاغانی (۲۱: ۱۲۷-۱۳۵) والخزانۃ (۱: ۴۷۶) والشعراء (۱۳۱-۱۳۶)

ہے۔ اسی طرح موذی شخص کو بھی ذُبَابٌ کہہ دیا جاتا ہے۔
ذَبَّبَ عَنْ فُلَانٍ کسی سے مکھی کو دور ہٹانا۔
اَلْمِذَبَّۃُ مورچھل۔ مکھیاں اڑانے کا آلہ۔
استعارہ کے طور پر ذَبَّ کا لفظ ہر چیز کے دفع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:۔
ذَبَبْتُ عَنْ فُلَانٍ۔ میں نے فلاں سے دور ہٹایا۔
ذُبَّ الْبَعِیْرُ اونٹ کی ناک میں مکھی داخل ہوگئی۔
یہ بھی بیماری کے دوسرے صیغوں کی طرح (جیسے زُکِمَ وغیرہ) فعل مجہول استعمال ہوتا ہے۔
بَعِیْرٌ مَذْبُوْبٌ وَذُبَّ جِسْمُہٗ۔ اونٹ دبلا ہوکر مکھی یا تلوار کی دھار کی طرح ہوگیا۔
اَلذَّبْذَبَۃُ اصل میں معلق چیز کے ہلنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ پھر بطور استعارہ ہر قسم کی حرکت اور اضطراب کے معنی میں استعمال ہونے لگا چنانچہ قرآن میں ہے:
مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ (۴-۱۴۳) بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں۔
یعنی وہ ہمیشہ مضطرب سے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کی طرف جھک جاتے ہیں اور کبھی کفار کی طرف۔
شاعر نے کہا ہے (ع)[1] (طویل)
(۱۶۲) تَرٰی کُلَّ مُلْکٍ دُوْنَھَا یَتَذَبْذَبُ
کہ اس کی سلطنت کے ورے ہر ایک سلطنت مضطرب نظر آتی ہے۔
ذَبَّبْنَا اِبِلَنَا۔ ہم نے اونٹوں کو سخت ہنکایا۔
شاعر نے کہا ہے[2] (ع) (متقارب)
(۱۶۳) یُذَبِّبُ وَرْدٌ عَلٰی اِثْرِہٖ
کہ وَرْد اس کے پیچھے سخت دوڑ رہا تھا۔

(ذ ب ح)

اَلذَّبْحُ (ف) اصل میں اس کے معنی حیوانات کے حلق کو قطع کرنے کے ہیں اور ذِبْحٌ بمعنی مَذْبُوْحٌ آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (۳۷-۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا۔
اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً (۲-۶۷) کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو۔
ذَبَحْتُ الْفَارَۃَ۔ میں نے نافہ مشک کو چیرا۔ یہ حیوان کے ذبح کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح ذَبَحَ الدَّنَّ کا محاورہ ہے جس کے معنی مٹکے میں شگاف کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ (۲-۴۹) تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالتے تھے۔
میں صیغہ تفعیل برائے تکثیر ہے یعنی وہ کثرت کے ساتھ یکے بعد دیگرے تمہارے لڑکوں کو ذبح کر رہے تھے۔
سَعْدُ الذَّابِحِ (برج جدی کے ایک) ستارے کا نام ہے۔ اور سیلاب کے گڑھوں کو مَذَابِحُ کہا جاتا ہے۔

---

[1] قالہ النابغۃ فی قصیدۃ یمدح فیہا النعمان بن المنذر واولہ: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللہَ اَعْطَاکَ سُوْرَۃً وسیأتی فی (سور) [2] وتمامہ: دو اورکہ وقع مِرْوَدٍ خَشِبٍ۔ والبیت لعنترۃ بن شداد العبسی ابوالمغلس راجع المرزوقی ۴۴۱ وفی رعایۃ المختار الجاہلی (ا: ۱۳۰) والعقد الثمین ۳۵ تذاءب بمل یذبب ومرد بدل مردی والبیت فی اللسان (خشب)، والمعانی ۱۸۲۰

(ذ خ ر)

اَلْاِدِّخَارُ (افتعال) اصل میں اِذْتِخَارٌ تھا۔ کہا جاتا ہے۔

ذَخَرْتُہٗ وَادَّخَرْتُہٗ (مستقبل کے لئے ذخیرہ جمع کرنا) ایک روایت میں ہے۔[1]

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَایَدَّخِرُ لِغَدٍ۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لئے کوئی چیز جمع نہ کرتے تھے۔

اَلْمَذَاخِرُ۔ پیٹ اور انتڑیاں جن میں طعام کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔[2] (الطویل)

(۱۶۳) فَلَمَّا سَقَیْنَاھَا الْعَکِیْسَ تَمَلَّأَتْ
مَذَاخِرُھَا وَامْتَدَّ رَشْحًا وَرِیْدُھَا

جب ہم نے اسے عکیس یعنی شوربے میں ملا ہوا دودھ پلایا تو اس کا پیٹ بھر گیا اور رگیں پھول کر پسینہ بہنے لگا۔

اَلْاِذْخِرُ۔ ایک قسم کی خوشبودار گھاس۔

(ذ ر ر)

اَلذُّرِّیَّۃُ۔ نسل۔ اولاد۔ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ۔ (۲-۱۲۴) اور میری اولاد میں سے بھی۔

وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ (۲-۱۲۸) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنائے رہیو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَایَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ (۴-۴۰) خدا کسی کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کرتا۔

اور کہا گیا ہے کہ ذُرِّیَّۃٌ اصل میں ھمزۃ اللام ہے اور (ذ ر ء) میں اس پر بحث آ رہی ہے۔

(ذ ر ء)

اَلذَّرْءُ کے معنی ہیں اللہ نے جس چیز کا ارادہ کیا اسے ظاہر کر دیا۔ کہا جاتا ہے۔

ذَرَءَ اللّٰہُ الْخَلْقَ۔ یعنی ان کے اشخاص کو موجود کیا قرآن میں ہے:۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۷-۱۷۹) اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا (۶-۱۳۶)۔ اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں (یعنی) کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ (۴۲-۱۱) اور چارپایوں کے بھی جوڑے (بنائے اور) اسی

---

[1] رواہ الترمذی عن انس مسندا وعن ثابت مرسلا وتاویل الحدیث ای لنفسہ فلا ینافی انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یحبس لاہلہ قوت سنتہم والحدیث رواہ ابن حبان فی زوائدہ رقم ۲۵۵۰، ۲۱۳۹ قال المناوی فی شرح الجامع الصغیر اسنادہ جید وفی الترمذی غریب وراجع التحفہ ج ۳ ص ۲۷۲)

[2] وفی اللسان (مدح) قالہ الراعی ابو منصور الاسدی یصف فرسا والصواب انہ للراعی النمیری یصف امرأۃ وہی ام خنزر بن ارقم وکان بینہ وبین خنزر ہجاء فہجاہ بکون امہ تطرقہ وتطلب منہ القری ویدل علیہ ماقبلہ: فلما عرفنا انہا ام خنزر وجنا لہ موالیہا وغاب مفیدہا الی آخر ما قال ثلاثۃ ابیات اللسان (مدح)، والصحاح (مدح، ذخر) وتہذیب الالفاظ ۴۰۴ مع آخر والحماسۃ لابی تمام بالتبریزی (۴: ۳۹) والمعانی للقتبی ۳۸۴ والحکم (عکس، مدح) ومشابہ الانصاف ۱۳۷ وفی روایۃ البیت اختلاف ففی روایۃ تمدحت بدل تملأت کما فی الصحاح واللسان وخواصرہا بدل مذاخرہا وازداد بدل امتد ۱۲

طریق پر تم کو پھیلا تا رہتا ہے۔
اور تَذْرُوْهُ الرِّيحُ (۱۸-۴۵) میں ایک قراءت تَذْرِيْهِ الرِّيَاحُ بھی ہے[1]۔
اَلذُّرْأَةُ۔ بڑھاپے یا نمک کی سفیدی۔ کہا جاتا ہے مِلْحٌ ذَرْآنِيٌّ نہایت سفید نمک[2] اور جس کے بال سفید ہو جائیں اسے رَجُلٌ اَذْرَءُ کہا جاتا ہے اس کی مؤنث ذَرْآءُ ہے۔
ذَرِئَ شَعْرُهٗ (د ذَرَءَ کفرح ومنع) اس کے بال سفید ہو گئے۔

(ذ ر ع)

اَلذِّرَاعُ۔ ہاتھ (کہنی سے لے کر درمیانی انگلی کے آخر تک) کبھی ذراع کا لفظ بول کر مَذْرُوْعٌ یعنی وہ چیز بھی مراد لی جاتی ہے جس کی پیمائش کی گئی ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ۔ (۶۹-۳۲) پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دو۔
اور ذِرَاعٌ مِّنَ الثَّوْبِ وَذِرَاعٌ مِّنَ الْاَرْضِ وغیرہ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور حیوان کے بازو کے ساتھ تشبیہ دے کر ایک ستارے کو بھی ذِرَاعُ الْاَسَدِ کہا جاتا ہے۔
ذِرَاعُ الْعَامِلِ۔ نیزے کا اگلا حصہ۔ محاورہ ہے۔
هٰذَا عَلٰى حَبْلِ ذِرَاعِكَ۔ یہ تیرے اختیار میں ہے جیسا کہ "هُوَ فِيْ كَفِّكَ" کا محاورہ ہے۔
ضَاقَ بِكَذَا ذِرَاعِيْ۔ یعنی میں اس سے عاجز ہوں[3]۔ جیسا کہ ضَاقَتْ بِهٖ يَدِيْ محاورہ ہے۔
ذَرَعْتُهٗ۔ (۱) بازو پر مارنا۔ اور ذَرَعْتُ کے معنی (۲) بازو پھیلانا بھی آتے ہیں اور اسی سے ذَرَعَ الْبَعِيْرُ فِيْ سَيْرِهٖ کا محاورہ ہے جس کے معنی اونٹ کے بازو پھیلا کر چلنے کے ہیں (تیز چلنا) فَرَسٌ ذَرِيْعٌ وَذَرُوْعٌ۔ کشادہ قدم گھوڑا (تیز رو) مُذَرَّعٌ (سفید بازو والا گھوڑا یا بیل) اور زِقٌّ ذِرَاعٌ کے معنی بعض کے نزدیک بڑی مشک کے ہیں اور بعض کے نزدیک چھوٹی مشک کو کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں بازوؤں والی مشک مراد ہوگی۔ اور دوسری صورت میں بغیر بازو مشک کے یعنی جس کے بازو کاٹ دیئے گئے ہوں۔
محاورہ ہے ذَرَعَهُ الْقَيْءُ اس پر قے غالب آگئی
ذَرَعَ الْفَرَسُ۔ گھوڑے کا کشادہ قدم چلنا۔
تَذَرَّعَتِ الْمَرْاَةُ الْخُوْصَ۔ عورت کا ٹوکری وغیرہ بنانے کے لئے کھجور کی شاخوں کو کاٹنا۔
اسی سے تشبیہ کے طور پر تَذَرَّعَ فِيْ كَلَامِهٖ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کلام میں تیزی کرنے کے ہیں جیسا کہ سَفْسَفَ فِيْ كَلَامِهٖ (لغو گوئی کرنا) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جو اصل میں سَفِيْفُ الْخُوْصِ (کھجور کے پتوں کی ٹوکری) سے ماخوذ ہے۔

(ذ ر و)

ذِرْوَةُ السَّنَامِ وَذُرَاهُ۔ کوہان کا بلند حصہ۔ اسی سے محاورہ ہے اَنَا فِيْ ذُرَاكَ میں تیری جناب میں باعزت ہوں[4] (یعنی تیری پناہ میں ہوں) اَلْمِذْرَوَانِ سرین کے دونوں کنارے (وَلَا وَاحِدَ لَهٗ)

---

[1] قراءة شاذة وفي حرف ابن مسعود تذريه الرياح وايضاً تُذريه فهذه ثلاث ذكرها اصحاب التفاسير (مراجع الطبري والشوكاني) [2] وفي المعاجم بفتح الراء وسكونها۔ [3] وفي التنزيل: وضاق بهم ذرعا (۱۱-۷۷)۔ [4] والمعروف بفتح الذال اي في ظلك وكنفك [5] راجع الامالي ج ۱ ص ۱۹۹ ؂

ذَرَتْهُ الرِّيْحُ تَذْرُوْهُ وَتَذْرِيْهِ۔ ہوا کا کسی چیز کو بکھیر دینا۔ قرآن میں ہے:۔
وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا (۵۱-۱) بکھیر نے والیوں کی قسم جو اڑا کر بکھیر دیتی ہیں۔
تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ۔ (۱۸-۴۵)۔ کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔
اَلذُّرِّيَّةُ کے اصل معنی چھوٹی اولاد کے ہیں مگر عرف میں مطلق اولاد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ جمع ہے مگر واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔
ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ۔ (۳-۳۴) ان میں سے بعض بعض کی اولاد تھے۔
ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ۔ (۱۷-۳) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔
وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۔ (۳۶-۴۱) اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔
اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ۔ (۲-۱۲۴) میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا انہوں نے کہا کہ پروردگار میری اولاد سے بھی۔
ذُرِّيَّةٌ کے اصل میں تین اقوال ہیں۔
(۱) بعض کے نزدیک یہ ذَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ سے ہے یعنی اصل میں مہموز اللام ہے مگر کثرت استعمال کے سبب ذَرِّيَّةٌ و بَرِيَّةٌ کی طرح ہمزہ کو ترک کر دیا گیا ہے۔
(۲) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں ذُرْوِيَّةٌ بروزن فُعْلِيَّةٌ تھا اور ذَرٌّ سے مشتق ہے۔ جیسے قُمْرِيَّةٌ قُمْرٌ سے (۳) ابوالقاسم البلخی[2] کہتے ہیں[3] کہ آیت کریمہ:۔
وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ۔ (۷-۱۷۹) اور ہم نے ...... جہنم کے لئے پیدا کئے۔
میں ذَرَاْنَا ذَرَيْتُ الْحِنْطَةَ سے مشتق ہے جس کے معنی گندم کو اساوِن کرنے کے ہیں گویا وہ اسے بھی مہموز نہیں سمجھتے۔

(ذ ع ن)

اَلْاِذْعَانُ (افعال) کے معنی کسی کا مطیع اور منقاد ہو جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (۲۴-۴۹) تو ان کی طرف مطیع ہو کر چلے آتے۔
نَاقَةٌ مِذْعَانٌ سواری کی مطیع اور فرمانبردار اونٹنی۔

(ذ ق ن)

ذَقَنٌ (ٹھوڑی) اس کی جمع اَذْقَانٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ۔ (۱۷-۱۰۹) اور

---

[1] وفی اشتقاقہ اختلاف ذکرہ اصحاب المعاجم فی (ذرر) وفی (ذ ر ء) وفی (ذ ر و)
[2] ابو القاسم البلخی عبداللہ بن احمد الحنفی المعروف بالکعبی احد شیوخ المعتزلہ ورأس طائفۃ منہم یقال لہم الکعبیہ و فی النحل للشہرستانی ۱/۳۷ وکان تلمیذا لابی الحسین الخیاط المعتزلی ومذہبہ فی کشف الظنون ۱/۴۲۳ وابن الندیم ۷/۱۵ انہ الف تفسیرا کبیرا فی اثنی عشر جلدا توفی رحمہ اللہ فی سنۃ ۳۱۹ و ۳۱۷ راجع لتراجمہ لسان المیزان ۳/۲۵۵ وابن خلکان ۱/۲۵۲ [3] لان المہموز معناہ یخالف الاعتزال فتجنبہ وتلوی راجع الکشاف ۱۲

ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں (اور) روتے جاتے ہیں۔
ذَقَنْتُہٗ: میں نے اس کی ٹھوڑی پر مارا۔
نَاقَۃٌ ذَقُوْنٌ وہ اونٹنی جو ٹھوڑی کے سہارے پر چلتی ہو[1]۔ پھر تشبیہ کے طور بڑے ڈول کو جو ایک جانب مائل ہو اسے بھی دَلْوٌ ذَقُوْقٌ کہہ دیتے ہیں[2]۔

(ذ ک ر)

اَلذِّکْرُ: یہ کبھی تو اس ہیئت نفسانیہ پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے علم کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ قریباً حفظ کے ہم معنی ہے مگر حفظ کا لفظ احراز کے لحاظ سے بولا جاتا ہے اور ذِکْرٌ کا لفظ استحضار کے لحاظ سے۔ اور کبھی "ذِکْرٌ" کا لفظ دل یا زبان پر کسی چیز کے حاضر ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ "ذِکْرٌ" دو قسم پر ہے۔ ذکر قلبی اور ذکر لسانی۔ پھر ان میں سے ہر ایک دو قسم پر ہے نسیان کے بعد کسی چیز کو یاد کرنا یا بغیر نسیان کے کسی کو ہمیشہ یاد رکھنا اور ہر قول کو ذکر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذکر لسانی کے بارے میں فرمایا:۔
لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (۲۱-۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے۔
وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (۲۱-۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔
وَهٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ (۲۱-۲۴) یہ میری اور میرے ساتھ والوں کی کتاب ہے اور جو مجھ سے پہلے (پیغمبر) ہوئے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا (۳۸-۸) کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے۔
میں ذکر سے مراد قرآن پاک ہے۔ نیز فرمایا:۔
صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ (۳۸-۱) ص۔ قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (۴۳-۴۴) اور یہ (قرآن) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے نصیحت ہے۔
میں ذکر بمعنی شرف ہے یعنی یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کیلئے باعث شرف ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
فَسْــَٔـلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ (۱۶-۴۳) تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔
میں اہل ذکر سے اہل کتاب مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ، رَّسُوْلًا (۶۵-۱۰-۱۱) خدا نے تمہارے پاس نصیحت (کی کتاب) اور اپنے پیغمبر (بھی بھیجے) ہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں الذکر آنحضرتؐ کی وصف ہے۔ جیسا کہ عیسیٰؑ کی وصف میں کلمۃ

---

[1] وفی الصحاح ترخی ذقنہا فی السیر وفی الاساس تمد خطامہا وتحرک رأسہا قوۃ ونشاطا فی السیر ۱۲

[2] وفی الصحاح والمحیط اذا خرزتہا فجاءت شفتہا مائلۃ (التاج) ۱۲

کا لفظ وارد ہوا ہے اور آنحضرت کو اَلذِّکر اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ کتب سابقہ میں آپؐ کے متعلق خوش خبری پائی جاتی تھی۔ اس قول کی بنا پر رَسُوْلًا ذِکْرًا سے بدل واقع ہو گا۔ بعض کے نزدیک رَسُوْلًا پر نصب ذِکْرًا کی وجہ سے ہے گویا آیت یوں ہے۔ قَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا ذِکْرًا رَسُوْلًا یَتْلُوْ[له] جیسا کہ آیت کریمہ:۔ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَتِیْمًا (۹۰-۱۴) میں یَتِیْمًا اِطْعَامٌ کی وجہ سے منصوب ہے اور لسیان کے بعد ذکر کے متعلق فرمایا:۔

فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ (۱۸-۶۳)۔ تو میں مچھلی (وہیں) بھول گیا اور مجھے (آپ سے) اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

اور ذکر قلبی اور لسانی دونوں کے متعلق فرمایا:۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (۲-۲۰۰)۔ تو منی میں خدا کو یاد کرو جسطرح اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ (۲-۱۹۸) تو مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں خدا کا ذکر کرو اور اسطرح ذکر کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ (۲۱-۱۰۵) اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

میں اَلذِّکر سے کتب سابقہ مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (۷۶-۱) انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔

میں شَيْئًا مَّذْكُوْرًا کے معنی یہ ہیں کہ بذات خود اس کا وجود نہ تھا اگرچہ علم الٰہی میں اس وقت بھی موجود تھا۔ اور آیت کریمہ:۔

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ (۱۹-۶۷) کیا (ایسا) انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا۔

کے معنی یہ ہیں کہ کیا حشر ونشر کے منکر کو اپنی پہلی پیدائش یاد نہیں ہے جس سے وہ دوبارہ جی اٹھنے پر استدلال کر سکتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔ (۳۶-۷۹)

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۳۰-۲۷)

اور آیت کریمہ:۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ (۲۹-۳۸) اور خدا کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے۔

کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو یاد کرنا بندے کے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے بڑھ کر ہے۔ گویا اس میں کثرت سے ذکر الٰہی کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

اَلذِّكْرٰى۔ کثرت سے ذکر الٰہی کرنا اس میں "اَلذِّکر" سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

له علی سبیل المبالغة او علی حذف مضاف من الاول تقدیرہ: انزل ذا ذکر رسولا (فتح القدیر ۵/۲۴۶-۲۴۷) له قالہ ابو علی الفارسی لان المصدر المنون یعمل (والسابق) فالمراد بالذکر القرآن راجع الطبری ۱۲

رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ (۳۸-۴۳)
(یہ) ہماری طرف سے رحمت اور عقل والوں کے لیے نصیحت ہے۔

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۱-۵۵) اور نصیحت کرتے رہو کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔

اسی طرح بہت سی آیات میں ذِکْرٰی کا لفظ آیا ہے۔

اَلتَّذْكِرَةُ: جس کے ذریعہ کسی چیز کو یاد دلایا جائے اور یہ دلالت اور امارت سے اعم ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (۷۴-۴۹)
ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں۔
كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۸۰-۱۱) دیکھو یہ (قرآن) نصیحت ہے۔ مراد قرآن پاک ہے۔

ذَكَّرْتُهُ كَذَا: کسی کو کچھ یاد دلانا۔ قرآن میں ہے:۔
وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ (۱۴-۵) اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ۔

اور آیت کریمہ:۔
فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (۲-۲۸۲) تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلا دے۔ اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذکر بنا دے گی۔ بعض علماء نے آیت کریمہ:۔
فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (۲-۱۵۲) سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔
اور اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ (۲-۴۰) میری وہ احسان یاد کرو۔ میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اُذْكُرُوْنِيْ کے مخاطب آنحضرتؐ کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الٰہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس کے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔ اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الٰہی میں غور و فکر کرتے رہو حتی کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔

اَلذَّكَرُ: نر۔ یہ اُنثیٰ (مادہ) کی ضد ہے قرآن میں ہے:۔
وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى (۳-۳۶) اور (نذر کے لئے لڑکا (موزوں تھا کہ وہ) لڑکی کی طرح (ناتواں) نہیں ہوتا۔
ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ (۶-۱۴۴) کہ خدا نے (دونوں (کے) نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں (کی) مادینوں کو۔

ذَكَرٌ کی جمع ذُكُوْرٌ وَذُكْرَانٌ آتی ہے چنانچہ فرمایا:۔
ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا (۴۲-۵۰)... بیٹے اور بیٹیاں۔
اور ذَكَرٌ کا لفظ بطور کنایہ عضو تناسل پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور جو عورت نرینہ بچہ جنے اسے مُذْكِرٌ کہا جاتا ہے مگر اَلْمِذْكَارُ وہ ہے جس کی عادت نرینہ اولاد کو جنم دینا ہو۔

نَاقَةٌ مُذْكِرَةٌ: وہ اونٹنی جو عظمت جثہ میں اونٹ کے مشابہ ہو۔

سَيْفٌ ذُوْ ذُكْرٍ وَمُذَكَّرٌ: آبدار اور تیز تلوار۔ صارم ذُكُوْرُ الْبَقْلِ۔ وہ ترکاریاں جو لمبی اور سخت وکلدار ہوں۔

(ذ ك و)

ذَكَتِ (ن) النَّارُ کے معنی آگ جلنے اور روشن ہونے کے ہیں اور ذَكَّيْتُهَا (تفعیل) کے معنی جلانے اور روشن کرنے کے۔ ذُكَاءُ: سورج

اور فجر کو سورج کا بیٹا تصور کر کے اسے اِبْنُ ذُکَاءَ کہا جاتا ہے اور اس کا حاجب اور دربان تصور کر کے اسے حَاجِبُ الشَّمْسِ کہہ دیتے ہیں۔
اور بطور کنایہ ذُکَاءٌ کے معنی ذہانت اور زود فہمی کے بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ فُلَانٌ هُوَ شُعْلَةُ نَارٍ کا محاورہ ہے کہ فلاں آتش کا پرکالا ہے۔ ذَکَّیْتُ الشَّاۃَ۔ بھیڑ ذبح کرنا۔
اصل میں تَذْکِیَةٌ (تفعیل) کے معنی حرارت غریزی خارج کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں مخصوص طریقہ سے حیاۃ زائل کرنے کو تَذْکِیَة کہتے ہیں[1]۔
اس اشتقاق کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ میت کو خَامِدٌ اور هَامِدٌ کہا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف بجھی ہوئی آگ کو مَیِّتَةٌ کہا جاتا ہے۔
ذَکَّی الرَّجُلُ۔ جب کوئی شخص سن رسیدہ ہو کر کثرت تجارب کی بنا پر ذکاوت اور فہم سے بہرہ مند ہو جائے تو اس کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اس اشتقاق کے اعتبار سے صرف اسی عمر رسیدہ کو مُذَکِّی کہا جائے گا جو کار آزمودہ اور ریاضت چشیدہ ہو اور پھر تجارب اور ریاضت عام طور پر چونکہ عمر رسیدہ آدمیوں میں پائے جاتے ہیں اس لئے ان کے بارے میں ذکاوت کا لفظ استعمال ہوا تو اس مناسبت سے عمدہ اور عمر رسیدہ گھوڑوں کے متعلق بھی ذُکَاء کا لفظ بولا جانے لگا چنانچہ محاورہ ہے: جَرْیُ الْمُذَکِّیَاتِ غِلَابٌ۔ کہ بوڑھے گھوڑے دوڑ میں غالب رہتے ہیں[2]۔

(ذ ل ل)

اَلذُّلُّ (ن)، یہ ذَلَّ یَذِلُّ کا مصدر ہے اور ذُلٌّ (بضمہ ذال) زور و قہر کی وجہ سے جھکنے کو کہتے ہیں مگر جب طبیعت کی تیزی اور سختی از خود مغلوب ہو جائے تو اسے ذِلٌّ (بکسرہ ذال) کہا جاتا ہے۔ لہٰذا آیت کریمہ:
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷-۲۴) کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے مقہور و مجبور بن کر رہو۔ اور ایک قراءت میں جَنَاحَ الذِّلِّ (بکسرہ ذال) ہے[3] یعنی ان کے سامنے نرم خو اور طاعت کیش بن کر رہا کرو۔ بغیر تاء کے ذُلٌّ اور تاء کے ساتھ ذِلَّةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ قُلٌّ اور قِلَّةٌ ہے۔ قرآن میں ہے:
وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (۱۰-۲۷) اور ان کے مونہوں پر ذلت چھا جائے گی۔
وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (۲-۶۱) اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (اور بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی۔
سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ (۷-۱۵۲) ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور ذلت (نصیب ہوگی)

---

[1] ای فی الشرع الاماذکیتم ای الا ان تذبحوا [2] المثل لقیس بن زهیر العبسی فیضربہ فی یوصف بالتبریز علی اقرانہ فی حلبة الفضل راجع المثل [ا] للسان (ذکی)، والمیدانی رقم ۹۲۱ وجمہرۃ الامثال ۸۰، والمشکل للقتبی ۵۶۵ وسمط اللالئ ۵۸۳ قال الیمنی فی طرتہ ... دی غلاءٌ والمثل فی الکامل ۲۱۹ والثمار ۲۸۵ والمستقصی والعسکری ۱/۷۷، ۳۰۳ والتبریزی ۳/۲۳ [3] وہی قراءۃ ابن عباس وعروۃ بن جبیر وغیرہما وبالضم قراءۃ الجمہور (ابو حیان ۶/۲۸ وابن الانباری ۳۷۴)

ذَلَّتِ الدَّابَّةُ ذُلًّا۔ منہ زوری کے بعد سواری کا مطیع ہو جانا اور اس قسم کی مطیع اور منقاد سواری کو ذَلُولٌ (صفت فاعلی) کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ (۲-۷۱) کہ وہ بیل کام میں لگا ہوا نہ ہو۔ نہ تو زمین جوتتا ہو۔

پھر اگر انسان کی ذلت خود اس کے اپنے اختیار وارادہ سے ہو تو وہ محمود سمجھی جاتی ہے جیسا کہ قرآن نے مومنین کی مدح کرتے ہوئے فرمایا۔

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (۵-۵۴) جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ (۳-۱۲۳) اور خدا نے جنگ بدر میں بھی تمہاری مدد کی تھی اور اس وقت بھی تو تم بے سرو سامان تھے۔

فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (۱۶-۶۹) یعنی بغیر کسی قسم کی سرکشی کے نہایت مطیع اور منقاد ہو کر اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا اور آیت کریمہ:۔

وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا (۷۶-۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ وہ گچھے اس طرح جھکے ہوئے ہوں گے کہ ان کو نہایت آسانی سے توڑ سکیں گے۔

محاورہ ہے۔ (مثل)

الْأُمُورُ تَجْرِي عَلَى أَذْلَالِهَا کہ تمام امور اپنے راستوں پر اور حسب مواقع جاری ہیں۔

(ذ م م)

ذَمَّهُ (ن) ذَمًّا کے معنی مذمت کرنے کے ہیں۔ اس سے صیغہ صفت مفعولی مَذْمُومٌ وَذَمِيمٌ آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

مَذْمُومًا مَّدْحُورًا (۱۷-۱۸) نفرین سنکر اور (درگاہ خدا سے) راندہ ہو کر۔

اور بعض ذَمَمْتُهُ صیغہ واحد متکلم میں دوسری میم کو تاء سے بدل کر ذَمَتُّهُ[1] بھی کہہ دیتے ہیں۔

اَلذِّمَامُ۔ وہ عہد وغیرہ جس کا ضائع کرنا باعث مذمت ہو۔ یہی معنی ذِمَّةٌ وَمَذَمَّةٌ کے ہیں۔ کہا گیا ہے لِي مَذَمَّةٌ فَلَا تَهْتِكْهَا کہ میرے عہد یا حرمت کا پاس کیجئے توڑیئے نہیں۔

أَذْهِبْ مَذَمَّتَهُمْ بِشَيْءٍ یعنی ان کے حق احترام کا بدلہ اتار دیجئے۔

أَذَمَّ بِكَذَا۔ اس کی حرمت کو ضائع کر دیا۔ تہاون سے کام لیا۔

رَجُلٌ مُذِمٌّ بے حس وحرکت بِئْرٌ ذَمَّةٌ[2] کم پانی والا کنواں۔ چیونٹی کے انڈوں کی طرح سفید سا مادہ جو ناک پر ظاہر ہو جاتا ہے اسے اَلذَّمِيمُ کہا جاتا ہے۔ شاعر[3] نے کہا ہے۔ (ر)

(۱۶۵) وَتَرَى الذَّمِيمَ عَلَى مَرَاسِنِهِمْ
يَوْمَ الْهِيَاجِ كَمَازِنِ النَّمْلِ

---

[1] ایضا ذَمِمْتُهُ وذَمَمْتُهُ (الصحاح) [2] بئر ذِمَام [3] قاله الحادرة الذبياني وفي رواية اللسان: كمازن الجثل وفي الجمهرة لابن دريد غب العجاج او غب الهياج (۱۹) بدل يوم الهياج وفي رواية الابدال لابي الطيب (۱: ۱۹۶) وترى الدفيق قال في الصحاح الذميم المخاط والبول الذي يذم ويذن من قضيب التيس والذميم البصّا شيء يخرج من مسام المارن كبيض النمل وذهب ابن دريد الى ان الذميم بهما هو الندى. راجع للبيت اللسان والتاج (جثل، ذمم، مزن) والصحاح (ذمم) و المخصص (۲: ۵۶ / ۱۴ / ۸) والاساس (رسن) ومبادي اللغة للاسكافي ۷۶

لڑائی کے دن ان کی ناک پر چیونٹی کے انڈوں کی طرح
سفید سی پھنسیاں نظر آتی ہیں۔

(ذ ن ب)

ذَنَبُ الدَّآبَّۃِ وَغَیْرِھَا۔ چوپایہ وغیرہ کی دم کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق کم مرتبہ اور رذیل آدمی پر ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے:۔
ھُمْ اَذْنَابُ الْقَوْمِ۔ یعنی وہ رذیل ہیں اور اسی سے بطور استعارہ ٹیلوں میں پانی کے بہنے کے راستوں کو مَذَانِبُ التِّلَاعِ کہا جاتا ہے۔
اَلْمُذَنِّبُ (ایضًا) وہ کھجور جو پچھلی جانب سے پکنا شروع ہو۔
اَلذَّنُوْبُ۔ لمبی دم والا گھوڑا۔ دم دار ڈول سَجْلٌ کی طرح بطور استعارہ ذَنُوْبٌ کے معنی بھی نصیبہ اور حصہ آجاتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِھِمْ (۵۱-۵۹) کہ ان ظالموں کے لئے بھی (عذاب کی) نوبت مقرر ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کی نوبت مقرر تھی۔
اَلذَّنْبُ (ض) کے اصل معنی کسی چیز کی دم پکڑنا کے ہیں کہا جاتا ہے ذَنَبْتُہٗ میں نے اس کی دم پر مارا دم کے اعتبار سے ہر اس فعل کو جس کا انجام برا ہو اسے ذَنْبٌ کہہ دیتے ہیں اسی بنا پر انجام کے اعتبار سے گناہ کو تَبِعَۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔
ذَنْبٌ کی جمع ذُنُوْبٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ (۳-۱۱) تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (عذاب میں) پکڑ لیا تھا۔
فَکُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِہٖ (۲۹-۴۰) تو ہم نے سب کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا۔
وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ (۳-۱۳۵) اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔ وَ غَیْرُ ذٰلِکَ مِنَ الْاٰیَاتِ ۔

(ذ ھ ب)

اَلذَّھَبُ۔ سونا۔ اسے ذَھَبَۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ ذَھِبٌ۔ جو کان کے اندر زیادہ سونا دیکھ کر ششدر رہ جائے۔
شَیْءٌ مُّذَھَّبٌ (او مُذْھَبٌ) زراندودہ طلاء کی ہوئی چیز۔
کُمَیْتٌ مُّذَھَّبٌ (او مُذْھَبٌ) کمیت گھوڑا جس کی سرخی پر زردی غالب ہو۔ گویا وہ سنہری رنگ کا ہے۔
اَلذَّھَابُ (و الذُّھُوْبُ) کے معنی چلا جانے کے ہیں۔ ذَھَبَ (ف) بِالشَّیْءِ وَ اَذْھَبَہٗ۔ لے جانا۔ یہ اعیان و معانی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (۳۷-۹۹) کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔
فَلَمَّا ذَھَبَ عَنْ اِبْرٰھِیْمَ الرَّوْعُ (۱۱-۷۴) جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا۔ اور آیت کریمہ:۔
فَلَا تَذْھَبْ نَفْسُکَ عَلَیْھِمْ حَسَرٰتٍ (۳۵-۸) تو ان لوگوں پر افسوس کر کے تمہارا دم نہ نکل جائے۔
میں ذَھَابِ نَفْسٍ موت سے کنایہ ہے اور فرمایا:۔
اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ (۱۴-۱۹) اگر وہ چاہے تو تمہیں نابود کر دے اور (تمہاری جگہ) نئی مخلوق پیدا کر دے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵-۳۴) وہ کہیں گے خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ (۳۳-۳۳) خدا چاہتا ہے تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کر دے۔

اور آیت:۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ (۴-۱۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم ان کو اپنے گھروں میں اس لئے نہ روک رکھو کہ اس طرح مہر وغیرہ کی کچھ رقم ان سے واپس لو۔ اور فرمایا۔

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (۸-۴۶) اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (۲-۱۷) تو خدا نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ (۲-۲۰) اور اگر خدا چاہتا تو ان کے کانوں (کی شنوائی) ..... کو زائل کر دیتا۔

لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ (۱۱-۱۰) تو (خوش ہو کر) کہتا ہے کہ (آہا) سب سختیاں مجھ سے دور ہو گئیں۔

(ذ ھ ل)

اَلذُّهُوْلُ (ف) ایسی مشغولیت جو غم و نسیان کی موجب ہو۔ کہا جاتا ہے:۔ ذَهَلَ عَنْ كَذَا۔ وہ اس سے غافل ہو گیا۔

اَذْهَلَهٗ كَذَا۔ فلاں چیز نے غافل کر دیا۔ قرآن میں ہے۔

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ۔ (۲۲-۲) (اے مخاطب) جس دن تو اس کو دیکھے گا (اس دن یہ حال ہو گا کہ) تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی۔

(ذ و)

ذُوْ (والا۔ صاحب) یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) اول یہ کہ اسماء اجناس و انواع کے ساتھ توصیف کے لئے اسے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ اسم ضمیر کی طرف مضاف نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع بھی آتا ہے۔ اور مونث کے لئے ذَاتُ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ ذَوَاتَا اور جمع ذَوَاتُ آتی ہے۔ اور یہ تمام الفاظ مضاف ہو کر استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ (۲-۲۵۱) لیکن خدا اہل عالم پر بڑا مہربان ہے۔

ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى۔ (۵۳-۶)۔ (یعنی جبریل) طاقتور نے پھر وہ پورے نظر آئے۔

وَذِى الْقُرْبٰى (۲-۸۳) اور رشتہ داروں۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ۔ (۱۱-۳) اور ہر صاحب فضل کو اسکی بزرگی (کی داد) دیگا۔

ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى (۲-۱۷۷) رشتہ داروں اور یتیموں۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۱-۵) وہ تو دلوں تک کی باتوں سے آگاہ ہے۔

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ۔ (۱۸-۱۸) اور ہم ان کو دائیں اور بائیں کروٹ بدلاتے ہیں۔

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ۔

(۸-۷) اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان و شوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آجائے۔

ذَوَاتَا اَفْنَانٍ - (۵۵-۴۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت) ہیں۔

علمائے معانی (منطق و فلسفہ) ذات کے لفظ کو بطور استعارہ عینِ شے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ جوہر اور عرض دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور پھر کبھی یہ مفرد (یعنی بدونِ اضافت کے) استعمال ہوتا ہے اور کبھی اسم ضمیر کی طرف مضاف ہو کر اور کبھی معرف باللام ہو کر۔ اور یہ لفظ بمنزلہ نفس اور خاصہ کے بولا جاتا ہے۔ اور نَفْسُهٗ وَخَاصَّتُهٗ کی طرح ذَاتُهٗ بھی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ عربی زبان کے محاورات سے نہیں ہے (۲) دوم بنی طی ذُو بمعنی اَلَّذِیْ استعمال کرتے ہیں اور یہ رفعی، نصبی، جری، جمع اور تانیث کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے؂ (الوافر)

(۱۶۴) وَبِئْرِیْ ذُوْ حَفَرْتُ وَذُوْ طَوَیْتُ

یعنی کنواں جسے میں نے کھودا اور صاف کیا ہے۔

(ذ ا)

ہاں "ھٰذَا" میں "ذَا" کا لفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ ھٰذِہٖ وَھٰذِیْ وَھَاتَا۔ ان میں سے صرف ھَاتَا کا تثنیہ ھَاتَانِ آتا ہے۔ ھٰذِہٖ اور ھٰذِیْ کا تثنیہ استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے:۔

اَرَاَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ (۱۷-۶۲) کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ (۳۸-۵۳) یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ...... تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ۔ (۵۱-۱۴) یہ وہی ہے جس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (۲۰-۶۳) کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔ (۵۲-۱۴)۔ یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ۔ (۵۵-۴۳) یہی وہ جہنم ہے جسے گنہگار لوگ جھٹلاتے تھے۔

"ھٰذَا" کے بالمقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔ اس کے لئے ذَاكَ اور ذٰلِكَ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ (۲-۱،۲) الٓمٓ یہ کتاب

ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ (۱۸-۱۷) یہ خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ یَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰی۔ (۶-۱۳۱) یہ اس لئے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو .... ہلاک کر دے۔

لہ قاله سنان بن فحل الطائی حین اختصم الی عبدالرحمٰن بن الضحاک والی المدینة (۱۰۲-۱۰۴) ایام یزید بن عبدالملک والبیت من خمسة اور دھا ابوتمام فی الحماسة رقم ۱۹۲ المرزوقی وقد عیب به علی المؤلف ایراده فی باب الحماسة دراجع شرح الحماسة ابن الدین الطبرسی) وفی اللسان (ذوو) غیر منسوب وامالی الشجریة (۲: ۳۰۷) والخزانة (۲: ۵۱۱) ۱۲ ۞ ۞ ۞ ۞

(ماذا)

اور "مَاذَا" بھی دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ اول یہ کہ "مَا" "ذَا" کے ساتھ مل کر بمنزلہ ایک اسم کے ہو۔ دوم یہ کہ ذَا بمنزلہ اَلَّذِیْ کے ہو (مَا بمعنی اَیُّ شَیْءٍ کے ہو) پہلی قسم کی مثال جیسے:۔ عَمَّاذَا تَسْأَلُ؟ (کہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہو) اس صورت میں چونکہ "مَا" اکیلا استفہام کے لئے نہیں ہے بلکہ "ذَا" کے ساتھ مل کر ایک اسم بنتا ہے۔ اس لئے "مَا" کے الف کو حذف نہیں کیا گیا۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[1] ع (الوافر)

(۱۶۷) دَعِیْ مَاذَا عَلِمْتِ سَأَتَّقِیْهِ

یعنی جو چیز تجھے معلوم ہے اسے چھوڑ دے میں اس سے بچنے کی کوشش کرونگا۔ اور آیت کریمہ:۔ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَهٗ (۲-۲۱۵) اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں۔

میں جو لوگ قُلِ الْعَفْوَ میں اَلْعَفْوَ کو منصوب پڑھتے ہیں۔ وہ "مَاذَا" کو بمنزلہ ایک اسم کے مانتے ہیں یعنی کونسی چیز صرف کریں مگر جن کے نزدیک "اَلْعَفْوُ" مرفوع ہے ان کے نزدیک "ذَا" بمعنی اَلَّذِیْ ہے اور "مَا" استفہامیہ ہے اَیْ مَا الَّذِیْ یُنْفِقُوْنَ یعنی وہ کونسی چیز ہے جسے خرچ کریں۔ اس بنا پر آیت کریمہ:۔ مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۶-۲۴) کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔ میں اَسَاطِیْرُ پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں[2]۔

(ذ و د)

ذَادَهٗ (ن) عَنْ كَذَا کے معنی کسی چیز سے دفع کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدٰنِ (۲۸-۲۳) اور دیکھا ان کے ایک طرف دو عورتیں (اپنے مال کو) روکے کھڑی ہیں۔ یعنی اپنے ذَوْدٌ کو روکے کھڑی ہیں۔ اور ذَوْدٌ دس اونٹوں کی جماعت کو کہا جاتا ہے۔

(ذ و ق)

اَلذَّوْقُ (ن) کے معنی چکھنے کے ہیں۔ اصل میں ذَوْقٌ کے معنی تھوڑی چیز کھانے کے ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کو زیادہ مقدار میں کھانے پر "اَكْلٌ" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن نے عذاب کے متعلق ذوق کا لفظ اختیار کیا ہے اس لئے کہ عرف میں اگرچہ یہ قلیل چیز کھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر لغوی معنی کے اعتبار سے اس میں معنی کثرت کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا معنی عموم کے پیش نظر عذاب کے لئے یہ لفظ اختیار کیا ہے۔ تاکہ قلیل وکثیر ہر قسم کے عذاب کو شامل ہوجائے قرآن میں بالعموم یہ لفظ عذاب کے

---

[1] قالہ المثقب العبدی عائذ بن محصن وتمامہ: لکن بالمغیب نبئینی۔ والبیت فی الخزانۃ (۲: ۵۵۴) وابن ہشام (۱: ۳۳۳) والعینی (۱: ۴۸۸) والسیوطی ۶۹ قال السیوطی اورده المؤلف فی "ماذا" علی انہا موصول او جنس بمعنی ای شیء وعلمت ضبطہ النحاس بکسر التاء والاخفش عن ابی اسحاق بضمہا والسان (ذو) ونسبہ الی ابی حیۃ النمیری والبحر ار ۱۱۹ والکتاب ار ۴۰۵ والزمخشری بغیر عزو ۱۲ [2] قارن المشکل للقیسی (۱۲۴-۱۲۵) ۱۲

ساتھ آیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ (۴-۵۶) تاکہ (ہمیشہ) عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔
وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ (۳۲-۲۰) اور ان سے کہا جائیگا کہ دوزخ کے مزے چکھو۔
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۶-۳۰) اب کفر کے بدلے (جو دنیا میں کرتے تھے) عذاب (کے مزے) چکھو۔
ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ (۴۴-۴۹) (اب) مزہ چکھو تو بڑی عزت والا (اور) سردار ہے۔
إِنَّكُمْ لَذَائِقُو الْعَذَابِ الْأَلِيمِ (۳۷-۳۸) بے شک تم تکلیف دینے والے عذاب کا مزہ چکھنے والے ہو۔
ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ (۸-۱۴) یہ مزہ تو یہاں چکھو۔
وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ (۳۲-۲۱) اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے۔
اور بعض مقامات پر رحمت کے ساتھ بھی آیا ہے جیسے فرمایا:۔
وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً (۱۱-۹) اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں۔
وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ (۱۱-۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔
اور کبھی (بطور استعارہ) ابتلاء و اختبار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے أَذَقْتُهُ كَذَا فَذَاقَ میں نے اسے مزہ چکھایا چنانچہ اس نے چکھ کر لیا۔ فُلَانٌ ذَاقَ كَذَا وَأَنَا أَكَلْتُهُ (مثل) فلاں نے تو اسے چکھا ہے اور میں کھا چکا ہوں یعنی میں اس سے زیادہ باخبر ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔
فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ (۱۶-۱۱۲) تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھایا۔
میں لباس کے ساتھ ذوق کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ اس سے اختبار و ابتلاء مراد ہے یعنی بھوک اور خوف سے اس طرح دوچار کیا کہ وہ ان کا تجربہ کرنے لگے بعض نے کہا ہے کہ یہاں در اصل دو جملے ہیں اور تقدیر کلام یہ ہے أَذَاقَهَا طَعْمَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ وَأَلْبَسَهَا لِبَاسَهُمَا۔ یعنی انہیں بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا اور ان دونوں کا لباس اوڑھا دیا۔ اور آیت کریمہ:۔
وَإِذَا أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً (۴۲-۴۸) اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں۔
میں رَحْمَة کے ساتھ اَذَاقَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور رحمۃ کے بالمقابل سَيِّئَة (یعنی سختی اور مصیبت) کے لئے اَصَابَ کا لفظ آتا ہے تو لفظ اَذَاقَ لا کر تنبیہ کی ہے کہ انسان ادنیٰ سی نعمت پاکر اترا جاتا ہے اور گھمنڈ کرنے لگ جاتا ہے اس سے آیت کریمہ:۔
كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغَىٰ أَنْ رَآهُ اسْتَغْنَىٰ (۹۶-۶،۷) مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔ کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

كِتَابُ الرَّاءِ

(ر ب ب)

اَلرَّبُّ (رن) کے اصل معنی تربیت کرنا یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشو و نما دے کر حد کمال تک پہنچانا کے ہیں اور رَبَّهٗ، وَرَبَّاهُ وَرَبَّبَهٗ تینوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔[1] لَاَنْ يَّرُبَّنِيْ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ يَّرُبَّنِيْ رَجُلٌ مِّنْ هَوَازِنَ۔ کہ کسی قریشی کا سردار ہونا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے کہ بنی ہوازن کا کوئی آدمی مجھ پر حکمرانی کرے۔ رَبٌّ کا لفظ اصل میں مصدر ہے اور استعارۃً بمعنی فاعل استعمال ہوتا ہے اور مطلق (یعنی اضافت اور لام تعریف سے خالی) ہونے کی صورت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو جملہ موجودات کے مصالح کا کفیل ہے، اور کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے۔ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ (۳۴-۱۵) عمدہ شہر اور (آخرت میں) گناہ بخشنے والا پروردگار۔ نیز فرمایا:۔ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اور وہ تم سے (کبھی بھی) یہ نہیں کہے گا کہ فرشتوں اور انبیاء کرام کو خدا مانو (یعنی انہیں معبود بناؤ) اور مسبب الاسباب اور مصلح عباد کو کفیل سمجھو (۳-۸۰)

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور دوسروں پر بھی۔ چنانچہ فرمایا:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱-۱) ہر طرح کی حمد خدا ہی کو (سزاوار) ہے (جو) تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اَللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (۳۷-۱۲۶) یعنی اللہ کو جو تمہارا (بھی) پروردگار (ہے) اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا (بھی) رَبُّ الدَّارِ گھر کا مالک۔ رَبُّ الْفَرَسِ گھوڑے کا مالک اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:۔ اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (۱۲-۴۲) اپنے آقا سے میرا بھی تذکرہ

---

[1] قالہ صفوان بن امیۃ، کما فی الکشاف ۱/۸ والمغازی لابن اسحاق (ومن طریقہ اخرجہ ابن حبان فی صحیحہ والبیہقی فی الدلائل و ذکر الدارقطنی فی الغرائب عن الزہری مرسلاً کما ذکرہ) والصواب ان صفوان قال لکلدۃ بن حنبل اخیہ من امہ وحدیثہ انہ لما انہزم الناس عن الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) یوم حنین وتکلم الناس فقال سفیان بن حرب لا تنتہی ہزیمتہم دون البحر وصرح کلدۃ بن حنبل الا بطل السحر الیوم فقال لہ صفوان اسکت فض اللہ فاک انظر للکلمۃ سیرۃ ابن ہشام ۴/۸۶ واللسان (ریب) والفائق ۲/ ۵۴ الاضداد لابن السکیت ۲۰۴ واضداد ابن الطیب ۳۱ وفی اللسان (رب)، وکذا قال ابن عباس فی حوار لابن الزبیر لان یربنی بنو عمی احب الی من ان یربنی غیرہم یعنی ان بنی امیۃ خیر منک ۱۲

کرنا۔ سو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے تذکرہ کرنا بھلا دیا۔

اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ۔ (۱۲-۵۰) اپنے سرکار کے پاس لوٹ جاؤ۔ اور آیت:۔

مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ۔ (۱۲-۲۳) (یوسف نے کہا) معاذ اللہ وہ (تمہارا شوہر) میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ رَبِّیْ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور بعض نے عزیز مصر مراد لیا ہے۔ لیکن پہلا قول انسب معلوم ہوتا ہے[1]۔

رَبَّانِیٌّ بقول بعض یہ رَبَّانَ (صیغہ صفت) کی طرف منسوب ہے۔ لیکن عام طور پر فَعْلَانُ (صفت) فَعِلَ سے آتا ہے۔ جیسے عَطْشَانُ سَکْرَانُ اور فَعَلَ (فتحہ عین) سے بہت کم آتا ہے جیسے۔ نَعْسَانُ (مِنْ نَعَسَ)،

بعض نے کہا ہے کہ یہ رَبٌّ (مصدر) کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسے حکیم (یعنی جو حکمت کو فروغ دے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَبٌّ مصدر کی طرف ہی منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ وہ ہے۔ جو علم سے اپنی پرورش کرے درحقیقت یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں کیونکہ جس نے علم کی پرورش کی تو اس نے علم کے ذریعہ اپنی ذات کی بھی تربیت کی اور جو شخص اس کے ذریعہ اپنی ذات کی تربیت کریگا وہ علم کو بھی فروغ بخشے گا۔

[2] بعض نے کہا ہے کہ یہ رَبٌّ بمعنی اللہ کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ بمعنی اِلٰهِیٌّ ہے (یعنی اللہ والا) اور اس میں الف نون زائدتان ہیں جیسا کہ جِسْمٌ و لِحْیَۃٌ کی نسبت میں جِسْمَانِیٌّ وَلِحْیَانِیٌّ کہا جاتا ہے[2]۔ حضرت علیؓ کا قول ہے (۱۶۸)

اَنَا رَبَّانِیُّ هٰذِهِ الْاُمَّةِ میں اس امت کا عالم ربانی ہوں اس کی جمع رَبَّانِیُّوْنَ ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ (۵-۶۳) انہیں ان کے رَبِّیْ (یعنی مشائخ) کیوں منع نہیں کرتے۔

کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ (۳-۷۹) (بلکہ دوسروں سے کہیگا) کہ تم خدا پرست ہو کر رہو۔

اور[3] بعض نے کہا ہے کہ رَبَّانِیٌّ اصل میں سریانی لفظ ہے اور یہی قول انسب معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ عربی زبان میں یہ لفظ بہت کم پایا جاتا ہے[4] اور آیت:۔ رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ (۳-۱۴۶) بہت سے اللہ والوں نے۔ میں رِبِّیٌّ بمعنی رَبَّانِیٌّ ہے[5]۔

اَلرُّبُوْبِیَّةُ وَالرَّبَابِیَّةُ یہ دونوں مصدر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے رُبُوْبِیَّةٌ اور دوسرں کے لئے رَبَابِیَّةٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اَلرَّبَّابُ (صیغہ صفت) جمع اَرْبَابٌ۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] ولہذا ہو قول الزجاج راجع فتح القدیر للشوکانی ۳/۲۷ ادا لفیوضات الالہیہ ۲/۵۴ [2] والزائدتان للمبالغۃ فی النسبۃ کمافی رقبانی وشعرانی راجع الکتاب لسیبویہ واضداد ابی الطیب ۳۰۵ [3] قال ابو عبیدۃ فی مجازہ (۱: ۹۷) لم یعرفوا ربانیین وفی العرب للجوالیقی (۱۶۱) قال ابو عبید احسن الکلمۃ لیس بعربیۃ انما ہی عبرانیۃ او سریانیۃ وذالک لان ابا عبیدۃ زعم ان العرب لا تعرف الربانیین۔ زاد ابو عبید وانما عرفہا الفقہاء واہل العلم راجع ایضا اللسان (ربب)، وانظرہ فی القرطبی ۴: ۱۲۲ و غریب ابی عبید [5] فی مجاز ابی عبیدۃ: الربیون الجماعۃ الکثیرۃ والواحد منہا رِبِّیٌّ ایضا قارن الفتح ۸/۱۵۵۔

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲-۳۹) بھلا دیکھو تو سہی کہ جدا جدا معبود اچھے یا خدائے یگانہ اور زبردست۔

اصل تو یہ تھا کہ رَبٌّ کی جمع نہ آتی۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہ لفظ خاص کر ذات باری تعالیٰ کیلئے استعمال ہوا ہے لیکن عقیدۂ کفار کے مطابق بصیغۂ جمع استعمال ہوا ہے اور اَرْبَابٌ کے علاوہ اس کی جمع اَرِبَّۃٌ وَرُبُوْبٌ بھی آتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (بسیط)

(۱۶۸) كَانَتْ اَرِبَّتُهُمْ بَهْزٌ وَغَرَّهُمْ
عَقْدُ الْجِوَارِ وَكَانُوْا مَعْشَرًا غُدُرًا

ان کے ہم عہد بنی بہز تھے جنہیں عقد جوار نے مغرور کر دیا اور درحقیقت وہ غدار لوگ ہیں۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)

(۱۶۹) وَكُنْتَ امْرَءًا اَفْضَتْ اِلَيْكَ رِبَابَتِيْ
وَقَبْلَكَ رَبَّتْنِيْ فَضِعْتُ رُبُوْبُ

تم وہ آدمی ہو جس تک میری سرپرستی پہنچی ہے تم سے پہلے بہت سے میرے سرپرست بن چکے ہیں مگر میں ضائع ہو گیا ہوں۔ رِبَابَۃٌ عہد و پیمان یا اس چیز کو کہتے ہیں جس میں قمار بازی کے تیر لپیٹ کر رکھے جاتے ہیں۔

رَابَّۃٌ وہ بیوی جو پہلے شوہر سے اپنی اولاد کی تربیت کر رہی ہو۔ اس کا مذکر رَابٌّ ہے۔ لیکن وہ اولاد جو پہلے شوہر سے ہو اور دوسرے شوہر کی زیر تربیت ہو یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی کی آغوش میں پرورش پا رہی ہو۔ اسے رَبِيْبٌ یا رَبِيْبَۃٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع رَبَائِبُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَرَبَائِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ (۴-۲۳) اور تمہاری بیویوں کی (پچھلی) اولاد جو تمہاری گودوں میں (پرورش پاتی) ہے۔

رَبَّيْتُ الْاَدِيْمَ بِالسَّمْنِ میں نے چمڑے کو گھی لگا کر نرم کیا۔

رَبَّيْتُ الدَّوَاءَ بِالْعَسَلِ میں نے شہد سے دوا کی اصلاح کی سِقَاءٌ مَرْبُوْبٌ پانی مشک جسے تیل لگا کر نرم کیا گیا ہو۔ شاعر نے کہا ہے[3] (طویل)

(۱۷۰) فَكُوْنِيْ لَهٗ كَالسَّمْنِ رُبَّتْ لَهُ الْاَدَمُ

تم اس کے لئے ایسی ہو جاؤ جیسے رُبٌّ لگا ہوا چمڑا گھی کے لئے ہوتا ہے۔

اَلرَّبَابُ بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ نباتات کی پرورش کرتا اور اسے بڑھاتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے مَطَرٌ کو دَرٌّ (دودھ) اور

---

[1] قالہ ابو ذؤیب الہذلی و بہز بطن من سلیم والبیت فی اللسان (رب) والمعانی الکبیر ۴۸ [2] قالہ علقمۃ بن عبدۃ فی قصیدۃ لمفضلیۃ (۲: ۱۹۴) وفی روایۃ امانتی بدل ربابتی وربتنی باثبات التانیث والبیت فی منتہی الطلب (۱: ۲۹) والطبری (۱: ۱۴۷ ۳۱: ۲۲۷) واللسان (رب) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۴۲۲) والعقد الثمین ۱۰۷ وایام العرب ۵۷ وفی الہامش قال بعض مصحح اللسان قال الصاغانی والروایۃ "انت امرؤ" والمخاطب حارث بن نضلۃ ۱۲ [3] قالہ عمرو بن شاس الاسدی یخاطب امرأتہ ام حسان ابنۃ الحارث وکانت تکرہ ابنہ عرارًا فطلقہا فہم ذم ولام نفسہ وصدرہ فان کنت منی او تریدین صحبتی۔ وقولہ ربت لہ الادم ای جعل فیہا الرب لئلا تفسد والادم واحدہ ادیم یرید الاسقیۃ التی یجعل فیہا الرب تصلح للسمن وفی روایۃ اسد الغابۃ بہ بدل لہ والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی ۲۸۰ والشعراء ۳۸۹ والکامل ۱۵۴ والطبقات للجمحی ۷۶ وانظر الخبر والابیات ایضًا فی الاغانی (۱۰: ۶۰) والامالی (۲: ۱۸۴-۱۸۵) وفی روایۃ رُبّت لہ الادم والتبریزی والسمط ۸۰۳

بادل کو تشبیہاً لَقُوحٌ (یعنی وہ دھیلی اونٹنی) کہا جاتا ہے جو دودھ دیتی ہے۔

اَرَبَّتِ السَّحَابَۃُ بدلی متواتر برستی رہی اور اسکے اصل معنی ہیں بدلی صاحب تربیت ہوگئی اس کے بعد اس سے ٹھہرنے کا معنی لے کر یہ لفظ کسی جگہ پر مقیم ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے اَرَبَّ فُلَانٌ بِمَکَانِ کَذَا اس نے فلاں جگہ پر اقامت اختیار کی۔

رُبَّ تقلیل کے لئے آتا ہے اور کبھی تکثیر کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ۔ (۱۵-۲) کافر بہتیرے ہی ارمان کریں گے (کہ) اے کاش (وہ بھی) مسلمان ہوتے۔

(ر ب ح)

اَلرِّبْحُ وہ فائدہ جو خرید و فروخت سے حاصل ہو مجازاً ثمرہ اعمال کو بھی رِبْحٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کبھی سامان تجارت کی طرف ہوتی ہے۔ اور کبھی صاحب سامان کی طرف۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ (۲-۱۶) سو نہ تو ان کی تجارت سود مند ہوئی۔

کسی شاعر نے کہا ہے۔ (   )

(۱۷۱) قَرَوْا اَضْیَافَھُمْ رُبَحًا بِبُحٍّ

بعض نے کہا ہے کہ رُبَحٌ ایک پرندے کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ رُبَحٌ بمعنی چربی ہے لیکن ہمارے خیال میں رُبَحٌ سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو رِبْحٌ سے حاصل ہوتی ہو جیسا کہ نِقْصٌ سے جو اثر ظاہر ہوتا ہے اسے نَقْص کہا جاتا ہے اور بُحٌّ قرعہ اندازی یا قماربازی کے تیر کو کہتے ہیں۔ تو شعر کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اپنے مہمانوں کی مہمانداری سے تعریف کا بہت بڑا فائدہ حاصل کیا۔ جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے[۱] (طویل)

(۱۷۲) فَاَوْسَعَنِیْ حَمْدًا وَاَوْسَعْتُہٗ قِرًی
وَاَرْخِصْ بِحَمْدٍ کَانَ کَاسِبُہُ الْاَکْلُ

اس نے میری تعریف میں فروگذاشت نہ کی اور میں نے بھی اس کی خوب مہمان نوازی کی۔ وہ تعریف کتنی سستی ہے جو چند لقموں سے حاصل ہوجائے۔

(ر ب ص)

اَلتَّرَبُّصُ کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ خواہ وہ انتظار سامان تجارت کی گرانی یا ارزانی کا ہو یا کسی امر کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا انتظار ہو۔ تَرَبَّصْتُ لِکَذَا وَلِیْ رُبْصَۃٌ بِکَذَا وَتَرَبُّصٌ کسی چیز کا انتظار کرنا۔ قرآن میں ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ (۲-۲۲۸) مطلقہ عورتوں کو چاہئے کہ انتظار کریں۔

قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ (۵۲-۳۱) ان سے کہو کہ (بہت اچھا تم بھی) انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

قُلْ ھَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِکُمْ (۹-۵۲) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں

---

[۱] قالہ خفاف بن ندبہ و تمامہ بعیش بفضلہن اذا الحسناء لم ترحض بدیہلہ والبیت فی اللسان والحکم والتاج (ربح، بح) وقبلہ: اذا الحسناء لم ترخص بدیھلہ ولم یقصرلھا بصر بستر [۲] البیت فی الفاضل للمبرد ۲۸ والحماسۃ (رقم: ۷۲۳) والمرزوقی ۱۵۶۹ وفی ثلاثۃ بلغیر عزو ۱۲

ہیں سے دخواہ نخواہ) ایک نہ ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمہارے حق میں انتظار کرتے ہیں۔

(ر ب ط)

رَبْطُ الْفَرَسِ کے معنی گھوڑے کو کسی جگہ پر حفاظت کے لئے باندھ دینے کے ہیں اور اسی سے رِبَاطُ الْجَیْشِ ہے یعنی فوج کا کسی جگہ پر متعین کرنا اور وہ مقام جہاں حفاظتی دستے متعین رہتے ہوں اسے رِبَاط کہا جاتا ہے۔ اور رَبَطْتُ ورَابَطْتُ کا مصدر بھی رِبَاط آتا ہے اور مُرَابَطَۃٌ کے معنی حفاظت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ رِبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸-۶۰) اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھے رکھنے سے جس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو مرعوب کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ (۳-۱۹۹) (ان تکلیفوں کو جو راہ خدا میں تم کو پیش آئیں) برداشت کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور دشمن کے مقابلے کے لئے تیار رہو۔

پس معلوم ہوا کہ مُرَابِطَۃٌ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی سرحدوں پر دفاع کے لئے پہرہ دینا اور دوسرے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنا اور اس میں کوتاہی نہ کرنا جیسے مجاہدۂ نفس کی صورت میں ہوتا ہے اور اس مجاہدۂ نفس کا ثواب بھی جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے[1] (——) مِنَ الرِّبَاطِ اِنْتِظَارُ الصَّلٰوۃِ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا بھی رباط ہے۔

فُلَانٌ رَابِطُ الْجَأْشِ۔ فلاں مضبوط دل ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا۔ (۲۸-۱۰) اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کئے رہتے (تو عجب نہ تھا کہ وہ ہمارا معاملہ ظاہر کر دیتیں۔

وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ (۸-۱۱) تاکہ تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھ جائے۔

اور اسی معنی کی طرف دوسرے مقام پر اشارہ فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۵۸-۲۲) وہ خدا ہی تو تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل ڈالا اور اپنے فیضان غیبی سے ان کی تائید کی۔

کیونکہ ان کے دل ایسے نہیں تھے جیسے فرمایا:۔

وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ۔ (۱۴-۴۳) اور ان کے دل (ہیں کہ) ہوا ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

اور اسی سے فُلَانٌ رَابِطُ الْجَأْشِ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی مضبوط دل شخص کے ہیں۔

(ر ب ع)

اَرْبَعٌ وَاَرْبَعُوْنَ وَرُبْعٌ وَرِبَاعٌ ان سب کی ایک ہی اصل ہے۔ قرآن میں ہے:۔

ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲) (اصحاب کہف) تین تھے اور چوتھا ان کے ساتھ ان کا کتا تھا۔

اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ چالیس برس تک

---

[1] اخرجہ ابن حبان فی زوائدہ من حدیث جابر انظر رقم ۱۶۱ وفی روایۃ افضل الرباط انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ (عب وابن جریر عن ابی ہریرۃ) راجع کنز العمال ۱۲

(وہ سرزمین ان کے نصیب نہ ہوگی اور) اس بیابان میں سرگرداں رہیں گے (۵ - ۲۶)

اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً (۷ - ۱۴۲) (اور) چالیس رات (کا وعدہ پورا ہو گیا)

وَلَھُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکْتُمْ۔ (۴ - ۱۲) اور تم کچھ (ترکہ) چھوڑ مرو تو بیبیوں کا حصہ چوتھائی ہے۔

مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ۔ (۴ - ۳) دو دو اور تین تین اور چار چار (عورتوں سے نکاح کر لو)۔

رَبَعْتُ الْقَوْمَ (۱) میں نے قوم سے چوتھائی حصہ وصول کیا (۲) میں نے انہیں چار بنا دیا۔

رَبَعْتُ الْحَبْلَ رسی کو چار ریشوں سے بٹنا

رِبْعٌ (۱) چار دن کے پیاسے اونٹ (۲) چوتھیا بخار

اَرْبَعَ اِبِلَہٗ اونٹوں کو چوتھے روز پانی پلانا۔

رَجُلٌ مَرْبُوْعٌ وَمُرْبِعٌ جسے چوتھیا بخار ہو۔

اَلْاَرْبِعَاءُ چہارشنبہ۔ کیونکہ عربی میں ہفتہ کا پہلا دن اتوار ہے۔ جسے یوم الاحد کہا جاتا ہے۔

رَبِیْعٌ موسم بہار (کیونکہ یہ سال کا چوتھا موسم ہے)، اسی سے محاورہ ہے:۔

رَبَعَ فُلَانٌ وَارْتَبَعَ۔ اس نے فلاں جگہ پر موسم بہار گذارا مجازاً کسی جگہ پر اقامت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ اقامت موسم بہار میں ہو یا کسی اور موسم میں ہو، حتیٰ کہ ہر منزل کو رَبْعٌ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اصل معنی موسم ربیع کی اقامت گاہ کے ہیں۔

اَلرُّبَعُ وَالرِّبْعِیُّ جانور کا وہ بچہ جو موسم ربیع میں پیدا ہو اور موسم بہار جانوروں کی ولادت کے لئے چونکہ سال میں پہلا اور بہتر موسم ہے اس لئے استعارہ کے طور پر وہ بچہ جو کسی کے ہاں عالم شباب میں پیدا ہو اسے رِبْعِیٌّ کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے[1]۔

اَفْلَحَ مَنْ کَانَ لَہٗ رِبْعِیُّوْنَ۔ سعادت مند ہے وہ شخص جس کے ہاں عالم شباب میں اولاد ہو جائے۔

اَلْمِرْبَاعُ موسم بہار میں بچہ دینے والی اونٹنی۔

غَیْثٌ مُرْبِعٌ موسم بہار کی بارش۔

رَبَعَ الْحَجَرَ وَالْحِمْلَ پتھر یا بوجھ کو چاروں طرف سے پکڑ کر اٹھانا۔

اَلْمِرْبَعُ لکڑی جس کے ذریعہ چوپایہ پر بوجھ لادا جاتا ہے رَبِیْعَۃٌ وہ پتھر جو ورزش کے طور پر اٹھایا جاتا ہے۔

اِرْبَعْ عَلٰی ظَلْعِکَ یعنی طاقت سے زیادہ کام نہ کرو یہ یا تو رَبَعَ بمعنی اِقَامَۃ سے ہے اور یا رَبَعَ الْحَجَرَ سے اَلْمِرْبَاعُ اموال غنیمت کا چوتھا حصہ جو رئیس قبیلہ وصول کیا کرتا تھا یہ رَبَعْتُ الْقَوْمَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی رُبْع وصول کرنے کے ہیں اور اسی سے استعارہ کے طور پر رِبَاعَۃ بمعنی سیادت آتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے:۔

لَا یُقِیْمُ رِبَاعَۃَ الْقَوْمِ اِلَّا فُلَانٌ کہ قوم کی سیاست کی باگ ڈور فلاں شخص ہی سنبھال سکتا ہے۔

رَبِیْعَۃٌ (ایضاً) اصل میں ڈبیہ کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ

---

[1] وقبلہ: ان بنی صبیۃ صیفیون والشطر قد اصبح مثلاً یضرب فی التندم علی مافات وقد تمثل بھا سلیمان بن عبدالملک وھو یجود بنفسہ الفائق (۱:۲۵۷) والاخبار الطوال ۳۳۰ والمثل فی المیدانی (۱:۴۱) والرجز ایضاً فی الاصلاح ۲۶۲، ۴۰۷ والحیوان (۱:۱۰۹) والاختقاق ۳۴۳، ۴۰۲ والعقد (۲:۱۰۳) والمقاییس (۳:۲۷۶) والالفاظ ۳۹۲ والفائق (۲:۷۴) والمخصص (۱:۳۰) والمحکم والتاج (ربع؛ جمہرۃ الامثال (۱:۴) واللسان (ربع، صیف) والشطر الثانی فی شرح الحماسۃ للمرزوقی ۱۳۴۵ والاول فی المعانی للقتبی ۳۱۱ واختلف فی اول قائلہ فعی نوادر ابی زید ۸۸ ہو اکثم بن صیفی وفی المیدانی سعد بن مالک بن ضبیعۃ وقیل بن معاویہ بن قشیر وفی محاضرات المؤلف (۳:۲۰۱) قالہ دہقان لملک من ملک العجم ونسبہ الخیر فی اللسان او اکثم بن صیفی ۱۲

اس کے چار طبقے یا چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔
اَلرُّبَاعِیَّتَانِ دو دانتوں کا نام۔ بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان چونکہ چار دانتوں کا فاصلہ ہوتا ہے اس لئے انہیں رباعیتان کہا جاتا ہے۔
اَلْیَرْبُوْعُ جنگلی چوہا کیونکہ یہ چوکھا بل بناتا ہے۔
اَرْضٌ مَرْبَعَۃٌ بہت چوہوں والی زمین جیسا کہ زیادہ سوسمار والی زمین کو مَضَبَّۃٌ کہا جاتا ہے۔

(ر ب و)

رَبْوَۃٌ (مثلثۃ الراء) وَرَبَاوَۃٌ (بفتح الراء و کسرھا) بلند جگہ یا ٹیلے کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ (۲۳-۵۰) ایک اونچی جگہ پر جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب (بھی تھی)
ابوالحسن نے کہا ہے کہ رَبْوَۃٌ کا لفظ زیادہ جید ہے۔ کیونکہ اس کی جمع رُبًی آتی ہے۔ اور رَبَا فُلَانٌ فلاں اونچی جگہ پر چلا گیا۔ اور رَبْوَۃٌ کو رَابِیَۃٌ بھی کہا جاتا ہے گویا وہ خود بلندی پر ہے اور اسی سے رَبَا ہے جس کے معنی بڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ (۲۲-۵) پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہلانے اور ابھرنے لگتی ہے۔
فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا (۱۳-۱۷) پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آگیا۔
فَاَخَذَھُمْ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً (۶۹-۱۰) تو خدا نے بھی انہیں بڑا سخت پکڑا۔
اَرْبٰی عَلَیْہِ کسی پر بلند ہونا یا کسی کی نگرانی کرنا۔
رَبَیْتُ الْوَلَدَ فَرَبَا میں نے بچے کی تربیت کی چنانچہ وہ بڑھ گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں رَبَّیْتُ ہے۔ تخفیف کے لئے ایک باء حذف کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ تَظَنَّیْتُ کا اصل میں تَظَنَّنْتُ ہے تخفیفاً ایک نون کو یاء سے تبدیل کر دیا ہے۔
اَلرِّبَا (سود) راس المال یعنی اصل سرمایہ پر جو بڑھوتی لی جائے وہ ربٰو کہلاتی ہے۔ لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔
چنانچہ زیادہ ہونے کے اعتبار سے فرمایا:۔
وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ (۳۰-۳۹) اور تم جو چیز (عطیہ) زیادہ لینے کے لئے دو تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتی ہو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھے گی۔
اور آیت:۔
یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ (۲-۲۷۶) اللہ سود کو بے برکت کرتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔ میں مَحْق کا لفظ لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ "رِبَا" یعنی سود میں برکت نہیں ہوتی اس کے مقابلہ میں زکوٰۃ کے متعلق فرمایا:۔
وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰-۳۹) اور جو تم (محض) خدا کی رضا جوئی کے ارادے سے زکوٰۃ دیتے ہو تو جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی اپنے دیئے ہوئے کو خدا کے ہاں بڑھا رہے ہیں۔
اَلْاُرْبِیَّتَانِ۔ سرینوں کے چڑھے۔
اَلرَّبْوُ سانس پھولنا۔ سانس پھول کر چونکہ اوپر کو چڑھتا ہے اس لئے اسے رَبْوٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ سانس پھولے ہوئے آدمی کے متعلق ھُوَ یَتَنَفَّسُ الصُّعَدَاءَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اَلرَّبِیْئَۃُ جس کے معنی جاسوس ہیں (ر ب ء) سے ہے اور اس

مادہ (رب د) سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔

(ر ت ع)

رَتَعَ (ف) رَتْعًا وَرُتُوْعًا. وَرِتَاعًا کے اصل معنی جانوروں کے چرنے کے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر انسانوں کے جی بھر کر کھانے پینے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ (۱۲-۱۲) کہ (جنگل کی پھل پھلاری) کھائے پئے اور کھیلے (کودے)

اور تشبیہ کے طور پر (بدگوئی) کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ (شاعر نے کہا ہے)[1] (رمل)

(۱۷۴) وَإِذَا خَلَوْا لَهُ لَحْمِي رَتَعْ

جب تنہائی میں اس کے پاس ہوتے ہیں تو میرا گوشت کھانے لگ جاتا ہے یعنی غیبت کرتا ہے۔

مویشی کے لئے رَاتِعٌ کی جمع رِتَاعٌ آتی ہے اور انسان کے لئے رَاتِعُوْنَ۔

(ر ت ق)

اَلرَّتْقُ۔ اس کے اصل معنی جوڑنا اور ملانا کے ہیں خواہ خلقی طور پر ہو یا صناعی طریقہ سے۔ قرآن میں ہے:۔

كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (۲۱-۳۰) (کہ آسمان و زمین) دونوں ایک ہیولیٰ تھے تو ہم نے (اس کو توڑ کر) زمین و آسمان کو الگ الگ کیا۔

رَتْقَاءُ وہ عورت جس کی شرمگاہ کے دونوں کنارے باہم چسپیدہ ہوں اور اس سے ہم بستری نہ ہو سکے مشہور محاورہ ہے۔

فُلَانٌ رَاتِقٌ وَفَاتِقٌ فِيْ كَذَا (مثل)

فلاں اس معاملہ میں کرتا دھرتا ہے۔

(ر ت ل)

اَلرَّتْلُ کسی چیز کا حسن تناسب کے ساتھ منتظم اور مرتب ہونا رَجُلٌ رَتْلُ الْاَسْنَانِ آدمی جس کے دانت آبدار اور حسن ترتیب کے ساتھ ہوں اور تَرْتِيْلٌ کے معنی سہولت اور حسن تناسب کے ساتھ کسی کلمہ کو ادا کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (۷۳-۴) اور قرآن کو خوب حسن ترتیب سے پڑھا کرو۔

وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا۔ (۲۵-۳۲) اور ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب اور تناسب کے ساتھ اتارا۔

(ر ج ج)

اَلرَّجُّ (ن) اس کے معنی کسی چیز کو ہلانے اور جنبش دینے کے ہیں اور اِرْتِجَاجٌ (افتعال) اس کا مطاوع ہے جس کے معنی ہلنے اور مضطرب ہونے کے ہیں۔ جیسے: رَجَّهُ فَارْتَجَّ. اسے ہلایا چنانچہ وہ ہلنے لگا۔ قرآن میں ہے:۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (۵۶-۴) (اور قیامت اس وقت واقع ہوگی) جب کہ زمین بڑے زور سے ہلنے لگے گی۔

اسی کو دوسرے مقام پر:۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ۔ الآیۃ (جب زمین بڑے زور سے ہلا دی جائے گی (۹۹-۱) سے تعبیر کیا ہے۔

اَلرَّجْرَجَةُ اضطراب۔ كَتِيْبَةٌ رَجْرَاجَةٌ لشکر جرار

---

[1] مقید القافیۃ قالہ سوید بن کاہل الیشکری فی کلمۃ مفضلیۃ ۸۸ بیتا بعضہا فی الامالی (۱: ۱۰۱/۲: ۳۱۹) وصدرہ: ویحیینی اذا لاقیتہ والبیت فی اللسان (رتع) والشعراء ۲۵ والخزانۃ (۱: ۵۴۷) وفی شواہد الکشاف ۲۷ وفی روایۃ اذ یخلو بدل خلوا وحبیب لی بدل ویحیینی ۱۲

جَارِيَةٌ رَجْرَاجَةٌ تھرتھرا کر چلنے والی چھوکری
اِذَا رَجَّ كَلَامُهٗ کلام کرتے وقت آواز میں گونج اور لہر پیدا ہونا۔
رِجْرِجَةٌ تھوڑا سا پانی جو ہلانے سے گدلا ہو جائے

(ر ج ز)

اَلرِّجْزُ اس کے اصل معنی اضطراب کے ہیں اور اسی سے رَجَزَ الْبَعِيْرُ ہے جس کے معنی ضعف کے سبب چلتے وقت اونٹ کی ٹانگوں کے کپکپانے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے ہیں ایسے اونٹ کو اَرْجَزُ اور ناقہ کو رَجْزَاءُ کہا جاتا ہے اور شعر کے ایک بحر کا نام بھی رَجَزٌ ہے جس میں شعر پڑھنے سے زبان میں اضطراب سا معلوم ہوتا ہے اور جو قصیدہ اس بحر میں کہا جائے اسے اُرْجُوْزَۃٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع اَرَاجِيْزُ آتی ہے اور رَجَزَ فُلَانٌ وَ اِرْتَجَزَ کے معنی بحر رجز پر شعر بنانے یا اُرْجُوْزَہ پڑھنے کے ہیں اور رجز گو شاعر کو رَاجِزٌ، رَجَّازٌ اور رَجَّازَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:۔

عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ۔ (۳۴-۵) (ان کیلئے) عذاب دردناک کی سزا ہے۔ میں لفظ رِجْز زلزلہ کی طرح عذاب سے کنایہ ہے۔ اور فرمایا:۔

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ (۲۹-۳۴) ہم ان پر ایک آسمانی آفت نازل کرنے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ (۷۴-۵) اور نجاست سے الگ رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رُجْز سے بت مراد ہیں۔ بعض نے اس سے ہر وہ عمل مراد لیا ہے جس کا نتیجہ عذاب ہو اور گناہ کو بھی مآل کے لحاظ سے عذاب کہا جا سکتا ہے۔ جیسے ندی یعنی شحم آجاتا ہو اور آیت:۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ۔ (۸-۱۱) اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی کو تم سے دور کرے۔

میں رِجْزَ الشیطان سے مراد خواہشات نفسانی ہیں جیسا کہ اس کے محل میں بیان کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے کفر بہتان طرازی فساد انگیزی وغیرہا گناہ مراد ہیں جن کی کہ شیطان ترغیب دیتا ہے۔

رِجَازَۃٌ وہ کمبل جس میں پتھر وغیرہ باندھ کر اونٹ کے ہودہ ۔۔۔۔ کا توازن قائم رکھنے کیلئے ایک طرف باندھ دیتے ہیں اس میں بھی حرکت و اضطراب کے معنی ملحوظ ہیں۔

(ر ج س)

اَلرِّجْسُ پلید، ناپاک، جمع اَرْجَاسٌ کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ رِجْسٌ ناپاک آدمی و رِجَالٌ اَرْجَاسٌ۔ قرآن میں ہے:۔

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (۵-۹۰) (تو یہ) ناپاک اور شیطانی کام ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ رِجْسٌ چار قسم پر ہے (۱) صرف طبیعت کے لحاظ سے (۲) صرف عقل کی جہت سے (۳) صرف شریعت کی رو سے (۴) ہر سہ کی رو سے جیسے میتہ (مردار) سے انسان کو طبعی نفرت بھی ہے اور عقل و شریعت کی رو سے بھی ناپاک ہے رجس شرعی جیسے جوا اور شراب ہے کہ شریعت

نے انہیں رجس قرار دیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ
چیزیں عقل کی رو سے بھی رجس ہیں چنانچہ آیت کریمہ۔
وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲-۲۱۹) دیگر (فائدہ سے ان کا گناہ (اور نقصان) بڑھ کر۔ میں
اسی معنی پر تنبیہ کی ہے کیونکہ جس چیز کا نقصان
اس کے نفع پر غالب ہو ضروری ہے کہ عقل سلیم
اس سے مجتنب رہنے کا حکم دے اسی طرح
کفار کو رجس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ شرک کرتے
ہیں اور شرک عندالعقل قبیح ترین چیز ہے جیسے فرمایا۔
فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ رِّجْسٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (۹-۱۲۵) اور جن کے دلوں
میں (نفاق کا) روگ ہے تو اس (سورت) نے
ان کی (پہلی) خباثت پر ایک اور خباثت بڑھا دی۔
وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔
(۱۰-۱۰۰) اور خدا (شرک وکفر کی) نجاست انہیں
لوگوں پر ڈالتا ہے جو دلائل وحدانیت (میں عقل
کو کام میں نہیں لاتے۔
بعض نے رِجْسٌ سے نتن (بدبودار) اور بعض
نے عذاب مراد لیا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت۔
اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (۹-۲۸) مشرک تو
(نرے) گندے ہیں۔
میں مشرکین کو اور آیت کریمہ :۔
اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ (۶-۱۴۵) یا سور
کا گوشت کہ یہ چیزیں بیشک ناپاک ہیں۔ میں خنزیر
کے گوشت کو رجس کہا گیا ہے یعنی شرعاً ناپاک ہو۔ الرجس
رِجْسٌ وَرَجْزٌ سخت آواز۔ بعیر رَجَّاسٌ
مست اونٹ۔ غَمَامٌ رَاجِسٌ وَرَجَّاسٌ
بہت گرجنے والا بادل۔

(ر ج ع)

اَلرُّجُوْعُ اس کے اصل معنی کسی چیز کے اپنے
مبدا حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں خواہ
وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ وہ رجوع
بذاتہ ہو یا باعتبار جزء کے اور یا باعتبار فعل کے ہو،
الغرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں
اور رَجْعٌ کے معنی لوٹانے کے اور رَجْعَةٌ کا لفظ
طلاق کے بعد رجوع کرنے یا موت کے بعد دنیا کی
طرف لوٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ
ہے[1]:۔ فُلَانٌ يُّؤْمِنُ بِالرَّجْعَةِ فلاں رجعت پر
ایمان رکھتا ہے اور رِجَاعٌ کا لفظ خاص کر پرند
کے اپنی جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد واپس
اس طرف لوٹ آنے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ رجوع
کے معنی میں فرمایا:۔
لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ (۶۳-۸) (اور منافق)
کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینے لوٹ کر گئے۔
فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ (۱۲-۶۳) تو جب
(یہ لوگ) اپنے والد کے پاس لوٹ کر گئے۔
وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ (۷-۱۵۰) اور
جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے۔
وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا (۲۴-۲۸)
اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ آؤ تو (بے تامل)
لوٹ آؤ۔ رَجَعْتُ عَنْ كَذَا میں نے فلاں بات
سے رجوع کر لیا۔ رَجَعْتُ الْجَوَابَ (متعدی) جواب
دینا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔
فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ (۹-۸۳) اگر
خدا تم کو (جہاد) سے ان منافقوں کے (کسی گروہ

---

[1] قال فی اللسان ومن جہلتہم طائفۃ من الرافضۃ یقولون ان علی بن ابی طالب مستتر فی السحاب فلا یخرج مع من خرج من ولدہ حتی ینادی مناد من السماء ا اخرج مع فلان ۱۲

کی طرف (صحیح وسلامت) لوٹا کر لے جائے۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ۔ (۱۰-۱۱-۴) تم (سب) کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى۔ (۹۶-۸) بے شک (ان سب کو) تمہارے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ۔ (۱۰-۴) اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔

مَرْجِعٌ رَجُوْعٌ سے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ آیت:۔

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲-۲۸) پھر اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

میں ہے اور رَجْعٌ (متعدی) سے بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ایک قراءت ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲-۲۸) پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

بھی ہے اور آیت کریمہ:۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ۔ (۲-۲۸۱) اور (دیکھو) اس دن (کی پرسش) سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹائے جاؤ گے۔

میں ایک قراءت تَرْجِعُوْنَ (بصیغہ معروف) بھی ہے۔ اور آیت:۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۳-۲۸) کہ (اب بھی) یہ لوگ باز آجائیں۔

میں رُجُوْعٌ عَنِ الذَّنْبِ یعنی گناہ سے باز آجانا مراد ہے۔ اسی طرح آیت:۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۲۱-۹۵) کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہے کہ توبہ کرکے شرک وکفر یا گناہوں سے باز آجائیں کیونکہ مرنے کے بعد توبہ نہیں ہے اسی بنا پر منافقین کو استہزا کے طور پر کہا جائیگا۔

ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا۔ (۵۷-۱۳) (الآیۃ) تو (ان سے کہا جائیگا) کہ (نہیں) اپنے پیچھے (یعنی دنیا) کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) کوئی اور روشنی تلاش کرو۔

(یعنی توبہ کرکے ایمان لاؤ جو اس روشنی کا سبب ہے۔ اور آیت:۔

بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۲۷-۳۵) کہ ایلچی کیا لے کر آتے ہیں۔

میں يَرْجِعُ رجوع سے بھی ہوسکتا ہے اور رَجْعُ الْجَوَابِ سے بھی جیسا کہ فرمایا:۔

يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ نِ الْقَوْلَ۔ (۳۴-۳۱) اور ایک کی بات ایک رد کر رہا ہوگا۔

اور آیت کریمہ:۔

ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (۲۷-۲۸) پھر ان سے (الگ) ہٹ جا۔ اور دیکھتا رہ کہ لوگ کیا جواب دیتے ہیں۔

میں يَرْجِعُوْنَ رَجْعَ الْجَوَابِ سے ہے نہ کہ رجوع سے اور آیت:۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۶-۱۱) (اور پانی برسانے والے آسمان کی قسم۔

میں رَجْعٌ کے معنی بارش کے ہیں اور بارش کو رَجْعٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ اولاً سمندروں سے بخارات بن کر پانی اوپر چلا جاتا ہے اور پھر ہوا، بارش کی صورت میں انہیں زمین پر واپس لے آتی ہے اور تالاب کو بھی رَجْعٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ اس کی لہروں میں تلاطم ہوتا رہتا ہے محاورہ ہے:۔

لَيْسَ لِكَلَامِهِ مَرْجُوْعٌ اس کی بات کا جواب نہیں۔
دَابَّةٌ لَهَا مَرْجُوْعٌ۔ وہ جانور جسے استعمال کے بعد بیچنا ممکن ہو۔
نَاقَةٌ رَاجِعٌ اونٹنی جو جفتی سے حاملہ نہ ہو گویا وہ نر کے نطفہ کو واپس لوٹا دیتی ہے۔
اَرْجَعَ يَدَهٗ اِلٰى سَيْفِهٖ۔ اس نے تلوار سونتنے کے لئے ہاتھ کو واپس لوٹایا۔
اَلْاِرْتِجَاعُ (افتعال) واپس لے لینا۔ اِرْتَجَعَ اِبِلًا۔ نر شتر بیچ کر ان کے عوض مادہ شتر خریدنا۔ اس میں اگرچہ بعینہٖ پہلی چیز کو لوٹانے کے معنی نہیں پائے جاتے لیکن تقدیرًا واپس لوٹانے کے معنی ملحوظ ہیں۔
اِسْتَرْجَعَ فُلَانٌ۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہا۔
اَلتَّرْجِيْعُ (۱) غنا یا قرأت کے وقت آواز کو حلق میں لوٹانا۔
(۲) کوئی بات دوبارہ کہنا، اسی سے ترجیع فی الاذان ہے جس کے معنی اذان میں شہادتین کو ایک مرتبہ پست آواز سے کہنے کے بعد دوبارہ بلند آواز سے کہنے کے ہیں۔
اَلرَّجِيْعُ (۱) انسان یا چوپایہ کا فضلہ اسے اگر رجوع سے مانا جائے تو فعیل بمعنی فاعل ہوگا۔ اور اگر رَجْعٌ (متعدی) سے مانا جائے تو فعیل بمعنی مفعول ہوگا۔
جُبَّةٌ رَجِيْعٌ۔ وہ جبہ جسے ادھیڑ کر دوبارہ سلا گیا ہو۔
(۲) نیز رجیع اس سواری کو کہتے ہیں جو ایک سفر سے واپس آنے کے بعد متصل ہی دوسرے سفر پر چل جائے اس کی مونث رَجِيْعَةٌ ہے اور کنایۃً کثرت اسفار کی وجہ سے لاغر اور دبلی سواری کو بھی دَابَّةٌ رَجِيْعٌ و رَجْعُ سَفَرٍ کہہ دیتے ہیں۔
(۳) نیز مکرر کلام کو بھی رَجِيْعٌ کہا جاتا ہے اور (۴) وہ کلام جو بوجہ کراہت متکلم کی طرف لوٹا دی جائے اسے بھی رَجِيْعٌ ہی کہا جاتا ہے۔

(ر ج ف)

اَلرَّجْفُ (ن) اضطراب شدید کو کہتے ہیں اور رَجَفَتِ الْاَرْضُ اَوِ الْبَحْرُ کے معنی زمین یا سمندر میں زلزلہ آنا کے ہیں۔ بَحْرٌ رَجَّافٌ متلاطم سمندر۔ قرآن میں ہے:۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ (۷۳-۱۴) جب کہ زمین اور پہاڑ ہلنے لگیں گے۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ۔ (۷۹-۶) جب کہ زمین لرز جائے گی۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ۔ (۷-۷۸) پس ان کو زلزلے نے پالیا۔
اَلْاِرْجَافُ (افعال) کوئی جھوٹی افواہ پھیلا کر یا کسی کام کے ذریعہ اضطراب پھیلانا کے ہیں قرآن میں ہے:۔ وَالْمُرْجِفُوْنَ فِى الْمَدِيْنَةِ (۳۳-۶۰) اور جو لوگ مدینے میں جھوٹی افواہیں پھیلاتے ہیں۔
مثل مشہور ہے[1]۔ اَلْاَرَاجِيْفُ مَلَاقِيْحُ الْفِتَنِ کہ جھوٹی افواہیں فتنوں کی جڑ ہیں۔

(ر ج ل)

اَلرَّجُلُ۔ کے معنی مرد کے ہیں اس بنا پر قرآن میں ہے:۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (۶-۹) اگر ہم (رسول کا مددگار) کوئی فرشتہ بناتے تو اس کو بھی آدمی ہی بناتے۔
رَجُلَةٌ۔ عورت جو مردسی وضع اختیار کر لے۔
شاعر نے کہا ہے[2]۔ (رجز)
(۱۷۵) "لَمْ يُبَالُوْا حُرْمَةَ الرَّجُلَةْ"

---

[1] راجع للمثل المعاجم وفی المیدانی ۱۲ ۱ [2] لم اجدہ قائلہ واولہ۔ خرقوا جیب فتاتہم۔ والبیت فی اللسان (رجل) والکامل ۱۴۱ ۲ تفسیر الطبری (۸: ۲۴۱) والبحر (۲: ۱۷۷) وفی المطبوع لم یبالوا مصحفہ وقبلہ، کل جار ظل مغتبطا۔ غیر جیران بنی جبلۃ۔ والبیت ایضًا فی امالی ابن الشجری (۲: ۲۸۷) واعراب ثلاثین لابن خالویہ ۴۴ وفی روایتہ صولۃ بدل حرمۃ والاعجاز للباقلانی

اس مرد نما عورت کی حرمت کی پرواہ نہ کی۔
اور رَجُلٌ کے معنی مردِ کامل بھی آتے ہیں جس میں مردانگی کے جوہر نمایاں ہو۔ قرآن میں ہے:۔
وَجَاءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى۔ (۳۶-۲۰) اور شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا آیا۔
رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ۔ فرعون کے لوگوں میں سے ایک مردِ مومن یعنی جو قوی اور بہادر تھا یہ ماجرا سن کر بولا) اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ۔ کہ کیا تم صرف اتنی بات پر) ایک شخص کے قتل کے درپے ہو کہ وہ خدا ہی کو اپنا پروردگار بتاتا ہے۔
محاورہ ہے:۔ هُوَ اَرْجَلُ الرَّجُلَيْنِ کہ وہ دونوں میں زیادہ جوانمرد ہے۔
اَلرِّجْلُ۔ پاؤں۔ اس کی جمع اَرْجُلٌ آتی ہے۔
قرآن میں ہے:۔
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۵-۶) اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور اپنے پاؤں بھی ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔
رَاجِلٌ و رَجِلٌ۔ پا پیادہ چلنے والا۔ یہ بھی الرجل بمعنی پاؤں سے مشتق ہے اور راجل کی جمع رِجَالَةٌ اور رَجْلٌ آتی ہے جیسے رَكْبٌ جو کہ رَاكِبٌ کی جمع ہے اور رَاجِلٌ کی جمع رِجَالٌ بھی آجاتی ہے جیسے رَاكِبٌ وَرِكَابٌ۔
اور رَجُلٌ رَاجِلٌ اسے کہتے ہیں جو چلنے پر قدرت رکھتا ہو اس کی جمع رِجَالٌ آجاتی ہے قرآن میں ہے۔
فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا۔ (۲-۲۳۹) تو پاؤں پیدل یا سوار۔
اسی طرح رَجِيْلٌ وَّ ذُوْ رَجْلَةٍ کے معنی بھی بہت زیادہ یا پیادہ چلنے والے شخص کے ہیں۔

حَرَّةٌ رَجْلَاءُ۔ جس میں صعوبت سے چلا جائے
اَلْاَرْجَلُ۔ سفید پاؤں والا گھوڑا۔ بڑے پاؤں والا۔ رَجَلْتُ الشَّاةَ میں نے بکری کو پاؤں سے باندھ کر لٹکا دیا۔ اور بطور استعارہ رَجْلٌ کے معنی (۱) ٹڈی دل اور پانی بہنے کا راستہ بھی آجاتے ہیں اس کا واحد رِجْلَةٌ ہے اور سَيْلُ الْمَاءِ کو رِجْلٌ کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے مذانب کہہ دیتے ہیں۔ رِجْلَةٌ۔ بقلۃ الحمقاء کیونکہ وہ بھی عموماً راستہ میں اگتا ہے۔
اور کسی شخص کے عہدِ حکومت کو بھی رِجْل کہہ دیتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے۔ كَانَ ذٰلِكَ عَلٰى رِجْلِ فُلَانٍ (کہ فلاں کے عہدِ حکومت میں تھا) جیسا کہ عَلٰى رَأْسِ فُلَانٍ کا محاورہ ہے۔
اِرْتَجَلَ الْكَلَامَ۔ فی البدیہہ کہنا۔ اِرْتَجَلَ الْفَرَسُ فِیْ عَدْوِہٖ گھوڑے کا درمیانی دوڑ دوڑنا۔
تَرَجَّلَ الرَّجُلُ۔ سواری سے اتر کر پیدل چلنا۔
تَرَجَّلَ فِی الْبِئْرِ۔ بغیر رسی کے کنوئیں میں اترنا۔
تَرَجَّلَ النَّهَارُ سائے کا دیواروں سے نیچے اترنا گویا وہ پیدل چل رہا ہے۔
رَجَّلَ شَعْرَہٗ۔ کے معنی بالوں کو کنگھی کرنا کے ہیں کیونکہ کنگھی کرنے سے بال نیچے پاؤں کی طرف اتر آتے ہیں۔
اَلْمِرْجَلُ۔ نصب کی ہوئی دیگ۔ اَرْجَلْتُ الْفَصِيْلَ۔ اونٹنی کے بچہ کو اسکی ماں کیساتھ آزاد چھوڑ دیا۔

(ر ج م)

اَلرِّجَامُ۔ پتھر۔ اسی سے الرجم ہے جس کے معنی سنگسار کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ رَجَمَهٗ۔ اسے سنگسار کیا اور جسے سنگسار کیا گیا

ہو اسے مَرْجُوْمٌ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۔ (۲۶-۱۱۶) کہ تم ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔
اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ۔ (۱۸-۲۰) کیونکہ تمہاری قوم کے لوگ تمہاری خبر پائیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔
پھر استعارہ کے طور پر رَجْمٌ کا لفظ جھوٹے گمان، توہم، سب وشتم اور کسی کو دھتکار دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
رَجْمًا بِالْغَيْبِ (۱۸-۲۲) یہ سب غیب کی باتوں میں انکل کے تکے چلاتے ہیں۔
شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)
(۱۷۶) "وَمَا هُوَ عَنْهَا بِالْحَدِيْثِ الْمُرَجَّمِ"
اور لڑائی کے متعلق یہ بات محض اندازے سے نہیں ہے۔
اور شیطان کو رجیم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ خیرات اور ملاء اعلیٰ کے مراتب سے راندہ ہوا ہے قرآن میں ہے:۔
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ (۱۶-۹۸) تو شیطان مردود کے وسواس سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔
فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ۔ (۳۸-۷۷) تو بہشت سے نکل جا کہ راندہ درگاہ ہے۔
اور شُهُبٌ (ستاروں) کو رُجُوْمٌ کہا گیا ہے قرآن میں ہے:۔
رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (۶۷-۵) ان کو شیاطین کے لئے ایک طرح کا زد بنایا ہے۔
رُجْمَةٌ و رُجْمَةٌ۔ قبر کا پتھر جو بطور نشان اس پر نصب کیا جاتا ہے۔ مجازاً اس سے قبر مراد لیتے ہیں۔ اس کی جمع رِجَامٌ وَ رُجَمٌ آتی ہے۔ اور رَجَمْتُ الْقَبْرَ کے معنی قبر پر پتھر نصب کرنا کے ہیں۔ حدیث میں ہے[2]۔ (۱۵۰)
لَا تَرْجُمُوْا قَبْرِيْ کہ میری قبر پر پتھر نہ لگانا۔
اَلْمُرَاجَمَةُ۔ باہم ایک دوسرے کو مغلظات سنانا۔ مُقَاذَفَةٌ کی طرح یہ لفظ بھی اس معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور رَجْمٌ سے تَرْجُمَان بر وزن تَفْعُلَان آجاتا ہے۔

(ر ج و)

رَجَا الْبِئْرِ۔ کنویں کا کنارہ۔ رَجَا السَّمَآءِ۔ آسمان کا کنارہ۔ اس کی جمع اَرْجَاءٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا۔ (۶۹-۱۷) اس کے کناروں پر فرشتے ہوں گے۔
اور رَجَآءٌ ایسے ظن کو کہتے ہیں جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو۔ اور آیت کریمہ:۔
مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا۔ (۷۱-۱۳) تو تمہیں کیا بلا مار گئی کہ تم نے خدا کا وقار دل سے اٹھا دیا۔
میں بعض مفسرین نے اس کے معنی لَا تَخَافُوْنَ کئے ہیں یعنی کیوں نہیں ڈرتے

---

[1] قالہ زہیر فی معلقتہ من السبعۃ واولہ:۔ وما الحرب الا ما علمتم وذقتم۔ والبیت فی مجاز ابی عبیدۃ ۸ ۳۹ تم ۴ ۲ ۴ وعنہ فی القرطبی (۱۰: ۳۸۳) والعقد الثمین ۹۵ وایام العرب ۴ ۲۷ والاساس (رجم) والمحاضرات للمؤلف (۲: ۱۷۶) والجمہرۃ ۱۰۷ ودیوانہ ۱۷ وشرح العشر للتبریزی ۱۱۲) والبحر (۶: ۴ ۱۱) والقرطبی (۱۰: ۳۸۲) والخزانۃ (۳: ۴۳۵) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۴ ۱۵) وشرح السبع لابن الانباری ۲۷۶۔
[2] وصیۃ اوصی بہا عبد اللہ بن مغفل وقت الموت ای لا تجعلوا علیہا الرجم ومعناہ النہی عن التسنیم والرفع انظر الفائق (۱: ۲۳۳) والنہایۃ (۲: ۲۰۵) قال الجوہری المحدثون یرونہ بتخفیف الجیم والصحیح تشدیدہا ۱۲

ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الطویل)

(۱۷۷) إِذَا لَسَعَتْهُ النَّحْلُ لَمْ يَرْجُ لَسْعَهَا
وَحَالَفَهَا فِي بَيْتِ نُوبٍ عَوَاسِلُ

جب اسے مکھی ڈنگ مارتی ہے تو وہ اس کے ڈسنے سے نہیں ڈرتا۔ اور اس نے شہد کی مکھیوں سے معاہدہ کر رکھا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ خوف ورجا باہم متلازم ہیں تو جب کسی محبوب چیز کے حصول کی توقع ہوگی۔ ساتھ ہی اس کے تضییع کا اندیشہ بھی دامن گیر رہے گا۔ اور ایسے ہی اس کے برعکس صورت میں کہ اندیشہ کے ساتھ ہمیشہ امید پائی جاتی ہے) قرآن میں ہے:۔

وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ۔ (۴-۱۰۴)

اور تم کو خدا سے وہ وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں۔

وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللَّهِ۔ (۹-۱۰۶) اور کچھ اور لوگ ہیں کہ حکم خدا کے انتظار میں ان کا معاملہ ملتوی ہے۔

أَرْجَتِ النَّاقَةُ اونٹنی کی ولادت کا وقت قریب آگیا۔ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اونٹنی نے اپنے مالک کو قرب ولادت کی امید دلائی۔

اَلْأُرْجُوَانُ ایک قسم کا سرخ رنگ جو رجاء کی طرح فرحت بخش ہوتا ہے۔

(ر ح ب)

اَلرَّحْبُ (اسم) جگہ کی وسعت کو کہتے ہیں۔ اسی سے رَحَبَةُ الْمَسْجِدِ ہے جس کے معنی مسجد کے کھلے صحن کے ہیں اور رَحُبَتِ الدَّارُ کے معنی گھر کے وسیع ہونے کے پھر یہ رَحْبٌ کا لفظ استعارۃً پیٹ یا سینہ کی وسعت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے رَحِبُ الْبَطْنِ (بسیار خور) رَحِبُ الصَّدْرِ (فراخ سینہ) عالی ظرف کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے برعکس ضیق الصدر کا لفظ مجازاً تنگ سینہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ۔ (۹-۲۵) اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگ ہوگئی۔

اور بطور استعارہ جس کے نوکر چاکر بہت زیادہ ہوں اسے رَحِيبُ الْفِنَاءِ کہا جاتا ہے۔

مَرْحَبًا وَأَهْلًا تو نے کشادہ جگہ پائی اور اپنے اہل میں آیا (یہ لفظ خوش آمدید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) قرآن میں ہے:۔

لَا مَرْحَبًا بِهِمْ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ۔ قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ۔ (۳۸: ۵۹-۶۰)

---

[1] قال ابوذؤیب الہذلی فی وصف مشتار والبیت من شواہد الکشاف ۴/۴۱ والطبری ۱۳/۲۱۳ والطبرسی ودیوان الہذلیین (۱: ۱۴۳) والاساس (۲: ۴۷۹) واللسان (نوب) ومجاز القرآن رقم ۳۰۹ والخزانۃ (۲: ۲۹۴) ورسالۃ المبرد ما اتفق لفظہ واختلف معناہ) والاضداد لابن الانبار) ۹ وابن السکیت ۷۹ والمقاییس (نوب) وابن ولاد ۳۴ والمعانی الکبیر ۶۲۷ والجمہرۃ (اشعار) ۴۲ والقرطبی (۸: ۲۱۱) والدرۃ للحریری ۷ا وتہذیب اصلاح المنطق (۲/۱۴ا: ۲۰۴) ومعانی القرآن المنسوب الی الفراء (۱: ۲۸۶) وفیہ عوامل بدل عواسل والمشکل للقتبی ۷۴ اوغریبہ ۱۲۱ وفی روایۃ ابی الطیب (ابدال ۲: ۴۳۸) ورسالۃ الغفران ۲۹۹ خالفہا بالخاء المعجمۃ) وروایۃ الاضداد او للثلاثۃ حالفہا بالحاء المہملۃ) ۱۲ والمخصص (۸: ۱۲۸/۱۷: ۱۱) والصحاح (نوب) واللسان والتاج (خلف، رجا، دبر) واضداد ابی الطیب (۲: ۴۳۲)

ان پر خدا کی مار بے شک یہ بھی دوزخ ہی میں آ رہے ہیں (یہ سن کر وہ کہیں گے) بلکہ تم پر خدا کی مار۔

(ر ح ق)

رَحِیْقٌ (خالص عمدہ شراب جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو) قرآن میں ہے:۔

یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ۔ (۸۳-۲۵) ان کو شراب خالص سر بند پلائی جائے گی۔

(ر ح ل)

اَلرَّحْلُ ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اس لئے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہوا جائے پھر یہ لفظ مجازاً خود اونٹ پر بولا جانے لگا ہے اور کبھی رَحْلٌ کا لفظ اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جس پر گھر میں بیٹھا جاتا ہے۔ اس کی جمع رِحَالٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ (۱۲-۶۲) تو اس نے اپنے نوکروں سے کہا کہ ان کا سرمایہ ان کے کجاووں میں رکھ دو۔

اَلرِّحْلَةُ (مصدر) اس کے اصل معنی سفر یا کوچ کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶-۲) جاڑے اور گرمی کے سفروں کو (اکٹھا رکھنے والے)

اَرْحَلْتُ الْبَعِيْرَ میں نے اونٹ پر پالان کسا

اَرْحَلَ الْبَعِيْرُ اونٹ کا اس قدر موٹا ہو جانا گویا موٹاپے کی وجہ سے اس کی پیٹھ پر پالان رکھا ہوا ہے۔

رَحَّلْتُهٗ میں نے اسے اس جگہ سے دور ہٹا دیا۔

اَلرَّاحِلَةُ اونٹ جو سواری کے قابل ہو جائے

رَاحَلَهٗ سفر کرنے میں اس کی مدد کی۔ مُرَحَّلٌ وہ کپڑا جس پر کجاوے کی تصویریں بنی ہوئی ہوں۔

(ر ح م)

اَلرَّحِمُ۔ عورت کا رحم۔ اور رَحُوْمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جسے خرابی رحم کی بیماری ہو اور استعارہ کے طور پر رحم کا لفظ قرابت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ تمام اقربا ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں رَحِمٌ و رُحْمٌ دو لغت ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَقْرَبَ رُحْمًا (۱۸-۸۱) اور قرابت میں (اس سے) بہتر (ہو)

اَلرَّحْمَةُ وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔ جیسے:۔ رَحِمَ اللّٰهُ فُلَانًا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے جب اس کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے صرف احسان مراد ہوگا جیسا کہ مروی ہے۔ (۱۵۱)

ان الرَّحْمَةَ مِنَ اللّٰهِ انعام و افضال و من الادميين رقة وتعطف کہ اللہ کی طرف سے رحمت اس کے انعام و فضل سے عبارت ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف سے رقت اور شفقت کے معنی میں آتی ہے۔ اسی معنی میں آنحضرت نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے[2] (۱۵۲)

انہ لما خلق اللہ الرحم قال لہ انا الرحمٰن

---

[1] ملاحظہ ہو فقہ اللغۃ للثعالبی ۱۲ مترجم [2] اخرجہ ابوداؤد وغیرہ

وَاَنَا الرحم شققت اسمك من اسمي فمن وصلك وصلتہ ومن قطعك قطعتہ. کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس سے فرمایا:۔ "میں رحمان ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے۔ پس جو تجھے ملائے گا۔ (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کریگا میں اسے پارہ پارہ کر دوں گا" اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کر دی ہے اور احسان کو اپنے لئے خاص کر لیا ہے۔ تو جس طرح لفظ رحم رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنی جو لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس معنی سے ماخوذ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنی میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ وَالرَّحِیْمُ یہ دونوں فَعْلَان وَفَعِیْل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں[1] جیسے نَدْمَانٌ وَنَدِیْمٌ پھر رحمٰن کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سما لیا ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنی بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر بھی جائز ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۲-۱۷۳) بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور آنحضرت کے متعلق فرمایا:۔ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۹-۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر نہایت درجے شفیق (اور) مہربان ہیں۔

بعض نے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ دنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت:۔ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُہَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ. (۷-۱۵۶) اور ہماری جو رحمت ہے وہ (اہل و نااہل) سب چیزوں کو شامل ہے۔ پھر اس کو خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ لیں گے۔ جو پرہیزگاری اختیار کریں گے۔ میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الٰہی عام ہے اور مومن و کافر دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت میں مومنین کے ساتھ مختص ہوگی (اور کفار اس سے کلیتہً محروم ہوں گے)

(ر خ و)

اَلرِّخَاءُ۔ لینت یعنی نرمی کو کہتے ہیں اور یہ شَیْءٌ رِخْوٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نرم چیز کے ہیں اور باب رَخِیَ یَرْخٰی بروزن عَلِمَ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] راجع غریب القرآن للقتبی، ومجاز القرآن لابی عبیدۃ ۲۱ والطبری (۱: ۵۸)، ورد علی ابی عبیدۃ رداعنیفاً فالقول. ان الرحمان مجازہ ذوالرحمۃ والرحیم مجازہ الرحیم ؛

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاءً حَيْثُ اَصَابَ. (۳۸-۳۶) تو ہم نے ہوا کو ان کا تابع کر دیا کہ جہاں پہنچنا چاہتے ان کے حکم کے مطابق اسی طرف وہ نرمی سے چلتی۔

اور اسی سے اَرْخَيْتُ السِّتْرَ کا محاورہ لیا گیا ہے۔ جس کے معنی پردہ لٹکانے کے ہیں پھر اِرْخَاءُ السِّتْرِ سے بطور استعارہ اِرْخَاءُ سَرْحَانٍ بولا جاتا ہے جس کے معنی بھیڑیئے کی تیز روی کے ہیں۔ ابو ذویب نے کہا ہے[1]۔ (الکامل)

(۱۷۸) " فَهِيَ رِخْوٌ تَمْزَعُ "

اور وہ ہوا کی طرح تیز اور نرم رفتار ہے۔

فَرَسٌ مِرْخَاءٌ۔ تیز رو گھوڑا۔ خَيْلٌ مَرَاخٍ۔ تیز رو گھوڑے۔

اَرْخَيْتُهُ میں نے اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی کہ تیز رفتاری سے چلے۔

(ر د د)

اَلرَّدُّ (ن) اس کے معنی کسی چیز کو لوٹا دینے کے ہیں خواہ ذات شے کو لوٹایا جائے یا اس کی حالتوں میں سے کسی حالت کو محاورہ ہے۔ رَدَدْتُهُ فَارْتَدَّ میں نے اسے لوٹایا پس وہ لوٹ آیا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ (۶-۱۴۸) (مگر تا یکے) لوگوں سے اس کا عذاب تو ہمیشہ کے لئے ٹلنے والا ہی نہیں۔

اور ذات شے کو واپس لوٹانے کے متعلق فرمایا:۔

لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ۔ (۶-۲۸) اور اگر (دنیا میں) واپس بھیج دیئے گئے تو جس چیز سے ان کو منع کیا گیا ہے اس کو پھر دوبارہ کریں۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ۔ (۱۷-۶) پھر ہم نے (تم کو) دشمنوں پر (غلبہ دے کر دوبارہ) تمہارے دن پھر دیئے۔

رُدُّوْهَا عَلَيَّ۔ (۳۸-۳۳) (تو) ان گھوڑوں کو میرے پاس لوٹا لاؤ۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ (۲۸-۱۳) غرض ہم نے پھر موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔

يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ (۶-۲۷) اے کاش ہم پھر دنیا میں واپس بھیج دیے جائیں اور پروردگار کی آیتوں کو) نہ جھٹلاتے۔

اور کسی کو اس کی پہلی حالت کی طرف رد کرنے کے متعلق ہے۔ فرمایا:۔

يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ۔ (۳-۱۴۹) تم کو الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا کر لے جائیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (۱۰-۱۰۷) اگر (اللہ تعالیٰ) تجھ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے (فضل) کا روکنے والا نہیں۔ میں رَآدَّ کے معنی روکنے والا اور دفع کرنے والا کے ہیں اور یہی معنی آیت:۔

عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ (۱۱-۷۶) اور ان لوگوں پر ایسا) عذاب آنے والا ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ میں مراد ہے اور اسی سے اَلرَّدُّ اِلَى اللهِ ہے جیسے فرمایا:۔

وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا۔ (۱۸-۳۶) (تو جب) میں اپنے پروردگار

---

[1] قطعۃ من عجز البیت لابی ذویب وتکملتہ: بنعد بہ خوصا یفصم جریہا حلق الرحالۃ ... والبیت من کلمۃ مفضلیۃ جمہریۃ طویلۃ فی ۴۵ بیتا (۲۲۱-۲۲۹) والبیت فی السمط ۸۴۴، ۴۱۷ والسیوطی ۹۲ والجمہرۃ ۶۴۲ والاقتضاب ۴۱۳ والحکم (رحل) ودیوان الہذلیین (۱: ۱۶) واللسان (رخو)۔

کی طرف لوٹایا جاؤں گا تو جہاں لوٹ کر جاؤں گا (بہرحال) اس (دنیا) سے (تو اس جگہ کو) بہتر ہی پاؤں گا۔

ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (۹-۹۴) پھر آخر کار تم اس زندہ مطلق کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب دونوں کو جانتا ہے۔

ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ (۶-۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔

تو یہاں رَدٌّ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ میں رَجْعٌ کا لفظ ہے۔

بعض نے کہا ہے اَلرَّدُّ اِلَی اللّٰہِ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک معنی وہ ہے جس کا ذکر آیت مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ۔ (۲۰-۵۵) میں ہے (یعنی فوت کر کے) زمین کی طرف لوٹا دینا اور دوسرے معنی وہ ہیں جس کی طرف کہ۔

وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی (۲۰-۵۵) میں ارشاد فرمایا ہے یعنی فوت کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا لیکن یہ دو معنی دو حالتوں کے اعتبار سے ہیں اور ردٌّ کا لفظ اپنے عموم کے اعتبار سے دونوں معنی کو شامل ہے اور آیت فَرَدُّوْا اَیْدِیَهُمْ فِیْٓ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴-۹) کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں ایک یہ کہ غصہ سے پشت دست کاٹنے لگے دوم یہ کہ منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے یہ کہ اَفْوَاهِهِمْ میں هِمْ کی ضمیر کا مرجع انبیاء کو قرار دیا جائے یعنی انہوں نے انبیاء کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور انہیں خاموش کر دیا اور ردٌّ کا لفظ لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہو کہ انہوں نے بار بار ایسا کیا۔[1]

اور آیت: لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا۔ (۲-۱۰۹) کہ ایمان لاچکنے کے بعد تم کو کافر بنا دیں۔

میں رَدٌّ کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمہیں دوبارہ حالت کفر کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں جسے تم چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ۔ (۳-۹۹) لوگو! تم اہل کتاب کے کسی فرقے کا بھی کہا مانو گے تو وہ تمہارے ایمان لائے پیچھے تم کو پھر کافر بنا دیں گے۔

اَلْاِرْتِدَادُ وَالرِّدَّةُ اس راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو۔ لیکن رِدَّةٌ کا لفظ کفر کی طرف لوٹنے کے ساتھ مختص ہو چکا ہے اور ارتداد عام ہے جو حالت کفر اور غیر دونوں کی طرف لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدٰی (۴۷-۲۵) بیشک جو لوگ اپنی پشتوں پر لوٹ گئے (اس کے) بعد کہ ان کے سامنے ہدایت واضح ہو گئی۔ اور آیت کریمہ:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ (۵-۵۴)۔

میں اسلام سے کفر کی طرف لوٹنا مراد ہے اور یہی معنی آیت:۔

وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ۔ (۲-۲۱۷)

میں مراد ہیں وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا۔ (۶-۷۱) تو (کیا) اس کے بعد بھی الٹے پیروں (کفر کی طرف) لوٹ جائیں گے۔

---

[1] والبسط ما رایت البحث فی الآیۃ فی امالی المرتضیٰ راجع (۱-۳۶۵-۳۶۷)

اور غیر کفر کی طرف لوٹنے کے متعلق فرمایا:۔
وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ (۵-۲۱) اور اپنی پشتوں پر مت پھرو یعنی کسی کام کی تحقیق کر لینے اور اس کی اچھائی کو جان لینے کے بعد اسے مت چھوڑو۔
فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا (۱۸-۶۴) پھر دونوں اپنے دپیروں کے، نشانوں کے کھوج لگاتے الٹے پاؤں پھرے۔
فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا (۱۲-۹۶)۔ پھر جب (یوسف علیہ السلام کے زندہ وسلامت ہونے کی) خوشخبری دینے والا (یعقوب علیہ السلام کے پاس) آپہنچا تو اس نے (آنے کے ساتھ ہی یوسفؑ کا کرتہ) یعقوب (علیہ السلام) کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ فوراً بینا ہوگئے۔ یعنی ان کی بینائی ان کی طرف لوٹ آئی اور رَدَدْتُ الْحُكْمَ اِلٰى فُلَانٍ کے معنی کسی کے فیصلہ سپرد کر دینے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ (۴-۸۳) اور اگر اس خبر کو رسول اور ان لوگوں کے سپرد کر دیتے جو ان میں سے برسر حکومت ہیں۔
فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۴-۵۹) پھر اگر کسی امر میں تم (اور حاکم وقت) آپس میں جھگڑ پڑو تو اس امر میں اللہ تعالٰے اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔
عام محاورہ ہے:۔ رَادَّهٗ فِيْ كَلَامِهٖ کسی سے بحث کرنا حدیث میں ہے[1]:۔ (۱۵۳)
اَلْبَيِّعَانِ يَتَرَادَّانِ یعنی بائع اور مشتری بیع کو رد کر دیں۔

رَدَّةُ الْاِبِلِ اونٹوں کا دوبارہ پانی پینے کو جانا۔
اَرَدَّتِ النَّاقَةُ (۱) اونٹنی کا ولادت سے قبل پستان نکالنا (۲) نمناک زمین پر بیٹھنے کی وجہ سے اونٹنی کے پستان اور مخصوص جگہ پر ورم ہو جانا۔
اِسْتَرَدَّ الْمَتَاعَ سامان واپس لے لینا۔

(ر د ء)

اَلرِّدْءُ۔ جو دوسرے کا مددگار بن کر اس کے تابع ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُّصَدِّقُنِيْٓ (۲۸-۳۴) ان کو مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج دو کہ میری تصدیق کریں۔
اور اَرْدَءَهٗ کے معنی کسی کی مدد کرنا کے ہیں اور رَدِيْءٌ (ردی) بھی اصل میں رِدْءٌ کے ہم معنی ہے مگر عرف میں متاخر مذموم پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے:۔ رَدُءَ الشَّيْءُ رَدَاءَةً فَهُوَ رَدِيْءٌ۔ کسی شے کا ردی ہونا۔

(ر د ف)

اَلرِّدْفُ تابع یعنی ہر وہ چیز جو دوسرے کے پیچھے ہو اور رِدْفُ الْمَرْءَةِ کے معنی عورت کے سرین کے ہیں۔
اَلتَّرَادُفُ یکے بعد دیگرے آنا ایک دوسرے کی پیروی کرنا۔
اَلتَّرَادُفُ۔ متاخر یعنی پچھلا۔
اَلْمُرْدِفُ اگلا جس نے اپنے پیچھے کسی کو سوار کیا ہو۔ قرآن میں ہے:۔

[1] رواہ النسائی عن سمرۃ وابوداؤد وابن ماجۃ من ابی بردۃ والمستدرک عن ابن عمرو والبخاری عن ابن عمر ومتفق علیہ عن حکیم بن حزام وراجع الفتح للنبہانی ۲ر۲۰)

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ (۸ - ۹) سو اس نے تمہاری سن لی (اور فرمایا) کہ ہم لگاتار ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کریں گے۔

ابو عبیدہ کے نزدیک رَدِفَ وَاَرْدَفَ یعنی مجرد اور مزید فیہ ایک ہی معنی میں آتے ہیں[1] اس لئے انہوں نے مُرْدِفِیْنَ کا معنی "بعد میں آنے والے" کیا ہے۔ اور یہ شاہد پیش کیا ہے[2] ( )

(۱۷۹) "اِذَا الْجَوْزَاءُ اَرْدَفَتِ الثُّرَيَّا" جب ثریا کے پیچھے جوزاء ستارا نکل آیا۔

مگر ابو عبیدہ کے علاوہ دوسرے علماء نے مُرْدِفِیْنَ کے معنی یہ کئے ہیں کہ "دوسرے فرشتوں کو پیچھے لانے والے" تو اس لحاظ سے گویا دو ہزار فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی گئی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ مُرْدِفِیْنَ سے مراد وہ فرشتے ہیں۔ جو اسلامی لشکر کے آگے آگے چلتے تھے تاکہ کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیں۔

اور ایک قرأت میں مُرْدَفِیْنَ فتح دال کے ساتھ ہے[3] یعنی ہر ایک مسلمان فوجی کے پیچھے اس کی مدد کے لئے ایک فرشتہ متعین تھا۔

ایک اور قرأت میں مُرَدِّفِیْنَ بتشدید دال ہے جو دراصل مُرْتَدِفِیْنَ باب افتعال سے ہے۔ صرفی قاعدہ کے مطابق تا کو دال میں ادغام کر کے اس کی حرکت دال کو دے دی گئی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ ۔ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ ۔ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ ۔ (۳ - ۲۳ - ۲۴) کیا تم کو اتنا کافی نہیں کہ تمہارا رب (آسمان سے) تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد فرمائے (ضرور کافی ہے) بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو (اور خدا اور رسول کی نافرمانی سے) بچو اور دشمن (بھی) اسی دم تم پر چڑھ آئیں تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو بڑی سج دھج سے آموجود ہوں گے۔

اَرْدَفْتُهٗ میں نے اسے اپنے پیچھے سوار کیا۔

اَلرِّدَافُ سواری پر ردیف کے بیٹھنے کی جگہ۔

دَابَّةٌ لَا تُرَادِفُ اَوْلَا تُرْدِفُ سواری جو ردیف کو سوار نہ ہونے دے۔

جَاءَ وَاحِدٌ فَاَرْدَفَهٗ اٰخَرُ ایک کے بعد دوسرا آیا۔

اَرْدَافُ الْمُلُوْكِ بادشاہوں کے جانشین۔ نائب۔

---

[1] وكذا قال ابن الاعرابي راجع شرح الدرة ۲۰۱ ومجاز ابي عبيدة (۱ : ۲۴۱) والحجة لابي علي الفارسي (۱ : ۱۹۳) والقرطبي ۷ / ۳۷۱ ونقل عن ابي عبيدة الحافظ في الفتح (۸ : ۲۲۴) [2] راجع اللسان (ردف افرط) قاله خزيمة بن نهد وكان يعشق فاطمة بنت يشكر وفيها يقول وتمام : ظَنَنْتُ بِاٰلِ فاطمة الظنونا . وبعده يقول : فحالت دون ذالك من هموم . هموم تورث الداء الدفينا والبيت في الطبري (۹ : ۱۹۱) وشرح الدرة ۲۰۱ والبحر ۷ : ۲۱۶) غير منسوب وفي السمط (۱ : ۹۹) انه لخزيمة (مثل ربيعة) بن نهد قال الاستاذ الميمني هذا هو الصحيح وهو مصحف في جل الكتب بخزيمة او جذيمة الا في المعجم البكري ۱۴ والمشتبه فانه ضبطه بالصواب والبيت في التاج (ردف) وشرح المعلقات لابن الانباري ۸۷ والتبريزي ۷۳ وخزيمة ترجمة في المعجم البكري ۱۴ وراجع ايضا المبدا في ۲۸۸ ، ۳۷۴ ، ۳۰۹ وكتاب البسوس ۷ وانظر لمعناه الانواء للقتبي والخبر بطوله في الاغاني (۱۱ : ۱۵۴) ۱۲ [3] قرا اهل المدينة ويعقوب مُرْدَفِيْنَ بفتح الدال والباقون بالكسر وقرئ في الشواذ مردفين (راجع الطبري ۹ / ۱۱۱)

(ر د م)

اَلرَّدْمُ۔ پتھروں سے کسی شگاف کو بند کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا (۱۸-۹۵)

میں تم (لوگوں) میں اور ان (لوگوں) میں ایک روک بنا دوں۔

رَدْمٌ بمعنی مَرْدُوْمٌ یا مُرْدَمٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] ع (الکامل)

(۱۸۰) هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمٍ

کیا شعراء قدیم نے کوئی قابل اصلاح مقام چھوڑا ہے (جس پر طبع آزمائی کی جائے)

اَرْدَمَتْ عَلَيْهِ الْحُمّٰی کسی کو دائمی بخار رہنا۔

سَحَابٌ مُرْدَمٌ ساکن اور ایک جگہ پر ٹھہرنے والا بادل۔

(ر د ی)

اَلتَّرَدِّی۔ (س) اس کے معنی ہلاکت کے ہیں اور التَّرَدِّیْ (تفعل) کے معنی ہیں اپنے آپ کو ہلاکت کے سامنے پیش کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهٗ إِذَا تَرَدّٰى۔ (۹۲-۱۱)

اور جب وہ جہنم میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدٰى۔ (۲۰-۱۶) اور وہ اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے پڑا (اگر ایسا کرو گے) تو تم تباہ ہو جاؤ گے۔

(اَلْاِرْدَاءُ (افعال) ہلاک کرنا قرآن میں ہے:۔

تَاللّٰهِ إِنْ كِدْتَ لَتُرْدِيْنِ۔ (۳۷-۵۶) خدا کی قسم تو تو مجھے تباہ کرنے کو تھا۔

اَلْمِرْدَاةُ وہ پتھر جس سے دوسرے پتھر توڑے جاتے ہیں۔

(ر ذ ل)

اَلرَّذْلُ وَالرَّذَالُ وہ چیز جس سے اس کے ردی ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلٰى أَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶-۷۰)

اور تم میں سے ایسے بھی ہیں جو بدترین حالت کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔

إِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ (۱۱-۲۷)

مگر جو ہم میں رذلے ہیں (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو) بے سوچے سمجھے سرسری نظر سے۔

أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُوْنَ۔ (۲۶-۱۱۱)

کیا ہم تمہاری بات تسلیم کریں۔ حالانکہ ادنیٰ درجے کے لوگ تمہارے متبع ہیں۔

یہ ارذل کی جمع ہے جس کے معنی حقیر اور رذیل شخص کے ہیں۔

(ر ز ق)

اَلرِّزْقُ وہ عطیہ جو جاری ہو خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور رزق بمعنی نصیبہ بھی آجاتا ہے۔ اور کبھی[2] اس چیز کو بھی رزق کہا جاتا ہے جو پیٹ

---

[1] قال عنترة العبسی وتمامہ: ام ہل عرفت الدار بعد توہم والبیت من معلقتہ تسمی المذہبۃ راجع السیوطی ۱۴۶ والامالی (۲: ۲۴۱) واللآلی فی السمط (۶۹) البیت لابوجانی شرحی التبریزی والزوزنی وابوجانی دیوان الستۃ ۴۴ والخفاء الثمین رقم ۱۲ مطلع قصیدۃ وانظر ایضاً ابن الانباری ۴۹۲ والتبریزی ۱۷۲ رواہ ابوعمرو عن ابی حرام العکلی فقط والبیت من قصیدۃ الطبری (۱۶: ۲۳) والشعر الجاہلی (۱: ۲۷۹) واللسان ورم ا ہیتہ من مترجم وفی روایۃ ابی عبیدۃ مترنم راجع ابدال ابی الطیب (۲: ۵۰) والجمہرۃ ۱۶۱ والشطر فی المثل السائر (۱: ۲۷۴) ؎

میں پہنچ کر غذا بنتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔
اَعْطَى السُّلْطَانُ رِزْقَ الْجُنُوْدِ۔ بادشاہ نے فوج کو راشن دیا۔
رُزِقْتُ عِلْمًا۔ مجھے علم عطا ہوا۔ قرآن میں ہے۔
وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (۶۳-۱۰) یعنی جو کچھ مال وجاہ اور علم ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے صرف کرو
اسی طرح آیت: ۔
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (۲-۳) اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے (راہ خدا میں) صرف کرتے ہیں۔ میں بھی رزق عام ہے جو ان تینوں کو شامل ہے۔
كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (۲-۸۱) اور ہم نے جو تم کو عمدہ اور پاکیزہ روزیاں دی ہیں (شوق سے) کھاؤ۔
اور آیت کریمہ: ۔ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔ (۵۶-۸۲)
میں رزق کے معنی حصہ اور نصیبہ کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نعمت الٰہی کی تکذیب کو تم نے اپنا حصہ بنالیا ہے۔ اور آیت: ۔
وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ (۵۱-۲۲) اور تمہارا رزق آسمان میں ہے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد بارش ہے جو ہر ذی حیات کے لئے باعث حیات ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ۔
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً اور ہم نے آسمان سے بارش کی اور بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد نصیبہ ہے اور آیت میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ حظوظ یعنی نصیبے مقادیر کے ساتھ ہیں۔ اور آیت:
فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ۔ (۱۸-۱۹) تو اس میں سے (بقدر ضرورت) کھانا تمہارے پاس لے آئے۔ میں رزق سے مراد طعام ہی ہے جو انسانی غذا بنتا ہے۔ اور آیت کریمہ: ۔
وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ۔ رِزْقًا لِّلْعِبَادِ۔ (۵۰-۱۰، ۱۱) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کی گیلیں خوب گتھی ہوئی ہیں بندوں کو روزی دینے کے لئے۔
میں رزق سے غذائی اشیاء مراد ہیں اور بعض کے نزدیک کھانے پہننے اور ہر قسم کے استعمال کی چیزیں مراد ہیں۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں قدرت الٰہی کے ساتھ بارش کے ذریعہ ہی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور آیت: ۔
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ (۳-۱۶۸)
اور (اے پیغمبر) جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں ان کو مرا ہوا خیال نہ کرنا (وہ مرے نہیں) بلکہ زندہ ہیں ان کو ان کے پروردگار کے ہاں روزی ملتی ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالٰے کی طرف سے ان پر اخروی نعمتوں کا برابر فیضان ہو رہا ہے۔
اسی طرح آیت: ۔
وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (۱۹-۶۲) اور وہاں ان کا کھانا صبح وشام (جس وقت وہ چاہیں گے ان کو ملا کرے گا۔
میں انعامات اخروی ہی مراد ہیں۔ اور آیت: ۔
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱-۵۸) اللہ تعالٰے خود بڑا روزی دینے والا، قوت والا اور زبردست ہے۔

میں رزق کا لفظ عموم پر محمول ہوگا اور ذات
باری تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس کا اطلاق جائز
نہیں ہے لیکن "رَازِق" کا لفظ خالق رزق اور
اس کے دینے والے اور مسبب تینوں پر بولا
جاتا ہے اس لئے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر بھی
ہوتا ہے اور اس انسان پر بھی جو دوسروں تک
رزق پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا آیت:۔
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ
لَهُ بِرَازِقِينَ۔ (۱۵-۲۰) ..... اور ہم ہی
نے زمین میں تمہارے لئے سامان معیشت پیدا
کیا اور ان کے لئے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے۔
یعنی جن کی روزی کا نہ تم سبب بنتے ہو اور نہ ہی
تمہیں ان کی روزی میں کسی قسم کا دخل ہے۔
اسی طرح آیت:۔
وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ
لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ شَيْئًا
وَلَا يَسْتَطِيعُونَ۔ (۱۶-۷۳) اور خدا کے سوا
ان (معبودوں) کی پرستش کرتے ہیں جو آسمانوں
و زمین میں ان کو رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں
رکھتے اور نہ ہی (ایسے اختیار پر) دسترس پا سکتے ہیں۔
میں لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا سے مراد یہ ہے کہ
انہیں رزق دینے میں کسی قسم کا بھی دخل نہیں ہے
(اور تمام اسباب رزق خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔
عام محاورہ ہے۔ اِرْتَزَقَ الْجُنْدُ یعنی لشکر نے
اپنا مقررہ راشن حاصل کیا اور وہ راشن جو ایک
دفعہ دیا جائے اسے رَزْقَة کہا جاتا ہے۔

(ر س س)

وَأَصْحٰبُ الرَّسِّ (۲۵-۳۸) اور رس
کے رہنے والوں نے۔
بعض نے کہا ہے کہ رَسٌّ ایک وادی کا نام ہے[1]
جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2]۔ (الطویل)
(۱۸۱) وَهُنَّ لِوَادِي الرَّسِّ كَالْيَدِ لِلْفَمِ
اور وہ وادی رس کے لئے جیسے ہاتھ منہ کی طرف
اصل میں رَسٌّ کسی چیز کے تھوڑے سے نشان
کو کہا جاتا ہے۔ عام محاورہ ہے:۔
سَمِعْتُ رَسًّا مِنْ خَبَرٍ میں نے کچھ یوں ہی سی خبر سنی
رَسَّ الْحَدِيثُ فِي نَفْسِي میرے دل میں تمہاری
بات کا تھوڑا سا اثر ہوا۔
وَجَدَ رَسًّا مِنْ حُمًّى۔ اس نے بخار کا تھوڑا
سا اثر محسوس کیا۔
رُسَّ الْمَيِّتُ۔ میت دفن ہوگئی اور اس کی
شخصیت کے بعد اب اس کے آثار باقی رہے۔

(ر س خ)

رَسُوخُ الشَّيْءِ۔ کسی چیز کا محکم اور جاگزیں ہونا
رَسَخَ الْغَدِيرُ جوہڑ کا پانی خشک ہو کر زمین میں
جذب ہوگیا۔
اَلرَّاسِخُ فِي الْعِلْمِ وہ محقق جسے کوئی اشکال اور
شبہ پیش نہ آ سکے۔ گویا یہ راسخ فی العلم لوگ
وہی ہیں جو آیت:۔ اَلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَ
رَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا۔ (۴۹-۱۵) الخ سچے

---

[1] ابن کثیر ۳ / ۳۱۹ عن ابن عباس قریۃ من قری ثمود وفی روایۃ ابن ابی حاتم عن ابن عباس انہا اسم بئر فی آذر بائیجان وقیل ان قوما دفنوا فیہا نبیہم وفی تفسیر الطبری ان اصحاب الرس ہم اصحاب الاخدود وفی البخاری الرس المعدن وجمعہ رساس وقیل قوم شعیب راجع البخاری مع الفتح ۸

[2] قالہ زہیر فی معلقتہ دیکھئے صفحہ ۲۹۴ حاشیہ ۱

مسلمان تو وہ ہیں) جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک و شبہ نہیں کیا ہیں مذکورہ صفات کیساتھ متصف ہیں اور اسیطرح سورۂ نساء میں فرمایا:۔
لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ (۴-۱۶۲)
لیکن (اے پیغمبر) ان میں سے جو علم میں بڑی پلے گاہ رکھتے ہیں۔

(ر س ل)

اَلرِّسْلُ۔ اصل میں اس کے معنی آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں اور نَاقَةٌ رِسْلَةٌ نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں اور سبکی کے ساتھ اٹھنے والے اونٹوں کو اِبِلٌ مَرَاسِيْلُ کہا جاتا ہے۔ اسی سے رسول ہے جس کے معنی ہیں روانہ ہونے والا پھر کبھی رفق اور نرمی کے لحاظ سے عَلٰی رِسْلِكَ کہہ دیتے ہیں یعنی اپنے حال پر سکون سے ٹھہرے رہیے اور کبھی صرف روانہ ہونے کا معنی لے لیتے ہیں چنانچہ اسی اعتبار سے اس سے رسول مشتق ہے مگر کبھی رسول کا لفظ صرف پیغام پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (
(۱۸۲) اَلَا اَبْلِغْ اَبَا حَفْصٍ رَسُوْلًا
ابو حفص (عمرؓ) کو میرا پیغام پہنچا دو۔
اور کبھی اس شخص پر جسے پیغام دے کر بھیجا گیا ہو اور واحد جمع دونوں کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (۹-۱۲۸)
لوگو تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ اور فرمایا:۔
اَنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶-۱۶) ہم تمام جہان کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔
اور شاعر نے کہا ہے۔ [2] (
(۱۸۳) اَلِكْنِيْ اِلَيْهَا وَخَيْرُ الرَّسُوْ
لِ اَعْلَمُهُمْ بِنَوَاحِي الْخَبَرِ
اسے میرا پیغام پہنچا دو اور بہتر پیغام بر تو وہ ہوتا ہے جو خبر کو اچھی طرح جانتا بھی ہو۔
اور رسول کی جمع رُسُلٌ آتی ہے اور قرآن پاک میں رسول اور رُسُلُ اللہ سے مراد کبھی فرشتے ہوتے ہیں جیسے فرمایا:۔
اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۸۱-۱۹) کہ یہ (قرآن) بے شک معزز فرشتے (یعنی جبریل) کا (پہنچایا ہوا) پیام ہے۔
اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ (۱۱-۸۱)
ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔
وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ (۱۱-۷۷)
اور جب ہمارے فرشتے لوطؑ کے پاس آئے تو وہ غمزدہ ہوئے۔

---

[1] قالہ زہیر بن ابی سلمٰی واولہ: بکرن بکورا واستحرن لسحرۃ۔ والبیت فی الکامل ۱/۸۱ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۵۲) والبحر (۲: ۳۹۸) والعقد ۵ وایام العرب ۲۷۷ والتبریزی فی العشرہ ۱۰۵ وابن الانباری ۵۰ وفی روایۃ فہن ووادی الرس ۱۲
[2] قالہ جعدۃ بن عبداللہ السلمی وتمامہ: فدتی لک من اخی ثقۃ ازاری۔ والبیت فی اللسان (ازر) فی ستۃ ابیات قال احد مصحح اللسان ولعل الاولی ان یقول قول نضیلۃ الاکبر الاشجعی بدل جعدۃ والبیت فی الوحشیات ۱۰۸ مع الخمسۃ قال فی ذیلہ لبقیلۃ الاکبر ولرجل من الانعام من سلیم راجع الآمدی ۴۳ وکنایات الثعالبی ۳ واللسان (قلص) انشدہ والعمدۃ (۱/۲۱) والفصول والغایات ۵۰۶ قال احمد شاکر وہی ایضا طبقات ابن سعد (۳/۱: ۲۰۵) والفائق (۲: ۱۳۱) والصناعتین ۳۵۴ [3] قالہ ابو ذؤیب الہذلی والبیت من شواہد الطبری (۷-۳
۱۵۸) والطبری
واللسان (رسل، الک) والمحکم (رغی)، ۱۲

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرَاهِيْمَ بِالْبُشْرٰی
(۱۱-۶۹) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام
کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔
وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا (۷۷-۱) قسم ہے ان فرشتوں
کی جو پیام الٰہی دے کر بھیجے جاتے ہیں۔
بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ (۴۳-۸۰) کیوں
نہیں (ضرور سنتے ہیں) اور (سننے کے علاوہ) ہمارے
فرشتے ان کے پاس (تعینات ہیں کہ وہ ان کی سب
باتیں) لکھے جاتے ہیں۔
اور کبھی اس سے مراد انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں
جیسے فرمایا وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (۳-۱۴۴)
اور محمد اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہیں اور بس
یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ
(۵-۶۷) اے پیغمبر جو احکام تم پر تمہارے پروردگار
کی طرف سے نازل ہوئے ہیں (بلا کم و کاست)
ان کو لوگوں تک پہنچا دو۔
اور آیت:۔ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا
مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ (۶-۴۸) اور پیغمبروں
کو ہم صرف اس غرض سے بھیجا کرتے ہیں کہ (نیکوں
کو خوشنودی خدا کی) خوشخبری سنائیں اور (بدوں
کو عذاب سے) ڈرائیں۔
میں ملائکہ اور انسان دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور آیت:۔
یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا
صَالِحًا (۲۳-۵۱) (ہم نے اپنے پیغمبروں سے
یہی ارشاد کرتے رہے ہیں کہ) اے گروہ پیغمبران
ستھری چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔
میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے تمام برگزیدہ اصحاب
مراد ہیں اور صحابہ کرام پر آنحضرت کے ساتھ تبعًا
رُسُل کا لفظ بولا گیا ہے جیسا کہ مُهَلَّبٌ اور ان
کی اولاد کو مَهَالِبَه کہا جاتا ہے۔
اَلْاِرْسَالُ (افعال) کے معنی بھیجنے کے ہیں اور
اس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے اور دوسری
محبوب یا مکروہ چیزوں کے لئے بھی آتا ہے۔ کبھی
(۱) یہ تسخیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے ہوا،
بارش وغیرہ کا بھیجنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَاَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا (۶-۶)
اور (اوپر سے) ان پر موسلادھار مینہ برسایا۔
اور کبھی (۲) کسی بااختیار و ارادہ شخص کے بھیجنے
پر بولا جاتا ہے جیسے پیغمبر بھیجنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً (۶-۶۱) اور تم لوگوں
پر نگہبان (فرشتے) تعینات رکھتا ہے۔
فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ (۲۶-۵۳)
اس پر فرعون نے (لوگوں کی بھیڑ) جمع کرنے کے
لئے شہروں میں ہرکارے دوڑائے۔
اور کبھی (۳) یہ لفظ کسی چیز کو اس کی اپنی حالت
پر چھوڑ دینے اور اس سے کسی قسم کا تعرض نہ
کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ
تَؤُزُّهُمْ اَزًّا (۱۹-۸۳) (اے پیغمبر) کیا تم
نے (اس بات پر) غور نہیں کیا کہ ہم نے شیطانوں
کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے کہ وہ انہیں انگیخت
کرکے اکساتے رہتے ہیں۔
اور کبھی (۴) یہ لفظ امساک (روکنا) کے بالمقابل
استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ
لَهَا وَمَا یُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ
(۳۵-۲) تو اللہ جو اپنی رحمت (کے لنگر) لوگوں
کے لئے (کھول دے تو کوئی اس کا بند کرنے والا نہیں

اور بند کرے تو اس کے (بند کئے) پیچھے کوئی اس کا جاری کرنے والا نہیں۔

اور رَسْلٌ اس اونٹنی یا بکری کو کہتے ہیں جو سہم اور نرم رفتاری سے چلے اور اگر لوگ یکے بعد دیگرے متواتر آئیں تو کہا جاتا ہے۔ جَاؤُا اَرْسَالًا یعنی وہ یکے بعد دیگرے آئے۔ اور اسی سے رِسْلٌ اس زیادہ دودھ کو کہتے ہیں جو مسلسل آرہا ہو۔

(ر س و)

رَسَا الشَّیْءُ (ن) کے معنی کسی چیز کے کسی جگہ پر ٹھہرنے اور استوار ہونے کے ہیں اور اَرْسٰی کے معنی ٹھہرانے اور استوار کر دینے کے۔ قرآن میں ہے: وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ (۳۴-۱۳) اور بڑی بھاری بھاری دیگیں جو ایک جگہ پر جمی رہیں۔

وَرَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ (۷۷-۲۷) اور اونچے اونچے پہاڑ یہاں پہاڑوں کو بوجہ ان کے ثبات اور استواری کے رَوَاسِیَ کہا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۷۹-۳۲) اور پہاڑوں کو اس میں گاڑ کر پلا دیا۔

اسی طرح معنی ثبات کے اعتبار سے پہاڑوں کو اوتاد فرمایا ہے۔ جیسے: وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا (۷۸-۷) اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا۔

کسی شاعر نے کہا ہے۔ (البسیط)

(۱۸۴) وَلَا عِمَادَ اِذَا لَمْ تُرْسِ اَوْتَادُ

اور میخوں کے بغیر ستون نہیں ٹھہر سکتے۔ عام محاورہ ہے: اَلْقَتِ السَّحَابَةُ مَرَاسِيَهَا کہ بادل نے اپنے لنگر ڈال دیئے یعنی جم کر برسنے لگا جیسا کہ اسی معنی میں اَلْقَتْ طُنُبَهَا کہا جاتا ہے اور قرآن میں ہے: بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا (۱۱-۴۱) اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا ہے۔ تو یہ اَلْجَرْيُ وَالْاِرْسَاءُ (باب افعال) سے ماخوذ ہے۔ اور مُرْسٰی کا لفظ مصدر میمی بھی آتا ہے اور صیغہ ظرف زمان ومکان اور اسم مفعول بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت مذکورۃ الصدر میں ایک قراءت مَجْرِيْهَا وَمُرْسِيْهَا بھی ہے[2]۔ اور آیت: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (۷-۱۸۷) (اے پیغمبر لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کہیں اس کا لنگر بیڑا بھی ہے! (یعنی کب واقع ہوگی) میں مُرْسٰهَا سے اس کے بپا ہونے کا زمانہ مراد ہے۔ عام محاورہ ہے: رَسَوْتُ بَيْنَ الْقَوْمِ میں نے قوم کے درمیان صلح کو پختہ کر دیا۔

(ر ش د)

اَلرَّشَدُ وَالرُّشْدُ یہ غَیٌّ کی ضد ہے اور ہدایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ باب نَصَرَ وَعَلِمَ دونوں سے آتا ہے۔ قرآن میں ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۲-۱۸۶) تاکہ وہ سیدھے رستے پر لگ جائیں۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲-۲۵۶) گمراہی سے ہدایت الگ ہو چکی۔

فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا (۴-۶) اور اگر تم

---

[1] قاله الافوه الاودی (واسمه صلاءة بن عمرو وکنیته ابو ربیعه) وصدره: والبیت لا یبتنی الا له عمد... وفی اللغانی الا له عمد. وفی المطبوع ولا جبال، اخشی ان یکون مصحفا والبیت من باب التمثیل ای لا ینال الامر الا بتوفر اسبابه (ل الطرائف من شعر الافوه الادوی والبیت فی روضة العقلاء (۴۴) والبحر (۱/۱۷) وانظر التخریج بحاشیة (۲) [2] کذا فی الصحاح [3] نسبه ابن کثیر الی ابی رجاء العطاردی (۲/۴۴۴)

ان میں صلاحیت دیکھو۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ ۔ (۲۱-۵۱) اور ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی۔

ان آیات میں ابراہیم اور یتیم دونوں کے متعلق رُشْد کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن دونوں میں بون بعید پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ رَشَدٌ (بفتح الراء والشین) رُشد (بضم الراء) سے اخص ہے کیونکہ رُشد کا لفظ امور دینوی اور اخروی دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور رَشَدٌ صرف امور اخروی کے ساتھ مختص ہے اور راشِدٌ اور رَشِيدٌ (صیغہ صفت) دونوں طرح پر یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ (۴۹-۷) یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ۔ (۱۱-۹۷) اور فرعون کی بات کچھ راہ کی بات تو تھی نہیں۔

(ر ص ص)

رَصَّ (ن) کے معنی دو چیزوں کو باہم ملا کر جوڑ دینے کے ہیں اور رَصَاصٌ سیسہ کو کہتے ہیں اور اسی سے فرمایا:۔

كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ (۶۱-۴) گویا ایک مضبوط دیوار ہیں جس میں سیسہ پلا دیا گیا ہے۔

اور رَصَصْتُهُ (ن) وَرَصَّصْتُهُ (تفعیل) کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کو سیسہ پلا کر مضبوط کرنا اور جوڑنا اور تَرَاصُّوا فِي الصَّلٰوةِ کے معنی ہیں نماز کی صف میں باہم پیوستہ ہو کر کھڑے ہونا اور تَرْصِيصُ الْمَرْأَةِ کے معنی ہیں عورت کا نقاب کو مضبوطی سے باندھنا اور اس میں تَرَصُّصٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ر ص د)

اَلتَّرَصُّدُ گھات لگا کر بیٹھنا۔ اور رَصَدَ لَهُ وَتَرَصَّدَ کے معنی ہیں کسی کے لئے گھات لگانا اور أَرْصَدْتُهُ کسی کو گھات لگانے کے لئے مقرر کرنا اور أَرْصَدَ لَهُ کے معنی پناہ دینا بھی آتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَإِرْصَادًا لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ (۹-۱۰۷) اور ان لوگوں کو پناہ دیں جو اللہ اور رسول کے ساتھ پہلے لڑ چکے ہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۸۹-۱۴) بیشک تیرا پروردگار نافرمانوں کی تاک میں رہتا ہے)۔

رَصَدٌ (صیغہ صفت) یہ معنی فاعل اور مفعول دونوں کے لئے آتا ہے اور واحد اور جمع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا۔ (۷۲-۲۷) تو ان کے آگے اور انکے پیچھے (فرشتوں سے پہرہ دینے والے ان کے ساتھ چلتے ہیں۔

تو یہاں رَصَدًا سے واحد اور جمع دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

اَلْمَرْصَدُ گھات لگانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ۔ (۹-۵) اور ہر گھات کی جگہ پر ان کی تاک میں بیٹھو۔

اور مِرْصَادٌ بمعنی مَرْصَدٌ آتا ہے لیکن مِرْصَادٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جو گھات کے لئے مخصوص ہو۔ قرآن میں ہے:۔

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (۷۸-۲۱) بیشک

دوزخ گھات ہیں ہے۔
تو آیت میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ جہنم کے اوپر سے لوگوں کا گزر ہوگا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا۔ (۱۹-۷۱) اور تم میں سے کوئی (ایسا بشر) نہیں جو جہنم پر سے ہو کر نہ گزرے۔

(ر ض ع)

رَضَعَ الْمَوْلُوْدُ (ض س) رِضَاعًا وَرَضَاعَۃً بچے کا دودھ پینا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر انتہائی کمینے کو لَئِیْمٌ رَاضِعٌ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس کنجوس شخص پر بولا جاتا ہے جو انتہائی بخل کی وجہ سے رات کے وقت اپنی بکریوں کے پستانوں سے دودھ چوس لے تاکہ کوئی ضرورت مند دودھ دوہنے کی آواز سنکر سوال نہ کرے۔ پھر اس سے رَضُعَ فُلَانٌ بمعنی لَؤُمَ استعمال ہونے لگا ہے۔ رَاضِعَتَانِ بچے کے اگلے دو دانت جن کے ذریعہ وہ ماں کی چھاتی سے دودھ چوستا ہے۔ (اور اِرْضَاعٌ (افعال) کے معنی دودھ پلانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَۃَ (۲-۲۳۳) اور جو شخص پوری مدت تک دودھ پلانا چاہے تو اس کی خاطر مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔ نیز فرمایا:۔
فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَکُمْ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ۔ (۶۵-۶) اگر وہ (بچے کو) تمہارے لئے دودھ پلانا چاہیں تو انہیں ان کی دودھ پلائی دو۔

عام محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ اَخُوْہُ مِنَ الرَّضَاعَۃِ (بضم الراء) فلاں کا رضاعی بھائی ہے۔ حدیث میں ہے[1] (۱۵۵) یَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ۔ جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں وہ بوجہ رضاعت کے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔
اَلْاِسْتِرْضَاعُ کسی سے دودھ پلوانا۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَکُمْ۔ (۲-۲۳۳) اگر تم اپنی اولاد کو (کسی دایہ سے) دودھ پلوانا چاہو۔ یعنی انہیں مزدوری دے کر دودھ پلوانے کا ارادہ ہو۔

(ر ض و)

رَضِیَ (س) رِضًا فَھُوَ مَرْضِیٌّ وَمَرْضُوٌّ۔ راضی ہونا۔ واضح رہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ قضائے الٰہی سے اس پر وارد ہو وہ اسے خوشی سے برداشت کرے اور اللہ تعالیٰ کے بندے پر راضی ہونے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسے اپنے اوامر کا بجا لانے والا اور منہیات سے رکنے والا پائے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (۵-۱۱۹) اللہ تعالیٰ ان سے خوش اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش۔
لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۴۸-۱۸) تو اللہ تعالیٰ ضرور ان مسلمانوں سے خوش ہوتا ہے۔
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵-۳) اور ہم نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند فرمایا:۔
اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۹-۳۸) کیا آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر قناعت کر بیٹھے ہو۔

---

[1] الحدیث فی (حم، ق، د، ن، ہ) عن عائشۃ (حم، م، ن، ہ) عن ابن عباس وفی روایۃ من الولادۃ بدل النسب وابن جریر عن عائشۃ بمعناہ (ت حسن صحیح) (والطبرانی عن ابن عباس [2] قال فی الصحاح نجائزوا بہ علی الاصل والقیاس ۱۲

يُرْضُوْنَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبٰى قُلُوْبُهُمْ (۹-۸)
اپنی زبانی باتوں سے تو تم کو رضامند کر دیتے ہیں اور ان کے دل ہیں کہ ان باتوں سے انکار کرتے ہیں۔

وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ (۳۳-۵۱)
اور آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ (بھی) تم ان کو دو گے وہ (لے کر سب کی سب) راضی ہو جائیں گی۔

اَلرِّضْوَانُ رضائے کثیر یعنی نہایت خوشنودی کو کہتے ہیں۔ چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے اس لئے قرآن پاک میں خاص کر رضائے الٰہی کے لئے رِضْوَانٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ۔ (۵۷-۲۷) اور (لذت) دنیا کا چھوڑ بیٹھنا جس کو انہوں نے از خود ایجاد کیا تھا ہم نے وہ طریق ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ . . . .
. . . مگر (ہاں) انہوں نے اس کو خدا (ہی) کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ایجاد کیا تھا۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (۴۸-۲۹)
اور خدا کے فضل اور خوشنودی کی طلب گاری میں لگے رہتے ہیں۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ۔ (۹-۲۱) ان کا پروردگار ان کو اپنی مہربانی اور رضامندی کی خوشخبری دیتا ہے۔

اور آیت کریمہ۔ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (۲-۲۳۲) جب جائز طور پہ آپس میں راضی ہو جائیں۔ میں تَرَاضَوْا باب تفاعل سے ہے جس کے معنی باہم اظہار رضامندی کے ہیں۔

(ر ط ب)

اَلرَّطْبُ (تر) یہ یَابِسٌ (خشک) کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ . . . . (۶-۵۹)۔ اور (دنیا کی) تر اور خشک چیزیں (سب ہی تو) کتاب واضح (یعنی لوح محفوظ) میں (لکھی ہوئی موجود) ہیں۔

اور رُطَبٌ کا لفظ (پختہ اور) تازہ کھجور کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَهُزِّيْ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (۱۹-۲۵) اور کھجور کی شاخ کو اپنی طرف ہلا تجھ پر تازہ پکی کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔

اَرْطَبَ النَّخْلُ کے معنی ہیں درخت خرما کی کھجوروں والا ہو گیا۔ اس میں صاحب ماخذ ہونے کا خاصہ پایا جاتا ہے (جیسے اَتْمَرَ وَاَجْنٰی میں ہے عام محاورہ ہے:۔

اَرْطَبْتُ الْفَرَسَ وَرَطَبْتُهٗ میں نے گھوڑے کو تازہ گھاس کھلائی اور رَطِبَ الْفَرَسُ (باب عَلِمَ سے لازمی ہے اور اس) کے معنی گھوڑے نے تر گھاس کھانا کے ہیں۔

رَطِبَ الرَّجُلُ۔ تر و خشک ہر قسم کی باتیں کرنا خوش گپیاں اڑانا یہ محاورہ رَطِبَ الْفَرَسُ کے ساتھ بطور تشبیہ استعمال ہوتا ہے:۔

اَلرَّطِيْبُ نرم و ملائم کو کہتے ہیں۔

(ر ع ب)

اَلرُّعْبُ۔ اس کے اصل معنی خوف سے بھر کر کٹ جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔

رَعَبْتُهٗ فَرَعُبَ رُعْبًا۔ میں نے اسے خوف زدہ کیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اور خوف زدہ شخص کو رَعِبٌ کہا جاتا ہے۔ اَلتِّرْعَابَۃُ (صیغہ صفت) بہت زیادہ ڈرپوک۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ۔ (۳-۱۵۱) ہم عنقریب تمہاری ہیبت کافروں کے دلوں میں بٹھا دیں گے۔

وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔ (۱۸-۱۸) اور ان کی (صورت حال سے تجھ میں ایک دہشت سما جائے۔

پھر کبھی یہ صرف بھرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے رَعَبْتُ الْحَوْضَ میں نے حوض کو پانی سے پر کر دیا۔

سَیْلٌ رَاعِبٌ سیلاب جو وادی کو پر کر دے۔

اور جَارِیَۃٌ رُعْبُوْبَۃٌ کے معنی جوانی سے بھرپور اور نازک اندام دوشیزہ کے ہیں اس کی جمع رَعَابِیْبُ آتی ہے۔

(ر ع د)

اَلرَّعْدُ (اسم) بادل کی گرج مروی ہے (۱۵۶) اَنَّهٗ مَلَکٌ یَسُوْقُ السَّحَابَ کہ رَعْدٌ اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں کو چلاتا ہے۔[1] کہا جاتا ہے۔

رَعَدَتِ السَّمَاءُ وَبَرَقَتْ بادل گرجا اور چمکا۔

اور یہی معنی اَرْعَدَتْ وَاَبْرَقَتْ کے ہیں اور کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ تہدید یعنی ڈرانے (دھمکانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور صَلَفٌ تَحْتَ رَاعِدَۃٍ (مثل)[2] (ضرب المثل ہے جو اس شخص کے حق میں بولی جاتی ہے جو بڑ بانکتا ہو لیکن کر کے نہ دکھاتا ہو۔

اَلرِّعْدِیْدُ بزدلی کی وجہ سے کانپنے والا نیز محاورہ ہے۔

اُرْعِدَتْ فَرَائِصُهٗ خَوْفًا یعنی مارے خوف کے اس کے پٹھے کانپنے لگے۔

(ر ع ن)

قرآن میں ہے:۔

لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا (۲-۱۰۴) یعنی راعنا کلمہ خطاب نہ کیا کرو۔

رَاعِنَا لَیًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ (۴-۴۶) اور اپنی زبانوں کو مروڑ مروڑ کر اور دین اسلام میں طعنے کی راہ سے کہہ کر تم سے خطاب کرتے ہیں۔

اس کلمہ کے ساتھ آنحضرت کو بطور تہکم خطاب کرتے تھے اور آپ پر رعونت کا الزام دھرتے اور ظاہر یہ کرتے کہ ہم رَاعِنَا کا کلمہ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں ہمارا خیال کیجیے اور رَاعِنًا۔ رعن سے مشتق ہے اور رَعُنَ الرَّجُلُ (ک) کے معنی کسی آدمی کے سست اور بے وقوف ہونے کے ہیں اس سے صیغہ صفت اَرْعَنُ اور رَعْنٌ آتا ہے جس کے معنی کم فہم آدمی کے ہیں یہ دراصل رَعْنٌ کی سالہ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے جس کے معنی بلنی کوہ کے ہیں یعنی پہاڑ کا وہ حصہ جو باہر نکلا ہوا ہو اور اَرْعَنُ کی مؤنث رَعْنَاءُ آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے (ع)[3]

(۱۸۵) لَوْلَا ابْنُ عُتْبَۃَ عَمْرٌو وَالرَّجَاءُ لَهٗ
مَا کَانَتِ الْبَصْرَۃُ الرَّعْنَاءُ لِیْ وَطَنًا

اگر عمرو بن عتبہ اور اس کے عطایا کی امید نہ ہوتی تو میں

---

[1] ہکذا ورد فی حدیث مرفوع عن ابن عباس والحدیث فی الترمذی والنسائی واحمد والطبرانی فی الاوسط من روایۃ جابر وابی عمران الکوفی - عن ابن جریج راجع التفاسیر تحت الآیۃ (۱۳-۱۳) (وتخریج الکشاف رقم ۲۲۵ وقد ذکرہ معنیہ ابو عبیدۃ فی مجازہ ۱/۳۲۵ - [2] مثل فی جل المعاجم فی الصحاح: لمن یکثر الکلام ولا خیر فیہ [3] قالہ الفرزدق فی عمرو بن عتبۃ (فی اللسان (رعن) حمدہ): لولا ابو مالک المرجو نائلہ وفی روایۃ الحقاید بدل الرعناء والبیت فی الاقتضاب ۱۸ ودیوانہ والبلدان (رسم: بصرۃ) وفیہ وجہ لقبہا بالرعناء ۱۲

بَصْرَۃُ رَعْنَا کو بھی اپنا وطن نہ بناتا۔

بصرۃ کو رَعْنَاءُ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بادیۃ کی بنسبت نشیبی ہونے کے سبب گویا رَعْنَاءُ (سست عورت) کے مشابہ ہے اور یا اس لئے کہ اس کی ہوا میں تغیر اور تکسر پایا جاتا ہے۔

(ر ع ی)

اَلرَّعْیُ۔ اصل میں حیوان یعنی جاندار چیز کی حفاظت کو کہتے ہیں۔ خواہ غذا کے ذریعہ ہو جو اس کی زندگی کی حافظ ہے یا اس سے دشمن کو دفع کرنے کے ذریعہ ہو اور رَعَیْتُہٗ کے معنی کسی کی نگرانی کرنے کے ہیں اور اَرْعَیْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اس کے سامنے چارا ڈالا اور رِعْیٌ چارہ یا گھاس کو کہتے ہیں مَرْعًی (ظرف) چراگاہ۔ قرآن میں ہے:۔

كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ (۲۰-۵۴) تم بھی کھاؤ اور اپنے چارپاؤں کو بھی چراؤ۔

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا (۷۹-۳۱) اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى (۸۷-۴) اور جس نے (خوش نما) چارہ (زمین سے) نکالا۔

رَعْیٌ اور رِعَاءٌ کا لفظ عام طور پر حفاظت اور حسن انتظام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (۵۷-۲۷) لیکن جیسے اس کی نگہداشت کرنا چاہیئے تھی انہوں نے نہ کی۔

اور ہر وہ آدمی جو دوسروں کا محافظ اور منتظم ہو اسے رَاعِیْ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے[1] (۱۶۵)

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال ہوگا۔ شاعر نے کہا ہے[2] (السریع)

(۱۸۶) .... وَلَا اَرْ

مَرْعِيٌّ فِي الْاَقْوَامِ كَالرَّاعِيْ

اور محکوم قومیں حاکم قوموں کے برابر نہیں ہوسکتیں۔

اور رَاعِیْ کی جمع رِعَاءٌ وَرُعَاۃٌ آتی ہے۔ اَلْمُرَاعَاۃُ کسی کام کے انجام پر غور کرنا اور دیکھنا کہ اس سے کیا صادر ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ رَاعَيْتُ النُّجُوْمَ میں نے ستاروں کے غروب ہونے پر نگاہ رکھی۔ قرآن میں ہے:۔

لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (۲-۱۰۴) (مسلمانو پیغمبر سے) راعنا کہہ کر مت خطاب کیا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو۔

کہا جاتا ہے:۔

اَرْعَيْتُهٗ سَمْعِيْ۔ میں نے اس کی بات پر کان لگایا یعنی غور سے اس کی بات کو سنا۔ اسی طرح محاورہ ہے:۔

اَرْعِنِيْ سَمْعَكَ میری بات سنیئے۔

اور اَرْعٰى عَلٰى كَذَا۔ کے معنی کسی پر رحم کھانے اور اس کی حفاظت کرنے کے ہیں۔

(ر غ ب)

اَلرَّغْبَۃُ اس کے اصل معنی کسی چیز میں وسعت کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔ رَغُبَ الشَّیْءُ

---

[1] اصل الحدیث متفق علیہ وایضاً فی الترمذی وابی داؤد والبیہقی من انس وابن عباس والطبرانی من حدیث ابن عباس راجع لتخریجہ احیاء العلوم للغزالی بتخریج العراقی ۲/۲۱ وکنز العمال ۶ رقم ۱۲۱۰۹۱ والفتح الکبیر ۲/۳۰-۲۳۱-۳۲ [2] قالہ ابوقیس بن الاسلت وتکملتہ: لیس قطاً مثل قُطَیّ ... والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲-۸۵) جمہرۃ فی ۱۹ بیتاً راجع السمط ۸۲۷ والمیدانی (۲:۹۰) واللسان (قطا، رعی) وایام العرب ۸۳ وخاص الخاص للثعالبی ۴ والمثل ایضاً فی المیدانی (۲: ۸۶، ۱۱۴) والعسکری ۱۷۵، ۲۰۳)

کسی چیز کا وسیع ہونا اور حَوْضٌ رَغِيْبٌ کشادہ حوض کو کہتے ہیں۔ عام محاورہ ہے۔

فُلَانٌ رَغِيْبُ الْجَوْفِ فلاں پیٹو ہے۔

فَرَسٌ رَغِيْبُ الْعَدْوِ تیز رفتار اور کشادہ قدم گھوڑا

اَلرَّغْبَةُ وَالرَّغَبُ وَالرُّغْبٰى ارادہ اور خواہش کی وسعت کو کہتے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (۲۱-۹۰) اور وہ ہم کو (ہمارے فضل کی) توقع اور (ہمارے عذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں۔

اور رَغِبَ فِيْهِ وَاِلَيْهِ کے معنی کسی چیز پر رغبت اور حرص کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ (۹-۵۹) ہم تو اللہ سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔

لیکن رَغِبَ عَنْ کے معنی کسی چیز سے بے رغبتی کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ (۲-۱۳۰) اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے انحراف کرے۔

اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ (۱۹-۴۶) (اے ابراہیم) کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے۔

اور رَغِيْبَةٌ کے معنی بہت بڑے عطیہ کے ہیں (ج رَغَائِبُ) یہ رغبت سے مشتق ہے یا تو اس لئے کہ وہ مرغوب فیہ ہوتی ہے اور یا اصل معنی یعنی وسعت کے لحاظ سے عطیہ کو رغیبہ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۱۸۷) يُعْطِي الرَّغَائِبَ مَنْ يَّشَاۤءُ وَيَمْنَعُ

وہ جسے چاہتا ہے بڑے بڑے عطایا بخشتا اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔

(ر غ د)

رَغَدًا اور رَغْدًا۔ آسودہ زندگی۔ قرآن میں ہے:۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا (۲-۳۵) اور اس میں سے تم دونوں بافراغت کھاؤ۔

يَاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (۱۶-۱۱۲) ہر طرف سے ان کا رزق بافراغت ان کے پاس چلا آتا تھا۔

اَرْغَدَ الْقَوْمُ آرام و راحت میں بسر کرنا۔

اَرْغَدَ مَاشِيَتَهٗ اس نے اپنے مویشی چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیئے۔

ان میں اول یعنی اَرْغَدَ الْقَوْمُ جَدَبَ وَاَجْدَبَ کی طرح لازم ہے اور دوسرا یعنی اَرْغَدَ مَاشِيَتَهٗ اَدْخَلَ کی طرح متعدی ہے۔

اَلْمُرْغَادُ ایک قسم کا کھانا جو دودھ میں خرما وغیرہ ڈال کر بنایا جاتا ہے اور وافر ہونے کی وجہ سے زندگی کی آسودگی پر دلالت کرتا تھا۔

(ر غ م)

اَلرُّغَامُ اصل میں خاک کو کہتے ہیں اور رَغِمَ اَنْفُ فُلَانٍ کے معنی ہیں اس کی ناک خاک آلودہ ہو یعنی وہ ذلیل ہو اور اَرْغَمَهٗ کسی کو ذلت کے ساتھ خاک میں ملا دیا جانا اور رَغِمَ اَنْفُ فُلَانٍ کے معنی ناراض ہونا بھی آتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [2] (   )

---

[1] لعبدة بن الطیب من قصیدۃ یعظ فیھا بنیه وصدرہ :۔ اوصیکم بتقی الالٰہ فانه ... راجع للبیت شرح شواہد التلخیص (۱: ۳۶)

[2] قد مرفی (الف) رقم ۲۱ وفیه غضبت بدل اغمت

÷ ÷

(۱۸۸) اِذَا رَغِمَتْ تِلْكَ الْاُنُوْفُ لَمْ اُرْضِهَا
وَلَمْ اَطْلُبِ الْعُتْبٰى وَلٰكِنْ اَزِيْدُهَا

اگر وہ ناراض ہو گئے تو میں ان کو راضی کرنے کی کوشش نہیں کروں گا بلکہ اس کی ناراضگی کو اور بڑھاؤں گا۔ یہاں پر رغم کو ارضا کے بالمقابل لانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے معنی سخط یعنی غصے اور ناراض ہونے کے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے:۔

اَرْغَمَ اللّٰہُ اَنْفَ فُلَانٍ اَوْ اَرْغَمَہٗ یعنی اللہ اسے ذلیل کرے اور رَاغَمَہٗ (باب مفاعلہ کے معنی باہم ناراض ہونے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی کوشش کے ہیں بعد ازاں مراغمہ کا لفظ منازعت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور آیت:۔

یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّسَعَۃً (۴-۱۰۰) تو وہ زمین میں اس کو بہت سی جگہ اور ہر طرح کی کشائش ملے گی۔

میں مُرٰغَمًا سے مراد پناہ گاہ ہے یعنی برائی کو دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش کرے اگر اس سلسلہ میں اسے وطن بھی ترک کرنا پڑے تو ہراساں نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے کوئی اچھی پناہ گاہ دے گا۔ جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہو گی اور یہ رَغِمْتُ اِلَیْہِ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کے پاس چلا جانا۔ جیسے غَضِبْتُ اِلٰی فُلَانٍ مِنْ کَذَا یعنی ناراض ہو کر فلاں کے پاس چلا گیا۔

(ر ف ف)

رَفِیْفُ الشَّجَرِ درخت کی شاخوں کا ہوا سے لہلہانا اور منتشر ہونا کہا جاتا ہے۔

رَفَّ الطَّائِرُ جَنَاحَیْہِ پرندکا اپنے بچے کی حفاظت کے لئے دونوں بازو پھیلانا۔ یہ باب رَفَّ یَرُفُّ (ن) سے ہے اور استعارہ کے طور پر رَفٌّ کا لفظ کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے عام محاورہ میں کہا جاتا ہے۔

مَا لِفُلَانٍ حَافٌّ وَلَا رَافٌّ یعنی اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ اس پر کوئی شفقت کرنے والا نہیں رہا۔ مثل مشہور ہے[1] (مثل)

مَنْ حَفَّنَا اَوْ رَفَّنَا فَلْیَقْتَصِدْ جو ہم پر شفقت کرے اسے چاہیے کہ اعتدال سے کام لے۔

اَلرَّفْرَفُ کے معنی درخت کے منتشر پتوں کے ہیں۔ اور قرآن کی آیت:۔

عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ (۵۵-۷۶) (وہ سبز قالینوں پر تکیہ لگائے)

رَفْرَفٍ سے خاص قسم کے کپڑے مراد ہیں۔ جو مرغزار کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ رَفْرَفٌ سے خیمے کا کنارہ مراد ہے۔ جو زمین پر پڑا رہتا ہے اور حسن (بصری) سے مروی ہے کہ اس سے گول تکئے مراد ہیں۔

(ر ف ت)

اَلرَّفْتُ یہ باب نصر کا مصدر ہے اور رَفَتَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو چورا چورا کر دینے کے ہیں اور جو بھوسہ وغیرہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے اسے رفات کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا (۱۷-۴۹)

---

[1] انظر للمثل النہایۃ لابن الاثیر (۲-۸۹) واللسان والصحاح (رنف) ومجالس ثعلب ۲/۱۱م و فی اتباع ابی الطیب ۸۴ فلیترک بدل فلیقتصد وکلہم جعل الکلمۃ من قبیل المثل الا ابا الطیب فانہ قال جاء فی الحدیث۔ ۱۲ ۞ ۞ ۞ ۞

اور کہا کرتے کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔
اور استعارہ کے طور پر رُفات اس رسی کو بھی کہتے ہیں۔ جو بوسیدہ ہو کر ٹکڑے ہو گئی ہو۔

(ر ف ث)

اَلرَّفَثُ (ن) وہ فحش باتیں جن کا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا یعنی جماع اور اس کے دواعی کا تذکرہ اور آیت کریمہ:
اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (۲-۱۸۷) مسلمانو! ماہِ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے جائز کر دیا گیا ہے۔
میں کنایۃً جماع مراد ہے اور اس سے متنبہ کیا گیا ہے کہ ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کو جماع کے لئے بلانا اور ان سے اس کے متعلق گفتگو کرنا جائز ہے اور اسے بواسطہ الیٰ متعدی کر کے معنی افضاء کی طرف اشارہ کیا ہے اور آیت:
فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ .... (۲-۱۹۷) (اور حج میں) نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ گناہ کی۔
میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جماع کی ممانعت کی گئی ہو اور یہ بھی کہ اس کے متعلق گفتگو سے منع کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ گفتگو جماع کے مقدمات میں شامل ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ دورانِ طواف میں یہ شعر پڑھا۔ (رجز)[1]

(۱۸۹) وَهُنَّ يَمْشِيْنَ بِنَا هَمِيْسًا
اِنْ تَصْدُقِ الطَّيْرُ نَنِكْ لَمِيْسَا

اور وہ اونٹ ہمیں لے کر آہستہ آہستہ نرم رفتاری سے چلتے ہیں اگر پرندہ سچ بولتا ہے تو ہم لمیس سے جماع کریں گے۔
اور رَفَثَ وَاَرْفَثَ دونوں ایک دوسرے کی جگہ میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ رَفَثَ کے معنی مباشرت کرنے کے ہیں اور اَرْفَثَ کے معنی رَفَثَ (مأخذ) کے ساتھ متصف ہونا کے اور یہ دونوں باتیں لازم ملزوم ہیں۔

(ر ف د)

اَلرِّفْدُ (ن) اس کے معنی عطا اور مدد کے ہیں اور رَفْدٌ مصدر (ض) ہے جس کے معنی مدد دینے اور عطا کرنے کے ہیں اور مِرْفَدٌ اس چیز کو کہتے ہیں۔ جس میں عطیہ ڈال کر دیا جائے عام طور پیالوں میں خیرات ڈال کر دی جاتی ہے اس لئے مِرْفَدٌ بمعنی پیالہ آتا ہے اور رَفَدْتُهٗ کے معنی عطیہ دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ (۱۱-۹۹) بہت ہی برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا۔
اور اَرْفَدْتُهٗ کے معنی کسی کے لئے عطا مقرر کرنے کے ہیں کہ وہ مقررہ مقدار میں اس سے لیتا رہے رَفَدَهٗ وَاَرْفَدَهٗ دونوں سَقَاهُ وَاَسْقَاهُ کی طرح متعدی بن کر استعمال ہوتے ہیں۔
اور رُفِدَ فُلَانٌ فَهُوَ مُرْفَدٌ سے بطور استعارہ

---

[1] راجع للقصۃ والبیت الکشاف والمستدرک للحاکم والطبری (۲: ۲۶۵) وفی روایتہ خرجن یسرین مکان یمشین والرجز ایضاً فی البحر (۲: ۱۶، ۲۷) والعمدۃ (۱: ۳۰) والمحاضرات للمؤلف (۱: ۷۹) وابن کثیر (۱: ۲۳۷) والحیوان للجاحظ (۳: ۴۰) والعیون (۱: ۲۱، ۳/۳: ۲۲)

وہ شخص بھی مراد ہوتا ہے جسے ریاست و سرداری دی گئی ہو۔

اَلرَّفُوْدُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک بار دودھ دوہنے سے پیالہ بھر دے لہٰذا یہ (فعول) بمعنی فاعل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ مَرَافِیْدُ ان اونٹنیوں اور بکریوں کو کہا جاتا ہے جو موسم گرما اور سرما میں برابر دودھ دیتی ہوں اور ان کا دودھ کبھی خشک نہ ہوتا ہو شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۱۹۰) أَأَطْعَمْتَ الْعِرَاقَ وَرَافِدَیْهِ
فَزَارِیًّا أَحَذَّ یَدِ الْقَمِیْصِ

یعنی تو نے عراق اور دجلہ و فرات پر ایک فزاری کو عامل بنا کر بھیجا ہے جو خیانت میں نہایت ماہر ہے۔ یہاں رَافِدَیْہِ سے دجلہ اور فرات مراد ہیں کیونکہ ان کا پانی مسلسل جاری رہتا ہے۔

تَرَافَدُوْا کے معنی ایک دوسرے سے تعاون کرنا کے ہیں اسی سے رِفَادَہٌ ہے یعنی وہ فنڈ جو قریش نادار حجاج کی مدد کے لئے جمع رکھتے تھے۔

(ر ف ع)

اَلرَّفْعُ (ف) کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں یہ کبھی تو مادی چیز جو اپنی جگہ پر پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (۲-۶۳) اور ہم نے طور پہاڑ کو تمہارے اوپر لاکر کھڑا کیا۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا (۱۳-۲) اللہ وہ قادر مطلق ہے جس نے آسمان کو بدون کسی سہارے کے اونچا بنا کر کھڑا کیا۔

اور کبھی عمارت کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ (۲-۱۲۷) اور جب ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

اور کبھی ناموری اور شہرت کا ذکر بلند کرنے کے لئے جیسے فرمایا:۔

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ (۹۴-۴) اور ہم نے تمہارے ذکر خیر کا آوازہ بلند کیا۔

اور کبھی مرتبہ کی بلندی بیان کرنے کیلئے۔ جیسے فرمایا:۔

وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (۶-۱۶۶) اور ان میں سے بعض کو بعض پر بلحاظ درجات کے فوقیت دی۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (۱۲-۷۶) اور ہم

---

[1] قالہ الفرزدق یہجو عمر بن ہبیرۃ الفزاری و یخاطب یزید بن عبد الملک لما ولاہ العراق (۱۰۲ھ) وقبلہ: تفیہق بالعراق ابو المثنی۔ وعلّم قومہ اکل الخبیص والبیت فی السمط ۶۲۸ واللسان والمحکم والصحاح (حذذ) ودیوانہ (۲: ۴۸۸) رقم ۴۰۲ والحصری (۱: ۵۷) والجرجانی ۴۷ والکامل ۸۰۸۔ والرافدان: الدجلۃ والفرات والبیت ایضًا فی الحیوان (۵: ۱۹۷/۶: ۱۰۵) فی اربعۃ ابیات والجزنی الفاضل ۱۱۱ وادب الکاتب للصولی ۱۱۳ والبیت ایضًا فی مجازات القرآن ۲۹۱ والمعارف للقتیبی ۱۷۹ والمعانی للقتیبی ۵۹۷ والروایۃ فی معظم المصادر "أأطعمت" وفی الاغانی (۱۹: ۱۷) والامالی (۲۳ ۱۲ت) والصحاح أولیت وفی الحیوان والاساس واللسان (رفد) "بعثت الی" فاظن ان الغار فی المطبوع مصحف قال القتیبی فی المعانی الاحذ معناہ سریع الید وارادا خفتہ یدہ فی السرقۃ والخیانۃ (کذا فی الصحاح)، وذکر القمیص للتسدید القافیہ وذکر الاخباریون: فعزلہ یزید ۱۰۵ھ ثم لیسمع لہ ذکر

جس کو چاہتے ہیں (حسن تدبیر ہیں) اس کے درجے بلند کر دیتے ہیں۔

رَفِیْعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ (۴۰-۱۵) خدا بڑا عالی مرتبہ (اور) عرش (بریں) کا مالک ہے۔

اور آیت:۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (۴-۱۵۸) بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔

میں رفع کے معنی آسمان کی طرف اٹھا لے جانا بھی ہو سکتے ہیں اور رفع[1] بلحاظ شرف بخشی بھی اور (قیامت کے متعلق) آیت:۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (۵۶-۳) بعض کو نیچا دکھائے گی اور بعض کو (بلحاظ درجہ) بلند کرے گی۔

(میں بھی) رَافِعَةٌ کا لفظ خَافِضَةٌ کے مقابلہ میں آیا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ رفع بلحاظ درجات مراد ہے۔ اور آیت:۔

وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ (۸۸-۱۸) اور آسمان کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کیسا اونچا بنایا۔

میں دونوں قسم کی بلندی کی طرف اشارہ ہے یعنی بلندی بلحاظ محل اور بلندی بلحاظ شرف و منزلت اور آیت۔

وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ (۵۶-۳۴) اور اونچے اونچے فرش۔

میں فرش کی بلندی سے ان کے عمدہ اور نفیس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح آیت:۔

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۸۰-۱۳،۱۴) ان اوراق میں (لکھا ہوا ہے) جن کی تعظیم کی جاتی ہے اور وہ پاکیزہ اور اونچی جگہ پر رکھے ہوئے ہیں۔

میں بھی بلندی بلحاظ شرف و منزلت ہی مراد ہے۔ اور آیت:۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ ...... (۲۴-۳۶) ایسے گھروں میں جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی عزت کی جائے۔

میں بھی رَفَعَ بلحاظ عز و شرف مراد ہے۔ یعنی ان کی تعظیم کی جائے اور ان کے اندر کوئی نازیبا حرکت نہ کی جائے جو ان کے ادب و احترام کے خلاف ہو اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ (۳۳-۳۳) (اے پیغمبر کے گھر والو) خدا کو تو یہی منظور ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) گندگی کو دور کر دے۔

میں رِجْس کے دور کرنے سے عز و شرف بخشنا مراد ہے اور رفع کے معنی تیز رفتاری بھی آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے۔ رَفَعَ الْبَعِیْرُ فِیْ سَیْرِهٖ اونٹ تیز رفتاری سے چلا اَرْفَعْتُهٗ اَنَا میں نے اسے تیز چلایا بَعِیْرٌ مَرْفُوْعُ السَّیْرِ تیز رفتار اونٹ۔ اور (رَفْعٌ) کے معنی کسی کے راز کو فاش کرنا بھی آتے ہیں جیسے) رَفَعَ فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ میں نے اس سے پردہ اٹھا دیا یعنی اس کے راز کو فاش کر دیا اور رِفَاعَةٌ اس چھوٹی سی گدی کو کہتے ہیں جسے عورتیں اپنے سرین پر باندھ لیتی ہیں تاکہ وہ دبڑے معلوم ہوں۔

(ر ق ق)

اَلرِّقَّةُ (باریکی) اور دِقَّةٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن دِقَّةٌ بلحاظ کناروں کی باریکی کے استعمال ہوتا ہے اور دِقَّةٌ بلحاظ عمق کے بولا جاتا ہے۔ پھر اگر رقت کا لفظ اجسام کے متعلق استعمال ہو تو اس کی ضد صفاقت آتی ہے جیسے ثَوْبٌ رَقِیْقٌ (باریک کپڑا) اور ثوب صفیق (موٹا کپڑا) اور دل کے متعلق استعمال ہو تو اس کی ضد قساوت اور جفاء آتی ہے مثلاً نرم دل کے متعلق کہا جاتا ہے۔

[1] لکن الرفع الی السماء متعین فی الآیۃ لان الاحادیث تدل بالتواتر علی انہا المعنی (راجع ر ی ق ن)

فلاں رَقِیْقُ الْقَلْبِ اور اس کے بالمقابل سخت دل آدمی کو قَاسِی الْقَلْبِ کہتے ہیں۔

اَلرَّقُّ: کاغذ کی طرح کی کوئی چیز جس پر لکھا جائے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲-۳) (اور چوڑے چھلکے) کاغذ پر لکھی ہوئی (کتاب کی قسم ہے)

اور نیز نرکچھوے کو بھی رِقٌّ کہا جاتا ہے۔

اَلرِّقُّ کے معنی غلاموں کا مالک ہونے کے ہیں۔ اسی سے مملوک غلام کو رقیق کہا جاتا ہے اس کی جمع اَرِقَّاءُ آتی ہے اور اِسْتَرَقَّ فُلَانٌ فُلَانًا کے معنی کسی کو غلام بنانے کے ہیں

اَلرَّقْرَاقُ شراب کی چمک دمک کو کہتے ہیں اور رَقْرَاقَۃٌ کے معنی شفاف شراب کے ہیں نیز ہر وہ قطعہ زمین جو پانی سے متصل ہو اسے رِقَّۃٌ کہا جاتا ہے کیونکہ مرطوب ہونے کی وجہ سے وہ نرم رہتی ہے مثال مشہور ہے (۱)

اَعَنْ صَبُوْحٍ تُرَقْرِقُ کیا تمہارا اشارہ صبح کی شراب سے ہے۔ یہ حسنِ طلب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

(ر ق ب)

اَلرَّقَبَۃُ اصل میں گردن کو کہتے ہیں پھر رقبۃ کا لفظ بول کر مجازاً انسان مراد لیا جاتا ہے اور عرف عام میں اَلرَّقَبَۃُ غلام کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ لفظ رَأْسٌ اور ظَهْرٌ بول کر مجازاً سواری مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ يَرْبِطُ كَذَا ظَهْرًا اَوْكَذَا رَأْسًا۔۔۔۔

یعنی فلاں کے پاس اتنی سواریاں ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاءً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (۴-۹۲) کہ جو مسلمان کو غلطی سے (بھی) مار ڈالے تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرائے۔

اور رَقَبَۃٌ کی جمع رِقَابٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَفِی الرِّقَابِ (۲-۷۷) اور غلام کو آزاد کرنے میں۔ مراد مکاتب غلام ہیں۔ کیونکہ مال زکوٰۃ کے وہی مستحق ہوتے ہیں اور رَقَبْتُہٗ (ن) کے معنی گردن پر مارنے یا کسی کی حفاظت کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً۔۔۔۔۔ (۹-۱۰) کسی مسلمان کے بارے میں نہ تو قرابت کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں اور نہ ہی عہد و پیمان کا۔

اسی سے نگران کو رَقِیْبٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ اس شخص کی گردن پر نظر رکھتا ہے جس کی نگرانی منظور ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ نگرانی کے لئے بار بار اپنی گردن اٹھا کر دیکھتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَارْتَقِبُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ (۱۱-۹۳) تم بھی منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (۵۰-۱۸) مگر ایک چوکیدار (اس کے لکھنے کو) تیار رہتا ہے۔

اَلْمَرْقَبُ۔ بلند جگہ جہاں رقیب (نگران) بیٹھ کر چوکسی کرتا ہے اور قمار بازوں کے محافظ کو بھی رَقِیْبٌ کہا جاتا ہے۔ جو قمار بازی کے بعد شراب نوشی کرتے ہیں۔ اسی طرح قمار بازی کے تیسرے درجہ کے تیر کو بھی رقیب کہتے ہیں۔

تَرَقُّبٌ (تفعل) کے معنی ہیں انتظار کرتے ہوئے کسی چیز سے بچنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ (۲۸-۲۱) چنانچہ موسیٰ علیہ السلام شہر سے نکل بھاگے اور دوڑتے جاتے تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

لہ راجع لمثل المعاجم ۔

رَقُوْبٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو کثرت اولاد کی وجہ سے اپنے بچوں کی موت کی منتظر ہو نیز وہ اونٹنی جو پانی پینے کے لئے باری کے انتظار میں ہو اسے بھی رَقُوْبٌ کہا جاتا ہے اَرْقَبَ (افعال) کے معنی رُقْبیٰ کرنے کے ہیں یعنی کسی کو اس کی زندگی بھر کے لئے مکان وغیرہ ہبہ کر دینا اور اس کی موت کے بعد اس عطا کو واپس لے لینا۔ اور اسے رُقْبیٰ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہبہ کے بعد گویا وہ اس کی موت کا انتظار کرتا ہے۔ اور ایسے ہبہ کو عُمریٰ بھی کہا جاتا ہے[1]۔

(ر ق د)

اَلرُّقَادُ خوشگوار اور ہلکی سی نیند کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے رَقَدَ (ن) رُقُوْدًا فَھُوَ رَاقِدٌ اور رَاقِدٌ کی جمع رُقُوْدٌ آتی ہے جیسے فرمایا:۔ وَھُمْ رُقُوْدٌ (۱۸-۱۸) حالانکہ وہ (اصحاب کہف) سوئے ہوئے ہیں۔

اصحاب کہف کی گہری اور لمبی نیند کے باوجود ان پر رقود کا لفظ بول کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نیند خواہ کتنی ہی گہری اور لمبی کیوں نہ ہو موت کے مقابلہ میں وہ نوم خفیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اصحاب کہف مر چکے ہیں قرآن نے وَھُمْ رُقُوْدٌ کہہ کر ان سے موت کی نفی کی ہے۔

اور مَرْقَدٌ (ظرف) خواب گاہ کو کہتے ہیں، چنانچہ قرآن میں ہے:۔

یٰوَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا۔ (۳۶-۵۱) ہم پر افسوس ہے کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے جگا اٹھایا۔

اور اَرْقَدَ الظَّلِیْمُ کے معنی شتر مرغ کے تیز دوڑنے کے ہیں گویا اس نے تیز روی سے اپنی نیند کو دور کر دیا۔

(ر ق م)

اَلرَّقْمُ کے معنی گاڑھے خط کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ رَقْمٌ کے معنی کتاب پر اعراب اور نقطے لگانے کے ہیں اور آیت:۔

کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳-۹) وہ ایک کتاب ہے (وقتاً فوقتاً) اس کی خانہ پری ہوتی رہتی ہے۔ میں مَرْقُوْم کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں یعنی گاڑھے اور جلی خط میں لکھی ہوئی یا نقطے لگائی ہوئی۔

اور جو شخص کسی کام کا ماہر اور حاذق ہو اس کے متعلق ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ یَرْقُمُ فِی الْمَآءِ یعنی وہ ماہر ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ اَصْحٰبَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ (۱۸-۹) کہ غار اور لوح والے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ رقیم ایک مقام کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس پتھر کی طرف نسبت ہے جس میں ان کے نام کندہ تھے اور گدھے کے دونوں بازوؤں پر جو نشان ہوتے ہیں انہیں رَقْمَتَا الْحِمَارِ کہا جاتا ہے اور اَرْضٌ مَرْقُوْمَۃٌ تھوڑی گھاس والی زمین کو کہتے ہیں گویا وہ کتابت کے نشانات کی طرح ہے۔

اَلرُّقَمِیَّات تیروں کو کہتے ہیں جو مدینہ کے ایک مقام کی طرف منسوب ہیں۔

(ر ق ی)

رَقِیَ (س) رُقِیًّا۔ فِی السُّلَّمِ کے معنی سیڑھی

[1] لکن اصحاب غریب الحدیث فرقوا بین العمری والرقبی ۱۲

پر چڑھنے کے ہیں اور ارتقی (انتعال) بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ (۳۸-۱۰) تو ان کو چاہیے کہ سیڑھیاں لگا کر آسمان پر چڑھیں۔

مثل مشہور ہے[1]:۔ اِرْقَ عَلٰى ظَلْعِكَ یعنی اپنی طاقت کے مطابق چلو اور طاقت سے زیادہ اپنے آپ پر بوجھ نہ ڈالو۔

اور رُقْيَةٌ بمعنی رقیہ یعنی افسوں کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔

كَيْفَ رُقْيَتُكَ اَوْ رُقْيَتُكَ کہ تمہارا افسوں کیسا ہے۔

اس میں رُقِيٌّ مصدر ہے اور رُقْيَةٌ اسم اور آیت کریمہ:۔

وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ (۱۷-۹۳) یعنی ہم تیرے افسوں پر یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

میں رُقِيٌّ بمعنی رُقْيَةٌ کے ہے۔ اور آیت:۔

وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ (۷۵-۲۷) اور کون افسوں کرے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس وقت جھاڑ پھونک سے کوئی اس کی جان نہیں بچا سکے گا۔ چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۱۹۰) وَاِذَا الْمَنِيَّةُ اَنْشَبَتْ اَظْفَارَهَا
اَلْفَيْتَ كُلَّ تَمِيْمَةٍ لَا تَنْفَعُ

کہ جب موت اپنا پنجہ گاڑ دیتی ہے۔ تو کوئی افسوں کارگر نہیں ہوتا۔

ابن عباس نے مَنْ رَاقٍ کے معنی کئے ہیں کہ کونسے فرشتے اس کی روح لے کر اوپر جائیں یعنی ملائکہ رحمت یا ملائکہ عذاب۔

اَلتَّرْقُوَةُ ہنسلی کی ہڈی کو کہتے ہیں اس لحاظ سے کہ سانس پھول کر وہیں تک پڑھتی ہے اس کی جمع تَرَاقِيْ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (۷۵-۲۶) سنو جی! جب جان بدن سے نکل کر گلے تک پہنچ جائیگی۔

(ر ک ب)

اَلرُّكُوْبُ کے اصل معنی حیوان کی پیٹھ پر سوار ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً (۱۶-۸) تا کہ ان سے سواری کا کام لو اور (سواری کے علاوہ یہ چیزیں) موجب زینت (بھی) ہیں۔

مگر کبھی کشتی وغیرہ پر سوار ہونے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ (۲۹-۶۵) پھر جب لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔

مگر عرف میں رَاكِبٌ کا لفظ شتر سوار کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ اس کی جمع رَكْبٌ وَرُكْبَانٌ اور رُكُوْبٌ تینوں آتی ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (۸-۴۲) اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف کو (ہٹا ہوا) تھا۔

فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا (۲-۲۳۹) تو پیادہ یا سوار (ہو کر)

اور "رِكَابٌ" خاص کر مرکوب یعنی سواری پر بولا جاتا ہے۔ اَرْكَبَ الْمُهْرُ بچھیرا سواری کے قابل ہو گیا۔

---

[1] المثل فی جل المعاجم [2] قالہ ابو ذؤیب الہذلی یرثی بنیہ والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲: ۲۲۰) جمہرۃ (۱۴۳) فی ۶۲ بیتًا مذکورہ بعضہا فی اللسان (نسب) والخزانۃ (۱: ۲۰۲) والسیوطی ۹۲، ۳/۴۹۳ و دیوان الہذلیین (۱: ۳) والعقد (۲: ۱۵) والصناعۃ ۲۵۰ والاسد (۵: ۱۹۰) والسمط ۴۹۴، ۸۸۸ والحماسۃ للبحتری ۹۹ والکامل ۵۱۸ وشواہد الکشاف ونقد الشعر ۶ ومحاضرات المؤلف (۴: ۸۹۴) وخاص الخاص ۱۸۲ والفاضل للمبرد ۱۵ وفی تاریخ الطبری ان معاویۃ تمثل بہ عند موتہ ۱۲

رَکُوبٌ۔ خاص کر اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے کے گھوڑے پر سوار ہو یا جو شخص سواری نہ کرسکے یا سوار ہونا نہ جانتا ہو۔

اَلْمُتَرَاکِبُ وہ چیز جو تہ برتہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔

فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا (۶-۱۰۰) پھر ہم سبز کونپلیں نکالتے ہیں کہ ان سے گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔

رُکْبَةٌ کے معنی زانو کے ہیں اور رَکَبْتُهٗ کے معنی ہیں "میں نے اس کے زانو پر مارا" جیسے فَأَدْتُهٗ (میں نے اس کے دل پر مارا) وَأَمْتَنْتُهٗ (میں نے اس کے سر پر مارا) اور نیز رَکَبْتُهٗ کے معنی گھٹنے سے مارنا بھی آتے ہیں۔ جیسے یَدَیْتُهٗ (میں نے اسے ہاتھ سے مارا) عِنْتُهٗ (میں نے اسے نظر لگادی) وغیرہ۔

پھر کنایۃ کے طور پر عورت کے ستر کو بھی رَکَبٌ کہہ دیتے ہیں[1] جیسا کہ مجازاً عورت کو مطیۃ (سواری) یا قَعِیْدَۃ (بمعنی مُقْعَدَۃ) کہا جاتا ہے۔

(ر ک د)

رَکَدَ (ن) رُکُوْدًا کے معنی پانی یا ہوا وغیرہ کے ٹھہر جانے کے ہیں۔ اسی طرح کشتی کے ٹھہر جانے پر بھی رُکُوْد کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ (۴۲-۳۲-۳۳) اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے دریا میں جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح (اونچے اونچے) دکھائی دیتے ہیں اگر خدا چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔

جَفْنَةٌ رَکُوْدٌ لبالب بھرا ہوا پیالہ۔

(ر ک ز)

اَلرِّکْزُ دھیمی آواز (یا آہٹ) کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا (۱۹-۹۸) اب تم ان میں سے کسی کو (بھی) دیکھتے ہو یا ان کی بھنک بھی سنتے ہو۔

اور رَکَزْتُ کَذَا۔ کے معنی ہیں میں نے اسے مخفی طور پر دفن کردیا اسی سے اَلرِّکَازُ ہے جس کے معنی دفینہ ہیں۔ خواہ اسے کسی انسان نے دفن کیا ہو جیسے خزانہ وغیرہ یا قدرتی طور پر زمین کے اندر پایا جائے جیسے معدنیات اور اَلرِّکَاز کا لفظ ان دونوں کو شامل ہے۔ اور حدیث[2] (۱۵۹) وَفِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ (رکاز میں خمس ہے) میں رکاز کے دونوں معنی بیان کئے گئے ہیں۔ عام محاورہ ہے: رَکَزَ رُمْحَهٗ اس نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور فوج کی فرودگاہ کو مَرْکَزٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جہاں ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ وہاں زمین میں اپنے نیزے (جھنڈے) گاڑ دیتے ہیں۔

(ر ک س)

اَلرَّکْسُ کے معنی کسی چیز کو اس کے سر کے بل الٹا

---

[1] وفی الصحاح: الرکب (بالتحریک) منبت العانة وقال الخلیل یختص بالمرأة وقیل یعم … الاول عند اہل الحجاز والثانی عند اہل العراق والقولان تحتملها اللغة (النہایة)۔
[2] الحدیث رواہ الجماعة عن ابی ہریرة ولہ الفاظ وطرق راجع النیل ۴/۱۵۷ و مالک فی مؤطاہ عن الزہری والشافعی فی الام ۲/۳۷ والرسالة رقم ۲۳۳ بتحقیق احمد شاکر و مسند احمد ۱۳/۳۵ رقم ۷۴۶۱ وایضاً عن ابن عباس (رطب) عن ثعلبة طس عن جابر وابن مسعود۔

کردینا یا اس کے اول حصے کو موڑ کر پچھلے حصے کے ساتھ ملا دینا کے ہیں محاورہ ہے:۔
اَرْکَسْتُہٗ میں نے اسے الٹا کر دیا اور رُکِسَ اس کا مطاوع آتا ہے۔ اور اِرْتَکَسَ فِیْ اَمْرِہٖ کے معنی کسی معاملہ میں الجھ جانے کے ہیں (یعنی کسی مصیبت سے رہائی کے بعد دوبارہ اس میں پھنس جانا) قرآن میں ہے:۔
وَاللّٰہُ اَرْکَسَھُمْ بِمَا کَسَبُوْا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر کفر میں پلٹا دیا ہے (۴-۸۸)

(ر ک ض)

اَلرَّکْضُ اس کے اصل معنی ٹانگ کو حرکت دینے کے ہیں اگر سوار کے متعلق بولا جائے جیسے:۔ رَکَضْتُ الْفَرَسَ تو اس کے معنی گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لئے ایڑھ لگانا کے ہوتے ہیں اور پیادہ آدمی کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی پاؤں کے ساتھ زمین کو روندنا کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا:۔ اُرْکُضْ بِرِجْلِكَ (۳۸-۴۲) یعنی اپنی ٹانگ زمین پر مارو۔ اور آیت کریمہ:۔
لَا تَرْکُضُوْا وَارْجِعُوْا اِلٰی مَا اُتْرِفْتُمْ فِیْہِ۔ (۲۱-۱۳) مت بھاگو اور ساز و سامان (دنیا) کی طرف لوٹ جاؤ جس میں تم چین کرتے تھے۔
(میں انہیں شکست خوردہ ہو کر بھاگنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ نہی تہدید اور تعجیز کے لئے ہے)

(ر ک ع)

اَلرُّکُوْعُ اس کے اصل معنی انحناء یعنی جھک جانے کے ہیں اور نماز میں خاص شکل میں جھکنے پر بولا جاتا ہے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے معنی میں آتا ہے خواہ بطور عبادت ہو یا بطور عبادت نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔
یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا (۲۲-۷۷) مسلمانو! (خدا کے حضور) سجدے اور رکوع کرو۔
وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (۲-۴۳) جو (ہمارے حضور بوقت نماز) جھکتے ہیں تم بھی انکے ساتھ جھکا کرو۔
وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ (۲-۱۲۵) اعتکاف کرنے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں (کے لئے)
اَلرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ (۹-۱۱۲) رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے۔
شاعر نے کہا ہے [1] (الطویل)

(۱۹۱) اُخَبِّرُ اَخْبَارَ الْقُرُوْنِ الَّتِیْ مَضَتْ
اَدِبُّ کَاَنِّیْ کُلَّمَا قُمْتُ رَاکِعُ

میں گزشتہ لوگوں کی خبر دیتا ہوں (میں سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے) رینگ کر چلتا ہوں اور خمیدہ پشت کھڑا ہوتا ہوں۔

(ر ک م)

رَکَمٌ (ن) کے معنی ہیں کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا قرآن میں ہے:۔ سَحَابٌ مَّرْکُوْمٌ۔ (۵۲-۴۴) تہ بہ تہ بادل۔
اَلرُّکَامُ اوپر تلے رکھی ہوئی چیزیں جیسے فرمایا:۔
ثُمَّ یَجْعَلُہٗ رُکَامًا (۲۴-۴۳) پھر اسے تو بر تو کر دیتا ہے۔

---

[1] قال لبید فی قصیدۃ فی الحکم راجع (۱: ۳۶) والمعمرین ۶۱ والشعراء ۱۵۲ والاغانی (۱۴: ۹۴، ۱۴۳) مجاز القرآن (۱: ۴۵) واضداد ابی الطیب ۵۸۹ والمعانی للقتبی ۱۲۱۲ واللسان والتاج (رکع) ومجموعۃ المعانی ۲۳ الی ثلاثۃ ابیات والبحر (۱: ۱۷۳) والعقد (۲: ۷۸)

اسی سے ریت کے ٹیلے اور لشکر کو بھی رُکام کہا جاتا ہے اور مُرْتَکَمُ الطَّرِیْقِ شاہراہ کو کہتے ہیں۔ جس میں آمد و رفت کے نشانات بکثرت ہوں۔

(ر ک ن)

رُکْنٌ۔ کسی چیز کی وہ جانب جس کے سہارے پر وہ قائم ہوتی ہے استعارہ کے طور پر زور اور قوت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔
لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (۱۱-۸۰) اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔
اور رَکَنْتُ اِلٰی فُلَانٍ اَرْکُنُ کے معنی کسی کی طرف مائل ہونے کے ہیں یہ فتح کاف کے ساتھ ہے مگر صحیح رَکَنَ یَرْکُنُ (ن) یا رَکِنَ یَرْکَنُ (س) ہے۔
قرآن میں ہے:۔
وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (۱۱-۱۱۳) اور جن لوگوں نے ہماری نافرمانی کی انکی طرف نہ جھکنا۔
نَاقَۃٌ مُرْکَنَۃُ الضَّرْعِ بڑے تھنوں والی اونٹنی۔
لَہٗ اَرْکَانٌ تُعَظِّمُہٗ (اس کی قوم اسے عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔
اَلْمِرْکَنُ۔ لگن۔ ٹب اور اَرْکَانُ الْعِبَادَاتِ سے عبادات کے وہ جوانب مراد ہوتے ہیں جو ان کا مبنیٰ بنتے ہیں اور ان کے ترک سے وہ باطل ہو جاتی ہیں۔

(ر م م)

اَلرَّمُّ (ن) کے معنی پوشیدہ چیز کی اصلاح اور مرمت کرنے کے ہیں اور رِمَّۃٌ خاص کر بوسیدہ ہڈی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ (۳۶-۷۸) ہڈیاں جب بوسیدہ ہو جائیں گی تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے۔
مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْہِ اِلَّا جَعَلَتْہُ کَالرَّمِیْمِ (۵۱-۴۲) جس چیز پر سے ہو کر وہ گزرتی ہے اسے پرانی ہڈی کی طرح (چورہ) کئے بغیر نہ چھوڑتی۔
اَلرُّمَّۃُ خاص طور پر بوسیدہ رسی کو کہا جاتا ہے اور اَلرِّمُّ لکڑی، بھوسہ وغیرہ کے چورہ کو کہتے ہیں۔
رَمَمْتُ الْمَنْزِلَ عمارت کی مرمت کرنا جیسے تَفَقَّدْتُ (کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا) مشہور محاورہ ہے[1] (مثل)
اِدْفَعْہُ اِلَیْہِ بِرُمَّتِہٖ اسے کلیۃً اس کے سپرد کر دیجئے۔
اَلْاِرْمَامُ اس کے معنی خاموش ہونے کے ہیں اور اَرَمَّتْ عِظَامُہٗ کے معنی ہیں ہڈیوں کا اس قدر بوسیدہ ہو کر باریک ہو جانا کہ پھونکنے سے اڑ جائیں اور آواز نہ آئے تَرَمْرَمَ الْقَوْمُ کے معنی مہمل بڑبڑانے یا گفتگو کے لئے ہونٹ ہلا کر رہ جانے کے ہیں۔
اَلرُّمَّانُ (فُعْلَانٌ) انار کو کہتے ہیں۔

(ر م ح)

اَلرُّمْحُ اسکے معنی نیزہ کے ہیں اس کی جمع رِمَاحٌ آتی ہے، چنانچہ قرآن میں ہے:۔
تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ (۵-۹۴) جہاں تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچ سکیں۔
اور رَمَحَہٗ کے معنی کسی کو نیزہ سے مارنے کے ہیں اور رَمَحَتْہُ الدَّابَّۃُ کے معنی جانور کے دولتی جھاڑنے کے ہیں۔ اَلسِّمَاکُ الرَّامِحُ ایک ستارے کا نام ہے کیونکہ اس کے پیش پیش ایک دم دار ستارہ ہوتا ہے جو دیکھنے میں نیزے جیسا معلوم ہوتا ہے جیسا مشہور ہے[1]

---

[1] انظر للکلمۃ ادب الکاتب لابن قتیبہ ۲۷۹ والمیدانی ۱/۳۳ وغیرہ وفی المستقصی المیدانی (۱: ۴۲) ✿ ✿ ✿ ✿

اَخَذَتِ الْاِبِلُ رِمَاحَهَا اونٹوں نے اپنے نیزے سنبھال لئے۔ یعنی تیز دار یا موٹا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ذبح سے بچالیا۔
اَخَذَتِ الْبُهْمٰى رُمْحَهَا بہمٰی۔ گھاس خار دار ہوگئی کیونکہ وہ بھی خار دار ہونے کی وجہ سے چرواہوں سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

(ر م د)

رَمَادٌ وَرِمْدَادٌ وَاَرْمَدٌ وَاَرْمِدَاءُ (خاکستر) راکھ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
كَرَمَادِنِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ (۱۴-۱۸) گویا راکھ کا ڈھیر ہے جسے آندھی کے دن ہوا اڑا کر لے جائے۔
رَمَدَتِ النَّارُ کے معنی آگ کے بجھ کر راکھ بن جانے کے ہیں پھر استعارہ کے طور پر ہلاکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ھُمُودٌ کا لفظ مجازاً بمعنی ہلاکت آجاتا ہے۔ اور رَمِدَ الْمَاءُ کے معنی پانی کے گدلا ہو جانے کے ہیں۔ گویا اس میں راکھ ڈال دی گئی ہے اور اَرْمَدُ رَمَدٌ خاکستری رنگ کی چیز کو کہتے ہیں اور مچھر کو رُمْدٌ کہا جاتا ہے (جو اَرْمَدُ کی جمع ہے) اور رَمَادَةٌ کے معنی قحط سالی کے ہیں۔

(ر م ز)

اَلرَّمْزُ (ن) ہونٹ کے ساتھ اشارہ کرنے یا ہلکی سی آواز کے ہیں۔ اور ابرو کے ساتھ اشارہ کرنے کو غمز کہا جاتا ہے۔ پھر استعمال میں ہر وہ کلام جو اشارہ کی طرح ہو رَمْزٌ کہلاتی ہے جیسا کہ شکایت کو غَمْزٌ کہہ دیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (۳-۴۰) نشانی (یہ) ہے کہ تم تین روز تک لوگوں سے بات نہ کرو۔ مگر اشارہ سے۔
اور مَا اَرْمَزَ کے معنی ہیں اس نے اشارہ سے بھی بات نہ کی اور كَتِيبَةٌ رَمَّازَةٌ بڑے لشکر کو کہتے ہیں۔ کیونکہ بوجہ کثرت ازدحام کے اس میں آواز سنائی نہیں دیتی اور صرف اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔

(ر م ض)

شَهْرُ رَمَضَانَ (۲-۱۸۵) روزوں کا مہینہ
یہ رَمَضٌ سے مشتق ہے جسکے معنی سورج کی سخت تپش کے ہیں اَرْمَضَتْهُ سخت تپش نے اسے جھلس دیا۔ فَرَمِضَ چنانچہ وہ جھلسا گیا۔
اَرْضٌ رَمِضَةٌ سخت گرم سرزمین۔ رَمِضَتِ الْغَنَمُ سخت گرمی میں باہر چرنے کی وجہ سے بکریوں کے جگر زخمی ہو گئے۔
فُلَانٌ يَتَرَمَّضُ الظِّبَاءَ فلاں سخت گرم جگہ میں ہرن شکار کرتا ہے۔

(ر م ی)

اَلرَّمْيُ (ض) کے معنی پھینکنے کے ہیں یہ اجسام (مادی چیزیں) جیسے تیر وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸-۱۷) اے پیغمبر جب تو نے تیر چلائے تو تم نے تیر نہیں چلائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تیر چلائے۔
اور اقوال کے متعلق استعمال ہو تو "قذف" کی طرح اس کے معنی سب وشتم اور تہمت طرازی کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ (۲۴-۶) جو لوگ اپنی بیبیوں پر (زنا کا) عیب لگائیں۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (۲۴-۴) جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں۔
محاورہ ہے۔ اَرْمٰی فُلَانٌ عَلٰی مِاْئَۃٍ وہ سو سے زائد ہیں۔ خَرَجَ یَتَرَمّٰی وہ نکل کر نشانہ بازی کرنے لگا۔

(ر ھ ب)

اَلرَّھْبُ وَالرَّھْبَۃُ ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو۔ قرآن میں ہے:۔
لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَھْبَۃً۔ (۵۹-۱۳) تمہاری ہیبت تو ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے (بڑھکر ہے)
جَنَاحَكَ مِنَ الرَّھْبِ (۲۸-۳۲) (اور دفع) خوف کے لئے اپنے بازو سکیڑ لو)۔
اس میں ایک قرأت رُھْب بضمہ الراء بھی ہے۔ جس کے معنی فَزَعٌ یعنی گھبراہٹ کے ہیں۔
مقاتل کہتے ہیں کہ میں رَھْبٌ کی تفسیر معلوم کرنے کی غرض سے نکلا۔ دریں اثنا کہ میں کھانا کھا رہا تھا ایک اعرابی عورت آئی۔ اور اس نے کہا "اے اللہ کے بندے مجھے کچھ خیرات دیجئے۔ جب میں لپ بھر کر اسے دینے لگا تو کہنے لگی ھٰھُنَا فِیْ رَھْبِیْ یعنی یہاں میری آستین میں ڈال دیجئے (تو میں سمجھ گیا کہ آیت میں بھی رھب بمعنی آستین ہے) لیکن پہلے معنی یعنی گھبراہٹ کے زیادہ صحیح ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
رَغَبًا وَّ رَھَبًا (۲۱-۹۰) (ہمارے فضل کی توقع اور (ہمارے عذاب کے) خوف سے (ہمیں پکارتے رہتے ہیں)۔
تُرْھِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ (۸-۶۰) اس سے تم اللہ کے دشمنوں پر (اور اپنے دشمنوں پر) دھاک بٹھائے رکھو گے۔
اور آیت:۔
وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ (۷-۱۱۶) اور ان کو دہشت میں ڈال دیا۔ میں اِسْتِرْھَاب کے معنی دہشت زدہ کرنے کے ہیں۔
وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنَ (۲-۴۰) اور مجھ سے ہی ڈرو۔
اور تَرَھُّبٌ (تفعل) کے معنی تعبد یعنی راہب بننے اور عبادت میں خوف سے کام لینے کے ہیں اور فرط خوف سے عبادت گذاری میں غلو کرنے کو رَھْبَانِیَّۃٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَرَھْبَانِیَّۃَنِ ابْتَدَعُوْھَا (۵۷-۲۷) اور رہبانیت (لذت دنیا کا چھوڑ بیٹھنا) جو انہوں نے از خود ایجاد کی تھی۔
اور رُھْبَان (صومعہ نشیں لوگ) واحد بھی ہوسکتا ہے اور جمع بھی، جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کی جمع رَھَابِیْنُ آتی ہے لیکن اس کی جمع رَھَابِنَۃٌ بنانا زیادہ مناسب ہے۔
اَلْاِرْھَابُ (افعال) کے اصل معنی اونٹوں کو خوف زدہ کرنے کے ہیں۔ یہ اَرْھَبْتُ (افعال) کا مصدر ہے۔ اور اسی سے "رَھْبٌ" ہے جس کے معنی لاغر اونٹنی (یا شتر نرقوی و کلاں جثہ) کے ہیں۔ مشہور محاورہ ہے[۱]:۔
رَھَبُوْتٌ خَیْرٌ مِنْ رَحَمُوْتٍ کہ رحم سے خوف بہتر ہے۔

(ر ھ ط)

اَلرَّھْطُ دس آدمیوں سے کم جماعت کو رھط کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق چالیس آدمیوں تک کی جماعت پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

۱؎ ای لان یفرق منک خیر من ان تحب راجع المیدانی ۲/۲۷۰ رقم ۲۷۵۸ واللسان (رہب) وغریب القرآن للقتبی ۱۹ وفی الکامل ۷، ا رہبوتی خیر لک من رحموتی۔

تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُوْنَ (۲۷-۴۸) نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے۔
وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ (۱۱-۹۱) اگر تیری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔
يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ (۱۱-۹۲) میری قوم! کیا میری برادری کے لوگ تمہیں (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ عزیز ہیں۔
اَلتُّرْهَطَاءُ جنگلی چوہے کا بل۔ اور اس کو رُهَطَةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ اور شاعر کے شعر[1]۔ (المتقارب)
(۱۹۲) اَجْعَلُكَ رَهْطًا عَلٰى حُيَّضٍ
(میں تجھے حیض والی عورتوں کا لتہ بنا دوں گا یعنی نہایت ذلیل کر دوں گا)
میں بعض نے رَهْط کے معنی اس چمڑے کے لیے ہیں۔ جو حائض عورتیں ایام ماہواری میں پہنا کرتی تھیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں رهط سے مراد وہ چیتھڑا ہے۔ جو حائض عورت جائے مخصوص میں رکھتی ہے۔ اور اسی سے مشہور محاورہ ہے۔ هُوَ اَذَلُّ مِنَ الرَّهْطِ۔ وہ حیض کے چیتھڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔

(ر ه ق)

رَهِقَهٗ (س) رَهَقًا۔ اَلْاَمْرُ کسی معاملہ نے اسے بزور وجبر دبا لیا۔ اور رَهِقَهٗ وَاَرْهَقَهٗ (مجرد و مزید فیہ) دونوں کے ایک ہی معنی ہیں جیسے رَدِفَهٗ وَاَرْدَفَهٗ وَبَعَثَهٗ وَابْتَعَثَهٗ۔ قرآن میں ہے:
وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (۱۰-۲۷) اور ان پر ذلت چھا رہی ہوگی۔
سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (۷۴-۱۷) ہم عنقریب اس کو عذاب سخت میں مبتلا کر دیں گے۔
اور اسی سے اَرْهَقْتُ الصَّلٰوةَ ہے جس کے معنی نماز کو آخر وقت تک موخر کرنے کے ہیں حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت آ جائے۔

(ر ه ن)

اَلرَّهْنُ (گروی رکھی ہوئی چیز) اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جو قرض میں بطور ضمانت رکھی جائے۔ اور یہی معنی رِهَانٌ کے ہیں۔ لیکن رہان خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ میں شرط کے طور پر رکھی جائے اصل میں یہ دونوں لفظ مصدر ہیں جیسے: رَهَنْتُ الرَّهْنَ وَرَاهَنْتُهٗ رِهَانًا اور رَهِيْنٌ وَمَرْهُوْنٌ صیغہ صفت ہیں اور رَهْنٌ کی جمع رِهَانٌ، رُهُنٌ اور رُهُوْنٌ آتی ہے اور آیت۔ فَرِهَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ (۲-۲۸۳) تو کچھ رہن قبضہ میں رکھ لو۔
میں ایک قراءت رُهُنٌ بھی ہے۔ اور آیت كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ۔ (۷۴-۳۸) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ رَهِيْنَةٌ فعیل بمعنی فاعل سے ہے اور اس کے معنی ثابت اور قائم رہنے والی کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فعیل بمعنی مفعول

---

[1] قالہ ابو المثلم الہذلی وصدرہ: متی ما تشا غیر زہو الملوک ...... والبیت فی اللسان (رہط، زہو) والمقاییس (۲: ۵۱۴/۳: ۲۹) بغیر عزو والمعانی الکبیر (۱: ۴۸۴/۹۳۵) والمشکل للقتبی ۱۹۸ وفی اربعۃ وتہذیب الالفاظ ۲۷۶ (باب الشباب) ودیوان الہذلیین (۲: ۲۲۳-۲۲۴) والمشا..ن بنی خزاعۃ بن سعد بن ہذیل وترجمتہ فی المؤتلف ۲۷۷ - ۲۸۳ قال القتبی فی المعانی الرہط جلد یشق اسفلہ ویترک اعلاہ فیلبسہ الصبیان فقد وکانوا فی الجاہلیۃ یطوفون عراۃ والنساء فی الرہط وہو شقق قدرما بین الرکبۃ الی السرۃ

سے ہے اور اس کے معنی ہیں کہ ہر شخص اپنے گزشتہ اعمال کی پاداش میں رکا رہے گا۔

پھر رَھْن میں چونکہ حبس (روکنے) کے معنی پائے جاتے ہیں اس لئے کبھی مجازاً رھن بمعنی حبس یعنی مطلق کسی چیز کو روکنے کے آجاتا ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے اور رَهَنْتُ فُلَانًا وَرَهَنْتُ عِنْدَهٗ کے معنی کسی کے پاس گروی رکھنے کے ہیں اور اِرْتَهَنْتُ (افتعال) کے معنی گروی لینے کے۔

اور اَرْهَنْتُ (افعال) فِي السِّلْعَةِ کے معنی بعض نے سامان تجارت کو گراں فروخت کرنا کئے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی بیعانہ کے طور پر کچھ سامان دے دینے کے ہیں۔ جو قیمت ادا کرنے تک بطور ضمانت بائع کے پاس رہتا ہے۔

(ر ھ و)

اَلرَّهْوُ ساکن چنانچہ آیت کریمہ: وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۴۴-۲۴) اور دریا کو ساکن چھوڑ دے۔ میں رَهْو کے معنی ساکن کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے راستہ کی کشادگی مراد ہے اور یہی معنی صحیح ہیں[1]۔ اور اسی سے رَهَاءٌ ہے جس کے معنی ہموار جنگل کے ہیں اور ہر وہ ہموار قطعہ زمین جہاں پانی جمع ہوتا ہو اسے رَهْو کہا جاتا ہے اسی سے ایک حدیث ہے[2] (۱۶۰) لَا شُفْعَةَ فِي رَهْوٍ ... کہ پانی کی گذرگاہ کے مشترک ہونے سے حق شفع ثابت نہیں ہوتا۔

ایک اعرابی نے ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوئے اونٹ دیکھ کر کہا:۔

رَهْوٌ بَيْنَ سَنَامَيْنِ۔ کہ یہ دونوں بلندیوں کے درمیان رَهْوٌ یعنی کشادگی ہے۔

(ر و ح)

اَلرَّوْحُ وَالرُّوْحُ۔ دراصل ایک ہی ہیں رُوح کا اطلاق سانس پر ہوتا ہے شاعر نے آگ کے متعلق کہا ہے[3] (طویل)

(۱۹۵) فَقُلْتُ لَهُ ارْفَعْهَا اِلَيْكَ وَاَحْيِهَا
بِرُوحِكَ وَاجْعَلْهُ لَهَا قِيتَةً قَدْرًا

تو میں نے کہا کہ اسے اٹھاؤ اور قدر سے نرم پھونک مار کر اسے سلگاؤ اور اس میں تھوڑا سا ایندھن ڈال دو۔ اور سانس بھی چونکہ روح کا ایک جزء ہے... اس لئے مجازاً اسے روح کہہ دیا ہے جیسا کہ نوع کو اسم جنس سے تعبیر کر دیتے ہیں مثلاً تَسْمِيَةُ الْاِنْسَانِ بِالْحَيَوَانِ اور کبھی روح کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ زندگی حرکت، منافع کا حصول اور مضرت سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (۱۷-۸۵) اور تجھ سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ میرے پروردگار کا ایک حکم ہے۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۱۵-۲۹) اور میں نے

---

[1] قال الطبری (۲۵: ۱۲۱-۱۲۲) واولی الاقوال فی ذالک بالصواب ای الساکن۔ [2] الحدیث فی الفائق ۳ / ۲۲۱ وغریب ابی عبید ۳ / ۱۲۱ وفی الصحاح (رہو) والتاج واللسان (رہو)۔ [3] قالہ ذوالرمۃ (فی لسان العرب وحایہا واقتت لہا قیتۃ قدرًا بمل واجعل لہا الخ یقال واقتت نارک قیتۃ ای اطعمہا والبیت من شواہد الطبری (۱۷-۶-۳) واللسان (قتت، نفخ، حی) ودیوانہ ۱۴۲ من قصیدۃ لہ وا المشکل للقتیبی ۱۰۷ فی ثلاثۃ ابیات والبحر (۳: ۱۰۴)

اس میں اپنی طرف سے، روح پھونک دی۔

یہں روح کے یہی معنی مراد ہیں اور اللہ تعالٰے کا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا اضافت ملک کے طور پر ہے جس سے اس کی شرافت کا اظہار مقصود ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالٰی نے آیت کریمہ:۔

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (۲-۲۶۲) میں بیت کی اضافت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ۔

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا (۳۹-۵۳) اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی۔

یں عباد کی نسبت بھی یا متکلم (ذات باری تعالٰی) کی طرف اضافت تشریفی ہے۔

اور قرآن نے ذو شرف ملائکہ کو بھی ارواح سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا (۷۸-۳۸) جس روز کہ روح (فرشتے) اور دیگر ملائکہ صفیں باندھ کھڑے ہوں گے۔

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ (۷۰-۴) فرشتے اور جبریل اس کی طرف چڑھتے ہیں۔

اور آیت:۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (۲۶-۱۹۳) اسے روح امین لے کر اترا۔

یں روح امین سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔

اور دوسری آیت میں جبریل علیہ السلام کو روح القدس بھی کہا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ (۲-۲۷) اس قرآن کو روح القدس لے کر آتے ہیں۔

قرآن نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو روح کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَرُوحٌ مِّنْهُ (۴-۱۷۱) اور وہ ایک روح تھی

جو خدا کی طرف سے آئی۔

اور عیسٰی کو روح اس لئے کہا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

اور قرآن کو بھی روح کہا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (۴۲-۵۲) اس طرح ہم نے اپنے حکم سے (دین کی) جان (یعنی یہ کتاب) تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجی۔ اس لئے قرآن سے حیات اخروی حاصل ہوتی ہے جس کے متعلق فرمایا:۔

فَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹-۶۴) اور دار آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

اور رَوْح (بفتح الراء) کے معنی سانس کے ہیں اور أَرَاحَ الْإِنْسَانُ کے معنی تنفس یعنی سانس لینے کے اور آیت:۔

فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ (۵۶-۸۹) تو راحت اور رزق ہے۔

یں ریحان سے خوشبودار چیزیں مراد ہیں اور بعض نے رزق مراد لیا ہے۔ اور کھانے کے اناج کو بھی ریحان کہا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (۵۵-۱۲) اور ہر طرح کے اناج جو بھوسی کے خول کے اندر ہوتے ہیں اور کھانے کا اناج۔

ایک اعرابی سے پوچھا گیا کہ کہاں جا رہے ہو۔ تو اس نے جواب دیا "أَطْلُبُ مِنْ رَيْحَانِ اللهِ" کہ میں اللہ کے رزق کی تلاش میں ہوں لیکن اصل معنی وہی ہیں۔ جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں (یعنی خوشبودار چیز) ایک حدیث میں ہے۔[1] (۱۶۲) اَلْوَلَدُ مِنْ رَيْحَانِ اللهِ کہ اولاد بھی اللہ کے ریحان سے ہے اور یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔[2]

---

[1] کلمۃ من حدیث طویل راجع الفائق ۱/۸۶ (جبن) الحکم لمن ریحان اللہ و فی (الحکیم عن خولۃ بنت حکیم الولد من ریحان الجنۃ و فی العیون (۴-۹۴) والعقد ۲/۸/۳۴) الولد من ریحان اللہ (راجع العراقی ۲/۸/۲۱ والطبرانی فی الصغیر ۱۶۹ والفتح الربانی ۱/۱۳۴

[2] لاعرابیۃ کانت ترقص ولدہا راجع ادب الدنیا والدین بشرح لغان زادہ والعیون (۳: ۹۴)

(۱۹۷) يَا حَبَّذَا رِيحُ الْوَلَدِ

رِيحُ الْخُزَامَى فِي الْبَلَدِ

اولاد کی خوشبو کیسی پیاری ہے۔ یہ خزامی گھاس کی خوشبو ہے جو شہر میں مہکتی ہے اور اولاد کو ریحان اس لئے کہا ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے

اَلرِّيحُ کے معنی معروف ہیں۔ یعنی ہوا متحرک کو کہتے ہیں عام طور پر جن مواضع میں ارسال الرِّيح صیغہ مفرد کے ساتھ مذکور ہے وہاں عذاب مراد ہے اور جہاں کہیں لفظ جمع کے ساتھ مذکور ہے وہاں رحمت مراد ہے[۱۵۲]۔ چنانچہ رِيح کے متعلق فرمایا:۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا۔ (۵۴-۱۹) ہم نے ان پر ایک زناٹے کی آندھی چلائی۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا. (۳۳-۹) تو ہم نے ان پر آندھی چلائی۔

كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ (۳-۱۱۷) مثال اس ہوا کی ہے جس میں بڑی ٹھر بھی ہو۔

اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ (۱۴-۱۸) اس کو سخت ہوا لے اڑی۔

اور رِيَاح (جمع کا لفظ) کے متعلق فرمایا:۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ۔ (۱۵-۲۲) اور ہم ہی ہوا کو چلاتے ہیں جو بادلوں کو پانی بار دار کرتی ہے۔

اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ (۳۰-۴۶) کہ وہ ہواؤں کو اس غرض سے بھیجتا ہے کہ لوگوں کو بارش کی خوشخبری پہنچائیں۔

يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا (۷-۵۷) باران رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ لوگوں کو مینہ کی آمد کی خوشخبری پہنچا دیں۔

اور آیت:۔ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا (۳۰-۴۸) اور وہ قادر مطلق ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ ہوائیں بادلوں کو ان کی جگہ سے ابھارتی ہے۔

میں بھی چونکہ معنی رحمت اغلب ہے اس لئے یہاں لفظ جمع کی قرائت زیادہ صحیح ہے۔

کبھی مجازًا رِيح۔ بمعنی غلبہ بھی آجاتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

فَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (۸-۴۶) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

محاورہ ہے:۔

اَرْوَحَ الْمَاءُ پانی متغیر ہو گیا خاص کر بدبودار ہونے کے وقت بولتے ہیں۔

رِيحَ الْغَدِيرُ يُرَاحُ جوہڑ پر ہوا کا چلنا۔ اور اَرَاحُوا کے معنی رَوَاح یعنی شام کے وقت میں داخل ہونے کے ہیں اور خوشبودار تیل کو دُهْنٌ مُرَوَّحٌ کہا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے[۱۵۳] (۱۶۳) لَمْ يَرَحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ کہ وہ جنت کی خوشبو تک نہیں پائے گا۔

اَلْمَرْوَحَةُ ہوا چلنے کی سمت اَلْمِرْوَحَةُ (آلہ) پنکھا۔ اَلرَّائِحَةُ مہکنے والی خوشبو۔

محاورہ ہے:۔

رَاحَ فُلَانٌ اِلَى اَهْلِهِ (۱) فلاں اپنے اہل کی طرف ہوا کی طرح تیزی کے ساتھ گیا۔ (۲) اس نے اپنے اہل و عیال میں پہنچ کر راحت حاصل کی۔

---

[۱۵۲] نسبہ فی الاتقان الی ابی بن کعب و مجیدة و ورد فی الادعیۃ الماثورة اللھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا (الخائق ۱/۲۵۴) وتعددہ الخفاجو فی شرح الدرة ۱۲۳-۱۲۴۔ وورد فی القرآن خلافہ ولسلیمان الریح عاصفة (۲۱-۱۸) وجرین بہم بریح طیبة (۱۰-۲۲) وفی الحدیث نصرت بالصبا وھی ریح الانبیاء

[۱۵۳] حدیث لم یرح رائحۃ الجنۃ ورد فی قتل المعاہد (حم، خ، ن، ۵) عن ابن عمرو (الخائق ۱/۵۴) والغریب لابی عبید ۵/۱۰ (راجع کنز العمال ج ۴ رقم ۱۸۲۱/۱۸۲۴-۱۸۳۵ وزد لہ ابن حبان رقم ۳۰-۱۳۱-۱۲۲۳-۱۲۳۳ عن ابی بکرة) ۱۲ ؛

اَلرَّاحَۃُ آرام۔ یہ بھی رَوْحٌ سے ماخوذ ہے۔ مشہور محاورہ ہے:۔ اِفْعَلْ ذٰلِكَ فِیْ سَرَاحٍ وَرَوَاحٍ کہ آرام سے یہ کام کرو۔

اَلْمُرَاوَحَۃُ کے معنی ہیں دو کاموں کو باری باری کرنا۔ اور استعارہ کے طور پر رَوَاحٌ سے دوپہر کو آرام کا وقت مراد لیا جاتا ہے اور اسی سے کہا جاتا ہے۔ اَرَحْنَا اِبِلَنَا کہ ہم نے اونٹوں کو آرام دیا (یعنی باڑہ میں لے آئے) اور پھر اَرَحْتُ الْاِبِلَ سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

اَرَحْتُ اِلَیْہِ حَقَّہٗ کہ میں نے اس کا حق واپس لوٹا دیا اور مُرَاحٌ باڑے کو کہا جاتا ہے اور تَرَوَّحَ الشَّجَرُ وَرَاحَ یَرَاحُ کے معنی درخت کے شگوفہ دار ہونے اور نئے پتے نکالنے کے ہیں اور کبھی رَوْحٌ سے وسعت اور فراخی کے معنی بھی مراد لئے جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے۔ قَصْعَۃٌ رَوْحَاءُ فراخ پیالہ اور آیت کریمہ:۔

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ۔۔۔۔ (۱۲-۸۷)

اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ میں بھی وسعت رحمت مراد ہے جو لفظ رَوْحٌ سے مفہوم ہوتی ہے۔

(ر و د)

اَلرَّوْدُ اس کے اصل معنی نرمی کے ساتھ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمد و رفت کے ہیں اور اسی معنی میں فعل رَادَ وَارْتَادَ آتا ہے اسی سے رَائِدٌ ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جسے پانی اور چارہ کی تلاش کیلئے قافلہ سے آگے بھیج دیا گیا ہو اور رَادَ الْاِبِلُ کے معنی گھاس کی تلاش میں اونٹوں کو ادھر ادھر لئے پھرنا کے ہیں پھر رفتار کے اعتبار سے کہا جاتا ہے رَادَتِ الْاِبِلُ فِیْ مَشْیِهَا۔ یَرُوْدُ رَوَدَانًا اونٹ نرم رفتار چلے۔ اور اسی سے مِرْوَدٌ ہے جس کے معنی سرمہ لگانے کی سلائی یا حلقہ لگام کے لوہا کے ہیں اور اَرْوَدَ یُرْوِدُ (افعال) کے معنی ہیں نرمی کرنا اور اس سے رُوَیْدًا (اسم فعل) ہے جیسے رُوَیْدَكَ الشِّعْرَ یَغِبُّ کل تک شعر کو مہلت دو (یعنی اس پر غور کر لو۔

اَلْاِرَادَۃُ یہ رَادَ یَرُوْدُ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں اور ارادۃ اصل میں اس قوۃ کا نام ہے، جس میں خواہش ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھنچنا اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہیے یا نہیں اذاں بعد یہ کبھی دل کے کسی طرف کھنچنے کے لئے بولا جاتا ہے جو کہ ارادہ کا مبدا ہے اور کبھی صرف منتہی کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ یعنی محض فیصلہ کے لئے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو منتہی کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کام کا فیصلہ نزوع نفس کا معنی مراد نہیں ہوتا کیونکہ ذات باری تعالیٰ خواہشات نفسانی سے مبرا ہے لہذا اَرَادَ اللّٰهُ کَذَا کے معنی ہوں گے۔ اللہ نے فلاں کام کا فیصلہ کیا چنانچہ فرمایا:۔

اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَۃً (۳۳-۱۳) یعنی اگر خدا تمہاری برائی کا فیصلہ کرے یا تم پر اپنا فضل و کرم کرنا چاہے۔

اور کبھی ارادہ بمعنی امر کے آتا ہے مثلاً اُرِیْدُ مِنْكَ كَذَا کے معنی یہ ہیں کہ تجھے فلاں کام کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ جیسے قرآن میں ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔۔۔۔ (۲-۱۸۸) اللہ تمہارے ساتھ آسانی

کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔
(یعنی آسان کاموں کا حکم دیتا ہے اور ایسے امور کا حکم نہیں دیتا جس سے تم سختی میں مبتلا ہو جاؤ)
اور کبھی ارادہ بمعنی قصداً آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ۔ (۲۸-۸۳)
وہ دنیا میں کسی طرح کی شیخی نہیں کرنا چاہتے۔
یعنی نہ اس کا قصد کرتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنا مطلوب بناتے ہیں پھر جس طرح یہ لفظ قوت اختیاریہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح قوت تسخیری یعنی اضطراری اور غیر اختیاری امور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے ارادہ کا لفظ حیوانات اور جمادات دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں دیوار کے متعلق فرمایا:۔
يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ (۱۸-۷۷) کہ وہ گرا چاہتی تھی۔
یعنی گرنے کے قریب تھی۔ اور محاورہ ہے:۔
فَرَسِي تُرِيدُ التِّبْنَ کہ میری گھوڑی بھوسہ کھانا چاہتی ہے۔
اَلْمُرَاوَدَةُ (مفاعلہ) یہ بھی رَادَ يَرُوْدُ سے ہے اور اس کے معنی ارادوں میں باہم اختلاف اور کشیدگی کے ہیں۔ یعنی ایک کا ارادہ کچھ ہو اور دوسرے کا کچھ اور رَاوَدْتُ فُلَانًا عَنْ كَذَا کے معنی کسی کو اس کے ارادہ سے پھسلانے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي (۱۲-۲۶) اس نے مجھے میرے ارادہ سے پھیرنا چاہا۔
تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ (۱۲-۳۰) وہ اپنے غلام سے ناجائز مطلب حاصل کرنے کے درپے ہے۔
یعنی اسے اس کے ارادہ سے پھسلانا چاہتی ہے۔
سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ (۱۲-۶۱) ہم اس کے باپ کو اس سے پھیرنے کی کوشش کریں گے۔
(یعنی اسے آمادہ کریں گے کہ وہ برادر یوسف ؑ کو ہمارے ساتھ بھیج دے)
وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ۔ (۱۲-۳۲) بے شک میں نے اس سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنا چاہا۔

(ر ء س)

اَلرَّأْسُ سر کو کہتے ہیں اور اس کی جمع رُءُوْسٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا (۱۹-۴) اور سر (بڑھاپے کی آگ) سے بھڑک اٹھا ہے۔
وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ (۲-۱۹۶) اپنے سر نہ منڈاؤ۔
اور کبھی رَأْسٌ بمعنی رئیس بھی آتا ہے اور اَرْءَسُ (اسم تفضیل) کے معنی بڑے سر والے کے ہیں اور سیاہ سر والی بکری کو شَاةٌ رَأْسَاءُ کہتے ہیں اور رِيَاسُ السَّيْفِ کے معنی دستہ شمشیر کے ہیں۔

(ر و ض)

اَلرَّوْضُ اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو اور سرسبز بھی ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ۔ (۳۰-۱۵) باغ بہشت میں ان کی خاطر داریاں ہو رہی ہوں گی۔
اور پانی کے جمع ہونے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔
أَرَاضَ الْوَادِي وَاسْتَرَاضَ وادی میں پانی وافر ہوگیا اور أَرَاضَهُمْ کے معنی ہیں "اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا"۔
اَلرِّيَاضَةُ کسی سے بکثرت کوئی کام لینا تاکہ اسے

اس میں سدھاؤ اور مہارت پیدا ہوجائے۔ اسی سے رُضْتُ الدَّابَّةَ ہے یعنی سواری کو سدھانا اور مطیع کرنا۔ اور اِفْعَلْ كَذَا مَا دَامَتِ النَّفْسُ مُسْتَرَاضَةً کے معنی ہیں کہ اس وقت تک یہ کام کرو جب تک نفس محنت کے قابل رہے یا اس میں وسعت رہے اور یہ اِرَاضَةٌ یا رَوْضٌ سے مشتق ہوگا اور آیت کریمہ: فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُوْنَ (۳۰-۱۵) میں رَوْضَة سے جنت کے سبزہ زار یعنی اس کے محاسن اور لذات مراد ہیں اور آیت فِي رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ میں (صیغہ جمع سے) ان ظاہری نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں اصحاب جنت کے لئے تیار کی گئیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ان علوم و اخلاق کی طرف اشارہ ہے جن میں تخصص حاصل کر لینے سے انسان کا دل پاکیزہ ہو جاتا ہے۔

(ر و ع)

اَلرُّوْعُ کے معنی خَلَدٌ یعنی دل کے ہیں جیسے حدیث میں ہے[1] (۱۴۷)

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ ....کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔ اور رَوْع (بفتح الراء) خوف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ (۱۱-۷۴) پھر جب ابراہیم (کے دل سے) خوف دور ہوا۔

محاورہ ہے:۔ رُعْتُهٗ وَرَوَّعْتُهٗ خوف زدہ کرنا، گھبرا دینا۔ نَاقَةٌ رَوْعَاءُ ڈرپوک اونٹنی۔

اَرْوَعُ۔ وہ چیز جو اپنے حسن و جمال سے دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دے گویا خوف زدہ کر رہی ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2]۔

(۱۹۸) يَهُوْلُكَ اِنْ تَلْقَاهُ فِي الصَّدْرِ مَحْفِلًا

کہ محفل میں اس سے ملاقات کرے تو دل میں ہول پیدا کر دے۔

(ر و غ)

اَلرَّوْغُ کے معنی کسی حیلہ اور تدبیر کی خاطر ایک جانب مائل ہونے کے ہیں اسی سے رَاغَ الثَّعْلَبُ رَوْغَانًا ہے یعنی لومڑ کا فریب دہی کے طور پر ادھر ادھر جانا اور کج راستہ کو رَائِغٌ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے پیچ و خم سے فریب دے رہی ہے۔ رَاوَغَ فُلَانٌ فُلَانًا کسی سے فریب کھیلنا اور رَاغَ فُلَانٌ اِلٰى فُلَانٍ کے معنی ہیں یہ فلاں کی طرف اس طرح لوٹا کہ اپنا مقصد حیلے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

فَرَاغَ اِلٰى اَهْلِهٖ (۵۱-۲۶) پھر وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچا۔

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ (۳۷-۹۳) تو بڑی قوت سے ان کے مارنے کیلئے مائل ہوئے۔

اور اصل میں اس کے معنی ہیں داؤ لگا کر کسی چیز کو حاصل کرنا اور (علیٰ (صلہ) کے لفظ سے معنی استیلاء کا اظہار مقصود ہے۔

(ر و م)

رُوْمٌ ایک مشہور قوم ہے کبھی یہ لفظ رُوْمِيٌّ کی جمع کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے جیسے عَجَمٌ و عَجَمِيٌّ۔ قرآن میں ہے:۔

الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۳۰-۲۱) رومی مغلوب ہو گئے

---

[1] وفی الصحاح: تربیع السراب (رابع) [2] راجع للحدیث الثالی ۸۰۸ والسان: شرح السنۃ من روایۃ عبداللہ بن مسعود العسکری فی الامثال والغزالی فی الاحیا وفی روایۃ روح الامین ... [illegible]

(ر و ی)

مَاءٌ رَوَاءٌ وَ رِوًی بہت زیادہ سیر کرنے والے پانی کو کہتے ہیں اور رِوًی بروزن عِدًی اور سِوًی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۱۲۲) مَنْ شَكَّ فِي فَلْجٍ فَهٰذَا فَلْجٌ
مَاءٌ رَوَاءٌ وَطَرِيقٌ نَهْجٌ

جسے مقام فلج میں شبہ ہو وہ دیکھ لے کہ یہی فلج ہے (یعنی سیراب کرنے والا پانی اور کھلا راستہ۔

اور آیت :-

هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا (۱۹-۷۴) جن کے ساز و سامان اور جن کی (ظاہری) رو اداری ان سے کہیں عمدہ تھی۔

جو لوگ اسے مہموز نہیں بتاتے ان کے نزدیک رَدِیَ سے مشتق ہے۔ اور خوبصورت کو رِیٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ حسن سے پُر ہے۔ لیکن اگر اسے مہموز پڑھا جائے تو رِئْيًا سے مراد وہ چیز ہو گی جس کی خوبصورتی کی وجہ سے اس کی طرف نظریں اٹھتی ہوں۔ بعض کے نزدیک بغیر ہمزہ کے بھی رُؤْيَة سے مشتق ہے اور رِیٌّ کے معنی منظر (ظاہری حالت) کے ہیں اسی سے رِوَاءٌ (خوش نمائی) ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ رُوَاءٌ میں قلب ہوا ہے اور یہ رَأَيْتُ سے مشتق ہے۔ ابو علی الفسوی کہتے ہیں کہ لفظ مَرْوْءَةٌ بھی حَسُنَ فِي مِرْءَةِ الْعَيْنِ كَذَا (ظاہر دیکھنے میں خوبصورت ہے) سے ماخوذ ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ مِرْأَة میں میم زائدہ ہے اور مَرُوْءَةٌ بروزن فَعُوْلَة ہے۔ اور اس میں میم اصلی ہے اور أَنْتَ بِمَرْأًى وَمَسْمَعٍ کے معنی ہیں کہ تم اس قدر میرے قریب ہو کہ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں اور تمہاری بات سن سکتا ہوں۔

بعض یار کو حذف کر کے أَنْتَ مِنِّي مَرْأًى وَمَسْمَعٌ بولتے ہیں اور مَرْءًى بروزن مَفْعَلٌ ہے اور رَأَيْتُ سے ماخوذ ہے۔

(ر ی ب)

رَابَنِي كَذَا اَوْ اَرَابَنِي کے معنی ہیں فلاں معاملہ نے مجھے رَيْب میں ڈال دیا اور رَيْب کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی طرح کا وہم ہو مگر بعد میں اس توہم کا ازالہ ہو جائے۔ قرآن میں ہے :-

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ۔ (۲۲-۲۵) اگر تم کو (قیامت کے دن) پھر جی اٹھنے میں کسی طرح کا شک ہو۔ اور آیت :-

فِي رَيْبٍ مِمَّا أَنْزَلْنَا۔ (۲-۲۳) (اگر تمہیں) مَا اَنْزَلْنَا میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے۔

اور آیت :-

رَيْبَ الْمَنُونِ۔ (۵۲-۳۰) گردش زمانہ (کا انتظار کرتے ہیں)۔

گردش زمانہ کو رَيْب کہنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کے وقوع میں شک و شبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے انہیں ریب کہا ہے کہ ان کے تعین اوقات میں انسان متردد رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے لہٰذا انسان نفس گردش کے وقوع کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے تعین اوقات کے لحاظ سے ہمیشہ رَيْبَ الْمَنُونِ میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی بناء پر شاعر نے کہا ہے[2] :

---

[1] البیت لراجز من بنی العنبر من تمیم ما لفلج مارلهم قاله فی یا لبلدان وابو عبید البکری فی معجم (رسم فلج) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ: ۱۰۸ والبیت فی السجاد ندی (۱: ۱۴۴) بغیر عزو ۱۲

[2] [illegible] راجع المحاضرات للمؤلف (۴: ۱۹۱)

(۱۹۳) اَلنَّاسُ قَدْ عَلِمُوْا اَنْ لَا بَقَاءَ لَهُمْ
لَوْ اَنَّهُمْ عَلِمُوْا مِقْدَارَ مَا عَلِمُوْا

کہ لوگوں کو اس بات کا تو یقین ہو چکا ہے کہ ان کیلئے بقا نہیں ہے۔ کاش انہیں اس کا وقت بھی معلوم ہوتا۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۱۹۴) اَمِنَ الْمَنُوْنِ وَرَيْبِهَا تَتَوَجَّعُ

کہ کیا تو زمانہ اور اس کی گردشوں پر جزع فزع کرتا ہے

قرآن میں ہے:۔

لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ (۱۱-۱۱۰) قرآن کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جس نے انہیں حیران کر رکھا ہے۔

مُعْتَدٍ مُّرِیْبٍ (۵۰-۲۵) حد (عبودیت) سے بڑھے ہوئے اور شک وشبہ پیدا کرنے والے (کی اطاعت مت کر)

اور اِرْتِیَابٌ (افتعال) اِرَابَةٌ کے ہم معنی ہے جس کے معنی شک وشبہ میں پڑنے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

اَمِ ارْتَابُوْا اَمْ یَخَافُوْنَ (۲۴-۵۰) یا شک میں پڑے ہوئے ہیں اور اس بات سے ڈرتے ہیں۔

وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ (۵۷-۱۴) اور اس بات کے منتظر رہے (کہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو) اور (اسلام کی طرف سے) شک میں پڑے رہے۔

اور مومنین سے اِرْتِیَاب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا

وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۷۴-۳۱) اور اہل کتاب اور مسلمان (ان باتوں میں کسی طرح کا) شک وشبہ نہ لائیں۔

ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا (۴۹-۱۵) پھر کسی طرح کا شک وشبہ نہیں کیا۔

ایک حدیث میں ہے[2] (۱۶۱) دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُكَ کہ شک وشبہ چھوڑ کر وہ کام کرو جس میں شک وشبہ نہ ہو۔

اور گردش زمانہ کو رَیْبُ الدَّهْرِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں فریب کاری کا وہم ہوتا ہے (کما مرّ) اور رِیْبَةٌ رَیْب سے اسم ہے جس کے معنی شک وشبہ کے ہیں (جمع رِیَبٌ) قرآن میں ہے:۔

بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ (۹-۱۱۰) کہ وہ عمارت ان کے دلوں میں رِیْبَةً بنی رہے گی۔ یعنی ہمیشہ ان کے دلی کھوٹ اور خلجان پر دلالت کرتی رہے گی۔

(ر ی ش)

رِیْشُ الطَّائِرِ پرندہ کے پروں کو کہتے ہیں اور کبھی یہ لفظ خصوصیت کے ساتھ بازوؤں کے پروں پر بولا جاتا ہے اور چونکہ پرندے کے پر اس کے

---

[1] قالہ ابو ذویب الہذلی فی مطلع رثا رنبیہ (راجع الانصاف ۷۷ ونخاص الخاص للثعالبی ۱۸ والغریب للقتبی ۴۲۵ والقرطبی ۱۷: ۱۶، ۷۰ (۱۷: ۷۲) واللسان (ریب) والسمط ۴۵۴ والقصیدۃ مفضلیۃ فی ۶۵ بیتًا وتمام البیت: والدھر لیس بمعتب من یجزع والبیت فی الاستیعاب ۶۶۷ والاغانی (۶: ۹۵) والخزانۃ (۱: ۲۰۲) والسیوطی ۹۲ والبیقی (۳: ۴۹۳) والعقد (۲: ۱۵) والاصابۃ ۴۵۴ واسد الغابۃ (۵: ۱۹۰) رقم ۲۵۰۷ ومجازات القرآن الرضی ۲۸۳ وتہذیب الالفاظ ۴۵ ونظام الغریب ۲۰۳ وشواہد المغنی (۲: ۴۷۲) واضداد ابی الطیب ۳۲۳ وشرح السبع لابن الانباری ۴۱۶ والبحر (۸: ۱۴۹)

[2] الحدیث بطولہ الترمذی فی آخر الطب والحاکم فی الاحکام والبیوع والطبرانی والبزار من حدیث الحسن بن علی وطس عن عمر والنسائی عن الحسن بن علی وابن حبان فی زوائدہ رقم ۵۱۲ عن الحسن والحدیث بطرقہ واختلاف الفاظہ فی کنز العمال (۲: ۲۴۵-۲۴۶) والکاف الشاف لابن حجر رقسم ۱۷ والفتح الباری (۴: ۲۳۴)

لئے بمنزلہ لباس کے ہوتے ہیں۔ اس لئے استعارہ کے طور پر یہ لفظ لباس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَرِيْشًا وَّلِبَاسُ التَّقْوٰى (۷-۲۶) اور موجب زینت اور پرہیز گاری کا لباس۔

عام محاورہ ہے:۔

اَعْطَاهُ اِبِلًا بِرِيْشِهَا اسے سامان سمیت اونٹ دے دیئے یعنی مال و متاع سمیت جو ان کے اوپر تھا۔

اور رِشْتُ السَّهْمَ اَرِيْشُهٗ رِيْشًا کے معنی تیر کو پر لگانے کے ہیں اور تیر پر نہادہ کو مَرِيْشٌ (کمبیع) کہتے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر اصلاح امر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لہٰذا رِشْتُ فُلَانًا فار عاش کے معنی ہیں۔ میں نے اس کی اصلاح کی تو اس کی حالت سدھر گئی۔ شاعر نے کہا ہے[۵]: (   )

(۱۹۷) فَرِشْنِيْ بِحَالٍ طَالَمَا قَدْ بَرَيْتَنِيْ
فَخَيْرُ الْمَوَالِيْ مَنْ يَرِيْشُ وَلَا يَبْرِيْ

مجھے عرصہ دراز تک تم نے تراشا ہے کبھی تو میری اصلاح کیجئے۔ بہتر موالی وہ ہیں جو بگاڑتے نہیں بلکہ سنوارتے ہیں۔

اور نیزہ کے پر سے کمزوری کے معنی کے تصور کی بنا پر کمزور نیزہ کو رُمْحٌ رَاشٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ر ی ع)

اَلرِّيْعُ بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ جو دور سے ظاہر ہو اس کا واحد رِيْعَةٌ ہے قرآن میں ہے:۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ (۲۶-۱۲۸) کیا تم ہر اونچی جگہ پر بے ضرورت یادگاریں بناتے ہو۔

اور معنی ارتفاع کے لحاظ سے کنوئیں کی منڈیر کو رَيْعٌ کہا جاتا ہے۔ پھر ہر چیز کے اوائل کو رَيْعَان کہا جاتا ہے۔ اور استعارہ کے طور پر رَيْعٌ ہر چیز کے زائد حصہ اور بلندی کے لئے آتا ہے اور اسی سے تَرَيَّعَ السَّحَابُ ہے جس کے معنی بادل کے نمایاں اور ظاہر ہونے کے ہیں۔

(ر ی ن)

اَلرَّيْنُ۔ اس زنگ کو کہتے ہیں جو کسی صاف چیز پر لگ جاتے۔ قرآن میں ہے:۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۸۳-۱۴) نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔ یعنی ان کے مجلی قلوب پر زنگ بیٹھ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتے۔ شاعر نے کہا ہے[۱]: (البسیط)

(۱۹۹) "اِذَا رَانَ النُّعَاسُ بِهِمْ"

جب نیند نے ان پر غلبہ پا لیا۔

محاورہ ہے:۔

رِيْنَ عَلٰى قَلْبِهٖ۔ اس کے دل پر زنگ بیٹھ گیا

(ر ء ف)

اَلرَّأْفَةُ یہ رَءُفَ رَكَ سے ہے اور اس کے معنی شفقت اور رحمت کے ہیں صفت کا صیغہ رَءُوْفٌ اور رَئِفٌ مثل حَذِرٌ وَيَقِظٌ آتا ہے قرآن میں ہے:۔

---

[۵] قالہ سوید بن الصامت الانصاری لمکاحل فی قومہ راجع البیقر (۲: ۷۷) والاساس (۱: ۳۸۸) والاصابۃ (   ) والعیون (۳: ۸۱) فی العقابیات وفی اللسان (تشریف) فی سنۃ۔ ونسبہ لعمیر بن حباب قال ابا حد جیمعۃ عبارۃ شارح القاموس قال سید الانصاری ہو الصواب ۱۲

[۱] ہذا من البیت ولعبدۃ بن الطبیب من کلمۃ مفضلیۃ (۱: ۱۳۹) وتکملتہ:۔ امدو تہ الفوم .... نقلت اذا نہکوا من جبتہ قیلوا والبیت فی الامالی (۱: ۲۷۰) والسمط ۶۰۵ والمفضلیات وفی المطبوع ۶ وایمل قد صحف والتصویب من المرجع

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ
(۲۴-۲) اور اللہ کے حکم (کی تعمیل) میں تم کو ان
(کے حال) پر (کسی طرح کا) ترس دامن گیر نہ ہو۔

(ر ء ی)

رائی یہ مہموز العین اور ناقص یائی ہے کیونکہ
اس سے اسم مشتق رُؤْيَةٌ آتا ہے چنانچہ اسی
سے شاعر نے تقلب کر کے کہا ہے[1] (الطویل)

(۲۰۰) وَكُلُّ خَلِيلٍ رَاءَنِي فَهُوَ قَائِلٌ
مِنْ اَجْلِكَ هٰذَا الهَامَةُ الْيَوْمَ اَوْ غَدِ

جو دوست مجھے دیکھتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ یہ بد
حالی تمہاری وجہ سے ہے اور یہ آج یا کل مر جائے گا۔
اور مضارع میں ہمزہ کو حذف کر کے تَرَى، يَرَى
اور نَرَى کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا (۱۹-۲۶) اگر کوئی
آدمی نظر پڑے۔

اور آیت کریمہ:۔
اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلَّانَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۴۱-۲۹)
شیطان اور آدمی جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا ایک
نظر ان کو ہمیں بھی تو دکھاؤ۔
میں ایک قرأت اَرْنَا بھی ہے۔

اَلرُّؤْيَةُ کے معنی کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا
کے ہیں اور قوائے نفس (قوائے مدرکہ) کے اعتبار
سے رُؤْيَةٌ کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) حاسۂ بصر یا کسی ایسی چیز سے ادراک کرنا
جو حاسۂ بصر کے ہم معنی ہے جیسے قرآن میں ہے:۔
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ
(۱۰۲-۶) تم ضرور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ
لو گے پھر (اگر دیکھو گے بھی تو غیر مشتبہ) یقینی
دیکھنا دیکھو گے۔

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللّٰهِ
(۳۹-۶۰) اور تم قیامت کے روز دیکھو گے کہ جن
لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا۔

اور آیت:۔
فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ (۹-۱۰۵) اللہ تعالیٰ ابھی
تمہارے کردار کو دیکھے گا۔
میں اللہ تعالیٰ کے علم کو آنکھوں کے ساتھ دیکھنے
کی طرح قرار دے کر يَرَى کا لفظ لایا گیا ہے ورنہ
آنکھ سے دیکھنا اللہ تعالیٰ کے حق میں صحیح نہیں ہے۔
اِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ
کہ وہ شیطان اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھ لیتا
ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

(۲) وہم و خیال سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے۔
اَرٰى اَنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ۔ میرا خیال ہے کہ زید جا
رہا ہوگا۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَوْ تَرٰى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا (۸-۵۰)
اور کاش تم اس وقت کی کیفیت خیال میں لاؤ
جب ..... کافروں کی جانیں نکالتے ہیں۔

(۳) کسی چیز کے متعلق تفکر اور اندیشہ محسوس
کرنا جیسے فرمایا:۔
اِنِّيْ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ (۸-۴۹) میں دیکھتا ہوں
جو تم نہیں دیکھتے۔

(۴) عقل و بصیرت سے کسی چیز کا ادراک کرنا
جیسے فرمایا:۔
مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۵۳-۱۱) پیغمبر
نے جو دیکھا تھا اس کے دل نے اس میں کوئی

---

[1] قالہ کثیر عزۃ یخاطب جیبۃ والبیت فی اللسان (ر ء ی) ہوم) وامالی ابن الشجری (۲:۲) والکامل ۲۲۶، ۳۳، ۱۱۱ والبحر (۷ : ۲۱) واستشہد
بہ القلب فی الکتاب ۲:۲ (۱۳۰) ...

جھوٹ نہیں ملایا۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:۔

وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی (۵۳-۱۳) ایک دفعہ اور بھی (اصل صورت پر) دیکھا۔

اور رای کے جب دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنی ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۳۴-۶) اور (اے پیغمبر) جن لوگوں کو صحف آسمانی کا علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں۔

اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْکَ (۱۸-۳۹) اگر مال اور اولاد کے اعتبار سے تو مجھ کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے۔

اور اَرَاَیْتَ (ہمزہ استفہام) اَخْبِرْنِی کے قائم مقام ہوتا ہے اور اگر اس پر کاف (ضمیر خطاب) داخل ہو، تو حالت تثنیہ جمع اور تانیث میں تاء کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان حالتوں میں تاء کی بجائے کاف میں حسب مقام تبدیلی ہوتی رہتی ہے جیسے فرمایا:۔

اَرَاَیْتَکَ ھٰذَا الَّذِیْ (۱۷-۶۲) بھلا بتائیے یہی وہ ہے۔

قُلْ اَرَاَیْتَکُمْ (۶-۴۰) (اے پیغمبر) ان سے پوچھو کہ بھلا دیکھو تو سہی۔

قُلْ اَرَاَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ (۴۶-۴) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ جن کو تم اللہ کے سوا) پکارتے ہو۔

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی (۹۶-۹) (اے پیغمبر) تم نے اس شخص کے حال پر بھی نظر کی جو منع کرتا ہے۔

قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ ..... (۲۸-۹)

(اے پیغمبر) ان سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ اگر اللہ تعالیٰ لے آئے۔

قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ کَانَ (۴۶-۱۰) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے) کہو بھلا دیکھو تو سہی کہ اگر یہ ہو۔

اَرَاَیْتَ اِذْ اَوَیْنَآ اِلَی الصَّخْرَۃِ (۱۸-۶۳) آپ نے یہ بھی دیکھا کہ جب ہم (دریا کے کنارے) اس پتھر کے پاس ٹھہرے۔

ان تمام آیات میں تنبیہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔

رَاْیٌ۔ غلبہ ظن کی بنا پر کسی معاملہ کے دو متناقض پہلوؤں میں سے کسی ایک کی صحت کا یقین کر لینا رائے کہلاتا ہے اور آیت:۔

یَرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ (۳-۱۳) جن کو آنکھوں دیکھنے مسلمانوں کا گروہ اپنے سے دو چند دکھائی دے رہا ہے۔

میں یَرَوْنَ "رَاْیٌ" سے مشتق ہے جس کے معنی گمان کرنے کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ عینی مشاہدہ کی رو سے وہ انہیں اپنے سے دو چند خیال کرتے تھے جیسے کہا جاتا ہے:۔

فَعَلَ ذٰلِکَ رَاْیَ عَیْنِیْ اَوْ رَاءَۃَ عَیْنِیْ کہ اس نے یہ کام میرے سامنے کیا ہے۔

اَلتَّرْوِیَۃُ وَالتَّرَوِّیَۃُ کے معنی کسی چیز پر غور و فکر کرنے اور ایک رائے اختیار کرنے کیلئے یکسوئی سے اس کی طرف توجہ دینے کے ہیں اور اَلْمُتَرَوِّیْ وَالْمُرْتَئِیْ بمعنی متفکر ہے اور رَاَیْتُ متعدی بہ اِلٰی ہو تو اس کے معنی کسی چیز کی طرف اس طرح نظر ڈالنے کے ہیں کہ اس کے بعد انسان کو عبرت حاصل ہو جیسے فرمایا:۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ .... (۲۵-۴۵) (اے پیغمبر) کیا تو نے اپنے پروردگار کی (قدرت کی) طرف نظر نہیں کی۔

اور آیت:۔ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ (۴-۱۰۵) میں اَرٰی (افعال) بمعنی تعلیم کے ہے یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھایا ہے۔

اَلتَّرَائِیَۃُ اس علامت کو کہتے ہیں جو دیکھنے کے لئے نصب کی گئی ہو اور محاورہ ہے :۔
مَعَ فُلَانٍ رَئِیٌّ مِّنَ الْجِنِّ یعنی وہ آسیب زدہ ہے۔
اور اَرْأَتِ النَّاقَۃُ فَھِیَ مُرْءٍ اونٹنی کا حاملہ ہونا ظاہر ہو جانا۔
اَلرُّؤْیَا بمعنی خواب کے ہیں اور یہ ہمزہ کے ساتھ بروزن فُعْلٰی ہے اور کبھی ہمزہ کو حذف کر کے واؤ کے ساتھ اَلرُّوْیَا کہہ دیتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے [۱] (۱۶۵) لَمْ یَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الرُّؤْیَا۔ کہ مبشرات نبوت سے صرف خواب رہ گئے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا بِالْحَقِّ (۴۸-۲۷) بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واقعی سچا خواب دکھایا تھا۔
وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ۔ (۱۷-۶۰) اور خواب جو ہم نے تم کو دکھایا تھا تو بس اس کو لوگوں (کے ایمان) کی آزمائش (کا ذریعہ) ٹھہرایا۔
فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ (۲۶-۶۱) پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔

یعنی جب وہ باہم اس طرح آمنے سامنے ہوئے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور اسی سے وہ حدیث ہے جس میں فرمایا [۲] (۱۶۶) لَا یُتَرَاۗءٰی نَارُھُمَا کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے محاورہ ہے۔
مَنَازِلُھُمْ رِئَاۗءٌ کہ ان کے مکانات باہم متقابل ہیں۔
فَعَلَ ذٰلِکَ رِئَاۗءَ النَّاسِ اس نے نمود اور دکھاوے کے لئے یہ کام کیا۔
اَلْمِرْاٰۃُ آئینہ جس میں اشیاء کا عکس نظر آئے۔
یہ رَأَیْتُ سے مِفْعَلَۃٌ کے وزن پر ہے جیسے صَحَفْتُ سے مِصْحَفَۃٌ اور اس کی جمع مَرَائِیُ آتی ہے۔
اَلرِّئَۃُ پھیپھڑا۔ اس کی جمع مِنْ لَفْظِہٖ رِؤُوْنَ آتی ہے۔ اس پر ابوزید نے اس شعر سے استشہاد کیا ہے۔ [۳]

(۱۲۱) حَفَظْنَاھُمُوْا حَتّٰی اَتَی الْغَیْظُ مِنْھُمُوْا
قُلُوْبًا وَاَکْبَادًا لَّھُمْ وَرِئِیْنَا

ہم نے انہیں غصہ دلایا حتیٰ کہ غیظ و غضب ان کے دل و جگر اور پھیپھڑوں میں سرایت کر گیا۔
اور اسی سے رِئْتُہٗ ہے جس کے معنی پھیپھڑے پر مارنے کے ہیں

[۱] رواہ ابوداؤد فی الصلوٰۃ فی باب الدعاء فی الرکوع والسجود من حدیث ابن عباس وفیہ الرؤیا الصالحۃ راجع العون ۱: ۳۲۷ والحدیث ایضاً رواہ مسلم ۱: ۱۹۱ طبع ھند وھالنسائی وابن ماجۃ ۱۲

[۲] رواہ ابوداؤد فی باب علیٰ ما یقاتل المشرکون من حدیث جریر بن عبداللہ والنسائی فی باب القود بغیر حدیدۃ مرسلاً والحدیث فی اللآلی ۲: ۵ وانظر تخریج الکاف الشاف لابن حجر ۵۵ وتخریج العراقی علی الاحیاء (۲: ۱۷۹) والفائق (۱: ۴۱۹) وغریب ابی عبید ۱۲ [۳] البیت فی اللسان (رأی) بغیر عزو ولیغظنا ہم بدل حفظناھم

کِتَابُ الزَّاءِ

(ز ب د)

اَلزَّبَدُ جھاگ کو کہتے ہیں اور اَزْبَدَ الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی کے اوپر جھاگ آگیا۔ قرآن میں ہے:۔ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً (۱۳-۱۷) سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے۔

پھر محض رنگ میں مشابہت کی وجہ سے مسکہ کو بھی زُبْدٌ کہا جاتا ہے اور زَبَدْتُهٗ زَبْدًا کے معنی ہیں "میں نے اسے جھاگ کی طرح بکثرت مال دیا" یا "میں نے اسے مسکہ کھلایا"۔

اَلزُّبَّادُ پھول یا کلی جو جھاگ کی طرح سفید ہوتی ہے۔

(ز ب ر)

اَلزُّبْرَةُ لوہے کی بڑی سل کو کہتے ہیں اور اس کی جمع زُبَرٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ (۱۸-۹۶) (اچھا) لوہے کی سلیں ہم کو لا دو۔

اور کبھی زُبْرَۃٌ کا لفظ بالوں کے گچھا پر بولا جاتا ہے اس کی جمع "زُبَرٌ" آتی ہے اور استعارہ کے طور پارہ پارہ کی ہوئی چیز کو زُبُرٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا (۲۳-۵۳) پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ کر کے اپنا (اپنا) دین جدا جدا کر لیا۔

زَبَرْتُ الْکِتَابَ میں نے کتاب کو موٹے خط میں لکھا اور ہر وہ کتاب جو جلی اور گاڑھے خط میں لکھی ہوئی ہو اُسے زَبُوْرٌ کہا جاتا ہے لیکن عرف میں زبور کا لفظ اس آسمانی کتاب کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔ (۴-۱۶۳) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا کی۔

وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّکْرِ (۲۱-۱۰۵) اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

اس میں ایک قرأت زُبُوْر (بضمہ زا) بھی ہے۔ جو یا تو زَبُوْرٌ بفتحہ زا کی جمع ہے جیسے ظَرِیْفٌ کی جمع ظُرُوْفٌ آجاتی ہے اور یا زِبْرٌ (بکسرۂ زا) کی جمع ہے۔ اور زِبْرٌ گو اصل میں مصدر ہے لیکن بطور استعارہ اس کا اطلاق کتاب پر ہوتا ہے جیسا کہ خود کتاب کا لفظ ہے کہ اصل میں مصدر ہے لیکن بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے پھر جس طرح کتاب

---

[1] هو مستعار من زبرت القضة وقال قتادہ و مجاہد الزبر بمعنی الکتب جمع زبور راجع تفسیر الکشاف ص۳۵ ج ۲ معالم ج ۳ ص ۵۲۔

کی جمع کتب آتی ہے اس طرح زبرۃ کی جمع زُبَرٌ آجاتی ہے بعض کا قول ہے کہ زبور کتب الٰہیہ میں سے ہر اس کتاب کو کہتے ہیں جس پر واقفیت دشوار ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ (۲۶-۱۹۶) اس میں شک نہیں کہ یہ (یعنی اس کی پیشین گوئی) اگلے پیغمبروں کی کتابوں میں موجود ہے۔

وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۳-۸۴) اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔

أَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ (۵۴-۴۳) یا تمہارے لئے صحیفوں میں معافی (لکھی ہوئی) ہے۔

اور بعض کا قول ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جو صرف حکم عقلیہ پر مشتمل ہو اور اس میں احکام شرعیہ نہ ہوں۔ اور الکتاب ہر اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو احکام وحکم دونوں پر مشتمل ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں کوئی حکم شرعی نہیں ہے۔

زِئْبِرُ الثَّوْبِ کپڑے کا رواں۔ اسی سے کہا جاتا ہے هَاجَ زِئْبِرُهُ وہ غصہ سے بھڑک اٹھا۔

اور بڑے کندھوں والے شخص کو زُبَرٌ کہا جاتا ہے۔

(ز ج ج)

اَلزُّجَاجُ ایک قسم کا شفاف پتھر (شیشہ) اس کا مفرد زُجَاجَةٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فِي زُجَاجَةٍ ۔ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ (۲۴-۳۵) ایک شیشہ میں ہے اور شیشہ گویا چمکتا ہوا تارا ہے۔

اَلزُّجُّ نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا۔ جمع زِجَاجٌ اور زَجَجْتُ الرَّجُلَ کے معنی ہیں میں نے اسے نیزہ کی نوک سے مارا۔ اَزْجَجْتُ الرُّمْحَ میں نے نیزہ میں زج لگائی یا اس سے زج کو نکال لیا۔

اَلزَّجَجُ ابرو کی درازی اور باریکی۔ جو نیزہ کی انی کے مشابہ ہو۔

ظَلِيمٌ أَزَجُّ وَنَعَامَةٌ زَجَّاءُ دراز گام شتر مرغ۔

(ز ج ر)

اَلزَّجْرُ اصل میں آواز کے ساتھ دھتکارنے کو کہتے ہیں زَجَرْتُهُ میں نے اسے جھڑکا، روکا۔

اِنْزَجَرَ (جھڑکنے پر) کسی کام سے رک جانا۔ یہ زَجَرَ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ (۷۹-۱۳) اور قیامت تو ایک ڈانٹ ہے۔

پھر کبھی یہ صرف دھتکار دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی آواز کیلئے اور آیت کریمہ:۔

فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا (۳۷-۲) میں زاجرات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ڈانٹ کر چلاتے ہیں اور آیت:۔

مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ (۵۴-۴) جس میں (کافی) تنبیہ ہے۔ میں مُزْدَجَرٌ سے ایسی باتیں مراد ہیں جو ارتکاب معاصی سے روکتی اور سختی سے منع کرتی ہیں اور آیت:۔

وَازْدُجِرَ (۵۴-۹) اور اسے جھڑکیاں دی گئیں۔ کے معنی ہیں ڈانٹ کر نکال دیا گیا یہاں زجر کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مار بھگانے کے وقت تہدید آمیز کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے جا چلا جا دور ہو جا وغیرہ۔

(ز ج و)

اَلتَّزْجِيَةُ کے معنی کسی چیز کو دفع کرنے کے ہیں تاکہ چل پڑے مثلاً پچھلے سوار کا اونٹ کو چلانا یا ہوا

کا بادلوں کو چلانا۔ قرآن میں ہے:۔
یُزْجِیْ سَحَابًا (۲۴-۴۳) (اللہ ہی) بادلوں کو ہنکاتا ہے
یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ (۱۷-۶۶) جو تمہارے لئے (سمندروں میں) جہازوں کو چلاتا ہے۔
اور اسی سے کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ مُزْجًی ہنکایا ہوا آدمی یعنی کمزور اور ذلیل آدمی۔
اَزْجَیْتُ رَدِیَّ التَّمْرِ میں نے ردی کھجوروں کو دور پھینک دیا اور زَجَا (لازم) اَزْجٰی کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔
زَجَا الْخَرَاجُ (ن) خراج کا سہولت سے جمع ہوجانا۔ اور "خَرَاجٌ زَاجٍ" اس خراج کو کہتے ہیں جو معمولی ہونے کی وجہ سے سہولت سے جمع ہوجائے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔
(۲۰۳) وَحَاجَۃٍ غَیْرِ مُزْجَاۃٍ عَنِ الْحَاجِ
اور حاجت مندوں کی بعض حاجتیں معمولی نہیں ہوتیں کہ انہیں پورا کیا جاسکے۔

(ز ح ز ح)

اَلزَّحْزَحَۃُ کے معنی ہیں دور ہٹانا اور پرے طرف کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ (۳-۱۸۴) پس جو شخص آگ سے دور رکھا گیا۔

(ز ح ف)

اَلزَّحْفُ اصل میں اس کے معنی پاؤں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا کے ہیں جیسا کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے سے پہلے اور اونٹ تھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں گھسیٹ کر چلتا ہے۔ یا فوج کثرت ازدحام کی وجہ سے آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا (۸-۱۵) جب کفار سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہوجائے۔
اور زَاحِفٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ سے ورے گر جائے۔

(ز خ ر ف)

اَلزُّخْرُفُ اصل میں اس زینت کو کہتے ہیں جو ملمع سے حاصل ہو اسی سے سونے کو بھی زُخْرُفٌ کہا جاتا ہے (کیونکہ یہ زیبائش کے کام آتا ہے)۔ قرآن میں ہے:۔
اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی (۱۰-۲۴)
بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ (۱۷-۹۳) طلائی گھر۔
وَزُخْرُفًا (۴۳-۳۵) اور سونے کے (دروازے)
اور زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (۶-۱۱۲) کے معنی ہیں "ملمع کی ہوئی باتیں"

(ز ر ب)

اَلزَّرَابِیُّ یہ زِرْبِیٌّ کی جمع ہے جو ایک عمدہ قسم کا کپڑا ہے اور ایک مقام کی طرف منسوب ہے پھر تشبیہ و استعارہ کے طور پر زَرَابِیُّ بمعنی فرش کے بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَزَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ (۸۸-۱۶) اور بچھائے ہوئے فرش۔
اور زَرْبٌ وَزَرِیْبَۃٌ بکریوں کے باڑہ اور تیر انداز کے چھپنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں۔

(ز ر ع)

اَلزَّرْعُ اس کے اصل معنی اِنْبَاتٌ یعنی

اگانے کے ہیں اور یہ کھیتی اگانا در اصل قدرت کا کام ہے اور انسان کے کسب و ہنر کو اس میں دخل نہیں ہے اسی بنا پر آیت کریمہ:۔

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (۵۶-۶۴) بھلا بتاؤ کہ جو تم بوتے ہو کیا اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔

میں حرث (بونا) کی نسبت تو انسان کی طرف کی ہے مگر زرع (اگانے) کی انسان سے نفی کرکے اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اور کھیتی اگانے کے اسباب مثلاً زمین کو تیار کرکے اس میں تخم ریزی کرنا اور مناسب احتیاطیں برتنا۔ چونکہ انسان سر انجام دیتا ہے اس لئے مجازاً انسان کی طرف بھی زرع کی نسبت کر دیتے ہیں جیسا کہ اَنْبَتَ کَذَا کا محاورہ بولا جاتا ہے کیونکہ انسان منجملہ اگانے کے اسباب سے ہے۔

زَرْعٌ اصل میں مصدر ہے اور اس سے مَزْرُوْعٌ (اسم مفعول) یعنی کھیتی مراد ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔

فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا (۳۲-۲۷) پھر ہم اس (پانی) کے ذریعہ کھیتی نکالتے ہیں۔

وَزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ (۴۴-۲۶) اور کتنی ہی کھیتیاں اور کتنے ہی عمدہ عمدہ مکانات۔

اور تشبیہ کے طور پر جس طرح انسان کے متعلق اَنْبَتَهُ اللّٰهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس طرح محاورہ میں زَرَعَ اللّٰهُ وَلَدَكَ (اللہ تمہاری اولاد کو نمو بخشے) بھی کہہ دیتے ہیں اور مُزْدَرِعٌ بمعنی زَرَّاعٌ یعنی کسان کے ہے۔ اور اِزْدَرَعَ النَّبَاتُ کے معنی ہیں نباتات بڑھ گئی۔

(ز ر ق)

اَلزُّرْقَةُ (نیلاہٹ) ایک رنگ جو سپیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ زَرِقَتْ عَيْنُهٗ زُرْقَةً وَزَرَقَانًا اس کی آنکھ نیلی ہوگئی اور آیت کریمہ:۔

زُرْقًا يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ (۲۰-۱۰۲، ۱۰۳) نیلی آنکھوں والے جو آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے۔

میں زُرْقًا کے معنی اندھے جن کی آنکھوں میں نور نہ ہو۔

اَلزُّرَّقُ ایک پرند کا نام ہے (سفید شاہین) محاورہ ہے۔ زَرَقَ الطَّائِرُ پرند کا بیٹ کرنا اور زَرَقَهٗ بِالْمِزْرَاقِ کے معنی ہیں "اسے چھوٹے نیزہ سے مارا"۔

(ز ر ی)

زَرَيْتُ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر عیب لگانے کے ہیں اور اَزْرَيْتُ بِهٖ وَ اِزْدَرَيْتُ (افتعال) کے معنی ہیں کسی کو حقیر اور بے وقعت گردانا۔ قرآن میں ہے:۔

تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ (۱۱-۳۱) (جنہیں) تمہاری نظریں حقیر دیکھتی ہیں۔

یہ اصل میں تَزْدَرِيْهِمْ اَعْيُنُكُمْ ہے یعنی اس کا مفعول محذوف ہے اور معنی یہ ہے کہ تم انہیں نظر حقارت سے دیکھتے ہو۔

(ز ع ق)

اَلزُّعَاقُ سخت کھاری اور کڑوے پانی کو کہتے ہیں اور جس کھانے میں حد سے زیادہ نمک ہو اسے طعام مزعوق کہا جاتا ہے۔

زَعَقَ (ف) بِهٖ کے معنی کسی پر چلا کر اسے گھبرا دینے کے ہیں اور اِنْزَعَقَ (لازم) گھبرا جانا۔ اَلزَّعِقُ بہت چلانے والا

اَلزَّعَّاقُ بہت بلند آواز نکالنے والا۔

(ز ع م)

اَلزَّعْمُ اصل میں ایسی بات نقل کرنے کو کہتے ہیں جس میں جھوٹ کا احتمال ہو اس لئے قرآن پاک میں یہ لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت مقصود ہے چنانچہ فرمایا:۔

زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۶۴-۷) کفار یہ زعم کرتے ہیں۔

بَلْ زَعَمْتُمْ (۱۸-۴۸) مگر تم یہ خیال کرتے ہو۔

کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶-۲۲) (جن کو تم شریک خدائی) سمجھتے تھے۔

زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (۱۷-۵۶) (جنہیں تم نے) اللہ کے سوا (معبود) خیال کیا۔

اور زَعَامَةٌ کے معنی ذمہ داری اٹھانے اور ریاست (سرداری) کے ہیں اور کفیل (ضامن) اور رئیس کو زعیم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی بات میں جھوٹ کا احتمال ہو سکتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ (۱۲-۷۲) اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ (۶۸-۴۰) ان میں سے کون اس کا ذمہ دار ہے۔ یہاں زعیم یا تو زعامہ بمعنی کفالۃ سے ہے اور یا زعم بالقول سے ہے۔

(ز ف ف)

زَفَّ الْاِبِلُ یَزِفُّ زَفًّا وَزَفِیْفًا کے معنی ہیں اونٹ کا تیز چلنا اور اَزَفَّهَا (افعال) کے معنی تیز چلانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ (۳۷-۹۴) وہ اسکی طرف دوڑتے آئے۔

اور ایک قرأت میں یُزِفُّوْنَ (بضمہ یا) ہے یعنی وہ اپنے ساتھیوں کو تیز روی پر برانگیختہ کرتے ہیں۔

اصل میں زَفِیْفٌ کے معنی ہوا کے تیز چلنے یا شتر مرغ کے اس قدر تیز چلنے کے ہیں جس میں نیم پرواز پائی جائے۔ کہا جاتا ہے زَفُوْفُ النَّعَامِ شتر مرغ تیز چلا پھر اسی سے استعارہ کے طور زَفَّ الْعَرُوْسَ کہا جاتا ہے۔ یعنی دلہن کو شوہر کے پیش کیا۔ اس میں بھی معنی سرعت ملحوظ ہے مگر اس کا تعلق چلنے سے نہیں ہے بلکہ پیش کرنے والوں کے وفور شوق سے ہے۔

(ز ف ر)

اَلزَّفِیْرُ اس کے اصل معنی سانس کی اس قدر تیزی سے آمد و شد کے ہیں کہ اس سے سینہ پھول جائے۔ قرآن میں ہے:۔

لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ (۱۱-۱۰۶) ان کے لئے اس میں چیخنا ہے۔

اِزْدَفَرَ (افتعال) فُلَانٌ کَذَا کسی چیز کو مشقت سے اٹھانا جس سے سانس پھول جائے۔ اس لئے پانی لانے والی لونڈیوں کو زَوَافِرُ کہا جاتا ہے۔

(ز ق م)

اَلزَّقُّوْمُ تھوہر کا درخت۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ (۴۴-۴۳) بیشک سینڈھ کا درخت۔

میں زَقُّوْمُ سے دوزخ کے کریہہ کھانے مراد ہیں۔

اور اس سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

زَقَمَ فُلَانٌ وَتَزَقَّمَ اس نے کوئی کریہہ چیز نگل لی۔

(ز ك و)

اَلزَّكَاةُ اس کے اصل معنی اس نمو (افزونی) کے ہیں جو برکت الٰہیہ سے حاصل ہو اس کا تعلق

دنیاوی چیزوں سے بھی ہے اور اخروی امور کے ساتھ بھی چنانچہ کہا جاتا ہے۔
زَکَا الزَّرْعُ یَزْکُوْ۔ کھیتی کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا
اور آیت:۔
اَیُّھَا اَزْکٰی طَعَامًا۔ (۱۸-۱۹) کس کا کھانا زیادہ صاف ستھرا ہے۔
میں اَزْکٰی سے ایسا کھانا مراد ہے جو حلال اور خوش انجام ہو اور اسی سے زکوٰۃ کا لفظ مشتق ہے یعنی وہ حصہ جو مال سے حق الہٰی کے طور پر نکال کر فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ یا تو اسلئے کہا جاتا ہے کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعہ اس میں نمو ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے تسمیہ میں ان ہر دو امور کا لحاظ کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ دونوں خوبیاں زکوٰۃ میں موجود ہیں۔
قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا:۔
وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (۲-۴۳) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔
اور تزکیہ نفس سے ہی انسان دنیا میں اوصاف حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب بھی اسی کی بدولت حاصل ہوگا اور تزکیہ نفس کا طریق یہ ہے کہ انسان ان باتوں کی کوشش میں لگ جائے جن سے طہارت نفس حاصل ہوتی ہے اور فعل تزکیہ کی نسبت کبھی تو انسان کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے جیسے فرمایا:۔
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (۹۱-۹) کہ جس نے اپنی روح کو پاک کیا (وہ ضرور اپنی) مراد کو پہنچا۔
اور کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فی الحقیقت وہی اس کا فاعل ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ (۴-۴۹) بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔
اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا (۹-۱۰۳) کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے رہو۔
یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْھِمْ (۲-۱۵۱) وہ پیغمبر انہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں بذریعہ تعلیم (اخلاق رذیلہ) سے پاک کرتا ہے:۔
اور کبھی اس کی نسبت عبادت کی طرف ہوتی ہے کیونکہ عبادت تزکیہ کے حاصل کرنے میں بمنزلہ آلہ کے ہے چنانچہ یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔
وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً (۱۹-۱۳) اور اپنی جناب سے رحمدلی اور پاکیزگی دی تھی۔
لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا (۱۹-۱۹) تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں۔
یعنی وہ فطرتاً پاکیزہ ہوگا اور فطرتی پاکیزگی جیسا کہ بیان کر چکے ہیں۔ بطریق اجتباء حاصل ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیتا ہے اور یہ پاکیزگی تعلیم و ممارست سے نہیں بلکہ محض توفیق الہٰی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اکثر انبیاء اور رسل کے ساتھ ہوا ہے۔ اور آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ لڑکا آئندہ چل کر پاکیزہ اخلاق ہوگا لہٰذا زَکِیًّا کا تعلق زمانہ حال کے ساتھ نہیں بلکہ استقبال کے ساتھ ہے قرآن میں ہے:۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ (۲۳-۴) اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔

یعنی وہ عبادت اس غرض سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کر دے یا وہ اپنے نفوس کو پاک کرنے کی غرض سے عبادت کرتے ہیں وَالْمَآلُ وَاحِدٌ لہٰذا لِلزَّكٰوةِ میں لام تعلیل کے لئے ہے جسے لام علت وقصد کہتے ہیں اور لام تعدیہ نہیں ہے حتیٰ کہ یہ فَاعِلُوْنَ کا مفعول ہو۔

انسان کے تزکیہ نفس کی دو صورتیں ہیں ایک تزکیہ بالفعل یعنی اچھے اعمال کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرنا یہ طریق محمود ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا (۹۱-۹) اور آیت:۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۸۷-۱۴) میں تزکیہ سے یہی مراد ہیں۔ دوسرے تزکیہ بالقول ہے جیسا کہ ایک ثقہ شخص دوسرے کے اچھے ہونیکی شہادت دیتا ہے۔ اگر انسان خود اپنے اچھا ہونے کا دعوے کرے اور خودستائی سے کام لے تو یہ مذموم ہے اور اللہ تعالےٰ نے اس قسم کے تزکیہ سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

لَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۵۳-۳۲) اپنے آپ کو پاک نہ ٹھہراؤ۔

اور یہ نہی تادیبی ہے کیونکہ انسان کا اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا نہ تو عقلاً ہی درست ہے اور نہ ہی شرعاً یہی وجہ ہے کہ جب ایک دانش مند سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی بات ہے جو باوجود حق ہونے کے زیب نہیں دیتی تو اس نے جواب دیا۔ مَدْحُ الْاِنْسَانِ نَفْسَهٗ کہ خودستائی کرنا۔

(ز ل ل)

اَلزَّلَّةُ کے اصل معنی بلا قصد کے قدم پھسل جانے کے ہیں کہا جاتا ہے:۔ زَلَلْتُ (ض) رِجْلُهٗ تَزِلُّ اور پھسلنے کی جگہ کو زَلَّةٌ کہا جاتا ہے نیز جو گناہ بلا قصد سرزد ہو جائے اسے بھی بطور تشبیہ زَلَّةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ (۲-۲۰۹) اگر تم لغزش کھا جاؤ۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (۲-۳۶) انہیں شیطان نے پھسلا دیا۔

اِسْتَزَلَّهٗ (استفعال) کسی کو پھسلانے کا قصد وارادہ کرنا اور آیت کریمہ:۔ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ (۳-۱۵۵) شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ شیطان انہیں آہستہ آہستہ پھسلانے کی کوشش کرتا رہا حتیٰ کہ وہ پھسل گئے کیونکہ جب انسان صغائر میں بے پرواہی سے کام لیتا ہے تو وہ شیطان کے تسلط کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔ حدیث میں ہے۔[1] (۱۶۶)

مَنْ اُزِلَّتْ اِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا کہ جسے بلا طلب نعمت مل جائے اسے منعم کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔

جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ جب بلا قصد نعمت حاصل ہونے پر شکر گزاری لازم ہے تو جو احسان کسی کے قصد اور ارادہ سے ہو اس کا شکریہ بالاولیٰ ضروری ہے۔

اَلتَّزَلْزُلُ اس کے معنی اضطراب کے ہیں اور

---

[1] فی الفائق مرفوعًا (۱: ۳۶۸) وفی غریب ابی عبید (۱: ۱۵) ہب۔ عن یحیٰی بن عبداللہ بن صیفی مرسلا بلفظ من اولیت الیہ ومن ازلت قال ابوعبید لیس نرالجفوظ وفی ابن عساکر عنہ مرسلا من ازلفت الیہ ید یا جع کنز العمال ۲: رقم ۱۹۸۸، ۱۹۹۲ ÷ ÷ ÷

اس میں تکرار حروف تکرار معنی پر دال ہے قرآن میں ہے:۔
إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹-۱) جب زمین بڑے زور سے ہلائی جائے گی۔
إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی (سخت) مصیبت ہوگی۔
وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا (۳۳-۱۱) اور وہ (دشمنوں کے رعب سے) خوب ہی جھڑ جھڑائے گئے۔

(ز ل ف)

اَلزُّلْفَةُ اس کے معنی قرب اور مرتبہ کے ہیں چنانچہ آیت:۔
فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً (۶۷-۲۷) سو جب وہ قریب دیکھیں گے۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ جب وہ مومنین کے مراتب قرب کو دیکھیں گے اور وہ خود ان سے محروم ہوں گے اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں زُلْفَةً سے عذاب کا قرب مراد ہے اور عذاب کو زُلْفَةً کہنا حالانکہ یہ مراتب محمودہ میں استعمال ہوتا ہے، بطور تہکم ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق بشارت یا اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔
اور منازل لیل یعنی رات کے حصوں کو بھی زُلَفٌ کہا گیا ہے جیسے فرمایا:۔
وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ (۱۱-۱۱۴) اور رات کے کچھ حصوں میں۔
شاعر نے کہا ہے[1]۔ (رجز)

(۲۰۴) طَيَّ اللَّيَالِي زُلَفًا فَزُلَفَا
اور راتوں کا تھوڑا تھوڑا کر کے گزرنا۔
اَلزُّلْفٰی۔ قرب و مرتبہ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (۲۶-۴۶) کہ خدا کے ہم کو قریب کر دیں۔
وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ (۵۰-۳۱) اور بہشت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی۔
اور لَیْلَۃُ الْمُزْدَلِفَۃِ کو اس نام سے اس لئے پکارتے ہیں کہ حجاج عرفات سے لوٹنے کے بعد اس رات منیٰ کے قریب پہنچ جاتے ہیں اور حدیث میں ہے[3] (۱۶۷) اِزْدَلِفُوْا اِلَی اللّٰہِ بِرَکْعَتَیْنِ کہ دو رکعت نماز سے اللہ کا قرب حاصل کرو۔

(ز ل ق)

زَلَقٌ اور زَلَلٌ تقریباً ہم معنی ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
صَعِيدًا زَلَقًا (۱۸-۴۰) صاف میدان۔ یعنی چکنی زمین جس میں کوئی سبزہ نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔ فَتَرَكَهُ صَلْدًا (۲-۲۶۴) اسے سپاٹ کر کے بہا گیا۔
اَلْمَزْلَقُ پھسلنے کی جگہ۔ اور آیت کریمہ:۔
لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ (۶۸-۵۱) اپنے نظروں سے (گھور کر) تجھے تیرے مکان سے پھسلا دیں۔

---

[1] وقبلہ: ناج طواہ الاین ہمّا وجفّا وثالثۃ، سماوۃ الہلال حتی احقوقفا۔ والشطر من ارجوزۃ للعجاج راجع اراجیز العرب للسید البکری
[2] وفیہا نا القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۳۰۰) والطبری (۱۹: ۸۱) والکامل ۱۲۹، ۸۲۴ فی ثلاثۃ اشطار وادب الکتاب للصولی ۱۲۲ والصحاح والتاج واللسان (زلف) والشنتمری (۱: ۱۸۰) ودیوانہ ۸۴ والکتاب (۱: ۱۵۰) والبحر (۱: ۸۳) وابن خالویہ ۹۸ والعینی (۱: ۲۹)
[3] وفی النہایہ (زلف) فی حدیث مصعب بن عمیر: فاذا زالت الشمس فازدلف الی اللہ برکعتین واخطب فیہا ای تقرب ۱۲

میں ابصار کے متعلق زَلَق کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الکامل)
(۵-۲) نَظَرٌ تُزِيلُ مَوَاضِعَ الْأَقْدَامِ
ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔
کہا جاتا ہے زَلَقَهُ و اَزْلَقَهُ اسے پھسلایا فَزَلِقَ۔
چنانچہ پھسل گیا۔
یونس لغوی کا قول ہے کہ زَلَقٌ اور اِزْلَاقٌ کا یہ محاورہ صرف قرآن میں استعمال ہوا ہے اور ابی بن کعب نے اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِيْنَ میں ازلقنا (قاف کے ساتھ) پڑھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے وہاں دوسرے لوگوں کو لاکر ہلاک کر ڈالا۔

(ز م ر)

زُمْرَةٌ کے معنی چھوٹی سی جماعت کے ہیں
اس کی جمع زُمَرٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (۳۹-۷۳) اور جنہوں نے اپنے رب کا تقویٰ اختیار کیا وہ بہشت کی طرف گروہ گروہ کرکے چلے جائینگے۔
اور اسی سے شَاةٌ زَمِرَةٌ ہے جس کے معنی کم اُون والی بھیڑ کے ہیں اور بے مروت آدمی کو زَمِرٌ کہا جاتا ہے اور زَمَرَتِ النَّعَامَةُ تَزْمِرُ زِمَارًا کے معنی ہیں شترمرغ نے سیٹی بجائی اور اسی سے کنایہ کے طور پر فاجرہ عورت کو زَمَّارَةٌ و زَمَّارَةٌ کہا جاتا ہے[2]۔

(ز م ل)

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۷۳-۱) اے اوڑھنے والے۔
تو مُزَّمِّلٌ اصل میں مُتَزَمِّلٌ ہے جس کے معنی کپڑے میں لپیٹنے کے ہیں اور استعارہ کے طور پر سستی اور کوتاہی کرنے والے کو بھی تعریضاً مُزَّمِّلٌ کہا جاتا ہے اسی سے زُمَّيْلٌ ہے جس کے معنی کمزور اور ناتواں کے ہیں تَأَبَّطَ شَرًّا کے متعلق اس کی والدہ نے کہا ہے[3]۔
لَيْسَ بِزُمَّيْلٍ شَرُوْبٍ لِلْقَيْلِ
کہ وہ کمزور اور ناتواں نہیں ہے کہ دوپہر کے وقت دودھ پینے کی ضرورت ہو۔

(ز ن م)

اَلزَّنِيْمُ یا مُزَنَّمٌ اسے کہتے ہیں جو کسی قوم سے نسبی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اس کے ساتھ یونہی ملحق ہو جیسے زَنَمَتَا الشَّاةِ یعنی گوشت کے وہ زائد ٹکڑے جو بکری کے گلے یا کان سے نیچے لٹک رہے ہوتے ہیں قرآن میں ہے:
عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (۶۸-۱۳) سخت جھگڑالو اس کے علاوہ بدذات بھی۔
اور زَنِيْمٌ اس غلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی قوم کی طرف منسوب ہو یعنی زَلَمَةٌ یا زَنَمَةٌ کی طرح

---

[1] وفی اللسان انشد ابو اسحاق راجع (زلق. قرض) وقد مر تخریجاً فی (رحض، والبیت فی المعانی للقتبی ۵۸۴/۱۱۲۹ و المتشابہین ۱/۲۸۱ والطبری (۲۸: ۳۷)۱۲ [2] وفی الحدیث نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن کسب الزمارة وہی التی تزمر او الزانیة (راجع غریب ابی عبید (۱: ۴۳) والفائق (۱: ۵۲۹) [3] ترثیہ انظر المعانی فی الکبیر ۱۲۳/۲ وفیہ وفی اللسان (قیل رثاها: وا ابناه، وابن اللیل - لیس بزمیل شروب للقیل، کمقرب الخیل - ترید بابن اللیل انہ صاحب غارات والقیل اللبن الذی یشرب وقت القیلولة ای نوم الظہیرة والفعل منہ قال واقتال ای لیس ہو شروب للقیل مہیا ناوتیق الخصر یحتاج الی الشرب نصف النہار وفی المطبوع الفیل مکان القیل والتصحیح من اللسان (زمل) ۱۲ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

لٹک رہا ہو در حقیقت ان سے نہ ہو شاعر نے کہا ہے[۱] (الطویل)

(۲۰۷) فَاَنْتَ زَنِیْمٌ نِیْطَ فِیْ اٰلِ ھَاشِمٍ
كَمَا نِيْطَ خَلْفَ الرَّاكِبِ الْقَدَحُ الْفَرْدُ

اور تو حرام زادہ ہے جو آل ہاشم کے ساتھ اس طرح معلق ہے جیسے لکڑی کا خالی پیالہ سوار کے پیچھے لٹک رہا ہوتا ہے۔

(ز ن ی)

اَلزِّنَا عقد شرعی کے بغیر کسی عورت سے ہم بستری کرنے کا نام زنا ہے۔ یہ اسم مقصور ہے اگر اسے ممدود پڑھا جائے تو باب مفاعلۃ کا مصدر بھی ہو سکتا ہے اور اس کی طرف نسبت کی جائے تو زَنَوِیٌّ کہا جائے گا اور فلاں لِزِنْیَۃٍ (بکسرہ زاو فتح آں) کے معنی ہیں فلاں حرام زادہ ہے۔

قرآن میں ہے:۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ (۲۴-۳) زانی مرد سوائے زانیہ یا مشرکہ عورت کے کسی سے نکاح نہیں کرتا اور فاجرہ عورت سوائے فاجرہ کے کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرتی۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ (۲۴-۲) زانیہ عورت اور زانی مرد۔

اور اگر مہموز اللام سے ہو جیسے زَنَاءً فِی الْجَبَلِ زَنَاءً وَزُنُوْءً۔ تو اس کے معنی پہاڑ پر چڑھنے کے ہوتے ہیں۔

اَلزَّنَاءُ۔ حاقن یعنی پیشاب روکنے والے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے[۲] (۱۶۸)

لَا یُصَلِّیَنَّ الرَّجُلُ وَھُوَ زَنَاءٌ۔ کہ آدمی کو چاہیے کہ حاقن ہونے کی صورت میں نماز نہ پڑھے۔

(ز ھ د)

اَلزَّھِیْدُ کے معنی حقیر چیز کے ہیں اور کسی چیز سے بے رغبتی کرنے والے یا حقیر سی چیز پر راضی ہو جانے والے کو زَاھِدٌ فِی الشَّیْءِ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَکَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزَّاھِدِیْنَ (۱۲-۲۰) اور اس کے بارہ میں وہ بے رغبت تھے۔

(ز ھ ق)

زَھَقَتْ نَفْسُهٗ کے معنی ہیں کسی چیز پر رنج و غم سے اس کی جان نکل گئی۔ قرآن میں ہے:۔

وَتَزْھَقَ اَنْفُسُھُمْ (۹-۵۵) اور ان کی جانیں (اس حال میں) نکلیں۔

(ز ی ت)

زَیْتٌ وَزَیْتُوْنَۃٌ مثل شَجَرٍ وَشَجَرَۃٍ ایک مشہور درخت کا نام ہے۔ قرآن میں ہے:۔

زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ (۲۴-۳۵) زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے۔ جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔

اَلزَّیْتُ زیتون کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ (۲۴-۳۵) قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی کرے۔

---

[۱] قالہ حسان بن ثابت یہجو ابا سفیان بن الحارث بن عبد المطلب من شواہد الکشاف ۳۸ و دیوانہ ۸۹ والبحریہ: ۵: ۳۰ (والحصری ۱: ۴۳) واللسان (زنم)، وفیات والمرزوقی ۴۵۰ [۲] الحدیث فی اللسان (زنا)، الفائق ۱: ۷۰۲ و راجع لتا ویلہ المرتضی (۲: ۲۸۵-۲۸۶) وغریب ابی عبید (۱: ۱۴۹)

اور زَاتَ طَعَامُہٗ کے معنی ہیں اس نے طعام میں زیتون کا تیل ڈالا جیسے سَمَنَہٗ اور دَھنَہٗ بِہٖ کیطرح زَاتَ رَأْسَہٗ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا جس کے معنی ہیں اس نے سر میں تیل لگایا اور اِزْدَاتَ بمعنی اِدَّھَنَ کے ہیں۔

(ز و ج)

اَلزَّوْجُ جن حیوانات میں نر اور مادہ پایا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نر اور مادہ دونوں میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیائیں سے جفت کو زَوْجٌ کہا جاتا ہے جیسے موزے اور جوتے وغیرہ پھر ہر اس چیز کو جو دوسری کی مماثل یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہو وہ اس کا زوج کہلاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (۷۵-۳۹) اور (آخر کار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرد اور عورت۔

وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (۲-۳۵) (تو) اور تیری بی بی جنت میں رہو۔

اور بیوی کو زَوْجَۃٌ (تا) کے ساتھ کہنا عامی لغت ہے اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے[1]

(۲۰۸) فَبَكَا بَنَاتِي شَجْوَهُنَّ وَزَوْجَتِي

تو میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔

اور زَوْجٌ کی جمع اَزْوَاجٌ آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے: هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ (۳۶-۵۶) وہ اور انکے جوڑے۔

اور آیت :۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ (۳۷-۲۲) جو لوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کرو۔

میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو ہر فعل میں ان کی اقتدا کیا کرتے تھے اور آیت کریمہ:۔

اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا (۲۰-۱۳۱) اس کی طرف جو مختلف قسم کے لوگوں کو ہم نے (دنیاوی سامان) دے رکھے ہیں۔

اشباہ و اقران یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ مراد ہیں اور آیت:۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ (۳۶-۳۶) پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم کی) چیزیں پیدا کیں۔ نیز:۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (۵۱-۴۹) اور تمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنائیں۔

میں اس بات پر تنبیہ کی ہے۔ کہ تمام چیزیں جوہر ہوں یا عرض مادہ و صورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بنا رہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور اس کے لئے صانع (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز تنبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس (خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ اس میں ترکیب پائی جاتی ہے۔ بلکہ نفس ترکیب سے تو کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر

---

[1] قاله عبدة بن الطبيب التيمي والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۷ في ۳۰ بيتا. صح فيها بنيه حين كبر وتمامه :۔ والاقربون الي ثم تصدعوا۔ والبيت في اضداد ابن الانباري ص ۴۳ والمخصص (۱۷: ۴۳) واضداد ابي الطيب ۔ ۴۳ ؎

تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جوہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے لہٰذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت:۔ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى (۲۰-۵۳) طرح طرح کی مختلف روئیدگیاں۔

میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنی آیت:۔

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۳۰-۱۰) ہر قسم کی عمدہ چیزیں (اگائیں)

اور آیت کریمہ:۔ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (۶-۱۴۴) (نر اور مادہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔ میں مراد ہیں

اور آیت کریمہ:۔

كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (۵۶-۷) میں اَزْوَاجٌ کے معنی ہیں قُرَنَاءُ یعنی امثال ونظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو چنانچہ اس کے بعد اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۸۱-۷) اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔

میں بعض نے زُوِّجَتْ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہر پیروکار کو اس کے پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کر دیا جائیگا۔ جیسا کہ آیت:۔ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ (۳۷-۲۲) میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اس روز روحوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملا دیا جائیگا جیسا کہ آیت:۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (۸۹-۲۷، ۲۸)

اے اطمینان پانے والی جان اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

میں بعض نے رَبِّكِ کے معنی صَاحِبِكِ یعنی بدن ہی کئے ہیں اور بعض کے نزدیک زُوِّجَتْ سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کر دیا جائیگا جیسا کہ آیت کریمہ:۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ .... (۳-۳۰) جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائیگا۔

میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۵۲-۲۰) اور ہم انہیں حور عین کا ساتھی بنا دیں گے۔

میں زَوَّجْنٰهُمْ کے معنی باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زَوَّجْنَا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازدواجی تعلقات نہیں ہوں گے کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بِحُوْرٍ کی بجائے زَوَّجْنٰهُمْ حُوْرًا کہتا جیسا کہ زَوَّجْتُهٗ اِمْرَءَةً کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کر دیا۔[1]

(ز و د)

اَلزَّادُ موجودہ ضرورت سے زائد اندوختہ کو کہتے ہیں اور اَلتَّزَوُّدُ (تفعل) کے معنی توشہ لینا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] ہذا مذہب ابی یونس وابو عبیدۃ من علماء العربیۃ قال الواحدی والتنزیل یدل علی ما قال یونس (راجع القرطبی ۲-۲۵۴)، وفی البخاری: زوجناہم بحور ای انکحناہم قال فی الفتح (۶-۳۵۵) وتعقب بان زوج لا یتعدی بالباء — وفیہ نظر لان صاحب المحکم حکاہ لکن قال انہ قلیل، واللہ اعلم۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (۲-۱۶۷)
اور زادِ راہ ساتھ لے جاؤ بے شک بہترین توشہ سوال سے بچنا ہے۔
اور اَلْمِزْوَدُ اس توشہ دان کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جاتا ہے اور اَلْمَزَادَۃُ مشکیزہ جس میں پانی بطور زادِ راہ رکھا جاتا ہے۔

(ز و ر)

اَلزَّوْرُ سینہ کا بالائی حصہ اور زُرْتُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا یا اس کے سینہ کا قصد کیا (اس کی ملاقات کی. جیسا کہ وَجَهْتُهٗ کا محاورہ ہے یعنی اس کے سامنے اپنا چہرہ کیا یا اس کے چہرہ کا قصد کیا۔ رَجُلٌ زَائِرٌ ملاقاتی زَائِرٌ کی جمع زَوْرٌ آتی ہے جیسا کہ سَافِرٌ کی جمع سَفْرٌ مگر کبھی رَجُلٌ زَوْرٌ بھی آجاتا ہے اس صورت میں یہ مقصد ہوتا ہے جیسا کہ ضَعْفٌ کا لفظ ہے نیز اَلزَّوْرُ کے معنی سینہ کے ایک طرف جھکا ہونا کے ہیں اور جس کے سینہ میں ٹیڑھا پن ہو اسے اَلْاَزْوَرُ کہتے ہیں اور آیت کریمہ:۔ تَزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ (۱۸-۱۷) کے معنی یہ ہیں کہ سورج ان کے غار سے ایک طرف کو ہٹ کر نکل جاتا ہے یہاں تَزَاوَرُ میں حرف زار پر تشدید بھی پڑھی جاتی ہے اور بغیر تشدید کے بھی اور بعض نے تَزْوَرُّ (افعلال) پڑھا ہے[1] مگر الحسن فرماتے ہیں یہ قراءت یہاں موزوں نہیں ہے کیونکہ اِزْوَرَّ اِزْوِرَارًا کے معنی ہیں منقبض ہونا کہا جاتا ہے تَزَاوَرَ عَنْهُ وَ اِزْوَرَّ عَنْهُ اس نے اس سے پہلو تہی کی۔ اس سے ایک جانب ہٹ گیا اور جس کنویں کی کھدائی میں ٹیڑھا پن ہو اسے بِئْرٌ زَوْرَاءُ کہا جاتا ہے۔ اسی سے جھوٹ کو اَلزُّوْرُ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی جہت راست سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

ظُلْمًا وَّزُوْرًا (۲۵-۴) ظلم اور جھوٹ سے۔
قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲-۳۰) جھوٹی بات سے۔
مِنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا (۵۸-۲) اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔
لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (۲۵-۷۲) وہ جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔

اور شاعر کے قول۔

(۲۰۹) وَجَاءُوْا بِزُوْرَيْهِمْ وَجِئْنَا بِالْاَصَمِّ[2]
وہ اپنے دو جھوٹے خدا لے کر آگئے اور ہم اپنے بہادر سردار کو۔

میں زُوْرٌ کے معنی بت کے ہیں[3] کیونکہ بت پرستی بھی جھوٹ اور حق سے ہٹ جانے کا نام ہے۔

---

[1] بالتشدید قراءۃ الحرمین وابی عمرو بالتخفیف قراءۃ الکوفیین والاعمش وطلحۃ وابن ابی لیلی اما تزور ففی قراءۃ قتادۃ وابن ابی اسحاق وابن عامر وفی قراءۃ اخری ای تزاوار علی خیال حمار وھی قراءۃ ابی رجاء وایوب السختیانی وابن ابی عبلۃ وجابر وقراءۃ ابن مسعود راجع ابی حیان (۶: ۱۰۷-۱۰۸) [2] الرجز للاغلب العجلی قالہ یوم الزویین حرب کانت بین بکر و بین بنی تمیم وھو الاصم لقب عمرو بن قیس بن عامر الشیبانی رئیس بکر بن وائل یومئذ یعنی بزوریہم بکرین مجللین قد قیدوہما وقالوا لن نفر حتی یفرا ای الاصنام بعدۃ بشیخ لنا فکان من عہدام۔ وفی المطبوع نسبہ بنیہم مصحف وارجع فی الامالی (۲: ۱۰۸) والسمط ۱۰۸ والعقد (۳: ۳۴۴) ۱۵ (۲۰۰۰) وایام العرب ۳۴ وھو الحماسۃ وابن الشجری ۲۷ واللسان والتاج زور والصم وفیہ عن ابی عبیدۃ وارجع لیعلی بن منصور وراجع ابدال ابی الطیب (۲: ۹۹) وابدال یعقوب ۴۵ وشرح السبع لابن الانباری ۴۹۲ وفی روایتہ لیشنعہم وزرا والغالث۔ [3] تقدم الشیخ تفاہ وکدم والاغلب العجلی د ۲۱ھ راجز جاہلی اسلامی احد المعمرین واستشہد فی وقعۃ نہاوند انظر المؤتلف ۲۳ والخزانۃ البغدادیۃ (۱: ۳۳۳) والاعلام للزرکلی (۱: ۳۳۹) ۱۲

زول

زَالَ الشَّیْئُ یَزُوْلُ زَوَالاً کسی چیز کا اپنا صحیح رخ چھوڑ کر ایک جانب مائل ہو جانا، اپنی جگہ سے ہٹ جانا اور اَزَلْتُهٗ وَ زَوَّلْتُهٗ کے معنی ہیں ایک جانب مائل کر دینا کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا دینا۔ قرآن میں ہے :۔

اَنْ تَزُوْلَا (۳۵-۴۱) کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں

وَلَئِنْ زَالَتَا (۳۵-۴۱) اگر وہ ٹل جائیں۔

لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (۱۴-۴۶) کہ اس سے پہاڑ ہی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔

(ز ی د)

اَلزِّیَادَةُ اس اضافہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد بڑھایا جائے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ زِدْتُهٗ میں نے اسے بڑھایا فَازْدَادَ چنانچہ وہ بڑھ گیا اور آیت :۔

وَنَزْدَادُ کَیْلَ بَعِیْرٍ (۱۲-۶۵) اور (اس کے حصہ کا) ایک بار شتر غلہ اور لیں گے۔

میں نَزْدَادُ فعل متعدی نہیں ہے حتیٰ کہ کَیْلَ بَعِیْرٍ کو اس کا مفعول کہا جائیگا بلکہ یہ اِزْدَدْتُ فَضْلاً کی طرح ہے جس کے معنی فضل میں زیادہ ہونے کے ہیں اور یہ باب سَفِهَ نَفْسَهٗ کے قبیل سے ہے۔

اور زیادہ (زیادتی) کبھی مذموم ہوتی ہے۔ یعنی کسی چیز کا ضرورت سے زیادہ ہونا مثلاً انگلیوں اور جانور کی ٹانگ میں زیادتی اور اسی طرح جگر میں جو گوشت کا زائد ٹکڑا پایا جاتا ہے، وہ چونکہ کھایا نہیں جاتا اس لئے اسے زائد اور بے فائدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور کبھی زیادتی محمود ہوتی ہے جیسے فرمایا :۔

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ (۱۰-۲۶) جو نیکی کرتے ہیں ان کیلئے نیک بدلہ ہے اور بڑھ کر

کئی طرق سے مروی ہے (۱۶۹) کہ یہاں زیادہ سے نظر الی وجہ اللہ مراد ہے اور اس سے ان انعامات اور احوال کی طرف اشارہ ہے جن کا اس زندگی میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے[1]۔ اور آیت

وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲-۲۴۷) اور علم و جسم میں اسے زیادہ کشائش بخشی۔

میں زیادہ سے مراد یہ ہے کہ وہ علم و جسم میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نیز فرمایا :۔

وَیَزِیْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا هُدًی (۱۹-۷۶) اور اللہ ان کو روز بروز زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔

اور مذموم زیادتی کے متعلق فرمایا :۔

مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۳۵-۴۲) ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (۱۶-۸۸) اور ہم ان کے حق میں عذاب پر عذاب بڑھاتے جائیں گے۔

فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ (۱۱-۶۳) تو تم میرا اور نقصان ہی کر رہے ہو۔

اور آیت کریمہ :۔

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (۲-۱۰) سو اللہ نے ان کے مرض میں اور اضافہ کر دیا۔

میں مرض کے بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی سرشت کچھ ایسی ہے، کہ جب وہ کوئی برا یا اچھا فعل سر انجام دیتا ہے تو جوں جوں اس فعل کو

---

[1] قال ابن کثیر (۲: ۴۱۴) فی تفسیرہ وبنا ء اہا المروی عن السلف والخلف وقد وردت فیہ احادیث کثیرۃ عن السلف۔

سرانجام دیتا رہتا ہے توں توں اس فعل کا ملکہ اس
میں قوی ہوتا رہتا ہے۔ اور آیت :۔
هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (۵۰-۳۰) کیا کچھ اور ہے ؟۔
میں طلب زیادہ بھی مراد ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا
ہے کہ اس میں دوزخ کے بھر جانے پر تنبیہ ہو اور یہ
کہ اللہ تعالیٰ نے جو دوزخ سے وعدہ کیا ہے کہ۔
لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۱۱-۱۱۹)
کہ ہم (کیا) جنات (اور کیا) بنی آدم سب سے
دوزخ بھر دیں گے
وہ پورا ہو کر رہے گا اور زِدْتُہٗ فعل متعدی
ہے اور زَادَ بمعنی اِزْدَادَ (لازم) بھی آیا ہے۔
قرآن میں ہے :۔
وَازْدَادُوْا تِسْعًا (۱۸-۲۵) اور نو برس اس کے
اوپر) اور رہیں۔
ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا (۳-۹۰) پھر وہ کفر میں (اور)
بڑھ گئے
وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ (۱۳-۸)
اور نیز (ہر ماہ کے) پیٹ کا گھٹنا اور بڑھنا)
اور شَتَّى، زَائِدٌ وَزَيْدٌ دونوں طرح کہا
جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)
(۲۱۰) وَاَنْتُمُوْا مَعْشَرٌ زَيْدٌ عَلٰى مِائَةٍ
فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ كَيْدًا فَكِيْدُوْنِیْ
اور تم سو سے زیادہ آدمی ہو تو تم میرے خلاف
جو تدبیر کرسکتے ہو کرو۔

(ز ی غ)

اَلزَّيْغُ کے معنی حالت استقامت سے ایک
جانب مائل ہوجانا کے ہیں اور اَلتَّزَايُغُ کے معنی
تَمَايُلٌ یعنی بہت زیادہ مائل ہوجانا یا ایک دوسرے
سے مائل ہونا۔ رَجُلٌ زَائِغٌ مائل ہونے والا۔ اس
کی جمع زَاغَةٌ وَزَائِغُوْنَ آتی ہے۔ زَاغَتِ الشَّمْسُ
سورج مائل بزوال ہوگیا زَاغَ الْبَصَرُ نگاہ نے
غلطی کی ایک طرف ہٹ گئی۔ اور آیت کریمہ :۔
وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ (۳۳-۱۰) کے یہ معنی بھی
ہوسکتے ہیں کہ خوف وہراس کی وجہ سے انہیں کچھ
نظر نہیں آئے گا اور یہ بھی کہ یہ آیت :۔
يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ (۳-۱۳)
کے ہم معنی ہو یعنی نگاہیں صحیح طور پر کسی چیز کا ادراک
نہیں کرسکیں گی۔ نیز فرمایا :۔
وَمَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۵۳-۱۷) نظر نہ تو
حقیقت سے ایک طرف ہٹی اور نہ ہی اس نے
حد سے تجاوز کیا۔
مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ (۹-۱۱۷) اس کے بعد
کہ ..... پھر جانے کو تھے۔
اور آیت کریمہ :۔ فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ
قُلُوْبَهُمْ (۶۱-۵) کے معنی یہ ہیں کہ جب
وہ از خود صحیح راہ سے ہٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے
بھی ان کے دلوں کو اسی طرف جھکا دیا۔

---

[1] قالہ ذوالاصبع العدوانی و اسمہ حرثان بن محرث (فی الصحاح زید) طا الامالی (۱: ۲۵۳) طراً بدل کیداً وفی المفضلیات (۱: ۱۷۱) الکافی ۸۵ خفی بدلہ۔ والبیت فی اللسان (زید) والحکم دعشرا ہو من قصیدۃ مفضلیۃ ۳۲ والبیت (۲۹) القصیدۃ بتمامہا فی الامالی (۱: ۲۵۲-۲۵۴) والکامل ۵۰۸ وفیہ کیدکم بدل امرکم وانظر القصیدۃ منتہی الطلب (۱: ۱۹۶-۱۹۷) والاغانی (۳: ۸-۱۰) والشعراء ۶۳۶-۶۳۸ شر البیت فی الکتاب والحماسۃ لابن الشجری ۱۷ والخزانۃ (۳: ۲۲۶) والعینی (۳: ۲۸۷) والمرتضی ۲ ۲۵ ولترجمۃ الشاعر راجع الاشتقاق ۱۶۳ والمعمرین ۹ والشعراء (۲۸-۲۹۰) والخزانۃ (۲۰۶-۲۰۹)

ز ی ل

زَالَهُ يَزِيلُهُ زَيْلًا کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کرنا کے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۲۱۱) " زَالَ زَوَالُهَا "

کہ اللہ تعالیٰ محبوبہ کے خیال کو میرے دل سے زائل کردے۔ اور زَوَالٌ کے معنی التصرف یعنی پھرنا بھی آتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْكَتَ اللّٰهُ نَامَتَهُ کی طرح محاورہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو ختم کردیا۔ اور یہی معنی زِيلَ زَوِيلُهُ کے ہیں شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

(۲۱۲) " اِذَا مَا رَأَتْنَا زَالَ مِنْهَا زَوِيلُهَا "

جب وہ ہمیں دیکھتی ہے تو بدک کر بھاگ جاتی ہے اور جن کے نزدیک زال متعدی نہیں ہے وہ شعر اول میں زَوَالَهَا کو منصوب علی المصدر مانتے ہیں یعنی مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

تَزَيَّلُوْا وہ متفرق ہوگئے۔ قرآن میں ہے:

لَوْ تَزَيَّلُوْا (۴۸-۲۵) اگر وہ الگ الگ ہوجاتے۔

اور آیت: فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ (۱۰-۲۸) پھر ہم ان میں جدائی ڈال دیں گے۔

میں اگر زِلْتُهُ کو متعدی کہا جائے تو باب تفعیل تکثیر کے لئے ہوگا یعنی بالکل الگ الگ کردینا جیسے مِزْتُهُ وَمَيَّزْتُهُ اور مَازَالَ اور لَا يَزَالُ ہمیشہ حرف نفی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور یہ کَانَ فعل ناقص کی طرح اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتے ہیں اور اصل میں یہ اجوف یائی ہیں کیونکہ عربی زبان میں زَيَّلْتُ (تفعیل) یا کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور مَا زَالَ کے معنی ہیں مَا بَرِحَ یعنی وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا چنانچہ قرآن میں ہے:

وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ (۱۱-۱۱۸) وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمْ (۹-۱۱۰) وہ عمارت ہمیشہ (ان کے دلوں میں باعث اضطراب بنی) رہے گی۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲۲-۵۵) کافر لوگ ہمیشہ ...... رہیں گے۔

مَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ (۴۰-۳۴) تم برابر شبہ میں رہے۔

اور محاورہ میں مَا زَالَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کہنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ مَا كَانَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کہا جاتا ہے کیونکہ زَالَ میں ثَبَتَ کی ضد ہونے کی وجہ سے نفی کے معنی پائے جاتے ہیں اور "مَا" و "لَا" بھی حروف نفی سے ہیں اور نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے لہٰذا مَا زَالَ مثبت ہونے میں کَانَ کی طرح ہے تو جس طرح کَانَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کی ترکیب صحیح نہیں ہے اس طرح مَا زَالَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا

---

[1] قطعة من عجز البيت قاله الاعشى وتكملته: هذا النهار بدا لها من همها - ما بالها بالليل زال زوالها. والبيت من قصيدة يمدح فيها قيس بن معديكرب مطلعها: رحلت سمية غدوة اجمالها. غضبى عليك فما تقول بدا لها: ديوانه ۱۵-۲۲ واللسان (زول) مثل للعرب قديم واختلف فى اى زوالها منصوب اللام او مرفوعها ومن رواه برفع اللام نزوالها، قال فيه اقوال راجع اللسان وقوى هو فى ذيل الامالى ۵۷ يقال: زال زوالا وزيل زويله وزوالا، اى ذهب ومات. [2] قاله ذوالرمة يصف بيضة وصدره: وبيضاء لا تنحاش منا وامها... وفى رواية المنار (رما نزول حوش زيل) زيل منها بدل زال منها ومعناه ذعرت منا ونفرت والبيت فى ديوانه ۵۴۵ والاضداد لابن الانبارى ۲۷۷ والفائق ۱: ۲۷ والاضداد لابى الطيب ۱: ۳۳۲ والحيوان ۵: ۴۷ والمعانى للقتبى ۲۵۵ والفائق (۱: ۸۲، ۱۵۰) وفى كل المراجع زيل منها بدل زال منها ولكلا الروايتين محمل وان كان الاول اكثر ولم يرد الثاني سوى المؤلف.

بھی صحیح نہیں ہوگا۔

ر ز ی ن

اَلزِّیْنَۃُ زینت حقیقی وہ ہوتی ہے جو انسان کے لئے کسی حالت میں بھی معیوب نہ ہو یعنی نہ دنیا میں اور نہ ہی عقبٰی میں اور وہ چیز جو ایک حیثیت سے موجب زینت ہو لیکن دوسری حیثیت سے موجب زینت نہ ہو وہ زینت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ اسے صرف ایک پہلو کے اعتبار سے زینت کہہ سکتے ہیں اور اجمالاً زینت کے تین اقسام ہیں۔

(۱) زینت نفسی جیسے علم اور اعتقادات حسنہ جو نفس انسانی کے لئے باعث آرائش بنتے ہیں۔

(۲) زینت بدنی۔ جیسے قوت اور طول قامت وغیرہ چیزیں جو جسم کے لئے خوبصورتی کا سبب بنتی ہیں۔

(۳) زینت خارجیہ جیسے مال وجاہ وغیرہ جو انسان کیلئے باعث زینت بنتے ہیں لہٰذا آیت کریمہ:۔ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹۔۷) خدا نے تمہیں ایمان کی محبت دے دی اور اس کو تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔ میں زینت سے نفسانی زینت مراد ہے اور آیت کریمہ:۔ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ (۷۔۳۲) (ان سے پوچھو کہ) اللہ نے جو زینت (کے سازو سامان پیدا کئے ہیں) ان کو کس نے حرام کیا ہے۔ کو بعض نے زینت خارجی پر محمول کیا ہے جیسا کہ مروی ہے کہ کچھ لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے تو اس آیت کے ذریعہ انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں زِیْنَۃَ اللّٰہِ سے وہ کرم مراد ہے جس کا ذکر کہ آیت:۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹۔۱۳) اور نعم میں بڑا شریف تو وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے میں پایا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ؎

(۲۱۳) وَزِیْنَۃُ الْمَرْءِ حُسْنُ الْاَدَبِ

کہ حسن ادب ہی انسان کے لئے باعث زینت بن سکتا ہے اور آیت:۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ فِیْ زِیْنَتِہٖ (۲۸۔۷۹) الغرض (ایک دن قارون) اپنے ترک سے اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ میں مال وجاہ اور سازو سامان وغیرہ دنیوی زینت مراد ہے زَانَہٗ کَذَا وَزَیَّنَہٗ کے معنی کسی چیز کے حسن کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ بالفعل آراستہ کر کے یا بذریعہ قول کے (جیسے کسی چیز کو لوگوں کی نظر میں بھلا کر کے دکھانا) اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد مقامات پہ تزیین کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے مگر بعض آیات میں اسے شیطان کی منسوب کیا گیا ہے اور بعض مواقع میں بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں لایا گیا ہے چنانچہ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتے ہوئے ایمان کے متعلق فرمایا:۔

وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹۔۷) اور اس (ایمان) کو تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔

اور کفار کے متعلق فرمایا:۔

زَیَّنَّا لَہُمْ اَعْمَالَہُمْ (۲۷۔۴) ہم نے ان کے اعمال کو ان کے لئے عمدہ کر دکھایا۔

زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمْ (۶۔۱۰۹) اور ہم نے ہر امت کے لئے ان کا عمل اچھا کر دکھایا۔

اور شیطان کی طرف نسبت کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَاِذْ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَہُمْ (۸۔۴۸) اور شیطان نے ان لوگوں کے اعمال بد ان کو اچھے کر دکھائے۔

لَاُزَیِّنَنَّ لَہُمْ فِی الْاَرْضِ (۱۵۔۳۹) میں ان کے لئے

لہ راجع ابن کثیر لہ لم اجدہ

(ساز و سامان۔ زندگی کو) انہیں عمدہ کر دکھاؤں گا۔
اور بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں فرمایا:۔
زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ (۳-۱۴) لوگوں کو (دنیا کی) مرغوب چیزوں کے ساتھ وابستگی بھلی معلوم ہوتی ہے۔
زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ (۹-۳۷) ان کی بدکرداریاں ان کو بھلی کر کے دکھائی گئیں۔
زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (۲-۲۱۲) جو لوگ دین حق کے منکر ہیں دنیا کی زندگی انہیں عمدہ کر دکھائی گئی۔

اور آیت کریمہ:۔
زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ (۶-۱۳۷) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے شریکوں نے ان کے بچوں کو جان سے مار ڈالنا اچھا کر دکھایا ہے۔

میں زُيِّنَ اصل میں زَيَّنَهٗ شُرَكَآؤُهُمْ ہے
اور آیات زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (۶۷-۵) ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے زینت دی۔
اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ (۳۷-۶) اور ہم ہی نے آسمان دنیا کو (ایک) زینت یعنی ستاروں سے آراستہ کیا۔
وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۵-۱۶) اور ہم نے دیکھنے والوں کے لئے اسے خوبصورت بنایا۔
میں اس زینت کیطرف اشارہ ہے جسکا تعلق حاسۂ بصر سے ہے اور جسے عوام وخواص محسوس کرتے ہیں۔ نیز اس میں زینت معنوی یعنی ستاروں کی رفتار انکے احکام کیطرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے جسکی معرفت خواص کو حاصل ہو سکتی ہے پھر اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو زینت بخشنا تکوین وابداع سے ہوتا ہے یعنی انکو آراستہ حالت میں پیدا کرنا اور لوگوں کا کسی چیز کو زینت بخشنا یا تو ملمع سازی سے ہوتا ہے اور یا بذریعہ قول کے یعنی کسی چیز کی تعریف کرنا اور اسے خوشنما صورت میں پیش کرنا۔

کِتَابُ السِّین

(س ء ل)

اَلسُّؤْل ۔ دراصل اس حاجت کو کہتے ہیں جس پر نفس حریص ہو قرآن میں ہے:۔ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ يَامُوْسٰى (۲۰-۳۶) موسیٰ تمہاری دعا قبول کرلی گئی۔ اور یہ سُؤْل وہی ہے جس کا تذکرہ آیت :۔ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ (الآیة) میں ہے۔ اَلسُّؤْل اور اَلْاُمْنِيَّة کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن امنیة کا لفظ اس خواہش پر بولا جاتا ہے جو تا حال انسان کے دل میں ہو اور اس کا اظہار نہ کیا ہو لیکن سُؤْل اس حاجت کو کہتے ہیں جو طلب بھی کی جاچکی ہو تو گویا سُؤْل کا درجہ امنیة کے بعد کا ہے۔

(س ب ب)

اَلسَّبَبُ اصل میں اس رسی کو کہتے ہیں جس سے درخت خرما وغیرہ پر چڑھا (اور اس سے اترا) جاتا ہے اس کی جمع اسباب ہے۔ قرآن میں ہے:۔ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ (۳۸-۱۰) تو ان کو چاہیئے کہ سیڑھیاں لگاکر (آسمان پر) چڑھیں۔ اور یہ معنوی لحاظ سے آیت:۔ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ (۵۲-۳۸) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر چڑھ کر (آسمان سے باتیں) سن آتے ہیں۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ پھر اسی مناسبت سے ہر اس شے کو سَبَبٌ کہا جاتا ہے۔ جو دوسری شے تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَاٰتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا فَاَتْبَعَ سَبَبًا۔ (۱۸:۸۴-۸۵) اور اسے ہر قسم کے ذرائع بخشے سو وہ ایک راہ پر چلا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر چیز کی معرفت اور سامان و ذرائع عطا کئے تھے جس کے ذریعہ وہ اپنے مقصود تک پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ذریعہ اختیار کیا اور آیت کریمہ:۔ لَعَلِّيْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ۔ (۴۰:۳۶-۳۷) تاکہ جو آسمان تک پہنچنے کے ذرائع ہیں ہم ان تک جا پہنچیں۔ میں بھی اسباب سے مراد ذرائع ہی ہیں یعنی تاکہ ہم ان اسباب و ذرائع کا پتہ لگائیں جو آسمان میں پائے جاتے ہیں اور ان سے موسیٰ (علیہ السلام) کے مزعومہ خدا کے متعلق معلومات حاصل کریں اور عمامہ، دوپٹہ اور ہر لمبے کپڑے کو طول میں رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر بھی سَبَبٌ کہا جاتا ہے اسی

جہت سے شاہراہ کو بھی سَبِیْبٌ کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ شاہراہ کو بھی خَیْطٌ (تاگا) اور کبھی ممدود کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

اَلتَّسَبُّبُ (مصدر ن) کے معنی مغلظات اور فحش گالی دینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ (۶-۱۰۹) تو جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو حاجت روائی کے لئے بلایا (یعنی ان کی پرستش کیا کرتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ بھی ازراہ نادانی ناحق خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

ان کے اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ صریح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیں گے۔ کیونکہ اس طرح تو کوئی مشرک بھی نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ جوش میں آکر شان الٰہی میں گستاخی کریں گے اور ایسے الفاظ استعمال کریں گے جو اس کی ذات کے شایان شان نہیں جیسا کہ عام طور پر مجادلہ کے وقت ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے[1]

فَمَا کَانَ ذَنْبُ بَنِیْ مَالِكٍ
بِاَنْ سُبَّ مِنْهُمْ غُلَامٌ فَسَبّ
بِاَبْیَضَ ذِیْ شَطَبٍ قَاطِعٍ
یَقُدُّ الْعِظَامَ وَیَبْرِی الْقَصَبْ

بنی مالک کا صرف اتنا گناہ ہے کہ ان میں سے ایک لڑکے کو بخل پر عار دلائی گئی اور اس نے عار کے جواب میں سفید دھاری دار قاطع تلوار سے اپنی موٹی اونٹنیوں کو ذبح کر ڈالا جو ہڈیوں کو کاٹ ڈالتی ہو اور اور قصب یعنی بانس کو تراش دیتی ہو ان اشعار میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جس کو دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے کہ[2]

نَشْتِمُ بِالْاَفْعَالِ لَا بِالتَّکَلُّمِ

کہ ہم زبان کی بجائے افعال سے گالی دیتے ہیں۔

اور سِبٌّ (فِعْلٌ) بمعنی دشنام دہندہ کیلئے آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[3]

لَا تَسُبَّنَّنِیْ فَلَسْتَ بِسِبِّیْ
اِنَّ سِبِّیْ مِنَ الرِّجَالِ الْکَرِیْمُ

مجھے گالی نہ دو تم مجھے گالی دینے کے لائق نہیں ہو کیونکہ نہایت شریف ورجہ کا آدمی ہی مجھے گالی دے سکتا ہے۔

اَلسُّبَّةُ ہر وہ چیز جو عار و ننگ کی موجب ہو اور کنایہ کے طور پر دبر کو بھی سُبَّةٌ کہا جاتا ہے۔

---

[1] قالہ ذوالخرق الطہوی واسمہ قرط یتعصب لغالب بن صعصعۃ ابی الفرزدق وکان بینہ وبین سحیم بن وثیل الرماحی معاقرۃ یوم صوءر (موضع قریب من الکوفۃ) واختلفت الروایات فی القصیدۃ راجع الخبر والاختلاف فی ذیل الامالی ۵۲-۴۵ والسمط ۴۷-۴۷ والابیات مقیدۃ القافیہ فی اللسان (سب) والنقائض ۱۰۷ والامالی (۲: ۱۱۴) والمؤتلف للآمدی ۱۲۷ وایام العرب ۴۰۱-۴۰۴ وفی روایۃ بنی عامر بدل بنی مالک وہو وہم نبہ علیہ ابن درید والازہری ورد البکری فی التنبیہ راجع ایضا المعانی للقتبی ۱۰۸۷ والمحکم (عقر) والثانی من الابیات: عراقیب کوم طوال الذری۔ تخر بوائکھا للرکب ۱۲ [2] قالہ معبد بن علقمۃ یخاطب زہیرا داود: تجهل ایدینا ویحلم رأینا۔ والبیت من کلمۃ فی الحماسۃ رواہ التبریزی (۲: ۹۱) وفی السمط (۱: ۴۴۳) فی ثلاثۃ والتنبیہ للبکری ۵۴ وفی الصون (۱: ۲۸) والشطر منسوب لایاس بن قتادۃ وعجزہ فیہ: تعاقب ایدینا ویحلم رأینا والبیت فی المضنون (۸۳) والصناعتین ۹۴ [3] البیت فی اصلاح یعقوب ۴۱ ودائرۃ المعارف (۲: ۱۳۳) ولم ینسبہ التبریزی فی تہذیبہ ۲۱ وہو لعبد الرحمان بن حسان یہجو مسکینا الدارمی قال والسب الذی یسابک ۱۲

جیسا کہ اسے سَوْءَۃٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
اَلسَّبَّابَۃُ انگشت شہادت یعنی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کیونکہ گالی دیتے وقت اس کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے جیسا کہ اس انگلی کو مُسَبِّحَۃٌ (انگشت شہادت) کہا جاتا ہے۔ چونکہ تسبیح کے وقت اشارہ کے لئے اسے اٹھایا جاتا ہے۔

(س ب ت)

اَلسَّبْتُ کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں اور اسی سے کہا جاتا ہے سَبَتَ السَّیْرَ اس نے تسمہ کو قطع کیا۔ سَبَتَ شَعْرَہٗ اس نے اپنے بال مونڈے سَبَتَ اَنْفَہٗ اس کی ناک کاٹ ڈالی۔
بعض نے کہا ہے کہ ہفتہ کے دن کو یَوْمَ السَّبْتِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق اتوار کے دن شروع کی تھی اور چھ دن میں تخلیق عالم فرما کر سنیچر کے دن اسے ختم کر دیا تھا اسی سے سَبَتَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی ہیں وہ ہفتہ کے دن میں داخل ہوا۔ اور آیت کریمہ:
یَوْمَ سَبْتِہِمْ شُرَّعًا (۷-۱۶۳) سنیچر کے دن (مچھلیاں) سینہ سپر ہو کر ان کے سامنے آجاتیں۔
میں بعض نے یَوْمَ سَبْتِہِمْ سے ان کے کاروبار کو چھوڑنے کا دن مراد لیا ہے اس اعتبار سے یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز وہ کاروبار نہ چھوڑتے اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ جس روز سنیچر نہ ہوتا ان ہر دو معنی کا مآل ایک ہی ہے اور آیت:
اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ (۱۶-۱۲۴) میں سبت سے مراد سنیچر کے دن ترک عمل کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سنیچر کے دن کام کاج چھوڑنے کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا..... اور آیت:
وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا (۷۸-۹) اور نیند کو (موجب) راحت بنایا۔ میں سبات کے معنی ہیں حرکت وعمل کو چھوڑ کر آرام کرنا اور یہ رات کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:
لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ (۱۰-۶۷) تاکہ تم رات میں راحت کرو۔ میں مذکور ہے یعنی رات کو راحت وسکون کے لئے بنایا ہے۔

(س ب ح)

اَلسَّبْحُ اس کے اصل معنی پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں سَبَحَ (ف) سَبْحًا وَسِبَاحَۃً وہ تیز رفتاری سے چلا پھر استعارۃً یہ لفظ فلک میں نجوم کی گردش اور تیز رفتاری کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا:
کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۲۱-۳۳) (سب (اپنے اپنے) فلک یعنی دائرہ میں تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔
اور گھوڑے کی تیز رفتاری پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:
وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا (۷۹-۳) اور فرشتوں کی قسم جو آسمان وزمین کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں۔
اور کسی کام کو سرعت کے ساتھ کر گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:
اِنَّ لَکَ فِی النَّہَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (۷۳-۷) اور دن کے وقت تو تم بہت مشغول کار رہتے ہو۔
اَلتَّسْبِیْحُ کے معنی تنزیہ الٰہی بیان کرنے کے ہیں اصل میں اس کے معنی عبادت الٰہی میں تیزی کرنا کے ہیں..... پھر اس کا استعمال ہر فعل خیر پہ

ہونے لگا ہے جیسا کہ اِبْعَاد کا لفظ شر پر بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے اَبْعَدَ کَا اللہُ خدا اسے ہلاک کرے۔ پس تسبیح کا لفظ قولی فعلی اور قلبی ہر قسم کی عبادت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔

فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ (۳۷-۱۴۳) تو اگر یونس علیہ السلام اس وقت (خدا کی تسبیح (و تقدیس) کرنے والوں میں نہ ہوتے۔

یہاں بعض نے مُسَبِّحِيْنَ کے معنی مُصَلِّيْنَ کئے ہیں لیکن انسب یہ ہے کہ اسے تینوں قسم کی عبادت پر محمول کیا جائے۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (۲-۳۰) اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔

وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (۳-۴۱) اور صبح و شام (اسی کی) تسبیح و تقدیس) کرتے رہنا۔

فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۵۰-۴۰) (اور رات میں بھی) اس کی تسبیح و تقدیس) کرو اور نماز ول کے بعد بھی۔

لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ (۶۸-۲۸) یعنی اس کی عبادت اور شکر گزاری کیوں نہیں کرتے ہو۔

بعض نے اسے استثنا کے معنی پہ حمل کیا ہے یعنی تم انشاء اللہ کیوں نہیں کہتے اور اس کی دلیل آیت اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ لَا يَسْتَثْنُوْنَ (۶۸-۱۷) ہے یعنی انہوں نے قسمیں کھائیں کہ صبح ہوتے ہی پھل کاٹ لیں گے اور استثنا نہ کیا۔

اور آیت کریمہ :۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷-۴۴) ساتوں آسمان اور زمین اور جو (فرشتے اور آدمی) آسمان و زمین میں (سب) اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتے ہیں اور (جتنی چیزیں ہیں سب اس کی حمد (و ثنا) کے ساتھ اس کی تسبیح (و تقدیس) کر رہی ہیں مگر تم لوگ ان کی تسبیح (و تقدیس) کو نہیں سمجھتے۔

میں تسبیح کے وہی معنی مراد ہیں جو کہ آیت کریمہ :۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (۱۳-۱۶) اور جس قدر مخلوق آسمان و زمین میں ہے (سب) خوشی سے یا زبردستی خدا ہی کے آگے سر بسجود ہے۔

اور آیت :۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ (۱۶-۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں (سب) اللہ ہی کے آگے سر بسجود ہیں۔

میں سجدہ کے ہیں یعنی تسبیح کے حقیقی معنی مراد ہیں، جیسا کہ سجدہ کے ہیں مگر ان کا ادراک ہماری سمجھ سے بالاتر ہے جیسا کہ آیت :۔

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ کے استدراک اور آسمان و زمین کے ذکر کے بعد وَمَنْ فِيْهِنَّ کے عطف سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے اس کی تقدیر یہ بیان کی ہے۔

يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَيَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي الْاَرْضِ مگر یہ صحیح نہیں ہے اولاً تو اس لئے کہ مَنْ (یعنی ذوالعقول) کی تسبیح کو ہم سمجھتے ہیں اور قرآن نے وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ کہا ہے اور ثانیاً اس لئے کہ بعد میں وَمَنْ فِيْهِنَّ عطف کے ساتھ مذکور ہے پھر اگر شروع آیت میں بھی مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ کی تقدیر کو مان لیا جائے (جیسا کہ بعض نے کہا ہے) تو اس عطف کا کوئی معنی

ہونا لازم آتا ہے۔ لہذا صحیح یہ ہے کہ سب اشیاء (بشمول آسمان وزمین) کی تسبیح اور سجود کو حقیقی معنی پر محمول کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں اور اس کے سامنے سربسجود رہتی ہیں لیکن بعض تسخیری طور پر اور بعض اپنے اختیار اور ارادہ سے۔ اور یہ بات تو بلا اختلاف سبھی مانتے ہیں کہ آسمان وزمین اور دواب جانوروں کی تسبیح تسخیری ہے یعنی انکے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ پر دال ہیں۔ البتہ اختلاف اس میں ہے کہ آیا آسمان وزمین تسبیح بالاختیار کرتے ہیں؟ تو آیت۔ اسی معنی کی متقضی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

سُبْحَانَ یہ اصل میں غُفْرَانٌ کی طرح مصدر ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ (۳۰-۱۷) سو جس وقت تم لوگوں کو شام ہو اللہ کی تسبیح بیان کرو۔

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا تو پاک (ذات) ہے ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔[1] (سریع)

(۲۱۸) سُبْحَانَ مِنْ عَلْقَمَةَ الْفَاخِرِ

سبحان اللہ! علقمہ بھی فخر کرتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سُبْحَانَ عَلْقَمَةَ ہے اس میں مِنْ معنی اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے زائد ہے اور علقمة کی طرف سبحان کی اضافت بطور تہکم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں "سُبْحَانَ اللّٰهِ مِنْ اَجْلِ عَلْقَمَةَ" ہے اس صورت میں اس کا مضاف الیہ محذوف ہوگا۔

السُّبُّوْحُ الْقُدُّوْسُ یہ اسماء حسنیٰ سے ہے اور عربی زبان میں فُعُّوْلٌ کے وزن پر صرف یہ دو کلمے ہی آتے ہیں اور ان کو فاء کلمہ کی فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے کَلُّوْبٌ وَسَمُّوْدٌ۔

السُّبْحَةُ بمعنی تسبیح ہے اور ان منکوں کو بھی سُبْحَةٌ کہا جاتا ہے جن پر تسبیح پڑھی جاتی ہے۔

(س ب خ)

اَلسَّبْخُ کے معنی وسعت کے ہیں اور آیت:۔

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا (۷۳-۷) کہ تیرے لیے دن میں بڑا مشغلہ ہے۔ میں ایک قرأت سَبْخًا بھی ہے۔

سَبَّخَ اللّٰهُ عَنْهُ الْحُمّٰى اللہ نے اس کا بخار ہلکا کردیا۔

اَلسَّبِيْخُ پرند کے پر اور دھنکی ہوئی روئی وغیرہ کو کہا جاتا ہے جن میں اکتناز اور ثقل نہیں ہوتا۔

(س ب ط)

اَلسَّبْطُ اس کا اصل معنی سہولت کے ساتھ کسی چیز کا منبسط ہونا ہیں اور سَبِطَ (س) سُبُوْطًا وَسَبَاطَةً وَسَبَاطًا کے معنی بالوں کے سیدھا اور دراز ہونے کے ہیں اور سیدھے بالوں کو جن میں گھنگٹ نہ ہو سَبِطٌ یا سَبْطٌ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح خوش قامت عورت کو بھی سَبِطَةٌ

---

[1] قالہ الاعشی فی ہجو علقمۃ وصدرہ: اقول لما جاءنی فخرہ۔ انظر الخبر وترجمۃ الشاعر فی الاغانی (۱۵: ۵) والخزانۃ (۲: ۴۲-۴۴) والبیت فی دیوانہ ۷۰ والجمہرۃ (۱: ۲۲۹) والنشمری (۱: ۱۴۳) ومجاز القرآن ق ۳۲ واللسان والتاج والاساس والحکم (سبح) والسمط (۱: ۵۵۵) والقرطبی (۱: ۲۷۶) والطبری (۱: ۲۱۱) والصحاح (سبح) وغریب القرآن للقتبی ۸ وعلقمۃ ہو علقمۃ بن علاثۃ صحابی قدم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہو شیخ فاسلم وبایع وسعی حدیثا واحدا واستعملہ عمر بن الخطاب علی حوران فمات بہا والبیت فی مجالس ثعلب (۱: ۲۱۶) وامالی الشجری (۲: ۲۵۰) وابن خالویہ ۴۵۔

کہا جاتا ہے اور دراز کف دست آدمی کو مَبْسُوْطُ الْکَفَّیْنِ کہتے ہیں اور یہ سخاوت سے کنایہ ہوتا ہے۔

اَلسِّبْطُ اس کے معنی اولاد کی اولاد یعنی پوتے اور نواسے کے ہیں گویا اس میں فروع کے امتداد کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ (۲-۱۴۰) اور حضرت یعقوب اور ان کی اولاد۔

یہاں اسباط سے مراد قبائل ہیں۔ ہر قبیلہ ایک شخص کی اولاد سے تھا۔ جیسے فرمایا:۔

اَسْبَاطًا اُمَمًا (۷-۱۶۰) (الگ الگ) بارہ قبیلے بنادیئے

اَلسَّابَاطُ وہ مسقف راستہ جو دو مکانوں کے درمیان ہو۔ اور اَخَذَتْ فُلَانًا سِبَاطٌ کے معنی ہیں فلاں کو بخار چڑھ گیا۔ مثل مشہور ہے[1] (مثل)

اَلسُّبَاطَةُ خَيْرٌ مِّنْ قُمَامَةٍ کہ خاک (دبہ کوڑے سے بہتر ہے۔

سَبَطَتِ النَّاقَةُ وَلَدَهَا اونٹنی نے ناتمام بچہ گرادیا۔

(س ب ع)

اَلسَّبْعُ اصل میں "سَبْعٌ" سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲-۲۹) سات آسمان۔ سَبْعًا شِدَادًا (۷۸-۱۲) سات مضبوط (آسمان) بنائے۔ سَبْعَ سُنْبُلٰتٍ (۱۲-۴۶) سات بالیں۔ سَبْعَ لَيَالٍ (۶۹-۷) سات راتیں۔ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲) (وہ) سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا (۶۹-۳۲) ستر گز

سَبْعِيْنَ مَرَّةً (۹-۸۰) ستر مرتبہ۔ اور آیت:۔

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ (۱۵-۸۷) (الحمد کی) سات آیتیں (عطا فرمائیں) جو نماز کی ہر رکعت میں مکرر پڑھی جاتی ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ سورۃ الحمد مراد ہے کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَلسَّبْعُ الطِّوَال یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک سات لمبی سورتیں مراد ہیں۔ اور قرآن پاک کی تمام سورتوں کو بھی مثانی کہا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں واقعات تکرار کے ساتھ مذکور ہیں اور منجملہ ان کے یہ سات سورتیں ہیں

اَلسَّبِيْعُ وَالسَّبِيْعُ اونٹوں کو ساتویں روز پانی پر وارد کرنا۔

اَلْاُسْبُوْعُ۔ ایک ہفتہ یعنی سات دن جمع اَسَابِيْعُ طُفْتُ بِالْبَيْتِ اُسْبُوْعًا میں نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے سَبَعْتُ الْقَوْمَ میں ان کا ساتواں بن گیا۔ اَخَذْتُ سُبْعَ اَمْوَالِهِمْ میں نے ان کے اموال سے ساتواں حصہ وصول کیا۔

اَلسَّبُعُ۔ درندہ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے جیسا کہ سات کا عدد "عدد تام" ہوتا ہے۔

ھُذَلِی نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۲۱۹) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کانہ
عَبْدٌ لِاٰلِ اَبِيْ رَبِيْعَةَ مُسْبَعٌ

گویا وہ آل ابی ربیعہ کا غلام ہے جس کی بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لئے درندے آگئے ہوں۔

بعض نے مُسْبِعٌ کا معنی مُھْمَلٌ مَعَ السِّبَاعِ کئے ہیں یعنی وہ جو درندوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے اور بعض نے مُسْبَعٌ (بفتح با) پڑھا ہے۔

---

[1] المثل فی جل المعاجم ۱۲ [2] قالہ ابو ذویب الہذلی یصف حمارا الوحشی واولہ: صخب الشوارب لایزال... والبیت من کلمۃ مفضلیۃ فی ۵۷ بیتا وفی الجمھرۃ ۲-۴۲ او ومنہا المؤلف ۲۶۶، ۴۷۵، ۳۷۲، ۴۴۷، ۳) راجع نظام الغریب للربعی (۱۲۳) واصلاح یعقوب ۴۷، ۲ والمحکم (ربع ابع) واللسان (شرب، سبع) والاغانی (۶: ۹ ن والمزہر (۱: ۳۵) والصاحبی ۶۹ قال یعقوب فی اصلاحہ اسبعت عبدی اذا اہملتہ فھو مسبع وفی الصاحبی لفظۃ سبع مافسر حتی الآن تفسیرا شافیا۔

اور یہ دَعِیٌّ سے کنایہ ہے یعنی وہ شخص جس کا نسب معلوم نہ ہو۔ سَبَعَ فُلَانًا کسی کی غیبت کرنا اور درندہ کی طرح اس کا گوشت کھانا۔ اَلْمَسْبَعَۃُ: درندوں کی سرزمین۔

(س ب غ)

دِرْعٌ سَابِغٌ: پوری اور وسیع زرہ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ اَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ (۳۴-۱۱) کہ کشادہ اور پوری پوری زرہیں بناؤ۔

اسی سے استعارہ کے طور پر اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ (پورا وضو کرنا) اور اِسْبَاغُ النِّعَمِ (پورا پورا انعام کرنا) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ (۳۱-۲۰) اور تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کیا۔

(س ب ق)

اَلسَّبْقُ اس کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھ جانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا (۷۹-۴) پھر وہ (حکم الہی کو سننے کے لئے) لپکتے ہیں۔

اَلْاِسْتِبَاقُ کے معنی تسابق یعنی ایک دوسرے سے سبقت کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ اِنَّا ذَھَبْنَا نَسْتَبِقُ (۱۲-۱۷) ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرنے لگ گئے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ (۱۲-۲۵) اور دونوں دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچے۔

مجازاً ہر شے میں آگے بڑھ جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ مَا سَبَقُوْنَا اِلَیْہِ (۴۶-۱۱) تو یہ ہم سے اس کی طرف سبقت نہ کر جاتے۔

وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ (۲۰-۱۲۹) اگر تمہارے پروردگار نے پہلے سے ایک بات نہ فرمائی ہوتی۔

پھر استعارہ کے طور پر احراز فضیلت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَلسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ (۵۶-۱۰) اور آگے نکل جانے والے ہی اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔

تو سَابِقُوْنَ سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اعمال صالحہ کے ذریعہ ثواب الہی اور جنت کی طرف پیش پیش جانے والے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا:۔ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ وَھُمْ لَھَا سَابِقُوْنَ (۲۳-۶۱) یہی لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور ان کے لئے لپکتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ (۵۶-۶۰) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں۔

کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ ہماری گرفت اور قبضہ سے باہر نہیں نکل سکتے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَبَقُوْا (۸-۵۹) کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے قابو سے نکل گئے ہیں۔

وَمَا کَانُوْا سَابِقِیْنَ (۲۹-۳۹) اور نہ وہ ہم سے کہیں بھاگ کر جاسکے۔

(س ب ل)

اَلسَّبِیْلُ۔ اصل میں اس رستہ کو کہتے ہیں (جس میں سہولت سے چلا جاسکے) اس کی جمع سُبُلٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاَنْھَارًا وَّسُبُلًا (۱۶-۱۵) دریا اور راستے۔

وَجَعَلَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا (۲۰-۳۰) اور تمہارے

لئے اس میں راستے بنا دیئے۔
اور آیت:۔
وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ (۴۳-۳۷) اور وہ صحیح راہ سے روکتے ہیں۔
میں اَلسَّبِيْل سے مراد طریق حق ہے کیونکہ اسم جنس جب مطلق استعمال ہو تو حق (یعنی فرد کامل) ہی مراد ہوتا ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا:۔
ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (۸۰-۲۰) پھر اس پر راہ آسان کر دی۔
اور راہگیر کو سَابِلٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَابِلَةٌ ہے اور جس راہ پر بہت زیادہ آمد و رفت ہو اسے سَبِيْلٌ سَابِلٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ شِعْرٌ شَاعِرٌ کا محاورہ ہے[1]۔
اِبْنُ السَّبِيْل اس مسافر کو کہتے ہیں جو اپنے منزل مقصود سے دور ہو اور سبیل کی طرف اس کی نسبت بوجہ ممارست کے ہے۔ پھر سبیل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو کسی دوسری چیز تک رسائی کا ذریعہ ہو عام اس سے کہ وہ چیز خیر ہو یا شر چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (۱۶-۱۲۵) خدا کے راستہ کی طرف دعوت دو۔
قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ (۱۲-۱۰۸) (اے پیغمبر ان سے) کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔
ان دونوں آیتوں میں سبیل سے مراد راہ حق ہی ہے لیکن پہلی آیت میں مبلغ (پہنچانے والے) کی طرف نسبت ہے اور دوسری آیت میں ان کی لے کر چلنے والے یعنی پیغمبر کی طرف۔
قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴۷-۴) جو اللہ تعالے کی راہ میں شہید ہو گئے۔
اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۴۰-۲۹) (اور وہی) راہ دکھاتا ہوں جو سیدھی ہے۔
وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (۶-۵۵) تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔
فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ (۱۶-۶۹) (مزے سے) اپنے پروردگار کے تعلیم کئے ہوئے آسان راستوں پر چل۔
اور سبیل کے معنی شاہراہ بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ (۱۲-۱۰۸) (اے پیغمبر) کہہ دو یہی میرا راستہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
سُبُلَ السَّلٰمِ (۵-۱۶) سلامتی کے رستوں کی طرف، میں سبل السلام سے جنت کے راستے مراد ہیں۔
مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ (۹-۹۱) نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں۔
فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ (۴۲-۴۱، ۴۲) تو یہ لوگ (معذور ہیں) ان پر کوئی الزام نہیں۔ الزام (تو) ان ہی پر ہے۔
اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا (۱۷-۴۲) مالک عرش (یعنی خدا) تک پہنچنے کا راستہ (ڈھونڈ) نکالتے۔
عام محاورہ ہے:۔
اَسْبَلَ السِّتْرَ وَالذَّيْلَ اس نے پردہ یا دامن لٹکا دیا۔ فَرَسٌ مُسْبَلُ الذَّنَبِ دراز دم گھوڑا سَبَلَ الْمَطَرُ وَاَسْبَلَ۔ بارش برسنا اور وہ بارش جو آسمان سے بہہ کر زمین کی طرف آرہی ہو اور ہنوز زمین پر نہ گری ہو اسے سَبَلٌ کہا جاتا ہے اور سَبَلَةٌ خاص کر مونچھوں کے بالوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ

---

[1] ولمثل ہذا الکلام یقال لہ مجاز فی الاسناد ۱۲

دھی بڑھ کر، نیچے کو لٹک پڑتے ہیں۔
اَلسُّنْبُلَۃُ بال اس کی جمع سَنَابِل آتی ہے۔
قرآن میں ہے:
سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ (۲-۲۶۱) سات بالیں ہر بال میں۔
سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ (۱۲-۴۶) سات سبز بالیں۔
اَسْبَلَ الزَّرْعُ کھیتی میں بالیں پڑ گئیں (ماخذ کے ساتھ متصف ہونا کے معنی پائے جاتے ہیں) جیسے اَحْصَدَ الزَّرْعُ واجنی النخل کا محاورہ ہے:
اَلْمُسْبِلُ جوئے کے تیروں میں سے پانچواں تیر۔

(س ب ء)

سَبَأٌ ایک شہر کا نام ہے جو پرانے زمانے میں ذیل العرم سے تباہ ہو گیا تھا۔ قرآن میں ہے:
وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِيْنٍ (۲۷-۲۲) اور میں سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لیکر آیا ہوں۔
اور اسی سے ایک ضرب المثل ہے۔ (مثل)
ذَهَبُوْا اَيَادِيْ سَبَاءٍ یعنی وہ تتر بتر ہو گئے۔ اور (اہل سبا کی طرح ان کا نام و نشان مٹ گیا۔
سَبَأْتُ الْخَمْرَ میں نے پینے کے لئے شراب خریدی۔
اَلسَّابِيَاءُ مشیمہ یعنی وہ جھلی جس میں بچہ ہوتا ہے!

(س ت ت)

سِتَّةٌ چھ کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:
فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ (۷-۵۴) چھ روز میں۔
سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (۵۸-۴) ساٹھ مساکین کو۔
اور سِتٌّ اصل میں سِدْسٌ ہے جسے اس کی بحث میں ذکر کیا جائے گی۔ (انشاء اللہ)

(س ت ر)

اَلسَّتْرُ (مصدر ن) اس کے اصل معنی کسی چیز کو چھپا دینے کے ہیں اور سِتْرٌ وسُتْرَةٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز چھپائی جائے۔
قرآن میں ہے:
لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا (۱۸-۹۰) جن کے لئے ہم نے اس (سورج) سے بچنے کیلئے کوئی اوٹ نہیں بنائی۔
حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (۱۷-۴۵) ایک گاڑھا پردہ (حائل کر دیتے ہیں)۔
اَلْاِسْتِتَارُ اس کے معنی چھپ جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ (۴۱-۲۲) اور (اس لیے نہ چھپتے تھے۔

(س ج د)

اَلسُّجُوْدُ (ن) اسکے اصل معنی فروتنی اور عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس کی عبادت کرنے کو سجود کہا جاتا ہے اور یہ انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے (کیونکہ) سجود کی دو قسمیں ہیں۔ سجود اختیاری جو انسان کے ساتھ خاص ہے اور اسی سے وہ ثواب الہٰی کا مستحق ہوتا ہے جیسے فرمایا:
فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳-۶۲) سو اللہ کے لئے سجدہ کرو اور (اسی کی) عبادت کرو۔
اور سجود تسخیری جو انسان، حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:
وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا

وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ (۱۳-۱۵) (فرشتے) جو آسمانوں میں ہیں اور جو انسان زمین میں ہیں۔ چار و ناچار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور صبح و شام ان کے سایے (بھی اسی کو سجدہ کرتے ہیں)

اور نیز فرمایا۔

يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ (۱۶-۴۸) اس کے سائے (کبھی) دائیں طرف کو اور (کبھی) بائیں طرف کو جھکے رہتے ہیں گویا اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔

تو اس سے مراد سجود تسخیری ہے یعنی وہ زبان حال سے گویا ہیں کہ ان کو کسی صانع حکیم نے بنایا ہے اور وہ اس کی مخلوق ہیں۔ اور آیت:۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔ (۱۶-۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں۔ اور فرشتے (سب) اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں اور ذرا بھی تکبر نہیں کرتے۔

دونوں قسم کے سجود یعنی تسخیری اور اختیاری پر مشتمل ہے اور آیت:۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵۵-۶) اور نجم و شجر اس کے سامنے سربسجود ہیں۔ میں سجود تسخیری مراد ہے۔ اور آیت:۔

اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۲-۳۴) آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے اس کو قبلہ بنانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کے سامنے انکساری اور ان کی اولاد کے مصالح کا بندوبست کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا سو بجز ابلیس کے تمام فرشتے یہ حکم بجا لائے تھے اور آیت:۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (۲-۵۸) اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انکسار و انقیاد کے ساتھ وہاں جانا۔ اصطلاح شریعت میں سجود کو نماز کا خاص کن قرار دیا گیا ہے اور اس کا اطلاق سجود قرآن اور سجود شکر پر بھی ہوتا ہے جو سجدہ نماز کے حکم میں ہے اور کبھی اس سے مراد نفس نماز ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۵۰-۴۰) اور نماز کے پیچھے بھی۔ یعنی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اور چاشت کی نماز کو سُبْحَةُ الضُّحٰى اور سُجُوْدُ الضُّحٰى کہتے ہیں اور آیت:۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (۱۵-۹۸) اپنے پروردگار کی حمد (و ثنا) کے ساتھ (اس کی) تسبیح (و تقدیس) بیان کیا کرو۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں تسبیح سے نماز مراد ہے۔ اَلْمَسْجِدُ (ظرف) کے معنی جائے نماز کے ہیں اور آیت

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (۷۲-۱۸) اور مسجدیں تو خدا ہی (کی عبادت) کے لئے ہیں میں بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے روئے زمین مراد ہے کیونکہ آنحضرت کے لئے تمام زمین کو مَسْجِدٌ اور طَهُوْرٌ بنایا گیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں مروی ہے[1] (۱۷۰) اور بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے اعضاء سجود یعنی پیشانی، ناک دونوں ہاتھ دونوں زانوں اور دونوں پاؤں مراد ہیں[2]۔ اور آیت:۔

---

[1] ولفظہ: جعلت لی الارض مسجدًا وطہورًا اخرجہ الجماعۃ [2] ابن عطاء کما فی البحر ۸: ۲۵۲ واللسان ا/۴۲ و ۴/۱۸۸ و الکشاف ۴/ ۸۸ اوقد اشار الیہ ابن قتیبۃ فی غریبہ ۱۲

أَلَّا يَسْجُدُوا لِلّٰهِ (۲۷-۲۵) (اور نہیں سمجھتے) کہ اللہ کو... سجدہ کیوں نہ کریں۔

میں لا زائدہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ میری قوم اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اور آیت:۔

وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا (۱۲-۱۰۰) اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

میں اظہار عاجزی مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مراد سجدۂ خدمت ہے جو اس وقت جائز تھا اور شعر[1] (الکامل)

(۲۲۰) وَافَی بِهَا كَدَرَاهِمِ الْاَسْجَادِ

میں شاعر نے وہ دَرَاهِم مراد لیے ہیں جن پر بادشاہ کی تصویر ہوتی تھی اور لوگ ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔

(س ج ر)

اَلسَّجْرُ اس کے اصل معنی زور سے آگ بھڑکانے کے ہیں۔ اور سَجَرْتُ التَّنُّوْرَ کے معنی ہیں میں نے تنور جلا دیا اسے ایندھن سے بھر دیا اسی سے فرمایا:۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۵۲-۶) اور (نیز) جوش مارنے والے سمندر کی۔

شاعر نے کہا ہے[2]۔ (المتقارب)

(۲۲۱) اِذَا شَاءَ طَالَعَ مَسْجُوْرَةً ؍ تَرَى حَوْلَهَا النَّبْعَ وَالسَّمْسَمَا

جب وہ چاہتا ہے تو پانی سے پُر گڑھا اسے نظر آجاتا ہے جس کے گرداگرد نبع اور سمسم کے درخت اگے ہوئے ہیں۔

اور آیت:۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۸۱-۶) اور جس وقت دریا پاٹ دیے جائیں۔

کے معنی حسنؒ (البصری) نے یہ کئے ہیں کہ جب دریا آگ سے بھڑکا دیئے جائیں اور بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ جب ان کے پانی خشک کر دیئے جائیں اور یہ ان میں آگ بھڑکانے کی غرض سے ہوگا۔

ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ (۴۰-۷۲) پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲-۲۴) جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

سَجَرَتِ النَّاقَةُ اُونٹنی وجد میں بھڑک اٹھی یعنی سخت دوڑی جیسے اِشْتَعَلَتِ النَّاقَةُ کا محاورہ ہے اور اَلسَّجِيْرُ کے معنی مخلص دوست کے ہیں گویا وہ محبت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ مُحْرَقٌ فِي مَوَدَّةٍ کہ فلاں سوختہ محبت ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے[3]

(۲۲۲) سُجَرَاءُ نَفْسِي غَيْرُ جَمْعِ اُشَابَةٍ

---

[1] قاله الاسود بن یعفر النهشلی وصدره: من خمر ذی نطف اغن منطق ... والبیت فی اللسان (سجد) والمفضلیات (۲ : ۱۸) وفیه لدراهم بدل كدراهم والاسجاد بكسر الهمزة السجود قال الاصمعی: ودراهم الاسجاد، دراهم الاكاسرة ای النصاری وهی دراهم الجزیة التی اخذتهم ۱۲ [2] البیت لنمر بن تولب العكل والشاعر لیصف دغلا فی روایة السماسما بدل السمسما وهو شجر یشبه الآبنوس اونفسه والبیت من شواهد الطبری (۲۷ر ۱) والطبری (۲۹ : ۵۴) والخزانة (۴ : ۳۸۰) ومجاز القرآن لابی عبیدة وتهذیب الالفاظ ۶۰۵ وكتاب الابدال لابی الطیب (۱ : ۱۳۵/۴) واللسان والتاج (سلم) والمختارات الشجری ۲۷ (مسورة بدل مسجورة) والاضداد للاصمعی ۲۸ والقرطبی (۲ : ۱۴) والجمهرة ۲۱ وابن درید (۲ : ۷۶) والسیوطی ۷۰ وشرح السبع لابن الانباری ۵۶۵ والاضداد ابن الانباری ۵۴ وابن السكیت ۱۸۸ والسجستانی ۲۶) والاضداد لابی الطیب ۲۴۲ وغریب القرآن للقتیبی ۴۲۴ [3] قاله ابو كبیر الهذلی (عامر بن الحلیس) وتمامه: خشنا ولامعاك المغارش عزل والبیت فی تهذیب الاصلاح ۲۶۷ مع آخر وطوانه مع اشعار الهذلیین (۲۲ - ۹۰) والمعانی الكبیر ۵۲۱ والمرزوقی ۲۳۳ والمحكم عزل خشنا وفیه قال ابن جنی: روی خشد مغلست الدلال ؛

(س ج ل)

اَلسَّجْلُ بڑے ڈول کو کہتے ہیں اور سَجَلْتُ الْمَاءَ فَانْسَجَلَ کے معنٰی ہیں میں نے پانی بہایا تو وہ بہہ گیا اور اَسْجَلْتُہٗ کے معنٰی ہیں میں نے اسے پانی سے بھرا ہوا ڈول دیا اور استعارہ کے طور پر عطاء کثیر کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے۔

اَلْمُسَاجَلَۃُ کے اصل معنٰی ڈول کے ساتھ کھیتی سیراب کرنے کے ہیں اور پھر مباراتٌ اور مناضلت کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] (الرجز)

(۲۲۳) مَنْ یُسَاجِلْنِیْ یُسَاجِلْ مَاجِدًا

جو میرے ساتھ مقابلہ کرے گا تو وہ ایک شریف آدمی سے مقابلہ کریگا یعنی میں ماجد اور شریف ہوں۔

اَلسِّجِّیْلُ سنگ گِل کو کہتے ہیں اور اصل میں جیسا کہ کہا گیا ہے۔ یہ لفظ فارسی سے معرب ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلسِّجِلُّ کے اصل معنٰی اس پتھر کے ہیں جس پر لکھا جاتا تھا بعدہ ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے سِجِلٌّ کہنے لگے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (۲۱-۱۰۴) جیسے خطوں کا مکتوب لپیٹ لیا جاتا ہے۔ یعنی لکھی ہوئی چیزوں کی حفاظت کے لئے اسے لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

(س ج ن)

اَلسَّجْنُ (مصدر ن) قید خانہ میں بند کر دینا اور آیت۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ (۱۲-۳۳) اے میرے پروردگار قید خانہ میں رہنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ میں ایک قراءت اَلسَّجْنُ (بفتحہ سین) بھی ہے۔

لَیَسْجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیْنٍ (۱۲-۳۵) (ان کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ) ایک وقت خاص تک اس کو قید رکھیں۔

وَدَخَلَ مَعَہُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ (۱۲-۳۶) اور (اتفاق سے) یوسفؑ کے ساتھ دو نوجوان (اور بھی) جیل خانہ میں داخل ہوئے۔

اَلسِّجِّیْنُ یہ عِلِّیِّیْنَ کے مقابلہ میں جہنم کا نام ہے اور اس میں الفاظ کی زیادتی معنٰی کی زیادتی پر دال ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ زمین کے ساتویں طبقہ کا نام ہے۔ قرآن میں ہے:۔

لَفِیْ سِجِّیْنٍ وَمَا اَدْرٰکَ مَا سِجِّیْنٌ (۸۳-۷،۸) (بدکار لوگوں کے نامۂ اعمال) سجین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عام طور پر جس چیز کو قرآن نے مَا اَدْرٰکَ کے ساتھ بیان فرمایا ہے اسے بعد میں بیان کر دیا گیا ہے اور جسے مَا یُدْرِیْکَ کے ساتھ بیان کیا ہے اسے مبہم چھوڑ دیا ہے لیکن یہاں باوجود اس کے کہ سِجِّیْنٌ اور عِلِّیِّیْنَ کو مَا اَدْرٰکَ کے بعد بیان فرمایا ہے پھر بھی انہیں مبہم رکھا گیا ہے اور کتاب کی تفسیر بیان فرما دی ہے تو اس میں

---

[1] قالہ الاخضر اللہبی (فضل بن عباس) وتمامہ: یملأ الدلو الی عقد الکرب۔ والبیت فی اللسان (سجل) وتفسیر الطبری (۲: ۹۸) والامالی (۲: ۹۴) والسمط ۷۰۰ والکامل ۵۰۷ والاغانی (۱۴: ۱۷۱/۱۵: ۳) وکنایات الجرجانی ۱۵ والمعانی للقتبی ۵۹۷ والاضداد لابن الانباری ۳۳۵ وبعدہ: انا الاخضر من یعرفنی۔ اخضر الجلدۃ فی بیت العرب وانما قال انا الاخضر لانہ کان شدید الادمۃ والخضرۃ انما اتتہ من قبل جدتہ وامہ ام الفضل بنت العباس بن عبد المطلب، وکانت حبشیۃ وفی مصارع العشاق ۲۷۹ تمامہ: اخضر الجلدۃ فی بیت العرب قال وتغنی بہ عبد اللہ بن جعفر فی مجلس معاویۃ بالابطح وفی الحصری (۳: ۱۷۱) اختلاط

ایک باریک نکتہ ہے جسے اس کتاب کے بعد دوسری جگہ پر بیان کیا جائے گا۔

(س ج و)

سَجَا اللَّیْلُ۔ رات پرسکون ہو گئی قرآن میں ہے:۔
وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی (۹۳-۲) اور رات کی قسم جب ساکن ہو جائے۔
اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ رات کے پرسکون ہونے کے لئے کہا جاتا ہے۔
ھَدَأَتِ الْاَرْجُلُ یعنی پاؤں کی چاپ رک گئی۔
اور عَیْنٌ سَاجِیَۃٌ کے معنی خاموش آنکھ کے ہیں اور سَجَی الْبَحْرُ سَجْوًا کے معنی ہیں سمندر پرسکون ہو گیا اسی سے استعارہ کے طور پر میت کو کفن میں چھپانے کیلئے تَسْجِیَۃُ الْمَیِّتِ کہا جاتا ہے۔

(س ح ب)

اَلسَّحْبُ اس کے اصل معنی کھینچنے کے ہیں۔ چنانچہ دامن زمین پر گھسیٹ کر چلنے یا کسی انسان کو منہ کے بل گھسیٹنے پر سَحْبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اسی سے بادل کو سَحَابٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ ہوا اسے کھینچ کر لے چلتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ خود پانی کو کھینچ کر لاتا ہے اور یا اس بنا پر کہ وہ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھسٹتا ہوا چل رہا ہے قرآن میں ہے:۔
یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ (۵۴-۴۸) جس دن ان کو ان کے منہ کے بل دوزخ کی آگ میں گھسیٹا جائے گا۔
اور فرمایا۔ یُسْحَبُوْنَ فِی الْحَمِیْمِ (۴۰ = ۷۱-۷۲) انہیں دوزخ میں کھینچا جائے گا۔
محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ یَتَسَحَّبُ عَلٰی فُلَانٍ کہ فلاں اس پر جرأت کرتا ہے۔ جیسا کہ یَتَجَرَّءُ عَلَیْهِ کہا جاتا ہے۔
اَلسَّحَابُ۔ ابر کو کہتے ہیں خواہ وہ پانی سے بھرا ہو یا خالی اس لئے خالی بادل کو سَحَابٌ جَهَامٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا (۲۴-۴۳) کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے۔
حَتّٰی اِذَا اَقَلَّتْ سَحَابًا (۷-۵۷) حتی کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھا لاتی ہیں۔
وَیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳-۱۲) اور وہ بھاری بادل اٹھاتا ہے۔
اور کبھی لفظ سحاب بول کر بطور تشبیہ کے اس سے سایہ اور تاریکی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (۲۴-۴۰) یا (ان کے اعمال کی مثال) ایسی ہے جیسے دریا کے اندرونی اندھیروں کی سی (ہے) کہ دریا کو لہر نے ڈھانپ رکھا ہے اور (لہر بھی ایک نہیں بلکہ) لہر کے اوپر لہر (اور) ان کے اوپر بادل (کی تاریکی غرض) اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک۔

(س ح ت)

اَلسُّحْتُ۔ اصل میں اس چھلکے کو کہتے ہیں جو پوری طرح اتار لیا جائے (اور اس سے ہلاک کر دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے) چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَیُسْحِتَکُمْ بِعَذَابٍ (۲۰-۶۱) ورنہ وہ تم پر کوئی عذاب (نازل کر کے اس) سے تم کو ملیامیٹ کر دے گا۔
اس میں ایک قرأت فَیَسْحَتَکُمْ (فتح یا کے ساتھ) بھی

ہے اور سَحَتَہٗ (ض)، وَاَسْحَتَہٗ (انعال) کے ایک ہی معنی آتے ہیں یعنی بیخ کنی اور استیصال کرنا پھر اسی سے سُحْتٌ کا لفظ ہر اس ممنوع چیز پر بولا جانے لگا ہے جو باعث عار ہو کیونکہ وہ انسان کے دین اور مروت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (۵-۴۲) اور مال حرام ڈکو سے چلے جاتے ہیں۔

یعنی وہ چیز جو ان کے دین کا ناس کرنے والی ہے۔ ایک حدیث میں ہے[1] (۱۷۱) کُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ اَوْلٰی بِہٖ.... جو گوشت مال حرام کے کھانے سے پیدا ہو وہ آگ کے لائق ہے اور اسی سے "رشوت" کو سُحْت کہا گیا ہے[2] (۱۷۲) ایک روایت میں ہے[3] (۱۷۳) کہ حجام (پچھنا لگانے والے) کی کمائی "سحت" ہے۔ تو یہاں سُحْت بمعنی حرام نہیں ہے جو دین کو برباد کرنے والا ہو بلکہ سُحْت بمعنی مکروہ ہے یعنی ایسی کمائی مروت کے خلاف ہے کیونکہ آنحضرت نے ایسی کمائی سے اونٹنی کو چارہ ڈالنے اور غلاموں کو کھلانے کا حکم دیا ہے۔

(س ح ر)

اَلسَّحَرُ کے معنی حلق کے کنارہ اور پھیپھڑے کے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔

اِنْتَفَخَ سَحَرُہٗ اس کا پھیپھڑا پھول گیا (یعنی وہ بزدل ہے) اور بڑے حلق والے اونٹ کو بَعِیْرٌ سَحِرٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز ذبح کے وقت نرخرے سے اتار کر پھینک دی جاتی ہے اسے "سُحَارَۃٌ" کہا جاتا ہے اور یہ نُقَایَۃٌ وَسُقَاطَۃٌ کے وزن پر ہے (اور فُعَالَۃٌ کا وزن ردی اشیاء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) بعض کا قول ہے کہ اسی سے سِحْرٌ مشتق ہے جس کے معنی گلے یا پھیپھڑے پر مارنے کے ہیں۔ اور سِحْرٌ کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اول دھوکا اور بے حقیقت تخیلات پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی صفائی سے نظروں کو حقیقت سے پھیر دیتا ہے یا نَمَّامٌ ملمع سازی کی باتیں کرکے کانو کو صحیح بات سننے سے روک دیتا ہے چنانچہ آیات:۔

سَحَرُوْا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ (۷-۱۱۶) تو انہوں نے جادو کے زور سے لوگوں کی نظربندی کردی اور ان سب کو دہشت میں ڈال دیا۔

یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِھِمْ (۲۰-۶۶) (تو موسیٰ کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا۔

میں سِحْرٌ کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے اور بنا بریں انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو سَاحِرٌ کہہ کر پکارا تھا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَقَالُوْا یٰۤاَیُّھَا السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّکَ (۴۳-۴۹)

---

[1] الحدیث بہذا اللفظ فی شعب الایمان من حدیث کعب بن عجرۃ وباختلاف الفاظہ فی الدارمی ۲: ۳۲۸ والمستدرک للحاکم والترمذی ولفظہا لایربو لحم نبت من سحت فالنار اولی بہ (رھب) حل عن ابی بکر وابن جریر عن ابن عمر کنز العمال ۴ رقم ۴ وبمعناہ ۱۰۰۷۰، ۵۰۷، ۹۰۷، ۱۶ر ۱۶: ۵۲۷ راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ج ۱ ص ۲ وتخریج الکشاف رقم ۴۷۵ [2] راجع للحدیث الفائق ۱: ۸۲ (ابن جریر عن ابن عمرو وابن مردویہ عن ابی ہریرۃ ست خصال من السحت رشوۃ الامام الحدیث [3] الطبرانی عن رافع بن خدیج والخطیب عن ابی ہریرۃ وابن النجار۔ عن السائب بن یزید والبیہقی عن ابی ہریرۃ وضعفہ۔ [4] انظر ضمن حدیث رافع بن خدیج المذکور الآن والترمذی وابوداؤد وحسنہ وابن ماجۃ من حدیث محیصۃ تخریج احیاء العلوم (۲ ر ۱۴۱)

تو ان لوگوں نے کہا اے جادوگر ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کر"۔

دوم[1] شیطان سے کسی طرح کا تقرب حاصل کرکے اس سے مدد چاہنا جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (۲۶-۲۲۲) (کہ) کیا میں تمہیں بتاؤں کس پر شیطان اترا کرتے ہیں (ہاں) تو وہ اترا کرتے ہیں ہر جھوٹے بدکردار پر۔

اور اسی معنی میں فرمایا:۔

وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲-۱۰۲) بلکہ کفر (کیا تھا تو) شیاطین نے کیا تھا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھلایا کرتے تھے۔

اور اس کے تیسرے معنی وہ ہیں جو عوام مراد لیتے ہیں یعنی سِحْرٌ وہ علم ہے جس کی قوت سے صور اور طبائع کو بدلا جاسکتا ہے (مثلاً) انسان کو گدھا بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت شناس علماء کے نزدیک ایسے علم کی کچھ حقیقت نہیں ہے[1]

پھر کسی چیز کو سحر کہنے سے کبھی اس شے کی تعریف مقصود ہوتی ہے جیسے کہا گیا ہے[2] (۱۴۷) إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا کہ بعض بیان جادو اثر ہوتا ہے

اور کبھی اس کے عمل کی لطافت مراد ہوتی ہے چنانچہ اطباء طبیعت کو "سَاحِرَةٌ" کہتے ہیں اور غذا کو سِحْرٌ سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ اس کی تاثیر نہایت ہی لطیف اور باریک ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ (۱۵-۱۵) (بلکہ) یہ تو نہیں کہ ہم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

یعنی سحر کے ذریعہ ہمیں اس کی معرفت سے پھیر دیا گیا ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا:۔

إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ (۲۶-۱۵۳) تم پر تو بس کسی نے جادو کر دیا ہے۔

بعض نے کہا ہے مُسَحَّرٌ وہ ہے جس کے سَحْرٌ یعنی پھیپھڑا وغیرہ ہوا اور مطلب یہ تھا کہ تم غذا کے محتاج ہو (پھر) پیغمبر کیسے ہوسکتے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ (ان کے اعتراض کو نقل کرتے ہوئے قرآن نے) فرمایا:۔

مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ (۲۵-۷) یعنی یہ تو ہماری طرح کا کھانے پینے والا انسان ہے جیسے فرمایا:۔

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا (۲۶-۱۵۴) کہ تم بھی ہم ہی جیسے آدمی ہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ مُسَحَّرٌ کے معنی ہیں وہ شخص جسے جادو کا علم دیا گیا ہو اور وہ اپنے دعویٰ کو لطف دو قت سے ثابت کرسکتا ہو۔ اور آیت:۔

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا (۱۷-۴۷) کہ تم مسحور

---

[1] وقد نقد علیہم ابن قتیبۃ فی مشکلہ وتلطف علی عقول من انکرہ وقال فی ختام البحث: "فمن آمن بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وبان ما جاء بہ الحق بجمیع ہذا وفرح صدرہ بہ من انکرہ لانہ لا لؤمن الا بما اوجبہ النظر والقیاس علی ما شاہد ورأی فی الموات والحیوان — فماذا ابقی علی المسلمین؟ وای شیئ ترک للملحدین انظر لمشکلہ من ۸۳—۹۲ وغرائب القرآن للنیسابوری والطبری والفخر وبجانبہ ما کتب صاحب الکشاف والجاحظ فی الحیوان تجد ما بین الفریقین من خلاف ۱۲

[2] قال صلی اللہ علیہ وسلم حین وفد علیہ عمرو بن الاہتم والزبرقان بن بدر وقیس بن عاصم والمثل یضرب فی استحسان المنطق وایراد الحجۃ البالغۃ راجع للمثل المیدانی (۱: ۷)، والحدیث فی (مالک، حم، خ، د، ت) عن ابن عمر وبدون اللام فی (حم، د) عن ابن عباس وفی (د) عن بریدۃ

آدمی کے پیچھے پڑے ہو۔

میں مَسْحُوْرًا کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ اور فرمایا۔

فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا (۱۷-۱۰۱) تو فرعون نے ان سے کہا کہ موسیٰ! میں تیری نسبت ایسا خیال کرتا ہوں کہ کسی نے تجھ پر جادو کر (کے تجھے دیوانہ بنا) دیا ہے۔

لیکن آیت:۔

اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۵-۱۱۰) کہ یہ تو صریح جادو ہے۔

دوسرے معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور فرمایا:۔

وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ (۷-۱۱۶) اور (بہت ہی بڑا (بھاری) جادو (بنا کر) لائے۔

أَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ (۱۰-۷۷) کیا یہ جادو ہے۔ اور جادوگروں (کا تو یہ حال ہے کہ ان) کو (کبھی) کامیابی نہیں ہوتی۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۶-۳۸) غرض (دن مقرر ہوا اور اس) معین دن کے وعدے پر جادوگر جمع کئے گئے۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ (۲۶-۴۶) یہ دیکھ کر جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سجدے میں گر پڑے۔

اَلسَّحَرُ وَالسُّحْرَةُ اصل میں تو اس کے معنی آخر شب کی تاریکی کے ہیں جو دن کی ابتدائی روشنی میں مخلوط ہو۔ پھر اس وقت کا نام ہی سَحَرٌ رکھ دیا گیا ہے۔ محاورہ ہے۔ لَقِیْتُهٗ بِاَعْلَی السَّحَرَیْنِ یعنی میں اسے صبح کاذب کے وقت ملا۔ اور مُسْتَحِرٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جو سحری کے وقت گھر سے نکلا ہو اور السَّحُوْرُ اس طعام کو کہتے ہیں جو بوقت سحر تناول کیا جائے اور تَسَحَّرَ کے معنی سحور تناول کرنے کے ہیں۔

(س ح ق)

اَلسَّحْقُ (ض ک) اس کے اصل معنی کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں۔ زیادہ تر دوا کے پیسنے پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:۔

سَحَقْتُهٗ فَانْسَحَقَ میں نے دوا کو پیسا چنانچہ وہ پس گئی۔ اَسْحَقَ الثَّوْبُ کے معنی کپڑے کا پرانا ہو جانا کے ہیں اور پرانے کپڑے کو سَحَقٌ کہا جاتا ہے اسی سے اَسْحَقَ الضَّرْعُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں دودھ خشک ہو جانے کی وجہ سے تھن مرجھا گئے۔

...... اور ہو سکتا ہے کہ "اسحٰق" (علم) بھی اسی سے مشتق ہو اس صورت میں یہ اسم منصرف ہوگا۔ اور کپڑے کے بوسیدہ کر دینے پر سَحَقَهٗ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے اور محاورہ میں اَسْحَقَهُ اللّٰهُ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے اسی سے فرمایا:۔

فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۶۷-۱۱) کہ دوزخیوں کے لئے دوری ہے۔ اور فرمایا:۔

اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ (۲۲-۳۱) یا اس کو ہوا کسی دور جگہ لے کر ڈال دے گی۔

اور استعارہ کے طور پر جاری خون کو مُنْسَحِقٌ و مَسْحُوْقٌ کہا جاتا ہے جیسے مَذْرُوْدٌ

(س ح ل)

قرآن میں ہے:۔

فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ (۲۰-۳۹) تو دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔

یہ اصل میں سَحَلَ الْحَدِیْدَ سے ہے جس کے معنی ریتی سے لوہے کا برادہ بنانے اور چھیلنے کے ہیں۔

بعض کا خیال ہے دریا کے کنارے کو ساحل کی بجائے مَسْحُوْلٌ کہنا چاہیے تھا مگر اسم مفعول کی بجائے اسم فاعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ھَمٌّ نَاصِبٌ کہا جاتا ہے حالانکہ ھَمٌّ مَنْصُوْبٌ ہوتا ہے بعض کے نزدیک سَاحِلٌ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ پانی کو متفرق اور محدود کر دیتا ہے اس صورت میں ساحل بمعنی فاعل ہوگا۔

اَلسُّحَالَۃُ: برادہ کو کہتے ہیں اور گدھے کی ہنہناہٹ کو سَحِیْلٌ یا سُحَالٌ کہا جاتا ہے گویا کرخت ہونے کے لحاظ سے اس کی آواز لوہے کو رگڑنے کی آواز کے مشابہ ہے۔

اور بلند آواز آدمی کو مِسْحَلٌ کہا جاتا ہے گویا وہ سَحِیْلُ الْحِمَارِ کے مشابہ ہے یعنی رفع صوت کے لحاظ سے نہ کہ آواز کے کرخت ہونے کے لحاظ سے جیسا کہ قرآن نے گدھے کی آواز کے متعلق کہا ہے۔
اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۳۱-۱۹) اور دہانہ لگام کے دونوں طرف کے حلقوں کو مِسْحَلَانِ کہا جاتا ہے۔

(س خ ر)

اَلتَّسْخِیْرُ (تفعیل) کے معنی کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لیجانا کے ہیں قرآن میں ہے۔
وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۵-۱۳) اور جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس نے (اپنے کرم سے) ان سب کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔
وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ...... (۱۴-۳۳) اور (اسی طرح ایک اعتبار سے) سورج اور چاند کو تمہارے اختیار میں کر دیا کہ دونوں پڑے چکر لگا رہے ہیں اور (ویسے ہی ایک طرح سے) رات اور دن کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔
وَسَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ (۱۴-۳۲) اور کشتیوں کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔
کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰھَا لَکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ (۲۲-۳۶) ہم نے یوں ان (جانوروں) کو تمہارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم (ہمارا) شکر کرو۔
سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا (۴۳-۱۳) پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا ہے۔
تو مُسَخَّرٌ وہ ہے جسے کسی کام پر مجبور کرکے لگایا گیا ہو اور مُسْخِرٌّ وہ جسے اولاً تو کسی کام پر مجبور کیا جائے پھر وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
لِّیَتَّخِذَ بَعْضُھُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا (۴۳-۳۲) تاکہ وہ ایک دوسرے کو تابع بنائے رہیں۔
اور سَخِرْتُ مِنْہُ وَاسْتَسْخَرْتُہٗ کے معنی کسی سے مذاق کرنے اور اس کی ہنسی اڑانا ہیں قرآن میں ہے۔
قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْکُمْ کَمَا تَسْخَرُوْنَ۔ وہ (حضرت نوح علیہ السلام ان کے تمسخر کا یہ) جواب دیتے کہ اگر (آج) تم ہم پر ہنستے ہو تو جس طرح تم (ہم پر ہنستے ہو اسی طرح) ہم (ایک دن) تم پر ہنسیں گے۔ (۱۱-۳۸)
بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ (۳۷-۱۲) (اے پیغمبر) بات یہ ہے کہ تم تو (ان کے انکار قیامت سے) تعجب کرتے ہو اور یہ (تمہاری باتوں پر) ہنستے ہیں۔
رَجُلٌ سُخَرَۃٌ ہنسی اڑانے والا۔ اور سُخْرَۃٌ وہ ہے جس کی لوگ ہنسی اڑائیں اور ہنسی اڑانے والے

کے اس فعل کو سُخْرِیَّۃٌ وَسِخْرِیَّۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

فَاتَّخَذْتُمُوْھُمْ سِخْرِیًّا (۲۳-۱۱۱) تو تم نے ان کی ہنسی بنائی۔ میں سُخْرِیًّا تسخیر سے بھی ہو سکتا ہے اور سُخْرِیَّۃ یعنی ہنسی اڑانے کے معنی میں بھی

اور اسی طرح آیت:۔

وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا کُنَّا نَعُدُّھُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ اَتَّخَذْنٰھُمْ سِخْرِیًّا (۳۸-۶۳)

اور دوزخی آپس میں یہ بھی کہیں گے کہ جن لوگوں کو ہم برے لوگوں میں شمار کرتے تھے کیا بات ہے کہ ہم ان کو یہاں دوزخ میں نہیں دیکھتے کیا ہم نے ان کی (ناحق) ہنسی بنائی۔ میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں لیکن اس کے بعد وَکُنْتُمْ مِّنْھُمْ تَضْحَکُوْنَ (۲۳-۱۱۰) سے دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے

(س خ ط)

اَلسَّخَطُ وَالسُّخْطُ اس سخت غصہ کو کہتے ہیں جو سزا کا مقتضی ہو۔ قرآن میں ہے:۔

اِذَا ھُمْ یَسْخَطُوْنَ (۲۳-۱۱۱) تو وہ فوراً غصہ سے بھر جاتے۔

اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد انزال عقوبت ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَا اَسْخَطَ اللّٰہَ (۴۷-۲۸) (اور ان کی) یہ نوبت اس لئے (ہوگی) کہ جو چیز خدا کو بری لگتی ہے یہ اسی کے رستے پر چلے۔

اَنْ سَخِطَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ (۵-۸۰) (نتیجہ یہ ہوا) کہ (دنیا میں بھی) خدا ان سے ناراض ہوا۔

کَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ (۳-۱۶۱) اس شخص جیسا (فعل سرزد) ہو سکتا ہے جو خدا کے غضب میں آ گیا ہو۔

(س د د)

اَلسَّدُّ (دیوار، آڑ)

بعض نے کہا ہے سَدٌّ اور سُدٌّ کے ایک ہی معنی ہیں اور بعض دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ سُدٌّ (بضمہ سین) اس آڑ کو کہا جاتا ہے جو قدرتی ہو اور سَدٌّ (بفتحہ سین) مصنوعی اور بنائی ہوئی روک کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ سَدَّ یَسُدُّ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنی رخنہ کو بند کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

بَیْنَنَا وَبَیْنَھُمْ سَدًّا (۱۸-۹۴) کہ (آپ) ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیں۔

اور تشبیہ کے طور پر ہر قسم کے موانع کو سَدٌّ کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا (۳۶-۹) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی۔

ایک قراءت میں سُدًّا بھی ہے۔

اَلسُّدَّۃُ برآمدہ جو دروازے کے سامنے بنایا جائے تاکہ بارش سے بچاؤ ہو جائے کبھی دروازے کو بھی سُدَّۃٌ کہہ دیتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے[1]:۔

اَلْفَقِیْرُ الَّذِیْ لَا تُفْتَحُ لَہٗ سُدَدُ السُّلْطَانِ یعنی وہ فقیر جن کے لئے بادشاہ کے دروازے نہ کھولے جائیں اَلسَّدَادُ وَالسَّدَدُ کے معنی استقامت کے ہیں اور اَلسِّدَادُ اسے کہتے ہیں جس سے رخنہ اور شگاف کو بھرا جائے۔ اور استعارہ کے طور پر ہر اس چیز کو سِدَادٌ کہا جاتا ہے جس سے فقر کو روکا جائے۔

---

[1] وفی وارد الحوض: ہم الذین لا تفتح لہم السدد (النہایہ ۱ سد)

(س د ر)

اَلسِّدْرُ (بیری کا) درخت جس کا پھل بہت کم غذائیت کا کام دیتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَّاَثْلٍ وَّشَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ (۳۴-۱۶) اور جن میں کچھ تو جھاؤ تھا اور تھوڑی سی بیریاں۔

اور کبھی (کانٹا جھاڑ دے کر) اسے بے کانٹا کر کے اس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے اس لیے اسے جنت کے آرام اور اس کی نعمتوں کے لیے بطور مثال کے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶-۲۸) بے خار کی بیریوں میں (مزے کر رہے) ہوں گے۔

کیونکہ ایسا درخت بہت زیادہ سایہ دار ہوتا ہے

اور آیت:۔

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی (۵۳-۱۶) جب کہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔

میں السدرة سے اس مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فیوضات الٰہیہ اور بھاری انعامات سے خاص طور پر نوازا گیا تھا بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ درخت ہے جس کے نیچے آنحضرت نے بیعت رضوان لی تھی اور وہاں اللہ تعالیٰ نے مومنین پر سکینت الٰہیہ نازل فرمائی تھی۔

اَلسَّدَرُ کے معنی خیرہ چشم ہونے کے ہیں اور خیرہ چشم کو سَادِرٌ کہا جاتا ہے اور سَدَرَ شَعْرَہٗ کے معنی بال لٹکانے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ (دَسَرَ) سے مقلوب ہے۔

(س د س)

اَلسُّدُسُ (اسم عدد چھٹا حصہ کو کہتے ہیں)

قرآن میں ہے:۔

فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (۴-۱۱) تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔

اَلسِّدْسُ پیاسے اونٹوں کو چھٹے روز پانی پلانے کی باری اور سِتٌّ بھی اصل میں سِدْسٌ ہی ہے۔

سَدَسْتُ الْقَوْمَ کے معنی قوم میں چھٹا آدمی ہونے یا ان کے اموال سے چھٹا حصہ وصول کرنے کے ہیں اور جَاءَ سَادِسًا وَسَاتًّا وَسَادِیًا کے ایک ہی معنی ہیں یعنی وہ چھٹے درجہ پر آیا۔

قرآن میں ہے:۔

وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ (۵۸-۷) اور (نہ کہیں پانچ کا مجمع ہوتا ہے) مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲) اور (بعض) کہیں گے کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔

محاورہ مشہور ہے:۔ لَا اَفْعَلُ كَذَا سَدِيْسَ عُجَيْسٍ میں کبھی بھی یہ کام نہیں کروں گا۔

اَلسُّدُوْسُ طیلسان کو کہتے ہیں اَلسُّنْدُسُ باریک اور اس کے مقابل اِسْتَبْرَقٌ موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔

(س ر ر)

اَلْاِسْرَارُ کسی بات کو چھپانا یہ اعلان کی ضد ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (۲-۲۷۴) اور پوشیدہ اور ظاہر

اور فرمایا:۔

يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۲-۷۷) (کہ) جو کچھ

یہ چھپاتے اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں خدا کو (سب) معلوم ہے۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ (۶۷-۱۳) اور تم (لوگ) بات پوشیدہ کہو یا ظاہر۔

اور اس کا استعمال اعیان و معانی دونوں میں ہوتا ہے اَلسِّرُّ۔ اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں پوشیدہ ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى (۲۰-۷) وہ چھپے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

نیز فرمایا:۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ (۹-۷۸) کہ خدا ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے واقف ہے۔

مَسَارَّةٌ (مفاعلة) کے معنی ہیں کسی بات کو چھپانے کی وصیت کرنا اور تَسَارَّ الْقَوْمُ کے معنی لوگوں کا باہم ایک دوسرے کو بات چھپانے کی وصیت کرنے یا باہم سرگوشی کرنے کے ہیں اور آیت:۔

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ (۱۰-۵۴) (پچھتائیں گے) اور ندامت کو چھپائیں گے۔

تو یہاں اَسَرُّوْا کے معنی چھپانے کے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی ظاہر کرنا بھی کئے ہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے:۔

فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا (۶-۲۷) اور کہیں گے کہ اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹا دیئے جائیں تاکہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں۔

لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ آیت مذکورہ میں جس ندامت کے چھپانے کا ذکر ہے اس سے وہ ندامت مراد نہیں ہے جس کے اظہار کی طرف آیت يٰلَيْتَنَا میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

اَسْرَرْتُ اِلٰى فُلَانٍ حَدِيْثًا کسی سے پوشیدہ طور پر راز کی بات کہنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا (۶۶-۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔

اور آیت:۔

تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ (۶۰-۱) اور تم ان کی طرف پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں اپنی پوشیدہ دوستی سے آگاہ کرتے ہو۔ اس بنا پر بعض نے یہاں تُسِرُّوْنَ کے معنی تُظْهِرُوْنَ کئے ہیں اور یہی معنی صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اِسْرَارٌ اِلَى الْغَيْرِ (کسی سے بھید کی بات کہنا) جس طرح دوسروں سے اخفا کو مقتضی ہے اسی طرح اس شخص کے سامنے اظہار کو مستلزم ہے جس سے وہ بھید کہا جاتا ہے لہٰذا اَسْرَرْتُ اِلٰى فُلَانٍ (یعنی دوسرے سے راز کی بات کہنا) میں من وجہ اخفا اور من وجہ اظہار کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیت:۔

وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (۷۱-۹) (ظاہر اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

اور کنایہ کے طور پر اَلسِّرُّ کے معنی نکاح (جماع) کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چھپ کر کیا جاتا ہے اور سِرٌّ خالص چیز کو کہتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے۔ هُوَ مِنْ سِرِّ قَوْمِهٖ وہ اپنی قوم میں سب سے بہتر ہے اور اسی سے سِرُّ الْوَادِيْ وَسَرَارَتُهٗ ہے جس کے معنی وادی کے بہتر حصہ کے ہیں۔

سُرَّةُ الْبَطْنِ ناف کا وہ حصہ جو قطع کرنے کے

بعد باقی رہ جاتا ہے اور یہ چونکہ عکن بطن میں مخفی رہتا ہے اس لئے اسے سُرَّۃُ الْبَطْنِ کہتے ہیں اور وہ چیز جو ناف سے قطع کی جاتی ہے اسے سُرٌّ وَ سُرُوْرٌ کہا جاتا ہے ہتھیلی کی لکیروں کو اَسِرَّۃُ الْکَفِّ کہتے ہیں اسی طرح پیشانی کے خطوط کو اَسَارِیْرُ الْجَبْهَةِ کہا جاتا ہے اسیطرح مہینہ کی آخری تاریخ جس میں چاند ظاہر نہیں ہوتا اسے سَرَارٌ کہا جاتا ہے۔ اَلسُّرُوْرُ دلی فرحت کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا (۷۶-۱۱) اور خدا ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔

تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ (۲-۶۹) کہ دیکھنے والے کے دل کو خوش کر دیتا ہو۔

اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:۔

وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۸۴-۹) اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔

اور اہل نار کے متعلق فرمایا:۔

اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۸۴-۱۳) یہ اپنے اہل و عیال میں مست رہتا تھا۔

تو اس میں تنبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔

اَلسَّرِيْرُ (تخت) وہ جس پر کہ ٹھاٹھ سے بیٹھا جاتا ہے یہ سُرُوْر سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں اس کی جمع اَسِرَّۃٌ اور سُرُرٌ آتی ہے۔ قرآن نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ (۵۲-۲۰) تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔

فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ (۸۸-۱۳) وہاں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے۔

وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ (۴۳-۳۴) اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنا دیئے) اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔

اور میت کے جنازہ کو اگر سَرِيْرُ الْمَيِّتِ کہا جاتا ہے تو یہ سریر (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یا نیک شگون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قید خانہ سے رہائی پاکر جوار الٰہی میں خوش و خرم ہے جس کی طرف کہ آنحضرت نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا[1] (۱۷۵) اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ کہ مومن کو دنیا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

(س ر ب)

اَلسَّرَبُ (مصدر ن) اس کے اصل معنی نشیب کی طرف جانے کے ہیں اور (اسم کے طور پر) نشیبی جگہ کو بھی سَرَبٌ کہہ دیتے ہیں قرآن میں ہے:۔

فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ سَرَبًا (۱۸-۶۱) تو اس نے دریا میں سرنگ کی طرح اپنا رستہ بنا لیا۔

سَرَبَ (ن) سَرَبًا، سُرُوْبًا جیسے مَرَّ مَرًّا وَمُرُوْرًا اور اِنْسَرَبَ (انفعال) کے ایک ہی معنی آتے ہیں لیکن سَرَبَ بالذات فاعل سے فعل صادر ہونے پر بولا جاتا ہے اور اِنْسَرَبَ بھی انفعالی معنی کے لحاظ سے بولا جاتا ہے یعنی وہ فعل جو دوسرے سے متاثر ہو کر کیا جائے۔

سَرِبَ الدَّمْعُ (س) آنسو رواں ہونا۔

[1] وجنة الکافر الحدیث راجع (حم م ، ت) وعن ابی ہریرۃ وابن حبان فی زوائدہ رقم ۱۰۸۴ (طب، ک) عن سلمان ، البزار عن ابن عمرو فی روایۃ سجن المؤمن وسنتہ راجع تخریج عراقی علی الاحیاء (۳: ۲۰۲)

السَّرَبُ الْحَيَّةُ إِلٰى جُحْرِهَا سانپ کا اپنے بل میں اتر جانا اسی طرح سَرِبَ (س) الْمَاءُ مِنَ السِّقَاءِ کے معنی مشکیزے سے پانی ٹپکنا کے ہیں اور وہ پانی جو مشکیزے سے ٹپک رہا ہو اسے مَاءٌ سَرَبٌ وَسَرِبٌ کہتے ہیں۔

اَلسَّارِبُ کسی راستہ پر اپنی مرضی سے چلا جانے والا۔

وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ (۱۳-۱۰) یا رات کو کہیں چھپ جائے یا دن (کی روشنی) میں کھلم کھلا چلے پھرے۔

سَارِبٌ کی جمع سَرْبٌ آتی ہے۔ جیسے رَكْبٌ وَرَاكِبٌ اور عرف میں اونٹوں کے گلہ کو سَرْبٌ کہا جاتا ہے۔ مثلاً محاورہ ہے: ذُعِرَتْ سِرْبُهٗ اس کے اونٹ ڈر کر متفرق ہو گئے (یعنی بدحال ہو گیا) اور هُوَ آمِنٌ فِي سِرْبِهٖ (وہ خوش حال ہے)

بعض نے سِرْبٌ کے معنی نفس کے ہیں اور بعض نے کنایتاً اہل وعیال مراد لیا ہے۔ اسی سے کنایہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

اِذْهَبِيْ فَلَا أَنْدَهُ سِرْبَكِ جاؤ تجھے طلاق ہے اور اصل معنی یہ ہے کہ تمہارے اونٹ جدھر جانا چاہیں آزادی سے چلے جائیں میں انہیں نہیں روکوں گا۔

اَلسُّرْبَةُ دس سے لے کر بیس تک گھوڑوں کی جماعت کو سُرْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمَسْرُبَةُ (بضم را) سینہ کے درمیان کے بال جو نیچے پیٹ تک ایک خط کی صورت میں چلے جاتے ہیں۔ اَلسَّرَابُ (شدت گرما میں دوپہر کے وقت) بیابان میں جو پانی کی طرح چمکتی ہوئی ریت نظر آتی ہے اسے سَرَابٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بظاہر دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے پانی بہہ رہا ہے پھر اس سے ہر بے حقیقت چیز کو تشبیہ کے طور پر سَرَابٌ کہا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل جو چیز حقیقت رکھتی ہو اسے شَرَابٌ کہا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:

كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً (۲۴-۳۹) جیسے میدان میں سراب کہ پیاسا اسے پانی سمجھے۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۷۸-۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو کر رہ جائیں گے۔

(س ر ب ل)

اَلسِّرْبَالُ۔ کرتہ۔ قمیص خواہ کسی چیز سے بنی ہوئی ہو جیسے فرمایا:

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ (۱۴-۵۰) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔

سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ (۱۶-۸۱) اور تمہارے (آرام کے) واسطے کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور کرتے (یعنی زرہیں) جو تم کو (اسلحہ) جنگ (کے ضرر) سے محفوظ رکھیں۔

تو بَأْسَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ رکھتے ہیں۔

(س ر ج)

اَلسِّرَاجُ (چراغ) وہ چیز جو بتی اور تیل سے روشن ہوتی ہے۔ مجازاً ہر روشن چیز کو سِرَاجٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۷۱-۱۶) اور سورج کو چراغ ٹھہرایا ہے۔

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا (۷۸-۱۳) اور روشن چراغ بنایا۔

تو یہاں "روشن چراغ" سے مراد سورج ہے۔
اَسْرَجْتُ السِّرَاجَ کے معنی چراغ روشن کرنے کے ہیں اور سَرَّجْتُ کَذَا کے معنی چراغ کی مثل کسی چیز کو خوبصورت بنانے کے۔ شاعر نے کہا ہے (رجز)

(۲۲۴) وَ فَاحِمًا وَ مَرْسَنًا مُسَرَّجًا

کوئلہ کی مثل سیاہ بال اور سراج کی مثل خوبصورت ناک
اَلسَّرْجُ کے معنی زین کے ہیں اور زین ساز کو سَرَّاجٌ کہا جاتا ہے۔

(س ر ح)

اَلسَّرْحُ ایک قسم کا پھلدار درخت ہے اس کا واحد سَرْحَۃٌ ہے اور سَرَحْتُ الْاِبِلَ کے اصل معنی تو اونٹ کو "سرح" درخت چرانے کے ہیں بعدہ چراگاہ میں چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دینے پر اس کا استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۱۶-۶) اور جب شام کو انہیں (جنگل سے) لاتے ہو اور جب صبح کو (جنگل) چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت و شان ہے۔
اور چرواہے کو "سَارِحٌ" کہا جاتا ہے اس کی جمع سَرْحٌ ہے جیسے شَارِبٌ کی جمع شَرْبٌ (اور رَاكِبٌ کی جمع رَكْبٌ) آتی ہے اور تَسْرِيحٌ کا لفظ طلاق دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔
اَوْ تَسْرِيحٌ بِاِحْسَانٍ (۲-۲۲۹) یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور اسی طرح آیت:۔
وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (۳۳-۴۹) اور ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر اچھی طرح سے رخصت کر دو۔
میں بھی سَرِّحُوهُنَّ کے معنی طلاق دینے کے ہیں اور یہ تَسْرِيحٌ سے مستعار ہے جس کے معنی جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑ دینا کے ہیں۔ جیسا کہ خود طلاق کا لفظ اِطْلَاقُ الْاِبِلِ (اونٹ کا پائے بند کھولنا) کے محاورہ سے مستعار ہے۔ اور کبھی "سَرْحٌ" میں تیز روی کے معنی کا اعتبار کر کے تیز رو اور سہل رفتار اونٹنی کو نَاقَۃٌ سُرُحٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے بطور استعارہ شعر کے ایک بحر کا نام مُنْسَرِحٌ رکھا گیا ہے۔

(س ر د)

اَلسَّرْدُ اصل میں اس کے معنی کسی سخت چیز کو سینے کے ہیں۔ جیسے زرہ بنانا اور چمڑے کو سینا پھر بطور استعارہ لوہے کی کڑیوں کو مسلسل جوڑنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ (۳۴-۱۱) اور کڑیوں کو اندازہ سے جوڑو۔
اور صِرَاطٌ وَ سِرَاطٌ وَ زِرَاطٌ کی طرح سَرْدٌ کو زَرْدٌ اور سَرَّادٌ کو زَرَّادٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْمِسْرَدُ (اسم آلہ) سوراخ کرنے کا اوزار۔

لہ قالہ العجاج یصف امرءۃ وقبلہ: ازمان ابدت واضحًا مفلجا۔ اغر براقا وطرفا ابرجا ومقلۃ وحاجبًا مزججا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وانظر فی دیوانہ ۸ واراجیز العرب ۴۳ والامالی ۲: ۷۰ وتہذیب الالفاظ ۲۰۷ والمعاہد ۲ والعینی (۱: ۲۹) وفی المتداولات ان لفظۃ المسرج فی الشطر غریب ولیست شعری الغرابۃ فیہ الا ان یقال ان ماخذہ دقیق ولا یاباہ الذوق۔

(س ر د ق)

اَلسُّرَادِقُ فارسی سے معرب ہے [1] کلامِ عرب میں کوئی ایسا اسم مفرد نہیں ہے جس کا تیسرا حرف الف ہو اور اس کے بعد دو حرف ہوں۔ قرآن میں ہے۔ وَاَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (۱۸-۲۹) جس کے شامیانے ان کو گھیر رہے ہوں گے۔

اور بَیْتٌ مُسَرْدَقٌ اس مکان کو کہتے ہیں جو شامیانہ کی طرز پر بنایا ہو۔

(س ر ط)

اَلسِّرَاطُ کے معنی "آسان راستہ" کے آتے ہیں اور اصل میں سَرَطْتُ الطَّعَامَ وَزَادْدَتُّهٗ سے مشتق ہے جس کے معنی طعام کو نگل جانے کے ہیں۔ اور راستہ کو صراط اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راہرو کو گویا نگل لیتا ہے یا رہرو اس کو نگلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ قَتَلَ اَرْضًا عَالِمُهَا وَقَتَلَتْ اَرْضٌ جَاهِلَهَا کہ واقف کار رہرو تو زمین کو مار ڈالتا ہے لیکن ناواقف کو زمین ہلاک کر دیتی ہے۔ ابو تمام نے کہا ہے [2]

رَعَتْهُ الْفَيَافِيْ بَعْدَ مَا كَانَ حِقْبَةً
رَعَاهَا اِذَا مَا الْمُزْنُ يَنْهَلُّ سَاكِبُهٗ

اس کے بعد کہ اس نے ایک زمانہ دراز تک سرسبز جنگلوں میں گھاس کھائی اب اس کو جنگلات نے کھالیا یعنی دبلا کر دیا۔

اسی طرح راستہ کو لَقَمٌ اور مُلْتَقَمٌ بھی کہا جاتا ہے اس لحاظ سے کہ گویا رہرو اس کو لقمہ بنا لیتا ہے۔

(س ر ع)

اَلسُّرْعَةُ اس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں اور یہ بُطْءٌ (درنگ کردن) کی ضد ہے۔ اجسام اور افعال دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے سَرُعَ (ک) فَهُوَ سَرِيْعٌ وَاَسْرَعَ (افعال)، فَهُوَ مُسْرِعٌ اس نے جلدی کی اور اَسْرَعُوْا کے معنی سَارَتْ اِبِلُهُمْ سِرَاعًا (ان کے اونٹ تیز رفتاری سے چلے گئے) آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل اَبْطَئُوْا کے معنی سست ہونا آتے ہیں۔

سَارَعُوْا وَتَسَارَعُوْا ایک دوسرے سے سبقت کرنا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳-۱۳۳) اور اپنے پروردگار کی بخشش (اور بہشت کی) طرف لپکو۔

وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ (۳-۱۱۴) اور نیکیوں پر لپکتے ہیں۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا (۵۰-۴۴) اس روز زمین ان پر سے پھٹ جائے گی اور جھٹ پٹ نکل کھڑے ہوں گے۔

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا (۷۰-۴۳) اس دن یہ قبروں سے نکل کر (اسطرح) دوڑیں گے۔

اور کسی کام میں قوم سے آگے نکل جانے والوں کو

---

[1] من سرا پردہ او من سرادر ۱۲ [2] الاحزوان وہما علا لبطء حلاحل ۱۲ [3] قال ابو تمام من قصیدتہ التی یمدح فیہا عبداللہ بن طاہر والبیت فی دیوانہ ۴۴ والخفاجی ۲۳ والامالی (۱ : ۵ ۸ ۵) وفی المطبوع دعتہ مصحف وفی روایۃ الدیوان ماء الروض بدل ماء المزن وبعدہٗ: فکم جزع واد جب ذروۃ غارب۔ ومن قبل کانت اتمکتہ ذوائبہ (الاتماک الاسمان والمذانب مجاری الماء) ۱۲

سَرَعَانُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے۔
مثل مشہور ہے[1] (مثل) سَرْعَانَ ذَا اِہَالَۃً یہ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو قبل از وقت کسی واقعہ کی پیش گوئی کرے۔ تو یہ سَرُعَ سے مبنی بر فتحہ ہے۔ جیسا کہ وَشُکَ سے وَشْکَانَ اور عَجِلَ سے عَجْلَانَ آجاتا ہے اور آیت:۔
اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۳-۱۹۹) (اور) خدا جلد (از جلد) حساب لینے والا ہے۔
اور اسی طرح آیت:۔
اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ (۷-۱۶۷) بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے۔
میں سَرِیْع کے لفظ سے اس معنی پر تنبیہ کرنا مقصود ہے جو کہ آیت:۔
اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۳۶-۸۲) اس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔
سے مفہوم ہوتے ہیں۔

(س ر ف)

اَلسَّرَفُ کے معنی انسان کے کسی کام میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں مگر عام طور پر اس کا استعمال انفاق یعنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کر جانے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا (۲۵-۶۷) اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں۔
وَلَا تَاْکُلُوْھَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّکْبَرُوْا (۴-۶) اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (یعنی بڑی ہو کر تم سے اپنا کا مال واپس لے لیں گے) اسے فضول خرچی اور جلدی میں نہ اڑا دینا۔
اور یہ یعنی بے جا سرف کرنا مقدار اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے بولا جاتا ہے چنانچہ حضرت سفیان (ثوری) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی میں ایک حبہ بھی صرف کیا جائے تو وہ اسراف میں داخل ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (۶-۱۴۲) اور بے جا نہ اڑانا کہ خدا بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔
وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ ھُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۴۰-۴۳) اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں۔
یعنی جو اپنے امور میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ (۴۰-۲۸) بے شک خدا اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے نکل جانے والا (اور) جھوٹا ہے۔
اور قوم لوط علیہ السلام کو بھی مُسْرِفِیْنَ (حد سے تجاوز کرنے والے) کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی خلاف فطرت فعل کا ارتکاب کرکے جائز حدود سے تجاوز کرتے تھے اور عورت جسے آیت:۔
وَنِسَاؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ (۲-۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔
میں حَرْثٌ قرار دیا گیا ہے ـــــ میں بیج بونے کی بجائے اسے بے محل ضائع کرتے تھے اور آیت:۔
یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِھِمْ (۳۹-۵۳) (اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی۔
میں اَسْرَفُوْا کا لفظ مال وغیرہ ہر قسم کے اسراف کو شامل ہے اور قصاص کے متعلق آیت:۔

[1] اہالۃ منصوب علی الحال والتقدیر سرعان اہالۃ ہذہ (منتہی الارب)

فَلَا یُسۡرِفۡ فِّی الۡقَتۡلِ (۱۷-۳۳) تو اس کو چاہیئے
کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے۔
میں اِسۡرَاف فِی الۡقَتۡلِ یہ ہے کہ غیر قاتل کو قتل
کرے اس کی دو صورتیں ہیں۔ مقتول سے بڑھ کر
باشرف آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔ یا
قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرے جیسا کہ
جاہلیت میں رواج تھا۔
عام محاورہ ہے۔ مَرَرۡتُ بِکُمۡ فَسَرَفۡتُکُمۡ
کہ تمہارے پاس سے بے خبری میں گزر گیا۔
تو یہاں سَرَفۡتُ بمعنی جَھِلۡتُ کے ہے یعنی
اس نے بے خبری میں اس حد سے تجاوز کیا جس
سے اسے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے تھا اور یہی معنی
جہالت کے ہیں۔
اَلسُّرۡفَۃُ ایک چھوٹا سا کیڑا جو درخت کے
پتے کھا جاتا ہے۔ اس میں اسراف کا تصور کر کے
اسے سُرۡفَۃ کہا جاتا ہے پھر اس سے اشتقاق
کر کے کہا جاتا ہے۔
سُرِفَتِ الشَّجَرَۃُ درخت کرم خوردہ ہو گیا۔
اور ایسے درخت کو مَسۡرُوۡفَۃ (کرم خوردہ) کہا جاتا ہے۔

(س ر ق)

اَلسَّرِقَۃُ (مصدر ض) اس کے اصل معنی خفیہ
طور پر اس چیز کے لے لینے کے ہیں جس کو لینے کا
حق نہ ہو اور اصطلاح شریعت میں کسی چیز کو
محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں لے لینے کے
ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ (۵-۳۸) اور جو چوری
کرے مرد ہو یا عورت۔
قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ۔
(۱۲-۷۷) (برادران یوسفؑ نے) کہا اگر اس نے
چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ اس کے ایک بھائی
نے بھی پہلے چوری کی تھی۔
اَیَّتُھَا الۡعِیۡرُ اِنَّکُمۡ لَسَارِقُوۡنَ (۱۲-۷۰) کہ اے قافلہ
والو! تم تو چور ہو۔
اِنَّ ابۡنَکَ سَرَقَ (۱۲-۸۱) کہ آپ کے صاحبزادے
نے (وہاں جا کر) چوری کی۔
اور اِسۡتَرَقَ السَّمۡعَ کے معنی چوری چھپے سننے
کی کوشش کرنا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اِلَّا مَنِ اسۡتَرَقَ السَّمۡعَ (۱۵-۱۸) ہاں اگر کوئی
چوری سے سننا چاہے۔
اَلسَّرَقُ وَالسَّرَقَۃُ سفید ریشم۔

(س ر م د)

اَلسَّرۡمَدُ کے معنی دائم (ہمیشہ) کے ہیں۔[1]
قرآن میں ہے:۔
قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ الَّیۡلَ
سَرۡمَدًا (۲۸-۷۱) کہو۔ بھلا دیکھو تو اگر خدا
تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک رات (کی
تاریکی) کئے رہے۔
اسی طرح اس کے بعد کی آیت میں اَلنَّھَارَ سَرۡمَدًا
فرمایا ہے۔

(س ر ی)

اَلسُّرٰی کے معنی رات کو سفر کرنے
کے ہیں اور اس معنی میں سَرٰی (ض) وَاَسۡرٰی
(افعال) دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] فی الکشاف انہ مشتق من السرد علی وزن فَعۡمَلٌ فالمیم فیہ زائدۃ وان کان رباعیا فوزنہ فعلل (الکشاف والروح)

فَاَسْرِ بِاَھْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ (۱۱-۸۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا (۱۷-۱) (وہ ذات (پاک) ہے جو ایک رات اپنے بندے کو...... لے گیا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْرٰی (باب افعال) سَرٰی یَسْرِیْ سے نہیں ہے۔ جس کے معنی رات کو سفر کرنے کے ہیں، بلکہ یہ سَرَاۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی کشادہ زمین کے ہیں۔ (اور اصل میں) اس کے لام کلمہ میں واو ہے اور اسی سے شاعر نے کہا ہے[1]۔ (البسیط)

(۲۱۶) بِسَرْوِ حِمْیَرَ اَبْوَالُ الْبِغَالِ بِہٖ

حمیر کی کشادہ زمین میں جہاں خچروں کا پیشاب یعنی کہ سراب نظر آتے ہیں۔

پس اَسْرٰی کے معنی کشادہ زمین میں چلے جانا ہیں جیسے اَجْبَلَ کے معنی ہیں وہ پہاڑ پر چلا گیا اور اَتْھَمَ کے معنی، وہ تہامہ میں چلا گیا۔

لہٰذا آیت:۔

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو وسیع اور کشادہ سرزمین میں لے گیا۔ نیز سَرَاۃٌ ہر چیز کے افضل اور اعلیٰ حصہ کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے سَرَاۃُ النَّھَارِ ہے جس کے معنی دن کی بلندی کے ہیں۔ اور آیت:۔

قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا (۱۹-۲۴) تمہارے پروردگار نے تمہارے نیچے ایک چشمہ پیدا کر دیا ہے۔

میں سَرِیٌّ سے نہر جاری مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ سَرْوٌ سے مشتق ہے جس کے معنی رفعت کے ہیں اور بلند قد آدمی کو رَجُلٌ سَرْوٌ کہا جاتا ہے تو لفظ سری سے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اس شرف کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص طور پر نوازا تھا۔

محاورہ ہے:۔

سَرَوْتُ الثَّوْبَ عَنِّیْ میں نے اپنے اوپر سے کپڑا اتار دیا۔

وَسَرَوْتُ الْجُلَّ عَنِ الْفَرَسِ میں نے گھوڑے سے جھول اتار دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ اسی سے رَجُلٌ سَرِیٌّ ہے کیونکہ بلند قد آدمی ہوشیار رہتا ہے گویا وہ کپڑے اتارے ہوئے ہے اسکے برعکس کاہل سست اور ناتوان آدمی کو مُتَدَثِّرٌ مُتَزَمِّلٌ اور زُمَّیْلٌ وغیرہ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے کپڑوں میں لپٹا پڑا ہے اور اَلسَّارِیَۃُ اس جماعت کو کہتے ہیں جو رات کو سفر کرتی ہو اور اس کے معنی رات کے بادل اور ستون بھی آتے ہیں۔

لہ من بحر جمہرۃ ۲۰۰...۳۱ فی صبیًّا منعلہا: طاف الخیال رکب ایلما بینا۔ ودون لیلی عوادٍ لو تعدینا قالہ تمیم بن مقبل العامری فی مشوبتہ وہ مشوبات العرب سبع قصائد [illegible] انی تسعیت وہنا فالک البنا وسرو حمیر من منازلہم بالیمن والبواب البغال یراد بہا السراب تشبیہًا فلان بوال البغال کاذبلا بقیح وکذا السراب والبین: الارض الواسعۃ قدر مد البصر کما فی المعاجم راجع المقاییس واللسان (بین، سری) تہ اصلاح ابن یعقوب [illegible] والبیت ایضا فی امالی المرتضی ۱: ۲۹۱ وتہذیب المنطق (...) وفیہ سرو حمیر بدل البا و سرو حمیر مکان یوصف بالمعنی حد بعضہم [illegible] الی قابل لاسترین بین الناس حتی یاتی الراعی حقہ بسرو حمیر لم یعرق جبینہ۔ راجع للبیت السبع لابن الانباری [illegible] اشتقاق ے والبلدان وراجع ایضا غریب ابی عبید ۳/ ۲۷۷-۲۷۸

(س ط ح)

اَلسَّطْحُ مکان کے اوپر کے حصے یعنی چھت کو کہتے ہیں اور سَطَحْتُ الْبَيْتَ کے معنی چھت ڈالنے کے ہیں لیکن سَطَحْتُ الْمَكَانَ کے معنی کسی جگہ کو چھت کی طرح ہموار کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۸۸-۲۰) اور زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی۔

اِنْسَطَحَ الرَّجُلُ کے معنی چت لیٹنے کے ہیں اور ربی ذئب کے ایک کاہن کا نام سَطِيْحٌ مشہور ہوگیا تھا۔ کیونکہ وہ زمانت کی مرض میں مبتلا ہونے کے باعث زمین پر پڑا رہتا تھا۔

اَلْمِسْطَحُ خیمہ کا ستون جس پر خیمہ نصب کیا جاتا ہے۔

سَطَحْتُ الثَّرِيْدَةَ فِي الْقَصْعَةِ میں نے پیالہ میں ثرید کو پھیلایا۔

(س ط ر)

اَلسَّطْرُ وَالسَّطَرُ قطار کو کہتے ہیں خواہ کسی کتاب کی ہو یا درختوں اور آدمیوں کی۔ اور سَطَرَ فُلَانٌ كَذَا کے معنی ایک ایک سطر کر کے لکھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

نٓ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸-۱) ن قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ (۵۲-۲) اور کتاب جو لکھی ہوئی ہے۔

كَانَ ذَالِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُوْرًا (۱۷-۵۸) یہ حکم کتاب یعنی قرآن میں لکھ دیا گیا ہے یعنی مندرج اور ثابت ہے۔

اور سَطْرٌ کی جمع اَسْطُرٌ وَسُطُوْرٌ وَاَسْطَارٌ آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رجز):

(۲۲۷) اِنِّیْ وَاَسْطَارٍ سُطِرْنَ سَطْرًا

یعنی قسم ہے قرآن کی سطروں کی کہ میں ۔۔۔۔۔

اور آیت کریمہ:۔

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۶-۲۵) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں

میں مبرد نے کہا ہے کہ یہ اُسْطُوْرَةٌ کی جمع ہے جیسے اُرْجُوْحَةٌ کی جمع اَرَاجِيْحُ اور اُثْفِيَّةٌ کی جمع اَثَافِيُّ اور اُحْدُوْثَةٌ کی اَحَادِيْثُ آتی ہے۔

اور آیت:۔

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَا اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۶-۲۴) اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔

یعنی انہوں نے بزعم خود یہ کہا کہ یہ جھوٹ موٹ کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ان کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۲۵-۵) اور کہتے ہیں کہ یہ (پہلے

---

[1] قاله رؤبة بن العجاج وتمامه: القائل يا نصر نصرًا نصرًا ۔ والشطر في الخزانة (۱: ۱۹۰) وفي الشطر الثاني بحث قرره على ثلاثة اوجه في العباب للصاغاني (بالصاد المهملة) مصحف والصواب المعجمة وهو اسم الحاجب وتبعه صاحب القاموس لكنه اخطأ والبيت من شواهد الكشاف ۲: ۵ والطبري ۲۹: ۸ (۱۰۲۰) ومجاز القرآن لابي عبيدة (۲: ۳۰۰) ۳۴۳، ۲۷۶ رقم ۷۶۲ وفي رواية آيات بدل اسطار والشنتمري (۱: ۳۰۴) والسيرافي ۲۷ وديوانه ۱۷۴ ط ليبسك والسان والصحاح (سطر) والرجز مما استشهد به النحويون في توابع المنادى انظر السيوطي وابن يعيش في شرح المفصل وابن العيون في شرح ابيات الايضاح وحاشية الامير على المغني (۲: ۱۵) والدسوقي (۲: ۴۶) والشذور ۳۲۷ وابن هشام رقم ۴۲۷ ❊ ❊ ❊

لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے وہ صبح وشام ان کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

اور آیت :۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ (۸۸-۲۱،۲۲) تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔

میں لفظ مُسَيْطِرٍ اور اسی طرح آیت :۔

أَمْ هُمُ الْمُسَيْطِرُونَ (۵۲-۳۷) یا یہ کہیں کے داروغہ ہیں۔

میں مُسَيْطِرُونَ، تَسَيْطَرَ فُلَانٌ عَلَىٰ كَذَا وَسَيْطَرَ عَلَيْهِ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی حفاظت کے لئے اس پر سطر کی طرح سیدھا کھڑا ہونے کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم ان پر نگہداشت کے لئے مقرر نہیں ہو۔ اور یہاں مُسَيْطِرٌ کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت :۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (۱۳-۳۳) تو کیا جو (خدا) ہر متنفس کے اعمال کا نگران (ونگہبان) ہے۔

میں قَائِمٌ کا۔ اور آیت :۔

وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِحَفِيظٍ۔ میں حفیظ کا لفظ ہے۔ بلکہ بعض نے تو آیت لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ کے معنی ہی لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِحَفِيظٍ کئے ہیں لہذا مُسَيْطِرٌ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت :۔

وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (۴۳-۸۰) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی سب باتیں) لکھ لیتے ہیں۔

میں کتابت کا لفظ ہے اور یہ کتابت وہی ہے جو کہ آیت أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ..... (۲۲-۷۰) کیا تم نہیں جانتے کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ خدا اس کو جانتا ہے یہ سب کچھ کتاب میں (لکھا ہوا) ہے بے شک یہ سب کچھ خدا کو آسان ہے۔ میں مذکور ہے۔

(س ط و)

السَّطْوَةُ (متعدیہ بواسطہ باء) کے معنی کسی کو سختی سے پکڑنے کے ہیں جیسے سَطَا بِهِ (ن) اس کو سخت پکڑا یا اس پر حملہ کیا۔ قرآن میں ہے :۔

يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا (۲۲-۷۲) قریب ہوتے ہیں کہ جو لوگ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں ان پر حملہ کر دیں۔

یہ اصل میں سَطَا الْفَرَسُ (ن) عَلَى الرَّمَكَةِ سے مشتق ہے جس کے معنی نر گھوڑے کے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اپنی مادہ پر چڑھ جانے کے ہیں خواہ بوجہ نشاط کے ہو یا جفتی کی غرض سے۔ اسی طرح سَطَا الرَّاعِي عَلَى النَّاقَةِ کے معنی چرواہے کے اونٹنی کے فرج میں ہاتھ ڈال کر اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکالنے کے ہیں[1]۔

پھر استعارہ کے طور پر طَغْوٌ کی طرح سَطْوَةٌ کا لفظ بھی پانی کی زیادتی پر بولا جاتا ہے اور طَغَى الْمَاءُ، وَسَطَا کے معنی پانی کے طغیانی میں آجانے کے ہیں۔

(س ع د)

السَّعْدُ وَالسَّعَادَةُ (خوش نصیبی) کے معنی ہیں حصول خیر میں امور الٰہیہ کا انسان کے لئے

---

[1] وفی الحدیث لا بأس أن يسطو الرجل على المرأة إذا خيف عليها ولم توجد امرأة تعالجها (النهایہ)

ممد اور معاون ہونا۔ اس کی ضد شَقَاوَۃٌ (بدبختی) ہے سَعِدَ (لازم) کے معنی نیک بخت ہونے اور اَسْعَدَہُ اللہُ کے معنی نیک بخت کرنے کے ہیں۔ سَعِیْدٌ (نیک بخت) جمع سُعَدَاءُ اور سب سے بڑی سعادت مندی جنت میں جانا ہے اسی لئے قرآن پاک میں فرمایا ہے:۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّۃِ (۱۱-۱۰۸) اور جو نیک بخت ہوں گے وہ بہشت میں داخل کئے جائیں گے۔

اور فرمایا:۔

فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ (۱۱-۱۰۵) پھر ان میں سے کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔

اَلْمُسَاعَدَۃُ (کار خیر میں مدد کرنا) کے معنی ایسے کام میں معاونت کے ہیں جس میں سعادت کا گمان ہو۔ اور لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بہت زیادہ سعادت بخشے اور تمہاری مساعدت فرمائے۔ لیکن پہلے معنی زیادہ بہتر ہیں۔

اَلْاِسْعَادُ خاص کر نوحہ خوانی میں کسی کی مدد کرنا۔ جیسے محاورہ ہے:۔

اِسْتَسْعَدْتُہٗ فَاَسْعَدَنِیْ میں نے اس سے مدد مانگی تو اس نے میری مدد کی۔

اَلسَّاعِدُ کلائی یا بازو کو کہتے ہیں کیونکہ انسان (دفاع اسی کے زور سے کرتا ہے تو) گویا اس میں مُسَاعَدَۃٌ کے معنی پائے جاتے ہیں اسی بنا پر پرند کے بازوں کو سَاعِدَیْنِ کہا جاتا ہے۔ جیساکہ (معنیٰ قوت کے لحاظ سے) انہیں یَمَانَیْنِ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اَلسَّعْدَانَۃُ ایک خاردار گھاس جس کے کھانے سے اونٹنی کا دودھ بڑھ جاتا ہے۔ اسی لئے مثال مشہور ہے[1]۔ (مثل)

مَرْعًی وَلَا کَالسَّعْدَانَۃِ کہ گھاس تو ہے لیکن سعدانہ کی سی نہیں۔ اَلسَّعْدَانَۃُ کے معنی کبوتر، تسمہ کی گرہ۔ اور اونٹ کے سینہ کے بھی آئے ہیں اور سُعُوْدُ الْکَوَاکِبِ مشہور دس ستارے ہیں جن میں سے ہر ایک کو سَعْدٌ کہا جاتا ہے۔

(س ع ر)

اَلسَّعْرُ کے معنی آگ بھڑکنے کے ہیں۔ اور سَعَرْتُ النَّارَ وَسَعَّرْتُہَا کے معنی آگ بھڑکانے کے۔ مجازاً لڑائی وغیرہ بھڑکانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:۔ اِسْتَعَرَ الْحَرْبُ لڑائی بھڑک اٹھی اِسْتَعَرَ اللُّصُوْصُ ڈاکو بھڑک اٹھے۔ یہ اِشْتَعَلَ کے ہم معنی ہے اور نَاقَۃٌ مَسْعُوْرَۃٌ کے معنی دیوانی اونٹنی کے ہیں جیسے:۔ مُوْقَدَۃٌ وَمُهَیَّجَۃٌ کا لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے۔

اَلْمِسْعَرُ آگ بھڑکانے کی لکڑی (کھرنی) لڑائی بھڑکانے والا۔

اَلسُّعَارُ آگ کی تپش کو کہتے ہیں اور سُعِرَ الرَّجُلُ کے معنی آگ یا گرم ہوا سے جھلس جانے کے ہیں۔

---

[1] انظر المثل الکامل ۹-۱۰۰ کالسعدان بدون الہاء قال الشاعر: ماءٌ ولا کصدّاءٍ مرعیً ولا کالسعدان یشرب التنبیع الذی فیہ فضل وغیرہ افضل اول من قال ذالک خنساء بنت عمرو بن الشرید وحکی انہ لامرءۃ من طی تزوجہا امرؤ القیس ابن حجر الکندی انظر المثل والقصۃ المیدانی رقم ۳۸۳۷ و ۳۸۳۸ والسمط ۴ والفاخر رقم ۱۲۱ والعسکری ۲/۱۸۷، ۲۰۲ والضبی ۵۴، ۶۹ والالفاظ ۵۵ والنویری ۳/۵۱ والمستقصی ۱۲

قرآن میں ہے:۔
وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (۴-۱۰) اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔
وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ (۸۱-۱۲) اور جب دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی۔
عَذَابَ السَّعِيْرِ (۶۷-۵) دہکتی آگ کا عذاب (تیار کر رکھا ہے۔
تو یہاں سَعِيْرٌ بمعنی مَسْعُوْرٌ ہے۔
نیز قرآن میں ہے:۔
اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (۵۴-۴۷) بے شک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں۔
اَلسُّعُرُ کے معنی مروجہ نرخ کے ہیں اور یہ استعار النار (آگ کا بھڑکنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا گیا ہے۔

(س ع ی)

اَلسَّعْيُ تیز چلنے کو کہتے ہیں اور یہ عَدْوٌ (سرپٹ دوڑ) سے کم درجہ (کی رفتار) ہے (مجازاً) کسی اچھے یا برے کام کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا (۲-۱۱۴) اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو۔
نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (۶۶-۸) (بلکہ) ان کا نور (ایمان) ان کے آگے .... چل رہا ہوگا۔
وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا (۵-۳۳) اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں۔
وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ (۲-۲۰۵) اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں (فتنہ انگیزی کرنے کے لئے) دوڑتا پھرتا ہے۔
وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (۵۳-۳۹، ۴۰) اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے، اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔
وَاِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (۹۲-۴) تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔
وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۷-۱۹) اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔
فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ (۲۱-۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔
لیکن اکثر طور پر سَعْيٌ کا لفظ افعال محمودہ میں استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الکامل)

(۲۲۸) اِنْ اَجْزِ عَلْقَمَةَ بْنَ سَيْفٍ سَعْيَهٗ
لَا اَجْزِهٖ بِبَلَاءِ يَوْمٍ وَّاحِدٍ

اگر میں علقمہ بن سیف کو اس کی مساعی کا بدلہ دوں تو ایک دن کے حسن کردار کا بدلہ نہیں دے سکتا اور قرآن میں ہے:۔
فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (۳۷-۱۰۲) جب وہ ان کے

---

[1] قال البغدادي في مدح علقمة بن سيف العتابي (والشعر قصة) انظر التبريزي والبيت في الحماسة (۲: ۲۶۷) والمرزوقي رقم ۶۲۶ واللسان (ظلم) والبيان ۳: ۱۳ والمعجم للمرزباني والبيت معزو لمرداق الطائي وفي المطبوع: بن سعد والتصحيح من البيان وشرح الحماسة والبيت ايضا في الحيوان (۳: ۲۶۴) في ثلاثة ۱۲

سانھد دوڑنے کی عمر کو پہنچا۔
یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹا سکے اور مناسک حج میں سَعْیٌ کا لفظ صفا اور مروہ کے درمیان چلنے کے لئے مخصوص ہوچکا ہے اور سعا یَسْعٰی کے معنی خاص کر چغلی کھانے اور صدقہ وصول کرنے کے آتے ہیں اور مُکَاتَبْ غلام کے اپنے آپ کو آزاد کروانے کے لئے مال کمانے پر بھی سِعَایَۃٌ کا لفظ بولا جاتا ہے مُسَاعَاۃٌ کا لفظ فسق و فجور اور مَسْعَاۃٌ کا لفظ اچھے کاموں کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ (۲۲-۵۱)
اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں اپنے زعم باطل میں ہمیں عاجز کرنے کے لئے سعی کی۔ میں سعی کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے ہماری نازل کردہ آیات میں ہمارے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے پوری طاقت صرف کر ڈالی۔

(س غ ب)

اَلْمَسْغَبَۃُ (س ن) بھوک چنانچہ آیت کریمہ:
اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ (۹۰-۱۴) یا بھوک کے دن کھانا کھلانا۔
میں مَسْغَبَۃٌ سَغَبٌ سے مشتق ہے جس کے معنی بھوک سے درماندہ ہوجانے کے ہیں اور پیاس سے نڈھال ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے سَغِبَ (س) سَغَبًا وَسُغُوْبًا وَھُوَ سَاغِبٌ اور صفت کا صیغہ سَغْبَانُ مثل عَطْشَانُ بھی آتا ہے۔

(س ف ر)

اَلسَّفْرُ اصل میں اس کے معنی کشفِ غطاء یعنی پردہ اٹھانے کے ہیں اور یہ اَعْیَان کے ساتھ مخصوص ہے جیسے سَفَرَ الْعِمَامَۃَ عَنِ الرَّأْسِ اس نے سر سے عمامہ اتار دیا۔ سَفَرَ عَنِ الْوَجْہِ چہرہ کھولنا اور سَفَرُ الْبَیْتِ کے معنی گھر میں جھاڑو دینے اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے ہیں اور جھاڑو کو مِسْفَر اور اس گرد و غبار کو سَفِیْرٌ کہا جاتا ہے جو جھاڑو دے کر دور کی جاتی ہے۔
اَلْاِسْفَارُ (افعال) یہ الوان کے ساتھ مختص ہے یعنی کسی رنگ کے ظاہر ہونے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ (۷۴-۳۴) اور قسم ہے صبح کی جب روشن ہو۔ اور فرمایا:
وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌ (۸۰-۳۸) کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے۔
اور حدیث[1] (۱۷۲)
اَسْفِرُوْا بِالصُّبْحِ تُؤْجَرُوْا صبح خوب روشن ہونے کے بعد نماز پڑھا کرو تو زیادہ ثواب ملے گا۔
میں اَسْفِرُوْا اَسْفَرْتُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی روشنی میں داخل ہونے کے ہیں جیسے اَصْبَحْتُ (میں صبح میں داخل ہوا)
سَفَرَ الرَّجُلُ اس نے سفر کیا اور سَافِرٌ (مسافر) کی جمع سَفْرٌ آتی ہے۔ جیسے رَاکِبٌ کی جمع رَکْبٌ (وعلی ہذا القیاس)۔

---

[1] کذا رواہ الشافعی فی اختلاف الحدیث (۲۰۷) والمعروف من الفاظ الحدیث اسفروا بالفجر فانہ اعظم للاجر من حدیث رافع بن خدیج رواہ الترمذی والشافعی فی الرسالۃ رقم ۷۴۳ وابن حبان فی موارد الظمآن رقم ۲۶۳، ۲۶۵ وفی ۲۶۲ اصبحوا بالصبح۔

اور سَافَرَ کے معنی ہیں اس نے سفر کیا یہ خاص کر باب مفاعلہ سے آتا ہے گویا اس میں جانبین یعنی وطن اور آدمی کے ایک دوسرے سے دور ہونے کے معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور سَفَرٌ سے ہی سُفْرَۃٌ کا لفظ مشتق ہے جس کے معنی طعام سفر یا توشہ دان ہیں جس میں سفری کھانا رکھا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ (۴-۴۳) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو۔

اَلسِّفْرُ اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حقائق کا بیان ہو گویا وہ حقائق کو بے نقاب کرتی ہے اس کی جمع اَسْفَارٌ آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲-۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

یہاں مُمَثَّلٌ بِہٖ میں خصوصیت کے ساتھ اَسْفَار کا لفظ ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ تورات اگرچہ اپنے مضامین کو محقق طور پر بیان کرتی ہے لیکن جاہل یہود، پھر بھی اس کو نہیں سمجھ پاتے۔ لہٰذا ان کی مثال بعینہٖ اس گدھے کی سی ہے جو علم و حکمت کے پشتارے اٹھائے ہوئے ہو اور آیت بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (۸۰-۱۵-۱۶) (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار نیکوکار ہیں۔ میں سَفَرَۃٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں دوسری جگہ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (۸۲-۱۱) عالی قدر لکھنے والے۔ کہا ہے اور یہ سَافِرٌ کی جمع ہے جیسے کَاتِبٌ کی جمع کَتَبَۃٌ۔

اَلسَّفِیْرُ۔ اس فرستادہ کو کہا جاتا ہے جو مُرْسِلٌ کی غرض کو مُرْسَلٌ اِلَیْہِ پر کھولتا اور فریقین سے منافرت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ فَعِیْلٌ بمعنی فاعل سے ہے اور سِفَارَۃٌ بمعنی رسالت آتا ہے پیغمبر، فرشتے اور (سماوی) کتابیں لوگوں پر حقائق کی کشادگی کرنے میں باہم شریک ہیں (اس لئے ان سب کو سَفِیْرٌ کہہ سکتے ہیں۔ اور سَفِیْرٌ (فعیل) بمعنی مفعول ہو تو اس کے معنی کوڑا کرکٹ کے ہوتے ہیں جو جھاڑو دے کر صاف کر دیا جاتا ہے۔ اور شاعر کے قول[1]

(۲۲۹) وَمَا السِّفَارُ قَبُحَ السِّفَارِ

میں بعض نے سِفَارٌ کے معنی اس لوہے کے کئے ہیں جو اونٹ کی ناک میں ڈالا جاتا ہے اور اس معنی پر اگر اس شعر کے علاوہ اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہ مُسَافَرَۃٌ (مفاعلہ) کا مصدر بھی ہو سکتا ہے[2]۔

(س ف ع)

اَلسَّفْعُ کے معنی گھوڑے کو سواد ناصیہ یعنی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ (۹۶-۱۵) تو ہم (اس کی) پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

اور سیاہی کے معنی کے اعتبار سے چولہے کے پتھروں (اَثَافِیْ) کو بھی سُفْعٌ کہا جاتا ہے۔ اور محاورہ ہے:۔ بِہٖ سُفْعَۃُ غَضَبٍ اس کے چہرہ پر غصے کا اثر ہے کیونکہ سخت غصہ کے وقت چہرہ کا رنگ دخانی سا ہو جاتا ہے۔ اور شکرے کو اَسْفَعُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پر (ل)

---

[1] بیدہ ۱۲ [2] کما قال حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ: لولا السفار وبعدہ خرق مہمہ۔ لترکتہا تحبو علی العرقوب وقول الاخطل یؤید قول البعض (موقع اثر السفار بخطمہ من سود عقۃ او بنی الجوال ۱۲

میں سیاہ چمک سی پائی جاتی ہے۔ اور اِمْرَءَۃٌ سَفْعَاءُ اللَّوْنِ سیاہ رنگ عورت کو کہتے ہیں۔

(س ف ک)

اَلسَّفْکُ (ض) کے معنی خون ریزی کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲-۳۰) اور کشت و خون کرتا پھرے۔

ویسے یہ لفظ ہر سیال چیز اور آنسو بہانے کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔

(س ف ل)

اَلسُّفْلُ یہ عُلُوٌّ کی ضد ہے اور سَفُلَ (سُفُوْلًا) فَهُوَ سَافِلٌ کے معنی پست اور حقیر ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (۹۵-۵) پھر (رفتہ رفتہ) اس کی حالت کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا۔ نیز فرمایا:۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ (۹-۴۰) اور کافروں کی بات کو پست کر دیا۔

کبھی اَسْفَلُ "فوق" کے بالمقابل بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ (۳۳-۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔

سُفَالَۃُ الرِّیْحِ ہوا کی بائیں جانب یعنی جدھر کو چل رہی ہو۔ اس کی ضد عُلَاوَۃٌ ہے جس کے معنی اوپر کی جانب کے ہیں یعنی جس طرف سے آ رہی ہو۔

اَلسِّفْلَۃُ کمینے لوگ جیسے دُوْنٌ۔

اَمْرُهُمْ فِيْ سَفَالٍ ان کا معاملہ انحطاط میں ہے یعنی ان کی حالت دگرگوں ہے۔

(س ف ن)

اَلسَّفْنُ۔ اس کے اصل معنی چوب اور چمڑا وغیرہ کو چھیلنے کے ہیں اور سَفَنَ الرِّیْحُ التُّرَابَ عَنِ الْاَرْضِ کے معنی ہیں۔ ہوا نے زمین سے مٹی کو کھس ڈالا۔ شاعر نے کہا ہے (الطویل) (۲۳۰) فَجَاءَ خَفِيًّا يَسْفِنُ الْاَرْضَ صَدْرُهُ وہ زمین پر اپنا سینہ رگڑتے ہوئے پوشیدہ طور پر وہاں جا پہنچا۔ اور تراشی ہوئی چیز کو سَفِيْنٌ (فعیل بمعنی مفعول) کہتے ہیں جیسے نَقِيْضٌ بمعنی منقوض آجاتا ہے اور اَلسَّفَنُ خاص کر اس کھردرے چمڑے کو کہا جاتا ہے جس کو تلوار کے قبضہ پر لگاتے ہیں اور چوب تراشی کے اوزار کو بھی مِسْفَنٌ کہا جاتا ہے جیسے تیشہ وغیرہ۔ اور چھیلنے کے معنی کے لحاظ سے کشتی کا نام سَفِيْنَۃٌ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی سطح آب کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَأَمَّا السَّفِينَةُ (۱۸-۷۹) لیکن کشتی پھر مجازاً کشتی کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر آرام دہ سواری کو سَفِیْنَۃٌ کہا جاتا ہے۔

---

[1] قالہ امرؤ القیس یصف ربیئا۔ یسفن ای یمسح وبجزہ: تری الترب منہ لاصقا کل ملصق۔ والبیت فی اللسان (سفن)، و دیوانہ۔ ۹ (صنعۃ السندوبی)، والعقد الثمین ۱۲۱ والمعانی الکبیر، ۷، ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۱) ونقد الشعر ۷۵ وفیہ لانقا کل ملزق وحضیا بالمہملۃ، والبیت ایضا فی تہذیب اصلاح المنطق (۱: ۹۲) وفی الاصلاح ۴۰۵۔ ویروی بعض الطائیین

(س ف ہ)

اَلسَّفَهُ اس کے اصل معنی جسمانی ہلکاپن کے ہیں اسی سے بہت زیادہ مضطرب رہنے والی مہار کو زِمَامٌ سَفِیْهٌ کہا جاتا ہے اور ثَوْبٌ سَفِیْهٌ کے معنی ردی کپڑے کے ہیں۔ پھر اسی سے یہ لفظ نقصان عقل کے سبب خفت نفس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ[1] جو اصل میں سَفِهَ نَفْسُهٗ ہے پھر اس سے فعل کی نسبت قطع کر کے بطور تمیز کے اسے منصوب کر دیا ہے جیسے بَطِرَتْ مَعِیْشَتَهٗ کہ یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِیْشَتُهٗ ہے[2]۔

اور سَفَهٌ کا استعمال امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق ہوتا ہے چنانچہ امور دنیوی میں سفاہت کے متعلق فرمایا:۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ (۴-۵) اور بے عقلوں کو ان کا مال .... مت دو۔

اور سفاہت اخروی کے متعلق فرمایا:۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (۷۲-۴) اور یہ کہ ہم میں سے بعض بیوقوف خدا کے بارے میں جھوٹ افترا کرتے ہیں۔

یہاں سفاہت دینی مراد ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے اور آیت کریمہ:۔

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۗءُ (۲-۱۳) تو کہتے ہیں بھلا جس طرح بیوقوف ایمان لے آئے ہیں اسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں؟۔

میں ان کو سفیہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ ان کا مؤمنین کو سُفَهَاۗءُ کہنا بنا بر حماقت ہے اور خود ان کی نادانی کی دلیل ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا (۲-۱۴۲) احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ پر (پہلے سے) چلے آتے تھے (اب) اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے۔

(س ق ر)

سَقَرُ۔ (جہنم) یہ اصل میں سَقَرَتْهُ الشَّمْسُ وَصَقَرَتْهُ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں اسے دھوپ نے جھلس دیا اور پگھلا دیا۔ پھر جہنم کا علم بن گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (۷۴-۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

اور نیز فرمایا:۔

ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (۵۴-۴۸) اب آگ کا مزہ چکھو۔

پھر چونکہ سَقَرَ اپنے اصل کے لحاظ سے جھلس دینے کے معنی کو مقتضی ہے اس لیے آیات:۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۭ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۚ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۷۴-۲۷ تا ۲۹) اور تم کیا سمجھے کہ سقر کیا ہے؟ (وہ آگ ہے کہ) نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی اور بدن کو جھلس کر سیاہ کر دے گی۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ سقر کے جو احوال تم مشاہدہ سے جانتے ہو اس کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے۔

---

[1] وفی الآیۃ (۲-۱۳۰) الا من سفہ نفسہ [2] وفیہ اختلاف قال المبرد انہ متعد بنفسہ فلا تاویل کما ورد فی الحدیث الکبر ان تسفہ الحق وعند البعض منصوب علی التمییز کما ذہب الیہ المؤلف راجع الکشاف ۱۰ ...

(س ق ط)

اَلسُّقُوْطُ (ن) اس کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے نیچے گرنے کے ہیں مثلاً کسی انسان کا چھت سے گر پڑنا یا اس کا بوڑھا ہو کر نیچے جھک جانا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا (۵۲-۴۴) اور اگر یہ آسمان (سے عذاب) کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں۔

فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ۔ (۲۶-۱۸۷) تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لا گراؤ

اور اس کے معنی قدر قیمت اور مرتبہ کے لحاظ سے گر جانا بھی آتے ہیں جیسے فرمایا:۔

اَلَا فِی الْفِتْنَۃِ سَقَطُوْا (۹-۴۹) دیکھو یہ آفت میں پڑ گئے۔

اَلسَّقْطُ وَالسُّقَاطَۃُ ناکارہ اور ردی چیز کو کہتے ہیں اور اسی سے رَجُلٌ سَاقِطٌ ہے جس کے معنے کمینے آدمی کے ہیں۔ اَسْقَطَہٗ کَذَا فلاں چیز نے اس کو ساقط کر دیا۔

اور اَسْقَطَتِ الْمَرْءَۃُ (عورت نے نا تمام حمل گرا دیا) میں اوپر سے نیچے گرنا اور ردی ہونا دونوں معنی اکٹھے پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ اَسْقَطَتِ الْمَرْءَۃُ اس وقت بولتے ہیں جب عورت نا تمام بچہ گرا دے اور اسی سے نا تمام بچہ کو سَقْطٌ یا سِقْطٌ کہا جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر چقماق کی ہلکی سی (ناقص) چنگاری کو سَقْطُ الزَّنْدِ کہا جاتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کبھی اس کے ساتھ بچہ کو بھی موسوم کیا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْہِمْ (۷-۱۴۹) اور جب وہ نادم ہوئے۔

میں پشیمان ہونا مراد ہے[1]۔ اور آیت:۔

تُسٰقِطْ عَلَیْکِ رُطَبًا جَنِیًّا (۱۹-۲۵) تم پر تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔

میں ایک قراءت تَسَّاقَطْ بھی ہے اور اس کا فاعل نَخْلَۃ ہے اور ایک قراءت میں تَسَاقَطْ ہے جو اصل میں تَتَسَاقَطْ فعل مضارع کا صیغہ ہے اس میں ایک تاء محذوف ہے اس صورت میں یہ باب تفاعل سے ہوگا اور یہ اگرچہ فاعَلَ کا مطاوع آتا ہے لیکن کبھی متعدی بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ تَجَرَّعَہٗ میں باب تَفَعُّلٌ متعدی ہے۔ اور ایک دوسری قراءت میں یَسَّاقَطْ (صیغہ مذکر) ہے اس صورت میں اس کا فاعل جِذْع ہوگا[2]۔

(س ق ف)

سَقْفُ الْبَیْتِ مکان کی چھت کو کہتے ہیں اس کی جمع سُقُفٌ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلِبُیُوْتِہِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّۃٍ (۴۳-۳۳) (ہم) ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (۵۲-۵) اور اونچی چھت کی قسم۔

میں مراد آسمان ہے جیسا کہ آیت:۔ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (۲۱-۳۲) میں آسمان کو محفوظ چھت فرمایا ہے۔

اور ہر وہ جگہ جو مُسَقَّفٌ ہو اسے سقیفہ کہا جاتا ہے جیسے صُفَّۃٌ (چبوترہ) مکان وغیرہ۔

اور چھت کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس لمبی چیز

---

[1] راجع (زیدی) [2] راجع للقراءات التاج (سقط)

کو جس میں خم سا پایا جائے مُسَقَّفٌ کہہ دیتے ہیں۔

(س ق م)

اَلسَّقَمُ وَالسُّقْمُ خاص کر جسمانی بیماری کو کہتے ہیں بخلاف مَرَضٌ کے کہ وہ جسمانی اور قلبی دونوں قسم کی بیماریوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے :۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (۲-۱۰) ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا۔ اور آیت :۔

فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ (۳۷-۸۹) اور کہا میں تو بیمار ہوں۔ میں سَقِیْمٌ کا لفظ یا تو تعریض کے طور پر استعمال ہوا ہے اور یا زمانہ ماضی یا مستقبل کی طرف اشارہ کے لئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہلکی سی بدنی تکلیف کی طرف اشارہ ہو جو اس وقت ان کو عارض تھی۔ کیونکہ انسان بہرحال کسی نہ کسی عارضہ میں مبتلا رہتا ہے اگرچہ وہ اسے محسوس نہ کرے اور خوفناک جگہ کو مَکَانٌ سَقِیْمٌ کہا جاتا ہے۔

(س ق ی)

اَلسَّقْیُ وَالسُّقْیَا کے معنی پینے کی چیز دینے کے ہیں اور اِسْقَاءٌ کے معنی پینے کی چیز پیش کر دینے کے ہیں تاکہ حسب منشا لے کر پی لے لہذا اِسْقَاءٌ بنسبت سَقْیٌ کے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اِسْقَاءٌ میں مَا یُسْقٰی مِنْهُ کے پیش کر دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ پینے والا جس قدر چاہے اس سے نوش فرمالے۔ مثلاً اَسْقَیْتُهٗ نَهْرًا کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے اسے پانی کی نہر پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ چنانچہ قرآن میں سَقْیٌ کے متعلق فرمایا :۔ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (۷۶-۲۱) اور ان کا پروردگار ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

وَسُقُوْا مَاءً حَمِیْمًا (۴۷-۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائیگا۔

وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ (۲۶-۷۹) اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اور اِسْقَاءٌ کے متعلق فرمایا :۔

وَاَسْقَیْنٰكُمْ مَّاءً فُرَاتًا (۷۷-۲۷) اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔

فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ (۱۵-۲۲) اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ :۔

نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهَا (۲۳-۲۱) (کہ) جو ان کے پیٹوں میں ہے اس سے ہم تمہیں (دودھ) پلاتے ہیں۔ میں ایک قرأت فتحہ نون کیساتھ بھی ہے۔

سِقْیٌ کے معنی پانی کا حصہ اور سیراب شدہ زمین دونوں آتے ہیں کیونکہ سِقْیٌ بمعنی مَسْقِیٌّ (اسم مفعول) کے ہے جیسے نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ۔ اور یہ دونوں چیزیں ہی مفعول بنتی ہیں اس لئے سِقْیٌ کا لفظ ان دونوں پر بولا جا سکتا ہے۔

اَلْاِسْتِسْقَاءُ کے معنی کسی سے پانی طلب کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے :۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی (۲-۶۰) اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لئے (خدا سے) پانی مانگا

اَلسِّقَاءُ (مشکیزہ) وہ برتن جس میں پینے کی چیز رکھی جائے اسی سے ہے اَسْقَیْتُكَ جِلْدًا کہ میں نے تمہیں (مشکیزہ بنانے کے لئے چمڑا دیا) اور آیت کریمہ :۔

جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ (۱۲-۷۰) (تو) اپنے

بھائی کے شلیتے میں پینے کا برتن رکھ دیا۔
یہاں سِقَایَۃ سے مراد وہی ہے جسے دوسری آیت میں (صُوَاعَ الملک کہا گیا ہے اس ایک ہی برتن کے یہ دو نام دو اعتبار سے ہیں یعنی اس کے ساتھ پانی پینے کے لحاظ سے اسے سِقَایَۃ کہا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس کے ساتھ غلہ ما پا جاتا ہے اسے صُوَاع کہدیا ہے۔

(س ک ب)

مَاءٌ مَسْكُوْبٌ کے معنی بہائے ہوئے پانی کے ہیں[1]۔
اور تیز رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ سَكْبُ الجَرْيِ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے:۔ سَكَبْتُهٗ فَانْسَكَبَ میں نے اسے بہایا تو وہ بہہ پڑا اور دَمْعٌ (آنسوؤں) کو بصورت فاعل تصور کر کے سَاكِبٌ (بہنے والے) کہا جاتا ہے اور کبھی دَمْعٌ مُنْسَكِبٌ بھی بولتے ہیں اور باریک کپڑے کو بھی سیال چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر ثَوْبٌ سَكْبٌ کہدیتے ہیں گویا وہ بہتا ہوا پانی ہے۔

(س ک ت)

اَلسُّكُوْتُ (ن) اسکے اصل معنی تو ترکِ کلام یعنی خاموش ہونے کے ہیں۔ اور بہت زیادہ چپ رہنے والے آدمی کو رَجُلٌ سِكِّيْتٌ وَسَاكُوْتٌ کہا جاتا ہے اور سَكْتَةٌ یا سُكَاتٌ مرض سکتہ کو کہتے ہیں اور موسیقی میں سَكْتٌ کا لفظ سکون نفس کے ساتھ مخصوص ہے اور افتتاح صلوٰۃ کی حالت اور قرأت سے فارغ ہونے کے بعد سکوت کرنے کو سَكَتَاتٌ فِی الصَّلٰوۃِ کہا جاتا ہے۔
اَلسُّكَيْتُ دوڑ میں سب سے آخر آنے والا گھوڑا

پھر چونکہ سُکُوْتٌ میں ایک گونہ سکون پایا جاتا ہے۔ اس لئے آیت:۔
وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ (۷-۱۵۴) اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا۔
میں بطور استعارہ غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَكَتَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(س ک ر)

اَلسُّكْرُ اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اس کا عام استعمال شراب کی مستی پر ہوتا ہے اور کبھی شدت غضب یا غلبۂ عشق کی کیفیت کو سکر سے تعبیر کر لیا جاتا ہے اسی لئے شاعر نے کہا ہے[2]: (   )
(۲۲۱) سُكْرَانِ سُكْرُ هَوًى وَسُكْرُ مُدَامَةٍ
نشے دو ہیں ایک نشۂ محبت اور دوسرا نشہ شراب۔
اور اسی سے سَكَرَاتُ الْمَوْتِ (موت کی بیہوشی) ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ (۵۰-۱۹) اور موت کی بے ہوشی حقیقت کھولنے کو طاری ہوگئی۔
اَلسَّكَرُ (بفتح السین والکاف) نشہ آور چیز۔ قرآن میں ہے:۔
تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ...... (۱۶-۶۷) کہ ان سے شراب بناتے ہو اور عمدہ رزق (کھاتے ہو)
اور شراب سے انسان اور اس کی عقل کے درمیان بھی چونکہ دیوار کی طرح کوئی چیز حائل ہو جاتی ہے اس اعتبار سے سَكْرٌ کے معنی پانی کو بند لگانے اور روکنے کے آجاتے ہیں اور اس بند کو جو پانی روکنے

---

[1] وفی القرآن وماءٍ مسكوبٍ (۵۶-۳۱) [2] وتمامہ: فمتی یفیق فتًی بہ سکران؟ والبیت فی الرسالۃ بغیر عزو وفی المطبوع طام بغیرها ۱۲

کے لئے لگایا جائے سکر کہا جاتا ہے (یہ فعل بمعنی مفعول ہے) اور آیت:۔

اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا ...... (۱۵-۱۵) کہ ہماری آنکھیں مخمور ہوگئی ہیں۔ میں سُکِّرَتْ بعض کے نزدیک شکر سے ہے اور بعض نے سکر سے لیا ہے اور پھر سِکْر سے سکون کے معنی لے کر پر سکون رات کو لَیْلَۃٌ سَاکِرَۃٌ کہا جاتا ہے۔

(س ک ن)

اَلسُّکُوْنُ (ن) حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو سُکون کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سَکَنَ فُلَانٌ مَکَانَ کَذَا کے معنی ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کرلی۔ اسی اعتبار سے جائے رہائش کو مَسْکَنٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَسَاکِنُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَا یُرٰی اِلَّا مَسٰکِنُہُمْ ...... (۴۶-۲۵) کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اور فرمایا:۔

وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّہَارِ (۶-۱۳) اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔

لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ (۲۸-۷۳) تاکہ تم اس میں آرام کرو۔

تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سَکَّنْتُہٗ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اَسْکَنْتُہٗ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ (۱۴-۳۷) اے پروردگار میں نے اپنی اولاد ...... لا بسائی ہے۔

اَسْکِنُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ (۶۵-۶) (مطلقہ) عورتوں کو (ایام عدت میں) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو۔

اور آیت:۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْکَنّٰہُ فِی الْاَرْضِ (۲۳-۱۸) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے ساتھ پانی نازل کیا پھر اسے زمین میں ٹھہرا دیا۔

میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وجود میں لانے اور پھر ایجاد کے بعد اسکے نابود کر دینے پر قادر ہے جیسا کہ آیت کے تتمہ وَاِنَّا عَلٰی ذَہَابٍ بِہٖ لَقٰدِرُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے۔ اَلسَّکَنُ کے معنی سکون کے ہیں اور ہر وہ چیز جس سے راحت حاصل ہو اسے سَکَنٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا (۱۶-۸۰) اور خدا ہی نے تمہارے لئے گھروں کو سکون کی جگہ بنایا۔ اور فرمایا:۔

اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمْ (۹-۱۰۳) تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔

وَجَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا (۶-۹۷) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام ٹھہرایا۔

اور سَکَنٌ اس آگ کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ سکون حاصل کیا جاتا ہے۔

اَلسُّکْنٰی کسی کو بغیر کرایہ کے رہائش کے لئے جگہ دینے کو سُکْنٰی کہا جاتا ہے اور ایک مکان میں رہنے والے لوگوں کو سَکْنٌ کہا جاتا ہے یہ سَاکِنٌ کی جمع ہے جیسے مسافرٌ کی جمع سَفْرٌ آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سَاکِنٌ کی جمع سُکَّانٌ (بضمہ سین) آتی ہے اور سُکَّان (بفتحہ سین) کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کشتی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

اَلسِّکِّیْنُ (چھری) کو سکین اس لئے کہا جاتا ہے (وہ مذبوح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے (تو یہ سکون سے فِعِّیْلٌ کے وزن پر اسم مشتق ہے)
اور آیت:۔
نَزَّلَ السَّکِیْنَۃَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴۸-۴)
وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ سَکِیْنَۃٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومن کے دل کو تسکین دیتے ہیں۔ جیسا کہ امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) سے روایت ہے
اِنَّ السَّکِیْنَۃَ لَتَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ (حضرت عمرؓ کی زبان پر سَکِیْنَۃٌ گویا ہے اور بعض نے اس سے عقل انسانی مراد لی ہے اور عقل کو بھی جب کہ وہ شہوات کی طرف مائل ہونے سے روک دے سَکِیْنَۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت:۔
وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ ۔۔۔۔۔۔
(۱۳-۲۸) اور جن کے دل یاد خدا سے آرام پاتے ہیں۔
بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سَکِیْنَۃٌ اور سَکَنٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی رعب اور خوف کا زائل ہونا اور آیت:۔
اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۔۔۔۔۔ (۲-۲۴۸) کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئیگا، اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسلی ہوگی۔
میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور بعض مفسرین نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ وہ چیز تھی جس کا سر بلی کے سر کے مشابہ تھا وغیرہ تو ہمارے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔
اَلْمِسْکِیْنُ بعض نے اس کی تفسیر مَنْ لَاشَیْئَ لَہٗ (یعنی جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو) کے ساتھ کی ہے اور یہ فقیر سے ابلغ ہے (یعنی بنسبت فقیر کے زیادہ نادار ہوتا ہے) لیکن آیت:۔
وَاَمَّا السَّفِیْنَۃُ فَکَانَتْ لِمَسَاکِیْنَ (۱۸-۷۹) اور کشتی غریب لوگوں کی تھی۔
میں باوجود کشتی کا مالک ہونے کے انہیں مسکین قرار دینا مَا یَؤُوْلُ کے لحاظ سے ہے یعنی کشتی کے چلے جانے کے بعد کی حالت کے لحاظ سے انہیں مسکین کہا گیا ہے۔ یا اس لئے کہ ان کی احتیاج اور مسکنت کے مقابلہ میں کشتی کی کچھ بھی حیثیت نہ تھی۔ اور آیت:۔
وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ۔
(۲-۶۱) اور آخر کار ذلت (و رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی۔
میں اصح قول کے لحاظ سے مَسْکَنَۃٌ کی میم زائد ہے (اور یہ سکون سے ہے)

(س ل ل)

سَلَّ (ن) الشَّیْئَ مِنَ الشَّیْئِ کے معنی ایک چیز کے دوسری سے کھینچ لینے کے ہیں جیسے تلوار کا نیام سے سونتنا۔ یا گھر سے کوئی چیز چوری کھسکا لینا۔ قرآن میں ہے:۔
یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا (۲۴-۶۳) جو تم میں سے آنکھ بچا کر چل دیتے ہیں۔
اسی مناسبت سے باپ کے نطفہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ ۔۔۔۔ (۳۲-۸) خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی۔

۱؎ وفیہا حکایات غریبۃ (راجع الدر للسیوطی ۱۲)

یعنی وہ جوہر جو غذا کا خلاصہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں بطور کنایہ نطفہ مراد ہے۔ اور نطفہ پر اس کا اطلاق اس جوہر کے لحاظ سے ہے جس سے نطفہ بنتا ہے۔

اَلسُّلُّ: سِل کی بیماری کیونکہ یہ انسان سے گوشت اور قوت کو کھینچ لیتی ہے اور اَسَلَّہُ اللّٰہُ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے اسے سل کی بیماری میں مبتلا کر دیا۔ حدیث میں ہے[1] (۱۷۷)

لَا اِسْلَالَ وَلَا اِغْلَالَ کہ چوری اور خیانت نہیں ہے۔

تَسَلْسَلَ الشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے مضطرب ہونے کے ہیں گویا اس میں بار بار کھسک جانے کا تصور کر کے لفظ کو مکرر کر دیا ہے تاکہ تکرار لفظ تکرار معنی پر دلالت کرے اسی سے سِلْسِلَۃٌ ہے جس کے معنی زنجیر کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فِیْ سِلْسِلَۃٍ ذَرْعُھَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا (۶۹-۳۲)

پھر اس زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے (جکڑ دو)۔

سِلْسِلَۃٌ کی جمع سَلَاسِلُ آتی ہے چنانچہ فرمایا:۔

سَلٰسِلَاْ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا (۷۶-۴) زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ (تیار کر رکھی ہے)

وَالسَّلَاسِلُ یُسْحَبُوْنَ (۴۰-۷۱) اور زنجیریں ہوں گی اور گھسیٹے جائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے[2] (۱۷۸)

یَا عَجَبًا لِقَوْمٍ یُقَادُوْنَ اِلَی الْجَنَّۃِ بِالسَّلَاسِلِ اس قوم پر تعجب ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جا رہے ہیں۔

اور مَاءٌ سَلْسَلٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو اپنی قرارگاہ میں مضطرب ہو کر صاف ہو جائے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (الطویل)

(۲۳۲) اَمَا تُھْلِیْ اِلَیَّ مِنَ الرَّحِیْقِ السَّلْسَلِ

وہ مجھے شفاف شراب سے زیادہ مرغوب ہے۔

اور آیت (۷۶-۱۸) میں سَلْسَبِیْلًا (سلسبیل) کے معنی تیزی سے بہتے ہوئے صاف، لذیذ اور خوشگوار پانی کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سَلْ اور سَبِیْل سے بنا ہے اور حَوْقَلَۃ وَبَسْمَلَۃٌ وغیرہ کی طرح الفاظ مرکبہ کے قبیل سے ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ہر تیز رو چشمے کو سَلْسَبِیْل کہا جاتا ہے۔ اور زبان کے باریک سرے کو اَسَلَۃُ اللِّسَان کہتے ہیں۔

(س ل ب)

اَلسَّلْبُ اس کے معنی کسی سے کوئی چیز چھین لینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ (۲۲-۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔

اَلسَّلِیْبُ لٹا ہوا آدمی۔ وہ اونٹنی جس کا بچہ چھن گیا ہو اور اَلسَّلَبُ کے معنی چھینی ہوئی چیز اور درخت

---

[1] غریب ابی عبید (۱: ۸۱۹) وابوداؤد فی الجہاد والحاکم (۴: ۲۲۵) والفائق ۲/۱۳ والطبرانی عن کثیر بن عبداللہ عن ابیہ عن جدہ و عن عمرو بن عوف سیاتی فی (غلل)۱۲۔ [2] الحدیث باختلاف الفاظہ فی (حم خ، د عن ابی ہریرۃ)، راجع کنز العمال (۳/۱۷۸)

[3] قالہ ابوکبیر الہذلی (عامر بن الحلیس) وصدرہ: اَمْ لَا سبیل الی الشباب وذکرہ والبیت فی اللسان (سلسل)

سے اتاری ہوئی چھال کے ہیں۔ اور شاعر کے قول[۱] (رجز)

(۲۳۳) فِي السُّلُبِ السُّوْدِ وَ فِي الْاَمْسَاحِ

(سیاہ ماتمی لباس اور ٹاٹ پہنے ہوتے ہیں)

میں بعض نے کہا ہے سیاہ ماتمی لباس مراد ہے جو مصیبت زدہ شخص پہن لیتا ہے اور ماتمی لباس کو سُلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اصل لباس اتار کر اسے پہنا جاتا ہے پھر جیساکہ اَحَدَّتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ماتمی لباس پہننے کے ہیں ایسے ہی تَسَلَّبَتِ الْمَرْءَةُ بھی کہا جاتا ہے اَلْاُسْلُوْبُ طریقہ، روش جمع اَسَالِيْبُ۔

(س ل ح)

اَلسِّلَاحُ (سازِ جنگ) یعنی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ لڑائی کی جائے جیسے تلوار، کمان، نیزہ چوب دستی وغیرہ اس کی جمع اَسْلِحَةٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ (۴-۱۰۲) اور ہشیار اور مسلح ہو کر (تمہارے ساتھ نماز ادا کریں)

اَلْاِسْلِيْحُ۔ ایک قسم کی گھاس ہے جس کے کھانے سے اونٹ موٹے ہو جاتے ہیں مادہ اونٹنی کھالے تو اس کا دودھ بڑھ جاتا ہے گویا وہ موٹے ہو کر مسلح ہو گئے اور ذبح ہونے سے بچ گئے۔ جیساکہ شاعر نے کہا ہے[۲] (الکامل)

(۲۳۴) اَذْمَانَ لَمْ تَلْخُذْ عَلَيَّ سِلَاحَهَا

اِبِلِيْ بِجِلَّتِهَا وَلَا اَبْكَارِهَا

اس زمانہ میں جب کہ میرے بڈھے اور جوان اونٹوں نے ہتھیار نہیں پہنے تھے یعنی موٹے نہیں ہوئے تھے۔

اَلسَّلَاحُ اصل میں اونٹ کے اس گوبر کو کہتے ہیں جو اِسْلِيْح گھاس کھانے کے بعد کرتا ہے پھر بطور کنایہ ہر فضلہ پر بولا جاتا ہے حتی کہ حباری جانور کے متعلق، مشہور محاورہ ہے۔

سِلَاحُهٗ سَلَاحُهٗ کہ اسکا فضلہ ہی اسکا ہتھیار ہے

(س ل خ)

اَلسَّلْخُ اس کے اصل معنی کھال کھینچنے کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے۔

سَلَخْتُهٗ فَانْسَلَخَ میں نے اس کی کھال کھینچی تو وہ کھچ گئی پھر اسی سے استعارہ کے طور پر زرہ اتارنے اور مہینہ کے گزر جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے سَلَخْتُ دِرْعَهٗ میں نے اس کی زرہ اتار لی۔ سَلَخَ الشَّهْرُ وَانْسَلَخَ مہینہ گزر گیا۔ قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ (جب عزت کے مہینے گزر جائیں (۹-۵)

نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ ..... (۳۶-۳۷) کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

---

[۱] قالہ لبید حین ضرب عامر بن مالک وغنت لہ قینتان واختلف فی قوہ فقی اللسان (سلب) تخفق حراوجہ صحاح وفی المجمہر (۳-۷۴) ہذا اول البیت وعجزہ: واتینا لاعب الرماح وبعدہ: یا عامرا! یا عامر الصحاح۔ وعامر الکتیبۃ الرواح۔ ولہ قصۃ راجع المجمہر والخطر فی الاشتقاق ۴ ۳۵ واللسان (نوح) [۲] قالہ النمر بن تولب فی وصف الابل والبیت فی اللسان والمحکم (سلح، جلل) وامالی المرتضی (۲: ۱۱۹) والثمار ۹۷۲ والمعانی للقتبی ۱۹۱، ۳، ۱۲۳۱ والمیدانی (۱: ۲۰۶، ۱۴، ۲۲۲، ۴۹، ۳۷۲، ۵۰) وفی اللسان ایام بدل ازمان وفی المطبوع علی بدل الی مصحف والمراد من سلاح الابل سمنہا وحسنہا وانہ یمنع صاحبہا من العقر والذبح وفی المرتضی فی سلاح الابل اشعار والبیت ایضا فی اللالی مع السمط ۲، ۴۳۲، ۸۳، وغریب ابی عبید (۱: ۲۰۵)

اور محاورہ ہے۔
اَسْوَدُ سَالِخٌ سَلَخَ جِلْدَہٗ: نر سیاہ سانپ نے اپنی کینچلی اتار دی اور کھجور کے جس درخت کی کچی کھجوریں جھڑ جائیں اسے نَخْلَۃٌ مِسْلَاخٌ کہا جاتا ہے۔

(س ل ط)

اَلسَّلَاطَۃُ اس کے معنی غلبہ حاصل کرنے کے ہیں اور سَلَّطْتُہٗ فَتَسَلَّطَ کے معنی ہیں "میں نے اسے مقہور کیا تو وہ مقہور ہو گیا" قرآن میں ہے:
وَلَوْ شَاءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَھُمْ (۴-۸۹) اور اگر خدا چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا۔
وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ (۵۹-۶) لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جن پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے۔
اور اسی سے بادشاہ کو "سلطان" کہا جاتا ہے۔ اور سلطان کا لفظ تسلط اور غلبہ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے فرمایا:
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا۔ (۱۷-۳۳) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے۔
اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ۔ (۱۶-۹۹، ۱۰۰) کہ جو مومن ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں ان پر اس کا کچھ زور نہیں چلتا۔ اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں۔
لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵-۳۳) اور زور کے سوا تم نہیں نکل سکتے۔

عام طور پر صاحب سلطنت کو سلطان کہا جاتا ہے اور حجت (دلیل) کو بھی سلطان کہا گیا ہے[1] کیونکہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے لیکن عام طور پر اس کا تسلط ان اصحاب علم و حکمت پر ہوتا ہے جو ایماندار و دیانتدار ہوں۔ قرآن میں ہے:
یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰھُمْ۔ (۴۰-۳۵) جو لوگ بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آئی ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔
فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۱۴-۱۰) کھلی کھلی دلیل لاؤ۔ یعنی واضح دلیل اور حجت قائم کرو۔
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ۔ (۱۱-۹۶) اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں اور دلیل روشن دے کر بھیجا۔
اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا۔ (۴-۱۴۴) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر خدا کا صریح الزام لو۔ اور آیت:
ھَلَکَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَہْ (۶۹-۲۹) (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی۔
میں سلطان کے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں یعنی اس سے مراد دلیل بھی ہو سکتی ہے اور غلبہ بھی۔
اَلسَّلِیْطُ۔ اہل یمن کی زبان میں زیتون کے تیل کو کہتے ہیں اور سَلَاطَۃُ اللِّسَانِ کے معنی گفتگو پر قدرت کے ہیں اور یہ عمومًا مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور زبان دراز عورت کو "اِمْرَاَۃٌ سَلِیْطَۃٌ" کہا جاتا ہے اور سَنَابِکُ سَلِطَاتٌ کے معنی تیز سموں کے ہیں گویا قوت اور طول کی وجہ سے انہیں تسلط حاصل ہے۔

---

[1] وعن ابن عباسؓ: قد جاء السلطان بمعنی الحجۃ فی جمیع القرآن ۱۲

(س ل ف)

اَلسَّلَفُ کے معنی متقدم یعنی پہلے گزر جانے والا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ (۴۳-۵۶) ان کو گئے گزرے کر دیا اور پچھلوں کے لئے عبرت بنا دیا۔
فَلَهٗ مَا سَلَفَ (۲-۲۷۵) تو جو پہلے ہو چکا وہ اسکا۔ یعنی اس کے پہلے گناہ کو معاف کر دیا جائے گا۔ اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اسی طرح آیت:۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (۴-۲۲) مگر (جاہلیت میں) جو ہو چکا (سو ہو چکا)
میں ماسلف سے مراد یہ ہے کہ جو گناہ اس سے قبل ہو چکے ہیں وہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ تو یہاں استثناء جواز فعل سے نہیں ہے کہ جو نکاح پہلے ہو چکے ہیں وہ جائز اور مباح ہیں بلکہ یہاں استثناء گناہ سے ہے یعنی اس سے قبل جو نکاح ہو چکے ہیں ان کا گناہ معاف کر دیا جائیگا اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی[1] اور لِفُلَانٍ سَلَفٌ کَرِیْمٌ کے معنی ہیں اس کے آباؤ واجداد کریم تھے سَلَفٌ کی جمع اَسْلَافٌ اور سُلُوْفٌ آتی ہے۔
اور کسی چیز کی پیشگی قیمت ادا کرنے کو بھی سَلَفٌ کہا جاتا ہے۔
اَلسَّالِفَةُ گردن کے کنارے کو کہتے ہیں اور لڑائی میں ہراول دستہ یا سفر میں قافلہ سے آگے جانے والے لوگوں کو سَالِفَةٌ اور سُلَّافٌ کہا جاتا ہے۔
سُلَافَةُ الْخَمْرِ باقی ماندہ عصیرہ۔ اَلسُّلْفَةُ (ناشتہ) یعنی وہ طعام جو مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کیا جائے۔ محاورہ ہے۔
سَلِّفُوْا ضَیْفَکُمْ وَلَهِّنُوْهُ اپنے مہمان کو نکل کھلاؤ۔

(س ل ق)

اَلسَّلْقُ قہر و غلبہ کے ساتھ دست یا زبان درازی کرنا کے ہیں اور اسی سے تَسَلَّقَ عَلَی الْحَائِطِ ہے جس کے معنی دیوار پھاندنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔ سَلَقُوْکُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ (۳۳-۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارے میں زبان درازی کریں گے۔
محاورہ ہے۔ سَلَقَ امْرَأَتَهٗ اپنی عورت کو زبردستی لٹا کر اس کے ساتھ جماع کیا۔ مسیلمہ نے ایک عورت سے کہا[2]۔ (

(۲۳۵) اِنْ شِئْتِ سَلَقْنَاكِ
وَ اِنْ شِئْتِ عَلٰی اَرْبَعٍ

چاہو تو چت لیٹ جاؤ اور چاہو تو پٹ لیٹو۔
اور سَلْقٌ کے معنی شلیتے کے ایک حلقہ کو دوسرے میں داخل کرنے کے ہیں اور میدہ کی روٹی کو سَلِیْقَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَلَائِقُ آتی ہے۔ اور سَلِیْقَةٌ بمعنی طبیعت بھی آتا ہے اور سَلَقٌ کے معنی ہموار اور عمدہ زمین کے ہیں۔

(س ل ک)

اَلسُّلُوْكُ (ن) اس کے اصل معنی راستہ پر

---

[1] فی البیضاوی، الاستثناء من المعنی اللازم للنہی ویحتمل الانقطاع (انوار التنزیل ج ۱ ص ۸۳ بجلالین علی الہوامش [2] فی اربع ابیات متقیدۃ، لقافیہ خاطب بہا سجاح التی تنبأت من بنی تغلب فی خلوۃ لم واقعہا فصدقت بنبوتہ انظر القصۃ فی الطبری (۲: ۴۹۹) والمحاضرات ۴/۱۳۷ وفی روایتہ علقناک بدل سلقناک محرف ۱۲

چلنے کے ہیں۔ جیسے سَلَکْتُ الطَّرِیْقَ اور یہ فعل متعدی بن کر بھی استعمال ہوتا ہے یعنی راستہ پر چلانا چنانچہ پہلے معنی کے متعلق فرمایا۔

لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (۷۱-۲۰) تاکہ اس کے بڑے بڑے کشادہ راستوں میں چلو پھرو۔

فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (۱۶-۶۹) اور اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا۔

يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ (۷۲-۲۷) اور اس کے آگے ..... مقرر کر دیتا ہے۔

وَسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا (۲۰-۵۳) اور اس میں تمہارے لئے رستے جاری کئے۔

اور دوسرے معنی یعنی متعدی کے متعلق فرمایا:۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (۷۴-۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۵-۱۲) اس طرح ہم اس (تکذیب وضلال) کو گنہگاروں کے دلوں میں داخل کر دیتے ہیں۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ (۲۶-۲۰۰) اسی طرح ہم نے انکار کو ..... داخل کر دیا۔

فَاسْلُكْ فِيْهَا (۲۳-۲۷) تو ..... کشتی میں بٹھالو۔

يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۷۲-۱۷) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

بعض نے سَلَکْتُ فُلَانًا فِیْ طَرِیْقِهٖ کی بجائے سَلَکْتُ فُلَانًا طَرِیْقًا کہا ہے اور عَذَابًا کو یَسْلُکْهُ کا دوسرا مفعول بنایا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عَذَابًا فعل محذوف کا مصدر ہے اور یہ اصل میں نُعَذِّبُهٗ عَذَابًا ہے اور نیزے کی بالکل سامنے کی اور سیدھی ضرب کو طَعْنَةٌ سُلْكَةٌ کہا جاتا ہے۔ (سُلْکٰی سیدھا نیزہ) اور سُلْکَةٌ مادہ کبک کو کہتے ہیں اس کا مذکر سُلَکٌ ہے۔

(س ل م)

اَلسَّلْمُ وَالسَّلَامَةُ کے معنی ظاہری اور باطنی آفات سے پاک اور محفوظ رہنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ..... (۲۶-۸۹) پاک دل (لے کر آیا وہ بچ جائیگا۔ یعنی وہ دل جو دغا اور کھوٹ سے پاک ہو تو یہ سلامت باطن کے متعلق ہے اور ظاہری عیوب سے سلامتی کے متعلق فرمایا:۔

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا (۲-۷۱) اس میں کسی طرح کا داغ نہ ہو۔

پس سَلِمَ یَسْلَمُ سَلَامَةً وَسَلَامًا کے معنی سلامت رہنے اور سَلَّمَهُ اللّٰهُ (تفعیل) کے معنی سلامت رکھنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (۸-۴۳) لیکن خدا نے (تمہیں) اس سے بچا لیا۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ (۱۵-۴۶) ان میں سلامتی (اور خاطر جمع) سے داخل ہو جاؤ۔

اسی طرح فرمایا:۔

اِهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا ..... (۱۱-۴۸) ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ ..... اترآؤ۔

اور حقیقی سلامتی تو جنت ہی میں حاصل ہوگی جہاں کہ بقا ہے۔ فنا نہیں، غنا ہے احتیاج نہیں، عزت ہے۔ ذلت نہیں، صحت ہے بیماری نہیں چنانچہ اہل جنت کے متعلق فرمایا:۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ (۶-۱۲۸) ان کے لئے ..... سلامتی کا گھر ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ (۱۰-۲۵) اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ ...... (۵-۱۶) جس سے خدا اپنی رضامندی پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا ہے۔

ان تمام آیات میں سلام بمعنی سلامتی کے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلسَّلَامُ اسمائے حسنیٰ سے ہے اور یہی معنی آیت لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور آیت:۔

اَلسَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ (۵۹-۲۳) سلامتی امن دینے والا نگہبان۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے وصفِ سلام کے ساتھ موصوف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو عیوب و آفات مخلوق کو لاحق ہوتے ہیں اللہ تعالےٰ ان سب سے پاک ہے۔ اور آیت:۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (۳۶-۵۸) پروردگار مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائیگا)

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (۱۳-۲۴) (اور کہیں گے) تم پر رحمت ہو (یہ) تمہاری ثابت قدمی کا بدلہ ہے۔

سَلَامٌ عَلٰى اِلْ يَاسِيْنَ (۳۷-۱۳۰) کہ الیاسین پر سلام اور اس مفہوم کی دیگر آیات میں سلام علیٰ آیا ہے تو ان میں لوگوں کی جانب سے تو سلامتی بذریعہ قول مراد ہے یعنی سَلَامٌ عَلٰى الخ کے ساتھ دعا کرنا اور اللہ تعالےٰ کی جانب سے سلامتی بالفعل مراد ہے یعنی جنت عطا فرمانا۔ جہاں کہ حقیقی سلامتی حاصل ہوگی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور آیت:۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵-۶۳) اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔

میں قَالُوْا سَلٰمًا کے معنی ہیں ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں۔ تو اس صورت میں سَلٰمًا منصوب بالفعل المضمر ہوگا یعنی نَطْلُبُ مِنْكَ السَّلَامَ اور بعض نے قَالُوْا سَلٰمًا کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ اچھی بات کہتے ہیں تو اس صورت میں یہ مصدر محذوف (یعنی قولاً) کی صفت ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ (۵۱-۲۵) جب وہ ان کے پاس آئے تو سلام کہا۔ انہوں نے بھی (جواب میں) سلام کہا۔

میں دوسرے سلام پر رفع اس لئے ہے کہ یہ باب دعا سے ہے اور صیغہ دعا میں رفع زیادہ بلیغ ہے گویا اس میں حضرت ابراہیمؑ نے اس ادب کو ملحوظ رکھا ہے جس کا کہ آیت:۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا۔ (۴-۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے سے) (اسے) دعا دو۔

میں حکم دیا گیا ہے اور ایک قرأت میں سِلْمٌ ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ سَلَامٌ (سِلْمٌ صلح) کو چاہتا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے خوف محسوس کر چکے تھے پھر جب انہیں سلام کہتے ہوئے سنا تو اس کو پیغام صلح پر محمول کیا اور جواب میں سلام کہہ کر اس بات پر تنبیہ کی کہ جیسے تم نے پیغام صلح دیا ہے۔ ایسے ہی میری جانب سے بھی پیغام صلح قبول ہو۔

اور آیت کریمہ:۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا۔ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۵۶-۲۵، ۲۶) وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ ہاں ان کا کلام سلام

سلام دہوگا)
کے معنی یہ ہیں کہ یہ بات صرف بذریعہ قول ہی نہیں ہوگی۔ بلکہ قولاً اور فعلاً دونوں طرح ہوگی۔ اسی طرح آیت:۔
فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۵۶-۹۱) تو کہا جائے گا کہ تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام۔
میں بھی سلام دونوں معنی پر محمول ہو سکتا ہے اور آیت۔
وَقُلْ سَلٰمٌ (۴۳-۸۹) اور سلام کہہ دو۔
میں بظاہر تو سلام کہنے کا حکم ہے لیکن فی الحقیقت ان کے شر سے سلامتی کی دعا کرنے کا حکم ہے اور آیات سلام جیسے:۔
سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ (۳۷-۷۹) (یعنی تمام جہان میں..... نوح پر سلام۔
سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۳۷-۱۲۰) کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام۔
سَلٰمٌ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ (۳۷-۱۰۹) ابراہیم پر سلام۔
میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء ابراہیم کو اس قدر بلند مرتبہ عطا کیا تھا کہ لوگ ہمیشہ ان کی تعریف کرتے اور ان کے لئے سلامتی کے ساتھ دعا کرتے رہیں گے اور فرمایا:۔
فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ (۲۴-۶۱)
اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں) کو سلام کیا کرو۔ یعنی تم ایک دوسرے کو سلام کہا کرو۔
اَلسَّلَامُ وَالسِّلْمُ وَالسَّلَمُ کے معنی صلح کے ہیں۔
چنانچہ فرمایا۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (۴-۹۴) اور جو شخص تم سے سلام علیک کہے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے حق میں نازل ہوئی ہے جسے باوجود اظہار اسلام اور طلب صلح کے قتل کر دیا گیا تھا اور فرمایا:۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (۲-۲۰۸) مومنو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔
وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ (۸-۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں۔
اس میں ایک قرأت سَلْم (بفتحہ سین) بھی ہے۔
وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ السَّلَمَ (۱۶-۸۷)
اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔
يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ (۶۸-۴۳)
(اس وقت) سجدے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ جب کہ صحیح وسالم تھے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ (۳۹-۲۸) اور ایک آدمی خاص ایک شخص کا (غلام) ہے۔
میں ایک قراءت سَلْمًا وَسِلْمًا بھی ہے اور یہ دونوں مصدر ہیں اور حَسَنٌ وَنَكَدٌ کی طرح صفت کے صیغے نہیں ہیں کہا جاتا ہے۔
سَلِمَ سَلْمًا وَسِلْمًا جیسے رَبِحَ رَبْحًا وَرِبْحًا اور بعض نے کہا ہے کہ سِلْمٌ اسم ہے اور اس کی ضد حَرْبٌ ہے۔
اَلْاِسْلَامُ اس کے اصل معنی سِلْم (صلح) میں داخل ہونے کے ہیں اور صلح کے معنی یہ ہیں کہ فریقین باہم ایک دوسرے کی طرف سے تکلیف پہنچنے سے بے خوف ہو جائیں۔ اور یہ اَسْلَمْتُ الشَّيْءَ اِلٰى فُلَانٍ (باب افعال) کا مصدر ہے اور اسی سے بیع سَلَم ہے۔
شرعاً اسلام کی دو قسمیں ہیں کوئی انسان محض زبان سے اسلام کا اقرار کرے دل سے معتقد ہو یا نہ ہو اس سے انسان کا جان و مال اور عزت محفوظ

ہو جاتی ہے مگر اس کا درجہ ایمان سے کم ہے۔ اور آیت:۔
قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (۴۹-۱۴) دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو اسلام لائے ہیں۔
میں اَسْلَمْنَا سے یہی معنی مراد ہیں۔ دوسرا درجہ اسلام کا وہ ہے جو ایمان سے بھی بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کے اعتراف کے ساتھ ساتھ دلی اعتقاد بھی ہو اور عملاً اس کے تقاضوں کو پورا کرے مزید برآں یہ کہ ہر طرح سے قضا و قدر الہٰی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ جیسا کہ آیت:۔
اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲-۱۳۱) جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کی کہ میں رب العالمین کے آگے سر اطاعت خم کرتا ہوں۔
میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے اور فرمایا:۔
اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳-۱۹) (کہ) دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔ اور آیت:۔
وَتَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا (۱۲-۱۰۱) تو مجھے اپنی اطاعت (کی حالت) میں اٹھائیو۔ کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں میں داخل کیجو جو تیری رضا کے تابع ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ مجھے کلیۃً شیطان کے پنجے سے آزاد کر دے۔ جیسا کہ شیطان نے کہا تھا۔
لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۳۸-۸۳) میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا۔ سوا ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں۔ اور آیت:۔
اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (۳۰-۵۳) تم تو انہیں لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں سو وہی فرمانبردار ہیں۔
میں مسلمون سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کے تابع اور فرمانبردار ہیں۔ اور آیت:۔
يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا (۵-۴۴) اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے .... حکم دیتے رہے ہیں۔
میں وہ انبیاء مراد ہیں جو اگرچہ اولوالعزم پیغمبروں کے تابع تھے لیکن حکم الہٰی سے ہدایت پا کے تھے اور مستقل شرائع لے کر مبعوث ہوئے تھے۔
اَلسُّلَّمُ اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بلند مقامات پر چڑھا جاتا ہے۔ تاکہ سلامتی حاصل ہو پھر مَسَبَّبْ کی طرح ہر اس چیز کو سُلَّمٌ کہا گیا ہے جو کسی بلند جگہ تک پہنچنے کا وسیلہ بنے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ (۵۲-۳۸) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر (چڑھ کر آسمان سے باتیں) سن آتے ہیں۔
اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ (۶-۳۵) یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کرو)
اور شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الطویل)
(۲۳۴) وَلَوْ نَالَ اَسْبَابَ السَّمَآءِ بِسُلَّمِ
گو سیڑھی لگا کر آسمان پر کیوں نہ چڑھ جائے۔
اور سَلْمٌ وَسِلَامٌ ایک قسم کے بڑے درخت کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر قسم کی آفت سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] لزہیر و اولہ ومن ہاب اسباب المنیۃ ینلنہ ... وفی اللسان واسم من نال و تدمرنی (برسع)، وفی السبع لابن الانباری ۲۸۱، ولو رام ان یرقی السماء بسلم ۱۲

اَلسِّلَامُ ایک قسم کا سخت پتھر اس کا واحد سَلِمَۃٌ ہے۔

(س ل و)

اَلسَّلْوٰی اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے لئے تسلی کا باعث ہو اسی سے اَلسُّلْوَان وَالتَّسَلِّیْ ہے جس کے معنی اطمینان اور راحت کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ..... (۲-۵) اور تمہارے لئے من وسلوٰی اتارتے رہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بٹیر کی قسم کے جانور مراد ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ من ایک چیز ہے جو آسمان سے اترتی تھی اور سَلْوٰی ایک پرند کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے حضرت ابن عباسؓ کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی کے الفاظ بطور مثال کے ذکر کئے گئے ہیں اور مراد وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے گوشت اور سبزیوں کی صورت میں انہیں دیا تھا۔ اصل میں سَلْوٰی کا لفظ تَسَلِّیْ سے ماخوذ ہے اور سَلَیْتُ عَنْ کَذَا وَسَلَوْتُ عَنْہُ وَتَسَلَّیْتُ کے معنی کسی چیز سے تسلی حاصل کرنے اور اس کی محبت کو بھلا دینے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ سُلْوَان اسے کہتے ہیں جو انسان کو تسلی دے اور ایک قسم کے مہرے کو بھی سُلْوَانٌ کہا جاتا ہے جسے عرب لوگ محبت اور عشق سے تسلی حاصل کرنے کے لئے گھس کر پیتے تھے۔

(س م م)

اَلسَّمُّ (بفتحہ سین وضمہ آں) کے معنی تنگ سوراخ کے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک اور کان کا سوراخ ہوتا ہے۔ اس کی جمع سُمُوْمٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ (۷-۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور سَمَّمَہٗ (ن) کے معنی کسی چیز میں گھس جانا کے ہیں۔ اور اسی سے اَلسَّامَّۃُ ہے یعنی وہ خاص لوگ جو ہر معاملہ میں گھس کر اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں دُخَّلٌ بھی کہا جاتا ہے۔

اَلسَّمُّ زہر قاتل کو کہتے ہیں کیونکہ یہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور یہ اصل میں مصدر بمعنی فاعل ہے۔

اَلسَّمُوْمُ (لو) گرم ہوا جو زہر کی طرح بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (۵۲-۲۷) اور ہمیں لو کے عذاب سے بچا لیا۔

فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ (۵۶-۴۲) (یعنی دوزخ کی) لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی میں۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰہُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵-۲۷) اور جنوں کو اس سے بھی پہلے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

(س م د)

اَلسَّامِدُ غافل تکبر سے سر اٹھانے والا یہ سَمَدَ الْبَعِیْرُ فِیْ سَیْرِہٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے گردن اٹھا کر تیز چلنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ (۵۳-۶۱) اور تم غفلت میں پڑے رہے ہو۔

اور سَمَدَ رَأْسَہٗ وَسَبَدَ کے معنی سر کے بالوں کو جڑ سے مونڈ ڈالنے کے ہیں۔

(س م ر)

اَلسُّمْرَۃُ گندمی رنگ کو کہتے ہیں اور کنایہ کے طور پر سَمْرَاءُ گندم کو کہا جاتا ہے اور اَلسَّمَارُ پتلا دودھ جس میں بکثرت پانی کی آمیزش ہو۔

اَلسَّمُرَۃُ ببول کا درخت غالباً اس کی رنگت کے اعتبار سے یہ نام رکھا گیا ہے۔

اَلسَّمَرُ۔ اصل میں رات کی تاریکی کو کہتے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے (مثل) لَا اٰتِیْکَ السَّمَرَ وَالْقَمَرَ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا پھر رات کو باتیں کرنا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اور سَمَرَ فُلَانٌ کے معنی ہیں اس نے رات کو باتیں کی۔ اسی سے مشہور محاورہ ہے[1]

لَا اٰتِیْکَ مَا سَمَرَ ابْنَا سَمِیْرٍ[2] کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا اور آیت کریمہ:۔

مُسْتَکْبِرِیْنَ بِہٖ سٰمِرًا تَھْجُرُوْنَ (۲۳-۶۷) ان سے سرکشی کرتے کہانیوں میں مشغول ہوتے اور بیہودہ بکواس کرتے تھے۔

میں بعض نے اس کے معنی سُمَّارٌ کئے ہیں تو ان کے نزدیک مفرد موضع جمع میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ سَامِرٌ کے معنی تاریک رات کے ہیں۔ سَامِرٌ کی جمع سُمَّارٌ، سَمَرَۃٌ اور سَامِرُوْنَ آتی ہے۔ اور سَمَرْتُ الشَّیْءَ (ن) کے معنی کسی چیز میں میخ لگا کر مضبوط اور استوار کرنے کے ہیں اور مہمل چھوڑے ہوئے اونٹوں کو اِبِلٌ مُسَمَّرَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور سَامِرِیٌّ ایک قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

(س م ع)

اَلسَّمْعُ۔ قوت سامعہ۔ کان میں ایک حاسہ کا نام ہے جس کے ذریعہ آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور اس کے معنی سننا (مصدر) بھی آتے ہیں اور کبھی اس سے خود کان مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ (۲-۷) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔

اور کبھی لفظ سِمَاعٌ کی طرح اس سے مصدری معنی مراد ہوتے ہیں (یعنی سننا) چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۶-۲۱۲) وہ (آسمانی باتوں کے) سننے (کے مقامات) سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔

اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ (۵۰-۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

اور کبھی سَمْعٌ کے معنی فہم و تدبر اور کبھی طاعت بھی آجاتے ہیں مثلاً تم کہو۔ اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَکَ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ لَمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ لَکَ تم نے میری بات سمجھی نہیں۔

قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا ..... (۸-۳۱) اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں (یہ کلام) ہم نے سن لیا ہے اگر چاہیں تو اسی طرح کا (کلام) ہم بھی کہہ دیں۔

اور آیت:۔ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا (۲-۹۳) (وہ کہنے لگے) ہم نے سن تو لیا۔ مگر مانتے نہیں کے معنی ہیں

---

[1] انظر المثل المستقصی والثمار ۲۲۸ والعسکری ۱۹۶، ۲/ ۲۲۹ واللسان والتاج (سمر) ۱۲ [2] ابنا سمیر اللیل والنہار والمراد الدھر فعنی المثل لا آتیک ابداً راجع المسط ۵۳۰

ہم نے تمہاری بات سمجھ لی ہے مگر ماننے کے نہیں۔
اسی طرح آیت :۔
سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (۲۔۲۸۵) کے معنی ہیں ہم نے تیرا حکم سمجھ لیا اور قبول کیا"
اور آیت :۔ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (۸۔۲۱) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم خدا) سن لیا مگر حقیقت میں (نہیں سنتے۔
میں سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ہم نے سمجھ لیا حالانکہ وہ سمجھتے نہیں۔ اور یہ بھی کہ ہم نے سمجھ لیا مگر وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتے کیونکہ جب انہوں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو گویا اس شخص کی طرح ہیں جو سرے سے سنتا ہی نہیں۔
پھر اس کے بعد فرمایا۔ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْھِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَھُمْ وَلَوْ اَسْمَعَھُمْ لَتَوَلَّوْا .... (۸۔۲۳) اگر خدا ان میں نیکی (کا مادہ) دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق بخشتا اور اگر (بغیر صلاحیت ہدایت کے) سماعت دیتا تو وہ .... بھاگ جاتے۔
تو یہاں بھی وَلَوْ اَسْمَعَھُمْ کے معنی ہیں اگر وہ انہیں قوت فہم بخشتا جس سے وہ سمجھتے۔ اور آیت (۴۔۴۶) میں وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ (سنیئے نہ سنوائے جاؤ) کا محاورہ دو طرح بولا جاتا ہے۔ ایک بددعا کے طور پر کہ وہ بہرا ہو جائے۔ دوم دعا کے طور پر پہلے معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ اَسْمَعَکَ اللّٰہُ۔ اللہ تجھے بہرہ کر دے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اَسْمَعْتُ فُلَانًا بولتے ہیں یعنی میں نے فلاں کو خوب سنائیں یعنی گالیاں دیں تو یہ گالی دینے کے معنی میں متعارف ہے۔
مروی ہے کہ اہل کتاب نبی صلعم کو یہ کلمہ کہا کرتے اور اس سے آں حضرت کو اس فریب میں ڈالنے کی کوشش کرتے کہ وہ آپ کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ آپ کے حق میں بددعا کرتے تھے۔
ہر وہ مقام جہاں اللہ تعالٰی نے مومنوں کے لئے سماعت کو ثابت کیا ہے یا کفار سے اس کی نفی کی ہے یا اس کی کوشش پر رغبت دلائی ہے تو اس سے مقصود اس کلام کے معنی کی طرف توجہ دینا اور اس میں غور و فکر کرنا ہے۔ جیسے فرمایا :۔
اَمْ لَھُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا (۷۔۱۹۵) یا ان کے کان ہیں جن سے سنیں ؟۔
اور (کفار سے نفی کرتے ہوئے) فرمایا :۔
صُمٌّ بُکْمٌ (۲۔۱۸) (یہ) بہرے ہیں گونگے ہیں۔
وَفِیْ اٰذَانِھِمْ وَقْرٌ (۴۱۔۴۴) اور ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہرا پن) ہے۔
اور جب سمع کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے مراد یا تو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام مسموعات کا علم ہے یا یہ کہ اس نے جزا دینے کا ارادہ فرمایا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے :۔
قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِھَا (۵۸۔۱) (اے پیغمبر) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث و جدال کرتی ہے .... خدا نے اس کی التجا سن لی۔
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْا (۳۔۱۸۱) خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ ......
اور آیت کریمہ :۔
اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ (۲۷۔۸۰) کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو .... آواز سنا سکتے ہو۔

میں لَا تُسْمِعُ کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں کچھ بھی سمجھا نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ اپنی بد عملی کی وجہ سے قوت عاقلہ کو جو کہ انسانیت کے لئے مخصوص سرمایۂ حیات ہے کھو بیٹھے ہیں مردوں کی طرح ہیں۔ اور آیت:۔ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ (۱۸-۲۶) وہ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے۔

میں اس شخص کے متعلق فرمایا کہ یہ شخص حکمت الٰہی کے عجائبات سے کس قدر آگاہ ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق مَا اَبْصَرَہٗ وَمَا اَسْمَعَہٗ کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کو صرف انہی صفات کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے جو بطریق سمع ثابت ہوں۔ اور کفار کے متعلق جو یہ فرمایا ہے۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا (۱۹-۳۸) وہ جس دن ہمارے سامنے آئیں گے کیسے سننے والے اور کیسے دیکھنے والے ہوں گے۔

تو اس کے معنی یہ ہیں جو باتیں ان کے اپنے نفوس پر ظلم کرنے اور نظر و فکر ترک کر دینے کی وجہ سے آج ان پر مخفی ہیں وہ اس روز ان کو سن اور دیکھ رہے ہونگے۔

اور فرمایا:۔

خُذُوْا مَا اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا (۲-۹۳) کہ جو کتاب تم کو دی گئی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو اور جو تمہیں حکم ہوتا ہے اس کو سنو۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (۵-۴۲) (یہ) جھوٹی باتیں بنانے کے لئے جاسوسی کرنے والے۔

یعنی وہ سرداروں کے سامنے جھوٹی باتیں بنانے کیلئے تمہاری باتیں سنتے ہیں اور آیت:۔

سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ (۵-۴۱) اور ایسے لوگوں کے لئے جاسوسی کرتے ہیں جو ابھی تمہارے پاس نہیں آئے۔

یعنی وہ تمہاری باتوں کو ان تک پہنچانے کیلئے سنتے ہیں

اَلْاِسْتِمَاعُ اس کے معنی غور سے سننے کے ہیں جیسے فرمایا:۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ...... (۱۷-۴۷) یہ لوگ جب تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جس نسبت سے یہ سنتے ہیں۔ ہم اسے خوب جانتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (۶-۲۵) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تمہاری (باتوں) کی طرف کان رکھتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (۱۰-۴۲) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ (۵۰-۴۱) اور سنو جس دن پکارنے والا ..... پکارے گا۔

اور آیت:۔ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (۱۰-۳۱) یا (تمہارے) کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔

یعنی ان کا پیدا کرنے والا اور ان کی حفاظت کا متولی کون ہے۔

اور مِسْمَعٌ یا مَسْمَعٌ کے معنی کان کے سوراخ کے ہیں اور اسی کے ساتھ تشبیہ دے کر ڈول کے دستہ کو جس میں رسی باندھی جاتی ہو مَسْمَعُ الْغَرْبِ کہا جاتا ہے۔

(س م ک)

اَلسَّمْكُ چھت کو کہتے ہیں اور سَمَكَهٗ (ن) کے معنی بلند کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا (۷۹-۲۸) اس کی چھت

کو اونچا کیا پھر اسے برابر کیا۔
شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الکامل)
(۲۲۷) اِنَّ الَّذِیْ سَمَكَ السَّمَاءَ بَنٰی لَنَا
وہ ذات جس نے آسمان کو بلند بنایا۔
اور ایک دعاء ماثورہ میں ہے[2] (۹۱) یَا بَارِئَ السَّمٰوٰتِ الْمَسْمُوْکَاتِ اے بلند آسمان کے پیدا کرنے والے۔
اور سَنَامٌ سَامِكٌ بلند کوہان کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جس سے کوئی چیز بلند کی جائے۔ اسے سِمَاكٌ (بکسرہ سین) کہا جاتا ہے اور سِمَاكٌ ایک ستارے کا نام بھی ہے اور اَلسَّمَكُ کے معنی مچھلی کے ہیں۔

(س م ن)

اَلسِّمَنُ کے معنی موٹاپہ کے ہیں اور یہ هُزَالٌ کی ضد ہے اور سَمِیْنٌ (صیغہ صفت کے معنی ہیں فربہ ج سِمَانٌ قرآن میں ہے:۔
اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ (۱۲-۴۶) ہمیں سات خواب کی تعبیر بتایئے کہ سات موٹی گایوں....
اور اَسْمَنْتُهٗ وَ سَمَّنْتُهٗ کے معنی موٹا کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔
لَا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ (۸۸-۷) جو نہ فربہی لائے اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔

اَسْمَنْتُهٗ فربہ جانور خریدنے یا دینے کے ہیں۔ اور اِسْتَسْمَنْتُهٗ کے معنی فربہ پانے کے۔
اَلسُّمْنَةُ۔ ایک دوا جو فربہ ہونے کیلئے کھائی جاتی ہے۔
اَلسَّمْنُ۔ گھی کیونکہ گھی بھی فربہی کی قسم سے ہے اور اس کے کھانے سے انسان موٹا ہوتا ہے۔ اَلسُّمَانٰی ایک پرند کا نام ہے۔

(س م و)

سَمَاءٌ ہر شے کے بالائی حصہ کو سَمَاءٌ کہا جاتا ہے شاعر نے ایک گھوڑے کی وصف میں کہا ہے[3]۔ (الطویل)
(۲۲۸) وَاَحْمَرُ کَالدِّیْبَاجِ اَمَّا سَمَاءُهٗ فَرَیَّا وَاَمَّا اَرْضُهٗ فَمَحُوْلٗ
وہ دیباج کی طرح سرخ ہے اس کا بالائی حصہ موٹا اور گدرانہ ہے اور زیریں حصہ لاغر اور سخت ہے۔ بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر "سَمَاءٌ" اپنے ماتحت کے لحاظ سے "سَمَاءٌ" ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے "اَرْضٌ" کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔ اور آیت:۔
اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (۶۵-۱۲) خدا ہی تو ہے جس نے سات

---

[1] البیت للفرزدق من نقیضته المشہور مطلعها ہذا البیت وتمامہ: بیتًا دعائمہ اعز واطول۔ والقصیدۃ فی دیوانہ (۲: ۷۱۴-۷۲۵) والنقائض (۱: ۱۸۲-۲۱۱) والبیت فی العمدۃ (۱: ۲۵۲) وفیہ قصۃ الفرزدق مع الطرماح ومجاز القرآن (۲: ۱۲۱) وشرح الدرۃ للخفاجی ۳۷ والمرزبانی فی العجم ۴۶۷ والموشح ۱۲۳ وابن عقیل رقم ۲۷۸ ومصارع العشاق ۷۷ والصاحبی ۲۵۷ والطبری (۲۱: ۳۷) والقرطبی (۱۴: ۲۱) والخزانۃ (۳: ۷۱۴، ۸۰) والاشباہ النحویہ (۳: ۱۹۳) والکامل ۷۹۶ و العینی (۴: ۴۱) [2] وفی النوادر (۳۷۱) اللھم داحی المدحوات وبارئ المسموکات الخ وہذہ الصلوٰۃ فی ما اسطاہ۔ وہذہ من جملۃ من الصلوٰۃ علی النبی التی کان علی رض یعلم اصحابہ ۱۲ [3] قالہ طفیل الغنوی وتقدم فی (ارض) ۱۲

آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں۔
کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

نیز مَطَرٌ (بارش) کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اوپر سے آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سماء اس بارش کو کہا جاتا ہے جو ہنوز زمین پر نہ گری ہو تو اس میں بھی بلندی کے معنی ملحوظ ہیں۔

اور نباتات کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے یا تو اسلئے کہ وہ بارش سے اگتے ہیں اور یا اس لئے کہ وہ زمین سے بلند ہوتے ہیں پھر لفظ سماء جو ارض کے بالمقابل ہے مؤنث ہے لیکن کبھی مذکر بھی آجاتا ہے اور واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ (۲-۲۹) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا۔

اور کبھی اس کی جمع سَمٰوٰتٌ بھی بنا لیتے ہیں چنانچہ فرمایا۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ (۳۱-۱۰) اسی نے آسمانوں کو۔۔۔۔ پیدا کیا۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ (۱۳-۱۶) ان سے پوچھو کہ آسمانوں۔۔۔۔ کا پروردگار کون ہے؟۔

اور آیت:۔ اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ (۷۳-۱۸) جس سے آسمان پھٹ جائیگا۔
میں سماء کو مذکر استعمال کیا ہے لیکن کئی ایک آیات جیسے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (۸۴-۱) جب آسمان پھٹ جائے گا۔

اور آیت:۔ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۸۲-۱) جب آسمان پھٹ جائے گا۔
میں مؤنث استعمال ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سماء کا لفظ اشجار میں نَخْلٌ یا اس قسم کے دوسرے اسماء جنس کی طرح ہے جو مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں اور سَمَاءٌ کے معنی بارش ہوں تو یہ ہمیشہ مذکر استعمال ہوگا اور اس کی جمع اَسْمِيَةٌ آئے گی اور کسی بلند چیز کے کالبد کو سَمَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۲۳۹) سَمَاوَةُ الْهِلَالِ حَتّٰى احْقَوْقَفَا

(راتیں تدریجاً) افق پر ابھرے ہوئے چاند کو دیکھتی رہیں، حتی کہ وہ ٹیڑھا ہوگیا۔

اور سَمَا اِلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں دور سے کسی چیز کا بلند شکل میں ظاہر ہونا۔

اور سَمَا الْفَحْلُ عَلَى الشَّوْلِ سَمَاوَةً سانڈھ اونٹ اونٹنی پر چڑھ گیا۔

اَلْاِسْمُ کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ یہ اصل میں سِمْوٌ ہے کیونکہ اس کی جمع اَسْمَاءٌ اور تصغیر سُمَیٌّ آتی ہے۔ اور اسم کو اسم اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے مسمی کا ذکر بلند ہوتا اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا (۱۱-۴۱) اور (نوحؑ نے) کہا کہ خدا کا نام لے کر (کہ اسی کے ہاتھ میں) اس کا چلنا (ہے) سوار ہو جاؤ۔

وَاِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲۷-۳۰) وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور (مضمون یہ ہے) کہ شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

اور آیت:۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ (۲-۳۱) اور اس آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔

---

[1] قاله العجاج واوله ناج طواه الاين مما وجفا طي الليالي زلفا فزلفا والشطر في اللسان (زلف) والمحكم (حقف) وقد مر في (زلف) ۱۲

میں اسماء سے یہاں الفاظ و معانی دونوں مراد ہیں۔ خواہ مفرد ہوں خواہ مرکب اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ اسم دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ایک اصطلاحی معنی ہیں اور اس صورت میں ہمیشہ مخبر عنہ بنتا ہے۔ جیسے رَجُلٌ وَ فَرَسٌ دوم وضع اول کے لحاظ سے اس اعتبار سے (کلمہ کی) انواع ثلاثہ یعنی مخبر عنہ (اسم) خبر اور رابطہ (حرف) تینوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام نے جس طرح اسماء کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی طرح افعال و حروف کا علم بھی انہیں حاصل ہوگیا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کی ذات کا علم حاصل نہ ہو محض نام کے جاننے سے انسان اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا مثلاً اگر ہم ہندی یا رومی زبان میں چند چیزوں کے نام حفظ کر لیں تو ان چیزوں کے اسماء کے جاننے سے ہم ان کے مسمیات کو نہیں پہچان سکیں گے۔ بلکہ ہمارا علم انہیں چند اصوات تک محدود رہے گا اس سے ثابت ہوا کہ اسماء کی معرفت مسمیات کی معرفت کو مستلزم نہیں ہے اور نہ ہی محض اسم سے مسمیٰ کی صورت ذہن میں حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا آیت:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ میں اسماء سے کلام کی انواع ثلاثہ اور صور مسمیات بمع ان کی ذوات کے مراد ہیں۔

اور آیت:۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَا (۱۲-۴۰) جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے رکھ لئے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ جن اسماء کی تم پرستش کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اصنام ان اوصاف سے عاری تھے۔ جن کا کہ وہ ان اسماء کے اعتبار سے ان کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے۔ اور آیت:۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ (۱۳-۳۳) اور ان لوگوں نے خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں۔ ان سے کہو کہ (ذرا) ان کے نام تو لو۔ میں سَمُّوْهُمْ سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات، عزیٰ وغیرہ ان کے نام بیان کرو بلکہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن کو تم اِلٰہ (معبود) کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق کر کے یہ تو بتاؤ کہ آیا ان میں ان اسماء کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ تم انہیں موسوم کرتے ہو (یقیناً نہیں) اسی لئے اس کے بعد فرمایا اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ..... (۱۳-۳۳) (کہ) کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جس کو وہ زمین میں (کہیں بھی) معلوم نہیں کرتا یا (محض) ظاہری (باطل اور جھوٹی) بات کی (تقلید کرتے ہو)

اور آیت:۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ (۵۵-۷۸) تمہارے پروردگار ..... کا نام بڑا با برکت ہے۔ میں اسم رب کے با برکت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صفات۔ الکریم۔ العلیم۔ الباری، الرحمٰن الرحیم کے ذکر میں برکت اور نعمت پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (۸۷-۱) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار (جلیل الشان) کے نام کی تسبیح کرو۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۷-۱۸۰) اور (خدا کے نام سب اچھے ہی اچھے ہیں۔

اور آیت:۔

اِسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۔ (۱۹-۷) جس کا نام یحییٰ ہے۔ اس سے پہلے ہم نے

اس نام کا کوئی شخص پیدا نہیں کیا۔
(میں سَمِيًّا کے معنی "ہم نام" کے ہیں، اور آیت :۔
هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (۱۹-۶۵) بھلا تم اس
کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔
میں سَمِيًّا کے معنی نظیر کے ہیں یعنی کیا اس کی کوئی
نظیر ہے جو اس نام کی مستحق ہو اور حقیقتاً اللہ کی صفات
کے ساتھ متصف ہو اور اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کیا
تم کسی کو ایسا بھی پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم
ہو کیونکہ ایسے تو اللہ تعالےٰ کے بہت سے اسماء
ہیں جن کا غیر اللہ پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے۔
لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان سے معانی
بھی وہی مراد ہوں جو اللہ تعالےٰ پر اطلاق کے وقت
ہوتے ہیں۔ اور آیت :۔
يُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (۵۳-۲۷)
اور وہ فرشتوں کو (خدا کی) لڑکیوں کے نام سے موسوم
کرتے ہیں۔
میں لڑکیوں کے نام سے موسوم کرنے کے معنی یہ ہیں۔
کہ وہ فرشتوں کو "بنات اللہ" کہتے ہیں۔

(س ن ن)

اَلسِّنُّ دانت اس کی جمع اَسْنَانٌ آتی ہے
قرآن میں ہے :۔
اَلسِّنُّ بِالسِّنِّ (۵-۴۵) دانت کے بدلے دانت
سَانَّ الْبَعِيْرُ النَّاقَةَ "نر اونٹ نے دانت سے
کاٹ کر اونٹنی کو نیچے بٹھا لیا۔
اَلسَّنُوْنُ (دانتوں کا منجن) ایک دوا جس سے دانتوں
کا علاج کیا جاتا ہے۔
سَنُّ الْحَدِيْدِ کے معنی لوہے کو تیز کرنے (اور
پگھلانے کے ہیں) اور جس چیز سے لوہے کو تیز کرتے
ہیں اسے مِسَنٌّ (سان) کہا جاتا ہے اور اَلسِّنَانُ
(بھالا) خاص کر اس لوہے کو کہتے ہیں جو نیزے کے
سرے میں لگایا جاتا ہے۔ پھر سَنَّ الْحَدِيْدِ
(تیز کرنا) کے ساتھ تشبیہ دے کر سَنَنْتُ الْبَعِيْرَ
کہا جاتا ہے جس کے معنی اونٹ کو سخت ہنکا کر دبلا
کر دینے کے ہیں اور پگھلانے کے معنی کے لحاظ
سے سَنَنْتُ الْمَاءَ بولتے ہیں جس کے معنی پانی
بہانے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔
تَنَحَّ عَنْ سَنَنِ الطَّرِيْقِ (سین مثلثہ) راستہ کے
کھلے حصہ سے ہٹ جاؤ۔ پس سُنَنٌ کا لفظ سُنَّةٌ
کی جمع ہے اور سُنَّةُ الْوَجْهِ کے معنی دائرہ رخ کے
ہیں اور سُنَّةُ النَّبِيِّ سے مراد آنحضرت کا وہ طریقہ
ہے جسے آپؐ اختیار فرماتے تھے۔ اور سُنَّةُ اللّٰهِ
سے مراد حق تعالیٰ کی حکمت اور اطاعت کا طریقہ
مراد ہوتا ہے جیسے فرمایا :۔
سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ
لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۴۸-۲۳) (یہی) خدا کی عادت
ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت کبھی
بدلتی نہ دیکھو گے۔
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵-۴۳) اور خدا
کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔
تو آیت میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے۔ کہ شرائع
کے فروعی احکام کی گو مختلف صورتیں چلی آئی ہیں لیکن
ان سب سے مقصد ایک ہی ہے۔ یعنی نفس کو
پاک کرنا اور اسے اللہ تعالےٰ کے ہاں ثواب اور اس
کا جوار حاصل کرنے کے لئے تیار کرنا اور یہ مقصد
ایسا ہے کہ اس میں اختلاف یا تبدیلی نہیں ہو سکتی۔
اور آیت :۔
مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۱۵-۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مسنون کے معنی متغیر کے ہیں۔ اور آیت:۔

لَمْ یَتَسَنَّهْ ..... (۲-۲۵۹) (دوسری ایسی نہیں۔) میں لَمْ یَتَسَنَّهْ کے معنی بھی لَمْ یَتَغَیَّرْ ہیں اس میں ہا استراحت یعنی سکتہ کی ہے[1]۔

(س ن م)

قرآن میں ہے:۔ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ (۸۳-۲۷) اور اس میں تسنیم (کے پانی) کی آمیزش ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ تَسْنِیْم جنت میں ایک اعلیٰ قسم کے چشمے کا نام ہے۔ جیسا کہ بعد میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:۔

عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳-۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے۔

(س ن و)

اَلسَّنَا (اسم مقصور) چمکدار روشنی کو کہتے ہیں اور اَلسَّنَاءُ (ممدود) کے معنی رفعت کے ہیں۔ اور معنی رفعت کے اعتبار سے آبکشی کے جانور کو "سَانِیَةٌ" کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

یَکَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ (۲۴-۴۳) اور بادل میں جو بجلی ہے اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر کے بینائی کو اچکے لئے جاتی ہے۔

اور سَنَتِ النَّاقَةُ تَسْنُوْ کے معنی ہیں اونٹنی نے کنویں سے پانی نکالا اور زمین کو سیراب کیا اور ایسی اونٹنی کو سَانِیَةٌ کہا جاتا ہے (والجمع السوانی)

اَلسَّنَةُ (سال) اس کی اصل دو طرح بیان کی جاتی ہے ایک یہ کہ اصل میں سَنْهَةٌ ہے کیونکہ محاورہ ہے سَانَهْتُ فُلَانًا کہ میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کیا۔ نیز اس کی تصغیر سُنَیْهَةٌ آتی ہے اور ایک قول کے مطابق اسی سے لَمْ یَتَسَنَّهْ (۲-۲۵۹) ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ سالہا سال گزر جانے سے بھی متغیر نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی تازگی ختم ہوئی ہے۔

بعض کے نزدیک اس کی اصل سَنْوَةٌ ہے۔ کیوں کہ اس کی جمع سَنَوَاتٌ آتی ہے اور اسی سے سَانَیْتُ فعل ہے اس صورت میں سَنَةٌ میں (ہ) برائے وقف ہوگی۔ جیسا کہ کِتَابِیَهْ و حِسَابِیَهْ میں ہے[2]۔ قرآن میں ہے:۔

اَرْبَعِیْنَ سَنَةً (۵-۲۶) چالیس برس کے لئے۔

سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا (۱۲-۴۷) سات سال متواتر۔

ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ (۱۸-۲۵) تین سو برس۔

اور آیت:۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ (۷-۱۳۰) اور ہم نے فرعونیوں کو کئی سال تک قحط میں مبتلا رکھا۔

میں سنین سے مراد قحط سالی ہے اور زیادہ تر سَنَةٌ کا لفظ قحط سالی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

اَسْنَتَ الْقَوْمُ لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے۔

---

[1] بناء علی قراءۃ حمزۃ والکسائی واصلہ عندہم لم یتسنی (من الحاد) وقد یحتمل ان یکون اصلہ لم یتسنن ماخوذا من سنّن فابدلت نونہ الاخیرۃ حرف علۃ وسقطت بالجزم (راجع انوار التنزیل) ۱۲

[2] اصحاب المعاجم ذکرہ فی (س ن ہ) و (س ن و) ۱۲

شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل):

(۲۴۰) لَهَا اَرَجٌ مَا حَوْلَهَا غَیْرُ مُسْنِتٍ

جس کی خوشبو مہک رہی ہو اور اسکے ارد گرد تازگی پھیلی ہوئی ہو۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے[2]

(الطویل مخروم)

(۲۴۱) فَلَیْسَتْ بِسَنْهَاءٍ وَلَا رُجَبِیَّةٍ

اسے نہ تو خشک سالی نے نقصان پہنچایا ہے اور نہ ہی کمزور ہونے کی وجہ سے اسے ستون لگا کر کھڑا کیا گیا ہے۔

واضح ہے کہ اس شعر میں ہا اصلی ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا ہے[3]

(۲۴۲) یَاکُلُ اَزْمَانَ الْهُزَالِ وَالسِّنِیْ

جو ہزال اور قحط سالی کے زمانہ میں چرتا رہا ہو۔

یہاں اَلسِّنِیْ سَنَةٌ سے مُرَخَّمٌ نہیں ہے۔ بلکہ یہ فُعُوْلٌ کے وزن پر جمع ہے جیسے مِائَةٌ کی جمع مِئِیْنٌ وَمِئُوْنَ آتی ہے اور عِصِیٌّ کی طرح فاء کلمہ مکسور ہے مگر برعایت قافیہ تخفیف کر کے ایک یا کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ اور آیت:۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲-۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند

میں سِنَةٌ وَسَنٌ سے ہے اور اس باب سے خارج ہے۔

(س ھ ر)

اَلسَّاهِرَةُ کے معنی میدان یا روئے زمین کے ہیں قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۷۹-۱۴) اس وقت وہ (سب) میدان (حشر) میں آجمع ہوں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ سَاهِرَةٌ سے مراد روئے زمین (یعنی یہی زمین) ہے اور بعض کے نزدیک اَرْضِ آخرت مراد ہے اور اصل میں سَاهِرَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر کثرت سے آمد و رفت ہو۔ گویا وہ آمد و رفت سے بیدار ہو چکی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[4] (الطویل)

(۲۴۳) تَحَرَّكَ یَقْظَانُ التُّرَابِ وَنَائِمُهٗ

تو بیدار اور سوئی زمین ہل جاتی ہے۔

اور ناک کی دونوں رگوں کو اَسْهَرَانِ کہا جاتا ہے۔

(س ھ ل)

اَلسَّهْلُ کے معنی نرم زمین کے ہیں اس

---

[1] قالہ الشنفری الازدی و صدرہ: بریحانۃ من حلیۃ نورت . . . . والبیت من کلمۃ مفضلیۃ رقم ۲۰ فی ۳۶ بیتا انظر الاغانی (۲۱-۹۰) والبیت فی اللسان (حلا) والمحکم (روح)، [2] قالہ سوید بن الصامت الانصاری وقد نسب الی احیحۃ بن الجلاح قال فی السمط (۱: ۳۶۱) والاول اثبت و تمامہ: ولکن عرایا فی السنین الجوائح - فی ابیات لیصف نخلا بالجودۃ یقول: نخلی لیست بسنہاء ولا ممنوعۃ التمر ولکن لعریہا الناس: رُجَبِیَّۃ "یروی بفتح الجیم بالتخفیف والتشدید وکلاہما نسبۃ نادر والتشدید اذہب فی الشذوذ اھ وفی مجالس ثعلب السنہاء النخلۃ التی تحمل سنۃ وسنۃ لا والرجبیۃ التی یخاف سقوطہا فیعمل لہا رجبۃ وفی السمط الرجبۃ الخطیۃ تبنی حول النخلۃ یمنع بہا من ثمرہا اھ لیست ممنوعۃ التمر واللفظان اختلف فی تغیرہما راجع اللسان (رجب، سنۃ، عری) ومجالس ثعلب (۲: ۲۸۵) والقرطبی (۳: ۲۹۳) والئالی (۱: ۱۲۰) واضداد ابی الطیب ۴۹ ومعانی القرآن المنسوب الی الفراء (۱: ۱۷۳) وغریب القرآن للقتبی ۴۹ [3] والبیت فی اللسان (حتم) بغیر عزو، قال ابن بری: الشطر لامرءۃ من بنی عقیل تفخر باخوالہا من الیمن و ذکر ابو زید انہ للعامریۃ وصلتہ: حیدۃ خالی ولقیط وعلی وحاتم الطائی وہاب المئی - ولم یکن کخالک العبد الدعی . . . . ہیاب غیر میتۃ غیر ذکی [4] قالہ ابن ہی عبدۃ فی قصیدۃ وصدرہ: اذا نحن سرنا بین شرق ومغرب راجع الحماسۃ لشرح التبریزی ۲/۴۹ والمرزوقی ۲۰۰ والجمان لابن ناقیا ص ۲۶۹

کی جمع سُھُوْل آتی ہے اور یہ حَزْنٌ کی ضد ہے۔
چنانچہ قرآن میں ہے:۔
تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُھُوْلِھَا قُصُوْرًا (۷-۷۴) (کہ) نرم زمین سے (مٹی لے کر) محل تعمیر کرتے ہو
اور اَسْھَلَ کے معنی نرم زمین میں جانے کے ہیں
اور رَجُلٌ سَھْلِیٌّ کے معنی میدانی علاقہ کا بسنے والا آدمی کے ہیں نَھْرٌ سَھْلٌ چھوٹے ریگ ناک اور نرم خو آدمی کو رَجُلٌ سَھْلُ الْخُلُقِ کہا جاتا ہے۔ (اس کی ضد) حَزْنُ الْخُلُقِ ہے اور سُھَیْلٌ ایک ستارے کا نام ہے۔

(س ھ م)

اَلسَّھْمُ وہ تیر جو چلایا جاتا ہے نیز قرعہ اندازی کے تیر وغیرہ کو سَھْمٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے قرآن میں ہے:۔
فَسَاھَمَ فَکَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ (۳۷-۱۴۱) اس وقت قرعہ ڈالا تو انہوں نے زک اٹھائی۔
اور اِسْتَھَمُوْا (افتعال) کے معنی قرعہ اندازی کرنے کے ہیں اور بُرْدٌ مُسَھَّمٌ اس چادر کو کہتے ہیں جس پر تیر کی تصویر ہو۔
سَھَمَ (ف)، سُھُوْمًا۔ اَلْوَجْہُ لاغری کی وجہ سے چہرے کا متغیر ہونا۔ اور اَلسُّھَامُ (بالضم والفتح) اس مرض کو کہتے ہیں جس سے چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔

(س ھ و)

اَلسَّھْوُ (ن) وہ غلطی جو غفلت کی وجہ سے سرزد ہو اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اسباب اور مولدات انسان کے اپنے اختیار سے پیدا کردہ نہ ہوں جیسے مجنوں آدمی کا کسی انسان کو گالی دینا۔ دوم یہ کہ اس کے مولدات انسان کے خود پیدا کردہ ہوں جیسے کوئی شخص شراب نوشی کرے اور پھر اس سے (نشہ میں) بغیر ارادہ کے کوئی برائی صادر ہو پہلی قسم کی خطا تو عفو کے حکم میں ہے لیکن دوسری قسم کی خطا پر مواخذہ ہوگا۔ اور اس دوسری قسم کے سہو کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔
فِیْ غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ (۵۱-۱۱) بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں۔
عَنْ صَلٰوتِھِمْ سَاھُوْنَ (۱۰۷-۵) نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

(س ی ب)

اَلسَّائِبَۃُ (۵-۱۰۳) وہ جانور ہے جو چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور اسے پانی اور چارہ سے کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو (جاہلیت میں) اس قسم کی آزادی اس جانور کو دی جاتی تھی جو پانچ بچوں کو جنم دے چکا ہوتا[1]۔ اور اَلسَّائِبَۃُ اس غلام کو بھی کہا جاتا ہے جو آزاد کیا جائے اور اس کی ولاء کا حقدار معتق (آزاد کنندہ) ہو[2] اور اسے حق حاصل ہو کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور اسی کے متعلق نہی وارد ہوئی ہے[3]۔
اَلسَّیْبُ عطا کو کہتے ہیں اور اَلسِّیْبُ (بکسرہ سین) پانی کے جاری ہونے کی جگہ اصل میں یہ سَیَّبْتُہٗ فَسَابَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا چنانچہ وہ چلا گئی اور اِنْسَابَ (انفعال) الْحَیَّۃُ کے معنی ہیں

---

[1] فی الصحاح، عشرۃ البطن [2] کذا فی المطبوع و قد نہی عنہ القرآن ولا سائبۃ [3] کذا فی المطبوع وفی الصحاح: ولا یکون ولاء ... الصحیح ... لسان العرب ...

سانپ پانی کی طرح تیزی سے اپنے بل میں اتر گیا۔

(س ی ح)

اَلسَّاحَةُ کے معنی فراخ جگہ کے ہیں اسی اعتبار سے مکان کے صحن کو سَاحَةُ الدَّارِ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے :۔

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ (۳۷-۱۷۷) مگر جب وہ ان کے میدان میں آ اترے گا۔

اور وسیع مکان میں ہمیشہ جاری رہنے والے پانی کو سَائِحٌ کہا جاتا ہے اور سَاحَ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ کے معنی پانی کی طرح زمین میں چکر کاٹنا کے ہیں قرآن میں ہے :۔

فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (۹-۲) تو (مشرکو تم) زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔

اور اسی سے ہمیشہ سفر کرنے والے آدمی کو سَائِحٌ یا سَیَّاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت۔ اَلسَّائِحُوْنَ (۹-۱۱۲) روزہ رکھنے والے۔

میں سَائِحُوْنَ بمعنی صَائِمُوْنَ کے ہے۔ اسی طرح اَلسَّائِحَاتُ (۶۶-۵) سے روزہ رکھنے والی عورتیں مراد ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ روزہ دو قسم پر ہے۔ ایک حقیقی روزہ جو کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنے سے عبارت ہوتا ہے اور دوسرا روزہ حکمی ہے۔ جو کہ جوارح یعنی آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کو معاصی سے روکنے کا نام ہے۔ تو سَائِحُوْنَ سے دوسری قسم کے روزہ دار مراد ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سَائِحُوْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو آیت :۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا...... (۲۲-۴۶) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔

کے مقتضیٰ کے تحت زمین میں سفر کرتے ہیں (یعنی قدرت الٰہی کے آثار و عجائبات دیکھتے اور ان پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

(س و د)

اَلسَّوَادُ (ضد بیاض) سیاہ رنگ کو کہتے ہیں۔ اور اِسْوَدَّ (افعلال) وَاِسْوَادَّ (افعیلال) کے معنی کسی چیز کے سیاہ ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (۳-۱۰۶) جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ۔

تو چہروں کے سفید ہونے سے اظہار مسرت اور سیاہ ہونے سے اظہار غم مراد ہے اسی طرح آیت ۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِیْمٌ (۱۶-۵۸) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہ ناک ہو جاتا ہے۔

میں بھی مُسْوَدًّا سے بھی مغموم ہونا ہی مراد ہے۔ بعض نے آیت :۔ تَبْیَضُّ الخ میں حسی سفیدی اور

لے صحیح المستدرک الحاکم عن ابی ہریرۃ وانظر کنز العمال ۵ رقم ۲۷ و فی الطبری ۱۱ ر ۱۲۸ ھر خوطا عن ابی ہریرۃ و فی اللسان قال الزجاج فی قول اہل التفسیر واللغۃ جمیعا السائحون معنی الصائمون تاما فی غریب القرآن للقتیبی ۱۹۳ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

سیاہی کے معنی مراد لئے ہیں۔ لیکن پہلا معنی زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ چیز تو قیامت کے دن اعمال کے اعتبار سے حاصل ہو گی عام اس سے کہ وہ دنیا میں سیاہ فام ہوں یا سفید فام اور اسی سفیدی اور سیاہی کو دوسری آیات میں یوں فرمایا ہے:۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۷۵-۲۲) اس دن بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ (۷۵-۲۴) اور بہت سے منہ اس روز اداس ہوں گے۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (۸۰-۴۰،۴۱) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔

وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا (۱۰-۲۷) اور ان کے منہ پر ذلت چھا جائے گی اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا ان کے مونہوں کی سیاہی کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر گویا اندھیری رات کے ٹکڑے اوڑھا دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح مومنین کے متعلق حدیث میں آیا ہے[1] (۱۸۰) يُحْشَرُوْنَ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ کہ قیامت کے دن آثار وضو سے ان کے ہاتھ پاؤں اور چہرے چمک رہے ہوں گے۔

اور دور سے جو چیز نظر پڑے اسے بھی سَوَاد کہا جاتا ہے اسی طرح آنکھ کی سیاہی کو بھی سَوَادُ الْعَيْنِ سے تعبیر کرلیتے ہیں جیسا کہ کسی نے کہا ہے لَا يُفَارِقُ سَوَادِيْ سَوَادَهٗ یعنی میری آنکھ اس کے شخص سے جدا نہیں ہوتی اور بڑی جماعت کو بھی سَوَادٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ مروی ہے[2] (عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ مسلمانوں کی بڑی جماعت کا ساتھ نہ چھوڑو اور نہ اس سے علیحدگی اختیار کرو۔)

اور سَيِّدٌ کے معنی بڑی جماعت کا سردار کے ہیں چنانچہ اضافت کے وقت سَيِّدُ الْقَوْمِ تو کہا جاتا ہے۔ مگر سَيِّدُ الثَّوْبِ یا سَيِّدُ الْفَرَسِ نہیں بولا جاتا اور اسی سے سَادَ الْقَوْمَ يَسُوْدُهُمْ کا محاورہ ہے چونکہ قوم کے رئیس کا مہذب ہونا شرط ہے اس اعتبار سے ہر فاضل النفس آدمی کو سَيِّدٌ کہا جاتا ہے چنانچہ آیت وَسَيِّدًا وَحَصُوْرًا (۳-۳۹) اور سردار ہوں گے اور عورت سے رغبت نہ رکھنے والے۔

میں بھی سَيِّدٌ کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت۔ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا (۱۲-۲۵) اور دونوں کو ...... عورت کا خاوند مل گیا۔

میں خاوند کو سید کہا گیا ہے کیونکہ وہ بیوی کا نگران اور منتظم ہوتا ہے اور آیت:۔

رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا (۳۳-۶۷) اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا۔

میں سَادَتَنَا سے ولاۃ اور حکام مراد ہیں۔

(س ی ر)

اَلسَّيْرُ (ض) کے معنی زمین پر چلنے کے ہیں اور چلنے والے آدمی کو سَائِرٌ وَسَيَّارٌ کہا جاتا ہے اور ایک ساتھ چلنے والوں کی جماعت کو سَيَّارَةٌ کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

---

[1] اخرجہ الشیخان عن ابی ہریرۃ وفی سند ایتھم جمیعًا: ان امتی یدعون یوم القیامۃ غرًّا ..... راجع کنز العمال ۱۹ رقم ۴۷ ۹۴) [2] رواہ ابن ماجۃ وتتمتہ:۔ ان امتی لن تجتمع علی ضلالۃ عن انس وذکرہ النبہانی فی الفتح ار ۲۰۵ -

جَاءَتْ سَيَّارَةٌ (۱۲-۱۹) (اب خدا کی شان دیکھو کہ اس کنوئیں کے قریب) ایک قافلہ وارد ہوا۔

سِرْتُ (ض) کے معنی چلنے کے ہیں اور سِرْتُ بِفُلَانٍ نیز سِرْتُهُ کے معنی چلانا بھی آتے ہیں اور معنی تکثیر کے لئے سَيَّرْتُهُ کہا جاتا ہے۔

(الغرض سَيْرٌ کا لفظ چار طرح استعمال ہوتا ہے) چنانچہ پہلے معنی کے متعلق فرمایا:۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ (۱۲-۱۰۹) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر (و سیاحت) نہیں کی۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ (۶-۱۱) کہو کہ (اے منکرین رسالت) ملک میں چلو پھرو۔

سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ (۳۴-۱۸) کہ رات ... چلتے رہو۔

اور دوسرے معنی یعنی سِرْتُ بِفُلَانٍ کے متعلق فرمایا:۔

سَارَ بِأَهْلِهِ (۲۸-۲۹) اور اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر چلے۔

اور تیسری قسم (یعنی سِرْتُهُ بدون صلہ) کا استعمال قرآن میں نہیں پایا جاتا اور چوتھی قسم (یعنی معنی تکثیر) کے متعلق فرمایا:۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ (۷۸-۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے

وَهُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۱۰-۲۲) وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرانے کی توفیق دیتا ہے۔

اور آیت:۔ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ (۶-۱۱) کہ ملک میں چلو پھرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سیاحت جسمانی یعنی ملک میں سیر (و سیاحت) کرنا مراد ہے اور بعض نے سیاحت فکری یعنی عجائبات قدرت میں غور و فکر کرنا اور حالات سے باخبر رہنا مراد لیا ہے جیسا کہ اولیاء کرام کے متعلق مروی ہے۔

أَبْدَانُهُمْ فِي الْأَرْضِ سَائِرَةٌ وَقُلُوبُهُمْ فِي الْمَلَكُوتِ جَائِلَةٌ (کہ ان کے اجسام تو زمین پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی روحیں عالم ملکوت میں جولانی کرتی رہتی ہیں) بعض نے کہا ہے اس کے معنی ہیں عبادت میں اس طرح کوشش کرنا کہ اس کے ذریعہ ثواب الٰہی تک رسائی ہو سکے اور آنحضرت علیہ السلام کا فرمان[1] (۱۸۱) سَافِرُوا تَغْنَمُوا سفر کرتے رہو غنیمت حاصل کر لوگے بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

پھر تَسْيِيرٌ دو قسم پر ہے ایک وہ جو چلنے والے کے اختیار و ارادہ سے ہو جیسے فرمایا:۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ (۱۰-۲۲) وہی تو ہے جو تم کو ... چلنے کی توفیق دیتا ہے۔

دوم وہ جو بذریعہ جبر کے ہو اور سَائِرٌ یعنی چلنے والے کے ارادہ و اختیار کو اس میں کسی قسم کا دخل نہ ہو جیسے جبال کے متعلق فرمایا:۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۷۸-۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائیں گے۔

---

[1] ولفظه الحديث سافروا تصحوا وتغنموا والحديث في رمق - عن ابن عباس والشيرازي في الالقاب لمس وابونعيم في الطب والقضاعي - عن ابن عمر و في رواية : وتستد قوا رعب - عن محمد بن عبدالرحمن مرسلا راجع للحديث باختلاف الفاظه كنز العمال ج ۶ رقم ۲۸۸۸-۲۸۹۲ فانه ذكره بطرقه المختلفة - وقد عقده ابوالفتح بن ابی حصين في بيت : سافروا تغنموا وقد قال عليه السلام صوموا تصحوا راجع خاص الخاص للثعالبی ۱۶۰) وفي المعاهد ۲ر ۸۵ "تمام الحديث" بدل "عليه السلام" وقد نسبه الی عبدالمحسن بن محمد الصوری ۱۲

وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ (۸۱-۳) اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

اَلسِّیْرَۃُ اس حالت کو کہتے ہیں جس پر انسان زندگی بسر کرتا ہے عام اس سے کہ اس کی وہ حالت طبعی ہو یا اکتسابی۔ کہا جاتا ہے:۔

فُلَانٌ حَسَنُ السِّیْرَۃِ فلاں کی سیرت اچھی ہے۔

فلاں قَبِیْحُ السِّیْرَۃِ اس کی سیرت بری ہے اور آیت سَنُعِیْدُھَا سِیْرَتَھَا الْاُوْلٰی (۲۰-۲۱) ہم اس کو ابھی اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

میں سیرۃ اولیٰ سے اس عصا کا دوبارہ لکڑی بن جانا ہے۔

(س و ر)

اَلسَّوْرُ اس کے اصل معنی بلندی پر کودنے کے ہیں اور غصہ یا شراب کی شدت پر بھی سَوْرَۃٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ سَوْرَۃُ الْغَضَبِ اور سَوْرَۃُ الشَّرَابِ (شراب کی تیزی) سُرْتُ اِلَیْکَ کے معنی ہیں میں تیری طرف چلا اور سَاوَرَنِیْ فُلَانٌ کے معنی ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے ہیں۔ اور مُسَاوِرٌ بمعنی وَثَّابٌ یعنی عربدہ گر کے ہیں اور اَلْاَسْوَارُ اَسَاوِرَۃُ الْفُرْسِ کا مفرد ہے جس کے معنی تیر انداز کے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے۔

سِوَارُ الْمَرْءَۃِ (عورت کا بازو بند) یہ بھی معرب ہے اور اصل میں دَسْتْوَار ہے۔ بہرحال اس کی اصل جو بھی ہو اہل عرب اسے استعمال کرتے ہیں اور اس سے اشتقاق کر کے کہا جاتا ہے۔

سَوَّرْتُ الْمَرْءَۃَ میں نے عورت کو کنگن پہنائے اور جَارِیَۃٌ مُسَوَّرَۃٌ وَمُخَلْخَلَۃٌ اس لڑکی کو کہتے ہیں جس نے بازوبند اور پازیب پہن رکھی ہو۔

قرآن میں ہے:۔

اَسْوِرَۃٌ مِّنْ ذَھَبٍ (۴۳-۵۳) سونے کے کنگن۔۔۔

اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّۃٍ (۷۶-۲۱) چاندی کے کنگن۔۔۔

اور قرآن میں سونے کے ساتھ اَسْوِرَۃٌ جمع لا کر پھر خاص کر اُلْقِیَ کا صیغہ استعمال کرنا اور فِضَّۃٍ سے قبل اَسَاوِرَ کا لفظ لا کر اس کے متعلق حُلُّوْا کا صیغہ استعمال کرنے میں ایک خاص نکتہ ملحوظ ہے جس کی تفصیل دوسری کتاب میں بیان ہوگی۔[1]

اَلسُّوْرَۃُ کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

(۲۴۴) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَعْطَاکَ سُوْرَۃً
تَرٰی کُلَّ مَلْکٍ دُوْنَھَا یَتَذَبْذَبُ

بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا مرتبہ بخشا ہے جس کے ورے ہر بادشاہ متذبذب نظر آتا ہے۔

اور سُوْرُ الْمَدِیْنَۃِ کے معنی شہر پناہ کے ہیں اور سُوْرَۃُ الْقُرْاٰنِ (قرآن کی سورت) یا تو سُوْرُ الْمَدِیْنَۃِ سے ماخوذ ہے کیونکہ سورہ بھی شہر پناہ کی طرح قرآن کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے انہیں سورۃ القرآن کہا جاتا ہے اور یا سورۃ بمعنی مرتبہ سے مشتق ہے۔ اور سورۃ بھی منازل قمر کی طرح ایک منزلۃ ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور یہ دونوں اشتقاق اس وقت ہو سکتے ہیں جب اس میں واؤ کو اصلی مانا جائے لیکن اگر اسے اصل میں سُؤْرَۃٌ مہموز مانا جائے تو یہ اَسْاَرْتُ سے

---

[1] الشارق الی تفسیر القرآن الذی الفہ بعد مفرداتہ [2] قالہ النابغۃ فی مدح نعمان بن المنذر معتذرا انظر دیوانہ ۱۳ ومختار الشعر الجاہلی ۱۴۵ وتفسیر الطبری (۱۵: ۳۳۵) وامالی المرتضیٰ (۱: ۸۴) والصناعتین ۷۵ مع آخر ونقد الشعر ۲۷ والحیوان (۳: ۹۵) والعقد (۵) والحصری (۳: ۹۲) والسیوطی ۸۰ والعقد الفرید (۲: ۱۴۳) والصاحبی ۱۹۸

مشتق ہوگا جس کے معنی کچھ باقی چھوڑ دینے کے ہیں اور سورۃ بھی چونکہ قرآن کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہوتی ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور آیت :۔

سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا۔ (۲۴-۱) یہ (ایک) سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا۔

میں سورۃ سے مراد احکام وحکم ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَسْاَرْتُ فِی الْقَدْحِ سے مشتق ہے جس کے معنی پیالہ میں کچھ باقی چھوڑنے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۲۴۵) لَا بِالْحَصُوْرِ وَلَا فِیْھَا بِسَآرٍ

نہ تنگ دل اور بخیل ہے اور نہ عربدہ گر۔

ایک روایت میں وَلَا بِسَوَّارٍ ہے۔ جو سَوْرَۃٌ بمعنی شدت غضب سے مشتق ہے۔

(س و ط)

اَلسَّوْطُ (چمڑے کا کوڑا) بٹے ہوئے چمڑے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ پیٹا جاتا ہے۔ اصل میں سَوْطٌ کے معنی کسی چیز کو خلط ملط کرنا کے ہیں اور اس سے فعل سُطْتُہٗ وَسَوَّطْتُہٗ آتا ہے اور کوڑے کو سوط اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی چند تسمے بٹنے سے باہم باہم خلط ملط ہوجاتے ہیں اور آیت :۔

فَصَبَّ عَلَیْھِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ (۸۹-۱۳) تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا نازل کیا۔

میں عذاب الٰہی کو دنیاوی سزا کے ساتھ تشبیہ دیکر سوط سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں کوڑے سے سزا دی جاتی تھی بعض نے کہا ہے کہ سَوْطَ عَذَابٍ کے لفظ سے انواع عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف کہ آیت حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا (۷۸-۲۵) میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

(س و ع)

اَلسَّاعَۃُ (وقت) اجزاء زمانہ میں سے ایک جزء کا نام ہے اور اَلسَّاعَۃُ بول کر قیامت بھی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ (۵۴-۱) قیامت قریب آپہنچی۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ (۷-۱۸۷) (اے پیغمبر لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

وَعِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ (۴۳-۸۵) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

تو قیامت کو سَاعَۃٌ کہنا یا تو سرعت حساب میں تشبیہ کے طور پر ہے۔ جیسے فرمایا :۔

وَھُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ (۶-۶۲) اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے۔

اور یا اس معنی کے پیش نظر اسے سَاعَۃٌ کہا ہے جس پر کہ آیت کریمہ :۔

کَاَنَّھُمْ یَوْمَ یَرَوْنَھَا لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوْ ضُحٰھَا

---

[1] قالہ الاخطل التغلبی وادلہ، وشارب مربح بالکاس نادمنی والبیت من قصیدۃ جمہرۃ (۲۲۲-۲۲۳) فی ۵۰ بیتاً یمدح فیھا یزید بن معاویۃ والبیت فی دیوانہ ۴ ۱۱ ط بیروت ۱۸۹۱ء) والبحر (۱۰۱۱۲:۸۲۴) ومجالس ثعلب (۵۱۱) والطبری (۳:۵۵۰۲۰۵۲۱۴) وشواہد الکشاف ۴۱۰ واللسان والمحکم والصحاح (حصر) والقرطبی (۴:۷۸) ومجاز القرآن (۱:۹۲) وتہذیب الالفاظ ۲۲۷ وتہذیب الاصلاح (۱:۱۲۵) وجمہرۃ اللغۃ ۹۹۵ والقیسی فی المعانی ۱۰۴ وفی صدرہ والسوادی روایۃ یعقوب فی اصلاح ۲۱۴، ۲۳۰ وابن قتیبہ فی المعانی وابوجرکانی صاحبہ ۱۲

(۴۶-۷۹) جب وہ اس کو دیکھیں گے (تو ایسا خیال کریں گے کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے ہیں۔
لَمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ (۴۶-۳۵) (تو خیال کریں گے کہ گویا (دنیا میں) رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر دن۔
اور آیت:
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ (۳۰-۱۴) اور جس دن قیامت برپا ہوگی۔ میں تنبیہ فرمائی ہے۔ اور پہلی آیت یعنی يَوْمَ يَرَوْنَهَا میں "ھا" ضمیر سے مراد قیامت ہے اور دوسری آیت میں سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ سے وقت قلیل مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ ساعات جن سے قیامت مراد ہوتی ہے تین ہیں (۱) اَلسَّاعَةُ الْكُبْرٰى یعنی لوگوں کو محاسبہ کے لئے اٹھانا یا دوبارہ زندہ کرنا اور اسی کے متعلق آنحضرت نے ارشاد فرمایا ہے؎ (۱۴۲)
لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ الْفُحْشُ وَالتَّفَحُّشُ وَحَتّٰى يُعْبَدَ الدِّرْهَمُ وَالدِّيْنَارُ الخ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا نہ ہونے لگ جائے اور درہم و دینار کی پرستش نہ ہونے لگے اور آنحضرت نے اس قسم کی بہت سی علامات کا تذکرہ فرمایا ہے جو نہ آپ کے زمانہ میں ظاہر ہوئیں اور نہ بعد میں اب تک ان کا ظہور ہوا ہے؎۔

(۲) دوم۔ اَلسَّاعَةُ الْوُسْطٰى جو کہ ایک قرن کے لوگ گزر جانے سے عبارت ہے جیسا کہ آنحضرت سے مروی ہے کہ آپ نے عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا (۱۴۳) اِنْ يَّطُلْ عُمُرُ هٰذَا الْغُلَامِ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ تمام قیامت سے پہلے نہیں مرے گا۔
چنانچہ بعض کا قول ہے کہ وہ صحابہ کرام میں سب سے آخر فوت ہوئے ہیں۔
(۳) اَلسَّاعَةُ الصُّغْرٰى جو کہ انسان کی موت سے عبارت ہے پس اس معنی کے لحاظ سے ہر انسان کی موت اس کے لئے قیامت ہے؎ چنانچہ اسی معنی کی طرف آیت:
قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا (۶-۳۱) جن لوگوں نے خدا کے روبرو کھڑے ہونے کو جھوٹ سمجھا وہ گھاٹے میں آ گئے۔ یہاں تک کہ جب ان پر قیامت ناگہاں آ موجود ہوگی تو بول اٹھیں گے کہ ہائے ..... افسوس ہے۔
میں اشارہ فرمایا گیا ہے (کیونکہ یہ حسرت انسان کو اس کی موت کے وقت ہوتی ہے۔ جیسا کہ آیت:
وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ

؎ منہا خروج الدابۃ ونزول المسیح وظہور الدجال وطلوع الشمس من مغربہا والی ذالک ۱۲ ؎ کان صحیح مسلم (۲ر۴۰۶) والبخاری من حدیث النبیؐ: ان یعش ہذا الغلام فعسٰی ان لا یدرکہ الہرم حتی تقوم الساعۃ وانا اسم ہذا الغلام فلم ارہ فی روایۃ صحیحۃ وفی صحیح مسلم الی غلام من ازدشنوءۃ وقال انسؓ وکان من اترابی ومعنی الحدیث یموت ذالک القرن وذالک المخاطبون قال النووی ویحتمل انہ علم ان ہذا الغلام لا یبلغ الہرم راجع للبحث الفتح للحافظ (۱۰ / ۴۹۱-۵۰) ؎ وفی الحدیث من مات فقد قامت قیامتہ۔ ؎ کما روی فی الحدیث من مات فقد قامت قیامتہ انظر الفردوس لابی شجاع الدیلمی وبمعناہ فی الطبری من حدیث المغیرۃ بن شعبۃ وابن ابی الدنیا من حدیث انسؓ بسند ضعیف۔ راجع تخریج الکشاف رقم ۵ وتخریج الاحیاء للعراقی (۴ر۴۶)

قَرِیْبٍ (۶۳-۱۰) اور جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس (وقت) سے پیشتر خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو اس وقت کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت:۔
قُلْ اَرَاَیْتَکُمْ اِنْ اَتَاکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَۃُ (۶-۴۰) (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو۔
میں اَلسَّاعَۃَ سے مراد موت ہی ہے ایک حدیث میں ہے (۱۸۴) کہ جب سخت آندھی چلتی تو آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور فرماتے تَخَوَّفْتُ السَّاعَۃَ کہ مجھے قیامت کا اندیشہ ہے۔ نیز فرمایا (۱۸۵)
وَمَا اَحُدُّ طَرْفِیْ وَلَا اَغُضُّھَا اِلَّا وَ اَظُنُّ اَنَّ السَّاعَۃَ قَدْ قَامَتْ کہ جب میں اپنی نظر اٹھاتا ہوں یا نیچی کرتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ بس قیامت آچکی۔ یعنی مجھے اپنی موت کا ہر لمحہ خیال رہتا ہے جس طرح کہ عَامَلْتُہٗ مُعَاوَمَۃً یا مُشَاھَرَۃً کا محاورہ ہے جس کے معنی سال یا مہینہ کے حساب سے معاملہ کرنے کے ہیں اسی طرح ساعات کے حساب سے معاملہ کرنے کے معنی میں عَامَلْتُہٗ مُسَاوَعَۃً استعمال ہوتا ہے اور جَاءَ نَابَعْدَ سَوْعٍ مِنَ اللَّیْلِ وَسُوَاعٍ کے معنی ہیں "سکون شب کے بعد وہ ہمارے پاس آیا" اور پھر سَاعَۃٌ سے کبھی اھمال (ضائع کرنا) کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
اَسَعْتُ الْاِبِلَ (افعال) میں نے اونٹوں کو بیکار چھوڑ دیا یا ضائع کر دیا۔ ھُوَ ضَائِعٌ سَائِعٌ وہ مہمل اور بیکار ہے۔

سُوَاعٌ ایک بت کا نام ہے[1]۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا اور وَدّ اور سُوَاعٌ ...... کو کبھی ترک نہ کرو (۷۱-۲۳)

(س وغ)

سَاغَ الشَّرَابُ فِی الْحَلْقِ کے معنی شراب کے آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتر جانا کے ہیں وَاَسَاغَہٗ کَذَا (افعال) کے معنی حلق سے نیچے اتارنے کے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
سَائِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ (۱۶-۶۶) پینے والوں کے لئے خوش گوار ہے۔
وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُہٗ (۱۴-۱۷) اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ سَوَّغْتُہٗ مَالًا میں نے اس کے لئے مال خوش گوار بنا دیا۔ یعنی مباح کر دیا اور پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ سَوْغُ اَخِیْہِ کا محاورہ اس بچے کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے بھائی کے بعد جلدی ہی پیدا ہو (یہ مذکر و مونث دونوں کے حق میں بولا جاتا ہے)۔

(س وف)

سَوْفَ۔ (حرف تسویف) یہ حرف ہے جو فعل مضارع کو معنی حال سے مجرد کر کے معنی استقبال کے لئے خاص کر دیتا ہے (اسی لئے اسے حرف استقبال بھی کہتے ہیں) چنانچہ قرآن میں ہے:۔
سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْ (۱۲-۹۸) میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا۔

---

[1] سواع لم یوجد اصلہ فی کلام العرب ویمکن ان یکون مشتقا من السوع بمعنی الزمان وانظر لود (ودد) فہما من الآلھۃ التی کانت قوم نوح تعبدھا۔

اور آیت :- فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۶ - ۱۳۶) عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔

میں تنبیہ کیا ہے کہ جس بات کا وہ مطالبہ کرتے ہیں اگرچہ فی الحال وہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن وہ لامحالہ ہو کر رہے گی۔

اور اس میں مَمَاطَلَۃ (ٹال مٹول) اور تاخیر کے معنی پائے جاتے ہیں اور چونکہ وعدہ کرنے والا سَوْفَ أَفْعَلُ كَذَا کا محاورہ استعمال کرتا ہے اسلئے اَلتَّسْوِيْفُ (تفعیل) کے معنی ٹال مٹول کرنا بھی آجاتے ہیں۔

اَلسَّوْفُ (ن) کے معنی مٹی یا بول کی بو سونگھنے کے ہیں پھر اس سے اس ریگستان کو جس میں راستہ کے نشانات مٹے ہوئے ہوں اور قافلہ کا رہنما اس کی مٹی سونگھ کر راہ دریافت کرے اسے "مَسَافَةٌ" کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۲۴۲) إِذَا الدَّلِيْلُ اسْتَافَ أَخْلَاقَ الطُّرُقْ

جب رہنما بے نشان راستوں پر سونگھ سونگھ کر چلے۔

اَلسُّوَافُ۔ اونٹوں کے ایک مرض کا نام ہے جس کی وجہ سے وہ مرنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور اس مرض کو سُوَافٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے موت کی بو سونگھ لیتے ہیں یا موت ان کو سونگھ لیتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے جلد ہی ان کی موت آجاتی ہے۔

(س و ق)

سَوْقُ الْإِبِلِ کے معنی اونٹ کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں یہ سُقْتُهٗ (ن) کا مصدر ہے اور اِنْسَاقَ (انفعال) کے معنی ہنکانے کے بعد چل پڑنے کے ہیں ان جانوروں کو جو ہنکائے جاتے ہیں سَيِّقَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور عورت کو مہر ادا کرنے کے لئے سُقْتُ الْمَهْرَ إِلَى الْمَرْأَةِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ عرب حق مہر میں (عام طور پر) اونٹ دیا کرتے تھے۔

اور آیت :- إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ (۷۵-۳۰) میں اَلْمَسَاق کے معنی پروردگار کی طرف چلنا کے ہیں جیسا کہ آیت :-

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ (۵۳-۴۲) میں ہے یعنی تمہیں اپنے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔

اور آیت :- مَعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيْدٌ (۵۰-۲۱) اس کے ساتھ چلانے والا ہوگا اور ایک (اس کے عملوں کی) گواہی دینے والا۔

میں سائق سے وہ فرشتہ مراد ہے جو اسے چلا کر حساب کے لئے پیش کرے گا اور دوسرا فرشتہ شہید بطور گواہ کے اس کے ساتھ ہوگا جو اسکے حق میں یا اسکے خلاف گواہی دیگا بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت :- كَأَنَّمَا يُسَاقُوْنَ إِلَى الْمَوْتِ (۸-۶) گویا موت کیطرف دھکیلے جاتے ہیں۔ کے ہم معنی ہے اور آیت :- وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵-۲۹) اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قبض روح کے وقت پنڈلیوں کا لپٹنا مراد ہے۔ اور بعض نے پنڈلیوں کا کفن میں لپٹنا مراد لیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے لپٹنے سے مراد موت ہے کہ زندگی میں وہ اس کے بوجھ کو اٹھا کر چلتی تھیں لیکن موت کے بعد وہ اس بار کی متحمل نہیں ہوسکیں گی بعض

---

[1] قالہ رؤبۃ بن العجاج (الراجز الاسلامی) فی ارجوزۃ لہ ۱۷۲ ابیتا وہی فی دیوانہ ۱۰۴ - ۱۰۸ وقبلہ : مستودۃ الاعطاف من وسم العرق وبعدہ : کانہا حقیا بلقا الزنق - والشطر وحدہ فی خزانۃ الادب (۱ : ۸۸) و دیوانہ ۱۰۵ والاقتضاب ۳۱۲ وادب الکاتب ۵۱ واضداد ابی الطیب ۸ ۴۹ واصلاح لیعقوب ۳۱۲ ۔

نے کہا ہے کہ ایک شدت کا دوسری شدت سے لپٹنا مراد ہے اسی طرح آیت:۔ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۶۸-۴۲) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائیگا۔ میں پنڈلی سے کپڑا اٹھانا صعوبت حال سے کنایہ ہے۔ اور یہ کَشَفَتِ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِهَا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی لڑائی کے سخت ہوجانے ہیں۔ بعض نے اس کی اصل یہ بیان کی ہے کہ جب اونٹنی کے پیٹ میں بچہ مرجاتا ہے۔ تو مُمَزِّمِرٌ (جنوانے والا) اس کے رحم کے اندر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اور اسے پنڈلیوں سے پکڑکر زور سے باہر نکالتا ہے۔ اور یہ کَشَفَ عَنِ السَّاقِ کے اصل معنی ہیں پھر ہر ہولناک امر کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہونے لگا ہے تو یہاں بھی شدت حال سے کنایہ ہے۔ اور آیت:۔ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ (۴۸-۲۹) اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سُوْق سَاقٌ کی جمع ہے جیسے لَابَةٌ کی جمع لُوْبٌ اور قَارَةٌ کی جمع قُوْرٌ آتی ہے۔ اور اسی طرح آیت:۔

فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (۳۸-۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

میں بھی سُوْق صیغہ جمع ہے اور رَجُلٌ اَسْوَقُ کے معنی بڑی پنڈلیوں والے آدمی کے ہیں، اسکی مؤنث سَوْقَاءُ آتی ہے اور سُوْقٌ کے معنی بازار بھی آتے ہیں جہاں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اور فروخت کے لئے وہاں سامان لے جایا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَسْوَاقٌ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (۲۵-۷) یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

اَلتَّسْوِيْقُ کے معنی ستو کے ہیں کیونکہ وہ بغیر چبائے حلق سے نیچے اتر جاتے ہیں۔

(س و ل)

اَلتَّسْوِيْلُ۔ کے معنی نفس کے اس چیز کو مزین کرنا کے ہیں جس پر اسے حرص بھی ہو اور اس کے قبح کو خوشنما بنا کر پیش کرنا کے ہیں قرآن میں ہے: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا۔ (۱۲-۸) بلکہ تم اپنے دل سے (یہ) بات بنا لائے۔

اَلشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ (۴۷-۲۵) شیطان نے (یہ کام) انہیں مزین کر دکھایا۔

بعض ادبانے[1] (البسیط)

(۲۴۷) سَالَتْ هُذَيْلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاحِشَةً: (بنی ہذیل نے آنحضرت سے ایک فحش امر کا مطالبہ کیا) میں کہا ہے کہ یہاں سالت بمعنی طلبت ہے اور یہ سَالَ (مہموز) سے نہیں ہے جیسا کہ اکثر ادبا نے خیال کیا ہے۔

(س ی ل)

سَالَ الشَّيْءُ يَسِيْلُ کے معنی کسی چیز کے بہنے کے ہیں۔ اور اَسَلْنَا کے معنی بہادینے کے۔ قرآن

---

[1] قالہ حسان بن ثابت الانصاری وتمامہ؛ ضلت ہذیل بما جاءت ولم تصب ، والبیت فی دیوانہ ۳۲۴ والکتاب (۲: ۳۰) وقال اصلہ مہموز۔ وذکر المؤلف فی محاضراتہ (۲: ۲۵۹) ان ابا کبیر الہذلی جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسألہ ان یحل الزنا فقال اتحب ان یؤتی الیک فی حرمک مثل ذالک قال لا ثم قال فادع اللہ ان یذہب منی الشبق فدعا لہ فقال حسان وانظر للقصۃ ایضا اسد الغابۃ (۵: ۸۲) وذکر ابو کبیر الہذلی واجعۃ اشعار

میں ہے:-

وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ (۳۴-۱۲) اور ان کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔

یہاں اَسَلْنَا کے معنی پگھلا دینے کے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت اِسَالَۃ کا لفظ قطر کی اس حالت پر بولا جاتا ہے جو پگھلانے کے بعد ہوتی ہے۔

اَلسَّیْلُ (ض) یہ اصل میں سَالَ یَسِیْلُ کا مصدر ہے جس کے معنی بہنے کے ہیں اور بطور اسم اس پانی پر بولا جاتا ہے جو دور سے بہہ کر کسی جگہ پر آ جائے اور وہاں برسا نہ ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے:-

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا (۱۳-۱۷) پھر برساتی نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔

سَيْلَ الْعَرِمِ ...... (۳۴-۱۶) زور کا سیلاب

اَلسِّیْلَانُ (دنبالہ شمشیر و کارد وغیرہ) اس لمبے لوہے کو کہتے ہیں جو نصاب کی جانب سے تلوار چھری وغیرہ کے دستہ میں لگا ہوتا ہے۔

(س ء ل)

اَلسُّؤَالُ کے معنی کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کے ہیں۔ جو مودی الی المعرفۃ ہو یا مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کو بھی سُؤَال کہا جاتا ہے جو مودی الی المال ہو پھر کسی چیز کی معرفت کی استدعا کا جواب اصل میں تو زبان سے دیا جاتا ہے لیکن کتابت یا اشارہ اس کا قائم مقام بن سکتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب اصل میں تو ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن زبان سے وعدہ یا انکار اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سوال کے معنی استدعاء معرفت کیسے صحیح ہو سکتے ہیں جب کہ یہ ثابت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے سوال کرے گا جیسے فرمایا:-

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ (۵-۱۱۶) اور (اس وقت کو بھی یاد رکھو) جب خدا فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے سوال کرنا کسی قسم کی معرفت حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ تو علام الغیوب ہے۔ (لَا تَخْفَىٰ عَلَيْهِ خَافِيَةٌ) بلکہ لوگوں کو بتلانے اور انہیں سرزنش کرنے کی غرض سے ہوگا لیکن پھر بھی یہ سوال سوال عن المعرفۃ کبھی کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور کبھی محض سرزنش کے لئے جیسا کہ قرآن میں ہے:-

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ (۸۱-۸) جب لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہے پوچھا جائے گا۔

اور کبھی صرف مسئول (جس سے سوال کیا جائے) کو جتلانے کے لئے (نہ کہ خود کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے)

اور سوال جب کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مفعول ثانی کی طرف کبھی تو وہ متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی حرف جار کے ذریعہ۔ چنانچہ تم کہو گے سَأَلْتُهُ كَذَا وَسَأَلْتُهُ عَنْ كَذَا وَبِكَذَا لیکن زیادہ تر بواسطہ عن کے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:-

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ (۱۷-۸۵) اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ (۱۸-۸۳) اور تم سے ذی القرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ (۸-۱) (اے محمد مجاہد لوگ)

تم سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔
اور فرمایا:۔
وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ (۲-۱۸۶) اور اے پیغمبر! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں۔
سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (۷۰-۱) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا جو نازل ہو کر رہے گا۔
اور جب سوال طلب مال کے لئے ہو تو وہ متعدی بنفسہٖ بھی ہوتا ہے اور بذریعہ مِنْ کے بھی چنانچہ فرمایا:۔
وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (۳۳-۵۳) اور جب پیغمبروں کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔
وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا (۶۰-۱۰) اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہو تم ان سے طلب کرو۔ اور جو کچھ انہوں نے (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کرلیں۔
وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (۴-۳۲) اور خدا سے اس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو۔
فقیر کو بھی جب وہ کسی چیز کی استدعا کرے تو اسے سائل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳-۱۰) اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔
لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱-۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے والے۔

(س و م)

اَلسَّوْمُ کے معنی کسی چیز کی طلب میں جانیکے ہیں پس اسکا مفہوم دو اجزاء سے مرکب ہے یعنی طلب اور جانا پھر کبھی صرف ذہاب یعنی چلے جانا کے معنی ہوتے ہیں جیسے سَامَتِ الْاِبِلُ اونٹ چراگاہ میں چرنے کیلئے چلے گئے۔ اور ان اونٹوں کو جو باہر چرنے جاتے ہیں سَائِمَةٌ کہا جاتا ہے اور کبھی صرف طلب کے معنی پائے جاتے ہیں جیسے سُمْتُ كَذَا میں نے اسے فلاں تکلیف دی چنانچہ قرآن میں ہے يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (۲-۴۹) جو لوگ تم کو بڑا دکھ دیتے تھے اور سِيْمَ فُلَانٌ الْخَسْفَ (فلاں کو خسف کا عذاب دیا گیا) یا هُوَ يُسَامُ الْخَسْفَ۔ کا محاورہ بھی اسی سے ماخوذ ہے اور اسی سے بَيْعٌ میں اَلسَّوْمُ ہے جس کے معنی نرخ کرنا کے ہیں چنانچہ کہا گیا ہے[1] (۱۸۶)
صَاحِبُ السِّلْعَةِ اَحَقُّ بِالسَّوْمِ سامان کا مالک نرخ کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔
اور سُمْتُ الْاِبِلَ فِي الْمَرْعٰى کے معنی چراگاہ میں چرنے کے لئے اونٹ بھیجنے کے ہیں۔ اور اسی معنی میں اَسَمْتُ الْاِبِلَ (انعال) وَسَوَّمْتُهَا (تفعیل) آتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ (۱۶-۱۰) اور اس سے درخت بھی (شاداب) ہوتے ہیں جن میں تم اپنے چارپایوں کو چراتے ہو۔
اَلسِّيْمَاءُ وَالسِّيْمِيَاءُ کے معنی علامت کے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

---

[1] البخاری فی تزوجاتہٖ فی اللسان (سوم) قالہ ابن عنقاء الفزاری فی عمیلة الفزاری واولہ: غلام رماہ اللہ بالخیر یافعا۔۔۔ وفی روایة ابن الانباری بالحسن بدل الخیر وانظر الخبر والشعر فی الحماسة (۴: ۲۸ ط مصر) والمرزوقی ۱۵۸۸ والحصری (۴: ۱۰۴) والکامل (۱: ۲۲) والاغانی (۱۷: ۱۱۱) والطبری (۳: ۹۸) (۴: ۸۴/۸: ۱۹۶) وشواہد الکشاف ۵۲ وابن ولاد ۴۲ والبحر (۲: ۳۱۶/۸: ۱۰۲) والمعجم للمرزبانی (۱۹۹) فی خمسة ابیات والمؤتلف للآمدی ۲۳۸ وبعدہ کان الثریا علقت فی جبینہ۔ وفی النفر الشعری وفی جیدہ القمر۔ وفی روایة فوق نحرہ وعنقاء امہ واسمہ قیس بن بجرة الفزاری المخضری والبیت الثانی قالہ علی بن طلحة یمدح طلحة قوم راجع العقد (۴: ۳۲۲)

(۲۴۸) لَهٗ سِيمِيَاءُ لَا تَشُقُّ عَلَى الْبَصَرِ
اس کے چہرے پر نشان ہے جو آنکھوں پر گراں نہیں گزرتا
قرآن میں ہے:۔
سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ
(۴۸-۲۹) (کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔

اور سَوَّمْتُهٗ کے معنی نشان زدہ کرنے کے ہیں۔
اور مُسَوَّمِيْنَ (۳: ۱۲۵) کے معنی مُعَلَّمِيْنَ کے ہیں یعنی نشان زدہ اور مُسَوِّمِيْنَ (بصیغہ فاعل) کے معنی ہیں اپنے آپ پر یا اپنے گھوڑوں پر نشان امتیاز بنانے والے یا ان کو چھوڑنے والے۔
آنحضرت سے ایک روایت میں ہے[1] (۱۸۷)
تَسَوَّمُوْا فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ قَدْ تَسَوَّمَتْ کہ تم بھی نشان بنالو کیونکہ فرشتوں نے اپنے لئے نشان بنائے ہوئے ہیں۔

(س ء م)

اَلسَّآمَةُ اس کے معنی کسی چیز کے زیادہ عرصہ تک رہنے کی وجہ سے اس سے کبیدہ خاطر یا دل برداشتہ ہوجانے کے ہیں اور یہ فعلاً (کسی کام کو زیادہ عرصہ تک کرنے) اور انفعالاً (کسی چیز سے زیادہ متاثر ہونے) دونوں طرح ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَهُمْ لَا يَسْأَمُوْنَ (۴۱-۴۹) اور (کبھی) اکتاتے ہی نہیں
نیز فرمایا:۔
لَا يَسْأَمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ (۴۱-۴۹) انسان بھلائی کی دعائیں کرتا کرتا تو تھکتا نہیں۔
شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

(۲۴۹) سَئِمْتُ تَكَالِيفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَعِشْ
ثَمَانِيْنَ حَوْلًا لَا أَبَا لَكَ يَسْأَمِ

میں زندگی کی خوشگواریوں سے اکتا چکا ہوں۔ ہاں جو شخص اسی کو پہنچ جائے وہ لامحالہ اکتا ہی جاتا ہے۔

(س ی ن)

طُوْرِ سَيْنَاءَ یہ مشہور پہاڑ کا نام ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ (۲۳-۲۰) (اور وہ درخت بھی ہم ہی نے پیدا کیا) جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے۔
یہ حرف اول یعنی سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ فتح کی صورت میں قطعی طور پر الف ممدودہ برائے تانیث ہوگا کیونکہ عربی زبان میں فَعْلَالٌ کا وزن صرف کلمہ مضاعف کے ساتھ مختص ہے جیسے زَلْزَالٌ وَ قَلْقَالٌ اور سین کے مکسور ہونے کی صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا الف عِلْبَاءٌ اور حِرْبَاءٌ کی طرح (برائے تانیث) ہو اور یہ بھی صحیح ہے کہ الف سِرْدَاحٌ کے ساتھ ملحق کرنے کے لئے ہو اور اسی کو دوسری جگہ طُوْرِ سِيْنِيْنَ (۹۵-۲) بھی کہا گیا ہے۔
اَلسِّيْنُ حروف ہجاء میں سے ایک حرف کا نام ہے۔

(س و ی)

اَلْمُسَاوَاةُ کے معنی وزن کیل یا مساحت

---

[1] اخرجہ الطبری عن عمیر بن اسحاق (۴-۸۲) وفی النہایہ (سوم) تسوموا فان الملائکۃ قد سومت ۱۲ ۔ [2] القائل زہیر بن ابی سلمی والبیت فی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۵۷) والبحر (۲: ۳۵۱) والمحاضرات (۴: ۵۹۸) والجمہرۃ ۱۰۱ والعقد الثمین ۹۶ وایام العرب ۲۷۲ (جامع الکبیر للبیزی)
۲۰ والمعلقات لابن الانباری ۲۸۷ وفی روایۃ عاما بدل حولا وابن الشجری (۱: ۲۴۲) والسیوطی ۱۳۲ ٭ ٭ ٭

ئے لحاظ سے دو چیزوں کے ایک دوسرے کے برابر ہونے کے ہیں جیسے محاورہ ہے:۔
ھٰذَا الثَّوْبُ مُسَاوٍ لِذَالِکَ الثَّوْبِ یہ کپڑا اس کپڑے کے مساوی ہے۔ ھٰذَا الدِّرْھَمُ مُسَاوٍ لِذَالِکَ الدِّرْھَمِ یہ درہم اس درہم کے مساوی ہے اور کبھی بلحاظ کیفیت کے برابری ہونے پر بولا جاتا ہے جیسے:۔
ھٰذَا السَّوَادُ مُسَاوٍ لِذَالِکَ السَّوَادِ کہ یہ سیاہی اس سیاہی کے برابر ہے مگر اصل میں یہاں مساوات بلحاظ ذات سواد کے مراد نہیں ہوتی بلکہ بلحاظ محل کے ہوتی ہے اور معنی معادلت (برابری) کے لحاظ سے یہ لفظ عدل والنصاف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)
(۲۵) اَبَیْنَا فَلَا نُعْطِی السَّوَاءَ عَدُوَّنَا
ہم انکار کر دیتے ہیں اور اپنے دشمن کو عدل وانصاف نہیں دیتے۔
اِسْتَوٰی اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے ایک یہ کہ ایک دو یا دو سے زیادہ فاعل کی طرف اس کی اسناد ہو جیسے۔
اِسْتَوٰی زَیْدٌ وَّعَمْرٌو فِیْ کَذَا کہ زید اور عمرو فلاں چیز میں برابر ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
لَا یَسْتَوُوْنَ عِنْدَ اللّٰہِ (۹-۱۹) یہ لوگ خدا کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔
دوم یہ کسی چیز کے اپنی ذات کے اعتبار سے حالت اعتدال پر ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
ذُوْ مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی (۵۳-۶) (یعنی جبرائیل) طاقتور نے پھر وہ پورے نظر آئے۔
فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ (۲۳-۲۸) جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جاؤ۔
اور محاورہ ہے:۔
اِسْتَوٰی اَمْرُ فُلَانٍ کہ فلاں کا معاملہ ٹھیک اور صحیح ہو گیا اور جب عَلٰی کے ذریعہ متعدی ہو تو اس کے معنی کسی چیز پر چڑھنے، قرار پکڑنے اور مستولی ہونا کے ہوتے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے:۔
اِسْتَوٰی فُلَانٌ عَلٰی عَمَالَتِہٖ فلاں نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ قرآن میں ہے:۔
لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُھُوْرِہٖ (۴۳-۱۳) تاکہ تم ان کی سواری کرو۔
فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ (۴۸-۲۹) اور پھر وہ اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔
اور اسی سے آیت:۔
اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (۲۰-۵) رحمٰن جس نے عرش پر قرار پکڑا ہے اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں اس کے سامنے مساوی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ان کو درست بنانے سے سب اس کے ارادہ کے مطابق ٹھیک اور درست ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ آیت:۔
ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰھُنَّ (۲-۲۹) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک (سات آسمان) بنا دیا۔
میں ہے بعض نے آیت اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ تمام چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف برابر ہے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ بنسبت دوسری چیز کے اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اجسام پر قیاس نہیں کر سکتے جو ایک جگہ موجود ہوتے ہیں اور دوسری جگہ نہیں ہوتے۔
اور جب یہ لفظ (اِسْتَوٰی) متعدی بالیٰ ہو تو اسکے

[1] قالہ عنترۃ وتمامہ: تیأثا یا عصا والسرا بالعطف والبیت فی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۹۰) والعقد الثمین

معنی کسی چیز تک بالذات یا بالتدبیر پہنچ جانے کے ہوتے ہیں اور آیت:۔

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ وَھِیَ دُخَانٌ (۴۱-۱۱) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔

میں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی اَلْاِنْتِھَاءُ اِلَیْھَا بِالتَّدْبِیْرِ۔ یعنی تدبیر کرنا۔

اَلتَّسْوِیَۃُ کے معنی کسی چیز کو ہموار کرنے کے ہیں اور آیت:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ (۸۲-۷) (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضاء کو ٹھیک کیا۔

میں سَوّٰکَ سے مراد یہ ہے کہ انسان کی خلقت کو اپنی حکمت کے اقتضاء کے مطابق بنایا اور آیت۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا (۹۱-۷) اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے قوی کو برابر بنایا۔

میں لفظ "ما" سے ان قوائے نفسانیہ کی طرف اشارہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نفس کے لئے مُقَوِّم بنایا ہے چنانچہ فعل کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ بحث دوسرے مقام پر مذکور ہو چکی ہے کہ فعل کی نسبت جس طرح فاعل حقیقی کی طرف ہوتی ہے اسی طرح آلہ اور ان تمام چیزوں کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوتی ہے جن کا کہ وہ فعل محتاج ہوتا ہے۔ جیسے سَیْفٌ قَاطِعٌ (کہ یہاں فعل قطع کی نسبت تلوار کی طرف ہے جو آلۂ قطع ہے) اور آیت کی یہ توجیہ جو ہم نے بیان کی ہے اس قول سے بہتر ہے جو مَا سَوّٰھَا سے اللہ تعالیٰ مراد لیتے ہیں کیونکہ لفظ ما عقل کے لئے موضوع ہے اور سمع (یعنی کسی دلیل سمعی) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے حق میں استعمال ہوا ہو لہذا اس سے ذات باری تعالیٰ مراد نہیں ہو سکتی۔ اور آیت:۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۔ (۸۷-۱،۲) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو جس نے (انسان کو) بنایا پھر اس کے اعضاء کو درست کیا۔

میں سَوّٰی فعل (بلا اختلاف) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اسی طرح آیت کریمہ:۔

فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (۱۵-۲۹) جب اس کو (صورت انسانیہ میں) درست کر لوں اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔

اور اسی طرح دوسری آیت:۔

رَفَعَ سَمْکَھَا فَسَوّٰھَا (۷۹-۲۸) اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کر دیا۔

میں بھی فعل تسویۃ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے اور آیت فَسَوّٰھَا میں آسمان کا تسویہ اس کی بناوٹ اور تزیین دونوں کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ نِ الْکَوَاکِبِ (۳۷-۶) بے شک ہم ہی نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا۔ میں مذکور ہے۔

اَلسَّوِیُّ اسے کہتے ہیں جو مقدار اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ قرآن میں ہے:۔

ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ..... (۱۹-۱۰) سالم تین رات (دن)۔ ......

مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ (۲۰-۱۳۵) (دین کے) سیدھے راستے پر چلنے والے کون ہیں۔

اور رَجُلٌ سَوِیٌّ اس مرد کو کہا جاتا ہے جس میں خلق و خلقت دونوں اعتبار سے اعتدال پایا جائے اور افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ اور آیت:۔

عَلٰی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ..... (۷۵-۴) پر قادر ہیں کہ ان کی پور پور درست کر دیں۔

میں تَسْوِيَةُ الْبَنَانِ سے مراد ہتھیلی کو اونٹ کے پاؤں کی طرح بنا دینا مراد ہے کہ اس کی انگلیاں ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ تَسْوِيَةُ الْبَنَانِ سے تمام انگلیوں کو یکساں بنا کر بیکار کر دینا مراد ہے کیونکہ انگلیوں کے قدر و ہیئت میں متفاوت ہونے کی حکمت ظاہر ہے کہ وہ اس صورت میں کسی چیز کے پکڑنے میں باہم تعاون کرتی ہیں اور اگر وہ سب برابر ہوتیں تو یہ تعاون ناممکن تھا اور آیت:۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰاهَا (۹۲-۱۴) تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا سب کو ہلاک کر کے، برابر کر دیا۔

میں سَوّٰاهَا سے ان کے شہروں کو برباد کر کے زمین کے ساتھ برابر کر دینا مراد ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (۲-۲۵۹) جو کہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی۔

اور بعض نے فَسَوّٰاهَا کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ان کے شہروں کو ان پر برابر کر دیا جیسا کہ آیت:۔

لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ (۴-۴۲) کہ کاش ان کو زمین میں مدفون کر کے مٹی برابر کر دی جاتی۔

میں مذکور ہے اور یہ کفار کے اس قول کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:۔ وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا (۷۸-۴۰) اور کافر کہے گا کہ اے کاش میں مٹی ہوتا۔ میں مذکور ہے۔

مَكَانٌ سُوًى وَسَوَاءٌ کے معنی وسط کے ہیں اور سَوَاءٌ وَسِوًى وَسُوًى اسے کہا جاتا ہے جس کی نسبت دونوں طرف مساوی ہوں اور یہ یعنی سَوَاءٌ وصف بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور ظرف بھی لیکن اصل میں یہ مصدر ہے۔

قرآن میں ہے:۔

فِيْ سَوَاءِ الْجَحِيْمِ ..... (۳۷-۵۵) (تو اس کو) وسطِ دوزخ میں۔

سَوَاءَ السَّبِيْلِ ..... (۲-۱۰۸) (تو وہ) سیدھے راستے سے۔

فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ (۸-۵۸) تو (ان کا عہد) انہیں کی طرف پھینک دو اور برابر کا جواب دو۔

تو یہاں عَلٰى سَوَاءٍ سے عادلانہ حکم مراد ہے۔ جیسے فرمایا:۔

اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۳-۶۴) (اے اہل کتاب) جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ۔

اور آیات:۔

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (۲-۶) انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے۔

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۶۳-۶) تم ان کے لئے مغفرت مانگو یا نہ مانگو ان کے حق میں برابر ہے۔

سَوَاءٌ عَلَيْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا (۱۴-۲۱) اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

میں سَوَاءٌ سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں عدم نفع میں برابر ہیں۔ نیز فرمایا:۔

سَوَاءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (۲۲-۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔

اور کبھی سِوًى وسَوَاءٌ بمعنی غیر (حرف استثناء) بھی آجاتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ( )

---

[1] لم اجدہ ویرجع

(۲۵۱) فَلَمْ یَبْقَ مِنْهَا سِوَی هَامِدٍ
جسم مردہ کے سوا ان میں کوئی شخص باقی نہ رہا۔
اور دوسرے شاعر نے کہا ہے (الطویل)

(۲۵۲) وَ مَا قَصَدَتْ مِنْ اَھْلِھَا لِسَوَائِکَا
اور اس اونٹنی نے اس شہر کے اہل میں سے تیرے سوا کسی کا قصد نہیں کیا۔

وَعِنْدِیْ رَجُلٌ سِوَاکَ تیرے علاوہ میرے پاس دوسرا آدمی ہے۔

اَلسِّیُّ کے معنی مساوی کے ہیں جیسے عِدْلٌ بمعنی مُعَادِلٌ اور قِتْلٌ بمعنی مُقَاتِلٌ کے آجاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

سِیَّانِ زَیْدٌ وَعَمْرٌو زید اور عمرو دونوں برابر ہیں۔ اور سِیٌّ کی جمع اَسْوَاءٌ آتی ہے جیسے نِقْضٌ کی جمع اَنْقَاضٌ اور بہت سے ہم مرتبہ یا برابر کے لوگوں کے لئے قَوْمٌ اَسْوَاءٌ وَ مُسْتَوُوْنَ کہا جاتا ہے۔

اَلْمُسَاوَاۃُ۔ عرف میں قیمتی اشیاء کے متعلق بولا جاتا ہے جیسے ھٰذَا الثَّوْبُ یُسَاوِیْ کَذَا کہ اس کپڑے کی اتنی قیمت ہے۔ اصل میں یہ مَسَاوَاۃٌ فِی الْعَدَدِ سے مشتق ہے جس کے معنی دو چیزوں کے مقدار یا مرتبہ میں برابر ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
حَتّٰی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ (۱۸-۹۶) جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان کا حصہ برابر کر دیا۔

(س و ء)

اَلسُّوْءُ۔ ہر وہ چیز جو انسان کو غم میں مبتلا کر دے اسے سوء کہا جاتا ہے خواہ وہ امور دنیوی کے قبیل سے ہو یا اخروی کے اور عام اس سے کہ اس کا تعلق احوال نفسانیہ سے ہو یا بدنیہ سے یا ان امور خارجیہ سے ہو جن کا تعلق جاہ و جلال کے چلے جانے یا کسی قریبی رشتے دار یا دوست کے فوت ہو جانے سے ہوتا ہے اور آیت:۔
بَیْضَاءَ مِنْ غَیْرِ سُوْءٍ (۲۰-۲۲) وہ کسی عیب کے بغیر (چمکتا دمکتا) نکلے گا۔

میں سوء سے مراد آفت یعنی بیماری ہے بعض نے سُوْءٍ سے برص مراد لی ہے۔ لیکن یہ منجملہ ان امراض کے ایک ہے جو ہاتھ کو لگ جاتے ہیں اور (عذاب اخروی کے متعلق) فرمایا:۔
اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (۱۶-۲۷) آج کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔

اور ہر وہ چیز جو قبیح ہو اسے "سُوْاٰی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ لفظ "اَلْحُسْنٰی" کے مقابلہ میں آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ کَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰی (۳۰-۱۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی ان کا انجام بھی برا ہوا۔

جیسے اس کے مقابلہ میں فرمایا:۔
لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ (۱۰-۲۶) جن لوگوں نے نیکوکاری کی ان کے لئے بھلائی ہے اور مزید برآں اور بھی۔

لہ البیت من قصیدۃ لاعشٰی میمون مدح بہا ہوذۃ بن علی بن ثمامہ رئیس الیمامۃ وصدرہ: تجانف عن جو الیمامۃ ناقتی۔ وفی روایۃ اللسان والتاج (سوی) عدلت بدل قصدت وفی روایۃ ابن الشجری (۱: ۳۵) جل الیمامۃ بدل جو الیمامۃ وفی الخزانۃ (۳: ۳۹۹) عمدت بدل قصدت والبیت ایضًا فی اللسان (جنف) والملی ابن الشجری (۲: ۵۴، ۲۵۳) وشرح الدیوان لثعلب ۴۷ وابن ولاد ۲۴ والاشباہ (۳: ۷۹) ودیوانہ ۱۳۱ والکامل ۱۱۸ والبحرا: ۴۹۸) والصاحبی ۱۵۴ وشرح شواہد للشنتمری (۱: ۱۳) والکتاب (۱: ۲۰۳) والبلدان (جو) واضداد ابی الطیب ۳۵۸ وفیہ تناورہ بدل تجانف واضداد ابن الانباری وفی روایتہ عدلت بدل قصدت والبیت من شواہد النحاۃ علی ان لفظۃ سواء قد یکون اسماً معنی غیر وفیہ بحث ۱۲

اور سَیِّئَۃٌ کے معنی برائی کے ہیں اور یہ حَسَنَۃٌ کی ضد ہے قرآن میں ہے:۔

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً (۲-۸۱) ہاں جو برے کام کرے۔

لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبْلَ الْحَسَنَۃِ (۲۷-۴۶) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لئے کیوں جلدی کرتے ہو۔

یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱-۱۱۴) گناہوں کو دور کر دیتی ہے۔

مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ (۴-۷۹) (اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔

فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا (۱۶-۳۴)

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ (۲۳-۹۶) اور بری بات کے مقابلہ میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔

اور حدیث میں ہے[1] (۱۸۶)

یَا اَنَسُ اَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُهَا کہ انس برائی کے بعد نیکی کرو جو برائی کے اثر کو مٹا ڈالے گی۔

حَسَنَۃ اور سَیِّئَۃ دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو عقل اور شریعت دونوں کی رو سے بھلی یا بری ہو۔ چنانچہ اس معنی کے لحاظ سے فرمایا:۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَاءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزٰی اِلَّا مِثْلَهَا (۶-۱۶۱) جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔

دوسری حَسَنَۃ اور سَیِّئَۃ وہ ہے جو باعتبار طبیعت کے ہے یعنی وہ چیزیں جو طبیعت کو سبک یا گراں محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَۃُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَۃٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَہٗ (۷-۱۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر سختی پہنچتی تو موسیٰ اور ان کے رفیقوں کی بدشگونی بتاتے۔

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الْحَسَنَۃَ (۷-۹۵) پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔

اور سَاءَ نِیْ کَذَا وَ سُؤْتَنِیْ کہا جاتا ہے۔ اور اَسَأْتُ اِلٰی فُلَانٍ (بھلا) بولتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

سِیْئَتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔۔۔۔ (۶۷-۲۷) تو کافروں کے منہ برے ہو جائیں گے۔

لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَکُمْ (۱۷-۷) تاکہ تمہارے چہروں کو بگاڑیں۔ اور آیت:۔

وَ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (۴-۱۲۳) جو شخص برے عمل کرے گا اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائیگا۔ میں سوء سے اعمال قبیحہ مراد ہیں۔ اسی طرح آیت:۔

زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ (۹-۳۷) ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور آیت:۔

عَلَیْهِمْ دَآئِرَۃُ السَّوْءِ (۹-۹۸) انہیں پر بری مصیبت (واقع) ہو۔ میں دَآئِرَۃُ السَّوْءِ سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے جو انجام کار غم کا موجب ہو اور آیت:۔

وَ سَاءَتْ مَصِیْرًا (۴-۱۱۵) اور وہ بری جگہ ہے۔

سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا (۲۵-۶۶) (دوزخ) ٹھہرنے کی بری جگہ ہے۔ میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

---

[1] وفی روایۃ قالہ لابی ذر و بعدھا "وخالق الناس بخلق حسن" والیضا لمعاذ (راجع ابن کثیر ج ۲ ص ۴۶۴)

اور کبھی سَاءَ بِئْسَ کے قائم مقام ہوتا ہے۔
یعنی معنی ذم کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ
(۳۷-۱۷۷) مگر جب وہ ان کے مکان میں آ اتریگا
تو جن کو ڈرسنایا گیا تھا ان کے لئے برا دن ہوگا۔
سَاءَ مَا يَعْمَلُوْنَ (۵-۶۶) انکے عمل برے ہیں۔
سَاءَ مَثَلًا ..... (۷-۱۷۷) مثال بری ہے۔
اور آیت:۔
سِيْئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۶۷-۲۷) (تو)
کافروں کے منہ برُے ہو جائیں گے۔
میں سِيْئَتْ کی نسبت وجوہ کی طرف کی گئی ہے
کیونکہ حزن و سرور کا اثر ہمیشہ چہرے پر ظاہر ہوتا
ہے اور آیت:۔
سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا (۱۱-۷۷) تو وہ
(ان کے آنے سے) غمناک اور تنگدل ہوئے۔
یعنی ان مہمانوں کو وہ حالات پیش آئے جن کی وجہ سے
اسے صدمہ لاحق ہوا۔ اور فرمایا:۔
لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ (۱۳-۱۸) ایسے لوگوں کا
حساب بھی برا ہوگا۔
وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۱۳-۲۵) اور ان کیلئے گھر بھی برا ہے
اور کنایہ کے طور پر سَوْءَةٌ کا لفظ عورت یا مرد کی
شرمگاہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ (۵-۳۱) اپنے بھائی کی
لاش کو کیونکر چھپائے۔
فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ (۵-۳۱) کہ اپنے بھائی کی
لاش چھپا دیتا۔
يُوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ (۷-۲۶) کہ تمہارا ستر ڈھانکے
بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا۔ (۷-۲۲) تو ان کے ستر
کی چیزیں کھل گئیں۔
لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُوْرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا
(۷-۲۰) تاکہ ان کے ستر کی چیزیں جو ان سے
پوشیدہ تھیں کھول دے۔

کِتَابُ الشِّیْنُ

ش ب ہ

اَلشِّبْہُ وَالشَّبَہُ وَالشَّبِیْہُ کے اصل معنی مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلاً لون اور طعم میں باہم مماثل ہونا یا عدل ظلم میں اور دو چیزوں کا حسی یا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوسکیں شُبْہَۃ کہلاتا ہے پس آیت کریمہ :۔

وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا (۲-۲۵) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔

میں مُتَشَابِھًا کے معنی یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اور مزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔ بعض کے نزدیک کمال اور عمدگی میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے اور آیت کریمہ :۔

مُشْتَبِھًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِہٍ (۶-۱۰۰) جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔

میں ایک قراءت مُتَشَابِھًا ہے مگر دونوں کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں اور آیت کریمہ :۔

اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَہَ عَلَیْنَا (۲-۷۰) کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔

میں تَشَابَہَ فعل ماضی مذکر کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور تَشَّابَہَ فعل مضارع مونث بھی جو اصل میں تَتَشَابَہُ ہے اور تا شین میں مدغم ہے۔ اور آیت :۔

تَشَابَھَتْ قُلُوْبُھُمْ (۲-۱۱۸) ان لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

میں اُن کے قلوب کا گمراہی اور جہالت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے اور آیت :۔

وَاُخَرُ مُتَشَابِھٰتٌ (۳-۷) اور بعض متشابہ ہیں۔

میں مُتَشَابِھٰتٌ سے مراد وہ آیات ہیں جن کی لفظی یا معنوی مماثلت کی وجہ سے تفسیر بیان کرنا مشکل ہو۔ عام فقہاء کے نزدیک متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظاہری معنی سے مقصود کا علم نہ ہوسکے۔

اصل میں آیات تین قسم پر ہیں بعض[1] علی الاطلاق محکم ہیں اور بعض[2] علی الاطلاق متشابہ اور بعض[3] من وجہ محکم اور من وجہ متشابہ ہیں۔

پھر متشابہات بھی تین قسم پر ہیں۔ متشابہ[1] بلحاظ لفظ، متشابہ[2] بلحاظ معنی اور متشابہ بلحاظ لفظ و معنی اور متشابہ بلحاظ لفظ پھر دو قسم پر ہے ایک وہ تشابہ جو الفاظ مفردہ میں ہوتا ہے۔ دوم وہ جو کلام مرکب میں پایا جاتا ہے۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت الفاظ کے ہوگا جیسے اَبٌّ وَّیَزِفُّوْنَ کہ دونوں غریب معنی ہیں اور یا بوجہ لفظ کے مشترک ہونے کے جیسے یَدٌ وعَیْنٌ کہ یہ دونوں مختلف معانی کے لئے موضوع ہیں اور کلام مرکب میں تشابہ تین

قسم یہ ہے۔ بوجہ اختصار جیسا کہ آیت کریمہ:۔
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ (۴-۳) اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ (یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں۔۔۔۔ ان سے نکاح کر لو۔

دوسرے بوجہ بسط کلام کے جیسے فرمایا:۔
لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲-۱۱) اس جیسی کوئی بھی چیز نہیں۔

کیونکہ اگر یہاں کاف نہ بڑھایا جاتا اور لَيْسَ مِثْلَهٗ شَيْءٌ کہا جاتا تو مطلب زیادہ صاف اور واضح ہو جاتا۔ تیسرے وہ اشتباہ جو ترتیب کلام میں تغیر کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت:۔
اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا (۱۸-۱،۲) جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر اپنی کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں رکھی (بلکہ) سیدھی (اور سلیس اتاری)

یہ اصل ترتیب کے لحاظ سے قَيِّمًا وَّلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا تھا۔ نیز فرمایا:۔
لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ۔ اِلٰی قولہ لَوْ تَزَيَّلُوْا (۴۸-۲۵) اور اگر ایسے مرد اور (عورتیں) نہ ہوتیں ۔۔۔ اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے۔

متشابہ بلحاظ معنی جیسے صفات باری تعالیٰ اور احوال قیامت کہ یہ اوصاف نہ محسوس ہیں اور نہ محسوسات کی جنس سے ہیں اور جو چیز محسوس یا اس کی جنس سے نہ ہو اس کا تصور ہمارے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ اور متشابہ من حیث اللفظ والمعنی کی پانچ قسمیں ہیں اول تشابہ بلحاظ کمیت کے مثلاً کسی حکم کے عام یا خاص ہونے کے متعلق شبہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (۹-۵) تو مشرکوں کو ۔۔۔ قتل کر دو۔

دوم بلحاظ کیفیت کے مثلاً کسی حکم کے واجب یا مندوب ہونے میں شک وشبہ پایا جاتا ہو چنانچہ فرمایا:۔
فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ (۴-۳) تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر دو۔

سوم بلحاظ زمانہ کے یعنی کسی آیت کے ناسخ یا منسوخ ہونے میں تشابہ پایا جاتا ہو جیسے فرمایا:۔
اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (۳-۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

چہارم تشابہ بلحاظ مکان اور اسباب نزول کے جیسے فرمایا:۔
لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (۲-۱۸۹) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ تم (احرام کی حالت) میں گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔
اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ (۹-۳۷) مہینے کو پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔

تو ظاہر ہے کہ جو شخص ان کے رسم ورواج اور جاہلی عادات سے واقف نہ ہو وہ اس آیت کی تفسیر کو نہیں سمجھ سکتا۔

پنجم وہ تشابہ جو کسی فعل کے صحت وفساد کے شروط کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز اور نکاح کی شروط نہ جاننے سے اشتباہ ہو جاتا ہے۔

الغرض تشابہ کے یہ چند اقسام ہیں جن کا تصور کر لینے سے معلوم ہو جائے گا کہ مفسرین نے تشابہ کی جتنی بھی تشریحات بیان کی ہیں ان میں سے کوئی بھی مندرجہ بالا اقسام سے خارج نہیں ہے۔ مثلاً بعض کا قول ہے کہ الٓمٓ (حروف مقطعات) متشابہات سے ہے اور قتادہؒ نے کہا ہے کہ ناسخ محکم ہیں اور منسوخ متشابہ میں داخل ہیں اور الاصم کا قول ہے کہ جس آیت کی تفسیر متفق علیہ ہو وہ محکم اور جس کی تفسیر میں اختلاف

ہو وہ تشابہ ہے پھر جملہ متشابہات تین قسم پر ہیں۔ ایک وہ جن کا علم ہمارے لئے ناممکن ہے جیسے قیامت کا وقت اور دابۃ الارض کا خروج اور اس کی کیفیت وغیرہ۔ دوم وہ جن کا علم ہمیں ہوسکتا ہے۔ جیسے الفاظ غریبہ اور احکام مشکلہ۔ سوم وہ جو ان دونوں کے بین بین ہیں جن کا علم صرف راسخین فی العلم کو ہی ہوسکتا ہے ہر ایک کے لئے ان تک رسائی ممکن نہیں۔ اسی قسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت نے حضرت علیؓ کے متعلق فرمایا (۱۸۷)

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِیْلَ کہ اے اللہ اسے دین میں سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما یہی دعا حضرت ابن عباسؓ کے متعلق بھی مروی ہے[1] (۱۸۸)

پس اس بحث کو پیش نظر رکھ لینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آیت کریمہ:۔

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳-۷) حالانکہ مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔

میں اِلَّا اللّٰهُ پر بھی وقف صحیح ہے اور اَلرّٰسِخُوْنَ کے ساتھ ملا کر پڑھنا بھی جائز ہے اور ہر ایک یعنی وقف اور وصل کی ایک خاص وجہ ہے جو مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (۳۹-۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب جس کی آیتیں ملتی جلتی ہیں۔

میں مُتَشَابِهًا کے معنی یہ ہیں کہ احکام حکمت اور استقامت نظم کے لحاظ سے قرآن مجید کی تمام آیات ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ:۔

وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴-۱۵۷) بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی۔

میں شُبِّهَ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا شخص مسیح علیہ السلام کے مشابہ بنا دیا گیا تھا جسے انہوں نے مسیح سمجھ کر قتل کر دیا تھا۔

اَلشَّبَهُ (پیتل) جواہر میں سے اسے کہا جاتا ہے جس کا رنگ سونے کے مشابہ ہوتا ہے۔

(ش ت ت)

اَلشَّتُّ کے معنی قبیلہ کو متفرق کرنے کے ہیں محاورہ ہے۔

شَتَّ جَمْعُهُمْ شَتًّا وَشَتَاتًا ان کی جمعیت متفرق ہوگئی۔ جَاؤُا اَشْتَاتًا وہ پراگندہ حالت میں آئے قرآن میں ہے:۔

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا (۹۹-۶) اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے۔

مِنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی (۲۰-۵۳) (یعنی) انواع (واقسام) کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔

وَقُلُوْبُهُمْ شَتّٰی (۵۹-۱۴) (مگر) ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔

یعنی ان کی حالت مسلمانوں کی حالت کے برعکس ہے جن کے متعلق فرمایا:۔

وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ (۸-۶۳) مگر خدا ہی نے ان میں الفت ڈال دی۔

شَتَّانَ یہ اسم فعل بروزن وَشْکَانَ ہے۔ محاورہ ہے۔

---

[1] واما دعاؤہ صلی اللہ علیہ وسلم لابن عباس فمعروف ومتفق علیہ من حدیث ابن عباس دون قولہ "وعلمہ التاویل" فانہ اخرجہ بہذہ الزیادۃ احمد وابن حبان والحاکم وصححہ (تخریج العراقی علی الاحیاء ۳ : ۲۴) وفی روایۃ الترمذی لابن عباس: اللھم علمہ الحکمۃ (۲/۲۲۲ مع التحفۃ) ۱۲

شَتَّانَ مَاهُمَا وَشَتَّانَ مَابَيْنَهُمَا ان دونوں میں کس قدر بُعد اور تفاوت ہے

(ش ت و)

قرآن میں ہے :-

رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶-۲) (یعنی) ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنیکے سبب)

اور شَتَّى وَاَشْتَى کے معنی کسی جگہ موسم سرما گزارنے یا موسم سرما میں داخل ہونے کے ہیں جیسے صَافَ وَاَصَافَ کے معنی موسم گرما گزارنے یا موسم گرما میں داخل ہونے کے ہوتے ہیں۔

اَلْمَشْتَى وَالْمَشْتَاةُ (جاڑے کا زمانہ) اسم ظرف ہے اور کبھی مصدر بن کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الرمل)

(۲۵۳) نَحْنُ فِي الْمَشْتَاةِ نَدْعُو الْجَفَلَى

ہم موسم سرما یعنی قحط سالی میں دعوتِ عام دیتے ہیں۔

(ش ج ر)

اَلشَّجَرُ (درخت) وہ نبات جس کا تنہ ہو۔ واحد شَجَرَةٌ جیسے ثَمَرٌ وَثَمَرَةٌ۔ قرآن میں ہے۔

اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (۴۸-۱۸) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا (۵۶-۷۲) کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵۵-۶) اور بوٹیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔

مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ (۵۶-۵۲) تھوہر کے درخت سے

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ (۴۴-۴۳) بلاشبہ تھوہر کا درخت

وَادٍ شَجِيْرٌ گنجان درختوں والی وادی۔ بہت درختوں والی جگہ۔

هٰذَا الْوَادِيْ اَشْجَرُ مِنْ ذٰلِكَ اس وادی میں اس سے زیادہ درخت ہیں۔

اَلتَّشَاجُرُ وَالْمُشَاجَرَةُ وَالتَّشَاجُرُ باہم جھگڑنا اور اختلاف کرنا۔ قرآن میں ہے۔

فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (۴-۶۵) اپنے تنازعات میں۔

شَجَرَنِيْ عَنْهُ مجھے اس سے جھگڑا کر کے دور ہٹا دیا یا روک دیا حدیث میں ہے[2] (۱۸۹)

فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهٗ اگر تنازع ہو جائے تو جس عورت کا ولی نہ ہو بادشاہ اس کا ولی ہے۔

اَلشِّجَارُ۔ ہودہ کی لکڑی چھوٹی پالکی۔

اَلْمِشْجَرُ لکڑی کا اسٹینڈ جس پر کپڑے رکھے یا پھیلائے جاتے ہیں۔

شَجَرَهٗ بِالرُّمْحِ اسے نیزہ مارا یعنی نیزہ مارکر اسی میں چھوڑ دیا۔

(ش ح ح)

اَلشُّحُّ (اسم) کے معنی حرص کے ساتھ بخل کے ہیں جو انسان کی عادت میں داخل ہو چکا ہو۔ قرآن میں ہے :-

---

[1] قال عنترة وتماماة لاترى الآدب فيهاينتقر والبيت في الكامل (۲: ۷۷۸) ديوانه ۶۸ واللسان (جفل) (نقرا دب) والاقتضاب ۳۴۶ والمقاصد ۲/۱ واصلاح يعقوب ۳۸۱ والمرتضى في اماليه (۱: ۳۵۴) ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۴۴۲) وابن ولاد ۱۲ وتهذيب الالفاظ ۹۱ رقم ۴۹۰ والعقد الثمين ۹۲ والمعاني للقتبي ۳۷۷ [2] اخرجه ابن حبان في زوائده من حديث عائشة رقم ۱۲۴۷ وفي الدارقطني عنها بلفظة : فان اشتجروا بدل تشاجروا راجع النيل ۶ : ۱۲۴ ــــــ ۱۲۵)

وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (۴-۱۲۸) اور طبائع تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔
وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ (۹-۵۹) اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا۔
رَجُلٌ شَحِيْحٌ بخیل آدمی قَوْمٌ اَشِحَّةٌ بخیل لوگ قرآن میں ہے۔
اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ (۳۳-۱۹) مال میں بخل کریں۔
اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ (۳۳-۱۹) یہ اس لئے کہ تمہارے بارے میں بخل کرتے ہیں۔
خَطِيْبٌ شَحْشَحٌ خوش بیان اور بلیغ لیکچرر۔ یہ شَحْشَحَ الْبَعِيْرُ فِيْ هَدِيْرِهٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے مستی میں آواز کو پھرانے کے ہیں۔

(ش ح م)

اَلشَّحْمُ چربی ج شُحُوْمٌ قرآن میں ہے۔
حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا ..... (۶-۱۴۷) ان کی چربی حرام کر دی تھی۔
شَحْمَةُ الْاُذُنِ کان کا نرم حصہ جس میں بالیاں پہنی جاتی ہیں۔ یہ نرم ہونے کے لحاظ سے چونکہ چربی جیسا ہوتا ہے اس لئے اسے شَحْمَةٌ کہا جاتا ہے اور شَحْمَةُ الْاَرْضِ (کیچوا) گرگٹ کی قسم کا ایک جانور جو زمین یا ریت میں گھس کر رہتا ہے۔
رَجُلٌ مُشْحِمٌ گھر میں بہت زیادہ چربی رکھنے والا۔ شَحِمٌ چربی کھانے کا حریص لیکن جو اپنے دوستوں کو بہت چربی کھلانے والا ہو اسے شَاحِمٌ کہا جاتا ہے۔ اور شَحِيْمٌ کے معنی موٹے تازے اور چربی دار کے ہیں۔

(ش ح ن)

اَلشَّحْنُ کشتی یا جہاز میں سامان لادنا بھرنا قرآن میں ہے:۔
فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (۲۶-۱۱۹) بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے۔
اَلشَّحْنَاءُ کینہ عداوت جس سے نفس پُر اور بھرا ہوا ہو عَدُوٌّ مُشَاحِنٌ بہت سخت دشمن گویا وہ دشمنی سے پُر ہے۔
اَشْحَنَ لِلْبُكَاءِ غم سے بھر کر رونے کیلئے آمادہ ہونا۔

(ش خ ص)

(اَلشَّخْصُ) کھڑے انسان کا جسم جو دور سے نظر آئے اسے شَخْصٌ کہا جاتا ہے اور شَخَصَ مِنْ بَلَدِهٖ کے معنی شہر سے چلے جانا کے ہیں۔ شَخَصَ بَصَرُهٗ اس کی آنکھ پتھرا گئی۔ شَخَصَ سَهْمُهٗ تیر نشانے سے اونچا نکل گیا۔ اور اَشْخَصَ (افعال) اس نے نشانے سے اونچا نکال دیا۔ قرآن میں ہے:۔
تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ (۱۴-۴۲) جب کہ (دہشت کے سبب) آنکھ کھلی کی کھلی رہ جائے گی۔
شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲۱-۹۷) کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

(ش د د)

اَلشَّدُّ یہ شَدَدْتُ الشَّيْءَ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنی مضبوط گرہ لگانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَشَدَدْنَا اَسْرَهُمْ (۷۶-۲۸) اور ان کے مفاصل کو مضبوط بنایا۔
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴۷-۴) ان کو مضبوطی سے قید کر لو۔

اور شِدّۃٌ کا لفظ عہد، بدن، قوائے نفس اور عذاب سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:-
وَكَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۵-۴۴) وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے۔
عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵-۵۳) ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا۔
نہایت قوت والے سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔
غِلَاظٌ شِدَادٌ (۶-۶۶) تند خو اور سخت مزاج (فرشتے)
بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ (۵۹-۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔
اَلشَّدِيْدُ وَالْمُتَشَدِّدُ بخیل۔ قرآن میں ہے۔
وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰-۸) اور وہ تو مال کی سخت محبت والے ہیں۔
یہاں شَدِيْدٌ بمعنی مفعول بھی ہوسکتا ہے۔ گویا وہ خرچ کرنے سے باندھ دیا گیا ہے کہ اس معنی میں غلّ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ (۵-۶۴) یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے بندھا) ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شَدِيْدٌ بمعنی فاعل کے ہو تو گویا مُتَشَدِّدٌ وہ ہے جس نے ہتیلی کو بوجہ بخل کے مضبوطی سے باندھ رکھا ہو۔ اور آیت کریمہ:
حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (۴۶-۱۵) یہاں تک کہ جب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔
میں متنبہ کیا گیا ہے کہ جب انسان اس عمر یعنی چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے جس میں اس کے قویٰ مضبوط ہو جاتے ہیں تو اس کی عادات پختہ ہو جاتی ہیں اور وہ انہیں ترک نہیں کر سکتا۔ شاعر نے کیا ہی خوب استادہ کیا ہے[1] (الطویل)

(۲۵۴-۵۵) اِذَا الْمَرْءُ وَافَى الْاَرْبَعِيْنَ وَلَمْ يَكُنْ
لَهٗ دُوْنَ مَا يَهْوٰى حَيَاءٌ وَلَا سِتْرٌ
فَدَعْهُ وَلَا تَنْفِسْ عَلَيْهِ الَّذِيْ مَضٰى
وَاِنْ جَرَّ اَسْبَابَ الْحَيَاةِ لَهُ الْعُمْرُ

جب انسان چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور اسے اس کی خواہش سے حیا کا پردہ مانع نہ ہو تو اسے اس کی حالت پر چھوڑ دے اور گزشتہ پر کسی قسم کا دریغ نہ کر اگرچہ عمر اس کے لئے زندگی کے تمام اسباب کھینچ کر کیوں نہ لے آئے۔
شَدَّ فُلَانٌ وَاشْتَدَّ تیزی سے چلنا۔
ہوسکتا ہے کہ یہ شَدَّ حِزَامَهٗ لِلْعَدْوِ کے محاورہ سے مشتق ہو جس کے معنی دوڑنے کے لئے کمربستہ ہونے کے ہیں جیسا کہ اسی معنی میں اَلْقٰى ثِيَابَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اِشْتَدَّتِ الرِّيْحُ کے محاورہ سے ماخوذ ہو جس کے معنی زور کی ہوا چلنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:-
اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ (۱۴-۱۸) کہ اس پر زور کی ہوا چلے۔

---

[1] فی سبط ابیات نسبہا القالی ۷۷/۱-الی لا ہن بن خریم بن فاتک الاسدی قال البکری ۲۶۱ والصحیح انہا لاقیشر مغیرۃ بن اسود من بنی اسد بن خزیمۃ وفی الوحشیات ۲۷۰ منسوبۃ لاعرابی نزل بیحیی بن جبریل۔ یقال من لم یرد ہذہ الابیات ظاہر وعزۃ لہ انظر لتخریجہا السمط ۲۶۱ والشعراء ۴۷۵ (بتحقیق احمد شاکر) وفی روایۃ الوحشیات (الحماسۃ الصغری) وفی بدل واتی نیاتی بدل یہوی واتی بدل معنی والدہر بدل العمر والبیت فی الروح للآلوسی (۲۶-۱۷)

(ش ر ر)

اَلشَّرُّ وہ چیز ہے جس سے ہر ایک کراہت کرتا ہو۔ جیسا کہ خیر اسے کہتے ہیں جو ہر ایک کو مرغوب ہو۔ قرآن میں ہے:-
مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا (۱۹-۷۵) کہ مکان کس کا برا ہے۔
اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ (۸-۲۲)
کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے ...... ہیں۔
شر کا اصل معنی اور اس کے جملہ اقسام خیر کی بحث میں بیان ہو چکے ہیں۔
رَجُلٌ شَرِيْرٌ وَشِرِّيْرٌ شریر آدمی وَقَوْمٌ اَشْرَارٌ برے لوگ۔ اَشْرَرْتُهٗ کسی کی طرف شر کی نسبت کرنا بعض نے کہا ہے کہ اَشْرَرْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اور شاعر کے اس قول سے استدلال کیا ہے[1] (الطویل)

(۲۵۶) اِذَا قِيْلَ اَيُّ النَّاسِ شَرُّ قَبِيْلَةٍ
اَشَرَّتْ كُلَيْبٍ بِالْاَكُفِّ الْاَصَابِعُ

جب یہ پوچھا جائے کہ کونسا قبیلہ سب سے برا ہے تو ہاتھ انگلیوں سے بنی کلیب کی طرف اشارہ کر دیتے مگر اس شعر کے علاوہ اس معنی پر اگر اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہاں اَشَرَّتْ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ہاتھ انگلیوں سے ان کی طرف شر کی نسبت کر دیتے ہیں۔
اَلشَّرُّ (بضمتین) شرر یکروہ چیز شَرَارُ النَّارِ آگ کی چنگاری۔ آگ کی چنگاری کو شَرَارٌ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے بھی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے قرآن میں ہے۔
تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (۷۷-۳۲) اس سے آگ کی راتنی اتنی بڑی) چنگاریاں اڑتی ہیں جیسے محل۔

(ش ر ب)

اَلشُّرْبُ کے معنی پانی یا کسی اور مائع چیز کو نوش کرنے کے ہیں۔ قرآن نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:
وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (۷۶-۲۱) اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائیگا۔
اور اہل دوزخ کے متعلق فرمایا:-
لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ...... (۶-۷۰)
ان کے لئے پینے کو کھولتا ہوا پانی۔
شَرَابٌ کی جمع اَشْرِبَةٌ ہے اور شَرِبْتُهٗ شَرْبًا وَشُرْبًا کے معنی پینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:-
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ اِلٰى قَوْلِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ (۲-۲۴۹) جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے پی لیا۔ نیز فرمایا:-
فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ (۵۶-۵۵) اور پیو گے بھی تو ایسے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔
اَلشِّرْبُ پانی کا حصہ۔ پینے کی باری۔ قرآن میں ہے
هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۶-۱۵۵) یہ اونٹنی ہے (ایک دن) اس کی پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری۔
كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (۵۴-۲۸) ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیئے۔

---

[1] قالہ الفرزدق فی ہجو جریر ولفظہ کلیب بالجر علی حذف الجار وابقاء عملہ ویروی بالرفع علی التقدیر ہذہ کلیب وفی البیت حذف وقلب واصلہ: اشرت الاکف بالاصابع الی کلیب وفی روایۃ اشارت والبیت فی ابن عقیل رقم ۲۱۸ والخزانۃ (۳: ۶۴۹) ودیوانہ ۵۲۰ والمغنی ۳ فی المخطبۃ والسیوطی ۴ والعینی (۲: ۲۴۵) وکلیب ہی کلیب بن یربوع قبیلۃ جریر۔

اَلْمَشْرَبُ (مصدر) پانی پینا (ظرف زمان یا مکان) پانی پینے کی جگہ یا زمانہ۔ قرآن میں ہے:۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ (۲-۶۰) تمام لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کرکے پانی پی لیا۔

اَلشَّارِبُ ۔ م پیالہ یا شراب کو کہتے ہیں اور مونچھ کے بالوں اور حلق کی اندرونی رگ کو شَارِبٌ کہا جاتا ہے گویا ان کو پینے والا تصور کیا گیا ہے اس کی جمع شَوَارِبُ آتی ہے۔ ھُذلی نے گورخر کے متعلق کہا ہے[1] (الکامل)

(۲۵۷) "صَخِبُ الشَّوَارِبِ لَا يَزَالُ كَأَنَّهُ"

اس کی مونچھیں سخت گویا وہ ......

اور آیت کریمہ:۔

وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ (۲-۹۳) اور ان (کے کفر کے سبب) بچھڑا (گویا) ان کے دلوں میں رچ گیا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ أَشْرَبْتُ الْبَعِيرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے گلے میں رسی باندھنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (

(۲۵۸) وَأَشْرَبْتُهَا الْأَقْرَانَ حَتَّى وَقَصْتُهَا

بِقُرْحٍ وَقَدْ أَلْقَيْنَ كُلَّ جَنِينِ

میں نے انہیں باہم باندھ لیا حتی کہ قرح (منڈی) میں لا ڈالا اس حال میں کہ انہوں نے حمل گرادیئے تھے۔ تو آیت کے معنی یہ ہیں کہ گویا بچھڑا ان کے دلوں پر باندھ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی ہے کیونکہ عربی محاورہ میں جب کسی کی محبت یا بغض دل کے اندر سرایت کر جائے تو اس کے لئے لفظ شَرَابٌ کو بطور استعارہ بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ بدن میں نہایت تیزی سے سرایت کرتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (الوافر)

(۲۵۹) تَغَلْغَلَ حَيْثُ لَمْ يَبْلُغْ شَرَابٌ

وَلَا حُزْنٌ وَلَمْ يَبْلُغْ سُرُورُ

اس کی محبت وہاں تک پہنچ گئی جہاں کہ نہ شراب اور نہ ہی حزن و سرور پہنچ سکتا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر زیادہ نہیں تھی تو ہم کہیں گے کیوں نہیں؟ عجل کا لفظ بول کر ان کی فرط محبت پر تنبیہ کی ہے کہ بچھڑے کی صورت ان کے دلوں میں اس طرح نقش ہو گئی تھی کہ محو نہیں ہو سکتی تھی مثل مشہور ہے۔ أَشْرَبْتَنِي مَا لَمْ أَشْرَبْ یعنی تو نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔

(ش ر ح)

شَرَحْتُ اللَّحْمَ وَشَرَّحْتُهُ کے اصل معنی گوشت (وغیرہ) کے لمبے لمبے ٹکڑے کاٹ کر پھیلانے کے ہیں۔ اور اسی سے شرح صدر ہے یعنی نور الہی اور سکون و اطمینان کی وجہ سے سینے میں وسعت پیدا ہو جاتا۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] قاله ابو ذؤيب وتمامه: عبد لآل ابي ربيعة مسبع، والبيت في اللسان (سبع)، وقد مر [2] انشده في هذا المعنى ايضا ثعلب والبيت لبعض بني اسد من اللصوص انظر مجالس ثعلب ۱۱۱ واللسان (شرب) والبارع والمحكم (قرح) في اربعة ابيات مع خلاف في الترتيب والقرح اسم سوق وادي القرى وقصتها والعائذ والكلابي وقبله: لقد علمت ذه والكلابي انني نهين يا جوا الغلاة مهين والذود حاتم بماعة من الابل اذا كانت اناثا [3] قاله عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود احد الفقهاء السبعة في المدينة في زوجته عثمة وله فيها اشعار كثيرة والبيت في الحماسة مع المرزوقي قم ۵۰۵ ومجالس ثعلب ۴۸ والامالي للمرتضى (۱: ۲۱۷، ۴۰۰) والقالي (۲: ۲۱۹) في خمسة والاغاني (۹: ۹۳) والسمط ۷۸۱ والحماسة بالتبريزي (۳: ۱۶۷) والاصبهاني (۵: ۴۹) والحصري (۱: ۲۱۲) في ثلاثة اشعار مجموعة المعاني ۱۶۲ وعزاه في المحاضرات (۲: ۴۴) الى ابي عبد الله بن طاهر وقبله: فشققت القلب ثم ذررت فيه هواك فليم فالتام الفطور

دَرِبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (۲۰-۲۵) کہا اے پروردگار میرا سینہ کھول دے۔
اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (۹۴-۱) (اے محمدﷺ) ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا۔
اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ (۳۹-۲۲) بھلا جس کا سینہ خدا نے... کھول دیا ہو۔
شَرْحُ الْمُشْکِلِ مِنَ الْکَلَامِ کے معنی مشکل کلام کی تشریح کرنے اور اس کے مخفی معنی کو ظاہر کرنیکے ہیں۔

(ش ر د)

شَرَدَ الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ بدک کر بھاگ نکلا شَرَّدْتُ فُلَانًا فِی الْبِلَادِ میں نے شہروں میں بھگا دیا وَشَرَّدْتُ بِہٖ یعنی میں اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس جیسا کام نہ کریں جیسے نَکَّلْتُ بِہٖ کہ میں نے اسے دوسروں کے لئے عبرت بنا دیا۔ قرآن میں ہے:۔
فَشَرِّدْ بِہِمْ مَّنْ خَلْفَہُمْ (۸-۵۷) تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہوں وہ ان کو دیکھ کر بھاگ جائیں۔
مشہور محاورہ ہے۔
فُلَانٌ طَرِیْدٌ شَرِیْدٌ فلاں راندۂ درگاہ ہے۔

(ش ر ذ م)

اَلشِّرْذِمَۃُ۔ تھوڑی سی جماعت جو لوگوں سے الگ ہوگئی ہو۔ قرآن میں ہے:۔
شِرْذِمَۃٌ قَلِیْلُوْنَ (۲۶-۵۴) یہ لوگ تھوڑی سی جماعت ہیں۔
یہ ثَوْبٌ شَرَاذِمُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پھٹے پرانے چیتھڑوں کے ہیں۔

(ش ر ط)

اَلشَّرْطُ وہ معین حکم جس کا وقوع کسی دوسرے امر پر معلق ہو اسے شرط کہتے ہیں وہ دوسرا امر اس کے لئے بمنزلہ علامت کے ہوتا ہے اور شَرِیْطٌ بمعنی شرط آتا ہے اس کی جمع شرائط ہے۔ اِشْتَرَطْتُ کَذَا کوئی شرط لگانا۔ اور اسی سے شَرَطٌ بمعنی علامت ہے۔ اور اَشْرَاطُ السَّاعَۃِ کے معنی علامات قیامت کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَقَدْ جَاءَ اَشْرَاطُہَا (۴۷-۱۸) سو اس کی نشانیاں (وقوع میں) آچکی ہیں۔
اور پولیس کو شُرَط کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ بھی ایسی علامت لگا لیتے ہیں جس سے ان کی پہچان ہوسکتی ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اشراط الابل سے مشتق ہے جس کے معنی رذیل اونٹوں کے ہیں۔ اور پولیس میں بھی چونکہ (عام طور پر) رذیل لوگ ہوتے تھے اس لئے انہیں شُرَطٌ کہہ دیا گیا ہے۔
اَشْرَطَ نَفْسَہٗ لِلْہَلَکَۃِ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یا کسی کام میں ہلاکت کی بازی لگانا۔

(ش ر ع)

اَلشَّرْعُ سیدھا راستہ جو واضح ہو، یہ اصل میں

ف واشراط الساعۃ معنی العلامات اوالبینات ثم الاشراط بمعنی العلامات علی نوعین مضیقۃ وھی التی لم تبق الدنیا بعدھا وتوعبا الاالیسر لیسیرکنزول المھدی وظھور الرجال وخروج الدابۃ وطلوع الشمس من مغربھا وغیرذالک وغیرمضیقۃ وھی اکثراشراط المذکورالمعروالفت فیھا کتب مختصرۃ ومطولۃ السیوطی رسالۃ سماھا الکشف عن مجاوزۃ ہذہ الامۃ الالف وبحورالزاخرۃ فی علوم الآخرۃ للسفارینی

شَرَعْتُ لَهٗ طَرِیْقًا (واضح راستہ مقرر کرنا) کا مصدر ہے اور بطور اسم کے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ واضح راستہ کو شَرْعٌ وَشِرْعٌ وَشَرِیْعَۃٌ کہا جاتا ہے۔ پھر استعارہ کے طور پر طریق الہیہ پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں قرآن میں ہے:۔

شِرْعَۃً وَّمِنْہَاجًا (۵-۴۸) ایک دستور اور طریق۔ اس میں دو قسم راستوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک وہ راستہ جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مسخر کر رکھا ہے کہ انسان اسی راستہ پر چلتا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور شہروں کی آبادی سے ہے چنانچہ آیت:۔

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳-۳۲) اور ہر ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔

میں اسی طرف اشارہ ہے دوسرا راستہ دین کا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے مقرر فرما کر انہیں حکم دیا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس پر چلے جس کے بیان میں شرائع کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں نسخ ہوتا رہا ہے اور جس پر کہ آیت:۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا (۴۵-۱۸) پھر ہم نے تمہیں دین کے کھلے راستہ پر (قائم) کر دیا تو اسی (راستے) پر چلے چلو۔ دلالت کرتا ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ شِرْعَۃً وہ راستہ ہے جسے قرآن نے بیان کر دیا ہے۔ اور مِنْہَاج وہ ہے جسے سنت نے بیان کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ (۴۲-۱۳) اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔

میں دین کے ان اصول کی طرف اشارہ ہے جو تمام ملل میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور ان میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ جیسے معرفت الہٰی اور وہ امور جن کا بیان آیت وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (۴-۱۳۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اس کے پیغمبروں سے انکار کرے۔ میں پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شریعت کا لفظ شَرِيْعَةُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی پانی کے گھاٹ کے ہیں اور شریعت کو شریعت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی صحیح حقیقت پر مطلع ہونے سے سیرابی اور طہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ سیرابی سے مراد معرفت الہٰی کا حصول ہے جیسا کہ بعض حکماء کا قول ہے کہ میں پیتا رہا لیکن سیر نہ ہوا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو گئی تو بغیر پینے کے سیری حاصل ہو گئی اور طہارت سے مراد وہ طہارت ہے جس کا ذکر کہ آیت:۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (۳۳-۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کی میل کچیل صاف کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا (۷-۱۶۳) (یعنی) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں۔

میں شُرَّعًا، شَارِعٌ کی جمع ہے۔ اور شَارِعَۃُ الطَّرِیْقِ کی جمع شَوَارِعُ آتی ہے جس کے معنی کھلی سڑک کے ہیں۔

اَشْرَعْتُ الرُّمْحَ قِبَلَہٗ میں نے اس کی جانب نیزہ سیدھا کیا۔ بعض نے شَرَعْتُہٗ فَہُوَ مَشْرُوْعٌ

کہا ہے اور شَرَعَتِ السَّفِيْنَةُ کے معنی جہاز پر
بادبان کھڑا کرنے کے ہیں جو اسے آگے چلاتے ہیں۔
هُمْ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ شَرَعٌ۔ یعنی وہ سب اس میں
برابر ہیں۔ یعنی انہوں نے اسے ایک ہی وقت میں
شروع کیا ہے اور شَرْعُكَ مِنْ رَجُلٍ زَيْدٌ یعنی
حَسْبُكَ ہے یعنی زید ہی اس قابل ہے کہ تم اس کا قصد
کرو یا اس کے ساتھ مل کر اپنا کام شروع کرو۔
اَلشِّرَعُ۔ بربط کے وہ تار جن سے راگ شروع کیا جاتا ہے۔

(ش ر ق)

شَرَقَتِ (ن) شُرُوْقًا۔ الشَّمْسُ آفتاب طلوع
ہوا۔ مثل مشہور ہے (مثل)
لَا اَفْعَلُ ذٰلِكَ مَاذَرَّ شَارِقٌ وَاَشْرَقَتْ جب
تک آفتاب طلوع ہوتا رہیگا میں یہ کام نہیں کروں گا۔
یعنی کبھی بھی نہیں کروں گا۔ قرآن میں ہے:۔
بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ (۳۸-۱۸) صبح و شام
یہاں اشراق سے مراد وقت اشراق ہے۔
اَلْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ جب مفرد ہوں تو ان سے شرقی
اور غربی جہت مراد ہوتی ہے اور جب تثنیہ ہوں تو
موسم سرما اور گرما کے دو مشرق اور دو مغرب مراد
ہوتے ہیں اور جمع کا صیغہ ہو تو ہر روز کا مشرق اور
مغرب مراد ہوتا ہے یا ہر موسم کا قرآن میں ہے۔
رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (۷۳-۹) وہی مشرق اور
مغرب کا مالک (ہے)
رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (۵۵-۱۷) وہی
دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک ہے۔
وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۳۷-۵) اور مشرقوں کا رب ہے۔
مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۹-۱۶) مشرق کی طرف (چلی گئی)۔
اَلْمُشَرَّقَةُ جاڑے کے زمانہ میں دھوپ میں بیٹھنے
کی جگہ جہاں سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی دھوپ
پڑتی ہو۔ شَرَّقْتُ اللَّحْمَ گوشت کے ٹکڑے کر
کے دھوپ میں خشک کرنا۔ اَلْمُشَرَّقُ عیدگاہ کو
کہتے ہیں کیونکہ وہاں طلوع شمس کے بعد نماز ادا کی
جاتی ہے۔ شَرِقَتِ الشَّمْسُ آفتاب کا غروب کے
وقت زردی مائل ہونا اسی سے اَحْمَرُ شَارِقٌ کا
محاورہ ہے جس کے معنی نہایت سرخ کے ہیں۔
اَشْرَقَ الثَّوْبَ کپڑے کو خالص گہرے رنگ
کے ساتھ رنگنا۔
لَحْمٌ شَرَقٌ سرخ گوشت جس میں بالکل چربی نہ ہو۔

(ش ر ك)

اَلشِّرْكَةُ وَالْمُشَارَكَةُ کے معنی دو ملکیتوں
کو باہم ملا دینے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک
چیز میں دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے شریک ہونے
کے ہیں۔ خواہ وہ چیز مادی ہو یا معنوی مثلاً انسان اور
فرس کا حیوانیت میں شریک ہونا یا دو گھوڑوں کا
سرخ یا سیاہ رنگ کا ہونا اور شَرِكْتُهُ وَشَارَكْتُهُ
وَتَشَارَكُوْا اور اِشْتَرَكُوْا کے معنی باہم شریک
ہونے کے ہیں اور اَشْرَكْتُهُ فِيْ كَذَا کے معنی
شریک بنا لینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَشْرِكْهُ فِيْ اَمْرِيْ (۲۰-۳۲) اور اسے میرے
کام میں شریک کر۔ اور حدیث میں ہے (۱۹۱)
اَللّٰهُمَّ اَشْرِكْنَا فِيْ دُعَاءِ الصّٰلِحِيْنَ اے اللہ
ہمیں نیک لوگوں کی دعا میں شریک کر۔
ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ
السلام کو فرمایا۔ (۱۹۲)
اِنِّيْ شَرَّفْتُكَ وَفَضَّلْتُكَ عَلٰى جَمِيْعِ خَلْقِيْ
وَاَشْرَكْتُكَ فِيْ اَمْرِيْ۔ کہ میں نے تمہیں تمام

مخلوق پر شرف بخشا اور تجھے اپنے کام میں شریک کرلیا یعنی میرے ذکر کے ساتھ تمہارا ذکر ہوتا رہے گا اور میں نے اپنی طاعت کے ساتھ تمہاری طاعت کا بھی حکم دیا ہے جیسے فرمایا۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (۵-۹۲) اور خدا کی فرمانبرداری اور رسول خدا کی اطاعت کرتے رہو۔

قرآن میں ہے:۔

وَفِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ (۳۷-۳۳) (اس دن) عذاب میں شریک ہوں گے۔

شَرِیْکٌ۔ ساجھی۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ (۱۷-۱۱۱) اور نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے۔

اس کی جمع شُرَکَاءُ ہے جیسے فرمایا:۔

شُرَکَاءُ مُتَشَاکِسُوْنَ (۳۹-۲۹) جس میں کئی آدمی شریک ہیں۔ (مختلف المزاج اور بدخو۔

شُرَکَاءُ شَرَعُوْا لَہُمْ (۴۲-۲۱) کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے اِن کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے۔

اَیْنَ شُرَکَاءِیَ (۴۱-۴۷) میرے شریک کہاں ہیں۔

دین میں شرک دو قسم پر ہے۔ شرک عظیم یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا اور اَشْرَکَ فُلَانٌ بِاللّٰہِ کے معنی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے ہیں اور یہ سب سے بڑا کفر ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ ... (۴-۱۱۶) خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔ اور فرمایا:۔

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۴-۱۱۵) اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ رستے سے دور جا پڑا۔

اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ ... (۵-۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شریک کریگا خدا اس پر بہشت کو حرام کر دیگا۔

یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا (۶۰-۱۲) اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ شرک کریں گی۔

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا۔ لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا (۶-۱۴۹) جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔

دوم شرک صغیر کہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرنا اسی کا دوسرا نام ریا اور نفاق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰہُمَا ج فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ (۷-۱۹۰) تو اس (بچے) میں جو وہ ان کو دیتا ہے اس کا شریک مقرر کرتے ہیں جو وہ شرک کرتے ہیں۔ خدا کا (رتبہ) اس سے بلند ہے۔

وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُہُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَہُمْ مُّشْرِکُوْنَ۔ (۱۲-۱۰۶) اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔

بعض نے اِلَّا وَہُمْ مُّشْرِکُوْنَ کے معنی یہ کئے ہیں کہ مگر وہ شَرَکٌ یعنی دنیا کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور اسی سے علیہ السلام نے فرمایا[1] (۱۹۳) اَلشِّرْکُ فِیْ ہٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ ... یعنی اس امت میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہوگا پس لفظ شِرْکٌ الفاظ مشترکہ

[1] اللسان والضہایۃ (شرک)، والحکیم عن ابن عباس معاشتۃ وعن ابی بکر وحل عن ابی عباس وفی جمیع الروایات فی امتی بدل ہذہ الامۃ وفی روایۃ الذر بدل النمل وفی تخریج العراقی (۳: ۳۰۶) اتقوا ہذا الشرک فانہ اخفی من دبیب النمل رواہ ابن حبان فی الضعفاء من حدیث ابی بکر الصدیق والطبرانی من حدیث ابی موسی الاشعری ونزہۃ المجالس للصفوری ص ۲، راجع کنز العمال ج ۳ رقم ۴۷ ۲۳، ۲۳۴۴-۲۳۷۷، ۹۶ ۲۳

ہے ہے اور آیت کریمہ :۔
وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا (۱۸-۱۱۰) پروردگار
کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔
میں دونوں قسم کا شرک مراد ہے اور آیت کریمہ :۔
اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (۹-۵) مشرکوں کو ۔۔۔ قتل کر دو۔
میں اکثر فقہاء نے تمام کفار مراد لئے ہیں۔ کیونکہ یہود
بھی (اہل کتاب تھے) عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے
جیساکہ قرآن میں ہے :۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ بْنُ اللّٰهِ (۹-۳۰) یہود
کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں ۔
اور بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کے علاوہ دوسرے
کفار مراد ہیں کیونکہ آیت :۔
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِيْنَ
وَالنَّصَارٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (۲۲-۱۷)
جو لوگ مومن (یعنی مسلمان) ہیں اور جو یہودی ہیں اور
ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک۔
میں مشرکین کو یہود و نصاریٰ سے الگ عطف کے
ساتھ بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل
کتاب مشرکین سے خارج ہیں۔

(ش ر ی)

شراءٌ اور بیع دونوں لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ
مُشْتَرِی کے معنی قیمت دے کر اس کے بدلے
میں کوئی چیز لینے والے کے ہیں۔ اور بائع اسے کہتے
ہیں جو چیز دے کر قیمت لے اور یہ اس وقت کہا
جاتا ہے جب ایک طرف سے نقدی اور دوسری
طرف سے سامان ہو۔ لیکن جب خرید و فروخت
جنس کے عوض جنس ہو۔ تو دونوں میں سے ہر ایک
کو بائع اور مشتری تصور کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ
بیع اور شراء کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ
استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر شَرَيْتُ بمعنی
بِعْتُ اور اِبْتَعْتُ بمعنی اِشْتَرَيْتُ آتا ہے قرآن
میں ہے :۔
وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (۱۲-۲۰) اور اس کو تھوڑی
سی قیمت پر بیچ ڈالا۔
يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (۴-۷۴) جو لوگ
آخرت (کو خریدتے اور اس) کے بدلے دنیا کی زندگی
کو بیچنا چاہتے ہیں۔
پھر شِرَاءٌ اور اِشْتِرَاءٌ کا لفظ ہر اس چیز کے
متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے عوض میں دوسری
چیز لی جائے۔ چنانچہ فرمایا :۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ (۳-۷۷)
جو لوگ خدا کے اقراروں کو بیچ کر اس کے عوض
تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔
لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (۳-۱۹۹) وہ خدا
کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔
اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (۲-۸۶)
جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔
اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ (۲-۱۶) جنہوں نے گمراہی خریدی۔
اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۹-۱۱۱) خدا
نے مومنوں سے ۔۔۔۔ خرید لئے ہیں۔
اور جس چیز کے بدلے اللہ تعالیٰ نے ان کی جانیں
خرید کی ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :۔
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ (یعنی خدا
کی راہ میں لڑتے اور شہید ہوتے ہیں) اور خوارج
اپنے آپ کو شُرَاةٌ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔
اور آیت :۔
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ

اللّٰہِ (۲-۲۰۷) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہو۔ سے استدلال کرتے تھے کہ یہاں یَشْرِیْ بمعنی یَبِیْعُ ہے۔ جیساکہ آیت اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی الآیۃ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ش ط ط)

اَلشَّطَطُ۔ کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے کے ہیں جیسے شَطَّتِ الدَّارُ وَاَشَطَّ (گھر کا دور ہونا) اور یہ کسی مقام یا حکم یا نرخ میں حد مقررہ سے تجاوز کرنے پر بولا جاتا ہے۔
شاعر نے کہا ہے[1] ع (البسیط)
(۲۶۰) شَطَّ الْمَزَارُ بِجَدْوٰی وَانْتَہَی الْاَمَلُ
یعنی جدوی (محبوبہ) کی زیارت مشکل ہوگئی اور ہر قسم کی امیدیں منقطع ہوگئیں۔
اور کبھی شَطَطٌ بمعنی جَوْرٌ بھی آجاتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا۔ (۱۸-۱۴) تو ہم نے بعید از عقل بات کہی۔
شَطُّ النَّھْرِ۔ دریا کا کنارا (جہاں سے پانی دور ہو۔

(ش ط ر)

شَطْرُ الشَّیْئِ کے اصل معنی نصف یا وسط شئے کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲-۱۴۴) اور اپنا منہ مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کیطرف پھیر لو۔ یہاں شطر بمعنی سمت ہے۔ جیسے فرمایا:۔ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ (۲-۱۴۴) (نماز کے وقت) اس مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو۔
شَاطَرْتُہٗ شِطَارًا آدھا آدھا تقسیم کر لینا۔
شَطَرَ بَصَرَہٗ اس طرح دیکھنا کہ تمہاری طرف بھی نظر رہے اور دوسرے کی طرف بھی۔
حَلَبَ فُلَانٌ الدَّھْرَ اَشْطُرَہٗ اس نے زمانہ کے خیروشر کو پہچان لیا۔ اصل میں یہ لفظ اونٹنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ جب کوئی شخص اونٹنی کے اگلی طرف کے دو تھنوں سے دودھ نکال لے اور پچھلی طرف کے چھوڑ دے تو اس کے متعلق حَلَبَ اَشْطُرَہٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور شَطُوْرٌ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس کے ایک جانب کے تھن خشک ہوگئے ہوں اور شَطُوْرٌ اس بکری کو بھی کہا جاتا ہے جس کا ایک تھن دوسرے سے لمبا ہو۔
شَطَرَ کے معنی ایک جانب ہو جانے کے ہیں۔ اور شَاطِرٌ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو دور رہتا ہو اس کی جمع شُطُرٌ آتی ہے۔
شاعر نے کہا ہے[2] ع (المتقارب)
(۲۶۱) اَشَاقَکَ بَیْنَ الْخَلِیْطِ الشُّطُرُ

---

[1] وتمامہ: فلا خیالٌ ولا عہدٌ ولا طللٌ۔ وبعدہٗ: الارجاء فما ندری اُندرکہٗ۔ ام یستمر فیاتی دونہ الاجل والبیت من قصیدۃ لابن احمر مدح بہا النعمان بن بشیر بن سعد الانصاری وھو اول لد فی الاسلام من الانصار وآخر من ولی الکوفۃ لمعاویۃ بن ابی سفیان قتلتہ بنوکلب فی فتنۃ مروان وکان عثمانیا وابوہ بشیر بن سعد عقبی بدری والشطانی الذیل ۸ والبیت فی التاج (شط) واللسان (جدا) والالفاظ ۳۳۹ والسمط (۳: ۷) وجدوی اسم امرءۃ۔ [2] وتمامہ: وفیمن اقام من الحی ھِر البیت لامرئ القیس رواہ فی اللسان (شطر) وفی روایۃ اشاقک وفی روایۃ الدیوان (صنعۃ السندوبی) ۵۷ وفیمن اقام من الحی ھر ام النطاعنون بہا فی اشطر وانہ البیت مع آخر قد تقدم علیہ فی رسائل البلغاء ۳۳۲-۳۳۳ وفیہ شاقذ بدل شاقک۔

دوستوں میں تجھے رہنے والوں نے اپنا مشتاق بنا لیا ہے۔
اور شاطر بعید عن الحق کو بھی کہتے ہیں۔ اور اس کی جمع شُطَّارٌ آتی ہے۔

(ش ط ن)

اَلشَّیْطَانُ اس میں نون اصلی ہے اور یہ شَطَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں[1] اور بِئْرٌ شَطُوْنٌ (بہت گہرا کنواں)۔
شَطَنَتِ الدَّارُ۔ گھر کا دور ہونا غَرْبَۃٌ شَطُوْنٌ (وطن سے دوری) وغیرہ محاورات اسی سے مشتق ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ لفظ شَیْطَانٌ میں نون زائدہ ہے اور یہ شَاطَ یَشِیْطُ سے مشتق ہے جس کے معنی غصہ سے سوختہ ہو جانے کے ہیں۔ اور شیطان کو بھی شیطان اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے جیسا کہ آیت:۔
خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵-۱۵) اور جنات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا۔
سے معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں قوت غضبیہ اور حمیت مذمومہ افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے اس بنا پر اس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
ابو عبیدہ نے کہا ہے[2] کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ وہ جن وانس سے ہو یا دیگر حیوانات سے۔ قرآن میں ہے:۔
شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (۶-۱۱۲) شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو۔

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ (۶-۱۲۱) اور شیطان (لوگ)۔۔۔۔ دلوں میں (یہ بات) ڈالتے ہیں۔
وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ (۲-۱۴) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔
یعنی جب جنوں اور انسانوں میں سے اپنے اصحاب کے پاس جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
کَاَنَّہٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ (۳۷-۶۵) جیسے شیطانوں کے سر۔
میں بعض نے کہا ہے کہ شیاطین سے باریک جسم کے سانپ مراد ہیں اور بعض نے سرکش جن مراد لئے ہیں اور زناگ یعنی تھوہر کے پتوں کو، بدنما ہونے کی وجہ سے بطور تشبیہ رؤس الشیاطین کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ (۲-۱۰۲) اور ان (یہودیوں) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمانؑ کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔
میں شیاطین سے سرکش جن مراد ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرکش انسان بھی مراد ہوں شاعر نے کہا ہے[3]

(۲۶۲) لَوْ اَنَّ شَیْطَانَ الذِّئَابِ الْعُسَّلِ
اگر سرکش تیز رو بھیڑیا۔

یہاں عُسَّلٌ۔ عَاسِلٌ کی جمع ہے اور عَاسِلٌ کے معنی نہایت سرعت کے ساتھ دوڑنے والے کے ہیں اور عَسَلَانٌ کا لفظ بھیڑیئے کی تیزروی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے[4] (الرجز)

(۲۶۳) مَا لَیْلَۃُ الْفَقِیْرِ اِلَّا شَیْطَانٌ

---

[1] راجع مجاز القرآن (۱: ۲۱۳) والاشتقاق (شطن)، وفیہا کل عات متمرد ومکان کل عارم [2] فعلی ہذا یکون وزنہ فیعالا وان کانت نونہ زائدۃ فوزنہ فعلان من شاط واعراب ثلاثین لابن خالویہ (۲-۸)، [3] لم اجدہ [4] ونمامہ مجنونۃ تودی بروح الانسان والبیت فی اللسان (فقر) بغیر عزو وفی البلدان (فقر) وعجزہ: مجنونۃ تودی تریح الانسان وسیاتی فی (فقر)

کہ مقام نفیر میں لات شیطان کی طرح بھیانک ہوتی ہو۔ اور انسان کی ہر بری خصلت کو شیطان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ علیہ السلام نے فرمایا ہے[1]۔ اَلْحَسَدُ شَیْطَانٌ وَالْغَضَبُ شَیْطَانٌ کہ حسد بھی شیطان ہے اور غصہ بھی شیطان ہے۔

(ش ط ء)

شَاطِئُ الْوَادِیْ کے معنی وادی کے کنارہ کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (۲۸-۳۰) تو میدان کے دائیں کنارے سے آواز آئی۔

شَاطَاتُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں اس کے ساتھ ساتھ وادی کے کنارے پر چلا۔

شَطْأُ الزَّرْعِ کھیتی کی سوئی جو زمین سے نکل کر دونوں جانب پھیل جاتی ہے ج اَشْطَاءٌ قرآن میں ہے۔

کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ (۴۸-۲۹) گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی۔

ایک قرأت میں شَطَأَهٗ ہے جیسے شَمْعٌ وَشَمَعٌ وَنَهْرٌ وَنَهَرٌ وغیر ذالک۔

(ش ع ب)

اَلشَّعْبُ اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو ایک قوم سے پھیلا ہو۔ اس کی جمع شُعُوْبٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ (۴۹-۱۳) قومیں اور قبیلے (بنائے)

اَلشِّعْبُ مِنَ الْوَادِیْ۔ وادی کا وہ مقام جہاں اس کا کنارہ ملتا اور دوسرا جدا ہوتا ہو جب تم اس جگہ کو دیکھو جہاں اس کا کنارہ جدا ہو رہا ہے تو ایسا معلوم ہو کہ ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا اس سے ملتا ہے تو ایسا محسوس ہو کہ دونوں سرے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شَعْبٌ کے معنی جمع کرنا اور متفرق کرنا دونوں آتے ہیں اور شُعَیْبٌ یا تو شَعْبٌ کی تصغیر ہے جو مصدر یا اسم ہے اور یا شِعْبٌ کی۔

اَلشَّعِیْبُ پرانی مشک جو مرمت اور درست کی گئی ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۷۷-۳۰) (اس سائے کی طرف چلو) جس کی تین شاخیں ہیں۔ کی تشریح اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔

(ش ع ر)

اَلشَّعْرُ بال اس کی جمع اَشْعَارٌ آتی ہے قرآن میں ہے۔

وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا (۱۶-۸۰) اون اور پشم اور بالوں سے۔

شَعَرْتُ کے معنی بالوں پر مارنے کے ہیں۔ اور اسی سے شَعَرْتُ کَذَا مستعار ہے جس کے معنی بال کی طرح باریک علم حاصل کر لینے کے ہیں اور شاعر کو بھی اس کی فطانت اور لطافت نظر کی وجہ سے ہی شاعر کہا جاتا ہے تو لَیْتَ شِعْرِیْ کَذَا کے محاورہ میں شعر اصل میں علم لطیف کا نام ہے پھر عرف میں موزوں اور مقفی کلام کو شعر کہا جانے لگا ہے اور شعر کہنے والے کو شاعر کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (۲۱-۵) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے نہیں بلکہ یہ شعر

---

[1] لم اجدہ ۱۲

ہے جواس (شاعر) کا نتیجہ طبع ہے۔

نیز آیت کریمہ:۔

لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷-۳۶) ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے۔

اور آیت: شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ (۵۲-۳۰) شاعر ہے اور ہم اس کے حق میں ... انتظار کر رہے ہیں بہت سے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت پر شعر بمعنی منظوم اور مقفّٰی کلام بنانے کی تہمت لگائی تھی۔ حتیٰ کہ وہ قرآن میں ہر اس آیت کی تاویل کرنے لگے جس میں وزن پایا جاتا ہے جیسے وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اور تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔

لیکن بعض حقیقت شناس لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے ان کا مقصد منظوم اور مقفّٰی کلام بنانے کی تہمت لگانا نہیں تھا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن اسلوب شعری سے مبرا ہے اور اس حقیقت کو عوام عجمی بھی سمجھ سکتے ہیں پھر فصحاء عرب کا کیا ذکر ہے۔ بلکہ وہ آپ پر (نعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنی کذب اور اور شاعر بمعنی کاذب استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جھوٹے دلائل کو اَدِلَّةٌ شِعْرِيَّةٌ کہا جاتا ہے اسی لئے قرآن نے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ (۲۶-۲۲۴) الآیۃ اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

اور شعر چونکہ جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے۔ اس لئے مقولہ مشہور ہے کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَكْذَبُهٗ سب سے بہتر شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہو اور کسی حکیم نے کہا ہے کہ میں نے کوئی متدین اور راست گو انسان ایسا نہیں دیکھا جو شعر گوئی میں ماہر ہو۔

اَلْمَشَاعِرُ حواس کو کہتے ہیں لہذا آیت کریمہ:۔

وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۴۹-۲) اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم حواس سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اور اکثر مقامات میں جہاں لَا يَشْعُرُوْنَ کا صیغہ آیا ہے اس کی بجائے۔ لَا يَعْقِلُوْنَ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محسوس تو نہیں ہو سکتی لیکن عقل سے ان کا ادراک ہو سکتا ہے اور مَشَاعِرُ الْحَجِّ کے معنی رسوم حج ادا کرنے کی جگہ کے ہیں اس کا واحد مَشْعَرٌ ہے اور انہیں شَعَائِرُ الْحَجِّ بھی کہا جاتا ہے اس کا واحد شَعِيْرَةٌ ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ (۲۲-۳۲) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ (۲-۱۹۸) مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں۔

اور آیت کریمہ:۔

لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ (۵-۲) خدا کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا۔

میں شَعَآئِرَ اللّٰهِ سے مراد قربانی کے وہ جانور ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ اور قربانی کو شَعِيْرَةٌ اس لئے کہا گیا ہے۔ کہ شَعِيْرَةٌ (یعنی تیز لوہے) سے اس کا خون بہا کر اس پر نشان لگا دیا جاتا تھا۔

اَلشِّعَارُ وہ لباس جو انسان کے جسم کے ساتھ ملا رہتا ہے نیز لڑائی میں فوجی اشارہ کو بھی شِعَار کہا جاتا ہے۔

اَشْعَرَهُ الْحُبُّ محبت اس کا لباس بن گئی۔

اَلْاَشْعَرُ لمبے بالوں والا آدمی یا وہ گھوڑا جس کے کھر کے اردگرد گھنے بال ہوں اور سخت مصیبت کو کہا

جاتا ہے۔ اور شُعَرَاءُ کنپٹی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت اس کے بالوں پر پسینہ سے بھیگی رہتی ہے۔

اَلشَّعِیْرُ جو کا دانہ۔ اَلشِّعْرٰی ایک ستارے کا نام ہے جو سخت گرمی کے زمانہ میں طلوع ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

ھُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (۵۳-۴۹) اور وہی شعریٰ کا مالک ہے میں شعریٰ کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ وہ ایک قوم کا معبود تھا۔

(ش ع ف)

آیت کریمہ: قَدْ شَغَفَھَا حُبًّا (۱۲-۳۰) میں ایک قرأت قَدْ شَعَفَھَا یعنی عین مہملہ کے ساتھ ہے جو کہ شَعَفَۃُ الْقَلْبِ سے مشتق ہے اور شَعَفَۃُ الْقَلْبِ دل کے اس سرے کو کہتے ہیں جو خون کے ساتھ لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اور شَعَفَۃُ الْجَبَلِ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:

فُلَانٌ مَشْعُوْفٌ بِکَذَا فلاں اس پر فریفتہ ہے گویا محبت اسکے شعفہ قلب تک پہنچ گئی ہے۔

(ش ع ل)

اَلشَّعَلُ۔ آگ کا بھڑکنا یا بھڑکانا کہا جاتا ہے شُعْلَۃٌ مِّنَ النَّارِ آگ کا شعلہ اور قَدْ اَشْعَلْتُھَا کے معنی ہیں میں نے آگ بھڑکائی۔

ابو زید کے نزدیک شَعَلْتُھَا (فعل مجرد) کہنا بھی جائز ہے۔ اَلشَّعِیْلَۃُ جلتی ہوئی بتی۔ بعض نے سفیدی کے چمکنے کے لئے بھی بَیَاضٌ یَشْتَعِلُ کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا (۱۹-۴) اور سر بڑھاپے کی وجہ سے شعلہ مارنے لگا ہے۔

یہاں رنگت کے لحاظ سے بالوں کی سفیدی کو آگ کے ساتھ تشبیہ دے کر اشتعال کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اِشْتَعَلَ فُلَانٌ غَضَبًا فلاں غصہ سے بھڑک اٹھا یہاں غصہ کو حرکت کے لحاظ سے آگ کے بھڑکنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اسی سے اَشْعَلْتُ الْخَیْلَ فِی الْغَارَۃِ کا محاورہ ہے۔ یعنی میں نے غارت گری کے لئے سواروں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ جیسا کہ اَوْقَدْتُھَا وَھَیَّجْتُھَا وَاَضْرَمْتُھَا کے محاورات ہیں۔

(ش غ ف)

اَلشَّغَافُ۔ دل کا اندرونی حصہ قرآن میں ہے۔ قَدْ شَغَفَھَا حُبًّا (۱۲-۳۰) اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔

حسن نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ یوسف کی محبت اس کے شغاف یعنی باطن قلب تک جا پہنچ گئی۔ اور ابو علی نے وسط قلب کے معنی بیان کئے ہیں اور یہ دونوں معنی مآل کے لحاظ سے تقریباً ایک ہی رہیں۔

(ش غ ل)

اَلشُّغُلُ وَالشَّغْلُ۔ ایسی مصروفیت جس کی وجہ سے انسان دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ دے سکے قرآن میں ہے۔

فِیْ شُغُلٍ فٰکِھُوْنَ (۳۶-۵۵) عیش و نشاط کے

له و فی مجاز ابو عبیدة ولقرءة قوم (قد شعفها) وهو من المشعوف قال فی الطبری (۱۲-۱۱۰۲) قرء بالمهملة ابو رجاء والاعرج وعوف وزرت عن علی والجمهور بالمعجمة (راجع الفتح ۸/۲۷۲)

مشغلے میں ہوں گے۔
ایک قرأت میں شُغُلٍ ہے یہ شُغِلَ فَھُوَ مَشْغُوْلٌ (باب مجرد) سے آتا ہے اور اَشْغَلَ استعمال نہیں ہوتا شُغُلٌ شَاغِلٌ مصروف رکھنے والا کام۔

(ش ف ع)

اَلشَّفْعُ کے معنی کسی چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے کے ہیں اور جفت چیز کو شَفْعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹-۳) اور جفت اور طاق کی۔
بعض نے کہا ہے کہ شَفْعٌ سے مراد مخلوق ہے کیونکہ وہ جفت بنائی گئی ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (۵۱-۴۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں۔
اور وتر سے ذات باری تعالیٰ مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے یگانہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شفع سے مراد یَوْمَ النَّحْرِ ہے کیونکہ اس کے بعد دوسرا دن اس کی مثل ہوتا ہے اور وتر سے مراد یوم عرفہ ہے[1] اور بعض نے کہا ہے کہ شفع سے اولادِ آدم اور وتر سے آدم علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ وہ بن باپ کے پیدا کئے گئے تھے[2]۔
اَلشَّفَاعَةُ کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا سفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں۔ عام طور پر کسی بڑے باعزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اس کی مدد کے لئے شامل ہو جانے پر بولا جاتا ہے اور قیامت کے روز شفاعت بھی اسی قبیل سے ہوگی[3]۔ قرآن میں ہے:۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹-۸۷) (تو لوگ) کسی کی سفارش کا اختیار رکھیں گے مگر جس نے خدا سے اقرار لیا ہو۔
لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ (۲۰-۱۰۹) اس روز کسی کی سفارش فائدہ نہ دے گی۔ مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے۔
لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا (۵۳-۲۶) جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی۔
وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (۲۱-۲۸) وہ اس کے پاس کسی کی سفارش نہیں کر سکتے مگر اس شخص کی جس سے خدا خوش ہو۔
فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (۷۴-۴۸) (اس حال میں) سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے حق میں کچھ فائدہ نہ دے گی۔
یعنی جن معبودوں کو یہ اللہ کے سوا سفارش کیلئے پکارتے ہیں وہ ان کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔
مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰-۱۸) کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات قبول کی جائے۔
وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴-۸۵) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔
یعنی جو شخص اچھے یا برے کام میں کسی کی مدد اور سفارش کرے گا وہ بھی اس فعل کے نفع ونقصان

---

[1] قول ابن عباس وعکرمۃ والضحاک [2] مجاہد والحسن وفی تفسیر الآیۃ اقوال اخریٰ (الطبری ۳۰ر۱۷۰-۱۷۲) [3] انکر الشفاعۃ المعتزلۃ وقالوا خلاف العدل وانکروا الاحادیث الواردۃ فی اثباتہ وہی اول فرقۃ انکر الحدیث (راجع کتب الاصول)

میں اس کا شریک ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شفاعت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے لئے کسی اچھے یا برے مسلک کی بنیاد رکھے اور وہ اس کی اقتداء کرے تو وہ ایک طرح سے اس کا شفیع بن جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے[1] (۱۹۵)

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا کہ جس شخص نے اچھی رسم جاری کی اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اسے اجر ملے گا اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا گناہ ہوگا۔ اور جو اس پر عمل کرے گا اس کے گناہ میں بھی وہ شریک ہوگا۔ اور آیت کریمہ۔

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ (۱۰-۳)

کوئی (اس کے پاس) اس کا اذن لئے بغیر کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ اکیلا ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور نظام کائنات کے چلانے میں کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ ہاں جب وہ امور کی تدبیر و تقسیم کرنے والے فرشتوں کو اجازت دیتا ہے تو وہ اس کی اجازت سے تدبیر امر کرتے ہیں۔

اِسْتَشْفَعْتُ بِفُلَانٍ عَلَى فُلَانٍ فَتَشَفَّعَ لِي میں نے فلاں سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد کی۔

شَفَّعَهُ۔ کے معنی کسی کی سفارش قبول کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے علیہ السلام کا فرمان ہے[2] (۱۹۶) اَلْقُرْآنُ شَافِعٌ وَمُشَفَّعٌ کہ قرآن شافع اور مشفع ہوگا یعنی قرآن کی سفارش قبول کی جائے گی۔

اَلشُّفْعَةُ کے معنی ہیں کسی مشترکہ چیز کے فروخت ہونے پر اس کی قیمت ادا کر کے اسے اپنے ملک میں شامل کر لینا۔ یہ شَفْعٌ سے مشتق ہے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے[3] (۱۹۷)

إِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ فَلَا شُفْعَةَ جب حدود مقرر ہو جائیں تو حق شفعہ باقی نہیں رہتا۔

(ش ف ق)

اَلشَّفَقُ غروب آفتاب کے وقت دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں مل جانے کو شفق کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۸۴-۱۶) ہمیں شام کی سرخی کی قسم۔

اَلْإِشْفَاقُ کسی کی خیر خواہی کے ساتھ اس پر تکلیف آنے سے ڈرنا کیونکہ مشفق ہمیشہ مشفق علیہ کو محبوب سمجھتا ہے اور اسے تکلیف پہنچنے سے ڈرتا رہتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَهُمْ مِنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ (۲۱-۴۹) اور وہ قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں۔

---

[1] رواہ الحاکم ومسلم والترمذی والنسائی وابن ماجۃ۔ عن جریر وباختلاف الفاظہ۔ عن ابی جحیفۃ وراجع الفتح (۱۳ ر ۲۰۰)

[2] الحدیث اخرجہ ابن حبان من روایۃ جابر والحاکم من حدیث معقل بن یسار والطبرانی من حدیث ابن مسعود وابو عبیدۃ فی فضائل القرآن وراجع لتخریجہ الکاف ۹۲ وکنز العمال ج ۱ رقم ۲۲۰۷ و ۲۳۰۳ و ۲۳۳۶

[3] رواہ الترمذی من حدیث جابر بن عبد اللہ قال وقد رواہ بعضہم مرسلا عن ابی سلمۃ والمسئلۃ مختلف فیہا بین الفقہاء راجع التحفۃ شرح الترمذی (۲ : ۴۲۹) وباختلاف الفاظہ فی البخاری ومسند احمد وابی داؤد وابن ماجۃ والشافعی عن الزہری عن ابی سلمۃ وسعید بن المسیب مرسلا وراجع کنز العمال ۷ ر ۳

اور جب یہ فعل حرف مِنْ کے واسطہ سے متعدی ہو تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور اگر بواسطہ فِی کے متعدی ہو تو عنایت کے معنی ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ (۵۲-۲۶) اس سے قبل ہم اپنے گھر میں خدا سے ڈرتے رہتے تھے۔

مُشْفِقُونَ مِنْهَا (۴۲-۱۸) وہ اس سے ڈرتے ہیں۔

مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا (۴۲-۲۲) وہ اپنے اعمال (کے وبال) سے ڈر رہے ہوں گے۔

أَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا (۵۸-۱۳) کیا تم اس سے کہ ..... پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔

(ش ف و)

شفا۔ کنوئیں وغیرہ کے کنارہ کو کہتے ہیں۔ یہ قرب ہلاکت کے لئے ضرب المثل ہے۔ قرآن میں ہے:۔

عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (۹-۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارہ پر۔

عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ (۳-۱۰۳) (اور تم) آگ کے گڑھے کے کنارے تک.......

أَشْفَىٰ فُلَانٌ عَلَى الْهَلَاكِ فلاں ہلاکت کے قریب پہنچ گیا۔ اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے مَا بَقِيَ مِنْهُ إِلَّا شَفًى .... کہ فلاں چیز تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے (یہ چاند یا سورج کے غروب ہونے یا کسی کی موت کے وقت بولا جاتا ہے) شفا کا تثنیہ شَفَوَانِ اور جمع أَشْفَاءٌ آتی ہے۔

(ش ف ی)

الشِّفَاءُ (ض) مِنَ الْمَرَضِ سلامتی سے ہمکنار ہونا یعنی بیماری سے شفا پانا یہ مرض سے صحت یاب ہونے کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں شہد کے متعلق فرمایا۔

فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ (۱۶-۶۹) اس میں لوگوں کے (امراض کی) شفا ہے۔

هُدًى وَشِفَاءٌ (۴۱-۴۴) وہ ہدایت اور شفا ہے۔

شِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ (۱۰-۵۷) وہ دلوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔

وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ (۹-۱۴) اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔

(ش ق ق)

الشَّقُّ شگاف کو کہتے ہیں۔ شَقَقْتُهُ بِنِصْفَيْنِ میں نے اسے برابر دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (۸۰-۲۶) پھر ہم نے زمین کو چیرا پھاڑا۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ (۵۰-۴۴) اس روز زمین (ان پر سے) پھٹ جائے گی۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ (۶۹-۱۶) اور آسمان پھٹ جائے گا۔

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (۸۴-۱) جب آسمان پھٹ جائیگا۔

اور آیت کریمہ:۔

وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴-۱) اور چاند شق ہوگیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ انشقاق قمر آنحضرت کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اور بعض نے انْشَقَّ الْقَمَرُ کے معنی وَضَحَ الْأَمْرُ کئے ہیں یعنی معاملہ واضح ہوگیا۔

اَلشَّقَّةُ پھاڑا ہوا ٹکڑا۔ اسی سے محاورہ ہے۔
طَارَ فُلَانٌ مِنَ الْغَضَبِ شِقَاقًا فلاں غصہ سے پھٹ گیا۔ جیسا کہ تَقَطَّعَ غَضَبًا کا محاورہ ہے۔
طَارَتْ مِنْهُمْ شُقَّةٌ ان کا ایک حصہ اڑ گیا۔ یعنی غضب ناک ہوئے۔
اَلشِّقُّ اس مشقت کو کہتے ہیں جو ٹوٹ پھوٹ سے بدن یا نفس کو لاحق ہوتی ہے جیسا کہ الانکسار کا لفظ بطور استعارہ نفس کی درماندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (۱۶-۷) زحمت شاقہ کے بغیر
اَلشُّقَّةُ وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔ قرآن میں ہے:۔
بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ (۹-۴۲) لیکن مسافت ان کو دور (دراز) نظر آئی۔
اَلشِّقَاقُ (مفاعلۃ) کے معنی مخالفت کے ہیں گویا ہر فریق جانب مخالف کو اختیار کر لیتا ہے اور یا یہ شَقَّ الْعَصَا بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی باہم افتراق پیدا کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا (۴-۳۵) اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے۔
فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (۲-۱۳۷) تو وہ تمہارے مخالف ہیں۔
لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْ (۱۱-۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرا دے۔
لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ (۲-۱۷۶) وہ ضد میں (آکر نیکی سے) دور (ہو گئے) ہیں۔
وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۸-۱۳) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے۔ یعنی اس کے اولیاء کی صف کو چھوڑ کر ان کے مخالفین کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَمَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۹-۶۳) یعنی جو شخص خدا اور رسول کا مقابلہ کرتا ہے۔
وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ (۴-۱۱۵) اور جو شخص پیغمبر کی مخالفت کرے۔
اَلْمَالُ بَيْنَنَا شَقَّ الشَّعْرَةِ اَوْ شَقَّ الْاُبْلُمَةِ[1] یعنی مال ہمارے درمیان برابر برابر ہے۔
فُلَانٌ شِقُّ نَفْسِيْ اَوْ شَقِيْقُ نَفْسِيْ یعنی وہ میرا بھائی ہے میرے ساتھ اسے گویا مشابہت ہے۔
شَقَائِقُ النُّعْمَانِ[2] گل لالہ یا اس کا پودا۔
شَقِيْقَةُ الرَّمْلِ ریت کا ٹکڑا۔
اَلشِّقْشِقَةُ اونٹ کا ریہ جو مستی کے وقت باہر نکالتا ہے اس میں چونکہ شگاف ہوتا ہے۔ اس لئے اسے شِقْشِقَةٌ کہتے ہیں[3]۔
بِيَدِهٖ شُقُوْقٌ اس کے ہاتھ میں شگاف پڑ گئے ہیں شِقَاقٌ سم کا شگاف فَرَسٌ اَشَقُّ راستہ سے ایک جانب مائل ہو کر چلنے والا گھوڑا۔
اَلشُّقَّةُ اصل میں کپڑے کے نصف حصہ کو کہتے ہیں اور مطلق کپڑے کو بھی شُقَّةٌ کہا جاتا ہے۔

---

[1] والابلمۃ الخوصۃ ای نحن متساوون فیہ لان الخوصۃ اذا شققت طولا انشقت نصفین [2] واحدہ شقیقۃ واضیف الی النعمان بن المنذر لانہ حمی ارضا فکثر فیہا وقیل النعمان اسم الدم فشبہت حمرتہا بحمرۃ الدم (اللسان: شق) [3] وفی اللسان: ولا تکون الا للجمل العربی والجمع الشق ومنہ سمیت الخطب شقاشق وفی حدیث علیؓ ان کثیرا من الخطب شقاشق الشیطان لما فی الشقاشق یدخل فیہا من الکذب وفی الفائق القول منسوب لعمرؓ

(ش ق و)

اَلشَّقَاوَۃُ (بدبختی) یہ سعادت کی ضد ہے اور شَقِیَ (س) شَقْوَۃً وَشَقَاوَۃً وَشَقَاءً کے معنی بدبخت ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا (۲۳-۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب ہوگئی۔

میں ایک قرأت شَقَاوَتُنَا ہے[1] تو شقوۃ بروزن ردۃ[2] ہے۔ سعادت کی طرح شقاوت بھی امور اضافیہ سے ہے۔ جیسا کہ سعادت دو قسم پر ہے دینوی و اخروی اور پھر سعادت دنیوی تین قسم پر ہے۔ نفسانی، بدنی اور خارجی۔ اسی طرح شقاوت بھی انہی اقسام کی طرف منقسم ہوتی ہے۔ چنانچہ شقاوت اخروی کے متعلق فرمایا:۔

فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (۲۰-۱۲۳) وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا (۲۳-۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب ہوگئی۔

اور شقاوت دنیوی کے متعلق فرمایا:۔

فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی (۲۰-۱۱۷) تو یہ کہیں تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے پھر تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی شِقَاءٌ کا لفظ تَعَبٌ[3] کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے شَقِیتُ فِی کَذَا یعنی میں نے فلاں معاملہ میں مشقت اٹھائی اور ان دونوں میں عموم خصوص کی نسبت ہے ہر شقاوت کو تعب کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تعب شقاوت نہیں ہوتی لہذا تعب شقاوت سے عام ہے۔

(ش ک ک)

اَلشَّکُّ کے معنی دو نقیضوں کے ذہن میں برابر اور مساوی ہونے کے ہیں یہ یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ ان دونوں کی علامتیں یکساں طور پائی جاتی ہیں اور یا اس لئے کہ دونوں میں سے کسی پر بھی دلیل نہیں ہوتی۔

اَلشَّکُّ کبھی تو نفس شے میں ہوتا ہے کہ کون سی جنس سے ہے اور کبھی اس کی صفت میں اور کبھی اس غرض کے بارے میں جس کے لئے وہ چیز وجود میں لائی گئی ہے۔

شک جہالت ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس سے اخص ہے کیونکہ جہل میں کبھی سرے سے نقیضین کا علم ہی نہیں ہوتا۔ پس ہر شک جہل ہے مگر ہر جہل شک نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:۔

لَفِی شَکٍّ مِّنْهُ مُرِیبٍ (۱۱-۱۱۰) وہ تو اس سے قوی شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔

بَلْ هُمْ فِی شَکٍّ یَلْعَبُونَ (۴۴-۹) لیکن یہ لوگ شک میں کھیل رہے ہیں۔

فَإِنْ کُنْتَ فِی شَکٍّ (۱۰-۹۴) اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں کچھ بھی شک ہے۔

اور یہ (شک) یا تو شَکَکْتُ الشَّیْءَ سے مشتق ہے جس کے معنی چاک کر ڈالنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[4] (الکامل)

(۲۶۴) وَشَکَکْتُ بِالرُّمْحِ الْاَصَمِّ ثِیَابَہُ
لَیْسَ الْکَرِیمُ عَلَی الْقَنَا بِمُحَرَّمِ

---

[1] وہی قراءۃ ابن مسعودؓ والاول قراءۃ اہل المدینۃ (اللسان)۔ [2] قالہ عنترۃ انظر اللسان (شک) والطبری (۹-۱۲۲) ومحاضرات المؤلف (۲: ۱۴۰) والجمہرۃ ۲۰ والمعلقات لابن الانباری ۴۲۶ والعشر للتبریزی ۱۹۶ والمعانی للقتبی ۲۱ ودیوانہ ۳ ۔

میں نے ٹھوس نیزے سے اس کا دل بادرع کو
چاک کر ڈالا اور شریف آدمی نیزے پر حرام نہیں ہوتا۔
تو گویا شک کے معنی کسی چیز میں شگاف ڈالنے
کے ہیں اور کسی شے کے اس طرح ہونے کے ہیں
کہ اس میں رائے کو قرار حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ
ہی اس پر اعتماد ہو سکے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
یہ اس شَکٌّ سے مستعار ہو جس کے معنی بازو
کے پہلو سے چمٹ جانے کے ہیں اس طرح شک
کا مفہوم یہ ہوگا کہ دو متضاد چیزوں کا باہم دیگر
اس طرح مل جانا کہ رائے اور فہم ان میں داخل ہو کر
ایک دوسری سے الگ نہ کر سکے اور اِلْتَبَسَ
الْاُمُوْرُ وَاخْتَلَطَ وَاَشْکَلَ وغیرہا استعارات سے
بھی اس اشتقاق کی تائید ہوتی ہے۔
اَلشِّکَّۃُ ہتھیار جس سے کسی چیز کو پھاڑا جاتا ہے۔

(ش ک ر)

اَلشُّکْرُ کے معنی کسی نعمت کا تصور اور
اس کے اظہار کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ
کَشْرٌ سے مقلوب ہے جس کے معنی کشف یعنی
کھولنا کے ہیں۔ شکر کی ضد کفر ہے جس کے معنی
نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا رکھنے کے ہیں اور
دَابَّۃٌ شَکُوْرٌ اس چوپائے کو کہتے ہیں جو اپنی فربہی
سے یہ ظاہر کر رہا ہو کہ اس کے مالک نے اس کی
خوب پرورش اور حفاظت کی ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ یہ عَیْنٌ شَکْرٰی سے ماخوذ
ہے جس کے معنی آنسوؤں سے بھرپور آنکھ کے
ہیں اس لحاظ سے شکر کے معنی ہوں گے منعم کے
ذکر سے بھر جانا۔
شکر تین قسم پر ہے۔ شکر قلبی یعنی نعمت کا تصور
کرنا۔ شکر لسانی یعنی زبان سے منعم کی تعریف کرنا
شکر بالجوارح یعنی بقدر استحقاق نعمت کی
مکافات کرنا۔ اور آیت کریمہ:۔
اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (۳۴-۱۳) اے داؤد
کی آل میرا شکر کرو۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں شُکْرًا منصوب
علی التمیز ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو عمل کرو وہ اللہ
تعالیٰ کی شکرگزاری کے لئے کرو۔ اور بعض نے
کہا ہے کہ شُکْرًا اِعْمَلُوْا کا مفعول ہے۔ اور
اُشْکُرُوْا کی بجائے اِعْمَلُوْا اس لئے کہا گیا ہے
تاکہ شکر کی انواع ثلاثہ یعنی شکر قلبی ولسانی اور
شکر بالجوارح کے التزام پر تنبیہ ہو جائے۔
قرآن میں ہے:۔
اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ (۳۱-۱۴) کہ میرا بھی
شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی۔
وَسَنَجْزِی الشّٰکِرِیْنَ (۳-۱۴۵) اور ہم شکر
گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔
وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ (۲۷-۴۰)
اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدہ کے لئے۔
اور آیت کریمہ:۔
قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (۳۴-۱۳) اور میرے
بندوں میں شکر گزار تھوڑے سے ہی ہیں۔
میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کما حقہ شکر
گزار ہونا بہت مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ
تعالیٰ نے اپنے اولیاء میں سے شکر گزاری پر صرف
دو پیغمبروں کی تعریف کی ہے اول حضرت ابراہیم
علیہ السلام کی جیسے فرمایا:۔
شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ۔ اس کی نعمتوں کے شکر گزار
ٹھہرے تھے دوم حضرت نوح کی جیسے فرمایا:۔

إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (۱۷-۳) بے شک نوح ہمارا شکر گزار بندہ تھا۔
اور جب شکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جیسے۔ إِنَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ (۶۴-۱۷) بے شک خدا قدر شناس اور بردبار ہے۔
تو اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام کرنا اور ان کی عبادت گزاری کی پوری پوری جزا دینا مراد ہوتا ہے نَاقَةٌ شَكِرَةٌ دودھ سے بھرے ہوئے تھنوں والی اونٹنی (یہ شکر سے صیغہ صفت ہے) مقولہ مشہور ہے[1]۔
هُوَ أَشْكَرُ مِنْ بَرُوقٍ وہ بروق گھاس سے بھی زیادہ شکر گزار ہے۔ بروق گھاس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہلکی سی بارش سے ہری بھری ہو جاتی ہے اور شَكْرٌ کے معنی کنایہ کے طور پر عورت کی شرمگاہ اور اس سے جماع کے بھی آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے[2]۔
إِنْ سَأَلَتْكَ ثَمَنَ شَكْرِهَا وَشِبْرِكَ أَنْشَأْتَ تَطُلُّهَا اگر وہ تجھ سے اپنی شرمگاہ اور جماع کی اجرت طلب کرتی ہے تو تو اس میں حیلے بہانے کرتا ہے۔
اَلشَّكِيرُ تر و تازہ گھاس جو درخت کے تنہ میں ہو۔ اور شَكِرَتِ (س) اَلشَّجَرَةُ کے معنی درخت کی شاخوں کے گنجان ہونے کے ہیں۔

(ش ك س)

اَلشَّكِسُ بدمزاج کو کہتے ہیں اور آیت کریمہ: شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ (۳۹-۲۹) جس میں کئی آدمی شریک ہیں (مختلف المزاج) اور بدخو۔ یعنی اپنی بدمزاجی کی وجہ سے باہم جھگڑا کرنے والے ہیں۔

(ش ك ل)

اَلْمُشَاكَلَةُ کے معنی شکل و صورت میں مشابہ ہونے کے ہیں اور نِدٌّ کے معنی جنس میں شریک ہونے کے ہیں اور شَبَهٌ کے معنی کیفیت میں مماثلت کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ (۳۸-۵۸) اور اس طرح کے اور بہت سے (عذاب ہوں گے) میں ہیئت اور تعاطی فعل کے لحاظ سے مماثلت مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شَكْلٌ کے معنی دَلٌّ یعنی عورت کے ناز و انداز کے ہیں لیکن اصل میں اس نسبت کو کہتے ہیں جو دو ہم مشرب و ہم پیشہ شخصوں میں پائی جاتی ہے چنانچہ اسی سے محاورہ ہے۔ اَلنَّاسُ أَشْكَالٌ وَأُلَّافٌ کہ لوگ باہم مشابہ اور الفت کرنے والے ہیں۔
اصل میں مُشَاكَلَةٌ شَكْلٌ سے ہے اور شَكَلْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہیں میں نے جانور کی ٹانگیں (شکال سے) باندھ دیں اور شکال اس رسی کو کہتے ہیں جس

---

[1] انظر للمثل اللسان (برق) والمیدانی رقم ۲۰۵۲ وفیہ تخضر من غیر مطر بل تنبت بالسحاب اذا نشأ ۱۲۔ [2] قالہ یحیٰی بن یعمر لرجل خاصمتہ امرأتہ فی مہرہا او سوۂ القتبی فی ادب الکتاب (ص ۱۲) مثلا للتقعیر والتقعیب وفیہ الخبر و مجالس ثعلب ۲۵۴ وقال والشکر: الفرج والکامل للمبرد ۲۸ وکتب تراجم النحویین مع اختلاف فی الروایۃ وفی اللسان (ضہل، طلل) والفائق ۱/۳۳۲ بزیادۃ تضہلہا ای تعطیہا القلیل من حقہا والنہایۃ (شکر) وفیہ: أإن بزیادۃ ہمزۃ الاستفہام وفی المطبوع تصحیف وارتباک ۱۲۔

سے اس کی ٹانگیں باندھ دی جاتی ہیں پھر اس سے استعارہ کے طور پر شَكَلْتُ الْكِتَابَ کی طرح شَكَّلْتُ الْكِتَابَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کتاب کو اعراب لگانے کے ہیں۔

دَابَّةٌ بِهَا شِكَالٌ وہ جانور جس کے ایک اگلے اور ایک پچھلے پاؤں میں شِکال یعنی پائے بند کی طرح سفیدی ہو۔ قرآن میں ہے:

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ (۱۷-۸۴) کہو کہ ہر ایک اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔

یعنی اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے جو اسے پائے بند کئے ہوئے ہے کیونکہ فطرت انسان پر سلطان قاہر کی طرح غالب رہتی ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب "الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ" میں بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ ایسے ہی جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے (۱۹۹)

كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ (کہ ہر کس لقدر ہمت اوست)

اَلْاَشْكَلَةُ حاجت جو انسان کو پابند کر دے اور اَلْاِشْكَالُ کے معنی (بطور استعارہ) کسی کام کے پیچیدہ ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ اشتباہ کا لفظ شُبْهَةٌ سے مشتق ہے اور مجازاً کسی امر کے مشتبہ ہونے پر بولا جاتا ہے۔

(ش ک و)

اَلشَّكْوُ وَالشِّكَايَةُ وَالشَّكَاةُ وَالشَّكْوٰى کے معنی اظہار غم کے ہیں اور شَكَوْتُ وَاَشْكَيْتُ دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:-

اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ (۱۲-۸۶) کہ میں تو اپنے غم اور اندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔

وَتَشْتَكِيْ اِلَى اللّٰهِ (۵۸-۱) اور خدا سے شکایت (رنج وملال) کرتی ہے۔

اَشْكَاهُ (افعال) کے معنی کسی کو صاحب شکوہ کر دینے کے آتے ہیں۔ جیسے اَمْرَضَهُ (اس کو صاحب مرض کر دیا) اور کسی کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے (۱۰۰)

شَكَوْنَا اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَرَّ الرَّمْضَاءِ فِيْ جِبَاهِنَا وَاَكُفِّنَا فَلَمْ يُشْكِنَا کہ ہم نے آنحضرت کے پاس اپنی پیشانیوں اور ہاتھوں میں گرمی کی شدت کی شکایت کی لیکن آپ نے ہماری شکایت کا ازالہ نہ کیا۔

اصل میں شکو کے معنی شَکْوَۃ یعنی چھوٹے مشکیزہ کو کھول لینے اور اس کے اندر کی چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں لہذا یہ دراصل بَثَثْتُ لَهُ مَا فِيْ وِعَائِيْ اور نَفَضْتُ مَا فِيْ جِرَابِيْ کی طرح استعارہ ہے جس کے معنی دل کی بات کو ظاہر کر دینے کے ہیں۔

اَلْمِشْكٰوةُ طاق جو آر پار نہ ہو۔ قرآن میں ہے:-

كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ (۲۴-۳۵) گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہو۔

تو مشکوٰۃ سے مراد مومن کا دل اور مصباح سے نور الٰہی مراد ہے۔

---

(۱۹۹) رواہ الحاکم وابو داؤد واصلہ متفق علیہ عن عمران بن حصین والترمذی عن عمر والحاکم ایضاً عن ابی بکر فی حدیث طویل (۱۰۰) اخرجہ مسلم لبیان ادوء احادیث ابراد الظہر والبیہقی من حدیث خباب راجع النیل (۲: ۳۲۹) والزرقانی علی الموطا (۱: ۴۰) والحدیث فی جل کتب الحدیث: فی الفائق (۱: ۲۵۲) والنہایۃ (شکو) ۱۲

(ش م ت)

اَلشَّمَاتَةُ کے معنی دشمن کی مصیبت پر خوش ہونے کے ہیں اور یہ شَمِتَ بِہٖ فَھُوَ شَامِتٌ کا مصدر ہے اور اَشْمَتَ اللّٰہُ بِہِ الْعَدُوَّ کے معنی ہیں اللہ اسے مصیبت پہنچائے جس سے اس کے دشمن خوش ہوں قرآن میں ہے :۔

فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَاءَ (۷-۱۵۰) تو ایسا نہ کیجئے کہ دشمن مجھ پر ہنسیں۔

تَشْمِیْتٌ کے معنی چھینکنے والے کو دعا دینے کے ہیں۔ گویا ازالہ شماتۃ کی دعا ہے جیسے تَعْرِیْضٌ کے معنی مرض کو زائل کرنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۲۶۵) .... خبات لہٗ

طوع الشوامت ....

تو اس نے خوف وہراس اور سردی میں کھڑے ہو کر رات گزاری۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شوامت سے قوائم یعنی ٹانگیں مراد ہیں لیکن یہ معنی محل نظر ہیں اس لئے کہ اس بیت کے علاوہ اس معنی پر اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

(ش م خ)

الشَّامِخُ بلند ج مونث شَامِخَاتٌ قرآن میں ہے :۔

رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ (۷۷-۲۷) اونچے اونچے پہاڑ۔

اور اسی سے شَمَخَ بِاَنْفِہٖ کا محاورہ ہے جس کے معنی تکبر کرنے کے ہیں۔

(ش م ء ز)

اَلْاِشْمِئْزَازُ منقبض وگرفتہ ہوجانا۔ قرآن میں ہے :۔

اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ (۳۹-۴۵) تو ان لوگوں کے دل منقبض ہوجاتے ہیں۔

(ش م س)

الشَّمْسُ کے معنی سورج کی ٹکیہ یا دھوپ کے ہیں ج شُمُوْسٌ قرآن میں ہے :۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا (۳۶-۳۸) اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵-۵) سورج اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں۔

شَمَسَ یَوْمُنَا وَاَشْمَسَ۔ دن کا دھوپ والا ہونا۔

شَمَسَ فُلَانٌ شِمَاسًا گھوڑے کا بدکنا ایک جگہ پر قرار نہ پکڑنا۔ گویا قرار نہ پکڑنے میں سورج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

(ش م ل)

اَلشِّمَالُ۔ بایاں ضد یمین۔ قرآن میں ہے :۔

عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ (۵۰-۱۷) جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں۔

---

[1] قالہ النابغۃ والبیت بتمامہ ؛ فارتاع من صوت کلاب خبات لہ۔ طوع الشوامت من خوف ومن بردا والبیت فی اللسان (شمت) ومختار الشعر الجاہلی (ا: ۵۲) والمحکم (طوع) وفیہ ومن صرد" والکلاب صاحب الکلاب والشوامت القوائم ای بات الثور طوع قوائمہ (یعنی قائما) وہٰذا علی روایۃ من روی طوع بالنصب ومن رفعہ فانہ یرید من طوع الشوامت ای ماتشتھیہ اعداءہ راجع للبیت ایضًا البحرۃ: ۲۲۷) والعقد الثمین ۲ والعشر للتبریزی ۴ ۲۹ والبیت من ابیات المعانی راجع اللسان والمعانی الکبیر للقتبی ۹ ۴۳ د

نیز چھوٹی چادر جس سے بائیں جانب ڈھانپ لی جائے اسے بھی شِمَالٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ عربی زبان میں دوسرے اعضاء کی مناسبت سے لباس کے مختلف نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً قمیص کی آستین کو یَدٌ (ہاتھ) اور جو حصہ سینہ اور پشت پر آئے اسے صَدْرٌ اور ظَهْرٌ کہا جاتا ہے اور پائجامہ کے پائنچہ کو رِجْلٌ سے موسوم کر دیتے ہیں وغیر ذالک۔

اور اَلْاِشْتِمَالُ بِالثَّوْبِ کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے حدیث میں ہے[1] (۱۰۱) نُهِيَ عَنْ اشْتِمَالِ الصَّمَّاءِ کہ اشتمال الصماء ممنوع ہے۔

اور استعارہ کے طور پر کمبل کو جو جسم پر لپیٹا جاتا ہے۔ شَمْلَةٌ وَمِشْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شَمَلَهُمُ الْاَمْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی امر کے سب کو شامل اور عام ہو جانے کے ہیں۔ پھر شِمَال کے لفظ سے مجازاً کہا جاتا ہے۔

شَمَلْتُ الشَّاةَ بکری کے تھنوں پر غلاف چڑھانا۔

اور شِمَال کے معنی عادت بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چادر کی طرح انسان پر مشتمل ہو جاتی ہے۔

اَلشَّمُولُ شراب کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور شراب کو شمول کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ عقل کو ڈھانپ لینے کی وجہ سے خَمْرٌ کہا جاتا ہے۔

اَلشِّمَالُ (بکسر الشین) وہ ہوا جو کعبہ کی بائیں جانب سے چلتی ہے اور اس میں ایک لغت شَمْاَلٌ (بفتحہ شین) بھی ہے۔

شَامَلَ وَاَشْمَلَ کے معنی شمال کی جانب میں جانے کے ہیں جیسے جنوب سے اَجْنَبَ (جنوب کو جانا) کنایہ کے طور پر تلوار کو مِشْمَلٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے رِدَاءٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے مُرْتَدِيًا بِالسَّيْفِ وَ مُتَدَرِّعًا لَهُ کی طرح جَاءَ مُشْتَمِلًا بِسَيْفِهِ کا محاورہ ہے:۔

نَاقَةٌ شِمْلَةٌ وَ شِمْلَالٌ بادِ شمال کی طرح تیز رفتار اونٹنی۔ اور شاعر کے قول[2] ع (الکامل)

(۲۶۶) وَلَتَعْرِفَنَّ خَلَائِقًا مَشْمُولَةً
وَلَتَنْدَمَنَّ وَلَاتَ سَاعَةَ مَنْدَمٍ

تم عمدہ اخلاق کو پہچان لوگے اور تم پشیمانی اٹھاؤگے لیکن وہ وقت پشیمانی کا نہیں ہوگا۔

میں مَشْمُولَةً سے مراد پاکیزہ اخلاق ہیں گویا باد شمال نے (شراب کی طرح) انہیں ٹھنڈا اور خوش گوار بنا دیا۔

(ش ن ع)

شَنِئْتُهُ (ف س) کے معنی بغض کی وجہ سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے ہیں۔ اسی سے اَزْدِ شَنُوءَةَ مشتق ہے جو ایک قبیلہ کا نام ہے اور آیت کریمہ:۔ شَنَاٰنُ قَوْمٍ (۵-۲) لوگوں کی دشمنی۔

میں شَنَاٰنٌ کے معنی بغض اور دشمنی کے ہیں ایک قرأت میں شَنْاٰنُ بسکون نون ہے پس تخفیف (یعنی سکون نون) کی صورت میں اسم

---

[1] متفق علیہ و ابو داؤد والبیہقی من حدیث ابن عمر راجع ایضاً الزرقانی علی الموطا ۴ر۲۸۷ والفائق ۲ر۲۰ ÷ [2] البیت من شواہد الطبری ۲۳ر۲۲ اور راجع لہ ایضاً اضداد ابی الطیب ۴۳ والاصمعی ۱۸ و ابن السکیت ۱۷۳ و ابن الانباری ۴۸ و فی کل المراجع بغیر عزو والخزانۃ البغدادیہ ۲ر۱۴۸ ÷

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

اور فتح نون کی صورت میں مصدر ہوگا[1] اور اسی سے فرمایا:۔
إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ (۱۰۸-۳) کچھ شک نہیں کہ تمہارا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔

(ش ھ ب)

اَلشِّهَابُ کے معنی بلند شعلہ کے ہیں خواہ وہ جلتی ہوئی آگ کا ہو یا فضا میں کسی عارضہ کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ قرآن میں ہے:۔
فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷-۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے لگتا ہے۔
شِهَابٌ مُّبِينٌ (۱۵-۱۸) روشنی کرنیوالا انگارہ۔
شِهَابًا رَّصَدًا (۷۲-۹) انگارہ تیار۔
اَلشُّهْبَةُ سفیدی جس میں کچھ سیاہی ملی ہوئی ہو۔ جیسا کہ انگارہ کی روشنی کے ساتھ دھوآں ملا ہوتا ہے اسی سے كَتِيبَةٌ شَهْبَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنی مسلح لشکر کے ہیں کیونکہ اس میں ہتھیاروں کی چمک سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہی اور سفیدی ملی ہوئی ہیں۔

(ش ھ د)

اَلشُّهُودُ وَالشَّهَادَةُ کے معنی کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کے ہیں خواہ بصر سے ہو یا بصیرت سے اور صرف حاضر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے۔
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (۹-۱۰۵) پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔
لیکن اولٰی یہ ہے کہ شُهُودٌ کے معنی صرف حاضر ہونا ہوں اور شَهَادَةٌ میں حاضر ہونے کے ساتھ مشاہدہ کا بھی اعتبار کیا جائے اَلْمَحْضَرُ بمعنی مشہد یعنی حاضر ہونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے مُشْهِدٌ وہ عورت جس کا خاوند حاضر ہو اور مَشْهَدٌ کی جمع مَشَاهِدُ آتی ہے اسی سے مَشَاهِدُ الْحَج ہیں یعنی وہ مواضع شریفہ جہاں کہ فرشتے اور نیک لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مَشَاهِدُ الْحَج کے معنی مناسک حج کے ہیں قرآن میں ہے:۔
لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲-۲۸) تاکہ وہ اپنے فائدہ کے لئے حاضر ہوں۔
وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا (۲۴-۲) اور ان کی سزا کے وقت ..... موجود ہو۔
مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ (۲۷-۴۹) ہم تو اس کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں۔
وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ (۲۵-۷۲) اور وہ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔
یعنی نہ تو زُورٌ کے موقع پر خود ہی حاضر ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کا قصد یا ارادہ کرتے ہیں۔
اَلشَّهَادَةُ۔ وہ بات جو کامل علم ویقین سے کہی جائے خواہ وہ علم مشاہدۂ بصر سے حاصل ہوا ہو یا بصیرت سے۔ اور آیت کریمہ:
أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ (۴۳-۹) کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے۔
میں مشاہدہ بصر مراد ہے۔ اور پھر سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ (عنقریب ان کی شہادت لکھ لی جائے گی) سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ شہادت

---

[1] او اسم مثل سکران وعطشان من سکر وعطش او المصدر مثل طیران ونسلان وعسلان ورملان ثال الجبری ۲ر۴۲: و اولی القراتین قراءة من یفتح النون لان المصادر یاتی علی فعلان ؛

یعنی حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۲-۷۰) اور تم اس بات کے گواہ ہو۔
یعنی تَشْهَدُوْنَ کے معنی تَعْلَمُوْنَ کے ہیں یعنی تم اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہو۔ اور آیت کریمہ
مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ (۱۸-۵۱) میں نے نہ تو ان کو آسمان کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا۔
یعنی تنبیہ کی ہے کہ یہ اس لائق نہیں ہیں کہ اپنی بصیرت سے خلق آسمان پر مطلع ہو جائیں
اور آیت کریمہ:
عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (۲۳-۹۲) وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔
میں غائب سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کا ادراک نہ تو ظاہری حواس سے ہو سکتا ہو اور نہ بصیرت سے اور شہادت سے مراد وہ اشیاء ہیں جنہیں لوگ ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔
شَهِدْتُّ کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے
(۱) علم کی جگہ آتا ہے اور اسی سے شہادت ادا ہوتی ہے مگر اَشْهَدُ بِكَذَا کی بجائے اگر اَعْلَمُ کہا جائے تو شہادت قبول نہیں ہوگی بلکہ اَشْهَدُ ہی کہنا ضروری ہے۔
(۲) قسم کی جگہ پر آتا ہے چنانچہ اَشْهَدُ بِاللّٰهِ اَنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ میں اَشْهَدُ بمعنی اُقْسِمُ ہے بعض نے کہا ہے کہ اگر اَشْهَدُ کے ساتھ بِاللّٰهِ نہ بھی ہو تب بھی یہ قسم کے معنی میں ہوگا اور کبھی عَلِمْتُ بھی اس کے قائم مقام ہو کر قسم کے معنی دیتا ہے اور اس کا جواب بھی جواب قسم کی طرح ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے (الکامل)

(۲۶۷) وَلَقَدْ عَلِمْتُ لَتَاْتِيَنَّ مَنِيَّتِيْ

مجھے یقین ہے کہ میری موت ضرور آکر رہے گی۔
شَاهِدٌ اور شَهِيْدٌ کے ایک ہی معنی ہیں شَهِيْدٌ کی جمع شُهَدَاءُ آتی ہے قرآن میں ہے
وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاءُ (۲-۲۸۲) تو گواہ انکار نہ کریں۔
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ (۲-۲۸۲) اور دو مردوں کو گواہ کر لیا کرو۔
شَهِدْتُّ کے معنی کسی جگہ پر حاضر ہونے کے ہیں اور شَهِدْتُّ عَلٰى كَذَا کے معنی کسی واقعہ کی شہادت دینے کے قرآن میں ہے:
شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ (۴۱-۲۰) ان کے کان ان کے خلاف (ان کے اعمال کی) شہادت دیں گے۔
اور کبھی شہادت کے معنی فیصلہ اور حکم کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:
وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا (۱۲-۲۶) اس کے قبیلہ میں سے ایک فیصلہ کرنے والے نے فیصلہ کیا۔
اور جب شہادت اپنی ذات کے متعلق ہو تو اس کے معنی اقرار کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:
وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ (۲۴-۶) اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ چار

لہ ذ السیوطی ۸۰۲ البیت منسوب للبید ولم اجدہ فی دیوانہ وتمامہ ان المنایا لا تطیش سہامہا وقد روی عجزہ ما عوف عل ولا عدم ، کذا قال العینی فی شرح الشواہد راجع رقم ۲۵۲

بار خدا کی قسم کھائے۔

اور آیت کریمہ:۔ مَا شَهِدْنَا اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا (۱۲-۸۱) اور ہم نے تو اپنی دانست کے مطابق (اس کے لے آنے کا) عہد کیا تھا۔

میں شَهِدْنَا بمعنی اَخْبَرْنَا ہے اور آیت کریمہ:۔ شَاهِدِيْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (۹-۱۷) جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں گے۔

میں شَاهِدِيْنَ بمعنی مُقِرِّيْنَ ہے یعنی کفر کا اقرار کرتے ہوئے۔

لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا (۴۱-۲۱) تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔

اور آیت کریمہ:۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ (۳-۱۸) خدا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ۔

میں اللہ تعالیٰ کے اپنی وحدانیت کی شہادت دینے سے مراد عالم اور انفس میں ایسے شواہد قائم کرنا ہے جو اس کی واحدانیت پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1]۔

(۲۶۸) فَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهٗ آيَةٌ
تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَاحِدٌ

ہر چیز کے اندر ایسے دلائل موجود ہیں جو اس کے یگانہ ہونے پر دلالت کر رہے۔

بعض نے کہا ہے کہ باری تعالیٰ کے اپنی ذات کے لئے شہادت دینے سے مراد یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو نطق بخشا اور ان سب نے اس کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى) اور فرشتوں کی شہادت سے مراد ان کا ان اعمال کو سرانجام دینا ہے جن پر وہ مامور ہیں۔ جس پر کہ آیت:۔

فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا (۷۹-۵) پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔ دلالت کرتی ہے۔

اور اُولوا العلم کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ وہ مخلوق کے رموز و اسرار پر مطلع ہوتے اور ان کا اقرار کرتے ہیں اور شہادت بایں معنی اہل علم کے ساتھ ہی مخصوص ہے کیونکہ جہلاء اس قسم کی شہادت سے کوسوں دور ہیں اسی لئے کفار کے متعلق فرمایا:۔

مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ (۱۸-۵۱) میں نے ان کو نہ تو آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت۔

اور آیت کریمہ:۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵-۲۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں۔ جو صاحب علم ہیں۔

میں بھی اسی معنی پر تنبیہ فرمائی ہے اور آیت:۔

وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (۴-۶۹) اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ۔

میں بھی شہداء سے یہی لوگ مراد ہیں۔

---

[1] البیت فی البحر (۲: ۴۰۲) و (۳: ۱۳۹) و (۴: ۲۳۲) و محاضرات المؤلف (۴: ۴۹۸) فی خلافۃ ابیات والطبری (؟) وفی ابن کثیر [illegible] فواعجبا کیف یعصی الالہ۔ ام کیف یجحدہ الجاحد۔ ونسبہ الی ابن المعتز وفی طبقات ابن المعتز ۲۰۰ انه لابی العتاھیۃ [illegible] نواس د جمارات ایاہ وھو الصواب کما فی زھر الآداب للحصری (۲: ۹۴) و طراز المجالس ۱۱۶۔

شَهِیْدٌ یہ کبھی بمعنی شاہد یعنی گواہ آتا ہے۔ چنانچہ آیت:۔
سَائِقٌ وَّشَهِیْدٌ (۵۰-۲۱) اس کے ساتھ (ایک) چلانے والا اور (ایک) گواہ ہوگا۔ میں شہید بمعنی گواہ ہی ہے جو اس کے لئے یا اس پر گواہی دیگا۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔
فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰؤُلَاءِ شَهِیْدًا (۴-۴۱) بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو لوگوں کا حال بتانے کو گواہ طلب کریں گے۔
میں بھی شہید بمعنی شاہد ہی ہے اور آیت کریمہ:۔
اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ (۵۰-۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں ان کے دل اس کی شہادت دیتے ہیں بخلاف ان لوگوں کے جن کے متعلق فرمایا ہے۔ اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِیْدٍ (۴۱-۴۴) ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔
اور آیت کریمہ:۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِلٰی قَوْلِهٖ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۱۷-۷۸) کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔
میں قرآن کے مشہود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قراءت کرنے والے پر شفاء، رحمت، توفیق، سکینت اور ارواح نازل ہوتی ہیں۔
جن کا کہ آیت:۔
وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۱۷-۸۲) اور ہم قرآن کے ذریعہ سے وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔
میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت:۔
وَادْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ (۲-۲۳) اور جو تمہارے مددگار ہیں ان کو بلاؤ۔ میں شُهَدَاءَ کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جن پر معنی شہادت مشتمل ہے۔ چنانچہ ابن عباسؓ نے اس کے معنی اَعْوَان یعنی مددگار کے کئے ہیں اور مجاہدؒ نے اس کے معنی یہ کئے ہیں "کہ جو تمہارے حق میں گواہی دیں" اور بعض نے شہداء سے وہ لوگ مراد لئے ہیں۔ جن کے موجود ہونے کو قابل قدر اور معتبر سمجھا جائے یعنی وہ ایسے لوگ نہ ہوں جن کے متعلق کہا گیا ہے[1] (البسیط)

(۹۲۶) یُخْلَفُوْنَ وَیَقْضِی النَّاسُ اَمْرَهُمْ وَهُمْ بِغَیْبٍ وَّفِیْ عَمْیَاءَ مَاشَعَرُوْا

وہ پیچھے رہتے ہیں اور لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے ہیں وہ غیر حاضر اور بے خبر ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کا علم تک نہیں ہوتا
اور آیت کریمہ:۔
وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا (۲۸-۷۵) اور ہم امت میں سے گواہ نکال لیں گے۔
میں بھی شہید کا لفظ انہی معانی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ

---

[1] قاله الاخطل فی کلیب بن یربوع رهط جریر وبعده: الآکلون خبیث الزاد وحدهم - والسائلون بظهر الغیب: ما الخبر. والبیت فی الکامل ومحاضرات المؤلف (۱: ۱۱۳) ودیوانه ۱۰ والسیوطی ۲۰۸ وفیه یعصی بدل یقضی وقبله: اما کلیب بن یربوع فلیس لها. عند التفاخر ایراد ولا صدر.

وَاِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَهِیْدٌ (۱۰۰-۷) اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔
اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۴۱-۵۳) کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے۔
وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (۴۸-۲۸) اور حق ظاہر کرنے کو، خدا ہی کافی ہے۔
میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالٰے سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔
لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ (۴۰-۱۶) اور کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں رہے گی۔
یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی (۲۰-۷) وہ تو چھپے بھید اور پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔
علی ہذا القیاس متعدد آیات ایسی ہیں جو اس معنی (یعنی علم باری تعالیٰ کے محیط ہونے) پر دال ہیں۔ اور قریب المرگ شخص کو بھی شہید کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔
تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا (۴۱-۳۰) الآیۃ ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ خوف نہ کرو۔
میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور فرمایا:۔
وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ (۵۷-۱۹) اور اپنے پروردگار کے نزدیک شہید ہیں ان کے لئے ان کے اعمال کا صلہ ہوگا۔
اور شُهَدَاءٌ کو شُهَدَاء یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حالت نزع میں ان نعمتوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے ارواح باری تعالٰے کے ہاں حاضر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:۔
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا (۳-۱۶۹) اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ مت سمجھنا اور آیت کریمہ:۔
وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۵۷-۱۹) اور پروردگار کے نزدیک شہید ہیں۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے اور آیت کریمہ:۔
وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ (۸۵-۳) اور حاضر ہونے والے کی اور جو اس کے پاس حاضر کیا جائے اس کی قسم۔
میں بعض نے کہا ہے کہ مَشْهُوْدٌ سے یوم جمعہ مراد ہے اور بعض نے یوم عرفہ مراد لیا ہے اور بعض نے یوم قیامت اور شَاهِدٌ سے ہر وہ شخص مراد ہو سکتا ہے جو اس روز میں حاضر ہوگا اور آیت کریمہ:۔
یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۱-۱۰۳) اور یہی وہ دن ہے جس میں خدا کے روبرو حاضر کئے جائیں گے۔
میں مَشْهُوْدٌ بمعنی مُشَاهَدٌ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ وہ دن ضرور آکر رہے گا۔
اَلتَّشَهُّدُ کے معنی اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھنے کے ہیں اور عرف میں تشہد کے معنی اَلتَّحِیَّاتُ اور ان اذکار کے ہیں جو حالت تشہد (جلسہ) میں پڑھے جاتے ہیں۔

(ش ھ ر)

اَلشَّهْرُ (مہینہ) وہ مدت معینہ جو چاند کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ یا دوران قمر کے بارہ

حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ہے جو ایک نقطہ سے شروع ہو کر دوسرے نقطہ پر ختم ہو جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ (۲-۱۸۵) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں . . . . .

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ (۲-۱۹۷) حج کے مہینے معین ہیں جو معلوم ہیں۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا (۹-۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں

فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (۹-۲) تو مشرکو! زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔

اَلْمُشَاهَرَةُ کے معنی ہیں مہینوں کے حساب سے معاملہ کرنا۔ جیسے مُسَانَهَةٌ (سال وار معاملہ کرنا) اور مُیَاوَمَةٌ (دنوں کے حساب سے معاملہ کرنا) اَشْهَرْتُ بِالْمَکَانِ کسی جگہ مہینہ بھر قیام کرنا شَهَرَ فُلَانٌ وَاشْتَهَرَ کے معنی مشہور ہونے کے ہیں خواہ وہ شہرت نیک ہو یا بد۔

(ش ھ و)

اَلشَّهْوَةُ کے معنی ہیں نفس کا اس چیز کی طرف کھنچ جانا جسے وہ چاہتا ہے۔ خواہشات دنیوی دو قسم پر ہیں صَادِقَہ اور کَاذِبَہ

سچی خواہش وہ ہے جس کے حصول کے بغیر بدن کا نظام مختل ہو جاتا ہے جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہا اور جھوٹی خواہش وہ ہے جس کے عدم حصول سے بدن میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ پھر شَهْوَةٌ کا لفظ کبھی اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور کبھی خود اس قوت شہویہ پر اور آیت کریمہ:۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ (۳-۱۴) لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں (بڑی) زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔

میں شہوات سے دونوں قسم کی خواہشات مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (۹-۵۹) اور خواہشات نفسانی کے پیچھے لگ گئے۔

میں جھوٹی خواہشات مراد ہیں یعنی ان چیزوں کی خواہش جن سے استغنا ہو سکتا ہو۔ اور جنت کے متعلق فرمایا:۔

وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْ اَنْفُسُکُمْ (۴۱-۳۱) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گا۔

فِیْمَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ (۲۱-۱۰۲) اور جو کچھ ان کا جی چاہے گا اس میں . . . . .

رَجُلٌ شَهْوَانٌ وَشَهْوَانِیٌّ خواہش کا بندہ شَیْءٌ شَهِیٌّ لذیذ چیز۔ مرغوب شے۔

(ش ھ ق)

اَلشَّهِیْقُ۔ کے معنی لمبی سانس کھینچنا کے ہیں لیکن شَهِیْقٌ سانس لینے اور زَفِیْرٌ سانس چھوڑنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ (۱۱-۱۰۶) اس میں ان کو چلانا اور دھاڑنا ہو گا۔

وَسَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّزَفِیْرًا (۲۵-۱۲) اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔

اصل میں یہ لفظ جَبَلٌ شَاهِقٌ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی انتہائی بلند پہاڑ کے ہیں۔

(ش و ب)

اَلشَّوْبُ (ن) کے معنی ہیں خلط ملط کرنا۔

قرآن میں ہے:۔

لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ (۳۷-۶۷) گرم پانی ملا کر

اور عَسَلٌ یعنی شہد کو شَوْبٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ تمام مشروبات میں ملایا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ اس کے ساتھ موم ملا ہوا ہوتا ہے مثل مشہور ہے (مثل)

مَا عِنْدَهٗ شَوْبٌ وَّلَا رَوْبٌ نہ اس کے پاس شہد ہے اور نہ دودھ بالکل قلاش ہے۔

(ش و ر)

اَلشَّوَارُ کے معنی ظاہری سامان آرائش کے ہیں اور کنایہ کے طور پر اندام نہانی پر بولا جاتا ہے اور شَوَّرْتُ بِهٖ کے معنی ہیں میں نے اسے شرمندہ کیا۔ گویا اس کے ستر کو ننگا کر دیا۔

شُرْتُ الْعَسَلَ وَاَشَرْتُهٗ چھتے سے شہد نکالنا شاعر نے کہا ہے (الرمل)

(۲۷۰) وَحَدِيْثٍ مِّثْلُ مَاذِيْ مُشَارٍ

اور باتیں جو چھتے سے نکالے ہوئے تازہ شہد کی طرح شیریں تھیں۔

اور شہد نکالنے کے اعتبار سے شِرْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہوئے گھوڑے کی دوڑ معلوم کرنا کہ کس قدر دوڑ سکتا ہے" اور خطبیوں کے متعلق کہا جاتا ہے:۔ مِشْوَارٌ كَثِيْرُ الْعِثَارِ کہ خطبے ایسی منڈی ہے جہاں بہت زیادہ لغزش کا خطرہ ہے۔

اور اَلتَّشَاوُرُ وَالْمُشَاوَرَةُ وَالْمَشُوْرَةُ کے معنی ہیں ایک دوسرے کی طرف بات لوٹا کر اسے معلوم کرنا یہ بھی شُرْتُ الْعَسَلَ سے مشتق ہے جس کے معنی چھتے سے شہد کا نکالنا کے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳-۱۵۹) اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو۔

اَلشُّوْرٰی ہر وہ امر جس میں مشورہ کیا جائے قرآن میں ہے:۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲-۳۸) اور اپنے کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں۔

(ش و ظ)

اَلشُّوَاظُ۔ آگ کا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو قرآن میں ہے:۔

شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ (۵۵-۳۵) آگ کے شعلے اور دھواں۔

(ش و ك)

اَلشَّوْكُ کانٹا اور کبھی شَوْكَةٌ اور شِكَّةٌ

۱؎ كذا في النوادر لابي سهل ا٥ وراجع للمثل اللسان (روب شوب) ومنه في الحديث: لاشوب ولا روب اى في بيع انت بري منهما قال ابن الاثير في تفسير هذا الحديث اى لاغش ولا تخليط ۲؎ قاله عدى بن زيد العبادى وهو من شعراء الجاهلية ذكره بروكلمن في تاريخه (۱: ۱۲۴) وايضا الخزانة (۲: ۲۰) واوله- في سماع يأذن الشيخ له والبيت في اللسان (اذن، شور، موذ) والفائق (۱: ۳۱) و(۱: ۲۳۷) والطبرسى (۲: ۲۷۰) ولترجمه الاغانى (۲: ۱۸-۴۳) وجمهرة اشعار العرب ۱۰۳ وتاريخ الطبرى والبيت فى الامالى المرتضى (۱: ۲۴۳) بغير عزو والصحاح (موذ) وقبله: ولباب قد تلهيت بها- تصرت البدم في بيت قداره والقصيدة مقيدة القافية۔ ۳؎ وفي الصحاح: اياك والخطب فانها مشوار كثير العثار۔

کے لفظ سے اسلحہ اور شدت مراد ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ (۸۔۷) کہ جو قافلہ بے شان و شوکت (یعنی ہتھیار) ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر بچھو کے ڈنک کو بھی شَوْكٌ کہا جاتا ہے اور خار دار درخت کو شَجَرَةٌ شَاكَةٌ وَشَائِكَةٌ کہہ دیتے ہیں۔ شَاكَنِيَ الشَّوْكُ مجھے کانٹا چبھ گیا شَوَّكَ الْفَرْخُ چوزے نے کانٹے اور پر نکال لئے شَوَّكَ ثَدْيُ الْمَرْءَةِ عورت کی چھاتی ابھر آئی شَوَّكَ الْبَعِيْرُ اونٹ کے انیاب کا لمبا اور کانٹے کی طرح تیز ہونا۔

(ش و ی)

شَوَيْتُ اللَّحْمَ وَاشْتَوَيْتُهُ کے معنی گوشت بھوننا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

يَشْوِي الْوُجُوْهَ (۱۸۔۲۹) ان کے چہروں کو جھلس دے گا۔

شاعر نے کہا ہے[1] (الرمل)

(۲۷۰) فَاشْتَوَى لَيْلَةَ رِيْحٍ وَاجْتَمَلَ

تو اس نے ٹھنڈی رات (یعنی قحط سالی) میں گوشت بھونا اور چربی پگھلا کر کھائی۔

اَلشَّوَى جسم کے اطراف۔ ہاتھ پاؤں۔ وہ اعضاء جن پر زخم لگنے سے موت واقع نہ ہو محاورہ ہے۔ رَمَاهُ فَاَشْوَاهُ اسے تیر مارا تو اس کے اطراف پر لگا یعنی ایسے عضو پر نہیں لگا جس پر زخم لگنے سے انسان مرجاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

نَزَّاعَةً لِلشَّوٰى (۷۰۔۱۶) کھال ادھیڑ ڈالنے والی۔

اور اسی سے غیر اہم معاملہ کو بھی شَوًى کہا جاتا ہے کیونکہ شَوًى مُقْتَل یعنی عضو رئیس نہیں ہوتا (جس پر زخم لگنے سے انسان مرجائے)

اَلشَّاۃُ بھیڑ۔ یہ اصل میں شَايِهَةٌ ہے کیونکہ اس کی جمع شِيَاهٌ اور تصغیر شُوَيْهَةٌ آتی ہے۔

(ش ی ء)

اَلشَّيْءُ بعض کے نزدیک شی وہ ہوتی ہے جس کا علم ہو سکے اور اس کے متعلق خبر دی جاسکے اور اکثر متکلمین کے نزدیک یہ اسم مشترک ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ماسوا پر بھی بولا جاتا ہے اور موجودات اور معدومات سب کو شے کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ شے صرف موجود چیز کو کہتے ہیں۔ یہ اصل میں شَاءَ کا مصدر ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق شے کا لفظ استعمال ہو تو یہ بمعنی شَاءٍ یعنی اسم فاعل کے ہوتا ہے اور غیر اللہ پر بولا جائے تو مَشِيْءٌ (اسم مفعول) کے معنی میں ہوتا ہے پس آیت کریمہ:۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (۳۹۔۶۲) خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔

میں لفظ شی چونکہ دوسرے معنی (اسم مفعول) میں استعمال ہوا ہے اس لئے یہ عموم پر محمول ہوگا اور اس سے کسی قسم کا استثناء نہیں کیا جائیگا کیونکہ شی

---

[1] قالہ لبید داولہ: او نہتہ فاتاہ رزقہ وقبلہ: وغلام ارسلتہ امہ۔ بالوک فبذلنا ماسأل۔ وفی روایۃ واحتمل بالحاء بدل الجیم وقال فی شواہد الکشاف (۱۰) ورروایۃ الجیم انسب مافیہ والبیت فی تہذیب الالفاظ ۱۱۶ ودیوانہ ۳۹ والمعانی للقتبی ۔ ۱۸ رط۔ حیدر آباد ۱۳۴۹

مصدر بمعنی المفعول ہے مگر آیت کریمہ:
قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً (۶-۱۹) ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت ہے۔
میں شے بمعنی اسم فاعل ہے اور اللہ تعالیٰ کو اَکْبَرُ شَھَادَۃً کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (۲۳-۱۴)
(تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے)
میں ذات باری تعالیٰ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا گیا ہے۔
اَلْمَشِیْئَۃُ۔ اکثر متکلمین کے نزدیک مشیئت اور ارادہ، ایک ہی صفت کے دو نام ہیں لیکن بعض کے نزدیک دونوں میں فرق ہے (۱) مشیئت کے اصل معنی کسی چیز کی ایجاد یا کسی چیز کو پا لینے کے ہیں۔ اگرچہ عرف میں مشیئت ارادہ کی جگہ استعمال ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے معنی اشیاء کو موجود کرنے کے ہیں اور لوگوں کی مشیئت کے معنی کسی چیز کو پا لینے کے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو چاہنا چونکہ اس کے وجود کو مقتضی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَاْ لَمْ یَکُنْ کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے نہیں ہوتا۔
ہاں اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کا ارادہ کرنا اس کے حتمی وجود کو نہیں چاہتا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۲-۱۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔
وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰-۳۱) اور خدا تو بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔
کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ لوگوں میں عسر اور ظلم پائے جاتے ہیں۔
(۲) مشیئت اور ارادہ میں دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کا ارادہ تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر ہو سکتا ہے مثلاً انسان چاہتا ہے کہ اسے موت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو مار لیتا ہے۔ لیکن مشیئت انسانی مشیئت الٰہی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی جیسے فرمایا:
وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ ......
(۸۱-۲۹) اور تم کچھ بھی نہیں چاہتے مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے۔
ایک روایت ہے کہ جب آیت:
لِمَنْ شَاءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ (۸۱-۲۸)
یعنی اس کے لئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے۔
نازل ہوئی تو کفار نے کہا ہے یہ معاملہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم چاہیں تو استقامت اختیار کریں اور چاہیں تو انکار کر دیں اس پر آیت کریمہ:
وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ نازل ہوئی۔
بعض نے کہا ہے کہ اگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیئت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال اس پر معلق اور منحصر نہ ہوتے تو لوگ تمام افعال انسانیہ میں انشاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ قرآن میں ہے:
سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (۳۷-۱۰۲) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائے گا۔
سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ صَابِرًا (۱۸-۶۹) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔
یَاْتِیْکُمْ بِہِ اللّٰہُ اِنْ شَاءَ ...... (۱۱-۳۳) اگر اس کو خدا چاہے گا تو نازل کریگا۔
اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ (۱۲-۹۹) مصر میں

داخل ہو جائیے خدا نے چاہا تو ....

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ (۷-۱۸۸) کہدو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو خدا چاہے

وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ .... (۷-۸۹) اور ہمیں شایان نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں ہاں خدا جو ہمارا پروردگار ہے وہ چاہے تو (ہم مجبور ہیں)۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (۱۸-۲۳) اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا مگر (ان شاء اللہ کہہ کر یعنی اگر) خدا چاہے۔

(ش ی ب)

اَلشَّيْبُ وَالْمَشِيبُ بڑھاپا۔ بالوں کی سفیدی۔ قرآن میں ہے:۔

وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا (۱۹-۴) اور بڑھاپے سے سر شعلہ مارنے لگا۔

بَاتَتِ الْمَرْأَةُ بِلَيْلَةٍ شَيْبَاءَ عورت نے شب زفاف گزاری یعنی جس میں اسکی بکارت زائل کی گئی ہو اس کے برعکس بَاتَتِ الْمَرْأَةُ بِلَيْلَةٍ حُرَّةٍ وہ رات جس میں اس کی بکارت زائل نہ کی گئی ہو۔

(ش ی ت)

شِيَةٌ اصل میں وِشْيَةٌ ہے اس کی بحث باب الواو میں بیان ہوگی۔

(ش ی خ)

اَلشَّيْخُ کے معنی معمر آدمی کے ہیں۔ عمر رسیدہ آدمی کے چونکہ تجربات اور معارف زیادہ ہوتے ہیں اس مناسبت سے کثیر العلم شخص کو بھی شیخ کہہ دیا جاتا ہے۔ محاورہ ہے:۔

شَيَّخَ بَيِّنُ الشَّيْخُوخَةِ وَالشَّيْخِ وَالتَّشْيِيخِ یعنی وہ بہت بڑا عالم ہے۔ قرآن میں ہے:۔

هَٰذَا بَعْلِي شَيْخًا (۱۱-۷۲) یہ میرے میاں (بھی) بوڑھے ہیں۔

أَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ (۲۸-۲۳) ہمارے والد بڑی عمر کے بوڑھے ہیں۔

(ش ی د)

اَلْمَشِيدُ (پلستر کیا ہوا، بلند) قرآن میں ہے:۔

وَقَصْرٍ مَشِيدٍ (۲۲-۴۵) اور بہت سے بلند محل ہیں۔

تو مَشِيدٌ کے معنی یا تو پلستر کی ہوئی عمارت کے ہیں اور یا مُطَوَّلٌ (یعنی بلند) کے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی مآل کے لحاظ سے پہلے معنی کی طرف راجع ہے محاورہ ہے شَيَّدَ قَوَاعِدَهُ اس کی بنیادوں کو اسی طرح محکم بنایا جیسے گچ کی ہوئی ہوتی ہیں۔

اَلْإِشَادَةُ (افعال) کے معنی (بلند آواز سے شعر پڑھنا یا گانا) کے ہیں۔

(ش ی ط)

اَلشَّيْطَانُ اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔[1]

[1] راجع (ش ط ن)

(ش ی ع)

اَلشِّیَاعُ کے معنی منتشر ہونے اور تقویت دینا کے ہیں کہا جاتا ہے۔
شَاعَ الْخَبَرُ خبر پھیل گئی اور قوت پکڑ گئی۔
شَاعَ الْقَوْمُ قوم منتشر اور زیادہ ہوگئی۔
شَیَّعْتُ النَّارَ بِالْحَطَبِ ایندھن ڈال کر آگ تیز کرنا۔
اَلشِّیْعَۃُ وہ لوگ جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے اور وہ اس کے اردگرد پھیلے رہتے ہیں اسی سے بہادر کو مُشَیَّعٌ کہا جاتا ہے۔
شِیْعَۃٌ کی جمع شِیَعٌ وَاَشْیَاعٌ آتی ہے قرآن میں ہے:
وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرَاھِیْمَ (۳۷-۸۳) اور ان ہی یعنی نوح علیہ السلام کے پیروؤں میں ابراہیم تھے۔
ھٰذَا مِنْ شِیْعَتِہٖ وَھٰذَا مِنْ عَدُوِّہٖ (۲۸-۱۵) ایک تو موسیٰ کی قوم کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں میں سے تھا۔
وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا (۲۸-۴) وہاں کے باشندوں کو گروہ در گروہ کر رکھا تھا۔
فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ (۱۵-۱۰) پہلے لوگوں میں (بھی)۔
وَلَقَدْ اَھْلَکْنَا اَشْیَاعَکُمْ (۵۴-۵۱) اور ہم تمہارے ہم مذہبوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔

(ش ء ن)

شَاْنٌ کے معنی حالت اور اس اتفاقی معاملہ کے ہیں جو کسی کے مناسب حال ہو اسکا اطلاق صرف اہم امور اور حالات پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:
کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵-۲۹) ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔
شَاْنُ الرَّاْسِ کھوپری کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ جس سے انسان کا قوام ہے اسکی جمع شُؤُوْنٌ آتی ہے۔

(تَمَّتْ الجزالاوّل)

وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا

سنن ابو داؤد شریف (مترجم)

۴۸۰۰- احادیث نبوی ﷺ کا مستند اور گران بہا مجموعہ
جس کو شیخ الاسلام زین المحدثین امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی
نے پانچ لاکھ احادیث نبوی ﷺ کے مجموعے سے منتخب فرمایا تھا

ترجمہ و فوائد

حضرت علامہ وحید الزمان رحمہ اللہ

ملنے کا پتہ

اسلامی اکادمی ○ اردو بازار
لاہور ○ پاکستان

مفردات القرآن (اردو)

تصنیف
امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری

شیخ شمس الحق
۲۸- کشمیر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

مفردات القرآن (اردو)

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروز پوری

جلد دوم

شیخ شمس الحق
۳۸ کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

23۴۰2
۲/ غ ۔ مم

کِتَابُ الصَّادِ

(ص ب ب)

صَبَّ الْمَاءَ کے معنی اوپر سے پانی گرانا کے ہیں محاورہ ہے صَبَّ الْمَاءَ فَانْصَبَّ وَصَبَبْتُہٗ فَتَصَبَّبَ یعنی اس نے اوپر سے پانی گرایا چنانچہ پانی گر گیا۔ قرآن میں ہے۔

اِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا بے شک ہم نے ہی داوپر سے) پانی برسایا (۸۰-۲۵)

فَصَبَّ عَلَیْھِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ (۸۹-۱۳) وتمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔

یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِھِمُ الْحَمِیْمُ (۲۲-۱۹) ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی گرایا جائیگا۔

صَبَّ اِلٰی کَذَا صَبَابَۃً عاشق ہونا اور صفت کا صیغہ صاص کرصَبٌّ (بروزن فَعِلٌ) آتا ہے۔

چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ صَبٌّ بِکَذَا فلاں اس پر فریفتہ ہے۔ اور صِرْمَۃٌ کی طرح صُبَّۃٌ کے معنی بھی جانوروں کی ٹکڑی یا جماعت کے ہیں اَلصَّبِیْبُ بارش کا پانی کسی چیز کا عصارہ۔ بہایا ہوا خون اَلصُّبَابَۃُ وَالصُّبَّۃُ کسی چیز کا باقی ماندہ جو گرانے کے لائق ہو تَصَابَبْتُ الْاِنَاءَ (تَفَاعُلٌ) میں نے برتن سے باقی ماندہ پانی بھی پی لیا۔ تَصَبْصَبَ (تَفَعْلَلَ) کسی چیز کا باقی ماندہ بھی ختم ہو جانا۔

(ص ب ح)

اَلصُّبْحُ وَالصَّبَاحُ دن کا ابتدائی حصہ جبکہ افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو۔ قرآن میں ہے۔

اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ (۱۱-۸۱) کیا صبح کچھ دور ہے۔

فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِیْنَ (۳۷-۱۷۷) تو جن کو ڈر سنایا گیا ہے۔ ان کے لئے برا دن ہوگا۔

اَلتَّصَبُّحُ صبح کے وقت سونا۔ اَلصَّبُوْحُ صبح کی شراب کو کہتے ہیں اور صَبَحْتُہٗ کے معنی صبح کی شراب پلانے کے ہیں۔

اَلصَّبْحَانُ صبح کے وقت شراب پینے والا (مونث صَبْحٰی) اَلْمِصْبَاحُ (۱) پیالہ جس میں صبوحی پی جائے (۲) وہ اونٹ جو صبح تک بیٹھا رہے (۳) قندیل جس میں چراغ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ۔ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ (۲۴-۳۵) اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ اور چراغ ایک قندیل میں ہے۔

اور چراغ کو بھی مِصْبَاحٌ کہا جاتا ہے اور صُبَاحٌ

کے معنی بتی کی لو کے ہیں۔ اَلْمَصَابِیْحُ چمکدار ستارے جیسے فرمایا:۔

وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ (۶۷-۵) اور ہم نے قریب کے آسمان کو تاروں کے (چراغوں سے زینت دی۔

صَبَّحْتُهُمْ مَاءَ کَذَا میں صبح کے وقت انکے پاس فلاں پانی پر جا پہنچا اور کبھی صُبْحٌ یا صَبَاحٌ کی مناسبت سے بالوں کی سخت سرخی کو بھی صُبْحٌ کہا جاتا ہے۔

صَبُحَ فُلَانٌ خوبصورت اور حسین ہونا۔[۱]

(ص ب ر)

اَلصَّبْرُ کے معنی ہیں کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا چنانچہ صَبَرْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہوں گے میں نے جانور کو چارہ کھلائے بغیر باندھ رکھا" صَبَرْتُ فُلَانًا میں نے اسے زبردستی قسم کھلائی لہذا اَلصَّبْرُ کے معنی ہوئے عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا پس صبر ایک عام لفظ ہے جو مختلف مواقع استعمال کے اعتبار سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی مصیبت پر نفس کو روک رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے یہ جَزَعٌ کی ضد ہے اور جنگ میں نفس کو روک رکھنا کو شجاعت کہا جاتا ہے اس کی ضد جُبْنٌ (بزدلی) ہے یہی صبر اگر کسی پریشان کن حادثہ کو برداشت کرنے کی صورت میں ہو تو اسے رَحْبُ الصَّدْرِ (کشادہ دلی) کہتے ہیں جس کی ضد ضَجْرٌ ہے۔ اگر کسی بات کو روک رکھے تو اسے کِتْمَان کہتے ہیں اس کی ضد مَذَلٌ (مجبور ہو کر راز فاش کر دینا) ہے قرآن نے ان تمام صفات کو صبر کے لفظ سے یاد کیا ہے۔[۲] چنانچہ فرمایا:۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ (۲-۱۷۷) سختی اور تکلیف کے وقت ثابت قدم رہیں۔

وَالصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَآ اَصَابَهُمْ (۲۲-۳۵) اور جب ان پر مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتے ہیں۔

وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ (۳۳-۳۵) صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔

اور روزہ کو صَبْرٌ کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ضبط نفس کی ایک قسم ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا[۳] (۱)

صِیَامُ شَهْرِ الصَّبْرِ وَثَلَاثَةِ اَیَّامٍ فِیْ کُلِّ شَهْرٍ یُذْهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ (ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں) اور آیت کریمہ:۔

فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَی النَّارِ (۲-۱۷۵) یہ آتش (جہنم) کی کیسی برداشت کرنے والے ہیں۔[۴] کی تفسیر میں ابو عبیدہ نے کہا ہے[۵] کہ لغت میں صبر کے معنی جرأت بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ

---

[۱] راجع الکیۃ (م ۵-۳۸) [۲] صبح یأتی بمعنی صار کما فی الآیۃ (۵-۳۰۰) (۳۲-۱۰۲)، [۳] وقد فصل الغزالی فی الاحیاء (م: ۶۶-۶۷) احسن تفصیل والبسط من ہذا فلیراجع الیہ وقد کان المؤلف معاصر الغزالی ود الغزالی مع فضلہ کان یستفید من کتب المؤلف کما ذکرنا فی التقدمۃ [۴] وفی الکنز عن الاعرابی مرفوعاً بصم شہر الصبر وصوم ثلاثۃ ایام من کل شہر یذہبن وحر الصدر جمعاً و راجع ابن جریر عن علی موقوفاً (۸: رقم ۲۳۲۰، ۲۳۴۶، ۲۳۲۱) [۵] لم اجدہ فی مجازہ بل قال ابن قتیبۃ فی مشکلہ (۷۹)، وحکی عن الفراء عن الاصمعی قول الاعرابی فان قتیبۃ تصحف بابی عبیدۃ ونسب الطبری ہذا المعنی الی قتادۃ وقد اختارہ (۲-۱۱۹-۹۲) وایضاً فانہ مجاز ابی عبیدۃ (۱: ۶۴) ولحکایۃ الاعرابی معانی القرآن للفراء (۱: ۱۰۳) والکشاف (۱: ۱۰۸) ۱۲ ۱۲ ۱۲

ایک اعرابی نے اپنے خصیم سے کہا[1]۔
مَا اَصْبَرَكَ عَلَى اللّٰهِ کہ تم خدا پر کتنے جری ہو
لیکن یہاں مجاز بصورت حقیقت ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو نے گناہ پر جرأت کرکے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو کیسے برداشت کیا۔ اور جن لوگوں نے اس کے معنی مَا اَبْقَاهُمْ عَلَى النَّارِ یا مَا اَعْمَلَهُمْ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ کئے ہیں[2] تو اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ کیونکہ کبھی صبر کے ساتھ وہ شخص بھی متصف ہوتا ہے۔ جو در حقیقت تو صابر نہ ہو لیکن بظاہر دیکھنے میں صابر نظر آتا ہو لہٰذا اس موقع پر صیغہ تعجب کا استعمال مخلوق کے لحاظ سے ہے نہ کہ باری تعالیٰ کے لحاظ سے اور آیت کریمہ :۔
اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا (۳-۲۰۰) ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو۔
کے معنی یہ ہیں کہ عبادت الٰہی پر اپنے آپ کو روک رکھو اور خواہشات نفسانی کے خلاف جہاد کرو اور آیت کریمہ :
فَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (۱۹-۶۵) اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہو۔ میں اِصْطَبِرْ کے معنی مشقت کے ساتھ صبر کرنے کے ہیں اور آیت :۔
اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا کے معنی یہ ہیں کہ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے جو تکالیف انہوں نے برداشت کیں اس کے بدلے انہیں جنت میں بالاخانے دیئے جائیں گے اور آیت :۔
فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ (۱۲-۱۸) اچھا صبر (کہ وہی) خوب ہے۔
میں صبر کا حکم اور اس کی تلقین ہے۔
اَلصَّبُوْرُ صبر پر قدرت رکھنے والا اَلصَّبَّارُ کے معنی تکلیف اور مجاہدہ سے صبر کرنے والا کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۴-۱۹)
اس میں ہر صابر و شاکر کے لئے نشانیاں ہیں۔
اور چونکہ انتظار میں صبر لازم ہے بلکہ یہ صبر ہی کی ایک قسم ہے اس لئے کبھی صبر کا لفظ بول کر انتظار کے معنی مراد لے لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (۶۸-۴۸) تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کئے رہو۔ یعنی کفار پر خدا کے حکم کا انتظار کیجئے۔

(ص ب غ)

اَلصَّبْغُ یہ صَبَغْتُ (ص) کا مصدر ہے اور صِبْغٌ بمعنی مَصْبُوْغٌ آتا ہے[3] اور آیت کریمہ :۔
صِبْغَةَ اللّٰهِ (۲-۱۳۸) (کہہ دو کہ ہم نے) خدا کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ میں اس عقل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر پیدا کی ہے اور وہ اس کے ذریعہ بہائم سے ممتاز ہوتا ہے۔ جیسا کہ فطرت انسانیہ۔
نصاریٰ کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا تو وہ ساتویں روز اسے "عمودیہ" زرد رنگ کا پانی میں غوطہ دیتے اور اس کا نام صِبْغَةَ یعنی دین رکھتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے دین کو صِبْغَةَ اللّٰهِ کہا اور فرمایا۔
وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲-۱۳۸) اور خدا سے بہتر رنگ یعنی دین کس کا ہو سکتا ہے۔
اور آیت کریمہ :۔
وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۳-۲۰) اور کھانے والے کے لئے سالن۔ میں صِبْغٌ کے معنی سالن کے ہیں اور یہ اَصْبَغْتُ بِالْخَلِّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس

---

[1] حکاہ الاصمعی عن قاضی الیمن (المشکل ۲۹)، [2] منسوب الی مجاہدؒ

[3] ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

کے معنی سر کہ میں روٹی ڈبو کر کھانے کے ہیں۔

(ص ب و)

اَلصَّبِیُّ نابالغ لڑکا رَجُلٌ مُّصْبٍ عیال دار جس کے بچے نابالغ ہوں۔ قرآن میں ہے:۔
کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا (۱۹-۲۹) (وہ بولے کہ) ہم اس سے کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔
صَبَا فُلَانٌ یَصْبُوْ صَبْوًا وَصَبْوَۃً کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے سے کام کرنے لگا۔
قرآن میں ہے:۔
اَصْبُ اِلَیْھِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰھِلِیْنَ (۱۲-۳۳) تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں داخل ہو جاؤں گا۔
اَصْبَانِیْ فَصَبَوْتُ اس نے مجھے گرویدہ کیا چنانچہ میں گرویدہ ہو گیا۔
اَلصَّبَا۔ پروائی ہوا۔ صَابَیْتُ السَّیْفَ اس نے تلوار نیام میں ڈالی۔ صَابَیْتُ الرُّمْحَ نیزہ مارنے کے لئے جھکا دیا۔
اَلصَّابِئُوْنَ ایک فرقے کا نام ہے جو نوح علیہ السلام کے دین پر ہونے کا مدعی تھا اور ہر وہ آدمی جو ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے اسے صَابِئٌ کہا جاتا ہے یہ صَبَأَ نَابُ الْبَعِیْرِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کچلی نکل آئی۔ قرآن میں ہے:۔
وَالصَّابِئِیْنَ وَالنَّصَارٰی (۲۲-۱۷) اور ستارہ پرست اور عیسائی۔
وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ (۲-۶۲) اور عیسائی یا ستارہ پرست۔
اور ایک قرات میں صَابِیْنَ (بدون ہمزہ کے) ہے بعض نے کہا ہے کہ ہمزہ تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت:۔
لَا یَاْکُلُہٗ اِلَّا الْخَاطُوْنَ (۶۹-۳۷) جس کو گنہگار کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔
میں اَلْخَاطُوْنَ اصل میں خَاطِئُوْنَ ہے۔ اور بعض نے کہا نہیں بلکہ یہ صَبَا یَصْبُوْ سے مشتق ہے جس کے معنی مائل ہونا اور جھکنا کے ہیں[۱]۔

(ص ح ب)

اَلصَّاحِبُ۔ کے معنی ہیں ہمیشہ ساتھ رہنے والا خواہ وہ کسی انسان یا حیوان کے ساتھ رہے یا مکان یا زمان کے اور عام اس سے کہ وہ مصاحبت بدنی ہو جو کہ اصل اور اکثر ہے یا بذریعہ عنایت اور ہمت کے ہو جس کے متعلق کہ شاعر نے کہا ہے (الطویل) (۲۷۰) لَئِنْ غِبْتَ عَنْ عَیْنِیْ لَمَا غِبْتَ عَنْ قَلْبِیْ (اگر تو میری نظروں سے غائب ہے تو دل سے تو غائب نہیں ہے) اور حرف میں صاحب صرف اسی کو کہا جاتا ہے جو عام طور پر ساتھ رہے اور کبھی کسی چیز کے مالک کو بھی ھُوَ صَاحِبُہٗ کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح اس کو بھی جو کسی چیز میں تصرف کا مالک ہو۔ قرآن میں ہے:۔
اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ (۹-۴۰) اس وقت

---

[۱] ولذا ذکرالمؤلف تحت (ص ب و) علہ وعمدۃ: انا والذی لوشار لم یخلق الہوی۔ والبیت فی الامالی (۲: ۱۹۲) وقال انشدنا منصور بن بشر وفیہ النوی بدل الہوی والحصری فی زہرۃ (۱: ۱۹۳) لغیر عزو وفیہ نما بدل لما وبعدہ: یومنیک الشوق حتی کانما اناجیک من قرب
فان لم تکن قربی ففی روایۃ ترحنیک ولم اجد من عزاہ الی قائلہ ؎

پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو۔
قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ (۱۸-۳۷) تو اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا۔
اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ (۱۸-۹) کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور لوح والے۔
وَاَصْحٰبُ مَدْيَنَ (۲۲-۴۴) اور مدین کے رہنے والے بھی۔
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ .... (۲-۸۲) وہ جنت کے مالک ہوں گے (اور) ہمیشہ اس میں (عیش کرتے) رہیں گے۔
وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (۶۸-۴۸) اور مچھلی کا لقمہ ہونے والے (یونس) کی طرح نہ ہونا۔ اور آیت کریمہ:۔
مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۳۵-۶) تاکہ وہ دوزخ والوں میں ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَمَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (۷۴-۳۱)
اور ہم نے دوزخ کے داروغہ فرشتے بنائے ہیں۔
میں اَصْحٰبَ النَّارِ سے دوزخی مراد نہیں ہیں بلکہ دوزخ کے داروغے مراد ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔
پھر "صاحب" کا لفظ کبھی ان کی طرف مضاف ہوتا ہے جو کسی کے زیر نگرانی ہوتے ہیں جیسے صَاحِبُ الْجَيْشِ (فوج کا حاکم) اور کبھی حاکم کی طرف جیسے صَاحِبُ الْاَمِيْرِ (بادشاہ کا وزیر) اَلْمُصَاحَبَةُ وَالْاِصْطِحَابُ میں بنسبت لفظ اَلْاِجْتِمَاعُ کے مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ مُصَاحَبَةٌ کا لفظ عرصہ دراز تک ساتھ رہنے کو مقتضی ہے اور لفظ اجتماع میں یہ شرط نہیں ہے لہذا اِصْطِحَابٌ کے موقعہ پر اجتماع کا لفظ تو بول سکتے ہیں مگر اجتماع کی جگہ پر ہر مقام میں اصطحاب کا لفظ نہیں بول سکتے اور آیت کریمہ:۔

مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۳۴-۴۶) تمہارے رفیق کو سودا نہیں۔ میں آنحضرت ﷺ کو صَاحِبُكُمْ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ زندگی بسر کی ہے ان کا تجربہ کر چکے ہو اور ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہو چکے ہو پھر بتاؤ کہ ان میں کوئی دماغی خلل یا دیوانگی پائی جاتی ہے۔ یہی معنی آیت وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (۸۱-۲۲) کے ہیں۔
اَلْاِصْحَابُ لِلشَّيْءِ کے معنی ہیں "وہ فرمانبردار ہو گیا" اصل میں اس کے معنی کسی کا مصاحب بن کر اس کے ساتھ رہنے کے ہیں۔ چنانچہ اَصْحَبَ فُلَانٌ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا بیٹا بڑا ہو کر اس کے ساتھ رہنے لگے۔ اور اُصْحِبَ فُلَانٌ فُلَانًا کے معنی ہیں وہ اس کا ساتھی بنا دیا گیا قرآن میں ہے:۔
وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ (۲۱-۴۳) اور نہ ہم سے پناہ ہی دیئے جائیں گے۔
یعنی ہماری طرف سے ان پر سکینت تسلی کشائش وغیرہ کی صورت میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی چیزوں سے اولیاء اللہ کی مدد کی جاتی ہے۔
اَدِيْمٌ مُّصْحَبٌ کچا چمڑہ جس سے بال نہ اتارے گئے ہوں۔

(ص ح ف)

اَلصَّحِيْفَةُ کے معنی پھیلی ہوئی چیز کے ہیں جیسے صَحِيْفَةُ الْوَجْهِ (چہرے کا پھیلاؤ) اور وہ چیز جس میں کچھ لکھا جاتا ہے اسے بھی صحیفہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع صَحَائِفُ وَصُحُفٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (۸۷-۱۹) یعنی

ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔ اور آیت کریمہ:۔
يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸-۲-۳) پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم (آیتیں) لکھی ہوئی ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ صُحُفٌ سے قرآن پاک مراد ہے اور اس کو صُحُفًا اور فِيهَا كُتُبٌ اس لئے کہا ہے کہ قرآن کتب سابقہ کی بنسبت بہت سے زائد احکام اور نصوص پر مشتمل ہے۔
اَلْمُصْحَفُ متعدد صحیفوں کا مجموعہ اس کی جمع مَصَاحِفُ آتی ہے اور اَلتَّصْحِيفُ کے معنی اشتباہ حروف کی وجہ سے کسی صحیفہ کی قرأت یا روایت میں غلطی کرنے کے ہیں۔ اور صَحْفَةٌ (چوڑی رکابی)[1] جو نسبۃً پیالے کی طرح کا ایک برتن۔

(ص خ خ)

اَلصَّاخَّةُ یہ صَخَّ يَصِخُّ صَخًّا فَهُوَ صَاخٌّ سے اسم ہے جس کے معنی کسی ذی نطق کی آواز کی سختی اور کرخت پن کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ (۸۰-۳۳) تو جب (قیامت کا) غل مچے گا۔ میں صَاخَّةٌ سے مراد قیامت ہے جس کی طرف کہ آیت کریمہ:۔
يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ (۲۰-۱۰۲) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور اسی سے اَصَاخَ يُصِيخُ مقلوب ہے جس کے معنی آواز کی سختی سے کسی کو بہرہ کر دینا کے ہیں۔

(ص خ ر)

اَلصَّخْرُ کے معنی سخت پتھر یا چٹان کے ہیں قرآن میں ہے:۔
فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ (۳۱-۱۶) اور خواہ وہ کسی پتھر کے اندر
وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۸۹-۹) اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جنہوں نے وادی (قری) میں چٹانیں تراش کر (مکان بنائے)۔

(ص د د)

اَلصَّدُودُ وَالصَّدُّ کبھی لازم ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے روگردانی اور اعراض برتنے کے ہیں جیسے فرمایا:۔
يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا (۴-۶۱) کہ تم سے اعراض کرتے اور رکے جاتے ہیں۔
اور کبھی متعدی ہوتا ہے یعنی روکنے اور منع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ (۲۹-۳۸) اور شیطان نے ان کے اعمال ان کو آراستہ کر دکھائے اور ان کو سیدھے رستے سے روک دیا۔
الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۱۶-۸۸) جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) خدا کے رستے سے روکا۔
وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۸-۴۷) اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔
قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۲-۲۱۷) (اے پیغمبر) کہدو کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا۔
وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنْزِلَتْ إِلَيْكَ (۲۸-۸۷) اور وہ تمہیں خدا کی آیتوں

[1] وجمعہ صحاف (۴۳-۷۱)

(کی تبلیغ) سے ایعد اس کے کہ وہ تم پر نازل ہو چکی ہیں روک نہ دیں۔

علی نہ اللہ. یاس اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یہ لفظ روکنے اور منع کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صُدُوْدٌ وَصَدٌّ دونوں مصدر ہیں۔ نیز پہاڑ کی روک کو بھی صَدٌّ کہا جاتا ہے[1]۔

اَلصَّدِیْدُ پیپ کیونکہ وہ چمڑے اور گوشت کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ اور دوزخیوں کے طعام کو بطور مثال کے صدید کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا:۔

وَیُسْقٰی مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ (۱۴-۱۶) اسے پیپ کا پانی پلایا جائیگا۔

(ص د ر)

اَلصَّدْرُ سینہ کو کہتے ہیں قرآن میں ہے:۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (۲۰-۲۵) میرے پروردگار اس کام کے لئے میرا سینہ کھول دے۔

اس کی جمع صُدُوْرٌ آتی ہے جیسے فرمایا:۔

وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰۰-۱۰) اور جو بھید دلوں میں ہیں وہ ظاہر کر دیئے جائیں گے۔

وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (۲۲-۴۶) بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں۔

پھر بطور استعارہ ہر چیز کے اعلیٰ (اگلے) حصہ کو صَدْرٌ کہنے لگے ہیں جیسے صَدْرُ الْقَنَاۃِ (نیزے کا بھالا) صَدْرُ الْمَجْلِسِ (صدر مجلس) صَدْرُ الْکِتَابِ اور صَدْرُ الْکَلَامِ وغیرہ صَدَرَہٗ کے معنی کسی کے سینہ پر مارنے یا اس کا قصد کرنے کے ہیں جیسا کہ ظَھَرَہٗ وَکَتَفَہٗ کے معنی کسی کی پیٹھ یا کندھے پر مارنا کے آتے ہیں۔ اور اسی سے رَجُلٌ مَصْدُوْرٌ کا محاورہ ہے۔ یعنی وہ شخص جو سینہ کی بیماری میں مبتلا ہو پھر جب صَدَرَ کا لفظ عَنْ کے ذریعہ متعدی ہو تو معنی اِنْصَرَفَ کو متضمن ہوتا ہے جیسے صَدَرَتِ الْاِبِلُ عَنِ الْمَآءِ صَدَرًا وَصَدْرًا اونٹ پانی سے سیر ہو کر واپس لوٹ آئے۔ قرآن میں ہے:۔

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا (۹۹-۶) اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے۔

اور مَصْدَرٌ کے اصل معنی پانی سے سیر ہو کر واپس لوٹنا کے ہیں۔ یہ ظرف مکان اور زمان کے لئے بھی آتا ہے اور علمائے نحو کی اصطلاح میں مَصْدَرٌ اس لفظ کو کہتے ہیں جس سے فعل ماضی اور مستقبل کا اشتقاق فرض کیا گیا ہو۔ اور صِدَارٌ بروزن دِثَارٌ وَلِبَاسٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے سینہ ڈھانپا جائے اور اسے صُدْرَۃٌ بھی کہا جاتا ہے اور صِدَارٌ اس داغ کو کہتے ہیں جو اونٹ کے سینہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

صَدَرَ الْفَرَسُ گھوڑے کا دوڑ میں اول آنا۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں قلب کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں صرف علم وعقل کی طرف اشارہ ہے جیسے فرمایا:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ... (۵۰-۳۷) جو شخص دل آگاہ رکھتا ہے اس کے لئے اس میں نصیحت ہے۔

اور جہاں صَدْرٌ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں علم وعقل کے علاوہ شہوت، ہوائے نفس اور غضب وغیرہ قوی نفسانیہ کی طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (۲۰-۲۵) میں نفسانی

---

[1] وَاِلَیْنَا مَدَدْ رِضٰی یَصِیْدُ صَدِیْدًا (۲۳-۵۶)

قوی کی اصلاح کا ہی سوال ہے اسی طرح آیت :۔
وَشِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰-۵۷) میں بتایا ہے کہ قرآن پاک نفسیاتی امراض کے لئے شفا ہے۔ اور آیت کریمہ۔ وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ (۹-۱۴) میں اشارہ ہے کہ مومن ہی اس سے نفسیاتی شفا حاصل کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔ فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (۲۲-۴۶) بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

میں قلوب سے مراد وہ عقول ہیں جو جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کر ان میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں اور صحیح راستے کی طرف ہدایت نہیں پا سکتیں۔

(ص د ع)

اَلصَّدْعُ کے معنی ٹھوس اجسام جیسے شیشہ لوہا وغیرہ میں شگاف ڈالنا کے ہیں [1]۔ صَدَعَ (ف) وَصَدَّعَ متعدی ہے اور اِنْصَدَعَ وَتَصَدَّعَ لازم اسی سے استعارہ کے طور پر صَدَعَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی امر کو ظاہر اور واضح کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (۱۵-۹۴) پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے اسے کھول کر بیان کرو۔

اور اسی سے صُدَاعٌ کا لفظ مستعار ہے جس کے معنی درد سر کے ہیں جس سے گویا سر پھٹا جا رہا ہو۔ قرآن میں ہے:۔

لَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْھَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ (۵۶-۱۹) اس سے نہ تو درد سر ہوگا اور نہ ان کی عقلیں زائل ہوں گی۔

اور اسی سے صَدِیْعٌ بمعنی فجر ہے۔ اور صَدَعْتُ الْفَلَاۃَ کے معنی بیاباں طے کرنے کے ہیں تَصَدَّعَ الْقَوْمُ لوگ منتشر ہوگئے۔ قرآن میں ہے:۔

یَوْمَئِذٍ یَّصَّدَّعُوْنَ (۳۰-۴۳) اس روز (سب لوگ) الگ الگ ہو جائیں گے۔

(ص د ف)

صَدَفَ عَنْہُ کے معنی سخت اعراض برتنے کے ہیں اور اَلصَّدَفُ اصل میں (۱) پہاڑ کے کنارہ (۲) سیپ اور (۳) اونٹ کی ٹانگوں میں کجی کو کہتے ہیں۔ پھر ٹانگوں کے ٹیڑھے پن یا پہاڑ اور سیپ کی سختی کے اعتبار سے شدت اعراض کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَصَدَفَ عَنْھَا سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ ..... بِمَا کَانُوْا یَصْدِفُوْنَ (۶-۱۵۷) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرے اور ان سے منہ پھیر لے جو ہماری آیتوں سے اعراض برتتے ہیں اس اعراض کے سبب ہم ان کو ..... سزا دیں گے۔

(ص د ق)

اَلصِّدْقُ۔ یہ اَلْکِذْبُ کی ضد ہے اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے۔ وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو۔ الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال

[1] وفی القرآن وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۸۶-۱۲) ۱۲

ہوتے ہیں پھر قول میں بھی صرف خبر کے لئے آتے ہیں اور اس کے ماسوا دیگر اصناف کلام میں استعمال نہیں ہوتے اسی لئے ارشاد ہے:۔

وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا (۴-۱۲۲) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (۱۹-۵۴) وہ وعدے کے سچے ۔۔۔۔۔ تھے۔

مگر کبھی بالعرض یعنی ضمنی طور پر دیگر اصناف کلام مثلاً استفہام امر دعا وغیرہ کے لئے بھی آجاتے ہیں مثلاً۔ أَزَيْدٌ فِي الدَّارِ (کیا زید مکان کے اندر موجود ہے؟) بظاہر استفہام کلام ہے مگر ضمناً اس میں خبر کے معنی بھی پائے جاتے ہیں یعنی یہ کہ متکلم زید کی حالت سے بے خبر ہے اسی طرح وَاسِنِيْ (میرے ساتھ ہمدردی کیجئے) اصل میں درخواست ہے مگر ضمناً معنی خبر مفہوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ میں ہمدردی کا محتاج ہوں اسی طرح جب لَا تُؤْذِ (مجھے تکلیف مت دو) کہا جائے تو اس کے ضمن میں یہ معنی پایا جاتا ہے کہ وہ اسے ایذا پہنچاتا ہے۔

اَلصِّدْقُ کے معنی ہیں دل و زبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا ایسی صورت میں یا تو وہ کلام صدق کے ساتھ متصف ہی نہیں ہوگی اور یا وہ مختلف حیثیتوں سے کبھی صدق اور کبھی کذب کے ساتھ متصف ہوگی مثلاً ایک کافر جب اپنے ضمیر کے خلاف مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتا ہے تو اسے نفس واقعہ کے مطابق ہونے کی حیثیت سے صدق (سچ) بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کے دل زبان کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے کذب (جھوٹ) بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس دوسری حیثیت سے اللہ نے منافقین کو ان کے اس اقرار میں کہ:۔ نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (۶۳-۱) ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ جھوٹا قرار دیا ہے کیونکہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ بات کہہ رہے تھے۔

اَلصِّدِّيْقُ۔ بہت سچ بولنے والا بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ صدیق اسے کہتے ہیں جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور بعض نے کہا ہے بلکہ صدیق وہ ہے جو سچ کا اس قدر خوگر ہو کہ اس سے جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو اور بعض کے نزدیک صدیق وہ ہے جو قول و اعتقاد میں سچا ہو اور پھر اپنی سچائی کی تصدیق اپنے عمل سے بھی کر دکھائے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا (۱۹-۴۱) اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔

وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ (۵-۷۵) اور ان کی والدہ (مریم) خدا کی ولی۔ اور آیت:۔

مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ (۴-۶۹) یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء۔ میں صِدِّيقِينَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو فضیلت میں انبیاء سے کچھ کم درجہ کے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم اپنی کتاب الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ میں بیان کر چکے ہیں۔

کبھی صدق و کذب کا استعمال ہر اس چیز کے متعلق ہوتا ہے جو عقیدہ میں ثابت اور موجود ہو جیسے صَدَقَ ظَنِّيْ وَكَذَبَ (اس نے میرا گمان سچ کر دکھایا یا جھوٹ کر دکھایا) اور کبھی ان کا استعمال افعال جوارح کے متعلق ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص جنگ میں حق شجاعت ادا کرے اور جو کچھ اور جیسا کہ اس پر

واجب ہوا اسے کر دکھائے تو ایسے شخص کے متعلق کہا جاتا ہے۔ صَدَقَ فِی الْقِتَالِ (وہ جنگ میں سچا رہا) اور اگر اس کے خلاف کرے تو کَذَبَ فِی الْقِتَالِ کہا جاتا ہے (یعنی وہ جنگ میں جھوٹا نکلا) اسی کے مطابق قرآن میں ہے:۔

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (۳۳-۲۳) یعنی ایسے شخص بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ اور آیت کریمہ:۔

لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (۳۳-۸) کے معنی یہ ہیں کہ زبان سے سچ بولنے والوں سے ان کی عملی سچائی کے متعلق دریافت کرے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ نجات کے لئے زبان سے حق کا اعتراف ہی کافی نہیں ہے جب تک کہ انسان عملاً اسے پورے کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اور آیت کریمہ:۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ (۴۸-۲۷) میں صدق فعلی مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی خواب کو عملاً سچ کر دکھایا اسی طرح آیت کریمہ:۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ (۳۹-۳۳) کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص جو سچائی لوگوں کے پاس لے کر آئے اور پھر اسے اپنے عمل سے بھی سچ کر دکھایا۔ نیز ہر وہ فعل جو ظاہر و باطن کے اعتبار سے فضیلت کے ساتھ متصف ہو اسے صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے اس بنا پر ایسے فعل کو صدق کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (۵۴-۵۵) یعنی سچے مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔

اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۱۰-۲) کہ ان کے پروردگار کے ہاں ان کا سچا درجہ ہے۔

اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (۱۷-۸۰) اور کہو کہ اسے پروردگار مجھے (مدینے) اچھی طرح داخل کیجیو اور (مکے سے) اچھی طرح نکالیو۔ اور آیت:۔

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۲۶-۸۴) اور پچھلے لوگوں میں میرا ذکر نیک (جاری) کر میں یہ دعا کی ہے کہ اللہ! مجھے ایسا صالح بنادے کہ میری موت کے بعد جب لوگ میری تعریف کریں تو ان کی تعریف غلط نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے (۲۷۳)[1]

اِذَا نَحْنُ اَثْنَيْنَا عَلَيْكَ بِصَالِحٍ
فَاَنْتَ الَّذِيْ نُثْنِيْ وَفَوْقَ الَّذِيْ نُثْنِيْ

جب ہم کسی بھی اچھے کام پر تیری تعریف کرتے ہیں تو تم واقعی اس تعریف کے اہل نکلتے ہو بلکہ ہماری تعریف سے بھی تم بڑھ کر ہو۔

اور صَدَقَ کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۳-۱۵۲) اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا ہے۔

صَدَّقْتُ فُلَانًا کے معنی ہیں کسی کو سچائی کی طرف منسوب کرنا اور اَصْدَقْتُهٗ کے معنی سچا پانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں فعل ہم معنی ہیں اور ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ

---

[1] قالہ ابونواس فی مدح الامین والبیت فی الوساطۃ ۱۸۳ و دیوانہ والصناعتین ۲۰۸ والحصری (۴: ۷۱) وبعدہ ٭ وان جرت الالفاظ یوما بمدحۃ۔ لغیرک انسانا فانت الذی نعنی ۱۲

لِمَا مَعَهُمْ (۲-۱۰۱) اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے پیغمبر (آخر الزمان) آئے اور وہ ان کی آسمانی کتاب کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (۵-۴۶) اور ان پیغمبروں کے بعد انہی کے قدموں پر ہم نے عیسٰی بن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے (کی) کتاب (تورات) کی تصدیق کرتے تھے۔

اَلتَّصْدِيْقُ کا لفظ اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس میں کسی چیز کی تحقیق پائی جائے محاورہ ہے۔ صَدَّقَنِيْ فِعْلُهٗ وَكِتَابُهٗ اس نے اپنے عمل یا کتاب سے میری تصدیق کر دی۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (۲-۸۹) اور جب خدا کے ہاں سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان کی (آسمانی) کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (۳-۳) اس نے (اے محمدؐ) تم پر سچی کتاب نازل کی جو پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا (۴۶-۱۲) اور یہ کتاب عربی زبان میں ہے اسکی تصدیق کرتی ہے۔ یعنی پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے یہاں لِسَانًا منصوب علی الحال ہے مثل مشہور ہے (مثل) صَدَقَنِيْ سِنَّ بَكْرِهٖ[1] یعنی اس نے اپنے دل کی بات صحیح طور پر بتا دی۔

اَلصَّدَاقَةُ کے معنی سچی دوستی کے ہیں اور یہ انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ (۲۶-۱۰۱) (تو آج) نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا اور نہ گرم جوش دوست۔ اس میں آیت کریمہ:۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (۴۳-۶۷)۔ جو (آپس میں) دوست (ہیں) اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اَلصَّدَقَةُ (خیرات) ہر وہ چیز جو انسان اپنے مال سے قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے اور یہی معنی زکوٰۃ کے ہیں مگر صَدَقَةٌ اسے کہتے ہیں جو واجب نہ ہو اور زکوٰۃ وہ ہے جس کا دینا واجب ہو۔ اور کبھی واجب کو بھی صَدَقَةٌ سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ خیرات دینے والا اس سے صدق یعنی صلاح و تقوی کا قصد کرے قرآن میں ہے:۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (۹-۱۰۳) ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کر لو۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ (۹-۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں کا حق ہے۔

صَدَّقَ وَتَصَدَّقَ کے معنی صدقہ دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى (۷۵-۳۱) تو اس (ناعاقبت اندیش) نے نہ تو زکوٰۃ دی اور نہ نماز پڑھی۔

اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ (۱۲-۸۸) کہ خدا خیرات کرنے والوں کو ثواب دیتا ہے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ (۵۷-۱۸) جو

---

[1] انظر مکاتبہ المیدانی رقم ۲۰۸۳، ۲۱۱۰ وسن منصوب علی معنی عرفنی وروی بالرفع علی التوسع قالہ علی و ابوعمرو نسبہ الی الاحنف حین رجع من عند معاویۃ والخبر فی المیدانی واللسان (صدق) ۱۲

لوگ خیرات کرنے والے ہیں مرد بھی اور عورت بھی۔ اسی طرح اور بھی بہت سی آیات میں اور تَصَدَّقَ بِہٖ کے معنی اپنے حق سے دست بردار ہو جانا بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِہٖ فَھُوَ کَفَّارَۃٌ لَّہٗ (۵-۴۵) اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس کیلئے کفارہ ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ (۲-۲۸۰) اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو تو اسے کشائش کے حاصل ہونے تک مہلت دو اور اگر زر قرض بخش ہی دو تو تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے۔ میں مُعْسِرٌ یعنی تنگ دست کو معاف کر دینے کو صَدَقَۃٌ کے قائم مقام قرار دیا ہے اور اسی معنی میں آنحضرت سے مروی ہے[1] (۲)
مَا تَاْکُلُہُ الْعَافِیَۃُ فَھُوَ صَدَقَۃٌ کہ جو کھیتی جانور کھا جائیں وہ بھی صدقہ ہے۔
اسی بنا پر آیت کریمہ:۔
فَدِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّصَّدَّقُوْا (۴-۹۲) اور دوسرے مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے ہاں اگر وہ معاف کر دیں۔ میں معاف کر دینے کو صدقہ قرار دیا ہے۔ اور آیات کریمہ:۔
فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقَۃً (۵۸-۱۲) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقٰتٍ (۵۸-۱۲) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔ میں صحابہؓ کو حکم دیا گیا تھا کہ جو شخص آنحضرت سے سرگوشی کرنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ سرگوشی سے پہلے حسب توفیق کچھ نذرانہ پیش کرے جس کی قرآن نے کوئی مقدار متعین نہیں کی تھی اور آیت کریمہ:۔
رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (۶۳-۱۰) اے میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں خیرات کر لیتا اور نیک لوگوں میں داخل ہو جاتا۔ میں اَصَّدَّقَ صِدْقٌ سے بھی ہو سکتا ہے اور صَدَقَۃٌ سے بھی۔
صَدَاقُ الْمَرْءَۃِ (بفتحہ صاد و کسرآں) وصَدُقَتُھَا[2] کے معنی عورتوں کے مہر کے ہیں اور اَصْدَقْتُھَا کے معنی ہیں میں نے اس کا مہر مقرر کیا قرآن میں ہے:۔
وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِھِنَّ نِحْلَۃً (۴-۴) اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔

(ص د ی)

اَلصَّدٰی۔ صدائے بازگشت جو کسی شفاف مکان سے ٹکرا کر واپس آئے اور اَلتَّصْدِیَۃُ (تفعیل) ہر اس آواز کو کہتے ہیں جو صَدٰی کی طرح ہو یعنی جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ اور آیت:۔
وَمَا کَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً (۸-۳۵) اور لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔

---

[1] انظر مجمع البحار ۲ رہ ۲۹۴ والنہایۃ (صدق)، وبمعناہ متفق علیہ من (دحم، ت) حدیث انس راجع الفتح (۵ ر ۲-۳) وفی الدارمی من حدیث جابر: وما اکلت العافیۃ منہ اری من حاصل الارض ایضا الترمذی وابن حبان۔ عن جابر رکنز العمال ج ۳ ص ۱۴۱ (۱۱)

[2] قال الجوہری الصَّدُقَۃ بالضم وتسکین الدال لغۃ وفی القرآن صدقتہ بضم الدال وجمعہ صُدُقَات ۱۲

میں بتایا ہے کہ ان کی نماز بے معنی ہونے میں صدی یا پرندکی چہچہاہٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

اَلتَّصَدِّیْ صدائے بازگشت کی طرح کسی چیز کے درپے ہونا۔ قرآن میں ہے:۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى (۸۰-۵-۶)

جو پرواہ نہیں کرتا اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو۔

اَلصَّدٰى کے معنی بوم یا دماغ کے ہیں کیونکہ دماغ بھی بوم کی شکل پر ہوتا ہے اسی لئے اس کو ہامہ بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے۔ (مثل)

اَصَمَّ اللّٰهُ صَدَاهُ خدا اسے ہلاک کرے یعنی اس میں آواز ہی نہ رہے حتیٰ کہ اس کی صدائے بازگشت آئے۔

صَدًى پیاس صَدْيَانٌ پیاسا آدمی اِمْرَءَةٌ صَدْيَاءُ وَصَادِيَةٌ پیاسی عورت۔

(ص ر ر)

اَلْاِصْرَارُ کسی گناہ پر سختی سے جم جانا اور اس سے باز نہ آنا اصل میں یہ صَرٌّ سے ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور صُرَّةٌ اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں نقدی باندھ کر رکھ دی جاتی ہے اور صِرَارٌ پستان بند اس لتہ کو کہتے ہیں جس سے اونٹنی کے تھن باندھ دیئے جاتے ہیں تاکہ اس کا بچہ دودھ نہ پی سکے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْهُ (۳-۱۳۵) اور وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے۔

ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا (۴۵-۸) مگر پھر غرور سے ضد کرتا ہے۔

وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (۷۱-۷) اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ (۵۶-۴۶) اور گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔

اَلْاِصْرَارُ پختہ عزم کو کہتے ہیں۔ محاورہ ہے:۔

هٰذَا مِنِّیْ صِرِّیْ وَاَصِرِّیْ وَصُرِّیْ وَصِرَّی وَصَرِّیْ وَصُرِّیْ یعنی میں اس کا عزم کر چکا ہوں۔

اَلصَّرُوْرَةُ وہ مرد یا عورت جو حج نہ کرے۔ وہ شخص جسے نکاح کی خواہش نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

رِيْحًا صَرْصَرًا (۵۴-۱۹) زور کی ہوا (چلائی)۔

میں صَرْصَرٌ کا لفظ صِرٌّ سے ہے۔ گویا سخت سرد ہونے کی وجہ سے اس میں بستگی پائی جاتی ہے۔

اَلصَّرَّةُ جماعت جس کے افراد باہم ملے جلے ہوں۔ گویا وہ کسی تھیلی میں باندھ دیئے گئے ہیں قرآن میں ہے:۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ (۵۱-۲۹) ابراہیم کی بیوی چلاتی آئی۔

بعض نے کہا ہے کہ صَرَّةٍ کے معنی چیخ کے ہیں۔[۲]

(ص ر ح)

اَلصَّرْحُ بلند، منقش و مزین مکان۔ ہر قسم کے عیب سے پاک ہونے کے اعتبار سے اسے صَرْحٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ (۲۷-۴۴) ایسا محل ہے جس کے (نیچے بھی) شیشے جڑے ہوئے ہیں۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ (۲۷-۴۴) (پھر) اس سے

[۱] وفی روایۃ عن ابن عباس لا صرورۃ فی الاسلام رواہ ابو داؤد والحاکم والطبرانی النیل (۶: ۱۰۸) وقال الجاحظ فی الحیوان (۱: ۳۴۸) انہ اسم اسلامی وانظر بخصوص الحدیث (وینسنک ۲۹۹ سطر ۱۳) والفائق ۲/۱ [۲] کذا قال المفسرین ونقل ذالک عن ابن عباس ومجاہد وقال ابو عبیدۃ معناہ شدۃ الصوت وقال الزجاج الصرۃ اشد الصیاح تکون فی الطائر والانسان وغیرہما وما اعلم احدا من المفسرین ذہب الی ان المراد من صرۃ بہما جماعۃ واللہ اعلم۔

کہا گیا کہ محل میں چلئے۔

لَبَنٌ صَرِيْحٌ خالص دودھ۔ صَرِيْحُ الْحَقِّ خالص حق جس میں باطل کی آمیزش نہ ہو صَرَّحَ فُلَانٌ فِيْ نَفْسِهٖ فلاں نے اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کر دی، محاورہ ہے۔

عَادَ تَعْرِيْضُكَ تَصْرِيْحًا۔ تمہاری تعریض نے تصریح کا کام دیا۔

جَاءَ صُرَاحًا وہ کھلے بندوں آیا۔

(ص ر ط)

اَلصِّرَاطُ سیدھی راہ۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا (۶-۱۵۳) اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔

اسے سِرَاط (بسین مهملة) پڑھا جاتا ہے ملاحظہ ہو (س ر ط)

(ص ر ع)

اَلصَّرْعُ (ف) کے معنی ہیں زمین پر پٹخ دینا، پچھاڑ دینا۔ صَرَعْتُهٗ صَرْعًا میں نے اسے پچھاڑ دیا۔ اَلصِّرْعَةُ پچھڑے ہوئے آدمی کی حالت۔ اَلصِّرَاعَةُ کشتی لڑنے کا فن رجل صَرِيْعٌ پچھاڑا ہوا آدمی قَوْمٌ صَرْعٰى پچھڑے ہوئے لوگ قرآن میں ہے:۔

فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى (۶۹-۷) یعنی تم دیکھو گے کہ لوگ پچھڑے پڑے ہیں۔

اور قِنْوَانِ کی طرح هُمَا صِرْعَانِ کہا جاتا ہے یعنی وہ دونوں ایک دوسرے کے برابر اور مثل ہیں۔

اَلْمِصْرَعَانِ مِنَ الْبَابِ۔ دروازے کے دو پٹ۔ پھر تشبیہ کے طور پر شعر کے دونوں مصرعوں کو بھی مِصْرَعَانِ کہا جاتا ہے۔

(ص ر ف)

اَلصَّرْفُ کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا یا کسی اور چیز سے بدل دینا۔

محاورہ ہے صَرَفْتُهٗ فَانْصَرَفَ میں نے اسے پھیر دیا چنانچہ وہ پھر گیا۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ (۳-۱۵۲) پھر خدا نے تم کو ان کے مقابلے سے پھیر کر بھگا دیا۔

اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ (۱۱-۸) دیکھو جس روز وہ ان پر واقع ہوگا پھر ٹلنے کا نہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۱۲۷) میں بددعا بھی ہو سکتی ہے اور اس حالت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں پیدا کر دی تھی اور آیت کریمہ:۔

فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا (۲۵-۱۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم میں قدرت نہیں ہوگی کہ ہمارے عذاب کو اپنے سے پھیر سکو یا اپنی جانوں کو آگ سے بچا سکو۔

اور بعض نے صَرْفًا کے معنی کئے ہیں کہ تم اپنی حالت کو تبدیل نہیں کر سکو گے۔ اسی سے کہا جاتا ہے[1]۔ (۳)

لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَّلَا عَدْلٌ یعنی نہ ان کا

---

[1] متفق علیہ من روایۃ علی و انس وفی مسلم من روایۃ ابی ہریرۃ انظر تخریج الکشاف للحافظ، رقم ۵ قالہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذکر المدینۃ وفی الفائق ۲/۱ الصرف التوبۃ والعدل الفدیۃ

فرض قبول ہوگا اور نہ نفل اور آیت کریمہ :۔
وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ (۴۶-۲۹) کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کا رخ تیری طرف پھیر دیا یعنی ان کو تمہارے پاس لے آئے کہ تم سے قرآن سنیں۔

اَلتَّصْرِيْفُ بمعنی صَرْفٌ ہے لیکن اس میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں اور عام طور پر یہ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنے یا ایک امر سے دوسرے امر کی طرف تبدیل کرنے کے لئے آتا ہے اور تَصْرِيْفُ الرِّيٰحِ (۲-۱۶۴) کے معنی ہیں ہواؤں کے رخ کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دینا۔ قرآن میں ہے :۔
وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ (۴۶-۲۷) اور آیات کو لوٹا لوٹا کر بیان کر دیا۔
وَصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ (۲۰-۱۱۳) اور اس میں طرح طرح کے وعید بیان کر دیئے ہیں۔
اور اسی سے محاورہ ہے :۔
تَصْرِيْفُ الْكَلَامِ یعنی بات کو لوٹا لوٹا کر بیان کرنا۔
تَصْرِيْفُ الدَّرَاهِمِ دراہم کو پرکھنے کے لئے الٹنا پلٹنا تَصْرِيْفُ النَّابِ دانت پیسنا کہا جاتا ہے نَابٌ بِهٖ صَرِيْفٌ وندانش بانگ کنند۔
اَلصَّرِيْفُ (ایضًا) دودھ جس کے جھاگ بیٹھ گئے ہوں۔ گویا وہ جھاگ سے پھیر دیا گیا ہے یا جھاگ اس سے پھیر دیئے گئے ہیں۔
رَجُلٌ صَيْرَفٌ وَصَيْرَفِيٌّ وَصَرَّافٌ سکہ پرکھنے والے یا ان کا تبادلہ کرنے والے عَنْزٌ صَارِفٌ بکری جسے نر کی خواہش ہو اور اسے صَارِفٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ نر کو اپنی جانب پھیرنے کی کوشش کرتی ہے۔
اَلصِّرْفُ خالص سرخ رنگ اور ہر خالص چیز کو جس میں ملاوٹ نہ ہو صِرْفٌ کہا جاتا ہے گویا اس سے ملاوٹ کو پھیر دیا گیا ہے۔
اَلصَّرَفَانُ قلعی یا سکہ گویا وہ چاندی کے برابر ہونے سے پھیر دیا گیا ہے۔

(ص ر م)

اَلصَّرْمُ کے معنی ریوڑ کے ہیں اور اَلصَّرِيْمَةُ کسی کام کے احکام اور ابرام کو کہتے ہیں اور ریت کے علیحدہ ٹکڑے کو اَلصَّرِيْمُ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ :۔
فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ (۶۸-۲۰) تو وہ ایسے ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ باغ ان درختوں کی طرح ہو گیا جن کے پھل کاٹ لئے گئے ہوں یعنی صَرِيْمٌ بمعنی مَصْرُوْمٌ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ صَرِيْمٌ رات کو بھی کہتے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ یعنی کھیتی سوختہ ہو کر رات کی طرح سیاہ ہو گئی۔ قرآن میں ہے :۔
اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (۶۸-۱۷) جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہوتے ہم اس کا میوہ توڑ ڈالیں گے۔
فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِيْنَ (۶۸-۲۱) جب صبح ہوئی تو وہ لوگ ایک دوسرے کو پکارنے لگے اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔
اَلصَّارِمُ تیز تلوار نَاقَةٌ مَصْرُوْمَةٌ اونٹنی جس کا دودھ خشک ہو گیا ہو۔ گویا اس کے پستان کاٹ دیئے گئے ہیں۔
تَصَرَّمَتِ السَّنَةُ سال گزر گیا۔ اِنْصَرَمَ الشَّيْءُ

کسی چیز کا منقطع ہو جانا اَصْرَمَ الرَّجُلُ وہ آدمی بدحال ہو گیا۔

(ص ط ر)

صَطَرَ وَسَطَرَ (ن) کے ایک ہی معنی ہیں یعنی لکھنا (سیدھی لائنوں میں) اور آیت :۔ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (۵۲-۳۷) یا یہ (کہیں کہ) داروغہ ہیں۔ میں اَلْمُصَيْطِرُوْنَ سَطْرٌ سے مُفَيْعِلٌ کے وزن پر ہے۔ اور التسطیر جس کے معنی لکھنے کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ کیا تخلیق سے قبل یہ اپنے نوشتہ تقدیر کے لکھنے پر مقرر تھے (کہ انہیں ہر بات کا علم ہو چکا ہے یعنی نہیں) اس میں آیت کریمہ :۔ اِنَّ ذَالِكَ فِيْ كِتَابٍ اِنَّ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۲۲-۷۰) یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے بیشک یہ سب خدا کو آسان ہے۔ اور آیت كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن (یعنی لوح محفوظ) میں لکھ رکھا ہے۔ کے معنی کی طرف اشارہ ہے اور آیت لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸-۲۲) تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم ان پر لکھنے کے لئے مقرر نہیں ہو اور نہ ہی اس چیز کو ثابت کرنے کے ذمہ دار ہو جس کے یہ متولی بنتے ہیں اور عربی میں سَيْطَرْتُ وَبَيْطَرْتُ کے علاوہ تیسرا لفظ اس وزن پر نہیں آتا تشریح کے لئے دیکھئے (س ط ر)

(ص ع د)

اَلصُّعُوْدُ کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں ایک ہی جگہ کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صُعُوْدٌ اور نیچے اترنے کے لحاظ سے حَدُوْرٌ کہا جاتا ہے۔ اصل میں صَعَدٌ وَصَعِيْدٌ وَصُعُوْدٌ تینوں ہم معنی ہیں لیکن صَعُوْدٌ وَصَعَدٌ کا لفظ عقبہ یعنی گھاٹی پر بولا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر دشوار اور گراں امر کو صَعَدٌ کہہ دیتے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۷۲-۱۷) اور جو شخص اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیریگا وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کریگا۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (۷۴-۱۷) ہم اسے صَعُوْدٌ پر چڑھائیں گے۔

اور صَعِيْدٌ کا لفظ وَجْهُ الْاَرْضِ یعنی زمین کے بالائی حصہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے :۔ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (۴-۴۳) تو پاک مٹی لو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صَعِيْدٌ اس گرد و غبار کو کہتے ہیں جو اوپر چڑھ جاتا ہے لہٰذا نماز کے تیمم کے لئے ضروری ہے کہ گرد و غبار سے ہاتھ آلودہ ہو جائیں اور آیت کریمہ :۔

كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ (۶-۱۲۵) گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ میں يَصَّعَّدُ اصل میں يَتَصَعَّدُ ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔

اَلْاِصْعَادُ (افعال) بقول بعض اس کے معنی زمین میں دور تک چلے جانا کے ہیں عام اس سے کہ وہ جانا بلندی کی طرف ہو یا پستی کی طرف گو اس کے اصل معنی بلند جگہوں کی طرف جانا کے ہیں۔ مثلاً بصرہ سے نجد یا حجاز کی طرف جانا بعدہ صرف دور

لے قال الزجاج لا اعلم خلافا بین اہل اللغۃ فی ذالک والطبری (۵-۱۴۸)

نکل جانے پر اِصْعَادٌ کا لفظ بولا جانے لگا ہے جیسا کہ تَعَالَ کہ اس کے اصل معنی علو یعنی بلندی کی طرف بلانے کے ہیں اس کے بعد صرف آنے کے معنی میں بطور امر استعمال ہونے لگا ہے عام اس سے وہ آنا بالائی کی طرف ہو یا پستی کی طرف قرآن میں ہے:۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ (۳-۱۵۳) جب تم لوگ دور نکلے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اِصْعَادٌ سے دور نکل جانا مراد نہیں ہے۔ بلکہ اشارہ ہے کہ انہوں نے بھاگنے میں غُلُوٌّ اختیار کیا یعنی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی جیسے محاورہ ہے:۔

اَبْعَدْتُ فِیْ کَذَا وَارْتَقَیْتُ فِیْهِ کُلَّ مُرْتَقًی یعنی میں نے اس میں انتہائی کوشش کی بنا بریں آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم نے دشمن کا خوف محسوس کرنے اور لگاتار ہزیمت کھانے میں انتہا کر دی اور استعارہ کے طور پر صُعُوْدًا کا لفظ ان انسانی اعمال کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جو خدا تک پہنچتے ہیں جیسا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان تک پہنچتی ہے اسے نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ (۳۵-۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔ یَسْلُکْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۷۲-۱۷) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کریگا۔ میں صَعَدًا کے معنی شاق یعنی سخت کے ہیں اور یہ تَصَعَّدَنِیْ کَذَا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی امر کے دشوار اور مشکل ہونے کے ہیں[1]۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا[2]۔ (۲)

مَا تَصَعَّدَنِیْ اَمْرٌ مَا تَصَعَّدَنِیْ خُطْبَةُ النِّکَاحِ کہ مجھے کوئی چیز خطبہ نکاح سے زیادہ دشوار محسوس نہیں ہوتی۔

(ص ع ر)

اَلصَّعَرُ کے اصل معنی گردن میں کجی کے ہیں۔ اور تَصْعِیْرٌ کے معنی ہیں تکبر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا کرنا اور اعراض برتنا چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱-۱۸) اور (تکبر کی بنا پر) لوگوں سے روگردانی نہ کرو۔

اور ہر مشکل امر کو مُصْعَرٌ کہا جاتا ہے شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پیدائشی طور پر اَصْعَرُ یعنی کج گردن ہوتا ہے۔

(ص ع ق)

اَلصَّاعِقَةُ اور صَاقِعَةُ دونوں کے تقریبًا ایک ہی معنی ہیں یعنی ہولناک دھماکہ۔ لیکن صَقْعٌ کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور صَعْقٌ اجسام علوی کے بارے میں بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ صَاعِقَةٌ تین قسم پر ہے۔ اول بمعنی موت اور ہلاکت جیسے فرمایا:۔ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ (۳۹-۶۸)

---

[1] راجع الغریب للقتبی ۱۹۴ والمجاز لابی عبید ۱۲ [2] انظر لقول عمر الغریب للقتبی ۱۹۴ والقرطبی ۱۸ والکشاف ۹۵/۴ والفخر (۳۰-۱۶۲) والنہایۃ (۲-۲۶۳) والفائق (۲: ۴۲) واللسان (صعد) والبحر ۳۵/۷ وفی اللسان (کأد) والاضداد لابی الطیب ۹-۶ ما تکاءدنی شیئ ما تکاءدنی خطبۃ النکاح والغریب لابی عبید (۳/۳۸۷) عن عروۃ عن عمرؓ

تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب کے سب مر جائیں گے۔
فَاَخَذَتْکُمُ الصَّاعِقَۃُ (۵۱-۴۴) سو تم کو موت نے آپکڑا۔
دوم بمعنی عذاب جیسے فرمایا:۔
اَنْذَرْتُکُمْ صَاعِقَۃً مِّثْلَ صَاعِقَۃِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱-۱۳) میں تم کو مہلک عذاب سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر وہ (عذاب) آیا تھا۔
سوم بمعنی آگ (اور بجلی کی کڑک)۔ جیسے فرمایا:۔
وَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِھَا مَنْ یَّشَآءُ (۱۳-۱۳) اور وہی بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے گرا بھی دیتا ہے۔
لیکن یہ تینوں چیزیں دراصل صَاعِقَہ کے آثار سے ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو فضا میں سخت آواز کے ہیں پھر کبھی تو اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے یعنی دراصل وہ ایک ہی چیز ہے اور یہ سب چیزیں اس کے آثار سے ہیں۔

(ص غ ر)

اَلصِّغَرُ یہ اَلْکِبَرُ کی ضد ہے جو کہ ایک دوسرے کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں ایک ہی چیز دوسری چیز کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے اور وہی کسی اور چیز کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے پھر صغیر وکبیر کا اطلاق کبھی تو باعتبار زمانہ کے ہوتا ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے سے عمر میں چھوٹا ہوتا ہے اور دوسرا بڑا اور کبھی باعتبار جسامت کے اور کبھی بلحاظ قدر ومنزلت کے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَکُلُّ صَغِیْرٍ وَّکَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ (۵۴-۵۳) یعنی ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔
لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّآ اَحْصٰھَا (۱۸-۴۹) نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے اور آیت کریمہ:۔
وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْبَرَ (۱۰-۶۱) اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے اور نہ بڑی۔ میں خیر وشر کا بلحاظ قدر ومنزلت کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑا اور چھوٹا ہونا مراد ہے۔
صَغِرَ صِغَرًا کے معنی چھوٹا ہونا کے ہیں جو اَلْکِبَرُ کی ضد ہے اور صَغُرَ صَغَرًا وَصَغَارًا کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں اور ذلیل اور کم مرتبہ آدمی کو جو اپنی ذلت پر قانع ہو صَاغِرٌ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ (۹-۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

(ص غ و ی)

اَلصَّغْوُ (ن) کے معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں مثلاً صَغَتِ النُّجُوْمُ وَالشَّمْسُ ستارے یا سورج کا مائل بہ غروب ہونا۔ صَغَیْتُ الْاِنَاءَ وَاَصْغَیْتُہٗ میں نے برتن کو مائل کر دیا۔ جھکا دیا۔ اَصْغَیْتُ اِلٰی فُلَانٍ میں نے اس کی طرف کان لگایا۔ اس کی بات سننے کے لئے مائل ہوا قرآن میں ہے:۔
وَلِتَصْغٰۤی اِلَیْہِ اَفْئِدَۃُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ (۶-۱۱۳) اور (وہ ایسے کام) اس لئے بھی (کرتے تھے) کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے دل ان کی طرف مائل رہیں۔

اور کلام عرب میں صَغَوْتُ اِلَیْہِ اَصْغُوْ صَغْوًا وَصَغَیْتُ اَصْغٰی صُغِیًّا (دونوں طرح) منقول ہے اور بعض نے اَصْغَیْتُ اُصْغِیْ یعنی باب افعال بھی استعمال کیا ہے اور جو لوگ کسی کے طرفدار اور حمایتی ہوں۔ انہیں صَاغِیَۃُ الرَّجُلِ کہا جاتا ہے فُلَانٌ مُصْغِیٌّ اِنَاءُہٗ فلاں بدنصیب ہے اور کبھی یہ ہلاکت سے بھی کنایہ ہوتا ہے۔ عَلَیْہِ صَغْوُہٗ اِلٰی کَذَا وہ فلاں چیز کی طرف مائل ہے اور اَلصَّغْیُ کے معنی تالو یا آنکھ میں کجی کے ہیں۔

(ص ف ف)

اَلصَّفُّ (ن) کے اصل معنی کسی چیز کو خط مستوی پر کھڑا کرنا کے ہیں جیسے انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کرنا یا ایک لائن میں درخت وغیرہ لگانا اور بقول ابوعبیدۃ کبھی صَفٌّ بمعنی صَافٌّ بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ آیات :۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا ..... (۶۱-۴) جو لوگ خدا کی راہ میں (ایسے طور پر) پرے جما کر لڑتے ہیں ..... وہ بیشک محبوب کردگار ہیں۔

ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا (۲۰-۶۴) پھر قطار باندھ کر آؤ۔

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (۸۹-۲۲) اور فرشتے قطار باندھ کر آموجود ہوں گے۔ میں صَفًّا مصدر بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی صَافِّیْنَ (اسم فاعل) بھی اور آیات :۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّوْنَ (۳۷-۱۶۵) اور ہم صف باندھتے رہتے ہیں۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (۳۷-۱) قسم ہے صف بستہ جماعتوں کی میں صَافُّوْنَ اور صَافَّاتٌ سے مراد فرشتے ہیں نیز فرمایا :۔

وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ (۲۴-۴۱) اور پرند بازو پھیلائے ہوئے۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ (۲۲-۳۶) تو قربانی کرنے کے وقت قطار میں کھڑے ہوئے اونٹوں پر خدا کا نام لو۔

اور صَفَفْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کی صف لگانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَۃٍ (۵۲-۲۰) صف میں لگائے تختوں پر۔

صَفَفْتُ اللَّحْمَ کے معنی گوشت کے پارچوں کو بریاں کرنے کے لئے سیخ کشید کرنے کے ہیں اور سیخ کشید کئے ہوئے پارچوں کو صَفِیْفٌ کہا جاتا ہے۔

اَلصَّفْصَفُ ہموار میدان گویا وہ ایک صف کی طرح ہے۔ قرآن میں ہے :۔

فَیَذَرُھَا قَاعًا صَفْصَفًا لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَلَا اَمْتًا (۲۰-۱۰۶-۱۰۷) اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا جس میں نہ تم کجی (اور پستی) دیکھو گے اور نہ ٹیلا (اور نہ بلندی)۔

اَلصُّفَّۃُ کے معنی سایہ دار چبوترہ یا برآمدہ کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر زین کی گدی کو صُفَّۃُ السَّرْجِ کہا جاتا ہے۔

اَلصَّفُوْفُ وہ اونٹنی جو زیادہ دودھ دینے کی وجہ سے دو یا تین برتن بھر دے یا وہ جو دودھ دوہنے کے وقت اپنی ٹانگوں کو ایک قطار میں رکھ کر کھڑی ہو جائے۔

لہ الصحیح ان یقال مصغی اناءہ ای من اصغی انظر الصحاح للجوہری واساس البلاغۃ للزمخشری ۱۲

اَلصَّفْصَافُ بید کا درخت۔

(ص ف ح)

صَفْحٌ۔ کے معنی ہر چیز کا چوڑا پہلو یا جانب کے ہیں مثلاً صَفْحَۃُ الْوَجْہِ (چہرے کی جانب) صَفْحَۃُ السَّیْفِ (تلوار کا چوڑا پہلو) صَفْحَۃُ الْحَجَرِ (پتھر کی چوڑی جانب) وغیرہ۔

اَلصَّفْحُ (مصدر) کے معنی ترک ملامت اور عفو کے ہیں مگر یہ عفو سے زیادہ بلیغ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ (۲-۱۰۹) تو تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا دوسرا حکم بھیجے۔ میں عفو کے بعد صَفْحٌ کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات انسان عفو یعنی درگزر تو کر لیتا ہے لیکن صَفْحٌ سے کام نہیں لیتا یعنی کسی سے اس قدر درگزر کرنا کہ اسے مجرم ہی نہ گردانا جائے نیز فرمایا:

فَاصْفَحْ عَنْھُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ (۴۳-۸۹) اس لئے درگزر کرو اور سلام کہہ دو۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ (۱۵-۸۵) تو تم ان سے اچھی طرح درگزر کرو۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْکُمُ الذِّکْرَ صَفْحًا (۴۳-۵) بھلا اس لئے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے۔

صَفَحْتُ عَنْہُ (۱) میں نے اس سے درگذر کرتے ہوئے اسے صَفْحٌ جَمِیْلٌ کا والی بنایا یعنی اسکے جرم سے کلیۃً اعراض برتا (۲) اس سے دور ہوتے ہوئے ایک جانب سے ملا (۳) میں نے کتاب کے اس صفحہ سے تجاوز کیا جس میں اس کا جرم لکھ رکھا تھا۔ اس صورت میں یہ تَصَفَّحْتُ الْکِتَابَ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی کتاب کے صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ (۱۵-۸۵) اور قیامت تو ضرور آکر رہے گی لہٰذا تم ان سے اچھی طرح سے درگزر کرو۔

اس آیت میں آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ ..... (۱۶-۱۲۷) اور ان کے بارے میں غم نہ کرو اور جو یہ بداندیش کر رہے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو۔

اَلْمُصَافَحَۃُ مصافحہ کرنا۔ ہاتھ ملانا۔

(ص ف د)

اَلصَّفَدُ وَالصِّفَادُ کے معنی لوہے کی زنجیر یا طوق کے ہیں اس کی جمع اَصْفَادٌ ہے یعنی لوہے کے زنجیر جن سے قیدیوں کو جکڑا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ (۳۸-۳۸) جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

نیز اَلصَّفَدُ کے معنی عطیہ بھی آتے ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے۔

اَنَا مَغْلُوْلُ اَیَادِیْکَ وَاَسِیْرُ نِعْمَتِکَ میں تیرے احسانات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں اور تیری انعام کا قیدی بن چکا ہوں وغیر ذالک من المحاورات۔

(ص ف ر)

اَلصُّفْرَۃُ زردی، ایک قسم کا رنگ جو

سیاہی اور سفیدی کے مابین ہوتا ہے مگر اس پر چونکہ سیاہی غالب ہوتی ہے اس لئے کبھی اس کے معنی سیاہی بھی آجاتے ہیں۔ اسی بنا پر حسنؒ نے آیت:۔ بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا (۲-۶۹) اس کا رنگ گہرا زرد ہو۔ میں صَفْرَاءُ کے معنی سیاہ کئے ہیں[۱] مگر بعض نے کہا ہے کہ اگر اس کے معنی سیاہ ہوتے تو اس کی صفت فَاقِعٌ نہ آتی بلکہ صَفْرَاءُ کے بعد حَالِكَةٌ کہا جاتا ہے[۲]۔ نیز فرمایا:۔ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا (۳۹-۲۱) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ (۷۷-۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صُفْرٌ اَصْفَرُ کی جمع ہے[۳] اور بعض نے کہا ہے کہ صُفْرٌ ایک دھات کا نام ہے جس کے ساتھ زردی میں تشبیہ دی گئی ہے) اسی سے نُحَاسٌ (پیتل) کو صُفْرٌ اور خشک بھنی (گھاس) کو صُفَارٌ کہا جاتا ہے اور کبھی صَفِيرٌ کا لفظ ہر اس آواز کی حکایت پر بولا جاتا ہے جو دور سے سنائی دے اسی سے صَفِرَ الْإِنَاءُ کا محاورہ ہے جس کے اصل معنی تو اس خالی برتن کے ہیں جس سے صَفِيرٌ کی سی آواز سنائی دے پھر عرف میں ہر خالی چیز کو صِفْرٌ کہنے لگے ہیں خواہ وہ برتن ہو یا اور کوئی چیز اور پیٹ اور رگوں کے غذا سے خالی ہونے کی صَفَرٌ کہا گیا ہے اور ان رگوں کو جو جگر اور معدہ کے مابین پھیلی ہوئی ہیں جب غذا میسر نہ ہو تو وہ معدہ کے اجزا کو چوسنے لگتی ہیں اس بنا پر جاہل عربوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ صَفَرٌ پیٹ میں ایک سانپ کا نام ہے جو بھوک کے وقت پسلیوں کو کاٹتا ہے۔ حتی کہ آنحضرت کو لَا صَفَرَ کہہ کر اس عقیدہ کی نفی کرنا پڑی[۴] (۵) یعنی پیٹ میں اس قسم کا سانپ نہیں ہوتا جس کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[۵] (عو بسیط)

(۲۷۳) وَلَا يَعَضُّ عَلَى شُرْسُوفِهِ الصَّفَرُ

اور نہ اس کی پسلیوں کو صفر (سانپ) کاٹتا ہے۔

---

[۱] راجع لقول الحسن الدر المنثور (۱: ۷۸) وتفسیر الطبری (۱: ۳۴۸) ورد علی الحسن ابن قتیبة فی غریبه (۵۳-۵۴) والطبری والشوکانی (۱: ۹۸) وقال ہذا من بدع التفاسیر و منکراتہا وقال ابوعبیدة فی مجازه (۱: ۴۴) ان نشئت صفرا، وان خشنت سودا و به فسر السجستانی فی غریبه (۱۰۹-۱۱۰) والبخاری تعالی فی الفتح (۸: ۲۳) من الاضداد و السجستانی فی اضداده [۲] کذا فی الشوکانی (۱: ۹۸) [۳] قاله ابوعبیدة فی مجازه (۲: ۲۸۱) [۴] رواه البخاری ومسلم و ابوداؤد فی سننه من حدیث ابی ہریرة والسائب بن یزید والترمذی فی القدر وغریب ابی عبید (۱: ۲۵) والفائق (۲: ۶۱) [۵] البیت لاعشی باہلة واسمه عامر بن الحارث یرثی المنتشر بن وہب اخیه لامه واختلف الروایات فی صدره؛ ففی اللسان (صفر) وجمہرة اشعار العرب ۲۵۷ صدره: لایتاسی لمافی القدر یرقبه۔ وہذا یوافق روایة الامالی (۲: ۱۹۷) وروایة المرتضی (۲: ۲۲) وملحقات دیوان الاعشی ۲۶۸ لکن بلفظ یتاری بدل یتاسی وخطاؤا الصاغانی وروی صدره لایغمز الساق من این ولا وصب وہذا مطابق لمارواه الطبری فی تفسیره (۴: ۹۱) وہی الروایة فی امالی المرتضی (۱: ۲۳۰) ویوافق امالی القالی ۵۷ والکامل لشرح المرصفی (۸: ۲۱۲) والمحاضرات للمؤلف (۴: ۶۱۹) وروایة جمہرة اشعار العرب ۲۸۲ والمعانی للقتیبی ۱۲۳۱ و ۲۰۰۴ ایضا راجع الاصمعیات (۲۴۳ طبعه برلن) وتبله کمافی الکامل ۱۲۳: لایتاری لمافی القدر یرقبه ولاتراه امام القوم یفتقر والبیت فی الکامل فی ۲۳ بیتا والمختارات ۹-۱۲ (صنعة ہبة اللہ الحسین) فی ۳۰ بیتا والبیت فی الفائق (۲: ۱۴) وغریب ابی عبید (۱: ۲۶) وتہذیب الاصلاح (۲: ۲۷) وادب الکاتب ۳۲ والخزانة (۱: ۹۲) والبخلاء ۱۱۹ وفی الاقتضاب کلام جید علی البیت (۳۴-۳۵)

اور ماہ صفر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں ان کے گھر توشہ سے خالی ہو جاتے تھے اس لئے اسے صفر کہتے تھے اور جو بچہ ماہ صفر میں پیدا ہو اسے صَفَرِیٌّ کہا جاتا ہے۔

(ص ف ن)

اَلصَّفْنُ دو چیزوں کو اس طرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے کچھ حصے دوسروں کے ساتھ مل جائیں چنانچہ محاورہ ہے:۔
صَفَنَ الْفَرَسُ قَوَائِمَہٗ گھوڑے کا تین پاؤں پر کھڑے ہو کر چوتھے پاؤں کا سم اس طرح اٹھایا کہ اس کا اگلا حصہ زمین پر لگا رہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ (۳۸-۳۱) خاصے کے گھوڑے پیش کئے گئے۔ اور آیت کریمہ:۔
فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ ج (۲۲-۳۶) تو قربانی کرنے کے وقت صف بستہ کھڑے اونٹوں پر خدا کا نام لو۔ میں ایک قرأت صَوَافِنَ بھی ہے[1] اور باطن صلب کی رگ کو جو نیاط قلب کو جمع کرتی ہے بھی صَافِنٌ کہا جاتا ہے اور صَفَنٌ کے معنی خصیتین کی تھیلی کے ہیں۔ صُفْنٌ وہ ڈول جس کے ساتھ حلقہ بندھا ہوا ہو۔

(ص ف و)

اَلصَّفَاءُ کے اصل معنی کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش سے پاک اور صاف ہونا کے ہیں اسی سے اَلصَّفَا ہے جس کے معنی صاف اور چکنا پتھر کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (۲-۱۵۸) بے شک کوہ صفا اور مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔ میں اَلصَّفَا ایک پہاڑی کا نام ہے۔
اَلْاِصْطِفَاءُ کے معنی صاف اور خالص چیز لے لینا کے ہیں جیسا کہ اِخْتِیَارٌ کے معنی بہتر چیز لے لینا آتے ہیں اور اَلْاِجْتِبَاءُ کے معنی جِبَایَۃٌ یعنی عمدہ چیز منتخب کر لینا آتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا کبھی بطور ایجاد کے ہوتا ہے یعنی اسے ان اندرونی کثافتوں سے پاک وصاف پیدا کرتا ہے جو دوسروں میں پائی جاتی ہیں اور کبھی بطریق اختیار اور حکم کے ہوتا ہے گو یہ قسم پہلے معنی کے بغیر نہیں پائی جاتی۔ قرآن میں ہے:۔
اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (۲۲-۷۵) خدا فرشتوں اور انسانوں میں رسول منتخب کر لیتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا (۳-۳۳) خدا نے آدم اور نوح ... کو (تمام جہان کے لوگوں میں) منتخب فرمایا تھا۔
اِصْطَفَاکِ وَطَهَّرَکِ وَاصْطَفَاکِ (۳-۴۲) خدا نے تم کو برگزیدہ کیا اور پاک بنایا اور ... منتخب کیا۔
اِصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ (۷-۱۴۴) میں نے تم کو ... لوگوں سے ممتاز کیا۔
وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ (۳۸-۴۷) اور یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب اور بہتر افراد تھے۔
اِصْطَفَیْتُ کَذَا عَلٰی کَذَا ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دینا اور پسند کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
اَصْطَفَی الْبَنَاتِ عَلَی الْبَنِیْنَ (۳۷-۱۵۳) کیا اس نے بیٹوں کی نسبت بیٹیوں کو پسند کیا۔
سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی (۲۷-۵۹) اس

---

[1] وھی قراءۃ ابن عباس وجماعۃ من الصحابۃ والتابعین وفی قراءۃ صوافی راجع ابا حیان ۶/۳۶۹ واتحاف الفضلاء ۳۱۵

کے بندوں پر سلام ہے جن کو اس نے منتخب فرمایا۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵-۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا۔

اَلصَّفِیُّ وَالصَّفِیَّۃُ مال غنیمت کی وہ چیز جسے امیر اپنے لئے منتخب کرلے (جمع صَفَایَا) شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۲۷۴) لَكَ الْمِرْبَاعُ مِنْهَا وَالصَّفَایَا

تمہارے لئے اس سے ربع اور منتخب کی ہوئی چیزیں ہیں۔

نیز صَفِیٌّ وَصَفِیَّۃٌ (۱) بہت دودھ دینے والی اونٹنی (۲) بہت پھلدار کھجور۔ اَصْفَتِ الدَّجَاجَۃُ مرغی انڈے دینے سے رک گئی گویا وہ اندروں سے خالص ہوگئی اس معنی کی مناسبت سے جب شاعر شعر کہنے سے رک جائے تو اس کے متعلق اَصْفَی الشَّاعِرُ کہا جاتا ہے اور یہ اَصْفَی الْحَافِرُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کنواں کھودنے والا صفا یعنی چٹان تک پہنچ گیا جس نے اسے آئندہ کھدائی سے روک دیا جیسا کہ اَکْدٰی وَاَحْجَرَ کے محاورات اس معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اور اَلصَّفَا کی طرح صَفْوَانٌ کے معنی بھی بڑا صاف اور چکنا پتھر کے ہیں اس کا واحد صَفْوَانَۃٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ (۲-۲۶۴) اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو۔

یَوْمٌ صَفْوَانٌ خنک دن جس میں سورج صاف ہو (یعنی بادل اور غبار نہ ہو)

(ص ل ل)

اصل میں صَلْصَالٌ کے معنی کسی خشک چیز سے آواز آنا کے ہیں اسی سے صَلَّ الْمِسْمَارُ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی میخ کو کسی چیز میں ٹھونکنے سے آواز پیدا ہونا کے ہیں اور کھنکنے والی خشک مٹی کو بھی صَلْصَالٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۵۵-۱۴) ٹھیکری کی طرح کھنکھناتی مٹی سے .....

مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۱۵-۳۳) کھنکنے والی خشک مٹی یعنی سنے ہوئے گارے سے۔

اور صَلْصَلَۃٌ کے معنی باقی ماندہ پانی کے ہیں کیونکہ مشکیزہ میں باقی ماندہ پانی کے ہلنے سے کھنکناہٹ کی آواز پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ صَلْصَالٌ کے معنی سڑی ہوئی مٹی کے ہیں اور یہ صَلَّ اللَّحْمُ سے مشتق ہے جس کے معنی گوشت کے بدبودار ہوجانے کے ہیں صَلْصَالٌ اصل میں صَلَّالٌ ہے ایک لام کو صاد سے بدل دیا گیا ہے اور آیت کریمہ:۔

اَئِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ (۳۲-۱۰) کیا جب ہم زمین میں ملیامیٹ ہوجائیں گے۔ میں ایک قرأت صَلَلْنَا بھی ہے یعنی جب ہم گل سڑ گئے اور یہ)

---

[1] قالہ عبداللہ بن عنمۃ فی مرثیتہ بسطام بن قیس الشیبانی راجع شرح سقط الزند ۲۷۰۹ والاشتقاق لابن درید ۱۹۹۔۲۰۰ وبسطام ہذا احد الفرسان الثلاثۃ والتبریزی قتلہ عاصم بن خلیفۃ الضبی والبیت من ثمانیۃ رواہا ابو تمام فی الحماسۃ (۱: ۲۰۴) والمرزوقی ۵۵۳ وتمامہ: وحکمک والنشیطۃ والفضول۔ والبیت فی اللسان (ربع، نشط، غافضل) والطبرسی (۲۸۔۳۰) والنقائض ۱۹۲، ۲۳۵ والعقد الفرید ۳: ۳۴۲ والاصمعیات ۳۴ والمعانی للقتیبی ۸۴۹ والامالی (۱: ۱۴۴) والسمط (۱: ۳۸۹) والحیوان (۱: ۲۳۰)

صَلَّ اللَّحْمُ وَاَصَلَّ کے محاورہ سے مشتق ہے۔

(ص ل ب)

اَلصُّلْبُ کے معنی سخت کے ہیں اور پشت کو بھی اس کی صلابت اور سختی کی وجہ سے صُلب کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ (۸۶-۷) جو پیٹھ اور سینے کے بیچ میں سے نکلتا ہے اور آیت کریمہ:۔

وَحَلَائِلُ اَبْنَائِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ (۴-۲۳) اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی۔

میں تنبیہ کی ہے کہ اولاد باپ کا جز ہوتی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (السریع)

(۲۷۵) وَاِنَّمَا اَوْلَادُنَا بَيْنَنَا
اَكْبَادُنَا تَمْشِيْ عَلَى الْاَرْضِ

ہماری اولاد ہمارے جگر گوشے ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں اور دوسرے شاعر نے کہا ہے[2] (الرجز)

(۲۷۶) فِيْ صُلُبٍ مِثْلِ الْعِنَانِ الْمُؤْدَمِ

ایسی پشت میں جو چمڑے کی ہوئی لگام کی طرح نرم ہے۔

اَلصَّلْبُ وَالْاِصْطِلَابُ کے معنی ہڈیوں سے چکنائی نکالنا کے ہیں اور صَلَبَ جس کے معنی قتل کرنے کے لئے لٹکا دینا کے ہیں۔ بقول بعض اسے صَلَبَ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں اس شخص کی پیٹھ لکڑی کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صَلْبُ الْوَدَكِ سے ہے جس کے معنی ہڈیوں سے چکنائی نکالنا کے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (۴-۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔

لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (۲۰-۷۱) اور کھجور کے تنوں پر سولی چڑھوا دوں گا۔

اَنْ يُّقَتَّلُوْا اَوْ يُصَلَّبُوْا (۵-۳۳) کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی پر لٹکوا دیئے جائیں۔

اَلصَّلِيْبُ اصل میں سولی کی لکڑی کو کہتے ہیں نیز صلیب اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جو عیسائی بطور عبادت کے گلے میں اس خیال پر باندھ لیتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس پر سولی لٹکایا گیا تھا اور جس کپڑے پر صلیب کے نشانات بنے ہوئے ہوں اسے مُصَلَّبٌ کہا جاتا ہے۔

صَالِبٌ سخت بخار جو پیٹھ کو چور کر دے یا پسینہ کے ذریعہ انسان کی چربی نکال لائے۔

صَلَّبْتُ السِّنَانَ میں نے نیزے کے بھالے کو تیز کیا۔

اَلصُّلْبِيَّةُ سان کا پتھر جس پر اوزار تیز کئے جاتے ہیں۔

(ص ل ح)

اَلصَّلَاحُ۔ (درست، باترتیب) یہ فساد کی ضد ہے عام طور پر یہ دونوں لفظ افعال کے متعلق استعمال ہوتے ہیں قرآن کریم میں لفظ صَلَاحٌ کبھی تو فساد کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور کبھی سَيِّئَةٌ کے چنانچہ فرمایا:۔

---

[1] والبیت مع خمسة اخری فی الامالی (۲: ۱۸۵) ونسب فی اللآلی والتبریزی (۱۴ رطبعہ اوربا) الی حطان بن المعلی فالتہ تأسفا علی ریب الزمان راجع المرزوقی ۲۸۸ والمحاضرات للمؤلف (۱: ۳۲۱) والبحر (۲: ۳۹۶) والماوردی ۳۶۵ والعقد الفرید (۲: ۴۳۸) ونسبہ الی المعلی بن الخطاب السلمانی و فی العیون (۳: ۹۵) وقال الحرنی۔ [2] قالہ العجاج یصف امرأة وقبلہ ریا العظام فخمة المخدم وبعدہ: الی سواء قطن مؤکم والبیت من شواہد الکشاف ۱۲۵ وایضاً تہذیب الاصلاح (۱: ۴۶) واللسان (صلب ۱۳۱) والاضداد ابی الطیب ۴۳۳ وفیہ بعدہ: فی کفل یخضب ملکم والارجوزة بتمامہا فی دیوانہ ۱۷۵-۱۸۰)

خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا (۹-۱۰۲) انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا دیا تھا۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (۷-۵۶) اور ملک میں اصلاح کے بعد خرابی پیدا نہ کرنا۔

اور قرآن میں اکثر مقامات پر وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ آیا ہے جس کے معنی صلاحیت بخش کام کرنے کے ہیں اور اَلصُّلْحُ کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت کو دور کرکے امن وسلامتی پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے، چنانچہ اِصْطَلَحُوْا وَتَصَالَحُوْا کے معنی باہم امن وسلامتی سے رہنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (۴-۱۲۸) کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کرلیں اور صلح ہی بہتر ہے۔

وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا (۴-۱۲۹) اور اگر باہم موافقت پیدا کرو اور تقویٰ اختیار کرو۔

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (۴۹-۹) تو ان میں صلح کرادو۔

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (۴۹-۱۰) تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔

اور اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کی اصلاح کرنا کے کبھی تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرۃً صالح بنایا اور کبھی اس کے معنی اس سے خرابی اور نقص کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷-۲) اور ان کی حالت سنوار دی۔

يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (۳۳-۷۱) وہ تمہارے اعمال درست کردیگا۔

وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ (۴۶-۱۵) اور میرے لئے میری اولاد میں صلاح اور تقویٰ پیدا کر اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰-۸۱) خدا شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔ کے معنی یہ ہیں کہ مفسد لوگ چونکہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرکے خرابیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسکے برعکس ذات باری تعالیٰ ہر کام میں اصلاح کو پسند کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے اعمال کو درست قرار دے اور صالح ایک پیغمبر کا نام بھی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا (۱۱-۶۲) صالح ... ہم تم سے کئی طرح کی امیدیں رکھتے تھے۔

(ص ل د)

اَلصَّلْدُ کے معنی ٹھوس اور چکنا پتھر کے ہیں جس پر کچھ پیدا نہ ہوسکے۔ قرآن میں ہے:۔

فَتَرَكَهٗ صَلْدًا (۲-۲۶۴) تو اسے صاف کر ڈالے اسی سے رَأْسٌ صَلْدٌ ہے یعنی وہ سر جس پر بالکل بال نہ ہوں۔ نَاقَةٌ صَلُوْدٌ وَصَلَادٌ کم دودھ والی اونٹنی فَرَسٌ صَلُوْدٌ وہ گھوڑا جسے پسینہ نہ آئے صَلَدَ الزَّنْدُ چقماق سے آگ نہ نکلنا۔

(ص ل و)

اَلصَّلٰوۃُ بہت سے اہل لغت کا خیال ہے کہ صَلٰوۃٌ کے معنی دعا دینے۔ تحسین وتبریک اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے صَلَّيْتُ عَلَيْهِ میں نے اسے دعا دی نشوونمادی اور بڑھایا اور حدیث میں ہے (۱)

اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ اِلٰى طَعَامٍ فَلْيُجِبْ وَاِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ کہ جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو اسے چاہیئے کہ قبول کرلے اگر روزہ دار ہے تو وہ انکے لئے دعا کرکے واپس چلا آئے اور قرآن میں ہے

---

(۱) مختصر من حدیث ابی ہریرۃ فی (حم، م، د، ت) وفی روایۃ ابن مسعود (طب) تلیبدع انظر کنز العمال ۹:۔ رقم ۲۵۲۷۳ ، ۲۵۲۷۴ وعن ابی عبداللہ (۱۷۶، ۱۷۷) واستشہد بہ الزمخشری فی الفائق (۲/۱۷) وابن الاثیر فی النہایۃ ۱۲۔

٭ ٭ ٭ ٭

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (۹-۱۰۳) اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔

يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ (۳۳-۵۶) (خدا اور اس کے فرشتے) پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں مومنو تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجا کرو۔

وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ (۹-۹۹) اور پیغمبر کی دعاؤں کا ۔۔۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے دعا کرنے کے معنی ہیں ان کو نشو ونما دینا، بڑھانا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ (۲-۱۵۷) یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی رحمت اور مہربانی ہے۔

اور انسانوں کی طرح فرشتوں کی طرف سے بھی صلاۃ کے معنی دعا اور استغفار ہی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ (۳۳-۵۶) بے شک خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔

اور الصَّلٰوۃُ جو کہ ایک عبادت مخصوصہ کا نام ہے اس کی اصل بھی دعا ہی ہے اور نماز چونکہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے اسلئے اسے صَلٰوۃ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تَسْمِيَةُ الشَّيْءِ بِاسْمِ الْجُزْءِ کے قبیل سے ہے یعنی کسی چیز کو اس کے ضمنی مفہوم کے نام سے موسوم کرنا اور صَلَاۃٌ (نماز) ان عبادات سے ہے جن کا وجود ہر شریعت میں ملتا ہے گو اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا (۴-۱۰۳) بے شک نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ لفظ صَلٰوۃ دراصل صِلَاءٌ سے مشتق ہے لہٰذا صَلَّى الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس شخص نے اس عبادت کے ذریعہ اپنے آپ کو صَلَاءٌ یعنی دوزخ کی آگ سے دور کیا اور جس طرح مَرَّضَ کا لفظ مرض کو دور کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح صَلَّى میں بھی سلب ماخذ کے معنی پائے جاتے ہیں اور کبھی عبادت گاہ کو بھی صَلَاۃٌ کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں کَنَائِس یعنی یہود کی عبادت گاہوں کو صَلَوٰتٌ کہا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ (۲۲-۴۰) تو راہبوں کے صومعے عیسائیوں کے گرجے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو چکی ہوتیں۔

اور قرآن میں جہاں کہیں بھی نماز ادا کرنے کی تعریف کی گئی ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے وہاں اسے لفظ اقامت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ (۴-۱۶۲) اور نماز پڑھتے ہیں۔

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ (۲-۱۱۰) اور نماز ادا کرتے رہو۔

وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۲-۲۷۷) اور نماز پڑھتے رہے۔

اور محض مُصَلِّينَ کا لفظ صرف منافقین کے متعلق وارد ہوا ہے چنانچہ فرمایا:۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (۱۰۷-۴، ۵) تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

وَلَا يَأْتُونَ الصَّلٰوةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ (۹-۵۴) اور نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

اور صَلٰوۃ کے ساتھ لفظ اِقَامَۃٌ ذکر کرنے سے غرض یہ ہے کہ نماز کو محض ہیئت مخصوصہ کے ساتھ ادا کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے

حقوق وفرائض کو پورا کرنا بھی ضروری ہے اس بنا پر ایک روایت میں اَتَی الْمُصَلِّیْنَ کَثِیْرٌ وَّ الْمُقِیْمِیْنَ لَهَا قَلِیْلٌ کہ محض نماز پڑھنے والے تو بہت ہیں مگر اس کو حقوق وفرائض کے ساتھ ادا کرنے والے بہت کم ہیں اور آیت کریمہ لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (۷۴-۴۳) ہم مصلین سے نہیں تھے۔ کے معنی یہ ہیں کہ ہم انبیاء کرام کی پیروی نہیں کرتے تھے اور آیت فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی (۷۵-۳۱) نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ میں وَلَا صَلّٰی سے مراد یہ ہے کہ اس نے محض رسمی نماز بھی نہیں پڑھی چہ جائیکہ اس کے حدود وفرائض کے ساتھ اسے ادا کرتا۔ اور آیت کریمہ:۔

مَا کَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّ تَصْدِیَةً (۸-۳۵) اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔ میں ان کی نماز کو مُکَآءً اور تَصْدِیَةً کہہ کر بتایا ہے کہ ان کی نماز بے روح تھی اور ان کا یہ عمل بے وقعت بلکہ ان کی اس نماز کی حیثیت پرندوں کی چہچہاہٹ اور گنبد کی آواز سے زیادہ نہیں تھی اور آیت کریمہ:۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ کے بعد وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ (۲۳-۹) (اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔ میں صلوٰۃ کو دوبارہ لانے کی وجہ ہم اس کتاب کے بعد (یعنی تفسیر قرآن میں) ذکر کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

(ص ل ی)

اَلصَّلْیُ (س) کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں صَلِیَ بِالنَّارِ اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا صَلِیَ بِکَذَا اسے فلاں چیز سے پالا پڑا۔ صَلَیْتُ الشَّاۃَ میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مَصْلِیَّةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ (۳۶-۶۴) آج اس میں داخل ہو جاؤ۔

یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی (۸۷-۱۲) بڑی تیز آگ میں داخل ہوگا۔

تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةً (۸۸-۴) دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔

وَیَصْلٰی سَعِیْرًا (۸۴-۱۲) اور دوزخ میں داخل ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا (۴-۱۰) اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ میں ایک قرأت ضمہ یا (باب افعال) کے ساتھ بھی ہے نیز فرمایا:۔

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ یَصْلَوْنَهَا (۵۸-۸) ان کو دوزخ ہی کی سزا کافی ہے (یہ) اسی میں داخل ہوں گے۔

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ (۷۴-۲۶) ہم عنقریب اسے سقر میں داخل کریں گے۔

وَتَصْلِیَةُ جَحِیْمٍ (۵۶-۹۴) اور جہنم میں جلنا۔ اور آیت کریمہ:۔

لَا یَصْلٰهَا اِلَّا الْاَشْقَی الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۹۲-۱۵،۱۶) اس میں وہی داخل ہوگا جو بڑا بدبخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں لَا یَصْلٰهَا کے معنی لَا یَصْطَلِیْ بِهَا ہیں یعنی دوزخ کے ساتھ وابستہ اور چمٹے نہیں رہیں گے۔۔۔ اور خلیل نے کہا ہے کہ صَلِیَ الْکَافِرُ النَّارَ کے معنی یہ ہیں

کر کافر نے دوزخ کی تکلیف برداشت کی جیسے فرمایا:۔ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۸-۸۵) اسی میں داخل ہوں گے اور وہ بری جگہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صَلِيَ النَّارَ کے معنی آگ میں داخل ہونے کے ہیں اور اَصْلَاهَا کے معنی داخل کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا (۴-۳۰) ہم اسے عنقریب جہنم میں داخل کریں گے۔ اور آیت کریمہ:۔
ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا (۱۹-۷۰) اور ہم ان لوگوں سے خوب واقف ہیں جو اس میں داخل ہونے کے زیادہ لائق ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ صِلِيًّا، صَالٍ کی جمع ہے[1] صِلَاءٌ (۱) آگ جلانے کا ایندھن (۲) بھنی ہوئی چیز۔

(ص م م)

اَلصَّمَمُ کے معنی حاسہ سماعت ضائع ہو جانے کے ہیں (مجازاً) اس کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہوتا ہے جو نہ تو حق کی آواز سنے اور نہ ہی اسے قبول کرے (بلکہ اپنی مرضی کرتا چلا جائے) قرآن میں ہے:۔
صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ (۲-۱۸) (یہ) بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں۔ صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵-۷۳) اندھے اور بہرے ہو کر۔
وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ (۱۱-۲۴) اور بہرہ ہو اور ایک دیکھتا سنتا، بھلا دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے۔

وَحَسِبُوْا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا (۵-۷۱) اور یہ خیال کرکے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آنے کی یہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔ پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی لیکن پھر اندھے اور بہرے ہو گئے۔
اور تشبیہ کے طور پر ہر اس چیز کو صَمَمٌ کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے جس کی آواز سنائی نہ دے چنانچہ محاورہ ہے[2]:۔
صَمَّتْ حَصَاةٌ بِدَمٍ یعنی خون ریزی اس کثرت سے ہوئی ہے کہ اگر اس میں کنکر ڈالا جائے تو اس کی حرکت سنائی نہ دے۔
ضَرْبَةٌ صَمَّاءُ مہلک ضرب جس کے بعد مضروب کی آواز ہی سنائی نہ دے اسی سے اس بہادر کو جو تلوار کی ایک ہی ضرب سے دوسرے کو ہلاک کر ڈالے صِمَّةٌ[3] کہا جاتا ہے صَمَمْتُ الْقَارُوْرَةَ میں نے شیشی پر کاک لگایا جس سے اس کا منہ بند ہو گیا۔ اَلْاَصَمُّ بہرے کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔
صَمَّمَ فِي الْاَمْرِ اس نے اپنی مرضی کی اور کسی کی نہ سنی صِمَّان سخت زمین۔ اِشْتِمَالُ الصَّمَّاءِ کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ جسم کا کوئی حصہ ننگا نہ رہے۔

(ص م د)

اَلصَّمَدُ وہ سردار جس کی طرف ہر معاملہ

---

[1] وفی القرآن الامن ہو صال الجحیم (۳۷-۱۶۳) [2] والصحیح ان صلیا مصدر صلی وسنا صطلی (افتعال) کمافی آیۃ (۲۷-۷) [3] انظر لکلمۃ المیدانی رقم ۵ منعوا المنشاط لمحکم (صمم) والحیوان (۴: ۳۹۲) والمعانی للقتیبی ۸۵۷ مثل یقال عن شدۃ الحرب وکثرۃ القتل قال ابن بری ہو الصحیح الذی یقال بمکی بدل بدم وفی المجالس للثعلب ۱۲۵/۱ قال فی الداہیۃ ۱۲

میں رجوع کیا جائے۔ صَمَدَ صَمْدًا کسی کو معتمد سمجھ کر اس کی جانب قصد کرنا۔ بعض نے کہا ہے[1] کہ صَمَدٌ ٹھوس اور بے جوف چیز کو کہتے ہیں۔ اور بے جوف چیزیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جو انسان سے کم درجہ کی ہیں جیسے جمادات اور دوم وہ جو انسان سے اعلیٰ درجہ کی ہیں، جیسے باری تعالیٰ اور فرشتے اور آیت کریمہ:۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۱۱۲-۲) اللہ بے نیاز ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کو صمد کہہ کر اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔ کہ مشرکین نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے ذات الٰہی ان سب کے برعکس ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ (۵-۷۵) اور ان کی والدہ (مریم خدا کی ولی اور) سچی فرمانبردار تھیں دونوں (انسان تھے اور) کھانا کھاتے تھے۔ میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(ص م ع)

اَلصَّوْمَعَةُ (راہب کی کوٹھری) ہر وہ عمارت جس کا سر لمبا اور نوکدار ہو جیسے گرجے کا منارہ) اس کی جمع صَوَامِعُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ (۲۲-۴۰) تو (راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے) گرجے ...... ویران ہو چکے ہوتے۔

اور اَصْمَعُ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے کان چھوٹے ہوں گویا وہ سر کے ساتھ پیوست ہیں قَلْبٌ اَصْمَعُ بہادر گویا اس کی حالت ان لوگوں کے خلاف ہے جو کہ آیت وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ (۱۴-۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے کے مصداق ہیں۔

اَلصَّمْعَاءُ بھی گھاس جس کے شگوفے تا حال ظاہر نہ ہوئے ہوں کِلَابٌ صُمْعُ الْكُعُوْبِ یعنی چھوٹے اور باریک ٹانگوں والے کتے۔

(ص ن ع)

اَلصُّنْعُ (ف) کے معنی کسی کام کو کمال مہارت سے اچھی طرح کرنے کے ہیں اس لئے ہر صُنْع کو فعل تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر فعل کو صنع نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی لفظ فعل کی طرح حیوانات اور جمادات کے لئے بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (۲۷-۸۸) یہ خدا کی صنعت کاری ہے جس نے ہر چیز کو نہایت مہارت سے محکم طور پر بنایا۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ (۱۱-۳۸) تو نوحؑ نے کشتی بنانی شروع کر دی۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ (۱۱-۳۷) اور ایک کشتی .... بناؤ۔

اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۸-۱۰۴) کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔

صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (۲۱-۸۰) تمہارے لئے نہایت عمدگی سے ایک طرح لباس بنانا۔

مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵-۶۳) جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا (۱۱-۱۶) اور جو عمل انہوں نے (دنیا میں) کئے سب برباد۔

تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ (۲۰-۶۹) کہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے اسے نگل جائیگی جو کچھ انہوں نے بنایا وہ تو جادوگر کے ہتھکنڈے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹-۴۵) اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔

اور لفظ صُنْعٌ میں چونکہ عمدگی کے ساتھ کسی کام کو

---

[1] نسبہ فی الطبرسی ۳۰، ۲۸ ۱۲ الی اللامام الباقر وکذا قال ابن عباس وعکرمۃ والضحاک والحسن علی ما فی القرطبی والطبری وقال الثقفی فی غریبہ ...... وکل ...... الخ

سرانجام دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے کسی کام کے ماہر کاریگر کو جو عمدہ طور پر کام کرتا ہو صَنَعٌ اور ماہر عورت کو صَنَاعٌ کہا جاتا ہے اور ہر اچھے اور نیک کام کو صَنِیْعَۃٌ فَرَسٌ صَنِیْعٌ عمدہ طور پر پرورش کیا ہوا گھوڑا اور شعر زاد ہر عیب مقامات کو مَصَانِعُ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ مَصْنَعٌ کی جمع ہے) جیسے فرمایا وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ (۲۶-۱۲۹) اور محل بناتے ہو۔ اور کنایہ کے طور پر مُصَانَعَۃٌ کے معنی رشوت دینا بھی آتے ہیں اَلْاِصْطِنَاعُ کسی چیز کی نہایت زور اور توجہ سے اصلاح کرنا۔

اور آیت کریمہ:۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ اور میں نے تم کو اپنے کام کے لئے بنایا ہے (۲۰-۴۱) اور آیت:۔ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ (۲۰-۳۹) اور اس لئے کہ تم میری سامنے پرورش پاؤ۔

میں حکماء کے اس قول کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اپنا محبوب بنالیتا ہے تو اس کی اس طرح دیکھ بھال کرتا ہے جیسے ایک دوست اپنے دوست کی۔

(ص ن م)

اَلصَّنَمُ کے معنی بت کے ہیں جو کہ چاندی پیتل یا لکڑی وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔ عرب لوگ ان چیزوں کے مجسمے بنا کر ان کی پوجا کیا کرتے اور انہیں تقرب الہٰی کا ذریعہ سمجھتے تھے صَنَمٌ کی جمع اَصْنَامٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (۶-۷۵) کہ تم بتوں کو کیوں معبود بناتے ہو۔

لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ (۲۱-۵۷) میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے خدا کے سوا پوجا جائے بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا تعالیٰ سے بیگانہ بنادے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری جانب منعطف کردے صَنَمٌ کہلاتی ہے چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۱۴-۳۵) مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی پرستش اختیار کریں۔

تو اس سے بھی ایسی چیزوں کی پرستش مراد ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو معرفت الہٰی کے تحقق اور اسکی حکمت پر مطلع ہونے کے بعد یہ اندیشہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اور ان کی اولاد بت پرستی شروع کردے گی۔

(ص ن و)

اَلصِّنْوُ کسی درخت کی جڑ سے جو مختلف شاخیں پھوٹتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو صِنْوٌ کہا جاتا ہے محاورہ ہے فُلَانٌ صِنْوُ اَبِيْهِ فلاں اس کے باپ کا حقیقی بھائی ہے[1] (کیونکہ باپ اور چچا ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہوتی ہیں، صِنْوٌ کا تثنیہ صِنْوَانِ اور جمع صِنْوَانٌ آتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے هُمَا صِنْوَا نَخْلَةٍ وہ دونوں ایک ہی کھجور کی دو شاخیں ہیں (یعنی ان کی اصل ایک ہی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ (۱۳-۴) بعض کھجوریں ایسی ہیں جو ایک ہی جڑ سے پھوٹتی ہیں اور بعض الگ الگ جڑوں سے۔

(ص ھ ر)

اَلصِّهْرُ کے معنی اَلْخَتَنُ بھی آتے ہیں یعنی وہ رشتہ دار جو شوہر کی جانب سے ہوں نیز بیوی کے خاندان والوں کو اَصْهَارٌ کہا جاتا ہے یہ قول خلیل کا ہے

---

[1] وفی الحدیث العباس صنو ابی ای شقیقہ (متفق بار ۲۰)

ابن الاعرابی نے کہا ہے[1] کہ جو دس نسب یا شادی کی وجہ سے جو تعلق پیدا ہو جائے اسے اِصْھَارٌ (افعال) کہا جاتا ہے رَجُلٌ مُّصْھِرٌ وہ مرد جسے اس قسم کا تعلق حاصل ہو اور آیت کریمہ :۔

فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (۲۵-۵۴) میں نسب سے وہ رشتے داری مراد ہے جو آباء و اجداد کی جانب سے ہو اور صِھْرٌ سے مراد وہ جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔

اَلْصَّھْرُ (ف) کے معنی ہیں چربی وغیرہ کو گرم کر کے پگھلانا قرآن میں ہے :۔

یُصْھَرُ بِهٖ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ (۲۲-۲۰) اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں کے اندر ہے گال دیا جائیگا۔

اَلصُّھَارَۃُ پگھلائی ہوئی چربی ایک اعرابی کا قول ہے کہ لَاَصْھَرَنَّكَ بِیَمِیْنٍ مُّرَّۃٍ یعنی میں تمہیں پگھلا کر چھوڑوں گا۔

(ص و ب)

اَلصَّوَابُ (صحیح بات) کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے (۱) کسی چیز کی ذات کے اعتبار سے یعنی جب کوئی چیز اپنی ذات کے اعتبار سے قابل تعریف ہو اور عقل و شریعت کی رو سے پسندیدہ ہو مثلاً تَحَرِّی الْعَدْلِ صَوَابٌ (انصاف کو مدنظر رکھنا صواب ہے) اَلْکَرَمُ صَوَابٌ (کرم و بخشش صواب ہے) (۲)

قصد کرنے والے کے لحاظ سے یعنی جب کوئی شخص اپنے حسب منشا کسی چیز کو حاصل کرلے تو اس کے متعلق اَصَابَ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے مثلاً اَصَابَهٗ بِالسَّھْمِ (اس نے اسے تیر مارا) پھر اس دوسرے معنی کے اعتبار سے اس کی چند قسمیں ہیں (۱) اچھی چیز کا قصد کرے اور اسے کر گزرے یہ صواب تام کہلاتا ہے اور قابل ستائش۔

(۲) مستحسن چیز کا قصد کرے لیکن اس سے غیر مستحسن فعل سرزد ہو جائے یہ بھی صواب میں داخل ہے کیونکہ اس نے اجتہاد کے بعد اسے صواب سمجھ کر کیا ہے اور آنحضرت کے فرمان کُلُّ مُجْتَھِدٍ مُّصِیْبٌ (کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے) کا بھی یہی مطلب ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ اَلْمُجْتَھِدُ مُصِیْبٌ وَّاِنْ اَخْطَاَ فَهٰذَا لَهٗ اَجْرٌ کہ مجتہد مصیب ہوتا ہے اگر خطا وار بھی ہو تو اسے ایک اجر حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے[2] مَنِ اجْتَھَدَ فَاَصَابَ فَلَهٗ اَجْرَانِ وَمَنِ اجْتَھَدَ فَاَخْطَاَ فَلَهٗ اَجْرٌ کہ جس نے اجتہاد کیا اور صحیح بات کو پالیا تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور جس نے اجتہاد کیا اور غلطی کی تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔

(۳) کوئی شخص صحیح بات یا کام کا قصد کرے مگر کسی سبب سے اس سے غلطی سرزد ہو جائے مثلاً ایک شخص شکار پر تیر چلاتا ہے مگر اتفاق سے وہ

---

[1] ابو عبداللہ محمد بن زیاد الاعرابی شیخ ابی العباس ثعلب وربیب المفضل الضبی ولد سنہ ۱۵۰ھ وتوفی ۲۳۱ھ وقد جاوز الثمانین - ابن الندیم ۹۹، ۱۰۹، ۱۳۰ والامالی القالی ۱/۱۹۸ و ۲/۲۳۷ والانباہ (۱۰۹-۱) (۳/۱۳۱) ومعجم الادباء ۱۸/۱۸۹ والمزہر (۱: ۴۴۹/۳۹۹، ۸۹، ۴۹۰، ۵۰۵، ۲/۷، کشف الظنون ۲/۱۹۸ تاریخ بغداد ۵/۲۸۲ - ۲۸۵ (المراجع فی بروکلمن ۲۴۳-۲۰۵)

[2] وفی المطبوع بیمینی مرۃ والتصویب من المعاجم ۱۲ ۔ [3] الحدیث باختلاف الالفاظ مروی عن ابی ہریرۃ وعمرو بن العاص رواہ احمد واصحاب الکتب الستۃ وابن عبدالحکیم فی فتوح مصر باسانید من طریق ابن الہاد (۲۲۷ - ۲۲۸) راجع الرسالۃ للشافعی رقم ۱۴۰۹ - ۱۴۱۰ بتحقیق احمد شاکر۔

کسی انسان کو لگ جاتا ہے اس صورت میں اسے متعدی سمجھا جائے گا۔

(۴) ایک شخص کوئی برا کام کرنے لگتا ہے مگر اس کے برعکس اس سے صحیح کام سرزد ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کے متعلق کہا جائے گا کہ گو اس کا ارادہ غلط تھا مگر اسنے جو کچھ کیا وہ درست ہے۔

اَلصَّوَابُ (ن) کے معنی بھی اِصَابَۃٌ (افعال) ہی ہیں اور صَابَہٗ وَاَصَابَہٗ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی پہنچنا یا لگانا اور صَوْبٌ اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو صرف اسی قدر برسے جس حد تک کہ مفید ہو چنانچہ آیت کریمہ :-

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ (۴۳-۱۱) ایک اندازے کے ساتھ آسمان سے پانی نازل کیا میں بِقَدَرٍ سے یہی معنی مراد ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۲۷۷) فَسَقَى دِيَارَكَ غَيْرَ مُفْسِدِهَا
صَوْبُ الرَّبِيعِ وَدِيمَةٌ تَهْمِي

موسم ربیع کی بارش اور متواتر برسنے والا پانی تمہارے شہر اور صَيِّبٌ خاص کر صَابَ يَصُوْبُ سے فَيْعِلٌ کے وزن پر (مبالغہ کا صیغہ) ہے جس کے معنی ہیں بارش کا گرنا اوپر سے نیچے آنا شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)

(۲۷۸) فَكَاَنَّهُمْ صَابَتْ عَلَيْهِمْ سَحَابَةٌ

گویا اس پر زور کا بادل برسا ہے۔

اور آیت کریمہ :- اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ (۲-۱۸) یا ان کی مثال اس بارش کی ہے جو آسمان سے برس رہی ہو) میں بعض نے کہا ہے کہ صَيِّبٌ کے معنی بادل ہیں۔ اور بعض نے بارش مراد لی ہے۔ اور بارش کو مجازاً صَيِّبٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے سَحَابٌ کہہ دیتے ہیں اَصَابَ السَّهْمُ تیر ٹھیک نشانہ پر جا لگا اور مُصِيْبَةٌ اصل میں تو اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھ جائے اس کے بعد عرف میں ہر حادثہ اور واقعہ کے ساتھ یہ لفظ مخصوص ہو گیا ہے قرآن میں ہے :-

اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا (۳-۱۶۵) (بھلا یہ کیا) بات ہے کہ) جب (احد کے دن کفار کے ہاتھ سے) تم پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو چند مصیبت تمہارے ہاتھ سے انہیں پہنچ چکی تھی۔

فَكَيْفَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ (۴-۶۲) تو کیسی (ندامت کی) بات ہے کہ جب ..... ان پر کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے۔

وَمَا اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ (۳-۱۶۶) اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مابین مقابلہ کے دن واقع ہوئی۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲-۳۰) اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے اعمال سے۔

اور اَصَابَ (افعال) کا لفظ خیر و شر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :-

---

[1] قالہ طرفۃ والبیت فی اللسان (دیمی) و دیوانہ ۲۶ مع شرحہ لاحمد شنقیطی وفیہ بلاوک والصناعتین ۹۰ ۲ و فی بحث التتمیم والتکمیل و فی ۸۰۴ بحث الاستثناء والعمدۃ (۲: ۵۰) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۵ ۸ ۲) ونقد الشعر ۹ ۴ والعقد الثمین ۷۱ و فی غریب ابی عبید (۱: ۲۳) ویقال انہ لمرقش [2] قالہ علقمۃ بن عبدۃ وتمامہ: صواعقہا لطیرہن دبیب والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲: ۱۹۵) فی ۴۲ بیتاً و فی الموشح ۱۹ و فی اشعار الابیات المنکرۃ) ونزلوا من لستۃ ۱۰۵ والطبری (۱: ۴ ۸ ۱) واللسان والتاج (صوب) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۳۲۲) والبحر (۱: ۸۴، ۵۵) ۴ ر ۲۸۰ ۳ والحیوان (۳: ۷۶) مع اخر والمعانی للقبتی ۸۶۰ وشرح السبع لابن الانباری ۲۲ ۵ والعقد الثمین ۱۰۷ و ایام العرب ۸ ۵ و فی المطبوع فکانما صابت علیہ مصحف

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ (۹-۵۰) اے پیغمبر اگر تم کو آسائش حاصل ہوتی ہو تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر مشکل پڑتی ہے۔
وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ (۴-۷۳) اور اگر خدا تم پر فضل کرے۔
فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَاءُ (۲۴-۴۳) تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔
فَاِذَا اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۳۰-۴۸) پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اسے برسا دیتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ جب اَصَابَ کا لفظ خیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ صَوْبٌ بمعنی بارش سے مشتق ہوتا ہے اور جب برے معنی میں آتا ہے تو یہ معنی اَصَابَ السَّهْمُ کے محاورہ سے ماخوذ ہوتے ہیں مگر ان دونوں معنی کی اصل ایک ہی ہے۔

(ص و ت)

اَلصَّوْتُ (آواز) اس ہوا کو کہتے ہیں جو دو جسموں کے ٹکرانے سے منضغط یعنی دب جائے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) وہ صوت جو ہر قسم کے تنفس سے خالی ہوتا ہے جیسے صوت ممتد (۲) وہ صوت جو تنفس کے ساتھ ملا ہوتا ہے۔ پھر صوت متنفس دو قسم پر ہے۔ ایک غیر اختیاری جیسا کہ جمادات اور حیوانات سے صادر ہوتا ہے۔ دوم اختیاری جیسا کہ انسان سے صادر ہوتا ہے جو صوت انسان سے صادر ہوتا ہے پھر دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو ہاتھ کی حرکت سے پیدا ہو جیسے عُود ستار اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی آواز۔ دوم وہ جو منہ سے نکلتا ہے اس کی پھر دو قسمیں ہیں ایک وہ جو نطق کے ساتھ ہو دوم وہ جو بغیر نطق کے ہو جیسے نے یعنی بانسری کی آواز بغیر نطق کی دو صورتیں ہیں ایک مفرد دوم مرکب جو کہ انواع کلام میں سے کسی ایک نوع پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:
وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (۲۰-۱۰۸) اور خدا کے سامنے آوازیں پست ہو جائیں گی تو تم آواز خفی کے سوا کوئی آواز نہ سنو گے۔
اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (۳۱-۱۹) کیوں کہ سب آوازوں سے بری آواز گدھوں کی ہے۔ اور آیت کریمہ:
لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (۴۹-۲) اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کرو۔ میں خصوصیت کے ساتھ صوت یعنی آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ نطق و کلام سے عام ہے اور ہوسکتا ہے کہ ممانعت کا تعلق صوت یعنی محض آواز کے ساتھ ہو نہ کہ بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے نیز اس کی وجہ تخصیص یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آنحضرت کی آواز سے بلند آواز کرنے کی کراہت ظاہر کرنا مقصود ہو اور مطلق بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے ممانعت مقصود نہ ہو۔ رَجُلٌ صَيِّتٌ بلند آواز آدمی رَجُلٌ صَائِتٌ چیخنے والا اَلصِّيْتُ کے اصل معنی مشہور ہونے کے ہیں۔ مگر استعمال میں اچھی شہرت کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔
اَلْاِنْصَاتُ کے معنی چپ رہ کے توجہ کے ساتھ

کسی کی بات سننا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا (۷-۲۰۴)
اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو۔
بعض نے کہا ہے کہ انصات کے معنی جواب دینا بھی آتے ہیں[1] لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جواب تو انصات یعنی بات سننے کے بعد ہوتا ہے اور اگر اس معنی میں استعمال بھی ہو تو آیت میں اس امر پر ترغیب ہوگی کہ کان لگا کر سنو تاکہ اسے قبول کرنے پر قوت حاصل ہو۔

(ص و ر)

اَلصُّوْرَةُ: کسی عین یعنی مادی چیز کے ظاہری نشان اور خدوخال جس سے اسے پہچانا جا سکے اور دوسری چیزوں سے اس کا امتیاز ہو سکے یہ دو قسم پر ہیں (۱) محسوس جن کا ہر خاص وعام ادراک کر سکتا ہو۔ بلکہ انسان کے علاوہ بہت سے حیوانات بھی اس کا ادراک کر لیتے ہیں جیسے انسان، فرس، حمار وغیرہ کی صورتیں دیکھنے سے پہچانی جا سکتی ہیں (۲) صورۃ عقلیہ جس کا ادراک خاص خاص لوگ ہی کر سکتے ہوں اور عوام کے فہم سے وہ بالاتر ہوں جیسے انسانی عقل وفکر کی شکل وصورت یا وہ معانی یعنی خاصے جو ایک چیز میں دوسری سے الگ پائے جاتے ہیں چنانچہ صورت کے ان ہر دو معانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (۷-۱۱) پھر تمہاری شکل وصورت بنائی
وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۴۰-۶۴) اور اس نے تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی نہایت حسین بنائیں۔
فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ (۸۲-۸) اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔
اَلَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ (۳-۶) جو ماں کے پیٹ میں ..... تمہاری صورتیں بناتا ہے۔
اور حدیث[2] (۷) اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس کی خصوصی صورت پر تخلیق کیا۔ میں "صورت" سے انسان کی وہ شکل اور ہیئت مراد ہے جس کا بصر اور بصیرت دونوں سے ادراک ہو سکتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان کو بہت سی مخلوق پر فضیلت حاصل ہے اور صُوْرَتِهٖ میں اگرچہ ضمیر کا مرجع ذات باری تعالیٰ ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف لفظ صورت کی اضافت تشبیہ یا تبعیض کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اضافت ملک یعنی بلحاظ شرف کے ہے یعنی اس سے انسان کے شرف کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جیسا کہ بَيْتُ اللّٰهِ یا نَاقَةُ اللّٰهِ میں اضافت ہے جیسا کہ آیت کریمہ:۔
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۳۸-۷۲) میں روح کی اضافت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور آیت کریمہ:۔
يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ (۲۰-۱۰۲) جس روز صور پھونکا جائیگا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ صُوْر سے قرن یعنی نرسنگھے کی طرح کی کوئی چیز مراد ہے جس میں پھونکا جائیگا۔

---

[1] کما فی قولہم (ای فانصات دراجع الصحاح والمعاجم لیکن فی الآیۃ من (ن ص ت) معناہ السکوت والاستماع للحدیث لا من (ص و ت) کما ذکرہ المؤلف قال التعلب معنی الآیۃ واذا قرء الامام فاستمعوا القراءۃ ولا تتکلموا قنذ (۲-۱۲۵)
[2] الحدیث متفق علیہ عن ابی ہریرۃ راجع کنز العمال رقم ۵۵ وایضاً حم وقط فی الصفات وطب فی السنۃ عن ابی ہریرۃ وعب عن قتادۃ مرسلا وقط فی الصفات عن ابن عمر راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ج ۲ ص ۱۷۸ والکنز ج ۱ ص ۲-۲-۳-۲۔

تو اس سے انسانی صورتیں اور روحیں ان کے اجسام کی طرف لوٹ آئیں گی۔ ایک روایت میں ہے[۱] ان الصور فیہ صورۃ الناس کلھم کہ صُوْر کے اندر تمام لوگوں کی صورتیں موجود ہیں اور آیت کریمہ:۔

فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ (۲-۲۶۰) میں صِرْهُنَّ کے معنی یہ ہیں کہ ان کو اپنی طرف مائل کر لو اور ہلالو اور یہ صُوْرٌ سے مشتق ہے جس کے معنی مائل ہونے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی پارہ پارہ کرنے کے ہیں[۲] ایک قرأت میں صُرْهُنَّ[۳] ہے بعض کے نزدیک صِرْتُهُ و صُرْتُهُ دونوں ہم معنی ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ صُرْهُنَّ کے معنی ہیں انہیں چلا کر بلاؤ چنانچہ خلیل نے کہا ہے کہ عُصْفُوْرٌ صَوَّارٌ اس چڑیا کو کہتے ہیں جو بلانے والے کی آواز پر آجائے۔ ابوبکر نقاش نے کہا ہے کہ اس میں ایک قرأت فَصُرَّهُنَّ ضاد کے ضمہ اور راء مشددہ مفتوحہ کے ساتھ بھی ہے یہ صَرٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور ایک قرأت میں فَصِرَّهُنَّ ہے جو صَرِيْرٌ بمعنی آواز سے مشتق ہے اور معنی یہ ہیں کہ انہیں بلند آواز دے کر بلاؤ اور قطع کرنے کی مناسبت سے بھیڑ بکریوں کے گلہ کو صِوَارٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ صِرْمَةٌ قَطِيْعٌ اور فِرْقَةٌ وغیرہ الفاظ ہیں کہ قطع یعنی کاٹنے کے معنی کے اعتبار سے ان کا اطلاق جماعت پر ہوتا ہے[۴]۔

(ص و ع)

اَلصُّوَاعُ اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی مشروب ڈال کر پیا جاتا ہے یا اس سے غلہ ماپ کر دیا جاتا ہے اسے صَاعٌ بھی کہتے ہیں اور یہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیت:۔ نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ (۱۲-۷۲) کہ بادشاہ کے پانی پینے کا پیمانہ کھو گیا ہے۔ کے بعد ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا (۱۲-۷۶) فرمایا ہے (یعنی ھا ضمیر مؤنث اس کی طرف لوٹ رہی ہے)

اور حدیث[۵]: صَاعٌ مِّنْ بُرٍّ وَصَاعٌ مِّنْ شَعِيْرٍ میں صَاعٌ سے وہ چیز مراد ہے جو اس سے ماپی جاتی ہے یعنی ظرف بول کر مظروف مراد لیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کبھی "صَاعٌ" کے معنی بطن ارض یعنی گڑھا کے آجاتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[۶] (الکامل)

(۲۷۹) تکرو بکفی لاعب فی صاع

جیسا کہ کھیلنے والا اپنے ہاتھوں سے تیزی کے ساتھ گولی کو گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں صاع کے معنی چوگان کے ہیں جس سے گیند کھیلی جاتی ہے تَصَوَّعَ النَّبْتُ

---

[۱] کذا مروی عن علماء التفسیر انظر القرطبی [۲] منسوب الی ابن عباس والتابعین کما فی الفتح ۸/۱۵۰ [۳] وہی قراءۃ علی وابن عباس والاکثرون بالکسر فقراءۃ ابن مسعود وہی لغۃ سلیم قارن اضداد ابی الطیب ۸۱ - ۴۲۴ وفی الدانی (۲/۸) حمزۃ بکسر الصاد والباقون بضمها وفی مجاز ابی عبیدۃ (۱-۸۰-۸۱) معناہ بالضم: ضمهن الیک وبالکسر قطعهن۔ الاصمعی فی اضدادہ ۳۳ وابن السکیت ۱۵۷ واللسان (صور) [۴] والجماعۃ النخل الصور وفی الحدیث یطلع من تحت ہذا الصور رجل من اہل الجنۃ فاطلع ابوبکرؓ الفائق ۲/۲۱ [۵] والحدیث باختلاف الفاظہ فی ابو داؤد والبخاری والمسلم والنسائی وابن ماجۃ من حدیث ابن عمر وراجع العون ج ۲ ص ۲۶-۲۷ والنیل ۴/۱۹۰ والزرقانی ج ۲ ص ۱۴۷-۱۴۹ [۶] قالہ المسیب بن علس واولہ: مرحت یداہا للنجاء کانما۔ وفی المطبوع ذکروا بدل تکرو مصحف والبیت من کلمۃ مفضلیۃ رقم ۱۱ فی ۲۶ بیتا ذکرہا القالی کلہا فی ۱۳۰-۱۳۲ والبیت فی المرتضی (۱: ۵۶۰) وفی روایتہ قارع بدل صاع وماقط بدل لاعب وایضا اصلاح یعقوب ۴۴ والفائق ۲/۲۲۔

ہوا ہو لسے ہلا اور لہلہایا تَصَوَّعَ الشَّعْرُ بال پراگندہ ہو گئے محاورہ ہے:۔

اَلْكَمِيُّ يَصُوعُ اَقْرَانَهٗ کہ بہادر اپنے ہمسروں کو منتشر کر دیتا ہے۔ آیت کریمہ:۔ صُوَاعَ الْمَلِكِ میں ایک قرأت صَوْغُ الْمَلِكِ بھی ہے کیونکہ وہ صاع سونے سے ڈھال کر بنایا گیا تھا۔

(ص و ف)

اَلصُّوْفُ (اون) کی جمع اَصْوَافٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ۔ (۱۶-۸۰) اور ان کی اون اور ریشم اور بالوں سے تم سامان اور دیگر مفید چیزیں (بناتے ہو جو) مدت تک کام دیتی ہیں۔

اَخَذَ بِصُوْفَةِ قَفَاهُ اسے گردن کے بالوں سے پکڑ لیا۔ كَبْشٌ صَافٍ وَاَصْوَفُ وَصَائِفٌ بہت اون والا مینڈھا اور خانہ کعبہ کے خدام کو بھی صُوْفَةٌ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ کعبہ کے ساتھ اس طرح چمٹے رہتے تھے جیسے بھیڑ پر اون جمی رہتی ہے۔

اَلصُّوْفَانُ ایک قسم کی گھاس جو چھوٹی سی ہوتی ہے بعض نے کہا ہے کہ لفظ صُوْفِيٌّ بھی صوف کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ لوگ اون کا لباس پہنا کرتے تھے اور بعض[2] نے کہا ہے کہ یہ صُوْفَةٌ کی طرف منسوب ہے جس کے معنی خدام کعبہ کے ہیں صوفی لوگ بھی چونکہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے اس لئے انہیں صوفی کہہ دیا گیا ہے۔ اور بعض[3] نے کہا ہے کہ صُوْفِيٌّ صُوْفَانُ کی طرف منسوب ہے جس کے معنے نو روئیدہ گھاس کے ہیں اور صُوْفِيٌّ لوگ بھی چونکہ زہد سے کام لیتے۔ اور معمولی سی غذا کھاتے تھے جو عدم کفایت میں صوفان گھاس کی مثل ہوتی تھی۔

(ص و م)

اَلصَّوْمُ (ن) کے اصل معنی کسی کام سے رک جانا اور باز رہنا کے ہیں خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا چلنے پھرنے اور یا گفتگو کرنے سے اس بنا پر گھوڑا چلنے سے رک جائے یا چارہ نہ کھائے اسے بھی صَائِمٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۲۸۰) خَيْلٌ صِيَامٌ وَاُخْرٰى غَيْرُ صَائِمَةٍ

کچھ گھوڑے اپنے تھان پر کھڑے ہیں اور دوسرے میدان جنگ میں ہیں۔

اور ہوا کے ساکن ہونے اور دوپہر کے وقت پر بھی صوم کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس تصور پر کہ اس وقت آفتاب وسط آسمان میں ٹھہر جاتا ہے اسی اعتبار سے قَامَ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دوپہر کے وقت سورج کے خط نصف النہار پر ہونا کے ہیں مَصَامُ الْفَرَسِ اَوْ مَصَامَتُهٗ گھوڑے کے کھڑا ہونے کی جگہ۔

اصطلاح شریعت میں کسی مکلف کا روزہ کی نیت کے ساتھ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے منی خارج کرنے اور عمداً قے کرنے سے رک جانے کا نام صوم ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا (۱۹-۲۵) کہ میں نے خدا کے لئے روزے کی منت مانی ہے۔

---

[1] قالہ النابغۃ الذبیانی وتمامہ: تحت العجاج واخری تعلک اللجاما فی اللسان (صمم) وفیہ بدل ناخری والبیت فی الصحاح والتاج والمحکم (صوع) اکرا والصاحبی ۸۱ والطبری ۲-۲۸-۱۲ والبحر (۲۶۱:۲) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱:۲) ۷ والمحق دیوانہ العقد الثمین ۷ م ۱ والکامل ۸۳ م ؂

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صمم سے مراد کلام سے رکنے یعنی خاموش رہنا کے ہیں۔ جیسا کہ بعد میں فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا تو آج میں کسی آدمی سے ہرگز کلام نہ کروں گی سے اسکی تعبیر کی گئی ہے۔

(ص ی ح)

اَلصَّيْحَةُ کے معنی آواز بلند کرنا کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً (۳۶-۲۹) وہ تو صرف ایک چنگھاڑ تھی (آتشین)۔ اور آیت کریمہ:۔ يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ (۵۰-۴۲) جس روز لوگ چیخ یقیناً سن لیں گے۔

میں صَيْحَةٌ کے معنی صور (نرسنگھے) میں پھونکنے کی آواز کے ہیں۔ دراصل صَيْحٌ کے معنی آواز پھاڑنا کے ہیں اور یہ اِنْصَاحَ الْخَشَبُ اَوِ الثَّوْبُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں لکڑی یا کپڑا پھٹ گیا اور اس سے آواز نکلی اور یہی معنی صَيَّحَ الثَّوْبُ کے ہیں۔ بِاَرْضِ فُلَانٍ شَجَرٌ قَدْ صَاحَ یعنی فلاں جگہ ایک درخت ہے جو اپنے طول کی وجہ سے نمایاں نظر آتا ہے۔ گویا وہ اپنی ذات پر ایسے ہی دلالت کرتا ہے جیسا کہ چیخنے والے کی آواز اس کے موجود ہونے پر دال ہوا کرتی ہے۔ پھر چیخ کبھی گھبراہٹ کا باعث ہوتی ہے۔ لہذا صَيْحَةٌ کے معنی فَزَعٌ یعنی چنگھاڑ کے بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ (۱۵-۷۳) سوان کو سورج نکلتے ہی چنگھاڑ نے آپکڑا۔

اور صَائِحَةٌ کے معنی مجلس نوحہ خوانی کی چیخ و پکار کے ہیں محاورہ ہے مَا يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ صَيْحَةِ الْحُبْلٰى یعنی وہ شتر واہل کا انتظار کر رہے ہیں۔

اَلصَّيْحَانِيُّ۔ ایک قسم کی کھجور۔

(ص ی د)

اَلصَّيْدُ (ض) یہ صَادَ کا مصدر اور اس کے اصل معنی تو کسی محفوظ چیز پر قدرت حاصل کر کے اسے پکڑ لینے کے ہیں مگر عرفاً ان حیوانات کے پکڑنے پر بولا جاتا ہے جو اپنی حفاظت آپ کریں بشرطیکہ وہ جانور حلال ہوں اور کسی کی ملکیت نہ ہوں اور کبھی مَصِيْدٌ یعنی شکار کئے ہوئے جانور کو بھی صَيْدٌ کہہ دیتے ہیں چنانچہ آیت:۔ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (۵-۹۶) کے معنی ہیں کہ (احرام کی حالت میں) تمہارے لئے سمندری جانوروں کا شکار حلال ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَلَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (۵-۹۵) جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا۔ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (۵-۲) اور جب احرام اتار دو تو (پھر اختیار ہے کہ) شکار کرو۔

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (۵-۱) مگر احرام (حج) میں شکار کو حلال نہ جاننا۔ میں فقہا نے تصریح کی ہے کہ یہاں اَلصَّيْدُ سے وہ جانور مراد ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے کیونکہ حدیث میں ہے[1] (۸) خَمْسَةٌ يَقْتُلُهُنَّ الْمُحْرِمُ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ: الْحَيَّةُ وَالْعَقْرَبُ وَالْفَأْرَةُ وَالذِّئْبُ وَالْكَلْبُ الْعَقُوْرُ پانچ

---

[1] حدیث قتل الخمس من الدواب رواہ مالک فی موطاہ من حدیث ابن عمر قال فی المنتقی رواہ الجماعۃ الا الترمذی وفیہ حدیث عائشۃ متفق علیہ والحدیث باختلاف الفاظہ فی النسائی واحمد وما رواہ المصنف من الدواب معدودۃ فی خمس الا الذئب قال فی الفتح (۴: ۵۰م) ووقع ذکر الذئب فی حدیث مرسل اخرجہ ابن ابی شیبۃ وابو داؤد من طریق سعید بن المسیب وکذا فی احمد من حدیث ابن عمر مرفوعا وموقوفا۔ انتہی النیل (۵: ۲۸-۲۹) والزرقانی (۲: ۲۸۷-۲۸۸) والمعروف فی اکثر الروایات الحداۃ والغراب مکان الحیۃ والذئب والتفصیل فی الفتح۔

جانور یعنی سانپ، بچھو، چوہیا، بھیڑیا اور کاٹ کھانے والے کتے یعنی درندہ جانور کو محرم حرم کی حدود کے اندر اور باہر ہر جگہ قتل کر سکتا ہے۔

اَلْاَصْیَدُ۔ وہ شخص جس کی گردن ایک جانب جھکی ہوئی ہو۔ اور متکبر آدمی کے لئے یہ لفظ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور صَیْدَانٌ کے معنی ہنڈیا کے پتھر کے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل):

(۲۸۱) وَسُوْدٌ مِّنَ الصَّیْدَانِ فِیْهَا مَذَانِبُ

اور سیاہ دیگیں جن میں لغدار لکڑی کے چمچے رکھے ہوئے ہیں۔ اور اسے صَادٌ بھی کہہ دیتے ہیں[2] جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3] (الطویل):

(۲۸۲) رَاَیْتُ قُدُوْرَ الصَّادِ حَوْلَ بُیُوْتِنَا

میں نے پتھر کی ہنڈیاں اپنے خیموں کے اردگرد دیکھیں۔

اور آیت کریمہ: صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ (۳۸-۱) قسم ہے قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے۔ میں صٓ حروف مقطعات سے ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ صَادَیْتُ کَذَا سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں "اسے لے کر قبول کرو"۔

(ص ی ر)

اَلصَّیْرُ کے معنی ایک جانب یا طرف کے ہیں دراصل یہ صَارَ (ض) کا مصدر ہے۔ اور اسی سے آیت فَصُرْهُنَّ میں ایک قراءت فَصِرْهُنَّ ہے۔ صَارَ اِلٰی کَذَا کے معنی کسی خاص مقام تک پہنچ جانے کے ہیں اسی سے صِیْرُ الْبَابِ ہے جس کے معنی دروازہ میں شگاف اور جھروکا کے ہیں اور اسے صِیْرٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ نقل و حرکت کا منتہیٰ ہوتا ہے اور صَارَ کا لفظ ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے پر بولا جاتا ہے۔ اسی سے اَلْمَصِیْرُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز نقل و حرکت کے بعد پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ (۵-۱۸) یعنی اللہ تعالیٰ ہی لوٹنے کی جگہ ہے۔[4]

(ص ی ص)

اَلصِّیْصَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اپنے آپ کو محفوظ کیا جائے (مثلاً حفاظت گاہ اور قلعہ) اس کی جمع اَلصَّیَاصِیْ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ (۳۳-۲۶) اور اہل کتاب میں سے جنہوں نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے (جن میں وہ محفوظ ہو گئے تھے) اتار دیا۔ پھر معنی حفاظت کے اعتبار سے گائے کے سینگ

---

[1] قالہ ابو ذؤیب الہذلی وتمامہ ۔۔۔ الذ ضار اذا لم نستعدھا نعارہا۔ والصیدان یروی بفتح الصاد وجمع صیدا روہی البرمۃ، وبکسرھا وجمع صماد وہو النحاس، (راجع اسمط ر ا: ۳۵۱) واللسان (صدن اصید) والاقتضاب ۲۴۶ والکلمۃ فی دیوانہ رقم ۵ فی ۱۴ بیتًا وفی اللسان نضار بدل النضار (۱) بدون اداۃ التعریف، وکذا فی المعانی للقتبی ۳۶۵ والبیت (ابو ذؤیب) ایضًا فی البلغۃ فی شذور اللغۃ ۳۰ اکتاب الرحل والمنزل [2] قال الاصمعی الصاد یکون للصفر والحجارۃ [3] قالہ حسان بن ثابت وتمامہ: تنابل سحمًا فی المحلۃ صُیَّمًا والبیت فی دیوانہ (۲۷۰ مع شرح المرزوقی) والصحاح (صید) وفیہ وہما بدل سحمًا واللسان (صید) [4] وفی القرآن تعالیٰ اللہ تصیر الامور (۴۲-۵۳) [5] وایضًا راجع (۲۵-۱۵) (۲۷-۳) (۲-۱۲۶)

کو صِیْصَۃٌ کہا جاتا ہے۔ نیز اس کے معنی خار خروس بھی آتے ہیں کیونکہ وہ اس کے ذریعہ اپنے آپ کی حفاظت کرتا ہے اور دوسروں سے لڑتا ہے۔

(ص ی ف)

اَلصَّیْفُ گرمی کا موسم یہ اَلشِّتَاءُ کے بالمقابل ہے جس کے معنی سردی کا موسم کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶-۲) جاڑے اور گرمی کے زمانے سفر۔
اور گرمی کے موسم میں جو بارش ہو اسے بھی صَیِّفٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ موسم بہار کی بارش کو ربیع کہتے ہیں۔
صَافُوْا گرمی کے موسم میں کسی جگہ چلے گئے اور اَصَافُوْا موسم گرما میں داخل ہوئے۔

کِتَابُ الضَّادِ

(ض ء ن)

اَلضَّانُ کے معنی بھیڑ اور دنبہ کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
مِنَ الضَّانِ اثْنَيْنِ (۶-۱۴۳) دو (دو) بھیڑوں میں سے۔
اَضْأَنَ الرَّجُلُ بہت بھیڑ والا ہوگیا بعض نے کہا ہے ضَائِنٌ کا واحد ضَائِنَۃٌ ہے۔

(ض ب ح)

(اَلضَّبْحُ کے معنی سرپٹ دوڑ کے وقت گھوڑے کے ہانپنے کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا (۱۰۰-۱) ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ضَبْحًا کے معنی گھوڑوں کے ہانپنے کی آواز کے ہیں کیونکہ وہ ضُبَاحٌ یعنی لومڑ کی آواز سے یک گونہ مشابہت رکھتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی دوڑنے کی آواز کے ہیں اور یہ لفظ سرپٹ دوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور بقول بعض ضَبْحٌ اور ضَبْعٌ دونوں لفظ ہم معنی ہیں اور ان کے معنی گھوڑے کا اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلا کر دوڑنا کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی لکڑی کو جلانا کے ہیں پھر تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے دوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ عرفِ عام میں گھوڑے کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

(ض ح ک)

اَلضِّحْكُ (س) کے معنی چہرہ کے انبساط اور خوشی سے دانتوں کا ظاہر ہو جانا کے ہیں اور ہنستے وقت چونکہ سامنے کے دانت ظاہر ہو جاتے ہیں اس لئے ان کو ضَوَاحِكُ کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ ضحک بمعنی تمسخر بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ ضَحِكْتُ مِنْهُ کے معنی ہیں میں نے اس کا مذاق اڑایا اور جس شخص کا لوگ مذاق اڑائیں اسے ضُحْكَةٌ اور جو دوسروں کا مذاق اڑائے اسے ضُحَكَةٌ (بفتح الحاء) کہا جاتا ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔
وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ (۲۳-۱۱۰) اور تم ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔
اِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ (۴۳-۴۷) تو وہ ان کا مذاق اڑانے لگے۔

---

[1] وکذا الضُّحَکَۃ ولعنۃ وصنفرۃ وہزءۃ وسخرۃ وخدعۃ راجع شرح کتاب الفصیح لابی سہل الہروی وتہذیب اصلاح المنطق للتبریزی وتاویل المشکل للقتیبی ۱۲ والصاحبی ۱۹۲

تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ (۵۳-۶۰) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو۔

اور کبھی صرف خوشی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

ضَاحِكَةٌ (۸۰-۳۹) چمک رہے ہوں گے اور خنداں۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا (۹-۸۲) یہ دنیا میں، تھوڑا خوش ہولیں۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا (۲۷-۱۹) تو وہ اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔

شاعر نے کہا ہے[1] (المدید)

(۲۸۳) يَضْحَكُ الضَّبْعُ لِقَتْلَى هُذَيْلٍ
وَتَرَى الذِّئْبَ لَهَا تَسْتَهِلُّ

بنی ہذیل کے مقتولوں کی وجہ سے بجو خوش ہورہے ہیں۔ اور بھیڑیے خوشی سے چلا رہے ہیں۔

اور کبھی ضحك محض تعجب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ضحک انسان کا خاصہ ہے دیگر حیوانات اس کے ساتھ متصف نہیں ہوتے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى (۵۳-۴۳) اور یہ کہ وہی ہنساتا اور رلاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ (۱۱-۷۱) اور حضرت ابراہیم کی بیوی (جو پاس) کھڑی تھی ہنس پڑی۔ میں ان کی بیوی کا ہنسنا تعجب کی بنا پر تھا جیسا کہ اس کے بعد کی آیت:۔

اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۱-۷۳) کیا خدا کی قدرت سے تعجب کرتی ہو۔ سے معلوم ہوتا ہے نیز آیت کریمہ:۔

ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ ..... عَجِيْبٌ (۱۱-۷۲) اے ہے میرے بچہ ہوگا؟ میں تو بڑھیا ہوں ...... بڑی عجیب بات ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور جن لوگوں نے یہاں ضَحِكَتْ کے معنی حَاضَتْ کئے ہیں[2] انہوں نے ضَحِكَتْ کی تفسیر نہیں کی ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ اس سے حضرت ابراہیم کی بیوی کی حالت کا بیان کرنا مقصود ہے کہ جب ان کو خوشخبری دی گئی تو بطور علامت کے انہیں اسی وقت حیض آگیا تاکہ معلوم ہوجائے کہ ان کا حاملہ ہونا بھی کچھ بعید نہیں ہے۔ کیونکہ عورت کو جب تک حیض آتا ہے وہ حاملہ ہوسکتی ہے اور شاعر نے سبزہ زار کی صفت میں کہا ہے[3] (البسیط)

(۲۸۴) يُضَاحِكُ الشَّمْسَ مِنْهَا كَوْكَبٌ شَرِقٌ

ان کے پھول اور کلیاں دھوپ میں چمکتے اور سورج کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔

یہاں شاعر نے اس روضہ کی چمک دمک کو بطور تشبیہ ضحک سے تعبیر کیا ہے اسی سے چمکنے والے بادل سفید چمکدار پتھر اور کدری کھجور کا شگوفہ جب

---

[1] البیت فی الحماسۃ مع المرزوقی (۲: ۴۹۲) منسوب لتابط شرا قالہ فی ثار وقتیل حین اخذ الثار من بنی ہذیل والبیت فی البحر (۱: ۲۴۸) و المعانی للقتبی ۲۹۲ والمحکم (ضحک) وفی السمط ۹۱ یستہل بالیاء و تضحک بدل یضحک و اختلف فی نسبتہا لقصیدۃ راجع (ظلل)
[2] ذکرہ ابوجعفر البیہقی فی تاج المصادر ونقل عن ثعلب وابن الاعرابی و ہذا قول عکرمۃ ومجاہد الفیوضات الالہیہ ۲ / ۲۹۴ والفتح للشوکانی ۲ / ۱۱) وقال الفراء: واما قولہم فضحکت ای حاضت فلم اسمعہ من ثقۃ وسئل ابوالعباس عن ہذا فقال لیس من کلام العرب وایضا روی ابن درید قول ابن الاعرابی ویؤید قول المؤلف ۱۲
[3] قالہ الاعشی (دتمامہ) موزر بعمیم النبت مکتہل راجع (کہل) والبیت فی العینی (۴: ۵۰۵) وقانون البلاغۃ ۵۵ ضمن رسائل البلغاء وقبلہ آخر وفیہ صنعۃ التفریع ۱۲

شگفتہ ہو جائے تو اس کو ضَاحِکٌ کہا جاتا ہے طَرِیْقٌ ضَحُوْكٌ واضح راستہ ضَحِكَ الْغَدِیْرُ حوض لبریز ہو کر چمکنے لگا اَضْحَکْتُهٗ میں نے اسے لبریز کر دیا۔

(ض ح و)

اَلضُّحٰی۔ کے اصل معنی دھوپ پھیل جانے اور دن چڑھ آنے کے ہیں پھر اس وقت کو بھی ضُحٰی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (۹۱-۱) سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی۔

اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا (۷۹-۴۶) ایک شام یا صبح

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی (۹۳-۱) آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی جب چھا جائے۔

وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا (۷۹-۲۹) اور اسکی روشنی نکالی۔

وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًی (۲۰-۵۹) اور یہ لوگ (اس دن) چاشت کے وقت اکٹھے ہو جائیں۔

ضَحِیَ یَضْحٰی الشمس یعنی دھوپ کے سامنے آنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی (۲۰-۱۱۹)

اور یہ کہ نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کھاؤ۔

یعنی نہ ہی دھوپ سے تکلیف اٹھاؤ گے۔

تَضَحّٰی ضحی کے وقت کھانا کھانا جیسے تَغَدّٰی دوپہر کا کھانا کھانا اور اس طعام کو جو ضُحٰی اور دوپہر کے وقت کھایا جائے اسے ضَحَاءٌ اور غَدَاءٌ کہا جاتا ہے۔ اور ضَاحِیَةٌ کے معنی کسی چیز کی کھلی جانب کے ہیں اس لئے آسمان کو الضَّوَاحِیْ کہا جاتا ہے لَیْلَةٌ اَضْحِیَانَةٌ وَضَحْیَاءُ روشن رات جس میں شروع سے آخر تک چاندنی رہے، اُضْحِیَّةٌ کی جمع اَضَاحِیُّ اور ضَحِیَّةٌ کی ضَحَایَا اور اَضْحَاةٌ کی جمع اَضْحًی آتی ہے اور ان سب کے معنی قربانی کے ہیں اور شرعًا قربانی بھی چونکہ نماز عید کے بعد چاشت کے وقت دی جاتی ہے اس لئے اسے اُضْحِیَّةٌ کہا جاتا ہے حدیث میں ہے[1] (۹) مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ صَلٰوتِنَا هٰذِهٖ فَلْیُعِدْ کہ جس نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر دیا وہ دوبارہ قربانی دے۔

(ض د د)

بعض نے کہا ہے ضِدَّانِ ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت ہوں مگر ان میں سے ہر ایک اپنے خصوصی اوصاف کے باعث دوسری سے مخالف ہو اور ان میں انتہائی بُعد پایا جائے۔ جیسے سفیدی و سیاہی اور خیر و شر اور جو دو متغایر چیزیں ایک جنس کے تحت نہ ہوں انہیں ضدان نہیں کہا جاتا جیسے حلاوت اور حرکت۔

علماء نے کہا ہے کہ ضد متقابلات کی ایک قسم کا نام ہے کیونکہ وہ دو چیزیں ہیں جن میں ذاتی اختلاف ہو اور یہ دونوں بیک وقت ایک جگہ میں اکٹھی نہ ہو سکتی ہوں انہیں متقابلین کہا جاتا ہے اور تقابل چار قسم پر ہے (۱) تقابل تضاد جیسے سفیدی اور سیاہی (۲) تقابل تناقض جیسے ضِعف (دوچند) اور نصف (۳) تقابل عدم ملکہ جیسے بصر و عمی۔ (۴) تقابل ایجاب وسلب جو جملہ خبریہ میں ہوتا ہے جیسے کُلُّ اِنْسَانٍ هٰهُنَا وَلَیْسَ کُلُّ اِنْسَانٍ هٰهُنَا اکثر متکلمین اور اہل لغت ان سب کو تقابل تضاد کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضدان ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظہ اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۲ رہم ۳ طبقہ منھا عن الشیخ

محل میں جمع نہ ہوسکتی ہوں اور ذات باری تعالےٰ کے متعلق لَا نِدَّ لَهٗ وَلَا ضِدَّ لَهٗ کہہ کر دونوں کی نفی کی جاتی ہے کیونکہ نِدّ شریک فی الجوہر کو کہتے ہیں اور ان دو متخالف چیزوں کو ایک دوسری کی ضد کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت علیٰ سبیل التعاقب پائی جاتی ہوں اور چونکہ ذات باری تعالیٰ جوہریت اور جنسیت دونوں سے منزہ ہے اس لئے نہ اس کا کوئی نِدّ ہوسکتا ہے اور ضد اور آیت کریمہ:۔
وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا (۱۹-۸۲) اور وہ انکے دشمن اور مخالف ہوں گے۔ میں ضد کے معنی دشمن اور مخالف کے ہیں۔

(ض ر ر)

اَلضُّرُّ کے معنی بدحالی کے ہیں خواہ اس کا تعلق انسان کے نفس سے ہو جیسے علم وفضل اور عفت کی کمی اور خواہ بدن سے ہو جیسے کسی عضو کا ناقص ہونا یا قلت مال وجاہ کے سبب ظاہری حالت کا برا ہونا اور آیت کریمہ:
فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ (۲۱-۸۴) اور جو ان کو تکلیف تھی وہ دور کردی۔
میں لفظ ضُرٌّ سے تینوں معنی مراد ہوسکتے ہیں نیز فرمایا:۔
وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ (۱۰-۱۲) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے ....
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَا اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ (۱۰-۱۲) پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کردیتے ہیں جو اسے پہنچی ہوتی ہے تو بے لحاظ ہوجاتا ہے اور اس طرح گزر جاتا ہے گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔
ضَرَّهٗ ضَرًّا کے معنی کسی کو ضرر وگزند پہنچانے کے ہیں اور آیت کریمہ:۔
لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى (۳-۱۱۱) اور یہ تمہیں خفیف سی تکلیف کے سوا کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ میں متنبہ کیا ہے کہ انہیں کفار کیطرف سے معمولی سی تکلیف کے سوا کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچے گا اور یہ کہ ان کے ضرر سے بے فکر رہیں جیسے فرمایا:۔
لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (۳-۱۲۰) تو ان کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔
وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا (۵۸-۱۰) اس سے انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔
وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲-۱۰۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس جادو سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔
وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ (۲-۱۰۲) اور ایسے منتر سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ اور ان دونوں آیتوں۔
يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ (۲۲-۱۲) یہ خدا کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے جو اسے نقصان پہنچائے اور نہ فائدہ دے سکے۔
يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ (۲۲-۱۳) بلکہ ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدے سے زیادہ قریب ہے۔
میں سے پہلی آیت میں نفع اور ضرر کی نفی سے مراد یہ ہے کہ وہ بے جان بت ہیں جو قصد وارادہ سے کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دوسری آیت میں جس ضرر کو ثابت کیا ہے اس سے وہ ضرر مراد ہے جو بتوں کی عبادت اور ان سے مدد طلب کرنے کی وجہ سے انسان کو پہنچتا ہے نہ کہ ان کے قصد وارادہ

سے اور ضَرَّاءُ کا لفظ سَرَّاءُ اور نَعْمَاءُ کے
مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور ضُرٌّ کا لفظ نفع
کے مقابلہ میں چنانچہ فرمایا:۔
وَلَئِنْ اَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ (۱۱-۱۰) اور
اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔
وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا
(۲۵-۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار
رکھتے ہیں۔
اور کنایہ کے طور پر رَجُلٌ ضَرِيْرٌ نابینا شخص کو
کہتے ہیں اور ضَرِيْرُ الْوَادِيْ وادی کے اس کنارہ
کو کہتے ہیں جسے پانی سے نقصان پہنچا ہو۔
اَلضَّرَرُ بمعنی مُضَارٌّ یعنی تنگی ہے اور ضَارَرْتُهٗ
کے معنی کسی کو نقصان پہنچانے کے ہیں قرآن میں ہے:۔
وَلَا تُضَارُّوْهُنَّ (۶۵-۶) اور ان کو.... تکلیف نہ دو۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (۲-۲۸۲) اور کاتب
دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح
نقصان نہ کریں۔ میں یُضَارَّ صیغہ معروف ہونے
کی صورت میں اصل میں لَا يُضَارِرْ ہو گا۔ اور صیغہ
مجہول ہونے کی صورت میں لَا يُضَارَرْ اور معنی یہ
ہوں گے کہ انہیں گواہی کے لئے بلا کر ان کے کاروبار
سے روک کر انہیں نقصان نہ پہنچایا جائے اور آیت کریمہ:۔
لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا (۲-۲۳۳) اور نہ تو
ماں کو اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے۔
میں لَا تُضَارَّ کو ضمہ را کے ساتھ پڑھا جائے تو خبر
بمعنی امر ہو گا اور فتحہ را کی صورت میں صیغہ امر یعنی
نہی، ضِرَارًا لِتَعْتَدُوْا (۲-۲۳۱) اور اس نیت
سے انہیں نکاح میں نہ رہنے دینا چاہئے کہ انہیں
تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔
ضَرَّةٌ اصل میں اس کام کو کہتے ہیں جس سے دوسرے
کو نقصان پہنچے اور ایک مرد کی دو بیویاں ضَرَّتَان
کہلاتی ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال تھا ان میں سے ہر ایک
دوسری کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے اسی معنی کے
پیش نظر آنحضرتؐ نے فرمایا:[۱] لَا تَسْأَلُ الْمَرْأَةُ
طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَكْفِيَ مَا فِيْ صَحْفَتِهَا کہ کوئی عورت
اپنی بہن کے برتن کو انڈیلنے کے لئے اس کی طلاق
کا مطالبہ نہ کرے۔
اَلْاِضْرَارُ۔ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی
لانا اور جس مرد کی ایک سے زائد بیویاں ہوں اسے
مُضِرٌّ کہتے ہیں اور اس میں ہر عورت دوسری کی
مُضَرَّةٌ کہلاتی ہے۔
اَلْاِضْطِرَارُ کے اصل معنی کسی کو نقصان دہ کام پر
مجبور کرنے کے ہیں اور عرف میں اس کا استعمال ایسے
کام پر مجبور کرنے کے لئے ہوتا ہے جسے وہ ناپسند
کرتا ہو۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مجبوری
کسی خارجی سبب کی بنا پر ہو مثلاً مار پٹائی کی جائے
یا دھمکی دی جائے حتیٰ کہ وہ کسی کام کے کرنے پر رضا
مند ہو جائے یا زبردستی پکڑ کر اس سے کوئی کام
کروایا جائے جیسے فرمایا:۔
ثُمَّ اَضْطَرُّهٗ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ (۲-۱۲۶) پھر اس
کو عذاب دوزخ کے بھگتنے کے لئے ناچار کر دوں گا۔
ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۳۱-۲۴) پھر
عذاب شدید کی طرف مجبور کر کے لے جائیں گے۔
دوم یہ کہ وہ مجبوری کسی داخلی سبب کی بنا پر ہو اس
کی دو قسمیں ہیں (۱) کسی ایسے جذبہ کے تحت وہ
کام کرے جسے نہ کرنے سے اسے ہلاک ہونے کا خوف

[۱] اخرجہ ابو داؤد فی سننہ ۱/۲۹۷ اصح المطابع والطبرانی عن ابن عمر (راجع کنز العمال ۸: ۳۵۵) ✤ ✤ ✤ ✤

نہ ہو مثلاً شراب یا قمار بازی کی خواہش سے مغلوب ہو کر ان کا ارتکاب کرے (۲) کسی ایسی مجبوری کے تحت اس کا ارتکاب کرے جس کے نہ کرنے سے اسے جان کا خطرہ ہو مثلاً بھوک سے مجبور ہو کر مردار کا گوشت کھانا۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (۲-۱۷۳) ہاں جو ناچار ہو جائے بشرطیکہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد ضرورت سے باہر نہ نکل جائے۔ اور آیت:۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ (۵-۳) ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے۔ میں اضطرار کے یہی معنی ہیں اور آیت:۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ (۲۷-۶۲) بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے۔ میں اضطرار کا لفظ اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی اضطرار داخلی اور خارجی دونوں کو شامل ہے۔

اور اَلضَّرُوْرِيُّ کا لفظ تین طرح پر استعمال ہوتا ہے ایک وہ جو کسی دباؤ کی وجہ سے ہو مثلاً سخت ہوا چلنے سے درخت بالضرور ہلتا ہے۔ دوم وہ جس کے بغیر کوئی چیز باقی نہ رہ سکے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ حفظ بدن کے لئے غذا ضروری ہے۔ سوم وہ جس کی جانب مخالف ممکن نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے۔ اَلْجِسْمُ الْوَاحِدُ لَايَصِحُّ حُصُوْلُهٗ فِيْ مَكَانَيْنِ فِيْ حَالَةٍ وَّاحِدَةٍ بِالضَّرُوْرَةِ بعض نے کہا ہے کہ ضَرَّةٌ کے معنی انگلی یا پستان کی جڑ کے ہیں نیز وہ چربی جو ران سے نیچے ڈھلک پڑتی ہے اسے بھی ضَرَّةٌ کہا جاتا ہے۔

(ض ر ب)

اَلضَّرْبُ کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر واقع کرنا یعنی مارنا کے ہیں اور مختلف اعتبارات سے یہ لفظ بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے (۱) ہاتھ، لاٹھی، تلوار وغیرہ سے مارنا۔ قرآن میں ہے:۔

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸-۱۲) ان کے سر مار کر اڑا دو اور ان کا پور پور مار کر توڑ دو۔

فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷-۴) تو ان کی گردنیں اڑا دو۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا (۲-۷۳) تو ہم نے کہا کہ اس بیل کا سا ٹکڑا مقتول کو مارو۔

اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ (۲-۶۰) اپنی لاٹھی پتھر پر مارو۔

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ (۳۷-۹۳) پھر ان کو داہنے ہاتھ سے مارنا اور توڑنا شروع کیا۔

يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ (۸-۵۰) ان کے مونہوں ... پر مارتے ہیں۔

اور (۲) ضَرْبُ الْاَرْضِ بِالْمَطَرِ کے معنی بارش برسنے کے ہیں۔

اور (۳) ضَرْبُ الدَّرَاهِمِ (دراہم کو ڈھالنا) کا محاورہ اَلضَّرْبُ بِالْمِطْرَقَةِ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے۔ اور ٹکسال کے سکہ میں اثر کرنے کی مناسبت سے طَبْعُ الدَّرَاهِمِ کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر انسان کی عادت کو ضَرِيْبَةٌ اور طَبِيْعَةٌ بھی کہہ دیتے ہیں۔

(۴) ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ کے معنی سفر کرنے کے ہیں کیونکہ انسان پیدل چلتے وقت زمین پر پاؤں رکھتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ (۴-۱۰۱) اور جب سفر کو جاؤ۔

وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ (۳-۱۵۶) اور ان کے مسلمان بھائی جب خدا کی راہ میں سفر کریں ..... تو ان کی نسبت کہتے ہیں۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ (۲-۲۷۳) اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اور یہی معنی آیت :-
فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ (۲۰-۷۷) کے ہیں یعنی
انہیں سمندر میں (خشک) راستے سے لے جاؤ۔
ضَرَبَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ (نر کا مادہ سے جفتی کرنا) یہ
محاورہ ضَرَبَ بِالْمِطْرَقَةِ (ہتھوڑے سے کوٹنا) کی
مناسبت سے طَرَقَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کا محاورہ
بولا جاتا ہے۔
ضَرْبُ الْخَيْمَةِ خیمہ لگانا کیونکہ خیمہ لگانے کیلئے
میخوں کو زمین میں ہتھوڑے سے ٹھونکا جاتا ہے اور
خیمہ کی مناسبت سے آیت :- وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ
الذِّلَّةُ (۲-۶۱) اور (ان پر) ذلت ..... ان سے چپٹا
دی گئی ہیں ذِلَّة کے متعلق ضَرَبَ کا لفظ استعمال
ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذلت نے انہیں اس
طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا جیسا کہ کسی شخص پر خیمہ
لگا ہوا ہوتا ہے اور یہی معنی آیت :- وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ (۳-۱۱۲) اور ناداری ان سے لپٹ
رہی ہے۔ کے ہیں اور آیت کریمہ :-
فَضَرَبْنَا عَلَى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا
(۱۸-۱۱) تو ہم نے غار میں کئی سال تک ان کے کانوں
پر نیند کا پردہ ڈالے (یعنی ان کو سلائے) رکھا۔ نیز
آیت کریمہ :-
فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ (۵۷-۱۳) پھر ان کے بیچ
میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائیگی۔ میں ضَرْب کا
لفظ ضَرَبَ الْخَيْمَةَ کے محاورہ سے مستعار ہے۔
ضَرْبُ الْعُوْدِ وَالنَّايِ وَالْبُوْقِ عود اور نے بجانا
یا نرسنگھے میں پھونکنا۔
ضَرْبُ اللَّبِنِ اینٹیں چننا ایک اینٹ کو دوسری
پر لگانا ضَرْبُ الْمَثَلِ کا محاورہ ضَرْبُ الدَّرَاهِمِ
سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں کسی بات کو اس طرح
بیان کرنے کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو
قرآن میں ہے۔
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا (۳۹-۲۹) خدا ایک مثال
بیان فرماتا ہے۔
وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا (۳۶-۱۳) اور ان سے
..... قصہ بیان کرو۔
ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ (۳۰-۲۸)
وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال
بیان فرماتا ہے۔
وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ (۳۰-۵۸) اور ہم نے
..... ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔
وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا (۴۳-۵۷)
اور جب مریمؑ کے بیٹے (عیسٰیؑ) کا حال بیان کیا گیا۔
مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا (۴۳-۵۸) انہوں
نے عیسٰی کی جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔
وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۸-۴۵)
اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کردو۔
أَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا (۴۳-۵)
بھلا اس لئے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو (ہم)
ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے۔
الْمُضَارَبَةُ ایک قسم کی تجارتی شرکت (جس
میں ایک شخص کا سرمایہ اور دوسرے کی محنت
ہوتی ہے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں)
الْمُضَرَّبَةُ (دلائی رضائی) جس پر بہت سی سلائی
کی گئی ہو۔ التَّضْرِيْبُ اکسانا گویا اسے زمین میں
سفر کی ترغیب دی جاتی ہے۔
الْاِضْطِرَابُ کثرت سے آنا جانا حرکت کرنا یہ
معنی ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ سے ماخوذ ہیں۔
اِسْتَضْرَبَ النَّاقَةَ سانڈھ نے ناقہ سے جفتی کھانے

ی خواہش کی۔

(ض ر ع)

اَلضَّرْعُ اونٹنی اور بکری وغیرہ کے تھن اَضْرَعَتِ الشَّاۃُ قرب ولادت کی وجہ سے بکری کے تھنوں میں دودھ اتر آیا یہ اَثْمَرَ وَأَلْبَنَ کی طرح کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں زیادہ دودھ یا کھجوروں والا ہونا اور شَاۃٌ ضَرِیْعٌ کے معنی بڑے تھنوں والی بکری کے ہیں مگر آیت کریمہ:۔
لَیْسَ لَہُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ (۸۸-۶)
اور خار جھاڑ کے سوا ان کے لیے کوئی کھانا نہیں ہوگا میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ضَرِیْعٌ سے خشک شبرق مراد ہے[1] اور بعض نے سرخ بدبودار گھاس مراد لی ہے۔ جسے سمندر باہر پھینک دیتا ہے بہر حال جو معنی بھی کیا جائے اس سے کسی مکروہ چیز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ضَرَعَ الْبَہْمُ چوپایہ کے بچہ نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لیا بعض کے نزدیک اسی سے ضَرَعَ الرَّجُلُ ضَرَاعَۃً کا محاورہ ہے جس کے معنی کمزور ہونے اور ذلت کا اظہار کرنے کے ہیں اَلضَّارِعُ وَالضَّرِعُ (صفت فاعلی) کمزور اور نحیف آدمی تَضَرَّعَ اس نے عجز و تذلل کا اظہار کیا۔ قرآن میں ہے:۔
تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (۶-۶۳) عاجزی اور نیاز پنہانی سے۔
لَعَلَّہُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ (۶-۴۲) تاکہ عاجزی کریں۔
لَعَلَّہُمْ یَضَّرَّعُوْنَ (۷-۹۴) تاکہ وہ عاجزی اور زاری کریں۔
یہ اصل میں یَتَضَرَّعُوْنَ ہے تاء کو ضاد میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ نیز فرمایا:۔
فَلَوْلَا اِذْ جَاءَہُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا (۶-۴۳)
تو جب ان پر ہمارا عذاب آتا رہا کیوں نہیں عاجزی کرتے رہے۔

اَلْمُضَارَعَۃُ کے اصل معنی ضَرَاعَۃٌ یعنی عجز و تذلل میں باہم شریک ہونے کے ہیں۔ پھر محض شرکت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اسی سے علمائے نحو نے الفعل المضارع کی اصطلاح قائم کی ہے (کیونکہ اس میں دو زمانے پائے جاتے ہیں)

(ض ع ف)

اَلضَّعْفُ (کمزوری) یہ اَلْقُوَّۃُ کے بالمقابل آتا ہے۔ ضَعُفَ فَہُوَ ضَعِیْفٌ کمزور ہونا۔ قرآن میں ہے:۔
ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (۲۲-۷۳) طالب اور مطلوب (یعنی عابد اور معبود دونوں) گئے گزرے ہیں۔
اور اَلضَّعْفُ رائے کی کمزوری پر بھی بولا جاتا ہے اور بدن اور حالت کی کمزوری پر بھی اور اس میں ضَعْفٌ اور ضُعْفٌ دو لغت ہیں قرآن میں ہے:۔
وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا (۸-۶۶) اور معلوم کر لیا کہ ابھی تم میں کس قدر کمزوری ہے۔
خلیل کا قول ہے کہ اَلضَّعْفُ عقل و رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضُعْفٌ بدنی کمزوری کو چنانچہ آیت کریمہ:۔ فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْہِ الْحَقُّ سَفِیْہًا اَوْ ضَعِیْفًا (۲-۲۸۲) اور اگر قرض لینے والا کم عقل یا کمزور رائے ہو۔ میں ضَعِیْفًا کا لفظ ضَعْفٌ سے مشتق ہے اور ضعیف کی جمع ضِعَافٌ اور ضُعَفَاءُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] قال مجاہد و نسب لبعضہم الی الفراء (راجع العینی شرح البخاری صفحہ ۲۶۵ ج ۱۹) کذا قال الخلیل العینی شرح البخاری صفحہ ۲۶۵ ج ۱۹

لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ (۹-۹۱) کمزوروں پر (کچھ گناہ) نہیں ہے۔

اِسْتَضْعَفْتُہٗ۔ میں نے اسے کمزور سمجھا حقیر جانا۔ قرآن میں ہے:۔

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا (۲۸-۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جنہیں ملک میں کمزور سمجھا گیا ہے ان پر احسان کریں۔

وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ (۴-۷۵) اور ان بے بس مردوں عورتوں اور بچوں . . . . .

قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ (۴-۹۷) تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز اور ناتواں تھے۔

اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ (۷-۱۵۰) کہ لوگ تو مجھے کمزور سمجھتے تھے۔ اور آیت کریمہ:۔

قَالَ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا (۳۴-۳۳) اور کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے۔ میں اِسْتَضْعَاف اِسْتَکْبَار کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور آیت کریمہ:۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ ضُعْفًا (۳۰-۵۴) خدا ہی تو ہے جس نے تمہیں (ابتدا میں) کمزور حالت میں پیدا کیا پھر کمزوری کے بعد طاقت عنایت کی۔ پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا) دیا۔ میں پہلے ضَعْفٌ سے نطفہ یا منی مراد ہے۔ اور دوسری جگہ اس سے وہ کمزوری مراد ہے جو جنین یا طفولیت کے زمانہ میں پائی جاتی ہے اور تیسرے سے وہ ضعف مراد ہے جو بڑھاپے کی عمر میں انسان کو لاحق ہوتا ہے۔ جس کی طرف کہ آیت اَرْذَلِ الْعُمُرِ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح پہلی جگہ قُوَّۃٌ سے وہ قوت مراد ہے۔ جو بچے کو حرکت کرنے، ہدایت پانے، دودھ مانگنے اور رو کر اپنے آپ سے تکلیف کو دفع کرنے کے لئے عطا کی جاتی ہے۔ اور دوسری جگہ قُوَّۃٌ سے مراد وہ قوت ہے جو بلوغت کے بعد عطا ہوتی ہے اور آیت کریمہ میں ضُعْفٌ کو نکرہ لانا اس بات کی دلیل ہے کہ ہر جگہ ضُعْفٌ سے ایک ایسی حالت کی طرف اشارہ ہے جو پہلی حالت کی غیر ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اسم نکرہ کو مکرر لا کر اگر پہلا معنی مقصود ہو تو اسے معرفہ بنا لیا جاتا ہے جیسے رَأَیْتُ رجلاً فقال لی الرجل کذا مگر جب اسم نکرہ کو دوبارہ نکرہ ہی لایا جائے تو پہلے معنی کا غیر مراد ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کریمہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (۹۴-۵،۶) کی تفسیر میں فرمایا۔ لن یغلب عُسْرٌ یسرین کو دو یسر پر ایک عسر غالب نہیں آسکتا۔[1]

اور آیت کریمہ:۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (۴-۲۸) اور انسان (طبعاً) کمزور پیدا ہوا ہے۔ میں ضَعِیْفًا کے لفظ سے انسان کی شدت احتیاج کی طرف اشارہ

---

[1] رواه اصحاب الآثار عن ابن مسعود مرفوعًا (راجع الشوكاني ٥ر٣٦٣) قال في الكشاف وعن ابن عباس مثله ولم اجده قال الحافظ في تخريجه: ذكره الفراء عن ابن الكلبي عن ابي صالح عنه وبمعناه مروي عن انس قال السيوطي وسنده ضعيف والصحيح عن الحسن به مرسلا رواه عبد الرزاق عن معمر عن طريقهم اخرجه الحاكم والبيهقي في الشعب و له طريق اخرى اخرجها ابن مردويه من رواية عطية عن جابر موصولا واسناده ايضا ضعيف وفي الموطا عن زيد بن اسلم عن ابيه ان عمر بن الخطاب كتب اليه وقال في الكتاب ولن يغلب عسر يسرين و هذا اصح طرقه راجع تخريج الكشاف للحافظ (ر ١٨٥ - ١٨٦) وتتم ٣٢ ٣٣ وتفسير ابن كثير (٤ ٥٢٥ - ٥٢٦) والطبري ٣٠ (٢٣٥ - ٢٣٦)

ہے جس سے کہ "ملا اعلیٰ" مستغنی ہوتے ہیں
اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (۴-۷۶) (اور) شیطان کا داؤ کمزور ہوتا ہے۔ میں شیطانی فریب کے کمزور ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے بندوں پر اس کی تدابیر کارگر نہیں ہو سکتیں جیسے فرمایا:۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (۱۷-۶۵) جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

اَلضِّعْفُ۔ یہ اسمائے متضایفہ سے ہے یعنی وہ الفاظ جو اپنے مفہوم ومعنی کے تحقق میں ایک دوسرے پر موقوف ہوتے ہیں جیسے نِصْفٌ وَزَوْجٌ اور ضِعْفٌ (دوگنا) کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ اس کے مثل کامل جانا اور یہ اسم عدد کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اَضْعَفْتُ الشَّیْءَ وَضَعَّفْتُهٗ وَضَاعَفْتُهٗ کے معنی ہیں کسی چیز کو دوچند کر دینا بعض نے کہا ہے کہ ضَاعَفْتُ (مفاعلہ) میں ضَعَّفْتُ (تفعیل) سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر قراء نے آیت کریمہ:۔ يُضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (۳۳-۳۰) ان کو دگنی سزا دی جائے گی۔
اور آیت:۔ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا (۴-۴۰) اور اگر نیکی (کی) ہوگی تو اس کو دوچند کر دیگا۔ میں يُضَاعَفُ (مفاعلہ) پڑھا ہے اور کہا ہے کہ اس سے نیکیوں کے دس گنا ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت:۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (۶-۶۷) سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ضَعَفْتُهٗ ضَعْفًا فَهُوَ مَضْعُوْفٌ۔ تخفیف عین کے ساتھ آتا ہے اس صورت میں ضَعْفٌ مصدر ہوگا اور ضِعْفٌ اسم جیسا کہ شَيْءٌ اور شِیْءٌ ہے اس اعتبار سے ضِعْفُ الشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کی مثل اتنا ہی اور جس سے وہ چیز دوگنی ہو جائے اور جب اس کی اضافت اسم عدد کی طرف ہو تو اس سے اتنا ہی اور عدد یعنی دوچند مراد ہوتا ہے لہذا ضِعْفُ الْعَشَرَةِ اور ضِعْفُ الْمِائَةِ کے معنی بلا اختلاف بیس اور دوسو کے ہوں گے چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۲۸۵) جَزَيْتُكِ ضِعْفَ الْوُدِّ لَمَّا اشْتَكَيْتِهٖ
وَمَا اِنْ جَزَاكِ الضِّعْفَ مِنْ اَحَدٍ قَبْلِیْ

جب تو نے محبت کے بارے میں شکایت کی تو میں نے تمہیں دوستی کا دوچند بدلہ دیا اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہیں دوچند بدلہ نہیں دیا۔
اور اَعْطِهٖ ضِعْفَیْ وَاحِدٍ کے معنی یہ ہیں کہ اسے سہ چند دے دو کیونکہ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ ایک اس کے ساتھ دو اور دے دو اور یہ کل تین ہو جاتے ہیں مگر یہ معنی اس صورت میں ہوں گے جب ضِعْف کا لفظ مضاف ہو ورنہ بدوں اضافت کے ضعفین کے معنی تو زوجین کی طرح دوگنا ہی ہوں گے۔ لیکن جب واحد کی طرف مضاف ہو کر آئے تو تین گنا کے معنی ہوتے ہیں[2]۔ قرآن میں ہے:۔
فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ (۳۴-۳۷) ایسے لوگوں کو دوگنا بدلہ ملے گا۔
اور آیت کریمہ:۔ فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (۷-۳۸) تو ان کی آتش جہنم کا دوگنا عذاب دے۔ میں دوگنا عذاب مراد ہے یعنی دوزخی باری تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے کہ جن لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا

---

[1] قالہ ابو ذؤیب الہذلی وفی اللسان (ضعف) لما استیتہ والبیت فی دیوان الہذلیین (۱: ۳۵) والمجاز لابی عبیدۃ (۱۹۳/۲، ۲۲۴/۲: ۲۲۲)
[2] قیہ ھذا الحکم (ضعف) ہذا روایتہما لما استیتہ ای استقللتہ وفی المجاز الحسیدل الود والصاحی ۲۰۳ وفیہ شاہد علی ان لفظ... یاتی نظیرتہ ؛

انہیں ہم سے دوگنا عذاب دیا جائے ایک تو انکے خود گمراہ ہونے کا اور دوسرے، ہمیں گمراہ کرنے کا جیسا کہ آیت کریمہ :-

یَحۡمِلُوۡۤا اَوۡزَارَهُمۡ كَامِلَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۙ وَمِنۡ اَوۡزَارِ الَّذِيۡنَ يُضِلُّوۡنَهُمۡ (۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے اعمال کے پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

سے مفہوم ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد لِكُلٍّ ضِعۡفٌ وَّلٰـكِنۡ لَّا تَعۡلَمُوۡنَ (۷-۳۸) کہہ کر بتایا کہ ان میں سے ہر ایک کو تم سے دگنا عذاب دیا جائے گا۔

بعض نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ تم اور ان میں سے ہر ایک کو اس سے دگنا عذاب ہو رہا ہے جتنا کہ دوسرے کو نظر آرہا ہے۔

کیونکہ عذاب دو قسم پر ہے ظاہری اور باطنی، ظاہری عذاب تو ایک دوسرے کو نظر آئے گا مگر باطنی عذاب کا ادراک نہیں کر سکیں گے اور سمجھیں گے کہ انہی اندرونی طور پر کچھ بھی عذاب نہیں ہو رہا ہے (حالانکہ وہ باطنی عذاب میں بھی مبتلا ہوں گے۔

اور آیت لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً (۳-۱۳۰) بڑھ چڑھ کر سود در سود نہ کھاؤ۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَضۡعَافًا کے بعد مضاعفة کا لفظ بطور تاکید لایا گیا ہے مگر بعض نے کہا ہے کہ مُضٰعَفَةً کا لفظ ضَعَفۡتُ (بفتح العین) سے ہے جس کے معنی کمی کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ سود جسے تم افزونی اور بیشی سمجھ رہے ہو یہ درا صل بڑھانا نہیں ہے بلکہ کم کرنا ہے جیسے فرمایا۔

يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِى الصَّدَقٰتِ (۲-۲۷۶) کہ اللہ تعالٰی سود کو کم کرتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر شاعر نے کہا ہے [1] (الطویل)

(۲۸۶) زِيَادَةُ شَيۡبٍ وَهِيَ نَقۡصُ زِيَادَتِي

کہ بڑھاپے کی افزونی در اصل عمر کی کمی ہے۔

(ض غ ث)

اَلضِّغۡثُ ۔ ریحان۔ خشک گھاس یا تنکے جو انسان کی مٹھی میں آجائیں اس کی جمع اَضۡغَاثٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے :-

خُذۡ بِيَدِكَ ضِغۡثًا (۳۸-۴۴) اپنے ہاتھ میں مٹھی بھر گھاس لو۔

اسی سے ایسے خواب کو جو ملتبس سا ہو اور اس کا مطلب واضح نہ ہو، اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :-

قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ (۱۲-۴۴) انہوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔

یعنی پریشان اور بے معنی خوابوں کے پلندے ہیں۔

(ض غ ن)

اَلضِّغۡنُ وَالضَّغَنُ ۔ سخت کینہ اور انتہائی بغض۔ اس کی جمع اَضۡغَانٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:-

اَنۡ لَّنۡ يُّخۡرِجَ اللّٰهُ اَضۡغَانَهُمۡ (۴۷-۲۹) کہ خدا ان کے کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا۔

پھر بطور تشبیہ اس اونٹنی کو جو بدوں مار پٹائی کے

---

[1] قاله المتنبي في قصيدة له ۴۳ بيتا يمدح فيها احمد بن الحسين ابو الفرج القاضي المالكي (۷۷ ۔۔۔ ۸۰) مطلعها: لجنيتـام غادة رفع السجف. لوحشية لا ما لوحشية شنف وبعده وقوة عشق دی من قوتي ضعف والبيت في ديوانه ۲۰ (طبعه هندية مصر ۲/ ۱۴۳) ∴ ∴ ∴

صحیح چال نہ چلے اسے نَاقَۃٌ ذَاتُ ضِغْنٍ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ٹیڑھے نیزے کو قَنَاۃٌ ذَاتُ ضِغْنٍ کہہ دیتے ہیں۔

اَلْاِضْغَانُ (افعال) کپڑا یا اسلحہ وغیرہ پہن کر اس میں مستور ہو جانا۔

(ض ل ل)

اَلضَّلَالُ۔ کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے ہیں۔ اور یہ ہدایۃ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۷-۱۵) جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے سے اختیار کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا۔

اور ضَلَالٌ کا لفظ ہر قسم کی گمراہی پر بولا جاتا ہے یعنی وہ گمراہی قصداً ہو یا سہواً معمولی ہو یا زیادہ کیونکہ طریق مستقیم۔ جو پسندیدہ راہ ہے ــــ پر چلنا نہایت دشوار امر ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:۔ (۱) اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا کہ استقامت اختیار کرو اور تم پورے طور پر اس کی نگہداشت نہیں کر سکو گے۔

حکماء نے کہا ہے کہ صحت وراستی کی راہ تو صرف ایک ہی ہے مگر گمراہی کے متعدد راستے ہیں کیونکہ استقامت اور صواب کی مثال تیر کے ٹھیک نشانہ پر بیٹھ جانے کی ہے اور صحیح نشانہ کے علاوہ ہر جہت کا نام ضلالت ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید بعض صالحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا اور عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جناب کے اس فرمان کے کیا معنی ہیں ﷺ (۲) شَيَّبَتْنِىْ سُوْرَةُ هُوْدٍ وَاَخَوَاتُهَا کہ سورہ ہود اور اس کی ہم مثل دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ تو آنحضرت نے فرمایا: سورہ ہود کی جس آیت نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے وہ آیت فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (۱۱-۱۱۲) ہے یعنی اے پیغمبر ٹھیک اسی طرح سیدھے رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

جب کہ ضَلَالٌ کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے ہیں خواہ وہ ہٹنا عمداً ہو یا سہواً تھوڑا ہو یا زیادہ تو جس سے بھی کسی قسم کی غلطی سرزد ہوگی اس کے متعلق ہم ضلالت کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انبیاء اور کفار دونوں کی طرف ضلالت کی نسبت کی گئی ہے گو ان دونوں قسم کی ضلالت میں بون بعید پایا جاتا ہے۔ دیکھئے آنحضرت کو آیت کریمہ: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳-۷) میں ضَآلًّا فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہدایت نبوت کے عطا ہونے سے قبل تم اس راہ نمائی سے محروم تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ان کی

---

(۱) رحم ک ہق) عن ثوبان (طب) عن ابن عمرو (طب) عن سلمۃ ابن الاکوع (الفتح السبانی ج ۱ ص ۱۸۱) (۲) الحدیث فی ابن مردویہ عن انس (و فی الطبرانی من ابی بکرؓ وابن عساکر عن محمد بن علی مرسلاً) ہود واخواتہا بغیر لفظ السورۃ والحدیث ایضاً فی الکشاف راجع تخریج الکشاف ۸۷ رقم ۱۹۵ (و فی تخریج العراقی۔ اخرجہ الترمذی) فی الشمائل من حدیث ابی جحیفۃ وللحاکم من حدیث ابن عباس نحوہ قال الترمذی حسن وقال الحاکم صحیح علی شرط البخاری ۲/ ۲۹۷ و ۳۴۴ و قد اطال الکلام علیہ الدارقطنی فی العلل وفی الکامل لابن عدی من روایۃ یزید الرقاشی عن انسؓ ولیس فیہ ذکر ہود واخواتہا بل الواقعۃ والقارعۃ وغیرہا من السور ٭ ٭ ٭ ٭

اولاد کا یہ کہنا اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (۱۲-۹۵) کہ آپ اسی پرانی غلطی میں (مبتلا) ہیں۔ یا یہ کہنا: اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱۲-۸) کچھ شک نہیں کہ ابا صریح غلطی پر ہیں۔ تو ان آیات میں ضلال سے مراد یہ ہے کہ وہ یوسف (علیہ السلام) کی محبت اور ان کے اشتیاق میں سرگرداں ہیں اسی طرح آیت کریمہ:۔
قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱۲-۳۰) اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے ہم دیکھتی ہیں کہ وہ صریح گمراہی میں ہیں۔ میں بھی ضلال مبین سے والہانہ محبت مراد ہے۔
اور آیت کریمہ:۔ وَاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (۲۶-۲۰) اور میں خطا کاروں میں تھا۔
میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ضال ہونے کا اعتراف کرکے اشارہ کیا ہے کہ قتل نفس کا ارتکاب مجھ سے سہواً ہوا تھا۔ اور آیت:۔
اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا (۲-۲۸۲) اور اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی۔ میں تَضِلَّ کے معنی بھول جانا کے ہیں اور یہی وہ نسیان ہے جسے عفو قرار دیا گیا ہے[1]
ایک دوسرے اعتبار سے ضَلَالَةٌ کی دو قسمیں ہیں (۱) علوم نظریہ یعنی توحید و نبوات وغیرہما کی معرفت میں غلطی کرنا چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (۴-۱۳۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور روز قیامت سے انکار کرے وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑا۔ میں اس قسم کی گمراہی کو ضَلٰلًا بَعِيْدًا کہا گیا ہے۔
(۲) علوم عملیہ میں ضلالۃ ہے جس کے معنی ہیں احکام شرعیہ یعنی عبادات (اور معاملات) کی معرفت میں غلطی کرنا اور آیت مذکورہ میں ضَلٰلًا بعیدا سے اس کے کفر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت کے ابتداء وَمَنْ يَّكْفُرْ اور آیت:۔
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (۴-۱۶۷) جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسروں کو خدا کے رستے سے روکا وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔
اور آیت فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ (۳۴-۸) میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور فِي کے معنی یہ ہیں کہ اس گمراہی کی سزا میں گرفتار ہوں گے اور یہی معنی آیت: اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ (۶۷-۹) میں مراد ہیں۔ نیز فرمایا:۔
قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (۵-۷۷) جو (خود بھی) پہلے گمراہ ہوئے اور بھی اکثروں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔ اور آیت کریمہ:۔
ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (۳۲-۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جب مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائیں گے اور آیت:۔
وَلَا الضَّآلِّيْنَ (۱-۷) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں۔ اور آیت:۔
لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى (۲۰-۵۲) کے معنی ہیں:۔ لَا يَضِلُّ عَنْ رَبِّيْ وَلَا يَضِلُّ رَبِّيْ عَنْهُ ہیں یعنی میرے پروردگار کو کوئی چیز غافل نہیں کرتی اور آیت:۔
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ (۱۰۵-۲) کیا ان کی تدبیر کو ضائع نہیں کیا (گیا)
میں فِيْ تَضْلِيْلٍ کے معنی ضائع کر دینا اور غلط راہ

---

[1] ای فی الحدیث: رُفِعَ عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرہوا علیہ (الطبرانی۔ عن ثوبان)

پر لگا دینا کے ہیں۔

الاضلال ، یعنی دوسرے کو گمراہ کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا سبب خود اپنی ضلالت ہو یہ دو قسم پر ہے:۔

(۱) ایک یہ کہ کوئی چیز ضائع ہو جائے مثلاً کہا جاتا ہے اَضْلَلْتُ الْبَعِیْرَ میرا اونٹ کھو گیا۔

(۲) دوم کہ دوسرے پر ضلالت کا حکم لگانا ان دونوں صورتوں میں اِضْلَال کا سبب ضلالۃ ہی ہوتی ہے۔ دوسری صورت اِضْلَال کی پہلی کے برعکس ہے یعنی اضلال بذاتہٖ ضلالۃ کا سبب بنے اسی طرح پر کہ کسی انسان کو گمراہ کرنے کے لئے باطل اس کے سامنے پر فریب اور جاذب انداز میں پیش کیا جائے جیسے فرمایا۔

لَهَمَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ (۴-۱۱۳) ان میں سے ایک جماعت تم کو بہکانے کا قصد کر ہی چکی تھی اور یہ اپنے سوا کسی کو بہکا نہیں سکتے۔

یعنی وہ اپنے اعمال سے تجھے گمراہ کرنے کی کوشش میں ہیں مگر وہ اپنے اس کردار سے خود ہی گمراہ ہو رہے ہیں۔ اور شیطان کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا۔ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ (۴-۱۱۹) اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا۔

اور شیطان کے بارے میں فرمایا:۔

وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا (۳۶-۶۲) اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا۔ (۴-۶۰) اور شیطان تو چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر رستے سے دور ڈال دے۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۳۸-۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی۔

اللہ تعالیٰ کے انسان کو گمراہ کرنے کی دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں (۱) ایک یہ کہ اس کا سبب انسان کی خود اپنی ضلالت ہو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف اضلال کی نسبت کے یہ معنی ہوں گے کہ جب انسان از خود گمراہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں اس پر گمراہی کا حکم ثبت ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آخرت کے دن اسے جنت کے راستہ سے ہٹا کر دوزخ کے راستہ پر ڈال دیا جائے گا۔

(۲) اور اللہ تعالیٰ کی طرف اضلال کی نسبت کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے انسان کی جبلت ہی کچھ اس قسم کی بنائی ہے کہ جب انسان کسی اچھے یا برے راستہ کو اختیار کر لیتا ہے تو اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور اسے اچھا سمجھنے لگتا ہے اور آخر کار اس پر اتنی مضبوطی سے جم جاتا ہے کہ اس راہ سے ہٹانا یا اس کا خود اسے چھوڑ دینا دشوار ہو جاتا ہے اور وہ اعمال اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں اسی اعتبار سے کہا گیا ہے کہ عادت "طبیعت ثانیہ" ہے۔

پھر جب انسان کی اس قسم کی فطرت اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اور دوسرے مقام پر ہم بیان کر چکے ہیں کہ فعل کی نسبت اس کے سبب کی طرف بھی ہو سکتی ہے لہذا اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کر دیا ورنہ باری تعالیٰ کے گمراہ کرنے کے وہ معنی نہیں ہیں جو عوام جہلاء سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے

کہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے نسبت
اسی جگہ کی ہے جہاں کافر اور فاسق لوگ مراد ہیں
نہ کہ مومن بلکہ حق تعالیٰ نے مومنین کو گمراہ کرنے کی
اپنی ذات سے نفی فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ (۹-۱۱۵)
اور خدا ایسا نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے
بعد گمراہ کر دے۔
فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيْهِمْ (۴۷-۴)
ان کے عملوں کو ہرگز ضائع نہ کریگا بلکہ ان کو سیدھے
رستے پر چلائے گا۔
اور کافر اور فاسق لوگوں کے متعلق فرمایا۔
فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷-۸) ان کے
لئے ہلاکت ہے اور وہ ان کے اعمال کو برباد کر دیگا۔
وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲-۲۶) اور گمراہ
بھی کرتا ہے تو نافرمانوں ہی کو۔
كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ (۴۰-۷۴)
اسی طرح خدا کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔
وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴-۲۷) اور خدا بے
انصافوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ (۶-۱۱۰) اور ہم ان کے
دلوں کو الٹ دیں گے۔
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۲-۷) خدا نے انکے
دلوں پر مہر لگا رکھی ہے۔
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔
(۲-۱۰) ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا خدا نے
ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔
میں دلوں کے پھیر دینے اور ان پر مہر لگا دینے اور
ان کی مرض میں اضافہ کر دینے سے بھی یہی معنی مراد
ہیں

(ض م م)

اَلضَّمُّ (ن) کے معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں
کو باہم ملا دینا کے ہیں قرآن میں ہے:۔
اُضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ (۲۰-۲۲) اور تم
اپنے بازو کو اپنے بغل سے لگا لو۔
وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ (۲۸-۳۲) اور بازو
کو سمٹائے رکھو۔
اَلْاِضْمَامَةُ لوگوں کی جماعت، کتابوں کا بنڈل،
گھاس وغیرہ کا گٹھا۔
اَسَدٌ ضَمْضَمٌ وَضَمَاضِمٌ اس شیر کو کہتے ہیں جو ہر
چیز کو اپنی ذات کے لئے اکٹھا کرنے والا ہو۔ بعض
نے اس کے معنی قوی اور مضبوط بھی کئے ہیں۔
فَرَسٌ سَبَّاقُ الْاَضَامِيْمِ وہ گھوڑا جو بیک
وقت گھوڑوں کی ایک جماعت سے سبقت
لے جانے والا ہو۔

(ض م ر)

اَلضَّامِرُ اس چھریرے گھوڑے کو کہتے
ہیں جس کا دبلا پن لاغری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس
اس ریاضت کی وجہ سے ہو جو سدھانے کے لئے
اس سے کرائی جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ (۲۲-۲۷) دبلی سواریوں پر۔
ضَمَرَ ضُمُوْرًا وَاضْطَمَرَ فَهُوَ مُضْطَمِرٌ
کے معنی لاغر ہو جانا کے ہیں اور ضَمَّرْتُهٗ کے
معنی لاغر کر دینا کے۔
اَلْمِضْمَارُ۔ گھوڑ دوڑ کا میدان جہاں گھوڑوں
کو دوڑانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔
اَلضَّمِيْرُ وہ بات جو تمہارے دل میں ہو اور اس پر

اطلاع پانا دشوار ہو اسی وجہ سے کبھی ضمیر کا لفظ قوت حافظہ پر بھی بولا جاتا ہے۔

(ض ن ن)

اَلضَّنَّۃُ (س) کے معنی کسی پسندیدہ اور مرغوب شے سے بخل کرنا کے ہیں اس سے عِلْقٌ مَضَنَّۃٌ وَمَضِنَّۃٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ نفیس چیز جس پر بخل کیا جائے۔ فُلَانٌ ضِنِّیْ بَیْنَ اَصْحَابِیْ میرے ساتھیوں میں سے فلاں اس قابل ہے کہ اس پر بخل کیا جائے (اور یہ باب ضَرَبَ وَسَمِعَ دونوں سے آتا ہے) چنانچہ کہا جاتا ہے ضَنَنْتُ بِالشَّیْءِ ضَنًّا وَضَنَانَۃً وَضَنِنْتُ اور آیت کریمہ: وَمَا ھُوَ عَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ (۸۱-۲۴) کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے جو وحی ملتی ہے وہ اس (کے عام کرنے) میں بخل نہیں کرتے۔

(ض ن ك)

اَلضَّنْكُ (ک) کے معنی کسی مقام یا معیشت کی تنگی کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

مَعِیْشَۃً ضَنْکًا (۲۰-۱۲۴) ان کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہے ضَنُكَ عَیْشُہٗ۔ اس کی معیشت تنگ ہو گئی۔ اِمْرَءَۃٌ ضِنَاكٌ گٹھیلے جسم والی عورت۔ نیز ضُنَاكٌ کے معنی زکام بھی آجاتے ہیں۔ اس سے زکام زدہ آدمی کو مَضْنُوْكٌ کہا جاتا ہے۔

(ض ھ ی)

اَلْمُضَاھَاۃُ کے معنی مشابہ اور مشاکلت کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:

یُضَاھُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۹-۳۰) یہ بھی انہی جیسی باتیں کرتے ہیں۔

میں یُضَاھُوْنَ کے معنی یُشَاکِلُوْنَ ہیں۔ یعنی دوسروں کے مشابہ اور ہم شکل ہونا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل مہموز ہے اور اس میں ایک قراءت (یُضَاھِئُوْنَ) ہمزہ کے ساتھ بھی منقول ہے[1]۔

اِمْرَءَۃٌ ضَھْیَاءُ۔ وہ عورت جسے حیض نہ آتا ہو اس کی جمع ضُھًی آتی ہے۔

(ض و ء)

اَلضَّوْءُ۔ کے معنی نور اور روشنی کے ہیں ضَاءَتِ النَّارُ وَاَضَاءَتْ آگ روشن ہو گئی۔ اور اَضَاءَتْ (افعال) کے معنی روشن کرنا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَہٗ (۲-۱۷) جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کر دیں۔

کُلَّمَا اَضَاءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِیْہِ (۲-۲۰) جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْءُ (۲۴-۳۵) تو اس کا تیل جلنے کو تیار ہے۔

یَاْتِیْکُمْ بِضِیَاءٍ (۲۸-۷۱) جو تم کو روشنی لائے۔

اور سماوی کتابوں کو جو انسان کی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہیں، ضِیَاءٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ (تورات کے متعلق) فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَاءً وَّ

---

[1] قراءۃ عاصم وعلی والاول اکثر القراء (الجمل ۲/۲۲۹)

ذِکْرًا (۲۱-۴۸) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو ہدایت (و گمراہی میں) فرق کر دینے والی اور (سرتاپا) روشنی اور نصیحت (کی کتاب) عطا کی۔

(ض ی ر)

اَلضَّیْرُ (ض) کے معنی مضرت اور گزند کے ہیں اور ضَارَہٗ وَضَرَّہٗ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی کو نقصان اور تکلیف پہنچانا۔ قرآن میں ہے:۔
لَا ضَیْرَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ (۲۶-۵۰) کچھ نقصان (کی بات) نہیں ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اور فرمایا:۔
لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا (۳-۱۲۰) ان کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

(ض ی ز)

آیت کریمہ:۔ تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی (۵۳-۲۲) میں ضِیْزٰی کے معنی ناقص اور بے انصافی کے ہیں۔ یہ اصل میں ضُیْزٰی بروزن فُعْلٰی ہے۔ یاء کی مناسبت سے ضاد کو مکسور کر دیا گیا ہے۔ (کیونکہ) بقول بعض کلام عرب میں فُعْلٰی کے وزن پر اسم صفت نہیں آتا۔[1]

(ض ی ع)

ضَاعَ (ض) اَلشَّیْئُ ضَیَاعًا کے معنی ہیں کسی چیز کا ہلاک اور تلف کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ (۳-۱۹۵) اور (فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔
اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا (۱۸-۳۰) ہم نیک عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔
وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ (۲-۱۴۳) اور خدا ایسا نہیں جو تمہارے عمل کو یونہی کھو دے۔
لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۹-۱۲۰) خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔
ضَیْعَۃُ الرَّجُلِ۔ کے معنی جائیداد کے ہیں کیونکہ اگر اس کی نگہداشت نہ کی جائے تو وہ ضائع ہو جاتی ہے اس کی جمع ضِیَاعٌ آتی ہے تَضَیَّعَ الرِّیْحُ ہوا کا اس قدر تند ہونا کہ جس چیز پر سے گزرے اسے تلف کرتی چلی جائے۔

(ض ی ف)

اَلضَّیْفُ (ض) دراصل اس کے معنی کسی جانب مائل ہونا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے ضِفْتُ اِلٰی کَذَا میں اس کی طرف مائل ہوا۔ اَضَفْتُ کَذَا اِلٰی کَذَا اسے ایک طرف مائل کر دیا۔
ضَافَتِ الشَّمْسُ لِلْغُرُوْبِ وَتَضَیَّفَتْ سورج مائل بغروب ہو گیا۔ ضاف السہم وتضیف عن الھدف تیر نشانہ سے ایک طرف ہٹ گیا۔
اَلضَّیْفُ۔ اصل میں اسے کہتے ہیں جو تمہارے پاس ٹھہرنے کے لئے تمہاری طرف مائل ہو مگر عرف میں ضیافت مہمان نوازی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اصل میں چونکہ یہ مصدر ہے اس لئے عام طور پر واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس کی جمع اَضْیَافٌ وَضُیُوْفٌ وَضِیْفَانٌ بھی آ جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ ضَیْفِ اِبْرٰھِیْمَ (۵۱-۲۴) بھلا

---

[1] ہذا قول سیبویہ یحکی عن ثعلب وغیرہ من العلماء ضِیْزٰی وسعلی وقال الکسائی انہما مصدران

تمہارے پاس ابراہیم ۔ ۔ ۔ ۔ کے مہمانوں کی خبر پہنچی ہے۔
وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ (١١-٧٨) اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری آبرو نہ کھوؤ۔
اِنَّ هٰؤُلَآءِ ضَیْفِیْ (١٥-٦٨) یہ میرے مہمان ہیں۔
اِسْتَضَفْتُ فُلَانًا فَاَضَافَنِیْ میں نے فلاں سے مہمان نوازی طلب کی تو میری مہمانی کی اِضِفْتُہٗ ضَیْفًا کے معنی کسی کی مہمانی کرنے کے ہیں اور میزبان کو ضَائِفٌ اور مُضِیْفٌ بھی کہا جاتا ہے۔
علمائے نحو کے نزدیک اَلْاِضَافَۃُ کا لفظ اس اسم مجرور کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس سے پہلے کوئی اسم (مضاف) ہو اور بعض کے نزدیک اسم اضافی ہر اس اسم کو کہتے ہیں جس کا ثبوت یا فہم دوسرے پر موقوف ہو جیسے اَبٌ، اِبْنٌ، اَخٌ، صَدِیْقٌ کہ ان سب کا وجود دوسرے اسماء کے حصول پر موقوف ہے۔ اس لئے اس قسم کے اسماء کو اسماء متضائفہ کہا جاتا ہے۔

(ض ی ق)

اَلضِّیْقُ وَالضَّیْقُ کے معنی تنگی کے ہیں اور یہ سَعَۃٌ کی ضد ہے اور ضِیْقَۃٌ کا لفظ فقر، بخل، غم اور اس قسم کے دوسرے معانی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔
ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا (١١-٧٧) کے معنی یہ ہیں کہ وہ انکے مقابلہ سے عاجز ہو گئے۔ اور آیات:۔
وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ (١١-١٢) اور اس خیال سے تمہارا دل تنگ ہو۔ وَيَضِيْقُ صَدْرِیْ (٢٦-١٣) اور میرا دل تنگ ہوتا ہے۔
يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (٦-١٢٥) اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (٩-١١٨) یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں۔
وَلَا تَكُ فِیْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (١٦-١٢٧) اور جو یہ بد اندیش کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو یہاں ضَیْقٌ بمعنی غم ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ (٦٥-٦) اور ان کو تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ دو میں تَضْیِیْقٌ کا لفظ نان و نفقہ میں بخل اور دلی تنگی یعنی غم کو شامل ہے۔
اور ضَاقَ وَاَضَاقَ فَهُوَ مُضِیْقٌ کے معنی محتاج ہونا بھی آتے ہیں اور فقر پر بھی ضَیْقٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل غنا کو وُسْعَۃٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

کتاب الطّاء

(ط ب ع)

اَلطَّبْعُ (ف) کے اصل معنی کسی چیز کو ڈھال کر کوئی شکل دینا کے ہیں مثلاً طَبْعُ السِّکَّۃِ وَطَبْعُ الدَّرَاہِمِ یعنی سکہ یا درہم کو ڈھالنا یہ خَتْمٌ سے زیادہ عام اور نَقْشٌ سے زیادہ خاص ہے۔ اور وہ آلہ جس سے مہر لگائی جائے اسے طَابَعٌ وَخَاتَمٌ کہا جاتا ہے اور مہر لگانے والے کو طَابِعٌ مگر کبھی یہ طَابِعٌ کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور یہ نِسْبَۃُ الْفِعْلِ اِلَی الْاٰلَۃِ کے قبیل سے ہے جیسے سَیْفٌ قَاطِعٌ قرآن میں ہے:۔

فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (۶۳-۴) تو ان کے دلوں پر مہر لگادی۔

کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۰-۵۹) اسی طرح خدا ان کے دلوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے مہر لگادیتا ہے۔

کَذٰلِکَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ (۱۰-۷۴) اس طرح ہم زیادتی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگادیتے رہیں۔

اور یہ بحث آیت خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ میں گزر چکی ہے[1]۔

اور نقش کرنے کے اعتبار سے سَجِیَّۃٌ (خلقی عادت) کو طَبْعٌ یا طَبِیْعَۃٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی دل پر بمنزلہ نقش کے ہوتی ہے۔ عام اس سے کہ پیدائشی ہو یا عادت ہونے کے اعتبار سے لیکن عام طور پر اس کا استعمال خلقی عادت پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے[2] (

(۲۸۷) فَتَاْبَی الطِّبَاعُ عَلَی النَّاقِلِ

کہ طبیعت کا بدلنا ممکن نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے آگ یا کسی دوا کا جو مزاج بنایا ہے اس خصوصی مزاج کو ان کی طبیعت کہا جاتا ہے۔

اور طَبْعُ السَّیْفِ کے معنی تلوار کا زنگ اور میل کچیل کے ہیں رَجُلٌ طَبِعٌ گندے اخلاق والا چنانچہ بعض نے آیات طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (۹-۹۳) خدا نے ان کے دلوں پر مہر کردی۔ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکَافِرِیْنَ (۷-۱۰۱) اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

---

[1] راجع (خ ت م)۔ [2] قال المتنبی فی قصیدۃ لہ یمدح بہا سیف الدولۃ ویذکر استنقاذہ اباوائل من اسر الخوارج مطلعہا: الام طماعیۃ العاذل۔ ولا رای فی الحب للعاقل والبیت فی دیوانہ ۲۰۷ طبع ہندیہ مصر ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳م) وصدر البیت یراد من القلب نسیانکم وانظر للبیت ایضاً محاضرات المؤلف (۳-۱۰۲) فی خلاصۃ وشرح ادب الدنیا والدین للماوردی ۱۸۲

ہیں طَبْعٌ کے معنی دلوں کو زنگ آلود یعنی گندہ کر دینا کئے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا :۔

بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (۸۳-۱۴) بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰہُ اَنْ یُّطَہِّرَ قُلُوْبَہُمْ (۵-۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے پاک کرنا نہیں چاہا۔

بعض نے کہا ہے کہ طَبَعْتُ الْمِکْیَالَ کے معنی ہیں میں نے پیمانے کو لبالب بھر دیا کیونکہ اس کا بھر جانا بھی گویا اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس میں اب کوئی اور چیز نہیں آسکتی اور طَبْعٌ بمعنی مَطْبُوْعٌ (بھرا ہوا) آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رمل)

(۲۸۸) کَزَوَایَا الطَّبْعِ ھَمَّتْ بِالْوَحَلْ

انکی حالت ان اونٹوں کی سی تھی جن پر پانی کے مشکیزے لدے ہوئے ہوں اور وہ دلدل میں پھنس گئے ہوں۔

(ط ب ق)

اَلْمُطَابَقَۃُ اسمائے متضایفہ سے ہے جس کے معنی ایک چیز کے اوپر اس کے برابر دوسری چیز رکھنا اسی سے طَابَقْتُ النَّعْلَ ہے جس کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے (   )

(۲۸۹) اِذَا لَاوَذَ الظِّلَّ الْقَصِیْرَ بِخُفِّہٖ
وَکَانَ طِبَاقَ الْخُفِّ اَوْ قَلَّ زَائِدًا

پھر طِبَاقٌ کا لفظ کبھی اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو دوسری کے اوپر ہو اور کبھی اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے مطابق اور موافق ہو جیسا کہ تمام ان الفاظ کا حال ہے جو دو معنوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور پھر کسی ایک معنی میں استعمال ہونے لگے ہوں۔ جیسے کَأْسٌ وَرَاوِیَۃٌ وَغَیْرُھُمَا چنانچہ آیت کریمہ :۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (۶۷-۳) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔ اور آیت کریمہ :۔

لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴-۱۹) کے معنی یہ ہوں گے کہ تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتے چلے جاؤ گے اور یہ ان مختلف احوال و مراتب کی طرف اشارہ ہے جن پر سے انسان گذر کر ترقی کے منازل طے کرتا ہے اور اس تدریجی ارتقاء کی طرف آیت وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَلْاٰیَۃ (۳۵-۱۱) اور خدا ہی نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے۔ میں اشارہ فرمایا ہے۔ نیز آخرت میں حشر و نشر حساب و کتاب اور پلصراط سے لے کر جنت اور دوزخ میں پہنچنے تک جو مختلف حالات انسان کو پیش آنے والے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے اور ایک جماعت جو باہم مطابقت اور موافقت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے ھُمْ فِیْ اُمِّ طَبَقٍ۔ نیز کہا جاتا ہے :۔ اَلنَّاسُ طَبَقَاتٌ لوگوں کے مختلف طبقے ہیں طَابَقْتُہٗ عَلٰی کَذَا وَتَطَابَقُوْا وَاَطْبَقُوْا

---

[1] قال لبید فی اللذین حاجوہ عند النعمان بن المنذر فاحجھم حتی زلقوا فلم یتکلموا فشبھھم بروایا مثقلۃ ارتطمت فی الوحل فلم تستطع الخروج وادلہ فتولوا فاترا مغبہم ... ... وقبلہ : والھبانیق قیام معھم کل مجموم اذا صب ھمل۔ والبیت فی الاساس والمحکم دطبع ، دوی، ودیوانہ ۳۹ والاقتضاب ۳۸۴ وتہذیب الالفاظ (۱۰۱) والاصلاح یعقوب ۹ والمعانی للقتبی ۷۶۴ قال فی الاصطلاح : الطبع النہر وجمعہ اطباع وطبوع قال لبید... کذا قال الاصمعی ۱۲ ۵۲ والبیت ایضا فی التاج بغیر عزو ؛

عَلَيْهِ باہم مطابق ہونا اسی سے جَوَابٌ يُطَابِقُ السُّؤَالَ کا محاورہ ہے یعنی جواب سوال کے عین مطابق ہے۔

اَلْمُطَابِقَةُ اس آدمی کی طرح چلنا جس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں اَلطَّبَقُ وَالطِّبَاقُ (۱) ٹھالی یا طباق جس پر خورونوش رکھتے ہیں (۲) ہر چیز کا ڈھکنا بیز (۳) پیٹھ کے مہروں میں سے ہر مہرہ کو طَبَقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باہم مطابق ہوتے ہیں اور طَبَّقْتُهُ بِالسَّيْفِ کا محاورہ بھی مُطَابَقَةُ الدَّمِّلِ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں میں نے ٹھیک اس کے جوڑ میں تلوار ماری اور اسے الگ کر دیا۔

طَبَقُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ رات اور دن کی ساعات جو باہم مطابق ہوں اَطْبَقْتُ عَلَيْهِ الْبَابَ میں نے اس پر دروازہ بند کر دیا رَجُلٌ عَيَايَاءُ طَبَاقَاءُ اَنکہ برد سے سخن بستہ گرود۔ یہ اَطْبَقْتُ الْبَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور فَحْلٌ طَبَاقَاءُ اس سانڈھ کو کہتے ہیں جو جفتی سے عاجز ہو اور بڑی مصیبت کو بِنْتُ الطَّبَقِ کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے وَافَقَ شَنٌّ طَبَقَةً[1] کہ شن طبقہ کے موافق ہو گئی اور شَنٌّ وَطَبَقَةٌ دو قبیلوں کے نام ہیں۔[2]

(ط ح و ر ی)

طحو اور دحو دونوں ہم معنی ہیں اور ان کے معنی کسی چیز کو پھیلانے اور لے جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے: وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۹۱-۶) اور زمین اور اس کی جس نے اسے پھیلایا۔

شاعر نے کہا ہے[3] (الطویل)

(۲۹۰) طَحَا بِكَ قَلْبٌ فِي الْحِسَانِ طَرُوبٌ

تجھے حسن پرست دل کہاں سے کہاں لے گیا۔

(ط ر ح)

اَلطَّرْحُ کے معنی کسی چیز کو پھینکنے اور دور کر دینے کے ہیں اور دور دراز مقام کو اَلطَّرُوحُ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے۔ رَأَيْتُهُ مِنْ طَرَحٍ میں نے اسے دور سے دیکھا۔

اَلطِّرْحُ پھینکی ہوئی چیز جس کی کسی کو ضرورت نہ ہو قرآن میں ہے: اُقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا (۱۲-۹) تو یوسف کو یا تو جان سے مار ڈالو یا کسی دور دراز ملک میں پھینک آؤ۔

---

[1] مثل يضرب للمتوافقين في امر انظر لقصتها مثل الميداني ۲ / ۲۵۹ واللسان (طبق) واصلاح يعقوب ۳۲۲ وفي تاريخ الطبري ... واتفقا فاعتنقه (الصحاح)، [2] قال علقمة ... ابيات يا ابا حبيب بن خدرة مولى بلال بن عامر والمثل في المحاضرات ۳ / ۲۱۵ وبعده: وافقها فاعتنقه (الصحاح)، [3] قاله علقمة

[2] بيتا يا ابا حبيب بن خدرة مولى بلال بن عامر والمثل في المحاضرات ۳ / ۲۱۵ وبعده

بن الفحل وتمامه: بعيد الشباب عصرحان مشيب والبيت من كلمة مفضلية في ۳۴ بيتا يمدح فيها الحارث بن جبلة الغساني وكان قد اسر فيه اخاه من تميم وانه من احسن المشهورات الثلاث راجع العمدة لابن رشيق (۱: ۱۴۰) وانظر للبيت شواهد المغني (۲: ۱۵) ۲ / ۱۰۵ والشعراء ۲ / ۱۰۵۰۲ وشواهد الشافية ۲۹۴ والعمدة (۱: ۵۷) والمعاهد (۱: ۱۲۱) واضداد السجستاني ۹۴ واين الانباري ۳۹۴ وابن ابي الطيب ۲۴۰ والعقد الثمين ۱۰۵ وايام العرب ۵۵ والمعلقات بشرح ابن الانباري ۱۷۴ وامالي ابن الشجري (۲: ۲۷۷) والاغاني (۱۴ / ۲ / ۲: ۱۱۲) والموشح ۹۳ واللسان (طحا) ومختارات ابن الشجري (۱: ۱۹ / ۳) والصناعتين لابن سلام ۱۱ وعدة من ثلاث روائع لا الفحول من شعر ۱۲

(ط ر د)

اَلطَّرْدُ (ن) کسی کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر دور کر دینا ہٹا دینا کہا جاتا ہے طَرَدْتُہٗ میں نے اسے بھگا دیا قرآن میں ہے:۔

وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ طَرَدْتُّھُمْ (۱۱-۳۰) برادران ملت! اگر میں ان کو نکال دوں تو عذاب خدا سے کون میری مدد کر سکتا ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ (۶-۵۲) اور ان کو مت نکالو۔

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۶-۱۱۴) اور میں ان مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نکالنے والا بھی نہیں ہوں۔

فَتَطْرُدَھُمْ فَتَکُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (۶-۵۲) اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔

اَطْرَدَہُ السُّلْطَانُ وَطَرَدَہٗ بادشاہ نے اسے شہر بدر کر دیا اور جہاں سکونت پذیر تھا وہاں سے نکال دینے کا حکم صادر فرمایا۔

طَرَدٌ وَطَرِیْدَۃٌ وہ شکار جسے اس کی جگہ سے نکال بھگایا جائے مُطَارَدَۃُ الْاَقْرَانِ ہمسروں کا ایک دوسرے پر حملہ کر کے مدافعت کرنا۔

اَلْمِطْرَدُ دھبگانے کا آلہ اِطِّرَادُ الشَّیْءِ کسی چیز کا پے در پے آنا۔

(ط ر ف)

اَلطَّرْفُ کے معنی کسی چیز کا کنارہ اور سرا کے ہیں اور یہ اجسام اور اوقات دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّھَارِ (۲۰-۱۳۰) اور...... اس کی تسبیح بیان کرو اور دن کے اطراف میں۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ (۱۱-۱۱۴) اور دن کے دونوں سروں (یعنی صبح اور شام کے اوقات میں) نماز پڑھا کرو۔

اور اس سے بطور استعارہ نجیب الطرفین کو کَرِیْمُ الطَّرَفَیْنِ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ طَرَفَیْنِ کے معنی زبان اور ستر کے ہیں اور یہ عفت کی طرف اشارہ ہے۔

طَرْفُ الْعَیْنِ آنکھ کی پلک اور اَلطَّرْفُ کے اصل معنی پلک جھپکنے کے ہیں اور پلک جھپکنے کو دیکھنا لازم ہے اس لئے الطرف کے معنی دیکھنا بھی آجاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ (۲۷-۴۰) میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے۔ اور آیت کریمہ:۔

فِیْھِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ (۵۵-۵۶) ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں۔ میں قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ کے معنی یہ ہیں کہ عفیف ہونے کی وجہ سے انکی نگاہیں ہمیشہ نیچے جھکی رہتی ہیں۔

طُرِفَ فُلَانٌ اس کی نظر کو صدمہ پہنچا۔ اور آیت کریمہ:۔

لِیَقْطَعَ طَرَفًا (۳-۱۲۷) تاکہ... ایک جماعت کو ہلاک کر دے۔ میں قطع کرنے کو ایک طرف کے ساتھ مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کو نابود کرنے کے لئے اس کی ایک جانب سے شروع ہوا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت:۔

نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا (۱۳-۴۱) ہم زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے آتے ہیں۔ میں بھی کم کرنے کو اطراف کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

اَلطِّرَافُ کے معنی چرمی خیمہ کے ہیں جس کے اطراف کو اوپر اٹھا دیا جاتا ہے۔

مِطْرَفُ الْخَزِّ وَمُطْرَفٌ منقش چادر جس کے کنارے ریشمی ہوں۔ ج مَطَارِفُ

اَطْرَفْتُ مَالًا میں نے تازہ مال حاصل کیا۔
نَاقَۃٌ طَرِفَۃٌ وَ مُسْتَطْرِفَۃٌ وہ اونٹنی جو اونٹ کی طرح چراگاہ کے اطراف سے گھاس کھائے اور جو گھاس وہ جانور کھاتا ہے اسے طَرِیْفٌ کہا جاتا ہے اور طَرِیْفٌ کے معنی نیا حاصل کردہ مال بھی آتے ہیں نیز جو شخص ایک عورت پر صبر نہ کرے اسے بھی طَرِفٌ کہہ دیتے ہیں۔
اَلطِّرْفُ عمدہ نسل کا گھوڑا جس کے حسن کے سبب اس کی طرف نگاہیں اٹھتی ہوں دراصل طِرْفٌ بمعنی مَطْرُوْفٌ آتا ہے یعنی جسے نظر اٹھا کر دیکھا جائے جیسا کہ نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ آجاتا ہے اسی اعتبار سے خوبصورت چیز کو جس پر نظر جم جائے اسے قَیْدُ النَّوَاظِرِ کہا جاتا ہے۔

(ط ر ق)

اَلطَّرِیْقُ کے معنی راستہ ہیں جس پر چلا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ (۲۰-۷۷) پھر ان کے لئے دریا میں راستہ بنادو۔
اسی سے بطور استعارہ ہر اس مسلک اور مذہب کو طریق کہا جاتا ہے جو انسان کوئی کام کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے عام اس سے کہ وہ فعل محمود ہو یا مذموم۔ قرآن میں ہے:۔
وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ (۲۰-۶۳) اور تمہارے بہتر مذہب کو نابود کردیں۔
اور ما ستداد میں راستہ کے ساتھ تشبیہ دے کر کھجور کے لمبے درخت کو بھی طَرِیْقَۃٌ کہہ دیتے ہیں۔
اَلطَّرْقُ کے اصل معنی مارنے کے ہیں مگر یہ ضَرْبٌ سے زیادہ خاص ہے۔ کیونکہ طَرْقٌ کا لفظ چٹاخ سے مارنے پر بولا جاتا ہے جیسے ہتھوڑے سے لوہے کو کوٹنا بعدازاں ضَرْبٌ کی طرح طَرْقٌ کے لفظ میں بھی وسعت پیدا ہوگئی ہے چنانچہ بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔
طَرْقُ الْحَصٰی کاہن کا اپنی کہانت کے لئے کنکر مارنا
طَرْقُ الدَّوَابِّ چوپائے جانوروں کا پانی میں داخل ہوکر اسے پاؤں سے گدلا کردینا۔ طَارَقْتُ النَّعْلَ وَ طَرَقْتُهَا میں نے جوتے کے ایک پرتلہ پر دوسرا رکھ کر اسے سی دیا۔ پھر طَرْقُ النَّعْلِ کی مناسبت سے طَارَقَ بَیْنَ الدِّرْعَیْنِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ایک زرہ کے اوپر دوسری زرہ پہننا کے ہیں طَرْقُ الْخَوَافِیْ پرند کے اندرونی پروں کا تہ برتہ ہونا اور اَلطَّارِقُ کے معنی ہیں راستہ پر چلنے والا۔ مگر عرف میں بالخصوص اس مسافر کو کہتے ہیں جو رات میں آئے چنانچہ طَرَقَ اَھْلَہٗ طُرُوْقًا کے معنی ہیں وہ رات کو آیا اور اَلنَّجْمُ ستارے کو بھی اَلطَّارِقُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بالخصوص رات کو ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ (۸۶-۱) آسمان اور رات کو آنے والے کی قسم۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الرجز)

---

[1] تمثلت بہ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ یوم احد تحض علی المسلمین (ابن ہشام ۵۶۲ و ابن الانباری ۴۰) و الرجز فی الاصل لہند بنت بیاضۃ الایادیہ قالتہ فی حرب الفرس لایاد و بعدہ: لانخشی لو امق بمشی علی النمارق۔ المسک علی المفارق۔ راجع اللسان (طرق) و الاقتضاب ۲۱۸ والبحر (۷: ۲۲۱) والعراب ثلاثین ۳۸ و ایام العرب ۱۳ والسیوطی ۲۳۷ والمعانی القتبی ۲۳۵ و روض الانف (۲: ۱۲۹) و قد جاء بعض ہذا الرجز منسوبا لامرءۃ من بنی عجل انشدتہ یوم ذی قار، راجع التاریخ للطبری (۲: ۲۱۵) و منسوبا لابنۃ للغند الزمانی انشدتہ یوم التحالف من ایام حرب بکر و تغلب (الاغانی ۲۰: ۱۴۴)

(۲۹۱) نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقٍ

ہم طارق یعنی سردار کی بیٹیاں ہیں۔

طَوَارِقُ اللَّیْلِ وہ مصائب جو رات کو نازل ہوں۔

طُرِقَ فُلَانٌ رات میں صدمہ پہنچا۔

شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۲۹۲) کَاَنِّیْ اَنَا الْمَطْرُوْقُ دُوْنَكَ بِالَّذِیْ
طُرِقْتَ بِهٖ دُوْنِیْ وَعَیْنِیْ تَهْمُلُ

(میں اس طرح بے چین ہوتا ہوں کہ وہ مصیبت جو رات کو تجھ پر آتی ہے، مجھے پہنچ رہی ہے۔ اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔

اور معنی ضرب یعنی مارنے کے اخفیار سے کہا جاتا ہے۔ طَرَقَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ (اونٹ کا ناقہ سے جفتی کرنا)، اَطْرَقْتُهَا میں نے سانڈھ کو اونٹنی پر چھوڑا۔ اِسْتَطْرَقْتُ فُلَانًا الْفَحْلَ میں نے فلاں سے جفتی کے لئے سانڈھ طلب کیا اور یہ محاورات ضَرَبَهَا الْفَحْلُ وَاَضْرَبْتُهَا وَاسْتَضْرَبْتُهٗ کی طرح استعمال ہوتے ہیں اور اس ناقہ کو جو گابھن ہونے کے قابل ہو جائے اسے طَرُوْقَةٌ کہا جاتا ہے اور بطور کنایہ طَرُوْقَةٌ بمعنی عورت بھی آجاتا ہے۔ اَطْرَقَ فُلَانٌ فلاں نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ گویا اس کی نگاہ زمین کو مارنے لگی جیسا کہ مِطْرَقَةٌ (ہتھوڑے) سے کوٹا جاتا ہے اور طَرِیْقٌ بمعنی راستہ کی مناسبت سے جَاءَتِ الْاِبِلُ مَطَارِیْقَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اونٹ ایک ہی راستہ سے آئے اور تَطَرَّقَ اِلٰی کَذَا کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف رستہ بنانا طَرَّقْتُ لَهٗ کسی کے لئے راستہ ہموار کرنا۔

اَلطَّرِیْقُ کی جمع طُرُقٌ آتی ہے اور طَرِیْقَةٌ کی جمع طَرَائِقُ۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ کُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا (۷۲-۱۱) کے معنی یہ ہیں کہ ہم مختلف مسلک رکھتے تھے اور یہ آیت کریمہ:۔ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (۳-۱۶۳) ان لوگوں کے خدا کے ہاں (مختلف اور متفاوت) درجے ہیں۔ کی مثل ہے (یعنی جیسا کہ یہاں درجات سے مراد اصحاب الدرجات ہیں اسی طرح طرائق سے اصحاب طرائق مراد ہیں) اور آسمان کے طبقات کو بھی طَرَائِقُ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ (۲۳-۱۷) ہم نے تمہارے اوپر کی جانب سات طبقے پیدا کئے۔ رَجُلٌ مَطْرُوْقٌ نرم اور سست آدمی یہ هُوَ مَطْرُوْقٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مصیبت زدہ کے ہیں یعنی مصائب نے اسے کمزور کر دیا جیسا کہ مصیبت زدہ آدمی کو مَقْرُوْعٌ یا مَدْقُوْقٌ کہا جاتا ہے یا یہ نَاقَةٌ مَطْرُوْقَةٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور یہ ذلت میں اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دیکر بولا جاتا ہے۔

(ط ر ی)

اَلطَّرِیُّ تروتازہ۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] قاله امیة بن الصلت فی قصیدة یشکو فیها عقوق ابنه فی سبعة المماسة مع المرشق تم ۵۲ واختلف فی قائلها قال التبهذی قی ترہ ی لابن عبد الاعلی قیل لابی العباس الاعمی قال ابو بلال اور دھا ابو عبیدة فی اخبار العقعقة فالبرة ونسبه فی العیون (۳: ۸۷) لیحیی بن سعید ولیس له لان قائلها انشدہ بین یدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کما فی الصغیر للطبرانی ۱۹۵ فاخذ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بتلابیب ابو ولدہ وسلمہ لوالدة قائلا له "انت ومالک لابیک" انظر ایضا الاغانی (۳: ۱۹۱) وتراجم امیة بن ابی الصلت فی الاصابة رقم ۵۵۲ والخزانة (۱: ۱۱۹-۱۲۲) وابن سلام (۶۳ و ۶۴) والاشتقاق ۴۸ والاغانی (۳: ۱۷۹-۱۸۵/۱۶: ۶۹-۷۲) وابن قتیبة ۲۹۴-۳۴۳

لَحْمًا طَرِيًّا (۱۶-۱۴) تازہ گوشت (کھاؤ)۔
طَرِيًّا کا مصدر طَرَاءٌ وَطَرَاوَةٌ آتا ہے جس کے معنی تر و تازہ ہونا کے ہیں۔ محاورہ ہے:۔
طَرَّيْتُ كَذَا فَطَرِيَ میں نے اسے تازہ کیا چنانچہ وہ تازہ ہو گیا۔ اسی سے نئے او تازہ کئے ہوئے کپڑوں کو مُطَرَّاةٌ کہا جاتا ہے اور اِطْرَاءٌ اس تعریف کو کہتے ہیں جس سے ممدوح کی یاد تازہ ہو جائے اور طَرَءَ (مہموز) کے معنی طَلَعَ یعنی اچانک طلوع ہونے کے ہیں۔

(ط س)

طٰسٓ یہ حروف مقطعات سے ہیں اور طَسٌّ وَطُسُوسٌ سے مشتق نہیں ہے جس کے معنی طشت ہیں۔

(ط ع م)

اَلطَّعْمُ (س) کے معنی غذا کھانے کے ہیں اور ہر وہ چیز جو بطور غذا کھائی جائے اسے طَعْمٌ یا طَعَامٌ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ (۵-۹۶) اور اس کا طعام جو تمہارے فائدہ کے لئے۔
اور کبھی طعام کا لفظ خاص کر گیہوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ ابو سعید الخدری سے روایت ہے[1] ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بصدقۃ الفطر صاعا من طعام او صاعا من شعیر۔ کہ آنحضرت نے صدقہ فطر میں ایک صاع طعام یا ایک صاع جو دینے کا حکم دیا۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ (۶۹-۳۶) اور نہ پیپ کے سوا اس کے لئے کھانا ہے۔
وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (۷۳-۱۳) اور گلوگیر کھانا ہے۔
طَعَامُ الْأَثِيمِ (۴۴-۴۴) گنہگار کا کھانا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ (۱۰۷-۳) اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لئے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔ میں طَعَامٌ بمعنی اِطْعَامٌ یعنی کھانا کھلانا کے ہے
فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا (۳۳-۵۳) اور جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔
لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا (۵-۹۳) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔
بعض نے کہا ہے کہ کبھی طَعِمْتُ بمعنی شَرِبْتُ آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي (۲-۲۴۹) جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا اس کی نسبت تصور کیا جائے گا کہ (وہ) میرا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ یہاں مَنْ لَمْ يَشْرَبْهُ کی بجائے وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح چلو بھر سے زیادہ محض پانی کا استعمال ممنوع ہے اسی طرح طعام کے ساتھ بھی اس مقدار سے زائد پانی پینا ممنوع ہے کیونکہ جو پانی کھانے کے ساتھ پیا جاتا ہے اس

---

[1] أخرجه الأئمة الستة في كتبهم مختصرا ومطولا وذكر الحافظ في الفتح ان ابن المنذر رد على من استدل من هذا الحديث ان المراد من الطعام الحنطة وقال تفسير أبي سعيد مخالف لهذا الاستدلال ولفظه قال ابو سعيد كان طعامنا الشعير والزبيب والاقط والتمر وهي ظاهرة فيما قال لكن في رواية عطف الشعير على الطعام وهو يدل على المغايرة واورد الحافظ بعده رواية من ثلاث طرق والله اعلم ؛

پر بھی طَعِمْتُ کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر مَنْ تَمْ يَتَنَوَّبْهُ لایا جاتا تو اس سے کھانے کے ساتھ پانی پینے کی ممانعت ثابت نہ ہوتی اس کے برعکس يَطْعَمْهُ کے لفظ سے یہ ممانعت بھی ثابت ہو جاتی اور معین مقدار سے زائد پانی کا پینا بہرحالت ممنوع ہو جاتا ہے۔ اور ایک حدیث (۲۰) میں آنحضرت نے زمزم کے پانی کے متعلق اِنَّهٗ طَعَامُ طُعْمٍ وَ شِفَاءُ سُقْمٍ (کہ یہ کھانے کا کھانا اور بیماری سے شفا ہے) فرما کر تنبیہ کی ہے کہ بیر زمزم کے پانی میں غذائیت بھی پائی جاتی ہے جو دوسرے پانی میں نہیں ہے۔

اِسْتَطْعَمْتُهٗ فَاَطْعَمَنِيْ میں نے اس سے کھانا مانگا چنانچہ اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ قرآن میں ہے:۔

اِسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا (۱۸-۷۷) اور ان سے کھانا طلب کیا۔

وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (۲۲-۳۶) اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ (۷۶-۸) اور وہ ۔۔۔۔ کھانا کھلاتے ہیں۔

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ (۳۶-۴۷) بھلا ہم ان لوگوں کو کھانا کھلائیں جن کو اگر خدا چاہتا تو خود کھلا دیتا۔

اَلَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ (۱۰۶-۴) جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا۔

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (۶-۱۴) وہی سب کو کھانا کھلاتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا۔

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (۵۱-۵۷) اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھانا کھلائیں۔

اور علیہ السلام نے فرمایا (۲۱) اِذَا اسْتَطْعَمَكُمُ الْاِمَامُ فَاَطْعِمُوْهُ یعنی جب امام نماز میں تم سے لقمہ طلب کرے یعنی بھول جائے تو اسے بتا دو۔ رَجُلٌ طَاعِمٌ خوش حال آدمی رَجُلٌ مُّطْعَمٌ جس کو وافر رزق ملا ہو مُطْعِمٌ نیک خورندہ مِطْعَامٌ بہت کھلانے والا، مہمان نواز طُعْمَةٌ کھانے کی چیز۔ رزق۔

(ط ع ن)

اَلطَّعْنُ (ف) کے معنی نیزہ، سینگ وغیرہ کسی تیز اور نوکیلی چیز کے ساتھ زخم کرنے کے ہیں تَطَاعَنُوْا وَاطَّعَنُوْا انہوں نے ایک دوسرے کو نیزہ مارا پھر استعارہ کے طور پر کسی پر الزام لگانے یا اس کی بدگوئی کرنے کے معنی میں بھی طعن کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ (۴-۴۶) اور دین میں طنز کی راہ سے۔

وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (۹-۱۲) اور تمہارے دین میں طعنے کرنے لگیں۔

(ط غ و ی)

طَغَوْتُ وَطَغَيْتُ طَغْوَانًا وَطُغْيَانًا کے معنی طغیان اور سرکشی کرنے کے ہیں اور اَطْغَاهُ (افعال) کے معنی ہیں اسے طغیان سرکشی پر ابھارا اور طغیان کے معنی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّهٗ طَغٰى وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔

---

[1] راجع للحدیث الفائق (۲/۳۱۴) وفیہ اہنا "والعائد لزمزم والسان (طعم) وفی الطیالسی عن ابی ذر رضی انہا المبارکۃ راجع الفتح الکبیر للنبہانی ۱/۴۴۴ [2] قال علی و راجع النیل ۲/۳۲۹ والفتح الاثر فی الفائق ۲/۴۲ قال وذہب مع باب التمثیل ۞ ۞ ۞ ۞

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی (٩٦-٦) مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے۔

قَالَ رَبَّنَا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (٢٠-٤٥) دونوں کہنے لگے کہ ہمارے پروردگار ہمیں خوف ہے کہ ہم پر تعدی کرنے لگے یا زیادہ سرکش ہو جائے۔

وَلَا تَطْغَوْا فِیْهِ فَیَحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبِیْ۔ (٢٠-٨١) اور اس میں حد سے نہ نکلنا ورنہ تم پر میرا عذاب نازل ہوگا۔

فَخَشِیْنَا اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّکُفْرًا (١٨-٨٠) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ بڑا ہو کر بدکردار ہوتا کہیں ان کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔

فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (٢-١٥) کہ بے حد سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

اِلَّا طُغْیَانًا کَبِیْرًا .... (١٧-٦٠) بے حد سرکشی

وَاِنَّ لِلطّٰغِیْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ (٣٨-٥٥) اور سرکشوں کے لئے برا ٹھکانا ہے۔

قَالَ قَرِیْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُهٗ (٥٠-٢٧) اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا اے ہمارے پروردگار میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا۔

اَلطَّغْوٰی (اسم) طغیان یعنی بے حد سرکشی اور آیت کریمہ:۔

کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ (٩١-١١) قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب پیغمبر کو جھٹلایا۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ قوم ثمود کو جب ان کی سرکشی کی پاداش سے ڈرایا گیا تو انہوں نے یقین نہ کیا اور آیت کریمہ:۔

هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰی (٥٣-٥٢) وہ لوگ بڑے ہی ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ سرکشی کسی حالت میں بھی ہلاکت سے نجات نہیں بخش سکتی چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم ان سے بھی زیادہ سرکش تھی۔ لیکن انہیں ہلاک کر دیا گیا اور آیت:۔

اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے .... (٦٩-١١)

میں پانی کے حد سے تجاوز کر جانے کو مجازاً طغیان سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

فَاُهْلِکُوْا بِالطَّاغِیَةِ (٦٩-٥) سو...... کڑک سے ہلاک کر دیئے گئے۔

میں طَاغِیَۃٌ سے طوفان کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ آیت اِنَّا طَغَی الْمَآءُ میں پایا جاتا ہے[1]

اَلطَّاغُوْتُ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حد شکن ہو اور ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے اسے طاغوت کہا جاتا ہے اور یہ واحد جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے[2]۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ (٢-٢٥٦) جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے۔

وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ (٣٩-١٧) اور جنہوں نے بتوں کی.... اجتناب کیا۔

اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ..... (٢-٢٥٧) ان کے دوست شیطان ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ (٤-٦٠) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں۔

---

[1] الآیۃ متعلق بقوم ثمود ولا تعلق لہ بالآیۃ: انا لما طغی الماء [2] قد یاتی جمعہ علی طواغیت کما ورد فی الحدیث لاتحلفوا بآباءکم ولا بالطواغیت

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

میں طاغوت سے حدود شکن مراد ہے اور نافرمانی میں حد سے تجاوز کی بنا پر ساحر، کاہن، سرکش جن اور ہر وہ چیز جو طریق حق سے پھیرنے والی ہو اسے طاغوت کہا جاتا ہے بعض کے نزدیک یہ فعلوت کے وزن پر ہے جیسے جبروت وملکوت[1] اور بعض کے نزدیک اس کی اصل طغووت ہے۔ پھر صاعقۃ اور صاقعۃ کی طرح پہلے لام کلمہ میں قلب کیا گیا اور پھر واؤ کے متحرک اور ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے اسے الف سے تبدیل کیا گیا۔

(ط ف ف)

اَلطَّفِیْفُ کے معنی حقیر اور تھوڑی سی چیز کے ہیں اسی سے ناقابل اعتناء چیز کو طفافۃ کہا جاتا ہے اور طفف الکیل کے معنی ہیں اس نے پیمانے کو پورا بھر کر نہیں دیا۔ اسی کی کہ قرآن میں ہے: وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ (٨٣-١) ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے۔

(ط ف ق)

طَفِقَ یَفْعَلُ کَذَا وہ ایسا کرنے لگا یہ اَخَذَ یَفْعَلُ کی طرح کسی کام کو شروع کرنے کے معنی دیتا ہے اور ہمیشہ کلام مثبت میں استعمال ہوتا ہے لہٰذا مَا طَفِقَ کَذَا کہنا جائز نہیں ہے۔ قرآن میں ہے: فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (٣٨-٣٣) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ وَطَفِقَا یَخْصِفَانِ (٧-٢٢) اور وہ لگے ... چپکانے۔

(ط ف ل)

اَلطِّفْلُ جب تک بچہ نرم ونازک رہے اس وقت تک اسے طِفْلٌ کہا جاتا ہے یہ اصل میں مفرد ہے مگر بمعنی جمع بھی آ جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے: ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا (٤٠-٦٧) پھر تم کو نکالتا ہے کہ تم بچے ہوتے ہو۔ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (٢٤-٣١) یا ایسے لڑکوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں۔

طِفْلٌ کی جمع اَطْفَالٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْکُمُ الْحُلُمَ (٢٤-٥٩) اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔

اور نرم ونازک ہونے کے معنے کی مناسبت سے گداز بدن عورت کو طَفْلَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور طَفُلَتْ طُفُوْلَۃً وَطَفَالَۃً کے نرم ونازک ہونے کے ہیں۔ اور جس ہرنی کے ساتھ اس کا بچہ ہو اسے مُطْفِلٌ کہا جاتا ہے طَفَّلَتِ الشَّمْسُ اس وقت بولا جاتا ہے جب آفتاب نکلنے کو ہو اور ابھی تک اس کی دھوپ اچھی طرح زمین پر نہ پھیلی ہو۔ شاعر نے کہا ہے[2]۔ (الرمل)

(٢٥٣) وَعَلَی الْاَرْضِ غَیَایَاتُ الطَّفَلْ

اور زمین پر تا حال صبح کا سو جھا کا موجود تھا۔

اور طُفَیْلِیٌّ جس کے معنی ایسے کھانا میں شریک ہونا کے ہیں جس پر اسے بلایا نہ گیا ہو کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ طَفَلَ النَّهَارُ سے ماخوذ ہے یعنی اس

---

[1] نوزنہ فعلوت [2] قالہ لبید یصف فرسا وصدرہ: فتدلیت علیہ قافلاً۔ والبیت فی السمط ٣٤٣ والدیوان (٢: ١٤) وتہذیب الالفاظ ٤٠٨ والاشتقاق ٣٠٧ و٤٠٨ وتہذیب الالفاظ ٤٨ والامالی (٢: ١٢١) ۔ ویحکی عن لحیانی اللہ یمن مرابیع رہان وکل ایضا راجع اللسان رغیا وغریب ابی عبید (١: ٢١٤)

وقت آنا اور بعض نے کہا ہے کہ طُفَیْلُ الْعَرَائِسِ ایک مشہور آدمی کا نام تھا[1] جو بلا دعوت تقریبات میں شریک ہوجاتا تھا۔ اور اسی سے طَفَّلَ ہے جس کے معنی طفیلی بن کر جانے کے ہیں۔

(ط ل ل)

اَلطَّلُّ کے معنی بہت ہلکی سی بارش کے ہیں جس کا معمولی سا اثر ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ (۲-۲۶۵) اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھوار ہی سہی۔
اور طَلَّ الْاَرْضَ فَهِيَ مَطْلُوْلَةٌ کے معنی زمین پر اوس پڑنے کے ہیں اسی سے جس خون کی پرواہ نہ کی جائے اور اسے اوس کی طرح معمولی سمجھا جائے اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ طُلَّ دَمُ فُلَانٍ یعنی فلاں کا خون باطل کر دیا گیا اور شبنم کا چونکہ ہلکا سا اثر ہوتا ہے اس مناسبت سے گھروں کے باقی ماندہ نشانات کو طَلَلٌ کہدیتے ہیں اَطَلَّ فُلَانٌ جھانکنا، دور سے نظر آنا۔

(ط ف ء)

طَفِئَتِ (س) اَلنَّارُ کے معنی آگ بجھ جانے کے ہیں۔ اور اَطْفَأْتُهَا (افعال) کے معنی پھونک سے بجھا دینے کے قرآن میں ہے:۔
يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ (۹-۳۲) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں
يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ (۶۱-۸) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے چراغ کی روشنی کو منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں۔

ان دونوں آیتوں میں معنوی طور پر یہ فرق پایا جاتا ہے[2] کہ يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا کے معنی نور الٰہی کو بجھانے کا قصد کرنے کے ہیں مگر لِيُطْفِئُوا کے معنی ایسے امر کا قصد کرنے کے ہیں جو اطفاء نور کا سبب بن سکے۔

(ط ل ب)

اَلطَّلَبُ (ن) کے معنی کسی شے کے پانے کی تلاش اور جستجو کرنے کے ہیں عام اس سے کہ وہ چیز اعیان واجسام سے تعلق رکھتی ہو یا معانی سے قرآن میں ہے:۔
فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا (۱۸-۴۱) تم اسے تلاش کے باوجود حاصل نہیں کر سکو گے۔
ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ (۲۲-۷۳) طلب کرنے والا اور جسے طلب کیا جائے (یعنی عابد معبود دونوں) کمزور ہیں۔
اَطْلَبْتُ فُلَانًا (۱) کسی کی حاجت روائی کرنا (۲) کسی کو محتاج کرنا اور جو گھاس پانی سے بہت دور ہو اور اس تک پہنچنے کے لئے تکلیف اٹھانا پڑے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے اَطْلَبَ الْکَلَأُ

(ط ل ت)

طَالُوتُ یہ عجمی لفظ ہے بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جالوت کے مقابلہ کے لئے مقرر فرمایا (۲-۲۴۷)

(ط ل ح)

اَلطَّلْحُ (موز) ایک درخت کا نام ہے اس کا واحد طَلْحَةٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَطَلْحٍ مَنْضُودٍ (۵۶-۲۹) اور تہ بتہ کیلوں ....

---

[1] رجل من اہل الکوفۃ من بنی عبداللہ ابن غطفان (الصحاح) [2] راجع روح المعانی ۲/۳۵۴ والکشاف ۱/۱۰۰ وابن کثیر ۱/۳۰۰-۳۴۳

اور اِبِلٌ طِلَاحٌ - یہ طَلَحٌ کی طرف منسوب ہے اور طِلَاحٌ وَطَلِیْحَۃٌ ان اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو طلح درخت کو کھا کر بیمار ہوگئے ہوں۔ نیز طَلَحٌ وَطَلِیْحُ اَسْفَارٍ محاورہ ہے یعنی کثرت سفر کی وجہ سے دبلی اونٹنی اور اسی سے اَلطَّلَاحُ ہے جو کبھی اَلصَّلَاحُ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔

(ط ل ع)

طَلَعَ (ن) الشَّمْسُ طُلُوْعًا وَمَطْلَعًا کے معنی آفتاب طلوع ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ (۲۰-۱۳۰) اور سورج کے نکلنے سے پہلے ...... تسبیح وتحمید کیا کرو۔
حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷-۵) طلوع صبح تک۔
اور مَطْلِعٌ کے معنی ہیں طلوع ہونے کی جگہ قرآن میں ہے:۔
حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ (۱۸-۹۰) یہاں تک کہ سورج کے طلوع ہونے کے مقام پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایسے لوگوں پر طلوع کرتا ہے ....
اسی سے استعارہ کے طور طَلَعَ عَلَیْنَا فُلَانٌ وَاطَّلَعَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کسی کے سامنے ظاہر ہونا اور اوپر پہنچ کر نیچے کی طرف جھانکنا قرآن میں ہے:۔
هَلْ اَنْتُمْ مُطَّلِعُوْنَ فَاطَّلَعَ (۳۷-۵۴) بھلا تم اسے جھانک کر دیکھنا چاہتے ہو اتنے میں وہ خود جھانکے گا۔
فَاَطَّلِعَ اِلٰی اِلٰهِ مُوْسٰی (۴۰-۳۷) پھر اوپر جا کر موسیٰ کے خدا کو دیکھ لوں۔
اَطَّلَعَ الْغَیْبَ (۱۹-۷۸) کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے۔
لَعَلِّیْ اَطَّلِعُ اِلٰی اِلٰهِ مُوْسٰی (۲۸-۳۸) تاکہ میں موسیٰ کے خدا کی طرف چڑھ جاؤں۔
اِسْتَطْلَعْتُ رَأْیَهٗ میں نے اس کی رائے معلوم کی۔
اَطْلَعْتُكَ عَلٰی كَذَا میں نے تمہیں فلاں معاملہ سے آگاہ کر دیا۔ طَلَعْتُ عَنْهُ میں اس سے پنہاں ہوگیا (اضداد) اَلطِّلَاعُ (۱) ہر وہ چیز جس پر سورج طلوع کرتا ہو یا (۲) انسان اس پر اطلاع پالے۔
طَلِیْعَةُ الْجَیْشِ ہراول دستہ اِمْرَأَةٌ طُلَعَةٌ قُبَعَةٌ وہ عورت جو بار بار ظاہر اور پوشیدہ ہو اور طلوع آفتاب کی مناسبت سے طَلْعُ النَّخْلِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی درخت خرما کے غلاف کے ہیں جس کے اندر اس کا خوشہ ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔
لَهَا طَلْعٌ نَضِیْدٌ (۵۰-۱۰) جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔
طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ (۳۷-۶۵) اُن کے شگوفے ایسے ہوں گے جیسے شیطانوں کے سر۔
وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ (۲۶-۱۴۸) اور کھجوریں جن کے شگوفے لطیف و نازک ہوتے ہیں۔
اَطْلَعَتِ النَّخْلُ کھجور کا شگوفے دار ہونا۔
قَوْسٌ طِلَاعُ الْكَفِّ کمان جس سے مٹھی بھر جائے۔

(ط ل ق)

اَلطَّلَاقُ دراصل اس کے معنی کسی بندھن سے آزاد کرنا کے ہیں۔ محاورہ ہے۔
اَطْلَقْتُ الْبَعِیْرَ مِنْ عِقَالِهٖ وَطَلَّقْتُهٗ میں نے اونٹ کا پائے بند کھول دیا طَالِقٌ وَطُلُقٌ وہ اونٹ جو مقید نہ ہو اسی سے خَلَّیْتُهَا کی طرح طَلَّقْتُ الْمَرْأَةَ کا محاورہ مستعار ہے یعنی میں نے اپنی عورت کو نکاح کے بندھن سے آزاد

کر دیا ایسی عورت کو طَالِقٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے۔
فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (۶۵-۱) تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔
اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ (۲-۲۳۰) طلاق صرف دو بار ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ (۲-۲۲۸) اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں۔ میں طلاق کا لفظ عام ہے جو رجعی اور غیر رجعی دونوں کو شامل ہے۔ لیکن آیت کریمہ:۔
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (۲-۲۲۸) اور ان کے خاوند ... ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔ میں واپس لے لینے کا زیادہ حقدار ہونے کا حکم رجعی طلاق کے ساتھ مخصوص ہے اور آیت کریمہ:۔
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ (۲-۲۳۰) پھر اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دے دے تو .... اس پہلے شوہر پر حلال نہ ہوگی۔ میں مِنْۢ بَعْدُ کے یہ معنی ہیں کہ اگر بینونت یعنی عدت گزر جانے کے بعد پھر تیسری طلاق دے۔ تو اس کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ دوسرے شوہر سے شادی نہ کرے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا (۲-۲۳۱) میں طَلَّقَهَا کے معنی یہ ہیں کہ اگر دوسرا خاوند بھی طلاق دے دے اور وہ پہلے خاوند کے نکاح میں آنا چاہے تو ان کے دوبارہ نکاح کر لینے میں کچھ گناہ نہیں ہے۔ اِنْطَلَقَ فُلَانٌ کے معنی چل پڑنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ (۶۸-۲۳) تو وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔
اِنْطَلِقُوْا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۷۷-۲۹) جس چیز کو تم جھٹلایا کرتے تھے اب اس کی طرف چلو۔
اور حلال چیز کو طَلْقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے کھا لینے پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔
عَدَا الْفَرَسُ طَلَقًا اَوْ طَلَقَيْنِ گھوڑے نے آزادی سے ایک دو دوڑیں لگائیں اور فقہ کی اصطلاح میں مُطْلَقٌ اس حکم کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی جزئی مخصوص نہ کی گئی ہو۔ طَلَقَ يَدَهٗ وَاَطْلَقَهَا اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔
طَلْقُ الْوَجْهِ اَوْ طَلِيْقُ الْوَجْهِ خندہ رو۔ ہنس مکھ۔ طُلِقَ السَّلِيْمُ (مجہول) مارگزیدہ کا صحت یاب ہونا۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۲۹۴) تُطَلِّقُهٗ طَوْرًا وَطَوْرًا تُرَاجِعُ

کہ وہ کبھی درد سے آرام پا لیتا ہے اور کبھی وہ درد دوبارہ لوٹ آتا ہے۔
لَيْلَةٌ طَلْقَةٌ وہ رات جس میں اونٹوں کو پانی پہ وارد ہونے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ گھاس کھاتے ہوئے اپنی مرضی سے چلے جائیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ اَطْلَقَ الْاِبِلَ یعنی اس نے پانی پر وارد ہونے کے لئے اونٹوں کو آزاد چھوڑ دیا۔

(ط م م)

اَلطِّمُّ کے معنی پانی سے بھرے ہوئے سمندر کے ہیں اور ایسے سمندر کو اَلطِّمُّ وَالرِّمُّ کہا جاتا ہے اور طَمَّ عَلٰى كَذَا کے معنی کسی پر چھا جانے

---

[1] قاله النابغة فی وصف السلیم واوله: تناذرها الراقون من سوء سمها۔ والقصیدة طویلة یعتذر فیها الی النعمان بن المنذر وفی دیوانه من سوء سمعها والبیت فی المعانی الکبیر والخزانة ۱: ۳۴۴ وقد مر فی ۲۹۰

اور اسے ڈھانپ لینا کے ہیں۔ اسی سے قیامت کو طَامَّۃٌ کہا گیا ہے کیونکہ اس کی مصیبت سب پر چھا جائے گی۔ چنانچہ فرمایا:۔
فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّۃُ الْکُبْرٰی (۷۹-۳۴)
تو جب بڑی آفت آئے گی۔

(ط م ث)

اَلطَّمْثُ (ن س) کے معنی (۱) دم حیض اور (۲) کسی عورت کی بکارت کو زائل کرنا کے ہیں اور طَامِثٌ کے معنی حیض والی عورت کے ہیں طَمَثَ الْمَرْءَۃَ اس نے عورت کی بکارت زائل کردی
قرآن میں ہے:۔
لَمْ یَطْمِثْہُنَّ اِنْسٌ قَبْلَہُمْ وَلَا جَآنٌّ (۵۵-۵۶)
جن کو اہل جنت سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ جن نے۔
اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے مَا طَمِثَ ھٰذِہِ الرَّوْضَۃَ اَحَدٌ قَبْلَنَا یعنی ہم سے قبل اس سبزہ زار میں کوئی اور داخل نہیں ہوا مَا طَمِثَ النَّاقَۃَ جَمَلٌ اس اونٹنی کو کسی اونٹ نے بھی نہیں چھوا۔

(ط م س)

اَلطَّمْسُ کے معنی کسی چیز کا نام و نشان مٹا دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ (۷۷-۸) جب ستاروں کی روشنی جاتی رہے گی۔
رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِہِمْ (۱۰-۸۸) اے پروردگار ان کے مال و دولت کو تباہ و برباد کردے۔ یعنی ان کا نام و نشان تک مٹا دے۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِہِمْ (۳۶-۶۶)
اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا کر اندھا کردیں۔ یعنی آنکھوں کی روشنی سلب کرلیں اور انکا نشان مٹا دیں جس طرح کہ کسی نشان کو مٹا دیا جاتا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْہًا (۴-۴۷) قبل اس کے کہ ہم ان کے چہروں کو بگاڑ کر۔
میں بعض نے کہا ہے کہ دنیا میں ان کے چہروں کو بگاڑنا مراد ہے مثلاً ان کے چہروں پر بال اگا دیں۔ ان کی صورتیں بندروں اور کتوں جیسی کردی جائیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آخرت میں ہوگا جس کی طرف کہ آیت:۔
وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ وَرَآءَ ظَہْرِہٖ (۸۴-۱۰)
اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائیگا میں اشارہ پایا جاتا ہے اور چہروں کو مٹانے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کی آنکھیں گدی پر پر لگا دی جائیں اور یا ہدایت سے گمراہی کی طرف لوٹا دینا مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ (۴۵-۲۳) اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے۔ تو) خدا نے بھی اس کو گمراہ کردیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی۔
بعض نے کہا ہے کہ وجوہ سے قوم کے اعیان اکابر مراد ہیں اور معنی یہ ہیں کہ ہم بڑے بڑے سرداروں کو عیبت اور تحکیم بنا دیں اس سے بڑھ کر اور کونسی ہلاکت ہوسکتی ہے۔

(ط م ع)

اَلطَّمَعُ کے معنی ہیں نفس انسانی کا کسی چیز

کی طرف خواہش کے ساتھ میلان۔

طَمِعَ (س) طَمْعًا وَطَمَاعِيَةً کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ مائل ہونا طَمِعٌ وَطَامِعٌ اس طرح مائل ہونے والا قرآن میں ہے:۔

إِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا (۲۶-۵۱) ہمیں امید ہے کہ ہمارا خدا ہمارے گناہ بخش دیگا۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ (۲-۷۵) (مومنو) کیا تم آرزو رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے دین کے قائل ہو جائیں گے۔

خَوْفًا وَّطَمَعًا (۱۳-۱۲) ڈرانے اور امید دلانے کیلئے۔

اور عموماً چونکہ طمع کی بنا خواہش نفسانی پر ہوتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے اَلطَّمَعُ طَبْعٌ والطبع تدنس الاھاب کہ طمع بھی ایک قسم کی آلودگی ہے جو انسان کے نفس کو ملوث کر ڈالتی ہے۔

(ط م ن)

اَلطَّمَانِيْنَةُ وَالْاِطْمِيْنَانُ کے معنی ہیں خلجان کے بعد نفس کا سکون پذیر ہونا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ (۳-۱۲۶) یعنی اسلئے کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی حاصل ہو۔

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (۲-۲۶۰) لیکن (میں دیکھنا) اس لئے چاہتا ہوں کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کر لے۔ اور آیت کریمہ:۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۸۹-۲۷) میں نفس مطمئنہ سے مراد وہ نفس ہے جسے برائی کی طرف کسی طور بھی رغبت نہ ہو اور آیت کریمہ:۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳-۲۸) اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔ میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ معرفت الٰہی اور کثرت عبادت سے ہی قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ جس قسم کی تسکین کا کہ آیت وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ میں حضرت ابراہیمؑ نے سوال کیا تھا۔ ارشاد ہے:۔ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ (۱۶-۱۰۶) اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ (۴-۱۰۳) پھر جب خوف جاتا رہے۔

وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (۱۰-۷) اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہو بیٹھے۔

وَاطْمَاَنَّ وَتَطَاْمَنَ مادہ اور معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

(ط ھ ر)

طَهُرَتْ (ک) الْمَرْاَةُ طُهْرًا وَطَهَارَةً وَطَهَرَتْ (ن) کے معنی عورت کے حیض سے پاک ہونا کے ہیں۔ اور اسے فتحہ ھاء کے ساتھ پڑھنا قیاس کے زیادہ مطابق ہے اولًا تو اس لئے کہ طَمَثَتْ کا ضد ہے جس کے معنی حیض آنا کے ہیں اور دوم اس لئے کہ اس سے اسم فاعل طَاهِرَةٌ وَطَاهِرٌ آتا ہے جیسے قَائِمَةٌ وَقَائِمٌ وقَاعِدَةٌ وَقَاعِدٌ[1]۔

طہارت دو قسم پر ہے۔ طہارت جسمانی اور طہارت قلبی اور قرآن پاک میں جہاں کہیں طہارت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہاں بالعموم دونوں قسم کی طہارت مراد ہے کہا جاتا ہے:۔

طَهَّرْتُهٗ فَطَهُرَ وَتَطَهَّرَ وَاطَّهَّرَ فَهُوَ طَاهِرٌ وَمُتَطَهِّرٌ

[1] وان کان بضم الطاء فلتکن لصفۃ منہ طہیر مثل کریم لکن قال ابن جنی: طاہر من طہر مثل شاعر من شعر فلذا انک جمع الشاعر علی شعراء لانہ علی جمع فعیل ۔

میں نے اسے پاک کیا چنانچہ وہ پاک ہوگیا قرآن میں ہے۔
وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (۵-۶) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہو جایا کرو۔ یعنی پانی یا جو چیز اس کے قائم مقام ہو اس کے ذریعہ طہارت کر لیا کرو۔ اور آیت کریمہ:۔
فَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ (۲-۲۲۲) اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔ میں دو فعل لاکر یہ بتایا ہے کہ عورتیں جب تک حیض سے فارغ ہوکر غسل نہ کرلیں اس وقت تک ان سے مقاربت جائز نہیں ہے اور ایک قراءت میں حَتّٰى يَطَّهَّرْنَ ہے جس سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (۲-۲۲۲) اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
میں مُتَطَهِّرِيْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو گناہوں کو ترک کرکے اصلاح نفس میں لگے رہتے ہیں۔ نیز فرمایا:۔
فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا (۹-۱۰۸) اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں۔
اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (۷-۸۲) ان کے گھر والوں کو اپنے گاؤں سے نکال دو کہ یہ لوگ پاک بننا چاہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (۹-۱۰۸) اور خدا پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔
میں مُطَّهِّرِيْنَ سے پاکیزہ قلب لوگ مراد ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳-۵۵) کے معنی یہ ہیں کہ خدا تجھے ان لوگوں سے نکال کر الگ لے جائے گا اور اس بات سے بلند و بالا رکھے گا کہ ان جیسے کام کرو۔ اسی معنی میں فرمایا:۔
وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (۳۳-۳۳) اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔
وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (۳-۴۲) اور پاک بنایا اور جہاں کی عورتوں میں منتخب کیا۔
ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ (۲-۲۳۲) یہ تمہارے لئے نہایت خوب اور بہت پاکیزہ بات ہے۔
ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ (۳۳-۵۳) یہ تمہارے ...... دلوں کے لئے بہت پاکیزگی کی بات ہے اور آیت کریمہ:۔
لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶-۷۹) اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پاک کے حقائق کی معرفت انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنے نفوس کو آلودگیوں سے پاک وصاف رکھتے ہیں اور دل و دماغ کو ہر قسم کی آلائش سے محفوظ رکھتے ہیں اور آیت کریمہ:۔
اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (۲۷-۵۶) کہ یہ لوگ پاک بننا چاہتے ہیں۔
میں انہوں نے مومنین کو اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ بطور طنز کہا تھا کیونکہ لوط علیہ السلام نے جب قوم کی بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ کہا تو انہوں نے طنزاً یہ جواب دیا تھا اور آیت کریمہ:۔
وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۲-۲۵) اور وہاں ان کے لئے پاک بیبیاں ہوں گی۔
میں مُطَهَّرَةٌ کے معنی ہیں کہ وہ ہر قسم کی دنیاوی کثافتوں اور نجاستوں (یعنی حیض نفاس وغیرہ) سے پاک ہوں گی اور بعض نے کہا ہے کہ اخلاق رذیلہ سے پاکیزہ ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں

لہ کذا فی ابی السعود انظر الفتوحات الالٰہیۃ (۱/۲۵۵) ۱۲

یعنی عورتوں کو عُرُبًا اَتْرَابًا (۵۶-۳۷) (شوہروں کی پیاریاں) اور ہم عمر کہا ہے اور قرآن پاک کے متعلق فرمایا :-

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۸۰-۱۴) جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں۔ اور آیت کریمہ :-

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۷۴-۴) اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں نفس کو رذائل سے پاک رکھنا مراد ہے[1] اور آیات کریمہ :-

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (۲۲-۲۶) اور میرے گھر کو . . . . صاف رکھا کرو۔

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ (۲-۱۲۵) اور ابراہیم اور اسماعیل کو کہا کہ . . . میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔ میں خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے بعض علماء نے کہا ہے کہ دل کو پاک وصاف رکھنا مراد ہے حتیٰ کہ اس کے اندر وہ سکون پیدا ہوسکے جس کا ذکر کہ آیت :-

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ (۴۸-۴) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔ میں پایا جاتا ہے۔

اَلطَّهُوْرُ یہ کبھی مصدر ہوتا ہے[2] جیسا کہ سیبویہ نے اہل عرب سے تَطَهَّرْتُ طَهُوْرًا وَتَوَضَّأْتُ وضوءً کا محاورہ نقل کیا ہے لہٰذا یہ فَعُوْلٌ کے وزن پر مصدر ہے۔ جیسا کہ وَقَدْتُ وَقُوْدًا ہے اور کبھی اسم ہوتا ہے جیسا کہ فَطُوْرٌ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے روزہ کھولا جائے اسی طرح وَجُوْرٌ سَعُوْطٌ اور ذَرُوْرٌ ہیں[3] اور کبھی صیغہ صفت ہوتا ہے جیسا کہ رَسُوْلٌ اور اس کے ہم وزن دیگر اسمائے صفت ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا :-

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا (۷۶-۲۱)

اور ان کا پروردگار ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائیگا۔ تو اس میں تنبیہ کی ہے کہ ان کے مشروبات اہل دوزخ کے مشروبات کے خلاف ہوں گے جن کا ذکر کہ آیت وَيُسْقَىٰ مِن مَّاءٍ صَدِيدٍ (۱۴-۱۶) اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ :-

وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا (۲۵-۴۸)

اور ہم آسمان سے پاک اور نتھرا ہوا پانی برساتے ہیں میں اصحاب شافعیؒ طَهُوْرٌ بمعنی مُطَهِّرٌ لیتے ہیں۔ لیکن یہ لفظاً صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اَفْعَلَ وَفَعَّلَ سے فَعُوْلٌ کے وزن پر صیغہ صفت نہیں آتا بلکہ یہ وزن فَعَلَ کے ساتھ خاص ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ لفظ طَهُوْرٌ معنوی اعتبار سے تطہیر کو چاہتا ہے کیونکہ طاہر (پاکیزہ) دو قسم پر ہوتا ہے ایک وہ جو خود تو پاک ہو مگر دوسری چیز کو پاک کرنے کی اس میں صلاحیت نہ ہو جیسے کپڑا کہ گو یہ پاک ہے مگر دوسری چیز کو پاک نہیں کر سکتا۔ دوم وہ جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیز کو بھی پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جیسے پانی چنانچہ قرآن پاک نے پانی کو طَهُوْرٌ کہہ کر اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے :-

(ط و د)

اَلطَّوْدُ۔ بلند پہاڑ۔ قرآن میں ہے :-

---

[1] ذکرہ عکرمۃ عن ابن عباس ص ۵۰۹ الجمل ج ۴ [2] انظر مبحث اصلاح المنطق ۳۳۲-۳۳۵ باب فَعُوْلٌ ۱۲ [3] کما ورد فی الحدیث الطہور ماءہ والحل میتتہ

کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ (۲۶-۳۴) کہ گویا بڑا پہاڑ ہے۔
اَلطَّوْدُ کے معنی ہی بڑے بلند پہاڑ کے ہیں[1] مگر اس کے باوجود اس کے وصف میں عظیم کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ پانی بلند پہاڑ کی طرح تھا نہ یہ کہ وہ سب پہاڑوں سے بلند تر تھا۔

(ط و ر)

طَوَارُ الدَّارِ وَ طِوَارُہٗ کے معنی گھر کی عمارت کے امتداد یعنی لمبا ہونے اور پھیلنے کے ہیں محاورہ ہے۔
عَدَا فُلَانٌ طَوْرَہٗ فلاں اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔
لَا اَطُوْرُ بِہٖ میں اسکے مکان کے صحن کے قریب تک نہیں جاؤں گا۔
فَعَلَ کَذَا طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ اس نے ایک بار کے بعد دوسری بار یہ کام کیا اور آیت کریمہ :۔
وَقَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَارًا (۷۱-۱۴) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اَطْوَارًا سے ان مختلف منازل ومدارج کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت :۔
خَلَقْنَاکُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَۃٍ (۲۲-۵) ہم نے تم کو (پہلی بار بھی) تو پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر۔
میں مذکور ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مختلف احوال مراد ہیں جن کی طرف آیت :۔
وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ (۳۰-۲۲)
اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔
میں اشارہ فرمایا ہے یعنی جسمانی اور اخلاقی تفاوت جو کہ ہر معاشرہ میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔
اَلطُّوْرُ ایلہ کے قریب ایک خاص پہاڑ کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ہر پہاڑ کو طور کہہ سکتے ہیں[2] اور بعض کے نزدیک طور سے وہ سلسلۂ کوہ مراد ہے جو کرۂ ارض کو محیط ہے۔ قرآن میں ہے :۔
وَالطُّوْرِ وَکِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ (۵۲-۱، ۲) کوہ طور کی قسم اور کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے۔
وَمَا کُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ (۲۸-۴۶) اور نہ تم اس وقت ... طور کے کنارے تھے۔
وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ (۹۵-۲) اور طور سینین کی۔
وَنَادَیْنٰہُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ (۱۹-۵۲) اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب سے پکارا۔
وَرَفَعْنَا فَوْقَھُمُ الطُّوْرَ (۲-۹۳) اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کر کھڑا کیا۔

(ط و ع)

اَلطَّوْعُ کے معنی (بطیب خاطر) تابعدار ہو جانا کے ہیں اس کے بالمقابل کَرْھٌ ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو ناگواری اور دل کی کراہت سے سر انجام دینا۔ قرآن میں ہے :۔
اِئْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا (۴۱-۱۱) (آسمان و زمین سے فرمایا) دونوں آؤ دل کی خوشی سے یا ناگواری سے۔
وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا اَوْ کَرْھًا (۳-۸۳) حالانکہ سب اہل آسمان و زمین بطیب خاطر یا دل کے جبر سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔
یہی معنی اَلطَّاعَۃُ کے ہیں لیکن عام طور پر طَاعَۃٌ

---

[1] قال الزمخشری انہ ماخوذ من البناء المنطاد ای العالی تا الفائق ص ۲۶۵ ج ۲ ۞ [2] وفی البخاری عن مجاھد ان الطور اسم سریانی بمعنی الجبل لکن القرآن اطلقہ علی جبل مخصوص واختلف فی تعیینہ معجم البلدان للحموی ۞

کالفظ کسی حکم کے بجا لانے پر آجاتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ (۴-۸۱) اور یہ لوگ منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم دل سے آپ کے فرمانبردار ہیں۔
طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ (۴۷-۲۱) (خوب بات) فرمانبرداری اور پسندیدہ بات کہنا ہے۔
طَاعَ لَهٗ يَطُوْعُ وَاَطَاعَهٗ يُطِيْعُهٗ کسی کی فرمانبرداری کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (۴-۵۹) اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو۔
وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴-۸۰) جو شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی۔
وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ (۳۳-۴۸) اور کافروں کا کہنا نہ مانو۔
اور حضرت جبریل علیہ السلام کے متعلق فرمایا:
مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (۸۱-۲۱) سردار اور امانتدار ہے۔
اَلتَّطَوُّعُ (تفعل) اس کے اصل معنی تو تکلیف اٹھا کر حکم بجالاتا کے ہیں۔ مگر عرف میں نوافل کے بجا لانے کو تَطَوُّعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ (۲-۱۸۴) اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔
ایک قرأت میں وَمَنْ يَّطَّوَّعَ خَيْرًا ہے۔
اَلْاِسْتِطَاعَةُ (استفعال) یہ طوع سے استفعال کے وزن پر ہے اور اس کے معنی ہیں کسی کام کو سرانجام دینے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا موجود ہونا مگر محققین کے نزدیک اِسْتِطَاعَةٌ نام ہے ان اسباب وذرائع اور صلاحیتوں کا جن کے ذریعہ انسان کو کسی کام کے کرنے پر قدرت ہو جائے اور وہ چار چیزیں ہیں (۱) فاعل کا مخصوص وصانچہ (۲) فعل کا تصور (۳) مادہ جو فعل کے اثر کو قبول کر سکے (۴) اگر وہ فعل کسی آلہ کا محتاج ہے تو اس آلہ کا فراہم ہونا مثلاً لکھنا کہ کاتب لکھنے کے لئے ان چار چیزوں کا محتاج ہے اور جب کسی شخص کو ان اشیاء میں سے ایک چیز بھی حاصل نہ ہو تو اس کو غیر مستطیع کہا جائے گا۔
اِسْتِطَاعَةٌ کا ضد عَجْزٌ ہے یعنی ان اشیاء میں سے ایک دو یا سب کا حاصل نہ ہونا اور جب کسی شخص کو یہ ساری چیزیں حاصل ہو جائیں تو اسے مُسْتَطِيْعٌ مطلق کہا جاتا ہے۔ اور جب ان میں سے کوئی بھی حاصل نہ ہو تو اسے عاجز مطلق کہا جائیگا اور جب کچھ حاصل ہوں اور کچھ حاصل نہ ہوں تو گو ایک اعتبار سے وہ مستطیع ہے مگر دوسرے اعتبار سے عاجز ہے اور اسے عاجز کہنا زیادہ بہتر ہے اور استطاعت قدرت سے اخص ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ (۲۱-۴۳) وہ نہ تو آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔
فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ (۵۱-۴۵) پھر وہ نہ تو اٹھنے کی طاقت رکھتے تھے۔
مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (۳-۹۷) جو اس (گھر) تک جانے کا مقدور رکھے۔
یعنی اس کے پاس یہ چاروں چیزیں مہیا ہو جائیں اور حدیث میں استطاعت حج کی جو تشریح زاد راہ اور سواری سے کی گئی ہے[1] (۲۲) تو اس سے صرف ان اسباب وذرائع کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو حج کے لئے لازم ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ باقی تینوں

[1] اخرجہ الترمذی وابن ماجۃ من حدیث ابی ہریرۃ وابن عباس والحاکم من حدیث انس قال فی الکاف اخرجہ الدارقطنی باسانید ضعیفۃ قال البیہقی والصواب الروایۃ عن الحسن مرسلا ولا یثبت مرفوعا راجع تخریج الکشاف ۳۸ ❊

❊ ❊ ❊

چیزوں کا ہوتا تو عقلاً ہر کام کے لئے لازم ہے اور شرعاً ان کے بغیر کسی کو مکلف بنانا ہی جائز نہیں ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ (۹-۴۲) اگر ہم طاقت رکھتے تو آپ کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے۔

میں استطاعت سے سواری، مال اور دیگر ذرائع مراد ہیں اسی طرح آیت کریمہ:۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا (۴-۲۵) اور جو شخص تم میں سے ... مقدور نہ رکھے۔

اور آیت کریمہ:۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً (۴-۹۸) کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں ......

میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔

اور کبھی فُلَانٌ لَا يَسْتَطِيْعُ سے یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ عدم مزاولت کی وجہ سے یہ کام اس پر دشوار ہے یا تو اس لئے کہ جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں ہیں اور یا اس لئے کہ اس کام کا تصور یعنی خاکہ اس کے ذہن میں نہیں ہے اس حالت میں انسان کو مکلف بنانا صحیح ہوتا ہے اور اسے معذور نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ آیات:۔

لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا (۱۸-۷۲) تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے۔

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۱۱-۲۰) کیونکہ یہ (شدت کفر سے تمہاری بات) نہیں سن سکتے اور نہ تم کو دیکھ سکتے تھے۔

وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا (۱۸-۱۰۱) اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

میں استطاعت کی نفی سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت کریمہ:۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا (۴-۱۲۹) اور تم خواہ کتنا ہی چاہو ... ہرگز برابری نہیں کر سکو گے۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے (حالانکہ ان تمام آیات میں استطاعت کی نفی کے باوجود انہیں مکلف بنایا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا (۵-۱۱۲) کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر ... نازل کرے۔

کی تفسیر میں بعض نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے از راہ نادانی یہ بات کہی تھی کیونکہ اس وقت ان کو صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں تھی اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں استطاعۃ بمعنی قدرت نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کیا مائدہ کا اتارنا تقاضائے حکمت کے خلاف تو نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں يَسْتَطِيْعُ بمعنی يُطِيْعُ ہے یعنی کیا تمہارا پروردگار ہماری اس عرض کو قبول فرما سکتا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰-۱۸) اور ظالموں کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ سفارشی جس کی بات قبول کی جائے۔

میں يُطَاعُ بمعنی يُجَابُ ہے یعنی ایسا جس کی بات مانی جا سکے۔ اور ایک قرأت میں هَلْ تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ بھی ہے یعنی کیا تم اپنے پروردگار سے یہ بات منوا سکتے ہو۔ جیسا کہ محاورہ ہے:۔

هَلْ تَسْتَطِيْعُ الْاَمِيْرَ اَنْ يَّفْعَلَ كَذَا (کہ کیا تم امیر سے یہ بات منوا سکتے ہو) اور آیت کریمہ:۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ (۵-۳۰) مگر اس کے نفس نے اسے ترغیب دی۔

میں طَوَّعَتْ کے معنی ہیں کہ نفسانی جذبات نے

تسویل سے اسے اس پر آمادہ کر لیا اور وہ اس کام
کے کرنے پر راضی ہو گیا اور طَوَّعَتْ کا صیغہ طَاعَتْ
سے زیادہ بلیغ ہے۔ اور طَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ کا
محاورہ تَابَتْ عَنْ كَذَا نَفْسُهٗ کے بالمقابل استعمال
ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کہ اسے یہ کام کرنا گوارا
نہیں ہے اور تَطَوَّعَ كَذَا کے معنی ہیں اس نے
رضامندی سے اس کام کے لئے تکلیف اٹھانا
گوارا کر لیا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ
(۲-۱۸۵) اور جو کوئی نیک کام کرے تو خدا قدر
شناس اور دانا ہے۔
اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
(۹-۷۹) جو ذی استطاعت مسلمان دل کھول کر
خیرات کرتے ہیں ... ان پر جو منافق طعن کرتے
..... ہیں۔
بعض نے کہا ہے طَاعَتْ وَتَطَوَّعَتْ کے ایک
ہی معنی ہیں اور اِسْتَطَاعَ وَاَسْطَاعَ بھی ہم معنی
ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا
لَهٗ نَقْبًا (۱۸-۹۷) پھر ان کو یہ قدرت نہ رہی کہ
اس پر چڑھ سکیں اور نہ یہ طاقت رہی کہ اس
میں نقب لگا سکیں۔

(ط و ف)

اَلطَّوْفُ (ن) کے معنی کسی چیز کے گرد چکر
لگانے اور گھومنے کے ہیں۔ اَلطَّائِفُ چوکیدار
جو رات کو حفاظت کے لئے چکر لگاتے اور
پہرہ دے۔ طَافَ بِهٖ يَطُوْفُ کسی چیز کے گرد
چکر لگانا، گھومنا۔ قرآن میں ہے:۔
يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (۵۶-۱۷)
نوجوان خدمت گزار جو ہمیشہ ایک ہی حالت
میں رہیں گے ان کے آس پاس پھریں گے۔
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا
(۲-۱۵۸) اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف
کرے۔
اور اسی سے بطور استعارہ جن، خیال، حادثہ
وغیرہ کو بھی طَائِفٌ کہا جاتا ہے چنانچہ
آیت کریمہ:۔
اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ
(۷-۲۰۱) جب ان کو شیطان کی طرف سے
کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے۔
میں طائف سے وہ شیطان مراد ہے جو
انسان کا شکار کرنے کے لئے اس کے گرد چکر
کاٹتا رہتا ہے ایک قرأت میں طَيْفٌ ہے
جس کے معنی کسی چیز کا خیال اور اس صورت کے
ہے جو خواب یا بیداری میں نظر آتی ہے اسی سے
خیال کو طَيْفٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ (۶۸-۱۹)
کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے (راتوں رات)
اس پر ایک آفت پھر گئی۔
میں طَائِفٌ سے وہ آفت یا حادثہ مراد ہے جو
انہیں پہنچی تھا۔ اور آیت کریمہ:۔
اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ (۲-۱۲۵)
طواف کرنے والوں ... کے لئے میرے
گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔
میں طَائِفِيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حج یا
عمرہ کرنے کے لئے بیت اللہ کا قصد کرتے اور
اس کا طواف کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَالطَّوَّافُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲۴-۵۸) اور نہ ان پر جو کام کاج کے لئے تمہارے اردگرد پھرتے پھراتے رہتے ہیں۔
میں طَوَّافُوْنَ سے نوکر چاکر مراد ہیں جنہیں خدمت گذاری کے لئے اندرون خانہ آنا جانا پڑتا ہے۔ اسی بنا پر بلی کے متعلق حدیث میں آیا ہے[1] (۲۳)
اِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ وَالطَّوَّافَاتِ - کہ یہ بھی ان میں داخل ہے جو تمہارے گرد پھرتے پھراتے رہتے ہیں۔
اَلطَّائِفَةُ (۱) لوگوں کی ایک جماعت (۲) کسی چیز کا ایک ٹکڑہ۔ اور آیت کریمہ :۔
فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (۹-۱۲۲) تو یوں کیوں نہیں کیا کہ ہر ایک جماعت میں چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین کا علم سیکھتے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ کبھی طائفة کا لفظ ایک فرد پر بھی بولا جاتا ہے[2]۔ چنانچہ آیت کریمہ :۔
وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۴۹-۹) اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق ..... اور آیت کریمہ :۔
اِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ (۳-۱۲۲) اس وقت تم میں سے دو جماعتوں نے چھوڑ دینا چاہا۔
طَائِفَةٌ سے ایک فرد بھی مراد ہو سکتا ہے مگر جب طَائِفَةٌ سے جماعت مراد لی جائے تو یہ طَائِفٌ کی جمع ہوگا۔ اور جب اس سے واحد مراد ہو تو اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جمع بول کر مفرد سے کنایہ کیا ہو اور یہ بھی کہ رَاوِيَةٌ وَعَلَّامَةٌ کی طرح مفرد ہو اور اس میں تا برائے مبالغہ ہو۔
اَلطُّوْفَانُ وہ مصیبت یا حادثہ جو انسان کو چاروں طرف سے گھیر لے اس بنا پر آیت کریمہ :۔
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ (۷-۱۳۳) تو ہم نے ان پر طوفان (وغیرہ کتنی کھلی ہوئی نشانیاں بھیجیں۔
میں طوفان بمعنی سیلاب بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نوح علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا تھا۔ وہ پانی کی صورت میں ہی تھا اور دوسری جگہ فرمایا :۔
فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ (۲۹-۱۴) پھر ان کو طوفان (کے عذاب) نے آپکڑا۔
طَائِفُ الْقَوْسِ خانہ کمان جو گوشہ اور دستہ کے درمیان ہوتا ہے۔ اَلطَّوْفُ رکنا یا پلیدی[3]۔

(ط و ق)

اَلطَّوْقُ۔ اس حلقہ کو کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گردن کے گرد بنا ہوتا ہے جیسے کبوتری کی گردن میں یا مصنوعی ہو جیسے سونے چاندی کا حلقہ جو گلے میں ڈالا جاتا ہے پھر بطور توسع کے قَلَّدْتُهُ کی طرح طَوَّقْتُهُ كَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور قرآن میں جو مال کے متعلق :۔
سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ (۳-۱۸۰) وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں (قیامت کے دن) اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائیگا۔

---

[1] انظر لتخاریج حدیث الہرالفتح الکبیر للنبہانی ۱/۴۹۴ والقرطبی ۱۲/۳۰۶ والغریب للقتبی ۲۰۷ والفائق ۲/۷۴ والترمذی والبیہقی وغیرہ وصححہ ابن حبان رقم ۱۲۱ من حدیث ابی قتادة وصححہ الائمہ واعلہ ابن مندہ وعلیہ تعقب للحافظ فی الفتح قال فی النیل ۱/۷۴ و فی الباب عن جابر عند ابن شاہین فی الناسخ والمنسوخ [2] عن ابن عباس والحسن ومجاہد ابراہیم وفی الطبرسی ۵/۹-۱۰ انہ مروی عن ابی جعفر [3] وفی الحدیث: نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن متحدثین علی طوفہما فی الآخر لا یتحدثین احدکم وہو یدافعہ الطوف وہو البول انظر الفائق ۲/۷۳ والنہایہ واللسان (طوف)

فرمایا ہے تو یہ بطور تشبیہ کے ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے (۱۴۲) یاتی احدکم یوم القیامۃ شجاع اقرع لہ زبیبتان فیتطوّق بہ فیقول انا الزکوٰۃ التی منعتنی کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی ایک کے پاس گنجا سانپ آئے گا۔ اور اس کے گلے میں طوق بن کر پڑ جائے گا اور کہے گا میں تمہارا خزانہ ہوں جس کی تم نے زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی۔

اَلطَّاقَۃُ اس مقدرت اور قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جا سکے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو۔ پس آیت کریمہ :۔

وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ (۲-۲۸۶) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت نہ ہو بلکہ اس سے ایسے کام مراد ہیں جن کا کرنا ہمارے لئے دشوار ہو جیسا کہ فرمایا :۔

وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ (۷-۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ ..... اتارتے ہیں۔

اسی طرح آیت کریمہ :۔

وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ (۹۴-۲) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا۔

میں وِزْرٌ سے ان دشوار عبادات کا بوجھ مراد جن کا ترک گناہ کا موجب تھا۔

اسی طرح آیت کریمہ :۔

قَالُوْا لَا طَاقَۃَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِہٖ (۲-۲۴۹) تو کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ میں بھی طَاقَۃٌ کی نفی سے یہی معنی مراد ہیں اور کبھی طاقۃ کی نفی سے قدرت کا انکار مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ (۲-۱۸۴) اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔

کے بظاہر معنی تو یہی ہیں کہ جو شخص روزہ کی طاقت رکھتا ہو اس پر فدیہ لازم ہے خواہ روزہ رکھے یا نہ رکھے مگر اس امر پر اجماع ہو چکا ہے کہ صرف دوسری شرط کے ساتھ فدیہ لازم ہوگا۔ ایک قرأت میں یُطَوَّقُوْنَہٗ ہے یعنی جن پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ بہ مشقت روزہ رکھیں۔

(ط و ل)

اَلطُّوْلُ یہ اسمائے اضافیہ سے ہے۔ اور اس کے معنی دراز اور لمبا ہونا کے ہیں یہ اَلْقِصَرُ کے مقابلہ میں آتا ہے اور اعیان و اعراض مثلاً زمانہ وغیرہ سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے :۔

فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ (۵۷-۱۶) پھر ان پر لمبا عرصہ گزر گیا۔

سَبْحًا طَوِیْلًا (۷۳-۷) بہت لمبے شغل رہتے ہیں۔

طَوِیْلٌ وَطُوَالٌ جیسے عَرِیْضٌ وَعُرَاضٌ دراز لمبا اس کی جمع طِوَالٌ آتی ہے اور بعض نے طِیَالٌ بھی کہا ہے اور لمبا ہونے کی مناسبت سے جانور کی پچھاڑی کی رسی کو طِوَلٌ کہا جاتا ہے طَوِّلْ فَرَسَکَ اپنے گھوڑے کی پچھاڑی باندھ دے۔

طِوَالَ الدَّھْرِ عرصہ دراز۔

۱ہ اصلہ فی البخاری من حدیث ابی ہریرۃ (وحم، ن ۵ ت۔ عن ابن مسعود و(ن، ۵) عن ابی ہریرۃ (وحم، ن۔ عن ابن عمر) والبزار وابن خزیمۃ والسفیانی (ع، حب، طب، ھل، ک۔ عن ثوبان (راجع کنز العمال ج ۴ رقم ۱۲۱-۱۲۲۰ و ۱۲۲۵، ۱۲۳۶، ۱۲۴۷) والکشاف مع التخ: ۱/۳۳۲ ۰

تَطَاوَلَ فُلَانٌ درازی یا وسعت کو ظاہر کرنا۔ قرآن میں ہے :۔

فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۸-۴۵) پھر ان پر لمبا عرصہ گزر گیا۔

اور طَوْلٌ کا لفظ خاص کر فضل و احسان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔

شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ (۴۰-۳) سخت عذاب دینے والا اور صاحب کرم ہے۔

اور آیت کریمہ :۔

اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ (۹-۸۶) تو جو ان میں دولتمند ہیں وہ تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ میں أُولُو الطَّوْلِ سے خوش حال طبقہ مراد ہے اور آیت کریمہ :۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا (۴-۲۵) اور جو شخص تم میں سے ... مقدور نہ رکھے۔

میں طَوْلًا کنایہ ہے اس مال سے جو عورت کو مہر میں یا نان ونفقہ کے طور پر دینا پڑتا ہے۔

طَالُوْتُ یہ اسم عجمی ہے اور بنی اسرائیل کے ایک با اقبال بادشاہ کا نام تھا۔[1]

(ط و ی)

طَوَيْتُ الشَّيْءَ طَيًّا کے معنی ہیں کسی چیز کو اس طرح لپیٹ لینا۔ جیسا کہ کپڑے کو اس کی درز پر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا :۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (۲۱-۱۰۴) جس دن ہم آسمان کو اسی طرح لپیٹ لیں گے جس طرح لکھے ہوئے کاغذوں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے۔

اسی سے طَوَيْتُ الْفَلَاةَ جنگل کو قطع کرنا کا محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی مسافت کو قطع کیا گویا راستوں کو لپیٹ لیا طَوَى اللّٰهُ عُمْرَهٗ اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر ختم کر دی گویا اس کی مدت عمر کو لپیٹ دیا۔ شاعر نے کہا ہے۔[2] (الوافر)

(۲۹۵) طَوَتْكَ خُطُوْبُ دَهْرِكَ بَعْدَ نَشْرٍ

حوادثات زمانہ نے پھیلانے کے بعد تمہیں لپیٹ دیا یعنی تمہاری عمر ختم کر دی اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ :۔

وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ (۳۹-۶۷) اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔

میں مَطْوِيّٰتٌ کا لفظ یا تو طَوَيْتُ الشَّيْءَ کے محاورہ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی لپیٹ دینا کے ہیں اور یا طَوَى اللّٰهُ عُمْرَهٗ سے ماخوذ ہوگا اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز آسمان کو فنا کر دیا جائے گا اور آیت :۔

اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۲۰-۱۲)

---

[1] وقد مر فی (ط ل ت) وقیل ان اسمہ بالعبرانیۃ کان شاول بن قیس من اولاد بنیامین بن یعقوب ولقب بطالوت لطولہ وکان اطول من کل احد ۱۲

[2] قالہ ابو العتاہیہ (اسماعیل بن القاسم) یرثی علی بن ثابت وتمامہ : کذاک خطوبہ نشرا وطیا والبیت فی الکامل ۲۵۶ والبیان (۳: ۱۳۰/۱: ۲۱۶) والزجاجی ۵۹ والاغانی (۳: ۱۴۲) والصناعتین ۱۱ والوحشیات (الحماسۃ الصغری) ۱۳۲ فی ستۃ ابیات و ذیل الامالی ۲ فی خمسۃ ونسبہا الی امرءۃ والسمط ۴ قال الاستاذ المیمنی :۔ والابیات لابی العتاہیۃ حقًا رواہا ۴ اللیثی د محمد بن یزید الزجاجی والاصبہانی وابن عبد ربہ وآخرون یرثی بہا علی بن ثابت وکان صدیقًا لہ ولہ فیہ ثلاث مراث راجع ادب الدنیا الماوردی لشرح اویس دفا ارزنجانی المعروف بخان زادہ ۲۱۶ والمعاہد ۲/ ۱۸۵

تم (یہاں) پاک میدان (یعنی) طویٰ میں ہو۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طُویٰ اسی وادی المقدس کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ پہنچ چکے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ طویٰ اس مرتبہ کی طرف اشارہ ہے جس سے انہیں اجتباء کے طور پر نوازا گیا تھا اگر وہ اس مرتبہ کو مساعی اور اجتہاد کی راہ سے حاصل کرنا چاہتے تو اس قدر طویل مسافت کو طے نہیں کر سکتے تھے وادی نبوت تک پہنچنے کی تمام مسافتیں ان کے لئے لپیٹ دی گئیں پھر اگر اسے اس وادی کا نام قرار دیا جائے تو اسے غیر منصرف بھی پڑھ سکتے ہیں اور منصرف بھی[1] اور اگر اسے طَوَیْتُ کا مصدر مانا جائے تو منصرف ہی پڑھا جائیگا اور ثُنًی و ثِنًی کی طرح فا کلمہ (ط) پر دونوں حرکتیں جائز ہوں گی اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ[2] کو دو مرتبہ پکارا۔

(ط ی ب)

طَابَ (ض) الشَّیْءُ یَطِیْبُ طِیْبًا فَھُوَ طَیِّبٌ (کے معنی کسی چیز کے پاکیزہ اور حلال ہونے کے ہیں) قرآن میں ہے:۔
فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ (۴-۳) تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں .... ان سے نکاح کر لو۔
فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ (۴-۴) ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے ..... تم کو چھوڑ دیں۔
اصل میں طَیِّبٌ اسے کہا جاتا ہے جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی اور شریعت کی رو سے اَلطَّعَامُ الطَّیِّبُ اس کھانے کو کہا جائے گا جو جائز طریق سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہ سے جائز اندازہ کے مطابق لیا جائے کیونکہ جو غذا اس طرح حاصل کی جائے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگوار ثابت ہوگی ورنہ دنیا کی خوشگوار چیزیں آخرت میں نقصان دہ ثابت ہونگی اسی بنا پر قرآن طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ (۲-۱۷۲) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ۔
وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا (۵-۸۸) اور جو حلال طیب روزی خدا نے تمہیں دی ہے اسے کھاؤ۔
لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ (۵-۸۷) جو پاکیزہ چیزیں خدا نے تمہارے لئے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو۔
کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (۲۳-۵۱) پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ اور یہی معنی آیت:۔
وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷-۳۲) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں ۔۔ میں مراد ہیں۔ اور آیت:۔
اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ (۵-۵) آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طیبات سے وہ جانور مراد ہیں جنہیں ذبح کر کے کھایا جاتا ہے اور آیت:۔
رَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ (۱۶-۷۲) اور کھانے کو تمہیں پاکیزہ چیزیں دیں۔
میں مال غنیمت کی طرف اشارہ ہے۔ اور انسانوں سے "طَیِّبٌ" اس انسان کو کہا جاتا ہے جو جہالت،

---

[1] قال فی الفتوحات لیس یریدبہ طیًا بعلاج وانتصاب وان المراد بذالک الفناء والذھاب (۳ر۹۴۷)، [2] واما صرفہ فلانسا ہم الواو ندکروا نحوہ فلتانیث مع العلمیۃ راجع مجاز القرآن (۲: ۱۶)، [3] ویمکن ان یکون معناہ ان الوادی قدس مرتین (الکشاف ۲ر ۴۲ھا)

نسق اور قبیح اعمال کی نجاست سے پاک ہو اور علم و ایمان اور محاسن اعمال کے زیور سے آراستہ چنانچہ آیت کریمہ :- اَلَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیۡنَ (۱۶-۳۲) جب فرشتے ان کی جانیں نکالتے ہیں اور یہ (کفر و شرک سے) پاک ہوتے ہیں۔ میں طَیِّبِیۡنَ سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں نیز فرمایا۔ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡهَا خٰلِدِیۡنَ (۳۹-۷۳) تم بہت اچھے رہے اب اس میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً (۳-۳۸) اپنی جناب سے اولاد طیب۔

لِیَمِیۡزَ اللّٰهُ الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ (۸-۳۷) تاکہ خدا ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔

اور آیت کریمہ :-

وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیۡنَ (۲۴-۲۶) اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے۔ میں اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ پاکیزہ اعمال پاکیزہ انسانوں سے ہی سرزد ہوتے ہیں۔

چنانچہ مروی ہے[1] (۲۵) اَلۡمُؤۡمِنُ اَطۡیَبُ مِنۡ عَمَلِهٖ وَالۡكَافِرُ اَخۡبَثُ مِنۡ عَمَلِهٖ (کہ مومن اپنے عمل کی وجہ سے اطیب اور کافر اپنے عمل کی وجہ سے خبیث (گندہ) ہوتا ہے۔

اور آیت کریمہ :-

وَلَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ (۴-۲) کے معنی یہ ہیں کہ اچھے اعمال کو چھوڑ کر بد اعمالیاں مت اختیار کرو اور اسی معنی میں فرمایا :-

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ طَیِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ (۱۴-۲۶) پاک عمل کی مثال شجرۂ طیبہ کی ہے۔

اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّیِّبُ (۳۵-۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلمے چڑھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ :- وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً (۹-۷۲) کے معنی یہ ہیں .... مکانات صاف ستھرے اور فرحت بخش ہوں گے اور آیت کریمہ :-

بَلۡدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ (۳۴-۱۵) (رہنے کو) پاکیزہ شہر ہے اور (وہاں بخشنے کو) خدائے غفار میں بعض نے کہا ہے کہ جنت اور رب العزۃ کے جوار کی طرف اشارہ ہے[2]۔ اور آیت کریمہ :-

وَالۡبَلَدُ الطَّیِّبُ (۷-۵۸) اور جو پاکیزہ زمین ہے۔ میں الطیب سے زرخیز زمین مراد ہے۔ اور آیت :- صَعِیۡدًا طَیِّبًا (۵-۶) تو پاک مٹی لو۔ میں طیب سے پاک مٹی مراد ہے یعنی جس میں نجاست کی آمیزش نہ ہو اور اِسۡتِنۡجَاء کو بھی اِسۡتِطَابَةٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے پاکیزگی اور طہارت حاصل ہوتی ہے اور اَلۡاَطۡیَبَانِ سے کھانا و نکاح مراد ہے طَعَامٌ مُطَیِّبَةٌ لِلنَّفۡسِ وہ کھانا جس سے طبیعت کو فرحت حاصل ہو اور رَطۡبٌ طَیِّبٌ گو طَابٌ بھی کہا جاتا ہے اور مدینہ طیبہ میں ایک قسم کی کھجور ہوتی ہے جسے طَابٌ کہا جاتا ہے[3]۔ اور آیت کریمہ :-

طُوۡبٰی لَهُمۡ (۱۳-۲۹) ان کے لئے خوشحالی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ طُوۡبٰی جنت میں ایک درخت کا نام ہے[4] اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر قسم کی خوش گواریاں مراد ہیں جو جنت میں

---

[1] قال العلامۃ القرطبی وھو الصحیح وبھذا الکف ورد الحدیث عن عتبۃ بن عبد السلمی روح المعانی ص۱۳۵ ج ۱۳ [2] رطب ابن طاب

[3] قال الزجاج وھذا مروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وحملہ سیبویہ علی الدعاء وقال ھو فی موضع رفع من ھو معطوفہ وحسن

حاصل ہوں گی مثلاً بقا، عزت، غنا، غیرہ جنکے زوال کا اندیشہ نہیں ہوگا۔

(ط ی ر)

اَلطَّائِرُ ہر پردار جانور جو فضا میں حرکت کرتا ہے طَارَ یَطِیْرُ طَیَرَانًا پرند کا اڑنا۔ اَلطَّیْرُ یہ طَائِرٌ کی جمع ہے جیسے رَاکِبٌ کی جمع رَکْبٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا طَائِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ (۶-۳۸) یا پرند جو اپنے پروں سے اڑتا ہے۔

وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَۃً (۳۸-۱۹) اور پرندوں کو بھی جو کہ جمع رہتے تھے۔

وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ (۲۴-۴۱) اور پر پھیلائے ہوئے جانور بھی۔

وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُہٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ (۲۷-۱۷) اور سلیمان کے لئے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّیْرَ (۲۷-۲۰) انہوں نے جانوروں کا جائزہ لیا۔

تَطَیَّرَ فُلَانٌ وَاطَّیَّرَ اس کے اصل معنی تو کسی پرندہ سے شگون لینے کے ہیں پھر یہ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہونے لگا ہے جس سے برا شگون لیا جائے اور اسے منحوس سمجھا جائے قرآن میں ہے:۔

اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِکُمْ (۳۶-۱۸) ہم تم کو منحوس سمجھتے ہیں۔

اسی لئے کہا گیا ہے[1] لَا طَیْرَ اِلَّا طَیْرُکَ کہ نہیں ہے نحوست مگر تیری طرف سے ہے۔

قرآن میں ہے:۔

اِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّطَّیَّرُوْا (۷-۱۳۱) اگر سختی پہنچتی ہے تو... بدشگونی لیتے ہیں۔ یعنی موسیٰؑ کو باعث نحوست سمجھتے ہیں چنانچہ ان کے جواب میں فرمایا) اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُھُمْ عِنْدَ اللّٰہِ (۷-۱۳۱) یعنی یہ ان کی بداعمالیوں کی سزا ہے جو اللہ کے ہاں سے مل رہی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔

قَالُوا اطَّیَّرْنَا بِکَ وَبِمَنْ مَّعَکَ قَالَ طٰٓئِرُکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ (۲۷-۴۷) وہ کہنے لگے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں کو ہم بدشگون خیال کرتے ہیں (صالحؑ نے) کہا کہ تمہاری بدشگونی خدا کی طرف سے ہے۔

قَالُوْا طَآئِرُکُمْ مَّعَکُمْ (۳۶-۱۹) انہوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیْ عُنُقِہٖ (۱۷-۱۳) اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔ میں انسانی اعمال کو طائر کہا گیا ہے (کیونکہ عمل کے سرزد ہو جانے کے بعد انسان کو یہ اختیار نہیں رہتا کہ اسے واپس لے گویا وہ) اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے تَطَایَرُوْا وہ نہایت تیزی سے

---

[1] وھو قال ابو اسحاق ۱۲ [2] ایضاً فی التاج وھو قولھم وفی الاصل انہ مرفوع من روایۃ عبداللہ بن عمر فی حدیث الطیرۃ ولفظہ:۔ لاخیر الاخیرک راجع عمل الیوم واللیلۃ لابن سنی ۲۹۲ وتحفۃ الذاکرین ۷ ۲۱ - ۲۱۸ ومسند احمد ۲ ر ۲۲۰ وفی الطبرانی ذمجمع الزوائد من حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص وفیہ ابن الہیعۃ ضعیف ۱۲

گئے منتشر ہو گئے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۲۹۶) طَارُوْا اِلَیْہِ زَرَافَاتٍ وَّوُحْدَانًا

تو جماعتیں بن کر اور اکیلے اکیلے اس کی طرف اڑتے چلے جاتے ہیں۔

فَجْرٌ مُّسْتَطِیْرٌ منتشر ہونے والی صبح قرآن میں ہے۔

وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا (۷۶-۷) اور اس دن سے جس کی سختی پھیل رہی ہوگی خوف رکھتے ہیں۔

غُبَارٌ مُّسْتَطَارٌ بلند اور منتشر ہونے والا غبار فجر کو فاعل تصور کرکے اس کے متعلق مستطیر اسم فاعل کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور غبار کو مفعول تصور کرکے مستطار کہتے ہیں۔

فَرَسٌ مُطَارٌ ہوشیار اور تیز رو گھوڑا۔

خُذْ مَا طَارَ مِنْ شَعْرِ رَأْسِکَ یعنی اپنے سر کے پراگندہ اور لمبے بال کاٹ ڈالو[2]۔

(ط ی ن)

اَلطِّیْنُ۔ پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں گو اس سے پانی کا اثر زائل ہی کیوں نہ ہو جائے اور طِنْتُ کَذَا وَطَیَّنْتُہٗ کے معنی دیوار وغیرہ کو گارے سے لیپنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

مِنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ (۳۷-۱۱) چکنے والی مٹی سے۔

وَخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ (۷-۱۲) اور اسے مٹی سے بنایا۔

فَاَوْقِدْ لِیْ یٰھَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ (۲۸-۳۸) ہامان! میرے لئے گارے کو آگ لگوا کر (اینٹیں تیار کرواؤ)۔

---

[1] قاله قريط بن انيف العنبري واوله:- اذا الشر ابدى ناجذيه لهم . . . كذا في التبريزي وفي التنبيه لابن جني وقد رده لابي الغول الطهوي والشطر من شواهد الكشاف والبيت في اللسان والمحكم (وحد) والصناعتين ٢٨٥ ومجالس ثعلب ٤٠٥ والعيون ١٨٩/٣) في تسعة ابيات والسيوطي ٢٥ وهو من اول مقطوعة اختارها ابوتمام في الحماسة (٢٢-٣١ مع المرزوقي) في سبعة وفي رواية التبريزي ثمانية ١٢ [2] قال في التاج ومنه الحديث خذ ماتطاير من شعرك وفي رواية من شعر راسك راجع ايضا النهاية (طير)

کِتَابُ الظّاء

(ظ ع ن)

ظَعَنَ (ف) یَظْعَنُ ظَعْنًا کے معنی کوچ کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَیَوْمَ ظَعْنِکُمْ (۱۶-۸۰) سفر کے دن۔
اور ظَعِیْنَۃٌ اس ہودج کو کہتے ہیں جس میں عورت سوار ہو اور کبھی یہ لفظ کنایۃً عورت کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ ہودج میں نہ ہو۔

(ظ ف ر)

اَلظُّفُرُ (ناخن) یہ لفظ انسان اور دوسرے جانوروں کے ناخن پر بھی بولا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ (۶-۱۴۷) تمام ناخن دار جانور
میں ذی ظفر سے ذی مخلب یعنی پنجہ دار شکاری جانور مراد ہیں اور چونکہ ناخن چونکہ اس کا اوزار ہوتا ہے اس مناسبت سے ظُفُرٌ کا لفظ سلاح یعنی ہتھیار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ کَلِیْلُ الظُّفُرِ فلاں کند ہتھیار یعنی کمزور ہے۔
ظَفَرَہٗ فُلَانٌ فلاں نے اس میں اپنے ناخن گاڑ دیئے۔ اَلْاَظْفَرُ لمبے ناخنوں والا۔
اَلظَّفَرَۃُ (ناخنہ چشم) ایک قسم کی جھلی جو آنکھ کو ڈھانپ لیتی ہے اور ناخن کی طرح سخت ہوتی ہے۔
ظَفِرَتْ عَیْنُہٗ اس کی آنکھ پر ناخنہ چھا گیا۔
اَلظَّفَرُ کامیاب ہونا۔ یہ مفہوم دراصل ظَفَرَہٗ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ناخن گاڑ دینے کے ہیں۔ اَظْفَرَ کامیاب کر دینا۔ قرآن میں ہے:۔
مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَکُمْ عَلَیْھِمْ (۴۸-۲۴) اس کے بعد کہ تمہیں ان پر فتحیاب کر دیا۔

(ظ ل ل)

اَلظِّلُّ۔ سایہ یہ اَلضِّحُّ (دھوپ) کی ضد ہے اور فَیْءٌ سے زیادہ عام ہے کیونکہ (مجازاً) اَلظِّلُّ کا لفظ تورات کی تاریکی اور باغات کے سایہ پر بھی بولا جاتا ہے نیز ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے اسے ظِلٌّ کہہ دیا جاتا ہے مگر فَیْءٌ صرف اس سایہ کو کہتے ہیں جو زوال آفتاب سے ظاہر ہو ہے اور عزت وحفاظت اور ہر قسم کی خوش حالی کو ظل سے تعبیر کر لیتے ہیں۔
چنانچہ آیت کریمہ:۔
اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ (۷۷-۴۱) کے معنی یہ ہیں کہ پرہیزگار ہر طرح سے عزت وحفاظت میں ہوں گے۔ نیز فرمایا:۔
اُکُلُھَا دَآئِمٌ وَّظِلُّھَا (۱۳-۳۵) اس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اور اس کی خوش گوارِیاں بھی۔

هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ (۳۶-۵۶) وہ بھی اور ان کی بیویاں ہر قسم کی خوشحالیوں میں۔
ظَلَّنِیْ الشَّجَرُ وَاَظَلَّنِیْ درخت نے مجھ پر سایہ کیا۔ قرآن میں ہے:۔
وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ (۲-۵۷) اور ہم نے بادلوں کا تم پر سایہ کئے رکھا۔
وَ اَظَلَّنِیْ فُلَانٌ اس نے میری حفاظت کی مجھے اپنے زیر سایہ لے لیا مجھے عزت سے رکھا۔ اور آیت کریمہ: یَتَفَیَّؤُا (۱۶-۴۸) جن کے سائے ...... لوٹتے رہتے ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ سائے کا وجود بھی اللہ تعالے کی وحدانیت اور حکمت پر دلالت کرتا ہے اور آیت کریمہ:۔
وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ اِلٰی قَوْلِهٖ وَ ظِلٰلُهُمْ (۱۳-۱۵) اور ...... خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی۔
کی تفسیر میں حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ انسان! تیرا سایہ تو اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے مگر تو کفر پر تلا ہوا ہے ظِلٌّ ظَلِیْلٌ گھنا سایہ۔ مگر آیت کریمہ:۔
وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا (۴-۵۷) اور ان کو ہم گھنے سائے میں داخل کریں گے۔
میں ظِلًّا ظَلِیْلًا سے کنایۃً زندگی کی آسائش مراد ہے اور ظُلَّةٌ سایہ فگن بدلی کو کہتے ہیں اور عام طور پر اس کا استعمال ناخوشگوار مواقع پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ (۷-۱۷۱) گویا وہ سایہ دار بدلی ہے۔
عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ "سائبان کی طرح چھا جانے والے دن کے عذاب نے" (۲۶-۱۸۹) اور آیت کریمہ:۔
اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (۲-۲۱۰) ان پر خدا کا عذاب سایہ دار بادلوں میں نازل ہو۔
میں ظُلَلٌ کا واحد ظُلَّةٌ آتا ہے جیسے غُرْفَةٌ وَغُرَفٌ وَقُرْبَةٌ وَقُرَبٌ اور ایک قراءت میں فِیْ ظِلَالٍ مِّنَ الْغَمَامِ بھی ہے اور ظِلَالٌ ظُلَّةٌ کی جمع بھی ہوسکتی جیسے عُلْبَةٌ کی جمع عِلَابٌ مُحْفَرَةٌ کی جمع حِفَارٌ آجاتی ہے اور ظِلٌّ کی بھی جیسا کہ آیت یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ (۱۶-۴۸) میں ہے بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ ہر بلند ہونے والی چیز کو ظِلٌّ کہا جاتا ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے[۱] (البسیط)
(۲۹۷) كُنَّا نَزَلْنَا رَفَعْنَا ظِلَّ اَخْبِيَةٍ
جب ہم فروکش ہوئے تو خیمے نصب کر دیئے۔
اور یہ ظاہر ہے کہ ظِلٌّ یعنی سایہ کو تو کوئی شخص بھی نصب نہیں کرتا لہٰذا یہاں ظِلَّ اَخْبِيَةٍ سے مراد خیمے ہیں اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے[۲] (الطویل)
(۲۹۸) تَتَبَّعُ اَفْيَاءَ الظِّلَالِ عَشِيَّةً
کہ شام کے وقت سایوں کے پیچھے چلتی ہے۔

---

[۱] قالہ عبدۃ بن الطبیب المحضری وتمامہ: وفار للقوم باللحم المراجیل۔ ولامیتہ ھو مفضلیۃ والبیت فی (۱: ۱۳۹) وفی روایۃ اللالی مع السمط (۱: ۶۹) وردنا بدل نزلنا وارویۃ بدل اخبیۃ وراجع ترجمۃ الشاعر الاصابۃ وابن الانباری ۲۸۰ والبیت ایضاً فی لجر ۵: ۸۹۴ والکامل ۹۴ لکن فیہا نصبنا بدل رفعنا والمحاضرات للمؤلف (۲: ۷۱۲) والعقد (۱: ۱۹۲) [۲] قالہ علقمۃ بن عبدۃ الفحل والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲: ۱۹۳) والضمیر للناقۃ وفی المطبوع یتبع بالیاء محرف وتمامہ: علی طرق کانہن سبوب۔ والبیت فی منتہی الطلب والشعراء ومختار الجاہلی (۱: ۳۲۱) والعقد الثمین ۱۰۶ وایام العرب ۵۶ والشطر الیضاً فی البحر ۵: ۸۹۴

مگر ان اشعار سے یہ معنی ثابت نہیں ہوتے کیونکہ مصرعہ اول کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے خیمے نصب کئے جن کے ساتھ ان کے سائے بھی بلند ہو گئے اور دوسرے مصرعہ میں اَلظِّلَالُ عام ہے اور فَیْءٌ کا لفظ خاص لہٰذا اَفْیَاءَ الظِّلَالِ میں اَلظِّلَالِ کی طرف اَفْیَاءَ کی اضافت ایسے ہی ہے جیسے کسی خاص کو عام کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے اور اسے اِضَافَةُ الشَّیْءِ اِلٰی جِنْسِهٖ کہتے ہیں۔

نیز اَلظُّلَّةُ کا لفظ کینوپی کی مثل ہر چھا جانے والی چیز پر بولا جاتا ہے اس بنا پر آیت کریمہ:۔ وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ کَالظُّلَلِ (۳۱-۳۲) کے معنی یہ ہیں جب بادلوں کی طرح سمندر کی بڑی بڑی موجیں انہیں ڈھانپ لیتی ہیں نیز فرمایا:۔ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ (۳۹-۱۶) ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں اور نیچے بھی۔

اور ہر ڈھانپ لینے والی چیز کو ظِلٌّ کہا جاتا ہے خواہ وہ اچھی ہو یا بری چنانچہ اچھے معنوں میں فرمایا:۔ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ (۳۵-۲۱) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔ وَدَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلٰلُهَا (۷۶-۱۴) ان سے ۔۔۔۔ ان کے سائے قریب ہوں گے۔

اور برے معنوں میں فرمایا:۔ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ (۵۶-۴۳) اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں۔ اور آیت کریمہ:۔ اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۷۷-۳۰) یعنی تین شاخوں والے سائے کی طرف۔ میں ظِلٌّ ظُلَّةٌ کے ہم معنی ہے جیسا کہ آیت کریمہ:۔ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ (۳۹-۱۶) سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ ظُلَّةٌ کی جمع ہے لہٰذا اس کے بعد لَا ظَلِیْلٍ (۷۷-۳۱) کے معنی یہ ہیں کہ وہ سایہ دوزخ کی گرمی سے بچانے کا کام نہیں دیگا اور حدیث میں جو آیا ہے کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ اِذَا مَشٰی لَمْ یَکُنْ لَهٗ ظِلٌّ کہ آنحضرت چلتے تو آپ کا سایہ نہ ہوتا تھا تو اس کی تفسیر دوسرے موقع پر بیان ہوگی۔

ظَلْتُ وَظَلِلْتُ (ایک لام کے ساتھ) یہ اصل میں تو اس کام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو دن کے وقت کیا جائے مگر کبھی بمعنی صِرْتُ یعنی ہو جانا بھی آجاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ فَظَلْتُمْ تَفَکَّهُوْنَ (۵۶-۶۵) اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ گے۔ لَظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ یَکْفُرُوْنَ (۳۰-۵۱) تو اس کے بعد وہ ناشکری کرنے لگ جائیں۔ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاکِفًا (۲۰-۹۷) جس کی عبادت پر جما ہوا تھا۔

(ظ ل م)

اَلظُّلْمَةُ۔ کے معنی ہیں روشنی کا معدوم ہونا اس کی جمع ظُلُمَاتٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ (۲۴-۴۰) یا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے، جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے۔ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (۲۴-۴۰) (غرض) اندھیرے ہی اندھیرے ہوں ایک پر ایک چھایا ہوا۔ اَمَّنْ یَّهْدِیْکُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۲۷-۶۳) بتاؤ بر و بحر کی تاریکیوں میں تمہاری کون رہنمائی کرتا ہے۔ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (۶-۱) اور تاریکیاں

اور روشنی بنائی۔

اور کبھی ظُلْمَۃٌ کا لفظ بول کر جہالت شرک اور فسق و فجور کے معنی مراد لیئے جاتے ہیں جس طرح کہ نورٌ کا لفظ ان کے اضداد یعنی علم و ایمان اور عمل صالح پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ (۲-۲۵۷) ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔

اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ (۱۴-۵) کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ۔

فَنَادٰی فِی الظُّلُمَاتِ (۲۱-۸۷) آخر تاریکیوں میں ہم کو پکارنے لگے۔ اور آیت کریمہ:۔

کَمَنْ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمَاتِ (۶-۱۲۲) کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے میں ہو۔ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی (۱۳-۱۹) کے ہم معنی ہے اور آیت سورہ انعام:۔

وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُکْمٌ فِی الظُّلُمَاتِ (۶-۳۹) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں اور تاریکیوں میں پڑے ہیں۔ میں فِی الظُّلُمَاتِ کا لفظ آیت صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ (۲-۱۸) میں عُمْیٌ کی جگہ پر استعمال ہوا ہے اور آیت کریمہ:۔

فِیْ ظُلُمَاتٍ ثَلٰثٍ (۳۹-۶) تین اندھیروں میں، میں تین تاریکیوں سے مراد پیٹ رحم اور بچہ دانی کی تاریکی مراد ہے۔

اَظْلَمَ کے معنی ہیں تاریکی میں ہو جانا۔ قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ (۳۶-۳۷) پھر اچانک وہ تاریکی میں رہ جاتے ہیں۔

اَلظُّلْمُ اہل لغت اور اکثر علماء کے نزدیک ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی یا زیادتی کر کے یا اسے اس کے صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر اسی سے ظَلَمْتُ السِّقَاءَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں مشکیزہ میں دودھ جمنے کے لیئے رکھا اور دہی بننے سے پہلے ہی پی لیا اور ایسے دودھ کو......

ظَلِیْمٌ کہتے ہیں ظَلَمْتُ الْاَرْضَ میں نے زمین کو ایسے مقام سے کھودا جہاں سے کھودنا نہیں چاہیئے تھا اس قسم کی زمین کو "مَظْلُوْمَۃٌ" کہا جاتا ہے اور اس سے کھود کر جو مٹی نکالی جاتی ہے اس مٹی کو ظَلِیْمٌ کہتے ہیں۔

اور اَلظُّلْمُ کا لفظ حق سے تجاوز پر بولا جاتا ہے جس کی مثال دائرہ میں مرکزی نقطہ کی ہوتی ہے اور ظلم کا اطلاق چونکہ ہر قسم کے تجاوز پر ہوتا ہے خواہ وہ تجاوز قلیل ہو یا کثیر یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو ابلیس کو ظالم کہا ہے اور دوسری طرف آدم علیہ السلام کو ان کی غلطی کی بنا پر ظالم کہہ دیا گیا ہے گو دونوں کے ظالم ہونے میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ ظلم تین قسم پر ہے[1] (۱) وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے اس کی کسب سے بڑی قسم کفر و شرک اور نفاق ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (۳۱-۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔

اور آیات:۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ (۱۱-۱۸) سن رکھو کہ

[1] کذا فی حل المعاجم ۲ و ۱۳ التفسیم ایضاً مروی عن الشیخ (ا لطیالسی ، البناء) راجع کنز العمال ج ۳ رقم ۱۲۲۶ ÷

ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔
وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۷۶-۳۱) اور ظالموں کے لئے اس نے دکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ (۲۹-۳۲) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ بولے۔
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ (۶-۲۱) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ افترا کرے۔
اور اس نوع کی دیگر آیات میں اسی قسم کا ظلم مراد ہے
(۲) دوسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان ایک دوسرے پر کرتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (۴۲-۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کرلے تو اس کا بدلہ خدا کے ذمہ ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ظلم کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا میں ظالمین سے اسی قسم کے لوگ مراد ہیں۔ نیز آیت کریمہ:۔
اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ (۴۲-۴۲) الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔
میں بھی ظلم کے یہی معنی مراد ہیں اسیطرح فرمایا:۔
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا (۱۷-۳۳) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے۔
(۳) تیسری قسم کا ظلم وہ ہے جو ایک انسان خود اپنے نفس پر کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔
فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (۳۵-۳۲) تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔
ظَلَمْتُ نَفْسِيْ (۲۸-۱۶) میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔
اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۴-۶۴) جب اپنے حق میں ظلم کر بیٹھتے تھے۔
فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۷-۱۹) ورنہ ظالم ہو جاؤ گے۔
یعنی ان لوگوں سے ہو جاؤ گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۲-۲۳۱) اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرے گا۔
یہ تینوں قسم کا ظلم درحقیقت ظلم علی النفس ہی ہے کیونکہ جب انسان پہلے پہل ظلم کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ظالم اپنے ظلم کی ابتدا ہمیشہ اپنی ذات سے کرتا ہے اس بنا پر متعدد مقامات پر فرمایا:۔
وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۶-۳۳) خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ تو خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔
وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۲-۵۷) وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے۔ بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔
اور آیت:۔
وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ (۶-۸۲) اور اپنے ایمان کو (شرک کے ظلم) سے مخلوط نہیں کیا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ ظُلْمٌ سے شرک مراد ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرتؐ نے فرمایا (۲۶) کہ ظلم سے مراد تو شرک ہے جیسا کہ حضرت لقمانؑ کے قول:۔

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (۳۱-۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے ــ سے معلوم ہوتا ہے[1]۔
اور آیت کریمہ:
وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا (۱۸-۳۳) اور اس کی پیداوار میں کسی طرح کی کمی نہ ہوتی۔
لَمْ تَظْلِمْ کے معنی لَمْ تَنْقُصْ کے ہیں یعنی اس کی پیداوار میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی تھی اور آیت:۔
وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (۳۹-۴۷) اور اگر ظالموں کے پاس وہ سب مال و متاع ہو جو زمین میں ہے۔
میں ظلم کا لفظ تینوں قسم کے ظلم کو شامل ہے کیونکہ جس شخص نے دنیا میں ادنیٰ سا ظلم بھی کیا ہوگا وہ قیامت کے دن دنیا کا سب مال و متاع فدیہ دے کر رہا ہونے کی کوشش کرے گا۔
اور آیت کریمہ:۔
هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَىٰ (۵۳-۵۲) وہ لوگ بڑے ہی ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔
میں متنبہ کیا ہے کہ ظلم و ستم کا انجام برا ہوتا ہے اور ایسے لوگ آخر کار ہلاک ہو جاتے ہیں چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ اس امر کا شاہد ہے اور قرآن نے ایک موقع پر تو۔ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰-۳۱) اور خدا بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔ کہا ہے اور دوسرے مقام پر:۔
وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (۵۰-۲۹) اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے۔ فرمایا ہے ــ پس پہلی آیت میں عباد یعنی بندوں سے ارادہ ظلم کی نفی کرنا مقصود ہے اور دوسری آیت میں بندوں پر سے لفظ ظَلَّامٌ (صیغہ مبالغہ) کے ساتھ نفی کی ہے۔ ان دونوں میں جو باریک فرق پایا جاتا ہے اس کی وضاحت ہم دوسری کتاب میں بیان کریں گے[2]۔
ظَلِيمٌ نر شتر مرغ کیونکہ عرب لوگ اسے مظلوم جانور خیال کرتے تھے۔
چنانچہ شاعر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے[3] (السریع)
(۲۹۹) فَصِرْتُ كَالْهَيْقِ غَدَا يَبْتَغِي ... قَرْنًا فَلَمْ يَرْجِعْ بِأُذْنَيْنِ
میں شتر مرغ کی طرف غائب و خاسر ہو کر لوٹا جو گیا تھا سینگ لینے مگر کھو بیٹھا کان بھی۔
ظَلْمٌ کے معنی دانتوں کی آب و تاب کے ہیں خلیل نے کہا ہے[4]:۔ لَقِيتُهُ أَدْنَىٰ ظَلَمٍ أَوْ ذِي ظَلَمَةٍ یعنی سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی اور میری نظر کو اس نے روکا وہ فلاں شخص ہے مگر اس معنی سے فعل مشتق ہو کر استعمال نہیں ہوتا۔

(ظ م ء)

اَلظِّمْءُ دو مرتبہ پانی پینے کے درمیان کا وقفہ اَلظَّمَاءُ پیاس جو اس وقفہ میں عارض ہو در اصل

---

[1] متفق علیہ من حدیث ابن مسعود ۱۲ [2] راجع لتاویل الآیۃ شرح الدرۃ للخفاجی ۱۳۲-۱۳۳ [3] قالہ بشار بن برد الاعمی فی قصیدۃ مطلعہا:۔ شط بسلمٰی عاجل البین وجاوزت اسد بنی القین۔ وقبلہ:۔ طالبہا قلبی فراعنت بہ۔ واسکت قلبی مع الدین ــ فی روایۃ کالہقل بدل الہیق وکنت بدل فصرت والبیت فی ذیل الامالی ۷۰ انی خمسۃ وفی روایۃ فکنت کالہقل۔ والمحاضرات للمؤلف (۱م ۱۰ ۶۷۲-۲:۲) والعیون (۳:۱۴۱) والسمط (۳:۵) قال الاستاذ المیمنی وفی ب ۵ کالعیر غدا کذا فی العیون وہو المضروب فیہ المثل راجع العیون مہرام والمیدانی والابیات مع الخبر فی الاغانی (۳:۲۰۵-۲۰۶) [4] راجع للکلام مجالس ثعلب۔ ۸ ومعناہ وضح لک ۱۲

یہ ظَمِئَ یَظْمَأُ فَهُوَ ظَمْآنٌ کا مصدر ہے ۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی (۲۰-۱۱۹) اور یہ کہ نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کھاؤ۔

یَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْئًا (۲۴-۳۹) کہ پیاسا اسے پانی سمجھ کر اس کی طرف جاتا ہے مگر جب وہاں پہنچتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔

(ظ ن ن)

اَلظَّنُّ کسی چیز کے علامات سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اسے ظَنٌّ کہتے ہیں جب یہ علامت قوی ہو تو ان سے علم کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے مگر جب بہت کمزور ہوں تو وہ نتیجہ وہم کی حد سے آگے تجاوز نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ جب وہ نتیجہ قوی ہو جائے اور علم کا درجہ حاصل کرلے یا اسے علم کے درجہ میں فرض کر لیا جائے تو اس کے بعد اَنَّ یا اَنْ استعمال ہوتا ہے۔ مگر جب وہ ظن کمزور ہو اور وہم کے درجہ سے آگے نہ بڑھے تو پھر اسکے ساتھ صرف اَنْ استعمال ہوتا ہے جو کسی قول یا فعل کے عدم کے ساتھ مختص ہے۔ چنانچہ آیات:۔

اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (۲-۴۶) جو یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں۔

یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ (۲-۲۴۹) جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ ان کو خدا کے روبرو حاضر ہونا ہے۔

وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ (۷۵-۲۸) اور اس (جان بلب) نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہے۔

میں ظَنٌّ کا لفظ علم و یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ (۸۳-۴) میں ان کی انتہائی مذمت کی ہے اور معنی یہ ہیں کہ موت کے بعد زندہ ہونے کے دلائل نہایت واضح ہیں مگر یہ اس زندگی کا گمان تک نہیں کرتے اور آیت کریمہ:۔

وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَآ (۱۰-۲۴) اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔

میں اشارہ ہے کہ زیادہ لالچ اور طمع میں آکر وہ اس امر کا یقین کر بیٹھے تھے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ (۳۸-۲۴) میں ظن بمعنی علم ہے اور فتنہ کے یہاں وہی معنی ہیں جو کہ آیت:۔ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (۲۰-۴۰) میں ہیں اور آیت:۔ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ (۲۱-۸۷) اور ذوالنون کو یاد کرو (جب وہ (اپنی قوم سے) ناراض ہو کر) غصے کی حالت میں چل دیئے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ظَنَّ بمعنی وہم لینا بہتر ہے یعنی ان کے دل میں یہ وہم گذرا کہ ہم ان پر قابو نہیں پا سکیں گے اور آیت:۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ (۲۸-۳۹) اور وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق مغرور ہو رہے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

میں ظَنَّ کے بعد اَنَّ لایا گیا ہے جو کہ ظن بمعنی علم کے بعد استعمال ہوتا ہے پس اس سے متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی جگہ پر یقین کر لیا تھا گو یہ یقین بے اصل تھا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَيَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (۳-۱۵۴)
وہ خدا کے بارے میں ناحق زمانہ جاہلیت کے سے گمان کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ زمانہ جاہلیت کی طرح اللہ تعالیٰ کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں یعنی وہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر نے انکے سامنے غلط بیانی کی ہے اس سے تنبیہ کی ہے کہ منافقین کی یہ بدگمانیاں کفار کی سی ہیں اور وہ اس قسم کی افواہیں پھیلا کر کفار کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ (۵۹-۲) اور وہ لوگ یہ سمجھے ہوئے کہ ان کے قلعے ان کو ..... بچالیں گے۔

کے معنی یہ ہیں کہ ان کا یہ خیال اس قدر پختہ تھا جیسا کہ کسی شخص کو پوراالیقین ہوتا ہے اسی معنی میں فرمایا:۔

وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۴۱-۲۲) بلکہ تم یہ خیال کرتے تھے کہ خدا کو تمہارے بہت سے عملوں کی خبر ہی نہیں۔

ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ (۴۱-۲۳) اور اسی خیال نے جو تم ..... رکھتے تھے۔

اور آیت کریمہ:۔

اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ (۴۸-۶) جو خدا کے حق میں برے برے خیال رکھتے ہیں۔ میں ظَنَّ السَّوْءِ کی تفسیر بعد کی آیت:۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ (۴۸-۱۲) بات یہ ہے کہ تم لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پیغمبر ..... کبھی لوٹ کر آنے کے ہی نہیں۔ میں بیان کردی ہے۔ نیز فرمایا:۔

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا (۴۵-۳۲) ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔

اور ظن چونکہ عام طور پر برا ہوتا ہے اس لئے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا (۱۰-۳۶) اور ان میں کے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ (۵۳-۲۸) اور ظن یقین کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔

وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ (۷۲-۷) اور یہ کہ ان کا بھی یہی اعتقاد تھا جس طرح تمہارا۔

اور ایک قرأت میں:۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِظَنِيْنٍ (۸۱-۲۴) اور وہ پوشیدہ باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں۔ ضاد کی بجائے ظاء کے ساتھ ہے جس کے معنی متہم کے ہیں۔

(ظ ھ ر)

اَلظَّهْرُ کے معنی پیٹھ اور پشت کے ہیں اس کی جمع ظُهُوْرٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ (۸۴-۱۰) اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائیگا

مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (۷-۱۷۲) یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد۔ اور آیت کریمہ:۔

اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۹۴-۳) جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔

میں گناہوں کو بوجھ کے ساتھ تشبیہ دے کر ظھر کا لفظ بطور استعارہ استعمال کیا ہے (کیونکہ بوجھ عام طور پیٹھ پر اٹھایا جاتا ہے) اور کبھی ظہر کا لفظ بطور استعارہ روئے زمین کے معنی میں بھی آجاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ظَهْرُ الْاَرْضِ زمین کا اوپر کا حصہ اس کے بالمقابل بَطْنُ الْاَرْضِ کے معنی ہیں زمین

کا اندرونی حصہ قرآن میں ہے :-
مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (۳۵-۴۵) [1] تو زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔
رَجُلٌ مُظْهَرٌ قوی پشت مضبوط آدمی ظَهَرَ پیٹھ درد کرنا اور ظَهْرٌ سواری کو کہتے ہیں۔ نیز ظَهْرٌ مددگار، پشت پناہ، بَعِيْرٌ ظَهِيْرٌ قوی اونٹ ظِهْرِيٌّ وہ فالتو سواری جسے احتیاطاً ساتھ رکھ لیا جاتا ہے تاکہ بوقت ضرورت اسے استعمال کیا جا سکے۔
نیز ظِهْرِيٌّ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے پس پشت ڈال کر بھول بسری کر دیا جائے قرآن میں ہے۔
وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا (۱۱-۹۲) پیٹھ پیچھے ....
ظَهَرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں وہ اس پر غالب آگیا، قرآن میں ہے :-
اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ (۱۸-۲۰) اگر وہ تم پر دسترس پالیں۔
ظَاهَرْتُهٗ میں نے اس کی مدد کی (اور ظَاهَرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی) قرآن میں ہے :-
وَظَاهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ (۶۰-۹) اور انہوں نے تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی۔
وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ (۶۶-۴) اور اگر پیغمبر کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو گی۔ ایک قرأت میں تَظَّاهَرَا ہے (یعنی تا کو ظا میں ادغام کیساتھ)
اَلَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ (۳۳-۲۶) (اور اہل کتاب میں سے) جنہوں نے ان کی مدد کی۔
تَظَاهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۲-۸۵) تم ان کے خلاف گناہ اور زیادتی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔
اَلظَّهِيْرُ مددگار۔ قرآن میں ہے :-
وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ (۳۴-۲۲) اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا مددگار ہے۔
فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ (۲۸-۸۶) تو تم ہرگز کافروں کے مددگار نہ ہونا۔
وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (۶۶-۴) اور ان کے علاوہ اور فرشتے بھی مددگار ہیں۔
اور آیت کریمہ :-
وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا (۲۵-۵۵) اور کافر اپنے پروردگار کی مخالفت میں بڑا زور مارتا ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ کافر خدائے رحمٰن کی مخالفت میں شیطان کا مددگار بنا ہوا ہے ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یہاں ظَهِيْرٌ کے معنی ہیں پس پشت ڈالا ہوا اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالٰی کے نزدیک کافر کی مثال اس چیز کی سی ہے جسے بے وقعت سمجھ کر پس پشت ڈال دیا جائے اور یہ ظَهَرْتُ بِكَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں میں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور در خور اعتناء نہ سمجھا۔
اَلظِّهَارُ کے معنی ہیں خاوند کا بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت کہا جاتا ہے ظَاهَرَ مِنِ امْرَاَتِهٖ اس نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا۔ قرآن میں ہے :-
وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ (۵۸-۳) اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں۔
ایک قرأت میں يَظَّاهَرُوْنَ ہے جو اصل میں يَتَظَاهَرُوْنَ ہے اور تا ظا میں مدغم ہے اور ایک قرأت يَظَّهَّرُوْنَ ہے [1]

---

[1] نسب الطبری (۲۸-۷) القراءۃ الاولٰی الی عامۃ قراء المدینۃ سوا نافع والی عامۃ قراء الکوفۃ سوا عاصم والثانیۃ الی نافع و ابوعمرو ۱۲

ظَهَرَ الشَّيْءُ کسی چیز کا زمین کے اوپر اس طرح ظاہر ہونا کہ نمایاں طور پر نظر آئے اس کے بالمقابل بَطَنَ کے معنی ہیں کسی چیز کا زمین کے اندر غائب ہو جانا پھر ہر وہ چیز جو اس طرح پر نمایاں ہو کہ آنکھ یا بصیرت سے اس کا ادراک ہو سکتا ہو اسے ظَاهِرٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (۴۰-۲۶) یا ملک میں فساد (نہ) پیدا کر دے۔
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (۶-۱۵۱) ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔
اِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا (۱۸-۲۲) مگر سرسری سی گفتگو۔ اور آیت کریمہ:۔
يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳۰-۷) یہ دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ صرف دنیوی امور سے واقفیت رکھتے ہیں اخروی امور سے بالکل بے بہرہ ہیں اور العلم الظاہر والباطن سے کبھی جلی اور خفی علوم مراد ہوتے ہیں اور کبھی دنیوی اور اخروی۔ قرآن میں ہے:۔
بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۵۷-۱۳) جو اس کی جانب اندرونی ہے اس میں تو رحمت ہے اور جو جانب بیرونی ہے اس طرف عذاب۔
اور آیت کریمہ:۔
ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۳۰-۴۱) خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا۔
میں ظَهَرَ کے معنی ہیں زیادہ ہو گیا اور پھیل گیا

اور آیت:۔
وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (۳۱-۲۰) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔
میں ظَاهِرَةً سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو ہمارے علم میں آ سکتی ہیں اور بَاطِنَةً سے وہ جو ہمارے علم سے بالا ہیں چنانچہ اسی معنی کی طرح اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴-۳۴) اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔
اور آیت کریمہ:۔
قُرًى ظَاهِرَةً (۳۴-۱۸) کے عام معنی تو یہی ہیں کہ وہ بستیاں سامنے نظر آتی تھیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بطور مثال کے انسانی احوال کی طرف اشارہ ہو جس کی تصریح اس کتاب کے بعد (دوسری کتاب میں) بیان کریں گے انشاء اللہ۔
اَظْهَرَهٗ عَلَيْهِ اسے اس پر مطلع کر دیا۔[1]
چنانچہ آیت کریمہ:۔
فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا (۷۲-۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اپنے غائب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا اور آیت کریمہ:۔
لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹-۳۳) میں يُظْهِرَ کے معنی نمایاں کرنا بھی ہو سکتے ہیں اور معاونت اور غلبہ کے بھی یعنی تمام ادیان پر اسے غالب کرے چنانچہ اس دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا:۔
اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ (۱۸-۲۰) اگر وہ تم پر دسترس پالیں گے تو تمہیں سنگسار

[1] وایضاً ظہر علیہ اطلع علیہ کما فی قولہ تعالیٰ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَاءِ (۲۴-۳۱)

کردیں گے۔
يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِى الْاَرْضِ (۴۰-۲۹) اے قوم آج تمہاری ہی بادشاہت ہے اور تم ہی ملک میں غالب ہو۔
فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ (۱۸-۹۷) پھر ان میں یہ قدرت نہ رہی کہ اس کے اوپر چڑھ سکیں۔
صَلٰوةُ الظُّهْرِ ظہر کی نماز ظَهِيْرَةٌ ظہر کا وقت۔ اَظْهَرَ فُلَانٌ فلاں ظہر کے وقت میں داخل ہوگیا جیسا کہ اَصْبَحَ وَاَمْسٰى صبح اور شام میں داخل ہونا۔ قرآن میں ہے۔
وَلَهُ الْحَمْدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (۳۰-۱۸) اور آسمان اور زمین میں اسی کیلئے تعریف ہے اور سہ پہر کے وقت بھی اور جب تم ظہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو۔

کِتَابُ الْعَيْنِ

(ع ب أ)

مَا عَبَأْتُ بِہٖ ۔ مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں اصل میں اَلْعَبْءُ کے معنی ثقل اور بوجھ کے ہیں لہٰذا مَا عَبَأْتُ بِہٖ کے معنی ہوں گے میرے نزدیک اس کا کوئی وزن نہیں یا میری نگاہ میں اس کی کچھ بھی قدر و قیمت نہیں قرآن میں ہے:۔
قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي. (۲۵-۷۷) کہہ دو کہ میرے پروردگار کی نگاہوں میں تمہاری کچھ بھی قدر و قیمت نہیں۔

بعض کے نزدیک آیت کریمہ میں يَعْبَؤُا کا لفظ عَبَأْتُ الطِّيْبَ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میں نے خوشبو کو باقی رکھا پس آیت کے معنی یہ ہیں "اگر تم اللہ کو پکارتے نہ ہوتے تو اللہ تمہیں باقی نہ چھوڑتا"

عَبَأْتُ الْجَيْشَ وَعَبَّأْتُهٗ میں نے لشکر کو تیار کیا
عُبِّيَّةُ الْجَاهِلِيَّةِ زمانہ جاہلیت کی نخوت جو ان کے دلوں میں رچ چکی تھی اور جیسے قرآن نے آیت:۔
فِي قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ (۴۸-۲۶)
ان کے دلوں میں زمانہ جاہلیت کی سی حمیت ہو۔ میں زمانہ جاہلیت کی سی حمیت سے تعبیر کیا ہے۔

(ع ب ث)

اَلْعَبَثُ دراصل اس کے معنی ہیں کسی کام کے ساتھ کھیل کود کو ملا دینا اور یہ عَبَثْتُ الْاَقِطَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں میں نے پنیر کے ساتھ اور چیز کو ملا دیا اور اَلْعَبِيْثُ وہ کھانا جو کسی چیز کے ساتھ خلط ملط کیا گیا ہو اسی اعتبار سے کھجور، گھی اور ستو کے آمیزہ کو عَوْبَثَانِيٌّ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ (۲۶-۱۲۸)
تم ہر بلند مقام پر بے مقصد بڑی عمارتیں تعمیر کرتے ہو۔
نیز اَلْعَبَثُ ہر اس کام کو کہتے ہیں جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو قرآن میں ہے:۔
اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (۲۳-۱۱۵)
کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بے غرض و غایت پیدا کر دیا ہے۔

(ع ب د)

اَلْعُبُوْدِيَّةُ کے معنی ہیں کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا مگر اَلْعِبَادَةُ کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکساری ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ معنوی

اعتبار سے اَلْعِبَادَۃ کا لفظ اَلْعُبُوْدِیَّۃ سے زیادہ بلیغ ہے لہٰذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے جو بے حد صاحب افضال و انعام ہو اور ایسی ذات صرف ذات الٰہی ہی ہے اسی لئے فرمایا:۔
اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ (۱۷-۲۳) کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

عِبَادَۃ دو قسم پر ہے (۱) عبادت بالتسخیر جیسے ہم سجود کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں (۲) عبادت بالاختیار اس کا تعلق صرف ذوی العقول کے ساتھ ہے یعنی ذوی العقول کے علاوہ دوسری مخلوق اس کی مکلف نہیں ہے اور آیت کریمہ:۔
اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ (۲-۲۱) اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔
وَاعْبُدُوا اللّٰہَ (۴-۳۶) اور خدا ہی کی عبادت کرو۔
میں اسی دوسری قسم کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے[1]۔

اَلْعَبْدُ (بندہ، غلام) کا لفظ چار معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) اَلْعَبْدُ بمعنی غلام یعنی وہ انسان جس کو خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہو چنانچہ آیات کریمہ:۔
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (۲-۱۷۸) اور غلام کے بدلے غلام۔
وَعَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ (۱۶-۷۵) ایک غلام ہے جو بالکل دوسرے کے اختیار میں ہے۔
میں عَبْدٌ کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۲) اَلْعَبْدُ بِالْاِیْجَادِ یعنی وہ بندہ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے اس معنی میں عبودیۃ اللہ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (۱۹-۹۳) تمام شخص جو آسمان اور زمین میں ہیں خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔
میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) عَبْدٌ وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبودیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے[2] اس لحاظ سے جن پر عَبْدٌ کا لفظ بولا گیا ہے وہ دو قسم پر ہیں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا:۔
وَاذْکُرْ عَبْدَنَا اَیُّوْبَ (۳۸-۴۰) اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔
اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا (۱۷-۳) بیشک نوحؑ ہمارے شکر گزار بندے تھے۔
نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (۲۵-۱) جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا:۔
عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ (۱۸-۱) جس نے اپنی بندے (محمدؐ) پر یہ کتاب نازل کی۔
اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ (۱۷-۶۵) جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔
کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ (۳-۷۹) کہ ... میری بندے ہو جاؤ۔
اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ (۱۵-۴۰) ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں۔
وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَہٗ بِالْغَیْبِ (۱۹-۶۱) جس کا خدا نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے۔
وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا (۲۵-۶۳) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو

---

[1] انظر لتفصیلہ لباب التاویل ص۱۹ ج۱ و تاج العروس للزبیدی والمہائمی ص۲۲ ج۱ و تفسیر ام الکتاب لمولانا ابوالکلام آزاد ص ۳۵-۱۴۸۔
[2] ای قدیاتی عبد بمعنی خدم کما جاء فی تفسیر قولہ تعالیٰ، وقومہما لنا عابدون، ان العابدون ہہنا بمعنی الخادم (الروح ۱۸/۳۲) وایضاً عبد بمعنی الف کما فی قولہ تعالیٰ، فانا اول العابدین (۴۳-۸۱) معناہ مستنکفین (راجع الصحیح ۲/۳۲۷)

زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا (۲۰-۷۷) ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا (۱۸-۶۵) (وہاں) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ دیکھا۔

(۲) دوسرے وہ جو دنیا کی لالچ اور حرص کے غلام بن کر ہر وقت اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ اور اسی کی طرف مائل رہتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق ہی آنحضرت نے فرمایا ہے[1] (۲۷) تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْھَمِ۔ تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ درہم ودینار کا بندہ ہلاک ہو عَبْدٌ کے ان معانی کے پیش نظر یہ بھی کہا جاسکتا ہے لَیْسَ کُلُّ اِنْسَانٍ عَبْدًا لِلّٰہِ کہ ہر انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے یعنی بندہ مخلص نہیں ہے لہذا یہاں عَبْدٌ کے معنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہیں لیکن عَبْدٌ عَابِدٌ سے زیادہ بلیغ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں:۔

وَالنَّاسُ کُلُّھُمْ عِبَادُ اللّٰہِ کہ تمام لوگ اللہ کے ہیں یعنی اللہ ہی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ تمام اشیاء کا یہی حکم ہے۔ بعض عبد بالتسخیر ہیں اور بعض عبد بالاختیار اور جب عَبْدٌ کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہو تو اس کی جمع عَبِیْدٌ یا عِبْدٌ آتی ہے اور جب عَبْدٌ بمعنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہو تو اس کی جمع عِبَادٌ آئے گی لہذا جب عَبِیْدٌ کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ عِبَادٌ سے زیادہ عام ہوگا یہی وجہ ہے کہ آیت:۔

وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۵۰-۲۹) اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے۔ میں عَبِیْدٌ سے ظلم کی نفی کر کے تنبیہ کی ہے وہ کسی بندے پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا خواہ وہ خدا کی پرستش کرتا ہو اور خواہ عبد الشمس یا عبد اللات ہونے کا مدعی ہو۔

طَرِیْقٌ مُّعَبَّدٌ ہموار راستہ جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔ بَعِیْرٌ مُّعَبَّدٌ جس پر تارکول مل کر اسے خوب بدصورت کردیا گیا ہو عَبَّدْتُّ فُلَانًا میں نے اسے مطیع کرلیا محکوم بنالیا قرآن میں ہے:۔

اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶-۲۲) کہ تم نے بنی اسرائیل کو محکوم بنا رکھا ہے۔

(ع ب ر)

اَلْعَبْرُ دراصل اس کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچ جانا مگر اَلْعُبُوْرُ کا لفظ خاص کر پانی عبور کرنے پر استعمال ہوتا ہے عام اس سے کہ تیر کر عبور کیا جائے یا کشتی اونٹ اور پل کے ذریعہ سے اسی سے عَبْرُ النَّھْرِ ہے جس کے معنی نہر کے اس کنارہ کے ہیں جہاں سے پانی میں اتر کر اسے عبور کیا جاتا ہے یا دوسری جانب سے عبور کر کے وہاں سے ہوا جاتا ہے اسی سے عَبَرَ الْعَیْنُ کا محاورہ مشتق ہے جس کے معنی ہیں آنکھ سے آنسو جاری ہونا اَلْعَبْرَۃُ آنسو اور مسافر کو عَابِرُ سَبِیْلٍ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ (۴-۴۳) ہاں اگر بحالت سفر رستے چلے جارہے ہوں۔

---

[1] الحدیث فی الفائق ۱/۱۷۱ و فی البخاری وابن ماجہ عن ابی ہریرۃ و فی روایۃ الترمذی لکن بدل تعس راجع کنز العمال ۳ رقم ۲۰۰۱ و ۳۴۱۰ و تخریج الاحیاء للعراقی ۳/۴۴ و ۳۲۵

نَاقَۃٌ عَبْرُ اَسْفَارٍ مضبوط اونٹنی جو ہر قسم کی زمین میں سفر کر سکے عَبَرَ الْقَوْمُ. لوگ مر گئے گویا انہوں نے دنیاوی زندگی کے پل کو عبور کر لیا اس اعتبار سے عِبَارَۃٌ خاص کر اس کلام کو کہتے ہیں جو متکلم کے منہ سے نکل کر فاصلہ عبور کر کے سامع کے کان تک پہنچ جائے اور اَلْعِبْرَۃُ وَالْاِعْتِبَارُ اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی دیکھی چیز کی وساطت سے اَن دیکھے نتائج تک پہنچا جائے قرآن میں ہے:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً (۳-۱۳) اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ (۵۹-۲) اے اصحاب بصیرت اس سے عبرت حاصل کرو۔

اور تَعْبِیْرٌ کے معنی ہیں خواب کا انجام بتانا گویا تاویل بتانے والا اس کے ظاہر سے باطن تک پہنچ جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

اِنْ کُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ (۱۲-۴۳) اگر تم خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہو۔

اور تَعْبِیْرٌ کا لفظ تاویل سے خاص ہے کیونکہ تَاْوِیْلٌ کے معنی مطلق کسی بات کا انجام بیان کرنے کے ہیں خواہ وہ خواب ہو یا خواب نہ ہو۔

اور اَلشِّعْرَی الْعَبُوْرُ ایک ستارے کا نام ہے کیونکہ وہ بھی اپنے فلک میں مسافت طے کرتا رہتا ہے اَلْعَبْرِیُّ گھاس جو نہر کے کنارے پر اُگ آتی ہے اور شَطٌّ مَعْبَرٌ نہر کا وہ کنارہ جہاں پر عبری گھاس اُگی ہوئی ہو۔

(ع ب س)

اَلْعُبُوْسُ (ض) کے معنی سینہ کی تنگی سے چہرہ پر شکن پڑنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی (۸۰-۱) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے

ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۷۴-۲۲) پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔

اور اسی سے یَوْمٌ عَبُوْسٌ ہے جس کے معنی سخت اور بھیانک دن کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا (۷۶-۱۰) اس دن سے جو (چہروں کو) شکن آلود اور دلوں کو سخت مضطر کر دینے والا ہے۔

اور اسی اعتبار سے اَلْعَبَسُ اس گوبر اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے بالوں کے ساتھ لگ کر خشک ہو جاتا ہے عَبَسَ الْوَسَخُ عَلٰی وَجْھِہٖ اس کے چہرہ پر میل کچیل جم گئی۔

(ع ب ق ر)

عَبْقَرٌ بعض نے کہا ہے کہ جنوں کی آبادی کا نام ہے عرب لوگ جب کسی انسان حیوان یا کپڑے وغیرہ میں نادرہ کاری دیکھتے تو اسے اسکی طرف نسبت کر دیتے اسی بنا حضرت عمرؓ کے بارے میں آنحضرتؐ نے ایک خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا (۲۷)

---

[1] قال الخلیل اَلْعِبْرَۃُ وَالْاِعْتِبَارُ معناہ التذکر من الحوادث السالفۃ ۱۲ [2] قال الشاعر وقد غابت الشعری وقد طلع النسر راجع التنبیہ للبکری ۳۸ والاغانی ۱۰/۵۴ [3] راجع للحدیث اللسان (فری) والنہایۃ ۳/۲۱۵ والاضداد لابی الطیب ۶۳ ۵ والبخاری مع الفتح فضائل اصحاب النبی وتعبیر وتوحید والمسلم فضائل الصحابۃ والترمذی (رؤیا) والحاکم (۲/۲۸) (۳/۵۵۴) والفائق ۲/۲۲ وغریب ابی عبید ۱/۸ [4] کما قال لبید: ومن فادمن اخوانہم وبنیہم کہول وشبان کجنۃ عبقری راجع التاج (عبقر)

نَمْاَرْ عَبْقَرِیًّا مِثْلَہٗ کہ میں نے اس جیسا نادرالمثال شخص نہیں دیکھا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَعَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ (۵۵-۷۶) اور نفیس مسندوں پر۔ میں عَبْقَرِیٍّ کے معنی ایک قسم کے عمدہ فرش کے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے جنت کے فرش کے لئے ضرب المثل کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

(ع ت ب)

اَلْعَتَبُ۔ ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جو وہاں اترنے والے کے لئے سازگار نہ ہو نیز دروازہ کی چوکھٹ اور سیڑھی کو بھی عَتَبَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بیوی سے جو فرمایا تھا قُوْلِی لِزَوْجِكِ غَیِّرْ عَتَبَۃَ بَابِكَ اپنے خاوند سے کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کرلے تو یہاں عَتَبَۃٌ کے معنی بطور کنایہ عورت کے ہیں اور استعارہ کے طور پر عَتَبٌ وَمَعْتَبَۃٌ کے معنی اس ناراضگی یا سختی کے بھی آجاتے ہیں جو انسان کے دل میں دوسرے کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے یہ بھی اصل میں اَلْعَتَبُ ہی سے ہے اسی کے مطابق خَشُنَتْ بِصَدْرِ فُلَانٍ وَوَجَدْتُ فِیْ صَدْرِہٖ غِلْظَۃً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اسی سے کہا گیا ہے حُمِلَ فُلَانٌ عَلٰی عَتَبَۃٍ صَعْبَۃٍ فلاں کو ناگوار حالت پر مجبور کیا گیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (خفیف)

(۳۰۰) وَحَمَلْنَاھُمْ عَلٰی صَعْبَۃٍ زَوْ
رَاءَ یَعْلُوْنَہَا بِغَیْرِ وِطَاءِ

ہم نے انہیں نہایت ٹیڑھی حالت پر سوار کیا چنانچہ وہ بغیر نمدہ کے اس پر سوار ہیں۔

اَعْتَبْتُ فُلَانًا (۱) ناراضگی ظاہر کرنا (۲) ناراضگی پر ابھارنا (۳) میں نے اس کی ناراضگی دور کردی یعنی راضی کرلیا جیسا کہ اَشْکَیْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اس کی شکایت دور کردی (یعنی سلب ماخذ کے معنی پائے جاتے ہیں) قرآن میں ہے:۔

فَمَا ھُمْ مِنَ الْمُعْتَبِیْنَ (۴۱-۲۴) ان سے عتاب دور نہیں کیا جائے گا۔

اَلْاِسْتِعْتَابُ (رضامندی چاہنا) کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اپنے عتاب کو دور کردے تاکہ راضی ہو جائے کہا جاتا ہے اِسْتَعْتَبَ فُلَانٌ کسی سے عتاب کو دور کرنے کی خواہش کی۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا ھُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ (۱۶-۸۴) اور نہ ان کی معذرت قبول کر کے ان سے عتاب دور کیا جائیگا۔

لَكَ الْعُتْبٰی تیرے لئے رضامندی ہے۔ بَیْنَھُمْ اُعْتُوْبَۃٌ وہ باہم کشیدہ ہیں۔

عَتَبَ عَتْبًا آدمی کا ایک پاؤں پر کود کر چلنا جیسے اوپر چڑھنے والا سیڑھیوں پر قدم رکھتا چلا جاتا ہے۔

(ع ت د)

اَلْعَتَادُ ضرورت کی چیزوں کا پہلے سے ذخیرہ کرلینا اور یہی معنی اِعْدَادٌ کے ہیں عَتِیْدٌ (اسم فاعل) تیار کرنے والا (اسم مفعول) تیار کی ہوئی چیز قرآن میں ہے:۔

ھٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ (۵۰-۲۳) یہ (اعمال نامہ) میرے سامنے حاضر ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (۵۰-۱۸) میں عَتِیْدٌ کے معنی ہیں وہ فرشتہ لوگوں کے اعمال لکھنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

---

[1] التفصیل فی البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ؎ [2] قالہ ابو زبید الطائی والبیت فی النقائض ۱۷۰ ؎ ؎ ؎ ؎

اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴-۱۸) ان کے لئے درد انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔
میں بھی بعض نے کہا ہے کہ اَعْتَدْنَا کا لفظ عَتَادٌ سے فعل ماضی اَفْعَلْنَا کے وزن پر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں اَعْدَدْنَا ہے جس میں ایک دال کو ت سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔
فَرَسٌ عَتِيْدٌ وَعَتَدٌ گھوڑا جو ہر وقت دوڑ کے لئے تیار ہو اَلْعَتُوْدُ بکری کا یکسالہ بچہ جمع اَعْتِدَةٌ وَعِدَّانٌ ت کے دال میں ادغام کے ساتھ)

(ع ت ق)

اَلْعَتِيْقُ کے معنی المتقدم یعنی پیش رو کے ہیں خواہ اس کا تقدم زمان کے اعتبار سے ہو خواہ مکان یا رتبہ کے اعتبار سے اسی لحاظ سے اَلْعَتِيْقُ کے معنی کہنہ نجیب اور آزاد شدہ غلام بھی آجاتے ہیں۔ لہذا آیت کریمہ:۔
وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۲۲-۲۹) اور خانہ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔ میں خانہ کعبہ کو اَلْعَتِيْق کہنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جبابرہ کے پنجہ ستم سے ہمیشہ آزاد رہا ہے اور جابر سے جابر بادشاہ بھی اس کے مرتبہ کو پست نہیں کر سکا اَلْعَاتِقَانِ دونوں طرف سے کندھوں اور گردن کے درمیانی حصے کو کہتے ہیں کیونکہ بدن کا یہ حصہ بھی باقی جسم سے بلند ہوتا ہے نیز عَاتِقٌ اس عورت کو بھی کہا جاتا ہے جو حبالہ نکاح سے آزاد ہو۔ کیونکہ شادی شدہ عورت ایک طرح سے خاوند کی ملک میں ہوتی ہے عَتَقَ الْفَرَسُ گھوڑے کا دوڑ میں آگے بڑھ جانا عَتَقَ مِنِّيْ يَمِيْنٌ۔ قسم کا واجب ہونا شاعر نے کہا ہے (الطویل)

(۳۰۱) عَلَىَّ اَلِيَّةٌ عَتَقَتْ قَدِيْمًا
وَلَيْسَ لَهَا وَاِنْ طُلِبَتْ مَرَامٌ

مجھ پر عرصہ قدیم سے قسم واجب ہو چکی ہے اور اسے پورا کرنے سے چارہ کار نہیں ہے۔

(ع ت ل)

اَلْعَتْلُ کسی چیز کو اس جگہ سے پکڑنا جہاں اس کے سارے سرے جمع ہوتے ہوں اور اسے بزور گھسیٹنا جس طرح کہ اونٹ کی مہار پکڑ کر اسے نہایت بیدردی کے ساتھ کھینچا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ (۴۴-۴۷) اور اسے کھینچ کر دوزخ کے اندر لے جاؤ۔
اَلْعُتُلُّ بسیار خوردہ مال کو روک کر رکھنے والا جو کسی چیز کو نہایت بے دردی سے گھسیٹتا ہو (سخت گیر) قرآن میں ہے:۔
عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (۶۸-۱۴) سخت گیر اور اس کے علاوہ بد ذات بھی۔

(ع ت و)

عَتَا۔ يَعْتُوْا۔ عُتُوًّا وَعِتِيًّا حکم عدولی کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (۵۱-۴۴) تو انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔
وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا (۲۵-۲۱) اور (یہ) اسی بنا پر بڑے سرکش ہو رہے ہیں۔

لہ قال اوس بن حجر انظر دیوانہ ۲۴ رقم ۴۳ وفیہ فلیس بدل ولیس والسان (عتق) والسمط ۹۰ ومجاز القرآن رقم ۸۹ والاقتضاب و اصلاح لیعقوب ۲۴۳ واوردہ العلامہ فی باب التمثیل وقیل: ان امرؤ القیس اول من ابتکرہ ولمریات الملح منہ ۱۲ ؎ ؎ ؎

عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّھَا (۶۵-۸) اپنے پروردگار کے امر سے سرکشی کی۔

بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ (۶۷-۲۱) لیکن یہ سرکش اور نفرت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا (۱۹-۸) کے معنی یہ ہیں کہ میں بڑھاپے کی ایسی حالت تک پہنچ گیا ہوں جہاں اصلاح اور مداوا کی کوئی سبیل نہیں رہتی یا عمر کے اس درجہ میں دیاضۃ بھی بیکار ہوتی ہے اور لفظ ریاضت سے یہی معنی مراد ہیں جن کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے (الکامل)

(۳۰۶) وَمِنَ الْعَنَاءِ رِیَاضَۃُ الْھَرِمِ

اور انتہائی بڑھاپے میں ریاضت دینا سراسر تکلیف دہ ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

اَیُّھُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا (۱۹-۶۹) جو خدا سے سخت سرکشی کرتے تھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ عِتِیًّا مصدر اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عَاتٍ کی جمع ہے اور اَلْعَاتِیْ کے معنی سنگدل اور اجڈ بھی آتے ہیں۔

(ع ث ر)

عَثَرَ، یَعْثُرُ، عِثَارًا وَعُثُوْرًا کے معنی پھسل جانے اور گر پڑنے کے ہیں مجازاً عَثَرَ عَلٰی کَذَا کے معنی کسی بات پر بغیر قصد کے مطلع ہوجانا بھی آتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤی اَنَّھُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا (۵-۱۰۷) پھر اگر معلوم ہوجائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

(اَعْثَرْتُہٗ عَلٰی کَذَا) اس نے فلاں کو اس چیز سے باخبر کردیا) چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَکَذٰلِکَ اَعْثَرْنَا عَلَیْھِمْ (۱۸-۲۱) اور اس طرح ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے باخبر کردیا۔ یعنی لوگوں کے قصد کے بغیر ہی ہم نے ان کے حال پر مطلع کردیا۔

(ع ث ی)

اَلْعَیْثُ وَالْعِثِیُّ (سخت فساد پیدا کرنا) بھی جَذْبٌ اور جَبْذٌ کی طرح تقریباً ہم معنی ہی ہیں لیکن عَیْثٌ کا لفظ زیادہ تر فساد حسی کے لیے بولا جاتا ہے اور اَلْعِثِیُّ کا حکمی یعنی ذہنی اور فکری فساد کے لیے آتا ہے کہا جاتا ہے عَثِیَ یَعْثٰی عِثِیًّا چنانچہ اسی سے قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (۲-۶۰) اور ملک میں فساد اور انتشار پیدا نہ کرو۔

اور عَثَا یَعْثُوْ عُثُوًّا (باب نصر سے بھی آتا ہے اور اَلْاَعْثٰی سیاہی مائل اور سست نیز احمق آدمی کو بھی اَعْثٰی کہا جاتا ہے۔

(ع ج ب)

اَلْعَجَبُ اور اَلتَّعَجُّبُ اس حیرت کو کہتے

لے وصدرہ: اُتردض ورسک بعدما ہرمت...... والبیت فی السمط (۱: ۱۰۷) والبیان (۱: ۲۲) والبحتری ۲۴۰ والعیون (۲: ۳۶۹) والعقد (۲: ۳۵۴) وفیہ ذتروض والحیوان (۱/۴۱، ۳/۱۰۲) وفیہ وتلوم بدل اُتروض ومجموعۃ المعانی ۱۵۷ ومحاضرات المؤلف (۱: ۸۴) والحصری (۲: ۲۵۹) فتاریخ الطبری (۷: ۱۵۸) بغیر عزو نسبۃ للماعرابی انظر الخبر والشطر فی طیلسینات الحمدونی والجدد فی مواسماعیل اعلم الناس شعراً وعامۃ شعرہ فی طیلسان ابن حرب راجع طبقات ابن المعتز (۳۷۱-۳۷۲) ۞

ہیں جو کسی چیز کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے
انسان کو لاحق ہوجاتی ہے اسی بنا پر حکماء نے کہا
ہے کہ عَجَبٌ اس حیرت کو کہتے ہیں جس کا سبب
معلوم نہ ہو اس لئے اللہ تعالےٰ پر تعجب کا اطلاق
جائز نہیں ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ تو عَلَّامُ
الْغُيُوْبِ ہے اس بنا پر کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے
عَجِبْتُ عَجَبًا (س) میں نے تعجب کیا عَجَبٌ ہر وہ
بات جس سے تعجب پیدا ہو اور جس جیسی چیز عام
طور نہ دیکھی جاتی ہو اسے عَجِيْبٌ کہا جاتا ہے۔ اور
آیت کریمہ :۔

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا (١٠-٢) کیا
لوگوں کو اس بات پر حیرت ہے کہ ہم نے وحی بھیجی۔
میں تنبیہ کی ہے کہ آنحضرت کی طرف وحی بھیجنا کوئی
تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ پہلے سے
سلسلہ وحی کو جانتے ہیں نیز فرمایا :۔

بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ (٥٠-٢) بلکہ
ان لوگوں نے تعجب کیا ہے کہ انہی میں سے ایک
ہدایت کرنے والا ان کے پاس آیا۔

وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ (١٣-٥) اور
اگر تم عجیب بات سننی چاہو تو کافروں کا یہ کہنا
عجیب ہے ۔ اور آیت کریمہ :۔

كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا (١٨-٩) کہ وہ ہماری نشانیوں
سے عجیب تھے ۔

کے معنی یہ ہیں کہ اصحاب کہف قدرت کے عجائبات
سے نہ تھے بلکہ ہماری قدرت کے نشانات ایسے
بھی ہیں جو ان سے بڑھ کر اور زیادہ عجیب ہیں۔
اور آیت کریمہ :۔

سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا (٧٢-١) (کہنے لگے کہ ہم نے
ایک عجیب قرآن سنا ۔

کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن (وحی) کا نہ تو سبب ہی
معلوم ہے اور نہ اس جیسا قرآن پہلے دیکھا ہے اور
بطور استعارہ یہ لفظ ہر بھلی چیز کے لئے استعمال
ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے ۔

أَعْجَبَنِيْ كَذَا یعنی مجھے فلاں چیز اچھی معلوم
ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے :۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ (٢-٢٠٤) اور
کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو ..... تم کو
دلکش معلوم ہوتی ہے۔

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ (٩-٨٥)
اور ان کے مال اور اولاد سے تعجب نہ کرنا ۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (٩-٢٥)
اور جنگ حنین کے دن جب کہ تم کو اپنی کثرت
پر غرّہ تھا ۔

أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ (٥٧-٢٠) اور کسانوں
کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ (٣٧-١٢) ہاں تم تو تعجب
کرتے ہو اور یہ تمسخر کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ دوبارہ زندہ ہونے پر پختہ یقین
ہونے کی وجہ سے تمہیں ان کے انکار پر تعجب
ہوتا ہے اور یہ لوگ ازراہ نادانی اس کا مذاق اڑاتے
ہیں۔ بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ آپ کو ان کے انکار
وحی پر تعجب ہوتا ہے ایک قرأت میں بَلْ عَجِبْتُ
ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے
تعجب کو اپنی طرف منسوب کیا ہے بلکہ مطلب یہ
ہے کہ یہ ان چیزوں سے ہے جن پر عَجِبْتُ بمعنی
أَنْكَرْتُ ہو جیسا کہ فرمایا :۔

أَتَعْجَبِيْنَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ (١١-٧٣) انہوں نے
کہا تم خدا کی قدرت سے انکار کرتی ہو۔

اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (۳۸-۵) یہ تو بڑی منکر بات ہے۔

هُوَ مُعْجِبٌ بِنَفْسِهٖ وہ غرور اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔

اَلْعَجَبُ جانور کی دم کا وہ حصہ جو سرین سے ملا ہوا ہوتا ہے۔

(ع ج ز)

عَجُزُ الْاِنْسَانِ۔ انسان کا پچھلا حصہ تشبیہ کے طور پر ہر چیز کے پچھلے حصہ کو عَجُزٌ کہہ دیا جاتا ہے[1]۔ قرآن میں ہے:-

كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (۶۹-۷) جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

عَجُزٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانا یا اس کے ایسے وقت میں حاصل ہونا کے ہیں جب کہ اس کا وقت نکل جا چکا ہو جیسا کہ لفظ اَلدُّبُر میں مذکور ہو چکا ہے لیکن عام طور پر یہ لفظ کسی کام کے کرنے سے قاصر رہ جانے پر بولا جاتا ہے اور یہ اَلْقُدْرَةُ کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:-

اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ (۵-۳۱) اے ہے مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں ..... ہوتا۔

اَعْجَزْتُ فُلَانًا وَعَجَّزْتُهٗ وَعَاجَزْتُهٗ کے معنی کسی کو عاجز کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:-

وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ (۹-۲) اور جان رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے۔

وَمَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ (۴۲-۳۱) اور تم زمین میں خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْ اٰيَاتِنَا مُعَاجِزِيْنَ (۳۴-۵) اور جنہوں نے ہماری آیتوں میں کوشش کی کہ ہمیں ہرا دیں گے۔

ایک قراءت میں مُعَجِّزِيْنَ ہے مُعَاجِزِيْنَ کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے وہ یہ زعم کرتے ہیں کہ ہمیں بے بس کر دیں گے کیونکہ وہ یہ گمان کر چکے ہیں کہ حشر و نشر نہیں ہے کہ اعمال پر جزا و سزا مرتب ہو لہٰذا یہ باعتبار معنی آیت کریمہ:-

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا (۲۹-۴) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے۔

کے مترادف ہوگا اور اگر مُعَجِّزِيْنَ پڑھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ آنحضرت کے متبعین کی طرف عجز کی نسبت کرتے ہیں جیسے جَهَّلْتُهٗ وَفَسَّقْتُهٗ کے معنی کسی کی طرف جہالت یا فسق کی نسبت کرنا کے ہوتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک مُعَجِّزِيْنَ بمعنی مُثَبِّطِيْنَ ہے یعنی لوگوں کو آنحضرت کی اتباع سے روکتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:-

اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۷-۴۵) جو خدا کی راہ سے روکتے رہیں۔

اور بڑھیا کو عَجُوْزٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اکثر امور سے عاجز ہو جاتی ہے۔

قرآن میں ہے:-

اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغَابِرِيْنَ (۲۶-۱۷۱) مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔

ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ (۱۱-۷۲) اے ہے میرے بچہ ہوگا؟ اور میں تو بڑھیا ہوں۔

---

[1] وفی الفائق (۲/۱۶۰)۔ العجز لهما والعجيزة للمرأة خاصة

(ع ج ف)

اَعْجَفُ (صفت) کے معنی انتہائی لاغر اور دبلا کے ہیں اس کی مؤنث عَجْفَاءُ ہے اور جمع عِجَافٌ قرآن میں ہے:۔
سَبْعٌ عِجَافٌ (۱۲-۴۳) سات دبلی۔
دراصل یہ نَصْلٌ اَعْجَفُ سے مشتق ہے جس کے معنی پتلے اور باریک تیر کے ہیں۔ اَعْجَفَ الرَّجُلُ اس کے مویشی دبلے ہو گئے۔
عَجَفَتْ نَفْسِیْ عَنِ الطَّعَامِ۔ میری طبیعت کھانے سے اچاٹ ہو گئی۔ عَنْ فُلَانٍ اس سے دل برداشتہ ہو گئی۔

(ع ج ل)

اَلْعَجَلَةُ۔ کسی چیز کو اس کے وقت سے پہلے ہی حاصل کرنے کی کوشش کرنا[1] اس کا تعلق چونکہ خواہش نفسانی سے ہوتا ہے اس لئے عام طور پر قرآن میں اس کی مذمت کی گئی ہے حتی کہ آنحضرت نے فرمایا (۲۹) اَلْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ کہ جلد بازی شیطان سے ہے، قرآن میں ہے:۔
سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ (۲۱-۳۷) میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا لہٰذا اس کے لئے جلدی نہ کرو۔
وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ (۲۰-۱۱۴) قرآن کی تلاوت کے لئے جلدی نہ کیا کرو۔
وَمَا اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ (۲۰-۸۳) تو تم نے اپنی قوم سے آگے چلے آنے میں کیوں جلدی کی۔ اور آیت کریمہ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى (۲۰-۸۴) اور تیری طرف آنے میں اس لئے جلدی کی کہ تم خوش ہو۔
میں موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی ہے کہ جلد بازی گو مذموم ہے مگر میں نے اچھے مقصد کے پیش نظر یہ اقدام کیا ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی کی طلب۔
اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (۱۶-۱) خدا کا حکم یعنی عذاب گویا آ ہی پہنچا تو کافرو اس کے لئے جلدی مت کرو۔
وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ (۱۳-۶) اور یہ تجھ سے برائی کے جلد خواستگار ہیں یعنی طالب عذاب۔
لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ (۲۷-۴۶) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لئے کیوں جلدی کرتے ہو۔
وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ (۲۲-۴۷) اور لوگ تم سے عذاب کے لئے جلدی کر رہے ہیں۔
وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ (۱۰-۱۱) اور اگر خدا لوگوں کی برائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلب خیر میں جلدی کرتے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (۲۱-۳۷) انسان جلد بازی ہی سے بنایا گیا ہے۔
میں بعض نے عَجَلٌ کے معنی مٹی کئے ہیں[2] مگر یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ اس سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جلد بازی انسان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:۔

---

[1] النعالق (۱:۷۶) رواه الترمذی عن سہل بن سعد و سہب من انس (کنز العمال ۳/۷۴ ۵-۵۸۴۸) وعن الحسن مرسلا لابن ابی الدنیا فی ذم الغضب والخرائطی فی مکارم الاخلاق (راجع احیاء العلوم بتخریج العراقی ۳/۱۶۲: ۳/۲۳۳) [2] نسبہ صاحب التاج الی ابن الاعرابی قال ابو عبیدۃ العجل بمعنی الحمأ فی لسان حمیر وقال الزمخشری واللہ اعلم بصحتہ باذا القول (۳/۱۱۷)

وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷-۱۱) انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (۱۷-۱۸) جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہشمند ہو تو ہم اس میں سے جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں۔

میں اَلْعَاجِلَةَ سے دنیوی ساز و سامان مراد ہے یعنی جو شخص دنیوی ساز و سامان چاہتا ہے اسے ہم جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔

عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸-۱۶) ہم کو ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔

فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ (۴۸-۲۰) سو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی۔

اَلْعُجَالَةُ کھانا جو اصل کھانے سے پہلے یوں ہی کھایا جائے جیسے لُهْنَةٌ اور عَجَلْتُهُمْ وَلَهَنْتُهُمْ کے معنی عُجَالَةٌ یا لُهْنَةٌ پیش کرنے کے ہیں۔

اَلْعَجَلَةُ چھوٹا سا لوٹا جو جلدی میں رفع حاجت کے وقت ساتھ لے جایا جاتا ہے اَلْعَجَلَةُ کوئیں کی گھرنی (چرخی) جس کے ذریعہ ڈول کھینچا جاتا ہے۔ اور بیل گاڑی کو بھی عَجَلَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سرعت سے چلتی ہے۔

اَلْعِجْلُ بچھڑے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں پھرتی پائی جاتی ہے جو بیل کی عمر تک پہنچنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

عِجْلًا جَسَدًا (۷-۱۴۸) ایک بچھڑا (بنا لیا) وہ ایک جسم تھا۔

اور وہ گائے جس کے ساتھ اس کا بچھڑا ہو اسے مُعْجِلٌ کہا جاتا ہے۔

(ع ج م)

اَلْعُجْمَةُ کے معنی ابہام اور خفا کے ہیں اور یہ اَلْاِبَانَةُ کی ضد ہے جس کے معنی واضح اور بیان کر دینا کے ہیں اور اِعْجَامٌ کے معنی ہیں مبہم کرنا اِسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ گھر سونا ہو گیا اور اس میں جواب دینے والا کوئی نہ رہا اسی بنا پر کسی عربی نے آباد شہروں سے کنایہ کرتے ہوئے کہا خَرَجْتُ عَنْ بِلَادٍ تَنْطِقُ میں شہروں سے نکلا جو آباد تھے اَلْعَجَمُ غیر عرب کو کہتے ہیں اور اَلْعَجَمِیُّ اس کی طرف منسوب ہے اَلْاَعْجَمُ وہ آدمی جس کی زبان فصیح نہ ہو خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ عرب لوگ عجمی کی گفتگو بہت کم سمجھتے تھے اور اَلْاَعْجَمِیُّ اسکی طرف منسوب ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ..... (۲۶-۱۹۸) اور اگر ہم اس کو غیر اہل زبان پر اتارتے۔ میں تخفیف کے لئے یا نسبت کو حذف کر دیا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ (۴۱-۴۴) اور اگر ہم اس قرآن کو غیر زبان (عربی) میں نازل کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیتیں (ہماری زبان میں) کیوں کھول کر بیان نہیں کی گئیں کیا (خوب کہ) قرآن تو عجمی اور مخاطب عربی۔

وَلِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ (۱۶-۱۰۳) مگر جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں اسکی زبان تو عجمی ہے

لہ کذا قال الفراء وقال ابو اسحاق وابن جنی وہذا ہو الصحیح۔

سی سے بَہِیمَۃٌ (چوپایہ) کو عَجْمَاءُ کہا جاتا ہے
کیونکہ وہ ناطق کی طرح الفاظ کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر
ادا نہیں کر سکتا۔
حدیث میں ہے۔ (۲) جُرْحُ الْعَجْمَاءِ جُبَارٌ
(چوپایہ اگر کسی کو زخمی کر دے تو مالک پر اس کی دیت
نہیں ہے) اور دن کی نماز کو عَجْمَاءُ کہا جاتا ہے
کیونکہ اس میں قرأت بالجہر نہیں ہوتی اَعْجَمْتُ الْکَلَامَ
میں نے بات مبہم رکھی یہ اَعْرَبْتُ کی ضد ہے کبھی
اَعْجَمْتُ الْکَلَامَ کے معنی کلام سے ابہام کو دور
کرنا بھی آجاتے ہیں[3] جیسا کہ اَشْکَیْتُہٗ (شکایت
زائل کرنا) خلیل سے مروی ہے کہ حروف مقطعہ کو
حروف معجمہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اعجمی یعنی گونگے ہوتے
ہیں بعض نے کہا ہے کہ خلیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ
حروف مفرد ہونے کی صورت میں ان معانی پر دلالت
نہیں کرتے جن پر کہ مرکب ہونے کی حالت میں دلالت
کرتے ہیں[3] بَابٌ مُعْجَمٌ بند دروازہ اَلْعَجَمُ
کھجور کی گٹھلی مفرد عَجَمَۃٌ اور گٹھلی کو عَجَمَۃٌ یا تو
اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گودا کے اندر مخفی ہوتی ہے
اور یا اس لئے کہ اس کا چبانا مشکل ہوتا ہے اور یا اس
لئے کہ کھاتے وقت اسے بھی منہ میں ڈال لیا جاتا
ہے۔ اور وہ منہ میں مخفی ہو جاتی ہے اور اَلْعَجْمُ
کے معنی چبانے کے ہیں محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ صُلْبُ الْعَجْمِ یعنی وہ آزمائش میں سخت ہے۔

(ع د د)

اَلْعَدَدُ (گنتی) آحاد مرکبہ کو کہتے ہیں اور بعض
نے اس کے معنی ترکیب آحاد یعنی آحاد کو ترکیب
دینا بھی کئے ہیں مگر ان دونوں معنی کا مرجع ایک ہی
ہے۔ قرآن میں ہے:۔
عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ (۱۰-۵)...... برسوں
کا شمار اور (کاموں) کا حساب ...... اور آیت کریمہ:۔
فَضَرَبْنَا عَلٰۤی اٰذَانِہِمْ فِی الْکَہْفِ سِنِیْنَ
عَدَدًا۔ (۱۸-۱۱) ہم نے غار میں کئی سال تک
ان کے کان پر (نیند کا) پردہ ڈالے (یعنی ان کو
سلائے) رکھا۔
کے لفظ سے کثرت تعداد کی طرف اشارہ ہے۔
اَلْعَدُّ کے معنی گنتی اور شمار کرنے کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
لَقَدْ اَحْصٰہُمْ وَعَدَّہُمْ عَدًّا (۱۹-۹۴) اس
نے ان سب کا اپنے علم سے احاطہ اور ایک ایک
کو شمار کر رکھا ہے۔ اور آیت:۔
فَاسْئَلِ الْعَادِّیْنَ (۲۳-۱۱۳) کے معنی یہ ہیں
کہ حساب والوں سے پوچھ دیکھو۔
کَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِیْنَ (۲۳-۱۱۲)
زمین میں کتنے برس رہے۔
وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا
تَعُدُّوْنَ (۲۲-۴۷) بے شک تمہارے پروردگار
کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کی رو سے
ہزار برس کے برابر ہے۔
اور مجازاً عَدٌّ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا
ہے (۱) شَیْءٌ مَعْدُوْدٌ اَوْ مَحْصُوْرٌ تھوڑی
سی چیز اس صورت میں یہ اس چیز کے مقابلہ میں
استعمال ہوتا ہے جو بے شمار ہو جس کی طرف قرآن
نے بغیر حساب کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

---

[1] والفظ: والعجماء جرحها جبار فی حدیث طویل (مسلم، وابوعوانہ) طب۔ عن عبادۃ بن الصامت والفائق ۲/۵۹ واللسان والنہایۃ (عجم)۔ [2] ای تکون الہمزۃ فیہ للسلب کما قال ابن جنی وقال فی المحکم لیدا اسد واصوب [3] وانظر بحث حروف المعجم المحکم لابن سیدہ ۱/۲۰۷-۲۰۹

الا ایاما معدودۃ (۲-۸۰) چند روز کے سوا۔۔۔۔
میں معدودۃ کے معنی چند دنوں کے ہیں کیونکہ
یہود یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں تو صرف چند دن عذاب
ہوگا جتنے دن کہ ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔
اور کبھی اس کے برعکس کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا
ہے جیسے جیش عدید کثیر تعداد لشکر انھم
لذو عدد وہ بے شمار ہیں اس کے بالمقابل
قلیل چیز کو جسے گننے کی ضرورت نہ ہو شیئ غیر
معدود کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
فی الکھف سنین عددا (۱۸-۱۱) غار میں کئی سال
میں عددا کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں اور اسی
سے ھذا غیر معتد بہ کا محاورہ ہے یعنی یہ چیز
شمار کے قابل نہایت حقیر ہے ولہ عدۃ
اس کے پاس مال و دولت اور اسلحہ وغیرہ بہت
سا ساز و سامان تیار رکھا ہے قرآن میں ہے:۔
لاعدوا لہ عدۃ (۹-۴۶) تو اس کیلئے سامان
تیار کرتے۔
اور ماء عد[۱] کے معنی بہت زیادہ پانی کے ہیں
جس کا ذخیرہ نہ ہو اور العدۃ شمار کی ہوئی چیز۔
قرآن میں ہے:۔
وما جعلنا عدتھم (۷۴-۳۱) اور ان کا شمار
مقرر نہیں کیا۔
فعدۃ من ایام اخر (۲-۱۸۴) تو دوسرے
دنوں میں رکھ کر ان کا شمار پورا کرے۔
یعنی جتنے دن ماہ رمضان سے فوت ہو گئے ہوں
ان کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھ لے۔
ان عدۃ الشھور (۹-۳۶) (خدا کے نزدیک)
مہینے گنتی میں۔۔۔۔۔۔

اور العدۃ کا لفظ عورت کی عدت پر بھی بولا
جاتا ہے یعنی وہ مدت جس کے اندر عورت دوسری
جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔ قرآن میں ہے:۔
فما لکم علیھن من عدۃ تعتدونھا (۳۳-۴۹)
تو تم کو کچھ اختیار نہیں کہ ان سے عدت پوری کراؤ۔
فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ (۶۵-۱)
تو ان کو عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت
کا شمار رکھو۔
الاعداد تیار کرنا، مہیا کرنا۔ یہ عد سے ہے جیسے
سقی سے اسقاء اور اعددت ھذا لک کے
معنی ہیں کہ یہ چیز میں نے تمہارے لئے تیار کر دی
ہے کہ تم اسے شمار کر سکتے ہو اور جس قدر چاہو
اس سے حسب ضرورت لے سکتے ہو۔ قرآن
میں ہے:۔
واعدوا لھم ما استطعتم (۸-۶۰) اور
جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت سے)۔۔۔
ان کے (مقابلے کے) لئے مستعد رہو۔
اعدت للکفرین (۲-۲۴) (اور جو) کافروں
کے لئے تیار کی گئی ہے۔
واعد لھم جنت (۹-۱۰۰) اور اس نے ان
کے لئے باغات تیار کئے ہیں۔
اولئک اعتدنا لھم عذابا الیما (۴-۱۸)
ایسے لوگوں کے لئے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے
واعتدنا لمن کذب (۲۵-۱۱) اور ہم نے
۔۔۔۔۔ جھٹلانے والوں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی
ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
واعتدت لھن متکاء (۱۲-۳۱) اور ان کے
لئے ایک محفل مرتب کی۔

[۱] وفی الحدیث قال (صلی اللہ علیہ وسلم) قیل یا رسول اللہ انما اقطعت لہ الماء العد فی قصۃ استقطاع ابیض بن حمال المازنی انظر الفائق (۲/۱۴۱)

میں بعض نے کہا ہے۔ کہ اَعْتَدَتْ بھی اسی (عَدٌّ) سے ہے اور آیت کریمہ :۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (۲-۱۸۵) تم روزوں کا شمار پورا کر لو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ماہ رمضان کی گنتی پوری کر لو۔

اور اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ (۲-۱۸۴) گنتی کے چند روز...... میں ماہ رمضان کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ (۲-۲۰۳) اور گنتی کے دنوں میں خدا کو یاد کرو۔

میں اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ سے عید قربان کے بعد کے تین دن مراد ہیں اور معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ سے یوم النحر اور اس کے بعد کے دو دن مراد ہیں اس صورت میں "یَوْمُ النَّحْرِ" بھی ان تین دنوں میں شامل ہوگا۔

اَلْعِدَادُ اس مقررہ وقت کو کہتے ہیں جس میں بیماری کا دورہ پڑتا ہو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا (۱۳)

مَا زَالَتْ اُكْلَةُ خَيْبَرَ تُعَادُّنِيْ کہ خیبر کے دن جو مسموم کھانا میں نے کھایا تھا اس کی زہر بار بار عود کرتی رہی ہے عِدَّانُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کے موسم یا زمانہ کے ہیں۔

(ع د س)

اَلْعَدَسُ مسور کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا (۲-۶۱) اور مسور اور پیاز۔

اور عَدَسَةٌ ایک قسم کی پھنسی ہے جو مسور کی شکل پر ہوتی ہے اور عَدَسْ (اسم صوت) خچر وغیرہ کو ہانکنے کی آواز کو کہتے ہیں اسی سے عَدَسَ فِي الْاَرْضِ وَهُوَ عَدُوْسٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں جانے کے ہیں۔

(ع د ل)

اَلْعَدَالَةُ وَالْمُعَادَلَةُ کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں اور معنی اضافی کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے یعنی ایک دوسرے کے ہم وزن اور برابر ہوتا اور عَدْلٌ وَعِدْلٌ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن عَدْلٌ کا لفظ معنوی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے احکام شرعیہ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا :۔

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا یا اس کے برابر روزے رکھنا (۵-۹۵)

اور عِدْلٌ وَعَدِيْلٌ کے الفاظ ان چیزوں کے لئے بولے جاتے ہیں جن کا ادراک حواس ظاہرہ سے ہوتا ہے جیسے وہ چیزیں جن کا تعلق

لہ وتمام الحدیث فہذا اوان قطعت ابھری (غریب ابی عبید ۱/۴۳) والحدیث رواہ البزار وابونعیم فی الطب وابن عدی فی الکامل من حدیث ابی ہریرۃ والحاکم وابوداؤد ومرسلاً والطبری من حدیث بریدۃ وفیہ سمت لہ امرأۃ یہودیۃ بخیبر والحدیث باختلاف الفاظ فی الطبرانی والدلائل لابی نعیم والطبقات لابن سعد والبیہقی فی دلائلہ والدارقطنی والکاف الشاف لابن حجر ص ۸) وایضاً مشکل القرآن للقتیبی ۱۸ والفائق (۱/۳۸) واللسان (عدد) والاضداد لابن الانباری ۹۰ والمخصص ۵/۸۸ وتاویل مختلف الحدیث والروض للسہیلی قالہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی مات فیہ والحدیث یدل علی انہ مات شہیداً۔ والحدیث فی النہایۃ ۳/۱۵) وفیہ تعاودنی بدل تعادنی ۱۲

اپ تول یا وزن سے ہوتا ہے پس عَدْلٌ کے معنی دو چیزوں کا برابر ہونا کے ہیں۔ چنانچہ اسی معنی میں مروی ہے (۳۷) بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (کہ عدل ہی سے آسمان و زمین قائم ہیں) یعنی اگر عناصر اربعہ جن سے کائنات نے ترکیب پائی ہے میں سے ایک عنصر میں بھی اس کی معینہ مقدار سے کمی یا بیشی ہو جائے تو نظام کائنات قائم نہیں رہ سکتا۔

اَلْعَدْلُ۔ دو قسم پر ہے اول عدل مطلق جو عقلاً مستحسن ہوتا ہے یہ نہ تو کسی زمانہ میں منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی کسی اعتبار سے تعدی کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے مثلاً کسی کے احسان کے بدلہ میں اس پر احسان کرنا اور جو تمہیں تکلیف نہ دے اسے ایذا رسانی سے باز رہنا وغیرہ۔

دوم عدل شرعی جسے شریعت نے عدل کہا ہے اور یہ منسوخ بھی ہو سکتا ہے جیسے قِصَاص، جنایات کی دیت اور مال مرتد کی اصل وغیرہ چنانچہ آیات:۔ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (۲-۱۹۴) پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے۔ ویسی ہی تم اس پر کرو۔ وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲-۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔

میں زیادتی اور برائی کی سزا کا کام بھی زیادتی اور برائی ہی قرار دیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶-۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا ۔ ۔ ۔ ۔ حکم دیتا ہے۔

میں عدل کے یہی معنی مراد ہیں کیونکہ کسی چیز کے برابر اس کا بدلہ دینے کا نام عَدْلٌ ہے یعنی نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے اور نیکی کے مقابلہ میں زیادہ نیکی اور شر کے مقابلہ میں مسامحت سے کام لینے کا نام احسان ہے اور لفظ عدل واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے رَجُلٌ عَدْلٌ عَادِلٌ وَرِجَالٌ عَدْلٌ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۰۲) فَهُمْ رِضًا وَهُمْ عَدْلٌ

وہ راضی رہنے والے اور عادل ہیں۔

در اصل عَدْلٌ کا لفظ مصدر ہے چنانچہ آیت:۔ وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (۶۵-۲) اور اپنے میں سے دو منصف مردوں کو گواہ بنا لو۔ میں عَدْلٌ کے معنی عَدَالَةٌ ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (۴۲-۱۵) اور مجھے حکم ہوا کہ تم میں انصاف کروں۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا (۵-۸) ۔ ۔ ۔ ۔ اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر

[1] قطعة من بیت لزہیر فی قصیدة له فی مدح ہرم بن سنان والحارث بن عوف المریین والقصیدة فی دیوانه ۹۷-۱۱۵ و تکملة البیت بمثلی یشتجر قوم یقل سرواتهم - هم بیننا . . . والبیت فی دیوانه ۱۰۷ والاضداد للسجستانی ۵۷ ومجاز القرآن ۱/۷ رقم ۲۰۹ ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۶۱) والعقد الثمین ۹۰ وشرح السبع لابن الانباری ۲۸۷ واضداد ابی الطیب ۴۸۲ قال وہذا ای اطلاق المصدر علی الواحد والجمع مشہور فی المصادر خاصة ۱۲

امادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو۔

اور آیت کریمہ :۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْآ اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ (۴-۱۲۹) اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کر سکو گے۔

میں انسان کے طبعی میلان کی طرف اشارہ ہے کہ تمام بیویوں سے برابر درجہ کی محبت اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴-۳) اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت کافی ہے۔

میں عدل سے نان و نفقہ اور ازدواجی تعلقات میں برابری مراد ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (۵-۹۵) اس کے برابر روزے رکھنا۔

میں عَدْل سے مراد یہ ہے کہ وہ روزے طعام سے فدیہ کے برابر ہوں کیونکہ فدیہ میں مساوات کے معنی ملحوظ ہوں تو اسے بھی عَدْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ اور (۳۳) لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَّلَا عَدْلٌ[1]۔ میں بعض نے کہا ہے کہ عَدْلٌ کا لفظ فریضہ سے کنایہ ہے مگر اس کے اصل معنی وہی ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں اور صَرْفٌ کا لفظ نافِلَةٌ سے اور یہ اصل فرض سے بڑھ کر کام کرنے کا نام ہے لہذا یہ باہم تقابل کے اعتبار سے عدل اور احسان کے ہم مثل ہیں اور لَا يُقْبَلُ مِنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ اسکے پاس کسی قسم کی نیکی نہیں ہوگی جو قبول کی جائے اور آیت :۔

بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (۶-۱۵۰) کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوسروں کو خدا کی مثل اور نظیر قرار دیتے ہیں۔

لہذا یہ آیت :۔

وَهُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ (۱۶-۱۰۰) کے ہم معنی ہوگی بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ وہ افعال الہیہ کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں بعض نے اللہ تعالےٰ کی عبادت سے عدول کرنا مراد لیا ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ (۲۷-۶۰) بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

بھی اسی معنی پر محمول ہو سکتی ہے یعنی اس کے معنی يَعْدِلُوْنَ بِهٖ کے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عَدَلَ عَنِ الْحَقِّ سے مشتق ہو جس کے معنی حق سے ہٹ جانا کے ہیں۔

اَيَّامٌ مُعْتَدِلَاتٌ معتدل زمانہ یعنی جب رات دن برابر ہوتے ہیں۔

عَادَلَ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ اس نے دو چیزوں کے درمیان موازنہ کیا عَادَلَ الْاَمْرَ کسی معاملہ میں پھنس گیا اور کسی ایک جانب فیصلہ نہ کر سکا اور جب کسی شخص کی زندگی سے مایوسی ہو جائے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے :۔

وُضِعَ عَلٰى يَدَىْ عَدْلٍ یعنی اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا[2]۔

---

[1] متفق علیہ من حدیث علی رضی و فی مسند عبدالرزاق العمل الفریضۃ و من حدیث انس و ابی ہریرۃ رواہ مسلم والبخاری و فی ابی داؤد من حدیث ابی ہریرۃ راجع الانصاف ، و النہایہ ۲/۰۰۶ ۳ و الغریب للقتبی ۱۱ ۳۱ [2] قال ابن الکلبی ہو العدل بن جزر بن سعد العشیرۃ وکان ولی شرط تبع وکان تبع اذا اراد قتل رجل دفعہ الیہ فقال الناس "وضع علی یدی عدل" ثم قیل لکل شی قد یئس منہ انظر للکلمۃ ادب الکاتب ۳۴ و اساس البلاغۃ و اللسان (عدل) و المیدانی ۰۰ ۴ ۲ ؛ ؛

(ع د ن)

عَدْنٌ (ن ض) کے معنی کسی جگہ قرار پکڑنے اور ٹھہرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔
عَدَنَ بِمَکَانِ کَذَا یعنی اس نے فلاں جگہ قیام کیا۔ قرآن میں ہے:۔
جَنّٰتُ عَدْنٍ (۱۳-۲۴) یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات۔
اسی سے اَلْمَعْدِنُ (کان) ہے کیونکہ کان بھی جواہرات کے ٹھہرنے اور پلنے بڑھنے کی جگہ ہوتی ہے حدیث میں ہے[1] (۳۴) اَلْمَعْدِنُ جُبَارٌ کہ اگر کوئی شخص کان میں گر کر مر جائے تو کان کن پر اس کی دیت نہیں ہے۔

(ع د و)

اَلْعَدْوُ کے معنی حد سے بڑھنے اور باہم ہم آہنگی نہ ہونا ہیں اگر اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہو تو یہ عَدَاوَۃٌ اور مُعَادَاۃٌ کہلاتی ہے اور اگر رفتار سے ہو تو اسے عَدْوٌ کہا جاتا ہے اور اگر عدل و انصاف میں خلل اندازی کی صورت میں ہو تو اسے عُدْوَانٌ اور عَدْوٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (۶-۱۰۸) کہ یہ بھی کہیں خدا کو بے ادبی سے بے سمجھے برا نہ کہہ بیٹھیں۔
اور اگر اس کا تعلق کسی جگہ کے اجزاء کے ساتھ ہو تو اسے عَدْوَاءُ کہہ دیتے ہیں جیسے مَکَانٌ ذُوْعَدْوَاءَ ناہموار مقام چنانچہ مُعَادَاۃٌ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے رَجُلٌ عَدُوٌّ وَقَوْمٌ عَدُوٌّ اور یہ واحد جمع دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۷-۲۴) اب سے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔
مگر کبھی اس کی جمع عِدًی وَاَعْدَاءٌ بنا لیتے ہیں قرآن میں ہے:۔
یَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَاءُ اللّٰهِ (۴۱-۱۹) جس روز خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے۔
اَلْعَدُوُّ دو قسم پر ہے ایک دشمن تو وہ ہوتا ہے جو قصد و ارادہ سے دشمنی کرتا ہے جیسے فرمایا۔
وَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّکُمْ ...... (۴-۹۲) اور اگر مقتول تمہارے دشمنوں کی جماعت سے ہو۔
جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ .... (۲۵-۳۱) ہم نے گنہگاروں میں سے ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا۔
اور دوسری آیت میں ہے:۔
عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (۶-۱۱۲) شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔
اور دوسرا دشمن وہ ہے جو قصد و ارادہ سے تو دشمنی نہیں کرتا لیکن اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جس سے انسان کو ایسے ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے دشمن سے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۶-۷۷) وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست ہے)
اور انسان کی اولاد کے متعلق فرمایا۔

---

[1] راجع لتخریج الحدیث (ع ج م)

عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ .... (۶۴-۱۴)
تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔
اور عَدْوٌ (دوڑنا) کے متعلق شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)
(۳۰) فَعَادٰی عِدَاءً بَیْنَ ثَوْرٍ وَّنَعْجَةٍ
اس نے ایک ہی دوڑ میں وحشی بیل اور نیل گائے کا شکار کرلیا۔

تَعَادَتِ الْمَوَاشِیْ مویشی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑے رَأَیْتُ عِدَاءَ الْقَوْمِ میں نے لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں دوڑتے ہوئے دیکھا۔

اَلْاِعْتِدَاءُ کے معنی حق سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا (۲-۲۳۱)
اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رہنے دینا چاہیے کہ انہیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔
وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ (۴-۱۴) اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کریگا اور اس کی مقررہ کردہ حدود سے آگے بڑھے گا۔
اِعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ (۲-۶۵) جو تم میں سے ہفتے کے دن میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔
یعنی انہوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار حلال سمجھ کر حد سے تجاوز کیا۔
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (۲-۲۲۹)
یہ خدا کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلو۔
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۲۳-۷) وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانیوالے ہیں۔
فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ (۲-۱۷۸) جس نے اس کے بعد زیادتی کی .... اور آیت کریمہ:
بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ (۲۶-۱۶۶)
میں عٰدُوْنَ کے معنی ہیں (۱) حد سے تجاوز کرنے والے اور یا (۲) دشمنی رکھنے والے اور یا (۳) اپنے مرتبہ سے تجاوز کرنے والے اس تیسری صورت میں یہ عَدَا طَوْرَهٗ (اس نے اپنے مرتبہ سے تجاوز کیا) کے محاورہ سے مشتق ہوگا۔ اور آیت کریمہ:
وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۲-۱۹۰) مگر زیادتی نہ کرنا کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔
میں ابتداءً ظلم وزیادتی کرنا مراد ہے نہ کہ کسی سے بدلہ لینے میں حد سے تجاوز کرنا۔ جس کا ذکر کہ آیت کریمہ:
فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ (۲-۱۹۴)
پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔

---

[1] قاله امرؤ القیس وآخره :- دراکا ولم ینضح بماء فیغسل - ای انه ادرکهما سریعًا وعقرهما قبل ان یعرق والبیت فی اللسان (عدو) ودیوانه ۱۰۳ (صنعة السندوبی) ومختار الشعر الجاهلی ۱۳ والبیت من ابیات المعانی راجع المعانی للقتبی (۱۲-۱۳) وفی مختار الشعر الجاهلی واللسان ایضًا العلقمة فی بائیته راجع دیوانه ۶۶ وتمامه : وبین شبوب کالهشیمة قریب وفی روایة وبین شبوب کالقضیمة .. ولسبه فی المحکم (عدی) الی امرئ القیس وهو الصحیح والبیت ایضًا فی ابن ولاد ۸۳ وشرح المقصورة الدریدیة فی مجموعة لامیتا العرب ۸۲ والجمهرة ۲۰ والعقد الثمین ۹۴ والسیوطی ۴۳ والقالی (۲: ۲۲۶) شرح السبع لابن الانباری ۹۶ ویروی ایضًا فعادیت منه ... وکان عدائی ان رکبت علی بالی - وفیه صنعة التبلیغ انظر التبریزی علی العشر ۴۶ ؛ ؛

میں پایا جاتا ہے یعنی اس کی زیادتی کے مطابق بدلہ دو اور ظلم و زیادتی میں پہل کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا:۔
وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵-۲) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔
اور عدوان یعنی زیادتی کا بدلہ لینے کو بھی قرآن نے عدوان کہا ہے حالانکہ یہ جائز ہے جیسے فرمایا:۔
فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِیْنَ (۲-۱۹۳) تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔
وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا (۴-۳۰) اور جو تعدی اور ظلم سے ایسا کرے گا ہم اس کو عنقریب جہنم میں داخل کریں گے۔ اور آیت کریمہ:۔
فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (۲-۱۷۳) ہاں جو ناچار ہو جائے بشرطیکہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد ضرورت سے باہر نہ نکل جائے۔
میں بَاغٍ سے وہ شخص مراد ہے جو لذت اندوزی کے لئے مردار کا گوشت کھانے کی خواہش کرتا ہے اور عَادٍ سے مراد وہ شخص ہے جو قدر کفایت سے تجاوز کرتا ہے بعض نے بَاغٍ کے معنی خلیفہ وقت کا باغی اور عَادٍ سے وہ شخص مراد لیا ہے جو عجز و نیاز کرنے والوں کے طریق سے تجاوز کرنے والا ہو[۱] اور یہ عَدَی طَوْرَهٗ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اپنے رتبہ سے تجاوز کرنے والا اور اسی سے تَعْدِیَةٌ فِی الْفِعْلِ ہے اور علم نحو میں فعل کے تَعْدِیَة سے مراد ہوتا ہے فعل کا اپنے فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچ جانا اور مَا عَدَا کا لفظ استثنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى (۸-۴۲) جس وقت تم (مدینے سے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔
میں عُدْوَةُ الدُّنْیَا سے مدینہ کی جانب کا کنارہ مراد ہے جو حد قریب سے کچھ دور تھا۔

(ع ذ ب)

مَاءٌ عَذْبٌ کے معنی خوش گوار اور ٹھنڈا پانی کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ (۲۵-۵۳) ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار ہے۔
اَعْذَبَ الْقَوْمُ لوگوں کو شیریں پانی ملنے لگا۔
اَلْعَذَابُ سخت تکلیف دینا عَذَّبَهٗ تَعْذِیْبًا اسے عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رکھا۔ قرآن میں ہے:۔
لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا (۲۷-۲۱) میں اسے سخت سزا دوں گا۔
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انہیں عذاب دے (۸-۳۳) یعنی بذریعہ عذاب کے ان کا استیصال نہیں کرے گا۔ اور آیت کریمہ:۔
وَمَا لَهُمْ اَلَّا یُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ (۸-۳۴) اور

---

[۱] ذکرہ ابوحیان فی بحرہ (۲/۴۸۱-۴۸۴) تسعۃ اقوال فی تفسیر الآیۃ والسید المرتضٰی فی امالیہ (۱: ۲۱۵-۲۱۹) خمسۃ اقوال ورجح الطبری القول الثانی (۲: ۳۱۳)

اب ان کے لئے کون سی وجہ ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اب انہیں نہ تمتع کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اور فرمایا:۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ (۱۷-۱۵) اور ہم ...... عذاب نہیں دیا کرتے۔

وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۲۶-۱۳۸) اور ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۳۷-۱۰) اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲-۱۰) اور ...... ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔

وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (۱۵-۵۰) اور یہ کہ میرا عذاب بھی درد دینے والا عذاب ہے۔

لفظ عَذَابٌ کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عَذَبَ (ض) الرَّجُلُ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی اس نے (پیاس کی شدت کی وجہ سے) کھانا اور نیند چھوڑ دی اور جو شخص اس طرح کھانا اور سونا چھوڑ دیتا ہے اسے عَاذِبٌ وَعَذُوْبٌ کہا جاتا ہے لہٰذا التَّعْذِيْبُ کے اصلی معنی ہیں کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر اکسانا اور بعض کے نزدیک یہ عَذْبٌ (شیریں) سے مشتق ہے لہٰذا عَذَّبْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے زندگی کی لذت اور خوشگواریوں سے محروم کردیا جیسا کہ مَرَّضْتُهٗ (میں نے اس سے مرض کو دور کیا) اور قَذَّيْتُهٗ (میں نے اس کی آنکھ سے تنکا نکالا)۔

بعض نے کہا ہے کہ دراصل اَلتَّعْذِيْبُ کے معنی ہیں کسی کو کوڑے کے عَذَبَه یعنی سرکے ساتھ متواتر مارنا۔ چنانچہ بعض علمائے لغت نے تَعْذِيْبٌ کے معنی ہی مارنا لکھے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مَاءٌ عَذَبٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی مکدر پانی جس کے اوپر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہو اس بنا پر عَذَّبْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کی زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کردیا اس سے زندگی کی راحت دور کردی عَذَبَةُ السَّوْطِ کوڑے کا سرا۔ عَذَبَةُ اللِّسَانِ زبان کا سرا عَذَبَةُ الشَّجَرِ درخت کا سرا۔

(ع ذ ر)

اَلْعُذْرُ ایسی کوشش جس سے انسان اپنے گناہوں کو مٹا دینا چاہے اس میں اَلْعُذُرُ اور اَلْعُذْرُ دو لغت ہیں اور عُذْرٌ کی تین صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ کسی جرم کے ارتکاب سے قطعًا انکار کردے دوم یہ کہ ارتکاب جرم کی ایسی وجہ بیان کرے جس سے اس کی براءت ثابت ہوتی ہو۔ سوم یہ کہ اقرار جرم کے بعد آئندہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرنے کا وعدہ کرلے عذر کی اس تیسری صورت کا نام توبہ ہے جس سے ثابت ہوا کہ توبہ عذر کی ایک قسم ہے لہٰذا ہر توبہ کو عُذْرٌ کہہ سکتے ہیں مگر ہر عذر کو توبہ نہیں کہہ سکتے اِعْتَذَرْتُ اِلَيْهِ میں نے اس کے سامنے عذر بیان کیا عَذَرْتُهٗ میں نے اس کا عذر قبول کرلیا۔ قرآن میں ہے:۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ (۹-۹۴) تو تم سے عذر کریں گے۔

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا (۹-۹۴) ان سے کہہ دو کہ عذر مت کرو۔

اَلْمُعْذِرُ جو اپنے آپ کو معذور سمجھے مگر در اصل وہ معذور نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَجَاۤءَ الْمُعَذِّرُوْنَ (۹-۹۰) عذر کرتے ہوئے (تمہارے پاس آئے)۔

ایک قرأت میں مُعْذِرُوْنَ ہے یعنی عذر پیش کرنے والے۔ ابن عباسؓ کا قول ہے:۔

لَعَنَ اللّٰهُ الْمُعْذِرِيْنَ وَرَحِمَ الْمُعَذِّرِيْنَ یعنی جھوٹے عذر پیش کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہو اور جو واقعی معذور ہیں ان پر رحم فرمائے اور آیت کریمہ:۔

مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ (۷-۱۶۴) تمہارے پروردگار کے سامنے معذرت کر سکیں۔

میں مَعْذِرَةٌ عَذَرْتُ کا مصدر ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا عذر قبول فرمائے اَعْذَرَ اس نے عذر خواہی کی اپنے آپ کو معذور ثابت کر دیا۔ کہا گیا ہے[۱] اَعْذَرَ مَنْ اَنْذَرَ یعنی جس نے ڈر سنا دیا وہ معذور ہے بعض نے کہا ہے کہ عُذْرٌ اصل میں عَذِرَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نجاست اور گندگی کے ہیں[۲] اور اسی سے جو چیز اختنہ میں کاٹا جاتا ہے اسے عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے[۳] اور عَذَرْتُ الصَّبِيَّ کے معنی ہیں میں نے لڑکے کا ختنہ کر دیا گویا اسے ختنہ کی نجاست سے پاک کر دیا اسی طرح عَذَرْتُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں نے اسے معاف دے کر اس سے گناہ کی نجاست کو دور کر دیا جیسا کہ غَفَرْتُ لَهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کا گناہ چھپا دیا اور لڑکے کے ختنہ کے ساتھ تشبیہ دے کر لڑکی کے پردہ بکارت کو بھی عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے اور عَذَرْتُهَا کے معنی ہیں میں نے اس کے پردہ بکارت کو زائل کر دیا اور بچے کے حلق کے درد کو بھی عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے اسی سے عُذِرَ الصَّبِيُّ ہے جس کے معنی بچہ کے درد حلق میں مبتلا ہونے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[۴] ( )

(۳۰۵) غَمْزَ الطَّبِيْبِ نَغَانِغَ الْمَعْذُوْرِ

جیسا کہ طبیب درد حلق میں مبتلا بچے کا گلا دباتا ہے۔ اور مُعْتَذِرٌ عذر خواہی کرنے والے کی مناسبت سے اِعْتَذَرَتِ الْمِيَاهُ پانی کے سرچشمے منقطع ہو گئے اور اِعْتَذَرَتِ الْمَنَازِلُ (مکانوں کے نشانات مٹ گئے۔ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں اور عَذِرَةٌ (یعنی نجاست کے اعتبار) سے کہا جاتا ہے۔

اَلْعَاذِرُ وہ عورت جسے استحاضہ کا خون آ رہا ہو عَذَوَّرٌ۔ بد خلق آدمی در اصل عَذِرَةٌ کے معنی مکانات کے سامنے کا کھلا میدان ہیں اس کے بعد اس نجاست کو عَذِرَةٌ کہنے لگے ہیں جو اس میدان میں پھینکی جاتی ہے۔

(ع ر ر)

اَلْمُعْتَرُّ وہ ہے جو کچھ لینے کے لئے تمہارے سامنے آئے قرآن میں ہے:۔

وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (۲۲-۳۶) اور

---

[۱] انظر للکلمۃ المیدانی رقم ۲۴۹۶ [۲] ومنہ قیل للفنا ر العذرۃ لالقاء النجاسۃ فیہا وفی الحدیث: مالکم لا تنظفون فدائکم وفی الحدیث ایضا الیھود انتن خلق اللہ فدہ الفائق (۱۴/۲) [۳] وفی الحدیث ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معذورا قال فی الفائق (۲/۱۳) ای مسرورا ای قطعت سرتہ [۴] قالہ جریر وصدرہ: غمز ابن مرۃ یا فرزدق کینہا۔ والبیت فی جل المعاجم (عذر۔ کین، نغغ) ودیوانہ ۳۸۴ والاقتضاب ۴۱۳ والاشتقاق ۵۳۹ والخزانۃ (۱: ۴۸۱) وفی المطبوع نغانع (بالمہملۃ) مصحف ۱۲ ✣

قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

عَرَّہٗ یَعُرُّہٗ کے معنی ہیں بخشش طلب کرنے کے لئے کسی کے سامنے آنا۔

اِعْتَرَرْتُ بِكَ حَاجَتِیْ میں نے اپنی ضرورت تمہارے سامنے پیش کی۔ اَلْعَرُّ وَالْعُرُّ خارش کی بیماری کو کہتے ہیں جو بدن کو عارض ہو جاتی ہے اس مناسبت سے مَعَرَّۃٌ کا لفظ ہر قسم کی مضرت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔

فَتُصِیْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ (٢٦-٤٨) مبادا انہیں ان کی طرف سے بے خبری میں کوئی نقصان پہنچ جائے۔

اَلْعِرَارُ اس سنسناہٹ کو کہتے ہیں جو تیز ہوا کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے پھر تشبیہاً نر شتر مرغ کی آواز کو بھی عِرَارٌ کہا جاتا ہے عَارَ الظَّلِیْمُ شتر مرغ نے آواز کی۔ اَلْعَرْعَرُ (شمشاد کی قسم کا) ایک درخت جو ہوا کے چلنے سے گونجتا ہے عَرْعَارِ ایک قسم کا بچوں کا کھیل (جس میں وہ یہ کلمہ بولتے ہیں تاکہ دوسرے بچے اپنے چھپنے کی جگہ سے باہر نکل آئیں)۔

(ع ر ب)

اَلْعَرَبُ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کو کہتے ہیں اَلْاَعْرَابُ دراصل یہ عَرَبٌ کی جمع ہے مگر یہ لفظ بادیہ نشین لوگوں کے ساتھ مختص ہو چکا ہے قرآن میں ہے :۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (١٤-٤٩) بادیہ نشین نے آکر کہا ہم ایمان لے آئے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا (٩٧-٩) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (٩٩-٩) اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ خدا پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اَعْرَابٌ کی جمع اَعَارِیْبُ آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(٣٠٧) اَعَارِیْبُ ذَوُوْ فَخْرٍ بِاِفْكٍ
وَاَلْسِنَةٍ لِطَافٍ فِی الْمَقَالِ

اعرابی جو جھوٹے فخر کے مدعی ہیں اور گفتگو میں نرم زبان رکھتے ہیں۔

اَلْاَعْرَابِیُّ یہ اَعْرَابٌ کا مفرد ہے اور عرف میں بادیہ نشین پر بولا جاتا ہے اَلْعَرَبِیُّ فصیح فصاحت سے بیان کرنے والا اَلْاِعْرَابُ کسی بات کو واضح کر دینا۔ اَعْرَبَ عَنْ نَفْسِهٖ اس نے بات کو وضاحت سے بیان کر دیا حدیث میں ہے[2] (٣٥)

اَلثَّیِّبُ تُعْرِبُ عَنْ نَفْسِهَا کہ ثیب اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کر سکتی ہے۔

اِعْرَابُ الْكَلَامِ کلام کی فصاحت کو واضح کرنا علمائے نحو کی اصطلاح میں اِعْرَابٌ کا لفظ ان حرکات و سکنات پر بولا جاتا ہے جو کلموں کے آخر میں یکے بعد دیگرے حسب عوامل بدلتے رہتے ہیں۔ اَلْعَرَبِیُّ واضح اور فصیح کلام کو کہتے ہیں چنانچہ فرمایا :۔

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا (٢-١٢) واضح اور فصیح قرآن نازل کیا۔

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ (١٩٥-٢٦) فصیح

---

[1] البیت فی الحماسۃ مع آخر بغیر عزو راجع المرزوقی ٦٤٨ [2] انظر للحدیث الفائق (٢: ٦٥) بتخفیف الراء و تشدیدہا راجع غریب ابی عبید (١: ١٦٢-١٦٣) وفی درجہ) فی النکاح والحاکم ٤/ ١٩٢

عربی زبان میں ۔۔۔۔۔۔۔۔
فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا (۴۱-۳) جس کی آیات کھول کھول کر بیان کردی گئی ہیں یعنی فصیح قرآن۔
مَا بِالدَّارِ عَرِیْبٌ گھر میں کوئی نہیں ہے اَمْرَأَۃٌ عَرُوْبَۃٌ وہ عورت جو اپنے خاوند سے محبت اور پاک بازی کو ظاہر کرنے والی ہو۔ اس کی جمع عُرُبٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
عُرُبًا اَتْرَابًا (۵۶-۳۷) (اور شوہروں کی) پیاریاں اور ہم عمر۔
اور عَرَّبْتُ عَلَیْہِ کے معنی کسی کو اس کی غلطی بتانے کے ہیں حدیث میں ہے (۳۶) عَرِّبُوْا عَلَی الْاِمَامِ (امام قرأت میں غلطی کرے تو اسے بتادو) اَلْمُعْرِبُ عربی گھوڑے کا مالک جیسا کہ خارش زدہ کو مُجْرِبٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
حُکْمًا عَرَبِیًّا (۱۳-۳۷) کے معنی واضح اور فصیح کتاب کے ہیں جو حق کو ثابت اور باطل کو غلط ثابت کر دکھائے۔
بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کریم اور بلند مرتبہ کے ہیں اور یہ عُرُبًا اَتْرَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو کہ کِتَابٌ کَرِیْمٌ کے ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ عَرَبِیًّا بمعنی مُعْرِبٌ ہے اور یہ عَرِّبُوْا عَلَی الْاِمَامِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں پہلی کتابوں کے احکام کو منسوخ کرنے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عربی نبی کی طرف منسوب ہے اور عَرَبِیٌّ کی طرف نسبت کے وقت بھی عَرَبِیٌّ ہی کہا جائے گا یعنی تلفظ میں منسوب اور منسوب الیہ ایک ہی ہیں یَعْرُبُ

اس شخص کا نام ہے جس نے سب سے پہلے سریانی زبان کو عربی میں منتقل کیا اس لئے اس کا نام ہی یعرب مشہور ہوگیا۔

(ع ر ج)

اَلْعُرُوْجُ کے معنی اوپر چڑھنا کے ہیں[1] قرآن میں ہے:۔
تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ (۷۰-۴) جس کی طرف روح (الامین) اور فرشتے چڑھتے ہیں۔
فَظَلُّوْا فِیْہِ یَعْرُجُوْنَ (۱۵-۱۴) اور وہ اس میں چڑھنے بھی لگیں۔
اور مَعَارِجُ کے معنی سیڑھیوں کے ہیں اس کا مفرد مَعْرَجٌ (اور معراج) ہے۔ قرآن میں ہے:۔
مِنَ اللّٰہِ ذِی الْمَعَارِجِ (۷۰-۳) سیڑھیوں والے خدا کی طرف سے (نازل ہوگا)۔
اور شب معراج کو بھی لَیْلَۃُ الْمِعْرَاجِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں دعائیں اوپر چڑھتی ہیں جیسا کہ آیت کریمہ:۔
اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ (۳۵-۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔
میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔
عَرَجَ عُرُوْجًا وَعَرَجَانًا (ناہموار زمین پر) ایسے چلنا جیسے کوئی شخص سیڑھیاں چڑھ رہا ہو جیسا کہ دَرَجَ کا لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو دَرَجٌ یعنی سیڑھی پر چڑھنے والے کی طرح چلے عَرِجَ (س) مستقل طور پر لنگڑا ہونا اور ضَبُعٌ عَرْجَاءُ (گفتار) کو عَرْجَاءُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ خِلْقَۃً لنگڑا ہوتا ہے اور تَعَارَجَ کے معنی تکلف لنگڑا کر

[1] قد ذکرہ ابو الطیب الحلبی فی الاضداد (۲: ۴۹۸-۴۹۹)

چلنے کے ہیں جیسا کہ تَضَالُعٌ کے معنی بتکلف سیری ظاہر کرنا کے ہوتے ہیں اسی سے استعارۃً شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۲۳۳) عَرِّجْ قَلِيلًا عَنْ مَدَى غُلَوَائِكَا

اَلْعَرَجُ اونٹوں کا بڑا گلہ گویا وہ اپنی کثرت کے اعتبار سے اوپر چڑھ چکا ہے۔

(ع ر ج ن)

اَلْعُرْجُوْنُ کھجور کے خوشے کی ڈنڈی جو خشک ہوکر خمیدہ ہو جاتی ہے[2]۔ قرآن میں ہے:۔ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۶-۳۹) یہاں تک کہ کھجور کے خوشے کی ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔

(ع ر ش)

اَلْعَرْشُ اصل میں چھت والی چیز کو کہتے ہیں اس کی جمع عُرُوْشٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (۲-۲۵۹) اور اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گرے پڑے تھے۔

اسی سے عَرَشْتُ (ن) الْكَرْمَ وَعَرَّشْتُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی انگور کی بیلوں کے لئے بانس وغیرہ کی ٹٹیاں بنانا کے ہیں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیل کو مُعَرَّشٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

مَعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ (۶-۱۴۱) ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے ہوئے۔

وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ (۱۶-۶۸) اور درختوں میں اور ان سے جنہیں ٹٹیوں پر چڑھاتے ہیں۔

وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۷-۱۳۶) جو ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ يَعْرِشُوْنَ کے معنی يَبْنُوْنَ ہیں یعنی جو وہ عمارتیں بناتے تھے[3]۔ اِعْتَرَشَ الْعِنَبُ انگور کی بیل کے لئے بانس وغیرہ کی ٹٹی بنائی۔ اَلْعَرِيْشُ چھولداری جس کی ہیئت انگور کی ٹٹی سے ملتی جلتی ہے اسی سے عَرَشْتُ الْبِئْرَ ہے جس کے معنی کنویں کے اوپر چھولداری سی بنانا کے ہیں بادشاہ کے تخت کو بھی اس کی بلندی کی وجہ سے عَرْشٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (۱۲-۱۰۰) اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔

اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا (۲۷-۳۸) کوئی تم میں سے ایسا ہے۔۔۔۔ کہ ملکہ کا تخت میرے پاس لے آئے۔

نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا (۲۷-۴۱) اس کے تخت کی صورت بدل دو۔

اَهٰكَذَا عَرْشُكِ (۲۷-۴۲) کہ آپ کا تخت بھی اسی طرح کا ہے۔

---

[1] قالہ ابراہیم بن العباس الصولی وصدرہ: اباجعفر خف نوۃ لعد صولۃ وفی روایۃ قصر بدل عرج والبیت فی الشعراء ۴۴۲ والصداقۃ ۳۵ والاغانی (۹: ۲۱) والادیار (۱: ۴۲۲) ونزہۃ الجلیس (۲: ۲۶۷) والوفیات (۲: ۵۶) والطرائف ۱۶۱ اشعر ابراہیم رقم ۱۲۴ والعقد (۲: ۳۵۶) وفیہ البیت: اباجعفر عرج علی خلطائکا واقصر قلیلاً عن مدی غلوائکا والمحاضرات للمؤلف (۱: ۱۷۵) وفیہ دولۃ لعد صولۃ وابن عبد نسبہ الی علی بن الجہم انہ کتب الی ابن الزیات وفی روایۃ العیون (۱: ۲۷۳) والعقد الفرید بہ اباجعفر عرج علی خلطائکا۔ واقصر قلیلاً من مدی غلوائکا ۱۲ [2] فنونہ اصلیۃ ووزنہ فعلول کذا فی القاموس قال الزجاج وزنہ فعلون والنون زائدۃ راجع الروح ۲۳: ۲۰ [3] راجع مجاز (۱: ۲۲۷)

اور بطور کنایہ عَرْش کا لفظ عزت، غلبہ اور سلطنت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ ثُلَّ عَرْشُهٗ (یعنی فلاں کی عزت جاتی رہی)
مروی ہے (۲۵/۳۳) کہ کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو ان سے دریافت کیا کہ پروردگار نے تیرے ساتھ کیا کیا؟ تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا اگر خدا اپنی رحمت سے میری دستگیری نہ کرتا لَثُلَّ عَرْشِیْ تو میں ذلیل ہو جاتا۔

اور عرش الٰہی سے صرف نام کی حد تک ہم واقف ہیں اور اس کی حقیقت انسان کے فہم سے بالاتر ہے اور وہ بادشاہ کے عرش کی طرح نہیں ہے جیسا کہ عوام خیال کرتے ہیں کیونکہ اس صورت میں تو عرش باری تعالیٰ کا حامل قرار پائے گا نہ کہ محمول، حالانکہ ذات الٰہی اس سے بالاتر ہے (کہ کوئی چیز اسے اٹھائے) جیسا کہ خود قرآن میں ہے:۔
اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (۳۵-۴۱) خدا ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے کہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو خدا کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ان کو تھام سکے۔

بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ عَرْش سے فَلَكُ الْاَعْلٰی (فلک الافلاک) اور کُرْسِی سے فلک الکواکب یعنی آٹھواں آسمان مراد ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا (۳۶) مَا السَّمٰوٰتُ السبع وَالْاَرَضُوْنَ السبع فی جنب الکرسی الا کحلقۃ ملقاۃ فی ارض فلاۃ" کہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے جیسے بیابان میں ایک انگوٹھی پڑی ہوئی ہو اور یہی حیثیت عرش کے مقابلہ میں کرسی کی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (۱۱-۷) اور (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا۔
میں متنبہ کیا ہے کہ عرش جب سے وجود میں آیا ہے پانی کے اوپر ہی رہا ہے۔ اور آیات:۔
ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ (۸۵-۱۵) عرش کا مالک بڑی شان والا۔
رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ (۴۰-۱۵) مالک درجات عالی اور صاحب عرش ہے۔
اور ان کے ہم معنی دیگر آیات میں بعض نے کہا ہے کہ ان سے حق تعالیٰ کی سلطنت اور حکومت کی طرف اشارہ ہے ورنہ ان کے یہ معنی نہیں ہے کہ عرش باری تعالیٰ کا ٹھکانا اور مسکن ہے۔

(ع ر ض)

اَلْعَرْضُ (کسی چیز کی چوڑائی) یہ اَلطُّوْلُ کی ضد ہے اصل میں اس کا استعمال اجسام کے متعلق ہوتا ہے اس کے بعد غیر اجسام کے متعلق بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (۴۱-۵۱) تو لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے۔
اور عَرْضٌ خاص کر ایک جانب اور کنارہ کو کہتے ہیں عَرْضُ الشَّیْءِ اس کی ایک جانب

---

۲۵ سیاتی فی (کرسی) وہناک الموعد لتخریجہ انشاء اللہ تعالیٰ ۱۲

ظاہر ہوگئی عَرَضْتُ الْعُوْدَ عَلَى الْاِنَاءِ برتن پر لکڑی کو چوڑی جانب سے رکھا۔

اِعْتَرَضَ الشَّيْءُ فِي حَلْقِهٖ وہ چیز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اِعْتَرَضَ الْفَرَسُ فِي مَشْيِهٖ گھوڑا اپنے سر اور سینے کو ایک جانب ٹیڑھا کرکے چلا فِيْهِ عُرْضِيَّةٌ اس میں منہ زوری ہے۔

عَرَضْتُ الشَّيْءَ عَلَى الْبَيْعِ میں لے اسے فروخت کے لئے پیش کیا۔ عَرَضْتُ الشَّيْءَ عَلٰى فُلَانٍ اَوْ لِفُلَانٍ میں نے فلاں کے سامنے وہ چیز پیش کی۔ چنانچہ فرمایا:۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (۲-۳۱) پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا (۱۸-۴۸) اور سب تمہارے پروردگار کے سامنے صف باندھ کر لائے جائیں گے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ (۳۳-۷۲) ہم نے (بار) امانت پیش کیا۔

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا (۱۸-۱۰۰) اور اس روز جہنم کافروں کے سامنے لائیں گے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ (۴۶-۲۰) اور جس روز کافر دوزخ کے سامنے کئے جائیں گے

عَرَضْتُ الْجُنْدَ لشکر کا جائزہ لیا۔

اَلْعَارِضُ وہ چیز جو تمہارے سامنے آئے خاص طور پہ بادل (جو افق پر پھیلا ہوا ہو) جیسے فرمایا:۔

هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (۴۶-۲۴) یہ تو بادل ہے جو ہم پر برس کر رہے گا۔

نیز اَلْعَارِضُ کا لفظ عارضۂ مرض پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے:۔ بِهٖ عَارِضٌ مِّنَ الْمَرَضِ اسے بیماری کا عارضہ ہے اور کبھی بمعنی رخسار آجاتا ہے جیسے اَخَذَ مِنْ عَارِضَيْهِ (اس نے اس کے رخسار پکڑ لئے) اور کبھی بمعنی دانت اسی سے ان دانتوں کو جو ہنستے وقت ظاہر ہوتے ہیں اَلْعَوَارِضُ کہا جاتا ہے اور کنایہ کے طور پر عمدہ گو اور فصیح شخص کو فُلَانٌ شَدِيْدُ الْعَارِضَةِ کہا جاتا ہے بَعِيْرٌ عَرُوْضٌ اونٹ جو منہ میں دونوں طرف سے کانٹے چبا کر کھاتا ہو۔

اَلْعُرْضَةُ جو کسی چیز کے سامنے آکر آڑ بن جائے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ (۲-۲۲۴) اور خدا کے نام کو اپنی قسموں کے لئے آڑ نہ بناؤ۔

بَعِيْرٌ عُرْضَةٌ لِّلسَّفَرِ وہ اونٹ جو سفر کے لئے تیار کیا گیا ہو۔ اَعْرَضَ اس نے اپنی ایک جانب ظاہر کی اَعْرَضَ لِيْ كَذَا کسی چیز کا اس طرح سامنے آنا کہ اس کے پکڑنے پر قدرت ہو جائے۔ اَعْرَضَ عَنِّيْ اس نے مجھ سے روگردانی کی اعراض کیا۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا (۳۲-۲۲) تو وہ ان سے منہ پھیر لے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ (۴-۶۳) تم ان سے اعراض برتو اور نصیحت کرتے رہو۔

وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (۷-۱۹۹) اور جاہلوں سے کنارہ کرلو۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ (۲۰-۱۲۴) اور جو

میری نصیحت سے منہ پھیرے گا۔

وَهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ (۲۱-۳۲) اس پر بھی وہ ہماری نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔

اور کبھی قرائن کی بنا پر اس کے بعد عَنْ کو حذف کر دیتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۴-۴۸) ان میں سے ایک فریق منہ پھیر لیتا ہے۔

ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۳-۲۳) تو ایک فریق ان میں سے کج ادائی کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ (۳۴-۱۶) تو انہوں نے شکر گزاری سے منہ پھیر لیا پس ہم نے ان پر ۔۔۔۔ چھوڑ دیا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۳-۱۳۳) اور بہشت ۔۔۔ جس کا عرض ارض و سماء کے برابر ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَرْضٌ کا لفظ اَلطُّوْلُ کی ضد ہے اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ عالم آخرت میں جنت کی چوڑائی اتنی ہو گی جتنی کہ اس عالم میں آسمانوں اور زمین کی چوڑائی ہے کیونکہ عالم آخرت کی صفت میں تو قرآن نے کہا ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (۱۴-۴۸) جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان۔

اور یہ عین ممکن ہے کہ عالم آخرت کے ارض و سماء اس دنیا کے ارض و سماء سے وسیع اور کشادہ ہوں چنانچہ مروی ہے[1] ان یهودیا سأل عمرؓ عن هذه الآية فقال:۔ فاين النار؟ فقال عمرؓ اذا جاء الليل فاين النهار کہ ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا اور کہا کہ اگر جنت ہی اتنی وسیع ہو گی تو دوزخ کس جگہ پر ہو گی؟ تو حضرت عمرؓ نے جواباً پوچھا جب رات آجاتی ہے تو دن کہاں ہوتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے عرض سے مراد وسعت ہے اور یہ وسعت پیمائش کے اعتبار سے مراد نہیں ہے بلکہ مسرت اور خوشی کے اعتبار سے جس طرح کہ اس کے برعکس دنیا کے متعلق کہا جاتا ہے:۔ الدُّنْيَا عَلٰى فُلَانٍ حَلْقَةُ خَاتَمٍ وَكِفَّةُ حَابِلٍ (کہ فلاں پر تو دنیا انگشتری کے حلقہ اور شکاری کے پھندے کی طرح تنگ ہو گئی ہے اسی طرح ایک اور محاورہ ہے:۔ سَعَةُ هٰذِهِ الدَّارِ كَسَعَةِ الْاَرْضِ (کہ اس گھر کی وسعت روئے زمین کی وسعت کے برابر ہے) بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَرْضٌ کا لفظ اَلْعَرْضُ لِلْمَبِيْعِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے چنانچہ جب کوئی چیز کسی قسم کے سامان کے عوض بیچ دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے بِيْعَ كَذَا بِعَرْضٍ (کہ یہ چیز اتنے) سامان کے عوض فروخت کی گئی) لہٰذا آیت میں بھی عَرْضُهَا کے معنی عوض اور بدلہ کے ہیں جیسے محاورہ ہے عَرْضُ هٰذَا الثَّوْبِ كَذَا وَكَذَا (کہ اس کپڑے کی قیمت اتنی اور اتنی ہے

اَلْعَرَضُ ہر وہ چیز جسے ثبات نہ ہو[2] اسی اعتبار

---

[1] رواہ ابن جریر بثلاثۃ طرق وفیہا ان ناس من الیہود وفی مسند احمد روی مرفوعًا وایضا فی ابن جریر وایضا اجاب بہ ابن عباس وفی مسند البزار مرفوعًا من ابن جریر)

[2] قال ابو عبیدۃ یقال جمع متاع الدنیا عرض بفتح الراء واما العرض بسکون الراء فھو ما سوی الدنانیر والدراہم راجع المجمل لابن فارس (ماخوذ من فتح القدیر للشوکانی ۱/۵۰۱)

سے علمائے کلام کی اصطلاح میں اَلْعَرَضُ کا لفظ
س چیز پر بولا جاتا ہے جو جَوْھَرٌ کے بغیر قائم نہ رہ
سکے جیسے رنگ ذائقہ وغیرہ اور دنیا کی بے ثباتی کی
رف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے :۔
لدُّنْیَا عَرَضٌ حَاضِرٌ کہ دنیا تو پیش افتادہ سازو
سامان کا نام ہے قرآن میں ہے :۔
تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ
(۸ - ۶۷) تم لوگ پیش افتادہ سازو سامان کے طالب
ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے۔
اْخُذُوْنَ عَرَضَ ھٰذَا الْاَدْنٰی (۷ - ۱۶۹) اس
نیا کی مال و دولت لیتے ہیں۔
اِنْ یَّاْتِہِمْ عَرَضٌ مِّثْلُہٗ (۷ - ۱۶۹) اگر ان کے
سامنے (بھی) ویسا ہی مال آجاتا . . . . . .
ر آیت کریمہ :۔
لَوْ کَانَ عَرَضًا قَرِیْبًا (۹ - ۴۲) کے معنی یہ ہیں
گر کوئی فائدہ آسانی سے حاصل ہونے کی توقع ہوتی۔
لتَّعْرِیْضُ پہلو دار بات کرنا جو سچ جھوٹ اور
ظاہر و باطن دونوں معنی پر محمول ہوسکتی ہو اور آیت :۔
وَلَاجُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا عَرَّضْتُمْ بِہٖ
مِنْ خِطْبَۃِ النِّسَآءِ (۲ - ۲۳۵) اگر تم کنایہ کی
توں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو . . . . . . تو
تم پر کچھ گناہ نہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ نکاح کے پیغام میں تعریض
ی صورت یہ ہے کہ عورت سے مثلاً کہا جائے تم
یت خوبصورت ہو پسندیدہ نظر ہو وغیرہ۔

(ع ر ف)

اَلْمَعْرِفَۃُ وَالْعِرْفَانُ کے معنی ہیں کسی
چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر کرکے اس کا

ادراک کرلینا یہ علم سے اخص یعنی کم درجہ رکھتا
ہے اور یہ اَلْاِنْکَارُ کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے یہی
وجہ ہے فُلَانٌ یَعْرِفُ اللّٰہَ تو کہا جاتا ہے مگر
تعدیہ بیک مفعول کی صورت میں فُلَانٌ یَعْلَمُ
اللّٰہَ استعمال نہیں ہوتا کیونکہ انسان ذات الہٰی
کا علم حاصل نہیں کرسکتا البتہ کائنات اور آثار
قدرت پر غور و فکر کرکے اس کی صفات کا
اندازہ لگایا جاسکتا ہے اسی طرح اللّٰہُ یَعْرِفُ
کَذَا نہیں کہتے کیونکہ مَعْرِفَۃٌ کا درجہ
علم سے کم تر ہوتا ہے اور لفظ معرفت اس
ادراک پر بولا جاتا ہے جو غور و فکر کے بعد
حاصل ہوتا ہے جس سے ذات باری تعالےٰ
بلند و برتر ہے دراصل معرفت کا لفظ عَرَفْتُ
کَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں میں نے
اس کی بو پالی اور یا اَصَبْتُ عَرْفَہٗ (میں نے
اس کے رخسار پر مارا) سے یہ لفظ پہچاننے کے
معنی میں استعمال ہونے لگا ہے قرآن میں ہے :۔
فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِہٖ (۲ - ۸۹)
پھر جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان
کے پاس آپہنچی تو اس سے کافر ہوگئے۔
فَعَرَفَہُمْ وَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ (۱۲ - ۵۸)
تو یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان کو نہ
پہچان سکے۔
فَلَعَرَفْتَہُمْ بِسِیْمٰھُمْ (۴۷ - ۳۰) اور تم
ان کے چہروں سے ہی پہچان لیتے۔
یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (۲ - ۱۴۶)
اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو
پہچانا کرتے ہیں۔
مَعْرِفَۃ کے مقابلہ میں اِنْکَارٌ اور عِلْمٌ کے مقابلہ

میں لفظ جَهَالَةٌ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا (۱۶-۸۳)
یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں مگر (واقف ہو کر) ان سے انکار کرتے ہیں۔

اور ایک گروہ (یعنی صوفیہ کرام) کی اصطلاح میں عَارِفٌ کا لفظ خاص کر اس شخص پر بولا جاتا ہے جسے عالم ملکوت اور ذات الٰہی اور اس کے ساتھ حسن معاملہ کے متعلق خصوصی معرفت حاصل ہو۔

عَرَّفَهُ كَذَا فلاں نے اسے اس چیز کا تعارف کروا دیا۔ قرآن میں ہے:۔

عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ (۶۶-۳) تو پیغمبر نے کچھ بات تو بتا دی اور کچھ نہ بتائی۔

تَعَارَفُوْا انہوں نے باہم ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ قرآن میں ہے:۔

لِتَعَارَفُوْا (۴۹-۱۳) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔

يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ (۱۰-۴۵) آپس میں ایک دوسرے کو پہچان بھی لیں گے۔

عَرَّفَهٗ کسی چیز کو خوشبودار کر دیا معطر بنا دیا چنانچہ جنت کے بارے میں عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷-۶) فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جنت کو خوشبو سے بسا دیا ہے اور ان کیلئے آراستہ کر رکھا ہے اور بعض نے اس کے معنی توصیف کرنا، شوق دلانا اور اس کی طرف رہنمائی کرنا بھی بیان کئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ (۲-۱۹۸) جب تم میدان عرفات سے واپس ہونے لگو۔

میں عَرَفَاتٌ سے میدان عرفات مراد ہے۔ بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اس میدان میں آدم علیہ السلام اور حوا کا باہم (دنیا میں پہلی دفعہ) تعارف ہوا تھا اس لئے عرفات کہا جاتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس (میدان میں دعا اور عبادت کے ذریعہ لوگ اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل کرتے ہیں اس لئے اسے عرفات کہا جاتا ہے۔

اَلْمَعْرُوْفُ ہر اس قول یا فعل کا نام ہے جس کی خوبی عقل یا شریعت سے ثابت ہو اور مُنْكَرٌ ہر اس بات کو کہا جائے گا جو عقل و شریعت کی رو سے بری سمجھی جائے۔ قرآن میں ہے:۔

يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳-۱۱۴) اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے۔

وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳۳-۳۲) اور دستور کے مطابق ان سے بات کیا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ جُوْدٌ (سخاوت) میں اعتدال اختیار کرنے کو بھی مَعْرُوْفٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اعتدال عقل و شریعت کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (۴-۶) اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر (یعنی بقدر خدمت) کچھ لے لے۔

اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ (۴-۱۱۴) ہاں (اس شخص کی مشورت اچھی ہو سکتی ہے) جو خیرات یا نیک بات ..... کہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ (۲-۲۴۱) اور مطلقہ کو بھی دستور کے مطابق نان و نفقہ دینا چاہیئے۔

یعنی اعتدال اور احسان کے ساتھ۔ نیز فرمایا:۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ

تو یا تو ان کو اچھی طرح سے زوجیت میں رہنے دو اور اچھی طرح سے علیحدہ کر دو۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ (۲-۲۶۳) نرم بات اور درگزر کرنا صدقہ سے بہتر ہے۔

یعنی نرم جواب دے کر لوٹا دینا اور فقیر کے لئے دعا کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس پر احسان جتلایا جائے۔

اَلْعُرْفُ وہ نیک بات جس کی اچھائی کو سب تسلیم کرتے ہوں قرآن میں ہے:۔

وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ (۷-۱۹۹) اور نیک کام کرنے کا حکم دو۔

عُرْفُ الْفَرَسِ گھوڑے کی ایال عُرْفُ الدِّيْكِ مرغ کی کلغی جَاءَ الْقَطَا عُرْفًا قطا جانور آگے پیچھے یکے بعد دیگرے آئے اسی سے قرآن میں ہے۔

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا (۷۷-۱) ہواؤں کی قسم جو متواتر چلتی ہیں۔

اَلْعَرَّافُ یہ کَاهِنٌ کے ہم معنی ہے مگر عَرَّافٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی باتوں کی خبر دے اور کَاهِنٌ اسے کہتے ہیں جو گزشتہ واقعات کے متعلق اطلاع دے اَلْعَرِيْفُ اسے کہتے ہیں جو لوگوں کو جانتا پہچانتا اور انکا تعارف کراتا ہو۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۳۰۸) بَعَثُوْا اِلَيَّ عَرِيْفَهُمْ يَتَوَسَّمُ

وہ میرے پاس اپنا عریف بھیجیں گے جو پہچان کر لے گا۔

اور عَرُفَ فُلَانٌ عَرَافَةً کے معنی عریف بننے کے ہیں اس لئے عَرِيْفٌ مشہور سردار کو کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[2] (البسیط)

(۳۰۹) بَلْ كُلُّ قَوْمٍ وَاِنْ عَزُّوْا وَاِنْ كَثُرُوْا
عَرِيْفُهُمْ بِاَثَافِي الشَّرِّ مَرْجُوْمٌ

ہر قوم خواہ کتنی ہی باعزت اور تعداد میں زیادہ کیوں نہ ہو مگر ان کے سردار بھی شرور زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

يَوْمُ عَرَفَةَ جس روز حجاج میدان عرفہ میں وقوف کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ (۷-۴۶) اور اعراف پر کچھ آدمی ہوں گے۔

میں اَلْاَعْرَافُ سے وہ دیوار مراد ہے جو جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہے۔

اَلْاِعْتِرَافُ (انتعال) کے معنی اقرار کے ہیں اصل میں اس کے معنی گناہ کا اعتراف کرنے کے ہیں۔ اس کی ضد جُحُوْدٌ یعنی انکار کرنا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ (۶۷-۱۱) پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے۔

فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا (۴۰-۱۱) ہم کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔

(ع ر م)

اَلْعَرَامَةُ کے معنی مزاج کی تندی اور سختی

---

[1] اولہ: أَوَكُلَّمَا وَرَدَتْ عُكَاظَ قَبِيلَةٌ . . . والبيت في اللسان والمحكم والتاج (عرف) ونسبه الى طريف بن مالك العنبري وقيل طريف بن عمرو كما في الاقتضاب ۴۳۶ والاشباه (۴: ۱۰۱) والبحر (۵/۶۳۴) والكتاب (۲: ۲۱۵) والشنتمري وعزاه لطريف بن تميم العنبري

[2] قاله علقمة بن عبدة الفحل وفي اللسان (عرف)، كل حي بدل كل قوم وفي كرموا بدل وان كثروا والبيت من كلمة مفضلية (۲: ۱۹۷)، وفي منتهى الطلب (۱: ۲۷-۲۹) والشعراء (۱۸۹۴-۵۰۲) ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۳۴۷) وديوانه ۱۲۹ والصناعتين ۳۰۰ والحيوان (۶: ۴۹۴) والمحاضرات للمؤلف (۴: ۹۰) وفي رواية كل قوم وكرموا بدل كثروا ذكره العسكري في باشله مدى الاستعارة

کے ہیں۔جس کا اثر انسان کے عمل پر ظاہر ہو کہا جاتا ہے عَرَمَ فُلَانٌ فلاں سخت مزاج ہو گیا چنانچہ ایسے شخص کو عَارِمٌ کہا جاتا ہے۔
اسی سے عُرَامُ الْجَیْشِ ہے جس کے معنی لشکر کی تندی و تیزی اور کثرت کے ہیں اور آیت کریمہ:۔
فَأَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ (۳۴-۱۶) کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ ہم نے ان پر سخت سیلاب بھیجا اور بعض نے اَلْعَرِمِ کے معنی بند کئے ہیں اور بعض نے اَلْعَرِمِ سے جنگلی چوہا مراد لیا ہے اور اس سیلاب کو اس کی طرف اسلئے منسوب کیا ہے کہ چوہوں نے اس بند میں نقاب ڈالے تھے اور وہ بند ٹوٹ گیا تھا۔

(ع ر و ی)

عَرِیَ مِنْ ثَوْبِهٖ یَعْرٰی ننگا ہونا چنانچہ برہنہ اور ننگے شخص کو عَارٍ وَعُرْیَانٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی (۲۰-۱۱۸) یہاں تم نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے۔
ھُوَ عُرْوٌ مِنَ الذَّنْبِ وہ گناہ سے عاری ہے اَخَذَہٗ عُرَوَاءُ برہنگی کی وجہ سے اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔اور انسان کے ان اعضاء کو جو عام طور پر ننگے رہتے ہیں جیسے چہرہ ہاتھ اور پاؤں اَلْمَعَارِی کہا جاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔
فُلَانٌ حَسَنُ الْمُعَرّٰی فلاں کے ننگے اعضاء خوبصورت ہیں۔جیسا کہ حَسَنُ الْمُحَسَّرِ وَالْمُجَرَّدِ کا محاورہ ہے اَلْعَرَاءُ کھلی جگہ جہاں کوئی چیز آڑ کے لئے نہ ہو جیسے فرمایا:۔
فَنَبَذْنَاہُ بِالْعَرَاءِ وَھُوَ سَقِیْمٌ (۳۷-۱۴۵) پھر ہم نے اسے جبکہ وہ بیمار تھے کھلے میدان میں ڈال دیا۔
اَلْعَرٰی (اسم مقصور) کنارہ اور جانب کو کہتے ہیں اور عَرَاہُ وَاعْتَرَاہُ اس کے سامنے آیا اس کی جانب قصد کیا۔قرآن میں ہے:۔
إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْءٍ (۱۱-۵۴) کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھ پر مصیبت ڈال دی ہے۔
اَلْعُرْوَۃُ۔ ہر وہ چیز جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے اور آیت کریمہ:۔
فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی (۲-۲۵۶) تو اس نے مضبوط حلقہ ہاتھ میں پکڑا۔
میں (ایمان باللہ کو) بطور تمثیل کے "مضبوط حلقہ" سے تعبیر فرمایا ہے۔نیز عُرْوَۃ یا عَلْقَه ایک قسم (کی) خاردار جھاڑی (یا پیلو کی قسم) کے درخت کو بھی کہتے ہیں جو اونٹوں کے لئے آخری سہارا ہوتا ہے اَلْعَرِیُّ وَالْعَرِیَّۃُ سرد ہوا جو انسان کو لگ جاتی ہے۔نیز اَلْعَرِیَّۃُ کھجور کا وہ درخت جو بیع سے مستثنیٰ کیا گیا ہو۔بعض کہتے ہیں کہ عَرِیَّۃٌ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جس کا پھل اس کے مالک نے کسی محتاج کو ہبہ کر دیا ہو شرعًا اس درخت کے پھل کو خشک کھجوروں کے عوض بیچنا جائز ہے بعض کہتے ہیں کہ عَرِیَّۃ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو کسی آدمی کے باغ میں دوسرے کی ملکیت ہو اور اس کے آنے جانے سے باغ کے مالک کو تکلیف ہوتی ہو تو شریعت نے خشک کھجوروں کے عوض اس کا پھل خریدنے کی اجازت دی ہے۔

اس کی جمع عَرَایَا ہے اور آنحضرت نے بیع عَرَایَا کی رخصت دی ہے۔ (۳۹)

(ع ز ز)

اَلْعِزَّۃُ اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے یہ اَرْضٌ عَزَازٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سخت زمین کے ہیں۔ تَعَزَّزَ اللَّحْمُ گوشت سخت ہو گیا اور گٹھ گیا گویا وہ سخت زمین میں پڑا ہے جس تک رسائی مشکل ہے جیسا کہ تَظَلَّفَ کے معنی ظَلِفٌ یعنی سخت زمین میں چلے جانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا (۴-۱۳۹) کیا یہ ان کے ہاں عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ عزت تو سب خدا ہی کی ہے۔
وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (۶۳-۸) حالانکہ عزت خدا کی ہے اور اس کے رسول کی اور مومنوں کی۔
سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ ..... (۳۵-۱) تمہارا پروردگار جو صاحب عزت ہے اس سے پاک ہے۔
اَلْعِزَّۃُ کبھی باعث مدح ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی باعث مذمت جیسا کہ کفار کے متعلق فرمایا:۔
بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ (۳۸-۲) مگر جو کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عزت اللہ رسول اور مسلمانوں کو حاصل ہے وہ دائمًا باقی رہنے والی ہے اور یہی عزت حقیقی ہے مگر کفار کو عزت حقیقی حاصل نہیں ہے بلکہ وہ بتکلف اپنے آپ کو قوی اور غالب ظاہر کر رہے ہیں جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا (۴۰) کہ جو عزت اللہ تعالٰی سے حاصل نہ ہو وہ سراسر ذلت ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:۔
وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اٰلِھَۃً لِّیَکُوْنُوْا لَھُمْ عِزًّا (۱۹-۸۱) یعنی اللہ کے سوا انہوں نے معبود بنا رکھے ہیں کہ ان کے ذریعہ عذاب سے محفوظ رہ سکیں اور آیت کریمہ:۔
مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ جَمِیْعًا (۳۵-۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص معزز بننا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ اللہ تعالٰی کے ہاں سے عزت حاصل کرے کیونکہ ہر قسم کی عزت خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے کبھی عزت کا لفظ حمیت اور غلط خودداری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ (۲-۲۰۶) تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے۔ میں عزت کے معنی حمیت کے ہیں۔
اَلْعَزِیْزُ وہ ہے جو غالب ہو اور مغلوب نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّہٗ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۹-۲۶) بے شک وہ غالب حکمت والا ہے۔
یٰٓاَیُّھَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَاَھْلَنَا الضُّرُّ (۱۲-۸۸) اے عزیز ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔
اَعَزَّہٗ (افعال) کے معنی کسی کو عزت بخشنے کے ہیں۔

لہ والحدیث فی اختلاف الفاظہ ایضاً فی الموطا ۲ ر ۱۲۵ والرسالۃ للشافعی رقم ۹۰۹ وتحت التخریج لاحمد شاکر مصری واختلاف الحدیث ۲۱۹ واصحاب الکتب الستۃ راجع ذخائر المواریث رقم ۱۹۶۱

قرآن میں ہے:۔
تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (۳-۲۶)
جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔
عَزَّ عَلَیَّ کَذَا مجھ پر یہ بات نہایت ہی گراں گذری۔ قرآن میں ہے:۔
عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ (۹-۱۲۸) تمہاری تکلیف ان پر گراں گزرتی ہے۔
اور عَزَّہٗ عَلٰی کَذَا کے معنی ہیں فلاں اس پر غالب آگیا چنانچہ مثل مشہور ہے۔ مَنْ عَزَّ بَزَّ (جس کی لاٹھی اسی کی بھینس) قرآن میں ہے:۔
وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ (۳۸-۲۳) اور گفتگو میں مجھ پر غالب آگیا ہے۔
بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ وہ گفتگو اور جھگڑا کرنے میں مجھ سے زیادہ باعزت بن بیٹھا ہے
عَزَّ الْمَطَرُ الْاَرْضَ بارش زمین پر غالب آگئی۔
عَزَّ الشَّیْءُ کسی چیز کا نادر اور کمیاب ہونا چنانچہ اسی اعتبار سے کہا گیا ہے۔
کُلُّ مَوْجُوْدٍ مَمْلُوْلٌ وَکُلُّ مَفْقُوْدٍ مَطْلُوْبٌ کہ ہر موجود چیز سے انسان اکتا جاتا ہے اور ہر نایاب چیز کی تلاش کی جاتی ہے شَاۃٌ عَزُوْزٌ بکری کا دودھ کم ہو گیا اور آیت کریمہ :۔
اِنَّهٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌ (۴۱-۴۱) یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اس جیسی کتاب کا کہیں سے حاصل کرنا اور پایا جانا نہایت دشوار ہے۔
اَلْعُزّٰی ایک بت کا نام ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی (۵۳-۱۹) بھلا تم لوگوں نے لات اور عزی کو دیکھا۔
وَاسْتُعِزَّ بِفُلَانٍ فلاں مرض یا موت سے مغلوب ہو گیا۔

(ع ز ب)

اَلْعَازِبُ وہ آدمی جو گھاس کی تلاش میں اپنے اہل و عیال سے دور نکل جائے عَزَبَ یَعْزِبُ وَیَعْزُبُ (ض ن) دور نکل جانا پوشیدہ ہو جانا۔ قرآن میں ہے :۔
وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّۃٍ (۱۰-۶۱) اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔
لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ (۳۴-۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔
رَجُلٌ عَزَبٌ کنوارا بے زن مرد۔
عَزَبَ عَنْهُ حِلْمُهٗ اس کی عقل جاتی رہی۔
عَزَبَ طُهُوْرُهَا اس کا خاوند غائب ہو گیا۔
قَوْمٌ مُعْزِبُوْنَ وہ لوگ جن کے اونٹ چرنے کے لئے دور نکل گئے ہوں۔
ایک حدیث میں ہے[1] (۱۴۰) مَنْ قَرَءَ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا فَقَدْ عَزَبَ کہ جس نے چالیس دن میں قرآن پاک ختم کیا اس نے بہت دیر کی۔

(ع ز ر)

اَلتَّعْزِیْرُ اس مدد کو کہتے ہیں جو جذبہ تعظیم

---

[1] قال فی الفائق (۲: ۳۷) ومعناہ فقد بعد العهد بما ابتدأ فی تلاوتہ والحدیث فی الترمذی عن ابن عمر وعن ابن عمرو ولفظہ اقرأ القرآن فی اربعین انظر کنز العمال ج ۱ رقم ۲۷۷۴ و ۲۸۱۹

کے ساتھ ہو قرآن میں ہے :-

وَتُعَزِّرُوْهُ (۴۸-۹) اور اس کی مدد کرو۔

وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ (۵-۱۲) اور ان کی مدد کروگے۔

اَلتَّعْزِيْرُ (ایضاً) کسی کو حد شرعی سے کم سزا دینا یہ بھی دراصل پہلے معنی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کیونکہ تادیبی سزا بھی درحقیقت اس شخص کی اصلاح کے لئے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ پہلے معنی کا تعلق کسی مضر چیز کو روکنے سے ہوتا ہے اور تادیب میں کسی شخص کو مضر چیز سے روکا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی کو مضر چیز سے روک دینا بھی اس کی مدد میں شامل ہے۔[1]

اسی بنا پر آنحضرت نے فرمایا (۱۴۲)[2] اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا اپنے بھائی کی مدد کرو، وہ ظالم ہو یا مظلوم یہ سنکر ایک شخص نے عرض کی اے اللہ کے رسول مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اس کے ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد کرنے کے کیا معنی ہیں آنحضرت نے فرمایا اسے ظلم سے روک کر۔ اور آیت کریمہ :-

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ (۹-۳۰) اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں۔ میں عزیر ایک پیغمبر کا نام ہے۔

(ع ز ل)

اَلْاِعْتِزَالُ کے معنی ہیں کسی چیز سے کنارہ کش ہوجانا عام اس سے کہ وہ چیز کوئی پیشہ ہو یا کوئی بات وغیرہ ہو جس سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا جائے نیز وہ علیحدگی بذریعہ بدن کے ہو یا بذریعہ دل کے دونوں قسم کی علیحدگی پر بولا جاتا ہے عَزَلْتُهٗ وَاعْتَزَلْتُهٗ وَتَعَزَّلْتُهٗ میں نے اس کو علیحدہ کیا فَاعْتَزَلَ چنانچہ وہ علیحدہ ہوگیا۔ قرآن میں ہے :-

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (۱۸-۱۶) اور جب تم نے ان مشرکوں سے اور جن کی یہ خدا کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے کنارہ کرلیا۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ (۴-۹۰) پھر اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی کریں اور لڑیں نہیں۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۹-۴۸) اور میں تم سے اور جنکو تم خدا کے سوا پکارتے ہو کنارہ کرتا ہوں۔

فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ (۲-۲۲۲) سو... عورتوں سے کنارہ کش رہو۔ شاعر نے کہا ہے[3] (الکامل)

---

[1] ذہب ابو الطیب فی اضداده (۵۰۹) انہ من الاضداد یاتی بمعنی التعظیم والتعذیب عن الفراء یاتی بمعنی التعلیم ومنہ قول سعد بن ابی وقاص ثم جاءوا اهل الکوفة یعزرونی اللسان (عزر) والنہایہ ۳ (۴-۱۰) [2] متفق علیہ من حدیث انس و ذکرہ ابن حبان فی صحیحہ ۴ ، ۸ من حدیث ابن عمرو والدارمی وابن عساکر عن جابر والمستدرک والترمذی عن انس (راجع الفتح الکبیر للنبہانی (۱: ۲۸۰-۲۸۱) [3] قاله الاحوص بن محمد بن عاصم بن ابی الافلح حمی الدبر الانصاری فی قصیدة له یمدح فیہا عمر بن عبد العزیز وتمامہ ، عذرا لعذی دیہ الفؤاد موکل رنی المطیع عن حکمة محرمة فی اللسان والمحکم (عزل) انعزل بدل اتعزل والروایتین لہا محل والبیت فی الاغانی (۱۸: ۱۹۷) واللالی مع السمط ۲۵۹ والخزانة (۱: ۸۰۲) والثمار ۲۵۳ والمنتخبات (۱: ۱۸۵) وکنایات الجرجانی ۸۳ والشنتمری (۱: ۱۹۰) والعقد الفرید (۴: ۶۳) والیتیمة (۱: ۱۵۱) والمرزوقی ۳۵۹ واختلف فی عکمة لیدا شبع الکلام علیہ الاستاذ المیمنی فی السمط وجاد والقصة فی المعارف ۷۰ او تعلق بالبیت قصة المعدل مع المنصور راجع المعاہد والبیت تمثل بہ ابن المقفع وقدر بیت نامجوس فجر معتنا راجع الامالی للمرتضی (۱: ۱۳۵) ومحاضرات الادباء (۳: ۷۲) والخزانة (۱: ۲۸۰) ۲/۲ (۵۹) والحصری (۱: ۲۶۴) وانشدہ ایضا یحیی بن خالد کما فی الثمار ۲۵۳ والجاحظ العلاء وما الیہ ۳ ق ۱۵۳-۱۵۴

(٣١٠) يَا بَيْتَ عَاتِكَةَ الَّتِي اَتَعَزَّلُ
اے بیت عاتکہ جس میں کنارہ کش رہتا ہوں۔

اور آیت کریمہ:-
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (٢٦-٢١٢) وہ (آسمانی باتوں کے سننے) کے مقامات سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ گو اس سے پہلے شیاطین آسمان سے باتیں سن لیا کرتے تھے مگر اب انہیں سننے سے روک دیا گیا ہے۔

اَلْاَعْزَلُ (١) غیر مسلح (٢) چوپایہ جس کی دم ایک جانب جھکی ہوئی ہو (٣) بادل بغیر بارش کے۔
اَلسِّمَاكُ الْاَعْزَلُ ستارہ جو اکیلا طلوع کرتا ہے جیسا کہ غیر مسلح شخص ہوتا ہے مگر اس کے بالمقابل اَلسِّمَاكُ الرَّامِحُ اس ستارہ کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ دوسرا ستارہ ہوتا ہے جو اس کے لئے بمنزلہ نیزہ کے ہے۔

(ع ز م)

اَلْعَزْمُ وَالْعَزِيْمَةُ کسی کام کو قطعی اور حتمی طور پر کرنے کا ارادہ کرنا عَزَمْتُ الْاَمْرَ وَعَزَمْتُ عَلَيْهِ وَاعْتَزَمْتُ میں نے اس کام کو قطعی طور پر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ قرآن میں ہے:
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (٣-١٥٩) جب کسی کام کا عزم مصمم کر لو تو خدا پر بھروسہ رکھو۔
وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (٢-٢٣٥) اور ..... نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔
فَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (٢-٢٢٧) اور اگر طلاق کا ارادہ کر لیں۔
اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (٣١-١٧) بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔
وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (٢٠-١١٥) اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ پایا۔
یعنی جس بات کا انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی حفاظت کرنے اور اسے بجا لانے میں ثابت قدم نہ پایا۔
اَلْعَزِيْمَةُ ایک قسم کا گنڈہ اور تعویذ جس میں اس خیال سے گرہیں لگائی جاتی تھیں کہ گویا شیطان کو ایذا رسانی سے روک دیا گیا ہے عَزِيْمَةٌ کی جمع عَزَائِمُ آتی ہے۔

(ع ز و)

اَلْعِزَةُ۔ گروہ۔ جماعت۔ اس کی جمع بحالت رفعی میں عِزُوْنَ اور بحالت نصبی اور جری میں عِزِيْنَ (٧٠-٣٧) آتی ہے اور اس کے معنی ہیں جماعتیں جو متفرق ہوں اصل میں یہ عَزَوْتُهٗ فَاعْتَزٰى سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میں نے اسے منسوب کیا چنانچہ وہ منسوب ہو گیا گویا عِزَةٌ ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بلحاظ نسب یا بلحاظ مدد کے ایک دوسرے کی طرف منسوب ہوتے ہیں اسی سے اَلْاِعْتِزَاءُ فِي الْحَرْبِ ہے جس کے معنی کسی شخص کا لڑائی میں اپنا نسب بیان کرنا اور اَنَا ابْنُ فُلَانٍ وَصَاحِبُ فُلَانٍ کہنا یعنی یہ کہ میں فلاں کا بیٹا یا اس کا ساتھی ہوں مروی ہے (١) کہ مَنْ تَعَزّٰى بِعَزَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَعِضُّوْهُ بِهَنِ

له رواه الحاکم فی المستدرک وابن حبان فی زوائده ٦٣٧ بحذف لفظ "بهن ابيه" والطبرانی والضیاء والترمذی عن ابی والرؤیانی فی الافراد وراجع کنز العمال ج ١ رقم ٢٩٢/٣٩٣، ٣٠٤ وغریب ابی عبید ١/٣٠١ والاحادیث فی ذم التفاخر بالآباء کثیرة ؞

اَبِیۡہٖ یعنی جو شخص اہل جاہلیت کی طرح اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرے اسے کہو کہ اپنے باپ کا مقام ستر کاٹ کھلئے۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عِزِیۡنَ کا لفظ عَزَا عَزَاءً فَھُوَ عِزٌ سے مشتق ہے جس کے معنی صبر و تسلی حاصل کرنے کے ہیں اس اعتبار سے عِزَۃٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد ایک دوسرے سے تسلی حاصل لیتے ہوں۔

(ع س س)

اَلْعَسْعَسَۃُ وَالْعِسَاسُ کے معنی تاریکی ہلکی ہونے کے ہیں یہ کیفیت رات کی دونوں طرفوں میں ہوتی ہے یعنی جب رات آنے والی ہو یا جانے والی ہو اس لئے آیت کریمہ :۔

وَالَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ (۸۱-۱۷) میں عَسۡعَسَ کے معنی رات کے آنے اور جانے دونوں ہو سکتے ہیں۔

اَلْعَسُّ وَالْعَسَسُ رات کے وقت مشتبہ لوگوں کی تلاش میں پھرنا کے ہیں اور رات کے وقت پہرہ دینے والے آدمی کو عَاسٌ یا عَسَّاسٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع عُسَسٌ ہے مثل مشہور ہے[۱] :

کَلْبٌ عَسَّ خَیۡرٌ مِنۡ اَسَدٍ رَبَضَ یعنی رات کے وقت شکار کی تلاش کرنے والا کتا بیٹھ رہنے والے شیر سے بہتر ہے۔

اَلْعَسُوۡسُ وہ عورت جو رات کو بدمعاشی کے لئے پھرتی رہتی ہو۔ اَلْعُسُّ بڑا پیالہ جمع عِسَاسٌ ۔

(ع س ر)

اَلْعُسْرُ کے معنی تنگی اور سختی کے ہیں یہ یُسۡرٌ (آسانی فارغ البالی) کی ضد ہے قرآن میں ہے :۔

فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ۔ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا (۹۴-۵،۶) یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اَلْعُسْرَۃُ تنگ دستی، تنگ حالی۔ قرآن میں ہے :۔

فِیۡ سَاعَۃِ الۡعُسۡرَۃِ (۹-۱۱۷) مشکل کی گھڑی میں۔

وَاِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ (۲-۲۸۰) اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو۔

اور اَضَاقَ فُلَانٌ کی طرح اَعْسَرَ فُلَانٌ کے معنی ہیں وہ مفلس اور تنگ حال ہو گیا تَعَاسَرَ الْقَوْمُ لوگوں نے معاملہ کو الجھانے کی کوشش کی قرآن میں ہے :۔

وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَہٗۤ اُخۡرٰی (۶۵-۶) اور اگر باہم ضد (اور نا اتفاقی) کرو گے تو بچے کو اس کے (باپ کے) کہنے سے کوئی اور عورت دودھ پلائے گی۔

یَوۡمٌ عَسِیۡرٌ سخت دن۔ قرآن میں ہے :۔

وَکَانَ یَوۡمًا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ عَسِیۡرًا (۲۵-۲۶) اور وہ دن کافروں پر (سخت) مشکل ہوگا۔

یَوۡمٌ عَسِیۡرٌ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ غَیۡرُ یَسِیۡرٍ (۷۴-۹-۱۰) مشکل کا دن (یعنی) کافروں پر آسان نہ ہوگا۔

عَسَرَنِی الرَّجُلُ تنگدستی کے وقت کسی چیز کا مطالبہ کرنا۔

(ع س ل)

اَلْعَسَلُ شہد کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

---

[۱] راجع للمثل المیدانی رقم ۳۴۹۳ و الاتباع لابی الطیب ۷۸ و فیہ من کلب بدل من اسد و المثل یقال للحث علی الکسب ۔

مِنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى (۴۷-۱۵) صاف کردہ شہد کی....

اور کنایہ کے طور پر جماع کو عُسَيْلَةٌ کہا جاتا ہے حدیث میں ہے (۴۴)[1] حَتّٰى تَذُوْقِیْ عُسَيْلَتَهٗ وَيَذُوْقَ عُسَيْلَتَكِ جب تک تم دونوں ایک دوسرے سے جماع کی لذت حاصل نہ کرلو (اس وقت تک پہلے خاوند سے نکاح کی اجازت نہیں ہے)

اَلْعَسَلَانُ نیزے کا مضبوط ہونا، دوڑ کے وقت اعضا کا ہلنا عام طور پر اَلْعَسَلَانُ کا لفظ بھیڑیے کی تیز رَوی کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ مَرَّ يَعْسِلُ وَيَنْسِلُ بھیڑیا تیزی سے دوڑتا ہوا گزرا۔

(ع س ی)

عَسٰى[2] کے معنی توقع اور امید ظاہر کرنا کے ہیں۔ اکثر مفسرین نے قرآن پاک میں اس کی تفسیر لازم معنی یعنی یقین سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں طمع اور رجا کا استعمال صحیح نہیں ہے مگر یہ ان کی کوتاہ نظری ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں قرآن میں عسیٰ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کا تعلق انسان کے ساتھ ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لہٰذا آیت کریمہ:۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ (۷-۱۲۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے امید رکھو کہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اسی طرح فرمایا:۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ (۵-۵۲) سو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ (۶۶-۵) اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دیں تو عجب نہیں کہ ان کا پروردگار

وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲-۲۱۶) مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ (۴۷-۲۲) تم سے عجب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ۔

هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ...... (۲-۲۴۶) کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو عجب نہیں.......

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (۴-۱۹) اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔

اَلْمُعْسِيَانُ شتر مادہ جس کا دودھ منقطع ہو گیا ہو اور اس کے لوٹ آنے کی امید ہو۔

عَسَى الشَّيْءُ يَعْسُوْ کسی چیز کا سخت ہو جانا۔

عَسَى اللَّيْلُ يَعْسُوْ رات کا تاریک ہو جانا۔

(ع ش ر)

اَلْعَشَرَةُ دس اَلْعُشْرُ دسواں حصہ

اَلْعِشْرُوْنَ بیسواں اَلْعِشْرُ (مویشیوں کا دسویں دن پانی پر وارد ہونا) قرآن میں ہے:۔

---

[1] قال صلی اللہ علیہ وسلم لامرأۃ رفاعۃ حین طلقہا ثلاثا وتزوجت عبدالرحمن بن الزبیر والحدیث فی السنۃ وایضا الشافعی فی الرسالۃ رقم ۴۴۹ بتحقیق احمد شاکر وعلام ۵/۲۲۹ واختلاف الحدیث ۴۳ علی ہامش الجزء السابع من الام وایضا المجازات النبویۃ للشریف الرضی (۲۸۲-۲۸۳)

[2] کلمۃ عسیٰ عند العلماء من الاضداد وقال ابن عباس ہی واجبۃ من اللہ انظر اضداد ابی الطیب ۴۸۷ ولیعلم ایضا ان کل ما فی القرآن من عسیٰ علی وجہ الخبر فہو موحد علی تاویل عسیٰ الامر کذا وما کان علی الاستفہام فانہ یجمع کما فی الآیات ثم الافصح ان یکون بعدہا "ان" وبما لم یکن علی عکس کا وفانہ الافصح فیہ عدم کون "ان" راجع للبحث الصاحبی ۱۵۰ وابن ہشام (۱۶۴-۱۶۵)

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ (۲-۱۹۶) یہ پوری دس ہوئے
عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ (۸-۶۵) بیس آدمی ثابت قدم۔
تِسْعَةَ عَشَرَ (۷۴-۳۰) انیس (داروغے)
عَشَرَتُهُمْ اَعْشُرُهُمْ میں ان میں دسواں بن گیا عَشَرَهُمْ ان سے عُشْر یعنی مال کا دسواں حصہ وصول کیا۔
عَشَرْتُهُمْ میں نے ان کے مویشی دس بنا دیئے یعنی پہلے نو تھے ان میں ایک اور شامل کرکے دس بنا دیا مِعْشَارُ الشَّيْءِ دسواں حصہ۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَا اٰتَيْنٰهُمْ (۳۴-۴۵) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا تھا یہ اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے۔
نَاقَةٌ عَشَرَاءُ دس ماہ کی حاملہ اونٹنی اس کی جمع عِشَارٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۸۱-۴) اور جب دس ماہ کی گابھن (حاملہ) اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی۔
جَاؤُا عُشَارٰى وہ دس دس افراد پر مشتمل ٹولیاں بن کر آئے۔
اَلْعُشَارِيُّ ہر وہ چیز جو دس ہاتھ لمبی ہو۔
اَلْعِشْرُ اونٹوں کو پانی نہ پلانے کی مدت (نو دن)
اِبِلٌ عَوَاشِرُ نو دن کے پیاسے اونٹ۔
قِدْرٌ اَعْشَارٌ ٹوٹا ہوا پیالہ دراصل اَعْشَارٌ کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جو ٹوٹ کر دس ٹکڑے ہو گیا ہو اسی سے شاعر نے بطور استعارہ کہا ہے (الطویل)

(۳۱۱) بِسَهْمَيْكِ فِيْ اَعْشَارِ قَلْبٍ مُّقَتَّلٖ
تم اپنی (نگاہوں) کے دونوں تیر میرے شکستہ دل کے ٹکڑوں پر دے مارنا چاہتی ہو
اَلْعَشُوْرُ کے معنی گدھے کی آواز کے ہیں کیونکہ گدھا جب آواز کرتا ہے تو دس مرتبہ آواز کرتا ہے
اَلْعَشِيْرَةُ انسان کے باپ کی طرف سے قریبی رشتہ دار پر مشتمل جماعت کیونکہ ان سے انسان کثرت عدد حاصل کرتا ہے۔ گویا وہ اس کے لئے بمنزلہ عدد کامل کے ہیں کیونکہ عَشَرَةٌ کا عدد ہی کامل ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ (۹-۲۴) اور عورتیں اور خاندان کے آدمی۔
لہٰذا عَشِيْرَةٌ انسان کے رشتہ داروں کی اس جماعت کا نام ہے جن سے انسان کثرت (وقوت) حاصل کرتا ہے۔ عَاشَرْتُهُ کے معنی ہیں کہ میں رشتہ دامادی میں اس کے لئے بمنزلہ عَشَرَة کے ہو گیا۔ قرآن میں ہے:۔
وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۴-۱۹) اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔
اَلْعَشِيْرُ مل کر رہنے والا خواہ رشتہ دار ہو یا اجنبی۔

ع ش و (ی)

اَلْعَشِيُّ زوال آفتاب سے لے کر طلوع فجر تک کا وقت قرآن میں ہے:۔
اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (۷۹-۴۶) گویا دنیا میں

---

[1] قال امرؤ القیس فی لامیتہ المشہورۃ صدرہ:۔ وما ذرفت عیناک الا لتضربی۔ شرح المعلقات لابن الانباری رقم ۲۲ والتبریزی ۲۲ واللسان والمحکم (عشر قتل) والمحاضرات ۲/۹۱ ودیوانہ ۲۶ والعقد الثمین ۱۴۷ والصناعتین ۲۵۶ ومختار الشعر الجاہلی۔ والجمہرۃ للقرشی ۵۰/۴ والعمدۃ (۱: ۲۷۷) وفیہ لتقدحی بدل لتضربی فی باب التمثیل وقیل ان امرؤ القیس اول من ابتکرہ ولعل یات اعلم منہ ۱۲

صرف ایک شام یا صبح رہے تھے۔
اَلْعِشَاءُ (ممدود) مغرب سے عشاء کے وقت تک اور مغرب اور عشاء کی نمازوں کو اَلْعِشَاءَانِ کہا جاتا ہے اور اَلْعِشَا (رتوندی) تاریکی جو آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے رَجُلٌ اَعْشٰی جسے رتوندی کی بیماری ہو اس کی مؤنث عَشْوَاءُ آتی ہے۔ مثل مشہور ہے[1] (   )
هُوَ يَخْبِطُ خَبْطَ عَشْوَاءَ وہ اندھی اونٹنی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے یعنی بلا سوچے سمجھے معاملات سرانجام دیتا ہے۔ عَشَوْتُ النَّارَ میں نے رات کو آگ کا قصد کیا۔
عُشْوَةٌ (بروزن شُعْلَةٌ) آگ کا شعلہ جو رات کے وقت دور سے دکھائی دے عَشِیَ عَنْ کَذَا کسی چیز سے آنکھیں بند کرلینا۔ اندھا ہوجانا قرآن میں ہے:۔
وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ (۴۳-۳۶)
اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کرے۔
اَلْعَوَاشِیْ رات کو چرنے والے اونٹ اور اس کا واحد عَاشِيَةٌ ہے اسی سے کہا گیا ہے[2] (مثل)
اَلْعَاشِيَةُ تُهَيِّجُ الْاٰبِيَةَ کہ رات کو چرنے والا اونٹ نہ چرنے والے کو رغبت دلاتا ہے یعنی جو اونٹ چارہ نہ کھاتا ہو وہ بھی اسے دیکھ کر چرنے لگ جاتا ہے۔
اَلْعَشَاءُ شام کا کھانا اَلْعِشَاءُ (بکسر العین) عشاء کی نماز تعشیت میں نے رات کا کھانا کھایا عَشَّيْتُهُ اسے رات کا کھانا کھلایا مشہور ہے:۔
عَشِّ وَلَا تَغْتَرَّ یعنی رات کو اپنے اونٹ چرا لو تو غافل نہ رہو۔

(ع ص ب)

اَلْعَصَبُ کے معنی بدن کے پٹھے جو جوڑوں کو ملائے ہوئے ہیں لَحْمٌ عَصِبٌ بہت پٹھوں والا گوشت۔
اَلْمَعْصُوْبُ دراصل لوہے کو کہتے ہیں جو پٹھے (کی تانت) کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ پھر عام مضبوطی کے ساتھ باندھنے پر عَصَبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے اہل عرب کہتے ہیں[3]
لَاَعْصِبَنَّكُمْ عَصْبَ السَّلِمَةِ میں تمہیں سلمہ درخت کی طرح باندھ کر چھوڑوں گا۔
فُلَانٌ شَدِيْدُ الْعَصَبِ مَعْصُوْبُ الْخَلْقِ فلاں کے جوڑ بند مضبوط ہیں يَوْمٌ عَصِيْبٌ سخت دن یہاں عَصِيْبٌ کے معنی ہیں سخت یہ بمعنی فاعل بھی ہوسکتا ہے اور بمعنی مفعول (مَعْصُوْبٌ) بھی گویا اس کے بدن کے اطراف کو یکجا کر کے رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے جس میں وہ گھرے ہوئے ہیں اور نجات کی صورت نظر نہیں آتی جیسا کہ سخت دن کو كَفَّةٌ حَابِلٍ یا حَلْقَةٌ خَاتَمٍ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

---

[1] يضرب المثل للمتهافت فی الشیئ المیدانی ۲/ ۴۱ م [2] قاله زيد بن سهيم الشيبانی انظر المثل والخبر المیدانی رقم ۱۱۷/ ۲۲۱ ۴۰۹/ ۲ وفيه خبر طويل والحيوان ۵/ ۱۲۲ وعيون الاخبار (۳: ۲۲۵) والمسان (۱۱) الجمهرة للعسكری ۵/ ۱ ومعناه ان دارات الآبية التی تتعفى اصاحتها الرعی نزعت معها [3] قاله الحجاج حين خطب الناس بالكوفة اللسان (عصب) وفی المیدانی (۲/ ۲۹) قاله زيد بن سهيم الشيبانی وفيه خبر طويل قال المیدانی ۲/ ۱۷ يضرب للبخيل يستخرج منه الشئی على كره وفی الكامل ۹۷- ۴/ ۱۳۵ لاخزم منكم حزم السلمة وايضا راجع ابی الطيب ۵۰۲ والعقد الفريد ۴/ ۹۱ وعيون الاخبار ۲/ ۲۴۲ وصبح الاعشیٰ والخطبة بطولها فی البيان والتبيين (۲/ ۳۰۸-۳۱۰)

اَلْعُصْبَۃُ وہ جماعت جس کے افراد ایکدوسرے کے حامی اور مددگار ہوں۔ قرآن میں ہے :۔

تَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَۃِ (۲۸-۷۶) ایک طاقتور جماعت (کو) اٹھانی مشکل ہوتیں۔

وَنَحْنُ عُصْبَۃٌ (۱۲-۸) حالانکہ ہم جماعت (کثیر) کی جماعت) ہیں۔

یعنی ہم باہم متفق ہیں اور ایک دوسرے کے یار و مددگار اِعْصَوْصَبَ الْقَوْمُ لوگ مجتمع ہو گئے عَصَبُوْا بِہٖ۔ اس کا احاطہ کر لیا۔

عَصَبَ الرِّیْقُ بِفَمِہٖ اس کے منہ میں تھوک خشک ہو گئی اور بول نہ سکا گویا اس کی زبان کو تانت کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔

عَصْبٌ ایک قسم کی یمنی منقش چادر۔

اَلْعِصَابَۃُ کے معنی پٹی یا پگڑی کے ہیں تَعَمَّمَ کی طرح اِعْتَصَبَ کے معنی بھی پگڑی باندھنا آتے ہیں۔

اَلْمَعْصُوْبُ اونٹنی کہ جب تک اس کے پاؤں باندھ کر اسے نہ دوہا جائے دودھ نہ دے۔

اَلْعَصِیْبُ پھیپھڑا کیونکہ وہ بھی انتڑیوں کے ساتھ لپٹا ہوتا ہے۔

(ع ص ر)

اَلْعَصْرُ یہ عَصَرْتُ الشَّیْءَ کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں نچوڑنا اَلْمَعْصُوْرُ وہ چیز جسے نچوڑا گیا ہو اَلْعُصَارَۃُ شیرہ جو نچوڑ کر نکال لیا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے :۔

اِنِّیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا (دیکھتا کیا ہوں) کہ شراب (کے لئے انگور) نچوڑ رہا ہوں۔

وَفِیْہِ یَعْصِرُوْنَ (۱۲-۴۹) اور لوگ اس میں رس نچوڑیں گے۔

یعنی اس میں خیر و برکت حاصل ہوگی۔ ایک قرأت میں یُعْصَرُوْنَ ہے یعنی اس سال خوب بارش ہوگی اِعْتَصَرْتُ مِنْ کَذَا کے معنی کسی چیز سے خیر و برکت حاصل کرنا کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (السریع)

(۳۱۲) وَاِنَّمَا الْعَیْشُ بِرُبَّانِہٖ
وَاَنْتَ مِنْ اَفْنَانِہٖ مُعْتَصِرُ

زندگی کا لطف تو اٹھتی جوانی کے ساتھ ہے جب کہ تم اس کی شاخوں سے رس نچوڑتے ہو۔

اور آیت کریمہ :۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (۷۸-۱۴) اور نچوڑنے والے بادلوں سے موسلادھار مینہ برسایا۔

میں مُعْصِرَات سے مراد بادل ہیں جو پانی نچوڑتے یعنی گراتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مُعْصِرَات ان بادلوں کو کہا جاتا ہے جو اَعْصَارٌ کے ساتھ آتے ہیں اور اِعْصَار کے معنی ہیں گرد و غبار والی تند ہوا۔ قرآن میں ہے۔

فَاَصَابَہَآ اِعْصَارٌ (۲-۲۶۶) تو (ناگہاں) اس باغ پر ..... بگولا چلے۔

اَلْاِعْتِصَارُ کے معنی کسی چیز کو دبا کر اس سے رس نچوڑنے کے ہیں اسی سے عُصْرٌ وَعَصَرٌ ہے۔ جس کے معنی جائے پناہ کے ہیں اَلْعَصْرُ وَالْعِصْرُ

---

[1] قالہ ابن احمر فی الثعالبی ۱۸ الحمس، واللسان غیر لمتقفر بدل معتصر ورباں العیش حدثانہ او اوائلہ والبیت فی اللسان (ربب) والمحکم (عصر) والحمس ۹/۱۲۹ والمعانی للقتیبی ۷۶۶ والسمط ۵۵۵ والثعالبی (۱: ۲۴۲) وابن درید (۱: ۲۷۷) وخصائص ابن جنی (۱: ۲۲۴) قال البکری معناہ انما الصبا والعیش باولہ وجدتہ ازمان انت معتصر من افنانہ وقبلہ وہو اول الشعر: قد بکرت عاذلتی بکرۃ۔ تزعم انی بالصبا مشتہر ۱۲

وقت اور زمانہ اس کی جمع عُصُوْرٌ ہے قرآن میں ہے۔
وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳-۱، ۲)
زمانہ کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے۔
اَلْعَصْرُ کے معنی اَلْعَشِیُّ بھی آتے ہیں یعنی زوال آفتاب سے غروب شمس تک کا زمانہ اسی سے صَلٰوۃُ الْعَصْرِ (نماز عصر) ہے۔ اَلْعَصْرَانِ صبح شام رات دن، اور یہ اَلْقَمَرَانِ کی طرح ہے جس کے معنی ہیں چاند اور سورج اَلْمُعْصِرُ وہ عورت جسے حیض آجائے اور جوانی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔[1]

(ع ص ف)

اَلْعَصْفُ وَالْعَصِیْفَۃُ کھیتی کے پتے جو کاٹ لئے جاتے ہیں نیز خشک نباتات جو ٹوٹ کر چورہ چورہ ہو جائے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ (۵۵-۱۱) اور اناج چھلکے کے اندر ہوتا ہے۔
کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ (۱۰۵-۵) جیسے کھایا ہوا بھس ہو۔
رِیْحٌ عَاصِفٌ وَعَاصِفَۃٌ وَمُعْصِفَۃٌ تند ہوا جو ہر چیز کو توڑ کر بھس کی طرح بنا دے اور مجازاً عَصَفَتْ بِھِمُ الرِّیْحُ کے معنی ہیں وہ ہلاک اور برباد ہو گئے

(ع ص م)

اَلْعَصْمُ کے معنی روکنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔
لَاعَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ (۱۱-۴۳)
آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں۔ بعض نے لَاعَاصِمَ کے معنی لَامَعْصُوْمَ بھی کئے ہیں[2] یعنی آج اللہ کے حکم سے کوئی بچ نہیں سکے گا اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ عربی زبان میں عَاصِم بمعنی مَعْصُوْم آجاتا ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ عَاصِم اور مَعْصُوْمٌ لازم ملزوم ہیں یعنی ایک کا حصول دوسرے کے حصول کو مستلزم ہے۔ اس لئے لفظ عاصم بول کر معصوم مراد لیا گیا ہے۔
مَالَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ (۱۰-۲۷) اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا۔
اَلْاِعْتِصَامُ کسی چیز کو پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا قرآن میں ہے۔
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (۳-۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا
وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ (۳-۱۰۱) اور جس نے خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑ لیا۔
اِسْتَعْصَمَ وہ باز رہا گویا اس نے ایسی چیز طلب کی جس کے ذریعہ برائی کے ارتکاب سے بچ جائے لہٰذا فَاسْتَعْصَمَ (۱۲-۳۲) کے معنی ہیں اس نے ایسی چیز تلاش کی جو برائی کے ارتکاب سے اس کی حفاظت کرے بچالے اور آیت کریمہ:۔
وَلَا تُمْسِکُوْا بِعِصَمِ الْکَوَافِرِ (۶۰-۱۰) میں عِصَمٌ کا واحد عِصْمَۃٌ ہے اور عِصْمَۃٌ کے معنی عقد نکاح کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہیں

[1] وفی الفائق ۲/۹۷ عن ابن عباس: کان وجہہ اذ قدم لم تبق معصر الا خرجت الیہ لانہ کان مفرط الجمال ۱۲

[2] وقد عدہ العلماء من الاضداد ۶-۵۰

جو عورتیں مسلمان نہیں ہونا چاہتیں انہیں مت روکو بلکہ عقد نکاح سے آزاد کردو۔

اَلْعِصَامُ مشک کی رسی یا تسمہ جس کے ساتھ اس کا منہ باندھا جاتا ہے اور عِصْمَةُ الْاَنْبِيَاءِ کے معنی انبیاء کی حفاظت کے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے انبیاء کی حفاظت کی ہے۔ اول یہ کہ ان کو صاف شفاف جوہر سے پیدا کیا دوم انہیں جسمانی اور روحانی فضائل سے آراستہ کیا سوم ان کی مدد کی انہیں استقلال بخشا ان پر اپنی طرف سے سکینت نازل کی ان کے دلوں کی حفاظت کی اور انہیں اپنی توفیق خاص سے نوازا قرآن میں ہے:۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵-۶۷) اور خدا تم کو لوگوں سے بچا رکھے گا۔

اَلْعِصْمَةُ بازو بند کے مثل ایک قسم کا حلقہ

اَلْمِعْصَمُ کلائی اور بازو بند کی مناسبت سے جانور کی کلائی کی سفیدی کو بھی عِصْمَةٌ[1] کہا جاتا ہے جیسا کہ اس کے پاؤں کی سفیدی کو اِلتَّحْجِيْل کہہ دیا جاتا ہے اسی معنی کے لحاظ سے بز کوہی کو غُرَابٌ اَعْصَمُ کہتے ہیں کیونکہ اس کے پہنچے سفید ہوتے ہیں اور باقی تمام بدن سیاہ یا سرخ ہوتا ہے۔

ع ص و (ی)

اَلْعَصَا (لاٹھی) یہ اصل میں ناقص واوی ہے کیونکہ اس کا تثنیہ عَصَوَانِ اور جمع عِصِيٌّ آتی ہے عَصَوْتُهُ میں نے اسے لاٹھی سے مارا عَصَيْتُ بِالسَّيْفِ تلوار کو لاٹھی کی طرح دونوں ہاتھ سے پکڑ کر مارا۔ قرآن میں ہے:۔

اَلْقِ عَصَاكَ (۷-۱۱۷) اپنی لاٹھی ڈال دو۔

فَاَلْقٰی عَصَاهُ (۷-۱۰۷) موسیٰ نے اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دی۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ (۲۰-۱۸) انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ (۲۰-۶۶) تو انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں۔

اَلْقٰی فُلَانٌ عَصَاهُ کسی جگہ پر پڑاؤ ڈالنا کیونکہ جو شخص سفر سے واپس آتا ہے وہ اپنی لاٹھی ڈال دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[2]

(۳۱۳) وَاَلْقَتْ عَصَاهَا وَاسْتَقَرَّ بِهَا النَّوٰی

(فراق نے اپنی لاٹھی ڈال دی اور جم کر بیٹھ گیا)۔

عَصٰی عِصْيَانًا کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں دراصل اس کے معنی ہیں اس نے

---

[1] وفی الحدیث ذکر المختالات المتبرجات قال رسول اللہ لا یدخل الجنة منهن الا مثل الغراب الاعصم ای الغالیۃ لنا در وفی آخرہ المرأۃ الصالحة مثل الغراب الاعصم (راجع الفائق والنهایہ (عصم)

[2] قالہ معقر بن اوس بن حمار البارقی وتمامہ: کما قر عینا بالایاب المسافر، فی المطبوع واستقرت والتصویب من المراجع والبیت فی التاج والصحاح والمحکم (عصی) من قصیدتہ المختارۃ وراجع للبیت المحاضرات للمؤلف (۲۸ ار۴: ۹ ۱۴) والمتولف ۱۲۸ ودایت فی طراز المجالس للخفاجی ۱۱۳ البیت. لراشد بن عبد ربہ قال وکان من شعراء الصحابۃ ومن شعرہ قصیدۃ اولہا: صحا القلب عن سلمی واقصر شأوہ ۔ وردت علیہ ما نفقتہ تماضر ۔ ثم فی الکتاب نفسہ ۴۸ نسبہ الخفاجی الی معقر بن الحارث البارقی وکذا فی العقد ۲: ۲۰۳، ۵۲ البیت معزو الی راشد والصواب انہ للمعقر راجع العقد (۳: ۴-۶۵) والاشتقاق ۴۸۱ والبیت ایضا فی تاریخ الطبری (۴: ۱۱۵/۲: ۲۶۲) وقالہ ای عائشۃ تمثلت بہ عندما بلغہا قتل علی (راجع المعجم) وتمثل بہ المنصور حینما بلغہ خبر ہزیمۃ ابراہیم وفی المیدانی ۲: ۲۰۷ لما بویع ابو العباس بالخلافۃ قام خطیبا فسقط القضیب من یدہ فتطیر فقام رجل فاخذ القضیب ودفعہ الیہ وانشد البیت وترجمۃ الشاعر فی الخزانۃ (۲: ۲۹۱) :

لاٹھی (عصا) سے اپنا بچاؤ کیا۔ قرآن میں ہے:۔
وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (۲۰-۱۲۱) اور آدم نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو (وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۴-۱۴) اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔
آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ (۱۰-۹۱) (جواب ملا کہ) اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا۔
اور اس شخص کے متعلق جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے کہا جاتا ہے فُلَانٌ شَقَّ الْعَصَا۔

(ع ض ض)

اَلْعَضُّ: کسی چیز کو دانت سے پکڑ لینا یا کاٹنا قرآن میں ہے:۔
عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (۳-۱۱۹) تم پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ (۲۵-۲۷) اور جس دن (ناعاقبت اندیش) ظالم اپنے ہی ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائیگا۔
میں ندامت سے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام پر انتہا درجہ پشیمان ہوتا ہے تو دانت سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگتا ہے۔
اَلْعُضُّ: کھجور کی گٹھلی، خاردار جھاڑی جسے اونٹ کھاتے ہیں۔
اَلتَّعَاضُّ: جانوروں کا ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنا۔ رَجُلٌ مِعَضٌّ اپنے کام میں نہایت کوشش کرنے والا آدمی۔ گویا وہ اسے دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی یہ لفظ بطور تعریف استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مذمت۔
هُوَ عِضٌّ سَفَرٍ وہ سفر پر بہت قدرت رکھتا ہے۔
هُوَ عِضٌّ فِي الْخُصُوْمَةِ وہ جھگڑنے میں نہایت فصیح اور سخنور ہے۔
زَمَنٌ عَضُوْضٌ خشک سال۔
اَلْعُضْعُوْضُ ایک قسم کی کھجور جو دشواری کے ساتھ چبا کر کھائی جاتی ہے۔

(ع ض د)

اَلْعَضُدُ (بازو) ہاتھ کا کہنی سے لیکر کندھے تک کا حصہ عَضَدْتُهٗ میں نے اس کے بازو پر مارا اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے:۔
عَضَدْتُ الشَّجَرَ بِالْمِعْضَدِ میں نے ہنسیا سے درخت کو کاٹا جَمَلٌ عَاضِدٌ نر شتر جو مادہ کے بازو کو پکڑ کر جفتی کرنے کے لئے اسے بٹھا لیتا ہے اور عَضَدْتُهٗ کے معنی کسی کا بازو پکڑنے اور اسے سہارا دینے کے ہیں اور یَدٌ کی طرح بطور استعارہ عَضُدٌ کا لفظ بھی مددگار کے معنی میں آجاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (۱۸-۵۱) اور میں ایسا نہیں تھا کہ گمراہ کرنیوالوں کو مددگار بناتا۔
رَجُلٌ اَعْضَدُ پتلے بازو کا آدمی عُضِدَ بازو کے درد میں مبتلا ہونا مُعَضَّدٌ وہ آدمی جس کے بازو پر نشان ہو ایسے نشان کو عِضَادٌ کہا جاتا ہے اور مِعْضَدٌ کے معنی بازو بند کے ہیں۔ اَعْضَادُ الْحَوْضِ حوض کے جوانب (میں جو پشتہ اس کی حفاظت کے لئے بنا دیا جاتا ہے) جو اس کے لئے بازو کا کام دیتے ہیں۔

(ع ض ل)

اَلْعَضَلَةُ پٹھا جس کے ساتھ سخت گوشت ہو رَجُلٌ عَضِلٌ وہ شخص جو گوشت سے گٹھا ہوا ہو عَضَلْتُهٗ میں نے اسے عَضَلٌ یعنی پٹھے کی تانت کے ساتھ باندھ دیا جیسا کہ عَصَبْتُهٗ اس کے بعد مجازاً یہ لفظ "سختی سے روک دینا" کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (۲-۲۳۲) تو ان کو دوسرے شوہروں کے ساتھ ...... نکاح کرنے سے مت روکو۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس کے مخاطب ان کے پہلے خاوند ہیں اور بعض نے اولیاء یعنی سرپرست مراد لئے ہیں اور سختی میں عَضَلَة کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے عَضَّلَتِ الدَّجَاجَةُ بِبَيْضِهَا مرغی پر انڈہ دینا دشوار ہوگیا عَضَّلَتِ الْمَرْأَةُ بِوَلَدِهَا عورت زچگی کی تکلیف میں مبتلا ہوگئی۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۱۴) تَرَى الْاَرْضَ مِنَّا بِالْفَضَاءِ مَرِيْضَةً
مُعَضِّلَةً مِنَّا بِجَمْعٍ عَرَمْرَمٍ

زمین ہمارے لشکر جرار کی وجہ سے اس عورت کی طرح بے چین نظر آتی ہے جو زچگی کے مرض میں مبتلا ہو۔

دَاءٌ عُضَالٌ لاعلاج مرض جس سے شفایاب ہونا مشکل ہو اَلْعُضْلَةُ بڑی مصیبت۔

(ع ض ہ و)

اَلْعِضَةُ کے معنی چیز کا ٹکڑا کے ہیں اس کی جمع عِضُوْنَ وَعِضِيْنَ ہے جیسا کہ ثُبَةٌ اور ظُبَةٌ کی جمع ثُبُوْنَ وَظُبُوْنَ آتی ہے[2]۔ اسی سے اَلْعُضْوُ وَالْعِضْوُ ہے جس کے معنی بدن کا ایک حصہ یا ٹکڑا کے ہیں اور عَضَّيْتُهٗ تَعْضِيَةً کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اعضا کو کاٹ کر الگ الگ کر دینا۔ الکسائی فرماتے ہیں کہ عِضَةٌ کی اصل عُضْوٌ بھی ہو سکتی ہے اور عِضَةٌ بھی جس کے معنی جادو کے ہیں[3]۔ لہذا بعض کے نزدیک عِضَةٌ کی اصل بھی عِضْهَةٌ ہی ہے کیونکہ اس کی تصغیر عُضَيْهَةٌ آتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل عِضْوَةٌ ہے کیونکہ اس کا تثنیہ عِضَوَانِ آتا ہے ایک روایت میں ہے[4] (۲۱۴) لَا تَعْضِيَةَ فِي الْمِيْرَاثِ کہ ترکہ کی تقسیم کے وقت ایسی چیز کو کاٹ کر تقسیم نہ کیا جائے جس کے کاٹنے سے وارثوں کو نقصان پہنچتا ہو مثلاً تلوار وغیرہ کہ اسے کاٹ کر دو ٹکڑے نہ کئے جائیں۔ قرآن میں ہے:۔ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ (۱۵-۹۱) انہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یعنی کسی نے

---

[1] قالہ اوس بن حجر والبیت فی اللسان والحکم (عضل) والسمط ۸۱۴ والمیدانی (۲: ۲۳) والمعانی للقتبی ۸۹ والشعراء ۱۰۱ والخزانۃ (۳: ۴۹۵) والبیت ایضاً من کلمۃ فی دیوانہ ۲۷ ومجموعۃ المعانی ۸۶ وتہذیب الالفاظ ۴۷۹، ۴۴۲ [2] وکذا ثبۃ جمعہ ثبین (الطبری ۱۴/ ۶۵) [3] ومنہ فی الحدیث لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العاضہۃ والمستعضہۃ اللسان (عضہ) [4] راجع للحدیث الفائق (۲/ ۱۸) والنہایۃ (عضی) وتمامہ الا ما حمل القسم رواہ البیہقی عن ابی بکر بن حزم مرسلاً وراجع کنز العمال ج ۱۱ رقم ۳۰۳۳ ولمعنی الحدیث غریب ابی عبید (

کہا کہ جادو ہے بعض نے اسے پہلے لوگوں کی کہانیاں اور قصے وغیرہ کہا[1] بعض مفسرین نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ انہوں نے بعض باتیں مان لیں اور بعض کا انکار کر دیا جس کی طرف کہ آیت اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (۲-۸۵) میں اشارہ پایا جاتا ہے[2] کہ الکتاب کے کچھ حصہ کو مانتے ہو اور اس کے کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو چنانچہ ایسے لوگوں کے بالمقابل مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

تُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتٰبِ کُلِّہٖ (۳-۱۱۹) کہ تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔

(ع ط ف)

اَلْعَطْفُ (ن) کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کا ایک سرا دوسرے کی طرف موڑ دیا جائے مثلاً رسی، درخت کی ٹہنی وغیرہ کو دوہرا کرنے کو عَطْفٌ کہا جاتا ہے اور عِطَافٌ کے معنی دو نہوں والی چادر کے ہیں۔

عِطْفَا الْاِنْسَانِ انسان کے دونوں پہلو یعنی سر سے لے کر سرین تک کے دونوں جانب کیونکہ بدن کے اس حصہ کو آسانی سے موڑا جا سکتا ہے ثَنَیٰ عِطْفَہٗ کے معنی ہیں اعراض کرنا اور دور ہونا جیسا کہ نَاٰی بِجَانِبِہٖ وَصَعَّرَ بِخَدِّہٖ وغیرہ محاورات ہیں جب یہ لفظ عَلٰی کے واسطہ سے متعدی ہو تو اس کے معنی کسی پر مائل ہونے اور شفقت کرنا آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: عَطَفَ عَلَیْہِ وَثَنَاہُ عَاطِفَۃٌ رَحِمٌ طَیِّبَۃٌ عَاطِفَۃٌ عَلٰی وَلَدِھَا وَنَاقَۃٌ عَطُوْفٌ عَلٰی بَوِّھَا وغیرہ اور جب تعدیہ بواسطہ عَنْ ہو تو اس کے معنی اعراض کرنا اور دور ہونا ہوتے ہیں جیسے عَطَفْتُ عَنْ فُلَانٍ میں نے فلاں سے اعراض کیا۔

(ع ط ل)

اَلْعَطَلُ (س) زیور سے خالی ہونا یا مزدور کا بیکار ہونا کہا جاتا ہے عَطِلَتِ الْمَرْأَۃُ عورت زیور سے خالی ہو گئی ایسی عورت کو عُطُلٌ اور عَاطِلٌ کہا جاتا ہے اسی سے قَوْسٌ عُطُلٌ ہے یعنی وہ کمان جس پر تانت نہ ہو عَطَّلْتُہٗ مِنَ الْحُلِیِّ اَوِ الْعَمَلِ میں نے اسے زیور یا کام سے خالی کر دیا فَتَعَطَّلَ چنانچہ وہ خالی ہو گیا بیکار ہو گیا۔ قرآن میں ہے:۔

وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَۃٍ (۲۲-۴۵) اور بہت سے کنوئیں بیکار پڑے ہیں۔

اور جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس جہان کا کوئی صانع نہیں ہے جس نے اسے محکم اور آراستہ کیا ہے انہیں مُعَطِّلَۃٌ کہا جاتا ہے عَطَّلَ الدَّارَ گھر کو ویران کر دیا عَطَّلَ الْاِبِلَ اونٹ بغیر محافظ کے چھوڑ دیئے ان کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا[3]

(ع ط و)

اَلْعَطْوُ (ن) کے معنی ہیں لینا پکڑنا اور

---

[1] ذکرہ القتبی فی غریبہ ۲۳۹ وابو عبیدۃ فی مجازہ واختارہ الطبری ۱۴ر۷۶ وقال وذالک اولی التاویلات ۱۲ [2] نسبہ الطبری الی ابن عباس وسعید بن جبیر وغیرہ وانک ۱۴ر۶۴-۶۶) وابن کثیر ۲ر۵۵۸ [3] وفی القرآن ثانی عطفہ (۲۲-۹)

[4] وفی القرآن اذا العشار عطلت (۸۱-۴) وایضا انا اعطینٰک الکوثر (۱۰۸-۱)

اَلْمُعَاطَاۃُ باہم لینا دینا۔ اَلْاِعْطَاءُ (افعال) قرآن میں ہے[1] :۔

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ (۹-۲۹) یہاں تک کہ ..... جزیہ دیں۔

اور اَلْعَطِیَّۃُ وَالْعَطَاءُ خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو محض تفضلاً دی جائے چنانچہ فرمایا :۔

ھٰذَا عَطَاؤُنَا (۳۸-۹) یہ ہماری بخشش ہے۔

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْھَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ یُعْطَوْا مِنْھَا (۹-۵۸) اگر ان کو اس میں سے (خاطر خواہ) مل جائے تو خوش رہیں اور اگر اس قدر نہ ملے۔

اَعْطَی الْبَعِیْرُ اونٹ مطیع ہوگیا دراصل اس کے معنی ہیں اونٹ نے منہ زوری اور سرتابی چھوڑ دی اور اپنا سر سوار کے سامنے جھکا دیا۔

ظَبْیٌ عَطُوٌّ وَّعَاطٍ وہ ہرن جو درخت کے پتے کھانے کے لئے اپنا سر اوپر اٹھائے ہوئے ہو۔

(ع ظ م)

اَلْعَظْمُ کے معنی ہڈی کے ہیں اس کی جمع عِظَامٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے :۔

عِظَامًا فَکَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ..... (۲۳-۱۴) ہڈیاں (بنائیں)، پھر ہڈیوں پر گوشت (پوست) چڑھایا۔

ایک قرأت میں دونوں جگہ عَظْمٌ ہے اور اسی سے عَظْمَۃُ الذِّرَاعِ ہے جس کے معنی بازو کا موٹا حصہ کے ہیں عَظْمُ الرَّحْلِ بغیر تنگ کے پالان کی لکڑی عَظُمَ الشَّیْءُ کے اصل معنی کسی چیز کی ہڈی کے بڑا ہونے کے ہیں مجازاً ہر چیز کے بڑا ہونے پر بولا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق حس سے ہو یا عقل سے اور عام اس سے کہ وہ مادی چیز ہو یا معنوی۔ قرآن میں ہے :۔

عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۲۶-۱۸۹) بڑے (سخت) دن کا عذاب (تھا)۔

قُلْ ھُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ (۳۸-۶۷) کہہ دو کہ وہ ایک سخت حادثہ ہے۔

عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ (۷۸-۱) یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں کیا بڑے حادثہ کی نسبت ؟ ۔

عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (۴۳-۳۱) ان دو بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر ....

اور عظیم کا لفظ جب اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے تو ایسے جسم کے متعلق بولا جاتا ہے جس کے اجزاء متصل ہوں مگر اس کے بالمقابل کثیر کا لفظ افراد پر بولا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں مگر کبھی عظیم کا لفظ بھی افراد کثیرہ پر بولا جاتا ہے جیسے جَیْشٌ عَظِیْمٌ بھاری لشکر مَالٌ عَظِیْمٌ زیادہ مال اس صورت میں عَظِیْمٌ کے معنی کَثِیْرٌ ہوتے ہیں۔ اور بڑے حادثہ کو عَظِیْمَۃٌ کہا جاتا ہے اَلْاِعْظَامَۃُ وَالْعِظَامَۃُ گدے کی مثل ایک چیز جسے عورت اپنے سرین بڑے ظاہر کرنے کیلئے ان پر باندھ لیتی ہے۔

(ع ف ف)

اَلْعِفَّۃُ نفس میں ایسی حالت کا پیدا ہوجانا

---

[1] وایضاً التعاطی الاخذ بغیر حق کما قال فی قائل ناقۃ صالح :۔ فتعاطی فعقر (۵۴-۲۹)۔

جس کے ذریعہ وہ غلبۂ شہوت سے محفوظ رہے۔ اَلْمُتَعَفِّفُ زبردستی سے اپنے اندر ایسی حالت پیدا کرنے والا اصل میں اس کے معنی تھوڑی سی چیز پر قناعت کرنے کے ہیں۔ جو بمنزلہ عُفَافَةٌ یا عُفَّفَةٌ یعنی بچی کھچی چیز کے ہو یا بمنزلہ عَفْعَفٌ یعنی پیلوں کے ہو الاِسْتِعْفَافُ عفت طلب کرنا کسی چیز سے پرہیز کرنا قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ (۴-۶) اور جو شخص آسودہ حال ہو اس کو ایسے مال سے قطعی طور پر پرہیز رکھنا چاہیے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (۲۴-۳۳) اور جو نکاح کا مقدور نہیں رکھتے انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔

(ع ف ر)

اَلْعِفْرِيْتُ جنوں میں سے عفریت اس جن کو کہا جاتا ہے جو نہایت موذی اور شریر ہو۔ قرآن میں ہے:۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ (۲۷-۳۹) جنات میں سے ایک موذی اور شریر جن نے کہا۔

پھر جس طرح کبھی شریر انسان کو شیطان کہہ دیا جاتا ہے اس طرح استعارۃً انسان کو عِفْرِيْتٌ بھی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ عِفْرِيْتٌ نِفْرِيْتٌ کا محاورہ ہے (نفریت تابع مہمل ہے) ابن قتیبہ کہتے ہیں[2] کہ اَلْعِفْرِيْتُ کے معنی قوی ہیکل کے ہیں۔

اصل میں عِفْرِيْتٌ کا لفظ اَلْعَفَرُ سے ہے جس کے معنی مٹی کے ہیں اور عَافَرَهٗ کے معنی ہیں اسے پچھاڑ کر مٹی میں لت پت کر دیا اور رَجُلٌ شِرٌّ وَشِمْرٌ کی طرح رَجُلٌ عِفْرٌ یعنی کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں چالاک اور شریر۔ آدمی لَيْثٌ عِفِرِّيْنٌ گرگٹ کی شکل کا ایک جانور ہے جو سوار پر حملہ کر کے اسے نیچے گرا لیتا ہے عِفْرِيَةُ الدِّيْكِ اَوِ الْحُبَارٰى مرغ یا حباری کے سر کے بال کلغی)

(ع ف و)

اَلْعَفْوُ کے معنی کسی چیز کو لینے کا قصد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

عَفَاهُ وَاعْتَفَاهُ کسی کے پاس جو کچھ ہے وہ لینے کا قصد کیا عَفَتِ الرِّيْحُ الدَّارَ ہوا نے گھر کے نشانات مٹا دیئے اسی معنی کے لحاظ سے شاعر نے کہا ہے[3] (   )

(۳۱۵) اَخَذَ الْبِلٰى اٰيَاتِهَا

بوسیدگی لے اس کے نشانات مٹا ڈالے۔

عَفَتِ الدَّارُ گھر کے نشانات مٹ گئے گویا ان آثار نے از خود مٹ جانے کا قصد کیا عَفَا النَّبْتُ وَالشَّجَرُ نباتات اور درخت بڑھ گئے جیسا کہ اَخَذَ النَّبْتُ فِي الزِّيَادَةِ کا محاورہ ہے یعنی پودے نے بڑھنا شروع کیا۔

عَفَوْتُ عَنْهُ کے معنی ہیں میں نے اس سے درگزر کرتے ہوئے اس کا گناہ مٹا دینے کا قصد کیا لہٰذا یہاں اصل میں اس کا مفعول ترک کر دیا گیا ہے اور عَنْ کا متعلق محذوف ہے یا قَصَدْتُ

---

[1] انظر لکلمۃ الاتباع لابی الطیب ۹۸ والقالی ۲ر۷ر۲۱ والمخصص ۱۴ر۳۷ والمزہر ۱ر۸۱ [2] ابو جعفر احمد بن عبد اللہ بن مسلم قتیبۃ المتوفی سنہ ۳۲۲ھ معجم الادباء ۲ر۱۶۰ [3] لم اجدہ ورجح

اِذَا اللّٰہُ ذَنْبَہٗ صَادِقًا عَنْہُ میں عَفْوٌ کے معنی گناہ سے درگزر کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کرلے (۴۲-۴۰)
وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۲-۲۳۷) اور اگر تم ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔
ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ (۲-۵۲) پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا۔
اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَۃٍ مِّنْکُمْ (۹-۶۶) اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کر دیں۔
فَاعْفُ عَنْھُمْ (۵-۱۳) تو ان کی خطائیں معاف کردو۔ اور آیت کریمہ:۔
خُذِ الْعَفْوَ (۷-۱۹۹) (اے محمد) عفو اختیار کرو۔ میں اَلْعَفْوَ ہر اس چیز کو کہا گیا ہے جس کا قصد کرنا اور لینا آسان ہو۔ اور بعض نے اس کے معنی کئے ہیں درگزر کیجئے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲-۲۱۹) (اے محمدؐ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ خدا کی راہ میں کس طرح کا مال خرچ کریں کہہ دو جو چاہو خرچ کرو۔
میں عفو سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ضروریات سے زائد ہو اور اس کے خرچ سے تکلیف نہ ہو اور

اَعْطٰی عَفْوًا اس نے اسے بے مانگے دے دیا یہاں عفوًا مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے اور حال واقع ہوا ہے یعنی بخشش کرنے وقت اس کی حالت یہ تھی کہ گویا خود لے رہا ہے اور اس میں اس عمدہ معنی کی طرف اشارہ ہے جیسے شاعر نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے[1]
(الطویل)
(۳۱۶) کَاَنَّکَ تُعْطِیْہِ الَّذِیْ اَنْتَ سَائِلُہٗ
یعنی جب سائل اس کے پاس آتا ہے تو اس طرح خوش ہوتا ہے گویا جو چیز تم اس سے لے رہے ہو وہ اسے دے رہے ہو۔
اور دعائے ماثورہ میں ہے[2] (۳۴۳) اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ یعنی اے اللہ! تجھ سے عفو اور تندرستی طلب کرتا ہوں اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو عَفُوٌّ کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (۴-۴۳) بے شک خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔
اور حدیث میں ہے[3] (۳۴۴) مَا اَکَلَتِ الْعَافِیَۃُ فَھُوَ صَدَقَۃٌ یعنی کھیتی سے جو کچھ پرند چرند اور ضرورت مند انسان کھا جائیں وہ صدقہ ہے۔

---

[1] وصدرہ: تراہ اذا ما جئتہ متھللاً تراہ اذا جئتہ متہللاً البیت فی اللسان (ھلل) غیر منسوب قال احد محشیہ زبالحاشیۃ وفی شواہد الکشاف انہ لزہیر بن ابی سلمی یمدح حصن بن ابی حذیفۃ ویعلم من روایۃ انہ وصف لمعن بن زائدۃ وفی المختارات ۶۵ یمدح ہرماً فی ۲۳ بیتاً وفی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۹) فی ۲۴ بیتاً ونقد الشعر ۲ فی ثلاثۃ ابیات معزو الی زہیر کذا فی البحر (۲: ۵) والعمدۃ (۲: ۱۳۱، ۴۰) والعقد الثمین ۹۳ والحصری (۳: ۱۳۳) وخاص الخاص للثعالبی ۱۸ ۳ قال وہو امدح بیت قالتہ العرب والعقد (۱: ۲۳۳) ورسائل البلغاء ۲۷۸ والعیون (۱: ۳/۲۳: ۵۲) والسیوطی ۹۴ [2] ابن ماجۃ عن ابی ہریرۃ وفی روایۃ الحاکم والترمذی عن ابی بکر: سلوا اللہ العفو والعافیۃ (الفائق ۲: ۸۰) [3] المستدرک ۳/۲ ۳۱ وابو داؤد (بیوع) وغریب ابی عبید (۱: ۴۸) وفی روایۃ "اصابت" انظر للحدیث الفائق (۲/۳: ۸۳) قال والعافیۃ جماعۃ ویقال للواحد عاف ۱۲

اَعْفَیْتُ کَذَا یعنی میں نے اسے بڑھنے دیا اسی سے "اَعْفُوا اللِّحٰی" [۱] (۴۵) یعنی ڈاڑھی کے بال بڑھنے دو۔

اَلْعِفَاءُ اون یا پرند کے پر جو بڑھ جائیں اور کسی سے دیگ مستعار لینے والا جو شوربہ اس کی دیگ میں اسے بھیجتا ہے اس شوربہ کو اَلْمُعَافِیْ کہا جاتا ہے۔

(ع ق ب)

اَلْعَقِبُ وَالْعَقْبُ پاؤں کا پچھلا حصہ یعنی ایڑی اس کی جمع اَعْقَابٌ ہے۔ حدیث میں ہے [۲] (۴۵) وَیْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ کہ وضو میں خشک رہنے والی ایڑیوں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور بطور استعارہ عَقِبٌ کا لفظ بیٹے پوتے پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ (۴۳-۲۸) اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے۔

جَآءَ فِيْ عَقِبِ الشَّهْرِ مہینے کے آخری دنوں میں آیا۔ رَجَعَ عَلٰى عَقِبِهٖ الٹے پاؤں واپس لوٹا۔ اِنْقَلَبَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وہ الٹے پاؤں واپس لوٹا جیسے:۔ رَجَعَ عَلٰى حَافِرَتِهٖ کا محاورہ ہے اور جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا (۱۸-۶۴) تو وہ اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے۔

نیز کہا جاتا ہے:۔

رَجَعَ عَوْدُهٗ عَلٰى بَدْئِهٖ یعنی جس راستہ پر گیا تھا اسی راستہ سے واپس لوٹ آیا قرآن میں ہے:۔

وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا (۶-۷۱) تو کیا ہم الٹے پاؤں پھر جائیں۔

اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ (۳-۱۴۴) تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہو جاؤ) اور جو الٹے پاؤں پھر جائیگا۔ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ (۸-۴۸) تو پسپا ہو کر چل دیا۔ فَكُنْتُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ (۲۳-۶۶) اور تم الٹے پاؤں پھر پھر جاتے تھے۔

عَقَبَهٗ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا اس کا جانشین ہوا جیسا کہ دَبَرَهٗ وَقَفَاهُ کا محاورہ ہے۔

اَلْعُقْبُ وَالْعُقْبٰى خاص کر ثواب یعنی اچھے بدلے پر بولے جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا (۱۸-۴۴) اس کا صلہ بہتر اور (اس کا) بدلہ اچھا ہے۔

اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳-۲۲) یہی لوگ ہیں جن کے لئے عاقبت کا گھر ہے۔

اور عَاقِبَةٌ کا لفظ بھی ثواب کے لئے مخصوص ہے جیسے فرمایا:۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۸-۸۳) اور انجام نیک تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

مگر یہ اضافت کی صورت میں کبھی عَقُوْبَةٌ کے معنی میں بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا:۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗاٰى (۳۰-۱۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی ان کا انجام بھی برا ہوا۔ اور آیت کریمہ:۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ (۵۹-۱۷)

---

[۱] کلمۃ من الحدیث رواہ النسائی والمسلم (طہارۃ) والبخاری (اللباس) وابو داؤد (ترجل) والترمذی (آدب) والمستدرک ۱۶۲ والحدیث فی النہایۃ ۳ر۲۷ والاضداد لابی الطیب ۲ر۴۸۳ وعدہٗ من الاضداد [۲] اصل الحدیث متفق علیہ من حدیث عبد اللہ بن عمرو باختلاف الفاظ ابن ماجۃ والنسائی وغیرہا من کتب الحدیث راجع لتخریجہا الکاف الشاف لابن حجر ص ۵۲ رقم ۴۴-۲-۴۴

تو دونوں کا انجام یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں داخل ہوئے۔
میں عَاقِبَۃ کا لفظ استعارۃً تا عذاب کے لئے
استعمال ہوا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:۔
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹-۳۴) ان کو اس
دن کے عذاب الیم کی خوشخبری سنادو۔
میں عذاب کے ساتھ بشارت کا لفظ لایا گیا ہے
اور عِقَابٌ، عَقُوْبَۃٌ اور مُعَاقَبَۃٌ عذاب کے
ساتھ مخصوص ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸-۱۴) تو میرا عذاب ان پر واقع ہوا۔
شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۱۳-۱۱) سخت عذاب کرنیوالا۔
فَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ
بِہٖ (۱۶-۱۲۶) اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو
اتنی ہی دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی ہے۔
وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِہٖ (۲۲-۶۰)
جو شخص کسی کو اتنی ہی سزا دے جتنی سزا کہ اس کو
دی گئی ہے۔
اَلتَّعْقِیْبُ ایک چیز کے بعد دوسری لانا۔
عَقَّبَ الْفَرَسُ فِیْ عَدْوِہٖ گھوڑے نے ایک
دوڑ کے بعد دوسری دوڑ لگائی۔ قرآن میں ہے:۔
لَہٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ
(۱۳-۱۱) اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں
اور آیت کریمہ:۔
لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ (۱۳-۴۱) کے معنی یہ ہیں کہ
اللہ کے فیصلے کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں
کرسکتا اور نہ اس پر بحث کرسکتا ہے۔ یہ
عَقَّبَ الْحَاکِمُ عَلٰی حُکْمِ مَنْ قَبْلَہٗ کے محاورہ
سے ماخوذ ہے یعنی حاکم نے اپنے پیشرو حاکم کے
خلاف فیصلہ دیا شاعر نے کہا ہے[1]:
(۳۱۷) وَمَا بَعْدَ حُکْمِ اللّٰہِ تَعْقِیْبُ
اللہ کے فیصلے کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آسکتا
اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں لوگوں کو
اللہ کے حکم اور اس کی مخفی حکمتوں میں خوض کرنے
سے منع فرمایا گیا ہو۔ جیسا کہ قضا و قدر کے اسرار
میں غور و خوض سے منع کیا گیا ہے اور آیت کریمہ:۔
وَلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ (۲۷-۱۰) میں لَمْ
یُعَقِّبْ کے معنی ہیں اس نے مڑ کر پیچھے کو نہ دیکھا۔
اَلْاِعْتِقَابُ کے معنی ایک چیز کے دوسری
کے بعد آنے کے ہیں جیسے شب و روز کہ یہ دونوں
یکے بعد دیگرے آتے ہیں اسی سے اَلْعُقْبَۃُ
ہے یعنی دو مسافروں کا یکے بعد دیگرے ایک
سواری پر سوار ہونا عُقْبَۃُ الطَّائِرِ پرندکا کبھی
اوپر چڑھنا اور کبھی نیچے اترنا اَعْقَبَہٗ کَذَا
کسی چیز کا وارث بنا دینا ایک چیز کی جگہ دوسری
چیز کو اس کا جانشین بنانا قرآن میں ہے۔
فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا (۹-۷۷) تو خدا نے ....
ان کے (دلوں میں) نفاق ڈال دیا۔
شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)
(۳۱۸) لَہٗ طَائِفٌ مِّنْ جِنَّۃٍ غَیْرُ مُعْقِبِ
یعنی اسے جنون کا دورہ پڑتا ہے جس کے بعد افاقہ
نہیں ہوتا۔
فُلَانٌ لَمْ یُعْقِبْ اس نے اولاد نہیں چھوڑی اور
اَعْقَابُ الرَّجُلِ کے معنی آدمی کی اولاد کے
ہیں اہل لغت کا قول ہے کہ اس کے تحت لڑکی
کی اولاد نہیں آتی کیونکہ وہ نسباً اس کی جانشین

---

[1] لم اجدہ فی المراجع [2] قالہ امرؤ القیس یصف فرسًا داولہ: یخضد فی الآری حتی کانہ، والبیت فی اللسان (عقب) وفی روایۃ الدیوان ۸۰ وصنعۃ السندوبی بہ عُرۃ اوطائف غیر معقب والبیت فی الاقتضاب الثمین ۱۰۰ والفائق (۱: ۲۷۱) وکتاب الخیل لابی عبیدۃ ۳۸ ففی روایۃ کانما بہ ملکانہ۔

نہیں ہوتی لیکن ذُرِّیَّۃٌ کے لفظ میں لڑکی کی اولاد بھی داخل ہوتی ہے اِمْرَءَۃٌ مِعْقَابٌ وہ عورت جو ایک بار لڑکا اور دوسری بار لڑکی جنے عَقَّبْتُ الرُّمْحَ کے معنی نیزے کو عقب یعنی بالوں کے پچھلے حصہ کے ساتھ باندھ دیا۔ جیسے عَصَبْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے عَصَبٌ یعنی تانت سے باندھ دیا اَلْعَقَبَۃُ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گذار راستہ اس کی جمع عُقَبٌ وَعِقَابٌ ہے اور شاہین کو بھی عُقَابٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ شکار کا تعاقب کرتا ہے اور تشبیہ کے طور پر عِقَابٌ کا لفظ (۱) جھنڈے (۲) کوئیں کے پتھر جس پر پانی بہانے والا کھڑا ہوتا ہے اور (۳) کان کی بالی کے تاگے پر بھی بولا جاتا ہے اَلْيَعْقُوْبُ نر چکور کیونکہ اس کی عادت یہ ہے کہ ایک مرتبہ دوڑنے کے بعد ٹھہر جاتا ہے اور پھر دوسری بار دوڑتا ہے۔

(ع ق د)

اَلْعَقْدُ کے معنی کسی چیز کے اطراف کو جمع کر دینے یعنی گرہ باندھنے کے ہیں یہ اصل میں تو سخت اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے عَقْدُ الْحَبْلِ (رسی کی گرہ باندھنا) عَقْدُ الْبِنَاءِ وغیرہ محاورات ہیں۔ پھر بطور استعارہ معانی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے عَقْدُ الْبَیْعِ سودے کو پختہ کرنا عَقْدُ الْعَھْدِ محکم عہد باندھنا وغیرہ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

عَاقَدْتُہٗ وَعَقَدْتُہٗ وَتَعَاقَدْنَا وَعَقَدْتُ یَمِیْنَہٗ میں نے اس سے پختہ عہد و پیمان باندھا قرآن میں ہے:۔

عَاقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ (۴-۳۳) جن لوگوں سے تم نے پختہ عہد باندھ رکھے ہوں۔

ایک قرأت میں عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ ہے نیز فرمایا:۔

بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ (۵-۸۹) پختہ قسموں پر ایک قرأت میں عَقَدْتُّمُ الْاَیْمَانَ ہے اسی سے لِفُلَانٍ عُقْدَۃٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی پختہ یقین کے ہیں اَلْعِقْدُ (گلے کا ہار) اور اَلْعَقْدُ یہ اصل میں مصدر ہیں اور بطور اسم کے استعمال ہوتے ہیں اس کی جمع عُقُوْدٌ آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵-۱) اپنے اقراروں کو پورا کرو۔

اَلْعُقْدَۃُ نکاح، عہد و پیمان وغیرہ جو پختہ کیا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ (۲-۲۳۵)
اور .... نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔

عُقِدَ لِسَانُہٗ اس کی زبان پر گرہ لگ گئی فِیْ لِسَانِہٖ عُقْدَۃٌ اس کی زبان میں لکنت ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ (۲۰-۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳-۴) اور گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔

میں عُقَدٌ عُقْدَۃٌ کی جمع ہے یعنی وہ گرہیں جو جادوگر عورتیں لگاتی ہیں دراصل اس کے معنی عَزِیْمَۃٌ کے ہیں اس لئے اس پر عُقْدَۃٌ اور عَزِیْمَۃٌ دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور جادوگر کو مُعَقِّدٌ بھی کہا جاتا ہے۔

لہ فالمراد من النفاثات السواحر کما ذکرہ القتیبی فی المشکل وغیرہ وسائر اصحاب التفاسیر (۴/۳/۲۵۳)

لَہٗ عُقْدَۃُ مُلْكٍ اس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے۔

نَاقَۃٌ عَاقِدَۃٌ وَعَاقِدٌ وہ اونٹنی جس کی دم گرہ دار ہو جائے اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ نر سے جفتی کی خواہش مند ہے۔

تَیْسٌ وَکَلْبٌ اَعْقَدُ نر سانڈ یا کتا جس کی دم لپٹی ہوئی ہو۔

تَعَاقَدَتِ الْکِلَابُ کتوں کا آپس میں جفتی کرنا۔

(ع ق ر)

اَلْعُقْرُ کے معنی حوض یا مکان کے اصل اور وسط کے ہیں اور اسے عَقْرٌ بھی کہتے ہیں حدیث میں ہے[1] (۲۶) مَا غُزِیَ قَوْمٌ فِیْ عُقْرِ دَارِھِمْ قَطُّ اِلَّا ذَلُّوْا کہ کسی قوم پر ان کے گھروں کے وسط میں حملہ نہیں کیا جاتا مگر وہ ذلیل ہو جاتی ہیں اور تَصَوُّرٌ یعنی محل کو عُقْرَۃٌ کہا جاتا ہے۔ عَقَرْتُہٗ اس کی عُقْر یعنی جڑ پہ مارا۔ جیسا کہ رَاَسْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اس کے سر پر مارا اسی سے عَقَرْتُ النَّخْلَ ہے جس کے معنی ہیں میں نے کھجور کے درخت کو جڑ سے کاٹ دیا۔ عَقَرْتُ الْبَعِیْرَ اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں اسے ہلاک کر دیا عَقَرْتُ ظَھْرَ الْبَعِیْرِ اونٹ کی پشت کو زخمی کر دیا اِنْعَقَرَ ظَھْرُہٗ اس کی پیٹھ زخمی ہو گئی قرآن میں ہے:۔

فَعَقَرُوْھَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِکُمْ (۱۱-۶۵) مگر انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح نے کہا کہ اپنے گھروں میں ..... فائدہ اٹھالو۔ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ (۵۴-۲۹) تو اس نے جسارت کر کے اونٹنی کو پکڑا اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

سَرْجٌ مُعْقِرٌ زخمی کر دینے والی زین۔

کَلْبٌ عَقُوْرٌ کاٹ کھانے والا کتا، درندہ جانور

رَجُلٌ عَاقِرٌ بانجھ مرد۔

اِمْرَءَۃٌ عَاقِرٌ بانجھ عورت گویا وہ مرد کے نطفہ کو قطع کر دیتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَامْرَءَتِیْ عَاقِرٌ (۳-۴۰) اور میری بیوی بانجھ ہے۔ وَکَانَتِ امْرَءَتِیْ عَاقِرًا (۱۹-۵) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

قَدْ عَقُرَتْ وہ بانجھ ہو گئی۔ اَلْعُقْرُ آخری بچہ بَیْضَۃُ الْعُقْرِ آخری انما عِقَارٌ (پرانی) شراب کیونکہ وہ عقل کو قطع کر دیتی ہے۔ اَلْمُعَاقَرَۃُ کے معنی ہیں شراب نوشی کا عادی ہونا اور تَصَوُّرٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر بکریوں کی ٹکڑی کو بھی عُقْرٌ کہا جاتا ہے۔

رَفَعَ فُلَانٌ عَقِیْرَتَہٗ فلاں نے آواز بلند کی مروی ہے کہ ایک آدمی کی ٹانگ کٹ گئی وہ چلایا تو اس وقت سے بطور استعارہ عَقْرٌ کا لفظ بلند آواز کے معنی میں ہونے لگا ہے۔

عَقَاقِیْرُ جڑی بوٹیاں۔ اس کا واحد عَقَّارٌ ہے۔

(ع ق ل)

اَلْعَقْلُ اس قوت کو کہتے ہیں جو قبول علم کے

---

[1] قال علی رضی فی خطبۃ خطبہا فی نخیلۃ جالسا علی باب السدۃ حین بلغہ ان خیل لمعاویہ قتل عاملہ حسان بن حسان البکری وکان علی الانبار فعقد لسفیان بن عوف للاسدی فی غارۃ دیبار ذ والتبیین (۲ / ۲۷ والکامل للمبرد ۲۰-۲۱ والعقد الفرید ۲ / ۶۹-۷۰) کذا فی الاغانی ۱۵ / ۴۵ والصحیح ان اسمہ اشرس بن حسان البکری کما فی الطبری وخطبتہ ہذہ مشہورۃ ۱۲

لئے تیار رہتی ہے اور وہ علم جو اس قوت کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اسے بھی عقل کہہ دیتے ہیں چنانچہ امیر المومنین حضرت علیؓ فرماتے ہیں[1] (رجز)

(۳۱۹) (۱) اَلْعَقْلُ عَقْلَانِ - مَطْبُوْعٌ وَّ مَسْمُوْعٌ

(۲) وَلَا یَنْفَعُ مَسْمُوْعٌ - اِذَا لَمْ یَکُ مَطْبُوْعٌ

(۳) کَمَا لَا یَنْفَعُ ضَوْءُ الشَّمْسِ وَضَوْءُ الْعَیْنِ مَمْنُوْعٌ

کہ عقل دو قسم پر ہے[2] عقل طبعی یعنی جو طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے اور عقل سمعی یعنی وہ جو لوگوں سے باتیں سن کر حاصل ہوتی ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص فطرۃً عقل سے کورا ہو تو سن کر حاصل کی ہوئی عقل اسے کچھ فائدہ نہیں بخشتی۔

(۳) جیسا کہ سورج کی روشنی اندھے آدمی کیلئے بے فائدہ ہوتی ہے۔

عقل کے پہلے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: (۴۷)

مَا خَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا اَکْرَمَ عَلَیْهِ مِنَ الْعَقْلِ

(اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کے نزدیک عقل سے زیادہ باعزت ہو) اور دوسرے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں اشارہ پایا جاتا ہے[3] (۴۷) مَا کَسَبَ اَحَدٌ شَیْئًا اَفْضَلَ مِنْ عَقْلٍ یَهْدِیْهِ اِلٰی هُدًی اَوْ یَرُدُّهٗ عَنْ رَدًی کہ کسی شخص نے اس عقل سے بڑھ کر کوئی چیز حاصل نہیں کی جو انسان کی رہنمائی کرے یا اسے ہلاکت سے بچائے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹-۴۳) اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔

میں اسی معنی کے اعتبار سے عقل کی نفی کی گئی ہے اور ہر وہ جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے فقدان عقل کی وجہ سے کفار کی مذمت فرمائی ہے وہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں جیسے فرمایا:۔

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (۲-۱۷۱) جو کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے بہرے ہیں۔ گونگے ہیں اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں کفار سے عقل کی نفی کی گئی ہے اور جس مقام پر عقل نہ ہونے پر انسان کو غیر مکلف قرار دیا گیا ہے۔ وہاں عقل کے اول معنی کی طرف اشارہ ہے۔

دراصل اَلْعَقْلُ کے معنی روکنا اور منع کرنا ہیں جیسے عِقَالٌ یعنی پائے بند سے اونٹ کا پاؤں باندھ دینا اور دوا کے پیٹ میں قبض کرنے کو بھی عَقْلٌ کہتے ہیں۔ عَقَلَتِ الْمَرْأَةُ شَعْرَهَا عورت نے اپنے بال باندھ لئے عَقَلَ لِسَانَهٗ اس نے اپنی زبان روک لی اسی سے حصین یعنی

---

[1] کذا فی الاحیاء (۳/۱۶) وفی ادب الدنیا والدین للماوردی ۳۱ ایضاً معزوۃ لعلیؓ والابیات فی روضۃ العقلاء للبستی بغیر عزو وفی روایۃ رأیت العقل نوعین وتقسیم العقل من کلام سابور بن اردشیر وغیرہ فاخذہ بعض الشعراء فقال الخ وانما نسبنا الابیات الی علیؓ غلم احققها [2] الحدیث اخرجہ الترمذی الحکیم فی نوادرہ باسناد ضعیف والاحیاء ۳/۱۶ اتخریج العراقی وباختلاف من امامۃ والطبرانی وابونعیم من حدیث عائشۃ وفی روایۃ ابن عساکر من معاذ اقل من العقل بدل اکرم انظر کنز العمال ج۳ رقم ۱۹۱۲ وفی اللآلی ج۱ ص ۱۲۹-۱۳۲ البطرق ما خلقت خلقا احسن منک والااکرم [3] والحدیث بالفاظہ ذہب عن عمر (الا ابن ما اکتسب مکتسب) ماکسب کنز العمال ج۳ رقم ۱۹۱۰ وفی تخریج العراقی اخرجہ المحبر فی العقل ؛

قلعہ کو مَعْقِلٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَعَاقِلُ ہے اور عَقْلُ الْبَعِيرِ سے عَقَلْتُ الْمَقْتُولَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں مقتول کی دیت ادا کرنا بعض نے کہا ہے کہ عَقَلْتُ الْمَقْتُولَ کے اصل معنی ہیں ولی الدم یعنی مقتول کے وارثوں کے گھر کے صحن میں اونٹ باندھنا مگر بعض کہتے ہیں کہ خون بہا اس کے معنی خون بہا ادا کرنے کے ہیں پھر مطلق خون بہا کو عَقْلٌ کہا جانے لگا ہے خواہ کوئی چیز دی جائے اور جو رشتے دار قاتل کی طرف سے دیت کا بوجھ اٹھاتے ہیں انہیں عَاقِلَةٌ کہا جاتا ہے عَقَلْتُ عَنْهُ کسی کی طرف سے خون بہا ادا کرنا۔ دَمُهُ مُعْقَلَةٌ عَلَى قَوْمِهِ اس کے خون بہا کا تاوان اس کی قوم پر ہے۔ اِعْتَقَلَهُ بِالشَّغْزَبِيَّةِ اسے پیچ لگا کر پچھاڑ دیا۔

اِعْتَقَلَ رُمْحَهُ بَيْنَ رِكَابِهِ وَسَاقِهِ اس نے نیزے کو اپنی رکاب اور پنڈلی کے درمیان رکھ لیا بعض نے کہا ہے کہ اَلْعِقَالُ کے معنی ایک سال کے صدقہ کے ہیں چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا قول ہے[1] (۸۴) لَوْ مَنَعُوْنِيْ عِقَالًا لَقَاتَلْتُهُمْ کہ اگر وہ ہمیں ایک سال کا صدقہ بھی نہ دیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا اور جب کوئی شخص اونٹ نہ لے اور ان کی بجائے نقدی وصول کرے تو عرب کہتے ہیں اَخَذَ النَّقْدَ وَلَمْ يَأْخُذِ الْعِقَالَ مگر جب عِقَال کا لفظ صَدَقَة کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ یا تو عِقَالٌ بمعنی پائے بند بول کر کنایۃً اونٹ مراد لئے جاتے ہیں اور یا اونٹ بمعہ ان کی رسیوں کے مراد ہوتے ہیں اور یا یہ عَقَلْتُهُ عَقْلًا وَعِقَالًا کا مصدر ہوتا ہے جس کے معنی باندھنا کے ہیں جیسے کِتَابٌ کہ اصل میں کَتَبْتُ کا مصدر ہے مگر کبھی بمعنی مکتوب آجاتا ہے۔ اسی طرح عِقَال بول کر مَعْقُوْل مراد لیتے ہیں یعنی وہ جانور جو زکوٰۃ میں وصول کیا جائے۔

اَلْعَقِيْلَةُ وہ خوبصورت عورت یا موتی جسے حفاظت سے چھپا کر رکھا جاتا ہے جیسا کہ اعلیٰ درجہ کی چیز کو عِلْقٌ مُضِنَّةٌ کہا جاتا ہے اَلْمَعْقِلُ (پناہ گاہ) پہاڑ یا قلعہ جس میں پناہ لی جاتی ہے اَلْعُقَّالُ ایک بیماری جو گھوڑے کے پاؤں میں پیدا ہو جاتی ہے اَلْعَقْلُ کے معنی چلتے وقت پاؤں کا باہم ٹکرانا کے ہیں۔

(ع ق م)

اَلْعُقْمُ اصل میں اس خشکی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اثر قبول کرنے سے مانع ہو چنانچہ محاورہ ہے عَقِمَتْ مَفَاصِلُهُ (اس کے جوڑ بند خشک ہو گئے) دَاءٌ عُقَامٌ لا علاج مرض۔ اَلْعَقِيْمُ (بانجھ) وہ عورت جو مرد کا مادہ قبول نہ کرے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ عَقِمَتِ الْمَرْأَةُ اَوِ الرَّحِمُ عورت بانجھ ہو گئی یا رحم خشک ہو گیا۔ قرآن میں ہے:-

فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ (۵۱-۲۹) اور اپنا منہ لپیٹ کر کہنے لگی کہ (اے ہے ایک تو بڑھیا) دوسرے بانجھ۔

اور رِيْحٌ عَقِيْمٌ (خشک ہوا) میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فعیل بمعنی فاعل ہو۔ یعنی وہ ہوا جو بادلوں کو ساتھ نہیں لاتی یا درخت کو بار دار نہیں کرتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فعیل بمعنی مفعول ہو جیسا کہ اَلْعَجُوْزُ الْعَقِيْمُ میں ہے اس صورت میں رِيْحٌ عَقِيْمٌ

[1] وفی المطبوع دیہ مصحف والتصویب من المعاجم [2] کلمۃ من الحدیث فی قتال ابی بکر اصحاب الردۃ رواہ اصحاب السنۃ والحدیث فی الفائق ۲۰۰/۲۔

کے معنی ہوں گے وہ ہوا جو کسی چیز کا اثر اپنے اندر نہ رکھتی ہو چونکہ ایسی ہوا نہ کسی چیز کے اثر کو قبول کرتی ہے اور نہ کسی سے متاثر ہوتی ہے اس لئے نہ وہ کچھ دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْھِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (۵۱-۴۱) جب ہم نے ان پر خشک ہوا چلائی۔
یَوْمٌ عَقِیْمٌ[1] سخت دن جس میں کسی قسم کا سامانِ فرحت نہ ہو۔

(ع ک ف)

اَلْعُکُوْفُ کے معنی ہیں تعظیماً کسی چیز پر متوجہ ہونا اور اس سے وابستہ رہنا۔ اور اصطلاح شریعت میں اَلْاِعْتِکَافُ کے معنی ہیں عبادت کی نیت سے مسجد میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَنْتُمْ عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ (۲-۸۱) جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو۔
سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ (۲۲-۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔
وَالْعَاکِفِیْنَ (۲-۱۲۵) اور اعتکاف کرنے والوں۔
فَنَظَلُّ لَھَا عَاکِفِیْنَ (۲۶-۷۱) اور اس کی پوجا پر قائم رہیں۔
عَکَفَتْہٗ عَلٰی کَذَا کسی چیز پر روک رکھنا
یَعْکُفُوْنَ عَلٰی اَصْنَامٍ لَّھُمْ (۷-۱۳۸) یہ اپنے بتوں کی عبادت کے لئے بیٹھے رہتے تھے۔
ظَلْتَ عَلَیْہِ عَاکِفًا (۲۰-۹۷) جس معبود کی پوجا پر تو قائم اور معتکف تھا۔
وَالْھَدْیَ مَعْکُوْفًا (۴۸-۲۵) اور قربانی کے جانوروں کو بھی کر روک دیئے گئے ہیں۔

(ع ل ق)

اَلْعَلَقُ کے معنی کسی چیز میں پھنس جانے کے ہیں کہا جاتا ہے عَلِقَ الصَّیْدُ فِی الْحُبَالَۃِ شکار جال میں پھنس گیا اور جب کسی کے جال میں شکار پھنس جائے تو کہا جاتا ہے اَعْلَقَ الصَّائِدُ۔ اَلْمِعْلَقُ وَالْمِعْلَاقُ ہر وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو لٹکایا جائے اسی طرح عِلَاقَۃُ السَّوْطِ وَعَلَقُ الْقِرْبَۃِ اس رسی یا تسمہ کو کہتے ہیں جس سے کوڑے کو یا مشک کا منہ باندھ کر اسے لٹکا دیا جاتا ہے۔
عَلَقُ الْبَکَرَۃِ وہ لکڑی وغیرہ جس پر کنوئیں کی چرخی لگی رہتی ہے۔ اسی سے اَلْعُلْقَۃُ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے سہارا کے لئے پکڑا جاتا ہے۔
عَلِقَ دَمُ فُلَانٍ بِزَیْدٍ فلاں کا خون زید کے ساتھ چمٹ گیا یعنی زید اس کا قاتل ہے۔
اَلْعَلَقُ (جونک) ایک قسم کا کیڑا جو حلق کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ نیز جما ہوا خون اسی سے لوتھڑے کی قسم کے خون کو عَلَقَۃ کہا جاتا ہے جس سے بچہ بنتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۹۶-۲) جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ کے آخر میں فرمایا:۔
فَخَلَقْنَا الْعَلَقَۃَ مُضْغَۃً (۲۳-۱۴) پھر لوتھڑے

---

[1] راجع الآیۃ (۲۲-۵۵)

کی بوئی بنائی۔
اَلْعِلْقُ اس عمدہ چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ مالک کا دل چمٹا ہوا ہو اور اس کی محبت دل سے اترتی نہ ہو
اَلْعَلِیْقُ جو وغیرہ جو سفر میں جانور کے کھانے کے لئے اس پر باندھ دیتے ہیں اور اَلْعَلِیْقَۃُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ بھیجا جائے۔ شاعر نے کہا[1] ہے (رجز)

(۳۲۰) اَرْسَلَھَا عَلِیْقَۃً وَقَدْ عَلِمْ
اَنَّ الْعَلِیْقَاتِ یُلَاقِیْنَ الرَّقَمْ

اس نے غلہ لینے کے لئے لوگوں کے ساتھ اپنا اونٹ بھیج دیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ دوسروں کے ساتھ بھیجے ہوئے اونٹ تکالیف سے دوچار ہوتے ہیں۔
اَلْعَلُوْقُ وہ اونٹنی جو اپنے بچے پر مہربان ہو اور اس سے لپٹی رہے اور موت کو بھی عَلُوْقٌ کہا جاتا ہے اَلْعَلْقٰی درخت جس میں انسان الجھ جائے تو اس سے نکلنا مشکل ہو عَلِقَتِ الْمَرْءَۃُ عورت حاملہ ہوگئی۔
رَجُلٌ مِعْلَاقٌ جھگڑالو آدمی جو اپنے مخالف کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے چمٹا رہے۔

(ع ل م)

اَلْعِلْمُ کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا اور یہ دو قسم پر ہے اول یہ کہ کسی چیز کی ذات کا ادراک کرلینا دوم ایک چیز پر کسی صفت کے ساتھ حکم لگانا جو (فی الواقع) اس کے لئے ثابت ہو یا ایک چیز کی دوسری چیز سے نفی کرنا جو (فی الواقع) اس سے منفی ہو۔ پہلی صورت میں یہ لفظ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:۔
لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ اَللّٰہُ یَعْلَمُھُمْ (۸-۶۰) جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے۔
اور دوسری صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
فَاِنْ عَلِمْتُمُوْھُنَّ مُؤْمِنَاتٍ (۶۰-۱۰) اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں۔
اور آیت یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ کے آخر میں:۔ لَا عِلْمَ لَنَا (۵-۱۰۹) سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے ہوش و حواس قائم نہیں رہیں گے۔
ایک دوسری حیثیت سے علم کی دو قسمیں ہیں (۱) نظری اور (۲) عملی۔ نظری وہ ہے جو حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہوجائے جیسے وہ علم جس کا تعلق موجودات عالم سے ہے اور علم عملی وہ ہے جو عمل کے بغیر تکمیل نہ پائے جیسے عبادات کا علم
ایک اور حیثیت سے بھی علم کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عقلی یعنی وہ علم جو صرف عقل سے حاصل ہو سکے (۲) سمعی یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل نہ ہو بلکہ بذریعہ نقل و سماعت کے حاصل کیا جائے دراصل اَعْلَمْتُہٗ وَعَلَّمْتُہٗ کے ایک معنی ہیں مگر اِعْلَامٌ جلدی سے بتا دینے کے ساتھ مختص ہے اور تَعْلِیْمٌ کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہوجائے۔
بعض نے کہا ہے کہ تَعْلِیْمٌ کے معنی تصور کیلئے نفس کو متوجہ کرنا کے ہیں اور تَعَلُّمٌ کے معنی ایسے تصور کی طرف متوجہ ہونا کے اور کبھی تَعْلِیْمٌ کا لفظ اِعْلَامٌ کی جگہ آتا ہے جب کہ اس میں تاکید کے معنی

[1] قالہ الراجز والرقم الداہیۃ والمعیبنہ (الذیل للثعالبی ۳۶۳ مبحث اسما راندا ہیۃ) والرجز لبعض الی اصلاح المنطق ۳۴۳، ۱۳ / ۳۴۷ والمحکم واللسان (علق)

مقصود ہوں جیسے فرمایا :۔
اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ (۴۹-۱۶) کیا تم خدا کو اپنی دینداری جتلاتے ہو۔
اور حسب ذیل آیات میں تَعْلِيْمٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا :۔
اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۵۵-۱،۲) خدا جو نہایت مہربان اس نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶-۴) قلم کے ذریعہ (لکھنا) سکھایا۔
وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْا (۶-۹۲) اور تم کو وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے۔ ....
عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (۲۷-۱۶) ہمیں خدا کی طرف سے جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۳-۱۶۴) اور خدا کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔
اور آیت کریمہ :۔
وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲-۳۱) اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔
میں آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دینے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے اندر بولنے کی صلاحیت اور استعداد رکھ دی جس کے ذریعہ اس نے ہر چیز کے لئے ایک نام وضع کرلیا یعنی اس کے دل میں القا کردیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو ان کے کام سکھا دیئے ہیں جسے وہ سرانجام دیتے رہتے ہیں اور آواز دی ہے جسے وہ نکالتے رہتے ہیں اور آیت کریمہ :۔
وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا (۱۸-۶۵، ۶۶) اور اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔ موسیٰ نے اس سے کہا کہ جو علم (خدا کی طرف سے) آپ کو سکھلایا گیا ہے اگر آپ مجھے اس میں سے کچھ رشد (وہدایت کی باتیں) سکھا دیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایک خاص علم مراد ہے جس پر انسان از خود واقف نہیں ہو سکتا اور جب تک اللہ تعالیٰ اس پر واقف نہ فرمائے لوگ اسے قابل انکار سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضرؑ کے ساتھ چلے تو جب تک انہوں نے ان واقعات کی حقیقت سے موسیٰؑ کو باخبر نہیں کردیا وہ ان باتوں کا انکار ہی کرتے رہے اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ :۔ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ (۲۷-۴۰) ایک شخص جس کو کتاب الٰہی کا علم تھا کہنے لگا۔
میں بھی علم کے یہی معنی مراد ہیں یعنی جسے علم خصوصی حاصل تھا اور آیت :۔
وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (۵۸-۱۱) اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کریگا۔
میں اللہ تعالیٰ کی طرف اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ مراتب علم کے اعتبار سے علماء کے بھی مختلف درجے اور مرتبے ہیں اور آیت کریمہ :۔
وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (۱۲-۷۶) اور ہر علم والے سے دوسرا علم والا بڑھ کر ہے۔
میں عَلِيْمٌ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ علم وفضل کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے سے بڑھ کر ہے اور عَلِيْمٌ صیغہ مبالغہ لاکر اس علمی فضیلت کو بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہر شخص اپنے سے کم درجہ کے اعتبار سے عَلِيْمٌ ہے گو اپنے سے بلند درجہ عالم کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے اور

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عَلِیْمٌ سے ذات باری تعالیٰ مراد ہو گو یہ لفظ نکرہ ہے کیونکہ درحقیقت اس صفت کے ساتھ موصوف ہونے کی اہل تو ذات باری تعالیٰ ہی ہے اس صورت میں کُلُّ ذِیْ عِلْمٍ سے جملہ اہل علم بحیثیت مجموعی مراد ہوں گے اور ہر ایک بحیثیت انفرادی مراد نہیں ہوگا جیسا کہ پہلی صورت میں تھا۔ اور آیت کریمہ:۔

عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۳۴-۴۸) اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے اور کوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ہے اور آیت کریمہ:۔

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (۷۲-۲۶،۲۷) وہی الغیب کا جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ اپنے علم خصوصی سے صرف انہیں کو نوازتے ہیں جو اس کے اولیاء کی صف میں داخل ہوں اور اَلْعَالِمُ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی صفت کی حیثیت سے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس پر کوئی چیز بھی مخفی نہ ہو جیسے فرمایا:۔

لَا یَخْفٰی مِنْکُمْ خَافِیَةٌ (۶۹-۱۸) اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہیں رہے گی۔

اور یہ مفہوم صرف ذات باری تعالےٰ کے حق میں ہی صحیح ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو اس معنی کے ساتھ متصف کرنا صحیح نہیں ہے۔

اَلْعَلَمُ: ایسا نشان جس سے کوئی شے پہچانی جا سکے جیسے عَلَمُ الطَّرِیْقِ اس نشان کو کہتے ہیں جو راستہ کی پہچان کے لئے اس میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور فوج کے جھنڈے کو عَلَمُ الْجَیْشِ کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے فوج کی پہچان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک قرأت میں (عیسیٰ علیہ السلام کو) وَاِنَّهٗ لَعَلَمٌ لِّلسَّاعَةِ (۴۳-۶۱) کہا گیا ہے یعنی وہ قیامت کی نشانی ہیں۔ اور اسی معنی کے اعتبار سے پہاڑ کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَعْلَامٌ ہے قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ (۴۲-۳۲) اور اس کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز ہیں جو گویا پہاڑ ہیں۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ (۵۵-۲۴) اور جہاز بھی اسی کے ہیں جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے ہوتے ہیں نیز اوپر کے ہونٹ کے شگاف اور کپڑے کے نقش و نگار کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے اور محاورہ ہے: فُلَانٌ عَلَمٌ فلاں مشہور و معروف ہے جھنڈے کے ساتھ تشبیہ کے اعتبار سے یہ معنی مراد ہوتا ہے۔

اَعْلَمْتُ کَذَا کے معنی کسی چیز پر نشان لگانے کے ہیں اور مَعَالِمُ الطَّرِیْقِ اَوِ الدِّیْنِ میں مَعَالِمُ کا واحد مَعْلَمٌ ہے اور مَعْلَمٌ اس نشان کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کی پہچان ہو سکے محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ مَعْلَمٌ لِلْخَیْرِ فلاں خیر و برکت کا نشان ہے۔ اَلْعُلَّامُ مہندی اَلْعَالَمُ فلک الافلاک اور جن جواہر و اعراض پر وہ حاوی ہے سب کو اَلْعَالَمُ کہا جاتا ہے در اصل یہ فَاعَلٌ کے وزن

پر ہے جو اسم آلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے طَابِعٌ - مَا یُطْبَعُ بِہٖ - خَاتَمٌ - مَا یُخْتَمُ بِہٖ وغیرہ اسی طرح عالَمٌ بھی ہے جس کے معنی ہیں مَا یُعْلَمُ بِہٖ یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ کسی شے کا علم حاصل کیا جائے اور کائنات کے ذریعہ بھی چونکہ خدا کا علم حاصل ہوتا ہے اس لئے جملہ کائنات اَلْعَالَمُ کہلاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت کے سلسلہ میں کائنات پر غور کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا:۔

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷-۱۸۵) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت پر غور نہیں کیا۔

اور اَلْعَالَمُ کی جمع (اَلْعَالَمُوْنَ) اس لئے بناتے ہیں کہ کائنات کی ہر نوع اپنی جگہ ایک مستقل عَالَمٌ کی حیثیت رکھتی ہے مثلاً عَالَمُ الْاِنْسَانِ، عَالَمُ الْمَاءِ وَعَالَمُ النَّارِ وغیرہ نیز ایک روایت میں ہے[1] (۹۴) اِنَّ لِلّٰہِ بضعۃ عشر اَلْفَ عَالَمٍ کہ اللہ تعالیٰ نے دس ہزار سے کچھ اوپر عالم پیدا کئے ہیں باقی رہا یہ سوال کہ (واؤ نون کے ساتھ) اسے جمع سلامت کے وزن پر کیوں لایا گیا ہے (جو ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ عالَمٌ میں چونکہ انسان بھی شامل ہیں اس لئے اس کی جمع، جمع سلامت لائی گئی ہے کیونکہ جب کسی لفظ میں انسان کے ساتھ دوسری مخلوق بھی شامل ہو تو تغلیباً اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ بنا لیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ چونکہ لفظ عَالَمٌ سے خلائق کی خاص قسم یعنی فرشتے، جن اور انسان ہی مراد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے[2]۔ اس لئے اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ لائی گئی ہے امام جعفرؒ بن محمدؒ کا قول ہے[3] کہ عَالَمِیْنَ سے صرف انسان مراد ہیں اور ہر فرد بشر کو ایک عَالَم قرار دے کر اسے جمع لایا گیا ہے۔ نیز انہوں نے کہا ہے کہ عَالَمٌ دو قسم پر ہے (۱) اَلْعَالَمُ الْکَبِیْرُ یعنی فلک دمافیہ (۲) اَلْعَالَمُ الصَّغِیْرُ یعنی انسان کیونکہ انسان کی تخلیق بھی ایک مستقل عَالَمٌ کی حیثیت سے کی گئی ہے اور اس کے اندر قدرت کے وہ دلائل موجود ہیں جو عالم کبیر میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اَوَلَمْ نَنْھَکَ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ کیا ہم نے تم کو سارے جہاں (کی حمایت وطرفداری سے) منع نہیں کیا (۱۵-۷۰)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱-۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۲-۱۲۲) کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ تم یعنی بنی اسرائیل کو ان کی ہمعصر اقوام پر فضیلت دی اور بعض نے اس دور کے فضلاء مراد لئے ہیں جن میں سے ہر ایک نوازشات الٰہی کی بدولت بمنزلہ ایک عالم کے تھا اور ان کو عَالَمٌ سے موسوم کرنا ایسے

---

[1] عن وہب بن منبہ وفی القرطبی ثمانیۃ عشر اقوال [2] الفتح للشوکانی ۱/۱۲ وعن الفراء وابوعبید العالم عبارۃ عمن یعقل وہم اربعۃ امم الانس والجن والملائکۃ والشیاطین [3] ہو ابوعبداللہ جعفر الصادق بن محمد الباقر سبط ثم فی زمنہ تداولت تلمیذہ جابر بن حیان الصوفی کتابا ینتظم رسائلہ وہی خمسمائۃ رسالۃ توفی سنۃ ۱۴۸ھ راجع شذرات ۱/۲۲۰

ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ:-
اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً (۱۶-۱۲۰) بے شک حضرت ابراہیم ایک امّت تھے۔ میں حضرت ابراہیم کو اُمَّةً کہا ہے۔

(ع ل ن)

اَلْعَلَانِيَةُ ظاہر اور آشکارا یہ سِرٌّ کی ضد ہے اور عام طور پر اس کا استعمال معانی یعنی کسی بات کے ظاہر ہونے پر ہوتا ہے اور اجسام کے متعلق بہت کم آتا ہے عَلَنَ كَذَا کے معنی ہیں فلاں بات ظاہر اور آشکارا ہوگئی اور اَعْلَنْتُهُ أنا میں نے اسے آشکارا کر دیا۔ قرآن میں ہے:-
اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ (۷۱-۹) میں انہیں بر ملا اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔
مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۲۸-۶۹) جو کچھ ان کے سینوں میں مخفی ہے اور جو یہ ظاہر کرتے ہیں
عِلْوَانُ الْكِتَابِ جس کے معنی کتاب کے عنوان اور سرنامہ کے ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ عَلَنٌ سے مشتق ہو اور عنوان سے چونکہ کتاب کے مشمولات ظاہر ہوتے ہیں اس لئے اسے عِلْوَانٌ کہہ دیا گیا ہو۔

(ع ل و)

اَلْعُلْوُ کسی چیز کا بلند ترین حصہ یہ سُفْلٌ کی ضد ہے ان کی طرف نسبت کے وقت عُلْوِيٌّ وَسُفْلِيٌّ کہا جاتا ہے اور اَلْعُلُوُّ بلند ہونا عَالٍ صفت فاعلی بلند عَلِيَ يَعْلَى عَلَاءً عَلِيٌّ مگر عَلَا (فَعَلَ) کا استعمال زیادہ تر کسی جگہ کے یا جسم کے بلند ہونے پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:-
عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ (۷۶-۲۱) ان کے بدنوں پر دیبا کے کپڑے ہوں گے۔
بعض نے عَلَا اور عَلِيَ میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ عَلَا (ن) محمود اور مذموم دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے لیکن عَلِيَ (س) صرف مستحسن معنوں میں بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:-
اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ (۲۸-۴) فرعون نے ملک میں سر اٹھا رکھا تھا۔
لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ (۱۰-۸۳) (اور فرعون) ملک میں متکبر اور متغلب اور (کبر و کفر میں) حد سے بڑھا ہوا تھا۔
فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ (۲۳-۴۶) تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔
اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ (۳۸-۷۵) کیا تو غرور میں آگیا یا اونچے درجے والوں میں تھا۔
لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ (۲۸-۸۳) جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے۔
وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲۳-۹۱) اور ایک دوسرے پر غالب آ جاتا۔
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ (۲۷-۳۱) کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔
وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۱۷-۴) اور بڑی سرکشی کرو گے۔
وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (۲۷-۱۴) اور بے انصافی اور غرور سے (ان کا انکار کیا) کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے
اَلْعَلِيُّ کے معنی بلند اور برتر کے ہیں یہ عَلِيَ (کسر اللام) سے مشتق ہے جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت

واقع ہو جیسے:۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (۳۴-۲۳)

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا (۴-۳۴) تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ ذات اس سے بلند و بالا تر ہے کہ کوئی شخص اس کا وصف بیان کر سکے بلکہ عارفین کا علم بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۲۷-۶۳) یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خدا (کی شان) اس سے بلند ہے۔

اور یہاں تَعَالیٰ باب تفاعل سے ہے جس کے معنی ہیں "نہایت ہی بلند" ورنہ یہاں تکلف کے معنی مقصود نہیں ہیں جیسا کہ جب یہ لفظ انسان کے متعلق استعمال ہو تو یہ معنی مراد لئے جاتے ہیں اور آیت کریمہ:۔

وَتَعَالَى عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا (۱۷-۴۳) اور جو کچھ یہ بکواس کرتے ہیں اس سے (اس کا رتبہ) بہت عالی ہے۔

میں لفظ عُلُوًّا فعل تعالیٰ کا مصدر نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا (۷۱-۱۷) اور وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (۷۳-۸) میں نَبَاتًا اور تَبْتِيلًا مصدر (مِنْ غَيْرِ بَابِهٖ) واقع ہوئے ہیں۔

اَلْاَعْلیٰ سب سے بلند اور اشرف۔ قرآن میں ہے:۔

أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى ۔۔۔۔ (۷۹-۲۴) کہ تمہارا سب سے بڑا مالک میں ہوں۔

اَلِاسْتِعْلَاءُ (استفعال) کبھی یہ مذموم غلبہ کی طلب کے لئے آتا ہے اور کبھی اس کے معنی طلب رفعت کے ہوتے ہیں اور آیت کریمہ:۔

قَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَى (۲۰-۶۴) اور آج جو غالب رہا وہی کامیاب ہے۔

میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (۸۷-۱) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار (جلیل القدر) کے نام کی تسبیح کرو۔ پروردگار کے اَلْاَعْلیٰ ہونے کے معنی یہ ہیں اس کی ذات اس بات سے بلند ہے کہ کسی مخلوق کو اس پر قیاس کیا جائے یا اسے دوسروں کی طرح سمجھا جائے اور آیت کریمہ:۔

وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى (۲۰-۴) اور اونچے اونچے آسمان بنائے۔

عُلیٰ عُلْیا کی جمع ہے اور عُلْیا اَعْلیٰ کی تانیث ہے اور معنی یہ ہیں کہ آسمان اس دنیا سے اشرف و افضل ہیں جیسے فرمایا:۔

أَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا (۷۹-۲۷) بھلا تمہارا بنانا آسان ہے یا آسمان کا؟ اسی نے اس کو بنایا۔ اور آیت کریمہ:۔

لَفِي عِلِّيِّينَ ۔۔۔۔۔ (۸۳-۱۸) علیین میں ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ عِلِّيِّينَ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام کا نام ہے جس طرح کہ سجین دوزخ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ طبقہ کا نام ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل اس کا اطلاق جنتی لوگوں پر ہوتا ہے اور نحوا عربی کے لحاظ سے یہی معنی اَقْرَبُ اِلَی الصَّواب معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ جمع (جمع سالم) ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے اور یہ عِلِّيٌّ بروزن بِطِّيخ کی جمع ہے اور معنی یہ ہیں کہ ابرار بھی عِلِّيِّين لوگوں کے زمرہ میں شامل ہوں گے جیسے فرمایا:۔

فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

مِنَ النَّبِيّٖنَ (۴-۶۹) الآیۃ وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق الخ ......

اور معنی عُلُوٌّ کے لحاظ سے بلند مقام کو اور بلندی کو عَلْيَاءُ کہا جاتا ہے اور عُلِّيَّةٌ اصل میں تو عَالِيَةٌ کی تصغیر ہے لیکن عرف میں بالاخانہ کو عُلِّيَّةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع عَلَالِيُّ بروزن فَعَالِيْلُ ہے تَعَالَى النَّهَارُ دن بلند ہو گیا عَالِيَةُ الرُّمْحِ سِنَانٌ (برچھے نیزے) سے چھوٹا نیزہ۔

عَالِيَةُ الْمَدِيْنَةِ مدینہ کی اعلیٰ جانب اس کی جمع عَوَالٍ ہے اسی سے کہا گیا ہے۔

بُعِثَ اِلٰی اَهْلِ الْعَوَالِيْ کہ اہل عوالی کو بلا بھیجا اور عَالِيَةٌ کی طرف نسبت کے وقت عُلْوِيٌّ کہا جائے گا اور عَلَاةٌ کے معنی سَنْدَانٌ یعنی نہائی کے ہیں[1] عام اس سے کہ وہ لوہے کی ہو یا پتھر کی۔

اَلْعِلْيَانُ بڑا جسیم اونٹ۔

عِلَاوَةُ الشَّيْءِ کسی چیز کے اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں اسی سے سر اور گردن کو عِلَاوَةٌ کہا جاتا ہے نیز بوسے بوجھ کے بعد اوپر سے جو زائد بوجھ رکھا جائے اسے بھی عِلَاوَةٌ کہا جاتا ہے[2] عِلَاوَةُ الرِّيْحِ جو ہوا اوپر سے آئے اس کی ضد سِفَالَةٌ ہے۔

اَلْمُعَلّٰى قمار بازی کا ساتواں تیر جو سب سے اشرف اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ اُعْلُ عَنِّيْ مجھ سے دور ہو جا۔

تَعَالَ۔ اس کے اصل معنی کسی کو بلند جگہ کی طرف بلانے کے ہیں پھر عام بلانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں عُلُوٌّ سے ہے جس کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں لہٰذا جب کوئی شخص دوسرے کو تَعَالَ کہہ کر بلاتا ہے تو گویا وہ کسی رفعت کے حصول کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جیسا کہ مخاطب کا شرف ظاہر کرنے کے لئے اِفْعَلْ كَذَا غَيْرَ صَاغِرٍ کہا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔

قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا (۳-۶۱) تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں ..... کو بلائیں۔

تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ (جو) بات (یکساں تسلیم کی گئی ہے اس کی) طرف آؤ۔ (۳-۶۴)

تَعَالَوْا اِلٰی مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (۴-۶۱) جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف رجوع کرو اور ..... آؤ۔

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ (۲۷-۳۱) کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔

تَعَالَوْا اَتْلُ (۶-۱۵۱) کہہ کہ (لوگو) آؤ میں (تمہیں) پڑھ کر سناؤں۔

تَعَلّٰی بلندی پر چڑھ گیا۔ دور چلا گیا۔

کہا جاتا ہے عَلَّيْتُهٗ فَتَعَلّٰی میں نے اسے بلند کیا۔ چنانچہ وہ بلند ہو گیا۔

عَلٰی

عَلٰی۔ یہ حروف جارہ سے ہے مگر کبھی بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے جیسے عَلَتْ مِنْ عَلَيْهِ اس پر اوپر کی جانب سے حملہ کیا گیا۔

(ع م م)

اَلْعَمُّ (چچا) باپ کا بھائی (جمع اَعْمَامٌ)

---

[1] وفی الفائق ۲-۹۲ عطاء فی مھبط آدم قال: ... ھبط مع علاۃ وفعلۃ من العلیم [2] وذکر ابن ابی الدنیا فی العزاء وابن المنذر (ق) انہ لما نزلت الذین اذا اصابتھم مصیبۃ الآیۃ۔ قال عمر نعم العدلان ای الصلوات ورحمۃ ونعم العلاوۃ ای اولئک ھم المہتدون ؛

اَلْعَمَّۃُ (پھوپھی) باپ کی بہن (جمع عَمَّات) قرآن میں ہے:۔

اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِکُمْ (۲۴-۶۱) یا اپنے چچاؤں کے گھر سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے۔

رَجُلٌ مُعَمٌّ مُخْوَلٌ وہ شخص جس کے چچا اور ماموں موں یعنی ننھیال اور ددھیال کی طرف قوی ہو۔

اِسْتَعَمَّ عَمًّا وَتَعَمَّمَہٗ کسی کو چچا بنانا اور اصل یہ عُمُوْمٌ سے ہے جس کے معنی شامل ہونے کے ہیں اور یہ شامل ہونا باعتبار کثرت ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔

عَمَّھُمْ کَذَا وَعَمَّھُمْ بِکَذَا عَمًّا وَعُمُوْمًا یعنی وہ چیز عام ہوگئی اور پبلک کو اَلْعَامَّۃ کہا جاتا ہے کیونکہ شہر میں عامی لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے اور معنی شمول یعنی لپیٹنے کے اعتبار سے پگڑی کو اَلْعِمَامَۃ کہا جاتا ہے اور تَعَمَّمَ کے معنی سر پر پگڑی لپیٹنے کے ہیں جس طرح کہ تَقَنَّعَ وَتَقَمَّصَ کے معنی چہرہ پر پردہ ڈالنا یا قمیص پہننا کے آتے ہیں عَمَّمْتُہٗ میں نے اسے عمامہ پہنایا۔ اور کنایۃً اس کے معنی کسی کو سردار بنانا بھی آتے ہیں شَاۃٌ مُعَمَّمَۃٌ "سفید سر والی بکری گویا اس کے سر پر عمامہ بندھا ہوا ہے۔ اور یہ مُقَنَّعَۃٌ وَمُخَمَّرَۃٌ کی طرح استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے ( )

(۳۲۱) یَا عَامِرَ بْنَ مَالِکٍ یَا عَمَّا
اَفْنَیْتَ عَمًّا وَجَبَرْتَ عَمًّا

اے میرے چچا عامر بن مالک تو نے بہت سے لوگوں کو فنا کیا اور بہت سے لوگوں پر بخشش کی۔

اور آیت کریمہ:۔

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ (۷۸-۱) (یہ) لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔

میں عَمَّ اصل میں عَنْ مَا تھا۔ اور یہ اس باب (ع م م) سے نہیں ہے۔

(ع م د)

اَلْعَمْدُ کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے اور اس پر ٹیک لگانا کے ہیں اور اَلْعِمَادُ وہ چیز ہے جس پر ٹیک لگائی جائے یا بھروسہ کیا جائے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۸۹-۷) جو ارم (کہلاتے تھے اتنے) دراز قد۔

میں اَلْعِمَادُ سے وہ چیزیں مراد ہیں جن پر انہیں بڑا بھروسہ تھا محاورہ ہے۔ عَمَدْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو سہارا دے کر کھڑا کرنا عَمَدْتُ الْحَائِطَ دیوار کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اَلْعَمُوْدُ اس لکڑی (بلی) کو کہتے ہیں جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے اس کی جمع عُمُدٌ وَعَمَدٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ (۱۰۴-۹) (یعنی آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں۔

اور ایک قرأت میں فِیْ عُمُدٍ ہے نیز فرمایا:۔

بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا (۱۳-۲) ستونوں کے بغیر ...... جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔

نیز اَلْعُمُوْدُ ہر اس لکڑی یا لوہے کو کہتے ہیں جس پر سہارا لگا کر انسان کھڑا ہوتا ہے عُمُوْدُ

اَلصُّبْحُ صبح کی ابتدائی روشنی کیونکہ یہ بھی ایک دم ستون کی طرح اوپر کو اٹھتی ہے۔ عرف میں اَلْعَمْدُ وَالتَّعَمُّدُ کے معنی قصداً کوئی کام کرنا آتے ہیں اور یہ سَھْوٌ کی ضد ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا (۴-۹۳) اور جو کوئی شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔

وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (۳۳-۵) لیکن جو قصد دل سے کرو۔ اور محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ رَفِيْعُ الْعِمَادِ یعنی وہ دراز قامت ہے۔ اَلْعَمَدَةُ ہر اس مال وغیرہ کو کہا جاتا ہے جس پر اعتماد کیا جائے اس کی جمع عُمُدٌ ہے اور عَمِيْدٌ وہ سردار جس پر معاملات میں لوگ بھروسہ کرتے ہوں اور عَمِيْدٌ کے معنی حزین بھی آتے ہیں گویا کہ وہ غم کا مقصود ہے جس طرح بیمار کو سَقِيْمٌ کہتے ہیں کہ وہ بیماری کا مقصود بنا ہوا ہوتا ہے وقَدْ عَمِدَ اس نے حزن وملال، غصہ یا بیماری کی وجہ سے درد وکرب کا اظہار کیا عَمِدَ الْبَعِيْرُ پیٹھ کے زخمی ہونے کی وجہ سے اونٹ کراہنے لگا۔

(ع م ر)

اَلْعِمَارَةُ یہ خَرَابٌ کی ضد ہے عَمَرَ اَرْضَهٗ يَعْمُرُهَا عِمَارَةً اس نے اپنی زمین آباد کی۔ قرآن میں ہے:۔

وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۹-۱۹) اور مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کو آباد کرنا۔

کہا جاتا ہے۔ عَمَرْتُهٗ میں نے اسے آباد کیا۔ فَعَمَرَ چنانچہ وہ آباد ہوگئی اور آباد کی ہوئی جگہ کو مَعْمُوْرٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَعَمَرُوْهَا اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا (۳۰-۹) اور اس کو اس سے زیادہ آباد کیا تھا جو انہوں نے آباد کیا۔

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ (۵۲-۴) اور آباد کئے ہوئے گھر کی۔

اَعْمَرْتُهُ الْاَرْضَ وَاسْتَعْمَرْتُهٗ میں نے اسے آباد کرنے کے لئے زمین دی۔ قرآن میں ہے:۔

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا (۱۱-۶۱) اور اس میں آباد کیا۔

اور اَلْعَمْرُ وَالْعُمُرُ اس مدت کو کہتے ہیں جس میں بدن زندگی کے ساتھ آباد رہتا ہے اور یہ بقا سے فروتر ہے چنانچہ طَالَ عُمُرُهٗ کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ اس کا بدن روح سے آباد رہے لیکن طَالَ بَقَاءُهٗ اس مفہوم کا مقتضی نہیں ہے کیونکہ اَلْبَقَاءُ تو فَنَاءٌ کی ضد ہے اور چونکہ بقاء کو عمر پر فضیلت ہے اس لئے حق تعالیٰ بقاء کے ساتھ تو موصوف ہوتا ہے مگر عُمُرٌ کے ساتھ بہت کم متصف ہوتا ہے۔

اَلتَّعْمِيْرُ کے معنی ہیں بالفعل عمر بڑھانا یا زبان کے ساتھ عَمَّرَكَ اللّٰهُ کہنا یعنی خدا تیری عمر دراز کرے۔ قرآن میں ہے:۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ (۳۵-۳۷) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو سوچنا چاہتا سوچ لیتا۔

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖ (۳۵-۱۱) اور نہ کسی بڑی عمر والے کو عمر زیادہ دی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے۔

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ (۲-۹۶) اگر اتنی لمبی عمر اس کو مل بھی جائے تو اسے عذاب سے تو نہیں چھڑا سکتی۔ اور آیت:۔

[1] وقد جاء فی القرآن فی مقابلۃ الخطا (کما فی (۴-۹۲، ۳۳-۵)) ÷

وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (۳۶-۶۸) اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں اسے خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔

حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۱-۴۴) یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ان کی عمریں بسر ہوگئیں۔

وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ (۲۶-۱۸) اور تم نے برسوں ہمارے ہاں عمر بسر کی۔

اَلْعُمُرُ وَالْعَمْرُ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن قسم کے موقعہ پر خاص کر اَلْعَمْرُ کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ عُمْرٌ کا لفظ نہیں بولا جاتا جیسے فرمایا:

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ (۱۵-۷۲) تمہاری زندگی کی قسم وہ اپنی مستی میں ۔۔۔۔۔

عَمْرَكَ اللّٰهَ خدا تمہاری عمر دراز کرے یہاں بھی چونکہ قسم کی طرح تاکید مراد ہے اس لئے لفظ عَمْر کو خاص کیا ہے۔ اَلْاِعْتِمَارُ وَالْعُمْرَةُ کے معنی ملاقات کے ہیں کیونکہ ملاقات سے بھی محبت اور دوستی کا خانہ آباد ہوتا ہے اصطلاح شریعت میں حج کے علاوہ بیت اللہ کی زیارت اور طواف سعی کرنے کو عُمْرَةٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ (۹-۱۸) خدا کی مسجدوں کو تو ۔۔۔۔۔ آباد کرتے ہیں۔

میں يَعْمُرُ کا لفظ یا تو اَلْعِمَارَةُ سے ہے جس کے معنی آباد اور حفاظت کرنا ہیں اور یا اَلْعُمْرَةُ سے ہے جس کے معنی زیارت کے ہیں اور یا عَمَرْتُ بِمَكَانِ كَذَا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں کیونکہ عَمَرْتُ الْمَكَانَ وَعَمَرْتُ بِالْمَكَانِ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

اَلْعِمَارَةُ کے معنی مخصوص خاندان کے ہیں اور یہ لفظ اَلْقَبِيْلَةُ سے اخص ہے یا اصل میں انسانوں کی اس جماعت کا نام ہے جس سے مکان کی آبادی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۲۲) لِكُلِّ اُنَاسٍ مِنْ مَعَدٍّ عِمَارَةٌ
تمام لوگوں کا سلسلہ نسب بنی معد سے ملتا ہے۔

اَلْعَمَارُ عمامہ یا پھول جو قوم کا سردار اپنی سرداری کی علامت اور اس کی حفاظت کے لئے سر پر رکھتا ہے اور بطور استعارہ صرف پھولوں کو بھی عَمَارٌ کہا جاتا ہے گو بطور علامت نہ ہوں۔ اَلْمُعْمَرُ رہائشی مکان کو کہتے ہیں بشرطیکہ اس میں کوئی آباد ہو اور اَلْعَمْرَمَةُ رفقار کی اس جماعت کو کہتے ہیں جو جب کسی مقام پر فروکش ہو تو مقام آباد نظر آئے۔

اَلْعُمْرٰى وہ عطیہ جو اس شرط پر دیا جائے کہ جب تک میری یا تمہاری زندگی ہے اس وقت تک اس سے فائدہ اٹھا لو اس کے بعد واپس لے لیا جائے گا جیسا کہ اَلرُّقْبٰى میں ہوتا ہے اور ایسے عطیہ کو عُمْرٰى کہنے سے اس کے مستعار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْعَمْرُ مسوڑھوں کا گوشت کیونکہ اس سے دانتوں کی درمیانی خلا پر اور آباد رہتی ہے اس کی جمع عُمُوْرٌ ہے اُمُّ عَامِرٍ گفتار۔ لگڑبگڑ اَبُوْ عَمْرَةَ مفلسی۔

---

[1] قالہ الاخنس بن شہاب التغلبی الجاہلی وتمامہ:۔۔۔۔۔ عروض الیہا یلجؤون وجانب (الشطر فی اللسان (عمر) والمحکم (عروض) والبیت من کلمۃ مفضلیۃ ۲۷ بیتا برقم ۴۱ معظمہا فی الحماسۃ مع المرزوقی رقم ۸۴۲ وبعضہا فی المعجم البکری ۷۰۵ والبلدان (اسم) قضیم والجنلار ۴۸۱ والبیت فی جزیرۃ العرب ''للہمدانی والسمط ۸۶۸

(ع م ق)

اَلْعُمْقُ۔ دراصل اس کے معنی نیچے کی طرف دوری یعنی گہرائی کے ہیں اس لئے بہت گہرے کنویں کو بِئْرٌ عَمِیْقٌ وَمَعِیْقٌ کہا جاتا ہے۔ دراستے کی صفت ہو تو اس کے معنی دور دراز راستہ کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (۲۲-۲۷) دور دراز راستے سے۔

(ع م ل)

اَلْعَمَلُ ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃً صادر ہو یہ فعل سے اخص ہے کیونکہ فعل کا لفظ کبھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں جن سے بلاقصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف اَلْبَقَرُ الْعَوَامِلُ ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لئے استعمال ہوا ہے۔ نیز عَمَلٌ کا لفظ اچھے اور برے دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲-۲۷۷) جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے......

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ (۲۰-۱۱۲) اور جو نیک کام کرے گا۔

مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (۴-۱۲۳) جو شخص برے عمل کرے گا اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائیگا۔

وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ (۶۶-۱۱) اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال (زشتہ مآل) سے نجات بخشیں۔

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ (۱۱-۴۶) وہ تو ناشائستہ افعال ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّئٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (۳۵-۱۰) اور جو برے برے مکر کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا (۹-۶۰) اور کارکنان صدقات کا حق ہے۔ میں عَامِلِیْنَ سے محکمہ زکوٰۃ کے کارندے مراد ہیں۔ جو زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے پر مقرر ہوتے ہیں اور ان کی اجرت کو عُمَالَةٌ کہا جاتا ہے۔

عَامِلُ الرُّمْحِ نیزے کا وہ حصہ جو سنان (بھالا) سے متصل ہوتا ہے۔

اَلْیَعْمَلَةُ کے معنی تیز رو اونٹنی کے ہیں یہ بھی اَلْعَمَلُ سے مشتق ہے۔

(ع م ہ)

اَلْعَمَهُ کے معنی حیرانگی کی وجہ سے کسی کام میں تردد سے کام لینا کے ہیں۔

عَمِهَ (س) صیغہ صفت فاعل عَمِهٌ وَعَامِهٌ اور عَامِهٌ کی جمع عُمَّهٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (۲-۱۵) وہ اپنی شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ (۲۷-۴) ہم نے ان کے اعمال ان کے لئے آراستہ کر دیئے تو وہ سرگرداں ہو رہے ہیں۔

۱۔ ویقال للناقة السریعة ناقة عملة و یعملة کما قال عبد اللہ بن رواحہ: ع یا زید زید الیعملات الذبل ۔

(ع م ی)

اَلْعَمٰی یہ بصارت اور بصیرت دونوں قسم اندھے پن کے لئے بولا جاتا ہے لیکن جو شخص بصارت کا اندھا ہو اس کے لئے صرف اَعْمٰی اور جو بصیرت کا اندھا ہو اس کے لئے اَعْمٰی و عَمٍ دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:۔
اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی (۸۰-۲) کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔
میں اَلْاَعْمٰی سے مراد بصارت کا اندھا ہے مگر جہاں کہیں قرآن نے اَلْعَمٰی کی مذمت کی ہے وہاں دوسرے معنی یعنی بصیرت کا اندھاپن مراد لیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ (۲-۱۸) یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں۔
فَعَمُوْا وَصَمُّوْا (۵-۷۱) تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔
بلکہ بصیرت کے اندھاپن کے مقابلہ میں بصارت کا اندھاپن۔ قرآن کی نظر میں اندھاپن ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔
فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (۲۲-۴۶) بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
اَلَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ (۱۸-۱۰۱) جنکی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں۔
بھی اسی معنی پر محمول ہے اور کور بصری کے متعلق فرمایا
لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ (۴۸-۱۷) نہ تو اندھے پر کچھ گناہ ہے۔
اور اَعْمٰی کی جمع عُمْيٌ و عُمْيَانٌ آتی ہے چنانچہ فرمایا:۔
بُكْمٌ عُمْيٌ (۲-۱۸) گونگے اور اندھے ہیں۔
صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵-۷۳) اندھے اور بہرے ہو کر ...۔ اور آیت کریمہ:۔
وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷-۷۲) جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اور نجات کے رستے سے بہت دور۔
میں پہلا اَعْمٰی صیغہ صفت مشبہ ہے اور ثانی کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ بھی صیغہ صفت مشبہ ہے۔
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَفْعَلُ مِنْ كَذَا اسم تفضیل کا صیغہ ہے کیونکہ یہ اس اَلْعَمٰی سے مشتق ہے جس کے معنی نقدان بصیرت کے ہیں اس لئے اس میں مَا اَفْعَلَهٗ و اَفْعَلُ مِنْ كَذَا دونوں طرح کہنا صحیح ہے مگر اس کے برعکس بعض نے آیت مذکورہ میں پہلے اَعْمٰی کو بصیرت کے اندھاپن اور دوسرے کو بصر کے اندھاپن پر محمول کیا ہے۔ یہ ابوعمرو کا قول ہے۔ اس لئے وہ پہلے اَعْمٰی میں امالہ کا قائل ہے کیونکہ یہ عَمَی الْقَلْب سے ہے اور دوسرے میں امالہ کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اسم ہے وَالْاِسْمُ اَبْعَدُ مِنَ الْاِمَالَةِ یعنی اسم میں امالہ جائز نہیں ہے[1] نیز فرمایا:۔
وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ

---

[1] قال الزمخشری وقد جوزوان یکون الثانی بمعنی التفضیل ومن ثم قرأ ابو عمرو الاول ممالا (ای بالامالة) والثانی مفخماً ای بدون الامالة لان افعل التفضیل لما کان تمامه بمن کانت الفه فی حکم الواقعة فی وسط الکلام کقولک اعمالکم واما الاول فلم یتعلق به شیء فکانت الفه واقعة فی الطرف معترضة للامالة انظر الکشاف ص ۶۹۳ ج ۲ طبع الاستقامة القاهرة ۱۳۶۵ھ ۱۲

هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى (۴۱-۴۴) اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہرہ پن) ہے یہ ان کے حق میں (موجب) نابینائی ہے۔
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ (۷-۶۴) کچھ شک نہیں کہ وہ اندھے لوگ تھے۔
اور ارشاد باری تعالیٰ:۔
وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا (۱۷-۹۷) اور ہم ان کو قیامت کے دن اوندھے منہ اندھے گونگے اور بہرے بنا کر اٹھائیں گے۔
میں بصر کا اندھاپن بھی مراد ہوسکتا ہے اور دل کی بصیرت کا زائل ہونا بھی عَمِيَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں اس پر فلاں معاملہ اس طرح غیر واضح اور مشتبہ ہوگیا کہ گویا وہ اس سے اندھا ہے (اور وہ اسے سمجھائی نہیں دیتا) قرآن میں ہے:۔
فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَاۗءُ يَوْمَىِٕذٍ (۲۸-۶۶) تو وہ اس روز خبروں سے اندھے ہوجائیں گے۔
وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ (۱۱-۲۸) اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے رحمت بخشی ہے جس کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔
اَلْعَمَاۗءُ بادل، جہالت بعض نے کہا ہے کہ روایت[1]: اَنَّهٗ قِيْلَ اَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ خَلَقَ السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ قَالَ فِيْ عَمَاۗءٍ تَحْتَهٗ عَمَاۗءٌ وَفَوْقَهٗ عَمَاۗءٌ۔ آپ سے پوچھا گیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا اَلْعَمَاۗءُ میں جس کے نیچے بھی عَمَاۗءٌ تھی اور اوپر بھی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جس کا علم حاصل نہیں ہوسکتا اور عَمِيَّةٌ کے معنی جہالت کے ہیں اور اَلْمَعَامِيْ (مَعْمَاةٌ کی جمع ہے) اس ریگستان کو کہتے ہیں جس میں کوئی نشان راہ نہ ہو۔

(عن) (حرف)

عن۔ یہ حرف جار ہے اور اپنے مجرور سے تجاوز کو چاہتا ہے جیسے حَدَّثْتُكَ عَنْ فُلَانٍ (میں فلاں سے تمہارے سامنے بیان کرچکا ہوں) وَاَطْعَمْتُهٗ عَنْ جُوْعٍ (میں نے اسے بھوک سے کھلایا) ابومحمد البصری نے کہا ہے کہ عَنْ بلحاظ استعمال کے عَلٰی سے عام ہے کیونکہ یہ جہات ستہ میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی عَلٰی بھی اس کی بجائے آجاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2]:

(۳۲۳) اِذَا رَضِيَتْ عَلَيَّ بَنُوْ قُشَيْرٍ
جب بنو قشیر مجھ سے راضی ہوں۔

اسی طرح اَطْعَمْتُهٗ عَلٰی جُوْعٍ وَكَسَوْتُهٗ عَلٰی عُرْيٍ میں اگر عَنْ کی بجائے عَلٰی کہا جائے تو صحیح ہوگا۔

(ع ن ب)

اَلْعِنَبُ (انگور) یہ انگور کے پھل اور اسی

---

[1] فی الفائق ۲ ر ۹۲ و رواہ ابن حبان رقم ۹۳؛ تحتہ ھواء فوقہ ھواء کذا فی ابن جریر والطبرانی و ابی الشیخ فی العظمۃ عن ابی رزین راجع کنز العمال رقم ۴۸ واللفظۃ الیواکرۃ ۱۲ ر ۲
[2] قالہ القحیف بن سلیم العقیلی من کلمۃ یمدح فیہا حکیم بن المسیب القشیری وتمامہ: لعمر اللہ اعجبنی رضاھا۔ وبعدہ: ولا تنبو سیوف بنی قشیر ولا تمضی الاسنۃ فی صفاھا۔ والبیت فی اللسان (رضی) والاقتضاب ۴۳۲ والکامل ۵۳۹؛ ۸۲۴ وادب الکتاب ۴۱۵ والفرائد للآلوسی ۱۳۷ والبحر ۵ ر ۴۶۲ والخزانۃ ۴: ۲۴۷ وابن عقیل ۲۰۶ وابن ہشام (۱: ۱۵۲) وامالی ابن الشجری (۲: ۲۶۹) والسیوطی ۴۲ ومجاز القرآن رقم ۴۳۵ ونوادر ابی زید ۱۷۶ والعینی (۳: ۲۸۲) ۱۲

بیل کے لئے بھی بولا جاتا ہے اس کا واحد عِنَبَۃٌ ہے اور جمع اَعْنَابٌ قرآن میں ہے :۔
مِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ (۱۶-۶۷) اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی ۔
جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ (۱۷-۹۱) کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو ۔
وَجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ (۱۳-۴) اور انگوروں کے باغ ۔
حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا (۷۸-۳۲) یعنی باغ اور انگور
وَعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَیْتُوْنًا (۸۰-۲۷، ۲۸) اور انگور اور ترکاری اور زیتون ۔
جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ (۱۸-۳۲) انگور کے دو باغ ۔
اور عِنَبَۃٌ کے معنی پھنسی کے بھی آتے ہیں جو شکل میں انگور کے دانہ کے مشابہ ہوتی ہے ۔

(ع ن ت)

اَلْمُعَانَتَۃُ یہ مُعَانَدَۃٌ کے ہم معنی ہے یعنی باہم عناد اور دشمنی سے کام لینا لیکن مُعَانَتَۃٌ اس سے بلیغ تر ہے کیونکہ مُعَانَتَۃٌ ایسے عناد کو کہتے ہیں جس میں خوف اور ہلاکت کا پہلو بھی ہو۔ چنانچہ عَنَتَ فُلَانٌ۔ یَعْنَتُ عَنَتًا اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایسے معاملہ میں پھنس جائے جس میں تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو قرآن میں ہے :۔
لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ (۴-۲۵) اس شخص کو ہے جسے ہلاکت میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔
وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ (۳-۱۱۸) اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو تمہیں تکلیف پہنچے ۔
عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ (۹-۱۲۸) (۳-۱۰۷) تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے :۔ اور آیت کریمہ :۔
وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ (۲۰-۱۱۱) اور سب کے چہرے اس زندہ و قائم کے روبرو جھک جائیں گے ۔
میں عَنَتْ کے معنی ذلیل اور عاجز ہو جانے کے ہیں اور اَعْنَتَہٗ کے معنی تکلیف میں مبتلا کرنے کے ہیں ۔ چنانچہ فرمایا :۔
وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَاَعْنَتَکُمْ (۲-۲۲۰) اور اگر خدا چاہتا تو تم کو تکلیف میں ڈال دیتا ۔
اور جس ہڈی کو جوڑ آگیا ہو اگر اسے کوئی صدمہ پہنچے اور وہ دوبارہ ٹوٹ جائے تو ایسے موقع پر بھی اَعْنَتَہٗ کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔

(ع ن د)

اَلْعَنِیْدُ کے معنی اَلْمُعْجِبُ بِمَا عِنْدَہٗ کے ہیں یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر اترانے والا !
اور مُعَانِدٌ اسے کہتے ہیں جسے جو کچھ اس کے پاس ہے اس پہ فخر ہو۔ قرآن میں ہے :۔
کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیْدٍ (۵۰-۲۴) ہر سرکش ناشکرے کو ۔
اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا (۷۴-۱۶) یہ ہماری آیتوں کا دشمن رہا ہے ۔
بعض کے نزدیک اَلْعَنُوْدُ کے بھی یہی معنی ہیں صرف ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ عَنِیْدٌ اسے کہتے ہیں جو حق سے عناد رکھے اور اس کی مخالفت کرے اور عَنُوْدٌ وہ ہے جو صحیح راہ سے ہٹ جائے اس لئے بَعِیْرٌ عَنُوْدٌ (وہ اونٹ جو صحیح راہ سے ہٹ کر چلے) تو بولتے ہیں مگر عَنِیْدٌ نہیں کہتے اور عُتَّدٌ عَانِدٌ کی جمع ہے اور عَنُوْدٌ کی جمع عُنُدٌ اور عَنِیْدٌ کی جمع

عُنُدٌ آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْعُنُوْدُ کے معنی راستہ سے ایک جانب مائل ہوجانے کے ہیں۔ لیکن عُنُوْدٌ خاص کر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی راستہ سے ہٹ جائے اور عَنِیْدٌ وہ ہے جو حکمی راہ سے ہٹا ہوا ہو عَنَدَ عَنِ الطَّرِیْقِ اس نے راستہ سے عدول کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَانِدٌ کے معنی کسی کو لازم پکڑنا بھی آتے ہیں اور اس سے الگ ہونا بھی اور یہ دونوں وہ مختلف اعتبار سے مشتق ہیں جیسا کہ اَلْبَیْنُ کا لفظ دو مختلف اعتباروں سے وصل کے معنی بھی دیتا ہے اور جدائی کے بھی۔

(عِنْدَ ظرف)

عِنْدَ یہ کسی چیز کا قرب ظاہر کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے کبھی تو مکان کا قرب ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے اور کبھی اعتقاد کے معنی ظاہر کرتا ہے جیسے عِنْدِیْ کَذَا اور کبھی کسی شخص کی قرب و منزلت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا۔ بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۳-۱۶۹) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ (۷-۲۰۶) جو لوگ تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ ...... وہ گردن کشی نہیں کرتے۔

فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ (۴۱-۳۸) جو فرشتے تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ (۶۶-۱۱) اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

اور اسی معنی میں اَلْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے مقرب فرشتے) کا محاورہ ہے۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (۴۲-۳۶) اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے۔ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (۴۳-۸۵) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۱۳-۴۳) اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۲۴-۱۳) تو خدا کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔

وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ (۲۴-۱۵) اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔

اور آیت کریمہ:

اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ (۸-۳۲) اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے برحق ہے۔ میں عِنْدَ بمعنی حکم ہے۔

(ع ن ق)

اَلْعُنُقُ۔ گردن جمع اَعْنَاقٌ۔ قرآن میں ہے:
وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ (۱۷-۱۳) اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بہ صورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔
مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (۳۸-۳۳) ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔
اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْ اَعْنَاقِهِمْ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے۔ اور آیت کریمہ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (۸-۱۲) کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سروں پر مارو اور اسی سے مراد گردن

آدمی کو رَجُلٌ اَعْنَقُ کہا جاتا ہے اِمْرَءَۃٌ عَنْقَاءُ دراز گردن عورت۔ کَلْبٌ اَعْنَقُ سفید گردن کتا۔

اَعْنَقْتُہٗ کَذَا میں نے اس کی گردن میں فلاں چیز ڈال دی اس سے بطور استعارہ اِعْتَنَقَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں کسی بات کی ذمہ داری اٹھا لینا۔ کسی مسلک کو قبول کر لینا۔

اَلْاَعْنَاقُ کے معنی رؤسائے قوم کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُھُمْ لَھَا خَاضِعِیْنَ (۲۶-۴)

پھر ان کے اکابر عاجز در ماندہ ہو کر اس کے سامنے جھک جائیں۔

میں اَعْنَاق سے رؤسا اور اکابرین قوم مراد ہیں۔

تَعَنَّقَ الْاَرْنَبُ خرگوش نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

اَلْعَنَاقُ بکری کا مادہ بچہ۔

عَنْقَاءُ مُغْرِبٌ بعض نے کہا ہے کہ ایک خیالی پرند کا نام ہے جس کا وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا۔

(ع ن و)

وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ (۲۰-۱۱۱) اور چہرے اس زندہ و قائم کے سامنے جھک جائینگے۔ یعنی مصیبت میں گرفتار ہو کر خدا کے سامنے جھک جائیں گے اور عَنَنْتُہٗ کے معنی کسی کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے ہیں اور عَنِیَ کے معنی مصیبت میں مبتلا ہونا یا قیدی بننا کے آتے ہیں اسی سے قیدی کو اَلْعَانِیْ کہا جاتا ہے اس کی مؤنث عَانِیَۃٌ ہے اور عَانِیَۃٌ کی جمع عَوَانٍ آتی ہے۔ آنحضرت نے فرمایا:[1] (۵۰)

اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا فَاِنَّھُنَّ عِنْدَکُمْ عَوَانٍ کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو بیشک وہ تمہارے پاس ایک طرح سے قیدی ہیں۔ محاورہ ہے:۔ عُنِیَ بِحَاجَتِہٖ فَھُوَ مَعْنِیٌّ بِھَا کسی حاجت میں مبتلا ہونا، بعض نے عَنِیَ فَھُوَ عَانٍ کہا ہے اور آیت کریمہ:۔

لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ (۸۰-۳۷) میں ایک قراءت یَعْنِیْہِ بھی ہے یعنی اسے مصروف رکھے گی۔

اَلْعَنِیَّۃُ ایک دوا جو خارشی اونٹ پر ملی جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے[2]:۔

عَنِیَّۃٌ تَشْفِیْ الْجَرَبَ در حق مرد نیک رای گویند کہ بفکر خود امور را نیک انجام دہد۔

اَلْمَعْنٰی مفہوم یا مقصود جو لفظ سے ظاہر ہوتا ہو۔ یہ عَنَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں زمین نے پودے نمودار کئے۔

عَنَتِ الْقِرْبَۃُ مشک سے پانی بہہ پڑا اور جو لوگ عِنْوَانُ الْکِتَابِ کو عُنِیَ سے مشتق مانتے ہیں ان کے نزدیک یہ بھی عَنَتِ الْقِرْبَۃُ سے ماخوذ ہے اور لفظ اَلْمَعْنٰی اور التفسیر کا تقریباً ایک ہی مفہوم ہے گو ان میں ندرے فرق پایا جاتا ہے۔

---

[1] فی الکشاف فانھن عوان فی ایدیکم الحدیث ا/۸۲۵ وفی الترمذی والنسائی وابن ماجۃ من حدیث عمرو بن الاحوص فی خطبۃ حجۃ الوداع فیھا فانھن عوان عندکم وسعی البیہقی والبزار والطبرانی من حدیث موسیٰ بن عبیدۃ الزبذی واحد الضعفاء عن ابن عمر مرفوعًا: النساء عوان فی ایدیکم انظر تخریج احادیث الکشاف ص ۴۰ - الم رقم ۳۳۵ وتخریج العراقی ص ۲/۴۱ ج ۲ نحوہ رواہ مسلم من حدیث جابر الطویل [2] قال المیدانی ۲/۱۸: العنیۃ بول البعیر یطلی بہ الاجرب والمثل یضرب للرجل الجید الرای یستشفی برایہ فیما ینوب انظر المثل الفائق ۲/۹۷ ❊ ❊ ❊ ❊

(ع ھ د)

اَلْعَھْدُ (ض) کے معنی ہیں کسی چیز کی پیہم نگہداشت اور خبر گیری کرنا اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عَھْدٌ کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَھْدِ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷-۳۴) اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔ یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔

لَایَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۲-۱۲۴) کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔

وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ (۹-۱۱۱) اور خدا سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔

عَھِدَ فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ کسی سے عہد و پیمان لیکر اسے اس پر قائم رہنے کی تاکید کرنا۔ قرآن میں ہے۔

وَلَقَدْ عَھِدْنَا اِلٰٓی اٰدَمَ (۲۰-۱۱۵) اور ہم نے ...... آدمؑ سے عہد لیا تھا۔

اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ (۳۶-۶۰) ہم نے تم سے کہہ نہیں دیا تھا ......

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ عَھِدَ اِلَیْنَا (۳-۱۸۳) جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم سے عہد لے رکھا ہے۔

وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ (۲-۱۲۵) اور ابراہیم ... کو کہا۔ اور عَھْدُ اللّٰہِ (خدائی عہد) سے مراد کبھی تو وہ صلاحیت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری عقلوں میں راسخ کر دی ہے اور کبھی اس سے مراد وہ احکام ہوتے ہیں جن کا پیغمبروں نے کتاب و سنّت کے ذریعہ حکم دیا ہے اور کبھی اس سے مراد وہ عبادات بھی ہوتی ہیں جن کی بجا آوری شرعًا واجب نہ ہو بلکہ ہم اپنی طرف سے اسے اپنے اوپر لازم کریں جیسے نذر وغیرہ چنانچہ آیات:۔

وَمِنْھُمْ مَّنْ عٰھَدَ اللّٰہَ (۹-۷۵) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا تھا۔

اَوَکُلَّمَا عٰھَدُوْا عَھْدًا نَّبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ (۲-۱۰۰) ان لوگوں نے (جب خدا سے) عہد واثق کیا تو ان میں سے ایک فریق نے اس کو پھینک دیا۔

وَلَقَدْ کَانُوْا عَاھَدُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ (۳۳-۱۵) حالانکہ پہلے خدا سے اقرار کر چکے تھے۔

میں یہی معنی مراد ہیں اور کفار میں سے جو شخص معاہدہ کے وقت مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو اسے مُعَاھِدٌ یا ذو عہد کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے[1] (۵۱) لَایُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِکَافِرٍ وَلَا ذُوْ عَھْدٍ فِیْ عَھْدِہٖ کہ کسی مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی معاہد کو مدت عہد کے اندر مارا جائے اور حفاظت اور پابندی کے اعتبار سے اس وثیقہ کو بھی عُھْدَۃٌ کہا جاتا ہے جو فریقین عہد و پیمان کے وقت باہم لکھ لیتے ہیں اور محاورہ ہے:۔ فِیْ ھٰذَا الْاَمْرِ عُھْدَۃٌ یعنی وہ معاملہ جس کی نگہداشت کا حکم دیا گیا ہو اور دیکھ بھال کے اعتبار سے بارش کو بھی عَھْدٌ وَعِھَادٌ کہا جاتا ہے اور رَوْضَۃٌ مَّعْھُوْدَۃٌ کے معنی ہیں وہ باغ جس پر بارش ہوئی ہو۔

(ع ھ ن)

اَلْعِھْنُ کے معنی رنگین اون کے ہیں قرآن میں ہے:۔

کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ (۱۰۱-۵) دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح۔

---

[1] متفق علیہ من حدیث معقل بن یسار۔ رواہ ابن ماجہ۔ عن ابن عباس رضؓ ۱۲

یہاں صرف رنگت کے اعتبار سے پہاڑوں کو رنگدار اون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۵۵-۳۷) تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا۔ میں بیان ہو چکا ہے۔

رَمٰى بِالْكَلَامِ عَلٰى عَوَاهِنِهٖ بے سوچے سمجھے بات کرنا، فکر و غور کئے بغیر بات کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے اَوْرَدَ كَلَامَهٗ غَيْرَ مُفَسَّرٍ کہ اس نے اپنی بات کی وضاحت نہیں کی۔

(ع و ج)

اَلْعَوَجُ (ن) کے معنی کسی چیز کے سیدھا کھڑا ہونے کی حالت سے ایک طرف جھک جانے کے ہیں۔ جیسے عُجْتُ الْبَعِيْرَ بِزِمَامِهٖ میں نے اونٹ کو اس کی مہار کے ذریعہ ایک طرف موڑ دیا فُلَانٌ مَا يَعُوْجُ عَنْ شَيْءٍ يَّهُمُّ بِهٖ یعنی فلاں اپنے ارادے سے باز نہیں آتا۔

اَلْعَوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے بسہولت دیکھا جا سکے جیسے کھڑی چیزوں میں ہوتا ہے مثلاً لکڑی وغیرہ اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو صرف عقل و بصیرت سے دیکھا جا سکے جیسے صاف میدان کی ناہمواری کو غور و فکر کے بغیر اس کا ادراک نہیں ہو سکتا یا معاشرہ میں دینی اور معاشی ناہمواریاں کہ عقل و بصیرت سے ہی ان کا ادراک ہو سکتا ہے قرآن میں ہے:۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹-۲۸) (یہ) قرآن عربی (ہے) جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں ہے۔

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱۸-۱) اور اس میں کسی طرح کی کجی (اور پیچیدگی) نہ رکھی۔ وَالَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (۷-۴۵) جو خدا کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں۔ . . . . .

اور کنایہ کے طور پر کج خلق آدمی کو بھی اَعْوَجُ کہا جاتا ہے۔

اَلْاَعْوَجِيَّةُ یہ اَعْوَج گھوڑے کی طرف منسوب ہے جو جاہلی عرب میں مشہور تھا۔

(ع و د)

اَلْعَوْدُ (ن) کسی کام کو ابتداءً کرنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف پلٹنے کو عَوْدٌ کہا جاتا ہے خواہ وہ پلٹنا بذاتہ ہو۔ یا قول و عزم سے ہو۔ قرآن میں ہے:۔ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ (۲۳-۱۰۷) اے پروردگار ہم کو اس میں سے نکال دے اگر ہم پھر (ایسے کام) کریں تو ظالم ہوں گے۔

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (۶-۲۸) اگر یہ (دنیا میں) لوٹائے بھی جائیں تو جن (کاموں) سے ان کو منع کیا گیا تھا وہی کرنے لگیں۔ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (۵-۹۵) اور جو پھر (ایسا کام) کرے گا تو خدا اس سے انتقام لیگا۔ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۳۰-۲۷) اور وہی تو ہے جو خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا۔ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ

لے راجع (دھن)

فِيهَا خَالِدُونَ (۲-۲۷۵) اور جو پھر (سود) لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

وَإِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (۱۷-۸) اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے۔

وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ (۸-۱۹) اور اگر پھر (نافرمانی) کرو گے تو ہم بھی پھر (تمہیں عذاب) کریں گے۔

أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا (۷-۸۸) یا تم ہمارے مذہب میں آجاؤ۔

إِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ (۲۳-۱۰۷) اگر ہم پھر (ایسے کام) کریں تو ظالم ہوں گے۔

إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ (۷-۸۹) اگر ہم ... تمہارے مذہب میں لوٹ جائیں۔

وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا (۷-۸۹) اور ہمیں شایاں نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں۔

اور آیت کریمہ:

وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا (۵۸-۳) اور جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں پھر اپنے قول سے رجوع کریں۔ میں اہل ظاہر کہتے ہیں کہ يَعُودُونَ کے معنی یہ ہیں کہ عورت سے ایک مرتبہ ظہار کرنے کے بعد اگر دوبارہ اسے وہی کلمہ کہے۔ تب اس پر کفارۂ ظہار لازم آتا ہے[1] لہٰذا ثُمَّ يَعُودُونَ کا جملہ فَإِنْ فَاؤُوا کی طرح ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عَوْدٌ فِي الظِّهَارِ یہ ہے کہ ظہار کے بعد عورت سے جماع کرے[2] اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہاں عَوْدٌ کے معنی ہیں ظہار کے بعد عورت کو اتنی مدت تک روک رکھنا جس میں اسے طلاق دے سکتا ہو۔ لیکن طلاق نہ دے۔[3] بعض متاخرین نے کہا ہے کہ ظہار بھی ایک طرح کی قسم ہے اور اس کے معنی ہیں کہ خاوند کہے کہ اگر میں فلاں کام کروں تو میری بیوی میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت پھر اس کے بعد اگر وہ اس کام کا ارتکاب کرے تو وہ حانث ہو جائیگا اور آیت ظہار میں بیان کردہ کفارہ کا ادا کرنا اس پر لازم ہوگا لہٰذا آیت:۔ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا (۵۸-۳) کے معنی یہ ہوں گے کہ جس کام کے نہ کرنے کی انہوں نے قسم کھائی تھی اس کی طرف پلٹیں یعنی اپنی قسم توڑنا چاہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے فُلَانٌ حَلَفَ ثُمَّ عَادَ یعنی اس نے وہ کام کیا جس کے نکرنے کی قسم کھائی تھی۔[4] اور اخفشؒ نے کہا ہے کہ لِمَا قَالُوا کا تعلق فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ سے ہے اس سے بھی اس آخری قول کی تائید ہوتی ہے نیز اخفشؒ نے کہا ہے کہ اس قسم کو توڑنے کے بعد اس پر کفارہ لازم ہوگا جیسا کہ اللہ کی قسم اٹھانے کے بعد اس پر کفارہ لازم آتا ہے[5] جو کہ آیت کریمہ:۔ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ (۵-۸۹)

---

[1] قال فى الطبرسى ۸۲/۲۷ وعن ابى العاليه وبكير بن عبد الله الاشج وهو مذهب اهل الظاهر لان لفظ العود يدل على تكرير القول ورده ابو على الفارسى راجع الفتح للشوكانى والمحلى [2] العزم على وطئها كما اروى عن قتادة وهو المشهور عن الحنفية واليه ذهب مالك وائمة البيت راجع الطبرسى وروح المعانى (۲۸/۷) [3] لان السكوت الى زمان يمكنه ان يطلق فيه ندم منه على ما ابتدأ وهو لعود على ما ابتداه و الحاصل ان العود بمعنى الندم كما قال ابن عباس راجع الطبرسى والروح [4] وذكره اصحاب الفروع فى ذيل تعليق الظهار وهو يصح عند الشافعية كذا فى بعض الصور عند الحنفية [5] ففى الآية تقديم وتاخير وهو كثير فى التنزيل الطبرسى ۲۸/۲۰ والروح ۲۸/۹

تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے۔ میں مذکور ہے۔

اَلْاِعَادَۃُ کے معنی لوٹانا کے ہیں مثلاً بات وغیرہ کو لوٹانا جیسے فرمایا:۔

سَنُعِیْدُھَا سِیْرَتَھَا الْاُوْلٰی (۲۰-۲۱) ہم اس کو ابھی) اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

اَوْ یُعِیْدُوْکُمْ فِیْ مِلَّتِھِمْ (۱۸-۲۰) یا پھر اپنے مذہب میں داخل کر لیں گے۔

اَلْعَادَۃُ کسی فعل یا انفعال کو بار بار کرنا حتی کہ وہ طبعی فعل کی طرح سہولت سے انجام پا سکے اسی لئے بعض نے کہا ہے کہ عَادَۃٌ طبیعت ثانیہ کا نام ہے۔

اَلْعِیْدُ وہ ہے جو بار بار لوٹ کر آئے۔ اصطلاح شریعت میں یہ لفظ یوم الفطر اور یوم الاضحی پر بولا جاتا ہے۔ چونکہ شرعی طور پر یہ دن خوشی کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے[1] (۵۲) اَیَّامُ اَکْلٍ وَشُرْبٍ وَبِعَالٍ کہ عید کے دن کھانے پینے اور جماع سے لطف اندوز ہونے کے دن ہیں اس لئے ہر وہ دن جس میں کوئی شادمانی حاصل ہو اس پر عید کا لفظ بولا جانے لگا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا (۵-۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان (نعمت) نازل فرما۔ ہمارے لئے (وہ دن) عید قرار پائے۔ میں عِیْدٌ سے شادمانی کا دن ہی مراد ہے اور اَلْعِیْدُ اصل میں (خوشی یا غم کی) اس حالت کو کہتے ہیں جو بار بار انسان پر لوٹ کر آئے اور اَلْعَائِدَۃُ ہر اس منفعت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی چیز سے حاصل ہو۔

اَلْمَعَادُ کے معنی لوٹنے کے ہیں اور لوٹنے کی جگہ یا زمانہ کو بھی اَلْمَعَادُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (۲۸-۱۰۵) (اے پیغمبر) جس (خدا) نے تم پر قرآن (کے احکام) کو فرض کیا وہ تمہیں بازگشت کی جگہ لوٹا دیگا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مَعَاد سے مکہ مکرمہ مراد ہے مگر اس کے صحیح معنی وہ ہیں جن کی طرف حضرت علیؓ نے اشارہ فرمایا ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے نے بھی ذکر کئے ہیں۔ کہ اس سے جنت مراد ہے۔ جس میں آنحضرت کو بالقوہ اس وقت پیدا کیا تھا جب کہ آپؐ صلب آدمؑ میں تھے پھر وہاں سے عالم دنیا میں لاکر آنحضرتؐ کو دنیا پر جلوہ گر کیا گیا جیسا کہ آیت:۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ (۷-۱۷۲) الآیۃ میں مذکور ہے۔

اور اَلْعَوْدُ عمر رسیدہ اونٹ کو عَوْدٌ یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ سیر و عمل کا تکرار کر چکا ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ اس پر متواتر لمبا سال گزر چکے ہوتے ہیں پہلی توجیہ کے لحاظ سے اَلْعَوْدُ (مصدر) بمعنی فاعل ہوگا۔ اور دوسرے اعتبار سے بمعنی مفعول نیز عَوْد پرانے راستہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس پر بار بار سفر ہو چکا ہوتا ہے اور عَوْدٌ سے ہی عِیَادَۃُ الْمَرِیْضِ مشتق ہے جس کے معنی تیمارداری کے ہیں

عِیْدِیَّۃٌ وہ اونٹ جو عِیْدٌ نامی سانڈ کی نسل

---

[1] الفائق ار ۵۵ والحدیث باختلاف الفاظ فی مسلم واحمد عن کعب بن مالک والدارقطنی عن انسؓ وعبداللہ بن حذافۃ السہمی والنسائی عن ابی مسعود بن الحکم عن امہ ومعناہ النہی فی ایام التشریق عن صیامہا وفی روایۃ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی یوم العید خاصۃ الاان المؤلف فہم ان وزانہا وذان یومی عید فاطلق الحدیث واللہ اعلم ۱۲

سے ہوں۔

اَلْعُوْدُ بعض نے کہا ہے کہ عُوْد اصل میں اس لکڑی کو کہتے ہیں جسے اگر کاٹ دیا جائے تو اس میں دوبارہ بڑھنے کی قوت ہو پھر یہ لفظ خاص کر مزمار یعنی ستار یا اس لکڑی پر بولا جانے لگا ہے جس سے دھونی دی جائے۔

(ع و ذ)

اَلْعَوْذُ (ن) کے معنی ہیں کسی کی پناہ لینا اور اس سے چمٹے رہنا۔ محاورہ ہے:۔

عَاذَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ فلاں نے اس کی پناہ لی اس سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (۲-۶۷) کہ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں۔

وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ (۴۴-۲۰) اور اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳-۱) کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

اِنِّیْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ (۱۹-۱۸) میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں۔

اور اَعَذْتُهٗ بِاللّٰهِ اُعِيْذُهٗ کے معنی دوسرے کو اللہ کی پناہ میں دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِنِّیْ اُعِيْذُهَا بِكَ (۳-۳۶) میں اس کو۔۔۔۔ تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔

مَعَاذَ اللّٰهِ (۱۲-۲۳) کہ خدا پناہ میں رکھے۔

کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ کی پناہ لیتے ہیں اور اس قسم کے برے کام سے بچنے کے لئے اس سے مدد مانگتے ہیں کیونکہ یہ گناہ کا کام ہے جس کے ارتکاب سے ہمیں کنارہ کش رہنا چاہیئے۔

اَلْعُوْذَةُ اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی چیز سے بچاؤ حاصل کیا جائے اسی سے تمیمۃ یعنی تعویذ اور رُقْيَة یعنی دم جھاڑ کو عُوْذَةٌ کہا جاتا ہے اور عَوَّذَهٗ کے معنی کسی کو (خطرہ سے) بچانے کے ہیں اور ہر وہ مادہ جس نے حال ہی میں بچہ دیا ہو اسے سات دن تک عَائِذٌ کہا جاتا ہے۔

(ع و ر)

اَلْعَوْرَةُ انسان کے مقام ستر کو کہتے ہیں مگر اس کے یہ معنی کنائی ہیں اصل میں یہ عار سے مشتق ہے اور مقام ستر کے کھلنے سے بھی چونکہ عار محسوس ہوتی ہے اس لئے اسے عَوْرَة کہا جاتا ہے اور عورت کو بھی عورت اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے بے ستر رہنے کو باعث عار سمجھا جاتا ہے اسی سے بری بات کو عوراء کہا جاتا ہے۔

عَوِرَتْ عَيْنُهٗ عَوَرًا وَعَارَتْ عَيْنُهٗ عَوْرًا اسکی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی عَوَّرْتُهَا میں نے اسے بھینگا کر دیا۔ اسی سے بطور استعارہ عَوَّرْتُ الْبِئْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں مٹی ڈال ڈال کر کنوئیں کا پانی خشک کر دینا اور مجازاً نظر کی تیزی کی وجہ سے کوے کو اَلْاَعْوَر کہا جاتا ہے جیسے کسی لفظ کو اس کی ضد میں استعمال کر لیتے ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (الخفیف)

(۳۲۴) وَصِحَاحُ الْعُيُوْنِ يُدْعَيْنَ عُوْرًا

---

[1] قال الكميت وصدره: (۱) الجوار التمام ذا السر منهم – ق ..... وفي المطبوع يدعون مصحف والتصويب من الراجح والبيت في المحاضرات للمؤلف

(۳۲۴) ب (۱) للمعاني للقتبي ۲۵ والجوزي في اللسان والتاج (عور) بغير عزو وقبله نطعم الجيأل ... من الكوم ولم ندع من يشيط الجزور ا۔

تندرست آنکھوں والے آدمی کو نکا بھینگا کہا جاتا ہے۔
اَلْعَوَارُ وَالْعَوْرَۃُ کے معنی کپڑے یا مکان وغیرہ میں شگاف کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ وَّمَا ھِیَ بِعَوْرَۃٍ (۳۳-۱۳) کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے۔
یعنی ان میں جگہ جگہ رخنے پڑے ہوئے ہیں جن میں سے جو چاہے ان کے اندر گھس سکتا ہے اسی سے محاورہ ہے۔ فُلَانٌ یَحْفَظُ عَوْرَتَہٗ کہ فلاں اپنے خلل کی حفاظت کرتا ہے اور آیت کریمہ:۔
ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّکُمْ (۲۴-۵۸) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے کے ہیں۔
میں ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ سے پردہ کے تین اوقات مراد ہیں یعنی دوپہر کے وقت، عشا کی نماز کے بعد اور صبح کی نماز سے پہلے اور آیت کریمہ:۔
لَمْ یَظْھَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (۲۴-۳۱)
(یا ایسے لڑکوں سے) جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں۔
سے مراد نابالغ لڑکے ہیں جن میں ہنوز جنسیات کے متعلق باتوں کا شعور پیدا نہ ہوا ہو۔ سَھْمٌ عَائِرٌ وہ تیر جو نامعلوم طرف سے آئے لِفُلَانٍ عَائِرَۃٌ مِنَ الْمَالِ فلاں کے پاس اتنا زیادہ مال ہے کہ اس کی فراوانی آنکھ کو حیرت زدہ اور خیرہ کر دیتی ہے۔[1]
اَلْمُعَاوَرَۃُ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی مستعار لینے کے ہیں اور اسی سے عَارِیَۃٌ بروزن فَعْلِیَّۃٌ ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ تَعَاوَرُوا الْعَوَارِیَّ استعمال کی چیزیں باہم لینا دینا بعض نے کہا ہے کہ یہ عار سے مشتق ہے چونکہ کوئی چیز مستعار دیکر اسکا واپس لینا بھی موجب عار سمجھا جاتا ہے اس لئے اسے عَارِیَۃٌ کہا جاتا ہے مثل مشہور ہے کہ عَارِیَۃٌ (مستعار لی ہوئی چیز) سے کسی نے دریافت کیا کہ کدھر جا رہی ہو تو اس نے کہا میں اپنے اہل کے لئے مذمت اور عار لینے جا رہی ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ عَارِیَۃ کا مادہ واوی ہے جیسا کہ تَعَاوَرْنَا کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے اور عَارٌ کا مادہ یائی ہے جیسا کہ عَیَّرْتُہٗ بِکَذَا کے محاورہ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ع و ق)

اَلْعَائِقُ وہ جو لوگوں کو خیر اور بھلائی سے روکنے والا ہو لوگوں کو ان کے مقاصد سے روک کر اپنی طرف متوجہ کریں اور عَاقَہٗ عَوْقَہٗ وَاعْتَاقَہٗ اس نے اسے روک دیا قرآن میں ہے:۔
قَدْ یَعْلَمُ اللّٰہُ الْمُعَوِّقِیْنَ (۳۳-۱۸) خدا تم میں سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو لوگوں کو منع کرتے ہیں۔
یعنی جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکتے اور منع کرتے ہیں۔ رَجُلٌ عَوْقٌ وَعَوْقَۃٌ جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکے۔
یَعُوْقُ (۷۱-۲۳) قبیلہ بنی کنانہ اور حضرت نوحؑ کی قوم کے (ایک بت کا نام (تھا)۔

(ع و ل)

عَالَہٗ وَغَالَہٗ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن اَلْغَوْلُ کا لفظ اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ جو انسان کو ہلاک کر ڈالے

لہ انظر المثل المیدانی ۲/۷ و فی تاویلہ اختلاف اخترنا منہ تاویل ابی حاتم ۱۲

اور اَلْعَوْلُ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو انسان کو گرانبار کر دے اور اس کے بوجھ تلے وہ دب جائے۔ محاورہ ہے۔

مَا عَالَكَ فَهُوَ عَائِلٌ لِي کہ جو چیز تجھ پر بار ہے وہ مجھ پر بھی گراں بار ہے اور اسی سے عَوْلٌ ہے جس کے معنی حق استحقاق سے زیادہ لے کر بے انصافی کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

ذَالِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا۔ (۴-۳) اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔[2]

اور اسی سے عَالَتِ الْفَرِيضَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ترکہ کی تقسیم کے وقت وارثوں کے مقررہ حصے دینے کے بعد کچھ مال بچ جانیکے ہیں۔

اَلتَّعْوِيْلُ کے معنی کسی مشکل کام میں دوسروں پر اعتماد کرنے کے ہیں اسی سے عَوْلٌ ہے جس کے معنی بھاری مصیبت کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے :۔

وَيْلَهُ وَعَوْلَهُ ہائے اس کی مصیبت اور اسی سے اَلْعِيَالُ یعنی وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو جن کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہو اس کا مفرد عَيِّلٌ ہے عَالَهُ اس نے فلاں کے اخراجات کا بوجھ اٹھایا اسی سے علیہ السلام کا فرمان ہے (۵۳)[3]

اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ ثُمَّ بِمَنْ تَعُوْلُ کہ پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو اور پھر ان پر جن کے اخراجات تمہارے ذمہ ہیں اَعَالَ الرَّجُلُ وہ آدمی کثیر العیال ہو گیا۔

(ع و م)

اَلْعَامُ (سال) اور اَلسَّنَةُ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن اَلسَّنَةُ کا لفظ عموماً اس سال پر بولا جاتا ہے جس میں تکلیف یا خشک سالی ہو اس بنا پر قحط سالی کو سَنَةٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور عَامٌ اس سال کو کہا جاتا ہے جس میں وسعت اور فراوانی ہو قرآن میں ہے :۔

عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ (۱۲-۴۹) اس کے بعد ایک ایسا سال آئیگا جس میں خوب بارش ہوگی اور لوگ اس میں نچوڑیں گے۔ اور آیت کریمہ :۔

فَلَبِثَ فِيْهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹-۱۴) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔

میں لفظ سَنَة کو مستثنیٰ منہ اور لفظ عَامٌ کو مستثنیٰ لانے میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے ہم اس کتاب کے بعد کسی دوسرے موقع پر بیان کریں گے انشاء اللہ

اور عَوْمٌ (ن) کے معنی پانی میں تیرنا بھی آتے ہیں چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ سال کو بھی عَامٌ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس مدت میں سورج اپنے تمام بروج میں تیر لیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ :۔

---

[1] من العول المقابل للعدل يقال عال الحاكم اذا جار وعال الميزان اذا مال من جانب الى جانب وايضا عال الرجل اذا كثرت عياله و

[2] به قال الشافعي في تفسير الآية والنقد عليه من الحريري في درته من سوء الادب فان الشافعي اعلم باللغة منه ومن اضرابه راجع الجمل از ۴/۲۶ وروح المعاني ۴/۱۷۵ وشرح الدرة للخفاجي ۲۰۵-۲۰۶ ص والخبر في الدرة للحريري قال الخفاجي في شرحه ۲۰۵-۲۰۶ هو بعض حديث

[3] رواه الطبراني والحديث في الاصل ملفق اما لفظ "ابدأ بنفسك" فرواه في رصب ان عن جابر ادفي رواية عنه فليبدأ بنفسه (حم، م، د، ت) ولم يروه الا جابر واما لفظة "وابدأ بمن تعول" فورد في حديث "اليد العليا خير" وفي "خير الصدقة ما كان عن ظهر غنى" اورد هما بجميع الطرق على المتقي في كنزه ج ۶ رقم ۲۱۶-۲۲۱ -

وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶-۴۰) سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔
میں یَسْبَحُوْنَ کے لفظ سے اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔

(ع و ن)

اَلْعَوْنُ (کے معنی کسی کی مدد اور پشت پناہی کرنا کے ہیں (نیز عَوْنٌ مددگار) کہا جاتا ہے۔
فُلَانٌ عَوْنِیْ یعنی فلاں میرا مددگار ہے قَدْ اَعَنْتُهٗ (افعال) میں نے اس کی مدد کی۔ قرآن میں ہے:۔
فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ (۱۸-۹۵) تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو۔
وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (۲۵-۴) اور دوسرے لوگوں نے اس میں اس کی مدد کی۔
اَلتَّعَاوُنُ ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵-۲) نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔
اَلْاِسْتِعَانَةُ مدد طلب کرنا قرآن میں ہے:۔
اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (۲-۴۳) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔
اَلْعَوَانُ ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ (۲-۶۸) بلکہ ان کے بین بین یعنی ادھیڑ عمر کی۔
اور کبھی بطور کنایہ کے عمر رسیدہ عورت کو بھی عَوَانٌ کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۳۲۵) فَاِنْ اَتَوْكَ فَقَالُوْا اِنَّهَا نَصَفٌ
فَاِنَّ اَمْثَلَ نِصْفَيْهَا الَّذِیْ ذَهَبَا

اگر تمہارے پاس آکر کہیں کہ ادھیڑ عمر ہے تو تم کہو اس کی عمر کا بہترین حصہ تو گزر چکا ہے۔
اور استعارۃً جو جنگ کئی سال تک جاری رہے اور پرانی ہو جائے اسے بھی عَوَانٌ کہا جاتا ہے نیز پرانی کھجور کو بھی عَوَانَةٌ کہہ دیتے ہیں۔
اَلْعَانَةُ گورخر اس کی جمع عَانَاتٌ وَعُوْنٌ ہے اَلْعَانَةُ موئے زہار اس کی تصغیر عُوَيْنَةٌ ہے۔

(ع ی ب)

اَلْعَیْبُ وَالْعَابُ نقص اور خرابی، ہر وہ حالت جس سے کسی چیز میں نقص پیدا ہو جائے اور عِبْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے عیب دار کر دیا جیسے فرمایا:۔
فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا (۱۸-۷۹) تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں۔
نیز عِبْتُهٗ کسی چیز کی مذمت کرنے اور اس کا عیب ظاہر کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے عِبْتُ فُلَانًا (میں نے اس کی مذمت کی)
اور عَيْبَةٌ (بیگ) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز چھپا کر رکھی جائے اسی سے

---

[1] البیت۔ فی اللسان والتاج بغیر عزو وفی روایۃ اطیب بدل امثل وغبر اہل ذہبا والبیت ایضا فی المحاضرات للمؤلف (۲: ۲۴۳) والحماسۃ مع المرزوقی رقم ۸۰۰ مع آخر وفی التبریزی "وان" بدل فان واختلف فی تسویتہ ففی الحماسۃ قبلہ۔ لا تنکحن عجوزا وان اتوک بہا۔ واخلع ثیابک منہ ضعفا ہربا۔ وفی اللسان وفیہ اقواء۔ لا تنکحن عجوزا او مطلقۃ۔ ولا یسوقنہا فی حبک القدر ۱۲۔ ✤ ✤ ✤ ✤

علیہ السلام کا فرمان ہے[1] (۴۵) اَلْاَنْصَارُ کَرِشِیْ وَعَیْبَتِیْ کہ انصار میرے مخزنِ اسرار ہیں۔

(ع ی ر)

اَلْعِیْرُ قافلہ جو غذائی سامان لاد کر لاتا ہے اصل میں یہ لفظ غلہ بردار اونٹوں اور ان کے ساتھ جو لوگ ہوتے ہیں ان کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے مگر کبھی اس کا استعمال صرف ان اونٹوں پر ہوتا ہے جو غذائی سامان اٹھا کر لاتے ہیں اور کبھی ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو کہیں سے غذائی سامان لاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ (۱۲-۹۴) جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا۔

اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّکُمْ لَسَارِقُوْنَ (۱۲-۷۰) کہ قافلے والو! تم تو چور ہو۔

وَالْعِیْرَ الَّتِیْٓ اَقْبَلْنَا فِیْهَا (۱۲-۸۲) اور جس قافلے میں ہم آئے۔

اور عَیْرٌ کا لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) گورخر (۲) پاؤں کی پشت پر ابھری ہوئی ہڈی (۳) آنکھوں کی پتلی۔ (۴) کان کی پچھلی طرف ابھری ہوئی نرم ہڈی (۵) خس و خاشاک جو پانی کے اوپر جمع ہو جاتا ہے (۶) میخ (۷) تیر کے پھل کا درمیانی حصہ جو اوپر ابھرا ہوا ہوتا ہے الغرض گو عَیْرٌ کا لفظ ان سب معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر ان معانی میں باہم مناسبت بیان کرنا تکلف اور تعسف سے خالی نہیں۔

اَلْمِعْیَارُ ناپ یا تول جانچنے کا معیار۔ اسی سے محاورہ ہے عَیَّرْتُ الدَّنَانِیْرَ اشرفیوں کو کسوٹی پر پرکھا عَیَّرْتُهٗ میں نے اس کی مذمت کی۔ یہ عَارٌ سے مشتق ہے۔ تَعَایَرَ بَنُوْ فُلَانٍ انہوں نے ایک دوسرے کو عار دلائی یا ایک دوسرے کے عیب بیان کئے۔ بعض نے کہا ہے کہ دراصل تَعَایَرَ کے معنی ہیں گورخر کی طرح ایک دوسرے سے دور بھاگنا اور بدکنا اور اسی سے عَایَرَتِ الدَّابَّةُ تَعِیْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں جانور کا بدک کر بھاگ جانا۔ کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ عَیَّارٌ فلاں آوارہ گرد یا غنڈہ ہے۔

(ع ی س)

عِیْسٰی (۳-۴۴-۴۵) یہ ایک پیغمبر کا نام اور اسم علم ہے اگر یہ لفظ عربی الاصل مان لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ اس عِیْسٌ سے ماخوذ ہو جو کہ اَعْیَسُ کی جمع ہے اور اس کی مؤنث عَیْسَاءُ ہے اور عِیْسٌ کے معنی ہیں سفید اونٹ جن کی سفیدی میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عَیْسٌ سے مشتق ہو جس کے معنی سانڈ کے مادہ منویہ کے ہیں اور بَعِیْرٌ اَعْیَسُ وَنَاقَةٌ عَیْسَاءُ (جمع عِیْسٌ) اور عَاسَهَا یَعِیْسُهَا کے معنی ہیں نر کا مادہ سے جفتی کھانا۔

(ع ی ش)

اَلْعَیْشُ خاص کر اس زندگی کو کہتے ہیں جو حیوان میں پائی جاتی ہے اور یہ لفظ اَلْحَیَاةُ سے اخص ہے کیونکہ اَلْحَیَاةُ کا لفظ حیوان، باری تعالیٰ اور ملائکہ

---

[1] کلمۃ من حدیث فی المناقب ۲/۷ ۱۵ رواہ النسائی عن اسید بن حضیر وانس والترمذی والبخاری ومسلم عن انس بن مالک قال الترمذی ہذا حدیث حسن صحیح وتتمتہ: ولولا الہجرة لکنت امرءً من الانصار (راجع غریب ابی عبید ۱/۱۳۷)

سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور اَلْعَیْشُ سے لفظ اَلْمَعِیْشَۃُ ہے جس کے معنی ہیں سامان زیست کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جن پر زندگی بسر کی جاتی ہے قرآن میں ہے:۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُمْ مَّعِیْشَتَھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۴۳-۳۲) ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا۔

مَعِیْشَۃً ضَنْکًا (۲۰-۱۲۴) اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔

وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ (۱۵-۲۰) اور ہم ہی نے تمہارے لئے اس میں زیست کے سامان پیدا کر دیئے۔

لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ .... (۷-۱۰) تمہارے لئے اس میں سامان زیست۔

اور اہل جنت کے متعلق فرمایا: فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ (۱۰۱-۷) وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔

اور علیہ السلام نے فرمایا (۵۵) لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃِ کہ حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہی ہے۔

(ع ی ل)

اَلْعَیْلَۃُ کے معنی فقر و فاقہ کے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً (۹-۲۸) اگر تم کو مفلسی کا خوف ہو۔

عَالَ الرَّجُلُ یَعِیْلُ وہ آدمی محتاج اور ضرورت مند ہو گیا۔ عَائِلٌ محتاج۔ ضرورت مند مگر اَعَالَ (افعال) جس کے معنی کثیر العیال ہونے کے ہیں اجوف واوی (ع و ل) سے ہے۔ اور آیت:۔ وَوَجَدَکَ عَائِلًا فَاَغْنٰی (۹۳-۸) اور تجھے ضرورت مند پایا تو غنی کر دیا۔

میں عَائِلًا کے معنی ہیں تجھ سے فقر نفس کو دور کر کے تجھے غنائے اکبر عطا کی چنانچہ آپؐ نے اس غنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا (۵۶) اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ (کہ اصل غنی تو نفس کی بے نیازی ہے۔ کہا جاتا ہے۔

مَا عَالَ مُقْتَصِدٌ اعتدال سے خرچ کرنے والا کبھی فقیر نہیں ہوتا۔ مگر بعض نے آیت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالے نے تمہیں اپنی رحمت اور عفو کا محتاج پا کر تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے اور تجھے اپنی مغفرت سے بہرہ وافر عطا فرما کر غنی کر دیا۔

(ع ی ن)

اَلْعَیْنُ کے معنی آنکھ کے ہیں قرآن میں ہے:۔

اَلْعَیْنُ بِالْعَیْنِ (۵-۴۵) آنکھ کے بدلے آنکھ۔

لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِھِمْ (۳۶-۶۶) ان کی آنکھوں کو مٹا کر (اندھا) کر دیں۔

وَاَعْیُنُھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ (۵-۸۳) ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَلَکَ (۲۸-۹) (یہ) میری اور

---

۱ الحدیث صدر البیت الذی تمثل بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الخندق الا ان فی الصحیحین:۔ لاہم ان العیش عیش الآخرۃ۔ فارحم الانصار والمہاجرہ والرجز لرجل من المسلمین ورد بہ: اللہم لاخیر الا خیرۃ فانصر الانصار والمہاجرہ وفی روایۃ فاغفر وفی روایۃ فاغفر روایۃ فاکرم انظر تخریج العراقی ۲/۴۷ وایضا فی حجۃ الوداع رواہ الشافعی مرسلا والحاکم متصلا (تخریج العراقی ۴/۱۰۳)

۲ واصل الحدیث متفق علیہ ورواہ الترمذی من حدیث ابی ہریرۃ وقال حسن صحیح ۲/۶۰ وابن حبان فی مسندہ ۲۵۲۰

تمہاری دونوں کی، آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا (۲۰-۴۰) تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں
اور عَیْنٌ کے معنی شخص اور کسی چیز کا محافظ کے بھی آتے ہیں اور فُلَانٌ بِعَیْنِی کے معنی ہیں، فلاں میری حفاظت اور نگہبانی میں ہے جیسا کہ ھُوَ بِمَرْأًی مِنِّی وَ مَسْمَعٍ کا محاورہ ہے۔ قرآن میں ہے:
فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (۵۲-۴۸) تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔
تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا (۵۴-۱۴) وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی۔
وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي (۲۰-۳۹) اور اس لئے کہ تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔
اور اسی سے عَیْنُ اللّٰہِ عَلَیْكَ ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت اور نگہداشت فرمائے۔ یا اللہ تعالیٰ تم پر اپنے نگہبان فرشتے مقرر کرے جو تمہاری حفاظت کریں اور اَعْیُنٌ وَعُیُوْنٌ دونوں عین کی جمع ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ (۱۱-۳۱) اور نہ ان کی نسبت جن کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ کہتا ہوں کہ۔
رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ .... (۲۵-۷۴) اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما۔
اور استعارہ کے طور پر عَیْنٌ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو مختلف اعتبارات سے آنکھ میں پائے جاتے ہیں۔
(۱) مشکیزہ کے سوراخ کو عَیْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہیئت اور اس سے پانی بہنے کے اعتبار سے آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ پھر اس سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے۔
سِقَاءٌ عَیِّنٌ وَمُعَیِّنٌ پانی کی مشک جس سے پانی ٹپکتا ہو عَیَّنْتُ قِرْبَتَكَ اپنی نئی مشک میں پانی ڈالو تاکہ تر ہو کر اس میں سلائی کے سوراخ بھر جائیں۔
(۲) جاسوس کو عَیْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دشمن پر آنکھ لگائے رہتا ہے جس طرح کہ عورت کو فَرْجٌ اور سواری کو ظَھْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ ان دونوں سے مقصود یہی دو چیزیں ہوتی ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔
فُلَانٌ یَمْلِكُ كَذَا فَرْجًا وَكَذَا ظَھْرًا (فلاں کے پاس) اس قدر لونڈیاں اور اتنی سواریاں ہیں۔
(۳) عین بمعنی سونا بھی آتا ہے کیونکہ یہ جواہر میں افضل سمجھا جاتا ہے جیسا کہ اعضاء میں آنکھ سب سے افضل ہوتی ہے اسی سے افاضل قوم کو اَعْیَانٌ کہا جاتا ہے اور ماں باپ دونوں کی طرف سے حقیقی بھائیوں کو اَعْیَانُ الْاِخْوَۃِ کہا جاتا ہے۔
(۴) بعض نے کہا ہے کہ عَیْنٌ کا لفظ جب ذات شے کے معنی میں استعمال ہو جیسے کُلُّ مَالِہٖ عَیْنٌ تو یہ معنی مجازی ہوگا جیسا کہ غلام کو رَقَبَۃٌ (گردن) کہہ دیا جاتا ہے اور عورت کو فَرْجٌ (شرمگاہ) کہہ دیتے ہیں کیونکہ عورت سے مقصود یہی جگہ ہوتی ہے۔
(۵) پانی کے چشمہ کو بھی عَیْنٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پانی ابلتا ہے جس طرح کہ آنکھ سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور عَیْنُ الْمَاءِ سے مَاءٌ مَعِیْنٌ کا محاورہ لیا گیا ہے۔ جس کے معنی جاری پانی کے ہیں جو صاف طور پر چلتا ہوا دکھائی دے۔ اور عَیْنٌ کے معنی جاری چشمہ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

عَیْنًا فِیْھَا تُسَمّٰی سَلْسَبِیْلًا (۷۶-۱۸) یہ بہشت میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے۔

وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا (۵۴-۱۲) اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے۔

فِیْھِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ (۵۵-۵۰) ان میں دو چشمے بہ رہے ہیں۔

عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (۵۵-۶۶) دو چشمے ابل رہے ہیں۔

وَاَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ (۳۴-۱۲) اور ان کیلئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا تھا۔

فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ (۱۵-۴۵) باغ اور چشموں میں۔

مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ (۴۴-۲۵، ۲۶) باغ اور چشمے اور کھیتیاں۔

عِنْتُ الرَّجُلَ کے معنی ہیں میں نے اس کی آنکھ پر مارا جیسے رَأَسْتُهٗ کے معنی ہوتے ہیں میں نے اس کے سر پر مارا اور فَأَدْتُهٗ میں نے اس کے دل پر مارا نیز عِنْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے نظر بد لگا دی جیسے سِفْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے تلوار سے مارا یہ اس لئے کہ اہل عرب کبھی تو اس عضو سے فعل مشتق کرتے ہیں جس پر مارا جاتا ہے اور کبھی اس چیز سے جو مارنے کا آلہ ہوتی ہے جیسے سِفْتُهٗ وَرَمَحْتُهٗ چنانچہ یَدَیْتُهٗ کا لفظ ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی میں نے اسے اپنے ہاتھ سے مارا یا اس کے ہاتھ پر مارا اور عِنْتُ الْبِئْرَ کے معنی ہیں کنواں کھودتے کھودتے اس کے پانی کے چشمہ تک پہنچ گیا قرآن میں ہے:۔

اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ (۲۳-۵۰) ایک اونچی جگہ پر جو ٹھہرنے کے لائق تھی اور ستھرا ہوا پانی جاری تھا۔

فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ (۶۷-۳۰) تو (رسوائے خدا کے) کون ہے جو تمہارے لئے شیریں پانی کا چشمہ بہا لائے۔

بعض نے کہا ہے کہ مَعِیْنٌ میں لفظ میم حروف اصلیہ سے ہے اور یہ مَعَنْتُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا سہولت سے چلنا یا بہنا اور عَیْنٌ کا لفظ بطور استعارہ ترازو کے جھکاؤ پر بھی بولا جاتا ہے اور وحشی گائے کو آنکھ کی خوب صورتی کی وجہ سے اَعْیَنُ وَعَیْنَاءُ کہا جاتا ہے اس کی جمع عِیْنٌ ہے پھر گاوان وحشی کے ساتھ تشبیہ دے کر خوبصورت عورتوں کو بھی عِیْنٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِیْنٌ (۳۷-۴۸) جو نگاہیں نیچی رکھتی ہوں (اور) آنکھیں بڑی بڑی۔

وَحُوْرٌ عِیْنٌ (۵۶-۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

(ع ی ی)

اَلْاِعْیَاءُ کے معنی اس درماندگی اور تکان کے ہیں جو چلنے سے پیدا ہو جاتی ہے اور عِیٌّ کے معنی کسی کام یا بات کو نہ کر سکنا کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (۵۰-۱۵) کیا ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے ہیں۔

وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ (۴۶-۳۳) اور انکے پیدا کرنے سے تھکا نہیں اور اسی سے ہے عَیَّ فِیْ مَنْطِقِهٖ عِیًّا فَهُوَ عَیٌّ ہے جس کے معنی سخن سے عاجز ہونے کے ہیں رَجُلٌ عَیَایَاءُ طَبَاقَاءُ مرد جو سخن اور کام کرنے سے عاجز ہو دَاءٌ عَیَاءٌ لا علاج مرض۔

کِتَابُ الْغَیْنِ

(غ ب ر)

اَلْغَابِرُ اسے کہتے ہیں جو ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جائے چنانچہ آیت کریمہ: اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغَابِرِیْنَ (۲۶-۱۷۱) مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے غابرین سے عمر رسیدہ لوگ مراد ہیں اور بعض نے اس سے پیغمبر کے مخالفین لوگ مراد لئے ہیں جو (سدوم میں) پیچھے رہ گئے تھے اور لوط علیہ السلام کے ساتھ نہیں گئے تھے بعض نے عذاب الہٰی میں گرفتار ہونیوالے لوگ مراد لئے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مقام پر: اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِیْنَ (۲۹-۳۳) بجز ان کی بیوی کے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی۔ اور دوسرے مقام پر: قَدَّرْنَا اِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِیْنَ (۱۵-۶۰) اس کے لئے ہم نے ٹھہرا دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جائے گی۔ فرمایا ہے اور اسی سے غُبْرَۃٌ ہے جس کے معنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ کے ہیں اس کی جمع اَغْبَارٌ آتی ہے غُبَّرُ اللَّیْلِ رات کا بقیہ۔ غُبَّرُ الْحَیْضِ حیض کا بقیہ۔

اَلْغُبَارُ (مٹی اڑنے کے بعد جو گرد وغبار (فضا میں) باقی رہ جاتا ہے اسے غبار کہا جاتا ہے یہ دُخَانٌ اور عُثَارٌ وغیرہما (فعال) کے وزن پر ہے جو کہ بقیہ شے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اَغْبَرَ الْغُبَارُ کے معنی ہیں گرد و غبار بلند ہونا اور اڑنا۔

بعض نے کہا ہے کہ غَابِرٌ کا لفظ ماضی اور باقی (مستقبل) دونوں پر بولا جاتا ہے اس قول کو صحیح مان لینے کی صورت میں یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ غبار بھی چونکہ زمین سے اٹھ کر اوپر چڑھ جاتا ہے اس لحاظ سے غَابِرٌ بمعنی ماضی آجاتا ہے اور دوڑتے ہوئے چونکہ غبار پیچھے باقی رہ جاتا ہے اس لحاظ سے غَابِرٌ بمعنی باقی یعنی مستقبل آجاتا ہے۔ اور غبار سے غُبْرَۃٌ مشتق ہے اور اس کے معنی یا تو اس گرد و غبار کے ہیں جو کسی چیز پر جم جاتا ہے اور خاکستری رنگ کی چیز کو بھی غُبْرَۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت: وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْهَا غَبَرَۃٌ (۸۰-۴۰) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑی رہی ہوگی۔ میں بطور کنایہ حسرت آگیں چہرے سے مراد ہیں جو غم کے باعث افسردہ نظر آئیں گے جس طرح کہ ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا (۱۶-۵۸) میں چہرے کے سیاہ پڑنے سے غمناک ہونا مراد ہے کہا جاتا ہے

غَبَرَ، غَبْرَۃً وَاِغْبَرَّ اِغْبَارًا غبار آلودہ ہونا اور طرفہ کے شعر[1] (الطویل)

(۳۲۶) رَأَیْتُ بَنِیْ غَبْرَاءَ لَا یُنْکِرُوْنَنِیْ

فقراء اور مہمان مجھے اجنبی خیال نہیں کرتے ہیں اور نہ اغنیاء مجھ سے ناواقف ہیں۔

میں بَنِیْ غَبْرَاءَ سے ریگستانوں میں رہنے والے لوگ مراد ہیں[2] جو ہر وقت غبار آلود رہتے ہیں جیسا کہ بنو السبیل سے مراد مسافر ہوتے ہیں۔ اور دَاھِیَۃٌ غَبْرَاءُ (بڑی مصیبت) کا محاورہ یا تو غَبَرَ الشَّیْءُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی غبار میں واقع ہونے کے ہیں گویا مصیبت بھی انسان کو غبار آلود کر دیتی ہے (اور ہوش سنبھلنے نہیں دیتی) اور یا یہ غُبُوْرٌ سے مشتق ہے جس کے باقی رہنے کے ہیں اس اعتبار سے غَبْرَاءُ اس مصیبت کو کہا جائیگا جو باقی رہے اور گزرنے نہ پائے اور یا یہ غُبْرَۃُ اللَّوْنِ سے مشتق ہے جس طرح کہ دَاھِیَۃٌ زَبَّاءُ کا محاورہ ہے اور یا غُبْرَۃُ اللَّبَنِ سے جس کے معنی تھنوں میں بقیہ دودھ کے ہیں اور ان سابق اشتقاقات کے اعتبار سے غَبْرَاءُ اس مصیبت کو کہا جائے گا جو گزر جانے کے بعد بھی اپنا اثر چھوڑ جاتے اور یا یہ عِرْقٌ غَبِرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیہم تڑپنے والی رگ کے ہیں چنانچہ جاتا ہے (غَبِرَ الْعِرْقُ) رگ پھڑکی۔

اَلْغُبَیْرَاءُ نوع از گیاہ ریگستانی۔ ثمرہ گیاہ جو غبار کے رنگ پر ہوتا ہے۔

(غ ب ن)

اَلْغَبْنُ (ض) کے معنی باہمی معاملہ میں پوشیدہ طور پر اپنے ساتھی کا حق مارنے کے ہیں[3] اگر یہ کمی مال وغیرہ میں ہو تو غَبَنَ فُلَانٌ کہا جاتا ہے اور اگر رائے وغیرہ میں ہو تو غَبِنَ کہتے ہیں اور غَبِنْتُ کَذَا اِغْبِنًا کے معنی کسی چیز سے غفلت برتنے کو خسارا خیال کرنے کے ہیں اور قرآن پاک میں یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴-۹) نقصان اٹھانے کا دن۔ سے یَوْمُ الْقِیَامَۃِ مراد ہے کیونکہ قیامت کے روز اس مبایعت (معاملہ) میں جسکی طرف کہ آیت۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (۲-۲۰۷) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۹-۱۱۱) الآیۃ خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۳-۷۷) جو لوگ خدا کے اقرار (کو) اور اپنی قسموں کو (بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض

---

[1] فی اضداد ابی الطیب ۲۷ (یاتی بمعنی الباقی والماضی والاول اکثر واعرف وعدہ العلماء من الاضداد ۲ تمامہ ۔ والبیت من معلقتہ المشہورۃ فی مطلعہا : لخولۃ اطلال ببرقۃ ثہمد ۔ تلوح کباقی الوشم فی ظاہر الید قال المبرد اراد ببنی غبراء اللصوص والمشہور المراد منہ الفقراء والاضیاف والبیت فی الخزانۃ (۳ : ۲۷۸) واللسان (غبر بنی) وشرح ابن الانباری (۱۹۲) والمعانی للقتبی ۸۴ ۲ والعشر للتبریزی ۸۰ ومختار الشعر الجاہلی (۱ : ۲۳۱) والعینی (۱ : ۱۰۴) والفائق (۲ : ۸۰) والجمہرۃ ۵۵ والعقد الثمین ۵۷ والانباری ۴۰

[3] قال الحریری الغبن باسکان الباء فی المال وبفتحہا یقع فی العقل والرائی قال الخفاجی وہذا ما ذہب الیہ بعض اہل اللغۃ ولیس المتعین ۱۲

تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

میں اشارہ فرمایا ہے نقصان ظاہر ہوگا اور انہیں معلوم ہو جائیگا کہ دنیا میں اس معاملہ کو جو انہوں نے اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا، چھوڑ کر اس کی بجائے متاع دنیا حاصل کر کے انہوں نے کس قدر نقصان اٹھایا ہے کسی سے دریافت کیا گیا کہ قرآن میں قیامت کو یَوْمُ التَّغَابُنِ کیوں کہا گیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کیونکہ وہاں ان مقادیر (پیمانوں) کے خلاف اشیاء کا ظہور ہوگا جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگایا کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصل میں غَبْنٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اور اَلْغَبْنُ (بفتح الباء) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپائی جائے اور دلیل میں یہ شعر پیش کیا ہے [1] (المنسرح)

(۳۲۷) وَلَمْ اَرَ مِثْلَ الْفِتْيَانِ فِيْ غَبَنِ
اَلْاَيَّامِ يُنْسٰى عَوَاقِبُهَا

اس زمانے کے چھپانے میں نوجوانوں جیسا کوئی نہیں دیکھا جس کے نتائج کو بھلا دیا جاتا ہے۔

چنانچہ مڑنے والے اعضاء جیسے بغل اور کنج ران وغیرہ کو مغابن کہا جاتا ہے کیونکہ اعضاء کے یہ حصے بھی پوشیدہ رہتے ہیں اور (نفاست پسند) عورت کو طَيِّبَةُ الْمَغَابِنِ کہا جاتا ہے۔

(غ ث و)

اَلْغُثَاءُ ہانڈی کے جھاگ اور اس کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں جسے سیلاب بہا کر لاتا ہے اور یہ ہر اس چیز کے لئے ضرب المثل ہے جسے (بوجہ بے سود ہونے کے) ضائع ہونے دیا جائے [2] اور اس کی کچھ بھی پرواہ نہ کی جائے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ غَثَا الْوَادِیْ (ن) غَثْوًا یعنی وادی میں کوڑا کرکٹ زیادہ ہوگیا غَثَتْ (ض) نَفْسُهٗ تَغْثِیْ غَثْیَانًا اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔

(غ د ر)

اَلْغَدْرُ (ض) اس کے اصل معنی کسی چیز میں خلل واقع کرنے اور اسے چھوڑ دینے کے ہیں اور تَرْكُ الْعَهْدِ یعنی بے وفائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی سے فُلَانٌ غَادِرٌ (بے وفا) کا محاورہ ہے غَادِرٌ کی جمع غَدَرَةٌ ہے اور بہت بڑے بے وفا اور عہد شکن کو غُدَرُ کہا جاتا ہے۔

اَلْاَغْدَرُ وَالْغَدِیْرُ اس پانی کو کہتے ہیں جو سیلاب کسی جوہڑ میں چھوڑ جائے غَدِیْرٌ کی جمع غُدْرَانٌ وَغُدُرٌ آتی ہے اور اِسْتَغْدَرَ الْغَدِیْرُ کے معنی ہیں تالاب میں پانی جمع ہوگیا۔

غَدِیْرَةٌ لمبے بال گیسو بافتہ اس کی جمع اَلْغَدَائِرُ ہے اور غَادَرَهٗ کے معنی ہیں اس نے اسے چھوڑ دیا۔ قرآن میں ہے:۔

لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا (۱۸-۴۹)

نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔

---

[1] قاله عدی بن زید مناة والبیت فی امالی ابن الشجری وشرح الدرة للخفاجی ۲۰۳ وفی روایتها ... فی غبن الد ایام ینسون العواقبها والبیت فی الشعراء ۵۲ والعمدة (۱: ۱۰۴) والاغانی (۲ / ۱۴۸) والمعانی الکبیر للقتبی ۱۲۷۰ قال وغبن الایام ما یغبن منها فینقضی ان عملوا فیه الاخرتهم ولجده، ما یعقلوا الایکن لهم سیتم فی کل حرف کسعی آدبها ولم ارنی المراجع من رواه بروایة المؤلف فاخشی ان تکون الروایة محرفة

[2] فی القرآن: فجعلنٰهم غثاءً (۲۳ - ۴۱)

فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (۱۸-۴۷) تو ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے۔

غَدَرَتِ الشَّاۃُ (عَنِ الْغَنَمِ) کے معنی بکری کے دوسری بکریوں سے پیچھے رہ جانا کے ہیں اس سے صیغہ صفت فاعلی، غَدِرَۃٌ ہے اور غَدِرٌ اس سنگلاخ زمین کو کہتے ہیں جس میں عرصہ دراز تک ویران پڑا رہنے کی وجہ سے سوراخ پڑ گئے ہوں اور اس میں اونٹ یا گھوڑا چلے تو لڑکھڑا ہو جائے اسی سے محاورہ ہے۔ مَا اَثْبَتَ غَدَرَ هٰذَا الْفَرَسِ (کہ یہ گھوڑا کس قدر ثابت قدم ہے) مَا اَثْبَتَ غَدَرَہٗ وہ کس قدر ثابت قدم ہے یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو لغزش کے موقعہ پر ثابت قدم رہے۔

(غ د ق)

اَلْغَدَقُ کے معنی بہت زیادہ اور وافر کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا (۷۲-۱۶) تو ہم ان کے پینے کو بہت سا پانی دیتے

اور اسی سے غَدِقَتْ عَیْنُہٗ تَغْدَقُ ہے جس کے معنی آنکھ سے خوب پانی بہنا کے ہیں اور غَیْدَاقٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو وافر اور زیادہ ہو عام اس سے کہ پانی ہو یا گفتگو اور یا دوڑ ہو۔

(غ د و)

اَلْغُدْوَۃُ وَالْغَدَاۃُ کے معنی دن کا ابتدائی حصہ کے ہیں۔ قرآن میں غُدُوٌّ (غُدْوَۃٌ کی جمع) کے مقابلہ میں اٰصَالٌ استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:۔

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۷-۲۰۵) صبح وشام یاد کرتے رہو۔

(اور غُدُوٌّ (مصدر) رَوَاحٌ کے مقابلہ میں) جیسے فرمایا:۔

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (۳۴-۱۲) اس کا صبح کا جانا ایک مہینہ کی راہ ہوتی ہے اور شام کا جانا بھی ایک مہینے کی۔

اور غَدَاۃٌ کے مقابلہ میں عَشِیٌّ جیسے فرمایا:۔

بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ (۶-۵۲) صبح وشام۔

اَلْغَادِیَۃُ صبح کا بادل اَلْغَدَاءُ کھانا جو دن کے ابتدائی حصہ میں کھا لیا جائے غَدَوْتُ اَغْدُوْ کے معنی ہیں صبح سویرے روانہ ہونا یا کسی جگہ جا پہنچ جانا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ (۶۸-۲۲) اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔

غَدًا کل آئندہ جیسا کہ آیت سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا (۵۴-۲۶) ان کو کل معلوم ہو جائے گا۔ اور دیگر آیات میں مذکور ہے[1]۔

(غ ر ر)

غَرَرْتُ (ن) فُلَانًا (فریب دینا) کسی کو غافل پا کر اس سے اپنا مقصد حاصل کرنا غِرَّۃٌ بیداری کی حالت میں غفلت غِرَارٌ اونگھ کے ساتھ غفلت، اصل میں یہ غُرٌّ سے ہے جس کے معنی کسی شے پر ظاہری نشان کے ہیں۔ اسی سے غُرَّۃُ الْفَرَسِ (گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی) ہے اور غِرَارُ السَّیْفِ کے معنی تلوار کی دھار کے ہیں غِرُّ الثَّوْبِ کپڑے کی تہ اسی سے محاورہ ہے:۔

---

[1] راجع الآیات و (۱۸-۵۹)(۱۸-۲۳)(۳۱-۳۴)

راظوہ علیٰ غرّہ کپڑے کو اس کی تہ پر لپیٹ دو یعنی اس معاملہ کو جوں کا توں رہنے دو غَرَّہٗ غُرُوْرًا اسے فریب دیا گویا اسے اس کی تہ پر لپیٹ دیا۔ قرآن میں ہے:۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (۸۲-۶) اے انسان تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکا دیا۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ (۳-۱۹۶) (اے پیغمبر) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمہیں دھوکا نہ دے۔

وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۷-۶۴) اور شیطان جو وعدے ان سے کرتا ہے سب دھوکا ہے۔

بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا (۳۵-۴۰) بلکہ ظالم جو ایک دوسرے کو وعدہ دیتے ہیں محض فریب ہے۔

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (۶-۱۱۲) وہ دھوکا دینے کے لئے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۳-۱۸۵) اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (۶-۷۰) اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا (۳۳-۱۲) کہ خدا اور اس کے رسول نے ہم سے دھوکے کا وعدہ کیا تھا۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۱-۳۳) اور نہ فریب دینے والا (شیطان) تمہیں خدا کے بارے میں کسی طرح کا فریب دے۔

پس غرور سے مال وجاہ، خواہش نفسانی، شیطان اور ہر وہ چیز مراد ہے جو انسان کو فریب میں مبتلا کرے بعض نے غَرُوْر سے مراد صرف شیطان لیا ہے کیونکہ جو چیزیں انسان کو فریب میں مبتلا کرتی ہیں شیطان ان سب سے زیادہ خبیث ہے اور بعض نے اس کی تفسیر دنیا سے کی ہے کیونکہ دنیا بھی انسان سے فریب کھیلتی ہے دھوکا دیتی ہے نقصان پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

اَلْغَرَرُ دھوکا۔ یہ غَرٌّ سے ہے اور (حدیث میں) بیع الغرر سے منع کیا گیا ہے[1] (۵۷)

اَلْغَرِيْرُ اچھا خلق۔ کیونکہ وہ بھی دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ (بوڑھے شخص کے متعلق محاورہ ہے۔ فُلَانٌ اَدْبَرَ غَرِيْرُهٗ وَاَقْبَلَ هَرِيْرُهٗ (اس سے حسن خلق جاتا رہا اور چڑچڑاپن آگیا۔

اور غُرَّةُ الْفَرَسِ سے تشبیہ کے طور پر مشہور معروف آدمی کو اَغَرّ کہا جاتا ہے اور مہینے کی ابتدائی تین راتوں کو غُرَر کہتے ہیں کیونکہ مہینہ میں ان کی حیثیت غُرَّةُ الْفَرَسِ کی ہوتی ہے

غِرَارُ السَّيْفِ تلوار کی دھار اور غِرَار کے معنی تھوڑا سا دودھ کے بھی آتے ہیں اور غَارَّتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں اونٹنی کا دودھ کم ہو گیا حالانکہ اس کے متعلق یہ گمان نہ تھا کہ اسکا دودھ کم ہو جائیگا گویا کہ اس اونٹنی نے مالک کو دھوکا دیا۔

(غ ر ب)

اَلْغَرْبُ (ن) سورج کا غائب ہو جانا

---

[1] رواہ الجماعۃ الا البخاری من حدیث ابی ہریرۃ واحمد من حدیث ابن عمر وابن ماجۃ من حدیث ابن عباس وعن سہل عند الطبرانی والبیع الغرر صور وراجع النیل ۵: ۱۵۶-۱۵۷) ومنہ المثل الغرۃ تجلب الدرۃ (المیدانی ۲ر۲۲)

غَرَبَتْ تَغْرُبُ غَرْبًا وَغُرُوْبًا سورج غروب ہو گیا اور مَغْرِبُ الشَّمْسِ وَمُغَیْرِبَانُھَا (مصغر) کے معنی آفتاب غروب ہونے کی جگہ یا وقت کے ہیں ؎۱۔ قرآن میں ہے:۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (۷۳-۹) (وہی) مشرق اور مغرب کا مالک ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ (۵۵-۱۷) وہی دونوں مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے۔

بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ (۷۰-۴۰) مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔

ان کے تثنیہ اور جمع لانے کی بحث پہلے گزر چکی ہے ؎۲۔

نیز فرمایا:۔

لَا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ (۲۴-۳۵) کہ نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف۔

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَھَا تَغْرُبُ۔ (۱۸-۸۶) یہاں تک کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا۔

اور ہر اجنبی کو غریب کہا جاتا ہے اور جو چیز اپنی ہم جنس چیزوں میں بے نظیر اور انوکھی ہو اسے بھی غَرِیْبٌ کہہ دیتے ہیں اسی معنی میں آنحضرت نے فرمایا (۵۸) اَلْاِسْلَامُ بَدَأَ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ ؎۳ کہ اسلام ابتدا میں غریب تھا اور آخر زمانہ میں پھر پہلے کی طرح ہو جائے گا اور جہلا کی کثرت اور اہل علم کی قلت کی وجہ سے علماء کو غرباء کہا گیا ہے۔ اور کوے کو غُرَاب اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ بھی دور تک چلا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ (۵-۳۱) اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا۔

اور غَارِبُ السَّنَامِ کے معنی کوہان کی بلندی کے ہیں کیونکہ (بلندی کی وجہ سے) اس تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے اور غَرْبُ السَّیْفِ کے معنی تلوار کی دھار کے ہیں کیونکہ تلوار بھی جسے ماری جائے اس میں چھپ جاتی ہے لہذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔ پھر جس طرح زبان کو تلوار کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے اسی طرح زبان کی تیزی کو بھی تلوار کی تیزی کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ غَرْبُ اللِّسَانِ (فلاں تیز زبان ہے) کہا جاتا ہے اور کنویں میں بعد مسافت کے معنی کا تصور کر کے ڈول کو بھی غَرْبٌ کہہ دیا جاتا ہے اور اَغْرَبَ السَّاقِیْ کے معنی ہیں پانی پلانے والے نے ڈول پکڑا اور غَرْبٌ کے معنی سونا بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی دوسری معدنیات سے قیمتی ہوتا ہے اور اسی سے سَھْمٌ غَرْبٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ تیر جس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ کدھر سے آیا ہے۔ اور بلا ارادہ کسی طرف دیکھنے کو نَظْرٌ غَرْبٌ کہا جاتا ہے اور غَرْبٌ کا لفظ بے پھل درخت پر بھی بولا جاتا ہے گویا وہ ثمرات سے دور ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ عَنْقَاءُ جانور ایک لڑکی کو اٹھا کر دور دراز لے گیا تھا۔ اس وقت سے اس کا نام عَنْقَاءُ مُغْرِبٌ اَوْ عَنْقَاءُ مُغْرِبٍ (اضافت کے ساتھ) پڑ گیا۔

اَلْغُرَابَانِ سرینوں کے اوپر دونوں جانب کے

؎۱ تصغیر مغربان ؎۲ راجع (ش رق) ؎۳ الحدیث باختلاف الفاظ فی (م، ھ) عن ابی ہریرة (ط) ابن مسعود (ط) انس بن مالک (ط) (طب) عن سلمان وسہل بن سعد وابن عباس وبمعناہ فی (ت) الترمذی عن عمرو بن عوف المزنی وابو نصر السجزی فی الابانة عن عبدالرحمان بن سنة ونعیم بن حماد فی الفتن عن ابی الحکم عن سعد بن ابی وقاص (انظر کنز العمال رقم ۱۱۹۲ - ۱۱۹۵ و رقم ۱۱۹۹ و ۱۲۰۲)

...گڑھے جو ہیئت میں کوے کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔
اَلْمُغْرَبُ گھوڑا جس کا کرانہ چشم سفید ہو کیونکہ اس کی آنکھ اس سفیدی میں عجیب و غریب نظر آتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
غَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵-۲۷) کالے سیاہ ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ غَرَابِيْبُ کا واحد غِرْبِيْبٌ ہے اور اس کے معنی کوے کی طرح بہت زیادہ سیاہ کے ہیں جس طرح کہ اَسْوَدُ كَحَلَكِ الْغُرَابِ کا محاورہ ہے۔ (یعنی صفت تاکیدی ہے اور اس میں قلب پایا جاتا ہے اصل میں سُوْدٌ غَرَابِيْبُ ہے[۱]۔

(غ ر ض)

اَلْغَرَضُ کے اصل معنی نشانہ کے ہیں پھر ہر اس غایت کو جہاں پہنچنا مقصود ہو غَرَضٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَغْرَاضٌ آتی ہے۔
غرض دو قسم پر ہے۔ غرض ناقص جو بالذات مقصود نہ ہو بلکہ اس سے کوئی دوسری چیز مقصود ہو جیسے تونگری یا ریاست یا اس قسم کی دوسری اغراض جن کے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں (۲) غرض تام جس کے بعد کسی اور چیز کا اشتیاق باقی نہ رہے جیسے جنت[۲]۔

(غ ر ف)

اَلْغَرْفُ (ض) کے معنی کسی چیز کو اٹھا لینے اور لے لینے کے ہیں جیسے غَرَفْتُ الْمَاءَ اَوِ الْمَرَقَ (میں نے پانی یا شوربہ لیا) اور غُرْفَةٌ کے معنی چلو بھر پانی کے ہیں اور اَلْغَرْفَةُ ایک مرتبہ چلو سے پانی لینا اَلْمِغْرَفَةُ چمچہ وغیرہ جس سے شوربہ وغیرہ نکال کر برتن میں ڈالا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:
اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ (۲-۲۴۹) ہاں اگر کوئی ہاتھ سے چلو بھر پانی لے لے (تو خیر)
اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے غَرَفْتُ عُرْفَ الْفَرَسِ میں نے گھوڑے کی پیشانی کے بال کاٹ ڈالے غَرَفْتُ الشَّجَرَةَ میں نے درخت کی ٹہنیوں کو کاٹ ڈالا۔
اَلْغَرَفُ ایک قسم کا پودا جس سے چمڑے کو دباغت دی جاتی ہے، غَرِفَتِ الْاِبِلُ اونٹ غرف کھا کر بیمار ہو گئے۔ اَلْغُرْفَةُ بالاخانہ (جمع غُرَفٌ وَغُرُفَاتٌ قرآن میں، جنت کے منازل اور درجات کو اَلْغُرَفُ کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا:۔
اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا (۲۵-۷۵) ان صفات کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیئے جائیں گے۔
لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا (۲۹-۵۸) ان کو ہم بہشت کے اونچے اونچے محلوں میں جگہ دیں گے۔
وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۴-۳۷) اور وہ خاطر جمع سے بالاخانوں میں بیٹھے ہوں گے۔

(غ ر ق)

اَلْغَرَقُ پانی میں تہ نشین ہو جانا کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانا۔ غَرِقَ (س)، فُلَانٌ يَغْرَقُ غَرَقًا فلاں پانی میں ڈوب گیا۔ قرآن میں ہے:۔
حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (۱۰-۹۰) یہاں تک کہ جب اسے غرقابی نے آلیا۔
اَغْرَقَهٗ (افعال)، اس نے اسے ڈبو یا غرق کر دیا قرآن میں ہے:۔

---

[۱] کذا قال النسفی راجع معجم القرآن لعبد الرؤف مصری ۱۲ [۲] ولیس فی القرآن من ہذا المادۃ ۱۲۔

وَاَغْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ (۲-۵۰) اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔
فَاَغْرَقْنٰہُ وَمَنْ مَّعَہٗ جَمِیْعًا (۱۷-۱۰۳) تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو ڈبو دیا۔
ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ (۲۶-۶۶) پھر دوسروں کو ڈبو دیا۔
ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِیْنَ (۲۶-۱۲۰) پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو ڈبو دیا۔
وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْھُمْ (۳۶-۴۳) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں۔
اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا (۷۱-۲۵) غرقاب کر دیئے گئے پھر آگ میں ڈال دیئے گئے۔
فَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ (۱۱-۴۳) اور وہ ڈوب گیا
اور تشبیہ کے طور پر زیر بار احسان ہونے کے لئے بھی اَلْغَرَقُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے۔
فُلَانٌ غَرِقَ فِیْ نِعْمَۃِ فُلَانٍ فلاں اس کے احسانات میں ڈوبا ہوا ہے۔

(غ ر م)

اَلْغُرْمُ (مفت کا تاوان یا جرمانہ) وہ مالی نقصان جو کسی قسم کی خیانت یا جنایت (جرم) کا ارتکاب کئے بغیر انسان کو اٹھانا پڑے غَرِمَ کَذَا غُرْمًا وَمَغْرَمًا فلاں نے نقصان اٹھایا اَغْرَمَ فُلَانٌ غَرَامَۃً اس پر تاوان پڑ گیا۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ (۵۶-۶۶) (کہ ہائے) ہم مفت تاوان میں پھنس گئے۔
فَھُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۵۲-۴۰) کہ ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔
یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا (۹-۹۸) کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں۔
اور غَرِیْمٌ کا لفظ مقروض اور قرض خواہ دونوں کے لئے آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۹-۶۰) اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے) کے لئے اور خدا کی راہ میں۔
اور جو تکلیف یا مصیبت انسان کو پہنچتی ہے اسے غَرَامٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّ عَذَابَھَا کَانَ غَرَامًا (۲۵-۶۵) کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے۔
یہ ھُوَ مُغْرَمٌ بِالنِّسَآءِ (وہ عورتوں کا دلدادہ ہے) کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی وہ شخص جو غَرِیْمٌ (قرض خواہ) کی طرح عورتوں کے پیچھے پیچھے پھرتا ہو۔ حسن[1] فرماتے ہیں[2] کُلُّ غَرِیْمٍ مُفَارِقٌ غَرِیْمَہٗ اِلَّا النَّارُ یعنی ہر قرض خواہ اپنے مقروض کو چھوڑ سکتا ہے لیکن آگ اپنے غُرَمَاءَ کو نہیں چھوڑے گی۔
بعض نے عذاب جہنم کو غرام کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ عذاب ان کا اسی طرح پیچھا کرے گا گویا وہ انہیں ہلاک کرنے پر شیفتہ ہے۔

(غ ر و)

غَرِیَ بِکَذَا کے معنی کسی کے ساتھ چمٹ جانا ہیں اصل میں یہ غِرَاءٌ سے ہے اور غِرَاءٌ اس مادہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسری کے ساتھ پیوست کی جائے اور اسی سے اَغْرَیْتُ فُلَانًا بِکَذَا کے معنی ہیں میں نے فلاں کو اس پر

---

[1] وجاء بمعنی المبالغۃ فی الشئ کما فی الآیۃ والنازعات غرقا و ۱ ای بمعناہ النزع بالمبالغۃ یا التعریق النامۃ (راجع الکشاف ۴ / ۲۰۹) ج ۳ [2] راجع لقول الحسن القرطبی ج ۱۳ ص ۷۲

شیفتہ کر دیا اس پر ابھارا اور اکسایا اس کے پیچھے لگا دیا۔ قرآن میں ہے:۔

وَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ (۵-۱۴) تو ہم نے ان کے باہم قیامت تک کے لئے دشمنی اور کینہ ڈال دیا۔

لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ (۳۳-۶۰) تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔

(غ ز ل)

اَلْغَزْلُ (ض) کاتے ہوئے سوت کو کہتے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا (۱۶-۹۲) اور عورت کی طرح نہ ہونا جس نے اپنا کاتا ہوا سوت ادھیڑ دیا۔

غَزَلْتُ غَزْلًا سوت کاتنا اور ہرنی کے بچہ کو غَزَالٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْغَزَالَةُ سورج کی ٹکیہ اور کنایہ کے طور پر غَزِلَ (س) اور مُغَازَلَةٌ کے معنی غزال یعنی ہرنوٹے جیسی خوبصورت عورتوں کے ساتھ عشق ومحبت اور دلبستگی کی باتیں کرنا آتے ہیں۔

غَزِلَ الْكَلْبُ غَزَلًا کتے کا ہرن کو پاکر اس سے پیچھے ہٹ جانا۔

(غ ز و)

اَلْغَزْوُ کے معنی دشمن سے جنگ کرنے کے ارادہ سے نکلنا ہیں غَزَا يَغْزُو غَزْوًا وہ دشمن سے جنگ کے ارادہ سے نکلا ایسے شخص کو اَلْغَازِيُ کہا جاتا ہے اس کی جمع غُزَاةٌ وَغُزًّى آتی ہے قرآن میں ہے:۔

أَوْ كَانُوا غُزًّى (۳-۱۵۶) یا وہ جہاد کرتے ہوں۔

(غ س ق)

غَسَقُ اللَّيْلِ کے معنی (ابتدائے) شب کی سخت تاریکی کے ہیں قرآن میں ہے:۔

إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ (۱۷-۷۸) رات کی تاریکی تک۔

اَلْغَاسِقُ تاریک رات[1] قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ (۱۱۳-۳) اور شب تاریک کی برائی سے جب اسکی تاریکی چھا جائے۔ اور اس سے مراد رات کے وقت پیش آنے والی مصیبت یا حادثہ کے ہیں جیسے طوارق اللیل (رات کے وقت آنے والا) بعض نے کہا[2] ہے کہ غاسق چاند کو کہتے ہیں جب کہ وہ گہن لگ کر سیاہ ہو جائے اَلْغَسَّاقُ دوزخیوں کے جسموں سے بہنے والا لہو یا پیپ۔ قرآن میں ہے:۔

إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (۷۸-۲۵) مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔

(غ س ل)

غَسَلْتُ الشَّيْءَ غَسْلًا کے معنی کسی چیز پر پانی بہا کر اسے میل کچیل سے پاک کرنے کے

---

[1] كذا فسره القتيبي في غريبه وفي الفخر ۳۲/۱۹۴ - وهذا قول الفراء وابي عبيدة وقال الزجاج الغاسق في اللغة البارد وسمي الليل غاسقا لانه ابرد من النهار (القرطبي ۲۰/۲۵۶) وهو قول ابن عباس وغيره وروي مرفوعا۔

[2] وهذا ايضا حكاه القتيبي في غريبه ۳ ۵۴۳ وقد نقله القرطبي (۲۰/۲۵۷ والبحر ۸/۵۳۱ والفخر ۳۲/۱۹۵ واللسان (غسق) وقد روي مرفوعا (راجع النهاية ۳/۱۶۱ والطبري ۳۰/۳۵۲ والكشاف ۴/۲۶۸ والدر ۶/۴۱۸ والشوكاني ۵/۵۰۷ وراجع كنز العمال عن عائشة ج ۲ رقم ۷۳

ہیں اسی سے غُسْلٌ اسم ہے اور غِسْلٌ وہ چیز ہے جس کے ساتھ کپڑے کو دھویا یا نہایا جاتا ہے (جیسے صابن وغیرہ) قرآن میں ہے:۔

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ الآية (۵-۶) تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو۔

اَلْاِغْتِسَالُ (افتعال) کے معنی نہانے اور تمام بدن کو دھونے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا (۴-۴۳) جب تک کہ غسل نہ کرلو۔

اَلْمُغْتَسَلُ نہانے کی جگہ یا نہانے کا پانی قرآن میں ہے:۔

هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (۳۸-۴۲) یہ چشمہ نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو شیریں۔

اَلْغِسْلِيْنُ کے معنی دوزخیوں کے اجسام کا غسالہ (پیپ) کے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (۶۹-۳۶) اور نہ پیپ کے سوا ان کے لئے کھانا ہے۔

(غ ش و)

غَشِيَهُ غِشَاوَةً وَغِشَاءً اس کے پاس اس چیز کی طرح آیا جو اسے چھپائے غِشَاوَةٌ (اسم) پردہ جس سے کوئی چیز ڈھانپ دی جائے قرآن میں ہے:۔

وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (۴۵-۲۳) اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۲-۷) اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

... ہے:۔ غَشِيَهُ تَغْشِيَةً وَغَشَّيْتُهُ۔ اسے چھپا لیا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ (۳۱-۳۲) اور جب ان پر لہریں چھا جاتی ہیں۔

فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ (۲۰-۷۸) تو دریا کی موجوں نے ان پر چڑھ کر انہیں ڈھانپ لیا (یعنی ڈبو دیا)۔

وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (۱۴-۵۰) اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۵۳-۱۶) جب کہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (۹۲-۱) رات کی قسم جو دن کو چھپا لے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ (۸-۱۱) جب اس نے ... تمہیں نیند کی چادر اڑھا دی۔

غَشِيْتُ مَوْضِعَ كَذَا میں فلاں جگہ پر آیا اور کنایۃً عورت سے مجامعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ غَشَاهَا وَتَغَشَّاهَا کے معنی ہیں میں نے عورت سے مجامعت کی قرآن میں ہے:۔

فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ (۷-۱۸۹) سو جب وہ اس سے ہم بستری کرتا ہے تو اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔

یہی معنی اَلْغِشْيَانِ کے ہیں اَلْغَاشِيَةُ ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز کو چھپایا جائے مثلاً غَاشِيَةُ السَّرْجِ چمڑا جو زین کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ (۱۲-۱۰۷) کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہو کر ان کو ڈھانپ لے۔

میں غَاشِيَةٌ سے مراد وہ مصیبت ہے جو چاروں طرف سے ان پر چھا جائے اور گھوڑے کے جھول کی طرح انہیں ڈھانپ لے بعض نے کہا کہ لفظ غَاشِيَةٌ اصل میں اچھی چیز کیلئے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں بطور استعارہ عذاب کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس طرح آیت کریمہ:۔

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ (۷-۴۱) ایسے لوگوں کے لئے (نیچے) بچھانا بھی (آتش) جہنم کا ہوگا اور اوپر سے اوڑھنا بھی۔ میں ہے کہ یہاں مِهَادٌ (بچھونے) کے مقابل میں غَوَاشٍ کا لفظ آیا ہے جس سے جہنم کا عذاب مراد ہے اور آیت کریمہ:۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۸۸-۱) بھلا کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت کا) حال معلوم ہے۔ میں اَلْغَاشِيَة سے مراد قیامت ہے اور اس کی جمع غَوَاشٍ ہے غُشِيَ عَلٰى فُلَانٍ اس پر بیہوشی طاری ہوگئی قرآن میں ہے:۔

كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۳۳-۱۹) جیسے کسی پر موت سے غشی طاری ہو۔

نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۴۷-۲۰) جس طرح کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو رہی ہو۔

اَغْشَاهُ اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا قرآن میں ہے:۔

فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۳۶-۹) ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو یہ دیکھ نہیں سکتے۔

كَاَنَّمَا اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ (۱۰-۲۷) ان کے مونہوں (کی سیاہی کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر گویا پردے اڑھا دیئے گئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ (۷۱-۸۷) کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے کپڑوں سے اپنے کان بند کر لئے اور یہ کسی کی بات پر توجہ نہ دینے سے [illegible] ہوتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دور بھاگ [illegible] ہے جس طرح کہ شَمَّرَ ذَيْلَهٗ وَاَلْقٰى ثَوْبَهٗ ہے کہ اس کے معنی کسی کام کی تیاری کے آتے ہیں غَشَّيْتُهٗ سَوْطًا اَوْ سَيْفًا [illegible] کوڑے سے یا تلوار سے مارا جس طرح کہ كَسَوْتُهٗ [illegible] کے معنی کسی کو کساء (کمبل) پہنانے اور عمامہ باندھنے کے آتے ہیں۔

(غ ص ص)

اَلْغُصَّةُ اس ہڈی کو کہتے ہیں جو حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (۷۳-۱۳) اور گلوگیر کھانا ہے۔

(غ ض ض)

اَلْغَضُّ (ن) کے معنی کمی کرنے کے ہیں خواہ نظر اور صوت میں ہو یا کسی برتن (میں سے کچھ کم کرنے کی صورت میں ہو قرآن میں ہے:۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (۲۴-۳۰) مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ (۲۴-۳۱) اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو (کہ اپنی نگاہیں) نیچی رکھا کریں۔

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (۳۱-۱۹) اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا۔

اور شاعر کے قول[1] (الوافر)

---

[1] قال جرير من كلمة طويلة في النقائض ۴۴۸ يهجو بها عبيد الشين الحصين الراعي النميري في قصيدته المشهورة التي تسمى الفاضحة وسماه جرير الدامغة وتمامه: فلا كعبا بلغت ولا كلابا - راجع ديوانه (۷۵) وتفسير الطبري (۲۱ = ۱۲۰) واللسان (غضض) والمحكم (رضه) والسمط ۱۷۸ والاقتضاب ۵۰ والكامل ۴۹۲ وامالي المرتضى (۱: ۲۸۹) والفاضل ۱۰۹ وكنايات الجرجاني ۴۷ والعقد الفريد (۲: ۴۷۸) والجمحي ۱۳۱ - ۱۴۵ (تاريخ [illegible]) والكتاب (۲: ۱۲۰) والمعاهد (۲: ۱۹۹) والعمدة (۱۰۱/۲: ۱۷۰) والحصري ۷۵ والماوردي ۱۶ ومحاضرات الادباء (۲: ۱۴۱) ۸۹ والجمهرة ۵۶ والتنبيه ۲۲ والاغاني ۷: ۴۹، ۵۰: ۱۵۰/۱۲: ۱۶۹ والحيوان ۱: ۹۵ ۲ والسيوطي ۱۷

(۲۲۸) نَغُضُّ الطَّرْفَ اِنَّكَ مِنْ نُمَيْرٍ
(نگاہ نیچی رکھو تو بنی نمیر سے ہے)
میں غَضٌّ کا لفظ بطور تہکم استعمال ہوا ہے
غَضَضْتُ السِّقَاءَ میں نے مشک سے پانی کم کر دیا۔ اور غَضٌّ ایسی تر اور تازہ چیز کو کہتے ہیں جس پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو۔

(غ ض ب)

اَلْغَضَبُ انتقام کے لئے دل میں خون کا جوش مارنا اسی لئے آنحضرت نے فرمایا ہے[1] (۵۹) اتقوا الغضب فانه جمرة توقد فی قلب ابن ادم الم تروا الی انتفاخ اوداجه وحمرة عینیه۔ کہ غصہ سے بچو بے شک وہ انسان کے دل میں دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح ہے تم اس کی رگوں کے پھول لینے اور آنکھوں کے سرخ ہوجانے کو نہیں دیکھتے لیکن غضب الٰہی سے مراد انتقام (اور عذاب) ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے۔
فَبَاءُوْا بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ (۲-۹۰) تو وہ اس کے غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے۔
وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲-۶۱) اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔
وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِیْ (۲۰-۸۱) اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا۔
وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (۴-۹۳) اور خدا اس پر غضب ناک ہوگا۔ اور آیت کریمہ:
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (۱-۷) نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یہود مراد ہیں[2] اور غَضْبَةٌ کے معنی سخت چٹان کے ہیں۔
اَلْغَضُوْبُ بہت زیادہ غصے ہونے والا۔ یہ سانپ اور تند مزاج اونٹنی پر بھی بولا جاتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ فُلَانٌ غُضُبَّةٌ کے معنی ہیں فلاں بہت جلد غصے ہونے والا ہے۔ بعض نے بیان کیا ہے کہ غَضِبْتُ لِفُلَانٍ کے معنی کسی زندہ شخص کی حمایت میں ناراض ہونا ہیں اور غَضِبْتُ بِهٖ کے معنی کسی مردہ شخص کی حمایت کے لئے غضب ناک ہونا۔

(غ ط ش)

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا (۷۹-۲۹) اور اس نے رات کو تاریک بنایا۔
یہ اصل میں رَجُلٌ اَغْطَشُ سے ہے جس کے معنی کمزور نظر اور چندھے آدمی کے ہیں۔
فَلَاةٌ غَطْشٰی اس صحرا کو کہتے ہیں جس میں راستہ نہ ملتا ہو۔ اَلتَّغَاطُشُ کسی چیز سے آنکھیں بند کر لینا۔ غفلت برتنا۔

(غ ط و)

اَلْغِطَاءُ کے اصل معنی طباق وغیرہ کی قسم کی چیز کے ہیں جو کسی چیز پر بطور سرپوش کے رکھی جائے جیسا کہ غِشَاءٌ لباس وغیرہ کی قسم کی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کے اوپر ڈالا جائے اور بطور استعارہ غِطَاءٌ کا لفظ پردۂ جہالت

---

[1] رواه الترمذي عن ابي سعيد الخدري في حديث طويل راجع تخريج العراقي على الاحياء ۳/ ۱۷۴ [2] تذ ثبت مرفوعا عن ابي ذر وعن عباس من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم (راجع ابن كثير ا: ۳۰) ۱۲

وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰-۲۲) ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

(غ ف ر)

اَلْغَفْرُ (ض) کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینے کے ہیں جو اسے میل کچیل سے محفوظ رکھ سکے اسی سے محاورہ ہے۔ اِغْفِرْ ثَوْبَكَ فِي الْوِعَاءِ اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ میں ڈال کر چھپا دو۔ اِصْبَغْ ثَوْبَكَ فَاِنَّهٗ اَغْفَرُ لِلْوَسَخِ کپڑے کو رنگ لو کیونکہ وہ میل کچیل کو زیادہ چھپانے والا ہے اللہ کی طرف سے مَغْفِرَةٌ یا غُفْرَانٌ کے معنی ہوتے ہیں بندے کو عذاب سے بچا لیا۔ قرآن میں ہے:۔
غُفْرَانَكَ رَبَّنَا (۲-۲۸۵) اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں۔
اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳-۱۳۳) اور اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف لپکو۔
وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (۳-۱۳۵) اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔
اور کبھی غَفَرَ لَهٗ کے معنی کسی کو ظاہری طور پر معاف کر دینا آتے ہیں خواہ دل سے معاف نہ کیا ہو یعنی درگزر کرنا جیسے فرمایا:۔
قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ (۴۵-۱۴) مومنوں سے کہدو کہ جو لوگ خدا کے دنوں کی (جو اعمال کے بدلے کے لئے مقرر ہیں) توقع نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں۔
اور اِسْتِغْفَارٌ کے معنی قول اور عمل سے مغفرت طلب کرنے کے ہیں لہٰذا آیت کریمہ:۔
اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (۷۱-۱۰) اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ میں صرف زبان کے ساتھ مغفرت مانگنے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ زبان اور عمل دونوں کے ساتھ معافی طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ صرف زبان سے بخشش طلب کرنا کذاب آدمیوں کا کام ہے اور یہی معنی آیت کریمہ:۔
اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (۴۰-۶۰) کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔
میں اُدْعُوْنِيْ کے ہیں قرآن میں ہے:۔
اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۹-۸۰) ان کے لئے بخشش مانگو یا نہ مانگو۔
وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۴۰-۷) اور مومنوں کے لئے بخشش مانگتے رہتے ہیں۔
اور اَلْغَافِرُ وَالْغَفُوْرُ اسمائے حسنٰی سے ہیں[1] اور ان کے معنی گناہوں کا بخشنے والا چنانچہ فرمایا:۔
غَافِرِ الذَّنْبِ (۴۰-۳) جو گناہ بخشنے والا ہے۔
اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۵-۳۰) وہ تو بخشنے والا قدر دان ہے۔
وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۱۰-۱۰۷) اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔
اور غَفِيْرَةٌ بمعنی غُفْرَانَ ہے اسی سے فرمایا:۔
رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ (۱۴-۴۱) اے پروردگار (حساب کتاب کے دن) مجھے اور میرے ماں باپ ..... کو بخش دیجیو۔
اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ (۲۶-۸۲) میرے گناہ بخش دے گا۔

---

[1] وایضاً غفار کما فی الآیات (۷۱-۱۰) (۲۰-۸۲) (۳۸-۶۶) (۳۹-۵) (۴۰-۴۲) ورا جع لمعناہ الغریب للقتبی (۱-۵) ۱۲ ۔

وَاغْفِرْلَنَا (۲-۲۸۶) اور ہمارے گناہ بخش دے۔
بعض نے کہا ہے کہ اِغْفِرُوْا ھٰذَا الْاَمْرَ بِغَفْرَتِہٖ کے معنی یہ ہیں کہ اس معاملہ کو اس طرح چھپا دو جس طرح چھپانے کا حق ہے[1] اَلْمِغْفَرُ لوہے کا خود۔ اَلْغِفَارَۃُ اس چیتھڑا کو کہتے ہیں جیسے عورت اپنے دوپٹہ کو تیل سے بچانے کے لئے اس کے نیچے سر پر اوڑھ لیتی ہیں نیز غِفَارَۃٌ اس بادل کو کہتے ہیں جو دوسرے بادل پر چھایا ہوا ہو نیز اس ٹکڑے کو بھی جس سے کمان کے گوشہ کو لپیٹتے ہیں۔

(غ ف ل)

اَلْغَفْلَۃُ۔ اس سہو کو کہتے ہیں جو تلت تحفظ اور احتیاط کی بنا پر انسان کو عارض ہو جاتا ہے غَفَلَ (ن) اس نے غفلت سے کام لیا چنانچہ ایسے شخص کو غَافِلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَۃٍ مِّنْ ھٰذَا (۵۰-۲۲) بے شک تو اس سے غافل ہو رہا تھا۔
وَھُمْ فِیْ غَفْلَۃٍ مُّعْرِضُوْنَ (۲۱-۱) اور وہ غفلت میں پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔
وَدَخَلَ الْمَدِیْنَۃَ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَۃٍ مِّنْ اَھْلِھَا (۲۸-۱۵) اور وہ ایسے وقت شہر میں آداخل ہوئے کہ وہاں کے باشندے بے خبر ہو رہے تھے۔
وَھُمْ عَنْ دُعَائِھِمْ غَافِلُوْنَ (۴۶-۵) اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو۔
لَمِنَ الْغَافِلِیْنَ ..... (۱۲-۳) بے خبر تھے۔
ھُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰-۷) (اور آخرت کی طرف سے) غافل ہیں۔

بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ (۲-۱۴۴) جو کچھ یہ کر رہے ہیں خدا اس سے غافل نہیں ہے۔
لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِکُمْ وَاَمْتِعَتِکُمْ (۴-۱۰۲) کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہو جاؤ۔
فَھُمْ غَافِلُوْنَ (۳۶-۶) وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔
عَنْھَا غَافِلِیْنَ (۷-۱۳۶) ان سے لاپرواہی کرتے تھے۔
اَرْضٌ غُفْلٌ وہ زمین جس پر نشان راہ نہ ہو اور ناتجربہ کار آدمی کو بھی غُفْلٌ کہا جاتا ہے اور اِغْفَالُ الْکِتَابِ کے معنی کتاب کو (نقطے) اور اعراب لگائے بغیر چھوڑ دینے کے ہیں پس آیت کریمہ۔
مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا (۱۸-۲۸) کے معنی یہ ہیں کہ جس کے دل کو ہم نے یوں ہی چھوڑ دیا ہے اور اس میں ایمان کا نقش نہیں بٹھایا جس طرح کہ اس کے برعکس مومنین کے دلوں کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ (۵۸-۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ کے معنی دل کو حقائق کی معرفت سے غافل کر دینا کے ہیں۔

(غ ل ل)

اَلْغَلَلُ کے اصل معنی کسی چیز کو اوپر اوڑھنے یا اس کے درمیان میں چلے جانے کے ہیں اسی سے غَلَلٌ اس پانی کو کہا جاتا ہے جو درختوں کے درمیان

[1] انظر المکلمۃ المیدانی رقم ۲۴۸۳

سے بہہ رہا ہو اور کبھی ایسے پانی کو غَیْلٌ بھی کہہ دیتے ہیں اور اِنْغَلَّ کے معنی درختوں کے درمیان میں داخل ہونے کے ہیں لہذا غُلٌّ (طوق) خاص کر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کسی کے اعضاء کو جکڑ کر اس کے وسط میں باندھ دیا جاتا ہے اس کی جمع اَغْلَالٌ آتی ہے اور غُلَّ فُلَانٌ کے معنی ہیں اسے طوق سے باندھ دیا گیا قرآن میں ہے:۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (۶۹-۳۱) اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو۔

اِذِ الْاَغْلَالُ فِیْ اَعْنَاقِهِمْ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ..... ہوں گے۔

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷-۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان (کے سر) پر (اور) گلے میں) تھے' اتارتے ہیں۔

اور (کنایہ کے طور پر) کنجوس شخص کو مَغْلُوْلُ الْیَدِ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ (۱۷-۲۹) اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کرلو۔

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ (۵-۶۴) اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں۔

یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر بخل کا الزام لگاتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ جب انہوں نے یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا فیصلہ کر دیا ہے تو کہنے لگے پھر تو اللہ کا ہاتھ مقید ہے یعنی فارغ ہونے کی وجہ سے مقید کے حکم میں ہے تو یہ آیت نازل ہوئی اور آیت کریمہ:۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا (۳۶-۸) ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں۔ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے انہیں ہر قسم کی خیر سے محروم کر رکھا ہے جس طرح کہ ان کے قلوب پر مہر لگانا اور آنکھ و کان پر پردہ ڈالنا ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں جَعَلْنَا اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن یہ اس سزا کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں انہیں دی جائے گی جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (۳۴-۳۳) اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔

اَلْغِلَالَةُ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو دو کپڑوں کے درمیان میں پہنا جاتا ہے چنانچہ شِعَارٌ وہ کپڑا ہے جو غلالہ کے نیچے پہنا جائے مگر کبھی بطور استعارہ غُلَالَةٌ کا لفظ درع پر بھی بولا جاتا ہے جس طرح کہ دِرْعٌ کا لفظ مجازاً غلالۃ کے معنی میں آجاتا ہے۔ اور غِلٌّ کے معنی (کینہ و پوشیدہ) دشمنی کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷-۴۳) اور جو کینے ان کے دلوں میں ہوں گے ہم سب نکال ڈالیں گے۔

وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۵۹-۱۰) اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دلوں میں کینہ (و حسد) نہ پیدا ہونے دے۔

غَلَّ یَغِلُّ کسی کے متعلق دل میں کینہ رکھنا اور اَلْغُلُوْلُ کے معنی ہیں خیانت کرنا اور یہ غَلَّ یَغُلُّ سے ہے جس کے معنی ہیں خیانت کرنا اور اَغَلَّ (افعال) کے معنی خیانت کے ساتھ متصف

ہونے کے ہیں اور اَغْلَلْتُ فُلَانًا کے معنی دوسرے کو خیانت کے ساتھ متہم کرنیکے قرآن میں ہے:۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (۳-۱۶۱) اور کبھی نہیں ہوسکتا کہ پیغمبر (خدا) خیانت کریں۔

ایک قرأت میں اَنْ يُّغَلَّ ہے جو کہ اَغْلَلْتُهٗ سے ہے یعنی اسے خیانت کے ساتھ متہم کیا جائے۔

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۳-۱۶۱) اور خیانت کرنے والوں کو قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز (خدا کے روبرو) حاضر کرنی ہوگی۔

ایک روایت میں ہے[1] (۷۰) لَا اِغْلَالَ وَلَا اِسْلَالَ یعنی خیانت اور چوری نہیں ہے اور حدیث میں ہے[2] (۷۲) ثَلَاثٌ لَا يُغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ یعنی تین باتوں پر مومن کا دل کینہ وری سے کام نہیں لیتا۔

اور ایک روایت میں لَا يَغِلُّ ہے یعنی خیانت نہیں کرتا اَغَلَّ الْجَازِرُ وَالسَّالِخُ قصاب کا کھال کے ساتھ کچھ گوشت چھوڑ دینا یہ اِغْلَالٌ بمعنی خیانت سے ہے گویا قصاب نے کھال کے ساتھ گوشت چھوڑ کر خیانت کی تاکہ وہ گوشت لے جائے۔

اَلْغُلَّةُ وَالْغَلِيْلُ پیاس، غصہ یا محبت کی سوزش شَفَا فُلَانٌ غَلِيْلَهٗ فلاں نے اپنا غصہ نکال لیا اَلْغَلَّةُ زمین کی پیداوار اسی سے اَغَلَّتْ ضَيْعَتُهٗ ہے جس کے معنی ہیں زمین نے پیداوار دی اور مُغَلْغَلَةٌ اس پیغام یا خط کو کہا جاتا ہے جو شہر بشہر پہنچایا جائے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (الوافر)

(۳۲۹) تَغَلْغَلَ حَيْثُ لَمْ يَبْلُغْ شَرَابٌ
وَلَا حُزْنٌ وَلَمْ يَبْلُغْ سُرُوْرٌ

اس کی محبت وہاں پہنچ گئی ہے جہاں شراب اور غم وسرور کا بھی گزر نہیں ہوسکتا۔

(غ ل ب)

اَلْغَلَبَةُ کے معنی قہر اور بالادستی کے ہیں۔ غَلَبْتُهٗ (ض) غَلَبًا وَغَلَبَةً میں اس پر مستولی اور غالب ہوگیا اسی سے صیغہ صفت فاعلی غَالِبٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

الٓمّٓ۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ (۳۰-۳۱) الم (۱) روم مغلوب ہوگئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوجائیں گے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

---

[1] قال ابن حجر اخرجہ ابوداؤد واحمد من روایۃ الزہری عن المسور ومروان فی حدیث ورواہ الدارمی والطبرانی وابن عدی من روایۃ کثیر بن عبداللہ ورواہ ابن زنجویہ فی الاموال وابراہیم الحربی فی الغریب راجع الکاف ۳۳ [2] انظر للحدیث الفائق ۲ر۲۴۱۱ والنہایۃ (غلل) ورواہ الشافعی فی رسالۃ رقم ۱۱۰۲ والبیہقی فی المدخل وابن ماجۃ والدارمی عن زید بن ثابت راجع شرح الترمذی ۲ر۲۷۴ والمستدرک ۱ر۸۶-۸۸ والترغیب (۱ر۶۳-۶۴) ومجمع الزوائد ۱ر۱۳۷-۱۳۹ ونسبہا الحافظ فی تخریجہ علی الکشاف الی ابن عدی وابی داؤد والاموال لابن زنجویہ والغریب لابراہیم الحربی وانظر رقم ۲۷۳) والفتح للنبہانی ۳ر۳۰۹ [3] قالہ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبۃ بن مسعود احد فقہاء السبعۃ یشیب بعثمۃ امرأتہ وقبلہ : تغلغل حب عثمۃ فی فؤادی۔ فبادیہ مع الخافی یسیر والبیت فی تاریخ الخطیب ۸ر۳۰۴ والمصارع ۲۰۱ والاصابۃ ۵۹۵ ولیسند ابن کثیر (۱: ۱۲۶) الی النابغۃ فی زوجتہ عثمۃ وحکاہ عن القرطبی واللہ اعلم وتقدم فی (قرب) رقم ۳۵۹ ÷ ÷

(۲-۲۴۹) کہ بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے۔

یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ (۸-۶۶) دو سو پر غالب رہینگے

یَغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا (۸-۶۵) وہ ہزار پر غالب رہیں گے۔

لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ۔ (۵۸-۲۱) کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

لَا غَالِبَ لَکُمُ الۡیَوۡمَ (۸-۴۸) کہ آج کے دن ..... کوئی تم پر غالب نہ ہوگا۔

اِنۡ کُنَّا نَحۡنُ الۡغٰلِبِیۡنَ (۷-۱۱۳) اگر ہم جیت گئے۔

اِنَّا لَنَحۡنُ الۡغٰلِبُوۡنَ (۲۶-۴۴) ہم ضرور غالب رہیں گے۔

نَغُلِبُوۡا هُنَالِكَ..... (۷-۱۱۹) اور وہ مغلوب ہوگئے۔

اَفَهُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ (۲۱-۴۴) کیا یہ لوگ غلبہ پانے والے ہیں۔

سَتُغۡلَبُوۡنَ وَ تُحۡشَرُوۡنَ (۳-۱۲) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں جہنم کیطرف) ہانکے جاؤ گے۔

ثُمَّ یُغۡلَبُوۡنَ (۸-۳۶) اور وہ مغلوب ہو جائینگے۔

غَلَبَ عَلَیۡهِ کے معنی کسی پر مستولی ہونے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

غَلَبَتۡ عَلَیۡنَا شِقۡوَتُنَا (۲۳-۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب ہوگئی۔

بعض نے کہا ہے کہ اصل میں غَلَبَتْ کے معنی کسی کی گردن کے موٹے حصہ کو پکڑنے یا اس پر مارنے کے ہیں اور موٹی گردن والے شخص کو اَغۡلَبُ کہا جاتا ہے۔ اس کی مؤنث غَلۡبَآءُ ہے اور هَضۡبَةٌ غَلۡبَآءُ کے معنی بلند ٹیلہ کے ہیں جیسا کہ اس معنی میں هَضۡبَةٌ رَقۡبَاءُ وَ عَنۡقَاءُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے[1] غُلۡبًا غَلۡبَاءُ کی جمع غُلۡبٌ ہے جسکے معنی گھنے باغات کے ہیں، جیسے فرمایا:۔

وَحَدَآئِقَ غُلۡبًا (۸۰-۳۰) اور گھنے گھنے باغ۔

(غ ل ظ)

اَلۡغِلۡظَةُ (غین کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) کے معنی موٹاپا یا گاڑھاپن کے ہیں یہ دِقَّةٌ کی ضد ہے اصل میں یہ اجسام کی صفت ہے۔ لیکن کَبِیۡرٌ وَ کَثِیۡرٌ کی طرح بطور استعارہ معانی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَلۡیَجِدُوۡا فِیۡکُمۡ غِلۡظَةً چاہئے کہ وہ تم میں سختی محسوس کریں (۹-۱۲۳) میں غِلۡظَةٌ کے معنی سخت مزاجی کے ہیں۔ نیز فرمایا:۔

ثُمَّ نَضۡطَرُّهُمۡ اِلٰی عَذَابٍ غَلِیۡظٍ (۳۱-۲۴) پھر عذاب شدید کی طرف مجبور کرکے لیجائیں گے۔

مِّنۡ عَذَابٍ غَلِیۡظٍ (۱۱-۵۸) عذاب شدید سے۔

جَاهِدِ الۡکُفَّارَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ (۹-۷۳) کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سختی کرو۔

اِسۡتَغۡلَظَ کے معنی موٹا اور سخت ہونے کو تیار ہو جانا ہیں اور کبھی موٹا اور سخت ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ (۴۸-۲۹) پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

(غ ل ف)

آیت کریمہ:۔ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ (۲-۸۸) کی تفسیر

---

[1] وفی الاصول هذا تقیید غلباء هو ونسب لقوله تعالیٰ: وحدائق غلبا (۸۰-۳۰)

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ یعنی (غُلْفٌ) اَغْلَفُ کی جمع ہے (اور اَغْلَفُ اس چیز کو کہتے ہیں جو غلاف میں بند ہو) چنانچہ سَیْفٌ اَغْلَفُ کے معنی ہیں تلوار جو غلاف یعنی نیام میں بند ہو اور بغیر ختنہ لڑکے کو غلام اَغْلَفُ کہا جاتا ہے اور جو چیز ختنہ کرتے وقت کاٹ دی جاتی ہے اسے غُلْفَةٌ کہتے ہیں۔ غَلَّفْتُ السَّیْفَ تلوار کو نیام میں بند کردیا غَلَّفْتُ الْقَارُوْرَةَ شیشے کے اوپر غلاف چڑھا دیا غَلَّفْتُ الرَّحْلَ اَوِ السَّرْجَ پالان یا زین پر چمڑا مڑھ دیا اسی طرح غَلَّفْتُ اللِّحْيَةَ بِالْحِنَاءِ کے معنی کسی کی داڑھی کو مہندی سے چھپا دینے کے ہیں اور تَغَلَّفَ (تفعل) بمعنی تَخَضَّبَ آتا ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں (اس لئے قرآن کریم کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آسکتیں) لہٰذا یہ آیت کریمہ: قُلُوْبُنَا فِیْۤ اَکِنَّةٍ (۴۱-۵) اور فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (۵-۲۲) کے ہم معنی ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ (غُلْفٌ) اصل میں غُلُفٌ بضم اللام ہے جیسا کہ ایک قرأت میں ہے۔ اور یہ اَغْلَفُ کی نہیں بلکہ غِلَافٌ کی جمع ہے جیسا کہ کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ آتی ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے گنجینے اور مخزن ہیں اور ان علوم کی موجودگی میں ہم دوسروں کے علوم سے بے نیاز ہیں لہٰذا ہم سے کسی قسم کے استفادہ کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

(غ ل ق)

اَلْغَلَقُ وَالْمِغْلَاقُ قفل وغیرہ جس کے دروازہ بند کیا جاتا ہے اور بعض نے وہ چیز مراد لی ہے جس کے ساتھ اسے کھولا جاتا ہے لیکن اگر معنی بندش کا لحاظ کیا جائے تو اسے مِغْلَقٌ وَمِغْلَاقٌ کہا جائیگا اور کھولنے کے اعتبار سے مِفْتَحٌ یا مِفْتَاحٌ کہا جاتا ہے اور اَغْلَقْتُ الْبَابَ کے معنی دروازہ بند کرنے کے ہیں اور غَلَّقْتُهٗ میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی بہت سے دروازوں کو بند کرنا یا ایک ہی دروازے کو احکام یعنی بڑی مضبوطی سے بند کرنا اسی بنا پر آیت کریمہ:

وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ (۱۲-۲۳) اور دروازے بند کرکے۔ میں ابواب کے ساتھ فعل غَلَّقَ لایا گیا ہے اور تشبیہ کے طور پر غَلِقَ الرَّهْنُ غُلُوْقًا کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی گروی چیز کو روک لینے کے ہیں[1]۔

غَلِقَ ظَهْرُهٗ دَبَرًا اونٹ کی پیٹھ کا زخم بھر گیا اور قمار بازی کے ساتویں تیر کو مِغْلَقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جوئے کے باقی ماندہ تمام حصوں کو روک لیتا ہے نَخْلَةٌ غَلِقَةٌ وہ کھجور جس کی جڑیں خشک ہوگئی ہوں اور وہ پھل دینے سے رک جائے اور غَلِقَةٌ زہریلی قسم کے ایک کڑوے درخت کا نام ہے۔

(غ ل م)

اَلْغُلَامُ اس لڑکے کو کہتے ہیں جس کی مسیں بھیگ چکی ہوں محاورہ ہے غُلَامٌ بَيِّنُ الْغُلُوْمَةِ وَالْغُلُوْمِيَّةِ لڑکا جو بھرپور جوانی

---

[1] وفی الحدیث لا یغلق الرھن ای لا یستحقہ المرتھن اذا لم یرد الراھن ما رھنہ فیہ وکان ھذا من فعل الجاھلیۃ فابطلہ الاسلام راجع للحدیث کنز العمال ۶: رقم ۱۱۶۲ و ۱۱۶۶ ولمعناہ الزرقانی (۴: ۵-۶) ۞ ۞ ۞

کی عمر میں ہو قرآن میں ہے :۔
اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ (۱۹-۲۰) میرے ہاں لڑکا کیونکر ہوگا۔
وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ (۱۸-۸۱) اور وہ لڑکا تھا اس کے ماں باپ دونوں مومن تھے۔
وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ (۱۸-۸۲) اور جو دیوار تھی سو وہ دو لڑکوں کی تھی۔
اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا:۔
هٰذَا غُلٰمٌ (۱۲-۱۹) یہ نوجوان نہایت حسین لڑکا ہے۔
غُلٰمٌ کی جمع غِلْمَةٌ وَغِلْمَانٌ آتی ہے۔ اور اِغْتَلَمَ الْغُلَامُ کے معنی ہیں لڑکا بالغ ہوگیا۔ عام طور پر چونکہ اس عمر میں جنسی خواہش کا غلبہ ہو جاتا ہے اس لئے غُلْمَةٌ کا لفظ جنسی خواہش کی شدت پر بولا جاتا ہے۔ اور اِغْتَلَمَ الْفَحْلُ کے معنی ہیں سانڈ جنسی خواہش سے مغلوب ہوگیا۔

(غ ل و ی)

اَلْغُلُوُّ کے معنی کسی چیز کے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اگر یہ حد سے تجاوز اشیاء کے نرخ میں ہو تو اسے غَلَاءٌ (گرانی) کہا جاتا ہے اور قدر و منزلت میں ہو تو اسے غُلُوٌّ کہتے ہیں اور اگر تیر اپنی حد و رسے تجاوز کر جائے تو غُلُوٌّ مگر ان ہر سہ اشیاء کے متعلق فعل غَلَا يَغْلُوْ (ن) ہی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ (۴-۱۷۱) اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔
اور ہانڈی کے ابال اور جوش کھانے کو غَلْیٌ وَغَلَيَانٌ (باب ضرب) کہتے ہیں۔ اسی سے بطور استعارہ ارشاد ہے۔
طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۛ كَالْمُهْلِ ۛ يَغْلِىْ فِى الْبُطُوْنِ ۙ كَغَلْىِ الْحَمِيْمِ (۴۴-۴۵-۴۶) گنہگار کا کھانا ہے جیسے پگھلا ہوا تانبا پیٹوں میں اس طرح کھولیگا جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔
اور تشبیہ کے طور پر غصہ اور لڑائی کے بھڑک اٹھنے کو بھی غَلَيَان کہہ دیتے ہیں تَغَالَى النَّبْتُ (گھاس کا زیادہ ہونا اور بڑھ جانا) غَلْیٌ اور غُلُوٌّ یعنی واوی اور یائی دونوں سے آتا ہے اور غُلَوَاء کے معنی خودسری میں حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اور اسی سے بطور تشبیہ جوش جوانی کو غُلَوَاءُ الشَّبَابِ کہا جاتا ہے۔

(غ م م)

اَلْغَمُّ (ن) کے بنیادی معنی کسی چیز کو چھپا لینے کے ہیں اسی سے اَلْغُمّٰى ہے جس کے معنی غبار اور تاریکی کے ہیں۔ نیز اَلْغُمّٰى جنگ کی شدت کو کہتے ہیں جو قوم پر چھا جائے اس طرح بادل کو اَلْغَمَامُ کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانپ لیتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (۲-۲۱۰) کہ خدا کا عذاب بادلوں کے سائبانوں میں آنازل ہو۔ اسی سے غُمَّ الْهِلَالُ (چاند ابر کے نیچے آگیا اور دیکھا نہ جاسکا) وَيَوْمٌ غَمٌّ (سخت گرم دن) وَلَيْلَةٌ غَمَّةٌ وَغُمّٰى (تاریک اور سخت گرم رات) وغیرہا محاورات ہیں کسی شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)
(۳۲۹) لَيْلَةُ غُمّٰى طَامِسٌ هِلَالُهَا
تاریک رات جس کا چاند بے نور ہو۔

---

[1] قاله الراجز وتمامه۔ او غلتها وكثرة ايغالها راجع اللسان والصحاح (غم) واصلاح يعقوب ۲۸۱ ٭ ٭ ٭

اور غُمَّۃُ الْاَمْرِ کے معنی کسی معاملہ کا پیچیدہ اور مشتبہ ہونا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَیْكُمْ غُمَّةً (۱۰-۷۱) پھر تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ رہے۔

یعنی پھر وہ معاملہ تمہارے لئے قلق و اضطراب کا موجب نہ ہو اور غَمٌّ وَغُمَّۃٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حزن و کرب جیسے کَرْبٌ وَكُرْبَۃٌ اور غِمَامَۃٌ اس چیتھڑے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کی ناک اور آنکھوں پر باندھ دیا جاتا ہے (تاکہ کسی چیز کو دیکھ یا سونگھ نہ سکے) اور نَاصِیَۃٌ غَمَّاءُ پیشانی کے لمبے بال جو چہرے کو چھپا لیں۔

(غ م ر)

اَلْغَمْرُ (ض) کے اصل معنی کسی چیز کے اثر کو زائل کر دینے کے ہیں۔ اسی سے غَمْرٌ غَامِرٌ اس زیادہ پانی کو کہتے ہیں جس کا سیلاب ہر قسم کے اثرات کو (چھپا کر) زائل کر دے شاعر نے کہا ہے (المتقارب)

(۳۳۰) وَالْمَاءُ غَامِرُ خُدَّادِهَا

اور پانی اپنے گڑھوں کو چھپانے والا تھا۔

اسی مناسبت سے فیاض آدمی اور تیز رو گھوڑے کو بھی غَمْرٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ تشبیہ کے طور پر اسے بَحْرٌ کہہ دیا جاتا ہے اور غَمْرَۃٌ اس پانی کثیر کو کہتے ہیں جس کی اتھاہ نظر نہ آئے۔ اور یہ اس جہالت کے لئے ضرب المثل ہے جو آدمی پر چھا جاتی ہے اور قرآن نے فَاَغْشَیْنٰهُمْ وغیرہ الفاظ سے اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے قرآن میں ہے:۔

فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ (۲۳-۵۴) تو ان کو.... ان کی غفلت ہی میں رہنے دو۔

اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (۵۱-۱۱) جو بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں۔

اور غَمَرَات کے معنی شدائد کے ہیں (کیونکہ وہ بھی انسان پر ہجوم کر کے اسے بدحواس کر دیتے) ہیں فرمایا:۔

فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ (۶-۹۳) (جب) موت کی سختی میں۔

اور ناتجربہ کار آدمی کو بھی غَمْرٌ کہا جاتا ہے۔ وَالْجَمْعُ اَغْمَارٌ نیز غَمْرٌ کے معنی پوشیدہ کینہ کے بھی آتے ہیں۔ وَالْجَمْعُ غُمُوْرٌ اور غَمَرٌ کے معنی چربی کی بدبو کے آتے ہیں جو تمام چیزوں کی بو پر غالب آجاتی ہے غَمِرَتْ یَدُهٗ اس کا ہاتھ میلا ہو گیا غَمَرَ عِرْضُهٗ اس کی عزت پر بٹہ لگ گیا محاورہ ہے۔

دَخَلَ فِیْ غُمَارِ النَّاسِ وَخُمَارِهِمْ وہ لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو گیا۔

اَلْغُمْرَۃُ زعفران سے تیار کیا ہوا ملا جو چہرے پر ملتے ہیں تَغَمَّرْتُ بِالطِّیْبِ میں نے (اپنے چہرہ پر) زعفرانی خوشبو ملی اور پانی پینے کے چھوٹے پیالے کو غُمَرٌ کہا جاتا ہے اسی سے تَغَمَّرْتُ

لہ لم اجدہ بہذا اللفظ و فی مجالس ثعلب (۱: ۲۲۲) والاقتضاب ۳۲۴ والمعانی للقتبی ۲۴۴ : واللیل غامر جدادھا۔ کذا فی اللسان (جدد) والمعرب للجوالیقی ذکر وہذا البیت لاعشی یصف خمارا طرقہ لابتیاع الخمر فاو قد سراجا واللیل قد غرای ستر جداد الخبار ای الخیوط المعقدۃ او اسفلہا واولہ ... اضاء مظلمتہ بالسراج۔ و بعدہ: دواحسنا کلہا جیدۃ۔ فلا تحسبنہا بتنقادہا والقصیدہ فی دیوانہ (۷۵-۷۱) فاخشی ان یکون البیت مصحفا فی المطبوع ۞

ہے جس کے معنی تھوڑا سا پانی پینے کے ہیں اور کسی شخص کو مُغَامِرٌ اس وقت کہتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو لڑائی کی آگ میں جھونک دے اور یہ یا تو دشمن کی صفوں میں گھسنے کے لیے ہوتا ہے جیساکہ فُلَانٌ يَخُوضُ الْحَرْبَ کا محاورہ ہے اور یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے اور اس صورت میں اسے مُغَامِرٌ کہنا ایسے ہی ہے جیساکہ اناڑی آدمی کو ھَوْجٌ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

(غ م ز)

اَلْغَمْزُ (ض) کے اصل معنی کسی کی عیب جوئی کرتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ یا پلک سے اشارہ کرنے کے ہیں اور اسی سے مَافِيْ فُلَانٍ غَمِيْزَةٌ ہے ...... یعنی اس میں کوئی ایسا عیب نہیں ہے جس کی طرف اشارہ کیا جاسکے اور غَمِيْزَةٌ کی جمع غَمَائِزُ آتی ہے (اَلتَّغَامُزُ) باہم کسی کے عیوب کی طرف ہاتھوں یا آنکھوں سے اشارہ کرنا قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (۸۳-۳۰) اور جب ان کے پاس سے گزرتے ہیں تو حقارت سے اشارہ کرتے ہیں۔

اصل میں یہ غَمَزْتُ الْكَبْشَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مینڈھے کے بدن کو دبا کر دیکھنے کے ہیں کہ اس میں چربی ہے یا نہیں جس طرح کہ عَبَطْتُهٗ کا محاورہ ہے۔

(غ م ض)

اَلْغَمْضُ (ض) کے اصل معنی نیند کے جھونکا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ مَا ذُقْتُ غُمْضًا وَ لَا غِمَاضًا (یعنی چشم من یکدم نخفتہ) اسی مناسبت سے نرم اور نشیبی زمین کو غَامِضَةٌ وَغَمْضَةٌ کہا جاتا ہے اور دَارٌ غَامِضَةٌ اس سرائے کو کہتے ہیں جو شارع عام پر نہ ہو۔

غَمَضَ عَيْنَهٗ وَاَغْمَضَهَا کے معنی آنکھ کو بند کر لینے کے ہیں اور بطور استعارہ تغافل اور تساہل برتنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔

وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ (۲-۲۶۷) تو بجز اس کے کہ لیتے وقت آنکھیں بند کر لو ان کو کبھی نہ لو۔

(غ ن م)

اَلْغَنَمُ بکریاں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ (۶-۱۴۶) اور گایوں اور بکریوں سے ان کی چربی حرام کر دی تھی۔

اَلْغُنْمُ کے اصل معنی کہیں سے بکریوں کا ہاتھ لگنا۔ اور ان کو حاصل کرنے کے ہیں پھر یہ لفظ ہر اس چیز پر بولا جانے لگا ہے۔ جو دشمن یا غیر دشمن سے حاصل ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ (۸-۴۱) اور جان رکھو کہ جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (۸-۶۹) جو مال غنیمت تم کو ملا ہے اسے کھاؤ کہ تمہارے لئے حلال طیب ہے۔

اَلْمَغْنَمُ مال غنیمت اس کی جمع مَغَانِمُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ (۴-۹۴) سو خدا کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں۔

(غ ن ی)

اَلْغِنٰی (تونگری، بے نیازی) یہ کئی قسم پر ہے
۱۔ کلی طور پر بے نیاز ہو جانا اس قسم کی غناء سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں ہے چنانچہ آیت کریمہ:
وَاِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (۲۲-۶۴) اور بے شک خدا بے نیاز اور قابل ستائش ہے۔
اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (۳۵-۱۵)...... تم سب خدا کے محتاج ہو اور خدا بے پرواہ سزاوار حمد و ثنا ہے۔ میں بھی اللہ تعالٰے کے غنی ہونے سے یہی معنی مراد ہیں۔
۲۔ قدرے محتاج ہونا اور ما تیسر پر قانع رہنا چنانچہ آیت کریمہ:
وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (۹۳-۸) اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔
میں اَغْنٰی سے اس قسم کی غنا مراد ہے اور اس قسم کی غنا (یعنی قناعت) کے متعلق آنحضرت نے فرمایا (۲۷) اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ۔ کہ غنی درحقیقت قناعت نفس کا نام ہے اور غنٰی کے تیسرے معنی کثرت ذخائر کے ہیں اور لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے اس کے مختلف درجات ہیں جیسے فرمایا:
وَمَنْ کَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ (۴-۶) جو شخص آسودہ حال ہو اس کو ایسے مال سے قطعی طور پر پرہیز رکھنا چاہئیے۔
اَلَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ وَھُمْ اَغْنِیَآءُ (۹-۹۳) جو دولت مند ہیں اور پھر تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ (۳-۱۸۱) خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں۔ خدا فقیر ہے اور ہم امیر ہیں۔
یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:
مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (۲-۲۴۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے۔ نازل فرما کر ان سے صدقات و خیرات کا مطالبہ کیا اور آیت کریمہ:
یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (۲-۲۷۳) کہ نا مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ بظاہر قانع اور بے نیاز بنتے ہیں اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنے کی وجہ سے ناواقف لوگ انہیں تونگر خیال کرتے ہیں چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ کو حکم دیا: (۲۳)
خُذْ مِنْ اَغْنِیَآءِھِمْ وَرُدَّ فِیْ فُقَرَآءِھِمْ کہ ان کے اغنیاء سے صدقات وصول کر کے وہاں کے فقراء میں تقسیم کر دو اور حقیقت یہ ہے کہ نفس قانع نہ ہو تو مال و دولت کے باوجود بھی انسان فقیر ہی رہتا ہے (جیسا کہ شاعر نے کہا ہے) (
(۳۳۱) وَقَدْ یَکْثُرُ الْمَالُ وَالْاِنْسَانُ مُفْتَقِرٌ
اور کبھی مال کی فراوانی کے باوجود انسان محتاج ہی نظر آتا ہے۔
محاورہ ہے:۔
غَنِیْتُ بِکَذَا غِنْیَانًا وَغَنَاءً وَاسْتَغْنَیْتُ وَتَغَنَّیْتُ وَتَغَانَیْتُ مال دار یا بے نیاز ہونا۔ قرآن میں ہے:۔

۱؎ رواہ مسلم (۱/۳۷۰) والطبرانی عن ابی سعید الانصاری بسند و الترمذی من حدیث ابی ہریرۃ و قال حدیث حسن صحیح (مشکوٰۃ ص ۶۰ ج ۲) ۲؎ رواہ الشیخان والترمذی والنسائی من حدیث عبداللہ بن عباس فانظر الصحیح ص ۱۹۶ ج ۱ والترمذی ص ۸۰ ج ۱ و مسلم ص ۳۶ ج ۱ والنسائی ص ۲۵۵ ج ۱ ۳؎ انظر ایضًا فی المحاضرات للمؤلف (۲: ۱۲۱ ص) بغیر عزو ؎

وَاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (۶۴-۶)
اور خدا نے بھی بے پروائی کی اور خدا بے پرواہ (اور سزاوار) حمد (وثنا) ہے۔
اور اَغْنَانِي كَذَا اور اَغْنٰى عَنْهُ كَذَا کسی چیز کا کافی ہونا اور فائدہ بخشنا۔ قرآن میں ہے:۔
مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ (۶۹-۲۸) میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا۔
مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ (۱۱۱-۲) نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا.......
لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔ (۳-۹) نہ تو ان کا مال ہی خدا کے عذاب سے انہیں بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد ہی کچھ کام آئیگی
مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ (۲۶-۲۰۷) تو جو فائدے یہ اٹھاتے رہے ہیں ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔
لَا تُغْنِيْ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ (۳۶-۲۳) انکی سفارش مجھے کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے گی۔
وَلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (۷۷-۳۱) اور نہ لپٹ سے بچاؤ۔
اور اَلْغَانِيَةُ اس عورت کو کہا جاتا ہے جو اپنے خاوند کے سبب زینت سے بے نیاز ہو بعض نے کہا ہے کہ غَانِيَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے ذاتی حسن وجمال کی وجہ سے خارجی زیبائش و آرائش سے بے نیاز ہو۔ غَنِيَ فِيْ مَكَانِ كَذَا۔ کسی جگہ مدت دراز تک اقامت کرنا گویا وہ دوسری جگہوں سے بے نیاز ہے قرآن میں ہے:۔
كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (۷-۹۲) گویا وہ ان میں کبھی آباد ہی نہیں ہوئے تھے۔
اَلْمَغْنٰى یہ اسم مصدر اور ظرف مکان دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔
غَنٰى اُغْنِيَةً۔ وَغِنَاءً (تَغَنّٰى) گیت گانا۔[1]
بعض نے کہا ہے کہ کبھی (تَغَنّٰى) بمعنی اِسْتَغْنٰى بھی آجاتا ہے چنانچہ فرمان نبویؐ (۴۴) مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ (جو شخص قرآن کے ساتھ اکتفا نہ کرے) میں لَمْ يَتَغَنَّ بمعنی لَمْ يَسْتَغْنِ ہی ہے یعنی جو شخص قرآن کے ساتھ دوسروں سے بے نیاز نہ رہے۔

غ وث (غ ی ث)

اَلْغَوْثُ کے معنی مدد اور اَلْغَيْثُ کے معنی بارش کے ہیں اور اِسْتِغَاثَةٌ (استفعال) کے معنی کسی کو مدد کے لئے پکارنے یا اللہ تعالٰی سے بارش طلب کرنا آتے ہیں جب کہ اس کے معنی مدد طلب کرنا ہو تو اس کا مطاوع اَغَاثَنِيْ آئیگا مگر جب اس کے معنی بارش طلب کرنا ہو تو اس کا مطاوع غَاثَنِيْ آتا ہے اور غَوِّثْتُ میں نے اس کی مدد کی یہ بھی غَوْثٌ سے مشتق ہے جس کے معنی مدد ہیں قرآن میں ہے:۔
اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ (۸-۹) جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے۔

---

[1] واختار ذلك المعنى ابو عبيد القاسم بن سلام (راجع غريبه) والحديث من رواية عبدالله بن نهيك وفي معناه بحث راجع امالى المرتضى (۱: ۳۱-۳۶) وللتخريج للحديث انظر الكنز للمتقي رقم ۲۷۰۰ ثم في رقم ۲۷۹۸ وتخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم ۲۴۲ و الفتح الكبير للنبهاني ۳/۶۷ قال البيهقي في سننه الكبرى من كتاب الشهادات من الشافعي معناه القرءة تحزينا وليس معناه الاستغناء على ما قال الواقدي كرهه بعض الفقهاء التحدث لهذا الحديث كراهة ان يتناول بالحان مكروهة (راجع المحاضرات للمؤلف ۴/۳۷) ÷

فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ (۲۸-۱۵) تو جو شخص ان کی قوم میں سے تھا اس نے دوسرے شخص کے مقابلے میں جو موسیٰؑ کے دشمنوں میں سے تھا موسیٰؑ سے مدد طلب کی۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ (۱۸-۲۹) اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے کھولتے ہوئے پانی سے ان کی دادرسی کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح گرم ہوگا۔

میں یَسْتَغِیْثُوْا غَوْثٌ (مدد مانگنا) سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور غَیْثٌ (پانی مانگنا) سے بھی اسی طرح یُغَاثُوْا (فعل مجہول) کے بھی دونوں معنی ہو سکتے ہیں (پہلی صورت میں یہ اَغَاثَ یعنی (باب افعال) سے ہوگا دوسری صورت میں غَاثَ، یَغِیْثُ سے اور آیت کریمہ:۔

كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ (۵۷-۲۰) جیسے بارش کہ اس سے کھیتی اگتی اور کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔

میں غَیْثٌ کے معنی بارش ہیں چنانچہ کہ شاعر نے کہا ہے[1] (

(۳۳۲) سَمِعْتُ النَّاسَ یَنْتَجِعُوْنَ غَیْثًا
فَقُلْتُ لِصَیْدَحَ انْتَجِعِیْ بِلَالًا

میں نے سنا ہے کہ لوگ بارش کے مواضع تلاش کرتے ہیں تو میں نے اپنی اونٹنی صیدح سے کہا تم بلال کی تلاش کرو۔

(غ و ر)

اَلْغَوْرُ کے معنی نشیبی زمین کے ہیں محاورہ ہے غَارَ الرَّجُلُ وَاَغَارَ نشیبی زمین میں چلا جانا غَارَتْ عَیْنُهٗ غَوْرًا وَغُئُوْرًا آنکھ کا اندر دھنس جانا قرآن میں ہے:۔

مَآؤُكُمْ غَوْرًا (۶۷-۳۰) تمہارا پانی بہت زیادہ زمین کے نیچے اتر جائے۔

اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا (۱۸-۴۱) یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے۔

اَلْغَارُ کے معنی غار کے ہیں (ج اَغْوَارٌ وَغِیْرَانٌ) قرآن میں ہے:۔

اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ (۹-۴۰) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے۔

اور کنایہ کے طور پر فرج و بطن یعنی پیٹ اور شرمگاہ کو غَارَانِ (تثنیہ) کہا جاتا ہے اور مَغَارٌ کا لفظ غَوْرٌ کی طرح اسم مکان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (جمع مَغَارَاتٌ) قرآن میں ہے:۔

لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا (۹-۵۷) اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مغاک یا (زمین کے اندر) گھسنے کی جگہ مل جائے۔

اور غَارَتِ الشَّمْسُ غِیَارًا کے معنی سورج غروب ہو جانے کے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

(۳۳۳) هَلِ الدَّهْرُ اِلَّا لَیْلَةٌ وَنَهَارُهَا
وَاِلَّا طُلُوْعُ الشَّمْسِ ثُمَّ غِیَارُهَا

---

[1] قالہ ذوالرمۃ فی مدح بلال بن ابی بردۃ والصیدح اسم ناقتہ والبیت فی اللسان (غیث) والمحکم (صدح) والکامل ۲۹۷ وشواہد الکشاف ۸۸ الدرۃ للخفاجی ۲۳۵ وطرز المجالس ۸۵ وفی البیت شاہد ان فعل السمع متعدی الی مفعولین ویدخل علی المبتداء والخبر مثل علم وندی برفع الناس علی الحکایۃ ای مقول فیہم کذا وینصبہ علی المفعولیۃ والمبحث فی المطولات ونظیرہ وجدت الناس اخبر تقلہ بہا دالسکتۃ [2] البیت من مطلع قصیدۃ لابی ذؤیب الھذلی فی دیوانہ ۲۰ وانظر اللسان (غور) والاقتضاب ۷۸ ، ابن عقیل رقم ۱۶۸ ومجالس ثعلب ۵۸۳

(زمانہ (دن رات کی گردش اور سورج کے طلوع و غروب ہونے کا نام ہے)

غَوْرٌ کے معنی پست زمین میں چلے جانے کے ہیں وَاَغَارَ عَلَی الْعَدُوِّ اِغَارَۃً وَغَارَۃً کے معنی دشمن پر لوٹ مارنے کے قرآن میں ہے:۔

فَالْمُغِیْرَاتِ صُبْحًا (۱۰۰-۳) پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں۔

اور اس سے مراد گھوڑے ہیں (جو صبح کو دشمن پر چھاپہ مارتے ہیں)

(غ و ص)

اَلْغَوْصُ کے معنی پانی میں غوطہ لگا کر کوئی چیز نکال لانے کے ہیں اور جو شخص کسی پیچیدہ مسئلہ کی تہ تک پہنچ جائے یا نیچے کی تہ سے کوئی چیز نکال لائے اسے غَائِصٌ کہا جاتا ہے اسی سے غواص صیغہ مبالغہ ہے جس کے معنی غوطہ خور کے ہیں۔

وَالشَّیَاطِیْنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ (۳۸-۳۷) اور شیاطین کو بھی (ان کے زیر فرمان کیا) وہ سب عمارتیں بنانے والے اور غوطہ مارنے والے تھے۔

وَمِنَ الشَّیَاطِیْنِ مَنْ یَّغُوْصُوْنَ لَہٗ (۲۱-۸۲) اور شیاطین (کی جماعت) کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ ان میں سے بعض ان کے لئے غوطہ مارتے تھے۔

میں پانی کے اندر سے موتی نکالنے والے غوطہ خور ہی مراد نہیں ہیں بلکہ نادر کام کرنے والے اور عجیب وغریب صنعتیں ایجاد کرنے والے بھی ان میں داخل ہیں۔

(غ و ل)

اَلْغَوْلُ کسی کو اس طرح ہلاک کر دینا کہ اس کا پتہ بھی نہ چل سکے غَالَ یَغُوْلُ غَوْلًا وَاغْتَالَہٗ اِغْتِیَالًا اس نے اسے ہلاک کر دیا اسی سے سِعْلَاۃٌ (چڑیل) کو غُوْلٌ کہا جاتا ہے (غَوْلٌ) دردسر سے مستی (قرآن نے جنت کی شراب کی صفت بیان کرتے ہوئے لَا فِیْھَا غَوْلٌ (۳۷-۴۷) نہ اس سے دردسر ہو گا۔

کہہ کر اس سے ہر اس عیب کی نفی کر دی ہے جس کی طرف آیت:۔

وَاِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا (۲-۲۱۹) (ان میں نقصان بڑے ہیں۔ اور آیت:۔

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْہُ (۵-۹۰) ناپاک اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا۔

میں اشارہ فرمایا ہے۔

(غ و ی)

اَلْغَیُّ۔ اس جہالت کو کہتے ہیں جو غلط اعتقاد پر مبنی ہو۔ کیونکہ جہالت کبھی تو کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے اور کبھی عقیدہ کو اس میں داخل نہیں ہوتا پہلی قسم کی جہالت کا نام غَیٌّ (گمراہی) ہے قرآن میں ہے:

مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی (۵۳-۲) کہ تمہارے رفیق (محمدؐ) نہ رستہ بھولے ہیں اور نہ بھٹکے ہیں۔

وَاِخْوَانُھُمْ یَمُدُّوْنَھُمْ فِی الْغَیِّ (۷-۲۰۲) اور ان (کفار) کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (۱۹-۵۹) سو عنقریب ان کو گمراہی (کی سزا) ملے گی۔

میں غَیٌّ سے عذاب مراد ہے اور عذاب کو غَیٌّ اس لئے کہا ہے کہ گمراہی عذاب کا سبب بنتی ہے لہٰذا

عذاب کو غَیٌّ کہنا مجازی ہے یعنی کسی شے کو اس کے سبب نام سے موسوم کر دینا جیسا کہ نبات کو نَدیٰ (طراوت) کہہ دیتے ہیں بعض نے آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ یہ لوگ عنقریب ہی اپنی گمراہی کا نتیجہ اور ثمرہ پالیں گے مگر مآل کے لحاظ سے دونوں معنی ایک ہی ہیں (غَاوٍ) بھٹک جانے والا گمراہ جمع غَاوُوْنَ وَغَاوِیْنَ جیسے فرمایا :۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغَاوِيْنَ (۲۶-۹۱) اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائی گی۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ (۲۶-۲۲۴) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

(اَلْغَوِیُّ) گمراہ غلط رو۔ جیسے فرمایا :۔

اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ (۲۸-۱۸) کہ تو تو صریح گمراہ ہے۔

اور آیت کریمہ :۔

وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (۲۰-۱۲۱) اور آدم نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا (تو وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہوگئے۔

میں غَوٰی کے معنی یہ ہیں کہ آدم نے جہالت کا ارتکاب کیا اور بعض نے اس کے معنی خَابَ کئے ہیں یعنی انہوں نے سراسر نقصان اٹھایا۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۳۴) وَمَنْ يَغْوِ لَا يَعْدَمْ عَلَى الْغَيِّ لَائِمًا

اور اگر ناکام ہو جائے تو ناکامی پر بھی ملامت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

بعض نے غَوَیٰ کے معنی فَسَدَ عَيْشُهٗ کئے ہیں یعنی اس کی زندگی تباہ ہوگئی اور یہ غَوِیَ الْفَصِيْلُ وَغَوٰی جیسے هَوِیَ وَهَوٰی۔ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا جس سے اسے بدہضمی ہوگئی" اور آیت کریمہ :۔

اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ (۱۱-۳۴) اور اگر خدا یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے۔

میں يُغْوِيَكُمْ سے مراد گمراہی کی سزا دینے کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی گمراہی کا حکم لگانا بھی کئے ہیں۔ اور آیت کریمہ :۔

قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰۤؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّاْنَاۤ اِلَيْكَ (۲۸-۶۳) (تو جن لوگوں پر) عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہوگا وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا اور جس طرح ہم خود گمراہ تھے اسی طرح انہیں گمراہ کیا تھا۔

میں بتایا گیا ہے کہ کفار قیامت کے دن اعلان کریں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ انتہائی مخلصانہ سلوک کیا تھا جو کہ ایک انسان اپنے دوست سے کر سکتا ہے کیونکہ انسان کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دوست کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو وہ کہیں گے

---

[1] فی المعجم للمرزبانی ۵ :۔ البیت للمرقش الاصغر (ربیعہ بن سلیمان بن سعد بن مالک) وھو ابن اخی المرقش الاکبر وعم طرفۃ بن العبد واولہ : فمن یلق خیرًا یحمد الناس امرہ ۔۔۔۔ انظر اللسان (غوی) والمفضلیات ۱۸۹ والبیت من شواہد الطبری (۱۶: ۱۰۱) والخزانۃ (۱: ۱۶۴) والاغانی (۵: ۱۸۵) والشعر والشعراء ۱۰۷ والحماسۃ للبحتری ۲۳۶ والمرزبانی ۱۰۲ وشعراء الجاہلیۃ ۳۴۹ والانصاف ۱۱۸ والمرتضی (۱: ۳۶۱، ۲: ۶۴) والبحر (۱: ۲۰۱، ۲: ۳۶۶) واصلاح لیعقوب ۳۰۲ وقبلہ :۔ امن حلم اصبحت تنکث واجما ۔ وقد تعتری الاحلام من کان نائما ۔ البیت ایضًا فی الحصری (۳: ۱۱) والعقد الفرید (۲: ۱۸۶) والسیوطی ۱۵۹ والفائق (۲: ۱۰۱) ÷ ÷ ÷ ÷

کہ ہم نے انہیں اپنی طرف سے فائدہ پہنچایا اور انہیں اپنے جیسا سمجھا تھا اور یہی معنی آیت :۔
فَاَغْوَیْنٰکُمْ اِنَّا کُنَّا غٰوِیْنَ (۳۷-۳۲) ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا اور ہم خود بھی گمراہ تھے۔ کے ہیں۔
فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّھُمْ .... (۱۵-۳۹) جیسا کہ تم نے مجھے رستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لئے (گناہوں کو) آراستہ کر دکھاؤں گا اور ان کو بہکاؤں گا۔

(غ ی ب)

اَلْغَیْبُ (ض) غَابَتِ الشَّمْسُ وَغَیْرُھَا کا مصدر ہے جس کے معنی کسی چیز کے نگاہوں سے اوجھل ہوجانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
غَابَ عَنِّیْ کَذَا فلاں چیز میری نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔ قرآن میں ہے۔
اَمْ کَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ (۲۷-۲۰) کیا کہیں غائب ہوگیا ہے۔
اور ہر وہ چیز جو انسان کے علم اور حواس سے پوشیدہ ہو اس پر غیب کا لفظ بولا جاتا ہے یعنی غیب بمعنی غائب ہے قرآن میں ہے :۔
وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۲۷-۷۵) اور آسمانوں اور زمین میں کوئی پوشیدہ چیز نہیں ہے مگر (وہ) کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔
اور کسی چیز کو غَیْبٌ یا غَآئِبٌ لوگوں کے لحاظ سے کہا جاتا ہے ورنہ باری تعالیٰ سے تو کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے جیسے فرمایا :۔

لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ (۳۴-۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔
لہٰذا آیت کریمہ :۔
عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ (۶-۷۳) وہی پوشیدہ اور ظاہر (سب) کا جاننے والا ہے۔
میں اَلْغَیْبُ وَالشَّھَادَةُ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو انسان کے علم و حواس سے پوشیدہ ہیں اور جو اس کے سامنے موجود ہیں اور آیت کریمہ :۔
یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۲-۳) غیب پر ایمان لاتے ہیں۔
میں الغیب سے وہ تمام اشیاء اور حقائق مراد ہیں جو انسانی حواس سے ماوراء ہیں اور بداہت عقل سے ان کا علم نہیں ہوسکتا بلکہ انبیاء علیہ السلام کے خبر دینے سے ہی ان کا علم ہوتا ہے اور انہیں نہ ماننے کی وجہ سے انسان ملحد ہوجاتا ہے[1] اور جن لوگوں نے غیب سے قرآن یا القدر مراد لی ہے تو انہوں نے اس کے جزوی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعض نے یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے معنی یہ کئے ہیں کہ تم سے غائب ہونے کی حالت میں بھی وہ ایمان لاتے ہیں[2] یعنی وہ ان منافقوں کی طرح نہیں ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ
وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ (۲-۱۴) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم (پیروان محمد سے) تو ہنسی کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیات :۔

---

[1] وہو قول جمہور المفسرین کما فی الروح [2] وہو اختیار ابی مسلم الاصفہانی فعل ہنا قولہ بالغیب (صفۃ المؤمنین) دراجع الفخر ۲ / ۲۷

اَلَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ (۲۵-۱۸) جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ..... ہیں۔
مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ (۵۰-۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔
وغیرہا میں بھی غیب کے معنی خلوت اور تنہائی کے ہیں۔
وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۶-۷۷) اور آسمانوں اور زمین کا علم خدا ہی کو ہے۔
اَطَّلَعَ الْغَیْبَ (۱۹-۷۸) کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے۔
فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا (۷۲-۲۶) اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا۔
لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ (۲۷-۶۵) کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے۔
تِلْکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ (۱۱-۴۹) یہ (حالات) منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں۔
وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ (۳-۱۷۹) اور اللہ تم کو غیب کی باتوں سے مطلع نہیں کرے گا۔
اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۵-۱۱۶) بیشک تو علام الغیوب ہے۔
اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۳۴-۴۸) میرا پروردگار اوپر سے حق اتارتا ہے (اور وہ) غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔
اَغَابَتِ الْمَرْءَۃُ وہ عورت جس کا خاوند اس کے پاس موجود نہ ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ (۴-۳۴) اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خاوندوں کی عدم موجودگی میں وہ کام نہیں کرتیں جسے وہ برا سمجھتے ہوں۔
اَلْغِیْبَۃُ کے معنی کسی انسان کی عدم موجودگی میں اس کے اس عیب کو بیان کرنے کے ہیں جو اس میں موجود تو ہو لیکن اس کا ذکر کرنا اس پر ناگوار گزرے قرآن میں ہے:۔
وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (۴۹-۱۲) اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔
اَلْغَیَابَۃُ کے معنی نشیبی زمین کے ہیں اور اسی سے گھنے جنگل کو غَابَۃٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ (۱۲-۱۰) کسی کنوئیں کی گہرائی میں ......۔ ایک محاورہ ہے:۔
ھُمْ یَشْھَدُوْنَ اَحْیَانًا وَیَتَغَایَبُوْنَ اَحْیَانًا کہ وہ کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی چھپ جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَیَقْذِفُوْنَ بِالْغَیْبِ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ کے معنی یہ ہیں کہ ....
(وہ یونہی اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں اور) نگاہ وبصیرت سے اس کا ادراک نہیں کرتے۔[1]

(غ ی ر)

غَیْرٌ۔ کا لفظ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ (۱) محض نفی کے لئے یعنی اس سے کسی دوسرے معنی کا اثبات مقصود نہیں ہوتا جیسے مَرَرْتُ بِرَجُلٍ غَیْرِ قَائِمٍ یعنی میں ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو کھڑا نہیں تھا۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوٰہُ بِغَیْرِ ھُدًی

[1] راجع للغیث (غوث)

مِّنَ اللّٰہِ (۲۸-۵۰) اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ (۴۳-۱۸) اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔

۲ یعنی اِلَّا جو مستثنیٰ کے لئے آتا ہے۔ اس صورت میں یہ نکرہ کی صفت بن سکتا ہے۔ جیسے مَرَرْتُ بِقَوْمٍ غَيْرِ زَيْدٍ یعنی میں زید کے علاوہ دوسری قوم کے پاس سے گزرا۔ قرآن میں ہے:۔

مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرِي (۲۸-۳۸) میں تمہارا اپنے سوا کسی کو خدا نہیں جانتا۔

مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ (۷-۶۵) اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (۳۵-۳) کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق (اور رازق) ہے۔

۳ کسی چیز سے صرف اس کی صورت یعنی صفت کی نفی کرنے کے لئے آتا ہے۔ جیسے اَلْمَاءُ إِذَا كَانَ حَارًّا غَيْرُهُ إِذَا كَانَ بَارِدًا۔ کہ پانی گرم ہونے کی حالت میں ٹھنڈے کا غیر ہوتا ہے قرآن میں ہے۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا (۴-۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو اور کھالیں بدل دیں گے۔

۴ یہ کہ وہ نفی ذات کو بھی شامل ہو۔ جیسے فرمایا:۔

الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ (۶-۹۳) آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لئے کہ تم خدا پر جھوٹ بولا کرتے تھے۔ یعنی باطل بہتان بندیاں کرتے تھے۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۲۸-۳۹) اور وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق مغرور ہو رہے تھے۔

أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِي رَبًّا (۶-۱۶۴) کیا میں خدا کے سوا اور پروردگار تلاش کروں۔

وَيَسْتَبْدِلْ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۹-۳۹، ۴۷-۳۸) اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا۔

ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هٰذَا (یا تو) اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ (۱۰-۱۵)

اور تَغْيِيرٌ کا لفظ بھی دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک صرف کسی چیز کی صورت کو بدلنا جیسے غَيَّرْتُ دَارِي یعنی میں نے اپنے گھر کی شکل و صورت بدل دی۔ دوم کسی دوسری چیز سے تبدیل کر لینا جیسے غَيَّرْتُ غُلَامِي وَدَابَّتِي یعنی میں نے اپنا غلام یا جانور دوسرے سے تبدیل کر لیا۔ قرآن میں ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۱۳-۱۱) خدا اس نعمت کو جو کسی قوم کو حاصل ہے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلیں۔

اور لفظ غَيْرٌ اور مُخْتَلِفٌ میں معنوی لحاظ سے فرق یہ ہے کہ غیر کا مفہوم لفظ مختلف سے زیادہ عام ہے کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز دوسری کی غیر ہے تو ان دونوں چیزوں کا بلحاظ جوہر کے مختلف ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ تغایر فی الوصف کی صورت میں ایک کو دوسری کا غیر کہا جا سکتا ہے مگر ایک چیز کو دوسری سے مختلف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب کہ ان دونوں میں تغایر بلحاظ جوہر کے پایا جائے۔ پس اس سے

لے کذا لاٰیۃ فی الاصل وانما ہو نسخۃ من المصحح دون لفظ بلی انما جاء فی (۱۰-۱۵) لکن منا کیستخلفہ ولا یستبدل ۱۲

واضح ہوتا ہے کہ ہر جگہ مختلفین کو متغائرین تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر موقعہ پر متغایرین کو مختلفین نہیں کہہ سکتے۔

(غ ی ض)

غَاضَ (ض) اَلشَّیْءُ غَیْضًا وَغَاضَهٗ غَیْرُهٗ

یہ نَقَصَ کی طرح لازم ومتعدی دونوں طرح آتا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی کسی چیز کو کم کرنے یا اس کے از خود کم ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَغِیْضَ الْمَآءُ (۱۱-۴۴) تو پانی خشک ہو گیا۔

وَمَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ (۱۳-۸) اور پیٹ کے سکڑنے۔ یعنی وہ نطفہ جسے بگاڑ کر رحم اس پانی کی طرح ضائع کر دیتے ہیں جسے زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے (اور وہ پینے کے کام نہیں آتا)

اَلْغَیْضَةُ وہ جگہ جہاں پانی ٹھہرے اور زمین اسے اپنے اندر جذب کر لے لَیْلَةٌ غَائِضَةٌ تاریک رات۔

(غ ی ظ)

اَلْغَیْظُ کے معنی سخت غصہ کے ہیں۔ یعنی وہ حرارت جو انسان اپنے دل کے دوران خون کے تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ (۳-۱۱۹) کہہ دو کہ (بدبختو) غصے میں مر جاؤ۔ غَاظَهٗ (کسی کو غصہ دلانا)

لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ (۴۸-۲۹) تاکہ کافروں کی جی جلائے۔

اور اللہ تعالیٰ نے سخت غصہ کے وقت نفس کو روکنے کا حکم دیا ہے اور جو لوگ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں ان کی تحسین فرمائی ہے چنانچہ فرمایا:۔ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (۳-۱۳۴) اور غصے کو روکتے۔

اور اگر غیظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے انتقام لینا مراد ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ (۲۶-۵۵) اور یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں۔

یعنی وہ اپنی مخالفانہ حرکتوں سے ہمیں انتقام پر آمادہ کر رہے ہیں اور تَغَیُّظٌ کے معنی اظہار غیظ کے ہیں جو کبھی ایسی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو سنائی دے جیسے فرمایا:۔ سَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّزَفِیْرًا (۲۵-۱۲) تو اس کے جوش غضب اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔

کتاب الفاء

(ف ء د)

اَلْفُؤَادُ کے معنی قلب یعنی دل کے ہیں مگر قلب کو فؤاد کہنا معنی تفؤد یعنی روشن ہونے کے لحاظ سے ہے محاورہ ہے فَادْتُ اللَّحْمَ گوشت کو آگ پر بھون لینا لحمٌ فَئِیْدٌ آگ میں بھنا ہوا گوشت۔ قرآن میں ہے:۔

مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی (۵۳-۱۱) جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ (۱۷-۳۶) کہ کان اور آنکھ اور دل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

فُؤَادٌ کی جمع اَفْئِدَۃٌ ہے قرآن میں ہے:۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ (۱۴-۳۷) لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف جھکے رہیں۔

وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔

وَاَفْئِدَتُھُمْ ھَوَاءٌ (۱۴-۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔

نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴-۶-۷) وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر جا لپٹیگی۔

اَفْئِدَۃ کی تخصیص سے اس کی شدت تاثیر پر تنبیہ کی ہے جس کی وضاحت اس کے بعد علوم قرآن پر کتابوں میں سے کسی کتاب میں بیان کی جائے گی۔

(ف ت ء)

مَا فَتَاَتُ وَمَا فَتِئْتُ افعل کذا (بمعنی مَا زِلْتُ) میں اس کام کو برابر کرتا رہا۔ قرآن میں ہے:۔

تَفْتَؤُا تَذْکُرُ یُوْسُفَ (۱۲-۸۵) آپ یوسف کو اسی طرح یاد کرتے ہی رہو گے۔

(ف ت ح)

اَلْفَتْحُ کے معنی کسی چیز سے بندش اور پیچیدگی کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ ازالہ دو قسم پر ہے ایک وہ جس کا آنکھ سے ادراک ہو سکے جیسے۔ فَتَحَ الْبَابَ (دروازہ کھولنا) اور فَتَحَ الْقُفْلَ (قفل کھولنا) اور فَتَحَ الْمَتَاعَ (اسباب کھولنا قرآن میں ہے:۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَھُمْ (۱۲-۶۵) اور جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ (۱۵-۱۴) اور اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ ان پر کھولتے۔

دوم جس کا ادراک بصیرت سے ہو جیسے:۔

فَتْحُ الْهَمِّ (یعنی ازالۂ غم) اس کی چند قسمیں ہیں
(۱) وہ جس کا تعلق دنیوی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے جیسے مال وغیرہ دے کر غم واندوہ اور فقر واحتیاج کو زائل کر دینا۔ جیسے فرمایا:۔
فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (۶-۴۴) پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔
یعنی ہر چیز کی فراوانی کر دی۔ نیز فرمایا:۔
لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷-۹۶) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔
یعنی انہیں ہر طرح سے آسودگی اور فارغ البالی کی نعمت سے نوازتے۔ (۲) علوم ومعارف کے دروازے کھولنا جیسے محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ فَتَحَ مِنَ الْعِلْمِ بَابًا مُّغْلَقًا فلاں نے علم کا بند دروازہ کھول دیا۔ یعنی شبہات کو زائل کر کے ان کی وضاحت کر دی۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸-۱) (اے محمدؐ) ہم نے تم کو فتح دی اور فتح بھی صریح وصاف۔
میں بعض نے کہا ہے یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ اس سے علوم ومعارف اور ان ہدایات کے دروازے کھولنا مراد ہے جو کہ ثواب اور مقامات محمودہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور آنحضرتؐ کیلئے غفران ذنوب کا سبب بنے۔
اَلْفَاتِحَةُ ہر چیز کے مبدء کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ اس کے مابعد کو شروع کیا جائے اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کو فَاتِحَةُ الْكِتَابِ کہا جاتا ہے۔ اِفْتَتَحَ فُلَانٌ كَذَا فلاں نے یہ کام شروع کیا فَتَحَ عَلَيْهِ كَذَا کسی کو کوئی بات بتانا اور اس پر اسے ظاہر کر دینا قرآن میں ہے:۔
اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ (۲-۷۶) جو بات خدا نے تم پر ظاہر فرمائی ہے وہ تم ان کو۔۔۔ بتائے دیتے ہو۔
مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ (۳۵-۲) جو لوگوں کیلئے ۔۔۔کھول دے۔
فَتَحَ الْقَضِيَّةَ فِتَاحًا یعنی اس نے معاملے کا فیصلہ کر دیا اور اس سے مشکل اور پیچیدگی کو دور کر دیا قرآن میں ہے:۔
رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ (۷-۸۹) اے ہمارے پروردگار ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
اسی سے اَلْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ (۳۴-۲۶) ہے یعنی خوب فیصلہ کرنے والا اور جاننے والا یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے ہے کسی شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۳۳۵) وَاِنِّيْ مِنْ فِتَاحَتِكُمْ غَنِيٌّ

اور میں تمہارے فیصلہ سے بے نیاز ہوں۔

---

[1] وہذا ہو المناسب لقولہ تعالیٰ بعد ولیغفرلک الله الآیۃ ملہ والصحیح بانی بدل وانی وادلہ:۔ الا ابلغ بنی عصم رسولا ۔۔۔ وفی روایۃ بنی عمرو بدل بنی عصم وفی روایۃ المحکم (فتح) صدرہ:۔ الا من مبلغ عمرًا رسولاً۔ وفی الاساس:۔ الا ابلغ بنی وہب رسولا۔ وفی روایۃ اللسان غنی بدل غنی وفی روایۃ القالی فانی عن بدل وانی من "والبیت کما تری اختلافا فی روایتہا ایضا کما اختلف فی عزوہ فنسبہ صاحب اللسان الی الاسعر الجعفی وفی زیادات الجمہرۃ (۱: ۲) منسوب لاعشی تمیم لکن الاعشی مصحف من الاسعر ونسبہ ابن السیرافی الی شویعر الجعفی وفی الحماسۃ الصغری لابی تمام ۲ / ۴: ان البیت لمحمد بن حمران ابی حمران وابو حمران اسمہ مرثد بن حمران ولعل محمد مصحف والبیت فی اصلاح المنطق ۱۲ وتہذیبہ (۱: ۸۸) والبصر (۴: ۴۳) وذیل مجازات القرآن للشریف الرضی والطبری (۹: ۲) والسمط ۹۲۷ والقرطبی (۱۳: ۴۹) واللسان والتاج (فتح، فتا) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۲۲۰، ۲ / ۸۷) وشواہد الکشاف ۵ وفی روایتہ: الا ابلغ بنی حمران انی عن عواذکم غنی فی ۹ ابیات راجع السمط ؛

بعض کے نزدیک فُتَاحَۃٌ فا کے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ صحیح ہے[1] اور آیت کریمہ:

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰-۱) جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح حاصل ہوگئی۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلْفَتْحُ سے نصرت، کامیابی اور حکم مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ علوم ومعارف کے دروازے کھول دینا مراد ہو۔ اسی معنی میں فرمایا:

نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ (۶۱-۱۳) (یعنی تمہیں خدا کی طرف سے مدد (نصیب ہوگی) اور فتح عنقریب (ہوگی)

فَعَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ (۵-۵۲) تو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْفَتْحُ (۳۲-۲۸) اور کہتے ہیں ..... یہ فیصلہ کب ہوگا۔

قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ (۳۲-۲۹) کہدو کہ فیصلے کے دن ......

یعنی حکم اور فیصلے کے دن بعض نے کہا ہے کہ اَلْفَتْحُ سے قیامت بپا کرکے ان کے شک وشبہہ کو زائل کرنے کا دن مراد ہے اور بعض نے یوم عذاب مراد لیا ہے۔ جسے وہ طلب کیا کرتے تھے۔

اَلْاِسْتِفْتَاحُ کے معنی غلبہ یا فیصلہ طلب کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

وَاِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَاءَکُمُ الْفَتْحُ (۸-۱۹) (کافرو) اگر تم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) فتح چاہتے ہو تو تمہارے پاس فتح آچکی۔

یعنی اگر تم کامیابی یا فیصلہ طلب کرتے ہو تو وہ آچکا ہے اور یا یہ معنی ہیں کہ اگر تم مبدء خیرات طلب کرتے ہو تو آنحضرت کی بعثت سے تمہیں مل چکا ہے اور آیت کریمہ:

وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۲-۸۹) اور وہ پہلے ہمیشہ کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔

میں یَسْتَفْتِحُوْنَ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) آنحضرت کی بعثت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے فتح طلب کرتے تھے (۲) وہ آنحضرت کی بعثت کے متعلق کبھی لوگوں سے دریافت کرتے تھے اور کبھی کتب سماویہ سے اس پر استدلال کرتے تھے (۳) وہ آنحضرت کے ذکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے تھے (۴) وہ کہا کرتے تھے کہ آنحضرت کے ذریعہ ہمیں بت پرستوں پر غلبہ حاصل ہوگا۔

اَلْمِفْتَحُ وَالْمِفْتَاحُ (کنجی) وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو کھولا جائے اس کی جمع مَفَاتِحُ ومَفَاتِیْحُ آتی ہے اور آیت وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ (۶-۵۹) اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔

میں مَفَاتِحُ سے وہ وسائل مراد ہیں جن کے ذریعہ اس غیب تک رسائی ہوتی ہے جس کا ذکر آیت فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (۷۲-۲۶) اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔

میں ہے اور آیت کریمہ:

مَا اِنَّ مَفَاتِحَہٗ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَۃِ اُولِی الْقُوَّۃِ (۲۸-۷۶) اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں

---

[1] والصحیح بالضمۃ والکسرۃ فانہ فی اصلاح یعقوب ۱۲: فی باب الفعالۃ والفِعَالۃ

ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتی ہیں۔
یں مَفَاتِحُہٗ سے بعض کے نزدیک خزانوں کی چابیاں مراد ہیں اور بعض نے خزانے ہی مراد لئے ہیں۔
عام طور پر بَابٌ فَتْحٌ کے معنی مَفْتُوحٌ کے آتے ہیں اور یہ غَلَقٌ کی ضد ہے۔ ایک روایت میں ہے۔
مَنْ وَجَدَ بَابًا غَلَقًا وَجَدَ اِلٰی جَنْبِہٖ بَابًا فَتْحًا۔ کہ جس سے ایک دروازہ بند ہو جائے تو اس کے لئے دوسرا دروازہ کھلا ہے اور بعض کے نزدیک فَتْحٌ بمعنی وَاسِعٌ ہے۔

(ف ت ر)

اَلْفُتُوْرُ کے معنی تیزی کے بعد ٹھہرنے سختی کے بعد نرم اور قوت کے بعد کمزور پڑجانا کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
یَا اَھْلَ الْکِتَابِ قَدْ جَاءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ (۵-۱۹) اے اہل کتاب پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ جو ایک عرصے تک منقطع رہا تو اب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر آگئے ہیں۔
یعنی سلسلۂ رسالت کے منقطع اور ماند پڑجانے کے بعد آنحضرت تشریف لے آئے ہیں آیت کریمہ:۔
لَا یَفْتُرُوْنَ (۲۱-۲۰) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور کبھی سست نہیں پڑتے اور ایک روایت میں ہے (
اِنَّ لِکُلِّ عَالِمٍ شِرَّۃً وَلِکُلِّ شِرَّۃٍ فَتْرَۃً فَمَنْ فَتَرَ اِلٰی سُنَّتِیْ فَقَدْ نَجَا وَاِلَّا فَقَدْ ھَلَکَ کہ ہر عالم میں تیزی ہوتی ہے اور ہر تیزی کے بعد فترۃ یعنی سکون ہوتا ہے تو جو شخص میری سنت سے سکون حاصل کریگا وہ نجات یافتہ ہے ورنہ وہ ہلاک ہوگا پس لِکُلِّ شِرَّۃٍ فَتْرَۃً میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باطن میں پہلے پہل تو جوش ہوتا ہے مگر جلد ہی مضمحل ہو جاتا ہے اور حق کی سلطنت کبھی ذلیل یا کمزور نہیں ہوتی۔ اور مَنْ فَتَرَ اِلٰی سُنَّتِیْ کے معنی سنت نبوی کی پناہ میں سکون حاصل کرنے کے ہیں۔
اَلطَّرْفُ الْفَاتِرُ نگاہ مست اور یہ اچھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔
اَلْفِتْرُ انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان کا فاصلہ اور شَبَرْتُہٗ بِشِبْرِیْ کی طرح فَتَرْتُہٗ بِفِتْرِیْ کا محاورہ ہے جس کے معنی انگوٹھا اور انگشت شہادت کے ساتھ کسی چیز کو ناپنے کے ہیں۔

(ف ت ق)

اَلْفَتْقُ (ض) کے معنی دو متصل چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں اور یہ رَتْقٌ کی ضد ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا (۲۱-۳۰)
آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا۔
اَلْفَتْقُ وَالْفَتِیْقُ صبح کو کہتے ہیں کیونکہ وہ تاریکی سے نمودار ہوتی ہے۔
اَفْتَقَ الْقَمَرُ چاند کا بادل سے ظاہر ہونا۔
نَصْلٌ فَتِیْقُ الشَّفْرَتَیْنِ بھالا جس کی دو شاخیں ہوں گویا ایک کو دوسری سے پھاڑ کر بنایا گیا ہے۔
جَمَلٌ فَتِیْقٌ اونٹ جس کا چمڑا موٹاپے کی وجہ سے پھٹ گیا ہو اور یہ فَتِقَ (س لازم) فَتْقًا سے ہے۔

(ف ت ل)

فَتَلْتُ الْحَبْلَ فَتْلًا کے معنی رسی کو بل دینے کے ہیں اور بٹی ہوئی رسی کو مَفْتُوْلٌ کہا جاتا ہے۔ اور کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں جو باریک سا ڈورا ہوتا ہے اسے بھی فَتِیْلٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رسی کی شکل وصورت پر ہوتا ہے (عربی زبان میں یہ حقیر شے کے لئے ضرب المثل ہے جیسے فرمایا:۔

وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (۴-۴۹) اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

فَتِیْلٌ اصل میں اس تاگے یا میل کو کہتے ہیں جو دو انگلیوں میں پکڑ کر بٹی جاتی ہے اور یہ حقیر چیز کے لئے ضرب المثل ہے۔

نَاقَةٌ فَتْلَاءُ الذِّرَاعَیْنِ مضبوط بازوؤں والی اونٹنی

(ف ت ن)

اَلْفَتْنُ[1] دراصل فَتَنَ کے معنی سونے کو آگ میں گلانے کے ہیں تاکہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے اس لحاظ سے کسی انسان کو آگ میں ڈالنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ یُفْتَنُوْنَ (۵۱-۱۳) جب ان کو آگ میں عذاب دیا جائے گا۔ اور اس کا اطلاق نفس عذاب پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ (۵۱-۱۴) اپنی شرارت کا مزہ چکھو۔ یعنی عذاب کا مزہ چکھو۔ جیسے آیت کریمہ:۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ (۴-۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے تاکہ (ہمیشہ) عذاب کا مزہ) چکھتے رہیں۔

میں لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ سے تعبیر فرمایا ہے اور آیت اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا (۴۰-۴۶) یعنی آتش جہنم پر پیش کئے جاتے ہیں۔

میں اسی عذاب کو عرض علی النار کہا ہے۔

اور کبھی فتنہ کا لفظ اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو عذاب کا باعث بنتی ہو جیسے فرمایا:۔

اَلَا فِی الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا (۹-۴۹) دیکھو! یہ آفت میں پڑ گئے ہیں۔

اور کبھی اس کے معنی امتحان اور آزمائش کرنے کے آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (۲۰-۴۰) اور ہم نے تمہاری کئی بار آزمائش کی۔

اور بلا کی طرح فتنہ کا لفظ بھی تکلیف اور آسائش دونوں قسم کی حالت پر بولا جاتا ہے۔ جن میں انسان کو مبتلا کرکے اس کی آزمائش کی جاتی ہے اور اس کے صبر وشکر کا امتحان کیا جاتا ہے۔ لیکن شدت کے معنی میں اس کا استعمال زیادہ ظاہر اور اکثر ہی ہے چنانچہ قرآن نے دونوں قسم کے فتنہ کے متعلق فرمایا ہے۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً (۲۱-۳۵) اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

اور تکلیف کے متعلق فرمایا:۔

اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ (۲-۱۰۲) ہم تو ذریعہ آزمائش ہیں۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲-۱۹۱) اور دین سے گمراہ کرنے کا فساد قتل وخون ریزی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

---

[1] انظر للفظ الفتنة ومعانيها المختلفة في القرآن الفتح الباري (۱۶/۱۱۸)

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (۲-۱۹۳) اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو حتی کہ فساد نابود ہو جائے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا (۹-۴۹) اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے تو اجازت ہی دیجئے اور آفت میں نہ ڈالئے دیکھو یہ آفت میں پڑگئے ہیں۔

یعنی مجھے بلا اور تکلیف میں نہ ڈالئے حالانکہ وہ یہی بات کہنے کی وجہ سے مصیبت اور عذاب میں گرفتار ہو رہے ہیں۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ (۱۰-۸۳) تو موسیٰ پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم میں سے چند لڑکے اور وہ بھی فرعون اور اس کے اہل دربار سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں وہ ان کو آفت میں نہ پھنسا دے۔

یعنی ایسا نہ ہو کہ انہیں مصیبت اور عذاب میں ڈال دے۔

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ (۵-۴۹) اور ان سے بچتے رہنا کہ ..... یہ کہیں تم کو بہکا نہ دیں۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ (۱۷-۷۳) قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بچلا دیں۔

یعنی تجھے وحی کے احکام سے برگشتہ کر کے مصیبت اور شدت میں مبتلا نہ کر دیں۔

فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ (۵۷-۱۴) تم نے خود اپنے تئیں بلا میں ڈالا۔

یعنی اپنے آپ کو بلا اور عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اور اسی معنی میں فرمایا۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸-۲۵) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہیں لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں گنہگار ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸-۲۸) اور جان رکھو کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔

میں اموال و اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے کیونکہ ان کے سبب سے انسان مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ (۶۴-۱۴) تمہاری عورتوں اور اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔

میں بعض ازواج اور اولاد کو دشمن قرار دیا ہے کیونکہ بعض اوقات ان سے اس طرح اذیت پہنچتی ہے جس طرح کہ دشمن سے پہنچتی ہے اور آیت کریمہ:۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ (۳-۱۴) لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے ...... بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔

میں عورتوں اور بیٹوں کو زینت قرار دیا ہے۔ کیونکہ لوگ ان کو باعث زینت خیال کرتے ہیں۔

نیز قرآن میں ہے:۔

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۲۹-۱) کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

یعنی انہیں آزمائش میں ڈال کر اچھے اور برے کو

الگ الگ نہیں کیا جائیگا جیسے دوسری مقام پر فرمایا:۔
لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ (۸-۳۷) تاکہ خدا ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔

اور آیت کریمہ:
أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ (۹-۱۲۶) کیا یہ دیکھتے نہیں کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار بلا میں پھنسا دیے جاتے ہیں۔ پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔

میں اس ابتلا کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر آیت۔
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ (۲-۱۵۵) الآیۃ اور ہم کسی قدر خوف ۔۔۔۔۔ سے تمہاری آزمائش کریں گے۔ میں پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:
وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ (۵-۷۱) اور یہ خیال کرتے تھے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آئے گی۔

میں بھی فِتْنَةٌ اسی معنی پر محمول ہے۔

فِتْنَةٌ کا لفظ بلا، مصیبت، قتل، عذاب وغیرہ، افعال کریہہ پر بولا جاتا ہے اور یہ ان افعال سے ہے جن کا اسناد اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کی طرف ہوتا ہے لیکن جب اس کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقتضائے حکمت کے مطابق آزمائش وامتحان مراد ہوتا ہے۔ اور جب اس کا اسناد انسان کی طرف ہو تو اس کے برعکس معنی مراد ہوتے ہیں اس لئے مختلف انواع کے فتنوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جا بجا انسان کی مذمت کی ہے چنانچہ فرمایا:۔
وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲-۱۹۱) اور (دین) سے گمراہ کرنا (یا فساد) قتل (وخونریزی) سے کہیں بڑھ کر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ (۸۵-۱۰) جن لوگوں نے مومن مردوں ۔۔۔۔ کو تکلیفیں دیں۔
مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِينَ (۳۷-۱۶۲) خدا کے خلاف بہکا نہیں سکتے۔
یعنی گمراہ کرنے والے نہیں ہو۔ اور آیت کریمہ:۔
بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ (۶۸-۶) کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے۔

میں بقول اخفش مَفْتُونٌ بمعنی فتنہ ہے جس طرح کہ لَيْسَ لَهُ مَعْقُولٌ وَخُذْ مَيْسُورَهُ وَدَعْ مَعْسُورَهُ میں معقول مَيْسُورٌ و مَعْسُورٌ بمعنی عقل، یُسر اور عُسر ہیں تو آیت کی اصل بِأَيِّكُمُ الْفُتُونُ ہے۔

بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ بِأَيِّكُمُ میں باء زائد ہے جیسا کہ آیت وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا میں ہے لہذا یہ اصل میں أَيُّكُمُ الْمَفْتُونُ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ (۵-۴۹) اور ان سے بچتے رہنا کہ کسی حکم سے جو خدا نے تم پر نازل فرمایا ہے یہ کہیں تم کو بہکا دیں۔
میں أَنْ يَفْتِنُوكَ کے معنی ہیں يَخْدَعُوكَ اس لئے عَنْ (صلہ) کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

(ف ت ی)

الْفَتَىٰ کے معنی نوجوان کے ہیں اس کی مؤنث فَتَاةٌ اور مصدر فَتَاءٌ ہے بعدہ کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ (فَتًى اور فَتَاةٌ) غلام اور لونڈی کے معنی میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ (۱۲-۳۰) اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی تھی۔

جس طرح نوجوان آدمی کو فتیٰ کہا جاتا ہے اسی طرح نوجوان اونٹ پر فتیٌّ (فعیل) بولا جاتا ہے فتیً کی جمع فِتْیَۃٌ وَفِتْیَانٌ اور فتاۃٌ کی جمع فَتَیَاتٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

مِنْ فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴-۲۵) تو مومن لونڈیوں میں سے......

وَلَا تُکْرِهُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (۲۴-۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔

وَقَالَ لِفِتْیٰنِهٖ (۱۲-۶۲) اور یوسف نے اپنے خدام سے کہا۔

اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَهْفِ (۱۸-۱۰) جب وہ جوان غار میں جا رہے۔

اِنَّهُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ (۱۸-۱۳) وہ کئی نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے۔

اور کسی مشکل مسئلہ کے جواب کو فُتْیَا وَفَتْوٰی کہا جاتا ہے۔

اِسْتَفْتَاهُ کے معنی فتوی طلب کرنے اور اَفْتَاهُ (افعال) کے معنی فتوی دینے کے ہیں جیسے فرمایا:۔

وَیَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِیْهِنَّ۔ (اے پیغمبر) لوگ تم سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتوی طلب کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ خدا تم کو ان کے (ساتھ نکاح کرنے کے) معاملے میں فتوی (اجازت) دیتا ہے (۴-۱۲۷)

فَاسْتَفْتِهِمْ (۳۷-۱۱) تو ان سے پوچھو.....

اَفْتُوْنِیْ فِیْ اَمْرِیْ (۲۷-۳۲) میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔

(ف ج ج)

اَلْفَجُّ دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی کو کہتے ہیں اس کے بعد وسیع راستہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اس کی جمع فِجَاجٌ ہے قرآن میں ہے:۔

مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (۲۲-۲۷) دور دراز راستوں سے۔

فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا (۲۱-۳۱) اس میں کشادہ رستے۔

اَلْفَجَجُ انسان کے دونوں گھٹنوں کے درمیان کشادگی ہونا اور ایسے آدمی کو جس کے گھٹنوں میں کشادگی ہو اَفَجُّ کہتے ہیں۔

اسی سے حَافِرٌ مُفَجَّجٌ ہے۔ یعنی وہ گھوڑا جس کی ٹانگوں کے درمیان کشادگی ہو اور خام زخم کو جُرْحٌ فِجٌّ کہا جاتا ہے۔

(ف ج ر)

اَلْفَجْرُ کے معنی کسی چیز کو وسیع طور پر پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے فَجَرَ الْاِنْسَانُ السِّکْرَ اس نے بند میں وسیع شگاف ڈال دیا فَجَرْتُهٗ فَانْفَجَرَ میں نے پانی کو پھاڑ کر بہایا تو وہ بہ گیا فَجَّرْتُهٗ فَتَفَجَّرَ شدت کے ساتھ پانی کو پھاڑ کر بہایا۔ قرآن میں ہے۔

وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا (۵۴-۱۲) اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے۔

وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا (۱۸-۳۳) اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔

فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا (۱۷-۹۱) اور اس

کے بیچ میں نہریں بہا نکالو۔

حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا (۱۷-۹۰)

جب تک کہ ہمارے لئے زمین میں سے چشمہ جاری (نہ) کر دو۔

اور ایک قراءت میں تُفَجِّرَ (بصیغہ تفعیل) ہے۔

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۲-۶۰)

تو پھر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اور اسی سے صبح کو فَجْر کہا جاتا ہے کیونکہ صبح کی روشنی بھی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ (۸۹-۲۷) فجر کی قسم اور دس راتوں کی۔

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۱۷-۷۸)

کیونکہ صبح کے وقت قرآن پڑھنا موجب حضور (ملائکہ) ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ فجر دو قسم پر ہے ایک فجر کاذب جو بھیڑیئے کی دم کی طرح (مستطیل) روشنی سی نمودار ہوتی ہے دوم فجر صادق جس کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ کے احکام تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (۲-۱۸۷) یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو۔

اَلْفُجُوْرُ کے معنی دین کی پردہ دری یعنی نافرمانی کرنے کے ہیں۔ اس کا باب فَجَرَ يَفْجُرُ فُجُوْرًا فَهُوَ فَاجِرٌ (بدکار) ہے اور فَاجِرٌ کی جمع فُجَّارٌ وَفَجَرَةٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۸۳-۷)

سن رکھو کہ بدکاروں کے اعمال سجین میں ہیں۔

اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ (۸۲-۱۴) اور بدکار دوزخ میں ہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (۸۰-۴۲)

یہ کفار بدکردار ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (۷۵-۵)

مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے کو خود سری کرتا جائے۔ یعنی وہ زندگی اس لئے چاہتا ہے کہ اس میں فسق و فجور کا ارتکاب کرے۔ بعض نے اس کے معنی لِيُذْنِبَ فِيْهَا (تاکہ اس میں گناہ کرے) کئے ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ انسان گناہ کرتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ کل توبہ کر لوں گا۔ لیکن پھر تائب نہیں ہوتا تو یہ سراسر فجور ہے کیونکہ وہ عہد کر کے اسے توڑ ڈالتا ہے اور کاذب کو فاجر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کذب بیانی بھی فجور کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ ایک دعا میں ہے[1] (۶۵) وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ یعنی جو تجھے جھٹلاتا ہے اسے ہم ترک کرتے ہیں۔ بعض نے مَنْ يَّفْجُرُكَ کے معنی مَنْ يَّتَبَاعَدُ عَنْكَ کئے ہیں یعنی جو تجھ سے علیحدہ اور دور ہوتا ہے۔

---

[1] کلمتہ فی قنوت الوتر عن عبدالرحمٰن بن العزی قال صلیت خلف عمر بن الخطاب الصبح الحدیث وفی آخر حدیث وزعم عبید انہما سورتان من القرآن فی مصحف عبداللہ بن مسعود وایضاً قنت بہو لاء الکلمات عثمان وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہما راجع کنز العمال ۸/۵۲ و ایضا المروزی فی الصلاۃ والطبرانی فی الدعاء ان علی بن ابی طالب حدثنی انہ من القرآن

اَیَّامُ الْفِجَارِ خانہ جنگی کے ایام جو عربوں میں واقع ہوئے۔

(ف ج و)

اَلْفَجْوَۃُ دو چیزوں کے درمیان کشادگی۔ کھلی جگہ قرآن میں ہے:۔
وَھُمْ فِیْ فَجْوَۃٍ مِّنْہُ (۱۸-۱۷) اور وہ اس کے میدان میں تھے۔
یعنی وسیع میدان میں تھے۔ اسی سے قَوْسٌ فَجَّاءُ وَفَجْوَاءُ ہے یعنی کمان جو کھینچی ہوئی حالت میں ہو۔ رَجُلٌ اَفْجٰی جس کے دونوں پنڈلیوں کے درمیان فاصلہ ہو۔

(ف ح ش)

اَلْفُحْشُ وَالْفَحْشَاءُ وَالْفَاحِشَۃُ اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو قباحت میں حد سے بڑھا ہوا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ (۷-۲۸) کہ خدا بے حیائی کے کام کرنے کا حکم ہرگز نہیں دیتا۔
وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (۱۶-۹۰) اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔
وَمَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ (۳۳-۳۰) تم میں سے جو کوئی صریح ناشائستہ (الفاظ کہہ کر رسول اللہ کو ایذا دینے کی) حرکت کرے گی۔
اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ (۲۴-۱۹) اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت بدکاری کی خبر) پھیلے۔
اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ (۷-۳۳) کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو...... حرام کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ (۴-۱۹) ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کی مرتکب ہوں۔
میں فَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ سے مراد زنا ہے اسی طرح آیت کریمہ:۔
وَاللّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَائِکُمْ (۴-۱۵) عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ میں بھی فاحشہ سے مراد بدکاری ہے۔
فَحُشَ فُلَانٌ برا ہونا۔ اسی سے شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۳۶) عَقِیْلَۃَ مَالِ الْفَاحِشِ الْمُتَشَدِّدِ
یعنی سخت بخیل آدمی کے نفیس مال کو منتخب کر کے، فنا کرتی ہے تو فاحش متشدد سے بخل میں حد سے بڑھا ہوا شخص مراد ہے۔
اور بہت زیادہ فحش کام کرنے والے کو مُتَفَحِّشٌ

[1] قالہ طرفۃ بن العبد البکری فی معلقتہ المشہورۃ مطلعہا لخولۃ اطلال .... وصدرہ البیت: اری الموت یعتام الکرام ویصطفی۔ والبیت فی الطبری (۳: ۲۷۶) واللسان (عوم) لکن فی روایتہ مال الباخل بدل مال الفاحش والنفوس بدل الکرام والبیت فی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۳۲) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۲۰۸) رقم ۴۴۶ وذیل الامالی للمرتضی (۱: ۸۲س) وذیل المشکل للقتبی ۵۸ ومحولا علی الطبری واللسان والتاج (عدم، فحش، والمحکم (عیم) والکامل ۲۱۴ وشواہد الکشاف ۲۹ وتاریخ الطبری (۵: ۳۸) فی خمسۃ ابیات والبحر (۲: ۳۱۹/۸: ۵۰۵) واضداد ابی الطیب ۷۰۰ والمعلقۃ فی دیوانہ ۲۱ - ۳۷ والبیت فی ۳۱ والجمہرۃ للقرشی (۱۴۹-۱۶۰) والبیت فی ۱۵۶ والعقد الثمین ۵۸ وابن الانباری ۲۰۰ وابن الشجری فی امالیہ (۱: ۲۱۱) والسیوطی ۱۷۴ وشرح العشر للتبریزی ۸۵ ؎

کہا جاتا ہے۔

(ف خ ر)

اَلْفَخْرُ (ن) کے معنی ان چیزوں پر اترانے کے ہیں جو انسان کے ذاتی جوہر سے خارج ہوں مثلاً مال وجاہ وغیرہ اور اسے فَخَرٌ (بفتح الخا) بھی کہتے ہیں اور فخر کرنے والے کو فَاخِرٌ کہا جاتا ہے اور فَخُوْرٌ وَفَخِیْرٌ صیغہ مبالغہ ہیں یعنی بہت زیادہ اترانے والا۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۳۱-۱۸) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔

فَخَرْتُ فُلَانًا عَلٰی صَاحِبِہٖ اَفْخَرُہٗ فَخْرًا ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا اور ہر نفیس چیز کو فَاخِرٌ کہا جاتا ہے ثَوْبٌ فَاخِرٌ قیمتی کپڑا اور جس اونٹنی کے تھن تو بڑے بڑے ہوں مگر دودھ بہت کم دے اسے فخور کہتے ہیں۔

اَلْفَخَّارُ مٹکوں کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹھوکا لگانے سے اس طرح زور سے بولتے ہیں جیسے کوئی کوئی بہت زیادہ فخر کر رہا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ (۵۵-۱۴) ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے ۔۔۔۔۔۔

(ف د ی)

اَلْفِدٰی وَالْفِدَاءُ کے معنی کسی کی جانب سے کچھ دیکر اسے مصیبت سے بچالینا کے ہیں قرآن میں ہے:۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً (۴۷-۴) پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیئے یا کچھ مال لے کر۔

چنانچہ محاورہ ہے فَدَیْتُہٗ بِمَالِیْ میں نے کچھ خرچ کرکے اسے مصیبت سے بچالیا فَدَیْتُہٗ بِنَفْسِیْ میں نے اپنی جان کے عوض اسے چھڑالیا فَادَاہُ بِکَذَا۔ اس نے کچھ دے کر اسے چھڑالیا قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسَارٰی تُفَادُوْھُمْ (۲-۸۵) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہوکر آئیں تو بدلہ دے کر انہیں چھڑا بھی لیتے ہو۔

تَفَادٰی فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ کسی کا فدیہ دے کر اس کو چھڑالینا۔

وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (۳۷-۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا۔

اِفْتَدٰی کے معنی خود اپنے کو مال کے عوض چھڑانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ (۲-۲۲۹) رہائی پانے کے بدلے میں ۔۔۔۔۔۔

وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ لَافْتَدَوْا بِہٖ (۱۳-۱۸) (تو وہ سب کے سب) اور ان کے ساتھ ہی اتنے اور (نجات کے) بدلے میں صرف کر ڈالیں۔

لَافْتَدَتْ بِہٖ (۱۰-۵۴) تو عذاب سے بچنے کے لئے (سب) دے ڈالے۔

لِیَفْتَدُوْا بِہٖ (۵-۳۶) تاکہ ۔۔۔۔ بدلہ دیں ۔۔۔

وَلَوِافْتَدٰی بِہٖ (۳-۹۱) اگر ۔۔۔ بدلے میں ۔۔۔ دیں

لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍ بِبَنِیْہِ (۷۰-۱۱) کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے ڈالے یعنی بیٹے ۔۔۔۔۔۔

اور جو مال کسی عبادت میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے

---

[1] فی المطبوع کثیرة الدرر والتصویب من المراجع۔

خرچ کرکے انسان خود اپنے کو گناہ سے بچاتا ہے
اسے بھی فِدْيَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ کفارہ یمین
اور صوم کے متعلق فرمایا:۔
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ (۲-۱۹۶)
تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا
قربانی کرے۔
فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (۲-۱۸۴) اس کے
بدلے محتاج کو کھانا کھلادیں۔

(ف ر ر)

اَلْفَرُّ وَالْفِرَارُ اس کے اصل معنی ہیں جانور
کی عمر معلوم کرنے کے لئے اس کے دانتوں کو کھولنا اسی
سے فَرَّ الدَّهْرُ جَذَعًا کا محاورہ ہے۔ یعنی
زمانہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آیا۔ اور اسی سے
اِفْتَرَّ ہے جس کے معنی ہنسنے میں دانتوں کا کھل
جانا کے ہیں۔ فَرَّ مِنَ الْحَرْبِ فِرَارًا میدان
کارزار چھوڑ دینا۔ لڑائی سے فرار ہوجانا قرآن میں ہے:۔
فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ (۲۶-۲۱) تو میں تم سے بھاگ گیا۔
فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (۷۴-۵۱) یعنی شیر سے ڈر
کر بھاگ جاتے ہیں۔
فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا (۷۱-۶)
لیکن میرے بلانے سے اور زیادہ گریز کرتے رہے۔
لَنْ يَنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ (۳۳-۱۶)
(اے پیغمبر) کہ اگر تم ..... بھاگتے ہو تو بھاگنا تم کو فائدہ
نہ دے گا۔
فَفِرُّوا إِلَى اللّٰهِ (۵۱-۵۰) تو تم خدا کی طرف
بھاگ چلو۔
أَفْرَرْتُهُ کسی کو بھگا دینا۔
رَجُلٌ فَرٌّ وَفَارٌّ۔ بھاگنے والا۔

اَلْمَفَرُّ (مصدر) کے معنی بھاگنا (ظرف مکان) جائے
فرار (ظرف زمان) بھاگنے کا وقت چنانچہ آیت:۔
أَيْنَ الْمَفَرُّ (۷۵-۱۰) کہ (اب) کہاں بھاگ جاؤں۔
کے معنی تینوں طرح ہو سکتے ہیں۔

(ف ر ت)

اَلْفُرَاتُ کے معنی شیریں یا نہایت شیریں
پانی کے ہیں اور یہ واحد جمع دونوں کے لئے استعمال
ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَأَسْقَيْنَاكُمْ مَاءً فُرَاتًا (۷۷-۲۷) اور تم لوگوں
کو میٹھا پانی پلایا۔
هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ (۲۵-۵۳) ایک کا پانی
شیریں ہے پیاس بجھانے والا۔

(ف ر ث)

اَلْفَرْثُ جو کچھ جانور کی اوجھڑی کے اندر
ہوتا ہے اسے فرث کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا (۱۶-۶۶)
گوبر اور لہو میں سے کس طرح خالص دودھ .....
فَرَثْتُ كَبِدَهُ میں نے اس کے جگر کو پارہ پارہ کردیا۔
أَفْرَثَ فُلَانٌ أَصْحَابَهُ فلاں نے اپنے ساتھیوں
کو ایسی مصیبت میں مبتلا کردیا جو بمنزلہ فرث کے
تھی (یعنی ریزہ ریزہ کردینے والی)۔

(ف ر ج)

اَلْفَرْجُ وَالْفُرْجَةُ کے معنی دو چیزوں کے
درمیان شگاف کے ہیں۔ جیسے دیوار میں شگاف
یا دونوں ٹانگوں کے درمیان کی کشادگی اور کنایہ
کے طور پر فرج کا لفظ شرمگاہ پر بولا جاتا ہے اور

کثرت استعمال کی وجہ سے اسے حقیقی معنی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۱-۹۱) اور ان (مریم) کو بھی یاد کرو) جنہوں نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔

لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳-۵) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (۲۴-۳۱) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔

اور استعارہ کے طور پر ہر سرحد اور ہر خطرہ کی جگہ کو فَرْجٌ کہا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسلامی دور حکومت میں فَرْجَانِ کا لفظ ترک اور سوڈان پر بولا جاتا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ (۵۰-۶) اور اس میں کہیں شگاف تک نہیں۔

میں فُرُوْجٌ بمعنی شگاف ہے اور آیت کریمہ:۔

وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ (۷۷-۹) اور جب آسمان پھٹ جائے۔

میں فُرِجَتْ بمعنی انْشَقَّتْ ہے یعنی جب آسمان شق ہو جائے گا۔

اَلْفَرْجُ کے معنی غم دور ہونے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْكَ اللہ تجھ سے غم کو دور کرے اور قَوْسٌ فَرْجٌ اس کمان کو کہتے ہیں جس کے دونوں گوشے کشادہ ہوں جیسا کہ تانت سے علیحدہ ہونے کی حالت میں اور جو شخص اپنا بھید نہ چھپائے اس کو فُرُجٌ کہا جاتا ہے اور فَرَجٌ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی شرمگاہ پر ستر یعنی پردہ نہ ہو۔

فَرَارِيْجُ الدَّجَاجِ مرغی کے چوزے کیونکہ وہ انڈوں سے نکلتے ہیں اور چوزوں والی مرغی کو مُفْرِجٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْمُفْرَجُ وہ قتیل جس سے لوگ دور ہو جائیں اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو سکے۔

(ف ر ح)

اَلْفَرَحُ کے معنی کسی فوری یا دنیوی لذت پر انشراح صدر کے ہیں۔ عموماً اس کا اطلاق جسمانی لذتوں پر خوش ہونے کے معنی میں ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ (۵۷-۲۳) اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اترایا نہ کرو۔

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۳-۲۶) اور (کافر) لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو رہے ہیں۔

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ (۴۰-۷۵) یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم ...... خوش ہوا کرتے تھے۔

حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا (۶-۴۴) یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے جو ان کو دی گئی تھیں خوب خوش ہو گئے۔

فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (۴۰-۸۳) تو جو علم (اپنے خیال میں) ان کے پاس تھا اس پر اترانے لگے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (۲۸-۷۶) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور قرآن پاک میں صرف دو آیتیں یعنی....

فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (۱۰-۵۸) تو چاہیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳۰-۴) اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے۔

ایسی ہیں جن میں فرح کا لفظ پسندیدہ معنی

میں استعمال ہوا ہے۔

مِفْرَاحٌ بہت زیادہ اترانے والا۔ شاعر نے کہا ہے ؎ (الطویل)

(۳۳۷) وَلَسْتُ بِمِفْرَاحٍ اِذَا الْخَیْرُ مَسَّنِیْ
وَلَاجَازِعٍ مِنْ صَرْفِہِ الْمُتَقَلِّبِ

نہ تو میں خیر حاصل ہونے سے اتراتا ہوا اور نہ ہی زمانہ کے حوادثات پر جزع فزع کرتا ہوں۔

محاورہ ہے۔ مَا یَسُرُّنِیْ بِھٰذَا الْاَمْرِ مِفْرِحٌ اَوْ مُفْرِدٌ بِہٖ مجھے اس امر سے کچھ بھی خوشی نہیں رَجُلٌ مُفْرَحٌ وہ آدمی جو قرض کے نیچے دب گیا ہو۔ حدیث میں ہے (۶۲) لَایُتْرَکُ فِی الْاِسْلَامِ مُفْرَحٌ یعنی اسلام میں کسی کو مُفْرَحٌ یعنی مقروض نہیں چھوڑا جائے گا گویا اِفْرَاحٌ کا لفظ فرحت کے حاصل ہونے اور زائل کرنے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اِشْکَاءٌ کا لفظ جلب شکوی وازالۂ آں کے معنی میں آتا ہے اور مقروض سے بھی چونکہ اس کی خوشی زائل ہوجاتی ہے اس لئے اسے مُفْرَحٌ کہا جاتا ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے لَاغَمَّ اِلَّا غَمُّ الدَّیْنِ کہ اصل غم تو قرض کا غم ہے۔

(ف ر د)

اَلْفَرْدُ (اکیلا) اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دوسری نہ ملائی گئی ہو یہ لفظ وِتر (طاق) سے عام اور وَاحِدٌ سے خاص ہے اس کی جمع فُرَادٰی ہے قرآن میں ہے:۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا (۲۱-۸۹) پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ۔

اور اللہ تعالٰے کے متعلق فرد کا لفظ بولنے میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ وہ تنہا ہے اس کے بر عکس باقی اشیاء جوڑا جوڑا پیدا کی گئی ہیں جیسا کہ آیت وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ (۵۱-۴۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ کے فرد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں سے بے نیاز ہے جیسا کہ آیت:۔

غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ..... (۳-۹۷) اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

میں اس پر تنبیہ کی ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ ذات باری تعالٰی اپنی واحدانیت میں منفرد ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ ذات ہر قسم کی ترکیب اور مجانست سے مبرا ہے اور جملہ موجودات کے برعکس ہے۔ اور فرید کے معنی واحد یعنی اکیلا اور تنہا کے ہیں۔ اس کی جمع فُرَادٰی آتی ہے جیسے اَسِیْرٌ کی جمع اُسَارٰی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (۶-۹۴) اور جیسا

لہ قالہ صابۃ العبدی انظر العقد (۱: ۲۱۱) وفی روایۃ سرّنی بدل مسنی وفی العیون (۱: ۲۷۲) البیت للبعیث واخری فیہ: (۱: ۲۸۱) انہ لتابط شرا انظر البیسر ۹۴ امالمعانی للقتبی ۱۵۱ ؎ الحدیث فی النھایۃ (فرح) والحدیث اخرجہ الطبرانی فی الکبیر اجع کنز العمال ۳۸۴ عن کثیر بن عبداللہ عن ابیہ عن جدہ وفی مجمع بحار الانوار مفرج بالجیم و معناہ من لا عشیرۃ لہ والفائق ۲/۱۲۶ ولفظ المفرج ذکرہ العلماء فی الاضداد ومعناہ المسرور وبہ ایضا المثقل بالدین - راضداد الی الطیب ۷۶ ہ وابن الانباری ۱۹۰ ولمعناہ انظر غریب ابی عبید ۱۲

ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ایسا ہی آج اکیلے ہمارے پاس آئے[1]۔

(ف ر ش)

اَلْفَرْشُ (ن ض) کے اصل معنی کپڑے کو بچھانے کے ہیں لیکن بطور اسم کے ہر اس چیز کو جو بچھائی جائے فرش و فراش کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:-

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (۲-۲۲) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا ... بنایا۔ یعنی قابل رہائش بنایا اور سا سے ابھرا ہوا نہیں بنایا جس پر سکونت نا ممکن ہو اور اَلْفِرَاش کی جمع فُرُشٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ (۵۶-۳۴) اور اونچے اونچے فرشوں میں۔

فُرُشٍۢ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ (۵۵-۵۴) ایسے بچھونوں پر جن کے استر اطلس کے ہیں ....

اور فَرْشٌ سے مراد وہ جانور بھی ہوتے ہیں جو بار برداری کے قابل نہ ہوں جیسے فرمایا:۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا (۶-۱۴۳) چوپایوں میں سے بڑی عمر کے جو بار برداری کے کام آتے ہیں اور چھوٹی عمر کے جو بار برداری کا کام نہیں دیتے اور زمین میں لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) بھی۔

اور کنایہ کے طور پر فِرَاش کا لفظ میاں بیوی میں سے ہر ایک پر بولا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا[2]۔ (۲۷) اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ کہ بچہ خاوند کا ہے۔

اور محاورہ ہے۔ فُلَانٌ کَرِیْمُ الْمَفَارِشِ یعنی اس کی بیگمات اعلیٰ مرتبہ کی ہیں۔ اَفْرَشَ الرَّجُلُ صَاحِبَهٗ اس نے اپنے ساتھی کی غیبت اور بدگوئی کی۔ اَفْرَشَ عَنْهُ کسی چیز سے رک جانا (اَلْفَرَاشَةُ پروانہ تتلی وغیرہ) اس کی جمع اَلْفَرَاش آتی ہے قرآن میں ہے:۔ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (۱۰۱-۴) جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔

اور تشبیہ کے طور پر تالے کے کنڈے کو بھی فَرَاشَةُ الْقُفْلِ کہا جاتا ہے نیز فَرَاشَة کے معنی برتن میں تھوڑا سا پانی کے بھی آتے ہیں۔

(ف ر ض)

اَلْفَرْضُ (ض) کے معنی سخت چیز کو کاٹنے اور اس میں نشان ڈالنے کے ہیں مثلاً فَرْضُ الْحَدِیْدِ لوہے کو کاٹنا فَرْضُ الْقَوْسِ کمان کا چلہ فَرْضُ الزَّنْدِ چقماق کا ٹکڑا اور فُرْضَةُ الْمَاءِ کے معنی دریا کا دہانہ کے ہیں اور آیت کریمہ:-

لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (۴-۱۱۸) میں تیرے بندوں سے (غیر خدا کی نذر دلوا کر) مال کا ایک مقرر حصہ لے لیا کروں گا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں مفروض کے معنی معین کے ہیں اور بعض نے کاٹ کر الگ کیا ہوا

---

[1] وتمام الحدیث وتعاہرا لجر انظر لحدیث النہایۃ ۱/۵۳۳ والفائق ۲/۲۰۱ واللسان (حجر) ہعدا والجملۃ الثانیہ فقط فی اضداد ابی الطیب ۱۱۷ واصل الحدیث متفق علیہ ورواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ عن عائشۃ انظر للتفصیل کنز العمال ۲۰۷ رقم ۲۰۷، ونحوہ ابن حبان رقم ۱۳۳۶ عن ابن مسعود والفتح الکبیر للنبہانی ۳-۳۰۸ ۔

مراد لیا ہے اور فَرَضَ بمعنی ایجاب (واجب کرنا) آتا ہے مگر واجب کے معنی کسی چیز کے بلحاظ وقوع اور ثبات کے قطعی ہونے کے ہیں اور فرض کے معنی بلحاظ حکم کے قطعی ہونے کے۔ قرآن میں ہے:۔
سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰهَا وَ فَرَضۡنٰهَا (۲۴-۱) (یہ) ایک سورۃ ہے جس کو ہم نے نازل کیا اور اس (کے احکام) کو فرض کر دیا۔
یعنی اس پر عمل کرنا فرض کر دیا[1]۔ نیز فرمایا:۔
اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ (۲۸-۸۵) (اے پیغمبر) جس نے تم پر قرآن (کے احکام) کو فرض کیا ہے ۔۔۔۔۔
یعنی اس پر عمل کرنا تجھ پر واجب کیا ہے اور اسی سے جو نفقہ وغیرہ حاکم کسی کے لئے مقرر کر دیتا ہے اسے بھی فَرَضَ کہا جاتا ہے اور ہر وہ مقام جہاں قرآن میں فَرَضَ عَلٰی (علیٰ) کے ساتھ آیا ہے اس کے معنی کسی چیز کے واجب اور ضروری قرار دینے کے ہیں اور جہاں۔ فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ (لام کے ساتھ) آیا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بندش کو دور کرنے اور اسے مباح کر دینے کے ہیں چنانچہ فرمایا:۔
مَا كَانَ عَلَى النَّبِیِّ مِنۡ حَرَجٍ فِیۡمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ (۳۳-۳۸) پیغمبر پر اس کام میں کچھ تنگی نہیں جو خدا نے ان کے لئے مقرر کر دیا۔
قَدۡ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمۡ تَحِلَّةَ اَیۡمَانِكُمۡ (۶۶-۲) خدا نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَ قَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِیۡضَةً (۲-۲۳۶)

لیکن مہر مقرر کر چکے ہو۔
کے معنی یہ ہیں چونکہ تم ان کے لئے مہر مقرر اور اپنے اوپر لازم کر چکے ہو اور یہی معنی فَرَضَ لَهٗ فِی الْعَطَاءِ کے ہیں (یعنی کسی کے لئے عطا سے حصہ مقرر کر دینا) اسی بنا پر عطیہ اور قرض کو بھی فَرَضٌ کہا جاتا ہے اور فَرَائِضُ اللّٰهِ سے مراد وہ احکام ہیں جن کے متعلق قطعی حکم دیا گیا ہے اور جو شخص علم فرائض کا ماہر ہو اسے فَارِضٌ وَ فَرَضِیٌّ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَنۡ فَرَضَ فِیۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوۡقَ وَ لَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ (۲-۱۹۷) تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط رکھے نہ کوئی برا کام کرے اور کسی سے جھگڑے۔
یعنی جس نے فریضہ حج کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہو اور اس کی پختہ نیت کر لی ہو یہاں پر فرض کی نسبت انسان کی طرف کرنے میں اس بات پر دلیل ہے کہ اس کا وقت مقرر کرنا انسان کا کام ہے (کہ میں امسال حج کروں گا یا آئندہ سال) اور زکوٰۃ میں جو چیز وصول کی جاتی ہے اس پر بھی فریضہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ اِلٰی قَوْلِهٖ فَرِیۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ (۹-۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں ۔۔۔۔۔ کا حق ہے (یہ) خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔
اسی بنا پر مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے ایک عامل کی طرف خط لکھا اور اس میں ارقام فرمایا[2] (۶۷)

---

[1] وعن عکرمۃ قدرنا فیہا الحدود وفی قرارۃ بالتشدید عن ابن کثیر وابی عمرو (مجمع البیان للطبرسی ۵/۶) [2] وکتاب ابی بکر الصدیق فی الصدقات مروی عن انس فی (حم) واموال ابی عبید (خ، د، ن) وابن جریر وابن الجارود وابی خزیمۃ والطحاوی راجع کنز العمال ۶ جرقم ۲۲۶۱ ؛

هٰذِهٖ فَرِیْضَۃُ الصَّدَقَۃِ الَّتِیْ فَرَضَہَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ کہ یہ یعنی جو مقادیر لکھی جاتی ہیں فریضہ زکوٰۃ ہے۔ جو رسول اللہ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔

اَلْفَارِضُ عمر رسیدہ گائے یا بیل۔ قرآن میں ہے:۔
لَا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ (۲-۶۸) نہ بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔

بعض نے کہا ہے کہ بیل کو فارض اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کو پھاڑتا یعنی جوتتا ہے اور یا اس لئے کہ اس پر سخت کاموں کا بوجھ ڈالا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ گائے کی زکوٰۃ میں تبیع اور مُسِنَّۃ لیا جاتا ہے اور تبیع کا لینا تو بعض حالتوں میں جائز ہوتا ہے اور بعض احوال میں ناجائز لیکن مُسِنَّۃ کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے اس لئے مُسِنَّۃ کو فَارِضَۃ کہا گیا ہے اس توجیہ کی بنا پر فَارِضٌ کا لفظ مصطلحات اسلامیہ سے ہوگا۔

(ف ر ط)

فَرَطَ یَفْرُطُ (ن) کے معنی تَقَدُّمًا آگے بڑھ جانے کے ہیں اسی سے فَارِطٌ ہے جس کے معنی ڈول وغیرہ درست کرنے کے لئے قافلہ سے پہلے پانی پر جانے والا کے ہیں اور اسے فَرَطٌ بھی کہا جاتا ہے اسی سے آنحضرت نے فرمایا[1]۔ (۲۶)
اَنَا فَرَطُکُمْ عَلَی الْحَوْضِ میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔

اور چھوٹے بچے پر جنازے کی دعا میں کہا جاتا ہے[2] (۲۹) اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا فَرَطًا اے اللہ اسے ہمارے لئے میر ساماں بنا۔ اور آیت کریمہ:۔
اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا (۲۰-۴۵) کہ وہ کہیں ہم سے زیادتی نہ کرے۔

فَرَسٌ فُرُطٌ۔ تیز رفتار گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے۔

اَلْاِفْرَاطُ کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر جانے کے ہیں[3] اور تَفْرِیْطٌ کے معنی فرط یعنی تقدم میں کوتاہی کرنے کے چنانچہ محاورہ ہے:۔
مَا فَرَّطْتُ فِیْ کَذَا میں نے فلاں معاملہ میں کوتاہی نہیں کی۔ قرآن میں ہے:۔
مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ (۶-۳۸) ہم نے کتاب یعنی لوح محفوظ میں) کسی چیز کے لکھنے میں کوتاہی نہیں کی۔
مَا فَرَّطْتُ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ (۳۹-۵۶) اس تقصیر پر افسوس ہے) جو میں نے خدا کے حق میں کی۔
مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ (۱۲-۸۰) تم یوسف کے بارے میں قصور کر چکے ہو۔
اَفْرَطْتُ الْقِرْبَۃَ مشکیزہ کو پانی سے خوب بھر دیا۔ قرآن میں ہے:۔
وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا (۱۸-۲۸) اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا۔
یعنی افراط و تفریط میں حد سے بڑھا ہوا ہے۔

---

[1] الحدیث فی الفائق (۱/۲۵۶) والنہایۃ ۳/۲۱۱ وغریب ابی عبید (۱: ۴۴) وابن حبان فی زوائدہ رقم ۱۸۵۸ من حدیث قیس بن ابی حازم مرسلا والحدیث فی البخاری (فتن، رقاق، طہارۃ، فضائل) راجع الفتح الکبیر (۱: ۲۷۵) [2] ای فی الصلوۃ علی المولود رواہ البیہقی من حدیث ابی ہریرۃ انظر النیل ۴/۷۹ وغریب ابی عبید واللسان والتاج (فرط) [3] وفی القرآن وانہم مفرطون (۶۲-۱۶) ؎

(ف ر ع)

فَرْعُ الشَّجَرِ کے معنی درخت کی شاخ کے ہیں اس کی جمع فُرُوْعٌ آتی ہے۔ اور آیت کریمہ: وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۱۴-۲۴) اور شاخیں آسمان میں۔
میں فَرْعُهَا کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ بلحاظ طول کے اسے فِي السَّمَآءِ کہا ہو جیسے محاورہ ہے فَرَعَ کَذَا (یعنی لمبا ہو جانا) اور سر کے بالوں کو بلندی اور طول کی وجہ سے فَرْعٌ کہا جاتا ہے۔
رَجُلٌ اَفْرَعُ گھنے اور لمبے بالوں والا اس کی مؤنث فَرْعَاءُ اور جمع فُرْعٌ آتی ہے اور کہا جاتا ہے۔
فَرَعْتُ الْجَبَلَ پہاڑ کی چوٹی پر چلا جانا فَرَعْتُ رَأْسَهٗ بِالسَّیْفِ اس کا سر تلوار سے قلم کر دیا۔
تَفَرَّعْتُ فِي بَنِيْ فُلَانٍ میں نے ان کے اونچے خاندان میں شادی کر لی۔ دوم یہ کہ عرض یعنی پھیلاؤ کے لحاظ سے اسے فِي السَّمَآءِ کہا ہو اور یہ تَفَرَّعَ کَذَا سے ہو جس کے معنی پھیل جانے کے ہیں اور مسئلہ کی جزئیات کو فروع کہا جاتا ہے۔ اور فُرُوْعُ الرَّجُلِ کے معنی اولاد کے بھی ہیں۔

(ف ر ع ن)

فِرْعَوْنُ۔ یہ علم عجمی ہے اور اس سے سرکشی کے معنی لے کر کہا جاتا ہے تَفَرْعَنَ فُلَانٌ کہ فلاں فرعون بنا ہوا ہے جس طرح کہ ابلیس سے اَبْلَسَ وَتَبَلَّسَ وغیرہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اسی سے سرکشوں کو فَرَاعِنَةٌ (جمع فرعون کی) اور اَبَالِسَةٌ (جمع ابلیس کی) کہا جاتا ہے۔

(ف ر غ)

اَلْفَرَاغُ یہ شُغل کی ضد ہے۔ اور فَرَغَ (ن) فُرُوْغًا خالی ہونا فَارِغٌ خالی۔ قرآن میں ہے: وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فَارِغًا (۲۸-۱۰) اور موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہو گیا۔
یعنی خوف کی وجہ سے گویا عقل سے خالی ہو چکا تھا۔۔۔۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)
(۳۳۸) کَاَنَّ ...... = ... جُؤْجُؤَہٗ هَوَاءٌ
گویا۔۔۔۔۔ اس کا سینہ ہوا ہو رہا تھا۔
اور بعض نے فَارِغًا کے معنی موسیٰ علیہ السلام کے خیال سے خالی ہونا کئے ہیں یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا خیال ان کے دل سے بھلا دیا حتیٰ کہ وہ مطمئن ہو گئیں اور موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا انہوں نے گوارا کر لیا۔ بعض نے فَارِغًا کا معنی اس کی یاد کے سوا باقی چیزوں سے خالی ہونا بھی کئے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بعد کی آیت:
وَاِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا (۲۸-۱۰) اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس قصے کو ظاہر کر دیں۔
سے معلوم ہوتا ہے اور اسی سے فرمایا:
فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۹۴-۷) تو جب

---

[1] قطعة من كلمة لزهير والبيت بتمامه: ـ كان الرحل منها فوق صعل من الظلمان جؤجؤه هواءُ ـ والبيت في اللسان (هوا) والكامل ۲۸۷ ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۱۹۳) والبحر (۵: ۳۰۴) وغريب القرآن للقتبي و ديوانه ۶۳ والحيوان (۴: ۳۹۸) و العقد الثمين ۷۶ والعيون (۲: ۷۹) والمعاني للقتبي ۳۳۵

فارغ ہوا کرو تو عبادت میں محنت کیا کرو۔
سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلٰنِ (۵۵-۳۱) اے دونوں جماعتو ہم عنقریب تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔
اور اَفْرَغْتُ الدَّلْوَ کے معنی ڈول سے پانی بہا کر اسے خالی کر دینا کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔
اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا (۲-۲۵۰) ہم پر صبر کے دہانے کھول دے بھی اسی سے مستعار ہے
ذَهَبَ دَمُهُ فَرْغًا۔ اس کا خون رائیگاں گیا۔
فَرَسٌ فَرِيْغٌ وسیع قدم اور تیز رفتار گھوڑا گویا وہ دوڑ کر پانی کی طرح بہا رہا ہے۔
ضَرْبَةٌ فَرِيْغَةٌ وسیع زخم جس سے خون زور سے بہہ رہا ہو۔

(ف ر ق)

اَلْفَرْقُ وَالْفَلْقُ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن معنی انشقاق یعنی پھٹ جانا کے لحاظ سے فلق کا لفظ بولا جاتا ہے اور معنی انفصال یعنی الگ الگ ہونے کے لحاظ سے فَرْقٌ قرآن میں ہے:۔
وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (۲-۵۰) اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑ دیا۔
اور اَلْفِرْقُ (۲۶-۶۳) کے معنی الگ ہونے والا ٹکڑا کے ہیں۔ اسی سے فِرْقَةٌ (۹-۱۲۲) ہے جس کے معنی لوگوں کا گروہ یا جماعت کے ہیں۔ اور طلوع فجر پر فَرَقٌ اور فلق دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (۲۶-۶۳) تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا (کہ) گویا بڑا پہاڑ ہے۔
اور فَرِيْقٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ (۳-۷۸) اور اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں کہ کتاب تورات کو زبان مروڑ مروڑ کر پڑھتے ہیں۔
فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۵-۷۰) ایک جماعت کو جھٹلا دیتے تھے اور ایک جماعت کو قتل کر دیتے تھے۔
فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ (۴۲-۷) ایک فریق بہشت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں۔
اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِىْ (۲۳-۱۰۹) میرے بندوں میں ایک گروہ تھا۔۔۔۔۔
اَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ (۱۹-۷۳) دونوں فریق میں سے۔۔۔ کس کے۔
وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ (۲-۸۵) اور اپنے میں سے بعض لوگوں کو۔۔۔۔۔۔ وطن سے نکال بھی دیتے ہو۔
وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (۲-۱۴۶) مگر ایک فریق ان میں سے سچی بات کو۔۔۔۔ چھپا رہا ہے۔
اور فَرَقْتُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ کے معنی دو چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں خواہ وہ علیحدگی نظر سے محسوس ہو رہی ہو یا اس کا تعلق بصیرت سے ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۵-۲۵) تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی کر دے۔

فَالْفَارِقٰتِ فَرْقًا (۷۷-۴) پھر وہ (اشیاء کے درمیان) فرق کر دیتے ہیں۔
یعنی وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اشیاء کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
فِیْهَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ (۴۴-۴) اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصل کئے جاتے ہیں۔
میں بھی یُفْرَقُ اسی معنی پر محمول ہے اور حضرت عمرؓ کو فاروق اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کرنے والے تھے اور آیت کریمہ:۔
وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ (۱۷-۱۰۶) اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے۔
کے معنی ہیں کہ ہم نے قرآن میں تمام احکام کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں اور بعض نے فَرَقْنٰهُ کے معنی متفرق طور پر نازل کرنا بھی لکھے ہیں۔
اَلتَّفْرِیْقُ اصل میں تکثیر کے لئے ہے اور کسی چیز کے شیرازہ اور اتحاد کو زائل کر دینے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔
مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (۲-۱۰۲) جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔
فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۰-۹۴) کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ اور آیت کریمہ:۔
لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲-۲۸۵) اور کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ نیز آیت:۔
لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (۳-۸۴) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔
میں اَحَدٍ کا لفظ چونکہ حرف نفی کے تحت واقع ہونے کی وجہ سے جمع کے معنی میں ہے لہٰذا تفریق کی نسبت اس کی طرف جائز ہے اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ (۶-۱۵۹) جن لوگوں نے اپنے دین میں بہت سے رستے نکالے۔
میں ایک قرأت فَارَقُوْا ہے اور فَرْقٌ وَمُفَارَقَةٌ کا لفظ عام طور پر اجسام کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِكَ (۱۸-۷۸) اب مجھ میں اور تجھ میں علیحدگی۔ اور آیت کریمہ:۔
وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ (۷۵-۲۸) اس (جان بلب) نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بس اب دنیا سے مفارقت کا وقت قریب آپہنچا ہے اور آیت کریمہ:۔
وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (۴-۱۵۰) اور خدا اور اس کے پیغمبروں میں فرق کرنا چاہتے ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں مگر حکم الٰہی کی مخالفت کر کے اس کے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور آیت کریمہ:۔
وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (۴-۱۵۲) اور ان میں کسی میں فرق نہ کیا۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔
اَلْفُرْقَانُ یہ فَرْقٌ سے ابلغ ہے کیونکہ یہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ رَجُلٌ قُنْعَانٌ (یعنی وہ آدمی جس کے حکم پر قناعت کی جائے) کی طرح اسم صفت ہے مصدر نہیں ہے اور

فَرْق کا لفظ عام ہے جو حق کو باطل سے الگ کرنے کے لئے بھی آتا ہے اور دوسری چیزوں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا (۸-۲۹) مومنو! اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لئے امر فارق پیدا کر دیگا (یعنی تم کو ممتاز کر دے گا۔ یہاں فرقان سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر نور اور توفیق پیدا کر دیگا جس کے ذریعہ تم حق و باطل میں امتیاز کر سکو گے تو گویا یہاں فرقان کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ سکینۃ اور روح کے الفاظ ہیں اور قرآن نے یوم الفرقان اس دن کو کہا ہے جس روز کہ حق و باطل اور صحیح وغلط کے مابین فرق اور امتیاز ظاہر ہوا چنانچہ آیت:۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ (۸-۴۱) اور اس (نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق و باطل میں) فرق کرنے کے دن نازل فرمائی۔ میں یوم الفرقان سے جنگ بدر کا دن مراد ہے کیونکہ وہ (تاریخ اسلام میں) پہلا دن ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا۔

اور کلام الٰہی (وحی) بھی فرقان ہوتی ہے کیونکہ وہ حق اور باطل عقائد میں فرق کر دیتی ہے سچی اور جھوٹی باتوں اور اچھے برے اعمال کو بالکل الگ الگ بیان کر دیتی ہے اس لئے قرآن کریم نے تورات اور انجیل کو فرقان سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ تورات کے متعلق فرمایا:۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ (۲۱-۴۸) اور ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت اور گمراہی میں) فرق کر دینے والی....

عطا کی۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ (۲۵-۱) وہ خدائے عزوجل بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ (۲-۵۳) اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کئے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ اور ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو معجزے دیئے (۲۱-۴۸)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ (۲-۱۸۵) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔

اَلْفَرَقُ کے معنی خوف کی وجہ سے دل کے پراگندہ ہو جانے کے ہیں اور دل کے متعلق اس کا استعمال ایسے ہی ہے جس طرح کہ صَدْعٌ و شَقٌّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ (۹-۵۶) اصل یہ ہے کہ یہ ڈرپوک لوگ ہے۔

اور فَرُوقٌ وَفَرُوقَةٌ کے معنی ڈرپوک مرد یا عورت کے ہیں (يَسْتَوِي فِيهِ التَّذْكِيرُ وَالتَّانِيثُ) اور اسی سے اس اونٹنی کو جو درد زہ کی وجہ سے بدک کر دور بھاگ جائے۔ فَارِقٌ یا فَارِقَةٌ کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر اس بدلی کو بھی فَارِقٌ کہا جاتا ہے جو دوسری بدلیوں سے علیحدہ ہو۔

؎ وفی المطبوع الکتاب مصحف والا لتنکرت الآیۃ واللہ اعلم ۱۲

اَلْاَفْرَقُ (۱) وہ مرغ جس کی کلغی شاخ در شاخ ہو (۲) وہ گھوڑا جس کا ایک سرین دوسرے سے اونچا ہو۔

اَلْفَرِیْقَۃُ دودھ میں پکائی ہوئی کھجور۔

اَلْفَرُوْقَۃُ گردوں کی چربی۔

(ف ر ہ)

اَلْفَرِہُ (صفت مشبہ) اترانے والا اور نَاقَۃٌ مُفْرِہَۃٌ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو چست اور پھرتیلے بچے دے (اس سے اسم فاعل فَارِہٌ ہے) قرآن میں ہے:۔

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فَارِہِیْنَ (۲۶-۱۴۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

میں فَارِہِیْنَ کے معنی حَاذِقِیْنَ (یعنی ماہر اور ہنرمند) کے ہیں اور فَرِہٌ کی جمع فُرَّہٌ ہے یہ انسان اور دیگر حیوانات کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک قرأت میں فَرِہِیْنَ ہے جو فَارِہِیْنَ کے ہم معنی ہے اور بعض نے (دونوں) کے معنی اَشِرِیْنَ (اترانے والے) بھی کئے ہیں۔

(ف ر ی)

اَلْفَرْیُ (ن) کے معنی چمڑے کو سینے اور درست کرنے کے لئے اسے کاٹنے کے ہیں اور اِفْرَاءٌ (افعال) کے معنی اسے خراب کرنے کے لئے کاٹنے کے۔

اِفْتَرَاءٌ (افتعال) کا لفظ اصلاح اور فساد دونوں کے لئے آتا ہے لیکن اس کا زیادہ تر استعمال افساد ہی کے معنوں میں ہوتا ہے اسی لئے قرآن پاک میں جھوٹ شرک اور ظلم کے موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا:۔

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰی اِثْمًا عَظِیْمًا (۴-۴۸) جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا۔

اُنْظُرْ کَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ (۴-۵۰) دیکھو یہ خدا پر کیسا جھوٹ (طوفان) باندھتے ہیں۔

اور کذب کے متعلق فرمایا:۔

افْتِرَاءً عَلَی اللّٰہِ قَدْ ضَلُّوْا (۶-۱۴۰) اور خدا پر افترا کر کے ..... وہ بے شبہ گمراہ ہیں۔

وَلٰکِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ (۵-۱۰۳) بلکہ کافر خدا پر جھوٹ افترا کرتے ہیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ (۱۱-۳۵) کیا یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) نے قرآن اپنے دل سے بنا لیا ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ۔ (۱۰-۶۰) اور جو لوگ خدا پر افترا کرتے ہیں وہ ..... کیا خیال رکھتے ہیں؟۔

اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۱۰-۳۷) کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (۱۱-۵۰) تم (شرک کر کے خدا پر) محض بہتان باندھتے ہو

اور آیت کریمہ:۔

لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا (۱۹-۲۷) یہ تو تم نے برا کام کیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ فَرِیًّا کے معنی عظیم بات کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عجیب بات کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے

معنی من گھڑت اور بنائی ہوئی بات کے ہیں لیکن مآل کے اعتبار سے یہ تمام اقوال ایک ہی ہیں۔

(ف ف ز)

اَلْاِسْتِفْزَازُ- ہلکا سمجھنا، گھبرا دینا اور جگہ سے مٹا دینا قرآن میں ہے۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ (۱۷-۶۴) اور ان میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے بہکاتا رہ۔

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۱۷-۱۰۳) تو اس نے چاہا کہ انہیں گھبرا کر سرزمین (مصر) میں سے نکال دے۔

اور فَزَّنِیْ فُلَانٌ کے معنی ہیں اس نے مجھے پریشان.... کر کے میری جگہ سے مٹا دیا اور گائے کے بچہ کو فَزٌّ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں خفت یعنی سبکی پائی جاتی ہے جس طرح کہ اس میں عجلت (جلد بازی) کا تصور کر کے اسے عِجْلٌ کہا جاتا ہے۔

(ف ز ع)

اَلْفَزَعُ- انقباض اور وحشت کی اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی خوفناک امر کی وجہ سے انسان پر طاری ہو جاتی ہے یہ جَزَعٌ کی ایک قسم ہے اور خِفْتُ مِنَ اللّٰهِ کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے لیکن فَزِعْتُ مِنْهُ کہنا صحیح نہیں ہے اور آیت کریمہ:۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (۲۱-۱۰۳) ان کو اس دن کا بڑا بھاری غم غمگیس نہیں کرے گا۔

میں فَزَعُ الْاَکْبَرُ سے دوزخ میں داخل ہونے کا خوف مراد ہے۔ نیز فرمایا:۔

فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (۲۷-۸۷) تو جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں سب گھبرا اٹھیں گے۔

وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ (۲۷-۸۹) اور ایسے لوگ (اس روز) گھبراہٹ سے بے خوف ہوں گے۔

حَتّٰى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ (۳۴-۲۳) یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے اضطراب دور کر دیا جائے گا۔

یعنی ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی فَزِعَ اِلَیْهِ کے معنی گھبراہٹ کے وقت کسی سے فریاد کرنے اور مدد مانگنے کے ہیں اور فَزِعَ لَهٗ کے معنی مدد کرنے کے[1]۔ شاعر نے کہا ہے[2] (البسیط)

(۳۳۵) وَكُنَّا اِذَا مَا اَتَانَا صَارِخٌ فَزِعٌ

یعنی جب کوئی فریاد چاہنے والا گھبرا کر ہمارے پاس آتا۔

---

[1] ومنہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم للانصار: انکم لتقلون عند الطمع وتکثرون عند الفزع انظر للکلمۃ الکامل للمبرد ۴۴ واضداد ابی الطیب ۱/ ۵-۴۴۵ وعدۃ العلماء من الاضداد [2] قالہ سلامۃ بن الجندل وتمامہ: ... کان الصراخ لہ قرع الظنابیب والبیت من قصیدۃ مفضلیۃ (۱: ۷/۱۱-۱۲۲) والشعراء النصرانیۃ ۴۸۶-۴۹۰ وراجع للبیت اضداد الاصمعی ۴۵ وابن السکیت ۲۰۸ واللسان (طنب) واضداد ابی الطیب ۱۳۴، ۴۰۵ والمعانی للقتیبی ۴۳۹ ودیوانہ ۱۱ والسمط ۴ والمزوقی (۱: ۱۳۰) والمیدانی (۲: ۹۳) والبحر ۵: ۱۴۱ والکامل ۴ ولیستشن من ھذا المعنی ان یقع مفزع فی معنی اغاث فاللفظ من الاضداد۔ ۱۲

بعض نے فَزِعٌ کے معنی مستغیث کئے ہیں تو یہ لفظ فزع کے اصل معنی نہیں ہیں بلکہ معنی مقصود کی تشریح ہے۔

(ف س ح)

اَلْفُسْحُ وَالْفَسِیْحُ کے معنی وسیع جگہ کے ہیں اور تَفَسَّحَ کے معنی وسیع ہونے کے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
فَسَحْتُ مَجْلِسَهٗ میں نے اس کے لئے محفل میں جگہ کر دی تو وہ اس میں کھل کر بیٹھ گیا۔ قرآن میں ہے:۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِى الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ (۵۸-۱۱) اے مومنو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھ جایا کرو خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔
اسی سے فَسَحْتُ لِفُلَانٍ اَنْ يَّفْعَلَ كَذَا کا محاورہ ہے جس کے معنی وَسَّعْتُ لَهٗ کے ہیں هُوَ فِیْ فُسْحَةٍ مِنْ هٰذَا الْاَمْرِ وہ اس معاملہ میں آزاد ہے۔

(ف س د)

اَلْفَسَادُ یہ فَسَدَ (ن) اَلشَّیْءُ فَهُوَ فَاسِدٌ کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ یہ اصل میں صلاح کی ضد ہے اور نفس بدن اور ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو حالت استقامت سے نکل چکی ہو اور اَفْسَدَہٗ کے معنی کسی چیز کا توازن بگاڑنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۲۳-۷۱) تو آسمان و زمین ۔ ۔ ۔ سب درہم برہم ہو جائیں۔
لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱-۲۲) اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔
ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۳۰-۴۱) خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا۔
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲-۲۰۵) اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا۔
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ (۲-۱۱) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو۔
اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ (۲-۱۲) دیکھو! یہ بلاشبہ مفسد ہیں۔
لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (۲-۲۰۵) تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے اور کھیتی کو اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے۔
اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا (۲۷-۳۴) کہ بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰-۸۱) بیشک خدا شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲-۲۲۰) اور خدا خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔

(ف س ر)

اَلْفَسْرُ (ض ن) کے معنی کسی چیز کی معنوی صفت کو ظاہر کرنے کے ہیں اسی سے تَفْسِرَۃٌ ہے جس کے معنی قارورہ کی تشخیص کے ہیں اور مجازاً قارورۃ (پیشاب کی بوتل) کو تفسرۃ کہدیتے ہیں۔ التفسیر بھی الفسر کے ہم معنی ہے مگر اس میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں اور (عرف میں) تفسیر کا لفظ کبھی تو مفرد اور غریب الفاظ کی تشریح اور وضاحت پر بولا جاتا ہے اور کبھی خاص کر تاویل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ تاویل الرؤیا (خواب کی تعبیر) کی بجائے تفسیر الرؤیا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:۔

وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا (۲۵-۳۳) اور خوب مشرح۔ میں بھی تفسیر بمعنی تاویل استعمال ہوا ہے۔

(ف س ق)

فَسَقَ فُلَانٌ کے معنی کسی شخص کے دائرہ شریعت سے نکل جانے کے ہیں یہ فَسَقَ الرُّطَبُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی گدری کھجور کے اپنے چھلکے سے باہر نکل آنے کے ہیں (شرعاً) فسق کا مفہوم کفر سے اعم ہے کیونکہ فسق کا لفظ چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے گناہ کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اگرچہ عرف میں بڑے گناہوں کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اور عام طور پر فَاسِقٌ کا لفظ اس شخص کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو احکام شریعت کا التزام اور اقرار کرنیکے بعد تمام یا بعض احکام کی خلاف ورزی کرے اور کافر حقیقی پر فَاسِقٌ کا لفظ اس لئے بولا جاتا ہے کہ وہ حکم عقل یا فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ (۱۸-۵۰) تو اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہوگیا۔

فَفَسَقُوْا فِیْہَا (۱۷-۱۶) تو وہ نافرمانیاں کرتی ہیں۔

وَاَکْثَرُھُمُ الْفَاسِقُوْنَ (۳-۱۱۰) اور اکثر نافرمان ہیں۔

اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا (۳۲-۱۸) بھلا جو مومن ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہے۔

وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ (۲۴-۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکار ہیں۔

یعنی جو نعمت الٰہی کی ناشکری کریگا وہ دائرہ طاعت سے خارج سمجھا جائیگا۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰھُمُ النَّارُ (۳۲-۲۰) اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کے رہنے کے لئے دوزخ ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّھُمُ الْعَذَابُ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ (۶-۴۹) اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کی نافرمانیوں کے سبب انہیں عذاب ہوگا۔

وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ (۹-۲۴) اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ (۹-۶۷) بے شک منافق نافرمان ہیں۔

وَکَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیْنَ فَسَقُوْا (۱۰-۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد

نافرمانوں کے حق میں ثابت ہو کر رہا۔
اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا (۳۲-۱۸) بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو۔
یہاں فسق کا لفظ ایمان کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "فاسق" کافر سے اعم ہے مگر ظالم فاسق سے بھی عام ہے چنانچہ فرمایا۔
وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ اِلٰى قوله وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴-۴) اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں ..... اور یہی بدکار ہیں۔
اور چوہیا کو اس کی خباثت اور ضرارت کی بنا پر فُوَيْسِقَةٌ کہا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس کے بار بار اپنے بل سے باہر نکلنے کی وجہ سے اسے فُوَيْسِقَةٌ کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا فرمان ہے (۷۰) اُقْتُلُوا الْفُوَيْسِقَةَ فَاِنَّهَا تُوْهِي السِّقَاءَ وَتُضْرِمُ الْبَيْتَ عَلٰى اَهْلِهٖ کہ چوہیا کو مار ڈالو کیونکہ وہ پانی کی مشک میں سوراخ کر ڈالتی ہے اور گھروں میں آگ لگا دیتی ہے۔
ابن الاعرابی کا قول ہے کہ فاسق کا لفظ صرف قرآن کریم نے انسانوں کے لئے استعمال کیا ہے ورنہ جاہلیت میں یہ لفظ انسانوں کے لئے اس معنی میں نہیں بولا جاتا تھا بلکہ گدری کھجور کے متعلق فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا کا محاورہ استعمال ہوتا تھا۔

(ف ش ل)

اَلْفَشَلُ (س) کے معنی کمزوری کے ساتھ بزدلی کے ہیں قرآن میں ہے:۔
حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ (۳-۱۵۲) یہاں تک کہ تم نے ہمت ہار دی اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے۔
فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (۸-۴۶) تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔
لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ (۸-۴۳) تو تم لوگ جی چھوڑ دیتے اور (جو) معاملہ (درپیش تھا) اس میں جھگڑنے لگتے۔
تَفَشَّلَ الْمَاءُ پانی بہہ پڑا۔

(ف ص ح)

اَلْفُصْحُ کے معنی کسی چیز کے ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہونے ہیں اصل میں اس کا استعمال دودھ کے خالص ہونے پر ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔
فَصَحَ اللَّبَنُ وَاَفْصَحَ دودھ کے اوپر سے جھاگ اتار کر اسے بالکل صاف کر لینے کے ہیں اور جس دودھ کے اوپر سے جھاگ اتار کر اسے بالکل صاف کر لیا جائے اسے مُفْصِحٌ یا فَصِيْحٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مروی ہے [1] (الوافر)
(۳۴۰) وَتَحْتَ الرَّغْوَةِ اللَّبَنُ الْفَصِيْحُ
جھاگ کے نیچے خالص دودھ ہوتا ہے۔

---

[1] قالہ النضلۃ السلمی فی یوم غول واولہ :۔ ولم یخشوا مصالتہ علیھم وفی روایۃ المصرح بدل الفصیح والبیت فی الکامل ۱؍۸ فی خمسۃ واللسان (فصح) وفی مجالس ثعلب ۸ لرجل من بنی سلیم وفی البیان للجاحظ (۳: ۲۴۸) لابی محجن السلمی وفی مجموع المعانی (۵۵) الفضل السہمی وفیہ بسالتہ بدل مصالتہ۔

اور اسی سے فَصُحَ الرَّجُلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی کسی شخص کے خوش گفتار ہونے کے ہیں اور اَفْصَحَ کے معنی خالص عربی زبان میں گفتگو کرنے کے ہیں اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے بعض نے کہا ہے کہ فَصِیْحٌ نَاطِقٌ (یعنی انسان فرشتے وغیرہ) کو کہتے ہیں اور اَعْجَمِیٌّ کے معنی غیر ناطق (یعنی چوپایہ وغیرہ) کے ہیں۔ قرآن میں ہے:-

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (۲۸-۳۴) اور ہارون جو میرا بھائی ہے اس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

اسی سے اَفْصَحَ الصُّبْحُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی صبح کے روشن اور نمودار ہونے کے ہیں اور اَفْصَحَ النَّصَارٰی کے معنی عیسائیوں کے الیسٹر کی عید (یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے دوبارہ زندہ ہونے کا تہوار) منانے کے ہیں۔

(ف ص ل)

اَلْفَصْلُ کے معنی دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اسی طرح علیحدہ کر دینے کے ہیں کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اسی سے مُفَاصِلُ (جمع مَفْصَلٌ) ہے جس کے معنی جسم کے جوڑ کے ہیں اور فَصَلْتُ الشَّاةَ کے معنی بکری کے جوڑ کاٹ کر الگ الگ کر دینے کے ہیں۔ فَصَلَ الْقَوْمُ عَنْ مَکَانِ کَذَا قوم کا کسی جگہ سے روانہ ہونا۔ قرآن میں ہے:-

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ (۱۲-۹۴) اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا۔

اور یہ اقوال اور اعمال دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن میں ہے:-

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُهُمْ اَجْمَعِیْنَ (۴۴-۴۰) کچھ شک نہیں کہ فیصلے کا دن سب کے اٹھنے کا دن ہے۔

هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ (۷۷-۳۸) یہی فیصلے کا دن ہے۔

یعنی آج اللہ تعالیٰ حق کو باطل سے الگ کر دیگا اور لوگوں کے درمیان (انصاف سے) فیصلہ کر دیا جائے گا چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:-

یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ ..... (۱۲-۱۷) (ان سب) میں .... فیصلہ کر دے گا۔

وَهُوَ خَیْرُ الْفَاصِلِیْنَ (۶-۵۷) اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اور فَصْلُ الْخِطَابِ (۳۸-۲۰) کے معنی فیصلہ کن بات کے ہیں اور یہی معنی حُکْمٌ فَیْصَلٌ و لِسَانٌ مِفْصَلٌ کے ہیں۔

اَلتَّفْصِیْلُ واضح کر دینا کھولکر بیان کر دینا چنانچہ فرمایا:-

وَکُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِیْلًا (۱۷-۱۲) اور ہم نے ہر چیز کی (بخوبی) تفصیل کر دی ہے۔

اور آیت کریمہ:-

الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (۱۱-۱) یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔

میں آیت کریمہ:-

تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّرَحْمَةً (۱۶-۸۹) کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت ..... ہے۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

فَصِيْلَةُ الرَّجُلِ آدمی کا خاندان جو اس سے الگ ہوتا ہے جیسے اولاد وغیرہ۔ قرآن میں ہے:۔
وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُؤْوِيْهِ (۷۰-۱۳) اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا۔
اَلْفِصَالُ کے معنی بچے کا دودھ چھڑانا کے ہیں قرآن میں ہے:۔
فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا (۲-۲۳۳) اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضامندی ...... سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں۔
وَفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (۳۱-۱۴) اور (آخر کار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔
اسی سے اَلْفَصِيْلُ (یعنی دودھ چھڑایا ہوا بچہ) ہے لیکن یہ خاص کر اونٹ کے بچہ پر بولا جاتا ہے
اَلْمُفَصَّلُ قرآن پاک کی آخری منزل کو کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں چھوٹی چھوٹی سورتوں میں تمام قصے الگ الگ بیان کئے گئے ہیں۔
اَلْفَوَاصِلُ اواخر آیات۔
اور فَوَاصِلُ الْقِلَادَةِ ان بڑے موتیوں کو کہا جاتا ہے جو ہار کے اندر چھوٹے موتیوں کے درمیان فاصلہ کے لئے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ (۱)
مَنْ اَنْفَقَ نَفَقَةً فَاصِلَةً فَلَهٗ مِنَ الْاَجْرِ كَذَا یعنی جس نے اتنا زیادہ خرچ کیا جس سے حق و باطل کے درمیان فاصلہ ہو جائے تو اس کے لئے اتنا اور اتنا اجر ہے۔

(ف ض ض)

اَلْفَضُّ کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں جیسے فَضَّ خَتْمَ الْكِتَابِ خط کی مہر کو توڑنا اسی سے اِنْفَضَّ الْقَوْمُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی متفرق اور منتشر ہو جانے کے ہیں قرآن میں ہے:۔
وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (۶۲-۱۱) اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو ادھر بھاگ جاتے ہیں۔
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳-۱۵۹) تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔
اَلْفِضَّةُ (۳-۱۳) چاندی یعنی وہ ادنیٰ جوہر جس کے ذریعہ لین دین کیا جاتا ہے۔
دِرْعٌ فَضْفَاضَةٌ وَفَضْفَاضٌ فراخ زرہ۔

(ف ض ل)

اَلْفَضْلُ کے معنی کسی چیز کے اقتصاد (متوسط درجہ) سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے (۱) محمود جیسے علم وحلم وغیرہ کی زیادتی (۲) مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا۔ لیکن عام طور اَلْفَضْلُ اچھی باتوں پر بولا جاتا ہے۔ اور اَلْفُضُوْلُ بری باتوں میں اور جب فضل کے معنی ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) برتری بلحاظ جنس کے جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔
(۲) برتری بلحاظ نوع کے جیسے نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا:۔
وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ..... وَفَضَّلْنٰهُمْ

---

(۱) انظر تحریف الصحاح للجوہری (فصل) وفی (حم ع والشاشی) من عبیدة بن الجراح فاضلة بالضاد المعجمة انظر کنز العمال ۶: رقم ۲۲۹۸

عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (۱۷-۷۰) اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ..... اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

(۳) فضیلت بلحاظ ذات مثلاً ایک شخص کا دوسرے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی فضیلت بلحاظ جوہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا۔ مثلاً گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لئے اس کا اکتساب عین ممکن ہے چنانچہ آیات کریمہ :۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (۱۶-۷۱) اور خدا نے رزق (ودولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (۱۷-۱۲) تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔

میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اور آیت کریمہ :۔

بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۴-۳۴) اس لئے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے۔ میں انسان کے ان ذاتی امتیازات کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اسے خاص طور پر نوازا جاتا ہے مثلاً مال وجاہ عزت اور قوت وغیرہ نیز فرمایا :۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّيْنَ عَلٰى بَعْضٍ (۱۷-۵۵) اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت بخشی

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ (۴-۹۵) خدا نے ..... جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں زیادہ فضیلت بخشی ہے۔

اور ہر اس عطیہ کو جو دینے والے پر لازم نہیں ہوتا وہ فضل کہلاتا ہے جیسے فرمایا :۔

وَاسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (۴-۳۲) اور خدا سے اس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ (۵-۵۴) یہ خدا کا فضل ہے۔

ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ..... (۳-۷۴) بڑے فضل کا مالک ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ (۱۰-۵۸) کہدو کہ (یہ کتاب) خدا کے فضل سے ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ (۴-۸۳) اور اگر ... خدا کا فضل نہ ہوتا۔

(ف ض ی)

اَلْفَضَاءُ کے معنی وسیع جگہ کے ہیں اور اسی سے اَفْضٰی بِيَدِهٖ اِلٰى كَذَا کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی جگہ پر ہاتھ پہنچ جانے کے ہیں اور اَفْضٰی اِلَى امْرَاَتِهٖ عورت سے جماع کرنے سے کنایہ ہوتا ہے اور یہ خلا بھا کے محاورہ سے زیادہ صریح ہے۔ قرآن میں ہے :

وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (۴-۲۱) تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو۔

شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۴۱) طَعَامُهُمْ فَوْضٰى فَضًا فِيْ رِحَالِهِمْ

---

[1] قاله المعذل بن عبدالله اليشكري احد بني قيس بن ثعلبة والمعجم للمرزباني ۳۸۸ والشعراء ۲۹ (۸۳/۲) يمدح العتيك رهط انس بن مدرك الخثعمي في خمسة ابيات وعجزه : ولا يحسنون الشر الا تنادیا وفي اللسان (فضا رفيض) ولا يحسبون السوء ..... والبيت في الحماسة بشرح المرزوقي رقم ۱۹۷ في خمسة وابن ولاد ۹۵ ❊

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

ان کے گھروں میں طعام منتشر اور بکھرا پڑا ہے۔

(ف ط ر)

اَلْفَطْرُ (ن ض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو پہلی مرتبہ (طولاً) پھاڑنے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ فَطَرَ فُلَانٌ کَذَا فَطْرًا کسی چیز کو پھاڑ ڈالنا۔ اَفْطَرَ ھُوَ فُطُوْرًا روزہ افطار کرنا اِنْفَطَرَ اِنْفِطَارًا پھٹ جانا اور آیت کریمہ:۔ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷-۳) بھلا تجھ کو کوئی شگاف نظر آتا ہے۔ میں فُطُوْرٌ کے معنی خلل اور شگاف کے ہیں اور یہ پھاڑنا کبھی کسی چیز کو بگاڑنے اور کبھی مبنی بر مصلحت ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا۔ (۷۳-۱۸) (اور) جس سے آسمان پھٹ جائیگا یہ اس کا وعدہ (پورا) ہو کر رہے گا۔ فَطَرْتُ الشَّاةَ میں نے بکری کو دو انگلیوں سے دوہا۔ فَطَرْتُ الْعَجِيْنَ آٹا گوندھ کر فوراً اور (روٹی) پکانا (اسی سے فِطْرَةٌ ہے جس کے معنی تخلیق کے ہیں اور فَطَرَ اللهُ الْخَلْقَ کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق اسطرح کی ہے کہ اس میں کچھ کرنے کی استعداد موجود ہے پس آیت کریمہ:۔ فِطْرَةَ اللهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰-۳۰) اور خدا کی فطرت کو جس پر لوگوں کو پیدا کیا (اختیار کئے رہو) میں اس معرفت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو تخلیقی طور پر انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے لہٰذا فطرۃ اللہ سے معرفت الٰہی کی استعداد مراد ہے جو انسان کی جبلت میں پائی جاتی ہے چنانچہ آیت:۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللهُ (۴۳-۸۷) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔ میں اسی قوت معرفت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۵-۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اَلَّذِیْ فَطَرَهُنَّ (۲۱-۵۶) جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا (۲۰-۷۲) اور جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ (۷۳-۱۸) (اور) جس سے آسمان پھٹ جائے۔ میں ہو سکتا ہے کہ انفطار سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر فیضان ہوگا۔ وہ اسے قبول کرلے گا۔ اَلْفِطْرُ روزہ افطار کرنا۔ کہا جاتا ہے۔ فَطَرْتُهٗ وَاَفْطَرْتُهٗ وَاَفْطَرَ هُوَ یعنی لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور كَمْاَةٌ (کھمبی) کو فُطْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہے۔

(ف ظ ظ)

اَلْفَظُّ کے معنی بدمزاج کے ہیں اور یہ اس فَظٌّ سے مستعار ہے جس کے معنی اونٹ کے اوجھری میں جمع رہنے والا پانی کے ہیں جو سخت ضرورت کے وقت بادل نخواستہ پیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ (۳-۱۵۹) اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے۔

(ف ع ل)

اَلْفِعْلُ کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تاثیر عمدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عمدگی کے ہو اور علم سے ہو یا بغیر علم کے قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے پھر وہ تاثیر انسان کی طرف سے ہو یا دوسرے حیوانات اور جمادات کی طرف سے ہو یہی معنی لفظ عمل کے ہیں۔ مگر لفظ صُنْع ان دونوں سے اخص ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ (۲-۱۹۷) اور جو نیک کام تم کروگے وہ خدا کو معلوم ہو جائیگا۔

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا (۴-۳۰) اور جو تعدی و ظلم سے ایسا کرے گا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (۵-۶۷) اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔

یعنی اگر تم نے یہ حکم نہ پہنچایا تو گویا تم نے تبلیغ کی ہی نہیں۔ اور جس پر فاعل اپنا فعل کرتا ہے اسے مُنْفَعِلٌ اور مفعول کہا جاتا ہے۔

بعض نے مفعول اور منفعل میں یہ فرق کیا ہے کہ فاعل کے فعل کے اعتبار سے اسے مفعول کہا جاتا ہے اور فعل کا اثر۔۔۔ قبول کر لینے کے لحاظ سے اسے منفعل کہا جاتا ہے پس مفعول منفعل سے اعم ہے کیونکہ منفعل تو اس اثر کو بھی کہا جاتا ہے جو فاعل سے صادر تو ہو مگر اس نے اس کے ایجاد کا ارادہ نہ کیا ہو جیسے خجالت کی سرخی جو کسی انسان کو دیکھ کر عارض ہو جاتی ہے اور طرب جو رقص وسرود کے سننے سے حاصل ہوتا ہے یا عاشق اپنے معشوق کو دیکھ کر بلا اختیار وجد میں آجاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر فعل کو انفعال کہہ سکتے ہیں۔ بجز ابداع کے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی جانب منسوب ہوتا ہے کیونکہ ابداع کے معنی عدم سے وجود میں لانے کے ہیں اور یہ کسی جوہر یا عرض پر عمل کا نام نہیں ہے بلکہ جوہر کو وجود میں لانے کا نام ہے۔

(ف ق د)

اَلْفَقْدُ کے معنی ہیں کسی چیز کے وجود کے بعد اس کا نہ پایا جانا۔۔۔۔۔ اور یہ عدم سے اخص ہے کیونکہ عدم فقد کو بھی کہتے ہیں۔ اور کسی چیز کے سرے سے موجود نہ ہونے کو بھی قرآن میں ہے۔

مَاذَا تَفْقِدُونَ۔ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ۔ (۱۲-۷۱، ۷۲) تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے وہ بولے کہ بادشاہ کے پانی پینے کا گلاس کھویا گیا۔

اور تفقد کے معنی تعہد یعنی کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے ہیں لیکن اصل میں تَفَقُّدٌ کے معنی کسی چیز کے گم ہونے کو معلوم کر لینے کے ہیں اور تَعَهُّدٌ عہد متقدم (پرانی ملاقات) کو پہچان لینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ (۲۷-۲۰) انہوں نے جانوروں

---

[1] راجع (ص ن ع) (ع م ل)۔

کا جائزہ لیا۔
اور فاقِدٌ اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا لڑکا یا خاوند فوت ہوگیا ہو۔

(ف ق ر)

اَلْفَقْرُ کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔
۱۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کا نہ پایا جانا اس اعتبار سے انسان کیا کائنات کی ہر شے فقیر و محتاج ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔
یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ (۳۵-۱۵) لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو۔
اور الانسان میں اسی قسم کے احتیاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔
وَمَا جَعَلْنٰھُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ (۲۱-۸) اور ہم نے ان کے لیے جسم نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھائیں۔
۲۔ ضروریات زندگی کا کما حقہ پورا نہ ہونا چنانچہ اس معنی میں فرمایا:۔
لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا ...... مِنَ التَّعَفُّفِ (۲-۲۷۳) تو ان حاجت مندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔
اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ (۲۴-۳۲) اگر وہ مفلس ہونگے تو خدا ان کو اپنے فضل سے خوشحال کر دے گا۔
اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ (۹-۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں .... کا حق ہے۔
۳۔ فَقْرُ النَّفْسِ یعنی مال کی ہوس چنانچہ فقر کے اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت نے فرمایا (۲۷)[1]
کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا۔ کچھ تعجب نہیں کہ فقر کفر کی حد تک پہنچا دے اس کے بالمقابل غنیٰ کے معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ (غنا تو نفس کی بے نیازی کا نام ہے۔ اور اسی معنی میں حکماء نے کہا ہے۔
مَنْ عَدِمَ الْقَنَاعَۃَ لَمْ یُفِدْہُ الْمَالُ غِنًی جو شخص قناعت کی دولت سے محروم ہو اسے مالداری کچھ فائدہ نہیں دیتی۔
۴۔ اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج جس کی طرف آنحضرت نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا (۲۸)[2]
اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْکَ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَآءِ عَنْکَ (اے اللہ مجھے اپنا محتاج بنا کر غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کرکے فقیر نہ بنا) اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔
رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ

---

[1] اخرجہ ابو مسلم الکشی فی سننہ والبیہقی فی الشعب من روایۃ یزید الرقاشی عن انس مرفوعا ویزید ضعیف وتمام الحدیث وکاد الحسد یغلب القدر رواہ ابن عدی فی الکامل ورواہ الطبرانی فی الاوسط بلفظ وکادت الحاجۃ ان یکون کفرا وفیہ ایضا ضعف نعم ورد فی النسائی عن ابی سعید الخدری انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول: اللھم انی اعوذ بک من الکفر والفقر الحدیث راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ار،۲۳ و ۳۰ر۷ والمقاصد للسخاوی رقم ۷۸۹ [2] متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ وللدیلمی بلا سند رفعہ عن انس: الغنی غنی النفس والفقر فقر النفس ورواہ العسکری من حدیث ابی ذر ولکن فیہ القلب بدل النفس وفی معناہ اشعار لیعقوب الکندی نقلہ السخاوی فی المقاصد رقم ۷۳۲

(۸۹-۲۴) کہ پروردگار میں اس کا محتاج ہوں کہ
تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔
اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[1] ( )
(۳۴۲) وَيُعْجِبُنِيْ فَقْرِيْ اِلَيْكَ وَلَمْ يَكُنْ
يُعْجِبُنِيْ لَوْلَا مَحَبَّتُكَ الْفَقْرُ
(مجھے تمہارا محتاج رہنا اچھا لگتا ہے اگر تمہاری
محبت نہ ہوتی تو یہ بھلا معلوم نہ ہوتا)
اور اس معنی میں اِفْتَقَرَ فَهُوَ مُفْتَقِرٌ وَفَقِيْرٌ
استعمال ہوتا ہے اور فَقُرَ کا لفظ اگرچہ قیاس
کے مطابق ہے۔ لیکن لغت میں مستعمل نہیں ہوتا۔
اَلْفَقِيْرُ دراصل اس شخص کو کہتے ہیں جس کی
ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو چنانچہ محاورہ ہے:۔
فَقَرَتْهُ فَاقِرَةٌ یعنی مصیبت نے اس کی کمر
توڑ دی اَفْقَرَكَ الصَّيْدُ فَارْمِهٖ یعنی شکار
نے تجھے اپنی کمر پر قدرت دی ہے لہٰذا تیر ماریئے
بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلْفُقْرُ سے ہے جس کے معنی
حُفْرَةٌ یعنی گڑھے کے ہیں اور اسی سے فقیر
ہر اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں بارش کا پانی جمع
ہو جاتا ہے۔
فَقَرْتُ لِلْفَسِيْلِ میں نے پودا لگانے کے لئے
گڑھا کھودا شاعر نے کہا ہے[2] (الرجز)
(۳۴۳) مَا لَيْلَةُ الْفَقِيْرِ اِلَّا شَيْطَانُ
کہ فقیر میں رات بھی شیطان کی مثل ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ یہاں الفقیر ایک کنویں کا
نام ہے۔
فَقَرْتُ الْخَرَزَ میں نے منکوں میں سوراخ کیا۔
اَفْقَرْتُ الْبَعِيْرَ اونٹ کی ناک چھید
کر اس میں مہار ڈالنا۔

(ف ق ع)

اَصْفَرُ فَاقِعٌ کے معنی گہرے زرد رنگ
کے ہیں اور یہ اصفر کی تاکید ہے جس طرح اَسْوَدُ
حَالِكٌ میں حَالِكٌ کا لفظ اَسْوَدُ کی تاکید
بن کر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
صَفْرَاءُ فَاقِعٌ (۲-۶۹) گہرا زرد رنگ۔
فَقْعٌ ایک قسم کی کھمبی ہے جس کے ساتھ ذلیل
آدمی کو تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ هُوَ اَذَلُّ
مِنْ فَقْعٍ بِقَاعٍ وہ جنگل کی کھمبی سے بھی زیادہ
ذلیل ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ شراب کو فُقَّاعٌ
اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس پر جھاگ ابھر آتی ہے
اور تشبیہ کے طور پر پانی کے بلبلے کو بھی فَقَاقِيْعُ
الْمَاءِ بولتے ہیں۔

(ف ق ہ)

اَلْفِقْهُ کے معنی علم حاضر سے علم غائب تک
پہنچنے کے ہیں اور یہ علم سے اخص ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ
حَدِيْثًا (۴-۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات
بھی نہیں سمجھ سکتے۔
وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ (۱۷-۴۴) لیکن تم ....
.... نہیں سمجھتے۔
عِلْمُ الْفِقْهِ احکام شریعت کے جاننے کا
نام ہے فَقُهَ الرَّجُلُ فَقَاهَةً فقیہ بن جانا فَقِهَ
فِقْهًا وَتَفَقَّهَ کسی چیز کو سمجھ لینا۔

---

[1] لم اجدہ فی المراجع ۱۲ ✤ ✤ [2] قالہ الراجز ولیعدہ، مجنونۃ تودی بروح الانسان دنی الفائق ۱۲: ۳۴۳ ، یعقل الانسان
والرجز فی اللسان والصحاح (فقر) والجمان ۵۴۳ وفی اللسان (ذقر)، ۔ مجزءہ تودی قرع الاسنان ✤ ✤ ✤

تَفَقَّہَ علم فقہ حاصل کرکے اس میں تخصیص حاصل کرلینا۔ قرآن میں ہے:۔

لِیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ (۹-۱۲۲) تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے۔

(ف ك ك)

اَلْفَکُّ اس کے اصل معنی جدا کر دینے کے ہیں جیسے فَکُّ الرَّھْنِ گروی چیز کو چھڑانا فَکُّ الرَّقَبَۃِ گردن کا آزاد کرنا۔ اور آیت کریمہ:۔

فَکُّ رَقَبَۃٍ (۹۰-۱۳) کسی کی گردن کا چھڑانا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ غلام کو آزاد کرانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کلمات طیبہ اور اعمال صالحہ کے ذریعہ انسان کا اپنے آپ اور دوسروں کو عذاب الٰہی سے آزاد کرانا مراد ہے۔ لیکن دوسروں کو بھی آزاد کرا سکتا ہے جب پہلے اپنے آپ کو رہا کرولے ورنہ جو شخص خود ہدایت یافتہ نہیں ہے وہ دوسروں کو کب ہدایت کر سکتا ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب "مکارم الشریعہ" میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں:۔

اَلْتِّفْکَاکُ کے معنی کمزوری کی وجہ سے شانہ کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کے ہیں۔ اور دونوں چیزوں کے ملنے کی جگہ کو فَکَّانِ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ (۹۸-۱) جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرک وہ کفر سے باز آنے والے نہ تھے۔

میں مُنْفَکِّیْنَ کے معنی یہ ہیں کہ (البینۃ کے آنے تک ان میں اختلاف نہیں تھا بلکہ سب گمراہی پر متفق تھے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا:۔

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (۲-۲۱۳) (پہلے تو سب) لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا۔

مَا انْفَکَّ یَفْعَلُ کَذَا وہ برابر ایسے کرتا رہا۔

(ف ك ر)

اَلْفِکْرَۃُ اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے اور تَفَکُّرٌ کے معنی نظر عقل کے مطابق اس قوت کو جولانی دینے کے ہیں۔ اور غور وفکر کی استعداد صرف انسان کو دی گئی ہے دوسرے حیوانات اس سے محروم ہیں اور تَفَکَّرَ فِیْہِ کا لفظ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جس کا تصور دل (ذہن) میں حاصل ہو سکتا ہو اسی لئے مروی ہے[1] (۴۷) تَفَکَّرُوْا فِیْ آلَاءِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِی اللّٰہِ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں پر تو غور کیا کرو لیکن خدا کی ذات میں کبھی غور نہ کرو (کہ وہ کیسی ہے) کیونکہ اس کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آسکتا اور وہ صورت کے ساتھ متصف ہونے سے منزہ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ (۳۰-۸) کیا انہوں نے اپنے دل

---

[1] الحدیث فی اللسان (۱۱) (۱) ابوالشیخ طس عدھب -عن ابن عمر وفیہ الفرات بن نافع متروک وتقدم فی (ال د) وفی روایۃ عن ابن عباس بتفکروا فی خلق اللّٰہ ولا تفکروا فی اللّٰہ فانکم لا تقدرون قدرہ رواہ فی الحلیۃ باسناد ضعیف والاصبہانی فی الترغیب والترھیب من وجہ آخر اصح منہ وفی ابن ابی شیبۃ فی کل شیء مدل فی آلاء اللّٰہ قال السخاوی فی المقاصد رقم ۳۴۲ واسانیدہا ضعیفۃ لکن اجتماعہا یکتسب قوۃ والمعنی صحیح وراجع ایضاً تخریج العراقی علی الاحیاء (۴ : ۴۳۴)

میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں کو... پیدا کیا ہے۔
اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِنْ جِنَّةٍ (۷-۱۸۴) کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے رفیق (محمد ﷺ) کو کسی طرح کا بھی جنون نہیں ہے۔
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰-۲۱) جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لئے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں۔
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ. فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲-۲۱۹/۲۲۰) تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں۔
رَجُلٌ فِكِّيْرٌ بہت زیادہ غور و فکر کرنے والا۔
بعض ادباء کا خیال ہے کہ لفظ فِکْرٌ دراصل فَرْكٌ سے مقلوب ہے لیکن فکر کا لفظ معانی کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے معنی معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لئے اس کے بارے میں چھان بین کرنے کے ہیں۔

(ف ك ه)

اَلْفَاكِهَةُ۔ بعض نے کہا ہے کہ فَاكِهَة کا لفظ ہر قسم کے میوہ جات پر بولا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ انگور اور انار کے علاوہ باقی میوہ جات کو فَاكِهَة کہا جاتا ہے۔ اور انہوں نے ان دونوں کو اس لئے مستثنیٰ کیا ہے کہ (قرآن میں) ان دونوں کو فاکہہ پر عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فاکہہ کے غیر ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ (۵۶-۲۰) اور میوے جس طرح کے ان کو پسند ہوں۔
وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ (۵۶-۲۰) اور میوہ ہائے کثیرہ (کے باغوں) میں۔
وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا (۸۰-۳۱) اور میوے اور چارہ۔
فَوَاكِهُ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ (۳۷-۴۲) (یعنی) میوے اور ان کا اعزاز کیا جائیگا۔
وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (۷۷-۴۲) اور میووں میں جو ان کو مرغوب ہوں۔
اَلْفُكَاهَةُ خوش طبعی کی باتیں خوش گپی۔
اور آیت کریمہ:
فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ (۵۶-۶۵) اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ گے۔
میں بعض نے تَفَكَّهُوْنَ کے معنی خوش طبعی کی باتیں بنانا لکھے ہیں اور بعض نے فروٹ تناول کرنا۔
اسی طرح آیت کریمہ:۔
فَاكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ (۵۲-۱۸) جو کچھ ان کے پروردگار نے ان کو بخشا اس کی وجہ سے خوش حال......
میں فَاكِهِيْنَ کی تفسیر میں بھی دونوں قول منقول ہیں۔

(ف ل ح)

اَلْفَلْحُ کے معنی پھاڑنا کے ہیں مثل مشہور ہے اَلْحَدِيْدُ بِالْحَدِيْدِ يُفْلَحُ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اس لئے فَلَّاحٌ کسان کو کہتے ہیں۔ (کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتا ہے) اور فَلَاحٌ کے معنی کامیابی اور مطلب وری کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے دنیوی اور اخروی۔ فلاح دنیوی ان سعادتوں کو حاصل کر لینے کا نام ہے جن سے دنیوی زندگی خوشگوار بنتی ہو یعنی بقاء، مال اور عزت و دولت۔ چنانچہ شاعر نے اسی

معنی کے مدنظر کہا ہے[1] (مخلع البسیط)

(۲۴۴) اَفْلِحْ بِمَا شِئْتَ فَقَدْ يُدْرَكُ بِالضُّ
عْفِ وَقَدْ يُخْدَعُ الْاَرِيْبُ

جس طریقہ سے چاہو خوش عیشی کرو کبھی کمزور کامیاب ہو جاتا ہے اور چالاک دھوکا کھا جاتا ہے۔

اور فلاح اخروی چار چیزوں کے حاصل ہو جانے کا نام ہے بقا بلا فنا، غنا بلا فقر، عزت بلا ذلت، علم بلا جہل اسی لئے کہا گیا ہے[2] (۲۵) لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ کہ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے اور اسی فلاح کے متعلق فرمایا۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹-۶۴) اور زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے۔

اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸-۲۲) (اور) سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۸۷-۱۴) بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹۱-۹) جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچ گیا۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲۳-۱) بے شک ایمان والے رستگار ہو گئے۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲-۱۸۹) تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۲۳-۱۱۷) کچھ شک نہیں کہ کافر رستگاری نہیں پائیں گے۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۷-۸) وہ نجات پانے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى (۲۰-۶۴) اور آج جو غالب رہا وہی کامیاب ہوا۔

میں یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے فلاح دنیوی مراد لی ہو بلکہ یہی معنی (بلحاظ قرآن) اقرب الی الصحت معلوم ہوتے ہیں۔

اور سَحُوْرٌ یعنی طعام سحر کو بھی فَلَاحٌ کہا گیا ہے کیونکہ اس وقت حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کی آواز بلند کی جاتی ہے اور اذان میں حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے معنی یہ ہیں کہ اس کامیابی کی طرف آؤ جو نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھی ہے اور حدیث[3] (۲۶) حَتّٰى خَشِيْنَا اَنْ يَفُوْتَنَا الْفَلَاحُ (حتیٰ کہ فلاح کے فوت ہو جانے کا ہمیں اندیشہ ہوا) میں بھی فَلَاح سے مراد وہ کامیابی ہے جو صلاۃ عشا ادا کرنے کی وجہ سے ہمارے لئے مقدر کی گئی ہے۔

---

[1] داولہ: حتی تری حباجیا تطرح دھو فی الصحاح والتاج (فلح)، والقرطبی ۱۲/۱۵۸ وقد ذھب مثلاً انظر المیدانی رقم ۱۲ والفرائد ۱/۲۸ وشرح المعلقات لابن الانباری ۱۸ وفیہ اولہ: قد علمت خیلک این الصحیح ولم اراحداً نسبہ۔ قالہ عبید بن الابرص فی قصیدۃ من الھجز والبسیط فی ۴۸ بیتا وکثیر منھا جارعلی مخلع وکثیر منھا مختلف الوزن والشاعر لایحسن القریض قال فیہ المعری: وقد یخطی الرأی المرؤ وھو حازم۔ کما اختل فی وزن القریض عبید والبیت فی الجمھرۃ ۱۴۷ والشعر والشعراء (۱: ۲۲۶) والغریب للقتیبی ۳۹ ومجاز القرآن (۱: ۳۰) والقرطبی (۱: ۱۵۸) والطبری (۱: ۱۰۸) واللسان والمحکم (فلح) وفیہا بالنوک بدل بالضعف وابن خالویہ فی اعرابہ ۱۰۰ والحیوان (۳: ۸۹) فی خمستہ ابیات وفی روایۃ فقد یبلغ بدل یدرک ۱۲ [2] رواہ الشیخان عن انسؓ وفی الباب عن سہل وقد مر ۱۲ [3] انظر للحدیث الفائق ۲/۲۷۴ واصحاب السنن ۱۲

(ف ل ق)

اَلْفَلْقُ (ض) کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے اور اس کے ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے:۔
فَلَقْتُهٗ میں اسے پھاڑ دیا فَانْفَلَقَ چنانچہ وہ چیز پھٹ گئی۔ قرآن میں ہے:۔
فَالِقُ الْاِصْبَاحِ (۶-۹۶) وہی رات کے اندھیرے سے صبح کی روشنی پھاڑ نکالتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی (۶-۹۵) بیشک خدا ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر ان سے درخت وغیرہ اگاتا ہے۔
فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (۲۶-۶۳) تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑہ یوں ہوگیا گویا بڑا پہاڑ ہے۔
اور دو ٹیلوں کے درمیان پست جگہ کو بھی فَلَقٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳-۱) کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔
میں فَلَقٌ سے مراد صبح ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے نہریں مراد ہیں جن کا کہ آیت:۔
اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَا اَنْهٰرًا (۲۷-۶۱) بھلا کس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے بیچ نہریں بنائیں۔
میں تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اور بعض نے وہ کلمہ مراد لیا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم دی تھی اور انہوں نے اس کی برکت سے سمندر پھاڑ دیا تھا اور فِلْقٌ بمعنی مَفْلُوْقٌ ہے جس طرح نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ اور نِكْثٌ بمعنی مَنْكُوْثٌ آتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فِلْقٌ اور فَيْلَقٌ کے معنی تعجب کے ہیں اور دو پہاڑوں کی درمیانی جگہ کو فَلِيْقٌ و فَالِقٌ کہا جاتا ہے اور اونٹ کی دو کوہان کے درمیانی حصہ کو کو بھی فَلِيْقٌ و فَالِقٌ کہتے ہیں۔

(ف ل ك)

اَلْفُلْكُ کے معنی سفینہ یعنی کشتی کے ہیں اور یہ واحد و جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن دونوں میں اصل کے لحاظ سے اختلاف ہے فُلْكٌ اگر مفرد کے لئے ہو تو یہ بروزن قُفْلٌ ہوگا۔ اور اگر بمعنی جمع ہو تو حُمُرٌ کی طرح ہوگا۔
قرآن میں ہے:۔
حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ (۱۰-۲۲) یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو۔
وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ (۲-۱۶۴) اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں .... رواں ہیں۔
وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ (۱۶-۱۴) اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔
وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (۴۳-۱۲) اور تمہارے لئے کشتیاں اور چار پائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔
اور فَلَكٌ کے معنی ستاروں کا مدار (مَجْرٰی) کے ہیں اور اسے فُلْكٌ یعنی کشتی نما ہونے کی وجہ سے فلک کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶-۴۰) سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

اور فَلْكَةُ الْمِغْزَلِ کے معنی چرخے کا دم کڑہ کے ہیں اور اسی سے فَلَكٌ ثَدْيُ الْمَرْءَةِ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں عورت کی چھاتی کے دم کڑہ کی طرح ابھر آنے کے ہیں اور فَلَّقْتُ الْجَدْيَ کے معنی بکری کے بچے کی زبان پھاڑ کر اس میں پھرکی سی ڈال دینے کے ہیں تاکہ وہ اپنی ماں کے پستانوں سے دودھ نہ چوس سکے۔

(ف ل ن)

فُلَانٌ وَفُلَانَةٌ انسانوں کے ناموں کے لئے بطور کنایہ بولا جاتا ہے اور اَلْفُلَانُ وَالْفُلَانَةُ (یعنی الف لام کے ساتھ) انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات کے لئے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔

يَا وَيْلَتٰى لَيْتَنِي لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا (۲۵-۲۸) ہائے شامت کاش میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔

آیت میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص باطل پرستی میں اپنے دوستوں اور آشناؤں کا ساتھ دینے پر اظہار ندامت کریگا اور کہنے گا کاش میں فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا لہٰذا یہ۔

اس آیت کے ہم معنی ہے۔

اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِينَ (۴۳-۶۷) جو آپس میں دوست ہیں اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار (کہ باہم دوست ہی رہینگے

(ف ن ن)

اَلْفَنَنُ۔ کے معنی اس شاخ کے ہیں جس پر تروتازہ پتے ہوں اس کی جمع اَفْنَانٌ آتی ہے پس آیت کریمہ:۔

ذَوَاتَا اَفْنَانٍ (۵۵-۴۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں۔ کے معنی ہری بھری شاخوں والے درختوں کے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے انواع واقسام کے درخت مراد ہوں۔

(ف ن د)

اَلْفَنَدُ کے معنی رائے کی کمزوری کے ہیں اس سے اَلتَّفْنِيدُ (تفعیل) ہے جس کے معنی کسی کو کمزور رائے یا فاتر العقل بتانے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُونِ (۱۲-۹۴) اگر مجھ کو یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے۔

بعض نے اس کے معنی تَلُوْمُوْنِي یعنی ملامت کے لکھے ہیں لیکن اس کے اصل معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں اور اَلْاِفْنَادُ (افعال) کے معنی بہکی بہکی باتیں کرنے کے ہیں۔ اور فَنَدٌ اصل میں پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اور اسی سے بوڑھے کھوسٹ کو فَنَدٌ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ بھی عمر کی انتہا کو پہنچ چکا ہوتا ہے)۔

(ف ه م)

اَلْفَهْمُ انسان کی اس ذہنی قوت کا نام ہے جس سے وہ مطالب کو بہتری اور عمدگی کے ساتھ اخذ کر لیتا ہے اور فَهِمْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو اچھی طرح سمجھ لینے کے ہیں اور آیت کریمہ:۔

فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ (۲۱-۷۹) ہم نے فیصلہ

---

[1] کذا ذکرہ صاحب التاج والمحیط وانظر ایضًا الکشاف ۱۲

کرنے کا طریقہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا۔
پس تفہیم کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوتِ فہم میں اضافہ کر دیا جس کے ذریعہ انہوں نے نزاع کی حقیقت کو پالیا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کی حقیقت ان کے قلب پر القا کر دی۔
اَفْهَمْتُهٗ کے معنی کسی کو کچھ سمجھا دینے کے ہیں اور استفہام کے معنی کسی چیز کے سمجھنے کی طلب کے ہیں۔

(ف و ت)

اَلْفَوْتُ (ن) ہاتھ سے نکل جانا کسی چیز کا انسان سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لیے دشوار ہو۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ (۶۰-۱۱) اور اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی عورت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس چلی جائے۔
لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ (۵۷-۲۳) تاکہ جو مطلب تم سے فوت ہو گیا ہے۔ اس کا غم نہ کھایا کرو۔
وَلَوْ تَرٰى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ (۳۴-۵۱) اور کاش تم دیکھو جب یہ گھبرا جائیں گے تو عذاب سے بچ نہیں سکیں گے۔
یعنی جس عذاب سے وہ گھبرائیں گے اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ محاورہ ہے:۔
هُوَ مِنِّيْ فَوْتَ الرُّمْحِ وہ میرے نیزے کی دسترس سے باہر ہے۔
جَعَلَ اللّٰهُ رِزْقَهٗ فَوْتَ فَمِهٖ (اللہ اس کا رزق اس کی دسترس سے باہر کر دے یعنی رزق سامنے نظر آئے لیکن منہ تک نہ پہنچ سکے (بددعا)
اسی سے اِفْتِيَاتٌ (افتعال) ہے اور اس کے معنی کسی ایسے شخص سے مشورہ کے بغیر کوئی کام کرنے کے ہیں جس سے مشورہ ضروری ہو۔
اَلتَّفَاوُتُ (تفاعل) کے معنی دو چیزوں کے اوصاف مختلف ہونے کے ہیں گویا ایک کا وصف دوسری کو یا ہر ایک کا وصف دوسری کو فوت کر رہا ہے قرآن میں ہے:۔
مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷-۳) کیا تو (خدا) رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ یعنی اس میں کوئی بات بھی حکمت کے خلاف نہیں ہے۔

(ف و ج)

اَلْفَوْجُ کے معنی تیزی سے گزرنے والی جماعت کے ہیں اس کی جمع اَفْوَاجٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ (۶۷-۸) جب اس میں ان کی کوئی جماعت ڈالی جائے گی۔
فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ (۳۸-۵۹) (یہ) ایک فوج (ہے جو تمہارے ساتھ) داخل ہو گی۔
فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ..... (۱۱۰-۲) غول کے غول خدا کے دین میں ....

(ف و ر)

اَلْفَوْرُ کے معنی سخت جوش مارنے کے ہیں یہ لفظ آگ کے بھڑک اٹھنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور ہانڈی اور غصہ کے جوش کھانے پر بھی۔ قرآن میں ہے:۔
وَهِيَ تَفُوْرُ (۶۷-۷) اور وہ جوش مار رہی ہوگی

وَفَارَ التَّنُّوْرُ (۱۱-۴۰) اور تنور جوش مارنے لگا۔
شاعر نے کہا ہے [1] (المتقارب)

(۳۴۵) وَلَا الْعِرْقُ فَارَا

اور نہ اس کی رگوں میں گرہ یا نفخ ظاہر ہوتا ہے۔
محاورہ ہے :۔
فَارَ فُلَانٌ مِنَ الْحُمّٰی يَفُوْرُ فلاں کو زور کا بخار ہے اور ہانڈی کے ابال کو فَوَّارَۃٌ کہا جاتا ہے پھر تشبیہ کے طور پر پانی کے ابلتے ہوئے چشمہ کو بھی فَوَّارَۃُ الْمَاءِ کہتے ہیں۔ ایک محاورہ ہے :۔
فَعَلْتُ كَذَا مِنْ فَوْرِی میں نے جوش میں ایسا کیا یعنی سکون امر سے قبل یہ کام کیا۔ قرآن میں ہے :۔
وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا (۳-۱۲۵) اور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعۃً حملہ کردیں۔
اَلْفَارُ چوہیا۔ اس کی جمع فِيْرَانٌ آتی ہے پھر شکل میں مشابہت کی وجہ سے نافہ مشک کو بھی فَارَۃُ الْمِسْكِ کہا جاتا ہے۔
مَكَانٌ فَئِرٌ بہت چوہوں والی زمین۔

(ف و ز)

اَلْفَوْزُ کے معنی سلامتی کے ساتھ خیر حاصل کرلینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ (۸۵-۱۱) یہی بڑی کامیابی ہے۔
فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۳۳-۷۱) تو بے شک بڑی مراد پائیگا۔
ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (۴۵-۳۰) یہی صریح کامیابی ہے۔
دوسری جگہ پر اَلْعَظِيْمُ ہے (۴۴-۵۷)
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۹-۲۰) اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔
اَلْمَفَازَۃُ تفاؤل کے طور پر ریگستان کو مَفَازَۃٌ کہا جاتا ہے۔ نیز کامیابی کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے بھی بیابان کو مَفَازَۃٌ کہتے ہیں [2] کیونکہ بیابان جس طرح ہلاکت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح کبھی کامیابی کا بھی سبب بنتا ہے لہذا ان دونوں معنی کے لحاظ سے اسے کبھی قَفْرٌ اور کبھی مَفَازَۃٌ کہا جاتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ لفظ مَفَازَۃٌ فَوَّزَ الرَّجُلُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاک ہوجانے کے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ لغت میں فَوَّزَ بمعنی هَلَكَ آتا ہے تو یہ بھی معنی فوز کے لحاظ سے ہے کیونکہ مرنے کے بعد انسان دنیا کے پھندے سے نجات پالیتا ہے لہذا موت اگر ایک لحاظ سے ہلاکت ہے تو دوسرے لحاظ سے باعث نجات بھی ہے۔ اسی بنا پر مثل مشہور ہے۔ مَا اَحَدٌ اِلَّا وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لَّهٗ کہ موت ہر ایک کے لئے بہتر ہے۔ یہ دنیا کے اعتبار سے ہے۔ لیکن اگر اخروی نعمتوں سے ہم آغوش ہونیکا

---

[1] قطعة من قول العوف بن عطية بن الخرع يصف قريشا والبيت بتمامه، لها رسغ ايد مكرب فلا العظم واه ولا العرق فارا ومعناه اى لايظهر بعرقه نفخ او عقد يقال: فارت عروقه تفور فورا وذا يكره من الفرس وفى المعانى للقتيبى اى لم يكن بها دار فتودج فيفور الدم وقطع الودج كالفصد للانسان والبيت فى اللسان (فور) وكتاب الخيل لابى عبيد ۱۰۸ و ۱۰۹ والمعانى الكبير للقتيبى (۱: ۱۶۳) [2] وقد عد العلماء لفظ المفازة "من الاضداد لكن المؤلف حملها على المجاز والاستعارة الاضداد لابى الطيب (۵۵-۵۶) ❖

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

لحاظ کیا جائے تو موت بہت بڑی کامیابی ہے۔
چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (۳-۱۸۵) تو جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔
اور آیت کریمہ:۔
فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ (۳-۱۸۸) ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہو جائیں گے۔
میں مَفَازَةٌ فَازَ کا مصدر ہے اور فَوْزٌ اسم ہے یعنی یہ مت سمجھو کہ یہ عذاب سے رہائی حاصل کر لیں گے اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا (۷۸-۳۱) بے شک پرہیز گاروں کے لئے کامیابی ہے۔
میں مَفَازًا فَوْزٌ سے اسم ظرف ہے یعنی متقین کے لئے کامیابی کا مقام ہے پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا حَدَائِقَ وَاَعْنَابًا الآیۃ (۷۸-۳۲) (یعنی) باغ اور انگور وغیرہ۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ اِلٰى قَوْلِهٖ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۴-۷۳) تو بیشک بڑی مراد پائیگا۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ دنیوی ساز و سامان کی حرص کرتے ہیں اور غنیمت وغیرہ حاصل کر لینے کو ہی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

(ف و ض)

فَوَّضَ (لالی) کے معنی کوئی معاملہ کسی کے سپرد کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْ اِلَى اللّٰهِ (۴۰-۴۴) اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں۔
یعنی میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں اصل میں یہ مَالُهُمْ فَوْضٰى بَيْنَهُمْ کے محاورہ سے مشتق ہے (یعنی ان کا مال سب میں مشترک ہے) شاعر نے کہا ہے (الطویل)
(۳۴۶) طَعَامُهُمْ فَوْضٰى فَضًا فِيْ رِحَالِهِمْ
ان کے گھروں میں طعام منتشر اور بکھرا پڑا ہے۔
اور اسی سے شَرِكَةُ مُفَاوَضَةٍ ہے یعنی کمپنی جس میں سب کے حصص مساوی ہوں۔

(ف و ق)

فَوْقٌ یہ مکان، زمان، جسم، عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور کئی معنوں میں بولا جاتا ہے اوپر جیسے فرمایا:۔
وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ (۲-۶۳) اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا۔
مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ (۳۹-۱۶) ان کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے۔
وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا (۴۱-۱۰) اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے۔
اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں چنانچہ فرمایا:۔
قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (۶-۶۵) کہہ دو کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے

ط قدمر تخریجہ فی (ف ض ی)

سے عذاب بھیجے۔
۲۔ صعود یعنی بلندی کی جانب کے معنی میں اس کی ضد اسفل ہے جس کے معنی پستی کی جانب کے ہیں چنانچہ فرمایا:۔
اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (۳۳-۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔
۳۔ کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے فرمایا:۔
فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ (۴-۱۱) اگر اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ۔
۴۔ جسمانیت کے لحاظ سے بڑا یا چھوٹا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (۲-۲۶) مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی. مکڑی) کی مثال بیان فرمائے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ فَمَا فَوْقَهَا سے مچھر سے بڑی چیز کی طرف اشارہ ہے جیسے مکڑی جس کی کہ دوسری جگہ مثال بیان کی گئی ہے اور بعض نے فوق بلحاظ صغر مراد لیا ہے یعنی مچھر سے بھی چھوٹا اور جنہوں نے اس کی تفسیر ما دونہا سے کی ہے ان کی مراد بھی یہی ہے بعض اہل لغت نے اس سے یہ سمجھ لیا ہے کہ فوق بمعنی دون بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے اضداد میں شمار کیا ہے مگر یہ محض ان کی خام خیالی ہے۔
۵۔ بلحاظ فضیلت دنیوی کے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ اور ایک دوسرے پر درجے بلند کئے۔

اور کبھی فضیلت اخروی کے لحاظ سے آتا ہے جیسے فرمایا:۔
وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۲-۲۱۲) لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر فائق ہوں گے۔
فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳-۵۵) کافروں پر فائق۔
۶۔ فوقیت معنی غلبہ اور تسلط کے جیسے فرمایا:۔
وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (۶-۱۸) اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔
مِنْ فِرْعَوْنَ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ (۷-۱۲۷) فرعون سے اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔
اور فَوْقٌ کے لفظ سے فَاقَ فُلَانٌ غَيْرَهٗ يَفُوْقُ کا محاورہ ہے جس کے معنی دوسرے پر بازی لے جانے کے ہیں لہٰذا یہ فوق بمعنی فضیلت سے مشتق ہے۔ اور فُوْقٌ سے فُوْقُ السَّهْمِ کا محاورہ مشتق ہے جس کے معنی سوفار تیر کے ہیں اور سَهْمٌ اَفْوَقُ کے معنی پر شکستہ سوفار کے ہیں۔
اَلْاِفَاقَةُ (افعال) کے معنی نشہ یا غشی کے بعد ہوش میں آنے یا مرض کے بعد ہوش میں آنے یا مرض کے بعد کمزوری سے قوت کی طرف لوٹ آنے کے ہیں نیز اِفَاقَةٌ کے معنی دودھ دوہنے کے بعد دودھ کا پھر تھنوں میں لوٹ آ ابھی آتے ہیں اور جو دودھ تھنوں میں لوٹتا ہے اسے فُوْقَةٌ کہا جاتا ہے اور ایک دفعہ تھنوں سے دودھ دوہنے کے بعد پھر ان میں دودھ لوٹنے تک جو وقفہ ہوتا ہے اسے فواق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
مَا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ (۳۸-۱۵) جس میں شروع

ہوئے پیچھے (کچھ وقفہ نہیں ہوگا)۔

جس کے معنی راحت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ دوبارہ دنیا کی طرف لوٹنا نہیں ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے[2] کہ اگر فُوَاق بضم الفاء پڑھا جائے تو یہ فُوَاقُ النَّاقَةِ کے محاورہ سے مشتق ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ فتحہ اور ضمہ فاء دونوں کے ایک ہی معنی ہیں[1] جیسے جَمَامٌ وَجُمَامٌ اور بعض نے کہا ہے کہ اِسْتَفِقْ نَاقَتَكَ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی اونٹنی کو چھوڑ دو تاکہ اس کے تھنوں میں دودھ اتر آئے اور فَوِّقْ فَصِيْلَكَ کے معنی ہیں کہ اونٹ کے بچہ کو کچھ وقفہ کے بعد دودھ پلاؤ۔ ظَلَّ يَتَفَوَّقُ الْمَحْضَ وہ دن بھر وقفوں کے ساتھ دودھ پلوتا رہا۔ شاعر نے کہا ہے[3] (البسیط)

(۳۴۷) حَتّٰى اِذَا فِيْقَةٌ فِيْ ضَرْعِهَا اجْتَمَعَتْ

حتی کہ جب اس کے تھنوں میں دودھ دوبارہ جمع ہوگیا۔

(ف و م)

اَلْفُوْمُ گیہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فوم اصل میں ثوم ہی ہے (یعنی فا ثا سے بدل دی گئی ہے، جیسا کہ جدث وجدف میں ہے اور اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا (۲-۶۱) اور گیہوں اور مسور۔

(ف و ہ)

اَفْوَاهٌ۔ فَمٌ کی جمع ہے اور فَمٌ اصل میں فَوَهٌ ہے اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قول کی نسبت فم یعنی منہ کی طرف کی گئی ہے۔ وہاں دروغ گوئی کی طرف اشارہ ہے اور اس پر تنبیہ ہے کہ وہ صرف زبان سے ایسا کہتے ہیں ان کے اندرون اس کے خلاف ہیں جیسے فرمایا:۔ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ (۳۳-۴) یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (۱۸-۵) بات جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ (۹-۸) یہ منہ سے تو تمہیں خوش کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔

فَرَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴-۹) تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دیئے (کہ خاموش رہو)۔

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (۵-۴۱) کچھ تو ان میں سے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔ لیکن ان کے دل مومن نہیں ہیں۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (۳-۱۶۷) منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

اور اسی سے فَمُ النَّهْرِ کی طرح فُوْهَةُ النَّهْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنی نہر کے دہانے کے ہیں اور اَفْوَاهُ الطِّيْبِ۔ ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو خوشبو کے لئے ڈالی جائیں۔ اس کا واحد فُوْهٌ ہے۔

---

[1] انظر مجانہ ۲ر۱۷۹ [2] کما یفہم من تفسیر الفراء حیث قال: مالہا من راحۃ وافاقۃ قرا الحسن وعاصم واہل المدینۃ فواق بالفتح ہی لغۃ جیدۃ وبالضم حمزۃ والاعمش والکسائی راجع الطبری [3] قالہ الاعشی بن میمون فی قصیدتہ یمدح فیہا ہوذۃ بن علی الحنفی ولم یلبس التاج معدی غیرہ والبیت ال ۳۳ من قصیدتہ وتمامہ: جادت لترضع شق النفس لو رضعا والبیت من شواہد الطبری (۲۳ر ۱۳۴) ۞ ۞ ۞

(ف ی ء)

اَلْفَیْئُ وَالْفَیْئَۃُ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی تَفِیْئَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ فَاِنْ فَآءَتْ (۴۹-۹) یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائے۔ پس جب وہ رجوع لائے۔

فَاِنْ فَآءُوْا (۲-۲۲۶) اگر (اس عرصے میں قسم سے) رجوع کرلیں۔

اور اسی سے فَاءَ الظِّلُّ ہے جس کے معنی سایہ کے (زوال کے بعد) لوٹ آنے کے ہیں اور فَیْئٌ اس سایہ کو کہا جاتا ہے (جو زوال کے بعد) لوٹ کر آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ (۱۶-۴۸) جنکے سائے ... لوٹتے ہیں۔

اور جو مال غنیمت بلا مشقت حاصل ہو جائے اسے بھی فَیْئٌ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ (۵۹-۷) جو مال خدا نے اپنے پیغمبر کو ... دلوایا۔

مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلَیْکَ (۳۳-۵۰) جو خدا نے تمہیں (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ مال غنیمت کو فَیْءٌ بمعنی سایہ کے ساتھ تشبیہ دے کر فے کہنے میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ دنیا کا بہترین سامان بھی بمنزلہ ظل زائل کے ہے شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۴۸) اَمَاوِیَّ اَلْمَالُ اَفْیَاءُ الظِّلَالِ عَشِیَّۃً

اے ماوی مال شام کے ڈھلتے ہوئے سایہ کی طرح ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے[2]:

(۳۴۹) اِنَّمَا الدُّنْیَا کَظِلٍّ زَائِلٍ

کہ دنیا زائل ہونے والے سایہ کی طرح ہے۔

اَلْفِئَۃُ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد تعاون اور تعاضد کے لئے ایک دوسرے کی طرف لوٹ کر آئیں[3]۔ قرآن میں ہے:۔

اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا (۸-۴۵) جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔

کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً (۲-۲۴۹) بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے ... بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔

فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا (۳-۱۳) دو گروہوں میں جو (جنگ بدر میں) آپس میں بھڑ گئے۔

فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ (۴-۸۸) کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ۔

مِنْ فِئَۃٍ یَّنْصُرُوْنَہٗ کوئی جماعت اس کی مددگار (نہ) ہوسکی (۲۸-۸۱)

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ (۸-۴۸) جب یہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہوئیں۔

(ف ی ض)

فَاضَ الْمَآءُ کے معنی کسی جگہ سے پانی اچھل کر بہ نکلنا کے ہیں (اور آنسوں کے بہنے کے لئے بھی آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ (۵-۸۳) تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔

اور اَفَاضَ اِنَاءَہٗ کے معنی برتن کو لبالب بھر دینے

---

[1] قالہ حاتم الطائی وتقدم فی (اوی)۔ [2] لم اجدہ [3] ذکرہ اصحاب المعاجم ایضا لفظۃ "الفئۃ" فی (ف ء و)

کے ہیں حتیٰ کہ پانی اس سے نیچے گرنے لگے اور اَفَضْتُهٗ کے معنی اوپر سے گرانے اور بہانے کے ہیں جیسے فرمایا: اَنْ اَفِیْضُوْا عَلَیْنَا مِنَ الْمَآءِ (۷-۵۰) کہ کسی قدر ہم پر پانی بہاؤ۔

اسی سے فَاضَ صَدْرُہٗ بِالسِّرِّ جس کے معنی بھید ظاہر کرنے کے ہیں اور سخی آدمی کو فَیَّاضٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَفَاضُوْا فِی الْحَدِیْثِ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی باتوں میں مشغول ہو جانے اور چرچا کرنے کے ہیں چنانچہ فرمایا: لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَفَضْتُمْ فِیْهِ (۲۴-۱۴) تو جس بات کا تم چرچا کرتے تھے اس کی وجہ سے تم پر ...... نازل ہوتا۔

هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ (۴۶-۸) وہ اس گفتگو کو خوب جانتا ہے جو تم اس کے بارے میں کرتے ہو۔

اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ (۱۰-۶۱) جب اس میں مصروف ہوتے ہو۔

اور حدیث مُسْتَفِیْضٌ کے معنی منتشر یعنی عام پھیلی ہوئی بات کے ہیں اور فَیْضٌ کے معنی کثیر پانی کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ۔

اَعْطَاهُ غَیْضًا مِنْ فَیْضٍ یعنی اسے زیادہ مال میں سے تھوڑا سا دیا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ:

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ (۲-۱۹۸) اور جب عرفات سے واپس ہونے لگو۔

اور آیت کریمہ:

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (۲-۱۹۹) پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں وہیں سے تم بھی واپس ہو۔

میں اِفَاضَةٌ کے معنی مجمع کثیر کے یکبارگی لوٹنے کے ہیں اور یہ فیضان الماء یعنی پانی کا زور سے بہہ نکلنا، کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

اَفَاضَ بِالْقِدَاحِ تیر گھمانا۔

اَفَاضَ الْبَعِیْرُ بِجِرَّتِهٖ اونٹ کا جگالی پھینکنا

دِرْعٌ مُفَاضَةٌ کشادہ زرہ گویا پہننے والے پر اسے بہا دیا گیا ہے جس طرح کہ دِرْعٌ مَسْنُوْنَةٌ کے معنی بھی وسیع زرہ کے ہیں جو کہ سَنَنْتُ بمعنی صَبَبْتُ سے مشتق ہے۔

(ف ی ل)

اَلْفِیْلُ ہاتھی جمع فِیَلَةٌ وَفُیُوْلٌ۔

قرآن میں ہے:

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ (۱۰۵-۱) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔

رَجُلٌ فِیْلُ الرَّاْیِ وَفَالُ الرَّاْیِ کمزور رائے آدمی۔

اَلْمُفَایَلَةُ ایک قسم کا کھیل جس میں بچے کوئی چیز مٹی میں چھپا دیتے ہیں پھر اس مٹی کو مٹھیاں بھر بھر تقسیم کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس کے حصہ میں آئی ہے اور فَائِلٌ سرین کے گڑھے یا گوشت کے نیچے ایک رگ کا نام ہے۔

کِتَابُ الْقَاف

(ق ب ح)

اَلْقَبِیْحُ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے دیکھنے سے آنکھ کو نفرت ہو اور اعمال واحوال میں سے اس عمل اور حالت کو کہتے ہیں جس سے طبیعت کو کراہت ہو کہا جاتا ہے:۔ قَبُحَ قَبَاحَۃً (ک) فَھُوَ قَبِیْحٌ اور آیت کریمہ:۔ مِنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ (۲۸-۴۲) میں مقبوحین سے بد حال لوگ مراد ہیں اور اس سے کفار کی صفات ذمیمہ کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں وہ پلید اور گندے رہتے ہیں اور آخرت میں سیاہ رو گربہ چشم ہوں گے اور اغلال وسلاسل میں جکڑ کر انہیں گھسیٹا جائے گا۔ الغرض اس قسم کی مذموم صفات مراد ہیں جن کے ساتھ قیامت کے دن متصف ہوں گے۔

قَبَّحَہُ اللّٰہُ عَنِ الْخَیْرِ اللہ اسے خیر سے دور کرے۔ اَلْقَبِیْحُ بازو کی ہڈی جس کا نصف کہنی کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔

(ق ب ر)

اَلْقَبْرُ کے معنی میت کو دفن کرنے کی جگہ کے ہیں اگر یہ قَبَرْتُہٗ (ضرب ونصر) کا مصدر ہو تو اس کے معنی میت کو قبر میں دفن کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور اَقْبَرْتُہٗ کے معنی کسی کیلئے قبر مہیا کرنے کے ہیں تاکہ اسے دفن کیا جائے جیسے اَسْقَیْتُہٗ کے معنی پینے کے لئے پانی مہیا کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ (۸۰-۲۱) پھر اس کو موت دی۔ پھر قبر میں دفن کرایا۔

بعض نے اَقْبَرَہٗ کے معنی یہ کئے ہیں کہ اسے الہام کر دیا کہ کس طرح میت کو دفن کیا جائے۔ اَلْمَقْبَرَۃُ وَالْمَقْبُرَۃُ (قبرستان) جمع مَقَابِرُ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲-۲) یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔

یہ موت سے کنایہ ہے اور آیت کریمہ:۔

اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ (۱۰۰-۹) کہ جو مردے قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لئے جائیں گے۔ میں حیات بعد الممات یعنی موت کے بعد زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ دلوں کے اسرار ظاہر کر دینے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب تک انسان دنیا میں رہتا ہے اس کے بھید مستور رہتے ہیں گویا قبر میں مدفون ہیں۔ تو یہاں قبور سے مجازاً دل مراد

ہیں۔ بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ جب موت کی وجہ سے جہالت کا پردہ اٹھ جائے گا گویا کافر اور جاہل جب تک دنیا میں رہتے ہیں جہالت کی قبروں میں مدفون رہتے ہیں چونکہ مرنے کے بعد وہ جہالت دور ہو جاتی ہے۔ تو گویا وہ قبر جہالت سے دوبارہ زندہ کر کے نکالے گئے ہیں۔ جیسا کہ مروی ہے اَلْاِنْسَانُ نَائِمٌ فَاِذَا مَاتَ انْتَبَہَ کہ انسان دنیا میں سویا رہتا ہے جب موت آکر دستک دیتی ہے تو اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

مَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ (۳۵-۲۲) اور تم ان کو جو قبروں میں مدفون ہیں نہیں سنا سکتے۔ یعنی یہ لوگ جہالت کے گڑھے میں گرنے کی وجہ سے مردوں کے حکم میں ہیں۔

(ق ب س)

اَلْقَبَسُ آگ کا شعلہ یا اس کی چنگاری جو شعلہ سے لی جائے قرآن میں ہے۔

اَوْ اٰتِیْکُمْ بِشِہَابٍ قَبَسٍ (۲۷-۷) یا سلگتا ہوا انگارہ تمہارے پاس لاتا ہوں۔

اور اَلْقَبْسُ (مصدر) وَالْاِقْتِبَاسُ کے معنی بڑی آگ سے کچھ آگ لینے کے ہیں۔ مجازاً علم و ہدایت کی طلب پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ (۵۷-۱۳) ہماری طرف نظر شفقت کیجئے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کر لیں۔

اَقْبَسْتُہٗ نَارًا اَوْعِلْمًا میں نے اسے آگ دی یا علم سکھایا۔

اَلْقَبِیْسُ وہ سانڈھ جو تیزی کے ساتھ مادہ کو حاملہ کر دے گویا سرعت میں وہ شعلہ کی طرح ہے۔

(ق ب ص)

اَلْقَبْصُ (ض) کے معنی چٹکی سے کوئی چیز لینے کے ہیں اور جو چیز چٹکی سے لی گئی ہو اسے قَبْصٌ وَقَبِیْصَۃٌ کہا جاتا ہے اس لئے قبیص حقیر چیز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت:۔ فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً (۲۰-۹۶) تو میں نے ایک مٹھی بھر لی۔ میں ایک قراءت فَقَبَصْتُ قَبْصَۃً (صاد مہملہ) کے ساتھ بھی ہے۔

قَبُوْصٌ سبک رفتار اور چست گھوڑا جو دوڑتے وقت صرف سم ہی زمین پر لگائے۔ اور تیز رفتار گھوڑے پر اس کا اطلاق مجازی ہے جیسا کہ مجازاً سرعت رفتاری کے لئے قَبْصٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(ق ب ض)

اَلْقَبْضُ کے معنی کسی چیز کو پورے پنجے کے ساتھ پکڑنے کے ہیں جیسے قَبْضُ السَّیْفِ وغیرہ تلوار کو پکڑنا۔ قرآن میں ہے:۔

فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (۲۰-۹۶) تو میں نے فرشتے کے نقش پا سے مٹی کی ایک مٹھی بھر لی۔ قَبَضَ الْیَدَ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی مٹھی میں لے لینے کے ہیں اور قَبَضَہَا عَنِ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو پکڑنے سے ہاتھ سکیڑ لینے کے ہیں۔ اسی مفہوم کے لحاظ سے مال خرچ کرنے سے ہاتھ روک لینے کو بھی قبض کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَیَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَہُمْ (۹-۶۷) اور خرچ کرنے

سے) ہاتھ بند کئے رہتے ہیں۔
یعنی خرچ نہیں کرتے۔ اور استعارہ کے طور پر کسی چیز کے حاصل کر لینے کو بھی قبض کہا جاتا ہے اگرچہ اسے ہاتھ سے نہ پکڑا جائے جیسے محاورہ ہے:۔
قَبَضْتُ الدَّارَ مِنْ فُلَانٍ یعنی اسے اپنے تصرف میں لے لیا۔ قرآن میں ہے[۱]۔
وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (۳۹-۶۷)
اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے تصرف میں ہوگی اور کسی کی ملک نہیں ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔
ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا (۲۵-۴۶)
پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔
میں سورج کے سایہ کو نقل کرنے کی طرف اشارہ ہے اور استعارہ کے طور پر قبض کے معنی تیز دوڑنے کے بھی آتے ہیں اس لحاظ سے کہ گویا دوڑنے والا زمین سے کسی چیز کو پکڑتا ہے اور آیت کریمہ:۔
یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ (۲-۲۴۵) (اور خدا ہی روزی کو) تنگ کرتا اور اسے وہی کشادہ کرتا ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ کبھی[۲] چھین لیتا ہے اور کبھی عطا کر دیتا ہے۔ یا ایک[۳] قوم سے چھین لیتا ہے اور دوسری کو عطا کر دیتا ہے۔ یا یہ[۴] کہ وہ کبھی جمع کرتا ہے اور کبھی بکھیر دیتا ہے اور[۵] یا اس کے معنی زندہ کرنے اور مارنے کے ہیں۔ کیونکہ کبھی قبض موت سے کنایہ ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے:۔
قَبَضَهُ اللّٰهُ اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اسی معنی میں آنحضرت نے فرمایا[۶] (۷) مَا مِنْ آدَمِیٍّ اِلَّا وَقَلْبُهٗ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ کہ ہر آدمی کا دل اللہ تعالےٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہے یعنی انسان کے سب سے اشرف جزء پر اللہ تعالےٰ کو تصرف حاصل ہے تو دوسرے اعضاء پر بالاولیٰ تصرف حاصل ہوگا۔
دَاعِیْ قُبْضَةٍ منتظم چرواہا۔
اَلْاِنْقِبَاضُ کے معنی اطراف یعنی ہاتھ پاؤں سمیٹ لینے کے ہیں اور ترک تبسط یعنی بے تکلفی چھوڑ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(ق ب ل)

قَبْلُ یہ تقدم متصل اور منفصل دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس کی ضد بَعْدُ ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں تقدم متصل کے لئے آتے ہیں اور ان کا ضد دُبُرٌ و دُبُوْ ہے یہ اس کے اصل معنی ہیں اگرچہ مجازاً ہر قسم کے تقدم پر بولا جاتا ہے پس قَبْل چار طرح استعمال ہوتا ہے۔
(۱) تقدم مکانی یعنی کسی مقام کا دوران سفر میں پہلے آنا اور دوسرے کا اس کے بعد آنا جیسے اصفہان سے مکہ کی طرف جاتے وقت بغداد کوفہ سے پہلے آتا ہے لیکن مکہ سے اصفہان کو جاتے وقت کوفہ بغداد سے پہلے آتا ہے۔
(۲) تقدم زمانی جیسے عَبْدُ الْمَلِكِ قَبْلَ الْمَنْصُوْرِ کہ عبد الملک کا زمانہ منصور سے پہلے کا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ ..... (۲-۹۱) تو خدا کے پیغمبروں کو پہلے ہی کیوں

---

[۱] قال فی الکشاف ۲/۵۴۴: وہی قراءۃ الحسن راجع ایضا امال ابی الطیب ۲/۲۴۳ وعلماء اللغۃ فرقوا بینہما راجع غریب ابی عبید ا/۳۶)
وکمانی قولہ تعالی: فرہان مقبوضۃ (۲/۲۸۳) [۲] وبمعناہ فی حم ۵ ک۔ من النواس (الفتح الکبیر للنبہانی ۵ ۲ ۷ ج ۳ ÷ ÷ ÷

قتل کیا کرتے ۔
(۳) تقدم بلحاظ مرتبہ جیسے عَبْدُ الْمَلِكِ قَبْلَ الْحَجَّاجِ کہ عبدالملک حجاج سے پہلے ہے یعنی مرتبہ میں بڑا ہے۔
(۴) تقدم صناعی یعنی ترتیب تعلیمی اور فنی میں ایک چیز کا دوسری سے پہلے ہونا جیسے کہا جاتا ہے ۔
تَعَلَّمُ الْهِجَاءِ قَبْلَ تَعَلُّمِ الْخَطِّ کہ حروف ہجا کی تعلیم کتابت سیکھنے سے پہلے دی جاتی ہے قرآن میں ہے : ۔
مَا اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ (۲۱-۶) ان سے پہلے جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا وہ ایمان نہیں لائی تھیں۔
قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (۲۰-۱۳۰) سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے ۔
قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ (۲۷-۲۹) قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں ۔
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ (۵۷-۱۶) (ان سے) پہلے کتابیں دی گئی تھیں۔
ان تمام آیات میں تقدم زمانی مراد ہے اور کنایہ کے طور پر قُبُلٌ وَ دُبُرٌ کا لفظ شرمگاہ پر بولا جاتا ہے اور استقبال کی طرح اِقْبَالٌ کے معنی بھی کسی کے رو برو اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں قرآن میں ہے : ۔
فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ (۶۸-۳۰) پھر لگے ایک دوسرے کو رو در رو ملامت کرنے ۔
وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ (۱۲-۷۱) اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر ۔۔۔۔۔۔
فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ (۵۱-۲۹) ابراہیم کی بیوی چلاتی آئی ۔

اور جو شخص ڈول کی طرف منہ کرکے اسے کنویں سے پکڑتا ہے ۔ اسے قَابِلٌ اور دائی کو قَابِلَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ولادت کے وقت بچے کو پکڑتی ہے ۔
قَبِلْتُ عُذْرَهٗ وَ تَوْبَتَهٗ وَ غَيْرَهٗ وَتَقَبَّلْتُهٗ میں نے اس کا عذر اور توبہ وغیرہ قبول کرلی۔ قرآن میں ہے : ۔
وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ (۲-۱۲۳) اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے ۔
وَقَابِلِ التَّوْبِ (۴۰-۳) اور توبہ قبول کرنے والا۔
وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ (۴۲-۲۵) اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ۔۔۔۔ ہے ۔
اور تَقَبُّلٌ کے معنی کسی چیز کو اس طرح قبول کرنے کے ہیں کہ وہ عوض کی مقتضی ہو جیسے ہدیہ وغیرہ قرآن میں ہے : ۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا (۴۶-۱۶) یہی لوگ ہیں جن کے اعمال نیک ہم قبول کریں گے ۔
اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵-۲۷) کہ خدا پرہیزگاروں ہی کی نیاز قبول فرمایا کرتا ۔۔۔ ہے ۔
میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر عبادت قبول نہیں ہوتی بلکہ وہی قبول کی جاتی ہے جو مخصوص طریق سے ادا کی جائے ۔ فرمایا : ۔
فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ (۳-۳۵) تو اسے میری طرف سے قبول فرما۔ كَفَالَةٌ کو قُبَالَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ كَفَالَةٌ کے معنی مؤکل طور پر کسی چیز کو قبول کرلینے کے ہیں تو آیت فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ میں کفالت کے معنی معتبر ہیں اور لکھے ہوئے عہد کو قُبَالَةٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ : ۔
فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ (۳-۳۷) پروردگار

نے اسے پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تَقَبَّلَهَا کے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تَكَفَّلَهَا کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے درحقیقت مجھے بہت بڑی کفالت کا ذمہ دار بنادیا ہے اور پھر آیت کریمہ میں بِتَقَبُّلٍ کی بجائے بِقَبُولٍ حَسَنٍ فرمایا ہے تاکہ اس میں دونوں امر جمع ہو جائیں یعنی تقبل جو قبولیت کا اعلیٰ درجہ ہے اور قبول کرنا جو کہ رضا اور ثواب کا مقتضی ہوتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ قَبُولٌ کا لفظ فُلَانٌ عَلَيْهِ قَبُولٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جو اسے دیکھتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور آیت کریمہ:۔
كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا (۶-۱۱۲) سب چیزوں کو.... سامنے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ قُبُلٌ قَابِلٌ کی جمع ہے جس کے معنی سامنے کے ہیں۔ مجاہدؒ نے اس کے معنی جماعت درجماعت کئے ہیں اس صورت میں یہ قَبِيلٌ کی جمع ہوگی۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔
أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا (۱۸-۵۵) یا ان پر عذاب سامنے آموجود ہو۔
میں بھی قُبُلًا کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے قِبَلًا پڑھا ہے جس کے معنی عیاناً یعنی سامنے کے ہیں۔
اَلْقَبِيلُ یہ قبیلہ کی جمع ہے یعنی وہ جماعت جو ایک دوسرے پر متوجہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔
وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ (۴۹-۱۳) تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔
وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۱۷-۹۲) اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں قبیل بمعنی کفیل یعنی ضامن کے ہے اور یہ قَبِلْتُ فُلَانًا وَتَقَبَّلْتُ بِهٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ضامن بننے کے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی مقابلہ یعنی معاینہ کئے ہیں۔ مثل مشہور ہے:۔
فُلَانٌ لَا يَعْرِفُ قَبِيْلًا مِّنْ دَبِيْرٍ وہ عورت کے اگلے اور پچھلے سوت میں تمیز نہیں کر سکتا یعنی بیوقوف ہے۔ اَلْمُقَابَلَةُ وَالتَّقَابُلُ کے معنی ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں خواہ وہ توجہ بذریعہ ذات کے ہو یا بذریعہ عنایت اور مروت کے ہو۔ قرآن میں ہے:۔
مُتَّكِـِٔيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ (۵۶-۱۶) آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوئے۔
إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ (۱۵-۴۷) بھائی بھائی تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔
لِيْ قِبَلَ فُلَانٍ كَذَا کے معنی ہیں میرے فلاں کی جانب اتنے ہیں اور یہ عِنْدَهٗ کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ (۶۹-۹) اور فرعون اور جو لوگ اس سے پہلے تھے سب.... کرتے تھے۔
فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ (۷۰-۳۶) تو ان کافروں کو کیا ہوا ہے کہ تمہاری طرف دوڑتے چلے آتے ہیں۔
اور استعارہ کے طور پر قوت اور قدرت علی المقابلہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے:۔
لَا قِبَلَ لِيْ بِكَذَا میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
قرآن میں ہے:۔
فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا (۲۷-۳۷)

ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس کے مقابلہ کی ان کو طاقت نہ ہوگی۔
یعنی ان کے سامنے ہونے اور مدافعت کرنے کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔
اَلْقِبْلَۃُ اصل میں بالمقابل۔ آدمی کی حالت کو کہا جاتا ہے جیسے جِلْسَۃٌ وَ قِعْدَۃٌ اور عرف میں اس جہت کو قبلہ کہا جاتا ہے جس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔
فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَۃً تَرْضٰھَا (۲-۱۴۴) سو ہم تم کو ایسے قبلہ کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو متوجہ ہونے کا حکم دیں گے۔
اور قَبُوْلٌ کے معنی پُروا کی ہوا کے ہیں اور اسے قَبُوْلٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قبلہ کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور سر کی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ کو قَبِیْلَۃٌ کہا جاتا ہے اور مُقَابَلَۃٌ اس بکری کو کہا جاتا ہے جس کا کان سامنے کی جانب سے کٹا ہوا ہو۔ اور قِبَالُ النَّعْلِ کے معنی جوتے کا تسمہ کے ہیں۔
قَابَلْتُ النَّعْلَ جوتے کو تسمہ لگانا۔
اَلْقَبَلُ پاؤں کے پنجہ کا اندر کی جانب مڑا ہوا ہونا
اَلْقَبَلَۃُ ایک قسم کا منکا جس کے متعلق ساحروں کا خیال ہے کہ وہ باہم محبت کا کام دیتا ہے اسی سے قُبْلَۃٌ ہے جس کے معنی بوسہ کے ہیں اس کی جمع قُبَلٌ آتی ہے اور قَبَّلْتُہٗ تَقْبِیْلًا کے معنی بوسہ دینے کے ہیں[1]۔

(ق ت ر)

اَلْقَتْرُ (ن) کے معنی بہت ہی کم خرچ کرنے اور بخل کرنے کے ہیں۔ یہ اِسْرَافٌ کی ضد ہے اور یہ دونوں صفات مذمومہ سے ہیں قرآن میں ہے۔
وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا۔۔۔۔ (۲۵-۶۷)
بلکہ اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔
اسی سے صفت مشبہ کا صیغہ قَتُوْرٌ و مُقْتِرٌ آتا ہے اور آیت کریمہ:۔
وَکَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۷-۱۰۰) اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔
میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان فطرۃً کنجوس واقع ہوا ہے جیسے فرمایا:۔
وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (۴-۱۲۸) اور طبیعتیں تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔
قَتَرْتُ الشَّیْئَ وَاَقْتَرْتُہٗ وَقَتَّرْتُہٗ کے معنی کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں اور مُقْتِرٌ بمعنی فقیر ہے قرآن میں ہے:۔
وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُہٗ (۲-۲۳۶) اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔
اصل میں یہ قُتَارٌ وَ قَتَرٌ سے ہے جس کے معنی اس دھوآں کے ہیں جو کسی چیز کے بھوننے یا لکڑی کے جلنے سے اٹھتا ہے گویا مُقْتِرٌ اور مُقَتِّرٌ بھی ہر چیز سے دھوئیں کی طرح لیتا ہے اور آیت کریمہ:۔
تَرْھَقُھُمْ قَتَرَۃٌ (۸۰-۴۱) (اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔
میں قَتَرَۃٌ غَبَرَۃٌ کی طرح ہے مراد دھوئیں کی طرح سیاہی اور افسردگی ہے جو جھوٹ کی وجہ سے چہرہ پر چھا جاتی ہے۔
اَلْقُتْرَۃُ شکاری کی کمین گاہ جو انسان کی لوکو بھی

---

[1] اُنظر فی القُبلۃ لطائف وطرائف (محاضرات الادباء (۳/۲-۱۲۰-۱۲۲)

شکار تک نہیں پہنچنے دیتی۔ کیونکہ شکاری کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بو بھی شکار تک نہ پہنچے تاکہ شکار بھاگ نہ جائے۔

رَجُلٌ قَاتِرٌ کمزور آدمی۔ گویا وہ ضعف میں دھوئیں کی طرح ہے جیسا کہ کمزور آدمی کو هُوَ هَبَاءٌ کہا جاتا ہے۔

اِبْنُ قَتْرَةَ ایک باریک اور چھوٹا سا سانپ۔

اَلْقَتِيْرُ زرہ کی میخوں کے سرے۔

(ق ت ل)

اَلْقَتْلُ (ن) الموت کی طرح اس کے معنی بھی جسم سے روح کو زائل کرنے کے ہیں لیکن موت اور قتل میں فرق یہ ہے کہ اگر اس فعل کو سرانجام دینے والے کا اعتبار کیا جائے تو اسے قتل کہا جاتا ہے اور اگر صرف روح کے فوت ہونے کا اعتبار کیا جائے تو اسے موت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ (۳-۱۴۴) بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (۸-۱۷) تم لوگوں نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ (۸۰-۱۷) انسان ہلاک ہو جائے۔

اور آیت کریمہ:۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۵۱-۱۰) انکل دوڑانے والے ہلاک ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بددعا کے لئے ہے اور قتل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ایجاد قتل کے ہوتے ہیں اور آیت کریمہ:۔

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۲-۵۴) اور اپنے تئیں ہلاک کر ڈالو۔

کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر دو اور بعض نے خواہشات نفسانی کا قلع قمع کر دینا مراد لیا ہے اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

قَتَلْتُ الْخَمْرَ بِالْمَاءِ میں نے شراب میں پانی ملا دیا (جس سے اس کا جوش ٹھنڈا ہو گیا)

قَتَلْتُ فُلَانًا وَقَتَّلْتُهٗ میں نے اسے ذلیل کر دیا۔ شاعر نے کہا ہے[۱] (البسیط)

(۳۵۰) كَاَنَّ عَيْنَيَّ فِيْ غَرْبَيْ مُقَتَّلَةٍ

گویا میری دونوں آنکھیں بھرے ہوئے ڈول میں رکھی ہوئی ہیں۔

قَتَلْتُ كَذَا عِلْمًا میں نے اچھی طرح جان لیا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (۴-۱۵۷) اور (انہوں نے عیسیٰ کو) یقیناً قتل نہیں کیا۔

کے معنی یہ ہے کہ انہیں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا یقین نہیں تھا[۲]۔

اَلْمُقَاتَلَةُ کے معنی جنگ کرنے اور کسی کے درپے قتل ہونے کے ہیں قرآن میں ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (۲-۱۹۳) اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا (۵۹-۱۲) اور اگر ان سے جنگ ہوئی۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ (۹-۱۲۳) (اپنے نزدیک کے رہنے والے) کافروں سے جنگ کرو۔

[۱] وتمامہ: من النضح تسقی جنة سحقا - قالہ زہیر وقد مر تخریجہ (ج ی) والبیت ایضا فی المحکم (سحق)۔ [۲] راجع (ق ی ن) ۱۲

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ (۴-۷۴) اور جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ قِتْلٌ کے معنی دشمن اور ہمسر کے ہیں مگر اس کے اصل معنی مُقَاتِلٌ یعنی لڑنے والا کے ہیں اور آیت کریمہ:۔

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ (۹-۳۰) خدا ان کو ہلاک کرے۔

بعض کے نزدیک جملہ دعائیہ ہے کہ اللہ ان پر لعنت کرے اور بعض نے اس کے معنی قتل کر دینا کے لکھے ہیں۔ لیکن اصل میں یہ باب مفاعلہ سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے لڑائی کے درپے ہو رہے ہیں اور جو اللہ سے جنگ کرے گا وہ مغلوب ہو گا جیسے فرمایا:۔

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ (۳۷-۱۷۳) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶-۱۵۲) اور ناداری کے اندیشے سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ عزل کے ذریعہ نطفے کو ضائع کرنے اور اسے بے محل ڈالنے سے منع فرمایا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس میں اولاد کو ایسے کاموں میں مشغول رکھنے سے منع کیا ہے جو ان کو حصول علم اور ایسے کاموں میں کوشش کرنے سے روک رکھیں جو ابدی زندگی کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں کیونکہ جاہل اور غافل لوگ آخرت سے مردوں کی طرح بے خبر رہتے ہیں اسی بنا پر آیت:۔

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ (۱۶-۲۱) (وہ) لاشیں ہیں بے جان۔ میں انہیں مردے کہا ہے اور یہی معنی آیت:۔

وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴-۳۰) اور اپنے آپ ہلاک نہ کرو۔ کے ہیں کیونکہ اس کے بعد:۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا (اور جو تعدی و ظلم سے ایسا کرے گا) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ (۵-۹۵) جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے تو (یا تو اس کا) بدلہ (دے) اور وہ یہ ہے کہ اسی طرح کا چارپایہ۔ میں ذبح کی بجائے لفظ قتل اس لئے ذکر کیا ہے کہ یہ سب الفاظ سے اعم ہے اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کی جان لینا بہمہ وجوہ ممنوع ہے۔

اَقْتَلْتُ فُلَانًا میں نے اسے قتل کے لئے پیش کیا اِقْتَتَلَهُ الْجِنُّ وَالْعِشْقُ اسے عشق یا جن نے قتل کر ڈالا۔ اور یہ لفظ ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا اور اِقْتِتَالٌ بمعنی مُقَاتَلَةٌ بھی آتا ہے جیسے فرمایا:۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا (۴۹-۹) مومنین میں سے ... آپس میں لڑ پڑیں۔

(ق ح م)

اَلْاِقْتِحَامُ کے معنی کسی خوفناک جگہ میں گھس جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (۹-۱۱) مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ (۳۸-۵۹) یہ ایک فوج ہے جو ۔۔۔۔ داخل ہو گی۔

تَقَحَّمَ الْفَرَسُ فَارِسَهٗ گھوڑا اپنے سوار کو لے کر خطرناک جگہ میں جا گھسا۔

تَقَحَّمَ فُلَانٌ نَفْسَهٗ فِیْ كَذَا اس نے اپنے تئیں بے سوچے سمجھے خطرہ میں ڈال دیا۔

مَقَاحِیْمُ (واحد مِقْحَامٌ) بے خطر کسی خوفناک امر میں گھس جانے والے بشاعر نے کہا ہے[1]:

(۳۵۱) مَقَاحِیْمُ فِی الْاَمْرِ الَّذِیْ یُتَجَنَّبُ

وہ قابل اجتناب یعنی خوفناک امور میں بے دھڑک گھسنے والے ہیں ۔۔۔۔ ایک روایت میں یَتَهَیَّبُ ہے۔

(ق د د)

اَلْقَدُّ کے معنی کسی چیز کو طول میں قطع کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ (۱۲-۲۶) اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو۔

وَاِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ (۱۲-۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

اَلْقِدُّ بمعنی مَقْدُوْدٌ ہے اور اسی سے انسان کے قد و قامت کو قَدٌّ کہا جاتا ہے جیسا کہ۔ تَقْطِیْعُ الْاِنْسَانِ (انسان کا قد و قامت) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

قَدَدْتُ اللَّحْمَ کے معنی گوشت کے پارچے بنانے کے ہیں اور کٹے ہوئے گوشت کو قَدِیْدٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْقِدَدُ اس کا واحد قِدَّةٌ ہے اور اس کے معنی مختلف طرق اور مذاہب کے ہیں جیسے فرمایا

كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا (۷۲-۱۱) ہمارے کئی طرح کے مذاہب ہیں۔

اور قِدَّةٌ کے معنی لوگوں کی ٹولی اور گروہ کے بھی آتے ہیں جیسے قِطْعَةٌ اِقْتَدَّ الْاَمْرَ کسی کام کی تدبیر کرنا جیسا کہ:۔

فَصَلَ وَحَزَمَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے۔

(ق د)

یہ حرف تحقیق ہے اور فعل کے ساتھ مخصوص ہے علماء نحو کے نزدیک یہ حرف توقع ہے اور اصل میں جب یہ فعل ماضی پر آئے تو تجدد اور حدوث کے معنی دیتا ہے جیسے فرمایا:۔

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا (۱۲-۹۰) خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰیَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ (۳-۱۳) تمہارے لئے دو گروہوں میں ۔۔۔۔ (قدرت خدا کی عظیم الشان) نشانی تھی۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ ۔۔۔۔ (۵۸-۱) خدا نے ۔۔۔۔ سن لی۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴۸-۱۸) (اے پیغمبر) ۔۔۔ تو خدا ان سے خوش ہوا۔

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَی النَّبِیِّ (۹-۱۱۷) بیشک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی۔

اور چونکہ یہ فعل ماضی پر تجدد کے لئے آتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے اوصاف ذاتیہ کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔ لہذا قَدْ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا کہنا صحیح نہیں ہے اور آیت:۔

قَدْ عَلِمَ اَنْ سَیَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰی (۷۳-۲۰) اس نے جانا کہ تم میں بعض بیمار بھی

---

[1] لم اجد قائلہ والبیت فی المحاضرات ۔

ہوتے ہیں۔
میں قَدْ لفظ اگرچہ عَلِمَ پر داخل ہوا ہے لیکن معنوی طور پر اس کا تعلق مرض کے ساتھ ہے جیسا کہ "مَا عَلِمَ اللّٰهُ زَيْدًا يَخْرُجُ" میں نفی کا تعلق خروج کے ساتھ ہے۔ اور اس کی تقدیر یوں ہے قَدْ يَمْرُضُوْنَ فِيْمَا عَلِمَ اللّٰهُ "وَمَا يَخْرُجُ زَيْدٌ فِيْمَا عَلِمَ اللّٰهُ" اگر قَدْ فعل مستقبل پر داخل ہو تو تقلیل کا فائدہ دیتا ہے یعنی کبھی وہ فعل واقع ہوتا ہے اور کبھی واقع نہیں ہوتا اور آیت کریمہ:۔
قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (۲۴-۶۳) خدا کو یہ لوگ معلوم ہیں جو تم میں سے آنکھ بچا کر چل دیتے ہیں۔
کی تقدیر یوں ہے قَدْ يَتَسَلَّلُوْنَ اَحْيَانًا فِيْمَا عَلِمَ اللّٰهُ تو یہ آیت بھی ماسبق کی طرح مؤول ہوگی اور قد کا تعلق تسلل کے ساتھ ہوگا۔
قَدْ وَقَطْ یہ دونوں اسم فعل بمعنی حَسْبُ کے آتے ہیں جیسے محاورہ ہے قَدْنِیْ كَذَا وَقَطْنِیْ كَذَا اور قَدِیْ (بدون نون وقایہ) کا محاورہ بھی حکایت کیا گیا ہے فراء نے قَدْنِیْ اور قَدْكَ پر قیاس کر کے قَدْ زَيْدًا بھی حکایت کیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ قَدْ (اسم فعل) اسم ظاہر کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا بلکہ صرف اسم مضمر کے ساتھ آتا ہے۔

(ق د ر)

اَلْقُدْرَةُ (قدرت) اگر یہ انسان کی صفت ہو تو اس سے مراد وہ قوت ہوتی ہے جس سے انسان کوئی کام کر سکتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ عاجز نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی معنوی طور پر قدرت کاملہ کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتی اگرچہ لفظی طور پر ان کی طرف نسبت ہو سکتی ہے اس لئے انسان کو مطلقاً هُوَ قَادِرٌ کہنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ تقیید کے ساتھ هُوَ قَادِرٌ عَلٰى كَذَا کہا جائیگا لہٰذا اللہ کے سوا ہر چیز قدرت اور عجز دونوں کے ساتھ متصف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے جو ہر لحاظ سے عجز سے پاک ہے۔
اَلْقَدِيْرُ اسے کہتے ہیں جو اقتضائے حکمت کے مطابق جو چاہے کر سکے اور اس میں کمی بیشی نہ ہونے دے۔ لہٰذا اللہ کے سوا کسی کو قدیر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن میں ہے:۔
وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (۴۲-۲۹) اور وہ جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر۔۔۔۔ ۔۔۔ قادر ہے۔
اور یہی معنی تقریباً مقتدر کے ہیں جیسے فرمایا:۔
عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (۵۴-۵۵) ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔
فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ (۴۳-۴۲) ہم ان پر قابو رکھتے ہیں۔
لیکن مقتدر کے ساتھ کبھی انسان بھی متصف ہو جاتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق مقتدر کا لفظ استعمال ہو تو یہ قدیر کے ہم معنی ہوتا ہے اور جب انسان کا وصف واقع ہو تو اس کے معنی تکلف سے قدرت حاصل کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے:۔
قَدَرْتُ عَلٰى كَذَا قُدْرَةً کہ میں نے فلاں چیز پر قدرت حاصل کر لی۔ قرآن میں ہے:۔
لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا (۲-۲۶۴)

(اسی طرح یہ ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ نہیں لے سکیں گے۔

اَلْقَدْرُ وَالتَّقْدِیْرُ کے معنی کسی چیز کی کمیت کو بیان کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ قَدَرْتُہٗ وَقَدَّرْتُہٗ اور قَدَّرَہٗ (تفعیل) کے معنی کسی کو قدرت عطا کرنا بھی آتے ہیں محاورہ ہے۔

قَدَّرَنِیَ اللّٰہُ عَلٰی کَذَا وَقَوَّانِیْ عَلَیْہِ اللہ نے مجھے اس پر قدرت عطا فرمائی پس "تقدیر الٰہی" کی دو صورتیں ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو قدرت بخشنا (۲) یا اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو مقدار مخصوص اور طرز مخصوص پر بنانا جیسا کہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے اس لئے کہ فعل الٰہی دو قسم پر ہے اول ایجاد بالفعل یعنی ابتدا ہی سے کسی چیز کو ایسا کامل وجود عطا کرنا کہ جب تک مشیت الٰہی اس کے فنا یا تبدیل کی مقتضی نہ ہو اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے جیسے اجرام سماویہ اور ومافیہا کی تخلیق (کہ ان میں تاقیامت کسی قسم کا تغیر نہیں ہو گا) دوم یہ کہ اصول اشیاء کو بالفعل اور ان کے اجزاء کو بالقوۃ وجود عطا فرمانا اور ان کو اس اندازہ کے ساتھ مقدر کرنا کہ اس کے خلاف ظہور پذیر نہ ہو سکیں جیسا کہ خرما کی گٹھلی کے متعلق تقدیر الٰہی یہ ہے کہ اس سے خرما کا درخت ہی اگتا ہے اور سیب یا زیتون کا درخت نہیں اگ سکتا اسی طرح انسان کی منی سے انسان ہی پیدا ہوتا ہے دوسرے جانور پیدا نہیں ہو سکتے۔

پس تقدیر الٰہی کے دو معنی ہوئے ایک یہ کہ کسی چیز کے متعلق نفی یا اثبات کا حکم لگانا کہ یوں ہو گا اور یوں نہیں ہو گا۔ عام اس سے کہ وہ حکم برسبیل وجوب ہو یا برسبیل امکان چنانچہ آیت :۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵-۳) خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

میں یہی معنی مراد ہیں دوم کسی چیز پر قدرت عطا کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ :۔

فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُوْنَ (۷۷-۲۳) پھر اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی خوب اندازہ مقرر کرنے والے ہیں۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اللہ کا ہر حکم قابل ستائش ہے۔ اور یہ آیت :۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵-۳) خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

کے ہم معنی ہے اور اس میں ایک قراءت فَقَدَّرْنَا (تشدید دال) کے ساتھ بھی ہے اور اس کے معنی یا تو حکم کرنے کے ہیں اور یا اعطاء قدرت کے اور آیت کریمہ :۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَکُمُ الْمَوْتَ ہم نے تم میں مرنا ٹھہرا دیا۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ موت مقدر کرنے والا چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لئے یہ بھی عین حکمت کے مطابق ہے اور مجوس کا یہ زعم غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور ابلیس مارتا ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔

میں لیلۃ القدر سے خاص رات مراد ہے جسے امور مخصوصہ کی انجام دہی کے لئے اللہ نے مقرر کر رکھا ہے۔ نیز فرمایا :۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (۵۴-۴۹) ہم نے ہر چیز اندازہ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔

اور آیت کریمہ :۔

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ أَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ (۷۳-۲۰) اور خدا تو رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔
میں سلسلہ لیل و نہار کے اجرار کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ ان کے اوقات کی معرفت حاصل کرنا اور پھر اوقات معینہ میں حق عبادات ادا کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ہے اور آیت کریمہ:۔
مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ نطفے سے بنایا پھر اس کا اندازہ مقرر کیا (۸۰-۱۹)
میں ان قویٰ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالٰے نے نطفہ میں بالقوۃ ودیعت کر رکھے ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً صورت کا لباس پہن کر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳-۳۸) اور خدا کا حکم ٹھہر چکا ہے۔
میں قدر کے لفظ سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جن کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ لوح محفوظ میں لکھے جا چکے ہیں جن کی طرف کہ آنحضرت نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ [۱]
فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْخَلْقِ وَالْأَجَلِ وَالرِّزْقِ کہ اللہ تبارک و تعالٰی خلق، عمر اور رزق سے فارغ ہو چکا ہے اور مَقْدُوْر کے لفظ سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جو وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔
جن کی طرف کہ آیت:۔
كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵-۲۹) وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔ میں اشارہ فرمایا ہے اسی معنی میں فرمایا:۔

وَمَا نُنَزِّلُهٗ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵-۲۱) اور ہم ان کو بمقدار مناسب اتارتے رہتے ہیں۔
ابو الحسن نے کہا ہے کہ یہ قَدْرٌ و قَدَرٌ (بفتح الدال و سکونہا) دونوں طرح بولا جاتا ہے چنانچہ محاورہ خُذْ بِقَدَرِ كَذَا و قَدْرِ كَذَا (کہ اتنی مقدار میں لے لو) وَفُلَانٌ يُخَاصِمُ بِقَدَرٍ وَقَدْرٍ اور آیت کریمہ:
عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (۲-۲۳۶) یعنی مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔
میں قَدَرٌ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنی مقدور کے مطابق اخراجات ادا کرے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۸۷-۳) اور جس نے (اس کا) اندازہ ٹھہرا دیا (پھر اس کو) رستہ بتایا۔
کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالٰے نے ہر چیز کو وہ کچھ عطا فرما دیا جس میں اس کی مصلحت ہے اور اسے تعلیمی یا تسخیری طور پر ان چیزوں کی طرف ہدایت کر دی ہے جن میں اس کی نجات مضمر ہے جیسے فرمایا۔
الَّذِيْ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰-۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر راہ دکھائی۔
جب "تقدیر" کا فاعل انسان ہو تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تقدیر محمود یعنی عقل و فکر کے مطابق کسی امر پر غور و فکر کرنا اور پھر اس خاکہ کے مطابق کسی کام کو سر انجام دینا۔ دوم تقدیر مذموم کہ انسان اپنی تمنا اور خواہش کے پیمانہ کے مطابق کسی امر پر غور و فکر کرے اور عقل و فکر سے کام نہ لے جیسے فرمایا:۔

---

[۱] وفی روایۃ ابن عساکر عن انس مرفوعاً فرغ اللہ عن اربع من الخلق الخ وفی روایۃ الطبرانی عن ابی الدرداء من خمس من اجلہ ورزقہ و اثرہ ومضجعہ وشقی او سعید وراجع کنز العمال رقم ۴۹۴-۴۹۶ والفتح الکبیر للنبہانی ۲/۲۶۶

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ. فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۷۴-۱۸،۱۹) اس نے فکر کیا اور تجویز کی یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی ۔

اور استعارہ کے طور پر قدرۃ اور مقدور کے معنی حالت اور وسعت مالی کے بھی آتے ہیں اور قَدَرٌ کے معنی اس معین وقت یا مقام کے بھی ہوتے ہیں جو کسی کام کے لئے مقرر ہو چکا ہو چنانچہ فرمایا:۔

اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۷۷-۲۲) ایک معین وقت تک ۔نیز فرمایا:۔

فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا (۱۳-۱۷) پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے ۔

یعنی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلتے ہیں ایک قرأت میں بِقَدْرِهَا ہے جو بمعنی تقدیر یعنی اندازہ ..... کے ہے اور آیت کریمہ :۔

وَغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ (اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں ۔ میں قٰدِرِیْنَ کے معنی قَاصِدِیْنَ کے ہیں یعنی جو وقت انہوں نے مقرر کر رکھا تھا۔ اندازہ کرتے ہوئے اس وقت پر وہاں جا پہنچے اور یہی معنی آیت کریمہ :۔

فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۵۴-۱۲) تو پانی ایک کام کے لئے جو مقدر ہو چکا تھا جمع ہو گیا ۔ میں مراد ہیں۔ اور قَدَرْتُ عَلَیْهِ الشَّیْءَ کے معنی کسی پر تنگی کر دینے کے ہیں گویا وہ چیز اسے معین مقدار کے ساتھ دی گئی ہے اس کے بالمقابل بغیر حساب (یعنی بے اندازہ) آتا ہے ۔قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ (۶۵-۷) اور جس کے رزق میں تنگی ہو۔

یعنی جس پر اس کی روزی تنگ کر دی گئی ہو۔ نیز فرمایا:۔

اَللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ (۱۳-۲۶) خدا جس پر چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے ۔

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ (۲۱-۸۷) اور خیال کیا کہ ہم ان پر تنگی نہیں کریں گے۔

اور ایک قرأت میں لَنْ نُّقَدِّرَ عَلَیْهِ ہے اور اسی سے لفظ اَقْدَرُ مشتق ہے جس کے معنی کوتاہ گردن آدمی کے ہیں اور اَقْدَرُ اس گھوڑے کو بھی کہتے ہیں جس کے دوڑتے وقت پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اگلے پاؤں پڑے تھے ۔ اور آیت کریمہ :۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ (۳۹-۶۷) ان لوگوں نے خدا کی قدر شناسی جیسی کرنی چاہیئے تھی نہیں کی ۔

یعنی یہ لوگ اس کی حقیقت کو نہیں پا سکے اور پھر اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ وہ اس کی کنہہ کا ادراک بھی کیسے کر سکتے ہیں جب کہ اس کی شان یہ ہے کہ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (۳۹-۶۷) اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہو گی ۔

اور آیت کریمہ :۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ (۳۴-۱۱) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور کڑیوں کو اندازے سے جوڑو ۔

میں قَدِّرْ فِی السَّرْدِ کے معنی یہ ہیں کہ مضبوط اور محکم زرہیں بناؤ ۔

اور مِقْدَارُ الشَّیْءِ اس وقت یا زمانہ وغیرہ کو کہا

جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (۷۰-۴) اور اس روز (نازل ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔
لِئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّن فَضْلِ اللَّهِ (۵۷-۲۶) (یہ باتیں) اس لئے (بیان کی گئی ہیں) کہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ خدا کے فضل پر کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے۔
پر بحث تاویل کے ساتھ مختص ہے (یعنی اس میں تاویل سے چارہ نہیں ہے)

اَلْقِدْرُ (دیگ) برتن جس میں گوشت پکایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَقُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ (۳۴-۱۳) اور دیگیں جو ایک ہی جگہ رکھی ہیں۔
اور قَدَرْتُ اللَّحْمَ کے معنی ہانڈی میں گوشت پکانے کے ہیں اور ہنڈیا میں پکائے ہوئے گوشت کو قَدِيرٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْقُدَارُ (قصاب) وہ شخص جو اونٹ کو نحر (ذبح) کرکے دیگ میں اس کا گوشت پکاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)
(۳۵۱) ضَرْبَ الْقُدَارِ نَقِيعَةَ الْقُدَّامِ
جیسا کہ قصاب سفر سے آنے والے کی خوشی میں دعوت کے لئے گوشت کاٹتا ہے۔

(ق د س)

اَلتَّقْدِيسُ کے معنی اس تطہیر الہٰی کے ہیں جو کہ آیت وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳-۳۳) اور تمہیں بالکل پاک صاف کردے۔ میں مذکور ہے۔ کہ اس کے معنی تطہیر بمعنی ازالہ نجاست محسوسہ کے نہیں ہے اور آیت کریمہ:۔
وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲-۳۰) اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے حکم کی بجا آوری میں اشیاء کو پاک و صاف کرتے ہیں اور بعض نے اس کے معنی نَصِفُكَ بِالتَّقْدِيسِ بھی لکھے ہیں یعنی ہم تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ (۱۶-۱۰۲) کہہ دو کہ اس کو روح القدس ۔۔۔۔ لے کر نازل ہوئے ہیں۔ میں روح القدس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قدس یعنی قرآن حکمت اور فیض الہٰی لے کر نازل ہوتے تھے۔ جس سے نفوس انسانی کی تطہیر ہوتی ہے۔ اور البیت المقدس کو بیت مقدس اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ نجاست شرک سے پاک صاف ہے

---

[1] قالہ مہلہل بن ربیعہ واولہ: وانا النضرب بالصوارم ہامہا وفی روایۃ بالسیوف رؤسہم ہل بالصوارم ہامہا۔ راجع للبیت الامالی للمرتضیٰ (۱: ۳۵۶، ۲: ۲۸) وتہذیب الالفاظ ۶۲۵ والبخلاء ۲۱۵ والفاخرہ ۹۸ والمخصص (۴: ۱۲۰) واللسان (قدر، نقع، قدم) والاشتقاق ۳۲۳ والمقاییس (۵: ۶۲، ۷۲، ۴) والمرزوقی ۱۰۲۵ ونظام الغریب ۲۴۲ والمعانی للقتبی ۳۷۷ و البیت ثالث ثلاثۃ فی دیوانہ (۷۰-۱) وراجع لمعناہ المرزوقی والاشتقاق وکتاب النوادر لابی مسحل (۱: ۳۷-۳۹) والشاعر اسمہ امرؤ القیس او عدی بن ربیعہ جاہلی ترجمتہ فی الشعراء ۲۵۶-۲۵۹ والمرزبانی ۲۴۸ والآمدی ۱۱ والاغانی (۴: ۱۴۰-۱۵۱) والامالی (۲۶-۲۷، ۱۱۱-۱۱۲) والعینی (۴: ۲۱۱، ۳۷، ۲) وشواہد المغنی ۲۲۵

اسی طرح آیت کریمہ :۔
يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (۵-۲۱) تو بھائیو! تم ارض مقدس (یعنی ملک شام) میں جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ رکھا ہے۔ داخل ہو۔
میں ارض مقدسہ کے معنی پاک سرزمین کے ہیں۔ اور حَظِيْرَةُ الْقُدُسِ سے بعض کے نزدیک جنت اور بعض کے نزدیک شریعت مراد ہے اور یہ دونوں قول صحیح ہیں کیونکہ شریعت بھی ایک ایسا حظیرہ یعنی احاطہ ہے جس میں داخل ہونے والا پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

(ق د م)

اَلْقَدَمُ انسان کا پاؤں جمع اَقْدَامٌ۔ قرآن میں ہے :۔
وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۸-۱۱) اس سے تمہارے پاؤں جمائے رکھے۔
اسی سے تقدم کا لفظ لیا گیا ہے جو کہ تاخر کی ضد ہے اور تقدم چار قسم پر ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں[1]۔ اور قَدِيْمٌ حَدِيْثٌ کی ضد ہے اور اس کے معنی پرانی چیز کے ہیں (یہ تقدم زمانی سے ہے) اور کبھی تقدم بلحاظ مرتبہ کے ہوتا ہے جیسے: فُلَانٌ مُتَقَدِّمٌ عَلٰى فُلَانٍ۔ یعنی فلاں اس سے اشرف ہے۔ اور کبھی متقدم اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر دوسری چیز کا وجود موقوف ہو جیسے اَلْوَاحِدُ مُتَقَدِّمٌ عَلَى الْعَدَدِ کہ واحد عدد پر متقدم ہے کیونکہ واحد کے بغیر عدد کا وجود ناممکن ہے۔ اَلْقِدَمُ کے معنی کسی چیز کے زمانہ ماضی میں موجود ہونے کے ہیں اس کے بالمقابل بقاء ہے جس کے معنی زمانہ مستقبل میں موجود رہنے کے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی وصف میں یَاقَدِیْمَ الْاِحْسَانِ تو آیا ہے۔ لیکن کہیں بھی قرآن اور آثار صحیحہ سے قَدِيْمٌ کے لفظ کا اسمائے حسنیٰ سے ہونا ثابت نہیں ہے البتہ علمائے متکلمین اسے بطور صفت الٰہی کے استعمال کرتے ہیں عموماً اَلْقَدِيْمُ کا لفظ قدم باعتبار زمانہ یعنی پرانی چیز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۶-۳۹) کھجور کی پرانی شاخ کی طرح۔ اور آیت کریمہ :۔
لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۱۰-۲) ان کے پروردگار کے ہاں ان کا سچا درجہ ہے۔
میں قَدَمَ صِدْقٍ سے سابقہ فضیلت مراد ہے۔ اور یہ اسم مصدر ہے اور قَدَّمْتُ كَذَا کے معنی پہلے سے کوئی کام کر چکنے یا بھیجنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ (۵۸-۱۳) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو، ڈر گئے ہو۔
لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ (۵-۸۰) انہوں نے جو کچھ اپنے واسطے آگے بھیجا ہے برا ہے۔
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (۲-۹۵) جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔
اور قَدَمْتُ فُلَانًا اَقْدُمُهٗ کے معنی کسی کے آگے آگے جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۱۱-۹۸) وہ قیامت

---

[1] راجع (ا خ ر)

کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا۔
اور آیت کریمہ:۔
لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۴۹-۱) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لَا تُقَدِّمُوْا بمعنی لَا تَتَقَدَّمُوْا کے ہے اور اس کے اصل معنی یہ ہیں۔ کہ قول وحکم میں پیغمبر سے سبقت نہ کرو بلکہ وہی کام کرو جس کا تمہیں حکم دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کے مکرم بندوں یعنی فرشتوں کا کردار بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔
لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ۔ (۲۱-۲۷) اس کے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے۔
اور آیت کریمہ:۔
لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۶-۶۱) ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ تقدم وتاخر کا ارادہ بھی نہیں کر سکیں گے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ (۳۶-۱۱) جو کچھ وہ آگے بھیج چکے ہیں اور جو ان کے (پیچھے) نشان (رہ گئے) ہیں ہم ان کو قلم بند کر لیتے ہیں۔
میں مَا قَدَّمُوْا سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ پہلے کر چکے ہیں۔
قَدَّمْتُ اِلَيْهِ بِكَذَا پہلے سے کسی چیز کے متعلق کہہ رکھنا اور قَدَّمْتُ بِهٖ وقت حاجت سے پہلے کسی کام کے متعلق آگاہ کرنا۔ اور اسی سے آیت کریمہ:۔
وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ (۵۰-۲۸) ہم تمہارے پاس پہلے ہی عذاب کی وعید بھیج چکے تھے۔
ہے اور قُدَّامُ خَلْفٌ کی ضد ہے اس کی تصغیر قُدَيْدِمَةٌ آتی ہے۔

رَكِبَ فُلَانٌ مَقَادِيْمَهٗ وہ سیدھا چلا گیا یعنی ادھر ادھر مڑ کر نہیں دیکھا۔
قَادِمَةُ الرَّحْلِ کجاوہ کا اگلا حصہ قَادِمَةُ الْاَطْبَاءِ (جانور کا اگلا پستان یا پستان کا سرا۔ قَادِمَةُ الْجَنَاحِ پرندے کے بازو کا اگلا حصہ۔ مُقَدَّمَةُ الْجَيْشِ لشکر کا اگلا حصہ (ہراول دستہ)
اَلْقُدُمُ دلیری سے آگے بڑھنے والا آدمی۔ تیشہ ان تمام الفاظ میں معنی تقدم معتبر ہے۔

(ق ذ ف)

اَلْقَذْفُ (ض) کے معنی دور پھینکنا کے ہیں پھر معنی بُعد کے اعتبار سے دور دراز منزل کو منزل قذف وقذیف کہا جاتا ہے اسی طرح دور دراز شہر کو بَلْدَةٌ قَذِيْفَةٌ بول لیتے ہیں . . . . . اور آیت کریمہ:۔
فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ (۲۰-۳۹) پھر اس (صندوق) کو دریا میں ڈال دو۔
کے معنی دریا میں پھینک دینے کے ہیں۔ نیز فرمایا:۔
وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (۳۳-۲۶) اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔
بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ (۲۱-۱۸) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں۔
يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (۳۴-۴۸) وہ اوپر سے حق اتارتا ہے اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔
وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا (۳۷-۸/) اور ہر طرف سے ان پر انگارے پھینکے جاتے ہیں (یعنی) وہاں سے نکال دینے کو۔
اور دَحْيٌ کی طرح قَذْفٌ کا لفظ بھی بطور استعارہ

گالی دینے اور عیب لگانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے[1]

(ق ر ر)

قَرَّ فِی مَکَانِہٖ یَقِرُّ قَرَارًا (ض) کے معنی کسی جگہ جم کر ٹھہر جانے کے ہیں اصل میں یہ قُرٌّ سے ہے جس کے معنی سردی کے ہیں جو کہ سکون کو چاہتی ہے جیسا کہ اس کے برعکس حَرٌّ (گرمی) حرکت کو چاہتی ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ (۳۳-۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔

میں ایک قراءت وَقِرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں اِقْرِرْنَ ہے ایک راء کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت: فَظَلْتُمْ تَفَکَّهُونَ میں ظَلْتُمْ اصل میں ظَلِلْتُمْ ہے اور ایک لام کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے)

اَلْقَرَارُ (اسم) (ٹھہرنے کی جگہ) قرآن میں ہے۔

جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا (۴۰-۶۴) جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا۔

اور جنت کے متعلق فرمایا:-

ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ (۲۳-۵۰) جو رہنے کے لائق اور جہاں نتھرا ہوا پانی جاری تھا پناہ دی)

اور جہنم کے متعلق فرمایا:-

وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴-۲۹) اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

اور آیت کریمہ:-

اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۱۴-۲۶) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس کو ذرا بھی قرار نہیں۔ میں . . . . .

قرار کے معنی ثبات کے ہیں شاعر نے کہا ہے[2] (۳۵۲) وَلَا قَرَارَ عَلٰی زَاْرٍ مِنَ الْاَسَدِ یعنی شیر کے دھاڑنے پر امن (چین) حاصل نہیں ہو سکتا۔

اور یَوْمَ النَّحْرِ سے بعد کے دن کو یَوْمَ الْقَرِّ کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ اس روز منیٰ میں ٹھہر کر رہتے ہیں۔ اِسْتَقَرَّ فُلَانٌ قرار پکڑنے کا قصد کرنا۔ اور کبھی بمعنی قَرَّ (قرار پکڑنا) بھی آجاتا ہے جیسے استجاب بمعنی اَجَابَ چنانچہ جنت کے متعلق فرمایا:-

خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا (۲۵-۲۴) ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا

اور جہنم کے متعلق فرمایا:-

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا (۲۵-۶۶) اور دوزخ ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور آیت کریمہ:-

فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ (۶-۹۸) تمہارے لئے ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی۔ میں ابن مسعودؓ کے نزدیک مُسْتَقَرٌّ سے مراد زمین میں ٹھہرنا ہے اور مُسْتَوْدَعٌ سے مراد قبریں ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ مُسْتَقَرٌّ سے مراد تو زمین ہی ہے لیکن مُسْتَوْدَعٌ سے مراد دنیا ہے۔ الحاصل ہر وہ حالت جس سے انسان منتقل ہو جائے وہ مُسْتَقَرٌّ تام نہیں ہو سکتا۔

اَلْاِقْرَارُ (افعال) کے معنی کسی چیز کو ٹھہرا دینے کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:-

وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (۲۲-۵) اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک میعاد مقرر

---

[1] وتقوف المحصنات معناه یعیبن بالزنا الالاتی فی القرآن ویرمون (۲۴-۴) [2] قالہ النابغۃ فی والبیت وصدرہ فیئت ان ابا قابوس اوعدنی ۔ . . . والبیت فی دیوانہ واللسان (قیس) وخاص الخاص ثعالبی ۹۵ والعشر للتبریزی ۳۰۲ والسیوطی ۲۸، ۸۵ ؎

تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔
اور کبھی اس کے معنی ثابت کرنا بھی آجاتے ہیں اور اقرار کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے اور کبھی ان دونوں سے۔ توحید اور دیگر ایمانیات کے بارے میں صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے ساتھ دل سے بھی اقرار نہ کرے۔ اقرار کی ضد انکار آتی ہے اور جحود صرف زبان سے انکار کر دینے پر بولا جاتا ہے خواہ دل سے اسے تسلیم ہی کیوں نہ کرتا ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے[1]۔ قرآن میں ہے۔
ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۲-۸۴) پھر تم نے اقرار کر لیا اور تم اس بات کے گواہ ہو۔
ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا (۳-۸۱) پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے۔ تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا۔ اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی (اور عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اقرار پر میرا ذمہ لیا۔ انہوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا۔
قَرَّتْ لَيْلَتُنَا تَقَرُّ رات کا ٹھنڈا ہونا۔
يَوْمٌ قَرٌّ (ٹھنڈا دن) لَيْلَةٌ قِرَّةٌ (ٹھنڈی رات) قُرَّ فُلَانٌ فلاں کو سردی لگ گئی اور مَقْرُوْرٌ کے معنی ٹھٹھرے ہوئے آدمی کے ہیں مثل مشہور ہے[2]۔
حَرَّةٌ تَحْتَ قِرَّةٍ یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو اپنے ضمیر کے خلاف بات کرے۔
قَرَرْتُ الْقِدْرَ اَقُرُّهَا میں نے ہانڈی میں ٹھنڈا پانی ڈالا۔ اور اس پانی کو قَرَارَةٌ یا قِرَّةٌ کہا جاتا ہے۔

اُقْتُرَّ فُلَانٌ اِقْتِرَارًا یہ تَبَرَّدَ کی طرح ہے جس کے معنی ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے ہیں۔
قَرَّتْ عَيْنُهٗ تَقَرُّ آنکھ کا ٹھنڈا ہونا مراد خوشی حاصل ہونا ہے، قرآن میں ہے:۔
كَیْ تَقَرَّ عَيْنُهَا (۲۰-۴۰) تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔
اور جسے دیکھ کر انسان کو خوشی حاصل ہو اسے قُرَّةُ عَيْنٍ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
قُرَّتُ عَيْنٍ لِّیْ وَلَكَ (۲۸-۹) یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (۲۵-۷۴) اے ہمارے پروردگار ہمیں بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما۔
بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں قُرٌّ بمعنی سردی سے ہے لہٰذا قَرَّتْ عَيْنُهٗ کے معنی آنکھ کے ٹھنڈا ہو کر خوش ہو جانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے۔ کہ قَرَّتْ عَيْنُهٗ کے معنی خوش ہونا اس لئے آتے ہیں کہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو چونکہ گرم ہوتے ہیں اس لئے بددعا کے وقت اَسْخَنَ اللّٰهُ عَيْنَهٗ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قَرَارٌ سے مشتق ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز بخشے جس سے اس کی آنکھ کو سکون حاصل ہو یعنی اسے دوسری چیز کی حرص نہ رہے۔
اَقَرَّ بِالْحَقِّ حق کا اعتراف کرنا۔ تَقَرَّرَ الْاَمْرُ عَلٰى كَذَا کسی امر کا حاصل ہو جانا۔
اَلْقَارُوْرَةُ شیشہ جمع قَوَارِیْرُ . . .
قرآن میں ہے:۔

---

[1] راجع رجحد ۔ [2] اللسان (حر، قر) قال وانما كسروا الحرة لمكان القرة والمثل ایضاً فی الحیوان ۵ر۱۰۷ و المیدانی ۱۲ ۔

قَوَارِيرَا مِن فِضَّةٍ (۷۶-۱۶) اور شیشے بھی چاندی کے۔
صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّن قَوَارِيرَ یہ ایسا محل ہے
جس میں نیچے بھی (شیشے جڑے ہوئے ہیں (۲۷-۴۴)
یعنی شیشے کا بنا ہوا ہے۔

(ق ر ء)

قَرَءَتِ الْمَرْءَةُ وَقَرَءَتِ الدَّمَ وَاَقْرَءَتْ
عورت کو حیض آنا اور قَرَءَتِ الْجَارِيَةُ استبراء رحم کرنا
اَلْقَرْءُ کے اصل معنی طہر سے حیض میں داخل ہونے
کے ہیں اور چونکہ یہ لفظ طہر اور حیض دونوں کا جامع
ہے اس لئے دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ
قاعدہ یہ ہے کہ جو اسم دو چیزوں کے لئے بحیثیت
مجموعی وضع کیا گیا ہو وہ ہر ایک پر انفراداً بھی بولا
جا سکتا ہے[1] مثلاً لفظ مَائِدَۃٌ کہ دستر خوان اور
کھانا دونوں کے مجموعہ کے لئے وضع کیا گیا ہے
مگر ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے لہٰذا قَرْءٌ
نہ صرف حیض کا نام ہے اور نہ صرف طہر کا بلکہ
دونوں کے لئے وضع کیا گیا ہے، اس کی دلیل یہ
ہے کہ جس عورت کو حیض نہ آتا ہو اسے ذَاتُ قَرْءٍ
نہیں کہا جاتا اور ایسے ہی حائض جسے متواتر خون
آ رہا ہو اور نُفَسَاءُ (صاحب نفاس) کو بھی
ذَاتُ قُرْءٍ نہیں کہتے اور آیت کریمہ:۔
يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ (۲-۲۲۸)
تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں۔
میں ثَلَاثَةَ قروء کے معنی تین مرتبہ طہر سے حالت
حیض کی طرف منتقل ہونے کے ہیں۔ اور آنحضرت
نے فرمایا[2] (۸۱)
اُقْعُدِي عَنِ الصَّلٰوةِ اَيَّامَ اَقْرَائِكِ کہ حیض
کے دنوں میں نماز ترک کر دے۔
یہ محاورہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کہا جائے اِفْعَلْ
كَذَا اَيَّامَ وُرُوْدِ فُلَانٍ کہ فلاں آدمی کی آمد کے
دنوں یہ اور یہ کام کرو تو یہاں بھی ایام کا لفظ استعمال
ہوا ہے حالانکہ ورود تو ایک ساعت میں ہو جاتا
ہے۔ بعض اہل لغت کا قول ہے کہ قَرْءٌ کا لفظ
قَرْءٌ سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے
ہیں۔ تو انہوں نے زمانہ طہر اور زمانہ حیض کو جمع
کرنے کے معنی کا اعتبار کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے
ذکر کر چکے ہیں۔ کیونکہ زمانہ طہر میں خون رحم میں
جمع ہوتا رہتا ہے۔
اَلْقِرَاءَةُ کے معنی حروف وکلمات کو ترتیل
میں جمع کرنے کے ہیں کیونکہ ایک حروف کے
بولنے کو قراءت نہیں کہا جاتا اور نہ یہ عام ہر چیز
کے جمع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ لہٰذا اَجْمَعْتُ الْقَوْمَ
کی بجائے قَرَءْتُ الْقَوْمَ کہنا صحیح نہیں ہے۔
اَلْقُرْاٰنُ۔ یہ اصل میں کفران و رجحان کی طرح
مصدر ہے چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ
فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (۷۵-۱۷، ۱۸) اس کا جمع کرنا
اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم وحی پڑھا
کریں تو تم (اس کو سنا کرو) اور پھر اسی طرح
پڑھا کرو۔
حضرت ابن عباسؓ نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ جب

---

[1] وعلی ہذا الاطلاق کلاہما مجاز والقعدۃ العلماء من الاضداد (اضداد ابی الطیب ۱۷۵-۷۶ ،۵) [2] قالہ صلی اللہ علیہ وسلم لام حبیبۃ بنت جحش او فاطمۃ بنت ابی حبیش وکلا الحدیثین باختلاف الفاظہما اخرجہما اصحاب السنن (راجع العون ۱۱-۱۲۲ والزرقانی علی الموطا ۱۲۱-۱۲۲) انظر للبحث عن لفظ القرآن مجاز ابی عبیدۃ من ۱-۳ وعلیہ سلک البخاری فی صحیحہ فتح الباری ۸ (۴۰۳-۳۳۹) ؎

ہم قرآن تیرے سینہ میں جمع کر دیں تو اس پر عمل کرو لیکن عرف میں یہ اس کتاب الٰہی کا نام ہے جو آنحضرت پر نازل کی گئی اور یہ اس کتاب کے لئے بمنزلہ عَلَم بن چکا ہے جیسا کہ توراۃ اس کتاب الٰہی کو کہا جاتا ہے جو حضرت موسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئی اور انجیل اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو حضرت عیسٰیؑ پر نازل کی گئی۔ بعض علماء نے قرآن کی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی ہے کہ قرآن چونکہ تمام کتب سماویہ کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے بلکہ تمام علوم کے ماحصل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس لئے اس کا نام قرآن رکھا گیا ہے جیسا کہ آیت :۔

وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (۱۲-۱۱۱) اور ہر چیز کی تفصیل کرنے والا۔ اور آیت کریمہ :۔

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶-۸۹) کہ اس میں ہر چیز کا بیان مفصل ہے۔

میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ نیز فرمایا :۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹-۲۸) یہ قرآن عربی ہے جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ (۱۷-۱۰۶) اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ۔

فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ (۱۷-۴۱) اس قرآن میں ۔۔۔۔ اور آیت کریمہ :۔

وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (۱۷-۷۸) اور صبح کو قرآن پڑھا کرو میں قرآن کے معنی تلاوت قرآن کے ہیں۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (۵۶-۷۷) یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔

اَقْرَأْتُ فُلَانًا کذا کے معنی کسی کو کچھ پڑھانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا :۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى (۸۷-۶) ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ فراموش نہ کرو گے۔

اور تَقَرَّأْتُ بمعنی تَفَهَّمْتُ ہے (یعنی میں نے اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا)

قَادَأْتُهٗ (مفاعلۃ) باہم مذاکرہ کرنا یا کتاب کا سبق دہرانا۔

(ق ر ب)

اَلْقُرْبُ وَالْبُعْدُ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے :۔ قَرُبْتُ مِنْهُ اَقْرُبُ وَقَرَّبْتُهٗ اُقَرِّبُهٗ قُرْبًا وَقُرْبَانًا کسی کے قریب جانا اور مکان زمان، نسبی تعلق، مرتبہ حفاظت اور قدرت سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرب مکانی کے متعلق فرمایا :۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲-۳۵) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ (۶-۱۵۲) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى (۱۷-۳۲) اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔

فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (۹-۲۸) تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔ اور آیت کریمہ :۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ ۔۔۔۔ (۲-۲۲۲) ان سے مقاربت نہ کرو۔ میں جماع سے کنایہ ہے۔

فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ (۵۱-۲۷) اور کھانے کے لئے ان کے آگے رکھ دیا۔

اور قرب زمانی کے متعلق فرمایا:۔
اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ (۲۱-۱) لوگوں کا حساب (اعمال) کا وقت نزدیک آپہنچا۔
اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (۲۱-۱۰۹) اور مجھ کو معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ عنقریب آنے والی ہے یا اس کا وقت دور ہے۔
اور قرب نسبی کے متعلق فرمایا:۔
وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى (۴-۸) اور جب میراث کی تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتے دار آجائیں۔
اَلْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (۴-۷) ماں باپ اور رشتے دار۔
وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (۶-۱۵۲) گو وہ تمہارا رشتے دار ہی ہو۔
وَلِذِی الْقُرْبٰى (۸-۴۱) اور اہل قرابت کا۔
وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى (۴-۳۶) اور رشتے دار ہمسایوں
يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰-۱۵) یتیم رشتے دار کو....
اور قرب بمعنی رتبہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا کے متعلق فرمایا:۔
وَالْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۴-۱۷۲) اور نہ مقرب فرشتے (عار سمجھتے) ہیں۔
اور عیسٰی علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔
وَجِيْهًا فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۳-۴۵) (اور جو) دنیا اور آخرت میں آبرو اور (خدا کے) خاصوں میں سے ہوگا۔
عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳-۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے۔

فَاَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۵۶-۸۸) پھر اگر وہ خدا کے مقربوں میں سے ہے۔
قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۷-۱۱۴) (فرعون نے) کہا ہاں (ضرور) اور اس کے علاوہ تم مقربوں میں داخل کر لئے جاؤ گے۔
وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا (۱۹-۵۲) اور باتیں کہنے کے لئے نزدیک بلایا۔
اور اَلْقُرْبَةُ کے معنی قرب حاصل کرنے کا ذریعہ کے بھی آتے ہیں جیسے فرمایا:۔
قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ (۹-۹۹) اس کو خدا کی قربت کا ذریعہ۔
اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ (۹-۹۹) دیکھو وہ بے شبہ ان کے لئے (موجب) قربت ہے۔
تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤى (۳۴-۳۷) کہ تم کو ہمارا مقرب بنا دیں۔
اور رعایت و نگہبانی کے متعلق فرمایا:۔
اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷-۵۶) کچھ شک نہیں کہ خدا کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔
فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲-۱۸۶) میں تو تمہارے پاس ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔
اور قرب بمعنی قدرۃ فرمایا:۔
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰-۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ (۵۶-۸۵) اور ہم اس مرنے والے سے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔

میں بھی یہ ممکن ہے کہ قرب بلحاظ قدرت مراد ہو۔
اَلْقُرْبَانُ (نیاز) ہر وہ چیز جس سے اللہ کی قرب جوئی کی جائے اور عرف میں قربان بمعنی نَسِیْکَۃٌ یعنی ذَبِیْحَۃٌ آتا ہے اس کی جمع قَرَابِیْنُ ہے۔
قرآن میں ہے :۔
اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا (۵ - ۲۷) جب ان دونوں نے خدا کی جناب میں کچھ نیازیں چڑھائیں۔
حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ (۳ - ۱۸۳) جب تک کوئی پیغمبر ہمارے پاس ایسی نیاز نہ لے کر آئے۔۔۔
۔۔۔ اور آیت کریمہ :۔
قُرْبَانًا اٰلِھَۃً (۴۶ - ۲۸) تقرب خدا کے سوا معبود بنایا تھا)
میں قُرْبَان کا لفظ قُرْبَانُ الْمَلِکِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بادشاہ کا ہم نشین اور ندیم خاص کے ہیں اور یہ واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے اور یہاں چونکہ جمع کے معنی میں ہے اس لئے اٰلِھَۃً بلفظ جمع لایا گیا ہے۔
اَلتَّقَرُّبُ ایسی چیز کا قصد کرنا جس سے دوسرے کے ہاں قدر و منزلت حاصل ہو۔
اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کے قریب ہو جانا باعتبار مکان کے نہیں ہوتا بلکہ اس پر فضل و کرم اور فیض (خاص) جاری کرنا مراد ہوتا ہے۔ اس لئے مروی ہے (۹) کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ باری تعالیٰ کیا تو قریب ہے کہ میں تجھ سے مناجات کروں یا دور ہے کہ میں تمہیں پکاروں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔ اگر میں تیرے لئے دوری معین کر دوں تو وہاں تک پہنچ نہیں سکے گا اور اگر قرب معین کر دوں تو تجھے اس پر قدرت نہیں ہوگی۔ چنانچہ فرمایا :۔
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (۵۰ - ۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
اور کسی بندہ کے مقرب الٰہی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ بہت سی ایسی صفات اپنے اندر پیدا کرے ۔۔۔۔ جن کے ساتھ ذات الٰہی متصف ہوتی ہے گو وہ صفات انسان میں اس درجہ نہ پائی جائیں جس درجہ میں کہ ذات الٰہی میں وہ صفات متحقق ہوتی ہیں۔ مثلاً انسان علم و حکمت حلم و رحمت اور بے نیازی ایسی صفات اپنے اندر پیدا کرلے اور یہ ان کے اضداد یعنی جہالت ۔۔۔۔ طیش و غضب اور احتیاج نفسانی کی میل کچیل سے پاک ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہیں اور یہ قرب جسمانی کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ قرب روحانی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت نے فرمایا[1] (۸۰)
مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا کہ جو شخص بالشت بھر میرے قریب ہوتا ہے۔ تو میں ایک ذراع یعنی ہاتھ بھر اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور نیز ایک روایت میں ہے کہ تقرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے فرائض کی ادائیگی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ اور بندہ فرائض کے بعد نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔۔۔۔۔۔
اور آیت کریمہ :۔

---

[1] متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ والحدیث باختلاف الفاظ فی المستدرک وابن ماجۃ عن ابی ہریرۃ وانس وابی ذر وابی سعید والطبرانی عن سلمان وابی ذر وابونعیم عنہ وابن شاہین فی الترغیب عن ابن عباس (راجع کنز العمال ۱۱۳۴ - ۱۱۳۸ و ۱۱۴۸ - ۱۱۴۸) وتخریج العراقی علی الاحیاء ۲/۹۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ (۶-۱۵۲) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔
یہں لَا تَقْرَبُوْا کے لفظ میں جو بلاغت پائی جاتی ہے۔ وہ مَا تَنَاوَلُوْا کے لفظ سے پیدا نہیں ہو سکتی! کیوں کہ کسی چیز کو لینے سے منع کرنے کی بنسبت اس کے قریب جانے سے منع کرنے میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اسی لئے فرمایا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲-۳۵) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (۲-۲۲۲) اور جب تک پاک نہ ہوجائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔
میں قرب جماع سے کنایہ ہے۔ نیز فرمایا:۔
لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى (۱۷-۳۲) اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔
اَلْقِرَابُ (مصدر) بمعنی مقاربت شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)
(۳۵) فَاِنَّ قِرَابَ الْبَطْنِ يَكْفِيْكَ مِلْؤُهُ
قَدَحٌ قَرْبَانُ تقریباً بھرا ہوا پیالہ۔
اور قِرْبَانُ الْمَرْءَةِ عورت سے مجامعت کرنا۔
تَقْرِيْبُ الْفَرَسِ گھوڑے کا ڈونکی ودڑنا ایک رفتار جو دوڑ کے قریب ہوتی ہے۔ اَلْقُرَابُ قریب۔
فَرَسٌ لَاحِقُ الْاَقْرَابِ گھوڑا جس کی تہی گاہیں پچکی ہوئی ہوں۔

اَلْقِرَابُ تلوار کی نیام بعض کا قول ہے کہ قراب نیام کو نہیں کہتے بلکہ نیام کے اوپر کے چمڑے کو کہا جاتا ہے اس کی جمع قُرُبٌ ہے اور قَرَبْتُ السَّيْفَ وَاَقْرَبْتُهٗ کے معنی تلوار کو نیام کے اندر بند کرنے کے ہیں۔
رَجُلٌ قَارِبٌ آدمی جو پانی کے قریب پہنچ جائے۔
لَيْلَةُ الْقَرَبِ عرب لوگ اونٹ چراتے چراتے پانی کی طرف چلے جاتے جب ان کے اور پانی کے درمیان ایک شب کا سفر باقی رہ جاتا تو عجلت سے سفر کرتے لہذا اس رات کو لَيْلَةُ الْقَرَبِ کہتے چنانچہ اسی سے اَقْرَبُوْا اِبِلَهُمْ کا محاورہ ہے جس کے معنی لَيْلَةُ الْقَرَبِ میں اونٹوں کو پانی کی طرف ہنکانے کے ہیں۔
اَلْمُقْرِبُ۔ حاملہ عورت جو قریب الولادت ہو۔

(ق ر ح)

اَلْقَرْحُ (بفتح القاف) کسی خارجی اثر سے ہونے والے زخم کو قَرْحٌ کہا جاتا ہے اور اندرونی طور پر پیدا ہونے والے زخم (جیسے پھنسی وغیرہ کا زخم) کو قُرْحٌ۔ قَرَحْتُهٗ (ف) کے معنی زخمی کرنے کے ہیں۔ مگر کبھی لازم بھی آتا ہے جیسے قَرِحَ قَلْبُهٗ (اس کا دل زخمی ہوگیا) وَاَقْرَحْتُهٗ (اسے زخمی کیا) وَقَرِحَ (س) زخمی ہوجانا۔
کبھی قَرْحٌ کا لفظ زخم اور قُرْحٌ اس درد والم

---

[1] قالہ ہلال بن خثعم وتمامہ: ویکفیک عورات الامور اجتنابہا والبیت فی امالی المرتضیٰ (۱: ۳۷۹) والحیوان (۱: ۸۲ ۳) فی اربعۃ و البغدادی ۲۰۲ ویروی لقیس بن خطیم وفی العیون (۳: ۱۸۲) لبشار بن بشر ولکنہ مجہول ولم یعرف بہذا الاسم ای شاعر وفی حماسۃ البحتری (طبعۃ ادریا) البیت لزیاد بن منقذ التمیمی وفی مجموعۃ المعانی لراقع بن جمیصہ وفی روایتہ لسوات الامور بدل عورات الامور کما فی الاحیا للغزالی (۳: ۴۰۲) فی ثلاثۃ ابیات وفیہ قصۃ ابی محمد الیزیدی مع ہارون وفی الحماسۃ لابن الشجری والمعانی للقتبی والاللی ملاہ ، بالنصب علی التمییز وہوا الصواب وفی المطبوع یکفیک بالموحدۃ مصحف ۱۲

پر بولا جاتا ہے جو زخم کی وجہ سے ہو قرآن میں ہے۔
مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (۳-۱۷۲) باوجود زخم کھانے کے۔
اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ (۳-۱۴۰) اگر تمہیں زخم (شکست) لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے۔
ایک قراءت میں قُرْحٌ بضمہ قاف ہے۔
اَلْقَرْحَانُ وہ شخص جو کبھی چیچک وطاعون (جدری) وغیرہ بیماری میں مبتلا نہ ہوا ہو۔
فَرَسٌ قَارِحٌ گھوڑا جس کے ناب (دانت جو سب دانتوں سے آخر میں نکلتے ہیں) ظاہر ہو گئے ہوں مؤنث قَارِحَةٌ۔ اَقْرَحُ گھوڑا جس کی پیشانی میں سفید نشان ہو۔ رَوْضَةٌ قَرْحَاءُ سبزہ زار جس کے وسط میں سفید پھول ہوں گویا وہ اَقْرَحُ گھوڑے کے مشابہ ہے (اِقْتَرَحْتُ الْجَمَلَ کسی اونٹ پر پہلے پہل سواری کرنا اِقْتَرَحْتُ كَذَا عَلٰى فُلَانٍ کسی کے سامنے پہلی مرتبہ کسی رائے کا اظہار کرنا۔
اِقْتَرَحْتُ بِئْرًا میں نے کنوئیں سے خالص پانی نکالا اَرْضٌ قَرَاحٌ او سر زمین جس میں نہ گھاس ہو اور نہ پانی۔ اَلْقَرِيْحَةُ پہلا پانی جو کنوئیں سے نکالا جاتا ہے اور اسی سے قَرِيْحَةُ الْاِنْسَانِ مستعار ہے جس کے معنی انسان کی طبیعت کے ہیں۔

(ق ر د)

اَلْقِرْدُ بندر اس کی جمع قُرُوْدٌ وَقِرَدَةٌ ہے۔ اور آیات کریمہ:۔
كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (۲-۶۵) ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ۔
وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ (۵-۶۰) اور جن کو ان میں سے بندر...... بنا دیا۔
کو بعض نے ظاہری معنی پر حمل کیا ہے یعنی انہیں سچ مچ بندر بنا دیا گیا تھا بعض نے کہا ہے کہ ان کے اخلاق واطوار بندروں جیسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ سچ مچ بندر بنا دیئے گئے تھے[1]۔
اَلْقُرَادُ چیچڑی۔ جمع قِرْدَانٌ۔
صُوْفٌ قَرِدٌ۔ الجھی ہوئی اون (جو کاتی نہ جا سکے) اسی سے تہ بر تہ چھلے ہوئے بادل کو سَحَابٌ قَرِدٌ کہا جاتا ہے۔
اَقْرَدَ چیچڑی کی طرح زمین کے ساتھ چمٹ جانا قَرِدَ چیچڑی کی طرح ساکن ہو جانا۔ اور قَرَّدْتُ الْاِبِلَ کے معنی اونٹ سے چیچڑ دور کرنے کے ہیں۔ (ازالہ ماخذ) جیسے قَذَّيْتُ وَ مَرَّضْتُ کا محاورہ ہے۔ اور استعارہ کے طور پر قَرَّدَ کے معنی چاپلوسی کے ذریعہ کسی کو دھوکا دینا بھی آتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ يُقَرِّدُ فُلَانًا۔ فلاں مدارات سے اسے فریب دے رہا ہے اور پستان کے سرے کو قُرَاد کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی شکل بھی چیچڑ جیسی ہوتی ہے۔

(ق ر ض)

اَلْقَرْضُ (کترنا) یہ قطع کی ایک قسم ہے پھر جس طرح کسی جگہ سے گزرنے اور تجاوز کرنے کے لئے قَطَعَ الْمَكَانَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اسی طرح قَرَضَ الْمَكَانَ بھی کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ ......

[1] كذا قال مجاهد والمعنى الاول ذهب اليه ابن عباس وغيره راجع انوار التنزيل واسرار التاويل للبيضاوى ۱۱

(۱۸-۱۷) اور جب غروب ہو تو اس سے بائیں طرف کترا جائے۔

یعنی غروب کے وقت انہیں ایک جانب چھوڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔

اور قرض اس مال کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو اس کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دیا جائے اس شرط پر کہ وہ واپس مل جائیگا۔ قرآن میں ہے :۔
مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (۲-۲۴۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے۔

اور شعر گوئی ... کو بھی مُقَارَضَة کہا جاتا ہے اور شعر کو بطور استعارہ قَرِيْض کہا جاتا ہے جس طرح کہ نَسِيْج اور حَوْك کے الفاظ اس معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ق ر ط س)

اَلْقِرْطَاسُ۔ ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے قرآن میں ہے :۔
وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِيْ قِرْطَاسٍ (۶-۷) اور اگر ہم تم پر کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب نازل کرتے۔
قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِيْ جَاءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ (۶-۹۱) کہو کہ جو کتاب موسیٰ لیکر آئے تھے اسے کس نے نازل کیا تھا جو لوگوں کے لئے نور اور ہدایت تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق پر نقل کر رکھا ہے۔

(ق ر ع)

اَلْقَرْعُ (ف) کے اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنے کے ہیں اسی سے قَرَعْتُهٗ بِالْمِقْرَعَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کوڑے سے سرزنش کرنے کے ہیں۔ اور قیامت کے حادثہ کو قَارِعَةٌ کہا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ (۶۹-۴) (وہی) کھڑکھڑانے والی (جس کو ثمود اور عاد دونوں) نے جھٹلایا۔
اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ (۱۰۱-۱، ۲) کھڑکھڑانے والی کیا ہے۔

(ق ر ف)

اَلْقَرْفُ وَالْاِقْتِرَافُ کے اصل معنی درخت سے چھال اتارنے اور زخم سے چھلکا کریدنے کے ہیں اور جو چھال یا چھلکا اتارا جاتا ہے۔ اسے قِرْفٌ کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ اِقْتَرَفَ (افتعال) کمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خواہ وہ کسب اچھا ہو یا برا جیسے فرمایا :۔
سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ (۶-۱۲۰) وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔
وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُقْتَرِفُوْنَ (۶-۱۱۴) اور جو کام وہ کرتے تھے وہی کرنے لگیں۔
وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا (۹-۲۴) اور مال جو تم کماتے ہو۔

لیکن اس کا بیشتر استعمال برے کام کرنے پر ہوتا ہے اسی بنا پر محاورہ ہے اَلْاِعْتِرَافُ يُزِيْلُ الْاِقْتِرَافَ کہ اعتراف جرم، جرم کو مٹا دیتا ہے۔ قَرَفْتُ فُلَانًا بِكَذَا میں نے فلاں پر تہمت لگائی۔ اور آیت کریمہ :۔ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُقْتَرِفُوْنَ (۶-۱۱۳) کو بھی بعض نے اسی معنی پر حمل کیا ہے۔ فُلَانٌ قَرَفَنِيْ فلاں نے

مجھ پر تہمت لگائی۔
رَجُلٌ مُقْرِفٌ دوغلا آدمی۔
قَارَفَ فُلَانٌ اَمْرًا اس نے برے کام کا ارتکاب کیا۔

(ق ر ن)

اَلْاِقْتِرَانُ۔ اِزْدِوَاجٌ کی طرح اِقْتِرَانٌ کے معنی بھی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے کسی معنی میں باہم مجتمع ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اَوْجَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (۴۳-۵۳) یا یہ ہوتا کہ فرشتے جمع کر اس کے ساتھ آتے۔
قَرَنْتُ الْبَعِيْرَ مَعَ الْبَعِيْرِ دو اونٹوں کو ایک رسی کے ساتھ باندھ دینا اور جس رسی کے ساتھ ان کو باندھا جاتا ہے اسے قَرَنٌ کہا جاتا ہے اور قَرَّنْتُهٗ (تفعیل) میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (۳۸-۳۸) اور اوروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔
اور وہ آدمی جو دوسرے کا ہم عمر ہو یا بہادری، قوت اور دیگر اوصاف میں اس کا ہم پلہ ہو اسے اس کا قِرْنَ کہا جاتا ہے اور ہم پلہ یا ہم سر کو قرین بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
فُلَانٌ قِرْنُ فُلَانٍ اَوْ قَرِيْنُهٗ فلاں اس کا ہم عمر یا ہم سر ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ (۳۷-۵۱) کہ میرا ایک ہم نشین تھا۔
وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ (۵۰-۲۳) اور اس کا ہم نشین (فرشتہ) کہے گا یہ (اعمال نامہ) میرے پاس تیار ہے۔

یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے دوسری جگہ شَهِيْدٌ (گواہ) کہا ہے۔
قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ (۵۰-۲۷) اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا۔
فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۴۳-۳۶) تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔
قَرِيْنٌ کی جمع قُرَنَاءُ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ (۴۱-۲۵) اور ہم نے شیطان کو ان کا ہم نشین مقرر کر دیا۔
ایک زمانہ کے لوگ یا امت کو قَرْنٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع قُرُوْنٌ ہے قرآن میں ہے:۔
وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (۱۰-۱۳) اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو ... ہلاک کر چکے ہیں۔
وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ (۱۷-۱۷) اور ہم نے ... بہت امتوں کو ہلاک کر ڈالا۔
وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ (۱۹-۷۴-۹۸) اور ہم نے ان سے پہلے بہت امتیں ہلاک کر دیں۔
وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا (۲۵-۳۸) اور ان کے درمیان اور بہت سی جماعتوں کو بھی ....
ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (۲۳-۳۱) پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کی۔
قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ (۲۳-۴۲) اور جماعتیں ....
اَلْقَرُوْنُ (بفتح القاف) کے معنی نفس کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے نیز قَرُوْنٌ وہ اونٹ ہے جو چلتے وقت پچھلے پاؤں اگلے پاؤں کی جگہ پر رکھے گویا وہ ان کو باہم ملا رہا ہے۔
قَرَنٌ. ترکش جب کہ کمان کے ساتھ بندھا ہوا

ہو ناقَةٌ قَرُوْنٌ وہ اونٹنی جس کے پچھلے نقش باہم ملے ہوئے ہوں۔

اَلْقِرَانُ۔ حج اور عمرہ کو جمع کرنا اور مطلق دو چیزوں کے جمع کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

قَرْنٌ جانور کا سینگ۔ کَبْشٌ اَقْرَنُ سینگوں والا مینڈھا مؤنث قَرْنَاءُ تشبیہ کے طور پر عورت کے عَفْلَة کو بھی قَرْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سینگ کی شکل کا ایک مادہ ہوتا ہے جس سے مرد کے عضو مخصوص کو مجامعت کے وقت اس طرح تکلیف محسوس ہوتی ہے گویا اسے سینگ چبھ رہا ہے۔

قَرْنُ الْجَبَلِ۔ پہاڑ کا ابھرا ہوا حصہ۔ قَرْنُ الْمَرْءَةِ عورت کے گیسو قَرْنُ الْمِرْآةِ۔ آئینے کا فریم۔

قَرْنُ الْفَلَاةِ جنگل کا کنارہ قَرْنُ الشَّمْسِ۔ آفتاب کا کنارہ قَرْنُ الشَّيْطَانِ شیطان کے سینگ الغرض ان تمام محاورں میں قَرْنٌ کا لفظ بطور تشبیہ کے استعمال ہوا ہے۔ اور ذُوالْقَرْنَيْنِ ایک مشہور بادشاہ کا لقب تھا جس کا قصہ سورہ کہف ۸۳ تا ۹۸ میں مذکور ہے۔

ایک مرتبہ آنحضرت نے حضرت علیؓ سے فرمایا[1]:
اِنَّ لَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَاَنَّكَ لَذُوْ قَرْنَيْهَا
کہ جنت میں تمہارے لئے ایک مکان مخصوص ہے اور تم اس امت کے ذُوالقرنین ہو یعنی بلحاظ مرتبہ کے اس امت میں ذوالقرنین کی شکل ہو۔

(ق ر ی)

اَلْقَرْيَةُ وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر آباد ہو جائیں تو بحیثیت مجموعی ان دونوں کو قریہ کہتے ہیں اور جمع ہونے والے لوگوں اور جگہ پر انفرادًا بھی قریہ بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ (۱۲-۸۲) اور ... بستی سے دریافت کر لیجئے۔

میں اکثر مفسرین نے اہل کا لفظ محذوف مان کر قریہ سے وہاں کے باشندے مراد لئے ہیں لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قَرْيَةٌ کے معنی ہی باشندوں کے ہیں لہذا اہل کا لفظ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (۱۶-۱۱۲) اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو ہر طرح امن چین سے بستی تھی۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ (۴۷-۱۳) اور بہت سی بستیاں تمہاری بستی سے ... زور و قوت میں کہیں بڑھ کر تھیں۔

اور آیت کریمہ:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى (۱۱-۱۱۷) اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو ... تباہ کر دے۔

میں اَلْقُرٰى ایک خاص شہر کا نام ہے اسی طرح آیت کریمہ:

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (۱۲-۱۰۹) اور ہم نے تم سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں سے مرد ہی بھیجے تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

میں بھی اَلْقُرٰى شہر کا نام ہے۔ نیز فرمایا:

رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (۴-۷۵) اے ہمارے پروردگار ہم کو اس شہر

---

[1] الحدیث فی الفائق ۲/۳۴۷ وغریب ابی عبید ۳/۷۸ والضمیر فی قرنیہا یعود الی الامۃ والعود الی المضمر اکثر فی القرآن وکلام العرب ۱۲

سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا۔

حکایت کی گئی ہے کہ ایک قاضی علی بن حسینؓ کے پاس آیا علی بن حسینؓ نے اس سے دریافت کیا کہ آیت:۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً (۳۴-۱۸) اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی، ایک دوسرے کے متصل دیہات بنائے تھے۔

کے متعلق تمہارے علماء کا کیا خیال ہے تو اس نے کہا کہ وہ اَلْقُرٰی سے مکہ مراد لیتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ تم نہیں جانتے کہ اس سے وہاں کے لوگ مراد ہیں تو میں (قاضی) نے کہا کہ کتاب اللہ میں اس کی کوئی دلیل بھی ہے۔ جہاں قریۃ سے مراد لوگ ہوں اس پر انہوں نے فرمایا کہ تم نے آیت کریمہ:۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ ...... (۶۵-۸) اور بہت سی بستیوں کے رہنے والوں نے اپنے پروردگار اور اس کے پیغمبروں کے احکام کی سرکشی کی۔

نہیں پڑھی (یعنی یہاں قریۃ سے لوگ مراد ہیں)

وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا (۱۸-۵۹) اور یہ بستیاں (جو ویران پڑی ہیں) جب انہوں نے (کفر سے) ظلم کیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ (۲-۵۸) اور جب ہم نے ان سے کہا اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔

قَرَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ میں نے حوض میں پانی جمع کیا۔

قَرَيْتُ الضَّيْفَ قِرًى میں نے مہمان کی مہمانی کی۔

قَرَى الشَّيْءَ فِي فَمِهِ منہ میں کوئی چیز جمع کرنا۔

قَرَيَانُ الْمَاءِ پانی جمع ہونے کی جگہ۔

(ق س س)

اَلْقَسُّ وَالْقِسِّيسُ کے معنی رؤسائے نصاریٰ میں سے خدا پرست عالم کے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

ذَلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا (۵-۸۲)

یہ اس لئے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی۔

اصل میں قَسٌّ کے معنی رات کے وقت کسی چیز کی جستجو کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔

تَقَسَّسْتُ أَصْوَاتَهُمْ بِاللَّيْلِ میں نے رات کے وقت ان کی آوازوں کی جستجو کی۔

اَلْقَسْقَاسُ وَالْقَسْقَسُ کے معنی رات کے وقت رہنمائی کرنے والے کے ہیں۔

(ق س ر)

اَلْقَسْرُ (ن) کے معنی غلبہ اور تسلط کے ہیں۔

قَسَرْتُهُ وَاقْتَسَرْتُهُ میں نے اسے مجبور کیا۔

اسی سے اَلْقَسْوَرَةُ ہے جس کے معنی شیر کے ہیں نیز تیر انداز اور شکاری کو بھی قَسْوَرَةٌ کہتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔

فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (۷۴-۵۱) یعنی شیر سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ قَسْوَرَةٌ سے مراد شیر ہے اور بعض نے تیر انداز اور بعض نے شکاری مراد لیا ہے[1]۔

---

[1] وفی الطبری ذهب الی الاول ابوہریرة وابن عباس وزید بن اسلم والی الثانی عکرمة ومجاہد والی الثالث سعید بن جبیر (انظر الطبری ۲۹ ر ۱۶۹)

(ق س ط)

اَلْقِسْطُ (اسم) نَصَفٌ وَنَصَفَةٌ کی طرح قِسْط بھی مبنی بر عدل حصہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ (۱۰-۴) تاکہ ایمان والوں اور نیک کام کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ (۵۵-۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو۔

اور قِسْط کے معنی دوسرے کا حق مارنا بھی آتے ہیں اس لئے یہ ظلم اور جور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اَلْقَسَطُ پاؤں میں ٹیڑھا پن یہ اَفْجَعُ کی ضد ہے جس کے معنی پاؤں کے اگلے حصہ کی جانب سے ان کے نزدیک اور ایڑیوں کی جانب سے دور ہونے کے ہیں۔ اَلْاِقْسَاطُ اس کے اصل معنی کسی کو اس کا حق دینے کے ہیں اسی چیز کا نام انصاف ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ قَسَطَ الرَّجُلُ (فَهُوَ قَاسِطٌ) کے معنی ظلم کرنے اور اَقْسَطَ کے معنی انصاف کرنے کے ہیں[1]۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۷۲-۱۵) اور گنہگار ہوئے وہ دوزخ کا ایندھن بنے۔

وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۹-۹) اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تَقَسَّطْنَا بَيْنَنَا ہم نے کسی چیز کو آپس میں برابر تقسیم کر لیا۔

چنانچہ اَلْقِسْطَاسُ ترازو کو کہتے ہیں اور لفظ میزان کی طرح اس سے بھی عدل و انصاف کے معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (۱۷-۳۵) اور جب تول کر دو۔ تو ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو۔

(ق س م)

اَلْقَسْمُ وَالْقِسْمَةُ (ض) کے معنی کسی چیز کے حصے کرنے اور بانٹ دینے کے ہیں مثلاً قِسْمَةُ الْمِيْرَاثِ ترکہ کو وارثوں کے درمیان تقسیم کرنا قِسْمَةُ الْغَنِيْمَةِ مال غنیمت تقسیم کرنا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۱۵-۴۴) ہر ایک دروازے کے لئے ان میں سے جماعتیں تقسیم کر دی گئیں ہیں۔

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ (۵۴-۲۸) اور ان کو آگاہ کر دو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کر دی گئی ہے۔

اِسْتَقْسَمْتُهُ کے معنی کسی سے تقسیم چاہنا ہیں اور کبھی یہ بمعنی تَقَسَّمَ (تقسیم کرنا) بھی آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ (۵-۳) اور یہ بھی کہ پانسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ کے کام ہیں۔

رَجُلٌ مُنْقَسِمُ الْقَلْبِ وہ آدمی جس کا دل تفکرات سے پریشان ہو گویا تفکرات نے اس کے دل کو تقسیم کر لیا ہے یہ مُتَوَزِّعُ الْخَاطِرِ وَمُشْتَرَكُ اللُّبِّ کی طرح کا محاورہ ہے۔

اَقْسَمَ (افعال) کے معنی حلف اٹھانے کے ہیں یہ دراصل قَسَامَةٌ سے مشتق ہے اور قَسَامَةٌ ان قسموں کو کہا جاتا ہے جو اولیائے مقتول پر تقسیم کی

---

[1] وبه صرح ابن السكيت في الاقتضاب وابو عبيدة في اضداده (البحر المحيط ۲/۳۵۱-۳۵۲)

جاتی ہیں پھر مطلق قسم کے معنی استعمال ہونے لگا ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ (۱۶-۱۳۸) اور یہ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔
اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ (۷-۴۹) کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھایا کرتے تھے۔
لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَامَۃِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ (۷۵-۱،۲) ہم کو روز قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی۔
فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ (۷۰-۴۰) ہمیں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔
اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّھَا مُصْبِحِیْنَ (۶۸-۱۷) جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ ہم صبح ہوتے اس کا میوہ توڑ لیں گے۔
فَیُقْسِمَانِ بِاللّٰہِ (۵-۱۰۶) اور دونوں خدا کی قسمیں کھائیں۔
قَاسَمْتُہٗ وَتَقَاسَمَا باہم قسمیں اٹھانا قرآن میں ہے۔
وَقَاسَمَھُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (۷-۲۱) اور ان کو قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔
قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰہِ (۲۷-۴۹) کہنے لگے کہ خدا کی قسم کھاؤ۔
فُلَانٌ مُقَسَّمُ الْوَجْہِ اَوْ قَسِیْمُ الْوَجْہِ کے معنی خوبرو کے ہیں اور اَلْقَسَامَۃُ بمعنی حسن اصل میں قِسْمَۃٌ سے ہے گویا ہر عضو کو اس کے مناسب حال حسن سے بہرہ ور کیا ہے اسلئے ان میں یگانگت پیدا ہوگئی ہے اور عدم تناسب نظر نہیں آتا بعض نے کہا ہے کہ خوبرو کو مُقَسَّمٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے حسن سے نظر کو تقسیم کر لیتا ہے یعنی نظر جسم کے کسی ایک حصہ پر جم کر نہیں رہ جاتی بلکہ ہر عضو کی طرف بار بار منتقل ہوتی رہتی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔
کَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَی الْمُقْتَسِمِیْنَ (۱۵-۹۰) جس طرح ان لوگوں پر نازل کیا جنہوں نے تقسیم کر دیا۔ میں مقتسمین سے وہ لوگ مراد ہیں جو مکہ کی مختلف گھاٹیوں میں بٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ تاکہ نووارد لوگوں کو اسلام سے روکیں اور رسول اللہ تک پہنچنے نہ دیں۔ بعض کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہ کے خلاف سازش کرنے پر قسمیں کھائی تھیں[2]۔

(ق س و)

اَلْقَسْوَۃُ کے معنی سنگ دل ہونے کے ہیں یہ اصل میں حَجَرٌ قَاسٍ سے ہے جس کے معنی سخت پتھر کے ہیں۔
اَلْمُقَاسَاۃُ سختی جھیلنا۔ قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ (۲-۷۴) پھر ... تمہارے دل سخت ہو گئے۔
فَوَیْلٌ لِّلْقَاسِیَۃِ قُلُوْبُھُمْ مِّنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (۳۹-۲۲) پس ان پر افسوس ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔
وَالْقَاسِیَۃِ قُلُوْبُھُمْ (۲۲-۵۳) اور جن کے دل سخت ہیں۔

---

[1] ایضاً قسم یطلق علی الدلیل والشہادۃ کما فی قولہ تعالٰے: وانہ لقسم لو تعلمون عظیم (۵۶-۷۶)
[2] وبہ قال مقاتل والفراء واختارہ البیضاوی وقال ابن عباس وعکرمۃ المراد بہ اہل الکتاب وقال زید بن اسلم المراد منہ قوم صالح تقاسموا علی تبییتہ فسموا مقتسمین والتفصیل فی الطبری والقرطبی ٭

وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً (۵-۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

ایک قرأت میں قَسِيَّةً ہے[1] یعنی ان کے دل خالص نہیں ہیں یہ دِرْهَمٌ قَسِيٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی کھوٹے درہم کے ہیں جس میں دسکہ کی ملاوٹ کی وجہ سے صلابت پائی جائے۔ شاعر نے کہا ہے[2] (البسیط)

(۳۵۴) صَاحَ الْقَسِيَّاتُ فِيْ اَيْدِي الصَّيَارِيْفِ

کھوٹے درہم صرافوں کے ہاتھ میں آواز دیتے ہیں۔

(ق ش ع ر)

اَلْقَشْعَرِيْرَةُ رونگٹے کھڑے ہونا۔ قرآن میں ہے:

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (۳۹-۲۳) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ اس سے ان کے بدنوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

(ق ص ص)

اَلْقَصُّ کے معنی نشان قدم پر چلنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ قَصَصْتُ اَثَرَهٗ یعنی میں اس کے نقش قدم پر چلا اور قَصَصٌ کے معنی نشان کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا (۱۸-۶۴) تو وہ اپنے اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ (۲۸-۱۱) اور اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا۔

اسی سے تَقْصِيْصٌ ہے جس کے معنی اس باقی ماندہ گھاس کے ہیں جس سے کھوج لگایا جا سکے۔

قَصَصْتُ ظُفْرَهٗ میں نے اس کے ناخن تراشے۔

اَلْقَصَصُ کے معنی اخبار متتبعہ کے ہیں قرآن میں ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ (۳-۶۱) یہ تمام بیانات صحیح ہیں۔

فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ (۱۲-۱۱۱) ان کے قصے میں ...... عبرت ہے۔

وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ (۲۸-۲۵) اور ان سے اپنا ماجرا بیان کیا۔

نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (۱۲-۲) تمہیں ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ (۷-۷) پھر اپنے علم سے ان کے حالات بیان کریں گے۔

يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۷-۷۶) بنی اسرائیل کے سامنے ..... بیان کر دیتا ہے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ (۷-۱۷۶) تو ان سے یہ قصہ بیان کر دو۔

اَلْقِصَاصُ کے معنی خون کا بدلہ دینے کے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (۲-۱۷۹) حکم قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (۵-۴۵) سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے۔

---

[1] وہی قراءۃ اہل الکوفۃ ۱۲ [2] قالہ ابو زبید الطائی فی قصیدۃ یرثی بہا عثمان بن عفان الخلیفۃ و صدرہ لہا صواہل فی صم السلام کما۔ والسلام معناہ الصخر والبیت من شواہد الطبری (۶: ۱۵۵) واللسان (قسا) والامالی (۱: ۲۷۰) واللآلی (۱: ۲۸) والبحر (۳: ۴۴۵) والمعانی ۴: ۲۰۱ ولبعض الابیات من الرثاء ایضا فی الاسماء (راجع السمط ۹۱۴) ۱۲

محاورہ ہے قَصَّ فُلَانٌ فُلَانًا وَضَرَبَہٗ ضَرْبًا فَاَقْصَّہٗ فلاں کو مار مار کر (مرنے کے قریب کر دیا)۔
اَلْقَصُّ کے معنی چونہ کے ہیں۔ حدیث میں ہے[1] (۱۸۱)
نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَقْصِيْصِ الْقُبُوْرِ کہ رسول اللہ نے قبروں کو گچ کرنے سے منع فرمایا۔

(ق ص د)

اَلْقَصْدُ (ض) راستہ کا سیدھا ہونا محاورہ ہے قَصَدْتُ قَصْدَہٗ میں اس کی طرف سیدھا گیا۔ اسی سے اِقْتِصَادٌ ہے اور اِقْتِصَاد دو قسم پر ہے (۱) محمود علی الاطلاق جو افراط و تفریط کے درمیان میں ہو جیسے سخاوت جو اسراف اور بخل کے مابین کو کہتے ہیں اور شجاعت جو لاپرواہی اور بزدلی کے درمیانی درجہ کا نام ہے چنانچہ اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا۔
وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ (۳۱-۱۹) اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا۔
اور اقتصاد کی اسی نوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا الآیۃ (۲۵-۶۷) یعنی اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔
(۲) قصد کا لفظ کنایہ کے طور پر ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس کے محمود اور مذموم ہونے میں شبہ ہو یعنی جو نہ بالکل محمود ہو اور نہ بالکل مذموم بلکہ ان کے درمیان میں ہو مثلاً ایک چیز عدل و جور کے مابین ہو چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ (۳۵-۳۲) تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں۔
اسی طرح درمیانی مسافت پر بھی قصد کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت وَسَفَرًا قَاصِدًا (۹-۴۲) اور سفر بھی ہلکا سا ہوتا۔ میں قَاصِدًا کے معنی معتدل سفر کے ہیں جو زیادہ دور کا نہ ہو اور بعض نے اس کا معنی سفر قریب لکھا ہے۔ لیکن اصل معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کر دیئے ہیں۔
اَقْصَدَ السَّهْمُ تیر لگ کر فوراً ہلاک کر دینا۔ گویا اس نے اپنے قصد کو پا لیا۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)
(۳۵۵) فَاَصَابَ قَلْبَكَ غَيْرَ اَنْ لَّمْ يُقْصِدِ
وہ تیرے دل پر لگا لیکن اس نے قتل نہیں کیا۔
اِنْقَصَدَ الرُّمْحُ کے معنی نیزہ ٹوٹ جانے کے ہیں اور تَقَصَّدَ بمعنی تَكَسَّرَ کے ہے۔
قَصَدَ الرُّمْحَ نیزہ توڑ دیا۔
نَاقَةٌ قَصِيْدٌ گوشت سے گتھی ہوئی اونٹنی۔
اَلْقَصِيْدُ کم از کم سات اشعار کی نظم۔

(ق ص ر)

اَلْقِصَرُ یہ طول کی ضد ہے اور یہ دونوں اسمائے نسبتی سے ہیں جو ایک دوسرے پر قیاس کے ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔
قَصُرْتُ کَذَا کے معنی کسی چیز کو کوتاہ کرنیکے

---

[1] رواہ احمد فی مسندہ ۶ / ۲۹۹ من روایۃ ام سلمۃ وفی معناہ روایات فی السنن ومجمع الزوائد ۳ / ۶۱۔ [2] قالہ النابغۃ فی قصیدۃ فی وصف المتجردۃ امرءۃ نعمان مطلعھا؛ اَمن آل میۃ رائح او مغتدی۔ عجلان ذا زاد وغیر مزود وصدر البیت؛ فی اثرِ غانیۃ رمتک بسھمہا والقصیدۃ فی دیوانہ ۴۴-۴۹ والبیت فی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۱۰) واللسان (قصد) والعقد الثمین ۹ فی ۳۳ بیتًا والجنی (۱: ۸۰)

ہیں اور تقصیر کے معنی کوتاہی اور سستی کے ہیں اور قَصَرْتُ كَذَا کے معنی سکیڑنے اور کسی چیز کے بعض اجزاء کو بعض کے ساتھ ملانے کے بھی آتے ہیں۔ اسی سے قَصْر بمعنی محل ہے اس کی جمع قُصُوْرٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَصْرٍ مَّشِيْدٍ (۲۲-۴۵) اور بہت سے محل۔

وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا (۲۵-۱۰) نیز تمہارے لئے محل بنادے گا۔

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (۷۷-۳۲) اس سے آگ کی اتنی (بڑی بڑی) چنگاریاں اٹھتی ہیں۔ جیسے محل۔

بعض نے کہا ہے کہ قَصْر جمع ہے اور اس کے معنی درخت کی جڑوں کے ہیں۔ اس کا واحد قَصْرَةٌ ہے جیسے جَمْرَةٌ وَجَمْرٌ اور ان شراروں کو قَصْر کے ساتھ تشبیہ دینا ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ان کو

كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (۷۷-۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

کہا ہے اور قَصَرْتُهٗ کے معنی محل میں داخل کرنے کے ہیں اور اسی سے ارشاد الٰہی ہے۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ (۵۵-۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔

قَصَرَ الصَّلٰوةَ بموجب رخصت شرعی کے نماز کے بعض ارکان کو ترک کرکے اسے کم کرکے پڑھنا۔ قرآن میں ہے:۔

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (۴-۱۰۱) تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو کم کرکے پڑھو۔

قَصَرْتُ اللِّقْحَةَ عَلٰى فَرَسِيْ اونٹنی کا دودھ اپنی گھوڑی کے لئے مخصوص کر دیا۔

قَصَرَ السَّهْمُ عَنِ الْهَدَفِ۔ تیر کا نشانے تک نہ پہنچنا۔

اِمْرَأَةٌ قَاصِرَةُ الطَّرْفِ وہ عورت جو ناجائز نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ قرآن میں ہے:۔

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ (۳۷-۴۸) ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں۔

قَصَّرَ شَعْرَهٗ بال کتروانا۔ قرآن میں ہے:۔

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ (۴۸-۲۷) اپنے سر منڈوا کر اور بال کترا کر۔

قَصَّرَ فِيْ كَذَا کسی کام میں سستی کرنا۔

قَصَرَ عَنْهُ کسی کام کے کرنے سے عاجز ہونا۔

اَقْصَرَ عَنْهُ باوجود قدرت کے کوئی کام کرنے سے باز رہنا۔

اِقْتَصَرَ عَلٰى كَذَا تھوڑی چیز پر اکتفا کرنا۔

اَقْصَرَتِ الشَّاةُ بوڑھا ہونے کی وجہ سے بکری کے دانتوں کے اطراف کا کوتاہ ہو جانا۔

اَقْصَرَتِ الْمَرْأَةُ چھوٹے قد کی اولاد جننا

تِقْصَارٌ چھوٹا سا ہار۔

اَلْقَوْصَرَةُ کھجور ڈالنے کی زنبیل جو کھجور کے پتوں یا نرکل کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

(ق ص ف)

اَلْقَاصِفُ (باد سخت شکنندہ) تیز اور سخت ہوا۔ جو درختوں اور عمارتوں کو توڑتی ہوئی چلی جائے۔ قرآن میں ہے:۔

فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ پھر تم پر تیز ہوا چلائی۔

سے ومنہ قولہ تعالیٰ ثم لا یقصرون (۷-۲۰۲)

رَعْدٌ قَاصِفٌ بڑے زور کی گرج جس کی آواز میں تکسر ہو اسی سے مَعَازِف یعنی آلات موسیقی کی آواز کو قَصْفٌ کہا جاتا ہے اور مجازاً ہر قسم کی لہو کو قَصْفٌ کہہ دیتے ہیں ۔

(ق ص م)

اَلْقَصْمُ (ض) کے معنی ہلاک کرنے اور کسی چیز کو توڑ دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے ۔
وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً ۔ (۲۱-۱۱) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستمگار تھیں ہلاک کر مارا ۔
یعنی انہیں توڑ مروڑ کر ریزہ ریزہ اور ہلاک کر دیا ۔
اور ہلاکت کو قَاصِمَةُ الظَّهْرِ کہا جاتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ۔
وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى (۲۸-۵۹) اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے ۔
اَلْقُصَمُ وہ آدمی جو ہر مقاومت کرنے والے کو توڑ ڈالے ۔

(ق ص و)

اَلْقُصُوُّ کے معنی بُعد یعنی دوری کے ہیں اور قَصِيٌّ بعید کو کہا جاتا ہے[۱] محاورہ ہے :۔
قَصَوْتُ عَنْهُ میں اس سے دور ہوا ۔ اَقْصَيْتُهُ میں نے اسے دور کر دیا ۔ اَلْمَكَانُ الْاَقْصٰى دور دراز جگہ ۔ اَلنَّاحِيَةُ الْقُصْوٰى دور یا کنارہ اسی سے قرآن میں ہے :۔
وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى (۲۸-۲۰) اور ایک شخص شہر کی پرلی طرف سے دوڑتا ہوا آیا ۔
اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى (۱۷-۱) مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک ۔
میں المسجد الاقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے اور اسے اَلْاَقْصٰى مخاطبین یعنی آنحضرت ؐ اور صحابہ کرام کے مقام سکونت کے اعتبار سے کہا ہے ۔ کیونکہ وہ مدینہ سے دور تھی ۔
وَاِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى (۸-۴۲) جس وقت تم (مدینے سے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر ۔
قَصَوْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی اونٹ کا کان قطع کرنے کے ہیں اور کان کٹی اونٹنی کو نَاقَةٌ قَصْوَاءُ کہا جاتا ہے اور اس معنی میں بَعِيْرٌ اَقْصٰى کا محاورہ بھی منقول ہے قَصِيَّةٌ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو کام کاج سے دور رکھی گئی ہو (اصیل اونٹنی)

(ق ض ض)

قَضَضْتُهُ فَانْقَضَّ میں نے اسے گرایا تو وہ گر پڑا ۔
اِنْقَضَّ الْحَائِطُ دیوار گر پڑی ۔ قرآن میں ہے ۔
يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (۱۸-۷۷) وہ (جھک کر) گرا چاہتی تھی (خضر نے) اس کو سیدھا کر دیا ۔
اَقَضَّ عَلَيْهِ مَضْجَعُهٗ خواب گاہ کا کنکر آلود ہونا (بے چینی کی وجہ سے نیند نہ آنا)

(ق ض ب)

اَلْقَضْبُ (اسم) کے معنی لمبے اور پھیلے

---

[۱] کما فی قولہ تعالیٰ: مکانا قصیا (۱۹-۲۲)

ہوئے درخت کے ہیں. مگر آیت کریمہ:۔

فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا (۸۰-۲۷، ۲۸)

پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا اور انگور اور ترکاری۔ میں قضب سے مراد تازہ گھاس اور ترکاریاں ہیں[1]۔

اَلْمَقَاضِبُ وہ زمین جہاں ساگ پات وغیرہ اگتا ہو۔

اَلْقَضِيْبُ بمعنی قضب ہے لیکن درخت کی ترو تازہ شاخوں کو قَضِيْبٌ اور سبزی ترکاری وغیرہ کو قَضْبٌ کہا جاتا ہے۔ نیز اَلْقَضْبُ (مصدر) کے معنی سبزی ترکاری اور ترو تازہ شاخوں کو قطع کرنا بھی آتے ہیں ایک روایت میں ہے[2] (۸۲)

اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا رَاٰى فِيْ ثَوْبٍ تَصْلِيْبًا قَضَبَهٗ کہ آنحضرت جب کسی کپڑے میں صلیب کے نشانات دیکھتے تو اسے قطع کر دیتے۔

سَيْفٌ قَاضِبٌ وَقَضِيْبٌ قاطع تلوار۔

یہ فعیل بمعنی فاعل ہے اور اس سے پہلی مثال میں بمعنی مفعول اس طرح نَاقَةٌ قَضِيْبٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اونٹوں سے الگ کر لی گئی ہو اور قضیب ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کاٹ کر جدا کر دی گئی ہو اور جو چیز غیر مہذب یعنی کانٹ چھانٹ کر درست نہ کی گئی ہو اسے مقتضب کہا جاتا ہے اور اسی سے اقتضب حدیثا کا محاورہ ہے جس کے معنی فی البدیہہ بات کہنے کے ہیں۔

(ق ض ی)

اَلْقَضَاءُ کے معنی قولاً یا عملاً کسی کام کا فیصلہ کر دینے کے ہیں اور قضاء قولی و عملی میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں[3]۔ قضاء الٰہی اور قضاء بشری چنانچہ قضاء الٰہی کے متعلق فرمایا:۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۷-۲۳)

اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ (۱۷-۴)

اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا...

یہاں قضاء سے مراد قطعی طور پر اطلاع دینے اور حکما فیصلہ کر دینے کے ہیں یعنی ہم نے انہیں اطلاع دے دی اور وحی کے ذریعہ قطعی طور پر حکم دے دیا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ (۱۵-۶۶) اور ہم نے لوط کی طرف وحی بھیجی کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی۔

میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

فعلاً قضاء الٰہی کے متعلق فرمایا:۔

وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ (۴۰-۲۰) اور خدا سچائی کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی حکم نہیں دے سکتے۔

---

[1] قال فی الکشاف والقضب الرطبۃ وفی الصحاح القضبۃ والقضب الرطب قال بعض الفضلاء القضب ہو المسمی فی مصر بالبرسیم الحجازی (الکشاف و ذیلہ ۴ ر ۷۰۴) [2] الحدیث فی الفائق ۲ ر ۱۷۵ و غریب ابی عبید (۱: ۳۲) و باختلاف الفاظہ فی ابی داؤد و عن عائشۃ راجع کنز العمال ۸ رقم ۹۹۵ [3] ذکر الفخر (۲۰ ، ۱۵۳) للفظ القضاء ثلاثۃ معان (۱) بمعنی الحکم والامر کما فی (۱۷-۲۳) و (۲) بمعنی الخبر والاعلام (۱۷-۴) و (۳) بمعنی صفۃ الفعل اذا تم کما فی (۴۱-۱۲) کذا فی البخاری۔

اور آیت کریمہ :۔

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ (۴۱-۱۲)

پھر دو دن میں سات آسمان بنائے۔ ۔ ۔ ۔

میں اللہ تعالیٰ کے ایجاد ابداعی اور اس سے فارغ ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسے فرمایا :۔

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲-۱۱۷) وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اور آیت کریمہ[1] :۔

اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیْنَهُمْ (۴۲-۱۴) اگر ایک وقت مقرر تک کے لئے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔

میں قُضِیَ بمعنی فُصِلَ ہے یعنی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور قضاء البشری بذریعہ قول جیسے قَضَی الْحَاکِمُ بِکَذَا۔ حاکم نے فلاں فیصلہ کیا۔ کیونکہ حاکم ہمیشہ زبان کے ساتھ فیصلہ دیتا ہے اور قضاء البشری بذریعہ فعل کے متعلق فرمایا۔

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ (۲-۲۰۰) پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو۔

ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ (۲۲-۲۹) پھر چاہئے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں پوری کریں۔

اور نیز فرمایا :۔

ذٰلِکَ بَیْنِیْ وَبَیْنَکَ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ (۲۸-۲۸) مجھ میں اور آپ میں یہ عہد پختہ ہوا کہ میں جونسی مدت چاہوں پوری کر دوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا (۳۳-۳۷) پھر جب زید نے اس سے کوئی حاجت متعلق نہ رکھی۔

ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۰-۷۱) پھر وہ کام میرے حق میں کر گزرو۔

یعنی تم میرے متعلق اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنالو۔ اور آیت کریمہ :۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۲۰-۷۲) تو آپ کو جو حکم دینا ہو دے دیجئے اور آپ جو حکم دے سکتے ہیں وہ صرف اسی دنیا کی زندگی میں دے سکتے ہیں۔

اور اسی طرح شعر[2] (الطویل)

(۳۵۶) قَضَیْتَ اُمُوْرًا ثُمَّ غَادَرْتَ بَعْدَهَا

تم نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے امور سرانجام دیئے۔ پھر اس کے بعد۔ ۔ ۔ ۔ چھوڑ دیئے ہیں۔ میں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔

یعنی قضاء قولی بھی اور قضا فعلی بھی۔

اور کبھی قضا سے موت مراد ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے فُلَانٌ قَضٰی نَحْبَهٗ یعنی اس نے اپنے

---

[1] زدہ من المصحح فالصواب الی اجل بدل لولا اجل ۔ [2] قالہ شاعر فی رثاء عمرؓ وتمامہ بوائج فی اکمامہا لم تفتق وفی روایۃ بوائق بدل بوائج ۔ والشعر مما اختلف فی قائلہ فنسبہ ابو تمام للشماخ بن ضرار وتابعہ الحصری فی زہرہ (۴ : ۱۱۵) وابن درید فی اشتقاق ۹۹ او کنانی اللسان والصحاح (بوج) والبیت لیس فی دیوان شماخ ونسبہ الجاحظ فی البیان (۳ : ۳۶۴) وابو الطیب فی ابدال (۱ : ۴۲) لمزرد بن ضرار الغطفانی اخا الشماخ الاکبر (۱ : ۲۳۱ م) وفی الاغانی (۸ : ۱۰۲) والفائق (۱ : ۶۲) الی الجن والبیت فی الطبری (۱ : ۵۰۹) والمشکل للقتبی ۲۴۳ والبحر (۱ : ۳۵۵) بغیر عزو قال فی ذیل الاہمال والصحیح انہ لجزء اخی الشماخ راجع المرزوقی رقم ۸۰۳ والیہ نسب ابن درید فی الاشتقاق فی ۲۸۷ والشماخ ہذا اسمہ معقل بن ضرار راجع لترجمتہ والاغانی (۸ : ۹۷-۱۰۴) والمؤتلف ۱۳۸ واللآلی ۵۸-۵۹ والخزانۃ (۱ : ۵۲۶) والشعراء ۲۸۴ والاشتقاق ۱۷۴

÷ ÷ ÷ ÷

دنیاوی امور جو اس کے ساتھ مخصوص تھے پورے
کرلئے یعنی فوت ہوگیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ
(۳۳-۲۳) تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی
نذر سے فارغ ہوگئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار
کررہے ہیں۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ انہوں نے اپنی نذر
پوری کرلی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر لازم کر
لیا تھا کہ وہ جان قربان کردیں گے اور کبھی بھی
دشمنوں سے شکست کھا کر نہیں بھاگیں گے۔
مگر بعض نے اس کے معنی فوت ہوجانا بھی کئے
ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (۶-۲)
پھر مرنے کا ایک وقت مقرر کردیا اور ایک
مدت اس کے ہاں اور مقرر ہے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ اجل اول سے دنیاوی
زندگی مراد ہے اور ثانی سے موت کے بعد دوبارہ
زندہ ہونا مراد ہے اور ارشاد الٰہی:۔
يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (۶۹-۲۷) اے
کاش موت (ابد الآباد کے لئے میرا کام) تمام
کرچکی ہوتی۔
وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (۴۳-۷۷)
اور پکاریں گے کہ اے مالک تمہارا پروردگار
ہمیں موت دے دے۔
میں بھی موت سے کنایہ ہے۔ نیز فرمایا:۔
فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى
مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ (۳۴-۱۴) پھر جب
ہم نے ان کے لئے موت کا حکم صادر کیا تو کسی
چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا مگر گھن کے کیڑے سے۔
تَقَضَّى الدَّيْنَ قرض ادا کرنا۔
اور اِقْتِضَاءٌ کے معنی قرض کی واپسی کا مطالبہ
کرنے ہیں۔ اور اسی سے هٰذَا يَقْتَضِي كَذَا
محاورہ ہے اور آیت کریمہ:۔
لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ (۱۰-۱۱) تو ان کی عمر کی
میعاد پوری ہوچکی ہوتی۔
کے معنی یہ ہیں کہ ان کی دنیاوی زندگی کی میعاد پوری
کردی جاتی۔
قَضَاءُ الٰہی قَدَرٌ (تقدیر) سے اخص ہے۔ کیونکہ
قضاء کے معنی تقدیر کو قطعی کردینے کے ہیں
لہٰذا قَدَرٌ (بمعنی تقدیر ہے اور قضاء اس کا فیصلہ
کرنے کا نام ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ
قَدَرٌ (بمنزلہ اس چیز کے ہے جو ماپ کے لئے
تیار کی گئی ہو۔ اور قضاء بمنزلہ ماپنے کے ہے جیسا
کہ مروی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ملک شام
سے بوجہ طاعون کے واپسی کا ارادہ کیا تو ابوعبیدہؓ
نے کہا[۱] (۸۳) اَتَفِرُّ مِنَ الْقَضَاءِ (کیا تم قضا
الٰہی سے بھاگ رہے ہو تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔
اَفِرُّ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ اِلٰى قَدَرِ اللّٰهِ کہ میں قضا
الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں۔ تو
اس میں تنبیہ ہے کہ تقدیر جب تک قضا کے
مرحلہ میں داخل نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
اسے (دعا وغیرہ کے وسیلہ سے) روک دے
لیکن جب اللہ تعالیٰ قضا یعنی قطعی فیصلہ
کردے تو کسی حیلہ سے اسے روکنا ممکن
نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے
معلوم ہوتا ہے۔

---

[۱] رواہ البخاری ۲/۸۵۳ (طبع ہند) من حدیث عبداللہ بن عباس و عبدالرحمٰن بن عامر لکن لفظہ نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ واصل الحدیث متفق علیہ۔

وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (۱۹-۲۱) اور یہ کام مقرر ہو چکا ہے۔
كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (۱۹-۷۱) یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔
اور اسی طرح آیت کریمہ:۔
وَقُضِيَ الْاَمْرُ (۱۱-۴۴) اور کام تمام کر دیا گیا۔ میں قُضِيَ کے معنی فُصِلَ کے ہیں یعنی قطعی فیصلہ کر دیا گیا کہ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی اسی طرح فرمایا:۔
وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا (۲-۱۱۷) اور جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔
اور ہر وہ قول جس میں نفع یا اثبات قطعی کا حکم پایا جائے اسے قَضِيَّة کہا جاتا ہے اسی لئے یہ صدق و کذب کے ساتھ متصف ہوتا ہے اور اسی بنا پر بعض نے کہا ہے کہ تجربہ خطرناک امر ہے اور قضاء مشکل یعنی کسی چیز کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ یہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے نہایت ہی مشکل امر ہے حدیث میں ہے آنحضرت نے فرمایا (۱۴۸) عَلِيٌّ اَقْضَاكُمْ کہ علیؓ تم سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔[1]

(ق ط ط)

اَلْقِطُّ حصہ حساب کا رجسٹر قرآن میں ہے:۔
وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸-۱۶) اور کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہم کو ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔
اَلْقِطُّ اصل میں صحیفہ کو کہتے ہیں پھر جو چیز (یعنی حکم وغیرہ) لکھا گیا ہو اور جس چیز میں لکھا گیا ہو دونوں کو قِطٌّ کہنے لگے ہیں اور کبھی صرف اس (فیصلہ وغیرہ) کو قِطٌّ کہا جاتا ہے جو کسی چیز پر لکھا گیا ہو جیسا کہ کلام کو کتاب کہا جاتا ہے اگرچہ وہ لکھی ہوئی نہ ہو۔[2]
اصل میں قِطّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو عرض میں قطع کی گئی ہو جیسا کہ (اس کے بالمقابل) قَدٌّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو طول میں قطع کی گئی ہو۔ پھر (محاورہ میں) اس معین حصہ کو (بھی) قِطّ کہا جاتا ہے جو کاٹ کر الگ کر لیا گیا ہو چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ میں یہی معنی مراد لئے ہیں۔
مَا رَاَيْتُهٗ قَطُّ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تو قَطُّ سے خاص زمانہ مراد ہے۔[3]
قَطْنِيْ (اسم فعل) مجھے کافی ہے۔

(ق ط ر)

اَلْقُطْرُ کے معنی جانب اور طرف کے ہیں اس کی جمع اَقْطَارٌ ہے قرآن میں ہے:۔
اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۵-۳۳) اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ۔
وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا (۳۳-۱۴)

---

[1] عن ابن عباس فی حدیث مرفوع وفی عبدالرزاق عن قتادة مرسلاً وعن انس اخرجها البغوی فی شرح السنة والمصابیح وفی معناه احادیث رواها اصحاب السنن (المقاصد رقم ۱۴۸) وایضاً قال عمر فیه رضی اللہ تعالیٰ عنہ علی اقضانا وابی اقرؤنا (المستدرک ۳/۵۳۰)
[2] وعند اکثر اہل التفسیر المراد منہ صحیفۃ الاعمال وقال قتادۃ المراد منہ نصیب العذاب وعن سعید بن جبیر نصیب من الجنۃ (راجع الطبری ۲۳/۵ ۱۳۰-۱۳۴)
[3] قال فی التنبیہ ۶۱-۶۲ تاتی قط بمعنی حسب وکفی تقول قط عبداللہ درہم وقطنی درہم وعند اہل البصرۃ تکون مضافاً الی مابعدہا تقول قط عبداللہ درہم وحینئذ تکون مخففۃ ومثقلۃ واما فی الزمان والعدد فلا تاتی الا مثقلۃ ۱۲

اور اگر فوجیں اطراف مدینہ سے ان پر آداخل ہوں۔
قَطَّرَہٗ کسی کو پہلو پر گرا دینا۔
اسی سے قَطَرَ الْمَطَرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بارش برسنے کے ہیں اور اسی وجہ سے بارش کو قَطْرٌ کہا جاتا ہے۔
تَقَاطَرَ الْقَوْمُ لوگ بارش کے قطروں کی طرح باہم آئے۔ اسی سے اونٹوں کی قطار کو قطار کہا جاتا ہے مثل مشہور ہے[1]
اَلنِّقَاضُ یُقْطِرُ الْجَلَبَ یعنی توشہ ختم ہو جائے تو عمدہ اونٹ بھی فروخت کے لئے منڈی میں لے جاتے ہیں۔
اَلْقَطِرَانُ کے معنی پگھلی ہوئی رال یا گندھک کے ہیں قرآن میں ہے
سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ (۱۴-۵۰) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔
ایک قراءت میں قِطْرٍ اٰنٍ ہے جس کے معنی پگھلے ہوئے گرم تانبے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا (۱۸-۹۶) (اب) میرے پاس تانبا لاؤ کہ اس پر پگھلا کر ڈال دوں یہاں قِطْرًا کے معنی پگھلا ہوا تانبا کے ہیں۔

(ق ط ع)

اَلْقَطْعُ کے معنی کسی چیز کو علیحدہ کر دینے کے ہیں خواہ اس کا تعلق حاسہ بصر سے ہو جیسے اجسام وغیرہ یا بصیرت سے ہو۔ جیسے معنوی چیزیں۔ چنانچہ اسی سے اعضاء کا قطع کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ (۷-۱۲۴) میں پہلے تو تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسرے طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا۔
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا (۵-۳۸) اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔
وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (۴۷-۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائیگا تو انکی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا۔
اور اسی سے قطع ثوب ہے جیسے فرمایا:۔
فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ جو کافر ہیں ان کے لئے آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے (۲۲-۱۹)
اور قطع طریق کے دو معنی آتے ہیں (۱) راستہ طے کرنا (۲) رہزنی کرنا۔ جیسے فرمایا:۔
اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ (۲۹-۲۹) تم کیوں (لذت کے ارادے سے) لونڈوں کی طرف مائل ہوتے اور مسافروں کی رہزنی کرتے ہو۔
یہاں قطع سبیل کے وہی معنی ہیں جس کی طرف کہ آیت اَلَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (۱۱-۱۹) جو خدا کے رستے سے روکتے ہیں۔
اور آیت:۔
فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ (۲۹-۳۸) اور ان کو سیدھے رستے سے روک دیا۔
میں اشارہ فرمایا ہے اور راہ گیروں کو لوٹنے پر قطع اس لئے بولا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ راہ چلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ تو گویا یہ راستہ کو قطع

---

[1] وفی المطبوع الانقاض والتصویب من الاصول راجع للمثل (حلبیہ) والمشکل للقتیبی ۲۶ ومجمع الامثال ۲/۱۲۱ ومعناہ اصلح بالک قیل اذا تسطرق الانفاد قال فی اللسان (نفض) وکان ثعلب یفتح النون ویقول معناہ الجدب نشکل فی بجاصبہ ۳۳ و امالی والنقاض بضم النون

کرنا ہے قَطْعُ الْمَاءِ بِالسِّبَاحَةِ پیراکی کے ذریعہ پانی عبور کرنا قَطْعُ الْوَصْلِ تعلق قطع کر لینا۔ قَطْعُ الرَّحِمِ رشتہ کاٹ لینا یا احسان کو روک لینا۔ قرآن میں ہے:۔

وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ (۴۷-۲۲) اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔

وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ (۲-۲۷) اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑ رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو قطع کر ڈالتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ (۲۲-۱۵) پھر اس سے اپنا گلا گھونٹ لے پھر دیکھے ....

کے معنی بعض نے رسی کاٹ دینا کئے ہیں تاکہ وہ زمین پر گر پڑے اور بعض نے کہا ہے کہ گلے میں پھانسی ڈال کر زندگی کو قطع کر دینا مراد ہے اور یہی معنی حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں۔

قَطْعُ الْاَمْرِ کے معنی کسی کام کا فیصلہ کرنے کے ہیں اسی سے فرمایا:۔

مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا (۲۷-۳۲) میں کسی کام کو فیصل کرنے والی نہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا (یہ خدا نے) اس لئے (کیا) کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک ..... کر دے۔

کے معنی کفار کی ایک جماعت کو ہلاک کر دینے کے ہیں قَطْعُ دَابِرِ الْاِنْسَانِ کے معنی نوع انسانی کو فنا کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۶-۴۵) غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔

اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ (۱۵-۶۶) تو ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی اور آیت کریمہ:۔

اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ (۹-۱۱۰) مگر یہ کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں۔

میں تقطع قلوب سے مر جانا مراد ہے اور یا اس سے مراد ایسی توبہ کرنے کے ہیں کہ اپنی کوتاہیوں پر ندامت کی وجہ سے انسان کا دل پارہ پارہ ہو جائے۔

قِطْعٌ مِّنَ اللَّيْلِ کے معنی رات کے ایک حصہ کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ (۱۱-۸۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

اَلْقَطِيْعُ بکریوں کا ریوڑ جمع قُطْعَانٌ۔

یہ معنی قطع سے مشتق ہے جیسا صِرْمَةٌ اور فِرْقَةٌ وغیرہ الفاظ کے معنی جماعت کے آتے ہیں اور ان میں قطع کا معنی پایا جاتا ہے۔

اَلْقَطِيْعُ کے معنی کوڑا بھی آتے ہیں۔ محاورہ ہے:۔

اَصَابَ بِئْرَهُمْ قُطْعٌ (گرمی کی وجہ سے) ان کے کنویں کا پانی ختم ہو گیا۔

مَقَاطِعُ الْاَوْدِيَةِ وادیوں کے سرے۔

(ق ط ف)

قَطَفْتُ (ض) الثَّمَرَ قَطْفًا کے معنی پھل چننا کے اور درخت سے توڑے ہوئے پھل کو قِطْفٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع قُطُوْفٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۶۹-۲۳) جن کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے۔

قَطَفَتِ الدَّابَّةُ قَطْفًا۔ جانور کا آہستہ چلنا اور ایسے جانور کو قَطُوْفٌ کہا جاتا ہے اور جانور کے

متعلق اس کا استعمال صرف تشبیہ اور استعارہ کے طور پر ہوتا ہے۔ یعنی دابّۃ کو قَاطِفٌ (پھل چننے والا) کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے جیسا کہ نقص کے ساتھ کوئی چیز متصف ہوتی ہے۔ وَقَدْ تقدم ذکرہ اَقْطَفَ الْکَرْمُ انگور چننے کا موسم قریب آگیا۔ اور جو انگور پک کر زمین پر گر پڑیں انہیں قِطَافَۃٌ کہا جاتا ہے اور یہ قِفَایَۃٌ کی طرح ہے۔

(ق ط م ر)

اَلْقِطْمِیْرُ (نقطہ سپید بر پشت دانہ کہ خرما از دے روید) قرآن میں ہے:۔

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ (۳۵-۱۳) اور جن لوگوں کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے نقطہ سپید کے برابر بھی تو کسی چیز کے مالک نہیں۔

قِطْمِیْرٌ کے معنی اس ہلکے سے سپید نقطہ کے ہیں جو گٹھلی پر ہوتا ہے۔ یہ حقیر اور بے قدر چیز کے لئے ضرب المثل ہے۔

(ق ط ن)

اَلْیَقْطِیْنُ گیاہ بے ساق مثل درخت کدو دمانند آں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنْبَتْنَا عَلَیْہِ شَجَرَۃً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ (۳۷-۱۴۶) اور ان پر کدو کا درخت اگایا۔

اَلْقُطْنُ روئی قُطْنُ الْحَیَوَانِ میاں دوراں۔

(ق ع د)

اَلْقُعُوْدُ یہ قِیَامٌ (کھڑا ہونا) کی ضد ہے اس سے قَعْدَۃٌ صیغہ مرۃ ہے یعنی ایک بار بیٹھنا اور قِعْدَۃٌ (بکسرۃ قاف) بیٹھنے کی حالت کو کہتے ہیں اور اَلْقُعُوْدُ قَاعِدٌ کی جمع بھی ہے جیسے فرمایا:۔

فَاذْکُرُوا اللہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا (۴-۱۰۳)۔ تو کھڑے اور بیٹھے ..... ہر حال میں خدا کو یاد کرو۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا (۳-۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے .... ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

اَلْمَقْعَدُ کے معنی جائے قیام کے ہیں اس کی جمع مَقَاعِدُ ہے قرآن میں ہے:۔

فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ (۵۴-۵۵) (یعنی) پاک مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔

یعنی نہایت پرسکون مقام میں ہوں گے اور آیت کریمہ:۔

مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (۳-۱۲۰) لڑائی کیلئے مورچوں پر۔ میں لڑائی کے مورچے مراد ہیں جہاں سپاہی جم کر لڑتے ہیں اور کبھی کسی کام میں سستی کرنے والے کو بھی قَاعِدٌ کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔

لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ (۴-۹۵) جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھ رہتے (اور لڑنے سے جی چراتے) ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے۔

اسی سے رَجُلٌ قُعَدَۃٌ ضُجَعَۃٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی بہت کاہل اور بیٹھے رہنے والے آدمی کے ہیں نیز فرمایا:۔

فَضَّلَ اللہُ الْمُجَاھِدِیْنَ عَلَی الْقَاعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴-۹۵) خدا نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجے میں فضیلت بخشی ہے۔

اور کبھی قَعَدَ لَہٗ کے معنی کسی چیز کے لئے گھات لگا کر بیٹھنے اور انتظار کرنے کے بھی آتے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ (۷-۱۶)
میں بھی سیدھے رستے پر ..... بیٹھوں گا۔

نیز فرمایا:۔

اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (۵-۲۴) ہم یہیں بیٹھے رہینگے یعنی یہاں بیٹھ کر انتظار کرتے رہینگے اور آیت کریمہ:۔

عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ (۵۰-۱۷)
جو دائیں بائیں بیٹھے ہیں۔

میں قَعِيْدٌ سے مراد وہ فرشتہ ہے جو ہر وقت اعمال کی نگرانی کرتا رہتا ہے اور انسان کے اچھے برے اعمال (اس کے نامۂ اعمال میں) درج کرتا رہتا ہے یہ واحد وجمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ نیز جو وحشی جانور پیچھے سے آتا ہے اور اس سے برا شگون لیا جاتا ہے اسے بھی قَعِيْدٌ کہا جاتا ہے اور یہ نَطِيْحٌ کی ضد ہے۔

قَعِيْدَكَ اللّٰهُ وَقِعْدَكَ اللّٰهُ یعنی میں اللہ تعالیٰ سے تیری حفاظت کا سوال کرتا ہوں۔

اَلْقَاعِدُ[1] وہ عورت جو عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے نکاح اور حیض کے قابل نہ رہی ہو اس کی جمع قَوَاعِدُ[2] ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ (۲۴-۶۰) اور بڑی عمر کی عورتیں

اور مُقْعَدٌ[3] اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہو اور اپاہج آدمی جو چل پھر نہ سکے اسے بھی مُقْعَدٌ کہہ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مجازاً مینڈک کو بھی مُقْعَدٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مُقْعَدَات ہے اور ابھری ہوئی چھاتی پر بھی ثَدْیٌ مُقْعَدٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور کنایۃً کے طور پر کمینے اور خسیس اطوار آدمی پر بھی مُقْعَدٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔ قَوَاعِدُ الْبِنَاءِ عمارت کی بنیادیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ (۲-۱۲۷) اور جب ابراہیم ..... بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔

قَوَاعِدُ الْهَوْدَجِ (ہودج) کھٹولا ہودے کی لکڑیاں جو اس کے لئے بمنزلہ بنیاد کے ہوتی ہیں۔

(ق ع ر)

قَعْرُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کی گہرائی کی انتہا کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (۵۴-۲۰) کہ گویا اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔

میں نَخْلٌ مُنْقَعِرٌ سے کھجور کے وہ درخت مراد ہیں جن کی جڑیں زمین کی گہرائی تک چلی گئی ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ اِنْقَعَرَتِ الشَّجَرَۃُ کے معنی درخت کے زمین کی گہرائی سے اکھڑ جانے کے ہیں اور بقول بعض اس کے معنی زمین کی گہرائی تک چلے جانے کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح زمین کی گہرائی تک چلے جانے والے نخلہ کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا یہی مثال ان لوگوں کی ہے کہ ان کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔

---

[1] بل القاعد بغیر ھاء یقال قعدت عن الحیض فھی قاعد (راجع اضداد ابی الطیب ۵۸۳) والجمع القواعد ۱۲ [2] منھا القواعد [3] جمع قاعدۃ وفی صفۃ المرءۃ جمع قاعد بغیر ھاء ۱۲

قَصْعَةٌ قَعِيرَةٌ گہرا پیالہ قَعَّرَ فُلَانٌ فِی کَلَامِہٖ حلق سے آواز نکالنا جیسا کہ جبڑے سے آواز نکالنے کو شَقَّقَ کہا جاتا ہے۔

(ق ف ل)

اَلْقُفْلُ تالا جمع اَقْفَالٌ محاورہ ہے:۔
اَقْفَلْتُ الْبَابَ میں نے دروازے کو قفل لگا دیا اور تمثیل کے طور پر ہر اس چیز کو قفل کہا جاتا ہے جو کسی کام سے مانع اور رکاوٹ بنے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ مُقْفَلٌ عَنْ کَذَا فلاں کو اس کام سے روک دیا گیا ہے۔
قرآن میں ہے:۔
اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (۴۷-۲۴) یا انکے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔
اور کنجوس آدمی کو جس طرح مغلول الیدین کہا جاتا ہے اسی طرح مَقْفُوْلُ الْیَدَیْنِ بھی کہہ دیتے ہیں۔
اَلْقُفُوْلُ سفر سے واپس لوٹنا اور سفر سے واپس آنے والی جماعت کو قافلہ کہا جاتا ہے۔
اَلْقَفِیْلُ خشک چیز کو کہتے ہیں اس لیئے کہ خشک ہونے کی وجہ سے اس کے اجزا ایک دوسرے کی طرف لوٹ آتے ہیں اور یا اس لئے کہ صلابت کی وجہ سے گویا اس پر قفل لگ جاتا ہے۔ محاورہ ہے:۔
قَفَلَ النَّبَاتُ نباتات خشک ہو گئی۔
قَفَلَ الْفَحْلُ مستی سے سانڈھ کا دبلا ہو جانا۔

(ق ف و)

اَلْقَفَا کے معنی گدی کے ہیں اور قَفَوْتُہٗ کے معنی کسی کی گدی پر مارنا اور کسی کے پیچھے پیچھے چلنا یہ دونوں محاورہ استعمال ہوتے ہیں قَفَوْتُ اَثَرَہٗ واقْتَفَیْتُہٗ کے معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں دوسرے کا مصدر اِقْتِفَاءٌ ہے۔ جس کے اصل معنی کسی کی قفا کا اتباع کرنے کے ہیں۔ لیکن کنایہ کے طور پر کسی کی غیبت اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ (۱۷-۳۶) اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔
یعنی محض قیافہ اور ظن سے کام نہ لو بعض کے نزدیک قیافہ کا لفظ بھی اقتفاء سے مقلوب ہے۔ جیسے جَذَبَ وَجَبَذَ اور یہ (قیافہ) ایک فن ہے۔ اور قَفَّیْتُہٗ کے معنی کسی کو دوسرے کے پیچھے لگانے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ (۲-۸۷) اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیجتے رہے۔
اَلْقَافِیَۃُ مصرعہ کے جزو اخیر کو کہا جاتا ہے جس کے حرف روی کی ہر شعر میں رعایت رکھی جاتی ہے۔
اَلْقَفَاوَۃُ وہ کھانا جس سے مہمان کی آؤ بھگت کی جائے۔

(ق ل ل)

اَلْقِلَّۃُ والْکَثْرَۃُ۔ بلحاظ اصل وضع کے صفات عدد سے ہیں جیسا کہ عِظَمٌ اور صِغَرٌ صفات اجسام سے ہیں بعد کثرت وقلت اور عظم وصغر میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ

بطور استعارہ استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ۔
ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا (۳۳-۶۰)
پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔
میں قَلِيلًا سے عرصہ قلیل مراد ہے۔ اسی طرح فرمایا۔
قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا (۷۳-۲) رات کو قیام کرو، مگر تھوڑی رات۔
وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۳۳-۱۶) اور اس وقت تم بہت ہی کم فائدہ اٹھاؤ گے۔
نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا (۳۱-۲۴) ہم ان کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے۔
اور آیت کریمہ:۔
مَّا قَاتَلُوا إِلَّا قَلِيلًا (۳۳-۲۰) تو لڑائی نہ کریں مگر کم۔
قَلِيلًا مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی قِتَالًا قَلِيلًا اور آیت کریمہ:۔
وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا (۵-۱۳) اور تھوڑے آدمیوں کے سوا ہمیشہ ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔
قَلِيلًا سے مراد تھوڑی سی جماعت اور یہی معنی آیت کریمہ:۔
إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا (۸-۴۳) اس وقت خدا نے تمہیں خواب میں کافروں کو تھوڑی تعداد میں دکھایا۔
وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ (۸-۴۴) اور کافروں کو تمہاری نظروں میں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا۔
میں مراد ہیں اور شاعر کے قول[1] (السریع)

(۳۵۷) وَلَسْتَ بِالْأَكْثَرِ مِنْهُمْ حَصًى
وَإِنَّمَا الْعِزَّةُ لِلْكَاثِرِ
اور تم تعداد میں ان سے زیادہ نہیں ہو اور عزت صرف کثیر التعداد کے لئے ہے۔
کے پیش نظر کبھی قلت کا لفظ بطور کنایہ ذلت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ (۷-۸۶) اس وقت کو یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے تو خدا نے تم کو جماعت کثیر بنا دیا۔
اور آیت کریمہ:۔
وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (۳۴-۱۳) اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہیں۔
اور آیت:۔
وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (۳۸-۲۴) اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔
میں قلیل کا لفظ بطور عزت و احترام کے استعمال ہوا ہے اس لئے کہ جتنی کوئی چیز زیادہ عزیز القدر ہو اتنی ہی کمیاب ہوتی ہے اور آیت کریمہ:۔
وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷-۸۵) اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔
میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مَا أُوتِيتُم سے مستثنیٰ ہو یعنی تم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں اس کا علم دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ قَلِيلًا مصدر محذوف کی صفت ہو یعنی تمہیں اس کے متعلق علم قلیل یعنی تھوڑا (سا علم) دیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا (۲-۴۱) اور میری آیتوں (میں تحریف کر کے ان) کے بدلے تھوڑی

---

[1] قالہ الاعشی المیمون فی روایۃ منہم بدل منہ والبیت فی التاج واللسان (کثر) راجع تخریجہ (ک ث ر)

سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) نہ حاصل کرو۔
یہں قلیل سے مراد دنیوی مال ومتاع ہے کیونکہ دنیوی مال ومتاع خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں جو حق تعالیٰ نے متقین کیلئے تیار کی ہیں، نہایت ہی حقیر ہے اسی بناء پر فرمایا:۔
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے (۴-۷۷)
اور کبھی قلیل کا لفظ بول کر نفی کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ جیسے قَلَّمَا يَفْعَلُ فُلَانٌ كَذَا کہ فلاں ایسا کام نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ نفی کیطرح اس کے بعد بھی استثنا لانا صحیح ہوتا ہے جیسے قَلَّمَا يَفْعَلُ كَذَا إِلَّا قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا أَوْ مَا يَجْرِي مَجْرَاهُ۔ اور بعض نے آیت کریمہ:۔
قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ (۶۹-۴۱) لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔
کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی وہ ایمان ہی نہیں لاتے" اور بعض نے اس کے معنی تُؤْمِنُونَ إِيمَانًا قَلِيلًا کئے ہیں یعنی وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں اور ایمان قلیل سے مراد صرف زبان کے ساتھ اقرار اور سطحی سی معرفت حاصل کرنے کے ہیں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔
وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ (۱۲-۱۰۶) اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔
أَقْلَلْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو ہلکا پانے کے ہیں کبھی یہ ہلکا سمجھنا محض حکمی ہوتا ہے۔
أَقْلَلْتُ مَا أَعْطَيْتَنِي یعنی میں نے تمہارے دیئے ہوئے کو حقیر سمجھا اور کبھی اس شے کی قوت کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا (۷-۵۷) جب وہ بھاری بھاری بادلوں کو اٹھا لاتی ہے۔
یہاں اقلت کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔ کہ وہ بادل جن کو اٹھا کر لاتی ہے اگرچہ فی نفسہ بھاری ہوتے ہیں مگر ہوا کی قوت کے اعتبار نہایت ہلکے ہیں۔
اِسْتَقْلَلْتُهُ کسی چیز کو حقیر خیال کرنا جیسے اِسْتَخْفَفْتُهُ کسی چیز کو ہلکا خیال کرنا۔
اَلْقُلَّةُ ہر چیز کا بالائی حصہ۔ اور قُلَّةُ الْجَبَلِ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں کیونکہ باقی پہاڑ کے مقابلہ میں وہ قلیل سی ہوتی ہے۔
تَقَلْقَلَ الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کے مضطرب ہونے کے ہیں اور تَقَلْقَلَ الْمِسْمَارُ میخ کا مضطرب ہونا، قَلْقَلَةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی حرکت کی آواز کو حکایت کرنے کے ہیں۔

(ق ل ب)

قَلْبُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے قَلَبْتُ الثَّوْبَ (کپڑے کو الٹنا) اور قَلْبُ الْإِنْسَانِ کے معنی انسان کو اس کے راستے سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ (۲۹-۲۱) اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔
اَلْاِنْقِلَابُ کے معنی پھر جانے کے ہیں ارشاد ہے۔
انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (۳-۱۴۴) تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہو جاؤ)
وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (۳-۱۴۴) اور جو الٹے

پاؤں پھر جائے گا۔
اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ (۲۶-۵۰) ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔
اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶-۲۲۷) کہ کونسی جگہ لوٹ جاتے ہیں۔
وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَھْلِھِمُ انْقَلَبُوْا فَکِھِیْنَ (۸۳-۳۱) اور جب اپنے گھر کو لوٹتے تو اتراتے ہوئے لوٹتے۔
بعض نے کہا ہے کہ انسان کے دل کو بھی قلب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ کثرت سے الٹتا پلٹتا رہتا ہے اور قلب کا لفظ بول کر اوصاف قلبی مراد لئے جاتے ہیں جیسے علم، شجاعت، روح وغیرہ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (۳۳-۱۰) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔
میں قلوب سے ارواح مراد ہیں اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ (۵۰-۳۷) جو شخص دل (آگاہ) رکھتا ہے..... اس کے لئے اس میں نصیحت ہے۔
میں قلب سے مراد علم وفہم ہے۔ نیز فرمایا:۔
وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّةً اَنْ یَّفْقَھُوْهُ (۶-۲۵) اور ہم نے ان کے دلوں پر تو پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کو سمجھ نہ سکیں۔
وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ (۹-۸۷) ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے تو یہ سمجھتے ہی نہیں
اور آیت کریمہ:۔
لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُکُمْ (۳-۱۲۶) اس لئے کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی ہو۔
میں قلوب کے مطمئن ہونے سے ان میں بہادری کا ثابت ہونا اور خوف کا زائل ہونا مراد ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس خوف کے طاری ہونے کے متعلق فرمایا:۔
وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ (۳۳-۲۶) اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔
اور آیت کریمہ:۔
ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ (۳۳-۵۳) یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے بہت پاکیزگی کی بات ہے:۔
میں اَطْھَرُ سے جالب عفت ہونا مراد ہے۔ نیز فرمایا:۔
ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴۸-۴) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔
اور آیت کریمہ:۔ وَقُلُوْبُھُمْ شَتّٰی (۵۹-۱۴) مگر ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔
میں شَتّٰی کے معنی متفرق ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (۲۲-۴۶) بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ قلوب سے مراد عقلیں ہیں اور بعض نے روحیں مراد لی ہیں۔ لیکن عقل کبھی اندھی نہیں ہوتی لہذا تعمیٰ کی قلوب کی طرف نسبت مجازی ہوگی جیسا کہ آیت کریمہ:
وَتَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (۲-۱۲۵) میں (مجازاً) جاری ہونے کی نسبت انہار کی طرف کی گئی ہے حالانکہ انہار جاری نہیں ہوتیں بلکہ ان میں پانی جاری ہوا کرتا ہے۔ تَقْلِیْبُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کی حالت کو متغیر کردینے کے

ہیں جیسے فرمایا: يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ (۳۳-۶۶) جس دن ان کے منہ آگ میں الٹائے جائیں۔
اور تَقْلِيبُ الْأُمُورِ کے معنی کسی کام کی تدبیر اور اس میں غور و فکر کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:
وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ (۹-۴۸) اور بہت سی باتوں میں تمہارے لئے الٹ پھیر کرتے رہے ہیں۔
اور اللہ تعالےٰ کے دلوں اور بصیرتوں کو پھیر دینے سے ان کے آراء کو تبدیل کر دینا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ (۶-۱۱۰) اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے۔
اور تَقْلِيبُ الْيَدِ پشیمانی سے کنایہ ہوتا ہے کیونکہ عام طور پر نادم آدمی کا یہی حال ہوتا ہے (کہ وہ اظہار ندامت کے لئے اپنے ہاتھ ملنے لگ جاتا ہے) قرآن میں ہے:۔
فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ (۱۸-۴۲) تو ...... (حسرت سے) ہاتھ ملنے لگا۔
شاعر نے کہا ہے[1] (   )

(۳۵۸) كَمَغْبُونٍ يَعَضُّ عَلَى يَدَيْهِ
تَبَيَّنَ غَبْنُهُ بَعْدَ الْبِيَاعِ

جیسے خسارہ اٹھانے والا آدمی تجارت میں خسارہ معلوم کرلینے کے بعد اپنے ہاتھ کاٹنے لگتا ہے۔
اور تقلب (تفعل) کے معنی پھرنے کے ہیں۔ ارشاد ہے:۔
وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ (۲۶-۲۱۹) اور نمازیوں میں تمہارے پھرنے کو بھی۔
أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ (۱۶-۴۶) یا ان کو چلتے پھرتے پکڑلے وہ (خدا کو) عاجز نہیں کرسکتے۔
رَجُلٌ قُلَّبٌ بہت زیادہ حیلہ گر اور ہوشیار آدمی جو معاملات میں الٹ پھیر کرنے کا ماہر ہو۔
اَلْقُلَابُ دل کی ایک بیماری (جو اونٹ کو لگ جاتی ہے)
مَابِهٖ قَلَبَةٌ[2] یعنی وہ تندرست ہے اسے کسی قسم کا عارضہ نہیں ہے جو پریشانی کا موجب ہو
اَلْقَلِيبُ۔ پرانا کنواں جو صاف نہ کیا گیا ہو۔
اَلْقُلْبُ ایک خاص قسم کا کنگن۔

(ق ل د)

اَلْقَلْدُ کے معنی رسی وغیرہ کو بل دینے کے ہیں۔ جیسے قَلَدْتُ الْحَبْلَ (میں نے رسی بٹی) اور بٹی ہوئی رسی کو قَلِيدٌ یا مَقْلُودٌ کہا جاتا ہے اور قِلَادَةٌ اس بٹی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو گردن میں ڈالی جاتی ہے جیسے ڈور اور چاندی وغیرہ کی زنجیر اور مجازاً تشبیہ کے طور پر ہر اس چیز کو جو گردن میں ڈالی جائے یا کسی چیز کا احاطہ کرے قِلَادَة کہا جاتا ہے اور اسی سے تَقَلَّدَ سَيْفَهٗ کا محاورہ ہے۔ کیونکہ وہ بھی قلادۃ کی طرح گردن میں ڈال کر لٹکائی جاتی ہے۔ جیسے وشاح (ہار) سے تَوَشَّحَ بِهٖ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور قَلَّدْتُهٗ سَيْفًا کے معنی کسی کی گردن میں تلوار باندھنے یا تلوار سے اس کی گردن مارنے کے ہیں۔ قَلَّدْتُهٗ عَمَلًا کوئی کام کسی کے ذمہ لگا دینا۔

---

[1] ق (قیس بن ذریح والبیت فی اللسان (بیع) و فی محاضرات الادباء ۳ر ۱۰۰ - ۱۰۱ فی ثلاثۃ بغیر عزو ۱۲
[2] انظر ادب الکاتب ۲۴۳ ۱۲

قَلَّدَتْهُ هِجَاءً کسی پر ہجو کو لازم کر دینا۔
اور آیت کریمہ:۔
لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۹-۶۳)
اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں۔ میں مقالید سے مراد وہ چیز ہے جو ساری کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بعض نے اس سے خزانے اور بعض نے کنجیاں مراد لی ہیں لیکن ان سب سے اللہ تعالٰے کی اس قدرت اور حفاظت کی طرف اشارہ ہے، جو تمام کائنات پر محیط ہے۔

(ق ل م)

اَلْقَلْمُ (مصدر ض) اس کے اصل معنی کسی سخت چیز کو تراشنے کے ہیں۔ اس لئے ناخن، بانس کی گرہ اور سرکنڈے وغیرہ کے تراشنے پر قَلْمٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور تراشیدہ چیز کو قِلْمٌ کہا جاتا ہے تو قِلْمٌ بمعنی مَقْلُوْمٌ ہے جیسے نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ آتا ہے۔ اور (عرف میں) خاص کر لکھنے کے آلہ اور قرعہ اندازی کے تیر پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَقْلَامٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
نٓ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸-۱) قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔
وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ (۳۱-۲۷) اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔
اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (۳-۴۴) جب وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے۔ میں اَقْلَامٌ سے قرعہ اندازی کے تیر مراد ہیں[1]۔
اور آیت کریمہ:۔
اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶-۴) جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔
میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ انسان کو کتابت کی تعلیم دینا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے اور جو حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت جبریل علیہ السلام سے وحی اخذ کرتے تھے اور جبریل میکائیل سے وہ اسرافیل سے اور اسرافیل لوح محفوظ سے اور لوح محفوظ قلم سے تو یہاں قلم سے سِرِّ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی تحقیق کا یہاں موقع نہیں ہے۔
اَلْاِقْلِيْمُ۔ ربع مسکون کا ساتواں حصہ۔ علماء ہیئت کی تحقیق کے مطابق زمین کے سات حصے ہیں۔ اور ہر حصہ پر اقلیم کا لفظ بولتے ہیں اس کی جمع اَقَالِيْمُ ہے۔

(ق ل ی)

اَلْقِلٰى کے معنی شدت بغض کے ہیں قَلَاهُ (ماضی) اور يَقْلِيْهِ وَيَقْلُوْهُ مضارع دونوں طرح آتا ہے۔
قرآن میں ہے:۔
مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (۹۳-۳) (اے محمد) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔
اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ (۲۶-۱۶۸) میں

---

[1] كذا قال عطاء ونقل عن ابن عباس ومجاهد وابن جريج ان المراد بها الاقلام التي كانوا يكتبون بها التوراة وكانت من نحاس انظر الفيوضات الالٰهية ص۱۳۱ ج۱ والطبري ص۲۶۳ ج۳

تمہارے کام کا سخت دشمن ہوں۔
اگر اسے واوی قُلُوٌّ سے مشتق مانا جائے جس کے معنی دَمْیٌ کے ہیں تو یہ قَلَتِ النَّاقَۃُ بِرَاکِبِھَا قُلُوًّا۔ (ناقہ نے سوار کو گرا دیا) وَقَلَوْتُ بِالْقُلَّۃِ (میں نے گلی کو پھینکا) وغیرہ محاورات سے مشتق ہوگا۔ اور جس چیز سے دل بوجہ بغض یا ناپسندیدہ ہونے کے اس طرح گھن کھائے گویا اسے پھینک رہا ہے تو اسے مَقْلُوٌّ کہا جائیگا۔ اور اگر ناقص یائی سے مشتق مانا جائے تو یہ قَلَیْتُ الْبُسْرَ وَالسَّوِیْقَ عَلَی الْمِقْلَاۃِ کے محاورہ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی مِقْلَاۃ (فرائی پین) میں کھجور اور ستو ڈال کر تلنے کے ہیں۔

(ق م ح)

اَلْقَمْحُ۔ خلیل نے کہا ہے کہ قَمْحٌ اس گیہوں کو کہتے ہیں جو پکنے کے وقت سے لے کر ذخیرہ اندوزی تک بالی کے اندر ہی رکھا جائے اور اس گیہوں سے جو ستو بنایا جاتا ہے اسے قَمِیْحَۃ کہا جاتا ہے۔
اور ستو کی مناسبت سے کوئی چیز پھانکنے کے لئے سر اوپر اٹھانے کو اَلْقَمْحُ (ف) کہتے ہیں پھر محض سر اٹھانے پر خواہ کسی وجہ سے ہو قَمْحٌ کہا جانے لگا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے قَمَحَ الْبَعِیْرُ اونٹ نے (سیری کے) بعد حوض سے (سر اوپر اٹھا لیا) قَمَحْتُ الْبَعِیْرَ میں نے اونٹ کا سر اونچا کر کے پچھلی جانب باندھ دیا۔ اور آیت کریمہ:۔
فَھُمْ مُقْمَحُوْنَ (۳۶-۸) تو ان کے سر اُلل رہے ہیں۔
میں تشبیہ اور تمثیل کے طور پر ان کو مُقْمَحُوْنَ کہا گیا ہے۔ اور اس سے مقصود قبول حق سے ان کی سرتابی اور سرکشی اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے ان کے انکار کو بیان کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قیامت کے دن ان کی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ آیت:۔
اِذِ الْاَغْلَالُ فِیْٓ اَعْنَاقِھِمْ وَالسَّلٰسِلُ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی۔ میں پایا جاتا ہے۔

(ق م ر)

اَلْقَمَرُ۔ چاند جب پورا ہو رہا ہو تو اسے قمر کہا جاتا ہے اور یہ حالت تیسری رات کے بعد ہوتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ چاند کو قمر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ستاروں کی روشنی کو خیرہ کر دیتا ہے اور ان پر غالب آجاتا ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔
ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (۱۰-۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا۔
وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰہُ مَنَازِلَ (۳۶-۳۹) اور چاند کی (بھی) ہم نے منزلیں مقرر کر دیں۔
وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴-۱) اور چاند شق ہو گیا۔
وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىھَا (۹۱-۲) اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے۔
کَلَّا وَالْقَمَرِ (۷۴-۳۲) ہاں ہاں (ہمیں) چاند کی قسم۔
اَلْقَمْرَاءُ چاند کی روشنی۔ چاندنی۔ تَقَمَّرْتُ فُلَانًا چاندنی رات میں کسی کے پاس جانا۔

[1] یقال قمرہ ای غلبہ علیہ فی القمار

قَمَرَتِ الْقِرْبَةُ چاند کی روشنی سے پانی کی مشک خراب ہو گئی۔

حِمَارٌ اَقْمَرُ چاند کے رنگ یعنی سبزی مائل سفید رنگ کا گدھا۔

قَمَرْتُ فُلَانًا كَذَا میں نے فلاں کو اس چیز سے دھوکا دیا۔

(ق م ص)

اَلْقَمِيْصُ قمیص، کرتہ۔ جمع قُمُصٌ وَاَقْمِصَةٌ وَقُمْصَانٌ قرآن میں ہے:۔

اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ (۱۲-۲۶) اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو۔

وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ (۱۲-۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

تَقَمَّصَهٗ قمیص پہننا۔ قَمَصَ (ن۔ض) اَلْبَعِيْرُ اونٹ کا جست کرنا۔

اَلْقُمَاصُ اونٹ کا ایک مرض جو اسے چین سے کھڑا ہونے نہیں دیتا اور اسی سے لفظ قَامِصَةٌ ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے[1] (۸۵)

(ق م ط ر)

اَلْقَمْطَرِيْرُ سخت۔ قرآن میں ہے:۔

عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا جو چہروں کو کریہہ المنظر اور دلوں کو سخت (مضطر) کر دینے والا۔ (۷۶-۱۰)

قَمْطَرِيْرٌ ایک لغت میں قماطیر بھی ہے۔

(ق م ع)

اَلْمَقَامِعُ (مفرد مِقْمَعٌ) ہتھوڑے۔

قرآن میں ہے:۔

وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (۲۲-۲۱) اور ان (کے مارنے ٹھوکنے) کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔

مَقَامِعُ کا واحد مِقْمَعٌ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے پیٹ پیٹ کر کسی کو مطیع اور مقہور کیا جائے اسی سے محاورہ ہے:۔

قَمَعْتُهٗ فَانْقَمَعَ میں نے اسے روکا تو وہ رک گیا۔

اور اَلْقِمَعُ وَالْقِمْعُ (قیف) وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی (سیال) چیز (بوتل وغیرہ میں) ڈالی جائے۔ تاکہ نیچے نہ گرنے پائے۔ حدیث میں ہے[2] (۸۶)

وَيْلٌ لِاَقْمَاعِ الْقَوْلِ یعنی ان پر افسوس ہے جو اپنے کان لوگوں کی باتیں سننے کے لئے قیفیں بنائے رکھتے ہیں یعنی دوسروں کی باتیں سننے کے درپے رہتے ہیں۔

اَلْقَمَعُ ذباب ازرق کیونکہ اسے مار کر دور بھگایا جاتا ہے تَقَمَّعَ الْحِمَارُ گدھے کا مکھی کو دھتکارتا۔

(ق م ل)

اَلْقُمَّلُ چھوٹی مکھیاں۔ قرآن میں ہے:۔

وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ (۷-۱۳۳) اور چھوٹی مکھیاں اور مینڈک اور خون۔

اَلْقَمْلُ کے معنی ہیں جوں اور رَجُلٌ قَمِلٌ اس

---

[1] روی عن علی انہ قضیٰ فی القارصۃ والقامصۃ والواقصۃ بالدیۃ اثلاثا راجع للقصۃ النہایۃ [2] الکلمۃ من الحدیث فی الفائق ۲ر۲۸۴ والنہایۃ (قمع) قال فی الفائق معناہ ای لایجع فیہم الوعظ کالاقماع التی لاتعی شیئا مما یفرغ فیہا ۱۲

آدمی کو کہتے ہیں جس کے جوئیں پڑ جائیں اور اسی سے چھوٹے سے بدصورت مرد یا عورت کو قَمْلٌ یا قَمْلَۃٌ کہا جاتا ہے گویا وہ جوں یا چھوٹی مکھی کی طرح ہے۔

(ق ن ت)

اَلْقُنُوْتُ (ن) کے معنی خضوع کے ساتھ اطاعت کا التزام کرنے کے ہیں اس بنا پر آیت کریمہ۔ وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ (۲-۲۳۸) اور خدا کے آگے ادب سے کھڑے رہا کرو۔ میں بعض نے قانتین کے معنی طائعین کئے ہیں[1] یعنی اطاعت کی حالت میں اور بعض نے خاضعین یعنی خشوع اور خضوع کے ساتھ اسی طرح آیت کریمہ۔ کُلٌّ لَہٗ قٰنِتُوْنَ (۲-۱۱۶) سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ میں بعض نے قٰنِتُوْنَ کے معنی خَاضِعُوْنَ کئے ہیں اور بعض نے طَائِعُوْنَ (فرمانبردار) اور بعض نے سَاکِتُوْنَ یعنی خاموش اور چپ چاپ اور اس سے بالکل خاموش ہو کر کھڑے رہنا مراد نہیں ہے بلکہ عبادت گذاری میں خاموشی سے ان کی مراد یہ ہے جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا[2] (۸۷) "کہ نماز تلاوت قرآن اور اللہ کی تسبیح و تحمید کا نام ہے اور اس میں کسی طرح کی انسانی گفتگو جائز نہیں ہے"۔ اسی بنا پر جب آپ سے پوچھا گیا کہ کونسی نماز افضل ہے تو آپؐ نے فرمایا (۸۸) طُوْلُ الْقُنُوْتِ یعنی عبادت میں ہمہ تن مصروف ہو جانا اور اس کے ماسوا سے توجہ پھیر لینا قرآن میں ہے:۔ اِنَّ اِبْرٰہِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا (۱۶-۱۲۰) بے شک حضرت ابراہیم لوگوں کے امام اور خدا کے فرمانبردار تھے۔ اور مریم علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔ وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ (۶۶-۱۲) اور فرمانبرداروں میں سے تھیں۔ اَمَّنْ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا (۳۹-۹) یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے۔ اُقْنُتِیْ لِرَبِّکِ (۳-۴۳) اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرنا۔ وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْکُنَّ لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (۳۳-۳۱) اور جو تم میں سے خدا اور اسکے رسول کی فرمانبردار رہے گی۔ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ (۳۳-۳۵) اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (۴-۳۴) تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں۔

(ق ن ط)

اَلْقُنُوْطُ (مصدر) کے معنی بھلائی سے مایوس ہونے کے ہیں اور یہ قَنَطَ (ض) وَقَنِطَ (س) قُنُوْطًا

[1] و فی المستدرک عن ابی سعید: کل حرف فی القرآن یذکر فیہ القنوت فھو الطاعۃ (کنز العمال ۲ رقم ۷۷)، [2] رواہ ابوداؤد و النسائی فی حدیث طویل ومسلم فی صحیحہ انظر العون (۱: ۳۴۹-۳۵۱) ورواہ الترمذی عن جابر (۱: ۵۱)، والحدیث فی اللسان (قنت) و مشکل القرآن للقتیبی ۳۵۰ ونسبہ المتقی فی الکنز الی الابانۃ لابی نصر عبد اللہ بن سعید بن حاتم السجزی رقم ۷۰، [3] الحاکم فی المستدرک والترمذی بسلم وابن ماجۃ عن جابرؓ والطبرانی عن ابی موسیٰ وعن عمرو بن عبیدۃ وعن عمرو بن قتادۃ اللیثی والحدیث فی الکشاف ۳: ۲۴۴ والفائق ۲: ۸۵ قال الحافظ فی تخریجہ علی الکشاف: وفی روایۃ الطحاوی طول القیام (راجع رقم ۱۸۳)

یعنی ہر دو ابواب سے استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔ فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَانِطِينَ (۱۵-۵۵) آپ مایوس نہ ہوجیے۔

وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ (۱۵-۵۶) خدا کی رحمت سے (میں مایوس کیوں ہونے لگا۔ اس سے) مایوس ہونا تو گمراہوں کا کام ہے۔

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ (۳۹-۵۳) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔

وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ اور اگر تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید ہوجاتا ہے اور آس توڑ بیٹھتا ہے (۴۱-۴۹) اور کبھی قنط کا لفظ فرح کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ (۳۰-۳۶) تو ناامید ہوکر رہ جاتے ہیں۔

(ق ن ع)

الْقَنَاعَةُ کے معنی ضروریات زندگی میں سے تھوڑی سی چیز پر راضی ہوجانے کے ہیں اور یہ قَنِعَ (س) يَقْنَعُ قَنَاعَةً سے ہے کیونکہ قَنَعَ (ف) يَقْنَعُ قُنُوعًا کے معنی سوال کرنے کے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ:۔ وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (۲۲-۳۶) اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنیوالوں کو بھی کھلاؤ۔ میں بعض نے کہا ہے کہ قانع سے مراد وہ سائل ہے جو باصرار سوال نہ کرے اور جو کچھ مل جائے اسی پر راضی ہوجائے شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۳۵۹) لَمَالُ الْمَرْءِ يُصْلِحُهُ فَيُغْنِي
مَفَاقِرَهُ أَعَفُّ مِنَ الْقُنُوعِ

وہ مال جو انسان کی حالت درست رکھے اور احتیاج سے بچائے وہ سوال کرنے سے بہرحال بہتر ہے۔

أَقْنَعَ رَأْسَهُ اس نے اپنے سر کو اونچا کیا۔ قرآن میں ہے: مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ (۱۴-۴۳) سر اٹھائے ہوئے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں قِنَاعٌ سے مشتق ہے اور قِنَاعٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے سر ڈھانکا جائے اس سے قَنِعَ (س) کے معنی ہیں اس نے اپنے فقر کو چھپانے کے لئے سر پر قناع اوڑھ لیا اور قَنَعَ (ف) کے معنی سوال کرنے کے لئے سر کھولنے یعنی لوگوں کے سامنے احتیاج ظاہر کرنے کے ہیں جیسا کہ خَفِيَ (س) کے معنی چھپنے اور خَفَى (ف) کے معنی خفاء کو دور کرنے یعنی ظاہر ہونے کے ہیں اور رَجُلٌ مَقْنَعٌ کا محاورہ قَنَاعَةٌ سے ہے یعنی وہ آدمی جس کی شہادت کو کافی سمجھا جائے۔ اس کی جمع مَقَانِعُ ہے۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

(۳۶۰) شُهُودِي عَلَىٰ لَيْلَىٰ عُدُولٌ مَقَانِعُ

اور لیلیٰ پر عادل اور پسندیدہ لوگ میرے گواہ ہیں

---

[1] قالہ شماخ بن ضرار فی ابیات یخاطب امرأتہ عائشۃ من قصیدۃ فی دیوانہ ۵۶-۶۲ والبیت فی اللسان والمحکم (قنع) والاضداد للاصمعی ۵۰ والسجستانی ۷ وابن السکیت ۲۰۳ وابن الانباری مع اخر ۶۶-۶۷ واضداد ابی الطیب ۵۷۶ والصاحبی (۱۶۸-۱۹۰) والمعانی للقتبی (۲۹/۴۹۹) ۳۳۳ والطبری ۱۷/۱۰۹ والبحر ۶/۳۶۴ وتہذیب الالفاظ والخلاء ۱۱۵ ومجاز ابی عبیدۃ (۲/۱۵) والجمہرۃ (۳: ۱۳۲) والقرطبی (۱۲/۶۴) والمیدانی (۱/۲۱۵) والاشتقاق ۲۵۶ [2] قالہ البعیث وصدرہ وبایعت لیلیٰ بالخلاء ولم یکن۔ والبیت فی اللسان (قنع) والاشباہ النحویہ (۲/۲۲) لکن فیہ خلاء مبل بالخلاء وشہود بدون الاضافۃ وھی روایۃ الکامل ۵۹۳ والمحاضرات للمولف ۸۶ والبیت ایضا فی القالی (۱: ۱۹۳) والبلدان دسم: تعاقع) فی ستۃ ابیات والمحکم (قنع) واضداد ابی الطیب ۵۸۰ وبعدہ:۔ وما کل ما منتک نفسک خالیا۔ یکون والا کل الہوی انت تابع ۱۲ ❊

تھے جن کی شہادت پر قناعت ہو سکے۔
اور قِنَاعٌ سے تَقَنَّعَتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی برقعہ اوڑھنے کے ہیں۔
اور اس کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے:۔
تَقَنَّعَ الرَّجُلُ مرد نے سر پر خود رکھا۔ قَنَّعْتُ رَأْسَهٗ بِالسَّيْفِ اَوِ السَّوْطِ کسی کے سر پر تلوار یا کوڑا مارنا۔

(ق ن و)

اَلْقِنْوُ کے معنی (کھجور یا انگور کے) خوشے کے ہیں اس کا تثنیہ قِنْوَانِ اور جمع قِنْوَانٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ (۶-۹۹) لٹکے ہوئے گچھے۔
اور قَنَاةٌ (نیزے کی لکڑی) بھی ٹہنی ہونے میں قِنْوٌ کے مشابہ ہے لیکن وہ قنات (نالی) جس میں پانی بہتا ہے اسے طول میں نیزے کی لکڑی کے ساتھ تشبیہ دے کر قَنَاةٌ کہا جاتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ یہ دراصل قَنَيْتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کا ذخیرہ جمع کرنے کے ہیں اور نالی میں بھی چونکہ پانی کا ذخیرہ جمع رہتا ہے اس لئے اسے قَنَاةٌ کہا جاتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ یہ قَانَاهُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی مل جل جانے کے ہیں۔
شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۱۴۶۳) کَبِكْرِ الْمُقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصُفْرَةٍ
اس کا رنگ شتر مرغ کے تازہ انڈے جیسا ہے جس کی سفیدی میں ہلکی سی زردی کی ملاوٹ ہوتی ہے۔
اور قنا جس کے معنی ناک کے بانسے کے اوپر اٹھنے اور اس کی نوک کے جھکی ہوئی ہونے کے ہیں۔ یہ معنی قَنَا بمعنی نیزہ سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ وہ ہیئت میں اس کے مشابہ ہوتی ہے۔ محاورہ ہے:۔
رَجُلٌ اَقْنٰى وَ امْرَءَةٌ قَنْوَاءُ وہ مرد یا عورت جس کی ناک درمیان سے اٹھی ہوئی ہو اور اس کے نتھنے تنگ ہوں۔

(ق ن ی)

اَلْاِقْنَاءُ (افعال) کے معنی غنی کر دینے کے ہیں قرآن میں ہے:۔
وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى (۵۳-۴۸) اور یہ کہ وہی دولت مند بناتا اور مفلس کرتا ہے۔
یہ اِقْنَاءٌ (افعال) سے ہے جس کے معنی اتنا مال دینے کے ہیں کہ احتیاج باقی نہ رہے یا یہ قُنْيَةٌ سے ہے اور اس کے معنی ذخیرہ کیا ہوا مال بخشنے کے ہیں[2]۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اَقْنٰى کے معنی اَرْضٰى یعنی راضی کرنا کے ہیں[3]۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی رضا و اطاعت کا خزانہ بخش دیا اور یہ غنا مادی (غناء بالمال) سے بڑھ کر ہے۔
اور قِنْيَةٌ کی جمع قِنْيَاتٌ آتی ہے اور قَنَيْتُ كَذَا و اقْتَنَيْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو لازم پکڑنے کے ہیں اسی سے شاعر نے کہا ہے[4] (   )

---

[1] قاله امرؤ القيس فی لامیتہ یصف جلیتہ: وتمامہ: غذاھا نمیر الماء غیر محلل۔ راجع للبیت دیوانہ ۱۰ (صنعۃ السندوبی) والجمھرۃ ۹۸ والمعانی للقتبی ۳۷۱ والعمدۃ (۱: ۹۸) والجرء: ۳۲ ومختار الجاہلی ۱۱ والاشباہ (۳: ۲۱۵) واللسان (قنی) وغریب القرآن للقتبی ۳۷۰ والعقد الثمین ۱۴۸ والمعلقات مع الانباری ۷۰ والتبریزی ۳۵ وفیہ ضبط اعرابہ [2] قال ابن کثیر وعلیہ یدور کلام کثیر من المفسرین واختارہ ابن جریر ورواہ عن ابی صالح ص ۲۷ ج ۷ [3] رواہ ابن ابی حاتم عن ابن عباس ونقل فیہ اقوالاً آخر ص ۲۷ ج ۷ [4] قالہ حاتم الطائی واولہ: اذا قل مالی اونکبت بنکبۃ والبیت فی اللسان (قنی) ۱۲

(۳۶۲) فَبَنَیْتُ حَیَائِیْ عِفَّۃً وَّتَکَرُّمًا
تو میں بوجہ عفت وکرم کی وجہ سے حیا کی چادر اوڑھ لیتا ہوں۔

(ق ھ ر)

اَلْقَھْرُ کے معنی کسی پر غلبہ پاکر اسے ذلیل کرنے کے ہیں اور ان دونوں (یعنی غلبہ اور تذلیل) میں سے ہر ایک معنی میں علیحدہ علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ (۶-۱۸) اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

وَھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (۱۳-۱۶) اور وہ یکتا اور زبردست ہے۔

وَاِنَّا فَوْقَھُمْ قَاھِرُوْنَ (۷-۱۲۷) اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ (۹۳-۹) تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرو۔ یعنی اسے ذلیل نہ کرو۔

اَقْھَرَہٗ کسی پر ایسے شخص کو مسلط کرنا جو اسے ذلیل کردے۔

اَلْقَھْقَرٰی پچھلے پاؤں لوٹنا۔

(ق و ب)

اَلْقَابُ کے معنی کمان کے درمیانی حصہ (مقبض) سے لے کر ایک گوشہ کمان تک کے فاصلہ کے ہیں (اور قوس کی طرف اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے) چنانچہ فرمایا:۔

فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (۵۳-۹) تو دو کمانوں کے قاب کے فاصلہ پر یا اس سے بھی کم۔

(ق و ت)

اَلْقُوْتُ غذا جس سے سد رمق ہوسکے اس کی جمع اَقْوَاتٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَدَّرَ فِیْھَا اَقْوَاتَھَا (۴۱-۱۰) اور اس میں سب سامان معیشت مقرر کیا۔

قَاتَہٗ یَقُوْتُہٗ قَوْتًا کے معنی غذا کھلانے کے ہیں، اور اَقَاتَہٗ یُقِیْتُہٗ کے معنی ایسی چیز دینے کے ہیں جس سے وہ قوت حاصل کرسکے۔ حدیث میں ہے[1] (۸۹)

اِنَّ اَکْبَرَ الْکَبَائِرِ اَنْ یُّضِیِّعَ الرَّجُلُ مَنْ یَّقُوْتُ کہ جس کی قوت انسان کے ذمہ ہو اسے ضائع کرنا سب سے بڑا گناہ ہے ایک روایت میں مَنْ یُّقِیْتُ (افعال) بھی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا (۴-۸۵) اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بعض نے اس کے معنی مقتدر (یعنی قدرت رکھنے والا) کئے ہیں اور بعض نے محافظ اور بعض نے شاہد یعنی حاضر رہنے والا ......

لیکن اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اللہ ہر چیز کی حفاظت کرتا اور اسے روزی دیتا ہے۔

اور اس میں قُوْتٌ قِیْتٌ وَقِیْتَۃٌ تین لغات ہیں جیسے طُعْمٌ وَطِعْمٌ وَطُعْمَۃٌ چنانچہ محاورہ ہے:۔

مَالَہٗ قُوْتُ لَیْلَۃٍ وَّقِیْتُ لَیْلَۃٍ وَّقِیْتَۃُ لَیْلَۃٍ اس کے پاس ایک رات کا بھی کھانا نہیں ہے

---

[1] مجمع البحار والفائق ۲/۱۸۹ وفیہ کفی بالرجل اثما ان یضیع من یقوت (ابوداؤد ۲/۲۳۵ والنسائی والحدیث فی الاحیا للغزالی ولفظہ کفی بالمرء اثما ان یضیع من یعول وھو عند مسلم بلفظ آخر آخرجہ تخریج العراقی علی الاحیاء ۲/۲۳۳

شاعر نے آگ کی صفت میں کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۶۳) نَقُلْتُ لَهُ اِرْفَعْهَا اِلَيْكَ وَاَحْيِهَا
بِرُوحِكَ وَاقْتَتْهُ لَهَا قِيتَةً قَدْرًا

میں نے اسے کہا کہ اسے اپنی طرف اٹھا‌ؤ اور اس پر تھوڑا تھوڑا ایندھن لگا کر نرم پھونک سے اسے سلگاؤ۔

(ق و س)

اَلْقَوْسُ کمان۔ قرآن میں ہے:۔
فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (۵۳-۹) تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔
اور کمان کی ہیئت کذائی کے لحاظ سے تَقَوُّسٌ بمعنی انحناء آتا ہے۔ محاورہ ہے:۔
قَوَّسَ الشَّيْخُ وَتَقَوَّسَ بوڑھا خمیدہ ہوگیا۔
قَوَّسْتُ الْخَطَّ میں نے خمیدہ خط کھینچا۔ اور خمیدہ خط کو مُقَوَّسٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْمِقْوَسُ وہ جگہ جہاں سے گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑنا شروع کرتے ہیں اور اس کے اصل معنی اس رسی کے ہیں جس سے گھوڑ دوڑ میں گھوڑوں کی صف بندی کی جاتی ہے اور پھر انہیں دوڑنے کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔

(ق و ل)

اَلْقَوْلُ اور اَلْقِيْلُ کے معنی بات کے ہیں قرآن میں ہے:۔
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (۴-۱۲۲) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔
قَوْلٌ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے:۔
(۱) عام طور پر حروف کے اس مجموعہ پر قول کا لفظ بولا جاتا ہے جو بذریعہ نطق کے۔ زبان سے ظاہر ہوتے ہیں خواہ وہ الفاظ مفرد ہوں یا جملہ کی صورت میں مفرد جیسے زَيْدٌ خَرَجَ اور مرکب جیسے زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ وَهَلْ خَرَجَ عَمْرٌو وَنَحْوُ ذَالِكَ کبھی انواع ثلاثہ یعنی اسم فعل اور حرف میں ہر ایک کو قَوْلٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ قصیدہ اور خطبہ وغیرہما کو قول کہہ دیتے ہیں۔
(۲) جو بات ابھی ذہن میں ہو اور زبان تک نہ لائی گئی ہو اسے بھی قول کہتے ہیں اس بنا پر قرآن میں آیت کریمہ:۔
وَيَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ (۵۸-۸) اور اپنے دل میں کہتے ہیں (اگر یہ واقعی پیغمبر ہیں تو) جو کچھ ہم کہتے ہیں خدا ہمیں اس کی سزا کیوں نہیں دیتا۔
یعنی دل میں خیال کرنے کو قول سے تعبیر کیا ہے۔
(۳) رائے خیال اور عقیدہ پر بھی قول کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے فُلَانٌ يَقُوْلُ بِقَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ (فلاں ابوحنیفہؒ کی رائے کا قائل ہے)
(۴) کسی چیز پر دلالت کرنے کو قول سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (الرجز)

(۳۶۴) اِمْتَلَاَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِيْ

---

[1] قالہ ذو الرمۃ فی وصف نار فی قصیدۃ لہ فی دیوانہ ۲۴ طبعۃ کیمبرج ۱۹۱۹ء (تذمری) (روح) [2] قالہ اراجز وتمامہ: مہلا رویدًا قد ملأت بطنی۔ بہذہ الروایۃ فی شرح الدرۃ للخفاجی ۱۳ والصحاح (قطط) والتنبیہ للبکری (۲۴) والسمط ۴۷۵ والابدال لابی الطیب (۲۳۷:۱) وہی روایۃ النحاۃ وفی اللسان والتاج (قطط) وتہذیب اصلاح المنطق (۱۰۱:۱) واصلاح یعقوب ۵۷،۳۴۲ وابن الشجری (۱: ۳۱۳/۲: ۴۰) سلًّا بدل مہلًا وفی المقاییس حسبی بدل قطنی وفی الکامل ۴۲ قد خنق بدل امتلأ راجع ایضًا الانصاف ۸۳ مجالس ثعلب (۱: ۱۵۸) والعینی ۱۴۳ والطبری (۱: ۵۱۰) والفخر (۲: ۱۰۲) والمقاییس (۵: ۴۱) والمرتضی (۲: ۱۰۹) ومجازات القرآن للسید شریف الرضی ۱۲۱

حوض بھر گیا اور اس نے کہا بس! مجھے کافی ہے

(۵) کسی چیز کا صدق دل سے اعتبار کرنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا جیسے فُلَانٌ يَقُولُ بِكَذَا فلاں اس کا صدق دل سے خیال رکھتا ہے۔

(۶) اہل منطق کے نزدیک قول بمعنی حد کے آتا ہے جیسے قَوْلُ الْجَوْهَرِ كَذَا۔ وَقَوْلُ الْعَرَضِ كَذَا یعنی جوہر کی تعریف یہ ہے اور عرض کی یہ۔

(۷) الہام کرنا یعنی کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دینا جیسے فرمایا:۔

قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ (۱۸-۸۶)

ہم نے کہا ذوالقرنین تم ان کو خواہ تکلیف دو۔ (یہاں قول بمعنی الہام اور القاء کے ہے) کیونکہ تاریخ اور روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کو (انبیاء کی طرح) مخاطب نہیں کیا گیا بلکہ یہ بات ان کے دل میں القاء کردی گئی تھی چنانچہ اس الہام کو قول سے تعبیر کردیا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ:۔

قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (۴۱-۱۱) انہوں نے کہا ہم خوشی سے آتے ہیں۔

میں خطاب ظاہری نہیں تھا بلکہ ان کا یہ امتثال اور اظہار اطاعت تسخیری طریقہ سے تھا اور یہی معنی آیت کریمہ:۔

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا (۲۱-۶۹)

ہم نے حکم دیا اے آگ سرد ہوجا اور ۔۔۔۔۔ (موجب) سلامتی بن جا۔

میں مراد ہیں اور آیت کریمہ:۔

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (۳-۱۶۷) منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

میں أَفْوَاهِهِمْ کے لفظ سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل اس کی تائید نہیں کرتے اور یہ محاورہ ایسے ہی ہے جس طرح کتابت کے ساتھ ید کا لفظ ذکر کرکے اس کے جھوٹا ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (۲-۷۹)

تو ان لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے تو کتاب لکھتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے آئی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۳۶-۷) ان میں سے اکثر پر خدا کی بات پوری ہوچکی سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

میں قول سے اللہ کا علم اور اس کا حکم مراد ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ (۶-۱۱۵) اور تمہارے پروردگار کی باتیں پوری ہوگئیں۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰-۹۶) جن لوگوں کے بارے میں خدا کا حکم (عذاب) قرار پاچکا ہے وہ ایمان نہیں لانے کے۔

حکم عذاب کو کلمۃ سے تعبیر فرمایا ہے اور آیت کریمہ:

ذَلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ (۱۹-۳۴) یہ مریم کے بیٹے عیسیٰ ہیں (اور یہ) سچی بات ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔

میں عیسیٰ علیہ السلام کو قول الحق کہہ کر آیت کریمہ:۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ ...... ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ (۳-۵۹) اللہ کے ہاں عیسیٰ کی مثال..... پھر فرمایا کہ (انسان) ہوجا تو وہ (انسان) ہوگئے۔

کے مضمون پر تنبیہ کی ہے اور عیسیٰ کو قول کہنا ایسے ہی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ:۔

وَکَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَا اِلٰی مَرْیَمَ (۴-۱۷۱) اور یہ کلمہ (بشارت) تھا جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا۔

میں انہیں کلمہ کہا گیا ہے اور آیت کریمہ:۔

اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (۵۱-۸) تم ایک متناقض بات میں پڑے ہوئے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ بَعْث (موت کے بعد زندگی) کے معاملہ میں تمہارے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور بَعْث کو جو درحقیقت مقول فیہ ہے (مجازاً) قول کہہ دیا ہے۔ جیسا کہ مذکور چیز کو ذکر کہہ دیا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ وَمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ (۶۹-۴۰، ۴۱)

یہ قرآن فرشتے عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔

میں قرآن کو رسول یعنی حضرت جبرئیل کا قول کہنا بنا بر مجاز ہے کیونکہ جو پیغام کسی رسول کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے اس کی نسبت رسول اور مرسل دونوں کی طرف صحیح ہوتی ہے یعنی کبھی مجازاً اسے قول رسول کہہ دیتے ہیں اور کبھی بنا بر حقیقت مرسل کی طرف نسبت کردیتے ہیں اگر اس پر یہ شبہ وارد ہو کہ اس اصل کی بنا پر تو شعر یا خطبہ کی نسبت بھی ان کے راوی کی طرف صحیح ہونی چاہیئے جس طرح کہ انکی نسبت قائل کی طرف ہوتی ہے تو ہم کہیں گے کہ بیشک آپ شعر یا خطبہ کو قول راوی کہہ سکتے لیکن اسے شعر لہٗ یا خطبہ راوی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ شعر کا اطلاق قول کی خاص شکل و صورت پر ہوتا ہے اور اس شکل وصورت کے ڈھالنے میں راوی کا کوئی دخل نہیں ہے مگر قول کی نسبت راوی اور مروی عنہ دونوں کی طرف ہو سکتی ہے اور آیت کریمہ:۔

اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (۲-۱۵۶) جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

میں صرف زبان کے ساتھ اِنَّا لِلّٰہِ الخ کہنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اعتقاد وعمل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اَلْمِقْوَلُ کے معنی زبان کے ہیں اور محاورہ میں رَجُلٌ مِقْوَلٌ وَمِنْطِیْقٌ وَقَوَّالٌ وَقَوَّالَۃٌ کے معنی زبان دراز آدمی کے ہیں۔

اَلْقَیْلُ حمیری بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا اور انہیں قَیْل یا تو اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان کی ہر بات پر اعتماد کیا جاتا تھا اور اس کی اقتداء کی جاتی تھی اور یا اس لئے کہ ان میں ہر ایک اپنے آباء کی روش پر چلتا تھا اور یہ تَقَیَّلَ فُلَانٌ اَبَاہُ (گفتار میں اپنے باپ کے مشابہ ہونا) کے محاورہ سے مشتق ہے جس طرح کہ (یمن کے ہر) بادشاہ کو تُبَّعٌ کہا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر بادشاہ اپنے فیصلوں میں اپنے سے پیشرو کی اقتداء کرتا تھا۔

اصل میں یہ واوی ہے کیونکہ اس کی جمع اقوال آتی ہے جیسے مَیْتٌ کی جمع اَمْوَاتٌ آتی ہے۔

نیز یہ قَیِّلٌ کا مخفف ہے جیسے مَیْتٌ وَمَیِّتٌ

اور جو لوگ اس کی جمع اَقْیَالٌ بناتے ہیں تو یہ (اقوال جمع قول سے) فرق کرنے کے لئے ہے جس طرح کہ (عید کی جمع) اَعْیَادٌ ہے پھر اس سے فعل مشتق کرکے تَقَیَّلَ اَبَاہُ کہہ دیتے ہیں جس طرح کہ (عید کے لفظ سے) تَعَیَّدَ کہا جاتا ہے۔

اِقْتَالَ قَوْلاً۔ ایسی بات کہنا جو فائدہ یا نقصان کا باعث بنے اور کبھی اِقْتَال بھی اِحْتَکَمَ آتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (الخفیف)

(۳۶۵) یَا اَبَی حُکُوْمَۃَ الْمُقْتَالِ

کسی زبردستی حاکم بننے والے کی حکومت کو نہیں مانتا۔

اَلْقَالُ وَالْقَالَۃُ وہ بات جو نشر ہو جائے۔ خلیل نے کہا ہے کہ کبھی قَالَ بمعنی قَائِلٌ بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔ اَنَا قَالَ کَذَا یعنی میں اس کا قائل ہوں[2]۔

(ق و م)

قَامَ یَقُوْمُ قِیَامًا فَھُوَ قَائِمٌ.... کھڑا ہونا قَائِمٌ کی جمع (بھی) قِیَامٌ آتی ہے اور اِقَامَۃٌ کے معنی دوسرے کو کھڑا کرنے کے ہیں اور اَقَامَ بِالْمَکَانِ اِقَامَۃً کے معنی کسی جگہ قیام کرنے کے ہیں اور قیام کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے:۔

(۱) کسی شخص کا تسخیری طور پر یا اپنے ارادے سے کھڑا ہونا۔

(۲) قیام لِلشیئ یعنی شے کی حفاظت اور نگہبانی کرنا۔

(۳) کسی کام کا پختہ ارادہ کر لینا۔

تسخیری طور پر کھڑا ہونے کے معنی میں فرمایا:۔ مِنْھَا قَائِمٌ وَّحَصِیْدٌ (۱۱-۱۰۰) ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور بعض تہس نہس ہو گئے ہیں۔ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَۃٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْھَا قَائِمَۃً عَلٰٓی اُصُوْلِھَا۔ (۵۹-۵) کھجور کے جو درخت تم نے کاٹے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو خدا کے حکم سے تھا۔

اور قیام اختیاری کے معنی میں فرمایا:۔ اَمَّنْ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا (۳۹-۹) یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا۔ (۳-۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے...... ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

اور نیز آیت:۔ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا اور وہ لوگ اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کرکے (عجز و ادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔ میں قِیَامٌ قَائِمٌ کی جمع ہے اور کسی چیز کی حفاظت اور مراعات کے معنی میں فرمایا:۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴-۳۴) مرد عورتوں پر راعی اور محافظ ہیں۔ کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ (۵-۸)

---

[1] قالہ الاعشیٰ فی قصیدۃ لہ فی ۷۵ بیتا یمدح فیھا الاسود بن المنذر اللخمی وصدرہ: ولمثل الذی جمعت لریب الدھر...... والبیت فی اللسان والمحکم (حکم) والمعانی للقتبی ۹۲۳ وفی المطبوع تابی بالتاء والصواب بالیاء کما فی المراجع وفی دیوانہ ۶۸ ایمن الغدر و بدل لریب الدھر۔ [2] وایضا ولو تقول علینا بعض الاقاویل (۶۹-۴۴) معناہ النسبۃ الی احد القول کذبا وزورا۔

انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لئے سچی گواہی دو۔
قَائِمًا بِالْقِسْطِ (۳-۱۸) جو انصاف پر قائم ہیں۔
اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ۔ (۱۳-۳۳) تو کیا جو خدا ہر متنفس کے اعمال کا نگہبان ہے۔

یہاں بھی قائم بمعنی حافظ ہے۔ نیز فرمایا:۔
لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ (۳-۱۱۳) یہ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان اہل کتاب میں کچھ لوگ حکم خدا پر قائم بھی ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔
اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا (۳-۷۵) تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو۔
میں قائما کے معنی برابر مطالبہ کرنے والے کے ہیں اور قیام بمعنی عزم کے متعلق فرمایا:۔
يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (۵-۶) مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو۔

اور آیت کریمہ:۔
وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (۲-۳) اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے .... ہیں۔
میں یُقِیْمُوْنَ کے معنی نماز پر دوام اور اس کے ارکان کی حفاظت کرنے کے ہیں۔

اور قیام و قوام اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے سہارے کوئی چیز قائم رہ سکے جس طرح کہ عماد اور سناد اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو سہارا لگا دیا جائے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا (۴-۵) اور بے عقلوں کو ان کا مال جسے خدا نے تم لوگوں کے لئے سبب معیشت بنایا مت دو۔

یعنی ان کو تمہاری بقا کا سبب بنایا اسی طرح آیت:۔
جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (۵-۹۷) خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبے کو موجب امن مقرر فرمایا۔
میں بیت اللہ کے قیاما للناس ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی دنیا اور آخرت کی اصلاح اور درستگی بیت اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔

اصم[1] کا قول ہے کہ یہاں قیاما بمعنی قائم ہے یعنی اس کی یہ حیثیت کبھی منسوخ نہیں ہوگی اور ایک قرأت میں قیماً ہے جو بمعنی قیاماً ہے اور بعض اسے قیمۃ کی جمع بتاتے ہیں لیکن یہ توجیہہ بے معنی سی ہے۔

اور محاورہ میں قَامَ كَذَا و ثَبَتَ و رَكَزَ کے ایک ہی معنی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى (۲-۱۲۵) اور حکم دیا کہ جس مقام پر حضرت ابراہیم کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنا لو۔
میں لفظ مقام بھی اسی محاورہ سے ماخوذ ہے۔

قَامَ فُلَانٌ مَقَامَ فُلَانٍ کے معنی کسی کے قائم مقام ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَاٰخَرَانِ يَقُوْمَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيَانِ (۵-۱۰۷) تو جن لوگوں کا انہوں نے حق مارنا چاہا تھا ان میں سے ان کی جگہ اور دو گواہ کھڑے ہوں۔

---

[1] هو ابو بكر عبد الرحمٰن بن كيسان الاصم المتوفى سنة ۲۲۵ھ اقدم شيوخ المعتزلة وفى الفهرست ۲۵ ان له كتابا فى تفسير القرآن وفى لسان الميزان (۳: ۴۲۷) الاصم المعتزلى صاحب المقالات فى الاصول وله تفسير عجيب انظر الملل وذيله (۱: ۳۶)

اور آیت کریمہ :- دِيْنًا قِيَمًا (۶-۱۶۲) یعنی دین صحیح ہے۔
میں قِيَمًا بھی ثابت و مقوم کے معنی میں ہے یعنی
ایسا دین جو لوگوں کے معاشی اور اخروی معاملات
کی اصلاح کرنے والا ہے ایک قرأت میں قِيَمًا
مخفف ہے جو قیام سے ہے اور بعض نے
کہا ہے کہ یہ صفت کا صیغہ ہے جس طرح کہ قَوْمٌ
عِدًى، مَكَانٌ سِوًى، لَحْمٌ زِدًى، مَاءٌ
رِوًى میں عِدًى سِوًى اور زِدًى وغیرہا اسمائے
صفات ہیں اور اسی معنی میں فرمایا :
ذَالِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (۹-۳۶) یہی دین کا
سیدھا راستہ ہے۔
وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا قَيِّمًا (۱۸-۱) اور اس
میں کسی طرح کی کجی اور پیچیدگی نہ رکھی بلکہ سیدھی
(اور سلیس اتاری ہے)
اور آیت کریمہ : وَذَالِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ
(۹۸-۵) یہی سچا دین ہے۔
میں قَيِّمَة سے مراد امت عادلہ ہے جس کی طرف
آیت کریمہ :-
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (۳-۱۱۰) تم سب سے بہتر ہو۔
اور آیت :-
كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ
(۴-۱۳۵) انصاف پر قائم رہو اور خدا کے
لئے سچی گواہی دو۔
میں اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ :
يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ
(۹۸-۲، ۳) جو پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں
مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔
میں صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے قرآن پاک کی طرف
اشارہ ہے۔ اور فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کے
معنی یہ ہیں کہ قرآن پاک تمام کتب سماویہ کے
مطالب پر حاوی ہے کیونکہ قرآن پاک
تمام کتب متقدمہ کا ثمرہ اور نچوڑ ہے اور آیت :-
اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (۲-۲۵۵)
خدا وہ معبود برحق ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت
کے لائق نہیں۔ زندہ ہمیشہ رہنے والا۔
میں قیوم (اسمائے حسنیٰ سے ہے یعنی ذات الٰہی
ہر چیز کی نگران اور محافظ ہے اور ہر چیز کو اس
کی ضروریات زندگی بہم پہنچاتی ہے جیسا کہ فرمایا :-
اَلَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى
(۲۰-۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت
بخشی پھر راہ دکھائی۔
اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ
(۱۳-۳۳) تو کیا جو (خدا) ہر متنفس کے اعمال
کا نگران ہے۔
قَيُّوْمٌ بروزن فَيْعُوْلٌ اور قَيَّامٌ بروزن
فَيْعَالٌ ہے جیسے دَيُّوْنٌ وَدَيَّانٌ ۔
اَلْقِيَامَةُ سے مراد وہ ساعت (گھڑی) ہے
جس کا ذکر کہ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ (۴۰-۴۶)
اور جس روز قیامت برپا ہوگی۔
يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۳-۶)
جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے
کھڑے ہوں گے۔
وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً (۱۸-۳۶) اور
نہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت برپا ہو۔
وغیرہ آیات میں پایا جاتا ہے۔ اصل میں قیامۃ
کے معنی انسان کے یکبارگی قیام یعنی کھڑا ہونے

کے ہیں اور قیامت کے یکبارگی وقوع پذیر ہونے پر تنبیہ کرنے کے لئے لفظ قیام کے آخر میں ھاء (ۃ) کا اضافہ کیا گیا ہے[1]۔

اَلْمُقَامُ: یہ قیام سے کبھی بطور مصدر میمی اور کبھی بطور ظرف مکان اور ظرف زمان کے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ (۱۰-۷۱) اگر تم کو میرا رہنا اور .... نصیحت کرنا ناگوار ہو۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱۴-۱۴) یہ اس شخص کے لئے ہے جو قیامت کے روز میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ (۵۵-۴۶) اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى (۲-۱۲۵) اور حکم دیا کہ جس مقام پر حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے اس کو نماز کی جگہ بنا لو۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ (۳-۹۷) اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ (۴۴-۲۶) اور کھیتیاں اور نفیس مکان۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ (۴۴-۵۱) بے شک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔

خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا (۱۹-۷۳) مکان کس کے اچھے اور مجلس کس کی بہتر ہیں۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (۳۷-۱۶۴) ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقرر مقام ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ (۲۷-۳۹) قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں میں اس کو آپ کے پاس حاضر کرتا ہوں۔

کی تفسیر میں اخفش نے کہا ہے کہ یہاں مقام بمعنی مَقْعَد یعنی نشستگاہ کے ہیں اگر اخفش کا مقصد اس سے یہ ہے کہ مقام اور مقعد بالذات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں صرف نسبت الی الفاعل کے لحاظ سے دونوں میں فرق پایا جاتا (یعنی ایک ہی جگہ کو کسی شخص کے وہاں کھڑے ہونے کے لحاظ سے مقام اور بیٹھنے کے اعتبار سے مقعد کہا جاتا ہے جس طرح کہ صَعُوْدٌ اور حَدُوْرٌ کے الفاظ ہیں (کہ ایک ہی جگہ کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صَعُوْد اور اس سے نیچے اترنے کے لحاظ سے حَدُوْرٌ کہا جاتا ہے) تو یہ بجا ہے اور اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ لغت میں مقام بمعنی مقعد آتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض نے المقامۃ کے معنی جماعت بھی کئے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

(۳۶۶) وَفِيْهِمْ مَقَامَاتٌ حِسَانٌ وُجُوْهُهُمْ

اور ان میں خوبرو لوگوں کی جماعتیں ہیں ...... مگر

---

[1] ولنا عبر من اتیانہا بلفظ بغتۃ راجع (۶-۳۰) (۷-۱۸۷) (۲۱-۴۰) (۲۲-۵۵) (۳۴-۶۶) (۴۷-۱۸)

[2] قالہ زہیر یمدح سنان بن الحارثۃ وتمامہ: وانديۃ ينتابها القول والفعل۔ والبیت فی دیوانہ مع شرح الاعلم الشنتمری ۔ رطبعیسن وشواہد الکشاف ۰ ۹ والعمدۃ (۲: ۴۳۱) والصناعتین ۱۰۲ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۲۳) ونقد الشعر ۳۲ فی سبعۃ ابیات والبحر المحیط ۵/۸۸) (۸/۱۹۱) والعقد الثمین ۹۱ والعقد الفرید (۱: ۳۸۸) والسیوطی ۱۰۸

یہ بھی دراصل ظرف مکان ہے اگرچہ (مجازاً) اصحاب مقام مراد ہیں جس طرح کہ[1] (الکامل)

(۳۶۷) وَاسْتَبَّ بَعْدَكَ يَا كُلَيْبُ الْمَجْلِسُ

اے کلیب تیرے بعد لوگ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے ہیں۔

میں مَجْلِسُ سے اہل مجلس مراد ہیں۔

اَلْاِسْتِقَامَةُ (استفعال) کے معنی استہ کے خط مستقیم کی طرح سیدھا ہونے کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر راہ حق کو بھی ...... صراط مستقیم کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱-۵) ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا (۶-۱۵۴) اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱-۵۷) بے شک میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔

اور کسی انسان کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۴۱-۳۰) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ اس پر قائم رہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ (۱۱-۱۱۲) سو (اے پیغمبر) جیسا کہ تم کو حکم ہوتا ہے اس پر ... قائم رہو۔

فَاسْتَقِيْمُوْا اِلَيْهِ (۴۱-۶) تو سیدھے اس کی طرف متوجہ رہو۔

اَلْاِقَامَةُ (افعال) فی المکان کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اِقَامَةُ الشَّیْءِ (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (۵-۶۸) کہو کہ اے اہل کتاب جب تک تم توراۃ اور انجیل ... کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہو سکتے۔ یعنی جب تک کہ علم و عمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔ اسی طرح فرمایا:۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (۵-۶۶) اور اگر وہ توراۃ اور انجیل کو ... قائم رکھتے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ وہاں اِقَامَةٌ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیئت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ادا کرنا مراد ہے اسی بنا پر کئی ایک مقام پر اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اور الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ کہا ہے[2]۔ اور آیت کریمہ:۔

---

[1] قال مہلہل بن ربیعہ یرثی اخاہ کلیبا وصدرہ کما فی امالی القالی (۱: ۹۵) نبئت ان النار بعدک اوقدت۔ والشطر فی مجالس ثعلب ۳۴ والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی رقم ۳۱۵ والمختارات ۲۶ واللآلی ۸ ۲۹ وفیہا صدرہ بروایۃ ابن السکیت، وذہب الخیار من المعاشر کلہم۔ والبیت فی الحصری ۴/ ۴۳ ر ۲: ۱۷۹) فی ثلاثۃ وفی الصناعتین ۲۰۳ والمجالس ۴ ۸ ۵ وامالی ابن الشجری (۱: ۵۲):۔ اودی بدل ذہب فی خمسۃ والبیت الیکانی البحر (۱: ۱۱۳) ومحاضرات المؤلف (۱: ۵۷/ ۲: ۰۰۴) وانظر النقد تلیہ (۱: ۳۰۱) والعقد فی ایام العرب والاغانی (۴: ۱۳۹-۱۵۱) [2] الآیۃ ۵ من سورۃ الحج بدہ قراءۃ ابن مسعود وبحذف النون بالاضافۃ قراءۃ ابی عمرو وابن ابی اسحاق والحسن وبحذف النون ونصب الصلوٰۃ راجع ابوحیان (۶: ۳۶۹)

وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (۴-۱۴۲)
اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

میں قَامُوْا، اِقَامَةٌ سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں۔ اور آیت :۔ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ (۱۴-۴۰) اے پروردگار! مجھ کو (ایسی توفیق عنایت) کر کہ نماز پڑھتا رہوں۔

میں دعا ہے کہ الٰہی! مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اور آیت کریمہ :۔
فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۹-۵) پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے ...... لگیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اِقَامَة سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے کے ہیں۔

اَلْمُقَامُ یہ مصدر میمی، ظرف مکان، ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن میں صرف مصدر میمی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۲۵-۶۶) اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور مُقَامَةٌ (بضم المیم) بمعنی اقامت ہے جیسے فرمایا:۔
اَلَّذِيْ أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ (۳۵-۳۵) جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ کے رہنے کے گھر میں اتارا
یہاں جنت کو دَارُ الْمُقَامَةِ کہا ہے جس طرح کہ اسے دَارُ الْخُلْدِ اور جَنَّاتِ عَدْنٍ کہا ہے۔

اور آیت کریمہ :۔
لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا (۳۳-۱۳) یہاں تمہارے لئے (ٹھہرنے کا) مقام نہیں ہے تو لوٹ چلو۔

میں مَقَامُ کا لفظ قیام سے ہے یعنی تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور ایک قرأت میں مُقَامَ (بضم المیم) اِقَامَة سے ہے اور کبھی اِقَامَة سے معنی دوام مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۵-۳۷) ہمیشہ کا عذاب۔

اور ایک قرأت میں آیت کریمہ :۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ (۴۴-۵۱) بے شک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔ مقام بضم میم ہے۔ یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تَقْوِيْمُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔
لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵-۵) کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

اس میں انسان کے عقل و فہم قد و قامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

تَقْوِيْمُ السِّلْعَةِ سامان کی قیمت لگانا۔

اَلْقَوْمُ۔ یہ اصل میں صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔ چنانچہ فرمایا:۔
لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ...... (۴۹-۱۱)

کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے۔

اور شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۳۶۸) أَقَوْمٌ آلُ حِصْنٍ أَمْ نِسَاءُ

کہ آل حصن مرد ہیں یا عورتیں ؟۔

اور قرآن پاک میں عموماً مرد عورتیں سبھی مراد لئے گئے ہیں لیکن اصل میں یہ مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس پر کہ آیت :۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ الْاٰیَة (۴-۳۴)

مرد عورتوں پر حاکم اور حاکم ہیں۔

میں (بھی) تنبیہ پائی جاتی ہے۔

(ق و و)

اَلْقُوَّةُ یہ کبھی قدرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا :۔

خُذُوْا مَا اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ (۲-۶۳) اور حکم دیا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی اس کو زور سے پکڑے رہو۔

اور کبھی[2] قوت بمعنی استعداد اور صلاحیت کے آتا ہے جو کسی چیز کے اندر پائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ نَوَاة (یعنی کھجور کی گٹھلی) بالقوة کھجور کا درخت ہے یعنی اس میں کھجور کا درخت بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اور کبھی[3] قوت بدنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے

اور کبھی[4] قوت قلبی کے لئے اور کبھی[5] کبھی خارجی معاون چیزیں مراد ہوتی ہیں اور کبھی[6] قوت بمعنی قدرت الہیہ کے آتا ہے چنانچہ بدنی قوت کے متعلق فرمایا :۔

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱-۱۵) ہم سے بڑھ کر قوت میں کون ہے۔

فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ (۱۸-۹۵) تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو۔

یہاں قوت سے بدنی قوت مراد ہے۔ کیونکہ انہوں نے خارجی مدد کی پیش کش کو مَا مَکَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا اور قوت قلبی کے متعلق فرمایا :۔

یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّةٍ (۱۹-۱۲) اے یحیٰی ہماری کتاب کو زور سے پکڑے رہو۔ یعنی پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ کتاب الہی پر عمل کرو اور خارجی معاون کے معنی میں فرمایا :۔

لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّةً (۱۱-۸۰) اگر مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی۔

چنانچہ بعض نے اس جگہ قوت سے فوجی یا مالی طاقت مراد لی ہے۔ نیز فرمایا :۔

نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ (۲۷-۳۳) ہم بڑے زورآور اور سخت جنگجو ہیں۔

اور قوة بمعنی قدرت الہیہ کے متعلق فرمایا :۔

[1] قاله زهیر بن ابی سلمی فی هجاء بیت من کلب من بنی سلیم فی قصیدة (مطلعها: عفا من آل فاطمة الجواء فیمن فالقوادم فالحساء) راجع اللسان (حصن) و دیوانه ۱۵۹ مع شرح الاعلم الشنتمری و شواهد الکشاف ۲ و مختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۹۵) والبحر المحیط (۵: ۸۳ / ۸: ۱۱۲) والطبری (۲۶-۹۳) والعمدة (۲: ۶۶) فی باب التشکک (۱۶۱) وابن هشام رقم ۵۵ و ۲۳۹ والعجز والعقد الثمین ۷۷ وامالی ابن الشجری (۲: ۳۳۴) (۱: ۲۲۶) والصاحبی ۱۸۹ والمعاهد (۲: ۵۲) والمعانی الکبیر ۵۹۳ والسیوطی ۴۰، ۱۴۱ وفی صنعتة تجاهل العارف انظر قانون البلاغة ۹۵ لم فی ضمن رسائل البلغاء ط ۵ وفی الکشاف القوم الرجال خاصة لانهم القوام بامور النساء قال الله تعالی الرجال قوامون علی النساء ص۳۳ ج۱ قال فی الطبری ۲۶/ ۹۳ : وهو قول الخلیل ۔

إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۵۷-۲۵) بے شک خدا قوی (اور) غالب ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا (۳۳-۲۵) اور خدا طاقت ور اور زبردست ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱-۵۸) خدا ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔

میں قوت کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ قدرت الٰہی اور اس قدرت کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالےٰ نے مخلوق کو عطا کی ہے اور آیت کریمہ۔

وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلٰى قُوَّتِكُمْ (۱۱-۵۲) اور تمہاری طاقت پر طاقت بڑھائے گا۔

میں اللہ تعالےٰ نے ہر ایک کو ان کی استعداد کے مطابق قسما قسم کی قوت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور آیت:۔

ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (۸۱-۲۰) جو صاحب قوت مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا۔

میں ذِي قُوَّةٍ سے حضرت جبرئیلؑ مراد ہیں اور اسے لفظ مفرد اور نکرہ کے ساتھ ذی قُوَّةٍ کہنے سے اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ مَلَأِ اعلیٰ کے لحاظ سے اس کی قوت کم درجہ کی ہے۔ اور پھر آیت کریمہ:۔

عَلَّمَهُ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵۳-۵) ان کو نہایت قوت والے نے سکھلایا۔

میں ان کو جمع معرف بلام الجنس کے ساتھ متصف کر کے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ عالم سفلی اور اہل دنیا کے لحاظ جنہیں وہ تعلیم دیتا ہے وہ بہت بڑی قوت اور قدرت عظیمہ کا مالک ہے۔

قوت بمعنی استعداد وصلاحیت عام طور پر علمائے فلاسفہ استعمال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص میں صلاحیت موجود ہو لیکن وہ بالفعل اسے استعمال نہ کر رہا ہو جیسے فُلَانٌ كَاتِبٌ بِالْقُوَّةِ (فلاں کاتب بالقوہ ہے) یعنی وہ لکھنا تو جانتا ہے لیکن اس وقت بالفعل لکھنے میں مشغول نہیں ہے اور دوسرے معنی فُلَانٌ كَاتِبٌ بِالْقُوَّةِ کے یہ ہوتے ہیں کہ اس میں کتابت سیکھنے کی صلاحیت ہے۔ نہ کہ وہ فن کتابت جانتا ہے۔

مَفَازَةٌ یعنی ریگستان کو قَوَاءٌ کہا جاتا ہے اور أَقْوَى الرَّجُلُ کے معنی کسی آدمی کے قواء یعنی بیابان میں چلے جانے کے ہیں۔ پھر قفر یعنی بیابان سے فقر کا معنی لے کر أَقْوَى الرَّجُلُ کا محاورہ افتقر یعنی محتاج اور نادار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ[1] (۵۶-۷۳) اور محتاج اور ضرورتمندوں کے لیے سامان آسا آسائش بنایا ہے۔ میں مُقْوِيْنَ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے

(ق ی ض)

القیض کے معنی انڈے کے اوپر کا چھلکا کے ہیں اور چھلکا چونکہ اس کے باقی ماندہ اجزاء پر محیط اور مستولی ہوتا ہے لہٰذا اس سے قَيَّضَ (فعل) کسی چیز پر غالب اور مستولی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

---

[1] أقوی من الاضداد (ابو الطیب ۵۷۶) ویحتمل ان یکون من اقوی الرجل اذا حصل فی القواء (الی المفازة) ۲ه۔

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ اور ہم نے شیطانوں کو ہم نشین مقرر کر دیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا (۴۳-۳۶) اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کر لے (یعنی تغافل کرے) ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔

پس نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سے الگ ہو جاتے ہیں تاکہ شیطان اس پر اس طرح مسلط ہو جائے، جیسے انڈے کا اوپر کا چھلکا اپنے مافیہا پر مستولی رہتا ہے۔

(ق ی ع)

اَلْقِيْعَةُ۔ ہموار میدان۔ قرآن میں ہے:۔ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ (۲۴-۳۹) جیسے میدان میں ریت۔ اَلْقِيْعُ وَالْقَاعُ کے معنی ہموار زمین کے ہیں۔ اس کی جمع قِيْعَانٌ اور تصغیر قُوَيْعٌ آتی ہے اور اسی سے قَاعَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی نر اونٹ کے ناقہ کے ساتھ جفتی کرنے (اور پوری طرح سوار ہو کر اس پر بیٹھ جانے) کے ہیں۔

(ق ی ل)

اَلْمَقِيْلُ۔ مقام استراحت چنانچہ آیت کریمہ:۔ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا (۲۵-۲۴) اس دن اہل جنت کا ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا۔

میں مَقِيْلًا قِلْتُ قَيْلُوْلَةً[1] کا مصدر ہے جس کے معنی دوپہر کے وقت استراحت کے لئے لیٹنے کے ہیں اور یا ظرف مکان ہے یعنی قیلولہ کی جگہ۔ محاورہ ہے قِلْتُهٗ فِي الْبَيْعِ وَاَقَلْتُهٗ وَتَقَايَلَا بیع فسخ کرنا۔

---

[1] القیلولۃ وزنہ فیعلولۃ ویختص بذوات الیاء مثل سار سیرورۃ وعاد حیدودۃ الاربعۃ احرف من ذوات الواو وہی: کینونۃ و دیمومۃ وھیعوعۃ وسیدودۃ راجع ادب الکاتب ۴۹۶ ومن القیلولۃ قولہ تعالیٰ: اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ (۷-۴) ❖ ❖ ❖

کِتَابُ الْکَافِ

(ک) (حرف)

اَلْکَاف۔ حروف ہجا سے ہے اور تشبیہ یا تمثیل کے معنی ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ (۲-۲۶۴) تو اس (کے مال) کی مثال اس چٹان کی سی ہے۔ جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو۔

اور آیت کریمہ:۔

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ (۲-۲۶۴) اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے۔

میں کاف تشبیہ کے لئے نہیں ہے بلکہ تمثیل کے معنی پر محمول ہے۔ جیسا کہ علماء نحو کہتے ہیں فَالْاِسْمُ كَقَوْلِكَ زَيْدٌ یعنی اسم کی مثال جیسے زید تو یہاں بھی کاف تمثیل کے لئے ہے۔ پھر تمثیل، تشبیہ سے عام ہے۔ کیونکہ ہر تمثیل کو تشبیہ کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تشبیہ تمثیل نہیں ہو سکتی[1]۔

(ک ء س)

اَلْکَاْسُ۔ پینے کا برتن جب کہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو۔ قرآن میں ہے:۔

مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا (۷۶-۵) اور ایسی شراب نوش جان کریں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔

اور کبھی اس کا اطلاق خالی پیالہ یا صرف پینے کی چیز پر ہوتا ہے۔ مثلاً۔

شَرِبْتُ كَاْسًا۔ میں نے شراب کا پیالہ پیا۔

كَاْسٌ طَيِّبَةٌ عمدہ شراب۔ قرآن میں ہے:۔

وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ (۵۶-۱۸) اور صاف شراب کے گلاس۔

كَاْسَتِ النَّاقَةُ تَكُوْسُ۔ اونٹنی کا تین پاؤں پر چلنا اور اَلْكَيْسُ کے معنی دانائی اور زیرکی کے ہیں اور اَكْاَسَ الرَّجُلُ وَاَكْيَسَ کے معنی غَدْرٌ یعنی بد عہدی بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں زیرکی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور یا اس لئے کہ کیسان نامی ایک شخص تھا جو بے وفائی میں ضرب المثل تھا پھر ہر غدار کو کیسان کہا جانے لگا۔ جیسا کہ ھَالِکِیٌّ اصل میں ایک مشہور آہنگر کا نام تھا پھر ہر حدّاد یعنی آہنگر پر ھالکیٌّ کا لفظ بولا جانے لگا ہے۔

(ک ب ب)

اَلْكَبُّ (ن) کے معنی کسی کو منہ کے بل گرانے

---

[1] التشبیہ یکون بین المفردات والتمثیل عام ای بین المفردات والمرکبات (البیضاوی)۔

کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ (۲۷-۹۰) تو ایسے لوگ اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔
اَلْاِکْبَابُ۔ کسی چیز پر منہ کے بل گر جانا اور کنایہ از ہمہ تن مشغول شدن درکارے! اسی سے قرآن میں ہے:۔
اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖ اَهْدٰى (۶۷-۲۲) بھلا جو شخص چلتا ہوا منہ کے بل گر گر پڑتا ہو۔ وہ سیدھے رستے پر ہے۔ یعنی جو غلط روش پہ چلتا ہو۔
اَلْكَبْكَبَةُ۔ کسی چیز کو اوپر سے لڑھکا کر گڑھے میں پھینک دینا۔ قرآن میں ہے:۔
فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ (۲۶-۹۴) تو وہ اور گمراہ (یعنی بت اور بت پرست) اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔
كَبَّ وَكَبْكَبَ (ثلاثی و رباعی) دونوں طرح آتا ہے۔ مثل كَفَّ وَكَفْكَفَ وَصَرَّ الرِّيْحُ وَصَرْصَرَ
اَلْكَوَاكِبُ ظاہر ہونے والے ستارے، ستاروں کو کواکب اسی وقت کہا جاتا۔۔۔۔ جب نمودار اور ظاہر ہوں۔ قرآن میں ہے۔
فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا (۶-۷۶) (یعنی) جب رات نے ان کو (پردۂ تاریکی سے) ڈھانپ لیا (تو آسمان میں) ایک ستارہ نظر پڑا۔
كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ (۲۴-۳۵) گویا وہ موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔
اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ (۳۷-۶) بے شک ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا۔
وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۸۲-۲) اور جب (آسمان کے) ستارے جھڑ پڑیں گے۔
محاورہ ہے۔ ذَهَبُوْا تَحْتَ كُلِّ كَوْكَبٍ وہ منتشر ہو گئے۔ كَوْكَبُ الْعَسْكَرِ لشکر میں اسلحہ کی چمک

(ک ب ت)

اَلْكَبْتُ (ض) کسی کو سختی اور ذلت کے ساتھ واپس کر دینا۔ قرآن میں ہے:۔
كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵۸-۵) وہ اسی طرح ذلیل کئے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے لوگ ذلیل کئے گئے تھے۔
لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ (۳-۲۷) (یہ خدا نے اس لئے کیا) کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک یا انہیں ذلیل و مغلوب کر دے کہ (جیسے آئے تھے ویسے ہی) ناکام واپس جائیں۔

(ک ب د)

اَلْكَبِدُ جگر کو کہتے ہیں اور اَلْكُبَادُ والْكَبَادُ کے معنی درد جگر کے ہیں۔ اور اَلْكَبْدُ (مصدر) کے معنی جگر پر مارنے کے ہیں اس سے كَبَدْتُ الرَّجُلَ (ض) کا محاورہ ہے۔ یعنی جگر پر مارنا۔ پھر انسان کا جگر چونکہ وسط جسم میں ہوتا ہے اس لئے تشبیہ کے طور پر وسط آسمان کو كَبِدُ السَّمَآءِ کہا جاتا ہے۔
تَكَبَّدَتِ الشَّمْسُ (آفتاب کا وسط آسمان میں پہنچنا) نیز اَلْكَبَدُ کے معنی مشقت بھی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ (۹۰-۴) کہ ہم نے انسان کو تکلیف (کی حالت) میں (رہنے والا) بنایا ہے۔

میں متنبہ کیا ہے کہ انسان کی ساخت ہی اللہ تعالیٰ نے کچھ اس قسم کی بنائی ہے کہ جب تک (دین کی) گھاٹی پر ہو کر نہ گزرے وہ نہ تو رنج و مشقت سے نجات پا سکتا ہے۔ اور نہ ہی اسے (حقیقی) چین نصیب ہو سکتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴ - ۱۹) کہ تم درجہ بدرجہ (رتبہ اعلیٰ پر) چڑھو گے۔

(ك ب ر)

کبیر اور صغیر اسمائے اضافیہ سے ہیں۔ جن کے معانی ایک دوسرے کے لحاظ سے متعین ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی چیز دوسری کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے۔ لیکن وہی شئے ایک اور کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے۔ اور قلیل وکثیر کی طرح کبھی تو ان کا استعمال کمیت متصلہ یعنی اجسام میں ہوتا ہے۔ اور کبھی کمیتہ منفصلہ یعنی عدد میں۔ اور بعض اوقات کثیر اور کبیر دو مختلف جہتوں کے لحاظ سے ایک ہی چیز پر بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا :۔

قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ (۲ - ۲۱۹) کہدو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں۔

کہ اس میں ایک قراءت كَثِيرٌ بھی ہے۔

یہ اصل وضع کے لحاظ سے تو اعیان میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن استعارہ کے طور پر معانی پر بھی بولے جاتے ہیں چنانچہ فرمایا :۔

لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا (۱۸ - ۴۹) کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے۔ اور نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے گن رکھا ہے۔

وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ (۱۰ - ۶۱) اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے یا بڑی۔

اور آیت کریمہ :۔ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ (۹ - ۳) (اور حج اکبر کے دن .... میں حج کو اکبر کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ عمرۃ حج اصغر ہے۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے۔

اَلْعُمْرَةُ هِيَ الْحَجُّ الْأَصْغَرُ کہ عمرہ حج اصغر ہے۔ اور کبھی بڑائی بلحاظ زمانہ مراد ہوتی ہے چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ كَبِيرٌ کہ فلاں سن رسیدہ ہے اور قرآن میں ہے :۔

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا (۱۷ - ۲۳) اگر ان میں سے ایک تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔

وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ (۲ - ۲۶۶) اور اسے بڑھاپا آپکڑے۔

وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ (۳ - ۴۰) کہ میں تو بڈھا ہو گیا ہوں۔

اور کبھی بڑائی بلحاظ مرتبہ اور رفعت کے ملحوظ ہوتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے :۔

قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ (۶ - ۱۹) ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت ہے۔ کہہ دو کہ خدا ہی مجھ میں اور تم میں گواہ ہے۔

الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ (۱۳ - ۹) سب سے بزرگ (اور) عالی رتبہ ہے۔

اور آیت :۔

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَهُمْ (۲۱ - ۵۸) پھر ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا مگر ایک بڑے (بت) کو (نہ توڑا) میں صنم کو کبیر کہنا اس کی حقیقی قدر و منزلت

کے لحاظ سے نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اعتقاد کی بنیاد پر ہے۔ اور آیت:۔

بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا (۲۱-۶۳) بلکہ یہ انکے بڑے بت نے کیا (ہو گا) بھی اس معنی پر محمول ہے۔ اور آیت:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا (۶-۱۲۴) اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کئے۔

میں اکابر سے وہاں کے رؤسا مراد ہیں اسیطرح آیت۔

اِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (۲۰-۷۱) بے شک وہ تمہارا بڑا (یعنی استاد) ہے جس نے تم کو جادو سکھایا۔

میں بھی کبیر بمعنی رئیس ہی ہے۔ اور اس معنی میں مشہور محاورہ ہے۔ وَرِثَهُ كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ یعنی یہ چیز اسے بلند مرتبہ آباؤ اجداد سے ورثہ میں حاصل ہوئی ہے۔

اَلْكَبِيرَةُ۔ عرف میں اس گناہ کو کہتے ہیں جس کی سزا بڑی سخت ہو۔ اس کی جمع اَلْكَبَائِرُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

اَلَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳-۳۲) جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

اور آیت۔ اِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ (۴-۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے، اجتناب رکھو۔

میں بعض نے کہا ہے۔ کہ کبائر سے مراد شرک ہے۔ کیونکہ دوسری آیت:۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (۳۱-۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔

میں شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کبائر کا لفظ۔ شرک اور تمام مہلک گناہوں کو شامل ہے۔ جیسے زنا اور کسی جان کا ناحق قتل کرنا جیسا کہ فرمایا:۔

اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيرًا (۱۷-۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت گناہ ہے۔

قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲-۲۱۹) کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کے نقصان فائدوں سے زیادہ ہیں۔

اور کبیرۃ اس عمل کو بھی کہتے ہیں جس میں مشقت اور صعوبت ہو۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (۲-۴۵) بے شک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جو عجز کرنے والے ہیں۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ اِلَيْهِ (۴۲-۱۳) جس چیز کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو وہ ان کو دشوار گزرتی ہے۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ (۶-۳۵) اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے

اور آیت:۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً (۱۸-۵) (یہ) بڑی بات ہے۔ میں اس گناہ کے دوسرے گناہوں سے بڑا اور اس کی سزا کے سخت ہونے پر تنبیہ پائی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے (۶۱-۳۵) اور آیت:۔

وَالَّذِي تَوَلّٰى كِبْرَهُ (۲۴-۱۱) اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا۔

میں تَوَلّٰى كِبْرَهُ سے مراد وہ شخص ہے جس

نے انک کا شاخسانہ کھڑا کیا تھا اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص کسی برے طریقے کی بنیاد ڈالے اور لوگ اس پر عمل کریں تو وہ سب سے بڑھ کر گنہگار ہوگا۔ اور آیت:۔

اِلَّا کِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ (۴۰-۵۶) (ارادہ) عظمت ہے اور اس کو پہنچنے والے نہیں۔

میں کِبْرٌ کے معنی بھی تکبر ہی کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر بڑا امر مراد ہے۔ اور یہ کبر بمعنی پیرانہ سالی سے ماخوذ ہے جیسا کہ آیت:۔ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ میں ہے۔ اور اَلْکِبْرُ وَالتَّکَبُّرُ وَالْاِسْتِکْبَارُ کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں پس کبر وہ حالت ہے جس کے سبب سے انسان عُجب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور عُجب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرے اور سب سے بڑا[1] تکبر قبول حق سے انکار اور عبادت سے انحراف کر کے اللہ تعالیٰ پر تکبر کرنا ہے۔

اَلْاِسْتِکْبَارُ (استفعال) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کا قصد کرے۔ اور یہ بات اگر منشائے شریعت کے مطابق اور بر محل ہو اور پھر ایسے موقع پر ہو جس پر تکبر کرنا انسان کو سزاوار ہے تو محمود ہے۔ دوم یہ کہ انسان جھوٹ موٹ بڑائی کا اظہار کرے اور ایسے اوصاف کو اپنی طرف منسوب کرے جو اس میں موجود نہ ہوں۔ یہ مذموم ہے۔ اور قرآن میں یہی دوسرا معنی مراد ہے۔ فرمایا:۔

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ (۲-۳۴) مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آگیا۔

اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ (۲-۸۷) تو جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آئے۔ جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا۔ تم سرکش ہو جاتے رہے۔

وَاَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوا اسْتِکْبَارًا (۷۱-۷) اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

اِسْتِکْبَارًا فِی الْاَرْضِ (۳۵-۴۳) (یعنی انہوں نے ملک میں غرور کرنا۔

فَاسْتَکْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ (۲۹-۳۹) تو وہ ملک میں مغرور ہو گئے۔

تَسْتَکْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۴۶-۲۰) کہ تم زمین میں ناحق غرور کیا کرتے تھے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا (۷-۴۰) جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے سرتابی کی۔

مَاۤ اَغْنٰی عَنْکُمْ جَمْعُکُمْ وَمَا کُنْتُمْ تَسْتَکْبِرُوْنَ (۷-۴۸) (آج) نہ تو تمہاری جماعت ہی تمہارے کسی کام آئی۔ اور نہ ہی تمہارا تکبر سود مند ہوا۔

اور آیت کریمہ:۔

فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا (۱۴-۲۱) تو ادنیٰ درجے کے لوگ بڑے آدمیوں سے کہیں گے۔ میں متکبرین کے مقابلہ میں ضعفاء کا لفظ لانے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ان کا استکبار بدنی اور مالی قوت کے حاصل ہونے کی وجہ سے تھا۔ اسی طرح آیت:۔

---

[1] وفی الحدیث الکبر ان تسفه الحق وتغمص الناس (رواہ البخاری فی الادب المفرد) عن روایة عبد اللہ بن عمرو بن العاص وقال علماء الاخلاق الکبر یکون بالمنزلة الرفیعة والعجب یکون بالفضیلة الماوردی لشرحه منهاج الیقین ۲۹۷ ۞ ۞ ۞ ۞

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا (۷-۷۵) تو ان کی قوم کے سردار لوگ جو غرور رکھتے تھے غریب لوگوں سے کہنے لگے۔ ......

میں بھی متکبرین مستضعفین کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ اور آیت:۔

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ (۱۰-۷۵) تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ گنہگار لوگ تھے۔

میں لفظ فَاسْتَكْبَرُوْا سے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے قبول حق کے سلسلہ میں تکبر، خودپسندی اور نخوت سے کام لیا اور پھر وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ان کے سابقہ جرائم نے ہی انہیں تکبر پر اکسایا تھا۔ اور یہ تکبر ان کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ اور فرمایا:۔

فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶-۲۲) تو جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کر رہے ہیں۔ اور وہ سرکش ہو رہے ہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا۔

اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ (۱۶-۲۳) وہ (خدا) سرکشوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اَلْمُتَكَبِّرُ اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ فی الحقیقت کسی کے افعال حسنہ زیادہ ہوں اور وہ ان میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہو اسی معنی میں اللہ تعالیٰ صفت تکبر کے ساتھ متصف ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (۵۹-۲۳) غالب زبردست بڑائی۔

دوم یہ کہ کوئی شخص صفات کمال کا ادعا کرے لیکن فی الواقع وہ صفات حسنہ سے عاری ہو اس معنی کے لحاظ سے یہ انسان کی صفت بن کر استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ (۴۰-۷۶) متکبروں کا کیا برا ٹھکانا ہے۔

كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰-۳۵) اسی طرح خدا ہر سرکش متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

تو معنی اول کے لحاظ سے یہ صفات محمودہ میں داخل ہے اور معنی ثانی کے لحاظ سے صفت ذم ہے اور کبھی انسان کے لئے تکبر کرنا مذموم نہیں ہوتا جیسا کہ آیت:۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۷-۱۴۶) جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبر بغیر الحق نہ ہو تو مذموم نہیں ہے۔ اور آیت:۔

عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۳۵-۴۰) ہر متکبر جابر کے دل پر۔ میں لفظ قلب متکبر کی طرف مضاف ہے۔ اور بعض نے قلب تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں متکبر قلب کی صفت ہوگا۔

اَلْكِبْرِیَاءُ اطاعت کیشی کے درجہ سے اپنے آپ کو بلند سمجھنے کا نام کبریاء ہے۔ اور یہ استحقاق صرف ذات باری تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَلَهُ الْكِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۵-۳۷)

اور آسمانوں اور زمینوں میں اس کیلئے بڑائی ہے۔
اور اس کا ثبوت اس حدیث قدسی سے بھی ملتا ہے۔ جس میں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں[1]۔ (۹۰)
اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظْمَۃُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا قَصَمْتُہٗ کہ کبریا میری رداء ہے اور عظمت ازار ہے۔ جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک میں میرے ساتھ مزاحم ہوگا۔ تو میں اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔ اور قرآن میں ہے:۔
قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا وَتَکُوْنَ لَکُمَا الْکِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ (۱۰-۷۸) وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ جس (راہ) پر ہم اپنے باپ دادوں کو پاتے رہے ہیں اس سے ہم کو پھیر دو اور اس ملک میں تم دونوں ہی کی سرداری ہو جائے۔
اَکْبَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو بڑا خیال کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَلَمَّا رَاَیْنَہٗٓ اَکْبَرْنَہٗ (۱۲-۳۱) جب عورتوں نے ان کو دیکھا تو ان کا رعب ان پر چھا گیا۔
اَلتَّکْبِیْرُ (تفعیل) اس کے ایک معنی تو کسی کو بڑا سمجھنے کے ہیں۔ اور دوم اللہ اکبر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت کو ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی عظمت کا احساس کرنیکے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ (۲-۱۸۵) اور اس احسان کے بدلے کہ خدا نے تم کو ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو۔
وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا (۱۷-۱۱۱) اور اس کو بڑا جان کر اس کی بڑائی کرتے رہو۔ اور آیت:۔
لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۰-۵۷) آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔
میں اَکْبَرُ کے لفظ سے قدرت الٰہی کی کاریگری اور حکمت کے ان عجائب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جو آسمان اور زمین کی خلق میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کو کہ وہ خاص لوگ ہی جان سکتے ہیں۔ جن کی وصف میں فرمایا:۔
وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳-۱۹۱) اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔
ورنہ ان کی ظاہری عظمت کو تو عوام الناس بھی سمجھتے ہیں (اس لئے یہ معنی یہاں مراد نہیں ہیں) اور آیت:۔ یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَۃَ الْکُبْرٰی (۴۴-۱۶) جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔ میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ روز قیامت سے پہلے دنیا یا عالم برزخ میں کافر کو جس قدر بھی عذاب ہوتا ہے عذاب آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔
اَلْکُبَّارُ اس میں کبیر کے لفظ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اور کُبَّار (بتشدید باء) اس سے بھی

---

[1] الحدیث ذکرہ السیوطی فی الدر (۶: ۳۰) وابن کثیر (۴: ۱۵۳) وفی روایۃ ابی داؤد قذفتہ فی النار وفی روایۃ مسلم عن ابی ہریرۃ وابی سعید القیتہ فی النار وعذبتہ انظر للحدیث وتخریجہ باختلاف الالفاظ کنز العمال ج ۳ رقم ۲۶۱۳-۲۶۱۶ عن علی وابی ہریرۃ وابن عباس وابی سعید وتخریج الکشاف للحافظ رقم ۱۴۰ وتخریج الاحیاء للعراقی ۳ / ۳۴۳ وتشدید ابن حبان رقم ۹۴ ومنہاج الیقین شرح ادب الدنیا والدین وادیس وقا الارزنجانی ۳۹۷ ۔

زیادہ بلیغ ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا۔ (۷۱-۲۲) اور وہ بڑی بڑی چالیں چلے۔

(ک ت ب)

اَلْكَتْبُ۔ کے اصل معنی کھال کے دو ٹکڑوں کو ملا کر سی دینے کے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے كَتَبْتُ السِّقَاءَ "میں نے مشکیزہ کو سی دیا" كَتَبْتُ الْبَغْلَةَ میں نے خچری کی شرمگاہ کے دونوں کنارے بند کر کے ان پر (لوہے) کا حلقہ چڑھا دیا" عرف میں اس کے معنی حروف کو تحریر کے ذریعہ باہم ملا دینے کے ہیں مگر کبھی ان حروف کو تلفظ کے ذریعہ باہم ملا دینے پر بھی بولا جاتا ہے الغرض کتابۃ کے اصل معنی تو تحریر کے ذریعہ حروف کو باہم ملا دینے کے ہیں مگر بطور استعارہ کبھی معنی تحریر اور کبھی بمعنی تلفظ استعمال ہوتا ہے اس بنا پر کلام الٰہی کو کتاب کہا گیا ہے گو (اس وقت) قید تحریر میں نہیں لائی گئی تھی۔ قرآن میں ہے:۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲-۱) یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں۔

اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ (۱۹-۳۰) میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے۔

اَلْكِتَابُ اصل میں مصدر ہے اور پھر مکتوب فیہ (یعنی جس چیز میں کچھ لکھا گیا ہو) کو کتاب کہا جانے لگا ہے دراصل اَلْكِتَابُ اس صحیفہ کو کہتے ہیں جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔ چنانچہ آیت:۔

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (۴-۱۵۳) (اے محمدؐ) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں کہ تم ان پر ایک لکھی ہوئی کتاب آسمان سے اتار لاؤ۔ میں "کتاب" سے وہ صحیفہ مراد ہے جس میں کچھ لکھا ہوا ہو اسی لئے دوسری جگہ فرمایا:۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِىْ قِرْطَاسٍ۔۔۔۔۔ (۶-۷) اور اگر ہم تم پر کاغذوں پر لکھی ہوئی کتاب نازل کرتے۔

نیز کسی چیز کے ثابت کر دینے "اندازہ کرنے، فرض یا واجب کر دینے اور عزم کرنے کو كِتَابَة سے تعبیر کر لیتے ہیں اس لئے کہ پہلے پہل تو کسی چیز کے متعلق دل میں خیال پیدا ہوتا ہے پھر زبان سے ادا کی جاتی ہے اور آخر میں لکھ لی جاتی ہے لہٰذا ارادہ کی حیثیت مبدأ اور کتابت کی حیثیت منتہیٰ کی ہے پھر جس چیز کا ابھی ارادہ کیا گیا ہو تاکید کے طور پر اسے كَتَبَ سے تعبیر کر لیتے ہیں جو کہ دراصل ارادہ کا منتہیٰ ہے۔۔۔۔ چنانچہ فرمایا:۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ (۵۸-۲۱) خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا۔ (۹-۵۱) کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ جو خدا نے ہمارے لئے مقدر کر دی ہے۔

لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ (۳-۱۵۴) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا۔ وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔ اور آیت:۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ (۸-۷۵) اور رشتے دار خدا کے حکم کی رو سے ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ میں کتاب اللہ سے مراد قانون خداوندی ہے اور آیت:۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (۵-۴۵) اور ہم نے ان لوگوں کے لئے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا۔ کہ جان کے بدلے جان۔
میں كَتَبْنَا بمعنی اَوْحَيْنَا وَ فَرَضْنَا ہے یعنی ہم نے وحی بھیجی یا فرض کر دیا اور اسی معنی میں فرمایا۔
كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (۲-۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے۔
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲-۱۸۳) مومنو تم پر روزے فرض کئے گئے۔
لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ (۴-۷۷) تو نے ہم پر جہاد (جلد) کیوں فرض کر دیا۔
مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (۵-۲۷)، ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور آیت:۔
وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ (۵۹-۳) اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلا وطن کرنا نہ لکھ رکھا ہوتا۔
کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے گھروں کو چھوڑنا ان پر ضروری نہ کیا ہوتا (تو ان کو کوئی دوسری سزا دی جاتی)، اور کبھی کتابت سے تقدیر حتمی یا حتمی کی مثل مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ آیت:۔
بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (۴۳-۸۰) ہاں ہاں (سب سنتے ہیں) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔
میں بعض نے تقدیر کے نویسندے مراد لئے ہیں اور بعض نے کہا ہے۔ کہ آیت:۔
يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ (۱۳-۳۹) میں بھی تقدیر کی دونوں قسم مراد ہیں اور آیت:۔
أُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ (۵۸-۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔
میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت ان کفار کے برعکس ہے۔ جن کے متعلق ارشاد ہے:۔
وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اس کا اس کا کہنا نہ ماننا۔
کیونکہ أَغْفَلْنَا کا لفظ أَغْفَلْتُ الْكِتَابَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کتاب کو مہمل یعنی اعراب و نقاط سے معرّی چھوڑ دینا کے ہیں۔ اور آیت:۔
فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ (۲۱-۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔ اور ہم اس کے لئے (ثواب اعمال) لکھ رہے ہیں۔
میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعمال کو ثابت رکھا جا رہا ہے اور ان کی ضرور ہی جزا دی جائے گی۔ اور آیت:۔
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (۳-۵۳) تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ رکھ۔
کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ان کے زمرہ میں داخل فرما۔
اور یہ آیت کریمہ:۔
فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۴-۶۹) وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ جن پر خدا نے بڑا فضل کیا۔
کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت:۔
وَمَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا (۱۸-۴۹) ہائے شامت یہ کیسی کتاب ہے نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے

اور نہ بڑی کو ر کوئی بات بھی نہیں۔ مگر اسے لکھ
رکھا ہے۔ میں اَلْکِتَاب سے لوگوں کے اعمال
نامے مراد ہیں اور آیت کریمہ:۔
اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا (۵۷-۲۲)
مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک
کتاب میں (لکھی ہوئی ہے)۔
میں بعض نے کہا ہے کہ "کتاب" سے لوح محفوظ
کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔
اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ کِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ
(۲۲-۷۰) یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے
شک یہ سب خدا کو آسان ہے۔
وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ۔
(۶-۵۹) کوئی تر یا خشک چیز نہیں۔ مگر کتاب
روشن میں لکھی ہوئی ہے۔
فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۱۷-۵۸) یہ کتاب
(یعنی تقدیر میں) لکھا جا چکا ہے۔ اور آیت:۔
لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ (۸-۶۸) اگر خدا کا
حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا۔
کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ بات حکمت الٰہی میں مقدر
نہ ہو چکی ہوتی لہٰذا یہ آیت:۔
کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶-۵۴) خدا
نے اپنی ذات پاک پر رحمت کو لازم کر لیا کیطرف
اشارہ ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ:۔
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ (۸-۳۳)
اور خدا ایسا نہ تھا۔ کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں
عذاب دیتا۔ کی طرف اشارہ ہے اور آیت:۔
قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (۹-۵۱)
کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز
اس کے جو خدا نے ہمارے لئے لکھ دی ہو۔
میں کَتَبَ کے معنی مقدر اور فیصلہ کرنا کے ہیں اور
یہاں عَلَیْنَا کی بجائے لَنَا کہنے سے اس بات پر
تنبیہ ہے کہ جو مصیبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف
سے ہمیں پہنچتی ہے اسے ہم اپنے لئے نعمت
سمجھتے ہیں۔ اور نقمت خیال نہیں کرتے اور آیت:۔
اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰهُ
لَکُمْ (۵-۲۱) (تو بھائیو) تم ارض مقدس (یعنی
ملک شام) جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ رکھا ہے
چل داخل ہو۔ میں بعض نے کَتَبَ اللّٰهُ کے
معنی وَهَبَهَا لَکُمْ کئے ہیں یعنی جو کہ اللہ تعالیٰ
نے تمہیں عطا کی تھی۔ اور پھر تمہارے وہاں نہ
جانے اور اس عطا الٰہی کو قبول نہ کرنے کے باعث
اللہ تعالیٰ نے وہ زمین ان پر حرام کر دی۔ اور بعض
نے کہا ہے کہ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ کے معنی یہ ہیں۔ کہ
اللہ تعالیٰ نے تمہارے حق میں اس کا فیصلہ
کر دیا تھا بشرطیکہ تم وہاں چلے جاتے اور بعض
نے کتب کے معنی اَوْجَبَ کئے ہیں یعنی اللہ
تعالیٰ نے وہاں چلے جانا تم پر واجب کر دیا تھا
اور پھر عَلَیْکُمْ کی بجائے لَکُمْ اس لئے کہا ہے
کہ وہاں چلے جانے میں ان کے دنیوی اور اخروی
دونوں قسم کے فوائد مضمر تھے اس لئے وہاں چلے
جانا لَکُمْ ہوگا نہ کہ عَلَیْکُمْ جیسا کہ مثلاً کوئی
شخص کسی بات کو نقصان دہ خیال کرتا ہو مگر آل
کے اعتبار سے جو فوائد اس میں پنہاں ہیں اس سے
غافل اور بے خبر ہو تو اس سے کہا جائے گا نَفْعُنَا
الْکَلَامُ لَكَ لَا عَلَیْكَ (یعنی اس میں تمہارا
فائدہ ہے نہ کہ نقصان اور آیت:۔
وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِیْمَانَ لَقَدْ
لَبِثْتُمْ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى یَوْمِ الْبَعْثِ (۳۰-۵۶)

اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا۔ وہ کہیں گے خدا کی کتاب کے مطابق تم قیامت تک رہے ہو گے۔ میں کتاب اللہ سے اللہ کا حکم، فیصلہ اور علم مراد ہے۔ اور یہی معنی آیت:۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳-۳۸) ہر حکم، (قضا کتاب میں) مرقوم ہے۔ کے ہیں۔ اور آیت:۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (۹-۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں یعنی ... کتاب خدا میں۔ میں کتاب اللہ کے معنی بھی حکم الٰہی ہی ہیں۔

اور کبھی کتاب سے وہ حجت الٰہی مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہو چکی ہو چنانچہ فرمایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۲۲-۸) اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ۔ یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی۔

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ (۳۷-۱۵۷) تو اپنی حجت پیش کرو۔

اُوْتُوا الْكِتٰبَ (۲-۵۴) جنہیں الکتاب یعنی حجت دی کِتٰبَ اللّٰهِ (۲-۱۰۱) خدا کی کتاب کو۔ اور آیت:۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا (۴۳-۲۱) یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی۔ اور آیت کریمہ:۔

فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (۶۸-۴۷) کہ وہ اسے لکھ لیتے ہیں۔ میں يَكْتُبُوْنَ سے ان کے علم و تحقیق اور عقیدہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت:۔

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (۲-۱۸۷) اور خدا نے جو تمہاری چیز تمہارے لئے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اس کو (خدا سے) طلب کرو۔ میں ایک لطیف نقطہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں نکاح کی خواہش اس لئے رکھی ہے کہ وہ اس سے طلب نسل کرے جو نوع انسانی کے بقاء کا موجب ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ وہ نکاح سے اسی چیز کا قصد کرے جو کہ عقل و دیانت کے تقاضا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے۔ یعنی حفظ نسل اور عفت نفس اور بعض نے جو یہ لکھا ہے کہ مَا كَتَبَ اللّٰهُ سے مراد اولاد ہے۔ تو انہوں نے بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور کبھی کتابت سے کسی چیز کا وجود میں لانا۔ اور محو سے کسی چیز کا زائل اور فنا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ آیت:۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ. يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ (۱۳-۳۸، ۳۹) میں تنبیہ ہے کہ کائنات میں ہر لمحہ ایجاد ہوتی رہتی ہے اور ذات باری تعالیٰ مقتضائے حکمت کے مطابق اشیاء کو وجود میں لاتی اور فنا کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس آیت کا وہی مفہوم ہے۔ جو کہ آیت كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (۵۵-۲۹) وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔ اور آیت (۱۳-۳۹) میں وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (اور اس کے پاس اصل کتاب ہے) کا ہے اور آیت:۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ (۳-۱۷۷) اور ان (اہل کتاب) میں سے بعض ایسے ہیں کہ کتاب کو زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں کتاب (تورات) میں سے ہے۔ حالانکہ وہ (کسی سماوی) کتاب سے نہیں ہوتا۔ میں (لفظ

الکتاب تین مرتبہ آیا ہے چنانچہ پہلی جگہ الکتاب
سے وہ جھوٹی تحریریں مراد ہیں جن کا تذکرہ آیت:۔
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ
(۲-۷۹) میں کیا گیا ہے۔ اور دوسری الکتاب
سے توراۃ مراد ہے اور تیسری الکتاب میں الف
لام جنس کا ہے اور اس سے ہر آسمانی کتاب
اور کلام الٰہی مراد ہو سکتی ہے پس آیت کے
معنی یہ ہیں کہ وہ حکم نہ تو کسی آسمانی کتاب میں
موجود ہے اور نہ ہی کلام الٰہی ہو سکتا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ (۲-۵۳)
اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت
کئے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کتاب اور
فرقان دونوں سے توراۃ مراد ہے اس لحاظ سے
کہ توراۃ میں احکام الٰہی ثبت ہیں اسے الکتاب
کہا گیا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس میں حق کو باطل
سے جدا کرنے والے احکام مذکور ہیں اسے الفرقان
کہا گیا ہے اور آیت:۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ
تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (۳-۱۴۵)
اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے
بغیر مر جائے (اس نے موت کا) وقت مقرر کر کے
لکھ رکھا ہے۔ میں كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا سے حکم الٰہی
مراد ہے۔ چنانچہ آیات لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ
لَمَسَّكُمْ (۸-۶۸) (اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا
ہوتا تو ۔۔۔۔۔ تم پر ۔۔۔۔۔ نازل ہوتا)
اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا
فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ میں کتاب سے مراد حکم ہی ہے۔
اور آیت:۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ
بِاَيْدِيْهِمْ (۲-۷۹) تو ان لوگوں پر افسوس ہے
ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں۔
میں تنبیہ کی ہے کہ از خود جھوٹی باتیں گھڑ کر لکھ
لیتے ہیں۔ اور یہاں جھوٹی تحریروں کو ان کے
ہاتھوں کی طرف منسوب کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ
آیت ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ (۹-۳۰) میں ان
کی من گھڑت باتوں کو ان کے مونہوں کی طرف
منسوب کیا ہے۔
اَلْاِكْتِتَابُ (افتعال) کا لفظ عموماً جھوٹی اور جعلی
تحریر کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا (۲۵-۵) پہلے
لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے۔
اور قرآن میں جہاں کہیں بھی اہل الکتاب کا لفظ
آیا ہے۔ وہاں الکتاب سے توراۃ انجیل یا دونوں
مراد ہیں۔ اور آیت:۔
وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى اِلٰى قَوْلِهٖ
وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ (۱۰-۳۷) اور یہ قرآن ایسا
نہیں کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے
بنا لائے۔ (وسلان ہی) کتابوں کی (اس میں)
تفصیل ہے۔
میں الکتاب سے قرآن سے پہلے کی تمام کتب
سماویہ مراد ہیں۔ کیونکہ زیر بحث آیت میں قرآن
کو ان کا مصدق ٹھہرایا گیا ہے۔ لہذا وہ خود ان
میں شامل نہیں ہو سکتا اور آیت کریمہ:۔
وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا
(۶-۱۱۴) حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح
المطالب کتاب بھیجی ہے۔
میں بعض نے کہا ہے۔ کہ الکتاب سے مراد
قرآن ہے۔
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ قرآن کے علاوہ

دوسرے دلائل حقہ اور علم وعقل کو بھی شامل ہے۔
اسی طرح آیت :-
فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (۲۹-۴۷)
توجن لوگوں کو ہم نے کتابیں دی تھیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں ۔ میں بھی الکتاب کا مفہوم عام ہے۔ اور آیت :-
قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ (۲۷-۴۰)
ایک شخص جس کو کتاب الہٰی کا علم تھا کہنے لگا ۔ میں بعض نے کہا ہے ۔ کہ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ میں مِن زائدہ ہے اور اس کے معنی علم الکتاب یعنی کتاب کا علم کے ہیں ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ منجملہ ان علوم کے ایک علم مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی خاص کتاب میں عطا فرمائے تھے اور اسی کے ذریعے سے ہر چیز حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع ہو گئی تھی ۔ اور آیت :-
وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتٰبِ کُلِّہٖ (۳-۱۱۹) اور تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔
میں الکتاب سے تمام کتب سماویہ مراد ہیں اور جمع کی بجائے مفرد کا لفظ یا تو اس لئے لایا گیا ہے کہ یہ اسم جنس ہے ۔ جیسا کہ کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ میں اَلنَّاسِ سے جنس درہم مراد ہے ۔ اور یا اس لئے کہ یہ اصل میں عدل کی طرح مصدر ہے (جو مفرد و جمع دونوں کے لئے آتا ہے) جیسا کہ آیت :-
یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (۲-۴) جو کتاب تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں ۔ میں ہے مگر بعض نے کہا ہے کہ الکتاب سے قرآن مراد ہے اور کُلِّہٖ کہہ کر اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہیں ہو ۔ جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :-
وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ (۴-۱۵۰) اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے ۔
کِتَابَۃُ الْعَبْدِ کے معنی غلام کے خود کو اپنے آقا سے اس (مقررہ) مال کے عوض خرید لینے کے ہیں ۔ جو وہ کما کر اسے (بالاقساط) ادا کرے گا ۔ چنانچہ آیت کریمہ :-
وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْھُمْ (۲۴-۳۳) اور جو غلام تم سے مکاتبت چاہیں ۔ . . . تو ان سے مکاتبت کر لو ۔
میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کَاتِبُوْھُمْ کتابت بمعنی ایجاب سے مشتق ہو ۔ اور یہ بھی کہ الکتب بمعنی نظم یعنی تحریر سے ہو کیونکہ ان دونوں کی نسبت انسان کی طرف ہو سکتی ہے ۔

(ک ت م)

کَتَمْتُہٗ (ن) کَتْمًا وَکِتْمَانًا کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں ۔ قرآن میں ہے :-
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ (۲-۱۴۰) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس کتاب اللہ میں موجود ہے ۔ چھپائے ۔
وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ (۲-۱۴۶) مگر ایک فریق ان میں سچی

بات جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ (۲-۲۸۳) اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔

اور آیت کریمہ :۔

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (۴-۳۷) جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) خدا نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں۔

میں کِتْمَانِ فَضْل سے کفرانِ نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا :۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۴-۳۷) اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ :۔

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (۴-۴۲) اور خدا سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو رہے ہیں جو شرک نہیں کرتے تھے۔ تو جھٹ سے پکار اٹھیں گے۔ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (۶-۲۳) خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔ مگر اس کے بعد جب ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ خدا تعالٰے سے کوئی بات نہ چھپائی ہوتی۔

حسن بصریؒ[1] فرماتے ہیں کہ آخرت میں متعدد مواقف ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کوئی بات چھپا نہ سکنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضا ان کے خلاف گواہی دینگے۔

(ک ث ب)

اَلْكَثِيْبُ۔ ریت کا ٹیلہ۔ چنانچہ آیت :۔

وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا (۷۳-۱۴) اور پہاڑ (ایسے بھربھرے گویا) ریت کے ٹیلے ہو جائینگے۔ اور كَثِيْبٌ کی جمع اَكْثِبَةٌ وَكُثُبٌ وَكُثْبَانٌ آتی ہے۔

اور معنی اجتماع کے لحاظ سے دودھ اور کھجور وغیرہ کی تھوڑی سی مقدار کو كُثْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

كَثَبَ (ض) اصل معنی اکٹھا کرنا کے ہیں اور اس سے صفت فاعلی كَاثِبٌ آتی ہے جس کے معنی ہیں "جمع کرنے والا" اور اَلتَّكْثِيْبُ کے معنی شکار کے اپنے آپ پر موقعہ دینے کے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے اَكْثَبَكَ الصَّيْدُ فَارْمِهٖ (کہ شکار تجھ پر آ گیا ہے لہٰذا اسے شکار کر لو) اور یہ كَثْبٌ سے مشتق ہے جس کے معنی قریب ہونے کے ہیں۔

(ک ث ر)

پہلے گزر چکا ہے کہ کثرت اور قلت کمیت منفصلہ یعنی اعداد میں استعمال ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا :۔

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ (۵-۶۸) (اس سے) ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور بڑھیگا۔

---

[1] ابو سعید الحسن البصری من سادات التابعین وامام اہل البصرۃ توفی سنۃ ۱۱۰ھ (شذرات الذہب ۱/۱۳۶ وابن خلکان ۱/۱۶۰) وقد جمع العاجز تراجمہ فی مقالۃ۔

وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُوْنَ (۲۳-۷۰) اور ان میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً (۲-۲۴۹) بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے ..... بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (۴-۱) پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کرکے روئے زمین پر) پھیلا دیئے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ (۲-۱۰۹) بہت سے اہل کتاب ..... یہ چاہتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس بہت سی اس قسم کی آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور آیت:۔

وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ (۵۶-۳۲) اور میوہ ہائے کثیرہ (کے باغوں میں)۔

میں فواکہ جنت کو مطعومات دنیا کے لحاظ سے کثیرہ کہا ہے۔ اور اس سے صرف کثرت عددی ہی مراد نہیں ہے۔ بلکہ کثرت بلحاظ فضیلت بھی مراد ہے۔

اور عَدَدٌ كَثِيْرٌ وَّكُثَارٌ وَّكَاثِرٌ کے معنی کثرت تعداد کے ہیں اور رَجُلٌ كَاثِرٌ مالدار آدمی کو کہتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے[1] (السریع):۔

(۳۶۹) وَلَسْتَ بِالْاَكْثَرِ مِنْهُمْ حَصًى
وَاِنَّمَا الْعِزَّةُ لِلْكَاثِرِ

تم گنتی میں ان سے زیادہ نہیں ہو۔ عزت تو انہی کے لئے ہے جو تعداد میں زیادہ ہوں۔

اَلْمُكَاثَرَةُ وَالتَّكَاثُرُ۔ کے معنی ایک دوسرے سے مال و دولت اور عزت میں بڑھنے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱۰۲-۱) (لوگو) تم کو (مال کی) بہت سی طلب نے غافل کر دیا۔

اور فُلَانٌ مَكْثُوْرٌ کے معنی مَغْلُوْبٌ فِي الْكَثْرَةِ کے ہیں۔

اَلْمِكْثَارُ عرف میں بہت سی باتیں کرنے والے کو کہتے ہیں۔

اَلْكَثَرُ کے معنی ہیں خرما کا گو واجب زیادہ ہو۔ اور بہ سکون ثاء کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ایک روایت میں ہے[2] (۱۹)

لَا قَطْعَ فِيْ ثَمَرٍ وَّلَا كَثَرٍ کہ پھل اور گودے کی چوری میں قطع ید نہیں ہے۔ اور آیت:۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸-۱) (اے محمدؐ) ہم نے تم کو کوثر عطا فرمائی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔ اور بعض نے خیر کثیر مراد لی ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو عطا کی اور سخی آدمی کو کوثر کہا جاتا ہے تَكَوْثَرَ الشَّيْءُ کے معنی

---

[1] قالہ الاعشی بلیمون بن کلمۃ فی ۶۰ بیتًا یہجو فیہا علقمۃ بن علاثۃ فی منافرتہ ویمدح عامر بن طفیل والاصح ان الکاثر بمعنی کثیر العدد کما فی اللسان (کثر) والقصیدۃ فی دیوانہ (۹۲-۹۶) والبیت فی التاج (کثر) والخزانۃ (۳:۸) وتہذیب الالفاظ ۴۲ وابن عقیل رقم ۲۷۷ والسیوطی ۲۰۵ وقد مر (قلل) [2] اوردہ فی المؤطا من حدیث رافع بن خدیج (والزرقانی ۴/۱۷۳ والشافعی فی الام (۷:۱۱۸) عن مالک وعن سفیان بن عیینۃ وابوداؤد والطیالسی رقم ۹۵۸ واحمد فی المسند ۳/۴۶۳ و ۴/۱۴۲ و ۴/۴ والدارمی ۲/۱۷۴ وابوداؤد ۲۳۸ والترمذی ۱/۲۷۳ - ۲۷۴ والنسائی ۲/۲۵۸ وابن ماجہ ۲/۲۶

کسی چیز کے بہت زیادہ ہونے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۷۰) وَ قَدْ ثَارَ نَقْعُ الْمَوْتِ حتی تَكَوْثَرَا

موت کا غبار اٹھا۔ یہاں تک کہ بہت زیادہ ہوگیا۔

(ک د ح)

اَلْكَدْحُ کے معنی کوشش کرنا اور مشقت اٹھانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا (۸۴-۶) تو اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا ہے۔

اور کبھی کَدْحٌ بمعنی کَدْمٌ بھی آتا ہے جس کے معنی دانت کاٹنے کا نشان کے ہیں۔

(ک د ر)

اَلْكَدَرُ کے معنی کسی چیز میں گدلا پن کے ہیں اور یہ صَفَاءٌ (صفائی) کی ضد ہے، مثلاً عَيْشٌ كَدِرٌ تیرہ زندگی۔ اَلْكُدْرَةُ کے معنی بھی گدلا پن کے ہیں مگر اس کا استعمال خصوصیت کے ساتھ رنگ میں ہوتا ہے اور كَدُوْرَةٌ کا پانی اور زندگی میں۔

اَلْاِنْكِدَارُ (انفعال) اس تغیر کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے بکھر جانے سے واقع ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۸۱-۲) اور جب ستارے بکھر کر بے نور ہو جائیں گے۔

اِنْكَدَرَ الْقَوْمُ عَلٰى كَذَا قوم بکھر کر اس پر ٹوٹ پڑی۔

(ک د ی)

اَلْكُدْيَةُ کے معنی سخت زمین کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔

حَفَرَ فَاَكْدٰى وہ گویا کھودتا ہوا سخت زمین تک جا پہنچا اور مزید کھدائی سے رک گیا اور استعارہ کے طور پر اَكْدٰى کا لفظ تھوڑا سا دے کر ہاتھ روک لینے اور ناکام ہونے پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى (۵۳-۳۴) تھوڑا سا دیا اور پھر (ہاتھ) روک لیا۔

(ک ذ ب)

اَلْكَذِبُ (جھوٹ) صِدْقٌ پر بحث کے سلسلہ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ قول اور فعل دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔

اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۶-۱۰۵) جھوٹ اور افتراء تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں۔ جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔

اور آیت کریمہ :۔

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۶۳-۱) لیکن خدا ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق (دل سے اعتقاد نہ رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔

میں ان کے کاذب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ

---

[1] قالہ حسان بن نشبہ وادلہ: ایوالان یہجو اجارہم لعدوہم۔ والبیت من قصیدۃ حماسیۃ فی اربعۃ ابیات راجع المرزوقی رقم ۱۱۳ وفی التبریزی حتی تکورا ای من کور العمامۃ والمعنی واحد قال ابو محمد الاعرابی واسم الشاعر مصحف والصواب جساس بن نشبہ قال جریر یہجو جذب بن حبیب التیمی:۔ اجذب اشبہت التی کان بنظرہا کسطر ثوث ارض غیر ذلت اناس، لقد شہدت تیم علی ام جذب بکان مراۃ اللئیم رہط جساس :

یہ کہتے ہیں گو واقعتًا صحیح ہے مگر ان کے ضمیر اس کے خلاف ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

لَیْسَ لِوَقْعَتِھَا کَاذِبَۃٌ (۵۶-۲) اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں ہے۔

میں نفس فعل یعنی وقوع کی طرف کذب کی نسبت کی ہے۔

جیسا کہ نِعْلَۃٌ صَادِقَۃٌ وَنِعْلَۃٌ کَاذِبَۃٌ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:۔

نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ (۹۶-۱۶) یعنی اس جھوٹے خطاکار کی پیشانی (کے بال)، میں ناصیہ کو مبالغہ کے طور پر کاذب کہا ہے، اور کَذَّابٌ کَذُوْبٌ، کُذُبْذُبٌ وَکَیْذُبَانٌ یہ سب مبالغہ کے صیغے ہیں۔ محاورہ ہے۔

لَا مَکْذُوْبَۃَ یعنی... میں تیرے سامنے جھوٹ نہیں بولتا۔ کَذَبْتُکَ حَدِیْثًا میں نے تم سے جھوٹ کہا قرآن میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ کَذَبُوا اللہَ وَرَسُوْلَہٗ (۹-۹۰) جنہوں نے خدا اور رسولؐ سے جھوٹ بولا۔

اور کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسا کہ آیت:۔

لَقَدْ صَدَقَ اللہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا بِالْحَقِّ۔ میں صَدَقَ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ محاورہ ہے۔ کَذَبَہٗ کَذِبًا وَکِذَّابًا یعنی اس کے سامنے جھوٹ بولا۔ اَکْذَبْتُہٗ میں نے اسے جھوٹا پایا۔ کَذَّبْتُہٗ میں نے اس کی طرف جھوٹ کی نسبت کی (یعنی اسے جھوٹا کہا) خواہ وہ واقعہ میں سچا ہے یا جھوٹا۔ دونوں حالتوں میں اس کا استعمال ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف سچے آدمی کی تکذیب پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا (۲-۳۹) اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنِ (۲۳-۲۶) کہ پروردگار انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے تو میری مدد کر۔

بَلْ کَذَّبُوْا بِالْحَقِّ (۵۰-۵) بلکہ انہوں نے حق کو جھوٹ سمجھا۔

کَذَّبَتْ قَبْلَھُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَکَذَّبُوْا عَبْدَنَا (۵۴-۹) ان سے پہلے نوحؑ کی قوم نے بھی تکذیب کی تھی تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا۔

وَاِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (۳۵-۲۵) اور (اے پیغمبر) اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو جو لوگ اُن سے پہلے تھے وہ بھی تکذیب کرچکے ہیں۔

فَاِنَّھُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ (۶-۳۳) یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے۔

ایک قراءت میں لَا یُکْذِبُوْنَکَ ہے یعنی وہ نہ تجھے جھوٹا پاتے ہیں۔ اور نہ ہی تیرا جھوٹ ثابت کرسکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

حَتّٰی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَآءَھُمْ نَصْرُنَا (۱۲-۱۱۰) یہاں تک کہ جب پیغمبر ناامید ہوگئے اور انہوں نے خیال کیا کہ اپنی نصرت کے بارے میں جو بات انہوں نے کہی تھی اس میں وہ سچے نہ نکلے۔

یعنی انہوں نے یقین کرلیا کہ یہ لوگ جن کی طرف انہیں بھیجا گیا ہے تکذیب ہی کریں گے۔ کُذِّبُوْا کے معنی جھٹلائے جانے کے ہیں جیسے فُسِّقُوْا وَخُطِّئُوْا کے معنی کسی کی طرف فسق یا خطاکاری کی نسبت کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ (۳۵-۴) تو تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے گئے ہیں۔
فَكَذَّبُوا رُسُلِي۔ تو انہوں نے میرے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
إِنْ كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ (۳۸-۱۴) (ان) سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
مذکورہ بالا آیت (۱۲-۱۱۰) میں ایک قرارت كُذِبُوا بتخفیف دال بھی ہے[1] جو کہ كَذَبْتُكَ حَدِيثًا سے ماخوذ ہے اس صورت میں كُذِبُوا کا فاعل کفار ہوں گے یعنی حتیٰ کہ کفار نے یہ خیال کیا کہ پیغمبر جھوٹ بولتے ہیں کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب نازل ہوگا اور کفار کے دلوں میں یہ خیال اس بنا پر پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دی اور فوراً عذاب نازل نہ کیا اور آیت:۔
لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا (۷۸-۳۵) وہاں نہ وہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ (وخرافات) میں كِذَّاب کے معنی تَكْذِيب کے ہیں۔ یعنی وہ جھوٹ ہی نہیں بولیں گے حتیٰ کہ ایک دوسرے کی تکذیب کی نوبت آئے لہٰذا جنت میں تکذیب کی نفی کذب کی نفی کو مستلزم ہے ایک قرأت میں كِذَابًا ہے۔ جو کہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے۔ کہ اہل جنت باہم کذب بیانی نہیں کریں گے۔ جس طرح کہ لوگ دنیا میں کرتے ہیں۔ محاورہ ہے۔
حُمِلَ فُلَانٌ عَلَى فِرْيَةٍ وَكَذِبٍ۔ فلاں کو جھوٹ بولنے پر اکسایا گیا۔ جیسا کہ اس کی ضد میں صَدَقَ استعمال ہوتا ہے۔ اور جب اونٹنی کے متعلق یہ یقین ہو کہ کچھ عرصہ تک اس کا دودھ خشک نہیں ہوگا لیکن توقع کے خلاف اس مدت سے پہلے ہی خشک ہو جائے تو کہا جاتا ہے كَذَبَ لَبَنُ النَّاقَةِ اونٹنی کا دودھ توقع کے خلاف خشک ہو گیا اور كَذَبَ عَلَيْكَ الْحَجُّ فَبَادِرْ کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ تم پر حج فرض ہو چکی ہے۔ اسے فوراً ادا کرو۔[2] (۹۲) دراصل حج کو اس غائب آدمی کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کی آمد میں دیر ہو گئی ہے اور یہ قَدْ فَاتَ الْحَجُّ فَبَادِرْ (کہ حج فوت ہونے کو ہے لہٰذا جلدی کرو) کے ہم معنی ہے اور كَذَبَ عَلَيْكَ الْعَسَلُ میں عسل منصوب عَلَى الْإِغْرَاءِ ہے یعنی شہد ہاتھ سے نہ نکل جائے۔[3] (۹۳)
بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَسَلٌ بمعنی عَسَلَانٌ ہے اور عَسَلَانٌ کے معنی ایک قسم کی دوڑ کے ہیں۔
اَلْكِذْبَةُ۔ ایک قسم کا کپڑا جس پر مصنوعی نقش و

---

[1] قال الطبري: وذالك قراءة لبعض قراء المدينة وعامة قراء اهل الكوفة ونحن نختار هذا القراءة وماخوذ من التفسير ص۹۰۔ ۱۲ [2] قاله عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه انظر للاثر ومعانيه المختلفة الصحاح واللسان (كذب) واصلاح المنطق لابن السكيت ۱۲ [3] قال في الدنياه ۱۳۲/۲: - ان لاحمد بن محمد الخسيكثي كتاب (كذب عليك كذا) وفي النواد ۱۱۲/۲-۱۱۵: قال ابوعبيدة الحج مرفوع على الاغراء ثم ذكر الشاهد وجاز في النصب ايضاً انتهى مختصراً وانظر للاثر ايضاً غريب ابي عبيد ۳ ر والمعاني للقتبي ۱۹۰ الزم الحج ۱۲ [4] وحينئذ يكون عليك اسم فعل بمعنى الزم وفي ابدال ابي الطيب ۲۱۹/۲ والفائق ۹۶/۲ (وفيها البحث على طوله)۔ وشكا عمرو بن معديكرب الى عمرؓ بن الخطاب المعص (اي النواد) عصب الرجل فقال كذب عليك العسل اي عليك بالعدو فالعسل ههنا بمعنى العسلان اي الاسراع وتقاربة الخطو كما يفعل الذئب لواعاد من الشيء والمثل يضرب على طرق مختلفة قال ابوشميل اللغوي كذب العسل اي امكنك فاعسل واسرع ورفع العسل بكذب ومعناه النصب لانه يريد ان يامره بالعسلان كما يقال امكنك الصيد فارمه وانظر ايضاً الدرة للحريري مع شرح الخفاجي ۱۴۹-۱۵۰ فان الشارح قد حقق القول بانه يجوز النصب والرفع على العسل والحج

نگار کیا گیا ہو مگر ایسا معلوم ہو کہ اس کا نقش و نگار اصلی ہے۔ اس کے دیکھنے سے چونکہ انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے کِذْابَۃٌ کہا جاتا ہے۔

(ک ر ر)

اَلْکَرُّ۔ اس کے اصل معنی کسی چیز کو بالذات بالفعل پلٹانا یا موڑ دینا کے ہیں۔ اور بٹی ہوئی رسی کو بھی کَرٌّ کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں مصدر ہے مگر بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع کُرُوْدٌ آتی ہے اسی سے اَلْکَرَّۃُ (دوسری بار) ہے جیسے فرمایا:۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّۃَ عَلَیْھِمْ (۱۷-۶)

پھر ہم نے دوسری بار تم کو ان پر غلبہ دیا۔

فَلَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۶-۱۰۲) کاش ہمیں دنیا میں پھر جانا ہو تو ہم مومنوں میں ہو جائیں۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً (۲-۱۶۷)

(یہ حال دیکھ کر) پیروی کرنے والے (حسرت سے) کہیں گے کہ اے کاش ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا۔

لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّۃً۔ اگر مجھے پھر ایک بار دنیا میں جانا نصیب ہوتا۔

اَلْکِرْکِرَۃُ (مثل زِبْرِجَۃٌ) شتر کے سینہ کی سخت جگہ کو کہتے ہیں۔ اور لوگوں کی مجتمع جماعت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اَلْکَرْکَرَۃُ۔ کے معنی ہوا کے بادل کو چلانا کے ہیں اور یہ کَرٌّ سے فعل رباعی ہے۔

(ک ر ب)

اَلْکَرْبُ۔ کے معنی سخت غم کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَنَجَّیْنَاہُ وَاَھْلَہٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ (۲۱-۷۶) تو ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بڑی گھبراہٹ سے نجات دی۔

اور کُرْبَۃٌ غُمَّۃٌ کی طرح ہے یہ اصل میں کَرْبُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے جس کے معنی زمین میں قلبہ رانی کے ہیں۔ اور غم سے بھی چونکہ طبیعت الٹ پلٹ جاتی ہے۔ اس لئے اسے کَرْبٌ کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے[1]۔

اَلْکِرَابُ عَلَی الْبَقَرِ یعنی ہر آدمی کو اس کا کام کرنے دو اور یہ اَلْکِلَابُ عَلَی الْبَقَرِ کے قبیل سے نہیں ہے[2] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کَرْبٌ (سخت غم) کَرَبَتِ الشَّمْسُ سے ماخوذ ہو۔ جس کے معنی ہیں سورج غروب ہونا کے قریب ہو گیا اور اِنَاءٌ کَرْبَانٌ میں کَرْبَانٌ بمعنی قَرْبَانٌ ہے یعنی تقریباً بھرا ہوا برتن اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کَرْبٌ (غم) اَلْکَرَبُ سے مشتق ہو جس کے معنی سخت گرہ کے ہیں جو ڈول کے ساتھ رسی میں لگی رہتی ہے۔ اور غم بھی دل پر بمنزلہ گرہ کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے اسے کَرْبٌ کہا جاتا[3] ہو۔ اَکْرَبْتُ الدَّلْوَ ڈول کے دستہ میں چھوٹی سی رسی باندھنا۔

---

[1] قال فی المیدانی ۲ ر ۲۴۲: یضرب فی تخلیۃ المرء وصناعتہ ۱۲ [2] انظر للمثل "الکلاب علی البقر" الحیوان للجاحظ (۱: ۲۰۰) واللسان (کلب) والعیون (۲: ۱۲) وفی التاج وکذا فی الحیوان للدمیری کلام فیہ کثیر والنیا انظر للمزھر ار ۶۵ [3] قال فی مجمع الامثال یضرب عند تحریش بعض القوم علی بعض من غیر مبالات ۔؛

(ک ر س)

اَلْکُرْسِیُّ۔ عوام کے عرف میں اس شے کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (۳۸-۳۴) اور ان کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا۔

یہ اصل میں کِرْسٌ کی طرف منسوب ہے اور کِرْسٌ کے معنی ہیں اوپر تلے جم جانے والا اور جمع ہو جانے والا اسی سے کُرَّاسَۃٌ (مجموعہ اوراق) ہے کَرَّسْتُ الْبِنَاءَ فَتَکَرَّسَ میں نے عمارت کی بنیاد رکھی چنانچہ وہ بنیاد پڑ گئی عجاج نے کہا ہے[1] (الرجز)

(۳۰۸) یَا صَاحِ ھَلْ تَعْرِفُ رَسْمًا مُکْرَسًا

قَالَ نَعَمْ اَعْرِفُہٗ وَاَبْلَسَا

اے میرے دوست کیا تم نشان منزل کو پہچانتے ہو جہاں کہ اونٹوں کا بول و براز جما ہوا ہے۔ اس نے کہا ہاں پہچانتا ہوں اور غم زدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔

اَلْکِرْسُ کسی چیز کی اصل اور بنیاد کو کہتے ہیں۔ محاورہ ہے:۔

ھُوَ قَدِیْمُ الْکِرْسِ اس کی بنیاد پرانی ہے اور ہر چیز کے ڈھیر کو کِرْسٌ کہا جاتا ہے اور کُرُوْسٌ کے معنی بڑے سر والا کے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲-۲۵۵)

اس کی "کرسی" آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے۔ کی تفسیر میں ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ کہ کرسی سے علم باری تعالیٰ مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے۔ کہ کرسی کے معنی حکومت و اقتدار کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ فلک محیط یعنی فلک الافلاک کا دوسرا نام کرسی ہے[2]۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ کہ سات آسمان کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے بیابان میں ایک انگوٹھی پڑی ہو[3]۔

(ک ر م)

اَلْکَرَمُ جب اللہ کی صفت ہو تو اس سے احسان و انعام مراد ہوتا ہے جو ذات باری تعالیٰ سے صادر ہوتا رہتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ (۲۷-۴۰) تو میرا پروردگار بے پرواہ اور کرم کرنے والا ہے۔

اور جب انسان کی صفت ہو تو پسندیدہ اخلاق اور افعال مراد ہوتے ہیں جو کسی انسان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور کسی شخص کو اس وقت تک کریم نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس سے کرم کا ظہور نہ ہو چکا ہو۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ حریت اور کرم ہم معنی ہیں لیکن حریت کا لفظ جھوٹی بڑی ہر قسم کی خوبیوں

---

[1] قالہ العجاج وتالثہا وانحلبت عیناہ من فرط الاسی وفی اللسان وابلسا بدل وا بأسا، انظر للشطر دیوانہ ۱۶ والکامل ۵۳۹ و الطبری ر۷: ۱۱۶ والقرطبی ر۶: ۲۷۴) واللسان والتاج ربلس، کرس) ومعانی القرآن المنسوب الی الفراء ر۱: ۳۳۵) والکرس موضع فیہ الکرس ای ابوال الابل وابعارہا یتلبد بعضہا علی بعض والرجز ایضا فی الطبری ر۱: ۲۲۷/۱۲۱، ۲۶) ومجاز القرآن رقم ۲۱، وتہذیب الالفاظ ۲۲۵ والبحر ر۲: ۲۸۰) والثالث نفطوی مجاز القرآن لہ ۱۶۱) [2] فسرہ الزمخشری بالملک والعلم قال ومنہ یقال للعلماء الکراسی ۱۲ [3] اخرجہ ابن جریر وابن المنذر عن ابن عباس وروی بمعناہ مرفوعا عن ابی ذر کما فی زوائد ابن حبان رقم ۹۴ فی اسناد حدیث طویل وقال فی آخرہ وفیہ ابراہیم بن ہشام بن یحیی الغسانی قال ابوحاتم وغیرہ کذاب انظر لترجمۃ الجرح علیہ لسان المیزان ۱۲ ح

پر بولا جاتا ہے اور کرم صرف بڑے بڑے محاسن کو کہتے ہیں۔ مثلاً جہاد میں فوج کے لیے ساز و سامان مہیا کرنا یا کسی ایسے بھاری تاوان کو اٹھا لینا جس سے قوم کے خون اور جان کی حفاظت ہوتی ہو۔ اور آیت:۔

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (٤٩-١٣) اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

میں "اَتۡقٰی" یعنی سب سے زیادہ پرہیزگار۔ کو "اَکۡرَمُ" یعنی سب سے زیادہ عزت و تکریم کا مستحق ٹھہرانے کی وجہ یہ ہے کہ کَرَم بہترین صفات کو کہتے ہیں اور سب سے بہتر اور پسندیدہ کام وہی ہو سکتے ہیں جن سے رضا الٰہی کے حصول کا قصد کیا جائے لہذا جو جس قدر زیادہ پرہیزگار ہوگا اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

نیز اَلۡکَرِیۡمُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ہم نوع چیزوں میں سب سے زیادہ باشرف ہو چنانچہ فرمایا:۔

وَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ (٣١-١٠) پھر (اس سے) اس میں ہر قسم کی نفیس چیزیں اگائیں۔

وَزُرُوۡعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیۡمٍ (٤٤-٢٦) اور کھیتیاں اور نفیس مکان۔

اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ (٥٦-٧٧) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔

وَقُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا (١٧-٢٣) اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا۔

اَلۡاِکۡرَامُ وَالتَّکۡرِیۡمُ کے معنی ہیں کسی کو اس طرح نفع پہنچانا کہ اس میں اس کی کسی طرح کی سبکی اور خفت نہ ہو یا جو نفع پہنچایا جائے وہ نہایت باشرف اور اعلیٰ ہو اور اَلۡمُکۡرَمُ کے معنی معزز اور باشرف کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ ضَیۡفِ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ (٥١-٢٤) بھلا تمہارے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے؟ اور آیت کریمہ:۔

بَلۡ عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَ (٢١-٢٦) کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے معزز بندے ہیں جیسے فرمایا:۔

وَجَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ (٣٦-٢٧) اور مجھے عزت والوں میں کیا۔

کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ (٨٢-١١) عالی قدر تمہاری باتوں کے لکھنے والے۔

بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ (٨٠-١٦) ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار اور نیکوکار ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ (٥٥-٢٧) اور جو صاحب جلال اور عظمت ہے۔

میں اکرام کا لفظ ہر دو معنی پر مشتمل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ عزت و تکریم بھی عطا کرتا ہے اور باشرف چیزیں بھی بخشتا ہے[1]۔

(ک ر ہ)

اَلۡکَرۡہُ وَالۡکُرۡہُ (سخت ناپسندیدگی) ہم معنی ہیں جیسے ضَعۡفٌ وَضُعۡفٌ بعض نے کہا ہے کہ کَرۡہٌ (بفتح الکاف) اس مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی ڈالی جائے۔ اور کُرۡہٌ (بضم الکاف) اس مشقت کو کہتے ہیں جو اسے ناخواستہ طور پر خود اپنے آپ سے پہنچتی ہے۔ اور یہ دو قسم

---

[1] وہذا المعنی ہو المراد (٩٦-٣) (١٧-٦٢) (٨٩-١٥)

پر ہے۔ ایک وہ جو طبعًا ناگوار ہو۔ اور دوم وہ جو عقل یا شریعت کی رو سے مکروہ ہو لہٰذا ایک ہی چیز کے متعلق انسان کہہ سکتا ہے کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور برا بھی سمجھتا ہوں یعنی مجھے طبعًا تو پسند ہے لیکن عقل و شریعت کی رو سے اسے ناپسند کرتا ہوں یا عقل و شریعت کی رو سے مجھے پسند ہے لیکن طبعًا ناپسند ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (مسلمانو) تم پر (خدا کے رستے میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہیں ناگوار تو ہوگا۔

میں كُرْهٌ کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری طبیعتیں اسے ناپسند کرتی ہیں پھر اس کے بعد،

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲-۲۱۶) (مگر) عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور تمہارے حق میں بھلی ہو۔

فرما کر وضاحت کر دی ہے۔ کہ انسان کو چاہیے کہ کسی چیز کو اس وقت تک محبوب یا مکروہ نہ سمجھے جب تک کہ اس کی حقیقت حال سے آگاہ نہ ہو جائے۔

کَرِهْتُ کا لفظ دونوں قسم کی کراہت کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ گو زیادہ تر کُرْهٌ یعنی ناگوار کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۹-۳۲) اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹-۳۳) اور اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (۸-۵) اور (اس وقت) مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ اور آیت کریمہ:۔

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (۴۹-۱۲) کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان اپنے بھائی کا گوشت کھانے کا خواہ قصد بھی کرے مگر طبعًا اسے اس سے ضرور نفرت ہوگی اور آیت کریمہ:۔

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاۗءَ كَرْهًا تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ (۴-۱۹) میں ایک قراءت كُرْهًا بھی ہے۔ اَلْاِكْرَاهُ اس کے معنی کسی کو ایسے کام پر مجبور کرنا کے ہیں جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَي الْبِغَاۗءِ (۲۴-۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو..... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔

میں بدکاری پر مجبور کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں كُرْهٌ اور كَرْهٌ دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اور آیت:۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲-۲۵۶) دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔

کی مختلف توجیہات بیان کی گئی ہیں۔ اول یہ کہ شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ کسی پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو جائے تو فبہا ورنہ اس پر جبر نہ کیا جائے[1]۔ دوم یہ کہ یہ حکم اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے یعنی اگر وہ لوگ جزیہ دینا قبول کر لیں اور دوسری شرائط کی پابندی کریں تو انہیں مسلمان

---

[1] وہذا ہو المروی عن عبد اللہ بن مسعود وابن زید سلیمان بن موسیٰ وعندہم ہذا الحکم منسوخ بآیۃ جاہد الکفار والمنافقین ٭ ٭ ٭

ہونے پر مجبور نہ کیا جائے
سوم یہ کہ اس آیت کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو دین باطل کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے اور وہ زبان سے اس کا اقرار کرکے اس دین میں داخل ہو جائے تو اس پر کفر کا حکم عائد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ آیت:۔
اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔
(۱۶-۱۰۶) وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو سے معلوم ہوتا ہے۔
چہارم زیر بحث آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص دنیا میں کسی طرح سے مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ تو آخرت میں اسے اس کا ثواب نہیں ملے گا بے شک اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ اور وہ اخلاص کے بغیر کسی عمل کو قبول نہیں کرتا (وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ) اسی لئے آنحضرت نے فرمایا (۹)
اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کہ اعمال کے ثواب کا مدار نیتوں پر ہے۔
نیز فرمایا، اَخْلِصْ يَكْفِيْكَ الْقَلِيْلُ مِنَ الْعَمَلِ کہ اخلاص کے ساتھ تو تھوڑا عمل بھی کافی ہوتا ہے۔
بعض نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن احکام کا بھی انسان کو مکلف بناتا ہے تو وہ درحقیقت اسے کسی امر پر مجبور نہیں کرتا بلکہ اپنی ابدی نعمتوں کے حاصل کرنے کی تکلیف دیتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ اس قوم پر تعجب فرماتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جاتے ہیں (۹۵)۔
ششم یہ کہ دین کے معنی اجزاء کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ جزائے اعمال پر مجبور نہیں ہے۔ بلکہ اسے اختیار ہے کہ جس کے ساتھ جس طرح چاہے سلوک کرے۔ اور آیت کریمہ:۔
اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (۳-۸۳)
کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طَوْعًا کا تعلق مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ کے ساتھ ہے اور كَرْهًا کا تعلق اَلْاَرْضِ سے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اہل

له وہو المحکی عن الحسن وقتادۃ والضحاک وورد فی سبب نزولہا ایضا (روح المعانی ص۱۲ ج ۳) ٢ه قالہ مجاہد وما اخرج ابن جریر وغیرہ من ابی العالیۃ (روح المعانی ۳ ر ۱۸۸) ٣ه متفق علیہ لکن بزیادۃ انما وابن حبان فی صحیحہ بدنہا (المقاصد ۴۸) ومالک بروایۃ محمد بن الحسن والحاکم فی المستدرک واصحاب السنن کلہم عن عمرؓ وایضا مالک فی روایۃ محمد بن الحسن والشافعی فی مختصر الربیع والحمیدی وابن الجارود وابن خزیمۃ والطحاوی عن غیر عمر ایضا لکن طرقہا کلہا ضعیفۃ راجع للبحث الفتح الباری والعینی فانہما اشبع الکلام والسیوطی فی التدریب فی بحث "الشاذ" والحاصل ان الحدیث صحیح غریب وقد تواتر معناہ (راجع کنز العمال ۲ رقم ۶ ۲۱۳، ۵۹ ۲) بعض علماء الازہر جمع اسانیدہ فی رسالۃ سماہ "الابتہاج بتخریج احادیث المنہاج" ٤ه والحدیث ابن ابی الدنیا فی الاخلاص والدیلمی فی مسندہ بانہ منقطع ولفظ اخلص العمل یجزک منہ القلیل (راجع کنز العمال ج ۲ رقم ۱۳۰ وتخریج العراقی علی الاحیاء ج ۴ ر ۳۸۶) ٥ه البخاری فی صحیحہ فی باب الاساری فی السلاسل من حدیث ابی ہریرۃ وابوداؤد ومسلم باختلاف الفاظہ الحاکم فی المستدرک والطبرانی عن ابی امامۃ (راجع کنز العمال ج رقم ۱۲۱۱۷)

آسمان تو بطیب خاطر اس کی فرمانبرداری کر رہے ہیں اور اہل زمین زبردستی سے یعنی دلائل فطرت سے مجبور ہو کر اس کی اطاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے:۔

اَلْجَأَنِیْ اَکْرَهَنِیْ عَلَی الْقَوْلِ بِهٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ کہ دلائل سے مجبور ہو کر میں اس مسئلہ کو مانتا ہوں اور اس قسم کا جبر مذموم نہیں ہے یعنی دلائل سے مجبور ہو کر کسی بات کو ماننا سلب اختیار کو مستلزم نہیں ہے حتیٰ کہ اس پر عدم جزا کا مسئلہ مرتب ہو جیسا کہ جبریہ فرقہ کا مذہب ہے۔

اس آیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مومنین تو خوشی سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور کافر کَرْهًا یعنی زبردستی سے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس بات کا ان سے ارادہ کرتا ہے اور جو بھی ان کے متعلق فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اس سے انکار کی طاقت نہیں رکھتے۔

قتادہ نے اس کو حالت نزع پر محمول کیا ہے کہ عند الموت مومنین تو خوشی سے اور کفار زبردستی سے اس کی فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس حالت میں ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آیت:۔

فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ (۴۰-۸۵)

اس وقت ان کے ایمان نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا۔

سے معلوم ہوتا ہے۔

چہارم یہ کہ کَرْهًا مسلمان ہونے سے وہ لوگ مراد ہیں جو لڑائی میں جان بچانے کے لئے مسلمان ہو جاتے تھے۔

اس آیت میں پانچواں قول ابوالعالیہ اور مجاہد کا ہے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا معترف ہے۔ خواہ مشرک ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ آیت:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۳۱-۲۵) اور اگر تم اس سے پوچھو کہ آسمان اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔

سے معلوم ہوتا ہے گویا مومن خوشی سے اس کی خالقیت کا اعتراف کرتے ہیں اور کفار زبردستی سے۔

ابن عباس سے مروی ہے کہ تمام لوگ احوال فطری کے لحاظ سے اس کے فرمانبردار ہیں اگرچہ زبان کے ساتھ وہ اظہار کفر کرتے ہیں اور اس سے مراد "ذر اول" کے وقت کا اسلام ہے جس کا ذکر کہ آیت اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی (۷-۱۷۲) کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں وہ کہنے لگے کیوں نہیں۔ میں پایا جاتا ہے یعنی عقل (وغیرہ) کی قسم کے فطری دلائل مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے مقتضی ہیں اور وہ دلائل وہی ہیں جن کی طرف کہ آیت:۔

وَظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ الْاٰیة (۱۳-۱۵) اور ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ کرتے ہیں) میں اشارہ فرمایا ہے۔

زیر بحث آیت میں ساتواں قول بعض صوفیہ کرام کا ہے۔ کہ مَنْ اَسْلَمَ طَوْعًا سے وہ لوگ مراد ہیں جو ثواب اور عقاب کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہیں کرتے بلکہ براہ راست اس ذات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ثواب و عقاب دینے والی ہے اور کَرْهًا سے مراد وہ لوگ ہیں جو صرف ثواب و عقاب کو ملحوظ رکھتے ہیں اور ثواب کی رغبت یا عذاب کے خوف سے اس کے فرمانبردار رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا (۱۳-۱۵) اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمینوں میں ہے خوشی سے یا زبر دستی سے خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے۔ بھی اس کی مثل ہے (یعنی مذکورۃ الصدر معانی پر محمول ہوسکتی ہے)

(ک س ب)

اَلْکَسْبُ۔ اصل میں جلب نفع یا خوش نصیبی حاصل کرنے کے لئے کسی چیز کا قصد کرنے کو کسب کہتے ہیں جیسے کسب مال وغیرہ اور ایسے کام کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے جسے انسان اس خیال پر کرے کہ اس سے نفع حاصل ہوگا لیکن الٹا اس سے نقصان اٹھانا پڑے۔ پس اَلْکَسْبُ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات اور اس کے ساتھ دوسروں کے فائدہ کے لئے کرے اسی لئے یہ کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے کَسَبْتُ فُلَانًا کَذَا میں نے فلاں کو اتنا کچھ حاصل کرکے دیا۔ مگر اَلْاِکْتِسَابُ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے لہٰذا ہر اکتساب کو کسب لازم ہوتا ہے لیکن ہر کسب کو اکتساب لازم نہیں ہے۔ اور یہ خَبَزَ وَ اخْتَبَزَ وَ شَوٰی وَاشْتَوٰی، وَطَبَخَ وَ اطَّبَخَ کی طرح ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ (۲-۲۶۷) جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو۔۔۔۔۔ اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔ کے متعلق آنحضرتؐ سے سوال کیا گیا اَیُّ الْکَسْبِ اَطْیَبُ کہ کونسا کسب زیادہ پاکیزہ ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِہٖ کہ انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور نیز فرمایا[۹۹]

ان اطیب ما یاکل الرجل من کسبه وان ولده من کسبه سب سے زیادہ پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے کماکر کھائے اور اس کی اولاد بھی اسکے کسب سے ہے"۔ قرآن میں ہے:۔

لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا (۲-۲۶۴) (اسی طرح یہ ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کرسکیں گے۔ اور قرآن میں نیک وبد دونوں قسم کے اعمال کے متعلق یہ فعل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:۔

اَوْ کَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِھَا خَیْرًا (۶-۱۵۹) یا اپنے ایمان کی حالت میں نیک عمل نہیں کئے ہونگے اور آیت کریمہ:۔

وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً الآیۃ کے بعد فرمایا:۔

مِمَّا کَسَبُوْا (۲-۲۰۲) ان کے کاموں کا (حصہ) اور اعمال بد کے متعلق فرمایا:۔

---

[۱] رواہ الترمذی عن عائشۃ والبخاری عن عبداللہ بن عمرو الطبرانی واحمد عن رافع بن خدیج وابن اسحاق عن علی قال فی الکنز ۴ رقم ۴۴۶: وتفرد بہ بیلول وقال الحاکم صحیح الاسناد راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ۲/۳ ۶۳ ۔ ۴ /۱۲۶ وسنہ الحدیث فی ابی داؤد عن عائشۃ وزوائد ابن حبان رقم ۱۰۹۱ و ۱۰۹۲ وکنز العمال ج ۴ رقم ۳۱، ۳۲، ۱ ۴۰ والیضا تخریج الکشاف للحافظ ص ۱۲۰ رقم ۹۰. قال الحاکم من عمارۃ عن امہ عن عائشۃ وذکر الدارقطنی فی العلل واطال ویتعلق بالباب حدیث انت ومالک لابیک. جع الیہ قال القتبی فی الغریب وبعضھم فسر آیۃ اللھب ومَا کسب ای وما ولدہ۔

أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶-۷۰) تاکہ (قیامت کے دن کوئی شخص اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا (۶-۷۰) یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ (۶-۱۲۰) جو لوگ گناہ کرتے ہیں وہ عنقریب اپنے کئے کی سزا پائیں گے۔

فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ (۲-۷۹) ان پر افسوس ہے اس لئے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے۔ اس لئے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۹-۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں) ان کو اعمال کے بدلے جو کرتے رہے ہیں بہت سا رونا ہوگا۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا (۳۵-۴۵) اور اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا (۶-۱۶۵) اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا ضرر اسی کو ہوتا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ (۲-۲۸۱) اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائیگا۔

میں مَا كَسَبَتْ کا لفظ نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کو شامل ہے اور اکتساب کا لفظ بھی دونوں قسم کے اعمال کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ (۴-۳۲) مردوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کئے اور عورتوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کئے۔

اور آیت کریمہ:۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ (۲-۲۸۶) اچھے کام کریگا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا اور برے کام کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا۔

سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ کَسَبَتْ کا لفظ اعمال صالحہ اور اکتساب کا لفظ اعمال سیئہ کے ساتھ مخصوص ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کسب سے اعمال اخروی اور اکتساب سے مکاسب دینوی مراد ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ کسب سے مراد ہر وہ عمل ہے جو فعل خیر یا جلب نفع کے قبیل سے ہو اور دوسرں کو نفع پہنچانے کے لئے جائز طریقے سے انسان اسے کرتا ہے اور اکتساب سے ہر وہ نفع مراد ہے جو انسان اپنی ذات کے لئے حاصل کرتا ہے بشرطیکہ اس کا حصول اس کے لئے جائز ہو لہٰذا آیت میں اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ جو فعل انسان دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے کرتا ہے۔ اس کا اسے ثواب حاصل ہوگا اور جو صرف اپنی ذات کے لئے حاصل کرتا ہے خواہ اس کا حصول جائز طریقے پر ہی کیوں نہ ہو تو شاذ و نادر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا وبال اس پر نہ پڑے تو یہ اس مقولہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے آپ کو مصائب

کا خوگر بنائے جیسا کہ آیت:۔
اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸-۲۸)
کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔
اور اس قسم کی دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے

(ک س ف)

كُسُوْفُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ کے معنی ہیں سورج یا چاند کا کسی خاص عارضے سے مستور یعنی گہن میں آجانا کے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر چہرہ یا حالت کے خراب ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے كَاسِفُ الْوَجْهِ یا كَاسِفُ الْحَالِ۔
اَلْكِسْفَةُ کے معنی بادل، روئی یا اس قسم کے دوسرے متخلخل اجسام کے ٹکڑے کے ہیں اس کی جمع كِسَفٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
ثُمَّ يَجْعَلُهُ كِسَفًا (۳۰-۴۸) اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔
اَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (۲۶-۱۸۷) تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لاکر گراؤ
اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (۱۷-۹۲) یا جیسا تم کہا کرتے ہو ہم پر آسمان کے ٹکڑے لاکر گراؤ۔
ایک قرات میں كِسْفًا بسکون سین ہے اور كِسَفٌ کا واحد كِسْفَةٌ ہے جیسے سِدْرَةٌ وَسِدَرٌ اور فرمایا۔
وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ (۵۲-۴۴) اور اگر یہ آسمان سے عذاب کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں ابوزید[1] نے کہا ہے كَسَفْتُ الثَّوْبَ (ض) كَسْفًا کے معنی کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں بعض نے كَسَفْتُ عُرْقُوْبَ الْاِبِلِ بھی کہا ہے جس کے معنی اونٹ کی کونچ کاٹ دینے کے ہیں (لیکن) بعض اہل لغت کے نزدیک اس معنی میں صرف كَسَحْتُ (ف) ہی استعمال ہوتا ہے۔

(ک س ل)

اَلْكَسَلُ کے معنی کسی ایسے معاملہ میں گراں باری ظاہر کرنا کے ہیں۔ جس میں گرانباری کرنا مناسب نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مذموم خیال کیا جاتا ہے اور یہ باب كَسِلَ (س) فَهُوَ كَسِلٌ وَكَسْلَانُ کا مصدر ہے۔ اور كَسْلَانُ کی جمع كُسَالٰی وَكَسَالٰی آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔
وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰی (۹-۵۴) اور نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہوکر۔
محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا يُكْسِلُهُ الْمَكَاسِلُ اس کو اسباب کاہلی سست نہیں بناتے۔ فَحْلٌ كَسِلٌ۔ جو نر کہ جفتی میں سست ہو جائے۔ اِمْرَاَةٌ مِّكْسَالٌ زن سست، جو نازپروردہ ہونیکی وجہ سے اپنے گھر سے باہر نہ نکلے (صفت مدح)

---

[1] ابوزید البلخی احمد بن سہل (۵ ۲۳-۳۲۲) احد الکبار الافراد من علماء الاسلام وصاحب التالیفات وکتابہ نظم القرآن من اشمل ما کتب فیہ قال ابوحیان فی کتاب "البصائر والذخائر" قال ابوحامد القاضی لم ار کتابا فی القرآن مثل کتاب ابی زید البلخی وفی الفہرست ۹۵ لہ کتاب غریب القرآن وتواسع القرآن وغیر ذالک وہناک ابوزید سعید بن اوس الانصاری ولہ ایضاً کتاب النوادر (فی ۲۱۵ھ الفہرست ۸۷) لکن النوادر للبلخی اجمع فی فنون شتی جمع بین الشریعۃ والمنطقۃ والادب العنون وراجع لسان المیزان ۱: ۱۸۳ اومعجم الادبار (۲: ۶۵-۸۷) وحکماء الاسلام (۲۲) ماخوذ من الاعلام للزرکلی ۱ : ۱۳۱

(ک س و)

اَلْکِسَاءُ وَالْکِسْوَۃُ کے معنی لباس کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
اَوْ کِسْوَتُھُمْ (۵۔۸۹) یا ان کو کپڑا دینا۔
کَسَوْتُہٗ۔ میں نے اسے لباس پہنایا۔
اِکْتَسٰی (انفعال) اس نے پہن لیا۔ قرآن میں ہے۔
فَارْزُقُوْھُمْ فِیْھَا وَاکْسُوْھُمْ (۴۔۵) ہاں اس میں سے ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو۔
فَکَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا (۲۳۔۱۴) پھر ہڈیوں پہ گوشت پوست چڑھایا۔
اِکْتَسَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ۔ زمین نے نباتات کا لباس پہن لیا۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۸۴) فَبَاتَ لَهٗ دُوْنَ الصَّبَا وَھِیَ قَرَّۃٌ
لِحَافٌ وَمَصْقُوْلُ الْکِسَاءِ رَقِیْقٗ

بعض نے کہا ہے۔ کہ یہاں مصقول الکساء سے مراد وہ دودھ ہے جس پر بالائی کی تہ آچکی ہو۔
دوسرے شاعر نے کہا ہے[1] (المنسرح)

(۳۸۳) حَتّٰی اَرٰی فَارِسَ الصَّمُوْتِ عَلٰی
اَکْسَاءِ خَیْلٍ کَاَنَّھَا الْاِبِلُ

یہاں تک کہ میں "صموت" کے شہسوار کو دیکھوں کہ وہ اونٹ جیسے قدآور گھوڑوں کا تعاقب کر رہا ہو۔
بعض نے کہا ہے کہ اَکْسَاء بمعنی اَعْقَاب کے ہے۔ لیکن اصل میں اونٹ کے تیز دوڑانے سے جو غبار اٹھتا ہے اور وہ بلند ہو کر انہیں چھپا لیتا ہے۔ اسے اَکْسَاءٌ کہا جاتا ہے۔ یہاں عَلٰی اَکْسَاءِ اِبِل سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کے لباس کے غبار میں متصل آرہا ہے۔

(ک ش ف)

اَلْکَشْفُ یہ کَشَفْتُ (ض) الثَّوْبَ عَنِ الْوَجْهِ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی چہرہ وغیرہ سے پردہ اٹھانا کے ہیں۔ اور مجازاً غم واندوہ کے دور کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَهٗ اِلَّا ھُوَ (۶۔۱۷) اور اگر خدا تم کو سختی پہنچائے تو اس کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔
فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ (۶۔۴۱) تو جس دکھ کے لئے اسے پکارتے ہو۔۔۔۔ تو اس کو دور کر دیتا ہے۔
لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ ھٰذَا فَکَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ (۵۰۔۲۲) یہ وہ دن ہے کہ اس سے تو غافل ہو رہا تھا۔ اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا۔
اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ (۲۷۔۶۲) بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے۔ اور رکون

قال ابن بری: والصواب ... غبوق وفی اللسان (کسا) ... خیرا وسمین زاہق ... والضیف موہنا
[1] قالہ عمرو بن الاہتم وقبلہ: فبات لنا منہا ... والمعانی للقتبی ۸ ۳۹ سلے قالہ الشلم
انشادہ وبات بدل فبات والبیت من کلمۃ مفضلیۃ رقم ۲۳ بیتًا راجع غبوق الاخبار (۱: ۲۳م ۳) والمعانی ... ا
بن عمرو القنوخی فی اربعۃ ابیات یصف فرس الصموت ومعناہ ہو بہزم اعداءہ فیسوقہم من وراءہم ویطردہم کما یطرد الابل والبیت فی
اللسان (صمت) والمؤتلف للآمدی ۲۰۷ فی خمسۃ ابیات وقد نسب الی بریق بن عیاض النبل (ربقیۃ اشعار الہذلیین ۲۵) الفی روایتہ
الساخیل بدل اکسا خیل وفی روایۃ التبریزی کانہا ابل دجیع ابیل (او المرزوقی ۹۷۴ وفی الجمہرۃ ۶ ونرویہا رجل من تنوخ ۱۲

اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔ اور آیت:۔
یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ (۶۸-۴۲) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا
میں بعض نے کہا ہے کہ یہ قَامَتِ الۡحَرۡبُ عَلٰی سَاقٍ کی طرح کا محاورہ ہے یعنی شدت اور سختی ..... ظاہر ہونے سے کنایہ ہے[1]۔
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں تَذۡمِیۡرُ النَّاقَةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جب کوئی شخص حاملہ اونٹنی کے پیٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر بچہ نکالتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے:۔
کُشِفَ عَنِ السَّاقِ (کہ پنڈلی کھول گئی) تو یہاں بھی صعوبت حال ہی سے کنایہ ہے۔

(ک ش ط)

اَلۡکِشۡطُ (ن) کے معنی کھال اتارنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ (۸۱-۱۱) اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔
یہ کَشَطَ النَّاقَةَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹنی کی کھال اتارنے کے ہیں اور اسی سے اِنۡکَشَطَ رَوۡعُهٗ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی خوف زائل ہونے کے ہیں۔

(ک ظ م)

اَلۡکَظۡمُ اصل میں مَخۡرَجُ النَّفَسِ یعنی سانس کی نالی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
اَخَذَ بِکَظۡمِهٖ اس کی سانس کی نالی کو پکڑ لیا یعنی غم میں مبتلا کر دیا۔
اَلۡکُظُوۡمُ کے معنی سانس رکنے کے ہیں اور خاموش ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ انتہائی خاموشی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے فُلَانٌ لَا یَتَنَفَّسُ کہا جاتا ہے۔ فلاں سانس نہیں لیتا یعنی خاموش ہے۔ کُظِمَ فُلَانٌ اس کا سانس بند کر دیا گیا۔ (مراد نہایت غمگین ہونا) چنانچہ قرآن میں ہے۔
اِذۡ نَادٰی وَهُوَ مَکۡظُوۡمٌ (۶۸-۴۸) کہ انہوں نے خدا کو پکارا اور وہ (غم) غصہ میں بھرے تھے۔
اور کَظۡمُ الۡغَیۡظِ کے معنی غصہ روکنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا۔
وَالۡکَاظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ (۳-۱۳۴) اور غصے کو روکتے۔
اور اسی سے کَظَمَ الۡبَعِیۡرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی اونٹ کا جگالی نہ کرنا کے ہیں۔
کَظَمَ السِّقَاءَ مشک کو پانی سے بھر کر اس کا منہ باندھ دینا تاکہ اس سے پانی نہ نکل سکے۔
اَلۡکِظَامَةُ ترازو کے اس حلقہ کو کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کر کے ترازو کی ڈنڈی کے ساتھ باندھ دی جاتی ہیں۔ (۲) اس تسمہ کو بھی کِظَامَةٌ کہا جاتا ہے جس کو کمان کی تانت کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔
اَلۡکَظَائِمُ واحد کِظَامَةٌ (وہ زمین دوز نالیاں جن کے ذریعہ ایک کنوئیں کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے (تاکہ ایک کا پانی دوسرے میں منتقل ہوتا ہے۔ گویا وہ سانس آنے جانے کی نالیاں ہیں[2]۔

---

[1] کذا قال قتادۃ علیٰ ما فی المشکل للقتبی ۳۰۔ ابو الطبری وروی نحوہ عن ابن عباس ومجاہد وابن جبیر وھو اختیار ابی عبیدۃ واہل اللغۃ کما فی اللسان
[2] وفی الحدیث: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کظامۃ قوم فتوضا ومسح علی قدمیہ انظر الفائق ۲/۲۰۱ وغریب ابی عبید ار ۲۷۸۔

(ر ك ع ب)

كَعْبُ الرِّجْلِ (ٹخنہ) اس ہڈی کو کہتے ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ پر ہوتی ہے قرآن میں ہے: وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (۵-۶) اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو۔

اَلْكَعْبَةُ اصل میں ہر اس مکان کو کہتے ہیں جو ٹخنے کی شکل پر چوکور بنا ہوا ہو اسی سے بیت الحرام کو اَلْكَعْبَةُ کے نام سے پکارا گیا ہے قرآن میں ہے: جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (۵-۹۷) خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبے کو لوگوں کے لئے موجب امن قرار فرمایا۔

ذُوالْكَعَبَاتِ۔ بنو ربیعہ کی عبادت گاہ کا نام جو انہوں نے جاہلیت میں بنائی تھی۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ جَالِسٌ فِي كَعْبَتِهٖ یعنی فلاں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ جو مکعب شکل پر بنا ہوا ہے۔

اِمْرَأَةٌ كَاعِبٌ ابھرے ہوئے پستانوں والی لڑکی۔ اور یہ كِعَابَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی عورت کی چھاتی ابھرنے کے ہیں۔

اور كَاعِبٌ کی جمع كَوَاعِبُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:- وَكَوَاعِبَ اَتْرَابًا (۷۸-۳۳) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔

كَعَبَ الثَّدْيُ كَعْبًا وَكَعَّبَ تَكْعِيبًا (لڑکی کی) چھاتی کا ابھر آنا۔

ثَوْبٌ مُكَعَّبٌ پیٹا ہوا کپڑا جس کی تہ سمٹ اور اکٹھی ہوئی ہو۔ اور سرکنڈے یا نیزے کی دو گرہوں کے درمیان کے حصہ کو بھی تشبیہ کے طور پر کعب ربوں کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح ٹخنہ پنڈلی اور پاؤں کے درمیان فاصل ہوتا ہے اس طرح یہ بھی دو گرہوں کے درمیان فاصل ہوتی ہے۔

(ر ك ف ف)

اَلْكَفُّ۔ کے معنی ہاتھ کی ہتھیلی کے ہیں جس کے ساتھ انسان چیزوں کو اکٹھا کرتا اور پھیلاتا ہے۔

كَفَفْتُهٗ کے اصل معنی کسی کی ہتھیلی پر مارنے یا کسی کو ہتھیلی کے ساتھ مار کر دور ہٹانے اور روکنے کے ہیں پھر عرف میں دور ہٹانے اور روکنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے خواہ ہتھیلی سے ہو یا کسی اور چیز سے[1] رَجُلٌ مَكْفُوْفُ الْبَصَرِ جس کی بینائی جاتی رہی ہو۔ اور آیت کریمہ: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (۳۴-۲۸) اور (اے محمد) ہم نے تم کو گناہوں سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

میں كَآفَّةً کے معنی لوگوں کو گناہوں سے روکنے والا کے ہیں۔ اس میں ہا مبالغہ کے لئے ہے۔ جیسا کہ رَاوِيَةٌ وَعَلَّامَةٌ اور نَسَّابَةٌ۔ میں ہے اور آیت کریمہ:-

قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (۹-۳۶) اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو۔ جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں۔ میں بعض نے دونوں جگہوں میں كَآفَّةً کے معنی کافین یعنی روکنے والے کئے ہیں۔ اور بعض نے یہ معنی کیا ہے۔ کہ جماعۃً یعنی اجتماعی قوت کی وجہ سے اسے كَآفَّةً بھی کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:-

---

[1] کمافی قولہ تعالیٰ: کف ایدی الناس عنکم (الفتح ۲۰) وھوالذی کف ایدیھم عنکم (الفتح ۲۵)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (۲-۲۰۸) مومنو اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ۔ میں بھی كَآفَّةً بمعنی جماعت ہی ہے اور آیت کریمہ۔ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا (۱۸-۴۲) تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

پشیمان ہونے والے کی حالت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ انسان پشیمانی کی حالت میں ہاتھ ملتا ہے۔

تَكَفَّفَ الرَّجُلُ۔ سوال کے لئے ہاتھ پھیلانا

اِسْتَكَفَّ سوال یا مدافعت کیلئے ہاتھ پھیلانا۔

اِسْتَكَفَّ الشَّمْسَ ہتھیلی کے ذریعہ دھوپ کو دفع کرنا اور وہ اس طرح کہ دھوپ کی شعاعوں کو روکنے کے لئے ابروں پر بطور سایہ ہاتھ رکھ لے تاکہ جس چیز کو دیکھنا مطلوب ہو آسانی سے دیکھی جا سکے۔

كِفَّةُ الْمِيْزَانِ ترازو کا پلڑا۔ کیونکہ وہ بھی موزون چیز کو روک لینے میں ہتھیلی کے مشابہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی كُفَّةُ الْحِبَالَةِ ہے[1] جس کے معنی شکاری کے پھندا کے ہیں۔

كَفْكَفْتُ الثَّوْبَ۔ یعنی سلائی کے بعد کپڑے کے اطراف کو سینا۔

(ك ف ت)

اَلْكَفْتُ (ض) کسی چیز کو جمع کر کے اسے قبضہ میں لے لینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا (۷۷-۲۵-۲۶) کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا۔ یعنی زندوں اور مردوں کو۔

یعنی زمین تمام مردوں اور زندوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ احیاء سے مراد انسان حیوان اور نباتات ہیں اور اموات سے جمادات۔ بعض نے "كِفَات" کے معنی تیزی سے اڑنا بھی کئے ہیں لیکن اصل میں اس کے معنی اڑنے کے لئے پروں کو سمیٹنا کے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ (۶۷-۱۹) کیا انہوں نے اپنے سر پر اڑتے جانوروں کو نہیں دیکھا جو پروں کو پھیلائے رہتے ہیں اور سکیڑ بھی لیتے ہیں۔

تو یہاں قبض کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں كِفَاتٌ کا لفظ ہے۔

اَلْكَفْتُ کے معنی تیز ہانکنا بھی آتے ہیں۔ اور قبض کی طرح كَفْتٌ کا لفظ بھی اونٹوں کے ہنکانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قَبَضَ الرَّاعِي الْاِبِلَ کے معنی ان کو تیز ہانکنے کے ہیں۔ اور منتظم چرواہے کو رَاعِيَ قُبْضَةٍ کہا جاتا ہے۔ اور كَفَتَ اللّٰهُ فُلَانًا اِلٰى نَفْسِهِ (اللہ تعالےٰ نے اس کی روح قبض کر لی) قَبَضَهُ کے ہم معنی ہے۔ حدیث میں ہے[2] (۹۸)

اِكْفِتُوْا صِبْيَانَكُمْ بِاللَّيْلِ۔ رات کو اپنے بچوں کو اپنے گھروں میں بند رکھو۔

(ك ف ر)

اَلْكُفْرُ۔ اصل میں کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے

---

[1] وفي الكامل يقال لكل مستطيل كفة (بضم الكاف) ومعناه كفة الحابل ولكل مستدير كفة ومنه كفة الميزان (۳/۸۵) [2] كلمة من حديث طويل عن جابر قال صلى الله عليه وسلم في الآداب والحديث في الفائق (۱/۸۴) والنهاية واللسان (كفت) ۱۲

کے ہیں۔ اور رات کو کافر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشتکار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لیے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔ اور یہ رات یا کسان کے ناموں میں سے نہیں ہے جیسا کہ بعض اہل لغت نے بطور دلیل مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے۔ (الکامل)

(۴۷) اَلْقَتْ ذُکَاءُ یَمِیْنَھَا فِیْ کَافِرٍ

سورج نے اپنا دایاں ہاتھ رات کے اندر ڈال دیا۔ یعنی غروب ہو گیا۔

اَلْکَافُوْرُ۔ اس غلاف کو کہتے ہیں۔ جو پھل کو اپنے آغوش میں چھپائے رکھتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے (الرجز)

(۳۷۵) کَالْکَرْمِ اِذْ نَادٰی مِنَ الْکَافُوْرِ

جیسے انگور غلاف سے ظاہر ہوتا ہے۔

کُفْرٌ یا کفران نعمت کے معنی نعمت کی ناشکری کرکے اسے چھپانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ (۲۱-۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا شریعت حقہ یا نبوات کا انکار ہے۔ پھر کفران کا لفظ زیادہ تر نعمت کا انکار کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکار دین کے معنی میں اور کُفُوْرٌ کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَاَبَی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا کُفُوْرًا (۱۷-۸۹)

تو ظالموں نے انکار کرنے کے سوا اسے قبول نہ کیا۔

فَاَبٰۤی اَکْثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوْرًا (۱۷-۸۹) مگر اکثر لوگوں نے انکار کرنے کے سوا قبول نہ کیا۔

اور فعل کَفَرَ فَھُوَ کَافِرٌ ہر دو معانی کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ معنی کفران کے متعلق فرمایا:۔

لِیَبْلُوَنِیْۤ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ؕ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ (۲۷-۴۰) تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفران نعمت کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے۔ اور جو ناشکری کرتا ہے۔ تو میرا پروردگار بے پروا (اور) کرم کرنے والا ہے۔

لہ قالہ ثعلبہ بن صعیر المازنی یصف ناقتہ وشبہ عیبتہ والقیان بریش جناحی الظلیم حین یکون معارضاً لنعامة رالحین بینہما عند غروب الشمس وصدرہ فتذکر ثقلا رثید ابعد ما . . . . . والبیت فی الطبری (۱: ۱۱۱) والطبرسی (۲: ۹۵) واللسان ذلل اثر ذکا، کفر یدی) وتہذیب اصلاح المنطق (۱: ۴۸) والاصلاح ۴۱۷ والحصری (۴: ۱۲۳) والشعراء ر ۵۷ اوالکنز اللغوی ۱۵ والاشتقاق ۳۵۱، ۸۰ اوفی الامالی (۲: ۴۲) غیرمنسوب ونسبۃ فی السمط ۷۶۹ مع البیتین دفی روایۃ المفضلیۃ ۱۵۲ فتذکرت بمل فتذکرا والبیت ایضاً فی ذیل الصناعتین ۱۸۵ وابن ولاد ۹۵ وتہذیب الالفاظ ۳۸۷ وابدال ابی الطیب (۱: ۵۷) وابدال یعقوب ۵۱ وشرح السبع لابن الانباری ومبادی اللغۃ للاسکافی ۱۱ والعجز فقط فی نظام الغریب ۸۵ اوالمعانی للقتبی ۳۵۸ وہو من قصیدۃ فی منتہی الطلب (۱: ۱۶۱-۱۶۲) والمفضلیۃ ۲۴ التی مطلعہا: بل عند عمرۃ من نبات . . . . . والرثید معناہ المنضید فانہم یذکرون ان النعامۃ تضع بیضہا طولا وعرضاً علی خط وسطر کما فی الحیوان (۴: ۳۲۸) وعیون الاخبار (۲: ۸۷-۸۸) والبیت ایضاً فی الحیوان ۵: ۱۳۱ والمخصص ۹/۱۹، ۱۷/۹ والحصری (۴: ۱۵) والباقلانی فی اعجازہ ۲۰۰ ٭ لہ قالہ العجاج ذبلہ غار تبی نظرالناظور۔ بناحم یعکف او منشور راجع اللسان (۱۲: ۱۱۲) والعمدۃ (۱: ۲۶۷) ومبادی اللغۃ ۱۷۸ ومشکل القرآن للقتبی ۱۰۰ ودیوانہ ۲۷

وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۲-۱۵۲) اور میرا احسان مانتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔
اور آیت کریمہ:۔
وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶-۱۹) اور تم نے ایک اور کام کیا تھا جو کیا۔ تم ناشکرے معلوم ہوتے ہو۔
کے معنی یہ ہیں کہ تم نے قصداً میری نعمت کی ناشکری کی ہے۔
لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (۱۴-۷) اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب بھی سخت ہے۔
اور کفران نعمت چونکہ انکارِ نعمت کو مقتضی ہے اس لئے یہ مطلقاً انکار کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ (۲-۴۱) اور اس سے منکر اول نہ بنو۔
تو یہاں کافر بمعنی جاحد (منکر) کے ہے اور کافر علی الاطلاق یعنی بلا تقیید عرف میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، شریعت اور نبوت میں سے کسی ایک یا تینوں کا منکر ہو۔ اور کبھی کَفَرَ کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جو شریعت کے کسی حکم میں خلل اندازی کرتا ہو یا اللہ تعالیٰ کی اس طرح شکر گزاری نہ کرتا ہو جیسے کرنا چاہیئے۔ چنانچہ آیت:۔
مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ (۳۰-۴۴) تو جس نے کفر کیا۔ اس کے کفر کا ضرر اسی پر ہے۔
میں کفر کے معنی شریعت کے حکم میں خلل اندازی کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل آیت:۔
وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ (۳۰-۴۴) اور جس نے نیک عمل کئے تو ایسے لوگ اپنے ہی لئے آرام گاہ درست کرتے ہیں۔
سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز فرمایا:۔
وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۶-۸۳) اور یہ اکثر ناشکرے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ (۲-۴۱) اور اس سے منکر اول نہ بنو۔
کے معنی یہ ہیں کہ تم ائمہ کفر نہ بنو کہ دوسرے لوگ اس میں تمہاری اقتدار کریں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (۲۴-۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔
میں مَنْ كَفَرَ سے حقوق الٰہی کو چھپانے والے لوگ مراد ہیں یہی وجہ ہے کہ انہیں فاسق کہا ہے کیونکہ کفر مطلق فسق سے اعم ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص حق باری تعالیٰ میں جحود سے کام لے گا تو وہ اپنے اس ظلم کے سبب اطاعت الٰہی سے خارج سمجھا جائیگا۔
پھر جس طرح ہر اچھے کام کو ایمان قرار دیا گیا ہے اسی طرح ہر برے کام کو کفر شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سحر کے متعلق فرمایا:۔
وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲-۱۰۲) اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے۔
اور آیت اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا کے بعد فرمایا:۔
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ۔ (۲-۲۷۶)

کہ اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ اور اسی طرح آیت وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ کے آخر میں فرمایا:۔

وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۳-۹۷) اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو خدا بھی اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

اَلْکَفُوْرُ (مبالغہ) کے معنی انتہائی درجہ کے ناسپاس کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ (۲۲-۶۶) اور انسان تو بہت ناشکرا ہے۔

ذٰلِکَ جَزَیْنٰھُمْ بِمَا کَفَرُوْا وَھَلْ نُجٰزِیْٓ اِلَّا الْکَفُوْرَ (۳۴-۱۷) یہ ہم نے ان کی ناشکری کی ان کو سزا دی۔ اور ہم سزا ناشکرے ہی کو دیا کرتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں انسان کو کفورٌ بصیغہ مبالغہ کہا ہے۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "اِنَّ" و لام تاکید لاکر کلام کو اور بھی زور دار بنا دیا گیا ہے حالانکہ دوسرے مقام پر آیت:۔

وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ (۴۹-۷) اور کفر سے تم کو بیزار کر دیا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کفر سے طبعی نفرت ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ میں "کفورٌ" کفر سے نہیں ہے۔ بلکہ کفران نعمت سے ہے پس آیت میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ ناسپاسی اور شکر گزاری سے غفلت برتنا انسان کا فطرتی خاصہ ہے۔ اور آیت:۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ (۸۰-۱۷) انسان ہلاک ہوجائے کیسا ناشکرا ہے۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اسی لئے دوسرے مقام پر فرمایا:۔

وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (۳۴-۱۳) اور میرے بندوں سے شکر گزار تھوڑے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا۔ (۷۶-۳) اور اسے رستہ بھی دکھا دیا (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔

میں بھی متنبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو (ہدایت اور گمراہی کے) راستے بتا دیئے ہیں جیسا کہ آیت:۔

وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (۹۰-۱۰) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

سے معلوم ہوتا ہے اب کوئی شکر گزاری کے رستہ پر گامزن ہے اور کوئی ناشکری کی راہ پر اور آیت:۔

وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا (۱۷-۲۷) اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے۔

میں کفورٌ کفر سے ہے اور آیت میں کَانَ کے لفظ سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اس نے جنم ہی کفر پر لیا ہے۔

اَلْکَفَّارُ۔ اس میں کفور سے بھی زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیْدٍ (۵۰-۲۴) ہر سرکش ناشکرے کو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کَاذِبٌ کَفَّارٌ۔ (۳۹-۳) بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے، ہدایت نہیں دیتا۔

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ (۲-۲۷۶) اور خدا کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔

اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا (۷۱-۲۷) وہ بھی بدکار اور ناشکرے

گزار ہوگی۔

اور کبھی کَفَّار بمعنی کفور بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا۔
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴-۳۴) بیشک انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

کُفَّارٌ اور کَفَرَۃٌ دونوں کافِرٌ کی جمع ہیں۔ لیکن پہلی جمع تو عام طور پر مومنین کے بالمقابل استعمال ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔
اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (۴۸-۲۹) وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں۔
لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۴۸-۲۹) تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

اور دوسری بمعنی کفرانِ نعمت کے آتی ہے۔ جیسا کہ آیت:۔
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (۸۰-۴۲) یہ لوگ کفار بدکردار ہیں۔

میں آپ نہیں دیکھتے کہ کَفَرَۃٌ کی صفت فَجَرَۃٌ لائی گئی ہے اور فَجَرَۃٌ فاسق مسلمان کو بھی کہا جاتا ہے (تو معلوم ہوا کہ یہاں کَفَرَۃٌ سے مراد ناشکرے ہی ہیں اور آیت:۔
جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ (۵۴-۱۴) یہ سب کچھ اس شخص کے انتقام کے لئے کیا گیا۔ جس کو کافر مانتے نہ تھے۔

میں لِمَنْ كَانَ كُفِرَ سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے خلفاء مراد ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں لوگوں کو نصیحت کی لیکن ان کی دعوت پر کسی نے بھی کان نہ دھرا۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا (۴-۱۳۷) جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوگئے۔ پھر ایمان لائے پھر کافر ہوگئے۔

کے بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اولاً موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کفر کیا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے مگر ان کے بعد آنے والے پیغمبر کے ساتھ کفر کیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا پھر انہی کے ساتھ کفر کرنا مراد ہے۔ کیونکہ ان کا کسی دوسرے پر تو ایمان لانا ثابت نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ آیت:۔
وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ (۳-۷۲) اور اہل کتاب ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ (جو) کتاب مومنوں پر نازل ہوئی اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو اور اس کے آخر میں انکار کر دیا کرو۔

کی طرح ہے۔ اور اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ دو دفعہ ایمان لائے اور پھر دوبارہ ہی کفر کیا بلکہ اس سے ان کی مختلف حالتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جس طرح فضائل میں ترقی کے تین درجات ہیں اسی طرح رذائل میں بھی انحطاط کے تین درجے ہیں۔ اور آیت کریمہ میں انہی درجات کی طرف اشارہ ہے۔ اس مفہوم کو ہم نے اپنی کتاب "الذریعة" میں خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

کَفَرَ فُلَانٌ کے معنی اعتقاد کفر کے بھی ہوتے ہیں اور محض زبان سے اظہار کفر کے بھی۔ خواہ دل سے اس کا معتقد نہ ہو۔ اسی لئے فرمایا:۔
مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (۱۶-۱۰۶)

جو شخص ایمان کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

کَفَرَ فُلَانٌ بِالشَّیْطَانِ ۔ کے معنی شیطان کی وجہ سے کفر کرنے کے ہیں۔ اور کبھی اس کا معنی شیطان کے ساتھ کفر کرنا بھی آجاتے ہیں چنانچہ فرمایا۔
فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ (۲-۲۵۶) تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے۔

اَکْفَرَہٗ اِکْفَارًا کے معنی کسی پر کفر کا فتویٰ لگانے کے ہیں۔
اور کبھی کفر کے معنی کسی سے بیزار ہونا بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔
ثُمَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ الآیۃ (۲۹-۲۵) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے کی دوستی سے انکار کردو گے۔
اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (۱۴-۲۲) میں تو اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ تم پہلے مجھے شریک بناتے تھے۔ اور آیت کریمہ:۔
کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ (۵۷-۲۰) اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش کہ اس سے کھیتی (اگتی اور) کسانوں کو بھلی لگتی ہے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ کُفَّار سے کسان مراد ہیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتے ہیں جیسا کہ کافر اللہ تعالیٰ کے حق کو چھپا لیتے ہیں چنانچہ آیت:۔
یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِہِمُ الْکُفَّارَ (۴۸-۲۹) اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔
بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ بارش کی روئیدگی سے خوش ہونا کافر کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ ہر کاشتکار اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر
بعض نے کہا ہے کہ یہاں بھی کُفَّار سے کافر ہی مراد ہیں اور ان کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ وہ دنیا اور اس کے ساز و سامان پر خوش اور اس کی طرف مائل رہتے ہیں۔[۲]

اَلْکَفَّارَۃُ ۔ جو چیز گناہ دور کر دے اور اسے ڈھانپ لے اسے کَفَّارَۃ کہا جاتا ہے۔ اسی لئے کَفَّارَۃُ الْیَمِیْنِ ہے چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔
ذٰلِکَ کَفَّارَۃُ اَیْمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ (۵-۸۹) یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسمیں کھا لو۔
فَکَفَّارَتُہٗ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسَاکِیْنَ (۵-۸۹) تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے۔
اسی طرح دوسرے گناہ جیسے قتل، ظہار وغیرہ کے تاوان پر بھی کفارہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اَلتَّکْفِیْرُ اس کے معنی بھی گناہ کو چھپانے اور اسے اس طرح مٹا دینے کے ہیں جیسے اس کا ارتکاب ہی نہیں کیا۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ اصل میں ازالۃ الکفر یا کفران سے ہو جیسے تَمْرِیْض کے معنی ازالہ مرض کے آتے ہیں۔ اور تَقْذِیَۃ کے معنی ازالہ قذی یعنی تنکا دور کرنے کے۔
چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَوْ اَنَّ اَہْلَ الْکِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَکَفَّرْنَا عَنْہُمْ سَیِّاٰتِہِمْ (۵-۶۵) اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے۔
نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ (۴-۳۱) تو ہم تمہارے سے

رچھوٹے چھوٹے گناہ معاف کردینگے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱-۱۱۴)
کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کردیتی ہیں۔
میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے مگر
بعض نے کہا ہے کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں بڑے
گناہوں کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔

لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ (۳-۱۹۵) میں
ان کے گناہ دور کردوں گا۔

لِيُكَفِّرَ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا
(۳۹-۳۵) تاکہ خدا ان سے برائیوں کو جو انہوں
نے کیں دور کردے۔ محاورہ ہے:۔
كَفَرَتِ الشَّمْسُ النُّجُومَ سورج نے ستاروں کو چھپالیا۔
اور اس بادل کو بھی کافر کہا جاتا ہے جو سورج کو
چھپالیتا ہے۔ تَكَفَّرَ فِي السِّلَاحِ اس نے ہتھیار
پہن لئے۔

اَلْكَافُورُ۔ اصل میں پھلوں کے غلاف کو کہتے
ہیں جو ان کو اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے شاعر
نے کہا ہے[1] (الرجز)

(۳۷۵) كَالْكَرْمِ إِذْ نَادَى مِنَ الْكَافُورِ

جیسے انگور شگوفہ کے غلاف سے ظاہر ہوتے ہیں۔
لیکن کافور ایک مشہور خوشبو ...... کا بھی نام
ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا (۷۶-۵) جس میں کافور
کی آمیزش ہوگی۔

(ک ف ل)

اَلْكَفَالَةُ: ضمانت کو کہتے ہیں اور تَكَفَّلْتُ
بِكَذَا کے معنی کسی چیز کا ضامن بننے کے ہیں۔

اور كَفَّلْتُهُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں نے اسے
فلاں کی کفالت میں دے دیا۔ قرآن میں ہے:۔
وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا (۳-۳۷) اور زکریا کو اس
کا متکفل بنایا۔

بعض نے كَفَلَ تخفیف فاء کے ساتھ پڑھا
ہے[2]۔ اس صورت میں اس کا فاعل زکریا علیہ السلام
ہوں گے یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے ان
کو اپنی کفالت میں لے لیا۔

(ا) أَكْفَلَهَا زَيْدًا اسے زید کی کفالت میں دیدیا)
قرآن میں ہے:۔
أَكْفِلْنِيهَا (۳۸-۲۳) یہ بھی میری کفالت میں دے
دو (میرے سپرد کردو)۔

اَلْكِفْلُ: اصل میں بقدر ضرورت حصہ کو کہتے
ہیں۔ گویا وہ انسان کی ضروریات کا ضامن ہوتا
ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا (۱۶-۹۱)
اور تم خدا کو اپنا کفیل بنا چکے ہو۔

اور اَلْكِفْلُ کے معنی بھی اَلْكَفِيلُ یعنی حصہ
کے آتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔
يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ (۵۷-۲۸) وہ
تمہیں اپنی رحمت سے اجر کے دو حصے عطا فرمائیگا۔
یعنی دنیا اور عقبیٰ دونوں جہانوں میں تمہیں اپنے
انعامات سے نوازے گا۔ اور یہی دو قسم کی نعمتیں
ہیں جن کے لئے آیت رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا
حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (۲-۲۰۱) کہ
پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور
آخرت میں بھی نعمت بخشیو۔ میں اللہ تعالیٰ
سے دعا کی جاتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں

---

[1] راجع فی العنوان نفسہ [2] وہی قراءۃ معظم السبعۃ وقراءۃ التشدید ہی قراءۃ الکوفیین عاصم وحمزۃ والکسائی (ابو حیان ۲/۴۴۲)

"کِفْلَیْن" سے دو نعمتیں مراد نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے پیہم اور کفایت کرنے والی نعمت مراد ہے۔ اور تثنیہ کا لفظ لَبَّیْکَ وَ سَعْدَیْکَ کی طرح تاکید معنوی کے لئے ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴-۸۵) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔

پس کِفْلٌ کے معنی کافی حصہ کے نہیں ہے بلکہ استعارةً اس سے حقیر چیز مراد لی ہے۔ اور یہ اس کفل سے مشتق ہے جس کے معنی کوہے کے پچھلے حصہ کے ہوتے ہیں۔ چونکہ اس حصہ پر سواری تکلیف دہ ہوتی ہے اس لئے عرف میں کِفْل بمعنی شدت استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ سِیْسَاءٌ کا لفظ ہے کہ اصل میں اس کے معنی گدھے کی پشت پر کی ابھری ہوئی ہڈی ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔

لَاَحْمِلَنَّكَ عَلَى الْكِفْلِ اَوْ عَلَى السِّیْسَاءِ اَوْ لَاُرْكِبَنَّكَ الْحَسْوٰی یعنی میں تمہیں سخت تکلیف پہنچاؤنگا۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۳۷۷) وَحَمَلْنَاهُمْ عَلٰی صَعْبَةٍ زَوْ
رَاءَ یَعْلُوْنَهَا بِغَیْرِ وِطَاءٍ

اور ہم نے ان کو نہایت تند اور ٹیڑھی حالت کی ننگی پشت پر سوار ہونے پر مجبور کر دیا۔

پس آیت (۴-۸۵) کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی اچھے کام میں دوسرے کا شریک کار ہوگا تو اسے بھی اس سے حصہ ملے گا۔ اور اگر کوئی شخص برے کام میں دوسرے کی مدد کرے گا تو اسے بھی اس کے انجامِ بد سے دوچار ہونا پڑے گا۔

بعض کے نزدیک اس آیت میں بھی کِفل بمعنی کفیل ہی ہے اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ جو شخص شر یعنی برائی کا جویا ہوگا تو وہ برائی اس پر کفیل ہوگی۔ جو اس سے بازپرس کرے گی۔ جیسا کہ محاورہ ہے:۔

مَنْ ظَلَمَ فَقَدْ اَقَامَ كَفِیْلًا بِظُلْمِهٖ کہ جس نے ظلم کیا تو اس نے اپنے اوپر ظلم سے کفیل کھڑا کر دیا چنانچہ آیت مذکورہ میں تنبیہ کی ہے کہ برائی میں دوسرے کی مدد کرنے والا کبھی بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

(ک ف ء)

اَلتَّكَافُؤُ کے معنی مرتبہ اور منزلت میں دوسرے کا ہم پلہ ہونے کے ہیں اسی سے كِفَاءٌ کپڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو اس جیسے دوسرے ٹکڑے کے ساتھ ملا کر خیمہ کے پچھلی طرف ڈال دیا جاتا ہے اور اسی سے نکاح یا لڑائی میں ہمسر دل کے متعلق کہا جاتا ہے فُلَانٌ كُفُوٌ لِفُلَانٍ فلاں اس کا ہمسر ہے قرآن میں ہے۔

وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲-۴) اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اسی سے مُکَافَاۃٌ ہے جس کے معنی کسی کام میں دوسرے کے بالمقابل ہونے کے ہیں نیز محاورہ ہے:۔ فُلَانٌ كُفُوٌ لَكَ فلاں دشمنی میں تیرا ہم پلہ ہے۔

---

[1] قالہ ابو زبید الطائی وقدمر تخریجہ فی (عتب)

اَلْاِکْفَاءُ کے معنی کسی چیز کو الٹا کر دینے کے ہیں گویا اس میں مساوات کو دور کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور اسی سے اِکْفَاءٌ فِی الشِّعْرِ ہے جس کے معنی قصیدہ میں حرف روی کے مختلف ہونے کے ہیں۔ مُکْفَأُ الْوَجْہِ اَوْ کَفِیُّ الْوَجْہِ متغیر رو آدمی۔ کَفَأٌ۔ اونٹوں کی ناقص پیدائش۔ محاورہ ہے:۔

جَعَلَ فُلَانٌ اِبِلَہٗ کَفْأَتَیْنِ۔ اس نے اپنے اونٹوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی ایک سال ایک حصہ سے نسل لیتا ہے اور دوسرے سال دوسرے سے۔

(ک ف ی)

اَلْکِفَایَۃُ: وہ چیز جس سے ضرورت پوری اور مراد حاصل ہو جائے۔ قرآن میں ہے:۔

وَکَفَی اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ (۳۳-۲۵) اور خدا مومنوں کے لئے جنگ کی ضروریات کے سلسلہ میں کافی ہوا۔

اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِءِیْنَ (۱۵-۹۵)۔ ہم تمہیں ان لوگوں کے شر سے بچانے کے لئے جو تم سے استہزاء کرتے ہیں کافی ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا (۴۸-۹) اور حق ظاہر کرنے کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بازائدہ ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی گواہ ہونے کے لئے کافی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ با اصلی ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ گواہ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ پر ہی اکتفاء کرو۔ اَلْکُفْیَۃُ مِنَ الْقُوْتِ غذا جو گذارہ کے لئے کافی ہو۔ ج کُفًی محاورہ ہے۔

کَافِیْکَ فُلَانٌ مِّنْ رَّجُلٍ یعنی فلاں شخص تمہارے لئے کافی ہے اور یہ حَسْبُکَ مِنْ رَّجُلٍ کے محاورہ کے ہم معنی ہے۔

(ک ل ل)

کُلٌّ کا لفظ کسی شے کے اجزاء کو یک جا کرنے پر بولا جاتا ہے اور یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) کبھی اس سے کسی چیز کی ذات اور اس کے احوال خصوصی کا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔ اور لفظاً تمام کے معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ (۱۷-۲۹) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو)

شاعر نے کہا ہے[1] (   )

(۳۷۸) لَیْسَ الْفَتٰی کُلَّ الْفَتٰی۔ اِلَّا الْفَتٰی فِیْ اَدَبِہٖ

یعنی کامل جوانمرد تو وہی ہو سکتا ہے جو ادب میں کامل ہو۔

(۲) کبھی اس سے کئی چیزوں کا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔

---

[1] قالہ ابو محمد الیزیدی یحییٰ بن المبارک بن العدوی التوفی ۲۰۲) وسمی الیزیدی لصحبتہ بزید بن منصور خال المہدی وکان شاعراً فصیحاً نحویاً ربیب ابی عمرو بن العلاء وفی النحو واللغۃ والغریب والقراءۃ اجعل الرشید المامون ابنہ فی حجرہ ولہ فی ہجو الاصمعی ابیات منہا اَبِنْ لی دعی بن اصمعی متی کنت فی الاسرۃ الفاضلۃ ومنہا رأیت قریب الاصمعی کثیراً تواضحکہ شاملۃ والبیت فی المواعظ فی ثمانیۃ ابیات وبعدہ: ولبعض اخلاق الفتیٰ اولیٰ بہ من نسبہ۔ راجع للبیت المعجم للمرزبانی ۴۸۷ وروضۃ العقلاء ۱۹۸ بغیر عزو ولاحوال الشاعر الانساب ۵۹۹ - ۶۰۰ وابن خلکان ۷۷۰ والیافعی (۲: ۳ - ۷) والبغیہ للسیوطی ۴۱۴، وطبقات زبیدی ۲۱ وطبقات ابن المعتز ۲۷۳ - ۲۷۶ ونزہۃ الالباء لابن الانباری ۱۰۴ - ۱۱۰)

اس صورت میں کبھی تو یہ جمع معرف باللام کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسے :-

كُلُّ الْقَوْمِ ۔ (پوری قوم) اور کبھی جمع معرف باللام کی ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے ۔ جیسے قرآن میں ہے ۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (۱۵-۳۰) تو فرشتے سب کے سب سجدہ میں گر پڑے ۔

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹-۳۳) تاکہ اس (دین) کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (۱۹-) اور سب قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے ۔

اور کبھی نکرہ مفردہ کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسے فرمایا : ۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ اور ہم نے ہر انسان (کے اعمال کو بصورت کتاب اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے (۱۷-۱۳) وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶-۱۰۲) اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے ۔

وغیر ذالک من الآیات : ۔

اور کبھی بغیر اضافت کے استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کا مضاف الیہ مقدر ہوتا ہے ۔

چنانچہ فرمایا : ۔

كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶-۴۰) اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں ۔

وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ (۲۷-۸۷) اور سب اس کے پاس عاجز ہو کر چلے آئیں گے ۔

وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ (۲۱-۷۲) اور سب کو نیک بخت کیا ۔

وَكُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (۲۱-۸۵) یہ سب صبر کرنے والے تھے ۔

ان کے علاوہ اور بھی اس نوع کی بہت سی آیات ہیں ۔ اور قرآن پاک اور فصحاء عرب کے کلام میں کہیں بھی یہ لفظ معرف باللام یعنی اَلْكُلُّ استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ محض متکلمین، فقہا اور دیگر علمائے فن کی اصطلاح ہے ۔

اَلْكَلَالَةُ باپ اور اولاد کے علاوہ جو وارث بھی ہو وہ كَلَالَةٌ ہے ۔

ابن عباسؓ کا قول ہے کہ كَلَالَةٌ ہر اس وارث کو کہتے ہیں، جو اولاد کے علاوہ ہو ۔ ایک روایت میں ہے[2] کہ آنحضرت ؐ سے "كَلَالَةٌ" کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا ۔ من مات ولیس له ولدٌ ولا والدٌ کہ كَلَالَةٌ ہر اس میت کو کہتے ہیں جس کا باپ اور اولاد زندہ نہ ہوں ۔ اس حدیث میں آنحضرتؐ نے خود میت کو کو کلالہ قرار دیا ہے اور کلالہ کے یہ دونوں معنی صحیح ہیں کیونکہ كَلَالَةٌ مصدر ہے جو وارث اور موروث دونوں پر بولا جاسکتا ہے گویا کلالہ کو کلالہ یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ سلسلہ نسب اس تک ...... پہنچنے سے عاجز ہو گیا ہے اور یا اس لئے کہ وہ نسب کسی ایک جانب یعنی جانب اصل یا جانب فرع سے اس کے ساتھ بالواسطہ پہنچتا ہے اور یہ (یعنی دو احتمال) اس لئے ہیں کہ نسبی تعلق دو قسم پر ہے ۔ انتساب[1] بالعمق (یعنی براہ راست تعلق) جیسے باپ بیٹے کا باہمی تعلق ۔ نسبت[2] بالعرض یعنی بالواسطہ

[1] راجع الآیات (۴-۱۳) (۴-۱۷۷) [2] وفی الطبری من قول ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما ولم یثبت عندی مرفوعًا و فی کنز العمال ۱۱ (۲۴۷-۷۷) لبعض آثار الصحابۃ فلیراجع الیہ ۱۲

جیسے بھائی یا چچا کے ساتھ رشتے کی نسبت۔ قطرب کا قول ہے کہ والدین اور بھائی کے علاوہ باقی رشتہ داروں کو "کَلَالَۃ" کہا جاتا ہے لیکن یہ قول بلا دلیل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کَلَالَۃ کا لفظ ہر واسطہ پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (مجزوء الکامل)

(۳۷۹) وَالْمَرْءُ یَبْخَلُ بِالْحُقُوقِ
وَلِلْکَلَالَۃِ مَا یُسِیْمُ

انسان حقوق کی ادائیگی میں بخل کرتا ہے حالانکہ اس کا تمام مال اس کے وارثوں کے لئے ہے۔

یُسِیْمُ اَسَامَ الْاِبِلَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی اونٹوں کو چراگاہ میں لے جانے کے ہیں مگر لفظ "کَلَالَۃ" سے شاعر نے وہ معنی مراد نہیں لئے جو اس شارح نے سمجھے ہیں بلکہ شاعر کی مراد یہ ہے کہ انسان کو مال جمع کرنے میں زہد سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ کلالہ کے لئے ترکِ مال اولاد کے لئے ترکِ مال سے بڑھ کر شاق ہوتا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جن کے لئے تم مرتے وقت مال چھوڑ رہے ہو وہ بمنزلہ کلالہ کے ہیں جیسے تم کہو۔ مَا تَجْمَعُہٗ فَھُوَ لِلْعَدُوِّ۔ تم جو جمع کرتے ہو وہ تمہارے دشمن کا ہے۔ اور اہل عرب کے ہاں محاورہ ہے:۔

لَمْ یَرِثْ فُلَانٌ کَلَالَۃً فلاں آدمی کلالہ کا وارث نہیں ہے۔ اور یہ اس شخص کے حق میں کہتے ہیں جو اپنے باپ سے کسی مال کا وارث ہو۔ شاعر نے کہا ہے[2] (البسیط)

(۳۸۰) وَرِثْتُمْ قَنَاۃَ الْمُلْکِ غَیْرَ کَلَالَۃٍ
عَنِ ابْنَیْ مُنَافٍ عَبْدِ شَمْسٍ وَّھَاشِمٍ

تمہیں عبدمناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے حکومت کا ورثہ ملا ہے۔ اور تم اسکے مستحق ہو۔

اَلْاِکْلِیْلُ کے معنی تاج کے ہیں۔ اور تاج کا نام اکلیل اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ سر پر محیط ہو جاتا ہے۔ محاورہ ہے:۔

کَلَّ الرَّجُلُ فِیْ مِشْیَتِہٖ کَلَالًا۔ انسان کا چلنے سے عاجز ہو جانا۔

کَلَّ السَّیْفُ عَنْ ضَرِیْبَتِہٖ کُلُوْلًا وَّکِلَّۃً۔ تلوار کا نشانہ پر نہ لگنا۔

کَلَّ اللِّسَانُ۔ زبان کا کلام سے عاجز ہو جانا۔

اَکَلَّ فُلَانٌ کسی کی سواری کا تھک جانا۔

اَلْکَلْکَلُ سینہ کو کہتے ہیں۔ نیز ہر چیز کا اگلا حصہ۔

کِلَا

کِلَا تثنیہ کے معنی دیتا ہے جیسا کہ کُلٌّ جمع کے لئے آتا ہے۔ یہ چونکہ لفظاً مفرد اور معنیً تثنیہ ہوتا ہے اس لئے اسے کبھی مفرد اور کبھی تثنیہ تصور کر لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَا اَوْ کِلٰھُمَا (۱۷-۲۳) اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ کِلَا کا مؤنث کِلْتَا ہے۔

---

[1] قالہ زید بن الحکم الثقفی یعظ ابنہ بسنا والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی ۱۱۹۵ من قصیدۃ فی ۲۳ بیتا والابیات قصۃ انظر الاغانی (۱۱: ۹۶-۱۰۲) والخزانۃ (۱: ۱۱۱) [2] قالہ الفرزدق والخطاب لسلیمان بن عبدالملک والبیت فی اللسان (کلل) فی روایۃ "لاعن" بدل عیر ... ۃ انجبل قناۃ الملک وفی روایۃ الکامل (۳: ۲۳۶) اول البیت بمعد نلتم ثیاب المجد فی ابو سکم والبیت فی الاشباہ (۳: ۷۰) والبحر (۳: ۱۸۸) والسیوطی ۳۲

جب یہ اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوں تو احوالِ ثلاثہ میں ان کا الف بحالہ باقی رہتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی مگر جب اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوں تو حالت رفعی میں بحالہ باقی رہتا ہے اور نصبی اور جری حالت میں ی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے:۔
جَاءَنِیْ کِلَاھُمَا رَأَیْتُ کِلَیْھِمَا، مَرَرْتُ بِکِلَیْھِمَا اور مؤنث کے لئے کِلْتَا آتا ہے۔
قرآن میں ہے:۔
کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَھَا (۱۸-۳۳)
دونوں باغ کثرت سے پھل لائے۔

(ک ل ء)

اَلْکِلَاءَۃُ کے معنی کسی چیز کی حفاظت کرنے اور اسے باقی رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
کَلَأَکَ اللّٰہُ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں محفوظ رکھے گا
بَلَغَ بِکَ اَکْلَأَ الْعُمُرِ تمہیں انتہائی عمر تک بحفاظت پہنچائے۔
اِکْتَلَأْتُ بِعَیْنِیْ کَذَا میں نے بذات خود فلاں چیز کی نگرانی کی قرآن میں ہے:۔
قُلْ مَنْ یَّکْلَؤُکُمْ بِاللَّیْلِ الْاٰیۃِ (۲۱-۴۲)
کہو کہ رات اور دن میں خدا سے تمہاری کون حفاظت کر سکتا ہے۔
اَلْمُکَلَّأُ (گودی) ہر وہ مقام جہاں کشتیوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔
اَلْکَلَّاءُ۔ بصرہ میں ایک مقام کا نام ہے کیونکہ وہاں کشتیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے لے جاتے تھے اور کَالِیٌٔ کے معنی ادھار کے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے (۱۰۳) کہ آنحضرت نے بَیْعُ الْکَالِیِٔ بِالْکَالِیِٔ یعنی ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا۔
اَلْکَلَأُ۔ اس گھاس کو کہتے ہیں جسے محفوظ کر لیا گیا ہو۔ اور ہر وہ مقام جہاں گھاس زیادہ ہو اسے مَکْلَأٌ یا مَکَانٌ کَالِیٌٔ کہا جاتا ہے۔

(ک ل ب)

اَلْکَلْبُ (کتا) بھونکنے والا جانور۔ اس کی مؤنث کَلْبَۃٌ اور جمع اَکْلُبٌ وَکِلَابٌ آتی ہے کبھی اس کی جمع کَلِیْبٌ بھی آجاتی ہے۔
کَمَثَلِ الْکَلْبِ (۷-۱۷۶) تو اس کی مثال کتے کی سی ہے۔
وَکَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ (۱۸-۱۸) اور ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔
اور اسی سے اَلْکَلَبُ (بفتح اللام) مشتق ہے۔ جس کے معنی شدتِ حرص کے ہیں۔ اسی سے کہا جاتا ہے:۔
ھُوَ اَحْرَصُ مِنْ کَلْبٍ۔ وہ کتے سے زیادہ حریص ہے اور رَجُلٌ کَلِبٌ کے معنی سخت حریص آدمی کے ہیں اور کَلْبٌ کَلِبٌ باؤلا کتا جسے

لہ اخرجہ الدارقطنی من حدیث ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وصححہ الحاکم علی شرط مسلم لکن اہل الحدیث یوھنون ہذا الحدیث وایضًا فی الطبرانی من حدیث رافع بن خدیج کما فی نیل الاوطار ۵/ ۲۴، وایضًا رک اہق عنہ کنز العمال ۴/ رقم ۱۳۱۴ والحدیث فی الفائق ۲/ ۲۰۶ وغریب ابی عبید (۱: ۲۰) واللسان والنہایۃ (کلأ)

انسان کا گوشت کھانے کا چسکا لگ جاتا ہے۔ اور جسے وہ کاٹ کھائے اُسے بھی ہڑکائے کتے جیسا مرض لاحق ہو جاتا ہے مفرد کے لئے رجل کلب اور جمع کے لئے قَوْمٌ كَلْبٰى کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۳۸۱) دِمَاءُهُمْ مِنَ الْكَلَبِ الشِّفَاءُ

ان کے خون کَلَب کی مرض سے شفا بخشتے ہیں۔

اور کبھی یہ مرض اونٹ کو بھی لاحق ہو جاتا ہے چنانچہ أَكْلَبَ الرَّجُلُ کے معنی باؤلے اونٹ کا مالک ہونے کے ہیں۔

كَلِبَ الشِّتَاءُ سردی سخت ہو گئی گویا وہ کتے کی طرح باؤلی ہو گئی ہے۔ دَهْرٌ كَلِبٌ سخت زمانہ۔ أَرْضٌ كَلِبَةٌ۔ اس زمین کو کہتے ہیں جو سیراب نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو جائے جیسا کہ باؤلا آدمی پانی نہ پینے کی وجہ سے آخر کار سوکھ کر رہ جاتا ہے۔ اَلْكَلَّابُ وَالْمُكَلِّبُ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو کتوں کو شکار کے لئے سدھاتا اور انہیں تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ (۵۔۴) اور وہ شکار بھی حلال ہے جو تمہارے لئے ان شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔

أَرْضٌ مُكْلِبَةٌ۔ بہت کتوں والی سرزمین۔ اَلْكُلَّابُ وَالْكَلْبُ میخ جو تلوار کے قبضہ میں لگی ہوتی ہے۔

اَلْكُلْبَةُ۔ توشہ دان باندھنے کے تسمہ سے نیچے کا تسمہ جس سے اسے سیا جاتا ہے۔ اس کا یہ نام شکاری کتے کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ پس كَلَبْتُ الْاَدِيْمَ کے معنی چمڑے کو سینے کے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے[2] (الرجز)

(۳۸۲) سَيْرُ صَنَاعٍ فِي اَدِيْمٍ تَكْلُبُهُ

کاریگر عورت کے تسمہ کی طرح ملائم اور چمکدار ہے جس سے وہ مشکیزہ سل رہی ہو۔

اَلْكَلْبُ۔ تاروں کے ایک جھمکے کا نام ہے جسے کتے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے جھمکے کے تابع ہوتا ہے جسے اَلرَّاعِيْ (چرواہا) کہا جاتا ہے۔ اَلْكَلْبَتَانِ (دستپناہ) لوہار کے ایک اوزار کا نام ہے جس سے وہ گرم لوہے کو پکڑتا ہے کسی چیز کو پکڑنے کے لحاظ سے اسے شکاری کتے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اور دو کنارے ہونے کی وجہ سے تثنیہ کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اَلْكَلُّوْبُ۔ کنڈی۔ كَلَالِيْبُ جمع كَلَالِيْبُ الْبَازِيْ۔ باز کے پنجے۔ یہ بھی كَلْبٌ سے مشتق ہے۔ کیونکہ جو چیز اس کے

---

[1] (فی اللآلی قال الشاعر وہو الحطیئۃ) قال الاستاذ المیمنی فی طرتہ علیہ "اونہ الزیادۃ خطأ" لانہ لایوجد فی شیئ من نسخ دیوان الحطیئۃ وانما ہو لابی البرج القاسم بن حنبل المری فی زفر بن ابی ہاشم رعامل الیمامۃ یکنی اباحبیب) من ثمانیۃ ابیات وصدرہ: بناۃ مکارم واُساۃ کلم .... راجع البیت للمرزوقی رقم ۲۷ والمعجم للمرزبانی (۲۱۴) والآمدی ۱۸ فی خمسۃ مطلعہا:۔ اری الخلان بعد ابی خبیب بجحرفی بعاہم جفاء۔ راجع للبیت الحیوان للجاحظ (۲: ۵) وفیہ لعبد ابی عمیر وفیہ البیت منسوب الی بعض المرسین والشطر ایضا مروی لامیۃ بن ابی الصلت وفی المعانی للقتیبی بغیر عزو (۲۱۴س) [2] قالہ دکین بن رجاء الفقیمی یصف فرسا وقبلہ: کان غبر متنہ اذ بخنبہ من بعد یوم کامل نؤوبہ۔ وفی روایۃ اللسان والصحاح (خرز) خرز بدل ادیم والرجز فی الاقتضاب بتقدیم وتاخیر وراجع للشطر ایضا الجمہرۃ لابن درید ۲۰۷: ۵ والازمنۃ للمرزوقی (۲: ۱۷) والمعانی للقتیبی ۲۰۶ والسمط ۵۸۷ واللسان والصحاح (کلب) ولفظہ خرز اکثر من لفظہ ادیم ؛

پنجہ میں آجائے اسے کتے طرح پکڑ کر روک لیتا ہے۔

(ک ل ف)

اَلْکَلَفُ (س) کسی چیز پر شیفتہ ہونا محاورہ ہے۔ کَلِفَ فُلَانٌ بِکَذَا فلاں اس پر شیفتہ ہے۔

اَکْلَفْتُہٗ بِہٖ میں نے اسے شیفتہ کر دیا۔

اَلْکَلَفُ۔ (ایضًا) چہرہ پر کے سیاہ دھبے، چہرہ کی چھائیاں گویا اس پر کلفت کا اثر ظاہر ہے۔

اَلتَّکَلُّفُ۔ کوئی کام کرتے وقت شیفتگی ظاہر کرنا باوجودیکہ اس کے کرنے میں مشقت پیش آرہی ہو اس لئے عرف میں کلفت مشقت کو کہتے ہیں اور تَکَلُّفٌ اس کام کے کرنے کو جو مشقت تصنع یا اوپرے جی سے دکھلاوے کے لئے کیا جائے اس لئے تکلیف دو قسم پر ہے محمود اور مذموم اگر کسی کام کو اس لئے محنت کسے سرانجام دے کہ وہ کام اس پر آسان اور سہل ہوجائے اور اسے اس کام کے ساتھ شیفتگی اور محبت ہوجائے تو ایسا تکلف محمود ہے چنانچہ اسی معنی میں عبادات کا پابند بنانے میں تکلیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور اگر وہ تکلیف محض ریاکاری کے لئے ہو تو مذموم ہے۔ چنانچہ آیت :۔

قُلْ مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ (۳۸-۸۶) (اور اے پیغمبر) کہہ دو کہ میں تم سے اس کا صلہ نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں ہوں۔ میں تکلیف کے یہی معنی مراد ہیں اور حدیث میں ہے (۹۹) اَنَا وَاَتْقِیَاءُ اُمَّتِیْ بُرَآءُ مِنَ التَّکَلُّفِ کہ میں اور میری امت کے پرہیزگار آدمی تکلف سے بری ہیں اور آیت۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲-۲۸۶) خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ جن احکام کو یہ مشقت سمجھتے ہیں وہ مآل کے لحاظ سے ان کے لئے وسعت کا باعث ہیں جیسے فرمایا :۔

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ (۲۲-۷۸) اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی اور تمہارے لئے تمہارے باپ ابراہیم کا دین پسند کیا۔

اور نیز فرمایا :۔

فَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ الآیۃ (۲-۲۱۶) مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

(ک ل م)

اَلْکَلْمُ۔ یہ اصل میں اس تاثیر کو کہتے ہیں جس کا ادراک دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکے چنانچہ کلام کا ادراک قوت سامعہ کیساتھ

لہ قال النووی لیس بثابت راجع المقاصد للسخاوی رقم ۱۹۱ والحدیث اخرجہ الدارقطنی فی الافراد من حدیث الزبیر بن العوام ولفظہ : - الا انی برئ من التکلف وصالحو امتی واسنادہ جید والحدیث بلفظ المؤلف اوردہ الغزالی فی الاحیاء وراجع . تخریج العراقی ۲/ ۱۸۹)

ہوتا ہے۔ اور کَلْمٌ (زخم) کا ادراک قوت بصر کے ساتھ۔ محاورہ ہے:۔

کَلَمْتُہٗ۔ میں نے اسے ایسا زخم لگایا۔ جس کا نشان ظاہر ہوا۔

اور چونکہ یہ دونوں (یعنی کلام اور کَلْم) معنی تاثیر میں مشترک ہیں۔ اس لئے شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۳۸۳) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وَارِ

کَلْمِ الاَصِیلِ کَارْغَبِ الْکَلِمِ

اس شعر میں پہلا اَلْکَلِمِ، کلمۃ کی جمع ہے اور دوسرا کَلْمٌ کی جس کے معنی زخم کے ہیں اور اَرْغَبُ کے معنی بہت وسیع کے ہیں پس شعر کے معنی یہ ہیں کہ دل میں لگ جانے والی باتوں کی تاثیر وسیع تر زخموں کی طرح ہوتی ہے اور دوسرے شاعر نے کہا ہے [2]۔ (المتقارب)

(۳۸۴) وَجَرْحُ اللِّسَانِ کَجُرْحِ الْیَدِ

اور زبان کے زخم بھی ہاتھ کے زخم کے مشابہ ہوتے ہیں۔

کَلَامٌ کا اطلاق منظم و مرتب الفاظ اور ان کے معانی دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ اور اہل نحو کے نزدیک کلام کے ہر جزء پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ اسم ہو یا فعل ہو یا حرف مگر اکثر متکلمین کے نزدیک صرف جملہ مرکبہ و مفیدہ کو کلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ قول پہلے سے اخص ہے کیونکہ قول کا لفظ ان کے نزدیک صرف مفرد الفاظ پر بولا جاتا ہے اور کَلِمَۃٌ کا اطلاق انواع ثلاثہ یعنی اسم فعل اور حرف تینوں میں سے ہر ایک پر ہوتا ہے۔ اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔ قرآن میں ہے۔ کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ۔ (۱۸-۵) یہ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ (۲-۳۷) پھر آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کلمات سے رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وغیرہ ادعیہ مراد ہیں [3]۔۔ الحسن بصریؒ سے مروی ہے کہ ان سے مراد یہ دعا ہے [4] (۱) اَلَمْ تَخْلُقْنِیْ بِیَدِکَ؟ اَلَمْ تُسْکِنِّیْ جَنَّتَکَ؟ اَلَمْ تُسْجِدْ لِیْ مَلٰٓئِکَتَکَ؟ اَلَمْ تَسْبِقْ رَحْمَتُکَ غَضَبَکَ؟ اَرَاَیْتَ اِنْ تُبْتُ اَکُنْتَ

---

[1] قال طرفۃ بن العبد والبیت بتمامہ: بحسام سیفک او لسانک وار۔ کلم الاصیل کارغب الکلم والبیت فی الصناعتین ۲۲، ۲۹۳ ومعانہ ۱۱۶ وفیہ قبلہ: وتصدعنک مخیلۃ الرجل الشـ۔ نوف موضحۃ عن العظم وفی نقد الشعر وتکف بدل تصد والقریض بدل الشنوف وفی اشعار للجمی "ترد" وفی العیون (۲/۲۳) کاوسع الکلم [2] وفی اللالئ ۵۳۰۔ ۵۳۱ نسبہ بعضھم لامرئ القیس انظر العقد الثمین ۱۲۳ والمعانی للقتیبی ۲۳ وعن ابن درید انہ لامرئ القیس بن عابس الصحابی وھو الصحیح (العینی (۲: ۳۱ او فی روایۃ ذوزوا للسان کذا والید (العینی ۲/ ۵۳) قال ابن الکلبی: ما البیت لعمرو بن معدی کرب قالہ فی قتلہ بنی مازن ثم ھدم علی قتالھم وصدرہ: ولو عن نثا غیرہ جاءنی۔۔۔ فی خمسۃ والشطر فی الصناعتین ۲۹۳ والعقد الفرید (۲: ۵۴) والعیون (۲، ۲۳) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۴۴) وفی المقصورۃ الدریدیۃ ۲۸ الغیر عو [3] اخرجہ الثعالبی عن ابن عباس، وابن المنذر من طریق ابن جریر نحوہ والبیہقی فی الشعب عن محمد بن کعب القرظی مثلہ [4] اخرجہ ابن جریر عن ابن عباس ایضاً انظر فتح القدیر للشوکانی (۱/ ۶۱) والحاکم فی المستدرک فی تنزیہ آدم عن فضائل الانبیاء (من روایۃ المنہال بن عمرو عن سعید بن جبیر قول ابن عباس ایضاً فی الکشاف وراجع تخریج الکشاف للحافظ (رقم ۴۴) وذکر الدیلمی فیہ قصہ طویلہ عن علی مرفوعاً قال فی الکنز (رقم ۵۵۰۵) سندہ واہ وابن جریر نسب القول الاول الی الحسن ایضاً والثانی الی ابن عباس علی عکس ما قال المؤلف ۱۲

مُعِیْلِیْ اِلَی الْجَنَّۃِ ؟ (اے باری تعالیٰ) کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ کیا تو نے مجھے اپنی جنت میں نہیں بسایا؟ کیا مجھے مسجود ملائکہ نہیں بنایا؟ کیا تیری رحمت تیرے غضب پر سبقت نہیں لے گئی؟ پھر کیا اگر میں توبہ کر لوں تو مجھے جنت میں دوبارہ لوٹا کر نہیں لے جائیگا؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیوں نہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے مراد وہ امانت ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین اور پہاڑوں پر پیش کی مگر انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا جس کا ذکر کر آیت کریمہ:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ الآیۃ (۳۳-۷۲) ہم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا۔ میں آچکا ہے اور آیت کریمہ:

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (۲-۱۲۴) اور جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیمؑ کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے ذبح ولد، ختنہ وغیرہ ایسے کام مراد ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کی تھی۔ اور زکریا علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فرمان۔

اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (۳-۳۹) خدا تمہیں یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔ جو خدا کے فیض یعنی عیسیٰؑ کی تصدیق کریں گے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ بِكَلِمَةٍ سے مراد کلمہ توحید ہے اور بعض نے کتاب اللہ مراد لی ہے اور بعض نے عیسیٰ علیہ السلام مراد لئے ہیں پس آیت (۳-۳۹) اور آیت کریمہ:

وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ (۴-۱۷۱) اور اس کا کلمہ (بشارت) تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا۔

میں عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ کلمہ کن سے پیدا ہوئے تھے جیسا کہ آیت:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ (۳-۵۹) عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک۔ میں مذکور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ لوگوں کے ان کے ذریعہ ہدایت پانے کی وجہ سے انہیں کلمہ کہا گیا ہے جیسا کہ کلام اللہ کے ذریعہ لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس خصوصی رحمت کے سبب سے ہے جو بچپنے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر کی تھی۔ جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (۱۹-۳۰) کہ میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نبی ہونے کی وجہ سے انہیں کَلِمَۃُ اللّٰہِ کہا گیا ہے جیسا کہ آنحضرت کو رسول اللہ ہونے کی وجہ سے ذِکْرٌ کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۶-۱۱۵) اور تمہارے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں۔

میں کَلِمَۃ بمعنی قضیہ یعنی فیصلہ کے ہے چنانچہ ہر قضیہ کو خواہ وہ قولی ہو یا فعلی کَلِمَۃ کہہ سکتے ہیں اور اسے صدق کے ساتھ متصف کرنا اس لئے ہے کہ قول اور فعل دونوں صدق کے ساتھ متصف ہوتے ہیں لہذا تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ

میں آیت کریمہ:-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (۵-۴)

(اور آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ آج کے بعد شریعت میں "نسخ" نہیں ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں آنحضرتؐ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے

(۱۰۲) اول ما خلق الله القلم فقال له اجر بما هو كائن الى يوم القيامة[1] سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے کہا کہ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اسے لکھ دو...... الخ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کَلِمَةُ سے مراد قرآن ہے اور سارے کو کَلِمَة کہنا ایسا ہی ہے جیسے قصیدہ کو کلمہ کہا جاتا ہے اور تَمَّتْ سے قرآن کے "تا قیامت (تحریف سے) محفوظ رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ ماضی لا کر اس بات کے قطعی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور قرآن پاک کی اسی قسم کی حفاظت کی طرف آیت کریمہ:-

فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ الاٰیة (۶-۹۰)

اگر یہ کفار ان باتوں سے انکار کریں۔ میں بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ سے ثواب وعقاب کا وعدہ مراد ہے۔ جیسا کہ دیگر آیات میں فرمایا۔ بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۳۹-۷۱) کہیں گے کیوں نہیں لیکن کافروں کے حق میں عذاب کا حکم حق ہو چکا تھا۔

وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا (۱۰-۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد نافرمانوں کے حق میں ثابت ہو کر رہا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے معجزات مراد ہیں جو قوم نے طلب کئے تھے اور لفظ تَمَّتْ سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ جو آیات بھیجی گئی ہیں وہ اپنی جگہ پر مکمل اور کافی ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۱۸-۲۷) اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ میں ان کے اس مطالبہ کی تردید ہے جو کہ آیت:-

ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ (۱۰-۱۵) کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ۔ میں مذکور ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ سے احکام الٰہی مراد ہیں اور تَمَّتْ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وہی احکام اپنے بندوں کے لئے مشروع کئے ہیں جن میں کہ ان کے لئے کفایت ہے اور آیت کریمہ:-

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا (۷-۱۳۷) اور بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے صبر کی وجہ سے تمہارے پروردگار کا وعدۂ نیک پورا ہوا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کلمۂ حُسْنٰی سے مراد وہ فیصلہ ہے جس کا ذکر کہ آیت:-

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا (۲۸-۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں۔

---

[1] اخرجه احمد في مسنده ۳۱۷/۵ وايضا ابو داؤد عن عبادة بن الصامت ولمعناه في (حل، حق) عن ابن عباس والترمذي عن عبادة راجع كنز العمال ۵۲۹ وروضة العقلاء للبستي ۱۳۵

میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا (۲۰-۱۲۹) اور اگر یہ بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور (جزائے اعمال کیلئے) ایک میعاد (مقرر) نہ ہوتی تو (نزول) عذاب واقع ہو جاتا۔

نیز دوسری آیت:۔
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ (۴۲-۱۴) اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہی ایک وقت مقرر تک کے لئے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

میں سبق کلمۃ اللہ تعالیٰ سے اس حکم ازلی کی طرف اشارہ ہے جس کی حکمت الٰہی مقتضی تھی اور یہ کہ کلمات الٰہیہ کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی ان میں کسی قسم کے تغیر کی گنجائش ہوتی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔
أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ (۸-۷) کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے۔

میں کلماتہ سے وہ دلائل ثابتہ مراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کفار کے خلاف مسلمانوں کے لئے سلطان مبین یعنی زبردست دلیل کی حیثیت سے قائم کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ (۴۸-۱۵) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں۔
میں کلام اللہ سے اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت قُل لَّن تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا (۹-۸۳) تو کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ ہرگز نہیں نکلو گے۔ میں مذکور ہے اور بتایا ہے کہ منافقین کا یہ کہنا کہ ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ (۴۸-۱۵) کلام الٰہی میں تبدیل کے مترادف ہے اور متنبہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہرگز ہرگز تمہارے ساتھ نہیں نکلیں گے اور نکل بھی کیسے سکتے ہیں جب کہ علم الٰہی میں یہ ...... فیصلہ ہو چکا ہے کہ ان سے یہ نہیں ہو سکے گا۔[1]

بندے سے اللہ تعالیٰ کا ہم کلام ہونا دو قسم پر ہے یعنی یا دنیا میں اور یا آخرت میں۔ چنانچہ آیت:۔
مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا الآیۃ (۴۲-۵۱) اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام کے ذریعہ سے ......

میں دنیا میں ہم کلام ہونے کا بیان ہے اور آخرت میں ثواب و کرامت کے طور پر صرف مومنین سے ہم کلام ہوگا جس کی کیفیت ہم سے مخفی ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔
إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ (۳-۷۷) کے آخر میں لَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ کفار اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہیں گے۔ اور آیت کریمہ:۔
يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ (۴-۴۶) کہ کلمات کو ان کے مقام سے بدل دیتے ہیں۔
میں کَلِم کَلِمَةٌ کی جمع ہے۔ اس آیت کی

---

[1] هذا ما تأول به عبد الرحمن بن زيد بن اسلم وقال به الجبائي وفيه نظر لان آية الجراءة نزلت في غزوة تبوك وهي متأخرة عن عمرة الحديبية باربع سنين (لان صلح الحديبية كان سنة ست وغزوة تبوك سنة تسع) (ابن كثير ۴/۱۸۶) فالصحيح هو الوعد الذي وعد به اهل الحديبية قال الطبرسي ۲۷/۶۰ وهذا اي قول الجبائي غلط فاحش حمله عليه العصبية ۱۲

تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ الفاظ میں تبدل و تغیر کرتے تھے اور بعض نے تحریف معنوی مراد لی ہے یعنی آیت کو اس کے مقتضی کے خلاف معنی پر حمل کرنا یہ دوسرا قول قوی تر معلوم ہوتا ہے[1] کیونکہ الفاظ کے مشہور اور متداول ہونے کے بعد ان میں تبدیلی کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے اور آیت کریمہ :۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ (۲-۱۱۸) اور جو لوگ کچھ نہیں جانتے (یعنی مشرک ہیں) وہ کہتے ہیں۔ کہ خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ۔

کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بالمشافہ گفتگو کیوں نہیں کرتا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ إِلَى قَوْلِهِ أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (۴-۱۵۳) (اے محمد) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں۔ ہمیں خدا کو ظاہر (یعنی آنکھوں سے دکھا دو۔

کَلَّا

یہ حرف ردع اور زجر ہے اور ماقبل کلام کی نفی کے لئے آتا ہے اور یہ "اِی" حرف ایجاب کی ضد ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا كَلَّا (۱۹-۷۷-۷۸-۷۹) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں سے کفر کیا۔ اور کہنے لگا اگر میں ازسرنو زندہ ہوا بھی تو یہی) مال اور اولاد مجھے وہاں ملے گا کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے یا خدا کے یہاں (سے) عہد لے لیا ہے ہرگز نہیں ۔

لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا (۲۳-۱۰۰) تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں نیک کام کروں ہرگز نہیں ۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ (۸۰-۲۳) کچھ شک نہیں کہ خدا نے اسے جو حکم دیا۔ اس نے ابھی تک اس پر عمل نہیں کیا ۔

اور اس نوع کی اور بھی بہت آیات ہیں ۔

کَمْ

یہ عدد سے کنایہ کے لئے آتا ہے اور یہ دو قسم پر ہے۔ استفہامیہ اور خبریہ۔ استفہامیہ ہو تو اس کا مابعد اسم تمیز بن کر منصوب ہوتا ہے (اور اس کے معنی کتنی تعداد یا مقدار کے ہوتے ہیں۔ جیسے کَمْ رَجُلًا ضَرَبْتَ اور جب خبریہ ہو تو اپنی تمیز کی طرف مضاف ہو کر اسے مجرور کر دیتا ہے اور کثرت کے معنی دیتا ہے یعنی کتنے ہی۔ جیسے کَمْ رَجُلٍ ضَرَبْتُ میں نے کتنے ہی مردوں کو پیٹا اور اس صورت میں کبھی اس کی تمیز پر مِنْ جارہ داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

كَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا (۷-۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے تباہ کر ڈالیں ۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً (۲۱-۱۱) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستمگار تھیں ہلاک کر ڈالا ۔

[1] نسبۂ علماء التفسیر الی ابن عباس رضہ

(ك م م)

اَلْكُمُّ آستین کو کہتے ہیں اور اَلْكِمُّ (بکسر الکاف) خوشوں کے غلاف کو۔۔۔۔ اس کی جمع اَكْمَامٌ آتی ہے جیسے فرمایا وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ (۵۵-۱۱) اور کھجور کے درخت ہیں جن کے خوشوں پر غلاف ہوتے ہیں۔ اَلْكُمَّةُ۔ ایک طرح کی گول ٹوپی جو سر پر پہنی جاتی ہے۔

(ك م ل)

كَمَالُ الشَّيْءِ کسی چیز کے کامل ہونے سے مراد ہے وہ غرض پوری ہو جانا جس کے لئے وہ وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ جب کسی چیز کے متعلق كَمُلَ ذَالِكَ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اس سے مقصود تھا۔ وہ حاصل ہو گیا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (۲-۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔

میں کَامِلَیْنِ سے مراد یہ ہے کہ رضاعت کے لئے دو سال کی مدت آخری مدت ہے جس سے بچہ کی نشو و نما اور اس کی بیوی کا تعلق ہے اور آیت کریمہ:۔

لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے اعمال کے پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ انہیں قیامت کے دن پوری سزا ملے گی اور آیت:۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ (۲-۱۹۶) یہ پورے دس ہوئے۔

میں عَشَرَةٌ کی صفت کَامِلَةٌ لانے سے یہ مقصد نہیں ہے کہ سات اور تین مل کر دس ہو جاتے ہیں۔ بلکہ کَامِلَةٌ کے لفظ سے اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ دس دن کے روزوں سے ہدی کا پورا بدل حاصل ہو جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کَامِلَةٌ کا لفظ استطرادًا لایا گیا ہے اور اس سے مقصد اسم عدد میں عشرۃ کی فضیلت کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ پہلی دہائی ہے جس پر عدد کامل ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد ان ہی ہندسوں کا تکرار ہوتا رہتا ہے جو اس سے قبل ہوتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عَشَرَةٌ ہی کامل عدد ہے۔

(ك م ه)

اَلْاَكْمَهُ کے معنی پیدائشی اندھا کے ہیں[1] مگر کبھی اس شخص کے لئے آتا ہے جس کی بعد میں بصارت کھو گئی ہو شاعر نے کہا ہے[2] (الرمل) (۳۸۵) كَمِهَتْ عَيْنَاهُ حَتّٰى ابْيَضَّتَا اس کی آنکھیں بے نور ہو کر سفید ہو گئیں۔

(ك ن ن)

اَلْكِنُّ۔ ہر وہ چیز جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے۔

---

[1] وفی القرآن دابری الاکمہ والابرص (۳-۴۹) [2] قالہ سعید بن ابی کاہل الیشکری فی عینیتہ المشہورۃ التی تسمی الیتیمۃ راجع المفضلیات (۱: ۱۸) والبیت فی اللسان (کمہ) وتمامہ: فھو یلحی نفسہ لما نزع والبیت من شواہد الطبری ۲/ ۲۷۷

كَنَنْتُ الشَّيْءَ كَنًّا۔ کسی چیز کو کِنّ میں محفوظ کر دیا اور کَنَنْتُ (ثلاثی مجرد) خصوصیت کے ساتھ کسی مادی شی کو گھر یا کپڑے وغیرہ میں چھپانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ (۳۷-۴۹) گویا وہ محفوظ انڈے ہیں۔

كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ (۵۲-۲۴) جیسے چھپائے ہوئے موتی۔

اور اَكْنَنْتُ (باب افعال سے) دل میں کسی بات کو چھپانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ (۲-۲۳۵) یا (نکاح کی خواہش کو) اپنے دلوں میں مخفی رکھو۔

اور کِنّ کی جمع اَكْنَانٌ آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا (۱۶-۸۱) اور پہاڑوں میں تمہارے لئے غاریں بنائیں۔

اَلْكِنَانُ۔ پردہ غلاف وغیرہ جس میں کوئی چیز چھپائی جائے اس کی جمع اَكِنَّةٌ آتی ہے۔ جیسے غِطَاءٌ کی جمع اَغْطِيَةٌ۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (۶-۲۵) اور ہم نے انکے دلوں پر تو پردے ڈال رکھے ہیں کہ اس کو سمجھ نہ سکیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ (۴۱-۵) اور کہنے لگے ہمارے دل پردوں میں ہیں۔

کے بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہم تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ (۱۱-۹۱) انہوں نے کہا اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (۵۶-۷۷، ۷۸) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے جو کتاب محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ كِتٰبٌ مَّكْنُوْنٌ سے لوح محفوظ مراد ہے[1] اور بعض نے کہا ہے کہ یہ قرآن کے عنداللہ محفوظ ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:۔

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵-۹) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

اور شادی شدہ عورت پر بھی كِنَّةٌ کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے خاوند کی حفاظت میں رہتی ہے اس بنا پر شادی شدہ عورت کو مُحْصَنَةٌ بھی کہتے ہیں۔ گویا وہ اپنے خاوند کی حفاظت کے قلعے میں محفوظ ہے۔

اَلْكِنَانَةُ۔ ترکش جو کہیں سے پھٹا ہوا نہ ہو۔

(ک ن د)

اَرْضٌ كَنُوْدٌ۔ بنجر زمین جہاں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو۔ (اور کنایہ کے طور پر ناسپاس گنہگار کو كَنُوْدٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۱۰۰-۶) کہ انسان اپنے پروردگار کا احسان نہ ماننے والا اور ناشکرا ہے۔

(ک ن ز)

اَلْكَنْزُ (ض) کے معنی دولت جمع کرکے اسے محفوظ رکھ دینے کے ہیں یہ اصل میں كَنَزْتُ التَّمْرَ فِي الْوِعَاءِ سے مشتق ہے۔

---

[1] کما فی قولہ تعالیٰ:۔ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵-۲۲)

جس کے معنی کھجور کو باردان میں بھر کر محفوظ کر لینے کے ہیں۔ اور کھجور اندوختہ کرنے کے موسم کو زَمَنُ اَلْکِنَازِ کہا جاتا ہے۔ اور نَاقَةٌ كِنَازٌ کے معنی گوشت سے گتھی ہوئی اونٹنی کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ (٩-٣٤)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں۔

میں يَكْنِزُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سونا اور چاندی جمع کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اسے راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے ایسے لوگوں کو قیامت کے دن کہا جائے گا۔

فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (٩-٣٥)

کہ جو کچھ تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

اور آیت لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ (١١-١٢) میں كَنْزٌ کے معنی خزانہ اور بڑی دولت کے ہیں اور آیت کریمہ:

وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا (١٨-٨٢) اور اس کے نیچے ان کا خزانہ (مدفون) تھا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں كَنْزٌ سے صحیفہ علم مراد ہے۔

(ک ہ ف)

اَلْكَهْفُ کے معنی پہاڑ میں غار کے ہیں اس کی جمع كُهُوْفٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

اِنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ (١٨-٩)

کہ غار اور لوح والے۔

(ک ہ ل)

اَلْكَهْلُ۔ ادھیڑ عمر آدمی جس کے بال سفید ہو گئے ہوں۔ قرآن میں ہے:

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (٣-٤٦) اور ماں کی گود میں اور ادھیڑ عمر کا ہو کر لوگوں سے گفتگو کرے گا اور نیکوکاروں میں ہوگا۔

اِكْتَهَلَ النَّبَاتُ پودے کا حدِ بوست یعنی بڑھنے کی آخری حد کو پہنچ جانا۔ جیسا کہ ادھیڑ عمر آدمی بڑھاپے کی حد کو پہنچ جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(٣٨٦) مُؤَزَّرٌ بِهَشِيْمِ النَّبْتِ مُكْتَهِلُ

اس کی گھاس آخری حد تک بڑھی ہوئی ہے اور اس نے اپنے گرد اگرد دوسرے پودوں کی چادر پہن رکھی ہے۔

(ک ہ ن)

اَلْكَاهِنُ اس شخص کو کہتے ہیں جو تخمینے سے ماضی کے خفیہ واقعات کی خبر دیتا ہو اور عراف اسے جو آئندہ کے متعلق خبر دیتا ہو ان دونوں پیشوں کی بنا چونکہ ظن پر ہے جس میں صواب

---

[1] قالہ الاعشی وصدرہ: یضاحک الشمس منھا کوکب شرق۔ راجع للبیت الصناعتین ٢٧٦ والبلغۃ فی شذور اللغۃ (کتاب النبات الاصمعی ٣٣) ودیوانہ ٤٤ انی تصیدۃ مخاطبا لیزید بن مسہر مطلعھا، ودِّع ہریرۃ ان الرکب مرتحل۔ وھل تطیق وداعا ایھا الرجل۔ وہریرۃ ہذہ قینۃ لبشر بن عمر تکنی بام الخلید والقصیدۃ فی دیوانہ (٤٤ ا-١٤٩) والبیت فی اللسان (ازر، کمل) وشرح للدیوان ٥٧ والطبری (٢١ = ٢٧) والمرتضی (١: ٢٠٢) والمشکل للقتبی (٣٠٢) والعیون (٢: ١٠٦) وشرح العشر للتبریزی ٢٧٦ وفی روایتہ لعیم بدل بھشیم ١٢

وخطا کا احتمال پایا جاتا ہے۔ اس لئے آنحضرتؐ نے فرمایا (۱) مَنْ اَتٰی عَرَّافًا اَوْ کَاھِنًا فَصَدَّقَہٗ بِمَا قَالَ فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی اَبِی الْقَاسِمِ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کہ جو شخص عراف یا کاہن کے پاس جاکر اس کے قول کی تصدیق کرے تو اس نے جو کچھ ابوالقاسم (یعنی مجھ پر) اتارا گیا ہے اس کے ساتھ کفر کیا کَھُنَ فُلَانٌ کَھَانَۃً کہانت کرنا۔ اور جب کوئی شخص اس پیشہ کے ساتھ مختص ہو تو اس کے متعلق کَھُنَ کہتے ہیں۔

تَکَھَّنَ۔ بتکلف کہانت کرنا قرآن میں ہے۔ وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (۶۹-۴۲) اور نہ کسی کاہن کے مزخرفات ہیں لیکن تم لوگ بہت ہی کم دھیان دیتے ہو۔

(ک و ب)

اَلْکُوْبُ۔ پیالہ جس کا دستہ نہ ہو۔ اس کی جمع اَکْوَابٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے: بِاَکْوَابٍ وَّاَبَارِیْقَ وَکَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ (۵۶-۱۸) یعنی آبخورے اور آفتابے اور صاف شراب کے گلاس۔

اَلْکُوْبَۃُ ڈگڈگی (یعنی باریک میان طبلک جو تماشہ کے وقت مداری بجاتے ہیں۔

(ک و د)

کاد (س) یہ فعل مقاربہ ہے یعنی کسی فعل کے قریب الوقوع ہونے کو بیان کرنیکے لئے آتا ہے مثلاً کَادَ یَفْعَلُ قریب تھا کہ وہ اس کام کو کر گذرتا یعنی کرنے والا تھا مگر کیا نہیں قرآن میں ہے۔ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا (۱۷-۷۴) تو تم کسی قدر ان کی طرف مائل ہونے ہی لگے تھے۔ وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ (۱۷-۷۳) قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بچلادیں۔ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ (۱۹-۹۰) قریب ہے کہ (اس فتنہ) سے آسمان پھٹ پڑیں۔ یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ (۲-۲۰) قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کی بصارت کو اچک لے جائے۔ یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ (۲۲-۷۲) قریب ہوتے ہیں کہ ان پر حملہ کردیں۔

اِنْ کِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ (۳۷-۵۶) تو تو مجھے ہلاک ہی کرچکا تھا۔ اور اگر اس کے ساتھ حرف نفی آجائے تو اثباتی حالت کے برعکس فعل کے وقوع کو بیان کرنے کیلئے آتا ہے جو وقوع کے قریب نہ ہو اور حرف نفی اس پر مقدم ہو یا متاخر دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے: مَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ (۲-۷۱) اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔ لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا (۴-۷۸) کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اور کاد کے بعد اَنْ کا استعمال صرف ضرورت شعری کے لئے ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے (۲) (الرجز)

---

(۱) عن ابی ہریرۃ مرفوعا رواہ الحاکم فی المستدرک وعن علیؓ موقوفا وسندہ (انظر کنز العمال (۶: رقم ۳۰۹۸ و ۴۰۰۴ ج ۷ و ۶ فی بروایۃ مسلم والحاکم فقد بری مما انزل اللہ علی محمد (کنز العمال ۵ ۳۰۹) (۲) قال رؤبۃ بن العجاج وقبلہ، ربع عفاہ الدھر طولا فانمحی۔ والرجز فی اسرار ابن الانباری ۱۲۹ واللسان والصحاح (کاد) والکامل ۲۸۷ والعینی (۲: ۲۱۵) وابن یعیش والاقتضاب ۳۹۶ وقال والرجز یروی لرؤبۃ بن العجاج ولم اجدہ فی دیوانہ وراجع للشطر ایضا المشکل للقتبی ۴۰۷ والکتاب (۱: ۴۰۸) والخزانۃ (۴: ۹۱) والجمل للزجاجی ۲۱۰ و الانصاف ۴۳۴ والدلائل اللوامع (۱: ۱۰۵) وادب الکاتب ۴۱۱ ویروی قبلہ: ربع عفاہ بعدہ ما قد انمحی وکلتا الروایتین ذکرہما الخفاجی فی شرح الدرۃ ونسبا الی رؤبۃ وفی الفائق [illegible]

(٣٨٧) قَدْ كَادَ مِنْ طُوْلِ الْبِلَى اَنْ يَمْصَحَا
قریب تھا کہ زیادہ بوسیدگی کے باعث وہ مٹ جائے۔

(ک و ر)

اَلْکَوْرُ کے معنی کسی چیز کو عمامہ کی طرح لپیٹنے اور اس کو اوپر تلے گھمانے کے ہیں چنانچہ آیت:۔ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ (٣٩-٥) اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔ میں مطالع شمسی کے تبدیل ہونے سے دن رات کے بڑھنے اور گھٹنے کو تکویر سے تعبیر فرمایا ہے۔ طَعَنَهُ فَكَوَّرَهُ اس کو نیزہ مار کر پچھاڑ دیا۔ اِكْتَارُ الْفَرَسِ۔ گھوڑے کا دوڑتے وقت اپنی دم گھمانا اور بہت سے اونٹوں کو بھی کَوْرٌ کہا جاتا ہے اور كُوَارَةُ النَّحْلِ کے معنی شہد کے چھتہ کے ہیں۔

اَلْكُوْرُ کے معنی اونٹ کا پالان بھی آتے ہیں اور ہر بڑے شہر کو كُوْرَةٌ کہا جاتا ہے یعنی وہ علاقہ جس میں بہت سی بستیاں اور دیہات جمع ہوں۔

(ک و ن)

کَانَ۔ فعل ماضی کے معنی کو ظاہر کرتا ہے بیشتر صفات باری تعالےٰ کے متعلق استعمال ہو تو ازلیت (یعنی ہمیشہ سے ہے) کے معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (٣٣-٤٠) اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔
وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (٤٨-٢١) اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

اور جب یہ کسی جنس کے ایسے وصف کے متعلق استعمال ہو جو اس میں موجود ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ وصف اس اسم کے ساتھ لازم وملزوم رہتا ہے اور بہت ہی کم اس سے علیحدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات:۔
وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (١٧-٦٠) اور انسان ہے ہی ناشکرا۔
وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (١٧-١٠٠) اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (١٨-٥٤) اور انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔
میں تنبیہ کی ہے کہ یہ امور انسان کے اوصاف لازمہ سے ہیں اور شاذ ونادر ہی اس سے منفک ہوتے ہیں اسی طرح شیطان کے متعلق فرمایا:۔
وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (٢٥-٢٩) اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔
وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (١٧-٢٧) اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا یعنی ناقدرا ہے۔

جب یہ فعل زمانہ ماضی کے متعلق استعمال ہو تو اس میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ چیز تاحال اپنی پہلی حالت پر قائم ہو اور یہ بھی کہ اس کی وہ حالت متغیر ہو گئی ہو مثلاً کَانَ فُلَانٌ كَذَا ثُمَّ صَارَ كَذَا۔ یعنی فلاں پہلے ایسا تھا لیکن اب اس کی حالت تبدیل ہو گئی ہے نیز یہ ماضی بعید کے لئے بھی آتا ہے جیسے:۔ كَانَ فِيْ اَوَّلِ مَا اَوْجَدَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَذَا۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز پیدا کی تھی اور ماضی قریب کے لئے بھی حتیٰ کہ اگر وہ حالت زمانہ تکلم سے ایک لحہ بھی پہلے

ہو تو اس کے متعلق کَانَ کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے لہذا جس طرح "کَانَ اٰدَمُ کَذَا" کہہ سکتے ہیں اسی طرح "کَانَ زَیْدٌ ھٰھُنَا" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر آیت:۔

کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا (۱۹-۲۹) (وہ بولے کہ) ہم اس سے کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جو ابھی گود کا بچہ تھا یعنی کم عمر ہے اور یہ بھی کہ "جو ابھی گود کا بچہ ہے" یعنی ماں کی گود میں ہے۔ لیکن یہاں زمانہ حال مراد لینا بے معنی ہے اس میں زمانہ قریب ہے جیسے آیت:۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ (۳-۱۱۰) جتنی امتیں ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ کُنْتُمْ زمانہ حال پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کے علم اور حکم کے مطابق بہتر تھے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ (۲-۲۸۰) اور اگر (قرض لینے والا) تنگ دست ہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کَانَ کے معنی کسی چیز کا واقع ہوجانا کے ہیں اور یہ فعل تام ہے۔ یعنی اگر وہ تنگدست ہوجائے۔[1] بعض لوگ کہتے ہیں کہ کَوْن کا لفظ کسی جوہر کے اپنے سے پست تر جوہر میں تبدیل ہونے کے لئے آتا ہے۔ اور اکثر متکلمین اسے معنی ابداع میں استعمال کرتے ہیں بعض علمائے نحو کا خیال ہے کہ کَیْنُوْنَۃٌ کا لفظ اصل میں کَوْنُوْنَۃٌ بروزن فَعْلُوْلَۃٌ ہے۔ ثقل کی وجہ سے واؤ یاء سے تبدیل ہوگئی ہے مگر سیبویہ کے نزدیک یہ اصل میں کَیْوِنُوْنَۃ بروزن فَیْعِلُوْلَۃٌ ہے۔ واؤ کو یا میں ادغام کرنے سے کَیِّنُوْنَۃٌ ہوگیا پھر ایک یاء کو تخفیف کے لئے گرادیا تو کَیْنُوْنَۃٌ بن گیا جیسا کہ مَیِّتٌ سے مَیْتٌ بنا لیتے ہیں جو اصل میں مَیْوِتٌ ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ کَیِّنُوْنَۃ (بتشدید الیاء) استعمال نہیں ہوتا اور مَیِّتٌ تشدید یاء کے ساتھ اکثر استعمال ہوتا ہے۔

اَلْمَکَانُ۔ بعض کے نزدیک یہ دراصل کَانَ یَکُوْنُ (ک و ن) سے ہے مگر کثرت استعمال کے سبب میم کو اصلی تصور کرکے اس سے تَمَکَّنَ وغیرہ مشتقات استعمال ہونے لگے ہیں جیسا کہ مِسْکِیْنٌ سے تَمَسْکَنَ بنا لیتے ہیں حالانکہ یہ (س ک ن) سے ہے۔ اِسْتَکَانَ فُلَانٌ فلاں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ گویا وہ ٹھہر گیا اور ذلت کی وجہ سے سکون وطمانینت کو چھوڑ دیا۔

قرآن میں ہے:۔

فَمَا اسْتَکَانُوْا لِرَبِّھِمْ (۲۳-۷۶) تو بھی انہوں نے خدا کے آگے عاجزی نہ کی۔

(ک و ی)

کَوَیْتُ الدَّابَّۃَ بِالنَّارِ کیا کے معنی جانور کو گرم لوہے سے داغ دینے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ (۹-۳۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو داغے جائیں گے۔

کَیْ

یہ کسی چیز کے فعل کا سبب بیان کرنے کے

[1] یعنی الصورۃ الثانیۃ یکون تامۃ وفی الاولیٰ ناقصۃ (الطبری صفحہ ۱۹)

لئے آتا ہے (بمعنی "تاکہ") اور کَیْلَا اس کی نفی کے لئے جیسے فرمایا:۔ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً (۵۹-۷) تاکہ مال... گردش نہ کرتا رہے۔

(ک ی د)

اَلْکَیْدُ (خفیہ تدبیر) کے معنی ایک قسم کی حیلہ جوئی کے ہیں یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی مگر عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ اِسْتِدْرَاجٌ اور مَکْرٌ بھی کبھی اچھے معنوں میں آجاتے ہیں چنانچہ اچھے معنوں میں فرمایا:۔ کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ (۱۲-۷۶) اسی طرح ہم نے یوسفؑ کے لئے تدبیر کردی۔ وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (۷-۱۸۳) اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں۔ میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں کید سے مراد عذاب ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے ڈھیل اور مہلت دینا مراد ہے جو آخر کار موجب عذاب بنتی ہے جیسے فرمایا۔ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (۳-۱۷۸)۔ (نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لئے مہلت دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کرلیں۔ اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (۱۲-۵۲) اور خدا خیانت کرنے والوں کے مکر کو رو براہ نہیں کرتا۔ خائنین کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی تدبیر سے خیانت کا ارادہ نہیں کرتے ان کی تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ رو براہ اور کامیاب کردیتا ہے۔ جیسا کہ یوسفؑ کی اپنے بھائی کے بارے میں تدبیر کرنا۔ اور آیت کریمہ:۔

لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ (۲۱-۵۷) میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔ میں لَاَکِیْدَنَّ کے معنی یہ ہیں کہ میں ان کے ساتھ بُری طرح پیش آؤں گا۔

فَاَرَادُوْا بِہٖ کَیْدًا فَجَعَلْنٰھُمُ الْاَسْفَلِیْنَ (۳۷-۹۸) غرض انہوں نے ان کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی اور ہم نے انہیں کو زیر کردیا۔

فَاِنْ کَانَ لَکُمْ کَیْدٌ فَکِیْدُوْنِ (۷۷-۳۹) اگر تم کو کوئی داؤں آتا ہو تو مجھ پر کر چلو۔

کَیْدُ سٰحِرٍ (۲۰-۶۹) جادو کے ہتھکنڈے...

فَاَجْمِعُوْا کَیْدَکُمْ (۲۰-۶۹) تو تم جادو کا سامان اکٹھا کرلو۔

محاورہ ہے:۔ فُلَانٌ یَکِیْدُ بِنَفْسِہٖ فلاں جان دے رہا ہے اور جب چقماق دیر سے آگ نکالے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کَادَ الزَّنْدُ۔

(ک ی ف)

کَیْفَ (اسم استفہام) اس چیز کی حالت دریافت کرنے کے لئے آتا ہے جس پر کہ شبیہ اور غیر شبیہ کا لفظ بولا جاسکتا ہو جیسے اَبْیَضُ (سفید) اَسْوَدُ (سیاہ) صَحِیْحٌ (تندرست) سَقِیْمٌ (بیمار) وغیرہ۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے متعلق اس کا استعمال جائز نہیں ہے اور کبھی اس چیز پر بھی کَیْفَ کا اطلاق کردیتے ہیں جس کے متعلق سوال کرنا ہو مثلاً کہا جاتا ہے کہ اَسْوَدُ اور اَبْیَضُ مقولہ کیف سے ہیں اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق کیف کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ تنبیہ یا توبیخ کے طور پر مخاطب سے استخبار کے لئے لایا گیا

ہے جیسے فرمایا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (۲-۲۸) کافرو! تم خدا سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا (۳-۸۶) خدا ایسے لوگوں کو کیونکر ہدایت دے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ (۹-۷) بھلا مشرکوں کے لئے کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ (۱۷-۴۸) دیکھو انہوں نے کس کس طرح کی تمہارے بارے میں باتیں بنائیں۔

فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (۲۹-۲۰) اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۲۹-۱۹) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا پھر کس طرح اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔

(ک ی ل)

اَلْكَيْلُ (ض) کے معنی غلہ ناپنے کے ہیں؛ اور كِلْتُ لَهُ الطَّعَامَ (صلہ لام) کے معنی ہیں۔ میں نے اس کے لئے غلہ ناپنے کی ذمہ داری سنبھالی اور كِلْتُ الطَّعَامَ (بدون لام) کے معنی ہیں میں نے اسے غلہ ناپ کر دیا اور اِكْتَلْتُ عَلَيْهِ کے معنی ہیں۔ میں نے اس سے ناپ کر لیا۔

قرآن میں ہے: وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۸۳-۱،۲،۳) ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔

یہ آیت اگرچہ خاص کر ناپ میں کمی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ مگر اس میں ہر قسم کے لین دین میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے کی تاکید ہے۔ نیز فرمایا:

فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ (۱۲-۸۸) آپ ہمیں (اس کے عوض) پورا غلہ دیجئے۔

فَاَرْسِلْ مَعَنَا اَخَانَا نَكْتَلْ (۱۲-۶۳) تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجئے تاکہ ہم پھر غلہ بنوا کر لائیں

اور آیت کریمہ:

وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ (۱۲-۶۵) (اور ہم) ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ زیادہ لائیں گے۔ میں كَيْلَ بَعِيْرٍ کے معنی بارِ شتر کے برابر غلہ کے ہیں۔

کِتَابُ اللّام

(اللام) (حرف)

یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ اول حرف جارہ اور اس کی چند قسمیں ہیں:۔

(۱) تعدیہ کے لئے اس وقت بعض اوقات تو اس کا حذف کرنا جائز نہیں ہوتا جیسے فرمایا ا۔

وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ (۳۷-۱۰۳) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹا دیا۔

اور کبھی حذف کرنا جائز ہوتا ہے چنانچہ آیت کریمہ۔

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ (۴-۲۶) خدا چاہتا ہے کہ تم سے کھول کھول کر بیان فرمادے۔

میں لام مذکور ہے اور آیت:۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا (۶-۱۲۵) تو جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔ میں اسے حذف کر دیا ہے یعنی اصل میں لِاَنْ يَّهْدِيَهٗ وَلِاَنْ يُّضِلَّهٗ ہے۔

(۲) ملک اور استحقاق کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے اور ملک سے ہمیشہ ملک عین ہی مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ ملک منافع اور ملک تصرف سب کو عام ہے چنانچہ فرمایا ا۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۵-۲۷) اور آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت خدا ہی کی ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۸-۴) اور آسمانوں اور زمین کے لشکر سب خدا ہی کے ہیں۔

اور ملک تصرف کے لئے مثلاً کسی شخص کے ساتھ لکڑی اٹھاتے وقت تم اس سے یہ کہو۔

خُذْ طَرَفَكَ لِاٰخُذَ طَرَفِيْ کہ تم اپنی جانب سے پکڑ لو تاکہ میں اپنی جانب پکڑ دوں۔

اور لِلّٰهِ دَرُّكَ کی طرح جب لِلّٰهِ كَذَا کہا جاتا ہے تو اس میں بعض نے لام تملیک مانا ہے یعنی یہ چیز بلحاظ شرف و منزلت کے اتنی بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس پر کسی کا ملک نہیں ہونا چاہیئے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں لام ایجاد کے لئے ہے یعنی اللہ نے اسے بطریق ابداع پیدا کیا ہے کیونکہ موجودات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اسباب طبعی یا صنعت انسانی کے واسطہ سے ایجاد کیا ہے۔ اور دوم وہ جنہیں بغیر کسی واسطہ کے پیدا کیا ہے جیسے افلاک اور آسمان وغیرہ اور یہ دوسری قسم پہلی کی نسبت اشرف اور اعلیٰ ہے اور آیات کریمہ:۔

وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ (۴۰-۵۲)
اور ان کے لئے لعنت اور برا گھر ہے۔
اور وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (۸۳-۱) ناپ اور تول
میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے۔
میں لام استحقاق کے معنی دیتا ہے یعنی یہ لوگ لعنت
اور ویل کے مستحق ہیں۔ اور یہ لام بھی لام ملک کی طرح
ہے لیکن لام ملک اس چیز پر داخل ہوتا ہے جو ملک
میں حاصل ہو چکی ہو اور لام استحقاق اس پر جو ابھی حال
حاصل تو نہ ہوئی ہو مگر اس پر استحقاق ثابت ہونے
کے لحاظ سے حاصل شدہ چیز کی طرح ہو بعض علمائے
نحو نے کہا ہے کہ آیت کریمہ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ
میں لام بمعنی علیٰ ہے۔ ای عَلَيْهِمُ اللَّعْنَةُ (یعنی
ان پر لعنت ہے) اسی طرح آیت کریمہ:۔
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ
(۲۴-۱۱) ان میں جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ
لیا اس کے لئے اتنا ہی وبال ہے۔ میں بھی لام
بمعنی علیٰ ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔
بعض نے کہا ہے کبھی لام بمعنی الیٰ بھی آتا ہے
جیسا کہ آیت بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۹۹-۵)
کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا۔
میں ہے یعنی اَوْحٰى اِلَيْهَا مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے
کیونکہ یہاں تو وحی تسخیری مراد ہے اور لام کے ذریعہ
اس وحی کے تسخیری ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے اور
یہ اس وحی کی طرح نہیں ہوتی جو انبیاء علیہم السلام
کی طرف بھیجی جاتی ہے لہذا لام بمعنی الیٰ نہیں ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (۴-۱۰۵) اور
(دیکھو) دغابازوں کی حمایت میں کبھی بحث نہ کرنا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہ لام لام اجل ہے اور
بسبب اور جانب کے معنی دیتا ہے یعنی تم ان
کی حمایت میں مت بحث کرو جیسا کہ دوسری
آیت میں فرمایا:۔
وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ
(۴-۱۰۶) اور جو لوگ اپنے ہم جنسوں کی خیانت
کرتے ہیں ان کی طرف سے بحث نہ کرنا۔
اور یہ لَا تَكُنْ لِّلّٰهِ خَصِيْمًا کے لام کی طرح نہیں
ہے کیونکہ یہاں لام مفعول پر داخل ہوا ہے اور
معنی یہ ہیں۔ لَا تَكُنْ خَصِيْمَ اللّٰهِ کہ تم اللہ کے
خصیم یعنی فریق مخالف مت بنو۔
(۳) لام ابتداء جیسے فرمایا:۔
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (۹-۱۰۸)
البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر
رکھی گئی ہے۔
لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا (۱۲-۸)
کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کو ہم سے
زیادہ پیارے ہیں۔
لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً (۵۹-۱۳) تمہاری
ہیبت ان کے دلوں میں ..... بڑھ کر ہے۔
(۴) چہارم وہ لام جو اِنَّ کے بعد آتا ہے۔ یہ کبھی
تو اِنَّ کے اسم پر داخل ہوتا ہے اور کبھی اِنَّ کی
خبر اور کبھی متعلق خبر پر۔ چنانچہ جب اسم خبر
سے متاخر ہو تو اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً (۲۴-۴۴) اس میں بڑی
عبرت ہے۔
اور خبر پر داخل ہونے کی مثال جیسے فرمایا:۔
اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۸۹-۱۴) بے شک
تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔
اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (۱۱-۷۵)

بے شک ابراہیمؑ بڑے تحمل والے نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

اور یہ لام متعلق خبر پر اس وقت آتا ہے جب متعلق خبر اِنَّ کی خبر پر مقدم ہو۔ جیسے فرمایا:۔
لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ (۱۵-۷۲) اے محمدؐ تمہاری جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش (ہو رہے) تھے۔

(۵) وہ لام جو اِن مخففہ اور اِن نافیہ میں فرق کرنے کے لئے اِن مخففہ کے ساتھ آتا ہے۔
جیسے فرمایا:۔
وَإِنْ كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۴۳-۳۵) اور یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے۔

(۶) لام قسم۔ یہ کبھی اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا۔ يَدْعُو لَمَنْ ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ (۲۲-۱۳) (بلکہ ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے۔ اور کبھی فعل ماضی پر آتا ہے جیسے فرمایا:۔
لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (۱۲-۱۱۱) ان کے قصے میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔

اگر یہ لام فعل مستقبل پر آئے تو اس کے ساتھ نون تاکید ثقیلہ یا خفیفہ کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا۔ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ (۳-۸۱) تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اور آیت کریمہ:۔ وَإِنَّ كُلًّا لَمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ (۱۱-۱۱۱) اور تمہارا پروردگار ان سب کو قیامت کے دن ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیگا۔

میں لَمَّا کا لام اِنْ کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ اور لَيُوَفِّيَنَّهُمْ کا لام قسم کا ہے۔

(۷) وہ لام جو "لَوْ" کی خبر پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ (۲-۱۰۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔
لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ (۴۸-۲۵) اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے تو جو ان میں کافر تھے ان کو ہم ...... عذاب دیتے۔
وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ (۴-۴۶) اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سُن لیا اور مان لیا اور آپ کو متوجہ کرنے کے لئے ... رَاعِنَا کی جگہ اُنْظُرْنَا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

اور کبھی لَوْ کے جواب میں لام محذوف ہوتا ہے جیسے لَوْ جِئْتَنِي أَكْرَمْتُكَ اصل میں لَأَكْرَمْتُكَ ہے۔

(۸) وہ لام جو "مدعو" یا مدعوالیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مدعو کے لئے یہ مفتوح ہوتا ہے۔ جیسے يَا لَزَيْدٍ۔ اور مدعوالیہ پر آئے تو مکسور ہوتا ہے جیسے يَا لِزَيْدٍ۔

(۹) لام امر یہ ابتدا میں آئے تو مکسور ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۲۴-۵۸)۔ مومنو تمہارے غلام، لونڈیاں ...... تم سے اجازت لیا کریں۔
لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (۴۳-۷۷) تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔
اور اگر اس پر واؤ یا فا آجائے تو ساکن ہو جاتا ہے

جیسے فرمایا۔
وَلِیَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۲۹-۶۶) اور
فائدہ اٹھائیں (سو خیر) عنقریب ان کو معلوم ہو جائیگا۔
وَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ
(۱۸-۲۸) تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے
کافر رہے۔
فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا (۱۰-۵۸) تو چاہیے کہ
لوگ اس سے خوش ہوں۔ ایک قراءت میں
فَلْتَفْرَحُوْا ہے۔
اور جب اس پر ثُمَّ داخل ہو تو اسے ساکن اور
متحرک دونوں طرح پڑھنا جائز ہوتا ہے جیسے فرمایا۔
ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ
وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ (۲۲-۲۹) پھر
چاہیئے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں
پوری کریں۔ اور خانہ قدیم یعنی بیت اللہ کا طواف کریں۔

(ل ء ل ء)

اَللُّؤْلُؤُ۔ موتی۔ جمع لَاٰلِئُ۔ قرآن میں ہے:۔
یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ (۵۷-۵۸) دونوں
دریاؤں سے موتی ..... نکلتے ہیں۔
کَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّکْنُوْنٌ (۵۲-۲۴) جیسے چھپائے
ہوئے موتی۔ اور تَلَاْلَأَ الشَّیْءُ کے معنی کسی
چیز کے موتی کی طرح چمکنے کے ہیں مشہور محاورہ ہے۔
لَآ اَفْعَلُ ذٰلِکَ مَا تَلَأْلَأَتِ الظِّبَاءُ بِاَذْنَابِهَا
جب تک کہ آہو اپنے دم ہلاتے رہیں گے میں یہ
کام نہیں کرونگا یعنی کبھی بھی یہ کام نہیں کروں گا۔

(لا حرف)

لا۔ یہ کبھی عدم محض کے لئے آتا ہے۔ جیسے:۔
زَیْدٌ لَا عَالِمٌ یعنی جاہل ہے اور کبھی نفی کے
لئے ہوتا ہے۔ اور اسم و فعل دونوں کے ساتھ ازمنہ
ثلاثہ میں نفی کے معنی دیتا ہے لیکن جب زمانہ ماضی
میں نفی کے لئے ہو تو یا تو اس کے بعد فعل کو ذکر
ہی نہیں کیا جاتا مثلاً اگر کوئی هَلْ خَرَجْتَ
کہے تو اس کے جواب میں صرف "لا" کہہ دینا کافی
ہے یعنی لَا خَرَجْتُ اور اگر فعل مذکور بھی ہوتا
ہے تو شاذ و نادر اور وہ بھی اس وقت (۱) جب
لا اور فعل کے درمیان کوئی فاصل آجائے۔ جیسے:۔
لَا رَجُلًا ضَرَبْتُ وَلَا امْرَأَةً (۲) جب اس
پر دوسرے فعل کا عطف ہو جیسے:۔ لَا خَرَجْتُ
وَلَا ضَرَبْتُ اور یا (۳) لا مکرر ہو جیسے:۔
فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی (۷۵-۳۱) اس ناعاقبت
اندیش نے نہ تو کلام خدا کی تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔
اور یا (۴) جملہ دعائیہ میں جیسے لَا کَانَ (خدا
کرے ایسا نہ ہو۔)
لَا اَفْلَحَ (وہ کامیاب نہ ہو) وغیرہ۔
اور زمانہ مستقبل میں نفی کے متعلق فرمایا:۔
لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ (۳۴-۳) ذرہ
بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔
اور کبھی "لا" کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے اور کلام
محذوف کی نفی کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی
الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ (۱۰-۶۱) اور تمہارے
پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں
ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں ۔۔۔۔
اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی بعض نے لا کو اسی
معنی پر حمل کیا ہے۔
لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ (۷۵-۱) ہم کو

روزِ قیامت کی قسم۔
فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ (۷۰-۴۰) میں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم کھاتا ہوں۔
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ (۴-۶۵) تمہارے پروردگار کی قسم یہ مومن نہیں ہوں گے۔
وَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ (۵۶-۷۵) ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم[1]۔ اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[2] (المتقارب)

(۳۸۸) لَا وَاَبِيْكَ اِبْنَةَ الْعَامِرِيّ

نہیں تیرے باپ کی قسم اے عامری کی بیٹی۔
اور مروی ہے[3] (۱۰۵) کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہوگیا ہے روزہ افطار کردیا اس کے بعد سورج نکل آیا تو آپ نے فرمایا:۔
لَا نَقْضِيْهِ مَا تَجَانَفْنَا الْاِثْمَ فِيْهِ اس میں بھی لَا کلام محذوف کی نفی کے لئے ہے یعنی اس غلطی پر جب لوگوں نے کہا کہ آپ نے گناہ کا ارتکاب لیا تو اس کی نفی کے لئے انہوں نے لَا فرمایا۔ یعنی ہم گنہگار نہیں ہیں۔ اس کے بعد نَقْضِيْهِ سے از سر نو جملہ شروع کیا ہے۔
اور کبھی یہ لَا نہی کے لئے آتا ہے جیسے فرمایا:۔
لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (۴۹-۱۱) کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے۔
وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹-۱۱) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ اور آیت:۔
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ (۷-۲۷) اے بنی آدم دیکھنا کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔
اور نیز لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ (۲۷-۱۸) ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں۔ . . . .
میں بھی لَا نہی کے لئے ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (۲-۸۳) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لَا نافیہ بمعنی خبر ہے یعنی وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ (۲-۸۴) اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں کشت و خون نہیں کرو گے۔
میں بھی لَا نفی پر محمول ہے اور فرمان باری تعالیٰ:۔
مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ (۴-۷۵) تمہیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں نہیں لڑتے۔
میں ہوسکتا ہے کہ لَا تُقَاتِلُوْنَ موضع حال میں ہو۔ اور معنی یہ ہو مَا لَكُمْ غَيْرَ مُقَاتِلِيْنَ یعنی تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم لڑنے والے نہیں ہو۔
اور لَا کے بعد اگر اسم نکرہ آجائے تو وہ مبنی بر فتحہ ہوتا ہے اور لائے نفی کے معنی دیتا ہے جیسے فرمایا:۔

---

[1] وبعضہم قال ان "لا" زائدۃ فی القسم لکن ضعفہ الرازی ۳۰/۲۱۴ - ۲۱۵ مبسوطہ والبیت مطلع قصیدۃ لامرئ القیس
علقہا ۴۴ بیناو طنی بابنۃ العامری فاطمۃ بنت عمرو ونمامہ . . . [2] یدّعی القوم انی افرّ والبیت فی الحماسۃ فی قصیدۃ
لحیلۃ راجع الخزانۃ (۱/۲۳۳،۲۳۴ ۸۹۴) والعینی (۱:۹۷) وشرح المفضلیات والمعلقات لابن الانباری ۴۴ والعقد الثمین
۲۳ والسیوطی ۱۲۰ والطبرسی ۲۷/۱۳۱) والفخر ۳۰/۲۱۴) والبیت من شواہد الکشاف "قال المحب" وقیل البیت لربیعۃ بن جشم النمیری۔
[3] انظر لقول عمرؓ وتاویلہ غریب ابی عبیدۃ ۳/۲۱۳ فی حدیث عمر والمسند لعمر ۱۰ عن زید بن وہب والنہایۃ (جنف) والفائق ۱/۲۱۸۔

لَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ (۲-۱۹۷) نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے۔

اور کبھی دو متضاد معنوں کے درمیان لا مکرر آجاتا ہے۔ اور دونوں کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے:۔

لَا زَیْدٌ بِمُقِیْمٍ وَّلَا ظَاعِنٍ نہ زید مقیم ہے اور نہ ہی مسافر یعنی کبھی مقیم ہے اور کبھی سفر پر اور کبھی دو متضاد معنوں کی نفی سے ایک درمیانی حالت کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے۔ لَیْسَ اَبْیَضَ وَلَا اَسْوَدَ سے مراد ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں کے درمیان ہے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا رنگ ہو چنانچہ آیہ کریمہ:۔ لَا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ (۲۴-۳۵) یعنی زیتون کہ نہ مشرق کی طرف منسوب ہے اور نہ مغرب کی طرف۔ کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ بیک وقت مشرقی بھی ہے اور غربی بھی۔ اور بعض نے اس کا افراط اور تفریط سے محفوظ ہونا مراد لیا ہے۔

کبھی لا محض سلب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس سے ایک شے کی نفی کرکے دوسری کا اثبات مقصود نہیں ہوتا مثلاً لَا اِنْسَانَ کہہ کر صرف انسانیت کی نفی کا قصد کیا جائے اور عامی محاورہ لَا حِدٌ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

(اللات)

اَللَّاتَ اور اَلْعُزّٰی۔ دو بتوں کے نام ہیں۔ اَللَّاتَ اصل میں اللہ ہے۔ ہاء کو حذف کرکے اس کے عوض تاء تانیث لائی گئی ہے۔ اور اس تانیث سے اللہ تعالیٰ کے مرتبہ سے کم ہونے پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ کہ وہ اس کو اپنے زعم میں قرب الٰہی حاصل کرنے کا خاص ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸-۳) اور وہ رہائی کا وقت نہیں تھا۔ میں فراء کے نزدیک لَاتَ اصل میں لَا حِیْنَ ہے اور اس میں تاء زائدہ ہے جیسا کہ ثُمَّتَ اور رُبَّتَ میں لائی جاتی ہے۔ بعض اہل بصرہ نے کہا ہے وَلَاتَ بمعنی لَیْسَ ہے۔ ابوبکر العلاف کا قول ہے کہ یہ اصل میں لَیْسَ ہے[1] یا الف سے اور سین تاء سے تبدیل ہو کر لَاتَ بن گیا ہے۔ جیسا کہ نَاسٌ میں ایک لغت نَاتٌ بھی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ لَاتَ اصل میں "لا" ہی ہے۔ اس میں تاء تانیث کا اضافہ کرکے ایک ساعت یا مدت کے معنی پر تنبیہ کی گئی ہے اور پوری بات یوں ہے:۔

لَیْسَتِ السَّاعَةُ اَوِ الْمُدَّةُ حِیْنَ مَنَاصٍ۔

(ل ب ب)

اَللُّبُّ کے معنی عقل خالص کے ہیں جو آمیزش (یعنی ظن و وہم اور جذبات) سے پاک ہو اور عقل کو لُبٌّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انسان کے معنوی قوی کا خلاصہ ہوتی ہے جیسا کہ کسی چیز کے خالص حصے کو اس کا لُبّ اور لُبَاب کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ لُبٌّ کے معنی پاکیزہ اور نتھری عقل کے ہیں چنانچہ ہر لُبٌّ کو عقل کہہ سکتے ہیں لیکن۔ ہر عقل "لُبٌّ" نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے

---

[1] ای بکسر الیاء ذکرہ ابن ہشام فی المغنی ار ۲۸۱ ولم ینسبہ والیہ ذہب ابو عبیدۃ وابن الطراوۃ والبوبکر ہذا العلۃ الخیاط مکان العلاف لان الخیاط کان من علماء النحاۃ ذکرہ السیوطی فی البغیۃ ۱۹ باب المحمدین مات سنۃ عشرین وثلاثمائۃ وثلاثمائۃ راجع للبحث المغنی لابن ہشام فانہ یغنیک۔

کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام احکام کو جن کا ادراک عقول زکیہ ہی کر سکتی ہیں اُولُوا الْاَلْبَابِ کے ساتھ مختص کیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲-۲۶۹) اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں۔

اور اس نوع کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

لَبَّ فُلَانٌ (س) کے معنی کسی کے صاحب لُبّ ہونے کے ہیں۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کو لڑکے کے متعلق کہا:۔

اِضْرِبْہُ کَیْ یَلُبَّ وَیَقُوْدَ الْجَیْشَ ذَا اللَّجَبِ

اسے پیٹو تاکہ عقلمند ہو جائے اور لشکرِ جرار کی قیادت کر سکے۔

رَجُلٌ اَلَبِیْبٌ کے معنی عقلمند آدمی کے ہیں اسکی جمع اَلِبَّاءُ آتی ہے۔ اور مَلْبُوْبٌ اسے کہتے ہیں جو عقلمندی میں مشہور ہو۔

اَلَبَّ بِالْمَکَانِ کسی مقام پر قیام کرنا اس کے اصل معنی اونٹ کا کسی مقام پر اپنا لبہ یعنی سینہ رکھ دینے کے ہیں۔

تَلَبَّبَ۔ اس کے اصل معنی سینہ پر پیٹی باندھنے کے ہیں (پھر مجازاً) (احرام باندھنے اور کسی کام کے لئے مستعد ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے)

لَبَبْتُہٗ کے معنی کسی کے لَبَّۃٌ یعنی سینہ پر مارنے کے ہیں۔ اور لَبَّۃٌ (سینہ) کو لَبَّۃٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قوت عقلی کا مقام ہے۔ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ فِیْ لَبَبٍ۔ فلاں آسودہ حال ہے۔

لَبَّیْکَ (کلمۂ ایجاب ہے) بعض نے کہا ہے کہ یہ لَبَّ بِالْمَکَانِ وَاَلَبَّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ پر مقیم ہونے کے ہیں اور مؤکد طور پر فرمانبرداری کا اظہار کرنے کے لئے اسے تثنیہ بنا لیا گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں لَبَّبَ ہے، اس کی آخری باء کو یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جیسے تَظَنَّیْتُ کہ اصل میں تَظَنَّنْتُ ہے اس کا آخری نون یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔

بعض کا خیال ہے یہ اِمْرَءَۃٌ لَبَّۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اولاد سے محبت کرنے والی عورت کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی اِخْلَاصٌ لَّکَ بَعْدَ اِخْلَاصٍ کے ہیں یعنی بار بار تمہارے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہوں اور یہ لُبُّ الطَّعَامِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی خالص کھانا کے ہیں۔ اسی سے حَسَبٌ لُبَابٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی خالص حَسَبَ کے ہیں۔

(ل ب ث)

لَبِثَ بِالْمَکَانِ کے معنی کسی مقام پر جم کر ٹھہرنے اور مستقل قیام کرنا کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَلَبِثَ فِیْھِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ (۲۹-۱۴) تو وہ ان میں ۔ ۔ ۔ ۔ ہزار برس رہے۔

فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ (۲۰-۴۰) پھر تم کئی سال ٹھہرے رہے۔

قٰلَ کَمْ لَبِثْتُمْ (۲۳-۱۱۲) خدا پوچھے گا کہ تم کتنے برس رہے۔

قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ (۲۳-۱۱۳) وہ کہیں گے کہ ہم ایک روز یا ایک روز سے بھی کم رہے تھے۔

قَالُوْا رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ (۱۸-۱۹) انہوں

نے کہا کہ جتنی مدت تم رہے ہو تمہارا پروردگار ہی اس کو خوب جانتا ہے۔

لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً (۷۹-۴۶) کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام رہے تھے۔

لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً (۴۶-۳۵) تو خیال کریں گے کہ گویا وہ دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر۔

مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (۳۴-۱۴) تو ذلت کی تکلیف میں نہ پڑے رہتے۔

(ل ب د)

لِبْدَةٌ۔ تہ برتہ جمی ہوئی اون ج لِبَدٌ قرآن میں ہے:۔

يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۷۲-۱۹) کافران کے گرد اگرد ہجوم کر لینے کو تھے۔

یعنی تہ برتہ جمی ہوئی اون کی طرح ان کے گرد جمع ہوگئے۔ بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ وہ آپ پر مجتمع ہوکر لبدہ کی طرح گرنے لگے ایک قرأت میں لُبَدًا بھی ہے یعنی آپ کے گرد ہجوم کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے۔ اور لِبْدٌ کی جمع اَلْبَادٌ وَ لُبُوْدٌ آتی ہے

اَلْبَدْتُ السَّرْجَ میں نے زین کے لئے نمدہ بنایا اور اَلْبَدْتُ الْفَرَسَ کے معنی ہیں میں نے گھوڑے پر نمدہ ڈالا۔ جیسے اَسْرَجْتُهٗ (میں نے اس پر زین کسی۔ وَاَلْجَمْتُهٗ میں نے اسے لگام دی۔ اَلْبَبْتُهٗ (سینہ بند باندھا)

اَللِّبْدَةُ یہ لِبْدٌ کا مفرد ہے نمدہ کے ایک ٹکڑہ کو لِبْدَةٌ کہتے ہیں مثل مشہور ہے[1]

هُوَ اَمْنَعُ مِنْ لِبْدَةِ الْاَسَدِ۔ وہ شیر کے لبدہ یعنی سینہ یا ایال سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔ لَبِدَ الشَّعْرُ بالوں کا اوپر تلے جم جانا۔

لَبِدَتِ الْاِبِلُ لَبَدًا: زیادہ گھاس کھانے کی وجہ سے اونٹ پریشان اور سینہ گرفتہ ہوگئے اور آیت کریمہ:۔

مَالًا لُبَدًا (۹۰-۶) بہت سا مال۔

میں لُبَدٌ کے معنی مال کثیر کے ہیں مثل مشہور ہے[2]

مَالَهٗ سَبَدٌ وَّلَا لَبَدٌ: نہ اس کے پاس اون ہے نہ بال یعنی بالکل مفلس ہے نہ تھوڑا ہے نہ بہت۔

لُبَدٌ ایک پرندہ جو زمین کے ساتھ سینہ لگا کر چپک جاتا ہے۔ اور نسور لقمان (لقمان کے گدھوں میں سے آخری نر گدھ) کو لُبَدٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْبَدَ الْبَعِيْرُ اونٹ کے سرین پر گوبر کا جم جانا کبھی یہ اس کے خوبصورت اور موٹا ہونے سے کنایہ ہوتا ہے۔

اَلْبَدْتُ الْقِرْبَةَ مشک کو لَبِيْدٌ یعنی بالوں سے بنی ہوئی چھوٹی بوری میں ڈال دینا۔

(ل ب س)

لَبِسَ الثَّوْبَ۔ کے معنی کپڑا پہننے کے ہیں اور اَلْبَسَهٗ کے معنی دوسرے کو پہنانا کے۔

قرآن میں ہے:۔

وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا (۱۸-۳۱) اور وہ سبز کپڑے پہنا کریں گے۔

اَللِّبَاسُ وَاللَّبُوْسُ وَاللِّبْسُ وہ چیز جو پہنی جائے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] المثل لی جل المعاجم ۔ [2] انظر للمثل ادب الکاتب ۲۹ و جمہرۃ العسکری ۱۹۱ و المیدانی (۲: ۲۰۰) و اللسان والبحر والحیوان ۵ (۹۰/۴) والنوادر لابی مسحل ۱۲

وَقَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا يُّوَارِيۡ سَوۡاٰتِكُمۡ (۷-۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانپے۔ اور لباس کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو انسان کے برے کاموں پر پردہ ڈال سکے۔ چنانچہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو قبائح کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲-۱۸۷) وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے اپنی بیوی کو اِزَارٌ کہا ہے[1]:۔

(۳۸۹) فِدًى لَكَ مِنۡ اَخِيۡ ثِقَةٍ اِزَارِيۡ

اے میرے قابل اعتماد بھائی تجھ پر میری اِزار یعنی بیوی قربان ہو۔

اور تمثیل و تشبیہ کے طور پر "تَقۡوٰى" کو بھی لباس قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

لِبَاسُ التَّقۡوٰى (۷-۲۶) اور جو پرہیزگاری کا لباس ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ لَّكُمۡ (۲۱-۸۰) اور ہم نے تمہارے لئے ان کو ایک طرح کا لباس بنانا .... میں لَبُوۡسٌ سے زرہیں مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَالۡخَوۡفِ (۱۶-۱۱۲) تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر ناشکری کا مزہ چکھا دیا۔ میں جوع یعنی بھوک اور خوف کی تصویر کھینچنے کے لئے اسے لباس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جیسا کہ:۔

تَدَرَّعَ فُلَانٌ الۡفَقۡرَ اور لَبِسَ الۡجُوۡعَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے[2]: ( )

(۳۹۰) وَكِسۡوَتُهُمۡ مِّنۡ خَيۡرِ بُرۡدٍ مُّنَجَّمٍ

عمدہ دھاری دار چادریں ان کا لباس ہیں۔

بعض نے وَلَبَاسُ التَّقۡوٰى پڑھا ہے جو لَبۡسٌ بمعنی سَتۡرٌ سے مشتق ہے۔

دراصل لَبۡسٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً لَبَسۡتُ عَلَيۡهِ اَمۡرَهٗ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلَلَبَسۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّا يَلۡبِسُوۡنَ (۶-۹) اور جو شبہ (وہ اب) کرتے ہیں اسی شبہ میں پھر ڈال دیتے۔

وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ (۲-۴۲) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ۔

لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ (۳-۷۱) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔

اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ (۶-۸۲) جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو شرک کے ظلم سے مخلوط نہیں کیا۔

فِي الۡاَمۡرِ لُبۡسَةٌ یعنی اس معاملہ میں اشتباہ ہے۔

لَابَسۡتُ الۡاَمۡرَ کسی کام کی مزاولت کرنا۔

لَابَسۡتُ فُلَانًا کسی سے گھل مل جانا یعنی اندرونی حال سے واقف ہونا۔

لَبِسَ فِيۡ فُلَانٍ مَلۡبَسٌ یعنی در وے کبر و سال خوردگی نیست۔

شاعر نے کہا ہے[3] (الطویل)

---

[1] قالہ جعدۃ بن عبد السلمی وقد مسرلی [illegible] [2] لم اجدہ فی المراجع [3] قالہ امرؤ القیس وصدرہ: الا ان بعد العدم للمرء قنوۃ .... والبیت فی اللسان (لبس) و دیوانہ ۱۴۲ ومن الستۃ ۳۵ و امالی المرتضیٰ (۱: ۵۹۶) والسمط ۳۲۷ و الصناعتین ۳۴۴ وفیہ بعد الشباب بدل بعد المشیب ۱۲

(۳۹) وَبَعْدَ الْمَشِيبِ طُولُ عُمْرٍ وَمَلْبَسًا
اور بڑھاپے کے کبر سنی اور کہن سالی ہے۔

(ل ب ن)

اَللَّبَنُ۔ دودھ ج اَلْبَانٌ۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَنْهَارٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ (۴۷-۱۵)
اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ نہیں بدلے گا۔
مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا۔ اور اس غذا سے جونہ فضلہ بنی ہو اور نہ خون ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں۔

لَابِنٌ۔ بہت دودھ والا۔ لَبَنْتُهٗ میں نے اسے دودھ پلایا۔

فَرَسٌ مَلْبُوْنٌ۔ دودھ سے پرورش کیا ہوا گھوڑا۔
اَلْبَنَ فُلَانٌ۔ بہت سے دودھ کا مالک ہونا اور ایسے آدمی کو مُلْبِنٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْبَنَتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں اونٹنی بہت دودھ والی ہوگئی عام اس سے کہ طبعی طور پر ہو یا تھنوں میں دودھ چھوڑ دینے کی وجہ سے ہو۔ اَلْمِلْبَنُ دودھ دوہنے کا برتن اور هُوَ اَخُوْهُ بِلِبَانِ اُمِّهٖ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کا رضاعی بھائی ہے اور اس محاورہ میں لِبَانِ اُمِّهٖ کی بجائے لَبَنُ اُمِّهٖ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ اہل عرب سے مسموع نہیں ہے۔

كَمْ لَبَنُ غَنَمِكَ یعنی تیری بکریوں میں دودھ والی کتنی ہیں[1]

اَللَّبَانُ کے معنی صدر یعنی سینہ کے ہیں۔ اور لُبَانَةٌ کے اصل معنی تو دودھ کی ضرورت کے ہیں مگر مطلق ضرورت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اَللَّبِنُ جس کے معنی عمارتی اینٹ کے ہیں اور اس کا واحد لَبِنَةٌ ہے اس کا لَبَنٌ (دودھ) سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہے۔ اَللَّبِنُ (اینٹ) سے لَبَنَهٗ (ض) یَلْبِنُهٗ کے معنی اینٹ سے ماپنے کے ہیں اور اینٹ بنانے والے کو لَبَّانٌ کہا جاتا ہے۔

(ل ج ج)

اَللَّجَاجُ (مصدر ض س) کے معنی کسی ممنوع کام کے کرنے میں بڑھتے چلے جانے اور اس پر ضد کرنے کے ہیں[2] اس سے فعل لَجَّ فِي الْاَمْرِ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۲۳-۷۵) اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو تکلیفیں انہیں پہنچ رہی ہیں وہ دور کر دیں تو اپنی سرکشی پر اڑے رہیں اور بھٹکتے (پھریں)
بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ (۶۷-۲۱) لیکن یہ سرکشی اور نفرت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔
اسی سے لَجَّةُ الصَّوْتِ مشہور ہے جس کے معنی

---

[1] وہو جمع لَبُوْنٌ بمعنی ذات الدر ﴿ [2] فی معناہ: استلج وفی الحدیث اذا استلج احدکم بیمینہ فانہ آثم لہ عند اللہ من الکفارۃ ﴿
[3] ای ارتفاعہ وفی حدیث عکرمۃ: سمعت لہم لجۃ بآمین (اللسان) ﴿

آواز کے بار بار آنے جانے اور پلٹنے کے ہیں۔ لُجَّةُ الْبَحْرِ (بضم اللام) سمندر کی موجوں کا تلاطم (ان کا بار بار آنا اور پلٹنا)

لُجَّةُ اللَّيْلِ۔ رات کی تاریکی کا آنا جانا اور سخت ہونا۔ اور لَجَّةٌ و لُجَّةٌ میں ایک لغت لُجٌّ و لَجٌّ بھی ہے۔ اور آیت کریمہ:

فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ (۲۴-۴۰) دریائے عمیق میں۔ میں لُجِّيٌّ بھی لُجَّةُ الْبَحْرِ کی طرف منسوب ہے اور روایت[1] (۱۰۷) وَضَعَ اللُّجَّ عَلَى قَفَيَّ (اس نے میری گردن پر تلوار رکھ دی)۔ میں لُجّ کے معنی آبدار تلوار کے ہیں اور قَفَيَّ اصل میں قَفَايَ ہے الف یاء سے مبدل ہو کر یاء میں ادغام ہو گیا ہے

اَللَّجْلَجَةُ کے معنی ہکلاپن کے ہیں اور نیز لقمہ کو بغیر چبائے منہ میں پھرانے کو بھی لَجْلَجَة کہتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے[2] (الوافر)

(۳۹۲) يُلَجْلِجُ مُضْغَةً فِيهَا أَنِيضٌ

یعنی منہ میں گوشت کا نیم پختہ ٹکڑا پھرا رہا ہے۔

رَجُلٌ لَجْلَاجٌ ہکلا رک رک کر بات کرنے والا۔

اَلْحَقُّ أَبْلَجُ وَالْبَاطِلُ لَجْلَجٌ حق واضح ہے اور باطل مشتبہ یعنی کوئی شخص باطل کو نہ تو صاف طور پر بیان کر سکتا ہے اور نہ انشراح صدر کے ساتھ اسے انجام دے سکتا ہے۔ بلکہ اس میں ہمیشہ متردد رہتا ہے۔

(ل ح د)

اَللَّحْدُ۔ اس گڑھے یا شگاف کو کہتے ہیں جو قبر کی ایک جانب میں بنایا جاتا ہے۔ اور لَحَدَ الْقَبْرَ وَأَلْحَدَهُ کے معنی قبر میں لحد بنانا کے ہیں۔

لَحَدَ الْمَيِّتَ وَأَلْحَدَهُ میت کو لحد میں دفن کرنا اور لَحْدٌ کو مُلْحَدٌ بھی کہا جاتا ہے جو کہ أَلْحَدْتُهُ (افعال) سے اسم ظرف ہے۔

لَحَدَ بِلِسَانِهِ إِلَى كَذَا (زبان سے کسی کی طرف جھکنے یعنی غلط باتیں کہنا کے ہیں اور آیت کریمہ:

لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ (۱۶-۱۰۳) مگر جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں۔ میں يَلْحَدُونَ لَحَدَ سے ہے اور ایک قرأت میں يُلْحِدُونَ (أَلْحَدَ سے) ہے۔ کہا جاتا ہے أَلْحَدَ فُلَانٌ۔ فلاں حق سے پھر گیا۔

الْحَادٌ دو قسم پر ہے۔ ایک شرک باللہ کی طرف مائل ہونا۔ دوم[3] شرک بالاسباب کی طرف مائل ہونا۔

---

[1] فی حدیث طلحۃ ولفظہ: قدمونی فوضعوا اللُّجَّ علی قفیَّ قال فی النہایۃ ۴ر۲۲۳ اللُّجُّ بالضم السیف بلغۃ طیء وقیل ہو اسم سمی بہ السیف کما قالوا الصمصامۃ راجع غریب ابی عبید (۴ر۹) احادیث طلحۃ بن عبید اللہ التیمی وہو من العشرۃ المبشرۃ قتل یوم الجمل سنۃ ۳۶ وہو بجانب عائشۃ ولہ فی الصحیحین ۳۸ حدیثا انظر لترجمتہ الاصابۃ ۳ر۲۹ وتہذیب التہذیب ۵ر۲۰ والحدیث فی قصۃ بیعۃ علیؓ قال طلحۃ: انی اخذت فادخلت فی الحش وقربوا فوضعوا اللج علی قفیّ فقالوا: التبایعن اولنقتلنک فبایعت وانا کمرہ وراجع الحدیث ایضاً الفائق ۳ر۱۹ والصواب وضعوا مکان وضع کذا فی جمیع المراجع ۱۲ [2] قالہ زہیر وتمامہ: اصلت فہی تحت الکشح داء۔ والبیت فی اللسان (انض، لج، صلل) ودیوانہ لشرح الشنتمری ۳۴۲ وحمنا (الشعر الجاہلی (۱: ۱۹۸) وتہذیب الالفاظ ۴۹۷ والجرہ: ۲۰۰) وفی روایۃ الکامل تلجلج (۱: ۱۶) وہی موافقۃ لروایۃ الستۃ (العقد الثمین ۸۷) وہو الصواب لانہ خطاب وبعدہ: غصصت بینہا فبشمت منہا۔ وعندک لو اردت لہا دواء۔ والبیت من ابیات المعانی انظر المعانی الکبیر للقتبی ۸۴۸، ۱۱۴۱ ؛

اوّل قسم کا الحاد ایمان کے منافی ہے اور انسان کے ایمان وعقیدہ کو باطل کر دیتا ہے۔ اور دوسری قسم کا الحاد ایمان کو تو باطل نہیں کرتا لیکن اس کے عُروۃ (حلقہ) کو کمزور ضرور کر دیتا ہے جیسا کہ آیات:۔

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۲-۲۵) اور جو اس میں شرارت سے کجروی و کفر کرنا چاہے اس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

اَلَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷-۱۸۰) جو لوگ اس کے ناموں کے وصف میں کجروی اختیار کرتے ہیں۔

میں یہی دوسری قسم کا الحاد مراد ہے اور الحاد فِیْٓ اَسْمَآئِهٖ یعنی صفات خداوندی میں الحاد کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ باری تعالیٰ کو ان اوصاف کے ساتھ متصف ماننا جو شان الوہیت کے منافی ہوں دوم یہ کہ صفات الٰہی کی ایسی تاویل کرنا جو اس کی شان کے زیبا نہ ہو۔

اِلْتَحَدَ فُلَانٌ اِلٰى كَذَا۔ وہ (راستہ سے ہٹ کر) ایک جانب مائل ہو گیا اور آیت کریمہ:۔

وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔ (۱۸-۲۷) اور اس کے سوا تم کہیں پناہ کی جگہ بھی نہیں پاؤ گے۔

میں مُلْتَحَدًا مصدر میمی بمعنی التحاد بھی ہو سکتا ہے اور اسم ظرف بھی (اور اس کے معنی پناہ گاہ کے ہیں) اِلْتَحَدَ السَّهْمُ عَنِ الْهَدَفِ۔ تیر نشانے سے ایک جانب مائل ہو گیا (یعنی ہٹ گیا)۔

(ل ح ف)

اَلْاِلْحَافُ کے معنی الحاح یعنی چمٹ کر مانگنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (۲-۲۷۳) (اور شرم کے سبب) لوگوں سے منہ پھوڑ کر (اور لپٹ کر) نہیں مانگ سکتے۔

اسی سے استعارہ کے طور پر اَلْحَفَ شَارِبَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی مونچھیں جڑ سے کاٹ دینے کے ہیں اور یہ دراصل لحاف سے ہے اور لِحَافٌ کے معنی اوڑھنے کا کپڑا ہیں۔ اَلْحَفْتُهٗ فَالْتَحَفَ میں نے اسے لحاف میں ڈھانپ دیا چنانچہ وہ اس میں لپٹ گیا۔

(ل ح ق)

لَحِقْتُهٗ وَلَحِقْتُ بِهٖ کے معنی کسی کو پالینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اَلَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ (۳-۱۷۰) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے۔ (اور شہید ہو کر) ان میں شامل نہ ہو سکے۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲-۳) اور ان میں سے دوسرے لوگوں کی طرف بھی (ان کو بھیجا ہے) جو ابھی ان مسلمانوں سے نہیں ملے۔ محاورہ ہے۔

اَلْحَقْتُ بِهٖ كَذَا۔ میں نے اسے اس سے ملا دیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَقَهٗ بمعنی لَحِقَهٗ ہے۔ اور دعائے قنوت میں[1] (۱۰۶) اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ میں بھی مُلْحِقٌ اسی معنی پر محمول ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلْحَقْتُ بِهٖ كَذَا سے ماخوذ ہے

---

[1] وقولہ ای قول الداعی او قولہ تعالیٰ لان اُبیًّا کان یدرجہ فی مصحفہ وبعد القنوت سورتین من القرآن انظر المشکل للقتیبی ۲۰ وایضًا فی مصحف ابن عبداللہ بن مسعود انظر کنز العمال ۸/۷۸ ولتخریجہ رقم ۲۹۲۰ وفی منتہی الارب ملحق بکسر الحاء والفتح احسن واصوب ۱۲

لیکن عذاب کی ہولناکی بیان کرنے کے لئے اسے مُلْحِقٌ (ملنے والا) کہہ دیا ہے۔ اور کنایۃً "مُلْحَقٌ" اسے بھی کہتے ہیں جسے کسی خاندان نے اپنے سے وابستہ کر لیا ہو اور وہ ان سے نہ ہو۔

(ل ح م)

اَللَّحْمُ (گوشت) کی جمع لِحَامٌ، لُحُوْمٌ، اور لُحْمَانٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ (۲-۱۷۳) اور سور کا گوشت۔

لَحُمَ الرَّجُلُ فَهُوَ لَحِیْمٌ کے معنی ہیں وہ پُر گوشت اور موٹا ہو گیا۔ اور موٹے چربی چڑھے ہوئے آدمی کو لَاحِمٌ شَاحِمٌ کہا جاتا ہے جیسے:۔ لَابِنٌ وَتَامِرٌ۔

لَحِمَ (س) کے معنی گوشت کھانے کا حریص ہونا کے ہیں اسی سے بہت زیادہ گوشت خور باز یا بھیڑیے کو لَحِمٌ کہا جاتا ہے۔

بَیْتٌ لَحِمٌ۔ وہ گھر جہاں لوگوں کی اکثر غیبتیں کی جائیں۔ حدیث میں ہے[1]: (۱۰۷)

اِنَّ اللّٰهَ یُبْغِضُ قَوْمًا لَحِمِیْنَ کہ اللہ تعالے بہت گوشت خور لوگوں کو ناپسند کرتا ہے۔ یعنی جو ہر وقت لوگوں کی غیبت کرتے رہتے ہیں۔

اَلْحَمَهُ کے معنی کسی کو گوشت کھلانے کے ہیں۔ اور اسی سے تشبیہ کے طور پر اس آدمی کو جس کی گذران شکار پر ہو رَجُلٌ مُلْحِمٌ کہا جاتا ہے۔ پھر مطلقاً تشبیہاً ہر کھاتے پیتے آدمی کو مُلْحِمٌ کہہ دیتے ہیں اور اسی سے ثَوْبٌ مُلْحَمٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی بُنے ہوئے کپڑا کے ہیں کپڑے کے بانا کو لُحْمَةٌ کہا جاتا ہے جو کہ لُحْمَةُ الْبَازِیْ سے مشتق ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے[2]:۔ (۱۰۸)

اَلْوَلَاءُ لُحْمَةٌ کَلُحْمَةِ النَّسَبِ کہ ولاء کا رشتہ بھی نسب کے رشتہ کی طرح ہے شَجَّةٌ مُتَلَاحِمَةٌ زخم جس پر گوشت چڑھ گیا ہو۔

لَحَمْتُ اللَّحْمَ عَنِ الْعَظْمِ میں نے ہڈی سے گوشت کو الگ کر دیا۔ لَحَمْتُ الشَّیْءَ وَاَلْحَمْتُهُ وَلَاحَمْتُ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ میں نے ایک چیز کو دوسری کے ساتھ اس طرح گتھی کر دیا۔ جیسے ہڈی کے ساتھ گوشت پیوست ہوتا ہے۔

اَللِّحَامُ وہ چیز جس سے برتن کو ٹانکا لگایا جائے۔

اَلْحَمْتُ فُلَانًا کسی کو قتل کر کے اس کا گوشت درندوں کو کھلا دیا۔

اَلْحَمْتُ الطَّائِرَ میں نے پرند کا گوشت کھلایا۔ اَلْحَمْتُكَ فُلَانًا۔ میں نے فلاں کی غیبت کا موقع دیا۔

اور یہ ایسے ہی ہے جیسے غیبت و بدگوئی کو اَکْلُ اللَّحْمِ یعنی گوشت کھانے سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا (۴۹-۱۲) کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔

فُلَانٌ لَحِیْمٌ فلاں کو قتل کر دیا گیا گویا اسے درندوں کی خوراک بنا دیا گیا۔ اَلْمَلْحَمَةُ معرکہ ج مَلَاحِمُ۔

---

[1] انظر مجمع البحار ۳/ ۲۸۴ والفائق ۲/ ۲۲۲ باختلاف یسیر فی اللفظ وکذا فسرہ سفیان الثوری [2] حدیث مرفوع۔ خرجہ ابو یعلی وابن حبان عن ابن عمر انظر النقد تانی علی المیؤطا ۲/ ۹۴، وکنز العمال ج ۱۰ رقم ۳۴۸۵ ورقم ۲۲۲۵۵ عن علی وعبداللہ بن ابی اوفیٰ یا الفتح الکبیر للنبہانی ۳/ ۳۰۸؛

وضاحت اور استدلال سے بیان کر سکتا ہو۔

(ل ح ن)

اَللَّحْنُ (ف) کے معنی ہیں بات کو اس کے مستعمل طریقہ اور اسلوب سے پھیر دینا۔ اگر یہ لفظ کے اعراب یا ہیئت تبدیل کر دینے سے ہو جو کہ لحن کا عام مفہوم ہے تو یہ قابل مذمت ہے اور اگر تصریح چھوڑ کر بطور تعریض کلام کرنے سے ہو تو اکثر ادباء کے نزدیک فن بلاغت کے لحاظ سے یہ مستحسن اور کلام کی خوبیوں میں شمار ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے [1] (الخفیف)

(۳۹۳) وَخَیْرُ الْحَدِیْثِ مَا کَانَ لَحْنًا

بہتر کلام وہ ہے جو تعریض میں ہو۔ اور آیت کریمہ: وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷-۳۰) اور تم انہیں ان کے انداز گفتگو سے پہچان لو گے۔ میں بھی یہی مراد ہے۔ اور اسی سے ذہین آدمی کو جو کلام کے صحیح مقصد کو خوب سمجھ لیتا ہو۔ لَحِنٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے [2] (۱۰۹)

لَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ

شاید تم میں سے بعض آدمی دوسرے کی نسبت دلیل پر زیادہ قدرت رکھتے ہوں تو اَلْحَنُ کے معنی زبان آور اور فصیح شخص کے ہیں جو اپنے مافی الضمیر کو

(ل د د)

اَلْاَلَدُّ۔ سخت جھگڑالو آدمی کو کہتے ہیں جو کسی کی بات مانتا ہی نہ ہو۔ اس کی جمع لُدٌّ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲-۲۰۴) حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔

وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُدًّا (۱۹-۹۷) تاکہ اس کے ذریعہ سخت جھگڑالو قوم کو بد انجام سے آگاہ کرو۔

اصل میں اَلَدُّ شدید اللدد (یعنی اس آدمی کو کہتے ہیں جس کی گردن کا پہلو بڑا سخت ہو۔ اور مجازاً اس شخص پر بولا جاتا ہے جسے اس کے ارادہ سے پھیرا نہ جا سکے۔

فُلَانٌ یَتَلَدَّدُ فلاں گردن موڑ کر رخ پھیرتا ہے۔

اَللَّدُوْدُ۔ وہ دوا جو منہ کی ایک جانب سے پلائی جائے [3]۔ اِلْتَدَدْتُ۔ لدود لینا۔

(ل د ن)

لَدُنْ۔ یہ عِنْدَ سے اخص ہے کیونکہ یہ کسی فعل کی انتہاء کے آغاز پر دلالت کرتا ہے جیسے

---

[1] قاله مالک بن اسماء بن خارجة (۵۶-۷۵/۸۰) الشعراء) شاعر اسلامی غزل وصدره منطق رائع وتلحن احیانا ... وفی مصارع العشاق ۲۶۳ انه قال فی امرته حبیبة بنت ابی جندب الانصاری انظر البیت السمط ۱۶ والمشاطرة للاستاذ المیمنی وامالی المرتضی ۱/۴ ۱۵ ذی روایتهما جمیعا صائب بدل رائع والبیت فی ادب الکتاب للصولی ۱۳۱ والعقد الفرید ۲/۴۸۰ والمعجم للمرزبانی ۲۶۶ والبیان للجاحظ ۱/۴ والحیوان ۲/۱۶۱ والخزانة ۲/۸۵ والعمدة ۱/۳۰۸ وفیه صنعة الاشارة اللحن ومعناه فی الآیة والبیت الشاهد کلام یعرفه المخاطب بفحواه وان کان علی غیر وجهه ویسمّی الیعم المحاجاة لدلالة الحجا علیها کذا فسره ابن درید البیت الملکن قرینة صائب یابی عن ذالک الا انه یستلذ من الجواری وایضا راجع حواشی مجالس ثعلب ۵۳۱
[2] قال الحافظ فی الکاف اصله فی الصحیحین قال فی الدرا ۳/۲۰۳ اخرجه مالک والشافعی وابن ابی شیبة والصحیحان عن ام سلمة والحاکم واحمد من روایة اسامة بن زید وابن حبان فی زوائده رقم ۱۱۹۷ عن ابی هریرة والحدیث فی الفائق ۲/۵۱، ۲۲۱ وغریب القتیبی ۵
[3] وفی الحدیث خیر ما تداویتم به اللدود والفائق ۲/۳ ۲۲

...تمت عندہ من لدن طلوع الشمس الی ... غروبھا آغاز طلوع شمس سے غروب آفتاب ... اس کے پاس ٹھہرا رہا۔ تو یہاں لدن کا لفظ ... ٹھہرنے کے آغاز کو بیان کرتا ہے اور کبھی عند ... کی بجائے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ حکایت ... ہے اصبت عندہ مالا و لدنہ مالا۔ میں ... نے اس کے پاس مال پایا بعض نے کہا ہے کہ ... لدن عند سے ابلغ اور اخص ہے قرآن میں ہے:۔ فلا تصاحبنی قد بلغت من لدنی عذرا (۱۸-۷۶) تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا کہ آپ کو مجھے ساتھ نہ رکھنے کے بارے میں میری طرف سے عذر حاصل ہوگا۔

ربنا اتنا من لدنک رحمۃ (۱۸-۱۰) اے ہمارے پروردگار ہم پر اپنے ہاں سے رحمت نازل فرما۔

فھب لی من لدنک ولیا (۱۹-۵) تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (۱۷-۸۰) اور اپنے ہاں سے زور و قوت کو میرا مددگار بنائیو۔

وعلمنٰہ من لدنا علما (۱۸-۶۵) ہم نے اسے اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔

اور لدن میں لد، لدُ، لدی تین لغات اور بھی ہیں۔

اللدن۔ لچکدار نرم۔

(ل د ی)

لدی یہ تقریبًا لدن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

الفیا سیدھا لدی الباب (۱۲-۲۵) اور دونوں کو دروازے کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

(ل ز ب)

اللازب۔ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر شدت سے ثبت ہو جائے اور چمٹ جائے قرآن میں ہے۔

من طین لازب (۳۷-۱۱) چکنے گارے سے (بنایا) اور کبھی لازب بمعنی واجب بھی آتا ہے جیسا کہ کسی چیز کے لازم اور ضروری ہونے کو بیان کرنے کے لئے ضربۃ لازب کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اللزبۃ سخت قحط سالی اس کی جمع لزبات آتی ہے۔

(ل ز م)

لزمہ یلزمہ لزوما کے معنی کسی چیز کا عرصہ دراز تک ایک جگہ پر ٹھہرے رہنا کے ہیں۔ اور الزام (افعال) دو قسم پر ہے ایک تو الزام بالتسخیر ہے اسکی نسبت اللہ تعالیٰ اور انسان دونوں کی طرف ہو سکتی ہے اور دوسرے الزام بالحکم والامر یعنی کسی چیز کا حکمًا واجب کر دینا جیسے فرمایا:۔

انلزمکموھا وانتم لھا کٰرھون (۱۱-۲۸) تو کیا ہم اس کے لئے تمہیں مجبور کر سکتے ہیں۔ اور تم ہو کہ اس سے ناخوش ہو رہے ہو۔

والزمھم کلمۃ التقوٰی (۴۸-۲۶) اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر قائم رکھا۔

فسوف یکون لزاما (۲۵-۷۷) (سو وہ عذاب) تمہارے لئے لازم ہوگی۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى (۲۰-۱۲۹) اور اگر ایک بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور جزائے اعمال کے لئے ایک میعاد مقرر نہ ہو چکی ہوتی۔ تو عذاب (تم سے) چمٹ جاتا۔

(ل س ن)

اَللِّسَانُ۔ زبان اور قوت گویائی کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ (۲۰-۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

یہاں لِسَانٌ کے معنی قوت گویائی کے ہیں کیونکہ وہ بندش ان کی زبان پر نہیں تھی بلکہ قوت گویائی سے عقدہ کشائی کا سوال تھا۔ محاورہ ہے:۔ لِكُلِّ قَوْمٍ لِسَانٌ وَلِسْنٌ (بکسر اللام) یعنی ہر قوم را لغت ولہجہ جدا است۔ قرآن میں ہے:۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ (۱۹-۹۷) (اے پیغمبر) ہم نے یہ قرآن تمہاری زبان میں آسان نازل کیا۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۲۶-۱۹۵) فصیح عربی زبان میں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ (۳۰-۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔

میں السنۃ سے اصوات اور لہجوں کا اختلاف مراد ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح دیکھنے میں ایک شخص کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی اسی طرح قوت سامعہ ایک لہجہ کو دوسرے سے الگ کر لیتی ہے۔

(ل ط ف)

اَللَّطِيْفُ۔ جب یہ کسی جسم کی صفت واقع ہو تو یہ جَثْلٌ کی ضد ہوتا ہے جس کے معنی بھاری اور ثقیل کے ہیں کہتے ہیں شَعْرٌ جَثْلٌ (یعنی زیادہ اور بھاری بال) اور کبھی لَطَافَةٌ یا لُطْفٌ سے حرکت خفیفہ اور دقیق امور کا سرانجام دینا مراد ہوتا ہے اور لَطَائِفُ سے وہ باتیں مراد لی جاتی ہیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے لَطِيْفٌ ہونے کے معنی یا تو یہ ہیں کہ وہ انسانی حواس کے ادراک سے مافوق اور بالاتر ہے اور یا اس لئے لطیف کہا جاتا ہے کہ وہ دقیق امور تک سے واقف ہے اور یا یہ کہ وہ انسانوں کو ہدایت دینے میں نہایت نرم انداز اختیار کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ (۴۲-۱۹) خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ (۱۲-۱۰۰) بیشک میرا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے حسن تدبیر سے کرتا ہے۔

میں لطیف سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کام کو حسن تدبیر سے سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے انہیں اس مرتبہ تک پہنچا دیا اور کبھی ان تحائف کو بھی لُطْفٌ کہا جاتا ہے جو دوستی بڑھانے کے لئے ایک دوسرے کو دیئے جاتے ہیں۔ اسی لئے آنحضرت نے فرمایا (۱۱۰)

تَهَادَوْا تَحَابُّوْا کہ ایک دوسرے کو تحفے بھیجا

له الحديث اخرجه البخاري في الادب المفرد والبيهقي من حديث ابي هريرة بسند جيد انظر تخريج الاحياء ۲/۰/۴ وكنز العمال ج ۳ رقم ۶،۴/۷،۴

کرو. تو تمہاری آپس میں محبت بڑھ جائے گی۔
اَلْطَفَ فُلَانٌ اَخَاہُ بِکَذَا ۔ فلاں نے اپنے بھائی کے ساتھ کسی چیز کے ذریعہ حسن سلوک کیا۔

(ل ظ ی)

لَظِیَتِ النَّارُ وَتَلَظَّتْ کے معنی آگ بھڑک اٹھنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
نَارًا تَلَظّٰی (۹۲-۱۴) بھڑکتی آگ سے۔
اور لَظٰی آگ کے شعلہ کو کہا جاتا ہے جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو یہ جہنم کا علم اور غیر منصرف ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اِنَّھَا لَظٰی (۷۰-۱۵) وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

(ل ع ب)

اَللَّعْبُ ۔ اس مادہ کی اصل لُعَابٌ ہے جس کے معنی منہ سے بہنے والی رال کے ہیں اور لَعَبَ (ف) یَلْعَبُ لَعْبًا کے معنی لعاب بہنے کے ہیں۔ لیکن لَعِبَ (س) فُلَانٌ یَلْعَبُ لَعِبًا کے معنی بغیر صحیح مقصد کے کوئی کام کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
وَمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا لَھْوٌ وَّ لَعِبٌ (۲۹-۶۴) اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے۔
وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَھُمْ لَعِبًا وَّ لَھْوًا (۶-۷۰) اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے۔ ان سے کچھ کام نہ رکھو۔
اَفَاَمِنَ اَھْلُ الْقُرٰٓی اَنْ یَّاْتِیَھُمْ بَاْسُنَا ضُحًی وَّھُمْ یَلْعَبُوْنَ (۷-۹۸) کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آنازل ہو اور وہ کھیل رہے ہوں۔
قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ (۲۱-۵۵) وہ بولے کیا تم ہمارے پاس واقعی حق لائے ہو یا ہم سے کھیل کی باتیں کرتے ہو۔
وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا لٰعِبِیْنَ (۲۱-۱۶) اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو مخلوقات ان دونوں کے درمیان ہے اس کو لہو ولعب کرتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔
اَللَّعْبَۃُ (صیغہ مَرَّۃ) ایک مرتبہ کھیلنا لِعْبَۃٌ (بکسر اللام) کھیلنے کی حالت رَجُلٌ تِلْعَابَۃٌ کے معنی ہیں وَتِلْعَبٌ یعنی بہت بڑا کھلاڑی یا بے کار کام کرنے والا۔ لُعْبَۃٌ۔ گڑیا، شطرنج چوسر وغیرہ جن کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ اَلْمَلْعَبُ (ظرف) کھیلنے کی جگہ یا میدان۔
لُعَابُ النَّحْلِ ۔ شہد۔ لُعَابُ الشَّمْسِ وہ چیز جو دھوپ میں مکڑی کے جالے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔
مُلَاعِبُ ظِلِّہٖ۔ ایک جانور جس کی گردن چھوٹی اور بازو بڑے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا پیٹ سفید ہوتا ہے بیٹھے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سائے سے کھیل رہا ہے۔

(لعل)[1]

لَعَلَّ (حرف) یہ طمع اور اشفاق (ڈرتے ہوئے چاہنے) کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے: بعض مفسرین کا قول ہے کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ اپنے لئے استعمال کرے تو اس کے معنی میں قطعیت آجاتی ہے........... اس بنا پر بہت سی آیات میں لفظ لَعَلَّ سے اس کی تفسیر

---

[1] والعنا الآیات (۷-۱۰۴، ۱۸-۱۹)

کی گئی ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ کے حق میں توقع اور اندیشے کے معنی لینا صحیح نہیں ہیں۔ اور گو لَعَلَّ کے معنی توقع اور امید کے ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا تعلق مخاطب سے ہوتا ہے اور کبھی متکلم سے اور کبھی ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص سے ہوتا ہے۔ لہذا آیت کریمہ:۔

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ (۲۶-۴۰) تاکہ ہم ان جادوگروں کے پیرو ہو جائیں۔ میں توقع کا تعلق قوم فرعون سے ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ (۲۰-۴۴) شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے۔ میں توقع کا تعلق موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ساتھ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اس امید پر فرعون سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا کہ ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے اور آیت کریمہ:۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ (۱۱-۱۲) شاید تم کچھ چیز وحی میں سے جو تمہارے پاس آتی ہے چھوڑ دو۔ میں لَعَلَّ کے معنی یہ ہیں کہ لوگ تمہارے متعلق ایسا گمان کرتے ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (۱۸-۶) تو شاید تم اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔

میں بھی لَعَلَّ کا تعلق لوگوں سے ہے یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں اور آیت کریمہ:۔

وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۶۲-۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو یاد کرو مگر دل میں یہ امید رکھ کر اللہ کا ذکر کرو کہ اس سے فلاح و کامرانی حاصل ہوگی جیسا کہ دوسری جگہ مومنین کے متعلق فرمایا:۔

وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ (۱۷-۵۷) کہ وہ اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

(ل ع ن)

اَللَّعْنُ: کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا اور دھتکار دینا۔ خدا کی طرف سے کسی شخص پر لعنت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں تو اللہ کی رحمت اور توفیق سے اثر پذیر ہونے سے محروم ہو جائے اور آخرت میں عقوبت کا مستحق قرار پائے اور انسان کی طرف سے کسی پر لعنت بھیجنے کے معنی بد دعا کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ (۱۱-۱۸) سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ (۲۴-۷) اور پانچویں (بار) یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ (۵-۷۸) جو لوگ بنی اسرائیل میں سے کافر ہوئے ان پر لعنت کی گئی۔

وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (۲-۱۵۹) اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔[1]

اَللُّعْنَةُ (بسکون العین) یہ اَلْتَعَنَ سے ہے یعنی اپنے آپ پر لعنت کرنے والا۔ یا جس پر بہت لعنتیں بھیجی جائیں۔ مگر اَللُّعَنَةُ (بفتح العین) لَعَنَ (متعدی) سے ہے یعنی دوسروں پر بہت

---

[1] ایضاً راجع الآیات (۳۳-۶۱) (۱۵-۳۵) (۲-۸۸)

لعنت کرنے والا۔
اَلتَّلَاعُنُ وَالْمُلَاعَنَۃُ۔ لوگوں کا باہم اپنے آپ یا دوسروں پر لعنت بھیجنا۔

(ل غ ب)

اَللُّغُوْبُ کے معنی بہت زیادہ درماندہ ہونے اور تھک جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
اَتَانَا سَاغِبًا لَاغِبًا۔ وہ ہمارے پاس بھوکا اور تھکا ہارا ہو کر پہنچا۔ قرآن میں ہے[1]:۔
وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (۵۰-۳۸) اور ہم کو ذرا بھی تکان محسوس نہیں ہوئی۔
سَھْمٌ لَغِبٌ۔ وہ تیر جس کے پر کمزور ہوں۔
رَجُلٌ لَغِبٌ کاہل اور کمزور رائے آدمی۔
ایک اعرابی کا قول ہے:۔ فُلَانٌ لَغُوْبٌ اَحْمَقُ جَآءَتْہُ کِتَابِیْ فَاحْتَقَرَہٗ کہ فلاں شخص بڑا بے وقوف اور احمق ہے کہ اس نے میرے خط کو حقیر سمجھا یہاں لَغُوْبٌ کے معنی کمزور رائے آدمی کے ہیں۔ اس پر اعرابی سے کسی نے سوال کیا کہ کتاب تو مذکر ہے پھر جَآءَتْہُ کیوں کہا تو اس نے جواب دیا اَلَیْسَ الْکِتَابُ بِصَحِیْفَۃٍ کہ کیا کتاب بھی ایک صحیفہ نہیں ہے (اور صحیفہ مونث ہے)

(ل غ و)

اَللَّغْوُ (ن) کے معنی بے معنی بات کے ہے جو کسی گنتی شمار میں نہ ہو یعنی جو سوچ سمجھ کر نہ کی جائے۔ گویا وہ پرندوں کی آواز کی طرح منہ سے نکال دی جائے ابوعبیدہؒ کا قول ہے کہ اس میں ایک لغت لَغًا بھی ہے۔ جیسے عَیْبٌ وَعَابٌ شاعر نے کہا ہے[2] (الرجز)

(۳۹۴) عَنِ اللَّغَا وَرَفَثِ التَّکَلُّمِ

جو بیہودہ اور فحش گفتگو سے خاموش ہیں۔
اس کا فعل لَغِیْتَ تَلْغٰی یعنی سَمِعَ سے ہے۔ اور کبھی ہر قبیح بات کو لغو کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا وَّلَا کِذَّابًا (۷۸-۳۵) وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ اور خرافات۔
وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۲۳-۳) اور جو بیہودہ باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔
وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْہُ (۲۸-۵۵) اور جب بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔
لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا (۵۶-۲۵) وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے اور نہ الزام تراشی۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا (۲۵-۷۲) اور جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گزرتے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ فحش بات کبھی صراحت سے نہیں کہتے۔ بلکہ ہمیشہ کنایہ سے کام لیتے ہیں۔ اور بعض نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ اگر کہیں اتفاق سے وہ ایسی مجلس میں چلے جاتے ہیں

---

[1] وایضًا لاحظ الآیۃ (۳۵-۳۵) [2] وفی اللسان قالہ رؤبۃ ونسبہ ابن بری للعجاج وقبلہ: ورب اسراب حجیج کظم والشطر فی القرطبی ۷۰:۱۷ وفی مجاز القرآن (۱: ۷۰) وفی دیوانہ ۵۹ وابن ولاد ۱۱۲ والطبرسی (۲: ۲۳۳) والاقتضاب ۴۴۱ واللسان والتاج (رفث لغو) وشواھد الکشاف ۲۹۸ وابوعلی الفارسی فی الحجۃ (۲: ۲۶۲) وفی الانصاف ۱۲۲ وصدرہ: استغفر الرحمٰن ذا التعظیم ۱۲

جہاں بیہودہ باتیں ہو رہی ہوتی ہیں تو اس سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

پس لغو ہر اس بات کو کہا جاتا ہے جو کسی شمار وقطار میں نہ ہو۔ اور اسی سے لَغْوٌ فِی الْاَیْمَانِ ہے یعنی وہ قسم جو یونہی بلا ارادہ زبان سے نکل جائے[1] چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ (۲-۲۲۵) خدا تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

اور شاعر نے کہا ہے[2] (البسیط)

(۳۹۵) وَلَسْتَ بِمَاخُوْذٍ بِلَغْوٍ تَقُوْلُہٗ
اِذَا لَمْ تَعَمَّدْ عَاقِدَاتِ الْعَزَائِمِ

لغو قسم کھانے پر تم سے مواخذہ نہیں ہوگا بشرطیکہ قصداً عزم قلب کے ساتھ قسم نہ کھائی جائے۔

اور آیت کریمہ:۔

لَا تَسْمَعُ فِیْھَا لَاغِیَۃً (۸۸-۱۱) وہاں کسی طرح کی بکواس نہیں سنیں گے۔ میں لَاغِیَۃٌ بمعنی لغو کے ہے اور یہ اسم فاعل (کلام کی صفت واقع ہوا ہے جیسا کہ کَاذِبَۃٌ وغیرہ۔

اور خونبہا میں لَغْوٌ اونٹ کے ان بچوں کو کہا جاتا ہے جو گنتی میں شمار نہ کئے جائیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے[3] (الوافر)

(۳۹۶) کَمَا اَلْغَیْتَ فِی الدِّیَۃِ الْحُوَارُ

جیسا کہ اونٹ کے چھوٹے بچے کو خونبہا میں ناقابل شمار سمجھا جاتا ہے۔

لَغِیَ بِکَذَا کے معنی چڑیا کے چہچہانے کی طرح کسی چیز کا بار بار تذکرہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور اسی سے ہر گروہ کی زبان اور بولی جس کے ذریعے وہ بات کرتا ہے لُغَۃٌ کہلاتی ہے۔

(ل ف ف)

لَفَفْتُ الشَّیْئَ لَفًّا کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور مدغم کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَجِئْنَا بِکُمْ لَفِیْفًا (۱۷-۱۰۴) اور ہم تم سب کو جمع کر کے لے آئیں گے۔ اور محاورہ ہے:۔ جَاؤُوْا وَمَنْ لَفَّ لَفَّھُمْ یعنی وہ اور ان کے سب متعلقین آئے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَجَنّٰتٍ اَلْفَافًا (۷۸-۱۶) اور گھنے گھنے باغ میں اَلْفَاف سے ایک دوسرے سے متصل گھنے اور گنجان درختوں والے باغیچے مراد ہیں۔

اِلْتَفَّ ایک چیز کا دوسری سے لپٹ جانا قرآن میں ہے:۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵-۲۹) اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔

اَلْاَلَفُّ۔ وہ آدمی جس کی رانیں موٹاپے کی وجہ

---

[1] کذا فسرہ ابن عباس وعکرمۃ والشعبی وروی مرفوعاً عن عائشۃ[4] قال ابوہریرۃ والحسن ومجاہد وآخرون اللغو فی الیمین ان یحلف زاعماً انہ صادق ولا یکون کذالک وروی مرفوعاً عن ابن عباس انہ لا یمین فی غضب (الطبری ج ۲ ص ۲۴۴-۲۴۱)

[2] قالہ الفرزدق روی ان الحسن سئل عن لغو الیمین فقال للفرزدق وعنی اجب عنک یا ابا سعید وانشد والبیت من شواہد الکشاف ۱:۱۱ البحر (۲: ۱۷۹) ومحاضرات المؤلف (۲: ۱۸۴)

[3] قالہ ذوالرمۃ یہجو ہشام بن قیس المرئی (احد بنی امرئ القیس بن زید مناۃ) وصدرہ:- ویہلک وسطہا المرئی لغوا ...... قال فی اللسان (لغو) وہذا البیت عمل لجریر وقد احس بہا الفرزدق لما سمعہ والبیت فی الامالی (۲: ۱۲۷)

سے باہم ملی ہوئی ہوں اور بہت زیادہ بھاری جسم اور سست آدمی کو بھی اَلَفّ[1] کہا جاتا ہے۔
لَفَّ رَأْسَہٗ۔ اس نے اپنے سر کو (کپڑوں) ...... میں) چھپا لیا۔
اَللَّفِیْفُ۔ مختلف قبائل کے ایک جگہ جمع ہونے والے لوگ اور خلیل نے ہر اس کلمے کا نام لفیف رکھا ہے جس کے حروف اصلی میں سے دو حرف علت ہوں۔

(ل ف ت)

لَفَتَہٗ عَنْ کَذَا۔ کسی چیز سے پھیر دینا۔
قرآن میں ہے:۔
اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا (۱۰-۷۸) کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ جس راہ پر ہم اپنے باپ دادا کو پاتے رہے ہیں اس سے ہم کو پھیر دو۔
اور اسی سے اِلْتَفَتَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی رخ موڑنے کے ہیں۔ اِمْرَءَۃٌ لَفُوْتٌ وہ عورت جو اپنے پہلے خاوند کے بچہ سے محبت کرے اور دوسرے خاوند کی طرف توجہ نہ دے۔
اَللَّفِیْتَۃُ۔ ایک قسم کا گاڑھا حریرہ۔

(ل ف ح)

لَفَحَتْہُ الشَّمْسُ وَالسَّمُوْمُ کے معنی ہیں سورج یا باد سموم نے اپنی لپٹ سے جھلسا دیا۔ قرآن میں ہے:۔
تَلْفَحُ وُجُوْھَھُمُ النَّارُ (۲۳-۱۰۴) آگ ان کے چہروں کو جھلس دے گی۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر لَفَحْتُہٗ بِالسَّیْفِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی تلوار سے سر قلم کر دینا ہیں۔

(ل ف ظ)

اَللَّفْظُ بِالْکَلَامِ کے معنی کلام کرنا کے ہیں اور یہ لَفَظْتُ الشَّیْءَ مِنَ الْفَمِ یا لَفَظَ الرَّحٰی بِالدَّقِیْقِ کے محاورہ سے مستعار ہے۔ اسی سے مرغ کو لَافِظَۃٌ" کہا جاتا ہے[1] کیونکہ وہ مرغی کے لئے چوگا ڈالتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (۵۰-۱۸) کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔

(ل ف ی)

اَلْفَیْتُ کے معنی وَجَدْتُّ یعنی کسی چیز کو پالینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا (۲-۱۷۰) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔
وَاَلْفَیَا سَیِّدَھَا لَدَی الْبَابِ (۱۲-۲۵) اور دونوں نے دروازے کے پاس اس کے شوہر کو پایا۔

(ل ق ب)

اَللَّقَبُ۔ اس نام کو کہتے ہیں جو اصلی نام کے

---

[1] وفی المثل اسمح من لافظۃ" الامالی ۱ر۲۴۴ والسمط ۵۲ ۵ وتہذیب الالفاظ ۲۰۳ والعسکری ۱۴۴ ر۱ والتکن بلفظ اسخی وفی الثمار ۴۷ ۳ والمستقصی والبخلاء ۱۳۵ الاقطۃ بالقاف وقیل الافظۃ العنز لانہا تلفظ ما فی فیہا من العلف وقت الحلب والحیوان ۱ر۲۲ ۴ ر۱۰ ولا یصح الاجملہ علی المجازۃ البعیۃ راجع الحیوان ۲ر۹/۱۴-۱۵۱) ؁ ؁ ؁

علاوہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لقب دینے میں معنی کی رعایت
کی جاتی ہے بخلاف اعلام کے کہ ان میں معنوی
رعایت نہیں ہوتی اس بنا پر شاعر نے کہا ہے [1] (
(۲۹) وَقَلَّمَا اَبْصَرَتْ عَیْنَاکَ ذَا لَقَبٍ
اِلَّا وَمَعْنَاہُ اِنْ فَتَّشْتَ فِیْ لَقَبِہٖ
تم نے کسی صاحب لقب کو نہیں دیکھا ہوگا۔
مگر ذرا تلاش کرنے پر اس کے اوصاف اس کے
لقب میں مل سکتے ہیں۔
لقب دو قسم پر ہے۔ ایک لقب تشریفی جیسا
کہ سلاطین کے القاب ہوتے ہیں اور دوسرا لقب
تحقیر چنانچہ آیت کریمہ :۔
وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹-۱۱) اور نہ ایک
دوسرے کا برا نام رکھو۔ میں اس دوسری قسم
کے القاب سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان سے
اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔

(ل ق ح)

لَقِحَتِ النَّاقَۃُ تَلْقَحُ۔ لَقْحًا وَلَقَاحًا
کے معنی اونٹنی کے حاملہ ہونے کے ہیں۔ اسی طرح
درخت کے پھلدار ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا
ہے اور اَلْقَحَ الْفَحْلُ النَّاقَۃَ وَالرِّیْحُ
السَّحَابَ کے معنی سانڈھ کے اونٹنی کو یا ہوا
کے بادل کو باردار کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (۱۵-۲۲) اور ہم
ہی ہوائیں چلاتے ہیں (جو بادلوں کے پانی سے)
بھری ہوئی ہوتی ہیں۔
اَلْقَحَ فُلَانٌ النَّخْلَ وَلَقَّحَہَا۔ کھجور کو پیوند کرنا۔
اِسْتَلْقَحَتِ النَّخْلَۃُ کھجور پیوند کے لائق ہوگئی۔
اور حاملہ اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دیکر حَرْبٌ لَاقِحٌ
کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سخت
لڑائی کے ہیں۔ جو اپنے ساتھ بہت مصائب لائے۔
لِقْحَۃٌ۔ شیردار اونٹنی۔ ج لِقَاحٌ وَلُقَحٌ۔
اَلْمَلَاقِیْحُ حاملہ اونٹنیاں۔
نیز بچوں کو بھی ملاقیح کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں
ہے [2] (۱۱۱) نُھِیَ عَنْ بَیْعِ الْمَلَاقِیْحِ وَالْمَضَامِیْنِ۔
کہ آنحضرت نے ملاقیح و مضامین کی بیع سے منع
فرمایا۔ تو ملاقیح کے معنی جنین کے ہیں اور مضامین نر
کے مادہ منویہ کو کہتے ہیں۔ جو تا حال اس کی پشت
میں محفوظ ہو۔
اَللَّقَاحُ۔ نر جانور کا مادہ منویہ۔ نیز لَقَاحٌ اس آزاد
قبیلے کو بھی کہتے ہیں جو کسی بادشاہ کے زیر حکومت
نہ ہو گویا وہ حامل ہے محمول نہیں ہے۔

(ل ق ف)

لَقِفْتُ الشَّیْءَ اَلْقَفُہٗ وَتَلَقَّفْتُہٗ کے معنی
کسی چیز کو ہوشیاری اور حذاقت سے لینا کے
ہیں اور یہ منہ یا ہاتھ دونوں سے لینے پر بولا جاتا
ہے۔ قرآن میں ہے :۔
فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ (۷-۱۱۷) وہ فوراً
جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو (ایک ایک
کرکے) نگلنے لگا۔

(ل ق م)

لُقْمَانُ (۳۱-۱۲) مشہور حکیم کا نام ہے جو

---

[1] والبیت فی محاضرات الادباء (۳/۲۳۴) بغیر عزو وفی روایۃ من رجل بدل ذالقب ذی اسم اولقب بدل ان فتشت فی لقبہ۔ [2] رواہ الطبرانی من ابن عباس والحدیث فی الفائق ۲/۴۲۲ وغریب ابی عبید ۱/۲۰۷ والفتح الکبیر للنبہانی ۳/۲۷۹ ؛

سکتا ہے کہ یہ بھی لَقِمْتُ الطَّعَامَ اَلْقَمُہٗ وَتَلَقَّمْتُہٗ سے مشتق ہو جس کے معنی کسی چیز کو ہڑپ کر جانا کے ہیں۔ رَجُلٌ تِلْقَامٌ۔ بڑے بڑے لقمے نگلنے والا۔ اَللَّقِیْمُ۔ نوالا اور راستہ کی ایک جانب کو لَقَمٌ کہا جاتا ہے۔

(ل ق ی)

لَقِیَہٗ (س) یَلْقَاہُ لِقَاءً کے معنی کسی کے سامنے آنے اور اسے پالینے کے ہیں اور ان دونوں معنی میں سے ہر ایک پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے اور کسی چیز کا حس اور بصیرت سے ادراک کر لینے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ (۳-۱۴۳) اور تم موت (شہادت) آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔

لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا (۱۸-۶۲) اس سفر سے ہم کو بہت تکان ہو گئی ہے۔

اور ملاقات الٰہی سے مراد قیامت کا بپا ہونا اور اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جانا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (۲-۲۲۳) اور جان رکھو کہ ایک دن تمہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ (۲-۲۴۹) جو لوگ یقین رکھتے تھے کہ ان کو خدا کے روبرو حاضر ہونا ہے وہ کہنے لگے۔ اور لِقَاءٌ (مصدر) مُلَاقَاۃٌ کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا (۲۵-۲۱) اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے۔

اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (۸۴-۶) اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے میں خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جا ملے گا۔ اور آیت کریمہ:۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (۳۲-۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ تم نے قیامت کے دن اور حشر ونشر کو بھلا رکھا تھا اور يَوْمَ التَّلَاقِ (۴۰-۱۵) سے قیامت کا دن مراد ہے اور قیامت کے دن کو يَوْمَ التَّلَاقِ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس روز سب اگلے اور پچھلے یا اہل سماء اور اہل ارض ایک دوسرے کے سامنے آجائیں گے۔ اور نیز اس روز ہر شخص اپنے اعمال کے نتائج کو پالے گا۔ لَقِيَ فُلَانٌ خَيْرًا اَوْ شَرًّا فلاں نے خیر یا شر کو پالیا۔ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الطویل)

(۳۹۸) فَمَنْ يَّلْقَ خَيْرًا يَّحْمَدِ النَّاسُ اَمْرَهٗ

جو شخص خیر کو پالیتا ہے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے:۔

(۳۹۹) وَتَلْقَى السَّمَاحَةَ مِنْهُ وَالنَّدٰى خُلُقًا

سخاوت اور بخشش کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔

لَقَّيْتُهٗ بِكَذَا۔ میں فلاں چیز کے ساتھ اس کے سامنے پہنچا۔ قرآن میں ہے:۔

وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا (۲۵-۷۵) اور وہاں ان کا استقبال دعا وسلام کے ساتھ کیا جائے گا۔

وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا (۷۶-۱۱) اور تازگی اور شادمانی سے ہمکنار فرمائے گا۔

تَلَقَّاهُ کے معنی کسی چیز کو پالینے یا اس کے سامنے آنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۲۱-۱۰۳) اور فرشتے

---

[1] قالہ المرقش الاصغر وتمامہ: ومن یغو لا یعدم علی الغی لائما۔ وقد مر تخریجہ فی (رغ و ی)

ان کو لینے آئیں گے۔
وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ (۲۷-۶) اور تم کو قرآن عطا کیا جاتا ہے۔
اَلْاِلْقَاءُ (افعال) کے معنی کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا کے ہیں کہ وہ دوسرے کو سامنے نظر آئے پھر عرف میں مطلق کسی چیز کو پھینک دینے پر القاء کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ (۲۰-۸۷) اور اسی طرح سامری نے ڈال دیا۔
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا (۷-۱۱۵، ۱۱۶) تو جادوگروں نے کہا کہ موسیٰ یا تو تم جادو کی چیز ڈالو یا ہم ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا تم ہی ڈالو۔
قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى فَاَلْقٰهَا (۲۰-۱۹) فرمایا کہ موسیٰ اسے ڈال دو تو انہوں نے اس کو ڈال دیا۔
فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ (۲۰-۳۹) تو دریا اس کو کنارے پر ڈال دے گا۔
اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا (۶۷-۷) جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے۔
كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ (۶۷-۸) جب اس میں ...... کوئی جماعت ڈالی جائے گی۔ اور آیت:۔
وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (۸۴-۴) اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اور بالکل خالی ہو جائے گی۔ دوسری آیت۔
وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۸۲-۴) اور جب قبریں الٹ پلٹ کر دی جائیں گی۔ کے ہم معنی ہے۔
اَلْقَيْتُ اِلَيْكَ قَوْلًا وَسَلَامًا وَكَلَامًا وَمَوَدَّةً کے معنے ہیں۔ تجھ سے کوئی بات کی یا سلام و کلام کیا یا دوستی بڑھائی۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ (۶۰-۱) تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ۔ (۱۶-۸۶) تو وہ ان سے کہیں گے۔
وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِنِ السَّلَمَ (۱۶-۸۷) اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔
اور آیت کریمہ:۔
اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (۷۳-۵) ہم عنقریب تم پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے۔
میں وحی اور نبوت کے اس بوجھ کی طرف اشارہ ہے۔ جو آپ پر ڈالا گیا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔
اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (۵۰-۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔
میں اِلْقَاءِ سَمْع سے کان لگا کر سننا مراد ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا (۲۰-۷۰) تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔
میں فعل مجہول لا کر اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ کو دیکھ کر وہ سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور انہیں اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آتا تھا۔

(لَمْ) (حرف)

لَمْ کے بعد اگرچہ فعل مستقبل آتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ اسے ماضی منفی بنا دیتا ہے اور اس پر ہمزہ استفہام تقریر کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا (۲۶-۱۸) کیا ہم نے لڑکپن میں تمہاری پرورش نہیں کی تھی۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی (۹۳-۶) بھلا اس نے تمہیں یتیم پاکر جگہ نہیں دی بے شک دی)

(لَمَّا) حرف

یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے زمانہ ماضی میں کسی فعل کی نفی اور اس کے قریب الوقوع ہونے کے لئے جیسے فرمایا:۔

وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ (۳-۱۴۲) حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو اچھی طرح معلوم کیا ہی نہیں۔

اور کبھی یہ اسم ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن میں بکثرت آیا ہے۔ جیسے فرمایا۔

فَلَمَّا اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ (۱۲-۹۶) جب خوشخبری دینے والا آپہنچا۔

(ل م م)

لَمَمْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو جمع کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ اسی سے لَمَمْتُ شَعْثَهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کی پراگندہ حالت کو سنوارنے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹-۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

اَللَّمَمُ کے اصل معنی معصیت کے قریب جانے کے ہیں کبھی اس سے صغیرہ گناہ بھی مراد لے لئے جاتے ہیں محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ یَفْعَلُ كَذَا لَمَمًا۔ وہ کبھی کبھار یہ کام کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳-۳۲) جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

میں لَمَمٌ کا لفظ اَلَمَمْتُ بِكَذَا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کے قریب جانا کے ہیں یعنی ارادہ کرنا مگر مرتکب نہ ہونا۔ نیز محاورہ ہے

زِیَارَتُهُ اِلْمَامٌ یعنی اس کی زیارت مختصر ہوتی ہے۔

(ل م ح)

اَللَّمْحُ کے معنی بجلی کی چمک کے ہیں۔

محاورہ ہے:۔

رَاَیْتُ لَمْحَةَ الْبَرْقِ میں نے اسے بجلی کی چمک کی طرح ایک جھلک دیکھا۔ قرآن میں ہے:۔

كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (۵۴-۵۰) آنکھ کے جھپکنے کی طرح۔ اور محاورہ ہے:۔

لَاُرِیَنَّكَ لَمْحًا بَاصِرًا۔ میں تمہیں صاف طور پر دکھلا دوں گا۔ تم پر حقیقت کھول دونگا۔

(ل م ز)

لَمَزَهٗ (ض ن) لَمْزًا کے معنی کسی کی غیبت کرنا۔ اس پر عیب چینی کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

لَمَزَهٗ یَلْمِزُهٗ وَیَلْمُزُهٗ۔ یعنی یہ باب ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّلْمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ (۹-۵۸) اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ تقسیم صدقات میں تم پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ ۔۔۔۔۔

(۹-۷۹) جو رضا کارانہ خیر خیرات کرنے والوں پر طنز و..... طعن کرتے ہیں۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۴۹-۱۲) اور اپنے (مومن بھائیوں) پر عیب نہ لگاؤ۔

یعنی دوسروں پر عیب نہ لگاؤ ورنہ وہ تم پر عیب لگائیں گے۔ اسی طرح گویا تم اپنے آپ پر عیب لگاتے رہو۔

رَجُلٌ لَمَّازٌ وَّ لُمَزَةٌ۔ بہت زیادہ عیب جوئی اور طعن و طنز کرنے والا۔ قرآن میں ہے:۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ (۱۰۴-۱) ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغلخور کی خرابی ہے۔

(ل م س)

اَللَّمْسُ (ن) مَسٌّ کی طرح اس کے معنی بھی اعضاء کی بالائی کھال کے ساتھ کسی چیز کو چھو کر اس کا ادراک کر لینا کے ہیں۔ پھر مطلق کسی چیز کی طلب کرنے کے معنی میں آتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] (مجزوالوافر)

(۴۰۰) اَلْمِسُهٗ فَلَا اَجِدُهٗ

میں اسے تلاش کرتا ہوں مگر وہ ملتا نہیں۔

قرآن میں ہے:۔

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ (۷۲-۸) اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا۔

اور لَمْسٌ اور مُلَامَسَةٌ کے معنی کنایۃً جماع کے بھی آتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۵-۶) یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو۔

میں ایک قراءت لَمَسْتُمُ النِّسَآءَ بھی ہے اس لیے بعض نے اس سے مطلق ہاتھ لگانا اور بعض نے مجامعت کرنا مراد لیا ہے[2] اور حدیث میں ہے[3] (۱۱۲) انہ نھی عن الملامسۃ کہ آنحضرتؐ نے بیع مُلَامَسَة سے منع فرمایا۔ اور بَیْعِ ملامسۃ کی صورت یہ ہے کہ بائع یا مشتری دوسرے سے کہے کہ جب ہم سے کوئی دوسرے کا کپڑا چھولے گا تو بیع واجب ہو جائے گی۔

اَللُّمَاسَةُ: معمولی حاجت۔

(ل ھ ب)

اَللَّهَبُ۔ آگ کا شعلہ۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (۷۷-۳۱) اور نہ لپٹ سے بچائیگا۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۱۱۱-۳) وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں جلے گا۔

---

[1] قالہ اعرابی فی زنا ربن لہ فی ستۃ وابنا خامسۃ وصدرہ الآم علی تبکیہ۔ والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی ۲-۳۰ وللسان (لمس) والبیت من شواہد الکشاف ۱۳۷ وبعدہ:۔ وکیف یلام محزون۔ کبیر فاتہ ولدہ [2] ذہب الی الاول عمر بن الخطاب وابن مسعود والشعبی وعطاء واختارہ الشافعی والی الثانی علی وابن عباس ومجاہد والسدی وقتادۃ واختارہ ابوحنیفۃ وابوعلی الجبائی من المعتزلۃ وفی الطبرسی (۵ر۱۳۲) قصتہ العرب والموالی واختلافہم فی معنی الآیۃ فقال ابن عباس غلبت الموالی المراد بہ الجماع ورجحہ الطبرسی من الامامیۃ ÷

[3] متفق علیہ من حدیث ابی سعید وعن انس فی البخاری وعن ابی ہریرۃ فی النسائی ومسلم ولہ ثلاث صور وما ذکرہ المؤلف منقول عن الزہری وابی ہریرۃ قال فی الفتح وتفسیر ابی ہریرۃ اقعد انظر النیل (۹ر۱۵۹-۱۶۰) ÷

اَللَّهِیْبُ: شعلہ۔ اور لَہَبٌ کا لفظ دھوئیں اور غبار پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَہَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱-۱) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔
میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ابولہب کے لفظ سے اس کی کنیت ..... مراد نہیں ہے۔ جس کے ساتھ وہ مشہور تھا۔ بلکہ اس سے اس کے دوزخی ہونے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے لہذا یہاں اس نام سے اسے موسوم کرنا ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ لڑائی بھڑکانے والے اور ہمیشہ لڑنے والے کو اَبُوالْحَرْبِ یا اَخُوالْحَرْبِ کہا جاتا ہے۔ فَرَسٌ مُّلْہِبٌ: برق رفتار گھوڑا گویا وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ اسی سے اَلْھُوْبُ ہے جس کے معنی سخت دوڑ کے ہیں۔
اَللُّھَابُ: پیاس کی شدت، اندرونی سوزش جو پیاس کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے۔

(ل ھ ث)

لَہِثَ (س) یَلْھَثُ لَہْثًا: سخت پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالنا۔
ابن درید[1] کہتے ہیں کہ لَہْثٌ کا لفظ درماندگی اور پیاس دونوں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:
فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ (۷-۱۷۶) اس کی مثال کتے کی سی ہوگی کہ اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے اور یوں ہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔

(ل ھ م)

اَلْاِلْھَامُ (افعال) کے معنی کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینا کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القاء کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے کسی کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:
فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا (۹۱-۸) پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (کرنے) کی سمجھ دی۔
اور اس کو لَمَّۃُ الْمَلَکِ یا نَفْثٌ فِی الرَّوْعِ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت[2] نے فرمایا (۱۱۳)
اِنَّ لِلْمَلَکِ لَمَّۃً وَّلِلشَّیْطَانِ لَمَّۃً کہ ایک لَمَّۃٌ فرشتے کا ہے اور ایک لَمَّۃٌ شیطان کا ہے۔
اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا (۱۱۴)[3]
اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔
اصل میں یہ اِلْتَھَامُ الشَّیْءِ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کو نگل جانا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:
اِلْتَھَمَ الْفَصِیْلُ مَا فِی الضَّرْعِ: کہ اونٹنی کے بچے نے تھنوں سے تمام دودھ چوس لیا۔
فَرَسٌ لَہِمٌ: تیز رو گھوڑا گویا وہ اپنی تیز روی سے زمین کو نگل رہا ہے۔

---

[1] ہو ابوبکر محمد بن الحسن بن درید العمانی صاحب الجمہرۃ فی اللغۃ ولد ۲۲۳ھ وتوفی ۳۲۱ انظر لتراجمہ الفہرست ابن ندیم ۹۷-۸۰ وبغیۃ الوعاۃ للسیوطی ۳۰-۳۳ وامالی القالی ۲/۲۷۹ وکشف الظنون ۲/۱۹۸۰ ولکتابہ الجمہرۃ عدۃ نسخ فالحجۃ ہی نسخۃ عبید اللہ بن عبداللہ ۱۷ [2] رواہ ابن حبان رقم ۱۴ من حدیث عبداللہ ۱۲ [3] رواہ البیہقی وفی شرح السنۃ راجع لتخریجہ (ر و ع) ؎ ؎ ؎

(ل ھ و)

اَللَّھْوُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے ہٹائے اور باز رکھے یہ لَھَوْتُ بِکَذَا اَوْ لَھِیْتُ عَنْ کَذَا سے اسم ہے جس کے معنی کسی مقصد سے ہٹ کر بے سود کام میں لگ جانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ (۵۷-۲۰) جان رکھو کہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے۔

پھر ہر وہ چیز جس سے کچھ لذت اور فائدہ حاصل ہو اسے بھی لَھْوٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَھْوًا لَّاتَّخَذْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّآ (۲۱-۱۷) اگر ہم چاہتے کہ کھیل بنائیں تو ہم اپنے پاس سے بنا لیتے۔

اور جن مفسرین نے یہاں لَھْوٌ سے مراد عورت یا اولاد لی ہے انہوں نے دنیاوی آرائش کی بعض چیزوں کی تخصیص کی ہے جو لہو ولعب بنالی گئیں ہیں[1]۔ محاورہ ہے:۔

اَلْھَاہُ کَذَا۔ یعنی اسے فلاں چیز نے اہم کام سے مشغول کر دیا۔ قرآن میں ہے:۔

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (۱۰۲-۱) لوگو تم کو کثرت مال وجاہ واولاد کی خواہش نے غافل کر دیا۔

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (۲۴-۳۷) یعنی ایسے لوگ جن کو خدا کے ذکر سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے اور نہ خرید وفروخت۔

اس آیت سے تجارت کی ممانعت یا کراہت بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں پروانہ وار مشغول ہو کر نماز اور دیگر عبادات سے غافل ہونے کی مذمت کی طرف اشارہ ہے نفس تجارت کو قرآن نے فائدہ منافع اور فضل الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ (۲۲-۲۸) تاکہ اپنے فائدے کے کاموں کے لئے حاضر ہوں۔

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ (۲-۱۹۸) اس کا تمہیں کچھ گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں بذریعہ تجارت) اپنے پروردگار سے روزی طلب کرو۔

اور آیت کریمہ:۔

لَاھِیَۃً قُلُوْبُھُمْ (۲۱-۳) ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ ان کے دل غافل ہو کر بیکار کاموں میں مشغول ہیں۔

اَللَّھْوَۃُ۔ آٹا پیستے وقت چکی میں ایک مرتبہ جتنی مقدار میں غلہ ڈالا جائے۔ اسے لُھْوَۃٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع لِھَاءٌ آتی ہے پھر تشبیہ کے طور پر عطیہ کو بھی لُھْوَۃٌ کہدیتے ہیں۔

اَللَّھَاۃُ (حلق کا کوا) وہ گوشت جو حلق میں لٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض نے اس کے معنی منہ کا آخری سرا بھی کئے ہیں۔

(ل و ح)

اَللَّوْحُ: تختہ (کشتی وغیرہ کا) اس کی جمع

---

[1] قال قتادۃ والحسن: اللھو المرأۃ وقال ابن عباس ھوا لولد راجع الطبری والدر فی الروح لکن حملہ علی العموم اولیٰ ۱۷/۱۹ قارن المشکل للقتیبی ۱۲۳-۱۲۴ ÷

اَلْوَاحٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَحَمَلْنٰهُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۵۴-۱۳)
اور ہم نے نوح کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔
اور لوح لکڑی وغیرہ کی اس تختی کو بھی کہتے ہیں جس پر کچھ لکھا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵-۲۲) لوح محفوظ میں۔
میں لوح محفوظ کی اصل کیفیت کو ہم اسی قدر جان سکتے ہیں جو احادیث میں مروی ہے اسی کو دوسری آیت میں کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ۔ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ (۲۲-۷۰) بے شک یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ سب خدا کو آسان ہے۔
اَللَّوْحُ کے معنی پیاس کے ہیں۔ اور جس چوپایہ کو جلدی پیاس لگتی ہو اسے دَابَّةٌ مِلْوَاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور لُوح (ضمہ لام کے ساتھ) آسمان اور زمین کے درمیانی خلا کو بھی کہتے ہیں لیکن اکثر علمائے لغت کے نزدیک فتحہ لام کے ساتھ بمعنی پیاس کے ہے اور ضمہ لام کے ساتھ زمین و آسمان کے درمیانی خلا کے معنی میں آتا ہے گو اس میں فتحہ لام بھی جائز ہے۔
لَوَّحَهُ الْحَرُّ اسے گرمی نے جھلس دیا۔
لَاحَ الْحَرُّ لَوْحًا گرمی فضا میں پھیل گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لَمَحَ کی طرح ہے اور لَاحَ بِسَیْفِهٖ کے معنی ہیں اس نے تلوار سے اشارہ کیا۔

(ل و ذ)

لَاوَذَ (مفاعلہ) یُلَاوِذُ لِوَاذًا وَمُلَاوَذَةً کے معنی کسی چیز کی آڑ لینا اور اس کے پیچھے چھپ جانا ہیں۔ پس آیت کریمہ:۔
قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (۲۴-۶۳) کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو وہ لوگ خوب معلوم ہیں جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ اور پناہ لے کر یکے بعد دیگرے کھسک کر نکل جاتے ہیں اور یہاں لِوَاذًا لَاوَذَ (مفاعلہ) کا مصدر ہے کیونکہ اگر یہ لَاذَ (ن) کا مصدر ہوتا تو لِیَاذًا (بالیاء) آنا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ لَاذَ لِیَاذًا کہا جاتا ہے۔
اَللَّوْذُ۔ پہاڑ کا کنارہ۔

(ل و ط)

لُوْطٌ (حضرت لوط علیہ السلام) یہ اسم علم ہے اور لَاطَ الشَّیْءُ بِقَلْبِیْ یَلُوْطُ لَوْطًا وَلِیْطًا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی محبت دل میں جاگزیں اور پیوست ہو جانے کے ہیں۔ حدیث میں ہے [1] (۱۱۵)
اَلْوَلَدُ اَلْوَطُ بِالْكَبِدِ۔ کہ اولاد سے جگری محبت ہوتی ہے۔
هٰذَا اَمْرٌ لَا یَلْتَاطُ بِصَفَرِیْ۔ یہ بات میرے دل کو نہیں بھاتی۔
لُطْتُ الْحَوْضَ بِالطِّیْنِ لَوْطًا۔ میں نے حوض پر کہگل کی۔ گارے سے پلستر کیا.....

---

[1] حدیث ابی بکر فی الجامع الکبیر مسند ابی بکر رقم ۴۳۵۴ والفائق ۲ر۴۷۹ وغریب ابی عبید ۳ر۲۲۲
والحدیث ذکرہ الماوردی فی ادب ص ۲۶۳

حضرت لوط علیہ السلام کے نام سے اشتقاق کر کے تَلَوَّطَ فُلَانٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے[1] جس کے معنی خلاف فطرت فعل کرنا ہیں حالانکہ حضرت لوط علیہ السلام تو اس فعل سے منع کرتے تھے اور اسے قوم لوط سے مشتق نہیں کیا گیا جو اس کا ارتکاب کرتے تھے۔

(ل و م)

لُمْتُهٗ (ن) لَوْمًا کے معنی کسی کو برے فعل کے ارتکاب پر برا بھلا کہنے اور ملامت کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۱۴-۲۲) تو آج مجھے ملامت نہ کرو اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ (۱۲-۳۲) یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں۔

وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (۵-۵۴) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔

اور مَلُوْمٌ (ملامت کیا ہوا) صفت مفعولی ہے اور آیت کریمہ:۔

فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ (۲۳-۶) ان سے مباشرت کرنے میں انہیں ملامت نہیں ہے۔ میں تنبیہ کی ہے کہ جب ان پر ملامت ہی نہیں ہے۔ تو اس سے زیادہ سرزنش کے وہ بالاولیٰ مستحق نہیں ہیں۔

اَلْاِلَامَۃُ۔ مستحق ملامت ہونا۔ قرآن میں ہے:۔

فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ (۵۱-۴۰) تو ان کو دریا میں پھینک دیا اور وہ کام ہی قابل ملامت کرتا تھا۔

اَلتَّلَاوُمُ۔ ایک دوسرے کو ملامت کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ (۶۸-۳۰) پھر لگے ایک دوسرے کو رو در رو ملامت کرنے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۷۵-۲) اور نفس لوامہ کی قسم۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے۔ کہ نفس لوامہ سے مراد نفس ہے جس نے کچھ فضائل حاصل کر لیے ہوں اور کسی غلطی کے ارتکاب پر صاحب نفس کو ملامت کرے۔ اس لحاظ سے لوامہ کا درجہ مطمئنہ سے کم ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ نفس لوّامہ اس نفس کو کہتے ہیں جو بذات خود مطمئن ہو علاوہ ازیں اس میں دوسروں کو تادیب کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو چکی ہو اس لحاظ سے یہ نفس مطمئنہ سے افضل ہوگا۔

رَجُلٌ لُوَمَةٌ۔ وہ شخص جو دوسروں کو ملامت کرے مگر لُوْمَةٌ (بسکون واؤ) وہ ہے جسے لوگ ملامت کرتے ہوں۔

جیسا کہ سُخَرَةٌ وَسُخْرَةٌ اور هُزَءَةٌ وَهُزْءَةٌ میں فرق پایا جاتا ہے۔

اَللَّوْمَةُ کے معنی ملامت کے ہیں۔ اور لَائِمَةٌ اس فعل کو کہتے ہیں جس کا ارتکاب کرنے پر انسان قابل ملامت سمجھا جائے۔

(ل و ن)

اَللَّوْنُ۔ کے معنی رنگ کے ہیں اور یہ سیاہ سفید اور ان دونوں سے مرکب یعنی ہر قسم کے

---

[1] ولا یخفیٰ ان الکلمۃ قبیحۃ لان فیہ نسبۃ السوء الی الانبیاء فالاولیٰ ما ورد فی الحدیث عمل قوم لوط فلیستعمل ہٰذہ

رنگ پر بولا جاتا ہے۔

تَلَوَّنَ کے معنی رنگ بدلنے کے ہیں قرآن میں ہے۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا (۳۵-۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کی دھاریاں ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ (۳۰-۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا۔

میں اختلاف الوان سے انواع واقسام کے رنگوں اور شکلوں کے مختلف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور باوجود اس قدر تعداد کے ہر انسان اپنی ہیئت کذائی اور رنگت میں دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس سے خدا کی وسیع قدرت پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور کبھی الوان سے کسی چیز کے انواع واقسام مراد ہوتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ أَتَى بِالْأَلْوَانِ مِنَ الْأَحَادِيثِ اس نے رنگا رنگ کی باتیں کیں اور أَلْوَانٌ مِنَ الطَّعَامِ سے مراد ہیں قسم قسم کے کھانے۔

(ل و ی)

لَوَى (ض) الْحَبْلَ يَلْوِيهِ لَيًّا کے معنی رسی بٹنے کے ہیں۔ لَوَى يَدَهُ۔ اس کے ہاتھ کو موڑا۔ لَوَى رَأْسَهُ وَبِرَأْسِهِ اس نے اپنا سر پھیر لیا یعنی اعراض کیا[1] چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ (۶۳-۵) تو سر پھیر لیتے ہیں۔

لَوَى لِسَانَهُ بِكَذَا کنایہ ہوتا ہے جھوٹ بولنے اور اٹکل پچو کی باتیں بنانے سے۔ قرآن میں ہے:۔

يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ (۳-۷۸) کتاب (توراۃ) کو زبان موڑ موڑ کر پڑھتے ہیں۔

لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ (۴-۴۶) زبان کو موڑ کر۔

محاورہ ہے:۔ فُلَانٌ لَا يَلْوِي عَلَى أَحَدٍ وہ کسی کی طرف گردن موڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہ سخت ہزیمت کھا کر بھاگ اٹھنے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ (۳-۱۵۳)

جب تم لوگ دور بھاگے جاتے تھے۔ اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ شاعر نے اس معنی کو یوں ادا کیا ہے[2] (الکامل)

(۴۰۱) تَرَكَ الْأَحِبَّةَ أَنْ يُقَاتِلَ دُونَهُ
وَنَجَا بِرَأْسِ طِمِرَّةٍ وَّثَّابِ

اور اس نے دوستوں کے واسطے لڑنا چھوڑ دیا اور چھلانگیں بھر کر دوڑنے والی گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگ گیا۔

اَللِّوَاءُ۔ جھنڈے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہوا سے لہراتا رہتا ہے۔ اَللَّوِيَّةُ وہ کھانا جو لپیٹ کر توشہ کے طور پر رکھ دیا جائے۔

لَوَى مَدِينَهُ۔ اپنے مقروض کو ڈھیل دینا۔

---

[1] ومنہ قولہ تعالیٰ: وان تلووا او تعرضوا (۴-۱۳۵) [2] قالہ حسان بن ثابت یعیرہ الحارث بن ہشام حیث فر یوم بدر عن اخیہ ابی جہل وقبلہ: ان کنت کاذبۃ الذی حدثتنی فنجوت منجی الحارث بن ہشام والبیت من کلمۃ فی دیوانہ ۹۵ و ۲۱۵ (طبعۃ دار صادر) والسیرۃ (۲/۳۸۳) والسہیلی (۲: ۱۱۰) والمحاضرات للمؤلف (۲/۱۸۶) واعجاز القرآن للباقلانی ۴۰۱ ولدا المعارف ۴۹۶) والبحرہ: ۱۵۸/ ۱۳ / ۲۹۱) والعقد (۱: ۱۷۰) والعیون (۱: ۱۶۹) والصناعتین ۹۸ ۳ فی بحث الاستطراد مع اعتذار الحارث وقال فیہ: وہذا اول من اعتذر من ہزیمۃ رویت عن العرب وفی البیت ایضا فی المجر لابن حبیب ۵۰۲ والجز فی الناقض ۵۲ والاصابۃ رقم ۴۰ ۱۵ فی ترجمۃ الحارث بن ہشام واسد الغابۃ (۱: ۳۵۱) وفی روایتہم ولجام بدل وثاب فی المطبوع وثاب: الطمرۃ الفرس الجواد ویستعار للاتان ویروی البیت ایضا لحماس بن قیس بن خالد البکری ۱۲ ✣

اَلنَّوِیٰ۔ ٹیلے کے لَوِی یعنی موڑ پر پہنچنا۔

(ل و)

لَوْ (حرف) بعض نے کہا ہے کہ یہ اِمْتِنَاعُ الشَّیْءِ لِاِمْتِنَاعِ غَیْرِہٖ کے لئے آتا ہے یعنی ایک چیز کا دوسری کے امتناع کے سبب ناممکن ہونا) اور معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِکُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ (۱۷-۱۰۰) کہہ دو کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے۔

(لولا)

لَوْلَا (حرف) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک شے کے پائے جانے سے دوسری شے کا ممتنع ہونا۔ اس کی خبر ہمیشہ محذوف رہتی ہے۔ اور لَوْلَا کا جواب قائم مقام خبر کے ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۴-۳۱) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہو جاتے۔

دوم بمعنی ھَلَّا کے آتا ہے۔ اور اس کے بعد متصلاً فعل کا آنا ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا۔ تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا۔ وغیر ذالک من الامثلۃ۔

(ل ی ت)

لَاتَهٗ (ض) عن كذا لَيْتًا۔ کے معنی اسے کسی چیز سے پھیر دینا اور ہٹا دینا ہیں۔ نیز لَاتَهٗ وَاَلَاتَهٗ کسی کا حق کم کرنا پورا نہ دینا۔ قرآن میں ہے:۔ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۴۹-۱۴) تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ اور اس کے اصلی معنی رَدُّ اللِّيْتِ۔ یعنی گردن کے پہلو کو پھیرنے کے ہیں۔

لَيْتَ۔ یہ حرف طمع و تمنی ہے یعنی گذشتہ کوتاہی پر اظہار تاسف کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ لَيْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (۲۵-۲۸) کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا (۷۸-۴۰) اور کافر کہے گا اے کاش میں مٹی ہوتا۔ يٰلَيْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (۲۵-۲۷) کہے گا اے کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ رستہ اختیار کیا ہوتا۔

شاعر نے کہا ہے[1] (الرجز)

(۴۰۲) وَلَيْلَةٍ ذَاتِ دُجًى سَرَيْتُ
وَلَمْ يَلِتْنِیْ عَنْ هَوَاهَا لَيْتُ

بہت سی تاریک راتوں میں میں نے سفر کئے۔ لیکن مجھے کوئی پرخطر مرحلہ بھی محبوب کی محبت سے دل برداشتہ نہ کر سکا کہ میں کہتا کاش میں نے محبت نہ کی ہوتی)۔

یہاں لَيْتَ اسم معرب اور لَمْ يَلِتْ کا فاعل ہے۔ اور یہ قَوْلِیْ لَيْتَهٗ كَانَ كَذَا کی تاویل میں ہے

---

[1] قالہ الراجز ابو محمد الجری الفقعسی وفی لسان العرب مدی بدل دجیً فلفظۃ "لیت" ھھنا اسم ای لم یلیتنی عن سراہا ان اتندم فاقول لیتنی ماسریتہا قبل لیت مصدر موضع اسم بمعنی صارف والشطران فی اللسان (لیت، سری) والقالی (۲: ۲۴) فی تسعۃ ابیات والطبری (۱۵: ۲۶-۳۴) ونسبہا الطبری وابوحیان فی البحر (۸: ۴۰) ویعقوب فی اصلاحہ ۱۳۶ وابن خالویہ فی اعرابہ ۴۷ الی رؤبۃ من العجاج ونسبہ صاحب الحاشیۃ الی الوہم والحق کما فی اللالی انہ رجز الضانی شرح دیوان الحطیئۃ للسکری ۳۶

جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے[1] (الخفیف)

(۴۰۳) اِنَّ لَیْتًا وَّاِنَّ لَوًّا عَنَاءٌ -

کہ لَیْتَ یا لَوْ کہنا سراسر باعث تکلف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ پہلے شعر میں لَیْتَ مصدر بمعنی لَائِتٌ یعنی اسم فاعل ہے اور معنی یہ ہیں کہ مجھے اس کی محبت سے کوئی چیز نہ پھیر سکی۔

(ل ی ل)

لَیْلٌ وَّلَیْلَۃٌ کے معنی رات کے ہیں۔ اس کی جمع لَیَالٍ وَّلَیَائِلُ وَّلَیْلَاتٌ آتی ہے اور نہایت تاریک رات کو لَیْلٌ اَلْیَلُ وَّلَیْلَۃٌ لَیْلَاءُ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لَیْلَۃٌ اصل میں لَیْلَاۃٌ ہے کیونکہ اس کی تصغیر لُیَیْلَۃٌ اور جمع لَیَالٍ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ (۹۷-۱) ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔

وَسَخَّرَ لَکُمُ اللَّیْلَ وَالنَّھَارَ (۱۴-۳۳) اور رات اور دن کو تمہاری خاطر کام میں لگا دیا۔

وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی (۹۲-۱) رات کی قسم جب ان پر چھا جائے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً (۷-۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

وَلَیَالٍ عَشْرٍ (۸۹-۲) اور دس راتوں کی۔

ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (۱۹-۹) برابر تین راتیں (دن)

(ل ی ن)

اللِّیْنُ کے معنی نرمی کے ہیں اور یہ خشونت کی ضد ہے اصل میں تو یہ اجسام کے لئے استعمال ہوتے ہیں مگر استعارہ اخلاق وغیرہ یعنی معانی کے لئے بھی آجاتے ہیں چنانچہ فُلَانٌ لَیِّنٌ یا خَشِنٌ کے معنی ہیں فلاں نرم یا درشت مزاج ہے۔ اور یہ دونوں لفظ حسب موقع ومحل کبھی مدح کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور کبھی مذمت کے لئے آتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَبِمَا رَحْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ (۳-۱۵۹) (اے محمد) خدا کی مہربانی سے تمہاری افتاد مزاج ان لوگوں کے لئے نرم واقع ہوئی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَقُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (۳۹-۲۳) پھر ان کی کھالیں

---

[1] قالہ ابو زبید الطائی یصف حال الحیوان عند اشتداد الہجر واولہ لیت شعری: واین منی لیت ۔ ۔ ۔ والبیت فی اللسان (الالا) والبحر (۱: ۳۶۲) والکتاب (۱۲، ۳۲) والخفاجی ۹۴ والفتح لابن حجر (۱۴=۳۵۳) باب ما یجوز من اللو والشطر فی الصناعتین ۷۷، ومحاضرات المؤلف ۲ / ۴۵۵ وفی الوسیط بعدہ ثلاثۃ اخری وصدر البیت فی البلدان (سم برلم) من قصیدۃ قالہا ابو قطیفۃ عمرو بن الولید بن عقبۃ بن ابی معیط فی حنین الی المدینۃ حین نفاہ عبداللہ بن الزبیر فلحق بالشام لکن فیہ عجزہ الی العہد یلین خیرام فی عشرۃ ابہات ویلین غدیر لمدینۃ ۱۲

اوران کے دل نرم ہوکر خدا کی یاد کی طرف متوجہ
ہوجاتے ہیں۔ یہی اس معنی کی طرف اشارہ
ہے کہ اِبا اور انکار کے بعد وہ حق کے سامنے
سرنگوں ہوجاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ (۵۹-۵)

مومنو! کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے۔
میں لِيْنَة کے معنی نرم و نازک کھجور کا درخت ہیں
۔۔۔ اور یہ فِعْلَة کے وزن پر ہے جیسے حِنْطَةٌ۔
تاہم یہ مختلف انواع میں سے ایک نوع کے
لئے مخصوص نہیں ہے۔

کِتَابُ المِیم

ما

یہ عربی زبان میں دو قسم پر ہے۔ اسمی اور حرفی۔ پھر ہر ایک پانچ قسم پر ہے لہذا کل دس قسمیں ہیں (۱) ما اسمی ہو تو واحد جمع اور تذکیر و تانیث سب کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے پھر لفظاً مفرد ہونے کے لحاظ سے اس کی طرف ضمیر مفرد بھی لوٹ سکتی ہے۔ اور معنیً جمع ہونے کی صورت میں ضمیر جمع کا لانا بھی صحیح ہوتا ہے۔ یہ ما کبھی بمعنی اَلَّذِیْ ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ (۱۰-۱۸) اور یہ (لوگ) خدا کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں۔ تو یہاں مَا کی طرف یَضُرُّهُمْ میں مفرد کی ضمیر لوٹ رہی ہے۔ اس کے بعد معنی جمع کی مناسبت سے هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَاۤؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ آگیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:۔
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۶-۷۳)
اور خدا کے سوا ایسوں کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمین میں روزی دینے کا ذرہ بھی اختیار نہیں رکھتے میں بھی جمع کے معنی ملحوظ ہیں اور آیت کریمہ:۔
بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ (۲-۹۳) کہ تمہارا ایمان تم کو بری بات بتاتا ہے۔ میں بھی جمع کے معنی مراد ہیں۔ اور کبھی نکرہ ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ (۴-۵۸) بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔
تو یہاں نِعِمَّا بمعنی نِعْمَ شَیْئًا ہے۔ نیز فرمایا:۔ فَنِعِمَّا هِیَ (۲-۲۷۱) تو وہ بھی خوب ہے۔ اور آیت کریمہ: مَا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (۲-۲۶) کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی۔
میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَا نکرہ بمعنی شَیْئًا ہو اور یہ[1] بھی کہ مَا صلہ ہو اور اس کا مابعد یعنی بَعُوْضَةً مفعول ہو اور نظم کلام دراصل یوں ہو۔ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا بَعُوْضَةً۔
اور کبھی یہ اِسْتِفْهَامِیَه ہوتا ہے۔ اس صورت میں کبھی کسی چیز کی نوع یا جنس سے سوال کے لئے آتا

[1] نسب العلامۃ الالوسی ہذا الاحتمال الی صاحب البحر (ا/۱۹۰)

ہے۔ اور کبھی کسی چیز کی صفات جنسیہ یا نوعیہ کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے۔ اور کبھی غیر ذوی العقول اشخاص اور اعیان کے متعلق سوال کے لئے بھی آجاتا ہے۔

بعض علمائے نحو کا قول ہے کہ کبھی اس کا اطلاق اشخاص ذوی العقول پر بھی ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (۲۳-۲-۶) مگر ان ہی بیویوں یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملک ہوتی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۲۹-۴۲) جس چیز کو خدا کے سوا پکارتے ہیں۔ خواہ وہ کچھ ہی ہو۔ خدا اسے جانتا ہے۔

میں خلیل نے کہا ہے کہ مَا تَدْعُوْنَ میں ما استفہامیہ ہے ای اَیَّ شَیْءٍ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور انہوں نے یہ تکلف اس لئے کیا ہے کہ یہ ہمیشہ ابتداء کلام میں واقع ہوتا ہے اور مابعد کے متعلق استفہام کے لئے آتا ہے۔ جو آخر میں واقع ہوتا ہے جیسا کہ آیت:۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ الآية (۳۵-۲) خدا جو اپنی رحمت کا دروازہ کھول دے۔ اور مثال مَا تَضْرِبْ اَضْرِبْ میں ہے۔

اور کبھی تعجب کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

مَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۲-۱۷۵) یہ (آتش) جہنم کی کیسی برداشت کرنے والے ہیں۔

(۲) ما حرفی ہونے کی صورت میں بھی پانچ قسم پر ہے۔

اول یہ کہ اس کا مابعد بمنزلہ مصدر کے ہو جیسا کہ فعل مستقبل پر ان ناصبہ داخل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲-۳) اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تو یہاں مَا رَزَقَ بمعنی رِزْق مصدر کے ہے اور اس مَا کے بمعنی اَنْ مصدریہ ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ اس کی طرف کہیں بھی لفظاً یا تقدیراً ضمیر نہیں لوٹتی۔ اور آیت کریمہ:۔

بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۲-۱۰) اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب۔ میں بھی ما مصدری معنی پر محمول ہے۔

اسی طرح اَتَانِیَ الْقَوْمُ مَا عَدَا زَیْدًا میں بھی ما مصدریہ ہے اور تقدیر ظرف کی صورت میں بھی ما مصدریہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ (۲-۲۰) جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵-۶۴) یہ جب لڑائی کے لئے آگ جلاتے ہیں۔ خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔

كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (۱۷-۹۷) جب (اس کی آگ) بجھنے کو ہوگی تو ہم ان کو (عذاب دینے) کے لئے اور بھڑکا دیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (۱۵-۹۴) پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے وہ (لوگوں کو) سنا دو۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما مصدریہ ہو اور یہ بھی کہ ما موصولہ بمعنی اَلَّذِیْ ہو۔

یاد رکھو کہ مَا اپنے مابعد کے ساتھ مل کر مصدری معنی میں ہونے کی صورت میں ہمیشہ حرفی ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اسمی ہو تو اس کی طرف ضمیر کا لوٹنا ضروری ہے۔ پس یہ اُرِیْدُ اَنْ اَخْرُجَ میں اَنْ کی طرح ہوتا ہے جس طرح اَنْ کے بعد ضمیر نہیں ہوتی جو اس کی طرف لوٹ سکے اسی طرح ما کے بعد بھی عائد (ضمیر) نہیں آتی۔

دوئم ما نافیہ ہے۔ اہل حجاز اسے مشروط عمل دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

مَا هٰذَا بَشَرًا (۱۲-۳۱) یہ آدمی نہیں ہے۔

تیسرا ما کافہ ہے جو اِنَّ وَ اَخَوَاتُهَا اور رُبَّ کے ساتھ مل کر فعل پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵-۲۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

اِنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (۳-۱۷۸) (نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لئے مہلت دیتے ہیں کہ اور گناہ کر لیں۔

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ گویا موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۱۵-۲) کسی وقت کافر لوگ آرزو کریں گے۔

میں بھی ما کافہ ہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ قَلَّمَا اور لَمَّا میں بھی ما کافہ ہوتا ہے۔

چہارم ما مُسَلِّطَة یعنی وہ ما جو کسی غیر عامل کلمہ کو عامل بنا کر مابعد پر مسلط کر دیتا ہے جیسا کہ اِذْمَا، حَيْثُمَا کا ما ہے کہ ما کے ساتھ مرکب ہونے سے قبل یہ کلمات غیر عاملہ تھے۔ لیکن ترکیب کے بعد اسمائے شرط کا سا عمل کرتے ہیں۔ اور فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں۔ جیسے حَيْثُمَا تَقْعُدْ اَقْعُدْ وغیرہ۔

پانچواں ما زائدہ ہے۔ جو محض پہلے لفظ کی تاکید کے لئے آتا ہے۔ جیسے اِذَا مَا فَعَلْتَ كَذَا (جب تم ایسا کرو) مَا تَخْرُجْ اَخْرُجْ (اگر تم باہر نکلو گے تو میں بھی نکلوں گا۔ قرآن میں ہے:

فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا (۱۹-۲۶) اگر تم کسی آدمی کو دیکھو۔

وَاِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ (۱۷-۲۳) اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔

(م ی ی)

اَلْمِائَةُ (سو) یہ اصول اعداد میں تیسری اکائی کا نام ہے۔ کیونکہ اصول اعداد چار ہیں۔ آحاد، عشرات، مئات اور الوف۔۔۔ قرآن میں ہے:۔

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (۸-۶۶) پس اگر تم میں ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے۔

وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۸-۶۵) اور اگر سو (ایسے) ہوں گے تو ہزاروں پر غالب رہیں گے۔

اور مِائَةٌ کا آخری حرف یعنی لام کلمہ محذوف ہے۔

اَمْأَيْتُ الدَّرَاهِمَ فَاَمْأَتْ هِيَ یعنی میں نے دراہم کو سو کیا تو وہ سو ہو گئے۔

(م ی د)

اَلْمَیْدُ۔ زمین کی طرح کی کسی بڑی چیز کا مضطرب ہونا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (۱۶-۱۵) کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے۔

اَنْ تَمِیْدَ بِھِمْ (۲۱-۳۱) تاکہ لوگوں (کے بوجھ سے ہلنے اور جھکنے) نہ لگے۔

مَادَتِ الْاَغْصَانُ تَمِیْدُ۔ شاخوں کا مضطرب ہونا بعض نے کہا ہے کہ شاعر کے کلام[1] (

(۴۱۵) نَعِیْمًا وَمَیْدَ انًا مِّنَ الْعَیْشِ اَخْضَرَا (نعمتیں اور سرسبز لہلہاتی ہوئی زندگی)

میں بھی مَیْدَانًا مَادَتِ الْاَغْصَانُ سے ہے اور اس کے معنی کشادہ زندگی کے ہیں اور اسی سے مَیْدَانُ الدَّابَۃِ ہے جس کے معنی جانور کے کھلے میدان میں پھرنے کے ہیں۔

اَلْمَائِدَۃُ اصل میں اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ اور ہر ایک پر یعنی کھانے اور خالی خوان پر انفرادًا بھی مَائِدَۃٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ مَادَنِیْ یَمِیْدُنِیْ سے ہے جس کے معنی کھانا کھلانے کے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی رات کا کھانا کھلانا بھی کئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (۵-۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ انہوں نے کھانا طلب کیا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے علم کے لئے دعا کی تھی۔ اور علم کو مَائِدَۃٌ سے اس لئے تعبیر فرمایا ہے کہ علم روح کی غذا بنتا ہے جیسا کہ طعام بدن کے لئے غذا ہوتا ہے۔

(م ی ر)

اَلْمِیْرَۃُ۔ غلہ جو انسان کھانے کے لئے فراہم کرتا ہے۔ اور مَارَ اَھْلَہٗ یَمِیْرُھُمْ کے معنی اہل و عیال کے لئے غلہ لانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَنَمِیْرُ اَھْلَنَا (۱۲-۶۵) اب ہم اپنے اہل و عیال کے لئے پھر غلہ لائیں گے۔

اور خِیْرَۃٌ اور مِیْرَۃٌ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں۔

(م ی ز)

اَلْمَیْزُ وَالتَّمْیِیْزُ کے معنی متشابہ اشیاء کو ایک دوسری سے الگ کرنے کے ہیں۔ اور مَازَہٗ یَمِیْزُہٗ مَیْزًا وَمَیَّزَہٗ تَمْیِیْزًا دونوں ہم معنی ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

لِیَمِیْزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (۸-۳۷) تاکہ خدا ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔

اور ایک قراءت میں لِیُمَیِّزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ ہے۔ اَلتَّمْیِیْزُ کے معنی الگ کرنا بھی آتے ہیں اور اس ذہنی قوت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے ذریعہ انسان معانی کا استنباط کرتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا تَمْیِیْزَ لَہٗ فلاں میں قوت تمیز نہیں ہے۔

---

[1] قالہ ابن احمر (ابو الخطاب عمرو بن احمر بن العمرد الباہلی القیسی المتوفی فی خلافۃ عثمان قبل سنۃ ۲۵ھ راجع الخزانہ ۳:۳۸) واولہ ...... وصادفت۔ والبیت فی اللسان والصحاح (مید)

اِنْمَازَ اور اِمْتَازَ کے معنی الگ ہونے کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
وَامْتَازُوا الْیَوْمَ (۳۶-۵۹) اور آج الگ ہو جاؤ۔
اور تَمَیَّزَ کَذَا (تفعل) مَازَ کا مطاوع آتا ہے۔ اور اس کے معنی الگ اور منقطع ہونے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔
تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ (۶۷-۸) گویا مارے جوش کے پھٹ پڑے گی۔

(م ی ل)

اَلْمَیْلُ۔ اس کے معنی وسط سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ کبھی ظلم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ اجسام کے متعلق استعمال ہو تو بدن میں پیدائشی کجی کو مَیَلٌ (بفتح الیاء) اور عارضی کجی کو مَیْلٌ (بسکون الیاء) کہتے ہیں۔ اور مِلْتُ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔
فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ (۴-۱۲۵) تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی طرف ڈھل جاؤ۔
مِلْتُ عَلَیْهِ کے معنی کسی پر حملہ کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا ہے۔
فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْکُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً (۴-۱۰۲) تو تم پر یکبارگی حملہ کر دیں۔
اور اَلْمَالُ کو مال اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ مائل اور زائل ہوتا رہتا ہے۔ بدیں وجہ اسے عَرَض بھی کہتے ہیں۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ مال کی مثال ایک پیشہ ور عورت کی ہے جو کبھی عَطَّار اور کبھی بَیْطَار کے گھر ہوتی ہے۔

(م ی ہ)

اَلْمَاءُ۔ کے معنی پانی کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱-۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔
مَاءً طَهُوْرًا (۲۵-۴۸) پاک (اور ستھرا ہوا) پانی۔
اور محاورہ ہے:۔
مَاءُ بَنِیْ فُلَانٍ۔ فلاں قبیلے کا پانی یعنی ان کی آبادی۔
مَاءٌ اصل میں مَوَهٌ ہے۔ کیونکہ اس کی جمع اَمْوَاهٌ اور مِیَاهٌ آتی ہے۔ اور تصغیر مُوَیْهٌ پھر ہا کو حذف کر کے واؤ کو الف سے تبدیل کر لیا گیا ہے۔
رَجُلٌ مَاهُ الْقَلْبِ۔ پانی دل یعنی بزدل آدمی۔ یہاں مَاهٌ مَوِهٌ سے بنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ رَجُلٌ ثَاهٌ کی طرح ہے۔ یعنی لا ہمزہ سے مبدل ہے۔ مَاهَتِ الرَّکِیَّةُ تَمِیْهُ وَتَمَاهُ۔ کنویں میں پانی بڑھ گیا۔ بِئْرٌ مَیِّهَةٌ وَمَاهَةٌ وَمَیْهَةٌ زیادہ پانی والا کنواں۔
اَمَاهَ الرَّجُلُ وَاَمْهٰی (کنواں کھودتے ہوئے) پانی تک پہنچ گیا۔

(م ت ع)

اَلْمُتُوْعُ کے معنی کسی چیز کا بڑھنا اور بلند ہونا کے ہیں۔
جیسے مَتَعَ النَّهَارُ (دن بلند ہو گیا)۔
مَتَعَ النَّبَاتُ (پودا بڑھ کر بلند ہو گیا) اَلْمَتَاعُ۔ عرصہ دراز تک فائدہ اٹھانا۔ محاورہ ہے:۔
مَتَّعَهُ اللّٰهُ بِکَذَا اَمْتَعَهُ اللّٰهُ اسے دیر تک فائدہ اٹھانے کا موقع دے۔ تَمَتَّعَ بِهِ۔ اس نے عرصہ دراز تک اس سے فائدہ اٹھایا۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ (۱۰-۹۸) اور ایک مدت تک (فوائد دنیوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔
نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا (۳۱-۲۴) ہم ان کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے۔
فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا (۲-۱۲۶) میں اس کو بھی کسی قدر متمتع کروں گا۔
سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۱-۴۸) ان کو ہم (دنیا کے فوائد سے) محفوظ کریں گے۔ پھر ان کو ہماری طرف سے عذاب الیم پہنچے گا۔
اور قرآن میں جہاں کہیں دنیاوی ساز وسامان کے متعلق تَمَتَّعُوا آیا ہے تو اس سے تہدید مراد ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ عیش کوشی اور وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں اور اِسْتَمْتَعَ کے معنی کسی چیز سے نفع حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کے ہیں قرآن میں ہے۔
رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ (۶-۱۲۸) اے ہمارے پروردگار ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔
فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ (۹-۶۹) وہ اپنے حصے سے بہرہ یاب ہو چکے۔ سو جس طرح تم سے پہلے لوگ اپنے حصے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اسی طرح تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھا لیا۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲-۳۶) اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور فائدہ اٹھانا (مقرر) کر دیا گیا ہے۔
میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر انسان کو دنیا میں ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ اور پھر آیہ کریمہ۔
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (۴-۷۷) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے۔ میں متاع دنیا کو قلیل کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اُخروی ثواب کے مقابلہ میں دنیا کا ساز وسامان بے وقعت ہے اور نا قابل اعتناء جیسا کہ آیت فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ (۹-۳۸) دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہیں
اور آیت:۔
وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ۔ دنیا کی زندگی کا فائدہ تو آخرت (کے مقابلے) میں محدود سا ہے۔ (۱۳-۲۶) سے واضح ہوتا ہے اور خانگی ضروریات کی چیزوں کو بھی متاع کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ (۱۳-۱۷) زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔
نیز ہر وہ چیز جس سے کسی قسم کا نفع حاصل کیا جائے۔ اسے مَتَاعٌ وَمُتْعَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کریمہ:۔
وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ (۱۲-۶۵) جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔
میں غلہ کو متاع کہا ہے۔ اور بعض نے غلہ کے تھیلے یا بوریاں مراد لئے ہیں اور یہ دونوں متاع میں داخل اور باہم متلازم ہیں کیونکہ غلہ ہمیشہ تھیلوں ہی میں ڈالا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ (۲-۲۴۱) اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان و

نفقہ دینا چاہیئے۔ ہیں متاع بمعنی متعہ ہے اور مُتعہ سے یہاں وہ نان و نفقہ مراد ہے جو عورت کو طلاق دینے کے بعد شوہر سے ملتا ہے تاکہ عدت طلاق پوری ہونے تک وہ گذر بسر کر سکے۔ اور اَمْتَعَ و مَتَّعَ کے معنی متعہ دینے کے ہیں۔ مگر قرآن میں اس معنی کے لئے صرف مَتَّعَ یعنی تفعیل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ (۳۳-۴۹) تو ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر... رخصت کر دو۔

وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ (۲-۲۳۶) ہاں ان کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق۔

مُتْعَةُ النِّكَاحِ (یعنی نکاح متعہ) کی صورت یہ ہے کہ مرد کسی عورت کو کچھ مال دے کر متعین عرصہ کے لئے اس سے نکاح کرلے۔ پھر جب وہ مدت گذر جائے تو وہ عورت بغیر طلاق کے خاوند سے الگ ہو جاتی ہے اور حج کے ساتھ عمرہ کرنے کو مُتْعَةُ الْحَجِّ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (۲-۱۹۶) تو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرہ سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔

شَرَابٌ مَاتِعٌ۔ بعض نے اس کے معنی سُرخ شراب کئے ہیں لیکن اصل میں مَاتِعٌ ہر عمدہ اور اعلیٰ شراب کو کہتے ہیں۔ گو شراب کا سرخ ہونا بھی اس کی عمدگی کی ایک علامت ہے مگر مَاتِعٌ کا لفظ اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

جَمَلٌ مَاتِعٌ۔ قوی اونٹ[۱] اور مَاتِعٌ کے معنی راجح اور زائد بھی آجاتے ہیں چنانچہ شاعر کے شعر۔[۲]

(۴۰۴) وَمِيْزَانُهٗ فِيْ سُوْرَةِ الْبِرِّ مَاتِعٌ

(اس کا ترازو نیکیوں سے جھکا ہوا ہے)

میں مَاتِعٌ معنی راجح اور زائد ہی کے ہے۔

(م ت ن)

اَلْمَتْنَانِ پیٹھ کے دونوں حصے جو ریڑھ کی ہڈی کے ارد گرد ہوتے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو اَلْمَتْنُ کہتے ہیں۔

مَتَنْتُهٗ کسی کی پیٹھ پر مارنا مَتُنَ مضبوط پشت والا ہونا اور مضبوط پشت والے آدمی کو مَتِيْنٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے حَبْلٌ مَتِيْنٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی مضبوط رسی کے ہیں قرآن میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱-۵۸) خدا ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔

(م ت ی)

مَتٰى۔ یہ اسم استفہام ہے اور کسی کام کا وقت دریافت کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے۔

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ (۳۶-۴۸) یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟

مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ (۳۲-۲۸) یہ فیصلہ کب ہوگا؟

---

[۱] کذا فی الصلب والصواب حبل بدل جمل کما فی المعاجم ۔

[۲] قالہ النابغۃ الذبیانی ناولہ: الی خیر دین سنۃ قد علمتہ والبیت فی اللسان (متع) وفی روایتہ الجد بدل البر وانظر ایضاً فی لحق دیوانہ

کہتے ہیں کہ بنی ہذیل جَعَلْتُهٗ مَتَی کُمِّیْ (میں نے اسے اپنے آستین کے وسط میں ڈال لیا) کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابوذویب (الہذلی) نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۴۰۵) شَرِبْنَ بِمَاءِ الْبَحْرِ ثُمَّ تَرَفَّعَتْ
مَتَی لُجَجٍ خُضْرٍ لَهُنَّ نَئِيْجُ

انھوں نے سمندر سے پانی پیا پھر سمندر کے گہرے کنڈوں سے بلند ہوئیں اور گرجتے ہوئے تیز رفتاری سے چل پڑیں۔

(م ث ل)

مَثَلَ (ک) اَلشَّيْءُ مُثُوْلًا کے معنی کسی چیز کا سیدھا کھڑا رہنا یا دوسری چیز کی شکل و صورت اختیار کر لینا کے ہیں۔ اسی سے حدیث میں ہے[2] (۱۱۶)

مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے بید ھے کھڑے رہیں۔ تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے۔

اَلْمُمَثَّلُ۔ وہ چیز جو کسی نمونہ کے مطابق بنائی گئی ہو۔

اَلتِّمْثَالُ۔ تصویر۔ کسی چیز کا مجسمہ[3] تَمَثَّلَ کَذَا کسی کی شکل بن جانا۔ قرآن میں ہے:۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹-۱۷) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی (کی شکل) بن گیا۔

اَلْمَثَلُ کے معنی ہیں ایسی بات کے جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو۔ اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ دوسری کا مطلب واضح ہو جاتا ہو اور معاملہ کی شکل سامنے آجاتی ہو۔ مثلاً عین ضرورت پر کسی چیز کو کھو دینے کے لئے اَلصَّيْفَ ضَيَّعْتِ اللَّبَنَ کا محاورہ ضرب المثل ہے۔ چنانچہ قرآن میں اَمْثَالَ بیان کرنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۵۹-۲۱) اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ فکر نہ کریں۔ اور دوسرے مقام پر وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ (۲۹-۴۳) اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

مَثَلٌ وَمِثْلٌ دونوں ہم معنی ہیں جیسے شَبَهٌ وَشِبْهٌ وَنَقَضٌ وَنِقْضٌ وغیرہ۔ اور یہ دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک معنی وصف جیسے فرمایا:۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (۱۳-۳۵) یعنی جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا

---

[1] وفی دیوان الہذلیین تروت بدل شربن وعلی حبشیات بدل لجج خضر والضمیر فی شربن یعود الی حناتم سود فی البیت قبلہ سقی ام عمرو کل آخر لیلۃ۔ حناتم سود ماء ہن ثجیج۔ والمراد بہا السحاب والبیت فی الطبری (۲۹: ۲۰۷) وادب الکاتب ۵۱۷ واللسان (متی) وشرح شواہد المغنی للسیوطی ۱۰۹ والاقتضاب ۴۴۷ والجوالیقی ۳۶۷ ودیوان الہذلیین (۱: ۵۱) وفی روایتہ اختلاف یسیر وفی الصاحبی ۱۷۵ غیر منسوب وفی مشکل القرآن ۳۰۴ وبحث البارمکان من والخزانۃ (۳: ۹۳-۹۵) والبیت الضائی الطبسی (۲۹: ۱۴۵) [2] وفی روایۃ ان تمثل قال الحافظ فی تخریجہ لم اجدہ بکذا وفی السنن من حدیث معاویۃ من سرہ ان یتمثل لہ الناس قیاما فلیتبوء مقعدہ من النار انظر ایضا تخریج الاحیاء للعراقی ۲ / ۲۰۵ وفی غریب ابی عبید من حدیث البراء وراجع الکافی ص ۲۴ ارقم ۳۰۷ والفائق (۳ / ۷) والنہایۃ (۴ / ۸۲) [3] وجمعہ تماثیل کما فی قولہ تعالٰی: (۳۴-۱۳) (۲۱-۵۲)

ہے اس کے اوصاف یہ ہیں۔
اور دوم مشابہ کے معنی میں آتا ہے اور ہر قسم کی مشابہت کو شامل ہوتا ہے یعنی عربی میں جو الفاظ بھی مشابہ کے معنی میں آئے ہیں سب سے عام ہوتا ہے مثلاً نِدٌّ صرف اس مشابہ کو کہتے ہیں جو دوسرے کے ساتھ اس کے جوہر میں شریک ہو اور شِبْہٌ کا لفظ دوسرے کے ساتھ صرف کیفیت میں شرکت کو ظاہر کرتا ہے اور مساوی اسے کہتے ہیں جو صرف کمیت میں دوسرے کے برابر ہو اسی طرح شَکْلٌ کا لفظ صرف اندازہ اور پیمائش کے لحاظ سے مشابہت پر بولا جاتا ہے اس بنا پر اللہ تعالیٰ سے من کل الوجوہ تشبیہ کی نفی کرنے کے لئے قرآن نے مِثْل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۴۲-۱۱) اس جیسی کوئی چیز نہیں۔
اب رہا یہ سوال کہ اگر یہاں مثل بمعنی مشابہ ہے تو پھر کاف تشبیہ کیوں لایا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کو تاکید نفی کی غرض سے یک جا لایا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں نہ تو مثل کا استعمال صحیح ہے اور نہ ہی کاف کا اس لئے یکبارگی دونوں کی نفی کر دی ہے۔
مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ (۱۳-۳۵) جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ یہاں مثل بمعنی صفت ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کی طرح کسی کی صفت نہیں ہے یعنی گو ذات باری تعالیٰ بھی بہت سی ان صفات کے ساتھ متصف ہوتی ہے جن کے ساتھ انسان متصف ہوتا ہے لیکن ان صفات کے وہ معنی نہیں ہیں جو بشر میں لئے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ (۱۶-۶۰) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہیں کے لئے بری باتیں (شایاں) ہیں۔ اور خدا کو صفت اعلیٰ زیب دیتی ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ نہایت بری صفات کے مالک ہیں۔ اور باری تعالیٰ اعلیٰ صفات کے ساتھ متصف ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ (۱۶-۷۴) تو (لوگو) خدا کے بارے میں (غلط) مثالیں پیش نہ کرو۔ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے امثال بیان کرنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر از خود ہی اس کے بعد آیت:۔
ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا (۱۶-۷۵) الآیۃ خدا ایک (اور) مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے .... میں اپنی ذات کے لئے مثال بھی بیان فرمادی ہے مگر ان میں تعارض نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس مثال کے بیان کرنے کے بعد آخر میں إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ کہہ کر یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم بشری صفات میں سے اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی صفت بیان نہیں کر سکتے بلکہ جو صفات اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے ثابت کی ہیں وہی بیان کر سکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ .... (۶۲-۵) جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی ..... ان کی مثال۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہود تورات میں

بیان کردہ حقائق کے مفہوم سے اس گدھے کیطرح جاہل ہیں جس کی پشت پر علم وحکمت کی بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں اور آیت کریمہ:۔

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (۷-۱۷۶) اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا۔ تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی ہے۔ کہ اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے۔ اور یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔ پس اس شخص کو ہوائے نفسانی کی اتباع اور ہر وقت اس کی تکمیل کے درپے رہنے میں اس کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو ہر حالت میں زبان باہر نکالے رہتا ہے۔ اور کسی حالت میں بھی زبان نکال کر ہانپنا نہیں چھوڑتا اور آیت کریمہ:۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا الْآيَة (۲-۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے (شب تاریک میں) آگ جلائی ...... پس اس شخص کو جسے اللہ تعالیٰ نے ایک گونہ ہدایت اور اس کے لئے سازگار ماحول عطا کیا ہو۔ لیکن اس نے ان صلاحیتوں کو ضائع کر دیا ہو اور ابدی انعامات کے حاصل کرنے کے لئے انہیں ذریعہ نہ بنایا ہو۔ اسے اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس نے تاریکی میں آگ سلگائی ہو لیکن جب اس نے اس کے لئے آس پاس کو روشن کر دیا تو اس نے وہ روشنی ضائع کر دی ہو اور وہ ...... دوبارہ اندھیرے میں چلا گیا ہو اور آیت کریمہ:۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً (۲-۱۷۱) جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔ پس اس شخص کو جسے ہدایت کی طرف دعوت دی گئی ہو۔ بکریوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ لیکن اختصار کے پیش نظر الفاظ کے باہم مقابلہ اور بسط کلام کے بجائے معنوی مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ کفار کو ہدایت کی طرف دعوت دینے والے شخص اور کفار کی مثال اس چرواہے اور بکریوں کی سی ہے۔ جو انہیں بلانے کے لئے چیختا ہو لیکن وہ اسکے بلانے اور پکارنے کی آواز کے سوا کچھ نہیں سنتیں اور اسی طرح آیات:۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (۲-۲۶۱) جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے مال کی مثال اس دانے کی سی ہے۔ جس سے سات بالیں اگیں اور ہر بال میں سو سو دانہ ہو۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ (۳-۱۱۷) یہ جو مال دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ہوا کی سی ہے جس میں سخت سردی ہو۔ پس بھی مَثَلٌ بمعنی مثال کے ہے۔

اَلْمِثَالُ (۱) ایک چیز کا اس کی نظیر سے مقابلہ کرنا یا (۲) وہ نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔

اَلْمُثْلَةُ۔ عبرتناک سزا جس سے دوسرے بھی عبرت حاصل کر کے ارتکاب جرم سے رک جائیں یہی معنی نکالٌ کے ہیں۔ اس کی جمع مُثُلَاتٌ وَمَثُلَاتٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:۔

وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ (۱۳-۶)

حالانکہ ان سے پہلے عذاب واقع ہو چکے ہیں۔ میں ایک قرأت اَلْمَثْلَاتُ (بسکون ثاء) بھی مروی ہے۔ جیسا کہ عَضُدٌ وَعَضْدٌ ہیں اور اَمْثَلَ السُّلْطَانُ فُلَانًا کے معنی یہ ہیں کہ بادشاہ نے فلاں کو عبرت ناک سزا دی۔

اَلْاَمْثَلُ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو لغوس فاضلہ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو اور اقرب الی الخیر ہو اور کنایہ کے طور پر برگزیدہ لوگوں کو اَمَاثِلُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا (۲۰-۱۰۴) جب کہ اس وقت ان میں سب سے اچھی راہ والا (یعنی عاقل و ہوشمند) کہے گا کہ نہیں بلکہ ایک ہی روز ٹھہرے ہو۔

میں بھی اَمْثَلُ اسی معنی پر محمول ہے اور آیت کریمہ:۔ وَیَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی (۲۰-۶۳)۔ اور تمہارے شائستہ ترین مذہب کو نابود کردیں۔ میں مُثْلٰی کا مذکر اَمْثَلُ ہے۔ یعنی وہ راستہ جو دوسروں سے بہتر ہو۔

(م ج د)

مَجَدَ یَمْجُدُ مَجْدًا وَمَجَادَةً کے معنی کرم و شرف اور بزرگی میں وسعت اور پہنائی کے ہیں یہ دراصل مَجَدَتِ الْاِبِلُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اونٹوں کا کسی وسیع اور زیادہ چارہ والی چراگاہ میں پہنچ جانا۔۔۔۔ اور اَمْجَدَهَا الرَّاعِیْ کے معنی ہیں چرواہے کا اونٹوں کو بڑی وسیع چراگاہ میں لے جانا عرب لوگ کہتے ہیں[1] فِیْ کُلِّ شَجَرٍ نَارٌ وَاسْتَمْجَدَ الْمَرْخُ وَالْعَفَارُ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے مگر مرخ اور عفار درخت میں تو بہت زیادہ آگ پائی جاتی ہے۔

اَلْمَجِیْدُ اسمائے حسنٰی میں سے ہے جس کے معنی ہیں وہ ذات جو اپنے فضل و کرم خصوصی سے نوازنے میں نہایت وسعت اور فراخی سے کام لینے والی ہو چنانچہ آیت کریمہ:۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ (۸۵-۱۵) عرش کا مالک بڑی شان والا ہے۔

میں ذات باری تعالیٰ کا اَلْمَجِیْدُ کے ساتھ متصف ہونا اسکے وسعت فیض اور کثرت جُود کے سبب سے ہی ہے ایک قرأت میں اَلْمَجِیْدِ کسرہ دال کے ساتھ ہے اس صورت میں یہ اَلْعَرْشِ کی صفت ہوگی اور جلالت قدر اور عظمت شان کے لحاظ سے عرش کو اَلْمَجِیْدِ کہا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے[2] (۱۷)

مَا الْکُرْسِیُّ فِیْ جَنْبِ الْعَرْشِ اِلَّا کَحَلْقَةٍ مُلْقَاةٍ فِیْ اَرْضٍ فَلَاةٍ کہ عرش کے مقابلہ میں کرسی کی حیثیت بیابان میں پڑی ہوئی ایک انگوٹھی کی ہے اور اسی مفہوم کے پیش نظر آیت کریمہ:۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ (۲۳-۱۱۶) میں عرش کو اَلْکَرِیْمُ کہا ہے۔

قرآن پاک کی صفت میں بھی اَلْمَجِیْدُ آیا ہے کیونکہ قرآن پاک بھی تمام دنیوی اور اخروی مکارم پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جلیل القدر کتاب ہے چنانچہ فرمایا:۔

---

[1] المثل فی المیدانی ۲: ۵۲ ۲۷ واللسان (مجد) والمخصص (۱۱: ۲۷) والخزانۃ (۱: ۱۵۹) (۲: ۸۶) (۴: ۲۴ بولاق) والحیوان ۴: ۳۶۴ والامالی للمرتضی ۲: ۹۲ والمثل یضرب فی تفضیل بعض الشیئ علی بعض [2] اخرجہ ابن جریر وابوالشیخ فی العظمۃ وابن مردویہ والبیہقی عن ابی ذر الغفاری مرفوعاً۔

قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (۵۰-۱) قرآن مجید کی قسم۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۔(۸۵-۲۱) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔

اور قرآن کے عظیم الشان اور مکارم دارین کی تعلیمات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ آیت بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

اَلتَّمْجِيْدُ۔ بندے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی تجید کے معنی اس کی صفات حسنہ بیان کرنے کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی تجید کے معنی اس پر فضل وکرم کرنے کے ہوتے ہیں۔

(م ح ص)

اَلْمَحْصُ کے اصل معنی کسی چیز کو کھوٹ اور عیب سے پاک کرنے کے ہیں۔ یہ فَحْصٌ کے ہم معنی ہے مگر فَحْصٌ کا لفظ ایک چیز کو دوسری ایسی چیزوں سے الگ کرنے پر بولا جاتا ہے جو اس میں مل جائیں لیکن درحقیقت اس سے منفصل ہوں۔ مگر مُحْصٌ کا لفظ ان ملی ہوئی چیزوں کو کسی چیز سے الگ کرنے کے لئے آتا ہے۔ جو اس سے متصل اور گھل مل گئی ہوں۔ . . . . .
. . . . . چنانچہ محاورہ ہے:۔

مَحَصْتُ الذَّهَبَ وَمَحَّصْتُهٗ سونے کو آگ میں گلا کر اس کے کھوٹ کو الگ کر دیا۔

چنانچہ آیات کریمہ:۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۳-۱۴۱) اور یہ بھی مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو خالص مومن بنا دے۔

وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۳-۱۵۴) اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو خالص اور صاف کر دے۔ میں دلوں کے پاک کرنے پر تحیص کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ تَزْكِيَةٌ وَتَطْهِيْرٌ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں چنانچہ دعا کرتے وقت کہا جاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ مَحِّصْ عَنَّا ذُنُوْبَنَا اے اللہ ہمارے گناہوں کو جو ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں دور کر دے۔

مَحَصَ الثَّوْبُ کپڑے کا رواں استعمال سے گھس گیا اور اس کی تازگی چلی گئی۔

مَحَصَ الْحَبْلُ يَمْحَصُ رسی پرانی ہوگئی۔ اور اس کا رواں صاف ہوگیا۔ مَحَصَ الظَّبْيُ بچہ (طاقتور ہو کر) دوڑنے لگا۔

(م ح ق)

اَلْمَحْقُ کے معنی گھٹنے اور کم ہونے کے ہیں اور اسی سے اَلْمِحَاقُ قمری مہینہ کی ان آخری راتوں کو کہتے ہیں جن میں چاند نمودار نہیں ہوتا۔

اِنْمَحَقَ وَاِمْتَحَقَ کے معنی کم ہونا اور مٹ جانا ہیں اور مَحَقَهٗ کے معنی کسی چیز کو کم کرنے اور اس سے برکت کو ختم کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (۲-۲۷۶) خدا سود کو نابود (یعنی بے برکت کرتا) اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے۔

وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ (۳-۱۴۰) اور کافروں کو نابود کر دے۔

(م ح ل)

مَحَلَ (ن) بِهٖ مَحْلًا وَمِحَالًا کے معنی

کسی کے خلاف بری تدبیر کرنے کے ہیں چنانچہ آیت:۔ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ (۱۳-۱۳) جس کے معنی "عقوبت کے ساتھ سختی سے گرفت کرنے والا کے ہیں" بعض کے نزدیک یہ مَحَلَ بِهٖ کے محاورہ سے ہی مشتق ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اَلْمِحَالُ میں میم زیادہ ہے اور یہ دراصل اَلْحَوْلُ اور اَلْحِيلَةُ سے مشتق ہے[1]۔

ابوزید نے کہا ہے کہ مَحَلَ الزَّمَانُ کے معنی قحط سالی ہونا کے ہیں اور قحط زدہ علاقہ کو مَكَانٌ مَاحِلٌ وَ مُتَمَاحِلٌ کہتے ہیں اور اَمْحَلَتِ الْاَرْضُ کے معنی بارش نہ ہونے کی وجہ سے ملک میں قحط ہونے کے ہیں نیز اَلْمَحَالَةُ بکیٹھ کے مہرہ کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع اَلْمَحَالُ ہے اور جو دودھ خراب اور ترش ہوجائے اسے مُمْحِلٌ کہا جاتا ہے۔ مَاحَلَ عَنْهُ کے معنی کسی کی طرف سے جھگڑنے کے ہیں اور مَحَلَ بِهٖ اِلَی السُّلْطَانِ کے معنی بادشاہ کے پاس کسی کی چغلی کھانے کے ہیں اور ایک حدیث میں ہے[2] (۱۱۸) اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الْقُرْاٰنَ مَاحِلاً بِنَا اے اللہ قرآن کو ہمارے عیوب ظاہر کرنے والا نہ بنا کہ تیرے سامنے ہماری بدعملیوں کی شکایت کرے۔

(م ح ن)

اَلْمِحَنُ وَالْاِمْتِحَانُ کے معنی آزمانے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔ فَامْتَحِنُوْهُنَّ (۶۰-۱۰) تو ان کی آزمائش کرو۔ اور اِمْتِحَانٌ اور اِبْتِلَاءٌ کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں چنانچہ قرآن نے ایک مقام پر:۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ (۴۹-۳) خدا نے ان کے دل تقویٰ کے لئے آزما لئے ہیں۔ کہا ہے اور دوسرے مقام پر لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا (۸-۱۷) اس سے یہ غرض تھی کہ مومنوں کو...... اچھی طرح آزمالے۔ فرمایا ہے اور یہاں بَلَاءٌ اور اِمْتِحَانٌ کا وہی مفہوم ہے جو کہ آیت:۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ الْاٰيَة (۳۳-۳۳) اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کر دے۔ میں جس کے دور کرنے کا ہے۔

(م ح و)

اَلْمَحْوُ (ن) کے معنی کسی چیز کے اثر اور نشان کو زائل کرنا اور مٹا دینا کے ہیں۔ اسی

---

[1] قاله القتيبي في غريبه (۲۲۶) وفي اللسان: قال ابو منصور الازهري قول القتيبي غلط فاحش لان الميم اذا كانت زائدة في "مِفعَل" يجيئ باظهار الواو والياء مثل مِزود ومِحول ومحور وما شاكلها ومثل هذا النقد ذكره ايضا في القرطبي ۹/۲۹۹ ولعله اخذ من قول قتادة: شديد المحال اى شديد الحيلة وعن عباس اى شديد الحول انظر الطبري ۱۳/۱۲۶-۱۲۸۔ [2] وفي الكشاف "ولا تجعله ماحلا مصدقا" وفي ابن حبان عن جابر والحاكم عن معقل بن يسار والطبراني عن انس وابو عبيد في فضائل القرآن "القرآن شافع ومشفع وماحل ومصدق" راجع الكافي ۲۲۸ وكنز العمال رقم ۲۳۰ و ۲۳۶ والفائق ۲/۲۳۸ موقوفا على ابن مسعود وقد مر الحديث في (ش ف ع) ۱۲

سے بادِ شمالی کو مَخوَۃٌ کہا جاتا ہے[1]۔ کیونکہ وہ بادل کے آثار اور نشانات کو مٹا دیتی ہے۔

قرآن میں ہے:۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ (۱۳-۳۹) خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔

(م خ ر)

مَخَرَ الْمَاءُ الْاَرْضَ پانی کا زمین کو چیرنا اور اس میں چکر لگانا۔ محاورہ ہے:۔

مَخَرَتِ السَّفِيْنَةُ مَخْرًا وَمُخُوْرًا کشتی کا اپنے سینہ سے پانی کو چیرنا اور سمندر چیر کر چلنے والی کشتی کو سَفِيْنَةٌ مَاخِرَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَوَاخِرُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ (۱۶-۱۴) اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔

اِسْتَمْخَرْتُ الرِّيْحَ وَامْتَخَرْتُهَا میں ہوا کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ حدیث میں ہے[2]۔

(۱۱۹) اِسْتَمْخِرُوا الرِّيْحَ وَاَعِدُّوا النَّبْلَ درفع حاجت کے وقت، ہوا کی طرف پشت کر کے بیٹھو اور استنجا کے لئے پتھر ساتھ لے جاؤ۔

اَلْمَاخُوْرُ شراب کی دوکان۔ وہ جگہ جہاں شراب فروخت ہوتی ہو۔ بَنَاتُ مَخْرٍ سفید ابر موسم گرما میں اٹھنے والی بدلیاں۔

(م د د)

اَلْمَدُّ کے اصل معنی (لمبائی ہیں) کھینچنے اور بڑھانے کے ہیں اسی سے عرصہ دراز کو مُدَّةٌ کہتے ہیں اور مِدَّةُ الْجُرْحِ کے معنی زخم کا گندہ مواد کے ہیں۔ مَدَّ النَّهْرُ دریا کا چڑھاؤ۔ مَدَّهٗ نَهْرٌ اٰخَرُ دوسرا دریا اس کا معاون بن گیا۔ قرآن میں ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (۲۵-۴۵) تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارا رب سائے کو کس طرح دراز کر کے پھیلا دیتا ہے۔

مَدَدْتُ عَيْنِيْ اِلٰى كَذَا کسی کی طرف حریصانہ ... اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ الْاٰيَة (۱۵-۸۸) تم ... للچائی نظروں سے نہ دیکھنا۔

مَدَدْتُهٗ فِيْ غَيِّهٖ گمراہی پر مہلت دینا اور فورًا گرفت نہ کرنا۔

مَدَدْتُ الْاِبِلَ اونٹ کو مدید پلایا۔ اور مدید اس بیج اور آٹے کو کہتے ہیں جو پانی میں بھگو کر باہم ملا دیا گیا ہو

اَمْدَدْتُ الْجَيْشَ بِمَدَدٍ لشکر کو مدد دینا۔ کمک بھیجنا۔

اَمْدَدْتُ الْاِنْسَانَ بِطَعَامٍ کسی کی طعام (غلہ) سے مدد کرنا۔

---

[1] ای غیر معروفۃ لکونہا علمًا للشمال انظر الذیل للقالی ۴۰ وفی السمط ۵ ۔۱۰ ہنا وتفسیر محوۃ، قول الاصمعی وتبعہ المبرد فی الکامل ۲۳۰ م و قد انکرہ علی بن حمزۃ فی التنبیہات علی اغالیط السراۃ علیہما ۱۲ [2] الحدیث فی عب۔ عن سراقۃ بن مالک مرفوعًا انظر کنز العمال ۹ رقم ۳۰۷-۳۰۸ وفی النہایۃ واللسان (مخر) والفائق ۲/ ۳۲۹ قال والنبل حجارۃ الاستنجاء والحدیث فی مجمع البحار ۳/ ۲۰۵ قال ہو المراد ہہنا من الاستمخار الاستدبار مع یاتی بمعنی الاستقبال ایضًا ۱۲

قرآن میں عموماً اَمَدَّ (افعال) اچھی چیز کے لئے اور مَدَّ (ثلاثی مجرد) بری چیز کے لئے استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:۔

وَاَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۔ اور جس طرح کے میوے اور گوشت کو ان کا جی چاہے گا ہم ان کو عطا کریں گے۔ (۵۲-۲۲)

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ (۲۳-۵۵) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں۔

وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ (۷۱-۱۲) اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ (۳-۱۲۵) تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتے تمہاری مدد کو بھیجے گا۔

اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ (۲۷-۳۶) کیا تم مجھے مال سے مدد دینا چاہتے ہو۔

وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا (۱۹-۷۹) اور اس کے لئے (آہستہ آہستہ) عذاب بڑھاتے جاتے ہیں۔

وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۲-۱۵) اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت اور سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ (۷-۲۰۲) اور ان (کفار) کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچے جاتے ہیں لیکن آیت کریمہ:۔

وَالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ (۳۱-۲۷) اور سمندر (کا تمام پانی) روشنائی ہو اور سات سمندر اور (روشنائی ہو جائیں)[1] میں يَمُدُّهٗ کا صیغہ مَدَّ النَّهْرُ نَهْرًا اٰخَرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور یہ اِمْدَادٌ یا مَدٌّ سے نہیں ہے جو کسی محبوب یا مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتے ہیں بلکہ یہ مَدَدْتُ الدَّوَاةَ اَمُدُّهَا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوات میں روشنائی ڈالنا کے ہیں اسی طرح آیت کریمہ:۔

وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۸-۱۰۹) اگرچہ ہم ویسا اور سمندر اس کی مدد کو لائیں۔ میں بھی مدد سے مِدَادٌ یعنی روشنائی کے معنی مراد ہیں۔

اَلْمُدُّ۔ غلہ ناپنے کا ایک مشہور پیمانہ۔

(م د ن)

اَلْمَدِيْنَةُ۔ بعض کے نزدیک یہ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر ہے اس کی جمع مُدُنٌ آتی ہے۔ اور مَدَنْتُ مَدِيْنَةً کے معنی شہر آباد ہونے کے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس میں میم زائدہ ہے (یعنی دین سے مشتق ہے) قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ (۹-۱۰۱) اور بعض مدینے والے بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔

وَجَاءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ (۳۶-۲۰) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک آدمی ۔۔۔۔ آیا۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ (۲۸-۱۵) اور وہ شہر میں داخل ہوئے۔

(م ر ر)

اَلْمُرُوْرُ کے معنی کسی چیز کے پاس سے گذر جانے کے ہیں۔

---

[1] وایضاً المدائن (۷-۱۱۱)

قرآن میں ہے :۔
وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (۸۳-۳۰) اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو باہم آنکھوں سے اشارہ کرتے ۔
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵-۷۲) اور جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں ۔ نیز آیت کریمہ میں اس بات پر بھی متنبہ کیا ہے کہ اگر انہیں بیہودہ بات کہنے پر مجبور بھی کیا جائے تو کنایہ سے بات کرتے ہیں اور لغویات سن کر اس سے بہرے بن جاتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں تو اعراض کر لیتے ہیں ۔ اور آیت کریمہ :۔
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَا (۱۰-۱۲) پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں (تو بے لحاظ ہو جاتا اور) اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہیں تھا ۔ میں مَرَّ بمعنی اَعْرَضَ ہے ۔ جیسے فرمایا :۔
وَاِذَا اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ (۱۷-۸۳) اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو روگرداں ہو جاتا اور پہلو پھیر لیتا ہے ۔
اَمْرَرْتُ الْحَبْلَ کے معنی رسی بٹنے کے ہیں ۔ اور بٹی ہوئی رسی کو مَرِيْرٌ یا مُمَرٌّ کہا جاتا ہے اسی سے فُلَانٌ ذُوْ مِرَّةٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی طاقتور اور توانا کے ہیں[1] ۔ قرآن میں ہے ۔
ذُوْ مِرَّةٍ (۵۳-۶) طاقتور نے ۔ مَرَّ الشَّيْءُ وَاَمَرَّ کسی چیز کا تلخ ہونا ۔ اسی سے محاورہ ہے ۔
فُلَانٌ مَا يُمِرُّ وَمَا يُحْلِيْ کہ فلاں نہ تو کڑوا ہے اور نہ میٹھا ، یعنی نہ تو اس سے کسی کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی نقصان ۔ اور آیت کریمہ :۔
حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ (۷-۱۸۹) (تو) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے ۔ اور وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے ۔
میں مَرَّتْ بمعنی اِسْتَمَرَّتْ ہے ۔ یعنی وہ اسے اٹھائے چلتی پھرتی رہتی ہے ۔
مَرَّةً (فَعْلَةٌ) ایک بار مَرَّتَانِ (تثنیہ) دو بار قرآن میں ہے :۔
يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ (۸-۵۶) پھر وہ ہر بار اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں[2] ۔
وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۹-۱۳) اور انہوں نے تم سے پہلی بار (عہد شکنی کی) ابتدا کی ۔
وَاِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (۹-۸۰) اگر آپ ان کے لئے ستر بار بخشش طلب فرمائیں ۔
اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۹-۸۳) تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر رضامند ہو گئے ۔
سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ (۹-۱۰۱) ہم ان کو دوبار عذاب دیں گے ۔
ثَلٰثُ مَرّٰتٍ (۲۴-۵۸) تین دفعہ (یعنی) تین اوقات میں ۔

(م و ج)

اصل میں اَلْمَوْجُ کے معنی خلط ملط کرنے اور ملا دینے کے ہیں اور اَلْمُوْجُ کے معنی اختلاط اور مل جانے کے ۔

---

[1] ومنہ فی الحدیث لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی اخرجہ النسائی وابن ماجة من حدیث ابی ہریرة والفائق ۲/۴۴۲ ۔
[2] وفی المطبوع فی کل عام مرة" زلة من المصحح وہی آیة اخری : یفتنون فی کل عام مرة او مرتین (۹-۱۲۶) ۱۲ ۔

مَرِجَ اَمْرُهُمْ۔ ان کا معاملہ ملتبس ہوگیا۔
مَرِجَ الْخَاتَمُ فِیْ اُصْبُعِیْ۔ انگوٹھی انگلی میں ڈھیلی ہوگئی مَارِجٌ بصفت فاعل (ڈھیلی انگوٹھی۔ اَمْرٌ مَرِیْجٌ گڈمڈ اور پیچیدہ معاملہ۔ غُصْنٌ مَّرِیْجٌ باہم گتھی ہوئی ٹہنی۔ قرآن میں ہے:۔
فَهُمْ فِیْ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ (۵۰-۵) سو یہ ایک غیر واضح معاملہ میں ہیں۔
اَلْمَرْجَانُ مونگا۔ چھوٹا موتی۔ قرآن میں ہے:۔
كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵-۵۸)
اور آیت کریمہ:۔
مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ (۵۵-۱۹) اس نے دو دریا رواں کئے جو آپس میں ملتے ہیں۔
میں مَرَجٌ کا لفظ مَرَجٌ[1] کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور جس زمین میں گھاس بکثرت ہو اور جانور اس میں مگن ہو کر چرتے رہیں اسے مرجٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵-۵) آگ کے شعلے سے۔ میں مَارِجٌ کے معنی آگ کے (دھوئیں سے) مخلوط شعلے کے ہیں۔
اَمْرَجْتُ الدَّابَّةَ فِی الْمَرْعٰی میں نے جانور کو چراگاہ میں کھلا چھوڑ دیا چنانچہ وہ آزادی سے چرتا رہا۔

(م ر ح)

اَلْمَرَحُ کے معنی ہیں بہت زیادہ اور شدت کی خوشی جس میں انسان اترانے لگ جائے، قرآن میں ہے:۔
وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (۱۷-۳۷) اور زمین پر اکڑ کر (اور اٹھلا کر) مت چل۔
اس میں ایک قراءت مَرِحًا بمعنی فَرِحًا بھی ہے۔
مَرْحٰی یہ کلمہ تعجب ہے (اور اَحْسَنْتَ یا اَصَبْتَ کی جگہ استعمال ہوتا ہے) یعنی خوب کیا کہنے ہیں۔

(م ر د)

اَلْمَارِدُ وَالْمَرِیْدُ۔ جنوں اور انسانوں سے اس شیطان کو کہا جاتا ہے جو ہر قسم کی خیر سے عاری ہو چکا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ (۳۷-۷) اور ہر شیطان سرکش سے اس کی حفاظت کے لئے۔
یہ شَجَرٌ اَمْرَدُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں۔ اور اسی سے رَمْلَةٌ مَّرْدَاءُ ہے یعنی ریت کا ٹیلہ جس پر کوئی چیز نہ اگتی ہو۔ اس سے اَمْرَدُ اس نوجوان کو کہتے ہیں جس کے ہنوز سبزہ نہ اگا ہو۔ حدیث میں ہے[2] (۱۲۰)
اَهْلُ الْجَنَّةِ كُلُّهُمْ مُرْدٌ کہ اہل جنت سب کے سب امرد ہوں گے۔ چنانچہ بعض نے اس

---

[1] وفی الطبعۃ الاولیٰ کان ہہنا بیاض وفی الطبعۃ الحلبیہ (تحقیق وضبط محمد سعید کیلانی) من قولہم مَرَجَ ولم یترک الفراغ فخلط علی خلط والصواب من قولہم مرج الدابۃ اذا اخلاہا فی المرج ترعیٰ (راجع الغریب للقتبی ۴۳۸) وفی اللسان وہذا لایقولہ الا اہل تہامۃ واما النحویون فیقولون امرجتہ ۱۲

[2] رواہ الدارمی ۲ر۳۳۵ والحدیث فی النہایۃ ار۱۸۱ و ۴ر۱۰ و الاضداد لابی الطیب ۶۲۱ وفی الکشاف: یدخل اہل الجنۃ الجنۃ جرداً مرداً۔ قال الحافظ فی الکاف (ص ۱۴۳ رقم ۷۶) رواہ احمد وابن ابی شیبۃ وابو یعلیٰ والطبرانی فی الاوسط من روایۃ سعید بن المسیب عن ابی ہریرۃ وروی موصلاً الترمذی وفی الباب عن معاذ بن جبل وروی مرسلاً وفی البیہقی موصولا ۱۲

حدیث کو ظاہری معنی پر ہی حمل کیا ہے۔ اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ وہ ہر قسم کے عیوب سے پاک ہوں گے۔ جیسے محاورہ ہے:۔

مَرَدَ فُلَانٌ عَنِ الْقَبَائِحِ فلاں ہر قسم کی قباحت سے پاک ہے۔

مَرَدَ فُلَانٌ عَنِ الْمَحَاسِنِ وہ محاسن سے عاری ہے۔

مَرَدَ عَنِ الطَّاعَةِ سرکشی کرنا۔ پس آیت کریمہ:۔

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ کے معنی یہ ہیں۔ کہ اہل مدینہ سے بعض لوگ...... نفاق پر اڑ کر ہر قسم کی خیر سے محروم ہو گئے ہیں[1]۔ اور آیت کریمہ:۔

مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ (۲۷-۴۴) شیشے جڑے ہونے کی وجہ سے ہموار۔

میں مُمَرَّدٌ کے معنی ہموار یا چکنا کیا ہوا کے ہیں۔ اور یہ شَجَرَةٌ مَرْدَاءُ سے ماخوذ ہے۔ گویا مُمَرَّدٌ کے لفظ سے اس کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے یوں بیان کیا ہے[2] (سریع)

(۴۰۶) فِيْ مِجْدَلٍ شُيِّدَ بُنْيَانُهُ
يَزِلُّ عَنْهُ ظُفُرُ الطَّائِرِ

ایک مضبوط محل میں جس پر ایسا پلاسٹر کیا گیا ہے کہ اس سے پرند کے ناخن بھی پھسل جاتے ہیں۔

مَارِدٌ ایک مشہور قلعے کا نام ہے[3]۔ مثل مشہور ہے تَمَرَّدَ مَارِدٌ وَعَزَّ الْاَبْلَقُ۔ مَارِدٌ (قلعہ) نے سرکشی کی اور ابلق (قلعہ) غالب رہا۔ یعنی یہ دونوں قلعے سر نہ ہو سکے۔ یہ مقولہ ایک بادشاہ کا ہے جو ان دونوں قلعوں کو زیر نہیں کر سکا تھا۔

(م ر ض)

اَلْمَرَضُ کے معنی ہیں انسان کے مزاج خصوصی کا اعتدال اور توازن کی حد کی نکل جانا اور یہ دو قسم پر ہے۔ مرض جسمانی جیسے فرمایا:۔

وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (۲۴-۶۱) اور نہ بیمار پر کچھ گناہ ہے۔

وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى (۹-۹۱) اور نہ بیماروں پر۔

دوم مَرَض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بولا جاتا ہے اور اس سے جہالت بزدلی، بخل، نفاق وغیرہ جیسے اخلاق رذیلہ مراد ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ ان کے دلوں میں کفر کا مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔ (۲-۱۰)

اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا (۲۴-۵۰) کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ شک میں ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (۲-۱۲۵) اور جن کے دلوں میں مرض ہے۔ ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا۔

---

[1] ومرد علی یاتی بمعنی التمرن والتعود علی الشیء لکن علی توجیہ المؤلف تکون صلتہ محذوفۃ وعلی النفاق حال ای ارتکسوا عن الخیر وہم علی النفاق ۱۲

[2] البیت من قصیدۃ الاعشی یہجو علقمۃ بن علاثۃ ویمدح عامر بن الطفیل فی المنافرۃ التی جرت بینہما والقصیدۃ فی دیوانہ (۱۲-۹۶) والبیت فیہ ۹۶ واللسان (شید جدل) وفی روایۃ شدد بدل شید والبلدان (رسم: وسط) وفیہ منزل بدل مجدل والمراد حصن الورد وفی المطبوع الظافر بدل الطائر ولعلہ زلۃ من المصحح وما اثبتناہ طبقا للمراجع ہو الانسب ۱۲

[3] قالتہ زباء والابلق والمارد کانا حصنین فی دومۃ الجندل للسموأل بن عادیا الیہودی فغزتہما زباء فاستصعبا علیہا فقالت انظر المثل والجزء المیدانی رقم ۲۵۹۶ والبلدان (رسم، مارد) والحیوان ۱ر۲۷

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (۵-۶۸) اور یہ (قرآن) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس سے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر بڑھے گا۔

اور نفاق، کفر وغیرہ اخلاق رذیلہ کو (مجازاً) بطور تشبیہ مرض کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لئے کہ اس قسم کے اخلاق کسب فضائل سے مانع بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ بیماری جسم کو کامل تصرف سے روک دیتی ہے۔ اور یا اس لئے کہ وہ اخروی زندگی سے محرومی کا سبب بنتے ہیں۔ جس قسم کی زندگی کا کہ آیت کریمہ:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹-۶۴) اور ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے کاش کہ یہ لوگ سمجھتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یا رذائل کو اس لئے مرض کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی طبیعت کو ردی اخلاق کی طرف مائل کر دیتے ہیں جیسا کہ بیماری جسم کو مضر اشیاء کے کھانے پر اکساتی ہے اور چونکہ ایسے اخلاق بھی ایک طرح کا مرض ہی ہیں اس لئے قلب و صدر میں کینہ و کدورت پیدا ہونے کے لئے وَدِيَ صَدْرُ فُلَانٍ وَنَغِلَ قَلْبُهٗ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں ایک حدیث میں ہے[1] (۱۲۱)

وَاَيُّ دَاءٍ اَدْوَأُ مِنَ الْبُخْلِ اور بخل سے بڑھ کر اور کونسی بیماری ہو سکتی ہے۔

اور شَمْسٌ مَرِيْضَةٌ اس وقت کہتے ہیں جب گردوغبار یا کسی اور عارضہ سے اس کی روشنی ماند پڑ جائے۔ اَمْرَضَ فُلَانٌ فِيْ قَوْلِهٖ کے معنی تعریض اور کنایہ سے بات کرنے کے ہیں۔

اَلتَّمْرِيْضُ بیمار داری کرنا۔ اصل میں تَمْرِيْضٌ کے معنی مرض کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ تَقْذِيَةٌ کی طرح ہے جس کے معنی آنکھ سے خاشاک دور کرنا کے ہیں۔

(م ر ء)

مَرْءٌ وَّامْرُؤٌ مرد اور مَرْءَةٌ وَامْرَاَةٌ کے معنی عورت کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ (۴-۱۷۶) اگر کوئی ایسا مرد جائے۔

وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا (۱۹-۵) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

اور مُرُوْءَةٌ کے معنی کمال مردانگی کے ہیں اور یہ لفظ رُجُوْلِيَّةٌ کے ہم معنی ہے۔ مَرِيْءٌ اَلْمَرِيْءُ اس نالی کو کہتے ہیں جو معدہ سے حلق تک ملی ہوتی ہے۔ اسی سے مَرُؤَ الطَّعَامُ وَاَمْرَاَ کے معنی ہیں کھانا خوشگوار ہو گیا اور طبیعت کے موافق ہونے کی وجہ سے غذا کی نالی میں بسہولت اتر گیا۔ قرآن میں ہے۔

فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا (۴-۴) تو اسے کھالو لذیذ اور خوش ہضم۔

(م ر ی)

اَلْمِرْيَةُ کے معنی کسی معاملہ میں تردد کرنے کے ہیں اور یہ شَكٌّ سے خاص ہوتا ہے۔

[1] قاله ابوبكر الصديق مخاطبا جابر بن عبدالله حين عيره بالبخل في حديث طويل اورده البخاري في كتاب الكفالة والشهادات وفي فرض الخمس وفي المغازي (الفتح ۸/۴۸) ۱۲

قرآن میں ہے:۔
وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ (۲۲-۵۵) اور کافر لوگ ہمیشہ اس سے شک میں رہیں گے۔
فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰؤُلَاءِ (۱۱-۱۰۹) تو یہ لوگ جو غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اس سے تم خلجان میں نہ پڑنا۔
فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهٖ (۳۲-۲۳) تو تم اس کے ملنے سے شک میں نہ ہونا۔
اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ (۴۱-۵۴) دیکھو یہ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے سے شک میں ہیں۔
اَلْاِمْتِرَاءُ وَالْمُمَارَاةُ کے معنی ایسے کام میں جھگڑا کرنا کے ہیں جس کے تسلیم کرنے میں تردد ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (۱۹-۳۴) یہ سچی بات ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔
بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (۱۵-۶۳) جس میں لوگ شک کرتے تھے۔
اَفَتُمَارُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (۵۳-۱۲) کیا جو کچھ وہ دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو۔
فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا (۱۸-۲۲) تو تم ان کے معاملے میں گفتگو نہ کرنا۔ مگر سرسری سی گفتگو۔
در اصل مَرَيْتُ النَّاقَةَ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں اونٹنی کے تھنوں کو سہلانا تاکہ وہ دودھ دے دے۔
(مَرْيَم) علیہا السلام۔ یہ عجمی لفظ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام (قرآن نے) مَرْيَمُ (۲۳-۵۰) بتایا ہے۔

(م ز ن)

اَلْمُزْنُ کے معنی سفید چمکدار بادل کے ہیں۔ اس بادل کے ایک ٹکڑے کو مُزْنَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا یا ہم نازل کرتے ہیں۔
اِبْنُ مُزْنَةٍ۔ ماہ نو جو بادل سے نمودار ہو۔
فُلَانٌ يَتَمَزَّنُ کے معنی ہیں۔ فلاں بادل کی طرح سخاوت کرتا ہے یعنی بتکلف سخاوت کرتا ہے۔
مَزَّنْتُ فُلَانًا میں نے اسے بادل کے ساتھ تشبیہ دی اور مَازِنٌ چیونٹی کے انڈوں کو کہتے ہیں۔

(م ز ج)

مَزَجَ الشَّرَابَ کے معنی شراب میں کوئی چیز ملا دینا کے ہیں۔ اور جو چیز شراب میں ملائی جائے اسے مِزَاجٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
مِزَاجُهَا كَافُوْرًا (۷۶-۵) جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔
وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (۸۳-۲۷) اور اس میں تسنیم کے پانی کی آمیزش ہوگی۔
مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا (۷۶-۱۷) جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔

(م س س)

اَلْمَسُّ کے معنی چھونا کے ہیں اور یہ لَمْسٌ کے ہم معنی ہیں لیکن گاہے لَمْسٌ کسی چیز کی تلاش

کرنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں
کہ وہ چیز مل بھی جائے۔ جیساکہ شاعر نے کہا
ہے[1]۔ (رجز و الوافر)

(۴۰۷) وَالْمِسُهُ فَلَا اَجِدُهُ

میں اسے تلاش کرتا ہوں لیکن وہ نہیں ملتا۔
مگر مَسّ کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے
جب "حاسہ لمس" کے ساتھ اس کا ادراک
بھی ہو۔ اور کنایۃً مجامعت کے معنوں میں
استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مَسَّ الْمَرْأَۃَ وَ
مَاسَّھَا کے معنی عورت سے مجامعت کے
ہیں۔ اور قرآن میں ہے:۔
وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْھُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْھُنَّ
(۲-۲۳۷) اور اگر تم عورتوں کو ان سے مجامعت
سے پہلے طلاق دے دو۔
لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا
لَمْ تَمَسُّوْھُنَّ (۲-۲۳۶) اور اگر تم عورتوں
کو ان سے مجامعت سے پہلے طلاق دے دو
تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔
ایک قرأت میں مَا لَمْ تُمَاسُّوْھُنَّ ہے۔
اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ
(۳-۴۷) میرے ہاں بچہ کیوں کر ہوگا حالانکہ کسی
انسان نے مجھے ہاتھ تو لگایا ہی نہیں۔
اور کنایۃً مَسِیْسٌ مجامعت کو کہتے ہیں اور
مجازاً مَسٌّ کا اطلاق جنون پر بھی ہوتا ہے۔
چنانچہ قرآن میں ہے:۔
کَالَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔
(۲-۲۷۵) جیساکہ کسی کو جن نے لپٹ کر
دیوانہ بنا دیا ہو۔
اور مَسّ کا لفظ ہر اس تکلیف کے لئے بول
دیا جاتا ہے جو انسان کو پہنچے۔ جیسے فرمایا:۔
وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ (۲-۸۰) اور کہتے
ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ۔۔۔۔۔ چھو ہی
نہیں سکے گی۔
مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ (۲-۲۱۴)
ان کو بڑی بڑی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں۔
ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (۵۴-۴۸) (اب) آگ کا
مزہ چکھو۔
مَسَّنِیَ الضُّرُّ (۲۱-۸۳) کہ مجھے ایذا ہو رہی ہے
مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ (۳۸-۴۱) شیطان نے
مجھ کو اذیت دے رکھی ہے۔
مَسَّتْھُمْ اِذَا لَھُمْ مَّکْرٌ فِیْٓ اٰیَاتِنَا (۱۰-۲۱)
"تکلیف پہنچنے کے بعد تو ہماری آیتوں میں
حیلے کرنے لگتے ہیں۔
وَاِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ (۱۷-۶۷) اور جب تم
کو ۔۔۔۔ تکلیف پہنچتی ہے:۔

(م س ح)

اَلْمَسْحُ (ف) کے معنی کسی چیز پر ہاتھ
پھیرنے اور اس سے نشان اور آلائش صاف
کر دینے کے ہیں اور کبھی صرف کسی چیز پر ہاتھ
پھیرنا اور کبھی ازالۂ اثر کے معنوں میں استعمال
ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
مَسَحْتُ یَدِیْ بِالْمِنْدِیْلِ میں نے رومال
سے ہاتھ پونچھا اور گھسے ہوئے چکنے (درہم) سکہ
کو مَسِیْحٌ کہا جاتا ہے اور ہموار اور چکنی جگہ
کو مَکَانٌ اَمْسَحُ کہہ دیتے ہیں۔
مَسَحَ الْاَرْضَ۔ اس نے زمین کی پیمائش کی۔
پھر جس طرح (مجازاً) ذَرَعٌ (ناپنا) کے معنی

---

[1] قالہ اعرابی وتقدم فی (ل م س)۔

چلنا اور مسافت طے کرنا آجاتے ہیں۔ اسی طرح مَسَحَ کا لفظ بھی چلنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے :۔
مَسَحَ الْبَعِيْرُ الْمَفَازَةَ وَذَرَعَهَا اونٹ نے بیابان کو عبور کیا۔ اصطلاح شریعت میں مَسْحٌ کے معنی اعضاء پر پانی گذارنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے :۔
مَسَحْتُ لِلصَّلٰوةِ وَتَمَسَّحْتُ میں نے نماز کے لئے مسح کیا۔ قرآن میں ہے :۔
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ (۵۔۷) اور سر کا مسح کر لیا کرو اور پاؤں دھو لیا کرو۔ اور کبھی مَسَسْتُ کی طرح مَسَحْتُهٗ بِالسَّيْفِ کے معنی بھی تلوار سے مارنا کے آجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے[1]۔
فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (۳۸۔۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔
بعض نے کہا ہے کہ دجال کا نام مَسِيْحٌ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کے چہرے کی ایک جانب مسخ ہو چکی ہوگی۔ چنانچہ مروی ہے انه لا عين له ولا حاجب کہ اس کے ایک جانب کی آنکھ اور ابرو کا نشان تک نہیں ہوگا۔ اور عیسٰی علیہ السلام کا نام مسیح اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ زمین میں سیاحت کرتے تھے۔ اور ان کے زمانہ میں ایک گروہ تھا جنہیں زمین میں سیاحت کی وجہ سے مَشَّائِيْنَ اور سَيَّاحِيْنَ کہا جاتا تھا بعض کہتے ہیں کہ عیسٰی علیہ السلام کے مس کرنے سے چونکہ کوڑھی تندرست ہو جاتے تھے۔ اس لئے آپؑ کو مسیح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ عیسٰی علیہ السلام بطن مادر سے پیدا ہوئے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بدن پر تیل کی مالش کی گئی ہے۔ اس لئے انہیں مسیح کہا گیا ہے۔
بعض کا قول ہے کہ یہ عبرانی لفظ مشوح سے معرب ہے جیسا کہ موسٰی عبرانی لفظ موشٰی سے معرب ہے (۔) بعض کا قول یہ ہے کہ مسیح اسے کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ مٹی ہوئی ہو اور مروی ہے[2] اِنَّ الدجال ممسوح اليمنى وان عيسٰى ممسوح اليسرىٰ کہ دجال کی دائیں اور عیسٰی علیہ السلام کی بائیں آنکھ مٹی ہوئی ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دجال علم و عقل، حلم اور دیگر اخلاق حمیدہ سے کلیتہً محروم ہوگا اس کے برعکس عیسٰی علیہ السلام کی بائیں آنکھ مٹنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہالت، حرص اور دیگر اخلاق مذمومہ سے پاک تھے۔
پھر جس طرح مَسٌّ اور لَمْسٌ کے الفاظ کنایۃً مجامعت کے لئے آجاتے ہیں۔ اسی طرح مَسْحٌ بھی مجامعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ معمولی پسینے پر بھی مَسِيْحٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور مِسْحٌ ٹاٹ کو کہتے ہیں اس کی جمع مُسُوْحٌ و اَمْسَاحٌ آتی ہے۔ اَلتِّمْسَاحُ مگرمچھ کو کہتے ہیں اور تشبیہ کے طور

---

[1] روى ذالك عن ابن عباس وقتادة ومقاتل وغيرهم واختاره الزمخشري لكن الرازي ذهب الى ان المراد منه المسح باليد لا بالسيف وهذا اقرب وقد حقق الآلوسي البحث ورد المعنى الاول ردا بليغا (راجع ۲۳ر ۱۷۵ - ۱۷۹) وقارن المغنى ۳۷۵ والطبري ۲۳ر ۱۰۰ والقرطبي ۲۳ر ۱۹۵ والبحر ۷ر ۳۹۶ والدر ۲۰۹ر۵ [2] تذكرنا الاقوال ابن الاثير في النهاية (مسح) ۱۲ ؛

پر سرکش آدمی کو بھی تِمْسَاح کہہ دیتے ہیں۔

(م س خ)

اَلْمَسْخُ کے معنی شکل وصورت بگاڑ دینا اور اخلاق وعادات خراب کر دینا کے ہیں۔ بعض حکماء نے کہا ہے کہ مسخ دو قسم پر ہے ایک مسخ خاص یعنی شکل وصورت وصورت بگاڑنا یہ خاص قوم کے ساتھ خاص دور میں ہوا تھا دوم مسخ عام یعنی اخلاق وعادات کا بگاڑنا یہ ہر دور میں ہو سکتا ہے کہ انسان جانوروں کے سے اخلاق اختیار کر لے مثلاً اس کے اندر کتے کی سی شدت حرص پیدا ہو جائے یا خنزیر کی طرح جنسی خواہش میں اندھا ہو جائے یا بیل کی سی حماقت اختیار کر لے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ (۵-۶۰)

اور ان میں سے بندر اور سور بنا دیئے۔

کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے۔ کہ یہاں بندر اور خنزیر بنا دینے سے ان کے اخلاق وعادات بگاڑ دینا مراد ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

لَمَسَخْنَاهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ (۳۶-۶۷) تو ان کی جگہ ان کی صورتیں بدل دیں۔

میں مسخ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ پہلے معنی زیادہ واضح ہیں[1] اور اَلْمَسِيْخُ وہ کھانا جو بے مزہ ہو چنانچہ شاعر نے کہا ہے[2] (المتقارب)

(۴۰۸) وَاَنْتَ مَسِيْخٌ كَلَحْمِ الْحُوَارِ

اور تو حُوار یعنی اونٹ کے نوزائیدہ بچے کے گوشت کی طرح بے مزہ ہے۔

مَسَخْتُ النَّاقَةَ میں نے ناقہ کو دبلا کر کے اس کی شکل بگاڑ دی۔

اَلْمَاسِخِيُّ کے معنی کمان ساز کے ہیں یہ مَاسِخَةٌ قبیلہ کی طرف منسوب ہے۔ جو کمانیں بنایا کرتا تھا پھر ہر کمان ساز کو ماسخی (منسوب) کہا جانے لگا ہے۔ جیسا کہ ہر آہنگر کو ھَالِكِيٌّ کہا جاتا ہے۔

(م س د)

اَلْمَسَدُ کھجور کے درخت کی پتے نکالی ہوئی شاخوں کا ریشہ جسے بٹ کر رسی بنائی جاتی ہے۔[3] قرآن میں ہے:۔

حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱-۵) یعنی کھجور کے پٹھوں سے بٹی ہوئی رسی۔

اِمْرَءَةٌ مَمْسُوْدَةٌ بٹی ہوئی رسی کی طرح گٹھے

---

[1] ذھب الی الاول ابن عباس والیعتار دی عنہ ان المسخ بمعنی الحملاکۃ در روح المعانی ۲۳ / ۲۴) [2] البیت لاشعر الرقبان الاسدی الجاہلی واسمہ عمرو بن حارثۃ) یہجو رجلاً اسمہ رضوان وکان نزل بہ فلم یقرہ و ترجمتہ فی المرزبانی ۱۹) وتمامہ: فلا انت حلو ولا مر[ہ] وفی روایۃ الامالی (۲: ۲۱۱) سلیخ ملیخ وفی اللسان مسیخ ملیخ بدل وانت مسیخ راجع اللسان والتاج (عنہ مسخ) ومجالس ثعلب (۱: ۱۹۸) والسمط (۲: ۸۳۰) وما ذکرہ المؤلف روایۃ ابی زید فی النوادر ۳۷ والبیت فی المیدانی (۲: ۴، ۲۳، ۱۸۶، ۲۵۱) وثمہ المؤتلف (۷۴، ۱۳۳) والجمہرۃ (۲: ۲۱۱، ۲۵۱) والمرزبانی ۱۹ والمخصص (۵: ۱۱/۱۴: ۳۸) وکتاب الابدال ۳۵ ومحاضرات المؤلف (۲/۳۱۳) والحیوان للجاحظ (۱: ۳۶۱) وتہذیب الالفاظ والابیات سنۃ وفی المؤتلف ۳۰ والمعجم للمرزبانی ۳۵ فی روایۃ ثعلب عزاہ الی عمرو بن ثعلبۃ الشیبانی وہو شاعر جاہلی خبیث [3] کذا ذکرہ القتیبی فی غریبہ ۲/۴ ۵ وقال عروۃ بن الزبیر ہو السلسلۃ التی ذکرہا اللہ تعالی فی سورۃ الحاقۃ ۳۲ انظر الطبری ۳۰ / ۴۳ وروی عن مجاہد وسفیان انظر المشکل ۱۲۳ - ۱۲۲ فیہ کذالک قال ابن عباس:۔

ہوئے گوشت والی (اور معتدل قامت) عورت۔

(م س ک)

اَمْسَكَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز سے چمٹ جانا اور اس کی حفاظت کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ۔ (۲-۲۲۹) پھر (عورت کو) یا تو بطریق شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ۔ (۲۲-۶۵) اور وہ آسمان کو تھامے رہتا ہے کہ زمین پر نہ گر پڑے۔

اِسْتَمْسَكْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو پکڑنے اور تھامنے کا ارادہ کرنا کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ (۴۳-۴۳) پس تمہاری طرف جو وحی کی گئی ہے اسے مضبوط پکڑے رہو۔

أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ (۴۳-۲۱) یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی تو یہ اس سے (سند) پکڑتے ہیں۔

محاورہ ہے:۔
تَمَسَّكْتُ بِهِ وَمَسَّكْتُ بِهِ کسی چیز کو پکڑنا اور تھام لینا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (۶۰-۱۰) اور کافر عورتوں کی ناموس قبضے میں نہ رکھو (یعنی کفار کو واپس دے دو)۔

أَمْسَكْتُ عَنْهُ كَذَا کسی سے کوئی چیز روک لینا۔ قرآن میں ہے:۔
هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ (۳۹-۳۸) تو وہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں۔

اور کنایہ کے طور پر اِمساک بمعنی بخل بھی آتا ہے اور مُسْكَةٌ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ اس قدر کھانے یا پینے کو کہتے ہیں جس سے سد رمق ہو سکے۔

اَلْمَسَكُ (چوڑا) ہاتھی دانت کا بنا ہوا زیور جو عورتیں کلائی میں پہنتی ہیں۔ اَلْمَسْكُ۔ کھال جو بدن کے ڈھانچہ کو تھامے رہتی ہے۔

(م ش ج)

اَلْمَشِيجُ۔ مخلوط شے جمع اَمشاج قرآن میں ہے:۔
أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ (۷۶-۲) نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں۔

یعنی خون کی مختلف خلطوں سے اور مختلف خلطوں سے مختلف قویٰ مراد ہیں[1]۔ جن کی طرف کہ آیت:۔
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ إِلَى قَوْلِهِ خَلْقًا آخَرَ۔ (۲۳-۱۲) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔
میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

(م ش ی)

اَلْمَشْيُ (ض) کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف قصد اور ارادہ کے ساتھ منتقل ہونے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ (۲-۲۰) جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

---

[1] و فی غریب القتبی (۲-۵۰۲) ای بیا اختلاط ما ماالرجل بماء المرأة وکذا قال ابن عباس وغیرہ علی مافی الفخر ۲۹۱/۲ والطبرانی ۲۹/۱۲۶ وانظر احکام شافعی (۲/۱۸۸-۱۸۹)۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ اَلْاٰيَة (۲۴-۴۵) ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔
يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵-۶۳) جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔
فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا (۶۷-۱۵) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔
اور کنایۃً مَشْيٌ کا لفظ چغل کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔
هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ (۶۸-۱۱) طعن آمیز اشارتیں کرنے والا چغلیاں لئے پھرنے والا۔
اور کنایۃً کے طور پر مَشْيٌ کے معنی مسہل پینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
شَرِبْتُ مَشْيًا وَمَشْوًا۔ میں نے مسہل دوا پی۔
اَلْمَاشِيَةُ۔ مویشی یعنی بھیڑ بکری کے ریوڑ کو کہتے ہیں۔ اور اِمْرَأَةٌ مَاشِيَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے بہت ہوں۔

(م ص ر)

اَلْمِصْرُ: ہر محدود شہر کو جس کے گرد فصیل ہو، مصر کہتے ہیں۔ اور مَصَّرْتُ مِصْرًا کے معنی شہر آباد کرنے کے ہیں۔ دراصل مِصْرٌ دو چیزوں کے مابین حد کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہجر شہر میں مکانات کے بیعناموں کی شرط میں یہ الفاظ خاص طور پر لکھے جاتے تھے۔
اِشْتَرٰى فُلَانٌ الدَّارَ بِمُصُوْرِهَا فلاں نے یہ مکان اس کی حدود (اربعہ) کے ساتھ خرید کیا۔ اور کسی شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۴۰۹) وَجَاعِلُ الشَّمْسِ مِصْرًا لَاخَفَاءَ بِهٖ
بَيْنَ النَّهَارِ وَبَيْنَ اللَّيْلِ قَدْ فَصَلَا

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو رات اور دن کے درمیان حد فاصل بنا رکھا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
اُدْخُلُوْا مِصْرًا۔ (۲-۹۹) مصر میں داخل ہو جائیے۔
میں مصر سے مشہور شہر مصر مراد ہے۔ اور تخفیف کے طور پر اسے منصرف کر دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے کوئی ایک شہر مراد ہے[2]۔
اَلْمَاصِرُ دو پانیوں کے درمیان حد فاصل۔
مَصَرْتُ النَّاقَةَ کے معنی اونٹنی کو انگلیوں کے اطراف سے دوہنا کے ہیں اسی سے محاورہ ہے:۔
لَهُمْ غَلَّةٌ يَمْتَصِرُوْنَهَا ان کے پاس کچھ غلہ ہے جسے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے استعمال کرتے ہیں۔ ثَوْبٌ مُمَصَّرٌ (گیرو سے رنگا ہوا کپڑا) گہرا رنگا ہوا کپڑا۔
نَاقَةٌ مَصُوْرٌ کم اور بمشکل دودھ دینے والی اونٹنی۔
حسن نے کہا ہے لَا بَأْسَ بِكَسْبِ التَّيَّاسِ مَا لَمْ يُمَصِّرْ وَلَمْ يُبَسِّرْ کہ سانڈ والے کی کمائی میں کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ انگلیوں سے نہ نچوڑے۔ اور نہ ہی مادہ کی خواہش کے بغیر سانڈ اس سے جفتی کھائے۔
اَلْمَصِيْرُ۔ آنت ج مُصْرَانٌ۔ بعض نے کہا

---

[1] فی اللسان قالہ امیۃ یذکر حکمۃ الخالق و قال ابن البری البیت لعدی بن زید العبادی و ہو الصواب راجع تفسیر الطبری (۱: ۷۱) والخفاجی شرح الدرۃ ۴۹ والبیت ایضاً فی البحر (۱: ۲۲۰ و ۴۵۵) [2] ولہ ذہب عامۃ المفسرین وحکی من ہاک انہ مصر مسکن فرعون وفی مصحف عبد اللہ بن مسعود بلا الف ولام یوید قالک روح المعانی (۱: ۲۵۰)

ہے کہ یہ مَصَادٌ سے مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم ظرف ہے۔ اور آنت کو مَصِيْرٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ طعام کی قرارگاہ بنتی ہے۔

(م ض غ)

اَلْمُضْغَةُ۔ گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا جو چبانے کے لئے منہ میں ڈالا جا سکے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۴۱۰) يُلَجْلِجُ مُضْغَةً فِيْهَا اَنِيْضٌ

وہ گویا نیم پختہ گوشت کی بوٹی کو منہ میں پھرا تا ہے۔ پھر جنین کی اس حالت کو جو علقہ کے بعد ہوتی ہے۔ مُضْغَةٌ۔ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا (۲۳-۱۴) اور لوتھڑے کی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ اور فرمایا:۔

مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (۲۲-۵) بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی۔

اَلْمُضَاغَةُ۔ چبانے سے جو آخر کار منہ میں باقی رہ جائے۔

اَلْمَاضِغَانِ۔ دونوں جبڑے۔ کیونکہ ان سے کھانا چبایا جاتا ہے۔ اَلْمَضَائِغُ (واحد مَضِيْغَةٌ) وہ تانت جو کمان کے دونوں سروں پر کسی ہوتی ہیں۔

(م ض ی)

اَلْمُضِيُّ وَالْمَضَاءُ۔ کسی چیز کا گذر جانا اور چلے جانا یہ اعیان واحداث دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ (۴۳-۸) اور اگلے لوگوں کی مثال گذر گئی۔

وَقَدْ مَضَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (۸-۳۹) تو اگلے لوگوں کی سنت گذر چکی ہے (وہی ان کے حق میں برتی جائے گی۔

(م ط ر)

اَلْمَطَرُ کے معنی بارش کے ہیں اور جس دن بارش برسی ہو اسے يَوْمٌ مَطِيْرٌ وَمَاطِرٌ وَمُمْطِرٌ کہتے ہیں[2] وَادٍ مَطِيْرٌ باراں رسیدہ وادی۔ مَطَرَتْنَا السَّمَاءُ وَاَمْطَرَتْنَا کے معنی بارش برسنے کے ہیں۔

مَا مُطِرْتُ مِنْهُ بِخَيْرٍ مرا از وخیرے نرسید۔ بعض نے کہا ہے کہ مَطَرَ اچھی اور خوشگوار بارش کے لئے بولتے ہیں اور اَمْطَرَ عذاب کی بارش کیلئے[3]۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (۲۶-۱۷۳) اور ان پر ایک بارش برسائی سو جو بارش ان (لوگوں) پر برسی جو ڈرائے گئے تھے بری تھی۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (۷-۸۴) اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی۔ سو دیکھ لو کہ گنہگاروں کا کیسا انجام ہوا۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً (۱۵-۷۴) اور ان پر (کھنگر کی) پتھریاں برسائیں۔

---

[1] قالہ زہیر و قدمر فی (رجع) ❊ [2] الفرق منقول عن ابی عبیدۃ وعلماء اللغۃ وذکرہ الحریری فی الدرۃ وعزاہ الی بعض علماء التفسیر ورد ہ فی الکشاف والخفاجی فی الدرۃ (ص۲۱) اذ الواقع فی القرآن اتفاقًا وضعًا ❊ ۱۲

فَاَمْطَرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (۸-۳۲)
تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔

مَطَرَ، يَمْطُرُ کے معنی بارش کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ زمین پر چلے جانے کے ہیں۔ چنانچہ بارش رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ مُتَمَطِّرٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْمُسْتَمْطِرُ۔ بارش طلب کرنے والا۔ کھلا میدان جہاں بارش سے کوئی روک نہ ہو۔ اور کنایہ کے طور پر طالب خیر یعنی سائل کو مُسْتَمْطِرٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے (المتقارب)

(۱۱۴) فَوَادٍ خِطَاءٌ وَوَادٍ مَطِرٌ

ایک وادی میں وہ قدم یعنی آہستہ چلتا ہے اور دوسری میں بارش کی طرح دوڑتا ہے۔

(م ط ی)

اَلتَّمَطِّیْ (تفعل) اس کے اصل معنی اَلْمَطَا (پیٹھ) کو بڑھانے اور لمبا کرنے کے ہیں (جیسا کہ انگڑائی لیتے وقت انسان کرتا ہے۔ اور کنایہ کے طور پر اکڑ کر چلنے کے معنی میں آتا ہے) قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى (۷۵-۳۳) پھر اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا چل دیا۔
اَلْمَطِيَّةُ وہ اونٹ جس کی اَلْمَطَا یعنی پیٹھ پر سواری کی جاتی ہے اور اِمْتَطَيْتُهُ (افتعال) کے معنی ہیں میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوا اسی سے مجازاً اس رفیق کو جس پر انسان کو پورا بھروسہ ہو مِطًى کہا جاتا ہے جیسے ظَهْرٌ۔

(م ع)

مَعَ۔ اجتماع کے معنی کو چاہتا ہے۔ خواہ وہ اجتماع مکانی ہو جیسے هُمَا مَعًا فِي الدَّارِ وہ دونوں ایک مکان میں ہیں۔ اور خواہ زمانی جیسے هُمَا وُلِدَا مَعًا وہ دونوں ایک وقت میں پیدا ہوئے۔
اور خواہ معنوی اعتبار سے ہو جیسے اَخٌ یا اَبٌ وغیرہ اسمائے اضافی ہیں کہ ایک آدمی کو اسی وقت دوسرے کا بھائی کہا جاسکتا ہے جب وہ بھی اس کا بھائی ہو۔
کبھی وہ اجتماع رتبہ اور شرف کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے هُمَا مَعًا فِي الْعُلُوِّ وہ دونوں بلند رتبہ ہونے میں برابر ہیں۔
اور کبھی مَعَ کا لفظ معنی نصرت کو چاہتا ہے۔ اس وقت یہ منصور یعنی جس کی مدد کی جاتی ہے اس کا مضاف الیہ بنتا ہے جیسے فرمایا:۔
لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹-۴۰) کہ غم نہ کر، خدا ہمارے ساتھ ہے۔
تو یہاں مَعَ کے مضاف الیہ یعنی نَا ضمیر سے منصور

ؔ قاله امرؤ القيس في فرس وصدره: - لها وثبات كوثب الظباء - والقصيدة مقيدة القافية في ۴۴ بيتًا وهي في ديوانه (صنعة السندوبي ۲۵-۷۵) والبيت في آخر القصيدة وبعده المقطع، - وتعدو كعدو نجاة الظباء - اخطأها الحاذف المقتدر والبيت في العقد الثمين ۱۲۸ والمعاني للقتبي ۲۰ وكتاب الخيل لابي عبيدة ۴۰ وقال في آخره: - وقد تروى هذه الابيات لربيعة بن جشم النمري وراجع للبيت محاضرات الادباء (۴:۲۴) واللسان (خطا) وخطاء جمع خطوة قال ابن البري معناه اى تخطو مرة فتكف عن العدو وتعدو مرة عدو الشيء المطر في رواية ابي عبيدة: فواد خطيط وكذا في المعاني للقتبي ۲۰ مع اختلاف طفيف في روايته في رواية كعصوب الخريف والمعنى واحد لان صوب الخريف يقع بموضع ويخطى اخرى ۱۲ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢

مراد ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ناصر ہے۔ جس کی معیت ناصمیر کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ نیز فرمایا۔
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (۱۶-۱۲۸) کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہو ...... خدا ان کا مددگار ہے۔
وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (۵۷-۴) اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (۲-۱۵۳) بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۸-۱۹) اور خدا تو مومنوں کے ساتھ ہے۔
اور موسیٰ علیہ السلام کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔
اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ (۲۶-۶۲) میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھے رستہ بتائے گا۔
رَجُلٌ اِمَّعَۃٌ۔ اناڑی آدمی جو ہر ایک کے ساتھ ہو جائے۔
اَلْمَعْمَعَۃُ۔ آتشزدگی کی آواز۔ لڑائی میں بہادروں کا شور۔
اَلْمَعْمَعَانُ لڑائی کی شدت۔

(م ع ز)

اَلْمَعْزُ بکریاں۔ قرآن میں ہے:۔
وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ (۶-۱۴۴) اور دو دو بکریوں میں سے۔
اَلْمَعِیْزُ بکریوں کے ریوڑ کو کہتے ہیں جیسا کہ ضَئِیْنٌ۔ بھیڑوں کے ریوڑ پر بولا جاتا ہے۔
رَجُلٌ مَاعِزٌ سخت جسم والا آدمی۔ اَلْاَمْعَزُ وَالْمَعْزَاءُ سخت زمین اِسْتَمْعَزَ فِیْ اَمْرِہٖ۔
کسی کام میں کوشش کرنا۔

(م ع ن)

مَاءٌ مَعِیْنٌ جاری پانی کو کہتے ہیں۔ یہ مَعَنَ الْمَاءُ فَھُوَ مَعِیْنٌ سے ماخوذ ہے مَمْعَانٌ۔ پانی بہنے کی جگہ اَمْعَنَ الْفَرَسُ گھوڑے کا دوڑ میں دور نکل جانا۔
اَمْعَنَ بِحَقِّیْ اس نے میرے حق کا انکار کر دیا۔
فُلَانٌ مَعَنَ فِیْ حَاجَتِہٖ اس نے اپنی حاجت میں کوشش کی۔
بعض نے کہا ہے کہ مَاءٌ مَعِیْنٌ میں مَعِیْنٌ عین سے مشتق ہے اور اس میں میم زائدہ ہے۔

(م ق ت)

اَلْمَقْتُ کے معنی کسی شخص کو فعل قبیح کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے بہت بغض رکھنے کے ہیں۔
یہ مَقُتَ مَقَاتَۃً فَھُوَ مَقِیْتٌ وَمَقَتَہٗ فَھُوَ مَقِیْتٌ وَمَمْقُوْتٌ سے اسم ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّمَقْتًا وَّسَآءَ سَبِیْلًا (۴-۲۲) یہ نہایت بے حیائی اور (خدا کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا۔
جاہلیت میں اپنے باپ کی بیوہ سے شادی کرنے کو نِکَاحُ الْمُقْتِ کہا جاتا تھا۔ اَلْمَقِیْتُ کی اصل قُوْتٌ ہے جس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

(م ك ك)

مَکَّۃُ یہ ایک مشہور شہر کا نام ہے اور تَمَکَّکْتُ الْعَظْمَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہڈی سے

مینگ نکال لینے کے ہیں۔
اَمْتَكَ الْفَصِيْلُ مَا فِي ضَرْعِ اُمِّهِ اونٹ کے بچے نے اپنی ماں کے تھنوں سے سارا دودھ چوس لیا۔ اسی سے تَمَكَّكَ بمعنی اِسْتَقْصَاءُ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے[1] (۱۲۲) لَا تَمَكَّكُوْا عَلٰی غُرَمَائِکُمْ اپنے قرضداروں سے مطالبہ میں اصرار نہ کرو۔

اور مَكَّة کو مکّہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حدود کے اندر ظلم کرنے والوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ خلیل کا قول ہے کہ روئے زمین کے وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے اسے مکہ کہا گیا ہے جیسا کہ مغز ہڈی کے درمیان میں ہوتا ہے۔

اَلْمَكُّوْكُ (والجمع مکاکی) صواع کی طرح کا ایک طاس جو پانی پینے اور غلہ ماپنے کے کام آتا ہے (یہ صاع کا ½ ہوتا ہے)۔

(م ك ث)

اَلْمَكْثُ کسی چیز کے انتظار میں ٹھہرے رہنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۲۷-۲۲) ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔

ایک قراءت میں مُكُثٌ ہے۔ نیز فرمایا:۔

اِنَّكُمْ مَّاكِثُوْنَ (۴۳-۷۷) تم ہمیشہ (اسی حالت میں) رہو گے۔

قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا (۲۰-۲۹) تو اپنے گھر والوں سے کہنے لگے کہ تم یہاں ٹھہرو۔

(م ك ر)

اَلْمَكْرُ کے معنی کسی شخص کو حیلہ کے ساتھ اس کے مقصد سے پھیر دینے کے ہیں۔ یہ دو قسم پر ہے (۱) اگر اس سے کوئی اچھا فعل مقصود ہو تو محمود ہوتا ہے ورنہ مذموم چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (۳-۵۴) اور خدا خوب چال چلنے والا ہے۔

پہلے معنی پر محمول ہے۔ اور دوسرے معنی کے متعلق فرمایا:۔

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهِ (۳۵-۴۳) اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۸-۳۰) اور (اے محمدؐ) اس وقت کو یاد کرو۔ جب کافر لوگ تمہارے بارے میں چال چل رہے تھے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا (۲۷-۵۰) اور وہ ایک چال چلے اور ہم بھی ایک چال چلے۔

میں دونوں معنی مذکور ہیں۔ یعنی مَكَرُوْا سے مکر مذموم اور مَكَرْنَا سے مکر محمود مراد ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مکرِ خداوندی کے معنی بندے کو ڈھیل دے رکھنے اور دنیوی ساز و سامان پر خوب قدرت دینے کے ہیں اسی لئے امیر المومنین[رض] نے فرمایا۔ (۱۲۳)

مَنْ وُسِّعَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ وَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّهُ مُكِرَ

---

[1] انظر للحدیث فی الفائق ۲/۲۵۲ والنہایۃ وفیہ لا تمکّکوا ... وفی روایۃ لا تمسکوا (مکلک ۴/۴۹۲ الجامع غریب ابی عبید ۳/۱۲۳

بہٖ فَھُوَ مَخْدُوْعٌ فِیْ عَقْلِہٖ۔ کہ جس پر اس کی دنیا فراخ کردی گئی ہو اور وہ یہ نہ سمجھا ہو کہ اسے ڈھیل دی گئی ہے تو وہ فریب خوردہ اور احمق ہے۔

(م ك ن)

اَلْمَکَانُ۔ اہل لغت کے نزدیک مکان اس جگہ کو کہتے ہیں جو کسی جسم پر حاوی ہو۔ بعض متکلمین کے نزدیک یہ من قبیل عرض ہے اور جسم حاوی و محوی دونوں کے اجتماع سے عبارت ہے۔ اس کی صورت یہ کہ جسم حاوی کی سطح (باطن) جسم محوی کی سطح پر محیط ہو تو گویا ان کے نزدیک ان دونوں جسموں کے باہم مل جانے کا نام مکان . . . ہے۔ قرآن میں ہے: مَکَانًا سُوًی (۲۰-۵۸) ایک ہموار مکان میں۔ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْھَا مَکَانًا ضَیِّقًا (۲۵-۱۳) اور جب یہ دوزخ کی کسی تنگ جگہ میں زنجیروں میں جکڑ کر ڈالے جائیں گے۔

مَکَّنْتُہٗ وَمَکَّنْتُ لَہٗ میں نے اسے تسلط یا قدرت دی فَتَمَکَّنَ چنانچہ اس نے قدرت حاصل کرلی۔ قرآن میں ہے: وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ (۷-۹) اور ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا۔

وَلَقَدْ مَکَّنّٰھُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّکَّنّٰکُمْ فِیْہِ (۴۶-۲۶) اور ہم نے ان کو ایسے مقدور دیئے تھے جو تم لوگوں کو نہیں دیئے۔

اَوَلَمْ نُمَکِّنْ لَّھُمْ (۲۸-۵۷) کیا ہم نے ان کو جگہ نہیں دی۔

وَنُمَکِّنَ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ (۲۸-۶) اور ملک میں ان کو قدرت دیں۔

وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ (۲۴-۵۵) اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ مستحکم و پائیدار کرے گا۔

فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ (۲۳-۱۳) ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں۔

اور اَمْکَنْتُ فُلَانًا مِنْ فُلَانٍ کے معنی کسی کو دوسرے پر قدرت دینے کے ہیں۔ مَکَانٌ وَمَکَانَۃٌ جگہ اور حالت کو کہتے ہیں قرآن میں ہے۔ اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ (۳۹-۴) اپنی جگہ پر عمل کیے جاؤ۔

ایک قراءت میں مَکَانَاتِکُمْ بصیغہ جمع ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ (۸۱-۲۰) جو صاحب قوت مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا ہے۔

میں مکین بمعنی متمکن یعنی صاحب قدر و منزلت ہے۔ مَکِنَاتُ الطَّیْرِ وَمَکُنَاتُھَا پرندوں کے گھونسلے۔

اَلْمَکْنُ۔ سوسمار وغیرہ کے انڈے۔ آیت کریمہ:۔ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ (۳۷-۴۹) محفوظ انڈے[1]۔

خلیل کا قول ہے کہ لفظ مکان (صیغہ ظرف) مفعل کے وزن پر ہے اور یہ کَوْنٌ سے مشتق ہے پھر کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے اسے فعالٌ کا حکم دے کر اس سے تمکن وغیرہ مشتقات استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے منزل سے تمنزل وغیرہ۔

(م ك و)

مَکَا الطَّیْرُ یَمْکُوْا مُکَآءً کے معنی پرندکے

---

[1] وعلیٰ ہذا وزنہ فعلون والصحیح انہ من الکن معنا والحفظ والستر ولیس من مادۃ الماوۃ

سیٹی بجانے کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً (۸-۳۵) میں ان کی نماز کو مُكَاءً کہکر تنبیہ کی ہے کہ وہ نماز بے روح ہونے کے اعتبار سے پرندوں کی سیٹی کے بمنزلہ ہے اور مُکَاء ایک پرند کا نام ہے۔
مکت استہٗ: گوز مارنا۔

(م ل ل)

اَلْمِلَّةُ۔ دین کی طرح ملت بھی اس دستور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی زبان پر بندوں کے لئے مقرر فرمایا تاکہ اس کے ذریعہ وہ قرب خداوندی حاصل کر سکیں۔
دین اور ملت میں فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف اس نبی کی طرف ہوتی ہے جس کا وہ دین ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔
فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ (۳-۹۵) پس دین ابراہیم کی پیروی کرو۔
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي (۱۲-۳۸) اور اپنے باپ دادا ..... کے مذہب پر چلتا ہوں۔
اور اللہ تعالیٰ یا کسی افراد امت کی طرف اسکی اضافت جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس قوم کی طرف بحیثیت مجموعی مضاف ہوتا ہے۔ جو اس کے تابع ہوتی ہے۔ اور افراد امت کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی۔ اس لئے مِلَّةُ اللهِ یا مِلَّتِي اور مِلَّةُ زَيْدٍ کہنا جائز نہیں۔ جیسا کہ دِينُ اللهِ وَدِينُ زَيْدٍ کا استعمال جائز ہے (اسی طرح کسی فریضہ کی نسبت بھی مِلَّةَ کی طرف نہیں کی جاتی) لہذا الصَّلٰوۃ مِلَّةُ اللهِ کہنا جائز نہیں ہے (اس کے برعکس اَلصَّلٰوۃ دِيْنُ اللهِ کہنا صحیح ہے)
اصل میں مِلَّةٌ کا لفظ اَمْلَلْتُ الْكِتَابَ سے مشتق ہے جس کے معنی لکھوانے کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ (۲-۲۸۲) اور جو شخص قرض لے وہی دستاویز کا مضمون بول کر لکھوائے۔
فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ (۲-۲۸۲) اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔
مِلَّةٌ اور دین میں دوسرا فرق یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے من جانب اللہ مشروع ہونے کے لحاظ سے مِلَّة کہا جاتا ہے۔ اور اس کے قائم کرنے اور بجالانے والے کے لحاظ سے دین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دین کے معنی طاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔
مَلَّ خُبْزَهُ يَمُلُّهُ مَلًّا کے معنی گرم راکھ پر روٹی پکانے کے ہیں۔ اور راکھ پر پکی ہوئی روٹی کو خُبْزٌ مَلِيلٌ کہا جاتا ہے اور اَلْمَلِيلُ وہ چیز کہلاتی ہے جسے آگ میں پھینک دیا گیا ہو۔ اور وہ حرارت جو انسان محسوس کرتا ہے۔ اسے مَلِيلَةٌ کہا جاتا ہے۔
مَلِلْتُ الشَّيْءَ اَمَلُّهُ کے معنی کسی چیز سے بدول ہو کر اس سے اعراض کر لینے کے ہیں۔

اَمْلَلْتُہٗ مِنْ عَنَاۗ کِسی کو کسی چیز سے بدل کر دینا۔ حدیث میں ہے[1] (۱۲۴)

تَکَلَّفُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِیْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا۔ وہ عمل بجالاؤ جن کی طاقت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ملول نہیں ہوگا۔ آخر کار تم ہی ملول ہو جاؤ گے۔ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بھی ملول ہو جاتا ہے جیسا کہ لفظ حتّٰی سے وہم ہوتا ہے۔ بلکہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اکتائے گا نہیں آخر کار تم ہی اکتا جاؤ گے۔

(م ل ح)

اَلْمِلْحُ اس پانی کو کہتے ہیں جو متغیر ہو کر جم جائے یعنی نمک بن جائے اور صرف متغیر پانی کو بھی مِلْحٌ کہہ دیتے ہیں چنانچہ کھاری پانی کو مَاءٌ مِلْحٌ کہا جاتا ہے۔ اور مَاءٌ مَالِحٌ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَھٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۵۳-۲۵) اور یہ کھاری ہے کڑوا

مَلَحْتُ الْقِدْرَ کے معنی ہنڈی میں نمک ڈالنے کے ہیں۔ اور اَمْلَحْتُھَا کے معنی زیادہ نمک ڈال کر خراب کر دینے کے۔ اور نمک لگا کر خشک کی ہوئی مچھلی کو سَمَكٌ مَلِیْحٌ کہتے ہیں۔ پھر مِلْحٌ سے استعارہ کے طور پر مَلَاحَۃٌ یعنی خوبروئی آتا ہے۔ اور رَجُلٌ مَلِیْحٌ اس خوبرو آدمی کو کہتے ہیں جس کا حسن خوب غور کے بعد محسوس ہو۔

(م ل ك)

اَلْمَلِكُ۔ بادشاہ جو پبلک پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ لفظ صرف انسانوں کے منتظم کے ساتھ خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَلِكُ النَّاسِ تو کہا جاتا ہے لیکن مَلِكُ الْاَشْیَاءِ کہنا صحیح نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (۱-۳) انصاف کے دن کا حاکم۔ میں ملک کی اضافت یوم کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ یہ اصل میں ملک الملک فی یوم الدین ہے۔ یعنی قیامت کے دن اسی کی بادشاہت ہوگی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ (۴۰-۱۶) آج کس کی بادشاہت ہے۔ خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

اور مَلِكٌ کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے مثلاً کسی کا متولی اور حکمران ہونے کو کہتے ہیں۔ دوم حکمرانی کی قوت اور قابلیت کے پائے جانے کو کہتے ہیں۔ خواہ بالفعل اس کا متولی ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ پہلے معنی کے لحاظ سے فرمایا:۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا (۲۷-۳۴) بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اور دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا:۔

اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا (۵-۲۰) کہ اس نے تم میں پیغمبر کئے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔

تو اس آیت میں نبوت کو خاص اور ملوکیۃ کو عام قرار دیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل

---

[1] والحدیث بتغیر الالفاظ فی البخاری ومسلم والموطا مالک من حدیث عائشۃ قال صلی اللہ علیہ وسلم فی شان امرأۃ لا تنام من اللیل (الزرقانی ۱/۳۴۲-۳۴۴) والحدیث فی المستدرک للحاکم والنسائی وانظر کنز العمال ج ۳ رقم ۱۲۹-۱۸۲) ؛ ؛ ؛

سامنے کے سامنے بادشاہ نہیں تھے۔ کیونکہ یہ تو حکمت الٰہی کے ہی منافی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ رؤساء کی کثرت میں خیر نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہاں جَعَلَكُمْ مُلُوكًا کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں ملک کا انتظام سنبھالنے کے قابل بنایا۔ تو یہاں ملک کا لفظ سیاست کی قابلیت اور قوت پیدا کر دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِلک ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سیاست کا مالک ہو خواہ وہ اپنے نفس کی سیاست کرے بایں طور کہ نفس کو خواہشات سے روک رکھنے پر اسے قدرت ہو۔ یا دوسروں کی سیاست کرے اور عام اس سے کہ بالفعل لوگوں کا بادشاہ ہو یا نہ ہو جیسا کہ گزر چکا ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۴-۵۴) ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب اور دانائی عطا فرمائی تھی اور سلطنت عظیم بخشی تھی۔

حقیقی بادشاہت چونکہ اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس لئے فرمایا۔

لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (۶۴-۱) اس کی (سچی) بادشاہی ہے اور اسی کی تعریف نامتناہی ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (۳-۲۶) کہو کہ اے خدا! اے بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔

پس مِلک کے معنی زیر تصرف چیز پر بذریعہ حکم کنٹرول کرنے کے ہیں۔ اور مِلک بمنزلہ جنس کے ہیں۔ لہٰذا ہر مُلْكٌ کو مِلْكٌ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر مِلک مُلک نہیں کہہ سکتے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۲۵-۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں اور نہ مرنا ان کے اختیار میں ہے۔ اور نہ جینا اور نہ مر کر اٹھ کھڑے ہونا۔ اور فرمایا:۔

اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (۱۰-۳۱) یا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا (۷-۱۸۸) کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔

علیٰ ہذا القیاس بہت سی آیات ہیں جن سے ثابت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ حتیٰ کہ انسان تو اپنے حواس اور اپنی ذات کے نفع و نقصان پر بھی قدرت نہیں رکھتا چہ جائیکہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ذمہ دار بنے۔

اَلْمَلَكُوْتُ یہ مَلَكٌ کا مصدر ہے اور رَحَمُوْتٌ وَرَهَبُوْتٌ کی طرح اس میں تاء زائدہ ہے۔ اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی مِلک کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ فرمایا۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶-۷۵) اور ہم اس طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷-۱۸۵) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں نظر نہیں کی۔

اَلْمَمْلَكَةُ کے معنی سلطنت کے ہیں۔ اور مملوک کا لفظ عرف میں غلام مملوک پر بولا

جاتا ہے۔ دوسری کیثرت کے مملوک نہیں کہتے چنانچہ
قرآن میں ہے:۔
عَبْدًا مَّمْلُوْكًا۔ (۱۶-۷۵) ایک غلام ہے۔
اور کبھی عام الملاک پر بولا جاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔
فُلَانٌ جَوَادٌ بِمَمْلُوْكِهٖ کہ فلاں اپنے املاک
میں سخی ہے۔
اَلْمَلَكَةُ خاص کر عبد یعنی غلاموں کا مالک ہونے
کو کہتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ حَسَنُ الْمَلَكَةِ یعنی فلاں اپنے غلاموں
کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔ اور
قرآن پاک میں غلاموں کے ملک کو یَمِیْنٌ کے
ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۲۴-۵۸)
تمہارے غلام لونڈیاں .... اجازت لیا کریں۔
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۴-۳) یا لونڈی جس
کے تم مالک ہو۔
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ (۲۴-۳۱) اپنے لونڈی
غلاموں کے سوا)
اَلْمَمْلُوْكَةُ بمعنی ملک کے آتا ہے جیسے:۔
مَمْلُوْكٌ مُقِرٌّ بِالْمَمْلُوْكَةِ وَالْمِلْكَةِ وَالْمِلْكِ
یعنی ملک کا اقرار کرنے والا غلام۔
مِلَاكُ الْاَمْرِ کسی چیز کا سرمایہ جس کے سہارے
پر وہ قائم ہو جیسے کہا جاتا ہے:۔
اَلْقَلْبُ مِلَاكُ الْجَسَدِ کہ دل جسم کا دارومدار
ہے۔
اَلْمِلَاكُ کے معنی تزویج کے ہیں۔ اور اَمْلَكُوْہُ
کے معنی ہیں کہ انہوں نے اس کا نکاح کر دیا پھر
خاوند کو عورت کا منتظم ہونے کے لحاظ سے
اس کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی کے

لحاظ سے کسی نے کہا ہے۔
کَادَ الْعَرُوْسُ اَنْ يَكُوْنَ مَلِكًا کہ عروس قریب
قریب بادشاہ ہی ہوتا ہے۔
مَلِكُ الْاِبِلِ وَالشَّاةِ اس اونٹ یا بکری کو
کہتے ہیں جو دوسروں کے آگے آگے چلتی ہے
دوسرے چونکہ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ اسلئے
تشبیہ کے طور پر اسے مَلِكٌ کہا جاتا ہے۔
ایک محاورہ ہے۔
مَالِاَحَدٍ فِيْ هٰذَا مَلْكٌ غَيْرِيْ کہ میرے سوا
اس پر میں کسی کا اختیار یا قبضہ نہیں ہے
قرآن میں ہے:۔
مَا اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا (۲۰-۸۷) ہم
نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلاف نہیں کی
اور ایک قراءت میں کسرہ میم کے ساتھ ہے
مَلَكْتُ الْعَجِيْنَ آٹے کو اچھی طرح سے گوندھ
حَائِطٌ لَيْسَ لَهٗ مِلَاكٌ دیوار میں پائیداری نہیں
اَلْمَلَكُ علمائے نحو اس لفظ کو مَلَائِكَةٌ سے
ماخوذ مانتے ہیں۔ اور اس کی میم کو زائدہ بنا
ہیں۔ لیکن بعض محققین نے اسے ملک سے
مشتق مانا ہے اور کہا ہے کہ جو فرشتہ کائنا
کا انتظام کرتا ہے۔ اسے فتحہ لام کے
مَلَكٌ کہا جاتا ہے۔ اور انسان کو مَلِك
ہیں معلوم ہوا کہ مَلَكٌ تو مَلَائِكَةٌ میں
ہے لیکن کل مَلَائِكَةٌ مَلَكٌ نہیں ہے
بلکہ ملک کا لفظ ان فرشتوں پر بولا جاتا ہے
کی طرف کہ آیات۔
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۷۹-۵) پھر دنیا کے
کاموں کا انتظام کرتے۔
فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (۵۱-۴) پھر چیزیں تقسیم

کرتے ہیں۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۷۹-۱) ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔

وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا (۶۹-۱۷) اور فرشتے اس کے کناروں پر اتر آئیں گے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ (۲-۱۰۲) اور ان باتوں کے بھی پیچھے لگ گئے جو دو فرشتوں پر اتری تھیں۔

اور ان کے علاوہ دوسری آیات میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور اسی سے مَلَكُ الْمَوْتِ (موت کا فرشتہ) ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (۳۲-۱۱) کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔ تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔

(م ل ء)

اَلْمَلَاُ وہ جماعت جو کسی امر پر مجتمع ہو تو نظروں کو ظاہری حسن و جمال اور نفوس کو ہیبت و جلال سے بھر دے۔ قرآن میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲-۲۴۶) بھلا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ (۷-۶۰) اور قوم فرعون میں جو سردار تھے کہنے لگے۔

اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ (۲۸-۲۰) کہ شہر کے رئیس تمہارے بارے میں صلاحیں کرتے ہیں۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (۲۷-۲۹) وہ کہنے لگی کہ اے اہل دربار میری طرف ایک نامہ گرامی ڈالا گیا ہے۔

ان کے علاوہ بہت سی آیات ہیں۔ جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ مَلَاُ الْعُيُوْنِ یعنی سب اسے عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں گویا اس نے ان کی نظروں کو اپنے جلوہ سے بھر دیا ہے۔ اسی سے کہا گیا ہے:۔

شَابٌّ مَالِئُ الْعَيْنِ۔ اپنی خوبصورتی سے آنکھ کو بھر دینے والا نوجوان۔ اَلْمَلَاُ اخلاق جو حسن سے بھرپور ہوں[1]۔ کسی شاعر نے کہا ہے[2]۔ (الوافر)

(۴۱۲) فَقُلْنَا اَحْسِنِيْ مَلَاً جُهَيْنَا

تو ہم نے کہا کہ اے جہینا اپنے اخلاق درست کرو۔

مَالَاَهٗ کے معنی کسی کا معاون بننے اور اس کے گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ شَايَعْتُهٗ کے معنی کسی کے طرف داروں میں داخل ہونے کے آتے ہیں۔ محاورہ ہے:۔

هُوَ مَلِيْءٌ بِكَذَا یعنی وہ فلاں چیز سے پُر ہے۔

اَلْمُلَاءَةُ زکام جو فضلہ سے دماغ کو بھر دے۔ اور مُلِئَ فُلَانٌ وَاُمْلِاَ کے معنی زکام زدہ ہونے کے ہیں۔

اَلْمِلْءُ کسی چیز کی اتنی مقدار جس سے کوئی برتن بھر جائے۔ محاورہ ہے:۔

اَعْطِنِيْ مِلْاَهٗ وَمِلْاَيْهِ وَثَلَاثَةَ اَمْلَائِهٖ۔

---

[1] وفی الحدیث "احسنوا املاءکم" قالہ صلی اللہ علیہ وسلم لاصحابہ حین ضربوا الرجل الذی بال فی المسجد اللسان والفائق ۱/۴۹۵ ٭ [2] قالہ الجہنی واولہ، تنادوا یالبھثۃ اذ لقونا۔ وبعضھم فسر الملاء ھھنا بالظن والبیت فی اللسان (ملأ جھن) وابن الانباری فی شرح السبع ۵۷۴ والحماسۃ بشرح المرزوقی رقم ۱۵۲ فی ۵ ابیات والمقطوعۃ من المنصفات والجہنی ہو عبداللہ شارق بن عبدالعزی الجہنی الجاہلی ٭

مجھے ایک، دو، یا تین پیمانے بھر کر دو۔

(م ل ی)

اَلْاِمْلَاءُ کے معنی امداد یعنی ڈھیل دینے کے ہیں اسی سے مَلَاوَۃٌ مِنَ الدَّھْرِ یا مَلِیٌّ مِنَ الدَّھْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنی عرصہ دراز کے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَاھْجُرْنِیْ مَلِیًّا (۱۹-۴۶) اور تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جا۔

تَمَلَّیْتَ دَھْرًا۔ تمہاری عمر دراز ہو۔

تَمَلَّیْتُ الثَّوْبَ۔ میں نے اس کپڑا سے بہت فائدہ اٹھایا۔

تَمَلّٰی بِکَذَا اس نے فلاں چیز سے عرصہ تک فائدہ اٹھایا۔

مَلَاکَ اللہُ (بغیر ہمزہ) اللہ تیری عمر دراز کرے۔

چنانچہ اسی سے عِشْتَ مَلِیًّا کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں تم عرصہ دراز تک جیتے رہو۔

اَلْمَلَا (اسم مقصور) وسیع ریگستان۔

بعض نے کہا ہے کہ اَلْمَلَوَانِ کے معنی ہیں "لیل و نہار" مگر اصل میں یہ لفظ رات دن کے تکرار اور ان کے امتداد پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ لیل و نہار کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۴۱۳) نَھَارٌ وَلَیْلٌ دَائِمٌ مَلَوَاھُمَا
عَلٰی کُلِّ حَالِ الْمَرْءِ یَخْتَلِفَانِ

رات دن کا تکرار ہمیشہ رہتا ہے اور ہر حالت میں یہ مختلف ہوتے رہتے ہیں۔

اگر مَلَوَان کا اصل معنی لیل و نہار ہوتا تو ان کی ضمیر کی طرف مضاف ہو کر استعمال نہ ہوتا اور آیت کریمہ:۔

وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (۷-۱۸۳) اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں۔ میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔ میں اُمْلِیْ لَھُمْ کے معنی مہلت دینے کے ہیں۔ نیز فرمایا:۔

اَنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِھِمْ (۳-۱۷۸) کہ ہم ان کو مہلت دیئے جاتے ہیں۔ تو یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ:۔

اَلشَّیْطَانُ سَوَّلَ لَھُمْ وَاَمْلٰی لَھُمْ (۴۷-۲۵) شیطان نے یہ کام ان کو مزین کر کے دکھایا اور انہیں طول (عمر کا وعدہ) دیا۔

میں اَمْلٰی کے معنی اَمْھَلَ یعنی مہلت دینے کے ہیں۔

ایک قرات میں اُمْلٰی لَھُمْ ہے جو اَمْلَیْتُ الْکِتَابَ اُمْلِیْہِ اِمْلَاءً سے مشتق ہے اور اس کے معنی تحریر لکھوانے اور املا کروانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

فَھِیَ تُمْلٰی عَلَیْہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا (۲۵-۵) اور وہ صبح شام اس کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

اصل میں اَمْلَیْتُ اَمْلَلْتُ (مضاعف) ہے۔ دوسرے لام کو تخفیف کے لئے یاء سے تبدیل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّہٗ بِالْعَدْلِ (۲-۲۸۲) تو جو اس

---

[1] قالہ ابن مقبل (واسمہ تمیم بن ابی بن مقبل) راجع للبیت اللالی مع السمط ۳۳۳ والاقتضاب ۴۷۲ والخزانۃ (۳: ۲۷۵) والعینی (۴: ۲۱۴) صحاح اللسان (ملا) وبعضہم نسبہ لاعرابی من بنی مقبل راجع الحصری (۴: ۶۸) وفی البلدان لابن مقبل او ابن احمر والبیت فی الروض (۱: ۲۶) والعینی علی ابن ہشام وقبلہ الایا دیار بالحی بالسبعان۔ امل علیہا بالبلی الملوان راجع ترجمتہ فی الاصابۃ رقم ۸۶۲ والخزانۃ (۱: ۱۱۳)

کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔

(م ن ن)

اَلْمَنُّ۔ ایک وزن کا نام ہے اس کا تثنیہ مَنَّانِ اور جمع اَمْنَانٌ آتی ہے۔ کبھی ایک نون کو الف سے تبدیل کر کے مَنًا بنا لیتے ہیں اس کی جمع اَمْنَاءٌ ہے۔ اور ہر اندازہ کی ہوئی چیز کو مَمْنُوْنٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسے مَوْزُوْنٌ کہتے ہیں۔

اَلْمِنَّۃُ کے معنی بھاری احسان کے ہیں۔ اور یہ دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک منت بالفعل جیسے مَنَّ فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ یعنی فلاں نے اس پر گرانبار احسان کیا۔ اسی معنی میں فرمایا:۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (۳-۱۶۴) خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ (۴-۹۴) تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے پھر خدا نے تم پر احسان کیا۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ (۳۷-۱۱۴) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر بھی احسان کئے۔

یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ (۱۴-۱۱) خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (نبوت) کا احسان کرتا ہے۔

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا (۲۸-۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں۔ ان پر احسان کریں۔

اور یہ یعنی منت بالفعل درحقیقت اللہ تعالےٰ ہی کی صفت ہے۔ اور دوسرے معنی مِنَّۃ بالقول یعنی احسان جتلانا گو انسانی معاشرہ میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب کفرانِ نعمت ہو رہا ہو تو اس کے اظہار میں کچھ قباحت نہیں ہے۔ اور چونکہ (بلاوجہ) اس کا اظہار معیوب ہے اس لیے مشہور ہے۔

اَلْمِنَّۃُ تَھْدِمُ الصَّنِیْعَۃَ منت یعنی احسان رکھنا احسان کو برباد کر دیتا ہے۔ اور کفرانِ نعمت کے وقت چونکہ اس کا تذکرہ مستحسن ہوتا ہے اس لئے کسی نے کہا ہے:۔ اِذَا کُفِرَتِ النِّعْمَۃُ حَسُنَتِ الْمِنَّۃُ۔ جب نعمت کی ناشکری ہو تو احسان رکھنا ہی مستحسن ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ (۴۹-۱۷) یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہدو کہ اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو۔ بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے۔ کہ اس نے تمہیں ایمان کا رستہ دکھایا۔

میں ان کی طرف سے منت بالقول یعنی احسان جتلانا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منت بالفعل یعنی انہیں ایمان کی نعمت سے نوازنا مراد ہے جیسا کہ بعد میں اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ کے لفظ سے خود ہی اس کی تشریح کر دی ہے اور آیت کریمہ:۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷-۴) پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ مال لیکر۔ میں مَنًّا کے لفظ سے انہیں بلامعاوضہ رہا کر دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ ھٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۳۸-۳۹) یہ ہماری بخشش ہے اسے خرچ کردیا ..... رکھ چھوڑو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے:۔

میں فَامْنُنْ کے معنی خرچ کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴-۶) اور (اس نیت سے) احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو۔
میں بعض نے کہا ہے کہ مِنَّة بالقول مراد ہے یعنی احسان جتلانا اور اسے بہت بڑا خیال کرنا۔[1] بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ زیادہ کی طلب کے لئے احسان نہ کر[2] اور آیت کریمہ:۔
فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۹۵-۶) ان کے لئے بے انتہا اجر ہے۔
میں بعض نے غیر ممنون کے معنی غیر محدود یعنی ان گنت کئے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ "بِغَيْرِ حِسَابٍ" فرمایا ہے:۔
بعض نے اس کے معنی غیر منقطع وَلَا منقوص کئے ہیں[3] یعنی ان کا اجر نہ منقطع ہوگا اور نہ ہی کم کیا جائے گا۔ اسی سے اَلْمَنُوْنُ بمعنی موت ہے[4]۔ کیونکہ وہ تعداد کو گھٹاتی اور عمر کو قطع کر دیتی ہے۔ بعض نے کہا ہے مِنَّة بالقول بھی اسی سے ہے۔ کیونکہ احسان جتلانا نعمت کو قطع کر دیتا ہے اور شکر گذاری کے انقطاع کو مقتضی ہے اور آیت کریمہ:۔
وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى (۲-۵۷) اور تمہارے لئے من سلوی اتارتے رہے۔
میں مَنّ سے شبنمی گوند مراد ہے۔ جو رات کو درخت کے پتوں پر جم جاتی تھی اور سلوی ایک پرند کا نام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی سے ان احسانات کی طرف اشارہ ہے۔ جو اللہ تعالے نے ان پر کئے تھے اور یہ دونوں اصل میں ایک ہی چیز سے عبارت ہیں۔ لیکن ان پر احسان کرنے کے لحاظ سے اسے مَنّ کہا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ نعمت ان کے لئے باعثِ اطمینان تھی اسے سلوی فرمایا ہے۔ جو کہ تسلی سے ماخوذ ہے۔
مَنْ۔ اس سے ذوی العقول مراد ہوتے ہیں۔ اور غیر ذوی العقول پر اس کا اطلاق یا تو اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ ذوی العقول کے بالتبع مراد ہوں مثلاً۔ رَاَيْتُ مَنْ فِى الدَّارِ کہہ کر گھر کے لوگ اور بہائم دونوں مراد لئے جائیں۔ اور یا اس وقت جب اہل نطق کے ساتھ شامل کر کے پھر ان کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔
فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى رِجْلَيْنِ الآية تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ اور یہ تنہا غیر ذوی العقول کے لئے استعمال نہیں ہوتا اسی لئے بعض محدثین نے اغنام (عوام) سے انسانیت کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ مَنْ استفہامیہ کے ساتھ ان کے متعلق سوال کرنا غلط ہے۔ پس آیت میں تنبیہ ہے کہ وہ بمنزلہ جانوروں کے ہیں یا ان سے بھی کمتر درجہ کے ہیں۔
"مَنْ" واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لئے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت:۔

---

[1] ہذا ما ذہب الیہ الحسن وابن ابی لیلی وعلی ہذا یکون تستکثر منصوبا بلا الناہیۃ بدلا من تمنن ای لا تمنن ولا تستکثر وہو من شان المنان بما یعطی ان یستکثرہ ویراہ کثیرا ۱۲ [2] وہذا ہو المنقول عن ابن عباس واکثر اصحاب التفاسیر فعلی ہذا المعنی یکون تستکثر منصوبا بان المقدرۃ ویؤیدہ قراءۃ ابن مسعود ان تستکثر باظہار ان مختصرا من روح المعانی (۲۹/۱۱۹)۱۲۰۰ [3] قارن اضداد ابی الطیب ۲۲۳-۲۲۴ [4] وایضا سمی الدہر المنون بہذا المعنی ویکون واحدا وجمعا اضداد ابی الطیب

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ (۶-۲۵) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو تمہاری باتوں کی طرف کان رکھتے ہیں۔ یہں مَنْ کے بعد ضمیر واحد مذکر لائی گئی ہے اور آیت:۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (۱۰-۴۲) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں۔ یہں مَنْ کی طرف ضمیر جمع لوٹ رہی ہے نیز فرمایا:۔ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ (۳۳-۳۱) اور جو تم میں سے خدا ۔۔۔ کی فرمانبردار رہے گی۔

مِنْ

یہ حرف جار ہے اور یہ ابتدائے غایت تبعیض، تبیین، کے لئے آتا ہے۔ اور حرف نفی اور استفہام کے ساتھ ہو تو استغراق جنس کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ (۶۹-۴۷) پھر تم میں سے کوئی۔ اور کبھی عوض کے لئے ہوتا ہے جیسے خُذْ هٰذَا مِنْ ذٰلِكَ یعنی اس کے عوض میں یہ لے لو اور آیت کریمہ:۔ اِنِّيْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ (۱۴-۳۷) میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں لابسائی ہے۔ میں مِنْ تبعیض کے لئے ہے۔ کیونکہ وہاں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے بعض آباد ہوئے تھے۔ اور آیت کریمہ:۔ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ (۲۴-۴۳) اور آسمان میں جو (اولوں کے) پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے۔ میں[1] ہو سکتا ہے کہ مِنْ جِبَالٍ منصوب علی المفعولیۃ ہو ای یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ جِبَالًا تو مِنْ اولیٰ برائے ظرفیت ہے اور ثانی برائے مفعولیۃ اور ثالث برائے تبیین۔ اور اولوں کے جبال اتارنے سے بکثرت اولے نازل کرنا مراد ہے جیسا کہ محاورہ ہے:۔ عِنْدَهٗ جِبَالٌ مِّنْ مَّالٍ یعنی اس کے پاس بہت سامان ہے۔ بعض[1] نے کہا ہے کہ مِنْ جِبَالٍ منصوب علی الظرفیۃ بھی ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اولے پہاڑوں سے نازل ہوتے ہیں اور مِنْ بَرَدٍ منصوب علی المفعولیۃ ہو تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ وہ آسمان کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مِنْ بَرَدٍ موضع رفع میں ہو۔ اور مِنْ جِبَالٍ منصوب علی المفعولیۃ ہو۔ گویا اصل عبارت یوں ہے۔ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ جِبَالًا فِيْهَا بَرَدٌ اور جبال کا لفظ مَا نَزَلَ مِنَ السَّمَآءِ کی عظمت اور کثرت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ (۵-۴) تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اسکو کھالیا کرو۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے[2] کہ مِنْ زائدہ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ مِنْ زائدہ نہیں ہے۔ بلکہ تبعیضیہ ہے کیونکہ بعض مَاۤ اَمْسَكْنَ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا کھانا جائز نہیں ہے۔ جیسے خون، غدود، اور وہ چیزیں جو قاذورات سے مختلط ہوتی ہیں اور ان کے تناول سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔

---

[1] ذکر المؤلف ثلاث توجیہات من الاعراب وقد ذکر ہذہ الثلاثۃ اصحاب التفاسیر فلا بدع فیہ وقد نسب صاحب الروح احتمال الثالث الی الفراء والاولان بتعبیر یسیر الی الاخفش (۲/۱۰۸/۱۲) وانوار التنزیل ۲/۲۵۷ [2] ای الاخفش ولکن عند الطبری بعض نحوی البصرۃ قال الطبری وخطاؤ البصریین ناخلاف فیہ مشہور والحق الجواز ولذا قال علماء التفسیر وان اکل فلا تاکل (۳م ص۱)

(م ن ع)

اَلْمَنْعُ۔ یہ عطا کی ضد ہے۔ رَجُلٌ مَانِعٌ وَ مَنَّاعٌ بخیل آدمی۔ قرآن میں ہے۔
وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (١٠٧-٥) اور برتنے کی چیزیں عاریۃً نہیں دیتے۔
مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ (٥٠-٢٥) جو مال میں بخل کرنیوالا ہے۔
اور منع کے معنی حمایت اور حفاظت کے بھی آتے ہیں اسی سے مَكَانٌ مَنِيعٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی محفوظ مکان کے ہیں اور مَنَعَ کے معنی حفاظت کرنے کے فُلَانٌ ذُوْ مَنَعَةٍ وہ بلند رتبہ اور محفوظ ہے کہ اس تک دشمنوں کی رسائی ناممکن ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (٤-١٤١) کیا ہم تم پر غالب نہیں تھے اور تم کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچایا نہیں۔
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ (٢-١١٤) اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو خدا کی مسجدوں سے منع کرے۔ اور آیت:۔
مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (٧-١٢) میں مَا مَنَعَكَ کے معنی ہیں۔ کہ کس چیز نے تمہیں اکسایا۔ اور بعض نے اس کا معنی مَا الَّذِيْ سَدَّكَ وَحَمَلَكَ عَلٰى تَرْكِ ذٰلِكَ کیا ہے۔ یعنی کس نے تجھے روکا اور ترک سجود پر اکسایا۔ اِمْرَاَةٌ مَنِيْعَةٌ عفیفہ عورت۔
اور مَنَاعِ اسم فعل بمعنی اِمْنَعْ (امر) جیسے نَزَالِ بمعنی اِنْزِلْ۔

(م ن ی)

اَلْمَنْیُ کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔
مَنٰى لَكَ الْمَانِيْ مقدر کنندہ نے تیرے لئے مقدر کر دیا ہے۔ اسی سے بعض کے نزدیک مَنًا ایک وزن کا نام ہے[1]
اَلْمَنِيُّ نطفہ منی اور اسے منی اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے حیوانات کی ساخت مقدر کی گئی ہے۔ قرآن میں ہے۔
اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى (٧٥-٣٧) کیا وہ منی جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا؟
مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى (٥٣-٤٦) (یعنی) نطفے سے جو رحم میں ڈالا جاتا ہے۔
یعنی نطفہ سے جو قدرت الہٰی کے ساتھ اس چیز کے لئے مقدر ہوتا ہے۔ جو اس سے پیدا ہونا ہوتا ہے۔ اسی سے مَنِيَّةٌ بمعنی اجل مقدر ہے۔ والجمع منایا۔
اَلتَّمَنِّيْ کے معنی دل میں کسی خیال کے باندھنے اور اس کی تصویر کھینچ لینے کے ہیں۔ پھر کبھی یہ تقدیر محض ظن وتخمین پر مبنی ہوتی ہے۔ اور کبھی غور وفکر کا نتیجہ اور مبنی برحقیقت۔ مگر عام طور پر تمنی کی بنا چونکہ ظن وتخمین پر ہی ہوتی ہے اس لئے اس پر جھوٹ کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر طور پر تمنی کا لفظ دل میں غلط آرزوئیں قائم کر لینے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى (٥٣-٢٤) کیا جس چیز کی انسان آرزو کرتا ہے وہ اسے ضرور ملتی ہے۔

---

[1] منسوب الی الاخفش کمافی الروح ٢٧/٥٩

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ (۲-۹۴) تو موت کی آرزو تو کرو۔ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا (۶۲-۷) اور یہ ہرگز نہیں کریں گے۔

اَلْاُمْنِيَّةُ کسی چیز کی تمنا سے جو صورت ذہن میں حاصل ہوتی ہے اسے اُمْنِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔ اور کذب چونکہ کسی غیر واقعی چیز کا تصور کرکے اسے لفظوں میں بیان کر دینے کو کہتے ہیں۔ تو گویا تمنی جھوٹ کا مبدء ہے۔ لہٰذا جھوٹ کو تمنی سے تعبیر کرنا بھی صحیح ہے اسی معنی میں حضرت عثمانؓ کا قول ہے[1]۔

مَا تَغَنَّيْتُ وَلَا تَمَنَّيْتُ مُنْذُ أَسْلَمْتُ کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں نہ راگ گایا ہے اور نہ جھوٹ بولا ہے۔ اور اُمْنِيَّةٌ کی جمع أَمَانِيُّ آتی ہے[2]۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ (۲-۷۸) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی) کتاب سے واقف نہیں ہیں۔

مجاہد نے إِلَّا أَمَانِيَّ کے معنی إِلَّا كَذِبًا یعنی جھوٹ کئے ہیں۔ اور دوسروں نے أَمَانِيَّ سے بے سوچے سمجھے تلاوت کرنا مراد لیا ہے کیونکہ اس قسم کی تلاوت بھی اس اُمْنِيَّة سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے جس کی بنا تخمینہ پر ہوتی ہے اور آیت کریمہ:۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ (۲۲-۵۲) اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا۔ مگر (اس کا یہ حال تھا کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں (وسوسہ) ڈال دیتا تھا۔

میں اُمْنِيَّة کے معنی تلاوت کے ہیں اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تمنی ظن و تخمین سے بھی ہوتی ہے۔ اور مبنی برحقیقت بھی۔ اور چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قلب مبارک پر روح الامین جو وحی لے کر اترتے تھے آپؐ اس کی تلاوت کے لئے مبادرت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپؐ کو آیت لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ اور لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ کے ذریعہ منع فرما دیا گیا۔ الغرض اس وجہ سے آپ کی تلاوت کو تمنی سے موسوم کیا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ ایسی تلاوت میں شیطان کا دخل غالب ہو جاتا ہے[3]۔ اسی معنی میں آنحضرتؐ نے بھی فرمایا ہے[4] (۱۲۵) إِنَّ الْعَجَلَةَ مِنَ الشَّيْطَانِ کہ جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔

مَنَّيْتُهُ كَذَا کے معنی فریب وہی سے جھوٹی امیدیں دلانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے شیطان کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:۔

[1] انظر لقول عثمان غریب القرآن للقتبی ۵ و النہایۃ لابن الاثیر (۴: ۱۹) و اللسان (منی) و الفائق ۱/۴۲۳ و فی کتاب الاشربۃ للقتبی "ولا تغنیت" ای ولا تشبہت بالفتیان ولا تصح۔ ورواہ ابو یعلی الموصلی فی معجمہ باسناد ضعیف من روایۃ انس عنہ فی اثناء حدیث راجع تخریج الاحیاء للعراقی ۳/۳۱۹) و فی روایۃ الفائق ایضاً فی جاہلیۃ ولا اسلام [2] بتشدید الیاء و تخفیفہا و بالثانی قرء ابو جعفر و شیبۃ (ابن الانباری ۲۴۲) [3] اشارۃ الی قصۃ ذکرہا بعض علماء التفسیر ای تلک الغرانیق العلی وان شفاعتہن لترتجی۔ ذہب الحافظ بناء علی کثرۃ الطرق الی ان لہا اصلاً الفتح ۸/۳۳۳) لکن المحققین انکروہ راجع الغر ۲/۲۴۵-۲۴۶ و قارن ما ذکرہ القتبی فی غریبہ ۵۵-۶۰ و فی اللسان (منی) قال الازہری والتلاوۃ سمیت امنیۃ لان تالی القرآن اذا مر بآیۃ رحمۃ تمناہا واذا مر بآیۃ عذاب تمنی ان یوقاہ [4] انظر تخریجہ (ع ج ل) ۱۲

وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ (۴-۱۱۹) اور ان کو گمراہ کرتا۔ اور امیدیں دلاتا رہوں گا۔

(م ہ د)

اَلْمَهْدُ۔ گہوارہ۔ جو بچے کے لئے تیار کیا جائے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا (۱۹-۲۹) کہ ہم اس سے کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

اور اَلْمَهْدُ وَالْمِهَادُ ہموار اور درست کی ہوئی زمین کو بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا (۲۰-۵۳) وہ وہی تو ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو فرش بنایا۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهَادًا (۷۸-۶) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟۔

اور یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں زمین کو فراش کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَجَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (۲-۲۲) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا۔

مَهَّدْتُ لَکَ کے معنی کسی چیز کو تیار اور ہموار کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمَهَّدْتُ لَهٗ تَمْهِیْدًا (۷۴-۱۴) اور ہر طرح سامان میں وسعت دی۔

اِمْتَهَدَ السَّنَامُ کے معنی کوہان کے مِهاد یا مَهْد یعنی فرش کی طرح ہموار ہو جانے کے ہیں۔

(م ہ ل)

اَلْمَهْلُ کے معنی حلم و سکون کے ہیں۔ اور مَهَلَ فِیْ فِعْلِهٖ کے معنی ہیں اس نے سکون سے کام کیا۔ اور مَهْلًا کے معنی رِفْقًا کے ہیں۔ یعنی جلدی مت کرو۔ مَهَّلْتُهٗ کسی کو مَهْلًا کہنا اور اَمْهَلْتُهٗ کے معنی کسی کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَمَهِّلِ الْکَافِرِیْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَیْدًا (۸۶-۱۷) تو تم کافروں کو مہلت دو بس چند روز ہی مہلت دو۔

اَلْمُهْلُ تلچھٹ کو بھی کہتے ہیں[1]۔ چنانچہ فرمایا:۔

کَالْمُهْلِ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ (۴۴-۳۵) جیسے پگھلا ہوا تانبا پیٹوں میں (اس طرح) کھولے گا۔

(م و ت)

اَلْمَوْتُ۔ یہ حیات کی ضد ہے۔ لہذا حیات کی طرح موت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

اول قوت نامیہ (جو کہ انسان، حیوانات اور نباتات (سب میں پائی جاتی ہے) کے زوال کو موت کہتے ہیں جیسے فرمایا:۔

یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۵۷-۱۷) زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔

اَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا (۵۰-۱۱) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔

دوم حس و شعور کے زائل ہو جانے کو موت کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا (۱۹-۲۳) کاش میں اس سے پہلے مر چکتی۔

وَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَیًّا (۱۹-۶۶) کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔

---

[1] قال ابو بکر الصدیق ادفنونی فی ثوبی ہذین فانہما للمہل والتراب الفائق ۲ر۸ (۲۵) ۞ ۞ ۞ ۞

سوم۔ قوت عاقلہ کا زائل ہوجانا اور اسی کا نام جہالت ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (۶۔۱۲۲) بھلا جو پہلے مردہ تھا۔ پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور آیت کریمہ:۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۲۷۔۸۰) کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے۔

میں اسی معنی کے لحاظ سے کفار کو مَوْتٰی کہا ہے۔

چہارم۔ غم جو زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کر دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴۔۱۷) اور ہر طرف سے اسے موت آ رہی ہوگی۔ مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا۔

میں موت سے یہی معنی مراد ہیں۔

پنجم[1] موت بمعنی نیند ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ اَلنَّوْمُ مَوْتٌ خَفِيْفٌ وَالْمَوْتُ نَوْمٌ ثَقِيْلٌ کہ نیند ہلکی سی موت ہوتی ہے۔ اور موت بھاری نیند کا نام ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو توفی سے تعبیر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ (۶۔۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۳۹۔۴۲) اور خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔ اور جو مرے نہیں ان کی روحیں سوتے میں قبض کر لیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ (۳۔۱۶۹) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زندہ ہیں۔

میں شہداء کی روحوں سے موت کی نفی مراد ہے۔ اور اس میں ان کی روحوں کے عیش و آرام میں ہونے پر متنبہ کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان سے اس حزن کی نفی ہے جس کا کہ ابھی آیت وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ میں ذکر ہو چکا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (۳۹۔۳۰) (اے پیغمبر) تم بھی مر جاؤ گے اور یہ بھی مر جائیں گے۔ میں بعض نے مَيِّتٌ کے معنی سَتَمُوْتُ کئے ہیں یعنی تم عنقریب فوت ہو جاؤ گے۔ تو اس سے متنبہ کیا ہے کہ موت سے کسی کو بھی چارہ کار نہیں ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (السریع)

(۴۱۴) اَلْمَوْتُ حَتْمٌ فِيْ رِقَابِ الْعِبَادِ

ہر انسان کو حتماً مرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلْمَيِّتُ کے معنی جسم سے روح کے الگ ہونے کے نہیں ہیں۔ بلکہ جسم کا تدریجاً تحلیل ہونا اور گھٹنا مراد ہے یعنی انسان جب تک زندہ رہتا ہے۔ تدریجاً مرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (   )

يَمُوْتُ جُزْءًا فَجُزْءًا

---

[1] وصدره: قد كان لي في الموت راحة مفيد القافيه (والبيت في الحصري (۱: ۱۷۱-۱۸۰) في ثلاثة قال ابو اسحاق ورويت لمحمد بن عبد الله بن الحسن بن الحسين وقد رويت لاخيه موسى وكان زيد بن علي كثيراً ينشد وروى في العقد (۳: ۲۳۲) بثلاثة وعزاه لزيد بن علي والبيان والتبيين (۱: ۱۹۷) وفي ذيل الامالي (۳: ۱۰۰) ان ابن الاشعث لما انهزم الى سجستان تولى خائباً فانشد في ثلاثة ۱۲ [2] لم اجده ورجمي ۱۲

کہ وہ تدریجاً تحلیل ہو جائے گا۔

اور اسی معنی کے لحاظ سے بعض نے انسان کو مَائِتٌ (بصیغۂ فاعل) کہا ہے، اور انہوں نے میّت و مائت میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ مَائِتٌ کے معنی تحلیل ہونے والے کے ہیں۔ اور مَیِّتٌ بمعنی مردہ کے۔

قاضی علی ابن عبدالعزیز نے کہا ہے کہ ہماری زبان (یعنی عربی) میں مَائِتٌ بایں معنی ثابت نہیں ہے۔

اَلْمَیْتُ یہ مَیِّتٌ کا مخفف ہے اور مَوْتٌ مَائِتٌ کا محاورہ مبالغہ پر محمول ہے جیسا کہ شِعْرٌ شَاعِرٌ وسَیْلٌ سَائِلٌ وغیرہما ہیں۔ اور بَلَدٌ یعنی شہر پر مَیِّتٌ اور مَیْتٌ دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَیِّتٍ۔ ہم اس کو ایک مری ہوئی بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں (۷-۵۷)

بَلْدَةً مَّیْتًا (۲۵-۴۹) شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو۔

اَلْمَیْتَةُ اس حیوان کو کہتے ہیں جس کی روح بغیر تذکیہ کے زائل ہوگئی ہو۔ قرآن میں ہے:۔

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ (۵-۳) تم پر مرا ہوا جانور حرام ہے۔

اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ مَیْتَةً (۶-۱۴۵) بجز اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو۔

اَلْمَوَتَانُ۔ یہ حیوان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور مَوَتَان یا مَوَاتٌ بنجر زمین کو کہتے ہیں۔ محاورہ ہے:۔

وَقَعَ فِی الْاِبِلِ مَوَتَانٌ کَثِیْرٌ بہت سے اونٹ مر گئے۔

نَاقَةٌ مُمِیْتَةٌ وَمُمِیْتٌ جس ناقہ کا بچہ مر گیا ہو۔

اِمَاتَةُ الْخَمْرِ (کنایة) شراب کو پکا کر اس کا جوش مارنا۔

اَلْمُسْتَمِیْتُ موت کا سامنا کرنے والا۔ نڈر آدمی۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۴۱۶) فَاَعْطَیْتُ الْجِعَالَةَ مُسْتَمِیْتًا

تو میں نے موت سے نہ ڈرنے والے کو انعام دیا۔

اَلْمُوْتَةُ ایک قسم کا جنون گویا اس سے علم و عقل مردہ ہو جاتا ہے اسی سے مردہ دل آدمی کو مَوَتَانُ الْقَلْبِ اور عورت کو مَوَتَانَةُ الْقَلْبِ کہا جاتا ہے۔

(م و ج)

اَلْمَوْجُ۔ سمندر سے پانی کی جو لہر مغرب کی طرف سے اٹھتی ہے اسے موج کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فِیْ مَوْجٍ کَالْجِبَالِ (۱۱-۴۲) لہروں میں چلنے لگی (لہریں کیا تھیں) گویا پہاڑ (تھے)

یَغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ (۲۴-۴۰) جس پر لہر چلی آتی ہو اور اس کے اوپر اور لہر آ رہی ہو۔

مَاجَ کَذَا یَمُوْجُ وَتَمَوَّجَ تَمَوُّجًا موج کی طرح مضطرب ہونا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

[1] فی معجم البلدان (۳: ۴۷۴) قالہ الاسدی وفی التبریزی: وقال شقیق بن سلیک الاسدی وہو شاعر اسلامی قالہ معتذرا الی الضحاک (ابو انس الضحاک بن قیس بن خالد الشیبانی الفہری شہد صفین مع معاویة وغلب علی دمشق ودعا الی بیعة ابن الزبیر ثم دعا الی نفسہ وقتل بمرج راہط سنة ۶۵ راجع الاصابة ۴۶۱ وتمامہ خفیف الحاذ من فتیان جرم" والبیت فی اللسان والحکم وجعل ہو الحماسة مع المرزوقی برقم ۱۶۲ فی ستة ۱۲

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ (۱۸-۹۹) (اس (روز) ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ (روئے زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں۔

(م و ر)

اَلْمَوْرُ کے معنی تیز رفتاری کے ہیں۔ اور یہ مَارَ يَمُوْرُ مَوْرًا سے ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔ يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا (۵۲-۹) جس دن آسمان لرزنے لگے کپکپا کر۔

مَارَ الدَّمُ عَلٰى وَجْهِهٖ کے معنی چہرہ پر تیزی سے خون جاری ہونے کے ہیں۔ اور مَوْرٌ غبار کو بھی کہتے ہیں۔ جو ہوا میں ادھر ادھر اڑتا ہے۔ اور نَاقَةٌ تَمُوْرُ فِيْ مَشْيِهَا کے معنی ہیں اونٹنی کا تیز رفتاری کی وجہ سے غبار اڑاتے ہوئے چلے جانا۔ اور تیز رو اونٹنی کو مَوَّارَةٌ کہا جاتا ہے۔

کِتَابُ النُّون

(ن ب ء)

اَلنَّبَاُ۔ کے معنی خیر مفید کے ہیں جو علم یا غلبہ ظن کا فائدہ دے۔ اور حقیقی معنی کے لحاظ سے کسی خبر پر نبأ کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس میں تین چیزیں موجود نہ ہوں۔ یعنی نہایت[۱] مفید[۲] ہونا اور اس سے علم[۳] یا غلبۂ ظن کا حاصل ہونا۔ اور نبأ صرف اس خبر کو کہا جاتا ہے۔ جس میں کذب کا احتمال نہ ہو۔ جیسے خبر متواتر، خبر الٰہی، اور خبر نبوی اور لفظ نبأ چونکہ معنی خبر کو متضمن ہوتا ہے۔ اسلئے اَخْبَرْتُہٗ بِکَذَا کی طرح اَنْبَأْتُہٗ بِکَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور معنی علم کو متضمن ہونے کی وجہ سے اَعْلَمْتُہٗ کَذَا کی طرح اَنْبَأْتُہٗ کَذَا بھی کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔

قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ (۳۸-۶۷) کہہ دو کہ یہ ایک بڑی (ہولناک چیز کی) خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے۔

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ (۷۸-۱-۲) یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔ کیا بڑی خبر کی نسبت۔

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ (۶۴-۵) کیا تم کو ان لوگوں کے حال کی خبر نہیں پہنچی جو پہلے کافر ہوئے تھے۔ تو انہوں نے اپنے کاموں کی سزا کا مزہ چکھ لیا۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ (۱۱-۴۹) یہ حالات منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں۔ جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں۔

تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا (۷-۱۰۱) یہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو سناتے ہیں۔

ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْقُرَى نَقُصُّهُ عَلَيْكَ (۱۱-۱۰۰) یہ (پرانی) بستیوں کے تھوڑے سے حالات ہیں جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (۴۹-۶) اگر کوئی بدکار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔

میں متنبہ کیا ہے کہ اگر کوئی خبر کسی اہم واقعہ کی حامل ہو تو اگرچہ اس کے صحیح ہونے کا یقین یا ظن غالب حاصل ہو جائے لیکن جب تک اس پر نظر ثانی اور اچھی طرح سے اس کی جانچ پڑتال نہ ہو جائے

اسے بیان کرنے میں توقف کرنا چاہیئے۔

نَبَّأْتُهٗ وَ اَنْبَأْتُهٗ کے معنی خبر دینے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲-۳۱) اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔

اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (۲-۳۳) کہ...... تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب انہوں نے ان کو ان کے نام بتائے۔

نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ (۱۲-۳۷) کہ میں تم کو اس کی تعبیر بتادوں گا۔

نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ (۱۵-۵۱) اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں کا حال دو۔

قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ (۱۰-۱۸) کہو کیا تم خدا کو ایسی چیز بتاتے ہو جس کا وجود اسے نہ آسمانوں میں معلوم ہوتا ہے اور نہ زمین میں۔

اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ (۱۳-۳۳) کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جن کو وہ...... معلوم نہیں کرتا۔

نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۶-۱۴۳) اگر سچے ہو تو مجھے سند سے بتاؤ۔

قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (۹-۹۴) خدا نے ہمیں تمہارے سب حالات بتادیئے ہیں۔

اور نَبَّاْتُهٗ میں اَنْبَاْتُهٗ کی بنسبت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا (۴۱-۵۰) پس کافر جو عمل کرتے ہیں۔ وہ ہم ان کو ضرور بتائیں گے۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ (۷۵-۱۳) اس دن انسان نے جو عمل آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے ہوں گے سب بتادیئے جائیں گے

اور اس سے ابلغ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آیت کریمہ۔

فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (۶۶-۳) تو جب وہ اس کو جتائی تو پوچھنے لگیں کہ آپ کو یہ کس نے بتایا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔

پس اس خبر کے متحقق اور من جانب اللہ ہونے پر تنبیہ کرنے کے لئے جواب میں اَنْبَأَ کی بجائے نَبَّأَ کہا ہے۔ کیونکہ یہ اس سے ابلغ ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ:۔

قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (۹-۹۴) خدا نے ہمیں تمہارے سب حالات بتادیئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۶۲-۸) پھر جو جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتائے گا۔ بھی اس لئے ابلغ ہونے پر دال ہیں۔

اَلنُّبُوَّةُ۔ وہ سفارت جو اللہ تعالٰے اور اس کے بندوں کے درمیان ان کے امور دنیوی اور اخروی میں خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جاری ہوتی ہے اسے نبوت کہا جاتا ہے۔ اور نبی کو نبی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اُن باتوں کی خبر دیتا ہے جن پر کہ عقول سلیمہ مطمئن ہوتی ہیں۔ اور نبیؐ ہو سکتا ہے کہ فعیل بمعنی فاعل سے ہو۔ چنانچہ فرمایا:۔

نَبِّئْ عِبَادِیْ (۱۵-۴۹) (اے پیغمبر) میرے بندوں کو بتادو۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ (۳-۱۵) (اے پیغمبر ان سے) کہو کہ بھلا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں۔

اور یہ بھی کہ نعیل بمعنی مفعول سے ہو یعنی خبر دیا گیا کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔

نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ (۶۶-۳) مجھے اس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔

تَنَبَّأَ فُلَانٌ کے معنی دعوائے نبوت کرنے کے ہیں۔ اور وضع لغوی کے اعتبار سے نبی کے متعلق اس کا استعمال صحیح ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ باب تفعیل کا مطاوع ہوتا ہے جیسے:۔ زَيَّنَهُ فَتَزَيَّنَ وَحَلَّاهُ فَتَحَلَّى وَجَمَّلَهُ فَتَجَمَّلَ وغیرہ۔

لیکن جھوٹا دعوٰی نبوت کرنے والے کے حق میں متعارف ہونے کی وجہ سے سچے نبی کے حق میں اس کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے اور صرف مدعی کاذب کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:۔ تَنَبَّأَ مُسَيْلِمَةُ یعنی مسیلمہ نے جھوٹا دعوٰی نبوت کیا۔ پھر اس بات پر متنبہ کرنے کے لئے کہ اس کی خبریں منجانب اللہ نہیں ہوتی تھیں نبی کی تصغیر کر کے مُسَيْلِمَةُ نُبَيِّئٌ سُوءٍ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے اس کا کلام سن کر کہا تھا۔ وَاللهِ مَا خَرَجَ هٰذَا الْكَلَامُ مِنْ إِلٍّ کہ اللہ کی قسم یہ إِلٌّ یعنی اللہ کا کلام نہیں ہے۔ اَلنَّبْأَةُ پست اور خفی آواز۔

(ن ب ت)

اَلنَّبْتُ وَالنَّبَاتُ۔ ہر وہ چیز جو زمین سے اگتی ہے۔ اسے نَبْتٌ یا نَبَاتٌ کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ تنہ دار ہو جیسے درخت۔ یا بے تنہ جیسے جڑی بوٹیاں لیکن عرف میں خاص کر نبات اسے کہتے ہیں جس کے تنہ نہ ہو۔ بلکہ عوام تو جانوروں کے چارہ پر ہی نبات کا لفظ بولتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔ لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا (۷۸-۱۵) تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں۔

میں نبات سے مراد چارہ ہی ہے۔ لیکن یہ اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور نباتات، حیوانات اور انسان سب پر بولا جاتا ہے۔ اور اِنْبَاتٌ (افعال) کا لفظ ان سب چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا (۸۰-۲۷ تا ۳۱) پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاری۔ اور زیتون اور کھجوریں۔ اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارہ۔

فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (۲۷-۶۰) (ہم نے) پھر اس سے سرسبز باغ اگائے تمہارا کام تو نہ تھا۔ کہ تم ان کے درختوں کو اگاتے۔

يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ (۱۶-۱۱) اسی پانی سے وہ تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اگاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (۷۱-۱۷) اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔

کی تفسیر میں علمائے نحو نے لکھا ہے کہ یہاں نَبَاتًا مصدر من غیر بابہ ہے اور اِنْبَاتًا کی جگہ پر استعمال ہوا ہے[1]۔ دوسرے علماء کے نزدیک نَبَاتًا حال ہے۔ مصدر نہیں ہے اور اس سے متنبہ کیا ہے کہ انسان بھی ایک طرح سے نبات میں داخل ہے کیونکہ اس کی ابتدائی

---

[1] نسب الالوسی ہذا القول الی ابی حیان النحوی وجماعة من العلماء وعلی ہذا یکون نباتًا مصدرًا منصوبًا بالانبت روح المعانی (۲۹-۷۵) ۱۲ ن۔

نشأت بھی تراب ہی سے ہے۔ اور پھر وہ نبات ہی کی طرح بڑھتا ہے اگرچہ اس میں نبات سے کچھ زائد اوصاف پائے جاتے ہیں چنانچہ اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ (۴۰-۶۷) وہی تو ہے جس نے تم کو پہلے مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ بنا کر۔ اور آیت کریمہ:۔

وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (۳-۳۷) اور اسے اچھی طرح پرورش کیا۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

تَنبُتُ بِالدُّهْنِ (۲۳-۲۰) (یعنی زیتون کا درخت کہ) ...... روغن ...... لیے ہوئے اگتا ہے۔

میں باء تعدیۃ کے لئے نہیں ہے کیونکہ نَبَتَ خود فعل متعدی ہے۔ بلکہ حال کے لئے ہے اور تقدیر یہ ہے تَنبُتُ حَامِلَةً لِلدُّهْنِ یعنی وہ درخت اس حال میں اگتا ہے کہ روغن اس میں بالقوۃ موجود ہوتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے:۔

إِنَّ بَنِي فُلَانٍ لَنَابِتَةُ شَرٍّ کہ فلاں لوگ فساد کی جڑ ہیں۔ نَبَتَتْ فِيهِمْ نَابِتَةٌ۔ یعنی ان کی نئی پود جوان ہو گئی۔

(ن ب ذ)

اَلنَّبْذُ کے معنی کسی چیز کو در خور اعتناء نہ سمجھ کر پھینک دینے کے ہیں۔ اسی سے محاورہ مشہور ہے۔

نَبَذْتُهُ نَبْذَ النَّعْلِ الْخَلَقِ میں نے اسے پرانے جوتا کی طرح پھینک دیا۔ قرآن میں ہے:۔

لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (۱۰۴-۴) وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائیگا۔

فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ (۳-۱۸۷) تو انہوں نے اسے پس پشت پھینک دیا۔

یعنی انہوں نے اسے قابل التفات نہ سمجھا نیز فرمایا:۔

نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم (۲-۱۰۰) تو ان میں ایک فریق نے اس کو بے قدر چیز کی طرح پھینک دیا۔

فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ (۲۸-۴۰) تو ہم نے ان کو اور ان کے لشکر کو پکڑ لیا۔ اور دریا میں ڈال دیا۔

فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ (۳۷-۱۴۵) پھر ہم نے ان کو فراخ میدان میں ڈال دیا۔

لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ (۶۸-۴۹) تو وہ چٹیل میدان میں ڈال دیے جاتے۔

اور آیت کریمہ:۔

فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ (۸-۵۸) تو ان کا عہد انہی کی طرف پھینک دو (اور برابر کا جواب دو)

میں فَانبِذْ عَلَىٰ سَوَاءٍ کے معنی یہ ہیں کہ معاہدہ صلح سے دستبردار ہو جاؤ لہذا یہاں معاہدہ صلح سے دستبردار ہونے کے لئے مجازاً انبذ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔

فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ۔ وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ (۱۶-۸۶، ۸۷) تو ان کے کلام کو مسترد کر دیں گے اور ان سے کہیں کے تم جھوٹے ہو۔ اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے

میں قول (اور متکلم) کے متعلق اِلْقَاءٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور آیت۔

فَانبِذْ الخ میں تنبیہ کیا ہے کہ (اس صورت میں) ان کے معاہدہ کو مزید مؤکد نہ کیا جائے۔ بلکہ حسن

معاملہ سے اسے فسخ کر دیا جائے اور ان کے رویہ کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے یعنی جب تک وہ معاہدہ کو قائم رکھیں اس کا احترام کیا جائے۔
فَانْتَبَذَ فُلَانٌ کے معنی اس شخص کی طرح یکسو ہو جانے کے ہیں جو اپنے آپ کو ناقابل اعتبار سمجھتا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا (۱۹-۲۳) اور وہ اس بچے کے ساتھ حاملہ ہو گئیں اور اسے لے کر ایک دور جگہ چلی گئیں۔
اور قَعَدَ نَبْذَةً وَنُبْذَةً کے معنی یکسو ہو کر بیٹھ جانے کے ہیں اور راستہ میں پڑے ہوئے بچے کو صَبِيٌّ مَنْبُوذٌ وَنَبِيذٌ کہتے ہیں۔ جیسا کہ اسے مَلْقُوطٌ یا لَقِيطٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ کسی نے اسے پھینک دیا ہے۔ اسے مَنْبُوذٌ کہا جاتا ہے۔ اور اٹھائے جانے کے لحاظ سے "لَقِيطٌ" کہا جاتا ہے۔
اَلنَّبِيذُ اصل میں انگور یا کھجور کو کہتے ہیں جو پانی میں ملائی گئی ہو۔ پھر خاص قسم کی شراب پر بولا جاتا ہے۔

(ن ب ز)

اَلنَّبَزُ کے معنی کسی کو بُرے نام کے ساتھ پکارنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹-۱۱) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

(ن ب ط)

اَلْاِسْتِنْبَاطُ کے معنی استخراج کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴-۸۳) اور اس کو پیغمبر اور اپنے سرداروں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کر لیتے۔
اور یہ اَنْبَطْتُ كَذَا سے استفعال کا صیغہ ہے جس کے اصل معنی پانی نکالنے کے ہیں اور کنواں کھودنے کے بعد جو پہلی دفعہ پانی نکالا جاتا ہے اسے نَبْط کہا جاتا ہے۔
فَرَسٌ اَنْبَطُ اسپ سفید بغل۔ اسی سے نَبَطٌ ایک مشہور قوم کا نام ہے۔

(ن ب ع)

اَلنَّبْعُ کے معنی چشمہ سے پانی پھوٹنے کے ہیں۔ اور یہ نَبَعَ الْمَاءُ يَنْبَعُ (ن) نُبُوْعًا وَنَبْعًا کا مصدر ہے اور اَلْيَنْبُوْعُ اس چشمہ کو کہتے ہیں جس سے پانی ابل رہا ہو اس کی جمع يَنَابِيْعُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ (۳۹-۲۱) کیا تم نے نہیں دیکھا۔ کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا ہے۔ پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا ہے۔
اَلنَّبْعُ ایک قسم کا درخت جس کی کمانیں بنتی ہیں۔

(ن ب و)

اَلنَّبِيُّ (بدون ہمزہ) کے متعلق بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہموز ہے لیکن اس میں ہمزہ متروک ہو چکا ہے۔ اور اس پر وہ مُسَيْلَمَةُ نُبَيُّ سُوْءٍ کے محاورہ سے استدلال کرتے ہیں۔

مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ نَبْوَۃٌ بمعنی رفعت سے مشتق ہے اور نبی کو نبی اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر معزز اور بلند اقدار کا حامل ہوتا ہے[1]۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۱۹-۵۷) اور ہم نے ان کو بلند درجات سے نوازا۔ کے مفہوم سے سمجھا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نَبِيٌّ (بدوں ہمزہ) (مہموز) سے ابلغ ہے کیونکہ ہر مُنْبَأٌ لوگوں میں بلند قدر اور صاحب مرتبہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے آنحضرت کو ازراہ بغض يَا نَبِيءَ اللهِ کہہ کر پکارا تو آپ نے فرمایا[2] (۱۲۵) لَسْتُ بِنَبِيءِ اللهِ وَلٰكِنْ نَبِيُّ اللهِ کہ میں نبیء اللہ نہیں ہوں بلکہ نَبِيُّ الله ہوں۔

اَلنُّبُوَّةُ وَالنَّبَاوَةُ کے معنی بلندی کے ہیں اسی سے محاورہ ہے۔ نَبَا بِفُلَانٍ مَكَانُهُ کہ اسے یہ جگہ راس نہ آئی۔ جیسا کہ قَضَّ عَلَيْهِ مَضْجَعُهُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بے چینی سے کروٹیں لینے کے ہیں۔ نَبَا السَّيْفُ عَنِ الضَّرِيبَةِ تلوار کا اچٹ جانا۔ پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر نَبَا بَصَرُهُ عَنْ كَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے کراہت کرنے کے ہیں۔

(ن ت ق)

نَتَقَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو کھینچ کر ڈھیلا کر دینے کے ہیں۔ جیسے نَتَقَ عُرَى الْحَبْلِ اس نے بوجھ کی گرہیں کھول دیں۔ قرآن میں ہے۔ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ (۷-۱۷۱) اور جب ہم نے ان کے سروں پر پہاڑ اٹھا کھڑا کیا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر کثیر الاولاد عورت کو اِمْرَءَةٌ نَاتِقٌ کہا جاتا ہے[3] اور اس عورت کے ساتھ تشبیہ دے کر زود آتش افروز چقماق کو بھی زَنْدٌ نَاتِقٌ کہتے ہیں۔

(ن ث ر)

نَثَرَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو بکھیرنے اور پراگندہ کر دینے کے ہیں۔ یہ نَثَرْتُهُ (ض) کا مصدر ہے۔ اور اِنْتَثَرَ (انفعال) کے معنی بکھر جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۸۲-۲) اور جب تارے جھڑ پڑیں۔ اور بہنی ہوئی زرہ کو نَثْرَةٌ کہا جاتا ہے۔ نَثَرَتِ الشَّاةُ بکری کا چھینک کر فضلہ باہر پھینکنا اور چھینک سے جو فضلہ ناک سے بہہ نکلتا ہے اسے بھی نَثْرَةٌ کہا جاتا ہے کبھی نَثْرَةٌ کا لفظ ناک پر بھی بولا جاتا ہے۔ اسی سے نَثْرَةٌ ایک ستارے کا نام ہے جسے اَنْفُ الْاَسَدِ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے:۔ طَعَنَهُ فَاَنْثَرَهُ اسے نیزہ مارا تو وہ ناک کے بل گر پڑا۔ اَلْاِسْتِنْثَارُ ناک میں پانی چڑھا کر جھاڑنا۔

---

[1] وفی الفائق ومنہ (نبوۃ) زعم ان اشتقاق النبی منہ وھو غیر مستقبل عند محققۃ اصحابنا ولا یعرج علیہ: ۲ ۲۶۲) [2] رواہ الحاکم فی المستدرک والحدیث غیر صحیح لان فی سندہ حمران من غلاۃ الشیعۃ ومما یدل علی ان الصحیح انہا بالہمزۃ قرء مہموزا فی السبعۃ [3] وفی الحدیث علیکم بالابکار فانہن اعذب افواہا وانتق ارحاما (انظر النہایۃ ۴ ۱۳ والفائق ۲۵ ۳)

(ن ج د)

اَلنَّجْدُ کے معنی بلند اور سخت جگہ کے ہیں۔
اور آیت کریمہ:
وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰-۱۰) اور اس کو (خیر وشر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔
میں نَجْدَيْنِ کا لفظ حق وباطل، صدق وکذب اور حسن وقبیح، قول وعمل کے لئے بطور مثال ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں راستے واضح کر دیئے ہیں جیسے فرمایا۔
اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ الآية (۷۶-۳) اور اسے رستہ بھی دکھایا۔
اَلنَّجْدُ (ایضًا) ایک علاقے کا نام ہے اور اَنْجَدَ کے معنی نجد کا قصد کرنے کے ہیں۔ اور رَجُلٌ نَجْدٌ وَنَجِيدٌ وَنَجِدٌ کے معنی مشہور طاقت ور اور بہادر آدمی کے ہیں۔ اور اِسْتَنْجَدَهُ فَاَنْجَدَنِيْ کے معنی ہیں میں نے اس سے فریاد کی تو اس نے بہادری اور قوت سے میری مدد کی اور کبھی اِسْتَنْجَدَ فُلَانٌ کے معنی قوی ہونا کے بھی آجاتے ہیں۔ اور تکلیف زدہ اور مغلوب آدمی کو مَنْجُوْدٌ کہا جاتا ہے۔ گویا وہ نَجْدَةٌ یعنی شدت میں گرفتار ہے۔
اَلنَّجْدُ (ایضًا) پسینہ۔ نَجَّدَهُ الدَّهْرُ کے معنی کسی کو قوی کر دینے کے ہیں۔ گویا وہ تجربہ حاصل کر کے قوی ہو گیا[1]۔
اسی سے فُلَانٌ اِبْنُ نَجْدَةِ كَذَا کا محاورہ ہے یعنی وہ اس کام میں ماہر ہے۔
اَلنِّجَادُ مکان کی آراستگی کا سامان یہ نَجْد کی جمع ہے۔
نَجَّادٌ۔ فرش ساز نیز آنچہ بستر و بالین دوزد۔
نِجَادُ السَّيْفِ تلوار لٹکانے کا پرتلہ۔
اَلنَّاجُوْدُ۔ شراب صاف کرنے کی صافی۔ راؤوق۔

(ن ج س)

اَلنَّجَاسَةُ کے معنی پلیدی کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔ نجاست حسی یا مادی جس کا ادراک حس سے ہو سکتا ہو۔ نجاست معنوی جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہو۔ چنانچہ نجاست معنوی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے متعلق فرمایا:۔
اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (۹-۲۸) مشرک تو پلید ہیں۔
نَجَّسَهُ کے معنی کسی چیز کو نجس کر دینا کے ہیں۔ نیز اس کے معنی ازالہ نجاست بھی آتے ہیں۔ اور اسی سے تَنْجِيْسُ الْعَرَبِ ہے یعنی تعویذ گنڈا۔ جو شیطانی نجاست کو دور کرنے کے لئے بچے کے گلہ میں لٹکاتے تھے۔
نَاجِسٌ وَنَجِيْسٌ۔ ایک بری اور لاعلاج بیماری

(ن ج م)

اَلنَّجْمُ اصل میں طلوع ہونے والے ستارے کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع نُجُوْمٌ آتی ہے۔ اور نَجَمَ (ن) نُجُوْمًا وَنَجْمًا کے معنی طلوع ہونے کے ہیں۔ نَجْمٌ کا لفظ کبھی اسم ہوتا ہے۔ اور کبھی مصدر اسی طرح نجوم کا لفظ کبھی قُلُوْبٌ وَجُيُوْبٌ کی طرح جمع ہوتا ہے اور

---

[1] وفي المثل "وانه لمنجذ البيان" ا/۲۹ .

کبھی طُلُوْعٌ وَ غُرُوْبٌ کی طرح مصدر اور تشبیہ کے طور پر سبزہ کے اگنے اور کسی رائے کے ظاہر ہونے پر بھی نَجَمَ النَّبْتُ اِذَا الْقَرْنُ وَنَجَمَ لِیْ رَأْیٌ نَجْمًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
نَجَّمَ فُلَانٌ عَلَى السُّلْطَانِ بادشاہ سے بغاوت کرنا۔ نَجَّمْتُ الْمَالَ عَلَيْهِ اس کے اصل معنی تو ستاروں کے طلوع کے لحاظ سے قرض کی قسطیں مقرر کرنے کے ہیں۔ مثلاً فلاں ستارے کے طلوع پر مال کی اتنی قسط ادا کرتا رہوں گا۔ مگر عرف میں مطلق اقساط مقرر کرنے پر بولا جاتا ہے قرآن میں ہے:
وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (۱۶-۱۶) اور لوگ ستاروں سے بھی رستے معلوم کرتے ہیں۔
فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ (۳۷-۸۸) تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی۔
یعنی علم نجوم سے حساب نکالا۔ اور آیت کریمہ:
وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳-۱) تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نجم سے مراد ستارہ ہے اور طَلَعَ کی بجائے هَوٰى کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے کہ طلوع کے معنی پر لفظ نجم ہی دلالت کر رہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نجم سے مراد ثریا یعنی پروین ہے کیونکہ اہل عرب جب مطلق اَلنَّجْمُ کا لفظ بولتے ہیں تو پروین ہی مراد ہوتی ہے جیسا کہ مقولہ ہے[1] (الرجز)

طَلَعَ النَّجْمُ غُدَيَّةً
وَابْتَغَى الرَّاعِيْ شُكَيَّةً

صبح کا ستارہ طلوع ہوا اور چرواہے نے اپنا مشکیزہ سنبھالا۔
بعض نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں النجم سے مراد نجوم القرآن ہیں۔ کیونکہ وہ بھی تدریجاً معین مقدار میں نازل ہوتا رہا ہے اور هَوٰى سے اس کا نزول مراد ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:
فَلَا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ (۵۶-۷۵) ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم۔
میں بھی مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ..... کی دو طرح تفسیر بیان کی گئی ہے۔ یعنی بعض نے مواقع النجوم سے مراد ستاروں کے منازل لئے ہیں اور بعض نے نجوم القرآن مراد لئے ہیں۔
اَلتَّنْجِيْمُ علم نجوم کے حساب سے کوئی پیش گوئی کرنا۔ اور آیت کریمہ:
وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (۵۵-۶) اور بوٹیاں اور درخت سجدے کر رہے ہیں۔
میں نجم سے بے تنہ نباتات یعنی جڑی بوٹیاں مراد ہیں اور بعض نے ستارے مراد لئے ہیں۔

(ن ج و)

اصل میں نَجَاءٌ کے معنی کسی چیز سے الگ ہونے کے ہیں۔ اسی سے نَجَا فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی نجات پانے کے ہیں۔ اور اَنْجَيْتُهُ وَ نَجَّيْتُهُ کے معنی نجات دینے کے چنانچہ فرمایا:۔
فَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲۷-۵۳) اور جو لوگ ایمان لائے ..... ان کو ہم نے نجات دی۔
اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ (۲۹-۳۳) ہم آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو بچا لیں گے۔

---

[1] انظر للکلمۃ المیدانی والبحر ۸/۱۵۷ والمرزوقی ۹۷۴ وامالی المعانی للقبتی عشاءۃ وکساءۃ بدل غدیۃ وشکیہ لغیر عزو۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۲-۴۹) جب ہم نے تم کو قوم فرعون سے مخلصی بخشی۔

فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۱۰-۲۳) لیکن جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ (۷-۸۳) تو ہم نے ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچالیا۔ مگر ان کی بی بی۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا (۷-۷۲) پھر ہم نے ہود اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے۔ ان کو نجات بخشی۔

نَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا (۳۷-۱۱۵) اور ان کو اور ان کی قوم کو ۔۔۔ نجات بخشی۔

نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ نِّعْمَةً (۵۴-۳۴) ان کو پچھلی رات ہی سے بچالیا اپنے فضل سے۔

وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۴۱-۱۸) اور جو ایمان لائے۔۔۔ ان کو ہم نے بچالیا۔

نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۱۱-۵۸) اور انہیں عذاب شدید سے نجات دی۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا (۱۰-۱۰۳) اور ہم اپنے پیغمبروں کو ۔۔۔ نجات دیتے رہے ہیں۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (۱۹-۷۲) پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے۔

اَلنَّجْوَةُ وَالنَّجَاةُ بلند جگہ، جو بلندی کی وجہ سے اپنے ماحول سے الگ معلوم ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ سیلاب کی زد سے محفوظ ہونے کی وجہ سے اسے نَجْوَةٌ یا نَجَاةٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے نَجَّيْتُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کو نَجْوَةٌ یعنی علیحدہ بلند جگہ پر چھوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ (۱۰-۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے۔

اور نَجَوْتُ کے معنی درخت یا بکری کا پوست اتارنا بھی آتے ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ ان دونوں معنی میں مشترک ہے۔ اسلئے شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۴۱۸) فَقُلْتُ انْجُوَا عَنْهَا نَجَا الْجِلْدِ اِنَّهٗ
سَيُرْضِيْكُمَا مِنْهَا سَنَامٌ وَغَارِبُهٗ

میں نے کہا کہ اس کا پوست اتارلو بے شک اس کی کوہان اور کندھے تمہارے لئے کافی ہوں گے۔

نَاجَيْتُهٗ کے معنی سرگوشی کرنے کے ہیں۔ مگر اس کے اصل معنی بلند زمین پر کسی کے ساتھ تنہا ہونے کے ہیں۔ بعض نے اسے نَجَاةٌ سے لیا ہے۔ لہٰذا نَاجَيْتُهٗ کے اصل معنی کسی معاملہ میں دوسرے کی رہائی کے لئے اس کی مدد کرنے کے ہیں یا اپنے بھید کو دوسروں پر افشا ہونے سے بچانے کے ہیں۔

تَنَاجَى الْقَوْمُ۔ لوگوں کا باہم سرگوشی کرنا۔ چنانچہ فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا

---

[1] البیت فی اللسان (نجا) جمع غیر منسوب والخزانۃ (۴: ۲۷۰ و ۲: ۲۲۷) والبیت من شواہد سیبویہ فی الکتاب والتنبیہات للبکری علی القالی واصلاح المنطق ۹۴ ونسبہ ابن البری لعبد الرحمن بن حسان بن ثابت لکنہ لابی الغمر الکلابی وکذا قال العینی ونسبہ الی العباب للصاغانی وشکن نقد علیہ صاحب الخزانۃ) والبیت مما اوردہ العلماء رشاہدًا علی انہ یجوز اضافۃ الشیء الی نفسہ اذا اختلف اللفظان فان النجا والجلد مترادفان وقد تضایفا (راجع الخزانۃ (۴: ۲۷۰-۲۷۲) وابن ولاد ۱۱۲ وذھب السیرافی فی شرح ابیات الاصلاح: ان النجا ھہنا بمعنی النجو منصوب علی انہ مفعول مطلق والبیت ایضًا فی امالی الزجاجی والتنبیہات لابی القاسم البصری (علی بن حمزہ) ۱۲

بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (۵۸-۹) مومنو! جب تم آپس میں سرگوشیاں کرنے لگو تو گناہ اور زیادتی اور پیغمبر کی نافرمانی کی باتیں نہ کرنا۔ بلکہ نیکوکاری اور پرہیزگاری کی باتیں کرنا۔

اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً (۵۸-۱۲) جب تم پیغمبر کے کانوں میں کوئی بات کہو تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ دیا کرو۔

اَلنَّجْوٰی۔ یہ اصل میں مصدر ہے جیسے فرمایا۔

اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ (۵۸-۱۰) (کافروں کی) سرگوشیاں تو شیطان (کی حرکات) سے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰی (۵۸-۸) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاَسَرُّوا النَّجْوَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (۲۱-۳) اور ظالم لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ میں نجوٰی کے ساتھ اَسَرُّوْا کا لفظ لاکر متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے ہر طرح سے اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ نجوٰی اگرچہ خفیہ ہوتا ہے لیکن کبھی قبل از وقت افشا ہو جاتا ہے نیز فرمایا۔

مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (۵۸-۷) (کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع اور) کانوں میں صلاح ومشورہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے۔

اور لفظ نجوٰی کبھی بطور صفت کے بھی آجاتا ہے اور واحد وجمع دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ۔ هُوَ نَجْوٰی وَهُمْ نَجْوٰی قرآن میں ہے: وَاِذْ هُمْ نَجْوٰی (۱۷-۴۷) اور جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں۔

اَلنَّجِیُّ کے معنی سرگوشی کرنے والے کے ہیں یہ بھی واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَقَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا (۱۹-۵۲) اور باتیں کرنے کیلئے نزدیک بلایا۔

فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا (۱۲-۸۰) جب وہ اس سے ناامید ہوگئے تو الگ ہوکر صلاح کرنے لگے۔

اِنْتَجَیْتُ فُلَانًا کسی کو رازدار بنانا۔

اَنْجٰی فُلَانٌ بلند زمین پر جانا۔

هُمْ فِیْ اَرْضٍ نَجَاةٍ۔ وہ ایسی سرزمین میں ہیں جس کے درختوں سے لاٹھیاں اور کمانیں بنائی جاتی ہیں۔ اور اَلنَّجَا اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کا پوست اتار دیا گیا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ نَجَوْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کے منہ کی بدبو سونگھنے کے ہیں۔ اور اس شعر سے استدلال کیا ہے (الوافر)

(۴۱۹) نَجَوْتُ مُجَالِدًا فَوَجَدْتُ مِنْهُ
كَرِیْحِ الْكَلْبِ مَاتَ حَدِیْثُ عَهْدٍ

تو بقول بعض اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے مجالد کے منہ کی بو سونگھی تو اس سے تازہ مرے ہوئے کتے کی سی بدبو پائی۔

میں کہتا ہوں کہ اگر وہ محض اس شعر کی بنا پر نجوتُ کے یہ معنی بیان کرتے ہیں تو یہ شعر ان کی دلیل نہیں

---

[1] فی اللسان (نجا) غیر منسوب والبیت للحکم بن عدل فی قصیدۃ ۴۴ بیتًا یھجو فیھا محمد بن حسان بن سعد کما فی الاغانی (۲: ۲-۱۴۱) و عیون الاخبار (۴: ۴۲) و فی البیت تحریف وان نقلہ ایضًا صاحب اللسان والصواب فی الروایۃ نجوت محمدًا بدل نجوت مجالدًا کما فی الحیوان (۱: ۲۵۱) فعلی ہذا لا غبار ۱۲

بن سکتا۔ کیونکہ شاعر کی مراد تو یہ ہے کہ میں نے مجالد سے سرگوشی کی تو مرض بخر کی وجہ سے اس کے منہ سے مجھے مردہ کتے کی سی بدبو آئی۔ اور کنایۃً کے طور پر نَجْوٌ کے معنی پاخانہ کے بھی آتے ہیں۔ محاورہ ہے:
شَرِبَ دَوَاءً فَمَا أَنْجَاهُ اس نے دوا پی لیکن شئی نہ آئی۔
اَلِاسْتِنْجَاءُ کے معنی استنجاء کرنے اور رفع حاجت کے لئے علیحدہ جگہ تلاش کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ تَغَوَّطَ کے معنی پست جگہ تلاش کرنے کے آجاتے ہیں کبھی استنجاء کے معنی ازالۂ نجاست کے لئے مٹی کا ڈھیلا تلاش کرنا بھی ہوتے ہیں۔ جیسے اِسْتَجْمَرَ۔ پتھر تلاش کرنا۔ اَلنَّجَاءَۃُ (بھمزہ) نظر بد لگانا۔ حدیث میں ہے[1]
اِدْفَعُوْا نَجَاءَۃَ السَّائِلِ بِاللُّقْمَۃِ۔ یعنی سائل کی حریصانہ نظر کو لقمہ سے دور کرو۔

(ن ح ب)

اَلنَّحْبُ۔ اس نذر کو کہتے ہیں جس کا پورا کرنا واجب ہو۔ محاورہ ہے:۔
قَضٰی فُلَانٌ نَحْبَہٗ یعنی فلاں نے اپنی نذر پوری کی۔ قرآن میں ہے:۔
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہوگئے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں (۳۳-۲۳)
مجازاً اس سے موت مراد لی جاتی ہے۔ جیسا کہ قَضٰی اَجَلَہٗ اور اسْتَوْفٰی اُکُلَہٗ اور قَضٰی مِنَ الدُّنْیَا حَاجَتَہٗ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں۔ اور ان سے موت مراد ہوتی ہے۔
اَلنَّحِیْبُ کے معنی گریہ زاری اور آواز کے ساتھ رونے کے ہیں۔ اور نُحَابٌ کھانسی کو کہتے ہیں۔

(ن ح ت)

نَحَتَ (ض) کے معنی لکڑی، پتھر یا اس قسم کی سخت چیزوں کو تراشنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔
وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ (۲۶-۱۴۹) اور تکلیف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر ۔۔۔ ۔۔۔ گھر بناتے ہو۔
نُحَاتَۃٌ تراشہ۔ وہ ریزے جو کاٹنے سے گریں۔ اور انسانی فطرت کو اس لحاظ سے کہ انسان کی ساخت اس کے مطابق بنائی گئی ہے نَحِیْتَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ انسان کے اندر پیوست کی گئی ہے غریزہ کہلاتی ہے۔

(ن ح ر)

اَلنَّحْرُ سینہ کا بالائی حصہ جہاں پر ہار پڑا رہتا ہے۔ نَحَرْتُہٗ کسی کے سینہ پر مارنا۔ اسی سے نَحْرُ الْبَعِیْرِ ہے جس کے معنی اونٹ کے سینہ پر برچھا مار کر اسے ذبح کرنے کے ہیں۔
اور عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں ہے۔
فَنَحَرُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (۲-۷۱) انہوں نے اس بیل کو ذبح کیا۔ اور وہ ایسا کرنے والے لگتے نہیں۔
پھر نَحْرُ الْبَعِیْرِ کی تشبیہ سے اِنْتَحَرُوْا عَلٰی کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز پر باہم لڑائی کرنے کے ہیں۔
نَحْرَۃُ الشَّھْرِ وَنَحِیْرُہٗ مہینہ کے پہلے دو دن

---

[1] انظر للحدیث الفائق ۲ر۳۶۵ وفیہ رُدُّوا بدل ادفعوا

اور تیسری رات کی مجموعی مدت۔

اور بقول بعض مہینے کے آخری دن کو بھی نَحِیْرَۃٌ کہا جاتا ہے۔ گویا وہ اپنے سے پہلے دنوں کو تحریر کر ڈالتا ہے۔ اور آیت کریمہ: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۱۰۸-۲) اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو۔

میں خاص کر ان ہر دو ارکان یعنی نماز اور قربانی ادا کرنے کی توکید کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں عبادتیں فرضی ہیں۔ اور ہر دین اور ہر دور میں یہ واجب رہی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں وَانْحَرْ کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے ہیں[1] (۱۲۶)

اور بعض نے کہا ہے کہ ریاضت کے ذریعہ نفس کشی مراد ہے۔

اَلنِّحْرِیْرُ کسی چیز کا ماہر و حاذق۔

(ن ح س)

اَلنُّحَاسُ۔ دھواں بغیر شعلہ کے آگ کی لپٹ۔ قرآن میں ہے:۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ (۵۵-۳۵) تم پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا۔

تو یہاں نُحَاس کے معنی آگ کی لپٹ کے ہیں۔ اور لپٹ کا رنگ چونکہ تانبے جیسا ہوتا ہے لہذا تشبیہًا نُحَاس کے معنی تانبا بھی آجاتے ہیں۔

اَلنَّحْسُ منحوس، یہ سعد کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے: فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۵۴-۱۹) سخت منحوس دن میں۔

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (۴۱-۱۶) ہم نے ان پر نحوست کے دنوں میں زور کی ہوا چلائی۔

اور ایک قرأت میں نَحْسَاتٍ بفتح الحاء ہے۔ جس کے معنی بعض نے منحوس اور بعض نے سخت سردی والے دنوں کے کئے ہیں۔ اصل میں نَحْسٌ کے معنی افق آسمان کے سرخ ہو کر نحاس کی طرح ہو جانے کے ہیں۔ اور یہ نحوست کے لئے ضرب المثل ہے۔

(ن ح ل)

اَلنَّحْلُ شہد کی مکھی۔ قرآن میں ہے:۔ وَأَوْحٰى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ (۱۶-۶۸) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا۔

اَلنُّحْلَةُ وَالنِّحْلَةُ اس عطیہ کو کہتے ہیں جو تبرعًا دیا جائے۔ یہ ہبہ سے خاص ہے۔ کیونکہ ہر ہبہ کو نِحْلَۃ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر نِحْلَہ کو ہبہ نہیں کہتے۔ میرے خیال میں یہ نَحْل سے مشتق ہے۔ اور اس میں مکھی کے فعل کے معنی ملحوظ ہیں۔ تو گویا نِحْلَةٌ کے معنی نَحْلٌ کی طرح عطیہ دینے کے ہیں جس پر کہ آیت:۔ وَأَوْحٰى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ الآیۃ میں متنبہ کیا ہے۔ حکماء کا بیان ہے کہ نحل جن پودوں سے غذا لیتی ہے۔ انہیں

---

[1] وفی السنن للبیہقی والتاریخ للبخاری منسوب الی علیؓ و انس ولکن قال صاحب الجوہری النقی ان ہذہ الروایۃ مضطربۃ ورواية انس غیر صحیحۃ وقال ابن کثیر والصحیح ان المراد منہ الذبیحۃ وقال الجصاص ہو معناہ الحقیقی الذی یفہم عند الاطلاق (احکام القرآن ۳ / ۵۱۵)

کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ الٹا فائدہ پہنچاتی ہے۔ اور شہد جیسی شفا بخش چیز لوگوں کو حاصل کر کے دیتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق بیان فرمایا ہے۔

اور نِحْلَةً وَ نُحْلَةً صداق یعنی عورتوں کے مہر کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے مقابلہ میں سوائے لذت اندوزی کے اور کوئی مالی معاوضہ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی سے اولاد کو عطیہ دینے پر نَحَلَ اِبْنَهُ كَذَا وَ اَنْحَلَهُ بولتے ہیں۔ اور اسی سے نَحَلْتُ الْمَرْأَةَ ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (۴-۴)

اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دیدیا کرو۔

اور نَحَلَ جِسْمُهُ کے معنی دبلا ہو کر مکھی کی طرح باریک ہو جانے کے ہیں۔ اور اسی سے تیز تلواروں کو ان کی دھاروں کے باریک ہونے کی وجہ سے نَوَاحِلُ کہا جاتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نِحْلَةٌ کو اصل قرار دے کر نَحْل کو اس سے مشتق مانا جائے۔ کیونکہ مکھی سے جو شہد حاصل ہوتا ہے وہ بھی فائدہ بخش ہونے کے لحاظ سے ایک قسم کی عطا ہی ہوتی ہے۔

اَلْاِنْتِحَالُ کے معنی کسی چیز کا ادعا کرنے اور لینے کے ہیں اسی سے فُلَانٌ يَنْتَحِلُ الشِّعْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی شعری سرقہ کرنے کے ہیں۔ واللہ اعلم۔

نَحْنُ

نَحْنُ (ہم) اسے ضمیر متکلم مع الغیر کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق نَحْنُ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (۱۲-۳)

اے پیغمبر ہم تمہیں ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔

اس کی تاویل میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد تو ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن شاہی خطابات کی طرح صیغہ جمع استعمال کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے ذات باری تعالیٰ اپنے متعلق اس قسم کے الفاظ ان افعال کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔ جو بواسطہ ملائکہ یا اولیاء اللہ کے سرانجام پاتے ہیں تو نَحْنُ سے مراد اللہ تعالیٰ اور وہ فرشتے یا اولیاء کرام ہوتے ہیں جن کے ذریعہ وحی مومنین کی نصرت کفار کی ہلاکت اور اس قسم کے دیگر افعال سرانجام پاتے ہیں۔ جن کا ذکر کہ آیت:۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۷۹-۵) پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔

میں پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر آیت کریمہ:۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ (۵۶-۸۵) اور ہم اس مرنے والے سے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔

میں نَحْنُ سے حالت نزع کے وقت حاضر ہونے والے فرشتے مراد ہوں گے۔ جن کا ذکر کہ آیت:۔

تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۱۶-۲۸) میں پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ قرآن پاک کا نزول بھی قلم، لوح محفوظ اور جبریل کی وساطت سے ہوا ہے۔ لہٰذا آیت کریمہ:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (۱۵-۹) بے شک

یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے۔
یہیں بھی تَنۡزِیۡل کو بصیغہ جمع ذکر فرمایا ہے۔

(ن خ ر)

نَخِرَۃٌ۔ بوسیدہ۔ قرآن میں ہے:۔
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (۷۹-۱۱) بھلا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے۔
یہ نَخِرَتِ الشَّجَرَۃُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی تیز ہوا چلنے سے بوسیدہ درخت میں آواز پیدا ہونے کے ہیں۔
اور اَلنَّخِیۡرُ خراٹے کی آواز جو نیند کی حالت میں ناک سے نکلتی ہے۔ اور ناک کے دونوں نتھنوں کو جن سے آواز نکلتی ہے نُخۡرَتَانِ یا مَنۡخَرَیۡنِ کہتے ہیں۔
اَلنَّخُوۡرُ۔ وہ اونٹنی کہ جب تک اس کے نتھنوں میں انگلی ڈال کر سہلایا نہ جائے دودھ نہ دے۔
اَلنَّاخِرُ۔ خراٹے بھرنے والے آدمی کو نَاخِرٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے محاورہ ہے:۔
مَا بِالدَّارِ نَاخِرٌ گھر میں کوئی نہیں رہا۔

(ن خ ل)

اَلنَّخۡلُ۔ کھجور کا درخت۔ یہ واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ (۶۹-۷) جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔
كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ (۲۶-۱۴۸) اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہوتے ہیں۔

وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ (۵۰-۱۰) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔
اس کی جمع نَخِیۡل آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَمِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِيۡلِ (۱۶-۶۷) اور کھجور کے میووں سے بھی۔
اَلنَّخۡلُ (مصدر) کے معنی چھانی سے آٹا چھاننے کے ہیں۔ اور اِنۡتَخَلۡتُ الشَّیۡءَ کے معنی عمدہ چیز منتخب کر لینے کے۔

(ن د د)

نَدِیۡدُ الشَّیۡءِ۔ وہ جو کسی چیز کی ذات یا جوہر میں اس کا شریک ہو اور یہ مماثلت کی ایک قسم ہے کیونکہ مثل کا لفظ ہر قسم کی مشارکت پر بولا جاتا ہے۔ اس بناء پر ہر نِدٌّ کو مِثۡلٌ کہہ سکتے ہیں لیکن ہر مِثۡلٌ نِدٌّ نہیں ہوتا۔
اور نِدٌّ، نَدِیۡدٌ، نَدِیۡدَۃٌ تینوں ہم معنی ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا (۲-۲۲) پس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔
وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا (۲-۱۶۵) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر خدا کو شریک خدا بناتے ہیں۔
وَتَجۡعَلُوۡنَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا (۴۱-۹) اور بتوں کو اس کا مدمقابل بناتے ہو۔
اور ایک قراءت میں يَوۡمَ التَّنَادِّ (۴۰-۳۲) تشدید دال کے ساتھ ہے۔ اور یہ نَدَّ یَنِدُّ سے مشتق ہے جس کے معنی دور بھاگنے کے ہیں اور قیامت کے روز بھی چونکہ لوگ اپنے

قرابتداروں سے دور بھاگیں گے جیسا کہ آیت کریمہ
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ میں مذکور ہے اس
لئے روز قیامت کو يَوْمَ التَّنَادِ بتشدید الدال
کہا گیا ہے۔

(ن د م)

اَلنَّدْمُ وَالنَّدَامَةُ کے معنی فوت شدہ
امر پر حسرت کھانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ (۵-۳۱) پھر وہ
پشیمان ہوا۔
عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ (۲۳-۴۰)
تھوڑے ہی عرصے میں پشیمان ہو کر رہ جائینگے۔
اس کے اصل معنی حزن کا ندیم بن جانے کے
ہیں۔ اور نَدِيْمٌ نُدْمَانٌ اور مُنَادِمٌ تینوں
قریب المعنی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مُنَادَمَةٌ
اور مُدَاوَمَةٌ دونوں قریب المعنی ہیں۔ اور
بقول بعض ادہم پیالہ (شراب نوش) کو ندیم اسلئے کہا جاتا ہے
کہ انجام کار وہ اپنے فعل پر پشیمان ہوتے ہیں۔

(ن د ی)

اَلنِّدَآءُ کے معنی آواز بلند کرنے کے
ہیں اور کبھی نفس آواز پر بھی یہ لفظ بولا جاتا
ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
.... مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ
الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً
(۲-۱۷۱) جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس
شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے
جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔
میں نداء سے مراد آواز اور پکار ہے یعنی وہ
چوپائے صرف آواز کو سنتے ہیں۔ اور اس کلام
سے جو مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ اسے ہرگز نہیں
سمجھتے۔ اور کبھی اس کلام کو جس سے کوئی معنی
مفہوم ہوتا ہو اسے نِدَاءٌ کہہ دیتے ہیں۔
چنانچہ قرآن میں ہے۔
وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰى (۲۶-۹) اور جب
تمہارے پروردگار نے موسیٰ کو پکارا۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (۵-۵۸) اور جب
تم لوگ نماز کے لئے اذان دیتے ہو۔
میں نماز کے لئے اذان دینا مراد ہے۔ اسی
طرح آیت کریمہ:۔
اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ
(۶۲-۹) جب جمعے کے دن نماز کے لئے
اذان دی جائے۔
میں بھی نداء کے معنی نماز کی اذان دینے کے ہیں۔
اور شریعت میں نِدَاءُ الصَّلٰوةِ (اذان) کے
لئے مخصوص اور مشہور کلمات ہیں اور آیت کریمہ:۔
اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ۔
(۴۱-۴۴) ان کو گویا دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے:۔
میں ان کے متعلق نداء کا لفظ استعمال کر کے
متنبہ کیا ہے کہ وہ حق سے بہت دور جا چکے
ہیں۔ نیز فرمایا۔
وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ
(۵۰-۴۱) اور سنو جس دن پکارنے والا نزدیک
کی جگہ سے پکارے گا۔
وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ (۱۹-۵۲)
اور ہم نے ان کو طور کے ذہنی جانب سے پکارا۔
فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ (۲۷-۸) جب موسیٰ ان

ان کے پاس آئے تو ندا آئی۔ اور آیت کریمہ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا (۱۹-۳) جب انہوں نے اپنے پروردگار کو دبی آواز سے پکارا۔ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق نادٰی کا لفظ استعمال کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زکریا علیہ السلام نے اپنے گناہ اور احوال سیئہ کے باعث اس وقت اپنے آپ کو حق اللہ تعالیٰ سے دور تصور کیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے کی حالت ہوتی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ (۳-۱۹۲) اے پروردگار ہم نے ایک ندا کرنے والے کو سنا۔ جو ایمان کے لئے پکار رہا تھا۔ میں منادی کا لفظ عقل، کتاب منزل، رسول مرسل اور ان آیات الہیہ کو شامل ہے جو ایمان باللہ کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان چیزوں کو مُنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ندا کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ اور وہ پکارنے والے کی طرح ایمان لانے کی طرف دعوت دے رہی ہیں۔

اصل میں نِدَاءٌ نَدًی سے ہے جس کے معنی رطوبت نمی کے ہیں۔ اور صَوْتٌ نَدِیٌّ کے معنی بلند آواز کے ہیں۔ اور آواز کے لئے نداء کا استعارہ اس بنا پر ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہوگی اس کی آواز بھی بلند اور حسین ہوگی اسی سے بہ فصیح شخص کو کثرت ریق کے ساتھ متصف کرتے ہیں اور نَدًی کے معنی مجلس کے بھی آتے ہیں اس کی جمع اَنْدَاءٌ وَ اَنْدِیَۃٌ آتی ہے۔

اور مدحت کو بھی نَدًی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ نمی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ تَسْمِیَۃُ الْمُسَبَّبِ بِاِسْمِ السَّبَبِ کے قبیل سے ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الرجز)

(۴۲۰) کَالْکَرْمِ اِذْ نَادٰی مِنَ الْکَافُوْرِ جیسا کہ انگور کا خوشہ غلاف (پردہ) سے ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ منادی کرنے والے کی آواز ہوتی ہے۔

کبھی ندا سے مراد مجالست بھی ہوتی ہے۔ اس لئے مجلس کو اَلنَّادِیْ وَالْمُنْتَدٰی وَالنَّدِیُّ کہا جاتا ہے۔ اور نادی کے معنی ہم مجلس کے بھی آتے ہیں قرآن میں ہے:۔

فَلْیَدْعُ نَادِیَہٗ (۹۶-۱۷) تو وہ اپنے یاران مجلس کو بلا لے۔

اور اسی سے شہر مکہ میں ایک مقام کا نام دَارُ النَّدْوَۃِ ہے۔ کیونکہ اس میں مکہ کے لوگ جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور کبھی نَدًی سے مراد سخاوت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ اَنْدٰی کَفًّا مِّنْ فُلَانٍ وہ فلاں سے زیادہ سخی ہے۔

ھُوَ یَتَنَدّٰی عَلٰی اَصْحَابِہٖ۔ وہ اپنے ساتھیوں پر بڑا فیاض ہے۔

مَا نَدِیْتُ بِشَیْءٍ مِّنْ فُلَانٍ۔ میں نے فلاں سے کچھ سخاوت حاصل نہ کی۔

مُنَدِّیَاتُ الْکَلِمِ۔ رسوا کن باتیں، مشہور ہو جائیں۔

---

[1] قد مر تخریجہ فی (ک ن ر)

(ن ذ ر)

اَلنَّذْرُ کے معنی کسی حادثہ کی وجہ سے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کرلینے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

نَذَرْتُ لِلّٰہِ نَذْرًا میں نے اللہ کے لئے نذر مانی قرآن میں ہے:۔

اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا (۱۹-۲۶) میں نے خدا کے لئے روزے کی نذر مانی ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ (۲-۲۷۰) اور تم خدا کی راہ میں جس طرح کا خرچ کردیا کرو یا کوئی نذر مانو۔

اَلْاِنْذَارُ کے معنی کسی خوفناک چیز سے آگاہ کرنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل تَبْشِیْرٌ کے معنی کسی اچھی بات کی خوشخبری سنانیکے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (۹۲-۱۴) سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کردیا۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱-۱۳) میں تم کو ایسے چنگھاڑ (کے عذاب) سے آگاہ کرتا ہوں۔ جیسے عاد اور ثمود پر چنگھاڑ (کا عذاب) آیا تھا۔

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ (۴۶-۲۱) اور (قوم) عاد کے بھائی (ہود) کو یاد کرو کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں (ہدایت کی اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ۔ (۴۶-۳) اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی ہے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (۴۲-۷) یعنی مکہ کے رہنے والوں اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں ان کو راستہ دکھاؤ۔ وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ (۴۲-۷) اور انہیں قیامت کے دن کا بھی ... خوف دلاؤ۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ (۳۶-۶) تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو متنبہ نہ کیا گیا تھا۔ متنبہ کردو۔

اَلنَّذِیْرُ کے معنی مُنْذِرٌ یعنی ڈرانے والا ہیں۔ اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے۔ جس میں خوف پایا جائے۔ خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۴۶-۹) اور میرا کام تو علانیہ ہدایت کرنا ہے۔

وَجَآءَكُمُ النَّذِیْرُ (۳۵-۳۷) اور تمہارے پاس ڈرانیوالا بھی آیا۔

نَذِیْرًا لِّلْبَشَرِ (۷۴-۳۶) اور بنی آدم کے لئے موجب خوف ہے۔

اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۱۱-۲۵) میں تم کو کھول کھول کر ڈر سنانے والا آیا ہوں۔

اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ (۱۵-۸۹) کہ میں تو علانیہ ڈر سنانے والا ہوں۔

اور نَذِیْرٌ کی جمع نُذُرٌ آتی ہے جیسے فرمایا۔ هٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (۵۳-۵۶) یہ (محمد) بھی اگلے ڈر سنانے والوں میں سے ایک ڈر سنانے والے ہیں۔ یعنی انہی کی جنس سے ہے جن کے ساتھ پہلے لوگوں کو ڈرایا گیا۔ نیز فرمایا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ (۵۴-۲۳) ثمود نے بھی ہدایت کرنے والوں کو جھٹلایا۔
وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ (۵۴-۴۱) اور قوم فرعون کے پاس بھی ڈر سنانے والے آئے۔
فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (۵۴-۱۶) سو دیکھ لو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا۔
نَذَرْتُ کسی چیز کو جان کر اس سے چوکس رہنے کے ہیں۔

(ن ز ع)

نَزَعَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو اس کی قرارگاہ سے کھینچنے کے ہیں۔ جیسا کہ کمان کو درمیان سے کھینچا جاتا ہے اور کبھی یہ لفظ اعراض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور محبت یا عداوت کے دل سے کھینچ لینے کو بھی نَزْعٌ کہا جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے :۔
وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷-۴۳) اور جو کینے ان کے دلوں میں ہوں گے۔ ہم سب نکال ڈالیں گے۔
اِنْتَزَعْتُ اٰیَةً مِّنَ الْقُرْاٰنِ فِیْ كَذَا۔ آیت کو کسی واقعہ میں بطور مثال کے پیش کرنا۔
نَزَعَ فُلَانٌ كَذَا کے معنی کسی چیز کو چھین لینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (۳-۲۶) اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔ اور آیت کریمہ :۔
وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۷۹-۱) ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نَازِعَات سے مراد فرشتے ہیں جو روحوں کو جسموں سے کھینچتے ہیں۔

اور آیت کریمہ :۔
اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ تَنْزِعُ النَّاسَ (۵۴-۱۹، ۲۰) ہم نے ان پر سخت منحوس دن میں آندھی چلائی وہ لوگوں کو اس طرح اکھیڑ ڈالتی تھی۔
میں تَنْزِعُ النَّاسَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہوا اپنی تیزی کی وجہ سے لوگوں کو ان کے ٹھکانوں سے نکال باہر پھینک دیتی تھی بعض نے کہا ہے کہ لوگوں کی روحوں کو ان کے بدنوں سے کھینچ لینا مراد ہے۔
اَلتَّنَازُعُ وَالْمُنَازَعَةُ باہم ایک دوسرے کو کھینچنا اس سے مخاصمت اور مجادلہ یعنی باہم جھگڑا کرنا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ۔ قرآن میں ہے :۔
فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ (۴-۵۹) اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو رجوع کرو۔
فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ (۲۰-۶۲) تو وہ باہم اپنے معاملے میں جھگڑنے لگے۔
اَلنَّزْعُ عَنِ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز سے رک جانے کے ہیں۔ اور اَلنُّزُوْعُ سخت اشتیاق کو کہتے ہیں۔
وَنَازَعَتْنِیْ نَفْسِیْ اِلٰی كَذَا نفس کا کسی طرف کھینچ کر لے جانا کسی کا اشتیاق غالب آجانا۔
اَنْزَعَ الْقَوْمُ۔ اونٹوں کا اپنے وطن کا مشتاق ہونا۔
رَجُلٌ اَنْزَعُ کے معنی سر کے بال جھڑ جانا کے ہیں۔ اور نَزَعَةٌ سر کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سے بال جھڑ جائیں۔ اور تانیث کے لئے نَزْعَاءُ کی بجائے زَعْرَاءُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
بِئْرٌ نَزُوْعٌ۔ کم گہرا کنواں جس سے ہاتھ کے

ذریعہ بغیر رسی کے پانی نکالا جا سکے۔
شَرَابٌ طَيِّبُ الْمَنْزَعَةِ لذیذ شراب کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اسی معنی میں قرآن نے خِتَامُهٗ مِسْكٌ کا محاورہ استعمال کیا ہے۔

(ن ز غ)

اَلنَّزْغُ۔ کے معنی کسی کام کو بگاڑنے کے لیے اس میں دخل انداز ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ۔ (۱۲۔۱۰۰) اور اس کے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا۔

(ن ز ف)

نَزَفَ الْمَآءَ کے معنی کنویں سے تدریجاً سارا پانی کھینچ لینے کے ہیں۔ اور بِئْرٌ نَزُوْفٌ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کا پانی خشک ہو گیا ہو۔
نُزْفَةٌ چلو بھر پانی۔ اس کی جمع نُزَفٌ آتی ہے۔
نُزِفَ دَمُهٗ اَوْ دَمْعُهٗ خون یا آنسوؤں کا کلیتہً نکل جانا۔ اسی سے سَكْرَانٌ نَزِيْفٌ ہے جس کے معنی بدمست کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ (۵۶۔۱۹) اس سے نہ تو سر میں درد ہو گا اور نہ ان کی عقلیں ضائع ہوں گی۔
ایک قرأت میں يُنْزِفُوْنَ ہے جو کہ اَنْزَفُوْا (افعال) سے ہے۔ جس کے معنی شراب کے ختم ہونے یا عقل کے ضائع ہو جانے کے ہیں۔ اصل میں یہ اَنْزَفُوْا سے ہے جس کے معنی کنویں کا پانی ختم ہو جانے کے ہیں اور اَنْزَفْتُ الشَّيْءَ میں نَزَفْتُهٗ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔
نَزَفَ الرَّجُلُ فِي الْخُصُوْمَةِ جھگڑے میں دلیل سے خاموش ہو جانا۔ مثل مشہور ہے۔
هُوَ اَجْبَنُ مِنَ الْمَنْزُوْفِ ضَرِطًا وہ منزوف سے بھی زیادہ بزدل ہے۔

(ن ز ل)

اَلنُّزُوْلُ (ض) اصل میں اس کے معنی بلند جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
نَزَلَ عَنْ دَابَّتِهٖ وہ سواری سے اتر پڑا۔
نَزَلَ فِيْ مَكَانِ كَذَا کسی جگہ پر ٹھہرنا۔
اَنْزَلَ (افعال) اتارنا۔ قرآن میں ہے:۔
اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ (۲۳۔۲۹) ہم کو مبارک جگہ اتاریو اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔
نَزَّلَ۔ بِكَذَا وَاَنْزَلَهٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر عذاب یا نعمتوں کے نازل کرنے سے ان کا وقوع یا عطا کرنا مراد ہوتا ہے اور یہ یا تو بعینہ اس چیز کے نازل کرنے کے ذریعہ ہوتا ہے مثلاً قرآن پاک کا نازل فرمانا اور یا ان چیزوں کے اسباب پیدا کر کے ان کی طرف ہدایت کر دینے کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ لوہا، لباس اور اس قسم کی دوسری چیزوں کا اتارنا ہے۔ چنانچہ انعامات کے نازل کرنے کے متعلق فرمایا:۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ۔ (۱۸۔۱) سب تعریف خدا ہی کو ہے جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر یہ کتاب نازل کی۔
اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۴۲۔۱۷) خدا

ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔
وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (۵۷-۲۵) اور لوہا پیدا کیا۔
اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِیْزَانَ (۵۷-۲۵)
اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (یعنی قواعد عدل)
وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ
(۳۹-۵) اور اسی نے چار پایوں میں سے آٹھ
جوڑے بنائے۔
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا (۲۵-۴۸)
اور ہم آسمان سے پاک اور (ستھرا ہوا) پانی
برساتے ہیں۔
وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا (۷۸-۱۴)
اور نچڑے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔
قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ
(۷-۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا
ستر ڈھانکے۔
اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (۵-۱۱۴)
ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔
اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ
(۲-۹۰) خدا جس پر چاہتا اپنی مہربانی سے نازل
فرماتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰۤی اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ (۲۹-۳۴)
ہم اس بستی کے رہنے والوں پر اس سبب
سے کہ یہ بدکاری کرتے ہیں۔ آسمان سے عذاب
نازل کرنے والے ہیں۔
عذاب کے متعلق اِنْزَالٌ کا لفظ استعمال ہوا
ہے۔ قرآن اور فرشتوں کے نازل کرنے کے
متعلق اِنْزَال اور تَنْزِیْل: دونوں لفظ استعمال
ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے

کہ تَنْزِیْل کے معنی ایک چیز کو مَرَّةً بعد اُخریٰ
اور متفرق طور پر نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔
اور اِنْزَال کا لفظ عام ہے۔ جو ایک ہی دفعہ
مکمل طور پر کسی چیز کو نازل کرنے پر بھی بولا جاتا
ہے۔ چنانچہ وہ آیات ملاحظہ ہو جہاں تَنْزِیْل
کا لفظ استعمال ہوا ہے۔
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ (۲۶-۱۹۳) اس
کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔
ایک قرارت میں نَزَّلَ ہے۔
نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا (۱۷-۱۰۶) اور ہم نے اس
کو آہستہ آہستہ اتارا۔
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (۱۵-۹) بیشک یہ
(کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے۔
لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ . . . . .
(۲۵-۳۲) کہ اس پر قرآن ایک ہی بار کیوں
نہیں اتارا گیا۔
وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰی بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ (۲۶-۱۹۸)
اور اگر ہم اس کو کسی غیر اہل زبان پر اتارتے۔
اور اِنْزَال کے متعلق فرمایا۔ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ
سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ (۹-۲۶)
پھر خدا نے اپنے پیغمبر پر اور مومنوں پر اپنی طرف
سے تسلی نازل فرمائی۔ اور (تمہاری مدد کو فرشتوں
کے لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے آسمان
سے اتارے۔ اور آیت کریمہ:۔
لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ
مُّحْكَمَةٌ . . . . . (۴۷-۲۰) کہ جہاد کی کوئی سورت
کیوں نازل نہیں ہوئی؟ لیکن جب کوئی صاف
معنوں کی سورت نازل ہو۔
میں پہلی بار نُزِّلَ اور دوسری بار اُنْزِلَ کا لفظ

ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ منافقین کا مطالبہ تو یہ تھا کہ یکے بعد دیگرے جہاد کے احکام نازل ہوں تاکہ وہ انہیں سرانجام دے سکیں لیکن جب انہیں صرف ایک مرتبہ ہی جہاد کا حکم دیا گیا۔ تو وہ کنارہ کش ہو گئے اور اس کی تعمیل نہ کی پس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مطالبہ تو بہت سے احکام کے نازل ہونے کا کرتے تھے۔ مگر ایک حکم بھی بجا نہیں لاتے۔

اور آیات کریمہ:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (۴۴-۳) ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ۔ (۲-۱۸۵) روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے۔ جس میں قرآن اول اول نازل ہوا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷-۱) ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔ میں تَنْزِیْل کا لفظ ترک کرکے خاص کر اِنْزَال کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے (۱۲۷) اِنَّ الْقُرْاٰنَ نَزَلَ دَفْعَةً وَّاحِدَةً اِلٰی سماء الدنیا ثم نزل نجماً فنجماً۔ کہ قرآن پاک ایک ہی دفعہ آسمان دنیا پر نازل کیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ اور آیت کریمہ:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۹-۹۸)۔

دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق اور اس قابل ہیں کہ جو احکام شریعت خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں۔ ان سے واقف ہی نہ ہوں۔ میں عام معنی لینے کی غرض سے خاص کر اِنْزَال کا لفظ لایا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اِنْزَال تَنْزِیْل سے عام ہے۔ اور آیت کریمہ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ (۵۹-۲۱) اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے۔ میں نَزَّلْنَا کی بجائے اَنْزَلْنَا کا لفظ لا کر متنبہ کیا ہے کہ جو کتاب ہم نے تم پر مرات میں نازل کی ہے۔ اگر اسے پہاڑ پر ایک دفعہ بھی نازل کر دیتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے وہ دبا جاتا ہے اور آیت کریمہ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكُمْ ذِكْرًا ۙ رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ (۶۵-۱۰، ۱۱) خدا نے تمہارے پاس نصیحت کی کتاب بھیجی ہے۔ اور اپنے پیغمبر بھی بھیجے ہیں۔ جو تمہارے سامنے ..... پڑھتے ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اِنْزَالِ ذکر سے آنحضرت کی بعثت مراد ہے۔ اور آپ کو لفظ "ذِکْر" سے موسوم کرنا ایسے ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "كَلِمَة" سے موسوم کیا گیا ہے لہذا اس تفسیر کی بنا پر رَسُوْلًا کا لفظ ذِكْرًا سے بدل الکل ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رسول کا ذکر ہے۔ تو اس صورت میں رَسُوْلًا کا لفظ ذِكْرًا کا مفعول ہوگا۔ اور تَنَزَّل کا لفظ بھی نَزَلَ بِهٖ کی طرح رصلہ بار

---

(۱۲۷) رواہ ابن ابی حاتم وابن مردویہ عن ابن عباس (ابن کثیر ۱/۲۱۶) وفی مجمع الزوائد ۷/۱۴۰ ورجال البزار رجال الصحیح فی اسناد الطبرانی عمرو بن عبد الغفار وہو ضعیف لکن لفظہ انزل القرآن جملۃ واحدۃ حتی وضع فی بیت العزۃ فی السماء الدنیا ونزلہ جبرئیل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بجواب کلام العباد واعمالہم ۱۲

کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
نَزَلَ الْمَلَكُ بِكَذَا وَتَنَزَّلَ بِهِ فرشتہ اسے لے کر اترا۔ مگر یہ محاورہ باری تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے:۔
نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (۲۶-۱۹۳) اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔ نیز فرمایا۔
تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ (۹۷-۴) اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لئے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں۔
وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ (۱۹-۶۴) کہ ہم تمہارے پروردگار کے حکم کے سوا اتر نہیں سکتے۔
يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ (۶۵-۱۲) ان میں خدا کے حکم اترتے رہتے ہیں۔
اور جو کلام افترا اور جھوٹ ہو یا شیاطین کی طرف سے القاء کیا گیا ہو اس کے متعلق صرف تَنَزُّلٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ (۲۶-۲۱۰) اور اس قرآن کو شیطان لے کر نازل نہیں ہوئے۔
عَلَى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ الآية (۲۶-۲۲۱-۲۲۲) کہ شیطان کس پر اترتے ہیں (ہر گنہگار جھوٹے پر)
اَلنُّزُلُ (طعام مہمانی) وہ کھانا جو آنے والے مہمان کے لئے تیار کیا جائے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَى نُزُلًا (۳۲-۱۹) ان کے رہنے کے لئے باغ ہیں یہ مہمانی۔

نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللهِ (۳-۱۹۸) یہ خدا کے ہاں سے ان کی مہمانی ہے۔
اور دوزخیوں کے متعلق فرمایا:۔
لَآكِلُونَ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زَقُّومٍ إِلَى قَوْلِهِ هَذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ (۵۶-۵۲-۵۶) جزا کے دن یہ ان کی ضیافت ہوگی۔
فَنُزُلٌ مِنْ حَمِيمٍ (۵۶-۹۳) (تو اس کیلئے کھولتے پانی کی ضیافت ہے۔
اَنْزَلْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کی مہمانی کرنے کے ہیں اور نَازِلَةٌ مصیبت اور سختی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع نَوَازِلُ آتی ہے۔
اَلنِّزَالُ (مصدر مفاعلہ) کے معنی دو گروہوں کا باہم لڑنے کے لئے میدان جنگ میں اترنے کے ہیں۔ اور نَزَلَ فُلَانٌ کے معنی مقام منیٰ میں اترنا بھی آتے ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)
(۴۲۸) أَنَازِلَةٌ أَسْمَاءُ أَمْ غَيْرُ نَازِلَةٍ
کیا اسماء میدان منیٰ میں فروکش ہوگی یا نہیں۔
اَلنِّزَالَةُ وَالنُّزْلُ کنایۃً مرد کے مادہ منویہ کو کہتے جب کہ وہ خارج ہو چکا ہو۔ اور طَعَامٌ نُزُلٌ یا ذُو نُزُلٍ کے معنی پاکیزہ اور بابرکت طعام کے ہیں۔ پھر طعام نُزُل کے ساتھ تشبیہ کے طور پر نَزَلٌ کے معنی جمع ہونے کی جگہ یا فرودگاہ کے بھی آتے ہیں۔

(ن س ء)

اَلنَّسْءُ کے معنی کسی چیز کو اس کے وقت سے مؤخر کر دینے کے ہیں۔ اور اسی سے نُسِئَتِ

---

[1] قالہ عامر بن الطفیل الغنوی وتمامہ:...... ابینی لنا یا اسم ما انت فاعل والبیت فی التفائعی ۲۸۸ واللسان والمقاییس (نزل) والمخلقات دبلانہ ۱۵۸ واصلاح لیعقوب ۳۰۹ وذیل الامالی ۱۱۴ والخزانۃ (۳: ۴۴) وشرح السبع لابن الانباری ۵۳۶۔

اَلنَّسُوْءَۃُ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی عورت کے حیض میں مقررہ ایام میں تاخیر کے ہیں۔ جس سے اس کے حاملہ ہونے کی امید کی جاسکے۔ اور ایسی عورت کو نَسُوْءٌ کہا جاتا ہے۔
اور نَسَأَ اللّٰہُ فِیْ اَجَلِکَ اور نَسَأَ اللّٰہُ بِعُمْرِکَ کا محاورہ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جو کہ درازیٔ عمر کی دعا کے لئے بولتے ہیں۔
اَلنَّسِیْئَۃُ اس کے معنی کسی چیز کو ادھار پر فروخت کرنے کے ہیں۔ اسی سے وہ نَسِیٌّ ہے۔ جس کا جاہلیت میں رواج تھا۔ یعنی وہ کسی ماہ حرام کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ (۹-۳۷) امن کے کسی مہینہ کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا (۲-۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں۔ میں ایک قرأت نَنْسَأْھَا بھی ہے جس کے معنی کسی چیز کو بھلا دینے یا ابطال حکم کے ذریعہ مؤخر کر دینے کے ہیں۔
اَلْمِنْسَأَۃُ عصا جس کے ذریعہ کسی چیز کو پیچھے ہٹایا جائے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
تَاْکُلُ مِنْسَاَتَہٗ۔ (۳۴-۱۴) جو ان کے عصا کو کھاتا رہا۔
نَسَأْتُ الْاِبِلَ فِیْ ظِمْئِھَا یَوْمًا اَوْ یَوْمَیْنِ اونٹوں کے پانی پلانے کے دن کو ایک یا دو روز مؤخر کر دینا شاعر نے کہا ہے (الطویل)

(۴۲۴) وَ عَنْسٍ کَاَلْوَاحِ الْاِرَانِ نَسَأْتُھَا
اِذَا قِیْلَ لِلْمَشْبُوْبَتَیْنِ ھُمَا ھُمَا[1]

اور تابوت کے تختوں جیسے سفید اونٹوں کو میں نے ہنکایا جب یہ کہا گیا کہ زہرہ اور مشتری دونوں طلوع ہو گئے۔
اَلنَّسُوْءُ (ایضًا) تازہ دودھ جو زیادہ دیر تک پڑا رہنے سے کھٹا ہو جائے۔ اور اس میں پانی ملا لیا جائے۔

(ن س ب)

اَلنَّسَبُ وَالنِّسْبَۃُ کے معنی اَبَوَیْن میں سے کسی ایک کی طرف سے رشتہ داری کے ہیں اور نسب دو قسم پر ہے۔ نَسَبٌ بِالطُّوْلِ یعنی وہ رشتہ جو آباء اور ابناء کے درمیان پایا جاتا ہے۔ دوم نَسَبٌ بِالْعَرْضِ یعنی وہ رشتہ جو بنو الاعمام یعنی عم زاد بھائیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:
فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّ صِھْرًا (۲۵-۵۴) پھر اس کو صاحب نسب اور صاحب قرابت دامادی بنایا۔
فُلَانٌ نَسِیْبُ فُلَانٍ۔ وہ فلاں کا قریبی رشتہ دار ہے۔ اور نِسْبَۃٌ کے معنی ان دو مقداروں کے درمیان باہمی مناسبت کے بھی آتے ہیں۔ جن میں کسی قسم کی مجانست ہو اسی سے نَسِیْبٌ کا لفظ ہے۔ جس کے معنی اشعار میں عورت کے محاسن ذکر کر کے اس کے ساتھ عشق کا اظہار کرنے کے ہیں۔ اور یہ نَسَبَ الشَّاعِرُ بِالْمَرْأَۃِ نَسَبًا وَّ نَسِیْبًا کا مصدر ہے۔

(ن س خ)

اَلنَّسْخُ۔ اس کے اصل معنی ایک چیز کو زائل کر کے دوسری کو اس کی جگہ پر لانے کے ہیں۔

[1] قالہ شدخ فی قصیدۃ ... ۹۹ والبیت فی مجالس ثعلب ۴۲۵ واللسان (ارن، خشب ...) وغریب القرآن للقتیبی ۳۵۵ والقرطبی ۸۰ ...

جیسے۔ دھوپ کا سائے کو ۔ ۔ ۔ ۔ اور سائے کا دھوپ کو زائل کرکے اس کی جگہ لے لینا یا جوانی کے بعد بڑھاپے کا آنا وَ غَیْرُ ذٰلِكَ پھر کبھی اس سے صرف ازالہ کے معنی مراد ہوتے ہیں جیسے فرمایا فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ (۲۲-۵۲) تو جو وسوسہ شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے۔

اور کبھی صرف اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی اس سے معًا دونوں معنی مفہوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا نَسْخُ الْکِتَابِ یعنی کتاب اللہ کے منسوخ ہونے سے ایک حکم کو زائل کرکے پھر اس کی بجائے دوسرا حکم نازل کرنا مراد ہوتا ہے اور آیت کریمہ:۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (۲-۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے نَسْخ اور اِنْسَاء کے معنی اس پر عمل سے منع کرنے یا لوگوں کے دلوں سے فراموش کر دینے کے لئے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نَسَخْتُ الْکِتَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کتاب کو نقل کرنے کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو آیت بھی ہم نازل کرتے ہیں یا اس کے نزول کو ایک وقت تک کے لئے ملتوی رکھتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔

نَسْخُ الْکِتَابِ کے معنی کتاب کی کاپی کرنے کے ہیں۔ یہ پہلی صورت کے ازالہ کو مقتضی نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے مادہ میں اس جیسی دوسری صورت کے اثبات کو چاہتا ہے جیسا کہ بہت سی شمعوں میں انگوٹھی کا نقش بنا دیا جاتا ہے۔

اَلْاِسْتِنْسَاخُ۔ کسی چیز کے لکھنے کو طلب کرنے یا لکھنے کے لئے تیار ہونے کے ہیں کبھی اِسْتِنْسَاخٌ بمعنی نسخ بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵-۲۹) جو کچھ تم کیا کرتے تھے ہم لکھواتے جاتے تھے۔

اور علم وراثت میں "مُنَاسَخَةٌ" کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وارث یکے بعد دیگرے مرتے رہیں اور میراث تقسیم نہ ہوئی ہو۔

تَنَاسُخُ الْاَزْمِنَةِ وَالْقُرُوْنِ ایک قوم کا گزر جانا اور دوسری کا اس کے قائم مقام ہونا۔

اور تَنَاسُخِیَّةٌ اس فرقے کو کہتے ہیں جو شریعت کے ثابت کردہ حشر ونشر کا انکار کرتے ہیں۔ اور ارواح کے مختلف اجسام میں منتقل ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

(ن س ر)

اَلنَّسْرُ۔ گدھ۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا (۷۱-۲۳) اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا۔

میں نسر ایک بت کا نام ہے اور اَلنَّسْرُ نَسَرًا اَلطَّائِرُ الشَّیْءَ یَنْسِرُہٗ کا مصدر بھی آتا ہے جس کے معنی پرند کا چونچ سے کوئی چیز اٹھاتا یا اسے ٹھونگنا کے ہیں۔

نَسْرُ الْحَافِرِ گھوڑے کے سم کے درمیان کا ابھرا ہوا گوشت۔

اَلنَّسْرَانِ دو ستارے ہیں جن میں سے ایک کو نَسْرِ (طائر) اور دوسرے کو نَسْرِ (واقع) کہا

جاتا ہے۔ نَسَرْتُ كَذَا کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے تناول کرنا جیسا کہ پرند چونچ بھرتا ہے۔

(ن س ف)

نَسَفَتِ الرِّيحُ الشَّيْءَ کے معنی ہوا کے کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کے ہیں۔ اور نَسَفْتُهُ وَانْتَسَفْتُهُ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

نَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا (۲۰-۱۰۵) خدا ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔

اور نَسَفَ الْبَعِيرُ الْأَرْضَ بِمُقَدَّمِ رِجْلِهِ کے معنی اونٹ کا اپنے اگلے پاؤں کے ساتھ مٹی کو پھینکنا کے ہے۔ اور گھاس کو جڑ سے اکھاڑ کر چرنے والی اونٹنی کو نَاقَةٌ نَسُوفٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا (۲۰-۹۷) پھر اس کی راکھ کو اڑا کر دریا میں بکھیر دیں گے۔ یعنی ہم نُسَافَه کی طرح اسے پھینک دیں گے اور نُسَافَة کے معنی اڑتی ہوئی غبار کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر جھاگ کو بھی نُسَافَه کہتے ہیں۔ اور اِنَاءٌ نَسْفَانٌ بھرے ہوئے برتن کو کہتے ہیں جس پر جھاگ غالب ہو۔

اُنْتُسِفَ لَوْنُهُ غبار آلود ہونے کی وجہ سے کسی شخص کی رنگت کا متغیر ہو جانا۔ جیسا کہ اِغْبَرَّ وَجْهُهُ کا محاورہ ہے۔

اَلنَّسْفَةُ سنگ پائے خار۔

كَلَامٌ نَسِيفٌ سخن پنہاں۔ جو متغیر اور بودا ہو۔

(ن س ك)

اَلنُّسُكُ۔ کے معنی عبادت کے ہیں۔ اور نَاسِكٌ عابد کو کہا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ ارکان حج کے ادا کرنے کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔

اَلْمَنَاسِكُ اعمال حج ادا کرنے کے مقامات۔

اَلنَّسِيكَةُ خاص کر ذبیحہ یعنی قربانی کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ۔ (۲-۱۹۶) تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (۲-۲۰۰) پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو۔

مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ (۲۲-۶۷) ایک شریعت مقرر کر دی جس پر وہ چلتے ہیں۔

(ن س ل)

اَلنَّسْلُ۔ کے معنی کسی چیز سے الگ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔

نَسَلَ الْوَبَرُ عَنِ الْبَعِيرِ اون اونٹ سے الگ ہو گئی

اور نَسَلَ الْقَمِيصُ عَنِ الْإِنْسَانِ کے معنی قمیص کے بدن سے الگ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۴۲۲) فَسُلِّي ثِيَابِي عَنْ ثِيَابِكِ تَنْسِلِي

تو اپنے کپڑوں کو میرے کپڑوں سے کھینچ لے تاکہ جدا ہو جائیں۔

---

[1] والبیت لامرئ القیس داولہ: وان تک قد ساءتک منی خلیقۃ۔ والبیت فی المعلقۃ مع التبریزی ۲۰ والسیوطی، واللسان (ثوب) ومختار الشعر الجاہلی (۱۰۰)، والجمہرۃ ۹۰ والعقد الثمین ۷۴ والمعانی للقتیبی ۴۸۲ ودیوانہ بشرح ابن الانباری رقم ۲۱

اَلنُّسَالَۃُ داڑھی سے اگرے ہوئے بال یا پرندکے پر جو جھڑ کر گر پڑتے ہیں۔

اَنْسَلَتِ الْاِبِلُ اونٹوں کی اون جھڑنے کا وقت آگیا اسی سے نَسَلَ یَنْسِلُ نَسْلاً نا ہے جس کے معنی تیز دوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ (۲۱-۹۶) اور وہ ہر بلندی سے دوڑ رہے ہوں گے۔

اَلنَّسْلُ۔ اولاد کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اپنے باپ سے جدا ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (۲-۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں) کی نسل کو نابود کر دے۔

اور تَنَاسَلُوْا کے معنی تَوَالَدُوْا کے ہیں۔ نیز جب کوئی انسان دوسرے سے خیرات طلب کرے۔ تو کہا جاتا ہے:۔

نَحُنُ مَا نَسَلَ لَکَ مِنْہُ عَفْوًا کہ جو کچھ ملے وہی لے لو۔

(ن س ی)

اَلنِّسْیَانُ۔ یہ نَسِیْتُہٗ نِسْیَانًا کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کو ضبط میں نہ رکھنے کے ہیں۔ خواہ یہ ترکِ ضبط ضعفِ قلب کی وجہ سے ہو یا ازراہ غفلت ہو۔ یا قصدًا کسی چیز کی یاد بھلا دی جائے حتیٰ کہ وہ دل سے محو ہو جائے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَقَدْ عَھِدْنَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ فَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا (۲۰-۱۱۵) ہم نے پہلے آدم سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ دیکھا۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ (۳۲-۱۴) سو اب آگ کے مزے چکھو۔ اس لئے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسَانِیْہُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ (۱۸-۶۳) تو میں مچھلی وہیں بھول گیا۔ اور مجھے آپ سے اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

وَلَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ (۱۸-۷۳) کہ جو بھول مجھ سے ہوئی اس پر مواخذہ نہ کیجئے۔

فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِہٖ (۵-۱۴) مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی۔ ایک حصہ فراموش کر دیا۔

ثُمَّ اِذَا خَوَّلَہٗ نِعْمَۃً مِّنْہُ نَسِیَ مَا کَانَ یَدْعُوْا اِلَیْہِ مِنْ قَبْلُ (۳۹-۸) پھر جب وہ اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دے دیتا ہے۔ تو جس کام کے لئے پہلے اس کو پکارتا ہے۔ اسے بھول جاتا ہے۔

اور آیت سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰٓی (۸۷-۶) ہم تمہیں پڑھائیں گے۔ کہ تم فراموش نہ کرو گے۔

میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسا بنا دے گا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سنو گے اسے بھولنے نہیں پاؤ گے۔ پھر ہر وہ نسیان جو انسان کے قصد اور ارادہ سے ہو۔ وہ مذموم ہے اور جو بغیر قصد اور ارادہ کے ہو اس میں انسان معذور ہے۔ اور حدیث میں جو مروی ہے[1] (۱۲۸)

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ کہ میری امت کو خطا اور نسیان معاف ہے تو اس سے یہی دوسری

[1] رواہ الطبرانی عن ثوبان وفیہ وما استکرھوا علیہ (راجع الفتح للنبہانی ۲ / ۱۳۵)

قسم کا نسیان مراد ہے۔ یعنی وہ جس میں انسان کے ارادہ کو دخل نہ ہو۔ اور آیت کریمہ :۔
فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا اِنَّا نَسِیْنٰکُمْ (۳۲-۱۴) سو اب آگ کے مزے چکھو اس لئے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

میں نسیان بمعنی اول ہے یعنی وہ جس میں انسان کے قصد اور ارادہ کو دخل ہو اور کسی چیز کو حقیر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا جائے۔

پھر جب نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے ازراہِ اہانت انسان کو چھوڑ دینے اور احکام الٰہی کے ترک کرنے کی وجہ سے اسے سزا دینے کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
فَالْیَوْمَ نَنْسٰھُمْ کَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِھِمْ ھٰذَا (۷-۵۱) تو جس طرح یہ لوگ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اس طرح آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔
نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ (۹-۶۷) انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔
وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ (۵۹-۱۹) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے۔

میں متنبہ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے سے ہی معرفت الٰہی حاصل کر سکتا ہے لہذا انسان کا اللہ تعالیٰ کو بھلا دینا خود اپنے آپکو بھلا دینے کے مترادف ہے۔ اور آیت کریمہ :۔
وَاذْکُرْ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیْتَ (۱۸-۲۴) اور جب خدا کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو۔

کے ابن عباسؓ نے یہ معنی کئے ہیں کہ جب تم کوئی بات کہو اور اس کے ساتھ انشاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو یاد آنے پر انشاء اللہ کہہ لیا کرو۔ اسی لئے ابن عباسؓ کے نزدیک علف میں کچھ مدت کے بعد بھی انشاء اللہ کہنا جائز ہے۔ اور عکرمہ نے کہا ہے کہ نَسِیْتَ بمعنی اِرْتَکَبْتَ ذَنْبًا کے ہے۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب تمہیں کسی گناہ کے ارتکاب کا خیال آئے تو اس وسوسہ کو دفع کرنے کے لئے خدا کے ذکر میں مشغول ہو جایا کرو تاکہ وہ وسوسہ دفع ہو جائے[1]۔

اَلنِّسْیُ کے اصل معنی مَایُنْسٰی یعنی فراموش شدہ چیز کے ہیں جیسے نِقْضٌ بمعنی مَایُنْقَضُ آتا ہے۔ مگر عرف میں نِسْیٌ اس معمولی چیز کو کہتے ہیں جو در خور اعتنا نہ سمجھی جائے اور اسی سے اہل عرب کا مقولہ ہے۔ اِحْفَظُوْا اَنْسَاءَکُمْ (کوچ کے وقت اپنی) معمولی چیزوں کا خیال رکھو جو عموماً بھول جاتی ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

---

[1] راجع الفتح للشوکانی (۳: ۲۸۰) انہ کان یری الاستثناء ولو لبعد سنۃ ولقول عکرمۃ راجع الطبری [2] قالہ عمرو بن عامر الشنفری الازدی وتمامہ: علی اھبادان تخاطبک تبلت قال ابن ابری وتبلت (بالفتح) انقطع وبالکسر اذ سکن والبیت فی الکامل ۷۹۴ : لاقتضاب ۷۱۴ واللسان (نساء بلت) والمفضلیات (۱: ۱۰۷) والطبری (۱۶: ۲۲) والطبرسی (۲۹۰۹۴۳) وفی روایۃ اذ ماغدت بدل علی اھباء ان تحدثک بدل ان تحاطبک کذا روایۃ الکامل ۴۳۸ وفی روایۃ وان تکلمک والبیت فی مجالس ثعلب ۳۵۳ وفیہ علی وجھہا بدل علی اھبا والقصیدۃ مفضلیۃ وہی فی منتھی الطلب (۲: ۲۰۵-۲۰۷) والاغانی (۲۱: ۹۰-۹۱) وبعضہا فی الخزانۃ (۲: ۱۸۱) والبیت ایضاً فی تہذیب الالفاظ ۵۰۸ والمحاضرات للمؤلف (۳: ۲۳۱) والمرزوقی ۳۵۸ وغریب القرآن ۲۷۳ ۔

(۲۳۴) کَانَ لَہٗ فِی الْاَرْضِ نِسْیًا تَنَقَّصَہٗ گویا زمین میں اس کی کوئی چیز گری ہوئی ہے۔ جسے وہ تلاش کر رہا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَکُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا (۱۹-۲۳) اور میں بھولی بسری ہو گئی ہوتی۔

میں نَسْیًا کے معنی ہیں کہ میں اس حقیر چیز کے بمنزلہ ہوتی جس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا اگرچہ وہ بھولی ہوئی نہ ہو۔ پھر بھولی بسری ہوئی چیز کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے مَنْسِیًّا کا لفظ لایا گیا ہے۔ کیونکہ نَسْیٌ کے معنی اس معمولی چیز کے ہیں۔ جو در خور اعتنا نہ ہو۔ اور اس کا فراموش ہونا ضروری نہیں ہے۔

اور ایک قراءت میں نَسْیًا ہے جو کہ مصدر بمعنی مفعول کے ہیں۔ جیسے:۔ عَصٰی عَصْیًا وَعِصْیَانًا۔ اور آیت کریمہ:۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا (۲-۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں۔

میں اِنْسَاء کے معنی قوت الہیہ کے ذریعہ دلوں سے محو کرنے اور فراموش کرا دینے کے ہیں۔

اَلنِّسَآءُ وَالنِّسْوَانُ وَالنِّسْوَۃُ یہ تینوں اِمْرَءَۃٌ کی جمع مِنْ غَیْرِ لَفْظِہٖ ہیں۔ جیسے مَرْءٌ کی جمع قوم آجاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ اِلٰی قَوْلِہٖ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ (۴۹-۱۱) اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں۔

نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ (۲-۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہے ......

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ (۳۳-۳۰) اے پیغمبر کی بیویو۔

وَقَالَ نِسْوَۃٌ فِی الْمَدِیْنَۃِ (۱۲-۳۰) اور شہر میں عورتیں گفتگوئیں کرنے لگیں۔

مَا بَالُ النِّسْوَۃِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَھُنَّ (۱۲-۵۰) کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیئے تھے۔

اَلنَّسَا (عرق النسا) ایک رگ کا نام ہے اس کا تثنیہ نَسَیَانِ اور جمع اَنْسَاءٌ آتی ہے۔

(ن ش ء)

اَلنَّشْاُ وَالنَّشْاَۃُ کسی چیز کو پیدا کرنا اور اس کی پرورش کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَۃَ الْاُوْلٰی (۵۶-۶۲) اور تم نے پہلی پیدائش تو جان ہی لی ہے۔

نَشَاَ فُلَانٌ کے معنی بچہ کے جوان ہونے کے ہیں۔ اور نوجوان کو "نَاشِئٌ" کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً (۷۳-۶) کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بہیمی کو) سخت پامال کرتا ہے۔

میں نَاشِئَۃ کے معنی نماز کے لئے اٹھنے کے ہیں۔ اسی سے نَشَاَ السَّحَابُ کا محاورہ ہے جس کے معنی فضا میں بادل کے رونما ہونے اور آہستہ آہستہ بڑھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳-۱۲) اور بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے۔

اَلْاِنْشَاءُ (افعال) اس کے معنی کسی چیز کی ایجاد اور تربیت کے ہیں۔ عموماً یہ لفظ زندہ چیز ... کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

قُلْ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ (۶۷-۲۳) وہ خدا ہی تو

ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ نیز فرمایا:۔

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۵۳-۳۲)

وہ تم کو خوب جانتا ہے۔ جب اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (۲۳-۳۱)

پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کی۔

وَنُنْشِئَكُمْ فِيْمَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۵۶-۶۱) اور تم کو ایسے جہان میں جس کو تم نہیں جانتے پیدا کر دیں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳-۱۴) پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا۔

ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ (۲۹-۲۰) پھر خدا ہی پچھلی پیدائش پیدا کرے گا۔

ان تمام آیات میں انشاء بمعنی ایجاد استعمال ہوا ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ (۵۶-۷۲) بھلا دیکھو جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرتے ہیں۔

میں آگ کا درخت اگانے پر بطور تشبیہ انشاء کا لفظ بولا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ (۴۳-۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

میں يُنَشَّؤُا کے معنی تربیت پانے کے ہیں یعنی عورت جو زیور میں تربیت پاتی ہے۔ ایک قراءت میں يَنْشَاُ ہے یعنی پھلے پھولے۔

(ن ش ر)

اَلنَّشْرُ کے معنی کسی چیز کو پھیلانے کے ہیں۔ یہ کپڑے اور صحیفے کے پھیلانے، بارش اور نعمت کے عام کرنے اور کسی بات کے مشہور کر دینے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۸۱-۱۰) اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ (۴۲-۲۸) اور وہی تو ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانیکے بعد مینہ برساتا اور اپنی رحمت (یعنی بارش کی برکت) کو پھیلا دیتا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (۷۷-۳) اور بادلوں کو (پھاڑ کر) پھیلا دیتی ہے۔

میں نَاشِرَاتِ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو ہواؤں کو پھیلاتے ہیں یا اس سے وہ ہوائیں مراد ہیں جو بادلوں کو بکھیرتی پھرتی ہیں۔

اور نَاشِرٌ کی جمع نُشُرٌ آتی ہے۔ چنانچہ ایک قراءت میں نُشُرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ بھی ہے جو کہ وَالنّٰشِرٰتِ کے ہم معنی ہے اور اسی سے سَمِعْتُ نَشْرًا حَسَنًا کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں میں نے اچھی شہرت سنی۔

نَشَرَ الْمَيِّتُ نُشُوْرًا کے معنی میت کے دوبارہ زندہ ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ (۶۷-۱۵) اسی کے پاس قبروں سے نکل کر جانا ہے۔

بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا (۲۵-۴۰) بلکہ ان کو مرنے کے بعد جی اٹھنے کی امید ہی نہیں تھی۔

وَلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۲۵-۳) اور نہ مرنا ان کے اختیار میں ہے۔ اور نہ جینا اور نہ مر کر اٹھ کھڑے ہونا۔
اَنْشَرَ اللّٰهُ الْمَیِّتَ کے معنی میت کو زندہ کرلینے کے ہیں۔ اور نَشَرَ اس کا مطاوع آتا ہے۔ جس کے معنی زندہ ہو جانے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔
ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۸۰-۲۲) پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔
فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا (۴۳-۱۱) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کر دیا۔
بعض نے کہا ہے کہ نَشَرَ اللّٰهُ الْمَیِّتَ وَاَنْشَرَهٗ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن درحقیقت نَشَرَ اللّٰهُ الْمَیِّتَ نَشْرُ الثَّوْبِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۴۲۸) طَوَتْكَ خُطُوْبُ دَهْرِكَ بَعْدَ نَشْرٍ
كَذَاكَ خُطُوْبُهٗ طَیًّا وَّ نَشْرًا

تجھے پھیلانے کے بعد حوادث زمانہ نے لپیٹ لیا اسی طرح حوادث زمانہ لپیٹنے اور نشر کرتے رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (۲۵-۴۷) اور دن کو اٹھ کھڑا ہونے کا وقت ٹھہرایا۔
پس دن کے نشور بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو کاروبار کے پھیلانے اور روزی کمانے کے لئے بنایا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (۲۸-۷۳) اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات کو اور دن کو بنایا۔ تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اس میں اس کا فضل تلاش کرو۔
اور اِنْتِشَارُ النَّاسِ کے معنی لوگوں کے اپنے کاروبار میں لگ جانے کے ہیں چنانچہ فرمایا:۔
ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ (۳۰-۲۰) پھر اب تم انسان ہو کر جابجا پھیل رہے ہو۔
فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا (۳۳-۵۳) تو جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔
فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ (۶۲-۱۰) پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نَشَرُوْا بمعنی اِنْتَشَرُوْا کے آتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (۵۸-۱۱) اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ میں ایک قراءت فَاِذَا قِیْلَ انْشُرُوْا فَانْشُرُوْا بھی ہے۔ یعنی جب کہا جائے کہ منتشر ہو جاؤ تو منتشر ہو جایا کرو۔
اَلْاِنْتِشَارُ کے معنی چوپایہ کی رگوں کا پھول جانا ۔۔۔ بھی آتے ہیں۔ اور نَوَاشِرُ بَاطِنِ ذِرَاعٍ کی رگوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بدن میں منتشر ہیں۔
اَلنَّشْرُ (ایضًا) پھیلنے والے بادل کو کہتے ہیں۔ اور یہ بمعنی مَنْشُوْرٌ بھی آتا ہے جیسا کہ نَقْضٌ بمعنی منقوض آجاتا ہے اسی سے محاورہ ہے:۔
اِكْتَسَی الْبَازِیْ رِیْشًا نَشْرًا۔ یعنی باز نے لمبے چوڑے پھیلنے والے پروں کا لباس پہن لیا۔
اَلنَّشْرُ (ایضًا) خشک گھاس کو کہتے ہیں جو بارش کے بعد سرسبز ہو کر پھیل جائے اور اس سے سر پستان کی سی کونپلیں پھوٹ نکلیں یہ گھاس

---

[1] البیت لابی العتاھیۃ وتقدم تخریجہ فی (طوی) وفی المطبوع "طیا ونشرا" مقلوب والتصحیح من المراجع ۱۲

بکریوں کے لئے سخت مضر ہوتی ہے۔
اسی سے نَشَزَتِ الْاَرْضُ فَهِيَ نَاشِزَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں نشر گھاس پھوٹنے کے ہیں۔
نَشْرُ الْخَشَبِ بِالْمِنْشَارِ۔ کے معنی آرے سے لکڑی چیرنے کے ہیں۔ اور لکڑی چیرنے کو نشر اس لئے کہتے ہیں کہ اسے چیرتے وقت نشارہ یعنی برادہ پھیلتا ہے۔ اور نَشْرَةٌ کے معنی افسوں کے ہیں جس سے مریض کا علاج کیا جاتا ہے۔

(ن ش ز)

اَلنَّشْزُ۔ بلند زمین کو کہتے ہیں۔ اور نَشَزَ فُلَانٌ کے معنی بلند زمین کا قصد کرنے کے ہیں۔ اسی سے نَشَزَ فُلَانٌ عَنْ مَقَرِّهٖ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کے اپنی قرارگاہ سے اوپر ابھر آنے کے ہیں۔ اور ہر اوپر اٹھنے والی چیز کو نَاشِزٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (۵۸-۱۱) اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔
اور نَشْزٌ وَاِنْشَازٌ کے معنی زندہ کرنا ..... بھی آتے ہیں۔ کیونکہ زندگی میں بھی ایک طرح کا ابھار پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا :۔
وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا (۲-۲۵۹) اور (ہاں) گدھے کی ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم ان کو کیونکر جوڑ دیتے ہیں اور ان پر (کس طرح) گوشت (پوست) چڑھا دیتے ہیں۔ اور نُنْشِزُهَا کے نون پر ضمہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں۔ اور نُشُوْزُ الْمَرْاَةِ کے معنی عورت کے اپنے شوہر کو برا سمجھنے اور سرکشی کرنے اور کسی دوسرے مرد پر نظر رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ (۴-۳۴) اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی (اور بدخوئی) کرنے لگی ہیں۔
چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)
(۴۲۶) اِذَا جَلَسَتْ عِنْدَ الْاِمَامِ كَاَنَّهَا
تَرٰى رُفْقَةً مِنْ سَاعَةٍ تَسْتَحِيْلُهَا
اور عِرْقٌ نَاشِزٌ کے معنی پھولی ہوئی رگ کے ہیں۔

(ن ش ط)

اَلنَّشْطُ (ض) کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ :۔
وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (۷۹-۲) اور ان کی جو آسانی سے کھول دیتے ہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ نَاشِطَاتٌ سے مراد ستارے ہیں جو مشرق سے نکل کر حرکت فلک سے مغرب کی طرف جاتے ہیں۔ یا خود مشرق سے مغرب کو چلتے ہیں اور یہ ثَوْرٌ نَاشِطٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایک علاقہ سے نکل کر دوسرے علاقہ میں جانے والے بیل کے ہیں۔

---

[1] البیت للفرزدق فی نشوز المرأۃ (النوار ابنۃ اعین بن ضبعۃ المجاشعی) فی قصیدۃ ۲۸ بیتًا راجع دیوانہ (۲: ۴۲) وفیہ بعدت بدل جلست وکما بدل کانہا فی المعانی للقتبی ۸۱۵، ۸۴۵ صدرہ : ترانا اذ اصطک الخصوم کانہا..... وقبلہ :- وما خاصم الاقوام من ذی خصومۃ۔ کورہاء مشنوء الیہا حلیلہا۔

بعض نے کہا ہے کہ نَاشِطَاتٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو امور کو طے کرتے ہیں۔ اور یہ نَشَطْتُ الْعُقْدَةَ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی گرہ لگانے کے ہیں اور یہاں خاص کر نَشْطٌ کے لفظ سے جس کے معنی آسانی سے کھلنے والی گرہ کے ہیں۔ اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ فرشتے نہایت آسانی سے ان امور کو سر انجام دے رہے ہیں جن پر کہ وہ مامور ہیں۔

بِئْرٌ اَنْشَاطٌ کم گہرا کنواں جس سے پانی کا ڈول ایک ہی جھٹکے میں باہر آجائے۔

اَلنَّشِيْطَةُ اس مال کو کہتے ہیں جو رئیس قوم تقسیم غنیمت سے قبل اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نَشِيْطَةٌ ان اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو بلا قصد لشکر کے ہاتھ لگ جائیں اور حدی خواں کے بغیر ہی نشاط سے چلتے ہوں۔

نَشَطَتْهُ الْحَيَّةُ۔ اسے سانپ نے کاٹ کھایا۔

(ن ص ب)

نَصْبُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو کھڑا کرنے یا گاڑ دینے کے ہیں مثلاً نیزے کے گاڑنے اور عمارت یا پتھر کو کھڑا کرنے پر نَصْبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور نَصِيْبٌ اس پتھر کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر بطور نشان کے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اس کی جمع نَصَائِبُ و نُصُبٌ آتی ہے۔ جاہلیت میں عرب جن پتھروں کی پوجا کیا کرتے اور ان پر جانور بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ انہیں نُصُبٌ کہا جاتا تھا[1]۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ (۷۰-۴۳) جیسے وہ عبادت کے پتھروں کی طرف دوڑتے ہیں۔

نیز فرمایا:۔

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۵-۳) اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے۔

اس کی جمع اَنْصَابٌ بھی آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (۵-۹۰) اور بت اور پاسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیاطین سے ہیں۔

اور نَصْبٌ و نَصَبٌ کے معنی تکلیف و مشقت کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (۳۸-۴۱) ایذا اور تکلیف میں ایک قراءت نَصَبٌ بھی ہے اور یہ بُخْلٌ و بَخَلٌ کی طرح ہے قرآن میں ہے:۔

لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ (۳۵-۳۵) یہاں نہ ہم کو رنج پہنچے گا۔

وَاَنْصَبَنِيْ كَذَا کے معنی کسی کو مشقت میں ڈالنے اور بے چین کرنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2]:

(۴۲۷) تَاَوَّبَنِيْ هَمٌّ مَعَ اللَّيْلِ مُنْصِبُ

میرے پاس رات کو تکلیف دہ غم بار بار لوٹ کر آتا ہے۔

اور عِيْشَةٌ رَاضِيَةٌ کی طرح هَمٌّ نَاصِبٌ کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے۔

اَلنَّصَبُ۔ کے معنی مشقت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

---

[1] قارن الطبری (۲: ۵۵-۶۰) والقرطبی ۲۹/۲۹۶ والشوکانی ۲۸۶ والغریب للقتبی ۴۸۶ [2] البیت مطلع قصیدة قالہا ابو قران طفیل بن کعب الغنوی فی فرسان قومہ وعجزہ:۔ ۔ ۔ ۔ وجاء من الاخبار لا اکذب والقصیدة فی دیوانہ ۱۷-۲۷ والبیت فی اللسان (عقب) والطفیل جاہلی مشہور بالجر لحسن وصفہ للخیل راجع لترجمتہ الشعراء ۲۲۴-۲۲۴ والاشتقاق ۲۷۰ ۞

لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا (۱۸-۶۲) اس سفر سے ہم کو بہت تھکان ہوگئی ہے۔

اور نَصَبَ (س) فَهُوَ نَصِبٌ وَنَاصِبٌ کے معنی تھک جانے یا کسی کام میں سخت محنت کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۸۸-۳) سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۹۴-۷) تو جب فارغ ہوا کرو۔ تو (عبادت میں) محنت کیا کرو۔

اَلنَّصِيْبُ کے معنی معین حصہ کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ (۴-۵۴) کیا ان کے پاس بادشاہی کا کچھ حصہ ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ أُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتَابِ (۴-۵۱) بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا۔

اور نَاصَبَهُ الْحَرْبَ وَالْعَدَاوَةَ وَنَصَبَ لَهُ کے معنی کسی کے خلاف اعلان جنگ یا دشمنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ اس میں لفظ حَرْبٌ یا عَدَاوَةٌ کا حذف کرنا بھی جائز ہے۔ تَيْسٌ أَنْصَبُ وَشَاةٌ أَوْ عَنْزَةٌ نَصْبَاءُ۔ کھڑے سینگوں والا مینڈھا یا بکری۔

نَاقَةٌ نَصْبَاءُ۔ ابھرے ہوئے سینہ والی اونٹنی نِصَابُ السِّكِّيْنِ وَنَصَبَةٌ کے معنی چھری کے دستہ ہیں۔ اور اسی سے نِصَابُ الشَّيْءِ کا محاورہ ہے جس کے معنی أَصْلُ الشَّيْءِ ہیں۔ تَنَصَّبَ الْغُبَارُ۔ غبار کا اڑنا۔ نَصَبَ السِّتْرَ پردہ اٹھانا۔ نَصْبٌ (اعراب) زبر کو کہتے ہیں۔ اور نَصْبٌ ایک قسم کا راگ بھی ہے۔

(ن ص ح)

اَلنُّصْحُ۔ کسی ایسے قول یا فعل کا قصد کرنے کو کہتے ہیں۔ جس میں دوسرے کی خیر خواہی ہو۔ قرآن میں ہے۔

لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النَّاصِحِيْنَ (۷-۷۹) میں نے تم کو خدا کا پیغام سنا دیا۔ اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم ایسے ہو کہ خیر خواہوں کو دوست ہی نہیں رکھتے۔

وَقَاسَمَهُمَا إِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِيْنَ (۷-۲۱) اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْ إِنْ أَرَدْتُّ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ (۱۱-۳۴) اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

یہ یا تو نَصَحْتُ لَهُ الْوُدَّ۔ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی سے خالص محبت کرنے کے ہیں۔ اور نَاصِحُ الْعَسَلِ خالص شہد کو کہتے ہیں۔ اور یا یہ نَصَحْتُ الْجِلْدَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی چمڑے کو سینے کے ہیں۔ اور نَاصِحٌ کے معنی درزی اور نِصَاحٌ کے معنی سلائی کا تاگا کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

تُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (۶۶-۸) خدا کے آگے صاف دل سے توبہ کرو۔

میں نَصُوْحًا کا لفظ بھی مذکورہ دونوں محاوروں میں سے ایک سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے معنی

خالص یا محکم توبہ کے ہیں۔ اس میں نَصُوْحٌ وَ نِصَاحٌ دو لغت ہیں جیسے ذُھُوْبٌ وَ ذَھَابٌ کسی شاعر نے کہا ہے[1]:

(۲۸م) اَحْبَبْتُ حُبًّا خَالَطَتْهُ نَصَاحَةٌ
میں اس سے خالص محبت رکھتا ہوں۔

(ن ص ر)

اَلنَّصْرُ وَالنُّصْرَۃُ کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ (۶۱-۱۳) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ (۱۱۰-۱) جب اللہ کی مدد آپہنچی۔

وَانْصُرُوْٓا اٰلِھَتَکُمْ (۲۱-۶۸) اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ (۳-۱۶۰) اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔

وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ (۲-۲۵۰) اور دشمن کفار پر فتح یاب کر۔

وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۳۰-۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا (۴۰-۵۱) ہم اپنے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں۔

وَمَا لَھُمْ فِی الْاَرْضِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۹-۷۴) اور زمین میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔

وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّکَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیْرًا (۴-۴۵) اور خدا ہی کافی کارساز اور کافی مددگار ہے۔

وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۲-۱۰۷) اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

فَلَوْلَا نَصَرَھُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۴۶-۲۸) تو جن کو ان لوگوں نے ...... خدا کے سوا معبود بنایا تھا۔ انہوں نے اس کی کیوں مدد نہ کی۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں (نَصَرَ) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کی مدد کرنا کے معنی تو ظاہر ہیں۔ اور بندہ کے اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے اس کے بندوں کی مدد، حدود الٰہی کی حفاظت، اس کے عہود کی رعایت، احکام شریعت کی بجا آوری اور اس کے نواہی سے اجتناب کرنا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ (۵۷-۲۵) اور اس لئے کہ جو اس کی مدد کرتے ہیں خدا ان کو معلوم کرے۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (۴۷-۷) اگر تم خدا کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔

کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ (۶۱-۱۴) خدا کے مددگار بن جاؤ۔

اَلْاِنْتِصَارُ وَالْاِسْتِنْصَارُ کے معنی طلب نصرت کے ہیں قرآن میں ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۴۲-۳۹) اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم و تعدی ہو تو مناسب طریقے سے بدلہ لیتے ہیں۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ (۸-۷۲) اور اگر وہ تم سے دین کے معاملات میں مدد طلب کریں۔ تو تم کو مدد کرنی لازم ہے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ (۴۲-۴۱) اور جس

---

[1] لم اجدہ فی المراجع ۱۲

پر ظلم ہوا ہو وہ اگر اس کے بعد انتقام لے۔
فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۵۴-۱۰) توانہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ (بار الٰہا) میں ان کے مقابلے میں کمزور ہوں تو ان سے (بدلہ لے۔
یہاں (اُنْصُرْ) کی بجائے اِنْتَصِرْ کہنے سے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ جو تکلیف مجھے پہنچ رہی ہے وہ گویا تجھے (ذات باری تعالیٰ) پہنچ رہی ہے کیونکہ میں تیرے حکم سے ان کے پاس گیا تھا لہٰذا میری مدد فرمانا گویا تیرا اپنی ذلت کے لئے انتقام لینا ہے۔
اَلتَّنَاصُرُ کے معنی باہم تعاون کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَمَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ (۳۷-۲۵) تم کو کیا ہوا کہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔
اور بعض کے نزدیک عیسائیوں کو بھی نَصَارٰی اس لئے کہا گیا ہے کہ انہوں نے نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ کا نعرہ لگایا تھا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (۶۱-۱۴) جیسے عیسیٰؑ بن مریم نے حواریوں سے کہا بھلا کون ہے جو خدا کی طرف بلانے میں میرے مددگار ہوں تو حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نصرانی کی جمع ہے جو نصران (قریہ کا نام) کی طرف منسوب ہے۔
قرآن میں ہے:۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ (۲-۱۱۳) یہود کہتے ہیں کہ عیسائی رستے پر نہیں۔

نُصِرَ اَرْضُ بَنِیْ فُلَانٍ کے معنی بارش برسنے کے ہیں۔ کیونکہ بارش سے بھی زمین کی مدد ہوتی ہے اور نَصَرْتُ فُلَانًا جس کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں یہ یا تو نَصْرُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے اور یا نَصْرٌ بمعنی عَوْنٌ سے۔

(ن ص ف)

نِصْفُ الشَّیْءِ کے معنی ½ حصہ کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ (۴-۱۲) اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں اگر ان کے اولاد نہ ہو تو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے۔
فَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (۴-۱۱) اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔
فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ (۴-۱۷۶) تو اس کو بھائی کے ترکہ میں سے آدھا حصہ ملے گا۔
اِنَاءٌ نِصْفَانٌ۔ آدھا بھرا ہو برتن۔
نَصَفَ النَّهَارُ وَانْتَصَفَ دن کا نصف ہو جانا۔ دوپہر کا وقت۔
نَصَفَ الْاِزَارُ سَاقَهٗ۔ ازار کا نصف پنڈلی تک ہونا۔
نَصِيْفٌ۔ غلہ ناپنے کے ایک پیمانے کا نام ہے گویا وہ مِكْيَالٌ اَكْبَرُ (بڑا پیمانہ) کا نصف ہے اور اس کے معنی عورتوں کی اوڑھنی یا دوپٹہ بھی آتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے

کہلاتے (الکامل)

(۴۲۹) سَقَطَ النَّصِيْفُ وَلَمْ تُرِدْ اِسْقَاطَهٗ
فَتَنَاوَلَتْهُ وَاتَّقَتْنَا بِالْيَدِ

اوڑھنی سر سے گری اور اس نے عمداً نہیں گرائی تھی پھر اس نے (ہاتھ بڑھا کر) اسے سنبھالا اور ہاتھ کے ذریعہ ہم سے پردہ کیا۔

بَلَغْنَا مَنْصَفَ الطَّرِيْقِ ہم نے آدھا سفر طے کر لیا۔

اَلنَّصَفُ۔ متوسط عمر کی عورت۔ ادھیڑ عمر۔

اَلْمُنَصَّفُ۔ شراب جو آگ پر پکانے کے بعد آدھا رہ گیا ہو۔

اَلْاِنْصَافُ کے معنی کسی معاملہ میں عدل سے کام لینے کے ہیں یعنی دوسرے سے صرف اسی قدر فائدہ حاصل کرے جتنا کہ اسے پہنچا ہے۔

اور نَصَفَةٌ کے معنی خدمت بھی آتے ہیں۔

اور خادم کو نَاصِفٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع نُصُفٌ آتی ہے۔ اس نام میں اشارہ ہے کہ خدام کو حق خدمت پورا پورا ملنا چاہیئے۔

اَلْاِنْتِصَافُ وَالْاِسْتِنْصَافُ طلب خدمت کرنا۔

(ن ص ی)

اَلنَّاصِيَةُ کے معنی پیشانی یا پیشانی کے بالوں کے ہیں کہا جاتا ہے:۔

نَصَوْتُ فُلَانًا وَانْتَصَيْتُهٗ وَنَاصَيْتُهٗ میں نے اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا (۱۱-۵۶) جو چلنے پھرنے والا ہے وہ اس کو چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے۔

میں اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چلنے پھرنے والی چیز پر پوری قدرت حاصل ہے۔

لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ (۹۶-۱۵) تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے (۱۲۹) کہ انہوں نے فرمایا۔ مَا لَكُمْ تَنْصُوْنَ مَيِّتَكُمْ تم میت کی ناصیہ کیوں باندھتے ہو اور فُلَانٌ رَأْسُهُمْ وَعَيْنُهُمْ کی طرح فُلَانٌ نَاصِيَةُ قَوْمِهٖ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی سردار کے ہیں۔

اِنْتَصَى الشَّعْرُ بالوں کا بڑھ جانا۔

اَلنَّصِيُّ۔ ایک قسم کا عمدہ چارہ۔

پھر اس کے ساتھ تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے:۔

فُلَانٌ نَصِيَّةُ الْقَوْمِ کہ فلاں ان میں بہتر ہے۔

(ن ض ج)

نَضِجَ اللَّحْمُ (ض) نُضْجًا وَنَضْجًا کے معنی گوشت کے پوری طرح پک جانے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا

لہ قالہ النابغۃ الذبیانی (...) فی وصف متجردۃ زوجۃ نعمان بن المنذر ولاجل ہذا الشعر قال صالح بن حسان المدنی: ان الشاعر کان مخنثا (شرح دیوان نابغۃ ۳۰) وراجع للقصۃ ایضًا الشعراء والاغانی والبیت فی دیوانہ ۳۰ وامالی المرتضی (۱: ۲۰۴) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۱۲) والعقد الثمین ۱۰ فی ۳۳ بیتًا والبحر (۷: ۲۲۹، ۴۲۴) والحصری (۱: ۲۶۵) والعینی (۱: ۸۳) والفائق (۲: ۲۷۵) والعمدۃ (۱: ۲۷۳) وادردہ فی العمدۃ فی امثلۃ الاختراع وہو مغایر عند العلماء والسرقۃ والتولید لوجوہ والنظر الاول فی المحاضرات للمؤلف (۱: ۸۷) ؂ ملہ فی غریب ابی عبید ۴ / ۲۳۱: علام بدل مالکم والحدیث فی الفائق ۲ / ۲۷۸ ولفظہ کما فی ابی عبید ۱۲

غَيْرَهَا (۴-۵۶) جب ان کی کھالیں گل اور جل جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔
اسی سے نَاقَۃٌ مُنْضِجَۃٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی حاملہ اونٹنی کے مدت ولادت سے تجاوز کر جانے کے ہیں۔ اور پختہ رائے آدمی کو نَضِیْجُ الرَّأْیِ کہا جاتا ہے۔

(ن ض د)

نَضَدْتُ الْمَتَاعَ بَعْضَهٗ عَلٰی بَعْضٍ کے معنی سامان کو قرینے سے اوپر نیچے رکھنے کے ہیں۔ اور قرینے سے رکھے ہوئے سامان کو مَنْضُوْدٌ یا نَضِیْدٌ کہا جاتا ہے۔ اور جس تخت پر سامان جوڑ کر رکھا جائے اسے بھی نَضِیْدٌ کہتے ہیں۔۔
۔۔۔ اسی سے استعارۃً فرمایا:۔
طَلْعٌ نَضِيدٌ (۵۰-۱۰) جن کا گابھا تہ بر تہ ہوتا ہے۔
اور دوسرے مقام پر فرمایا:۔
وَطَلْحٍ مَنْضُودٍ (۵۶-۲۹) اور تہ بہ تہ کیلوں۔
اور مجازاً گہرے بادل کو بھی نَضَدٌ کہا جاتا ہے۔ اور اَنْضَادُ الْقَوْمِ کے معنی لوگوں کی مختلف جماعتوں کے ہیں۔ اور نَضَدُ الرَّجُلِ کے معنی آدمی کے اعمام واخوال کے ہیں جن کی مدد سے وہ مضبوط ہوتا ہے۔

(ن ض ر)

اَلنَّضْرَۃُ وَالنَّضَارَۃُ کے معنی حسن اور تروتازگی کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ (۸۳-۲۴) تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے۔
وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا (۷۶-۱۱) اور تازگی اور خوشدلی عنایت فرمائے گا۔
اور یہ نَضَرَ وَجْهُهٗ يَنْضُرُ فَهُوَ نَاضِرٌ (نصر) سے آتا ہے۔ اور بعض نے نَضِرَ يَنْضَرُ یعنی باب علم سے مانا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔
اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے (۷۵-۲۲)
نَضَّرَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو تروتازہ (یعنی خوش وخرم) رکھے۔
غُصْنٌ اَخْضَرُ وَنَاضِرٌ تروتازہ ٹہنی۔
اور سونے کو بھی اس کی تروتازگی اور حسن کے باعث نَضْرٌ وَنَضِيرٌ کہا جاتا ہے۔ وَقَدَحٌ نُضَارٌ (اضافت کے ساتھ) پیالہ کو کہتے ہیں۔ جو عمدہ لکڑی سے بنا ہوا ہو۔

(ن ط ح)

اَلنَّطِيحَةُ۔ سینگ لگنے سے مری ہوئی بکری۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ (۵-۳) اور جو جانور گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے۔
اَلنَّطِيحُ وَالنَّاطِحُ۔ اس آہو یا پرند کو کہتے ہیں۔ جو شکاری کی طرف سیدھا آئے۔ گویا وہ سینگ سے مارنا چاہتا ہے۔ ایسے شکار کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اور اسی سے نَوَاطِحُ الدَّهْرِ ہے جس کے معنی شدائد زمانہ کے ہیں۔
اور فَرَسٌ نَطِيحٌ (اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی پیشانی کے دونوں طرف سفید ہوں۔

(ن ط ف)

اَلنُّطْفَۃُ۔ (ضمہ نون) اصل میں تو آب صافی کو کہتے ہیں مگر اس سے مرد کی منی مراد لی جاتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ جَعَلْنٰہُ نُطْفَۃً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ (۲۳-۱۳) پھر اس کو ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔

مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ (۷۶-۲) نطفۂ مخلوط سے۔

اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی (۷۵-۳۷) کیا وہ منی کا جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا۔

اور کنایہ کے طور پر موتی کو بھی نُطْفَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے صَبِیٌّ مُّنَطَّفٌ ہے یعنی وہ لڑکا جس نے کانوں میں موتی پہنے ہوئے ہوں۔

اَلنَّطَفُ کے معنی ڈول کے ہیں اس کا واحد بھی نُطْفَۃٌ ہی آتا ہے اور لَیْلَۃٌ نَطُوْفٌ کے معنی برسات کی رات کے ہیں جس میں صبح تک متواتر بارش ہوتی رہے۔

اَلنَّاطِفُ۔ سیال چیز کو کہتے ہیں۔ اسی سے نَاطِفٌ بمعنی شکر پنیر ہے اور فُلَانٌ مُنْطِفُ الْمَعْرُوْفِ کے معنی ہیں۔ فلاں اچھی شہرت کا مالک ہے۔ اور فُلَانٌ یَنْطِفُ بِسُوْءٍ کے معنی برائی کے ساتھ آلودہ ہونے کے ہیں جیسا کہ فُلَانٌ یُنَدّٰی بِہٖ کا محاورہ ہے۔

(ن ط ق)

عرف میں نُطْقٌ ان اصوات مُقَطَّعَۃٌ کو کہا جاتا ہے۔ جو زبان سے نکلتی ہیں۔ اور کان انہیں سنکر محفوظ کر لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

مَا لَکُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ (۳۷-۹۲) تمہیں کیا ہوا کہ تم بولتے نہیں۔

یہ لفظ بالذات صرف انسان کے متعلق بولا جاتا ہے دوسرے حیوانات کے لئے بالتبع استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَلْمَالُ النَّاطِقُ وَالصَّامِتُ کا محاورہ ہے جس میں ناطق سے حیوان اور صامت سے سونا چاندی مراد ہے۔ ان کے علاوہ دیگر حیوانات پر ناطق کا لفظ مقید یا بطور تشبیہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1]:

(۴۳۰) عَجِبْتُ لَھَا اَنّٰی یَکُوْنُ غِنَاؤُھَا
فَصِیْحًا وَلَمْ تَفْغَرْ لِمَنْطِقِھَا فَمًا

مجھے تعجب ہوا کہ وہ کتنا فصیح گانا گاتی ہے حالانکہ اس نے گویائی کے لئے منہ نہیں کھولا۔

اہل منطق قوت گویائی کو نطق کہتے ہیں جب وہ انسان کی تعریف کرتے ہوئے اَلْحَیُّ النَّاطِقُ ...... کہتے ہیں تو ناطق سے ان کی یہی مراد ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ نطق کا لفظ مشترک ہے جو قوت نطقیہ اور کلام ملفوظ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ کبھی نَاطِقٌ کے معنی اَلدَّالُّ عَلَی الشَّیْءِ کے بھی

---

[1] قالہ حمید بن ثور یصف حمامۃ و فی لسان العرب (لغز) بمنطقھا بدل لمنطقھا والبیت من شواہد الکشاف ۱۱۹ والکامل ۸۴۹ فی ثمانیۃ ابیات والمصری (۱: ۲۷۱) فی عشرۃ والبلدان ویلسیلم، وطبقات الشافعیۃ الکبری (۱: ۱۱۱) فی ۳۸ ابیت والوسیط ۱۲۸-۱۲۹) والسمط ۳۸۲ فی خمسۃ والامالی (۱: ۱۳۹) والوحشیات ۷۳ فی سبعۃ والمحاضرات للمؤلف (۲: ۲۶) وادب الکاتب ۳۴ ونثار الازہر ۸۷ والخزانۃ (۱: ۱۷۴ و ۴: ۲۹۹) والحیوان (۳: ۱۹۸)

آتے ہیں اسی بنا پر ایک حکیم سے جب پوچھا گیا کہ النَّاطِقُ الصَّامِتُ کسے کہتے ہیں۔ تو اس نے جواب دیا۔ الدلائل المُخْبِرَةُ والعِبَرُ الوَاعِظَةُ۔

اور آیت کریمہ:۔ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (۲۱-۶۵) کہ تم جانتے ہو یہ بولتے نہیں۔

میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ وہ ذوی النطق اور ذوی العقول کی جنس سے نہیں ہیں۔ اور آیت کریمہ:

اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ (۴۱-۲۱) جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اس نے ہم کو بھی گویائی دی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نطق اعتباری مراد ہے کیونکہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ تمام چیزیں حقیقتاً ناطق نہیں ہیں۔ اور آیت کریمہ:

عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (۲۷-۱۶) ہمیں (خدا کی طرف سے) جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

میں پرندوں کی آواز کو محض حضرت سلیمان علیہ السلام کے لحاظ سے نطق کہا ہے کیونکہ وہ ان کی آوازوں کو سمجھتے تھے اور جو شخص کسی چیز سے کوئی معنی سمجھتا ہو تو وہ چیز خواہ صامت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لحاظ سے تو ناطق کا حکم رکھتی ہے اور آیت کریمہ:

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (۴۵-۲۹) یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں سچ سچ بیان کر دے گی۔

میں کتاب کو ناطق کہا ہے لیکن اس کے نطق کا ادراک صرف آنکھ ہی کر سکتی ہے۔ جیسا کہ کلام بھی ایک کتاب ہے لیکن اس کا ادراک حاسۂ سماعت سے ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا۔ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ (۴۱-۲۱)

اور وہ اپنے چمڑوں یعنی اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی؟ وہ کہیں گے جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اسی نے ہم کو بھی گویائی دی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نطق صوتی مراد ہے۔ اور بعض نے نطق اعتباری مراد لیا ہے۔ اور عالم آخرت کی اصل حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نطق درحقیقت لفظ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ معنی کو لپیٹنے اور محصور کرنے میں بمنزلہ نطاق کے ہوتا ہے۔

اَلْمِنْطَقُ وَالْمِنْطَقَةُ کمربند کو کہتے ہیں اور شاعر کے قول۔ قولہ[1] ( )

(۴۱۲) وَاَبْرَحُ مَا اَدَامَ اللّٰهُ قَوْمِیْ
بِحَمْدِ اللّٰهِ مُنْتَطِقًا مُجِيْدًا

جب تک میری قوم زندہ ہے میں بحمد اللہ عمدہ گو شاعر رہوں گا۔

میں بعض نے کہا ہے مُنْتَطِقًا کے معنی جانبا کے ہیں یعنی میں گھوڑے کو آگے سے پکڑ کر کھینچتا رہوں گا اور اس پر سوار نہیں ہوں گا۔ان

---

[1] قالہ خداش بن زہیر و فی اللسان (نطق) علی الاعداء بدل بحمد اللہ و فی دیوانہ رہطی بدل قومی والبیت من شواہد ابی عبیدۃ فی مجازہ (۱: ۳۱۲) رقم ۳۶ والعینی (۲: ۴۶) ۔

اگر اس معنی میں کوئی دوسرا شعر نہ آیا ہو تو یہاں منتطق سے مراد وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جس نے کمر پر نطاق باندھا ہوا ہو۔ جیسا کہ مقولہ مشہور ہے[۲]

وَمَنْ يَطُلْ ذَيْلُ اَبِيْهِ يَنْتَطِقْ بِهٖ یعنی جس کے باپ کے فرزند زیادہ ہوں گے۔ تو وہ ان کی وجہ سے طاقت ور اور توانا ہو جائے گا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ مُنْتَطِقٌ کے معنی عمدہ گو کے ہیں۔

(ن ظ ر)

اَلنَّظْرُ کے معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اس کا ادراک کرنے کے لئے آنکھ یا فکر کو جولانی دینے کے ہیں۔ پھر کبھی اس سے محض غور و فکر کرنے کا معنی مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس معرفت کو کہتے ہیں جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ نَظَرْتَ فَلَمْ تَنْظُرْ۔ تو نے دیکھا لیکن غور نہیں کیا۔

چنانچہ آیت کریمہ:۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ (۱۰-۱۰۱) ان کفار سے کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ میں اُنْظُرُوْا کے معنی غور کرنے کے ہیں۔ اگرچہ عوام کے نزدیک زیادہ تر نظر کا لفظ رؤیت بصری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن خواص کے نزدیک یہ عام طور بصیرت کے معنی میں آتا ہے جیسے فرمایا:۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۷۵-۲۲، ۲۳) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے۔

نَظَرْتُ اِلٰى كَذَا کے معنی کسی چیز کی طرف نظر اٹھانے کے ہیں۔ خواہ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔ اور نَظَرْتُ فِيْهِ کا معنی کسی چیز کو دیکھ کر اس میں غور کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۸۸-۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کئے گئے ہیں۔

نَظَرْتُ فِيْ كَذَا کے معنی کسی چیز میں غور کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ (۳۷-۸۸، ۸۹) تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی اور کہا میں تو بیمار ہوں۔

اور آیت کریمہ:۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷-۱۸۵) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں ۔۔۔۔ نظر نہیں کی۔

میں آسمان و زمین کی خلقت میں جو جو حکمتیں مضمر ہیں ان پر فکر و تامل کی ترغیب دی گئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کی طرف نظر کرنے سے ان پر احسان اور لطف کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور کفار کی طرف نظر نہ کرنے کے معنی ان سے لطف و کرم اور افاضۂ انعامات کو روک لینے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۳-۷۷) ان سے خدا نہ تو کلام کرے گا اور نہ قیامت کے روز ان کی طرف دیکھے گا۔

اور آیت کریمہ:۔

---

[۲] وفی روایۃ "من ابیہ" بدل ذیل ابیہ (نطق) وفی اللسان (ایر) ایر ابیہ وانظر لامثل اللسان (نطق) وجمہرۃ الامثال ۱۸۷ ومجمع الامثال (۲، ۲۵۶) والفائق (۱، ۱۳) والمشکل للقتبی ۴۶ والحیوان للجاحظ (۳، ۴۲) والعیون فی مقدمتہ ۱۲

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۸۳-۱۵) بے شک یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

اور اَلنَّظْرُ بمعنی انتظار بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ نَظَرْتُهٗ وَانْتَظَرْتُهٗ دونوں کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

وَانْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۱-۱۲۲) اور (نتیجہ اعمال کا) تم بھی انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۱۰-۱۰۲) سو جیسے برے دن ان سے پہلے لوگوں پر گزر چکے ہیں اسی طرح کے دنوں کے یہ منتظر ہیں۔ کہدو کہ تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (۵۷-۱۳) کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجئے۔ کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰهُ (۳۳-۵۳) کھانے کے لئے۔۔۔ اور اس کے پکنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔

فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۲۷-۳۵) اور دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۴۳-۶۶) یہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ قیامت ان پر ناگہاں آموجود ہو اور ان کو خبر تک نہ ہو۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ (۲-۲۱۰) کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان پر خدا (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں آنازل ہو اور فرشتے بھی (اتر آئیں)

وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً (۳۸-۱۵) اور یہ لوگ تو صرف ایک زور کی آواز کا انتظار کرتے ہیں۔

اور اَنْظَرْتُهٗ کے معنی اَخَّرْتُهٗ یعنی مؤخر کرنے اور مہلت دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (۱۵-۸) اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملتی۔

قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ (۷-۱۴، ۱۵) اس نے کہا کہ مجھے اس دن تک مہلت عطا فرماؤ جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا (اچھا)

فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۱۱-۵۵) تجھ کو مہلت دی جاتی ہے میرے بارے میں جو تدبیر (کرنی چاہو) کرلو اور مجھے مہلت نہ دو۔

لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (۳۲-۲۹) کہ کافروں کو ان کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۴۴-۲۹) پھر ان پر نہ تو آسمان وزمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی۔

یہاں ان سے اِنْظَارٌ کی نفی کرکے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس پر کہ آیت کریمہ:۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷-۳۴) جب وہ وقت آجاتا ہے

تو نہ تو ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی۔ یہ میں تنبیہ کیلئے ہے۔ اور آیت کریمہ:

رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (۷-۱۴۳) اے میرے پروردگار مجھے جلوہ دکھا کہ میں تیرا دیدار (بھی) دیکھ لوں۔

کی کچھ تشریح پہلے گذر چکی ہے۔ اور اس کے متعلق پر مفصل بحث اس کے بعد دوسری کتاب (تفسیر القرآن) میں بیان ہوگی۔

اور نَظَرٌ کا لفظ کسی معاملہ میں متحیر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۲-۵۵) تو تم کو بجلی نے آگھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔

وَتَرٰهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۷-۱۹۸) آنکھیں کھولے تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ مگر (دراصل) کچھ نہیں دیکھتے۔ نیز فرمایا:۔

وَتَرٰىهُمْ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا خٰشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ (۴۲-۴۵) اور تم ان کو دیکھو گے کہ دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے۔ ذلت سے عاجزی کرتے ہوئے چھپی (اور نیچی) نگاہ سے دیکھ رہے ہوں گے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْکَ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَلَوْ کَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ (۱۰-۴۳) اور بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے اگرچہ کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔

ان تمام آیات میں نَظَرٌ کے معنی حیرت زدہ ہو کر دیکھنے کے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح دیکھنا بے معنی ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ (۲-۵۰) اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا اور تم دیکھ ہی تو رہے تھے۔

میں بعض نے تَنْظُرُوْنَ کے معنی مشاہدہ کے لکھے ہیں۔ اور بعض نے عبرت حاصل کرنے کے۔ اور شاعر کے قول[1] (الرمل)

(۴۲۳) نَظَرَ الدَّهْرُ اِلَیْهِمْ فَابْتَهَلْ

میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ زمانے نے خیانت کی اور انہیں ہلاک کر ڈالا۔

اور حَیٌّ نَظَرٌ اس قوم کو کہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے اس قدر قریب فروکش ہوں کہ ان کے خیمے آمنے سامنے نظر آتے ہوں۔ اور آبادی بھی اسی قسم کے قرب سے حدیث میں کفار سے دور رہنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ (۱۳۰[2])

لَا تَتَرَاءٰی نَارَاهُمَا کہ مسلمان کفار سے اتنی دور ہوں کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے۔

اور نَظِیْرٌ کے معنی ہم مثل کے ہیں۔ اصل میں نظیر بمعنی مُنَاظِرٌ ہے گویا ایک دوسرے کو دیکھ کر باہم موازنہ کرتے ہیں۔

وَبِهٖ نَظْرَۃٌ وہ آسیب زدہ ہے الشاعر نے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے[3] ( )

(۴۳۲) وَقَالُوْا بِهٖ مِنْ اَعْیُنِ الْجِنِّ نَظْرَۃٌ

---

[1] قاله لبید وصدره: فی قروم سادة من قومه "انظر دیوانه" ۱۴ (طبع لیدن ۱۸۹۱ء) والطبرسی (۳: ۲۸۰) وقد مر فی ابهل [2] اخرجه النسائی وابو داؤد وقد تخریجه فی (رءی) [3] نسبه صاحب مصارع العشاق ۱۲۹ - ۱۳۰ بروایة ابن الاعرابی الی مجنون بنی عامر وتمامه .... ولو عقلوا قالوا به اعین الانس وفی محاضرات المؤلف (۳: ۸۲) بعجزه: ولو صدقوا قالوا به نظرة الانس وقبله: وجاءوا الیه بالتعاوید والرقی وصبوا علیه الماء من الم النکس ❊

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

اور لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔ اور اسے کسی جن کی نظر لگی ہوئی ہے۔

اَلْمُنَاظَرَۃُ کے معنی مباحثہ یعنی بحث و نظر میں باہم مقابلہ کرنے اور ہر ایک کے اپنی رائے علی وجہ البصیرۃ ظاہر کرنے کے ہیں اور نَظَرٌ کے معنی بحث کرنا بھی آتے ہیں۔ اور یہ قیاس سے عام ہے کیونکہ ہر قیاس کو نَظَرٌ کہہ سکتے ہیں لیکن ہر نظر قیاس نہیں ہوتی۔

(ن ع ج)

اَلنَّعْجَۃُ کی جمع نِعَاجٌ آتی ہے اور اس کا اطلاق بھیڑ، نیل گائے اور پہاڑی بکریوں میں سے مادینہ پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

اِنَّ ھٰذَآ اَخِیْ لَہٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَۃً وَّلِیَ نَعْجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ (۳۸-۲۳) یہ میرا بھائی ہے اس کے ہاں ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے۔

نَعِجَ الرَّجُلُ بھیڑ کا گوشت کھانے سے بدہضمی ہونا۔

اَنْعَجَ الرَّجُلُ موٹی بھیڑوں کا مالک ہونا۔

اَلنَّعَجُ کے معنی سپیدی یا سپید ہونے کے ہیں اور اَرْضٌ نَاعِجَۃٌ نرم زمین کو کہتے ہیں۔

(ن ع س)

اَلنُّعَاسُ کے معنی اونگھ یا ہلکی سی نیند کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ (۸-۱۱) جب اس نے ..... تمہیں نیند کی چادر اڑھادی۔

اَمَنَۃً نُّعَاسًا (۳-۱۵۴) تسلی ..... یعنی نیند

بعض نے کہا ہے کہ یہاں نُعَاسًا سے مراد سکون اور اطمینان ہے اور یہ آنحضرت کے قول مبارک کی طرف اشارہ ہے (۱۳۱)

طُوْبٰی لِکُلِّ عَبْدٍ نُوَمَۃٍ کہ ہر باسکون آدمی کے لئے خوش خبری ہے۔

(ن ع ق)

نَعَقَ الرَّاعِیْ بِصَوْتِہٖ[1] کے معنی چرواہے کے چلانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً اس کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

(ن ع ل)

اَلنَّعْلُ کے معنی جوتا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی (۲۰-۱۲) تو اپنا جوتا ..... اتار دو تم یہاں پاک میدان یعنی طوی میں ہو۔

اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کی حفاظت کے لئے جو چمڑا یا لوہا لگایا جاتا ہے اسے بھی نَعْلُ الْفَرَسِ کہتے ہیں۔

اسی طرح نیام شمشیر کے بائیں جانب جو لوہا لگایا جاتا ہے اسے نَعْلُ السَّیْفِ کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ مُنْعَلٌ وہ گھوڑا جس کے رسغ کے نیچے کے بالوں پر سفید نشان ہو۔

اور پاپوش پوش کو نَاعِلٌ وَّ مُنْعَلٌ کہا جاتا ہے اور کبھی اس سے مالدار آدمی بھی مراد لیا جاتا ہے جیسا کہ اَلْحَافِیْ سے مراد فقیر ہوتا ہے۔

---

[1] وفی المعاجم نَعَقَ الرَّاعِیْ بغنمہ ۱۲

(ن ع م)

اَلنِّعْمَۃُ۔ اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اور یہ فِعْلَۃٌ کے وزن پر ہے جو کسی حالت کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ جیسے: جِلْسَۃٌ وَرِکْبَۃٌ وغیرذالک۔

اور نَعْمَۃٌ کے معنی تَنَعُّمٌ یعنی آرام و آسائش کے ہیں۔ اور یہ فَعْلَۃٌ کے وزن پر ہے۔ جو مرۃ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے: ضَرْبَۃٌ وشَتْمَۃٌ اور نِعْمَۃٌ کا لفظ اسم جنس ہے جو قلیل وکثیر کیلئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (۱۴-۳۴) اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔

اُذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ (۲-۴۰) میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے۔

وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (۵-۳) اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ (۳-۱۷۱) پھر خدا کی نعمتوں کے ساتھ واپس آئے۔ وغیرذالک۔

اَلْاِنْعَامُ (افعال) کے معنی دوسروں پر احسان کرنے کے ہیں۔ اور یہ لفظ صرف اسی وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب مُنْعَمٌ عَلَیْہِ ذوی العقول سے ہو۔ لہٰذا اَنْعَمَ فُلَانٌ عَلٰی فَرَسِہٖ کہنا درست نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:

اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (۱-۶) جن پر تو اپنا فضل وکرم کرتا رہا۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ (۳۳-۳۷) اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا یہ کہتے تھے۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْہِ (۴۳-۵۹) وہ تو ہمارے ایسے بندے تھے جن پر ہم نے فضل کیا تھا۔

اَلنَّعْمَآءُ یہ ضَرَّآءُ کے مقابلہ میں آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنٰہُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْہُ (۱۱-۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

اور نُعْمٰی یُؤْسٰی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور نَعِیْمٌ کے معنی نِعْمَۃٌ کَثِیْرَۃٌ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (۵۶-۱۲) نعمتوں کی بہشت میں۔

جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (۲۲-۸) نعمت کے باغ ہیں۔

تَنَعُّمٌ کے معنی خوش حال ہونے اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کے ہیں اور نَعَّمَہٗ کے معنی کسی کو آسودہ حال بنانے کے۔ قرآن میں ہے:

فَاَکْرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ (۸۹-۱۵) اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے۔

طَعَامٌ نَاعِمٌ (عمدہ کھانا) جَارِیَۃٌ نَاعِمَۃٌ نازک اندام لڑکی۔ اور اَلنَّعَمُ کا لفظ خاص کر اونٹوں پر بولا جاتا ہے اور اونٹوں کو نَعَمٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ عرب کے لئے سب سے بڑی نعمت تھے اس کی جمع اَنْعَامٌ آتی ہے۔ لیکن اَنْعَامٌ کا لفظ بھیڑ بکری اونٹ اور گائے سب پر بولا جاتا ہے۔ مگر ان جانوروں پر اَنْعَامٌ کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے۔ جب اونٹ بھی ان میں شامل ہو۔ قرآن میں ہے:

جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ (۴۳-۱۲)

اور تمہارے لئے کشتیاں اور چارپائے بنائے۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَۃً وَّ فَرْشًا۔ (۶-۱۴۲)

اور چارپایوں میں بوجھ اٹھانے والے (یعنی بڑے بڑے بھی) پیدا کئے اور زمین سے لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے بھی)۔ اور آیت کریمہ:

فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ (۱۰-۲۴) پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں۔ مل کر نکلا۔

میں اَنْعَام کا لفظ عام ہے۔ جو تمام جانوروں کو شامل ہے۔

نَعَامٰی۔ جنوبی ہوا جو نرمی سے چل رہی ہو اور شتر مرغ کو "نَعَامَۃٌ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خلقت میں اونٹ کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور پہاڑ یا کنویں کے اوپر سائبان کے مانند بنی ہوئی عمارت جو کہ دور سے شتر مرغ کی طرح دکھائی دیتی ہو۔ اس کو بھی نَعَامَۃٌ کہا جاتا ہے[1] نَعَائِمُ منازل قمر سے ایک منزل کا نام ہے[2] جو شتر مرغ کی ہم شکل فرض کی گئی ہے۔۔۔

۔۔۔ اور شاعر کے قول[3]۔ (الکامل)

(۴۳۴) وَابْنُ النَّعَامَۃِ عِنْدَ ذٰلِکَ مَرْکَبِیْ

اور میری سواری میرا گھوڑا ابن نعامہ ہوگا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ابن نعامہ سے شاعر نے خود اپنے پاؤں مراد لئے ہیں۔ اور سرعت رفتاری

میں انہیں ابنِ نَعَامَہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ نعامہ کے معنی باطن قدم کے بھی آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اہل عرب نے یہ معنی بھی اِبْنُ النَّعَامَۃ کے محاورہ سے ہی اخذ کیا ہے۔

اور تَنَعَّمَ فُلَانٌ جس کے معنی آہستہ آہستہ چلنے کے ہیں، نِعْمَۃ سے مشتق ہے۔

نِعْمَ کلمہ مدح ہے جو بِئْسَ فعل ذم کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّہٗ اَوَّابٌ (۳۸-۳۰) بہت خوب بندے تھے اور (خدا کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔

فَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ (۳-۱۳۶) اور اچھے کام کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے۔

نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ (۸-۴۰) وہ خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰھَا فَنِعْمَ الْمَاھِدُوْنَ (۵۱-۴۸) اور زمین کو ہم ہی نے بچھایا تو دیکھو ہم کیا خوب بچھانے والے ہیں۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا ھِیَ۔ (۲-۲۷۱) اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے۔

اور محاورہ ہے:۔

اِنْ فَعَلْتَ کَذَا فَبِھَا وَنِعْمَتْ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو خوب کیا اور یہ اچھی عادت ہے۔

---

[1] انظر المخصص ۵ر ۱۳۵ [2] ہی منزلۃ من منازل القمر بہا ثمانیۃ نجوم اربعۃ فی المجرۃ تسمی الواردۃ واربعۃ خارجۃ تسمی الصادرۃ (الحیوان ۴ر ۱۵۴) [3] اختلفت الروایات فی صدرہ ونسبتہ ففی الصحاح (نعم) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۴۰۰) قالہ عنترۃ فی سبعۃ ابیات وصدرہ: فیکون مرکبک القعود ورحلہ وکذا فی المخصص (۱۳ر ۲۰۷) والحکم والعقد ۳۵ وابن الشجری فی حماستہ ۸ وامالیہ (۱: ۲۶۱) والمعانی للقتبی اوفی ذیل الصحاح انہ لخزز بن لوذان وکذا فی اللسان (عتق) وابن خالویہ والحیوان (۴: ۳۷۲-۳۷۶) مع اربعۃ اخری فیہ مدحہ بدل رحلہ ویوم ذاک بدل عند ذالک وکذا بالخیل لابن زیاد والاعرابی ۹۲ وعلی یا ابن النعامۃ فرسا یقال لہ خراف بن نعامۃ کانت لہ کما فی الخزانۃ البغدادیۃ (۳ر ۱۱) والبیان للجاحظ (۳ر ۷۹) وامالی ابن الشجری (۱: ۳۰۷) والشاعر جاہلی قدیم راجع الخزانۃ والمؤتلف ۱۰۲ والمعنی البیت انظر المعانی للقتبی ۹۰ ﴿

غَسَلْتُہٗ غَسْلًا نِعِمَّا: میں نے اسے اچھی طرح دھویا۔
فَعَلَ کَذَا اَوْ اَنْعَمَ: اس نے فلاں کام کیا اور خوب کیا
نَعَّمَ اللّٰہُ بِكَ عَیْنًا: اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرے یا تمہاری وجہ سے دوسروں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔
نَعَمْ: یہ کلمۂ ایجاب ہے اور لفظ نعمت سے مشتق ہے۔
اور نَعَمَۃُ وَ نُعْمَۃُ عَیْنٍ وَ نُعْمٰی عَیْنٍ وَ نُعَامُ عَیْنٍ وغیرہ (ان سب کا ماخذ نعمت ہی ہے)۔
اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تمام مرکبات اَلنَّعْمَۃُ سے ماخوذ ہوں جس کے معنی نرم اور سہل بنانے کے ہیں۔

(ن غ ض)

اَلْاِنْغَاضُ کے معنی دوسرے کے سامنے تعجب سے سر ہلانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَھُمْ (۱۷-۵۱) تو تعجب سے تمہارے آگے سر ہلائیں گے۔
نَغَضَ نَغَضَانًا: کپکپی کے ساتھ سر اور دانت ہلانا۔
اَلنُّغْضُ: بہت سر ہلانے والا نر شتر مرغ۔
اَلنُّغْضُ: کندھے کے کنارے کی پتلی ہڈی۔

(ن ف ث)

اَلنَّفْثُ: کے معنی تھوڑا سا تھوکنے یا تھتکارنے کے ہیں۔ اور یہ تفل (تھوکنا) سے کم درجہ ہوتا ہے۔ اور افسوں یا جادو کرنے والے کے گنڈوں پر پڑھ کر پھونکنے کو بھی نَفْثٌ کہا جاتا ہے۔
چنانچہ فرمایا:
وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳-۴) اور گنڈوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔
اور اسی سے اَلْحَیَّۃُ تَنْفُثُ السُّمَّ (سانپ زہر اگلتا ہے) کا محاورہ ہے مثل مشہور ہے[1]:
لَوْ سَاَلْتَہٗ نُفَاثَۃَ سِوَاكٍ مَا اَعْطَاكَ اگر تو اس سے مسواک کا ایک ریزہ بھی طلب کرے تو نہ دے (یعنی وہ نہایت بخیل ہے) اور نُفَاثَۃُ سِوَاكٍ اس ریزہ کو کہا جاتا ہے جو مسواک کرنے سے دانتوں میں رہ جاتا ہے۔ اور اسے پھینک دیا جاتا ہے۔
دَمٌ نَفِیْثٌ: خون جو زخم سے بہہ نکلے۔ مثل مشہور ہے[1]:
لَا بُدَّ لِلْمَصْدُوْرِ اَنْ یَّنْفُثَ (درد سینہ کے مریض کو تھوکنے سے چارہ نہیں)۔

(ن ف ح)

نَفَحَ (ن) نَفْحًا اَلرِّیْحُ: ہوا کا چلنا۔
لَہٗ نَفْحَۃٌ طَیِّبَۃٌ: وہ سخی ہے۔
اور کبھی بطور استعارہ شر کے لئے بھی نَفْحَۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:
وَلَئِنْ مَّسَّتْھُمْ نَفْحَۃٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ (۲۱-۴۶) اور اگر ان کو تمہارے پروردگار کا تھوڑا سا عذاب بھی پہنچے۔
نَفَحَتِ الدَّابَّۃُ: جانور کا سم سے مارنا۔

---

[1] کذا فی المعاجم علہ الاولی ان یکون بالف الاشباع ای ان ینفثا وترینہا: وللذی فی الصدر ان ینفثا (رسالۃ ابن القارح الی ابی العلاء المعری الذی اجاب عنہا فی رسالۃ خاصۃ سماہا رسالۃ الغفران) انظر رسائل البلغاء نشر کرد علی بمصر ص ۲۶۵ ومثلہ فی الفائق ۲ر۹: قال عمر بن عبدالعزیز لعبیداللہ بن عبداللہ بن عتبۃ حتی متی تقول الشعر فقال: لا بد للمصدور ان یسعلا۔ وللذی فی الصدر ان ینفثا ۱۲

نَفْحَۃٌ بِالسَّیْفِ. ہلکی سی تلوار مارنا۔
اَلنَّفُوْحُ (من النوق) وہ اونٹنی جس کے تھنوں سے بغیر دوہنے کے دودھ نکل پڑے (مِنَ القِسِیّ) دور تک تیر پھینکنے والی کمان۔
اَنْفِحَۃُ الْجَدْیِ بکری کے شیر خوار بچے کے پیٹ سے ایک زرد سی چیز نکالتے ہیں اور اسے ریشم کے لتہ میں لپیٹ کر پنیر کی طرح خشک کر لیتے ہیں عوام اسے "مَجْبَنَۃ" کہتے ہیں۔

(ن ف خ)

اَلنَّفْخُ کے معنی کسی چیز میں پھونکنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (۲۰-۸۷) اور جس دن صور پھونکا جائیگا۔
وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ (۳۶-۵۱) اور جس وقت صور پھونکا جائے گا۔
ثُمَّ نُفِخَ فِیْہِ اُخْرٰی (۳۹-۶۸) پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا۔
اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ (۷۴-۸) جب صور پھونکا جائے گا۔
اور اسی سے نَفْخُ الرُّوْحِ ہے جس کے معنی اس دنیا میں کسی کے اندر روح پھونکنے کے ہیں چنانچہ آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔
وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (۱۵-۲۹) اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔
محاورہ ہے:۔
اِنْتَفَخَ بَطْنُہٗ. اس کا پیٹ پھول گیا۔
اور اسی سے بطور استعارہ اِنْتَفَخَ النَّھَارُ کا محاورہ ہے جس کے معنی دن کے بلند ہونے کے ہیں۔
اور نَفْخَۃُ الرَّبِیْعِ کے معنی موسم بہار کی تروتازگی کے ہیں۔ اور موٹے آدمی کو رَجُلٌ مَنْفُوْخٌ کہا جاتا ہے۔

(ن ف د)

اَلنَّفَادُ (س) ختم ہو جانا۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّ ھٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَہٗ مِنْ نَّفَادٍ (۳۸-۵۴) یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔
اور اس معنی میں فعل نَفِدَ (س) استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ (۱۸-۱۰۹) کہہ دو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے۔
مَا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ (۳۱-۲۷) تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔
اَنْفَدُوْا۔ ان کا توشہ ختم ہو گیا۔ اور خَصْمٌ مُنَافِدٌ دوسرے کی حجت کو ختم کرنے کے لئے جھگڑنے والے کو کہتے ہیں۔ اور نَافَدْتُہٗ وَنَفَدْتُہٗ کے معنی دوسرے کی دلیل کو ختم کرنے کے ہیں۔

(ن ف ذ)

نَفَذَ السَّھْمُ فِی الرَّمِیَّۃِ نُفُوْذًا وَّنَفَاذًا کے معنی تیر کے نشانہ سے پار ہو جانے کے ہیں۔
اور نَفَذَ فُلَانٌ فِی الْاَمْرِ نَفَاذًا کے معنی کسی کام کو کر گزرنے کے اور اَنْفَذْتُہٗ (افعال) کے معنی پار کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ۔ (۵۵-۳۳) اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان وزمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ۔ اور زور کے سوا تو تم نکل سکتے ہی نہیں۔

نَفَّذْتُ الْاَمْرَ تَنْفِيْذًا۔ حکم نافذ کرنا۔

نَفَّذْتُ الْجَيْشَ فِی الْغَزْوِ غزوہ میں لشکر بھیجنا...

.... حدیث میں ہے (۱۳۰)

نَفِّذُوْا جَيْشَ اُسَامَةَ۔ کہ جیش اسامہ کو روانہ کر دینا۔

اَلْمَنْفَذُ باہر نکلنے کا راستہ۔

(ن ف ر)

اَلنَّفْرُ (ع ن) کے معنی کسی چیز سے روگردانی کرنے اور دالی کے ساتھ) کسی کی طرف دوڑنے کے ہیں۔ جیسا کہ نزع کا لفظ الیٰ اور عن دونوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ نَفَرَ عَنِ الشَّيْءِ نُفُوْرًا کسی چیز سے دور بھاگنا۔ قرآن میں ہے:۔

مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا۔ (۳۵-۴۲) تو اس سے ان کی نفرت ہی بڑھی۔

وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۱۷-۴۱) مگر وہ اس سے اور بدک جاتے ہیں۔

نَفَرَ اِلَی الْحَرْبِ (ض ن) نفرًا لڑائی کیلئے نکلنا اور اسی سے ذی الحجہ کی بارھویں تاریخ کو يَوْمَ النَّفْرِ کہا جاتا ہے کیونکہ اس روز حجاج منیٰ سے مکہ معظمہ کو واپس ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا (۹-۴۱) تم سبکسار ہو یا گراں بار (یعنی مال واسباب تھوڑا رکھتے ہو یا بہت) گھروں سے نکل آؤ۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۹-۳۹) اگر نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا۔

مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹-۳۸) تمہیں کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد کے لئے) نکلو۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ (۹-۱۲۲) اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب سب نکل آئیں۔ تو یوں کیوں نہیں کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے۔

اَلْاِسْتِنْفَارُ (۱) جنگ کے لئے نکلنے کی ترغیب دینا (۲) لوگوں کو لڑائی سے بھاگ جانے پر اکسانا (۳) ڈر کر بھاگ جانا۔ اور آیت کریمہ۔ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (۷۴-۵۰) گویا گدھے ہیں کہ بدک جاتے ہیں۔

میں مُسْتَنْفِرَةٌ اگر کسرہ فاء کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی نَافِرَةٌ یعنی ڈر کر بھاگنے والے کے ہوں گے۔ اور فتح فاء کے ساتھ ہو تو مُنَفَّرَةٌ کے ہم معنی ہوگا یعنی بھگایا ہوا۔

اَلنَّفْرُ وَالنَّفِيْرُ وَالنَّفَرَةُ بھاگنے والے آدمیوں کا گروہ۔

اَلْمُنَافَرَةُ۔ مفاخرۃ میں محاکمہ کرنا اسی سے اُنْفِرَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی مفاخرۃ میں غالب ہونے کا فیصلہ دیئے گئے کے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے۔

لہ من جملۃ وصایاہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرض موتہ راجع البخاری ؛

نَفَرَ فُلَانٌ (بزعم اہل جاہلیت) شیطان کو بھگانے کے لئے بچے کا کوئی نام رکھنا۔ چنانچہ ایک اعرابی کا بیان ہے کہ میری پیدائش پر کسی نے میرے والد سے کہا: نَفِّرْ عَنْهُ کہ اس سے شیطان کو بھگا دو۔ تو والد نے میرا نام قُنْفُذٌ اور کنیت ابوالعداء رکھ دی۔

نَفَرَ الْجِلْدُ۔ جلد میں ورم ہو جانا۔

ابوعبید کا قول ہے کہ یہ نِفَارُ الشَّیْءِ عَنِ الشَّیْءِ سے ہے جس کے معنی ایک چیز کے دوسری سے دور اور الگ ہونے کے ہیں۔

(ن ف س)

اَلنَّفْسُ کے معنی روح کے آتے ہیں چنانچہ فرمایا۔ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۶-۹۳) کہ نکال لو اپنی جانیں۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ (۲-۲۳۵) اور جان رکھو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خدا کو سب معلوم ہے۔

اور ذیل کی دونوں آیتوں۔

تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ (۵-۱۱۶) اور جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے۔ اور جو تیرے ضمیر میں ہے میں اسے نہیں جانتا ہوں۔

وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (۳-۳۰) اور خدا تم کو اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے۔

میں نفس بمعنی ذات ہے اور یہاں نَفْسَهٗ کی اضافت اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرۃ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوئی سے پاک ہے۔ بعض کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی طرف نفس کی اضافت اضافت ملک ہے۔ اور اس سے ہمارے نفوس امارہ مراد ہیں جو ہر وقت برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔

اَلْمُنَافَسَةُ کے معنی نفوس فاضلہ کے ساتھ اتصال اور تشبیہ حاصل کرنے کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔

مجاہدہ نفسانی (نفس کشی) کے ہیں۔ بادل اس کے کہ دوسروں کو اس سے ضرر پہنچے۔ قرآن میں ہے: وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳-۲۶) تو (نعمتوں کے) شائقین کو چاہیئے کہ اسی سے رغبت کریں۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:۔

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵۷-۲۱) بندو اپنے پروردگار کی بخشش کیطرف لپکو۔

اَلتَّنَفُّسُ کے معنی سانس کے ہیں۔ جو منہ اور ناک کے نتھنوں کے ذریعہ بدن کے اندر جاتا اور باہر نکلتا ہے۔ اور یہ روح کے لئے بمنزلہ غذا کے ہے۔ جس کے انقطاع سے روح زائل ہو جاتی ہے۔ اور نَفَسٌ کے معنی کشائش اور فراخی کے بھی آتے ہیں اور اسی سے ایک روایت میں ہے[1] (۱۲۰)

اِنِّیْ لَاَجِدُ نَفَسَ رَبِّكُمْ مِّنْ قِبَلِ الْیَمَنِ کہ میں یمن کی جانب سے کشائش اور فراخی یعنی نصرت

[1] الحدیث فی الفائق وفی الطبرانی نفیر ربکم وبھٰذا اللفظ ذکرہ صاحب الکشاف وفی روایۃ نفس الرحمٰن انظر اللسان (نفس)، والمشکل للقتبی والغزالی فی الاحیاء ۳ر۲۲۲ قال العراقی فی تخریجہ اشار بہ الی اویس القرنی ولم اجدلہ اصلا وفی مناقب اہل الیمن احادیث ۱۲

الٰہی پاتا ہوں (انصار کا یمنی ہونا اس احساس کی تصدیق کے لئے کافی ہے) اور آنحضرت نے فرمایا[1] (۱۳۱)

لَا تَسُبُّوا الرِّيحَ فَإِنَّهَا مِنْ نَفَسِ الرَّحْمٰنِ۔ ہوا کو برا بھلا مت کہو۔ بے شک یہ خدائے رحمٰن کے نفس سے ہے یعنی اس سے غم دور ہوتا ہے۔ اور ایک دعا میں ہے[2]:- (۱۳۲)

اَللّٰهُمَّ نَفِّسْ عَنِّيْ۔ اے اللہ میری تکلیف دور فرما۔

تَنَفَّسَتِ الرِّيحُ عمدہ ہوا چلنا۔ شاعر نے کہا ہے[3] (الطویل)

(۱۳۵) فَإِنَّ الصَّبَا رِيحٌ إِذَا مَا تَنَفَّسَتْ
عَلٰى نَفْسِ مَحْزُوْنٍ تَجَلَّتْ هُمُوْمُهَا

بے شک باد صبا ایسی ہوا ہے کہ اس کے چلنے سے مغموم دلوں کے تمام غم دور ہو جاتے ہیں۔

اَلنِّفَاسُ کے معنی عورت کے بچہ جننے یا حالت زچگی میں ہونے کے ہیں۔ اور اس عورت کو جو حالت نفاس میں ہو نُفَسَاءُ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع نُفَاسٌ آتی ہے اور صَبِيٌّ مَنْفُوْسٌ کے معنی نوزائیدہ بچہ کے ہیں۔

تَنَفَّسَ النَّهَارُ دن کا چڑھنا۔ دوپہر ہونا قرآن میں ہے:- وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (۸۱-۱۸) اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے۔

اور نَفِسْتُ بِكَذَا کے معنی کسی چیز کو عزیز سمجھنے اور اس پر بخل کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے نَفِيْسٌ اور مُنْفِسٌ ہے جس کے معنی قیمتی چیز کے ہیں۔

(ن ف ش)

اَلنَّفْشُ (ن) کے معنی اون دھنکنے اور پھیلانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:- كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (۱۰۱-۵) جیسے دھنکی ہوئی ہوئی رنگ برنگ کی اون۔

نَفَشَ الْغَنَمُ (رات کے وقت) بکریوں کا بغیر چرواہے کے چرنے کے لئے منتشر ہونا۔

اَلنَّفَشُ (بفتح الفاء اسم) وہ بکریاں جو رات کو بغیر چرواہے کے چرنے کے لئے منتشر ہو گئی ہوں۔ قرآن میں ہے:- إِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ (۲۱-۷۸) جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں۔

اَلْإِبِلُ النَّوَافِشُ رات کو بغیر چرواہے کے چرنے والے اونٹ۔

(ن ف ع)

اَلنَّفْعُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے خیرات تک رسائی کے لئے استعانت حاصل کی جائے یا وسیلہ بنایا جائے پس نفع خیر کا نام ہے۔ اور اس کی ضد ضُرٌّ ہے۔ قرآن میں ہے۔
وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا۔ (۲۵-۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں۔

قُلْ لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّضَرًّا (۷-۱۸۸) کہدو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی

---

[1] قطعة من الحديث اخرجه الترمذي في جامعه والبيهقي في سننه [2] قطعة من الدعاء (ابن السني في اليوم والليلة وتحفة الذاكرين [3] قالته امرأة نجدية في ثلاثة ابيات ولشعرها قصة راجع القالي (۲: ۱۷۰) وفي محاضرات المؤلف (۱: ۵۵۰) انشده المجنون في الريح السنطابة وقبله: اجد بردها وتشفي مني حرارة۔ على كبد لم يبق الا سويدها والبيت في اللسان (نسم) بلغير عزو۔

اختیار نہیں رکھتا۔
لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ (۶۰-۳) نہ تمہارے رشتے ناتے کام آئیں گے اور نہ اولاد۔
وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ (۳۴-۲۳) اور خدا کے ہاں (کسی کے لئے) سفارش فائدہ نہیں دے گی۔
وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْ (۱۱-۳۴) تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ وغیر ذالک من الآیات یعنی اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔

(ن ف ق)

نَفَقَ (ن۔ س) الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کے ختم ہونے یا چلے جانے کے ہیں۔ اور چلے جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔ (۱) خوب فروخت ہونے سے جیسے نَفَقَ الْبَيْعُ (سامان کا) خوب فروخت ہونا۔ اسی سے نَفَاقُ الْاَيِّمِ ہے جس کے معنی بیوہ عورت سے نکاح کے طلب گاروں کا بکثرت ہونا کے ہیں۔
نفق الْقَوْمُ۔ بازار کا پررونق ہونا۔
(۲) بذریعہ مرجانے کے جیسے نَفَقَتِ الدَّابَّةُ نُفُوْقًا۔ جانور کا مرجانا۔
(۳) بذریعہ فنا ہوجانے کے جیسے نَفِقَتِ الدَّرَاهِمُ درہم خرچ ہوگئے۔ اَنْفَقْتُهَا ان کو خرچ کر دیا۔
اَلْاِنْفَاقُ کے معنی مال وغیرہ صرف کرنا کے ہیں۔ اور یہ کبھی واجب ہوتا ہے۔ اور کبھی مستحب اور مال اور غیر مال یعنی علم وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا۔
اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۲-۱۹۴) اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرو۔
وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (۶۳-۱۰) اور جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے ..... خرچ کرلو۔
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۳-۹۲) مومنو! جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (راہ خدا میں) صرف نہ کروگے کبھی نیکی حاصل نہیں کر سکوگے۔ اور جو چیز تم صرف کروگے۔ خدا اس کو جانتا ہے۔
وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ (۳۴-۳۹) اور تم جو چیز خرچ کروگے۔ وہ اس کا (تمہیں) عوض دے گا۔
لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ (۵۷-۱۰) جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا۔ وہ ..... برابر نہیں۔
علیٰ ہذا القیاس اس قسم کی بہت سی آیات ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ (۱۷-۱۰۰) کہو اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ ہوجانے کے خوف سے ان کو بند کر رکھتے۔
میں خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ کے معنی مفلس ہونے کا خوف کے ہیں اور یہ اَنْفَقَ فُلَانٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مال کے خرچ ہوجانے کے بعد قلاش ہوجانے کے ہیں۔
یہاں اِنْفَاقٌ بمعنی اِمْلَاقٌ ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (۱۷-۳۱) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا۔

نَفَقَةٌ (اسم) جو چیز خرچ کی جائے۔ فرمایا:۔
وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ (۲-۲۷۰) اور تم خدا کی راہ میں جس طرح کا خرچ کرو۔
وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً (۹-۱۲۱) اور (اسی طرح) وہ جو خرچ کرتے ہیں۔
اَلنَّفَقُ۔ آر پار ہونے والا کوچہ یا سرنگ جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ فرمایا:۔
وَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ (۶-۳۵) اور اگر طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو۔
اور اسی سے نَافِقَاءُ الْيَرْبُوعِ ہے یعنی جنگلی چوہے کا بل جس کے دو دہانے ہوں۔ نَافَقَ الْيَرْبُوعُ وَنَفَقَ۔ جنگلی چوہیا اپنے بل کے دہانے سے داخل ہو کر دوسرے سے نکل گئی اور اسی سے نِفَاقٌ ہے۔ جس کے معنی شریعت میں دو رخی اختیار کرنے (یعنی شریعت میں ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے سے نکل جانا) کے ہیں چنانچہ اسی معنی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔
إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴-۱۴۵) کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے۔
نَيْفَقُ السَّرَاوِيلِ۔ پاجامے کا نیفہ۔

(ن ف ل)

اَلنَّفْلُ۔ بعض کے نزدیک نفل اور غنیمت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ان میں صرف اعتباری فرق ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ فتح کے بعد چھینا ہوا مال ہوتا ہے اسے غنیمت کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا غیر لازم ہونے کے لحاظ نفل کہلاتا ہے۔
بعض کے نزدیک ان میں نسبت عموم وخصوص مطلق ہے یعنی غنیمت عام ہے اور ہر اس مال کو کہتے ہیں جو لوٹ سے حاصل ہو خواہ مشقت سے ہو یا بلا مشقت کے فتح سے قبل حاصل ہو یا بعد میں استحقاق سے حاصل ہو یا بغیر استحقاق کے اور نفل خاص کر اس مال کو کہتے ہیں جو غنیمت سے قبل از تقسیم حاصل ہوا ہو۔
بعض کے نزدیک نَفْلٌ وہ مال ہے جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے اور اسے فے بھی کہتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے جو سامان وغیرہ تقسیم غنائم کے بعد بانٹا جاتا ہے۔ اسے نفل کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔
يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ الآية (۸-۱) (اے محمد) مجاہد لوگ آپ سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ کیا حکم ہے)
اصل میں اَنْفَالٌ نَفْلٌ سے ہے جس کے معنی واجب پر زیادتی کے ہیں اور اسے نَافِلَةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ (۱۷-۷۹) اور بعض حصہ شب میں بیدار ہوا کرو۔ اور تہجد کی نماز پڑھا کرو۔ (یہ شب خیزی) تمہارے لئے (سبب زیادت ثواب اور نماز تہجد تم کو نفل) ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً (۲۱-۷۲) اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق عطا کئے اور مستزاد برآں یعقوب۔
میں نَافِلَةً بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اولاد کی اولاد ہے۔ محاورہ ہے۔

نَفَلْتُهٗ کَذَا میں نے اسے بطور نفل کے دیا۔
نَفَلَهُ السُّلْطَانُ۔ بادشاہ نے اسے تبرع کے طور پر قتیل کا سامان دے دیا۔ اَلنَّوْفَلُ عطائے کثیر۔
اِنْتَفَلْتُ من کَذَا۔ میں نے اس سے چن لیا۔

(ن ق ب)

اَلنَّقْبُ کے معنی دیوار یا چمڑے میں سوراخ کرنے کے ہیں اور ثقب کے معنی لکڑی میں سوراخ کرنے کے . . . . محاورہ ہے:۔
نَقَبَ الْبَیْطَارُ سُرَّةَ الدَّابَّةِ بیطار نے جانور کی ناف میں مِنْقَبُ (نشتر) کے ساتھ سوراخ کردیا۔
مَنْقَبٌ۔ سوراخ کرنے کی جگہ۔
نُقِبَ الحَائِطُ دیوار میں نقب لگائی گئی۔
نَقَّبَ الْقَوْمُ قوم کا چلنا پھرنا۔ قرآن میں ہے:۔
فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ (۵۰-۳۶) وہ شہروں میں گشت کرنے لگے کیا کہیں بھاگنے کی جگہ ہے
کَلْبٌ نَقِیْبٌ۔ کتا جس کے گلے میں آواز کمزور کرنے کے لئے سوراخ کردیا گیا ہو۔
اَلنُّقْبَةُ۔ ابتدائی خارش۔ ج۔ نُقَبٌ
اَلنَّاقِبَةُ۔ ناسور۔ زخم جو کئی روز تک ایک پہلو پر لیٹے رہنے کی وجہ سے پیدا ہوجاتا ہے۔
اَلنُّقْبَةُ۔ ازار کی مثل ایک قسم کا کپڑا جس میں سوراخ ہونے کی وجہ سے تکہ لگایا جاتا ہے۔
اَلْمَنْقَبَةُ۔ اصل میں پہاڑ کے درہ کو کہتے ہیں۔ اور بطور استعارہ شریفانہ کارنامہ کو مَنْقَبَةٌ کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لئے کہ اس کا اچھا اثر باقی رہ جاتا ہے۔ اور یا اس لئے کہ وہ بھی اس کی رفعت کے لئے بمنزلہ منہاج کے ہے۔

اَلنَّقِیْبُ کسی قوم کے حالات جاننے والا۔ ج نُقَبَاءُ۔ قرآن میں ہے۔
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا (۵-۱۲) اور ان میں ہم نے بارہ سردار مقرر کئے۔

(ن ق ذ)

اَلْاِنْقَاذُ کسی خطرہ یا ہلاکت سے خلاصی دینا۔ قرآن میں ہے:۔
وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (۳-۱۰۲) اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تو خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔
اَلنَّقَذُ بمعنی چھڑایا ہوا۔ فَرَسٌ نَقِیْذٌ دشمن کے ہاتھ سے چھینا ہوا گھوڑا گویا وہ ان سے بچایا گیا ہے ج نَقَائِذُ

(ن ق ر)

اَلنَّقْرُ (ن) کسی چیز کو کھٹکھٹانا حتیٰ کہ اس میں سوراخ ہوجائے۔
اَلْمِنْقَارُ۔ کھٹکھٹانے کا آلہ جیسے پرندہ کی چونچ یا چکی کو کندہ کرنے کے اوزار وغیرہ۔
نَقَرْتُ عَنِ الْاَمْرِ کسی معاملہ کی چھان بین کرنا۔
نَقَرْتُهٗ بطور استعارہ بمعنی غیبت کرنا۔ جیسا کہ ایک عورت نے اپنے خاوند سے کہا:۔
مُرَّ بِیْ عَلٰی بَنِیْ نَظَرٍ وَلَا تَمُرَّ بِیْ عَلٰی بَنَاتِ نَقَرٍ۔ کہ مجھے مردوں کے پاس سے لے کر گزرنا جو نظر ڈالتے ہیں۔ اور عورتوں کے پاس سے لے کر نہ گزرنا جو عیب لگاتی اور غیبت کرتی ہیں۔
اَلنُّقْرَةُ (۱) گڑھا جس میں سیلاب کا پانی باقی رہ جاتا ہے اور (۲) گردن کے پچھلے حصے کے گڑھے

کو نُقْرَۃُ الْقَفَا کہا جاتا ہے۔
اَلنَّقِیْرُ کھجور کی گٹھلی کے گڑھے کو کہتے ہیں اور یہ حقیر چیز کے لئے ضرب المثل ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا (۴۔۱۲۴) اور تل برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔
اور اَلنَّقِیْرُ اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس میں گڑھا کرکے اس میں نبیذ ڈالتے ہیں کہا جاتا ہے۔
ھُوَ کَرِیْمُ النَّقِیْرِ فلاں شریف الاصل ہے یعنی بعد از تفتیش۔
النَّاقُوْرُ کے معنی صور یعنی بگل کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ (۷۴۔۸) جب صور پھونکا جائے گا۔
نَقَرْتُ الرَّجُلَ زبان کو تالو سے لگا کر آواز نکال کر کسی آدمی کو بلانا۔
نَقَرْتُ الرَّجُلَ کسی شخص کو جماعت میں سے خاص کر علیحدہ بلانا گو یا زبان کے ذریعہ آواز نکال کر خاص کر اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
اور اس طور سے بلانے کو نَقْرٰی کہا جاتا ہے۔
دَعَوْتُھُمُ النَّقْرٰی میں نے خاص طور پر انہیں بلایا۔

(ن ق ص)

اَلنَّقْصُ (اسم) حق تلفی اور یہ نَقَصْتُہٗ (ن) فَھُوَ مَنْقُوْصٌ کا مصدر بھی ہے جس کے معنی گھٹانے اور حق تلفی کر نیکے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ (۲۔۱۵۵) اور جانوں اور مالوں۔۔۔۔ کے نقصان سے۔
وَاِنَّا لَمُوَفُّوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ۔ (۱۱۔۱۹) اور ہم ان کو ان کا حصہ پورا پورا بلا کم و

کاست دینے والے ہیں۔
ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْکُمْ شَیْئًا (۹۔۴) اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور نہ کیا۔

(ن ق ض)

اَلنَّقْضُ۔ یہ ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنی کسی چیز کا شیرازہ بکھیرنے کے ہیں جیسے نَقَضْتُ الْبِنَاءَ عمارت کو ڈھانا۔ اَلْحَبْلَ رسی کے بل اتارنا۔ اَلْعَقْدَ گرہ کھولنا۔
اَلنِّقْضُ وَالنَّقْضُ یہ دونوں بمعنی منقوض آتے ہیں۔ لیکن بکسر النون زیادہ تر عمارت کے لئے آتا ہے۔ اور بفتح النون کا عام استعمال اشعار کے متعلق ہوتا ہے۔ اسی سے نبلے اونٹ اور زمین کی پرت کو جو کھمبی وغیرہ کے نکلنے سے پھٹ جاتی ہے نِقْضٌ کہا جاتا ہے۔ پھر نَقْضُ الْحَبْلِ وَالْعَقْدِ سے استعارہ کے طور پر عہد شکنی کے لئے بھی نَقْضٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَھُمْ (۸۔۵۶) ہر بار اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔
اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ (۲۔۲۷) جو خدا کے اقرار کو۔۔۔۔ توڑ دیتے ہیں۔
وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا (۱۶۔۹۱) اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو نہ توڑو۔
اور اسی طرح کلام و شعر میں مُنَاقَضَۃٌ ہے جیسا کہ جریر اور فرزدق کے نقائض شعریہ مشہور ہیں۔
اَلنَّقِیْضَانِ وہ قضیے جن میں سے ایک کا صدق دوسرے کے کذب کو مستلزم ہو جیسے ایک ہی چیز کے متعلق ایک ہی حالت میں ھُوَ کَذَا وَلَیْسَ

بگڑ جانا کا حکم لگانا۔

اِنْتَقَضَ (انتعال) اِنْتِقَاضًا کے معنی عمارت مسمار ہونے یا رسی کھل جانا کے ہیں۔ اور اسی سے اِنْتَقَضَتِ الْقَرْحَۃُ ہے یعنی زخم کا اچھا ہونے کے بعد خراب ہو جانا۔

اَنْقَضَتِ الدَّجَاجَۃُ مرغی کا انڈا دیتے وقت کڑکڑانا۔

اَلْاِنْتِقَاضُ کے اصل معنی آواز کے نہیں ہیں بلکہ کسی چیز کے اس طرح ٹوٹنے کے ہیں۔ کہ اس سے آواز پیدا ہو۔ پھر اس کا اطلاق آواز پر ہونے لگا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَلَّذِیْ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ (۹۴-۳) جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔

میں اَنْقَضَ کے معنی کمر کو اس طرح توڑنا کے ہیں کہ اس سے کڑکڑانے کی آواز سنائی دے۔

اَلْاِنْقَاضُ۔ بیٹھے ہوئے جانور کو للکارنے کی آواز شاعر نے کہا ہے [1]۔ (الرجز)

(۴۳۶) اَعْلَمْتُھَا الْاِنْقَاضَ بَعْدَ الْقَرْقَرَۃِ یعنی میں نے اسے انقاض کے بعد قرقرہ کی آواز سنائی۔

نَقِیْضُ الْمَفَاصِلِ جوڑوں کے کڑکڑانے کی آواز۔

(ن ق م)

نَقِمْتُ الشَّیْءَ وَنَقَمْتُہٗ کسی چیز کو برا سمجھنا۔ یہ کبھی زبان کے ساتھ عیب لگانے اور کبھی عقوبت (سزا دینے) پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْھُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ (۸-۸۵) ان کو مومنوں کی یہی بات بری لگتی تھی۔ کہ وہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ (۹-۷۴) اور انہوں نے (مسلمانوں میں عیب ہی کونسا دیکھا ہے سوا اس کے کہ خدا نے اپنے فضل سے ۔ ۔ ۔ ۔ ان کو دولت مند کر دیا۔

ھَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ الایۃ (۵-۵۹) تم ہم میں برائی ہی کیا دیکھتے ہو۔

اور اسی سے نِقْمَۃٌ بمعنی عذاب ہے قرآن میں ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْھُمْ فَاَغْرَقْنٰھُمْ فِی الْیَمِّ (۷-۱۳۶) تو ہم نے ان سے بدلے کر ہی چھوڑا۔ کہ ان کو دریا میں غرق کر دیا۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا (۳۰-۴۷) سو جو لوگ نافرمانی کرتے تھے ہم نے ان سے بدلہ لے کر چھوڑا۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْھُمْ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ (۴۳-۲۵) تو ہم نے ان سے انتقام لیا سو دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

(ن ک ب)

نَکَبَ عَنْ کَذَا کسی چیز سے پھر جانا قرآن میں ہے:۔

عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰکِبُوْنَ (۲۳-۷۴) وہ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

---

[1] وفی اللسان (نقض) شمیرہ قال شظاظ اللص الضبی وقبلہ: "رب عجوز من نمیر شھبرۃ" وفی اللسان د قرتہ ملتھا یمل ملفنیا وفی الاشتقاق لابن درید ۳۴۹ ما یدل نمیر راجع للبیت ومعناہ ایضًا المعانی الکبیر للقتبی قال الانقاض والقرقرۃ صوتان من اصوات الابل ومعنی البیت انھا کانت لہا بعیر مسن یقرقر فرکبہا وذھب بہ وترک لہا بکرًا ینقض بہ وفی الاشتقاق خلاف ذالک

اَلْمَنْكِبُ کندھا ج۔ مَنَاكِبُ۔ اور اسی سے بطور استعارہ زمین کے راستوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا (۶۷-۱۵) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور یہ زمین کے لئے بطور استعارہ ایسے ہی استعمال ہوا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:۔

مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ (۳۵-۴۵) تو روئے زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔ میں ظَهْر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مَنْكِبُ الْقَوْمِ۔ قوم کا کندھا یعنی رئیس جیسا کہ رأس بمعنی رئیس اور یَدٌ بمعنی ناصر آجاتا ہے۔

لِفُلَانٍ النِّكَابَةُ فِیْ قَوْمِهٖ فلاں کے پاس قوم کی ریاست ہے۔

اَلْاَنْكَبُ (۱) ٹیڑھے شانے والا (۲) اونٹ جو ایک جانب جھک کر چلے۔

اَلنَّكَبُ۔ ایک قسم کی بیماری جو شانے میں ہوتی ہے (ترکی میں اسے نولا عنو کہا جاتا ہے)۔

اَلنَّكْبَاءُ۔ اپنی سمت سے پھر کر چلنے والی ہوا۔

نَكَبَتْهُ حَوَادِثُ الدَّهْرِ مصیبت پہنچانا۔

(ن ك ث)

اَلنَّكْثُ کے معنی کمبل یا سوت ادھیڑنے کے ہیں۔ اور یہ قریب قریب نَقْضٌ کے ہم معنی ہے۔ اور بطور استعارہ عہد شکنی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ (۹-۱۲) اور اگر اپنی قسمیں توڑ ڈالیں۔

اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۷-۱۳۵) تو وہ عہد توڑ ڈالتے ہیں۔

اَلنِّكْثُ وَالنَّكِيْثَةُ (مثل النقض والنقيضة) اور نَكِيْثَةٌ ہر اس مشکل معاملہ کو کہتے ہیں جس میں لوگ عہد و پیمان توڑ ڈالیں شاعر نے کہا (الطویل):

(۴۲۷) مَتٰى يَكُ اَمْرٌ لِلنَّكِيْثَةِ اَشْهَدِ

جب کوئی معاملہ عہد شکنی کی حد تک پہنچ جائے تو میں حاضر ہوتا ہوں۔

(ن ك ح)

اصل میں نکاح بمعنی عقد آتا ہے۔ اور بطور استعارہ جماع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یہ ناممکن ہے کہ یہ اصل میں بمعنی جماع ہو اور پھر عقد میں بطور استعارہ استعمال ہوا ہو۔ کیونکہ عربی زبان میں جماع کے معنی میں تمام الفاظ کنائی ہیں۔ کیونکہ نفس فعل کی طرح صراحتًا اس کا تذکرہ بھی مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ جو زبان ذکر فحش سے اس قدر گریزاں ہو وہ ایک مستحسن امر کے لئے قبیح لفظ استعمال کرے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (۲۴-۳۲) اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو۔

اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۳۳-۴۹) جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (۴-۲۵) تو ان لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو۔

علٰی ہذا القیاس متعدد آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

لہ قالہ طرفۃ اولہ وقربت بالقربی وجدک انہ وفی اللسان (نکث) عقد بدل امر نا البیت فی العقد الثمین ۸ ۵ و فی روایۃ عہد بدل امرنا

(ن ك د)

اَلنَّکَدُ۔ ہر وہ چیز جو صعوبت سے حاصل ہو۔ اسی سے سخت خو کو جو سائل کو مشکل کچھ دینے پر راضی ہو۔ نَکَدٌ وَ نَکِدٌ کہا جاتا ہے۔ اور کم دودھ والی اونٹنی کو جو بمشکل دوہی جا سکے نَاقَۃٌ نَکْدَاءُ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا (۷-۵۸) اور جو خراب ہے اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے۔

(ن ك ر)

الْاِنْکَارُ ضِدِ عِرْفَان اور اَنْکَرْتُ کَذَا کے معنی کسی چیز کی عدم معرفت کے ہیں اس کے اصل معنی انسان کے دل پر کسی ایسی چیز کے وارد ہونے کے ہیں جسے وہ تصور میں نہ لا سکتا ہو۔ لہذا یہ ایک درجہ کی جہالت ہی ہوتی ہے۔
قرآن میں ہے:۔
فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَھُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْہِ نَکِرَھُمْ۔ (۱۱-۷۰) جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں جاتے (یعنی وہ کھاتا نہیں کھاتے) تو ان کو اجنبی سمجھ کر دل میں خوف کیا۔
فَدَخَلُوْا عَلَیْہِ فَعَرَفَھُمْ وَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ۔ (۱۲-۵۸) تو یوسفؑ کے پاس گئے تو یوسف نے ان کو پہچان لیا۔ اور وہ اس کو نہ پہچان سکے۔
اور کبھی یہ دل سے انکار کرنے پر بولا جاتا ہے اور انکار لسانی کا اصل سبب گو انکارِ قلب ہی ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان ایسی چیز کا بھی انکار کر دیتا ہے جسے دل میں ٹھیک سمجھتا ہے۔ ایسے انکار کو کذب کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا۔
یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا (۱۶-۸۳) یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں۔ مگر واقف ہو کر ان سے انکار کرتے ہیں۔
فَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ (۲۳-۶۹) اس وجہ سے ان کو نہیں مانتے۔
فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُنْکِرُوْنَ (۴۰-۸۱) تو خدا کی کن کن نشانیوں کو نہ مانو گے۔
اور اَلْمُنْکَرُ ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقول سلیمہ قبیح خیال کریں یا عقل کو اس کے حسن و قبح میں توقف ہو۔ مگر شریعت نے اس کے قبیح ہونے کا حکم دیا ہو۔ چنانچہ آیات:۔
اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (۹-۱۱۲) نیک کاموں کا امر کرنے والے اور بری باتوں سے منع کرنے والے۔
کَانُوْا لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ (۵-۷۹) اور برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔
وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (۳-۱۰۴) اور بری باتوں سے منع کرتے۔
وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ (۲۹-۲۹) اور اپنی مجلسوں میں ناپسندیدہ کام کرتے ہو۔
تَنْکِیْرُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو بے پہچان کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
نَکِّرُوْا لَھَا عَرْشَھَا (۲۷-۴۱) اس کے تخت کی صورت بدل دو۔
اور اس کے بالمقابل تعریف کے معنی کسی چیز کو معروف بنانے کے ہیں۔ اور علمائے نحو کے نزدیک

کسی اسم کو مخصوص صیغہ پر بنانے کے ہوتے ہیں۔
نَکَرْتُ عَلٰی فُلَانٍ وَاَنْکَرْتُ کسی کو عملاً کسی کام سے روک دینا۔ قرآن میں ہے:۔
فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ (۲۲-۴۴) میرا عذاب کیسا سخت تھا۔
اَلنُّکْرُ: مکاری یا مشکل امر جو سمجھ میں نہ آسکے۔
اور نَکُرَ نَکَارَۃً کسی معاملہ کا دشوار ہونا۔
قرآن میں ہے۔
یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّکُرٍ (۵۴-۶)
جس دن بلانے والا ان کو ایک ناخوش چیز کی طرف بلائے گا۔
اور حدیث میں ہے[۱] (۱۳۲) اِذَا وُضِعَ الْمَیِّتُ فِی الْقَبْرِ اَتَاہُ مَلَکَانِ مُنْکَرٌ وَّنَکِیْرٌ کہ جب میت قبر میں اتار دی جاتی ہے۔ تو اس کے پاس مُنْکَرٌ وَ نَکِیْرٌ دو فرشتے آتے ہیں۔
اور استعارۃً مُنَاکَرَۃٌ بمعنی مُحَارَبَۃٌ استعمال ہوتا ہے۔

(ن ک س)

اَلنَّکْسُ (ن) کے معنی کسی چیز کو الٹا کر دینے کے ہیں اور اسی سے نُکِسَ الْوَلَدُ ہے۔۔۔۔ یعنی ولادت کے وقت بچے کے پاؤں کا سر سے پہلے باہر نکلنا۔
ثُمَّ نُکِسُوْا عَلٰی رُءُوْسِھِمْ (۲۱-۶۵) پھر شرمندہ ہو کر سر نیچا کر لیا۔
اَلنُّکْسُ صحت یابی کے بعد مرض کا عود کر آنا۔
اور نُکْسٌ فِی الْعُمُرِ کے متعلق فرمایا:۔
وَمَنْ نُّعَمِّرْہُ نُنَکِّسْہُ فِی الْخَلْقِ (۳۶-۶۸)
اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں۔ اسے خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔
جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶-۷۰) اور تم میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ نہایت خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں۔
اور ایک قرارت میں نُنْکِسْہُ ہے۔
اخفش کا قول ہے۔ کہ نُنَکِّسْہُ (بتشدید الکاف) کے معنی کسی چیز کو سرنگوں کر دینے کے ہوتے ہیں۔ اور نِکْسٌ اس تیر کو کہتے ہیں جس کا فوق ٹوٹ گیا ہو اور اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے لگا دیا گیا ہو۔ ایسا تیر چونکہ ردی ہو جاتا ہے۔ اس لئے تشبیہ کے طور پر کمینے آدمی کو بھی نِکْسٌ کہا جاتا ہے۔

(ن ک ص)

اَلنُّکُوْصُ (ن ض) کسی چیز سے پیچھے ہٹنا۔
قرآن میں ہے:۔
نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْہِ (۸-۴۸) تو لیسپا ہو کر چل دیا۔

(ن ک ف)

نَکَفْتُ مِنْ کَذَا وَاسْتَنْکَفْتُ مِنْہُ کے معنی کسی چیز کو اپنے لئے باعث عار سمجھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ (۴-۱۷۲) مسیح اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ خدا کے بندے ہوں۔
وَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْکَفُوْا (۴-۱۷۳) اور جنہوں نے (بندہ ہونے سے) عار و انکار اور تکبر کیا۔

---

[۱] رواہ النسائی ا ر ۲۳ ، ۲ ، و اصحاب السنن ۔

اصل میں یہ تَكَفَّفْتُ الشَّیْءَ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو دور ہٹا دینے کے ہیں اور اسی سے نَكَفَ ہے یعنی رخسار سے ہاتھ کے ساتھ آنسو پونچھنا اور بَحْرٌ لَا یُنْكَفُ بے پایاں سمندر کو کہتے ہیں۔

اَلْاِنْتِكَافُ۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلا جانا۔

(ن ك ل)

نَكَلَ عَنِ الشَّیْءِ کسی کام سے کمزور اور عاجز ہو جانا۔

نَكَّلْتُهٗ۔ کسی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینا۔ اور نِكْلٌ۔ جانور کی بیڑی اور لگام کے لوہے کو کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی چلنے سے مانع ہوتے ہیں۔ اس کی جمع اَنْكَالٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِیْمًا (۷۳-۱۲) کچھ شک نہیں کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی آگ ہے۔

نَكَّلْتُهٗ۔ کسی کو عبرت ناک سزا دینا۔ اس سے اسم نَكَالٌ ہے جس کے معنی عبرت ناک سزا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا (۲-۶۶) اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لئے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ عبرت بنا دیا۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (۵-۳۸) ان کے فعلوں کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے۔

اور حدیث میں ہے[1] (۱۳۳) اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ النَّكَلَ عَلَی النَّكَلِ کہ قوی آدمی جو طاقتور گھوڑے پر سوار ہو اللہ تعالیٰ کو پیارا لگتا ہے۔

(ن م م)

اَلنَّمُّ (ن) کے معنی چغلی کھانے کے ہیں۔ اور چغلخوری کو نَمِیْمَةٌ کہا جاتا ہے۔ نَمَّامٌ چغل خور۔ قرآن میں ہے:۔

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِیْمٍ طعن آمیز اشارے کرنے والا۔ چغلیاں لئے پھرنے والا۔ (۶۸-۱۱)

اصل میں نَمِیْمَةٌ کے معنی هَمْسٌ (پاؤں کی آہٹ) اور حرکت خفیفہ کے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:۔ اَسْكَتَ اللّٰهُ نَامَّتَهٗ۔ خدا اس کی حرکت کو بند کر دے یعنی وہ مر جائے۔

اَلنَّمَّامُ گھاس جس کی خوشبو اس کے وجود پر دلالت کرے۔

اَلنَّمْنَمَةُ۔ قریب قریب خطوط گویا کتابت میں قلت حرکت پر دال ہیں۔

(ن م ل)

نَمْلَةٌ۔ چیونٹی (ج) نمل قرآن میں ہے۔

قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ (۲۷-۱۸) تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو۔

طَعَامٌ مَّنْمُوْلٌ۔ طعام جس میں چیونٹیاں پڑ گئی ہوں۔

نَمْلَةٌ (۱) ایک قسم کا پھوڑا۔ جو پہلو میں نکلتا ہے۔ اور اس کی شکل چیونٹی جیسی ہوتی ہے (۲) جانور کے کھر کا شگاف۔

اور اسی سے فَرَسٌ نَمِلُ الْقَوَائِمِ کا محاورہ ہے یعنی سبک پاؤں والا گھوڑا جو ایک جگہ پر سکون سے کھڑا نہ ہو اور مجازاً اَلْمُتَنَمِّلُ بمعنی

---

[1] الحدیث فی الفائق ۲/۲۹۱

نَمِیْمَۃٌ بھی آتا ہے۔ اور یہ معنی چیونٹی کی چال سے ماخوذ ہے۔ اور ھُوَ نَمِلٌ وَذُوْ نَمْلَۃٍ وَ نَمَّالٌ کے معنی چغل خور کے ہیں۔

تَنَمَّلَ الْقَوْمُ۔ مال جمع کرنے کے لئے چیونٹیوں کی طرح پھیل گئے۔ اسی سے ھُوَ اَجْمَعُ مِنْ نَمْلَۃٍ کا محاورہ ہے۔ یعنی وہ چیونٹی سے بھی زیادہ ذخیرہ اندوز ہے۔

اَلْاَنْمِلَۃُ۔ انگلیوں کے اطراف۔ ج۔ اَنَامِل۔

(ن ھ ج)

اَلنَّھْجُ کے معنی کھلے راستہ کے ہیں۔ اور نَھَجَ الْاَمْرُ وَاَنْھَجَ کے معنی ہیں کسی امر کا واضح ہونا۔

اَلْمَنْھَجُ وَالْمِنْھَاجُ کشادہ راہ۔ قرآن میں ہے۔ لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجًا (۵-۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک فرقے کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔

اور اسی سے نَھَجَ الثَّوْبُ وَاَنْھَجَ۔ ہے جس کے معنی کپڑے میں بوسیدگی کے آثار ظاہر ہونے کے ہیں۔

اَنْھَجَہُ الْبِلٰی۔ کپڑے کو بوسیدگی نے جھر جھرا کردیا۔

(ن ھ ر)

اَلنَّھْرُ۔ بافراط پانی بہنے کے مجری کو کہتے ہیں۔ کی جمع اَنْھَارٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَفَجَّرْنَا خِلٰلَھُمَا نَھَرًا (۱۸-۳۳) اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔ وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَ اَنْھٰرًا وَّ سُبُلًا (۱۶-۱۵) اور اس نے زمین پر پہاڑ بنا کر رکھ دیئے کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے اور نہریں اور رستے بنا دیئے۔

اور جنت میں لوگوں پر جو فیض اور فضل الٰہی جاری ہوگا اسے بھی بطور مثال کے اَنْھَارٌ سے تعبیر فرمایا ہے جیسے:۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ (۵۴-۵۴) جو پرہیزگار ہیں وہ باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔

وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْھٰرًا (۷۱-۱۲) اور تمہیں باغ عطا کرے گا۔ اور (ان میں) تمہارے لئے نہریں بہا دے گا۔

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (۲-۲۵) (نعمت کے) باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

اَلنَّھْرُ کے معنی وسعت اور فراخی کے بھی آتے ہیں۔ (تَشْبِیْھًا بِنَھْرِ الْمَاءِ) اور اسی سے اَنْھَرْتُ الْمَاءَ (پانی بہانا) ہے۔

اور اَنْھَرَ الْمَاءُ کے معنی پانی کے جاری ہونے کے ہیں۔ نَھْرٌ وَنَھِرٌ نہر جس میں پانی فراوانی سے بہہ رہا ہو۔

ابو ذویب نے کہا ہے[1]

(۴۳۸) اَقَامَتْ بِہٖ فَابْتَنَتْ خَیْمَۃً
عَلٰی قَصَبٍ وَفُرَاتٍ نَھَرٍ

اَلنَّھَارُ (ن) شرعاً طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب کے وقت کو نَھَارٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن لغوی لحاظ سے اس کی حد طلوع شمس سے لیکر غروب آفتاب تک ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَۃً (۲۵-۶۲)

---

[1] البیت فی دیوانہ ۱۲

اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔
اَتَاهَا اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا (۱۰-۲۴) ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم عذاب آپہنچا۔
اور کبھی بیات کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جیسے:۔ اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا (۱۰-۵۰) تو اگر اس کا عذاب تم پر ناگہاں آجائے رات کو یا دن کو۔
رَجُلٌ نَهِرٌ۔ دن کو لوٹ مارنے والا۔
اَلنَّهَارُ۔ حباری کا بچہ۔
اَلْمَنْهَرَةُ۔ آبادی کے درمیان کھلی جگہ کو کہتے ہیں جیسے وہ جگہ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔
اَلنَّهْرُ وَالْاِنْتِهَارُ سختی سے جھڑکنا۔ قرآن میں ہے:۔
فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا (۱۷-۲۳) تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا۔
وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳-۱۰) اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

(ن ھ ی)

اَلنَّهْيُ کسی چیز سے منع کر دینا۔ قرآن میں ہے:۔
اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (۹۶-۹، ۱۰) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے یعنی ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے۔
معنوی لحاظ سے نہی بالقول اور بالفعل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور نہی بالقول عام ہے کہ صیغہ اِفْعَلْ کے ذریعہ ہو۔ جیسے اِجْتَنِبْ کذا (اس سے دور رہو) یا صیغہ لَا تَفْعَلْ کے ذریعہ ہو لیکن لفظی لحاظ سے صرف "لَا تَفْعَلْ" کو نہی کہا جاتا ہے۔ پس صیغہ لَا تَفْعَلْ لفظاً و معنی دونوں لحاظ سے نہی ہوگا۔ جیسے فرمایا:۔
لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲-۳۵) لیکن اس درخت کے .... پاس نہ جانا۔
اسی بنا پر شیطان نے کہا تھا۔
مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ (۷-۲۰) کہ تم کو تمہارے پروردگار نے اس درخت سے صرف اس لئے منع کیا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (۷۹-۴۰) اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا۔
میں نَهْيٌ سے نفس کو شہوات سے روکنا اور ان کے قصد سے دفع کرنا مراد ہے نہ کہ زبان سے صرف لَا تَفْعَلْ کہدینا۔ اسی طرح نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ بھی عام ہے۔ جو کہ ہاتھ اور زبان کے ساتھ روکنے اور دل سے برا سمجھنے کو شامل ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَتَنْهٰنَا اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا (۱۱-۶۲) کیا تم ہم کو ان چیزوں کے پوجنے سے منع کرتے ہو جن کو ہمارے بزرگ پوجتے آئے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ (۱۶-۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے منع کرتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے امر و نہی سے امر خیر کی ترغیب دینا اور شر سے روکنا مراد ہے۔ اور یہ ممانعت بعض امور سے عقل کے ذریعہ کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے۔ اور بعض کاموں سے بذریعہ شریعت کے منع فرمادیا ہے جو ہمارے لئے مقرر فرمائی ہے۔

اَلْاِنْتِهَاءُ کسی ممنوع کام سے رک جانا۔ قرآن میں ہے۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (۸-۳۸) (اے پیغمبر) کفار سے کہدو کہ اگر وہ اپنے افعال سے باز آجائیں تو جو ہو چکا وہ انہیں معاف کر دیا جائے گا۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا۔ (۱۹-۴۶) اگر تو باز نہ آئے گا۔ تو میں تجھے سنگسار کروں گا اور تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جا۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ (۲۶-۱۱۶) کہ نوح اگر تم باز نہ آؤ گے تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔ اور آیت کریمہ:

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۵-۹۱) تو تم کو ان کاموں سے باز رہنا چاہیئے۔

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ (۲-۲۷۵) تو جس شخص کے پاس خدا کی نصیحت پہنچی اور وہ سود لینے سے باز آگیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا۔

میں فَانْتَهٰى کے معنی اس کی نہایت کو پہنچے یعنی رک جانے کے ہیں۔

اَلْاِنْهَاءُ اصل میں اس کے معنی نہایۃ کو پہنچا دینے کے ہیں پھر عرف میں مطلقاً کسی خبر کے پہنچا دینے پر بولا جاتا ہے جیسے:

اَنْهَیْتُ اِلٰى فُلَانٍ خَبَرَ كَذَا۔ میں نے اس کے پاس فلاں خبر پہنچا دی۔

نَاهِیْكَ مِنْ رَّجُلٍ۔ فلاں آدمی تجھے کافی ہے۔ یعنی وہ تیرے مطلوب کی غایت ہے گویا کسی دوسرے کی طلب سے تجھے منع کرتا ہے۔

نَاقَةٌ نَهِیَةٌ انتہائی موٹی اونٹنی۔

اَلنُّهْیَةُ عقل جو انسان کو قبیح باتوں سے روکتی ہو اس کی جمع نُهًى آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى (۲۰-۵۴) بے شک ان (باتوں) میں عقل والوں کے لئے (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

تَنْهِیَةُ الْوَادِیْ وادی کا آخری کنارہ جہاں کہ سیلاب رک جاتا ہے۔ نِهَایَةُ النَّهَارِ دن کا بلند ہونا۔

طَلَبَ الْحَاجَةَ حَتّٰى نَهِیَ عَنْهَا۔ اس نے اپنی حاجت کو طلب کیا حتیٰ کہ اس کی طلب کرنے کے بعد اس سے رک گیا اور اس (میں) کامیاب ہونا شرط نہیں ہے۔

(ن و ب)

اَلنَّوْبُ۔ کسی چیز کا بار بار لوٹ کر آنا۔ یہ نَابَ (ن) نَوْبَةً وَّنَوْبًا کا مصدر ہے اور شہد کی مکھی کو نَوْبٌ۔ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی قرارگاہ کی طرف لوٹ کر جاتی ہے۔

نَابَتْهُ نَائِبَةٌ یعنی اسے ایسی مصیبت پہنچی جس کے دوبارہ آنے کا بھی امکان ہے۔

اَلْاِنَابَةُ اِلَى اللّٰهِ توبہ اور اخلاص عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا۔ قرآن میں ہے:

وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ (۳۸-۲۴) اور جھک کر گر پڑے اور (خدا کی طرف) رجوع کیا۔

وَ اِلَیْکَ اَنَبْنَا (۶۰-۴) اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں۔
وَاَنِیْبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ (۳۹-۵۴) اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو۔
مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ (۳۰-۳۱) (مومنو) اس (خدا) کی طرف رجوع کئے رہو۔
فُلَانٌ یَنْتَابُ فُلَانًا۔ وہ اس کے پاس آتا جاتا ہے۔

(ن و ح)

نُوْحٌ۔ یہ ایک نبی کا نام ہے دراصل یہ نَاحَ یَنُوْحُ کا مصدر ہے جس کے معنی بلند آواز کے ساتھ گریہ کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ نَاحَتِ الْحَمَامَۃُ نُوْحًا۔ فاختہ کا نوحہ کرنا۔ نُوْحٌ کے اصل معنی عورتوں کے ماتم کدہ میں جمع ہونے کے ہیں۔ اور یہ تَنَاوُحٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی تَقَابُلٌ کے ہیں جیسے۔ جَبَلَانِ مُتَنَاوِحَانِ دو متقابل پہاڑ۔ رِیْحَانِ یَتَنَاوَحَانِ دو متقابل ہوائیں۔
اَلنَّوَائِحُ۔ نوحہ گر عورتیں۔ اَلْمَنُوْحُ۔ مجلس گریہ۔

(ن و ر)

اَلنُّوْرُ۔ وہ پھیلنے والی روشنی جو اشیاء کے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور یہ دو قسم پر ہے دنیوی اور اُخروی۔
نور دنیوی پھر دو قسم پر ہے۔ معقول بعین کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے یعنی امور الٰہیہ کی روشنی جیسے عقل یا قرآن کی روشنی۔ دوم محسوس جسکا تعلق بصر سے ہے جیسے چاند سورج ستارے اور

دیگر اجسام نیرہ چنانچہ نور الٰہی کے متعلق فرمایا:۔
قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (۵-۱۵) بے شک تمہارے خدا کی طرف سے نور اور روشن کتاب آ چکی ہے۔
وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْہَا (۶-۱۲۲) اور اس کے لئے روشنی کر دی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے۔ جو اندھیرے میں پڑا ہو اور اس سے نکل نہ سکے۔
مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (۴۲-۵۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔
اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ (۳۹-۲۲) بھلا جس شخص کا سینہ خدا نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی پر ہو۔
نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (۲۴-۳۵) روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔ خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے۔ سیدھی راہ دکھاتا ہے۔
اور نور حسی کے متعلق فرمایا:۔
ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (۱۰-۱۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا۔
یہاں خاص کر سورج کو ضیاء اور قمر کو نور کہنے کی

وجہ یہ ہے کہ ضوء، نور سے اخص ہے۔
وَقَمَرًا مُّنِيْرًا۔ (۲۵-۶۱) اور چمکتا ہوا چاند بھی بنایا۔
یعنی روشن بنایا۔ اور بعض آیات میں نور عام معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا۔
وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (۶-۱) اور اندھیرا اور روشنی بنائی۔
وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (۵۷-۲۸) اور تمہارے لئے روشنی کر دے گا جس میں چلو گے۔
وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹-۶۹) اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھیگی۔
اور نور اخروی کے متعلق فرمایا۔
نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (۶۶-۸) ان کا نور ایمان ان کے آگے اور دہنی طرف (روشنی کرتا ہوا) چل رہا ہوگا اور وہ خدا سے التجا کریں گے کہ اے پروردگار ہمارا نور ہمارے لئے پورا کر۔
اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (۵۷-۱۳) کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجئے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔
فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (۵۷-۱۳) اور وہاں نور تلاش کرو۔
محاورہ ہے:۔
اَنَارَ اللّٰهُ كَذَا وَنَوَّرَهٗ اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو روشن کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات نور کہنا مُنَوِّر ہونے کے لحاظ سے ہے۔
چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۴-۳۵) خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔
نیز اس کا اپنی ذات کو نور کہنا روشنی میں مبالغہ کی وجہ سے ہے۔

اَلنَّارُ۔ اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ (۵۶-۷۱) بھلا دیکھو کہ جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (۲-۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔
اور نار کا اطلاق صرف حرارت اور نار جہنم پر بھی ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲۲-۷۲) وہ دوزخ کی آگ جس کا خدا نے کافروں سے وعدہ کیا ہے۔
فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲-۲۴) تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔
نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ (۱۰۴-۶) وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔
الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں نارٌ کا لفظ نار جہنم پر بولا گیا ہے اور نار بمعنی نار حرب بھی آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ (۵-۶۴) یعنی جب لڑائی کی آگ جلاتے ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ نار اور نور کی اصل ایک ہی ہے اور عام طور پر یہ لازم ملزوم ہوتے ہیں۔ لیکن نار کو مقوین کے لئے متاع دنیوی قرار دیا ہے۔ اور نور کو متاع اخروی۔ اسی لئے نور کے متعلق اِقْتِبَاسٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (۵۷-۱۳) کہ ہم بھی تمہارے

نور سے روشنی حاصل کریں۔
تَنَوَّرْتُ نَارًا میں نے آگ دیکھی۔
اَلْمَنَارَۃُ یہ یا تو نور سے مَفْعَلَۃٌ کے وزن پر ہے اور یا نار سے جیسے مَنَارَۃُ السِّرَاجِ (چراغ پایہ) یا وہ جس پر کہ اذان دی جاتی ہے اور مَنَارُ الْاَرْضِ راستہ معلوم کرنے کے نشانات کو کہتے ہیں۔
اَلتَّنَاوُرُ (جانثے تہمت سے نفرت کرنا۔
نَارَتِ الْمَرْاَۃُ (ن) نَوْرًا وَنَوَارًا۔ عورت کا تہمت سے دور رہنا۔
نُوَّارُ الشَّجَرَۃِ وَنَوَارُہٗ۔ درخت کی کلیاں، کیونکہ وہ سفیدی میں نور کے مشابہ ہوتی ہیں۔
نُوْرٌ۔ گودنے کا پوڈر۔ اور اسی سے محاورہ ہے۔
نَوَّرَتِ الْمَرْءَۃُ یَدَھَا۔ عورت کا ہاتھ پر گودنا اور گودنے سے چونکہ عضو کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے اس لئے اسے تَنْوِیْرٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

(ن و س)

اَلنَّاسُ بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل اُنَاسٌ ہے۔ ہمزہ کو حذف کرکے اس کے عوض الف لام لایا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک نَسِیَ سے مقلوب ہے اور اس کی اصل اِنْسِیَانٌ بروزن اِفْعِلَانٌ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں نَاسَ یَنُوْسُ سے ہے جس کے معنی مضطرب ہونے کے ہیں۔ اور نُسْتُ الْاِبِلَ کے معنی اونٹ ہنکانے کے ہیں بعض کا قول ہے کہ ذونواس بادشاہ کی وجہ تلقیب بھی یہی تھی کہ اس کے دراز گیسو اس کی پشت پر لہرایا کرتے تھے۔ اس صورت میں اس کی تصغیر نُوَیْسٌ ہوگی۔

قرآن میں ہے:۔
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴-۱) کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔
کبھی مجازاً نَاسٌ کا عام معنی مراد نہیں ہوتا بلکہ صرف فضلاء لوگ مراد لیتے ہیں اس وقت اس میں اِنْسَانِیَۃٌ کا معنی ملحوظ ہوتا ہے یعنی جس میں کہ فضیلت، ذکر اخلاق حمیدہ اور خصوصیات انسانی علی وجہ الاتم پائی جاتی ہیں کیونکہ جو چیز اپنے خواص سے عاری ہو وہ اس نام کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً ہاتھ میں اگر اس کے خصوصی وظیفہ کو ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو اس پر اور سریر کے پایہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا پس آیت کریمہ:۔
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ (۲-۱۳) جس طرح اور لوگ ایمان لائے تم بھی لے آؤ۔
میں اَلنَّاسُ سے کوئی خاص انسان مراد نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کی طرح ایمان لے آؤ جن میں انسانیت کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔
اسی طرح آیت:۔
اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (۴-۵۴) یا جو خدا نے لوگوں کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس پر حسد کرتے ہیں۔
میں بھی اَلنَّاسُ سے خاص لوگ مراد نہیں ہیں۔ بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن میں انسانیت کے اوصاف پائے جاتے ہیں اور کبھی اس سے نوع انسانی مراد لی جاتی ہے اور بعض نے آیت مذکورہ کو بھی اسی معنی پر حمل کیا ہے۔

لہ وفی الحدیث لعن اللہ من غیر منار الارض (الفائق ۲/۲۹۲)۔

(ن و ش)

اَلنَّوْشُ۔ کے معنی کسی چیز پکڑنا کے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۴۳۹) تَنُوْشُ الْبَرِیْرَ حَیْثُ طَابَ اهْتِصَارُهَا۔

وہ وہاں سے پیلو کھاتی ہے جہاں سے خوب جھکی ہوئی ہوں۔

بَرِیْرٌ کے معنی پیلو کے ہیں اور اِهْتِصَارٌ کے معنی مائل کرنے اور جھکانے کے چنانچہ محاورہ ہے:۔ هَصَرْتُ الْغُصْنَ۔ میں نے ٹہنی کو جھکایا۔

تَنَاوَشَ الْقَوْمُ کسی چیز کو پکڑنا۔ قرآن میں ہے:۔ اَنّٰی لَهُمُ التَّنَاوُشُ (۳۴-۵۲) تو (اب) ..... ان کا ہاتھ ایمان کے لینے کو کیونکر پہنچ سکتا ہے؟ یعنی وہ دور جگہ سے ایمان کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں جب کہ انہوں نے قریب جگہ سے اسے حاصل نہیں کیا جس وقت کہ ایمان لانا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا ان کے اختیار میں تھا۔ تو یہ آیت کریمہ۔ یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا الْاٰیَةَ (۶-۱۵۹) مگر جس روز تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آجائیں گی تو .... اس وقت اسے ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دیگا۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ایک قراءت میں اَلتَّنَاؤُشُ ہمزہ کے ساتھ ہے تو اس صورت میں یا تو یہ نَأْشٌ سے مشتق ہوگا جس کے معنی طلب کے ہیں اور یا اس کا ہمزہ واؤ سے مبدل ہوگا جیسے اُقِّتَتْ وَاَدْؤُرٌ میں ہے جو کہ اصل میں وُقِّتَتْ وَاَدْوُرٌ ہے۔

(ن و ص)

نَاصَ اِلٰی کَذَا کے معنی کسی کے پاس پناہ لینے کے ہیں اور نَاصَ عَنْهُ یَنُوْصُ نَوْصًا کے معنی کسی کام سے پیچھے ہٹ جانا اور اس سے پھر جانا کے ہیں۔

اور مَنَاصٌ جائے پناہ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸-۳) اور وہ رہائی کا وقت نہیں رہا تھا۔

(ن و ل)

اَلنَّوْلُ۔ کے معنی تناول کے ہیں اور یہ نِلْتُ کَذَا اَنُوْلُ نَوْلًا سے آتا ہے۔ اور اَنَلْتُهٗ (افعال) کے معنی کسی چیز کے عطا کرنے کے ہیں۔ اور یہ عَطَوْتُ کَذَا بمعنی تَنَاوَلْتُ اور اَعْطَیْتُهٗ بمعنی اَنَلْتُهٗ کی طرح ہے پھر نِلْتُ اصل میں نَوِلْتُ ہے اور محاورہ ہے:۔ وَمَا کَانَ نَوْلُكَ اَنْ تَفْعَلَ کَذَا یعنی ایسا کرنے میں تمہاری بہتری نہیں ہے شاعر نے کہا ہے[2] (الوافر)

(۴۴۰) جَزِعْتَ وَلَیْسَ ذٰلِكَ بِالنَّوَالِ

تم گھبرا گئے ہو اور یہ درست نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نوال بمعنی صواب ہے اصل میں نوال اس عطا کو کہتے ہیں جو انسان حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہیں کہ اس سے تیری مراد

---

[1] قالہ ابو ذؤیب الہذلی وصدرہ: فما تم خشف بالعلایة شادن۔ والبیت فی اللسان (نوش، علا) و دیوان الہذلیین (۱:۲۲) ومعجم البلدان (رسم: علایہ) والمعانی الکبیر ۱/۲۷ والمحکم (علو) وفی روایتہما قال بدل طاب وا ہتصار ۱۴۵ ای جذبہا۔

[2] قالہ لبید واولہ: وقفت بہو حتی قال صحبی۔ والبیت فی اللسان (نول) ۱۲

حاصل نہیں ہو سکتی۔ قرآن میں ہے۔
لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (۲۲-۳۷) خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ اس تک تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

(ن و م)

اَلنَّوْمُ۔ اس کی تفسیر گئی ہے اور مختلف اعتبارات سے تمام وجوہ صحیح ہو سکتی ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ بخارات کی رطوبت سے اعصاب دماغ کے ڈھیلا ہونے کا نام نوم ہے۔ اور بعض کے نزدیک اللہ تعالےٰ کا بغیر موت کے روح کو قبض کرلینے کا نام نوم ہے چنانچہ قرآن ہے:۔
اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا (۳۹-۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روحیں) سونے میں (قبض کر لیتا ہے)۔
اور بعض نوم کو موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل کہتے ہیں رَجُلٌ نَوُوْمٌ وَنُوْمَةٌ بہت زیادہ سونے والا اور مَنَامٌ بمعنی نوم آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمِنْ اٰیَاتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ (۳۰-۲۳) اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے تمہارا رات میں . . . . سونا۔
وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (۷۸-۹) اور نیند کو تمہارے لئے موجب آرام بنایا۔
لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲-۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

نیز النُّوْمَةُ کے معنی خامل الذکر یعنی گمنام بھی آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔
اِسْتَنَامَ فُلَانٌ اِلٰى كَذَا کسی چیز سے اطمینان حاصل کرنا۔ مَنَامَةٌ۔ لباس خواب۔ نَامَتِ السُّوْقُ کساد بازاری ہونا۔
نَامَ الثَّوْبُ (لازم و متعدی) کپڑے کا پرانا ہونا یا کرنا۔ ان دونوں معنی میں نَامَ کا لفظ تشبیہ کے طور مجازًا استعمال ہوتا ہے۔

(ن و ن)

اَلنُّوْنُ۔ حرف ہجا میں سے ایک حرف کا نام ہے۔ قرآن میں ہے:۔
نٓ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ (۶۸-۱) ن۔ قلم اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔
اور نون بڑی مچھلی کو بھی کہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ (۲۱-۸۷) اور ذا النون کو یاد کرو جب وہ (اپنی قوم سے ناراض ہو کر) چل دیئے۔
میں یونس علیہ السلام کو ذَا النُّوْنِ کہا ہے کیونکہ انہیں مچھلی نے نگل لیا تھا۔ اور حارث بن ظالم کی تلوار کا نام بھی ذَا النُّوْنِ تھا۔

(ن و ء)

نَاءَ بِجَانِبِهٖ یَنُوْءُ وَیَنَاءُ کے معنی پہلو پھیر لینے کے ہیں۔
ابو عبیدہ کے نزدیک نَاءَ مثل نَاعَ کے ہے جس کے معنی اٹھنے کے ہیں اور اَنَاءَهٗ کے معنی اٹھانے کے قرآن میں ہے۔
مَا اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ۔

(۲۸-۷۶) کہ ان کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔ اور آیت کریمہ:- نَاٰی بِجَانِبِہٖ (۱۷-۸۳) اور پہلو پھیر لیتا ہے۔ میں ایک قراءت نَاءَ بروزن نَاعَ ہے جس کے معنی پہلو اٹھانا کے ہیں اور یہ تکبر سے کنایہ ہوتا ہے جیسا کہ شَمَخَ بِاَنْفِہٖ وَاَزْوَرَّ جَانِبُہٗ کا محاورہ ہے۔

ابو عمرو[1] کا قول ہے کہ نَاٰی بروزن نَعٰی کے ہے جس کے معنی اعراض کرنے کے ہیں اور ابو عبیدہ کے نزدیک نَاٰی یناٰی کے معنی دور ہونے کے ہیں اور اسی سے اِنْتَاءٰی بروزن اِنْتَعَلَ ہے اور مُنْتَاٰی کے معنی مکان بعید کے ہیں۔ اور اسی سے نُؤْیٌ ہے جس کے معنی خیمے کے گردا گرد گڑھے کے ہیں جو بارش کے پانی کو اس سے دور رکھتا ہے۔ اور نَاٰی بِجَانِبِہٖ کے معنی پہلو تہی کرنے کے ہیں

اَلنِّیَّۃُ: یہ نَوَیْتُ کا مصدر ہے اور کبھی بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے اور اسکے معنی کسی کام کی جانب دل سے متوجہ ہونیکے ہیں۔ یہ نَاٰی کے باب سے قطعًا نہیں ہے۔

(ن ی ل)

اَلنَّیْلُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔ اور یہ نِلْتُہٗ اَنَالُہٗ نَیْلًا کا مصدر ہے۔ قرآن میں ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ (۳-۹۲) تم کبھی نیکی حاصل نہیں کر سکو گے۔

وَلَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَیْلًا (۹-۱۲۰) یا دشمنوں سے کوئی چیز لیتے۔

لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا (۳۳-۲۵) کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے۔

---

[1] ھو ابو عمرو بن العلاء بن عمار التیمی المازنی عالم البصرۃ المشہور (ت ۱۵۴ھ) ترجمہ فی مراتب النحویین ۱۳-۲۰ واخبار النحویین (۲۲-۲۵) وطبقات النحویین للزبیدی (۲۸-۳۴) والمزہر ۹ ۳-۳۹۹ والبغیہ ۳۶۷ وطبقات القراء (۱: ۲۸۸-۲۹۲)

کِتَابُ الْوَاو

(و ب ر)

اَلْوَبَرُ کے معنی ببری اور اون کے ہیں اس کی جمع اَوْبَارٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا (۱۶-۸۰) اور ان کی اون اور ریشم سے۔

اور جو لوگ پشم کے خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں انہیں سُکَّانُ الْوَبَرِ بادیہ نشین کہا جاتا ہے۔

بَنَاتُ اَوْبَرَ۔ ردی قسم کے ککرمتے جن پر ببری کی طرح کا مادہ ہوتا ہے۔ چھوٹی اور ردّی قسم کی سانپ کی چھتری۔

وَبَّرَتِ الْاَرْنَبُ خرگوش کا اپنے پاؤں کے پچھلے حصہ کے لٹکے ہوئے بالوں سے اپنے قدموں کے نشانات کو مٹانا۔ وَتَبَرَّ الرَّجُلُ فِیْ مَنْزِلِهٖ اپنے مکان سے باہر نہ نکلنا۔ یہ وَبْرٌ یعنی پشم کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے گھر کے اندر پشم کی طرح جما ہوا ہے جیسا کہ تَلَبَّدَ بِمَکَانِ کَذَا کا محاورہ ہے یعنی وہ اپنے مکان کا لبدہ بنا ہوا ہے۔

وَبَارِ بعض نے کہا ہے کہ قوم عاد کے ایک علاقہ کا نام ہے۔

(و ب ق)

وَبَقَ (ض) وَبْقًا وَمَوْبِقًا ...... کے معنی ضعیف اور گراں بار ہو کر ہلاک ہو جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا (۱۸-۵۲) اور ہم ان کے بیچ میں ہلاکت کی جگہ بنا دیں گے۔

اَوْبَقَهٗ کَذَا ہلاک کرنا:۔

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا (۴۲-۳۴) یا ان کے اعمال کے سبب ان کو تباہ کر دے۔

(و ب ل)

اَلْوَبْلُ وَالْوَابِلُ کے معنی بڑی اور بھاری بوندوں والی بارش کے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلْدًا (۲-۲۶۵) مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو جب اس پر بارش ہو۔

پھر معنی ثقل کے لحاظ سے ہر اس چیز کو وَبَالٌ کہا جاتا ہے جس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔

ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ (۵۹-۱۵) اپنے کاموں کی سزا کا مزہ چکھ چکے ہیں۔

وَبِیْلٌ۔ وہ طعام یا گھاس جس کے کھانے سے بدہضمی اور ضرر کا اندیشہ ہو۔ قرآن میں ہے۔

فَاَخَذْنَاہُ اَخْذًا وَّبِیْلًا (۷۳-۱۶) تو ہم نے اس کو بڑے وبال میں پکڑ لیا۔

(و ت د)

اَلْوَتَدُ وَالْوَتِدُ (ج اَوْتَادٌ) کے معنی میخ کے ہیں۔ وَتَدْتُہٗ اَتِدُہٗ وَتْدًا کے معنی کسی چیز میں میخ لگا کر اسے مضبوط کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا (۷۸-۷) اور پہاڑوں کو (اس کی) میخیں نہیں ٹھہرایا۔ اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں ٹھہرانے کی کیفیت اس کے بعد بیان ہوگی[1]۔ اور کبھی وَتِدٌ کی تاء کو ساکن اور پھر دال میں ادغام کرکے وَدٌّ بھی پڑھ لیتے ہیں۔

اَلْوَتِدَانِ دونوں کانوں کے سامنے کے حصے جو میخ کی طرح ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

(و ت ر)

اَلْوِتْرُ (طاق) یہ اعداد میں شفع کی ضد ہے جس کی بحث آیت وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹-۳) اور جفت اور طاق کی (قسم) کے تحت گزر چکی ہے[2]۔ اَوْتَرَ۔ وتر نماز پڑھنا۔

اَلْوَتْرُ وَالْوِتْرُ وَالتِّرَۃُ کے معنی کینہ کے ہیں اور اسی سے وَتَرْتُہٗ (ض) ہے جس کے معنی کسی کو تکلیف پہنچانے یا اس کا حق کم کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَنْ یَّتِرَکُمْ اَعْمَالَکُمْ (۴۷-۳۵) وہ ہرگز تمہارے اعمال کو کم (اور گم) نہیں کرے گا۔

اَلتَّوَاتُرُ کسی چیز کا یکے بعد دیگرے آنا محاورہ ہے جَاؤُا تَتْرٰی (وہ یکے بعد دیگرے کچھ وقفہ کے بعد آئے)، قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (۲۳-۴۴) پھر ہم پے در پے اپنے پیغمبر بھیجتے رہے۔

لَاوَتِیْرَۃَ فِیْ کَذَا وَلَا غَمِیْزَۃَ وَلَا غَیْرُ اس میں عقلی کمزوری یا کوئی دوسرا عیب نہیں ہے اور تواتر سے وَتِیْرَۃٌ ہے جس کے معنی سَجِیَّۃٌ (طبعی عادت) کے بھی آتے ہیں نیز وَتِیْرَۃٌ کا لفظ حسب ذیل معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ حلقہ جس پر بچے تیر اندازی کی مشق کرتے ہیں۔

(۲) نرم زمین (۳) ناک کے نتھنوں کا درمیانی پردہ۔

(و ت ن)

اَلْوَتِیْنُ (رگ جان) اس رگ کو کہتے ہیں جو جگر کو خون پہنچاتی ہے۔ اور اس کے کٹ جانے سے انسان مر جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْہُ الْوَتِیْنَ (۶۹-۴۶) پھر اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔

اَلْمُوَاتَنَۃُ (مفاعلہ) کے معنی شاہ رگ کی طرح قریب ہونے کے ہیں گویا آیت:۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (۵۰-۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس کے زیادہ قریب ہیں میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] وفی القرآن: وفرعونَ ذی الاوتادِ (۳۸-۱۲) قال البیضاوی معناہ ذوالجموع الکثیرۃ وفی الکتاب ذو الملک الثابت وکذا فی الروح ۲۳-۱۵۵) ؛ [2] ملاحظہ ہو عنوان (ش ف ع) ؛ ؛ ؛ ؛ ؛

اِسْتَوْثَنَ الْاِبِلُ موٹاپے کی وجہ سے اونٹ کی رگ گردن کا غلیظ اور موٹا ہو جانا۔

(و ث ق)

وَثِقْتُ بِهٖ اَثِقُ ثِقَةً کسی پر اعتماد کرنا اور مطمئن ہونا۔

اَوْثَقَهٗ۔۔۔ (افعال) زنجیر میں جکڑنا، رسی سے کس کر باندھنا۔

اَلْوَثَاقُ وَالْوِثَاقُ اس زنجیر یا رسی کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے۔

قرآن میں ہے:۔

وَلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ (۸۹-۲۶) اور نہ کوئی ایسا جکڑنا جکڑے گا۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴۷-۴) یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) قید کر لو۔

اَلْمِیْثَاقُ کے معنی پختہ عہد و پیمان کے ہیں جو قسموں کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ (۳۳-۷) اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا۔

وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا (۳۳-۷) اور عہد بھی ان سے پکا لیا۔

اَلْمَوْثِقُ (اسم) پختہ عہد و پیمان کو کہتے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ۔۔۔۔ مَوْثِقَهُمْ (۱۲-۶۶) کہ جب تک تم خدا کا عہد نہ دو۔

اَلْوُثْقٰی یہ اَوْثَقُ (افعل) کی مؤنث ہے اور قریب قریب۔ مَوْثِقٌ کے ہم معنی ہے۔

قرآن میں ہے:۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی (۲-۲۵۶) اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی۔

ثِقَةٌ قابل بھروسہ آدمی، یہ مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جیسے رَجُلٌ ثِقَةٌ وَقَوْمٌ ثِقَةٌ اور بطور استعارہ مَوْثُوْقٌ (معتمد) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

نَاقَةٌ مُوَثَّقَةُ الْخَلْقِ مضبوط بناوٹ کی اونٹنی۔

(و ث ن)

اَلْوَثَنُ (بُت) اس کی جمع اَوْثَانٌ ہے اور اَوْثَانٌ ان پتھروں کو کہا گیا ہے جن کی جاہلیت میں پرستش کی جاتی تھی۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا (۲۹-۲۵) کہ تم جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو لے بیٹھے ہو۔

اَوْثَنْتُ فُلَانًا کسی کو بڑا عطیہ دینا۔

اَوْثَنْتُ مِنْ كَذَا کسی کام کو کثرت سے کرنا۔

(و ج ب)

اَلْوُجُوْبُ (ض) کے معنی ثبوت کے ہیں اور واجب کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ممکن کے بالمقابل یعنی وہ چیز جو ضروری الثبوت ہو اور اس کا ارتفاع فرض کرنے سے محال لازم آئے جیسے کہا جاتا ہے۔

وُجُوْدُ الْوَاحِدِ مَعَ وُجُوْدِ الْاِثْنَیْنِ وَاجِبٌ دو کے ساتھ ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۲) وہ کام جس کے نہ کرنے سے انسان قابل ملامت سمجھا جائے یہ دو قسم پر ہے: (الف)

له انظر: ۲۹-۷

واجب مِنْ جِهَةِ الْعَقْلِ جیسے اللہ کی واحدنیت اور نبوت کہ ان کی معرفت عقلاً واجب ہے (ب) واجب مِنْ جِهَةِ الشَّرْعِ یعنی وہ فعل جس کا وجوب شریعت سے ثابت ہو جیسے وُجُوْبُ الْعِبَادَاتِ الْمُوَظَّفَةِ یعنی فرضی عبادات کا وجوب وَجَبَتِ الشَّمْسُ کے معنی سورج کے گرنے یعنی غروب ہونے کے ہیں چنانچہ معنی سقوط کے لحاظ سے فرمایا:۔

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا (۲۲-۳۶) تو جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں۔

وَجَبَ الْقَلْبُ وُجُوْبًا دل کا دھڑکنا، اس میں بھی معنی سقوط معتبر ہے اور اَوْجَبَ (افعال) بھی ان تمام معانی میں استعمال ہوتا ہے اور کبائر گناہ کو مُوْجِبَاتٌ کہا گیا ہے کیونکہ ان کے ارتکاب سے دوزخ کا عذاب واجب ہو جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ واجب کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک وہ چیز جس کا عدم ناممکن ہو جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ واجب الوجود ہے دوسرے واجب اسے کہتے ہیں جس میں موجود ہونے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو اور فقہا کا یہ کہنا کہ واجب وہ ہے جس کے نہ کرنے سے انسان عقوبت کا مستحق ہو تو یہ تَعْرِیْفُ الشَّیْءِ بِالْعَوَارِضِ کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ استحقاق عقوبت اس کا وصف لازم نہیں ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے جس طرح کہ انسان کی تعریف میں کہا جائے مُسْتَقِیْمُ الْقَامَةِ وَالْمَاشِیْ عَلَی الرِّجْلَیْنِ

(و ج د)

اَلْوُجُوْدُ (ض) کے معنی کسی چیز کو پالینا کے ہیں اور یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ حواس خمسہ میں سے کسی ایک حاسہ کے ساتھ ادراک کرنا جیسے وَجَدْتُ زَیْدًا (حاسہ بصر) وَجَدْتُ طَعْمَهٗ (حاسہ ذوق) وَجَدْتُ سَمْعَهٗ (حاسہ سمع) وَجَدْتُ خُشُوْنَتَهٗ (حاسہ لمس)۔

۲۔ قویٰ باطنہ کے ساتھ کسی چیز کا ادراک کرنا۔ جیسے وَجَدْتُ الشِّبَعَ (میں نے سیری کو پایا) کہ اس کا تعلق قوت شہویہ کے ساتھ ہے۔ وَجَدْتُ الْحُزْنَ اَوِ السَّخَطَ (میں نے غصہ یا غم کو پایا) اس کا تعلق قوت غضبیہ کے ساتھ ہے۔ اور بذریعہ عقل کے کسی چیز کو پالینا جیسے اللہ تعالیٰ یا نبوت کی معرفت کہ اسے بھی وِجْدَان کہا جاتا ہے۔ جب وجود (پالینا) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو اس کے معنی محض کسی چیز کا علم حاصل کر لینا کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ذات باری تعالےٰ جوارح اور آلات کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل کرنے سے منزہ اور پاک ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَا اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ (۷-۱۰۱) اور ہم نے ان میں سے اکثروں میں عہد کا نباہ نہیں دیکھا اور ان میں اکثروں کو دیکھا تو ...... بدعہد دیکھا۔

اس کے بالمقابل معدوم کے بھی کئی معنی آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو پالینا کسی ایسے طریق سے ہوتا ہے جو تمام مذکورہ وجوہ سے بالا ہو۔

اور کبھی کسی چیز پر تمکن (قدرت) حاصل کر لینے کو بھی وجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۹-۵) تم مشرکوں کو جہاں قدرت پاؤ قتل کر دو۔

اور آیت کریمہ:۔
فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ (۲۸-۱۵) تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں۔ میں بھی وَجَدَ بمعنی تَمَكَّنَ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَجَدْتُّ امْرَأَةً۔ يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ (۲۷-۲۳-۲۴) میں نے ایک عورت دیکھی ...... (وہ اور اس کی قوم) آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں۔
میں وجود بلحاظ بصر اور بصیرت مراد ہے کیونکہ ہُدہُد نے آنکھوں سے ان کو دیکھا بھی تھا اور پھر بصیرت سے ان کی حالت کا اندازہ بھی لگایا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کا وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا الآیۃ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا (کیونکہ تمام قوم کو تو اس نے سورج کی پرستش کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ کچھ اعتبار اور قیاس سے بھی کام لیا تھا) اور آیت:۔
فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً (۴-۴۳) اور تمہیں پانی نہ ملے۔
میں لَمْ تَجِدُوا بمعنی لَمْ تَقْدِرُوا ہے یعنی اگر تمہیں پانی پر قدرت نہ ہو۔ اور آیت:۔
مِنْ وُّجْدِكُمْ (۶۵-۶) مقدور کے مطابق۔
میں وُجْد سے مقدور یا مالی حالت مراد ہے۔ اور غنی (تونگری) کو وُجْدٌ اور جِدَةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور وُجْد میں وَجْدٌ اور وِجْدٌ (بفتحہ واو وکسرہ آں) بھی حکایت کیا گیا ہے۔ اور وَجْدٌ کے معنی غم اور محبت کے بھی آتے ہیں۔ اور مَوْجِدَةٌ غصہ کو کہتے ہیں۔ اور وجود کے معنی گم شدہ چیز کو پالینا بھی آتے ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ موجودات تین قسم پر ہیں۔
ایک وہ جو ازلی اور ابدی ہو۔ یعنی اس کی ابتداء اور انتہا نہ ہو اور یہ صرف ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ دوم وہ ہے جو مبدأ اور منتہی رکھتی ہو جیسے اس دنیا میں انسان اور عالم دنیا کے دیگر جواہر۔ تیسری قسم موجودات کی وہ ہے جن کا مبدأ تو ہے لیکن منتہی نہیں ہے۔ جیسے عالم آخرت کا انسان۔

(و ج س)

اَلْوَجْسُ کے معنی صوت خفی کے ہیں اور تَوَجُّسٌ (تفعل) خفی آواز سننے کی کوشش کرنے کو کہتے ہیں اور اِيجَاسٌ کے معنی دل میں کوئی بات محسوس کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔
فَاَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيْفَةً مُّوسٰى (۲۰-۶۷) (اس وقت) موسیٰ نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔
لہذا وَجْسٌ اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی (خطرہ) کے بعد دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو چیز مبدأ بنتی ہے اسے هَاجِسٌ اور اس کے بعد کی حالت کو وَاجِسٌ کہا جاتا ہے۔

(و ج ف)

اَلْوَجِيفُ کے معنی تیز رفتاری کے ہیں اور اَوْجَفْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی ہیں میں نے اونٹ کو تیز دوڑایا (قرآن میں ہے۔
فَمَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ (۵۹-۶) کیونکہ اس کے لئے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ۔ مثل مشہور ہے۔
اَذَلَّ كَامِلٌ وَاَوْجَفَ كَاعِجَفٍ یعنی گھوڑے کو تیز دوڑا کر دبلا کر دیا۔ وَجَفَ الشَّيْءُ کسی چیز کا مضطرب ہونا۔ قَلْبٌ وَّاجِفٌ مضطرب دل جیسے فرمایا:۔
قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ (۷۹-۸) اس دن

لوگوں کے) دل خائف ہو رہے ہوں گے۔
یعنی مضطرب اور پریشان ہوں گے جیسا کہ قلوب کے اضطراب کے لئے طائرۃٌ یا خافقۃٌ وغیرہ الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں۔

(و ج ل)

اَلْوَجَلُ کے معنی دل ہی دل میں خوف محسوس کرنے کے ہیں اور یہ باب وَجِلَ یَوْجَلُ کا مصدر ہے جس کے معنی ڈرنے یا گھبرانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (۸-۲) مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو انکے دل ڈر جاتے ہیں۔
اِنَّا مِنْکُمْ وَجِلُوْنَ (۱۵-۵۲) (انہوں نے کہا) ہمیں تو تم سے ڈر لگتا ہے۔ یہ وَجِلٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ڈرنے والا۔
قَالُوْا لَا تَوْجَلْ (۱۵-۵۳) (مہمانوں نے) کہا کہ ڈریئے نہیں۔
وَقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ (۲۳-۶۰) اور ان کے دل ...... ڈرتے رہتے ہیں۔

(و ج ہ)

اَلْوَجْہُ کے اصل معنی چہرہ کے ہیں۔ ج وُجُوْہٌ جیسے فرمایا:۔
فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ (۵-۶) تو اپنے منہ اور ہاتھ دھو لیا کرو۔
وَتَغْشٰی وُجُوْھَھُمُ النَّارُ (۱۴-۵۰) اور انکے چہروں پر آگ لپٹ رہی ہوگی۔
اور چونکہ استقبال کے وقت سب سے پہلے انسان کا چہرہ سامنے آتا ہے۔ اس لئے کسی چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے اسے وجہ کہہ لیتے ہیں۔ نیز ہر چیز کے اشرف حصہ اور مبدا پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے وَجْہُ کَذَا اس کا اول حصہ۔
وَجْہُ النَّھَارِ دن کا اول حصہ اور آیت کریمہ:۔
وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵-۲۷) اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت) جو صاحب جلال وعظمت ہے۔ ..... باقی رہ جائے گی۔
میں بعض نے وجہ سے ذات باری تعالیٰ مراد لی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَجْہُ رَبِّکَ سے اعمال صالحہ مراد ہیں۔ جن سے ذات باری تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود ہوتی ہے۔ نیز فرمایا:۔
فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ (۲-۱۱۵) تو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے۔
کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ (۲۸-۸۸) اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔
یُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ (۳۰-۳۸) جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں۔
اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ (۷۶-۹) اور کہتے ہیں کہ ہم تو خالص خدا کے لئے کھلاتے ہیں۔
ان تمام آیات میں بعض نے کہا ہے کہ وجہ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے لہذا آیت کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ کے معنی یہ ہیں کہ باستثناء ذات باری تعالٰی ہر چیز نابود ہونے والی ہے۔ اور اسی قسم کی دوسری آیات میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ مروی ہے کہ ابی عبداللہ بن الرضا نے کہا ہے سبحان اللہ لوگ بہت بڑا کلمہ کہتے ہیں۔

آیت هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ میں توجہ کے معنی جہت قصد کے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ بقا صرف انہیں اعمال کو حاصل ہوگی جن سے ذات باری تعالیٰ کا قصد کیا جائے اور دیگر آیات بھی اسی معنی پر محمول ہیں۔ اور یہی معنی آیت يُرِيدُونَ وَجْهَ اللّٰهِ (۳۰-۳۸) جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں۔ اور:۔

يُرِيدُونَ وَجْهَهُ (۱۸-۳۸) اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ میں مراد ہیں۔ اور آیت:۔

وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (۷-۲۹) اور ہر نماز کے وقت سیدھا (قبلے کی طرف) رخ کیا کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ وجوہ سے مراد چہرے ہیں۔ اور یہ فَعَلْتُ كَذَا بِيَدِي کی طرح بطور استعارہ کے استعمال ہوا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وجہ کے معنی متوجہ ہونے کے ہیں اور اقامت کے معنی استقامت کا قصد کرنے کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نماز میں خالص رضائے الٰہی کا قصد کرو۔ (یعنی ریاکاری وغیرہ سے کام نہ لو) چنانچہ آیات:۔

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ (۳-۲۰) (اے پیغمبر) اگر لوگ تم سے جھگڑنے لگیں تو کہدو کہ میں اور میرے پیروکار تو خدا کے فرمانبردار ہو چکے ہیں۔

وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ (۳۱-۲۲) اور جو اپنے تئیں خدا کا فرمانبردار کردے اور نیکوکار بھی ہو تو اس نے مضبوط دستاویز ہاتھ میں لے لی۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا (۳۰-۳۰) تو تم ایک طرف ہو کر دین (خدا کے رستے) پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ۔

میں وجہ سے خدا کی رضا جوئی اور اس کی جانب متوجہ ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اور استعارہ کے طور پر مذہب یا طریقہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا:۔

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ (۹۲-۱۶) اور اس لئے نہیں (دیتا کہ) اس پر کسی کا احسان ہے (جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے۔ اور آیت:۔

آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ (۳-۷۲) کہ جو کتاب مومنوں پر نازل ہوئی اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو۔

میں وجہ النہار کے معنی دن کے شروع حصہ کے ہیں۔ وَاجَهْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کے آمنے سامنے ہونے کے ہیں۔ اور وَجْهٌ کے معنی قصد بھی آتے ہیں اور جِهَةٌ اور وِجْهَةٌ کے معنی مقصد کے ہیں یعنی کسی چیز کی طرف متوجہ ہونے کی جگہ۔ قرآن میں ہے:۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (۲-۱۴۸) اور ہر ایک فرقے کے لئے ایک سمت مقرر ہے۔

تو وِجْهَةٌ سے شریعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (۵-۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔

اَلْجَاہُ۔ مرتبہ بعض نے کہا ہے کہ یہ وجہ سے مقلوب ہے لیکن وجہ کا لفظ عزت مرتبہ اور چہرہ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور جَاہٌ کے معنی صرف مرتبہ کے آتے ہیں۔ وَجَّهْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو ایک جانب بھیجنے کے ہیں اور تَوَجَّهَ کے معنی ازخود جانے کے۔

فُلَانٌ وَجْهُ الْقَوْمِ کے معنی رئیس قوم کے ہیں جیسا کہ قوم کے رئیس اور سردار کو اَنْفُسُهُمْ وَ عَيْنُهُمْ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ سے تعبیر کرلیتے ہیں۔ فُلَانٌ وَجِيْهٌ اَوْ ذُوْ جَاهٍ فلاں صاحب وجاہت ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۳-۴۵) اور جو دنیا اور آخرت میں باآبرو ہوگا۔

ایک محاورہ ہے:۔

اَحْمَقُ مَا يَتَوَجَّهُ بِهٖ یعنی وہ انتہائی درجہ کا احمق ہے اور کبھی بِهٖ کو حذف کرکے بھی بولتے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ حماقت کی وجہ سے وہ کوئی کام بھی صحیح طور پر نہیں کرسکتا۔

اَلتَّوْجِيْهُ علم عروض میں اس حرف کو کہتے ہیں جو الف تاسیس اور حرف روی کے درمیان ہو۔

(و ح د)

اَلْوَحْدَةُ کے معنی یگانگت کے ہیں اور واحدۃ درحقیقت وہ چیز ہے جس کا قطعاً کوئی جزء نہ ہو پھر اس کا اطلاق ہر موجود پر ہوتا ہے حتی کہ ہر اسم عدد اس کے ساتھ متصف ہوسکتا ہے۔ جیسے عَشَرَةٌ وَاحِدَةٌ (ایک عشرہ) مِائَةٌ وَاحِدَةٌ (ایک سو) اَلْفٌ وَاحِدٌ (ایک ہزار) پس وَاحِدٌ کا لفظ مشترک ہے جو چھ طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ واحد بلحاظ جنس یا نوع کے جیسے کہا جاتا ہے کہ انسان اور فرس دونوں ایک ہی ہیں یعنی بلحاظ جنس ایک ہی ہیں۔ یا زید اور عمرو ایک ہیں یعنی بلحاظ نوع کے ایک ہیں۔

۲۔ واحد بالاتصال۔ یعنی کئی اجزاء مل کر ایک ہوجائیں عام اس سے کہ وہ اتصال خلقی ہو جیسے شخص واحد یا صناعی ہو جیسے حِرْفَةٌ وَاحِدَةٌ۔

۳۔ یکتا اور بے نظیر خواہ وہ یکتائی بلحاظ خلقت کے ہو جیسے اَلشَّمْسُ وَاحِدَةٌ یا بلحاظ دعوائے فضیلت کے ہو جیسے فُلَانٌ وَاحِدُ عَصْرِهٖ (فلاں یکتائے روزگار ہے۔ یا هُوَ نَسِيْجُ وَحْدِهٖ (وہ اپنی طرز کا ایک ہے یعنی صاحب الرائے ہونے میں اس کا کوئی شبیہ نہیں[1]۔

۴۔ وہ جس میں تجزی ممتنع ہو خواہ وہ امتناع صغر جسم کی وجہ سے ہو جیسے ذرہ یا صلابت کی وجہ سے جیسے الماس یعنی ہیرا۔

۵۔ بمعنی مبدا آتا ہے۔ خواہ وہ مبدائے اعداد ہو جیسے وَاحِدٌ اِثْنَانِ یا مبدء خط جیسے نقطہ۔

الحاصل ان سب اقسام کو وحدۃ کے معنی عارض ہوتے ہیں لیکن (۶) جب واحد کا لفظ باری تعالیٰ پر بولا جاتا ہے۔ جیسے اَللّٰهُ وَاحِدٌ تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس میں تجزی یا تکثر ناممکن ہو اور اس قسم کی وحدت چونکہ بمشکل ہی سمجھ میں آسکتی ہے اس لئے فرمایا:۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (۳۹-۴۸) اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو جو لوگ آخرت

---

[1] وقالت عائشة فی عمر کان واللہ احوذیا نسیج وحدہ (اللسان (وحد) دانس)

پریقین نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہوجاتے ہیں۔
اَلْوَحْدُ کے معنی اکیلا کے ہیں اور غیر اللہ کی صفت بھی واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۱۴۴) عَلٰی مُسْتَانِسٍ وَحْدِ

لیکن اَحَدٌ کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور ھُوَ نَسِیْجُ وَحْدِہٖ کی طرح فُلَانٌ لَا وَاحِدَ لَہٗ کا محاورہ بھی مشہور ہے اور ذم کے لیے ھُوَ عُیَیْرُ وَحْدِہٖ یا جُحَیْشُ وَحْدِہٖ کہا جاتا ہے یعنی وہ کمزور رائے ہے اور جب معمولی سی مذمت کرنا مقصود ہوتی ہے تو رُجَیْلُ وَحْدِہٖ کہدیتے ہیں۔

و ح ش

اَلْوَحْشُ یہ اَلْاِنْسُ کی ضد ہے اور وہ جانور جو انسان سے مانوس نہیں ہوتے۔ انہیں وَحْشٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع وُحُوْشٌ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۸۱-۵) اور جب وحشی جانور جمع کئے جائیں گے۔
اور مَکَانٌ وَحْشٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی آبادی نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے:۔
لَقِیْتُہٗ بِوَحْشِ اِصْمِتَ یعنی میں نے ویران جگہ میں اس سے ملاقات کی[2]۔
بَاتَ فُلَانٌ وَحْشًا اس نے بھوکے رات گزاری اس کی جمع اَوْحَاشٌ آتی ہے۔
اور وَحْشٌ سے اَرْضٌ مُوْحِشَۃٌ (ویران جگہ) کا محاورہ ہے اور اس کی طرف نسبت کے وقت وَحْشِیٌّ کہا جاتا ہے۔ اور وَحْشِیٌّ اِنْسِیٌّ کے بالمقابل بھی آتا ہے۔ اور کسی شے کی ہر وہ جہت جو انسان کی طرف ہو اسے اِنْسِیٌّ اور دوسری جانب کو وحشی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں وَحْشِیُّ الْقَوْسِ وَاِنْسِیُّہٗ کا محاورہ آتا ہے۔

و ح ی

اَلْوَحْیُ کے اصل معنی اشارہ سریعہ کے ہیں۔ اور اس کے معنی سرعت کو متضمن ہونے کی وجہ سے ہر تیز رفتار معاملہ کو اَمْرٌ وَحْیٌ کہا جاتا ہے۔ اور یہ (وحی) کبھی رمز و تعریض کے طور پر بذریعہ کلام کے ہوتی ہے۔ اور کبھی[2] صوت مجرد کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی اس میں ترکیب الفاظ نہیں ہوتی۔ اور کبھی[3] بذریعہ جوارح کے اور کبھی بذریعہ کتابت کے اس بنا پر آیت:۔
فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْھِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا (۱۹-۱۱) پھر وہ (عبادت کے) حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو ان سے اشارے سے کہا کہ صبح و شام خدا کو یاد کرتے رہو۔
میں بعض نے اَوْحٰی کے معنی رَمَزَ اور بعض نے کَتَبَ (لکھنا) اور بعض نے اغتبار کر لینا کئے ہیں
اور آیت:۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (۶-۱۱۳) اور اسی طرح ہم نے شیاطین (سیرت) جنوں اور انسان کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ دھوکہ دینے کے لئے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے تھے۔

---

[1] قالہ النابغۃ وتکملۃ البیت:۔ کان رحلی وقد زال النہار بنا۔ بذی الجلیل علی مستانس وحدہ وتفسیر بجہ فی دان س. [2] ای بمکان لا انیس فیہ انظر للکلمۃ الیھدانی ۲ / ۱۸۴ ۔

میں بھی وحی کا لفظ مذکورہ بالا وجوہ پر حمل کیا جا سکتا ہے۔ اور آیت:۔

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِھِمْ (۶-۱۲۱) اور شیطان (لوگ) اپنے رفیقوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ایحاء بمعنی وسوسہ اندازی کے ہے جس کی طرف کہ آیت:۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴-۴) (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

نیز حدیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا[1] (۱۳۴) وَاِنَّ لِلشَّیْطَانِ لَمَّۃً "کہ شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور شریعت میں کلمہ الہیہ کو وحی کہا جاتا ہے۔ جو انبیاء و اولیاء کی طرف القاء کیا جاتا ہے۔ اس کی چند صورتیں ہیں۔ جیسا کہ آیت:۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ الآیۃ (۴۲-۵۱) اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے۔ مگر الہام (کے ذریعہ) سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو خدا چاہے القا کرے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی یا تو فرشتہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتا ہے اور اس کا کلام سنائی دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت جبریل ایک معین شکل میں آکر آنحضرت تک پیام رسالت پہنچایا کرتے تھے۔ چنانچہ جملہ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا میں اس معنی کو بیان فرمایا ہے۔

وحی کی دوسری صورت یہ ہے کہ پردے کے پیچھے سے کلام سنائی دے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور یہی معنی مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کے ہیں وحی کی یہ دونوں قسمیں انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔

وحی کی تیسری صورت القاء فِی الرُّوْع کی ہے یعنی دل میں کسی بات کا ڈال دینا۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا[2] (۱۳۵)

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔

اور کبھی وحی بذریعہ الہام ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْہِ (۲۸-۷) اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ اسکو دودھ پلاؤ۔

اور کبھی وحی تسخیری ہوتی ہے یعنی کسی چیز کو اس کے کام پر مامور کرنا جیسے فرمایا:۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (۱۶-۶۸) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا:۔

اور کبھی نیند میں خواب کے ذریعے جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا[3] (۱۳۶) اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ وَبَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ کہ وحی تو منقطع ہو چکی ہے مگر مبشرات یعنی رؤیا مومن باقی رہ گئے ہیں۔

اور وحی کی ان ہر سہ اقسام یعنی الہام تسخیر اور رؤیا پر آیت اِلَّا وَحْیًا دلالت کرتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا

---

[1] وتمامہ وللملک لمۃ فاما لمۃ الشیطان فایعاد بالشر وتکذیب بالحق الحدیث رواہ ابن حبان فی زوائدص۔۴۰ [2] الحدیث لی انغانی ۲/۲۸۵ وانظر التخریجہ فی (ر و ع) و (نفث)۔ [3] قدمر تخریجہ فی (ب ش ر) ۱۲

أَوْ قَالَ أُوْحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ (۶-۹۴)
اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ افترا کرے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو۔
عام ہے اور ہر اس شخص پر چسپاں ہو سکتی ہے جو مذکورہ بالا اقسام وحی میں سے کسی ایک قسم کی وحی کا جھوٹا دعویٰ کرے۔ اور آیت :۔
وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ الْآيَةِ (۲۱-۱۵) اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی ۔۔۔۔۔۔
میں بھی وحی کا لفظ جمیع انواع وحی کو شامل ہے۔ کیونکہ اس آیت میں وحی کے تحت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کا ذکر ہے اور ان دونوں چیزوں کی معرفت اولوالعزم پیغمبروں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ چیز جس طرح خدا ع علیہ السلام سے بذریعہ سماعت کے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی عقل والہام سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔۔۔ پس اس میں صرف اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ شخص کبھی بھی اللہ تعالیٰ کا سچا پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ جسے باری تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی وجوب عبادت کے متعلق معرفت حاصل نہ ہو۔ اور آیت :۔
وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ (۵-۱۱۱) اور جب میں نے حواریوں کو حکم بھیجا۔
میں حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے سے حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے ان کو حکم دینا مراد ہے۔ اور آیت :۔
وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ (۲۱-۷۳)
اور ان کو نیک کام کرنے ۔۔ کا حکم بھیجا۔

میں بھی لوگوں کی طرف وحی کرنے سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انہیں ان باتوں کا حکم دینا مراد ہے۔ اور آیات :۔
اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (۶-۱۰۶)
اور جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آتا ہے اس کی پیروی کرو۔
إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (۱۰-۱۵) میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔
قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (۱۸-۱۱۰) کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے۔
میں خاص وہ وحی مراد ہے جو آنحضرت کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور آیت :۔
وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ (۱۰-۸۷) اور ہم نے موسیٰؑ اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی۔
میں موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف یکساں قسم کی وحی بھیجنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی تو حضرت جبریل کی وساطت سے آتی تھی مگر ہارون علیہ السلام کی طرف حضرت موسیٰ اور جبریل علیہا السلام دونوں کی وساطت سے وحی کی جاتی ہے۔ اور آیت :۔
إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ (۸-۱۲) جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو ارشاد فرماتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ لوح وقلم کی وساطت سے وحی بھیجنا مراد ہے۔ اور آیت کریمہ :۔
وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا (۴۱-۱۲) اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا۔
میں آسمان سے مراد اہل سماء ہیں تو یہاں تُوحِي إِلَيْهِمْ (یعنی جن کی طرف وحی کی تھی) محذوف ہے

اور اہل سماء سے مراد چونکہ فرشتے ہی ہیں اسلئے
اصل میں وَاَوْحٰی اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ (۸-۱۲) ہے کہ
ہم نے فرشتوں کی طرف وحی بھیجی پس یہ مذکورہ
بالا آیت کے ہم معنی ہوگی۔

اور اگر مُوْحِیْ اِلَیْھِمْ سے آسمان ہی مراد لئے
جائیں تو جو لوگ آسمانوں کے غیر جاندار ہونے
کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے وحی تسخیری
مراد ہوگی۔ اور جن کے نزدیک آسمان زندہ اور
جاندار مخلوق ہیں۔ ان کے نزدیک وحی بذریعہ
کلام مراد ہوگی۔ اور آیت:۔
بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا (۹۹-۵) کیونکہ تمہارے
پروردگار نے اس کا حکم بھیجا ہوگا۔
میں وحی کے پہلے معنی یعنی وحی تسخیری مراد لینا اقرب
معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت:۔
لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ
وَحْیُہٗ (۲۰-۱۱۴) اور قرآن کی وحی جو تمہاری
طرف بھیجی جاتی ہے۔ اس کے پورا ہونے سے
پہلے قرآن کے پڑھنے کے لئے جلدی نہ کرو۔
میں آنحضرت کو تثبت کے ساتھ وحی کو سننے
اور اس کی تلقی میں عجلت کو ترک کرنے کی ترغیب
دی گئی ہے۔

(و د د)

اَلْوُدُّ کے معنی کسی چیز سے محبت اور اس
کے ہونے کی تمنا کرنا کے ہیں یہ لفظ ان دونوں
معنوں میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس
لئے کہ کسی چیز کی تمنا اس کی محبت کے معنی کو متضمن
ہوتی ہے۔ کیونکہ تمنا کے معنی کسی محبوب چیز کی آرزو
کرنا کے ہوتے ہیں۔ اور آیت:۔
وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً (۳۰-۲۱)
اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔ اور
نیز آیت:۔
سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹-۹۶)
خدا ان کی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کر دیگا۔
میں اس الفت کی طرف اشارہ ہے جس کا آیت:
لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ
بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ (۸-۶۳) اور اگر تم دنیا بھر
کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں
الفت پیدا نہ کر سکتے۔
میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت:۔
قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ
فِی الْقُرْبٰی (۴۲-۲۳) کہدو کہ میں اس کا تم سے
صلہ نہیں مانگتا مگر (تم کو) قرابت کی محبت تو چاہیے[1]
میں مَوَدَّت کے معنی محض محبت کے ہیں۔ اور آیت:
وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ (۸۵-۱۴) اور وہ بخشنے
والا (اور) محبت کرنے والا ہے۔
اور نیز:۔ اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ ([illegible]۹۰) بے
شک میرا پروردگار رحم والا اور محبت والا ہے۔
میں وَدُوْدٌ اسمائے حسنٰی سے ہے اور ان میں
محبت کے ان معنوں کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:۔
فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ
(۵-۵۴) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دیگا جن کو وہ
دوست رکھے۔ اور جسے وہ دوست رکھیں۔
میں پائے جاتے ہیں۔
اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے محبت کرنے
اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے

[1] الاستثناء منقطع لان القرابۃ لیست من جنس الاجر فی للسببیۃ ای بمعنی اللام ومعناہ الا ان تودونی لقرابتی منکم (الفتوحات ص۲۶۲ ج۴)

معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے مودت کے معنی ان کی نگہداشت کرنے کے ہیں۔ مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں کبھی بھی چھوٹے سے اس کے چھوٹا پن اور کسی بڑے سے اس کی بڑائی کے سبب غافل نہیں ہوتا اور میں ودود اور شکور ہوں لہٰذا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت:۔

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹-۹۶) کے بھی وہی معنی ہوں جو کہ آیت:۔ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ کے ہیں۔

اور مَوَدَّةٌ بمعنی تمنا کے متعلق فرمایا:۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ (۳-۶۹) (اے اہل اسلام) بعضے اہل کتاب اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ تم کو گمراہ کر دیں۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (۱۵-۲) کسی وقت کافر لوگ آرزو کریں گے اے کاش وہ مسلمان ہوتے۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ (۳-۱۱۸) اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو تمہیں تکلیف پہنچے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (۲-۱۰۹) بہت سے اہل کتاب (اپنے دل کی جلن سے) یہ چاہتے ہیں۔

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ (۸-۷) اور چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان و شوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا (۴-۸۹) وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں (اسی طرح) تم بھی کافر ہو کر (سب) برابر ہو جاؤ۔

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ يَوْمَئِذٍ بِبَنِيْهِ (۷۰-۱۱) (اس روز) گنہگار خواہش کرے گا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے (یعنی) اپنے بیٹے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵۸-۲۲) جو لوگ خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔

نیز اس آیت میں کفار سے موالات اور ان کی پشت پناہی سے بھی منع فرمایا گیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ (۶۰-۱) مومنو! اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (مکے سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو ....

تو یہاں مَوَدَّت سے تعلقات محبت یعنی خیر خواہی وغیرہ مراد ہے۔

كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ (۴-۷۳) گویا تم میں اور اس میں دوستی تھی ہی نہیں۔

فُلَانٌ وَدِيْدُ فُلَانٍ وہ فلاں کا دوست ہے۔

اَلْوُدُّ- ایک بت کا نام تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ اس بت کو انتہائی محبوب سمجھنے کی وجہ سے اسے وُدٌّ کہتے تھے اور یا ان کے اس اعتقاد کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اور اس بت کے درمیان رابطۂ محبت پایا جاتا ہے، اسے وُدٌّ کہا گیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس قسم کی قباحتوں سے پاک ہے۔

اَلْوُدُّ کے معنی وَتِدٌ یعنی میخ کے ہیں اور یہ بھی

ہوسکتا ہے کہ یہ اصل میں وَتْدٌ ہو تاء دال میں مدغم ہو کر وَدٌّ ہو گیا ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ میخ کے ایک جگہ پر جمے رہنے یا جس چیز میں لگائی جائے اس میں مضبوطی کے ساتھ لگ جانے کی وجہ سے اس سے محبت کے معنی لے کر اسے وَدٌّ کہہ دیا گیا ہو۔

(و د ع)

اَلدَّعَۃُ کے معنی آرام اور فراخی عیش کے ہیں اور وَدُعَ کَذَا (دَعَۃً وَدَعَارَۃً) کے معنی ہیں تَرَکْتُہٗ وَادِعًا یعنی پرسکون طریقہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا بعض کا قول ہے کہ اس کا فعل ماضی اور اسم فاعل استعمال نہیں ہوتا صرف یَدَعُ اور دَعْ یعنی فعل مضارع اور امر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے[1] اور آیت مَا وَدَعَکَ رَبُّکَ (۹۳-۳) میں ایک قرأت تخفیف دال کے ساتھ بھی منقول ہے[2]۔ شاعر نے کہا ہے[3]۔ (؟)

(۴۴۲) لَیْتَ شِعْرِیْ عَنْ خَلِیْلِیْ مَا الَّذِیْ
غَالَہٗ فِی الْحُبِّ حَتّٰی وَدَعَہٗ

کاش مجھے میرے دوست کے متعلق معلوم ہوتا کہ اسے محبت سے کس چیز نے روک دیا کہ وہ اسے چھوڑ بیٹھا ہے۔

اَلتَّوَدُّعُ کے معنی تن آسان ہونے کے ہیں۔ اور فُلَانٌ مُتَّدِعٌ وَمُتَوَدِّعٌ وَفِیْ دَعَۃٍ کے معنی ہیں کہ فلاں آسودہ حال اور عیش و آرام میں ہے۔ اصل میں یہ معنی وَدَعَ بمعنی تَرَکَ سے ماخوذ ہیں۔ یعنی اس نے مشقت اور تکلیف کے سبب طلب معاش کے لئے جد وجہد کرنا چھوڑ دیا ہے۔

اَلتَّوْدِیْعُ یہ بھی دَعَۃٌ (سکون) سے مشتق ہے اور تودیع کے اصل معنی مسافر کو الوداع کہنے کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اسے سفر کی تکالیف سے محفوظ رکھے اور اسے آرام کی حالت میں پہنچا دے پھر یہ لفظ مسافر کو رخصت کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسا کہ لفظ تسلیم اصل میں اس کے معنی سلامتی کی دعا کے ہیں کہا جاتا ہے۔ وَدَّعْتُ فُلَانًا میں نے اسے چھوڑ دیا چنانچہ آیت: مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی (۹۳-۳) (اے محمد تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔

میں وَدَّعْتُ فُلَانًا (میں نے فلاں کو چھوڑ دیا) کی طرح صرف چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کنایہ کے طور میت کو مُوَدَّعٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَسْتَوْدِعُکَ غَیْرَ مُوَدَّعٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی درازی عمر کی دعا کے ہیں۔ اور اسی سے شاعر کا قول ہے۔

---

[1] ہذا قول علماء النحو وفی الحدیث ودعوا الجنشۃ ما ودعوکم وفی المستوفی ان کل ذالک وارد فی کلام العرب ولا عبرۃ بکلام النحاۃ وفیہ تفصیل ذکرہ صاحب الروح ۳۰ / ۵۷ اہ (روح المعانی (۳۰ / ۱۵۶) [2] قال ابن جنی وہی قراءۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الحب۔ قال الازہری: روی ابن اخی الاصمعی ان انما الشعر لانس بن زنیم اللیثی الصحابی وفیہ عن امیری موضع من خلیلی وفی الطبرسی (۳۰ = ۱۲۳) وروح المعانی (۳۰:۵۶) [3] والبیت مما اختلف فی نسبتہ وروایتہ ففی اللسان والحکم (ودع) فی الوبدل فی الحب۔ قال الازہری: روی ابن اخی الاصمعی ان انما الشعر لانس بن زنیم اللیثی الصحابی وفیہ عن امیری موضع من خلیلی ... معزو الی ابی الاسود الدؤلی وفی الاصابۃ رقم ۲۷۳ والاشباہ النحویہ (۱ : ۲۱۵) والبحر (۸ : ۴۸۵) وابن خالویہ ۱۷۱ والعیون (۳ : ۱۵۶) معزو الی ابی الاسود الدؤلی وفی الاصابۃ رقم ۲۷۳ ... والبیت فی البلدان (رسم ودعان) بغیر عزو وفی حماسۃ البحتری ۲۷۲ فی ثلاثۃ تا لہا فی عبد اللہ بن عامر حین ایطاً علیہ عطاءہٗ وایضاً بروایۃ اخری الیضا لانس بن انس اللیثی وروایتہ اسل امیری ما الذی غیرلہ ۔ وَدَّہٗ والنفع حتی ودعہ [4] لم اجدہ ۱۲

(۳۴۳) وَدَّعَتْ نَفْسِي سَاعَةَ التَّوْدِيعِ
کہ الوداع کے وقت میری جان ہوا ہو گئی۔

(ر و د ق)

اَلْوَدْقُ۔ بعض نے کہا ہے کہ بارش میں جو غبار سا نظر آتا ہے اسے وَدْقٌ کہا جاتا ہے۔ اور کبھی اس سے مراد بارش بھی ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهِ (۲۴-۴۳)
پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل کر برس رہا ہے۔

اور گرمی کی شدت سے ہوا میں جو لہریں نظر آتی ہیں انہیں وَدِيقَةٌ کہتے ہیں۔ اور وَدَقَتِ الدَّابَّةُ وَاسْتَوْدَقَتْ کے معنی ہیں مادہ چوپایہ کا نر کی خواہش کے وقت، رطوبت نکالنا چنانچہ اس مادہ (چوپایہ) کو جو نر کی خواہش میں رطوبت نکال رہی ہو وَدِيقٌ یا وَدُوقٌ کہتے ہیں۔

اور جہاں بارش ہوئی ہو اس جگہ کو مَوْدِقٌ (ظرف) کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۳۴۴) تُعَفِّيْ بِذَيْلِ الْمِرْطِ اِذْ جِئْتُ مَوْدِقِيْ
تُعَفِّيْ کے معنی نشان مٹانے کے ہیں اور مِرْط بڑی چادر کو کہتے ہیں جو ستر کے لئے عورتیں اوپر اوڑھتی ہیں یہاں شاعر نے قدم کے پڑنے کی جگہ کو موضع مطر کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور شعر کے معنی یہ ہیں کہ جب میں اپنی محبوبہ کے پاس آتا ہوں تو وہ اپنی چادر سے میرے قدموں کے نشان مٹا دیتی ہے۔

(ر و د ی)

اَلْوَادِيْ۔ اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہتا ہو اسی سے دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ زمین کو وادی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۲۰-۱۲) تم (یہاں) پاک میدان (یعنی) طویٰ میں ہو۔
اس کی جمع اَوْدِيَةٌ آتی ہے جیسے نَادٍ کی جمع اَنْدِيَةٌ اور نَاجٍ کی جمع اَنْجِيَةٌ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا (۱۳-۱۹) پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے۔
اور حدیث میں ہے[2] (۱۴۷)
لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا کہ اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہش مند ہو گا۔
اور استعارہ کے طور پر مذہب، طریقہ اور اسلیب بیان کو وادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ فِيْ وَادٍ غَيْرِ وَادِيْكَ کہ فلاں کا مسلک تجھ سے جداگانہ ہے اور قرآن نے شعراء کی مذمت کرتے ہوئے ان کے متعلق کہا ہے۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (۲۶-۲۵۶) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں۔
تو یہاں فِيْ كُلِّ وَادٍ سے مختلف اسالیب سخن مراد ہیں جیسے مدح، ہجو، جدل، غزل وغیرہ چنانچہ

---

[1] قالہ امرؤ القیس وصدرہ: وخلت علی بیضاء جم عظامہا۔ وفی دیوانہ ۹۰ والسندوبی اذیل الاسع بدل بذیل المرط راجع دیوانہ و للسان (ودق) والعقد الثمین ۱۴۱ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۷۰) [2] رواہ الترمذی ۲/۵۷: عن انس بن مالک واحمد والشیخان عن ابن عباس ومسلم فی صحیحہ عن ابن الزبیر وابن ماجۃ عن ابی ہریرۃ والبخاری فی التاریخ عن بریرۃ وفی کنز العمال ج ۳۲ رقم ۱۱۱۲-۱۱۲۰۰ باختلاف الفاظہ وفی محاضرات الادباء ۲/۳۳۴: وکان فی مصحف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

شاعر نے کہا ہے[1]؎

(۵۴۴) اِذَا مَا قَطَعْنَا وَادِیًا مِنْ حَدِیْثِنَا
اِلٰی غَیْرِہٖ زِدْنَا الْاَحَادِیْثَ وَادِیًا

جب ہم موضوعِ سخن کی ایک وادی کو قطع کر لیتے ہیں تو دوسری وادی میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اور کنایہ کے طور پر مرد کی اس رطوبت کو وَدْیٌ کہا جاتا ہے جو عورت سے لذت اندوزی کے وقت یا پیشاب کے بعد خارج ہوتی ہے اور اَمْذٰی وَ اَمْنٰی کی طرح اَوْدٰی (افعال) کے معنی نر کا وَدی (رطوبت) خارج کرنے کے ہیں اور یہ مَنٰی وَ اَمْنٰی کی طرح مجرد و مزید فیہ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

اَلْوَدِیُّ چھوٹے پودے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی پانی کی طرح طول میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اَوْدَاہُ کے معنی ہلاک کرنے کے ہیں گویا اس کے خون کو بہا دیا اسی سے وَدَیْتُ الْقَتِیْلَ کا محاورہ ہے جس کے معنی مقتول کا خونبہا ادا کرنے کے ہیں اور دِیَۃٌ اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

فَدِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖ (۴-۹۲) تو وارثان مقتول کو خون بہا دینا۔

(و ذ ر)

یَذَرُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو قلتِ اعتداد کی وجہ سے پھینک دینے کے ہیں (پھر صرف چھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اس کا فعل ماضی استعمال نہیں ہوتا چنانچہ فرمایا:۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰہَ وَحْدَہٗ وَنَذَرَ مَا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا (۷-۷۰) وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم اکیلے خدا ہی کی عبادت کریں اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں ان کو چھوڑ دیں؟۔

وَیَذَرَکَ وَاٰلِھَتَکَ (۷-۱۲۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔

فَذَرْھُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ (۶-۱۳۸) تو ان کو چھوڑ دو کہ وہ جانیں اور انکا جھوٹ۔

وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا (۲-۲۷۸) تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور آیت:۔

وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا (۲-۲۳۴) اور عورتیں چھوڑ جائیں۔

میں یَتْرُکُوْنَ یا یُخَلِّفُوْنَ کی بجائے یَذَرُوْنَ کا صیغہ اختیار کرنے میں جو خوبی ہے وہ اس کے بعد دوسری کتاب میں بیان کریں گے۔

اَلْوَذْرَۃُ گوشت کی چھوٹی سی بوٹی کو کہتے ہیں اور قلتِ اعتناء کے سبب اسے اس نام سے پکارتے ہیں جیسا کہ حقیر شخص کے متعلق ھُوَ لَحْمٌ عَلٰی وَضَمٍ (یعنی وہ ذلیل ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(و ر ث)

اَلْوِرَاثَۃُ وَالْاِرْثُ کے معنی عقدِ شرعی یا جو عقد کے قائم مقام ہے اوکے بغیر کسی چیز کے ایک شخص کی ملکیت سے نکل کر دوسرے کی

---

[1] ؎ لم اجدہ ۱۲

ملکیت میں چلے جاتا کے ہیں۔ اسی سے میت کی جانب سے جو مال ورثاء کی طرف منتقل ہوتا ہے اسے اِرْثٌ تُرَاثٌ اور مِیْرَاثٌ کہا جاتا ہے اور تُراث اصل میں وُراث ہے واؤ مضموم کے شروع میں آنے کی وجہ سے اسے تا سے تبدیل کر لیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا (۸۹-۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

اور حج کے موقعہ پر آنحضرتؐ نے فرمایا۔[1] (۱۳۸)

اُثْبُتُوْا عَلٰی مَشَاعِرِكُمْ فَإِنَّكُمْ عَلٰی إِرْثِ أَبِيْكُمْ کہ اپنے مشاعر (مواضع نسک) پر ٹھہرے رہو تم اپنے باپ (ابراہیمؑ کے ورثہ پر ہو۔ تو یہاں اِرْث کے معنی اصل اور بقیہ نشان کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ (

(۴۴۶) فَيَنْظُرُ فِي صُحُفٍ كَالرِّيَا
طِ فِيهِنَّ إِرْثُ كِتَابٍ مُحِي

وہ صحیفوں میں تالت باندھنے والے کی طرح غور کرتا ہے جن میں کہ مٹی ہوئی کتابت کا بقیہ ہے۔

اور محاورہ میں وَرِثْتُ مَالًا عَنْ زَيْدٍ وَوَرِثْتُ زَيْدًا (میں زید کا وارث بنا) دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ (۲۷-۱۶) اور سلیمان داؤد کے قائم مقام ہوئے۔

وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ (۴-۱۱) اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ (۲-۲۳۲) اور اسی طرح نان ونفقہ بچے کے وارث کے ذمہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا (۴-۱۰۱) مومنو! تم کو جائز نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔

اور أَوْرَثَنِي الْمَيِّتُ كَذَا کے معنی ہیں میت نے مجھے اتنے مال کا وارث بنایا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً (۴-۱۱) اور اگر ایسے مرد یا عورت کی میراث ہو جس کے نہ باپ ہو نہ بیٹا۔

اور أَوْرَثَنِي اللّٰهُ كَذَا کے معنی کسی چیز کا وارث بنا دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ (۴۰-۵۳) اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا۔

وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ (۴۴-۲۸) اور ہم نے دوسرے لوگوں کو ان کا مالک بنا دیا۔

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ (۳۳-۲۷) اور ان کی زمین ...... کا تم کو وارث بنایا۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ (۷-۱۳۶) اور جو لوگ (کمزور سمجھے جاتے تھے) ان کو ...... وارث کر دیا۔

ہر وہ چیز جو بلا محنت ومشقت حاصل ہو جائے اس کے متعلق وَرِثَ كَذَا کہتے ہیں اور جب کسی کو خوشگوار چیز بطور عطیہ دی جائے تو أُوْرِثَ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا (۴۳-۷۲) اور یہ جنت جس کے تم مالک کر دیئے گئے ہو۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ يَرِثُونَ

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظ فی ابو داؤد والترمذی (۲/ ۹۹ ... ۱) مع تحفۃ الاحوذی والنسائی ۲/ ۵۴ وابن ماجۃ ۲/ ۲۳ والحاکم ۱/ ۲۴ والبیہقی فی سنن الکبریٰ ۵/ ۵ والشافعی فی رسالتہ رقم ۱۳۲۲ من طریق سفیان بن عیینۃ باسنادہ وقال الترمذی حدیث سر بع حدیث حسن لانعرفہ الامن حدیث ابن عیینہ عن عمرو بن دینار وانظر لتخریجہ ایضا الفتح الکبیر ۲/ ۲۳ ۔ ۵ لم اجدہ ۱۲

(۲۳-۱۰) (۱) یہی لوگ میراث حاصل کرنے والے ہیں (یعنی) جو . . . میراث حاصل کریں گے۔

اور آیت :-

وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ (۱۹-۷) اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو۔

میں وراثت سے مراد مال کا ورثہ نہیں ہے بلکہ علم وفضل اور نبوت کا ورثہ مراد ہے کیونکہ دنیا کے مال کی تو انبیاء کی نظر میں کچھ قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی فکر کریں۔ بلکہ وہ نہ مال کو جمع کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے مالک بنتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت فرماتے ہیں ﷺ (۱۳۹) اِنَّا مَعَاشِرَ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَةٌ ہم انبیاء کا گروہ جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اور ہمارا کوئی وارث نہیں بن سکتا۔

تو یہاں معاشر الانبیاء منصوب علی الاختصاص ہے اور تَرَکْنَاہُ سے مراد علم ہے اور اس صدقہ میں تمام امت برابر کی شریک ہے۔ اور جو حدیث میں آیا ہے[ؑ] (۱۴۰) اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ (کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں) تو اس سے مراد بھی ورثہ علم ہی ہے اور اس پر ورثہ کا اطلاق اس لئے ہوا ہے کہ وہ کسی احسان اور معاوضے کے بغیر ملتا ہے۔ اور آنحضرت نے حضرت علیؓ کو فرمایا[۳]

(۱۴۱) اَنْتَ اَخِیْ وَوَارِثِیْ تو میرا بھائی اور وارث ہے لیکن ساتھ ہی فرمایا وَمَا اَرِثُكَ کہ میں تیرا وارث نہیں ہوں گا اسی طرح فرمایا (۱۴۲) مَاوَرَّثَتِ الْاَنْبِیَاءُ قَبْلِیْ کِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ کہ مجھ سے پہلے انبیاء کا ورثہ کتاب اللہ اور میری سنت ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو وارث کہا ہے کیونکہ آخرکار تمام اشیاء اسی کی ملک میں جانے والی ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳-۱۸۰) اور آسمانوں اور زمین کا وارث خدا ہی ہے۔

اور فرمایا :-

وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ (۱۵-۲۳) اور ہم ہی (سب کے) وارث (مالک) ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے وارث ہونے کے متعلق (یہ بھی) امر وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (کہ آج کس کی بادشاہت ہے) کے ساتھ منادی فرمائیں گے تو جواب میں کہا جائیگا۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۰-۱۶) خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

وَرِثْتُ عِلْمًا مِنْ فُلَانٍ کے معنیٰ کسی سے علم حاصل کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے :-

وَرِثُوا الْكِتٰبَ (۷-۱۶۹) جو کتاب کے وارث بنے۔

---

[۱] الحديث باختلاف الفاظه في السنن الكبرى للنسائي واصله متفق عليه بطرق من حديث مالك… والنظر لتخريجه كنز العمال (۱۱، رقم ۹۰-۹۲) واللآلئ المصنوعة ج ۲ ص ۲۴۴ [۲] رواه ابوداؤد والترمذي وابن ماجة وزاد ابن حبان رقم ۸۰ وفيه ان العلماء من حديث ابي الدرداء (حديث ۵۱) وله طرق عند الطبراني وفي الباب عن البراء بن عمرو بن العاص وراجع تخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم ۱۷۰ ص ۱۲۴ [۳] وفي رواية انت طريقي وعن ابن بريدة عن ابيه مرفوعا ان وصيي ووارثي علي بن ابي طالب اللآلئ المصنوعة ج ۱ ص ۳۵۹ وفي الخصائص من سنن الكبرى للنسائي حديث طويل في اخوة علي قال العراقي في تخريج الاحياء ج ۲ ص ۱۹۰ وكل ما روى في اخوته فضعيف لا يصح منه شيء [۴] قطعة من حديث سابق ولم اجده بهذا اللفظ ۱۲

اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ (۴۲-۱۴) (اور جو لوگ) ان کے بعد خدا کی کتاب کے وارث ہوئے۔
ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ (۳۵-۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا۔ ......
یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱-۱۰۵) میرے نیکوکار بندے ملک کے وارث ہوں گے۔
اور وراثت حقیقی تو یہ ہوتی ہے کہ انسان کو ایسی چیز حاصل ہو جائے جس کے متعلق اس پر نہ کوئی محاسبہ ہو اور نہ کسی قسم کی ذمہ داری عائد ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے چونکہ دنیا سے بوقت ضرورت قدر کفایت سے زیادہ نہیں لیتے اور پھر اسے جائز طریقہ سے حاصل کرتے ہیں تو جو شخص دنیا کو ان شرائط کے ماتحت حاصل کرے گا اس پر کسی قسم کا محاسبہ یا عقاب نہیں ہوگا بلکہ وہ مال اس کے لئے عفو و صفو ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے۔
(۱۴۲) مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهٗ فِی الدُّنْیَا لَمْ یُحَاسِبْهُ اللّٰهُ فِی الْاٰخِرَةِ کہ جو شخص دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرلے گا۔ آخرت میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس پر کسی قسم کا محاسبہ نہیں ہوگا۔

(و ر د)

اَلْوُرُوْدُ۔ یہ اصل میں وَرَدْتُ الْمَاءَ (ض) کا مصدر ہے جس کے معنی پانی کا قصد کرنے کے ہے۔ پھر ہر جگہ کا قصد کرنے پر بولا جاتا ہے اور پانی پر پہنچنے والے کو وَارِدٌ اور پانی کو مَوْرُوْدٌ کہا جاتا ہے اور اَوْرَدَ الْاِبِلَ (افعال) عَلَی الْمَاءِ کے معنی اونٹوں کو پانی پر وارد کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْیَنَ (۲۸-۲۳) اور جب مدین کے پانی کے مقام پر پہنچے۔
اَلْوِرْدُ۔ اس پانی کو کہتے ہیں جو وارد ہونے کے لئے تیار کیا گیا ہو۔ اور یہ صَدْرٌ (لوٹنا) کی ضد بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور بخار کی باری کے دن کو بھی وِرْدٌ کہتے ہیں۔
اور تقطیع کے طور پر دوزخ کی آگ میں داخل ہونے پر بھی وَرَدَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۱۱-۹۸) اور ان کو دوزخ میں جا اتارے گا اور جس مقام پر وہ اتارے جائیں گے وہ برا ہے۔
اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا (۱۹-۸۶) دوزخ کی طرف پیاسے.....
اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ (۲۱-۹۸) تم (سب) اس میں داخل ہو کر رہو گے۔
مَّا وَرَدُوْهَا (۲۱-۹۹) تو اس میں داخل نہ ہوتے۔
اَلْوَارِدُ (ایضًا) اس شخص کو بھی کہا گیا ہے جو قافلے کے آگے جا کر پانی لاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ (۱۲-۱۹) اور انہوں نے (پانی کے لئے) اپنا سقا بھیجا۔
ہر وہ شخص جو پانی پر پہنچ جائے اسے بھی وَارِدٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:۔
وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (۱۹-۷۱) اور تم میں سے کوئی (شخص) نہیں مگر اسے اس پر سے گزرنا ہوگا۔
میں بعض نے وَارِدُهَا کو وَرَدْتُ مَاءَ کَذَا۔ کے محاورہ سے لیا ہے جس کے معنی پانی پر حاضر

ہونے کے ہیں اور اس میں اترنا شرط نہیں ہے[1] اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں اترنا بھی شرط ہے اور اولیاء الشہداء اور صالحین بھی ایک مرتبہ دوزخ کی آگ میں داخل ہوں گے لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کی حالت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سی ہوگی کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا۔ تو ان پر آگ کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (۲۱-۶۹) ہم نے حکم دیا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم پر موجب سلامتی بن جا)۔

اور اس مسئلہ پر بحث کے لئے ذرا تفصیل درکار ہے۔ جو یہاں پر ہمارا مقصد نہیں ہے۔

اور جس شخص کو باری کا بخار چڑھا ہوا ہو اسے بھی مَوْرُوْدٌ کہا جاتا ہے اور شَعْرٌ وَارِدٌ لمبے بالوں کو کہتے ہیں۔ جو عورت کی کمر یا اس کے سرینوں تک دراز ہوں۔

اَلْوَرِيْدُ۔ رگ جس کا تعلق جگر اور دل کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ خون اور روح کا مجری بنتی ہے۔ قرآن میں ہے :۔

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۰-۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔

یعنی اس کی روح سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اَلْوَرْدُ۔ اصل میں گل سرخ کو کہتے ہیں۔ اور یہ وَادِدٌ۔ سے ہے جس کے معنی قافلے سے پہلے پانی پر آنے والا کے ہیں۔ مشہور ہے کہ گلاب کا پھول تمام پھولوں سے پہلے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے اسے وَرْدٌ کہا جاتا ہے۔ پھر ہر درخت کے پھول کو مجازاً وَرْدٌ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ درخت کے پھولدار ہونے پر وَرَدَ الشَّجَرُ بولا جاتا ہے۔

پھر گھوڑے کے رنگ کو بھی گل سرخ کے ساتھ تشبیہ دے کر فَرَسٌ وَرْدٌ کہا جاتا ہے۔ اور آثار قیامت کے طور پر جب آسمان سرخ ہوجائیگا تو اسے بھی قرآن نے وَرْدَةً کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۵۵-۳۷) تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا (تو وہ کیسا ہولناک دن ہوگا۔

(و ر ق)

اَلْوَرَقُ۔ درخت کے پتے اس کی جمع اَوْرَاقٌ اور واحد وَرَقَةٌ آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا (۶-۵۹) اور کوئی پتہ نہیں جھڑتا مگر وہ اس کو جانتا ہے۔

اور وَرِقَتِ الشَّجَرَةُ کے معنی درخت کا پتے دار ہونا کے ہیں اور سرسبز خوبصورت پتے دار درخت کو وَارِقَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَامٌ أَوْرَقُ کے معنی قحط سالی کے ہیں۔ اور اَوْرَقَ فُلَانٌ کے

---

[1] قال فی روح المعانی واردہا ای داخلہا کما ذہب الی ذالک جمع کثیر من سلف المفسرین واہل السنۃ وفی معناہ روایۃ جابر بن عبداللہ مرفوعاً اخرجہ احمد والحکیم الترمذی وابن المنذر والحاکم وصححہ جماعۃ من ابی امیہ وقد ذکر الامام الرازی لہذا الدخول عدۃ فوائد فلیراجع وعند الحسن وقتادۃ المرور کما روی ذالک عن عبداللہ بن مسعود کذا فی الروح ۱۶/۱۱۱ [2] ھو قول عبداللہ بن مسعود فی روایۃ ابن ابی حاتم عنہ واخرجہ عبد بن حمید عن ولید بن نمیر ایضاً ویدل علیہ قولہ تعالیٰ "ولما ورد ماء مدین" راجع الروح وابن کثیر ۱۲

معنی ناکام ہونے کے ہیں گویا وہ پتے دار درخت ہے جو بدون ثمر کے ہے اور اس کے بالمقابل آیت:۔ وَکَانَ لَهٗ ثَمَرٌ (۱۸-۳۴) اور اس کو پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔

میں مال کو ثمر کہا ہے جیسا کہ ابن عباس سے مروی ہے[1] اور رنگ کی تروتازگی کے لحاظ سے خاکستری رنگ کے اونٹ کو بَعِیْرٌ اَوْرَقُ کہا جاتا ہے اسی طرح حَمَامَةٌ وَرْقَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنی خاکی رنگ کی کبوتری یا فاختہ کے ہیں۔

اَوْرَقَ (ایضًا) مال دار ہونا۔ گویا کثرت کے لحاظ سے مال کو درخت کے پتوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ مال کو ثَرٰی تُرَابٌ یا سَیْلٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس معنی میں کہا جاتا ہے:۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔ لَہٗ مَالٌ کَالتُّرَابِ اَوِ السَّیْلِ اَوِ الثَّرٰی یعنی وہ بہت زیادہ مالدار ہے۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الرجز)

(۴۴) وَاغْفِرْ خَطَایَایَ وَثَمِّرْ وَرِقِیْ

میری خطائیں معاف فرما اور میرا مال بڑھا دے۔

اور اَلْوَرِقُ (بکسر الراء) خصوصیت کے ساتھ دراہم کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ فَابْعَثُوْا اَحَدَکُمْ بِوَرِقِکُمْ هٰذِهٖ (۱۸-۱۹) تو اپنے میں سے کسی کو یہ سکہ دے کر شہر بھیجو۔

ایک قراءت میں بِوَرْقِکُمْ وبِوُرْقِکُمْ ہے اور یہ وَرْقٌ وَوَرِقٌ دونوں طرح بولا جاتا ہے جیسے کَبْدٌ وَکَبِدٌ۔

(و ر ی)

وَارَیْتُ کَذَا۔ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ (۷-۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔

تَوَارٰی (لازم) چھپ جانا۔ قرآن میں ہے:۔ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (۳۸-۳۲) یہاں تک کہ (آفتاب) پردے میں چھپ گیا۔

وَرَّی الْخَبَرَ کے معنی توریہ کرنے کے ہیں یعنی اصل بات کو چھپا کر اسے کسی اور طریقہ سے ظاہر کرنا..... (اس طور پر کہ جھوٹ بھی نہ ہو۔ اور اصل مقصد بھی ظاہر نہ ہونے پائے) چنانچہ حدیث میں ہے[3] (۱۴۳) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اراد غزوًا وری بغیرہ کہ آنحضرت جب کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تو توریہ سے کام لیتے۔

اَلْوَرٰی بقول خلیل مخلوقات کو کہتے ہیں جو ایک وقت میں زمین پر موجود ہو۔ اس میں ماضی اور مستقبل کی نسل شامل نہیں ہوتی اور ان کو اَلْوَرٰی اس لئے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ اپنے اشخاص سے زمین کو چھپائے ہوئے ہیں۔

اَلْوَرَاءُ کے معنی خلف یعنی پچھلی جانب کے ہیں مثلاً جو زید کے پیچھے یا بعد میں آئے اس کے متعلق وَرَاءَ زَیْدٍ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

---

[1] فی مترفی رث م د)۱۷ [2] قالہ العجاج وقبلہ: ایاک ادعو فتقبل ملقی۔ والشطر فی اللسان (ورق)۔ ملق اد مجالس ثعلب ۷ وتہذیب الاصلاح (۱ ؍ ۵۰ ۱۷) ابن خالویہ ۲۵ والصاحبی ۱۸۷ واضداد ابی الطیب ۲۶۲ والارجوزۃ فی دیوانہ ۴۳-۲۵۔
[3] رواہ البخاری ۴ ؍ ۴۱ وایضًا فی مواضع ۱۲

مِن وَّرَآءِ اِسْحَاقَ يَعْقُوْبَ (11-71) اور اسحاق کے بعد یعقوب (کی) خوش خبری دی۔

اِرْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (57-13) پیچھے کو لوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو۔

فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ (4-102) تو وہ پرے ہو جائیں۔

اور کبھی معنی قُدَّامٌ (سامنے کی طرف) بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا (18-79) اور ان کے سامنے (کی طرف) ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ اور آیت:۔

اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ (59-14) یا دیواروں کی اوٹ میں۔

میں دیوار کی دونوں جانب مراد ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ جو شخص کسی ایک جانب میں ہوگا تو دوسری جانب اس کے لئے وَرَاءَ ہی ہوگی۔ اور آیت:۔

وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ (6-95) اور جو (مال و متاع) ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔

میں مرنے کے بعد پیچھے چھوڑ آنا مراد ہے۔ اور اس میں ان کے لئے سرزنش ہے کہ تم نے مال خرچ کر کے ثواب آخرت کیوں نہ حاصل کیا۔

اور آیت:۔

فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (3-187) تو انہوں نے اس کو پس پشت پھینک دیا۔

بھی تبکیت (ملامت) پر محمول ہے کہ انہوں نے نہ تو کتاب اللہ پر عمل ہی کیا اور نہ کبھی اس کی آیات میں غور کیا۔ اور آیت:۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (23-7) اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں۔

میں وَرَآءَ ذٰلِكَ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ان بیان کردہ حلائل کے علاوہ دیگر کا خواہش مند ہوگا یا ذوات المحارم سے تعرض کریگا تو اس نے حدود شریعت سے تجاوز کیا اور اس کی حرمت کے پردہ کو چاک کر ڈالا۔ اور آیت:۔

وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (2-91) (یعنی) یہ اس کے سوا اور (کتاب) کو نہیں مانتے۔

میں وَرَآءَهٗ سے دوسری آسمانی کتابیں مراد ہیں۔

اور وَرِيَ الزَّنْدُ يَرِيْ وَرْيًا کے معنی چقماق کے پیچھے سے آگ نکالنے کے ہیں تو گویا اس میں آگ کے پوشیدہ ہونے کے معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (الرمل)

(448) كَكُمُوْنِ النَّارِ فِيْ حَجَرِهٖ

جیسے پتھر کے اندر آگ پوشیدہ ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ (56-71) بھلا دیکھو تو جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔

---

[1] قالہ ابو نواس (الحسن بن ہانی) وصدرہ: یکمن الشنآن فیہ لنا . . . . . . والبیت فی طرائف الشعراء ۳۰ ومجموعۃ المعانی ۱۶۷ والعقد (۱: ۲۵۲) وفی الموشح للمرزبانی ۲۷۳، ۲۷۴ - اخذ علی بن المبارک علی ابی نواس فی شعرہ فی حرفین احدہما ہذا البیت وقال انما کان ینبغی لہ ان یقول فی حجرہ بدل فی حجرہ والثانی فی قولہ: اسرع من قول قطاۃ قطا۔ وکان ینبغی لہ ان یقول قطا بالتخفیف انظر الحیوان للجاحظ (۲: ۳۲۳)

اور کامیاب شخص کے متعلق کہا جاتا ہے:۔
فُلَانٌ وَارِی الزَّنْدِ - فلاں کا پتھر آگ دینے والا ہے یعنی وہ کامیاب ہے اور اس کے بالمقابل کَابِی الزَّنْدِ کے معنی ناکام کے ہیں۔ اور چربی دار گوشت کو اَللَّحْمُ الْوَارِیُ کہا جاتا ہے۔
اَلْوَرَآءُ (ایضًا) اولاد کی اولاد یعنی پوتے یا نواسے کو کہا جاتا ہے اور وَرَاءَكَ کسی کام پر ابھارنے کے لئے بولا جاتا ہے یعنی پیچھے ہٹ جاؤ۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
وَرَاءَكَ اَوْسَعُ لَكَ۔ اس میں وَرَاءَكَ منصوب بفعل مضمر ہے یعنی اِئْتِ وَرَاءَكَ۔
اور بعض نے اس کا اصل يَكُنْ اَوْسَعَ لَكَ بیان کیا ہے اَیْ تَنَحَّ وَائْتِ مَكَانًا اَوْسَعَ لَكَ۔
اَلتَّوْرَاةُ اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ فَوْعَلَةٌ کے وزن پر ہے اور اس میں تا واؤ سے مبدل ہے جیسے تَيْقُورٌ وَقَارٌ سے بنا ہے اصل میں وَيْقُورٌ ہے اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے اور انہوں نے اسے تَفْعَلَةٌ کے وزن پر نہیں بنایا کیونکہ یہ وزن کلام عرب میں قلیل الوجود ہے۔

(و ز ر)

اَلْوَزَرُ پہاڑ میں جائے پناہ۔ قرآن میں ہے۔
كَلَّا لَا وَزَرَ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمُسْتَقَرُّ (۷۵-۱۱) بے شک کہیں پناہ نہیں اس روز پروردگار ہی کے پاس جانا ہے۔
اَلْوِزْرُ کے معنی بارگراں کے ہیں اور یہ معنی وَزَرٌ سے لیا گیا ہے جس کے معنی پہاڑ میں جائے پناہ کے ہیں اور جس طرح مجازًا اس کے معنی بوجھ کے آتے ہیں اسی طرح وِزْرٌ بمعنی گناہ بھی آتا ہے (اسی کی جمع اَوْزَارٌ ہے) جیسے فرمایا:۔
لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (۱۶-۲۵) (اے پیغمبر ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی (اٹھائیں گے)۔
جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ۔ (۲۹-۱۳) اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی۔
اور دوسروں کا بوجھ اٹھانے کی حقیقت کی طرف آنحضرت ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا[1] (۱۴۴)
مَنْ سَنَّ سنة حسنة كان له اجرها واجر من عمل بها من غير ان ينقص من اجره شيءٌ ومن سن سنة سيئة كان له وزرها ووزر من عمل بها کہ جس شخص نے اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کا بھی اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے بدوں اس کے کہ ان کے اجر میں کسی قسم کی کمی ہو اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور ان لوگوں کا بھی جو اس پر عمل کریں گے۔
تو یہاں ان لوگوں کے اجر یا بوجھ سے ان کی مثل اجر یا بوجھ مراد ہے اور آیت کریمہ میں بھی یہی

---

[1] الحديث ذكره مسلم في صحيحه من حديث جرير بن عبدالله والغزالي في الاحياء (راجع تخريج العراقي ۲/۳۰۷) واشار اليه القتبي في غريبه، انظر القرطبي ۱۳/۳۳۱ والبحر ۷/۱۴۴ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

معنی مراد ہیں۔ اور آیت :۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۶-۱۶۵)

اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائیگا۔ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ مَحْمُوْل عَنْہُ یعنی وہ دوسرا اس گناہ سے بری ہو جائے (لہذا ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے) اور آیت :۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (۹۴-۲) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا۔

میں وِزْرٌ سے مراد وہ لغزشیں ہیں جو جاہلی معاشرہ کے رواج کے مطابق قبل از نبوت آنحضرت سے سرزد ہوئی تھیں۔

اَلْوَزِیْرُ وہ ہے جو امیر کا بوجھ اور اس کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہو۔ اور اس کے اس عہدہ کو وِزَارَۃٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ (۲۰-۲۹) اور میرے گھر والوں میں سے (ایک کو) میرا وزیر (یعنی مددگار) مقرر فرما۔

اَوْزَارُ الْحَرْبِ۔ اس کا مفرد وِزْرٌ ہے اور اس سے مراد اسلحہ جنگ ہے[1]۔ اور آیت کریمہ :۔

وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَا اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ (۲۰-۸۷) بلکہ ہم لوگوں کے زیوروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ میں زیورات کے بوجھ مراد ہیں۔

اَلْمُوَازَرَۃُ (مفاعلۃ) کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنے کے ہیں اور وَازَرْتُ فُلَانًا مُوَازَرَۃً کے معنی ہیں میں نے اس کی مدد کی۔

(و ز ع)

وَزَعْتُہٗ عَنْ كَذَا کے معنی کسی آدمی کو کسی کام سے روک دینا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُہٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فَھُمْ یُوْزَعُوْنَ (۲۷-۱۷) اور سلیمان کے لئے جنوں اور انسانوں کے لشکر جمع کئے گئے اور وہ قسم وار کئے گئے تھے۔

تو یُوْزَعُوْنَ۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عساکر باوجود کثیر التعداد اور متفاوت ہونے کے غیر مرتب اور منتشر نہیں تھے جیسا کہ عام طور پر کثیر التعداد افواج کا حال ہوتا ہے بلکہ وہ نظم وضبط میں تھے کہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے تھے اور بعض نے یُوْزَعُوْنَ کے یہ معنی کئے ہیں کہ لشکر کا اگلا حصہ پچھلے کی خاطر رکا رہتا تھا۔ اور آیت :۔

یَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰہِ اِلَی النَّارِ فَھُمْ یُوْزَعُوْنَ ...... (۴۱-۱۹) جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے تو ترتیب وار کر لئے جائیں گے۔

میں یُوْزَعُوْنَ سے انہیں عقوبت کے طور پر روک لینا مراد ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا :۔

وَلَھُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ (۲۲-۲۱) اور ان کے مارنے ٹھوکنے کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہونگے۔

محاورہ ہے[2] (۴۴) لَا بُدَّ لِلسُّلْطَانِ مِنْ وَزَعَۃٍ کہ سلطان کے لئے محافظ دستہ یا

---

[1] وفی القرآن: حتی تضع الحرب اوزارھا (۴۷-۴) [2] قالہ الحسن البصری لما ولی القضاء وازدحم الناس علیہ فاذوہ انظر المیدانی رقم ۴۰۱۲ واللسان (وزع) والنھایۃ ۴/۱۲۲ والفائق (۲/۳۰۵) (۳/۲۰) وفی حدیث ابی بکر و قد شکی الیہ بعض عمالہ لیقتص منہ فقال: اَنا اُقید من وزعۃ اللہ، الفائق ۴/۳۸ و غریب ابی عبید ۳/۲۲۸

کارندوں کا ہونا ضروری ہے۔ جو لوگوں کو بے قانون ہونے سے روکیں۔

بعض نے کہا ہے کہ وَزَعَ کے معنی کسی چیز پر فریفتہ ہونے کے ہیں اور محاورہ ہے:۔

اَوْزَعَ اللّٰہُ فُلَانًا اللہ تعالیٰ نے فلاں کو شکر گزاری کا الہام کیا۔ بعض نے کہا کہ یہ بھی اُوْزِعَ بِالشَّیْءِ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کا شیدائی بننے کے ہیں تو اَوْزَعَ اللّٰہُ فُلَانًا سے مراد یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی شکر گزاری کا شیدائی بنا دیا اور رَجُلٌ وَزُوْعٌ کے معنی کسی چیز پر فریفتہ ہونے والا کے ہیں۔ اس بنا پر آیت کریمہ:۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ (۲۷-۱۹) اے پروردگار مجھے توفیق عنایت کر کہ جو احسان تو نے مجھ پر کئے ہیں ان کا شکر کروں۔

میں بعض نے اَوْزِعْنِیْ کے معنی اَلْھِمْنِیْ کئے ہیں یعنی مجھے شکر گزاری کا الہام کر مگر اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ مجھے شکر گزاری کا اس قدر شیفتہ بنا کہ میں اپنے نفس کو تیری ناشکری سے روک لوں۔

(و ز ن)

اَلْوَزْنُ (تولنا) کے معنی کسی چیز کی مقدار معلوم کرنے کے ہیں اور یہ وَزَنْتُہٗ (ض) وَزْنًا وَزِنَۃً کا مصدر ہے اور عرف عام میں وزن اس مقدار خاص کو کہتے ہیں جو ترازو یا قبان کے ذریعہ معین کی جاتی ہے اور آیت کریمہ:۔

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ (۱۷-۳۵) ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو۔ اور نیز آیت کریمہ:۔

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ (۵۵-۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو۔ میں اس بات کا حکم دیا ہے کہ اپنے تمام اقوال و افعال میں عدل و انصاف کو مد نظر رکھو۔ اور آیت:۔

وَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ (۱۵-۱۹) اور اس میں ہر ایک سنجیدہ چیز اُگائی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ شئی موزون سے سونا چاندی وغیرہ معدنیات مراد ہیں۔ اور بعض نے ہر قسم کی موجودات مراد لی ہیں اور آیت کے معنی یہ کئے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو اعتدال اور تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے جس طرح کہ آیت:۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (۵۴-۴۹) ہم نے ہر چیز اندازہ مقررہ کے ساتھ پیدا کی ہے۔ سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور آیت:۔

وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ (۷-۸) اور اس روز (اعمال کا) تلنا برحق ہے۔ میں بتایا ہے۔ کہ قیامت کے دن نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حساب لیا جائیگا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (۲۱-۴۷) اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے۔

قرآن میں (قیامت کے روز اعمال کی ترازو کے لئے) بعض مقامات پر میزان لفظ واحد آیا ہے۔ اور بعض جگہوں پر موازین لفظ جمع پس جہاں کہیں لفظ واحد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہاں محاسب (حساب لینے والا) کا اعتبار کیا ہے۔ کہ وہ اکیلی ذات الہٰی ہے اور جہاں لفظ جمع آیا ہے وہاں لوگوں کا اعتبار کیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک کے اعمال کی ترازو الگ الگ ہوگی۔

وَزَنْتُ لِفُلَانٍ وَوَزَنْتُہٗ کے معنی کسی کو تول

کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْوَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ (۸۳۔۳) اور جب ان کوناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں ۔

محاورہ ہے :۔

قَامَ مِیْزَانُ النَّھَارِ یعنی دوپہر ہوگئی ۔

(و س و س)

اَلْوَسْوَسَۃُ ۔ اس برے خیال کو کہتے ہیں، جو دل میں پیدا ہوتا ہے اور اصل میں یہ وَسْوَاسٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی زیور کی جھنکار یا ہلکی سی آہٹ کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

فَوَسْوَسَ اِلَیْہِ الشَّیْطَانُ (۲۰۔۱۲۰) تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا ۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴۔۵) شیطان وسوسہ انداز کی برائی سے جو خدا کا نام سنکر پیچھے ہٹ جاتا ہے ۔

اور وَسْوَاسٌ کے معنی شکاری کے پاؤں کی آہٹ کے بھی آتے ہیں ۔

(و س ط)

وَسَطُ الشَّیْئِ ۔ ہر چیز کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں۔ جہاں سے اس کے دونوں اطراف کا فاصلہ مساوی ہو۔ اور اس کا استعمال کمیتہ متصلہ یعنی ایک جسم پر ہوتا ہے جیسے وَسَطُہٗ صُلْبٌ (اس کا درمیان سخت ہے)

ضَرَبْتُہٗ وَسَطَ رَأْسِہٖ لیکن وَسْطٌ (بالسکون) کمیت منفصلہ پر بولا جاتا ہے یعنی دو چیزوں کے درمیان فاصل کو وَسْطٌ کہا جاتا ہے۔ جیسے

وَسْطُ الْقَوْمِ کَذَا کہ وہ لوگوں کے درمیان فاصل ہے۔

نیز اَلْوَسَطُ (بفتح السین) اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو دو مذموم اطراف کے درمیان واقع ہو یعنی معتدل جو افراط و تفریط کے بالکل درمیان ہوتا ہے۔ مثلاً جُوْدٌ کہ بخل اور اسراف کے درمیانی درجہ کا نام ہے اور معنی اعتدال کی مناسبت سے یہ لفظ عَدْلٌ، نَصَفَۃٌ سَوَاءٌ کی طرح ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لئے بولا جاتا ہے مثلاً جو شخص اپنی قوم میں بلحاظ حسب سب سے بہتر اور اونچے درجہ کا ہو اس کے متعلق ھٰذَا اَوْسَطُھُمْ حَسَبًا کہا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں امت مسلمہ کے متعلق فرمایا ۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا ۔ (۲۔۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا۔

اسی طرح آیت :۔

قَالَ اَوْسَطُھُمْ (۶۸۔۲۸) ایک جوان جو ان میں فرزانہ تھا بولا ۔

میں بھی اوسط کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے۔ اور کبھی وَسَطٌ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو نہ زیادہ اچھی ہو اور نہ بری بلکہ درمیانے درجہ کی ہو۔ اور کبھی (کنایۃً) رذیل چیز پر بھی بولا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ وَسَطٌ مِّنَ الرِّجَالِ کہ فلاں کم درجے کا آدمی ہے یعنی درجۂ خیر سے گرا ہوا ہے اور آیت کریمہ :۔

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی (۲۔۲۳۸) مسلمانو! سب نمازیں خصوصًا بیچ کی نماز (یعنی عصر) پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو ۔

میں بعض نے کہا ہے کہ وسطی سے مراد صلوۃ ظہر ہے

کیونکہ وہ دن کے درمیانی حصہ میں ادا کی جاتی ہے اور بعض اس سے صلوٰۃ مغرب مراد لیتے ہیں کیونکہ وہ تعداد رکعات کے لحاظ سے ثنائی اور رباعی نمازوں کے درمیان میں ہے اور بعض نے صلوٰۃ فجر مراد لی ہے کیونکہ وہ دن اور رات کی نمازوں کے درمیان میں ہے جیسا کہ دوسری آیت فرمایا:۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (۱۷-۷۸) (اے محمدؐ) سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب عشا کی) نمازیں اور صبح کو قرآن پڑھا کرو۔

اور صلوٰۃ وسطیٰ کو خاص کر الگ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ صبح کا وقت سستی اور غفلت کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اٹھنے کے لئے نیند کی لذت کو چھوڑنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ صبح کی اذان میں اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کیا گیا ہے[۱] (۱۴۵)

اور جو لوگ اس سے صلوٰۃ عصر مراد لیتے ہیں[۲] جیسا کہ آنحضرت سے ایک حدیث میں بھی مروی ہے تو وہ اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عصر کا وقت عوام کے کاروبار کا وقت ہوتا ہے اس لئے اس نماز میں سستی ہو جاتی ہے بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان کے اول یا آخر میں فرصت کا وقت مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ نے زجراً فرمایا[۳]:

مَنْ فَاتَتْهُ صَلٰوةُ الْعَصْرِ فَكَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلُهُ وَمَالُهُ۔ کہ جس نے عصر کی نماز ضائع کر دی گویا اس نے اپنے اہل وعیال اور مال کو برباد کر دیا۔

(و س ع)

اَلسَّعَةُ۔ کے معنی کشادگی کے ہیں اور یہ امکنہ، حالت اور فعل جیسے قدرت، جود وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ وسعت مکانی کے متعلق فرمایا:۔

إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ (۲۹-۵۶) میری زمین فراخ ہے۔

أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً (۴-۹۷) کیا خدا کا ملک فراخ نہیں تھا۔

اور وسعت حالت کے متعلق فرمایا:۔

لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ (۶۵-۷) صاحب وسعت کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیئے۔

عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ (۲-۲۳۶) (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق . . . .

اَلْوُسْعُ اس طاقت کو کہتے ہیں جو اس کام سے زائد یا وہ ہو جو اس کے ذمہ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲-۲۸۶) خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف

---

[۱] انظر کنز العمال ۷ ر ۹۴ (ابوالشیخ فی کتاب الاذان عن ابی محذورۃ) و عن بلال ✧ [۲] کما ہو مروی عن الحسن و علی و ابن عباس و ابن مسعود و خلق کثیر الحدیث الذی اشار الیہ المؤلف فی ذالک فقد رواہ مسلم من حدیث علیؓ فی قصۃ یوم الاحزاب — شغلونا عن الصلوٰۃ الوسطیٰ صلوٰۃ العصر ملا اللّٰہ بیوتہم نارا۔ و حدیث مصحف عائشۃ و حفصۃ مشہور فی ہذہ المسئلۃ رواہ مالک و ابوداؤد (روح المعانی ص ۱۳۵ ج ۲) [۳] متفق علیہ من حدیث ابن عمر انظر التکافی لابن حجر ۱۸۸ و ۱۵۱ رقم ۵۰۴ و کنز العمال ۷ ر ۲۷۱-۲۷۳ ✧

نہیں دیتا۔
میں تنبیہ فرمائی ہے کہ خدا بندے کے ذمہ اتنا ہی کام لگاتا ہے جو اس کی طاقت سے ذرا کم ہوتا ہے۔ اور بعض نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن احکام کا انسان کو مکلف بناتا ہے۔ ان کا ثمرہ وسعت یعنی وہ جنت ہے جس کی پہنائی ارض وسما ہے۔ جیسا کہ اس کی تائید میں دوسری جگہ فرمایا:۔
یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ (۲-۱۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔
اور آیت:۔
وَسِعَ كُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا (۲۰-۹۸) اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔
میں اللہ تعالیٰ کے احاطہ علمی کا بیان ہے۔ جیسے دوسری جگہ اسی مفہوم کو:۔ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا (۶۵-۱۲) خدا اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ سے تعبیر فرمایا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ (۳-۷۳) اور خدا کشائش والا اور علم والا ہے۔
اور نیز آیت کریمہ:۔
وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا (۴-۱۳۰) اور خدا بڑی کشائش اور حکمت والا ہے۔
میں اللہ تعالیٰ کا بلحاظ علم وقدرت ورحمت وفضل کے وسیع ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ آیت:۔
وَسِعَ رَبِّىۡ كُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا (۶-۸۱) میرا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اور آیت کریمہ:۔
وَرَحۡمَتِىۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَیۡءٍ (۷-۱۵۶) اور جو میری رحمت ہے وہ ہر چیز کو شامل ہے۔
سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت:۔
وَاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ (۵۱-۴۷) اور ہم کو سب مقدور ہے۔
میں اللہ تعالیٰ کی اس وسعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت:۔
اَلَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰-۵۰) وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی اور پھر راہ دکھائی۔
میں بیان کیا جاتا ہے (یعنی خلق وہدایت کے فیضان سے وہ ہر چیز کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے)
وَسَعَ الشَّیۡءُ اِتَّسَعَ۔ کے معنی کسی چیز کے فراخ ہونا کے ہیں اور اَلۡوُسۡعُ کے معنی تونگری اور طاقت کے بھی آتے ہیں چنانچہ محاورہ مشہور ہے۔
هُوَ يُنۡفِقُ عَلٰى قَدۡرِ وُسۡعِهٖ کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔
اَوۡسَعَ فُلَانٌ وہ غنی اور صاحب وسعت ہوگیا
فَرَسٌ وَسَاعُ الۡخَطۡوِ وہ گھوڑا جو لمبی لمبی ڈگ بھرتا ہوا نہایت تیزی سے دوڑے۔[1]

(و س ق)

اَلۡوَسۡقُ۔ کے معنی متفرق چیزوں کو یکجا اکٹھا کرنے کے ہیں چنانچہ وَسَقۡتُ (ض) الشَّیۡءَ کے معنی ہیں میں نے اس شے کے متفرق اجزا کو اکٹھا کیا اور بوجھ کی معین مقدار۔ مثلاً ایک اونٹ کے بار کو بھی وَسۡقٌ کہا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے ایک وَسۡقٌ ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے

[1] کما فی آیۃ (۵۷-۲۱) [2] وفی المثل قد یبلغ القطوف (الوساع) (رق طف) [2] وھدا القطوف وتقدم فی (رق طف) النظر المیدانی رقم ۲۹۸۱

اسی سے اَوْسَقْتُ الْبَعِیْرَ (افعال) ہے جس کے معنی اونٹ پر بوجھ لادنے کے ہیں۔
نَاقَۃٌ وَاسِقٌ حاملہ اونٹنی اس کی جمع مَوَاسِیْقُ آتی ہے۔
وَسَقْتُ الْحِنْطَۃَ میں نے گیہوں کا ایک وسق بھرا وَسَقَتِ الْعَیْنُ الْمَآءَ آنکھ پانی سے بھر گئی۔ مشہور محاورہ ہے:۔
لَا اَفْعَلُہٗ مَا وَسَقَتْ عَیْنِیَ الْمَآءَ کہ جب تک میری آنکھ میں پانی ہے (یعنی زندگی بھر) یہ کام نہیں کروں گا۔ قرآن میں ہے:۔
وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ (۸۴-۱۷) اور رات کی اور جن چیزوں کو وہ اکھٹا کر لیتی ہے ان کی۔
بعض نے کہا ہے کہ مَا وَسَقَ سے مراد رات کی تاریکی ہے جبکہ پوری طرح چھا جائے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مَا وَسَقَ سے طارق (رات میں واقع ہونے والے حوادث) مراد ہیں۔
اَلْوَسِیْقَۃُ اونٹوں کے گلہ کو کہتے ہیں جیسے رُفْقَۃٌ کے معنی انسانوں کی جماعت کے ہیں۔
اَلْاِتِّسَاقُ کے معنی کسی چیز کے اجزاء کے مجتمع اور (پورے طور پر) اکٹھا ہوجانا کے ہیں چنانچہ فرمایا:۔
وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۸۴-۱۸) اور چاند کی جب وہ کامل ہوجائے۔

(و س ل)

اَلْوَسِیْلَۃُ کے معنی کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنے کے ہیں۔ چنانچہ معنی رغبت کو متضمن ہونے کی وجہ سے یہ وَصِیْلَۃٌ سے اخص ہے۔
وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ (۵-۳۵) اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرو۔
درحقیقت توسل الی اللہ، علم و عبادت اور مکارم شریعت کی بجا آوری سے طریق الٰہی کی محافظت کرنے کا نام ہے اور یہی معنی تقرب الی اللہ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والے کو وَاسِلٌ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے علاوہ تَوَسُّلٌ کے معنی چوری کرنا بھی آتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔
اَخَذَ فُلَانٌ اِبِلَ فُلَانٍ تَوَسُّلًا اس نے فلاں کے اونٹ چوری کر لئے۔

(و س م)

اَلْوَسْمُ (ض) کے معنی نشان اور داغ لگانے کے ہیں اور سِمَۃٌ علامت اور نشان کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
وَسَمْتُ الشَّیْءَ وَسْمًا میں نے اس پر نشان لگایا۔ قرآن میں ہے:۔
سَنَسِمُہٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ (۶۸-۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔
یعنی اس کی ناک پر ایسا نشان لگائیں گے جس سے اس کی پہچان ہوسکے گی۔ جیسا کہ مومنین کے متعلق فرمایا:۔
تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْھِھِمْ نَضْرَۃَ النَّعِیْمِ۔ (۸۳-۲۴) تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کرلوگے۔
سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔
تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمَاھُمْ (۲-۲۷۳) اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لوگے۔

اَلتَّوَسُّمُ۔ کے معنی آثار و قرائن سے کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرنا کے ہیں اور اسے علم ذکانت فراست اور فطانت بھی کہا جاتا ہے حدیث میں ہے[1] (۴۷)

اِتَّقُوْا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ

یعنی مومن کی فراست سے ڈرتے رہو وہ خدا تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے نور توفیق سے دیکھتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ (۱۵-۷۵)

بے شک اس (قصے) میں اہل فراست کے لئے نشانیاں ہیں۔

یعنی ان کے قصہ میں عبرت اور نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے بہت سے نشانات ہیں۔

اَلْوَسْمِيُّ۔ موسم بہار کی ابتدائی بارش کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس سے زمین پر گھاس کے نشانات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور تَوَسَّمْتُ جس کے معنی علامت سے پہچان لینے کے ہیں۔

در اصل یہ لفظ وسمی گھاس کے تلاش کر لینے پر بولا جاتا ہے۔

فُلَانٌ وَسِيْمُ الْوَجْهِ فلاں خوب رو ہے۔

هُوَ ذُوْ وَسَامَةٍ۔ وہ صاحب جمال ہے۔

فُلَانَةٌ ذَاتُ مِيْسَمٍ فلاں عورت صاحب حسن و جمال ہے۔

فُلَانٌ مَوْسُوْمٌ بِالْخَيْرِ اس کے چہرہ سے خیر ٹپکتی ہے۔

قَوْمٌ وِسَامٌ۔ خوبصورت لوگ۔

مَوْسِمُ الْحَاجِّ۔ حجاج کے جمع ہونے کا زمانہ اس کی جمع مَوَاسِمُ ہے اور وَسَّمُوْا کے معنی موسم حج میں حاضر ہونے کے ہیں۔

جیسا کہ عَرَّفُوْا وَحَصَّبُوْا وَعَيَّدُوْا کے معنی عرفہ، محصب اور عیدگاہ میں جمع ہونے کے ہیں اور جس جگہ پر حجاج کنکر پھینکتے ہیں اسے مُحَصَّبٌ کہا جاتا ہے۔

(و س ن)

اَلْوَسَنُ وَالسِّنَةُ کے معنی غفلت یا اونگھ کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲-۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

رَجُلٌ وَسْنَانٌ اونگھنے والا مرد۔

تَوَسَّنَ الْمَرْاَةَ۔ سوئی ہوئی عورت سے مجامعت کرنا۔

وَسِنَ وَاَسِنَ کے معنی کنویں کی بدبو سے بیہوش ہونے کے ہیں۔ مصنف کی رائے یہ ہے کہ یہ معنی نیند کی مناسبت سے لیا گیا ہے نہ کہ غشیان یعنی ڈھانپنے کے معنی سے۔

(و س ی)

مُوْسٰى۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

جو لوگ اسے عربی مانتے ہیں اس کے نزدیک یہ موسی الحدید سے منقول ہے جس کے معنی استرے ۔ ۔ ۔ ۔ کے ہیں اور اَوْسَيْتُ رَاْسَهٗ کے معنی ہیں میں نے استرے سے اس کا سر مونڈ ڈالا۔

---

[1] رواہ الترمذی والبخاری فی تاریخہ من حدیث ابی سعید راجع لطرقہ کنز العمال ۱۱/۸۵ واللالئ المصنوعۃ ۲۲۹-۲۳۰ وتخریج العراقی علی الاحیاء ۲/۳۹۴

(و ش ی)

وَشَيْتُ (ض) الشَّيْءَ وَشْيًا کے معنی کسی چیز میں اس کے تمام رنگ کے خلاف اور رنگ لگانا کے ہیں اسی سے وَشْيَةٌ بروزن فِعْلَةٌ ہے جس کے معنی کسی ایسے رنگ کا نشان یا داغ کے ہیں (جو سارے بدن کے رنگ کے خلاف ہو) قرآن میں ہے:۔

مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا (۲-۷۱) وہ بالکل صحیح سالم ہو اور اس پر کسی قسم کا داغ نہ ہو۔

اور ثَوْرٌ مُوَشًّى الْقَوَائِمِ اس بیل کو کہتے ہیں جس کی ٹانگوں پر اس کے سارے بدن کے رنگ کے خلاف نشانات ہوں۔ (یہ تو اس کے اصل معنی ہیں) اس کے بعد یہ لفظ کلام میں رنگ آمیزی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ مَوَّهَهُ وَزَخْرَفَهُ کی طرح کہا جاتا ہے وَشَّى فُلَانٌ كَلَامَهُ اس نے اپنی بات میں جھوٹ بول کر رنگ آمیزی کی اور اس میں تمویہ سے کام لیا اور اسی سے اَلْوَاشِي ہے جس کے معنی چغلخوری کے ہیں۔

(و ص ب)

اَلْوَصَبُ۔ کے معنی دائمی مرض کے ہیں اور وَصِبَ فُلَانٌ (س) فَهُوَ وَصِبٌ کے معنی دائمی مرض میں مبتلا ہونے کے ہیں۔

اَوْصَبَهُ كَذَا فَهُوَ يَتَوَصَّبُ اسے فلاں بیماری لگ گئی چنانچہ وہ بیمار پڑ گیا جیسے اَوْجَعَهُ فَهُوَ يَتَوَجَّعُ قرآن میں ہے:۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ (۳۷-۹) اور ان کے لئے عذاب دائمی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا (۱۶-۵۲) اور اسی کی عبادت لازم ہے۔

میں اس شخص کے لئے وعید ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے۔ کہ ایسے شخص کو دائمی عذاب کی سزا ملے گی۔ اور یہاں دین بمعنی طاعت ہے اور واصب بمعنی دائم اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو ہر حالت میں ہمیشہ اسی کی عبادت کرنی چاہیئے جیسا کہ فرشتوں کے متعلق فرمایا:۔

لَا يَعْصُونَ اللهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (۶۶-۶) جو ارشاد خدا ان کو فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں ملتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔

وَصَبَ وُصُوبًا۔ کسی چیز کا دائم اور ثابت رہنا وَصَبَ الدَّيْنُ۔ قرض کا واجب اور لازم ہو جانا مَفَازَةٌ وَاصِبَةٌ دور تک پھیلا ہوا بیابان جس کی انتہا نہ ہو۔

(و ص د)

اَلْوَصِيدُ۔ اصل میں اس احاطہ کو کہتے ہیں جو مویشی کے لئے پہاڑ میں بنالیا جائے اور آیت (۱۸-۱۸) میں اس کے معنی غار کا صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں اسی سے اَوْصَدْتُ الْبَابَ وَآصَدْتُهُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں میں نے دروازے کو بند کر دیا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُوْصَدَةٌ (۹۰-۲) یہ لوگ آگ میں بند کر دیئے جائیں گے۔

ایک قرارت مُؤْصَدَةٌ ہمزہ کے ساتھ ہے۔

اور آیت کے معنی ہیں اس آگ کو ان پر بند کر دیا جائے گا۔

اَلْوَصِيْنُ (ایضًا) پودا جس کی جڑیں زیادہ گہری نہ ہوں۔

(و ص ف)

اَلْوَصْفُ کے معنی کسی چیز کا حلیہ اور نعت بیان کرنے کے ہیں اور کسی چیز کی وہ حالت جو حلیہ اور نعت کے لحاظ سے ہوتی ہے اسے صِفَةٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ زِنَةٌ ہر چیز کی مقدار پر بولا جاتا ہے۔

اور وصف چونکہ غلط اور صحیح دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ (۱۶-۱۱۶) اور یونہی جھوٹ جو تمہاری زبان پر آئے مت کہہ دیا کرو۔ میں تنبیہ کی ہے کہ وہ (یہود) جو کچھ بیان کرتے ہیں سراسر جھوٹ ہے اسی طرح آیت۔ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۳۷-۱۸۰) یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں..... صاحب عزت ہے..... میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات سے متصف نہیں ہے جن کا کہ اکثر لوگ اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل اور ان باتوں سے جو کفار اس کی طرف منسوب کرتے ہیں بہت بلند اور دور ہے اسی لئے فرمایا:۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (۳۰-۲۷) اور اس کی شان نہایت بلند ہے۔

اِتَّصَفَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کہ بظاہر دیکھنے میں یہ چیز اس صفت کے ساتھ متصف ہو سکتی ہے۔ وَصَفَ الْبَعِيْرُ وُصُوْفًا اونٹ کا عمدہ رفتار ہونا۔

اَلْوَصِيْفُ۔ خادم اور خادمہ کو وَصِيْفَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے محاورہ ہے۔ وَصُفَتِ الْجَارِيَةُ کنیزک خدمت کے لائق ہو گئی۔

(و ص ل)

اَلْاِتِّصَالُ کے معنی اشیاء کے باہم اس طرح متحد ہو جانے کے ہیں جس طرح کہ قطرِ دائرہ کی دونوں طرفیں ملی ہوتی ہیں۔ اس کی ضد انفصال آتی ہے۔ اور وَصْلٌ کے معنی ملانے کے ہیں اور یہ اسم عین اور معنی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ وَصَلْتُ فُلَانًا صلہ رحمی کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ (۲-۲۷) اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اسی کو قطع کئے ڈالتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (۴-۹۰) مگر جو لوگ ایسے لوگوں سے تعلق رکھتے ہوں جن میں اور تم میں (صلح کا) عہد ہو۔ میں يَصِلُوْنَ کے معنی منتسب ہونے کے ہیں۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ مُتَّصِلٌ بِفُلَانٍ یعنی فلاں اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ (۲۸-۵۱) اور ہم پے در پے ان لوگوں کے پاس (ہدایت کی) باتیں بھیجتے رہے ہیں۔

میں وَصَّلْنَا الْقَوْلَ کے معنی متواتر بات کہنے کے

ہیں یعنی ہم ...... ان کے پاس لگاتار اپنا کلام بھیجتے رہے ہیں۔
مُوْصِلُ الْبَعِیْرِ۔ اونٹ کا مفصل جوڑ جو دو اعضا کے درمیان ہوتا ہے مثلاً ران اور عجز کے درمیان کا جوڑ اور آیت:۔
وَلَا وَصِیْلَۃٍ (۵-۱۰۳) اور نہ وصیلہ ہے۔
میں وصیلہ سے مراد وہ بکری ہے جو دو دو مادینہ بچے دینے کے بعد ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ بچہ دے۔
(جاہلیت میں) اس مادہ کی وجہ سے نر بچہ کو بھی ذبح نہ کرتے اور کہتے کہ وَصَلَتْ اَخَاھَا کہ یہ اپنے بھائی سے مل گئی۔
اور بعض نے کہا ہے کہ اَلْوَصِیْلَۃُ کے معنی آبادی اور زرخیزی کے ہیں اور وسیع زمین کو بھی اَلْوَصِیْلَۃُ کہا جاتا ہے۔
محاورہ ہے:۔ ھٰذَا وَصْلُ ھٰذَا۔
یعنی (یہ اس کی مثل ہے) یہ اس کا صلہ ہے۔

(و ص ی)

اَلْوَصِیَّۃُ واقعہ پیش آنے سے قبل کسی کو ناصحانہ انداز میں ہدایت کرنے کے ہیں اور یہ اَرْضٌ وَاصِیَۃٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیوستہ گیاہ یعنی باہم گتھی ہوئی گھاس والی زمین کے ہیں اور اَوْصَاہُ وَ وَصَّاہُ کے معنی کسی کو وصیت کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَوَصّٰی بِھَا اِبْرٰھِیْمُ بَنِیْہِ وَیَعْقُوْبُ (۲-۱۳۲)
اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اس بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی۔
ایک قرأت میں اَوْصٰی ہے۔
نیز فرمایا:۔
وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ (۲۹-۸) اور ہم نے انسان کو حکم دیا۔
مِنْ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصِیْ بِھَا اَوْدَیْنٍ (۴-۱۰) وصیت کی تعمیل کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض کے۔
حِیْنَ الْوَصِیَّۃِ اثْنَانِ (۵-۱۰۶) کہ وصیت کے وقت ...... تم دو مرد۔
وَصّٰی (ایضاً) کسی کی فضیلت بیان کرنا۔
تَوَاصَی الْقَوْمُ ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔
قرآن میں ہے:۔
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳-۳) اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔
اَتَوَاصَوْا بِہٖ بَلْ ھُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۱-۵۳) کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے آئے ہیں بلکہ یہ شریر لوگ ہیں۔

(و ض ع)

اَلْوَضْعُ (نیچے رکھ دینا) یہ حَطٌّ سے عام ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَاَکْوَابٌ مَّوْضُوْعَۃٌ (۸۸-۱۴) اور آبخورے (قرینے سے) رکھے ہوئے۔
اور اسی سے مَوْضِعٌ ہے جس کی جمع مَوَاضِعُ آتی

لہ ذکرہ ابوعبیدۃ فی مجازہ ۱/۲۷۳ و جری علیہ ابن قتیبۃ ۱۳۳ ولکن نقد علیہ النحاس فی الناسخ والمنسوخ ۱۰۵ والطبری فی تفسیرہ ۹/۲۷۲ راجع البحر ۱/۲۳۲ والقرطبی ۵/۳۰۸ سے وہی قراءۃ نافع وابن عامر من اہل المدینۃ والباقون۔ ۔ ۔ فی تفسیر ابی حیان ۱/۳۹۸) وقد ذکر ابوحیان فی ہذا الموضع ان مصحف اہل المدینۃ مخالف لمصحف اہل العراق فی اثنی عشر حرفا فراجعہ ۱۲

ہے جس کے معنی ہیں جگہیں یا موقعے جیسے فرمایا:۔
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (۵-۱۳) یہ لوگ کلمات (کتاب) کو ان کے مقامات سے بدل دیتے ہیں ۔
اور وَضْعٌ کا لفظ وضع حمل اور بوجھ اتارنے کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے وَضَعَتِ الْمَرْأَةُ الْحَمْلَ وَضْعًا عورت نے بچہ جنا۔ قرآن میں ہے۔
فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ (۳-۳۶) جب ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور جو کچھ ان کے ہاں پیدا ہوا تھا خدا کو خوب معلوم تھا تو کہنے لگیں کہ پروردگار میرے تو لڑکی ہی ہوئی ہے ۔
لیکن اَلْوُضْعُ وَالتُّضْعُ کے معنی عورت کے آخر طہر میں حاملہ ہونے کے ہیں ۔ وَضَعْتُ الْحِمْلَ ۔ میں نے بوجھ اتار دیا اور اتارے ہوئے بوجھ کو مَوْضُوْعٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت :۔
وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵-۱۰) اور اسی نے خلقت کے لئے زمین بچھائی ۔
میں وضع سے مراد خلق وایجاد (یعنی پیدا کرنا) ہے۔
اور وَضْعُ الْبَيْتِ کے معنی مکان بنانے کے آتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (۳-۹۵) پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کیلئے بنایا گیا تھا۔
اور آیت کریمہ :۔
وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ (۱۸-۴۹) اور عملوں کی کتاب کھول کر رکھی جائے گی ۔
میں وضع کتاب سے قیامت کے دن اعمال کے دفتر کھولنا اور ان کی جزا دینا مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (۱۷-۱۳) اور قیامت کے دن وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا ۔
وَضَعَتِ (ف) الدَّابَّةُ فِیْ سَیْرِهَا سواری تیز رفتاری سے چلی ۔ اور تیز رفتار سواری کو حَسَنَةُ الْمَوْضُوْعِ (و) حَسَنُ الْمَوَاضِعِ کہا جاتا ہے۔
اَوْضَعْتُهَا میں نے اسے دوڑایا ۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا۟اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ (۹-۴۷) اور تم میں (فساد ڈلوانے کی غرض) سے) دوڑے دوڑے پھرتے ۔
اور وَضْعٌ کا لفظ سَيْرٌ یعنی چلنے کے معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اَلْقٰی بَاعَهٗ وَثِقْلَهٗ میں قیام کرنے سے کنایہ ہوتا ہے ۔
اَلْوَضِيْعَةُ ۔ (رعایت) کمی جو اصل قیمت میں کی جائے ۔
وُضِعَ الرَّجُلُ فِیْ تِجَارَتِهٖ اس نے تجارت میں نقصان اٹھایا۔
رَجُلٌ وَضِيْعٌ ۔ نہایت خسیس آدمی (باب کرم) یہ رَفِيْعٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بلند قدر کے ہیں ۔

(و ض ن)

اَلْوَضْنُ ۔ اس کے اصل معنی زرہ بافی کے ہیں ۔ اور استعارۃً کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ بُننے پر بولا جاتا ہے ۔ چنانچہ قرآن میں ہے ۔
عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ (۵۶-۱۵) (جواہرات) سے مرصع پلنگوں پر ...
اور اسی سے وَضِيْنُ النَّاقَةِ ہے جس کے معنی حزام یعنی پالان کسنے کی رسی کے ہیں ۔ اس کی جمع وُضُنٌ ہے

(و ط ء)

وَطُؤَ الشَّیْءُ فَھُوَ وَطِیْءٌ کے معنی کسی چیز کے پامال ہونے کے ہیں۔
اَلْوِطَاءُ ہر اس شے کو کہتے ہیں جو پاؤں کے نیچے روندی جائے۔ جیسے فراش وغیرہ۔
وَطَأْتُ لَہٗ بِفِرَاشِہٖ کسی کے لئے فراش بچھانا۔
وَطَأْتُہٗ (ف) بِرِجْلِیْ وَطْأً وَوَطْأَۃً وَوَطَاءَۃً وَتَوَطَّأْتُہٗ کسی چیز کو پاؤں سے روندنا قرآن میں ہے:۔
اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْأً (۷۳-۶) کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بہیمی کو) سخت پامال کرتا ہے۔
ایک قرأت میں وِطَاءً ہے۔ اور حدیث میں ہے[۱] (۱۴۸)
اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَکَ عَلٰی مُضَرَ۔ اے اللہ مضر پر اپنی گرفت کو سخت کر یعنی انہیں ذلیل کر۔
وَطِئَ امْرَءَتَہٗ عورت سے ہمبستری کرنا۔
یہ لفظ اگرچہ اپنے اصل معنی کے لحاظ سے جماع کے معنی میں بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن عرف میں بمنزلہ لفظ صریح کے ہے۔
اَلْمُوَاطَاۃُ۔ اس کے معنی موافقت کے آتے ہیں۔ اور اصل معنی دوسرے کے نشان قدم پر اپنا قدم رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ آیت اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ کے آخر میں فرمایا۔ لِیُوَاطِئُوْا عِدَّۃَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ۔ (۹-۳۷) تاکہ ادب کے مہینوں کی جو خدا نے مقرر کئے ہیں گنتی پوری کر لیں۔

(و ط ر)

اَلْوَطَرُ کے معنی کسی چیز کی انتہائی خواہش اور اہم ضرورت کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَطَرًا۔ پھر جب زید نے اس سے (کوئی) حاجت (متعلق) نہ رکھی (یعنی اس کو طلاق دے دی۔ (۳۳-۳۷)

(و ع د)

اَلْوَعْدُ (وعدہ کرنا) کا لفظ خیر و شر (یعنی اچھے اور برے (وعدہ) دونوں پر بولا جاتا ہے اور اس معنی میں وَعَدَ یَعِدُ وَعْدًا وَمَوْعِدًا وَمِیْعَادًا استعمال ہوتا ہے مگر اَلْوَعِیْدُ کا لفظ خاص کر شر (یعنی دھمکی اور تہدید) کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں باب اَوْعَدَ (توعّد) استعمال ہوتا ہے۔ اور وَاعَدْتُہٗ (مفاعلۃ) وَتَوَاعَدْنَا (تفاعل) کے معنی باہم عہد و پیمان کرنا کے ہیں (قرآن کریم میں وَعْدٌ کا لفظ خیر و شر دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے (چنانچہ وعدۂ خیر کے متعلق فرمایا۔
اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمْ وَعْدَ الْحَقِّ ......
(۱۴-۲۲) جو وعدہ خدا نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا۔
اَفَمَنْ وَّعَدْنٰہُ وَعْدًا حَسَنًا (۲۸-۶۱) بھلا جس شخص سے ہم نے نیک وعدہ کیا۔
وَعَدَکُمُ اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِیْرَۃً (۴۸-۲۰) خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا۔
وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲۴-۵۵) جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ان سے خدا کا وعدہ ہے۔
الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں وَعْدًا کا لفظ خیر کے متعلق استعمال ہوا ہے اور وعدہ شر یعنی وعید کے معنی میں فرمایا۔

---

[۱] متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ فی قصۃ القنوت فی الصحیح و مسند احمد (۲/ ۴۰۲) بتحقیق احمد شاکر و ابن سعد فی طبقاتہ راجع تخریج الکشاف (۱۱۲۰/۱)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۲۲-۴۷) اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لئے جلدی کر رہے ہیں۔ اور خدا اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا۔

کفار چونکہ آنحضرت سے عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ کرتے تھے اس لئے لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ میں وَعْدٌ بمعنی وَعِيْدٌ ہوگا۔ نیز فرمایا:۔

قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲۲-۷۲) کہدو کہ میں تم کو اس سے بھی بری چیز بتاؤں وہ دوزخ کی آگ ہے جس کا خدا نے کافروں سے وعدہ کیا ہے۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ (۱۱-۸۱) ان کے عذاب کے وعدے کا وقت صبح ہے۔

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا (۷-۷) تو جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو اسے لے آؤ۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ (۱۰-۴۶) اگر ہم کوئی عذاب جس کا ان لوگوں سے وعدہ کرتے ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے (نازل) کریں۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ..... (۱۴-۴۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے۔ اس کے خلاف کرے گا۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ (۲-۲۶۸) (اور دیکھنا) شیطان (کا کہا نہ ماننا وہ) تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے۔

اور کبھی وَعَدَ کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی بیک وقت خیر و شر دونوں معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیات کریمہ:۔

اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۱۰-۵۵) اور یہ بھی سن رکھو کہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ (۶-۱۳۵) کچھ شک نہیں کہ جو وعدہ تم سے کیا جاتا ہے۔ وہ وقوع میں آنے والا ہے۔

میں قیامت کے روز جزائے اعمال کا وعدہ مراد ہے کہ اگر اعمال اچھے ہوں گے تو نتائج بھی خوشگوار ہوں گے اگر برے ہوں گے تو نتائج بھی تباہ کن ہوں گے۔

اَلْمَوْعِدُ وَالْمِيْعَادُ یہ دونوں لفظ کبھی مصدر اور کبھی اسم ظرف بن کر استعمال ہوتے ہیں۔ (اور اسم ظرف ہونے کی صورت میں ان سے وعدہ کا زمانہ یا مقدم وعدہ مراد ہے) چنانچہ فرمایا:۔

فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا (۲۰-۵۸) تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کر لو۔

بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا (۱۸-۴۸) لیکن تم نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہارے لئے قیامت کا کوئی وقت مقرر ہی نہیں کیا۔

مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ (۲۰-۵۹) (موسیٰ نے کہا کہ) آپ کے لئے یوم زینت کا وعدہ ہے۔

بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا (۱۸-۵۸) مگر ان کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے کہ اس کے عذاب سے کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے۔

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ (۳۴-۳۰)۔ کہدو کہ تم سے ایک دن کا وعدہ ہے۔

وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ (۸-۴۲) اگر تم جنگ کے لئے آپس میں قرار داد کر لیتے تو وقت معین پر جمع ہونے میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی .....

اور لفظ مُوَاعَدَةٌ (مفاعلۃ) کے متعلق فرمایا:۔

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا (۲-۲۳۵) مگر پوشیدہ

طور پیمان سے قول و قرار نہ کرنا۔

وَاعَدْنَا مُوسٰى ثَلَاثِيْنَ لَيْلَةً (۷-۱۴۲) اور ہم نے موسٰی علیہ السلام سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

وَاِذْ وَاعَدْنَا مُوسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (۲-۵۱) اور ہم نے موسٰی علیہ السلام سے چالیس رات کی میعاد مقرر کی۔

ان دونوں آیتوں میں ثَلَاثِيْنَ وَاَرْبَعِيْنَ وَاعَدْنَا کی ظرف نہیں ہیں۔ بلکہ مفعول بہ ہیں اور ان کا مضاف محذوف ہے یعنی اِنْقِضَاءَ ثَلَاثِيْنَ وَ اَرْبَعِيْنَ یعنی تیس اور چالیس رات کے گزرنے کا وعدہ کیا۔ اور آیت:۔

وَ وَاعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ (۲۰-۸۰) اور تورات دینے کے لئے ہم سے کوہ طور کی داہنی طرف مقرر کی۔

میں بھی یہی تاویل ہوگی یعنی یہاں جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ ظرف نہیں ہے بلکہ مفعول بہ ہے اور اس کا مضاف محذوف ہے یعنی اِتْيَانَ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ۔ اور آیت۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (۸۵-۲) اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے۔ میں یوم موعود سے قیامت مراد ہے جیسا کہ آیت:۔ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۵۶-۵۰) (سب) ایک روز مقرر کے وقت پر جمع کئے جائیں گے میں میقات یوم معلوم قیامت کا دن مراد ہے۔

اور اَلْاِیْعَادُ (افعال) یعنی تہدید کے متعلق فرمایا۔

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۷-۸۶) اور ہر راستے پر مت بیٹھا کرو کہ تم ڈراتے اور راہ خدا سے روکتے ہو۔

اور لفظ وعید کے متعلق ارشاد ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱۴-۱۴) یہ اس شخص کے لئے ہے جو قیامت کے روز میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اور میرے عذاب سے خوف کرے۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۵۰-۴۵) پس جو ہمارے عذاب کی وعید سے ڈرے۔ اس کو قرآن سے نصیحت کرتے رہو۔

لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ (۵۰-۲۸) ہمارے حضور میں ردو کد نہ کرو۔ ہم تمہارے پاس پہلے ہی عذاب کی وعید بھیج چکے تھے۔

اور محاورہ ہے۔

رَاَيْتُ اَرْضَهُمْ وَاعِدَةً یعنی ان کی زمین سے اچھی پیداوار کی امید ہے۔

يَوْمٌ وَاعِدٌ بہت گرم یا بہت سرد دن۔

وَعِيْدُ الْفَحْلِ حملہ کے وقت نر اونٹ کا بڑبڑانا اور آیت:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴-۵۵) اور جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔ میں لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ الخ وعدہ کی تفسیر ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (۴-۱۱) خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔

میں جملہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ وصیت کی تفسیر واقع ہوا ہے۔ اور آیت:۔

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّائِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ (۸-۷) اور اس وقت کو یاد کرو جب تم خدا سے وعدہ کرتا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا مسخر ہو جائے گا۔

میں اَنَّھَا لَکُمْ اِحْدَی الطَّائِفَتَیْنِ سے بدل ہے۔ اور اصل عبارت یوں ہے۔ وَعَدَکُمُ اللّٰہُ اَنَّ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ لَکُمْ۔ یعنی یا تو قافلہ ہاتھ لگے گا اور یا لشکر سے مقابلہ ہوگا اور مال غنیمت حاصل ہوگا۔

اَلْعِدَۃُ یہ وَعْدٌ سے اسم ہے اور اس کی جمع عِدَاتٌ آتی ہے اور وعد کا لفظ مصدر ہے جس کی جمع نہیں آتی اور وَعَدْتُ دو مفعول کو چاہتا ...... ہے اور دوسرا مفعول ظرف زمان۔ مکان یا کوئی اور چیز ہوتی ہے۔ جیسے:۔

وَعَدْتُ زَیْدًا یَوْمَ الْجُمُعَۃِ اَوْ مَکَانَ کَذَا اَوْ اَنْ اَفْعَلَ کَذَا وغیرہ۔

پس آیت وَاعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً میں وَاعَدْنَا کا دوسرا مفعول اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً نہیں ہو سکتا کیونکہ وعدہ کا وقوع اربعین کے اندر نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد ہوا ہے لہذا اس کا دوسرا مفعول اِنْقِضَاءَ الْاَرْبَعِیْنَ یا تَمَامَ الْاَرْبَعِیْنَ ہوگا ورنہ اس کے بغیر کلام صحیح نہیں ہو سکتا۔

(و ع ظ)

اَلْوَعْظُ کے معنی ایسی زجر و توبیخ کے ہیں۔ جس میں خوف کی آمیزش ہو خلیل نے اس کے معنی کئے ہیں خیر کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے دل میں رقت پیدا ہو اور عِظَۃٌ وَمَوْعِظَۃٌ دونوں اسم ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ [illegible]

نصیحت کرتا ہے۔ تاکہ تم یاد رکھو۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ (۳۴-۴۶) کہدو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔

ذٰلِکُمْ تُوْعَظُوْنَ بِہٖ (۵۸-۳) مومنو! اس حکم سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے۔

قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (۱۰-۵۷) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ پہنچی۔

وَجَآءَکَ فِیْ ھٰذِہِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَۃٌ وَّذِکْرٰی (۱۱-۱۲۰) اور ان قصص میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا اور نصیحت اور عبرت ہے۔

وَھُدًی وَّمَوْعِظَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ (۳-۱۳۸) اور اہل تقویٰ کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے۔

وَکَتَبْنَا لَہٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَۃً وَّتَفْصِیْلًا (۷-۱۴۵) اور ہم نے (تورات کی) تختیوں میں ان کے لئے ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَعِظْھُمْ (۴-۶۳) تم ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں نصیحت کرو۔

(و ع ی)

اَلْوَعْیُ (ض) کے معنی (عموماً) بات وغیرہ کو یاد کر لینا کے ہوتے ہیں جیسے وَعَیْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ میں نے اسے یاد کر لیا۔ قرآن میں ہے:۔

لِنَجْعَلَھَا لَکُمْ تَذْکِرَۃً وَّتَعِیَھَآ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ (۶۹-۱۲) تاکہ اس کو تمہارے لئے یادگار بنائیں اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔

اَلْاِیْعَاءُ (افعال) کے معنی ساز و سامان کو وِعَاءٌ (ظرف) میں محفوظ کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

جَمَعَ فَاَوْعٰی۔ مال جمع کیا اور بند رکھا۔ (۷۰-۱۸)
شاعر نے کہا ہے (البسیط)

(۴۶۴) وَالشَّرُّ اَخْبَثُ مَا اَوْعَيْتَ مِنْ زَادٍ

اور شر سب سے برا زاد ہے جو انسان جمع کرتا ہے۔

اَلْوِعَاءُ کے معنی بوری یا تھیلا کے ہیں جس میں دوسری چیزیں اکٹھی کرکے رکھی جائیں اس [illegible] جمع اَوْعِيَةٌ آتی ہے قرآن میں ہے:

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ اَخِيْهِ (۱۲-۷۶) پھر یوسف نے اپنے بھائی کے شلیتے سے پہلے ان کے شلیتوں کو دیکھنا شروع کیا پھر اپنے بھائی کے شلیتے میں سے اس کو نکال لیا۔

وَلَا وَعْيَ عَنْ كَذَا اس کے بغیر طبیعت کو سکون نہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔

مَالِيْ عَنْهُ وَعْيٌ مجھے اس سے چارہ کار نہیں۔

وَعَى الْجُرْحُ يَعِيْ وَعْيًا زخم میں مدّہ یعنی گندہ مواد بھر گیا۔

وَعَى الْعَظْمُ ہڈی کا ٹوٹنے کے بعد مضبوط ہوجانا اور قوت کو جمع کر لینا۔

اَلْوَاعِيَةُ (رایہ نًا) چیخنے والی۔

سَمِعْتُ وَعَيَ الْقَوْمِ میں نے قوم کی چیخ و پکار کی آواز سنی۔

(و ف د)

وَفَدَ الْقَوْمُ (ض) وِفَادَةً لوگوں کا وفد بن کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا اور وَفْدٌ یا وُفُود ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے بادشاہوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور اسی سے وَافِدٌ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو سب سے آگے نکل جانے والا ہو۔ قرآن میں ہے:

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا (۱۹-۸۵) جس روز ہم پرہیزگاروں کو خدا کے سامنے بطور مہمان جمع کریں گے۔

(و ف ر)

اَلْوَفْرُ مال کثیر کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی کمی نہ ہو اور وَفَرْتُهُ (ض) وَفْرًا وَوُفُوْرًا وَفِرَةً کے معنی کسی چیز کو پورا کرنے کے ہیں۔ اور وَفَّرْتُهُ (تفعیل) تکثیر کے لئے آیا ہے۔ قرآن میں ہے:

فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُكُمْ جَزَاءً مَوْفُوْرًا (۱۷-۶۳) تو تم سب کی سزا جہنم ہے (اور وہ) پوری پوری سزا ہے)

وَفَرْتُ عِرْضَهُ میں نے اس کی عزت کو کم نہیں کیا۔

اَرْضٌ فِيْ نَبْتِهَا وَفْرَةٌ وہ زمین جس میں پوری طرح گھاس جمی ہوئی ہو۔

رَاَيْتُ فُلَانًا ذَا وِفَارَةٍ میں نے فلاں کو عقل و مروت میں کامل پایا۔

اَلْوَافِرُ علم عروض کی اصطلاح میں ایک بحر کا نام ہے (جس میں مفاعلتن چھ بار آتا ہے)

۱؎ قالہ عبید بن الابرص وصدرہ: ... والخیر ان طال الزمان بہ۔ والبیت فی التاج واللسان (وعی) وذیل کتاب الابدال لابی الطیب اللغوی (۱: ۹۳) والکامل للمبرد ۷، ۹ وفی مجمع الامثال للمیدانی رقم ۴۱۹۵ وزعموا ان ہذا البیت قالتہ الجن وقیل بل ہو لعبید بن الابرص وادرج فی العقد الثمین ۸۴ فی ملحقات دیوان طرفۃ۔

ر و ف ض)

اَلْاِیْفَاضُ (انفعال) کے معنی تیز روی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی کسی کے وَفْضَۃ کو اٹھا کر اس طرح تیزی سے بھاگنے کے ہیں کہ اس سے خشخشہ کی آواز پیدا ہو اور وَفْضَۃٌ چمڑے کے ترکش کو کہتے ہیں اس کی جمع وِفَاضٌ آتی ہے۔

قرآن میں ہے:۔
گَاَنَّھُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ جیسے شکاری شکار کے جال کی طرف دوڑتے ہیں۔ (۷۰-۴۳)
بعض نے کہا ہے کہ اَوْفَاضٌ تیز رو جماعتوں کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
لَقِیْتُہٗ عَلٰی اَوْفَاضٍ ہیں اسے عجلت میں ملا۔ اس کا واحد وَفْضٌ ہے جس کے معنی جلدی کے ہیں۔

ر و ف ق)

اَلْوَفْقُ۔ دو چیزوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہونے کو کہتے ہیں قرآن نے اعمال کے نتائج کو...... جَزَاءً وِّفَاقًا (۷۸-۲۶) (یہ) بدلہ ہے پورا پورا۔ کہا ہے اور یہ وَافَقْتُ فُلَانًا وَ وَافَقْتُ الْاَمْرَ (میں نے اسکی موافقت کی یا اسے پالیا) کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔
اَلْاِتِّفَاقُ۔ انسان کے کسی کام کا تقدیر کے مطابق ہو جانا اور یہ خیر و شر دونوں میں بولا جاتا ہے جیسے۔ اِتَّفَقَ لِفُلَانٍ خَیْرٌ فلاں کو اتفاق سے خیر حاصل ہو گئی۔
اِتَّفَقَ لَہٗ شَرٌّ اسے اتفاق سے برائی پہنچی یہی مفہوم توفیق کا ہے مگر یہ متعدی ہے اور عرف میں یہ خیر کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے (یعنی اسباب کا مقصد کے مطابق مہیا کر دینا) اور شر میں استعمال نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ (۱۱-۸۸) اور مجھے توفیق کا ملنا خدا ہی کے فضل سے ہے۔ محاورہ ہے:۔ اَتَانَا لِتَیْفَاقِ الْھِلَالِ وَمِیْفَاقِہٖ۔ میرے پاس رؤیت ہلال کے موقع پر آیا۔

ر و ف ی)

اَلْوَافِیْ۔ مکمل اور پوری چیز کو کہتے ہیں جیسے وہ دِرْھَمٌ وَّافٍ، کَیْلٌ وَّافٍ وَغَیْرُ ذٰالِکَ اَوْفَیْتُ الْکَیْلَ وَالْوَزْنَ میں نے ناپ یا تول کر پورا پورا دیا۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ (۱۷-۳۵) اور جب کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو۔
وَفٰی بِعَھْدِہٖ (رض)، وَفَاءً وَاَوْفٰی۔ اس نے عہد و پیمان پورا کیا۔ یعنی اس کی خلاف ورزی نہیں کی اس کی ضد غَدْرٌ ہے۔ جو نقض عہد اور عدم وفا کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن قرآن میں اَوْفٰی (افعال) استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ (۲-۴۰) اور اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا اور میں اس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔
وَاَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عَاھَدْتُّمْ (۱۶-۹۱) اور جب خدا سے عہد واثق کرو تو اس کو پورا کرو۔
بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ وَاتَّقٰی (۳-۷۶) ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرے اور خدا سے ڈرے۔
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عَاھَدُوْا (۲-۱۷۷) اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (۷۶-۷) یہ لوگ نذریں پوری کرتے ہیں۔
وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ (۹-۱۱۱) اور خدا سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔
اور آیت:۔
وَ اِبْرَاهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی (۵۳-۳۷) اور ابراہیم کی جنہوں نے (حق طاعت ورسالت) پورا کیا۔
میں وَفّٰی سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان مطالبات کو پورا کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر ڈالی جن کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:۔
اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹-۱۱۱) خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں اور اس کے عوض میں ان کے لئے بہشت تیار کی ہے۔
میں ارشاد فرمایا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کی طاعت میں مال صرف کیا تو دوسری طرف لڑکے کی قربانی پیش کرنے میں بھی کچھ دریغ نہیں کیا حالانکہ وہ انہیں ان کی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اور وَفّٰی سے جن باتوں کے پورا کرنے پر متنبہ کیا ہے۔ وہ وہی ہیں جن کی طرف کہ آیت:۔
وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (۲-۱۲۴) اور جب پروردگار نے چند باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ میں ارشاد فرمایا ہے:۔
اور تَوْفِیَةُ الشَّیْءِ کے معنی بلا کسی قسم کی کمی کے پورا پورا دے دینے کے ہیں اور اِسْتِیْفَاءٌ کے معنی (اپنا حق) پورا لے لینے کے۔ قرآن میں ہے:۔

وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ (۳-۲۵) اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا۔
وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ (۳-۱۸۵) اور تم کو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔
ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ (۲-۲۸۱) اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا۔
اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (۳۹-۱۰) جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا۔
مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا (۱۱-۱۵) جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب وزینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں پورا پورا دے دیتے ہیں۔
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ (۸-۶۰) اور تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔
فَوَفّٰهُ حِسَابَهٗ (۲۴-۳۹) تو اس سے اس کا حساب پورا پورا چکا دے۔
اور کبھی تَوَفّٰی کے معنی موت اور نیند کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا (۳۹-۴۲) خدا لوگوں کی مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔
وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰكُمْ بِالَّیْلِ (۶-۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے۔
قُلْ یَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (۳۲-۱۱) کہدو کہ موت کا فرشتہ تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ (۱۶-۷۰) اور خدا ہی نے تم کو پیدا کیا پھر وہی تم کو موت دیتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ (۱۶-۲۸) (ان کا حال یہ ہے کہ جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے لگتے ہیں۔

تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (۶-۶۱) (تو) ہمارے فرشتے ان کی روح قبض کر لیتے ہیں۔

اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ (۱۳-۴۰) یا تمہاری مدت حیات پوری کر دیں۔

وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (۳-۱۹۳) اور ہم کو دنیا سے نیک بندوں کے ساتھ اٹھا۔

وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ (۷-۱۲۶) اور ہمیں ماریو تو مسلمان ہی ماریو۔

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا (۱۲-۱۰۱) مجھے اپنی اطاعت کی حالت میں اٹھائیو۔

اور آیت:۔

یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (۳-۵۵) عیسٰی! میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کرکے تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ توفی بمعنی موت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مدارج کو بلند کرنا مراد ہے۔ مگر حضرت ابن عباسؓ نے توفی کے معنی موت کئے ہیں چنانچہ ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی کو فوت کرکے پھر زندہ کر دیا تھا۔

(و ق ب)

اَلْوَقْبُ کے اصل معنی چٹان پتھر وغیرہ میں گڑھا کے ہیں۔ اور وَقَبَ (ض) کے معنی گڑھے وغیرہ میں داخل ہو کر غائب ہو جانے کے اسی سے وَقَبَتِ الشَّمْسُ ہے جس کے معنی آفتاب غروب ہونے کے ہیں۔ اور وَقَبَ الظَّلَامُ کے معنی ہیں تاریکی چھا گئی اور اشیاء اس کے اندر غائب ہو گئیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۱۳-۳) اور شب تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے۔

اَلْوَقِیْبُ گھوڑے کے ذکر کے ایستادہ ہونے کی آواز۔

وَقَبَہٗ وَقْبَۃً۔ اس نے اسے اکٹھا کر لیا۔

(و ق ت)

اَلْوَقْتُ کسی کام کے لئے مقررہ زمانہ کی آخری حد کو کہتے ہیں۔ اس لئے یہ لفظ معین عرصہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:۔

وَقَّتُّ کَذَا میں نے اس کے لئے اتنا عرصہ مقرر کیا۔ اور ہر وہ چیز جس کے لئے عرصہ متعین کر دیا جائے موقوت کہلاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴-۱۰۳) بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۷۷-۱۱) اور جب پیغمبر اکٹھے کئے جائیں۔

اَلْمِیْقَاتُ۔ کسی شے کے مقررہ وقت یا اس وعدہ کے ہیں جس کے لئے کوئی وقت متعین کیا گیا ہو قرآن میں ہے:۔

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا (۷۸-۱۷) بے شک فیصلے کا دن مقرر ہے۔

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُھُمْ (۴۴-۴۰) کچھ شک …

نہیں کہ فیصلے کا دن ..... اٹھنے کا وقت ہے۔
اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۵۶-۵۰) سب ایک روز مقرر کے وقت پر جمع کئے جائیں گے۔
اور کبھی مِیْقَاتٌ کا لفظ کسی کام کے لئے مقرر کردہ مقام پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے مَوَاقِیْتُ الْحَجِّ یعنی مواضع (جو احرام باندھنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں)۔

ر و ق د)

وَقَدَتِ النَّارُ (ض) وُقُوْدًا۔ وَوَقْدًا۔ آگ روشن ہونا۔
اَلْوَقُوْدُ۔ ایندھن کی لکڑیاں جن سے آگ جلائی جائے۔ اور آگ کے شعلہ کو بھی وَقُوْدٌ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲-۲۴) جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے
وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ (۳-۱۰) اور یہ لوگ آتش جہنم کا ایندھن ہوں گے۔
اَلنَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (۸۵-۵) آگ کی خندقیں جن میں ایندھن جھونک رکھا تھا۔
اِسْتَوْقَدْتُ النَّارَ۔ آگ جلانے کی تیاری کرنا اور کبھی بمعنی اَوْقَدْتُهَا میں نے آگ جلائی بھی آجاتا ہے قرآن میں ہے:۔
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا (۲-۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے شب تاریک میں آگ روشن کی۔
وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِی النَّارِ (۱۳-۱۷) اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں۔

فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ (۲۸-۳۸) تو ہامان! میرے لئے گارے کو آگ لگا کر اینٹیں پکا) دو۔
نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ (۱۰۴-۶) خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔
اور اسی سے وَقَدَةُ الصَّيْفِ کا محاورہ ہے جس کے معنی گرمی کی شدت کے ہیں۔
اِتَّقَدَ فُلَانٌ غَضَبًا فلاں غصہ سے بھڑک اٹھا اور استعارہ کے طور پر وَقَدَ وَاتَّقَدَ لڑائی بھڑکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اَلْاِشْتِعَالُ وَالْاِسْتِعَارَةُ وغیرہ الفاظ اس معنی میں بطور مجاز استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵-۶۴) یہ جب لڑائی کے لئے آگ جلاتے ہیں تو خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔
اور کبھی استعارہ کے طور پر چمک دمک کے معنی میں آتا ہے:۔
اِتَّقَدَ الْجَوْهَرُ وَالذَّهَبُ جوہر یا سونے کا چمکنا۔

ر و ق ذ)

اَلْوَقْذُ (ض) کے معنی شدت ضرب کے ہیں اور جس جانور کو لاٹھی یا پتھر سے مار دیا جائے اسے موقوذۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْمَوْقُوْذَةُ (۵-۳) اور جو چوٹ لگ کر مر جائے۔

ر و ق ر)

اَلْوَقْرُ کان میں بھاری پن۔ وَقَرَتْ اُذُنُهٗ تَقِرُ وَتَوْقَرُ کان میں ثقل ہونا) یعنی باب ضَرَبَ وفَتَحَ سے آتا ہے۔ لیکن ابوزید نے

اسے سَمِعَ سے مانا ہے۔ اور اس سے مَوْقُوْرَةٌ صفت مفعولی ۔۔۔ ہے۔ قرآن میں ہے۔
وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ (۴۱-۵) اور ہمارے کانوں میں بوجھ یعنی بہرہ پن ہے۔
وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (۶-۲۵) اور کانوں میں ثقل پیدا کر دیا۔
نیز وَقْرٌ کا لفظ گدھے یا خچر کے ایک بوجھ پر بھی بولا جاتا ہے[1]۔ جیسا کہ وَسْقٌ کا لفظ اونٹ کے بوجھ کے ساتھ مخصوص ہے اور اَوْقَرْتُهٗ کے معنی بوجھ لادنے کے ہیں۔
نَخْلَةٌ مُوْقِرَةٌ وَمُوْقَرَةٌ پھل سے لدی ہوئی کھجور۔
اَلْوَقَارُ۔ کے معنی سنجیدگی اور علم کے ہیں[2]۔ باوقار اور حلیم آدمی کو وَقُوْرٌ، وَقَارٌ اور مُتَوَقِّرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:
مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (۷۱-۱۳) تم کو کیا ہوا کہ تم خدا کی عظمت کا اعتماد نہیں رکھتے۔
فُلَانٌ ذُوْ وَقْرَةٍ فلاں بردبار ہے۔ اور آیت:
وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ (۳۳-۳۳) اور اپنے گھروں میں پڑی رہو۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قَرْنَ، وَقَارٌ بمعنی سکون سے ہے اور بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ وَقَرْتُ، اَقِرُّ، وَقْرًا سے ہے جس کے معنی بیٹھ رہنا کے ہیں[3]۔
اَلْوَقِیْرُ۔ بھیڑ بکری کا بہت بڑا ریوڑ۔
یہ بھی وقار سے ہے گویا کثرت تعداد ... رفتاری کی وجہ سے اس میں وقار یعنی سکون پایا جاتا ہے۔

(و ق ع)

اَلْوُقُوْعُ۔ کے معنی کسی چیز کے ثابت ہونے اور نیچے گرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:
وَقَعَ الطَّیْرُ وُقُوْعًا۔ پرند نیچے گر پڑا۔
اَلْوَاقِعَةُ۔ اس واقعہ کو کہتے ہیں جس میں سختی ہو۔ اور قرآن پاک میں اس مادہ سے جس قدر مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر عذاب اور شدائد کے واقع ہونے کے متعلق استعمال ہوئے ہیں چنانچہ فرمایا۔
اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ (۵۶-۲۹) جب واقع ہونے والی واقع ہو جائے اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں۔
سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (۷۰-۱) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا۔ جو نازل ہو کر رہے گا۔
فَیَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۶۹-۱۵) تو اس روز ہو پڑنے والی (یعنی قیامت) ہو پڑے گی۔
اور کسی قول کے وقوع سے اس کے متضمن مفہوم کا واقع ہو جانا مراد ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:
وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا (۲۷-۸۵) اور ان کے ظلم کے سبب ان کے حق میں وعدہ عذاب پورا ہو کر رہے گا۔
یعنی ان پر وہ عذاب اتر پڑا جس کا ان کے ظلم کے سبب ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ نیز فرمایا:
وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ ...
... بارے میں عذاب کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔ تو ہم ان

---

[1] وفی القرآن فالحاملات وقرا[2] وقد وقر الرجل فهو وقور [3] وفی الروح ۲۲/۶: قرء الاکثر وقرن بکسر القاف من وقر یقر وقارًا اذا ثبت وسکن واصله وقرن فعل به ما فعل بعدہ من وعد۔

کے لئے زمین میں سے ایک جانور نکالیں گے۔
یعنی جب ان علاماتِ قیامت کا ظہور ہو جائیگا۔ جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔
قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ (۷-۷۱) ہودؑ نے کہا کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب کا نازل ہونا مقرر ہو چکا ہے۔
نیز فرمایا:۔
أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ (۱۰-۵۱) کیا جب وہ آ واقع ہوگا۔ تب اس پر ایمان لاؤ گے۔
فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللهِ (۴-۱۰۰) تو اس کا ثواب خدا کے ذمے ہو چکا۔
یہاں لفظ وقوع کا استعمال محض تاکید وجوب کے لئے ہے (یعنی اس کے بغیر ہی صحیح ہو سکتے تھے) جیسا کہ آیت:۔
وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰-۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔
اور آیت:۔
كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰-۱۰۳) اس طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔
میں حق کا لفظ محض تاکید کے لئے استعمال ہوا ہے ورنہ یہ معنی عَلَيْنَا سے بھی مفہوم ہو سکتا تھا۔
اور آیت:۔
فَقَعُوْا لَهُ سٰجِدِيْنَ (۱۵-۹) تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔
میں قَعُوْا کا لفظ مبادرت إِلَى السُّجُوْدِ کے معنی کو ظاہر کرتا ہے۔

وَقَعَ الْمَطَرُ بارش ہونا۔ مَوَاقِعُ الْغَيْثِ جن مقامات پر بارش برسی ہو[1]۔
اَلْمُوَاقَعَةُ باہم جنگ کرنا۔ نیز کنایہ کے طور پر اس کے معنی عورت سے مجامعت کے بھی آتے ہیں۔
اَلْاِيْقَاعُ (افعال) واقع کرنا۔ سخت معرکہ قائم کرنا۔ اور کنایۃً وَقْعَةٌ کے معنی جنگ بھی آتے ہیں۔ (والجمع وَقَائع)
وَقْعُ الْحَدِيْدِ۔ لوہے کی آواز (تلواروں کے کھٹ کھٹانے کی آواز) محاورہ ہے۔
وَقَعْتُ الْحَدِيْدَ (ن) وَقْعًا مِيْقَعَةً یعنی سان پر تلوار وغیرہ کا تیز کرنا۔ نیز وَقْعٌ کا لفظ سقوط شدید یعنی دھماکہ پر بھی بولا جاتا ہے اور اسی سے اَلْوَقِيْعَةُ (فی الانسان) ہے جس کے معنی کسی کی غیبت کرنے کے ہیں اور اَلْحَافِرُ الْوَاقِعُ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے سم سنگستان میں چلنے سے گھس گئے ہوں۔
اَلْوَقِيْعَةُ (ایضًا) وہ جگہ جہاں بارش کا پانی ٹھہر جاتا ہو (والجمع الوقائع) مَوْقِعٌ پرند کا مستقر (ج مَوَاقِعُ)
اَلتَّوْقِيْعُ۔ سواری کی پیٹھ میں زخم کے نشان کو کہتے ہیں اسی طرح کتاب پر نشان لگانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی سے اَلتَّوْقِيْعُ کے معنی کسی چیز کا گمان کرنا بھی آتے ہیں۔

(و ق ف)

وَقَفْتُ الْقَوْمَ (ض) وَقْفًا (متعدی) لوگوں کو ٹھہرانا اور وَقَفُوْا۔ وُقُوْفًا (لازم) ٹھہرنا۔

---

[1] وفی القرآن فلا أقسم بمواقع النجوم (۵۶-۷۵) فالمراد من المواقع ههنا المغارب کما جاء فی روایۃ ابن جریر عن قتادۃ وعند البعض نجوم القرآن راجع الروح ۲۷/۱۳۲ وقدمر البحث فی حرف النون۔

قرآن میں ہے:۔

وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ (۳۷-۲۴) اور ان کو ٹھہرائے رکھو کہ ان سے کچھ پوچھنا ہے۔

اور اسی سے بطور استعارہ وَقَفْتُ الدَّارَ آتا ہے جس کے معنی مکان کو وقف کر دینے ہیں۔ نیز اَلْوَقْفُ کے معنی ہاتھی دانت کا کنگن بھی آتے ہیں اور حِمَارٌ مُوَقَّفٌ اس گدھے کو کہتے ہیں جس کی کلائیوں پر کنگن جیسے سفید نشان ہوں جیسا کہ فرس مُحَجَّلٌ اس گھوڑے کو کہا جاتا ہے جس کے پاؤں میں حجل کی طرح سفیدی ہو۔

مَوْقِفُ الْاِنْسَانِ انسان کے ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور اَلْمُوَافَقَۃُ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے معاملہ کو اسی چیز پر روک دے جس پر کہ دوسرے نے روکا ہے۔ (ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا ہونا)

اَلْوَقِیْفَۃُ بھگایا ہوا شکار جو شکاری کے تعاقب سے عاجز ہو کر ٹھہر جائے۔ یہاں تک کہ وہ اسے شکار کر لے۔

(و ق ی)

وَقَیْتُ الشَّیْءَ (ض) وِقَایَۃً وَوِقَاءً کے معنی کسی چیز کو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ (۷۶-۱۱) تو خدا ان کو ..... بچالیگا۔

وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ (۴۴-۵۶) اور خدا ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔

وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۱۳-۳۴) اور ان کو خدا کے عذاب سے کوئی بھی بچانے والا نہیں۔

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ (۱۳-۳۷) تو خدا کے سامنے نہ کوئی تمہارا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔

قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (۶۶-۶) اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش جہنم سے بچاؤ۔

اَلتَّقْوٰی اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقوی اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے [1] اور اصطلاح شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقوی ہے جو گناہ کا موجب ہو۔ اور یہ بات محظورات شرعیہ کے ترک کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے مگر اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لئے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے (۱۴۹) اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمٰی فَحَقِیْقٌ اَنْ یَّقَعَ فِیْهِ کہ حلال بھی بین ہے اور حرام بھی بین ہے اور جو شخص چراگاہ کے ارد گرد چرائے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے۔ (یعنی مشتبہ چیزیں اگرچہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں لیکن ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی چھوڑ دیا جائے) قرآن میں ہے۔

فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۷-۳۵) جو شخص ان پر ایمان لا کر خدا سے ڈرتا رہے گا اور اپنی حالت درست رکھے گا۔ ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

لہ رواہ النسائی ص ۲۰۳ ج ۲ وسائر اصحاب السنن - ۱۲

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (۱۶-۱۲۸) کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہیں اللہ ان کا مددگار ہے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (۳۹-۷۳) اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کو گروہ گروہ بناکر بہشت کی طرف لے جائیں گے۔

پھر تقویٰ کے چونکہ بہت سے مدارج ہیں اس لئے آیات وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (۲-۲۸۱) اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم خدا کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے۔

اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ (لوگو) اپنے پروردگار سے ڈرو۔ (۱-۳۳)

وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ (۲۴-۵۲) اور اس سے ڈرے گا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (۴-۱) اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو۔ اور قطع مودت ارحام سے۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ (۳-۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

میں ہر جگہ تقویٰ کا ایک خاص معنیٰ مراد ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے بعد بیان ہوگی[1]۔

اِتَّقٰى فُلَانٌ بِكَذَا کے معنی کسی چیز کے ذریعہ بچاؤ حاصل کرنے کے ہیں۔ اور آیت:۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۳۹-۲۴) بھلا جو شخص قیامت کے دن اپنے منہ سے برے عذاب کو روکتا ہوا۔ میں اس عذاب شدید پر تنبیہ کی ہے جو قیامت کے دن ان پر نازل ہوگا اور یہ کہ سب سے بڑی چیز جس کے ذریعہ وہ عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے وہ ان کے چہرے ہی ہوں گے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا:۔

وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (۱۴-۵۰) اور ان کے مونہوں کو آگ لپیٹ رہی ہوگی۔

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ (۵۴-۴۸) اس روز منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے۔

(و ک ء)

اَلْوِكَاءُ۔ کے معنی کسی چیز کا سر بند کے ہیں[2]۔ اور کبھی وِكَاءٌ اس ظرف کو بھی کہدیا جاتا ہے جس میں کوئی چیز ڈال کر اس کا منہ باندھ دیا گیا ہو۔ اسی سے اَوْكَأْتُ فُلَانًا ہے جس کے معنی کسی کے لئے تکیہ لگا دینے کے ہیں۔

تَوَكَّأَ عَلَى الْعَصَا اس نے عصا پر ٹیک لگائی اور اس سے قوت حاصل کی چنانچہ قرآن میں ہے:۔

هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا (۲۰-۱۸) (انہوں نے کہا) یہ میری لاٹھی ہے اس پر میں سہارا لگاتا ہوں۔

اور حدیث میں ہے[3] (۱۵۰)

كَانَ يُوكِيْ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ یعنی بالکل خاموش یا نہایت تیزی سے طواف کرتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سعی سے ان کے مابین کو

---

[1] وفی المطبوع ومن یخش اللہ مصحف [2] وفی الحدیث: ان العین وکاء السہ فاذا نامت العینان استطلق الوکاء (الفائق ۲/۳۴۱) [3] والحدیث فی الفائق ۲/۳۴۱: موقوف علی الزبیر قال ابو عبید فی غریبہ (۴: ۸) وہو عندی من امساک الکلام وفیہ تفسیر آخر انہ یروی عنہ قال کان یوکی ما بین الصفا والمروۃ سعیا فان کان ہذا محفوظا فوجہہ ان یملأ ما بینہما سعیا لا یمشی علی ہینتہ فی شیء من ذالک شبہا بالسقاء وغیرہ یملأ ثم یوکا علیہ حیث انتہی امتلاءہا وایضا انظر مجمع البحار الانوار ۳/۱۶۴

اس طرح پر کر دیتے تھے جیسا کہ مشکیزہ کو بھرنے کے بعد اس کا منہ باندھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ مشک کا منہ باندھنے کے لئے اَوْکَیْتُ السِّقَاءَ (یعنی یار کے ساتھ) بولتے ہیں اور اَوْکَأْتُ (ہمزہ کے ساتھ) اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

(و ک د)

وَکَدْتُ وَاَکَّدْتُ (تفعیل) کے معنی کسی بات یا معاملہ کو محکم اور پختہ کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا (۱۶-۹۱) اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو۔

اور وہ تسمہ جس سے زین کے اگلے حصہ کو کس کر باندھ دیتے ہے اسے (بھی) تاکید یا توکید کہا جاتا ہے۔ اور اَلْوِکَادُ اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دودھ دوہتے وقت گائے کی ٹانگیں باندھ دیتے ہیں۔

خلیل نے کہا ہے کہ اَیْمَانُ (یعنی قسموں) کی پختگی کے لئے اَکَّدْتُ زیادہ مناسب ہے اور باقی اقوال کے متعلق وَکَّدْتُ زیادہ صحیح ہے۔ لہذا عقد ایمان کے لئے اَکَّدْتُ اور حلف وغیرہ کے لئے وَکَّدْتُ کہا جائے گا۔ اور وَکَدَ وَکْدَہٗ کے معنی کسی کی طرح قصد کرنے اور اس جیسے اخلاق اختیار کرنے کے ہیں۔

(و ک ز)

اَلْوَکْزُ (ض) کے معنی کچوکا لگانے، دھکا دینے اور مکا مارنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔ فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی (۲۸-۱۵) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کو مکا مارا۔

(و ک ل)

اَلتَّوْکِیْلُ کے معنی کسی پر اعتماد کر کے اسے اپنا نائب مقرر کرنے کے ہیں اور وَکِیْلٌ فَعِیْلٌ (بمعنی مفعول) کے وزن پر ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا (۴-۸۱) اور خدا ہی کافی کارساز ہے۔ یعنی اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دیجئے اور کارسازی کے لئے اسی کو کافی سمجھئے۔

اور آیت کریمہ:۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (۳-۱۷۳) ہم کو خدا کافی ہے۔ اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ (۳۹-۴۱) اور اے پیغمبر تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ان کے اعمال کے ذمہ دار اور محافظ نہیں ہو۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا:۔ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی (۸۸-۲۲-۲۳) تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔ ہاں جس شخص نے منہ پھیرا ......

اور اسی معنی میں فرمایا:۔ قُلْ لَّسْتُ عَلَیْکُمْ بِوَکِیْلٍ (۶-۶۶) کہہ دو کہ میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں۔

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا (۲۵-۴۳) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔ تو کیا تم اس پر نگہبان ہو سکتے ہو۔

اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا (۴-۱۰۹) اور کون ان کا وکیل بنے گا۔

یعنی ان کی طرف سے کون ذمہ داری اٹھائیگا۔

اَلتَّوَکُّلُ (تفعل) اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے اول (صلہ لام کے ساتھ) تَوَکَّلْتُ لِفُلَانٍ یعنی میں فلاں کی ذمہ داری لیتا ہوں چنانچہ وَکَّلْتُہٗ فَتَوَکَّلَ لِیْ کے معنی ہیں میں نے اسے وکیل مقرر کیا تو اس نے میری طرف سے ذمہ داری قبول کر لی۔

(علیٰ کے ساتھ) تَوَکَّلْتُ عَلَیْہِ کے معنی کسی پر بھروسہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳-۱۰۱) اور خدا ہی پر مومنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (۶۵-۳) اور جو خدا پر بھروسہ رکھیگا تو وہ اس کو کفایت کریگا۔

رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَکَّلْنَا (۶۰-۴) اے ہمارے پروردگار تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے۔

وَعَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْا (۵-۲۳) اور خدا ہی پر بھروسہ رکھو۔

وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا (۴-۸۱) اور خدا پر بھروسہ رکھو اور خدا ہی کافی کارساز ہے۔

وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ (۱۱-۱۲۳) اور اسی پر بھروسہ رکھو۔

وَتَوَکَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (۲۵-۵۸) اور اس خدائے زندہ پر بھروسہ رکھو جو کبھی نہیں مریگا۔

وَاکَلَ فُلَانٌ دوسرے شخص پر اعتماد کر کے اپنا کام ضائع کر دینا۔

تَوَاکَلَ الْقَوْمُ لوگوں نے اپنے کام ایک دوسرے پر ڈالنا شروع کر دیئے۔

رَجُلٌ وُکَلَۃٌ۔ تُکَلَۃٌ وہ آدمی جو خود کمزور ہو اور ہر کام میں دوسروں کا سہارا تلاش کرے۔

اَلْوِکَالُ۔ چوپایہ جانوروں میں عیب کو کہتے ہیں یعنی یہ کہ وہ دوسرے جانور کے چلنے کے بغیر تنہا نہ چلے۔

بعض نے وکیل کی تفسیر کفیل کے ساتھ کی ہے کہ وکیل کفیل کو کہتے ہیں۔ مگر وکیل کفیل سے اعم ہے کیونکہ ہر کفیل وکیل بھی ہوتا ہے لیکن ہر وکیل کا کفیل ہونا ضروری نہیں ہے۔

(و ل ج)

اَلْوُلُوْجُ (ض) کے معنی کسی تنگ جگہ میں داخل ہونے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ (۷-۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔

اور آیت:۔

یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ (۲۲-۶۱) (کہ خدا) رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔

میں اس نظام کائنات پر متنبہ کیا گیا ہے جو اس عالم میں رات کے دن اور دن کے رات میں داخل ہونے کی صورت میں قائم ہے اور مطالع شمسی کے حساب سے رونما ہوتا رہتا ہے۔

اَلْوَلِیْجَۃُ وہ شخص ہے جو دوسری قوم سے ہو لیکن تم اسے اپنا معتمد بنالو اور یہ فُلَانٌ وَلِیْجَۃٌ فِی الْقَوْمِ کے محاورہ سے لیا گیا ہے یعنی وہ جو قوم میں داخل ہو جائے اور ان میں سے نہ ہو عام اس سے کہ انسان ہو یا کوئی دوسری چیز قرآن میں ہے:۔

وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلَا رَسُوْلِہٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَۃً (۹-۱۶) اور انہوں نے خدا اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بنایا۔

جیسا کہ مومنین کے متعلق دوسری جگہ فرمایا:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَ

النَّصَارٰی اَوْلِیَآءَ (۵-۵۱) اے ایمان والو یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

رَجُلٌ خُرَجَةٌ وُلَجَةٌ بہت زیادہ اندر اور باہر آنے جانے والا آدمی۔

(و ل د)

اَلْوَلَدُ۔ جو جنا گیا ہو یہ لفظ واحد جمع (مذکر مؤنث) چھوٹے بڑے سب پر بولا جاتا ہے۔
چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلَدٌ (۴-۱۱) اور اگر اولاد نہ ہو۔
اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ۔ (۶-۱۰۱) اس کے اولاد کہاں سے ہو۔
اور وَلَدٌ کا لفظ متبنّٰی پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (۱۲-۲۱) یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔
وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (۹۰-۳) اور باپ (یعنی آدم) اور اس کی اولاد کی قسم۔
ابوالحسن کا قول ہے کہ وُلْدٌ کا لفظ بیٹے اور بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے اور وُلْدٌ وَ وِلْدٌ کے معنی اہل وعیال کے ہیں۔ محاورہ ہے:۔ وُلِدَ فُلَانٌ فلاں پیدا ہوا ۔۔۔ قرآن میں ہے:۔
وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ (۱۹-۳۳) اور جس دن میں پیدا ہوا مجھ پر سلام (و رحمت) ہے۔
وَسَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ (۱۹-۱۵) اور جس دن وہ پیدا ہوئے ان پر سلام و رحمت ہے۔
اور باپ کو والد اور ماں کو والدہ کہتے ہیں اور دونوں کو والدین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ (۷۱-۲۸) اے میرے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو معاف کرنا۔

اَلْوَلِیْدُ۔ عرف میں نوزائیدہ بچے پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ لغت کے لحاظ سے ہر چھوٹے بڑے کو ولید کہنا صحیح ہے۔ جیسا کہ تازہ چنے ہوئے پھل کو جَنِیٌّ کہا جاتا ہے پھر جب بچہ بڑا (یعنی بالغ) ہو جائے تو اسے وَلِیْدٌ نہیں کہتے۔ اس کی جمع وِلْدَانٌ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا (۷۳-۱۷) (اس دن سے (کیونکر بچو گے) جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔
اَلْوَلِیْدَةُ عرف عام میں کنیزک کے ساتھ مختص ہے اور لِدَةٌ خاص کر تِرْبٌ (لنگوٹیا) کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ لِدَةُ فُلَانٍ وَتِرْبُهٗ فلاں اس کا ہم عمر ہے یہ اصل میں وِلْدَةٌ ہے تخفیف کے لئے واؤ ساقط ہو گئی ہے۔
تَوَلَّدَ الشَّیْءُ مِنَ الشَّیْءِ ایک چیز کا دوسری سے پیدا ہونا۔
اور وَلَدٌ کی جمع اَوْلَادٌ آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ (۸-۲۸) تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔
اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ (۶۴-۱۴) تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔
ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد انسان کے لئے آزمائش ہے۔ مگر بعض اولاد دشمن ثابت ہوتی ہے پہلی آیت میں سب کو فتنہ قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری آیت میں بعض کو دشمن قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وَلَدٌ کی جمع وُلْدٌ بھی آتی ہے جیسے اَسَدٌ کی جمع اُسْدٌ مگر ہو سکتا ہے کہ وُلد کا لفظ مفرد ہو جیسے بُخْلٌ وَ بَخَلٌ اور

عَرَبٌ وَعُرْبٌ کہ یہ دونوں مفرد ہیں.... مثل مشہور ہے۔ وُلْدُكِ مَنْ دَمّٰى عَقِبَيْكِ یعنی تیرا لڑکا تو وہی ہے جو تیری ایڑیوں کو خون آلود کرے یعنی جو تمہارے بطن سے پیدا ہوا ہو اور ایک قراءت میں ہے:۔ مَنْ لَمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوُلْدُهٗ (۷۱-۲۱) جن کو ان کے مال اور اولاد نے ..... کچھ فائدہ نہیں دیا۔[1]

(و ل ق)

اَلْوَلْقُ کے معنی تیزروی کے ہیں اور وَلَقَ الرَّجُلُ (ض) کے معنی جھوٹ بولنا کے ہیں۔ اور آیت:۔ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ (۲۴-۱۵) جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے۔ میں ایک قرأت تَلِقُوْنَهٗ بھی ہے[2] یعنی کذب بیانی کے لئے جلدی کرتے تھے اور یہ جَاءَتِ الْاِبِلُ تَلِقُ۔ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی اونٹوں کے تیز رفتاری کیساتھ آنے کے ہیں۔ اَلْاَوْلَقُ۔ جس کی عقل میں فتور ہو۔ رَجُلٌ مَأْلُوْقٌ وَمُؤَوْلَقٌ۔ پاگل اور دیوانہ آدمی۔ نَاقَةٌ وَلَقَى۔ تیزرو اونٹنی۔ اَلْوَلِيْقَةُ ایک قسم کا کھانا جو گھی سے تیار ہوتا ہے۔ اَلْوَلْقُ۔ نیزے کا بہت ہلکا زخم۔

(و ل ی)

اَلْوِلَاءُ وَالتَّوَالِيْ کے اصل معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو۔ پھر استعارہ کے طور پر قرب کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ خواہ وہ قرب بلحاظ مکان یا نسب اور یا بلحاظ دین اور دوستی یا نصرت کے ہو اور یا بلحاظ اعتقاد کے۔ اَلْوِلَايَةُ (بکسر الواو) کے معنی نصرت اور وَلَايَةُ (بفتح الواو) کے معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔[3] بعض نے کہا ہے کہ یہ دَلَالَة وَدِلَالَة کی طرح ہے یعنی اس میں دو لغت ہیں۔ اور اس کے اصل معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔ اَلْوَلِيُّ وَالْمَوْلٰى۔ یہ دونوں کبھی اسم فاعل یعنی مُوَالٍ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی اسم مفعول یعنی مُوَالًى کے معنی میں آتے ہیں۔ اور مومن کو ولی اللہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن مولی اللہ کہنا ثابت نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَوْلَاهُمْ دونوں طرح بول سکتے ہیں۔ چنانچہ معنی اول یعنی اسم فاعل کے متعلق فرمایا:۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲-۲۵۷) جو لوگ ایمان لائے ان کا دوست خدا ہے۔ اِنَّ وَلِيِّ َۧ اللّٰهُ (۷-۱۹۶) میرا مددگار تو خدا ہی ہے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳-۶۸) اور خدا مومنوں کا کارساز ہے۔

---

[1] وفی القرآن وعلی الولوہ لد (۲: ۳۳۳) ای الاب او العصبة ۱۲ [2] مروی عن عائشۃ والآیۃ فی شان حدیث الافک (اللسان دلق) والنہ اور لابی سہیل ار ۳۱۶ وابطال ابی الطیب ۲ / ۳۱۲ والمشکل للقتبی ۱۹ والقراءات الشاذہ (۱۰۰) لابن خالویہ ۱۲ ؛

[3] کذا قال ابوعبیدۃ فی مجازہ (۱ / ۵-۴) ومنہ اخذ البخاری تفسیر ہذہ الکلمۃ (فتح الباری ۸ / ۳۲۹) ؛

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (۴۷-۱۱)
یہ اس لئے کہ جو مومن ہیں ان کا خدا کارساز ہے۔

نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۸-۴۰) خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى۔ (۲۲-۷۸) اور خدا کے دین کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست ہے۔

اور دوسرے معنی یعنی اسم مفعول کے متعلق فرمایا۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ (۶۲-۶) کہدو کہ اے یہود اگر تم کو یہ دعویٰ ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں۔

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ۔ (۶۶-۴۔ اور پیغمبر (کی ایذا) پر باہم اعانت کرو گی تو خدا ان کے حامی اور دوستدار ہیں۔

ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ (۶-۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائینگے۔

اور آیت:۔

وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ۔ (۱۳-۱۱) اور خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ یہاں وال کے معنی ولی کے ہے۔ اور متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے درمیان ولایۃ کی نفی کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵-۵۱) اے ایمان والو یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہیں میں سے ہوگا۔

لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (۹-۲۳) اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی ایمان کے مقابل کفر کو پسند کریں تو ان سے دوستی نہ رکھو۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ (۷-۳) اور اس کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو۔

مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا (۸-۷۲) تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کو ان کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ (۶۰-۱) مومنو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

اور آیت:۔

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے آخر میں فرمایا:۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ (۵-۸۱) اور اگر وہ خدا پر اور پیغمبر پر اور جو کتاب ان پر نازل ہوئی تھی اس پر یقین رکھتے تو ان لوگوں کو دوست نہ بناتے۔

اور کفار اور شیاطین کے درمیان دنیا میں موالات تو ثابت ہے لیکن آخرت میں ان کے درمیان دوستی کی نفی کی گئی ہے چنانچہ دنیا میں ان کی باہم موالات کے متعلق فرمایا:۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔ (۹-۶۷) منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس (یعنی ایک ہی طرح کے) ہیں۔

نیز فرمایا:۔
اِنَّھُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۷-۳۰) ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو رفیق بنالیا۔
اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۷-۲۷) ہم نے شیطانوں کو ان ہی لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔
فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ (۴-۷۶) سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔
پھر جس طرح ان کے درمیان باہم دوستی کو ثابت کیا ہے اسی طرح دنیا میں کفار پر شیاطین کو تسلط بھی دے رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ (۱۶-۱۰۰) اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں۔
اور آخرت میں ان کی باہم دوستی کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:۔
یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَیْئًا (۴۴-۴۱) جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہیں آئے گا۔
ثُمَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ (۲۹-۲۵) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے (کی دوستی) سے انکار کروگے۔
وَقَالَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَا (۲۸-۶۳) الآیة۔ اور جن لوگوں پر عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔
اور تَوَلّٰی کا لفظ جب متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے۔ تو معنی ولایۃ اور قریب ترین مواضع سے اس کے حصول کو چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی سے کہا جاتا ہے۔ وَلَّیْتُ سَمْعِیْ کَذَا اَوْ وَلَّیْتُ عَیْنِیْ کَذَا میں نے اپنے کان یا آنکھ کو فلاں چیز پر لگایا۔
وَلَّیْتُ وَجْهِیْ کَذَا میں اپنے چہرے کے ساتھ اس پر متوجہ ہوا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲-۱۴۴) سو ہم تم کو اسی قبلے کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو۔ چہرہ پھیرنے کا حکم دیں گے۔ اب اپنا چہرہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور تم لوگ جہاں ہوا کرو (نماز پڑھنے کے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کرلیا کرو۔
اور جب بذریعہ عَنْ کے متعدی ہو تو خواہ وہ عن لفظوں میں مذکور ہو یا مقدر، اس کے معنی اعراض اور دور ہونا کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ تعدیہ بذاتہ کے متعلق فرمایا:۔
وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵-۵۱) اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا۔ وہ بھی انہیں میں سے ہوگا۔
وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵-۵۶) اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر سے دوستی کرے گا۔
اور تعدیہ بعن کے متعلق فرمایا:۔
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ۔ (۳-۶۳) تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو خدا مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔
اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَكَفَرَ (۸۸-۲۳) ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا (۳-۶۴) اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہدو کہ تم گواہ رہو۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۴۷-۳۸) اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔ (۶۴-۱۲) اور اگر تم منہ پھیر لوگے تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کر پہنچا دینا ہے۔

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ (۸-۴۰) اور اگر روگردانی کریں تو جان رکھو کہ خدا تمہارا حمایتی ہے۔

فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۳-۸۲) تو جو اس کے بعد پھر جائیں وہ بدکردار ہیں۔

اور تَوَلّی (بمعنی اعراض) کے معنی کبھی پیٹھ پھیرنا کے ہوتے ہیں اور کبھی توجہ نہ کرنے اور ترک قرب کے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ (۸-۲۰) اور اس سے روگردانی نہ کرو اور تم سنتے ہو۔

یعنی ان لوگوں کا کردار ادا نہ کرو جن کی صفت یہ تھی کہ:۔

وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا۔ (۷۱-۷) اور کپڑے اوڑھ لئے اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

اور نہ ہی ان لوگوں کے قول کی نقالی کرو۔ جن کے متعلق فرمایا:۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ (۴۱-۲۶) اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو۔ اور (جب پڑھنے لگیں تو) شور مچا دیا کرو۔

محاورہ ہے:۔

وَلَّاهُ دُبُرَهُ۔ یعنی ہزیمت کھا کر بھاگ جانا۔ قرآن میں ہے:۔

وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ (۳-۱۱۱) اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائینگے۔

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ (۸-۱۶) اور جو شخص جنگ کے روز ان سے پیٹھ پھیرے گا۔

اور آیت کریمہ:۔

هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا (۱۹-۵) مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

میں ولی سے ایسا لڑکا مراد ہے جو اولیاء اللہ سے ہو۔ اور آیت:۔

خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَائِي (۱۹-۵) اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ موالی سے عم زاد بھائی مراد ہیں[1]۔ اور بعض نے دور کے رشتہ دار مراد لئے ہیں[2]۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ (۱۷-۱۱۱) اور نہ اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے کوئی اس کا مددگار ہے۔

میں مطلق ولی کی نفی نہیں ہے بلکہ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ کی نفی ہے یعنی اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہو اس کا کوئی ولی نہیں ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کے سب نیک بندے اس کے اولیاء سے ہیں لیکن وہ اولیاء من الذل نہیں ہیں کہ کسی پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کو ان سے امداد کی ضرورت ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا (۱۸-۱۷) اور جس کو گمراہ کرے تو تم اس کے لئے

---

[1] ہٰذا ہو المروی عن الاصم۔ [2] علی ما روی عن ابن عباس ومجاہد روح المعانی ص۵۷ ج ۱۶ ۔

کوئی دوست راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔

اَلْوَلِیُّ (ایضًا) وہ بارش جو وسمی یعنی موسم بہار کی پہلی بارش کے بعد متصل برسے اسے وَلِیٌّ کہا جاتا ہے۔

اَلْمَوْلٰی۔ یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ۱؎ غلام کو آزاد کرنے والا ۲؎ آزاد شدہ غلام ۳؎ حلیف ۴؎ عم زاد بھائی ۵؎ پڑوسی۔

اور ہر وہ شخص جو دوسرے کے معاملہ کا والی ہو وہ بھی اس کا مولا کہلاتا ہے:۔

فُلَانٌ اَوْلٰی بِکَذَا فلاں اس کا زیادہ حق دار ہے قرآن میں ہے:۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ (۳۳-۶) پیغمبر مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرَاھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ۔ (۳-۶۸) ابراہیمؑ سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں۔ جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔

فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا (۴-۱۳۵) تو خدا ان کا خیرخواہ ہے۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ (۳۳-۶) اور رشتہ دار آپس میں زیادہ حق دار ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت:۔

اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی (۷۵-۳۴) افسوس ہے تم پر پھر افسوس ہے۔

میں بھی اولیٰ اسی محاورہ سے ماخوذ ہے اور اَوْلٰی لَکَ وَلِکَ دونو طرح بولا جاتا ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ عذاب تیرے لئے اولیٰ ہے یعنی تو عذاب کا زیادہ سزاوار ہے ۱؎۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فعل متعدی بمعنی قرب کے ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اَوْلٰی بمعنی اِنْزَجِرْ ہے یعنی اب بھی باز آجا۔

وَلِیَ الشَّیْءُ الشَّیْءَ دوسری چیز کا پہلی چیز کے بعد بلافصل ہونا۔

اَوْلَیْتُ الشَّیْءَ الشَّیْءَ دوسری چیز کو پہلی چیز کے ساتھ ملانا۔

اَلْوَلَاءُ میراث جو آزاد کردہ غلام سے حاصل ہوتی ہے اور احادیث میں وَلَاء کی بیع اور اس کے ہبہ سے منع کیا گیا ہے ۲؎ (۱۵۳)

اَلْمُوَالَاۃُ کے معنی متابعت کے ہیں یعنی اشیاء کا یکے بعد دیگرے واقع ہونا۔

(و ہ ب)

وَھَبْتُہٗ (ف) ھِبَۃً وَمَوْھِبَۃً وَمَوْھِبًا بلاعوض کوئی چیز دے دینا یا کچھ بخش دینا۔ قرآن میں ہے:۔

وَوَھَبْنَا لَہٗ اِسْحَاقَ (۶-۸۵) اور ہم نے ان کو اسحاق (اور یعقوب) بخشے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحَاقَ (۱۴-۳۹) خدا کا شکر ہے جس نے مجھے بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق بخشے۔

اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلَامًا زَکِیًّا (۱۹-۱۸) انہوں نے کہا کہ میں تو تمہارے پروردگار کا بھیجا ہوا یعنی فرشتہ ہوں اور اسلئے آیا ہوں کہ تمہیں پاکیزہ لڑکا بخشوں۔

۱؎ قال محی السنۃ وذہب صاحب غرۃ التنزیل انہ من الولی بمعنی القرب ویفہم من کلام المحلی ان الاول اسم فعل بمعنی التہدید و الثانی افعل التفضیل والصحیح ما فی الفائق ۲/۳۱۶ انہ کلمۃ للسف و وعید ۲؎ رواہ الجماعۃ من حدیث ابن عمر وبمعناہ عند الحاکم وابن حبان والبیہقی جمع ابونعیم طرقہ فرواہ عن خمسین رجلا من اصحاب عبداللہ بن دینار عنہ (النیل ۵/۱۵۰-۷۵) وایضًا کنز العمال ۱۲

یہاں فرشتے کا لڑکا بخشنے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا محض سبب ہونے کی بنا پر ہے (ورنہ حقیقت میں بخشنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے)

اور ایک قرأت میں لِیَھَبَ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ تو یہ نسبت حقیقی ہوگی اور پہلی یعنی فرشتے کی طرف مجازی۔ قرآن میں ہے۔

فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُکْمًا (۲۶-۲۱) خدا نے مجھ کو نبوت و علم بخشا۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ (۳۸-۳۰) اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کئے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ اَهْلَهٗ (۳۸-۴۳) اور ہم نے ان کو اہل وعیال بخشے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِیًّا (۱۹-۵۳) اور اپنی مہربانی سے ان کو ان کا بھائی ہارون پیغمبر عطا کیا۔

فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ (۱۹-۱۵) تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا (۳۳-۵۰) اگر اپنے تئیں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لینے کے بغیر نکاح میں آنا چاہتی ہے)

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ (۲۵-۷۴) ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما۔

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً (۳-۸) ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما۔

وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ (۳۸-۳۵) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا کر کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔

اور وَاهِبٌ وَوَهَّابٌ دونوں اسمائے حسنیٰ سے ہیں[1]۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو بقدر استحقاق بخشتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ کو اَلْوَهَّابُ کہا جاتا ہے۔

اَلْاِتِّهَابُ (افتعال) ہدیہ قبول کرنا۔ حدیث میں ہے[2]۔ (۱۵۴)

لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ لَّا اَتَّهِبَ اِلَّا مِنْ قُرَشِیٍّ اَوْ اَنْصَارِیٍّ اَوْ ثَقَفِیٍّ میں نے عزم کر لیا ہے کہ قرشی یا انصاری یا ثقفی قبیلہ کے سوا کسی کا ہدیہ قبول نہیں کروں گا۔

(و ھ ج)

اَلْوَهَجُ کے معنی گرمی کی حرارت یا روشنی کے ہیں اور یہی معنی وَهَجَانٌ کے ہیں چنانچہ آیت:۔

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (۷۸-۱۳) اور آفتاب کو روشن چراغ بنایا۔

میں وَهَّاجٌ کے معنی (بافراط) روشنی کرنیوالا کے ہیں۔

وَهَجَتِ النَّارُ (ف ض س) آگ روشن ہونا۔

تَوَهَّجَ الْجَوْهَرُ جوہر چمک اٹھا۔

(و ھ ن)

اَلْوَهْنُ کے معنی کسی معاملہ میں جسمانی طور پر کمزور ہونے یا اخلاقی کمزوری ظاہر کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ (۱۹-۴) اے میرے پروردگار میری ہڈیاں بڑھاپے کے سبب کمزور ہوگئی ہیں۔

---

[1] انظر الآیۃ (۳-۷) [2] قطعۃ من الحدیث انظر الفائق ۲/۲۱۷ وفی النسائی عن ابی ہریرۃ: او دوسی

فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ (۳-۱۴۶) تو جو مصیبتیں ان پر واقع ہوئیں ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری۔

وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ (۳۱-۱۴) تکلیف پر تکلیف سہہ کر۔ یعنی جوں جوں پیٹ میں حمل کا بوجھ بڑھتا ہے کمزوری پر کمزوری بڑھتی چلی جاتی ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (۳-۱۳۹) اور دیکھو بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔

وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ (۴-۱۰۴) اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا۔

ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (۸-۱۸) بات یہ ہے، کچھ شک نہیں کہ خدا کافروں کی تدبیر کو کمزور کر دینے والا ہے۔

(و ه ی)

اَلْوَهْیُ۔ کے معنی چمڑے کپڑے یا اس قسم کی دوسری چیزوں میں شگاف ہو جانا کے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:۔

وَهَتْ عَزَالِی السَّحَابِ بِمَآئِهَا بادل کے دھانے پانی کے زور سے ڈھیلے ہو گئے۔ یعنی خوب بارش ہوئی۔ قرآن میں ہے:۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (۶۹-۱۶) اور آسمان پھٹ جائیگا اور اسکی بندش ڈھیلی پڑجائیگی۔ اور وَهِیَ الشَّیْءُ کے معنی بندش کا ڈھیلا پڑجانا کے ہیں۔

(و ی)

وَیْ (اسم صوت) یہ کلمہ حسرت وندامت اور اظہار تعجب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے۔ وَیْ لِعَبْدِ اللّٰهِ عبد اللہ پر افسوس یا تعجب ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۲۸-۸۲) ہائے شامت! خدا ہی تو ...... جس کے لئے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے۔

وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۲۸-۸۲) ہائے خرابی کافر نجات نہیں پا سکتے۔

بعض وَیْ لِزَيْدٍ (بلام) اور بعض وَیْ زَيْدٍ (بغیر لام) بولتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَيْلَكَ اصل میں وَيْلَكَ۔ ہی ہے لام حذف ہونے کے بعد وَيْكَ رہ گیا ہے۔

(و ی ل)

اَلْوَيْلُ۔ اصمعی نے کہا ہے کہ وَيْلٌ برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حسرت کے موقع پر ویل اور تحقیر کے لئے ویس اور ترحم کے ویح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اور جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وَيْل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے تو ان کا یہ مقصد نہیں کہ یہ اس کے وضعی معنی ہیں۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے متعلق قرآن نے یہ کلمہ استعمال کیا ہے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ اس میں ضرور داخل ہوں گے۔[1] چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۲-۷۹) ان پر افسوس ہے اس

---

[1] قال السید الآلوسی (۱-۳۰۳) وجاء فی الحدیث بطرق صحیح الفاظا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الویل واد فی جہنم الخ وا طلاقہ علی ذالک اما حقیقۃ شرعیۃ واما مجاز لغوی من اطلاق لفظ الحال علی المحل ولا یمکن ان یکون حقیقۃ لغویۃ لان العرب تکلمت بہ فی نظمہا ونثرہا قبل ان یجیئ القرآن ولم تطلقہ علی ذالک (۱-۳۰۴) فہذا یؤید ما قال المؤلف انہ محمول علی المجاز ۱۲

لئے کر دیے اصل باتیں اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے اس لئے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ (۱۴-۲) اور کافروں کے لئے سخت عذاب کی جگہ خرابی ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (۴۵-۷) ہر جھوٹے گنہگار پر افسوس ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۱۹-۳۷) سو جو لوگ کافر ہوئے ان کو خرابی ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۴۳-۶۵) سو جو لوگ ظالم ہیں ان کی خرابی ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (۸۳-۱) ناپ تول میں کمی کرنیوالوں کے لئے خرابی ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (۱۰۴-۱) ہر طعن آمیز اشارے کرنے والے چغلخور کی خرابی ہے۔

يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶-۵۲) ہائے ہماری، ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے (جگا) اٹھایا۔

يَا وَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۱-۱۴) ہائے شامت بے شک ہم ظالم تھے۔

يَا وَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ (۶۸-۳۱) ہائے شامت ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے۔

کتابُ الھاء

(ھ ب ط)

اَلْھُبُوْطُ (ض) کے معنی کسی چیز کے قہراً یعنی بے اختیاری کی حالت میں نیچے اتر آنا کے ہیں۔ جیسا کہ پتھر بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے اور اَلْھَبُوْطُ (بفتح الہاء) سبوغ صفت ہے یعنی نیچے گرنے والی چیز۔ ھَبَطَ۔ (فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے جیسے ھَبَطْتُ اَنَا میں نیچے اتر پڑا۔ وھَبَطْتُ غَیْرِیْ دوسرے کو نیچے اتار دیا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ (۲-۷۴) اور بعض پتھر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔

اور جب لفظ ھبوط انسان کے لئے بولا جاتا ہے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے بخلاف لفظ اِنْزَالٌ (از افعال) کے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر باشرف چیزوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جیسے ملائکہ، قرآن، بارش وغیرہ اور جہاں کہیں کسی چیز کے حقیر جہنے پر تنبیہ مقصود ہے۔ وہاں لفظ ھُبُوْط استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَقُلْنَا اھْبِطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲-۳۶) اور ہم نے حکم دیا کہ تم (سب) اتر جاؤ۔ تم ایک کے دشمن ایک۔

فَاھْبِطْ مِنْھَا فَمَا یَکُوْنُ لَکَ اَنْ تَتَکَبَّرَ فِیْھَا (۷-۱۳) تو بہشت سے نیچے اتر کیونکہ تیری ہستی نہیں کہ تو بہشت میں رہ کر شیخی مارے۔

اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَکُمْ مَا سَاَلْتُمْ (۲-۶۱) (اچھا تو) کسی شہر میں اتر پڑو۔ کہ جو مانگتے ہو (وہاں) تم کو ملے گا۔

یہاں یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ فَاِنَّ لَکُمْ مَا سَاَلْتُمْ سے ان کا شرف ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے مابعد کی آیت:۔

وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (۲-۶۱) اور ان پر ذلت اور محتاجی نہیں دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں آ گئے۔ اس وہم کو دور کرنے کے لئے کافی ہے۔

قُلْنَا اھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا (۲-۳۸) ہم نے حکم دیا کہ تم سب (کے سب) یہاں سے اتر جاؤ محاورہ ہے:۔ ھَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَ الْعَلِیْلِ بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا یعنی (لاغر کر دیا) اور اَلْھَبِیْطُ اونٹ وغیرہ کو کہتے ہیں۔ جو غذا کے ناقص اور مالک کی بے اعتنائی کی وجہ سے لاغر ہو جائے۔

(ھ ب و)

ھَبَا (ن) اَلْغُبَارُ۔ کے معنی غبار کے اڑنے اور فضا میں پھیل جانے کے ہیں اور ھَبْوَۃٌ (بروزن) غَبْرَۃٌ اور ھَبَاءٌ کے معنی غبار یا ان باریک ذرات کے ہیں جو کمرے کے اندر روشندان سے دہوپ کی کرنیں اندر پڑنے سے اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵-۲۳) اور ان کو (اس طرح رائگاں کر دیں گے جیسے بکھری ہوئی دھول۔

فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (۵۶-۶) تو پہاڑ (ایسے) ہوجائیں گے (جیسے) ذرے پڑے اڑ رہے ہیں۔

(ھ ج د)

اَلْهُجُوْدُ کے معنی نیند کے ہیں[1] اور نائم (سوئے ہوئے) آدمی کو ھَاجِدٌ کہا جاتا ہے اور هَجَّدْتُهٗ فَتَهَجَّدَ۔ (ازالہ اغند) کے معنی ہیں میں نے اس کی نیند کو دور کیا تو وہ جاگ گیا جیسا کہ مَرَّضْتُهٗ کے معنی ہوتے ہیں میں نے اس کے مرض کو دور کیا۔

قرآن میں ہے:۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ (۱۷-۷۹) اور رات کے وقت میں نماز تہجد بھی پڑھا کرو۔

اس آیت میں رات کے قیام میں قرآن پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسے دوسری جگہ اسی کو قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗ (۷۳-۲) رات (کے وقت نماز) میں کھڑے رہا کرو ساری رات سے کم یعنی آدھی رات۔

قیام کیا ہے تعبیر فرمایا ہے۔

اَلْمُتَهَجِّدُ کے معنی رات کو نیند سے اٹھ کر نماز پڑھنے والا کے ہیں۔

اَهْجَدَ الْبَعِيْرُ کے معنی اونٹ کا تھواب کیوقت اپنا سینہ زمین پر رکھ دینے کے ہیں۔

(ھ ج ر)

اَلْهَجْرُ وَالْهِجْرَانُ کے معنی ایک انسان کے دوسرے سے جدا ہونے کے ہیں عام اس سے کہ یہ جدائی بدنی ہو یا زبان سے ہو یا دل سے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ (۴-۳۴) پھر ان کے ساتھ سونا ترک کر دو۔

میں مفارقت بدنی مراد ہے اور کنایتًا ان سے مجامعت ترک کر دینے کا حکم دیا ہے۔ اور آیت:۔

اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵-۳۰) کہ میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

میں دل یا دل اور زبان دونوں کے ذریعہ جدا ہونا مراد ہے (یعنی نہ تو انہوں نے اس کی تلاوت کی اور نہ ہی اس کی تعلیمات کی طرف دھیان دیا) اور آیت۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (۷۳-۱۰) اور وضع داری کے ساتھ ان سے الگ تھلگ رہو۔

میں تینوں طرح الگ رہنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی جمیلًا کی قید لگا کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ حسن سلوک اور مجاملت کسی صورت میں بھی

---

[1] من الاضداد یاتی بمعنی النوم والیقظۃ (ابوالطیب ۶۷۸-۶۸۱) وفیہ اکثر مایقال فی النائم الھاجد وفی المستیقظ المتھجد وکذا قال ابن الاعرابی راجع اللسان (ہجد) ۱۲

ترک نہ ہونے پائے۔ اس طرح آیت وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (۱۹-۴۶) اور تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جا۔ میں بھی ترک بوجوہِ ثلاثہ مراد ہے۔ اور آیت:۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۷۴-۵) اور ناپاکی سے دور رہو۔ میں بھی ہر لحاظ سے رجز کو ترک کر دینے کی ترغیب ہے۔

اَلْمُهَاجَرَةُ کے اصل معنی تو ایک کے دوسرے سے کٹ جانے اور چھوڑ دینے کے ہیں جیسے فرمایا:۔ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا (۲-۲۱۸) اور خدا کے لئے وطن چھوڑ گئے اور (کفار سے) جنگ کرتے رہے۔

اور آیات قرآنیہ:۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ (۵۹-۸) (فے کے مال میں) محتاج مہاجرین کا (بھی) حق ہے۔ جو (کافروں کے ظلم سے) اپنے گھر اور مال سے بیدخل کر دیئے گئے۔

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ (۴-۱۰۰) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے۔

وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴-۸۹) تو جب تک (یہ لوگ) خدا کی راہ میں (یعنی خدا کے لئے) ہجرت نہ کر آئیں ان میں سے کسی کو بھی اپنا دوست نہ بنانا۔

میں مہاجرت کے ظاہر معنی تو دارالکفر سے نکل کر دارالاسلام کی طرف چلے آنے کے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ کرام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی لیکن بعض نے کہا ہے۔ کہ ہجرت کا حقیقی اقتضاء یہ ہے کہ انسان شہوات نفسانی، اخلاق ذمیمہ اور دیگر گناہوں کو کلیۃً ترک کر دے اور آیت:۔

اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ (۲۹-۲۶) اور ابراہیم نے کہا کہ میں تو دیس چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف (جہاں کہیں اس کو منظور ہوگا) نکل جاؤں گا۔ کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی قوم کو خیر باد کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف چلا جاؤں گا۔ اور فرمایا:۔

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (۴-۹۷) کیا اللہ تعالیٰ کی (اتنی لمبی چوڑی) زمین (اس قدر) گنجائش نہیں رکھتی تھی کہ تم اس میں کسی طرف کو ہجرت کر کے چلے جاتے۔

ہاں جس طرح ظاہری ہجرت کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان خواہشات نفسانی کو خیرباد کہہ دے۔ اس طرح دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے میں بھی مجاہدۃ بالنفس کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں مروی ہے کہ آنحضرت نے ایک جہاد سے واپسی کے موقع پر صحابہ کرام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔ (۱۵۵)

رَجَعْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ۔ کہ تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے ہو یعنی دشمن کے ساتھ جہاد کے بعد اب نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے[۲] (۱۵۶)

---

[۱] فی البیہقی فی الزہد والدیلمی فی مسندہ من حدیث جابر رفعہ بدل جئتم ورواد: قیل وما الجہاد الاکبر قال مجاہدۃ العبد ہواہ وفیہ ضعف واوردہ النسائی فی الکنی من قول ابراہیم بن عبلۃ احد التابعین وفی الکشاف ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجع من بعض غزواتہ فقال رجعنا الحدیث قال الحافظ فی تخریجہ ہکذا ذکرہ الثعلبی بغیر سند دراجع تخریج الکشاف ص ۴/ ۱۱۴ رقم ۳۳ وکنز العمال ۴/ ۲۸۶ [۲] موقوف علی عمرؓ والمستدرک للحاکم ۳/ ۸ وغریب ابی عبید ۳/ ۱۴۳ والحدیث فی الفائق ۲/ ۴۱۶ بطولہ عن زر بن حبیش (۱۲)

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

هَاجِرُوْا وَلَا تَهَجَّرُوْا یعنی صحیح طور پر مہاجر بنو اور عمل کو ترک کر کے محض زبان سے مہاجر ہونے کے جھوٹے دعاوی نہ کرو۔

اَلْهُجْرُ کے معنی بذیاں کے ہیں جس کے برا ہونے کی وجہ سے اسے ترک کر دینا چاہیئے اور حدیث میں ہے (۱۵۷)

لَا تَقُوْلُوْا هُجْرًا فحش کلامی نہ کرو۔

اور اَهْجَرَ فُلَانٌ کے معنی ہیں اس نے قصداً فحش کلامی کی اور هَجَرَ الْمَرِیْضُ کے معنی مریض کے بیہوشی میں بڑبڑانے کے ہیں اور آیت:۔

مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ (۲۳-۶۷)

(تو تم) اکڑ اکڑ کر شغل بناتے ہو بیہودہ بکواس کرتے ہوئے پاؤں بھلگتے۔

میں ایک قرأت تُهْجِرُوْنَ (باب افعال سے بھی ہے۔ اور کبھی ہجر (بکواس) میں مبالغہ کرنے والے کو بھی مُهْجِر کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو اس لحاظ سے هجر کے معنی قصداً بکواس کرنا بھی آجاتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[۲] (الطویل)

(۵۰م) كَمَا جِدَةِ الْأَعْرَاقِ قَالَ ابْنُ ضَرَّةٍ

عَلَيْهَا كَلَامًا جَارَ فِيْهِ وَ اَهْجَرَا

شریف النسل عورت کی طرح جس کی سوکن کے لڑکے نے اس کے بارے میں بے انصافی اور فحش کلامی کی ہو (اور وہ اپنی براءت کے لئے بار بار لڑتھ اظہار سی ہو)

اور محاورہ ہے۔ وَمَا زَالَ هِجِّیْرَاهُ کَذَا یعنی فلاں نے اس کو فحش گالیاں دیں اور فُلَانٌ هِجِّیْرَاهُ کے معنی ہیں[۳] کہ فلاں کا یہ شیوہ بن چکا ہے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی آدمی کسی چیز کا کثرت سے ذکر کرے اور مریض کی طرح اس کے متعلق ہر وقت بڑاتا رہے اور هِجِّیْر کا لفظ اصل میں تو عادات ذمیمہ کے متعلق بولا جاتا ہے۔ مگر جو لوگ اس کے صحیح معنوی استعمال کا لحاظ نہیں کرتے وہ اسے اس کی ضد (یعنی اچھی عادت کے معنی) میں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔

اَلْهَجِیْرُ وَالْهَاجِرَةُ کے معنی دوپہر کا وقت کے ہیں۔ کیونکہ عموماً مسافر سخت گرمی کی وجہ سے اس وقت سفر کو ترک کر کے راحت حاصل کرتا ہے تو گویا اسے لوگوں نے چھوڑ دیا اور اس وقت نے لوگوں کو چھوڑ دیا۔

اَلْهِجَارُ یہ عِقَال و زِمَام کے وزن پر ہے اور اس کے معنی اونٹ کا پاؤں باندھنے کی رسی کے ہیں وہ رسی چونکہ دوسرے اونٹوں سے علیحدگی کا سبب بنتی ہے اس لئے اسے هِجَارٌ بھی کہتے ہیں۔ اور مَهْجُوْرٌ اس اونٹ کو کہتے ہیں۔ جو هجار (رسی) کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ اور پھر اونٹ کی اس رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر کمان کی تانت کو بھی هِجَارُ الْقَوْسِ کہہ دیا جاتا ہے۔

---

[۱] وتمام الحدیث نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا ولا تقولوا ہجرا (۱۔عن زید بن ثابت) الفتح الکبیر للنبہانی ۲/۴۳۱ والنہایہ ۴/۲۵۵ واللسان والمجمع (ہجر) واضداد ابی الطیب ۶۸۵ والطبرانی فی الصغیر ۸۳ والفائق ۲/۳۲۱ ؛ [۲] قالہ شماخ بن ضرار الغطفانی یصف سیرنا قتہ ولیشبہ وراعیھا فی شیہا بدماع امرۃ صنتھا کذا۔ وفی روایۃ ودیوانہ مجھدۃ الاعراق بدل کماجدۃ الاعراق والبیت فی اللسان (ہجر) وامالی المرتضی ۱/ ۵۶ و دیوانہ من نشیدۃ طویلۃ ۲۶ - ۳۴ [۳] وفی الفائق ۲/۳۲۲ : کان عمر یطوف بالبیت وہو یقول ربنا آتنا الخ ۔۔۔ مالہ ہجیری سواہ وراجع ایضا غریب ابی عبید ۳/۸۱ ۳ وفیہ ۳/۲۱۸ وفیہ غیرما) وفی (رح) مسند عمر ۱۵۱۲ ؛ ۞

(ھ ج ع)

اَلْھُجُوْعُ کے معنی رات کو سونا کے ہیں ۔

قرآن میں ہے:۔

وَكَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (۵۱-۱۷)

اور وہ (عبادت میں مشغول رہنے کے سبب رات کو بہت کم سوتے تھے ۔

اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور یہ بھی کہ وہ رات کو سوتے ہی نہیں تھے" کیونکہ قلیل کا لفظ جس طرح نہایت تھوڑی چیز کے معنی میں آتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہو اس طرح کبھی نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:۔

لَقِيْتُهٗ بَعْدَ هَجْعَةٍ کہ میں اسے رات کو کچھ دیر سو لینے کے بعد ملا اور هُجَعٌ (مثل نُوَمٌ) مدہوش اور بے خود آدمی کو کہتے ہیں۔ جو ہر چیز سے غافل ہو۔

(ھ د د)

اَلْھَدُّ کے معنی کسی چیز کو زور کی آواز کے ساتھ گرا دینے یا کسی بھاری چیز کے گر پڑنے کے ہیں اور کسی چیز کے گرنے کی آواز کو هَدَّة کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (۱۹-۹۰) زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔

اور هَدَّدْتُ الْبَقَرَةَ کے معنی گائے کو ذبح کرنے کے لئے زمین پر گرانے کے ہیں اور هِدٌّ بمعنی مهدود (یعنی گرائی ہوئی چیز کے آتا ہے جیسے ذِبْحٌ بمعنی مَذْبُوْحٌ اور کمزور بزدل آدمی کو بھی هِدٌّ کہا جاتا ہے ۔

ایک محاورہ ہے:۔

مَرَرْتُ بِرَجُلٍ هَدَّكَ مِنْ رَجُلٍ میں ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو تیرے لئے فلاں سے کافی ہے۔ اصل میں اس کے معنی ہیں کہ جس کا وجود تجھے بے چین اور مضطرب کرتا ہے۔

هَدَّدْتُ فُلَانًا وَتَهَدَّدْتُهٗ میں نے اسے دھمکایا اور ڈرایا۔

اَلْهَدْهَدَةُ بچے کو سلانے کے لئے تھپکی دینا اور ہلانا۔

اَلْهُدْهُدُ ایک جانور کا نام ہے۔ قرآن میں ہے:۔

مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ (۲۷-۲۰) کیا سبب ہے کہ ہدہد نظر نہیں آتا۔

اس کی جمع هَدَاهِدُ آتی ہے اور هُدَاهِدُ ضمہ کے ساتھ واحد ہے۔ شاعر نے کہا ہے (الکامل)

(۴۵) كَهُدَاهِدٍ كَسَرَ الرُّمَاةُ جَنَاحَهٗ
يَدْعُوْ بِقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ هَدِيْلًا

وہ اس حمام کی طرح پریشان تھا جس کے بازو شکاریوں نے توڑ دیئے ہوں اور وہ راستہ میں کھڑا واویلا کررہا ہو۔

---

[1] قاله الراعي النميري (عبيد بن حصين من فحول الشعراء) والبيت من قصيدة جمهرية ۲۳۱-۲۳۷ في نحو ۸۵ بيتا يمدح فيها عبد الملك بن مروان يشكو السعاة مطلعها: ما بال دفك بالفراش مذيلا. اقذى بعينك ام اردت رحيلا. وبعد البيت: وقع الربيع وقد تقارب خطوه. راى لعقوته ازل نسولا. البيت في الجمهرة ۳۳۵ والبلدان (رسم: بغيبغة) واللسان والصحاح (هدهد، هدل) والحيوان (۳: ۳۴۲) والجمهرة لابن دريد ۲۷ وامالي الزجاجي ۴۵ والمعاني للقتبي ۱۸۸-۳۰۰ والنشاعر شبه رجلا اخذ المصدق ابله بهدهد كسر جناحه وقبل البيت: اخذوا حمولته فاصبح قاعدا. لا يستطيع عن الديار حويلا يدعوا امير المؤمنين ودونه. خرق تجر به الرياح ذيولا. والراعي ممن ذكره الجمحي في الطبقة الاولى من الشعراء الاسلاميين وكان يقدم الفرزدق على الجرير فاستكفه فهجاه بقصيدته البائية اولها: اقلي اللوم عاذل والعتابا. وقولي ان اصبت لقد اصابا. راجع الجمحي ۲۳ والاغاني (۲۰: ۱۶۸-۱۷۳) ۱۲

(ھ د م)

اَلْهَدْمُ (ض) کے اصل معنی عمارت کو گرا دینا کے ہیں اس سے فعل هَدَمَ آتا ہے اور گری ہوئی چیز کو هَدَمٌ کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے استعارہ کے طور پر رائگاں خون کو دَمٌ هَدَمٌ کہا جاتا ہے اور یہی معنی هِدْمٌ بکسرالہا کے ہیں لیکن یہ خاص کر بوسیدہ کپڑے پر بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اَهْدَامٌ آتی ہے۔ اور هَدَّمْتُ الْبِنَاءَ کے معنی بھی عمارت کو گرا دینے کے ہیں مگر اس میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں قرآن میں ہے:

لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ (۲۲-۴۰) تو (نصاریٰ) کے صومعے کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

(ھ د ی)

اَلْهِدَايَۃُ کے معنی لطف وکرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں اور اسی سے هَدِيَّةٌ (فعلۃ) ہے جس کے معنی اس تحفہ کے ہیں جو بغیر معاوضہ دیا جائے۔ اور هَوَادِی الْوَحْشِ جنگلی جانوروں کے پیش رو دستے کو کہتے ہیں جو گلے کا رہنما ہوتا ہے۔ عرف میں دلالت اور رہنمائی کے لئے هَدَيْتُ (افعال) استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَهْدَيْتُ الْهَدِيَّةَ میں نے ہدیہ بھیجا اور اَهْدَيْتُ اِلَى الْبَيْتِ میں نے بیت اللہ کی طرف ہدی بھیجی۔ یہاں پر شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر هِدَايَه کے معنی لطف وکرم کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں تو پھر کفار کو دوزخ کی طرف دھکیلنے کیلئے یہ لفظ کیوں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (۳۷-۲۳) پھر ان کو جہنم کے راستے پر چلا دو۔

وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۲۲-۴) اور دوزخ کے عذاب کا رستہ دکھائے گا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہدایت کے اصل معنی تو لطف وکرم کے ساتھ رہنمائی کے ہی ہیں لیکن یہاں کفار کے متعلق مبالغہ کے لئے بطور تہکم یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت:

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۸۴-۲۴) تو (اے پیغمبر) انہیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔

میں عذاب کے متعلق لفظ بشارت استعمال کیا ہے اور شاعر نے اپنے کلام ( )

(۴۵۲) تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ

ان کا باہمی تحیہ تلوار کی دردناک ضرب ہے)

میں ضرب وجیع کے متعلق تحیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انسان کو اللہ تعالٰی نے چار طرف سے ہدایت کی ہے۔

(۱) وہ ہدایت ہے جو عقل وفطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے سے کی ہے اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمیع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار چیز کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰-۵۰) ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان کی خاص اغراض پورا کرنے کی) راہ دکھائی۔

(۲) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالٰی نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں

لہ قالہ عمرو بن معدی کرب وصدرہ: وخیل قد دلفت لہا بخیل .... انظر تخریجہ (رب ش ر) ۱۲

کو راہِ نجات کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ آیت:۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (۲۱-۲۴) اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے (دین کے) پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے۔ میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(۳) سوم ہدایت بمعنی توفیق خاص آیا ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۴۷-۱۷) جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں (قرآن کے سننے سے) خدا ان کو زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (۶۴-۱۱) اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ (۱۰-۹) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کئے ان کے ایمان کی برکت سے ان کو ان کا پروردگار (نجات کا) رستہ دکھائیگا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹-۶۹) اور جن لوگوں نے ہمارے دین (کے کام) میں کوشش کی۔ ہم (بھی) ان کو ضرور اپنے رستے دکھائیں گے۔

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى (۱۹-۷۶) اور جو لوگ راہ راست پر ہیں اللہ ان کو (روز بروز) زیادہ ہدایت دیتا جاتا ہے۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲-۲۱۳) تو خدا نے (اپنی عنایت سے) مسلمانوں کو راہ دکھا دی۔

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲-۱۴۲) جس کو چاہتا ہے (دین کا) سیدھا رستہ دکھاتا ہے۔

(۴) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷-۵) (بلکہ) وہ انہیں (منزل) مقصود تک پہنچا دے گا۔ اور آیت وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ میں فرمایا:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ (۷-۴۳) خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں کا رستہ دکھایا اور اگر خدا ہم کو رستہ نہ دکھاتا تو ہم رستہ نہ پا سکتے۔

ہدایت کے یہ چاروں اقسام ترتیبی درجات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی جسے پہلے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو۔ وہ دوسرے درجہ ہدایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ توشرعًا مکلف ہی نہیں رہتا۔ علیٰ ہذا القیاس جسے دوسرے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو وہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہدایت سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا اور جسے چوتھے درجہ کی ہدایت حاصل ہو تو اسے پہلے تینوں درجات لازمًا حاصل ہوں گے۔ اسی طرح تیسرے درجہ کی ہدایت کا حصول پہلے دو درجوں کی ہدایت کو مستلزم ہے اور اس کے برعکس درجہ اولیٰ کا حصول درجہ ثانیہ کو اور ثانیہ کا حصول ثالثہ کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک انسان کسی دوسرے کو صرف دعوت الی الخیر اور رہنمائی کے ذریعہ ہی ہدایت کر سکتا ہے باقی اقسام ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں لہذا جن آیات میں ہدایت کی نسبت پیغمبر یا کتاب یا دوسرے انسانوں کی طرف کی گئی ہے وہاں صرف راہ حق کی طرف رہنمائی کرنا مراد ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲-۵۲) اور بیشک (محمدؐ) سیدھا رستہ دکھلاتے ہیں۔

يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (۳۲-۲۴) جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳-۷) اور ہر ایک قوم کے لئے رہنما ہوا کرتے ہیں۔

اور جن آیات میں پیغمبروں یا دوسرے لوگوں سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہاں باقی اقسام ہدایت مراد ہیں چنانچہ فرمایا:۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (۲۸-۵۶) (اے محمد) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے۔

اور قرآن میں جہاں کہیں ظالموں اور کافروں کو ہدایت سے روک دینے کا ذکر آیا ہے۔ وہاں یا تو ہدایت بمعنی ثالث ہے یعنی وہ توفیق خاص جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا ہوتی ہے ان سے سلب کرلی جاتی ہے اور یا ہدایت بمعنی رابع ہے کہ اللہ انہیں آخرت میں ثواب کی طرف ہدایت نہیں دیگا اور نہ ہی انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ چنانچہ آیت "يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا" کے آخر میں فرمایا۔

وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۹-۱۱۹) اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (۱۶-۱۰۷) یہ اس لئے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا اور اس لئے کہ خدا کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر یا کسی انسان کے متعلق یہ کہا ہے وہ کسی کو ہدایت دینے پر قدرت نہیں رکھتے بلکہ ہدایت خدا تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تو وہاں دعوت الی الحق اور صحیح رہنمائی کے علاوہ باقی اقسام ہدایت مراد ہیں یعنی کسی کو عقل اور توفیق بخشنا یا جنت میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قدرت میں نہیں ہے چنانچہ فرمایا:۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۲-۲۷۲) (اے محمد) تم ان لوگوں کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو۔ بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ (۶-۳۵) اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔

وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ (۲۷-۸۱) اور نہ اندھوں کو گمراہی سے نکال کر رستہ دکھا سکتے ہو۔

إِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ (۱۶-۳۷) اگر تم ان (کفار) کی ہدایت کے لئے للچاؤ تو جس کو خدا گمراہ کر دیتا ہے اس کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (۳۹-۳۶) اور جس کو خدا گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ (۳۹-۳۷) اور جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۲۸-۵۶) (اے محمد) تم جس کو دوست رکھتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے۔ ہدایت کرتا ہے۔

اور اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۱۰-۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ مومن ہو جائیں۔

اور آیت:۔ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ (۱۸-۱۷) جس کو خدا ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ہدایت کا طلبگار اور متلاشی ہو اسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت یاب ہونے کی توفیق بخشتا اور راہ جنت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کے برعکس جو شخص کفر و ضلالت کا خواہاں رہتا ہے وہ توفیق الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے چنانچہ فرمایا۔
وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (۲-۲۶۴)
اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں کرتا۔
اور دوسری آیت میں کٰفِرِیْنَ کی جگہ ظٰلِمِیْنَ ہے۔ اور آیت:۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی مَنْ ھُوَ کَاذِبٌ کَفَّارٌ (۳-۳۹)
بیشک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے۔ ہدایت نہیں دیتا۔
میں کَاذِبٌ کَفَّارٌ سے مراد وہ شخص ہے جو ہدایت الٰہی کے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ اگرچہ اس کے وضعی معنی نہیں ہیں لیکن حاصل مطلب یہی ہے۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت قبول نہیں کرتا اسے اللہ بھی ہدایت نہیں بخشتا جیسے محاورہ ہے۔
مَنْ لَمْ یَقْبَلْ ھَدِیَّتِیْ لَمْ اُھْدِ لَہٗ وَ مَنْ لَمْ یَقْبَلْ عَطِیَّتِیْ لَمْ اُعْطِہٖ ...... یعنی جو شخص میرے ہدیہ یا عطیہ کو قبول نہیں کریگا میں بھی اسے ہدیہ نہیں دوں گا۔ یا آپ کہیں:۔ مَنْ رَغِبَ عَنِّیْ لَمْ اَرْغَبْ فِیْہِ کہ جو شخص مجھ سے اعراض کرتا ہے مجھے بھی اس کی ضرورت نہیں پس آیت:۔
وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۲-۲۵۸) اور خدا بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔
اور دوسری آیت میں اَلْفٰسِقِیْنَ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت:۔
اَفَمَنْ یَّھْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمْ مَّنْ لَّا یَھِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّھْدٰی (۱۰-۳۵) بھلا جو حق کا رستہ دکھلائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ یا وہ کہ جب تک کوئی اسے رستہ نہ بتلائے رستہ نہ پائے۔
میں ایک قرائت لَا یَھْدِیْ اِلَّآ اَنْ یُّھْدٰی ہے۔ یعنی وہ دوسرے کی رہنمائی نہیں کر سکتا بلکہ وہ خود رہنمائی کا محتاج ہے مطلب یہ ہے کہ ان میں علم و معرفت حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور اگر انہیں کوئی شخص ہدایت دے بھی تو بیکار ہے۔ کیونکہ وہ بت (پتھر وغیرہ کی) بے جان مورتیاں ہیں پس اِلَّآ اَنْ یُّھْدٰی سے بظاہر اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہدایت دینے سے وہ ہدایت پا سکتے ہیں۔ لیکن یہ مجاز پر محمول ہے۔ جیسا کہ محض صوری مشابہت کی وجہ سے ان بتوں کو آیت:۔
اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (۷-۱۹۴) (مشرکو) جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو تمہاری طرح کے بندے ہی ہیں۔
میں عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ کہدیا ہے حالانکہ وہ بے جان مجسے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا:
وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَھُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَیْئًا وَّلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ (۱۶-۷۳) اور خدا کے سوا ان کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمینوں میں روزی دینے کا ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ (کسی اور طرح کا) مقدور رکھتے ہیں۔
اور آیات کریمہ:۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ (۷۶-۳) اور اسے رستہ بھی دکھا دیا۔
وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (۹۰-۱۰) اور اس کو (خیر و شر

کے، دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔
وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۳۷-۱۰۸)
اور ان کو سیدھا رستہ دکھایا۔
میں خیر و شر اور ثواب و عتاب کا رستہ مراد ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے عقل و شریعت کے ذریعہ انسان کو ہدایت فرمائی ہے اور یہی معنیٰ آیت:۔
فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ (۷-۳۰) ایک فریق کو تو اس نے ہدایت دی اور ایک فریق پر گمراہی ثابت ہو چکی۔
میں مراد ہیں اور آیت: - وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ (۶۴-۱۱) اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے۔ وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔
میں ہدایت سے توفیق الٰہی مراد ہے جو کہ مومن کے دل میں القاء کی جاتی ہے اور وہ اپنے مشاغل میں اس سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۴۷-۱۷)
اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو وہ ہدایت مزید بخشتا ہے۔
لفظ ہدایت کبھی متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ لام یا الیٰ کے متعدی ہوتا ہے، چنانچہ تعدیہ بواسطہ الیٰ کے متعلق فرمایا:۔ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۳-۱۰۱) اور جس نے خدا (کی ہدایت کی رسی) کو مضبوط پکڑ لیا وہ سیدھے رستے لگ گیا۔
وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۶-۸۷) اور ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔
اور نیز فرمایا:۔
أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ (۱۰-۳۵) بھلا جو شخص حق کا رستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔
هَلْ لَكَ إِلَىٰ أَنْ تَزَكَّىٰ ....
.... وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ (۷۹-۱۸، ۱۹)
کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے اور میں تمہیں تمہارے پروردگار کا رستہ بتاؤں تاکہ تجھ میں خوف پیدا ہو۔
اور تعدیہ بنفسہ کے متعلق فرمایا:۔
وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (۴-۶۸) اور سیدھا رستہ بھی دکھاتے۔
وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۶-۸۷-۳۰) اور ہم نے انہیں سیدھا رستہ دکھایا۔
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱-۵) ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔
أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ (۴-۸۸) کیا تم چاہتے ہو کہ جس شخص کو خدا نے گمراہ کر دیا اس کو رستے پر لے آؤ۔
وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا (۴-۱۶۸) اور نہ انہیں رستہ ہی دکھائے گا۔
أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ (۱۰-۴۳) تو کیا تم اندھوں کو رستہ دکھاؤ گے۔
وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (۴-۱۷۶) اور اپنی طرف (پہنچنے کا) سیدھا رستہ دکھائے گا۔
پھر ہدایت و تعلیم دو باتوں کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی ایک یہ کہ معلم اپنی طرف سے کما حقہ سمجھانے کی کوشش کرے اور دوسرے یہ کہ متعلم استفادہ کرنے میں کوتاہی سے کام نہ لے اگر ہادی یا معلم اپنی طرف سے تعلیم میں پوری کوشش کرے لیکن متعلم میں قبولیت کی صلاحیت نہ ہو

تو اس کے عدم قبول کے لحاظ سے آپ (مجازاً) یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ہدایت نہیں کی اور ہادی کے اپنی کوشش صرف کرنے کے لحاظ سے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس نے ہدایت اور تعلیم دی پس جب عدم قبولیت کی صورت میں (نفی اور اثبات کیساتھ) دونوں طرح کہنا صحیح ہے تو کفار کے ہدایت الٰہی کو قبول نہ کرنے کے لحاظ سے یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت نہیں دی کیونکہ ہدایت و تعلیم پر قبولیت کا ثمرہ مرتب نہیں ہوا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی۔ کیونکہ انہیں مبادٔ ہدایت یعنی (عقل و حواس) عطا فرمائے۔ پس آیت:۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (۹-۱۹) اور خدا ظالم یا ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

میں نفی معنی اول (یعنی عدم قبولیت) پر محمول ہوگی اور آیت وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۴۱-۱۷) اور جو ثمود تھے ان کو ہم نے سیدھا رستہ دکھایا تھا۔ مگر انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنا پسند کیا۔

میں اثبات ہدایت دوسرے معنی بَذْلُ السَّعْیِ یعنی کوشش کرنے کے لحاظ سے ہوگا۔ لیکن جہاں قبولیت حاصل نہ ہو وہاں یہ کہنا زیادہ اولیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت کی لیکن اس نے ہدایت الٰہی کو قبول نہ کیا۔ جیساکہ آیت وَاَمَّا ثَمُوْدُ الآیۃ میں ہے اور آیت:۔

لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى قولِهٖ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (۲-۱۴۲) (تم کہہ دو) کہ مشرق اور مغرب سب خدا ہی کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے

سیدھے رستے پر چلاتا ہے الخ ...... اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی۔ پس اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس سے رہنمائی حاصل کی اور آیت:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱-۵) ہم کو سیدھے رستے چلا۔

اور آیت وَلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۴-۶۸) اور سیدھا رستہ بھی دکھا دیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ہدایت سے ہدایت عامہ یعنی قرآن اور انبیاء کے ذریعہ ہدایت کرنا مراد ہے۔ اور یہ اگرچہ ہمیں حاصل ہے۔ لیکن ہمیں حصول ثواب کے لئے ان کلمات کے زبان سے ادا کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے جس طرح کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ الخ پڑھنے یعنی آپ پر درود بھیجنے کے ہم مکلف ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آپ پر رحمت بھیجتے اور آپ کے لئے دعا اور استغفار کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ آیت:۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (۳۳-۵۶) خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں سے ثابت ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ) گمراہی اور شہوات نفسانیہ کے پنجہ میں گرفتار ہونے سے حفاظت کی دعا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں توفیق الٰہی کی طلب کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ آیت:۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۴۷-۱۷) اور جو ہدایت یافتہ ہیں وہ ان کو مزید ہدایت بخشتا ہے۔

ہیں وعدہ فرمایا ہے اور بعض نے آخرت میں ہدایت الی الجنۃ مراد لی ہے۔ اسی طرح آیت:۔

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ۔ (۲-۱۴۳) اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی۔

میں بھی ہدایت ہے۔ توفیق الٰہی مراد ہے۔ جس کا ذکر کر آیت:۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى: میں پایا جاتا ہے۔

اَلْهُدٰى اور هِدَايَة اگرچہ لغۃً ہم معنی ہیں۔ لیکن قرآن پاک نے هُدًى کا لفظ خاص کر ہدایت الٰہی کے لئے استعمال کیا ہے اور کسی انسان کی طرف اس کی نسبت نہیں کی چنانچہ فرمایا۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲-۱) خدا سے ڈرنیوالوں کی رہنما ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (۲-۵) یہی لوگ اپنے پروردگار (کی طرف) سے ہدایت پر ہیں۔

هُدًى لِّلنَّاسِ (۲-۱۸۵) لوگوں کے لئے رہنما ہے۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ (۲-۳۸) جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے (تو اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (۲-۱۲۰) کہدو کہ خدا کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ (۱۶-۳۷) اگر تم ان (کفار) کی ہدایت کے لئے للچاؤ تو جس کو خدا گمراہ کر دیتا ہے اس کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (۲-۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی۔

اَلْاِهْتِدَاءُ (ہدایت پانا) کا لفظ خاص کر اس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو امور دنیوی یا اخروی کے متعلق انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا (۶-۹۷) اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تاکہ (جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں) ان سے رستہ معلوم کرو۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا (۴-۹۸) اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں۔ کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں۔

لیکن کبھی اِهْتِدَاءٌ کے معنی طلب ہدایت بھی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۲-۵۳) اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کئے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۲-۱۵۰) سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔

فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا (۳-۲۰) اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بے شک ہدایت پالیں۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ (۲-۱۳۷) تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے

آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو تو ہدایت یاب ہو جائیں۔

اَلْمُهْتَدِیْ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالم کی اقتداء کر رہا ہو چنانچہ آیت:۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵-۱۰۴) بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے ہوں اور نہ کسی کی پیروی کرتے ہوں۔ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ نہ وہ خود عالم تھے اور نہ ہی کسی عالم کی اقتداء کرتے تھے۔ اور آیت:۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۰-۱۰۹) تو جو کوئی ہدایت حاصل کرے تو ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

میں (اِهْتَدَوْا) کا لفظ طلب ہدایت' اقتدار اور تحری ہدایت تینوں کو شامل ہے۔ اس طرح آیت:۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ (۲۷-۲۴) اور شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ کرکے دکھائے ہیں۔ اور ان کو رستے سے روک رکھا ہے پس وہ رستے پر نہیں آتے۔

میں بھی لَا يَهْتَدُوْنَ سے تینوں قسم کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے اور آیت:۔ وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (۲۰-۸۲) اور جو توبہ کرلے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے۔ پھر سیدھے راستہ پر چلے اس کو میں بخش دینے والا ہوں۔

میں اِهْتَدٰى کے معنی لگاتار ہدایت طلب کرنے اور اس میں سستی نہ کرنے اور دوبارہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے کے ہیں۔ اور آیت:۔

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ کے بعد فرمایا:۔

وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۲-۱۵۷) اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔

میں مُهْتَدُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس کے حصول کے لئے کوشش کی اور اس کے مطابق عمل بھی کیا چنانچہ الٰہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ (۴۳-۴۹) اے جادوگر اس عہد کے مطابق جو تیرے پروردگار نے تجھ سے کر رکھا ہے اس سے دعا کر بیشک ہم ہدایت یاب ہونگے۔

اور هَدْيٌ کا لفظ خاص کر اس جانور پر بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کی طرف ذبح کے لئے بھیجا جائے۔ اخفش نے اس کا واحد هَدْيَةٌ لکھا ہے نر کی طرح مادہ جانور پر بھی ہدی کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ جو بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (۲-۱۹۶) اور اگر رستے میں روک لئے جاؤ۔ تو جیسی قربانی میسر ہو کر دو۔

هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (۵-۹۵) قربانی کعبے پہنچائی جائے۔

وَالْهَدْيَ وَالْقَلَاۗىِٕدَ (۵-۹۷) اور قربانی کو اور ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹے بندھے ہوں۔

وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا (۴۸-۲۵) اور قربانیوں کو بھی کہ اپنی جگہ پہنچنے سے رکی رہیں۔

اَلْهَدِيَّةُ ان تحائف کو کہا جاتا ہے جو ہم ایک دوسرے کو پیش کرتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ (۲۷-۳۵) اور

میں ان کی طرف کچھ تحفہ بھیجتی ہوں۔
بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (۲۷-۳۶) بلکہ اپنے تحفے سے تم ہی خوش ہوتے ہو گے۔
اَلْمِهْدَى۔ طباق وغیرہ جس میں ہدیہ بھیجا جاتا ہے۔ اور اس شخص کو جو بہت زیادہ تحائف پیش کرنے کا عادی ہو اسے مِهْدَاءٌ کہا جاتا ہے۔
شاعر نے کہا ہے[۱] (الطویل)

وَاِنَّكَ مِهْدَاءُ الْخَنَا نَطِفُ النَّثَا

بیشک تو فحش گو اور بد باطن ہے۔
اَلْهَدِيُّ کے معنی قربانی کا جانور اور دلہن اور سیرت کے آتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے:۔
هَدَيْتُ الْعَرُوْسَ اِلٰى زَوْجِهَا دلہن کو شوہر کے پاس بھیجا۔ مَا اَحْسَنَ هِدْيَةَ فُلَانٍ وَهَدْيَهُ یعنی اس کی سیرت کتنی اچھی ہے۔ فُلَانٌ يُهَادٰى بَيْنَ اثْنَيْنِ فلاں دو آدمیوں پر سہارا لے کر ان کے درمیان چلتا ہے۔
تَهَادَتِ الْمَرْاَةُ عورت کا قربانی کے جانور کی طرح لڑکھڑا کر چلنا۔

(ھ ر ت)

آیت کریمہ:۔ وَمَا اُنْزِلَ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (۲-۱۰۲) اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت ماروت پر اتری تھیں۔
کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتوں کے نام ہیں اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ انسانوں یا جنوں میں سے دو شیطانوں کے نام ہیں۔ اور یہ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ سے بدل البعض ہونے کی بناء پر منصوب ہے جیسا کہ اَلْقَوْمُ قَالُوْا كَذَا زَيْدٌ وَعَمْرٌو میں زید اور عمرو قوم سے بدل البعض ہونے کی بناء پر مرفوع ہیں۔
لغت میں اَلْهَرَتُ کے معنی منہ کی باچھوں کا کشادہ ہونا کے ہیں اور اسی سے فَرَسٌ هَرِيْتُ الشِّدْقِ کا محاورہ ہے یعنی وہ گھوڑا جس کی باچھیں وسیع ہوں اور اصل میں یہ لفظ هَرَتَ (ض ن) ثَوْبَهُ سے مشتق ہے جس کے معنی کپڑا پھاڑنے کے ہیں اور جس عورت کی شرم گاہ کثرت جماع سے کشادہ ہو گئی ہو اسے اَلْهَرِيْتُ کہا جاتا ہے۔

(ھ ر ع)

هَرِعَ وَاُهْرِعَ کے معنی سختی اور تخویف سے ہانکنے اور۔۔ چلانے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے: وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ (۱۱-۷۸) اور لوط کی قوم کے لوگ ان کے پاس بے تحاشا دوڑتے ہوئے آئے۔
اور هَرِعَ بِرُمْحِهٖ فَتَهَرَّعَ کے معنی نیزے کو سرعت کے ساتھ کسی کی طرف سیدھا کرنے کے ہیں اور هَرِيْعٌ تیز رو اور چلا کر رونے والے کو کہتے ہیں۔
اَلْهَرِيْعُ (ایضًا) وَالْهَرْعَةُ چھوٹی جوں کو کہتے ہیں۔

---

[۱] قالہ حسیل بن عرفطۃ بن نضلۃ الاسدی مخضرمی رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وروی عنہ وہو ممن غیر علیہ السلام اسماءہم فسماہ حسینًا (الاصابۃ رقم ۱۷۱۷) وعدہ ابوزید فی نوادرہ من شعراء الجاہلیۃ وذکر بعضہم کما فی البیان ۳:۲۰۴۱) ہذا الاسم حسنا وہو تحریف والبیت وجدتہ بعد الکلال فی العیان (۳: ۱۰۲-۱۰۳) رقم فی ۴۹۴) فی اربعۃ ابیات وعجزہ:۔ شدید السباب رافع الصوت غالبہ۔ وفی المطبوع نطف الحشا بدل نطف النثا محرف والتصویب من المراجع ۱۲

(ھ ر ن)

ھٰرُوْنَ۔ (موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی کا نام ہے) یہ اسم عجمی ہے اور کلام عرب میں یہ مادہ مستعمل نہیں ہے۔

(ھ ز ز)

اَلْھَزُّ کے معنی کسی چیز کو زور سے ہلانے کے ہیں۔ جیسے ھَزَزْتُ الرُّمْحَ میں نے نیزہ زور سے ہلایا اِھْتَزَّ انفعال اس کا مطاوع ہے۔ اسی طرح ھَزَزْتُ فُلَانًا لِلْعَطَاءِ کے معنی ہیں "میں نے فلاں کو بخشش کے لئے حرکت دی" یعنی وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ قرآن میں ہے:۔

وَھُزِّیْٓ اِلَیْکِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ (۱۹-۲۵) اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ۔

فَلَمَّا رَاٰھَا تَھْتَزُّ کَاَنَّھَا جَآنٌّ (۲۷-۱۰) جب اسے دیکھا تو اس طرح ہل رہی تھی گویا سانپ ہے

اِھْتَزَّ النَّبَاتُ نباتات (سبزے) کا لہلہانا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ (۲۲-۵) پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو وہ شاداب ہوجاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے۔

اِھْتَزَّ الْکَوْکَبُ فِی انْقِضَاضِہٖ ستارے کا تیزی کے ساتھ ٹوٹنا اور سَیْفٌ ھَزْھَازٌ کے معنی چمکدار تلوار کے ہیں اور شفاف پانی کو مَاءٌ ھَزْھَزٌ کہا جاتا ہے اسی طرح ھُزَھِزٌ کے معنی سبک اور ہلکے پھلکے آدمی کے بھی آتے ہیں۔

(ھ ز ء)

اَلْھُزْءُ کے معنی اندرونی طور پر کسی کا مذاق اڑانے کے ہیں۔ اور کبھی یہ مذاق کی طرح کی گفتگو پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ قصداً مذاق اڑانے کے معنی میں فرمایا:۔

اِتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا (۵-۵۸) یہ اسے بھی ہنسی اور کھیل بناتے ہیں۔

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئَا نِ اتَّخَذَھَا ھُزُوًا۔ (۴۵-۹) اور جب ہماری کچھ آیتیں اسے معلوم ہوتی ہیں تو ان کی ہنسی اڑاتا ہے۔

وَاِذَا رَاٰکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا ھُزُوًا (۲۱-۳۶) اور جب کافر تم کو دیکھتے ہیں تو تم سے استہزاء کرتے ہیں۔

اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا (۲-۶۷) کیا تم ہم سے ہنسی کرتے ہو۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا (۲-۲۳۱) اور خدا کے احکام کو ہنسی (اور کھیل) نہ بناؤ۔

اس آیت میں انہیں سخت سرزنش کی ہے۔ اور ان کی خباثت پر تنبیہ کیا ہے کہ آیات الٰہی کا علم اور ان کی صداقت سے آگاہ ہونے کے بعد ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ھَزِئْتُ بِہٖ وَاسْتَھْزَاْتُ کے معنی کسی کا مذاق اڑانے کے ہیں اور اَلْاِسْتِھْزَاءُ اصل میں طلب ھزء کو کہتے ہیں۔ اگرچہ کبھی اس کے معنی مذاق اڑانا بھی آجاتے ہیں جیسے اِسْتِجَابَةٌ کے اصل معنی طلب جواب کے ہیں۔ اور یہ اِجَابَةٌ (جواب دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) چنانچہ قرآن میں ہے:۔

قُلْ اَبِاللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ وَرَسُوْلِہٖ کُنْتُمْ تَسْتَھْزِءُوْنَ (۹-۶۵) کہو کیا تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی کرتے تھے۔

وَحَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ۔ (۱۱-۸) اور جس چیز کے ساتھ یہ استہزاء کیا کرتے

تھے وہ ان کو گھیر لے گی۔
وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۱۵-۱۱) اور ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا تھا مگر اس کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔
أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا (۴-۱۴۰) کہ جب تم (کہیں) سنو کہ خدا کی آیتوں سے انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔
وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ (۶-۱۰) اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمسخر ہوتے رہے۔
حقیقی معنی کے لحاظ سے استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے جیسا کہ لہو ولعب کا استعمال باری تعالیٰ کے حق میں جائز نہیں ہے لہذا آیت:۔
اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۲-۱۵) (ان منافقوں سے) خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت وسرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔
میں يَسْتَهْزِئُ کے معنی یا تو اسْتِهْزَاء کی سزا دینے کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ دیر تک مہلت دی اور پھر انہیں دفعۃً پکڑ لیا یہاں انہاں کو استہزاء سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اس سے انہوں نے هُزُوٌ کی طرح دھوکا کھایا پس یہ استدراج کے ہم معنی ہے جیسے فرمایا:۔
سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ۔ (۷-۱۸۲) ان کو بتدریج اس طرح سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔
اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر وہ استہزاء اڑاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے استہزاء سے باخبر ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ بھی ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو دھوکا دے۔ اور وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہو کر اسے اطلاع دیئے بغیر اس سے احتراز کرے تو کہا جاتا ہے سَخِرَ عَنْهُ یعنی وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہے۔
ایک حدیث میں ہے[1] (۱۵۸) إِنَّ الْمُسْتَهْزِئِينَ فِي الدُّنْيَا يُفْتَحُ لَهُمْ بَابٌ مِنَ الْجَنَّةِ فَيُسْرِعُونَ نَحْوَهُ فَإِذَا انْتَهَوْا إِلَيْهِ سُدَّ عَلَيْهِمْ۔ کہ جو لوگ دنیا میں دین الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں قیامت کے دن ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائیگا جب یہ لوگ اس میں داخل ہونے کے لئے سرپٹ دوڑ کر وہاں پہنچیں گے تو وہ دروازہ بند کر دیا جائیگا چنانچہ آیت:۔ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ (۸۳-۳۴) تو آج مومن کافروں سے ہنسی کریں گے۔
میں بعض کے نزدیک ضحک سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۹-۷۹) خدا ان پر ہنستا ہے اور ان کے لئے تکلیف دینے والا عذاب تیار ہے۔
میں بھی اسی قسم کی تاویل ہو سکتی ہے۔

(ھ ز ل)

اَلْهَزْلُ کے معنی لاحاصل اور بے نتیجہ بات کے ہیں گویا وہ هُزَالٌ (لاغری) ہے۔
قرآن میں ہے:۔
إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶-۱۳-۱۴) کہ یہ کلام (حق کو باطل سے) جدا کرنے والا ہے اور بیہودہ بات نہیں۔

---

[1] روی عن ابن عباس وغیرہ من التابعین تحت تفسیر الآیۃ "فضرب بینھم بسور باطنہ فیہ الرحمۃ وظاھرہ من قبلہ العذاب" (الحدید)

(ھ ز م)

اَلْھَزْمُ کے اصل معنی کسی خشک چیز کو دبا کر توڑ دینے کے ہیں۔ خشک اور پرانے مشکیزہ کو دبا کر توڑ ڈالنے یا تربوز کاکڑی وغیرہ کے توڑنے پر ھزم کا لفظ بولا جاتا ہے اور اسی سے ضربیت (بمعنی شکست) ہے جس طرح حَطْمٌ یا کَسْرٌ کا لفظ بمعنی شکست کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ھَزَمَ کا لفظ بھی اس معنی میں بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: فَھَزَمُوْھُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ تو طالوت کی فوج نے خدا کے حکم سے ان کو ہزیمت دی۔ (۲-۲۵۱) جُنْدٌ مَّا ھُنَالِکَ مَھْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ۔ (۳۸-۱۱) یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے یہ بھی ایک لشکر ہے۔

اور فَاقِرَۃٌ کی طرح ھَازِمَۃٌ بھی بڑی مصیبت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: اَصَابَتْہُ ھَازِمَۃُ الدَّھْرِ اسے بڑی مصیبت پہنچی۔

ھَزَمَ الرَّعْدُ گرج کی آواز کا شکستہ ہونا۔

اَلْمِھْزَامُ ایک لکڑی جس کے سرے پر آگ لگا کر بچے کھیلتے ہیں۔ گویا وہ اس سے دوسرے لڑکوں کو ہزیمت دیتے ہیں اور کمینے روٹی تخص کے متعلق ھَزَمَ یا تَھَزَّمَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(ھ ش ش)

اَلْھَشُّ (ض) کے معنی بھی ھَزٌّ کی طرح کسی چیز کو حرکت دینے کے ہیں۔ لیکن یہ کسی نرم چیز کو حرکت دینے پر بولا جاتا ہے جیسے ھَشَّ الْوَرَقَ درخت سے پتے جھاڑنا۔ قرآن میں ہے:

وَاَھُشُّ بِھَا عَلٰی غَنَمِیْ (۲۰-۱۸) اور اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں۔

ھَشَّ الرَّغِیْفُ فِی التَّنُّوْرِ روٹی کا تنور میں پھول کر نرم ہوجانا۔

نَاقَۃٌ ھَشُوْشٌ نرم مزاج اور بہت دودھ دینے والی اونٹنی اور وہ گھوڑا جسے بہت زیادہ پسینہ آئے۔ اسے بھی ھَشُوْشٌ کہا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس گھوڑے کو پسینہ نہ آئے اسے صَلُوْدٌ کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ ھَشُّ الْوَجْہِ ھَشَاشٌ بشاش آدمی۔

اور ھَشَشْتُ وَھَشِشْتُ لِلْمَعْرُوْفِ (ن س) سخاوت کے وقت خوش ہونا۔

فُلَانٌ ذُوْ ھَشَاشٍ نیک خو اور سخی مرد۔

(ھ ش م)

اَلْھَشْمُ۔ اصل میں سوکھی یا نرم چیز کے توڑنے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

فَاَصْبَحَ ھَشِیْمًا تَذْرُوْہُ الرِّیَاحُ (۱۸-۴۵) پھر وہ چورا چورا ہو گئی کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔

فَکَانُوْا کَھَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴-۳۱) تو وہ ایسے ہو گئے جیسے باڑ والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔

اور ہڈی وغیرہ سخت چیز کے توڑنے پر ھَشْمٌ بولا جاتا ہے اور اسی سے ھَشَمْتُ الْخُبْزَ کا محاورہ ہے جس کے معنی سوکھی روٹی کو توڑ کر ثرید بنانے

لہ دایضاً انظر (۷۳:۵ - ۴۸)

کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے (۱)

(۵۱۴) عَمْرُو الْعُلَا هَشَمَ الثَّرِيْدَ لِقَوْمِهِ
وَرِجَالُ مَكَّةَ مُسْنِتُوْنَ عِجَافُ

عمروالعلا نے خشک سالی نے زمانہ میں اپنی قوم کو ثرید کھلایا جب کہ مکہ کے سردار قحط سالی کی وجہ سے دبلے ہو رہے تھے۔

هَاشِمَةٌ سر کا زخم جس سے کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ جائے۔

اِهْتَشَمَ كُلَّ مَا فِي ضَرْعِ النَّاقَةِ اونٹنی کے پستانوں سے تمام دودھ نچوڑ لیا۔ محاورہ ہے۔ تَهَشَّمَ فُلَانٌ عَلَى فُلَانٍ کسی پر مہربان ہونا۔

(ھ ض م)

اَلْهَضْمُ (ض) کے اصلی معنی کسی نرم چیز کو کچلنا کے ہیں۔ محاورہ ہے:۔ هَضَمْتُهٗ فَانْهَضَمَ میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ ٹوٹ گیا۔ اور باریک سرکنڈا جسے بانسری کی طرح بجایا جاتا ہے اسے مَهْضُوْمَةٌ کہتے ہیں اور اسی سے نازک بانسری کو مِزْمَارٌ مُهْضَمٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہونے کی وجہ سے کچلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اَلْهَاضُوْمُ کھانا ہضم کرنے کا چورن بَطْنٌ هَضُوْمٌ پچکا ہوا پیٹ۔ كَشْحٌ مُهْضَمٌ پتلی کمر۔ اِمْرَأَةٌ هَضِيْمَةُ الْكَشْحَيْنِ پتلی کمر والی عورت اور استعارہ کے طور پر هَضْمٌ بمعنی ظلم بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰-۱۱۲) تو اس کو نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ نقصان کا۔

(ھ ط ع)

هَطَعَ الرَّجُلُ بِبَصَرِهٖ کے معنی ہیں اس نے نظر جما کر دیکھا اور گردن اٹھا کر چلنے والے اونٹ کو بَعِيْرٌ مُهْطِعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ (۱۴-۴۳) (اور لوگ) سر اٹھائے ہوئے (میدان قیامت کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے۔ ان کی نگاہیں ان کی طرف لوٹ نہ سکیں گی۔

مُهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ (۵۴-۸) اس بلانے والے کی طرف دوڑتے جاتے ہوں گے۔

(ھ ل)

هَلْ یہ حرف استخبار اور کبھی استفہام کے لئے آتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے:۔ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا۔

---

(۱) عمرو العلا ی ہاشم بن عبد مناف جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویکنی ابا نضلۃ راجع الطبقات (۱: ۳۴) والاشتقاق والبدایۃ والنہایۃ (۲: ۲۵۳) ورسائل جاحظہ ۲ ونوادر ابی زید ۱۶۷ وصبح الاعشی (۱: ۱۵۸) والبخلاء ۲۳۰ والخلاف فی القائل نسبہ بعضہم الی ابن الزبعری راجع السیرۃ (۱: ۹۴) وابن ابی الحدید (۳: ۴۵۲) والعینی (۴: ۱۴۰) وامالی المرتضی (۱: ۱۵۸ / ۲: ۲۶۹) وفی اللسان (ہشم) منسوب الی بنت ہاشم وفی الکامل ۲۱۷ بغیر عزو وفیہ عمرو الذی بدل عمرو العلا وقال الصواب عمرو العلی والشطر الثانی فی البحر (۵: ۳۰۰) وفی تاریخ الطبری (۲: ۱۲) نا المرزبانی ۳۰ قاله مطرود بن کعب الخزاعی ۱۲

(۲۰-۹۹) کہدو کہ تمہارے پاس کوئی سند ہے (اگر ہے تو) اسے ہمارے سامنے نکالو۔

اور کبھی تنبیہ، تبکیت یا نفی کے لئے چنانچہ آیات:۔

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا (۱۹-۹۸) بھلا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا کہیں ان کی بھنک سنتے ہو۔

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (۱۹-۶۵) بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷-۳) ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو کیا تجھے (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے۔

میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیات:۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ (۲-۲۱۰) کیا یہ لوگ اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان پر خدا (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں نازل ہو اور فرشتے بھی اتر آئیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۶-۱۵۸) یہ اس کے سوا اور کس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ (۴۳-۶۶) یہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ قیامت ......

هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷-۱۴۷) یہ جیسے عمل کرتے ہیں ویسا ہی ان کو بدلہ ملے گا۔

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۲۱-۳) یہ شخص کچھ بھی نہیں ہے مگر تمہارے جیسا آدمی ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر تنبیہ اور اس کی سطوت سے تخویف کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:۔

(ھ ل ل)

اَلْهِلَالُ مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کے چاند کو کہتے ہیں پھر اس کے بعد سے قمر کہا جاتا ہے اس کی جمع اَهِلَّةٌ ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (۲-۱۸۹) (اے محمدؐ) لوگ تم سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے) کہدو کہ وہ لوگوں کے (کاموں) کی میعادیں اور حج کے وقت معلوم ہونیکا ذریعہ ہے یعنی ہلال کے طلوع ہونے اور اس کے کم و بیش ہونے کی حکمت پوچھتے ہیں۔

تشبیہ کے طور پر ھِلَالٌ کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) شکار کرنے کا نیزہ جو ہلال کی طرح دو شاخ کا ہوتا ہے (۲) ایک قسم کا زہریلا سانپ (۳) کنویں کے تلے میں تھوڑا سا پانی جو گول دائرے کی شکل پر ہوتا ہے (۴) چکی کا کنارہ۔ (جب کہ ٹوٹ جائے)۔

اَهَلَّ الْهِلَالُ کے معنی چاند نظر آنے کے ہیں۔ اور اُسْتُهِلَّ کے معنی رویت ہلال ہیں لیکن کبھی استہلال بمعنی صلال بھی آجاتا ہے جیسے اِسْتِجَابَةٌ بمعنی اِجَابَةٌ۔ اَلْاِهْلَالُ کے معنی چاند نظر آنے پر آواز بلند کرنے کے ہیں پھر یہ لفظ عام آواز بلند کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اسی سے تشبیہاً اَهَلَّ الصَّبِيُّ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بچے نے آواز بلند کی اور آیت:۔

وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ (۲-۱۷۳) اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے۔

کے معنی ہیں کہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے یعنی جو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ اَلْهَلَلُ اور تَهْلِيْلٌ کے معنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے کے ہیں اور یہ لفظ جملہ مخفف

لہ والمعروف لفظ التفعیل

ہے۔ جیسا کہ تَبَسْمَلَ وَبَسْمَلَۃٌ اور تَحَوْقَلَ وَحَوْقَلَۃٌ کے معنی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہنے کے ہیں اور اسی سے اَھْلَالٌ بِالْحَجِّ ہے جس کے معنی بلند آواز سے تلبیۃ کہنے کے ہیں اور باریک جھرجھرے کپڑے کو ثوب مُھَلْھَلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شعر مُھَلْھَلٌ ہے جس کے معنی عمدہ شعر کے ہیں۔

(ھ ل ک)

اَلْھَلَاکُ یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے ایک یہ کہ کسی چیز کا اپنے پاس سے جاتے رہنا خواہ وہ دوسرے کے پاس موجود ہو جیسے فرمایا:۔ ھَلَکَ عَنِّیْ سُلْطَانِیَہْ (۶۹-۲۹) ہائے میری سلطنت خاک میں مل گئی۔

دوسرے یہ کہ کسی چیز میں خرابی اور تغیر پیدا ہو جانا۔ جیسا کہ طعام (کھانا) کے خراب ہونے پر ھَلَکَ الطَّعَامُ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَیُھْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (۲-۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے۔

۳ موت کے معنی میں جیسے فرمایا:۔ اِنِ امْرُؤٌ ھَلَکَ (۴-۱۷۶) اگر کوئی ایسا مرد مر جائے۔

اور قرآن نے کفار کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔ وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ (۴۵-۲۴) اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔

قرآن پاک میں ہلاکت کا لفظ بری موت کے لئے استعمال ہوا ہے صرف آیت (۲-۲۵) اور آیت:۔ وَلَقَدْ جَآءَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمْ بِہٖ حَتّٰی اِذَا ھَلَکَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ مِنْۢ بَعْدِہٖ رَسُوْلًا (۴۰-۳۴) اور پہلے یوسف (علیہ السلام) بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔ تو جو وہ لائے تھے اس سے تم ہمیشہ شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔

میں موت کے معنی مراد ہیں۔ چہارم یہ کہ کسی چیز کا اس دنیا سے کلی طور پر معدوم ہو جانا۔ اور یہی معنی فنا کے ہیں جس کی طرف کہ آیت:۔ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ (۲۸-۸۸) اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے ۵ عذاب خوف اور فقر پر بھی ہلاکت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیات:۔ وَمَا یُھْلِکُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (۶-۲۶) مگر (ان باتوں سے) اپنے آپ ہی کو ہلاک کرتے ہیں اور (اس سے) بے خبر ہیں۔

وَکَمْ اَھْلَکْنَا قَبْلَھُمْ مِّنْ قَرْنٍ (۱۹-۷۴) اور ہم نے ان سے پہلے بہت سی امتیں ہلاک کر دیں۔

وَکَمْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا (۷-۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے تباہ کر ڈالیں۔

فَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا (۲۲-۴۵) اور بہت سی بستیاں ہیں کہ ہم نے ان کو تباہ کر ڈالا۔

اَتُھْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَھَآءُ مِنَّا (۷-۱۵۵) کیا تو اس فعل کی سزا میں جو ہم سے بے عقل لوگوں نے کیا ہے ہمیں ہلاک کر دے گا۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور آیت:۔ فَھَلْ یُھْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶-۳۵) سو اب وہی ہلاک ہوں گے۔ جو نافرمان تھے۔

میں ہلاکت سے ہلاکت کبریٰ یعنی عذاب مراد ہے۔ جس کے متعلق آنحضرت نے ارشاد فرمایا (۱۵۹)

لَا شَرَّ بِشَرٍّ بَعْدَهُ النَّارُ کہ اس شر کے برابر کوئی شر نہیں ہے جس کے بعد دوزخ کا سامنا ہو۔ اور فرمایا:۔
وَمَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهٖ (۲۷-۴۹) اور ہم تو اس کے گھر والوں کے موقعہ ہلاکت پر گئے ہی نہیں۔
اَلتَّهْلُكَةُ کے معنی ہلاک کرنے کے ہیں اور جو چیز مُؤَدِّيْ إِلَى الْهَلَاكِ یعنی موجب ہلاکت ہو اسے تَهْلُكَةٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (۲-۱۹۵) اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔
اور اِمْرَءَةٌ هَلُوْكٌ کے معنی نازک خرام عورت کے ہیں۔ گویا وہ چلتے وقت زمین پر گری پڑتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۴۵۴) مَرِيْضَاتُ أَوْبَاتِ التَّهَادِيْ كَأَنَّمَا
تَخَافُ عَلٰى أَحْشَائِهَا أَنْ تَقَطَّعَا

وہ عورتوں کے درمیان مریض کی طرح لڑکھڑا کر اس انداز سے چلتی ہے گویا اسے اپنی کمر یا انتڑیوں کے کٹ جانے کا اندیشہ ہے۔
اور کنایتہ کے طور پر هَلُوْكٌ بدکار عورت کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی مائل ہو کر خراماں چلتی ہے۔
اَلْهَالِكِيُّ اصل میں یہ هَالِكَةٌ قبیلہ کے ایک آہنگر کا نام تھا۔ پھر اس مناسبت سے ہر آہنگر کو هَالِكِيٌّ کہا جانے لگا ہے۔
اَلْهُلْكُ (ایضاً) برباد ہونے والی چیز۔

(ھ ل م)

هَلُمَّ (اسم فعل) کے معنی کسی چیز کی طرف بلانے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل هَا لُمَّ ہے۔ اور یہ لَمَمْتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے جس کے معنی اصلاح کرنے کے ہیں۔ ھا کا الف حذف ہونے کے بعد هَلُمَّ بن گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل هَلْ × اَمَّ ہے گویا یہ اصل میں هَلْ لَكَ فِيْ كَذَا أَمَّهُ ...... (بمعنی قصدہ) کا مخفف ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْقَائِلِيْنَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا (۳۳-۱۸) اور اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔
بعض اسے فعل غیر متصرف مانتے ہیں اور تثنیہ جمع (نیز تذکیر وتانیث) میں اسے ایک ہی حالت پر رہنے دیتے ہیں اور قرآن بھی اسی کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اور بعض فعل متصرف مانتے ہیں (اور آخر میں ضمائر کا الحاق کرتے ہیں جیسے) هَلُمَّا، هَلُمُّوْا، هَلُمِّيْ، هَلْمُمْنَ۔

(ھ م م)

اَلْهَمُّ کے معنی پگھلا دینے والے غم کے ہیں۔ اور یہ هَمَمْتُ الشَّحْمَ فَانْهَمَّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں میں نے چربی کو پگھلایا چنانچہ وہ پگھل گئی اصل میں هَمٌّ کے معنی اس ارادہ کے ہیں جو ابھی دل ہی میں ہو۔ شاعر نے کہا ہے[2] (

(۴۵۵) وَهَمُّكَ مَا لَمْ تُمْضِهٖ لَكَ مُنْصِبٌ

اور جب تک تو اپنے ارادے کو پورا نہ کرے وہ تجھے بے چین رکھے گا۔ قرآن میں ہے:۔
إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَّبْسُطُوْا (۵-۱۱) جب ایک جماعت نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں۔

---

[1] فی الحماسۃ لابی تمام (۲: ۳۰۹) قالہ مسلم بن الولید وفی المرزوقی رقم ۸۹۸ لہ: "آخر" وفی المحاضرات للمؤلف (۲: ۱۳۹) وتستحسن للسعدی ای لرجل من بنی سعد وبعدہ: تسیب انسیاب الایم اخصرہ الندی ۔ فرفع من اعطافہ ما ترفعا۔ والبیتان فی الحیوان (۴: ۲۵۹) وفی روایۃ مریضۃ انشاد التہادی ویرفع من المرآۃ بدل فرفع من اعطافہ والبیت فی مجموعۃ المعانی ۲۵۹۔ [2] لم اجدہ

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا (۱۲-۲۴) اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور وہ اس کا قصد کر لیتے (اگر)
اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (۳-۱۲۲) اس وقت تم میں سے دو جماعتوں نے جی چھوڑ دینا چاہا۔
لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ (۴-۱۱۳) تو ان میں سے ایک جماعت ... قصد کر ہی چکی تھی۔
وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (۹-۷۴) اور وہ ایسی بات کا قصد کر چکے ہیں جس پر قدرت نہیں پا سکے۔
وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ (۹-۱۳) اور انہوں نے پیغمبر (خدا) کے جلا وطن کرنے کا عزم مصمم کر لیا۔
وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ (۴۰-۵) اور ہر امت نے اپنے پیغمبر کے بارے میں یہی قصد کیا کہ ......
اَهَمَّنِيْ كَذَا مجھے فلاں چیز نے بے چین کر دیا چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ (۳-۱۵۴) اور کچھ لوگ جن کو جان کے لالے پڑ رہے تھے محاورہ ہے:۔
هٰذَا رَجُلٌ هَمُّكَ مِنْ رَجُلٍ اِذْ هَمَّتُكَ مِنْ رَجُلٍ وہ آدمی تجھے بس کرتا ہے (بمعنی ناهيك) اَلْهَوَامُّ حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑے۔
رَجُلٌ هِمٌّ پیر فرتوت مؤنث هِمَّةٌ گویا کبر سنی نے اسے پگھلا دیا ہے۔

(ھ م د)

هَمَدَتِ النَّارُ کے معنی آگ کا بجھ جانا کے ہیں۔ اور خشک اور بنجر زمین کو اَرْضٌ هَامِدَةٌ کہتے ہیں اور نَبَاتٌ هَامِدَةٌ کے معنی خشک گھاس کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً (۲۲-۵) اور (اے دیکھنے والے) تو دیکھتا ہے (کہ ایک وقت میں) زمین خشک پڑی ہوتی ہے۔ اَلْاِهْمَادُ (افعال) کے معنی کسی جگہ اقامت کر لینے کے ہیں گویا وہ سکونت پذیر ہو کر بجھ گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اہماد کے معنی سرعت رفتاری کے بھی آتے ہیں۔ اگر یہ قول صحیح ہو تو یہ لفظ اِشْكَاءٌ کی طرح (اضداد سے ہوگا۔ جو کبھی شکایت کرنے اور کبھی ازالہ شکایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(ھ م ر)

اَلْهَمْرُ (ض) کے معنی آنسو یا پانی بہا دینے کے ہیں۔ جیسے:۔ هَمَرَهٗ فَانْهَمَرَ۔ اس نے پانی بہایا چنانچہ وہ بہہ پڑا۔ قرآن میں ہے:۔
فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ (۵۴-۱۱) پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دہانے کھول دیئے۔
هَمَرَ مَا فِي الضَّرْعِ تھنوں سے تمام دودھ دوہ لینا۔ هَمَرَ الرَّجُلُ فِي الْكَلَامِ مرد باتوں میں بہ جانا یعنی بکواس کرنا فُلَانٌ يُهَامِرُ الشَّيْءَ کوئی چیز مقدار سے زیادہ لے لینا۔ جیٹ کر جانا اور اسی سے محاورہ ہے:۔
هَمَرَ لَهٗ مِنْ مَّالِهٖ اس نے اسے بہت زیادہ مال دیا۔
اَلْهَمِيْرَةُ بہت بوڑھی عورت۔

(ھ م ز)

اَلْهَمْزُ کے اصل معنی کسی چیز کو دبا کر نچوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: هَمَزْتُ الشَّيْءَ فِيْ كَفِّيْ میں نے فلاں چیز کو اپنی ہتھیلی میں دبا کر نچوڑا اور اس سے حرف ہمزہ ہے جو کہ زبان کو جھٹکا دے کر پڑھا جاتا ہے اور هَمْزٌ کے معنی غیبت کرنا بھی آتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (۶۸-۱۱) طعن آمیز اشارتیں کرنے والا چغلیاں لئے پھرنے والا۔ اور هَامِزٌ وَهُمَزَةٌ وَهَمَّازٌ کے معنی عیب چینی کرنے والا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ (۱۰۴-۱) ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغلخور کی خرابی ہے۔
شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)
(۵۶م) وَاِنِ اغْتَیَبْتُ فَاَنْتَ الْھَامِزُ اللُّمَزَۃ
اگر غیبت کی جائے تو تو طعن آمیز اشارتیں کرنے والا بدگو ہے۔
قرآن میں ہے:۔ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ (۲۳-۹۷) کہو اے پروردگار میں شیاطین کے وساوس سے پناہ مانگتا ہوں۔

(ھ م س)

اَلْھَمْسُ کے معنی خفی آواز کے ہیں اور ھَمْسُ الْاَقْدَامِ کے معنی ہیں پاؤں کی ہلکی سی آہٹ۔ قرآن میں ہے:۔ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا ھَمْسًا (۲۰-۱۰۸) تو تم خفی آواز کے سوا کوئی آواز نہ سنو گے۔

(ھ نا)

ھُنَا (یہاں) یہ زمانہ اور جگہ قریب کی طرف اشارہ کرنے کے آتا ہے لیکن عموماً جگہ کیطرف اشارہ کیلئے استعمال ہوتا ہے اور ذا، ذاک، ذالک کی طرح ھُنَا ھُنَاکَ وَھُنَالِکَ تینوں طرح بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ جُنْدٌ مَّا ھُنَالِکَ مَھْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (۳۸-۱۱) یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے یہ بھی ایک لشکر ہے۔

اِنَّا ھٰھُنَا قَاعِدُوْنَ (۵-۲۴) ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔
ھُنَالِکَ تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ (۱۰-۳۰) وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہونگے آزمائش کرلے گا۔
ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳۳-۱۱) وہاں مؤمن آزمائے گئے۔
ھُنَالِکَ الْوَلَایَۃُ لِلّٰہِ الْحَقِّ (۱۸-۴۴) یہاں سے ثابت ہوا کہ حکومت سب خدائے برحق کی ہے۔
فَغُلِبُوْا ھُنَالِکَ (۷-۱۱۹) اور وہ مغلوب ہوگئے۔

(ھ ن)

ھَنٌ۔ شرمگاہ یا اس قسم کی قبیح الذکر چیزوں سے کنایہ ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:۔ فِیْ فُلَانٍ ھَنَاتٌ فلاں میں بری خصلتیں ہیں اور روایت (۱۰) سَتَکُوْنُ ھَنَاتٌ (عنقریب فتنہ وفساد ظاہر ہوں گے) میں بھی ھَنَات اسی معنی پر محمول ہے۔

(ھ ن ء)

اَلْھَنِیْءُ۔ ہر وہ چیز جو بغیر مشقت کے حاصل ہو جائے اور نتائج کے اعتبار سے بھی خوش کن ہو اصل میں یہ لفظ طعام کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور ھَنِیءَ الطَّعَامُ فَھُوَ ھَنِیْءٌ کے معنی طعام کے خوشگوار ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَکُلُوْہُ ھَنِیْئًا مَّرِیْئًا (۴-۴) اس کو ذوق شوق سے کھالو۔

---

[1] البیت لزیاد الاعجم وصدرہ: وقد نبئت بودی اذا لاقیتنی ۔۔۔۔ وفی روایۃ فان اُغیّب علی البناء للمجہول وفی روایۃ اللسان (ہمز) والطبری (۳۰، ۲۲۹) وان تغیبت وکنتَ بدل فانت والبیت من شواہد ابی عبیدۃ فی مجازہ رقم ۴ ۲۹ وفی روایتہ. اذا لقیتک تبدی لی مکاشرۃ. وان اغیب فانت العائب اللمزۃ. راجع ایضاً شواہد الکشاف ۔۴ واللسان (ہمز) والطبری (۱-۱۵۶) (۳۰، ۲۹) والسجاوندی (۱: ۲۰) واصلاح یعقوب ۲۸۴ واعراب ثلاثین ۱۸۰ وزیاد الاعجم ہو زیاد بن سلیمان الاعجم ویکنی ابا امامۃ لہ ترجمۃ فی المؤتلف ۱۳۲ والاغانی (۱۴: ۹۸) ۱۲

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (۶۹-۲۴) اور جو عمل تم ایام گزشتہ میں آگے بھیج چکے ہو۔ اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷۷-۴۳) جو عمل تم کرتے رہے تھے اسکے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔
اَلْهِنَاءُ۔ ایک قسم کا تارکول جو خارشی اونٹ پر ملا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: هَنَأْتُ الْاِبِلَ فَهِيَ مَهْنُوْءَةٌ یعنی میں نے اونٹ پر تارکول ملا۔

(ھ و د)

اَلْهُوْدُ کے معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا کے ہیں اور اسی سے اَلتَّهْوِيْدُ (تفعیل) ہے جسکے معنی رینگنے کے ہیں۔ لیکن عرف میں هَوْدٌ بمعنی تَوْبَةٌ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ (۷-۱۵۶) ہم تیری طرف رجوع ہو چکے۔
بعض نے کہا ہے لفظ یہود بھی اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ سے ماخوذ ہے۔ یہ اصل میں ان کا تعریفی لقب تھا لیکن ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد ان پر بطور علم جنس کے بولا جاتا ہے نہ کہ تعریف کے لئے جیسا کہ لفظ نصاریٰ اصل میں مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ سے ماخوذ ہے۔ پھر ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد انہیں اسی نام سے اب تک پکارا جاتا ہے۔ هَادَ فُلَانٌ کے معنی یہودی ہو جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا (۲-۶۲) جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی۔
کیونکہ کبھی اسم علم سے بھی مسمیٰ کے اخلاق و عادات کا لحاظ کر کے فعل کا اشتقاق کر لیتے ہیں مثلاً ایک شخص فرعون کی طرح ظلم و تعدی کرتا ہے تو اس کے متعلق تَفَرْعَنَ فُلَانٌ (کہ فلاں فرعون بنا ہوا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح تَطَفَّلَ فُلَانٌ کے معنی طفیلی یعنی طفیل نامی شخص کی طرح بن بلائے کسی کا مہمان بننے کے ہیں۔ تَهَوَّدَ فِيْ مَشْيِهٖ کے معنی نرم رفتاری سے چلنے کے ہیں اور یہود کے تورات کی تلاوت کے وقت آہستہ آہستہ جھومنے سے یہ معنی لئے گئے ہیں۔
هَوَّدَ الرَّائِضُ الدَّابَّةَ رائض کا سواری کو نرمی سے چلانا هُوْدٌ اصل میں هَائِدٌ کی جمع ہے جس کے معنی تائب کے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کا نام ہے[ل]۔

(ھ و ر)

هَارَ الْبِنَاءُ تَهَوَّرَ کے معنی ہیں عمارت منہدم ہو گئی اور یہی معنی اِنْهَارَ کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ (۹-۱۰۹) اگر جانے والی کھائی کے کنارے پر رکھی گود اس کو دوزخ کی آگ میں لے گری۔
ایک قرأت میں هَارٌ ہے اور بِئْرٌ هَائِرٌ وَهَارٌ وَهَارٍ و مُهَارٌ ویران کنویں کو کہتے ہیں پھر ویران کنویں کی مناسبت سے۔۔۔۔ کمزور اور عاجز آدمی کو بھی هَارٍ یا هَائِرٌ کہا جاتا ہے۔
تَهَوَّرَ اللَّيْلُ رات کا سخت تاریک ہونا۔
تَهَوَّرَ الشِّتَاءُ کے معنی جاڑے کا اکثر موسم گزر جانے کے ہیں اور بعض نے تَهَيَّرَ کہا ہے جو اجوف یائی (دھری) رسے ہے کیونکہ اگر یہ واوی ہوتا تو تَهَيَّرَ کی بجائے تَهَوَّرَ کہا جاتا۔

[ل] ہود بن عبداللہ یتصل نسبہ الی نوح علیہ السلام بسبع وسائط ارسل الی قوم عاد انظر لقصتہ فی القرآن (۷-۶۵ تا ۷۲ ; ۲۶-۱۲۳ تا ۱۴۰ ; ۴۶-۲۱ تا ۲۶)

(ھ و ن)

اَلْھَوَانُ۔ اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ۱؎ انسان کا کسی ایسے موقعہ پر نرمی کا اظہار کرنا جس میں اس کی سبکی نہ ہو یہ قابل ستائش ہے چنانچہ فرمایا۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا (۲۵-۶۳) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر متواضع ہو کر چلتے ہیں۔

اور آنحضرت سے مروی ہے (۱۶) اَلْمُؤْمِنُ ھَیِّنٌ لَیِّنٌ۔ کہ مومن متواضع اور نرم مزاج ہوتا ہے۔ دوم ھَوَانٌ بمعنی ذلت اور رسوائی کے آتا ہے یعنی دوسرا انسان اس پر متسلط ہو کر اسے سبکسار کرے تو یہ قابل مذمت ہے چنانچہ اس معنی میں فرمایا۔ فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ (۶-۹۳) سو آج تم کو ذلت کا عذاب ہے۔ فَاَخَذَتْھُمْ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْھُوْنِ (۴۱-۱۷) تو ... کڑک نے ان کو آپکڑا اور وہ ذلت کا عذاب تھا۔ وَلِلْکَافِرِیْنَ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۲-۹۰) اور کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۳-۱۷۸) اور آخر کار ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔ فَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۲۲-۵۷) انکے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔ وَمَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ (۲۲-۱۸) اور جس کو خدا ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔

ھَانَ الْاَمْرُ عَلٰی فُلَانٍ (علی کے ساتھ) کے معنی کسی معاملہ کے آسان ہونیکے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے: ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ (۱۹-۲۱) کہ یہ مجھے آسان ہے۔ وَھُوَ اَھْوَنُ عَلَیْہِ (۳۰-۲۷) اور یہ اس پر بہت آسان ہے۔ وَتَحْسَبُوْنَہٗ ھَیِّنًا (۲۴-۱۵) اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے ہو۔

ھَاوُوْنَ۔ کنڈی یہ ھَوْنٌ سے ہے اور چونکہ فَاعُوْلٌ کا وزن کلام عرب میں نہیں پایا اسلئے ھَاوُوْنٌ کی بجائے ھَاوَنٌ (بروزن فاعول) کہا جاتا ہے۔

(ھ و ی)

اَلْھَوٰی (س) اس کے معنی خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ اور جو نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو اسے بھی ھَوًی کہدیتے ہیں کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کو اس کے شرف و منزلت سے گرا کر مصائب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اور آخرت میں اسے ھَاوِیَةٌ (دوزخ) میں لے جا کر ڈال دیں گی۔

اَلْھُوِیُّ (ض) کے معنی اوپر سے نیچے گرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: فَاُمُّہٗ ھَاوِیَةٌ (۱۰۱-۹) اسکا مرجع ہاویہ ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ ھَوَتْ اُمُّہٗ کیطرح ایک محاورہ ہے اور بعض کے نزدیک دوزخ کے ایک طبقے کا نام ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اسکا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور بعض نے آیت: وَاَفْئِدَتُھُمْ ھَوَآءٌ (۱۴-۴۳) اور ان کے دل مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔ میں ھَوَاءٌ کے معنی خالی یعنی بے قرار کئے ہیں جیسے دوسری جگہ فرمایا: وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فَارِغًا (۲۸-۱۰) موسیٰ کی ماں کا دل بے قرار ہو گیا۔

اور اللہ تعالٰے نے قرآن میں خواہشات انسانی کی اتباع کی سخت مذمت کی ہے۔ چنانچہ فرمایا: اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰهُ (۴۵-۲۳) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی (۳۸-۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا۔ وَاتَّبَعَ ھَوٰهُ (۱۸-۲۸) اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اور آیت: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ (۲-۱۲۰)

اگر تم ان کی خواہشوں پر چلو گے۔
میں اَهْوَاءُ جمع لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی خواہش دوسرے سے مختلف اور جدا ہے اور پھر ایک کی خواہش غیر متناہی ہونے میں اَهْوَاءُ کا حکم رکھتی ہے لہذا ایسی خواہشات کی پیروی کرنا سراسر ضلالت اور اپنے آپ کو ورطہ حیرت میں ڈالنے کے مترادف ہے نیز فرمایا۔ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۴۵۔۱۸) اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا (۵۔۷۷) اور اس قوم کی خواہشوں پر مت چلو (جو تم سے پہلے) گمراہ ہو چکے ہیں۔ قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا (۶۔۵۶) (ان لوگوں سے) کہدو کہ میں تمہاری خواہشوں پر نہیں چلتا۔ ایسا کروں تو میں گمراہ ہو چکا ہوں گا۔
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۴۲۔۱۵) اور ان (یہود ونصاریٰ) کی خواہشوں پر مت چلو اور ان سے (صاف) کہدو کہ میرا تو اس پر ایمان ہے۔ جو خدا نے اتارا۔
وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (۲۸۔۵۰) اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔
اَلْهَوِيُّ (بفتح الہا) کے معنی پستی کی طرف اترنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل هُوِيٌّ (بضم الہا) کے معنی بلندی پر چڑھنے کے ہیں[1]۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)۔

(۴۷۵) يَهْوِي مَخَارِمَهَا هُوِيَّ الْأَجْدَلِ

اس کی تنگ گھاٹیوں میں صقرہ کی طرح تیز جاتا ہے۔
اَلْهَوَاءُ آسمان وزمین کے مابین فضا کو کہتے ہیں اور بعض نے آیت: وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔ کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی بے قرار ہونے میں هَوَاء کی طرح ہوں گے۔
تَهَاوَى (تفاعل) کے معنی ایک دوسرے کے پیچھے مَهْوَاة (یعنی گڑھے) میں گرنے کے ہیں)۔
أَهْوَاهُ اسے فضا میں لے جا کر نیچے دے مارا۔ قرآن میں ہے۔ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى (۵۳۔۵۳) اور اسی نے الٹی بستیوں کو دے پٹکا۔
اِسْتَهْوَى کے معنی عقل کو لے اڑنے اور پھسلا دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ (۶۔۷۱) جیسے کسی کو شیاطین (جنات) نے۔۔۔۔ بھلا دیا ہو۔

(ھ ی ت)

هَيْتَ اور هَلُمَّ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں اور آیت: وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ (۱۲۔۲۳) کہنے لگی (یوسف) چلا آؤ۔ میں ایک قرأت هِئْتُ لَكَ بھی ہے جس کے معنی تَهَيَّأْتُ لَكَ کے ہیں یعنی میں تیرے لئے تیار ہوں اور هَيَّتَ بِهِ وتَهَيَّتَ کے معنی هَيْتَ لَكَ کہنے کے ہیں۔
هَاتِ (اسم فعل) لا (تثنیہ اور جمع کے لئے هَاتِيَا وهَاتُوا آتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ (۲۔۱۱۱) (اے پیغمبر ان سے) کہدو کہ۔۔۔۔ دلیل پیش کرو۔ (فراء کا کہنا ہے کہ کلام عرب میں هَاتَيْتُ مستعمل نہیں ہے یہ صرف اہل حیرہ کی لغت ہے اور اس سے لَا أُهَاتِ

---

[1] قال الخفاجی فی شرح الدرۃ ۲۰۲: لیس ہذا مما اتفقوا علیہ بل ہو قول لبعض اہل اللغۃ (انظر ایضاً شرح اشعار هذیل للمرزوقی ۲۰ ۱۰ لابی کبیر الہذلی (عامر بن الحلیس) یصف تابط شرا بالشجاعۃ وصدرہ: واذا رمیت بہ الفجاج رأیتہ ۔۔۔۔۔ والبیت فی الحماسۃ (مع المرزوقی ۹۵ رقم ۱۲) وفیہ
[2] حوازہا بدل مخارمہا واللسان (خرم)، وشواہد الکشاف ۷۶ وفی البحر ۵۰۲۹ (۴) والسیوطی ۸۱ ❊ ❊ ❊ ❊

(فعل نہی) استعمال نہیں ہوتا۔ خلیل نے کہا ہے کہ اَلْمُهَاتَاةُ وَالْهِنَاءُ (مفاعلہ سے) معاتِ عینوا امر ہے۔
هَيْهَاتَ یہ کلمہ کسی چیز کے بعید از قیاس ہونیکو بتانے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس میں هَيْهَاتَ هَيْهَاتِ اور هَيْهَاتًا تین لغت ہیں اور اسی سے قرآن میں ہے:۔
هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ (۲۳-۳۶) جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (بہت) بعید اور (بہت) بعید ہے۔
زجاج نے هَيْهَاتَ کے معنی اَلْبُعْدُ کئے ہیں دوسرے اہل لغت نے کہا ہے کہ زجاج کو (لِمَا) کے لام کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ اس کی اصل بَعُدَ الْاَمْرُ وَالْوَعْدُ لِمَا تُوعَدُونَ ہے اور اس میں ایک لغت هَيْهَا بھی ہے۔
اَلْفَسَوِیُّ نے کہا ہے کہ هَيْهَاتِ کسرۂ تا کے ساتھ هَيْهَاتَ (بفتحہ تاء) کی جمع ہے۔

(ھ ی ج)

هَاجَ الْبَقْلُ (ض) کے معنی بقول کے پک کر زرد پڑ جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا (۳۹-۲۱) پھر وہ پک کر خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے۔
اور اَهْيَجَتِ الْاَرْضُ کے معنی زمین کے خشک گھاس والی ہونے کے ہیں۔ هَاجَ الدَّمُ وَالْفَحْلُ هَيْجًا وَهِيَاجًا کے معنی خون یا نر اونٹ کے جوش مارنے کے ہیں اور هَيَّجْتُ الشَّرَّ وَالْحَرْبَ کے معنی شر یا لڑائی بھڑکانے کے اسی سے اَلْهَيْجَاءُ (بالمد والقصر) ہے جس کے معنی لڑائی کے ہیں۔ اور هَيَّجْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی اونٹ کو برانگیختہ کرنے کے ہیں۔

(ھ ی م)

رَجُلٌ هَيْمَانُ وَهَائِمٌ سخت پیاسا آدمی۔ هَائِمٌ کی جمع هِيْمٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهِيْمِ (۵۶-۵۵) اور پیو گے بھی تو اس طرح جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔
اَلْهُيَامُ اونٹ کی ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے اسے اتنی پیاس لگتی ہے کہ سیر نہیں ہوتا۔ اور شوریدگی عشق کے لئے یہ کلمہ ضرب المثل ہے۔ هَامَ عَلٰی وَجْهِهٖ سرگردان پھرنا۔ قرآن میں ہے:۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (۲۶-۲۲۵) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں۔
یعنی مدح، ذم وغیرہ ہر قسم کے موضوع سخن میں وہ مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں اور اسی سے اَلْهَائِمُ عَلٰی وَجْهِهٖ ہے جس کے معنی سرگردان پھرنے والا کے ہیں۔
هَامَ (ض) کے معنی سرگردان پھرنے کے بھی آتے ہیں اور شوریدۂ عشق اور پیاسا ہونے کے بھی اور هِيْمٌ کے معنی پیاسے اونٹوں کے ہیں اور خشک ریت بھی چونکہ پیاسے اونٹوں کی طرح پانی نگل لیتی ہے اسلئے خشک ریت کو اَلْهِيَامُ کہا جاتا ہے۔

(ھ ی ء)

اَلْهَيْئَةُ اصل میں کسی چیز کی حالت کو کہتے ہیں عام اس سے کہ وہ حالت محسوسہ ہو یا معقولہ لیکن عموماً یہ لفظ حالت محسوسہ یعنی شکل وصورت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَنِّيْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ (۳-۴۹) کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بہ شکل پرند بناتا ہوں۔
اَلْمُهَايَاةُ (رہموز) جس کے لئے لوگ تیار ہوں۔ اور

اس پر موافقت کا اظہار کریں۔

هَيَّأَ کے معنی کسی معاملہ کیلئے اسباب مہیا کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا (۱۸-۱۰) اور ہمارے کام میں درستی (کے سامان) مہیا کر۔

وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا (۱۸-۱۶) اور تمہارے کاموں میں آسانی (کے سامان) مہیا کرے گا۔

اور إِيَّاكَ أَنْ تَفْعَلَ كَذَا میں ایک لغت هَيَّاكَ أَنْ تَفْعَلَ كَذَا بھی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (۵۸۴) هَيَّاكَ هَيَّاكَ وَحَنْوَاءَ الْعُنُقِ گردن مروڑنے یعنی تکبر سے دور رہو۔

ھا

ھَا۔ یہ حرف تنبیہ ہے اور ذا، ذہ، اُولٰٓئِ اسم اشارہ کے شروع میں آتا ہے اور اس کے لئے بمنزلہ جز سمجھا جاتا ہے مگر هَا أَنْتُمْ میں حرف ھا استفہام کے لئے ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

هَا أَنْتُمْ هٰٓؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ (۳-۶۶) دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا۔

هَا أَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ (۳-۱۱۹) دیکھو تم ایسے (صاف دل) لوگ ہو کہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہو۔

هَا أَنْتُمْ هٰٓؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ (۴-۱۰۹) بھلا تم لوگ .... ان کی طرف سے بحث کر لیتے ہو۔

ثُمَّ أَنْتُمْ هٰٓؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ (۲-۸۵) پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو۔

لَا إِلٰى هٰٓؤُلَاءِ وَلَا إِلٰى هٰٓؤُلَاءِ (۴-۱۴۳) نہ ان کی طرف رہوتے ہو نہ ان کی طرف۔

هَاؤُمُ (۱) اسم فعل بمعنی خُذْ بھی آتا ہے اور ھَاتِ (لاؤ) کی ضد ہے اور اس کی گردان یوں ہے۔

هَاؤُمْ، هَاؤُمَا، هَاؤُمُوا۔ قرآن میں ہے:۔

هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ (۶۹-۱۹) لیجئے میرا اعمالنامہ پڑھئے۔

او(ر) اس میں ایک لغت بغیر میم کے بھی ہے۔ جیسے:۔ هَا، هَا آ، هَاؤُا، هَائِي، هَأْنَ بروزن خِفْنَ اور بعض اس کے آخر میں ك ضمیر کا اضافہ کر کے تثنیہ جمع اور تذکیر و تانیث کے لئے ضمیر میں تبدیل کرتے ہیں۔ جیسے هَاكَ، هَاكُمَا الخ

اور بعض اسم فعل بنا کر اسے هَاءَ يَهَاءُ بروزن خَافَ يَخَافُ کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک هَائِي يُهَائِي مثل نَادَى يُنَادِي ہے اور بقول بعض متکلم مضارع کا صیغہ أَهَاءُ بروزن أَخَالُ آتا ہے۔

---

[1] وفی اللسان (ھنو) الشدہ اللحیانی عن الکسائی وصدرہ:۔ یا خال ھلا قلت اذ اعطیتنی۔ وایضًا اللسان (ھیا) والبیت فی ابدال ابی الطیب ۲ / ۵۷۰ وبعدہ :۔ اعطیتنیہا فانیا اضراسہا۔ لوتعلف البیض بہ لم ینفلق قال صاحب الابدال وعند الفراء انما یقال ھیاک فی موضع زجر ولا یقولون ھیاک اکرمت ۱۲

کِتَابُ الْیَاءِ

(ی ب س)

یَبِسَ (س) الشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کا خشک ہو جانے کے ہیں۔ اور گھاس جب خشک ہو جائے تو اسے یَبْسٌ (بسکون الباء) کہا جاتا ہے اور جس جگہ پر پانی ہو اور پھر خشک ہو جائے اسے یَبَسٌ (بفتح البا) کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا (۲۰-۷۷) تو ان کے لئے دریا میں لاٹھی مار کر خشک راستہ بنا دو۔

اور پنڈلیوں کے جن حصوں پر گوشت نہیں ہوتا ان کو اَیْبَسَانِ (تثنیہ) کہا جاتا ہے۔

(ی ت م)

اَلْیُتْمُ کے معنی نابالغ بچہ کے شفقت پدری سے محروم ہو جانے کے ہیں۔ انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یُتْمٌ کا اعتبار ماں کیطرف سے ہوتا ہے اور جانور کے چھوٹے بچے کے بن ماں کے رہ جانے کو یُتْمٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی (۹۳-۶) بھلا اس نے تمہیں یتیم پاکر جگہ نہیں دی۔

یَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا (۷۶-۸) یتیموں اور قیدیوں کو۔ یَتِیْم کی جمع یَتَامٰی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰی اَمْوَالَهُمْ (۴-۲) اور یتیموں کا مال (جو تمہاری تحویل میں ہو) ان کے حوالے کر دو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی (۴-۱۰) جو لوگ یتیموں کا مال (ناجائز طور پر) کھاتے ہیں۔

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی (۲-۲۲۰) اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

مجازاً ہر یکتا اور بے مثل چیز کو عربی میں یتیم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ گوہر یکتا کو دُرَّۃٌ یَتِیْمَۃٌ کہہ دیتے ہیں۔ اور اس میں اس کے مادہ کے منقطع ہونے پر تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور دُرَّۃٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر یکتا مکان کو بھی یتیم کہہ دیا جاتا ہے۔

(ی د ی)

اَلْیَدُ کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں یہ اصل میں یَدْیٌ (ناقص یائی) ہے کیونکہ اس کی جمع اَیْدٍ و یَدِیٌّ اور تثنیہ یَدَیَانِ اور فعل یَدَیْتُهٗ آتا ہے جس کے معنی ہاتھ پر مارنے کے ہیں۔

عام طور پر اس کی جمع اَیْدٍ (اَفْعُلٌ) آتی ہے کیونکہ اکثر طور پر فَعْلٌ (بسکون عین) کی جمع اَفْعُلٌ استعمال ہوتی ہے۔ جیسے فَلْسٌ وَاَفْلُسٌ وَ کَلْبٌ وَ اَکْلُبٌ لیکن کبھی اس کی جمع یَدِیٌّ (فَعِیْلٌ) بھی آجاتی ہے جیسے عَبْدٌ وَ عَبِیْدٌ اور کبھی فَعَلٌ (بفتح العین) کی جمع بھی اَفْعُلٌ کے وزن پر آجاتی ہے جیسے زَمَنٌ اَزْمُنٌ وجَبَلٌ اَجْبُلٌ قرآن میں ہے:۔

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ (۵-۱۱) جب ایک جماعت نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں تو اس نے ان کے ہاتھ روک دیئے۔

اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَاۤ (۷-۱۹۵) یا ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں۔

استعارہ کے طور پر یَدٌ کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ [1] بمعنی نعمت، اور اسی سے یَدَیْتُ اِلَیْهِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی پر احسان کرنے کے ہیں۔ اس کی جمع اَیَادٍ آتی ہے اور کبھی یَدِیٌّ بھی آجاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (   )

(۴۵۹) فَاِنَّ لَهٗ عِنْدِیْ یَدِیًّا وَّ اَنْعُمَا

کیونکہ اس کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔

[2] کسی چیز پر قبضہ یا ملک جیسے هٰذَا فِیْ یَدِ فُلَانٍ (یہ فلاں کے اختیار میں ہے) قرآن میں ہے:۔

اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (۲-۲۳۷) ہاں اگر عورتیں مہر بخش دیں یا مرد جن کے قبضہ قدرت میں عقد نکاح ہے اپنا حق چھوڑ دیں۔

نیز محاورہ ہے:۔ وَقَعَ فِیْ یَدَیْ عَدْلٍ وہ عدل کے ہاتھوں میں چلا گیا [3] بمعنی قوت جیسے لِفُلَانٍ یَدٌ عَلٰی کَذَا فلاں کو اس پر قدرت حاصل ہے۔ مَالِیْ بِکَذَا یَدٌ اَوْ مَالِیْ بِهٖ یَدَانِ یہ میری قدرت سے باہر ہے۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۴۶۰) فَاعْمِدْ لِمَا تَعْلُوْ فَمَالَكَ بِالَّذِیْ
لَا تَسْتَطِیْعُ مِنَ الْاُمُوْرِ یَدَانِ

جو کام تو کر سکتا ہے اس کا قصد کیجئے اور جو امور تیری استطاعت سے بالا ہیں ان سے تعلق مت رکھئے۔ اس معنی کے لحاظ سے تشبیہ کے طور پر دَهْرٌ کی طرف بھی یَدٌ کی اضافت ہوتی ہے جیسے یَدُ الدَّهْرِ اَوْ یَدُ الْمُسْنَدِ۔ اور شاعر نے ہوا کی طرف ید کی نسبت کرتے ہوئے کہا ہے[3] (الکامل)

(۴۶۱) بِیَدِ الشَّمَالِ زِمَامُهَا

جب کہ اس کی باگ ڈور شمالی ہوا کے ہاتھ میں تھی، کیونکہ ہوا میں زور اور قوت ہوتی ہے۔

وَضَعَ یَدَهٗ فِیْ کَذَا اس کے معنی کسی کام کو شروع کرنے

---

[1] لاعشی القیسی الجاہلی یمدح نعمان بن المنذر وصدرہ: فلن اذکر النعمان الا بصالح ...... ولم اجد فی دیوانہ والبیت فی اللسان (یدی سیبو نعم) وفتوابما الکشاف والحکم (نعم)، ونسبہ الی النابغۃ وابن البری نسبہ لضمرۃ بن ضمرۃ النہشلی [2] لکعب بن سعد الغنوی کما فی اللسان (علا) والقالی (۲: ۲۳۱) وہو الصواب لان فی اول الابیات خطاب لابنہ علی بن کعب وقیل لعلی بن عدی الغنوی وقال بعضہم لعلی بن الغدیر الغنوی کما فی البیان (۳: ۸۰) والاضداد للاصمعی ۷، والسجستانی ۱۰۸ و ابن الانباری ۳۲۴، ۵۶ والسمط (۱: ۸۳) وتہذیب الالفاظ ۴۵۴ واضداد ابن السکیت ۱۹۶ و ابی الطیب ۴۰۱ والبحریہ ۱۵۸۵ (۳: ۱۴۲۵) [3] قطعۃ بیت للبید فی معلقتہ ۱۵۸ والبیت تمامہ وغداۃ ریح قد کشفت وقرۃ۔ اذا اصبحت ...... والبیت فی اللسان (یدی) والانصاف ۴۴۱ والصناعتین ۲۸۵ والعمدۃ (۱: ۲۷۹) (الحصری) (۴: ۱۴۳) وشرح السبع لابن الانباری ۵۷۸ وشرح العشر للتبریزی ۱۵۸ وفی روایۃ قد وزعت بدل قد کشفت ۱۲

کے ہیں اور اطلاق الیک و امساکہا سخاوت اور بخل سے کنایہ ہوتا ہے جیسا کہ سخی کے متعلق یَدُہٗ مُطْلَقَۃٌ اور بخیل کے متعلق یَدُہٗ مَغْلُوْلَۃٌ کہا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

وَقَالَتِ الْیَہُوْدُ یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ غُلَّتْ اَیْدِیْہِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ (۵-۶۴) اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ بندھے جائیں اور ایسا کہنے کے سبب ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

محاورہ ہے:۔ نَفَضْتُ یَدِیْ عَنْ کَذَا میں نے فلاں چیز سے ہاتھ جھاڑ لیا یعنی اسے چھوڑ دیا۔

اَیَّدَ (تفعیل) کے معنی کسی کی تائید یا اس کی مدد کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۵-۱۱۰) جب میں نے روح القدس (یعنی جبریل) سے تمہاری مدد کی۔

اور آیت کریمہ:۔

فَوَیْلٌ لَّہُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْہِمْ (۲-۷۹) ان پر افسوس ہے اس لئے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔

میں کتابت کو ہاتھوں کی طرف نسبت کرکے ان تحریر کے بناوٹی ہونے پر تنبیہ کی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ:

ذٰلِکَ قَوْلُہُمْ بِاَفْوَاہِہِمْ (یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں) ان کی دروغ بیانی پر تنبیہ کرنے کے لئے قول کی نسبت اَفْوَاہ کی طرف کی ہے اور آیت کریمہ:

اَمْ لَہُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِہَا (۷-۱۹۵) یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں۔

میں اَیْدٍ (ہاتھ) سے مراد قوت ہے اسی معنی میں فرمایا:۔

اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ (۳۸-۴۵) جو قوت والے اور صاحب نظر تھے۔

وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ (۳۸-۱۷) اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو صاحب قوت تھے۔

اور آیت کریمہ:۔

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّہُمْ صٰغِرُوْنَ۔ (۹-۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

میں عَنْ یَّدٍ سے مراد یہ ہے کہ اس نعمت کے عوض جو ان کی سکونت گاہوں میں برقرار رکھے جانے سے انہیں حاصل ہوئی ہے، جزیہ ادا کریں تو عَنْ یَّدٍ موضع حال میں ہے۔

اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ تمہاری حاکمیت اور اپنی محکومی کا اقرار کرتے ہوئے جزیہ ادا کریں محاورہ ہے۔

خُذْ کَذَا اَثَرَ ذِیْ یَدَیْنِ۔ یَدٌ بمعنی حامی اور مددگار کے آتا ہے جیسے اَنَا یَدُکَ (میں تمہارا مددگار ہوں) فُلَانٌ یَدُ فُلَانٍ (وہ فلاں کا مددگار ہے۔ اسی معنی میں اولیاء اللہ کو اَیْدِ اللّٰہِ کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر آیت کریمہ:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ (۴۸-۱۰) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

میں آنحضرت کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ قرار دیا ہے۔ یعنی جب آپؐ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے تو گویا اللہ کا ہاتھ ان پر ہے۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اللہ عزوجل فرماتے ہیں[1] (۱۶۲) لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ

[1] الحدیث باختلاف الفاظ فی الطبرانی ... (کنز العمال رقم ۱۱۵۷-۱۱۷۱)

وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا "بندہ نوافل کے ذریعہ برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں پھر جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں ہی اس کا کان ہوتا ہوں جس سے سنتا ہے اور میں ہی اس کی آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ ہوتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا (۳۶-۷۱) جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائیں۔

اسی طرح آیت:۔

لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (۳۸-۷۵) جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔

میں اللہ تعالیٰ کے اپنے ہاتھ کے ساتھ پیدا کرنے سے وہ خصوصی تولیت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے اور اس عنایت ربانی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ ید کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ وہ اعضائے انسانی میں سب سے اعلیٰ عضو ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کوئی کام سرانجام دیتا ہے لہٰذا یہاں لفظ ید سے تشبیہ کا وہم نہیں ہونا چاہیئے۔ بعض نے کہا ہے کہ بِيَدَيَّ کے معنی بنفسی ہے اور نَقْطَعُهُ بِالسِّكِّينِ کی طرح یہاں باء آلہ کے لئے نہیں ہے بلکہ خَرَجَ بِسَيْفِهِ کی طرح باء معنی مع کے ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اسے پیدا کیا درآں حالیکہ ہمارے دنیوی اور اخروی انعامات اس کے شامل حال تھے جن کی رعایت کرکے وہ سعادت کبریٰ حاصل کرسکتا ہے۔

رَجُلٌ يَدِيٌّ وَامْرَأَةٌ يَدِيَّةٌ ماہر کاریگر مرد یا عورت۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ (۷-۱۴۹) اور جب وہ نادم ہوئے۔

میں سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ کے معنی نادم ہونے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔ فُلَانٌ سُقِطَ فِي يَدِهِ وَأُسْقِطَ وہ پشیمان ہوا اور یا اس کے معنی حسرت سے ہاتھ ملنے کے ہیں جیسے فرمایا:۔

فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنْفَقَ فِيهَا (۱۸-۴۲) تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

اور آیت کریمہ:۔

فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ (۱۴-۹) تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دیئے۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے حق بات کو قبول نہ کیا جس کے قبول کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا جیسا کہ محاورہ ہے۔ رَدَّ يَدَهُ فِي فَمِهِ یعنی اس کی بات نہ مانی۔

بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ انہوں نے انبیاء کے ہاتھوں کو ان کے مونہوں کی طرف لوٹا دیا یعنی ان سے کہنے لگے کہ اپنے مونہوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہو اور بعض نے أَيْدِيَهُمْ سے مراد انعامات لئے ہیں۔ یعنی انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کرکے ان کے احسانات کو ان کے مونہوں پر دے مارا یعنی ان کے نصائح اور مواعظ پر کان نہ دھرا جو ان کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔

(ی س ر)

اَلْيُسْرُ کے معنی آسانی اور سہولت کے ہیں یہ عُسْرٌ کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:۔

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲-۱۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے۔

اور سختی نہیں چاہتا۔
سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا (۶۵-۷) خدا عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشے گا۔
وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا (۱۸-۸۸) بلکہ اس سے نرم بات کہیں گے۔
فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا (۵۱-۳) پھر نرمی سے چلتی ہیں۔
تَيَسَّرَ كَذَا وَاسْتَيْسَرَ کے معنی آسان ہوسکنے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (۲-۱۹۶) اگر رستے میں روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو کردو۔
فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (۷۳-۲۰) تو جتنا آسانی سے ہوسکے پڑھ لیا کرو۔
اسی سے اَيْسَرَتِ الْمَرْاَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی عورت کے سہولت سے بچہ جننے کے ہیں۔
يَسَّرْتُ كَذَا کے معنی کسی کام کو آسان اور سہل کردینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (۵۴-۱۷) اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کردیا۔
فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ (۱۹-۹۷) (اے پیغمبر) یہ (قرآن) تمہاری زبان میں آسان (نازل) کیا ہے۔
اَلْيُسْرٰى (اسم) بمعنی يُسْرٌ قرآن میں ہے۔
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (۹۲-۷) اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔
اور آیت کریمہ:۔
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (۹۲-۱۰) اسے سختی میں پہنچائیں گے۔ میں عُسْرٰى کے ساتھ تيسير کا لفظ بطور تہکم لایا گیا ہے۔ جس طرح کہ آیت:۔
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۸۴-۲۵)

میں عذاب کے متعلق بشارت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔
اَلْيَسِيْرُ وَالْمَيْسُوْرُ سہل اور آسان۔
قرآن میں ہے:۔
فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (۱۷-۲۸) تو ان سے نرمی سے بات کہدیا کرو۔
اور کبھی يَسِيْرٌ کے معنی حقیر چیز بھی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۳۳-۳۰) اس کو دونی سزا دی جائیگی اور یہ (بات) خدا کو آسان ہے۔
میں لفظ يَسِيْرًا کے معنی آسان اور سہل کے ہیں اور آیت وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا (۳۳-۱۴) اور اس کے لئے بہت کم توقف کریں۔
میں اس کے معنی بہت کم عرصے کے ہیں۔
اَلْمَيْسَرَةُ وَالْيَسَارُ کے معنی غنا اور مالی وسعت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (۲-۲۸۰) تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو)
اور يَسَارٌ کا لفظ کبھی يَمِيْنٌ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے بعض اس کو يِسَارٌ بکسر الیاء پڑھتے ہیں۔
اَلْيَسَرَاتُ پاؤں کے سبک۔
اَلْمَيْسِرُ (قمار بازی) یہ بھی يُسْرٌ سے مشتق ہے کیونکہ قمار بازی میں بھی بلا کلفت مال حاصل ہوجاتا ہے۔

(ی ق ن)

اَلْيَقِيْنُ کے معنی کسی امر کو پوری طرح سمجھ لینے کے ساتھ اس کے پایۂ ثبوت تک پہنچ جانے کے ہیں۔ اسی لئے یہ صفات علم سے ہے اور معرفت، درایۃ وغیرہ سے اس کا درجہ اوپر ہے یہی

وجہ ہے کہ عِلْمُ الْيَقِيْن کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے لیکن مَعْرِفَةُ الْيَقِيْن نہیں بولتے۔ اور علم الیقین، عین الیقین و حق الیقین میں قدرے معنوی فرق پایا جاتا ہے۔ جیسے ہم اس کتاب کے بعد بیان کریں گے۔ اِسْتَيْقَنَ وَ اَيْقَنَ یقین کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۴۵-۳۲) ہم اس کو محض ظن ہی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ (۵۱-۲۰) اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵-۴) یقین کرنے والوں کیلئے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (۴-۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰؑ کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے قتل ہوجانے کا یقین نہیں ہے بلکہ ظن وتخمین سے ان کے قتل ہوجانے کا حکم لگاتے ہیں)۔

(ی م م)

اَلْيَمُّ کے معنی دریا اور سمندر کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ (۲۸-۷) تو اسے دریا میں ڈال دینا۔

يَمَّمْتُ كَذَا وَ تَيَمَّمْتُ قصد کرنا قرآن میں ہے:

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (۵-۶) تو پاک مٹی لو۔

يَمَّمْتُهٗ بِرُمْحِيْ میں نے اسے نیزے کا نشانہ بنایا۔

اَلْيَمَامُ جنگلی کبوتر کو کہتے ہیں اور يَمَامَةُ ایک عورت کا نام تھا جس کے نام پر (صوبہ یمن کے ایک) شہر کا نام اَلْيَمَامَةُ رکھا گیا تھا۔

(ی م ن)

اَلْيَمِيْنُ کے اصل معنی دایاں ہاتھ یا دائیں جانب کے ہیں اور آیت کریمہ:۔ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ (۳۹-۶۷) اور آسمان اس کے دہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔

میں حق تعالیٰ کی طرف یمین کی نسبت مجازی ہے۔ جیسا کہ ید وغیرہا کے الفاظ باری تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں آسمان کے لئے یمین اور بعد میں آیت:۔

وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۳۹-۶۷) (اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔

میں ارض کے متعلق قبضة کا لفظ لانے میں ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ ہے) جو اس کتاب کے بعد بیان ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ (۳۷-۲۸) تم ہی ہمارے پاس دائیں (اور بائیں) سے آتے تھے۔

میں یمین سے مراد جانب حق ہے یعنی تم جانب حق سے ہمیں پھیرتے تھے اور آیت کریمہ:۔

لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ (۶۹-۴۵) تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔

میں دایاں ہاتھ پکڑ لینے سے مراد روک دینا ہے۔ جیسے محاورہ ہے: خُذْ بِيَمِيْنِ فُلَانٍ عَنْ تَعَاطِي الْهِجَاءِ یعنی فلاں کو ہجو سے روک دو۔

بعض نے کہا ہے کہ انسان کا دہنا ہاتھ چونکہ اعضاء میں افضل سمجھا جاتا ہے اسلئے معنی یہ ہونگے کہ ہم بہتر سے بہتر حال میں بھی اسے باشرف اعضاء سے پکڑ کر منع کردیتے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ (۵۶-۲۷) اور دہنے ہاتھ والے۔

یعنی داہنی سمت والوں سے مراد اہل سعادت ہیں کیونکہ عرف میں میامن دبابرکت، کو یمین اور مشائم (منحوس) کو شمالی کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر یمین کا لفظ برکت وسعادت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

فَاَمَّا اِنْ کَانَ مِنْ اَصْحَابِ الْیَمِیْنِ فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ (۵۶-۹۰، ۹۱) اگر وہ دائیں ہاتھ والوں (یعنی اصحاب خیر و برکت) سے ہے تو کہا جائیگا کہ تجھ پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام۔

اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔ (الوافر)

(۴۶۲) اِذَا مَا رَایَۃٌ رُفِعَتْ لِمَجْدٍ
تَلَقَّاھَا عَرَابَۃُ بِالْیَمِیْنِ

جب کبھی فضل و مجد کے کاموں کے لئے جھنڈا بلند کیا جاتا ہے تو عَرَابَۃ اسے خیر و برکت کے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔ نیز اَلْیَمِیْن بمعنی دایاں ہاتھ سے استعارہ کے طور پر لفظ یَمِیْنٌ قسم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عرب قسم کھاتے یا عہد کرتے وقت اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر مارتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَمْ لَکُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَۃٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (۶۸-۳۹) یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو قیامت کے دن تک چلی جائیں گی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ (۶-۱۰۹) اور یہ لوگ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ (۲-۲۲۵) خدا تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

وَاِنْ نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَھْدِھِمْ اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ لَھُمْ (۹-۱۲) اگر عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں۔

اور عربی محاورہ یَمِیْنُ اللّٰہِ (اللہ کی قسم) میں یَمِیْن کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے کی جاتی ہے۔ کہ قسم کھانے والا اللہ کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ اور جب ایک شخص دوسرے سے عہد و پیمان باندھتا ہے تو وہ اس کا مُوَالِي الْيَمِيْنِ کہلاتا ہے اور کسی چیز پر ملک اور قبضہ ظاہر کرنے کے لئے فی یدی کی بنسبت مِلْکُ یَمِیْنِیْ کا محاورہ زیادہ بلیغ ہے۔ اسی بنا پر غلام اور لونڈیوں کے بارے میں قرآن نے اس محاورہ کو اختیار کیا ہے چنانچہ فرمایا:۔

مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (۴-۲۵) جو تمہارے قبضے میں آگئی ہوں۔

اور حدیث میں حجر اسود کو یمین اللہ کہا گیا ہے[2] (۱۶۳) کیونکہ اس کے ذریعہ قرب الٰہی کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

یَمِیْن سے یُمْن کا لفظ ماخوذ ہے جو خیر و برکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے: ھُوَ مَیْمُوْنُ النَّقِیْبَۃِ وہ سعادت مند ہے اور مَیْمَنَۃٌ کے معنی دائیں جانب بھی آتے ہیں۔

---

[1] قال الشماخ بن ضرار النھشلی یمدح عرابۃ الاوسی فیما بذل لہ وسق بعیر تمرا وکان مدحہ سببا لاشتہار الاوسی الصحابی والبیت فی الشعراء (۱: ۲۷۸) والاصابۃ (۴: ۲۴۳) والخزانۃ (۱: ۳۵۴/۲: ۲۲۳) والبحر المحیط (۱: ۲۰) والعمدۃ (۱: ۴۲/۲: ۱۲) وامالی القالی (۱: ۲۷۱) واسد الغابۃ (۳: ۳۹۹) ونقد الشعر ۲۶ وھو غیر منسوب فی الطبری (۲۳: ۳۲) واللسان (یمن) والسمط ۴۰۷ وابن الشجری (۲: ۱۶۵) والکامل (۳: ۱۳۲، ۱۴۵) والمشکل للقتبی ۱۸۸ وقبلہ: رأیت عرابۃ الاوسی یسمو الی الخیرات منقطع القرین والبیتان فی تاریخ الطبری (۲: ۱۹۱) والمنتخب ۲۰۸ ونقد الشعر (۱: ۲۰) وابن الانباری ۵۷۵ والعقد (۲: ۲۸۸) [2] والحدیث فی نزھۃ المجالس ۱۲

(ی ن ع)

یَنْعَت (ف) اَلثَّمَرَۃُ یُنْعًا وَیُنْعًا وَاَیْنَعَتْ (افعال) اِیْنَاعًا کے معنی پھل کے پک کر بالکل تیار ہو جانے کے ہیں اور پختہ پھل کو یَانِعٌ یا مُوْنِعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِہٖ اِذَا اَثْمَرَ وَیَنْعِہٖ (۶-۱۰۰) یہ چیزیں جب پھلتی ہیں تو ان کے پھلنے کو اور جب پک کر تیار ہو جاتی ہیں تو ان کے پکنے پر نظر کرو۔

ابن ابی اسحاق کی قراءت میں وَیُنْعِہٖ (ضمہ یاء) کیساتھ ہے۔ جو کہ یَانِعٌ کی جمع ہے اور یَانِعٌ کے معنی نہایت پختہ پھل کے ہیں۔

(ی ء س)

اَلْیَاْسُ (مصدر س) کے معنی نا امید ہونیکے ہیں اور یَئِسَ (مجرد) وَاِسْتَیْاَسَ (استفعال) دونوں ہم معنی ہیں جیسے۔ عَجِبَ فَاسْتَعْجَبَ وَسَخِرَ وَاسْتَسْخَرَ۔ قرآن میں ہے۔

فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْہُ خَلَصُوْا نَجِیًّا۔ (۱۲-۸۰) جب وہ اس سے نا امید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔

حَتّٰی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ (۱۲-۱۱۰) یہاں تک کہ جب پیغمبر نا امید ہو گئے۔

قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَۃِ کَمَا یَئِسَ الْکُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ (۶۰-۱۳) جس طرح کافر مردوں (کے جی اٹھنے) کی امید نہیں اسی طرح ان لوگوں کو بھی آخرت (کے آنے) کی امید نہیں۔

اِنَّہٗ لَیَئُوْسٌ کَفُوْرٌ تو نا امید (اور) ناشکرا (ہو جاتا) ہے، اور آیت کریمہ:۔

اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۱۳-۳۱) تو کیا مومنوں کو اس سے اطمینان نہیں ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنی اَفَلَمْ یَعْلَمْ کے ہیں یعنی کیا انہوں نے اس بات کو جان نہیں لیا مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ اس کے حقیقی معنی ہیں بلکہ یہ اس کے لازم معنی ہیں کیونکہ کسی چیز کے انتفاء کا علم اس سے نا امید ہونے کو مستلزم ہوتا ہے لہذا یہاں بھی (بلحاظ قرائن) یہ کہہ سکتے ہیں کہ یَیْئَسُ بمعنی یَعْلَمُ ہے۔

(ی و م)

اَلْیَوْمُ (دن) یہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے اور عربی زبان میں مطلقًا وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ زمانہ (ایک دن کا ہو یا ایک سال اور صدی کا یا ہزار سال کا ہو) کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ (۳-۱۵۵) جو لوگ تم سے (احد کے دن) جب کہ . . . . . دو جماعتیں ایک دوسرے سے گتھ ہو گئیں (جنگ سے بھاگ گئے۔

اور آیت کریمہ:۔

قُلْ اَئِنَّکُمْ لَتَکْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ (۴۱-۹) کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔

میں زمین کو دو دن میں پیدا کرنے کے معنی اور اس کی تحقیق اس کے بعد دوسری کتاب میں بیان کی جائے گی اور کبھی یَوْمٌ کے بعد اِذْ بڑھا دیا جاتا ہے اور (اضافت کے ساتھ) یَوْمَئِذٍ پڑھا جاتا

ہے اور یہ کسی معین زمانہ کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے اس صورت میں یہ معرب بھی ہو سکتا ہے اور اِذْ کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے مبنی بھی۔ جیسے فرمایا:۔

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِنِ السَّلَمَ (۱۶-۸۷) اور اس روز خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائینگے۔

فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيْرٌ (۷۴-۹) وہ دن بڑی مشکل کا دن ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ (۱۴-۵) اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ۔ میں ایام کی لفظِ جلالت کی طرف اضافت تشریفی ہے اور ایام سے وہ زمانہ مراد ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے افضال و انعام کے سمندر بہا دیئے تھے۔

(یٰسٓ)

یٰسٓ (۳۶-۱) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی اے انسان کے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ دوسرے اوائل سور کیطرح یہ بھی حروف مقطعات سے ہے۔

(یاء)

یہ حروف ندا سے ہے اور دور سے کسی کو آواز دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مگر جب سے ذات باری تعالیٰ کو دعا کے وقت یا رب کہا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ بہت دور ہے بلکہ اس امر پر تنبیہ کے لئے ہے کہ دعا کنندہ اپنے آپ کو اللہ کی معاونت اس کی توفیق سے دور خیال کرتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

فَقَدْ تَمَّتْ بِفَضْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى

حکیم محمد منظور عالم عاتب ساکن صالح پور ڈاکخانہ کاموکی

ضلع گوجرانوالہ

فہرست

القوافی والشعراء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

القوافی والشعراء

الف

ب

القوافی والشعراء

القوافی والشعراء

صفحات	الشعراء	البحر	القافیہ	رقم	سلسلہ
۷۴۷	عدی بن زید مناۃ	منسرح	عن انبئها؟	۳۰	۴۲
۹۲۸	دکین بن رجا الفقیمی	رجز	تکلّبُہ	۳۱	۴۳
۱۰۳۰	ابو عزا الکلدلی	طویل	غاریہُ	۳۲	۴۴
۱۱۶۱	حتیل بن عرفطَۃ	″	غالیہُ	۳۳	۴۵
۳۱	المتنبی	بسیط	الغضب	۳۴	۴۶
۱۱۴	ضمرۃ بن ضمرۃ النهشلی	کامل	عنابی	۳۵	۴۷
۳۱۳	نابغۃ ذبیانی	طویل	الکتائب	۳۶	۴۸
۵۶۹	مسعود بن بشر	″	قلبی	۳۷	۴۹
۷۱۱	امرؤ القیس	″	معقب	۳۸	۵۰
۷۸۸	هدبۃ العذری	″	المتقلب	۳۹	۵۱
۷۹۷	سلامہ بن جندل	بسیط	الظنابیب	۴۰	۵۲
۱۰۶۶	عنترہ	کامل	مترکبی	۴۱	۵۳
۱۳۳	ابن قیس الرقیات	منسرح	طنبہ	۴۲	۵۴
۹۲۴	ابو محمد الیزیدی	—	أدبہ	۴۳	۵۵
۹۶۴	—	—	لغبہ	۴۴	۵۶
			بابها	۴۵	۵۷

ت

صفحات	الشعراء	البحر	القافیہ	رقم	سلسلہ
۳۶۹	سنان بن الفحل الطائیٔ	وافر	طویتُ	۱	۵۸
۹۷۴	ابو محمد الجرمی	رجز	سریت ثبیت	۲	۵۹
۴۲	الشنفری	طویل	اقلّت	۳	۶۰
۱۰۸	ابن الرومی	—	بغتات	۴	۶۱
۱۶۶	عسباء بن الرقم الیشکری	رجز	اللثات	۵	۶۲
۳۰۶	—	—	الخفت	۶	۶۳
۵۰۵	الشنفری	طویل	مُشنِبُ	۷	۶۴

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشاعر	صفحات
۶۵	۸	تبلت	طویل	الشنضری	۱۰۴۸
		زیادتی	″	المتنبی	۶۱۵
۶۶	۹	آیاتہا	—	—	۷۰۸
۶۷	۱۰	ان ینعشنا	—	—	۱۰۶۷
		ان یبعثنا	—	—	
۶۸	۱۱	انیث	—	صخر الغی	۵۲

ج

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشاعر	صفحات
۶۹	۱	بہجُ	—	—	۱۲۵
۷۰	۲	تہجُ	رجز	راجز من بنی العنبر	۴۲۴
۷۱	۳	مَفلجا	″	العجاج	۴۷۰
		مُسرجا	″	″	
۷۲	۴	نئیج	کامل	ابو ذؤیب	۹۸۴

ح

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشاعر	صفحات
۷۳	۱	کسحُ	رمل	الاعشی	۲۹۰
۷۴	۲	ان ینصحا	رجز	دؤبہ	۹۳۹
۷۵	۳	یُفلحُ	—	—	۸۱۰
۷۶	۴	الفصیح	وافر	نضلۃ السہمی	۸۰۰
۷۷	۵	الامساح	کامل	لبید	۴۸۹
۷۸	۶	الجوانح	طویل	سوید بن الصامت	۵۰۵
۷۹	۷	مجی	—	—	۱۱۰۶

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشاعر	صفحات
۸۰	۱	ان یتبیلا	—	صبابہ	۱۱۸

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۸۱	۲	نَفْسا	–	عبداللہ بن عبداللہ بن طاہر	۲۳ -
۸۲	۳	زائدا	–	–	۶۲۴
۸۳	۴	مجیدا	–	خراش بن زہیر	۱۰۶۰
۸۴	۵	مخلّدا	–	–	۲۲۰
۸۵	۶	خلودُ	کامل	لبید	۲۲۴
۸۶	۷	الفرد	طویل	حسانؓ	۴۳۹
۸۷	۸	واحدُ	–	ابوالعتاھیہ	۵۵۵
۸۸	۹	ازیدُھا	–	–	۵۴
۸۹	۱۰	دریدُھا	طویل	الراعی/ابومنصور الاسدی	۳۵۹
۹۰	۱۱	اوتادُ	بسیط	الافوہ الاسدی	۳۹۸
۹۱	۱۲	سادُوا	//	//	۴۷
۹۲	۱۳	ازیدُھا	–	–	۴۰۴ (۲)
۹۳	۱۴	وحدہٖ	بسیط	نابغۃ	۱۰۹۸-۲۰
۹۴	۱۵	مخلّد	طویل	درید بن الصمۃ	۳۲
۹۵	۱۶	منضّد	//	زہیر	۵۹
۹۶	۱۷	اِی برود	خفیف	ابوزبید الطائیؒ	۸۳
۹۷	۱۸	فی البَعَد	بسیط	نابغۃ	۱۰۵
۹۸	۱۹	ابلدوی	//	قطامی	۱۱۸
۹۹	۲۰	المغاربد	//	غدارۃ ابن درہ الطائیؒ	۲۱۴
۱۰۰	۲۱	الثمد	//	نابغۃ	۲۵۳
۱۰۱	۲۲	اَحَدٖ	//	//	۲۷۲
۱۰۲	۲۳	الاَسود	–	–	۲۷۶
۱۰۳	۲۴	تنادِی	–	–	۲۷۹
۱۰۴	۲۵	اوعدا	طویل	کثیر عزۃ	۴۲۷
۱۰۵	۲۶	الاسجاد	کامل	الاسود بن یعفر	۴۵۸

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۱۰۶	۲۷	واحہا	کامل	القدکی	۴۷۸
۱۰۷	۲۸	برد	بسیط	نابغة	۵۵۱
۱۰۸	۲۹	الممدد	طویل	طرفه بن العبد	۷۴۶
۱۰۹	۳۰	المتشدد	″	″	۷۸۴
۱۱۰	۳۱	الاسدی	بسیط	نابغة	۸۳۶
۱۱۱	۳۲	البیہ	متقارب	امرؤالقیس بن عابص الصحابی	۹۱۳۰
۱۱۲	۳۳	عہد	وافر	الحکم بن عبدل	۱۰۳۱
۱۱۳	۳۴	بالیہ	کامل	نابغة	۱۰۵۷
۱۱۴	۳۵	العیاد	سریع	زید بن علی	۱۰۱۹
۱۱۵	۳۶	زاد	بسیط	عبید بن الابرص	۱۱۲۸
۱۱۶	۳۷	عَضُدُ	رجز	الراجز	۱۱۴
۱۱۷	۳۸	الحدین	—	—	۲۸۳
۱۱۸	۳۹	فی البلد	—	اعرابیہ	۴۳۰۴

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۱۱۹	۱	تُحُمُر	رجز	عجاج	۱۶۶
۱۲۰	۲	افتر	متقارب	امرؤ القیس	۱۷۹
۱۲۱	۳	اَلْقَطَرُ	—	—	۲۳۲
۱۲۲	۴	فانکدر	رجز	عجاج	۲۹۱
۱۲۳	۵	الجحر	″	ابو ذؤیب	۳۹۶
۱۲۴	۶	البصر	طویل	اسید بن عنقاء الفزاری	۵۱۷
۱۲۵	۷	ینتصر	رمل	طرفة بن العبد	۵۲۸
۱۲۶	۸	هِرُ	متقارب	امرؤ القیس	۵۳۸
۱۲۷	۹	معتصر	سریع ؟	ابن الاحمر	۷۰۱
۱۲۸	۱۰	مفتقر	—	—	۷۶۶

القوافی والشعراء

صفحات	الشعراء	البحر	القافیہ	رقم	عدد مسلسل
۹۴۷	امرؤ القیس	متقارب	اقِرّ	۱۱	۱۲۹
۹۹۹	اشعر الرقبان الاسدی	"	مَرّ	۱۲	۱۳۰
۱۰۰۳	امرؤ القیس	"	مطر	۱۳	۱۳۱
۱۰۸۱	ابو ذؤیب	—	نَہرُ	۱۴	۱۳۲
۵۵۹	عدی بن زید النصرانی	رمل	مشارٗ	۱۵	۱۳۳
۱۵	الاعشیٰ	متقارب	الھجیرا	۱۶	۱۳۴
۱۵	عمرو بن احمر الباھلی	طویل	تحدّرا	۱۷	۱۳۵
۱۱۱	امرؤ القیس	طویل	بیقرا	۱۸	۱۳۶
۲۱۲	المخبل السعدی	طویل	المعصضیٰ / المزعضیٰ	۱۹	۱۳۷
	"	"			
۲۴۰	الاشعر الجعفی	کامل	القریٰ	۲۰	۱۳۸
۳۷۴	ابو ذؤیب الھذلی	بسیط	غدرا	۲۱	۱۳۹
۴۱۸	ذوالرمۃ	طویل	قدرا	۲۲	۱۴۰
۴۷۵	رؤبۃ بن العجاج	رجز	نصرا	۲۳	۱۴۱
۶۵۳-۷۳۷	الکمیت	خفیف	عُورا	۲۴	۱۴۲
۸۱۴	عوف بن الخرع	متقارب	فارا	۲۵	۱۴۳
۸۷۴	ذوالرمۃ	طویل	قدرا	۲۶	۱۴۴
۹۰۱	حسان بن نشبہ	—	تکوثوا	۲۷	۱۴۵
۹۶۲	ذوالرمۃ	وافر	الحوارا	۲۸	۱۴۶
۹۸۰	ابن احمر	"	اخضرا	۲۹	۱۴۷
۱۱۵۱	شماخ بن ضرار الاسدی	طویل	الھجرا	۳۰	۱۴۸
۱۰۷۶	شطاظ من اللصوص	رجز	شھبرہٗ / الفرقرہٗ	۳۱	۱۴۹
۶۲	حاتم الطائی	طویل	الذکر	۳۲	۱۵۰
۷۴	ذوالرمۃ	"	المقادرٗ	۳۳	۱۵۱

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیه	البحر	الشعراء	صفحات
١٥٢	٣٤	بُورُ	خفیف	عبداللہ بن الزبعری	١٢٨
١٥٣	٣٥	الجبُوُ	رجز، کامل	ابن احمر	١٦٧
١٥٤	٣٦	تنورُ	—	—	٢٤٥
١٥٥	٣٧	کثیرُ	طویل	العجب السلولی	٣٤٦
١٥٦	٣٨	سمرُ	—	خفاف بن ندبه	٣٧٥
١٥٧	٣٩	(١) العمرُ (٢) سنترُ	طویل	ایمن بن حزیم	٥٣٠
١٥٨	٤٠	سرُورُ	وافر	عبداللہ بن عبداللہ بن عتبه بن مسعود	٥٣٢
١٥٩	٤١	شغرُوا	بسیط	الاخطل	٥٥٦
١٦٠	٤٢	الصقرُ	بسیط	اعشیٰ باهلة رعامة بن الحارث احد بنی وائل	٥٨٦
١٦١	٤٣	السافر	—	معقر بن اوس بن حمار البارقی	٧٠٢
١٦٢	٤٤	سرورُ	وافر	عبداللہ بن عبداللہ بن عتبة بن مسعود	٧٤٠
١٦٣	٤٥	الفقرُ	—	—	٩٠٧
١٦٤	٤٦	اوامرُه	—	خداش بن زهیر	٧٩
١٦٥	٤٧	ولا ابکارها	کامل	النمر بن تولب	٤٨٩
١٦٦	٤٨	نعارها	طویل	ابو ذؤیب	٦٠٣
١٦٧	٤٩	اهتصارُها	"	ابو ذؤیب الهذلی	١٠٨٧
١٦٨	٥٠	ازارِیُ	—	ابو المنهال بقیلة الاکبر	٩٥١١٣٩٦٠٢٩
١٦٩	٥١	منکرِ	—	مسافع بن حذیفه	١٣٣
١٧٠	٥٢	یجری	[illegible]	[illegible]	[illegible]
١٧١	٥٣	لایدرِی	—	—	٣٠٢
١٧٢	٥٤	لایفری	کامل	زهیر	٣١٧

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۱۷۳	۵۵	ام عامر	طویل	تابط شرا	۳۲۱
۱۷۴	۵۶	مقدار	-	-	۳۴۱
۱۷۵	۵۷	دوّاری	رجز	العجاج	۳۵۲
۱۷۶	۵۸	لا یبری	-	سوید بن الصامت	۴۲۶
۱۷۷	۵۹	الفاخر	سریع	الاعشیٰ	۴۵۲
۱۷۸	۶۰	السقاب	-	-	۴۸۰
۱۷۹	۶۱	بسآر	بسیط	الاخطل	۵۱۱
۱۸۰	۶۲	المعنون	-	جریر	۶۸۲
۱۸۱	۶۳	للکاثر	سریع	الاعشیٰ	۹۰۰/۸۶۳
۱۸۲	۶۴	الکافور	رجز	العجاج	۹۲۲،۱۰۳۲/۹۱۷
۱۸۳	۶۵	کافور	کامل	ثعلبہ بن صعیر المازنی	۹۱۷
۱۸۴	۶۶	الطائر	سریع	الاعشیٰ	۹۹۴
۱۸۵	۶۷	فی حجرہ	رمل	ابونواس	۱۱۱۱

ش

۱۸۶	۱	اللمزہ	البسیط	زیاد الاعجم	۱۱۷۰

س

۱۸۷	۱	لیسا	رجز	ابن عباسؓ	۴۰۶
۱۸۸	۲	وا بأسا	رجز	العجاج	۹۰۵
۱۸۹	۳	وملبسا	طویل	امرؤ القیس	۹۵۱
۱۹۰	۴	المجلس	-	عباس بن مرداس	۲۴
۱۹۱	۵	المتلمس	طویل	المتلمس	۳۵۷
۱۹۲	۶	المجلس	کامل	مہلہل بن ربیعہ	۸۸۱
۱۹۳	۷	المستأسی	-	-	۳۳

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۱۹۴	۸	ضروس	وافر	بیاض	۵۳
۱۹۵	۹	الرأس	سریع	علی بن جبلہ	۱۰۱
۱۹۶	۱۰	الانس	–	مجنون بن عامر	
		ص			
۱۹۷	۱	نمیص	طویل	امرؤ القیس	۱۶۶
۱۹۸	۲	القمیص	وافر	فرزدق	۴۰۷
		ض			
۱۹۹	۱	باضا	–	–	۱۳۴
۲۰۰	۲	مخیض	متقارب	ابو مثلم الهذلی	۴۱۷
۲۰۱	۳	الارض	سریع	الحطان بن المعلی	۵۸۹
		ع			
۲۰۲	۱	ترتع	رمل	سوید بن ابو کامل الیشکری	۳۶۹
۲۰۳	۲	نزع	〃	〃	۹۳۵
۲۰۴	۳	مجمعا	طویل	تابط شرا	۱۰۰
۲۰۵	۴	مضجعا	〃	عبید بن حصین الراعی	۱۲۹
۲۰۶	۵	رضعا	بسیط	الاعشی میمون	۸۱۷
۲۰۷	۶	ان تقطعا	طویل	مسلم بن الولید	۱۱۶۸
۲۰۸	۷	تدعہ	–	انس بن زنیم راو انس بن ابی انس	۱۱۰۳
۲۰۹	۸	طائع	طویل	نابغہ	۴۳
۲۱۰	۹	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۱۱	۱۰	سلفع	کامل	ابو ذؤيب [illegible]	
۲۱۲	۱۱	تصدعوا	–	عبدة بن الطبیب	۴۴۰

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۲۱۳	۱۲	مجیع	رجز	راجز	۱۹۱
۲۱۴	۱۳	تراجع	طویل	نابغۃ الذبیانی	۳۱۹، ۶۳۵
۲۱۵	۱۴	تمزع	کامل	ابوذؤیب الهذلی	۳۸۹
۲۱۶	۱۵	لاتنفع	کامل	ابوذؤیب	۴۱۱
۲۱۷	۱۶	داکع	طویل	لبید	۴۱۳
۲۱۸	۱۷	یجزع	کامل	ابوذؤیب	۴۲۵
۲۱۹	۱۸	مسبغ	کامل	″	۵۳۲، ۵۳۴
۲۲۰	۱۹	الاصابع	طویل	الفرزدق	۵۳۱
۲۲۱	۲۰	مقانع	″	البعیث	۸۷۱
۲۲۲	۲۱	مانع	″	لانابغۃ الذبیانی	۹۸۳
۲۲۳	۲۲	مسموع، مطبوع، ممنوع	ہزج	منسوب الی علیؓ	۷۱۴
۲۲۴	۲۳	ربوعها	—	البحتری	۳۲
۲۲۵	۲۴	بالاسراع	کامل	المسیب بن العلس	۷۱
۲۲۶	۲۵	بمباع	کامل	الهذلی راجل عمرو بن مالک الهذلی	۱۳۴
۲۲۷	۲۶	جُنّاع	سریع	ابوقیس بن الاسلت	۱۹۰
۲۲۸	۲۷	تهجاع	″	″	۲۳۸
۲۲۹	۲۸	الهاع	″	″	۳۵۱
۲۳۰	۲۹	ضیّع	—	العجیر السلولی	۳۵۵
۲۳۱	۳۰	کالنواعی	سریع	ابوقیس بن الاسلت	۴۰۳
۲۳۲	۳۱	اربع	—	مسیلمہ الکذّاب	۴۹۱
۲۳۳	۳۲	صاع	کامل	المسیب بن علس	۶۰۰
۲۳۴	۳۳	البیاع	—	قیس بن ذریح	۸۶۶
۲۳۵	۳۴	القتوع	وافر	شماخ بن ضرار	۸۷۱

القوافی والشعراء

القوافی والشعراء

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۲۷۷	۱۴	بلالا	—	ذوالرمة	۷۶۸
۲۷۸	۱۵	فصلا	بسیط	عدی بن زید العبادی	۱۰۰۱
۲۷۹	۱۶	هدیلا	کامل	عبید بن حصین النمیری	۱۱۵۲
۲۸۰	۱۷	لَهَا	متقارب	خنساء	۵۹
۲۸۱	۱۸	فاعلَة	طویل	عامر بن الطفیل	۱۰۴۳
۲۸۲	۱۹	اَلرُّجلَة	—	—	۳۸۳
۲۸۳	۲۰	فحول	طویل	طفیل الغنوی	۵۰۰، ۲۸
۲۸۴	۲۱	افعل	—	کعب بن زهیر	۴۸
۲۸۵	۲۲	تاویل	بسیط	عبدة بن طبیب	۵۹
۲۸۶	۲۳	بسل	طویل	زهیر بن ابی سلمی	۹۱
۲۸۷	۲۴	ونائل	"	ابراهیم بن هرمه	۲۴۶
۲۸۸	۲۵	تحلیل	—	کعب بن زهیر	۲۵۷
۲۸۹	۲۶	النعل	طویل	زهیر	۲۵۸
۲۹۰	۲۷	یغلُوا	"	"	۲۸۶
۲۹۱	۲۸	للقیل	—	اقّ تابط شر	۴۳۸
۲۹۲	۲۹	لخلّ	مدید	تابط شرا	۳۰۸
۲۹۳	۳۰	یتخیّلُ	مجزوء الکامل	ابوذؤیب	۳۲۹
۲۹۴	۳۱	الاکلُ	طویل		
۲۹۵	۳۲	عواسل	"	ابوذؤیب	۳۸۶
۲۹۶	۳۳	قیلوا	بسیط	عبدة بن طبیب	۴۲۶
۲۹۷	۳۴	اطول	کامل	فرزدق	۵۰۰
۲۹۸	۳۵	الفضول	وافر	عبدة بن عنمة	۵۸۸
۲۹۹	۳۶	تستهلّ	مدید	تابط شرا	۶۰۶
۳۰۰	۳۷	مکتهل	بسیط	الاعشی	۹۳۷، ۶۰۶
۳۰۱	۳۸	تهمل	طویل	امیه بن ابی الصلت	۶۲۸

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۳۰۲	۳۹	الواجیل	بسیط	عبدۃ بن طبیب	۶۵۲
۳۰۳	۴۰	عدلُ	طویل	زہیر	۶۷۶
۳۰۴	۴۱	مؤکل	کامل	الاحوص	۶۹۵
۳۰۵	۴۲	والفعل	طویل	زہیر	۸۸۰
۳۰۶	۴۳	الابلُ	منسرح	المتلمس بن عمرو	۹۱۳
۳۰۷	۴۴	بادلہٗ	طویل	زینت طثریہ	۷۷
۳۰۸	۴۵	فصیلُہا	”	رجلٌ من بنی عقل	۲۷۳
۳۰۹	۴۶	زوالُہا	کامل	الاعشیٰ	۴۴۵
۳۱۰	۴۷	زویلُہا	طویل	ذوالرمۃ	۴۴۵
۳۱۱	۴۸	سائلہٗ	”	زہیر	۷۰۹
۳۱۲	۴۹	ہلالُہا	رجز	راجز	۷۶۳
۳۱۳	۵۰	تستعیلُہا	طویل	فرزدق	۱۱۵۲
۳۱۴	۵۱	بمثالِ	خفیف	الاعشیٰ	۴۱
۳۱۵	۵۲	فانزلِ	—	عبد القیس بن خفاف الرجمی	۹۶
۳۱۶	۵۳	الاجمالِ	الکامل	جمیل بن عبداللہ العذری	۲۴۷
۳۱۷	۵۴	نایلِ	طویل	ابوذؤیب	۳۲۸
۳۱۸	۵۵	النملِ	—	الحادرۃ الذبیانی	۳۶۶
۳۱۹	۵۶	عُوَّلِ	کامل	ابوکبیر الھذلی	۴۵۸
۳۲۰	۵۷	السلسلِ	”	”	۴۸۸
۳۲۱	۵۸	قبلی	طویل	ابوذؤیب	۶۱۴
۳۲۲	۵۹	الغافل	—	المتنبی	۶۲۳
۳۲۳	۶۰	فیغسلِ	طویل	امرؤالقیس	۲۷۹
۳۲۴	۶۱	المقالِ	وافر	—	۶۸۳
۳۲۵	۶۲	مقتلِ	طویل	امرؤالقیس	۶۹۹
۳۲۶	۶۳	للقیلِ	”	ام تابط شرا	۴۳۸

القوافی والشعراء

م

القوافی والشعراء

القوافی والشعراء

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۳۷۳	۴۰	الاقدام	الکامل	ابواسحٰق	۴۳۸، ۳۳۴
۳۷۴	۴۱	المرجّم	طویل	زہیر	۳۸۵
۳۷۵	۴۲	التوہم	کامل	عنترہ	۳۹۳
۳۷۶	۴۳	للفم	طویل	زہیر	۳۹۵
۳۷۷	۴۴	بالتکلّم	″	معبد بن علقمہ	۴۴۹
۳۷۸	۴۵	یسأم	″	زہیر	۵۱۸
۳۷۹	۴۶	بمحرم	کامل	عنترہ	۵۴۷
۳۸۰	۴۷	مندم	″	—	۵۵۲
۳۸۱	۴۸	المؤدم	رجز	العجاج	۵۸۹
۳۸۲	۴۹	الہرم	کامل	الہمدونی	۶۶۸
۳۸۳	۵۰	عرمرم	طویل	اوس بن حجر	۷۰۵
۳۸۴	۵۱	القدّام	کامل	مہلہل بن ربیعہ	۸۲۳
۳۸۵	۵۲	ھائم	—	فرزدق	۹۳۶
۳۸۶	۵۳	الکلم	الکامل	طرفۃ بن العبد	۹۳۰
۳۸۷	۵۴	منجم	—	—	۹۵۱
۳۸۸	۵۵	التکلّم	رجز	العجاج	۹۶۱
۳۸۹	۵۶	العزائم	بسیط	فرزدق	۹۶۲
۳۹۰	۵۷	لجام	کامل	حسان	۹۷۳
۳۹۱	۵۸	جوم	وافر	الاسدی (شقیق بن سلیک الاسدی	۱۰۲۰
۳۹۲	۵۹	یتیمۃ	—	—	۳۴۲

ن

عدد مسلسل	رقم	القافیہ	البحر	الشعراء	صفحات
۳۹۳	۱	غداق	طویل	امرؤالقیس	۱۶۲
۳۹۴	۲	ربیعون	رجز	اکثم الصیفی	۳۷۷

القوافی والشعراء

صفحات	الشعراء	البحر	القافیہ	رقم	عدد مسلسل
۴۸۵	—	—	سکرانُ	۳	۳۹۵
۵۳۹،۸۰۷	راجز	رجز	الانسانُ	۴	۳۹۶
۳۳	شوید المراثد الغنوی الحارثی	—	جنی	۵	۳۹۷
۷۸	حمید الدرقط	رجز	التبدینا / انفرینا	۶	۳۹۸
۱۶۰	زھیر	طویل	ثنی	۷	۳۹۹
۳۹۶	حزیمہ بن نھد	—	الظنونا	۸	۴۰۰
۴۰۲	الفرزدق	—	وطنا	۹	۴۰۱
۴۲۹	—	—	رئینا	۱۰	۴۰۲
۴۷۴	تمیم بن مقبل العامری	بسیط	البیٰا	۱۱	۴۰۳
۶۵۰	قریط بن انیف	″	وحدانا	۱۲	۴۰۴
۹۵۶	مالک بن اسماء	خفیف	لحنا	۱۳	۴۰۵
۱۰۱۱	عبد الشارق بن عبد العزیٰ الجہنی	وافر	جھینا	۱۴	۴۰۶
۳۲	زھیر	بسیط	الاسنِ	۱۵	۴۰۷
۳۴۰	سحیم بن وثیل الریاحی	″	الاربعینِ	۱۶	۴۰۸
۳۷۰	المثقب العبدی	وافر	نبیّنی	۱۷	۴۰۹
۴۴۴	ذوالاصبع العدوانی	بسیط	فکیدونی	۱۸	۴۱۰
۵۰۵	—	—	والسنی	۱۹	۴۱۱
۵۲۲	بعض بنی اسد	طویل	جبینی	۲۰	۴۱۲
۵۷۵	ابونیاس	—	نشنی	۲۱	۴۱۳
۶۵۶	بشار بن برد الدعی	سریع	باذنینِ	۲۲	۴۱۴
۷۷۶	ابوحمران مرثد بن حمران	وافر	غنی	۲۳	۴۱۵
۱۷۴	رؤبۃ	رجز	قطنی	۲۴	۴۱۶

القوافی والشعراء

صفحات	الشعراء	البحر	القافیہ	رقم	عدد مسلسل
۱۰۱۲	ابن المقبل	طویل	یختلفان	۲۵	۴۱۷
۱۱۷۷	کعب بن سعد الغنوی	کامل	یدان	۲۶	۴۱۸
۱۱۸۲	الشماخ بن ضرار	وافر	بالیمین	۲۷	۴۱۹
		ی			
۸۳	مالک بن الریب المازنی	طویل	الیواکیا	۱	۴۲۰
۱۰۵۱، ۴۴۷	ابوالعتاھیہ	وافر	طیا	۲	۴۲۱
۸۱۵، ۸۰۳	المنذل بن عبد اللہ	طویل	تنادیا	۳	۴۲۲
۱۱۰۵	-	-	وادیا	۴	۴۲۳
۱۰۲۹	-	رمل	شکیتہ	۵	۴۲۴
		ھ			
۱۰	رؤبہ اوابوالنجم	رجز	غایتاھا	۱	۴۲۵
۷۲۹	نحیف بن سلیم العقیلی	وافر	رضاھا	۲	۴۲۶

فهرس المراجع لتخريج الاحاديث والاشعار

١ الرضی علی الکافیہ
٢ دیوان زہیر
٣ ملحقات دیوان زہیر
٤ العقد الثمین
٥ المختارات
٦ السمط
٧ البحر المحیط
٨ الطبرسی
٩ الطبری
١٠ دیوان البحتری
١١ المعمرین
١٢ العمدۃ لابن رشیق
١٣ جمہرۃ العرب
١٤ دیوان حطیئہ
١٥ الاشتقاق
١٦ الاغانی
١٧ اللآلی المصنوعہ
١٨ المؤتلف للآمدی
١٩ بغدادیہ
٢٠ سیرۃ لابن ہشام
٢١ الشعراء
٢٢ دیوان المتنبی
٢٣ العکبری علی المتنبی
٢٤ المحاضرات للراغب اصفہانی
٢٥ کنز العمال
٢٦ الصحیح للبخاری
٢٧ الصحیح للمسلم
٢٨ السنن لابی داؤد
٢٩ الجامع للترمذی
٣٠ المجتبیٰ للنسائی جمع ابن السنی
٣١ ابن ماجہ
٣٢ الموطا لمالک مع زرقانی
٣٣ الفائق للزمخشری
٣٤ النہایہ لابن الاثیر
٣٥ غریب الحدیث لابی عبید
٣٦ مجازات القرآن للشریف الرضی
٣٧ الصناعتین
٣٨ المشکل للقتیبی
٣٩ غریب القرآن لابن قتیبہ
٤٠ العقد الفرید لابن عبد ربہ
٤١ الباب مختارہ
٤٢ الاقتضاب
٤٣ تہذیب الاصلاح
٤٤ معانی العسکری
٤٥ المعانی للقتبی
٤٦ قانون البلاغۃ ضمن رسائل البلاغۃ کرد علی
٤٧ امالی المرتضیٰ
٤٨ دیوان طفیل
٤٩ دیوان حسان
٥٠ دیوان امرؤ القیس
٥١ دیوان ابو العتاہیہ
٥٢ تخریج الکشاف لابن حجر
٥٣ عون المعبود
٥٤ المرزوقی علی الحماسہ
٥٥ الکامل للمبرد
٥٦ العیون
٥٧ اللسان
٥٨ التاج للزبیدی
٥٩ الصحاح للجوہری
٦٠ جمہرۃ اللغۃ لابن درید
٦١ شواہد الکشاف
٦٢ تہذیب الالفاظ
٦٣ الالفاظ
٦٤ الذیل الامالی المرتضیٰ
٦٥ شرح شواہد للسیوطی
٦٦ شرح شواہد الکبری للعینی
٦٧ الاصمعیات
٦٨ الاشباہ النحویہ
٦٩ الامالی لابن الشجریہ
٧٠ اعراب ثلاثین لابن خالویہ
٧١ الحصری زہر الآداب
٧٢ ابن الحدید
٧٣ المطرزی علی المقامات
٧٤ زخائر القصر
٧٥ الکناس الکواکبی
٧٦ المسائل والاجوبہ لابن سیدہ
٧٧ معالم التنزیل
٧٨ المغنی لابن ہشام
٧٩ دیوان اعشیٰ
٨٠ نقد الشعر
٨١ الحیوان للجاحظ
٨٢ شرح الحیوان للجاحظ
٨٣ ثمار القلوب
٨٤ التیجان

۸۵ العجب العجاب
۸۶ المفضلیات للضبی
۸۷ المحکم لابن سیدہ
۸۸ کتاب الابدال لابن الطیب
۸۹ التبریزی علی الحماسہ
۹۰ التبریزی علی المعلقات
۹۱ الزوزنی علی المعلقات العشر
۹۲ مجمع الامثال للثعالبی
۹۳ دیوان الستہ
۹۴ مجالس ثعلب
۹۵ مجاز القرآن لابی عبید
۹۶ مختار الشعر الجاہلی
۹۷ البلدان للحموی
۹۸ المعجم للطبرانی الصغیر
۹۹ النوادر لابی سہل
۱۰۰ مجمع الزوائد
۱۰۱ نزہۃ الالباء
۱۰۲ طبقات زبیدی
۱۰۳ تاریخ بغدادی
۱۰۴ ابن خلکان
۱۰۵ اعلام زرکلی
۱۰۶ کشف الظنون حاجی خلیفہ
۱۰۷ روح المعانی
۱۰۸ معجم الادباء
۱۰۹ معانی القرآن للفراء
۱۱۰ الطرائف
۱۱۱ دیوان ابی الاسود صنعہ سکری
۱۱۲ دیوان الافوہ
۱۱۳ مجموعۃ المعانی

۱۱۴ روضۃ العقلاء
۱۱۵ المزہر للسیوطی
۱۱۶ القراءت الشاذہ لابن خالویہ
۱۱۷ دیوان کعب
۱۱۸ الاسماء والصفات للبیہقی
۱۱۹ ابن کثیر تفسیر
۱۲۰ التوضیح للشوکانی
۱۲۱ المستدرک للحاکم
۱۲۲ التعریفین الکنانی
۱۲۳ المسائل الحلبیہ
۱۲۴ جامع البیان للقرطبی
۱۲۵ الاحکام الجصاص
۱۲۶ احکام القرآن لابن العربی
۱۲۷ الروض الانف للسہیلی
۱۲۸ بدائع الفوائد لابن القیم
۱۲۹
۱۳۰ تشذرات
۱۳۱ بغیۃ الوعاۃ للسیوطی
۱۳۲ ازاہیر الریاض المریعہ
۱۳۳ التنبیہ للبکری
۱۳۴ شرح ابن الانباری علی المفضلیات
۱۳۵ شرح ابیات الایضاح للشنتمری
۱۳۶ شرح ابیات الکتاب
۱۳۷ الاضداد لابی الطیب
۱۳۸ الکامل لابن عدی
۱۳۹ الطراز للخفاجی
۱۴۰ الصاحبی
۱۴۱ اعلان التوبیخ
۱۴۲ نفح الطیب للمقری

۱۴۳ شرح الشواہد الاعلام
۱۴۴ شرح السیرانی
۱۴۵ تخریج عراقی
۱۴۶ الرسالۃ القشیریہ
۱۴۷ الشفاء للقاضی عیاض مع شرح نسیم الریاض
۱۴۸ شرح المہذب للنووی
۱۴۹ منتہی الطلب
۱۵۰ المیدانی
۱۵۱ التقائض
۱۵۲ امالی الیزیدی
۱۵۳ الاختیارین
۱۵۴ ایام العرب
۱۵۵ البیان للجاحظ
۱۵۶ دیوان ابن الرومی
۱۵۷ الفخر المحسن
۱۵۸ منہاج السنہ
۱۵۹ الوزقۃ الجراح
۱۶۰ الطبقات لابن المعتز
۱۶۱ خاص الخاص الثعالبی
۱۶۲ غریب القرآن للسجستانی
۱۶۳ الاشتقاق
۱۶۴ الدرۃ للخفاجی
۱۶۵ الاضداد لابی حاتم
۱۶۶ لباب الآداب
۱۶۷ الوحشیات
۱۶۸ مصارع العشاق
۱۶۹ مقاییس
۱۷۰ اسد الغابہ
۱۷۱ الرسالۃ للشافعی

۱۷۲	الفتح الکبیر	۲۰۱	الرسالہ للشافعیؒ	۲۳۰	تاریخ المصادر للبیہقی
۱۷۳	زوائد لابن حبان	۲۰۲	المعارف للقتبی	۲۳۱	تحفۃ الذاکرین
۱۷۴	اشعار الہذلیین	۲۰۳	نیل الاوطار شوکانی	۲۳۲	عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی
۱۷۵	کبیر رازی	۲۰۴	کتاب الام للشافعیؒ	۲۳۳	الحمدونی
۱۷۶	الادب الدنیا والدین للماوردی	۲۰۵	زوائد ابن حبان	۲۳۴	مکارم الاخلاق للخرائطی
۱۷۷	الکنز اللغوی	۲۰۶	النجاذی (نظام الغریب)	۲۳۵	تاویل مختلف الحدیث
۱۷۸	المحکم لابن سیدہ	۲۰۷	تخریج عراقی علی الاحیاء	۲۳۶	ذخائر المواریث
۱۷۹	الجمی	۲۰۸	حاشیہ امیر علی علی المغنی	۲۳۷	الفرائد للآلوسی
۱۸۰	الاضداد لابن الانباری	۲۰۹	ابن یعیش علی المفصل	۲۳۸	الاموال لابی عبید
۱۸۱	الاضداد للجاحظ	۲۱۰	ابن یسعون شرح ابیات الایضاح	۲۳۹	صنعۃ تجاہل العارف
۱۸۲	الاتباع لابی الطیب	۲۱۱	الفاخر	۲۴۰	الابتہاج فی تخریج احادیث المنہاج
۱۸۳	المعرب للجوالیقی	۲۱۲	النویری	۲۴۱	التدریب للسیوطی
۱۸۴	المجازات النبویہ	۲۱۳	المحبر لابن حبیب	۲۴۲	النوادر للبلقی
۱۸۵	اساس البلاغۃ	۲۱۴	انوار التنزیل للبیضاوی	۲۴۳	البصائر والذخائر
۱۸۶	الاسرار لابن الانباری	۲۱۵	الموشح للمرزبانی	۲۴۴	اعجاز القرآن للباقلانی
۱۸۷	ایام العرب	۲۱۶	الجمان لابن ناقیا	۲۴۵	مبادئ اللغۃ للاسکافی
۱۸۸	الامثال للایجری	۲۱۷	دیوان رؤبہ	۲۴۶	الانصاف
۱۸۹	الاخبار الطوال	۲۱۸	ادب الکاتب	۲۴۷	الدرر اللوامع
۱۹۰	لباب التاویل	۲۱۹	اسد الغابۃ	۲۴۸	منتہی الارب
۱۹۱	الفارسی	۲۲۰	ابن ولاد	۲۴۹	الحجۃ لابی علی الفارسی
۱۹۲	الجرجانی (الکنایات)	۲۲۱	الجامع الکبیر للجزری	۲۵۰	نثار الازہار
۱۹۳	الامثال للعسکری	۲۲۲	شرح الدیوان لثعلب	۲۵۱	الوسیط
۱۹۴	الازمنۃ والامکنۃ	۲۲۳	الاصبہانی	۲۵۲	الغفران (ضمن رسائل البلغاء کرد علی)
۱۹۵	مجمع البحار الانوار	۲۲۴	الضعفاء لابن حبان	۲۵۳	طبقات النحویین
۱۹۶	الانصاف فی شواہد الکشاف	۲۲۵	البحور الزاخرہ فی علوم الآخرۃ للسفارینی	۲۵۴	طبقات القراء
۱۹۷	المستقصی للزمخشری	۲۲۶	الکشف عن مجاوزۃ ہذہ الامۃ الالف	۲۵۵	اللآلی المصنوعۃ
۱۹۸	مبادئ اللغۃ للاسکافی	۲۲۷	ابن السکیت (اصلاح المنطق)	۲۵۶	مسند احمد تحقیق احمد شاکر
۱۹۹	الفیوضات الالہیہ	۲۲۸	البخلاء للجاحظ		تمت بالخیر
۲۰۰	الفاضل للمبرد	۲۲۹	شرح الکامل للمرصفی		